

دلِ دیادِ اہلبیز



رفعت سراج



بسم اللہ الرحمن الرحیم

پیش لفظ

اس دنیا میں ہر متحرک انسانی وجود ایک کہانی ہے۔
دل دیا، دہلیز کو ایک آئیڈیل ”لوا ستوری“ کا سرٹیفکیٹ (قارئین کی طرف سے) ایٹو ہوا۔ 48 ماہ تک یہ ناول قسط وار شائع ہوا۔

اس دوران مجھ سے اس کے نام کے معنی و مقصد دریافت کیا جاتا رہا.....
جہاں دل ہے وہاں انتظار کی کیفیت سے گزرتا اس کی قسمت ہے..... دل.....
کھلنے کا انتظار دہلیز پر سماعت ٹھہری رہتی ہے..... کسی کے قدموں کی آہٹ پر کارننگ رہتے
ہیں، دہلیز پر جلتا ہوا دیا اس بات کا غماز ہے کہ اندر کوئی جاگ رہا ہے۔ اندھیری دہلیز سے تو یہ
خوشہ ہے آنے والا یہ سمجھ کر واپس نہ پاٹ جائے کہ انتظار کرنا والے سوچکے ہیں۔
محبت کہ اندیشے و دھڑلے بہت جتنے ہیں..... ہر آن کوئی تسلی کی تھپکی چاہتے ہوتی
ہے جلتا ہوا دیا..... اندیشوں میں سہارا ہے..... نہیں دور سے آنے والے کیلئے خوشامیدی
کی کرن ہے..... اس کی روشنی میں وصال کی آس ہے۔

یہ دل کی کہانی ہے۔ دل والوں کی کہانی ہے۔ پھول کھلنے کی کہانی ہے۔ آگ
لگنے کی کہانی ہے وہ آگ جو دل میں سلگتی رہے تو محبت کہا جائے۔

بھڑک اٹھے تو سب کچھ بھسم کر ڈالے۔ اس آگ کا نام ہے۔ حسد انتقام

یہ وہ جذباتی کیفیات ہیں، واذل سے انسان کو زنجیر کرتی آ رہی ہیں.....
انسانوں کے موڈ اور رویے بناتی ہیں..... جن سے واقعات جنم لیتے ہیں جن کو مرتب کر دیں
تو کہانی کہلائے بے ترتیب رہنے دیں تو صرف مسائل کا انبار ہوں۔

میں نے دل کی کہانی لکھی ہے.....
دل والوں نے بڑے پیار سے پڑھی ہے اور انشاء اللہ پڑھتے رہیں گے.....

جنریشن خواہ کوئی ہو۔

دل تو سب کا ہے

سب کے پاس ہے

اس خوف سے کہ

آنے والا اندھیرا دیکھ کر

پلٹ نہ جائے.....

بے وفائی کے اندیشوں کے

گھنے جنگل میں بھٹک جائے

دل کی دہلیز پہ

اک دیا جلار کھا ہے

وے بول سانول وے بول سانول

نہ روئیں سانوں نہ روئیں سانوں

ویکیں کنڈیاں وے وچ نہ تو ' توئیں سانوں

وگدی اے راوی وچ ' شاں مہندیاں - شاں مہندیاں

تیرا ڈھولا بڑا سوہنا مینوں سہیاں کہندیاں۔

”روٹی آپا۔ آپ کو بابا صاحب بلار ہے ہیں۔“ خادمہ اس کے کان میں بولی تھی۔

ڈھول کی تھاپ یکدم رک گئی۔ اور اس کی سانس بھی۔

”لاہیری میں ہیں؟“ وہ کہہ کر رو بوٹ کی طرح نکل گئی۔

روٹی نے اپنے چاروں طرف بیٹھی ہوئی لڑکیوں کو اس طرح دیکھا۔ جیسے ان میں سے کوئی آنے والے لمحات کی پیشگوئی کرے گی۔

وہ بدقت تمام انھی اور ڈرے ڈرے انداز میں چلتی لاہیری کے دروازے پر آ کر رک گئی اور بہت مشکل سے جیسے دستک دی۔

”آجاؤ۔ بابا صاحب رنجشک اور بے تاثر آواز اس کے کانوں سے نکلائی۔ وہ اندر داخل ہو کر مزید آئے نہیں بڑھی۔

بابا صاحب نے کتاب چہرے کے سامنے کی ہوئی تھی۔ اور روٹی کو جیسے یہ پردہ غنیمت تھا۔ ایک ڈھال۔ ایک دیواری درمیان میں حائل پا کر جیسے اس کے خوف میں کمی واقع ہو رہی تھی۔

”ڈھولک کون بجا رہا تھا؟“ بابا صاحب کی سر دھڑ سے جیسے وجود برف مرنے لگا۔

”مم..... میں..... بجا رہی تھی بابا صاحب۔“

”کیوں؟“

”ظفری بھائی کی شادی جو ہے“ اس نے بمشکل تھوک نکلا۔

”اور یہ شادی کس کے ساتھ ہو رہی ہے؟“ لہجہ ہنوز پتھر ملا تھا۔

روشی نے حیران نظروں سے انہیں دیکھا۔

”جھومر کے ساتھ بابا صاحب۔“ اس کے لہجہ میں الجھن تھی۔

”جھومر کون ہے؟“ وہ برہمی سے پوچھ رہے تھے۔

اللہ۔ (معاملہ کیا ہے آخر؟) اب خوف کی جگہ پریشانی نے لے لی۔

”کا کا جان کے شو فرعنایت علی کی بیٹی ہے بابا صاحب۔“ اس نے اس بار قدرے سنبھل کر جواب دیا۔

”بے وقوف لڑی۔ یہ بات جو چند افراد کے علاوہ کسی کو پتا نہیں۔ تم ڈھول پیٹ کر گویا اعلان کی صورت بتا رہی ہو۔“ وہ

گرجے۔

روشی کی توانائیں کمپنے لگیں۔

”بابا صاحب! بابا کی تو کوئی بھی لڑکی نہیں ہے۔ ہماری تینوں چاروں نوکرانیاں ہیں اور میں۔ زری آپا، موننا باجی، گلوآپا،

حنا، فانیہ، لالی، روبی، مریم، شنوآپا، بیہ، سونی۔ کوئی بھی تو نہیں گارہا تھا۔ تو۔“

”اس لئے کہ وہ تمہاری طرح بے وقوف اور کم عقل نہیں ہیں۔ اور تمہارا اس قدر حرج ہو رہا تھا کہ خادماؤں کو لیکر بیٹھ

گئیں۔“

ان کی ہچکچاہٹ اور پرروشی کی رسی سہی طاقت بھی جواب دے گئی۔

”جو وقت کالج میں اور تصویریں بنانے میں گزارتی ہو، گنوا تی ہو۔ کسی سمجھدار لڑکی کے ساتھ گھر میں مصروف رہا کرو۔

شاید تمہاری بہت عقل آج آئے۔“

بڑی زبردست لڑکتھی۔ اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ مگر، بابا صاحب کو چہرہ نہ دیکھنے کی نہ عادت تھی نہ فرصت۔

”جہاں۔ اور آئندہ دھیان رکھنا۔ جو کچھ آج ہو اس پر غور کرنا۔ غور فکر کرنے سے بھی عقل میں اضافہ ہوتا ہے۔“

کس قدر بات تھی اس سے بے میں

اتنی سخت سست پر اس کا دل چاہ رہا تھا پھوٹ پھوٹ کر روئے۔

وہ نیم تاریک راہداری میں نکل آئی۔ اس جوش و لوئے سے وہ گارہی تھی۔ کیا بے چارے ظفری بھائی انسان نہیں؟ کیا

ان کا دل نہیں؟ کتنے پتھر ہیں بابا صاحب۔ میں نے تو کھوکھو بھیجا ہوا تھا کہ وہ ظفری بھائی کو بلا لائے۔ وہ کتنا خوش ہوں گے۔

ہائے۔ کاش بچپن میں انہیں خراکار اٹھا کر لے جاتے۔ کم از کم ان کی شادی پر سارے بیگار کپ میں شادی والی رونق تو

ہوتی۔

روشی نے اپنی سمجھ عقل کے مطابق تمنا کی۔

”ادھر اندھیرے میں کہاں جا رہی ہیں؟“ وہ کیونکہ سوچوں میں غلطاں تھی۔ اچانک آواز پر جیسے اچھل پڑی۔

”جہنم میں بھی جا رہی ہوں تو۔ تم سے مطلب؟“ وہ بھوکی شیرینی کی طرح غرائی۔

”میں تو پوچھ رہا تھا۔ وہ خفیف سا ہو کر گویا ہوا تھا۔

”کس قدر شوق ہے تمہیں پوچھنے کا۔ کسی روز تمہیں پوچھ لیا ناں تو پتہ لگ جائے گا۔“ وہ علی علی کرتی جیسے اس پر چڑھ

دوڑی۔

”ارے ہم تو عاجز ہیں بابا۔ آپ کے نوکر جیسے۔ دبے دبائے سے۔ کیوں بلا وجہ اپنی ازجی ضائع کرتی ہیں۔“ وہ عجیب

سی تلخی سے ہنسا اور آگے موڑ پر گم ہو گیا۔

”لو۔ ہر بات دل پر لے لیتے ہیں۔ حالات۔ یہ حضرت جانتے ہیں سارے گھر میں سب سے زیادہ نرم گوشہ رکھتی ہوں

ان کیلئے۔“

”اب بھی ان کی قسمت ایسی ہے تو میرا کیا تصور ہے اس میں۔“ اب وہ نئے سرے سے کڑھ رہی تھی۔

”اے شی! موننا نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور سب کو کھڑکی کی سمت آنے کا اشارہ بھی ساتھ

ہی کیا۔

وہ سب گرتی پڑتی کھڑکی کی سمت بڑھی تھیں سوائے روشی کے۔ وہ اسی طرح بیڈ پر سر جھکائے یہاں کے تانوں پر۔

کیونکہ کھرچ رہی تھی۔

”اے روشی آؤ ناں۔“ گلوآپا نے جیسے اس کے نمس بیٹھے رہنے پر تعجب کا اظہار بھی کیا تھا۔

روشی اسی طرح بہری گوئی بنی بیٹھی رہی۔

گلوآپا۔۔۔ جیسے بیزار کن انداز میں شانے جھٹک دیئے تھے اور دوسری لڑکیوں کی سمت بڑھ گئی تھیں۔

”دو پہرے۔ نو ڈھول پھاڑے جا رہے تھے اور اب حرکت بھی دشوار ہے۔“ وہ بڑبڑاتی تھیں۔

”یہ ظفری بھائی کو گاڑی میں کون بٹھا رہا ہے؟“ سونی کی آواز کمرے میں ابھری۔

”چھوٹے چچ ہیں۔“ موننا نے جواب دیا تھا۔

”بابا صاحب نظر نہیں آ رہے؟“ بیہ نے ذرا دھڑک تاک جھانک کی۔

”ان کی بجیر و دیر ہو۔ روانہ ہو چکی۔“ مریم نے اطلاع بہم پہنچائی۔

”وہ ساتھ کیوں نہیں آئے؟“ بیہ نے حیرت سے پوچھا۔

”آئیں گے تو پوچھ لینا۔“ زری آپا نے جیسے ڈانٹا تھا۔

”لو بابا۔ ان سے کون پوچھ سکتا ہے۔“ بیہ نے کانوں کو ہاتھوں سے چھوا۔

”زری۔ یہ جھومر بھلا کیا نام ہوا؟“ مونا باجی کی انشا پر دازی والی حس بیدار ہو چکی تھی۔

”ٹھیک ہے۔ اسم ہے۔ مگر مذکر ہے۔“ مونا باجی بڑی سوچ بچار میں مبتلا تھیں۔

”حد ہے تم سے مونا۔ ہمہ وقت ٹائم پسیس سے باہر ہی رہتی ہو۔ کا کا جان کے ملازم زیادہ تر قبائلی اور علاقہ غیر سے تعلق رکھتے ہیں اور تم تو جانتی ہو وہاں نام رکھنا بالکل بھی در دسر نہیں۔ پھول پتے، دیوار، پہاڑ، جز، بچ، کہیں سے اٹھا کر اپنی اولاد کو نام دے دیتے ہیں۔“ شیو کے انداز میں ازلی زہر پلا پن موجود تھا۔

”پتا نہیں واپسی کب تک ہوگی؟“

”لو۔ ان کی واپسی بھی شروع ہو گئی۔ انہوں نے تو ابھی آدھا فاصلہ بھی طے نہ کیا ہوگا۔“ روبی ہنسی۔

”اچھا جب جھومر بھابی آئیگی تو کیا ہم سب سواگت کو جانیگی؟“ مونا باجی، گلو آپا سے مخاطب ہوئیں۔

”بابا صاحب نے مجھے مشورہ دیا تھا کہ آپ لوگوں کی صحبت میں بیٹھا کروں کہ مجھے بھی دانشمندی کا ذائقہ معلوم ہو۔ اور آپ لوگوں کا یہ حال ہے۔“ روشی نے معنی خیز انداز میں بات ادھوری چھوڑ دی۔

”کیا حال ہے ہمارا؟“ مونا کو وہ بہت سی بے ادب لگی تھی۔

”یہ مسٹری میرج ہے بھولی آپنی۔“ روشی کے اب سارا سمجھ میں آچکا تھا اس نے علم تقسیم کرنا شروع کر دیا تھا۔

”لو بھئی۔ یہاں تو ہر چیز ہی ”مسٹری“ ہے یہ صرف میرج پکڑے بیٹھی ہیں۔“ زری آپنی نے ہنس کر مونا کو آنکھ ماری۔

”مجھے تو ان سب کی واپسی تک نیند بالکل نہیں آئے گی۔“ یہ تے اپنی مشکل بیان کی۔

”اور ہمیں نہایت افسوس کے ساتھ بتاتا پڑ رہا ہے کہ جن راستوں سے یہ باراتی گئے ہیں ان راستوں سے واپس نہیں آئیں گے۔ پچھلے پڑے پھانک سے دلہن سیدھی جلد عروسی میں پہنچادی جائے گی۔ اسے اس طرف کبھی بھی نہیں آنا۔ کچھ سمجھیں۔“

”بائے گلو آپا آپ کتنی بے درد ہیں۔ ایسی شام غریباں جیسی شادی۔ آپ کو ترس نہیں آ رہا جھومر پر۔“

سونی نے خاصی دیر بعد حصہ لیا۔

گلو آپا نے اپنی حسین بلوریں آنکھیں ایک لختے کو سونی کی آنکھوں میں ڈالیں اور اٹھ کھڑی ہوئیں۔

”بہت ہی نا سمجھ ہو سونی۔“ وہ گم صم سے انداز میں مسکرائیں۔

”کہاں چلیں گلو؟“ زری بھی اب ہر پہلو سے متجسس تھیں۔

”نیند آرہی ہے سونا چاہتی ہوں۔“

”ابھی ہے۔“

”ہاں۔ اگر سونہ بائی تو پندرہ دن تک ڈپریشن رہے۔“ نیند کیسی اچھی راہ فرار ہے مگر آجائے تو۔“

وہ سرگوشی کے انداز میں کہہ کر مسکرائیں اور باہر نکل گئیں۔

”ظفری بھائی کو دو لہا تو بنایا ہوگا بڑی امی نے“ یہ کو یکدم پھر کچھ یاد آیا۔

”تو پھر چپ رہو۔“ مریم کو جیسے یہ بے نتیجہ گفتگو بہت کھل رہی تھی۔

”ارے بڑی امی بھی جارہی ہیں۔“ حنا کی تعجب خیز آواز روشی کے کانوں میں پڑی۔

”لو تو کیا وہ نہیں جانتیگی اپنے نور چشم ظفریاب بن خان آفتاب کے عقد مسنونہ میں۔“ مانیہ نے چڑ کر قدرے سوالیہ انداز میں جواب دیا تھا۔

”اللہ کتنا دل چاہ رہا ہے ظفری بھائی کے چہرے کے تاثرات دیکھئے کو۔“ شیو بڑی بے بسی سے گرل تھام کر بولی تھی۔

”جاؤ دیکھ آؤ۔ ابھی مریم نے بتایا نہیں۔ بابا صاحب تو دیر ہوئی جا چکے۔ گلو آیا ہے جیسے اس کی بے بسی سب سے زیادہ محسوس کی تھی اسی لئے فوراً حل بھی بتایا تھا۔“

”مگر گلو آپا۔ اس وقت جتنے بھی لوگ پورنیکو میں کھڑے ہیں۔ سب تقریباً بابا صاحب جیسے ہی ہیں۔ کوئی کم، کوئی زیادہ۔“ شیو نے خاصی تلخی سے جواب دیا۔

”لو بھئی۔ روانگی شروع۔“ یہ نے کن اکھیوں سے بظاہر بے نیاز روشی کی طرف دیکھ کر رنگ کنٹری کی تھی۔

”آج تو ظفری بھائی بہت خوش ہوں گے۔“ یہ دھپ سے بیڈ پر بیٹھ گئی۔

”لو۔ ایسے۔ ویسے۔ اب تو انہوں نے سب کی شادیوں پر ”رونا“ شروع کر دیا تھا۔ انیق بھیا کا سہرا نہیں نوج ڈالا تھا۔ اسی دن تو بابا صاحب نے وعدہ کیا تھا کہ ان سے کہ ان کی شادی بھی بہت جلد کر دیں گے۔“

روبی جواب تک بڑی خاموشی سے تمام کارروائی دیکھ رہی تھی۔ بڑی تفصیل سے شروع ہوئی تھی۔

”مگر۔“ ہائے بے چاری جھومر۔ اس کے بھی تو۔ خواب ہوں گے۔ کچھ ارمان ہوں گے۔ ماما بلی بتا رہی تھی کہ بہت حسین ہے۔“

روبی کی معلومات واقعی وسیع تھیں۔

”لو۔ ماما بلی کو کیسے پتا۔“ زری آپنی نے تنک کر جھوٹ پکڑنے کی کوشش کی تھی۔

”جب ٹیپو کی آیا اس دار فانی سے کوچ کر گئی تھیں۔ تو کا کا جان نہیں لے گئے تھے ماما بلی کو۔“ روبی کو ”ٹنک“ کرنے پر شدید غصہ آیا تھا۔ (ہونہہ۔ یہ ہر ایک کو جھوٹا ہی سمجھتی ہیں)

”اوہ۔ ہاں۔ اس کا تو مجھے دھیان ہی نہیں آیا پورے چار مہینے رہ کر آئی تھی ماما بلی سرائے۔“

”اور واپسی کے بعد سینکڑوں قصے بھی سنائے تھے۔ سرائے کے۔“ زری آپنی کو یاد آ گیا۔

روبی کا موڈ خاصا آف ہو چکا تھا اس لئے اس نے کسی قسم کے تاثرات دینا مناسب نہ سمجھا۔

”اچھا۔ تو روبی تم بتا رہی تھیں۔ جھومر بہت حسین ہے۔“ زری آپنی کا اشتیاق دوا آتھ تھا۔

”بس بتا تو دیا۔“ روبی نے اسی بگڑے بگڑے انداز میں کہا۔

”ایک تو تم نازک مزاج بہت ہو۔ فٹ برامان جاتی ہو۔ وہ تو میں اپنی یادداشت کیلئے ہی پوچھ رہی تھی۔“

زری آپنی نے اسے دونوں بانہوں میں دبوچ لیا اور کھلکھلائیں۔

”ہاں۔ ظاہر ہے آخر اکلوتے بیٹے ہیں ان کے۔“ شیو نے پھر تلخ انداز میں شرکت کی۔

”آپ کو جیسے بڑا دکھ ہے۔“ روبی نے شیو کی سمت دیکھا۔

”تم بس اپنی حد میں رہا کرو۔ بڑی آئیں خوش ہونے والی۔“ شیو کوتاہ آگیا۔

روبی بے نیازی سے شانے جھٹک کر باہر نکل گئی۔

”اے۔ بی بی سی جا رہا ہے۔“ مونانے کھڑکی میں کھڑے کھڑے ان سب کو مخاطب کیا۔

”بلائیں اسے۔ اسے تو سارا ایجنڈا ازبر ہوگا۔“ زری نے مارے اشتیاق کے کھڑکی کی سمت دوڑ لگائی

”بی بی سی نہیں۔ غیر ضروری مبالغہ۔ جو کچھ وہ سنائیں گے اس میں سے سچ چھاننے کے کیلئے دو راتیں درکار ہوں گی۔“

روشی جل کر بولی تھی۔

”پھر بھی کچھ تو پتہ چلے گا۔“

”باری بھائی۔ شش۔ ادھر آئیں۔ ہمارے کمرے میں۔“ مونانے کھڑکی سے پیغام رسانی شروع کی۔

”ارے آئیں ناں۔“ وہ جیسے اس کی ہچکچاہٹ پر جھلائی۔

”سب ہیں اور سب تو ہمیشہ سے ہی ہیں۔ آج کیا نئی ہے۔ جلدی سے آئیں۔“ مونانے کھڑکی کے پاس سے ہٹ گئی

اور جلدی سے دروازے کے سچ جا کھڑی ہوئی۔

”توبہ۔ کتنے غرے ہیں۔ جلدی سے آئیں۔ ارے بھی ریڈ کار پٹ ریسپشن دیں آپ لوگ۔“

”السلام علیکم“ وہ چند لمحے گزرنے کے بعد نمودار ہو چکا تھا۔

”وعلیکم السلام“ سب نے کورس کے انداز میں جواب دیا سوائے روشی کے۔

”فرمائیے!“ وہ پشت پر ہاتھ باندھ کر سیدھا کھڑا ہو گیا۔

”ہم نے نہیں فرماتا۔ اس وقت تو جو فرماتا ہے۔ آپ نے فرماتا ہے۔ حاضرین سوالات کی بارش فرمائیے۔“

حنانے شرارت بھرے انداز میں اس کے مقابل میں آکر کہا۔

”میں۔ میں۔ میں کیا فرما سکتا ہوں؟ حد کرتی ہیں آپ لوگ۔“ وہ بری طرح بوکھلا رہا تھا۔

”ابھی پتہ چل جائے گا۔ آپ کیا فرما سکتے ہیں اور کیا نہیں۔ پہلے تشریف تو رکھئے۔“ سونی نے موڑھا اس کے سامنے

کیا۔

”گلو کہاں ہے؟“ وہ ہٹھا کر ادھر دیکھنے لگا۔

”نعوذ باللہ۔ غیاث الہ متعین بنا رکھا ہے انہیں۔“ زری چڑ گئیں۔

”ہر بات کی فریاد ان سے۔“

”اوئی!“ روبی چیخ مار کر سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔

”دماغ میں پھنس گیا۔ اوئی۔“ وہ سر پکڑ کر بیٹھ پر اوندھ گئی۔

”کیا پھنس گیا؟“ حیرت آمیز آوازیں بلند ہوئیں۔

”وہ کیا تھا۔ غیاث۔!“

”بدتمیز۔“ سونی نے خفت منانے کی کوشش میں اس کے ایک دھپ جزا۔

”آپ نے تو ہاتھ پاؤں پھلا دیئے۔“ باری موڑھا کھینچ کر بیٹھنے ہی بولا۔

”مگر آپ فکر مند نہ ہوں۔ اگر ہاتھ پاؤں پھول بھی گئے تو کل اس وقت تک واپس آ جائیں گے۔“

”وہ کیسے؟“ روبی شیو کے تلخ انداز سمجھنے میں ہمیشہ ہی ناکام رہتی تھی۔

”فجر سے تہجد تک معمول کی چمک پھیریاں لگیں گی اور یہ چوبیس گھنٹے کے اندر اندر فٹ ہو جائیں گے۔“ کچھ آیا سمجھ؟“ شیو

اپنی مخصوص زہریلی ہنسی ہنس کر بولی۔

روشی نے جھک کر اٹھا کر باری کی سمت دیکھا۔

وہ ہمیشہ کی طرح بے تاثر تھا۔ اس نے گہری سانس لیکر ٹیل فائل بیک کی سائڈ ٹیبل پر رکھ دیا۔

”کیا میں یاد دلاؤں کہ میں یہاں کیوں مدعو ہوں؟“ باری نے حنا کی سمت دیکھا۔

”نہیں نہیں زحمت نہ کریں۔ ہمیں یاد ہے۔“ حنا دوسرا موڑھا کھینچ کر اس کے برابر بیٹھ گئی۔

”باری۔ کیا تمہیں علم ہے۔ بابا صاحب دہن لیکر کب تک آجائیں گے؟“ زری آپنی نے قدرے آہستگی سے سوال کیا

تھا۔

”لیجئے۔ یہ آپ لوگوں کے پروگرام مجھے کیوں معلوم ہونے لگے۔“ وہ جیسے ان کی سادگی پر ہنس دیا۔

”اچھا یہ بتاؤ۔ بارات تو سرائے ہی گئی ہے ناں“ زری آپنی اب اندازوں میں کھیلنے لگی تھیں۔

”جی۔ یہ بات تو اچھی طرح کنفرم ہے کہ بارات (اس نے بارات پر خاصا زور دیا) سرائے ہی گئی ہے۔

دو گھنٹے کا راستہ ہے۔ سات بجے وہ لوگ یہاں سے گئے ہیں۔ بارہ بجے تک ہی واپس ہوں گے۔“ وہ حساب کتاب

میں لگ گئیں۔

”ہاں۔ یہ تو ہے۔ وہاں کون سا ماحضر تامل کیا جائے گا۔“ شیو نے مسکرا کر ٹکرا لگایا۔

”وہاں نہ سکی۔ کا کا جان تو ڈنر کے بغیر نہیں آنے دینگے۔“

”تو کیا ایک بجے تک جا گئیں۔“ حنانے یہ بڑی سی جمائی لی۔

”بررات کی ایک صبح بھی ہوتی ہے۔“ روبی نے یاد دلایا۔

”اوہ ہاں۔ میں تو بھول ہی گئی تھی۔ حنانے اسے چڑایا۔

”ظفری بھائی تو بہت خوش ہوں گے۔ ہے نا باری بھائی۔“ مریم نے بھی حصہ لیا۔

”بہت۔ میں تو ہلکی روشنی میں بس کانوں تک چڑی باٹھیں ہی لکھ رہی تھی۔“ اس نے بھی سانس لینے کا فیصلہ کیا۔

”اچھا۔ اب ذرا حد میں ہی رہو۔“ شیو کی سنجیدہ روح بلبلائی۔

”کیا سہرا باندھا تھا؟“
”نہیں۔“

”تو پھر پھولوں کے ہار ہی پہنے ہوں گے؟“
”صرف ایک ہی تھا۔“ وہ فرائگویا ہوا۔

”اس کی بھی کیا ضرورت تھی۔ اس سے زیادہ پھول تو لوگ قبر پر ڈال دیتے ہیں۔“ روٹی آزردگی سے گویا ہوئی۔
”ساتھ لے گئے ہوں گے۔ لارہے ہیں ایک چلتی پھرتی قبر۔“ شیو کی زہر میں بھی آواز نے کمرے میں سکوت طاری کر دیا۔

”کون کون گیا ہے؟“ باختر حنا نے خاموشی توڑی۔

”بابا صاحب ہیں۔ بڑے ابا ہیں۔ بصیر چچا ہیں۔ بہادر ماموں، کبیر ماموں، عباد پھوپھا، مٹھلے پھوپھا، ظہیر پھوپھا۔“

اکا۔ میاں صاحب۔ چھوٹے بھیا۔ ثمر، جواد، فاران، امیر، حماد، مصور، منہاج، مظاہر، منہاج، دہاج.....

”یوں کیوں نہیں کہتے کہ سب گئے ہیں۔“ شیو نے زچ ہو کر اسے درمیان میں ٹوک دیا۔

”سب نہیں گئے۔ زوار ماموں، یاور چچا اور ندیم نہیں گئے۔ بڑی امی کے علاوہ کوئی خاتون نہیں گئیں۔ اب مجھے اجازت؟“ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

”ہم اجازت دیں گے تو جانا۔ مانتے کیوں ہو۔“ شیو نے خاص تکبرانہ انداز سے اس کی سمت دیکھا۔

بیڈ پر خاموش بیٹھی روشی نے باری کی طرف بڑی جانچتی نظروں سے دیکھا تھا۔

ایک خفت کی لہر لٹلے بھر کو ابھری تھی اور فوراً ہی معدوم ہو گئی تھی۔

”جائیے باری بھائی۔ بس یہی پوچھنا تھا“ حنا نے جیسے اس کی جان چھڑائی۔

”بیٹھا رہنے دو۔ اس بہانے کچھ آرام ہی مل رہا ہوگا۔“ شیو ہنسی۔

”ارے نہیں۔ نہیں بس جاؤ تم“ زری نے بھی جیسے اس پر ترس کھایا۔

”تھینک یو۔“ وہ بے تاثر مسکراہٹ پھینک کر چلا گیا۔

”کچھ زیادہ فری نہیں ہو گیا۔“ شیو نے نخوت سے ناک سکیڑ کر زری آپا کی سمت دیکھا۔

”کیوں خامخوہ پچھالیتی ہو۔ وہ کیا کر سکتا ہے بے چارے بس و مجبور۔ زری آپا نے شیو کو جیسے اس کے بے رحم رویے کی جانب توجہ دلائی تھی۔

”اور بھی لڑکیو! چلو اپنے اپنے ٹھکانے پر۔ میں تو کچن دیکھتی ہوں۔ ماما ملی تو ہمیں غائب پا کر خود می‘ ستر میں غائب

ہو چکی ہوگی۔“ وہ اپنے مخصوص انداز میں سترائیں۔

چند لمحات کے بعد کمران مشر محفل کا منظر پیش کرنے لگا۔ باقاعدہ دھکم پیل تھی۔

”کب تک بیٹھا رہوں۔ ارے بیمار ہی تو ہے، تم تو اس طرح بیٹھی ہو جیسے میت کے سر ہانے پر۔“
وہ بری طرح حالت غیض میں تھا۔

”تمہارے منہ میں خاک۔“ زبیدہ بلبل کر رہ گئی۔

”اسی لئے لائے تھے مجھے گھر میں۔ بیٹھی جنازے روتی رہوں۔ تین تو ان ہاتھوں سے مٹی تلے سلائے ہیں۔ اب کیا؟“
اس کی آواز بھرا گئی۔

”خبر بھی ہے تمہیں تین دفعہ بے ہوش ہو چکا ہے بد نصیب۔ تمہیں گھر میں کھتے ہی سوائے روٹی کے کچھ نظر نہیں آتا۔“ وہ روٹی۔

”ڈاکٹر کے پاس نہیں لے گئی۔“ پدری محبت نے یکدم جوش مارا تھا۔ اٹھ کر اس کے پلنگ کے نزدیک چلا آیا۔

”ارے یہاں تو پہنچنے پہنچنے جا رہے ہیں۔ ڈاکٹر“

”کیا رٹ لگا رکھی ہے ڈاکٹر۔ ڈاکٹر۔ روکڑے دفن ہیں اس کچے مکان میں۔“ وہ چیخ پڑی۔

بچے پر مردنی چھائی ہوئی تھی۔ اس نے جھک کر بچے کو بازوؤں میں اٹھالیا۔

دن بھر منوں وزن کی بوریاں اٹھانے والے کو بچہ پھول کی طرح ہلکا لگا تھا۔

”چل رہی ہے تو چل۔“ اس نے بیوی کی طرف دیکھا۔

”ذرا صبر کرو۔ برقعہ لے کر آتی ہوں۔ بالو۔ دروازہ اچھی طرح بند کر لہجو۔“ اس نے چوہے کی راہ کرید کر مسئلے کا حل ڈھونڈتی اپنی پہلوٹھی کی بنی کوتا کید کی۔

”اور دیکھ..... بچوں کو یہ کہہ کر سنانے کی کوشش کچھو کہ اماں ابا ابھی روٹی لیکر آتے ہیں۔“

”یہ کیوں نہ کہہ دوں کہ چند ماموں آئیں گے۔ دودھ ملائی لائیں گے۔ کہ روٹی کا یقین تو انہیں شاید ہی آئے۔“ وہ زہریلے انداز میں ہنس کر بولی۔

برقعہ پہنتی زبیدہ نے اپنی مصروفیت میں اس کا جملہ نہیں سنا۔ خاوند اور بچے کے پیچھے تیزی سے نکل گئی۔

ایمر جنسی کی وجہ سے شنوائی تو جلدی ہو گئی مگر ساتھ ہی دواؤں کی فہرست بھی اس کے ہاتھ میں تھما دی گئی۔ وہ ششدر سا دواؤں کی فہرست اور قیمت کا اندازہ لگا رہا تھا۔ زبیدہ تو فہرست تھما کر اندر بچے کے پاس چلی گئی تھی۔

وہ شکست خوردہ انداز میں ہاسپٹل کے پچھواڑے آکر ٹھیلنے لگا تھا۔

سیٹھ نے جو رقم دی تھی وہ تو پچھلے تین دنوں میں دواؤں اور گھر کے اخراجات میں اٹھ گئی تھی۔

ایک سوالیہ نشان اب دل میں تراژو تھا۔

خالی کنگول نظر آ جاتا ہے۔ خالی جیب، خالی پیٹ نظر نہیں آتا۔ آنکھوں کی ویرانی دکھائی دے جاتی ہے۔ وجہ دکھائی نہیں دیتی۔

ایک دولت اولاد ہے

ایک دولت غیرت ہے

کیا لٹاؤں؟

کیا گنواؤں؟

نفع کا سودا کون سا ہوگا؟

جان گنواؤں، خلوص مشہور کر دوں۔

پر پیچھے رہ جانے والوں کا گھانا ہی گھانا ہے۔

ہر طرف خسارے کا سودا ہے۔

کوئی تجارت کروں۔ ہاتھ خالی کے خالی۔ ازلی مزدور کی آنکھیں بے قیمت موتیوں سے جھلملانے لگیں۔

”اندھیرے میں روٹی ڈھونڈنے آیا ہے۔“ اچانک اس کے قریب سے نحیف آواز آئی۔

وہ چونک پڑا۔ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر آواز کی سمت دیکھنے لگا۔

”بھائی! میں یہ رہا۔ ابھی زمین کے اوپر ہی ہوں۔ آواز پھر آئی۔

ذرا سا آگے بڑھ کر اسے بالآخر وہ زندہ لاش نظر آ گئی۔

”تم یہاں زمین پر اس طرح کیوں لیٹے ہو۔ اندر اسپتال میں کیوں نہیں آتے؟ تم تو بیمار دکھائی پڑتے ہو۔“ وہ اس کے

قریب ہوا تو مخاطب کی حالت فوراً آشکار ہو گئی۔

”ابھی خادما میں چھپر کھٹ سجا رہی ہیں۔ سجا چکیں گی تو صندل لگا کر مجھے عرق گلاب سے غسل دینگے۔ پھر احتیاط سے

چھپر کھٹ پر رکھ دینگے اور ریشمی زلفوں سے ہوا دیں گی۔ ہا ہا ہا۔ ہا ہا ہا۔“

”کیا مجھ سے بھی زیادہ بدنصیب ہو؟“ میں تو ابھی تک اتنا زہر یلا نہیں ہوا۔“

وہ آہستگی سے اس کے نزدیک بیٹھ گیا۔

”ہو جاؤ گے۔ ہر بات کا آغاز بھی ہوا کرتا ہے یا نہیں۔“

”مت ڈراؤ بھائی۔ آٹھ پہر کوئی اچھی بات سننے کو نہیں ملتی۔ میں تو کوئی حل سوچنے اس طرف نکل آیا تھا۔“ وہ بے چارگی

سے بولا۔

جن کی جیب خالی ہو۔ سوچ سے نہیں بھرا کرتی۔“ وہ اجنبی پھر تلخی سے ہنسا۔

”کیا کرتے ہو ویسے؟“

”خون پلا رہا ہوں اولاد کو۔ ایک ایک کر کے چراغ بجھ رہے ہیں۔ خون بھی کافی نہیں، مزدوری کرتا ہوں اور کوئی ہنر

پاس نہیں۔“ وہ لاچار انداز میں بیٹھ گیا۔

”محاورے والا خون پلاتے ہو یا اصلی؟“ اجنبی نے چمکتے ستاروں پر نظریں جما کر سوال کیا۔

”اصلی؟ کیا مطلب؟“ میں واقعی نہیں سمجھا۔

”مال تمہاری رگوں میں دوڑ رہا ہے۔ اندر ہسپتال میں تمہارے خون کے طلب گار لال ہرے سرمئی کڑک کاغذ لئے تمہارے انتظار میں ہیں۔ منت مان لو اگر تمہارے خون کی طلب گار کوئی موٹی آسامی مل گئی تو روپے کا تیل مسجد میں چراغ میں ڈالو گے۔“

”اب مسجدوں میں چراغ کہاں جلتے ہیں؟ بجلی کے فانوس چمکتے ہیں۔“ وہ گم صم انداز میں گویا ہوا۔

”ہاں۔ مسجد کی دیواریں بیٹرے گرم ہوتی ہیں۔ ایک ایک کے سر پر دو دو پتکے جلتے ہیں۔ گیزر ہے، اور ہیٹ ٹینک ہے۔ انڈر گراؤنڈ ٹینک ہے۔ موازینک فلور ہیں۔ ٹائلوں والے برآمدے ہیں۔ کیسی سہولت کی نماز ہے۔ کاش ہم کوئی مسجد ہی ہوتے۔“

”لاحول ولا قوۃ۔“ اس نے فوراً اجنبی کی گفتگو پر لاحول پڑھ کر مداخلت کی۔

مذاکیوں مانتے ہو؟“ اتنے چاؤ سے انسان مسجد سنوارتا ہے۔ تھوڑا قصیدہ تو چلنے دو۔

”سنوارتا بھی چاہیے مسجد اللہ کا گھر ہے۔“ اس کی مذہبی حس اجنبی کی ذہنی آوارگی پر تڑپ کر رہ گئی۔

”اور قرآن میں وہ خود کہتا ہے کہ ہم انسان کے اتنے قریب ہیں۔ اس کی شہرگ سے بھی زیادہ۔ وہ تو صاحب قدرت و

مختار ہے۔ اس کے سامنے تو دیواریں بھی گونگی نہیں۔ مگر بھائی۔ ہم تو پھر انسان ہیں۔ کوئی دیوار تو نہیں۔“

”یہ فیصلے کرنے والے کا اختیار ہے کہ وہ دیواریں سجانیں یا انسان کی مدد کو آئیں۔ اس نے تو دیواروں میں موتی

پروٹے کا حکم نہیں دیا۔

”اس نے تو جگہ جگہ انسان کو ہی اہمیت دی ہے۔ یہ اندھی عقیدت بھی نہیں ہے۔ محض برتری کی دوڑ ہے۔ کلیسا سچے

مندرجوہ سے چمکے، بیکل میں سونے کی کیلیں گزریں۔ ہم کیوں پیچھے رہیں۔ انسان تو روز پیدا ہوتے ہیں۔ عبادت گاہیں روز

تھوڑا ہی بنتی ہیں۔“

”چلو مسجد والی منت نہ مانو، یہی مان لو اگر کسی سا ہو کار کو میرے خون کی پیاس لگی تو کسی بھوکے کو پیٹ بھر کھانا کھلاؤں گا۔

اب تو ٹھیک ہے۔“ اجنبی نے اندھیرے میں اس کے تاثرات دیکھنے کی کوشش کی۔

”کیا خون بچ کر اتنے پیسے مل جائیں گے کہ بچے کی ساری دوائیاں آجائیں؟“ اس کے اندر ایک عجیب ولولہ سا بیدار ہو

چکا تھا۔

”ارے۔ دوائیاں بھی آجائیں گی، رضائیاں، دلائیاں، ملائیاں، سب آجائیں گی۔ جانناں جا کر کسی گرے کو ذرا اپنے خون کا

ذرا لقمہ تو چکھا۔ پھر دیکھتا تھا۔“

”اتنا آسان حل!“ اس کی رگ رگ میں خوشی دوڑے گی۔ آنکھوں کے سامنے بچہ۔ جاوید میاں دادا والے شاٹ کھیلنے

کا۔“ وہ یکدم اٹھ کھڑا ہوا۔

”بچہ کھیل رہا تھا۔ گلاس بھر دودھ پی رہا تھا۔ سارے گھر والے کباب پر اٹھے کھا رہے تھے۔“

”بھائی تمہارا نام کیا ہے؟“

”گم ہو گیا ہے۔“ وہاں سے بڑا فلسفیانہ جواب آیا۔

”کیا نشہ کرتے ہو؟“ وہ جاتے جاتے رک کر پوچھنے لگا۔

”جس طرح کامیابی کا نشہ ہوتا ہے اسی طرح نامرادی کا بھی ایک نشہ ہوتا ہے۔ عادت ہر شے کی بری۔ تم نے پوچھا ہے

کیا نشہ کرتا ہوں؟“ وہ ہنسا۔

آپ کی محسوس آنکھوں کی قسم

میری سے خواری ابھی تک راز ہے

وہ جھٹکن جھٹکن لہجے میں شوخی پرونے کی کوشش کر رہا تھا۔

”پڑھے لکھے بھی لگتے ہو۔“ اسے حیرت بھی ہوئی تھی اور ترس بھی آیا تھا۔

”لگتا تو جانے کیا کیا ہوں۔ پر وہ نہیں لگتا جو ہوں۔“ اجنبی پھر پوری قوت لگا کر ہنسا۔

مگر اب وہ دوسرے مرحلے میں تھا۔ توجہ تقسیم ہو چکی تھی۔

”بھائی! کہاں کھڑے ہو کر اعلان کروں کہ میرا خون لے لو۔“ ایک بنیادی سوال پیدا ہوا تو اس کے قدموں کی حرکت خود بخود رک گئی۔

”اعلان کرنے کی کیا ضرورت۔ پیاسے خود تڑپتے ہیں۔ ابھی تک تو رشتوں کی جوئیں چٹنی ہوئی تھی۔ اب ذرا باہر کی جوئوں کا تماشا دیکھو۔ اور نور و سرجری کی طرف چلے جاؤ۔ لال مظفر پہنے ایک موٹی سی جوئک سٹلنگار ہی ہوگی۔ کہنا عارف نے بھیجا ہے۔“

”بس؟“

”اور نہیں تو ٹرک۔“ اجنبی جھلا گیا۔ بڑی اپروچ ہے اس لال مظفر کی ذرا پھنسو تو۔“

”کتنے پیسے دے گا وہ؟“

”کہا تو ہے منت مان۔ آسامی وہ چھانے گا تو کیشن بھی لے گا۔ دیکھ بھائی بانٹ کر کھانا ہوگا۔ پہلے بتائے دیتا ہوں۔“

”سمجھ گیا۔“ وہ تیزی سے آگے بڑھا۔

”بھائی ذرا سنتا۔“ اجنبی نے پھر اس کے بڑھتے قدموں کو رخیر کیا۔

”اب کیا ہے؟“ وہ جھلایا۔ میرا بچہ اندر دوا کے انتظار میں ہے۔ جلدی کہو۔“

”نسخہ ہاتھ لگتے ہی انداز بدل گئے۔ شکر یہ ادا کرنے سے گئے۔ بھائی میں وہ ایک شعر سن رہا تھا۔ وہ کیا ہے کہ۔“

زمانے بھر کے غموں کو ہے دعوت آزار

کہ اک جام میں سب کا جواب ہے ساقی

چل اک بہشت بسائیں سرور مستی کی

بہشت دہر تو غم سے خراب ہے ساقی

اشعار کی زنجیر جان کر وہ آگے بڑھ چکا تھا۔ آخر مصرعے آتے آتے وہ بہت آگے بڑھ چکا تھا۔

”ہاں معقول انسان۔ باتوں سے تو پڑھا لکھا لگتا ہے روشنی اندر لے اندھیروں میں پھرتا ہے۔ احمق۔“

وہ نہایت تیز چلتا ہوا اندر دوسری جری کی طرف آیا تھا۔

ساری عمارت پر سنائے کا راج تھا۔

کچھ دیر قبل کسی مرنے والے نے بے وقت اذان دی تھی۔ اس کے فوراً بعد شیخو کے بیڑے میں بندگی سفید گائیں ڈکرائی تھی۔

جس کے جواب میں اصغر تیلی کا بیل بھی ڈکرا کر اس طرح خاموش تھا جیسے ڈیوٹی بھگتا کر فارغ ہو گیا ہو۔ کافی دیر سے تو کوئی کتا

بھی نہیں بھونکا تھا۔ جھینگروں کے ٹرانے میں بھی تسلس نہیں تھا۔

وال کلاک کی ٹک ٹک۔ دل کی دھک دھک کے ساتھ مل کر ماحول میں ردھم کی کیفیت برپا کر رہی تھی۔

وہ کروٹیں بدل بدل کر تھک چکی تھی۔

معا۔ اسے محسوس ہوا۔ کہ ماحول کا سکوت ٹوٹ گیا ہے۔ پہلے تو کتوں کے بھونکنے میں ترتیب سی محسوس ہوئی۔ پھر اسی شور

میں گاڑیوں کی آواز واضح سنائی دی۔ وہ اچھل کر بستر سے کودی اور تقریباً دوڑتی ہوئی کھڑکی میں آکھڑی ہوئی۔

پور ٹیکو کی چھت میں لٹکا نحیف نزار روشنی پھینکتا بلب وہاں کے مناظر اجاگر کرنے میں ناکام رہا تھا۔ اس نے بے بسی سے

اپنی مٹھیاں بھینچ لیں۔ پھر کچھ سوچنے لگی۔

”اوہ۔“ جیسے اسے اپنے مسئلے کا حل مل گیا۔ وہ دو پٹاشانوں پر پھیلا کر دبے پاؤں کمرے سے نکل آئی اور چھت کی طرف

جانے والی میز میوں کی طرف بڑھتی چلی گئی۔

مختاط انداز میں زینے طے کر کے اس منڈیر کی طرف آئی جہاں سے پور ٹیکو کا منظر صاف دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے

کہیاں منڈیر پر نکادیں اور غور سے نیچے دیکھنے لگی۔

بابا صاحب اپنے کمرے کی طرف بڑھ رہے تھے۔ بڑے آبا گاڑی کے دروازے چیک کر رہے تھے یا در چچا۔ چھوٹے

بھیا سے بات چیت میں مصروف تھے۔

”اللہ۔ ظفر کی بھائی اور دلہن کہاں ہیں؟“ اس کی سوچ یہاں آ کر ٹھہر گئی۔

معا سے پیچھے کی جانب کچھ کھڑ پڑ محسوس ہوئی۔ وہ بھاگ کر پچھلی منڈیر تک آگئی اور منڈیر پر ہاتھ جما کر نیچے جھانکنے

لگی۔

بڑی امی پچھلے پورچ میں سرخ کٹھڑی تھامے اندر کی طرف بڑھ رہی تھیں۔

”ہوں۔ تو دلہن کو یہاں رکھا جائے گا۔ مگر کیوں۔ وہ تو معذور نہیں ہے۔ اچھی بھلی کھڑی ہے۔“

وہ سوچنے لگی۔ بڑی امی دلہن سمیت اس کے دیکھتے ہی دیکھتے اندر چلی گئیں۔ اسی دم بڑے ابو بھی پچھلے پورچ میں نمودار

ہوئے اور لحظہ بھر میں اندر غائب ہو گئے۔ پھر بصیر چچا جواد کے ساتھ وہاں دکھائی دیئے پھر وہ بھی وہیں چلے گئے جہاں بڑی

ای دہن کو لے کر گئی تھیں۔

وہ بڑے غور سے نیچے دیکھ رہی تھی۔ معاً اسے محسوس ہوا کہ اس کے علاوہ بھی چھت پر کوئی موجود ہے۔ یہ محسوس کرتے ہی اس کے حلق میں کانٹے پڑ گئے۔

اماؤس کی کالی رات میں تاروں کی چھاؤں میں بھگتے اسے خیال تک نہ آیا تھا کہ چہار سو کس قدر اندھیرا ہے۔ شوق نے کچھ مہلت ہی نہ دی تھی کہ اسباب و ماحول پر غور کرتی۔ ستاروں کی روشنی اس کے شوق کو کافی تھی جیسے۔ مگر اب صورتحال خاصی کٹھن تھی۔ ہتھیلیوں میں پسینہ اتر آیا تھا۔ جنبش گراں تھی۔

”ڈریں نہیں۔ میں ہوں باری۔“

اس کے کانوں میں باری کی آواز کیا آئی، مستعدی از سر نو بیدار ہوئی۔

”یہ تم کیا میری بوسو گھمتے پھرتے ہو؟“ وہ تنٹائی۔

”اب ان ڈائریکٹ حیوان تو نہ کہیں۔ بابا صاحب جس وقت جیب سے اتر رہے تھے۔ میں نے آپ کو کھڑکی میں کھڑا دیکھ لیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد آپ کو کھلی چھت سے بھاگتے پایا تو یہ پوچھنے چلا آیا۔ یہ بے قراری کیوں؟ آپ بھی اس طرح کیوں نہیں سو جاتیں جیسے اس گھر کے سارے مکین سو رہے ہیں؟“

”سارے کہاں سو رہے ہیں۔ ستر فیصد تو جاگ رہے ہیں۔“ وہ ترخ کر بولی۔

”آپ کو ملا کر اکہتر بن گئے ہیں۔“

”تم آدمی ہو یا جن رات کو بھی آرام نہیں کرتے؟“ وہ زچ ہو کر بولی۔

”پری زاد کہہ لیں آپ سے کچھ نسبت ہو جائیگی۔“

”وہ ڈائلاگ بولا کرو جو تمہارے منصب کے لحاظ سے سوٹ کریں۔“ وہ آگ بگولا ہو گئی۔

”آہستہ روشنی بی بی۔ آہستہ۔ میں تو آپ کی مدد کو حاضر ہوا ہوں۔“

”کیسی مدد۔ مجھے کسی کی مدد کی ضرورت نہیں۔ جاؤ تم یہاں سے۔“ وہ رکھائی سے گویا ہوئی۔

”دہن دیکھے بغیر تو آپ کو نیند نہیں آئیگی۔ آپ فکر نہ کریں جیسے ہی سب لوگ اپنے اپنے کمروں میں چلے جائیں گے۔ میں

لائن کلیر دیکھ کر آپ کو لے جاؤں گا۔ مگر گھر کے سارے راتے جو پچھلے حصے کو جاتے ہیں بند ہیں۔“

”آپ کو کھوکھر کے کوارٹر سے لے جاؤں گا۔ اس کا کتا بھونکے تو آپ ڈریے گا نہیں رات کو بندھا ہوتا ہے۔“

”کھوکھر جاگ رہا ہے؟“ وہ اور الجھ گئی۔

”بابا صاحب کے ذاتی خدمت گار اس وقت تک نہیں سوتے جب تک بابا صاحب نہ سو جائیں۔“

”جیسے تم۔“ روشنی نے فوراً بات کاٹ دی۔

ہ ایک ٹائیپ کو چپ سا ہو گیا۔ پھر آہستگی سے گویا ہوا۔

”جیسے میں۔“

”ارے نہیں۔ میں تو ایسے ہی کہہ رہی تھی۔“ اسے نہ جانے کیوں وضاحت کرنا پڑی۔

”باری۔ کھوکھر کہیں بابا صاحب سے نہ کہہ دے۔“ اسے خدشہ ہوا۔

”فکر ہی نہ کریں۔ یہ میرا درد دوسرے۔ آپ کو کچھ نہیں ہوگا۔“

”آئیے۔ آپ اپنے کمرے میں میرا انتظار کریں۔“

وہ زینے کی طرف بڑھا تو وہ بھی اس کے پیچھے پیچھے چل پڑی۔

اسے بیٹھے بیٹھے پے در پے جمائیاں آنا شروع ہو گئیں مگر باری کی طرف سے کوئی سگنل نہ ملا۔ یا اللہ۔ کہیں بھول تو نہیں گیا؟“

اس نے گردن موڑ کر گہری نیند سوئی ہوئی حنا کو دیکھا۔

”ایک یہ لوگ ہیں انہیں کوئی فکر ہی نہیں۔ دن بھر ہڑ بونگ رات ہوئی پڑ کر سو گئے۔ یہ صرف میرے ذہن میں ہی کیوں سوال جاگتے ہیں۔ ان سب کی طرح کیوں نہیں ہوں میں۔ مجھے کیا تجسس ہے؟ میں حاصل اور موجودہ پر مطمئن کیوں نہیں ہوں؟“

وہ انگلیاں چٹخا چٹخا کر سوچوں کے جال میں الجھی ہوئی تھی۔

”گلو آپا۔ مونا باجی۔ یہ لوگ بھی کتنی سنجیدہ ہیں مگر عجیب بے حس ہیں۔ کسی بات پر چونکتی ہی نہیں۔ کسی بات کا نوٹس ہی نہیں لیتیں۔“

”اور بابا صاحب کہتے ہیں میں بے وقوف ہوں۔ ہونہ۔ کیا غلندی بے حس کو کہتے ہیں؟“

”لگتا ہے۔ باری واقعی بھول گیا؟“

وہ دوبارہ کمرے سے باہر آئی۔ چین ہی نہیں آ رہا تھا۔

”اس گھر میں کیا چھپایا جاتا ہے۔ بس میں جانا چاہتی ہوں۔“ وہ جیسے خود سے الجھی۔

”روٹی!“ اسے محسوس ہوا جیسے کسی نے پکارا ہو۔ وہ ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ واقعی دائیں جانب باری موجود تھا۔

”آجائیں۔ آرام سے بالکل بے آواز۔“ وہ سرگوشی میں گویا ہوا۔

”اب کیا پاؤں سر پر رکھ لوں؟ اتنی آواز تو پیدا ہوگی ہی۔“

وہ بھنائی۔ طویل انتظار نے جان جلا کر رکھ دی تھی۔

باری آگے آگے چلنے لگا اور وہ اس کے پیچھے۔

طویل راہ داری سے گزر کر انہوں نے بائیں طرف بنا ہوا چھوٹا سا گارڈن طے کیا۔ اور کھوکھر کے کوارٹر کی زنجیر آہستگی سے کھڑکائی۔

”آج صاحب جی۔ دروازہ کھلا ہے۔“

کھوکھر کی نیند سے بوجھل آواز آئی۔ باری نے آہستگی سے ہٹ دھکیلا۔ ہلکی سی چڑچاہٹ کی آواز پیدا ہوئی۔ باری نے مرکز گویا اسے پیچھے آنے کو کہا۔ وہ کون سا اس کے اشاروں کی منتظر تھی۔ اس کا تو بس نہیں چل رہا تھا کہ پلک جھپکتے سارا راستہ طے ہو جائے۔

جھلنگا سے پلنگ پر کھوکھر جیسے انہی کے انتظار میں بیٹھا تھا۔ بجلی بجائیے ہم پر غالباً سب سے زیادہ عمل کھوکھر کے گھر میں ہو رہا تھا۔ چالیس واٹ کا بلب سارے گھر میں روشنی پھیلانے کا فریضہ تنہا انجام دے رہا تھا۔

”سلام بی بی“

”وعلیکم السلام۔ جلدی چلو باری“۔ اس نے جلدی سے کہا۔ مبادا وہاں مکالمات شروع ہو جائیں۔

وہ گھر سے نکل کر بیڑے میں آگئے۔ کھوکھر کے کتے نے وفاداری کے تقاضے پورے کرنا شروع کئے۔

روشنی کا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ اس نے بے اختیار باری کا بازو سختی سے تھام لیا۔ کتے نے اب زیادہ قوت سے بھونکنا شروع کر دیا تھا۔ روشنی پر لرزہ طاری ہو گیا۔

”باری!“ وہ گھکھکیائی۔

باری نے اسے بائیں بازو کے گھیرے میں محفوظ کر لیا۔

”گھبراائیں نہیں۔ کچھ نہیں کہے گا“۔ وہ رسانیت سے تسلی دینے لگا۔

”مجھے کتوں کے بھونکنے سے بہت وحشت ہوتی ہے لگتا ہے جیسے بوٹی نوج کر اب گئے کہ تب گئے“۔

”حد ہو گئی۔ آپ تو واقعی کانپ رہی ہیں؟“ وہ ہنس دیا غیر ارادی طور پر اسے خود سے قریب کر لیا۔ ایسا ہمدردانہ طرز عمل جو کسی کیلئے مخصوص نہیں ہوتا۔ بیڑے سے باہر آتے ہی روشنی اپنے حواسوں میں آگئی اور جیسے تڑپ کر اس کی گرفت سے نکلی۔ یہ کیا حرکت تھی بھلا؟“ انداز میں خفت بھی تھی اور جلال بھی۔

”یہ صرف جوابی حرکت تھی۔ وقتی کارروائی۔ مت لیں اتنی گہرائی سے“۔ وہ بے تاثر سا تھا بلکہ خاصا تلخ بھی۔

”عجیب کتا ہے۔ مالکوں کو بھی نہیں پہچانتا“۔ اس کے کچھ سمجھ میں نہ آیا تو کتے پر لعنت ملا مت کرنے لگی۔

”اس کا مالک کھوکھر ہے“۔ اس نے تھمچ کی۔

”کھوکھر کو بھلا کیا پڑی ہے کتے پالنے کی۔ بڑے خزانے دفن ہیں یہاں“۔ اس نے نخوت سے ناک چڑھائی۔

باری خاموش رہا۔ اور بالآخر اسے عمارت کے پچھلے حصے میں لے کر داخل ہو گیا۔

یہ وہ حصہ تھا جو اس عمارت کے کمین کسی ایمر جنسی میں بھی استعمال نہیں کرتے تھے۔ بہر حال یہ حصہ آباد ضرور تھا۔ اس کی آبادی سے متعلق عمارت میں گفتگو کرنے پر سخت ممانعت تھی اور روشنی اس پابندی کے اسرار سے واقف ہونے پر بند تھی۔ مگر کے افراد آپس میں بہت بے تکلف تھے۔ مگر پچھلے حصے کے بارے میں بات چیت کرتے ہوئے اس طرح کتراتے تھے جیسے بھاری جرمانے کا ڈر ہو۔

عجب طرح کا شوق روشنی کے وجود میں الجھل مچانے لگا تھا نہ جذبہ تھا کوئی بڑی مہم سر کرنے کا۔ کسی میدان میں نہروں

ہونے کا اعزاز۔ کچھ اپنی خود سری کی احمقانہ سی خوشی۔

”آئیے“۔ وہ ایک تاریک راہداری میں بند دروازے کے سامنے رک گیا۔

”کیا ظفیری بھائی بھی اندر ہیں؟“ وہ ہچکچائی۔

”نہیں۔ وہ بڑی امی کے ساتھ اس طرف گول کمرے میں ہیں“۔

”بڑی امی! کیا وہ ابھی تک جاگ رہی ہیں؟“۔ وہ گھبرا گئی۔

”جی ہاں۔ ظفیری کی طبیعت کچھ اچھی نہیں ہے“۔

”اب بھی نہیں۔ آج بھی نہیں؟“ اس کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔ باری خاموش رہا۔

”کیا اس حصے میں بھی کوئی گول کمرہ ہے؟“

”جی“ باری نے نہایت اختصار سے کام لیا۔

”میں اندر چلی جاؤں اگر بڑی امی آگئیں؟“

”یہ سوچنا اب آپ کا کام ہے“ وہ جھلا گیا۔

”سارے حل بتائے ہیں اب یہ بھی بتاؤ“

”کتنا سخت گناہ کیا ہے میں نے۔ ایک منٹ کی بات ہے، دلہن دیکھئے اور واپس آجائیے۔ آپ نے کیا قصیدہ کہنا ہے؟“

وہ زچ ہو کر بولا۔

”دلہن ہی تو دیکھنا چاہتی تھیں آپ؟“

”ہاں ہاں۔ اچھا اب بگڑ تو مت“۔ وہ جھپاک سے اندر داخل ہو گئی۔

”دیکھئے پاپا! اگر میرا دل وہاں نہیں لگتا تو میں راتوں رات واپس آ جاؤں گی۔ پہلے سے بتائے دے رہی ہوں“۔

”ارے بھئی وہاں سے تو تمہارا دل کبھی واپس نہیں چاہے گا۔ درجن بھر خوبصورت لڑکیوں کی تو تم آنٹی ہو“۔

”ہائے اللہ۔ اب اتنی بزرگ نہیں بن رہی میں“۔ وہ بسوری۔

”بھئی بزرگی تو تمہیں۔ تمہاری پیدائش سے پہلے مل چکی ہے۔ تمہاری تین چار بھانجیاں تو تم سے پہلے استقبال کو موجود تھیں“۔ فیب احمد نے قہقہہ لگایا۔

”اچھا جب میں جاؤں گی تو کیا وہ سب خالہ خالہ کہہ کر مجھ سے لپٹ جائیگی؟“

”یہ تم اچھا خاصا قابل قبول جملہ کہہ کس طرح رہی ہو؟ مجھے تو یوں محسوس ہوا جیسے کہہ رہی ہو، چڑیلیں چٹ جائیگی۔

لاحول ولا قوۃ“۔

”نوی بھائی۔ آپ بھی چلیں ناں“۔

”اللہ کی پناہ۔ میں باز آیا اس قدر خوفناک بزرگی سے، درجن بھر حسین زنانہ آوازیں۔ وہ بھی ماموں، ماموں کی۔ توبہ

توبہ۔ اس نے پاؤں سے جرابیں کھینچ کے ماہین کے سامنے نہچائیں۔

”اچھا یہ مت کریں۔ مجھے متلی ہونے لگتی ہے۔“ اس نے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

”تم بھی چلے جاؤ۔ کوئی حرج نہیں۔ ابھی تو پورے بیس دن ہیں تمہاری واپسی میں۔“ فیب احمد نے نعمان احمد کو جوان کے اکلوتے فرزند ارجمند تھے مخاطب کیا۔

”موڈ نہیں بن پارہا۔ پھر سہی۔“ اس نے شاہانہ انداز میں ماہین کو چڑایا۔

”ممکن ہے جین اور شاہین بھی آج کل یہاں آ موجود ہوں۔“

”پھر تو آپ مجھے آج ہی روانہ کر دیں۔ دونوں کے بچے جب اکٹھے ہوں گے تو۔ اف میری توبہ۔ لگتا ہے یوگنڈا میں

انہیں خیمہ میسر نہیں۔ جنگل میں رہتے ہیں۔“

”بری بات بیٹا۔ وہ بچے ہیں۔ اور بچے ایسے ہی ہوا کرتے ہیں۔“

ماہین منہ بنا کر بیٹھ گئی۔

نعمان کمرے سے باہر چلا گیا۔

”ماہی۔ بیٹا ادھر آؤ میرے قریب۔“ فیب احمد نے اسے محبت سے اپنے پاس بلایا۔

جی! وہ آہستگی سے اٹھ کر ان کے قریب چلی آئی۔

”دیکھو بیٹا! تمہاری بجو نازنین کا سسرال دو حصوں میں بٹا ہوا ہے۔“

”دو حصوں میں! ماہین نے حیرت سے فیب احمد کے سفید ریش سے آراستہ چہرے کی سمت دیکھا۔

”ہاں۔ تمہاری بجو کے دادا سر بہاول علی خان کو انگریز سرکار نے جنگ عظیم اول میں شاندار کارکردگی پیش کرنے پر جاگیریں عطا کی تھیں۔ ابھی وہ جرمنی میں ہی تھے کہ انگریز سرکار نے بہاول علی خان اور ان کے بیٹے دلاور کے نام جاگیر عطا کرنے کا اعلان کیا تھا۔ وہ انگریز کی خوشی کی انتہا تھی۔

ایک چھوٹی سی جاگیر تمہاری بجو کے سردار دلاور علی خان سنبھالتے ہیں۔ اس کا نام دریا بستی ہے۔ دوسری ان کے دو بیٹوں کے سپرد ہے۔ جو دریا بستی سے ستائیس میل کے فاصلے پر ہے۔ اسے یہ لوگ سرائے کہتے ہیں۔ وہ بھی چھوٹے چھوٹے دو تین دیہاتوں پر مشتمل ہے۔

”مگر بیٹا۔ بجو کی وفات کے بعد دریا بستی والے مجھے کیا حیثیت دیں گے؟“

”ہمارا ان سے رشتہ برقرار ہے بیٹی۔ نازنین کے دو بچے وہاں موجود ہیں۔ ایک لڑکی روشنائی دوسرا اس سے بڑا بیٹا

جواد۔“

”تو پھر؟“ وہ ابھی۔

”تو پھر یہ کہ تم ان کی خالہ ہو۔ حقیقی خالہ۔“

”آب بھی تو نانا ہیں۔ آپ کیوں نہیں جاتے؟“

”میں بھی جاؤں گا۔“

”پہلے آپ کبھی وہاں گئے ہیں؟“ ماہی کے ذہن میں ایک دم سوال پیدا ہوا۔

”ہاں نازی کی شادی کے بعد دو تین مرتبہ جانا ہوا۔ پھر میں یوگنڈا واپس چلا گیا۔ اس وقت تم پیدا نہیں ہوئی تھیں۔“

”پھر؟“

”پھر کیا۔ مدتوں وطن واپس آنا نہ ہوا۔ ناز کے خط و فون پہنچتے رہتے تھے۔ پھر اچانک یہ رابطے بھی ختم ہو گئے۔ اور ایک روز اس کے انتقال کی خبر پہنچ گئی۔ اس وضاحت کے ساتھ کدوہ عرصے سے بیمار تھی۔“

”میری سمجھ میں نہ آیا کہ اسے کیا بیماری تھی۔ سترہ سال کی عمر میں اس کی شادی ہوئی تھی۔ نہایت قابل رشک اٹھان اور صحت تھی۔ اللہ نے حسن بہت دیا تھا۔ اپنی سہیلی کی سالگرہ پر گئی تھی وہیں دلاور علی خان کی اہلیہ نے پسند کر لیا تھا۔ ہم اتنی کم عمری میں اس کی شادی کے حق میں نہیں تھے۔ مگر بھئی ان کے سامنے کچھ پیش نہ گئی۔ تمہاری امی بھی رشتے پر بہت خوش تھیں۔ وہ کہا کرتی تھیں اس کی تو شکل مہاراجوں جیسی ہے۔ اس لئے اللہ نے یہ سب کیا ہے اس کی شادی ایسی ہی جگہ پر مناسب ہے۔ دولت اقتدار اور رسوخ خدام۔ میں نے ایسے ہی خواب دیکھے تھے اپنی بیٹی کیلئے۔“

”ان لوگوں نے فی الفور شادی مانگی۔ وہ سنہیر کیمبرج سے فارغ ہوئی اور ہم نے شادی کر دی۔“

”وہ خوش تھیں؟“ ماہین نے کھوئے انداز میں سوال کیا۔

”تمہاری ماں کے بقول بہت خوش۔ ورنہ ہمیں کیا پڑتی تھی اسے جو جہ کی طرح اتار پھینکنے کی؟ کون سی عمرنگی جاری تھی۔“

”اور ان کے دولہا کیسے تھے؟“

”اللہ اسے سلامت رکھے۔ موجود ہے۔ تم خود دیکھ لینا۔“

”اچھا۔ وہ دریا بستی رہتی تھیں یا سرائے؟“

”بیٹا کہو وہ دریا بستی گئی تھی۔ بعد میں جو اس کے خط آئے تھے۔ ان پر سرائے کا پتا درج ہوتا تھا۔ مگر اس سے کیا فرق پڑتا ہے دونوں جاگیریں انہی کی ہیں۔“

”جی!“

”تم کیا سوچتے لگیں؟“ فیب احمد نے عینک کے پار سے اسے گھورا۔

”کیا وہ کبھی یوگنڈا آئیں گی؟“

”نہیں۔ لکھا کرتی تھی کہ آئیں گے۔ یاد رکھو جاگیر کے کھیتوں سے فرصت نہیں ملتی۔ یہ ہے وہ ہے۔ ہم نے بھی کبھی زور نہیں دیا۔ بھئی وہ اپنے گھر خوش تھی۔ ہمیں اور چاہیے بھی کیا تھا؟“

”کیوں؟“

”جی۔ مگر اتنی دولت و شہرت کے ہوتے ہوئے یوگنڈا کا چکر لگانا ان کیلئے کوئی مسئلہ نہ تھا۔ بالکل ایسے ہی جیسے جیب میں بیٹھ کر اپنی زمینوں کا چکر لگائیں۔“

”سوچنے کی حد تک تو یہ بہت آسان بات ہے۔“ فیب احمد نے۔
 ”آپ ان کے انتقال پر آئے تو کیا فاتحہ پڑھی تھی۔ وہ کسی گہری سوچ میں گم تھی۔“
 ”مجھے افسوس ہے۔ ہوا یہ کہ جب میں وطن واپس آیا تو دلاور علی خاں خود میرے پاس آگئے۔ تعزیت کیلئے۔“
 ”وہ خود کیوں آگئے۔ جاگیر کا حرج نہیں ہوا؟“ وہ تنک کر گویا ہوئی۔
 ”اتفاق سے وہ شہر آئے ہوئے تھے۔ وہ اپنے کاموں کے سلسلے میں شہر آتے ہی رہتے تھے۔ یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔“
 ”چلیں خیر۔ وہ آگئے تھے۔ پر آپ کو جانا تو چاہیے تھا نا؟“
 ”ہماری سات پشتوں میں کوئی وکیل نہیں گزرا پھر یہ روح تم میں کہاں سے آگئی؟“
 وہ مسکرا کر بیٹی کو دیکھنے لگے۔

”دیکھئے پاپا! میں تو اس جاگیر دارانہ نظام کے ہی سخت خلاف ہوں۔ یہاں انسانیت نہیں ملتی۔ آپ نے سب سے بڑی اور پہلی غلطی یہ کی کہ بیٹی جاگیر دار سے بیاہی۔ دوسری یہ کہ پلٹ کر خبر نہیں لی۔ تیسری یہ کہ بیٹی کو ملوانے کیلئے ان پر دباؤ نہیں ڈالا۔ چوتھی یہ کہ ان کی فاتحہ ان کی قبر پر پڑھنے نہیں گئے۔“
 ”آپ ہم سب سے اتنا پیار کرتے ہیں تو کیا بچہ آپ کو محبت نہیں تھی؟“
 وہ قدرے خفگی سے گویا ہوئی۔

”وہ لوگ اور طرح کے جاگیر دار ہیں۔ وہ نہیں جو تم فلموں، کہانیوں میں دیکھتی یا پڑھتی ہو۔ میری لائبریری میں سرخ لیدر کی فائل موجود ہے۔ اس میں ناز کے سارے خطوط موجود ہیں۔ پڑھ لو۔ وہ تو ان میں اس طرح مدغم ہو گئی تھی کہ انہی کا حصہ بن گئی تھی۔ ہتھیلی کا چھالہ بنا کر رکھا ہوا تھا۔ دلاور علی خاں اور ان کی اہلیہ نے۔ ایک مرتبہ جب ہم وطن آئے تو وہ ہمارے پاس دو تین دن رہنے کیلئے آئی۔ یقین کرو چند گھنٹوں میں پریشان ہو گئی۔ فوراً فون کر کے اپنی ذاتی ملازمہ کو بلوایا۔ حالانکہ جواد کی آیا ساتھ تھی جو اس کے بھی سارے کام کرتی تھی۔ اس کے بال بہت حسین تھے۔ بہت لالچے۔ جنہیں اس کی ملازمہ دھوتی تھی اور وہی سنواری تھی۔ اس قدر تنگ مزاج ہو گئی تھی کہ اسے معمولی سی زحمت دینے کے خیال سے گھبراہٹ ہوتی تھی۔ دوسرے دن اس نے سامان سمیٹ لیا تھا کہ سڑک پر دوڑتی ٹریفک کی وجہ سے اسے ٹینڈ نہیں آتی۔ اس کا زورس سسٹم متاثر ہو رہا ہے۔ امید ہے اب تمہاری سمجھ میں آ گیا ہو گا کہ ہم اسے بلانے پر اصرار کیوں نہیں کرتے تھے۔“

فیب احمد پاپ میں تمباکو بھرنے لگے۔

”میں کیونکہ اس کے انتقال کی خبر پر جلدی میں آیا تھا۔ اس لئے دلاور علی خاں صاحب سے ملاقات پر دریاہستی جانے کا خیال موقوف کر دیا۔ پھر وہاں تمہاری امی اسپتال میں داخل تھیں۔ یہ وجہ تھی اور کوئی بات نہیں۔ وہ ہماری اولاد تھی اور اولاد سے کسے محبت نہیں ہوتی؟“

”بہر حال۔ آپ کو ان کی شادی اتنے بڑے لوگوں میں نہیں کرنی چاہیے تھی۔ بتائیے رشتہ دار ایسے ہوتے ہیں؟ جو ایک دوسرے سے واقف تک نہ ہوں۔ ہونہ اب میں جا کر وہاں تعارف اس طرح کراؤں گی۔“

مجھ سے ملے۔ مجھے ماہین احمد کہتے ہیں۔ میں آپ کی بہو نازنین یا داور علی خاں کی حقیقی بہن ہوں۔ گڑے مردے اکھاڑنے آئی ہوں یعنی پرانی یادیں تازہ کرتے۔ کس قدر مضحکہ خیز تعارف ہے۔ لاجول ولاقوۃ۔“

”ہو۔ ہو۔“ فیب احمد بے ساختہ ہنسنے لگے۔

”پر۔ میں وہاں کروں گی کیا؟ اسے نئی فکر نے ستایا۔“

”بجوں کی جاگیر کا دورہ کرنا۔ پھل توڑ توڑ کر کھانا۔ بچوں کے کچھ کو کہانیاں سنانا۔“

نعمان نے کمرے میں داخل ہو کر مدخلت کی۔

”بچہ کے بچے تو خود کہانیاں سنانے والے ہو چکے ہوں گے۔ جواد مجھ سے ڈیڑھ برس بڑے ہیں۔ اور روشی تو تقریباً

میری ہم عمر ہوگی۔ کیوں پپا؟“

”ہاں۔ ہاں۔ بالکل۔“

پتا نہیں وہاں کا ماحول کیسا ہوگا۔ میرے پاس تو سارے کپڑے جدید فیشن کے ہیں۔“

”تم کون سا وہاں مستقل رہنے جا رہی ہو۔ تم کھانے پینے میں ان کی پابند نہیں ہو۔ نعمان نے اسے تردد سے آزاد کیا۔“

”ہاں۔ ہاں۔ بیٹے یہ کوئی مسئلہ نہیں۔“ فیب احمد نے بھی تسلی دی۔

”پپا۔ بچے تو بڑے ہیں۔ جانے کس طرح بی ہو کریں۔“

”بھئی تم ان کی خالہ ہو۔ رشتہ بڑا ہے۔ وہ تمہارا احترام کریں گے۔ مجھے یقین ہے۔ تمہارا وہاں بہت دل لگے گا۔“

نازنین کی طرح۔“

”خدا نہ کرے میرا دل اس طرح لگے کہ ماں باپ کی فاتحہ تک نصیب نہ ہو۔“ وہ جل کر بولی۔

”بھئی تو دیکھنے جا رہی ہوں کہ نازنین بچہ پروہاں کیا گزری۔“

”تمہاری واپسی پر میں ایک ناول لکھوں گا۔ میڈم ان دریاہستی۔“ نعمان نے سر پریش چلاتے ہوئے شرارت سے کہا۔

”ہاں اگر خیریت سے واپس آگئی۔“ وہ نہ جانے کیوں اتنا جھلک رہی تھی۔

”زبردستی نہیں ہے بیٹا۔ نہیں موڈ تو نہ جاؤ۔ میں تو تمہارا شوق دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔“ فیب احمد نے جیسے اس کا وزن ہلکا کرنے کی کوشش کی۔

”جاؤں گی تو خیر ضرور۔ چاہے کچھ بھی ہو۔“ وہ بڑے مستحکم انداز میں اٹھ کھڑی ہوئی۔

”بیٹے۔ کچھ تحائف ضرور ساتھ لے کر جانا۔“

”تحائف۔“ وہ استہزائیہ انداز میں ہنسی۔ ”نا نعمان بھائی؟“

”پھر تو ریوڑیاں ہی مناسب رہیں گی۔ دریاہستی کی آدمی ہستی تو اس عمارت میں ہے۔“ ہا۔ ہا۔ نعمان کا قہقہہ بے حد

بھر پور تھا۔

فیب احمد بھی مسکرا دیئے۔

”اچھا بیٹی اب تم تیاری کرو۔ میں دریا بستی اطلاع کرا چکا ہوں۔ وہاں سب تمہارے منتظر ہیں۔“

”آپ کیوں نہیں چل رہے پاپا؟“

”میں بھی دو چار روز میں آ جاؤں گا۔ پھر تمہیں ساتھ لے کر ہی واپسی ہوگی۔ ابھی ذرا یہاں کام ہے۔“

”بہت اچھا۔ میں تھوڑی دیر سو جاؤں پھر پکٹنگ کروں گی۔ ٹھیک ہے ناں پاپا؟“

”ہوں ٹھیک ہے۔ دس چندرہ ریٹ واپز تو تمہاری امی کے لاکر میں ہیں رکھ لینا۔ باقی کچھ چیزیں میں کل شام سے پہلے تمہیں بھجوا دوں گا۔ میرا خیال ہے تمہارے پاس تو اب شاہنگ کا ٹائم نہیں۔“

”جی ہاں۔ یہ تو ہے۔“

وہ آئندہ کی تیاری کے خیال سے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ اس وقت عصر کی اذانیں ہو رہی تھیں اور اس کے ذہن کے افق پر دریا بستی طلوع تھی۔

.....

وہ دبے پاؤں کمرے میں داخل ہوئی تھی

پیچھے ہاتھ کر کے اس نے دروازہ آہستگی سے بند کر دیا تھا اور وہیں کھڑی ہو کر کمرے میں نظر دوڑانے لگی۔

سادہ سے فرنیچر سے آرامتہ کمراسی طور دلہن کا کمر انہیں لگ رہا تھا۔

اس قسم کی بے توجہی بابا صاحب سے تو ممکن ہے مگر بڑی امی۔ وہ تو جانتی ہیں کہ ظفری بھائی کس قدر حساس ہیں۔

سامنے سنہری بنا ری سوٹ میں طویل گھونگٹ نکالے دلہن جیسے سانس رو کے منتظر تھی۔ وہ آگے بڑھی اور ہولے سے

کھنکھاری تاکہ دلہن مونٹ مذکر کی پہچان کر کے پرسکون ہو جائے۔ اس نے قدرے جھک کر گھونگٹ الٹ دیا۔

گویا بجلی کا شاگ لگا تھا۔ وہ منہ کھولے حیران دیکھتی رہ گئی تھی۔

اس قدر..... ہوشربا حسن آج سے پہلے اس حویلی میں نہیں تھا۔ میک اپ سے بے نیاز چہرہ۔ ہلکا پھلکا میک اپ اور

صرف پھول..... اتنے سے سنگھار پر وہ ہوش اڑا رہی تھی۔

وہ دم بخود کھڑی تھی۔

حسن جو دیکھنے والے کیلئے بجائے خود ایک الوہی خوشی ہے۔ ایک آسان سا تھک ہے جو دیدار سے فیضیاب ہونے والے

کو دنیا سے بے گانہ کر دینے والی عطا ہے۔

اس نوخیز دم آگاہ لڑکی پر کیونکو بجلیاں نہ گرتیں۔

”آداب!“ اس نے کسی خواب سے جاگ کر اسے متوجہ کیا۔

پلکیں دھیرے دھیرے لرز رہی تھیں۔ بدقت تمام اوپر اٹھیں۔

نیلا جھاگ سا سمندر ٹھاٹھیں مارنے لگا۔

وہ جیسے نشے میں ڈوب کر بستر پر گرنے کے انداز میں بیٹھ گئی۔

”آپ واقعی جھومر ہیں جس میں نورتن جڑے ہیں۔“

وہ لوٹ پوٹ ہوئی جا رہی تھی اور والہانہ انداز میں اس کے ہاتھ تھام لئے۔

دلہن نے دوبارہ نظریں جھکا لیں۔

اس نے دلہن کے سراپے پر نظر ڈالی۔ ایک میکدہ جیسے اپنے اندر حشر سیٹھے ہوئے تھا۔ وہ کچھ بولنے کو وقت کا زیاں سمجھ رہی تھی بس اسے دیکھتے رہنا چاہتی تھی۔

”آپ ہماری بڑی آفت سی بھابی ہیں مجھے آپ کے دیدار کے شوق نے اس قدر حواس باختہ کر دیا تھا کہ رونمائی کی طرف دھیان ہی نہیں گیا۔ بہر حال.....؟“

اس نے سونے کا چھلا اپنی انگلی سے تقریباً کھسوا اور اس کا ہاتھ تھام کر ایک انگلی میں ڈال دیا۔

”آپ کوئی بات نہیں کریں گی؟ حالانکہ اب تو ساری زندگی آپ نے ہی باتیں کرنا ہیں۔ کیونکہ ظفری بھائی.....؟“

ٹک..... ٹک..... ٹک..... دروازے پر دستک ہوئی۔ جملہ ادھر اڑ گیا اور وہ جیسے یک دم ہوش میں آ گئی۔

”اف کون آ گیا؟ ظفری بھائی تو دستک دے کر آنے سے رہے وہ بے چارے۔“

وہ کانپتے قدموں سے دروازے کی سمت آئی تھی۔ دل بری طرح دھک دھک کر رہا تھا۔

اس نے گویا خوف کی تلوار پر پاؤں رکھ کر دروازہ کھولا۔

”اوہ۔“ دیر سے رکی سانس بالآخر خارج ہوئی۔

”تم نے تو مجھے ڈرا ہی دیا باری۔ حد ہو گئی۔ وہ خوف سے رہائی کے بعد کی خوشی سے دو چار تھی۔

”مزید تفصیل بعد میں۔“ وہ عجلت میں بولا۔ ”فورا سے پیشتر یہاں سے روانہ ہوں بابا صاحب دلہن کے پاس آرہے ہیں۔“

”ہیں!“ وہ سر پٹ دوڑی تھی دروازہ بھی بند نہیں کیا تھا۔

ایک منٹ میں باری نے اسے جالیا اور ہاتھ بڑھا کر اس کا بازو تقریباً کھینچا۔

وہ کھوکھر کے دروازے سے ابھی کافی دور تھے۔

”یہ کیا تمیزی ہے؟“ وہ برہمی سے کہہ رہی تھی۔ کس بری طرح اس کا بازو دبوچا تھا۔

”یہ جو آپ دوڑیں گاری ہیں اس میں کوئی شک نہیں آپ دوڑ کے مقابلے میں وکٹری پوائنٹ پر ضرور پہنچتی ہوں گی۔ آپ ضرور شوق فرمائیں۔ بس ذرا اپنے یہ میسر بہانہ میں سے میں۔ پورا گاؤں سارے کھلیں گونج اٹھے ہیں۔ ان کی ٹھک ٹھک ہے۔“

وہ بھی چڑ کر بولا تھا۔

”جبکہ ابھی آپ نے کھوکھر کے کتے سے داؤرا بھی سنا ہے۔“

روٹی اپنے بازو کو سہلا رہی تھی۔

”بالکل ہی اجڑ ہو اتنی زور سے پکڑنے کی کیا تک تھی۔ اتنا درد ہو رہا ہے۔“ اس کی آنکھوں میں پانی تیر گیا۔
 ”آئی ایم سوری روشی! یہ تو بڑا امیر جنسی اقدام تھا۔ اس عمارت میں چاروں طرف کھڑکیاں ہیں آپ کو تو شاید یہاں کے کینوں سے رعایت مل جائے مگر آپ کو میرے پاؤں میں پڑی زنجیروں کی آواز نہیں آتی؟“

اس کی آواز بہت دھیمی تھی۔

”سوری! مجھے واقعی خیال نہیں آرہا تھا۔ اس نے رخسار تک آجانے والا اکلوتا آنسو اپنی انگلیوں سے صاف کیا۔

”ارے آپ تو رو پڑیں۔“ وہ ازسرنو احساس جرم میں مبتلا ہوا۔

دونوں آگے پیچھے کھوکھر کے کوارٹر میں داخل ہوئے وہ ابھی تک منتظر بیٹھا تھا۔

انہیں دیکھ کر اٹھ کھڑا ہوا۔

”ہمیں زیادہ دیر تو نہیں ہوئی؟“ باری کھوکھر سے مخاطب تھا۔

”نہیں سرکار۔“

”تمہارا کتا نہیں بھوک رہا اب۔“ روشی نے حیرانی سے چاروں طرف دیکھا۔

”وہ جو آپ بہت ڈر رہی تھیں ناں تو میں اسے استھان پر باندھ آیا۔“

”اچھا..... اچھا.....!“ وہ جلدی سے اس کے کوارٹر سے باہر آگئی۔

”باری! تم کھوکھر کو احتیاطاً تاکید ضرور کر دینا۔ بابا صاحب کو دیے ہی مجھ سے شکایت رہتی ہے۔“ اس نے پلٹ کر

باری کو یاد دہانی کرائی۔

وہ خاموش رہا۔

”جواب کیوں نہیں دے رہے؟“ وہ جھلائی۔

”آپ نے حکم دیا میں نے سن لیا۔“

”رات بہت ہو گئی ہے ورنہ پوچھتی تھیں۔“

”دن میں تو آپ اتنا بھی نہیں پوچھ سکتیں جتنا اب پوچھ لیا ہے۔“ وہ مسکرایا۔

”ہمت ہے۔“

”نان سینس..... اچھا شب بخیر۔“ وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

”بالو!“

”ہاں اماں!“

”دیکھ تیرے باپ کو بھنا ہوا قیرہ بہت پسند ہے اچھی طرح بھون لپیو۔“

”کیا ہے اماں۔“

”لے..... دین محمد کو جا کر یہ بانوے روپے چار آنے دے اور اسے کہہ دیجیو بار بار تقاضے نہ بھیجا کر بھاگ نہیں جائیں گے تیرے ذرا سے روپے لیکر۔ اور دیکھ اپنی آپا سے پوچھ لے کچھ منگوانا تو نہیں ہے پھر تو چڑچڑ کر لے گا کہ بار بار چکر لگواتی ہو۔“

”اے بالو! پرائٹوں میں گھی ٹھیک سے بھرا کر..... سوکھ کر پا پڑ بنے ہوئے تھے۔ اے میں کہہ رہی ہوں سن رہی ہے؟“

وہ اس حصے کی طرف منہ کر کے چلائی جہاں بالو کی موجودگی کا احتمال تھا۔

”سن رہی ہوں اماں بولو۔“ بالو کی آواز کسی کونے سے برآمد ہوئی۔

”دیکھ! پچاس روپے ہفتہ سنبھال کر رکھا کر شیخانی ایک پرانی مشین بیچنے کو کہہ رہی تھیں دو تین سو دے کر لے لیں گے“

باقی بعد میں دیتے رہیں گے۔ گھر میں سلائی کا کام آئیگا تو دال آٹا موجود رہے گا کیوں؟“

”ٹھیک ہے اماں!“ اس نے مصروف انداز میں تائید کی۔

”اللہ کرے تیرے باپ کا بھی روزگار لگا رہے سال بھر میں تیری شادی بھی کر دیں گے۔“

بالو اس جملے کے جواب میں اقرار و انکار دونوں سے معذور تھی۔ لہذا چپ رہی۔ مگر روشی کے جھماکے چہار اور ضرور محسوس ہوئے۔

غریب لڑکی کی بے مقصد زندگی میں ایک یہی تو روزن ہوتا ہے جس میں جھماک جھماک کر آنے والی اس عظیم خوشی کا راستہ دیکھتی رہتی ہے۔

سونے کے چند زیورات گونا گے چند شوخ جوڑے ایک ساتھ ایک دم کئی نئے جوڑے۔

اور آنے والے اجنبی ساتھی کی رومان بھری باتیں۔

اس کی انتہائی قربت کے وہ پرفسوں لمحات..... جہاں ذات تکمیل کے لمحے سے گزر کر بے نیاز و بے فکر ہو جاتی ہے۔

زندگی جو جھجک کر ٹھنک کر گزر رہی ہوتی ہے۔ ایک دم سے رواں ہو جاتی ہے۔ محبت بھری قربتوں کے ان سنہرے لمحوں کا تصور غربت کی آزمائشوں کو بہت بے وزن کر دیتا ہے۔ کڑے کوس طے کرنے کی لگن بیدار ہو کر زندگی کو قدرے آسان بنا دیتی ہے۔

ماں کے اگلے سنہرے پروگرام نے جیسے اس کے ذہن پر پڑا جالا کاٹ دیا تھا۔ اسے نئے نئے کام یاد آنے لگے۔

روزانہ کی صفائی میں رہ جانے والے قسم دکھائی دینے لگے۔ کچے مچن میں پھول پودے لگانے کا خیال ازسرنو یاد آیا۔

صندوق میں پڑے چند ان سلعے کپڑے بھی دھیان میں آئے۔ جن پر سلائی کڑھائی کا پروگرام بھی ساتھ ہی بنے لگا۔

وہ بڑی ترنگ کے ساتھ روزانہ کے معمول میں مصروف ہو گئی۔

اس کا رشتہ کہاں ہو سکتا ہے؟

”بڑی پھپھو کے جیل کے ساتھ؟“

نہیں وہ تو خود بے چارے بڑے غریب ہیں۔ کیا وہاں جا کر بھی سلائیاں کروں گی۔ گھر بدلنے سے کیا ہوتا ہے حالات

بھی بدلنا چاہیں۔

چچا انور کے رشید کے ساتھ؟

نہیں اس کا تو غصہ بہت تیز ہے وہ محبت بھلا کیا کریگا؟ ہر وقت تو انکارے چباتا ہے۔

”ہائے کیا پتا..... زاہدہ (سہیلی) کا بھائی رشتہ بھیج دے۔ کیسے دیکھتا ہے گھنٹوں میرا دل کانپتا ہے۔“

نہیں۔ وہ جو کرکٹ کھیلتا ہے ہمارے ہاں سے جگ بھر داکر لے جاتا ہے جمعے کے جمعے۔ اس نے اس روز مجھے کس طرح

دیکھا تھا؟ میں دھک سے رہ گئی تھی۔ شاید وہ اپنی ماں کو ہمارے ہاں بھیج دے۔

شاید..... حمیدہ بھابی اپنے دیور کا رشتہ لے آئیں۔ مجھے کتنا چاہتی ہیں اور ان کا دیور بھی تو اس شب برات پر حلوہ لایا تھا

اور کتنی دیر تک ابا سے باتیں کرتا رہا تھا۔

”بالو کی ماں..... جلدی سے ایک گلاس ٹھنڈا پانی لے آ۔“

چھناک! ایک خیالی سوکبر رچانے ہی والی تھی..... کٹ..... اور مالا ٹوٹ گئی۔

باپ کی تھکی اور لرزتی آواز پر وہ نگے پاؤں دوڑی تھی۔ اس کی ماں اس سے پہلے پانی کا گلاس لیکر پہنچ چکی تھی۔

”ارے کیوں کرتے ہوں اتنی محنت۔ چہرہ ایک دم پیلا ہوا ہے۔ چھوڑو یہ دو دو نوکریاں، شیشیانی سے مشین لے آؤں

مگی کچھ پیسے جمع کر کے۔ پھر تم بس ایک ہی کام پکڑنا۔“

”ابا! طبیعت تو ٹھیک ہے باپ کی بے وقت آمد نے اسے ہولا کر رکھ دیا۔ سارے سہنوں کی ڈور اس کے باپ سے تو

بندھی تھی۔

”ہاں ٹھیک ہوں، آج دھوپ بھی تو بہت تیز ہے چکر آ گیا تھا۔“ وہ ہانپتے ہوئے وجہ بیان کر رہا تھا

”چکر آ گیا تھا۔ پہلے تو ابا کو کبھی چکر نہیں آیا۔“ اسے بے حد تشویش ہوئی۔

”ہاں، مگر اب نوکریاں بھی تو دو دو کرتے ہیں۔“ اس نے عقیدت سے باپ کا ہاتھ تھام کر سہلایا۔

”ابا! سیون اپ منگو آؤں؟“

”نہیں نہیں! پانچ روپے کی ذرا سی بوتل آتی ہے پانچ روپے بڑی مشکل سے پیدا ہوتے ہیں۔ پانچ روپے کی ایک ڈکار

اتنی ہستی نہیں میری۔ بشیر کو بھیج کر گولے گنڈے والے سے ایک روپے کا شربت منگا لے۔ بس!“

وہ فکر مندی سے باپ کے زرد چہرے کو دیکھتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

”میں خواجواہ چندرہ روپے کا پراندہ لے آئی۔ تین بوتلیں آجاتیں ابا کیلئے۔ اس نے اپنی فضول خرچی پر خود کو لعنت

ملا مت کی۔

باورچی خانے سے تانبے کا گلاس لیا اور دروازے کی سمت آ گئی۔

اس نے پرے کی اوٹ سے گلی میں جھانکا۔

بشیر سامنے ہی کھڑا تھا۔

”کیا ہے آپ؟“

”ابا کیلئے ایک گلاس ٹھنڈا شربت لے آؤ۔“

”آج ابا شربت پیئیں گے؟ (وہ تو آٹھ آنے کی برف منگاتے سوچتے ہیں)

”ہاں ان کی طبیعت ٹھیک نہیں۔“

اس نے پلٹ کر پلنگ پر پڑے باپ کو دیکھا جو چند دنوں میں ہی بہت بوڑھا لگنے لگا تھا۔

پشاور ایئر پورٹ کے لاؤنج سے باہر آ کر وہ حیران پریشان کھڑی تھی۔ بقول منیب احمد کے وہ اس کی اٹلار جڈ تصویر دریا

بستی بھیج چکے تھے۔ اگر وہ تصویر سے نہ بھی پہچانی جاتی تو پلے کارڈ اس کی مدد کیلئے موجود ہوگا۔

منیب احمد نے یہ بھی کہا تھا کہ توقع تو یہی ہے کہ یاور اسے ریسو کرنے خود آئینگے۔ انہوں نے بچپن میں اسے دیکھا ہوا

ہے۔ تصویر بھجوانے کی وجہ سے بھی وہ اسے فوراً ہی پہچان جائینگے۔ دوسری بات نازنین سے بے حد مشابہت کی وجہ سے بھی کوئی

مسئلہ نہ ہوگا۔

دلاور علی خان کی جاگیر اگرچہ پنجاب کے علاقے میں گئی جاتی تھی۔ مگر لاہور ایئر پورٹ سے اس کا فاصلہ زیادہ تھا۔ یہ

نسبت پشاور ایئر پورٹ کے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ صوبہ سرحد کے اس حصے میں تھی جو پنجاب کا آخری اور سرحد کا ابتدائی تھا۔

منیب احمد نے یہ بھی بتا دیا تھا کہ ایئر پورٹ سے جاگیر تک کا سات گھنٹے سے زیادہ کا فاصلہ ہے۔ ابھی اتنا طویل فاصلہ

طے کرنا تھا اور اس سے پہلے کی پریشانی یہ تھی کہ اسے لینے کوئی آیا بھی ہے یا نہیں؟

وہ رینگ تھام کر ادھر ادھر نظریں دوڑانے لگی۔

گھڑی کی سوئیاں اس کا فشار خون بڑھا رہی تھیں، اگر کوئی نہ آیا تو آسیر پھپھو کے ہاں صدر چلی جاؤں گی۔ یہاں سے

صدر کا فاصلہ بھی زیادہ نہیں۔ اس نے متبادل حل سوچ کر جیسے خود ہی اپنی ڈھارس بندھائی۔

سہ پہر کے پانچ بجنے والے تھے۔ اس نے جیسے مایوس ہو کر ژالی سے بھاری بھر کم سوٹ کیس کھینچا۔

”پتا نہیں مجھے کیا جلدی ہوئی تھی۔ پاپا کے ساتھ ہی آجاتی تو ٹھیک تھا۔“ اس نے اپنے غلط اقدام پر خود ہی تنقیدی حملہ

کیا۔

”السلام علیکم!“

اس سے پہلے کہ وہ چونک کر صورتحال سمجھتی، سلام کرنے والے نے اس کا سوٹ کیس اٹھالیا۔

”دیکھیں جی..... وہ..... یہ کہ.....؟“ وہ اس قدر پر اعتماد عمل کے سامنے گڑبڑا کر رہ گئی۔

”یاور علی خان۔ آپ مابین ہیں۔ کم آن پلیز.....؟“ وہ اس کا بھاری سوٹ کیس اٹھا کر سامنے گاڑی کی قطار کی سمت

بڑھے تو اسے بھی ان کے پیچھے تقریباً بھاگنا پڑا۔

”یا اللہ! یہ ان لوگوں کا انداز ملاقات ہے۔ استغفر اللہ۔“ وہ اپنے دوڑنے بھاگنے پر جھلا کر رو گئی تھی۔ سیاہ رنگ کی

پٹھو ہار جیب کے پچھلے دروازے کو کھول کر انہوں نے سوٹ کیس رکھ کر پلٹ کر پیچھے دیکھا۔
 ”تو بہ انسان ہے یا حیث طیارہ۔ ایسے دھیمے سروں جیسی بجو کو تو یقیناً انہوں نے دوڑا بھاگ کر مارا ہے۔“
 وہ ان کے نزدیک پہنچ کر سانس درست کرنے لگی۔

انہوں نے جیب کا اگلا دروازہ کھول کر اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ سیٹ پر بیٹھ کر ان کا چہرہ غور سے دیکھنے کی نیت سے بائیں طرف دیکھنے لگی اور وہ کھٹاک سے دروازہ بند کر کے دائیں طرف بھی آگئے۔ اور ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ تب اس نے بھی گویا طمانیت کا سانس بھرا اور دائیں طرف چہرہ موڑ کر ان کے رخ انور پر تفصیلی نگاہ دوڑائی۔ البم میں لگی تصویروں سے بے حد مختلف دکھائی دے رہے تھے۔ جب ہی تو وہ فوراً پہچان نہیں پائی۔ تصویریں بھی جانے کون سے زمانے کی لگی ہوئی تھیں البم میں۔

چھٹ سے اونچا قد و قامت، جاگیر داروں کی نمایاں نشانی گھنی مونچھیں۔ مگر وہ تلوار مار کہ طرز کی نہیں تھیں۔ آنکھوں پر انتہائی تاریک گلاسز..... کنپٹیوں پر سفیدی، بالوں کی تراش فوجی انداز کی، سیاہ پینٹ، سفید بے داغ قمیض، سفید و سیاہ ڈاٹس کی خوبصورت ٹائی، جس میں لگی ٹائی پن کے ٹکینے نیم تاریک ماحول میں جگنوؤں کی طرح دمک رہے تھے۔
 ”اچھی پرسنالٹی ہے۔“ اس نے فوراً نمبر دے دیئے۔

”اگر یہ روایتی بے تکلف اور ملنے ملانے والے دولہا بھائی ہوتے تو بڑی شان بڑھاتے، ہمارے خاندان کی مگر اب کیا، جنگل میں مورنا چاکس نے دیکھا۔“
 اس نے شانے اچکائے۔

”کیا کچھ بولیں گے نہیں؟“ وہ حیرت سے سوچنے لگی۔

”آپ غالباً بہت جلدی میں ہیں۔“ بالآخر وہ خود ہی بولی۔

وہ گاڑیوں کے جھوم سے بڑی احتیاط سے جیب نکال رہے تھے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ تجل سی ہو کر رہ گئی۔

چند منٹوں کے بعد جیب ایک شفاف کشادہ سڑک پر دوڑنے لگی۔

”آئی سے آگین موسٹ ولیم ٹویو۔ جلدی میں نہیں ہوں۔ سفر بہت لمبا ہے راستے میں رات ہو جائیگی۔“ ان کی بھاری و پختہ آواز جو کچھ زیادہ ہی دھیمی تھی بڑی تفصیل سے محدود فضا میں مرتعش ہوئی۔

”آپ اکیلے..... میرا مطلب ہے بچے نہیں آئے؟“ اس نے قدرے احتیاط سے گفتگو شروع کی۔

یاور علی خان نے قدرے گردن موڑ کر اس کی طرف دیکھا۔

بہت ہی بزرگانہ انداز میں اس نے بچوں کی بابت دریافت کیا تھا۔

”شاید انہیں پتا نہیں چل سکا، میں زمینوں سے واپس آیا تو پتا چلا آپ تشریف لارہی ہیں، مجھے اس لئے لازمی آنا پڑا کہ

میرے علاوہ شاید کوئی دوسرا آپ کو آسانی سے نہ پہچان پاتا۔“

”پاپا نے تصویر بھی تو بھجوائی تھی۔“ اب ذرا اس کے اوسان بحال ہوئے۔

”ضرورت ہی نہیں تھی کسی تصویر کی۔ سب زبانی یاد ہے۔“ وہ خود کلامی کے انداز میں گویا ہوئے۔
 ”جی!“ وہ تعجب سے ان کی سمت دیکھنے لگی۔
 ”کچھ نہیں۔“

”اگر آپ کو تھکن محسوس ہو تو آپ پچھلی سیٹ پر جا کر آرام کر سکتی ہیں۔“ ان کی پراثر گہری آواز میں اس بار خاصی ملائمت تھی۔

تیس چالیس منٹ کی ڈرائیونگ کے بعد انہوں نے سڑک کے کنارے جیب روک دی اور سگریٹ لگانے لگے۔ ”میں آپ سے اخلاقاً بھی اس کی اجازت نہیں لے سکتا کیونکہ یہ میری مجبوری ہے..... ڈرائیونگ طویل ہے۔“

”کوئی بات نہیں۔“ اس نے رواداری سے کہا۔

”مجھے دیکھ کر آپ کو بجو تو بہت یاد آئی ہوں گی۔“ اس نے وجہ تعلق کا تذکرہ کر کے گویا اپنی اہمیت کا احساس لاشعوری طور پر دلایا۔

وہ حیرت انگیز طور پر قطعی خاموش رہے۔ وہ تو سوچ رہی تھی کہ اپنی چہیتی مگر مرحوم بیوی کے تذکرے پر وہ ایک دم خوش ہو جائینگے اور جانے نازنین کی کیا کیا باتیں شروع کر دیں گے۔

”اس سے پہلے آپ کبھی پشاور آئی ہیں؟“ انہوں نے اس کی سوچ سے بہت ہی مختلف گفتگو شروع کی۔

”جی نہیں۔“ اس نے جھلا کر جواب دیا۔

سگریٹ کے دو چار کش لگا کر انہوں نے ڈرائیونگ پھر شروع کر دی۔

اب شام کا جھپٹا تھا۔ یاور علی خان نے گلاسز اتار کر جیب میں اٹکا لئے۔ مابین نے نہایت پرشوق انداز میں ان کی سمت دیکھا تھا۔

خوابیدہ بھاری سیاہ اور سوچتی ہوئی گہری آنکھیں، عادی ”پینے“ والوں جیسی۔

مابین کو عجیب سا خوف محسوس ہوا۔

”میں اسی لئے ڈارک گلاسز استعمال کرتا ہوں۔ دھوپ میری آنکھوں کو کچھ نہیں کہتی مگر یہ آنکھیں..... دوسروں کو پریشان کر دیتی ہیں۔ دراصل برسوں سے اصلی اور جی نیند نہیں سویا۔ نیند کے قرض سے سرخ سی ہیں اور کوئی بات نہیں، آپ پریشان نہ ہوں۔“

(واقعی کس قدر محبت کرتے ہیں یہ بجو سے۔ ان کی جدائی سے نیندیں ہی پریشان ہو گئیں)

”میں نے تو کچھ بھی نہیں کہا۔“ وہ شپٹا کر رہ گئی اور بوکھلا کر کھڑکی سے باہر جھانکنے لگی۔

یاور علی خان نے اندرونی لائٹ آن کر دی۔ گھنی مونچھوں تلے ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ یوں نمودار ہو کر غائب ہوئی تھی جیسے بادلوں کی اوٹ سے لمحہ بھر کو چاند جھلکتا ہے۔

مابین دور تک نظر آنے والی سڑک پر نظر دوڑا کر فاصلے کی طوالت محسوس کر کے منزل تک پہنچنے کے بعد کی تھکن کو ابھی سے

محسوس کر رہی تھی۔

”باری!“

”جی بابا صاحب!“

”وہ ہمارے برابر والا کرا مہمان کیلئے صاف ہو گیا؟“

”جی بابا صاحب! دیکھ کر آیا ہوں۔“ اس نے مودبانہ کہا۔

”ہوں۔“ انہوں نے گہری سوچ کے درمیان ”ہوں“ کہہ کر گویا اپنے متوجہ ہونے کا اظہار کیا۔

”دیکھو! اس کا پچھلا دروازہ باہر سے بند کر دو اور اس میں تالا ڈال دو۔“

”جی بہتر۔“

”دھیان رہے سوائے بڑی دلہن کے مہمان کے پاس زیادہ دیر کوئی نہ رہے۔“

”جی۔“

”خاص طور پر روشانی۔“

”جی۔“

”یہ مہمان کہاں سے آرہی ہیں بابا صاحب؟“ اس نے عام سے انداز میں سوال کیا۔

”کراچی سے..... ماہین نام ہے۔ روشانی کی سگی خالہ ہیں۔“

”اوہ! ناز چچی کی سگی بہن۔“

”ہاں۔“

”گھر میں اور کسی کو خبر نہیں۔“ اس نے گویا کوئی لائحہ عمل ترتیب دینا شروع کیا۔

”تمہاری بڑی امی اور بڑے ابا کو اطلاع ہے۔“

”انہوں نے آہستگی سے جواب دیا۔“

بابا صاحب نے جتنی ڈھیل اور رعایت باری کو دے رکھی تھی وہ گھر میں اور کسی کو حاصل نہیں تھی جس پر سارے گھر والوں

کو بہت تعجب تھا۔ اسے ان کے عمدہ خاص کی حیثیت حاصل تھی۔

”دیکھو جیسے ہی یاور مہمان کو لیکر گھر میں داخل ہوں سیدھے میرے پاس لے کر چلے آنا۔ ماما جی کو تاکید کر دینا مہمان

سے پہلے وہ نہیں سوئے گی۔ نہ جانے وہ کس وقت آئیں۔ کھانا دانا بھی پوچھنا ہوگا۔“

کیوں.....؟

”جی۔!“

”اور اسے کہنا سونے سے پہلے مہمان کیلئے دودھ ضرور لے جانے خواہ وہ پیے یا نہ پیے۔ ضروری اشیاء اس تک پہنچ جانی

چاہئیں چاہے وہ استعمال کرے یا نہ کرے سمجھ گئے؟“

”بہت اچھی طرح۔“ اس نے بابا صاحب کو مطمئن کیا۔

”اب تم جا سکتے ہو۔“

وہ اگلے قدموں باہر نکل آیا اور سیدھا برابر والے کمرے میں چلا گیا۔

”خان! اس کمرے میں ٹائٹ بلب نہیں۔“ کمرے میں پہنچتے ہی ماما جی نے اطلاع دی۔

”کوئی بات نہیں انہیں اندھیرے میں رکھیں گے۔“ اس نے ذومعنی جملہ پھینکا۔

”جی!“ ماما جی نے آنکھیں پھاڑیں۔

”لگا دیں گے بھی۔“

”لگائی بجھائی آپ سے زیادہ کون کر سکتا ہے وہ بھی عمدہ طریقے سے۔ روشنی ویلیوٹ کے پردے کے پیچھے سے نمودار

ہوئی۔“

”میں خوش قسمتی سے خاتون نہیں ہوں یہ آپ لوگوں کا ڈیپارٹمنٹ ہے اور آپ یہاں کیا کر رہی ہے؟“ وہ کسی خیال کے

تحت فوراً چونکا۔

”گھر ہے ہمارا کہیں بھی کچھ بھی کر سکتے ہیں آپ کو اعتراض کیا ہے؟“

”مجھے بھلا کیوں اعتراض ہونے لگا۔“ وہ نائب بلب لانے کے خیال سے باہر نکلنے لگا۔

”باری!“

”فرمائیے۔“

”کون آرہا ہے۔“

”مہمان۔“ وہ اختصار سے کہہ کر بڑھا۔

”کون مہمان؟“ وہ ٹھٹکی۔

”یہ سارے گھر میں آپ ہی کیوں اس قدر تجسس کی حالت میں رہتی ہیں؟“ وہ مسکرایا۔

”بتاؤ نا باری کون مہمان ہے؟“

”ماما جی تمہیں کچھ پتا ہے؟“

”بتا دیجئے جلدی کیا ہے۔“ وہ تیزی سے باہر آیا۔ مبادا کوئی نیا سوال حملہ آور ہو۔

”آپ سے پہلے مجھے کیا پتا ہو سکتا ہے بی بی۔“ ماما جی مسکرا دی۔

”لے لے تو میرے پتا ہی گئے ہیں چل جائے گا پتا۔“ وہ شانے اچکا کر کمرے سے باہر نکل گئی۔

وہ تو کرنز پارٹی میں اپنی معلومات سے کوئی دھماکہ کرنا چاہتی تھی مگر کچھ پتا ہی نہ چل سکا تھا۔ وہ بددلی سے اس سمت آئی

جہاں ”کزنز اجتماع“ نہایت ہی ذوق و شوق سے کراچی جانے کے پروگرام پر بحث و تمحیص میں مشغول تھا۔

”یہ آپ کی شکل کیوں ”ہجریائی“ ہو رہی ہے؟“ شیئو نے چوہک کر اس کی شکل دیکھی۔
 ”جیسے آپ کو بڑا تجربہ ہے ہجر و فراق کا۔ ملا کی دوڑ مسجد تک اور آپ کی دوڑ اس گھر میں موجود کزنز تک۔ کل کلاں کو خبر ملے گی، شیئو آپ کی فلاں بھائی سے نسبت ٹھہر گئی ہے اور پھر ان کا ہجر اس کھڑکی سے شروع اور اس کھڑکی پر ختم۔“
 وہ برا سامنہ بنا کر کارپٹ پر ڈھسے گئی۔ ایک زبردست قہقہہ پڑا تھا۔
 ”شیئو بلبلا کر رہ گئی، ایک تو تمہیں بڑے چھوٹے کا ذرا لگا نہیں۔“ وہ بالآخر جھلا کر بولی۔
 ”تو مجھے کیوں ہجریائی“ کہا؟ ہجریائی ہوں میرے دشمن۔“
 ”ان کی تاریخ تو وصال و ملاپ سے ترتیب پائے گی اور سنہری حروف سے لکھی جائیگی۔“
 حنانے ریموٹ کے ذریعے ٹی وی کی آواز اونچی کی۔ اس شور شرابے میں اس کی فلم خراب ہو رہی تھی۔
 ”تمہیں کوئی اس کا بھید پتہ لگا ہے؟“ گلوآ پانے فوراً ہی تفتیش شروع کر دی۔
 ”جو باتیں جاننا چاہیں وہ تو کوئی جاننے کی کوشش نہیں کرتا۔ خونخوہ اندھیرے میں تیر چلاتے ہیں۔ جس کا حاصل نہ وصول۔“ وہ ایک دم چڑ گئی۔
 ”تم نے دیکھا۔ یہ باری کو بھائی نہیں کہتی۔“ زری نے وکیلوں کی طرح نکتہ اٹھایا۔
 ”یہ تو ہے۔“
 ”میں زبردستی کے بھائی نہیں بناتی۔ اچھی خاصی خود کفیل ہوں۔ بھائیوں کے سلسلے میں۔“
 ”اچھا پھر کل ذرا اسے بھائی کہہ کر ہمارے سامنے بلانا۔ اگر کوئی بات نہیں۔ شیئو نے جیسے اپنا بدلہ لے لیا۔
 ”میں اسے تاپا، خالو حتیٰ کہ دولہا بھائی تک کہنے کو تیار ہوں، اگر آپ برا نہ مانیں، مگر بھائی نہیں کہوں گی۔ اب تو میری اتنا کا مسئلہ ہے۔“ وہ تو جیسے اڑ گئی۔
 اور شیئو تو معنی خیز انداز میں دولہا بھائی کہنے پر گویا جلتے توڑے پر جا بیٹھی۔
 ”خبردار! جو تم نے میرے ساتھ کسی ایسے ویسے کا تعلق مذاق میں بھی جوڑا۔“
 ”میں اس سے شادی کروں؟ اس سے لاکھ درجے بہتر ہے کنواری مر جاؤں؟“
 ”ارے شیئو! چھوڑو مذاق ہے۔“ گلوآ پانے بچاؤ کر لیا۔
 ”ارے نہیں، یہ یونہی بد تمیزی کرتی ہے۔“ شیئو کا غصہ ٹھنڈا ہو کر نہیں دے رہا تھا۔
 ”بری بات، چھوٹی ہے۔“ بابا صاحب سمیت سب نے اسے سر پڑچڑھا رکھا ہے۔ شیئو کے انداز شدید تر ہو گئے۔
 ”چھوڑو شیئو! عمر بھی کم ہے اور عقل بھی ہوش کی دوا کرو۔ ایمانداری کی بات ہے، یہ بے چاری اول تو کسی کو کچھ کہتی بھی نہیں ہے۔“
 گلوآ پانے ماحول میں امن پیدا کرنے کی کوششوں کے ساتھ ساتھ کلمہ حق بھی بلند کیا۔
 ”یا اللہ، تو بہ! یہ کیا شروع ہو گیا۔ کتنا اچھا، وگرام بنا رہے تھے ہم لوگ۔ خوش قسمتی سے پہلی بار ایسا ہوا ہے کہ بابا صاحب

نے ہم سب کو کراچی جانے کیلئے خود کہا ہے، ورنہ تو اجازت بھی مشکل سے دیتے تھے۔“
 ”حالانکہ نہیں پتا ہے ہم سب ”سیون سی“ جانے کیلئے ہمیشہ تیار رہتے ہیں۔ اف وہ جھاگ اڑاتا سمندر وہ بھی رات کے وقت۔ چلو بس ہنگامہ ختم۔ ہاں! تو کیا بات کر رہے تھے ہم۔“ بیہ بڑی تفصیل سے شروع ہوئی۔
 ”یہی کہ بابا صاحب لاکھ کہیں دو مہینے سے پہلے واپسی نہیں ہوگی۔ جب بھی آنے کو کہیں گے، کوئی نہ کوئی بہانہ بنا دیا کریں گے۔“
 مونا جو کسی کام سے باہر گئی ہوئی تھی، اندر داخل ہو کر وزیر باتدبیر کا رول ادا کرنے لگی۔ وہ کچھ دیر پہلے کی صورتحال سے قطعی لاعلم تھی۔
 ”مونا باجی اسارے بہانے بنا لیں گی آپ؟“ سونی نے مونا کو یوں تعجب سے دیکھا جیسے خرگوش گوریلے کو دیکھ رہا ہو۔
 ”تم سب کے ساتھ مل کر بناؤں گی، اکیلے تھوڑا ہی۔“ وہ زری کو آنکھ مار کر ہنس دی۔
 ”ارے یہ روشی کیوں چپ ہے؟“ مونا نے روشی کی خاموشی نوٹ کی۔
 ”ایسے ہی طبیعت ٹھیک نہیں کچھ تھک گئی ہوگی، شام سے پینٹنگ کر رہی تھی۔“
 روشی کشن پر سر رکھے دراز تھی۔ گلوآ پاس کے برابر بیٹھی ہوئی تھیں۔ بہت محبت سے انہوں نے روشی کی پیشانی پر بکھرے بال سمیٹ کر مونا کو جواب بھی دیا تھا اور دوسری موجود لڑکیوں کے ذہن میں جملے کے اندرونی اثرات اتارنے کی شعوری کوشش بھی کی تھی۔ مبادا وہ کچھ دیر قبل کی ناپسندیدہ صورتحال کو دوبارہ موضوع بنا ڈالیں۔
 الفاظ مونا کیلئے تھے اور معنی خیز بلکہ پر معنی لہجہ باقی تمام لڑکیوں کیلئے۔
 لڑکیاں بھی پچھلی صورتحال کی طرف پلٹنے کے موڈ میں نہیں تھیں۔ اس لئے گلو کو زیادہ محنت نہیں کرنا پڑی۔
 ”جن لوگوں کے امتحانات نزدیک ہیں وہ ہمارے اس پروگرام میں بالکل شامل نہ ہوں، اس لئے کہ ان قصورواروں کی وجہ سے ہم بے قصوروں کو بھی جلد بوریا بستر سمیٹنا پڑ جائیگا۔“ تانیہ جو انٹر کے بعد کی طویل تعطیلات منانے کے موڈ میں تھی فوراً ہی پیش بندی کی نیت سے بول پڑی۔
 ”پہلے چلے تو جائیں۔“ حنانے بے مزا ہو کر اسکرین سے نظریں ہٹائے بغیر چڑ کر کہا۔
 ”لو پروگرام تو پکا ہے۔“ اماں نے تو مجھے پورے ایک ہزار روپے بھی دے دیے۔ زری نے انکشاف کیا۔
 ”ایک ہزار! آپ کیا کریں گی اتنے سارے روپوں کا؟“ روبی جو صرف سن رہی تھی، ایک ہزار کا سن کر جیسے سوتے سے جاگ گئی۔
 ”بے چاری روبی! دو سو روپے مہینہ دیتی ہیں پھپھو۔“ تانیہ نے ترس کھایا۔
 ”دو سو روپے تو نام کے ہیں، کپڑے وہ بناتی ہیں، ہر فرمائش پوری کرتی ہیں، سب کچھ تو میسر ہے۔“ روبی نے یہ سن کر ہی کرتی ہوئی۔“ زردی نے کہا۔
 ”کہاں جمع ہوتے ہیں۔“ کالج کینٹین کا خرچ چار سو روپے کا ہے، امی دو سو دیتی ہیں۔“ روبی نے فریاد کی۔

”پھر کیوں روتی ہیں؟“

وہ اس کی سادگی پر مسکرا دی۔

”اگر تقدیر میں رونا ہو تو بیٹی یا بہو ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔“ اس نے ہتھیلی سے آنکھیں صاف کرتے ہوئے کہا۔

”خدا نہ کرے آپ تو شہزادی ہیں، مائسن ہیں۔“

روشی تنہی سے مسکرا دی۔

”بھابی! ظفری بھائی مجھ سے بہت بڑے ہیں، آپ میری بڑی بھابی ہیں، مجھے باجی نہ کہا کریں۔ میں تو آپ کی چھوٹی

نند ہوں۔ روشا نے نام ہے میرا، سب مجھے روشی کہتے ہیں، آپ بھی مجھے روشی کہا کریں۔“

اس نے جھومر کوشانوں سے پکڑ کر بیڈ پر بٹھا دیا۔

”اچھا یہ بتائیں، ظفری بھائی نے آپ سے کیا باتیں کیں۔“

”باتیں z y c s t ! نے حیرانی سے روشی کی سمت دیکھا۔

”میرا مطلب ہے اشاروں ہی سے سہی۔“ اس نے شرمندہ سے لہجہ میں وضاحت کی۔

”ابھی مجھے ان کے اشارے سمجھ نہیں آتے۔“ جھومر نے نظریں جھکا کر کہا۔

”محبت کے اشارے بھی نہیں؟“ روشی نے شرارت سے جھومر کو اپنے بازوؤں میں سمیٹ لیا۔

شرم سے جھومر کے چہرے پر لالی کھیلنے لگی۔

”بھابی! ظفری بھائی آپ کو بہت چاہیں گے، یقین کیجئے آپ ان کی معذوری نہیں، ان کی محبت کو نظر میں رکھیے گا۔“

”یہی تو کرنا ہوگا، ورنہ دن کیسے کٹیں گے؟“ اس نے اک سرد آہ کھینچی۔

”اچھا مجھے اپنے کپڑے دکھائیے۔“ روشی نے اس کی توجہ بٹانا چاہی۔

”کپڑے تو ڈھیر سارے ہیں، مگر دل نہیں چاہتا۔“

”ارے کیوں دل نہیں چاہتا، صبح شام تبدیل کیا کریں، ظفری بھائی بہت خوش ہوں گے۔“

”وہ تو خیر ویسے بھی بہت خوش ہیں۔“ اس کے لہجہ میں یاسیت تھی۔

روشی خاموش ہو گئی۔ مخرج خاموش جیسے دعا کر رہی ہوں کہ جھومر اپنی محرومی آشکار نہ کرے پی جائے، ضبط کر

جائے کہ آخر وہ استحصال کر دے، گروہ سے تعلق رکھتی تھی۔ اس میں کسی سنگین صداقت کو رو برو سننے کا حوصلہ نہ تھا۔

اس کا جی چاہا، جھومر کہے۔

”میں خوش ہوں، میرے ساتھ کسی نے زیادتی نہیں کی۔ یہ میری تقدیر ہے۔ ظفری معذور ہیں تو کیا؟ میں ان کے دل کی

تسکین و خوشی ہوں اور اس بات پر خوش ہوں کہ مجھے بے لوث بے کھوت محبت کی دولت حاصل ہے۔“ تاکہ وہ اس تکیہ پر

احساس سے نجات پا جائے کہ وہ اپنے سامنے ضمیر فروری کے ٹل کو جاری دیکھ رہی ہے اور خاموش ہے۔

جھومر نے جس انداز میں ظفری کی خوشی کا ذکر کیا تھا وہ انداز اس کی اپنی خوشی کی کوئی گواہی نہیں دے رہا تھا۔

”بھابی! آپ خالص قبائلی ہیں، مگر لگتا ہے آپ نے پڑھا لکھا بھی ہے۔“ وہ اس کی متناسب گفتگو سے بہت کچھ اخذ کر چکی تھی۔

”ہاں، میں میٹرک کر چکی ہوں۔ انٹر کی تیاری کر رہی تھی۔“ اس نے بنا روکد فوراً اقرار کر لیا۔

”جی! وہ واقعی بھونچکی رہ گئی۔

”تیور خان جی نے میرے ساتھ آج تک بڑی مہربانی کی تھی، مگر شاید وہ تو یہاں تک پہنچنے کی تیاری تھی۔“ اس کی آنکھیں پھر بھیگ چلیں۔

”کیا آپ کو کا کا جان نے پڑھایا ہے؟“

”جی..... پر مجھے وہم سا پڑتا تھا، وہ میرا تنا خیال کیوں کرتے ہیں؟“ جھومر خاصی گہری تھی۔

”آپ کی اور بہنیں بھی ہیں؟“

”نہیں..... تین چھوٹے بھائی ہیں، اگر میری اور بہنیں ہوتیں تو شاید میں آج یہاں نہ ہوتی، میرے لالہ کو سب کچھ ہی

مجھ سے ہی حاصل کرنے کا لالچ نہ ہوتا۔ بھلے اس کی ڈرائیوری چھوٹ جاتی، اسے کوئی فکر نہ ہوتی۔“

”باجی!“

”اول..... ہوں..... روشی۔!“ روشی نے اسے ٹوک دیا۔

”جی..... روشی بی بی!“

”صرف روشی۔“ اس نے دوبارہ ٹوکا۔

”اچھا جی، صرف روشی۔“ وہ معصوم سے انداز میں جیسے زج ہو کر بولی۔

روشی بے ساختہ کھلکھلا اٹھی..... تو جھومر کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ آ گئی۔

”روشی! آپ کے اور ظفری کی امی کے علاوہ اور عورتیں نہیں ہیں گھر میں؟“

”ایک جھوم بیکراں ہے، جب ہم سب کھانا کھاتے ہیں تو لگتا ہے دعوت میں ”زنا نہ کھانا“ ہو رہا ہے۔“ وہ ہنس کر بولی۔

”پھر..... وہ یہاں کیوں نہیں آئیں؟“

روشی نے جیسے ترحم آمیز انداز میں اس کی سمت دیکھا۔

”بابا صاحب کا نام سن ہے؟“

”جی، تیور خان جی کے والد۔“

”ہاں وہی..... ان کی اجازت نہیں ہے۔“

”آپ کو ہے؟“ اس نے تعجب سے روشی کو دیکھا۔

”مجھے بھی نہیں ہے، جب ہی تو رات کے اندھیرے میں چھپ چھپ کر آتی ہوں۔“

”آپ کیوں خطرہ مول لیتی ہیں؟“

”جن کو کچھ کھوجانے کا خطرہ ہوتا ہے، وہ خطرہ مول لیتے ڈرتے ہیں، میرے بہت بڑے بڑے نقصان ہو چکے ہیں، مجھے کچھ کھوجانے کا خوف نہیں۔“

اس نے بات کے اختتام پر گہری سانس لی۔

”دو اور خواتین بھی تو بڑی امی کے علاوہ یہاں آتی ہیں، آپ سے نہیں ملیں؟“

روشی کسی خیال سے چونک کر پوچھنے لگی۔

”نہیں، میرے پاس بڑی امی کے علاوہ اور کوئی نہیں آیا۔“ جھومرنے کہا۔

(حالانکہ میرے علم میں ہے ارجمند چچی اور بڑی پھپھو بڑی باقاعدگی سے یہاں آتی ہیں)

”روشی! مجھے یہاں بہت ڈر لگتا ہے۔ دیکھو ناں، کوئی نظر نہ آئے، خالی آوازیں آئیں، تو کیا ڈر نہیں لگے گا؟“

”کیسی آوازیں؟“

”زیادہ تو نہیں سمجھ سکی، مگر ایسا لگتا ہے، کوئی روتا ہے۔“

روشی کے دل پر ایک دھکا سا لگا۔

(ہائیں..... اور کون روتا ہے؟) ”آپ کو یقین ہے؟“ اس نے الجھ کر پوچھا۔

”آپ کا گھر ہے، آپ کو نہیں پتا؟“ اسے اچنبھا ہوا جو کہ لازمی امر تھا۔

”یہ گھر نہیں ہے بھابی! بابا صاحب کی سلطنت ہے۔“

”تم یہاں کیا کر رہی ہو؟ معاً سے پیچھے سے بڑی امی کی بارعب آواز سنائی دی۔

ایک لمحے کو تو وہ چکرا کر رہ گئی، پیچھے مڑ کر دیکھتے ہوئے خوف آیا۔

وہ خود ہی سامنے آئیں۔ ان کی آنکھیں اس کی ریزھ کی بڈی میں کپکپا ہٹ پیدا کر رہی تھیں۔

ساتھ ہی حیرانی بھی عیاں تھی۔

”تم یہاں کس طرح آئیں، وہ بھی اتنی رات کو، تمہاری ہمت کیسے ہوئی؟ تم سمجھتی کیا ہوا ہے آپ کو۔ یہاں وہاں اپنی

من مانی کرتی ہو۔ تمہیں احساس نہیں کہ ساری مصیبت مجھ پر آئیگی۔ یہاں میرے خزانے دفن ہیں۔ تمہیں یا کسی اور کو کیوں

دلچسپی ہو؟۔ یک دم ان کی آواز بھرا گئی۔

”یہاں حکمرانی ہوتی ہے، رشتے داری نہیں، دفع ہو جاؤ یہاں سے، آئندہ یہ حرکت نہ دہرانا، میں کہہ رہی ہوں جاؤ یہاں

سے۔“ وہ دبے دبے لہجے میں برہمی کا اظہار کر رہی تھیں۔

روشی تو وہاں سے بگٹ بھاگ کھڑی ہوئی۔

”اف میرے خدا۔“ اس نے کھوکھر کے کوارٹر میں جا کر گہرے گہرے سانس کھینچے۔

”کھوکھر ابی بی کو ٹھنڈا پانی پلاؤ۔“ اسے نہایت قریب سے باری کی آواز آئی۔

”باری! میں تمہیں شوٹ کر دوں گی۔ جنات کی طرح میرا پیچھا لیا ہوا ہے۔“

”بہت ہی خوش فہم ہیں حضور، یہاں سے وہاں میرے سینکڑوں چکر لگتے ہیں، اگر کہیں آپ کھڑی ہوں تو آپ کا تصور ہے، میرا نہیں۔“

”خان! بسنتی آج بھوکی ہے۔“ کھوکھر کو باری کی صورت دیکھتے ہی اپنا مسئلہ یاد آیا۔

”جمہیں اسے عادی بنانا ہے کھوکھر! یہ تمہارا درد ہے۔“

”ویسے خان! خمرے باز لگتی ہے، بہت ستائے گی۔“

”کوئی خمرے دکھاتا ہی اس لئے ہے کہ اس کے خمرے کو توڑا جائے، ٹرک لگاؤ یا رکوئی۔“ وہ اپنے مضبوط بازوؤں پر باری

باری ہاتھ مارتے ہوئے مسکرایا۔

”یہ بسنتی کون ہے؟“ روشی نے فوراً مداخلت کی۔ عجیب سا ٹیکھا پن تھا سوال میں۔

”نئی گھوڑی آئی ہے اصطبل میں، کوئی اعتراض؟“ وہ باہر کی جانب بڑھ رہا تھا۔

وہ کھسیا کر رہ گئی۔ اس پر مستزاد باری کی مسکراہٹ اور گنگناہٹ۔

مجھ کو اس رات کی تنہائی میں آواز نہ دو

آواز نہ دو

”ہونہہ! بابا صاحب کا چچہ! وہ پاؤں پٹختی ہوئی باہر آگئی۔ کھوکھر کی بیوی بے چاری باری کے حکم کی تعمیل میں پانی کا

گلاس لئے پیچھے پیچھے آئی تھی۔

آج ہم نے بھی جبر سے ہنس کر

جینے والوں کی نقل اتاری ہے

”بھائی! وہاں کہاں..... یہ رہے ہم ادھر۔“ اس نے اندھیرے میں سرگوشی سے آتی عارف کی آواز سنی۔

”بھائی! تو کتنا اچھا ہے، نہ فکر نہ فاقہ، بس شعر پڑھتا رہتا ہے۔“ وہ اس کے نزدیک بیٹھ گیا۔

”اور کیا حال ہیں تمہارے؟“ اس نے تھکے تھکے انداز میں عارف کا احوال پوچھا۔

کہتے ہیں عمر رفتہ کبھی لوتی نہیں

جا میکدے سے میری جوانی اٹھا کے لا

”کیا حال ہوتا ہے اب ہمارا؟“ وہ اپنی مخصوص زہریلی ہنسی بنا۔

”میں تیرے بارے میں سوچ رہا تھا۔ تیری نشے سے یہ حالت ہوئی ہے یا خون پیچنے سے؟“

وہ عارف کی سمت گھورتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

”ہمارے متعلق نہ سوچا کر، تیرے اپنے دکھڑے کم ہو گئے ہیں؟“ عارف بالکل چپ لیٹا تھا۔ پیٹ پر سے قمیض ہٹا کر

سینے تک چڑھائی ہوئی تھی اور ننگے پیٹ پر ہاتھ پھیر رہا تھا اور پیٹ بھی کیا تھا۔ پسلیاں بلندی پر تھیں اور پیٹ کھائی میں۔ جیسے

”معدہ“ نام کا تھیلا بھی اندر نہ رہا ہو۔

”عارف یار..... لال خان بہت تنگ کرتا ہے۔“

”پے منٹ نہیں کرتا پوری؟“ عارف نے بچ میں سے بات اچک لی۔

”ہاں بھائی۔“

”یہ تو ہے اس دھندے میں بلکہ ہر دھندے میں سالی گردن پتلی ہو تو..... ہر کوئی نظر رکھتا ہے..... بات کروں گا اس سے۔“

”ابھی کر لویا آج مجھے چکر آ گیا تھا۔ سینٹھ نے پیسے نہیں دیئے واپس گھر جو آنا پڑا۔“

”کوئی ٹکڑی چیز کھایا کر رُس بنے گا تو رُس نکلے گا نا۔“

”کہاں سے کھاؤں؟“ ابھی کچھ بچتا ہی نہیں۔

”ابھی بھی نہیں بچتا؟ کیا سونے کے نوالے کھلا رہا ہے اولاد کو؟“ وہ بے ہنگم انداز میں ہنسا۔

”ابھی وہ پوری اجرت دیتا ہی کب ہے۔ یہ سالا بھی اپنے سینٹھ ہی جیسا ہے۔ قسمت ہی خراب ہے۔“

”پھر بھی کچھ تو دیتا ہوگا؟“

”لوٹے کی دوائیاں بڑی مہنگی ہیں پھر پھلادھار بھی تھا۔“

”دودن میں تو حالات نہیں بدلیں گے ذرا انتظار کر ہمارے جیسے ضرورت مندوں نے ہی ان کے دماغ آسمان پر

چڑھائے ہیں۔“

انہیں اپنی صورت پہ یوں ناز کب تھا

مرے عشق رسوا کو اختر دعا دیں

”تو پھر چل رہے ہو؟“ اس نے عارف کی سمت بہت امید سے دیکھا۔

”پھیسے سرکار بولے تو کنڈی بھی کھولیں گے پر ذرا ٹائم لگے گا انھنے میں ہمت باندھ رہے ہیں۔ ذرا ہاتھ تھام کر اٹھا کر تو

بٹھاؤ۔“

”یار تم سے تو اٹھنا محال ہے پھر تمہاری اتنی چلتی کیسے ہے؟“ اسے حیرانی ہوئی۔

”زہر زہر کو مارتا ہے سنا نہیں؟ لوہا لوہے کو کاٹتا ہے زندہ لاش ہیں تو کیا ہوا؟ سانس تو پوری کرنی ہے۔ ایک آدھ چابی تو

رکھتی پڑتی ہے جیب میں۔“

اس نے جیب سے سگریٹ اور ماچس کی ڈبیانکا لے ہوئے بڑی تفصیل سے جواب دیا۔

”اب تم سگریٹ پورا کرو گے؟“ اسے جتنی جلدی تھی عارف اتنی دیر لگا رہا تھا۔

”کبوگے تو آدھاپا لیں گے۔ بات یہ ہے بھائی سٹلگائے بغیر اپنی گاڑی موڑ نہیں لیتی۔“

”ویسے لوٹنا اب پہلے سے بہتر ہے تم تو یار میرے محسن ہو بھیک بھی مانگتا تو اس وقت اتنی تو نہ ملتی۔“ اس کے لہجے میں

ممنونیت تھی۔

”ہاں بھائی! جب کھڑے تھے تو کسی کے کام کے نہیں تھے لیٹے ہیں تو بڑے کارآمد ہیں۔“ وہ ہنسا تو دھوکے کی وجہ سے

کھانسی شروع ہو گئی۔

بڑی مشکل سے کھانسی تھمی۔ ”تمہیں تو بڑی سخت کھانسی ہے۔“ اس نے بہت ترس کھا کر جیسے اظہار ہمدردی کیا تھا۔

”وہ کہ کبھی سینے سے نہ گئی اور یہ ہے کہ چھاتی سے الگ نہیں ہوتی۔“ وہ بھونڈے پن سے ہنسا۔

”وہ کون؟“

”پھر سنائیں گے یہ داستان الم۔“

چھپ گئے وہ ساز ہستی چھیڑ کر

اب تو بس آواز ہی آواز ہے

”بیوی تھی وہ تمہاری؟“ وہ سادگی سے پوچھ رہا تھا۔

”بیویوں کا ذکر بھی اتنے اہتمام سے کیا جاتا ہے نادان؟“ وہ مذاق اڑانے والے انداز میں ہنسا۔

”تم تو بیوی والے ہو کر بھی بڑے نا تجربہ کار ہو پرتم بھی کیا کرو تمہاری زندگی میں ڈائریکٹ آئی ہی بیوی ہے۔ ہم سے

پہلے ملتے تو ہم مشورہ دیتے کہ معاشرت بنا بیوی نہیں لاتے۔“

”یہ اور بات ہے معاشرت کسی اور سے شادی کسی اور سے۔“

”بھائی تیری باتیں اپنے کھاتے میں نہیں لگ رہیں چل یار دیر نہ کر۔“

”ذرا سہارا دو۔“ عارف بمشکل اٹھتے ہوئے مدد کا طالب ہوا۔

اس نے دل و جان سے اسے سہارا دیا اور اسے تھامے ہوئے نیوروسرجری کی طرف آیا۔

”لال خان!“ اس نے پوری قوت اکٹھی کر کے آواز دی جو پھر بھی کافی نہ تھی۔

لال خان ایک پاؤں بیچ پر اور دوسرا زمین پر رکھے بڑے زوروں کا سٹلگاہا تھا۔

عارف کی آواز سن کر دوڑا چلا آیا۔

”یار! ادھر کھڑے کھڑے تیرے بالوں میں سفیدی آگئی۔ انسان اب بھی نہ پہچانے گئے تجھ سے؟“ عارف کی نحیف

آواز میں گویا یہ ملامت تھی۔

”کیا گلہ ملی ہو گئی باؤ جی؟؟“

”اس کا چھو کر ایما رہے اتنے آرام سے یہ عادی بننے والا نہیں چھو کر امر گیا تو آئے گا پھر یہ تیرے پاس؟“

”اونیکٹو آسامی ہے تیرے سے بڑا پاگل نہیں ادھر کوئی۔“ عارف اس کے کان میں سرگوشی کرنے لگا۔

”اس کی پے منٹ پوری کر بلکہ پچاس روپے ہر جانے کے دے غریب کوئی ٹکڑا مال کھائے گا پچاس روپے لگائے گا تو

پانچ سو نہیں گئے۔“

لال خان نے کسی معمول کی مانند عارف کے حکم کی تعمیل کی۔ جسے ہوا کے جھونکے ہلائے جا رہے تھے۔ اسے عارف کے دبدبے پر سخت حیرانی ہوئی۔

”دوسورہ گئے تھے یہ پکڑاؤ یہ پچاس روپے اوپر سے..... خوش؟“

”مہربانی تمہاری..... وہ اتنی آسانی سے کام ہوتا دیکھ کر نہال ہو گیا۔“

”صبح نو بجے پہنچ جائیو بڑی بگڑی پرائیوٹ آسامی ہے وارے نیارے ہو جائینگے فیکٹریوں زمینوں کا اکیلا وارث‘ مہینے بھر کا کل ہی کما لے گیو۔“

”اچھا!“ اس کی آنکھیں خوشی سے چمکنے لگیں۔ ”اب میں جاؤں؟“

”بھائی! مجھے بھی ذرا رکشہ کرادے میری ماں میرے حصے کا بھی روچکی ہوگی۔“

اس نے ادھر ادھر ڈولتے ہوئے بے نیازی سے ماں کا دکھ بیان کیا۔

”ماں کو نہیں رلاتے عارف بھائی!“ وہ اسے تمام کر باہر کی سمت بڑھا۔

”یہ ماں بھی عجیب ہوتی ہے۔ نوٹ دو تب بھی روتی ہے نہ دو تب بھی روتی ہے۔“ وہ مسکرایا۔

”جو امرت اس نے تمہیں دودھ میں پلایا‘ پتھو گے تو روئے گی نہیں؟“

وہ اس کی ماں کا دکھ محسوس کر کے اداس ہو گیا۔

”اس امرت دھارے سے نہ جانے ہم نے کتنی زندگیوں کو کھلا دیا ہے۔ پھول کی طرح میرے یار! سود کے ساتھ اصل

لوٹایا ہے۔“ ہا ہا..... ہا..... اس کی ہنسی میں نوحہ تھا۔

اس نے عارف کی سمت دیکھا اس کی آنکھوں کے دونوں گوشوں سے آنسوؤں کی چمک ظاہر تھی۔

”روشی۔“ وہ لاؤنچ کی طرف جا رہی تھی کہ بڑی امی کی آواز آئی۔ وہ وہیں رک گئی۔

”جی بڑی امی۔“ اس نے پلٹ کر ان کی طرف دیکھا۔

”میرے کمرے میں آؤ۔“ وہ بائیں طرف بنی طویل راہداری کی سمت بڑھ گئیں۔

وہ دل ہی دل میں اللہ کی پناہ مانگتی ان کے پیچھے پیچھے چل پڑی۔

وہ ایک دروازے پر جا کر ٹھہر گئیں اور مڑ کر دیکھا کہ وہ ان کے پیچھے آرہی ہے یا نہیں اور دروازہ کھول کر کمرے میں

داخل ہو گئیں اور ان کے پیچھے روشنی بھی چند لمحوں کے توقف کے بعد کمرے میں داخل ہو گئی۔

بڑی امی ایک طرف پڑی کرسی پر بیٹھ گئیں۔

”ادھر بیٹھو! انہوں نے قریب پڑی دوسری کرسی کی سمت اشارا کیا۔ وہ بے چوں و چرا کئے دم سادھ کر بیٹھ گئی۔

”تم پچھلے حصے کی طرف کیا کرنے گئی تھیں؟“ ان کے لہجے میں برہمی تھی۔

”ایسے ہی۔“ اس کے منہ سے نکل گیا۔

”یہ ایسے ہی کیا ہوتا ہے؟“ وہ ڈپٹ کر پوچھنے لگیں۔

”جھومر بھابی کے پاس گئی تھی بڑی امی۔“ اس نے ڈرتے ڈرتے ان کی سمت دیکھا۔

”تمہیں اتنی دلچسپی کیوں ہے؟ گھر کے بچوں میں سب سے زیادہ شکایت تمہاری سننے کو ملتی ہے جس طرح اور لڑکیاں

ہیں، تم اس طرح کیوں نہیں رہتیں، کیا تکلیف ہے تمہیں؟“ ان کے لہجے میں بلا کا جلال تھا۔

”کوئی تکلیف نہیں، میں تو جھومر.....“

”کوئی تعلق نہیں ہے کسی کا جھومر سے، جب تمہیں پتا ہے بڑے خان نے سختی سے منع کیا ہوا ہے کہ کوئی غلطی سے بھی پیچھے

نہیں جائے گا تو تمہاری سمجھ میں یہ بات کیوں نہیں آتی؟“ انہوں نے شعلہ بارنگا ہوں سے اسے گھورا۔

”یہی سمجھنے تو گئی تھی۔“ اس نے بڑی جرات سے کہہ دیا۔

”خبردار! کوئی ضرورت نہیں، تمہاری دلچسپی کی کوئی چیز ادھر نہیں ہے، اگر تم نے آئندہ یہ حرکت کی تو اچھا نہیں ہوگا۔“

”بڑی امی! ظفری بھائی کی جھومر سے شادی ہوئی ہے، اب وہ ہمارے گھرانے میں شامل ہے۔“ اس نے جھجکتے ہوئے

بالآخر کہہ دیا۔

”تمہارا کیا خیال ہے، ہمیں یہ بات معلوم نہیں۔ جو حدیں لگا دی گئی ہیں، ان کے اندر رہو ورنہ.....“

”ورنہ.....“ وہ سوالیہ انداز میں ان کی سمت دیکھنے لگی۔

”ہم تمہیں سرائے بھوادیں گے، پھر کبھی تم یہاں قدم نہیں رکھو گی۔ سن لیا؟“ اب تم جاؤ اور آئندہ خیال رکھنا۔ بڑے خان

کو پتا چل گیا تو میں تمہارے لئے کچھ نہ کر سکوں گی۔“ وہ اٹھ کر وارڈروب کھولنے لگیں۔

اس نے طمانیت بھرا گہرا سانس لیا اور اٹھ کر باہر آ گئی۔

”اس کا مطلب ہے یہ والی شکایت بڑی امی ابھی بابا صاحب سے نہیں کریں گی۔“

وہ اب دوبارہ لاؤنچ کی طرف بڑھی۔ اسی دم پورچ میں جیب کی ہیڈ لائٹس جھمکائیں۔ اس نے کلائی میں بندھی گھڑی

کی سمت دیکھا۔ بارہ بج کر دس منٹ ہوئے تھے۔ وہ رک کر سامنے دیکھنے لگی۔ اس نے دیکھا اس کے پیپا اور علی خان جیب

سے اتر رہے تھے۔

☆.....☆.....☆.....☆

وہ ٹھنک کر دیکھنے لگی۔ بے بی پنک کاٹن کے جدید فیشن کے لباس میں۔ دوسری جانب سے بڑی ٹیوٹ سی لڑکی اتری تھی۔ وہ مارے اشتیاق کے فوراً پیش قدمی کرنا چاہتی تھی۔ مگر باپ کی سمت دیکھ کر وہیں رکی رہی۔

معاذ علی خان کی نظر بیٹی کی سمت اٹھی۔ ان کے سر دچرے کے تاثرات قدرے بدل گئے۔

”آؤ بیٹا۔ وہاں کیوں کھڑی ہو؟“ انہوں نے اسے مخاطب کیا۔

”ماہین..... یہ روشانی ہے۔“

”اور..... یہ آپ کی خالہ جان ہیں۔“ انہوں نے روایتی انداز میں تعارف کرایا۔

”اوہ..... نو۔“ اسے حیرت کا شدید جھٹکا لگا تھا۔

ایسی لگی بندھی زندگی میں اتنی حسین تبدیلی کا تو خواب بھی نہ آتا تھا۔ اس نے غور سے ماہین کی شکل دیکھی۔ واقعی وہ اس کی خالہ ہر لحاظ سے ثابت ہو رہی تھی۔

نگاہ میں والہانہ اپنائیت۔

لبوں پر بے تکلف مشفقانہ سی مسکراہٹ۔

سب سے بڑھ کر بالکل نازنین جیسی۔ بس فرق تو اتنا کہ ماہین کے بال شانوں تک جدید انداز میں ترشے ہوئے تھے جبکہ اس کی امی کے بال مثالی لحاظ سے دراز اور گھنے تھے۔ اس نے اپنے ہوش میں ماں کو نہیں پایا تھا۔ مگر ان کی بے شمار تصویریں اس کے پاس محفوظ تھیں۔

”السلام علیکم۔“

”وعلیکم السلام۔ صرف سلام کرو گی۔ گلے نہیں ملو گی۔“ ماہین نے آگے بڑھ کر اسے گلے سے لگایا۔ اس کے رخسار پر پیار کیا۔

”پاپا۔ آپ کہاں سے لے آئے میری خالہ کو؟“ وہ بہت خوش نظر آرہی تھی۔

”آئیے۔ پپا میں لاؤنج میں لے جا رہی ہوں خالہ جانی کو۔ وہاں سب موجود ہیں۔ اف سب کتنا حیران ہوں گی۔“

مارے خوشی کے روشی کے قدم زمین پر نہیں ٹک رہے تھے۔

”یہ..... ابھی وہاں نہیں جا سکتی۔ بابا صاحب انتظار کر رہے ہیں۔ پہلے ان سے ملاقات ہوگی۔“

آئیے ماہین! وہ روشی کی سمت دیکھے بغیر ماہین سے گویا ہوئے اور بابا صاحب کی خوابگاہ کی سمت قدم بڑھا دیئے۔

ماہین نے روشی کا ہاتھ تھام لیا۔ تم بھی آ جاؤ روشی۔“

”روشی کو رہنے دیں۔ اس وقت بابا صاحب سے صرف آپ ملیں گی۔ پلیز۔“

یاد علی خان نے رک کر ماہین کو ٹوک دیا۔

ماہین نے قدرے ہچکچاتے ہوئے روشی کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ وہ لب بستہ سی کھڑی رہ گئی۔

اسے باپ سے ڈھیروں شکایتیں تھیں۔ ایک اور کا اضافہ ہو گیا تھا۔

وہ بسورتے چہرے کے ساتھ مسلسل اس راستے کو گھور رہی تھی جہاں سے ماہین اور یاد علی خان گزر کر ایک موڑ پر غائب ہو چکے تھے۔

”کیا بچے اسٹاپ (STOP) کہہ کر غائب ہو گئے؟“ غالباً نہیں واقعی یہ باری کی آواز تھی۔

اس نے اسی کیفیت میں گردن موڑ کر باری کی سمت دیکھا۔

”خالہ آئی ہیں۔“ اس نے باری کو مطلع کیا جیسے خود کو یقین دلارہی ہو۔

”جج کر کے؟“ جج کا سیزن تو اگلے ماہ ہے۔“

”جاؤ تم یہاں سے تمہارا تو کوئی فائدہ ہی نہیں۔“ ماہین کے اس طرح ہٹ جانے کے بعد وہ خود کو بہت بے زار و مضحک محسوس کر رہی تھی۔

”تم بہت بنتے ہو۔ تم کمراسٹ کر رہے تھے تمہیں سب پتا تھا۔“ معاوہ باری پر برس پڑی۔

”جانے کیا سمجھ بیٹھی ہیں آپ مجھے۔ میں صرف حکم کی تعمیل کرتا ہوں۔ اور مجھے تفصیلات بتائی جائیں تو کیوں؟ فرق کیا پڑتا ہے اس سے؟“ وہ شانے اچکا کر آگے بڑھا۔

”باری! اس نے بے ساختہ پکارا۔

”جی۔ ارشاد! وہ واپس پلٹا۔

”کچھ نہیں جاؤ۔“ وہ بہت الجھ رہی تھی۔

”جی بہتر۔ پہلے اپنی مرضی سے جا رہا تھا اب آپ کے حکم سے۔“ وہ مسکرایا۔

”ہج۔ یہ تم اتنا خوش کیوں رہتے ہو؟“ وہ اسے مسکراتے دیکھ کر جھلائی۔

”بددعا پروف ہوں۔ ورنہ لوگوں کا تو حلق بیٹھ جاتا ہے کوس کوس کر۔“ وہ ہنستا ہوا آگے بڑھ گیا۔

اسے کھڑے کھڑے دس منٹ سے زائد ہو چکے تھے۔ معاً اس نے یاور علی خان کو بابا صاحب کے کمرے سے باہر آتے

دیکھا۔ ”خالہ جانی کو کیوں روکا ہوا ہے بابا صاحب نے؟“ اسے غصہ آ گیا۔

”تم ابھی تک یہیں کھڑی ہو؟“ یاور علی اس کے قریب آ کر گویا ہوئے۔

”جی۔ میں خالہ جانی کا انتظار کر رہی ہوں۔“

”اب تم ان سے صبح ملو گی؟“ انہوں نے بے تاثر اور دھیمی آواز میں اسے بتایا۔

”کیوں؟“

”یہ تمہارے پاس بہت سے کیوں کہاں سے آ گئے؟“

”میں ان سے ابھی کیوں نہیں مل سکتی؟“

”ابھی وہ کھانا کھائیں گی بابا صاحب اور جواد کے ساتھ۔“

”تو میں بھی ویسے ہی بیٹھ جاؤں گی؟“ اس نے ضد کی۔

”نہیں۔ نہ ایسے نہ ویسے۔ جاؤ اپنے کمرے میں۔“ وہ سختی سے بولے۔

”پاپا۔ جواد بھائی بھی تو ہوں گے۔“

”بابا صاحب کا حکم نہیں ہے۔“ انہوں نے قدرے نرمی سے سمجھایا۔

”اللہ کرے میں اپنی ماں کے پاس چلی جاؤں یہاں تو کوئی بھی مجھ سے محبت نہیں کرتا۔“ اسکی آنکھوں میں آنسو جھللا

گئے۔

یاور علی خان کے دل کو کچھ ہوا۔ مگر وہ خود پر قابو پا کر اس سمت بڑھے جہاں جواد کی موجودگی کی امکان تھا۔

وہ کافی دیر سے اونٹیکو آسامی کا انتظار کر رہا تھا۔ کافی دیر تو وہ ٹھنڈے ہوا دار برآمدے میں بیٹھا رہا۔ ”لال مفلز“ نے اسے

انتظار کرنے کو کہا تھا۔ معاً برآمدے سے باہر ہری ہری گھاس پر اسے عارف لینا نظر آ گیا۔ وہ انتظار کی کوفت سے بچنے کیلئے

اس کے پاس چلا آیا۔ عارف نے اسے دیکھتے ہی آنکھ ماری۔

”بڑا تیز دھڑک رہا ہے تیرا دل۔“ اس نے اپنے ہاتھ سے تصوراتی ریسور کا کام کیا اور کان سے اس طرح لگایا جیسے

حقیقت میں فون سن رہا ہو۔

”بھائی تمہیں دیکھ کر سوچتا ہوں کہ تم بڑے خوش نصیب ہو۔ ہر طرح کی فکر سے آزاد۔“

”او بندہ خدا! ڈیوٹی سے بھی کبھی فراغت ہوتی ہے کہ نہیں؟ ظاہر دیکھ کر دھوکہ کھانے والے عقل کے اندھے ہوتے

ہیں۔“

”کیا بنا۔ آسامی سے ملاقات نہیں ہوئی؟“ اس نے مزید فلسفہ موخر کر دیا۔

”کہہ رہا ہے۔ ابھی پتا لگے گا کہ آپریشن کب ہے۔ ابھی تو بے چارے کو ”مشینوں“ میں پھنسا رکھا ہے۔“

اس نے اپنی فکر معاش سے سکڑی آنکھیں مزید سکڑ کر آنے جانے والوں پر مرکوز کر دیں۔ صبح کا وقت تھا۔ اوپی ڈی کی

وجہ سے خلقت خدا کا ایک ہجوم بے کراں تھا جو مزید پھیلتا جا رہا تھا۔

”تم ہمیشہ سے یہیں رہتے ہو بھائی۔“

”نہیں۔ پیدائش کے بعد اماں گھر لے گئی ہوگی۔ پھر بعد میں آ گیا تھا۔“ وہ حلق پھاڑ کر ہنسا۔

یہ اس کی بڑی بری عادت تھی اپنے مذاق پر سب سے پہلے خود ہی تہقہہ لگاتا تھا۔ اس نے قدرے برا مان کر عارف کی

طرف دیکھا۔

”میرا مطلب یہ تھا کہ اسی شہر میں رہتے ہو شروع سے؟ اس کے پریشان ذہن کو مذاق سے اور الجھن ہوتی تھی۔ جب

ہی تو کسی دانش مند نے کہا ہے کہ ”بے موقع مزاح دشمنی پیدا کرتا ہے۔“

”بھائی صاحب۔ بڑے شہروں کی خاک چھان رکھی ہے۔ تفصیل سنو گے تو دونوں تھک جائیں گے۔ میں بھی۔ تم بھی۔“

”گنا سنو گے؟ بڑی اچھی آواز ہے میری۔“ وہ جیسے اسے چھیڑ رہا تھا۔

”میں نے کبھی گنا نہیں سنا۔ خود بخود کان میں پڑ جائے وہ دوسری بات ہے۔“ اس کا ذہن برآمدے میں بھٹک رہا تھا۔

جہاں سے ”لال مفلز“ نے طلوع ہونا تھا۔

”میں گارہا ہوں۔ تمہارے کان میں خود بخود پڑ جائے گا۔ لوٹے سے ڈالنا نہیں پڑے گا۔“ وہ پھر بے ہنگم تہقہہ میں الجھ

گیا۔

وہ چپ رہا۔ وہ بہر حال اس کا محسن تھا۔ وہ ایک حد تک ہی اس پر ناراض ہو سکتا تھا۔

پتھر کے خدا، پتھر کے صنم، پتھر کے ہی انساں پائے ہیں

تم شہر محبت کہتے ہیں، ہم جان بچا کر آئے ہیں

وہ گنگنا نے لگا۔

”رہنے دو یا رہیہ گانا دانا۔“

اس کے اندیشوں نے بھرے ذہن کو اس بے وقت کی راگنی سے چڑ سی پیدا ہوئی۔ جوں جوں وقت سرک رہا تھا۔ اس کی

پریشانی بڑھ رہی تھی۔

”کہیں مریض کے رشتے داروں نے خون نہ دید یا ہو۔ کہیں اور سے انتظام نہ ہو گیا ہو۔ بلند بینک سے ڈائریکٹ نہ لے لیا ہو۔ فاطمید والوں سے نہ مل گیا ہو۔ کہیں یہ نہ ہو گیا ہو۔ کہیں وہ نہ ہو گیا ہو۔ ہم تو مگر ان سب سے سستا ہی دیتے۔ مگر انہیں مہنگے سستے سے کیا وہ تو پیسے والے لوگ ہیں۔“

”کہاں گم ہو گئے۔ پریشانی میں اتنی طاقت ہوتی تو بات ہی کیا تھی؟ ادھر پریشان ہوئے ادھر مسئلہ حل۔ ہوتا تو وہی ہے جو ہونا ہوتا ہے شاعر نے کیا خوب کہا ہے۔“

نیند سے بھی سکون نہیں ہوتا

آنکھ سوتی ہے دل نہیں سوتا

عمر گزری اسی کشاکش میں!

یوں نہ ہوتا عدم تو یوں ہوتا

مگر ازل سے یہی فطرت کی پابندیاں ہیں اور انسان کی بے بسی۔ پھر ایسی بے کار سوچوں میں پڑ کر کیا فائدہ۔ آرام میں رہو یہ سوچ کر کہ جو ہونا ہو گا وہ ہو جائے گا۔ ایک تو ویسے ہی پریشانی۔

پھر پریشانی کی پریشانی۔ ایک خدشہ ایک ڈر ایک وہم۔ جس کا کوئی سر نہ پیر۔

یہ ٹھیک ہے جب قسمت خراب ہو تو دل ڈرتا ہی رہتا ہے کہ نہ جانے اب کیا ہو۔ مگر بھائی جو ہونا ہو گا وہ تو بغیر ڈرے کانپے بھی ہو جائے گا۔

”بھائی عقلمند ہو کے بھی یہاں پڑے ہو؟“ اس نے بالآخر اس کی قابلیت کا اعتراف کیا۔

”پھر کہاں پڑوں؟ جس دن زیادہ عقلمند ہو گیا۔ پاگل خانے پہنچ جاؤں گا۔ جو زیادہ عقلمندی دکھاتا ہے۔ لوگ پکڑ کر وہاں پہنچا دیتے ہیں۔“

”اور تم ان چکروں میں نہ پڑو۔ عقل و دل اٹھا کے رکھو کسی طاق میں۔ نہ چھیڑو ذکر اس کا۔ کیا سمجھے؟“

جس کے پاس جتنا پیسہ ہے۔ یہاں وہ عقلمند ہے۔ جس کے ہاتھ اتفاقاً کرسی لگ جائے۔ وہ عقلمند ہے۔“

”بھائی کیا تمہاری گھر گرہستی نہیں ہے؟“ اسے عارف کی بے فکری سے ایک نیا سوال سوچھا۔

”گھر ہے۔ اور گرہستی؟“ وہ ہنسا۔ جب ہستی نہیں تو گرہستی کیا۔“

”مجھے یاد نہیں پڑتا میں نے تم سے کچھ پوچھا ہو اور تم نے سیدھا جواب دیا ہو۔“ وہ چڑ گیا۔

”پھر کیوں پوچھتے ہو؟“ عارف نے خلا میں گھورتے ہوئے سوال کیا۔

وہ لا جواب ہو کر چپ ہو گیا۔

سورج ذرا - آ پاس آ

آج سپنوں کی روٹی پکائیں گے ہم

عارف نے بے سرے انداز میں نغمہ شروع کیا۔

”ارے بھائی..... چپ ہو جا..... اللہ کے واسطے۔“ اس نے باقاعدہ ہاتھ جوڑ دیئے۔

”عجب رنگ ہیں قدرت کے۔ کوئی خون بنانے کیلئے پریشان۔ کوئی نکالنے کیلئے پریشان، کوئی نچوڑنے کیلئے بے

تاب۔“ عارف ہنسا۔

وہ بدستور برآمدے کی سمت دیکھتا رہا۔

”یار۔ ایک سوال مجھے پریشان کر رہا ہے۔“ عارف کے لہجے میں بلا کی سنجیدگی تھی۔

”کیا؟“ اس نے ایک لچکے کو برآمدے سے نظریں ہٹائیں۔

”یہی کہ سورج اگر مشرق کے بجائے مغرب سے نکلتا تو دھوپ یہاں تک کتنے بجے پہنچتی؟“

اس کا جی چاہا اپنا سر پیٹ لے۔

”وہ اٹھ کھڑا ہوا۔“ میں جارہا ہوں۔ اب نہیں آؤں گا تمہارے پاس۔“

”ارے یہ تو ہمیں پتا تھا۔“ وہ لا پرواہی سے مسکرایا۔ ”کیا کہا ہے شاعر نے کہ

محسن! مگلی ناچوٹ پھر خلوص میں

میں نے کہا نہ تھا کہ میرے یار سوچنا

وہ عارف کی سمت بے بسی سے دیکھتے ہوئے پھر بیٹھ گیا۔

”تم اتنی بے سری باتیں کیوں کرتے ہو؟“ وہ لا چاری سے پوچھ رہا تھا۔

”سارے سر جو ٹوٹ گئے ہیں۔“ عارف کے ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ کھیلنے لگی۔

”مجھے تم پر بڑا ترس آتا ہے۔“ اس نے ترحم بھری نظروں سے عارف کی سمت دیکھا۔

”اچھا۔“ عارف یوں ہنسا جیسے اس نے کوئی دلچسپ لطیفہ سنایا ہو۔

”تمہارے پاس تو بڑا دماغ ہے تم تو کہیں افسر لگ سکتے تھے۔“ اس نے تجزیہ کیا۔

”ابھی بھی افسری ہوں تم جیسوں کا۔“ وہ مسکرایا۔

تو وہ بے بس ہو کر خاموش ہو گیا۔ اور ابھی ہوئی نظروں سے عارف کو دیکھنے لگا۔

”کیا تمہارے گھر میں صرف ایک اماں ہی ہے؟“ پانچ منٹ کی خاموشی بالآخر اس نے توڑ دی۔

”ابا کی آمدنی زیادہ نہیں تھی۔ اس لئے اماں ایک ہی ہے۔“ وہ آسمان کی سمت دیکھ رہا تھا۔

اب اس نے پکا تبیہ کر لیا تھا کہ ایک لفظ منہ سے نہیں نکالے گا۔

وہ جیسے ہی بیدار ہوئی۔ ملی آنکھوں والی خادمہ کو منتظر پایا۔

”بیٹے خان نے کہا ہے آپ ناشتان کے کمرے میں کریں گی۔“ وہ مودبانہ انداز میں گویا ہوئی۔

”بڑے خان؟“ وہ ابھی۔

”بابا صاحب۔ بی بی جی۔“

”اوہ! کونٹ اس کی نس میں اتر گئی۔ رات کا منظر نگاہوں میں گھوم گیا۔ وہ جواد سے ڈھیر ساری باتیں کرنا چاہ رہی تھی مگر بابا صاحب نے موقع ہی نہیں دیا۔ ایسی کف گئی فضا میں ایک گھنٹا سے ایک صدی کے برابر لگا تھا۔ یاور علی خان اور جواد تو اس طرح بیٹھے تھے گویا موجود ہی نہ ہوں۔ کھانے کے دوران زیادہ باتیں تو نہیں کی تھیں۔ بس سفر کا اور پاپا کا حال احوال دریافت کیا تھا۔“

”اچھا۔“ وہ کچھ سوچتے ہوئے وارڈروب کی سمت بڑھی۔ بابا صاحب سے کہنا بی بی کہہ رہی ہیں کہ روشی اور جواد کو پالیں۔ میں ان سے باتیں کرنا چاہ رہی ہوں۔“

خادمہ خاموشی سے باہر نکل گئی۔ اس نے بلیک کٹر کا سوٹ نکالا۔ اسے بالکل بھی حیرت نہیں ہوئی تھی۔ یہ دیکھ کر کہ اس کے کئی استری شدہ سوٹ وارڈروب میں لٹک رہے تھے۔ رات اس نے یہ کپڑے سوٹ کیس سے نکال کر صوفے پر ڈال دیئے تھے۔

یہ سوٹ جدید فیشن کا تھا۔ جس پر سرخ وزروریشم سے کڑھائی کی گئی تھی۔

اس نے غسل کر کے بال سکھانے کا تردد نہیں کیا۔ ویسے ہی سلجھا کر کھلے چھوڑ دیئے۔ نہ ہی کسی قسم کے میک اپ کا اہتمام کیا۔

جدید فیشن کو قدرے مشرقیت کا رنگ دینے کیلئے اس نے کڑھائی سے بوجھل سیاہ دوپٹا سر پر ڈال لیا۔ بیس پچیس من بعد خادمہ اسے لینے آگئی۔

وہ اس کے پیچھے پیچھے بابا صاحب کی خواب گاہ میں داخل ہوئی۔

بھاری بھر کم صوفے پر سامنے ہی بابا صاحب بیٹھے تھے۔ ان کے سامنے بڑی سی میز اور لدی پھندی ٹرائی تھی۔ دائیں جانب صوفے کے سنگل پیس پر یاور علی خان تازہ اخبار لئے بیٹھے تھے۔ معاً اس کا دل دھک سے رہ گیا۔

اخبار ایک سمت سے نیچا کئے یاور علی خان اسے بڑی چھٹی ہوئی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ اس نے مارے گھبراہٹ کے دوپٹا مزید آگے سرکایا۔ اور بمشکل سلام کیا۔

نظر کا ایسا طلسم تھا کہ اس کی خود اعتمادی کا آئینہ دھندلا کر رہ گیا تھا۔

وہ میز کے قریب پڑی ایک خوبصورت کرسی پر بیٹھ گئی۔

”روشی اور جواد نہیں آئے؟“ اس نے بڑی ہمت کر کے بابا صاحب اور یاور علی خان کو باری باری دیکھا۔

یاور علی خان نے اخبار کو پھیل کر صفحہ تبدیل کیا جیسے انہیں اس کی آواز نہ پہنچی ہو۔

”روشی کالج گئی ہوئی ہے اور جواد ضروری کام سے زمینوں پر گیا ہے۔“

بابا صاحب نے جواب دینے کے ساتھ خادمہ کو ناشتا پیش کرنے کا اشارہ بھی کیا۔ وہ تو منتظر تھی۔ روبوٹ کی طرح شردا

ہو گئی۔

”سب تک آتی ہے کالج سے؟“ اس نے خادمہ کے ہاتھ سے ایک پلیٹ لئے کر بابا صاحب کے سامنے رکھی۔

تین بجے تک۔ یہاں سے ایک گھنٹے سے زیادہ کا فاصلہ ہے اس کے کالج کا۔“

وہ اس کی سمت دیکھے بغیر کہہ رہے تھے۔

”اور یوں بھی بہت سویرے ناشتا کرتے ہیں۔ سب دوپہر کا کھانا ایک بجے اور رات کا کھانا آٹھ بجے تک ہو جاتا ہے۔“

”آپ نے کیوں زحمت کی میری وجہ ہے۔“ وہ شرمندہ ہوئی۔

”ایسی کوئی بات نہیں۔ تم ہماری مہمان ہو۔ ہمیں احساس ہے کہ راستہ بہت تھکا دینے والا ہے۔ آج تم اپنی تھکن اتارو۔ کل سے یہاں کے معمول کے مطابق سب میں شامل ہو جاؤ گی ان کے لہجہ و آواز میں بہت دھیمے پن کا تاثر تھا۔

جس سے وہ ان کے بارے میں کوئی اندازہ نہ لگا پارہی تھی۔

”ماما بی! مجھے صرف ایک کپ کافی دینا۔“

”کیا ناشتا کر لیا تھا؟“ بابا صاحب نے یاور علی خان سے دریافت کیا۔

”جی! انہوں نے اخبار سے نظریں ایک لمبے کو ہٹا کر باپ کی سمت دیکھا۔

”مہمان کا انتظار نہیں کیا؟“ انہوں نے حیرت سے یاور علی خان کی سمت دیکھا۔

”یہ زمانہ مہمان ہیں۔ اس لئے دھیان نہیں رہا کیونکہ ہمارے ہاں تو خواتین کی اپنی الگ ٹائمنگ ہے۔“ انہوں نے وضاحت کی۔

”یہ زمانہ مہمان ضرور ہیں مگر خصوصیت کے ساتھ تمہاری مہمان ہیں۔“ مابین دلاور علی خان کے تاثرات سمجھتے سے قاصر رہی۔

”حالانکہ آپ کو یہ بتانے کی ضرورت تو نہیں کہ میں خصوصیت سے آپ کی مہمان ہوں۔“

اس نے چہرہ موڑ کر یاور علی خان کی طرف دیکھا۔ جو ماما بی سے کافی کی پیالی لے رہے تھے۔ سفید شلوار سوٹ اور اخبار کے مطالعے کی وجہ سے سنہری فریم کی عینک لگائے ہوئے وہ رات سے خاصے مختلف دکھائی دے رہے تھے۔ اب اخبار ان کی گود میں اور پیالی ہاتھ میں تھی۔ انہوں نے مابین کو بہت توجہ سے اپنی سمت دیکھتا پا کر خود ہی نگاہ اٹھانے کی کوشش نہیں کی تھی۔

”اگر تم پیچھے سے انہیں پہچاننے اور یاد کرنے کی کوشش میں ہو تو کوئی فائدہ نہیں اس لئے کہ جب ہم بارات لیکر تمہارے ہاں۔“

”آپ نے بلایا تھا بابا صاحب۔“ اسی دم باری خواب گاہ میں داخل ہوا۔

مابین جواد اور علی خان کی گرفت میں لینے والی نگاہوں میں خود کو پا کر حواس باختہ سی ہو گئی تھی ایک دم حالت سکون میں آگئی۔ اس نے نووار دفرشتے کو دیکھا۔

”یہ روشی کی خالہ ہیں باری۔“

”اور یہ بھی ہمارا بچہ ہے۔“ انہوں نے تعارف کرایا۔

”یہ بھی۔ ماہین کی سمجھ میں خاک نہ آیا کہ ”یہ بھی“ سے ان کی کیا مراد ہے؟“

”بیٹھ جاؤ باری۔ ناشتا کر چکے؟“

”جی بابا صاحب۔“

”دیکھو یہ ہماری خاص مہمان ہیں، وہی ہیں جن کا تذکرہ میں نے تم سے کیا تھا۔“ باری نے نئے سرے سے اس پر ایک تفصیلی نظر ڈالی۔ بے ساختہ غیر شعوری۔

”جی۔“

”ان کا خیال رکھنا۔ کوئی شکایت پیدا نہ ہو۔“

”کیا یہ دلاور علی خان کے اے ڈی سی ہیں۔ اتنی خلقت کی موجودگی کے باوجود یہی کیوں میرا خیال رکھیں گے؟“ وہ ہل

ابھی۔

”ماما! بڑی دلہن کو کہہ دیا تھا؟“

”جی خان!“ وہ مودبانہ انداز میں انڈوں کا حلوہ ان کے سامنے رکھتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

”ماما۔ بی بی کو پیٹھے کا حلوہ دو۔ ہمارے ہاں ناشتے کی خاص چیز۔“

”یا اللہ۔ ناشتے کے نام پر پورے ”ماہضر“ کا سامنا تھا۔ وہ پریشان ہو گئی۔ حلوہ چکھنے کے ارادے سے لیا۔ مگر واقعی بہن

مزے دار تھا۔

”یہ تو بہت مزے کا ہے۔ میں اس کی ترکیب سیکھ کر جاؤں گی۔“ اس نے بے ساختہ تعریف کی۔

”ایسی الجھن میں پڑنے کی بھلا کیا ضرورت۔ ہم آپ کے ہاں وقتاً فوقتاً بطور تحفہ بھجوا دیا کریں گے۔ کراچی تو بڑا آنا جانا

رہتا ہے۔ ہمارے بندوں کا بھی اور ہمارا بھی۔“

وہ بڑی تمکنت سے اپنی فیاض طبع کا مظاہرہ کر رہے تھے۔

وہ اس دریا دلی پر مجبور سی ہو گئی۔

”آپ لیجئے ناں! اس نے یاور علی خاں کی سمت پلیٹ بڑھائی۔ وہ بائیں ہاتھ سے عینک اتار رہے تھے۔ اس کی طرف

دیکھ کر مسکرائے۔

”شکریہ اس وقت میں صرف کافی سے لطف اندوز ہوتا چاہتا ہوں۔“

ماہین ان کی سرخ آنکھوں کی تاب نہ لا کر ایک دم ہی باری کی سمت مڑ گئی۔

”آپ لیجئے ناں۔“

”جی بس شکریہ۔“

”لے لو باری۔“ بابا صاحب نے بھی اس سے کہا۔

جب باری نے ایک چھوٹی پلیٹ میں ذرا سا حلوہ نکالا۔ اور بڑی سادگی سے کھانے لگا۔

”آپ صرف زمینداری کرتے ہیں؟“ اب اس نے مصمم ارادہ کر لیا، وہ ان سرخ آنکھوں سے بالکل خائف نہیں ہوگی۔

”آپ بتائیے اور کیا کروں؟“ یاور علی خان برسوں بعد قدرے ہشاش بشاش دکھائی دے رہے تھے۔ یہ بات دلاور علی

خاں اور باری دونوں محسوس کر رہے تھے۔

”میرا مطلب ہے۔“

وہ ان کے غیر متوقع انداز پر گڑبڑا کر رہ گئی۔

”یہ ڈی سی ہوتے ہیں سرحد کے ایک ضلع میں۔“

ماہین ہکا بکا ہو کر ان کی صورت دیکھنے لگی۔ ڈی سی؟ اس قدر کوالیفائیڈ اور اپروچ فل بہنوئی۔

اسے بے حد مسرت ہوئی۔

”پھر آپ ڈیوٹی پر نہیں ہیں آج۔“ وہ اب پہلے سے زیادہ خوش نظر آ رہی تھی۔

”آج کل آرام کر رہے ہیں۔“

”آپ اکیلے ہوتے ہیں وہاں۔“ اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

یاور علی خان خاموش رہے۔

”ہم تو بہت چاہتے تھے کہ یہ دوسری شادی کر لیں۔ مگر.....“ انہوں نے ایک اچھتی نظر بیٹے پر ڈالی۔

”آپ تو بور ہوتے ہوں گے بہت۔“

”سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بڑا دور افتادہ ضلع ہے۔ ملازمین، عرضی گزار، خدمت گزار، سیدھے سادے لوگوں کی نہ ختم

ہونے والی عرضداشتیں۔ وہاں تو خالی وقت ملنا دشوار ہے۔“

”چنانچہ تو آپ کی یہ اضافی قابلیت مجھے نہیں بتائی۔“ وہ حیران تھی۔

”انہوں نے سول سروس کا امتحان شادی کے بعد دیا تھا۔“ اس بار بھی جواب دلاور علی خان نے دیا تھا۔

”آپ اگر اسلام آباد سے آتیں تو راستہ بہت شارٹ کٹ ہو جاتا۔“ باری ابھی تک اس بات پر حیران تھا کہ وہ پشاور

سے کیوں آئی۔

در اصل اسلام آباد والی فلائٹس کی ناممکن مجھے سوٹ نہیں کر رہی تھی۔ دن کی فلائٹس پر رش کی وجہ سے سیٹ نہیں مل رہی

تھی اور مجھے بہت جلدی تھی۔ میں بہت تھوڑے عرصے کیلئے وطن آئی ہوں۔“

”کیا ابھی پڑھ رہی ہو؟“ بابا صاحب نے سوال کیا۔

”جی..... لاہ کر رہی ہوں۔“

”بہت خوب!“ وہ خوش ہوئے۔

”السلام علیکم۔“ معاً ایک پروکارنسوانی آواز دروازے کی سمت سے آئی۔

”علیکم السلام۔ آؤ عالم تاب۔ تمہارا ہی انتظار ہو رہا ہے۔“

باری اپنی جگہ سے اٹھا اور آنے والی خاتون کو مودبانہ انداز میں خوش کیا۔
یاور علی خان نے بھی سلام کیا تھا۔

باری کو دیکھ کر وہ بھی اٹھ کھڑی ہوئی تھی اور انہیں آداب کیا تھا۔

وہ آسمانی ریشمی شلوار سوٹ میں ملبوس تھیں۔ ہم رنگ نفیس شبنم کا دو پٹا انہوں نے سر پر اچھی طرح جما کر پورے وجود پر پھیلا رکھا تھا۔ دونوں ہاتھوں میں ڈھیروں سونے کی چوڑیاں اور کڑے تھے۔ رنگت بالکل گلابی تھی۔ ان کے خوبصورت پاؤں میں سیاہ گرگایاں اس قدر نمایاں ہو رہی تھیں کہ چند لمحوں کیلئے تو اس کی نظریں ان کے پاؤں پر جم کر رہ گئیں۔ تن و توش روایتی چودھرائیوں سے خاصا کم تھا۔ قد البتہ دراز تھا۔

”یہ ہماری سگی بہتیجی اور اس گھر کی سب سے بڑی بہویں۔ یہاں سب بچے انہیں بڑی امی کہتے ہیں۔“

”عالم تاب! یہ ماہین ہیں۔۔۔۔۔ نازنین کی سب سے چھوٹی بہن۔“ بابا صاحب نے تعارف مکمل کیا۔

”کوئی نہ بھی بتائے تو بھی میں پہچان لیتی۔“ انہوں نے آگے بڑھ کر اسے گلے سے لگالیا۔

عالم تاب کے کانوں میں پڑی موہیے کے پھولوں کی بالیاں۔ اس کے مسام جاں کو معطر کر گئیں۔ ”سب سے زیادہ تمہاری تھکن کا خیال تھا۔“

”سفر تو آرام سے گزرا؟“

”جی۔“ اسے جانے کیا یاد آیا کہ اس نے ایک نظریا ور علی خان کو دیکھا تھا۔

”ناشتا کرو۔ ٹھیک سے۔ یہ تمہارا اپنا ہی گھر ہے۔“ انہوں نے اس کے شانے پر محبت سے ہاتھ رکھ کر گویا اصرار کیا۔

”جی۔ بس کر لیا ہے۔“

”بی بی۔ آپ چائے میں دودھ کم لیتی ہیں؟“ ماما بیلی اس کی چائے تیار کر رہی تھی۔

”اوہ۔“ اس نے جذبہ تشکر کے ساتھ ماما بیلی کو دیکھا۔

”شکر ہے بڑی کو ایفائیڈ ملازمہ ہے۔ چائے کے نام پر نرادرودھ تھا دیتی تو مروتا پیر پینا پڑتا۔ اسے معلوم ہوا تھا کہ دیہاتوں میں چائے کو بھی حفظان صحت کے معیار سے ناپتے ہیں۔ چائے کا مطلب یہاں یہ ہوتا ہے کہ دماغ میں خشکی اور شریانوں میں آگ بھردینے والی شے۔ لہذا کثرت شیر سے اس کے ان عیوب کا ازالہ کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ دودھ میں برائے نام چائے کا استعمال کرنے والوں سے آج تک غالباً یہ سوال کسی نے نہیں کیا۔ کہ آخر اس رسمی کارروائی کی ضرورت ہی کیا ہے۔

ماما بیلی نے بہت حسین کپ میں بڑی خوبصورت سی رنگت کی چائے پیش کی تو اس کا جی خوش ہو گیا اب یہ اطمینان تو اسے ہو گیا کہ وہ جب بھی چائے طلب کرے گی تو بڑی اچھی چائے ملے گی۔ اس نے ریلیکس ہو کر پشت سے ٹیک لگالی۔

”یاور! تم کب تک ہو؟“ عالم تاب پوچھ رہی تھیں۔

”میں کل تک ہوں یہاں۔ خیریت؟“

”کچھ نہیں۔۔۔۔۔ ویسے ہی پوچھ رہی تھی۔“ وہ کچھ سوچنے لگیں۔

”خیر آباد کے فارمز میں پھل تیار ہیں۔ ماہین بی بی کو وہاں گھما پھرالانا۔ پھر یہ کس کے ساتھ جائیگی۔“

دلاور علی خان نے بیٹے کی سمت سوالیہ انداز میں دیکھا۔

”یہاں تو عالم تاب اور باری انہیں سیر کر سکتے ہیں۔ کیا خیال ہے تمہارا؟“

”جی۔۔۔۔۔ مگر مجھے پرسوں ڈیوٹی پر ہونا ہے۔ ڈی آئی جی سے بہت ضروری میٹنگ ملے ہے۔“

”گھر میں اور بھی تو لوگ ہوں گے۔ میں نے تو سنا ہے۔“

”آپ نے ٹھیک سنا ہے ماہین بی بی! مگر ہمارا ماحول ذرا مختلف ہے۔ یہاں مردانہ زنانہ الگ الگ ہے۔ بچیاں

پردے میں ہوتی ہیں۔ آزادانہ میل جول یہاں پسند نہیں کیا جاتا۔“ عالم تاب نے رسائیت سے سمجھایا۔

”مگر میں جواد کے ساتھ تو جاسکتی ہوں۔ اس کی تو حقیقی خالہ ہوں۔“ اس نے دلیل دی۔

”بالکل۔۔۔۔۔ کیوں نہیں۔۔۔۔۔ مگر جواد آج کل بہت مصروف ہے امتحان کی تیاری کر رہا ہے اور ایک مقامی تازے کی وجہ

سے کچہری بھی جاتا ہے۔

”جواد کے علاوہ ماشاء اللہ یہاں اور بہت لوگ ہیں۔ میں نے سنا ہے۔“

”آپ نے بالکل ٹھیک سنا ہے ماہین بی بی۔“

بابا کی پیشانی کی لکیریں گہری ہو گئیں۔ انہوں نے قدرے خشک انداز میں اس کی سمت دیکھا تھا۔ ان کے سامنے کبھی

کوئی دوسری بات نہیں ہوتی تھی۔ صرف ایک بات ہوتی تھی اور وہ بھی ان کی اپنی زبان سے نکلی ہوئی۔

”مگر آپ بچی ہیں اور سراسر ہماری ذمہ داری۔ اس لئے یاور اور باری یہ دو افراد ہیں۔ ان میں سے آپ کسی کے ساتھ

ہوں گی تو مجھے بہت اطمینان رہے گا۔“

ماہین کی سمجھ میں ”یاور“ والی بات تو آسکتی تھی مگر باری۔ اس نے چہرہ موڑ کر اپنے بائیں جانب دیکھا۔ سفید کاشن کے

کلف شدہ سوٹ میں ملبوس وہ ایک مہذب نوجوان نظر آیا تھا۔ اچھی اٹھان کا حامل ورزشی جسم، بھرپور مردانگی کا احساس دلاتی

کھنی مونچھیں۔ بالوں کی تراش میں نفاست۔ چہرے کے تاثرات میں بلا کی سادگی۔

”یہ کون ہے؟“ اس کے ذہن میں فطری سوال پیدا ہوا۔ مگر اب وہ بابا صاحب کے بر فیلے تاثرات کے سبب خاموش

رہی۔

”ایسے کرنا یاور۔“

”جی بابا صاحب۔“ یاور علی خان بہت دیر سے خاموش تھے۔ اتنی دیر کی گفتگو میں کسی قسم کے تردیدی و تائیدی تاثرات

انکی جانب سے غلطی سے بھی نہیں آئے تھے۔

”تم ماہین بی بی کو خیر آباد کے فارمز کی سیر کے بعد اپنے ڈاک بنگلے پر لے جانا۔ وہاں کی سیر بھی ہو جائیگی۔ دو دن بعد

جمعہ ہے۔ جمعرات کو آف ہو کر یہاں لے آنا۔ کیا خیال ہے؟“

(مگر وہ تو یہاں آئی ہے) اس نے چونک کر بابا صاحب کی شکل دیکھی تھی۔

”جیسے آپ مناسب سمجھیں۔“ انہوں نے باپ سے اتفاق کرنے میں ذرا دیر نہ لگائی تھی۔

”اف خدایا۔ وہ تو یہاں آئی ہے۔ یہ یہاں وہاں۔ کدھر بھیج رہے ہیں؟ یاور کے ساتھ اکیلی۔ ہرگز نہیں۔ وہ اس کے بہنوئی سہی۔ اس سے عمر میں بڑے سہی۔ مگر ان کے ڈاک بنگلے پر ان کے ساتھ تہا دودن۔ ناں بھی ناں۔“

اس نے چوری سے ان کی سرخ آنکھیں دیکھ کر گویا جھر جھری لی۔

”روٹی کو بھی ساتھ لیں گے۔ پھر میں بالکل بور نہیں ہوں گی۔“ اس نے تجویز پیش کی۔

”مگر روٹی تو کالج.....“ عالم تاب نے جملہ ادھورا چھوڑ کر سر کی شکل دیکھی۔

”ایک دودن کی چھٹی سے کوئی مضائقہ نہیں۔“ یاور علی خان جیسے اس کی سوچ پڑھ رہے تھے۔ انہوں نے پہلی بار فیصلہ کن انداز میں حصہ لیا۔

”ٹھیک ہے۔ جیسے تمہاری مرضی۔ مگر بچی کا خیال رکھنا۔“ بابا صاحب کے لہجے میں غیر معمولی پن ماہین نے صاف محسوس کیا۔

”تو کیا روٹی۔ لڑکیوں کے ساتھ کراچی نہیں جا رہی؟“ عالم تاب نے یاور علی خان سے پوچھا۔

(کراچی.....!!!)

کراچی والے یہاں آئے ہیں۔ یہاں والے کراچی جا رہے ہیں۔ لڑکیاں کیا مجھے کمپنی نہیں دیں گی؟ میں یہاں کیا بزرگی کی تربیت لینے آئی ہوں؟

”باقی گھر والوں سے نہیں ملوائیں گے آپ؟“ وہ یاور علی خان کی سمت متوجہ ہوئی۔ اس کے چہرے پر پھیلی الجھن پوشیدہ نہ تھی۔

”اچھا تم لوگ باتیں کرو۔ مجھے ضروری کام سے شہر جانا ہے۔ رات کھانے پر انشاء اللہ ملاقات ہوگی۔“ دلاور علی خان اپنی آنسوئی چھڑی تھام کر اٹھ کھڑے ہوئے۔

”اگر اس علاقے کی سیر کرنا چاہو تو یاور بھی موجود ہیں اور باری بھی۔“

(انہیں سیر کی پڑی ہوئی ہے۔ اس گھر کے درجنوں لوگوں کا ذکر سنا ہے۔ جن کی نقاب کشائی ہو کر نہیں دے رہی۔ وہ جل کر سوچ رہی تھی)

بابا صاحب اٹھ کھڑے ہوئے یاور علی خان باری اور عالم تاب بھی اٹھ کھڑی ہوئیں تو وہ بھی ہڑبڑا کر کھڑی ہو گئی۔ اس بڑھاپے میں بھی دلاور علی خان کی چال میں بلا کا دباؤ اور مضبوطی تھی۔

یاور علی خان اور باری دوبارہ بیٹھ گئے۔ عالم تاب البتہ سر کے پیچھے ہی چل پڑی تھیں۔

”دیکھو..... بالکل نہ گھبرانا..... یہ تمہارا اپنا گھر ہے۔“ وہ جاتے جاتے مڑ کر بڑی شفقت سے مسکرائیں۔

”ظاہر ہے یہاں میری سگی بہن کا وارث موجود ہے، گھر تو ہے ہی میرا۔ وہ کیا کہہ گئے ہیں بزرگ۔“ ماں مری ماسی جیسے“

بائے کیا لفظ ہے۔ ماسی۔ یعنی ماں۔ سی LIKE MOTHER اس نے اپنے ہم عمر بھانجے، بھانجی کیلئے اپنے اندر شفقت کا سمندر ٹھانھیں مارتا محسوس کیا۔

”بسنٹی ایڈ جسٹ ہوئی باری؟“ یاور علی خان نے بغلی جیب سے سگریٹ کا پیکٹ اور لائٹر نکالا۔

”تھوڑی بہت۔ علاقہ ماحول لوگ۔“ آب و ہوا۔ ہر چیز اس کیلئے نئی ہے۔ مائٹم تو لے گی۔ باری نے ان کی طرف تائید طلب نظروں سے دیکھا۔

”یہ تو ہے۔ حسن بہت ہے۔ یقیناً ناز برداری بھی بڑی ہوئی ہوگی۔“ وہ دھواں بکھیرتے ہوئے برائے نام مسکرائے۔

”آف کورس سر! باری ہنس دیا۔“

”اف اللہ! وہ ان کی بے تکلفانہ گفتگو پر حیران ہوئی۔ اتنا پردہ دار ماحول اور بسنٹی کے حسن کے تذکرے۔“

”کیا فائزر ہیں؟“ اس نے ان کی گفتگو سے نتیجہ اخذ کر کے خواہ مخواہ ٹانگ اڑائی۔

یاور علی خان کے لبوں پر پہلی مرتبہ طویل عرصے کیلئے مسکراہٹ پھیلی جس کا دورانیہ کم و بیش ایک منٹ ہوگا۔ البتہ باری کل کر فز پڑا تھا۔

وہ نکوی بن کر باری باری دونوں کو دیکھنے لگی۔

”بسنٹی ہماری نئی گھوڑی ہے۔“ باری نے اطلاع دی تو وہ ہنوتی سی بن کر رہ گئی۔

”آپ سائیکس ہیں۔“ اس نے سادگی سے بڑا احقانہ سوال کیا تھا۔

”آپ سمجھ لیں۔“ اس کے چہرے پر سنجیدگی چھا گئی۔

(لو میں سمجھ لوں؟ اس گھر کا سارا نظام میری سوجھ بوجھ سے تو چل رہا ہے۔ ہونہ)

”گھر کے اندر لوگ کہاں ہے؟“ اس نے بہنوئی کا پچھالیا۔

”سب سے ملوائیں گے۔ آپ فکر کیوں کرتی ہیں۔“ انہوں نے احتیاطاً نگاہ اٹھا کر نہیں دیکھا تھا۔

نگاہ ملے ہی۔ اس کا خائف سا ہو کر ادھر ادھر دیکھنا ان سے پوشیدہ نہ رہ سکا تھا۔

”وہ..... کیا ہے کہ.....“ ماہین باری کی سمت متوجہ ہوئی۔

”جی؟“ وہ ہمد تن گوش ہو گیا۔

”میں آپ کو کیا کہوں؟“

”مجھے باری کہتے ہیں، گھر یلو ملازمین خان کہتے ہیں۔ آپ جو چاہے کہیے۔ ویسے خادم ہیں آپ کے۔“ اس نے چھٹی ہوئی سنجیدگی سے جواب دیتے ہوئے ایک نظر یاور علی خان کی سمت دوڑائی تھی۔

”یہاں بھی کھیت اور باغات ہوں گے آپ کے؟ وہی دکھالائیے۔ روشنی کی واپسی تک وقت تو گزر جائے گا۔“

”کیا میں چاکسکتی ہوں؟“ وہ یاور علی خان سے اجازت لے رہی تھی۔

”اوہ شیور..... کیوں نہیں؟“ انہوں نے آگے کی طرف جھک کر راکھ جھاڑی۔

”چلیے باری!“ وہ دوپٹا درست کرتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

”باری جیپ کون سی لے جاؤ گے؟“

”کون سی لے جاؤں؟“

”اوپن لے جاؤ۔“

”ارے نہیں پلیز اوپن نہیں۔ آج کل تو ہوا بہت گرم ہے۔“ وہ دونوں کے بیچ نخل ہوئی۔

بڑی بے ساختہ مداخلت تھی۔ دونوں کے سوال جواب کا سلسلہ چند لمحات کیلئے موقوف ہو گیا۔ پھر میری والی لے جاؤ۔

چابی میرے بیڈروم میں ہے۔ انہوں نے عینک چڑھا کر اخبار دوبارہ کھول لیا تھا۔

ماما ملی برتن سمیٹ رہی تھی۔ وہ باری کے پیچھے دلاور علی خان کی خوابگاہ سے باہر آگئی۔

”گلو آپا۔“

”ہوں؟“

”یہ حیدر آبادی سوٹ رکھ لوں؟“ حنا نے کرتا اپنے ساتھ لگا کر خود کو آئینے میں دیکھتے ہوئے کہا۔

”سمیہ“ بھابی کا نکاح کا سوٹ بھی رکھ لو۔ کہہ دینا کراچی سے واپس آ کر دیدوں گی۔“ شیو نے استہزاء سے انداز میں مفت

مشورہ دیا۔

حنا کی جان جل کر رہ گئی۔ اس نے پوری قوت سے کرتا بیڈ کی طرف اچھال دیا۔

”توبہ ہے شیو آرام سے بھی کہہ سکتی تھی۔ بچی ہی تو ہے۔“ گلو کو بھی شیو کا انداز ناگوار گزرا۔

”تو اسے اتنی سمجھ نہیں۔ وہاں کون سا ہم تقریبات اٹینڈ کرنے جا رہے ہیں۔“ شیو کو اپنے رویے پر ذرا ملال نہ تھا۔

”دیکھو بیہ! تم لوگ زیادہ سامان نہ باندھ لینا۔ پلین تو جلدی پہنچا دیتا ہے۔ سامان کی وصولی میں اس سے ڈبل ٹائم لگتا

ہے۔ ویسے بھی بونٹنگ کی سٹیشیں ہیں۔ چار پانچ سو مسافر۔ ہر ایک کے دو دو ٹکے لازمی۔ گھنٹہ بھر تک چھکڑے بھر بھر سامان آتا

رہتا ہے۔ شیشے کے پار تکتے تکتے آنکھیں پتھر جاتی ہیں۔ پچھلی مرتبہ جب کراچی گئی تھی تو دو سو سے زیادہ مرتبہ میں نے بورڈ

پڑھا تھا۔ برائے مہربانی باہر نکلنے سے پہلے گمشدگی کا کلیم کریں۔ بعد میں کوئی کلیم قبول نہیں کیا جائیگا۔“

زری نے اپنے سابقہ تجربات کا نچوڑ پیش کیا۔

”ایسے کرو دو تین تین لڑکیوں کا سامان بڑے سوٹ کیس میں کر دو۔ تک کی گنتی میں بھی آسانی رہے گی۔“

”تمہیں نہیں پتا پلین سے اتر کر سامان کا انتظار تھا کمارتا ہے۔“ زری نے مشورے کے ساتھ ساتھ اگلی صورتحال بھی واضح

کی۔

”اسلام آباد سے جائیگے ناں۔“ لالی نے پوچھا۔

”ظاہر ہے۔“ مونہ نے اپنی قمیض کی ترپائی کے دوران جواب دینے کی فرصت نکالی۔

”پانچ بج رہے ہیں۔ روشی کہاں ہے؟“ تانیہ کو روشی کی غیر موجودگی محسوس ہوئی۔

”سمیہ بھابی کے بیڈروم میں ہوگی۔ وہ میکے چلی جاتی ہیں تو اس کے مزے آ جاتے ہیں۔ اے سی چلا کر ٹھاٹھ سے سوتی

ہے۔“ شیو مخصوص انداز میں ہنسی۔

”کوئی مزے دے نہیں آرہے۔ تین بجے سے بیٹھی اپنی خالہ کا انتظار کر رہی ہوں۔“

روشی بگڑتے تیور کے ساتھ ہال میں داخل ہوئی۔

”ارے ہاں۔ بڑی امی بتا رہی تھیں کہ تمہاری خالہ آئی ہوئی ہیں۔ کمال ہے، ہم نے ابھی تک انہیں دیکھا ہی نہیں۔

ویسے یہ اچانک ان میں کیسے دلو لے جا گئے۔ آج تک تو تمہارے خالہ ماموں کا کوئی ذکر نہیں تھا۔“ شیو کو اچنبھا ہوا۔

”کل تک کہیے۔ آج تو ہو رہا ہے۔“ وہ ایک کشن پھینک کر دھپ سے بیٹھ گئی۔

”اتنے دنوں بعد آئیں اور پھر۔ کہاں چلی گئیں؟ مونہ کو حقیقت میں سخت حیرانی تھی۔

”باری کے ساتھ سیر کیلئے گئی ہیں۔ بڑی امی بتا رہی تھیں۔“

”باری کے ساتھ؟ کیا عمر ہے ان کی؟ شیو کی زہریلی ہنسی جیسے انگارے برسا گئی۔

”ماما ملی بتا رہی تھی کہ بیس پچیس سال کے درمیان ہوگی۔“ گلو نے سادگی سے کہا۔

”ارے۔ پھر باری کے ساتھ کیسے چلی گئیں؟ بابا صاحب کو پتا نہیں کیا؟“

زری نے تعجب سے مونہ کی طرف دیکھا۔

”لو۔ وہ بابا صاحب کا چچا ان کی مرضی کی خلاف سانس نہیں لیتا۔ انہی کی مرضی سے گیا ہوگا۔“ شیو نے پھر مداخلت کی۔

کمرے میں لحظہ بھر کو سکوت چھا گیا۔

”ویسے دیکھنے میں کیسی ہیں؟ تم ملی تو ہوگی ان سے۔“ گلو کے اندر تجسس جاگا۔

”امی جیسی ہیں۔“ اس نے معصومیت سے کہا۔

”ہائے۔ پھر کیوں بھیج دیا باری کے ساتھ؟“ ناز آنٹی کے حسن کے چرچے تو آج تک جاری ہیں۔“ شیو نے کن اکھیوں

سے روشی کی طرف دیکھ کر گویا اسے چڑایا۔

روشی لا پرواہ انداز میں بیٹھی رہی۔

”انہیں ریسو کرنے کون کیا تھا؟“ زری نے سوال کیا۔ ایسی غیر متوقع..... باتیں اس عمارت کے مکینوں پر اثر انداز

نہیں ہوتی تھیں۔ وہ ان طور طریقوں کے عادی تھے۔

”ہپا۔“ روشی نے مونہ کی قمیض کا جائزہ لیتے ہوئے مختصر جواب دیا۔

”یہ ٹھیک ہے۔ وہ چند برس پہلے کیوں نہ آ گئیں۔ شاید یاور مامون مان جاتے۔“ شیو ہنسی۔

روشی کا چہرہ ضبط سے سرخ ہو گیا۔

”مکراہ تو وہ باری کے ساتھ سیر کرنے جا چکی ہیں۔“ وہ مزید گویا ہوئی۔

”شیئو۔ یہ زیادتی ہے۔“ زری نے فہمائش کی۔

روشی کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ گلو نے لپک کر اسے گلے سے لگا لیا۔

”بعض اوقات تم حد کر دیتی ہو۔ کیا ضرورت ہے اس طرح کی باتیں کرنے کی؟“

گلو نے ناراضگی سے کہا

”لو..... میں نے کیا کہا ہے۔ یہی تو کہا ہے کہ خالہ باری کے ساتھ سیر کرنے چلی گئیں۔“ شیئو کی بے حسی قابل دید تھی۔

”بریں بات ہے تم اسے خواخوہ رلا دیتی ہو۔“ گلو نے ملامت کی۔

”رونا تو اسے کسی اور بات پر آ رہا ہے۔“ ان کے طنز بدستور تھے۔

روشی جھپٹکے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ قالین پر پڑا دو پٹا اٹھایا اور ہاتھ میں لئے لئے باہر نکل گئی۔

”نان اسٹاپ کا بھی کوئی اسٹاپ ہوتا ہے۔“ وہ اس سے برآمدے میں ہی بھڑ گیا۔

”میرے منہ لگنے کی ضرورت نہیں۔“ وہ غرائی۔

”خالہ کو کہاں لے گئے تھے؟“ وہ برہمی سے پوچھنے لگی۔

”کہیں بھی۔ خیریت؟“ وہ حیران ہوا۔

”اور کوئی نہیں تھا انہیں لے جانے کیلئے۔ مگر تم جو ہر جگہ مفت خدمات کے نوکرے اٹھا کر پہنچ جاتے ہو۔ وہ میری خالہ

ہیں۔ کوئی ضرورت نہیں ہے۔ ان سے بے تکلف ہونے کی۔“

”میں نے کب کہا میری خالہ ہیں؟ یوں بھی خوبصورت لڑکی کو چھوٹے ہی ”خالہ“ بنانے والے کا ذہنی توازن درست

نہیں سمجھا جاتا۔“

”شٹ اپ۔ تمہیں کیا پڑی ہے یہ نوٹ کرنے کی کہ وہ خوبصورت ہیں یا بدصورت؟“ وہ بھڑک گئی۔

”آپ کو اتنا غصہ کس بات پر ہے کہ آپ کی خالہ میرے ساتھ سیر پر کیوں گئیں؟“

”تو اور کیا۔“ وہ اسی انداز میں بگڑ کر بولی۔

”مگر میں انہیں پنا کر تو نہیں لے گیا۔ وہ اپنی خوشی سے میرے ساتھ گئیں۔ بابا صاحب کی اجازت سے۔“ اس کا لہجہ

بظاہر بڑا سادہ مگر عزائم بہت شوخ تھے۔

”ہونہ۔ پنا کر۔ ہے صلاحیت تم میں؟“ وہ طنزیہ بولی۔

”پٹنے کیلئے کوئی تیار ہو تو اس صلاحیت کا مظاہرہ ابھی بھی کر سکتا ہوں۔“ اس کی شریر مسکراہٹ دیکھ کر اس کے تن بدن

میں آگ لگ گئی۔

”بس تم بابا صاحب کو ہی پٹاؤ۔ تمہاری قسمت میں یہی ہے۔“ وہ چڑ کر بولی۔

”یہ کام تو میں بغیر تاکید کے کر رہا ہوں۔ کوئی نیا حکم؟“

اس کی مسکراہٹ بدستور تھی۔ وہ پاؤں پٹختی اس کمرے کی سمت بڑھی جہاں مابین کا قیام تھا۔

مابین کا انگ انگ تھکن سے چور تھا۔ پسینے میں بھیگے ہوئے کپڑے اس کے ذہن پر بوجھ بن رہے تھے۔ چہرہ دھوپ کی تپش سے کھلا کر رہ گیا تھا۔

سیراگرچہ بہت دلچسپ تھی۔ سرسبز کھیت و باغات۔ دیہاتی عورتوں سے گپ شپ مگر بہر حال وہ بہت تھک گئی تھی۔ اس نے وارڈروب سے سفید و گلابی پھولوں کا ہلکا پھلکا سوٹ نکالا اور بڑے تھکے تھکے انداز میں پلٹی تو روشی کو دروازے

پر کھڑا پایا۔

”آؤ روشی۔ وہاں کیوں کھڑی ہو؟ میں تو تمہیں دیکھنے کو ترس گئی۔“ وہ مسکرائی۔

”ایسے ہی کہہ رہی ہیں۔ میرا انتظار بھی نہیں کیا اور سیر کرنے چلی گئیں۔“ روشی نے شکوہ کیا۔

”بھئی، یہاں تو تمہارے بابا صاحب کے پروگرام چلتے ہیں۔“ وہ دھیرے سے ہنس پڑی۔ ”آؤ بیٹھو۔“

روشی فوراً بیڈ پر اس کے قریب بیٹھ گئی۔

”پتا بھی تو تھے۔ وہ نہیں لے گئے آپ کو؟“

”بابا صاحب نے تو آپشن دیا تھا مگر انہوں نے کوئی رد عمل ہی ظاہر نہیں کیا۔ پھر میں نے سوچا باری کے ساتھ ایزی فیل

کروں گی۔ بھائی صاحب کے ساتھ تو بہت تکلف رہتا۔ ویسے باری بہت اچھا ہے۔ ذرا بوریت نہیں ہوئی۔ بہت مزے کی

باتیں کرتا ہے۔ تمہارے بابا صاحب نے ہمارے لئے خیر آباد کے فارمز کی سیر کا پروگرام سیٹ کیا ہے اور تمہیں بھی ساتھ لے

جانے کی اجازت دیدی ہے میں سوچ رہی ہوں باری کو بھی لے چلیں۔

”ہم تینوں؟؟“ روشی کی حیرانی قابل دید تھی۔

”ارے نہیں بھائی صاحب بھی ہوں گے۔“ انہوں نے بالوں میں لگا کلب نکالا۔

”پتا؟“

”ہاں اور کون؟ ان کے ڈاک بنگلے میں رکنے کا پروگرام ہے۔“

”پتا مان گئے؟“ وہ ہنوز حیران تھی۔

”نہ ماننے کی وجہ؟ انہیں تو کوئی اعتراض نہیں۔“

”کمال ہے۔ میں تو جب بھی ان کے ساتھ چلنے کو کہتی تھی تو کہتے تھے۔ کیا کروگی۔ بور ہوگی وغیرہ وغیرہ۔“

اس کی حیرانی میں کوئی کمی واقع نہیں ہو رہی تھی۔

”ہو سکتا ہے ایسا مکان ہو۔ جب ہی تو کہہ رہی ہوں باری کو بھی لے چلیں گے۔ کیوں؟“

”وہ نہیں جاسکتا۔“ اس نے منہ بنا کر کہا۔

”کیوں؟“ مابین نے حیرانی سے پوچھا۔

”بابا صاحب کا اس سے بغیر گزار نہیں۔“

”سب گزارے ہو جاتے ہیں۔ مگر میں اس کے بغیر سیر کا تصور نہیں کر سکتی۔“

روشی کو جیسے جھٹکا سا لگا۔ وہ ایک دم مابین کی صورت دیکھنے لگی۔

”ایسا تو قابل ذکر نہیں وہ۔“ وہ ناگواری سے ناک چڑھا کر بولی۔

”ارے نہیں۔ بڑا بڑا کس بندہ ہے۔ لائق بھی بہت ہے۔“

”یہ تو ہے بڑی جلدی گھوڑے سدھا لیتا ہے۔“ اس نے ہلکا سا تہقہہ لگایا۔

”لگتا ہے بابا صاحب کا خاص ملازم ہے۔ کیوں؟“

”وہ ملازم تو نہیں ہے۔“ روشی نے فوراً کہا۔

”کزن ہے؟“

”نہیں۔“

”پھر کیا ہے؟“ مابین کا تعجب بھرالہجہ فطری تھا۔

”پتا نہیں۔ بس اچھا خاصا احق ہے۔ آپ باتھ لینے جاری رہی ہیں۔“ اس نے فوراً موضوع بدل دیا۔

”ہاں۔“

”پھر چائے پیئیں گی؟“

”نہیں۔ ذرا آرام کروں گی۔ یہاں کسی کو اعتراض تو نہیں ہوگا بے وقت آرام کرنے پر؟“

”کیوں؟ آپ مہمان ہیں۔ ہمیں آپ کے موڈ کا خیال کرنا چاہیے۔“

”آپ کے سوٹ کا پرنٹ بہت پیارا ہے۔ کراچی سے لیا ہے۔“ اس نے پھر پٹری بدلی۔

”نہیں..... یوگنڈا میں ہی بنایا تھا لاسٹ ایر۔ تمہیں اچھا لگا؟ تم ہاکن لو۔ ویسے میں تمہارے لئے کئی سوٹ پیس لائی

ہوں۔ اللہ کرے تمہیں پسند آجائیں۔“

ارے نہیں یہ تو آپ پہننے کوئی چیز اچھی لگنے کا مطلب لینا تو نہیں ہوتا۔“ وہ جھینپ کر بولی۔

”رہی سوٹ پیس پسند آنے کی بات۔ میری خالہ نے بہت محبت سے ہی پسند کئے ہوں گے وہ۔“

”سونائیں۔“ مابین کو اس پر بے ساختہ پیارا آگیا۔ اس نے روشی کے رخسار پر پیار کیا۔

”اچھا آپ آرام کیجئے۔ تھوڑی دیر بعد ملیں گے۔“ وہ اٹھ کر کمرے سے باہر آگئی۔ اور وہاں سے کچن کا رخ کیا۔

”ماما بلی۔ ہماری خالہ کیلئے آج کون سی خاص ڈش بنائیگی؟“ اس نے دو ملازم حضرات کے ساتھ ماما بلی کی از حد

مصروفیت دیکھ کر سوال کیا تھا۔

”آپ یہاں کیسے بی بی؟ چائے پیئیں گی؟“ ماما بلی نے مسکرا کر اس کا چہرہ دیکھا۔

”نہیں چائے تو میں خالہ کے ساتھ پیوں گی۔ آج تصویریں بنانے کا موڈ نہیں تھا تو سوچا کچن میں ہی کچھ کر لیں۔“

”اس کا مطلب ہے کھانا باہر سے منگوانا پڑے گا۔“ باری اندر داخل ہوا۔

وہ منہ بنا کر کونے میں لگی چھوٹی سی ڈائننگ ٹیبل کی چیر پر بیٹھ گئی۔

”ماما۔ کھانا کھلاؤ۔ بی بی تو شہری ہیں۔ پھل کھا کر شکم سیر ہو گئیں۔ مگر بھی ہم تو قضا ہی سہی مگر کھائیں گے ضرور۔“

”ہائے اللہ۔ بی بی نے دوپہر کو کچھ بھی نہیں کھایا۔“ ماما بلی کو تشویش ہوئی۔

”نہیں خیر..... ایک دیہاتی دوشیزہ کی محبت میں سر تا پا ڈوب کر اچار اور مین کی روٹی تناول فرمائی تھی۔“

”تو آپ نے نہیں کھائی؟“ ماما بلی نے پوچھا۔

”بھئی یہ اچار و چار خاصا زانا نہ کھا جا ہے مجھے تو بالکل بھی دلچسپی نہیں۔“

اس نے کن اکھیوں سے روشی کی طرف دیکھ کر بظاہر بڑی بے زاری سے کہا۔ روشی تو اچار کی رسیا تھی۔ اب بھی ذکر سے

منہ میں پانی بھرا آیا تھا۔ مگر باری کی سمت سے منہ موڑے ایک ہی زاویے سے بیٹھی رہی۔ وہ اس کے سامنے ڈٹ گیا۔

”ماما! کوئی گوشت کا اچھا سا آئٹم ہو تو لانا۔“

”کوئی اور قیمہ مٹر بنایا تھا دوپہر کو۔“

”واہ بھئی۔ کھانے سے پہلے ہی مزا آگیا۔ ویسے مابین بی بی سے اخلاقاً تو پوچھ لینا چاہیے۔“ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

”وہ نہیں کھائیں گی۔ صرف چائے پیئیں گی۔ تم اپنے اخلاق آڑے وقتوں کیلئے اٹھا رکھو۔“ وہ قدرے تیکھے انداز میں گویا

ہوئی۔

باری اس کے انداز پر قدرے الجھا پھر بیٹھ گیا۔

”میں نہ ہوں تو دوسری بات۔ مگر میری موجودگی میں اس قدر انغیشتی دکھانے کی کیا ضرورت ہے؟“ اس کے انداز

میں تہجی تھی۔

”پتا نہیں کیا کیا ڈرامے کئے ہیں جو خالہ اس قدر تعریفوں کے پل باندھ رہی ہیں۔“ وہ بڑبڑائی۔

”مت اتنا کڑھا کریں۔ مزید پیچیدہ ہو جائیگی۔“ باری کے لب مسکراہٹ سے منور ہو رہے تھے۔

”مجھے کیا ضرورت ہے کڑھنے کی۔ ہونہ۔ تم اتنے اہم تو نہیں ہو کہ تمہاری وجہ سے کڑھا جائے۔“ اس نے نخوت سے

ناک سکوزی۔

”پھر تو مسئلہ ہی کوئی نہیں۔“ اس کی نظر بھی مسکرا رہی تھی اور ہونٹ بھی۔

”اور سنو۔“ وہ حکمانہ گویا ہوئی۔

”جی حکم۔“

”ہمارا خیر آبا جانے کا پروگرام سیٹ ہو گیا ہے خالہ تم سے چلنے کو نہیں تو انکار کر دینا۔“

”جی بہتر۔ پھر تو آپ کے ذہن سے بوجھ اتر جائیگا ناں؟“ اس نے آواز مزید دھیمی کی۔ ماما کھانا کے برتن اس کے

سامنے رکھ رہی تھی۔

”میرے ذہن پر کوئی بوجھ نہیں ہے۔ بس ہم تمہیں اپنے پروگرام میں دیکھا پسند نہیں کرتے۔“

”یاد رکھیے گا اپنی ہی کبی بات۔“ وہ اب بھی مسکرا رہا تھا۔

”ہم کچھ نہیں بھولتے۔“ وہ بڑے ناز و غرور سے کہتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی۔

”ماما۔“ اس نے نوالہ حلق سے اتارتے ہوئے ماما بلی کو مخاطب کیا۔

”جی خان؟“ وہ بڑی شفقت سے مسکرا کر متوجہ ہوئی۔

”اندرا یک غزل جوش مار رہی ہے کہیں پسلیاں توڑ کر باہر نہ آجائے۔ حلق سے نکال دوں؟“

”جی! ماما بلی ہنسنے لگی۔“

دیکھ تو دل کہ جاں سے اٹھتا ہے

یہ دھواں سا کہاں سے اٹھتا ہے

وہ گنگٹایا۔

”میری ہانڈی سے تو ہر گز نہیں اٹھ سکتا۔ اس لئے کہ ہلکی آنچ پر پک رہی ہے۔“ وہ مسکرائی۔

اس نے کھا جانے والی نظروں سے باری کی سمت دیکھا تھا جو بڑی معصومیت سے دوبارہ کھانے میں مصروف ہو گیا تھا۔

بعض اوقات بہار کی دعا مانگی جائے تو آشیانے کو جگہ نہیں رہتی۔

بارش کی دعا مانگو تو وہ جل تھل ہوتا ہے کہ چھت ٹپکنے لگتی ہے۔

اس کی خوشحالی کا بھی ایسا ہی مزاج تھا۔

وہ ہانپتے وجود کے ساتھ گھر میں داخل ہوا تو درود یوار سے خوشی و طمانیت کی مہک آئی۔

آج اس کا عرصے سے بیمار بچہ محلے کے ہم عمر بچوں کے ساتھ ہڑبونگ میں مگن تھا۔ اس نے ایک نگاہ غلط باپ کی سمت دوڑائی پھر لا پرواہی سے سامنے کھڑے بچے کی ٹانگ میں ٹانگ پھنسا کر گرا دیا۔ بچوں نے سرمستی میں نعرے لگائے اور گھر سر پر اٹھالیا۔

”کم بختو! چپ ہو جاؤ۔ چلو رات ہو رہی ہے۔ اپنے اپنے گھر جاؤ۔ اوسعد چل ایک طرف بیٹھ۔ دیکھ نہیں رہا باپ تھا ہوا آیا ہے۔“

اس کی بیوی کی لٹاڑ پر ایک دم خاموشی چھا گئی۔ بچے اس کے تیر دیکھ کر ایک ایک کر کے کھسکنے لگے۔

”چوتم منہ ہاتھ دھولو۔ آج قیمہ کر بیٹے پکائے ہیں۔“

وہ بنا کچھ بولنے لعل کی طرف بڑھ گیا۔

اس کی بیوی بیٹی کوتا کید کرنے لگی کہ وہ جلدی سے کھانا لے آئے۔

وہ کاندھے پر پڑے رومال سے ہاتھ منہ پونچھتا واپس پٹنگ پر آ بیٹھا تھا۔

”تمہاری صحت کو دن بدن گھٹا جا رہا ہے۔ کسی ڈاکٹر کو تو دکھاؤ۔ مجھے بڑی فکر رہتی ہے۔“ اس نے تشویش بھری نظروں سے اپنے شوہر کو دیکھا تھا۔

”دکھا دیں گے ڈاکٹر کو بھی۔“ وہ کہتے ہوئے جیب میں جھانک کر پیسے نکالنے لگا۔

”لے۔ یہ رکھ لے۔ دو ہزار ہیں۔“ اس نے رقم بیوی کی طرف بڑھائی۔

”دو ہزار! اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔“

”ایڈوانس لیا ہے؟“

”نہیں..... مزدوری ہے۔“

”اتنی مزدوری؟ کیا حکومت نے مزدوری بڑھا دی ہے۔“ وہ خوشی کی بجائے حیرت میں مبتلا تھی۔

”ہم حکومت کے نوکر تھوڑا ہی ہیں۔“ وہ پر مڑدہ انداز میں کہہ رہا تھا۔

”سینہ اتنا مہربان ہو گیا؟“ وہ کچھ الجھن میں تھی۔

”تجھے نہیں چاہیے تو واپس دے دے پر لمبی بات نہ کر میرا سر دکھتا ہے۔“

وہ اکتاہٹ بھرے لہجے میں کہہ رہا تھا۔

”میں تو دیے ہی پوچھ رہی تھی۔ مجھے کیا نظر نہیں آ رہا کہ تم پہلے سے کتنی زیادہ محنت کرتے ہو۔ برسوں کے بیمار لگنے لگے ہو۔ روٹی کھاؤ۔ میں تمہارا سر دبا دوں گی۔ اور دیکھو اپنا خیال رکھا کرو۔ میرے منہ میں خاک۔ تمہیں کچھ ہو گیا تو یہاں کون بیٹھا ہے ہمارا۔“

بالوں نے سلور کی ٹرے میں سلیقے سے کھانا سجا کر باپ کے سامنے رکھ دیا تھا۔

”اگر تم کہو تو مشین اٹھالوں۔ بالو اور میں سلائی کا کام پکڑ لیں گے تو تمہیں اتنی محنت نہیں کرنا پڑے گی۔“

”پہلے قرضہ اتار دے۔ تاکہ دماغ کو کچھ آرام ملے۔ بہت ذلیل کرنے لگے ہیں لوگ۔ اسی طرح ذلیل ہوتے رہے تو بیٹی کیلئے بر کہاں سے لائے گی۔ انسان کی تھوڑی بہت عزت ہو تو ایسے کام آسان ہو جاتے ہیں۔“ اس نے بڑی عقلمندی سے بیوی کو سمجھایا۔

بات عورت کی سمجھ میں آ گئی۔ وہ گہری سانس لیکر اٹھ کھڑی ہوئی۔

”کہہ تو تم ٹھیک رہے ہو۔ بنو کی ماں نے بیٹی پانچ تو لے زیور کے ساتھ بیاہی ہے تب سے وہ ہماری کھوج میں پڑی ہے۔ بیٹی کیلئے کچھ جوڑا کچھ بنایا۔“

”کسی کو ہم سے مطلب۔ کیوں میل جول رکھتی ہو ایسی عورتوں سے۔ یہ عورتیں ہی ہیں جو مردوں کو حرام کمائی کی طرف دھکیلتی ہیں۔“

”میں کب بھاتی ہوں۔ کوئی خود آجائے تو گھر سے نکالا تو نہیں جاتا۔“ وہ نرمی سے بولی۔ اب وہ اس کی ترشی کے جواب میں بڑی دھیمی رہتی تھی۔ مرد کمار ہا ہو تو اور حاوی ہونے لگتا ہے۔

”ابا! اس کے بڑے بیٹے نے اسے مخاطب کیا۔

”کیا ہے بے۔ اب کیا رات کو بھی پیے چاہیں؟“ اب تو اسے بات بات پر جھنجلاہٹ ہونے لگی تھی۔

”باہر ایک آدمی آیا ہے رکشے میں تمہیں بلارہا ہے۔“

”کون آگیا ہے بھائی!“ وہ برتن ایک طرف ہٹا کر پاؤں میں چہل ڈالنے لگا۔

”سوکھا سا ہے۔ بھولے دودھ والے جیسا۔ ابا۔ دودھ والے سوکھے بھی ہوتے ہیں؟“

”چل ہٹ ادھر سے۔ افلاطون کی روح۔ وہ جھلا کر کہتا ہوا دروازے کی طرف بڑھا۔ سامنے رکشہ میں عارف کو دیکھ کر

وہ ٹھنک گیا۔

”خیر تو ہے بھائی؟“

”خیر ہے۔ فٹ رکشے میں بیٹھ جاؤ۔“ اس نے ہاتھ میں پکڑی سگریٹ کی راکھ جھاڑی۔

”ابھی تو آیا ہوں۔ اب کہاں جانا ہے؟“

”انہیں اور خون کی ضرورت پڑگئی ہے۔“

”مگر اب ہمت نہیں ہے بھائی۔“ اس نے معذرت کی۔

”ایسی آسامی روز نہیں پھنستی۔ تیری تو قسمت زوروں پر ہے۔ خون تو بنتا ہی رہتا ہے۔“

”یقین کرو بھائی ذرا ہمت نہیں ہو رہی۔“ اس نے لاچاری سے کہا۔

بالو نے یونہی تجسس میں پردے کی اوٹ سے جھانکا تھا کہ ابا سے کون ملنے آیا ہے؟

سعید نے ایک دم پردہ ہٹا دیا تھا۔ جیسے بہن کو تنگ کر رہا ہو۔

بالو فوراً پلٹ گئی۔

ابا نے دیکھ لیا ہوگا تو بہت بگڑیں گے۔ اس کا کلیجہ دھک سے رہ گیا تھا۔

”بے وقوفی مت کرو۔ بیٹیاں نہیں بیانی تم نے؟“ اس نے گہرا کش لگایا۔

”ایک ہی بیٹی ہے میری۔ اللہ مدد کرے گا۔“ اس نے اب بھی اسی بے زار لہجہ میں جواب دیا۔

”کرتو رہا ہے اللہ مدد۔ ارے بھائی تجھے سمجھ نہیں تو کتنا بڑا نقصان کر رہا ہے اپنا۔ ہمدردی میں آیا ہوں تیری۔ اس لال

مفکر کو کوئی تازہ ہنسی کئی آسامی مل گئی تو تیرا دھندا مندا ہو جائے گا۔ آگے کی فکر کرو۔ مال بناؤ۔ خون بھی بن جائیگا۔“

”ابھی تو میں نے کھانا بھی نہیں کھایا پیٹ بھر کر۔“ اس نے تھکے ہوئے اعصاب کو سنبھالنے کی کوشش کی۔

”عارف یار۔ مجھے چکر آنے لگے ہیں۔ کل بوری اٹھائی تو آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔ سینٹھ کہہ رہا تھا کہ ست ہو

گیا ہوں۔ فارغ کرنے کی دھمکی دے رہا تھا۔ خون روز تو نہیں دیا جاتا پروٹی تو روز چاہیے۔“

”جب ہی تو کہہ رہا ہوں۔ آجاؤ مہینہ میں چار دفعہ خون پیچا کرو۔ باقی دن آرام سے کھایا کرو۔ چلو شاباش آسامی بہت

پریشان ہے۔ اس وقت ہماری مٹھی میں ہے۔ ارے لکشی برس رہی ہے تیرے سر پر۔ چل بیٹھ شاباش۔“

”اچھا میں ذرا گھر والی کو بتا دوں۔“

”ہاں ہاں۔ مگر جلدی اس کی نظریں پردے کے اس پار کچھ دیکھ رہی تھیں

ماما ملی نے اسے رات کا کھانا لگنے کی اطلاع دی اور اپنے ساتھ آنے کو کہا۔

وہ خاصی دیر سے ایک میزین کی ورق گردانی میں مگن تھی۔ فوراً ماما کے ساتھ چل پڑی۔ ماما نے اسے بتایا تھا کہ ڈنر سب

لوگوں کے ساتھ ہوگا۔ بہت تجسس اور اشتیاق کے ساتھ اس نے ہال میں قدم رکھا تھا۔

اوہ۔ جیسے کسی دعوت کا منظر تھا۔ اچھی اچھی صورتوں والی رتھیں آچل لہراتی لڑکیاں۔ بارعب اور قدرے سردو

مغروسی خواتین۔ فرشی دسترخوان تھا۔ سارے ہال پر بڑی امی (عالم تاب) کا کنٹرول دکھائی دیتا تھا۔

اس نے اندر داخل ہو کر سلام کیا۔

جس کے جواب میں سلام کے ساتھ ساتھ کچھ سرگوشیاں بھی ابھری تھیں۔

”آؤ بیٹا! ادھر بیٹھو میرے پاس۔“ بڑی امی نے اپنے پاس جگہ بتائی۔

”روٹی کہاں ہے؟“ انہوں نے نظر دوڑائی۔

”آ رہی ہیں..... میں نے کہہ دیا ہے۔“ ماما نے کہا۔

”یہ میرے بھائی زوار کی بیگم شفیقہ ہیں۔“ انہوں نے دائیں طرف بیٹھی ایک سونے میں لدی پھندی خاتون کی طرف

اشارہ کیا۔

”یہ روشی کی سب سے بڑی پھوپھی ہیں ریسہ۔ یہ ان سے چھوٹی ہیں تزئین اور یہ منجھلی پھوپھی جہاں آراء ہیں۔“ انہوں

نے بائیں طرف بیٹھی خواتین کی طرف اشارہ کیا۔ ”سب سے چھوٹی پھوپھی امریکہ میں ہوتی ہیں اور یہ میری چھوٹی بھانجی امینہ

ہیں۔ اور یہ ان سے بڑی بھانجی سائرہ ہیں۔“

ابھی تعارف آدھا بھی نہیں ہوا تھا کہ مامی چکر کر رہ گئی تھی۔

”ہم سب ساتھ رہتے ہیں۔ میری بھانجیوں بھائی کیونکہ بابا صاحب ہمارے حقیقی چچا بھی ہیں اور ادھر یہ میری دیورانی

ہیں۔ روشی کی چچی۔ بصیر چچا کی بیگم ارجمند۔ گھر کے بڑوں کا تعارف تو میں نے کر دیا ہے۔ اب لڑکیو اپنا اپنا تعارف

کراؤ۔“ وہ مسکرائیں۔

سب اپنی اپنی ماؤں کی طرف اشارہ کر کے حوالے کے ساتھ ساتھ اپنا نام بتانے لگیں۔

تعارف کے مرحلے میں ہی مامی ”سیر“ ہو گئی۔

”ہمارے ہاں لڑکے لڑکیوں کی بے تکلفی پسند نہیں کی جاتی۔ گھر میں آتے جاتے بات چیت کرتے ہیں مگر کچھ حدیں

قائم ہیں۔ بڑے ہونے پر نہ ساتھ کھیلے ہیں نہ ساتھ دسترخوان پر بیٹھتے ہیں۔ نہ بلا ضرورت لڑکیوں کے ساتھ بیٹھتے ہیں۔ یہ

بابا صاحب کے اصول ہیں۔ پیچھے سے ہم افغانی ہیں۔ مگر ہمارے پچھلے مدتوں یوپی میں رہے ہیں۔ میرا ایک بیٹا انیق اور اس

کی بیوی بچے سوئٹز لینڈ میں رہتے ہیں۔ ایک اور ہماری بہو سمیہ ہے۔ اس کا میکہ پشاور میں ہے۔ آج کل گنی ہوئی ہے۔ میری بڑی نند ریکسہ کی بہو ہے۔“

”ہائے خالہ! مجھے آپ پر ترس آرہا ہے۔“ روشی کب سے دروازے میں کھڑی یہ منظر دیکھ رہی تھی۔
ماہین مسکرا دی۔

”لو اس میں ترس آنے کی کیا بات ہے۔ اتنا بڑا کنبہ تو قسمت والوں کا ہوتا ہے۔“ سارہ ممانی یعنی بیہ اور سونی کی والدہ نے خاصی ناگواری سے کہا۔

”بجو تو آپ لوگوں میں گھل مل گئی تھیں۔ پتا بتا رہے تھے۔“ ماہین نے اتنی دیر میں پہلی بات کی۔
”بجو؟ امینہ ممانی نے بڑی امی کی طرف سوالیہ انداز میں دیکھا۔
”نازنین کی بات کر رہی ہے۔“

”اوہ۔ حاضرین میں سے بہت ساری ”اوہ“ کی آوازیں بلند ہوئیں۔

”اچھا بھی چلو۔ کھانا شروع کرو۔“ بڑی امی نے سب کو کھانے کی طرف متوجہ کر دیا۔
وہ سب کی سب بڑے صبر سے بیٹھی ہوئی تھیں۔ مگر اشارا ملتے ہیں جیسے ٹوٹ پڑیں۔
”آپ پڑھتی ہیں؟“ زری سے سوال کیا۔

”جی۔ لاء کر رہی ہوں۔“

”پھر تو ہمارے پاس آجائیے گا۔ دیوانی مقدمات کی ایک تظار کھڑی ہے۔ آپ کو کام پر لگا دیں گے۔“ مونا مسکرائی۔
”ہمارے پاس یہاں ہر چیز ہے۔ ہر شے ہے۔ وکیل بھی گھر کا ہو جائیگا۔ ہمارے ہاں ماشاء اللہ اتنے لڑکے ہیں مگر کوئی بھی وکالت کی طرف نہیں گیا۔ کچھ بزنس کر رہے ہیں۔ کچھ میڈیکل میں ہیں۔ زیادہ کاروبار۔ حجام سول سروسز کی طرف ہے۔“ مونا بولیں۔

”تو کیا ان کے ساتھ ان کے میاں کو بھی رہیں رکھو گی۔“ شینو کی رگ پھڑکی۔

”میاں؟ کیا شادی شدہ ہیں؟“ چند حیرت آمیز آوازیں ابھریں۔

”بھئی کبھی تو ہوں گی۔ یہ مطلب ہے شینو کا۔“ سارہ ممانی نے اپنی عقل سمجھ کے مطابق بات کی۔
محفل میں سناٹا سا چھا گیا۔ چمچے پلیٹوں کی کھٹکناہٹ بہت محسوس ہونے لگی۔

”سنا تھا تمہارے والد بھی آئیے گئے؟“ بڑی امی نے فوراً موضوع بدل دیا۔ اس کی نظر ان پر پڑی تو وہ لڑکیوں کو اجتماعی انداز میں گھور رہی تھیں۔ چہرے کی ساری ملائمت غائب ہو گئی تھی۔ لڑکیوں کو جیسے سانپ سونگھ گیا تھا۔

”جی تین چار روز میں آئیے گئے۔“ وہ ایسے ہو گئی جیسے اس نے کچھ دیکھا ہی نہ ہو۔

”وطن، مستقل کب آنے کا ارادہ ہے؟“ انہوں نے عجب شور ڈال دیا تھا۔

”ابھی تو کوئی ارادہ نہیں۔ برسوں کا جما ہوا بزنس ہے۔“ اس نے پانی کا گلاس اٹھایا۔

”خالہ جانی۔ میں آپ کے ساتھ ہی سوؤں گی آج۔ رات کو باتیں کر بیٹھے۔“ روشی نے کہا۔

”کیوں پریشان کرو گی مہمان کو۔ ویسے بھی بے چاری کی نیند پوری نہیں ہوئی۔“

”ارے نہیں! ایسی کوئی بات نہیں۔ روشی کی موجودگی سے اور دل لگے گا۔“ ماہین نے روشی کی تائید کی۔
”بابا صاحب پسند نہیں کرتے۔“

”لیکن اس میں ہرج ہی کیا ہے۔ یہ تو کوئی قابل اعتراض بات نہیں۔“ ماہین حیران ہوئی۔

”بس بابا صاحب کے اپنے کچھ اصول و ضوابط ہیں۔ ان کی بات کے آگے کسی کی بات نہیں ہوتی۔“ بڑی امی کے سبب میں قطعیت تھی۔

”کوئی بات نہیں۔ ذرا سی ڈانٹ کھالیں گے۔“ وہ لا پرواہی سے بولی۔

”ماما۔ یاد رہا ہر گئے ہوئے تھے۔ آگئے؟“ بڑی امی نے ماما بلی کو مخاطب کیا۔

”جی۔ پتا کرتی ہوں۔“ وہ باہر نکل گئی۔

ماہین کے ہونٹوں سے گلاس لگا تھا۔ یونہی اس کی نظر عالم تاب کی طرف اٹھی۔ وہ ٹھٹھک سی گئی۔
وہ شعلہ باز نظروں سے روشی کو دیکھ رہی تھیں۔

ہے۔ اس سے کھانا بھی نہیں کھایا جا رہا تھا۔

”آپ جب یوگنڈا میں ہوں گی تو بڑا برتری کا احساس ہوتا ہوگا۔ ان کالوں کے بیچ“۔ شیونے مسکراتے ہوئے اس کا گلاب جیسا تروتازہ چہرہ دیکھا۔

”ارے نہیں اس طرح کی باتیں کمپنیکس کی نشاندہی کرتی ہیں۔ زندگی بامقصد ہو تو اس طرح کی الٹی سیدھی سوچیں حملہ نہیں کرتیں، ہمارے والدین بہت سلیجی ہوئی فطرت کے حامل رہے ہیں۔ امی مرحومہ گھریلو خاتون ہونے کے باوجود بہت فعال تھیں۔ یہی حال بابا کا ہے۔ تقدیر میں مصروفیت ہے اور فطرت میں محبت۔ اس طرح کے لوگ ماحول کو خوشگوار رہنے دیتے ہیں کیونکہ واضح ہوتے ہیں۔ کمپلیکس نہیں ہوتے تو اس طرح کے ماحول میں پرورش پانے کے بعد کمتری و برتری کے احساس سے الجھے رہنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ ہمارے آس پاس رہنے والے مقامی باشندے ہم سے اس درجہ محبت کرتے ہیں کہ سارے ماحول سے حسن نکلتا ہے۔“

وہ ہنسی۔

شیونے مہری سانس لیکر گلو کی طرف بڑے تسخرانہ انداز میں مسکرا کر دیکھا۔

”یہ تو خیر بہت سمجھداری کی بات ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں تمہارے باپ بہت قابل اور لائق انسان ہیں۔“ بڑی امی نے بھی حصہ لیا۔

ماہین کے چہرے پر روشنی سی پھیل گئی۔ اسے یکدم بڑی امی اچھی لگنے لگیں جو اس کے پاپا کی تعریف کر رہی تھیں۔

”اس کا مطلب ہے بڑی تیز نظرتھی ہماری دادی جان کی۔ تاز آئی بھی ظاہر ہے ماہین آپنی جیسی ہی ہوں گی۔“ حنانے جیسے بڑی امی سے تائید چاہی۔

”بالکل۔“ ریسہ پھوپھو نے جلدی سے کہا۔

”اللہ میاں کو بھی پتا نہیں کیا جلدی تھی اتنی پیاری چیز ٹافٹ لے لی۔ ایک گلو (ملازمہ) کا نانا ہے میری پیدائش سے پہلے سے کھانس رہا ہے اسے کچھ نہ ہوا۔“ روبی نے آزر دگی سے کہا۔

”ہوں۔ اوں۔ بری بات اس طرح نہیں کہتے۔“ محفل کو ایک دم سانپ سونگھ گیا تھا۔ بڑی امی کی سرزنش بھری آواز سے جیسے دوبارہ زندہ ہو گئی۔

اچانک ماہین کی نظر روشنی کی سمت اٹھی۔ اس کے ہاتھ میں نوالہ تھا۔ سر جھٹکا ہوا تھا اور آنسو بڑی خاموشی سے بہہ رہے تھے۔

ماہین نے اپنی جگہ سے اٹھ کر اسے گلے لگا کر خاموش کرنے کا ارادہ کیا تو بڑی امی نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روک دیا۔

”اس طرح سے اور زیادہ رونا آئے گا پھر مشکل سے چپ ہوگی۔“ انہوں نے دھیمی آواز میں ماہین کو کہا۔

”روٹی۔ بری بات بیٹا دسٹر خوان پر بیٹھ کر ایسے نہیں رویا کرتے۔ بے ادبی ہے رزق کی چلو شاباش کھانا کھاؤ۔“ تزئین

☆.....☆.....☆.....☆.....☆

ایک سنسنات سی ماہین کے وجود میں دوڑنے لگی۔ اس نے فوراً اپنی نظریں پلیٹ پر مرکوز کر دیں۔ مبادا بڑی امی یہ جان بیٹھیں کہ وہ ان کی ”حرکت“ دیکھ چکی ہے۔

روشنی کے وجود پر ایک مکمل سناٹا طاری ہو چکا تھا۔

اف۔ کس قدر گھٹن ہے یہاں۔ اور معصوم سی روشنی بغیر ماں کے یہاں ”آمرود“ کے زیر سایہ کس طرح زندگی گزار رہی ہے۔ یاور بھائی اور جواد کو اس کا خیال رکھنا چاہیے۔ مگر انہیں اپنی کمشنری اور جواد کو اپنے جھمیلوں سے فرصت ہی کب ہوگی۔ میں اگر اسے ساتھ لے جانا چاہتی تو یہ لوگ کبھی بھی لے جانے نہیں دیں گے۔

کاش اس کی شادی کہیں بیرون ملک ہو جائے اور جلدی ہو جائے تاکہ اس زندان سے چھٹکارا ملے۔ اسے تو یہ سوچ سوچ کر پریشانی ہو رہی تھی کہ یہاں سے واپسی کے بعد وہ ایک لمحہ بھی خوشی اور سکون سے نہ رہ سکے گی۔ رہ رہ کر اسے روشنی کی قیدیوں جیسی حالت یاد آئیگی۔

”ٹھیک ہے۔ یہاں سب ہی اس طرح رہ رہے ہیں۔ مگر ان سب کی آنسو پونچھنے والی مائیں تو ہیں۔ یہ بے ماں کی بچی اس پر دادی بھی نہیں ہیں۔ دادی بھی ایک نعمت ہوتی ہے جو اپنے پوتی پوتے کے لئے خالص اور بے کھوٹ محبت رکھتی

پھو پھو جو اس کے قریب بیٹھی تھیں اسے چکارنے اور سمجھانے لگیں۔

ماحول ایک دم بدل گیا تھا۔

ہر شخص اپنی جگہ یوں خاموش تھا جیسے اس صورتحال کا وہی ذمہ دار ہے مابین جو بڑی چاہ اور خواہش سے شاہی کمرے پلیٹ میں نکالے بیٹھی تھی اور مہکتے کھانوں کی خوشبوؤں سے الگ لطف اندوز ہو رہی تھی ایک دم افسردہ بنی نظر آنے لگی۔ اس کے تصور کی اڑان کھانے کے ماحول سے نکل کر کافور و اگر بتی کی خوشبوؤں سے گلے مل رہی تھی اور کھانا کڑوا ہو رہا تھا۔

کھانا کھا کر وہ سب نماز پڑھنے چھت پر چلی گئیں تو وہ یہ کہہ کر اپنے رہائشی کمرے میں آگئی کہ وہ اپنے کمرے میں نماز پڑھے گی اور یہ کہ جلدی سونا چاہتی ہے۔

نماز پڑھ کر اس نے دروازہ کھول کر باہر جھانکا۔ ہر سمت نیم تاریکی اور سناٹا تھا۔ دوپٹا پھیلا کر پورا وجود ڈھانپ لیا اور یاور علی خان کے بیڈروم میں چلی آئی اور دروازے پر دستک دی۔

”ہوں۔“ ان کی آواز کے بجائے ہلکی سی ہنکار ابھری جو گویا اجازت تھی۔ وہ آہستگی سے دروازہ وا کر کے اندر چلی آئی۔ انتہائی شاہانہ انداز میں سجا ہوا بیڈروم تھا اور بے حد وسیع تھا۔ باغ کی طرف کھلنے والے درتپے کے ساتھ ان کا بیڈ تھا اور بیڈ سے ذرا فاصلے پر ان کی رائٹنگ ٹیبل اور جیر تھی۔ وہ وہیں مصروف تھے۔ کمرے میں لائٹ آف تھی۔ ٹیبل لیمپ کی روشنی کی وجہ سے ایک دم تاریکی نہیں تھی۔

وہ آگے نہیں بڑھی۔ دروازے کی طرف انکی مکمل پشت تھی۔ وہ کھنکاری۔

”کون۔ روشنی؟“

”جی نہیں۔ میں مابین۔“ وہ وہیں کھڑے کھڑے گویا ہوئی۔ وہ بہت آہستگی سے گھومے۔ آپ اس وقت؟“ ان کی آواز مدہم اور لہجہ معمول کا تھا۔

”کیا کریں۔ یہاں تو ہر بات ہی باضابطہ ہے۔ کوئی تنہا اور ذاتی بات کرنا چاہے تو کیا کرے؟“ اس نے ہنوز اسی جگہ کھڑے کھڑے الٹا سوال جزدیا۔

یاد علی خان اپنی کرسی چھوڑ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ اور اسے اپنی جانب آتے دکھائی دیئے۔ وہ کچھ سمجھی نہیں مگر اپنی جگہ سے ہلی بھی نہیں۔

وہ دراصل سوچ بورڈ کی جانب بڑھے تھے۔ کھٹ کھٹ کی کئی آوازیں ابھریں۔ چاروں طرف لگی فینسی لائٹس روشن ہو گئیں۔ کمر ایک دم جگمگا اٹھا۔ وہ گویا روشنی میں نہا گئی۔ ٹیبل لیمپ تو بے چارہ سا لگنے لگا تھا۔

”آئیے تشریف رکھئے۔“ انہوں نے گہرے جامنی مخملی صوفے کی سمت اشارہ کیا۔

وہ سوچ رہی تھی کہ وہ شاید حیران ہوں گے کہ وہ اتنی رات کو کیوں ان سے ملنے آئی۔ مگر وہ بلا کے پرسکون اور نارمل تھے۔ اس کے مقابل خود بھی بیٹھ گئے تھے۔ ادھ جلا سگریٹ ان کی انگلیوں میں دبایا ہوا تھا۔ اور نظریں جھکی ہوئی تھیں۔ درتپے کے پردے ہٹے ہوئے تھے۔ اور باغ میں لگے دیو قامت درخت بڑے عجیب سے دکھائی دے رہے تھے اور جب ہوا سے شاخیں

بلتی تھیں تو یوں محسوس ہوتا تھا جیسے جن بھوت قدم بڑھا رہے ہوں۔ بلا کی تاریکی تھی باہر۔

”میں جو کچھ کہوں آپ مائنڈ تو نہیں کریں گے؟“ اس نے قدرے جھجک کر پوچھا۔

”آپ کہئے۔ میں کوشش کروں گا کہ مائنڈ نہ کروں۔ اگر کروں بھی تو اظہار نہ کروں۔“ انہوں نے بچے کچے سگریٹ کو چٹکی میں پکڑ کر لباش لیا۔

”یہ کیا بات ہوئی۔ اس طرح تو مجھے اپنی بات کہنے کی ہمت نہ ہوگی؟“ اس نے بے دلی سے منہ بنا کر کہا۔

”مگر میں مائنڈ نہ کرنے کا وعدہ بھی تو نہیں کر سکتا کہ موضوع جانے بغیر اس طرح کا وعدہ بڑی غیر ذمہ داری کی بات ہو گی۔“ وہ مبہم سا مسکرائے۔

”مگر سیلف کنٹرول کے سبب آپ ایسا کر بھی سکتے ہیں۔“ وہ بھی مسکرا دی۔

”لیکن سیلف کنٹرول کا فیصلہ کن لمحہ بھی بات یا موضوع کی نوعیت سے ہی مشروط ہے۔“

”اف اللہ۔“ مابین نے سر تھام لیا۔

”آپ بات کہئے۔ اور اس چکر میں مت پڑیئے کہ میں مائنڈ کروں گا یا نہیں کروں گا۔ جو کچھ مجھ پر گزرے گی منفی یا مثبت آپ کو کیا پتہ چلے گا؟ ہے کوئی پیمانہ؟ فرض کیجئے میں مائنڈ نہ کرنے کا وعدہ کر لوں اور آپ کی بات مجھے نہایت نامناسب محسوس ہو اور میں محض وعدے کی بنا پر اظہار ناپسندیدگی نہ کروں تو ایسی صورتحال کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

”جب بات کہے بنا کوئی چارہ نہ ہو تو بات کہنے یا کرنے سے پہلے اپنے اندر جرات پیدا کرتے ہیں ہر طرح کے رد عمل کا سامنا کرنے کی جرات۔ جی۔ فرمائیے۔ ارشاد۔“

”آپ ویل ایجوکیٹڈ ہیں۔ ناز بجز بھی تعلیم یافتہ تھیں۔ آپ کو ذرا احساس نہیں کہ آپ نے اپنے بچوں کو انقلاب فرانس سے قبل کے ماحول میں قید کیا ہوا ہے۔ آپ خود کلاس ون سرکل موو کرتے ہیں۔ آپ کو چاہیے تھا کہ آپ اپنے بچوں کو ساتھ رکھتے۔“

”یہاں کیا سقم ہے۔“ انہوں نے رسائیت سے مگر وکیلوں کے ہی انداز میں کہا۔

”آپ اپنے بچوں کو کتنا وقت دیتے رہے ہیں؟“ اس نے پینتیر ابدلا اور نکلتا اٹھایا۔

”جب وہ چھوٹے تھے تو وقت زیادہ تر ان ہی پر خرچ ہوتا تھا۔“ ان کا انداز بدستور تھا۔

”اور اب..... اب آپ جائزہ لیتے ہیں کہ آپ کے بچوں پر تعلیم، تہذیب اور جدید تمدن کا کتنا اثر ہے۔ وہ بہترین دماغوں کے ساتھ کس درجہ اعتماد سے اٹھنے بیٹھنے کے قابل ہوئے ہیں؟“

”انہیں کوئی کمپلیکس نہیں۔ اس لئے کہ انہوں نے معاشی الجھنوں کے بارے میں صرف سنا ہے۔ اور زیادہ تر الجھنیں اسی ایک کمی کے سبب بیدار ہوتی ہیں۔“ انہوں نے غایت درجہ استغنا سے نیا سگریٹ سٹگایا۔

”مگر ایک ویل ایجوکیٹڈ اور ایک صرف ”ویل آف“ یعنی امیر کبیر کا فرق آپ سے بہتر کون جان سکتا ہے۔ آپ کو ایفائیڈ بھی ہیں اور ویل آف بھی۔ اس وقت کو یاد کیجئے بلکہ اس دور کی تصاویر ہی دیکھ لیجئے جب آپ صرف دولت مند

”اوہ۔ شیور۔“ وہ ایک دم مستعدی دکھائی دی۔

”یہی کہ آپ مجھے غافل، غیر ذمہ دار، خود غرض، خود میں مگن، اپنی کوالیفیکیشن پر نازاں و مغرور، حقائق سے نظر چرانے والا فرد ثابت کرنا چاہ رہی ہیں۔“

انہوں نے اسی اطمینان سے پشت صوفے کی بیک سے نکائی جس کا مظاہرہ وہ شروع سے کر رہے تھے۔ وہ واقعی دھک سے رہ گئی۔ حقیقتاً جب انسان کسی پر تنقیدی حملہ کر رہا ہوتا ہے تو اس کے جذبات بڑے آزادی سے مظاہرے کے خواہش مند ہوتے ہیں۔ مگر رشتے و تعلق، ماحول و فضا کو مد نظر رکھتے ہوئے خود پر ہی کچھ پابندیاں عائد کرنا پڑ جاتی ہیں۔ نرم نرم الفاظ استعمال کرنے کے باوجود انسان چاہتا ہے کہ اس کی بات اسی تاثر کے ساتھ اپنے ہدف تک پہنچے جس تاثر نے اس کے دل و دماغ کی دنیا میں تہلکہ مچایا ہوا ہوتا ہے۔ اس طرح کی لفاظی کی جنگ ذرا کامیاب رہتی ہے۔

اگر مخاطب نے تنقیدی حملہ ظرف سے برداشت کر لیا تو طبیعت خوش کہ غبار نکل گیا۔

اور جو آستینیں چڑھالیں تو نہایت سادگی سے کہہ دیا۔ ”نہیں جی۔ آپ غلط سمجھے۔ میرا مطلب یہ نہیں۔ یہ ہے۔“

اسے بھی اسی طرح کی صورتحال درپیش تھی۔ لفاظی کی جنگ میں بلاشبہ اس کا فطری خلوص کارفرما تھا۔ اور وہ ان کی کوتاہیوں کی نشاندہی کرنا چاہ رہی تھی۔ مگر اب جو انہوں نے خود اپنے لئے الفاظ استعمال کئے۔ انہیں سن کر وہ خاصی غلجی ہو گئی تھی۔

غلج ہونے کی دوسری وجہ یہ بھی تھی کہ وہ ایک لمحے کیلئے بھی اس سے تنخی یا برہمی سے مخاطب نہیں ہوئے تھے کہ وہ اپنی تنقید کو جائز قرار دے سکتی۔ ان کے برامانے کی صورت میں وہ شک کا فائدہ حاصل کر لیتی کہ

”دیکھا لگتا برا۔ ہیں جو ایسے۔“ مگر ان کی مستقل حالت سکون اسے الٹا مضطرب کرنے لگی تھی کہ مبادا وہ انہیں غلط سمجھ رہی ہو۔

”اگر میں آپ کے پیارے بھانجے کو کہیں سے ایک ماں مہیا کر دیتا تو بھی آپ کو مجھ سے شکایت ہوتی۔“ وہ اسے خاموش پا کر گویا ہوئے۔

”آپ کو تو میرا شکر یہ ادا کرنا چاہیے کہ میں نے بچوں کو اپنے ذاتی مقاصد کی نذر نہیں کیا۔ جی؟“

”آپ کا بہت بہت شکریہ۔“ وہ شریرا انداز میں زربل مسکرائی۔

”مگر میں یہ عرض کروں گی آپ ماں کی کمی تو کیا پوری کرتے آپ نے تو باپ کا رول بھی ٹھیک طرح سے ادا نہیں کیا۔ آپ نے شاید نوٹ نہیں کیا ہو گا جو چوبیس گھنٹے میں میں نے نوٹ کر لیا ہے۔“

بالآخر وہ یاد علی خان کو چونکا نے میں کامیاب ہو گئی۔ وہ سگریٹ کا کٹر الیش ٹرے میں مسلنا بھول گئے تھے۔ آنکھوں کی سرخی کچھ گہری سی ہو گئی۔ ”بات بات پر روشنی کی آنکھیں بھیگ جاتی ہیں۔ مجھے لگتا ہے خدا نخواستہ اسے کبھی کسی وجہ سے رونا پڑا تو وہ پھٹ پڑے گی۔“

”مگر یہاں تو سب اس سے بہت پیار کرتے ہیں۔“ انہیں جیسے گہرا صدمہ ہوا تھا یہ سن کر۔

تھے۔ اور آج خود پر نظر ڈالیے۔ بہت فرق محسوس کریں گے۔

”وہ اچھی تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔“ یاد علی خان نے تحمل سے بات کاٹی تھی۔

”مگر جو کچھ کتابوں اور لیکچرز سے سیکھتے ہیں۔ یہاں وہ یاد ہی کہاں رہنے دیا جاتا ہے۔ ایک ایک حرف پھانک کے اس پار خیر باد کہہ کر اندر داخل ہوتے ہیں۔“ وہ طنزیہ انداز میں ہنس پڑی۔

پہلی مرتبہ یاد علی خان کی پیشانی کی عمودی لکیریں گہری ہوئیں۔ ”میں اچھا محسوس کروں گا اگر آپ وضاحت کر سکیں۔“ انہوں نے سگریٹ ہونٹوں میں دبالی اور بہت سرسری سا اس کی سمت دیکھا۔

”بڑی سادہ سی بات کہی تھی میں نے۔ یہاں اس ماحول میں ذاتی شعور اور جائز آزادی کے تمام دستور کا عدم ہیں۔“

”یہ ان کے حق میں اچھا ہے کیونکہ ابھی ان کا ذاتی شعور کا فیضان نہیں۔“ ان کے سکون میں ذرا فرق نہ آیا۔

”کیا اس کی کوئی مخصوص عمر یا پیمانہ ہوتا ہے۔“ اس نے برجستہ سوال کیا۔

”نہیں۔ مگر والدین اپنی اولاد کے تمام ادوار سے آگاہ ہوتے ہیں۔ وہ محسوس کرتے ہیں۔“

”مگر والدین۔“ وہ اپنی نکتہ رسی پر بڑے افتخار سے مسکرائی۔

”ٹھیک ہے۔ مگر میں تو ہوں ناں؟“ وہ قدرے جزبہ دکھائی دیئے۔

”ماں تو بچے کی زندگی میں بڑی اہم ہوتی ہے۔ اس کی کے ازالے کیلئے میری بہن کے پیارے بچوں کے ساتھ آپ نے کیا رول ادا کیا؟“ بڑا بے رحم سوال تھا۔

”انہیں مجھ سے کوئی شکایت نہیں۔ انہیں معلوم ہے۔“

”کہ اکیسویں، بائیسویں گریڈ کے افسران ہوتے ہی پر تکلف ہیں۔ خواہ باپ ہوں۔ بڑے باضابطہ اور پروٹوکول کا شمس ہوتے ہیں۔ بچوں کو بھول جانا چاہیے کہ ان کا کوئی باپ بھی ہے۔ بس اس بات پر خوش اور مست رہنا چاہیے کہ وہ بڑے افسر کی اولاد ہیں۔“ اس نے ایک اور جارحانہ حملہ کیا۔

وہ خاموش رہے۔

”کچھ کہیں ناں۔ کیا سوچ رہے ہیں۔“ اسے ان کی خاموشی پر حیرانی ہوئی۔

انہوں نے بہت سادہ سادہ ناک و منہ سے خارج کیا۔ چند لمحوں کیلئے اس کے اور یاد علی خان کے درمیان دھوئیں کے مرغولے حائل رہے۔

غبار چھٹا تو اس نے دیکھا ان کی سرخ اور بوجھل نظریں اس کے چہرے پر ٹکی تھیں۔

”ایک نتیجے پر پہنچنا چاہتا ہوں۔ اول یہ کہ آپ نا سبھی کی وجہ سے اتنی جرات مند ہیں کہ وہ ان کی وجہ سے۔“

”آپ کسی نتیجے پر نہ پہنچیں مگر مجھے آپ کی قوت برداشت اور طرز گفتگو نے بہت امپریس کیا ہے۔“ وہ مسکرائی۔

”اور میں نے آپ کی ساری گفتگو سے ایک ہیڈ لائن تیار کی ہے۔ کیا آپ کو اس ہیڈ لائن سے دلچسپی ہوگی؟“ انہوں

نے دائیں طرف جھک کر راکھ جھاڑی۔

مخنوں سے ذرا اونچے سیاہ دراز گیسو گلے میں چنا ہوا دوپٹا۔
 ساس کے ٹوکنے کے باوجود اس کے دوپٹے کو پھیلانا نہیں آیا تھا۔
 بلا کی فیشن ایبل۔

غضب کی جامہ زیب۔

بے حد طرح دار۔

جس کی معمولی سے معمولی ادا بھی دودھاری تلوار تھی۔

ان کی سرخ آنکھیں بے خیالی میں اس پر مرکوز تھیں۔ وہ گھبرا کر کھڑی ہو گئی۔

”کہنا تو بہت کچھ ہے مگر باقی باتیں آپ سے پھر کروں گی۔“

وہ چوک پڑے۔“ جی کچھ کہا آپ نے؟“ ان کے تاثرات بدل گئے۔ بہت کھر در اور خشک لہجہ تھا اب۔

”جی نہیں۔ میں نے کچھ نہیں کہا“۔ وہ جھل کر بولی اور شب بخیر کہہ کر باہر آ گئی۔

ماما ملی کی اسٹنٹ سرسوتی بیچ رہا باری میں ننگے فرش پر اپنی چادر کا تکیہ بنائے خراٹے شمارٹ ویوز پر نشر کر رہی تھی۔

جانے کیوں اسے سامنے پا کر ایک نیا خیال وہم کی صورت اسے پریشان کرنے لگا۔ یہ سونے کے بجائے جاگتی ہوئی بھی پائی جاسکتی تھی۔

اسے اس طرح رات کے اس پہر یا ور علی خان کے کمرے میں نہیں جانا چاہیے تھا۔ محلاتی سازشیں تو یوں بھی بڑی مشہور ہیں۔ اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا تو اس نے بڑے قریب سرسوتی کا چہرہ دیکھا۔

آیا وہ سچ سچ سو رہی ہے۔ کہیں بن تو نہیں رہی؟

”یہ واقعی سوری ہے۔ یہ اسی طرح گھوڑے بیچ کر سوتی ہے۔ اب تو صبح بابلی دو چار دھموکڑے مار کر ہی اسے اٹھا سکے گی

۔ آپ فکر مند نہ ہوں۔“ باری کی دھیمی آواز اس کے کان میں آئی تھی۔

”وہ چونکی۔ پھر خفیف سی ہو کر رہ گئی۔“ تم جاگ رہے ہو اب تک؟ وہ دراصل میں۔ یا اور بھائی سے۔“

”آپ کو کسی چیز کی ضرورت تو نہیں؟“ اس نے جیسے سنی ان سنی کرتے ہوئے پوچھا۔

نہیں۔ وہ اس کی سمت دیکھے بنا بولی تھی۔

اچھا لو پھر۔ شب بخیر۔ وہ تیز تیز قدم بڑھاتا ہوا ایک موٹر پر غائب ہو گیا۔

“1, 2, 3”

”ما الھذا؟“

پہنچ گئی تھی۔ وہ باج بے انتہائی کونے میں ایک کتاب لئے بیٹھا تھا اور وہ اسے ڈھونڈتی ہوئی اس کونے میں بھی

”باری..... پلیز ہیلپ مجھ“

- پاپی -

”خدا خیر کرے۔ زیادہ ایمر جنسز یہاں آپ ہی کو پیش آتی ہیں۔“

”باری۔ آج میں خالہ سے ڈھیروں باتیں کرنا چاہتی ہوں۔ میرا دل نہیں چاہ رہا کالج جانے کو۔“

”مگر میں آپ کے بدلے کالج نہیں جاسکتا۔ مجھے افسوس ہے۔“ وہ دوبارہ کتاب سے آنکھیں لگا کر بیٹھ گیا۔

”پوری بات بھی تو سن لیا کرو۔“ وہ بھنائی۔

”اچھا! ابھی بات آدھی تھی۔ اوہ۔ فرمائیے۔“

”پتا ہے کیا تم گھر میں شور ڈال دو۔ مجھے دو میٹنگ ہو رہی ہے رات سے۔“

”یعنی مجھے اب ڈھنڈورچی کا عہدہ بھی تفویض فرما رہی ہیں آپ؟“

”مت بولا کرو اتنی مشکل اردو۔ میری دماغ میں کنکر چھپنے لگتے ہیں۔“ وہ جھلا گئی۔ ”بس اتنا سا کام ہے کوئی بڑا کام نہیں۔“

”آپ کے تو سارے کام ہی اتنے سے ہوتے ہیں۔ یوں تو میں آپ کو زبردستی ہوں۔ مگر کام پڑتے ہی یکا یک آنکھوں کا تارا بن جاتا ہوں۔ پھر کام نکلتے ہی آنکھیں پھیرتی ہیں کہ طوطے احتجاجی تحریک شروع کرنے کا پروگرام بنانے لگے ہیں۔“

”نہیں تو پھر کیا ہر وقت تمہارے کھنسنے سے لگی بیٹھی رہوں؟“ وہ فطری نخوت سے ناک چڑھا کر بولی۔ باری کی باقی بات منہ میں ہی رہ گئی تھی۔

”کیسے دیوانے کے خواب دکھا رہی ہیں آپ۔“ وہ کتاب بالکل چہرے کے قریب لے گیا۔

”باری۔ سمجھو ناں۔ پر اہم یہ ہے کہ صرف بابا صاحب اور بڑی امی کا مسئلہ نہیں بلکہ آج کل تو پاپا بھی گھر پر ہیں۔ بس میرا دل نہیں چاہ رہا کالج جانے کو۔ باری پلیز۔“

”میں جھوٹ نہیں بول سکتا۔ اصولی مدد کر سکتا ہوں۔“ اس کی بے نیازی میں کوئی فرق نہیں آیا۔

”بڑے آئے وہاں سے اصول پرست۔ اچھا اگر میں منہ میں انگلی ڈال کرتے کر دوں پھر تو کہہ دو گے؟“

”مگر اتنی صبح صبح نکلے گا کیا؟ ناشتے کے بعد پروگرام بنائیے گا۔“ اس نے انگلی میں تھوک لگا کر کتاب کا صفحہ پلٹا۔

”ویسے آپ کی چھٹی بے کاری جا چکی۔ آج تو میں آپ کی خالہ کو نہرو والا علاقہ دکھانے لے جاؤں گا۔“

”تو پھر کیا ہوا۔ میں بھی چلوں گی۔“ وہ ہنسی۔

”نہیں بھئی، سارا مزا خراب ہو جائے گا سیر کا۔ وہ اتنی سیریس اور نپنی تلی باتیں کرنے والی اور کہاں آپ کی ایک زمین کی

ایک آسمان کی بے ربط گفتگو۔ کیا باتیں کرتی ہیں۔ واہ۔“

”واہ۔“ اس نے نقل اتاری۔ ”خالہ میری ہیں۔ باتیں تم سنو گے؟“ وہ طیش میں آ گئی۔

”اگر آپ کہیں تو آپ کو ”دو چار“ سنو سکتا ہوں۔“ اس نے سادگی سے آفرنی۔

”دیکھنا اب مجھ سے بات کر کے۔“ وہ پاؤں پختی آگے بڑھی۔

”اگر کبھی ایسی غلطی سرزد ہو گئی تو کیا ہوگا؟“ وہ مسکرایا۔

”خون پی جاؤں گی تمہارا۔“ وہ غرائی۔

”کوئی بات نہیں۔ میں شام کے اخبار میں آپ کی سچی کہانی شروع کر دوں گا قسط وار۔“ آدم خود بننے سے پہلے، کیا

عنوان ہے۔“

”بالکل تمہاری طرح بد شکل۔“ وہ رک کر پھنکاری۔ باری بہت کوشش کے باوجود اپنے بلند قبضے پر قابو نہ رکھ سکا تھا۔

ہال کمرے میں بھکڑ مچ گئی تھی۔

وقت پر سونے کی وجہ سے وہ علی الصبح بیدار ہو گئی تھی۔ نماز پڑھی کیونکہ سورج طلوع ہونے والا تھا اس لئے پہلے نماز بعد

میں صبح کے غسل کا اہتمام کیا۔

کلف نئے شلوار کانن کے کھڑکھڑاتے ہوئے سفید کرتا شلوار اور چوڑے سے دوپٹے میں ملبوس جیسے سحر کے اہتمام کا

حصہ ہو رہی تھی۔ بال سوکھتے ہی عمارت کے بائیں طرف کمروں کی طرف آ گئی تھی۔

لڑکوں کی صبح کی بھاگ دوڑ اپنے عروج پر تھی۔ ٹی وی آن تھا۔ صبح کی نشریات سے بھی لطف اندوز ہوا جا رہا تھا۔

”یار! ٹی وی کی آواز آہستہ کرو۔ رفیع کا بڑا اچھا گانا شروع ہوا ہے۔“ ثمر نے جھلا کر دہانج کو مخاطب کیا تھا۔ وہ ریڈیو

سے چپکا بیٹھا تھا۔

”آپ کی فرمائش“ سن رہا ہے۔ غدار کہیں کا۔“ ندیم نے کھنچائی کی۔

”ڈوپٹے رنگنے کی ترکیبیں سیکھ رہے ہو محبت وطن؟“ خمیر میں جا کر لڑو۔ بڑا آیا جنگجو مجاہد۔ خود تو جیسے ”ریسٹ“ پر آیا ہوا

ہے۔ اس نے جواباً ندیم کو دبوچا۔

”یار! کتنی مرتبہ کہا ہے کہ جب ریزرتباہ کیا کرو تو انفارم کر دیا کرو۔“ چھوٹے بھیا جھلاتے ہوئے ہاں میں داخل ہوئے

اور منہ ہانج پر برسے لگے۔ جوان کاریزراستعمال کرتے ہوئے کئی بار پکڑا جا چکا تھا۔

”بدا چھا۔ بدنام برا۔ کیا ضروری ہے کہ اس بار بھی مجرم میں ہی ہوں۔“ وہ بے بسی کی تصویر بن گیا۔

”تمہارے علاوہ اور کوئی نہیں ہو سکتا۔“ چھوٹے بھیا نے پر یقین انداز میں کہا۔

”کیوں۔ کیا ان سب نے“ مجنوں لیگ“ بنالی ہے۔ داڑھیاں رکھیں گے؟“

ندیم کی زبان پر کچھ نہ کچھ پھسل جاتا تھا۔ اور اس کے بارے میں سب ہی کو پتا تھا کہ نمبر ایک کا بل ہے۔ باربر سے شیو

بنواتا ہے۔

وہ بے ساختہ ہنس دی تھی۔ دھیرے سے۔ مگر امیر نے دیکھ لیا تھا بے چارہ بغیر قمیض کے بے تکلف حلیے میں بیٹھا اخبار

پڑھ رہا تھا۔

”شیر آیا۔ شیر آیا۔“ اس نے رونی شکل بنا کر آواز نکالی۔

”آئے گا تب ہی بھاگیں گے۔“ فاران تو ویسے ہی ڈھیٹ مشہور تھا۔

تب وہ کھٹکھارتی ہوئی باقاعدہ اندر آ گئی۔

”السلام علیکم!“ اس نے بڑے اعتماد سے حاضرین کو سلام کیا۔

جو جہاں تھا وہیں جم گیا تھا۔ چھوٹے بھیا کو تو یہ بھی یاد نہیں رہا کہ ان کے آدھے چہرے پر کریم کا جھاگ لگا ہوا تھا۔
”شرکو“ رُفیع“ بھول گیا۔

جو کاندھوں پر تو لیے ڈالے گھوم رہے تھے۔ انہوں نے تو لیے اچھی طرح لپیٹ لئے۔

”معاف کیجئے گا۔ مجھے اس طرح کی صورتحال کا اندازہ نہیں تھا۔“ وہ واقعی شرمندہ ہو گئی۔

”میں تو جواد کے پاس آئی تھی۔ نظر نہیں آ رہا وہ۔“ اس نے طویل و عریض ہال پر نظر دوڑائی۔

”وہ“ حکیم سعید“ بننے کی تیاریاں کر رہا ہے۔ دو میل پیدل آنے کے دو میل جانے کے۔“ ندیم نے تفصیلاً جواب دیا۔

”اوہ۔ مارنک واک۔ گڈ۔“ اسے بھانجے کی صحت مندانہ عادت جان کر خوشی ہوئی۔

”کتنے بجے تک آ جاتا ہے۔“ اس نے ندیم ہی کو مخاطب کیا۔

”آتا ہوگا۔“ وہاں نے بڑے سلیقے سے جواب دیا۔

”آپ؟“

”خالہ ہوں جواد کی۔“

”خالہ!“ دو چار حیرت آمیز آوازیں بلند ہوئیں۔

”جی بتایا تھا جواد نے کہ اس کی خالہ آئی ہوئی ہیں۔“ چھوٹے بھیا نے کہا۔

”مگر ہمیں تو معلوم نہیں تھا۔ خیر۔“ ثمر نے شانے اچکائے۔

”ایک بات بتائیے۔ کیا ہم سب کو بھی خالہ ہی کہنا چاہیے۔“ بان کو بہت زیادہ تشویش ہوئی۔

”ویسے یہ اس حویلی کا سب سے بھیا تک حادثہ ہے۔“ منہاج نے اس کے سراپے پر نظر ڈالی۔ چھوٹے بھیا اسے گھور کر رہ گئے۔

”شیو مکمل کر لیجئے۔ کہیں بھول گئے تو ہم سب کو بھی پھنسا دیں گے۔ کل کو فیشن چل پڑے گا۔ آدھی شیو کا۔“ ندیم ان کے کان میں منمنایا۔

وہ قدرے کھسیا کر ہاتھ روم کی طرف بڑھ گئے۔

”آپ جو چاہے کہیے۔ جواد آپ کے برادر عزیز ہیں۔ اصولاً تو آپ سب مجھے خالہ ہی کہیں۔“ اس کی ہنسی میں ہلا کا اعتماد تھا۔

”آپ بالکل مس فٹ ہیں اس رشتے کیلئے۔“ امیر نے بڑی تیزی سے اظہارِ ناپسندیدگی کیا۔

”مردانے زناتے الگ ہونے پر آپ لوگوں کا یہ حال ہے؟“ اسے بہت ہنسی آرہی تھی۔

”اسی وجہ سے یہ حال ہے۔“ مصور نے بہت سوچ سمجھ کر حصہ لیا۔ ایک فرما کٹی قبچہ پڑا۔

”آپ ذرا۔ این۔ او۔ سی تو چیک کرائیے۔“ ندیم آگے بڑھا۔

”این۔ او۔ سی؟“ اس نے حیرت سے پوچھا حالانکہ سمجھ تو گئی تھی کہ ضرور مذاق ہی ہو رہا ہوگا۔

”بابا صاحب جاری کرتے ہیں۔ آپ کو چاہیے تھا بج کی شکل میں ڈوپٹے پر لٹائیں۔ تاکہ ہمیں بھی اطمینان رہتا کہ

کوئی غیر قانونی ملاقات نہیں ہو رہی۔“ ندیم نے اسے بیٹھنے کیلئے موڑھا پیش کیا۔

”شک۔“ وہ موڑھا مزید سرکا کر بیٹھ گئی۔

”میرے خیال میں این او سی کا تعلق ان لوگوں سے ہوتا ہے جو ریاست کے شہری ہوتے ہیں اور ریاست سے شہریت

کے مخصوص فوائد حاصل کرتے ہیں۔“

”پالینکس۔۔۔۔۔۔“ ثمر نے حیرت سے ندیم کی سمت دیکھا۔ اس نے بھی شانے اچکادے۔

”بھئی! میں یہاں آپ کے گھر میں ہوں۔۔۔۔۔۔ یہی میرا این او سی ہے۔ آپ فکر مند نہ ہوں۔ میں اپنی ذمہ داری پر آپ

لوگوں کے درمیان ہوں۔“

”میرے خیال میں مطمئن رہی جاؤں۔“ وہاں ایک کرسی پر گر گیا۔

”دراصل جواد ہی نہیں پار رہا ہے۔ ایک کے بعد دوسرے کام سے کہیں چلے جاتے ہیں اور مجھے بہت کوفت ہو رہی

ہے۔“

اسی وقت جواد، سیاہ زریک سوٹ میں اندر داخل ہوا۔ اس کے پیچھے پیچھے منحنی سا ملازم جس کا گلاس لئے آ رہا تھا۔

ناجین کی آنکھوں میں محبت اور اپنائیت کی روشنی سی کوند گئی۔

جواد کے چہرے پر حیرت آمیز تاثرات نمودار ہوئے۔ وہ ٹھٹھک کر رک گیا۔

”آپ۔۔۔۔۔؟“

”تو کیا کریں؟ خود تو آپ ہمارے پاس آئے نہیں، ہم خود چل کر آئے ہیں تو جناب پھر بھی ہاتھ نہیں لگتے۔“ اس نے

پیارے اس کی سمت دیکھ کر شکوہ کیا۔

”رات میں آپ کی وجہ سے جلدی آ گیا تھا۔“

”کتنی جلدی؟“ اس نے بے یقینی کے انداز میں اس کی طرف دیکھا اور گویا جھوٹ پکڑنے کی کوشش کی۔

”ساڑھے نو بجے۔ آپ کے کمرے کا دروازہ نوک کیا، کوئی آواز ہی نہیں آئی۔“

”ہاں، ہو سکتا ہے شاید میں نماز پڑھ رہی ہوں گی۔“

”پھر میں پندرہ منٹ کے وقفے کے بعد دوبارہ گیا، دروازہ ناک کیا پھر کوئی آواز ہی نہیں آئی۔ یہ سوچ کر زیادہ زور سے

ناک نہیں کیا کہ آپ سونہ گئی ہوں۔“

(اس وقت تو میں غالباً یاد اور بھائی سے باتیں کر رہی تھی)۔ ہاں ہو سکتا ہے میں سو گئی۔۔۔۔۔۔ مجھے پتہ نہ چل سکا ناکنگ

کا۔ بہر حال یہ سن کر میرا سیروں خون بڑھ گیا ہے کہ تمہیں اس درجہ خیال آیا، ورنہ میں تو یہی بھی تھی، تمہیں پرواہ بھی نہیں

ہے۔

”یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“ وہ ہنس دیا

”خیر! پہلے تو تم یہ جوس پو“ اس نے بالکل مادرانہ انداز میں کہا تھا۔

”آپ لیں ناں پلیز..... اور منگا لیتے ہیں۔“ اس نے گلاس مابین کی طرف بڑھایا۔

”میں تو بیڈٹی لے چکی ہوں بالکل بھی میچنگ نہیں ہو رہی۔“ وہ دھیرے سے ہنس دی۔

جواد نے جوس کے گھونٹ بھرنے شروع کر دیے۔

”کہاں کہاں سیر کی آپ نے؟“

”کل باری کے ساتھ گئی تھی۔ آج بھی جانے کا پروگرام ہے، تم چلو گے؟“

”سوری! آج کچھری جانا بہت ضروری ہے۔ بابا صاحب.....!“

”ماشاء اللہ! اتنے سارے لوگ موجود ہیں کوئی اور چلا جائے گا کچھری۔“ اسے سراسر عذر لنگ محسوس ہوا تھا۔ ایک دم

بجھ گئی تھی۔

”بابا صاحب جسے کام سونپ دیں اسے ہی مکمل کرنا ہوتا ہے۔“ اس نے آہستگی سے جواب دیا۔

”یہ بہت لاڈلے ہیں بابا صاحب کے۔“ منہاج نے مطلع کیا۔

”وہ تو میں دیکھ رہی ہوں۔ دوپہر کا رات کا کسی وقت کا کھانا تو وقت پر کھاتا نہیں ہے۔“ اس نے تنک کا کہا۔ (بے ماں

کے بچوں پر حد ہے کوئی ظلم کی)

”روٹی بتا رہی تھی دن کے اجالے میں تو بھائی نظر ہی نہیں آتے۔ تم تنک نہیں پڑتے اس خالمانہ لاڈ پیار سے؟“ اسے

غصہ آ گیا تھا۔

ایسی فطری اپنائیت کے اظہار نے جیسے جواد کا دل موہ لیا۔

”آپ کو نہیں پتا بڑے ”ٹور“ ہیں اس کے..... ڈی سی کا بیٹا ہے۔ سب کی نظروں میں رہتا ہے آپ ترس نہ کھائیں۔

ہم سب تو اس سے جلنے کا پروگرام بنا رہے ہیں۔“ فاران نے صورتحال کلیئر کرنے کی کوشش کی۔

”یہ سارے کام پروگرام بنا کر کرتا ہے مرنے سے پہلے بھی پروگرام بنائے گا۔“ امیر کو فاران سے خاصی پر خاش رہتی

تھی۔

ماہین بے ساختہ ہنسی پڑی تھی۔ اف خدایا کتنے دلچسپ ہیں یہ لوگ۔ بلکہ سارا گھر۔ اب سمجھ میں آیا بجو کا میکے میں دل

کیوں نہیں لگتا تھا۔

”بجو! جواد نے اس کی سمت سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

”تمہاری امی بھی ہم سب بہن بھائیوں کی بجو۔“ اس نے بتایا۔

”اوہ! وہ خاموش سا ہو گیا۔

ماہین کو افسوس ہوا کہ اس کی ماں کا ذکر چھیڑ کر خواہناہ اداس کر دیا۔

”ویسے آپ کو شاید یہ سن کر خوشی ہو کہ خیر آباد کے پروگرام میں میں بھی شامل ہوں۔“

”ج“۔ ماہین کو بے انتہا خوشی ہوئی۔

”بالکل ج! ابھی پاپا میرے ساتھ ہی تھے مجھے کہہ رہے تھے کہ مجھے ضرور چلنا ہے۔“

”اب آئے گا مزاتو“ ورنہ میں سوچ رہی تھی جب تمہارے نانا جان مجھ سے پوچھیں گے کہ بھانجی بھانجے کے ساتھ کیسا

وقت گزارا تو کیا جواب دوں گی۔“

”پتا تو بتا رہے تھے نانا جان بھی آرہے ہیں۔“

”ہاں! مگر ابھی دیر ہے ان کے آنے میں روشنی بھی تو ہمارے ساتھ ہوگی۔“

”پتا نہیں پانے تو کوئی ذکر نہیں کیا۔ باری کے متعلق البتہ کہہ رہے تھے کہ شاید وہ ہمارے ساتھ چلے گا۔ اسے بابا

صاحب کا کوئی کام بھی کرنا ہے ادھر۔“

”وہی میں سوچ رہا تھا بغیر کسی بھاری وجہ کے باری صاحب یہاں سے مل کیسے سکتے ہیں۔ وہ تو بابا صاحب کے آکسیجن

ماسک ہیں۔“ ثمر نے ذرا سی دیر میں خاصا غور و خوص کر لیا تھا۔

”اچھا میں چلتی ہوں تم لوگ اپنی تیاری کرو ویسے تو میں ماما ملی کو بتا کر آئی تھی۔ اگر وہ بتانا..... بھول گئی ہوگی تو سب یہی

سوچ رہے ہوں گے کہ میں ابھی تک سو رہی ہوں۔“

وہ باہر نکل گئی۔

”بڑی بولڈ خالہ ہیں یار..... خالہ.....“ چھوٹے بھیا تو لیے سے سر رگڑتے ہوئے ہال میں داخل ہوئے۔

”آپ کو سوٹ نہیں کر رہا یہ رشتہ۔ آپ انہیں صرف میری خالہ رہنے دیں۔“ جواد شرٹ اتارتے ہوئے تقریباً جھلا کر

بولتا تھا۔

”یار! بڑے لگی ہو۔ ایسی شاندار خالہ! اللہ ہر کسی کو ایسی ہزاروں خالائیں دے۔“ امیر نے دعائیہ انداز میں ہاتھ بلند

کئے۔

”تمنا میں کرنے سے غرض ہے نتیجے کی طرف کبھی دھیان نہیں دیتا۔“ ہزاروں خالائیں..... ہونہ! سالی آدمی گھر

والی ہوتی ہے۔ انسان کو تھوڑی بہت ہمدردی اپنے باپ سے بھی ہونی چاہیے۔“ ندیم نے جھاڑ پلائی۔

اسی وقت کھوکھر نے اندر آ کر ناشتا لگنے کی اطلاع دی تھی اور اب نئے سرے سے آپا دھانی شروع ہو گئی تھی۔ ہر ایک پر

عجلت سوار تھی۔ اس کی خاص وجہ یہی تھی کہ بابا صاحب اکثر انہی سب کے ساتھ ناشتہ کرتے تھے۔

”خان! آپ کو بڑے خان بلارہے ہیں۔“ سرسوتی پیغام دے کر فوراً ہی پلٹ گئی تھی۔

وہ اپنے کسی ضروری کام سے شہر جانے کا پروگرام بنا رہا تھا اور سوچ رہا تھا۔ دس گیارہ بجے تک واپس آجائے گا۔ وہ گہری

سوچ میں مستغرق ان کی خواہ گاہ میں چلا آیا۔ اور اندر داخل ہوتے ہی چونک پڑا۔

روشی کالج یونیفارم میں ملبس بابا صاحب اور یاور علی خان کے درمیان بے چاری سی بیٹھی تھی۔ یاور علی خان حشر معمول اردو اور انگریزی اخبارات میں الجھے ہوئے تھے۔ بابا صاحب روشی سے باتیں کر رہے تھے۔

”آؤ باری کہاں تھے بھئی؟ آج تو صبح سے نظر ہی نہیں آئے۔“

”میں تو یہیں ہوں گھر میں۔ ابھی البتہ باہر جانے والا تھا اور یہی بتانے آ رہا تھا آپ کو.....“

”بہت اچھے۔ بھئی آج روشی کی آنکھ نہیں کھلی جلدی ماما نے بھی نہیں اٹھایا۔ سب بچیاں تو چلی گئیں۔ امتحان نزدیک ہیں چھٹی سے حرج ہوگا۔ تم شہر تو جا رہے ہو یہ اور اچھا ہوا۔ اسے کالج چھوڑتے جانا۔ جاؤ بیٹی تمہارا تو مسئلہ حل ہو گیا۔“ انہوں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

باری نے بمشکل اپنی مسکراہٹ دبائی۔

”بہتر بابا صاحب؟“

”چلیے روشی بی بی! آپ کی جیب لے جاؤں بابا صاحب؟“

”ہاں ہاں وہی لے جاؤ چابی جواد کے پاس ہوگی۔“

وہ پلٹ گیا یہ دیکھے بغیر کہ وہ آ رہی ہے یا نہیں۔ بابا صاحب کا حکم ہو چکا تھا۔ اب تعیل تو ہونا ہی تھی۔ وہ جواد سے چابی لے کر آیا تو وہ جیب کی پچھلی سیٹ پر بیٹھی ہوئی ملی۔

وہ بڑے زناٹے سے جیب لے اڑا۔ کچا راستہ طے کر کے جب بڑی سڑک پر آئی تو رفتار دھیمی کر کے بیک مررینڈ کرنے لگا۔

”اگر تم نے مرر میں مجھے دیکھنے کی کوشش کی تو میں جیب سے چھلانگ مار دوں گی۔“ وہ بھوک شیرنی کی طرح غرائی۔ مرر پر ہاتھ رکھتے ہی وہ اس کی نیت بھانپ گئی تھی۔

اس نے ہاتھ ہٹالیا۔ ایک جھٹک تو بہر حال دیکھ لی تھی۔ وہ رو رہی تھی۔ اس کے دل کو بہت افسوس سا ہوا تھا۔

”آپ کے پپا تو وہیں موجود تھے آپ اپنے دل کی بات ان سے کہہ سکتی تھیں۔ وہ آپ کی سفارش کر سکتے تھے۔“

”نہیں ہیں وہ میرے پپا“ بابا صاحب کو کسی کی بھی پڑھائی لکھائی سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ پپا ہی کی وجہ سے وہ اتنا زور دیتے ہیں۔“

”اور پپا! وہ صرف ڈی سی ہیں۔ ہر شے اے کلاس پسند کرتے ہیں۔ اولاد کو بھی چیز ہی سمجھتے ہیں، کم پڑھے لکھے رہ گئے تو انسٹ ہوگی۔ کالج میں حاضریاں پوری ہونا چاہیں، ورنہ کالج میں سب کیا کہیں گے ڈی سی کی بیٹی کس قدر غیر منظم اور بے ڈھنگی طالبہ ہے۔ خود بھی پتھر کے ہیں اور ہمیں بھی پتھر کا سمجھ..... رکھا ہے۔“

اس کی باقاعدہ سکیاں شروع ہو گئی تھیں۔

”میری ماں کو بھی ان لوگوں نے اسی طرح سکا سکا کر مارا ہوگا اور اب خالہ سے دور رکھنے کی کوشش کرتے رہے

ہیں۔ خود تو کبھی شاید..... خالہ ماموں سے ملانے بھی نہ لے جاتے۔ ان کی مہربانی کہ وہ آگئیں۔ تو بھی ان کے ساتھ وقت گزارنے نہیں دیتے۔“

اب ہچکیاں بندھ گئی تھیں اور باری کیلئے ناقابل برداشت ہو گیا تھا۔

اس نے گھنے درخت کے نیچے جیب روک دی۔ اور آنکھ بچا کر مرر سیٹ کر لیا۔

”آپ اسی طرح روتی دھوتی کالج پہنچیں گی؟“ اس نے اسے مرر میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

”تمہیں کیا۔“

”اور جو راستے میں کسی نے مجھے پکڑ لیا کہ ساتھ بیٹھی لڑکی روتی کیوں جا رہی ہے؟“

”اپنی آنکھوں سے رو رہی ہوں کسی کو کیا تکلیف ہے۔“ وہ بگڑاٹھی۔

”مگر دیکھنے والے تو مجھے ہی ذمہ دار سمجھیں گے۔“ وہ زچ ہو گیا۔

”تو تم ہی تو ہو ذمہ دار۔ اگر ذرا سا ساتھ دے دیتے..... اچھا بس بات نہیں کرو مجھ سے۔ میں رونا چاہتی ہوں۔ مجھے رونے دو تمہیں کیا تکلیف ہے؟“

”یہی تکلیف ہے۔ جیب چلاتا مشکل ہو رہی ہے۔“ وہ بڑبڑایا۔

”باری! مجھے یہیں اتار دو۔ نہ میں کالج جاؤں گی نہ گھر۔ یہیں کسی کنوئیں میں چھلانگ مار دوں گی۔“ وہ جیب سے اترنے لگی۔

باری نے بڑی پھرتی سے گھوم کا اس کا بازو دبوج لیا۔

”ہوش میں تو ہیں آپ؟“ اسے سچ مچ غصہ آ گیا ”باری پلیز!“ وہ اس کے بازو سے چہرہ نکا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ وہ سوچتی نظروں سے اسے بغور دیکھنے لگا۔

یقیناً اس پر اعلیٰ درجے کا ڈپریشن طاری تھا۔

”شٹی! کیا عین سڑک پر تماشا بنوائیں گی آپ؟ آپ سے درخواست کر رہا ہوں کہ آگے آجائیے کیونکہ اس طرح کی صورتحال میں مجھ سے ڈرائیونہ ہو سکے گی..... پلیز روشی!“

وہ خاموشی سے سکیاں بھرتے ہوئے اس کے برابر آ کر بیٹھ گئی۔ باری اس وقت شدید دکھ کی کیفیت میں مبتلا تھا۔

”روشی! اگر میں یہ کہوں کہ آپ کا ایک ایک آنسو مجھ پر عذاب بن کر نازل ہو رہا ہے تو کیا آپ مجھ پر رحم کریں گی؟“

”سب لغاعی ہے کسی پر کسی چیز کا اثر نہیں ہوتا میں تو خونی رشتوں کو بھی دیکھ چکی ہوں؟“ وہ پھنکاری۔

”مجھتیں عنایتیں تلاش کرنے اور غور کرنے سے نہیں ملا کر تیں قسمت سے ملتی ہیں۔“

”تمہاری عنایت بھی میں نے دیکھ لی۔ ایک تم پر ہی بھروسہ تھا۔ تم سے ہی تو امید تھی اسی لئے تو ہر مسئلے پر دوڑی دوڑی تمہارے پاس جاتی تھی۔ مجھے ہمیشہ سے یونہی محسوس ہوتا تھا کہ میرا کوئی بھی مسئلہ ہوگا اور تم منٹوں میں حل کر دو گے۔ مگر نہیں تم بھی اسی سسٹم کا ایک پرزہ ہو۔ اب مجھے تم سے کبھی کوئی امید نہیں ہوگی۔“

”مت بولواتا دل میں آگ لگی ہو تو کسی بات کا اثر نہیں ہوتا۔“ اس نے تلخی سے باری کی بات کاٹ دی۔
 ”تم مجھے کالج کے گیٹ پر اتار دینا، مگر میں اندر نہیں جاؤں گی۔ اس کے لہجے میں ضد تھی۔
 ”پھر کہاں جائیں گی؟“ اس نے حیرت سے مگر برہم انداز میں اس کی طرف دیکھا۔
 ”جہاں میرا دل چاہے گا۔“ وہ اطمینان سے گویا ہوئی۔
 ”کہیں کا نہیں رکھے گا آپ کو یہ دل۔“ وہ ناراضگی سے کہہ رہا تھا۔
 ”تمہیں کیا، تمہیں کون سی میری پرواہ ہے۔“ وہ ناراضگی سے بولی۔
 ”تو پھر ایسا کرتا ہوں یہ جیب کہیں دے مارتا ہوں یہ سب سے اچھا حل ہے سب مسئلے ختم۔“
 ”مگر تم کیوں نقصان کا سودا کرتے ہو؟“ وہ استہزائیہ انداز میں بولی۔
 ”تو پھر اس کا مطلب ہے دو بجے تک میں کالج کے گیٹ پر ہی موجود رہوں؟“ اس نے طویل سڑک پر پہلا موڑ کاٹا۔
 ”فائدہ.....!! اس کالج میں تو تین گیٹ ہیں۔ دو بڑے اور ایک چھوٹا۔“ وہ دل جلانے والے انداز میں ہنسی۔
 ”شہر پہنچتے ہی پہلا کام یہ کرتا ہوں کہ گھر فون کر کے یاور چچا کو بلاتا ہوں وہ خود سنبھالیں گے۔“ اس نے گویا دھمکی دی۔
 ”بلاؤ۔“

”آپ کیا چاہتی ہیں؟“ وہ جھلایا۔

”باری! تمہیں مجھ سے ذرا ہمدردی نہیں؟“ وہ پھر رونے کو ہو گئی۔

باری نے گردن موڑ کر اس کی سمت دیکھا۔

”مجھے اتنا مت بلوائیں کہ منہ سے کچھ سرزد ہو جائے۔“ وہ آہستگی سے گویا ہوا۔

”کیا مطلب؟“ اسے واقعی کچھ سمجھ میں نہ آیا تھا۔

”مطلب یہ کہ مجھے میری اوقات میں رہنے دیں۔“ اس کی نظریں سامنے جمی ہوئی تھیں۔

روٹی نے اس کی سمت بغور دیکھا۔

”آف دہائنٹ شلوار سوٹ میں بلبوس آنکھوں پر سن گلاسز چڑھائے گرمی کی وجہ سے قمیض کی آستینیں کہنیوں تک پلٹے۔
 وہ بہت شاندار نظر آ رہا تھا۔

”اگر تمہاری امی ہوتیں تو تمہیں دیکھ کر کتنا خوش ہوتیں۔“ اس کی رو بہک گئی۔

”کیوں؟“

”تم بہت سمارٹ ہو؟“ وہ معصومیت سے کہہ رہی تھی۔

باری مسکرا دیا۔

”آپ کی اطلاع کیلئے عرض ہے۔ ماں اپنے بچے سے کسی وجہ سے محبت نہیں کرتی وہ بس محبت کرتی ہے چاہے اس کی
 اولاد بد شکل ہو یا خوش شکل۔“

”میرے سینے میں بھی ایک دل ہے روشنی اتنا آزما بھی اچھا نہیں ہوتا۔“ اس کے لہجے میں بے حد شائستگی تھی۔

”کیا مطلب ہے تمہارا؟“ وہ حیرانی سے اسے دیکھنے لگی۔

”یہی کہ میں ایک انسان ہوں۔ باتوں کے زخم مجھے بھی اسی طرح کھاتے ہیں جیسے دوسرے انسانوں کو۔ مگر آپ کو میری
 پرواہ کیوں ہو؟“ اس نے اسپید بہت آہستہ ردی تھی۔

”مجھے اب دنیا کے کسی انسان پر بھروسہ نہیں۔ میں اپنوں کی زخم خوردہ ہوں۔“ وہ پھٹکاری۔

”آپ اپنی سوچ پہ مختار ہیں جو چاہے سوچ لیں۔“ اس نے بے دلی سے کبیر بدلا۔

”تم بہت لگی ہو باری! تمہارا یہاں کوئی خونی رشتہ نہیں۔ تم بہت سارے تکلیف دہ انکشافات سے محفوظ ہو۔ تم میرے
 مسائل نہیں سمجھ سکتے۔“ اس نے چادر سے آنکھیں پونچھ ڈالیں۔

”انسان کو غلط فہمی بھی ہو سکتی ہے۔“ باری نے ایک اچھتی نگاہ اس پر ڈالی۔

”ہونہہ! غلط فہمی، کلیجہ میرا پھٹتا ہے۔ راتوں کو میں جاگتی ہوں خون کے آنسو میری آنکھوں سے بہتے ہیں۔ یہ سب غلط
 فہمی کا کرشمہ ہے۔ جو چیز جو بات غلط محسوس ہوتی ہے وہ اگر محض وہم ہو تو کچھ عرصے بعد سچائی ثابت ہو ہی جاتی ہے۔ یہ کیسی
 مسلسل غلط فہمی ہے۔“ وہ تلخی سے بولی۔

باری نے نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبایا۔

”باری!“

”جی؟“

”یہ جوڑکیاں گھروں سے بھاگتی ہیں سب کی سب فلم ایکٹریس بننے کیلئے تھوڑا ہی بھاگتی ہوں گی۔ میری جیسی بھی ہوں
 ہیں جو زنجیریں توڑنا چاہتی ہوں گی۔“

”شٹ اپ پلیز۔ کیا وہی تباہی شروع کر دی ہے آپ نے؟“ وہ برہم ہو گیا۔

”تم کرو نمک حلائی کون روک رہا ہے تمہیں مگر میں سچ کہہ رہی ہوں۔“

وہ اٹل تھی۔

”اللہ کا شکر ادا کریں اس نے آپ کو عزت داروں میں پیدا کیا۔ روٹی کپڑے کے مسئلے سے بے نیاز کیا۔ سلام لے
 والوں میں شامل کیا۔ محض ایک آدھارا مان رہ جانے پر سارا ملیا میٹ تو نہ کریں۔“

اس دنیا میں کروڑوں اربوں لوگ ہیں جو روٹی کے مسئلے میں الجھ کر بھی باعزت زندگی کی جدوجہد کرتے ہیں کتنے لڑکے
 لڑکیاں ایسی ہیں جو مسائل کے انبار میں دبے ہوئے ہیں اور ساتھ اپنی تعلیم کے بندوبست میں بھی الجھے رہتے ہیں۔ گھنڈ
 دھوپ میں چلتے ہیں۔ لالٹینوں میں ساٹھ پاور کے بلب میں راتوں کو جاگ کر پڑھتے ہیں۔ جبکہ اگلے دن انہیں صرف امتحان
 ہی دینا نہیں پڑتا۔ روٹی کی فکر بھی کرنا ہوتی ہے۔ آپ حاصل نعمتوں پر شکر ادا کرنا شروع کر دیں ناشکری کی فرصت نہیں ملے
 گی۔“

”باری! تم اور چھوٹے بھیا تو کوا بچو کیشن میں پڑھتے تھے۔ تمہیں لڑکیاں پسند تو کرتی ہوں گی؟“
باری نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اس کی توجہ ادھر ادھر ہوئی رونے پینے کا عمل تو تمام ہوا۔
”ہاں! بعض تو ابھی بھی فون کرتی ہیں“ وہ مسکرا دیا۔
”کیوں؟“

”پسند جو کرتی ہیں۔“

”پھر تم کیا کہتے ہو؟“ اس نے اچھتی نظر اس پر ڈالی۔

”یہی کہ شادی تو میں اپنی پسند سے کروں گا۔“

”تم کسی کو پسند کرتے ہو؟“ اس کے دل کو جانے کیا ہوا۔

”بھئی کیا پتا کون کب پسند آجائے۔“

”تمہارے خیال میں تمہاری دلہن کیسی ہونی چاہیے؟“

”سناڑھے پانچ فٹ قد ہونا چاہیے اور سوا پانچ فٹ لمبے بال۔ چہرہ ایسا ہو جسے دیکھ دیکھ کر دل نہ بھرے۔“

”سوا پانچ فٹ لمبے بال؟“ روشی کی آنکھیں پھیل گئیں۔ اس نے لاشعوری طور پر اپنے کٹے ہوئے بالوں پر ہاتھ

پھیرا۔ (چادر کے اوپر ہی سہی۔)

”پھر تو تمہاری شادی کبھی نہیں ہوگی۔ اتنے لمبے بال تو شاید ہی کہیں ہوں۔“ اس نے مایوسی سے کہا۔

”آپ ٹمکنیں نہ ہوں ہے ایک ایسی لڑکی۔“ اس نے گویا تسلی دی۔

”کہاں؟“

”زمین پر۔“

”ظاہر ہے آسمان پر تو ہونے سے رہی۔“

”نہ جانے کیوں اس کا موڈ آف ہو گیا۔“

”نام کیا ہے؟“ وہ بددلی سے پوچھ رہی تھی۔

”جلدی کیا ہے۔ نام بھی بتا دیں گے بلکہ ملوا بھی دیں گے۔“ وہ شرارت سے مسکرا رہا تھا۔

روشی چپ ہو گئی تھی۔

”کالج آنے والا ہے۔“

”تم چلے جانا اندر میں تو بیٹھی بیٹھی رہوں گی۔“ وہ پھراڑ گئی۔

”کہاں بیٹھی رہیں گی؟“ وہ حیران ہوا۔

”جیپ میں اور کہاں۔“ وہ جھٹائی۔

”اور جو میرا کام ہے وہ کب کروں گا؟“

”تو پھر اپنے کام سے چلو۔ جہاں تم جاؤ گے میں تمہارے ساتھ جاؤں گی۔“

”مجھے تو آج اس کے پاس بھی جانا تھا۔“ اس نے مسکراہٹ روک کر قدرے سنجیدگی سے کہا۔

”تو مجھے بھی ملو اونٹاں اس سے۔“ اس نے آہستگی سے کہا۔

”ابھی نہیں پھر سہی۔“ اس نے اسپنڈ ایک دم بڑھادی۔

روشی ایک دم چپ سی ہو گئی جیسے الجھ سی گئی ہو۔

باری نے خاصی دیر اسے مخاطب نہیں کیا وہ سامنے بھی نہیں دیکھ رہی تھی۔ سر جھکائے کسی خیال میں گم تھی۔

”کیا سوچ رہی ہیں؟“ اسے جیسے روشی پر ترس آ گیا۔ جیپ کے رخ ماحول میں جیسے باد نسیم چلنے لگی تھی۔

بعض اوقات کسی کی چپ کتنی خوشگوار ہوتی ہے۔ لاکھوں خطیبوں کے خطاب پر بھاری۔

”سوچ رہی ہوں بعض لوگ کتنے خوش نصیب ہوتے ہیں۔ کتنی آسانی سے محبت اور توجہ حاصل کر لیتے ہیں اور بعض

انسان کتنے برتر اور معزز ہوتے ہیں مگر کتنے محروم ہوتے ہیں۔“ اس کے لہجے میں عجیب سادہ تھا۔

”باری!“

”جی!“

”وہاں حویلی میں ہر کوئی تمہیں عزیز رکھتا ہے کیسا لگتا ہے تمہیں؟“

”بہت اچھا لگتا ہے تا بعد اوروں سے سب اسی طرح محبت کرتے ہیں۔“

اس کے لہجے میں نامعلوم سی جھین در آئی۔

”کالج آ گیا ہے۔“ اس نے گیٹ کے سامنے جیپ کو بریک لگائے۔

”تم پڑھ لو میرے حصے کا جاکر کہہ دو یا تمہیں کہ نہیں جاؤں گی۔“ وہ پھر سے کاٹ کھانے کو دوڑی۔

”گھر کی دوسری لڑکیاں بھی کالج میں موجود ہیں بابا صاحب کو پتا چل جائے گا۔“

”تو چل جائے۔“ اس نے ضدی انداز میں باری کی بات کاٹ دی تھی۔

”میرے بارے میں بھی کچھ سوچئے۔“ وہ بے بسی سے کہہ رہا تھا۔

”میرے پاس فالو وقت نہیں ہے بے کار باتیں سوچنے کیلئے۔ تمہارے بارے میں تو وہی ”لمبے بالوں“ والی سوچے

گی۔ جس کی شامت نے دھکا دیا ہے۔“

وہ تلخی سے کہہ کر اطمینان سے پھیل کر بیٹھ گئی۔

باری کی مسکراہٹ بڑی بے ساختہ تھی۔

”روشی پلیز! آج کالج چلی جائیے۔ آئندہ میں آپ کے ہر گھریلو جھوٹ میں آپ کا ساتھ دوں گا۔“ مہینے میں دو چار

مرتبہ آپ کو۔ دو میٹنگ کروا کر چھٹیاں دلوا دیا کروں گا۔

آپ کے کسی من پسند رشتے دار کی آمد پر آپ کی سخت طبیعت خرابی کا اشتہار مشتہر کر دیا کروں گا۔ آپ کے ہر معمولی

نزلہ وز کام کو ایک سودو بخار میں تبدیل نہ کر دوں تو میرا نام باری نہیں۔ پلیز روشی صرف آج۔“

”اچھا میں کالج میں خشک لیکچر سنوں اور تم اس ”لبے بالوں والی کے ساتھ مزے اڑاؤ۔“

وہ تو دوسری طرف سے پٹری سے اتر گئی تھی۔ ذرا اس سے مس نہ ہوئی۔

”آپ کے سر کی قسم۔ آپ کی اجازت کے بغیر نہیں جاؤں گا اس کے پاس۔“ اس نے گویا اپنا سر پیٹ لیا تھا۔

روشی بڑے تقاخر سے مسکرائی۔

”پھر اب کہاں جاؤں گے؟“

”ایک ضروری کام ہے اور بھی کام ہیں زمانے میں محبت کے سوا۔“ وہ بے چارگی سے بولا۔

”باری! تم مجھے پتا کر کالج میں بھیج رہے ہو اگر آئندہ تم نے بہانہ بنانے میں میرا ساتھ نہ دیا تو میں بڑی بھیانک بد کروں گی۔“ اس نے دھمکی دی۔

”مثلاً.....!“ وہ مسکرا رہا تھا۔

”یہی کہ اللہ کرے اس کے سر میں خشکی ہو جائے اس کے سارے لبے بال گر جائیں۔“

باری کا تہقہ بے ساختہ اور بھرپور تھا۔

وہ جیب سے اتر گئی تھی۔

باری نے اس کی فائل اور کتا میں آگے کو جھک کر اسے تھما دیں۔

”باری! تم یہ مت سمجھنا کہ میں ہار گئی ہوں۔ میں صرف تمہاری خاطر اپنی ضد توڑ رہی ہوں اس لئے کہ ادھر سب بہ

بے رحم ہیں۔ جانے تمہارے ساتھ کیا کریں۔“ اس نے کھٹاک سے جیب کا دروازہ بند کیا۔

”میری خاطر.....؟“ وہ مسکرا دیا۔

”ابھی تو بہت مزے ہیں روشا نے یا در علی خان! کہیں اپنی ”خاطر“ پہ لگا دیا تو..... ہم اپنے ضبط اور ظرف کو آزمائے گئے۔ پر تمہیں مشکل میں نہیں ڈالیں گے۔“

”یہ کیسے پھول کھلائے ہیں میرے چہار سو..... کہ بجائے مہک کے تپش آرہی ہے۔“

اس نے انجن اشارت کیا اور بڑے ڈھیلے ڈھالے انداز میں ایکسیلیٹر پر پاؤں دے مارا تھا۔

”کیا سوچ رہے ہو؟“ وہ اس کے قریب بیٹھ گیا

”دیوانے کے خواب..... مثلاً

اف وہ روئے تابناک و چشم تر میرے لئے

ہائے وہ زلف پریشاں تا کمر میرے لئے

وہ شعر پڑھتے ہوئے ہنس دیا۔

”اس حال میں بھی ایسا سوچتے ہو۔“ اس نے ہمدردانہ نظر اس کے وجود پر ڈالی۔

”اس حال ہی میں تو ان خوابوں کا مزہ ہے مگر تم کیا جانو۔“

”بھائی! زندگی خراب کر رہے ہو کچھ آگے کا بھی سوچو۔“ اس نے مخلصانہ مشورہ دیا۔

”کیا سوچنا ہے آگے کا جو سوچنا تھا۔ سوچ لیا۔ مست از سرشار است ہیں۔“

جو جہنم میں بھی فردوس بداماں ہوں گے

دیکھ لینا وہ ہی سوختہ ساماں ہوں گے

وہ تنہی سے ہنس دیا ”تم سناؤ یا ر! کیسی زندگی گزر رہی ہے؟“

”تمہاری مرضی کی گزر رہی ہے۔ اب تو ذرا چلتا ہوں تو ٹانگیں جواب دے جاتی ہیں۔ سوچتا ہوں میرے مرنے کے

بعد گھر والوں کا کیا ہوگا؟“ وہ آزدگی سے گویا ہوا۔

”لڑکی کہیں مانگی ہوئی ہے؟“

”کون مانگنے آتا ہے غریب کی بیٹی اب تو دن رات یہی فکر ہے کوئی اچھا بر ملے تو اس کے ہاتھ پیلے کر دوں۔“ وہ

یاسیت سے آسمان تکنے لگا۔

”تیرے اپنے بھی تو ہوں گے۔“

”اندھیرے میں تو سایہ بھی ساتھ چھوڑ جاتا ہے کہاں لاؤں اپنے.....؟“

”لال خان بھی آج کل شادی کے چکر میں ہے۔“

”کیا ہانک رہا ہے؟ میری لونڈیا تو مشکل سے انیسویں میں لگی ہوگی۔“ اسے غصہ آ گیا۔

”جہیز نہیں لے گا روپے پیسے کی کمی نہیں ہے۔ عمر کی بات چھوڑ، مرد تو ساٹھا اور پاٹھا ہوتا ہے۔“

”بھائی، کوئی عمر نہیں نکلی جا رہی، تین مردہ دفن کئے ہیں ایک زندہ دفن کر دوں؟“

وہ مزید بھڑک گیا۔

”ارے تیری سوچ کا پھیر ہے عیش کر گئی تیری لونڈیا۔“ وہ بے نیازی سے کہہ رہا تھا۔

”بڈھے کے ساتھ؟“ وہ مزید مشتعل ہوا۔

”میرے جیسے دس جوانوں پہ بھاری ہے وہ..... ہائے ہماری گمشدہ جوانی

کیا کہیے کس طرح سے جوانی گزر گئی

بدنام کرنے آئی تھی، بدنام کر گئی

دیکھ بھئی غریب کے مکان میں راستے بہت ہوتے ہیں، کب تک کرے گا لونڈیا کی حفاظت؟ اپنی زندگی میں اس کی

شادی کر دے وقت کا کیا بھروسہ ہے۔“

”یہی تو میں چاہتا ہوں، مگر کوئی ڈھنگ کا رشتہ ملے تو۔“

”پتا نہیں تم ڈھنگ کا رشتہ کسے کہتے ہو؟ لال خان زربچہ ہے پیسے میں کھیلتا ہے، بھوکا نہیں مارے گا تیری لونڈیا کو۔“
 ”نہ بھائی! عمر کا بڑا فرق ہے، تیری عمر کا بھی ہوتا تو کوئی بات نہیں تھی۔“ اس نے سوچتے ہوئے جواب دیا۔
 ”بس تو پھر بیاہ دی تو نے لڑکی۔“ اس نے گھاس نوچتے ہوئے مایوسی سے کہا۔

”خون ڈال رہا ہوں گھر کے چراغ میں روشنی ہو ہی جائیگی۔ اس نے نقاہت بھرے لہجے میں جواب دیا۔
 ”واہ بھئی واہ! کیا ڈائیلاگ مارا ہے، مگر بھائی ڈائیلاگوں سے لڑکی کی شادی نہیں ہوگی، میں تو خود تیری بیٹی کا رشتہ ماں
 لبتا پر مردوں کی شادیاں نہیں ہوتیں۔“

”یہ تو تیرے اپنے کرن ہیں، مجھے تو بڑا ترس آتا ہے۔“ اس نے دکھ سے اس ہڈیوں کے ہنجر پر نظر ڈالی۔
 ”دیکھ، بھائی غلام احمد! مذاق نہیں کر رہا ہوں تجھ سے۔ گھر والی سے بات کر کے دیکھ، شاید اسے یہ بات سمجھ
 آجائے۔“

”ہاں اب تو میرے گھر میں فساد ڈلوادے۔“ اس نے تلخی سے جواب دیا۔

”تو مجھے گھر لے چل میں کر لیتا ہوں بات۔“

”سارے گھر کے برتن توڑ ڈالے گی تجھ پر..... تجھے اس کا پتا نہیں ہے.....“ اس نے اس کی تانکھی پر گویا ماتم کیا۔
 ”دیکھ غلام احمد! آج لال خان جیسے قسمت سے تیرے دروازے پر دستک دے رہا ہے، تو کیوں اپنی اولاد کا دشمن ہو رہا
 ہے۔ اپنے جیسے نصیب کا داماد دیکھ رہا ہے، جو خون بچ بچ کر وقت سے پہلے ہی بوڑھا ہو جائے۔“

”یہ کوئی ضروری تو نہیں۔“ وہ واقعی مایوس نہیں تھا۔

”تیرے گھر میں تیسرے دن گوشت پکنے لگا ہے، نواب پہنچنا شروع ہو جائیگے اب۔“

”وہ تلخی سے ہنسا۔ غور کر میری بات پر۔“

وہ سوچ میں گم ہو گیا۔

”کیا سوچنے لگا؟“ عارف کو اپنی بیرسٹری پر بڑا بھروسہ رہتا تھا۔ اس کی آنکھیں معنی خیز انداز میں چمکنے لگی تھیں۔

”سوچ رہا ہوں، شاید تو ٹھیک کہہ رہا ہے۔ بات کر کے دیکھوں گا گھر والی سے۔“

”یہ ہوئی بات..... بات ہی نہیں کرنی اونچ نیچ بھی سمجھاتا ہے۔“ اس نے پتا پھینکا۔

وہ سر ڈال کر پھر گہری سوچ میں غرق ہو گیا۔

جنوں سے معصوم کون سی چیز ہے بتا دے

وفا کے شعلوں کو سرد کرنا ہے، آگ لا دے

دل حزیں کو تیرا یہ پیغام ڈس رہا ہے

کہ میں نے تجھ کو بھلا دیا، تو مجھے بھلا دے

عارف کی آواز میں دل چیرنے والا سوز تھا۔ وہ خیال سے چونکا تھا۔ دھموتی عارف کی آنکھوں کے گوشوں سے ٹوٹ کر

گرے تھے۔ جو اس نے دیکھ لئے تھے۔

ساڑھے گیارہ یا گیارہ کا عمل تھا۔ جب اس نے گاڑیوں کے اشارت ہونے کی آواز سنی تھی۔ نیند ضرور ٹوٹی تھی۔ مگر شاید
 مکان کی وجہ سے دوبارہ غافل ہو گئی تھی۔

مگر اس بار ایک دم ہڑبڑا کر جاگی تھی۔ یوں محسوس ہوا تھا جیسے پردے کے پیچھے مقفل دروازے پر کوئی دھڑام سے آکر
 گرا ہو۔ دھپ کی آواز کے ساتھ رنجیر کے چھٹکنے کی آواز بھی واضح تھی۔ وہ چھلانگ مارنے کی صورت میں بستر سے نیچے آئی
 تھی۔ دل بری طرح دھک دھک کر رہا تھا۔ وہ سیدھی دروازے سے ملحق بند درتیکے کی طرف آئی تھی۔ شیشوں کے اس پار
 پردہ ہٹا کر بھی کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس نے در پچہ نیم وا کر کے باہر جھانکنے کی کوشش کی۔

”باری! خدا کیلئے میرے حال پر رحم کرو، میں کہیں نہیں جا رہی، بس کھلی ہوا میں ذرا سانس لے رہی ہوں۔ دیکھو میرے
 پاؤں میں رنجیر موجود ہے، اتنا وزن اٹھا کر کہاں بھاگوں گی؟“ (ہچکیاں اور سسکیاں.....)
 مابین کی توانائیں جیسے بے جان ہو رہی تھیں۔

”وسلام۔ یہ یہاں کیا کر رہی ہے؟“ آواز میں بلا کی گھمبیر تھی۔

”باہر آگئی جانے کیسے۔ سن نہیں رہی۔“ یہ جیسے شکایت تھی۔

”اب بھی اس کے دماغ ٹھکانے نہیں لگے۔ اور کیا چاہتی ہے؟“ لہجے میں سخت برہمی تھی۔

”اس کی بیڑیاں کھولنا بند کر دو۔ یہ اس قابل نہیں کہ اس کے ساتھ ذرا سی بھی رعایت کی جائے۔“ بلا کی ناراضگی تھی۔

عورت نے آگے بڑھ کر آنے والے کے پاؤں تھام لئے۔ ”آپ کی گناہ گار ہوں، آپ ہی رحم کریں گے تو جان چھوڑے گی۔“

”سب سے آخر میں آج تمہاری کوٹھڑی میں کون گیا تھا؟“ نوار کے لہجے میں غضب بھی تھا اور سوال بھی۔ بڑی حقارت سے اس نے پاؤں پیچھے ہٹائے تھے۔ وہ سکتی رہی۔

”کیا پوچھ رہا ہوں؟“ نوار کے لہجے میں پھنکار تھی۔

”سرسوتی کھانا لائی تھی۔“ میرے خان۔ بڑا نہ سمجھ میں آنے والا سا نکل تھا۔

”باری۔ سرسوتی اگر سوچتی ہے تو اسے اٹھاؤ۔ اس کے ساتھ اس کی کوٹھڑی میں دو دن کے لئے بند کر دو۔ اسے کھانا دینا

رہو۔ سرسوتی کا بند کر دو جب وہ کوٹھڑی سے باہر آئے گی تب ہی کھانا کھائے گی۔ چلو اٹھو جاؤ کوٹھڑی میں۔“ لہجہ واضح اور

تھکسانہ تھا۔

”عورت کھڑی ہوگئی۔“ ایک بار کہہ دیں کہ آپ نے مجھے معاف کر دیا۔ پھر چاہے میری جان لے لیں۔ آپ کا نام

سوئی چڑھوں۔ زندہ جلوں۔ دیوار میں چنوا دی جاؤں۔ پتھر کھاؤں۔“

”شٹ اپ۔“ نوار نے خاصے بلند آواز سے اسے ٹوکا۔

”دیکھ رہے ہو باری؟ نان سنس۔ اسے لے جاؤں یہاں سے۔ فارگا ڈسک۔“ نوار نے جیسے بمشکل اپنے

غضب پر قابو پایا تھا۔

عورت دھیرے دھیرے چلتے ہوئے پچھلے حصے کی طرف بڑھی۔ اس کی سسکیاں ماحول میں ایک دکھ کا دل ہلا دینے

کا اثر بکھیر رہی تھیں۔ اس پر مستزاد بیڑیوں کی جھنک۔

”میں نے سنا ہے گھر میں مہمان آئے ہیں؟“ نوار دجائے جاتے پھر باری کی سمت پلٹا۔

”غیب احمد کی سب سے چھوٹی صاحبزادی آئی ہوئی ہیں۔“ باری کی آواز ہنوز دھیمی تھی۔

”یاد رہائی یہ ہیں؟“

”جی۔“

”کتنے دن سے چھٹیوں پر ہیں؟“

”پانچ دن ہو گئے ہیں۔“

”اجہا۔۔۔ میں چلتا ہوں۔ پھر آؤں گا۔“

”اتنی رات کو پھر واپس جا رہے ہیں؟“ باری نے حیرت سے سوال کیا تھا۔

”ہم چند دوست یہاں شکار پر آئے تھے۔ وہ ساتھ والے گاؤں میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ تم مت ذکر کرنا میرے آنے

کا۔ دو چار دن بعد آ جاؤں گا۔ اور ہاں ”اس کا“ دھیان رکھا کرو۔ بعض اوقات بچے اسٹڈی کی وجہ سے جاگ رہے ہوتے

ہیں۔“

سرسوتی کو سزا ضرور ملنی چاہیے۔ بابا صاحب پوچھیں تو بتا دینا میں نے کہا ہے۔“

”بہتر۔“ باری گردن موڑ کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔ جہاں عورت گئی تھی۔

نوار نے چند منٹوں بعد ہی جیب بیک کی تھی اور باری نے پھانک کھول دیا تھا۔

ماہین تو کھڑے کھڑے جیسے پتھر ہو گئی تھی۔

دل اس طرح دھک دھک کر رہا تھا جیسے اندر نوبت بج رہی ہو۔

وہ اپنے آپ کو تقریباً گھسیٹتی ہوئی بستر تک آئی۔

کون تھی یہ عورت؟

بہن ایک دم منظر سے غائب ہوئی تھی اس طرح کا شک پیدا ہو جانا کوئی انوکھی بات نہیں تھی۔ مگر باری کا اس کے ساتھ

طرز کلام کی طرح ”سابقہ مالکین“ ہونے کا پتا نہیں دے رہا تھا۔ بلکہ باری کا انداز ماکانہ آزادانہ اور قدر تحکمانہ تھا۔

پھر کون ہے؟

آنے والا کون تھا؟

اپنے انداز سے تو یہاں کے حاکموں میں سے ایک لگتا تھا۔

آیا تھا۔ تو چلا کیوں گیا؟

عورت اسے فوراً پہچان گئیں۔ اس کا انداز بتا رہا تھا۔ وہ کس بات کی معافی مانگ رہی تھی؟

مابین کو یوں محسوس ہوا اس کے دماغ کی شریانیں پھٹ جائیگی۔ اس نے پاس رکھے سے گلاس میں پانی اٹھایا اور ایک

سانس میں پی گئی۔ قدرے بجالی محسوس ہوئی۔ نیند کا تو اب دور دور پتا نہ تھا۔ کیا باری آنے والے کا حکم بجالائے گا۔ سرسوتی کو

جنگائے گا۔؟ ذہن نے ایک دم پلٹا کھایا۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ اب اس کے قدم دروازے کی سمت اٹھ رہے تھے۔ وہ

دروازے کے پاس ٹھہر گئی۔

ٹانگی کے گلے میں بڑی ڈوری لوز ہو رہی تھی۔ اس نے ڈوری کھینچ کر گھانٹا کیا اور بہت آہستگی سے دروازہ کھولا۔ مگر

خوف و وحشت سے ایک ٹائیے کو اپنی جگہ جم کر رہ گئی۔ دروازہ باہر سے بند تھا۔ اس نے وحشت زدہ ہو کر دروازے کو دو تین

جھٹکے دیئے۔ مگر وہ کسی گہرے راز کی طرح مقفل تھا۔

دو دھیرے دھیرے چلتی ہوئی واپس اپنے بستر پر آ گئی۔

بچو۔۔۔ آپ پر کیا گزری تھی؟ کتنا تانا بانوس اور سفاک ماحول ہے اجنبیوں کیلئے۔ وہ آڑی ترچھی بیڈ پر ڈھکے گئی۔ کچھ دیر

”شکرانے تو اب تم پڑھو گے۔“ روشی نے تیزی سے اس کی بات کاٹ دی۔

”آ رہے ہو مجھے لینے یا کراچی آؤ گے میری ڈیڈ باڈی لینے۔ ظاہر ہے بابا صاحب مجھے جاگیر سے باہر تو دفن نہیں کریں گے۔“

”گلو بے بات کرائیں۔“ وہ واقعی پریشان ہو گیا۔

”وہ بورڈنگ کارڈز کے چکر میں مجھ سے خاصی دور ہے۔ یوں بھی بات کرنا بے کاری ہے۔“ اس نے ریسور رکھ دیا تھا۔

باری ریسور کو گھورتا رہ گیا۔ وہ سخت تشویش میں مبتلا ہو گیا تھا۔ وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس کی چال بہت آہستہ تھی۔ وہ ڈھیلے ڈھیلے ہاتھوں سے اپنے گریبان کے بٹن کھولتا ہوئے زینہ طے کر رہا تھا۔

سب کی سب گھوڑے بیچ کر سو رہی تھیں۔ یہاں والے مستقل ملازمین اور ساتھی آئی ہوئی کلو ان کے جاننے کے انتظار میں اپنے کئی کام روکے بیٹھے تھے کہ خدا معلوم کب محشر جاگ اٹھے اور ناشتے کا رن پڑے

”آپ جب سے آئی ہو بی بی اسی طرح بیٹھی ہو۔ چائے لاؤں آپ کیلئے؟“ کلو نے اس کے چہرے سے اس کے موڈ کا اندازہ لگا لیا تھا۔ لہذا ڈرتے ڈرتے پوچھ رہی تھی۔

”اپنے پاس رکھو اپنی چائے۔“ وہ پلٹ کر غرائی۔ کلو بے چاری اٹنے پاؤں دوڑ گئی۔

روشی نے چاروں طرف دیکھا اور فون کی طرف بڑھی۔ فون گلو کے قریب تھا جو بے سدھ سو رہی تھی۔ اس نے نمبر ڈائل کیا اور دوزانو ہو کر بیٹھ گئی۔

”ہیلو۔ دوسری طرف ماما ملی تھی۔“

”ماما۔“ خالہ سو رہی ہیں یا جاگ رہی ہیں؟“

”ہاں نہیں بی بی۔ میں کافی دیر سے بچوں کو ناشتا کر رہی ہوں۔“ ان کا اشارہ لڑکوں کی طرف تھا۔

”اتنی لیٹ ہو گئیں آج۔“ روشی کو حیرت تھی۔

”بابا صاحب ”سرائے“ گئے ہوئے ہیں آج پانچ بجے صبح سے۔ سب کے مزے آئے ہوئے ہیں۔“ وہ ہنس کر بتا رہی تھی۔

”ہائیں۔ اچھا۔ کہیں باری تو ان کے ساتھ نہیں گیا؟“ اس کا دل بڑے زور سے دھڑکا۔

”نہیں..... وہ نہیں گئے۔“

”اچھا ذرا بلا دو۔“

”آپ ہولڈ کریں۔ بلائی ہوں۔“

روشی بے چینی سے انتظار کرنے لگی۔ ساتھ ساتھ گلو کو بھی دیکھتی جاتی تھی۔

پہلے کے واقعات بار بار کسی فلم کی طرح ذہن کی اسکرین پر متحرک ہو رہے تھے۔ بظاہر اس کی آنکھیں چھت کو گھور رہی تھیں۔

ٹرن۔ ٹرن۔

وہ سرسوتی کو کوٹھڑی میں پہنچا کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ فون کی گھنٹی نے اسے آگے بڑھنے سے روک دیا۔

وہ زنانہ ہال کمرے میں داخل ہوا۔ دروازے کے بالکل ساتھ فون لگا تھا۔ اس نے ریسور اٹھاتے ہوئے سامنے وال

کلاک پر نظر ڈالی۔ رات کا ڈیڑھ بج رہا تھا۔

”اللہ رحم کرے۔“ اس نے دل ہی دل میں کہا۔

”ہیلو۔ باری بات کر رہا ہوں۔“

”روشی بول رہی ہوں۔“

”اوہ۔“ وہ بری طرح چونک پڑا تھا۔

”کہاں سے؟“ اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

”فی الحال دنیا سے۔“ اس کی آواز بہت دھیمی تھی۔

”باری۔ میں کراچی جانا نہیں چاہ رہی۔ میں کیا کروں؟“

”مگر اب تو آپ ایئر پورٹ پہنچ چکی ہیں۔“ اسے حیرت ہوئی تھی۔

”تو کیا ہوا۔ میں یہاں ہنگامہ مچا دوں گی۔ تم آکر لے جانا۔“ وہ بہت سکون سے بات کر رہی تھی۔

”یہیں مچالیا ہوتا ہنگامہ۔“ وہ اس کے بے سرو پا پروگرام پر جھلا گیا۔

”موقع نہیں ملا۔ ارادہ تو تھا۔“ وہ اطمینان سے کہہ رہی تھی۔

”دیکھیں آپ کوئی الٹی سیدھی حرکت نہیں کریں گی۔“ اس نے تنبیہ کی۔

”تم مجھے نہیں روک سکتے۔ دیکھ لینا میں ثابت کر دوں گی کہ میں دلاور خان کی پوتی ہوں۔“

”مجھے افسوس ہے میں آپ کے پروگرام میں شامل نہیں ہو سکتا۔“ اس نے ریسور لٹکا دیا۔ اور باہر کی طرف بڑھا۔

گھنٹی دوبارہ جینج پڑی۔

باری نے گہرا سانس لے کر فون کی طرف بڑھا۔ گھنٹی بجتی رہی۔ ناچار اسے ریسور اٹھانا پڑا۔

”جی؟“

”فون کیوں بند کر دیا۔ کیا تم مجھے اس طرح روک سکتے ہو جو میں کرنے جا رہی ہوں؟“ وہ برہمی سے کہہ رہی تھی۔

”باری کی پیشانی پر پسینہ چمکنے لگا۔“ کیا کرنے جا رہی ہیں آپ؟“ وہ جیسے بے چارگی سے پوچھ رہا تھا۔

”جب میں تکلیف میں ہوتی ہوں تو تمہیں کچھ نہیں ہوتا؟“

”جس کے پاس آزادی ہے۔ اسی کے پاس راحت ہے اللہ کا شکر ادا کریں۔“

”اب کیا ہے؟“ ایرپس میں باری کی بیزاری آواز ابھری۔

”میرے دل کو ذرا چین نہیں، تم بہت یاد آرہے ہو۔ خالہ بہت یاد آرہی ہیں۔ کیا کروں؟“

”اتنی دور پہنچ کر بھی آپ مجھے چین سے نہیں بیٹھنے دیں گی؟“ وہ جھلارہا تھا۔

”میں بے چین ہوں تو تمہیں کیوں چین سے بیٹھنے دوں؟“ وہ الٹ پڑی۔

”باری۔“

”جی۔“

”دیکھو مجھے سنبھالو۔ مجھے کسی طرح بھلاؤ۔ ورنہ یاد رکھو یہی کیفیت چند گھنٹے اور رہی تو میں موت کو گلے لگا لوں گی۔“

”وہ سب کیا کر رہی ہیں؟“ باری کا لہجہ سرد تھا۔

”سورہی ہیں؟“ اس کی آواز بھرا گئی۔

”آپ بھی سو جائیے۔ نیند پوری ہوگی تو طبیعت ٹھیک ہو جائیگی۔“ باری نے بڑے بے رحم انداز میں مشورہ دے کر

کھٹاک سے ریسیور رکھ دیا تھا۔

”اب ایسی طبیعت نہیں ہماری جو سونے سے ٹھیک ہو جائیگی۔“ ریسیور ہنوز اس کے ہاتھ میں تھا۔ اس نے قریب سونی

ہوئی گلو کی سمت دیکھا پھر صوفہ کم بیڈ پر لیٹی ہوئی روٹی پر نظر ڈالی۔ اس کے بالکل نزدیک کارپٹ پر مونٹیشن کے جم غیرٹر

بے سدھ ہو رہی تھی۔ باقی لڑکیاں اوپر کمرے میں تھیں۔

کتنی خوش نصیب ہیں یہ سب۔ اسے رشک آیا۔

ایک میں ہوں۔

اور میرا دل ہے جیسے قید میں پھڑپھڑاتا ہوا پرندہ۔

کاش میں کوئی چڑیا ہوتی۔

دانہ ڈھونڈتی۔ انڈے سیتی، تنکے جمع کرتی۔

کتنی مصروفیت ہوتی۔ اور کتنا سکھ ہوتا۔

پرندوں کے دل تو اس طرح نہیں ستاتے ہوں گے۔ صرف خون پمپ کرتے ہوں گے۔ نہ بے قرار ہوتے ہوں گے۔

نہ اداس۔

نہ گرفتار ہوں گے نہ پاگل۔

نہ بڑپتے ہوں گے نہ پھڑپھڑاتے ہوں گے۔

کھلی و بسیط فضا کی طرح ان کا عشق بھی آزاد ہوتا ہوگا۔ نہ وسواس میں الجھتا ہوگا نہ ترستا ہوگا۔ خوشی انہیں ڈھونڈتی پھرنا

ہوگی۔

کاش میرا دل میری دسترس میں ہوتا۔

بالکل اسی طرح جیسے ڈال میں انکی کوئیل۔

میں ہاتھ بڑھا کر نوچ کر پھینک دیتی۔ جسم و جاں آرام میں آجاتے۔ اور پھر میں بھی ان سب کی طرح ہاتھ پھیلا کر بے

خبر ہوتی۔

اس پر عجیب دیوانگی طاری تھی۔

اس نے پھر نمبر ڈائل کیا۔ دوسری طرف فون باری نے اٹھایا تھا۔

”جی؟“

”میں ہوں روشی۔“

”مزارعوں کا خون پسینہ ٹیلی فون کے بلوں کے ذریعے بہا دینا کوئی انسانیت نہیں ہے۔“ اس کا لہجہ بڑا گستاخ سا تھا۔

”میرے باپ کا مال ہے جیسے چاہے اڑاؤں۔ کسی کو کیا؟“ وہ تلخی سے بولی۔

”اب کیا ہوا؟“ اس نے کوفت بھرے انداز میں سوال کیا۔

”باری..... مجھے یقین ہے تمہیں سب پتا ہوگا۔ مجھے بتاؤ بابا صاحب مجھے خالہ سے دور کیوں رکھنا چاہ رہے ہیں۔ اتنی

اچھی تو ہیں وہ۔ کیا پتا نہیں آج ہری پور لے جائینگے؟“ اس نے ایک ساتھ کئی سوال کر ڈالے۔

”میرے پاس کسی سوال کا جواب نہیں ہے براہ مہربانی اب آپ مجھے۔ سن رہی ہیں۔“ مجھے، ہرگز فون مت کیجئے گا۔

ہاتھ جوڑ کر درخواست کر رہا ہوں۔“ اس نے بات مکمل ہوتے ہی فوراً ریسیور رکھ دیا تھا۔

مارے طیش کے روشی کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ ایسا لگا پورا وجود دھماکے سے اڑ جائیگا۔

وہ ریسیور کریڈل پر ڈالنا بھول گئی تھی۔ سارا جسم ہولے ہولے کانپ رہا تھا۔

”کس کا فون تھا؟“ گلو نے کروٹ بدلتے ہوئے غنودگی کے عالم میں اسے دیکھ کر سوال کیا۔

”کسی کا نہیں۔ میں نے گھر کیا تھا۔“ اس نے آہستگی سے ریسیور کریڈل پر ڈال دیا۔

”باری۔ جی چاہ رہا ہے ٹھنکی پر بندھوا کر اتنے کوڑے لگواؤں کہ تمہارے خون سے زمین رنگین ہو جائے اور تمہارا بے

بنیاد غرور خاک میں مل جائے۔“

اس کے دماغ میں چنگیزی قسم کے خیالات برپا ہونے لگے۔ منھیاں کھول رہی تھی بھیج رہی تھی۔

”سیون کی“ سے باہر سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا اور اندر شور و غل کا ایک سمندر برپا ہوا تھا۔ وہ سب جاگ چکی تھیں۔ آزادی کے احساس سے خواجواہ قیصر اُٹھ رہے تھے۔

”بھئی! یہ بابا صاحب کی آنا فانا مہربانی بالکل سمجھ میں نہیں آئی۔“ مونا سب سے پہلے ہاتھ روم سے برآمد ہوئی تھی۔ اور حیرانی کا اظہار کر رہی تھی۔

”جبکہ گھر میں خصوصی مہمان موجود تھے۔“ شینو نے اچنتی نظر روشی پر ڈالی جو سوٹ کیس سے اپنے کپڑے نکال رہی

ڈھکی۔

”یہ تو ہے۔“ زری نے اپنی چوٹی کے بل کھولنا شروع کئے۔

”شاید روشی کو آئیڈیا ہو۔“ روبی نے متوقع انکشاف کی آس میں روشی کی طرف دیکھا۔

”مجھے سے کوئی بات نہ کرے۔“ وہ پھاڑ کھانے کو دوڑی۔

”ہاں۔ اس سے کوئی بات نہ کرے۔ یہ یوں بھی اپ سیٹ ہوگی۔“ شینو اپنے کپڑے اٹھا کر ہنس پڑی۔ اس کی ہر روشی کی نس نس میں اتر گیا۔

”اف کتنے شاندار پراٹھے بن رہے ہیں۔ خوشبو بتا رہی ہے۔“ تانیہ نے اندر سانس کھینچ کر جلدی سے فضا بحال کر کی کوشش کی۔

”ماما سے اچھے پراٹھے تو کوئی نہیں بنا سکتا۔“ مونا کو ماما کے پراٹھے یاد آئے۔

”کلو بھی انہی کی اسسٹنٹ ہے۔ فکر نہ کریں۔“ گلو مسکرائیں۔

”اسسٹنٹ تو ان کی سرسوتی بھی ہے۔ کیسا نقشہ بناتی ہے پاکستان کا بغیر کشمیر کے۔“ زری نے گرہ لگا کر سب کو ہنسنے پر مجبور کر دیا۔

”آپی۔ میں ڈرائیور کے ساتھ قریبی بازار تک ہو آؤں۔“ روشی نے بازو پر کپڑے لٹکائے زری سے مخاطب تھی۔

”اکیلی؟ کیا لوگی..... ابھی تو ہمارے پاس بہت وقت ہے۔“ مونا نے مداخلت کی۔

”اکیلی کہاں..... ڈرائیور بھی تو ہوگا۔ اور یہ کہ میرے پاس وقت نہیں ہے۔“ اس کے انداز میں عجیب کھویا کھویا صاف محسوس ہو رہا تھا۔ وہ سب چونک کر اس کی شکل دیکھنے لگیں۔

”جلدی آ جاؤں گی۔“ وہ پھر بولی۔

”اچھا ٹھیک ہے۔ مگر دیکھو جلدی آ جانا۔“ زری نے کچھ سوچتے ہوئے اجازت دیدی۔

”آپ فکر نہ کریں۔“

”غسل کر کے پہلے ناشتہ تو کر لو۔“ گلو نے ٹوکا۔

”غسل کرنے جا رہی ہوں مگر ناشتا کرنے کا موڈ نہیں ہے۔“ وہ اسی طرح گم صم انداز میں کہتی ہوئی باہر نکل گئی۔

”اس کی جھکن نہیں اتری ابھی شاید۔“ مونا نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

”پھر باہر جانے کی کیا ضرورت ہے۔ بازار تو رات تک کھلے رہتے ہیں۔“ شینو نے تلخی سے کہا۔ تو مونا بس اس کی طرف دیکھ کر رہ گئی۔

غسل کے بعد ناشتے کا غافلہ شروع ہوا۔ صبح کے دس بج رہے تھے۔ روشی سیاہ کپڑے بدل کر جا چکی تھی۔ وہ سب فلم لائونج میں ڈھیر ہو گئی تھیں۔ انہیں پتا تک نہ چلا کہ روشی کب واپس آئی اور اوپر کمرے میں چلی گئی۔

قلم دیکھنے کے بعد وہ شام کو سمندر کی سیر کا پروگرام بناتے ہی تھی۔ جب فاطمہ (نوکرانی) نے انہیں بتایا کہ اوپر سے کمرے

لاک نہیں کھل رہا۔ اسے صفائی کرنا ہے۔ شاید لاک خراب ہو گیا ہے۔ یا اندر سے بند ہو گیا ہے۔

”اندر کون ہے جو بند کرے گا؟“ زری نے مونا کی شکل دیکھی۔

”روشی نہیں آئی ابھی تک۔“ معا گلو نے چونک کر وال کلاک پر نظر ڈالی۔ دوپہر کا ایک بج چکا تھا۔

”مونا روشی نہیں آئی۔“ زری کا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔

”تفصیلی شاپنگ کر رہی ہوں گی۔“ مال پیسہ بہت ہے۔“ شینو ہنسی۔

”آپ کے پاس چابی ہوگی۔ مجھے دے دیجئے۔ شاید خود بخود لاک ہو گیا ہو۔ ان تالوں میں یہی تو خرابی ہے۔“ فاطمہ

نے زری سے چابی مانگی۔

”ارے تمہیں چابی کی پڑی ہوئی ہے۔ مجھے روشی کی فکر لگ گئی ہے۔ بابا صاحب کھال کھنچو ادینگے میری۔“ گلو بے حد

پریشان تھیں۔

”اسے اکیلا بھیجنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔“ شینو نے پھر ترخ کر کہا۔

”مونا! فاطمہ کو چابیاں دے دو دروازوں کی۔ اسے تو ٹالو۔“ شینو بڑبڑائی۔ گلو نے سنی ان سنی کر دی تھی۔

وہ ابھی بیچ میں ہی تھیں کہ اختر (ڈرائیور) گیٹ پر چونکدار سے باتیں بناتا دکھائی دے گیا۔

”ہائیں۔ ڈرائیور تو یہ رہا۔ پھر روشی کہاں ہے؟ کیا وہ اکیلی گئی ہے؟“ انہیں جیسے شاک لگا۔

”اختر۔“ وہ دور ہی سے پکاریں۔

”جی۔“ وہ ہڑبڑا کر کھڑا ہو گیا۔

”روشی بی بی گئی تھیں تمہارے ساتھ؟“ ان کا دل انجانے خدشات سے کانپ رہا تھا۔ اسے تو یہاں کے راستے کا بھی نہیں پتا۔

”جی ہاں۔“

”تو پھر کہاں ہیں وہ؟“ گلو کی جان میں جان آئی۔

”وہ تو جی جلدی آ گئی تھیں۔ میڈیکل سٹور سے شاید دوائی لینا تھی انہیں۔ بس دوائی لی اور فوراً ہی میں انہیں واپس لے آیا تھا۔“

”کس بات کی دوا؟“ انہیں مزید تشویش ہو گئی۔

”اگر کوئی دوا چاہیے بھی تھی تو وہ ڈرائیور بھی لا سکتا تھا۔ مگر دوا کس مرض کی۔ کیا ہوا ہے اسے؟“ وہ از حد فکر مند تھیں۔

”پھر کہاں ہے وہ؟“ وہ جیسے جھلائیں۔

”میرے سامنے تو اندر گئی تھیں۔ پھر میں نے انہیں نہیں دیکھا۔“

”وہ یہاں آنے پر بالکل رضامند نہیں تھی۔ سارا سفر اس نے بنا بات کئے کاٹا تھا۔ یہاں آ کر بھی وہ بے چین تھی۔ سوئی

بھی نہیں تھی۔ ناشتا بھی نہیں کیا تھا۔“ گلو کے دماغ میں فلم سی چل پڑی۔

”میڈیکل اسٹور سے کیا لینے گئی تھی۔“ انہوں نے پلٹ کر روبی اور بیہ کی طرف دیکھا اور پھر جیسے کسی خیال سے چونک کر اوپر کی طرف دوڑ پڑیں۔

انہیں اس کا جملہ یاد آگیا تھا جو اس نے دریا بستی سے روانہ ہوتے ہوئے بڑے روہانے انداز میں کہا تھا۔ ”اللہ کرے میری میت ہی اب یہاں آئے۔“

گلو سر پٹ دوڑتی ہوئی اس کمرے کی طرف آئی تھیں۔ جہاں فاطمہ لاک کھولنے کی سر توڑ کوشش کر رہی تھی۔

”یہ نہیں کھل رہا بی بی۔“ وہ جیسے تھک کر بولی تھی۔ گلو نے جیسے اس کی بات نہیں سنی۔ وہ زمین سے چھت تک سینے درپٹ کی طرف آئی تھیں۔ جس کے درمیانی پٹ انہوں نے صبح کھلے ہوئے دیکھے تھے۔ مگر اب وہ بھی بند تھے اور اندر دین پڑے پڑے ہوئے تھے۔

گلو پر جیسے وحشت سی طاری ہو گئی۔ انہوں نے پاس پڑا ہوا گلا شیشے پر دے مارا۔

”آئیں۔ ہائیں۔“ روبی اور بیہ کی سمجھ میں خاک نہیں آ رہا تھا۔ وہ حیران پریشان گلو کو دیکھ رہی تھی۔

فاطمہ نے بھی اپنی ”کوششیں“ ملتوی کر دیں۔ چھناک کی آواز کے ساتھ شیشہ ٹوٹ چکا تھا۔ گلو دیوانہ وار پردہ ہٹا کر اندر جھانکنے کی کوشش کر رہی تھی۔ کمرے کا ماحول چونکہ نیم تاریک تھا اس لئے فوری طور پر کچھ بھی واضح طور پر دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ مگر وہ بدستور بغیر پلک جھپکے اندر گھور رہی تھیں۔

چند لمحوں بعد انہیں اپنے پاؤں کے نیچے سے زمین سرکتی محسوس ہوئی۔ روشنی سیاہ کپڑوں میں آڑی ترچھی لپٹی ہوئی نظر آ گئی۔

”روبی“ اختر کو اور چوکیدار کو بلا کر لاؤ بھاگ کر۔ جلدی سے۔“ وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر وہیں بیٹھ گئی۔

”کیا ہوا آپا؟ وہ دونوں بدحواس ہو گئیں۔

”دیر نہیں کرو جلدی جاؤ۔“ انجانے دسو اس نے انہیں جیسے بے دم کر دیا تھا۔ یہ کیا کیا روشنی؟ اور کیوں کیا؟ انہیں پتا تھا وہ دریا بستی سے روانہ ہونے سے بہت پہلے بہت چپ چاپ سی تھی۔ جانے اس نے کتنی بار ان سے کہا تھا وہ کراچی جانا نہیں چاہتی۔ وہ خالہ کے پاس رہنا چاہتی ہے۔

مگر یہ کوئی اتنی بڑی بات تو نہیں کہ جان پر بنالی جائے ان کا دل ڈوب رہا تھا۔ روبی ڈرائیور کی طرف دوڑی اور تھ لاؤنچ کی طرف۔ آٹا فانا اوپر افراتفری پھیل گئی تھی اختر چوکیدار کے ساتھ مل کر دروازہ توڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔ لڑکیاں اور ملازمین حواس باختہ ایک دوسرے کی شکلیں دیکھ رہے تھے۔

مونا اور تانیہ تو باقاعدہ رو رہی تھیں۔

”تمہیں کیسے دھیان آیا۔“ شینو کے بھی سارے کس بل نکلے ہوئے تھے۔

”ڈرائیور جو سامنے نظر آ گیا تھا۔ کہہ رہا تھا وہ میڈیکل اسٹور سے کوئی دوا لائی تھی۔ چلتے ہوئے وہ اپ سینت بھی بہت تھی۔“ گلو روہانسی ہو کر بتا رہی تھیں۔

دروازے پر پڑنے والی ہر ضرب پر ان کے دل دھڑک اٹھتے۔ شاید اس بار دروازہ کھلے گا۔

دروازہ ٹوٹ گیا۔ اور وہ سب دروازے پر ٹوٹ پڑیں۔ سب سے پہلی جست زری نے لگائی تھی۔ فاطمہ نے کمرے کی لائیں آن کر دیں۔ سرخ کار پٹ پر سیاہ کپڑوں میں ملبوس بے ترتیب لپٹی ہوئی روشنی کا چہرہ سفید اور پرسکون تھا۔ مونا نے اس کے رخسار تھپتھپائے۔ روشنی..... جان..... اف خدایا۔“ روشنی کی مردنی نے جیسے اس کے حواس بھی مردہ کر دیئے تھے۔

”مونا خود کو سنبھالو۔“ زری نے ٹوکا۔

”جھاڑی نکالو ڈرائیور۔“ چوکیدار بہت بوڑھا تھا۔ زری نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا۔

”دریا خان..... اٹھا لو گے اسے؟“ وہ بہت مضبوط اعصابی کا مظاہرہ کر رہی تھی۔

چوکیدار نے روشنی کو کاندھے پر لاد لیا۔

آؤ گلو..... تم لوگ آرام سے بیٹھو۔ انشا اللہ کچھ نہیں ہوگا۔ کوئی ضرورت نہیں رونے دھونے کی۔ فون کر دوں گی۔“ زری نے دو پاسر پر جاتے ہوئے انہیں تسلی دی۔ اور دریا خان کے پیچھے چل پڑی۔ گلو بھی بمشکل خود کو گھسیٹ رہی تھیں۔

”سر سے پیر تک پر اہلیم ہے یہ لڑکی۔“ شینو کے انداز میں برہمی بھی تھی اور جھنجھلاہٹ بھی۔

”نی الحال تو اسے بخش دیں۔“ مونا نے آنکھیں پونچھیں۔ عجیب سا سکوت طاری ہو چکا تھا۔

”یہ اتنی دور بھی نکل سکتی ہے میں تو سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔“ تانیہ نے لمحے بھر کوروا دھونا موقوف کیا۔ ”ناشکری اور پاگل پن کا جیتا جاگتا نمونہ ہے بس۔“ شینو کی ساری تفریح خطرے میں تھی۔ وہ تو سب ہی اس کے ساتھ ہاسٹیل جانا چاہتی تھیں۔ مگر زری نے سختی سے منع کر دیا تھا۔

ابھی گاڑی نے آدھا فاصلہ بھی طے نہیں کیا ہوگا اور وہ فون کی گھنٹی کے انتظار میں اپنی اپنی جگہ چپ تھیں۔

”مونا باجی..... گھر فون کروں؟“ روبی کو فوراً خیال آیا۔

”نہیں ابھی نہیں۔“ لالی نے منع کر دیا۔

”ہاں ابھی ذرا ہاسٹیل کے فون کا انتظار کرتے ہیں۔“ مونا نے بھرائی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

کمرے میں ایک بار پھر سکوت طاری ہو گیا

ماہین بستر پر خاموش لپٹی تھی ماما بلی دومرتبہ اسے ناشتے کا پوچھ چکی تھی۔ اب پھر دروازہ پر دستک ہوئی تھی۔

”آجاؤ۔“ اس نے کوفت بھرے انداز میں دروازے کی سمت دیکھا۔

دروازہ کھلا اور باری داخل ہوا۔

ماہین ایک دم اٹھ کر بیٹھ گئی۔

”آپ نے ناشتا نہیں کیا؟“ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد باری نے پوچھا۔

”بری امی کہہ رہی ہیں؟“ آپ نے چونکہ ناشتا نہیں کیا تھا اس لئے کھانا جلدی لگا دیا ہے۔

”مجھے بھوک نہیں ہے۔“ اس نے رکھائی سے جواب دیا۔

”جی۔“ باری نے الجھ کر اس کی سمت بغور دیکھا۔

”آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے ناں؟“ وہ فکر مندی سے اس کی سمت دیکھ رہا تھا۔

”میں بالکل ٹھیک ہوں الحمد للہ۔“ اس کے انداز بدستور تھے۔

”پھر.....؟“ وہ کچھ کہنے کی خواہش کے باوجود پھر کہہ کر خاموش ہو گیا۔

”کچھ بھی نہیں پھر۔“ وہ بے زاری سے گویا ہوئی۔

باری نے سوچتی ہوئی نظروں سے اس کو دیکھا۔

اس کے ارد گرد بے شمار رویوں کی گزرگاہیں تھیں۔ جن سے وہ روز لچہ لچہ گزرتا تھا۔ رویے کی معمولی سی تہہ

حساس طبع پر الہام کی طرح اترتی تھی۔

اس نے باغ کی سمت کھٹنے والی کھڑی کی طرف دیکھا۔ جواد کھلی تھی۔ پردہ گرا ہوا تھا۔ اس کے باوجود ادھکے

اشارہ واضح تھا۔

”کل میں نے سرسوتی کو دو پٹا دھونے کیلئے دیا تھا، نہ معلوم کہاں رکھ گئی، ملا ہی نہیں، تم اسے ذرا میرے پاس

۔“ مایہن کے لہجے میں قدرے سکون تھا۔

باری کے ہاتھ پشت پر بندھے تھے۔ وہ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے درتہ کی سمت بڑھا، پردہ پیچھے سرکایا، در

دونوں پٹ کھول دیئے۔

”صبح کے وقت اسے کھول لیا کریں، تازہ ہوا آتی ہے۔“ اس نے پلٹ کر مایہن کو دیکھا۔

”اور رات کیلئے کیا حکم ہے؟“ وہ طنز سے مسکرائی۔

”یہ آپ کا رہائشی کمرہ ہے، جیسے چاہے تصرف کریں۔“ وہ بھی مسکرایا۔

”تو پھر آپ کھانا نہیں کھا رہی ہیں؟“

”نہیں، مجھے بالکل بھوک نہیں۔“ اس نے منہ بنا کر جواب دیا۔

”تھوڑا سا کھالیں، شام کو آپ یا در چچا اور جواد کے ساتھ لمبے سفر پر روانہ ہوں گی۔“

”کہیں نہیں جا رہی میں، روشنی کالج سے آئے تو اسے میرے پاس بھیج دینا۔“

”آپ یا در چچا سے خود بات کر لیں۔“

”روشنی کالج سے آئے تو بھیج دینا، یہ یا در بھائی کا مقدمہ کہاں سے شروع ہو گیا؟ بس تو میری طرف سے انہیں

پہنچا دو، میرے دل میں خیر آباد دیکھنے کی کوئی حسرت نہیں، وہ میری سیٹ بک کر ادیں، میں جلد کراچی جانا چاہتی ہوں۔“

سرسوتی کو بلا دو۔“ اس نے گہری نظر سے باری کا جائزہ لیا۔

ہلکے بادامی رنگ کے شلوار قمیض میں لبوس ہاتھ پشت پر باندھے ہوئے کسی خیال میں الجھا ہوا وہ بہت بے ضرر دکھائی د

”خالموں کا آلہ کار..... مگر کیا سادگی ہے۔“ اس نے دل ہی دل میں داد دی تھی۔

”فی الحال تو کوئی نیا پروگرام سیٹ نہیں ہو سکتا، اس لئے کہ بابا صاحب سرائے گئے ہوئے ہیں۔“ وہ گویا اطلاع تھی۔

”اچھا؟“ اسے حیرت ہوئی۔ لڑکیاں تو آج بہت خوش ہوں گی۔“ اس کے منہ سے نکل گیا۔

باری چپ رہا۔

مایہن نے اس کی چپ کوئی کوئی اہمیت نہ دی۔

”سرسوتی۔“

”میں اس سے معلوم کر لیتا ہوں، کہ اس نے دوپٹا کہاں رکھا ہے۔“ باری نے باہر کی طرف قدم بڑھا دیئے۔ مایہن کی

بات اس نے فوراً کاٹ دی تھی۔

”مجھے اس سے ایک اور بات کرنا ہے۔“ اس نے نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبا کر باری کو سلگتی نگاہ میں تو لا۔

باری جاتے جاتے رک گیا۔ پھر کچھ سوچ کر پلٹا۔ نہایت خود اعتمادی سے اس نے مایہن کے چہرے پر نظریں جمادی

تھیں۔ ایک لمحے کو تو مایہن بھی شپٹا گئی تھی۔

”مایہن بی بی! جب سب کچھ دیکھ لیا، سن لیا، پھر کیوں مجھے پریشان کر رہی ہیں؟“ اس کے سادہ سے لہجے میں بلا کی

سمجھ بیر تھی۔

مایہن نے بری طرح چوٹ کر اس کا چہرہ دیکھا۔

”تھوڑے سے شرمندہ ہی نظر آ جاؤ تو ذرا سا بھرم رہ جائے، زندگی کا انسانیت کا۔“ مایہن کے لہجے میں بہت تپش تھی۔

باری نے ایک اچھتی سی نظر اس پر ڈالی، پھر مبہم سا مسکرایا۔

”یوں بھی زیادہ باتیں کرنا میری عادت نہیں، اس لئے بس یہی کہوں گا، مجھے وضاحتوں کی اجازت نہیں۔“ اس نے اتنا

کہہ کر دروازہ کھولا۔

”باری۔“ مایہن نے بے ساختہ اسے آواز دی۔

دور رک گیا اور اس کی آواز کا انتظار کرنے لگا۔

”تم کون ہو؟“

”آپ کی طرح مجھے بھی اس سوال کے جواب کی تلاش ہے۔“ وہ فوراً باہر نکل گیا تھا۔

مگھوٹے سہ پہر تین بجے ہاسپٹل سے فون کیا تھا۔ اس کے لہجے میں بے حد پریشانی تھی اس نے تاکید کی تھی کہ فی الفور دریاہستی فون کر کے بابا صاحب کو اطلاع کی جائے۔ روشنی کی حالت سخت خطرے میں ہے۔

ان کا فون بند ہوتے ہی مونٹا نے بڑی عجلت میں دریا بستی ڈائل کیا تھا۔

اس کی آواز بھی کپکپا رہی تھی اور ہاتھ بھی۔

حویلی میں اینڈنٹ تو ظاہر ہے باری ہی تھا۔ دوسری طرف سے ریسور اسی نے اٹھایا تھا۔

ریسور اٹھاتے ہوئے اس کا دھیان روشی کی طرف ہی گیا تھا۔ اس نے خود کو جیسے تیار کیا۔ لہجہ اس کا انتہائی نرم
”ہیلو.....!“ اس نے جیسے پتھر پھوڑے۔

”مونٹا بات کر رہی ہوں۔“ مونٹا کے لہجے میں غیر معمولی پن واضح تھا۔

”جی مونٹا بی بی! وہ فوراً سنبھل گیا۔

”کون..... باری؟“

”جی! میں ہوں۔“

”بابا صاحب سو رہے ہیں؟“ اس کی آواز کانپ رہی تھی۔

”جی کچھ کہہ نہیں سکتا۔ وہ صبح پانچ بجے سرائے چلے گئے تھے۔“ اس نے تفصیل سے جواب دیا۔

”اوہ! اور یاور ماموں؟“

”وہ بھی صبح سے کہیں گئے ہوئے ہیں۔“ اب وہ الجھنے لگا۔ ”خیریت.....؟“

”خیریت نہیں ہے۔ بابا صاحب کو سرائے فون کر کے فوراً اطلاع کر دو کہ روشی نے خودکشی کر لی ہے۔“

ریسور باری کے ہاتھوں سے پھسلنے لگا۔

”جی.....؟“ اسے اپنے کانوں پر اعتبار نہ آیا۔

”ہاں! بس یہی کہنا۔“ مونٹا کی آواز بھرا گئی

”کیا کیا ہے انہوں نے؟“ اس کی آواز بہت کمزور تھی۔

”گولیاں کھائی ہیں..... پوائزن..... اچھا دعا کرو..... خدا حافظ۔“ مونٹا نے ریسور رکھ دیا تھا، مگر وہ ابھی تک کا

لگائے کھڑا تھا۔

روشی کی اپ سیٹ کیفیت یادداشت میں فلم بن کر چل پڑی تو عنوان سمجھ میں آنے لگا۔ اسے اپنے انداز پر بھی نئی
ندامت ہوئی۔ اگر اسے کچھ ہو گیا تو ضمیر کی خلش اسے کبھی خوش ہونے کا موقع نہیں دے گی۔ اس کا ذہن ماؤف ہو
اتنی بہادر ہو روشی؟ یا.....!

اس نے ریسور کریڈل پر ڈال دیا اور سر تھام کر سوچنے لگا۔ اس پاس موجود ہر شے اپنی حقیقت اور اثر کھوری تھی
ایک دم سے خالی خالی اور ویران لگنے لگی۔ اس نے بمشکل خود کو سنبھال کر سرائے ڈائل کیا۔ اینڈنٹ نے فوراً بابا صاحب
مٹا دیا۔

”باری بات کر رہا ہوں خالص.....“

”ہوں..... بولو۔“

”کراچی سے فون آیا ہے ابھی ابھی..... مونٹا بی بی کا۔“

”مونٹا کا؟ خیریت..... کیا کہہ رہی تھی وہ.....؟“ بابا صاحب ایک دم مستعد ہو گئے۔

”اچھی خبر نہیں ہے خان۔“ باری نے انہیں خبر کیلئے تیار کیا۔

”جلدی بولو۔“ بابا صاحب کے لہجے میں ایک دم سختی آ گئی۔

”روشی بی بی نے خودکشی کر لی ہے۔“

”زور سے بولو آواز صاف نہیں آرہی۔“ ان کی حواس باختگی واضح تھی۔

باری نے دائیں بائیں دیکھ کر اپنے ہونٹ تقریباً نو تھپیس سے لگا دیئے۔

”خان! روشی بی بی نے پوائزن کھایا ہے ہاسپٹل میں ہیں۔ مونٹا بی بی بتا رہی تھیں ان کی حالت بہت ہی خراب ہے۔“

”کیوں کیا اس نے یہ سب.....؟“ ان کی آواز غصے اور صدمے کے ملے جلے اثر سے کانپ رہی تھی۔

”اور کچھ نہیں بتایا انہوں نے۔“

”اچھا تم ایسا کرو گھر میں یا در اور جواد سمیت فی الحال کسی کو اطلاع نہ دو۔“

”جی بہتر۔“

”آج کی کراچی جانے والی کسی فلائٹ سے میری اور اپنی سیٹ بک کراؤ۔ پھر مجھے اطلاع دو، میں ڈائریکٹ ایئر پورٹ

پہنچوں گا، تم کراچی فون نہ کرتا میں کر رہا ہوں۔“ ان کی آواز میں جیسے صدیوں کی تھکن اتر آئی تھی۔

”پھر تا کید کر رہا ہوں گھر میں کسی کو اطلاع دینے کی ضرورت نہیں آج کل وہاں اس کی خالہ بھی موجود ہے..... میرے

پاس پہلے ہی بہت سے مسئلے موجود ہیں۔“ انہوں نے یہ کہتے ہی ریسور رکھ دیا تھا۔

باری نے ریسور رکھتے ہوئے گھڑی کی سمت دیکھا۔ پھر فوراً ہی ریسور دوبارہ اٹھالیا۔ اب وہ اسلام آباد ایئر پورٹ

ڈائل کر رہا تھا۔

”بھائی تمہارے اپنے بھی تو دنیا میں ہوں گے جو تمہاری فکر کرتے ہوں گے۔ تمہاری حالت پر کڑھتے ہوں گے۔“

آج وہ بھی مارے نقابہت کے عارف کے برابر لیڈ ہوا تھا۔

”بس یا کون کون اپنا کون پرایا اب تو سب برابر ہیں۔“ وہ ہنسا۔

حسن غمزے کی کشاکش سے چھٹا میرے بعد

بارے آرام سے ہیں اہل جفا میرے بعد

اور وہ کیا ہے کہ

دو گھڑی غم زیست اٹھا میری روح

پھر نظر آئے گا تجھ کو بھی خدا میری طرح

یہ دعا مانگو برا وقت نہ آئے ورنہ

آپ بھی ڈھونڈیں گے اپنوں میں وفا میری طرح

کیا سمجھے۔ اپنے پن کی بھی کچھ شرطیں ہوتی ہیں یہاں بلاوجہ کوئی اپنا نہیں ہوتا۔ وہ زہر زہر ہو کر ہنس رہا تھا۔

”چھوڑو یہ سب باتیں یہ بتاؤ ہماری درخواست آگے پہنچائی؟“ عارف نے نیا موڑ لیا۔

”پہنچادی، مگر ابھی لال خان کی عمر نہیں بتائی، ذرا تیز مزاج کی ہے گھر والی، آہستہ آہستہ لائن پہ لاؤں گا۔“

اس نے آسمان کی طرف اڑتے پرندوں کا نظروں سے تعاقب کرتے ہوئے جواب دیا۔

”اتنی احتیاطیں بھی دروازے بند کر دیتی ہیں قسمت کے بند دروازے کو دھکا لگانے کیلئے ذرا ہمت بھی کرنا چاہیے۔ خیر،

لال خان سے کہوں گا بر دکھوے کو جائے تو ایک ٹوکرا پھلوں کا اور ایک ٹوکرا مٹھائی کا لیتا جائے۔ جتنے دن گھر والے پہلے

مٹھائی کھا کیئے۔ ذرا نرمی سے سوچیں گے۔ ہو سکتا ہے کام بغیر محنت کے بن جائے۔“ وہ بڑا پر امید تھا۔

”مال کھا کے ٹرخانا کوئی اچھی بات تو نہیں۔“ اس کی خوددار طبیعت بلبلائی۔

”ٹرخائیں گے کیوں کام کر کے دکھائیں گے۔ ارے مٹھائی کے ٹوکرے پر شاہ جی سے دم کرا لیں گے۔ اور بول۔“

وہ ہنسا۔

”صحت دیکھی ہے لال خان کی؟ دس جوانوں پہ بھاری ہے۔ تیس سال اور چلے گا ابھی۔ اتنی جلدی بوڑھی ہونے والی

آسامی نہیں۔ عورت تو چار بچے پیدا کرتی ہے وقت سے پہلے ثانی لگنے لگتی ہے۔“ عارف نے ایک اور پتا پھینکا۔

”ابھی تمہاری لڑکی کے جوڑ کا نہیں لگتا، شادی کو دو سال ہو گزر رہی ہے تو تمہاری لڑکی برابر کی لگے گی۔“

عارف نے بات اور آگے بڑھائی۔

”کیوں بولے تجار ہا ہے؟ میں تو لائن پر ہوں۔ مسئلہ تو گھر والی کا ہے۔“ وہ چڑ گیا۔

”تو تیرے لئے تھوڑا ہی بول رہا ہوں، ڈکٹیشن دے رہا ہوں۔“ وہ حلق پھاڑ کر ہنسا۔

”کیا دے رہا ہے بھائی؟“ یہی کچھ تم اپنی گھر والی کے آگے اگل دینا اور بس۔“

”اتنا آسان کہاں یہ سب اگل دینا۔“ وہ زبردستی مسکرایا۔

”اب تو کما کر دے رہا ہے یا۔ کمانی والے مرد کے آگے تو عورت سمجھی جاتی ہے۔“ اس نے بے حد حیرانی کا مظاہرہ کیا۔

”ارے تابعدار تو بہت ہو رہی ہے ان دنوں رات کو میرے پیر دبا کر سوتی ہے۔ پر بھائی یہ اولاد کا معاملہ ہے۔“ اس

نے بہت سوچتے ہوئے جواب دیا۔ ذہن ایک وقت میں جانے کہاں کہاں ہلک گیا تھا۔

”مگر اب تم شروع کرو سلسلہ دیکھ بڑی ہمدردی کر رہا ہوں تم سے۔“

”بڑی مہربانی، اس نے عارف کی بات کاٹ دی، دیکھ رہا ہوں ذرا ہوا کا رخ، یہ چلتی ہوا کہیں سچ میں رک نہ جائے۔“

عارف نے پھر اسے سچ میں ٹوک دیا۔

”میری سمجھ میں نہیں آرہا، تم مجھ پر اتنی مہربانیاں کیوں کر رہے ہو۔ میں تو تمہارے کسی کام کا بھی نہیں۔“ اس کے

ذہن میں ہمک کا ناگ سرسرایا تو اس نے ازلی سادگی سے مجبور ہو کر سچ اگھنے میں ذرا دیر نہ لگائی۔

”میں برا نہیں مان رہا، خوش ہو جاؤ۔“ عارف نے شاہانہ ادا سے کہا۔

”جس نے کبھی ہمدردی کا مزانہ چکھا ہو، جس کی سیدھی تدبیریں بھی اپنی پڑی ہوں۔ اسے اتنی جلدی کسی کا اعتبار کیسے ہو

گا، تم بے قصور ہو۔“ اس نے بڑے عدل کا مظاہرہ کیا۔

”دیکھ بھائی اجڑے ہوئے سے دوسرا اجڑا ہوا دکھ برداشت نہیں ہوتا۔ بس اتنی سی بات ہے۔ بھوکے کو دوسرے بھوکے

کی تکلیف محسوس ہوتی ہے۔ پیٹ بھرے کو بھوکے کے دکھ پتا نہیں لگتا یا وہ پتا لگنا نہیں چاہتا۔“ عارف نے کہا۔

”تم اپنے بارے میں کچھ نہیں بتاتے، جب بھی تمہاری بات کرتا ہوں ادھر ادھر کی ہانکنے لگتے ہو۔“ اس نے بمشکل اٹھتے

ہوئے عارف کی صورت دیکھتے ہوئے کہا۔

”جس بات سے کچھ حاصل نہ ہوتا ہو، وہ بات کرنے کا کیا فائدہ۔ اب ہم تو تجھ سے وہ باتیں کرتے ہیں جن میں ”حل“

بھی ہیں اور ”حل“ بھی۔“ پھر وہ بے ہنگم ہنسی ہنسا۔

پھر بھی مجھے خیال تو آتا ہے تمہارے تم اتنے اکیلے کیوں ہو؟ تمہارے آگے پیچھے کوئی نہیں اور پھر لگتا..... بہت دکھی

ہو۔“ اس نے عارف کے چہرے پر نظریں جمادیں، جیسے جواب کا انتظار کرنے لگا۔

”تمہیں کس بات نے یا کس نے اجاڑ دیا۔ تم اتنے دماغ والے ہو تو تم پر کس کا داؤ چل گیا۔“

”بس..... بھائی..... پریس کانفرنس میں بٹھا دیا مجھے۔“ وہ ہنسا اور کھانسی شروع ہو گئی۔

”وہ پریشان ہو کر اذیت میں مبتلا اسے دیکھے گا، جلدی جلدی سینے پر ہاتھ بھی پھیرا، مگر کھانسی رکنے کا نام نہیں لے رہی

تھی۔“

”جب ہنسنے سے پھندا لگ جاتا ہے تو ہنسنے کیوں ہو؟“ اس نے ناراضگی سے کہا۔

”یہی تو بات ہے، اوپر والا نہیں چاہتا کہ ہم ہنسیں۔ حکم عدولی کرتے ہیں اور پھنس جاتے ہیں۔“ وہ کھانستے کھانستے بھی

بولنے سے باز نہیں آیا۔ تب وہ اس کیلئے پانی لینے چلا گیا۔

واپس آیا تو وہ اپنی کھانسی پر قابو پا چکا تھا۔

اس نے گلاس اسے تھما دیا، جو عارف نے ایک سانس میں خالی کر دیا۔

”مست پوچھا کرو ایسے سوال جنہیں سن کر پہلے ہنسی کا پھر کھانسی کا دورہ پڑ جائے۔“

عارف نے گلاس گھاس پر چھیننے کے انداز میں رکھا۔

”میں نے تو کوئی ایسا سوال نہیں کیا، جسے سن کر ہنسی آئے۔“ وہ الجھا۔

”اچھا!“ عارف مسکرا کر برآمدے کی طرف دیکھنے لگا۔“ مجھے تمہارے سوال سن کر بہر حال ایک شعر یاد آ گیا۔ وہ کیا کہا

ہے مرزا نوشہ نے

نظر گئے نہ کہیں اس کے دست و بازو کو

یہ لوگ کیوں میرے زخم جگر کو دیکھتے ہیں

”پر تمہاری سمجھ میں خاک نہ آیا ہوگا، مگر خیر ہم دوسروں کو کہاں سناتے ہیں۔“

”جی بات ہے مجھے واقعی سمجھ نہیں آتے تمہارے شعر۔“ اس نے اعتراف کیا۔

”ایک تو تم بات پوری کرنے نہیں دیتے بیچ میں چھلانگ ماردیتے ہو۔“ عارف کے فلسفیانہ تواتر میں پھر خلل آیا

تو وہ جھلا گیا۔ فلسفے کا تسلسل ٹوٹنے سے ایک ضرب سی پڑی تھی دماغ پر۔ وہ ”بحالی“ کے انتظار میں خاموش ہو گیا اور سانس لینے لگا۔

”ناراض ہو گئے۔ اچھا اب بیچ میں نہیں بولوں گا۔“ وہ اسے چپ دیکھ کر شرمندہ سا ہو گیا۔

”ارے نہیں یار! ناراض و ناراض نہیں ہوتے ہم۔ جب چپ ہوتے ہیں تو کچھ سوچ رہے ہوتے ہیں۔“

گھاس نوچتے ہوئے بیزار سے کہا۔

”اب کیا سوچنے لگے؟“ اسے نہ جانے کیوں عارف کی سوچ سے دلچسپی ہو جاتی تھی۔

”کچھ نہیں بس یہی کہ

آئے ہے بے کسیء عشق پہ رونا غالب

کس کے گھر جائے گا سیلاب بلا میرے بعد

اسے افسوس ہوا خونخواہ اسے چھیڑا پھر ایک شعر..... اس کا سر پٹنے کو دل چاہا تھا۔

یہ کوئی سکون کا موقع نہیں تھا کہ وہ ڈرینگ کا اہتمام کرتا۔ اس نے وارڈروب کھولی تو سامنے سرمئی سفاری سوٹ

اس نے وہی پہن لیا۔ تین چار شلوار سوٹ ایک چھوٹے سے سفری بیگ میں رکھے ایک دو کتابیں، تین چار رومال، تین

گھر میں پہننے والی چپل اور ایک واک مین۔ اس نے بار باروشی کو باغ کے کونے میں کتاب ہاتھ میں تھامے واک مین

موسیقی سنتے دیکھا تھا۔

”کہاں کی تیاری ہے؟“ وہ بڑی امی کو یہ بتا کر کہ وہ بابا صاحب کے ساتھ کراچی جا رہا ہے۔ راہداری عبور کرنے

تھا کہ اسے عقب سے مابین کی آواز آئی۔

وہ قدرے چوت کر رہ گیا۔

”ہیں نہیں بس ایک ضروری کام سے جا رہا ہوں۔“ وہ نظریں چرا کر سامنے دیکھنے لگا۔

”مگر یہ تو پارٹی میک اپ ہے۔“ وہ اسے مشتعل نظروں سے دیکھنے لگی۔

”ارے نہیں اتنا تو باہر جاتے ہوئے چل جاتا ہے۔“ وہ خفیف سا ہو کر مسکرا دیا۔

نہایت مصنوعی اور سطحی مسکراہٹ تھی۔

”مجھے تم سے نہایت ضروری باتیں کرنا ہیں، چاہے کچھ بھی ہو، ورنہ میں اپنا سوٹ کیس اٹھا کر کسی کو مطلع کئے بغیر یہاں

سے چلی جاؤں گی سنا؟“

وہ بہت سنجیدگی سے دھمکی آمیز گفتگو کر رہی تھی۔

”جی سمجھ گیا۔“

”کیا سمجھے؟“ وہ سنجیدہ بھی تھی اور قدرے برہم بھی۔

”یہی کہ آپ کو مجھ سے بہت ضروری باتیں کرنا ہیں، اچھا خدا حافظ۔“ اس نے قدم بڑھائے۔

”میں انتظار کروں گی۔“

”جی بہتر۔“ اسے اس وقت کسی بھی قیمت پر جان چھڑانا تھی۔

ڈرائیور تو بابا صاحب کے ساتھ سرائے گیا ہوا تھا۔ وہ مردانہ ہال کی طرف چلا آیا۔

”قاران! یار ذرا شہر تک ڈراپ تو کر دو۔“

”کہاں جارہی ہے تشریف؟“ اسے شہر جانے کے خیال سے بخار چڑھنے لگا۔

”ایمر جنسی ہے، دیر نہ کرو! بابا صاحب نے بلایا ہے۔“ اس نے سنجیدگی سے کہا۔

بابا صاحب نے! سرائے تک چھوڑ آؤں؟“ اس نے بدحواس ہو کر کھونٹی سے لگی شرٹ اتاری اور جلدی جلدی پہننے لگا۔

”نہیں بس۔ شہر سے ہائر کرلوں گا کچھ نہ کچھ۔ وہ مسئلہ اس لئے ہے کہ ڈرائیور تو ہے نہیں گاڑی لے جاؤں تو واپس کون

لائے گا؟“

”تو کیا کئی دن قیام و طعام ہوگا سرائے میں؟“

”جانی.....!“ اس نے سوالیہ انداز سے باری کر دیکھا۔

”ہے میرے پاس ہری اپ پلینز ایک ایک اچھی قیمتی ہے۔“ وہ بہت الجھا ہوا تھا۔

”بڑی کٹ میں ہو کہاں کی تیاری ہے؟“ جواد ہال میں داخل ہوا۔

”کام سے جا رہا ہوں۔“ اس نے جواد سے نظریں چرا لیں۔

”کام سے تو نہیں لگ گئے؟“ اس نے پاؤں جو توں سے آزاد کر کے سکون کا سانس لیا۔

وہ اتنا الجھا ہوا تھا کہ اس کی شہ رازت سے حظ نہ اٹھا سکا۔ اس سے پیشتر کہ مزید گفتگو ہوتی یا بات آگے بڑھتی ہے وہ باہر

نکل آیا۔ بابا صاحب کو اس نے فون کر دیا تھا اور اسے یقین تھا وہ اس سے پہلے ایئر پورٹ پہنچ جائیگا۔

اور جب رات سوا آٹھ بجے اس نے ایئر پورٹ کے احاطے میں قدم رکھا تو بابا صاحب کے ڈرائیور نے آگے بڑھ کر

اپنی مونہ بگنی کی اطلاع دی۔ اس نے بابا صاحب کو سلام کیا اور گاؤں کی طرف بڑھ گیا۔ نکت حاصل کئے پھر بابا صاحب کو لے کر اندر چلا گیا۔

”وہ بھی شام کو اسپتال چلی گئیں..... روبی نے بتایا تھا۔“

”یا اور آگئے تھے گھر پر؟“

”جی نہیں۔“

”ماہین سے ملاقات ہوئی؟“

”جی۔“

”کیا بات ہوئی؟“

”میں نے ضروری کام کا کہہ کر جلدی کا مظاہرہ کیا۔ موقع نہیں دیا انہیں بات کرنے کا۔“

”ہوں روشی کا نہیں پوچھا؟“

”میں نے زیادہ بات کرنے کا موقع نہیں دیا۔“

”اچھا کیا۔ یہ لڑکی ایک مسئلے کی طرح اٹل ہو رہی ہے۔ ہمیں اس کا حل ڈھونڈنا ہے۔“

باری خاموش رہا۔

”اس نے اتنا بڑا قدم اٹھا کر ہماری نسلوں کی محنت پر پانی پھیرنے کی کوشش کی ہے، ہم اسے معاف نہیں کر سکتے۔“ ان

کا چہرہ مارے جذب کے سرخ ہونے لگا۔

”فی الحال تو وہ زندگی اور موت کی کشمکش میں ہے۔“

”ہمیں اس کی موت کا ذرا افسوس نہ ہوگا۔“ ان کا لہجہ پر جلال تھا۔

باری کا دل کہیں کسی اتھاہ میں اتر ا۔

”باری؟“

”جی خان۔“

”خاندانی وقار نہ جانے کتنی نسلوں کی محنت کا جوہر ہوتا ہے، دولت صرف عیب چھپاتی ہے، خون نہیں بدلتی۔ ہم اپنے

پرکھوں کی محنت ایک گھڑی میں ٹھکانے لگانے کی اجازت نہیں دیں گے۔

ہر روشنی نور نہیں ہوتی۔ چمن چمن کر مختلف مرحلوں سے گزرتی ہے تو نور بنتی ہے۔

اسی طرح خاندان کا تاج ہوتا ہے، جس کی بنت و بناوٹ میں صدیوں اور پرکھوں کے کشٹ کا حصہ ہوتا ہے۔“

دولت مندوں کا شمار نہیں ہو سکتا، مگر خاندانوں کا شمار ہو سکتا ہے۔ اچھا نسب اس دنیا میں اعزاز ہے۔ حکمرانی نمبر دو چیز

ہے، مگر نسب نمبر ایک ہے، ہم نگران ہیں اپنے نسب کے، دو چار لوگوں کی خاطر ہزاروں کا نقصان نہیں کر سکتے۔ تمہیں شاید پتا نہ

ہو۔ ظفری کی بیوی کم نسب ضرور لائے ہیں، وہ اس لئے کہ ظفری میں باپ بننے کی صلاحیت نہیں۔ بچپن سے آج تک اس کے

سینکڑوں میڈیکل ٹیسٹ ہوئے ہیں، ہم اپنے ایک ایک بچے سے باخبر ہیں۔“

باری جو مستقل خاموشی اختیار کئے ہوئے تھا، ایک دم چونک پڑا۔

بورڈنگ کارڈز کیلئے بھیڑ میں کھڑے کھڑے اس نے بابا صاحب کی طرف دیکھا۔ وہ اپنی چھڑی کو..... اضطرابی انداز میں زمین پر مار رہے تھے، پیشانی پر لکیروں کا جال گہرا تھا۔ اتنی بھیڑ اور شور کے باوجود وہ ایک بے خبری کی کیفیت میں تھے۔ باری کو کئی بار محسوس ہوا جیسے وہ خود سے باتیں کر رہے ہوں۔

فلانٹ میں ابھی دیر تھی، وہ لاؤنج میں ایک صوفے پر برابر بیٹھ گئے۔

یہ ایئر پورٹ کا سب سے بارونق حصہ تھا۔ مختلف شہروں کے باسی یا مسافر اپنی اپنی فلائٹ کا انتظار کر رہے تھے۔

بچوں نے عجب چہل چلن کر رکھی تھی۔ بھاگ دوڑ بھی رہے تھے اور اپنے اپنے سر پرستوں سے شکایتیں بھی کر رہے تھے۔

گود کے بچے کا رونا دھونا بھی شور کا ایک حصہ تھا۔ گاہے بگا ہے اردو انگریزی میں ہونے والی اتانوسمنٹ ماحول میں نئے سرے سے ہلچل پیدا کر دیتی تھی۔

اور اس کے باوجود وہ دونوں اپنے اپنے دھیان میں تھے۔ ان کی فکر کا تسلسل کوئی بات، کوئی چیز توڑ نہیں پار رہی تھی۔

”اور کچھ بھی کہا تھا مونا نے.....؟“ آخر بابا صاحب نے چپ توڑی۔

”جی نہیں۔“

”دوبارہ فون نہیں آیا؟“

”جی نہیں۔“

”تم نے اطلاع دی؟“

”جی۔“

”کون ملا تھا فون پر؟“

”روبی۔“

”کچھ کہا نہیں اس نے؟“

”جی نہیں۔“

”تم نے بھی کچھ نہیں پوچھا؟“

”وہ بہت رورہی تھی۔“

”تمہیں چاہیے تھا گلو سے بات کرتے۔“

وہ اسپتال میں ہیں، روشی بی بی کے پاس۔

”اور زری؟“

”وہ بھی۔“

”پھر تو مونا کو بلا تے فون پر۔“

جھومر کی مظلومیت اس کے سینے پر ہاتھ مارنے لگی۔

”ہم خاندان سے باہر شادی کیخلاف نہیں، ہم نے اپنی بیٹیوں اور بیٹوں کی شادیاں باہر کی ہیں۔ مگر خاندانی ہونے کی سند جن کے پاس ہے وہاں۔ ہم نے بہوؤں کے جہیز کالا لچ نہیں کیا اور بیٹیاں باہر دیتے ہوئے یہ نہیں سوچا کہ جائیداد بن جائے گی۔“

”ہم دولت کی ضرورت اور اہمیت سے بے خبر نہیں، مگر ہم خاندان کی اہمیت کو ہر چیز سے بڑھ کر سمجھتے ہیں۔“

”ہم اپنے خاندانی وقار کی خاطر اپنی اولاد کو قربان کرنے کی ہمت بھی رکھتے ہیں۔“ ان کا لہجہ بہت مستحکم اور مضبوط تھا۔

”ہم نے فیصلہ کر لیا ہے کہ اگر روشی کو اللہ نے زندہ رکھا تو ہم اسی ہفتے اس کی شادی کر دیں گے۔“

”جی!“ باری نے چونک کر ان کی شکل دیکھی۔

”ہوں..... ہم چاہتے تھے کہ اس کی شادی گھر کے ہی کسی قابل بچے سے کریں۔ مگر اب ہم اسے حویلی میں نہیں رکھیں گے۔“ ان کے انداز سے غیظ و غضب ظاہر تھا۔

”پھر کہاں؟“ باری کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔

”کسی غریب خاندان کے..... کے ساتھ بیاہنے پر بھی ہم راضی ہوں گے۔ خاندانی ہو گا تو ہم یہ بھی نہیں دیکھیں گے کہ وہ میٹرک بھی ہے یا نہیں۔“

”جی.....؟“ باری کو ایک اور دھچکا لگا۔

”گوٹکا، بھرا بھی ہوا تو بیاہ دیں گے۔“

”جی۔“ باری کی پیشانی پر موتی چمکنے لگے۔

”یاور چچا۔“ اس نے بابا صاحب کو کچھ یاد دلانے کی کوشش کی۔

”وہ کچھ نہیں بول سکتے۔ وہ ہمیشہ ہمارے فیصلوں سے اتفاق کرتے ہیں۔ وہ عزت و وقار کے مسئلے پر ہم سے بھی زیادہ حساس ہیں۔ اسی وجہ سے ہمیں بہت عزیز بھی ہیں۔ انہوں نے زندگی میں بہت دکھ اٹھائے ہیں۔ ہمیں روشی پر اس لئے بہت زیادہ غصہ ہے کہ اس نے یاور کو ایک اور زخم لگانے کی کوشش کی۔ ہم اسے ہرگز معاف نہیں کر سکتے۔“

باری کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ ان اداؤں کو کیا نام دے۔ سفاکی یا عدل۔

کراچی جانے والی پرواز پی کے 302 روانگی کیلئے تیار ہے۔ اناؤنٹمنٹ ہو رہی تھی، وہ ایک دم سر جھٹک کر کھڑا ہو گیا۔

”آئیے بابا صاحب! اس نے بابا صاحب کا ہاتھ تھام کر اٹھایا۔

اسے لگا جیسے اس نے بابا صاحب کو نہیں اٹھایا..... روشی کی قضا کو اٹھایا۔

☆.....☆.....☆.....☆.....☆

ماحول اس وقت زیادہ پریشان کن ہو گیا جب مونا روتے روتے ایک طرف ڈھس گئی۔

گلوہ اسپتال کے کارڈور میں نفل پڑھنے میں مصروف تھیں۔ زری کی چیخ پر نیت توڑ کر بھاگیں۔ میں نے کہا بھی تھا کہ مت آؤ مگر یہ سنتی کب ہے۔“ انہوں نے اس کے رخسار تھپتھپاتے ہوئے شیشے کے اس پار موت و زندگی کی کشمکش میں مبتلا روشی کی طرف آئی۔

”ایسا ویک لوگ پشٹ کے ساتھ نہیں آنا چاہیے بابا۔“ نرس زری بد مزاجی سے مونا کو چپک کرنے لگی۔

”مین..... تم اسٹریچر لاؤ..... ام دیکھتا ہوں..... ادھر کوئی ڈاکٹر نہیں آئے..... ڈیوٹی ڈاکٹر ابھی نہیں آیا۔ جو ہے وہ..... تمہارے مریض کے ساتھ مصروف آئے۔“ وہ مونا کی نبض پر ہاتھ رکھ کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔ جہاں سے وارڈ بوائے نے ”ظنون“ ہونا تھا۔

چند منٹوں کے بعد آخر اسٹریچر آ گیا۔ زری گلوہ اور نرس نے مونا کو اسٹریچر پر لٹایا اور اس کے ساتھ ساتھ چل دیں۔

”گلوہ! تم یہیں ٹھہرو۔ روشی کے پاس..... میں ہوں مونا کے ساتھ.....“ زری نے گلوہ کے بڑھتے قدم روک دیئے تھے۔

زری نے ڈاکٹر کو روک کر بس اتنا پوچھ لیا تھا کہ کوئی خطرناک بات تو نہیں اور ہر چند ڈاکٹر نے نفی میں جواب دیا اس کی آنکھوں میں جو تھکرا اور الجھن تھی موت تو اسے دیکھ کر ہی حواس کھو بیٹھی تھی۔

اب گلوادھر روشی کی طرف ٹکٹکی لگا کر بیٹھ گئیں اور ادھر زری موت کی طرف.....

رات کے پونے گیارہ بج چکے تھے۔ بابا صاحب بس پہنچنے ہی والے تھے۔

ایک تو ناگہانی اس پر مستزاد بابا صاحب کی آمد..... گلو کے کلبے میں ایک دھکن پکڑ شروع ہو گئی تھی۔

”ہائے روشی! کیا ہوگا تیرا؟“ انہوں نے ترجم بھری نظروں سے ہوش و حواس سے بیگانہ روشی کی طرف دیکھا۔
! مگر فی الحال روشی کی جان بچ جائے..... افسوس جان بچ کر بھی نہ بچے گی، کیسی نادانی کی ہے تو نے۔“ ان کی آنکھوں آنسو بہنے لگے۔

وہ ٹھنوں میں سردے کر بیٹھ گئیں۔ اب تک بہت ضبط سے کام لیا تھا، مگر جیسے اب دل پر اختیار نہ رہا تھا۔ پھر بھی محتاط ضرورت تھیں کہ اس پاس چلتے پھرتے لوگوں کو شبہ بھی نہ ہو کہ وہ رو رہی ہیں، ناک بہتی تو رومال سے پونچھ لیتیں۔ پھر دیر کو سراٹھاتی تھیں، پھر ٹھنوں میں دے لیتی تھیں۔

پندرہ بیس منٹ گزر گئے۔ تب زری نے آکر بتایا کہ موت کو ہوش آ گیا ہے مگر سسٹر کہہ رہی ہے، اسے ابھی وہیں بٹھادو یا فوراً گھر لے جاؤ۔“

”آخر تو بابا صاحب کو لینے ایئر پورٹ گیا ہوا ہے۔ وہ آجائے تب ہی لے جاسکتے ہیں۔“ وہ زری سے نظریں جدا جواب بھی دے رہی تھیں اور ناک بھی پونچھ رہی تھیں۔

”رو رہی ہو گلو.....؟“ زری کا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ اس نے چونک کر شیشے کے پار دیکھا تھا۔ روشی ہنوز پہلی سیڑھی میں تھی۔

”بس ایسے ہی..... سگی بہنوں سے بڑھ کر نخرے ہیں اس کے، اگر اسے کچھ ہو گیا تو میرا دل پھٹ جائیگا۔“ وہ دہلے پھوٹ کر رونے لگیں۔

”اللہ نہ کرے۔“ زری نے سر اپنے سینے پر لگا لیا۔

”اس نے کیوں کیا یہ سب؟ کس شے کی کمی ہے اس کے پاس۔ بابا صاحب تک اس کی کوتاہیوں سے چشم پوشی کر رہے ہیں۔“ وہ اس طرح رو رہی تھیں جیسے ضبط کے سارے بندھن ٹوٹ گئے ہوں۔

زری، جو گلو کے حوصلے سے تقویت پکڑے ہوئے تھی، خود بھی آنسو بہانے لگی۔

باری بابا صاحب اور اختر سے چار قدم پیچھے ہی چل رہا تھا۔ بہت سارے دوسروں اس کی جان کو لگے تھے۔ قدم نہ بھر کے ہو رہے تھے۔ اب جو سامنے گلوادھر زری کو گئے مل کے روتے دیکھا تو جیسے اپنی جگہ پتھر کا ہو گیا۔

اس حویلی میں ڈھیروں لڑکیاں ہیں..... مگر.....!

جو شہزادیوں کا سا طمطراق۔

حاکموں کی سی تمکنت۔

آقاؤں جیسا قطعی پن و حتمی انداز اس کے اندر سے ابل ابل کر بہتا دکھائی دیتا تھا، وہی جیسے اس کیلئے چیلنج سا بن گیا تھا۔ وہ اتنی بے خوف تھی کہ اس کی مردانگی زنجیروں میں پھڑپھڑانے لگتی۔

وہ ستون تھام کر اپنی جگہ کھڑا رہ گیا تھا۔

”بی بی! خان تشریف لے آئے ہیں۔“ اختر نے رونے دھونے میں مصروف گلوادھر زری کو متوجہ کیا۔

گلو تو بدحواس ہو کر ایک دم اٹھ کھڑی ہوئی۔ زری کے البتہ سارے ایمر جنسی سوچ بے کار ہو گئے۔ وہ بیٹھی کی بیٹھی رہ گئی۔
بیشکل منہ سے ”السلام علیکم“ نکل سکا تھا۔

”وعلیکم السلام! ڈاکٹر کدھر ہے؟ بات کراؤ۔“ بابا صاحب جوان کے رونے کی وجہ سے قدرے ٹھنک گئے تھے شیشے کے پار نظر پڑتے ہی اپنی وضع میں واپس آ گئے۔

”جی اچھا زری ڈاکٹر کو بلانے دوڑی گئی۔“

”کوئی ایسی بات جو تمہارے علم میں ہو جس کی وجہ سے یہ سب ہوا؟“ وہ چھڑی پر زور ڈال کر پاس رکھی بیٹھ گئے۔

”جی نہیں، میرے علم میں ایسی کوئی بات نہیں۔ شاید وہ کراچی آنا نہیں چاہتی تھی۔“ گلو قدرے جھجک کر گویا ہوئی تھیں۔

”ہوں!“ بابا صاحب نے گہری سوچ کا غماز ایک لمبا ہنکارا بھرا۔

”مگر بیٹی! کراچی آنا یا نا آنا ایسی خاص بات نہیں کہ انسان زندگی داؤ پر لگا بیٹھے۔ مسئلہ کچھ اور ہے، بلکہ کچھ نہ کچھ ہے ضرور۔“ ان کی پیشانی کی لکیریں گہری ہو گئیں۔

”بابا صاحب! ڈاکٹر اپنے کمرے میں ہیں، آپ وہیں آجائیے، آرام سے بات ہو جائیگی وہاں۔“ زری نے آکر انہیں گہری سوچ کی دلدل سے باہر نکالا۔

”یہاں بچی موت سے لڑ رہی ہے۔ وہ وہاں جھک مار رہے ہیں۔“ اصولاً تو انہیں اس کے ہوش آنے تک کمرے سے باہر نہیں نکلنا چاہیے۔ اب میں ان نوابوں سے دفتر میں ملوں۔“ دلاور علی خان چل کر جانے کے احساس سے ایک دم مشتعل ہو گئے۔

ایک قہر آلود نظر انہوں نے آکسیجن ماسک کی مرہون منت روشی پر بھی ڈالی تھی۔

”یہ ہاسپٹل پرائیوٹ ہے؟“ وہ زری سے مخاطب ہوئے۔

”جی..... بابا صاحب!“ ان کو برہم دیکھ کر ویسے ہی حلق میں کانٹے پڑ جاتے تھے۔

”جیسے بھی ہم جھاڑیں گے اور نخرے بھی ہم اٹھائیں گے۔ تف ہے ایسی اولاد پر جو ایسے ویسے لوگوں کے سامنے دو کوڑی کا کر کے رکھ دے۔“

وہ دونوں بے بسی سے دلاور علی خان کی صورت دیکھنے لگیں۔

اس وقت مشکل گھڑی تھی۔ ڈاکٹروں سے بد مزگی کا خطرہ مول نہیں لیا جاسکتا تھا۔ جبکہ کیس بھی ”خودکشی“ کا تھا۔

باری کے اوسان بحال ہو چکے تھے۔ اصل صورتحال تک پہنچنے تک اب اس کی رسائی تھی۔ وہ نئے سرے سے بازو کران کی جانب بڑھاتا کہ بات تکرار تک نہ پہنچے۔

”خان“۔ اس نے انہیں پشت کی طرف سے پکارا۔

”خان! ڈاکٹر تو دوپہر سے ظاہر ہے یہیں ہوگا۔ اب رات بڑھ گئی ہے اس لئے تھوڑی دیر کو چلا گیا ہوگا“۔ ڈاکٹر کیس ہے۔ ابھی ڈرائمری ہوگی خان۔ پھر صورتحال کنٹرول میں ہوگی۔ ورنہ مسئلہ ہو جائیگا۔“

اس کو سب بابا صاحب کاریموٹ کنٹرول کہہ کر چھیڑتے تھے۔ اس لئے کہ حیرت انگیز بات تھی..... کہ بابا صاحب کی ہر بات کو سنتے تھے اور باتا تھے ہنوس لیتے تھے۔ یہی ہوا۔ اس کی دھیمی آواز اور نپے تلے الفاظ جیسے ہی ان کے کان پر اترے۔ ان کے چہرے پر موجود تناؤ کی کیفیت معدوم ہونے لگی۔

”تم بھی چلو ہمارے ساتھ“ تم ہی بات کرو گے ان ”افلاطونوں“ سے۔ ہم کام نہیں کرینگے جو مریض سے پوٹھ بھر خوش گپیاں کر رہے ہیں۔“ وہ چھری پر زور ڈال کر اٹھ کھڑے ہوئے۔

”جی“۔ باری شیشے کے اس پار نہ جانے کیا ڈھونڈ رہا تھا۔ ایک دم چونک کر ان کے پیچھے ہولیا۔ مگو اور زری کو پوٹھ بھرے رہنے کا اشارہ کیا۔

”شکر ہے باری ساتھ آیا ہے۔“

”تا معقولیت کی حد تک ہم اس کے مادی ہو چکے ہیں۔ ایسا لگا۔ جیسے ”بچوں کی ماں آگئی ہو“۔ زری کھسیا کر کہہ رہی تھی۔ افسردگی کے ماحول میں لمحے بھر کیلئے مسکراہٹ کی کرنیں چمکی تھیں۔ ایسی ہی بے ساختہ مسکراہٹ جیسے کہ بے ساختہ آنے ہوتے ہیں۔

دونوں سر جھکائے بیٹھی تھیں۔ بابا صاحب اور باری کو دوبارہ اس طرف آتے آتے آدھا گھنٹہ لگ گیا تھا۔

”زری بی بی! آپ لوگ جائیں میں ہوں یہاں پر“۔ باری ان سے مخاطب تھا۔

”ہم یہیں ٹھیک ہیں تم تھک گئے ہو آرام کرلو“۔ مگو وہاں سے کسی طرح ہلنے کو راضی نہ تھیں۔

”باری ٹھیک کہہ رہا ہے تم لوگ گھر چلو اب کوئی بات نہیں“۔ بابا صاحب اپنے مخصوص فیصلہ کن لہجے میں مخاطب ہوئے۔

دونوں نے بے بسی سے ایک دوسرے کی شکل دیکھی۔

”میں مونا کو لے کر آتی ہے۔“ زری بادل خواستہ انداز میں اٹھ کھڑی ہوئی۔

”مونا کہاں ہے؟“ بابا صاحب جو کم صم کیفیت میں روشنی کی سمت متوجہ تھے ایک دم چونک پڑے۔

”وہ ادھر دارڈ میں ہے بے ہوش ہو گئی تھی“۔ زری جلدی سے بولی۔

”کیوں بے ہوش ہو گئی تھی طبیعت تو ٹھیک ہے اس کی؟“ وہ پریشان سے نظر آئے۔

”وہ رو بہت رہی تھی روشنی کی وجہ سے“۔ مگو نے ہچکچاتے ہوئے بتایا۔

”حق“۔ انہوں نے بہت کوفت محسوس کی ”اب ایسی ہے؟“

”ٹھیک ہے آپ لوگ چلیں میں لاتی ہوں اسے گاڑی گیٹ کے ساتھ ہی ہے نا اختر؟“ زری نے فاصلے پر کھڑے

ڈرائیور کو مخاطب کیا۔

”جی بی بی؟“

”ہوں! اچھا ہم گاڑی میں بیٹھتے ہیں تم مونا کو لے آؤ۔ مگو اٹھو بیٹی۔“

مگوروشی کی طرف دیکھتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئیں۔

”باری! میرا ذرا بھی دل نہیں چاہ رہا۔ یوں بھی مینڈ تو آئیگی نہیں“۔ وہ افسردگی کا مجسمہ بنی ہوئی تھیں۔

”پلیز.....!“ باری نے بس ان سے اتنا ہی کہا۔ تب وہ آہستہ قدموں سے ڈرائیور اور بابا صاحب کے پیچھے چل

پڑیں۔

”باری!“ وہ جاتے جاتے ٹھہر گئیں۔

”جی!“

”فون کر کے صورتحال بتاتے رہنا۔ میں تمہیں جاگتی ہوئی ملوں گی۔“

”بہتر..... آپ اطمینان رکھیں۔“ وہ اس جگہ بیٹھ گیا جہاں اب تک گھوٹنٹھی ہوئی تھیں۔

”بی بی! کھانا کھالیں۔ بڑی بیگم کہہ رہی ہیں بھوک نہ ہو تو تھوڑا سا ہی کھالیں“۔ ماما بی دروازے میں کھڑی تھی اور بہت مودبانہ انداز میں کہہ رہی تھی۔

”پہلے روشنی کی شکل دکھاؤ؟“ ڈانڈک ہال میں اسی کے ساتھ جاؤں گی۔“ وہ تو جیسے بھری بیٹھی تھی۔

”وہ تو جی رات کراچی چلی گئی تھیں“۔ ماما نے سادگی سے بتایا جس میں قدرے حیرانی بھی شامل تھی۔

”کیا.....؟“ وہ ایک دم اچھل کر کھڑی ہو گئی۔ کیا کہا تم نے رات کراچی چلی گئی مجھ سے ملے بغیر..... اوہ نو؟“ اس کا

ذہن تیزی سے چک پھیریاں کھانے لگا۔

”رات..... تمہارا مطلب ہے کل رات؟“ وہ ماما کے نزدیک چلی آئی۔

”جی بی بی! کل رات“۔ وہ مامین کے اندر پر قدرے پریشان نظر آنے لگی تھی۔

”اکیلی یا اپنے بچا کے ساتھ؟“ اس نے کل سے یاور علی خان کو بھی تو نہیں دیکھا تھا۔

”ساری لڑکیاں گئی ہیں بی بی! سبوں کے ساتھ گئی ہیں وہ“۔ ماما نے وضاحت کی۔

”سب گئی ہیں“۔ یہ ایک اور چونکا دینے والا انکشاف تھا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی بیڈ پر بیٹھ گئی۔

”اچھا! ماما ذرا باری کو بلواؤ“۔ وہ کچھ سوچ رہی تھی۔

”وہ جی..... خان حویلی میں نہیں ہیں“۔ وہ دھیرے سے بولی۔

”پھر کہاں ہیں.....؟“ وہ تاراضگی سے ماما کو دیکھنے لگی۔

”جی مجھے پتا نہیں۔ بڑے خان بھی تو نہیں ہیں، جہاں بڑے خان ہوتے ہیں تو خان (باری) انہی کے ساتھ ہوتا ہے۔“ ماما پر پے سوالات سے پریشان نظر آرہی تھی۔

”بڑے خان کہاں گئے ہوئے ہیں؟“ اس سوال کے جواب میں ہی باری کا اتا پتا چھپا ہوا تھا۔

”جی مجھے پتا نہیں، ہم ملازموں کو ایسی باتیں پتا نہیں ہوتیں؟“ ماما نے اس کے مزید سوالات کے حملوں کو روکنا چاہا۔

”پھر کیسی باتیں پتا ہوتی ہیں؟“ اس نے دانت پیس کر پاس رکھی کتاب اٹھا کر پٹنی۔

”ملازم کو تو جی صرف اپنے کام سے مطلب ہونا چاہیے۔ ہمیں ضرورت بھی کیا ہے پتا کرنے کی، آقا کے کاموں ہمیں کیا مطلب جی۔“ وہ مابین کو غصے میں دیکھ کر پریشان سی ہو گئی۔

”اچھا تم جاؤ۔“ اسے مزید روکنا بے کار ہی تھا۔

”آپ آرہی ہیں کھانا کھانے میں بڑی بیگم کو کیا جواب دوں؟“

”آرہی ہوں میں۔“ اس نے جیسے کوئی تہیہ کر لیا تھا۔

ماما کے جاتے ہی اس نے خود پر نظر ڈالی۔ رات سے اتنا موڈ خراب تھا کہ اس نے خود پر توجہ ہی نہیں دی تھی۔ اب ہر کھانا تو محفل میں ہوتا تھا۔

اس نے فیروزی شلوار کرتا اور سیاہ دوپٹے کا انتخاب کیا۔ فیروزی کپڑوں پر سیاہ کشیدہ کاری اور کالے دوپٹے پر فیروز کشیدہ کاری نے لباس کو بہت خوبصورت اور جاندار بنا دیا تھا۔ جیولری تو وہ کبھی کبھار خاص مواقع پر ہی تبدیل کرتی تھی ڈائننگ کے ننھے منے آویزے ہمیشہ اس کے کانوں میں رہتے تھے۔ ہونٹوں پر پنک لپ اسٹک کا بچ دیا اور دوپٹا شان پر پھیلا کر اپنے رہائشی کمرے سے باہر آ گئی۔

ذہن میں ادھیڑ بن جاری تھا، مگر چہرہ پر سکون تھا۔ وہ ڈائننگ ہال تک پہنچانے والے بیچ میں داخل ہی ہوئی تھی سامنے سے یاور علی خان آتے ہوئے دکھائی دیے۔

وہ ٹھنک کر رک گئی۔ ”اسلام علیکم“ اس کا انداز غیر شعودی طور پر طنزیہ ہو گیا۔

”وعلیکم السلام۔“ ٹھیک ہیں آپ؟“

”میں کھانا کھا کر ابھی آتی ہوں، سومت جائیے گا۔“ اس نے ان کا سوال نظر انداز کر کے اپنی بات کی..... اور آگ بڑھ گئی۔

یاور علی خان اسے جاتے ہوئے دیکھنے لگے یہاں تک کہ اس کا سیاہ لہراتا ہوا آچل موڑ پر غائب ہو گیا۔ تب وہ چومک کر اپنے کمرے کی طرف بڑھے۔

آج کھانے پر وہ چہل پہل نہیں تھی، جولو کیوں کی موجودگی میں نظر آتی تھی۔

یہاں سے وہاں تک سنجیدہ تجربہ کار اور محتاط خواتین تشریف فرما تھیں۔ سامنے ہی عالم تاب زرد اور سیاہ شلوار قمیض اور زرد چوڑے سے دوپٹے میں ملبوس اس طرح فرشی نشست پر بیٹھی تھیں کہ ایک گھٹنا فرش پر اور دوسرا دونوں بازوؤں کے گھیرے میں تھا۔ گوشت سے پرکلائیوں میں چمکتی ہوئی سونے کی چوڑیوں کی منعکس ہوتی ہوئی کرنوں سے ان کے ارد گرد کی فضا بڑی روشن سی محسوس ہوئی۔

”السلام علیکم!“ اس نے حاضرین کو سلام کیا۔ عالم تاب نے اسے اپنے پہلو میں آنے کا اشارہ کیا۔

وہ وعلیکم السلام کی آوازوں کے بیچ ان کی ہدایت کے مطابق بیٹھ گئی۔

”طبیعت کیسی ہے اب؟ تم نے ماما سے کہلوادیا تھا کہ کوئی ڈسٹرب نہ کرے، اس لئے میں تمہارے کمرے میں نہیں گئی۔“ جہاں ”راز“ ہوتے ہیں وہاں ”وضا حقیق“ بھی ہوتی ہیں۔

”جی ٹھیک ہوں اب، بس سر میں درد بہت تھا۔ رات سو نہیں سکی تھی۔ پتا نہیں باغ کی طرف سے کیسی آوازیں آرہی تھیں۔ جیسے زنجیریں کھنک رہی ہوں۔“ اس نے ان سب کے رد عمل سے بے نیاز ہو کر پلیٹ اپنے سامنے کھسکائی۔

مگر اس نے محسوس کیا کہ دو تین خواتین کے علاوہ اس کی بات پر اور کوئی نہ چونکا تھا۔ سب سے پہلے تو اس نے برابر بیٹھی ہوئی عالم تاب کا ایک لچلے ٹھکنا صاف محسوس کیا تھا۔

”یہ کھوکھر بعض اوقات بہت لا پرواہی کرتا ہے، کتے اصطبل میں کھلے چھوڑ دیتا ہے۔ وہ رات کو باغ میں بھاگتے پھرتے ہیں۔ بہت خونی قسم کے کتے ہیں۔ بڑی بھاری زنجیریں ان کے گلے میں ڈالنا ہوتی ہیں۔ تھوڑی دیر کو بھی ان کو کھولتے ہیں تو زنجیروں کے ساتھ تاکہ قابو کرنے میں آسانی ہو۔ پوچھوں گی کھوکھر سے میں کہ کیوں لا پرواہی کرتا ہے۔ بتاؤ، کتنی بے آرامی ہوئی تمہیں۔“ انہوں نے ڈش اس کی سمت بڑھا کر اظہار افسوس کیا۔

مابین نے نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبا کر اپنی بے لگام تلخ مسکراہٹ کے آگے بند باندھے۔

”آج یہاں سرسوتی نظر نہیں آرہی۔“ مابین نے نہ جانے کیوں عالم تاب کو بغور دیکھتے ہوئے پوچھ لیا۔ جانے وہ کس نتیجے کی تلاش میں تھی۔

”کبھی صبح سے غائب ہے۔“ سائرہ ممانی نے قاب اس کے سامنے رکھتے ہوئے قدرے خفگی کے انداز میں کہا۔

”ذمیرا پڑا ہوا ہے کپڑوں کا استری کیلئے۔ ایک تو کلو بھی کراچی گئی ہوئی ہے، زرینہ پہلے ہی چھٹی پر ہے۔ ماما کیلی کیا کیا دیکھے۔“

سرسوتی کا ذکر آتے ہی جیسے انہیں اپنی پریشانیوں نے سرے سے یاد آئیں۔

مابین کے صرف کان سائرہ ممانی کی طرف متوجہ ہوئے تھے۔ آنکھیں بدستور عالم تاب کا جائزہ لے رہی تھیں۔ اس نے نوٹ کیا کہ عالم تاب نے سرسوتی کی غیر موجودگی پر نہ کوئی تبصرہ کیا اور نہ ہی اس سے متعلق کوئی ٹکڑا جوڑا۔ وہ اسی طرح کھانا کھانے میں معارف رہیں۔ جیسے پہلے تھیں۔ حالانکہ گھر کی منتظم کی حیثیت سے سرسوتی کی غیر موجودگی کی وجہ..... انہیں معلوم ہونا چاہیے تھی۔ اس نے صاف محسوس کیا کہ وہ سرسوتی کے ذکر کو بال رہی ہیں اور چاہتی ہیں کہ یہ موضوع یہیں تمام ہو

جائے وہ اسی طرح مطمئن تھیں۔ جیسے یہ کوئی خاص بات نہیں۔

”آئے تو لگا بیٹے گا دو جوتے اور کہیے گا کہاں غائب ہو جاتی ہے بغیر بتائے، نوکری نہیں ہوتی تو سیدھا سیدھا دے۔“ جہاں آرا پھر بھی نے بھی ہماوج کی تاکید کی۔

عالم تاب تو جیسے قسم کھا کر چپ تھیں۔

”آپ ڈانٹتی نہیں ہیں اسے؟ مہین نے عالم تاب کو بغور دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

”ہاں..... ہاں..... ڈانٹتی ہوں، آئے گی تو ڈانٹوں گی۔“ انہوں نے رکی سے انداز میں جواب دیا۔ جیسے کہ بھروسہ دل کھنے کیلئے ان کی حسب خواہش کوئی بات کر دی جاتی ہے۔

اور مہین اپنے مقصد میں کامیاب ہو چکی تھی۔ اس نے واضح طور پر محسوس کر لیا تھا کہ عالم تاب اس گھر کے ایک ایک سے نہ صرف باخبر ہیں بلکہ حصہ دار ہیں۔

”اس کی ماں بہت محنتی عورت تھی۔ اس گھر کی خدمت کرتے کرتے مر گئی۔ اس جیسے نمک حلال بڑی مشکل سے ہیں۔ تازمین تو اس کے بغیر کہیں جاتی تک نہیں تھی۔ ایک تو ماشاء اللہ اس کے بال اتنے لمبے اور گھنے تھے کہ اس سے سنبھ نہیں تھے۔ سرسوتی کی ماں کی ڈیوٹی تھی اس کے سر کی مالش کرنا، سلجھانا۔ کہتی تھی آپا کہ اگر یہ کہیں ادھر ادھر ہو جائے تو گزارا تو نہیں ہوگا۔

اس کو مالش کی اتنی عادت ہو گئی جیسے کوئی نشے کا عادی ہو جاتا ہے۔ مجھے یاد ہے ایک مرتبہ جب وہ اپنے نیکے گئی تو کراپا سے دوسرے ہی دن فون آگیا تھا کہ ”روپا“ کو فوراً جہاز سے بھیجیں، مجھے نیند نہیں آتی۔ اس کی مالش کے بغیر صبح معنوں پر ”ملکہ“ جیسی زندگی گزاری۔ اتنا عیش و آرام تو بابا صاحب کی بیٹیوں کو بھی نہیں ملا ہوگا۔ جو اسے اس گھر کی بہو کی حیثیت سے ملا۔ آہ! مگر بے چاری تھوڑی عمر لائی تھی۔“

رکیسہ یعنی تازمین کی بڑی مند سرسوتی سے اس کی ماں روپا اور روپا سے تازمین پر آکر رک گئیں۔ سرسوتی کا ذکر اور معاملہ تو ایک طرف جا پڑا اور تازمین کی یادیں شروع ہو گئی تھیں۔

”بابا صاحب نے جتنے لاڈ پیار تازمین سے کئے، کسی اور کے حصے میں نہیں آئے۔“ رکیسہ سے چھوٹی جہاں آراء نے نر لگایا۔

”ہاں بعض لوگوں کی اس معاملے میں قسمت بہت تیز ہوتی ہے۔ ہر ایک سے محبت پاتے ہیں۔ اپنی شرط پر زندگی گزارتے ہیں۔ اس کے باوجود ان سے پیار کیا جاتا ہے۔ ان سے لاڈ کئے جاتے ہیں۔“ عالم تاب نے اتنی دیر میں پہلی مرتبہ گفتگو میں باقاعدہ حصہ لیا۔

مہین جو بہن کے ذکر میں کھوس گئی تھی ایک دم چونک کر ان کی شکل دیکھنے لگی۔

”اس طرح مت دیکھو۔ یقین کرو میں بھی اس کے چاہنے والوں میں شامل رہی ہوں، دیورانی نہیں سمجھا، اپنی چھوٹی بہن سمجھتی تھی۔ اس کے ہاتھوں پیروں میں مہندی بہت جیتی تھی۔ میں ہر نئے مہندی کا پیالہ لے لے اس کے پیچھے پھرتے جیتی تھی۔“

نہیں گدوائی تھی۔ جیتی تھی، یاد رکھی تو بہت پسند کرتے ہیں اور بہت تعریف کرتے ہیں میری مہندی کی۔ کہتے ہیں میری طرف سے بھابی کا بہت بہت شکر یہ ادا کر دیا کرو مگر مجھے اچھی نہیں لگتی۔ لمبے پتے سرخ سرخ ہاتھ پاؤں کے ساتھ ماڈر ان ڈریسنگ کا مزہ نہیں آتا۔ عجیب مصلحہ خیر قسم کی صورت حال ہو جاتی ہے؟ مگر میں زبردستی لگا دیا کرتی تھی کہ تیرے میاں کو اچھی لگتی ہے، تجھے دنیا سے کیا غرض۔“

عالم تاب مسکراتی ہوئی ماضی کے خوبصورت دن یاد کر رہی تھیں۔

”میرے دل کو آج تک صبر نہیں آیا۔ بہت یاد آتی ہے وہ۔“ ان کی آواز دھیمی اور شکستہ سی ہو گئی۔ وہ دوپٹے کے پلو سے آنکھیں پونچھ رہی تھیں۔

مہین کی تو ساری جاسوسی دھری کی دھری رہ گئی۔ وہ الجھ کر رہ گئی۔ اس کو تو یہ بھی بھول گیا کہ یہ کیا جاننا چاہ رہی تھی۔ صورت حال یکھت بدل کر رہ گئی تھی۔

”میں تمہیں اس کی بہت شاندار تصاویر دکھاؤں گی۔ جو ادکی چھٹی پر ہم نے اسے دلہن کی طرح پور پور سجاایا تھا۔ اتنے پھول پہنائے تھے کہ بس، بہت ہی حسین تصویر ہے وہ..... ابھی چلنا میرے کمرے میں کھانے کے بعد۔ یاد رہے سونے کی فریم جڑائی تھی۔ گود میں چھ دن کا صحت مند جو اد ہے۔ اتنی شاندار تصویر ہے اگر کسی آرٹ گیلری میں لگا دی جائے تو بس سب اسی کو دیکھیں۔“ وہ مہین کا اشتیاق بڑھا رہی تھیں اور مہین کا واقعی دل چاہ رہا تھا، کھانا ڈانا چھوڑ کر پہلے وہ تصویر دیکھے۔

عالم تاب اس کا ذہن ادھر ادھر کرنے میں کامیاب ہو گئی تھیں۔ اس وقت اس کے ذہن میں سوائے اپنی بہن کے کچھ نہ تھا۔

شک و بدگمانی کے وہ سانپ، کچھ جو رات سے اس کے ذہن میں کلبلا رہے تھے، جیسے اونگھنے لگے تھے۔ یہاں تو ہر شخص بھوکا عاشق زار دکھائی دیتا ہے۔ وہ کچھ سوچنے لگی۔ اتنا تو خیر اسے یقین تھا کہ وہ زنجیروں میں بندھی عورت گھر کی مالکوں میں سے تو نہیں تھی۔

انداز میں جس طرح کی عاجزی اور مسکینی تھی، اس سے تو وہ ازلی نمک خوروں میں سے لگتی تھی۔ مگر یہ سوال تو اپنی جگہ موجود ہے۔ وہ کون ہے؟ کس جرم میں قید ہے

”تم ٹھیک سے نہیں کھا رہی؟“ عالم تاب نے اسے سوچ میں ڈوبا دیکھ کر ٹوکا۔

”ایسی کوئی بات نہیں۔ کھا رہی ہوں۔“ وہ چونک کر خفیف سے انداز میں مسکرائی تھی۔

”کیا تمام لڑکیاں کھانا کھا چکی؟“

یہ وہ سوال تھا جو اسے سب سے پہلے کرنا تھا، مگر گفتگو کا آغاز کچھ اس طرح ہوا کہ عجیب و شور و غل سا شروع ہو گیا تھا۔

سب سے بڑھ کر رات کا واقعہ اتنا پر اسرار اور خوفزدہ کر دینے والا تھا کہ باقی تمام سوالات کی حیثیت ثانوی سی ہو کر رہ گئی تھی۔

”ہائیں! روشنی مل کر نہیں گئی تم سے؟“ صاف ظاہر تھا کہ عالم تاب بہت انجان بن کر پوچھ رہی ہیں۔

”جی نہیں، مجھے تو کسی قسم کی اطلاع نہیں۔“ ادھر بھی اداکاری تھی اور ادھر بھی۔
”ہاں، شاید تم سوچتی ہو گی۔“

”مگر پروگرام تو ان کا پہلے سے ہو گا۔ مگر میں سب ہی کو اس کی اطلاع ہو گی۔ یہ بات تو کھانے کے وقت بھی بتائی جاسکتی تھی، مگر وہاں تو کسی قسم کا کوئی تذکرہ ہی نہیں ہوا۔ کالج بھی کھلے ہوئے ہیں۔ غالباً، یہیں کسی رشتے دار سے ملنے گئی ہو گی۔“ اس نے باری باری تمام چہروں کو پڑھنے کی کوشش کی۔ اور یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی، گویا اسے کوئی خبر نہیں۔

”کراچی گئی ہیں، بہت پہلے سے پروگرام سیٹ تھا۔“ عالم تاب نے گویا اطلاع دی۔

”کراچی! روشنی اتنی دور گئی اور بتا کر بھی نہیں گئی اور سب سے اہم تو یہ ہے کہ میں تو اس کی اور جواد کی خاطر ہی یہاں آئی ہوں۔ میری تو سمجھ میں نہیں آ رہا کہ یہ کیا سلسلہ ہے، مہمان موجود، میزبان غائب۔“ اس کے لہجے سے ناراضگی چمک رہی تھی۔ سب خواتین عالم تاب کی صورت دیکھنے لگیں، جیسے وہ ان کی نجات دہندہ ہوں۔

”میں دن پہلے سے ان کی سیٹیں کنفرم تھیں۔ تمہارے آنے سے پہلے ہی۔ میرے خیال میں کسی کو دھیان نہیں رہا، نہ دل براندہ کرو۔ ایسی کوئی بات نہیں۔ بہر حال روشنی کی یہ بات واقعی غلط ہے کہ اس نے نہ تم سے تذکرہ کیا نہ ہی مل کر گئی۔“

عالم تاب نے ساری ذمہ داری روشنی کے سر منڈھ دی۔

اب بولنے کی گنجائش ہی کیا رہ گئی تھی۔ قصور روشنی کا نکال کر گویا اس کا اپنا کھونٹا کمزور ثابت کر دیا گیا تھا۔ اب تو یہ اس کے جمل ہونے کا مقام تھا کہ اس نے اپنی محبت کرنے والی خالہ کو اتنی اہمیت بھی نہیں دی تھی کہ جاتے ہوئے مل کر جاتی۔ جبکہ رشتے کی قربت کا تقاضا یہ تھا کہ اس کی خاطر وہ اپنے سارے پروگرام کینسل کر دیتی۔

وہ سر جھکا کر کھانا زہر مار کرنے لگی۔ خون بے شک کھول رہا تھا مگر ہونٹ سی لئے تھے۔ اب تو شاید سارا نزلہ یاور علی خان پر گرنا تھا۔

”تم خیال نہ کرنا،“ کراچی میں بابا صاحب کے بہت قریبی دوست کے پوتے اور پوتی کی شادی کی وجہ سے بچپن کو جانا پڑا، ورنہ ظاہر ہے تمہاری موجودگی میں تو کسی سیر و تفریح کا غرض سے جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ان لوگوں کا اصرار تھا۔ لڑکیوں کو ہفتہ دس دن پہلے بھیجیں۔ ہم عورتوں میں سے تو جو بھی جائے گی۔ ایک دن پہلے ہی جائیگی۔ مردوں کو تو اتنی فرصت نہیں آج کل، لڑکوں کے اپنے دھندے۔“

وضاحت دروضاحت کا سلسلہ تھا۔ ماہین کا سر درد کرنے لگا۔ کیونکہ اسے یہ احساس تو بہت اچھی طرح تھا کہ جو کچھ کہا جا رہا ہے، حقیقت اس کے برعکس ہے، مقام مجبوری تھا، خاموشی ہی بہتر تھی کہ اظہار حقیقت کیلئے درست زاویہ نہیں بن پا رہا تھا۔ اس کے پاس کوئی دلیل، کوئی سچ، کوئی ثبوت نہیں تھا۔ جوان کو غلط یا جھوٹا ثابت کرتا۔ اب بس یہ تھا کہ اس کا ذہنی سکون رخصت ہو چکا تھا۔ وہ یاور علی خان کو ملنے کو بہت بے چین تھی۔

ڈیڑھ دو گھنٹے قبل کے واقعات ذہن میں دوہراتے، کوئی سرا ڈھونڈتے ڈھونڈتے اس کا ذہن شل ہو چکا تھا۔ وہ چاہتی

تھی ساری حویلی خیمہ میں ڈوب جائے تب وہ یاور علی خان کے پاس جائے۔ اسے خدشہ تھا کہ اگر کسی نے اسے یاور علی خان کے بیڈروم میں جاتے ہوئے دیکھ لیا تو بہانے سے آمو جو ہو گا۔ خصوصاً عالم تاب کو بھٹک بھی پڑ گئی کہ وہ یاور کے کمرے میں ہے تو وہ ضرور آمو جو ہو گی۔ اسے تو ان کی نظریں مشاق جاسوس کی نظریں دکھائی دیتی تھیں۔
وہ نماز پڑھنے کے ارادے سے بالآخر بیٹھ گئی اور اپنے ذہن کو یکسو کرنے کی شعوری کوشش کی۔ پھر وضو کر کے نماز ادا کرنے لگی۔

تقریباً آدھا گھنٹہ نماز میں گزر گیا۔ اس نے وال کلاک کی سمت دیکھا۔ بارہ بجنے میں دو تین منٹ باقی تھے۔ وہ آہستگی سے دروازہ کھول کر باہر جھانکنے لگی۔ راہداریاں سونی تھیں۔ آج تو سرسوتی بھی نہیں تھی، یقیناً وہ کوٹھڑی میں سزا کاٹ رہی تھی۔ وہ چند منٹ تک باہر کا جائزہ لیتی رہی۔ آج باری کی مداخلت کا بھی کھٹکا نہیں تھا۔ اس نے آہستگی سے دروازہ بند کیا اور سر پر دوپٹا جما کر یاور علی خان کے بیڈروم کی طرف چلی آئی۔ بہت آہستگی سے دروازے پر دستک دی۔

”یس.....!“ راہداری کی طرف کھلے ہوئے در پہنچے کی وجہ سے بہت واضح آواز سنائی دی۔

اس نے در پہنچے کی سمت دیکھا۔ وہاں بہت بھاری پردوں کی آڑ موجود تھی۔ وہ کمرے میں داخل ہو گئی۔

آج کمرے میں پہلے سے لائیں آن تھیں اور وہ صوفے میں دھنسنے ہوئے بلیڈ کلر کی فائل کا مطالعہ کر رہے تھے۔ ادھ جلا سگریٹ اگلیوں میں دبا ہوا تھا۔ اگلے سرے پر رکھ کر جمع ہو چکی تھی، جو اس بات کی غماز تھی کہ خاصی دیر۔ کش نہیں لگایا گیا۔ یعنی یا تو وہ بہت مصروفیت کے عالم میں تھے یا غائب دماغی کی حالت میں تھے۔

”آئیے! بہت انتظار کرایا۔“ انہوں نے کش لگ کر آگے کو جھک کر رکھا جھاڑی۔

دو سیاہ شلوار قمیض میں ملبوس تھے جو ان پر بے پناہ سج رہی تھی۔

”ہائے بچو!“ اس کے دل سے ہائے نکلی۔

”آپ واقعی میرا انتظار کر رہے تھے؟“ وہ حیرت آمیز مسکراہٹ سے انہیں دیکھنے لگی۔

”آپ نے کہا جو تھا، اس لئے انتظار تو کرنا چاہیے تھا۔“ وہ ہمیشہ کی طرح سنجیدہ تھے۔ ”میں سب کے سونے کا انتظار کر رہی تھی۔“ اس کے منہ سے نکل گیا۔ بہت سچ بولنے کی عادت جو تھی۔

”ارے وہ کیوں؟“ انہیں سن کر جیسے اچنبھا ہوا۔ دھیرے سے مسکرا دیئے تھے۔

”ہمارا آپ کا ایج گروپ تو مختلف ہے، بے کار احتیاط کی۔“ ان کی طرف سے پہلی مرتبہ مزاح کی آمیزش دیکھنے کو ملی۔

دو قدم بڑے جھینپ گئی۔ درحقیقت اسے ایسی امید نہیں تھی کہ وہ اس طرح کی جملے بازی بھی کر سکتے ہیں۔

حیثیت اس کا چہرہ گلابی ہو رہا تھا۔ وہ کوئی جملہ موزوں کرنے لگی۔

انہوں نے اس کی طرف دیکھا تو یونہی بے ساختہ کہہ دیا تھا۔ اب جو جواب میں خاموشی کی طوالت بڑھی تو نظریں اٹھا کر اس کی سمت دیکھا۔

ایک چوٹی سے کھٹک دار ہنسی آس پاس سنائی دینے لگی۔ کلیسا کی گھنٹیاں بجنے لگیں۔

فیروزی سنک کے پاجامے اور دوپٹے اور سیاہ جالی کے کرتے میں ایک شوخ، جود کے بجائے ان کی رنگیں میں بھاگنے لگا۔ ماحول میں آتش بازی چھوٹ رہی تھی۔ آزمائش میں مبتلا کر دینے والا سراپا۔ دل کھول کر ہنستی ہوئی سوتیلوں کی چکا چوند ہاتھ میں ہاتھ پھنسا کر ہنسی سے دہری ہوتی ہوئی۔

متناسب جسم کے خون میں آگے لگا دینے والے زاویے۔ جیسے خوشی اور ہنسی کے خمیر سے گندھا ہوا وجود جیسے راز کے تانے بانے سے بنا سراپا۔

جیسے خوشبوؤں کی خیالی تجسیم.....

”بیٹھ جائیے پلیز“۔ بلکی سی شکستگی جو لمبے بھر کو جھلکی تھی ایک دم معدوم ہو چکی تھی۔ لہجہ از سر نو خشک اور پر تکلف تھا۔

”اب بتائیے کیسے زحمت کی؟“۔

”ہمارا آپ کا رشتہ تو ایسا ہے کہ اس طرح کی ”زحمتیں“ ہوتی رہنا چاہیں۔“ وہ ان کے تبدیل شدہ انداز پر اپنا چہپاتے ہوئے بیٹھ گئی۔

”وہ اس کی بات پر خاموش رہے۔“

”روٹی کہاں ہے؟“ اس کا خیال تھا وہ اس کے سوال پر چونک انھیں گے، مگر ان کا انداز بدستور رہا۔

”جس سوال کا جواب آپ کو معلوم ہے اس کو کرنے کا فائدہ؟“ وہ کش لگا رہے تھے۔

”آپ کے پاس کیا دلیل ہے کہ مجھے اس سوال کا جواب معلوم ہے؟“ اس نے انہیں لا جواب کرنا چاہا۔

”آپ گھر کی خواتین سے ملی ہوں گی، ملازمہ سے ملی ہوں گی، یہ اتنا اہم سوال ہے کہ آپ نے فوراً سے پیشتر کیا ہوگا۔

پہلے شخص سے جو آپ سے ملا ہوگا۔“ انہوں نے اپنی سرخ نظریں لمبے بھر کو اٹھائیں۔

”تو آپ مانتے ہیں کہ یہ بڑا اہم سوال ہے لہذا جس سے متعلق ہے اس کی اہمیت میرے لئے کیا ہوگی؟“

اسے لا جواب ہونا پڑا تھا۔ اس کے سامنے وہ تھا جو پی آر کا اہم پرزہ تھا۔

”نہ ماننے کی کوئی وجہ ہی نہیں۔“ وہ مخصوص انداز میں کہہ رہے تھے۔

”پھر آپ نے میری موجودگی کے باوجود..... اسے کیوں بھیج دیا؟“ وہ ناراضگی چھپانے میں ناکام رہی۔

”اسے میں نے نہیں بھیجا، یہ سب بچیوں کا پروگرام تھا۔“ وہ مزید سکون سے بیٹھ گئے۔

”پروگرام تبدیل بھی کئے جاسکتے ہیں۔ کیا میری اتنی بھی اہمیت نہیں کہ میری بھانجی میری خاطر پروگرام بدلے؟“

.....

”وہ بچی ہے لا پرواہی کہہ سکتے ہیں اسے میں تو آپ کی خاطر ٹھہرا ہوا ہوں ناں۔ حالانکہ مجھے آج ڈیوٹی پر ہونا تھا۔ میں کبھی کسی ایمر جنسی میں بھی آفس میں نہیں کرتا، مگر آپ کی خاطر۔“

اتنا خشک..... اپنے کام سے کام رکھنے والا انتہائی کم گو شخص، جب اس طرح کا جملہ بولتا ہے تو چونکا دیتا ہے وہ بھی ہوتا ہے۔

پڑی تھی۔

”کیا واقعی ایسا ہے؟“ وہ قدرے شرارت سے مسکرائی۔

اسے اس شخص کا یہ جملہ حد سے زیادہ اچھا لگا تھا۔ یہاں سے لے جائی جانے والی بہترین سوغات۔ ایک ایک شکوہ جی برف کی طرح پگھلنے لگا۔ وہ بھولنے لگی کہ اسے بہت سی اہم اور چھپتی ہوئی باتیں کرنا ہیں۔

”آپ کو جو شکایت ہو مجھ سے کریں۔ میں یہاں کا پہلا حوالہ ہوں۔ بچوں کے اپنے ذہن اور ترجیحات ہوتی ہیں۔ ان کی تجربات سے عاری زندگی بہت سے گلے بن جاتی ہے۔ مگر بہت کچھ جاننے والوں کو درگزر سے کام لے کر انہیں معاف دینا چاہیے۔“ انہوں نے سگریٹ الیش ٹرے میں مسلتے ہوئے بہت ہی ٹھنڈے اور دھیمے لہجے میں کہا۔

”مگر بچوں کے جو بڑے ہوتے ہیں ان کا بھی تو کوئی فرض ہوتا ہے، یہ تو بڑوں کا کام ہے کہ وہ نشاندہی کریں، کیا اہم ہے یا غیر اہم۔“

”آپ کچھ بھی کہیں آپ کی کوئی دلیل ایسا جواز نہیں بن سکتی کہ میں مطمئن ہو جاؤں۔“

”آپ کی عمر میں دلیل کی اہمیت بھی نہیں ہوتی۔ میں آپ سے معذرت خواہ ہوں روشنی کی طرف سے۔“ وہ نیا سگریٹ نکال کر سٹاکر ہے تھے۔

”روٹی کی معذرت کی تو ضرورت ہی نہیں۔ اس لئے کہ وہ بے تصور ہے۔ اسے جیسا حکم ملا اس نے کیا۔“

”میں آپ کی غلط فہمی کا ازالہ کرنے سے قاصر ہوں۔“ پہلی مرتبہ ایسا ہوا کہ یاد علی خان نے اس کی بات کاٹ دی تھی۔

”جی نہیں۔ میں اپنی آنکھوں سے دیکھتی ہوں اور اپنے کانوں سے سنتی ہوں۔ کاش کوئی پوچھے میں نے کیا دیکھا؟ کیا سنا؟“ وہ پہلو بدل کر اپنی ہتھیلی کو بغور دیکھنے لگی۔

لائبریری علی خان کے ہاتھوں سے پھسلا تھا۔ انہوں نے جیسے اپنی حالت پر قابو پانے کی خاطر جلدی جلدی دو تین کش لگائے۔

”نئی جگہ نیا ماحول ہوتا ہے تو بہت سی باتیں چونکا سکتی ہیں۔“ وہ بہت آہستگی سے دھواں منہ سے خارج کر رہے تھے اور دھوئیں سے بننے والے سلسلہ وار مرغولوں کو بغور دیکھ رہے تھے۔

”اور ایسی چونکا دینے والی باتوں سے ذہن میں سوال پیدا ہوتا ہے کیا کریں؟“ مہین کو اپنی مضبوط پوزیشن پر بلا کا اعتماد تھا۔

”وہ جتنی بھی وہ ایک مقام پر ضرور ہار جائینگے۔“

”مثلاً..... اس گھر میں حکم دینے والوں کی کیا کمی ہے کہ رات کے اندھیرے میں کوئی حکمران کی حیثیت سے داخل ہوتا ہے۔ ٹھہرتا بھی نہیں ہے۔ حکم صادر کرتا ہے اور چلا جاتا ہے۔“

اسے یقین تھا وہ اس بات کا جواب نہیں دے سکیں گے۔ اس کا جی چاہا، بچوں کی طرح تالیاں بجا کر خوشی سے نعرہ لگائے۔ ”وہ مارا۔“

”ہمارے جاکیز دو حصوں پر مشتمل ہے۔ کچھ حکم دینے والے وہاں بھی ہوتے ہیں۔ ڈزن میٹر۔ آپ یہ بتائیے اور کیا دیکھا

”بچے..... اس طرح کانشس نہیں ہوتے۔ اور بے فکری کے ماحول میں پلے بڑھے بچے تو بعض اوقات اسی طرح کی لاپرواہی کا مظاہرہ کر دیتے۔ ڈونٹ کیئر پلیز۔“ یاد علی خان اپنی مخصوص احسان کنندہ قسم کی مسکراہٹ کے ساتھ گویا ہوئے۔

”اچھا اب آپ یہ بتائیے فارمز کی سیر پر چل رہی ہیں؟“ انہوں نے پہلو بدل کر موضوع بھی بدل دیا۔

”اکیلی؟“ وہ بے ساختہ پوچھ بیٹھی۔

”اکیلی کیوں؟ میں بھی ہوں آپ کے ساتھ۔“ ان کا لہجہ ہر قسم کے جذبات سے عاری تھا۔

”نہیں، میرا مطلب ہے کہ ساتھ کوئی دوسری خاتون یا لڑکی ہو تو وقت اچھا گزر سکتا ہے۔“ روشی کے آنے تک انتظار کر لیتے ہیں۔ اس نے ان کا سپاٹ چہرہ بغور دیکھا۔

”ہو سکتا ہے پھر میرے پاس وقت نہ ہو۔ آج کل جو سیاسی صورتحال ہے، اس سے آپ واقف ہیں۔ آنے والے دنوں میں بہت کام ہوگا۔“

”پھر رہنے دیں۔“ اس نے بے دلی سے کہا۔

”جیسے آپ کی مرضی۔ مگر روشی بھی نہیں ہے۔ میں بھی کل سے آن ڈیوٹی ہوں۔ آپ بور نہیں ہوں گی؟“ کش لگانے اور دھواں منہ سے خارج کرنے کا عمل مسلسل جاری تھا۔

”ہاں اس طرف تو میرا دھیان ہی نہیں گیا۔“ (محض واہموں اور بے نتیجہ تجسس کے ساتھ وقت گزارنے کا آخر فائدہ بھی کیا ہے؟ میں چاکو کوں کر دوں گی؟ وہ ہمارے پاس وہیں ہری پورا آ جائیگے)

”ٹھیک ہے، پھر روانگی کس وقت ہے؟“ وہ ان کی سرخ مگر بلا کی داستان گو قسم کی نگاہوں سے نگاہیں ملانے سے بہت احتراز کرتی تھی۔ جانے کیوں اسے محسوس ہوتا تھا، یہ نگاہیں نہیں ہیں موسم کا حال ٹھیک ٹھیک Read کرنے والا موسمی طیارہ ہیں۔ اسے لگا جیسے یاد علی خان کے سر سے کوئی بہت بڑا بوجھ سرک گیا ہو۔ اطمینان اور سکون کی لہریں ان کے چہرے پر صاف محسوس کی جاسکتی تھیں۔

اس کے ذہن میں ایک ”کیوں“ بیدار تو ہوا مگر وہ خاموش رہی۔

”تو پھر آپ کہہ رہے ہیں ناں بابا صاحب سے کہ وہ روشی کو بلوالیں۔ ابھی تو شادی میں دس دن ہیں غالباً اور میں آپ کی میزبانی کا لطف مزید تین چار دن اور اٹھا سکوں گی۔ پھر اسے اپنے ساتھ ہی لے جاؤں گی۔“

اس نے پھر اپنی بات دہرانا ضروری سمجھا۔

”آپ فکر مند نہ ہوں۔ اطمینان رکھیں۔“

”آپ بہت اچھے ہیں یاد بھائی۔ اگر مجھ سے کوئی غلطی سرزد ہوئی ہو جس نے آپ کو ہرٹ کیا ہو تو میں معذرت چاہوں گی۔ آپ کو دیکھتی ہوں تو سوچتی ہوں۔ بھوکتی مختصر مگر خوش نصیب زندگی لائی تھیں۔ وہ بہت شاندار تھیں مگر آپ کی رفاقت نے انہیں اور شاندار بنادیا ہوگا۔ کاش وہ آج آپ کے ساتھ ہوتیں۔ ہماری زندگی میں کتنی عظیم الشان خوشی شامل ہوتی۔“

”ارے..... یہ تو بہت زیادہ ہے۔“ وہ بہت تکلف سے مسکرائے۔ اور نظریں اٹھا کر سر اٹھانے والی کو اچھے جذبات سے

کیا سنا؟“

”کیا واقعی آپ مجھے ہر سوال کا جواب دینگے؟“ وہ حیرانی سے انہیں دیکھ رہی تھی۔

”ہر سوال“ کا وعدہ نہیں کر سکتا۔ انہوں نے دو ٹوک معذرت کی۔

”تو پھر سوال کرنا ہی بے کار ہے۔ اب تو بس آپ یہ کریں روشی کو واپس بلوائیں۔ میں کراچی جاؤں گی تو اسے ہلے جاؤں گی۔ کوئی مسئلہ ہی نہیں۔“ اس کا انداز بہت سادہ تھا مگر اندر بلا کی باریک تفتیش پوشیدہ تھی۔ اب پتہ چل جاتا تھا، روشی کا جانا ایک معمول کی کارروائی تھی یا واقعی اسے روانہ کیا گیا ہے۔

”ٹھیک ہے بابا صاحب سے کہہ دوں گا اسے بلوالیں۔“ انہوں نے عام سے انداز میں کہا تھا۔ مابین کا منہ کھلا کا کھلا گیا۔

”آپ اس کے باپ ہیں۔ آپ خود ہی اسے آنے کیلئے کیوں نہیں کہہ دیتے۔“ اسے بابا صاحب کی آمریت ہمیشہ زیادہ کھلی۔

”ہم سب انہی کے ذریعے کام کرنا پسند کرتے ہیں۔ یہ زبردستی نہیں، شکریہ کا سادہ سا انداز ہے۔ شکریہ اس بات کا کہ انہوں نے اپنی بہترین صلاحیتیں استعمال کر کے ہمیں شاندار اور ممتاز زندگی گزارنے کا موقع دیا۔ عزت اور امتیاز کے ساتھ ہمارا خاندان انہی کے ثمرات کھا رہا ہے۔ ان کی ان کے کام کی جواہریت ہے، ہم سب کو اس کا احساس کرنا چاہیے۔ ہم نا ہوش سنبھالا تو دنیا کی تمام نعمتیں جیسے دسترخوان پر بھی ہوئی تھیں اور آپ جانتی ہیں۔ دسترخوان ایسے ہی تو نہیں ج جاتے۔ انہوں نے گود میں رکھی بلیو فائل آگے کو جھک کر ٹیبل پر رکھی۔

سعادت مندی کا اتنا اعلیٰ نمونہ وہ بھی اس عمر میں جہاں وہ اپنی ذاتی حیثیت میں ممتاز تھے۔ مابین نے شاید پہلی بار دیکھا تھا۔

وہ چپ ہو کر رہ گئی تھی۔ ظاہر ہے اگر کوئی شخص اپنے والد یا والدین کے ساتھ فرمانبرداری کا مظاہرہ کر رہا ہو تو اس کا تردید کرنا اپنے ہی اخلاقی دیوالیہ پن کا اظہار کرنا ہوتا ہے۔

”تو پھر آپ کہیں ان سے۔“ وہ یہی کہہ سکی۔

”ڈونٹ باؤر..... وہ آجائیں تو ضرور کہوں گا۔“ ان کا انداز ایسا تھا کہ جاسوسی اور شک کے سارے دروازے بند ہو کر گئے۔ کھودا پہاڑ۔ نکلا چوہا۔ اسے یقین ہو گیا کہ وہ سب شادی میں انوائنڈ تھے۔ اور واقعی ان کا پروگرام پہلے سے تھا۔

”مگر..... روشی کو مجھ سے مل کر جانا چاہیے تھا۔“ وہ ابھی مکمل طور پر الجھن سے آزاد نہیں تھی۔

”ہاں یہ غلطی ہے اس کی۔ ممکن ہے۔ اس وقت آپ آرام کر رہی ہوں۔ اور اس نے یہ سوچا ہو، وہ آپ کی واپسی پہلے ہی آ موجود ہوگی۔“

”اب میں ہر وقت آرام تو نہیں کرتی۔“ اس نے یاد علی خان کی بات تیزی سے کاٹ دی۔ ”وہ کئی بار مجھ سے ملے۔ جب ان کا پروگرام پہلے سے تھا تو وہ کبھی ذکر تو کرتی۔“

دیکھا۔

دو پناسر سے ڈھلک کر آدھا شانوں پر آدھا گود میں گر چکا تھا۔ زلفیں کلپ میں مقید پونی کی شکل میں کئی ہونے لگی تھیں۔ پیشانی کو چوم رہی تھی۔ بہن کو یاد کرتی ہوئی اداس اداس سے تاثرات چہرے پر بکھرائے۔ وہ پھر انہیں کچھ دیکھتی تھی۔ اور یہ یادیں ان پر قہر کی طرح ٹوٹتی تھیں۔

جب تک بات چلتی تھی ان کے پاس بیٹھنا آسان رہتا تھا۔ مگر جو نبی خاموشی کے وقفے میں اس کا بلا ارادہ جان بوجھ کر وہ خاصی پریشانی محسوس کرنے لگتی تھی۔

”اچھا میں چلتی ہوں۔ گڈ نائٹ۔“ وہ ایک دم سے کھڑی ہو گئی۔

”صبح چھ بجے تک تیار رہیے گا۔ کیونکہ نو بجے تک مجھے کل ہر حال میں آفس ہونا چاہیے۔“

”ٹھیک ہے۔“ وہ جلدی سے باہر آ گئی۔

صبح کے چار بجے تھے۔ اور ابھی تک حوصلہ افزا امکانات ظاہر نہیں ہوئے تھے۔ مگر کا دو مرتبہ فون آچکا تھا۔ اسے زور پڑا تھا کہ اب حالت تسلی بخش ہے۔ مگر وہ کارڈور میں ٹپٹے ٹپٹے رک کر شیشے کے پار سے اسے دیکھنے لگا۔

”روشانے یا ورعلی خان۔ زندگی سے تو بہت کم لوگ ہی راضی دکھائی دیتے ہیں۔ اس سے تو سب کو ہی گلے رہے جو خود کشی کرتا ہے دکھ صرف اسی کو تو نہیں ملا ہوتا۔“

جو اس کے آس پاس ہوتے ہیں دکھ تو ان کے پاس بھی ہوتے ہیں۔

کس بلا کی خود غرضی ہے۔

صرف اپنی نجات سے غرض۔ دوسروں پر یہ فرقت کیا اثرات ڈالے گی؟ جو پہلے دکھوں کی چٹانوں پر حوصلے سے ضربیں لگا رہے ہیں۔ یہ جدائیاں ان کے حوصلے کو ریت بنا سکتی ہیں۔

کس قدر خود غرضی ہے پچھلے سال بارشوں کا بہت زور تھا۔ 6 اگست کو تمہاری سالگرہ تھی۔ تم بغداد تھیں کہ سالگرہ؟ آکس کریم کیک آئیگا۔ یاور چچا کہہ رہے تھے بارش بہت تیز ہے۔ سڑک نری کچھڑ بن چکی ہے۔ کیوں ڈرائیور کو معینہ ڈال رہی ہو۔ میں نے بھی تم سے کہا تھا۔ اندھیرا ہو رہا ہے۔ راستہ خطرناک ہو چکا ہے۔ خدا نخواستہ کوئی حادثہ ہو سکتا ہے۔ نے کہا تھا ہمیں اس سے کوئی مطلب نہیں۔ ہم سال بھر میں ملنے والی اس اکلوتی خوشی کو اپنی پسند سے منائیں گے۔ مجھے بے رحمانہ اور خود غرضانہ انداز پر نہ جانے کیوں بہت رنج ہوا تھا۔

مگر آج یہ انکشاف ضرور ہوا ہے۔ تمہاری خود غرضی حویلی کی دیواروں سے بھی زیادہ سفاک ہے۔ تم صرف اپنی کے علاوہ کسی اور ذات کی پرواہ نہیں کرتیں۔ نہ اس معاملے میں تم زندگی کو اہمیت دیتی ہو۔ چاہے وہ تمہاری اپنی ہو یا کسی کی۔ زندگی بھی جیسے تمہاری جائیداد ہے۔ جاگیر ہے۔ جسے ہر آن تمہاری خواہشات کے تحت رہنا چاہیے۔

اور جب یہ تمہاری پسند سے متصادم ہو تو تم اسے بھی ٹھکرا دو۔ چاہے تمہارے اس عمل سے دوسرے زندہ لاشیں

جائیں۔ مثلاً یاور چچا۔ میں جانتا ہوں تم ان کے لہو میں زندگی بن کر دوڑتی ہو۔

جائیں۔ مثلاً یاور چچا۔ میں جانتا ہوں تم ان کے لہو میں زندگی بن کر دوڑتی ہو۔

مطلب تم زندہ رہو یا..... مگر کوئی تو ہو یہ سوچنے والا کہ تم ایسی ہی ہو یا ایسی ہو گئی ہو؟

”ہیلوسرا“ وہ اتنی گہری سوچ میں مستغرق تھا کہ نرس کو اسے متوجہ کرنے کیلئے باقاعدہ کوشش کرنا پڑی۔

”ایس سسرا“ وہ ایک دم بولا۔

”آپ ساتھ والے کمرے میں آرام کر سکتے ہیں۔ جب یہ انسینو (I-C-U) کیئر سے باہر آئیگی تو اسی کمرے میں ہوں گی۔ وہاں انینڈنٹ کیلئے بھی ایک بیڈ موجود ہے۔ کوئی خاتون ہوتی تو زیادہ بہتر ہوتا۔ بہر حال شوہر بھی رک سکتا ہے۔“ وہ اپنی بات مکمل کر کے تیزی سے آگے بڑھ گئی۔

ایک لمحے کو اس کی سمجھ ہی میں نہ آیا کہ وہ کیا کہہ گئی ہے اسے غور سے جاتے دیکھتا رہا۔ پھر ایک تلخ سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر نمودار ہو گئی۔

”میں شہزادہ فلپ“ بننے کیلئے کبھی تیار نہیں ہو سکتا۔ ملکہ پھر ملکہ ہوتی ہے۔ ایسی ان بیلنس زندگی۔ خوانخواستہ۔“ اس کا مردانہ غور پوری قوت سے ابھرا۔

”اور ہی دل کے چاہنے کی بات۔ دل تو نہ جانے کیا کیا چاہتا ہے۔ کون اس کی پرواہ کرے۔“ وہ دوبارہ بیچ پر بیٹھ گیا۔

”جب تم کسی نادانی کا مظاہرہ کرتی ہو۔ یا مجھے بہت اہمیت دیتی ہو تو میں سوچتا ہوں۔ تمہارا کیا بنے گا۔ مگر اب تو تم نے ایک بھیاٹکامانی انجام کو خود سے قریب کر لیا ہے۔“

”مگر تم میرے دل میں کیوں بول رہی ہو۔ میں تمہارا دشمن نہیں ہوں جو تمہیں کانٹوں پر ٹھیسٹوں۔ بس وہ تصوراتی لمبے بال والی ٹھیک ہے۔ تمہیں تھوڑا رنج پہنچا کر کسی بڑے رنج سے بچانا بھی تو میری نمک حلائی کا تقاضا ہے۔“

”سرا آپ روم میں نہیں گئے۔ بہر حال کا مگر بیلویشن۔ ان کی حالت اب مکمل کنٹرول میں ہے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے بے ہوش کا زور ٹوٹا ہے۔ بڑا بڑا بھی رہی ہیں اور مسلسل باری باری کہہ رہی ہیں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ بہر حال آپ کو خوش ہونا چاہیے۔“ وہ مسکرائی۔

”باری۔ باری۔ ان سے یہی خطرہ ہے مجھے۔ یہ خدا نخواستہ مجھ سے پہلے ”عالم بالا“ میں پہنچ گئیں تو مجھے اتنا پکاریں گی کہ مجھے بھی مجبوراً جانا پڑے گا۔“ ذہن ایک دم ریلیکس ہوا تو لہجے میں از خود بشارت آ گئی۔

”بچہ ہے کوئی آپ کا۔“ نوحہ نرس نے مسکرا کر پوچھا۔

”وہ میری بیوی نہیں ہیں۔ آپ نے مجھے وضاحت کا موقع ہی نہیں دیا۔ مجھے شوہر بنا کر فوراً چل پڑیں۔“ وہ فوراً اعتماد

سے مسکرا رہا تھا۔

”پھر آپ کے درمیان کیا رشتہ ہے؟“ وہ جھل سی ہو گئی۔ وہ تو ڈیوٹی روم میں ساتھی نرسز کے ساتھ اس باقاعدہ تبصرہ کر کے آرہی تھی جس کا دورانیہ کم و بیش پانچ سات منٹ کا تو ہو گا۔ (جس میں اس کے اقدام خودکشی حیرانی کا اظہار بھی کیا تھا۔ کہ اتنے اچھے شوہر کے ہوتے ہوئے وہ زندگی سے بیزار ہو گئی۔ جو اسے خودکشی کے بعد اتنے مہنگے ترین ہاسپٹل میں داخل کراتا ہے۔

جو شخص اس لڑکی پر اتنا پیسہ بہا رہا ہو جس کے بچنے کے امکانات کم ہوں۔ وہ عام حالات میں اس پر کتنا خفا اس سے تو یہی ثابت ہوتا ہے۔ وہ اس سے محبت نہیں عشق کرتا ہے۔ اور ہر حالت میں اسے زندہ رکھنا چاہتا ہے) ”ریلیٹو (رشتہ دار) ہیں میری۔“ اس نے نرس کو جواب دیا۔ جو کچھ سوچ رہی تھی۔ ”کیا اس وضاحت کے بعد اجازت مل جائے گی اس کمرے میں آرام کرنے کی۔ میرا خیال ہے ابھی یعنی فی الوقت تو وہ اس کمرے میں۔“ ”جی۔ جی۔ ایسا ہوتا تو نہیں مگر مجبوری ہے۔ آپ کئی گھنٹوں سے اسی طرح بیٹھے ہیں۔ آپ ایک دو گھنٹے وہاں سکتے ہیں۔“ نرس نے اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے سمجھ لی تھی۔

ذہن آزمائشی دور سے آزاد ہوا تو بہت تھکاؤ محسوس ہونے لگی۔ اسے جاگتے ہوئے مسلسل چوبیس گھنٹے ہونا تھے۔ وہ جمای لیتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔

ایک نظر پھر نیم بے ہوش روشنی پر ڈالی اور اس طرف مڑ گیا جس طرف نرس نے اشارہ کیا تھا۔

ڈھونڈتی پھرتی ہے دشت و بیاباں میں ہمیں

زندگی ہم سے نکھر کر خود بھی پچھتائی بہت

آج عارف صاف سترے کپڑے پہنے بیچ پر بیٹھا بہت اہتمام سے کش پہ کش لگا رہا تھا وہ اس سے ذرا فاصلے پر سوچ رہا تھا۔

”کتنے بچے کا کہا تھا لال خان نے؟“ اس نے عارف کو مخاطب کیا۔

”آتا ہی ہو گا۔ گھر والی کو سیٹ کر دیا ناں؟“

”بھائی! ابھی میری ہمت نہیں پڑی۔ آج لال خان خود جا رہا ہے۔ سو غائب لے کر۔ پھر اس کے بعد اسے چھیڑنا آسان رہے گا۔“

”اور وہ جو لال خان کے سامنے ”اکھاڑے“ میں اتر آئی تو بڑی بے عزتی ہو گی یہ سوچا تم نے؟“ اس نے چونک محمد کی شکل دیکھی۔

”ارے اتنی بھی بے لگام نہیں۔ تم فکر نہ کرو۔ میں جو کر رہا ہوں کرنے دو۔ وہ دیکھو شاید لال خان ہی ہے۔“ اچانک گیٹ میں داخل ہوتے لال خان پر پڑی۔

”ہاں وہی ہے۔ کیا بات ہے لال خان کی۔ آتش مگلابی شلوار سوٹ زیب تن کئے بچے کھچے بالوں اور تلوار مار کے موچھوں

”جئے۔“ کسی الوہی خوشی سے سرشار وہ ان کی طرف بڑے جوش و ولولے سے بڑھ رہا تھا۔

”اسلام علیکم۔“ لال خان نے قدرے جھک کر بطور خاص عاجزانہ و فرزانہ انداز میں غلام محمد کو سلام کیا۔

”وعلیکم السلام۔“ غلام محمد نے بھی بڑی ”شفقت“ سے جواب دیا جیسے وہ باقاعدہ داماد ہو۔

”خیر خیر بت تو ہے۔ یہ کچھ ”پے منٹ“ رہ گئی تھی۔“ اس نے چند لال نوٹ اس کی جانب بڑھائے۔ غلام محمد نے بے

یقینی کے انداز میں نوٹوں کی سمت دیکھا۔ پہلی بار تقاضے کے بغیر مال مل رہا تھا۔ اس نے فوراً اس کے ہاتھ سے لیکر اندرونی جیب میں احتیاط سے رکھ لئے۔

”اور کیا حال ہے؟“ عارف نے آنکھ دبا کر گویا لال خان سے چھیڑ خانی کی۔

بجائے سینے کے آنکھوں میں دل دھڑکتا ہے

یہ انتظار کے لمحے عجیب ہوتے ہیں !

”چھوڑو یار یہ شعرویر۔“ لال خان کو بہت ساری شرم آگئی۔ تا بنے جیسا رنگ اور گہرا ہو گیا۔

”ارے آج ہی تو شعر و شاعری کا مزا ہے۔“ عارف نے جھک کر اس کے کان میں سرگوشی کی۔ ”اب تو سہرا پڑھنے کے دن آرہے ہیں۔“ وہ مسکرایا اور زور سے کش لگایا۔

لال خان دولہا کی طرح شرما کر رہ گیا۔ ”چلیں؟ کیا انتظام کیا ہے؟“ عارف نے اٹھنے کی مشق کی۔

”باہر سوز کی کھڑی ہے۔ گاڑی ہے اپنے پاس۔“ وہ غلام محمد کو سنانے کی غرض سے اونچا بولا۔

”کیوں نہیں۔۔۔ کیوں نہیں۔۔۔ سیٹھ لال خان ہے، کوئی معمولی چیز نہیں۔ چلو بھائی!“ وہ غلام محمد کی طرف پلٹا۔ اچانک ملنے والی رقم نے بڑا خوشگوار اثر ڈالا تھا۔

تینوں باہر آگئے۔ جہاں نیلی سوز کی کیری کھڑی تھی۔ جس کے اندر دو نوکرے پھلوں کے اور ایک مٹھائی کا ٹوکرا رکھا تھا۔ ایک بیٹی روح افزا کی بوتلوں کی تھی لال خان اور عارف آگے بیٹھے تھے۔ غلام محمد پیچھے تھا۔ اس قدر سامان دیکھ کر اس کی حالت غیر ہو رہی تھی۔ پہلے دن یہ حال ہے تو بعد میں کیا ہو گا۔ نہ جانے کتنا سونا بری میں چڑھا دے گا۔ کاش گھر والی مان جائے۔ بالو تو دولت میں کھیلے گی۔ جب انسان کی ہر خواہش پوری ہو رہی ہو تو اسے خوش ہونے سے کون روک سکتا ہے۔

نچیک ہی تو کہتا ہے مرد صحت مند اور کماؤ ہو بس۔ عورت کو اور چاہیے بھی کیا۔ سمجھاؤں گا گھر والی کو۔ کیا بیٹی کو ایسے گھر میں بیاہے گی جہاں کڑکی دکان کا قرضہ ہی چڑھا رہے۔ میں نے لہو بیچا تو گھر میں روشنی ہوئی۔ بیٹی کو کتنی آسانی سے مل رہا ہے یہ سب۔ اسے بالو کی قسمت بہت اچھی معلوم ہو رہی تھی۔ بچے ہوئے تو اچھے سکولوں میں پڑھیں گے۔ قابل بنیں گے۔ آخر کار عورت کی جمع پونجی اس کی اولاد ہی ہوتی ہے۔ اور اگر وہ قابل ہو تو عورت کو دنیا میں اور چاہیے بھی کیا؟

تازہ پھلوں اور مٹھائیوں کی مہک گاڑی کے اندر پھیل رہی تھی اور اس کے ساتھ اس کے خیالات کے دائرے بھی۔

بالو چھوٹی سی کھڑکی سے گلی میں جھانک رہی تھی کہ اچانک اس نے اپنے گھر کے دروازے پر ایک سوزو کی رائے دیکھی۔ بھائی کو تلاش کرتی ہوئی نظریں سوزو کی پر جم گئیں۔ وہ آگے بیٹھے ہوئے آدمیوں دیکھ رہی تھی کہ پچھلے حصے باپ اتر کر سامنے آیا۔

”ابا کو گاڑی چھوڑنے آئی ہے۔ اللہ خیر کرے۔“ وہ جلدی سے کھڑکی سے ہٹ گئی۔

”اماں..... اماں..... ابا کو گاڑی چھوڑنے آئی ہے۔“ وہ بھاگ کر ماں کے پاس آئی جو نلکے کے پاس بیٹھی رہی تھی۔ وہ منہ پر چھینٹیں ڈالنا بھول گئی۔

”کیا کہہ رہی ہے۔“

”ٹھیک کہہ رہی ہوں۔ لہوہ ابا آگئے خود پوچھ لو۔“ غلام محمد ان کے قریب آچکا تھا۔

”طبیعت تو ٹھیک ہے تمہاری۔“ وہ تشویش بھری نظروں سے خاوند کو دیکھ کر ہی تھی۔

”میری طبیعت ٹھیک ہے۔ مہمان آئے ہیں۔ چائے بنالے اور دیکھ لو نڈے سے کچھ منگالے۔“ اس نے جبے نوٹ نکال کر بیوی کو تھمایا۔

”کیا منگاؤں؟“ وہ نوٹ لے کر اس کی شکل دیکھنے لگی۔ کبھی اس گھر میں مومگ کی دال بھی ادھاڑ آتی تھی۔ ان کے لوازمات کے لئے سوکانوٹ مل رہا تھا۔

”سمو سے۔ فلاقتد کیلے اور جو تیراجی چاہے۔“ وہ دوبارہ باہر کا رخ کرتے ہوئے بولا۔

تین چیزیں بتا کر آگے جی چاہنے کی رعایت بھی مل رہی تھی۔ وہ تعجب سے اس کی پشت پر دیکھنے لگی۔

”لگتا ہے کوئی خاص مہمان ہیں۔ شاید تیرے باپ کا سیٹھ ہے۔“ اس نے بالو سے کہا ”تو چائے بنا میں خود لے آؤں۔“ ہوں چیزیں۔ بچے کو تو یونہی الٹی سیدھی پرانی دھرائی چیزیں پکڑا دیتے ہیں۔ ذرا میرا برقعہ لائیو۔“ وہ دوپٹے سے منہ لپی۔ بالو برقعہ لینے اندر دوڑ گئی۔

جتنی دیر میں وہ برقعہ نکال کر لائی۔ اتنی دیر میں پھلوں اور مٹھائی کے ٹوکڑے اور شربت کی بوتلوں کی بیٹی اندر آگئی تھی۔ وہ برقعہ ہاتھ میں پکڑے پکڑے بجائے ماں کی طرف جانے کے ٹوکڑوں کی طرف بڑھی۔

”اتنی ساری مٹھائی اماں!“ اس نے ٹوکڑے کے منہ پر پڑے اخبار کو تھوڑا سا سرکایا تھا۔ ”پھر دوسرے ٹوکڑے کھا لگی۔ حیرت آمیز خوشی اس کی آنکھوں سے پھلکنے لگی۔

”ہاں..... ہاں تو برقعہ تو دے۔“ وہ بیٹی کی طرح خوش ہونے کی بجائے الجھ رہی تھی۔ جتنی دیر میں اس نے برقعہ بن بند کئے مہمان کمرے میں بیٹھ چکے تھے۔

وہ چائے بنانے کی نیت سے چھوٹے سے باورچی خانے میں کھس گئی۔

اندر کمرے میں دو ہی کرسیاں تھیں جن پر عارف اور لال متمکن ہو چکے تھے۔ اپنے لئے وہ چار پائی کھینچ کر لارہا تھا۔ لال خان تو اس طرح بیٹھا تھا جیسے دو لہا بن کر آیا ہو۔ تھوڑی سی گھبراہٹ اس کے چہرے سے صاف پڑھی جاسکتی تھی۔

”کیا سوچ رہے ہو؟ گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ یار۔ وہ کیا کہتے ہیں کہ

رات دن گردش میں ہیں سات آسمان

ہو رہے گا کچھ نہ کچھ، گھبرا نہیں کیا

”میں گھبرا تو نہیں رہا یار۔ یہ غلام محمد تو بہت سیدھا آدمی ہے۔ پتا نہیں اس کی گھروالی کیسی ہوگی؟“

”تو اس کی گھروالی کے چکر میں پڑا ہوا ہے۔ نادان اپنی ہونے والی گھروالی کو سوچ۔“ وہ نیا سگریٹ سلگاتے ہوئے

شرارت سے مسکرایا۔ لال خان کو جیسے گدگدی سی ہونے لگی۔ وہ پہلے کے مقابلے میں ذرا پراعتماد دکھائی دینے لگا۔

”تمہارا اپنا گھر ہے غلام محمد؟“ عارف نے ڈھیروں دھواں منہ سے سوال کے ساتھ خارج کیا۔

”ہاں بس سر چھپانے کا آسرا ہے۔“ اس نے تشکرانہ انداز میں جواب دیا۔

لال خان گردن ادھر ادھر گھما کر جائزہ لینے لگا۔ سارے کمرے میں صرف ایک کھڑکی تھی۔ وہ گلی کی طرف کھلتی تھی۔

”یار..... اس کی گھروالی مجھے دیکھے گی کس طرح؟ کیا یہ اسے یہاں بلائے گا؟“ اس نے سرگوشی کی۔

”حد ہے بے مبری کی۔“

خدا کے واسطے داد اس جنون شوق کی دنیا

کہ اس کے در پہ پہنچتے ہیں نامہ بر سے ہم آگے

”یار..... جنہوں نے دیکھا ہو۔ ان کے پاس ہزار راستے ہوتے ہیں۔ تم کیوں فکر کرتے ہو۔ آرام سے بیٹھو۔“ عارف نے قدرے جھلا کر ٹوکا۔

”تم نے گھر میں کچھ سامان تو ڈالوا لیا ہوتا۔ اتنے دن ہو گئے تمہیں کماتے ہوئے۔ اب بھی ہاتھ تنگ رہتا ہے کیا؟ عارف نے غلام محمد سے گویا پائی پائی کا حساب لینے کے انداز میں سوال کیا۔

”لنڈا بڑا کرم ہے۔ بات یہ ہے قرضہ بہت چڑھا ہوا تھا۔ کتنے دن تو قرضہ اٹارنے میں لگ گئے۔ پھر یہ سوچا کچھ بیٹی کیلے جوڑوں۔“

”اے نیلے جوڑے دوڑنے کی ضرورت نہیں۔“ لال خان کے پاس اللہ کا دیا بہت کچھ ہے۔ ہم تم سے ایک کپڑے کا جوڑا بھی نہیں مانگے۔ غور سے سن لو۔“ عارف نے ٹائف پر ناگ رکھ کر بڑے شاہانہ انداز میں کہا اور ایک زور کا کش لگا کر ٹائف سے لڑکھائی شروع کر دی۔

”بجائے تمہارے گھر میں۔“

”پچھلے گھر سے لی ہوئی ہے بچوں روپے مہینہ دیتے ہیں۔“ غلام محمد نے جواب دیا۔

”بس تو تم پہلی فرصت میں اپنے گھر بجلی لگواؤ۔ تمہاری ایک ہی بیٹی ہے۔ جیہیز تم نے اس کا بنانا نہیں۔ اپنا گھر ٹھیک کرو۔“ لال خان کو کام سکھانے پر بٹھا دو۔ عارف نے پورا پروگرام بنا کر دیدیا۔

”میں بھی سوچ رہا تھا بڑے“ کوئیلر کے پاس بٹھا دوں۔ بڑی کمائی ہے اس میں۔“ اسے نئے سرے سے خوبصورت

خواب آنے لگے۔ جہاں اس کا بیٹا ایک بڑا ٹیلر ماسٹر تھا اور اس کے سیف میں رنگ برنگے لوٹ بھرے تھے۔ وہ جانے کتنی دیر باتوں میں مصروف رہے حتیٰ کہ کمرے کے باہر سے آواز آئی۔
”بالو کے ابا! چائے لے جاؤ۔“

لال خان ایک دم سنبھل کر بیٹھا۔ عارف پر البتہ کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ اسی طرح بیٹھا کچھ سوچ رہا تھا۔
”کیا سوچنے لگے؟“ لال خان نے اپنا چہرہ پوچھتے ہوئے سے متوجہ کیا۔
”کچھ نہیں..... کچھ اپنے حساب کتاب یاد آگئے تھے۔“

”کیسے حساب کتاب؟“ لال خان نے تعجب سے اسے دیکھا۔ اس نے تو عارف کے ساتھ سارے معاملات فیئر تھے۔
”تمہیں نہیں بتا سکتے کہ کوئی فائدہ ہی نہیں۔“

آہی جاتا وہ راہ پر غالب
کوئی دن اور بھی جئے ہوتے

وہ ہنس دیا۔ ”چائے پیو۔ بڑے نورانی ہاتھوں کی چائے ہے۔ جب گھر میں لڑکی جوان ہو تو عام طور پر چائے پاتا ہے۔“ عارف نے آنکھ ماری۔ اور لال خان چائے کو دلچسپی سے دیکھنے لگا۔
وہ انہیں چائے پیش کر کے ”ابھی آیا“ کہہ کر کمرے سے باہر آ گیا۔
”بالو کی ماں!“ اس نے آہستگی سے بیوی کو آواز دی۔
”ہوں۔“ وہ فوراً لپک کر آئی۔ جانے کتنی تجسس کی لہریں اس کے اندر کروٹیں لے رہی تھیں۔
”یہ جو مہمان آئے ہیں جب یہ جانے لگیں تو آڑ سے دیکھ لہجہ اچھی طرح۔“
”کیوں؟ یہ کیا ”سر کیسے“ ہیں؟“ وہ ہونٹ سی ہو کر اس کی شکل غور سے دیکھنے لگی۔
”بس کہہ رہا ہوں ناں میں۔“

”اچھا اچھا۔ بگڑتے کیوں ہو۔ دیکھ لوں گی۔“ اور اب تو ضرور دیکھوں گی۔ آخر ہے کیا ان میں بگڑتے کی بات۔ وہ خود کلامی کے انداز میں بولتی ہوئی باورچی خانے کی طرف بڑھ گئی۔
وہ دوبارہ کمرے میں چلا آیا۔

”بیوی سے کچھ بات کر کے آرہا ہے۔“ عارف نے لال خان کو ٹوک کر کہا۔ ”جی ہاں، ہمارے قہار بالو کی بات ہے۔“
لال خان مارے حیا اور خائیاہٹ کے آگے کو جھٹ کر رہ گیا۔
”عارف بھائی! تم بھی ملاج معالجہ کراؤ۔ بھلا۔ برے تو ذرا بھی نہیں ہو۔ میرا دل چاہتا ہے تمہیں منتہی بہ منتہی اس نے سوکھے انچور عارف کو ترم بھری نظروں سے دیکھا۔
”اچھا!“ وہ مسکرایا۔ (آج کل شدید کھانسی کے خوف سے صرف مسکراہٹ پر ہی اکتفا ہو رہا تھا) اب کیا ہیں

پھر تنہا بھی نہیں ہے۔ ہم تو قسط وار خود کشی کرنے والوں میں سے ہیں۔ اب ہم میں بچا ہی کیا ہے؟
کر دیا ضعف نے عاجز غالب

ننگ پیری ہے جوانی میری!

غلام محمد نے بے بسی سے لال خان کی سمت دیکھا۔ پھر شعر۔ جو اس کے خاک بھی پلے نہیں پڑتے تھے۔
”ارے۔ یہ سو سے تو کھاؤ۔ تم تو خالی چائے پی رہے ہو۔“ اس نے لال خان کی طرف پلیٹ بڑھائی۔ اور میزبانی کے لمحات میں اس نے خود کو بہت معتبر سا محسوس کیا۔
آج وہ بھی اس قابل ہے کہ کسی کو کچھ کھلا سکے۔ اس نے عارف کی سمت دیکھا۔ نگاہوں میں احساس ممنونیت خود بخود اتر آیا۔ جدی پشتی قرض سے دہلی زندگی آخر اس کے تعاون سے تو ہلکی پھلکی ہوئی تھی۔
کمرے سے باہر ”بالو کی ماں“ بے چینی سے ان کے باہر آنے کا انتظار کر رہی تھی۔

روٹی پر ہنوز بے ہوشی کی کیفیت طاری تھی۔ وہ صبح آٹھ بجے ہاسپٹل میں بیدار ہوا تو بابا صاحب وہاں موجود تھے۔ انہوں نے اسے گھر بھیج دیا تھا کہ وہ آرام کر لے اور ضرورت محسوس ہوئی تو فون کر کے بلا لیں گے۔ گلو ان کے ساتھ تھیں۔
روٹی صبح پانچ بجے سے شام پانچ بجے تک تین چار مرتبہ ہوش میں آئی تھی مگر صرف دو چار لمحوں کے لئے۔ محسوس ہوتا تھا کہ اب وہ بے ہوش نہیں ہے۔

بابا صاحب نے چونکہ حکم دیا تھا کہ وہ خود بلوائیں گے۔ اس لئے کوئی بھی ہاسپٹل خود سے روانہ ہونے کی ہمت نہیں پارہا تھا۔ خطرے کی گھڑیاں چونکہ ٹل چکی تھیں لہذا اب اس انداز کی تشویش تو نہیں تھی جس طرح کی کل تک تھی۔ مگر اب ذہن یہ سوچ رہے تھے کہ اب تک ”باری“ کو کیوں نہیں بلوایا۔ زری نے دو تین مرتبہ فون کیا تو گلو نے یہی جواب دیا۔ صبح جیسی ہے مزید ”پیش رفت“ نہیں ہوئی۔ اسے روم میں منتقل کر دیا گیا ہے۔ وہاں بابا صاحب موجود ہیں۔ اور اس کے ہوش میں آنے کا بے چینی سے انتظار کر رہے ہیں۔

وہ بیدار ہو کر غسل سے فارغ ہوا۔ پھر کلو سے چائے منگوائی۔ جب سے وہ گھر آیا تھا وقتے وقتے سے سو رہا تھا۔ اتنا سارا تو شاید وہ زندگی میں سویا ہوگا۔ ”واہ روشنی بی بی آپ نے جان پر کھیل کر کم از کم جی بھر کر آرام کا موقع تو دیا۔“ وہ کپ تھاے بانگنی میں آکھڑا ہوا۔ لڑکیاں تو سب نیچے ہی تھیں۔ بے چاریوں کی آوازیں تو کل سے بند تھیں۔ اس لئے سمندر کی لہروں کا شور زیادہ محسوس ہو رہا تھا۔ لگ رہا تھا۔ گھر میں کوئی ہے ہی نہیں۔

”بابا صاحب روشنی سے کیا کہیں گے؟ کیا بات کریں گے۔ سب سے پہلے؟ اس پر برہم ہوں گے۔ ملامت کریں گے۔“ انہا کوئی سفاک سا فیصلہ سنا کیے؟ ”ایک لمحے کیلئے بھی اس کا ذہن روشنی اور دلاور علی خان کے تصور سے ادھر ادھر نہیں ہو رہا تھا۔ اپنی بات کے تو وہ کہے ہیں۔ جو منہ سے نکال دیں اس کی تکمیل تک مصروف رہتے ہیں۔

روشنی کی اگلی منزل کون سی ہے؟ ”وہ دلاور علی خان کے نزدیک یہاں وہاں سب رشتہ داروں ملاقاتیوں سے واقف تھا۔

ان سے بھی جو ”خاندانی“ تھے۔ ان سے بھی جو اس قسم کے تاج سے محروم تھے۔

ان کا نشانہ تو ظاہر ہے ”خاندانی“ ہی ہوں گے کہ وہ تو نسب کو زندگی پر فوقیت دیتے ہیں۔

”خان..... بڑے خان کا ٹیلی فون آیا ہے۔ بلا رہے ہیں آپ کو۔ اسپتال میں ہیں بولتے ہیں جلدی آجائیں۔“
سے کلو پیغام لائی تھی۔

وہ کپ رکھ کر تیزی سے زینے طے کر کے نیچے آیا۔ یہاں مونا حواس باختہ سی موجود تھی۔

”میں چلوں باری؟“

”آپ..... پوچھ لیا آپ نے بابا صاحب سے؟“

”ان سے تو کوئی بات نہیں ہوئی۔ لالی نے فون اینڈ کیا تھا۔“

”آپ کیوں فرمند ہو رہی ہیں۔ اب تو وہ آجائیں گی۔ یہاں ٹھیک ہیں اب۔“ اس نے تسلی دی۔

”پھر تمہیں کیوں بلایا ہے؟“ وہ غالباً اس کے بلائے جانے پر فرمند تھی۔

”یہ تو معمول کی کارروائی ہے۔ جہاں وہ ہوتے ہیں۔ وہاں میں ہوتا ہوں۔“ وہ مسکرایا۔

”باری۔“

”جی۔“

”تم یہ بتاؤ بابا صاحب کے ایکسپریشن کیا ہیں؟ وہ تو تم سے ہر بات کرتے ہیں۔ روشنی کی اس حرکت پر کچھ کہنا تھا تمہیں قسم ہے بتاؤ ناں۔ پتا نہیں کیوں مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔“ مونا تو حویلی کی کم ہمتوں کی کھپ میں سرفہرست تھی۔
”اوہ۔“ اسے مونا کی پریشانی کی وجہ سمجھ آ گئی۔
”کچھ نہیں۔ وہ تو چپ ہیں۔“

”تم جھوٹ بول رہے ہیں۔ کچھ تو ضرور کہا ہوگا۔ پلیز باری۔ اتنی بڑی بات ہو گئی۔ ایسا تو ہو ہی نہیں سکتا۔ کہہ دو۔“
بولے ہی نہ ہوں۔ تم مجھے بتا دو کچھ میں کسی سے نہیں کہوں گی۔“

”کچھ بھی نہیں کہا مونا بی بی! یقین کریں۔“ اس نے بمشکل جان چھڑائی اور ڈرائیور کی طرف بڑھ گیا۔ مونا ہنوا کر
طرح کھڑی تھی۔

”لگتا ہے لڑکیوں میں مونا بی بی سب سے زیادہ ”خان“ سے واقف ہیں۔“ اس نے گویا مونا کو داد دی۔
اختر کو گاڑی نکالنے کا کہتے وقت اس نے کن اکھیوں سے اس سمت دیکھا جہاں مونا ہنوز اسی سابقہ کیفیت میں کھڑی
تھی۔

جب وہ ہاسپٹل پہنچے تو شام گہری ہو چکی تھی۔ شہر روشن ہو چکا تھا۔ وہ تیزی سے اس کمرے کی طرف آیا تھا جہاں روٹی
موجودگی کا یقین تھا۔

وہ کمرے میں داخل ہوا تو روشنی کمرے میں تباہ تھی۔ وہ چت لیٹی چھت کو گھور رہی تھی۔ آ۔

بدلا۔ باری پر نظر پڑتے ہی اس نے دوسری طرف کروٹ لے لی۔

”نئی زندگی مبارک ہو۔“ اس کو بھانگی ہوش و حواس اور ”اینیشن“ حالت میں دیکھ کر بڑی فطری سی خوشی ہوئی تھی۔

”فورا یہاں سے نکل جاؤ۔ اگر ایک لمحہ کی دیر کی تو میں گھاس توڑ کر اس کے ٹکڑے سے اپنی کلائی کی رگ کاٹ لوں گی۔“

میت آؤٹ ان اے مومنٹ۔“ اس کی آواز میں حکم بھی تھا اور آنسوؤں کی آمیزش بھی۔

”یہ کہیں نہیں جائے گا۔ یہ ہمارے ساتھ ہے۔“ عقب سے دلاور علی خان کی آواز آئی تو وہ ایک دم چونک کر پلٹا۔

وہ درحقیقت ان دادا پوتی کے درمیان بیٹھنے کا خواہشمند نہیں تھا۔ ابھی تک اس کے کانوں میں روشی کے الفاظ گونج رہے تھے "Get out with in movment"

"میں باہر بیٹھ جاتا ہوں خان کوئی بات نہیں"۔ اس نے اپنی مہذب فطرت سے مجبور ہو کر کہا۔
"نہیں تم یہیں بیٹھو جہاں ہم ہیں وہیں تم ہو"۔ انہوں نے قطعی انداز میں کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ جو روشی کے بیڈ کے بالکل ساتھ ہی رکھی تھی۔

وہ ناچار کرسی کی طرف بڑھ گیا۔
روشی اتنی دیر میں نیم دراز ہو چکی تھی۔ اس کے چہرے پر سوائے سرد تاثرات کے اور کچھ نہیں تھا۔
"تم بچ گئی ہو۔ بہر حال مقام شکر۔ فی الحال ہم تم سے اس موضوع پر کوئی بات نہیں کر رہے۔ اب تم بس اتنا کرو کہ جتنی جلدی ہو سکے بستر سے اتر آؤ۔"

روشی خاموشی سے انگلیاں مروڑتی رہی۔

"باری پاس بات کا غصہ ہے؟" باری کے حصے کا سوال بابا صاحب نے کیا تھا۔
وہ چپ رہی۔

"ہم کچھ پوچھ رہے ہیں؟" ان کی نازک طبع پر اس کی خاموشی گراں گزری تھی۔
"یونہی۔ ذہن بہت اپ سیٹ ہے ایسے ہی کہہ دیا تھا۔" باری کے سامنے بے بسی اور احساس توہین سے اس کی آنکھیں جھٹک پڑیں۔ وہ آنسوؤں پر قابو پانے کی خاطر ہونٹ کاٹنے لگی۔ مگر چند قطرے رخساروں پر لڑھک ائے تھے۔
بابا صاحب نے ایک اچھتی سی نگاہ اس کے چہرے پر ڈالی تھی۔

"تم اکیلی نہیں ہو تمہارے پاس بے شمار ایسے لوگوں موجود ہیں جن سے دل کی بات کہی جاسکتی ہے۔" ان کا انداز غیر معمولی طور پر نرم تھا۔

"مگر فائدہ.....؟" روشی کے منہ سے بلا سوچے سمجھے بے ساختہ نکل گیا تھا۔ باری کو ایسا محسوس ہوا جیسے طوفان قریب آگیا۔ اس نے شہنا کر روشی کی سمت دیکھا تھا جس کے رخساروں پر آنسو چمک رہے تھے مگر ایک عجیب سی خود سری اس کے چہرے سے چھٹک رہی تھی۔

"باری! ہم گھر جا رہے ہیں آرام کر بیٹے تم یہیں ٹھہرو ہم وہاں سے کسی لڑکی کو بھیج دیں گے۔ پھر تم گھر آ جانا۔"
"میں آپ کے ساتھ ہی چلتا ہوں خان"۔ اس نے ضبط سے سرخ پڑتے بابا صاحب کو بغور دیکھا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

روشی کا جی چاہا پاس رکھا مگھاس اس پر کھینچ مارے ٹھیک ہے میں اسے جانے کو کہہ رہی ہوں مگر کیا اس کے دل میں اتنی سی بھی آرزو نہیں کہ یہ مجھ پر نوٹ پڑنے والی قیامت کی حقیقت پوچھے..... میرا حال پوچھے..... میری دل جوئی کرے..... کیا میں اس کے نزدیک اتنی اہمیت بھی نہیں رکھتی کہ یہ میرے ساتھ بیٹھنا چاہے مجھ سے بات کرنا چاہے کتنی جلدی ہے اٹھ کر جانے کی۔"

☆.....☆.....☆.....☆.....☆

بابا صاحب کے چہرے پر برہمی بھی تھی اور شاید بے بسی بھی۔ رعایا اور اولاد میں بہر حال بہت فرق ہوتا ہے۔ حد تک ہر شے امکان و اختیار میں ہوتی ہے۔

مگر فیصلہ کن لمحہ اور اس لمحے میں کچھ کر گزرتا ہی سب کچھ ہے۔

بعض اوقات ایک لمحے میں اظہار عمل ضرور ہوتا ہے۔

"مگر اس اظہار نے" میں جانے کتنی نیندیں کتنی راتیں کتنی محسوس، بھینٹ چڑھی ہوتی ہیں۔

اس طرح کے سفاک "اظہار نے" ہو تو جاتے ہیں لیکن ہونے کے بعد ان کا حاصل راکھ کا ڈھیر ہوتا ہے اور نا آسودگی کی ایک سنگتی چنگاڑی.....

اور جس شخص نے کئی بار "راکھ کے ڈھیر" کی کمائی کی ہو..... جو نا آسودگی کی چنگاڑیوں سے جسم و جان لگائے ہوئے اسے اس طرح کا نیا سدا کرتے ہوئے بہت سوچنا ہوتا ہے۔

باری اپنی جگہ سے ایک انچ..... آگے نہیں بڑھا تھا۔ وہ جہاں تک پہنچا تھا۔ بنوڑ وہیں ایسا رہا تھا۔

"بیٹھ جاؤ باری"۔ بابا صاحب نے حکم دیا اور خود دوسرے بیڈ پر بیٹھ گئے۔

اس نے جل کر باری کی طرف سے منہ پھیر لیا۔

”نہیں فی الحال یہاں ایک بندہ اس کے ساتھ ہونا چاہیے، فکر نہ کرو گھر سے یہاں تک کسی کو پہنچنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔“ وہ روشی کی طرف سے شعوری بے توجہی برت رہے تھے۔

باری دوبارہ بیٹھ گیا

”یہ تم سے عمر میں خاصا بڑا ہے یاد رکھا کرو۔“

وہ خشک انداز میں اس کی طرف دیکھے بغیر گویا ہوئے اور چھڑی نکاتے باہر نکل گئے..... دروازہ خود بخود بند ہو گیا۔

سائینڈ نیبل پر کئی انگلش میگزین رکھے ہوئے تھے۔ اس نے ایک میگزین اٹھا کر تقریباً آنکھوں سے لگا لیا۔

”تم کیوں آئے کراچی؟“ وہ پھنکاری۔

”لایا گیا ہوں۔“ اس نے میگزین کی اوٹ سے ہی جواب دیا۔

”تم کیسے آدمی ہو تم وہ کام کیسے کر لیتے ہو جو کرنے کا دل نہیں چاہتا.....؟“ اس کا حرف حرف سگ رہا تھا۔

”آپ سے کس نے کہہ دیا کہ میں اپنے معمولات زبردستی مناتا ہوں۔ میرا ذہن بن چکا ہے مجھے خان کا خانوں

بذوں کا خیال رکھنا اچھا لگتا ہے۔ اس لئے کہ میں ان سے کسی قسم کا خونی رشتہ نہیں رکھتا۔ اس کے باوجود مجھے ہوش سنبھ

کے بعد سے اب تک اس قدر محبت ملی ہے جس کے قرض اتارے نہیں اتریں گے۔“

”ہونہہ! تمہاری غلامی اور تابعداری کے طفیل ہے یہ سب..... ذرا کسی دن اپنی بات پر زور دیکر دکھاؤ پھر دیکھو

لوگوں کی محبت۔“ وہ زہر بھری مسکراہٹ سے گویا ہوئی۔

”جن لوگوں نے ہمیشہ میرا خیال رکھا..... حتیٰ کہ مجھے بہترین تعلیم دلوائی میں ان سے جھگڑا کس بنیاد پر شروع کر

اور کیوں؟“ وہ سیرے ساتھ اچھے ہیں مجھے ان کے ساتھ اچھا ہونا چاہیے۔ آپ میرے بارے میں زیادہ نہ سوچیں آپ

صحت کیلئے ٹھیک نہیں۔“

اس نے میگزین ایک ہاتھ میں تھام کر کرسی بیڈ سے ذرا دور کھسکائی اور دوبارہ ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر بیٹھ گیا۔

”تم اتنے خود پسند کیوں ہو؟“ وہ جیسے چڑ کر بولی۔

”میں.....؟“ باری نے بابا صاحب کے جانے کے بعد پہلی بار نظر اٹھا کر اس کی شکل دیکھی۔

”اچھی خبر ہے۔“ وہ مسکرا کر میگزین کے اوراق الٹ پلٹ کرنے لگا۔

”تمہیں غصہ کیوں نہیں آتا؟“ اس کی جان جل گئی تھی باری کی مسکراہٹ دیکھ کر۔

”آیا تو تھا پھر آپ نے زہر کھالیا تھا۔“ اس کا اطمینان قابل دید تھا۔

روشی بری طرح چونک گئی۔ دل پوری قوت سے سکڑا اور اسی قوت سے پھیلا۔

”ہونہہ! تمہارے غصے کی وجہ سے منہ دھولو جا کر۔“ اس نے بڑی نخوت سے کہہ کر منہ پھیر لیا۔

”نہا کر آیا ہوں۔“ وہ میگزین میں ایک چونکا دینے والی خبر بغور دیکھنے لگا۔

روشی نے تملاکرا سے دیکھا۔ ڈارک بلیو جینز اور لائٹ پنک شرٹ میں وہ درحقیقت بہت فریش لگ رہا تھا۔

”تم تو دل ہی دل میں بہت خوش ہو رہے ہو گے..... کہ چلو جان چھوٹی۔“ وہ نہ جانے کیوں اس قدر سگ رہی تھی۔

”آپ کو کیسے پتہ چلا؟“ اس نے لا پرواہی سے ورق الٹا تھا۔

”ہونہہ! تم میری طرف دیکھ کر بات کیوں نہیں کر رہے؟ بد شکل تو نہیں ہوں۔“ اسے بہت زیادہ احساس توہین لاحق

تھا۔

”ارے نہیں آپ دل برانہ کیجئے۔ آپ کی شکل تو خاصی اچھی ہے۔ شاید اسی وجہ سے آپ ایکسٹرا آرڈینری کالیفڈنٹ

ہیں۔“ اس نے مسکرا کر میگزین بند کر دیا اور بغور اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

”میں نے تو نہ جانے کب سے آئینہ بھی نہیں دیکھا۔ اب تو پھنکار برس رہی ہوگی۔“ اس کی آواز رندھ گئی۔

”برس تو نہیں رہی..... البتہ آپ نے برسانے کیلئے زور پورا لگایا تھا۔ شاید آپ کو علم نہیں۔ اسلام کے مطابق خود کشی

کرنے والا مرد دھمبہ رہتا ہے۔ شکر کیجئے بڑی مستقل قسم کی بچت ہو گئی۔ لگتا ہے گلوہی آئیں گی۔ پتہ نہیں کب پہنچیں گی؟“ اس

نے ریٹ واپس پر نگاہ ڈالی۔

”جاؤ باہر لان میں بیٹھ جاؤ مجھ پر احسان کرنے کی ضرورت نہیں۔“

وہ گزربولی اور سیدھی لیٹ گئی۔ آنکھوں پر بازو رکھ کر۔ ڈھیلی ڈھالی سیاہ آستین جھٹکے کی وجہ سے الٹ گئی۔ دودھیا بازو

دور تک عیاں ہو گیا۔ جس پر ایک گہرا سیاہ تل عجیب سا جادو جگمگا رہا تھا۔

باری نے نظریں چرا کر کمرے میں دیکھنا شروع کر دیا۔ کمرے میں پتھہ دیر خاموش چھائی رہی۔

وہ سائینڈ نیبل سے دو انیاں اٹھا اٹھا کر دیکھنے لگا۔

”نمبر پچر بھی ہے آپ کو؟“ وہ اس کی طرف فکر مندی سے دیکھ رہا تھا۔

”جنم بھڑک رہا ہے میرے اندر نمبر پچر کیوں نہیں ہوگا؟“ وہ تنک کر بولی۔ انداز بدستور تھا۔

”کیوں بھڑک رہا ہے جنم کوئی وجہ بھی تو ہو؟“ وہ قدرے سنجیدہ تھا۔

”کاش وہ منحوس اس وقت صفائی کرنے نہ پہنچتی۔ گھنٹہ آدھا گھنٹہ اور گزر جاتا۔ میری تودہ میں بھی اثر نہیں کہ میں یہ دعا

کر کے ہی پرسکون ہو جاؤں اللہ کرے میں مرجاؤں۔“ وہ سسکنے لگی۔

”ہاں تو خیر ہے ہی نہیں۔ باپ سے بھی دور رکھتے ہیں۔ مجھے یقین ہے چپا کو اطلاع ہی نہ دی ہوگی کہ میں مر رہی

ہوں۔“

باری نے چونک کر اس کی سمت دیکھا، مگر خاموش رہا۔

”وہ لاکھ بڑے سسکی میں تو سب سے زیادہ میرے..... جو سکون اور خوشی مجھے ان کا چہرہ دیکھ کر ہوتی ہے وہ کسی اور کو دیکھ

کر تو نہیں ہو سکتی۔ باری میں چپا کو کیسے بتاؤں کہ میں ان سے بے پناہ محبت کرتی ہوں۔ وہ اتنے پتھر کیوں ہیں؟“ وہ رو رہی

تھی۔

”اب ایک بات میں پوچھوں آپ سے؟“ باری نے میگزین رول کر کے ٹھوڑی کے نیچے نکالیا۔
 روشی کا دل دھڑک اٹھا۔ وہ اس سے از خود تو کم ہی بات کرتا تھا۔ زیادہ تر گفتگو ”جوابیہ“ ہی ہوتی تھی، یا محض چھیڑ چھاڑ۔
 ”لبے بالوں والی تو مجھے کسی وجہ سے یاد رہتی ہے؟ آپ کو اتنا کیوں یاد آتی ہے؟ آپ نے تو اسے دیکھا بھی نہیں ہے۔“
 اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟ تم نے تو جی بھر کے دیکھا ہے ناں۔“ وہ رکھائی سے بولی۔
 ”آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے؟ وہ باتیں کیجئے جن سے آپ کو خوشی ہو۔“ نہ جانے کیوں باری کو اس پر ترس آ گیا۔
 ”میرے پاس کوئی ایسی بات نہیں جو مجھے خوشی دے۔“ اس کی آواز بھرا گئی۔
 ”بتائیے میں آپ کے کس کام آ سکتا ہوں۔“ باری کو سو فیصد یقین ہو چکا تھا کہ وہ واقعی نا آسودہ اور مضطرب ہے۔
 ”تم میرے کس کام کے نہیں ہو۔“ اس نے باری کی طرف سے کروٹ لے لی۔ اس کی سوسوں سے صاف ظاہر تھا وہ
 روری تھی۔

”اب تو دوسری ہے ناں؟ صبح آ جاؤں خیریت معلوم کرنے، ناراض تو نہیں ہوگی؟“

وہ چپ رہی۔

(کاش میرے بس میں ہوتا، میں جن جن کر خوشیاں اکٹھی کرتا اور تمہارے قدموں میں ڈیر کر دیتا)

”مرضی ہے تمہاری، میرا کوئی زور نہیں ہے تم پر۔“ وہ آنکھیں پونچھ کر سیدھی ہو گئی۔

”اچھا! ایک بات بتائیں، زہر کیوں کھایا تھا؟“ وہ اس کے سستے چہرے کو بغور دیکھا رہا تھا۔

”تمہاری وجہ سے نہیں کھایا تھا۔“ وہ چہرہ موڑ کر باری کی طرف دیکھنے لگی۔

”اتنی زبردست خوش فہمی مجھے عمر بھر نہیں ہو سکتی۔“ وہ ہنس دیا۔

ایک دم نرس ہاتھ میں گلو کوڑی بوتل لئے اندر داخل ہوئی۔ باری کو دیکھ کر مسکرائی اور وٹس کیا۔

”آپ کب آئے سر؟“ وہ بوتل اسٹینڈ پر لٹکانے لگی۔

”خاصی دیر ہو گئی۔“ وہ جواباً مسکرایا۔

”آپ واقعی بہت پریشان تھے۔ رات آپ گھنٹوں سوچ میں ڈوبے رہے، میں وہاں سے کئی بار گزری، آپ کو پتا نہ
 چلا آپ بہت اچھے ریلیو ہیں۔“ وہ بوتل لٹکا کر تھرمائیٹر جھٹکنے لگی۔

”ٹھیک ہے، جیک کرائیے، ٹھیک ہو گیا تھا، اس لئے ڈرپ ہٹا دی تھی۔“ وہ باری کو بتا رہی تھی۔

”اور اتنی ڈرپیں لگیں گی؟ میرا تو بازو شل ہو چکا ہے۔“ روشی بے زاری سے بولی۔

”یہ ضروری ہے۔۔۔۔۔ پلیز!“ اس نے تھرمائیٹر روشی کے منہ میں لگا دیا۔ اور اپنی کلائی پر بندھی گھڑی پر نظر جم کر کھڑی
 ہوئی۔

”میں نے ایس کو بتا دیا تھا کہ مجھے مس انڈر اسٹینڈنگ ہو گئی تھی۔ یہ کپل نہیں ہے ریلیو ہیں۔ دراصل اس نے رات مجھ
 سے کہا تھا کہ پچھ کر آؤ آپ کا کوئی بچہ ہے؟ اسے خوبصورت کپل کا بچہ دیکھنے کا بڑا تجسس رہتا ہے۔“ وہ ہنس رہی تھی۔

”یہ بات کوئی بتانے کی ہوتی ہیں، یہ تو فطری رشتہ ہے، وہ آپ کے والد ہیں۔ ان سے محبت آپ کے خون کا تقاضا
 بھی آپ کو دل و جان سے عزیز سمجھتے ہیں۔“

”جیسے یقین نہیں ہے۔“ روشی نے تیزی سے اس کی بات کاٹ دی۔

”کیوں؟“ باری نے تعجب سے اس کی طرف دیکھا۔

”وہ تو بہت اہم فاضل آدمی ہیں۔ وہ یہ یقین کیوں میرے اندر نہیں اتار سکے کہ وہ مجھے بہت عزیز رکھتے ہیں؟
 دنیا میں سب سے زیادہ مجھ سے محبت کرتے ہیں اس لئے کہ میں ان کی بیٹی ہوں۔“

”محبت کا بھلا علم و فضل سے کیا تعلق؟ محبت مشروط شے ہوتی تو اکثریت روٹی کی طرح اس کے لئے بھی منت کرنا
 باری ہنس دیا۔

”یہ تو ایک آسمانی گفت ہے، جسے ملنا ہوتی ہے مل جاتی ہے، بغیر محنت کے، بغیر سیرھی کے، جیسے مٹی میں پانی جذب
 جاتا ہے۔ یہ بھی اپنے اصل ٹھکانے سے پرواز کرتی ہے اور اپنے ہدف یعنی کسی روح میں جذب ہو جاتی ہے۔ کسی بہن
 اور من چاہی روح میں، خونی رشتوں میں کیونکہ ہم آہنگی فطری ہوتی ہے، اس لئے محبت ان رشتوں میں درحقیقت موج
 ہے۔“

”تمہیں اتنی سمجھ ہے محبت کی۔“ روشی کی آنکھوں میں ہلاکی حیرت تھی۔

”کوشش کر رہا تھا، آپ کو یقین آ جائے کہ یاور چچا آپ سے بے پناہ محبت کرتے ہیں۔“ وہ بڑے سادہ سے الفاظ
 مسکرا دیا۔

”اچھا اگر تم سے کوئی کہے کہ محبت کی تعریف ایک جملے میں کرو تو کیا تم کر سکو گے؟“ وہ کم عمر تھی سوال بھی کچے
 تھے۔

”جی ہاں کر سکتا ہوں، یعنی اس طرح کہوں گا، محبت ایک الجھا ہوا ریٹم ہے، جس کو سلجھانے کی کوشش کرنا بھی عقلاً
 ہے۔“

”بہت مشکل جملہ ہے۔“ اس نے منہ بنا کر دونوں ہاتھوں کا ٹکیہ اپنے سر کے نیچے رکھ لیا۔

”محبت رعایت کی خوبصورت شکل ہے۔“ روشی کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔

”مجھے نلم ہے دہرائیے مت۔“ اس نے میگزین دوبارہ اٹھا لیا۔

”لبے بالوں والی تو تمہیں بہت مس کر رہی ہوگی؟“ اسے یک دم کچھ یاد آ گیا۔

”ہاں یہ تو ہے۔“ اس نے بھی سنجیدگی سے جواب دیا۔

”کیا تم بروقت اس کے بارے میں سوچتے ہو؟“

”ہر وقت تو نہیں، جب فارغ ہوتا ہوں یا ڈرائیونگ کر رہا ہوتا ہوں۔“ باری نے بھی جیسے ہر بات کا جواب دینا
 کھائی تھی۔

باری بہت جزبز ہو رہا تھا۔ بھلا وضاحت کے بعد اس قسم کی گفتگو کی کیا گنجائش رہ جاتی ہے۔ ماحول دانا تو ہے۔
 ”کس کا بچہ؟“ تھرما میٹر منہ میں ہونے کے باوجود روشنی بولنے سے باز نہ رہ سکی۔
 ”کسی کا نہیں۔“ باری جلدی سے بول پڑا۔

نرس نے تھرما میٹر اس کے منہ سے نکال کر روشنی کی طرف کر کے ریڈ کرنا شروع کر دیا تھا۔
 ”تھینک گاڈ ٹیپر پچر تو نارمل ہوا۔ دراصل ابھی دو تین ڈرپس لگنا بے حد ضروری ہیں۔“
 اس نے ایک انجکشن اٹھا کر بوتل میں انجیکٹ کیا اور روشنی کا بازو بستر سے لگا کر رگ ٹٹولنے لگی۔
 ”پلیز ذرا آپ یہاں آئیے۔“ اس نے باری کو بلایا۔
 وہ میگزین سائیڈ ٹیبل پر رکھ کر نرس کے نزدیک چلا آیا۔
 ”جی۔“

”ایک تو ان کی رگ جانے کہاں غائب ہو جاتی ہے۔ یہاں سے ذرا زور ڈال لے۔“ اس نے روشنی کے بازو پر ہاتھ نشاندہی کی۔

باری نے اپنا مضبوط ہاتھ وہیں رکھ دیا اور باقاعدہ دبا دیا۔

روشنی نے تڑپ کر اپنا بازو اس کی گرفت سے چھڑایا۔

”رگ ڈھونڈ رہے ہیں آپ لوگ یا تیل کے کنویں؟“ وہ برا فروختہ ہو کر بولی۔

”یہ موصوف سرکش گھوڑے قابو کرتے ہیں۔ آپ نے میرا نازک سا بازو ان کے حوالے کر دیا۔“ وہ اپنا بازو دھکا دے کر نکلی۔

نرس ہنس ہنس کر بے حال ہو گئی۔

باری بھی بے ساختہ مسکرا دیا تھا۔

”ویری فنی!“ نرس نے بمشکل اپنی ہنسی کنٹرول کی۔

”اچھا ذرا آرام سے۔“ اس نے باری کو بیڈ پر بیٹھ جانے کا اشارہ کیا۔

وہ بیٹھ گیا اور بہت رسائیت سے اس کا بازو تھام لیا۔

اس کے اہلتے ہوئے لبو سے زندگی کی حرارت جیسے روشنی کے جسم و جان میں اتر گئی۔

اس نے چھو اتو زندگی کا ادراک ہوا۔ وہم و خیال تو سراسر نا آسودگی ہیں۔ مادی اور اسباب و علل کی دنیا میں بس زندگی موجودگی کا یقین ہے۔ ایک شے یا ذات آٹھ پہر خواہ نظر کے سامنے رہے۔ خواب و خیال کا شک رہتا ہے۔ جسے چھو کے ہونے کا یقین آ گیا۔

”اس نے آنکھیں موند لیں۔ اسے احساس تک نہ ہوسکا۔ نرس نے سوئی کب اس کی رگ میں اتار دی۔

اپنے بازو پر سے باری کا ہاتھ ہٹ جانے کے احساس سے اس نے چونک کر آنکھیں کھول دیں۔ وہ کھڑا ہوا۔

آنکھوں میں الجھن اور ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔

”ہوا ذرا زور سے چھو کر گزر جائے تو آپ چیخ پڑتی ہیں اتنی موٹی سوئی اندر اتر گئی اور..... خیر اچھی تبدیلی ہے۔ انسان کو صابر ضرور ہونا چاہیے۔ کیوں سسٹر؟ میں ڈر رہا تھا جب آپ سوئی رگ میں اتار رہی تھیں کہ ان کی چیخ کے زور پر کمرے سے باہر نہ جا کر دوں۔“

وہ بہت پرسکون تھا اس کی ہنسی سے ظاہر تھا..... نرس ہنس رہی تھی..... اور اپنا بکھیرا سمیٹ رہی تھی۔

”آپ لوگ خامے پروگرامیو“ ہیں۔ آپ رکیں گے رات کو ان کے ساتھ؟“ وہ جاتے جاتے پلٹ کر پوچھنے لگی۔ خاصی شوخ و شنگ نرس تھی۔

”نہیں ان کی بہن آنیوالی ہیں اچھا ہوا آپ نے پوچھ لیا، ورنہ آج ڈیوٹی روم میں نئی کہانی سناتیں۔“

وہ بھی کم تو نہ تھا۔ شرارت سے کہہ رہا تھا۔ وہ کھٹکھٹاتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔

”اس سے پہلے کون سی کہانی سنائی تھی؟“ وہ ان دونوں کے مابین ہونے والی گفتگو بغور سن رہی تھی۔

باری کرسی کی طرف بڑھتے بڑھتے رک گیا۔ پورا گھومنے کے بجائے اس نے صرف چہرہ موز کر اس کی سمت دیکھا۔

”رہنے دیجئے کیا کریں گی سن کر صدمہ بھی ہوگا اور غصہ بھی آئے گا۔“ وہ کچھ سوچ کر ہنس دیا۔

”نہیں آئے گا مجھے غصہ بتاؤ ناں۔“ وہ مصر ہوئی۔

”آپ کو اس وقت ہر نیکیو سینس سے دور رکھنا ہماری اخلاقی ذمہ داری ہے اور ایسی کوئی خاص بات بھی نہیں۔“ وہ مسکرا رہا تھا۔

”جب کوئی خاص بات نہیں تو بتا کیوں نہیں دیتے۔ وہ میری طرف دیکھ کر ہنس کیوں رہی تھی؟“ وہ اچھی خاصی مشکوک تھی۔

”منع کر دوں گا ہنسنے سے، تاکید کر دوں گا کہ آئندہ کورنش بجا کر کمرے سے باہر نکلے۔“ وہ کرسی پر بیٹھ گیا اچھی طرح ناٹیں پھیلا کر اور بازو سینے پر لپیٹ لئے۔

”ہونہا!“ روشنی نے دوسری سمت منہ پھیر لیا۔

وہ اس کے سراپے پر نظر ڈالنے لگا۔

”ویسے میں آپ کو بے حد منظم اور باضابطہ ہونے پر داد ضرور دوں گا۔“ وہ نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبائے جانے لگا۔

”شکریہ سنبھال کر رکھو اپنی داد..... آگے کسی کام آئے گی۔“ اس کا موڈ سخت آف تھا۔

”خودکشی سے پہلے آپ نے سیاہ سوٹ کا انتخاب کر کے بڑے باذوق ہونے کا ثبوت دیا ہے۔“

”شٹ اپ!“ وہ بڑبڑانے کے انداز میں بولی۔

وہ ہنس رہی۔

”موڈ کیوں آف ہو گیا؟“

”بالکل بھی اچھی نہیں ہیں تمہاری عادتیں، ہر کسی سے راز و نیاز کرنے بیٹھ جاتے ہو۔ اتنی سی دیر میں نرس بے تکلفی؟“ وہ چہرہ موڑ کر اسے گھورتے ہوئے بولی۔

”راز و نیاز کا مطلب جانتی ہیں آپ؟“ اس کا قبضہ بلند ہو گیا۔

”جاہل ہوں ایک تم ہی عالم فاضل ہو۔ ہونہ۔ اور ہاں سنو!“

دھڑام سے دروازہ کھلا..... گلو کی قیادت میں روبی، مونا، زری اور شینو اندر داخل ہوئیں۔ اس کی بات سن کر عینی۔

”یا اللہ! تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے، ہم لوگوں کو ذرا دیر ہو گئی۔ جیسے ہی پتہ چلا کہ تم مکمل ہوش میں ہو تو بھی ہم سب نے فرصت میں شکرانے کے نفل پڑھے۔“

گلو اس سے لپٹنے کے ارادے سے آگے بڑھی تھیں مگر ڈرپ لگی دیکھ کر فاصلے پر رک گئیں، پھر بڑے سکون سے بیٹھیں اور جھک کر اس کے رخساروں کو چوما۔

”بس بستر سے اٹھ جاؤ، پٹائی تو بہت سخت کروں گی، فی الحال تو بہت خوشی کا وقت ہے..... مار ڈالنے والے خون رہائی ملی، جتنا شکر کریں کم ہے۔“

”انسان کو اتنا نادان بھی نہیں ہونا چاہیے کہ اس پاس رہنے والوں کی زندگی بھی عذاب ہو جائے۔“ شینو دوسرے بیٹھے ہوئے بولیں۔ اپنے حساب سے انہوں نے ”نصیحت“ کی تھی۔

زری نے آنکھوں آنکھوں میں شینو کو تنبیہ کی۔

”یہ آپ سب کی سب اندر آ کیسے گئیں؟“ باری نے ان سب کو دلچسپی سے دیکھا۔

”سب کہاں ہیں؟ چار آنے ہیں یہ تو..... بارہ آنے تو گھر پر ہیں۔“ مونا نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

”آپ سے درخواست ہے آپ زندگی میں کبھی ”معاشیات“ پر نظر کرم فرمائیے گا۔“ اس نے باقاعدہ ہاتھ درخو است کی۔

مونا فطری سادگی سے مسکرا دی۔ جب کہ شینو نے خاصے کٹیلے انداز میں باری کا جائزہ لیا تھا۔

”کتنا تنگ کیا تم نے؟“ گلو اس کے نزدیک بیٹھ کر بہت پیار سے اسے دیکھنے لگیں۔

”وجہ بتائی اس نے تمہیں؟“ انہوں نے باری سے استفسار کیا۔

”میں ان کا ہمارا نہیں ہوں۔“ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

”تو بننے میں کیا حرج ہے؟“ شینو بے چاری عادت سے مجبور تھیں۔

باری نے قدرے چونک کر شینو کی سمت دیکھا۔ ”کیا“ اسے بھی مذاق میں ملوث کیا جاسکتا ہے؟ مگر یہ ہونا چاہیے۔ اندر سے بہت زیادہ احتیاط کا تقاضا ابھرا۔

”میں باہر گاڑی میں ہوں، آپ لوگ ”نرس“ کی درخواست کے بغیر ہی کمرے سے باہر آنے کی کوشش کیجئے گا۔“

”باری! شینو نے آواز دی۔

”گاڑی میں ”واک مین“ رکھا ہوا ہے، کچھلی سیٹ پر تمہارا ہے؟“

”جی!“ اسے اپنی غائب دماغی پر تاسف ہوا۔

”گاڑی میں تو کیسٹ پلیئر ہے، اسے کیوں اٹھائے اٹھائے پھر رہے ہو؟“ وہ عجیب سی ہنسی نہیں۔

”وہ میرا نہیں ہے، روشی بی بی کا ہے، بھول گیا تھا گاڑی میں۔ دریا بستی سے چلتے ہوئے لے لیا تھا کہ ہاسپٹل میں انسان بہت زیادہ تنہائی محسوس کرتا ہے۔“

”اوہ!“ وہ اس طرح ہو گئیں جیسے ان کا کوئی خاص مطلب نہیں تھا ویسے ہی پوچھ لیا تھا۔

روشی کے کان کھڑے ہو گئے تھے واک مین کے ذکر پر۔ وہ بہت حیرانی سے باری کی سمت دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔

”اب لڑکی کے جتنی جلدی ہو سکے ہاتھ پیلے کر دینے چاہیں۔“ بچے سو گئے تو اس نے احتیاطاً موضوع چھیڑا۔

”میری تو تنہا ہے، کل کی ہوتی آج ہو جائے اس کی شادی پر کوئی ڈھنگ کا بر تو آئے۔“ اس کی بیوی نے اپنے پہلو میں سوئے بچے کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

”یہ جو آج بیروں مٹھائی لے کر آئے تھے۔ رشتہ لائے ہیں کسی کا؟“ اس کے ذہن میں مغرب کے وقت سے سوال کلبل رہا تھا۔ وہ سمجھ تو گئی تھی کہ خاوند نے یہ موضوع کیوں چھیڑا ہے۔

”دیکھا تو تھا تو نے وہ جلال کپڑوں میں تھا۔“ غلام محمد نے ذرا ہمت کی۔

”اپنے لڑکے کا رشتہ لایا تھا۔ کیا کرتا ہے اس کا لڑکا؟ خود تو اس عمر میں بھی بڑا بانا بنا پھرتا ہے۔“ بڑی تیز نظر تھی اس کی گھر والی کی۔

”اس کا کوئی لڑکا وڑکا نہیں ہے۔“

”بھائی ہو گا؟“ اس کی بیوی نے بات کاٹ دی۔

”وہ خود کنوارا ہے۔“ اس نے دبے دبے لہجے میں بتایا۔

”تو اس میں ہمارا کیا قصور؟“ وہ تنک کر بولی۔

”پیسے والا بہت ہے.....“ اس کی آواز ہنوز کمزور تھی۔

”اپنا رشتہ لایا تھا؟“ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

وہ خاموش رہا۔

”شرم تو نہیں آئی تمہیں۔ ایسی کیا عمر گزرتی جا رہی ہے اس کی؟ ذرا ہوش کے ناخن لو۔ کہاں میری پھول سی بچی اور کہاں دیر ہو.....“ اس کی آواز تیز ہو گئی۔

عارف ایک عجیب سرمستی کی کیفیت میں تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ خود ادھر ادھر توجہ کرنا نہیں چاہتا تھا۔
کافی دیر خاموشی دونوں کے مابین حائل رہی۔ ہاسپٹل کی مخصوص چہل پہل اور معمولات کے باوجود لگتا ہے کچھ یاد کر رہے ہوں۔ غلام محمد کو خاموشی ٹوٹی دکھائی نہ دی تو ناچار بول پڑا۔
”ہیں۔“ عارف واقعاً چونک پڑا۔ پھر قدرے جھینپ کر مسکرا دیا۔

اعجاز بے خودی ہے کہ یہ حسن بندگی
اک بت کی جستجو میں خدا سے گزر گیا

اے یقین تھا شعر تو ہوگا لہذا صبر سے بیٹھ رہا۔

”رات گھر والوں سے بات ہوئی تھی۔“ اس نے قدرے ہچکچاتے ہوئے عارف کی طرف دیکھا۔

”خوب بند باجے بچے ہوئے“ ہاتھ چھٹ“ تو نہیں ہے ہماری بھاوج؟“

”وہ بڑے مزے لے رہا تھا۔“

”ایسے زن مرید بھی نہیں ہیں اب۔“ وہ قدرے ناراض ہوا۔

”ارے واہ..... بڑا بہادر ہے..... لگائیں گے نعرہ شجاعت..... مگر ذرا کارکردگی کا حال تو سناؤ۔“ عارف نے پیٹ

سے قمیض ہٹا کر بڑے رसान سے ہاتھ پھیرا۔ پیٹ بھی بے چارہ نا توانی کے جھکڑوں سے کھائی میں جا پڑا تھا۔

”نہیں مان رہی پٹھے پہ ہاتھ دھرنے نہیں دیا۔“ وہ گھاس نوچنے لگا۔

”پٹھے پہ ہاتھ پھر کسی وقت دھر لیتا، ٹائم سے کام کرتے ہیں۔“ وہ ہنسنے لگا۔

”لاحول ولا قوۃ!“ غلام محمد نے جوانی میں ایسے مذاق نہیں سہے تھے۔ منہ بنا لیا۔

”کیا کہا ہے وہ اقبال نے کہ

جو ہو ذوق یقین پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں

لگے رہو..... ایک دن خود پیش کر دے گی ہماری چنگیز خانم بھابی۔“ اس نے ہنسنے کی کوشش کی۔

”اللہ کے واسطے ہنسنا نہیں۔“ غلام محمد نے گھبرا کر ہاتھ جوڑ دیئے۔

”ارے تم تو ہمیں ہنسنے دو۔ اب ہماری ہنسی۔ دراصل ہنسی نہیں ہوتی، مگر تم کیا سمجھو گے؟

آج پھر جام تہی اور گھٹا اٹھی ہے

آج پھر رحمت یزداں پہ ہنسی آئی ہے

”بھئی تم یہ جام وام اور شراب و راب کا ذکر نہ کیا کرو۔ مجھے تو سننا بھی گناہ لگتا ہے نری تاپاک شے..... اور پھر اس سے

حاصل کیا ہوتا ہے؟“ غلام محمد نے سادگی سے غیرت دینی کا مظاہرہ کیا۔

”جنت میں جانا چاہتے ہو؟“ وہ مسکرایا۔

”اللہ ہر مسلمان کو جنت نصیب کرے۔“ غلام محمد کا موڈ آف ہو گیا تھا۔

”آہستہ بول بچے سو رہے ہیں۔“ توقع کے عین مطابق نتیجہ تھا اس لئے وہ پرسکون تھا۔

”اس کی ہمت کیسے ہوئی یہ بات کرنے کی، کیا غریب کی کوئی بات ہی نہیں ہوتی۔ کہہ دینا اس سے کہ آنکھوں پر کرے خون پی جاؤں گی اس کا۔“ وہ بڑبڑاتی ہوئی دوبارہ لیٹ گئی۔

”صحت مند ہے پیسے والا ہے، جوڑ کا ڈھونڈے گی تو کوئی غریب اور مقروض ہی ملے گا۔ ساری زندگی تو پیسے رہی ہے۔ چاہتی ہے بیٹی بھی اسی عذاب میں زندگی گزارے؟ تیرے طعنے میری طاقت چاٹ گئے۔ بیٹی کی اور کون مارا کرے گی۔ آج میں تیرے ہاتھ پر پیسے رکھتا ہوں تو بھی محلے میں چوکڑیاں بھرنے لگتی ہے۔ تو مجھ سے سیدے نہیں کرتی تھی، دن رات پیسے کا رونا تھا۔ بولتی ہے پیسے سے کیا ہوتا ہے ہونہار!“

اسے جانے کیا کیا یاد آگیا، زخم ہرے ہونے لگے۔

”عورت پیسے سے خوش ہوتی ہے، جس سے اس کے ارمان پورے ہوتے ہیں۔ بھوک سے بڑا عذاب نہیں ہے تو بیٹی کی، مہاراجے آئینکے اسے بیاہنے تیرے دروازے پر۔ دودھ پیتے بچے تو نے قبر میں سلوائے ہیں۔ دوا نہیں نہیں تھے ہمارے پاس؟“

”اچھا رات کے وقت شور نہیں کرو، اور نہیں تو کچھ تو یہی سوچو دنیا کیا کہے گی؟ کیسی تھو تھو ہوگی۔“ اس نے ہاتھ

کہہ کر آنکھوں پر بازو رکھ لیا۔

”نام نہ لے میرے سامنے دنیا کا، بھوکے ہوتے ہیں تو کوئی پوچھنے نہیں آتا، کہ روٹی کھائی ہے یا نہیں۔ بچے نے یہ نہیں پوچھا کہ کفن کے پیسے ہیں یا نہیں۔“ وہ ایک دم مشتعل ہو گیا۔

”رہنا تو اسی دنیا کے ساتھ ہے، کہاں جا بیٹھے؟ اچھا اب سو جاؤ، دماغ نہیں چاٹو میرا۔“ اس نے خاوند کی طرف

لی۔

(ایک دفعہ میں تو نہیں سننے گی۔ آخر بات ہی ایسی ہے، خیر کل دیکھیں گے) اس نے سونے کے خیال سے آنکھیں

لیں۔

”جب ہی کھٹک گئی تھی میں اتنی مٹھائیاں دیکھ کر آدمی دوست بھی جوڑ کا بناتا ہے، خواہ مخواہ ہی تو یاری بھی نہیں کی نیت میں کھوٹ ہے۔ خرید رہا ہے ہمیں۔“ عورت کے اندر آگ سی بھڑک گئی تھی۔ وہ مسلسل بڑبڑاتی تھی۔

اے میرے دل کے داغ تو ہی بتا

تو کہاں تھا؟ بہار سے پہلے

ہلکی ہلکی بوند باندی ہو رہی تھی۔ وہ دونوں ایک گھنے درخت کے سائے میں بیٹھے تھے۔ غلام محمد بہت دیر سے اسے خوف تھا جیسے ہی وہ گھر والی کا رد عمل بتا کر اس سے معذرت کرے گا وہاں سے کھانسی، مشورے اور شعر برساتا جائینگے۔ ایک شعر تو ہو بھی چکا تھا، جس سے خوفزدہ ہو کر وہ مزید محتاط ہو رہا تھا۔

حوروں کی طلب اور مے ساغر سے ہے نفرت
زاہد! تیرے عرفان سے کچھ بھول ہوئی ہے

”بھئی جو چیز اللہ اپنی مرضی سے دے اس میں کیا برائی ہے۔“ پہلی مرتبہ غلام محمد نے اس کے کسی شعر سے کچھ اظہار کیا تھا۔ باقی سر سے گزر گیا تھا۔

”اچھا چلو جانے دو ناراض نہیں ہوتے۔“ وہ صلح کن انداز میں بولا۔

”یہ تم اتنے سارے شعر یاد کیسے کر لیتے ہو؟“ آج اس نے پوچھ ہی لیا۔

”مجھے گالیاں بھی یاد ہیں سناؤں؟“ وہاں سے پھر بے سرو پا جواب آیا۔

غلام محمد نے جیسے سر پیٹ لیا۔

”اچھا! اب ذرا لائن پر آؤ“ دیکھو گھر والی کو پہلے نرمی سے رام کرو۔ نہیں مانے تو گھر سے نکالنے کی دھمکی دو اس عمر میں کہاں جائیگی، راضی ہو جائیگی اور جب اپنی بیٹی کے ٹھاٹ باٹ دیکھے گی تو سب بھول جائیگی اور پہلے سے زیادہ تمہاری خدمت کرے گی۔ اپنی بے وقوفی کا اعتراف کرے گی، تمہاری ناکمیں دبائے گی۔“

”اور جو اتنے دن جج جج کرے گی؟“ اس نے خاصی دورانہیشی کا مظاہرہ کیا۔

”چار دن کی تکلیف سے اگر لمبا آرام مل رہا ہو تو پھر گھانا کیا ہے؟“ عارف نے پھر دلیل دی۔

”ویسے کبھی ”تڑی لگائی ہے؟“ اس نے سگریٹ ہونٹوں میں دبا کر جیسیں ٹٹول کر ماحس تلاش کی۔

”ارے جب روٹی کا شور مچتا تھا روز ہی کل کل ہوتی تھی۔ کبھی وہ جانے کی ”تڑی“ لگاتی تھی۔ کبھی میں طلاق کی ”تڑی“ دیتا تھا۔“ غلام محمد ازلی سادگی سے بتا رہا تھا۔

”پھر تو تمہیں ”پریکٹس“ ہے تڑی لگانے کی۔ شاباش! اب پھر ”چالو“ ہو جاؤ۔ انشا اللہ تمہاری بیٹی دعائیں دے گی۔ ارے لال خان مزاج کا بھی اچھا ہے۔ گرمی نہیں ہے اس کے دماغ میں زیادہ اور پھر کھلے دل کا ہے۔ ہار بندوں کو بولا کر گیتو ”ہر مال دور روپے“ والے ٹھپے پہ نہیں لے جائے گا۔ سیدھا سنا رنگ پہنچے گا۔“

عارف نے کن اکھیوں سے غلام محمد کی طرف دیکھ کر بظاہر شاہانہ انداز میں کہا۔ ”بھائی کسی کو تو سکھ ملے اور جبکہ خود خوشی دروازے پر کھڑی پوچھ رہی ہے اندر آ جاؤں..... بولو؟“

عارف نے سگریٹ سلگا کر غور سے ماحس کی تیلی کو گھورتے ہوئے مزید زور لگایا۔

”ہاں خیر یہ تو تم ٹھیک کہہ رہے ہو خیر تم بتاؤ تمہاری ماں تو ٹھیک ہے؟“ اس نے عارف کی ماں کی خیریت دریافت کی۔

”مائیں“ کہاں ٹھیک ہوتی ہیں۔ ہزارو ہموں کی ستائی ہوئی۔ اندر ہو تو سوہم باہر نکلو تو ہزار پریشانی۔ یہ دبلا ہو رہا ہے۔“ موٹا ہو رہا ہے۔ یہ موٹر سائیکل پر جا رہا ہے پتا نہیں کیسے چلائے گا۔ یہ کار میں جا رہا ہے کچھ ہونہ جائے۔ پیدل جا رہا ہے تو سڑک دیکھ بھال کر پار کرنا۔“ وہ بہت آرام سے دھواں چھوڑتے ہوئے مسکرا رہا تھا۔

”تم نے بھی تو زیادتی کی۔ ٹھیک ٹھاک چلتے اس بے چاری کو ایک بہولا دیتے، غریب بہل جاتی۔“ غلام محمد کو اس کی

ہاں کی تنہائی پر ترس آیا۔

ابھی تک بے کفن سی ہے مری وحشت کی عریانی

یہ کس امید پر گھر کو بیاباں کر لیا میں نے

آہ..... ہا..... ”بہو.....“ کتنا مزے دار لطیفہ ہے۔ ہنسنے کی طاقت ہو تو ایک گھنٹہ ہنسوں۔“ اس کی آنکھوں کے گوشے نم نچے۔ مگر ب مسکرا رہے تھے۔

وہ فجر کے وقت اٹھنے کا عادی تھی۔ معمول کے مطابق آنکھ کھل گئی تھی۔ نہاد دھو کر نماز پڑھی، پھر کلو کو چائے کہہ کر لان میں آگیا۔ فوارے کے قریب بنی مور کے ڈیزائن کی سنگ مرمر کی بیچ پر بیٹھ گیا اور پانی کی اچھل کود پر نظریں جمادیں۔

”اچھا ہوا تمہاری مل گئے۔“ وہ بابا صاحب کی آواز پر جانے کس خیال سے چونک پڑا۔

”السلام علیکم خان!“ وہ کھڑا ہو گیا۔

”..... والسلام! بیٹھو۔ رات سے ہم ایک بات پر غور کر رہے ہیں۔“ وہ اس کے برابر ہی بیٹھ گئے۔

”جی..... فرمائیے۔“

”یہ جو کراچی کی چمڑا فیکٹری میں ہمارا فیجر ہے، علیم الدین تمہیں تو پتا ہوگا، یہ اپنے ہی گاؤں کا ہے۔“

”جی..... جی.....“ وہ سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھنے لگا۔

”سید ہیں یہ لوگ، وقت بگڑ گیا تھا بے چاروں کا۔ پاکستان بننے سے پہلے کی واقعیت ہے ہماری ان کے خاندان سے۔“

”جی۔“ وہ مزید سنبھل گیا۔ اسے بہت ہی خاص بات کی ”بو“ آرہی تھی۔

”اس کا ایک ہی بیٹا ہے۔ روشی سے سال چھ مہینے چھوٹا ہوگا۔“

”اوہ!“ باری کی سمجھ میں بات آگئی۔ اس نے دکھ کی آنچ سے سلگتا ایک گہرا سانس لیا۔

”بارہ جماعت پڑھا ہوا ہے۔ باپ نے الگ کاروبار کر دیا تھا۔ غلط صحبت میں پڑنے لگا تھا کالج میں، باپ نے دور اندیشی سے کام لیا اور کالج سے اٹھا کر کاروبار میں کھپا دیا پچاس ہزار قرض لیا تھا ہم سے چالیس ہزار واپس کر چکا ہے۔ ہم سمجھتے تھے۔ یہ ایک اچھا فیصلہ ہے۔ اکیلا لڑکا اور ماں باپ۔ ہمیں بھی سکون ملے گا اور اسے بھی۔ سال چھ مہینے چھوٹا ہے تو کیا ہوا۔ ابھی دس مہینے ہی ہوئے ہیں اسے کاروبار سنبھالے۔ ماشاء اللہ بہت اچھا جا رہا ہے۔ ایسا کرو! آج علیم الدین کو شام کی چائے بارات کے کھانے پر بلا لو۔ فون کر دینا اور کہہ دینا ہو سکے تو بیٹے کو بھی ساتھ لائے۔ ٹھیک ہے؟“

”جیسے آپ حکم کریں۔“

”یاور بھی دس پندرہ دن بعد کراچی کا چکر لگائیے۔“ وہ بھی دیکھ لیں گے۔ ویسے تو ہمیں امید ہے، وہ ہمیشہ کی طرح ہمارے فیصلے سے اتفاق کریں گے۔ اس کے ایک بیٹے بعد ہم روشی کی بارات کر دیں گے، کیوں؟“

وہ اپنی پھٹری پر دونوں ہاتھ جما کر سامنے دیکھنے لگے۔

”پہلے کہاں تھے؟“
”کوہاٹ۔“

”وہ بھی تو سنا ہے بہت خوبصورت ہے؟“

”سمجھ لائیں گے وہاں بھی آپ کو اور جہاں کہیں گی۔“

”ارے اتنے مہربان ہیں آپ؟ آپ کا چہرہ تو یہ نہیں بتاتا۔“ وہ ہنس دی۔

”چہرے بلکہ چہروں پر نہ جائیے یہ بعض اوقات بہت جھوٹ بولتے ہیں۔“ انہوں نے گیسر بدلتے ہوئے اس پر

سرری نظر ڈالی۔

سرخ سوتی مگر خوبصورت لباس میں وہ ماحول کو خوش نظر بنانے میں اہم کردار ادا کر رہی تھی۔

”کیسے ہوتے ہیں جھوٹے چہرے؟“ اس نے مسکراتے ہوئے پیشانی سے بال ہٹائے۔

”یہ تو سمجھنا مشکل ہے۔ یہ تو بس انکشاف ہوتا ہے۔ پہلے سے پیشگوئی نہیں کی جاسکتی۔“

”کبھی ہوا ہے انکشاف؟“ وہ ان کا خوبصورت و پر وقار چہرہ غور سے دیکھنے لگی۔

”میں پیش گوئی کر سکتا ہوں آپ اچھی وکیل بنیں گی۔“ وہ مبہم سا مسکرائے۔

”یہ میرے سوال کا جواب ہے؟“

”اچھا یہ بتائیے آپ کو پہلے ریٹ ہاؤس چھوڑا جائے یا آپ میرے آفس چلیں گی پہلے۔ ذرا آفس کا جائزہ لے کر

اطمینان سے آگے بڑھیں گے۔ اس طرح اگلا پروگرام بنانا بہت آسان ہوگا، کیوں؟“

وہ سامنے سے آتے ہوئے بکریوں کے ریوڑ کو بغور دیکھ رہی تھی جیسے چونک سی گئی۔

”آپ ظاہر ہے جو سوچیں گے میں اس میں ساتھ دوں گی اس لئے کہ مجھے کچھ پتا ہی نہیں اور ہاں میرا سوال آپ کے

پاس امانت ہے۔ میں اتنی سادہ لوح نہیں ہوں کہ آپ اپنی مرضی سے جب چاہیں ادھر ادھر میرا ذہن کر دیں اور مجھے پتا نہ

چلے۔“ وہ ہنس پڑی۔

”ذہین عورت بھی جیسے بعض اوقات سزا ہو جاتی ہے۔“ وہ پہلی مرتبہ اس انداز میں اس کی طرف دیکھ کر بولے کہ ان کی

آنکھوں میں سرخی کے ساتھ چمک اور مسکراہٹ بھی تھی۔

”بجوبھی تو بہت ذہین ہوں گی۔ کاش انہوں نے بھی آپ کی ڈپٹی کمشنری کے مزے چکھے ہوئے۔ جاگیر داری میں وہ مزا

کہاں جو ”اسٹیلشمنٹ“ کا ذرا سا پرزہ بننے میں ہے۔ پاکستان میں تو پیدا ہونے والے بچے کو اگر سب سے اچھی دعا دی جا

سکتی ہے تو وہ یہ ہے کہ اللہ کرے ”بیورو کریٹ“ بنے دو دھوں نہ بوائے پوتوں پھلے۔“ وہ پاؤں پھیلا کر ذرا آرام دہ انداز میں

بیٹھتے ہوئے بولی۔

”یاد علی خان کھل کر مسکرا دیئے۔“ ویری نائس آف یو مائی گڈنیز۔“

نچی اتھیرا تہ ترنیت پر ایک معصوم سی شرکیں مسکراہٹ مایہن کے ہونٹوں پر کھیلنے لگی۔

”جو آپ بہتر سمجھیں۔“ وہ اس طرف دیکھ رہا تھا جہاں سے کلو چائے لئے آرہی تھی۔

”اچھا ہم ذرا اپنے کمرے میں جا رہے ہیں ایک ضروری فون کرنا ہے ”سرائے“ اتنی جلدی میں آنا پڑا کہ وہاں کلو

”چائے پی لیں خان۔“

”تم ہیو ہم پی چکے ہیں۔“ وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔

کلو نے اسے چائے کا کپ تھمایا اور اگلے حکم کے انتظار میں کھڑی ہو گئی۔

”تم جاؤ اپنا کام کرو۔“ اس نے جیسے کسی خیال سے چونک کر اسے کہا تھا۔ وہ چلی گئی۔

اسے محسوس ہوا تھوڑی دیر پہلے لان بہت حسین تھا۔ پھول مسکرا بھی رہے تھے اور باتیں بھی کر رہے تھے۔ اب پورے محسوس ہو رہا ہے جیسے کسی گھر میں اچانک بری خبر آگئی ہو۔ اور سب کے چہرے اتر گئے ہوں۔ دیواریں آئینہ دار حیرانی۔ لیکنوں کو تک رہی ہوں۔

اس نے چائے کے گھونٹ بھرنا شروع کر دیئے جو بے حد بے مزہ محسوس ہو رہی تھی۔

بڑی امی یعنی عالم تاب اور ان کی نند جہاں آرا سے جیپ تک خدا حافظ کہنے آئی تھیں۔

جو ادا سے رہائشی کمرے میں دو چار باتیں کر کے خدا حافظ کہہ چکا تھا۔

وہ فرنٹ سیٹ پر یاد علی خان کے برابر میں بیٹھ گئی اور کھٹاک سے جیپ کا دروازہ بند کر لیا۔

ابھی تک وہ یاد علی خان کی طرف متوجہ نہیں ہوئی تھی۔

”دیہاتوں میں صبح جتنی حسین ہوتی ہے شہروں میں تو پتا ہی نہیں چلتا اس کے حسن کا“ آپ کبھی اس سے پہلے ہری پور

ہیں؟“ وہ کچے راستے پر جیپ بہت احتیاط سے چلاتے ہوئے پوچھ رہے تھے۔

”..... ذرا وہاں گریزی اور بیک گراؤنڈ میں پہاڑوں کا منظر دیکھئے گا کبھی بھول نہیں سکیں گی۔“

”مری سے بھی زیادہ حسین ہے؟“ اس نے ان کی طرف چہرہ موڑ کر دیکھا۔

لائٹ براؤن کوٹ پینٹ اور سرخ براؤن میچنگ ٹائی میں وہ بہت تر و تازہ محسوس ہوئے۔

”مری کا حسن الگ انفرادیت رکھتا ہے۔ ہری پور اپنی جگہ منفرد ہے۔ وہاں قدرتی حسن کے علاوہ سکون بہت ہے۔

زیادہ ہنگامہ سنا نہیں ہے۔ پھر یہ کہ لوگ بھی از حد سادہ ہیں۔“

پکی سڑک شروع ہو گئی تھی۔ انہوں نے رفتار بڑھا دی تھی۔ سورج ابھی طلوع نہیں ہوا تھا۔ سڑک کے دونوں اطراف

لگے ہوئے گھنے درخت ایک عجیب سی تازگی اور ٹھنڈک کا احساس بخش رہے تھے۔

”کتنے عرصے سے ہے آپ کی پوسٹنگ ہری پور میں؟“

”زیادہ دن نہیں ہوئے۔“

محبت عادت ہو سکتی ہے۔

مگر عشق سراسر مجبوری ہے۔

زندگی یونہی دریا سی بہہ رہی ہوتی ہے

انسانوں کا اثر دھام بھی وہی ہوتا ہے ہمیشہ سا

لیکن۔

ایک طلسمی نظر نو منکشف سیارے کی طرح آشکار ہوتی ہے۔

کہکشاؤں کا ایک نیا جہاں دریافت ہوتا ہے۔

انسان ایک جست میں اڑ کر اس نئے جہاں میں پہنچتا ہے۔

اس جہاں کی تہذیب۔

یہاں کے رکھ رکھاؤ۔

یہاں کے شام و سحر۔

یکسر مختلف ہوتے ہیں۔

اس جہاں میں ہم آہنگ ہونے کیلئے یہاں کا مخصوص لباس پہننا ہوتا ہے۔

جس کے تاروں میں سرمستی ہو۔

بے خبری ہو۔

جس کے ٹھنڈے ریٹم سے طلب کی آنچ آتی ہو۔

اس جہاں میں نیند و بیداری کے مفہوم بھی الگ ہوتے ہیں۔

مطلوب و محبوب و مقصود کے زانو و بازو میسر ہوں تو میٹھی نیند کے جھونکے آتے ہیں۔ وہ نظر سے اوجھل ہوتی۔

حریر و ریٹم سے آراستہ خواب گاہ میں الاؤ بھڑکتے ہیں۔

نیند اپنی نہ بیداری۔

نہ خوشی نہ غم۔

نہ زہر نہ امرت۔

کوئی شے اپنے اختیار میں نہیں ہوتی۔

اس ایک نگاہ کے معنی کے ساتھ زندگی سفر کرتی ہے۔

وہ نگاہ۔

جس کی تائید و تردید کے ساتھ ذات وابستہ ہو جاتی ہے۔

بس وہ نگاہ۔

کہ اسی نگاہ کا اثر ہر شے پر غالب آ جاتا ہے۔

چاند کا حسن محسوس ہوتا ہے تو اس نگاہ کے احساس کے ساتھ۔

ہنرہ زاروں کی ٹھنڈک کا ادراک ہے تو اس کی مسکراہٹ کے ساتھ۔

بچے درباؤں کی روانی ہے تو گویا اس نظر کی معنی خیزی کا استعارہ۔

اس نظر کی معنی خیز گفتگو کا تسلسل۔

عشق کیا ہے.....؟

آداب غلامی کی تفصیل۔

پہننا۔

اڑھنا۔

ہنسنا مسکراتا۔

سوٹا جاگنا۔

سب اس شکر کے اختیار میں چلا جاتا ہے۔

عشق کیا ہے؟

جاں کو سوختہ بنا دینے والا بڑا سا ہمارا۔

زندگی بن کر دوڑنے والے لہو سے روشن رہنے والا الاؤ۔

تکنا کا سینٹی ہوئی زندگی آن کی آن میں اس بھاڑ میں جا پڑتی ہے۔

اور پھر کوئلہ بنے تو قہر ختم ہو۔

راکھ بنے تو جان چھوٹے۔

پرنہ کوئلہ نہ راکھ۔

نہ سستی ہے نہ بھگتی ہے۔

عشق کیا ہے؟

اپنی ذات سے دستبرداری کا اعلان۔

اپنی اپنی رخصتی کا سامان۔

اپنی گمشدگی کا اعتراف۔

اپنی ذات کے لاپتہ ہونے کا اشیہار۔

اپنے وجود سے لاقلمتی کا بیان۔

عشق کیا ہے؟

اس ایک نظر کا اثر.....

وہ نظر جو ہست و نیست کے معنی سے بہت آگے اڑاں بھرتی ہے۔

یہی نظر جس میں بربادی کے سامان چھپے ہوتے ہیں۔

پھیل کر کائنات بن جاتی ہے۔

اور ساری زندگی گویا اس کائنات میں مقید ہو جاتی ہے۔

ہر آن ہر لمحے۔

اس نظر کی توجہ محسوس ہوتی رہتی ہے۔

دل مضطر کی گوشہ نشینی تو بظاہر ہوتی ہے۔

وگرنہ.....!

جہاں گوشہ ہوتا ہے وہیں کائنات ہوتی ہے۔

اس نے تازہ اخبار رول کر کے سینے سے لگالیا۔ ہاسپٹل سے آئے اسے دوسرا دن تھا۔

اس کی درد مندانہ اپیل پر کوئی اس کی تنہائی میں غل نہیں ہو رہا تھا۔ البتہ گلوگا ہے بگا ہے اسے دیکھنے یا سوپ وغیرہ۔

آتی جاتی تھیں۔

اور جس کے سنگ بار لہجے نے اس کی دنیا تلپٹ کر رکھی تھی اس کی جھٹک بھی دیکھنے کو نہیں مل رہی تھی۔

وہ پوری طاقت مجتمع کر کے بستر سے اٹھی اور کھڑکی میں آکھڑی ہوئی۔ پردہ ہٹا کر باہر جھانکنے لگی۔ وہ سامنے ہی کمر

آگیا۔ اختر (ڈرائیور) سے باتیں کر رہا تھا۔ اختر بھی ہنس رہا تھا اور وہ بھی۔

روشنی کے سینے سے ہوک سی اٹھی۔

کتنا مشکل اور کتنا آسان ہے ہنسنا جیسے اس وقت دنیا کا دلچسپ ترین لطیفہ بھی اسے نہیں ہنسا سکتا تھا۔ دھونکی ال۔ مگنی۔

رخساروں پر لڑھک آئے۔ میں تو شاید اب عمر بھر نہ ہنس پاؤں گی۔ مجھ پر آخر یہ انکشاف کیوں ہوا کہ میری خوشیاں اور

ہنسی تمہاری ذات کی مرہون منت ہے۔

”بی بی! چائے پیس کی آپ؟“ کلو کی آواز اینٹ پتھر کی طرح اس کے دماغ پر لگی۔

”ہاں۔“ اسٹرائنگ سی ہونا چاہیے۔

”اور ہاں سنو۔“ اس نے جاتی کلو کو پکارا۔ وہ ٹھہر گئی۔

”باری کو بھیجنا میرے پاس۔“ وہ دوبارہ سامنے دیکھنے لگی۔ اختر گاڑی گیٹ کی طرف لے جا رہا تھا۔ باری ریٹ

پر نظر ڈال کر اس طرف ہی بڑھ رہا تھا۔ اس کا دل بے قابو ہونے لگا۔ یہ جا رہا ہے جانے کب واپس آئے گا؟ اور یہ

مرگئی۔ جب پہنچے گی تو اس وقت تک تو نکل بھی چکا ہوگا۔“ اس کے دل و دماغ کی دنیا یروز بروز ہونے لگی۔

اگر چند لمحوں کے اندر اس سے بات نہ ہوئی تو میرا دماغ پھٹ جائیگا یا دل رک جائیگا۔ اس کا جی چاہا کھڑکی سے کود کر

سے کھینچ لائے۔

معا اس نے دیکھا کلو سر پٹ دوڑتی ہوئی باری کی طرف جا رہی ہے۔ ساتھ خان خان کی آواز بھی لگا رہی ہے۔ وہ رک

لیا تھا۔ کلو غالباً اس کا پیغام دے رہی تھی۔

روشنی کے سینے سے دیر سے رک سانس خارج ہوا۔ اعصاب پر سکون ہوئے۔ وہ کھڑکی سے ہٹ کر دوبارہ بستر پر لیٹ

گئی۔

دومنٹ کے وقفے کے بعد دروازے پر دستک ہوئی۔

”آ جاؤ۔“ اس نے سکون سے آنکھیں موند لیں۔

”لیس میم! کیسے یا ذرا مایا؟“ اس کی شریر آواز بہت قریب سے آئی۔

”تمہارے ہاں بیمار کی عیادت کا رواج نہیں۔“ وہ جیسے بہت سلگ رہی تھی۔

”ہمارے ہاں! بڑی عجیب سی بات کی ہے آپ نے“ جو ہمارا ہے وہ ہی آپ کا ہے ہمارے تمہارے کی پابندی سے

قدرت نے ہمیں آزاد کیا ہوا ہے حکم کیجئے۔“

وہ سینے پر ہاتھ باندھ کر سر کو خم دے کر کہہ رہا تھا۔

”اتنی تابعداری مت دکھایا کرو ڈراما لگتا ہے۔“ وہ پھنکاری۔

”آپ کو میری تابعداری پر شک ہے کیا؟“ وہ ہنوز کھڑا ہوا تھا۔

”اچھا بیٹھ جاؤ کیوں پوز کرتے ہو کہ سارا کام تمہارے بغیر رکا ہوا ہے۔“

”بیٹھ بیٹھ گیا ارشاد۔“ وہ ایک کرسی کھینچ کر اس کے قریب ہی بیٹھ گیا۔

”ارشاد اور شار کچھ نہیں تم اتنے بے حس ہو اندازہ نہیں تھا۔ ایک دفعہ بھی آکر میرا حال نہیں پوچھا۔“ اس کی آواز بھرا

اس نے جلدی سے باری کی طرف سے پشت کر لی اور باری حیران و پریشان اسے دیکھتا رہ گیا۔

”باقی سب لوگ تو آپ کے ارد گرد طواف کر رہے ہیں۔ میں تو یہ سوچ کر آپ کے پاس نہیں آیا کہ کہیں آپ کو ناگوار نہ

گزرے۔ آپ کو اینشن نہ ہو۔ میں تو احتیاط برت رہا تھا۔“

”بھڑمیں جائے تمہاری احتیاط تمہیں نہیں پتا میں تمہاری کتنی ”عادی“ ہوں۔“ اس کے منہ سے برجستہ نکل گیا تھا۔

”جیسے میں آنسوؤں کا نمک گھلا ہوا تھا۔“

”آئی ایم سوری روشنی بی بی! اچھا چلیں تاہم ہو جائیے۔ اب میں آپ کے کمرے کے اتنے چکر لگاؤں گا کہ آپ تنگ

ہو جائیں گی۔“

Get out with in movment (ایک لمحوں میں دفع ہو جاؤ)۔ وہ مسکرا رہا تھا مگر آنکھوں میں سخت الجھن

”طنز کر رہے ہو، تم بھی نہیں بخشو گے؟“ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

”باری شپٹا کر اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔

”کیا ہوا ہے؟“ (شاید بابا صاحب اپنا فیصلہ اسے سنا چکے ہیں) پلیز! دیکھیں روئیں نہیں۔ کیا بابا صاحب ”سچ نہیں“ پر سوں وہ لوگ آئے تھے ناں میں سمجھا آپ ان کے متعلق بات کر رہی ہیں۔ خیر جانے دیں۔ جب کوئی؟“ اس نے کوئی بات منہ سے نکالنے سے پیشتر اپنی تسلی کرنا چاہی۔

”مجھے ان کے کہنے کی پروا نہیں، جو ان کے جی میں آتا ہے وہ کریں، جو میرے دل میں آئے گا میں دوں۔“ اگر ان کے صاحبزادے کی تعلیم کم ہے تو کیا وہ مجھ سے ٹیوشن پڑھیں گے؟ میں کیوں ان کی تعلیمی کمی پوری غرائی۔

”اب کیا کریں گی؟“ اسے بخار چڑھنے لگا۔

”میں اوپر بنی ہوئی پانی کی ٹنکی سے چھلانگ لگا دوں گی، اگر مر نہ سکی تو معذور ہو جاؤں گی، پھر بابا صاحب

حصے میں ڈال دیں گے۔ پھر تم بھی کھانے کا پوچھنے کے بہانے میرا تماشا دیکھنے آیا کرو گے۔“ وہ اسی طرح پڑا۔ وہ دل ہی دل میں خود کو کوس رہا تھا۔

”اس کی شکل و صورت بھی اچھی ہے۔ تم بتا رہے تھے۔ مگر تم مجھے کیوں بتا رہے تھے؟ کیا میں نے اسے دیکھا ہوا نہیں؟“

”یہ سارے قصے میں ”میں غریب“ کیوں بار بار بیچ میں آ جاتا ہوں۔“ وہ بے بسی سے بولا۔

”یہ سب ”تم غریب“ ہی کا تو کیا دھرا ہے۔“ وہ ہتھیلیاں سے آنسو پونچھنے لگی۔

”اس طرح بلیم نہ کیجئے۔ میں تو محض پرزہ ہوں۔ بابا صاحب نے حکم دیا کہ عظیم الدین اور ان کے بیٹے کو

میں نے دیدیا اور ظاہر ہے کہ میں کر بھی کیا سکتا ہوں۔ آپ دل برانہ کیجئے۔ اچھے لوگ ہیں۔ بعض اوقات زندگی

آنا فنا آتی ہے۔ وہ آگے چل کر بہت فائدہ مند ثابت ہوتی ہے۔ تعلیم کی کمی ہے آپ چاہیں گی تو یہ کمی بھی پوری ہوگی۔

شکل و صورت بھی اچھی ہے۔ بات کرنے کا انداز بھی برا نہیں۔“

”کس کی بات کر رہے ہو؟“ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ باری کی بات ادھوری رہ گئی تھی۔

”عظیم الدین صاحب کے صاحبزادے کی اور کس کی؟“ وہ قدرے حیران نظر آیا۔

”مگر مجھے اس ”گھاس کھودنے والے“ کے ذکر سے کیا دلچسپی۔ تم سے اس وقت سراسر اپنی بات کر رہا ہوں لیں۔“

الدین صاحب کہاں بیچ میں ٹپک پڑے۔“

”اچھا۔۔۔ اچھا۔۔۔ باری بری طرح شپٹا گیا۔ اس کے انداز نے ظاہر کر دیا تھا کہ ابھی عظیم الدین والے آگیا۔

نہیں پہنچی۔ وہ اپنی حماقت پر سر پیت کر رہ گیا۔

”اچھا خیر، چھوڑیں اس قصے کو، یہ بتائیے میں آپ کی کیا خدمت کروں؟ آپ اچھی طرح فرونگ کرنا۔“ وہ اس کے مضبوط بازوؤں کی گرفت میں پھڑپھڑا کر رہ گئی۔

”نیچہ آزمائی“ کی ہے، انجر پنجر ڈھیلے ہو رہے ہوں گے۔ رنگ تو آپ کا بالکل ہلکا ہو چکا ہے، آپ انگریزی

رکھیں۔ جب تک آپ نہیں کہیں گی، میں یہاں سے نہیں اٹھوں گا۔

”نیک ہے۔“ وہ گھبرا کر بات سنبھال رہا تھا۔

روشن دم بخود ہی اس کی شکل دیکھ رہی تھی۔

”کیا چکر ہے یہ عظیم الدین اور ان کے صاحبزادے کا؟“ اس کی نظروں میں ایک کھوج تاج رہی تھی۔

”سچ نہیں“ پر سوں وہ لوگ آئے تھے ناں میں سمجھا آپ ان کے متعلق بات کر رہی ہیں۔ خیر جانے دیں۔ جب کوئی

ی نہیں ہے۔“ وہ نظریں چار ہا تھا۔

”اگر ان کے صاحبزادے کی تعلیم کم ہے تو کیا وہ مجھ سے ٹیوشن پڑھیں گے؟ میں کیوں ان کی تعلیمی کمی پوری

ی نہیں کیا ہے میں نے جاہلوں کو پڑھانے کا؟ وہ ہمارے ملازم ہیں۔ ہماری خدمت کریں گے۔ ہم ان کی نہیں۔

”نیک ٹیک بتاؤ باری! یہ سارا چکر کیا ہے۔“ وہ بستر سے اتر کر کھڑی ہو گئی۔

”کیوں پریشان ہو رہی ہیں، کوئی چکر نہیں ہے۔ کہاں الجھ گئی ہیں آپ؟“

وہ دل ہی دل میں خود کو کوس رہا تھا۔

”اس کی شکل و صورت بھی اچھی ہے۔ تم بتا رہے تھے۔ مگر تم مجھے کیوں بتا رہے تھے؟ کیا میں نے اسے دیکھا ہوا نہیں؟“

اب مشکوک نظروں سے اس کا جائزہ لے رہی تھی۔

”بابا صاحب کے دسارو و ہراز اگل دوسب کچھ۔ جس قیامت نے رکنا نہیں۔ وہ پھر آج ہی کیوں نہ آجائے۔“ وہ بڑی

اور کرب سے مکر رہی تھی۔

”آپ دراصل کبھی نہیں ہیں، میرا مطلب یہ تھا کہ.....“ وہ عجیب مشکل میں گرفتار ہو چکا تھا۔

”باری! ادھ کے دانت نہیں ہیں منہ میں، اب ذرا دیکھو، کیا کرتی ہوں میں، یہ لوگ بھی کیا یاد کریں گے کہ ان کے ہاں

کوئی روشنائی یا درعلی خان ہوئی تھی۔“ اس نے پاؤں میں سلپرنکائے۔

باری چونک کر اٹھ کھڑا ہوا۔ ”کہاں جا رہی ہیں آپ؟“

”جب جہنم ہی مقدور ہے تو ان کی مرضی کا جہنم منظور نہیں۔ اپنی مرضی کے جہنم میں جاؤں گی۔“

باری نے لپک کر اس کا بازو پکڑ لیا۔ ”خدا کیلئے روشنائی! کیوں زندگی کو کھیل بنا رہی ہیں۔ آپ کم از کم میری پوری

روشنی نے جھٹکے سے اپنا بازو چھڑا لیا اور کھلے دروازے سے دوڑتی ہوئی نکل گئی۔ باری نے ایک سیکنڈ کی تاخیر کے بغیر اس کا

دو سیکنڈ فکرو کو جانے والے زینے پر بھاگ رہی تھی۔ اس نے روشنی کو اوپر پہنچنے سے پہلے ہی درمیان میں جالیا۔

وہ سیکنڈ فکرو کو جانے والے زینے پر بھاگ رہی تھی۔ اس نے روشنی کو اوپر پہنچنے سے پہلے ہی درمیان میں جالیا۔

وہ سیکنڈ فکرو کو جانے والے زینے پر بھاگ رہی تھی۔ اس نے روشنی کو اوپر پہنچنے سے پہلے ہی درمیان میں جالیا۔

وہ سیکنڈ فکرو کو جانے والے زینے پر بھاگ رہی تھی۔ اس نے روشنی کو اوپر پہنچنے سے پہلے ہی درمیان میں جالیا۔

وہ سیکنڈ فکرو کو جانے والے زینے پر بھاگ رہی تھی۔ اس نے روشنی کو اوپر پہنچنے سے پہلے ہی درمیان میں جالیا۔

وہ سیکنڈ فکرو کو جانے والے زینے پر بھاگ رہی تھی۔ اس نے روشنی کو اوپر پہنچنے سے پہلے ہی درمیان میں جالیا۔

وہ سیکنڈ فکرو کو جانے والے زینے پر بھاگ رہی تھی۔ اس نے روشنی کو اوپر پہنچنے سے پہلے ہی درمیان میں جالیا۔

”خدا نہ کرے“۔ بازی نے نچھا ہونٹ دانتوں تلے دبا کر بہت دکھ اور الجھن سے اسے دیکھا۔
 ”آپ سمجھنے کی کوشش کریں“۔ اس نے پھر سمجھانا چاہا۔
 ”سمجھ لیا سب کچھ۔ میرے پیچھے اب تم سمجھتے رہنا“۔

ہاؤس میں اسے چھڑے رکھا۔

”آرمی ہے یا لوہا۔ چلو ذرا نیچے گولی مار دوں گی تمہیں۔“ وہ ہندیانی انداز میں چیختی۔

”شور نہیں مچائیں، اس وقت آپ نہایت قابل اعتراض حالت میں میرے قابو میں ہیں۔ اسکیٹڈل بن جائے گا۔“ وہ آہستہ آہستہ لئے فرسٹ فلور پر آ گیا۔ اسے تنگ کرنے کے انداز میں مسکراتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

”تو بن جائے، مائی فٹ۔“ وہ پھر چیخا۔

”مگر میرا تو ہو جائے گا ناں نقصان۔ حویلی کے پیچھے میرا کمرہ بھی آباد ہو جائے گا۔“ وہ اسے لئے ہوئے اسی کمرے کی بڑھا جہاں کچھ دیر پہلے تھے۔

”بزدل۔ پہاڑ جیسا جسم اور دل چڑیا سے بھی جھوٹا ہونہ۔“ اس نے حقارت سے سر جھٹکا۔

”آپ میرے منفی جذبات ابھارنے کی کتنی ہی کوشش کریں۔ کامیابی نہیں ہوگی۔“ وہ بے حد پرسکون تھا۔

”تمہاری شادی ہونا تمہاری مرضی کیخلاف تو پتا چلے منفی مثبت کا“۔ وہ بے بسی سے رونے کو ہو گئی۔

”اللہ کرے، مرجائے وہ لمبے بالوں والی۔ تمہارے دل میں بھی آگ لگے۔ تب پتہ چلے“۔ وہ رورہی تھی۔

”یہ بددعا تو آپ نے سنبھال کر رکھی ہوئی تھی۔ کبھی نہ کبھی تو دینا ہی تھی۔“ وہ ہنوز مسکرا رہا تھا۔

اب وہ اسے لئے کمرے میں داخل ہو گیا تھا اور کمرے میں داخل ہوتے ہی اسے اپنی گرفت سے آزاد کر دیا اور بڑی سادہ سادہ روازہ بند کر کے چٹنی چڑھا دی۔

”باری! یاد رکھنا بہت بری طرح پیش آؤں گی تمہارے ساتھ“۔ وہ کھست خوردہ انداز میں بیڈ پر بیٹھ گئی۔

”آپ بات کو سمجھیں، خود ہی فرض کر لیا سب کچھ۔ علیم الہین اور ان کے صاحبزادے کا معاملہ دراصل یہ ہے۔“

”اچھا بس چپ ہو جاؤ۔ چچے بابا صاحب کے اس قدر احمق سمجھا ہوا ہے مجھے۔ اب اسٹوری گھڑیں گے، موصوف۔ کب تک کرو گے میری نگرانی۔“

”بہت بری بات“۔ باری نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”زندگی کو کیوں مذاق بننا ہی ہیں“۔

”روزمرنے سے بہتر نہیں ہے کہ انسان ایک بار ہی چلا جائے اس دنیا سے، جن کی شکل تک دیکھنا مجھے گوارا نہیں، میں ان کے ساتھ عمر گزاروں گی؟ فوراً دیکھنا کیسا سبق پڑھا کر جاؤں گی ان سب کو۔ ہمیشہ یاد رکھیں گے۔“ وہ پھنکاری۔

باری کی جان مصیبت میں پھنس گئی تھی۔ اب اسے نہیں سمجھایا جاسکتا تھا۔

”دیکھو باری! گواہ رہو میری شادی میری مرضی کی خلاف کرنے کی کوشش کی گئی تو جنازہ اٹھے گا میرا۔ میری طرف سے بھلے یہ پیغام بابا صاحب کو پہنچا دیتا۔“

”خدا نہ کرے“۔ باری نے نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبا کر بہت دکھ اور الجھن سے اسے دیکھا۔

”اپ بھنے کی کوشش کریں۔“ اس نے پھر سمجھانا چاہا۔

مجھ لیا سب کچھ۔ میرے پیچھے اب تم سمجھتے رہنا۔“

☆.....☆.....☆.....☆.....☆

”میں کہتی ہوں، مجھے چھوڑ دو۔“ روشی نے اس کے بازوؤں کی گرفت سے آزاد ہونے کیلئے پورا زور لگا کر اسے جیسے بے دم ہو گئی۔ دیہاتی اور بے فکری کے ماحول میں پلا بڑھا مضبوط وجود جیسے اس کیلئے لوہے کی دیوار بن گیا۔

”ہوش کی دوا کریں کچھ کرنے سے پہلے تھوڑی دیر سوچ لینا بھی بہت سی مشکلات سے بچا لیتا ہے۔“ روانہ تھامے یعنی اپنے بازوؤں میں جکڑے نیچے اتارنے لگا۔ روشی نے ایک بار پھر بھرپور مزاحمت کی۔

”چھوڑ دو مجھے نہیں تو میں تمہارا خون پی جاؤں گی۔“ وہ بری طرح بھر کر بولی تھی۔

”چھوڑ دوں گا تو پیسے گی۔“ وہ اسے لئے ہوئے ایک زینہ مزید نیچے اترا۔

روشنی نے اس کے بازو میں دانت گاڑ دیئے۔ ایک لمحے کو تو مارے اذیت کے وہ بلبلا کر رہ گیا مگر گرفت ڈھیلے ہوئی۔ ”فرض کر لیں، جہاد کر رہا ہوں، دشمن کی گولی لگی ہے، ڈزن میٹر“۔ وہ مسکرایا اور ایک زینہ مزید نیچے اتار آیا۔

اس نے بہت آرام سے اس کے چھوٹے چھوٹے خوبصورت ہاتھ اک ہاتھ میں مضبوطی سے دبوچ لئے

اسے سوالیہ نظروں سے مگر بہت اعتماد سے دیکھ رہی تھی۔

”ہس وقت تک جذبات کا طوفان اتر چکا ہوگا اور آپ کو ایڈجسٹمنٹ کے ہنر آ جائیں گے۔“ وہ اب پرسکون ہو چکا تھا۔

”ایڈجسٹمنٹ کبھی نہیں ہوگی۔ اس کا تو ہم تمہیں یقین دلاتے ہیں۔ بس اس سوال کا جواب دو اگر وہ نہ ہو سکا جس کا وعدہ تم کر رہے ہو۔ پھر کیا کرو گے؟ میں تو لعنت بھیجتی ہوں ایسی زندگی پر جس میں جسم زندہ اور دل مردہ ہو۔ ایسی زندگی جس میں میرے دل سے ہر لمحے آہیں نکلتی ہیں۔ میں تھوکتا بھی پسند نہ کروں۔ چوپایہ نہیں ہوں۔ پیٹ بھروں اور سو جاؤں۔ سمجھے تم؟“

”پھر کیا کر سکو گام میں؟ میری کچھ حدود مقرر ہیں۔ آپ یہ سمجھ لیں۔“

وہ دوبارہ کرسی پر بیٹھ گیا۔ مگر اب وہ بہت الجھا ہوا تھا۔

”تم بہت بزدل ہو باری۔ تم پر تو غلاموں کو بھی شرم آ جائے۔“

”میں بزدل نہیں ہوں۔ آپ یقین کر لیں۔ میں جب چاہے حویلی سے نکل سکتا ہوں۔ مگر حویلی کے حکمران میرے مربی میرے محسن ہیں۔ مجھے ان کو خوشی اور سکون پہنچا کر دلی سکون ملتا ہے۔“ وہ بہت بردباری اور تحمل سے گویا ہوا۔ اگرچہ بزدلی ”وہ طعنہ ہے جو بڑی برداشت والے مرد کا بھی ٹمپر لوز کر دیتا ہے۔“

”ہونہہ! حویلی کے حکمران تو احسان کرتے ہی اس لئے ہیں کہ لوگوں کو اپنا غلام بنائے رکھیں، کوئی ان کے سامنے سر نہ اٹھائے۔“ وہ ناک چڑھا کر بولی۔

”بہر حال اچھا سلوک احسان ہی ہوتا ہے؟“ وہ آہستگی سے گویا ہوا۔

”اور آپ کو میرا یقین کر لینا چاہیے کہ میں حویلی کے ایک ایک فرد کا خیر خواہ ہوں۔ میں یاد رکھتا ہوں کہ اپنے انداز میں بات کروں گا۔ وہ بہت اچھے ہیں۔ انشاء اللہ آپ کے ساتھ زیادتی نہیں ہوگی۔ آپ یقین کر لیں۔“ اس نے نہایت رسانییت سے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

”میرا سوال اپنی جگہ موجود ہے اگر زیادتی ہونے لگی اور تم بھی کچھ نہ کر سکتے پھر؟ تمہیں نہیں بھولنا چاہیے میں موت سے بالکل نہیں ڈرتی۔ کس طرح مجھے زندہ رکھو گے۔ کیا راستہ نکالو گے؟ وہ اسے بغور دیکھ رہی تھی۔

”آپ اپنی زندگی کیلئے جو بھی شرط پیش کر دیں گی۔ مجھے منظور ہوگی لیکن میری بھی ایک شرط ہے اگر کوئی شخص جو ہر صورت مجھ سے بہتر ہوگا اسے آپ رو نہیں کریں گی۔ میں صرف لائف سیونگ ٹریٹمنٹ (زندگی بچانے والی گولی) کے طور پر اپنا آپ استعمال کروں گا۔“

”وعدہ کر رہے ہو؟“ اس کے جسم و جاں میں عجیب سا سکون در آیا۔

”مرد کی بات ہی قبول ہوتی ہے۔ مگر آپ کو میری شرط ذہن میں محفوظ کر لینا چاہیے فکر ہی نہ کرو۔ جاؤ۔ اب کچھ نہیں بگاڑو۔“ وہ بستر پر دراز ہو گئی اور باری کی طرف سے کروٹ لے کر نہ جانے کیا سوچنے لگی۔

باری نے دروازے کی چٹائی گرا دی۔ لیکن دروازہ کھول کر باہر جاتے جاتے رک گیا۔ جیسے کچھ کہنا چاہتا ہو۔ مگر پھر بغیر کچھ بولے تیزی سے گراؤنڈ فلور کی طرف جا۔ نے والے زینے کی طرف بڑھ گیا۔

بہت مشکل ہو گئی تھی وہ کرسی کھینچ کر اس کے قریب بیٹھ گیا تھا ”ضروری تو نہیں جو کچھ ہونے جا رہا ہے وہ ہو بھی پھر ذرا صبر کریں۔“ وہ بہت سنجیدگی سے اسے سمجھانے لگا

”اچھا اگر صبر کے بعد بھی سب کچھ سامنا آیا تو۔“ وہ دراز سے ٹٹو پیپر نکال کر ناک پونچھنے لگی۔

”دنیا میں زیادہ تر ایسا ہی ہوتا ہے۔ ہمیں وہ زندگی گزارنا ہوتی ہے جو ہم گزارنا نہیں چاہتے۔“ وہ پھر زنی سے کہنے لگا اور پھر آپ نے تو اپنی شامت خود بلوائی ہے۔“

”وہ احتجاج تھا زبردستی بے دخلی پر اور آئندہ بھی ہوگا اگر یونہی زبردستی ہوئی۔“ وہ بھڑک اٹھی۔

”جو بڑے ہیں وہ آپ کے خیر خواہ ہیں آپ کو یقین کیوں نہیں آتا؟“

”میرے جنازے پر پھول تم بھی ڈالو گے۔ آجائے گا تمہیں یقین خیر خواہوں کا۔“

اس نے اپنی ناک ذرا زیادہ ہی رگڑ ڈالی تھی جو ایک دم سرخ ہو گئی تھی۔

”اب یہ بات بات پر ”جنازہ“ نکل رہا ہے۔“ وہ بھی جھلا گیا۔

”نکل رہا ہے کیا مطلب؟ نکلے گا۔“ وہ پھر غرائی۔

”میں صرف اسے زندگی سمجھتی ہوں جو میری مرضی کی ہو۔“ وہ بہت اٹل انداز میں گویا ہوئی۔

”یہ زنی جذباتیت ہے کاش آپ سمجھ سکتیں۔“ وہ جیسے تھک کر گویا ہوا۔

”تم اپنی انرجی ضائع مت کرو۔ جاؤ آرام کرو۔ ہاں مگر یہ بتاتے جاؤ۔ کتنی عزیز ہے تمہیں میری زندگی؟“ وہ اٹھ درتچے سے پردے ہٹانے لگی۔

”میرے آس پاس میری حدود میں میری نظر کے سامنے جو زندگی بھی ہے وہ میرے لئے اہم ہے۔ اس میں کوئی فرق نہیں۔“ وہ کچھ سوچتے ہوئے جواب دے رہا تھا۔

”کیا ایسے لمحوں میں جب میری زندگی داؤ پر لگی ہو۔ تم کر سکتے ہو مجھ سے شادی؟“ وہ بہت خود اعتمادی سے اس کے سامنے ایستادہ تھی۔

باری تو بری طرح چونک کر اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اور اسے اس طرح دیکھنے لگا جیسے اس کا ذہنی توازن بگڑ گیا ہو۔

”اس طرح کی بات آئندہ کبھی مذاق میں بھی منہ سے نہ نکالے گا۔ آپ کو زیب نہیں دیتی۔ میں اپنا مقام بچانا نہیں میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ یاد رکھنا چاہتا ہوں کہ جذبات پہنچا کر ہر شے آپ کی پسند کے مطابق آپ کے حق میں کر کے کی کوشش کروں گا اور آپ کی شادی ہرگز ہرگز زبردستی نہیں ہوگی۔ آپ کے شایان شان شخص کو آپ کا جیون ساتھی بننے دیا جائے گا۔“

وہ بہت مستحکم لہجے میں وعدہ کر رہا تھا۔

”اور جو ایسا نہ ہو سکا؟“ روشی کا لہجہ اس بار نہایت نرم اور آواز بہت دھیمی تھی۔

باری نے نظریں اٹھا کر اس کی سمت دیکھا۔ ست رنگے پرنٹ کے شلوار قمیض اور دوپٹے میں وہ اپنی سرخ ناک کے

رہسٹ ہاؤس کا جادو سننا اس کی وحشت بڑھا رہا تھا۔ وقفے وقفے سے کچن میں برتن کھڑکھڑاتے تھے تو اس کا احساس ہوتا تھا۔

وہ اکتا کر دوپٹا سنبھالتی کچن میں چلی آئی۔ خانساں کو جیسے سو فیصد کسی کی مداخلت کا یقین نہیں تھا۔ اسے کچن میں جھوم جھوم کر برتن دھو رہا تھا۔ وہ خاموشی سے اس کی پشت پر جا کھڑی ہوئی۔ مگر اسے احساس تک نہ ہوا۔

”صاحب کھانا کھانے آئیے کیا؟“

”آپ بی بی! کھانا نگار ہوں۔ بس پانچ منٹ لگیں گے۔“ وہ تدریجاً بھل سا نظر آیا۔

”یہ میرے سوال کا جواب نہیں ہے؟“ اس نے فریج کھول کر پانی کی بوتل نکالی۔

”صاحب کا کچھ پتائیں ہوتا۔ کبھی نہیں بھی آتے۔“ اس نے ہانڈی میں چمچ چلاتے ہوئے جواب دیا۔

”مگر اب تو میں یہاں ہوں انہیں آنا چاہیے۔“ اس نے گلاس میں پانی انڈیل کر ہونٹوں سے لگایا۔ (حیدر علی خان)

نے پلٹ کر اس کی سمت سرسری سا دیکھا۔

”بی بی! صاحب کا کام ہی ایسا ہے کہ۔“

”پھوڑو! یہ کام دام کے تذکرے۔ کام تو کام ہی ہوتا ہے۔ اپنے اپنے حساب سے سب ہی کرتے ہیں۔“ اسے

ناگہاری سے اس کی بات کاٹ دی۔

خانساں نے تعجب سے اس کی شکل دیکھی اس کا صاحب کوئی معمولی آدمی نہیں تھا۔

”اچھا ابھی کھانا مت لگنا۔ میں یاور بھائی کو فون کر رہی ہوں۔“

وہ یاور علی خان کے بیڈروم میں چلی آئی اور ان کا نمبر ملا یا پی اے نے صاحب کے ”سرفوف“ پر۔ نہ کا مڑوا سا لہجہ

کا تو دماغ ہی گھوم گیا۔

”دیکھئے مسٹر! میں اس بھری دوپہر میں دفتر پہنچ جاؤں گی۔ اگر ان کے پاس پرائم منسٹر بھی بیٹھ ہوئے ہیں تو بھی آپ

انہیں میسج کنوے کیجئے کہ مایین احمد فون پر ہیں۔“ اس نے ناراضگی سے کہا۔

”جسٹ اے منٹ ہولڈ پلیز۔“ پی اے اس کے اس انداز پر واقعی بوکھلا گیا تھا۔

چند سیکنڈ بعد یاور علی خان کی گھمبیر آواز ایریز میں ابھری۔

”یس یاور علی۔“

”کیا آپ مجھے یہاں اس لئے لائے تھے کہ میں بھوک مر جاؤں؟“ وہ بچوں کی طرح جھٹکی سے گویا ہوئی۔

”اللہ نہ کرے۔۔۔۔۔ دراصل میری غیر موجودگی میں کام اور ملاقاتیں خاصی مقدار میں آٹنسی ہو چکی تھیں۔ اب ہزار ہائے

کے باوجود سیٹ سے نہیں اٹھ پارہا۔ دو منٹ قبل اٹھنے ہی والا تھا کہ ایس پی صاحب تشریف لے آئے۔ سیاسی صورتحال تبدیل

ہو رہی ہے تو اسی حساب سے کام بھی بڑھ رہے ہیں۔ آپ کھانا کھالیں کیونکہ میرا کچھ پتہ نہیں۔ کچھ پتائیں ایس پی صاحب

کس قسم کے معاملات ساتھ لائے ہیں۔ اور ان میں کتنا وقت لگے گا۔“

باجن کو معلوم تھا وہ اس وقت جو بھی کہے گی۔ ادھر سے بڑا منطقی جواب آئے گا۔ اس نے ایک نکتہ منہ سے نکالے بغیر

ریسیور رکھ دیا۔ جبکہ دوسری سمت ریسیور ہنوز یاور علی خان کے ہاتھ میں تھا۔ اور وہ اس کی کسی اگلی بات کے فشر تھے۔

”اور وہ برسا منہ بناتی ان کے بیڈروم سے باہر آگئی۔“

”کھانا گاروں بی بی؟“ خانساں ایک دم سامنے گیا۔

”نہیں۔۔۔ ایک گلاس جوس لے آؤ۔“

”بس۔۔۔ بے چارہ بڑا ہی حیران ہوا خود جو ”پیو“ تھا۔“

”ہاں بھی بس۔“ وہ جھلا کر گویا ہوئی اور اپنے رہائشی کمرے میں چلی آئی۔

”تو پتہ کتنا مشکل ہے۔ کسی ”بڑے“ افسر کے ساتھ گزارا کرنا۔ نری آرٹیفشل لائف۔“ وہ بڑبڑاتی ہوئی شام کیلئے

کپڑے دیکھنے لگی۔

دس منٹ بعد خانساں انارکا جوس لے کر حاضر ہو گیا۔ اس نے جوس کا گلاس اٹھا کر اسے واپس جانے کا اشارہ کیا۔ اور

خود ایک کرسی پر بیٹھ کر آہستہ آہستہ جوس پینے لگی۔ ابھی گلاس آدھا بھی نہیں ہوا تھا کہ خانساں پھر حاضر ہو گیا۔

”صاحب کا فون ہے بی بی۔“

وہ چونک پڑی ابھی تو بات ہوئی ہے پانچ منٹ قبل۔ واٹس اے نیو میٹر۔ وہ گلاس رکھ کر تیزی سے ان کے بیڈروم میں

آئی۔

”جی۔“

”مجھے ابھی ابھی دھیان آیا کہ آپ نے بغیر کچھ کہے ریسیور رکھ دیا تھا۔ کہیں کھانے سے ناراض تو نہیں ہو گئی؟“

”جلیں شکر! آپ کو دیر سے سہی دھیان آ تو جاتے ہیں۔“ اس کا موڈ آف تھا۔

”دراصل آپ کے اور میرے اتج گردپ میں اتنا زیادہ فاصلہ ہے کہ اس وقت میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ میں کس انداز

اور کن الفاظ میں آپ کو مطمئن کروں۔“ وہ بہت سنجیدگی سے کہہ رہے تھے۔

”رہنے دیجئے۔ یہ تپ تول یہ محض مصنوعی اظہار ہے۔ دراصل آپ پر کسی بات کا اثر ہو ہی نہیں سکتا۔ میں جان چکی

ہوں آپ کی نیچر۔“ وہ اسی موڈ میں گویا ہوئی۔

”میں تو بہت سادہ سا آدمی ہوں مجھے جاننا کوئی مشکل بات نہیں۔ مگر بہر حال یہ اچھی اطلاع ہے آپ کھانا ضرور

کھائیں۔ ورنہ میں گلی فیل کروں گا۔ او۔ کے؟“

”یعنی آپ نے محض اس لئے فون کیا ہے تاکہ آپ ایک اچھے میزبان ثابت ہوں، بہر حال آپ فکر نہ کریں۔“

”خیر میں آپ کے ”تجزیاتی کام“ میں مداخلت نہیں کروں گا۔ بس اتنا کہوں گا کہ شام کو آپ تیار رہے گا۔ آپ کو بہت

اچھی جگہ سیر کرائیں گے۔ آپ کی ساری کوفت دور ہو جائیگی۔ ٹھیک ہے؟“

”جھینکس“۔ وہ ان کی اتنی مہربان وضع پر واقعی خوشی سے مسکرا دی۔

”اب بات ہوئی ناں۔ ورنہ میں تو الجھ گیا تھا۔ ایس پی صاحب کو ابھی تک انتظار میں بیٹھایا ہوا ہے آپ کی بہن۔“

”جھینکس اکیں“۔ وہ زائد خشک قسم کے انسان سے اتنی توجہ اور مہربانی کے انداز پا کر واقعی خوش ہوئی تھی۔

.....

باری کا بلاوا آ گیا تھا۔ وہاں دریا بستی میں اس کی سخت ضرورت پیش آ گئی تھی۔

”وہ بابا صاحب کے ساتھ شہر آ جاتا تھا تو اسے شہر میں ہی ڈھیروں کام پیش آ جاتے تھے۔ صبح فیکٹری گیا۔ وہاں پورٹ گیا۔ سیٹ کنفرم کرائی۔ شام سواپانچ بجے تک فلائٹ تھی۔ بمشکل فرسٹ کلاس میں سیٹ ملی تھی۔ وہاں کی دھڑ دھڑاوت فراغت پا کر بابا صاحب کے بزنس پارٹنر سے حساب کتاب کر کے فائل اور چیک وصول کیا۔

تین بجے کے بعد گھر آیا، بمشکل دو چار نوالے ہی منہ میں ڈالے تھے کہ فیکٹری سے منیجر کی کال آ گئی۔ ہار میڈیکل چیک اپ کیلئے گئے ہوئے تھے۔ ناچار اسے فیکٹری کا دوسرا چکر لگانا پڑا۔ گھر سے فیکٹری زیادہ دور نہیں تھی۔ تک واپس آ گیا۔ جلدی جلدی کپڑے بیک میں ٹھونے۔ غسل کر کے جینز بدلی۔ بنیان پہن کر یاد آیا کہ قمیض پر توجہ نہیں ہوئی۔ بڑی سخت جھلاہٹ ہوئی۔ آخر بھی گاڑی لے کر آ چکا تھا۔ باری کو ایئر پورٹ پہنچا کر اس نے بابا کو بھی پا تھا۔ وہ شرٹ ہاتھ میں پکڑے پکڑے کمرے سے باہر آیا۔

”کلو“۔ اس نے آواز لگائی۔

”محترمہ کلو صاحبہ! ادھر ادھر کہیں پائی جاتی ہوں تو سامنے آ جائیں۔ سخت ضرورت ہے۔“ اس نے راہداری سے پرکھڑے ہو کر صدا لگائی۔

”وہ تو گیٹ پر کھڑی سبزی خرید رہی ہے۔ بہت تیزی میں ہو۔“ معاروشی سامنے آ گئی۔

وہ جینز اور بنیان میں خود کو اس کے سامنے پا کر قدرے جھل سا ہو گیا ”ایئر پورٹ پہنچنا ہے ویسے ہی سیٹ بڑی ملتی ہے۔“ وہ جانے کیوں نظریں چرا گیا۔

”جار ہے ہو؟“ اس کے دل کو کچھ ہوا۔

”جی۔“

”کلو آف کرنے جائے گی؟“ وہ مسکرائی۔

”ارے نہیں۔ یہ شرٹ بغیر استری کی ہے۔ میں تو خود ہی کر لیتا مگر یہاں تو کہیں آس پاس استری بھی نظر نہیں آتا۔“

”روٹی نے آگے بڑھ کر اس کے ہاتھ سے شرٹ لے لی اور ایک سمت بڑھ گئی۔ وہ اپنی جگہ پر کھڑا کا کھڑا ہوا۔“

کی واپسی کا انتظار کرنے لگا۔ اس خیال سے اوپر نہیں گیا کہ پھر اسے اوپر آنا پڑ جائے گا۔

پانچ منٹ بعد روٹی شرٹ ہاتھ میں لئے اسی جگہ واپس آئی۔

”ہو سکتا ہے جلدی میں اچھی نہ ہوئی ہو۔ بہر حال گزارا کر لو۔“ وہ اسے شرٹ تھما رہی تھی اور شیوہ جانے لگا۔

آ کر ان دونوں کے پاس سے بے نیازی سے گزر گئیں۔

”معنیو آ پا۔ یہ باری دریا بستی واپس جا رہا ہے۔ کوئی میسج دینا ہو تو دے دیں۔“

”نابالائتم میسج ہی دے رہی ہو۔ حویلی میں فون ہے۔ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ بلکہ کوئی میسج ہی نہیں ہے ہمارے پاس۔ ہاں مگر

تم ضرور دو۔“ وہ ان سے خاصے فاصلے پر رک کر اپنے مخصوص انداز میں گویا ہوئیں۔

”بلاوا آیا ہے یا ویسے ہی جارہے ہو؟“

”بلاوا ہے اصل میں کام ”سرائے“ میں ہے۔ دریا بستی سے تو میسج آیا ہے؟“ وہ بہت سنبھل کر ان سے مخاطب تھا۔

”مگر تمہاری ضرورت تو یہاں بھی بہت ہے۔“ معنی خیز انداز میں مسکرائیں۔

”کام کے بندے کی تو ہر جگہ ہی ضرورت رہتی ہے۔“ وہ زیادہ برداشت نہ کر سکی۔ تڑخ کر بولی۔

”ہاں بھئی۔ باری۔ کام کے تو تم بہت ہو۔“ وہ مسکرا کر آگے بڑھ گئیں۔

باری شرٹ پہن کر مٹن لگا رہا تھا۔ غور سے انہیں جاتا دیکھنے لگا۔

”ہر وقت ہی جلی بھنی رہتی ہیں۔“ روٹی کے ماتھے پر ہل پڑ گئے تھے۔

”مگر ہوش مند بھی بہت ہیں“ آنکھیں کھلی رکھتی ہیں۔ آپ کو احتیاط کرنا چاہیے۔ آپ کیلئے مسائل پیدا ہو سکتے ہیں۔“

”اور تمہارے لئے؟“ وہ تو یوں بھی خاصی بڑبڑاتی تھی۔

”میں تو خود ہی مسئلہ ہوں۔ میرے کوئی سنہرے رو خواب نہیں ہیں۔ آپ بس مجھے ایک کمپیوٹر فرض کر لیں۔“ اس نے

آگے کی سمت قدم بڑھائے۔

”جا کر فون ضرور کرنا۔“ اس نے تاکید کی۔

”وہ تو میں خان کو کروں گا ہی۔“

روٹی کی اٹانے اسے اگلی بات سے باز رکھا۔

”اور ہاں اگر خالہ دریا بستی ہوں تو فون پر میری ان سے بات ضرور کر دینا۔“

”بس؟“ وہ پھر آگے بڑھا۔

”ہاں بس۔“

”اور ہاں سنو۔“

”جی!“ وہ پھر رک گیا اور ریٹ وائچ پر نظر دوڑانے لگا۔

روٹی کو اس کی ریٹ وائچ سے سوتن کا سایہ تھا۔ ”تم تو خود ہی گھڑی ہو، کیوں گھڑی باندھے پھرتے ہو؟“

”آپ کچھ کہہ رہی تھی؟“

”جاؤ تم۔“ کچھ نہیں کہہ رہی۔ وہ جل کر بولی تھی۔ اور ڈرائیونگ روم کی طرف بڑھ گئی۔

وہ کم صم سے انداز میں ڈرائیونگ روم میں داخل ہوئی۔

وہاں سب بیٹھی بہت زور و شور سے بابا صاحب کے ایک شراکت دار کے ہاں ڈنر پر جانے کے پرہیز تھیں۔ پہننے جانے والے ملبوسات پر سخت بحث و مباحثہ ہو رہا تھا۔

روبی کا خیال تھا کہ لباس بہت جدید ہونا چاہیے کیونکہ وہ لوگ بہت زیادہ ایڈوانس ہیں اور پھر ہمیشہ سے کراچی شینو کو اس پر اختلاف تھا کہ ہم اور وہ ایک ہی کلاس سے تعلق رکھتے ہیں۔ لباس وغیرہ پر غور و فکر کرنے کی ضرورت ہے۔

تردید و تاخیر کا پر شور ماحول تھا۔

اس کی آمد پر قدرے خاموشی چھا گئی۔

”شینو نے بہت معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ اس کی سمت دیکھا تھا اور گاؤنگیہ کھسکا کر نیم دراز ہو گئی تھی۔

”آؤ روشی! تم تو نظر ہی نہیں آئیں۔ طبیعت کیسی ہے اب؟“ گلو نے اس کا ہاتھ تھام کر اپنے پہلو میں بٹھالیا۔

”اب تو انشاء اللہ اچھی ہو جائے گی۔ ارے ہاں یاد آیا۔ آج صبح صبح ایک بہت مزے کے گانوں کی کیسٹ ملی۔

سے۔ لتا اور مکیش کے دو گانے ہیں۔“ شینو نے کیسٹ پلیئر میں کیسٹ راونڈ کی اور ”پلے“..... پلش کر کے واپس لپٹا

آ کر دراز ہو گئیں۔ لتا اور مکیش کی آواز کمرے میں گونجنے لگی۔ والیوم خاصا اونچا تھا۔

(لتا)

بالی عمر یا بھجن کروں کیسے؟

چڑھتی جوانی جو گن بنوں کیسے؟

جھوٹا گرو کا دھن کروں کیسے؟

سادھو ہوں تیرا بھن بنوں کیسے؟

(مکیش)

روشی نے چونک کر شینو کی صورت دیکھی وہ آنکھیں موندے بہت معنی خیز انداز میں مسکرا رہی تھیں۔

”گانا تو مزے کا ہے کس قسم کا ہے“ منگوا کر دیکھیں گے۔“ روبی نے بہت دلچسپی لی۔

”تمہارے پیٹ نہیں بھرتا فلمیں دیکھ دیکھ کر؟“ زری ہنس دی۔

”ہاں نہیں اس کے ”دیدے“ ہیں یا مشین دو دو فلمیں اکٹھی دیکھ لیتی ہیں۔ میں تو ڈیڑھ گھنٹہ ٹی وی کے سامنے بیٹھا

تو سر دکھنے لگتا ہے۔ گلو نے بھی حصہ لیا۔

”گانا سنو بڑے مزے کا ہے“ سن رہی ہو روشی؟“ شینو بول پڑیں ”میں نے کیسٹ لگائی۔ تم لوگوں نے اپنی

پیاؤں شروع کر دی۔ ہے ناں مزے کا روشی؟“

روشی نے جیسے زچ ہو کر ان کی صورت دیکھی۔

”اگر آپ کے پاس میرے خلاف چارجز (Charges) اکٹھے ہو گئے ہیں تو بیچ چور ہے پر ہانڈی پھونڈنا

کس نے کیا ہے۔ بلیک میل ہونے والوں میں سے نہیں ہوں۔ اور نہ حلق پھاڑ کر یہ کہوں گی کہ آپ مجھے (الزام) لگاتے

ہیں۔“ روشی ایک میگزین اٹھا کر درصوبہ پر جا کر بیٹھ گئی۔

مگوا اور دوسری لڑکیاں حیرانی سے کبھی شینو کو اور کبھی روشی کو دیکھ رہی تھیں۔

”کوئی بات ہو گئی شینو؟“

گلو نے ترجم آمیز نظروں سے روشی کی طرف دیکھا۔ (ابھی تو بے چاری انجرجنجر ڈھیلے کروا کر گھر لوٹی ہے شینو تو کچھ ضرورت سے زیادہ بے رحم ہیں۔ ایک تو اس پر اس کی ماں کا سایہ نہیں۔ وہ پہلے ہی نہایت حساس ہے یہ نہ جانے کیوں اس پر چوٹیں کرتی رہتی ہیں)

”روشی“ انہوں نے نہایت محبت سے اسے پکارا۔

”جی آپ؟“

”چندا! تم اوپر جا کر آرام کر لو۔ شام سات بجے کے بعد ہی سمجھو جائیں گے سب۔ تم تھوڑی دیر کیلئے سو جاؤ۔ جاؤ

شاہش۔“

ان کے لہجے میں اتنی محبت اور حلاوت تھی کہ روشی ناچار اٹھ گئی۔ ”ٹھیک ہے“ یوں گلو کی مداخلت سے ماحول ایک دم پرسکون ہو گیا تھا۔

”شینو پلیز اس کے ساتھ اس انداز میں بات نہ کیا کرو۔ وہ تو بے چاری پہلے ہی دکھی ہے اور پھر بچی ہے۔“ گلو نے روشی کے باہر جاتے ہی شینو کو گھیرا۔

”نام ’نب‘ دولت سب کچھ تو ہے۔ پھر دکھ کس بات کا؟ ہونہہ تم تو ایمان سے ”پروپیگنڈا لابی“ ہو۔ گلو۔“ شینو نے منہ بنا کر جواباً گلو کی خبر لی۔

”تمہیں نہیں پتا شینو۔ ماں کے پیار سے محرومی بعض اوقات انسان کی ہستی کو ہلا کر رکھ دیتی ہے“ تو اس کائنات کا بنیادی حسن ہے۔ خدا کی اپنے بندے سے محبت کا لطیف سا اشارہ۔ یہ محرومی بہت بڑی محرومی ہے شینو۔ تمہیں احساس کرنا چاہیے۔“

”اچھا بابا“ کر لیں گے احساس۔ اب خدا کیلئے اپنی تقریر سمیٹو۔“

شینو نے ہاتھ جوڑ دیئے اور زری نے آگے بڑھ کر ٹیپ ریکارڈر کا سوئچ آف کر دیا۔

”اب تمہیں پیسے کے سوا کچھ نہیں سو جھتا۔ یہ دھیان نہیں آتا کہ بیٹی کیا سوچے گی۔ یہ بڑھوٹا ہے ماں باپ نے؟“ عورت نے اس کے تئیر دیکھ کر ذرا الجھ سنبھال کر بات کی۔

”اور جو کسی کنکال اور مقروض کے پلے باندھ دی تو بھی لوٹ یا یہی کہے گی۔ یہ ڈھونڈا ہے اور بس اب بات ختم کر۔ اگلے جیسے برات کروں گے۔ ہمیں کوئی تیاری نہیں کرنا۔ برادری کو روٹی کھانا ہے کھلا دیں گے اور کچھ نہیں ہوگا۔“

”ارے تاک کٹ جائے گی برادری میں۔ کچھ ہوش کی دوا کر۔“ عورت نے ماتھا پیٹ کر کہا۔

”کل سے کمانے نہیں جاؤں گا۔ ایک دھیلا تیرے ہاتھ پہ نہیں رکھوں گا اور جو تو نے روٹی دوا کی کی آواز لگائی تو تین

بولوں سے حرام کر لوں گا تجھے خود پر۔ اس نے چار پائی پر سیدھا لیٹتے ہوئے کہا اور آنکھوں پر بازو رکھ لیا۔
عورت تعجب سے اس کی طرف دیکھتی رہی۔

”جب بھوک مرنے لگے تو چلی جائیو برادری کے پاس کہ پالو ہمارے پیٹ۔ پھر دیکھوں گا کون کھلاتا ہے تجھے۔“
کون کیا ہوتا ہے تیری بیٹی؟“ وہ بڑبڑایا۔

”یہ تجربے تو اٹھائے بیٹھی ہوں۔ کون کھلاتا ہے کسی کو۔ سب اچھے وقتوں کے ساتھی ہوتے ہیں۔ ماں ہوئی۔ کچھ تھی۔ بیٹی کے دل کی خوشی سوچ رہی تھی۔ تم باپ ہو اس کے منتار ہو میں تمہیں سمجھا تو سکتی ہوں روک نہیں سکتی۔ کروا کر بارات۔ اللہ نصیب اچھے کر۔ خوشیاں دے۔“
نہ جانے کیوں وہ ہچکیوں سے رو پڑی۔
وہ ایک دم اٹھ کر بیٹھ گیا۔

”دیکھ بھگوان میں بھی باپ ہوں۔ دشمن نہیں ہوں اپنی لونڈیا کا۔ لال خان عمر کا ہے مگر صحت مند ہے۔ تو نے گھر نہیں دیکھا۔ چھ کمروں کا مکان ہے۔ دو منزلہ سامان سے بھرا ہوا۔ اللہ کی ہر نعمت موجود ہے چھوٹ جانے دے الہ ہر پستی غریبی سے لونڈیا کی جان۔ ہم کسی لالچ سے نہیں بیاہ رہے اپنی لونڈیا۔ اگر لالچ ہے تو بس اتنا کہ ہماری بیٹی سکھ دیکھے۔ عورت روتی رہی۔

”جب ماں گئی ہے رومت۔ دعا کر اللہ ہماری لونڈیا کو سکھ دے۔“
”بیٹیاں بیاہتے ہوئے تو مائیں روتی ہی ہیں۔ جسم کا کلر انوج کر کسی کو تھما نا ہنسی کھیل تو نہیں۔“ عورت آنکھیں پونپون ہوئے بولی۔

وہ چپ رہا۔ بہت سی باتیں ایسی ہوتی ہیں جن کا کوئی جواب نہیں ہوتا۔
وہ اٹھ کر اورچی خانے کی طرف آگئی۔ بالو دوپہر کے کھانے کے اور شام کی چائے کے برتن اکٹھے کئے بہت تندی سے مٹھنے میں مصروف تھی۔

”اماں! قیہ میں آلو ڈالوں یا مٹر؟“ اس نے ماں کو موجود پا کر لگے ہاتھوں اپنا مسئلہ حل کرنا چاہا۔
”مٹر ڈال دیجیو تیرے باپ کو اچھے لگتے ہیں۔“ وہ غائب دماغی کے عالم سے چونک کر باہر آئی۔
”ابا! آج جلدی آگئے۔“

”جلدی کام ختم ہو گیا ہوگا“ میں تو تجھے یہ کہنے آئی تھی کہ جو بغیر سِلے کپڑے ہیں ان میں سے چار پانچ جوڑے سی لپی۔
تین دن میں پھر دوپٹوں پر گونٹا لپکا بھی لگاتا ہے۔“
”کیوں اماں؟“ بالو کے متحرک ہاتھ ساکن ہو گئے۔

”تیرا نکاح کر رہا ہے تیرا باپ اگلے جمعے۔“
”تیسری دنیا“ کی تیسرے درجے کی لڑکی ہزار چاہنے پر بھی نہ پوچھ سکی کہ وہ میرا ”نصف“ کون ہے؟ کون ہے جوئے

کھل کرنے آ رہا ہے۔ کہیں یوں نہ ہو پورا ہونے کے آسرے میں آدھی سے بھی جاؤں۔ چند لمحے ساکت و صامت رہنے

کے بعد وہ بھراپنے کام میں لگ گئی۔
”ہمیں کوئی خاص تیاری نہیں کرنی۔ بس برادری اور بارات کو روٹی کھلانی ہے۔ پیسے والا آدمی ہے ہر چیز کو منع کر دیا ہے

اس نے۔“
وہ ایک بار پھر ساکت ہو گئی۔
”پیسے والا اس کا ہمارے دروازے پر کیا کام؟ پتا نہیں کیسا ہے۔ ہائے اتنا تو ہو کہ سکھیوں میں عزت رہ جائے۔“
چاچا قاسم کی سیکڑ کا دو لہا ذرا سا موٹا تھا۔ ساری سہیلیاں کتنا تک کرتی تھی سیکڑ کو۔
”اور دیکھ روٹیاں ذرا دیکھ کر پکاؤ۔ رات بہت بچی تھیں۔ رزق ضائع نہیں کرتے۔ اللہ کو برا لگتا ہے۔“ اس نے باہر نکلے ہوئے مزید ہدایت دی۔

”اچھا اماں! وہ اپنے دھیان سے چونک کر بولی تھی۔“

اس نے وال کلاک کی سمت نظر اٹھائی۔ چھ بج رہے تھے۔
ایک عجیب سی کوفت اس کے رگ و پے میں اتر گئی۔ یا الہی کس طرح سزا مل رہی ہے؟ وہ برآمدے میں پڑی کرسی پر گرنے کے انداز میں بیٹھ گئی۔ اسی دم پورنیکو میں جیب داخل ہوئی اس نے ایک گہرا سانس لیا۔ ٹھنکس گاڈ۔“
یاد دل خان جیب سے اتر کر سیدھے اس کی طرف بڑھے۔

”تیار ہیں آپ؟“ انہوں نے اس کے سر اپنے پر نظر ڈالی۔ پر پل کرتے شلوار اور دوپٹے میں ملبوس بہت تروتازہ سی محسوس ہوئی۔ دائیں کلائی میں بہت ساری میچنگ کی چوڑیاں پہنی ہوئی تھی۔ اور بائیں کلائی میں گولڈ کی دیکتی ہوئی ریٹ

یاد دل خان نے ایک اچھتی نگاہ میں اس کا جائزہ لے لیا۔
”بہت دیر سے تیار ہوں۔ مگر اتنی بے حس بھی نہیں ہوں کہ آپ کو چائے یا کھانے کی مہلت نہ دوں۔ آپ اطمینان سے

بات چلیں اور کھانا کھائیں۔“ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔
”کھانا تو میں کھا چکا ہوں۔ البتہ باتھ لینے کی تجویز اچھی ہے۔ فریش ہو جاؤں گا۔“
”شیر خان!“ انہوں نے ملازم کو آواز دی۔
وہ فوراً موجود ہوا۔

”جلدی سے ایک شلوار سوٹ تیار کر دو۔ میں بہت ریلیکس ہو کر سیر کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے زیادہ دیر نہیں لگے گی۔“ وہ

معدرت خواہانہ انداز میں سرکرا کر اندر بڑھ گئے۔
وہ دوبارہ کرسی پر بیٹھ گئی۔

انہیں باہر آنے میں واقعی چند منٹ سے زیادہ نہیں لگے۔

وہ جیب ایک شفاف سڑک پر لے آئے۔

”پہلے ہم ٹی ایڈیٹی کالونی چلیں گے۔ وہاں ایک دوست سے ضروری کام ہے۔ بہت خوبصورت پر شاندار مناظر ہیں۔ مجھے یقین ہے آپ لطف اندوز ہوں گی۔“ انہوں نے بہت مہارت سے اسٹیرنگ سے ہاتھ نہ سلگائی۔

”میں بہت گلی فیل کر رہی ہوں۔“ اس نے قدرے جھل ہو کر کہا۔

”ارے مگر وہ کیوں؟“ انہوں نے حیرانی کے تاثرات نہیں دیے۔ صرف سپاٹ انداز میں پوچھا۔

”آپ اتنے ذمہ دار اور مصروف آدمی ہیں۔ حقیقتاً میں نے ڈسٹرب کیا ہے آپ کو۔ بہت ساری ٹارگیٹس ہیں۔ خواہ مخواہ۔“ وہ دھیرے سے ہنس دی۔

”ایسی کوئی بات نہیں۔ میں آل ریڈی ڈسٹرب آدمی ہوں۔“ انہوں نے بہت سادہ سے انداز میں جواب دیا۔

”جی! وہ بھونچکا سی رہ گئی۔“ لگتے تو نہیں ہیں۔“ اس کے منہ سے نکل گیا۔

”لگنے اور ہونے میں اچھا خاصا فرق ہوتا ہے۔“ انہوں نے سگریٹ منہ سے نکالے بڑی اچھی آواز سے کہا۔

”ہاں ظاہر ہے۔“ بھونچھی بیوی سے دوری وہ بھی ہمیشہ کی دوری کوئی چھوٹی بات تو نہیں۔ بھونچھی بیوی کی

نصیب ہوتی ہے۔ اور پھر اتنی شاندار رفیقہ حیات مل کے پھڑ جائے یہ تو قسمت کا ستم ہی ہے۔“ اس نے افسردگی سے یاور علی خان خاموش رہے۔

”دریا بستی آنے کے بعد میں تو بہت الجھ گئی ہوں۔“ وہ بولی۔

”مگر کیوں؟ کوئی کوتاہی ہو گئی ہم سے؟ یاور علی خان نے پھر ایک سرسری نظر اس پر ڈالی۔

”نہیں۔“ یہ بات نہیں۔ آپ سب نے تو سمجھیں حق میزبانی ادا کر دیا۔“ وہ شرمندہ سی ہو کر بولی۔

”روٹی واپس آ جائے گی۔ ڈزن میٹر۔“ انہوں نے سگریٹ منہ سے نکال کر ہاتھ سے دوبارہ اسٹیرنگ پر قابو

”یہ بات بھی نہیں۔“ وہ بولی۔

یاور علی خان خاموش رہے مگر ان کی خاموشی کا سوالیہ پن صاف محسوس ہو رہا تھا۔

”میری الجھن یہ ہے کہ دریا بستی کا ماحول مجھے بہت پراسرار اور گھٹا ہوا محسوس ہوا۔“ بھونچو تو بہت پروردگار

ایڈجسٹ منٹ میں بہت مسئلہ ہوا ہو گا جب کہ پتا کہتے ہیں کہ وہ حویلی میں بہت خوش تھیں۔ کراچی میں تو ان کو

لگتا تھا۔ ایک ہفتہ بھی مشکل سے رہتی تھیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ حویلی میں ان کیلئے کیا اٹرکیشن تھی؟“ وہ

گھر کر بولے جا رہی تھی۔

یاور علی خان بدستور خاموش تھے۔

ماہین نے چہرہ میڈ کر ان کی سمت دیکھا۔ گرے شلوار سوٹ میں ملبوس آنکھوں پر مخصوص گلاس چڑھائے

موچوں کے ساتھ وہ بہت متاثر کر رہے تھے۔

”حویلی میں میرا خیال ہے ان کی ساری دلچسپی آپ کی وجہ سے تھی۔ وہ محض آپ کی وجہ سے کراچی میں نہیں نکلتی تھیں۔“

وہ مسکرا کر شرارت سے گویا ہوئی۔

”اور تو حویلی میں کوئی خاص بات نہیں۔“ وہ کھلکھلا پڑی۔

”آپ کچھ بول نہیں رہے؟“ معاوہ چونک کر پوچھنے لگی۔

”آپ خود ہی سوال اور خود ہی جواب کے نہایت دلچسپ عمل سے گزر رہی ہیں۔ میں اٹینشن ہوں۔ آپ فکر نہ کریں۔“

انہوں نے بہت سکون سے ایک موڑ کاٹا۔

”شرمندہ کر رہے ہیں؟“ وہ مسکرائی۔

”یہ کام نہیں کرتا۔“ وہ اپنے مخصوص انداز میں لحظہ بھر کو مسکرائے۔

”ہاں تو میں کہہ رہی تھی کہ آپ نے ہماری بجو پر اپنی ذات کا ظلم بھوک دیا تھا۔ انہیں آپ کے سوا کچھ سوچتا ہی نہیں

ہو گا۔ خیر لگی تو وہ بھی بہت تھیں کہ انہیں آپ جیسا شریک سفر ملا تھا جس کی وفا کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ان کے

بعد آپ نے دوسری شادی نہیں کی حالانکہ آپ کی طرح کے لینڈ لارڈ تو بیک وقت کئی بیویاں رکھتے ہیں۔“

”آج آپ صرف مرنے والوں کو ہی یاد کریں گی؟“ انہوں نے عجیب سے انداز میں پوچھا۔

”جی۔“ وہ چونک کر ان کی صورت دیکھنے لگی۔

”آپ کو اچھا نہیں لگتا کہ کوئی بھوک کی بات کرے۔“ وہ ابھی تک حیرت کے عالم میں تھی۔

”اچھا یہ بتائیں، شام کے اس سے بیک گراؤنڈ میں نظر آنے والے پہاڑ کیسے لگ رہے ہیں۔“ انہوں نے قریب الختم

سگریٹ منہ میں دبا کر گہرا کش لیا۔

”اس طرف تو میرا دھیان ہی نہیں گیا۔“ اس کے لہجے میں اب افسردگی کا تاثر تھا۔

”آئس کریم کھا بیٹگی؟“ ایک شاپ کے نزدیک انہوں نے جیب آہستہ کی۔

”چلیں کھا لیتے ہیں۔ کچھ تو کرنا چاہیے۔“ اس کا موڈ عجیب سا ہو گیا تھا۔

فون کی بیل بہت دیر سے ہو رہی تھی ابھی تو سورج بھی نہیں لگھا تھا۔

دو لان کی طرف جانے کے ارادے سے کمرے سے باہر آئی تھی۔ ظاہر ہے۔ اتنی صبح کا فون بابا صاحب کیلئے ہی ہو گا۔

وہ آگے بڑھتے ہوئے سوچ رہی تھی۔

”پھر ایک دم چونک پڑی۔“ بابا صاحب کا فون“ ہائیں یہ تو“ دریا بستی“ سے بھی ہو سکتا ہے اور یقیناً“ اس“ کا ہو سکتا

ہے۔ وہ سر ہنٹ دوڑتی ہوئی بابا صاحب کے کمرے میں آئی اسے یقین تھا کہ بابا صاحب ہاتھ روم یا لان میں ہوں گے جب

عی تو ابھی تک ریسپونڈ نہیں اٹھایا۔ وہ سب تو بے سدھ سو رہی تھیں۔ جاگتی ہوئی بھی ہوتیں تو فون سننے کیلئے کبھی نہ ہلتیں۔

اس نے گردن موڑ کر بابا صاحب کی طرف دیکھا۔ پھر آہستگی سے ریسور کر یڈل پر رکھ دیا۔ دلاور علی خان نے ایک لمحے کو اس کی جانب دیکھا پھر بنا کچھ کہے کمرے سے باہر چلے گئے۔

سارا محلہ لال خان کی دلہن دیکھنے کیلئے جملہ عروسی پر حملہ آور تھا۔ بالو کو اس قدر جس اور ٹھٹھن کا احساس تھا۔ لگتا تھا تھوڑی دیر ان عورتوں میں مزید گھری رہی تو بے ہوش ہو جائے گی۔ بھاری بھر کم عروسی جوڑا۔ مختلف سائزوں اور وزن کے چار پانچ سونے کے سیٹ۔ پھولوں کے زیور علیحدہ۔ فوم کا گدا فوم کا نکیہ اور چاروں طرف عورتیں اور بچے۔ وہ بے دم سی ہو کر تکیے پر ڈھسے گئی۔

”دلہن بے ہوش ہو گئی۔ دلہن بے ہوش ہو گئی۔“ ایک چیخ پکار مچ گئی۔
”چلو ہمیں سب باہر نکلو۔ جلدی۔“ لال خان کی ایک رشتہ دار سب کو باہر نکالنے لگی۔
”دیکھنے میں تو ہے ہی نازک۔ مزاج بھی نازک لگتا ہے۔“ ایک بڑی بی نے تنقیدی حملہ کیا۔
چند منوں میں ہی کمر خالی ہو گیا۔

بے ہوشی کا ”اعلان“ باہر تک سنا گیا۔ لال خان نے فوراً سے میسٹر سیون اپ کی بوتل اندر بھجوائی۔
”تقریباً آدھے گھنٹے بعد اس کے اوسان بحال ہوئے لال خان کی ایک اور رشتہ دار نے اس کا میک اپ ٹھیک کرنا شروع کر دیا تھا۔

”ہلو ہمیں۔ ذرا راستہ دو۔ دولہا بھائی اپنی بھانج کی منہ دکھائی کرنے آ رہے ہیں۔“ ایک عورت کی منحنی سی آواز باہر سے آئی۔

”ہاں بھی آگئے ہم بہت دیر سے انتظار کر رہے ہیں۔“ کمرے میں عارف کی آواز ابھری۔ لال خان بھی ساتھ تھا۔
”لال خان! ہم تمہیں مبارکباد دیں یا تم ہمیں دو گے؟“ وہ شوخی سے پوچھ رہا تھا۔
”اچھا سرکار! ساری محنت آپ کی ہے۔“ لال خان تو سرتاپا نہال تھا۔
”بس یہی ہے ہماری مبارکباد۔ لو اب ہم تمہیں دیتے ہیں۔“

کسی کو گھر سے نکلتے ہی مل گئی منزل

کوئی ہماری طرح عمر بھر سفر میں رہا

”بہت بہت مبارک ہو تمہیں۔“

بالو کی آنکھیں بند تھیں۔ مگر شعر پڑھنے والے کو اس نے چونک کر دیکھا۔ پٹ سے آنکھیں کھل گئی تھیں۔ ”یہ ہماری طرف سے حقیر سا تحفہ ہے بھائی۔“ اس نے انگوٹھی ذبیہ سمیت اس کی سمت بڑھائی۔
”شادی مبارک ہو۔ یہ ہمارا یاد دہانی کا بھی سیٹھ ہے اور دل کا بھی سیٹھ ہے۔ امید ہے آپ کو بہت خوش رکھے گا۔“

بالو کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ وہ کوشش کے باوجود ”سیٹھ“ کی طرف نہ دیکھ سکی۔

اس نے اندر آ کر ادھر ادھر دیکھے بغیر ریسور تقریباً جھپٹ کر اٹھایا۔
”ہیلو۔“

”جھینکس گاڈ۔“ ادھر واقعی باری تھا۔

جسم و جاں میں ایک سرخوشی کی لہر دوڑ گئی۔ ”روشنی بات کر رہی ہوں ہوں۔ پہنچ گئے تم ٹھیک ٹھاک؟“
”ظاہر ہے عالم بالا سے تو فون کرنے سے رہا۔ خان کو ریسور دیجئے۔“

”بابا صاحب تو آس پاس کہیں نظر نہیں آ رہے۔ میسج دیدو۔ میں پہنچا دوں گی۔“ اس نے منہ بنا کر کہا۔
”آپ ذرا ادھر ادھر دیکھ لیجئے۔ مجھے انہی سے بات کرنا ہے۔ میسج سے کام نہیں چلے گا۔“ ادھر سے جواب آیا۔
”خالہ ہیں ابھی حویلی میں؟“ اس نے سنی ان سنی کر کے اپنا سوال کیا۔

”نہیں۔ وہ یاور چچا کے ساتھ ہری پور گئی ہیں۔“ اس نے غلت بھرے انداز میں جواب دیا جیسے جان چھڑا رہا ہو۔
”وہ مجھے کراچی فون بھی تو کر سکتی تھیں۔“ اس نے خفگی سے کہا۔

”وہ جو کچھ کر سکتی تھیں یا کر سکتی ہیں۔ خود ہی بتا سکتی ہیں۔ میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ آپ پلیز خان کو فون دیجئے۔“
پھر لگا بندھا جواب آیا۔

”کیا خان خان کئے جارہے ہو؟ میں جو بات کر رہی ہوں۔“ وہ بھڑک کر بولی۔

”میں نے اس وقت کام کے سلسلے میں فون کیا ہے۔ مجھے خان سے بہت ضروری بات کرنا ہے۔“ وہ جیسے زنا
”وہ گھر ہی میں کہیں ہوں گے دیکھ لیجئے پلیز۔“ وہ جیسے عاجز آ گیا تھا۔

”اچھا دیکھتی ہوں مگر مجھ سے بات کئے بغیر ریسور نہ رکھتا؟“

”سن لیا۔ نہیں رکھوں گا۔ بس آپ ذرا جلدی کریں۔“ غالباً دوسری طرف اس نے سر پیٹ لیا تھا۔

وہ باتھ روم کا دروازہ چیک کر کے دوڑتی ہوئی لان میں آئی۔ بابا صاحب بیچ پر بیٹھے اخبار پڑھ رہے تھے۔
”بابا صاحب! آپ کا فون ہے حویلی سے۔“ اس نے پھولی ہوئی سانس پر قابو پا کر کہا۔

”ہاں۔ بول رہا ہوں۔“ بابا صاحب نے ریسور اٹھا لیا تھا۔ ”والسلام۔“

”ٹھیک ہے۔ گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اسے کہو کچھ نہیں ہوگا۔“

”ہم کہہ رہے ہیں ناں۔ ہم خود وہاں پہنچیں گے۔“

”ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔ ٹیپو کی طبیعت اب کیسی ہے؟ سرائے پہنچ کر ہمیں فوراً اس کی خبریت سے مطلع کرنا۔“
اور کوئی خاص بات نہیں۔“

”بابا صاحب! ریسور مجھے دیجئے گا۔ ایک ضروری بات کرنا ہے۔“ وہ ان کے سر پر سوار تھی۔

انہوں نے ریسور اسے تھما دیا۔

”ہیلو۔“ دوسری طرف سے باری بول رہا تھا۔

”لال خان بھابی بہت نازک سی ہیں۔ بہت خیال رکھنا ہوگا۔ اچھا اب ہم چلیں گے۔“

”اب دیکھیں کہ بھابی کے آنے کے بعد تم ہمیں کس طرح دستیاب ہوا کرو گے۔ اب دیکھیں گے کہ ہر انداز۔“

”پانی“ اس کے حلق میں جیسے کانٹے پڑ گئے تھے۔

لال خان نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا۔ دور میز پر گھوکوز ملا پانی رکھا ہوا تھا۔ اس نے لپک کر گلاس اٹھایا اور تیزی سے اس کے قریب آیا اور بہت آرام اور احتیاط سے اسے سہارا دے کر گلاس ہونٹوں سے لگا دیا۔

دو ایک سانس میں چہا گئی۔ قدرے سکون کا احساس ہوا تو سنبھل کر بیٹھ گئی۔ بلکہ لال خان سے ذرا پرے ہو گئی۔ ابھی پانی پیچے ہوئے وہ لال خان کے بازو کے گھیرے میں تھی۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے یہ بازو کا حلقہ نہ ہو۔ دوزخ کی آگ میں تپا ہوا طوق ہو۔

لال خان کو ”جیا“ کا یہ انداز مزید بے خود کر گیا۔

”راہی ہو تم اس گھر کی۔۔۔۔۔ نہ ساس نہ سسر۔۔۔۔۔ ہم پانچ بھائی ہیں۔ سب کا اپنا اپنا کاروبار۔۔۔۔۔ اپنا اپنا گھر۔۔۔۔۔ سیاہ سفید کی باتیں ہو تم۔ جو جی چاہے کرو۔ جیسے چاہے رہو۔ اپنی طرف سے اجازت ہے۔ ہم تو بس چاہیں گے کہ تم خوش رہو۔“

یاد دلہا تھا۔ چونچلے کر رہا تھا۔

”خوش؟“ اس نے پہلی بار نظر اٹھا کر لال خان کی سمت دیکھا۔

پانچس اب خوشی کس رنگ میں آئے گی۔ میں اسے پہچانوں گی بھی یا نہیں۔ یا ایک سوالی کی طرح پتھرائی آنکھوں سے بہت شاندار اور قیمتی فرنیچر تھا۔ اس نے تو کبھی اتنے قیمتی بستر پر بیٹھنے کا خواب بھی نہ دیکھا تھا۔ نیکل لپٹا خوشی کا راستہ دیکھا کروں گی۔

کرتے گلدانوں سے آراستہ۔ کھڑکیوں اور دروازوں پر لٹشی پردے کمرے کی سجاوٹ میں اضافہ کر رہے تھے۔

اور گلابوں سے بچی بیج۔ جن کی مہک اس کے اپنے وجود سے اٹھنے والی خوشبوؤں سے ہم آہنگ ہو کر ایک عجیب سا ماحول

رہی تھی۔

”معاوہ بری طرح چوک پڑی سامنے کارنس پر لال خان کی بڑی سی تصویر رکھی تھی۔

سفید شلوار قمیض اور واسٹ پہنے موچھوں کو تاؤ دیئے۔ وہ شاید کسی متوقع کامیابی پر مسکرا رہا تھا۔ اس کا دل جیسے کہ اس نے تنگ آ کر طلاق دیدی اور کویت چلا گیا۔ سات سال وہاں لگائے۔ پھر ملک واپس آ گیا۔ یوں تو شادی میں کوئی

بلاؤٹ نہیں تھی۔ بڑے رشتے دیکھے۔ دراصل قسمت میں تو تم نکھی تھی۔ اس لئے دیر ہو رہی تھی۔ ہر کام کا کوئی وقت مقرر ہے۔

لڑ بھئی بڑی اچھی قسمت ہے ہماری۔ سب تعریف کر رہے ہیں ہماری دلہن کی۔“

اب دلہن کو بھلانے کا مرحلہ آ رہا تھا جو لحاتی قرب کے بعد دور جانیٹھی تھی۔

”بھئی! تم تو سسر سے ہمہ تنک تمہارے ہیں۔ اتنی دور کیوں ہو گئی ہو۔“ لال خان گاؤٹھکے سے لپک کر آرام سے بیٹھ گیا۔

ایک ہاتھ اس کی طرف بڑھایا۔

وہ ایک رومان پرور لڑکی تھی جو اپنے خوابوں میں بہت آسودہ رہتی ہے بجائے ایک ناپسندیدہ قرب کے۔ وہ مزید دور

سک گئی۔ بلا ارادہ۔ تاراستہ۔

اس کا کام اب بھر رہا تھا۔ اس خیال ہی سے اسے غشی آ رہی تھی کہ وہ اس کے قریب آئے گا۔

”میں تنگ مٹی ہوں۔ سونا چاہتی ہوں۔“ وہ کاہنتی آواز میں بمشکل گویا ہوئی۔

ہر اک چیز بدل جاتی ہے عشق کا موسم آتے ہی

راتیں پاگل کر دیتی ہیں دن دیوانے ہو جاتے ہیں

”اچھا بھئی۔ شب بخیر“ خدا حافظ۔ بالو کی نگاہ بے اختیار اٹھ گئی تھی۔

لبا۔۔۔۔۔ انتہائی دبلا۔۔۔۔۔ داڑھی چھوٹی تھی یا کئی روز سے شیونہیں بنا کی تھی۔ صارف رنگ شاید کبھی گورا ہوگا۔۔۔۔۔ کی سی چال۔

نہ جانے کس کا بچہ رویا۔ اس نے چوک کر آنکھیں جھکا لیں۔

اس کے جاتے ہی جانے کس کے کہنے پر کمرہ خالی کر دیا گیا۔ تب اس نے ایک گہرا طمانیت بھرا سانس لیا اور

نظر دوڑانے لگی۔

بہت شاندار اور قیمتی فرنیچر تھا۔ اس نے تو کبھی اتنے قیمتی بستر پر بیٹھنے کا خواب بھی نہ دیکھا تھا۔ نیکل لپٹا خوشی کا راستہ دیکھا کروں گی۔

کرتے گلدانوں سے آراستہ۔ کھڑکیوں اور دروازوں پر لٹشی پردے کمرے کی سجاوٹ میں اضافہ کر رہے تھے۔

اور گلابوں سے بچی بیج۔ جن کی مہک اس کے اپنے وجود سے اٹھنے والی خوشبوؤں سے ہم آہنگ ہو کر ایک عجیب سا ماحول

رہی تھی۔

”معاوہ بری طرح چوک پڑی سامنے کارنس پر لال خان کی بڑی سی تصویر رکھی تھی۔

سفید شلوار قمیض اور واسٹ پہنے موچھوں کو تاؤ دیئے۔ وہ شاید کسی متوقع کامیابی پر مسکرا رہا تھا۔ اس کا دل جیسے کہ اس نے تنگ آ کر طلاق دیدی اور کویت چلا گیا۔ سات سال وہاں لگائے۔ پھر ملک واپس آ گیا۔ یوں تو شادی میں کوئی

بلاؤٹ نہیں تھی۔ بڑے رشتے دیکھے۔ دراصل قسمت میں تو تم نکھی تھی۔ اس لئے دیر ہو رہی تھی۔ ہر کام کا کوئی وقت مقرر ہے۔

لڑ بھئی بڑی اچھی قسمت ہے ہماری۔ سب تعریف کر رہے ہیں ہماری دلہن کی۔“

اب دلہن کو بھلانے کا مرحلہ آ رہا تھا جو لحاتی قرب کے بعد دور جانیٹھی تھی۔

”بھئی! تم تو سسر سے ہمہ تنک تمہارے ہیں۔ اتنی دور کیوں ہو گئی ہو۔“ لال خان گاؤٹھکے سے لپک کر آرام سے بیٹھ گیا۔

ایک ہاتھ اس کی طرف بڑھایا۔

وہ ایک رومان پرور لڑکی تھی جو اپنے خوابوں میں بہت آسودہ رہتی ہے بجائے ایک ناپسندیدہ قرب کے۔ وہ مزید دور

سک گئی۔ بلا ارادہ۔ تاراستہ۔

اس کا کام اب بھر رہا تھا۔ اس خیال ہی سے اسے غشی آ رہی تھی کہ وہ اس کے قریب آئے گا۔

”میں تنگ مٹی ہوں۔ سونا چاہتی ہوں۔“ وہ کاہنتی آواز میں بمشکل گویا ہوئی۔

آبلہ پانی کا ہولناک سفر درپیش دیکھ کر اس کے حواس گم ہو گئے۔

اس نے چکرانے ہوئے سر کو سنبھال کر اس پاس نظر ڈال کر پانی تلاش کیا۔

لال خان نے فوراً شوق سے ڈولتے ہوئے قدم اندر رکھے۔

”ہا ہا ہا“۔ لال خان کا بلند قہقہہ بے ساختہ تھا۔

”بہت کم عمر ہو۔ بہت نادان ہو۔ ارے ابھی ساری جھکن اتر جائے گی۔“

بالو کو اس کے والہانہ انداز پر چکر آنے لگے۔

”میں روپڑوں کی“۔ اس کی آواز بھرا گئی۔ گویا یہ دھمکی تھی۔

”اور پھر ساری عمر ہنسی بھی تو“۔ لال خان کھائی سے گھڑی اتار کر سائیڈ ٹیبل پر رکھتے ہوئے بولا۔

یا الہی۔ ایک تو عورت بناتا ہے۔ پھر اسے ششے کا دل دیتا ہے۔ اور پھر اسے ”لال خان“ دیتا ہے۔

چہرہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھی۔

روبی ہاتھ میں آئینہ پکڑے آئی برو بتا رہی تھی۔ زری کے بالوں میں رد لر گئے تھے۔ مونا کپڑوں کا انتخاب کر کے بڑی

عجلت میں گلو سے پاس کرانے کے ارادے سے لاؤنج میں داخل ہوئی تھی۔

”ہیو ایک کونے میں بیٹھی“ کلاسوٹ پہن لوں؟ کلاسوٹ پہن لوں؟ کی گردان کر رہی تھی۔

”پرل ٹاپس“ کم ہو گئے تھے وہ ایک ایک سے پوچھتی پھر رہی تھی۔

”یہ“ ”پرل ٹاپس“ کم ہو گئے تھے وہ ایک ایک سے پوچھتی پھر رہی تھی۔

لالی ایک تذبذب کے عالم میں سوٹ لئے بیٹھی تھی۔ جو بھی فارغ دکھائی دیتا اسی کے پاس جا کھڑی ہوتی یہ پوچھنے کیلئے

کہ روپے کا رنگ تیز تو نہیں ہے۔ چل جائے گا؟ اور تو نہیں لگے گا؟

مریم کو استری کرتے ہوئے شرٹ پر نیل پالش کا نشان نظر آ گیا تھا اب وہ یہ پوچھتی پھر رہی تھی۔ یہ چھوٹ بھی جائے گا؟

اور یہ بھی کس طرح؟

پورے لاؤنج میں اگر کوئی پرسکون تھا تو وہ گلو تھیں۔ وہ تیر کی طرح انہی کے پاس پہنچی۔

”ہیو نے سر اٹھا کر روشنی کی سمت دیکھا۔“

”ارے بھی گلو..... اس کا پہلا مصرعہ کیا ہے۔“

اڑنے بھی نہ پائے تھے کہ گرفتار ہوئے

”ارے چھوڑیں آپا۔ یہ بے وقت کی راگنی۔“ مریم نیل پالش کے دھبے والی شرٹ لئے انتہائی غم ناک پوزیشن میں

تھی۔ ایک دم تک کر بولی تھی۔

”ارے کیوں غم میں دہلی ہوئی جا رہی ہو حنا کے پاس بھی تو ایسا سوٹ ہے۔ اس کی شرٹ لے لو اگر قسم کھا بیٹھی ہو کہ یہی

سوٹ پہننا ہے۔“ ”ہیو اس سے زیادہ تک کر بولیں۔“

”ہائے اللہ! یہ شیشو بڑا خراب ہے سارے بالوں کی لٹیں بن گئیں۔“ تانیہ دہائی دیتی ہوئی لاؤنج میں داخل ہوئی۔ اس

کی غل دیکھ کر سب اپنی فکریں بھول گئیں۔ وہ قہقہے شروع ہوئے کہ بس۔

”کس سلسلے میں آخر یہ قیامت برپا ہے؟“ روشنی اب زیادہ برداشت نہ کر سکی۔ سمجھ تو خیر وہ گئی تھی۔ مگر ایک خود فریبی کا بھی

”مارجن“ ہوتا ہے ہر انسان کے اندر۔

”لو بھی دو لہا باراتیوں کا پوچھ رہا ہے۔ آپ کیوں آئے ہیں۔“ روبی کوئی نئی باتیں گھڑنا خوب آتیں تھیں۔

لاؤنج میں ایک مرتبہ پھر مشترکہ قہقہہ گونجا تھا۔ وہ نکوسی بن کر انہیں دیکھنے لگی۔

”تم نے اپنے کپڑے وغیرہ تیار نہیں کئے؟ گلو نہ جانے کیوں آج کم صم ہی تھیں۔“

”اب کہاں جاتا ہے؟“ وہ انجان بن کر پوچھنے لگی۔ ”دریا بستی سے اٹھتے ہیں تو کراچی میں گرتے ہیں۔ آگے تو اب

سمندر ہے۔“ اس کی خود اعتمادی آنا فانا بحال ہو گئی تھی۔ وہ اطمینان سے کشن کھسکا کر کارپٹ پر بیٹھ گئی۔

روبی نے سب سے زیادہ اس کی اس بات سے حظ اٹھایا تھا۔ خوب لوٹ پوٹ ہو رہی تھی۔ ”مان گئے روشنی کیا جواب

ازل ہوتے ہیں تم۔“

”آج تو کچن سے خوشبوؤں کا طوفان باہر آرہا ہے۔ کیا ہمارے نئے جنم کا جشن منایا جا رہا ہے۔“

داخل ہو کر گہرے گہرے سانس لئے اور ایک کباب اٹھا کر ٹوٹنے لگی۔

”بڑے ابا پہنچ رہے ہیں آج شام چھ بجے۔“ گلو نے اطلاع بہم پہنچائی۔

”ہائیں..... اچھا..... یعنی حویلی کے سب باشندے قسطوں میں کراچی آرہے ہیں۔“ وہ مزے لے

رہی تھی۔

”سب ٹھنڈے ہو جائیں گے۔ انہیں پہلی فرصت میں اوون پہنچا دو۔“ روشنی کو اچانک سکھڑا پاسو جھ گیا۔

”ابھی رکھ رہی ہوں۔ تھوڑے سے باقی رہ گئے ہیں۔“ وہ کڑھائی میں کباب الٹ پلٹ کر رہی تھی۔

”کلو۔“

”جی بی بی۔“

”یہ بڑے ابا کیوں آرہے ہیں؟“

”مجھے کیا پتا بی بی۔ ان کا گھر ہے سو بار آئیں گے۔“

”تو گویا بڑے ابا کی دعوت ہو رہی ہے۔“

”دعوت تو دوسروں کی ہے آپ کو نہیں پتا؟ فاطمہ بتا رہی تھی وہ جو اس دن نہیں آئے تھے مولے سے جی

سما ہے۔ جب آپ اسپتال سے آئی تھیں خان بھی یہیں تھے۔“ (اس کا اشارہ باری کی طرف تھا)

روشنی کا ہاتھ منہ کی طرف جاتے جاتے رہ گیا ”علیم الدین؟“

”جی نام مجھے پتا نہیں۔ ویسے خان (باری) بتا رہے تھے کہ ہمارے گاؤں ہی کے ہیں۔“

”پر جی وہ تو سالوں سے شہر میں ہیں۔ جب وہ گاؤں میں ہوں گے تو میں چھوٹی سی ہوں گی۔“

”ابھی تو گئے تھے دعوت کھا کر۔ اتنی جلدی پھر آرہے ہیں۔“ اب سمجھ میں آیا کہ ”بڑے ابا“ کیوں

نے ہاتھ کلو کے اپرن سے پونچھے اور تقریباً پاؤں ٹانگیں لاؤنج سے باہر آئی۔

”اچھا اب تم بعد میں ٹائیس پھیلا کر بیٹھنا۔ جا کر نہاؤ دھوؤ۔ اچھے سے کپڑے بدللو۔ بڑے ماموں بھی ہیں۔“ زری نے اسے حالت اطمینان میں پا کر ”ذرا“ چابی بھرنے کی کوشش کی۔

”لیڈی آف دی ایننگ“ کا انعام دینے آرہے ہیں بڑے ابا۔“ وہ باقاعدہ لیٹ گئی تھی۔

”روٹی۔ چلو اٹھو۔ بدتمیزی نہیں چلے گی۔“ موتا نے چھاڑ پلائی۔

”میں ٹھیک ہوں۔ صبح ہی تبدیل کئے ہیں میں نے کپڑے۔ آپ سب میرے غم میں دبے نہ ہوں۔“ زری میں ذرا فرق نہ آیا۔

”دعوت ہے گھر میں۔ دس پندرہ لوگ باہر کے آرہے ہیں۔“ گلو نے سمجھایا۔

”وہ کھانا کھانے آرہے ہیں۔ کھانا اچھا پکا ہے۔ میں سوچھ کر اور کچھ ”نوٹنگ“ کر آ رہی ہوں۔“ وہ منہ کر دیکھنے لگی۔

”ہو سکتا ہے۔ آنے والے دنوں میں وہ تمہارے ”سسرالی“ کہلائیں۔“ شینو اب مزید برداشت نہ کر سکی۔ ”یہ تو اور بھی اچھی بات ہے۔ لڑکی کو اور بچل حالت میں دیکھنا چاہیے۔“ وہ مسکرا رہی تھی۔ ”یہ لیا پاتی تو کبھی ہے۔ کیوں زری آپنی؟“

”چھوڑو اسے اس کے حال پر۔ تم لوگ اپنی تیاریاں کرو۔“ موتا نے ہمیشہ کی طرح صورتحال سنبھالی۔ نگران برداشت نہ ہوتی تھی۔

”اچھا سنو۔ کیا تم لوگ گانے بھی گاؤ گی؟“ وہ شرارت بھرے انداز میں مریم سے پوچھ رہی تھی ”مگر تم لوگوں کے گانے بھی نہیں آتے خیر میں ہیلپ کر دوں گی۔ ورنہ تم لوگ تو ہر شادی میں ایک ہی گانا گاتی ہو۔“

چاندنی میں آئیو میاں بنزے

”بھئی پورے چاند کے دنوں میں اگر ”بنزے“ کو ضروری کام پڑ گئے تو کیا بارات ایک مہینہ لیٹ کر دو گی؟“ تھی ان کی ہونق صورتیں دیکھ کر۔

گلوخو فردہ سی اس کی شکل دیکھ رہی تھیں جیسے اس کا ذہنی توازن بگڑ گیا ہو۔

”تمہیں پتا ہے کون ہیں وہ لوگ؟“ وہ دبی آواز میں پوچھنے لگیں۔

”علیم الدین بھلیہ جسیم الدین۔ ایک عدد ہونہار سپوت کے والد ماجد نہ مزید کوئی بیٹا نہ عابد نہ خالد۔“ وہ لٹ لٹ پوٹ ہو رہی تھی ان کی حیران پریشان صورتیں دیکھ کر۔

وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ ”اوپر جا رہی ہوں جب کھانے کا وقت ہو جائے تو بلوا لیجئے گا۔“ وہ اسی طرح کھٹکھٹاتی ہو سے باہر چلی گئی۔

اور سیدھی اوپر بابا صاحب کے کمرے میں پہنچی۔ اس کی خواہش کے مطابق وہ کمرے میں موجود نہیں تھی۔ رات ہوئی اور آہستگی سے دروازہ بند کر دیا اور فون کی طرف بڑھ گئی۔ دروازے کی سمت دیکھتے ہوئے اس نے نمبر پش کئے۔

؟؟ فون ماما نے اٹھایا تھا۔

”ماما۔ باری ہے؟ اچھا فافٹ بلا دیں۔“ چند ثانیے اسے انتظار کرتا پڑا۔

”پیلو۔ روشی بات کر رہی ہوں۔“

”اب کیا ہوا؟ وہ دوسری طرف سے پوچھا جا رہا تھا۔

”آج ٹیم لے کر آرہے ہیں جس میں بارہویں کھلاڑی وہ خود ہیں۔“ وہ خشکی سے کہہ رہی تھی۔

”پتا ہے۔ مجھے۔ بڑے ابا یہاں سے روانہ ہو چکے ہیں۔ تین گھنٹے پہلے۔“ وہ کہہ رہا تھا۔

”تم نے مجھے اطلاع کیوں نہیں دی۔“ وہ دانت پیس کر پوچھنے لگی۔

”بڑے ابا۔ بطور ”ہیڈ لائن“ خود پہنچ رہے ہیں۔“ وہ ہنس رہا تھا۔

”میں کیا کروں؟“ وہ جھٹلائی۔

”کھانا کھائیے سب کے ساتھ۔ آج تو خاص ڈشیں ہوں گی۔“ اس کا قہقہہ ابھرا۔

”کسی دن باری! تم نے میرا اس طرح انتظار کیا ناں! تو دیکھنا سر سے پاؤں تک پھول پہنوں گی۔“

بالوں کو سرسری برش کیا، کانوں میں چھوٹی چھوٹی جھکیاں پہنی ہوئی تھیں۔ اتار کر دراز میں ڈال دیں۔ اور چہرے پر اپنی ہی نظر ڈال کر دوپٹا ٹھیک کرتی نیچے آ گئی۔

”کہاں ہیں سب لوگ؟“ اس نے سامنے سے آتی فاطمہ سے پوچھا۔

”ڈاننگ روم میں۔ آپ ہی کو لینے جا رہی تھی بی بی۔“

”ایک عزرائیل ہی نہیں آتا میری جان لینے باقی سب آتے رہتے ہیں۔“ وہ جھلاتی ہوئی ڈاننگ روم کی طرف طویل و عریض پر شکوہ ڈاننگ ٹیبل یہاں سے وہاں تک فل ہو چکی تھی۔

”السلام علیکم۔“ اس نے جائزہ لئے بغیر مختصر سلام کیا۔

”روشی! ادھر آؤ بیٹا۔“ بڑے ابا بابا صاحب کے نزدیک بیٹھے تھے اپنے سامنے والی کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ وہ بابا صاحب کی طرف قدرے خفگی بھرے انداز میں دیکھتے ہوئے بیٹھ گئی۔

”بیٹی! ابھی پڑھ رہی ہے؟“ برابر ہی بیٹھی اجنبی خاتون نے بڑے دلار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

”جی۔“ اس نے بے زار کن انداز میں جواب دے کر اپنے سنوارے بال۔ گویا جتانے کی کوشش کی کہ انہوں۔

خراب کر دیئے تھے۔

”کون سی جماعت چڑھی ہے خیر ناں؟“ وہی محترمہ پھر گویا ہوئیں۔

وہ چپ رہی اور سامنے رکھی قسم قسم کی ڈشز کا جائزہ لیتی رہی۔

بابا صاحب نے بڑے پر جلال انداز میں اس کی سمت دیکھا۔ پھر اپنے بیٹے (بڑے ابا) کی طرف دیکھا۔ ان میں علیم الدین بیٹھے ہوئے تھے۔

”نور تھایر میں ہے۔“ بڑے ابا نے علیم الدین کی طرف دیکھتے ہوئے اس کے حصے کا جواب دیا۔

”اور بھئی نعیم بیٹے! تمہارا بزنس کیسا ہے؟“ ساتھ ہی انہوں نے علیم الدین کے صاحبزادے کو بھی مخاطب کیا۔ طرح سے سب کی توجہ روشنی پر سے ہٹانے کی کوشش کی تھی۔

”فرسٹ کلاس! گراف اونچا ہی جا رہا ہے۔ کل ہم نے ریکارڈ کنسائنمنٹ روانہ کی ہے۔ یوں سمجھ لیں، لاسٹ ان ٹوٹل کے ایز اقول ہے۔“

”بہت خوب! بابا صاحب ایک نظر روشنی پر ڈال کر کہ آیا وہ کس قدر ”مٹا“ ہوئی ہے۔ ہونہار فرزند کو سراہنے نے درحقیقت متاثر کرنے کیلئے اپنا پورا پورا زور بیاں صرف کیا تھا۔

روشنی، نعیم کی طرف دیکھنے کے بجائے بڑی بے چارگی سے کھانے کی طرف دیکھ رہی تھی۔

”بڑے ابا! کھانا تو ٹھنڈا ہو جائے گا۔“ بالآخر اس سے رہانہ گیا۔

ٹیبل کے آخری سرے تک ایک بالکل ہی محسوس کی گئی، مگر اس کی بے نیازی میں کوئی کمی رکھائی نہیں دی۔

اسے اس بات کا تو سو فیصد یقین تھا کہ وہ جس کی سمت توجہ سے دیکھ لے گی۔ وہ اپنی نظر میں معتبر ہو جائے گا۔ خود کو اہم سمجھنے لگے۔ لہذا اس نے آخری حد تک شعوری کوشش کی کہ غلطی سے بھی اس کی نظر نعیم کی طرف نہ اٹھے۔

ہاتھ کے ساتھ کوفتے کھانے کے خیال سے اس کے منہ میں پانی آ رہا تھا۔ کوفتے بھی، شاہی کوفتے..... ڈھیروں

لوہرات سے تیار کئے ہوئے۔ جیسے ہی کھانا شروع ہوا، وہ تو سر تا پا جیسے اس ”حسین عمل“ میں غرق ہو گئی۔ سارے ماحول سے بے نیاز بابا صاحب کی قربت سے بے خبر.....

”آپ نے اپنے بیدار روم میں بجو کی کوئی تصویر نہیں سجائی ہوئی؟“ مابین یاور علی خان کے ہمراہ بیٹھی ہوئی شام کی چائے پی

رہی تھی۔ شام بھی کیا دھند لکوں سے رات ہی کا ہیولا ابھر رہا تھا۔ طویل و عریض لان..... اور لان کے اس پار چاروں طرف بے

آبادی اور ویرانی۔

”لوگ تصویریں کیوں سجاتے ہیں؟ دل و دماغ میں اتری ہوئی تصویریں کیا کاغذ پر اتری ہوئی تصاویر کا مقابلہ کر سکتی

ہیں؟ کاغذ پر اتری ہوئی تصویر تو جامد اور بے جان ہوتی ہے۔ ذہن کے پردے پر زندہ اور متحرک تصویر ہوتی ہے، لہو میں اتر جانے والے بے رحم احساس کے ساتھ۔“ وہ آہستگی سے دوبارہ سپ لینے لگے۔

”میری شامت نے دھکا دیا تھا کہ آپ سے سوال کر لیا۔ حالانکہ میرے ”سب کانشس“ میں یہ بات اچھی طرح اتر چکی ہے کہ آپ کے ہاں ہونے اور نہ ہونے کی ہر انداز کی ریزن (وجہ) موجود ہے۔ آپ سے سوالیہ گفتگو تو تقریباً بے کار ہی

ہے۔“ وہ شرارت سے منہ بنا کر بولی۔

”آپ تو بغیر ریزن کے کسی کی موت میں بھی شریک نہ ہوں۔“

”یعنی ایک حساب سے آپ مجھے مطلبی یا غرض کا بندہ کہہ رہی ہیں؟ مگر ایک بات میں آپ کو بتا دوں، اس دنیا میں بہت سے کام بغیر وجہ کے بھی لازماً کرنا ہوتے ہیں کیونکہ ان کے کرنے سے دل کو وہ خوشی ملتی ہے جو غیر مرئی (نظر نہ آنے والی) تحفہ

ہوتی ہے۔ جس کے ملنے سے انسان پہلے سے زیادہ طاقتور اور توانا ہو جاتا ہے یا اس کی عمر میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ اور ایسی خوش حال عمل ہونے کے بعد انسان کو یہ ہوش ہی نہیں رہتا کہ وہ یہ جاننے کی کوشش کرے کہ اس کی وجہ کیا ہے؟ البتہ جب دکھ ملے تب شاید انسان گمشدہ خوشی کے اسباب و وجوہات پر غور کرتا ہے۔ حالانکہ اکثر وہ اس کی سمجھ سے بالاتر ہی ہوتے ہیں۔“

”میں غریب بابا کا تھی اور ان کی سمت ایک ننگ دیکھ رہی تھی۔

یاور علی خان کو جیسے اندازہ تھا جب اس کی حیرت ختم ہوگی، تو وہ اپنے انداز پر شرمندہ ہو جائے گی۔ لہذا وہ سگریٹ کیس سے سگریٹ نکالنے اور سگائے میں گن ہو گئے۔

”آپ کو اس طرح کے لطیف جذبوں کی پہچان ہے یقین کریں، مجھے یہ جان کر بہت خوشی ہوئی، ورنہ ایمانداری کی بات

ہے اب تک تو مجھے بجو پر حیرت تھی۔ کیوں آپ کی دیوانی تھیں۔ پھر میں کیا نظر آتا تھا۔ معاف کیجئے گا۔

”سر! آپ کا فون ہے۔“ معاملہ لازم نے مداخلت کی۔

یاد علی خان فوراً اٹھ کھڑے ہوئے۔

ماہین اپنے لئے دوسرا کپ تیار کرنے لگی۔ دو منٹ بعد ہی وہ واپس آگئے۔

”آپ کے بھائی نعمان احمد سے بات کر لیجئے۔“

ماہین تو جیسے سر ہٹ دوڑی تھی۔ حویلی میں جتنی بار کراچی سے فون آیا تھا۔ فیب احمد کا تھا جب سے وہ آئی تھی۔ پہلا فون تھا۔

اس نے فوراً شوق سے ریسور کا نوں سے لگاتے ہی سلام کیا تھا۔

اور ادھر سے سلام کا جواب دینے کے۔۔۔ فوراً بعد اسے فی الفور کراچی واپس پہنچنے کیلئے کہا گیا تھا کہ جو بھی ملازم پہلی فرصت میں آجائے۔ چپا کی طبیعت خراب ہے۔ اور پریشان کن بات یہ تھی کہ نعمان بھائی نے مزید کوئی بات ریسور رکھ دیا تھا۔

اب اس کی پریشانی فطری تھی۔ وہ تقریباً دوڑتی ہوئی یاد علی خان کے پاس آئی تھی۔

”آپ فکر نہ کریں اپنا سامان پیک کریں میرا آدمی آپ کو چھوڑ آئے گا۔“ بلکہ جہاز میں بٹھا آئے گا۔“ گویا انہیں معلوم ہو چکا تھا۔

”میں نہیں جاؤں گی آپ کے کسی آدمی وادی کے ساتھ آپ میرے ساتھ چلیں۔ مجھے تو ان آدمیوں کی شکل و خوف آتا ہے۔ اتنا لمبا راستہ میں کسی بے ڈھب آدمی کے ساتھ نہیں گزار سکتی۔ اس سے تو بہتر ہے میں اکیلی آپ کا ڈرائیو کر کے ایئر پورٹ لے جاؤں۔ بعد میں آپ کا ڈرائیو آکر جیپ لے جائے۔“

”یہ دنیا نانوے فیصد بے ڈھب ہے۔ کیا بنے گا آپ کا؟ اچھا چلیں تیار ہو جائیں اور پریشان نہ ہوں اور جاکھینٹے۔“

”وہ کون؟“ وہ برامان کران کی طرف پلٹی۔

”آپ کے پاپا۔۔۔ ا۔۔۔ وہ خاصی الجھن میں دکھائی دیئے۔“

”میرے پاپا آپ کے کچھ نہیں لگتے یا اور بھائی؟“ اسے جیسے ان کے انداز پر بہت صدمہ ہوا۔

”آئی ایم سوری۔۔۔ میرا مطلب ہے فیب اٹکل۔“

ان کے انداز میں جان چھڑانے والی غلٹ تھی جسے وہ محسوس کر سکتی تھی مگر اس کے پاس وقت نہیں تھا۔

اب ظاہر ہے ان کے ہاتھ مشغلہ لگ ہی گیا تھا روشنی کا ان کے درمیان چلنا پھرنا دو کمر ہو چکا تھا۔

جملے بازی جوتھی سوتھی۔ ادھر ادھر کڑوں سے باقاعدہ نعمات نشر ہو رہے تھے۔

پھول بکھیر دے نغمے چھیڑو آیا ہے جان بہاراں

صنم آئے ہیں ہمارے وارو چاند ستارے

میرے محبوب پر

لالی اور بیہ بہت ترنگ اور نظم سے گارہی تھیں۔

”مکھوتم نے“ انارکلی“ دیکھی ہے بڑا شاندار گیت ہے اس میں۔“

”کون سا؟“ گلو اپنی دوست کو بہت انہماک سے خط لکھ رہی تھیں۔

”وہی۔۔۔ کیا ہے وہ۔۔۔؟“

جودل یہاں نہ مل سکے ملیں گے اس جہان میں

کھلیں گے آرزو کے پھول جا کے آسمان میں

”ہاں واقعی بہت پیارا گیت ہے پہلا مصرعہ غالبیہ ہے۔“

یہ زندگی اسی کی ہے جو کسی کا ہو گیا

وہ خط لکھتے لکھتے بڑی سادگی سے بولیں۔

”آپا! آپ تو ہمیشہ خوشی کے لمحوں میں کسی کو نہ سے غم اٹھا لایا کریں۔“ روہی کو غصہ آ گیا۔

”آج تو بڑا اچھا ماحول ہے۔۔۔ خوشی کی گھڑیاں ہیں دیکھتے کتنی شاندار جوڑی بنے گی جودیکھے گا حریف کرے گا بڑی

جھی پر سناٹا ہے۔ شلوار قمیض میں تو وہ ایک دم قبائلی سرور دکھائی دے۔“ مونا نے بھی حصہ لیا۔

”پورا نام غالباً نعیم الدین ہوگا۔“ بیہ کو پورے نام کے مسئلے نے ستایا۔

”خدا کیلئے روش! تم اپنے بیٹوں کے نام اس قافیے پر مت رکھنا۔“ مریم نے باقاعدہ ہاتھ جوڑے۔

”کبھی پتا چلے گا لاں دین۔۔۔ فلاں دین کے ناموں کا رش رکھا ہوا ہے۔“

وہ اس قدر سنجیدگی سے کہہ رہی تھیں جیسے روش کے ہاں بیٹے ہونے کا اسے سو فیصد یقین ہو۔

”رش کا کیا مطلب؟ کیا تمہیں کسی نجونی سے بتایا ہے کہ روشی کے ہاں گیارہ بیٹے ہوں گے؟“ زری نے تعجب سے مریم کی طرف دیکھا۔

”اچھی بات فرض کر لینے میں کوئی حرج تو نہیں۔“ مریم کے پاس جواب تیار تھا۔

”پھر بھی کچھ کم کر دے بیٹے بہت زیادہ ہیں۔“ لالی کو اتنی تعداد پر سخت اعتراض تھا۔

”مثلاً کتنے کروں؟“ مریم نے کن اکھیوں سے روشی کی طرف دیکھا۔

”کوئی ضرورت نہیں کم کرنے کی۔ تھوڑے دنوں کی پریشانی ہوگی جب بچے چھوٹے ہوں جب جوان ہو جائیں تو گھر

بجھ جائے گا۔ روشی کا جو ”نیکہ“ ہوگا وہ الگ۔۔۔ ا۔۔۔“

”پھر تو روشی کا ایک الگ قبیلہ بنے گا۔ میں نے بسٹری پڑھی ہے۔ یونو؟“ سلطنت عثمانیہ کی بنیاد جس قبیلے نے رکھی تھی

وہ صرف نومردوں پر مشتمل تھا۔“ تانیہ نے معلومات ”تقسیم“ کیں۔
 ”گستاخہ روشی کے نصیب میں مکہ بننا ہی نکھا ہے۔“ زری نے شرارت سے روشی کی طرف دیکھا، جوان کی طرف
 کئے بظاہر سرور ہی تھی۔

”ٹھیک نہیں ہے۔ میرا دل چاہا، آپ سے کہوں، آپ یہاں آکر مجھے ان حالات میں ”مورل سپورٹ“ دیں۔ میں
 بیت پریشان ہوں۔“ اس کی آواز رندھ گئی۔

”آپ تو باہت ہیں ایسے نہ کریں، نعمان کہاں ہے؟“
 ”وہ اسپتال میں ہیں، پاس۔ یاد رہائی! میرا دل ڈوب رہا ہے۔“ وہ رو دی۔
 ”ایسے کیوں سوچ رہی ہیں، انشاء اللہ ٹھیک ہو جائیگی۔۔۔۔۔ ٹیک اٹ ایزی پلیز۔“
 ”آپ آئیے؟“

”آپ یہاں کے حالات دیکھ کر گئی ہیں۔“
 ”آپ کو تو دل رکھنا بھی نہیں آتا، کتنے بے رحم ہیں آپ؟“
 ”بچ کتنا ہی بے رحم کیوں نہ محسوس ہو، جھوٹ سے زیادہ بے رحم نہیں ہوتا۔“
 ”آپ کو بری الذمہ ہونے کے سارے ہنر آتے ہیں۔“ وہ سوسوں کر رہی تھی۔
 ”سچائی اور عیاری کے فرق کو پہچانا سیکھے مابین۔“ وہ جیسے زج ہو گئے۔
 ”گھبراہٹ نہیں، سوچیں تو بہت فاصلے ہیں۔ سوچیں تو فاصلہ ہی نہیں۔ میں آپ کو فون کرتا رہوں گا۔“ یاد علی نے
 ریسورر کھ دیا تھا۔

سفر تو بڑا خاموش اور پرسکون تھا کہ بابا صاحب اور بڑے ابا ہمراہ تھے۔ لڑکیاں خاموش اور پرسکون رہنے پر مجبور تھیں۔
 مگر جیسے ہی وہ اپنے ٹھکانے پر پہنچیں، ایک ہنگامہ شروع ہو گیا۔ اپنی ماؤں کے گلے لگ کر پیار ہو رہے تھے۔ بہت زیادہ
 یاد کرنے کے یقین دلائے جا رہے تھے۔ روشی تھوڑی دیر ایک طرف کھڑی سب کو دیکھتی رہی۔ جانے کیا سوچ رہی تھی۔

بڑی امی آگے بڑھیں اور اس کے سر پر پیار کیا ”اچھی تو ہے میری بیٹی؟ ادھر کونے میں کیوں کھڑی ہے؟“
 ”وہ بزرگن انداز میں ان کے پاس سے ہٹ گئی۔“ ٹھیک ہوں، مجھے ہونا بھی کیا ہے؟“
 ”اور جو کچھ ہو چکا ہے، وہ سب آپ کو صبح ہونے سے پہلے بتا دیں گی، تسلی رکھیے۔“
 ”بابا بزرگ ل آئی۔ ماما ملی کچن کی طرف ٹرائل دھکیلتی جا رہی تھی۔“

”تو بی بی!“ دیکھ رہی تھی۔

”جو دیکھ رہی تھی، پھر میٹھیوں پر بیٹھی تھی۔“ وہ حکم صادر کر کے باغ کی طرف
 چلی۔

”کچھ دیر بیٹھی رہی، پھر میٹھیوں پر بیٹھی گئی۔“
 ”پانچ سات منٹ بعد اسے جواد آتا دکھائی دیا۔“

چاند پھر نکلا مگر تم نہ آئے۔ جلا پھر مرادل میں کیا کروا بائے۔۔۔۔۔!
 چاند پھر نکلا۔۔۔۔۔!

”ہینیو کی پرسوز آواز اس شور میں بھی اپنی جگہ بنائے ہوئے تھی۔ وہ آنکھیں بند کئے گنگنا رہی تھیں۔
 ”آپ کو صرف غمگین گانے ہی کیوں پسند ہیں؟“ بیہ نے بالآخر پوچھ لیا۔
 ”پسند ہے اپنی اپنی، مجھے اصل میں پائیدار چیزیں پسند ہیں۔“ وہ اپنے مخصوص انداز میں مسکرائیں۔
 ”ایٹینشن پلیز!“ حنا تقریباً بھاگتے ہوئے اندر داخل ہوئی تھی۔
 ”الہی خیر!“ موتا گھبرانے میں سب سے آگے رہتی تھی۔ ایک دم ہول گئی تھی۔
 ”ابھی ابھی فون آیا تھا۔ بتائیں کہاں سے میں اوپر تھی، بابا صاحب بات کر رہے تھے۔ کہہ رہے تھے میں بچوں
 ہی لا رہا ہوں۔ جمعے کی سٹینٹس کر لیتا ہوں۔“

حنانے سانسوں پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے چونکا نے والی خبر پہنچی۔
 ”آج کیا ہے؟“ روشی یک دم اٹھ کر بیٹھ گئی تھی۔
 ”جمعے میں دو دن باقی ہیں۔“ ہینیو نے مسکرا کر روشی کو جواب دیا۔

اس کی جان جل گئی۔ اس کا جی چاہا ہاتھ جوڑ کر درخواست کرے کہ خدا کیلئے آپ مسکرایا نہ کریں۔ بلا وجہ کا ”خرفا“
 ہے۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

”کہاں چل پڑیں؟“ گلو نے خط مکمل کرتے کرتے اسے ٹوکنے کی فرصت نکالی۔
 ”سامان پیک کرنے۔“ ہینیو پھر بولیں۔ روشی خاموش رہی۔
 ”اتنی جلدی، ابھی تو ہمارا دل بھی نہیں بھرا۔“ لالی بسوری۔

”یہاں ہے کیا؟ سوائے نزلے کے۔ میں تو جس دن سے آئی ہوں۔ نزلہ زکام ہی پیچھا نہیں چھوڑ رہا۔ بھوک بھوک
 سے نہیں لگتی۔ رنگ علیحدہ ”کالے“ ہو رہے ہیں۔“ روشی نے تنک کر لالی کو ٹوکا۔

”ٹھیک کہہ رہی ہے روشی۔ ایک حساب سے تو واقعی یہاں کچھ بھی نہیں ہے۔“ ہینیو نے ہنس کر تانیہ کی۔ روشی
 بال جھٹکتی باہر نکل گئی۔ کچھ آئندہ پر چھوڑ کر۔

”ہیلو۔۔۔۔۔ جی مابین بات کر رہی ہوں۔“

”ج۔۔۔۔۔؟ کیسی طبیعت ہے آپ کے پاپا کی؟“ وہ اپنے آفس سے بات کر رہے تھے۔

بات کرادیں، پلیز جواد بھائی۔“ اس نے جیسے منت کی۔

”اچھا تم بیٹھو میں کھوکھر سے چابی لے کر آتا ہوں۔“ وہ جیسے بادل خواستہ اٹھا۔

وہ پاؤں کے انگوٹھے سے ٹائل پر کچھ نقش بنانے میں مصروف ہو گئی۔

جواد جلد ہی واپس آ گیا تھا۔ ”آؤ“ اس نے روشنی کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔

وہ بڑی پھرتی سے انھی اور اس کے پیچھے چل پڑی۔

پہانک کے ساتھ ہی بڑے ابا کی بیٹھک تھی، جہاں وہ ملاقاتیوں سے مخصوص اوقات میں ملا کرتے تھے۔

جواد نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے تالا کھولا۔ رات کے سوا آٹھ بجے کا عمل تھا۔

بڑے ابا کی ٹیبل پر جدید ترین ماڈل کا امپورٹڈ ٹیلی فون سیٹ موجود تھا۔ جواد نے نمبر ملانے کے دوران اسے نزدیکی کر سی

پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ نمبر ملا کر دونوں ہاتھ ٹیبل پر رکھ کر سر جھکا کر بیٹھ گیا۔ سیٹ سے ”نون“ آرہی تھی، جسے روشنی بھی سن رہی

تھی۔ نون کا آہنگ تبدیل ہوا اور جواد نے تیزی سے ریسیور اٹھا لیا۔

”ہیلو..... السلام علیکم پاپا! میں جواد بات کر رہا ہوں..... یہ روشنی آپ سے بات کرنا چاہ رہی ہے..... خاصی ڈسٹرب ہے“

اب آپ اسی سے پوچھ لیجیے۔ لو بات کرو۔“

اس نے ریسیور روشنی کی سمت بڑھایا۔

”السلام علیکم پاپا۔“ اس کی آواز نہ چاہتے ہوئے بھی بھر ا گئی۔

”میں آپ کو بہت مس کیر رہی ہوں۔“ آنسو خساروں پر ڈھلک آئے۔

”خانا کہاں ہیں؟“

”جی نہیں..... اتنی زیادتی پاپا.....؟“

”میرے جیسے ماں کی محبت نہیں آئی تو کیا خانا بھی نہیں..... پاپا! آپ نے میرے ساتھ اتنی زیادتی کی ہے کہ میرا جی

چاہتا ہے کہ میں مر جاؤں۔“ وہ رو رہی تھی۔

”ابھی ہم کراچی سے واپس آئے تو مجھے احساس اور زیادہ ہوا کہ آپ نے میرے ساتھ کتنی زیادتی کی ہے، جب ہم اندر

آئے ناں پاپا! تو وہ سب اپنی اپنی ماؤں سے لپٹ گئیں۔ میری طرف تو کسی کا دھیان بھی نہیں آیا۔ سب کی پول کھل گئی۔ ویسے

سمتیار جاتی ہیں۔ سب اور کیا بڑی امی مجھے گلے نہیں لگا سکتی تھیں۔ صرف سر پر ہاتھ پھیر کر چلی گئیں۔ تب مجھے احساس ہوا

آپ نے میرے ساتھ کتنا ظلم کیا ہے۔ آپ مجھے دوسری ”ماں“ لا کر نہیں دے سکتے تھے؟“ وہ سسکیاں لے رہی تھی۔

جواد نے سر ہیٹ لیا تھا۔

”جی.....؟ ٹھیک ہے۔ دوسری ماں کی محبت کی گارنٹی نہیں ہوتی، وہ مجھے گلے سے نہ لگاتیں تو کیا ہوا میں خود ان کے گلے

سے لگ جاتی۔“

”جی؟ مجھے پتا ہے آپ کو میری ان باتوں سے غصہ ہی آئے گا، مگر میں فیصلہ کر چکی ہوں کہ اب کوئی بات میں دل نہیں

”السلام علیکم بھائی!“ اس نے اسی انداز میں بیٹھے بیٹھے سلام کیا۔

”وعلیکم السلام!“ وہ اس کے برابر بیٹھ گیا۔

”کیسا وقت گزرا کراچی میں؟“ اس نے روشنی کے اترے ہوئے چہرے پر تفصیلی نظر دوڑائی۔

”سینٹرل جیل سے ”سب جیل“ میں چلے گئے تھے۔“ وہ تنگی سے ہنسی۔

”یہ ہمارا ماحول ہے، جو بچہ اس ماحول میں پیدا ہوتا ہے، اسی ماحول کا عادی ہوتا ہے، تم یہ بات کیوں نہیں سمجھو؟“

طرح خود سے سب کو بدظن کر کے طے گا بھی کیا؟“

”آپ یہاں خوش ہیں؟“ اس نے بھائی کو بغور دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

”بہت اتنی محبتیں، اتنی نعمتیں اور سہولتیں ہیں، اور پھر سب سے بڑھ کر جو کچھ ہے، ہمارا اپنا ہے۔ یہ گھر، زمین، اور

دکھ سکھ کے سنا بھی۔“

”آپ ”اس گھر“ کے مرد ہیں، عورت نہیں ہیں، اس لئے آپ کو آزادی جو بہت ہے۔“

اس نے بھائی کی بات درمیان ہی میں کاٹ دی۔

”تمہیں کس طرح کی آزادی چاہیے۔ عورت کو آزادی سے کیا سروکار، وہ جتنی پابند ہوتی ہے، اتنی ہی محفوظ ہوتی ہے،

جو عورت جتنی محفوظ ہوتی ہے، وہ اتنی ہی پرسکون ہوتی ہے۔ عورت کے ذہنی سکون کے تمام سلسلے گھر سے شروع ہو کر

ہوتے ہیں۔ عورت گھر میں مصروف رہ کر گھر کو سنوارتی ہے اور جتنا زیادہ گھر سنوارتا ہے، اتنا زیادہ باہر سکون اور صحت مند

اب اگر تم سیاست دان بننا چاہتی ہو تو بے کار ہے، جو پہلے سے سیاست میں ہیں انہوں نے کیا کر لیا؟ انہیں تو میدان ملے،

پھر بھی ملک وہیں کا وہی ہیں۔ جو آتا، وہ سب سے پہلے ”خزانہ خالی“ سونے کی اطلاع دیتا ہے اور ہر بار خزانہ پہلے

خالی ہوتا ہے۔“

”سامعندان بن کر کچھ ”ایجاد“ کرنا چاہتی ہو تو بتاؤ، میں تمہیں مقصد حاصل کرنے کا راستہ بتاتا ہوں۔ تمہارا

کا وعدہ کرتا ہوں۔“

”انسان خالی سیاست دان یا سامعندان ہی تو نہیں بننا چاہتا۔“ اس نے تنک کر پھر جواد کو بچ میں ٹوک دیا۔

”تمہارے ایف ایس سی میں اچھے خاصے نمبر آئے تھے۔ پاپا نے تم سے پوچھا بھی تھا کہ ڈاکٹر بننا چاہتی ہو؟“

”تھناں؟“

”جی..... مگر میں نے اس لئے منع کر دیا تھا کہ ڈاکٹر بن کر بھی میں نے صرف ”خانوں“ کی خدمت کرنا

صاحب کو عورت کے ”جاب“ کرنے سے کتنی چڑ ہے۔ پتا ہے آپ کو..... پھر فائدہ اتنی محنت و مشقت کا؟“

”پھر اب کیا کرنا چاہتی ہو؟“ وہ اس کی سمت دیکھتے ہوئے کچھ سوچ رہا تھا۔

”فی الحال تو پاپا سے بات کرنا چاہتی ہوں۔ مجھے ان کے آفس کا نمبر نہیں پتا۔ آپ ملا کر دیں، مگر ان سے پاپا

بات کرنا چاہتی ہوں۔ وہاں لاؤنچ میں وہ سب بیٹھی ہیں۔ بڑے ابا باہر گئے ہیں۔ آپ ان کی بیٹھک کا تالا کھولیں۔“

رکھوں گی ہر بات آپ سے کہا کروں گی۔ آپ کو مجھ پر کتنا ہی غصہ آئے مگر مجھے شوٹ تو نہیں کر سکتے۔“

”بتا رہی ہوں کہ آپ کو فون کیوں کیا ہے۔ پہلے یہ بتائیے کہ ”ایچ گروپ“ میں فرق ہو تو کیا شادی معیوب ہوگی؟“

”یہ الٹی سیدھی باتیں نہیں ہیں پاپا! پلیز آپ مجھے جواب دیں۔“

”میرے نزدیک تو یہ بالکل بھی معیوب نہیں۔“

”مطلب یہ ہے پاپا! آپ خالہ سے شادی کر لیں۔ اس نے دھماکہ کر دیا۔“

”ڈونٹ لی سلی روشانے.....!“ جواد نے لپک کر ماؤ تھپیں پر ہاتھ رکھ دیا۔

”آپ مجھے بات کرنے دیں بھائی..... پلیز۔“

”تمہیں معلوم ہے تم کیا کر رہی ہو؟ پاپا تم سے سخت ناراض ہو جائیں گے بات نہیں کریں گے تم سے۔“

جواد نے ماؤ تھپیں پر اسی طرح ہاتھ رکھا ہوا تھا کہ دوسری طرف سے ریسورر کھنے کی واضح آواز سنائی دی۔

”اس نے گہرا سانس لیکر ریسورر جواد ہی کو تھما دیا۔“

”آپ بہت خراب ہیں بھائی، مجھے پاپا کا جواب تو سننے دیتے۔ ہاں نہیں تو..... اصل بات یہ ہے کہ آج کچھ

کیلئے پر خلوص اور پکی کوشش ہی نہیں کی۔“

وہ بسور کر بولی۔ ”یہ لوگ ذرا سی زبردستی کرتے پاپا کے ساتھ اور ہمارا بھلا ہو جاتا۔“

”تم کرو گی پاپا کیلئے کوشش؟ نان سینس! اچھا اب اٹھو بڑے ابا نہ آجائیں اور ہاں سنو! یہ گلے لگانے اور نہ

قصہ تمہیں پاپا کے علم میں نہیں لانا چاہیے تھا۔ وہ ڈسٹرب ہو گئے ہوں گے، اگر ہماری مٹی نہیں رہیں تو اس میں ان کا کھانا

آگے اور جواد اس کے پیچھے پیچھے چلتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

”پتا نہیں اس حویلی کے مردوں کے سینے میں دل ہی نہیں ہوتے شاید..... آپ کبھی بھی مس نہیں کرنے لیا

حیرت ہے شاید آپ کو مجھ سے بھی محبت نہ ہو۔“ وہ واپسی کیلئے اندر کی جانب بڑھتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

”روشانی! کیا ہو گیا ہے تمہیں، ہر ایک پر شک کرنے لگی ہو؟“ جواد نے اس کا بازو تھام کر اسے جانے سے روکا۔

”آپ کو میرا ذرا سا بھی خیال ہوتا تو آپ مجھے پاپا سے ساری بات کرنے دیتے بلکہ میری ہاں میں ہاں ملانے

ساتھ مل کر پاپا کو پر لیں کرتے اور کہتے آپ کو شادی ضرور کرنا چاہیے۔“

”دماغ خراب نہیں ہے میرا تمہاری طرح..... اندر وہاں کسی سے ذکر نہ کرو دینا غلطی سے، تماشا بن جائے گا۔“

”مگر مجھے رونا آ رہا ہے۔ اگر میں رو پڑی تو سب پوچھیں گے اور اس وقت میں سب سے جیلس ہو رہی ہوں۔“

رہا ہے سب کے سر پھاڑ دوں۔“

اس نے رک کر جواد کو پوری سچائی سے اپنے اندرونی احساسات سے آگاہ کیا۔

وہ بے ساختہ مسکرا دیا۔

”روشی۔“

”جی بھائی۔“

”جی بھائی! آؤ شاہباش۔“

اس نے نظریں اٹھا کر بھائی کی طرف دیکھا۔ رشتہ بھی فطری تھا۔ جذبہ بھی فطری اور اسے یہ بھی سمجھ میں آ رہا تھا کہ وہ

اسے بہانا چاہتا ہے اور کیوں بہانا چاہتا ہے۔ یہ بھی.....!

”اندرونی امی کو بتاؤ کہ ہم ذرا ایک گھنٹے کیلئے باہر جا رہے ہیں۔ اس نے جیب کو چھو کر گاڑی کی چابی تلاش کی۔“

”بھوکھ۔“

”جی بی بی۔“

”جاؤ ذرا بڑی امی کو کہہ دو کہ میں جواد کے ساتھ باہر جا رہی ہوں اور ہاں سنو! یہ باری نظر نہیں آ رہا۔“

جواد چابی لینے اندر کی طرف جا رہا تھا اس نے آہستگی سے دریافت کیا۔

”وہ یہاں نہیں ہیں سرائے گئے ہوئے ہیں۔“

”کب سے؟“

”کل گئے تھے۔“

وہ جانے کس دھیان میں چلی گئی تھی۔ جواد نے واپس آ کر مخاطب کیا تو وہ چونک گئی تھی۔

جب روش کا فون آیا تو وہ بہت تھک کر بستر پر لیٹے تھے۔ جواد کی آواز سن کر وہ ذرا چونک گئے تھے، مگر روش کی آواز سن کر

وہ فانی خامے پریشان ہو گئے تھے۔ کیونکہ روشی کا رات کے وقت فون آنا اپنے اندر بہت سارے معنی رکھنا تھا۔ وہ ویسے بھی

اس کی طرف سے شکریہ رہتے تھے۔

اور اب جب کہ وہ اپنا دکھ کہہ چکی تھی، فون خاموش ہو چکا تھا۔ مگر روح میں ایک شور برپا تھا۔ جواد نے انہیں کبھی احساس

نہیں دلایا تھا کہ وہ ماں کو مس کرتا ہے۔ شاید وہ بہت گہرا تھا مگر روشی نے کئی بار انہیں لاشعوری طور پر احساس دلایا تھا کہ وہ ماں

کے بغیر مکمل ہے۔ اسے بہت زیادہ اس بات کا قلق ہے کہ اس کی ماں نہیں ہے۔

انہوں نے سگریٹ لگا کر سر بازو کے نیچے رکھ لیا۔ آج ان کو یقین ہو گیا تھا کہ روشی جسمانی طور پر ضرور بڑی ہوئی ہے۔

مگر اس کا ذہن بنوڑ بچوں جیسا ہے۔

اس عمر میں ان سے ماں کی فرمائش کر رہی ہے، جبکہ اب خود اس قابل ہو چکی ہے کہ شادی کر کے اپنی گزشتہ سنبھالے۔

نازنین کا تصور کر کے وہ جیسے اپنے آپ سے بھی شرمندہ ہو گئے۔ نان سینس روشی سلی گرل۔ انہوں نے گہرا کٹس لگایا۔

نازنین کا ہیولانے رنگوں میں تحلیل ہوا۔ اب نازنین اپنی چوٹی میں بل ڈال رہی تھی اس کے سفید ماتہ سیاہ بالوں پر اس طرح

مکھڑے تھے جیسے رات کے وقت جھیل کے پانی پر کھول۔

کمرے میں اس کی مستثناتی ہوئی ہنسی کو بجھنے لگی۔ اس کے گہرے رنگ کے ملبوس سے انھیں ان نمونوں میں ان کے

اعصاب چٹخنے لگیں۔

وہ ادھر ادھر یہاں وہاں متحرک ہو گئی۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

پھر بستر سے اتر کر آئے کھڑکیوں کے پردے سرکائے۔ دروازہ کھول دیا۔

”عمر دین!“ انہوں نے ملازم کو آواز دی۔

”جی صیب۔“ وہ فوراً آ موجود ہوا۔

”اچھی سی چائے بنا لاؤ۔“ انہوں نے اس کی طرف دیکھے بغیر حکم دیا اور آگے بڑھ کر سگریٹ کا بچا ہوا ٹکڑا اسے مسل دیا۔

”یاور! آپ شادی میں نہیں آئے ناں تو میں یہ سب کپڑے نہیں پہنوں گی۔ میں جب اہتمام سے تیار ہوں تو دل چاہتا ہے آپ موجود ہوں۔ آپ نہیں ہوتے تو میرا دل ہر شے سے اچاٹ رہتا ہے بال بنانے تک کوئی نہیں ہوتا وہ اپنی بہن شاہین کی شادی میں جانے کی تیاری کرتے ہوئے ان سے مخاطب تھی۔

”اور پھر جو اد کو آپ کی اتنی عادت ہے کہ وہاں مجھے بہت ڈسٹرب کرے گا۔ حالانکہ دن بھر میں مشکل سے آدھ گھنٹے کو میسر آتے ہیں پھر بھی آپ کو اتنا پیچانے لگا ہے۔“ وہ وارڈروب سے کپڑے نکال کر سوٹ کیس لیا تھی۔

”اب اتنا بے وقوف مت بناؤ وہ بے چارہ بچہ ہے اسے صرف آپ کی عادت ہے محترمہ! آپ مجھے اولاد کے ذریعے مزید بلیک میل نہ کریں۔ جب اعتراف شق ہے تو پھر انہیں سیدھے سیدھے کہیے آپ کا ہمارے بغیر۔“

وہ اسے تنگ کر رہے تھے اور اس کے چہرے پر ایک ایسے غم کا اثر رہا تھا۔

وہ سر جھٹک کر دوسرا سگریٹ سلگانے لگی۔ ان کی سرخی گہری ہو گئی تھی۔ ان کے چہرے پر جوہر وہ اتنے گہرے اور ناقابل فہم تھے کہ انہیں سمجھا نہیں جاسکتا تھا۔ صرف خوفزدہ ہوا جاسکتا تھا۔

وہ فون کی طرف بڑھے۔ نمبر ملایا۔

”یہ وہ علی خان۔“ اسٹیمپنگ۔

”یقین نہ کرنے کی وجہ؟ میں کوئی ماورائی مخلوق تو نہیں ہوں نہ ہی کوئی دوسرا سیارہ میرا وطن ہے۔“

”یہی طبیعت ہے انکل کی؟“

”بعض اوقات نظر انداز بھی کر دیا کرتے ہیں غلطی سے کہہ دیا تھا“ آپ کے چہرے پر۔

”بہر حال آپ زیادہ پریشان نہ ہوں وہ ٹھیک ہو جائیگے۔“

”میں کوشش کروں گا کہ کچھ دیر کیلئے ہی سہی آپ کے پاس پہنچ جاؤں آپ حیران کیوں ہوتی ہیں؟“

”کہا تھا آپ آج کی بات کریں ابھی کی بات کریں۔“

”نہیں۔۔۔۔۔ نہیں حقیقت میں میں ہی ہوں کوئی اور نہیں۔“

”یقین نہیں آ رہا؟ تو بتائیے میں کیا کر سکتا ہوں؟“

”آپ انتظار کریں گی مجھے۔۔۔۔۔ اچھا لگے گا۔۔۔۔۔ او کے خدا حافظ۔“

”آپ انتظار کریں گی“ (بہت بہت شکریہ میری بیٹی) انہوں نے نیچے کے نیچے سے اپنا پرس نکالا اور کھول کر روشنی کے عکس اے لوٹ مائی ڈاٹر (بہت بہت شکریہ میری بیٹی) انہوں نے نیچے کے نیچے سے اپنا پرس نکالا اور کھول کر روشنی

کی تصویر کو اپنے ہونٹوں سے چھوا۔ وہ روشنی کی پہلی سانگرہ کی تصویر تھی۔ اور برسوں سے ان کے پرس میں رہا کرتی تھی۔ اتنے سالوں میں جانے کتنے پرس وہ بدل چکے تھے۔ مگر تصویر وہی تھی۔ وہ اسٹینٹ کی سرخ کار والی فراک میں انتہائی صحت مند روشنی منہ بسور رہی تھی۔

ملازم چائے لے آیا تھا۔

”عمر دین۔“

”جی صیب۔“

”دیکھو جمعہ کو ڈرائیور کو ساتھ لے کر دریا بستی چلے جانا اور روشنی بی بی کو لے آنا۔“

”اور۔۔۔۔۔؟“ ملازم تمام عرصہ ملازمت میں پہلی بار انہیں کسی کو گھر سے بلاتے دیکھ رہا تھا۔

”ہاں ادھر۔“ انہوں نے بڑی گہری سوچ میں ڈوبے ڈوبے جواب دیا اور چائے کی پیالی اٹھالی۔

”اور بڑے خان۔“

”میں یہاں سے فون کروں گا اب تم جاؤ۔“ انہوں نے اس کی بات کاٹ کر اسے جانے کا اشارہ کیا۔

اور سائینڈیکل پر بائی فوکل عینک اٹھا کر اپنی ناک پر ٹکائی اور ایک فائل کا مطالعہ کرنے لگے۔ چہرے پر انتہائی درجے کا سکون طاری تھا۔

وہ علی الصبح بیدار ہو گئی تھی۔ نماز پڑھ کر اپنی کتابیں اٹھائیں اور باغ کا رخ کیا۔

سامنے ہی ماما بی بی لڑائی کے گیسٹ روم کی طرف جاتی دکھائی دی۔

”کس کے لئے چائے لے جا رہی ہیں ماما؟“ اس نے رک کر لڑائی پر نظر ڈالی۔

”مہمان آئے ہیں؟“

”کیا خالہ والہیں آگئی ہیں؟“ اس نے پے درپے سوال کر ڈالے۔

”نہیں بی بی! خالی کیسے اتنی جلدی آسکتی ہیں؟ کراچی سے علیم الدین صاحب آئے ہیں آج صبح پانچ بجے۔۔۔۔۔ ان کیلئے

سے جا رہی ہوں۔“ وہ سادگی سے بولی۔

”علیم الدین۔۔۔۔۔“ یہ کیوں آگئے ہمارے پیچھے پیچھے؟“ اس کا ماتھا ٹھنکا۔

”کیا آئے ہیں؟“ اس نے گھبرا کر ان کی شکل دیکھی۔

ماما نے بغور اس کی صورت دیکھی ”اور بھی کسی کو آنا تھا ان کے ساتھ؟“ وہ انسا سوال کرنے لگی۔

”اب..... اب مجھے کیا پتا؟ یہ باری کب آئے گا؟ کیا آفت آئی ہے سرائے میں؟“ وہ جھنجھلا گئی۔

”یہ تو بڑے خان ہی جانتے ہوں گے“ ویسے خان کہہ رہے تھے ہفتہ دس دن تو لگ ہی جائینگے۔

”ایک تو اس نے توپوں میں گولے ڈالنا ہوتے ہیں۔ کوئی کام ہی نہیں ہوتا اس کے بغیر۔ اس کا فون آئے تو“

ایک تو کا کا جان کے ہاں ڈائریکٹ فون نہیں ملتا۔ امینڈنٹ بٹھایا ہوا ہے۔ مرضی ہوتی ہے تو ملتا ہے“ ورنہ نہیں۔

وہاں ہوتا ہے۔ تو میں ٹرائی کرتی ہوں، مگر پتا چلتا ہے وہ ”لام“ پر گیا ہوا ہے۔“ ماما اسے جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔

آگے بڑھ گئی۔

وہ ایک کونے میں کتاب کھول کر تو بیٹھ گئی تھی، مگر ذہن اب ایک ہی سوچ کے گرد اب میں پھنس چکا تھا۔ ”عطر“

صاحب کس سلسلے میں آکر براجمان ہوئے ہیں؟

کیا ہونے والا ہے؟ اگر وہ ہو گیا، جونہیں ہونا چاہیے تو وہ کیا کر سکے گی؟ باری کیا کرے گا۔ وہ پاپا سے کیا کہے؟

طرح کہے گی؟ بابا صاحب پاپا کی بات مان لیں گے، کیا پاپا ان کے سامنے میرے حق میں بول سکیں گے۔ پھر میں پاپا کو بھلانے لگا۔

گی کہ مجھے سزا دی جا رہی ہے۔

اگر بابا صاحب محض میری شادی کرنا چاہتے تو گھر میں ہی کسی سے کرتے۔ وہ مجھے خاندان سے نکال دینا چاہتے۔

میں اینٹ سے اینٹ بجا دوں گی، کہ میں بھی پھر انہیں کی پوتی ہوں۔ اس نے جیسے مصمم ارادہ کر لیا تھا۔

.....

”اندرا جاؤ یار! تمہاری طرح بھی کوئی اپنا دشمن نہ ہو۔“ لال خان عارف کو تھامے گھر میں لا رہا تھا۔

”بالو! دودھ میں ہلدی ڈال کر لے آؤ“ تمہارے دیور صاحب اسپتال کی سیڑھیوں سے گر پڑے ہیں۔ دروازے بند نہیں آئی۔

کہیں۔ جان، ماس تو تم میں رہا نہیں کہیں.....!“

لال خان ترجمان انداز میں اسے ایک پٹنگ پر ٹکا کر نکلے لگا۔ ”اور کوئی ہمارے لائق خدمت؟“

زخم ہوتے ایک دو تو پھر فو کی بات تھی

اس دل صد چاک کا سینا پروتا چھوڑیے

وہ تکیہ درست کر کے گرنے کے انداز میں لیٹ گیا۔

بالو باورچی خانے میں تھی۔ اس نے لال خان کا حکم سن کر دودھ ایک گلاس میں ڈال کر ہلدی ملانا شروع کر دی۔

سوچ کر باورچی خانے سے باہر آ گئی۔

”دودھ میں چینی بھی ملا دوں؟“ اس نے وہیں سے لال خان کو مخاطب کیا۔

لال خان سوچ میں پڑ گیا۔ ”پتا نہیں ہلدی والے دودھ میں چینی ملاتے ہیں یا نہیں؟“

”رہنے دوا ایسے ہی لے آؤ۔“ بالآخر وہ کسی نتیجے پر پہنچ کر بولا۔

”بالو! اندر نہیں آئی۔ دروازے پر انگلی سے دستک دے کر اس نے لال خان کو متوجہ کیا۔ وہ اٹھ کر گیا اور گلاس لے

ہیں۔“

”بھئی اندر آ جایا کرو! پردہ وردہ نہیں کرتا، اپنا یار ہے اور پھر بے چارہ ہے“ لال خان نے مسکرا کر عارف کو

”بھئی اندر آ جایا کرو! پردہ وردہ نہیں کرتا، اپنا یار ہے اور پھر بے چارہ ہے“ لال خان نے مسکرا کر عارف کو

”بھئی اندر آ جایا کرو! پردہ وردہ نہیں کرتا، اپنا یار ہے اور پھر بے چارہ ہے“ لال خان نے مسکرا کر عارف کو

”بھئی اندر آ جایا کرو! پردہ وردہ نہیں کرتا، اپنا یار ہے اور پھر بے چارہ ہے“ لال خان نے مسکرا کر عارف کو

”بھئی اندر آ جایا کرو! پردہ وردہ نہیں کرتا، اپنا یار ہے اور پھر بے چارہ ہے“ لال خان نے مسکرا کر عارف کو

”بھئی اندر آ جایا کرو! پردہ وردہ نہیں کرتا، اپنا یار ہے اور پھر بے چارہ ہے“ لال خان نے مسکرا کر عارف کو

”بھئی اندر آ جایا کرو! پردہ وردہ نہیں کرتا، اپنا یار ہے اور پھر بے چارہ ہے“ لال خان نے مسکرا کر عارف کو

”بھئی اندر آ جایا کرو! پردہ وردہ نہیں کرتا، اپنا یار ہے اور پھر بے چارہ ہے“ لال خان نے مسکرا کر عارف کو

”بھئی اندر آ جایا کرو! پردہ وردہ نہیں کرتا، اپنا یار ہے اور پھر بے چارہ ہے“ لال خان نے مسکرا کر عارف کو

”بھئی اندر آ جایا کرو! پردہ وردہ نہیں کرتا، اپنا یار ہے اور پھر بے چارہ ہے“ لال خان نے مسکرا کر عارف کو

”بھئی اندر آ جایا کرو! پردہ وردہ نہیں کرتا، اپنا یار ہے اور پھر بے چارہ ہے“ لال خان نے مسکرا کر عارف کو

”بھئی اندر آ جایا کرو! پردہ وردہ نہیں کرتا، اپنا یار ہے اور پھر بے چارہ ہے“ لال خان نے مسکرا کر عارف کو

”بھئی اندر آ جایا کرو! پردہ وردہ نہیں کرتا، اپنا یار ہے اور پھر بے چارہ ہے“ لال خان نے مسکرا کر عارف کو

”بھئی اندر آ جایا کرو! پردہ وردہ نہیں کرتا، اپنا یار ہے اور پھر بے چارہ ہے“ لال خان نے مسکرا کر عارف کو

”بھئی اندر آ جایا کرو! پردہ وردہ نہیں کرتا، اپنا یار ہے اور پھر بے چارہ ہے“ لال خان نے مسکرا کر عارف کو

”بھئی اندر آ جایا کرو! پردہ وردہ نہیں کرتا، اپنا یار ہے اور پھر بے چارہ ہے“ لال خان نے مسکرا کر عارف کو

”بھئی اندر آ جایا کرو! پردہ وردہ نہیں کرتا، اپنا یار ہے اور پھر بے چارہ ہے“ لال خان نے مسکرا کر عارف کو

”بھئی اندر آ جایا کرو! پردہ وردہ نہیں کرتا، اپنا یار ہے اور پھر بے چارہ ہے“ لال خان نے مسکرا کر عارف کو

”بھئی اندر آ جایا کرو! پردہ وردہ نہیں کرتا، اپنا یار ہے اور پھر بے چارہ ہے“ لال خان نے مسکرا کر عارف کو

”بھئی اندر آ جایا کرو! پردہ وردہ نہیں کرتا، اپنا یار ہے اور پھر بے چارہ ہے“ لال خان نے مسکرا کر عارف کو

”بھئی اندر آ جایا کرو! پردہ وردہ نہیں کرتا، اپنا یار ہے اور پھر بے چارہ ہے“ لال خان نے مسکرا کر عارف کو

”بھئی اندر آ جایا کرو! پردہ وردہ نہیں کرتا، اپنا یار ہے اور پھر بے چارہ ہے“ لال خان نے مسکرا کر عارف کو

”بھئی اندر آ جایا کرو! پردہ وردہ نہیں کرتا، اپنا یار ہے اور پھر بے چارہ ہے“ لال خان نے مسکرا کر عارف کو

”بھئی اندر آ جایا کرو! پردہ وردہ نہیں کرتا، اپنا یار ہے اور پھر بے چارہ ہے“ لال خان نے مسکرا کر عارف کو

”بھئی اندر آ جایا کرو! پردہ وردہ نہیں کرتا، اپنا یار ہے اور پھر بے چارہ ہے“ لال خان نے مسکرا کر عارف کو

”لال خان! اپنی نو بیاہتا بیوی پر نظر کرم ڈال کر بہانے بہانے سے ہٹنے لگا۔“

”بھائی! ہم آج بھی افسر ہیں، اپنی اپنی سمجھ کی بات ہے۔“

”ایسا کرو، مچھلی کے کباب بنا لو اور مرغی کے نکلے یہ میرا رتو تو یونہی الٹی باتیں کرے گا، اسے کھانی ہو چیزیں اس کیلئے اچھی ہیں۔“

”یار! ہمارے پیٹ کا جہنم تو کب کا ٹھنڈا ہو چکا، اب تو اس میں آج ہی نہیں آتی، کیوں بھابی کو کباب ہو؟“

لال خان نے آنکھ کے اشارے سے جانے کو کہا۔

”تم تو یونہی کہتے ہو، اچھی چیزیں کھایا پیا کرو تا کہ جسم میں طاقت آئے۔“ وہ عارف کو کبل اوڑھا رہا تھا۔

گلو ایک میڈیم سائز کا سوٹ کیس کھینچتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئی تھی۔ اس کے پیچھے گلو بھی اندر آئی، لیکن ہوئی دونوں کو ٹکر کر دیکھ رہی تھی۔

”جاؤ تم، اور دیکھو دروازہ بند کرتی جانا۔“ گلو نے گلو کو ننگا طلب کیا۔

وہ فوراً چلی گئی۔

”سمیہ بھابی آئی تھیں۔“ گلو نے کارپٹ پر بیٹھ کر سوٹ کی چابیاں چلائیں۔

اور کھنا کھناک کی آوازوں کے ساتھ سوٹ کیس کھول دیا۔

”کیوں؟ صبح سے دس بار ملی ہیں، اب کیا ہے؟“ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی اور کھلے ہوئے سوٹ کیس کو گھورنے لگی۔

”مہندی لگائیں گی تمہیں۔“ گلو نظریں چڑا کر سوٹ کیس سے کپڑے اور جانے کیا کیا نکالنے لگی۔

”مجھے خود مہندی لگانا آتی ہے اور سب سے اچھی آتی ہے آپ کو پتا بھی ہے۔“ اس کا دل بری طرح اڑا۔

بظاہر سکون سے بات کر رہی تھی۔

”مگر یہ رواج ہے شادی، منگنی کی مہندی دلہن خود نہیں لگاتی۔“ گلو ایک سوٹ پھیلا کر دیکھنے لگی۔

”کیسی اور کس کی شادی، منگنی؟“ وہ بستر سے نیچے آئی۔

”تمہاری اور کس کی؟“ وہ ڈرے ڈرے انداز میں اس کی طرف دیکھ کر بولیں۔

”مگر میری مرضی پوچھے بغیر میری شادی یا منگنی کیسے ہو سکتی ہے؟“ وہ پھری ہوئی ان کے نزدیک چلی آئی۔

”ہمارے ہاں لڑکیوں سے کون پوچھتا ہے؟“ وہ چوری چوری تھیں۔

”پھر لڑکیوں کو کمروں میں کیوں رکھتے ہیں؟ استھان یا اصطبل میں کیوں نہیں باندھتے؟“ اس نے آگے

سوٹ اٹھایا اور گولہ بنا کر سامنے دیوار پر دے مارا۔ گلو..... ہائیں ہائیں کرتی رہ گئیں۔

”وہ زیور کے ڈبوں پر چھٹی۔ گلو نے آگے بڑھ کر ڈبے اپنے قابو میں کر لئے۔“

”پاگل ہوئی ہو، برائی کیا ہے اس رشتے میں؟“ وہ ڈبے واپس سوٹ کیس میں رکھنے لگیں۔

”تو پھر آپ کر لیں۔“ وہ خون آشام بنی ہوئی تھی۔

”ٹٹ اپ روشی!“ گلو نے اسے ڈانٹ دیا۔

اسی دم سمیہ بھابی دروازہ کھول کر اندر آئیں، ان کے ہاتھ میں مہندی کی کون تھی۔

”گلو دروازہ کھلنے کی وجہ سے ادھر متوجہ ہو گئی تھیں۔ روشی نے لپک کر سوٹ کیس میں پڑی اشیاء بوجھیں اور ہاتھ روم کے

درازے پر دے ماریں۔

”یہ کیا ہو رہا ہے؟“ سمیہ ہکا بکا دونوں کو باری باری دیکھنے لگیں۔

”دماغ خراب ہو گیا ہے اس کا۔“ گلو روہانسی ہو کر اس کی پھینکی ہوئی چیزیں سمیٹنے لگیں۔

”مجھ سے پوچھنے میں شان میں بٹ لگ رہا تھا تو کم سے کم میرے باپ سے تو پوچھ لیا ہوتا۔“

وہ زور سے سوٹ کیس کو لات مار کر واپس اپنے بیڈ پر بیٹھ گئی۔

”پوچھ لیا ہے ان سے۔“ گلو نے جلدی جلدی سوٹ کیس میں چیزیں رکھنا شروع کر دیں۔

”پوچھا ہے یا حکم سنایا ہے..... ہونہ۔“

”آپا! جایی بابا صاحب سے کہہ دیجئے، جب تک میری پپا سے بات نہیں ہو جاتی، کوئی مجھے اپنی شکل نہ دکھائے۔“ وہ غصے سے ہنکار رہی تھی۔

”تم کرو گی یا در ماہوں سے بات؟“ گلو حیرت سے اسے دیکھ رہی تھیں۔

”ہاں! اس لئے کہ میری ماں مر چکی ہے۔“ وہ غرائی۔

”مگر وہ تو شام کو آئیں گے۔ بڑی امی بتا رہی تھیں۔“

”مت ذکر کریں کسی رشتے کا، میں لاوارث ہوں۔“ اس کی آواز بھرا گئی۔

گلو اسے چکارنے آگے بڑھیں۔ وہ دوڑ کر ہاتھ روم میں گھس گئی اور دروازہ بند کر کے چٹنی چڑھا دی۔

”چلی جائیں آپ دونوں۔“ وہ چیختی تھی۔

”دونوں کافی دیر تک جتن کرتی رہیں۔ مگر نام کام رہیں۔ بالآخر تھک کر واپس چلی گئیں۔ وہ کافی دیر ہاتھ روم میں بند رہی، پھر اطمینان کے بعد آہستگی سے باہر آئی اور دروازہ کھلا دیکھ کر بند کرنے کے خیال سے آگے بڑھی۔“

”کھڑا رہنے دو۔ ہم زیادہ دیر نہیں بیٹھیں گے۔“ اسے بائیں جانب سے بابا صاحب کی آواز سنائی دی۔ ایک لمحے کو تو

آنکھوں کے سامنے ہر شے ناپچے لگی۔ گول گول دائروں کی صورت۔

”دلہن کچھ کہہ رہی تھیں..... کیا ٹھیک کہہ رہی تھیں؟ ان کی پر جلال آواز کمرے میں گونجی تھی۔“

”وہ خاموش رہی۔“

”ہم کیا پوچھ رہے ہیں وقت نہیں ہے ہمارے پاس۔“ وہ برہمی سے کہہ رہے تھے۔

وہ اسی طرح خاموش رہی۔

”اگر تم نے ہماری بات کا جواب نہیں دیا تو ہم مگنی کرنے کے بجائے آج تمہارا نکاح کر دیں گے۔“
 بھی۔ کراچی فون کریں گے۔ شام تک لڑکا پہنچ جائے گا۔“ وہ غیض کے عالم میں اسے دیکھ رہے تھے۔
 ”اتنے آزاد تو ہمارے لڑکے بھی نہیں۔“ وہ اسی انداز میں بولے۔

”نکاح‘ رخصتی کا سن کر تو جیسے اس کے اوسان خطا ہو گئے۔ مگنی میں تو پھر بھی کچھ گنجائش نظر آ سکتی تھی۔
 اس نے بے حد ناراض اور شاکی نظریں اٹھا کر دادا کو دیکھا۔ وہ اسی کی طرف دیکھ رہے تھے۔ وہ تابڑ
 ”بابا صاحب! میں آپ سے کچھ بھی نہیں کہوں گی، بس آپ ایک بار پاپا کو بلا دیں، پھر جو ہوگا ہو جائے گا۔
 نہیں بولوں گی، یہ شام کیلئے میری شرط ہے۔“ وہ بڑی بے خوفی سے کہہ رہی تھی۔

”بابا صاحب غصے سے کانپ گئے۔ یہ کل کی لڑکی، ان کے سامنے شرطیں پیش کرے گی۔
 ”ورنہ؟“ وہ خود پر قابو پاتے ہوئے پوچھ رہے تھے۔

”کچھ نہیں، یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ میں موت سے بالکل نہیں ڈرتی۔“

”تم ہمیں دھمکی دے رہی ہو، ہم تمہیں اپنے ہاتھوں سے شوٹ کر سکتے ہیں۔“ وہ احساس تو ہیں تھے۔
 ”میں جانتی ہوں، اور میں تیار ہوں، بس آپ ایک بار پاپا سے بات کرادیں، پھر جو کچھ کہیں گے، میں
 نے پست آواز میں کہا۔

”مگر ہمیں یہ منظور نہیں، تم یقیناً اس کے ساتھ بھی گستاخی کرو گی۔ اس کا دل دکھاؤ گی۔ وہ پہلے ہی بہت
 نے قطعی انداز میں جواب دیا۔

”میرے باپ کو دکھی بھی اسی حویلی کے کسی قانون نے کیا ہوگا۔“

”ہم نہیں چاہتے ہمارا بیٹا اولاد کی گستاخی کا سامنا کرے۔ اس سے بہتر ہے، وہ اپنی اولاد کے مرنے کا
 مارے غیظ کے ادھر ادھر ٹھنسنے لگے۔

”آپ یہ بات آرام سے کہہ سکتے ہیں، اس لئے کہ میں آپ کی بیٹی نہیں پوتی ہوں۔“ وہ رد دی۔

”نادان لڑکی! تم نے سنا نہیں اصل سے سو پیارا ہوتا ہے۔ ہم نے جتنے ناز تمہارے اٹھائے، اس گھر
 نہیں اٹھائے۔ یہ ہمارے لاڈ پیار کا نتیجہ ہے کہ آج تم ہمارے سامنے گزبھری زبان لئے کھڑی ہو۔ ہم تمہیں
 کریں گے۔ ٹھیک ہے یا ورنہ ضرور بات کرو، مگر جو تمہاری بھانج اور بہنیں تمہیں کہیں، اس کے مطابق شادی
 ”ایک بات اور آئندہ تم ہم سے اس طرح کی گستاخی نہ کرنا۔ ہم نے زندگی میں پہلی بار اتنی برداشت
 ہو سکتا ہے آئندہ برداشت نہ کر سکیں۔ آؤ ہمارے ساتھ۔ ہم تمہارے باپ سے تمہاری بات کرادیتے ہیں۔“
 سے کام لے رہے تھے۔

”مگر میں کسی کے سامنے پاپا سے بات نہیں کر سکوں گی۔“ وہ ہچکچائی۔

”وہاں کوئی نہیں ہوگا۔“ وہ اپنی چھتری نکاتے مضبوطی سے قدم جماتے باہر نکل گئے۔ اور پیچھے پیچھے وہ بھی.....!

بابا صاحب اپنی خواب گاہ میں داخل ہوئے اور موبائل فون اپنے بیڈ سے اٹھا کر اسے تھمایا۔

”ہم نمبر بول رہے ہیں ملاؤ۔“ ان کے لہجے سے انتہائی سرد مہری ظاہر ہو رہی تھی۔
 ”یہ ہے میری آزاد زندگی، اپنے باپ کا کانٹیکٹ نمبر بھی معلوم نہیں تھا، وہ کڑھ رہی تھی اور نمبر پیش کر
 رہی تھی۔

نمبر ملا کر اس نے فون بابا صاحب کی طرف بڑھا دیا۔ انہوں نے کانوں سے لگا کر کچھ توقف کیا۔ ”ہاں..... یا ورنہ..... ہم
 بول رہے ہیں۔ یہ تمہاری بیٹی اپنی شادی کے مسئلے پر تم سے بات کرنا چاہ رہی ہے، بات کرو۔“ انہوں نے فون روشنی کی طرف
 بڑھایا۔

”نہ جانے کیوں وہ نظریں نہ اٹھا سکی۔ دلاور علی خان کے لہجے سے چھلکنے والی برہمی طنزیہ ہو کر جیسے بے دم سی کرنے لگی تھی۔
 ”اپنے کمرے میں جاؤ اور اطمینان سے بات کرو۔“ وہ شملہ سر سے اتار کر اپنے بستر پر بیٹھتے ہوئے اسی انداز میں گویا
 ہوئے۔

”جسٹ اے منٹ پاپا..... ہولڈ پلیز۔“ اس نے آہستگی سے کہا اور تیزی سے تقریباً بھاگتی ہوئی کمرے میں آگئی اور
 دھپ سے اپنے بیڈ پر بیٹھ گئی۔

”السلام علیکم پاپا! وہ ذرا حواسوں میں آئی۔

”والسلام..... کیا بد تمیزی ہے یہ؟“ دوسری طرف سے یاوہر علی خان کی ناراض آواز سنائی دی۔

”وہ دم بخود رہ گئی..... جی!“ (ابھی تو میں نے بات بھی نہیں کی)

”کیا کہہ رہے ہیں بابا صاحب؟“ یاوہر علی خان برہم لہجے میں پوچھ رہے تھے۔

”آپ کو پتا ہے پاپا کہ.....!“ وہ اٹکنے لگی۔

”مجھے پتا نہیں تھا۔ آج صبح بابا صاحب نے بتایا ہے۔ اس طرح کے کام ان کی ذمہ داری ہیں۔ ان معاملات میں وہ بہتر
 فیصلہ کرتے ہیں۔ اس لئے کہ آج تک جو عزت انہوں نے کمائی ہے، اس کی حفاظت کا احساس ان سے زیادہ کسی کو نہیں ہو
 سکتا۔“

”مگر پاپا۔“

”یہ اگر تمہیں کہاں سے آئے ہیں۔ جب میری شادی طے ہوئی تھی تو میں انگلستان میں پڑھ رہا تھا۔ مجھے اپنی مگنی کی
 تعداد بڑی فون موصول ہوئی۔ میں مرد تھا اس کے باوجود جبکہ تم اس گھر کی لڑکی ہو۔ جس کو دنیا جہان کی نعمتیں بغیر محنت کے
 حاصل تھیں۔ حتیٰ کہ حاکمانہ زندگی۔ کیا کسی انسان کیلئے یہ سب کافی نہیں۔ آخر تمہیں اتنی ہمت کیسے ہوئی کہ بابا صاحب سے
 سوال جواب کرنے لگیں؟“

”پاپا! میں آپ کی بیٹی ہوں، آپ کو میری بات سننا چاہیے، آپ نہیں سنیں گے تو پھر کون سنے گا؟“ وہ ہچکیں لے کر

رونے لگی۔

”کیا تمہیں نیتوں پر شبہ ہے کہ ہم تمہارے متعلق غلط فیصلہ کریں گے یا تمہیں تکلیف دینا چاہیں گے۔“
”میرا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے پاپا۔“

”جب یہ مطلب نہیں تو پھر بحث کرنے سے فائدہ؟“ وہ ہنوز برہم تھے۔

”پاپا! آپ کو شاید پتا ہی نہیں کہ بابا صاحب نے اچانک اور اتنی جلدی یہ فیصلہ کیوں کیا ہے اس تمام کارروائی سے کون سا اہم واقعہ چھپا ہوا ہے۔“ وہ رورہی تھی۔

”مجھے کچھ جاننے کا شوق بھی نہیں ہے میں بس اتنا جانتا ہوں کہ میرے باپ سے زیادہ ہمارے خاندان کیلئے کیا نہیں ہو سکتا اور ان کا کوئی فیصلہ بے معنی نہیں ہو سکتا۔“ وہ اسی لہجے میں کہہ رہے تھے۔

”آخر آپ حقیقت جاننا کیوں نہیں چاہتے؟“

”کھوج اس وقت ہوتی ہے جب شک یا شبہ ہوتا ہے مجھے اپنے باپ پر نہ شک ہے نہ شبہ۔“ وہ ڈانٹنے کے انداز میں کہہ رہے تھے۔

”مگر بات سن لینے میں حرج کیا ہے پاپا؟“ وہ بری طرح رورہی تھی۔ آخری امید بھی ختم ہو گئی تھی۔ عجب حواس ہلکے عالم تھا۔

”مجھے لگتا تو تھا کہ جیسے میں آپ کی اولاد نہیں ہوں مگر آج یقین ہو رہا ہے۔“

”شب آپ روشی میں شام چھ بجے تک پہنچوں گا“ اچھی مینی کی طرح جو کہہ رہے ہیں اس پر عمل کرو۔ رات میں ان تھیں۔

”میرے کمرے میں آنا اور جو بات کہنا چاہتی ہو کہہ لینا بلکہ جو جو بات بھی کہنا چاہتی ہو۔“

وہ اس کی سسکیوں کو کافی دیر سے جھیل رہے تھے۔ اب برداشت کی حد ہو گئی تھی۔ آخر باپ تھے۔ مگر وہ جتنا اپنے اپنے جانتے تھے وہ نہیں جانتی تھی۔ اپنی بات گنوا کر نظروں سے گرنے انہیں منظور نہیں تھا۔

”پھر کیا فائدہ ہو گا پاپا۔“ اس کے لہجے میں درشتی در آئی۔

”گھبراؤ نہیں روشی، اگر تمہیں مجھ سے محبت ہے ذرا سی بھی تو بابا صاحب کو پریشان مت کرنا۔“ منگنی دگنی ہونا لگا۔
خاص بات نہیں ہوتی، باقی باتیں رات کو کریں گے، خدا حافظ۔“ یاور علی خان نے ریسور رکھ دیا تھا۔

ایک لمحے کو تو اسے یقین ہی نہیں آیا یاور علی خان کے بدلے ہوئے لہجے پر۔۔۔۔۔ ان کے الفاظ پر۔۔۔۔۔ وہ سانس کی بجلی گئی۔

”منگنی دگنی ایسی کوئی خاص بات نہیں ہوتی۔“ یہ جملہ تو اسے حیرت سے مارنے کو کافی تھا۔ دو دھیرے دھیرے۔

ہوئی بابا صاحب کے کمرے میں آئی۔ دو دونوں ہاتھوں کا تکیہ بنائے۔۔۔۔۔ لیٹے ہوئے عجیب کو گھور رہے تھے۔

اس نے دبے پاؤں آگے بڑھ کر فون سائڈ ٹیبل پر رکھ دیا۔ اور لاور علی خان کی طرف بڑھے بغیر باہر آ گئی۔
”کلو۔“ اس نے راہداری میں جھرا ڈال گئی کلو کو پکارا۔

”جی ہاں بی۔“

”سمیہ بھابی کو بھیج دو کہنا آکر مہندی لگا دیں میں اپنے کمرے میں ہوں۔“

اس نے لحظہ بھر رک کر پیغام دیا اور کمرے میں واپس آ گئی۔ ڈرائنگ ٹیبل کے آئینے میں اس نے اپنا چہرہ دیکھا، آنکھیں رونے کی وجہ سے سرخ ہو رہی تھیں۔ اس نے خواہ مخواہ بالوں میں برش چلانا شروع کر دیا تھا۔

اسی دم۔۔۔۔۔ دھڑ سے دروازہ کھلا۔ وہ سب کی سب سمیہ بھابی سمیت اندر داخل ہوئی تھیں۔ سمیہ اور گلو کے چہروں پر تعجب اور بات کے چہروں پر خوشی تھی۔ وہ کارپٹ پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی تھی اور دایاں ہاتھ بھابی کے سامنے پھیلا دیا تھا۔

گلیو بے ہوش ہوتے ہوتے بچی تھیں۔ اس نے سوٹ کیس کو جولت ماری تھی۔ اس کا دھماکہ ابھی تک ان کے کانوں میں رزش پیدا کر رہا تھا۔

انہوں نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ چھوا۔

”برہم نہیں ہوا مجھے بالکل ٹھیک ہوں۔“ اس نے جھلا کر اپنا سر جھٹکا۔

”یائٹی یہ اتنی دیر میں کیا ماجرا ہو گیا۔“ ان کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔

”کرنگل کا جنگل برا ہو گیا۔“ وہ گنگنائی۔

”ہینٹ دس گی پکڑ کے ستانے کو ہم ہی رہ گئے ہیں؟“ گلو کھسکیاں۔

”ہو سکتا ہے آپ کے علاوہ اور بھی ہوں مگر دور ہوں فی الحال۔“ شینو بھی سب کو غائب پا کر ڈھونڈتی ہوئی وہیں آ گئی۔

روشنی کے ذہن میں اچانک جھماکا سا ہوا۔ باری کے تصور سے جانے کیا کیا اسے سوچنے لگا۔ اب اسے ہنسی آرہی تھی۔

آخر اس نے کچھ کس کا دیا ہوا اعتماد تھا۔ اس نے شاید پہلی بار مسکرا کر شینو کو دیکھا تھا۔

گھر میں خاصے عرصے کے بعد تقریب ہو رہی تھی اور وہ بھی اچانک۔ لڑکیوں کو اس بات کا شکوہ تھا کہ انہیں تیاری کا

وقت بھی نہیں دیا گیا اور یہ کہ انہیں رکھے ہوئے پہنے ہوئے کپڑے پہننا پڑ رہے ہیں۔ وہ آتے جاتے روشی کو اس طرح گھور

رہتی تھیں کہ جیسے سارا تصور اسی کا ہو۔
”پاپا بیکے ٹک روشی کو مہندی لگتی ہے۔ گلو اس کے کپڑے پر پس کر کے بیڈ پر ڈال گئیں کہ آدھ گھنٹے بعد مہندی سوکھ جائے۔“

”جب تک میں تیار ہو جاتی ہوں پھر آکر تمہیں دہن بناؤں گی۔“

نہ بچی تھیں نہ مہر کے افراد پورے نہیں آئے ہوئے ہیں۔ اس پر بھی روشی کی حالت میں تغیر نہ پا کر وہ دو تین مرتبہ باری کا

کرکچ تھیں کہ اس کے نہ ہونے سے آج کی تقریب کے انتظامات میں بڑی الجھن ہو رہی ہے۔ لڑکے تو اپنے اپنے

دھندوں سے تھکے ہارے لوٹے ہیں۔ وہ کیا کر سکتے ہیں۔ روشی تو مگر جیسے کان دبائے بیٹھی تھی۔ بالآخر مٹی کی پٹری مایوس ہو کر اپنی تیاری میں لگ گئی تھیں۔

جس وقت روشی غسل کر کے باہر آئی تو اطلاع ملی۔ دولہا اور ان کی والدہ بھی حویلی پہنچ چکی ہیں۔

گلو نے پہلے ڈرا بستر سے اس کے بال خشک کئے پھر اسے کیپ پہنا کر ہلکا ہلکا میک اپ کرنے لگیں۔

دولہا، ان کی طرف سے زیور کا مکمل سیٹ آیا تھا جس میں نتھ، بندیا تک شامل تھی۔ جب کہ ایک اور سیریز تھا وہ چوہ (ہائی نیک قسم کا مگوبند) اور جھمکیوں وانگوٹھی پر مشتمل تھا۔

”گلو اسے تیار کرتے وقت کئی بار پوچھ چکی تھیں کہ بابا صاحب نے اسے کیا کہا؟ اور یہ کہ انہوں نے ڈانر جواب میں مکمل خاموشی اختیار کئے ہوئے تھی۔ بلکہ دھیرے سے سرا بھی دیتی تھی۔ جبکہ سمیہ کا خیال تھا کہ وہ ڈانٹا تھا کہ سیدھی ہو گئی ہے۔

گلو اسے تیار کر کے دوپٹا سیٹ کر رہی تھیں کہ ماما جی پھولوں کے زیور لے کر آ گئی۔

”یہ تو بڑی بیگم نے بھجوائے ہیں۔“ مگلو نے مخاطب ہوئی۔

”لو دیکھو تمہیں بڑی شکایت تھی کہ بڑی امی لڑکیوں کو پھول پہننے نہیں دیتیں۔ آج انہوں نے یہ ڈیرال بھیجے ہیں۔“ گلو نے اس کی پیشانی چوم لی۔

تھوڑی دیر بعد گلو پیغام لے کر آ گئی کہ ”بڑی امی کہہ رہی ہیں روشی بی بی کو ہم رسم کیلئے بال کمرے میں لائے اس کے جاتے ہی زری اور روبی اسے لینے آئیں۔“

”پاپا آگئے؟“ روشی کا دل جانے کیوں تیز تیز دھڑکنے لگا تھا۔

”انہیں آئے ہوئے تو ایک گھنٹے سے زیادہ ہو گیا۔“ روبی نے جواب دیا۔

روشی کو یک گونہ سکون کا احساس ہوا۔ جیسے دھوپ میں چلتے ہوئے معاصرک کے کنارے گھٹا درخت غرا سنانے کے خیال ہی سے آدھی تھکن اتر جائے۔

وہ اسے لئے بال کمرے میں چلی آئیں۔

آتش گلابی زرتہ شرارہ سوت میں بسن بنی روشی کو دیکھ کر اس کی کزنز کے چہرے خوشی سے جھمکانے لگے۔ وقت گلو نے کمرے میں داخلہ بند کر دیا تھا۔ اسے ایک صوفے پر بٹھا دیا گیا تھا۔ دائیں طرف بڑی امی اور بائیں والدہ تھیں۔ بڑی امی نے بسما سے کہنے کو کہا۔

اور نعیم کی والدہ نے اس کی انگی میں انگوٹھی پہنا دی۔

روشی کو یک دم نامعلوم احساس نے بے چین کر دیا۔ ایسا لگا جیسے کچھ کھو گیا ہو۔ وہ زیادہ دیر نہ بیٹھ سکی اور روشی بیٹھی نہ وہ اپنے کمرے میں جانا چاہتی ہے۔

انہوں نے اسے چند منٹ بیٹھے رہنے کو کہا کہ تصویریں بن رہی تھیں۔ جب کہ اسے ایک ایک لمحہ بھاری

چاہ رہا تھا کہ کسی طرح بھاگ کھڑی ہو۔

بشکل آدھا گھنٹہ برداشت ہو سکا پھر وہ روبی کے ساتھ اپنے کمرے میں آ گئی۔

”روبی! دیکھو مجھے کوئی ڈسٹرب نہ کرے۔“ میں کھانا سب کے ساتھ نہیں کھاؤں گی اور ہاں میں پپا کے بیڈروم میں جا رہی ہوں۔ یہاں بیٹھوں گی تو سب ڈسٹرب کریں گے۔“

وہ روبی کو حیران پریشان چھوڑ کر شرارہ سنبھالتی کمرے سے باہر چلی آئی اور محتاط انداز میں ادھر ادھر دیکھتی یا در علی خان کی خواب گاہ کی طرف بڑھی۔ مگر بری طرح چونک کر فٹک کر اپنی جگہ پر جم رہی گئی تھی۔

باری سینے پر ہاتھ لپیٹے بڑے الجھے ہوئے انداز میں اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ راہداری کے عین درمیان میں اس طرح ایستادہ تھا کہ وہ سیدھی سیدھی نہیں گزر سکتی تھی۔

وہ ذرا سی تر چھی ہو کر اس کے پاس سے گزرنے لگی۔ وہ تیزی سے عین اس کے سامنے یوار کی طرح کھڑا ہو گیا۔

”ایک سیکنڈ تو رُک جائیں مبرا کہہ نہیں لیں گی۔“ وہ بڑی ٹھیکڑی سے منی طلب تھا۔

”میں بقیہ ہوش و حواس بچا کے کمرے میں جا رہی ہوں۔ مجھے ان سے بہت ضروری باتیں کرتا ہیں۔“
 ”اب کیا ضروری باتیں باقی ہیں؟ کیا یہ کہ شادی کتنے دنوں میں ہوگی۔ کیا بارات کراچی سے آئے گی۔ یا یہ کہ شادی
 جلد سے جلدی نہیں ہو سکتی؟ دیر کرنے سے کیا فائدہ؟ اور یہ کہ.....“
 ”اور یہ کہ تمہارا سر۔“ روشی نے جھلا کر اس کی بات کاٹی۔ ”تم اتنے انٹرنسٹ کیوں ہو۔ تمہاری بلا سے میں جیوں یا
 مردوں؟“

”تمام مناظر آپ نے مجھے دکھائے ہیں، کچھ معاہدے کئے ہیں۔ انٹرنسٹ پیدا ہونا تو بڑی فطری سی بات ہے۔ مگر یقین
 کریں۔ میں واقعی بہت خوش ہوں۔ آپ نے سچ بچ بڑی حقیقت پسندی اور ہوش مندی سے کام لیا ہے۔ کراچی سے جو بوجھ
 اپنے سر پر لے کر چلا تھا آج اتر گیا۔ میں خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کر رہا ہوں، ورنہ یقین کریں میری توراتوں کی نیند اڑ گئی تھی
 “۔ وہ بہت پرسکون انداز میں مسکرا رہا تھا۔

روشی نے روح میں پیوست ہو جانے والی نظریں اس پر جمادیں۔
 ”تو پھر جاؤ، شکرانے کے نفل پڑھو۔ بے کار مجھ سے باتیں کر کے وقت ضائع کر رہے ہو۔ تم سمیت یہ سارا گھر ہی مجھے
 ہینک سمجھتا ہے۔ سب ہی اس طرح خوش ہو رہے ہیں جیسے سروں سے بلا ٹل رہی ہے۔“ وہ دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر
 سک پڑی۔

”روشی بی بی۔“ باری ایک دم شپٹا گیا۔ آراستہ و پیراستہ مگر سسکتی ہوئی روشی اسے پھر سے الجھن میں ڈالنے لگی تھی۔ اسے
 تو پہلے ہی اس کے اطمینان سے خوف آ رہا تھا۔ الجھن ہو رہی تھی۔
 ”ہٹو میرے سامنے سے، کاش! تم قصائی ہوتے۔“

وہ تقریباً بھاگتی ہوئی یا در علی خان کے بیڈروم تک گئی تھی اور وہ بہت الجھے ہوئے انداز میں چہرہ موڑ کر شرارہ سنبھال کر
 بھاگتی ہوئی روشی کو دیکھ رہا تھا۔

یا در علی خان کے بیڈروم کے باغ کی طرف کھلنے والے در پہنچے تھے۔ اور باہر باغ سے روشنیاں کمرے میں آرہی
 تھیں۔ جب کہ کمرے کی تمام لائٹیں آف تھیں۔ یقیناً مردانہ تقریب باغ میں ہو رہی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی در پہنچے
 میں آکھڑی ہوئی۔ بلکہ اوٹ میں کھڑی ہوئی۔ باہر کا جائزہ لینے لگی۔

آج باغ کی تمام لائٹیں آن تھیں۔ جو کسی تقریب کی واضح علامت ہوا کرتی تھیں۔ دو تین صوفہ سیٹ اور اطراف میں لگی
 رنگ برنگی فولڈنگ چیئرز تھیں۔ جن پر اکثریت گھر کے مردوں کی براجمان تھی۔ مرکزی صوفے پر بابا صاحب، یا در علی خان،
 علیم الدین بڑے ابا اور علیم براجمان تھے۔ اکا دکا گاؤں کے دیگر اہم افراد بھی دکھائی دیے۔
 سیاہ و زسٹ میں ملبوس کم عمر سافیم سرخ ٹائی اور رومال سے سوٹ مکمل کئے بہت ہی پر تکلف انداز میں بیٹھا تھا۔ جواد
 کیمرا سنبھالے ادھر ادھر ٹھہرتا دکھائی دیا۔ جب کہ باری دکھائی نہیں دیا۔ تمام مردوں میں اگر کوئی بہت شاندار دکھائی دے رہا

☆.....☆.....☆.....☆.....☆

”کیوں نہیں لوں گی؟ دو گے تو ضرور لوں گی۔“ وہ ڈھلکتے آچھل کو سنبھالتے ہوئے لا پرواہی کے انداز میں بات کر رہی
 تھی۔

”جب میں کنوئیں کر رہا تھا تو آپ ہتھے سے اکھڑ رہی تھیں۔ اب یہ آٹا ناٹا انقلاب؟ وہ مسکرایا۔

”تم سے مطلب؟ تمہیں تو اس کی مطلق پرواہ نہیں کرنا چاہیے۔“ وہ نظریں چرا رہی تھی۔

”پرواہ تو خیر نہیں کر رہا۔ بس اپنی حیرت کا اظہار کر رہا تھا مگر ابھی تو مہمان موجود ہیں، آپ کہاں بھاگی جا رہی ہیں۔

ابھی تو مسٹر نعیم کو انگوٹھی پہنائی جائیگی۔ ہو سکتا ہے۔ آپ اپنی افتاد طبع سے مجبور ہو کر یہ منظر دیکھنا چاہیں۔ میں آپ کی مدد کرتا

ہوں۔“ وہ سینے پر ہاتھ باندھے براہ راست اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔

”نعیم کو دیکھنا تھا، دیکھ لیا۔ باقی تو تمام باتیں عام سی ہیں۔ میں ذرا تھک گئی ہوں۔“ وہ مسکرائی۔

”مگر آپ کا کمر تو پیچھے رہ گیا، اس طرف تو یا در چچا کا بیڈروم ہے، کیا مارے خوشی کے.....؟“

اس نے معنی خیز انداز میں مسکرا کر جملہ ادھر ادھر اچھوڑ دیا۔

تھا تو وہ اس کے پپا تھے۔ نوی بیوسوٹ میں ٹانگ پر ٹانگ رکھے، صوفے کے ہتھے پر بازو جمائے اپنے ہونٹوں کو بچ سے گاہے گاہے چھوتے ہوئے وہ اطراف پر نظر دوڑا رہے تھے۔ مگر اس کے باوجود صاف محسوس کیا جاسکتا تھا کہ وہ کچھ سوچ میں ہیں۔

غالباً کھانا شروع ہونے کا وقت ہو گیا تھا۔ بابا صاحب کی قیادت میں ایک ایک کر کے سب اندر مردانہ ہال کی طرف جانے لگے۔ ذرا سی دیر میں باغ میں خاموشی چھا گئی۔ وہ بھی درتپے سے ہٹ کر صوفے کی طرف بڑھی۔ خود بخود ہی چکی تھی کہ کسی منظر نے اسے ذرا یاد نہیں۔ وہ بہت پرسکون تھی۔ اس نے اپنے باپ کا ایک جملہ اپنی گرفت میں لے لیا۔
”مستثنیٰ کوئی خاص چیز نہیں ہوتی۔“

اس نے صوفے سے پشت ٹکا کر آنکھیں موند لیں۔ ابھی اس کیفیت میں بیٹھے اسے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ باغ کی طرف سے ایک خوبصورت نغمہ اس کے کانوں میں جلتی لگا۔ وہ یکسو ہو کر سننے لگی مگر اسے اس وقت چکر چلا۔ جب ایک ہی نغمہ تیسری مرتبہ شروع ہوا۔ وہ اپنا ملبوس سنبھالتی پھر درتپے میں آن کھڑی ہوئی۔ باغ میں کرسیوں کے سروں پر ڈیک رکھے ہوئے تھے۔ یہ اہتمام لازماً موسیقی کے رسیا فاران نے کیا ہوگا۔

اس نے سوچتے ہوئے اس طرف نظر ڈالی۔ جہاں چھوٹی سی ٹیبل پر پلیئر اور کمیشیں رکھی ہوئی تھیں۔ اسے خاصی چیز کے چند پڑی محفوظ کرلو۔ اٹھو یا۔ شاباش۔ اس طرح جواد بھی سب کے ساتھ کھانے میں شریک ہو جائے گا۔ اتنے ڈھیلے ہوئی۔ وہاں ”زاد خشک“ باری بیٹھا ہوا تھا۔ وہی گیت اب چوتھی مرتبہ رپوائنڈ کر رہا تھا۔ نغمہ ایک مرتبہ پھر پورے ہال کیوں ہو رہے ہیں۔ بخار و خارتو نہیں ہو گیا؟ وہ کیا کہتے ہیں دشمنوں کے کان تیز۔ وہ اسے کاندھوں سے پکڑ کر اٹھا رہا تھا۔ ساتھ فضا میں بکھر رہا تھا۔

میرا ایمان محبت ہے، محبت کی قسم !

ساری دنیا تیرے قدموں پہ نچھاور کر دوں
چاند تاروں سے میری جاں تیرا دامن بھر دوں

تیرے خوابوں پہ کبھی چھان نہ سکے شام الم
میرا ایمان محبت ہے، محبت کی قسم

وہ جہاں ایک جہنم ہے جہاں تو نہ ملے
جل کے مر جاؤں جو یہ سایہ گیسو نہ ملے

زندگی زہر بھرا جام ہے اب تیرے بغیر
تیری چاہت پہ قربان ہیں میرے لاکھ جنم

میرا ایمان محبت ہے، محبت کی قسم !

مسکرا جان بہاراں کہ سویرا ہو گا !
ختم صدیوں کے رواجوں کا اندھیرا ہو گا !

شب کی قسمت میں لکھا ہے گزر ہی جاتا
راہ سورج کی کہاں روک سکے اہل ستم
میرا ایمان محبت ہے، محبت کی قسم !

”تم کھانا نہیں کھا رہے؟“ اچانک سامنے سے ندیم نمودار ہوا۔

باری نے پلیئر آف کر دیا۔ ”مجھے فی الحال بھوک نہیں ہے۔“ اس نے بڑی سنجیدگی سے جواب دیا۔

”مگر..... ہال میں آؤ جاؤ..... دیکھو تو سب کھانا کھاتے ہوئے کیسے لگ رہے ہیں۔ تم جواد سے کمرالے کر دو لہامیاں

اس نے سوچتے ہوئے اس طرف نظر ڈالی۔ جہاں چھوٹی سی ٹیبل پر پلیئر اور کمیشیں رکھی ہوئی تھیں۔ اسے خاصی چیز کے چند پڑی محفوظ کرلو۔ اٹھو یا۔ شاباش۔ اس طرح جواد بھی سب کے ساتھ کھانے میں شریک ہو جائے گا۔ اتنے ڈھیلے ہوئی۔ وہاں ”زاد خشک“ باری بیٹھا ہوا تھا۔ وہی گیت اب چوتھی مرتبہ رپوائنڈ کر رہا تھا۔ نغمہ ایک مرتبہ پھر پورے ہال کیوں ہو رہے ہیں۔ بخار و خارتو نہیں ہو گیا؟ وہ کیا کہتے ہیں دشمنوں کے کان تیز۔ وہ اسے کاندھوں سے پکڑ کر اٹھا رہا تھا۔ ساتھ فضا میں بکھر رہا تھا۔

”تیر نہیں بہرے۔“ وہ صبح کرتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ اب مسکرا رہا تھا۔

”مگر تمہارے دشمن بھی تمہارے لیول کے ہوں گے۔ بڑے الرٹ قسم کے ہوں گے۔ ایسے لوگ بڑی تیز حسیات کا

سمیت رکھتے ہیں۔ فار یور کانسڈ انفارمیشن“۔ ندیم نچل ہونے کے بجائے ڈھٹائی سے بولا۔

”جھٹکس فار انفارمیشن“۔ وہ بھی اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر ہنس دیا۔

”کیا لگا بابا صاحب کا انتخاب؟“ ندیم اور باری اب اندر کی طرف بڑھ رہے تھے۔

باری کی ہلکی سی آواز آئی۔ وہ کوشش کے باوجود نہ سن سکی تو جھلا کر صوفے پر بیٹھ گئی اور کچھ دیر قبل کی صورتحال پر غور کرنے لگی۔ گیت کی طرز گلوکار کی آواز اور اشعار درحقیقت بے حد پر تاثیر تھے۔ جیسے ہنوز اس کی سماعت سے نکرار ہوا تھا۔ ”کیوں سن رہا تھا یہ گیت بار بار..... بے حس..... نہیں بلکہ پتھر..... ایک دم ٹھس۔“

دور صدیوں کے رواجوں کا اندھیرا ہو گا

ہونہ..... پڑے پڑے ہوئے ہیں۔ یہ انھیں گے اور سر کا دیں گے۔ کیسے دور ہو گا اندھیرا؟ ان کے والد صاحب آئینے معائنہ راعی کی طرح لٹکارتے ہوئے۔ کیونکہ ان کے بس کی تو بات نہیں۔ ”تا بعد اری کا میڈل جیتے بغیر سانس نہیں لیں گے حضرت۔“

اس نے وال کھا ک کی سمت نظر دوڑائی۔ جب تک پپا سے صاف صاف بات نہیں ہوگی۔ نیند بھی نہیں آئے گی۔ وہ ایک انا خبر اٹھا کر صوفے پر نیم دراز ہو گئی۔

”کیوں آئی ہو اس طرف؟“ انہوں نے اپنی جگہ پر کھڑے کھڑے سوال کیا۔

”ایسی نفرت کا فرکو بھی کہے سے نہ ہوگی جتنی آپ کو مجھ سے ہوگی۔ اس حویلی میں پتھروں کی کمی تو نہیں۔ آپ مجھے پتھر

”نہیں مارتے؟“ وہ آگے بڑھی۔ بیڑیوں کی کھنک ساری فضا میں سرایت کر گئی۔

”خان! یہ تو نہیں کہتی کہ مجھے زبردے دیں۔ یہ تو نہیں کہتی مجھے گولی مار دیں۔ یہ بھی نہیں کہتی کہ میری گردن اڑا دیں۔

”سان موت تو میں بھی نہیں مانتی۔ میری کھال میں جتنے مسام ہیں اتنے پتھر ماریں۔ اتنی دھاریں خون کی نکالیں مگر پھر مجھے

خاف کر دیں۔ جب میری روح میرے بدن سے نکلنے لگے تو بس اتنا کہہ دیں آپ نے مجھے معاف کر دیا۔

”موت آتی ہے خان۔ نہ معافی ملتی ہے۔ ادھر یا ادھر کچھ تو ہو۔ یا تو مجھے یہ احساس دیں کہ میں زندہ ہوں یا یہ احساس

دیں کہ میں مر چکی ہوں۔ مجھے چکی کے دو پاٹوں کے بیچ سے نکالیں۔ میرا جسم نہیں، میری روح آزاد کر دیں۔ خان اللہ کے

واسطے۔“

”ٹھاپ۔ سروسٹی! اسے اس کی کوٹھڑی میں لے جاؤ۔“ یاد علی خان کی آواز غصیلی مگر دھیمی تھی۔

”ہاں خان۔“ سروسٹی عورت کا بازو تھام کر کھینچنے لگی۔

”میں نہیں جاؤں گی۔ مجھے خان سے باتیں کرنا ہیں۔“ عورت نے ایک جھٹکے سے بازو چھڑا لیا۔

”دیکھو اگر تم باز نہیں آئیں تو تمہیں حویلی سے نکال کر بارہ پتھر دور بھیج دیں گے۔“ یاد علی خان نے جاتے جاتے رک کر

اسے دھکی دیا۔

”رک جائیں خان۔ فیصلہ کر کے جائیں۔“ وہ بیڑیاں چھٹکاتی ان کی طرف بڑھی۔

”کجاں بند کرو۔ تمام فیصلے ہو چکے۔ دفاع ہو جاؤ یہاں سے۔“ وہ برہم ہوئے۔

”خان۔۔۔۔۔۔ اب تو مرنے کے دن دور نہیں۔ آپ ایسا کریں، مجھے ”سرائے“ بھجوا دیں۔“

یاد علی خان کا ہاتھ فضا میں بلند ہوا۔ اور وہیں رک گیا۔ جیسے انہوں نے بمشکل خود کو روکا تھا۔

”سروسٹی! اس کی زنجیریں کھینچ کر اسے کوٹھڑی میں لے جاؤ۔ تمہاری ڈیوٹی اس پر ہے پھر یہ باہر کیسے آ جاتی ہے۔ آئندہ

ایسا ہوا تو تمہیں بھی اس کے ساتھ کوٹھڑی میں بند کر دیں گے۔“

”خان۔ روشنی بی بی۔“

”ٹھاپ۔ اس گھر کے کسی فرد کا نام تمہاری ناپاک زبان پر نہیں آنا چاہیے۔“

”تیز قدم بڑھاتے اندر کی طرف چلے گئے۔ ان کا بلند پریشربائی ہو رہا تھا۔ تمام جسم زلزلے کی زد میں تھا اور چہرہ

”نانا! ان کی بھاری آواز راہداری میں گونجی۔“

”جی خان۔“ وہ دوڑتی ان کے پاس آئی۔

”دو کپ کافی میرے کمرے میں لے آؤ۔“

حالانکہ اسے سو فیصد یقین تھا کہ اسے نیند نہیں آئے گی۔ اس کے باوجود آنکھ لگ گئی تھی۔ یاد علی خان کے پاس بیٹروم میں داخل ہوئے تھے۔ اور روشنی کو صوفے پر دراز دیکھ کر چونک پڑے تھے۔

کتنی ضدی اور خود سر ہو گئی ہے یہ۔ انہوں نے دلہنا پے کی چھب سے پر نور روشنی پر ایک سرسری نظر ڈالا۔ ایک دم بوڑھا محسوس کرنے لگے۔ ان کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی کہ وہ روشنی کو جگا کر اپنے کمرے میں جانے کو کہیں۔

ان کا وجد ان کہہ رہا تھا کہ روشنی کے جاگنے سے طوفان جاگ پڑیں گے۔ وہ کوٹ اتار کر آہستگی سے لٹکانے لگے۔ معاً انہیں درتپے کے پار دونوں آوازوں نے متوجہ دیا۔ باہر درختوں پر قہقہے ہنوز روشن تھے۔

برخواست ہونے کا مکمل تاثر بھی فضا میں موجود تھا۔ وہ تیزی سے درتپے کی طرف بڑھے۔

”ڈابڈی ضدی طبیعت تساں دی۔ بہوں دیر ہو گئی اے۔ ہن تساں جلو۔ تساں نوں رب دا واسطہ۔ واسطے۔“

آساں تے ساڈی خیر نہیں۔ تمہیتی جلو۔“ (چلو)

سروسٹی کو ”بند کو“ زبان کے علاوہ کوئی زبان نہیں آتی تھی۔ وہ گھاس پر بیٹھی عورت سے مخاطب تھی۔ یعنی اے چلنے کو کہہ رہی تھی۔ اسے ڈر رہی تھی کہ بڑے خان ادھر آگئے تو دونوں ہی کی خیر نہیں۔ لہذا یہاں سے جلدی چلو۔

”فیر۔۔۔۔۔۔ میں کی کر ساں۔۔۔۔۔۔ آن دیو اتاں ناوں۔۔۔۔۔۔ تساں ڈر دے او؟ تے بھجو اتھوں۔“

پھر ساں؟“ (پھر میں کیا کرو؟ انہیں آنے دو۔ تم ڈرتی ہو تو بھاگو میں نے تمہیں پکڑا ہوا ہے؟) جواباً گھاس پر بیٹھی عورت نے بھی ہند کو میں بڑی تنگی سے جواب دیا۔

”ہک داری میں توں روشنی بی بی ناں گل کر لین دے۔ ہن تے فیرای جل ساں اتھوں۔“ (ایک بار روٹا

بات کرنے دے۔ اب تو تب ہی جاؤں گی)

”وڈے خان مینوں ساڑو اتناں ساں۔“ سروسٹی لرزتی آواز میں کہتی ہوئی دوزانو بیٹھ گئی (بڑے خان مجھے

بنادیں گے)

یاد علی خان نے پلٹ کر روشنی کی سمت دیکھا اور نہایت آہستگی سے درتپے کے پٹ بند کئے اور اسی تیز رفتاری سے باہر آئے۔ اور باہر باغ کا رخ کیا۔

اور ان دونوں سے تھوڑے فاصلے پر رک گئے۔ ”تمہارے ساتھ کون ہے سروسٹی؟“ وہ بہت دھیمی مگر بارعب آواز میں اس سے مخاطب ہوئے۔

اور سروسٹی کی تو جیسے کھٹکھی بندھ گئی۔ کوشش کے باوجود حلق سے آواز نہ نکل سکی۔

”میں کیا پوچھ رہا ہوں سروسٹی؟“ ان کے لہجے میں بلا کی ناراضگی تھی۔

معا گھاس پر بیٹھی ہوئی عورت اٹھ کھڑی ہوئی۔ اور ماحول ایسا ہو گیا جیسے باغ نہ ہو زنداں ہو۔ بیڑیوں کا شور۔

چادر سرکانے لگا۔ اور یاد علی خان نے کوفت بھرے انداز میں گہری سانس سینے سے خارج کی۔

”دو؟“ ماما بلی نے الجھ کر ان کی شکل دیکھی۔
 ”روٹی بھی میرے کمرے میں ہے۔“ وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئے۔

غور اس کا رویہ۔ بہت نرم اور شفیق محسوس ہو رہے تھے۔

شکوہ نہ جانے کیوں ان کو پہنچا۔ اور ایک پلیٹ میں تھوڑے سے چاول اور سلاڈ لے کر کھانے لگی۔

انہوں نے کرسی کی بیک سے پشت ٹکا کر اس کا چہرہ

”روٹی بیٹے اٹھو۔ اپنے کمرے میں جا کر آرام سے سو جاؤ۔“ روٹی نے کسمسا کر دوسری طرف چہرہ ہلایا۔

”چھپرہ روتی ہے ہاتھوں میں۔“
 ”سخت قحط ہے میری زندگی میں خوشخبریوں کا۔“ وہ ایک دم بے صبری ہو گئی۔

دھندلانے لگا۔ انہیں یوں لگا جیسے ان کی بیٹی بہت سارا رونا چاہتی ہے۔

”ہم کراچیا جا رہے ہیں۔“ انہوں نے آگے جھک کر سنگریٹ کی راکھ جھاڑی۔

”ہم؟“ وہ چونک پڑی۔

”ہاں..... میں اور تم“۔ ان کے انداز میں بلا کا سکولن تھا۔

”صرف؟“ اے جیسے یقین نہ آیا۔

”صرف“۔ وہ میرے سے مکرانے۔

”خالد کے ہاں؟“ اس نے غور سے ان کی طرف دیکھا۔

”ہاں۔“ انہوں نے نظریں چرا کر منہ سے دھواں خارج کیا۔

اور رشتی کو اٹھاواوٹ پٹا ہم گفتگو اور ”فرمائش“ یا دعا گئی۔ وہ قدرے بجل سی ہو کر ابھیں چوری چوری دیکھنے لگی۔

اگر کا خیال تھا کہ اب تو جب بھی پراسے سامنا ہوگا، پہلی فرصت میں سخت ستھنے کو ملے گی مگر توقع کے سراسر برعکس ہو

غذا - شاید یہاں اُن عادت کے مطابق برداشت سے کام لے رہے تھے۔ ضبط تو بلا کا ہے۔ پیما میں - کاش میں تھوڑی سی

چڑھتا جاؤں۔ اگلے گویا خود ہی اپنی کمزوری کا اعتراف کیا اور سبکدوشی سے یا در علی خان کو دیکھنے لگی۔

”آپ کی ساری ساری کھالیں لے کر لینا چاہیے۔ یقیناً پاپا خوش ہوں گے۔“

”بٹ آئی واز پزل۔“ اس نے کہہ کر جلدی سے چمچہ منہ میں رکھ لیا۔

”دوست“ وہ واقعی نہیں سمجھے۔

اس نے جچے میں چاول بھر کر منہ کی طرف لے

”او“۔ دو جہر کے

”ڈزن میٹر“۔ ”ڈزن میٹر بیٹا“۔

”اچھا۔ ہم بات کر رہے تھے۔“

اب اسرار ہے تختے کراچی کے پروگرام پر، تم تیاری رکھنا۔ میرا شو فر پہلے تمہیں ہری پور لائے گا۔ پھر ہم وہاں

سے کراچی کیلئے روانہ ہوں گے۔ مگر ایک بات۔“

وہ تنبیہ کے انداز میں انگلی اٹھا کر بولے۔

”جی ہاں۔“ اس کے خوش ہونے کے عمل میں کھٹائی سی پڑی۔

”یہاں کسی کو اپنے کراچی کے پروگرام کے بارے میں نہ بتانا۔ بھٹک نہ پڑے کسی کو۔“

”بابا صاحب کو بھی نہیں۔“ اس نے بے تابی سے ان کی بات کاٹ دی۔

”انہیں بھی نہیں۔ اگر یہاں کسی کو پتا چل گیا تو میں تمہیں ساتھ نہیں لے جا سکوں گا۔“ انہوں نے ہنس

کہا۔

”کیا آپ ڈرتے ہیں ان سب سے؟“ آپ تو ”ان ڈیپنڈنٹ“ ہیں؟“ اسے جیسے باپ کا ڈرنا پسند نہیں آیا۔

”ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ جب بہادری بغیر عقل کے ہوتی ہے تو وبال جان بن جاتی ہے۔ جب غرور

ہے تو کسی یقینی فتح کی بنیاد بن جاتی ہے۔“ وہ بہت تدبیر سے سمجھا رہے تھے۔

روشنی نے بہت محبت اور ستائش سے باپ کی طرف دیکھا۔

”بے موقع کام کرنے سے انسان تماشا بن جاتا ہے اور ہاتھ بھی کچھ نہیں آتا۔ جب رسی موٹی ہو اور

آہستہ کٹتی ہے۔ نہ ایک وار میں نہ ایک جھٹکے سے۔ تم جو کچھ آج کرنے جا رہی تھیں۔ اس سے تمہیں کوئی

میرے حصے میں ایک عظیم دکھ کا اور اضافہ ہو جاتا۔“

وہ آہستہ آہستہ اس کے من چاہے موضوع کی طرف آئے۔ کیونکہ انہیں یقین تھا اب اس کی گفتگو کارآمد

کی طرف مڑ جائے گا۔

روشنی کا دل سینے میں تیز تیز دھڑکنے لگا۔ بہر حال وہ ایک مخصوص ماحول کی پروردہ تھی۔ باپ کے عین

تذکرہ ایک نئی بات تھی۔

”مگر ہاں..... وہ۔“ اس نے کچھ کہنا چاہا۔

”تم فکر نہ کرو۔ اگر تم اس رشتے سے خوش نہیں ہو تو کچھ نہیں ہوگا۔“ انہوں نے نیا سگریٹ نکالا۔

روشنی تو جیسے ریشہ عطمی ہو گئی۔ ”سچ ہاں۔“ اس کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔

انہوں نے روشنی کے خوشی سے جھمکتے ہوئے چہرے پر ایک نظر ڈالی۔ اور سگریٹ سلگانے لگے۔

”کیا میں وجہ پوچھ سکتا ہوں؟“ انہوں نے خامے سے تردد سے سوال کیا۔

”کوئی وجہ نہیں۔“ اس نے نظریں جھکا لیں۔

”کیا تمہیں کوئی پسند ہے؟“ انہوں نے جھکی جھکی نظروں سے نیا سوال کیا۔

روشنی کا دل پسلیاں توڑ کر باہر آنے لگا۔ کیا آج پاپا سارے شہروں کا حساب باقی کر دیں گے؟

سے اعلان کر دے کہ وہ کیا چاہتی ہے۔

”مگر بیٹے۔ ایک بات کا ہمیشہ خیال رکھنا تمہیں میری طرف سے خاص رعایت حاصل سہی کہ تم کو ایفائیڈ والدین کی

ہو۔ اور میں مختلف تقریبات میں خواتین کے حقوق پر خطاب کرتا ہوں۔ مگر۔ ہمارا ایک اسٹینڈر مین ٹین ہو چکا ہے۔ کوئی

قدم اٹھانے سے پہلے اپنے مقام اور حیثیت کو مد نظر رکھ لینا۔ تم اس ملک کے درجہ اول کے شہریوں میں شمار ہوتی ہو۔

تو تم معاشی اور سماجی طور پر فلی اسٹرونگ ہو۔ ہم جاگیر دار لوگ ہیں۔ سرکاری عہدے بھی کلاس ون لیول کے قبول کرتے

ہیں۔ ہر شے میں ہمارا انتخاب کلاس ون لیول کا ہونا چاہیے۔ دوسری صورت میں تم مجھ سے کسی طرح کی مدد اور تعاون کی امید

رکھنا۔“

انہوں نے ہراسے لے کر در پیچ کی طرف کان لگا کر کچھ سننے کی کوشش کی۔ روشنی کا جھمکا تا چہرہ ایک دم پھیکا پڑ گیا۔

”پاپا! انسان کی ذاتی قابلیت اور اہلیت بھی تو کوئی چیز ہوتی ہے۔“ وہ دھیسے انداز میں مخاطب تھی۔

”شیر۔ مگر انسان کی اسٹرونگ پوزیشن تب ہی سمجھی جاتی ہے جب اس کے باپ دادا کا بیک گراؤنڈ بھی اچھا ہو۔“

انہوں نے اپنے مخصوص بردباری کے انداز میں جواب دیا۔

”اگر کسی کو اس کے باپ دادا ہی کا پتا نہ ہو تو۔“ اس نے ہچکچاتے ہوئے سوال کیا۔

”نہیں۔“ وہ دھیرے سے مسکرائے۔ ”سلی گرل۔“ انہوں نے راکھ جھاڑی۔

”یعنی؟“ وہ واقعی کچھ سمجھی نہیں۔

”یعنی یہ کہ ایسا شخص ہماری جاگیر میں۔ صرف ہمارے ملازمین کی لائن میں کھڑا ہو سکتا ہے۔“

”چاہے وہ کتنا ہی قابل اور لائق کیوں نہ ہو؟“

”بھولوٹی۔ یہ ہماری اسٹش مجبوری ہے۔“ انہوں نے قدرے الجھ کر بیٹی کے چہرے پر نظر دوڑائی۔

”جو تمہارے دل میں ہے کہہ دو۔ میں ہمیشہ کیلئے تمہیں کسی نتیجے پر پہنچا سکتا ہوں۔“

اس باران کا لہجہ خاصا سرد اور پر تکلف تھا۔ جیسے وہ کسی انہونی کیلئے پیش بندی کر رہے ہوں۔

”مگر تو بیٹے پوچھ رہی تھی آج اتنے ہیں ناں ذہن میں سپلیمنٹری کو کس چیز۔“

”ایک کباب اٹھا کر کھانے لگی۔ اور چہرے پر جی بھر کر بے نیازی طاری کرنے کی کوشش کرنے لگی۔

”تو آؤ اور پلٹیں؟“ انہوں نے بیٹی کو بہت محبت سے دیکھا۔

”نہیں۔“ اس نے کم صم انداز میں جواب دیا۔

”جو کچھ ہوا ہے اب یہ میرا ”ہیڈک“ ہے تمہارا نہیں۔“

”مگر اس سے لوٹ ڈیڑھ پاپا۔“ وہ فی الحال اس تازہ ترین پیدا شدہ مسئلے کے حل پر ہی خوش تھی۔

”ڈیڈنڈ کیس کا اظہار بھی نہیں کرتا۔“ انہوں نے تاکید کی۔

”ڈیڈنڈ کیس۔“

”ڈیڈنڈ کیس۔“ فلائنگ میں کافی ہے۔ ایک کپ کافی بناؤ۔ کھانا کھا لیا ہے؟“ انہوں نے سائیڈ ٹیبل پر رکھے فلاسک کی

طرف اشارہ کیا۔

”جی میں کھا چکی۔“

”سوئیٹ نہیں لوگی؟“

”نہیں موڈ نہیں ہے۔ پیٹ بھر کر کھالوں گی تو ڈراؤ نے خواب آئیگئے۔ رات بھی تو خاصی ہو چکی ہے۔“

”اب انشاء اللہ ڈراؤ نے خواب نہیں آئیگئے۔“ وہ مسکرائے۔

روشنی کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں تھا۔ عجب اندیشوں میں لپٹی ہوئی خوشی ملی تھی۔

”ہم کراچی کتنے دن رکیں گے پاپا؟“ وہ کافی بنانے لگی۔

”کچھ کہہ نہیں سکتے۔ چار پانچ سوٹ رکھ لینا۔ بہت ہوں گے۔“ انہوں نے کہا۔

”پھر میں وہاں آپ کے ساتھ شاپنگ بھی تو کروں گی۔“ اس نے کپ یاور علی خاں کو تھمایا۔

”شیور..... تم کافی نہیں لوگی؟“

”نہیں..... پھر نیند نہیں آئیگی۔ آپ کو کافی پی کر نیند آ جاتی ہے؟“ اس نے پوچھا۔

”نیند؟“ یاور علی خاں نے اپنی سرخ آنکھیں ایک لمحے کو اس پر مرکوز کیں۔

”آپ کی آنکھوں سے تو لگتا ہے آپ سوتے ہی نہیں ہیں۔ پاپا آپ آئی اسپیشلسٹ کنسلٹ کیوں نہیں لیتے؟“

”آئیز ریڈ کیوں رہتی ہیں؟“ وہ معصومیت سے ان سے پوچھ رہی تھی۔

”اچھا۔“ وہ مبہم سا مسکرائے مجھے کبھی دھیان ہی نہیں آیا اب تم نے توجہ دلائی ہے تو ضرور کروں گا۔“

”جی..... آپ کا دھیان رکھنے والا بھی تو کوئی نہیں ہے۔ می بوتس تو کم از کم۔“

اسے جانے کیا یاد آ گیا ایک دم سے شرمندہ سی ہو کر چپ ہو گئی۔

”می نہیں ہیں تو کیا ہوا بیٹی تو ہے۔“ انہوں نے ایک اڑتی پڑتی سی نظر درپے کی جانب ڈال لیا۔

انداز میں جواب دیا۔

”اچھا اب میں چلتی ہوں۔ کیا میں آپ کے ساتھ ہری پور جاؤں گی؟“ وہ جاتے جاتے رک گئی۔

”نہیں..... میں تمہیں بلوالوں گا۔“

”گڈ نائٹ پاپا۔“ وہ دونوں ہاتھوں میں اپنی جیولری سمیٹتے ہوئے باہر نکل گئی۔

”گڈ نائٹ گڑیا۔“ وہ آہستگی سے بولے۔

وہ نہ جانے کس دھن میں تھی۔ ایک دم شرار سے میں الجھ کر گرتے گرتے بچی۔

”کیا صیبت ہے حاصل نہ وصول کچھ۔ انٹی چورٹ ہی لگ جاتی۔“ وہ دیوار تمام کر جھٹائی۔

”خود شہ سے باتیں شروع کر دی ہیں۔ کیا باتیں کرنے والے معذرت کر چکے ہیں۔“

”ہاں۔“ ایک کھٹک کر سامنے دیکھا۔ باری ایک۔ کوئی ہاتھ سے چھارتے سے زینے کی طرف۔

”تم سے مطلب؟“ وہ چیخ کر گویا ہوئی۔

”اجی اب ہم کس قابل ہیں۔ بڑے بچے رہے تھے آج نعیم صاحب۔“ وہ مسکرا رہا تھا۔

”اپنے دینے ٹیٹ کرا لو۔ کوئی فالٹ آ گیا ہے۔“ وہ دائیں بائیں سے شرارہ سمیٹ کر بڑے مصروف انداز میں مشورہ دے رہی تھی۔

”باری نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے خاصی حیرانی سے اس کی سمت دیکھا۔

”اگر مگر کی چار دیواری میں موجود افراد میں سے کسی پر تحقیق سے پی ایچ ڈی کی ڈگری ملتی تو میں آپ پر ہی پی ایچ ڈی

کرتا۔“ اس نے برساتی کوٹ کا منہ پر لاد کر قدم بڑھا دیئے۔

”ظہر۔“ وہ بے ساختہ بولی تھی۔

”لیجے ظہر گیا۔ حکم؟“

”کہاں جا رہے ہو؟“

”بڑا عجیب سوال ہے۔ نیچے تو زمین پر یہاں وہاں نکلنے کے چانسز ہوتے ہیں۔ اوپر جا کر چھلانگ تو ماروں گا نہیں۔“

”دیر سے فس دیا۔“ ظاہر ہے اپنے کمرے میں ہی جا رہا ہوں۔“

”میں نے آج تک تمہارا کمرہ اندر سے دیکھا ہی نہیں۔ تعجب ہے۔“ وہ واقعی حیران تھی۔

”کبھی دن میں تشریف لائے گا ہمارے ہاں۔“ وہ زینے پر چڑھنے لگا۔

”بڑی اچھی جوائس ہے تمہاری بہت اچھا لگتا تھا۔“

”وٹھک کر رک گیا اور گردن موڑ کر اسے دیکھنے لگا۔“ کون سا لگا؟“

”دنی جو باغ میں تم گیارہویں مرتبہ سن رہے تھے کہ ندیم بھائی آ گئے تھے۔“ وہ فاخرانہ مسکرائی جیسے اسے شرمندہ کر کے کوئی دیرینہ تمنا پوری کر رہی ہو۔

”اچھی چیز سب ہی کو اچھی لگتی ہے۔ دل چاہے تو مجھ سے کیسٹ لے کر سن لیجیے گا۔ مجھے اس کے اشعار یاد نہیں رہتے۔

”اس کی طرز اور آواز اچھی ہے۔ اس لئے اچھا لگتا ہے۔“ وہ بے نیازی سے جواب دے کر تیزی سے زینے چڑھ گیا۔

”ہونہ۔“ اشعار یاد نہیں رہتے بہت ہی پوز کرتا ہے۔ اتنی دفعہ تو سنا ہے کوئی بہرا بھی اتنی مرتبہ سنتا تو اسے بھی یاد ہو

ہوتے۔ پتا نہیں اسے گھمنہ کس بات پر ہے۔“ وہ جھلاتی ہوئی اپنے کمرے میں گھس گئی۔

”بھائی..... کہاں ہیں آپ؟“ وہ کچن کے دروازے پر ایسا دھ تھا۔

”لو بڑا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ کچن کے دروازے پر اس کا دو پٹا پڑا ہوا تھا۔ وہ ایک دم ہی سامنے آ گیا تھا۔ وہ بغیر دوپٹے

پہنے ہوئی تھی۔

”خوارش کا احساس دلاتی چند شکلیں اس کی پیشانی پر نمودار ہوئی گئی تھیں۔ بھلا اس طرح ایک دم سامنے آ جانے کی کیا

تک تھی؟ اتنا جڈ تو دکھائی نہیں دیتا۔ اس نے دوپٹا کھینچ کر سر پر ڈال لیا۔
”فرمائیے۔“ اس کے لہجے میں خود بخود تلخی آگئی۔

”ہماری آنکھیں بند رہتی ہیں بھابی! خاص طور پر عورتوں پر نظر ڈالنا تو ہم نے بالکل چھوڑ دیا ہے۔ اپنے
تو ہم فاتحہ پڑھ چکے ہیں۔ سردی بہت لگ رہی ہے۔ شاید بخار تیز ہو گیا ہے۔ ایک کبیل اور دے دیں۔ کراہیں
اور زور دے کر ہم آواز دے نہیں سکتے۔ اس لئے ہمت کر کے خود کو کھینچتے ہوئے یہاں تک آئے ہیں۔

لازماً آپ ستم گر ہوں گے

آپ کی شکل بڑی پیاری ہے

وہ بڑبڑانے کے انداز میں شعر پڑھتے ہوئے واپس پلٹ رہا تھا۔

بالوکا دھیان کہیں اور تھا اس کی سمجھ میں شعر کیا خاک آتا۔ اس کی حساس طبیعت تو جیسے یہ سن کر ہی تڑپ
سخت بخار کی وجہ سے سردی لگ رہی ہے۔
وہ تیزی سے اسٹور کی طرف گئی تھی۔

اور لال خان کا لایا ہوا میڈان یو ایس اے قسم کا بلیٹک لے کر اس کمرے میں چلی آئی جہاں عارف کا تاج
”عارف بھائی! یہ کبیل۔“ اس نے دور ہی سے اسے متوجہ کیا۔

”شکریہ بھابی۔“ وہ بے دم انداز میں اپنے بیڈ پر گر پڑا تھا اور تیز تیز سانس لے رہا تھا۔ بالوکھڑی دیکھتی
دیکھا عارف میں تو پہلے سے موجود کبیل اٹھانے کی سکت نہیں۔ بالآخر وہ آگے بڑھی۔ عارف کی آنکھیں بند تھیں۔
اس نے آہستگی سے کبیل اس پر پھیلایا۔ پھر ساتھ لایا ہوا دوسرا کبیل بھی اس پر ڈال دیا۔ اور سیدھی کھڑی ہوئی
اگلی بات کا انتظار کرنے لگی۔

”بھابی..... لال خان۔“ سے کہنا پہلی فرصت میں میری ماں کو اطلاع کر دے کہ میں آپ کے ہاں.....
پوری کر رہا ہوں۔ ملنا چاہے تو آکر مل جائے۔“ اس کی آواز بہت دھیمی اور کمزور تھی۔
”ایسی باتیں کیوں کرتے ہیں عارف بھائی؟ آپ انشاء اللہ اچھے ہو جائیں گے۔“ وہ چھوٹے سے دل کی لڑائی
گئی۔

کم نہیں نازش ہم نامی چشمِ خواہاں

تیرا بیمار برا کیا ہے گرا چھانہ ہوا

اور بھابی وہ جو آگے کہا ہے چچا غائب نے کہ.....

درد منت کش دووانہ ہوا

میں نہ اچھا ہوا برا نہ ہوا

وہ کھانسنے لگا۔ بالوحیران پریشان سی کھڑی تھی۔ ”توبہ نشے کی طرح عادی ہے شعر پڑھنے کا۔ اس حالت میں

اتنا تیز چلتا ہے۔“ وہ سوچ رہی تھی۔

”آپ کیلئے چائے لاؤں عارف بھائی؟“ اس وقت اس کا دل انسانی ہمدردی سے لبریز تھا۔
”نہیں بھابی..... اس وقت تو ذرا سا اٹھنا محال ہے۔ کچھ کھانا پینا محال ہے۔ اس کیلئے میں لال خان کا انتظار کئے لیتا
ہوں۔ شکریہ۔“
”آپ لیٹے لیٹے اللہ اللہ کرتے رہیں۔ دل کو سکون ملتا ہے۔“ اسے بروقت یہی ہمدردانہ فعل بھائی دیا کہ اسے ”یاد
الہی“ کی ترغیب ہی دے ڈالے۔

کاٹ دیتا ہے کتنے بند عدم

بندہ ذوالجلال ہو جانا !

”مگر“ وہ خود ہی شعر کہہ کر فس دیا۔ ”مگر..... بھابی۔“

اب آخری عمر میں کیا خاک مسلمان ہوں گے

”آپ کی عمر زیادہ تو نہیں۔“ بالوکے منہ سے بے ساختہ نکل گیا تھا۔

”عمر کا پانچ سال نہیں قوت حیات ہوتی ہے بھابی۔“ وہ اس کی سادہ لوحی پر مسکرا دیا۔

اس نے مصرعے سے اپنے مطلب کی بات اخذ کر لی تھی۔ اور بس..... وہ درحقیقت اتنی گہرائیوں میں اترنے کی
ملاحت نہیں رکھتی تھی۔

”میں آپ کیلئے نمکین دلیہ بنا لیتی ہوں۔ وہ دوپہر کا کھانا کھانے آئیں گے تو آپ ان کے ساتھ کھا لیجیے گا۔“ وہ باہر
نکلے ہوئے بولی۔

”آپ کے وہ جب تک آئیں گے میں پیاسا سر جاؤں گا“ فرشتے آپس میں بحث کر چکے کہ صحرا میں بھٹک کر مرا ہے۔ حلق
میں کانٹے دکھائی دے رہے ہیں۔“

”میں ابھی لاتی ہو پانی۔“ وہ شرمندہ سی ہو گئی۔

کچن میں تل سے پانی لیتے ہوئے اسے دھیان آیا وہ تو اٹھ کر بیٹھنے کے بھی لائق نہیں۔ پانی کیسے پیے گا؟ کیا وہ اسے
ہمارا دے کر اٹھائے گی؟ اسے جھرجھری آگئی۔ بالکل نہیں۔ یہ تو وہ کبھی نہیں کرے گی۔ شوہر کی غیر موجودگی میں کسی نامحرم کے
اس قدر قریب جانا سراسر فتنہ ہے۔ اوہ اسے ایک دم دھیان آ گیا۔ اس نے ایک چمچہ ساتھ لیا۔ مسئلے کا حل سمجھ میں آتے ہی
پر سکون سی ہو گئی تھی۔

وہ واپس عارف کے کمرے میں آئی اور چمچے میں پانی لے کر اسے متوجہ کیا۔

”عارف بھائی پانی۔“

”ہاں۔ خواب تو اچھا ہے۔ یوں بھی ساحلی شہر میں رہتا ہوں پانی ادھر بہت ہے، مگر منہ میں تو اس وقت صحرانہ کوٹ لے
رہا ہے۔“

”یا اللہ۔ اتنا کمزور ہونے پر اس قدر بولتا ہے۔ طاقت آگئی تو کیا عالم ہوگا۔“

”چچہ لائی ہوں ساتھ۔ آپ آنکھیں بھی کھولیں اور منہ بھی۔“ وہ زچ ہو گئی تھی۔

عارف نے قہقہہ کی، وہ اسے پانی پلاتی رہی۔ وہ اس کی سمت دیکھنے کی بجائے چھت کی طرف دیکھتا رہا۔

”ارے کیا بہت حالت خراب ہے۔“ پیچھے سے لال خان کی گھبرائی ہوئی آواز آئی۔

بالو کے ہاتھ سے گلاس فرش پر جا پڑا۔ یہاں وہاں کرجیاں بکھر گئیں۔

”کیا میں دروازہ بند کرنا بھول گئی تھی۔ کھلا ہوا تھا؟“ دل بری طرح دھک دھک کر رہا تھا۔ وہ لرزتی ہوئی

اور شیشے کے ٹکڑے اٹھانے لگی۔ مگر نہ جانے کیوں نظریں اٹھا کر لال خان کی سمت نہ دیکھ سکی۔

”کوئی بات نہیں ایسا ہو جاتا ہے۔ انسان اپنے دھیان میں ہو تو اچانک آواز سے چونک پڑتا ہے۔ میں تو

پاؤں واپس آیا تھا کہ کہیں میرا ریا پیا سا نہ مر جائے۔ یہ تمہاری بھابی اسے تو بہت شرم آتی ہے۔ شکر ہے اس نے غیور

بوجھ لیا۔ اب چلو اٹھو۔ اسپتال میں داخلے کا بندوبست کر کے آیا ہوں۔ باہر گاڑی کھڑی ہے۔“

لال خان نے عارف کو بازوؤں میں اٹھالیا۔ کرجیاں چنتی بالو نے نہ سراٹھایا نہ لال خان سے کوئی بات کی۔

اس کے ہاتھ پیروں کی جان کیوں نکل رہی تھی۔ بالکل ٹھنڈے پڑ گئے تھے۔

دروازہ بند کر لو بالو۔ لال خان کمرے سے باہر نکلتے ہوئے بولا۔

مگر بالو تو جیسے کسی پتھر کی طرح اپنی جگہ اٹل تھی۔ حالانکہ اس نے کوئی چوری نہیں کی تھی۔ مگر حالت چوروں

تھی۔ کیا سوچتے ہوں گے۔ یہ ویسے تو سامنے نہیں آتی اور جب میں موجود نہیں ہوتا۔ کہیں انہیں کوئی برا خیال نہ

حالانکہ وہ بے چارہ تین میں نہ تیرہ میں۔ آج مراکل دوسرا دن۔

مگر لال خان کو اس طرح غیر مرد گھر میں اکیلا نہیں چھوڑنا چاہیے۔ وہ اب تک اپنے مرد سے کھل کر بات نہیں

مگر اس کے دوست کو پانی پلا رہی تھی۔

وہ کم عمر تھی۔ بے بنیاد سو سے اس کے کچے ذہن کو پریشان کر رہے تھے۔ وہ ساتھ والا آمنہ کا باپ اپنی عورت

طعنوں سے کھاتا ہے۔ وہ اپنے آنگن میں کام کرتی سنا کرتی تھی۔ جب بھی غصے میں ہوتا ہے کھڑے کھڑے غریب

کے دس بیس ”یار“ گنوا دیتا ہے۔ اسے اس طرح کی باتوں سے ہمیشہ گھن آتی تھی۔ اور ایک مرد کا عورت پر کچھ

بہت مکروہ لگتا تھا۔ وہ سوچتی تھی کہ جب اس کی شادی ہوگی تو وہ ایسی عورت بنے گی۔ جس کی وفات پر اس کا شوہر

ہو۔

کہیں یہی واقعہ کبھی کا طعنہ نہ بن جائے۔

بار بار ایک فلم ذہن کے پردے پر چل رہی تھی۔

وہ پانی پلا رہی تھی۔ پیچھے سے لال خان آ گیا تھا۔

”یار باری! تم تو بالکل بے کار نکلتے۔“ فاران نے اسٹڈی میں باری کا پچھالیا۔ ”یعنی.....؟“ وہ کوئی کتاب ڈھونڈ رہا

تھا۔ ”بھلا یہ بھی کوئی بات ہوئی ایک شخص باہر سے آیا۔ ہمارے گھر کی ایک لڑکی پر ہاتھ صاف کیا اور چلتا بنا۔ یار گھر میں ہی

انے تھے۔ سوئپر ہو سکتا تھا۔“ وہ بڑبڑاتے ہوئے ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

”یعنی تو ہوئی ہے۔ کوئی نکاح تو نہیں ہوا۔ جا کر کہہ دو بابا صاحب سے۔“ باری کو مظلہ۔ کتاب نہیں مل رہی تھی۔

”شریف آدمی..... میں صرف اپنی بات تو نہیں کر رہا۔“ فاران ایک دم پھڑپھڑا کر رہ گیا۔

”تو پھر پرچی پر نام لکھ کر دے دو۔ یا اور چچا کمپیوٹر سے قرعہ اندازی کر لیں گے۔ کمپیوٹر کی تو سب مانتے ہیں یقیناً کوئی

مجرا بھی نہیں ہوگا۔“ وہ دوسرے شیلف کی جانب بڑھ گیا۔

”ارے میرے بھائی..... ارے سقراط کے کچھ لکتے۔ بات سمجھ میں آئی نہیں اور ہو گئے مشورے شروع۔ بھلا یہ غیروں

میں رشتہ کرنے کی کیا تک تھی؟ وہ بھی اتنی ایمر جنسی میں جیسے کوئی معرکہ ہو رہا ہو۔ ہار جیت کے مسئلے آ پڑے ہوں۔ تم نے ہم

میں سے کسی کو نہیں بتایا۔ حالانکہ تم تو وہ کمپیوٹر ہو۔ جس میں بابا صاحب کا سب کچھ فیڈ ہو جاتا ہے۔“ فاران پنچہ جھاڑ کر پیچھے

پڑا تھا۔

”آپ کو یقین نہیں آئے گا مگر..... واقعی مجھے کچھ نہیں پتا۔“ وہ تھک کر ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

”میں اپنی مردانگی کی بڑی حفاظت کرتا ہوں۔ معمولی سی ”زنانہ“ ملاوٹ مجھے پسند نہیں ورنہ ابھی لگا دیتا تمہیں قسموں پر

کہاؤ میرے سر کی قسم۔ الاں کی قسم اور فلاں کی قسم۔ ہم سب بہت شاکد ہیں۔ آپ کو مطلع کیا جا رہا ہے۔“

”اور یار میں نے تو سنا ہے وہاں کراچی میں بڑا مسکنگ ڈنر ہوا۔ زنانہ مردانہ کباٹن۔ یہ بھی غلط ہے؟“

”میں وہاں سے آچکا تھا۔ کیا کہہ سکتا ہوں۔“ باری کے سر میں درد ہونے لگا۔

”اچھا بتاؤ۔ اس گھن چکر میں ایسی کیا بات ہے جو اسے ترجیح دی گئی۔ ایسا تو یہاں ہوتا نہیں۔“

”آپ انٹرنیٹ تھے روشنی بی بی میں؟“ باری زچ ہو کر سوالات پر اتر آیا۔

”لاحول ولا قوۃ..... دماغ خراب نہیں ہے میرا جو سول انجینئر سے ایک دم شعبہ بدل کر مکینیکل انجینئر بن جاؤں۔ نٹ

اٹھیں رجتے ہیں۔“ اس کی طرف۔ ”کیا ہر وقت ٹول بکس اٹھائے پھروں گا؟“ فاران بری طرح سلگا۔

”پھر دھواں دھار زریں اظہار خیال کا مقصد؟“

”یار! سب بتاؤ اس ایمر جنسی کا؟ بتاؤ..... ایک رنگ روٹ کو اٹھا کر ”جیف“ بنا دیا گیا۔ ہمیں ایسے دیکھ رہا تھا جیسے ہم سب

”مٹا کر خور“ ہوں۔“

”اگر کوئی آپ میں انٹرنیٹ ہے تو بتائیں میں آگے نام پیش کر دوں گا۔“ اس نے باٹ کاٹی۔

”بابا صاحب کے فیصلوں کے بعد ہمارے ہاں لیکچر چٹنی جاتی ہے۔ میرے بار سوخ بھائی۔“ فاران نے دانت پیستے

”سر کی قیمت خواہ کتنی زیادہ کیوں نہ ہو ”دل“ کی قیمت سے زیادہ نہیں ہو سکتی۔ ہم انشاء اللہ سودا مہنگا ہی کریں گے۔ بلکہ کر رہے ہیں۔ زندگی اور کیریئر کا سن کر آپ خوفزدہ ہو گئے فاران صاحب۔ دل بھی کوئی منصب رکھتا ہے اس خاندان میں؟ ستنی بے توقیر شے ہے یہ۔ یہاں اس حویلی میں۔“
 وہ تنگی سے مسکرا رہا تھا۔
 ”زندگی خطرے میں دیکھ کر آپ نے بحث ہی سمیٹ لی۔ کچھ زندگی سے بھی زیادہ ہوتا ہے جو اس حویلی کے کینوں کے شعور سے ماورا ہے۔“

”پتھر کی حویلی سے پتھر کی قبر تک یہاں پتھروں ہی کی اہمیت ہے۔“
 اس نے کھولتے ذہن مگر کھوجتی نظروں سے بالآخر فیلف کے سب سے نچلے خانے سے مطلوبہ کتاب ڈھونڈ نکالی۔ اور اپنے کمرے میں جانے کے خیال سے باہر نکلے لگا۔

”یار..... باری۔ جسٹ اے منٹ..... ایک کانفیڈنشل ہے۔“ ندیم بڑا حواس باختہ سا اسٹڈی میں داخل ہوا تھا۔
 ”یعنی..... اس جان ناتوان پر ایک بوجھ مزید۔“ وہ مسکرا دیا۔

”یار! غضب ہی ہو گیا ہے۔“ اس نے اسٹڈی کی دروازہ بند کرتے ہوئے اگلا جملہ کہا۔
 ”پہلے یہ بتاؤ۔ تم نے کبھی کسی سے عشق کیا؟“ وہ آرام سے کرسی پر ڈھس گیا۔

ہاری قدرے ٹھنکا۔ پھر مسکرا دیا۔ ”عشق کرتے نہیں، عشق ہو جاتا ہے“ کرنا کا لفظ اس صورت میں استعمال کرتے ہیں۔ جب کوئی کام ارادے کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ اس پوزیشن میں ارادہ بالکل کام نہیں آتا۔“ وہ بھی بیٹھ گیا۔
 ”واہ یار۔ میری سوچ کے مطابق تم تو واقعی تجربہ کار نکلے۔“ ندیم کو جیسے اطمینان ہوا۔
 ”کیا مطلب ہے؟“ وہ قدرے الجھ گیا۔

”بات یہ ہے یار۔ وہ بھٹی انکل ہیں ناں۔ ان کا نمبر دو بیٹا میرا بیسٹ فرینڈ ہے۔ اس کی ایک بہن ہے جسے میں بالکل مگی بہن سمجھتا ہوں۔“

”یہاں تو کوئی منجائش ہی نہیں نکل رہی۔ گھر کی اکلوتی دختر نیک اختر کو تو آپ نے اپنی بہن بتالیا۔“ اس نے بات کاٹ دی۔ حالانکہ دلچسپی پیدا ہو رہی تھی کہ آخر قصہ کیا ہے؟

”یار! اس کی کزن آئی ہوئی ہے۔ یار میں نے بطور شرارت ایک دو مرتبہ اسے گھور کر دیکھ لیا۔“
 ”دو چار مرتبہ اور دیکھ لیجیے اگر آسانی سے نظر آ جاتی ہے۔“ وہ ہنس دیا تھا۔

”اوہ..... نہیں بھائی..... اوئے مگروں ای پے گئی اے۔“ (وہ تو پیچھے ہی پڑ گئی ہے) وہ کیا کہا ہے شاعر نے کہ

عاشق اپنا جان لیا ہے شاید ان نے میر ہمیں

دیکھ بھری مجلس میں اپنی ہم ہی سے شرماتا ہے

”یار! آج یہ رقعہ ملا ہے۔ اگر میں نے اس سے بے وفائی کی تو وہ خود کو آگ لگا لے گی۔“

”اب اگلا حکم سنائیے۔“ وہ رسائیت سے کہہ رہا تھا۔

”ہم سب اس ناگہانی پر حیران پریشان ہیں۔ اصل بات کا کھوج لگاؤ یار! کہیں لڑکی ماری نہ جائے۔ جو اذراں پریشان تھا۔ کہہ رہا تھا اس نے تصویریں بھی نہیں بنوائیں۔ کھانا بھی نہیں کھایا اور جلدی سونے چلی گئی تھی۔“

”وہ بہت خوش ہیں۔ ڈونٹ وری۔“ اس نے فاران کو بیچ میں ٹوک دیا تھا۔

”میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔“ اس نے فاران کو یقین دلایا۔

”پتا نہیں یار کیا ٹھیک ہے کیا غلط۔ مجھے تو لال جتی کی سپارنگ دکھائی دے رہی ہے۔ صحیح کہہ رہا ہوں میں۔“

”یقین کرو۔ اگر تمہارے ساتھ بھی روشی۔“

”مجھے میری اوقات میں رہنے دیں۔ فاران!“ وہ شاید فاران سے پہلی بار تنگی سے مخاطب ہوا تھا۔ جب ہی فاران کو کر رہ گیا تھا۔

”کیوں تمہاری اوقات کو کیا ہوا؟ Don't be complexed (احساس کمتری کا شکار نہ ہو) فاران نے اس سے سوال کیا تھا اور نصیحت بھی کی تھی۔“

باری سنی ان سنی کر کے اٹھ کھڑا ہوا۔ ”انٹرنیشنل لاء“ کی بک نہیں مل رہی۔

”پہلے ڈومیسٹک لاء پر عبور حاصل کرو۔ جھک نہیں مار رہا ہوں۔“ فاران جھلایا۔

”یہ میرا شعبہ نہیں، آپ سب مجھے بخش دیں۔“ وہ اس بار بجائے چڑنے کے مسکرا رہا تھا۔

”مگر تمہارا پروج فل ہونا تو شک و شبہ سے بالاتر ہے۔“ فاران نے ترکی بہ ترکی کہا۔

”مگر میرے پروج فل ہونے کی وجہ بھی یہی ہے کہ میں ”کانفیڈنشل“ ادھر سے ادھر نہیں کرتا۔“ بالآخر اس نے سچے سے قطعی جواب نہیں دیا۔

”اس کا مطلب ہے، تمہیں حقیقت معلوم ہے؟“ فاران اپنی جیت پر مسکرایا۔ باری خاموش رہا۔

”مجھے بتا دو۔ کسی سے نہیں کہوں گا۔“ فاران شاید سب کی نمائندگی کر رہا تھا۔

”وہ راز ہی کیا جو دوسرے کو منتقل ہو جائے۔“ وہ بدستور کتاب تلاش کرتا رہا۔

”اہمیت جتنا ہے ہو؟“ فاران قدرے خشکی سے گویا ہوا۔

”آپ کسی کی زندگی یا کیریئر کی قیمت پر بھی مجبور کریں گے؟“ وہ فاران کی طرف پلٹا اور اس کے چہرے پر ہلکا سا

”فاران نظریں نہ اٹھا سکا۔“ ہرگز نہیں، اب یوں بھی فائدہ نہیں ہے۔“

وہ اسٹڈی سے باہر چلا گیا۔ باری نے سکون کا گہرا سانس لیا۔

”سب اپنی اپنی پریشانیوں کا اظہار کسی نہ کسی سے کر دیتے ہیں۔ ہم اگر کسی سے کچھ کہہ سکتے ہیں تو یہ۔“
 ”دیواریں“ ہیں۔

ندیم نے رقعہ باری کی جانب بڑھایا۔

”آپ اسے رکھیں۔ یہ آپ کیلئے ہے۔“ وہ طرح دے گیا۔

”کچھ بھلاؤ باری صاحب۔ کچھ کرنہ بیٹھے یہ۔ اپنا تو بھٹہ بیٹھ جائے گا۔ عجیب نڈر لڑکی ہے، حویلی رنگ کرنے لگی ہے۔“

ندیم بہت پریشان تھا۔

”کیا بھلاؤں؟ اگر اچھے خاندانی لوگ ہیں تو آپ شادی کر لیجیے اس سے۔“ اس نے پرسکون چہرے و اعصاب ساتھ مشورہ دیا۔

”اس سے شادی کرنے کا ارادہ ہوتا تو تمہارے پاس ڈسکس کرنے کیوں آتا؟“ ندیم بھنا کر رہ گیا۔

”پھر گھورا کیوں تھا؟“ وہ اپنی سیراب اور چمکدار آنکھیں اس کے چہرے پر گاڑے ہوئے تھا۔

”یونیورسٹی بس کی عادت ہے آہستہ آہستہ چھوٹے گی۔“ وہ ڈھٹائی سے کہہ رہا تھا۔

باری کتاب ہاتھ میں تھام کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے چہرے پر بلا کی سنجیدگی تھی۔

”ندیم خان! ہو سکتا ہے آپ کو برا لگے۔ مگر ہم آپس میں ایک دوسرے سے مخلص رہے ہیں۔ یہ بھی یاد رکھیے گا۔“

رک گیا جیسے کسی تذبذب کا شکار ہو..... یا..... الفاظ ترتیب دے رہا ہو۔

”لڑکیاں شیشہ ہوتی ہیں۔ اور محبت ان کی کمزوری۔ ان سے نہیں کھیلے۔ یہ قتل عمد ہے۔ میرے نزدیک۔“

”شیشے کو معمولی سی بھاپ بھی چھو جائے تو عکس دھندلا جاتا ہے۔ جو ہمارا آپ کا ”صرف“ ہوتا ہے۔ وہ ان کا ”بہتر“ ہوتا ہے۔“ اس نے ندیم کی طرف دیکھے بغیر قدم آگے بڑھا دیئے۔

”تم کیسے دوست ہو؟ تم نے مجھے احساس جرم میں مبتلا کر دیا۔“ ندیم بے انتہا الجھ گیا تھا۔

”میں نے تو حقیقت کہی ہے۔ رد عمل آپ کا ذاتی شعور ہے۔“ وہ بہت دھیمے انداز میں کہہ رہا تھا۔

”مگر اس سے شادی کیسے کر سکتا ہوں۔ مجھے اس سے محبت تو نہیں ہے۔“ وہ اٹھ کر باری کے سامنے آکھڑا ہوا۔ ”اور ہاں یہ محبت کیا ہوتی ہے؟“ وہ سچ مچ احساس جرم میں مبتلا تھا اور شدت سے اس بات کا خواہشمند محسوس ہو رہا تھا کہ کوئی اسے اندرونی جنگ سے نجات دلا دے۔

خلیل جبران کہتا ہے ”محبت خود کو پیش کر دیتی ہے۔ یہ اپنے سوا کچھ نہیں چاہتی۔ امرتا پر تیم ایک جگہ لکھتی ہے ”محبت آگ ہے اور جدائی ہوا۔ آگ کم ہوگی تو ہوا اسے بجھا دے گی۔ آگ زیادہ ہوگی تو ہوا اسے اور بھڑکا دے گی۔ آپ ان سے دور رہیے۔ کچھ عرصہ انہیں نہ دیکھئے۔ اگر بہت یاد آئیں تو ان سے شادی کر لیجیے۔ ورنہ بڑے انسانوں کی طرح اپنی غلطی اعتراف کر کے معذرت کر لیجیے اور آئندہ کیلئے اس قسم کی شرارت سے توبہ کر لیجیے۔ مجھے اجازت۔“

”بڑی جلدی میں رہتے ہو۔“ ندیم غائب دماغی کی کیفیت میں تھا۔

”جی بس کچھ اسٹڈی کرنا ہے۔ پھر سکی۔ اوکے۔“ وہ تیزی سے باہر نکل آیا۔ مبادا کوئی نئی بات پیدا ہو جائے۔

”محبت خلیل جبران اور امرتا پر تیم کے احساسات پر تو منتج نہیں۔ ہر انسان کے ذاتی تجربات بھی ہوتے ہیں۔“

باری۔ ”جب ہم اپنے ذاتی احساسات چھپانا چاہتے ہیں تو دوسروں کی کبھی کوئی بات دہرا دیتے ہیں۔“ وہ زینے طے ہانگی۔ ”بہت بڑی حقیقت پسندی سے منس دیا۔“ گویا یہ جتاتے ہیں جو کچھ کہہ رہے ہیں دوسروں سے سن رکھا ہے۔ ذاتی طور پر کچھ نہ نہیں۔“

”مگر مسٹر باری آپ یہ کہہ سکتے تھے۔“

”محبت اس طلسمی پرندے کا نام ہے جس کے سنہرے پروں سے کرب کی آنچ آتی ہے۔ کہیں دور بسیط فضاؤں میں پرواز کرتا ہے مگر دل کے زنداں میں کسی قیدی کی طرح سر پھوڑتا محسوس ہوتا ہے۔“

”محبت اس کھیت کی طرح ہے جسے نیندیں قربان کر کے پانی لگاتے ہیں۔“

اور یہ کہ۔

”محبت تھک کر ابدی نیند تو سو سکتی ہے مگر مایوس نہیں ہوتی۔“

”یوں کہہ سکتے ہیں۔ محبت کائنات کا سب سے خوبصورت انکشاف ہے۔“

”یہ بھی کہہ سکتے ہیں دنیا میں جتنا بھی حسن نظر آتا ہے سب محبت کی تشریح ہے۔“

”آخری زینہ طے کر کے اپنے کمرے کی طرف مڑا اور کسی سے ٹکراتے ٹکراتے بچا۔“

”رات میں ”پیا کرو“ یوں بھی سب جلدی سو جاتے ہیں۔“ روشنی سنہیل کر حملہ آور تھی۔

”میں شاید کبھی دھیان میں تھا۔“ وہ کتر آکر آگے بڑھ گیا۔

”تمہارا کراؤ دیکھنے آئے ہیں۔“ وہ اس کے پیچھے چل رہی تھی۔

”آئیے دیکھ لیجیے۔ اس کی بے نیازی گہری نیند کی طرح ٹوٹ کر نہیں دے رہی تھی۔ وہ اس کے پیچھے کمرے میں داخل ہوئی۔“

”بھائی سادہ کرا تھا۔ لائٹ گرین اور وہائٹ کے امتزاج کا مظہر۔ فرنیچر وہائٹ پالش کا، پردے لائٹ گرین بیڈ شیٹ وہائٹ ڈیڈ کو گرین۔ اور وہائٹ پھول اور گرین زمین والا کارپٹ۔ ایک طرف شیلف کارنر پر بڑا سا گرین گلدان تھا جس میں تازہ پھول تھے۔“

”مجھے تمہارے کمرے میں آ کر تو قومی جذبہ بیدار ہو رہا ہے۔ اور قومی پرچم کو سلامی دینے کو جی چاہ رہا ہے۔“ وہ ہنسی۔

”اسے اہتمام سے رہتے ہو۔ اندازہ نہیں تھا۔“ وہ پھر گویا ہوئی۔

”ابھی ہمیں کہاں فرصت اہتمام کرنے کی۔ وہ تو پچھلے دنوں کا اپنا بیڈ روم سیٹ کر رہے تھے۔ کوئی مہربانی ولی رگ پر۔“

”وہ مگر یہی ہے۔ دراصل ان کا کمرہ بھی تو برابر میں ہے۔“

وہ مگر یہی ہے۔

”بابا صاحب نے کوئی آنکلیکشن نہیں کیا کہ کیوں پیسہ خرچ کر رہے ہو؟“ اس نے باری کا چہرہ غور سے دیکھا۔
”وہ مجھے غیر ضروری رعایت دیتے ہیں۔“ وہ مسکرا کر اس کی شکل دیکھنے لگا۔

”کیوں؟ تم میں کیا سرخاب کے پر لگے ہوئے ہیں؟“ وہ اپنی مخصوص نخوت کے مظاہرے سے باز نہ رہا۔
”انہی سے پوچھئے گا۔“

”تم ان کے گھوڑوں پر بہت محنت کرتے ہو شاید اسی لیے۔ وہ اپنے اصطبل کو حویلی پر فوقیت دیتے ہیں۔ بات یہ ہے۔“ اس نے بڑے بڑے انداز میں تجزیہ کیا۔

”بالکل یہی بات ہوگی۔ آپ ان کی پوتی ہیں۔ ان کے بارے میں زیادہ بہتر جانتی ہیں۔“ وہ ایک اخبار نویس لگا۔

”طنز کر رہے ہو؟“ وہ بدک گئی۔

”یہ تاب، یہ مجال، یہ طاقت نہیں واللہ!“ وہ دھیرے سے ہنس دیا۔

”تم برا کیوں نہیں مانتے؟“ وہ چڑ گئی۔

”وہ کیسے مانتے ہیں؟“ وہ پھر ہنس دیا۔

”کیا برا لگتا ہی نہیں ہے یا سنیس نہیں ہے یہ؟“ وہ ہنوز کھڑی تھی۔

”شاید سنیس نہیں ہے۔“ اس نے نہایت آسانی سے اتفاق کر لیا۔

”تمہیں تو یہ بھی سنیس نہیں ہے کہ کوئی کھڑا ہے تو اسے بیٹھنے کے لیے بھی کہہ دو۔“ وہ بازو لپیٹ کر شہلٹی ہوئی رہی۔
جا کھڑی ہوئی۔

”کمرابھی آپ کا ہے، گھر بھی آپ کا۔ جیسے چاہے استعمال کریں۔“

وہ پھر اسی سکون اور مسکراہٹ سے گویا ہوا۔

”مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ تم میری ”انجیج منٹ“ سے خوش نہیں ہو۔ خاصے بدلے ہوئے لگ رہے ہو؟“ اس نے کہہ دیا۔

”مائی گاڈ! یہ کیا آگیا آپ کے ذہن میں؟ مجھے تو اس قدر اطمینان ہے آپ کی اس تبدیلی پر کہ آپ انداز میں

سکتیں۔ بلکہ میں تو اس بات پر اُلجھ گیا ہوں کہ بابا صاحب نے شادی کے بجائے یہ منگنی وگنی کا چکر کیوں ڈال دیا۔

سیدھے شادی کر دیتے۔ جو کام ہر حال میں کرنا ہے، اس میں دیر کیوں کی جائے۔ آپ کی اس تبدیلی کا بھروسہ بھی نہیں

سکتا۔ یہ بات تو سب ہی جانتے ہیں کہ آپ موڈی اور۔۔۔۔۔“

”اور پاگل ہیں۔ بند کرو یہ تقریر۔ بڑے آئے وہاں سے میرے ہمدرد۔ شادی کر دیتے۔ شادی کر دیتے تو تیرے

کو اچھی طرح سے۔ میں تمہارے گلے میں تو نہیں لٹک رہی زبردستی۔ اپنی جان چھڑانے کی پڑی ہوئی ہے۔ کیا تمہیں

ہوں؟ بچی ہوں؟ میں تو اپنی جان چھڑانے کو تمہیں ڈھال بنا رہی تھی۔ تمہارا تو کام ہی یہ ہے کہ حویلی والوں کے

مرض کی ہو۔ تم شاید یہ سمجھنے لگے کہ میں تمہارے عشق میں مری جا رہی ہوں۔ نان سنیس۔“
دوبہی طرح مشتعل ہو گئی تھی۔ باری اسی طرح ہند سکون انداز میں بیٹھا اخبار رول کر رہا تھا۔

”ہانی پڑھنے لکھنے سے کیا ہوتا ہے۔ تم ہو کیا؟ میں نے تمہیں اہمیت دی۔ اس لیے کہ میں احمق ہوں۔ تم جانے کن

س میں اڑنے لگے۔ میں نے تو صرف یہ سوچا تھا تم استعمال ہونے والی شے ہو۔ تمہیں استعمال کرنے میں کوئی حرج

اس کا سانس تیز تیز چلنے لگا تھا۔ وہ دم لینے کو زک گئی۔

باری نے اٹھ کر سائیڈ ٹیبل سے جگ اٹھا کر گلاس بھرا اور اس کی طرف بڑھا دیا۔

”آپ سوچ رہی ہوں گی کہ جواب میں بھی کچھ کہوں گا۔ اس لیے آپ کو بتا دوں کہ میرے پاس کہنے کو کچھ نہیں ہے۔

پ کا قبضہ دت ضائع نہ ہو، اس لیے وضاحت کر دی ہے۔ آپ البتہ اور کچھ کہنا چاہیں تو کہہ سکتی ہیں۔ اگر میں نے آپ کو

رٹ کیا ہے تو میں آپ سے سوری کرنے میں کوئی قباحت محسوس نہیں کروں گا۔“

”یہ بول۔ یو۔ آئی ہیٹ یو۔ آئی ریلی ہیٹ یو۔ ورسٹ، ہیٹ یو۔“

اس نے باری کے ہاتھ سے گلاس لے کر کارپٹ پر دے مارا۔ اور خود بیڈ پر بیٹھ کر دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپا لیا اور

پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

دروازہ تھوڑا سا کھلا ہوا تھا۔ باری نے آگے بڑھ کر دروازہ ٹھیک طرح سے بند کیا۔ اور خاموشی سے کرسی پر بیٹھ کر دوبارہ

اخبار کھول کر نظر ڈالنے لگا۔ ایک آدھ منٹ بعد ایک اچھتی سی نظر روتی ہوئی روشنی پر بھی ڈال لیتا، پھر دوبارہ نظریں اخبار پر

دوڑانے لگتا۔

آخر پانچ منٹ بعد اس کی سسکیاں تھم گئیں۔ اس نے دوپٹے سے آنکھیں رگڑیں اور باری کی طرف دیکھا۔ عین اسی

لئے باری کی نگاہیں بھی اس کی طرف اٹھی تھیں۔ وہ بہت خونی انداز میں اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ باری نے بہت آہستگی

سے اپنی نظروں کا رخ دوبارہ اخبار کی طرف موڑ لیا تھا۔

”تمی چاہ رہا ہے اخبار سمیت تمہیں آگ لگا دوں۔“ وہ بیڈ سے اتر کر کھڑی ہو گئی۔

باری اخبار رول کر کے ٹھوڑی کے نیچے کا کر مسکرا کر اسے دیکھنے لگا۔

”میری طرف سے کوئی مزاحمت نہیں ہوگی۔ آپ شوق پورا کریں۔“

”ہونہہ!“ وہ پاؤں پٹختی آگے بڑھی اور جھٹکے سے دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔

باری اسی انداز میں بیٹھ جانے کس سوچ کے پاتال میں بہکنے لگا تھا۔

یاد علی خان کو گھمے ہوئے تیسرا دن تھا۔ اس نے تو ان کے جاتے ہی اپنا سوٹ کیس پیک کر لیا تھا۔ اس دن کے بعد سے

اسے باری بھی نظر نہیں آیا تھا۔ ماما نے خود ہی بتا دیا تھا کہ ”سرائے“ گیا ہوا ہے۔ ہونہہ، سرائے میں پتا نہیں کون سے میلے لگتے

ہیں آئے دن۔ اس نے سُن کر سر جھٹک دیا تھا۔ ایک تو کراچی جانے کا سن کر جوش و خروش اس درجہ تھا کہ نہیں لگ رہا تھا۔ جی چاہتا تھا پر لگا کر کراچی پہنچ جائے۔ وہ بڑی بددلی سے باغ میں آئی تھی اور جھولا جھولتا رہتا تھا۔ تین روز سے طبیعت پر کچھ بوجھ بھی محسوس ہو رہا تھا۔ اندر سے جانے کتنی مرتبہ یہ آواز آئی تھی کہ باتیں نہیں کرنی چاہیے تھیں۔ کس طرح تاک تاک کر اس نے باری کی روح پر نشانے لگائے تھے۔ اور وہ سن رہا تھا۔ جو اب کچھ کہہ دیتا تو شاید احساسات اتنے شدید نہ ہوتے۔ وہ جھولا جھولتے ہوئے مسلسل سوچ رہی تھی۔

”بی بی! ہری پور سے خان کا فون آیا ہے۔ وہ کہہ رہے ہیں آپ شام چھ بجے تک تیار رہیے گا۔ ان کا آئے گا۔“ کلو اسے کھڑی پیغام دے رہی تھی۔

وہ چونک کر کلو کو دیکھنے لگی پھر ایک دم اچھل کر جھولے سے نیچے اتر آئی۔ اور اندر دوڑ گئی۔ پانچ تو بج رہے تھے اپنے کمرے میں آ کر دیگر ضروری چیزیں سمیٹنے لگی۔ وقت بہت کم تھا۔ ابھی اپنی تمام کزنز کے سامنے دھماکا دن سے یہ انوکھی خبر دبائے دبائے اس کا پیٹ پھولنے لگا تھا۔ ظاہر ہے ان کے لیے یہ خبر انوکھی ہی ہوتی تھی کہ پہلی بار بیٹی کو اپنے پاس بلایا تھا۔

وہ کپڑے اٹھا کر باتھ روم میں جا رہی تھی کہ بڑی امی آ گئیں۔

”کلو نے بتا دیا تھا تمہیں؟“ وہ آتے ہی مخاطب ہوئیں۔

”جی بڑی امی!“

”اچھا تو تم تیاری کرو۔ ٹائم بہت تھوڑا رہ گیا ہے۔ اندھیرا تو ویسے بھی ہو گیا ہے مگر اب کیا کریں۔ باہر رہے ہیں۔“

”حیرت ہے وہ تمہیں وہاں کیوں بلوا رہے ہیں۔ اور پھر وہاں تنہائی میں تمہارا دل کیسے لگے گا۔ خیر دل نہ جاتا۔ کچھ کھانے پینے کی چیزیں بندھوا دیتی ہوں راستے میں کھا لینا۔“

”جی اچھا،“ وہ غلٹ بھرے انداز میں بولی۔

”اچھا چلو! تم تیاری کرو۔“ وہ بڑی گم صم سی نظر آ رہی تھیں۔ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی دروازے کی سمت بڑھتی رہتی تھی۔ ان کی پیٹھ ہوتے ہی جھپاک سے باتھ روم میں گھس گئی۔ دو منٹ میں کپڑے تبدیل کیے اور بیٹن دھوئی ہوئی ہال کمرے میں آ گئی۔ جہاں وہ سب ”حسب توفیق“ ہاتھ پیر پھیلائے بچوں کا کوئی پروگرام دیکھ رہی تھیں۔ ”ہیلو کزنز!“ اس نے دروازے میں کھڑے ہو کر چیخ ماری۔

وہ سب چونک پڑیں۔

”ارے۔ آؤ بھئی۔ کہاں غائب ہو۔ کمرے سے نکل آنے کا ٹائم تو کب کا ہو چکا۔“ مونانے پاؤں سمیٹے۔

”ہم اس لیے آئے ہیں کہ ہم جا رہے ہیں۔“ اس نے پھلجڑی چھوڑی۔

”خیر ہو۔ کتنے چلیے؟“ روبری کو بھی اسکرین سے نظریں ہٹانا پڑیں۔

”ہری پور“ اس نے خامے استغنا کا مظاہرہ کیا۔

”اس کیلی؟“ وہ سب اپنے زاویے بدل کر متوجہ ہو گئیں۔

”پتا کے ڈرائیور کے ساتھ۔“ اس نے وضاحت کی۔

”بھائی۔ کیا ہو رہا ہے یہ؟“ زری کو یقین نہ آیا۔

”بڑا اچھا ہو رہا ہے۔“ وہ کھلکھلائی۔

”یاد چھانے بلوایا ہے۔“ سیر کی شوقین تانیہ پھڑپھڑائی۔

”ظاہر ہے۔ بن بلائے تو ہم خدا کے ہاں بھی نہ جائیں۔“ اس کے انگ انگ میں ترنگ تھی۔

”جانے کی کوشش تو کی تھی۔“ مینیو نے مقابل کے دروازے سے داخل ہو کر ککڑا لگایا۔

رڈی نے آج اپنا اچھا موڈ ان کی خاطر خراب نہیں کیا۔ اور اندر آ کر ایک موڑھے پر بیٹھ گئی۔ وہ سب اسے گھیر کر بیٹھ گئیں۔ پریس کانفرنس کا سماں بندھ گیا۔

سز تو جیسے تیسے کٹ ہی گیا تھا۔ آنے کی خوشی میں کسی قسم کی ناگواری میں وزن نہیں تھا۔ مگر گھر میں داخل ہوتے ہی اسے کونٹ کا سامنا کرنا پڑا۔ یاور علی خاں کسی ڈنر میں گئے ہوئے تھے۔

حالانکہ ملازمین نے بہت اچھے انداز میں گرجوٹی سے استقبال کیا تھا، مگر اس پر جیسے اوس سی پڑ گئی تھی۔ وقت گزارنا بہت مشکل ہو رہا تھا۔ پہلے کچن میں آئی۔ وہاں موجود ایک ایک چیز کا جائزہ لیا۔

”کیا پتا کچن چیک کرتے ہیں؟“ وہ خانساں سے مخاطب ہوئی۔

”نہیں!“ وہ بے چارہ حیران سا نظر آیا۔

”اچھا پھر تو تم بڑے ایماندار قسم کے سروٹ ہو۔ بڑا صاف ستھرا کچن ہے۔ برتن تو بہت خوبصورت ہیں۔ کیا پتا لائے تین؟“ اس نے دیوار گیر شیشے کی الماری میں لگے برتنوں کا جائزہ لیا۔

”جی مجھے علم نہیں۔ جب میں یہاں آیا تو یہ برتن پہلے سے موجود تھے۔“

”ہوں۔ بہت ناکس! بہت شاندار ہیں میرے پتا۔ ان سے تعلق رکھنے والی ہر چیز ہی بہت اچھی ہوتی ہے۔ میں تو خیر ٹھیک ٹھاک ہوں۔ مگر میری امی بہت حسین تھیں۔ سب سے اچھی بیوی بھی گھر بھر میں میرے پتا کو ملی تھی۔“ وہ ہنسی ”لکی ہیں“

بے چارہ خانساں مودبانہ ہاتھ باندھے اس کے ”ارشادات“ سن رہا تھا۔

اسی دم فون کی گھنٹی بجی۔ وہ چپ ہو گئی۔

”فون کیا ہے؟“

”آپ فکر نہ کریں۔ انٹینڈنٹ سن لے گا۔“ خانساں کو اس کی باتیں بہت اچھی لگ رہی تھیں۔

”ارے نہیں بھئی۔ میں سنوں گی۔ ہو سکتا ہے، پتا کا ہی ہو۔ یا شاید حویلی سے آیا ہو۔“ وہ کہتی ہوئی یاد دہانی پر روم میں آ گئی۔ اس کے آنے تک فون خاموش ہو چکا تھا۔ فون کی تیل دوبارہ سے شروع ہوئی۔

اس نے ریسیور اٹھا لیا۔ ”ہیلو!“

”آپ کون ہیں؟ سر کو فون دیجیے۔ کراچی سے مس ماین کی کال ہے۔“ انٹینڈنٹ کہہ رہا تھا۔

”سرگئے ہوئے ہیں۔ میں ان کی بیٹی ہوں۔ مجھ سے بات کرائیں۔“

”ہیلو!“ ایرپیس میں ماین کی آواز ابھری۔

”ہوں۔ حویلی فون نہیں کر سکتیں؟ پتا کو بڑے فون ہوتے ہیں۔“ اس کی شوخی عروج پر تھی۔

☆.....☆.....☆.....☆.....☆.....☆

”دوسری طرف ماین حیرت و خوشی سے ایک لمحے کو گنگ سی ہو گئی۔

”وہاں کیونکر پہنچ گئیں جاگیر دارنی؟“ وہ سنبھل کر جوابی کارروائی کرنے لگی۔

”جاگیر دار صاحب کو شاید ہماری ضرورت پڑ گئی ہے۔“ وہ کھلکھلائی۔

”بڑے مطلبی ہیں جاگیر دار صاحب!“ ماین شرارت سے کہہ رہی تھی۔

”ارے میرے پتا کو مطلبی کہہ رہی ہیں؟“ وہ مصنوعی خشگی سے گویا ہوئی۔

”پہلے تو تم نے انہیں ”ضرورت مند“ کہا ہے۔“ ماین نے کمال برجستگی کا مظاہرہ کیا۔

”ہوں، آپ ہیں ناں آخر میری امی کی سگی بہن، ہلا کر رکھ دیا ہے اپنی جگہ سے۔ ہم کراچی آرہے ہیں، سب سمجھ میں آ

سکتا ہے۔“ وہ بڑے تجربہ کار و آزمودہ انسان کی طرح تجزیہ کر رہی تھی۔

”تم کراچی آرہی ہو۔۔۔۔؟ اونو! دیکھو میرے ساتھ مذاق مت کرو۔“ ماین بے ربط سی ہونے لگی۔

”اب کیا، ہاں ہاں۔۔۔ ناں ناں کریں۔ آفتاب آمد بردلیل آفتاب۔“ وہ ہنسی۔

”تم ایک دم سے بڑی بڑی سی محسوس ہونے لگی ہو، یہ انقلاب کیسا؟ کیا باری باقاعدگی سے ٹیوشن پڑھا رہے ہو؟“

”یہ اچھی بھلی باتیں کرتے کرتے آپ کیا کدالیں، پھاوڑے چلانے لگیں؟“ اس نے منہ بنایا۔

”اچھا یہ بتاؤ۔۔۔“ ٹوں۔۔۔ ٹوں۔۔۔ ٹوں۔۔۔ اچانک رابطہ منقطع ہو گیا۔

اس نے ریسور کو دیکھا، پھر آہستگی سے رکھ دیا اور گھوم کر دروازے کی طرف پلٹی۔ یاد علی خان بیڈ کے ساتھ کوٹ اتار رہے تھے۔

”السلام علیکم پتا!“ وہ انہیں یوں اچانک سامنے پا کر بہت خوش ہوئی تھی۔

”والسلام بیٹے! ٹھیک ٹھاک ہو، کوئی پریشانی تو نہیں ہوئی راستے میں؟“ انہوں نے کوٹ روشنی کی سمت بڑھا دیا۔

روشنی نے سرخوشی، بارش کی طرح اپنے وجود پر محسوس کی۔ روح کی ساری کثافت آنا فنا دھلے لگی۔

جن سے محبت ہوتی ہے، اُن کی طرف سے محبت واپنائیت کے ذرا ذرا سے مظاہرے۔۔۔ بھی زندہ رہنے کی ہوتی ہے۔ جاتے ہیں۔ مقبول دعاؤں کا سا اثر رکھتے ہیں۔

اُس نے باپ کے ہاتھ سے کوٹ اس طرح لیا، جیسے کوئی سوغات لے رہی ہو۔

اتنی پیاری مہک تھی، اُس نے دل سے لگا لیا تھا۔ موتی اس کے رخساروں پر پھسل پڑے۔ اُس نے وارڈروب کھولا۔ ہینگر نکالا اور نہایت پیار سے کوٹ ہینگر کیا۔ اپنی انگلیوں سے بھانڈا، جیسے وہ کوئی بے جان کوٹ نہ ہو، زندہ وجود ہے ہی برتاؤ تھا۔

”کون سا پرفیوم لگاتے ہیں آپ پتا؟“ وہ اُن کی طرف مڑی۔

”بہت سی باقاعدہ قسم کی عادتیں ہیں میری، بیس سال سے زائد عرصہ سے یہ پرفیوم استعمال کر رہا ہوں۔ پچھلے انگلینڈ اور یورپ ہی میں ملتا تھا۔ اب تو یہاں بھی مل جاتا ہے، بلکہ اب تو کمپنی پوری کٹ بناتی ہے۔ ہاتھ سوپ، شیمپو، آفٹر شیو، شیونگ کریم، کیونکہ بہتہ سوئٹ پرفیوم ہے، اس لیے ان تمام چیزوں کو استعمال کرنے کے بعد ہی اس کی مہک ہوتی ہے۔“

انہوں نے ڈریسنگ ٹیبل سے پرفیوم اٹھا کر اس کی سمت بڑھایا۔ وہ اُن ہی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ وہ کتنی تفصیل جواب دے رہے تھے، جیسے اس نے کوئی بہت اہم اور ضروری سوال کیا ہو۔

”خالہ کا فون آیا تھا پتا۔“ اچانک اسے دھیان آیا کہ نہایت ضروری بات تو بھول ہی گئی۔

”اور تم نے پہلی فرصت میں انہیں بتا دیا ہوگا کہ ہم کراچی آ رہے ہیں؟“ یاد علی خاں ڈریسنگ روم کی طرف بڑھنے سے تھک چکا تھا۔

”اب کیا، ہاں ہاں۔۔۔ ناں ناں کریں۔ آفتاب آمد بردلیل آفتاب۔“ وہ ہنسی۔

”تم ایک دم سے بڑی بڑی سی محسوس ہونے لگی ہو، یہ انقلاب کیسا؟ کیا باری باقاعدگی سے ٹیوشن پڑھا رہے ہو؟“

”یہ اچھی بھلی باتیں کرتے کرتے آپ کیا کدالیں، پھاوڑے چلانے لگیں؟“ اس نے منہ بنایا۔

”اچھا یہ بتاؤ۔۔۔“ ٹوں۔۔۔ ٹوں۔۔۔ ٹوں۔۔۔ اچانک رابطہ منقطع ہو گیا۔

اس نے ریسور کو دیکھا، پھر آہستگی سے رکھ دیا اور گھوم کر دروازے کی طرف پلٹی۔ یاد علی خان بیڈ کے ساتھ کوٹ اتار رہے تھے۔

”السلام علیکم پتا!“ وہ انہیں یوں اچانک سامنے پا کر بہت خوش ہوئی تھی۔

”والسلام بیٹے! ٹھیک ٹھاک ہو، کوئی پریشانی تو نہیں ہوئی راستے میں؟“ انہوں نے کوٹ روشنی کی سمت بڑھا دیا۔

روشنی نے سرخوشی، بارش کی طرح اپنے وجود پر محسوس کی۔ روح کی ساری کثافت آنا فنا دھلے لگی۔

جن سے محبت ہوتی ہے، اُن کی طرف سے محبت واپنائیت کے ذرا ذرا سے مظاہرے۔۔۔ بھی زندہ رہنے کی ہوتی ہے۔ جاتے ہیں۔ مقبول دعاؤں کا سا اثر رکھتے ہیں۔

اُس نے باپ کے ہاتھ سے کوٹ اس طرح لیا، جیسے کوئی سوغات لے رہی ہو۔

اتنی پیاری مہک تھی، اُس نے دل سے لگا لیا تھا۔ موتی اس کے رخساروں پر پھسل پڑے۔ اُس نے وارڈروب کھولا۔ ہینگر نکالا اور نہایت پیار سے کوٹ ہینگر کیا۔ اپنی انگلیوں سے بھانڈا، جیسے وہ کوئی بے جان کوٹ نہ ہو، زندہ وجود ہے ہی برتاؤ تھا۔

”کون سا پرفیوم لگاتے ہیں آپ پتا؟“ وہ اُن کی طرف مڑی۔

”بہت سی باقاعدہ قسم کی عادتیں ہیں میری، بیس سال سے زائد عرصہ سے یہ پرفیوم استعمال کر رہا ہوں۔ پچھلے انگلینڈ اور یورپ ہی میں ملتا تھا۔ اب تو یہاں بھی مل جاتا ہے، بلکہ اب تو کمپنی پوری کٹ بناتی ہے۔ ہاتھ سوپ، شیمپو، آفٹر شیو، شیونگ کریم، کیونکہ بہتہ سوئٹ پرفیوم ہے، اس لیے ان تمام چیزوں کو استعمال کرنے کے بعد ہی اس کی مہک ہوتی ہے۔“

انہوں نے ڈریسنگ ٹیبل سے پرفیوم اٹھا کر اس کی سمت بڑھایا۔ وہ اُن ہی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ وہ کتنی تفصیل جواب دے رہے تھے، جیسے اس نے کوئی بہت اہم اور ضروری سوال کیا ہو۔

”خالہ کا فون آیا تھا پتا۔“ اچانک اسے دھیان آیا کہ نہایت ضروری بات تو بھول ہی گئی۔

”اور تم نے پہلی فرصت میں انہیں بتا دیا ہوگا کہ ہم کراچی آ رہے ہیں؟“ یاد علی خاں ڈریسنگ روم کی طرف بڑھنے سے تھک چکا تھا۔

یاد علی خان نے لائٹر بند کرتے ہوئے اپنی سی نظر روشنی پر ڈالی۔

”پھر کیا جواب دیا انہوں نے۔“

”کچھ نہیں، لائن ہی ڈسکنکٹ ہو گئی تھی۔“ اس نے براسامہ بنایا۔

اُسی دم فون کی گھنٹی بجی۔ اور یاد علی اپنی جگہ سے فوراً اٹھے۔

”جی۔۔۔۔۔ ہیلو۔۔۔۔۔!“ انہوں نے ریسورکان سے لگایا۔ پھر روشنی کی سمت دیکھا۔

”حویلی سے فون ہے۔۔۔۔۔ باری ہے لائن پر۔“

انہوں نے ریسورکان سے ہٹا کر روشنی کی طرف دیکھا۔ وہ فوراً ہی اپنی جگہ سے اٹھی۔

”میرا فون ہے۔۔۔۔۔ اس وقت۔۔۔۔۔؟“ وہ حیران ہوئی اور ریسوریا اور علی خاں کے ہاتھ سے لے لیا۔

”ہوں۔۔۔۔۔ روشنی۔۔۔۔۔ بات کر رہی ہوں۔ اتنی اہم تو نہیں ہوں کہ وہاں سے آتے ہی مسئلہ پیدا ہوئے۔“

”ارے، آپ کو خبر نہیں، اب تو آپ بہت اہم ہو گئی ہیں۔ کراچی سے نعیم صاحب آپ سے بات کر رہے۔“

نمبر دے دوں؟ کوئی ہرج تو نہیں؟“ دوسری طرف سے باری بہت شوخ لہجے میں اُس سے پوچھ رہا تھا۔

”نان سینس!“ اس کا موڈ ایک دم آف ہو گیا۔ اُس نے پلٹ کر یاد علی خاں کی سمت دیکھا۔

”مگر وہ بھند ہیں، حالانکہ میں نے تو یاد اور چچا کا ڈراوا بھی دیا تھا، مگر بھی بڑے بہادر قسم کے بندے ہیں۔“

بدستور تھا۔

”تم کوئی میڈل دے دو انہیں بہادری کا، میرے کان مت کھاؤ۔“ وہ برس پڑی۔

”آفٹر آل فیانسی ہیں، کچھ تو اُن کے حقوق تسلیم کریں۔ یہ تو زیادتی ہے ناں؟“ وہ ہنس رہا تھا۔

”کمیشن مجھ سے لے لینا اور آئندہ اس موضوع پر مجھ سے بات مت کرنا، ورنہ اچھا نہیں ہوگا۔۔۔۔۔“

”تو انہیں کہوں کیا؟“ وہ بے بسی سے پوچھ رہا تھا۔ ”وہ دس منٹ بعد پھر فون کریں گے۔“

”کہہ دینا روشنی کے باپ سے بات کر لیں۔“ اُس نے ریسور کریدل پر مٹخ دیا۔

اپنی تیز تیز سانسیں سنبھالتی وہ دوبارہ بستر تک آئی اور گرنے کے انداز میں بیٹھ گئی۔

یاد علی خاں نے آہستگی سے نظریں اٹھا کر بیٹی کا چہرہ ٹولا۔

”غصے سے انرجی ضائع ہوتی ہے، جو ہم نے نہیں کرنا، بس نہیں کرنا۔ پھر غصہ کر کے اپنا نقصان کیوں کرنا۔“

ایزی مائی ڈیر۔“

”پاپا! میرے پاس بہت اچھے کپڑے نہیں ہیں۔۔۔۔۔ بس موسموں میں۔۔۔۔۔ آکورد نہیں گئے گا وہاں۔“

جھٹ۔ موضوع بدل دیا۔

”تو پھر کیا ہوا، کراچی سے لے لینا، مگر ایک بات کا خیال رکھنا، اگر نانا جان کی طبیعت اچھی ہو تو شاید۔“

ضرورت نہیں، ہم اُن کی عیادت کرنے جا رہے ہیں۔“

”ذیل پتا! جب سے میری امی کی ڈیڑھ ہوئی ہے، آپ نانا جان سے کتنی مرتبہ ملے ہیں؟“ اُس نے بہت معصومانہ انداز میں سوال کیا تھا۔

یاد علی خاں جو جھک کر سائیڈ ٹیبل پر رکھی ایش ٹرے میں سگریٹ کی راکھ جھاڑ رہے تھے، بجائے راکھ جھاڑنے کے انہوں نے سگریٹ مسل کر رکھ دی اور اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑے ہوئے۔

”بیٹے! کھانا کھاؤ۔ رات زیادہ ہو گئی تو کیا فائدہ۔ گیسٹ روم میں تمہارا قیام ہوگا۔“

”مگر پاپا! میں گیسٹ تو نہیں ہوں۔“ اُسے ڈکھ سا ہوا۔

یاد علی خاں مسکرا دیے۔ ”آپ تو مالک ہو بیٹا۔ دراصل گیسٹ روم میں فی الحال سب سے زیادہ سہولیات ہیں۔ وہاں کوئی ناگواری محسوس نہیں ہوگی۔ وہاں بہت اچھا محسوس ہوگا۔“ پھر انہوں نے سر ہانے لگی تیل بجائی۔

نور ایک ملازم آ موجود ہوا۔

”شردل! بی بی کے لیے کھانا لگاؤ۔“

روشنی کی غیر ضروری حساس طبیعت بوجھل سی ہو گئی۔ ایک تو اُس کے سوال کا جواب نہیں دیا گیا تھا۔ دوسرے اسے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ اس کی موجودگی سے تنگ آ گئے ہوں۔ وہ دوپٹا سنبھالتی اُٹھ کھڑی ہوئی۔

”گڈ نائٹ پاپا!“ اس نے اتنی دھیمی آواز میں کہا، جیسے نہایت مجبوری میں کہہ رہی ہو۔

”گڈ نائٹ۔۔۔۔۔!“ یاد علی خاں نے اُس کے کمرے سے باہر نکلنے کا انتظار بھی نہیں کیا اور نائٹ بلب جلا دیا۔

روشنی نے آہستگی سے اپنے پیچھے کا دروازہ بند کیا اور ڈائننگ ٹیبل کی طرف مڑ گئی۔

ٹاید ماں۔۔۔۔۔ ماں بننے ہی کوئی مرکزی طاقت حاصل کر لیتی ہے۔ ایک مقناطیسی طاقت۔۔۔۔۔ جو یہاں، وہاں ہر طرف سے رشتوں کو کھینچتی ہوئی ایک اُن دیکھے دائرے میں متحرک رکھتی ہے۔۔۔۔۔ ماں کی کمی سے بڑی کمی ہو جاتی ہے۔ سب کچھ ہوتے ہوئے یوں محسوس ہوتا ہے، جیسے کچھ رکھ کر بھول گئے ہوں، یا یوں جیسے کوئی ضروری چیز گم ہو گئی ہو اور ذہن میں ہر آن اُن کی تلاش جاتی ہو، یا جیسے معمول کے سارے کام ہو گئے ہوں، اور سب سے ضروری کام ذہن سے نکل گیا ہو اور بہت دیر تک یاد آ یا ہو۔ ایسی ملال کی سی کیفیت۔۔۔۔۔ ایسی نامکمل اور ادھوری سی زندگی اُسے لگتی تھی۔

اس ادھورے پن کا احساس اسے ہمیشہ ہی رہا تھا۔ مگر لا شعور کے پاتال سے تب ہی باہر آتا تھا۔۔۔۔۔ جب کوئی ذہنی دھچکا ملتا تھا۔

جیسے بوسیدہ چھت بارش میں ٹپکتی ہے تو اپنی ٹوٹ پھوٹ کا پتہ دیتی ہے۔ اس پر سے یہ شقی القلب باری۔۔۔۔۔ کتنے

سے آ رہے ہیں اسے۔۔۔۔۔ ملا ناں تو بتاؤں گی اچھی طرح۔

بعض اوقات ایسا ہوتا ہے ناں کہ غصے کی ایک لہر کے ساتھ جانے کب کب کا دبا ہوا غصہ۔۔۔۔۔ اور غصے کی وجوہات نئے

سے سے اُٹھ پڑتی ہیں۔

دو ڈائننگ ٹیبل پر آ کر ایک کرسی پر گرنے کے انداز میں بیٹھ گئی تھی۔ میز پر کھدیاں لگی ہوئی تھیں اور میز کی چمکتی سطح پر اسے

ماہیت: ”وہ جگہوں سے رو رہی تھی۔“

ماتہ۔ وہابیوں کی آنکھوں کی سرفی یگانہ بڑھ گئی۔ انہوں نے روشی کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔

”جی تو تم بہت چھوٹی ہو روشی! تمہیں کیا خبر کہ کتنی خوشیاں تمہاری منتظر ہیں۔“

”سے بڑی خود فریبی ہے یہ!“ اُس نے باپ کی بات کاٹ دی اور آنکھیں پونچھنے لگی۔

”میر نے والی خوشی کی توقع فریب ہے تو آنے والے دکھ کا خوف بھی تو واہمہ ہو سکتا ہے۔ بیش گوئی تو کسی کی بھی نہیں

راجہ سنجے۔ جب اچھا سوچنا بھی اپنے اختیار میں ہے اور برا سوچنا بھی اپنے اختیار میں، تو اختیار مثبت انداز میں کیوں نہ

تعال کر لیا جائے۔ اچھائی کا پہلو سامنے رکھنے میں کوئی ہرج تو ہمیں؟“

وہاں کے کمر پر شفقت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہہ رہے تھے۔

وہ مجھے ہار مان کر چپ ہو گئی اور یاور علی خاں فوراً اسے پیشتر باہر نکل گئے۔ مبادا وہ کسی اور بہانے سے رو پڑے۔

وہ ہڑے اتر کر وارڈ روب کی سمت آئی۔ اس کا خیال تھا۔ کراچی جانے میں کچھ دن گئیں گے، اس لیے اس نے

پڑے اور رُوب میں لٹکا دیے تھے۔ ہٹ لھول کروہ کپڑوں پر نظر ڈالنے لگی۔ کتنے اچھے اچھے کپڑے لائی تھی۔ اب یہ سوچ

وفا نہ موت کے ماحول میں کون سے پتھرے پہن کر جائے۔

مومنان! لا اور علی خاں جیسے جیسے ترک گئے اور قریب موجود ملازم سے مخاطب ہوئے۔

”بھڑک کر میں نے اسے لایا اور اسے لایا۔“

تم جانتے ہوئے لڑکی کو کہہ رہے ہیں؟“ وہ ایک ایک کلمہ کا جواب دیتے ہوئے کہتا ہے۔

”خان ایہ توئی دلہن بیگم ہیں، روزانہ اوہ آتے رہیں گے۔“

تمہارا مطلب ہے ظفری کی دلہن۔۔۔؟ جھم جھم؟“ زوجہ کے

مردخان! "کھوکھر مودبانہ بولا۔

میں نے کہا: "میں نے تم سے کہا تھا کہ تم میری بات نہ سناؤ گے۔"

محبوبہ چوہدری نے کہا: "وہ میری ہی سے گویا ہوئے۔"

ایک جگہ۔۔۔۔۔ ہم نے جھانک کر دیکھا تو

پوچھ رہے ہیں کیا کر رہا ہوں؟ وہ بدستور برہمی سے پوچھ رہے ہیں۔

میں نے کہا: "جی ہاں، اکیس سال پہلے میں جی گھبرا رہا تھا۔" وہ آہستگی سے کہتا تھا:

ان کا کام تو

نہ اس کا لیا مطلب ہے، تمہارا تو مرد معذور ہے، تمہیں تو اس کی خدمت سے فرصت

”ایک ایک نوالہ زہریلہ ہوتا ہے آپ کے کھانے کا۔“ اُس نے حقارت سے جواب دیا۔
”میرے بڑے بھائی نے تو تمہارا قیمہ ہم اپنے ہاتھوں سے بناتے۔“ وہ دھاڑے۔

”آپ مجھے انسان سمجھتے ہیں؟ کتنی حیرت کی بات ہے۔ حالانکہ آپ کے ملازم کی بکری بھی مجھ سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔“ وہ استہزاء سے بولی۔

”میرے چار بھائی ہیں؟ خود کو کوئی انقلابی سمجھنے لگی ہو؟ حالانکہ یہاں تمہاری حیثیت دیوار میں لگے کسی پتھر سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔“ وہ استہزاء سے بولی۔

”میرے چار بھائی ہیں؟ خود کو کوئی انقلابی سمجھنے لگی ہو؟ حالانکہ یہاں تمہاری حیثیت دیوار میں لگے کسی پتھر سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔“ وہ استہزاء سے بولی۔

”آپ مجھے ظفری سے نجات دلا دیں اور اس کے بدلے میں سال کی بیگار لے لیں۔“ وہ دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

”وہ تو اسارا بنا رہا ہے، مگر حویلی کے وارثوں میں سے ہے، تمہارے لیے کیا یہ اعزاز کم ہے۔۔۔ گستاخ لڑکی!“ وہ سزاوارتہ طرح بے ربط سانسوں میں کہہ رہے تھے۔

”ہم کی کمین لوگ ہیں خان، اعزاز و انعام سے ہمیں کیا مطلب۔ یہ چیزیں تو نام، نسب والوں کو خوش کرتی ہیں۔ ہم نام نہاد لڑکے ہیں۔“ وہ اپنی چادر سے آنسو پونچھ رہی تھی۔

”ہم تمہارا انتقام کرتے ہیں، خود کو کمی کمین بھی کہتی ہو اور مالکوں کے منہ کو بھی آتی ہو، کمی کمین غلام ہوتا ہے اور ام۔۔۔ اس کی اپنی مرضی، اپنی پسند، ناپسند کچھ نہیں ہوتی، مگر تم آداب غلامی سے واقف نہیں ہو، مگر فکر نہ کرو، ہم تمہیں یہ اب سکھائیں گے اور اس طرح کہ پھر کبھی بھولو گی نہیں، مگر تمہاری روح ہماری غلامی کرے گی۔“

وہ اپنی چھری نکالتے ہوئے حویلی کی طرف بڑھ گئے۔

جھومر، لکھی ہوئی نظروں سے اُنہیں جاتا دیکھ رہی تھی۔ ایک لمحے کو تو خوف کی لہر اُس کی ریڑھ کی ہڈی میں سرایت کر رہی تھی۔

جذبات چاہے، غصے کے ہوں یا خوف کے، انتقام کے ہوں یا بغاوت کے، عشق کے ہوں یا نفرت کے، جھامگ کی طرح بائیں تو حقیقتیں کو اور کی دھار بن کر محسوس ہوتی ہیں، وہ بے دم ہی ہو کر گھاس پر بیٹھ گئی تھی۔

وہ روز سے ہی میں رک گئی تھی، جبکہ لال خان اپنی مست چال کے ساتھ آگے بڑھ گیا تھا۔

”ہم آج ہی تیمور خاں اور تمہارے باپ کو بلواتے ہیں۔“ وہ جھامگ اُڑا رہے تھے۔

”وہ سب آپ کے بعد ہیں، جو آپ کر سکتے ہیں، وہ نہیں کر سکتے۔ کیوں انہیں زحمت دینا ہے۔“

”میں منتظر ہوں۔“ جھومر جیسے اپنے ہوش و حواس کھو چکی تھی۔

”تمہیں کمانے کو اچھا ملتا ہے، اس لیے آنکھوں پر چربی چڑھ چکی ہے، مگر ہم یہ چربی اتار بھی سکتے۔“

کر رہے ہیں ہم۔

نہیں ملتی چاہیے۔ تم اسے اکیلا چھوڑ کر ملازموں سے ہنسی ٹھنکھول کرتی پھرتی ہو۔“ وہ غضب ناک ہوئے۔
”وہ معذور ہے خان، میں تو معذور نہیں ہوں، انسان ہوں، قیدی بھی نہیں ہوں۔“

”گلاب خاں! تم اپنے لڑکے کو لے کر یہاں سے جاؤ، اپنا کام کرو۔“ اُنہوں نے مالی کو مخاطب کیا۔
وہ دونوں تقریباً دوڑ لپے۔

”تم بھی جاؤ کھوکھر!“ وہ کھوکھر کی سمت متوجہ ہوئے۔

کھوکھر بھی سر جھکا کر چل دیا۔

”ہاں کیا کہہ رہی تھیں تم۔۔۔ قیدی نہیں ہو؟۔۔۔ قیدی نہیں ہو، مگر ہماری تنخواہ دار تو ہو۔ ہزار روپے پر کو دیتے ہیں۔“

”تو میرے باپ سے کہیں، وہی ظفری کے ساتھ رہا کرے۔“ جھومر نے ترخ کر بات کاٹ دی۔
دلاور علی خاں دم بخود اس کی شکل دیکھنے لگے۔ سارا خون سمٹ کر چہرے پر آ گیا۔

”کیا تم نہیں جانتیں؟ یہ گزبھر کی زبان نکال کر تمہارے ہاتھ میں دے دیں گے۔ تمہاری اتنی ہمت۔“
”آپ ہزار روپے کے عوض مجھ سے حویلی میں کام کرا لیا کریں، میں بیس گھنٹے کام کرنے کو تیار ہوں۔“

ساتھ نہیں رہ سکتی۔ میں اس کی نوکرانی بن کر تو اس کی خدمت کر سکتی ہوں، مگر ایک بیوی کی طرح اُس کے رہا کر سکتی۔“ اُس نے بڑے نڈر انداز میں دو ٹوک جواب دیا۔

”اُسے نوکرانیوں کی کمی نہیں ہے، ہم نے تمہارے باپ کے ساتھ سودا کیا ہے۔“
”کیا آپ صرف ظلم کے سودے کرتے ہیں؟“ وہ بے خوف اور بگڑے ہوئے انداز میں پوچھ رہی تھی۔

”تم ہم سے کیا چاہتی ہو؟“ وہ بری طرح پھر رہے تھے۔
”آپ مجھے ظفری سے نجات دلا دیں اور اس عورت کے ساتھ اس کی ہنری میں قید کر دیں۔“

آوازیں مجھے رات کو سونے نہیں دیتیں۔“
دلاور علی خاں چونک کر اُس کی صورت دیکھنے لگے۔

”اتنی زبان درازی کا نتیجہ تم جانتی ہو؟ ہم تمہاری کھال میں بھس بھرا کر بیچ چور ہے میں لگا رہا ہوں۔“
”ہر روز موت کے عمل سے گزرتی ہوں، اب مجھے کسی بات سے خوف نہیں آتا۔“ وہ بڑی جرأت سے

”ہم آج ہی تیمور خاں اور تمہارے باپ کو بلواتے ہیں۔“ وہ جھامگ اُڑا رہے تھے۔
”وہ سب آپ کے بعد ہیں، جو آپ کر سکتے ہیں، وہ نہیں کر سکتے۔ کیوں انہیں زحمت دینا ہے۔“

”میں منتظر ہوں۔“ جھومر جیسے اپنے ہوش و حواس کھو چکی تھی۔
”تمہیں کمانے کو اچھا ملتا ہے، اس لیے آنکھوں پر چربی چڑھ چکی ہے، مگر ہم یہ چربی اتار بھی سکتے۔“

کر رہے ہیں ہم۔

مجھے حادثوں نے سجا سجا کر بہت حسین بنا دیا!

میرادل بھی جیسے دلہن کا ہاتھ ہو مہندیوں سے رچا ہوا

اُس نے مسکرا کر اخبار ایک طرف ڈال دیا۔ ”ارے بھابی آپ وہاں کہاں کھڑی رہ گئیں؟ آئیے عزیز ہلکے گلابی شلوار قمیص اور سرخ ویلوٹ کی شال پہنے بالو چمکاتی ہوئی اس کے بیڈ کے قریب رکھی ٹیبلٹ لیں۔“
”بالو! دیکھا چار دن اسپتال میں وقت پر کھانا پینا اور آرام ملا تو شکل نکل آئی۔ اس کا دشمن یہاں کوئی ہے خود ہے، پتا نہیں کس نمک حرام کی خاطر مردہ بنا ہوا ہے۔ ارے مرد ایسے ہوتے ہیں۔ چار چھ کی ایسی قمیص زیبہ کام کی؟ یہ ایک ہی کو پیٹے جا رہا ہے، احمق کہیں کا۔“

لال خان نے مردوں کے خواص گنوا کر اسے حماقت کی سند سے نوازا۔

”بھابی! آپ چپ ہیں، بلکہ چپ رہتی ہیں، چپ لگتی ہیں، حال احوال بھی نہیں پوچھا؟“

اُس نے مسکرا کر بالو کا سادہ اور گھبرایا ہوا چہرہ دیکھا۔

”وہ تو انہوں نے پوچھ لیا۔ ایک ہی بات ہے۔“ وہ زبردستی مسکرائی۔

”آپ کتنا پڑھے ہوئے ہیں؟“ وہ جیسے مریض کا دل رکھنے کے خیال سے بات کرنے لگی۔

وہ چہرہ کتابی رہا سامنے

بڑی خوبصورت پڑھائی ہوئی

وہ ہنس دیا۔

بالو خوفزدہ ہو کر میاں کی طرف دیکھنے لگی (عجیب پاگل آدمی ہے)۔

”جیسے کسی کو کھانسی کی بیماری ہوتی ہے، کسی کو بارہ مہینے نزلہ رہتا ہے۔ اسے شعروں کی بیماری ہے۔“

لال خان نے دوست کی طرف سے مفاتی پیش کی۔

بالو ذرا رینیکس سی ہو گئی، جس کی وجہ سے برامانا پڑ رہا تھا۔ جب اسے ہی اعتراض نہیں تو بات ہی کچھ نہیں

”تم بیٹھو، میں ذرا جوس لے کر آتا ہوں۔“ لال خان نے سائیڈ سے فلاسک اٹھا کر بالو سے کہا اور کمر

گیا۔

”آپ اپنا خیال رکھا کریں، عارف بھائی! آپ ٹھیک ہو جائیں گے تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

بعض اوقات دو افراد کے درمیان خاموشی کسی کڑوے سچ، کسی سفید جھوٹ سے بھی زیادہ خوفناک

وحشت زدہ سا ہو جاتا ہے۔ ایسی خوفناک خاموشی کا ٹوٹنا ایسا ہی ہوتا ہے، جیسے طوفان ٹٹنے کی خبر آ جائے۔ جسم

آ جائیں۔ نہ جانے کیوں اسے عارف سے اتنی گھبراہٹ محسوس ہوتی تھی۔ اس نے بوکھلا کر گفتگو کا سلسلہ شروع

”جتنا خیال رکھنا جائز ہے، اتنا تو اپنا خیال رکھتے ہیں اور سب ٹھیک ہوتا ہے یا نہیں، اس کی ہمیں پروا

بہت مشکل ہے دنیا کا سنورنا

تیری زلفوں کا پیچ و خم نہیں ہے!

”آپ کی بوڑھی ماں ہے، اُن کے بہت سے ارمان ہوں گے۔“ بالو نے شعر سن کر بڑی عجلت میں جملہ پھینکا۔

”ماں کا دوسرا نام ارمان ہی ہے، اُس کا دل کیا ہوتا ہے، ارمانوں بھرا صندوق ہوتا ہے، ماں دنیا کی سب سے بڑی بلیک

بلر ہے۔ ساری زندگی محبت کے نام پر بلیک میل کرتی ہے۔“

”نوروز باللہ! یہ ماں کی شان میں گستاخی ہے۔ ماں صرف ارمان بھرے دل ہی کا نام نہیں، قربانی میں بھی کوئی اس کا

مذہب نہیں کر سکتا۔“

”میری ماں نے اپنی محبت کا واسطہ دے کر اپنی مرضی سے میری شادی کی تھی۔ میں نے ماں کا دل رکھا تھا اور اپنے خواب

رہن رکھے تھے۔ بڑے ہی خون آسام قسم کے مہاجن تھے وہ۔۔۔۔۔ اپنے قیمتی خواب رہن رکھ کر ماں کے لیے خوشی اُدھار لی

تھی۔ کس کی قربانی بڑی ہوئی بھابی؟“ وہ مسکرانے لگا۔

”انہوں نے بھی آپ ہی کو خوش کرنا چاہا ہوگا۔“ بالو اپنے موقف پر جمی ہوئی تھی۔

”ہاں، بڑی سنہری روپلی خوشی لائی تھی وہ میرے لیے۔ میری منکوحہ کے ہاں نکاح کے ٹھیک پانچ مہینے بعد ایک صحت

منہ بچے کی ولادت ہوئی۔“

”پانچ مہینے بعد۔۔۔۔۔؟“ بالو بے ساختہ بول پڑی، پھر ایک دم خجل سی ہو کر چپ ہو گئی۔

”تمی ہاں، پانچ مہینے بعد ساڑھے آٹھ پونڈ کا بچہ قدرت نے مجھے ماں کا دل خوش کرنے کی وجہ سے انعام میں دیا۔“

بالو کے ہونٹ اس طرح ایک دوسرے میں پیوست تھے، جیسے اب کھلیں گے نہیں۔

اگر چاہ وہ ایک بیابتا لڑکی تھی، مگر مارے شرم کے وہ عارف سے کوئی سوال نہ کر پار ہی تھی۔

”آپ نے بہت سی لڑکیوں کے جہیز کی دھوم سنی ہوگی۔ ایسا جہیز بھی کسی کو نصیب ہوتا ہے، اب آپ پوچھنا چاہیں گی۔“

”یاراجوس ٹھنڈا نہیں ہے، فوراپی لو۔“ لال خان اپنی مخصوص تیز رفتاری کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا۔

”یاراجوس، چائے، کافی، موڈ سے پیتے ہیں۔ دوا کی طرح زبردستی تو نہیں۔“ اس نے ربط ٹوٹنے پر جیسے برا سامنہ بنایا۔

”یہ جوس دوا ہی ہے سمجھو، سیب کا ہے رکھا رہا تو رنگ بدل جائے گا۔ شاباش فٹنٹ پی لو، اور ہاں اب تو نہیں ہے پینے

پلانے کا پھر؟“

”وہ جوس گلاس میں اٹھ پیتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔“ وہ آگ تمہیں خاک کر دے گی۔ اس طرح کی چیزیں پیا کرو اندر پھول

کھلیں گے۔“

اُس نے بڑے اچھے جذبوں سے نہال ہو کر گلاس اس کی سمت بڑھایا۔

عارف نے مسکرا کر اس کا لیکچر سنا اور گلاس تھامتے ہوئے کن اکھیوں سے بالو کی طرف دیکھا۔

سے کدے میں اب بھی ذکر آتا ہے مے نوشی کے وقت

کیا خبر تھی اختر اتنا پارسا ہو جائے گا!!

یار! بھابھی پر ساری خصوصیات ظاہر کر دو گے۔ بھولی بھنگی شرم ہمیں بھی آ ہی جاتی ہے۔“

اور بالو۔۔۔ وہ ان دونوں کے درمیان تھی کب۔۔۔ اس کا ذہن تو ان سوالات کے بوجھ سے شل ہو رہا تھا۔ کبھی بھی عارف سے نہیں کر سکتی تھی۔ البتہ اُس کے الجھے ہوئے اندازِ نظر سے عارف خاصا محفوظ ہو رہا تھا۔ بظاہر ہنس رہا تھا۔

انہیں منیب احمد کی کوشی تلاش کرنے میں زیادہ مشکل پیش نہیں آئی۔ جو تقریباً سڑک ہی پر واقع تھی، جس کے کنارے کی اطویل قطار کسی غیر معمولی واقعے کی مظہر تھی۔ وہ گیٹ میں داخل ہوئے تو آس پاس کوئی شخص ایسا نہیں تھا، جو انہیں ہو۔ اور اپنی آمد کی اطلاع انہوں نے جان بوجھ کر نہیں دی تھی کہ میزبان کو مزید زحمت ہوگی، جبکہ گھر میں پہلے ہی غیر معمولی ہے۔

ٹیکسی سے اترنے کے فوراً بعد اُن کی نظر گیٹ پر موجود چوکیدار پر پڑی تھی۔ انہوں نے ویزینگ کارڈ نکال کر دیا تھا۔

”یہ نعمان صاحب تک پہنچاؤ۔“

”وہ پشت پر ہاتھ باندھ کر ٹہلنے لگے۔ روشی ہنوز ٹیکسی میں بیٹھی ہوئی تھی۔ کیونکہ ابھی تو ان کے سوٹ کیس ی ہاں نہیں نکلے تھے۔“

تھوڑی ہی دیر بعد ایک اچھی صحت کا حامل افسردہ سالو جوان چوکیدار کے ساتھ باہر آیا۔

”السلام علیکم! اپنے گھر میں تکلف؟ کب سے یہاں کھڑے ہیں، حد ہو گئی۔“

وہ بے اختیار یاور علی خاں کے گلے لگتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ یاور علی خاں نے بھی جواباً نعمان احمد کی پشت پر ہاتھ بولے کچھ نہیں۔ نعمان اُن سے فوراً الگ ہو کر ٹیکسی سے اُترتی ہوئی روشی کی سمت متوجہ ہوا۔

”السلام علیکم ماموں!“ وہ بہت دھیمی آواز میں کہہ رہی تھی۔

”روشانے!“ نعمان احمد نے یاور علی خاں کی سمت سوالیہ انداز میں دیکھا، پھر سلام کا جواب دیا۔ فطری طور پر سوچ سے الگ میسر آیا تھا، تو ملین کے انداز بھی بڑے عجیب سے تھے۔

”آئیے بھائی صاحب! سامان ملازم اندر لے جائے گا۔“

وہ اُن دونوں کو لے کر اس کمرے کی طرف بڑھا، جہاں مایین کی موجودگی کا یقین تھا۔ دروازے میں خاموشی ہوئی تھیں۔ آنے اور جانے والے دونوں ہی کسی قسم کی رعایت دینے کو تیار نہیں تھے، لہذا نتیجے کے طور پر دروازے بند ہو گئے تھے۔

”پلیز، آپ لوگ راستہ دیجیے۔“ نعمان احمد خواتین سے مخاطب ہوا۔

”کون ہیں؟ کون ہیں؟ کون۔۔۔ کون۔۔۔؟“ سرگوشیاں ابھرنے لگیں۔

”آئیے یہ یاد رہائی ہیں۔۔۔ ناز بھجی کے شوہر اور یہ اُن کی بیٹی روشانے۔“ نعمان احمد ایک بزرگ خاتون کے سوال پر جواب دے رہا تھا۔

کمرے میں ایک کھلی سی میز تھی۔ عمر رسیدہ خواتین کا جوش و ولولہ دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔۔۔ کوئی یاور علی خاں کے سر پر سب شفقت پھیر رہی تھی تو کوئی روشانے کو گلے لگا رہی تھی۔

دونوں باپ بیٹی ایک خاموش اور آرام دہ ماحول و فضا سے ایک دم باہر آ کر امتحان میں مبتلا ہو گئے تھے۔

”ڈاکٹر نہیں آیا ابھی تک؟“ نعمان احمد ایک خاتون سے دریافت کر رہا تھا۔

”نہیں!“ جواب نفی میں ملا۔

مایین جہازی سائز بیڈ کے ایک کنارے پر بے خبر ہاتھ پاؤں چھوڑے دراز تھی۔

روش کی تیر کی طرح اُس کی طرف بڑھی، مایین کے رخساروں پر ایک تواتر سے آنسوؤں کے بہنے کے نشان تھے۔

نعمان نے یاور علی خاں کو مایین کے قریب کرسی پر بیٹھنے کے لیے کہا، بلکہ انہیں تھامے ہوئے خود کرسی تک لایا۔

میں اسی لمحے ڈاکٹر کی آمد کا غلطہ ہوا۔ آنا فانا بھیڑ چھٹ گئی۔

محض دو منٹ کے دور ایسے میں مایین بڑا کر اٹھ گئی تھی۔ جانے ڈاکٹر نے روئی میں کتنی طاقت کی دوا لگائی تھی کہ ناک کے قریب لے جاتے ہی مایین اس طرح تڑپ کر مچلی جیسے سطح پر آ کر مچھلی پھڑکتی ہے۔

”ہائے پاپا!“ اس نے ہوش میں آتے ہی سسکاری لی۔

”مایین! دیکھو کون بیٹھا ہے تمہارے پاس؟“ نعمان نے اسے ماحول کی طرف متوجہ کیا۔

مایین نے رونے کی وجہ سے بھاری بھاری پونے بمشکل اٹھا کر آواز کی سمت دیکھا۔ قدرے چوکی، جیسے یقین نہ آیا ہو۔

”اب آئے ہیں آپ؟ کتنا ترسایا ہے آپ نے میرے پاپا کو۔۔۔ کتنے مفلس ہیں آپ، آپ کی جھولی میں میرے

باپ کے لیے ایک خوشی بھی نہیں تھی۔ کیا ضرورت تھی اب آنے کی، جنہوں نے آپ سے رشتہ داری کی بنیاد رکھی تھی۔ جب

دعا نہیں رہے۔“ وہ بری طرح رو دی۔

یاور علی خاں اپنے سپاٹ اور بے تاثر چہرے کے ساتھ اس طرح بیٹھے ہوئے تھے، جیسے کوئی ملزم فردِ جرم سنتے وقت کچھ نہ

کرنے کی پوزیشن میں ہوتا ہے اور اپنی بے بسی کو محسوس کرتے ہوئے مصلحتاً خاموشی اختیار کرتا ہے۔

روش اپنی جگہ سے اٹھی اور مایین کی سمت بڑھی۔ اُسے بہت سارا رونا آیا تھا۔ وہ بہت سارا رونا چاہ رہی تھی۔ اس سے

اچھا موقع شاید اسے پھر نہ ملتا۔ وہ آگے بڑھی اور مایین کے گلے لگ گئی۔ اب دونوں طرف طفیلی تھی۔

خواتین دونوں کو خاموش کرانے میں لگ گئیں۔

نعمان احمد، ڈاکٹر اور یاور علی خاں تینوں مرد بڑی مشکل سی صورتِ حال سے دوچار ہو گئے۔

”آئیے بھائی صاحب! ہم اس طرف چلتے ہیں، جہاں پاپا ہیں، آئیے پلیز۔۔۔!“ نعمان احمد نے یاور علی خاں کو مشکل

دیکھ جانتے تھے۔ انہوں نے جیب سے ریڈ اینڈ وہائٹ کا پیکٹ نکالا۔ سگریٹ نکالنے لگے۔ پھر کچھ سوچ کر رُک گئے۔ اور دیکھ رہے تھے جیب میں رکھ لیا۔ اور ہال میں لگے پورٹریٹس پر نظریں دوڑانے لگے۔ ذہن اس درجہ یکسو ہو گیا تھا کہ انہیں دلاور علی خاں کی آمد کا احساس تک نہ ہوسکا۔

”بہت گہری سوچ میں ہو؟“ ہال کا سکوت دلاور علی خاں کی آواز سے لکھت ٹوٹ گیا۔ تیمور علی خان چونک کر اپنی جگہ سے کھڑے ہوئے۔

”اسلام علیکم!“ انہوں نے مودبانہ انداز میں سلام کیا۔

”وہم السلام۔ بیٹھو۔ دلاور علی خاں ان کے قریب ہی بیٹھ گئے

”کیا ضروری ہے کہ سارے گھر میں گھر والوں کی تصویریں پھیلا دی جائیں۔ بس ایک محسوس جگہ ہونا چاہیے مجھے تو کچھ نہیں لگتا۔“ تیمور علی خاں کے انداز تکلم میں باپ کا عکس واضح تھا۔

”مگر اس میں قیامت کیا ہے؟“ دلاور علی خاں کے انداز میں ناز برداری سی تھی۔

”جن کی موجودگی کا احساس ہم نہیں کرنا چاہتے۔ وہ موجود محسوس ہوتے ہیں۔ اسٹرائیک کرتے ہیں۔“ تیمور علی خاں نے غامی بیزاری سے جواب دیا۔

”آپ نے مجھے کیوں بتایا ہے؟“ انہوں نے پلٹ کر تھوڑا سا انداز بدل کر دلاور علی خاں سے سوال کیا

”بتاتے ہیں۔ بتاتے ہیں۔ صبر کرو۔“ وہ اپنی جگہ سے اٹھے اور دیوار میں نصب ایک مٹن دبایا۔ چند لمحوں بعد ہی ایک ملازم اندر داخل ہوا۔

”کی خان!“ وہ ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔

”سرسوتی سے کہو۔ جھومر کو یہاں لے آئے۔“ وہ آرام سے بیٹھ گئے۔

ملازم باہر چلا گیا۔ تیمور علی خاں بغور باپ کی شکل دیکھنے لگے مگر بولے کچھ نہیں۔ دونوں کے درمیان ایک گہری خاموشی کا پردہ اٹھ رہا۔

تقریباً پانچ سات منٹ بعد ہال کا دروازہ کھلا۔ سرسوتی، جھومر کے ساتھ داخل ہوئی۔ اور دونوں دروازے ہی میں رُک گئیں۔

”اسلام علیکم خاں!“ جھومر بے تاثر انداز میں بولی۔

”وہم السلام!“ تیمور علی خاں کے چہرے پر الجھن کی لہریں ابھرنے لگیں۔

”سرسوتی! تم باہر جاؤ۔ کسی کو اندر مت آنے دیتا۔ باہر ہی کھڑی ہو کر ہمارا انتظار کرو۔“ سرسوتی اُلٹے قدموں باہر نکل گئی۔

جھومر دروازے کی طرف تھڑکی طرح ایستادہ تھی۔ جامنی مٹل کی فراک اور جامنی چوڑی دار پانچا مے میں۔ ملبوس سمور کی چٹائی اور نازک شمال سے سرخ حنائی نے وہ جیسے کوئی بے رحمانہ فیصلہ سننے کی منتظر تھی۔

سے نکالا۔ وہ بادلِ خواستہ اٹھ کھڑے ہوئے۔

ماہین رورہی تھی۔ انہیں تکلیف ہو رہی تھی، مگر بیٹی کے تڑپ تڑپ کر رونے سے ان کے دل پر بہت بوجھ تھا۔

کابس نہیں چل رہا تھا، وہ روشنائی کو سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں بے سکون دیکھ لیں۔

نعمان نے راستہ صاف کیا اور انہیں لے کر اُس حصے کی طرف بڑھا، جہاں منیب احمد کا جسدِ خاکی رکھا ہوا تھا۔

نعمان احمد بہت صبر و استقامت کا مظہر بن کر یاد رہی خاں سے۔ نہ تو۔ نہیں اپنی۔ ضرورتی کی وجہ سے بہت پرہیزگار

پشت پر ہاتھ باندھے دھیرے دھیرے اُس کے ساتھ قدم اٹھاتے تھے۔ کیا کیا آہستہ آہستہ دندناتا رہا تھا۔ اُن کی آواز سرخی گہری ہو رہی تھی، مگر آج کے ماحول میں اس سرخی پر کون چوکتا، سرخ۔ نہیں بھرم رکھ رہی تھیں۔

سہ پہر کے سائے منڈلانے لگے تھے، مگر حویلی پر ابھی۔ کھوت جاری تھا۔

معا ایک سیاہ بکیر و سرخ روش کوروندتی ہوئی پورٹریٹوں میں جا کر رُک گئی۔

کھوکھر جیب کے پیچھے دوڑا تھا۔ اور اگلا دروازہ ایک لمبے کی تاخیر کے بغیر کھول دیا تھا۔ ڈارک براؤن قمری پیر میں ملبوس ایک پر شکوہ سا مرد جیب سے اُتر اُترا تھا۔

”میں مردانے میں ہوں۔ بابا صاحب کو اطلاع دے دو۔“ یہ کہہ کر وہ تیز تیز قدم اٹھاتا اندر کی طرف چلا گیا۔

”السلام علیکم کا کا جان!“ سامنے سے جواد آ رہا تھا۔

نواد نے قدرے چونک کر جواد کی شکل دیکھی، ”والسلام!“

”بابا جان تو اپنے کمرے میں ہیں۔“ جواد نے انہیں دھیان دلایا۔

”میں اُن سے اُدھر ملوں گا۔“ نووارد نے قدرے رُکھائی سے جواب دیا۔

”جلدی میں ہیں؟“ جواد نے قدرے بچھے ہوئے لہجے میں دریافت کیا۔

”ہاں!“ سابقہ انداز میں جواب ملا۔

”اور سب نہیں ملیں گے؟“ جواد نے خود پر قابو پا کر بااخلاق میزبان کے انداز میں سوال کیا۔

”نہیں۔ ٹائم نہیں ہے میرے پاس۔“ نووارد آگے بڑھ گیا۔ جواد چند ٹائیپے کچھ سوچتا رہا پھر سر جھٹک کر اپنے رشتہ چل دیا۔

اسے حیرت کا شدید جھٹکا البتہ ضرور لگا۔ بابا صاحب غیر معمولی تیزی سے اس طرف آ رہے تھے۔ وہ ٹھہر گیا۔

”تیمور اندر ہے؟“ انہوں نے رُک کر دریافت کیا۔

”جی۔۔۔ اندر ہی گئے ہیں۔ اور جلدی میں ہیں۔“ اس نے جواب دیا۔ دلاور علی خاں آگے بڑھ گئے۔

تیمور علی خاں نے ہال کا دروازہ بند کر دیا تھا اور کارز صوفے پر بیٹھ گئے تھے۔ چہرے پر تفکر کے گہرے سائے

”یہ تمہارے خاں اس وقت موجود ہیں۔ جو کہنا چاہتی ہو کہہ ڈالو۔“ دلاور علی خاں کی پیشانی پر کیرول کھری تھا۔

”کیا کہے گی یہ؟ اور کیوں؟ اور اب یہ بھی کہا کرے گی؟“ تیمور علی خاں نے بگڑے ہوئے انداز میں کہا۔

”اب کیوں خاموش ہو؟ جس طرح تمہاری دس گز کی زبان مچ چاہک بن کر ہمارے دل پر برس رہی تھی۔ خاں کو دکھاؤ۔“ دلاور علی خاں برہمی سے کہہ رہے تھے۔

”اس کی یہ مجال۔ اس نے آپ سے گستاخی کی ہے بابا صاحب؟“ تیمور اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے اور قریب جا کھڑے ہوئے۔ ان کے لہجے میں بلا کا غضب تھا۔

جھومر نے نظریں اٹھا کر انہیں دیکھا۔

”تنخواہ بڑھوائی ہے باپ کی؟“ وہ حقارت سے پوچھ رہے تھے۔

”وہ میرا باپ نہیں ہے خاں!“ جھومر نے قطعی انداز میں بلا خراب کشائی کی۔

”اگر وہ میرا باپ ہوتا تو مجھے زندہ دفن نہ کرتا کہیں ہزار روپے کی مزدوری کر لیتا۔“

”تم جیسے لوگوں کو عزت راس نہیں آتی شاید۔ کیا تکلیف ہے تمہیں؟“ تیمور علی خاں سینے پر بازو لپیٹے۔

اسے دیکھتے ہوئے پوچھ رہے تھے۔

”آرام کیا ہے مجھے یہاں؟ یہ پوچھئے۔“ وہ بہت دھیمے انداز میں کہہ رہی تھی۔

”کیوں بھوکی مرتی ہو تم؟ کپڑے نہیں ہیں تمہارے پاس؟“ وہ غضبناک ہوئے۔

”آپ نے میرے ساتھ یہی کرنا تھا تو مجھے پڑھایا کیوں تھا؟“ وہ آنسو پی رہی تھی۔

”تمہیں حویلی میں عزت دینا تھی اس لیے یہ مہربانی کی تھی۔ مگر لگتا ہے تمہیں ہضم نہیں ہوئی۔“

”مگر میں حویلی کی عورتوں میں تو شامل نہیں ہوں۔ کیا فرق ہے مجھ میں اور سرسوتی میں! وہ بھی خدمات دیتی ہیں۔“

”میں بھی۔ انداز مختلف ہیں بس۔“

”کیا چاہتی ہو تم؟“ تیمور علی خاں کے چہرے سے گاڑھی سُرخ چھلکنے لگی۔

”مجھے آزاد کر دیں۔ یا مجھے کنیزوں میں شامل کر کے انہی کی طرح کے کام لیں مجھ سے!“

”تم ظفری کے نکاح میں ہو۔ میں یا بابا صاحب تمہیں آزاد نہیں کر سکتے۔ اس کا حق صرف ظفری کو ہے۔“

وہ بہت ضبط کا مظاہرہ کر رہے تھے۔

”خاں۔ اگر میں کچھ دن اور ظفری کے ساتھ رہی تو پاگل ہو جاؤں گی۔ آپ مجھے سرائے واپس لے لیں۔“

دونوں ہاتھوں میں چھپا کر مٹھوٹ مٹھوٹ کر رو دی۔

”تم ظفری کا دل بہلاؤ۔ وہ تمہارا خیال رکھے گا۔“ وہ سختی سے گویا ہوئے۔

”کیا میں کھلوں ہوں؟“ اُس نے اٹھک روک کر سوال کیا۔

”ہاں۔“ وہ حقارت سے بولے۔

”مگر میں کھلنے نہیں بن سکتی۔“ وہ جیسے پھر گئی۔

”دونوں باپ بیٹے اُسے اس طرح گھوڑنے لگے جیسے قیمہ بنادیں گے۔“

”دیکھ لیا تم نے تیمور؟“ بابا صاحب کی سانسیں تیز تیز چلنے لگیں۔

”لڑکی! غور سے سُنو۔ تم صرف کاغذ پر ہماری بہو ہو۔ زیادہ اونچی اڑان بھرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ تکلیف اس تکلیف

سے کم ہے جو ہماری بات نہ مان کر تمہیں اٹھانی پڑے گی۔“

”ہم تمہیں کبھی واپس سرائے نہیں لے جائیں گے۔ حویلی کو اپنی قبر سمجھو۔ ہر انسان کا ایک انجام ہوتا ہے۔ یہ تمہارا انجام

ہے۔ بابا صاحب سے معافی مانگو اور آئندہ گستاخی نہ کرنے کا عہد کرو۔ چلو۔“

جھومر نے مس نہ ہوئی۔

”مجھے کسی تبدیلی کا حکم سنائیے خاں۔ صبح سے اب تک جو آگ کا سفر طے کیا ہے وہ بے کار نہ جائے۔“

”تمہیں ذرا سی عزت کیا دی۔ سر پر تڑھ آ رہی ہو۔ تم ہو کیا۔ تم جیسے لوگ تو بات کرنے کے قابل نہیں ہوتے۔ اور

تمہاری زبان قینچی کی طرح چل رہی ہے۔ ہم عورتوں پر ہاتھ نہیں اٹھاتے۔ تمہاری جگہ کوئی مرد ہوتا تو شل بدل دیتے۔“

تیمور علی خاں جیسے بمشکل خود پر قابو پا رہے تھے۔

”دفعہ ہو جاؤ۔ یہاں سے۔ بچ لوگ۔“

”میں آپ کے ساتھ جاؤں گی خاں۔ نہیں تو آپ مجھے بیس گولی مار دیں۔“ وہ اٹل تھی۔

تیمور علی خاں باپ کی طرف مڑے۔

”بابا صاحب! میں اسے ساتھ لے جا رہا ہوں۔“

”مگر ظفری!“

”آپ فکر نہ کریں۔ ابھی سارا انتظام بتاتا ہوں آپ کو۔ جاؤ لڑکی! دو چار جوڑے کپڑے لے لو۔ ابھی بلواتے ہیں

تمہیں۔“ تیمور علی خاں کی آنکھوں میں خون اُترا ہوا تھا۔

جھومر ہٹکا بکا کی کھڑی رہ گئی۔ وہ خاں کے اس طرح پینتر ابد۔ لے سے جیسے سنبھل نہ پائی۔

”غرق ہو یہاں سے۔“ وہ پھونکارے اور دلاور علی خاں کے پہلو میں آ کر بیٹھ گئے۔

”فکر نہ کریں بابا صاحب! سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

”مگر ہم یہ بدتمیزی بھلا نہیں سکتے۔“ دلاور علی خاں ایک بے مایہ لڑکی کے ہاتھوں بڑی طرح گھائل تھے۔

”آپ دیکھتے رہیے بابا صاحب۔ بہت جلد خوش ہوں گے آپ!“ تیمور علی خاں گہری سوچ میں ڈوبے ڈوبے باپ کو

سننے لگے تھے۔ جھومر کمرے سے باہر جا چکی تھی۔

”تم تو ظاہر ہے زیادہ دیر زکوہ نہیں۔ مگر چائے دوائے تو پی لو۔ ہم ذرا پٹواری سے بات کر لیں۔ بہت اچھا ہے۔“ وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔

”خدا حافظ بابا صاحب!“

”جائے ہوئے مل کر نہیں جاؤ گے؟“ وہ جاتے جاتے رُک گئے۔ ”اور وہ کچھ بتانے کا ابھی کہہ رہے تھے۔ اچانک دھیان آیا۔“

”رات کو آرام سے فون پر بات ہوگی۔ فی الحال مجھے جانے کی جلدی ہے۔“ وہ قطعی انداز میں جواب دے رہے تھے۔ ”ہمارے اپنے بچے کا مسئلہ نہ ہوتا تو کیوں سنتے اس چھو کڑی کی باتیں۔ نہ تمہیں زحمت دیتے۔ اچھا خیر خدا اپنے مخصوص انداز میں چھڑی نکاتے ہال سے باہر چلے گئے۔“

تیسویں علی خاں نے اپنی گھنی مونچھوں میں کچھ دیر انگلیاں چلائیں پھر سرگرمیٹ سلگا کر سامنے لگی تصاویر دیکھنے لگے۔ کے مرغولے سامنے تھے۔ ہر تصویر دھندلا رہی تھی۔ چہرہ جتنا سرخ ہو رہا تھا۔ کانوں کی لونکیں اس سے زیادہ سرخ ہو رہی تھیں۔

عصر اور مغرب کے درمیان فیب احمد کو سپرد خاک کر دیا گیا۔ گھر سے زیادہ تر مہمان رخصت ہو چکے تھے۔ تھا۔ چند خواتین ڈرائنگ روم میں سپارے پڑھ رہی تھیں۔ اگر بتی اور کافور کی مہک دلوں میں وحشت سی پیدا کر رہی تھی۔

یاد علی خاں سفید شلوار قمیص پہنے سر پر جالی کی ٹوپی لگائے نعمان کے ساتھ مایین کے کمرے میں چلے آئے۔ ٹانگوں پر کبل پھیلائے۔ بال بکھرائے بیڈ کی پشت سے ٹیک لگائے چپ چاپ سامنے دیوار پر جانے کیا دیکھ رہی تھی۔ اٹھتے ہی وہ پھر بے ہوش ہو گئی تھی۔ اسی وجہ سے وہ دونوں فوراً اس کے کمرے میں آئے تھے۔ روشنی آنکھوں پر مایین کے برابر میں دراز تھی۔

”حوصلہ کیجیے مایین! یہ بھی زندگی کا ایک حقیقی رُخ ہے۔ اسے برداشت کرنا ہوتا ہے۔“ وہ اس کے قریب پہنچے بیٹھ گئے۔

مایین خالی خالی آنکھوں سے انہیں دیکھنے لگی۔

”کتنی اکیلی ہو گئی ہوں میں۔“ اس کی آواز بھڑکنی۔

”ہم سب ہیں ناں آپ کے ساتھ۔ ایسے کیوں سوچتی ہیں۔“ یاد علی خاں آہستہ سے گویا ہوئے۔

”کب تک؟ بالآخر اکیلی ہوں۔“ رخساروں پر آنسو لڑھکنے لگے۔ روشنی بھی اٹھ گئی تھی۔

”خالہ۔ ہم آپ کو اپنے ساتھ لے جائیں گے۔ ماموں تو یوگنڈا واپس چلے جائیں گے ناں!

کیوں پتا۔ ٹھیک ہے ناں؟ روشنی بھی دلجوئی میں شریک ہوئی۔

”تمہارے ساتھ یا تمہارے پتا کے ساتھ؟“ مایین پھینکی مسکراہٹ سے روشنی کو اس کی نادانی کا احساس دلانے لگی۔

”جب آپ ساتھ ہوں گی تو ہم اکٹھے ہی رہیں گے۔ میں بھی پتا کے ساتھ ہی رہنے لگوں گی۔ وہ تو میں نے بہت پہلے ہی سوچ لیا ہے۔“ وہ اعتماد انداز میں کہہ رہی تھی۔

”اس طرح نہیں ہونا روشنی۔ بہت پاگل ہو تم۔ بچے ہوتے تو دوسری بات تھی۔ البتہ اس طرح کی باتیں کر کے تم میرے اکیسے ہن کے احساس کو کچھ کم کر سکتی ہو۔“ مایین نے ٹھنڈی سانس بھری۔

”کیوں نہیں ہوتا اس طرح؟ انسان جو چاہے کر سکتا ہے۔“ روشنی نے تنک کر کہا۔

”نندن ماموں! ہم خالہ کو اپنے ساتھ لے جائیں گے۔ آپ مایینڈ تو نہیں کریں گے۔“ روشنی نے دُور صوفے پر سر جھکا کر بچے کو چوتے ہوئے نعمان کو متوجہ کیا۔

”بپ کو ایٹ روشنائی!“ یاد علی خاں نے بیٹی کو روک دیا۔

روشنی حیرت سے انہیں دیکھنے لگی۔ مگر کچھ بولی نہیں۔

”آپ نے صبح سے کچھ کھایا؟“ یاد علی خاں مایین سے مخاطب ہوئے۔

”ہب رہی۔“

”بیٹے! اپنی خالہ کو کچھ سوپ وغیرہ بنا کر پلاؤ۔“ وہ روشنی سے کہہ رہے تھے۔

”ابھی لاتی ہوں۔ مجھے بہت اچھا سوپ بنانا آتا ہے۔“ وہ فوراً بیڈ سے اتر گئی۔

”میرا جی نہیں چاہ رہا۔ تم بیٹھ جاؤ۔“ مایین نے اسے روکا۔

”جاؤ روشنی۔ تم جاؤ۔ نعمان۔ آپ بھی کچھ کھا لیجیے۔ اس طرح کے ماحول میں خوشی سے کھانا پینا نہیں ہوتا۔ مگر یہ زندہ انسانوں کی ضرورت ہے۔ چلیے اٹھیے شاباش۔“ وہ نعمان کو ڈرائنگ روم میں لے جانے کو اٹھ کھڑے ہوئے۔

”آپ بیٹھی بھائی صاحب۔ میں کھالوں گا۔ ابھی موڈ نہیں ہے۔ پلیز۔“ وہ بہت افسردہ تھا۔

”تو پھر آپ بھی مایین کے ساتھ تھوڑا سا سوپ لے لیجیے۔“ وہ دوبارہ بیٹھ گئے۔

وہ اتنے بڑے تکلف تھے کہ اس سے زیادہ اصرار کی اہلیت نہیں رکھتے تھے۔ اپنے تمام تر مخلصانہ جذبوں کے باوجود۔

”ابھی آتا ہوں میں۔ باہر کچھ دوست بیٹھے ہوئے ہیں۔“ نعمان اٹھ کھڑا ہوا۔

”ٹھیک ہے۔ مگر جلد آجائیے گا۔ روشنی خاصا تیز کام کرتی ہے۔ ابھی آجائے گی۔“ یاد علی خاں نے تاکید کی۔

”آپ کو کیسے پتا۔ وہ کون سا آپ کے ساتھ رہی ہے۔“ مایین نے انہیں ٹوک دیا۔

”بیٹی ہے وہ میری۔ مجھ سے زیادہ اُسے کون جانے گا؟“ وہ دھیرے سے مسکرا دیے۔

”آپ ہمارے کھانے پینے کا بندوبست کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ یہ بتائیے آپ دونوں نے بھی کچھ کھایا؟“ مایین نے اس پوری طرح جاگے تو وہ چونک پڑی۔

”ہاں۔ پلین میں کھالیا تھا۔ روشنی نے البتہ کچھ زیادہ نہیں لیا تھا۔ وہ آپ کے ساتھ شریک ہو جائے گی۔“

انہی سانسے مگر میٹ کی ڈبیہ اور لائٹ سائڈ ٹیبل پر رکھ دیا اور سینے پر ہاتھ باندھ کر بیٹھ گئے۔

بیورو کریٹ ہی محسوس ہوتے تھے۔
 ”نہیں۔ دوسرا۔ پہلا آج سے نو سال پہلے یوگنڈا میں ہوا تھا۔ میں تو اس وقت سے بس ہر وقت کانٹنٹس میں رہتا ہوں۔“
 ”تو یہ ہے نا؟ ایک بچے میں تمہارا یہ حال ہے۔ بتاؤ۔ کم از کم یہاں تو دیکھ لیتیں۔ یاد رہے پہلے ہی کہہ دیتے۔ چلو شکر ہے مل جائے۔“
 ”ہاں۔ لوگوں کو اچھی طرح تیار ہونا۔ پھول بھجوا دوں گی میں۔“
 ”ارے کف کے نازنین کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔“
 ”وہ تار ہور ہی تھی اور ان سے خفا ہور ہی تھی۔“

”میں نے پردے ہٹائے۔ اور واپس آ کر بیڈ پر بیٹھ گئی۔“

”میں نے پردے ہٹا دیے ہیں۔ آپ اپنا کام کیجیے۔“ اس نے سگریٹ کے پیکٹ کی طرف اشارہ کیا۔

یاد علی خاں شاید یہ کام ملتوی کر کے بھول چکے تھے۔ چونک سے گئے۔ اور آگے کو جھک کر پیکٹ اور لائٹر اٹھائے۔

سگریٹ نکال کر سلاکی۔

بڑی بھابی اسے ایک تقریب میں کوئی مخصوص ساڑھی پہننے پر اصرار کر رہی تھیں اور وہ ساڑھی کئی بار پہننے کے بعد دل سے اتر گئی تھی۔ اس نے نہایت خاموشی سے وہ ساڑھی بیڈ کے نیچے رکھے سوٹ کیس میں جھپا دی تھی اور کہا: ”میر تو کوئی مغرور نہیں ہوں۔ موم جیسا دل ہے میرا۔ مغرور تو آپ ہیں پتھر رکھا ہوا ہے سینے میں دل کی جگہ ذرا سی کراچی میں بھول آئی ہے اُن سے کیونکہ بہنوں کی طرح بے تکلفی تھی اس لیے خدشہ تھا وہ آکر وارڈروب نہ کھلے اور پھر دے دیتے تو کیا ہو جاتا۔ لگ گئے انہی بھابی کے ساتھ۔ ہاں نہیں تو۔“

اس خدشے کے عین مطابق عالم تاب ان کی خواب گاہ میں آگئی تھی۔
 ”ارے وارڈروب میں اچھی طرح دیکھ لو۔ ہٹو۔ لاؤ، میں دیکھتی ہوں۔“ انہوں نے اپنی خدمات پیش کر دی تھیں۔
 پوری تندہی سے وارڈروب چھاننے لگی تھیں۔

”بھابی بیگم! یہ ہمارے بیڈ کے نیچے ایک سوٹ کیس ہے۔ اس میں دیکھ لیجیے شاید اسی میں ہو۔“ باورچی نے

”بھابی بیگم! یہ ہمارے بیڈ کے نیچے ایک سوٹ کیس ہے۔ اس میں دیکھ لیجیے شاید اسی میں ہو۔“ پادری نے

بال بے ترتیب سے تھے۔ بکھری ہوئی لٹوں کی وجہ سے پیشانی تقریباً اوجھل تھی۔

یہ بات طے ہے جب کسی کو بغور دیکھا جائے خواہ کسی بھی طریقے سے۔ تو محسوس ہو ہی جاتا ہے۔ اچھا ہوں کے حصار سے نکل کر سنبھلی بھی نہیں تھی۔ کہ دوبارہ نظروں کی زد میں تھی۔ نہ اسے اچھا لگا نہ بُرا۔ بس سب سے اچھا لگا۔ (کہاں رہ گئی یہ روشی؟)

”آپ بھی لیجیے ناں۔“ باآ خزان کی نظروں سے بچنے کا اسے یہی حل سنبھائی دیا کہ کسی طرح خاموشی توڑ دے۔
”سوری پتا! میں ذرا لیٹ ہو گئی۔ وہ دراصل جہاں میں نے ایش رے دیکھی تھی وہاں وہ مہمانوں کی بھرپور ورنہ جگہ اس کی کہیں اور مقرر ہے۔ بہر حال میں ڈھونڈ لائی۔“

روش عجب سا شور برپا کرتی دوبارہ اندر داخل ہوئی۔ اور سائیڈ ٹیبل پر ایش رے رکھ دی۔

”آپ نے ابھی تک اتنا سا نوپ لیا ہے۔ حد ہو گئی۔ اتنا دل لگا کر بنایا ہے۔“ اس نے اگلے ہی لمحے مایہ ناز میں لے لیا ہے۔ دل نہیں چاہ رہا۔ پلیز روشی۔“ وہ بے بسی سے بولی۔

”اچھا نہیں ہے کیا؟“ وہ ڈرتے ڈرتے پوچھنے لگی۔

”ارے نہیں۔ بہت مزے کا ہے۔ بس کسی بھی چیز کو دل نہیں چاہ رہا۔“ اس نے شکستہ انداز میں وضاحت کی۔

”پتا۔ آپ کہتے ناں خالہ سے۔ شاید آپ کی بات مان لیں۔ ماموں بھی نہیں آئے ابھی تک۔“

”نہیں دل چاہ رہا تو زبردستی نہیں کرو۔ بعد میں پی لیں گی۔“ شاید دباؤ ان کی فطرت میں نہیں تھا۔

”شاہین خالہ اور جبین خالہ نہیں آئیں؟“ روشی کو ایک اہم کی کا احساس ہوا۔

”سیٹ نہیں ملی۔ فون آیا تھا ان کا۔ جبین آپ کی ہاں تو بیٹا ہوا ہے۔ دس دن کا ہے۔“

”آپ کو یاد ہیں پتا وہ لوگ؟“ روشی نے باپ کی طرف توجہ کی۔

وہ بہت خاموشی سے ان دونوں کے درمیان ہونے والی بات چیت سن رہے تھے۔

”لو۔ یہ رشتے بھی بھولنے والے ہوتے ہیں۔“ مایہ نے ٹوکا۔

”اچھا آپ کتنی بار ملے ہیں اُن سے؟“ وہ مدشوق انداز میں پوچھنے لگی۔

”کئی بار۔“ انہوں نے بہت مختصر جواب دیا۔

”وہ لوگ حویلی آئی تھیں؟“

”دو تین مرتبہ شاید۔“ وہ روشی کے سوالوں سے تنگ پڑ رہے تھے۔

”وہ بھی شروع شروع میں۔“ مایہ نے بھی حصہ لیا۔

”شروع شروع؟“ روشی کے پلے نہیں پڑا۔

”بھئی، بچہ کی شادی کے شروع میں۔“ مایہ بھی عارضی طور پر کچھ دیر پہلے والے ماحول سے باہر آ گئی تھی۔

”پھر تو سب یوگنڈا چلے گئے تھے۔“ مایہ مزید گویا ہوئی۔

”اچھا بتائیں۔ ان دونوں میں امی سے زیادہ کون سی خالہ ملتی ہیں؟“ حویلی سے باہر آ کر تجسس کے رنگ بدل گئے

”شہین آپ!۔“ مایہ نے جواب دیا۔

”تپ پتا؟“ وہ اپنی ماں اور خالوں کے ذکر سے بہت لطف اندوز ہو رہی تھی۔

”مجھے اسیان نہیں۔“ بہت ہی صاف گو تھے یاور علی خاں۔

”پتا مجھے اتنا اچھا لگا۔ جب میں نے نعمان ماموں کو دیکھا۔ ایسا لگا جیسے جواد بھائی آکھڑے ہوئے ہوں۔“

”میں بھی جواد کو دیکھ کر اسی قسم کے احساسات سے دوچار ہوئی تھی۔“ مایہ نے تصدیق کی۔

”بہائی کی شادی اسی گھر میں ہوئی تھی۔“ وہ جیسے سارے سوالات کر دینا چاہتی تھی۔

”نہیں۔ اس وقت پاپا سرکاری ملازم تھے۔ سرکاری کوٹھی تھی۔“

”پاپا آپ نے محسوس کیا ہو کہ میں امی کو بہت مس کرتی ہوں۔ میرا دل شدت سے چاہتا ہے۔ بس وہ ایک دم میرے ہانے آ جائیں۔“

”راٹی۔ بیٹے نماز نہیں پڑھو گی کیا؟“ یاور علی نے مداخلت کی۔

”غشاء کی نماز تو پتا میں بہت آرام سے پڑھتی ہوں۔ خالہ آپ بستر سے اُتریں پلیز گھر میں چلیں پھر میں۔ مجھے کام

تاک۔“ مایہ کی ہیلپ کروں گی۔ ابھی میں کچن میں تھی۔ سب مجھ سے پوچھ رہے تھے کہ آپ کی طبیعت کیسی ہے۔ آپ

بہائی۔“

ماہین خاموشی سے بستر سے اُتر آئی۔ ”پتا نہیں نعمان بھائی کہاں ہیں۔“

”آئیے یاد رہائی! آپ تھک چکے ہوں گے۔ میں آپ کو کمرہ دکھا دوں۔“

”اچھے لہجے میں کہتی ہوئی دروازے کی طرف بڑھی۔ یاور علی خاں اس کے پیچھے چل دیے۔

”اُور روشی! ہمارے ساتھ۔“ مایہ نے پلٹ کر اسے بلایا۔

”میں ڈرائنگ روم میں جا رہی ہوں۔ وہاں ایک آنٹی سے ملوں گی۔ کچن میں دوستی ہوئی ہے میری اُن سے۔ آپ

سے رات سائیڈ پر رہتی ہیں۔“

”اس نے سلیم پاپاؤں میں پھنسانے کے دوران جواب دیا۔

”اچھا۔۔۔ سارا آنٹی، وہ ابھی ہیں یہاں۔ بہت اچھی پڑوسن ہیں۔ انیس روکنا۔ میں آرہی ہوں۔“ مایہ اور یاور علی

نہ اسے پیچھے باہر چلے گئے۔

روش! وہ پاس پر پڑنے سے جما کر ڈرائنگ روم میں چلی آئی۔

”روش! فون ہے۔“ نعمان نے ڈرائنگ روم میں آ کر اطلاع دی۔ ”یہ سامنے میرا بیڈ روم ہے۔ ادھر آ جاؤ۔“

دوبارہ چار خواتین میں گھری نہایت خضوع و خشوع سے گفتگو کرنے میں مگن تھی۔

بڑے اہتمام سے دو ہٹاپورے وجود پر پھیلائے، زمانے بھر کی بنجیدگی چہرے پر سجائے اس کا اندازہ غصہ سے تعلق رکھتا تھا۔ بہت ہی کھٹکی تھی مداخلت۔

”ایکسیوزی، ابھی آئی۔“ وہ اٹھ کر نعمان کے بیڈروم میں چلی آئی۔
 ”ہیلو!“

”بھئی، آپ اتنی دُور جا کر بھی مجھے چین سے بیٹھنے نہیں دیں گی؟“ دوسری طرف باری تھا۔

دل کچھ عجیب سے انداز میں دھڑکا۔ مگر دوسرے ہی لمحے جیسے بھڑکیں چمٹ گئیں۔

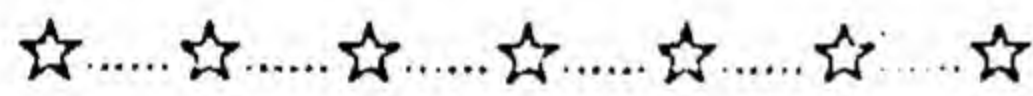
”ڈونٹ بلیم می، ریموٹ سے چنگیاں کاٹ رہی ہوں؟“ وہ الزام تراشی پر تلملنائی۔

”الزام نہیں لگاتا۔ جرم ڈینوٹ کرتا ہوں۔ نعیم صاحب ایڈریس مانگ رہے ہیں۔ تعزیت کے لیے پہنچاؤ۔“

بتائیے۔ کسی کا غم کسی کی خوشی ہے، کیوں؟“

باری بڑے پُر تاسف انداز میں کہہ رہا تھا۔

”باری! حویلی پہنچ کر تمہاری وہ خبر لوں گی۔“ وہ دانت پیستے ہوئے کہہ رہی تھی۔



”حوالی کیا، تمام ریابستی میں آپ کو نامہ ولت کن ”خبریں“ مل سکتی ہیں۔ موصوف بڑے ہمہ جہت ہیں۔ ”ان“ رہتے

تیسرا نمبر۔ یہ بتائیے تعزیت کرنا کوئی بری بات ہے یا وہ اب بڑی سنجیدہ سی آواز میں پوچھ رہا تھا۔

”مگر جو لوگ تعزیت کرنا چاہ رہے ہیں۔ ان کی تعزیت کی یہاں کسی بضرورت نہیں۔“ وہ گرجولہ ہوئی۔

”اجی ”لوگ“ کہیں۔ ابھی تو اکیلے ہیں۔ لوگ تو آپ کے ساتھ مل کر نہیں گئے۔“

”اُن کے کچھ تھے۔ مت کیا کرو اُن سے متعلق مجھے فون۔“ وہ پھر بھڑکی۔

”اب تو میں جو کچھ سنوں گا، آپ کے حوالے سے لگوں گا اُن کا۔“ بلکہ پہلے تو آپ میری ”کچھ“ لکھیں۔ خیر ڈونٹ مائنڈ۔

فون بند کر رہا ہوں۔ ویسے یہ ورچا اُن کی طرف جائیں تو آپ ضرور جائیے گا۔ اسی بہانے گھر بھی دیکھ لیجیے گا۔ مثلاً وہاں کے

وہ جو اس کا جملہ مکمل ہونے کے بعد ایک ”عظیم جہاز“ شروع کرنے والی تھی۔ دانت چیس کر رہ گئی۔ جہنم کا فرشتہ، میری

پھر ہے۔ مارے کوفت کے آنکھوں میں پانی اُتر آیا۔ ایسے گن گن کر بد لے لوں گی۔ وہ آئندہ کالائجہ عمل

ترتیب دے کر اپنا اشتعال بجھانے کی کوشش کرنے لگی۔

چند منٹ خود پر قابو پانے میں لگے۔ پھر دوپٹا درست کرتی واپس ڈرائنگ روم میں آ گئی۔
مسکراہٹ کی تو آج کے ماحول میں ضرورت ہی نہ تھی۔ اُترا ہوا چہرہ آج ہر قسم کے سوالات سے مبرا تھا۔
اس کے حق میں تھی۔

”یہ پاپا کا بیڈ روم ہے۔ آپ کو کچھ فیمل تو نہیں ہوگا؟“ اس کی آواز رندھی ہوئی تھی۔
”ڈزن میٹر، زندہ وجود بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ یہ بے چاری بے جان دیواریں اور یہ وقت کی قسم کے ٹکڑے
ہے۔ اگر آپ مجھے کسی راہداری میں پٹنگ ڈال کر بھی آرام کرنے کو کہیں گی تو مجھے کوئی اعتراض نہ ہوگا۔“
ماہین نے حیرت سے چونک کر ان کی شکل دیکھی۔ اتنا بڑا تکلف۔ حد سے زیادہ فارمل۔ ڈی۔ سی۔ جو غلطی نہ

ضابطے کے تحت اٹھاتا تھا۔ کس قدر تبدیلی کا مظہر بنا ہوا تھا۔
”بہت بہت شکریہ! اس اپنائیت کا۔ ہم ہمیشہ یاد رکھیں گے۔“ اس کی آواز بھیگی ہوئی تھی۔
یاور علی خاموش رہے۔
”آپ تھک گئے ہوں گے۔“
”سو واٹ؟“ وہ اپنا سوٹ کیس جو ان سے پہلے وہاں موجود تھا۔ بیڈ پر رکھ کر شبِ خوابی کا لباس نکالنے لگے۔
”میرا مطلب ہے، اب آپ آرام کیجیے۔“ وہ جانے کے لیے پلٹی۔
”یہ روٹین کا ماحول تو نہیں ہے۔ آپ مجھے آرام کا کہہ کر پھر ایک کونے میں جا بیٹھیں گی اور روٹین کی غورانی
یہاں بیٹھیے۔“
”آپ کے پاس؟“ ماہین کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔ کس قدر ”تبدیل شدہ“ حالت میں تھے وہ۔
”نہیں، وہاں صوفے پر۔“ وہ بھی برجستہ بولے۔
ماہین کو قطعی توقع نہیں تھی۔ عجیب سی کھیاہٹ اس پر طاری ہو گئی۔ وہ اپنی حالت کو نارمل بناتی ہوئی صوفے پر بیٹھی۔
یاور علی خاں اپنے کام سے فارغ ہو کر، اس کے نزدیک پڑی ایک خوبصورت سی کرسی پر آ کر بیٹھ گئے۔
”کس خیال میں ہیں۔ زیادہ ٹینس طاری نہ کریں خود پر۔ یہ آپ کے لیے اچھا نہیں ہے۔ میں آپ سے بات
سکتا کہ آپ نہیں اور مسکرائیں، لیکن پلیز کوشش کر کے اپنے دل و ذہن پر کنٹرول کریں۔“
”نہیں ہوتا۔“ وہ جو محض طرزِ مزبانی میں خود پر بہت کنٹرول کر رہی تھی پھر ایک دم سے بکھر گئی اور ہنسنے لگی۔
رونے لگی۔

یاور علی خاں کے سرِ داور بے مہر سے دل میں ہلکی سی لرزش ہوئی۔ اس سے تو بہتر پہلے کی صورت حال تھی۔
کیا کیا؟ وہ بُری طرح الجھ گئے۔

”یہ آپ کا بیڈ روم ہے۔ آپ کو کچھ فیمل تو نہیں ہوگا؟“ اس کی آواز رندھی ہوئی تھی۔
”ڈزن میٹر، زندہ وجود بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ یہ بے چاری بے جان دیواریں اور یہ وقت کی قسم کے ٹکڑے
ہے۔ اگر آپ مجھے کسی راہداری میں پٹنگ ڈال کر بھی آرام کرنے کو کہیں گی تو مجھے کوئی اعتراض نہ ہوگا۔“
ماہین نے حیرت سے چونک کر ان کی شکل دیکھی۔ اتنا بڑا تکلف۔ حد سے زیادہ فارمل۔ ڈی۔ سی۔ جو غلطی نہ

ضابطے کے تحت اٹھاتا تھا۔ کس قدر تبدیلی کا مظہر بنا ہوا تھا۔
”بہت بہت شکریہ! اس اپنائیت کا۔ ہم ہمیشہ یاد رکھیں گے۔“ اس کی آواز بھیگی ہوئی تھی۔
یاور علی خاموش رہے۔
”آپ تھک گئے ہوں گے۔“
”سو واٹ؟“ وہ اپنا سوٹ کیس جو ان سے پہلے وہاں موجود تھا۔ بیڈ پر رکھ کر شبِ خوابی کا لباس نکالنے لگے۔
”میرا مطلب ہے، اب آپ آرام کیجیے۔“ وہ جانے کے لیے پلٹی۔
”یہ روٹین کا ماحول تو نہیں ہے۔ آپ مجھے آرام کا کہہ کر پھر ایک کونے میں جا بیٹھیں گی اور روٹین کی غورانی
یہاں بیٹھیے۔“
”آپ کے پاس؟“ ماہین کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔ کس قدر ”تبدیل شدہ“ حالت میں تھے وہ۔
”نہیں، وہاں صوفے پر۔“ وہ بھی برجستہ بولے۔
ماہین کو قطعی توقع نہیں تھی۔ عجیب سی کھیاہٹ اس پر طاری ہو گئی۔ وہ اپنی حالت کو نارمل بناتی ہوئی صوفے پر بیٹھی۔
یاور علی خاں اپنے کام سے فارغ ہو کر، اس کے نزدیک پڑی ایک خوبصورت سی کرسی پر آ کر بیٹھ گئے۔
”کس خیال میں ہیں۔ زیادہ ٹینس طاری نہ کریں خود پر۔ یہ آپ کے لیے اچھا نہیں ہے۔ میں آپ سے بات
سکتا کہ آپ نہیں اور مسکرائیں، لیکن پلیز کوشش کر کے اپنے دل و ذہن پر کنٹرول کریں۔“
”نہیں ہوتا۔“ وہ جو محض طرزِ مزبانی میں خود پر بہت کنٹرول کر رہی تھی پھر ایک دم سے بکھر گئی اور ہنسنے لگی۔
رونے لگی۔

یاور علی خاں کے سرِ داور بے مہر سے دل میں ہلکی سی لرزش ہوئی۔ اس سے تو بہتر پہلے کی صورت حال تھی۔
کیا کیا؟ وہ بُری طرح الجھ گئے۔

”یہ آپ کا بیڈ روم ہے۔ آپ کو کچھ فیمل تو نہیں ہوگا؟“ اس کی آواز رندھی ہوئی تھی۔
”ڈزن میٹر، زندہ وجود بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ یہ بے چاری بے جان دیواریں اور یہ وقت کی قسم کے ٹکڑے
ہے۔ اگر آپ مجھے کسی راہداری میں پٹنگ ڈال کر بھی آرام کرنے کو کہیں گی تو مجھے کوئی اعتراض نہ ہوگا۔“
ماہین نے حیرت سے چونک کر ان کی شکل دیکھی۔ اتنا بڑا تکلف۔ حد سے زیادہ فارمل۔ ڈی۔ سی۔ جو غلطی نہ

ضابطے کے تحت اٹھاتا تھا۔ کس قدر تبدیلی کا مظہر بنا ہوا تھا۔
”بہت بہت شکریہ! اس اپنائیت کا۔ ہم ہمیشہ یاد رکھیں گے۔“ اس کی آواز بھیگی ہوئی تھی۔
یاور علی خاموش رہے۔
”آپ تھک گئے ہوں گے۔“
”سو واٹ؟“ وہ اپنا سوٹ کیس جو ان سے پہلے وہاں موجود تھا۔ بیڈ پر رکھ کر شبِ خوابی کا لباس نکالنے لگے۔
”میرا مطلب ہے، اب آپ آرام کیجیے۔“ وہ جانے کے لیے پلٹی۔
”یہ روٹین کا ماحول تو نہیں ہے۔ آپ مجھے آرام کا کہہ کر پھر ایک کونے میں جا بیٹھیں گی اور روٹین کی غورانی
یہاں بیٹھیے۔“
”آپ کے پاس؟“ ماہین کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔ کس قدر ”تبدیل شدہ“ حالت میں تھے وہ۔
”نہیں، وہاں صوفے پر۔“ وہ بھی برجستہ بولے۔
ماہین کو قطعی توقع نہیں تھی۔ عجیب سی کھیاہٹ اس پر طاری ہو گئی۔ وہ اپنی حالت کو نارمل بناتی ہوئی صوفے پر بیٹھی۔
یاور علی خاں اپنے کام سے فارغ ہو کر، اس کے نزدیک پڑی ایک خوبصورت سی کرسی پر آ کر بیٹھ گئے۔
”کس خیال میں ہیں۔ زیادہ ٹینس طاری نہ کریں خود پر۔ یہ آپ کے لیے اچھا نہیں ہے۔ میں آپ سے بات
سکتا کہ آپ نہیں اور مسکرائیں، لیکن پلیز کوشش کر کے اپنے دل و ذہن پر کنٹرول کریں۔“
”نہیں ہوتا۔“ وہ جو محض طرزِ مزبانی میں خود پر بہت کنٹرول کر رہی تھی پھر ایک دم سے بکھر گئی اور ہنسنے لگی۔
رونے لگی۔

یاور علی خاں کے سرِ داور بے مہر سے دل میں ہلکی سی لرزش ہوئی۔ اس سے تو بہتر پہلے کی صورت حال تھی۔
کیا کیا؟ وہ بُری طرح الجھ گئے۔

تھا کہ انہوں نے سنی اُن سنی کرتے ہوئے گہرا کش لگا کر آہستہ آہستہ منہ سے دھواں نکالنا شروع کر دیا۔
 ”ظاہر ہے، فوراً تو سبجلیں گی نہیں۔ تازہ تازہ غم ہے۔“ ”مگر آپ تو سلی دینے کی لڑائی تو کرنا چاہیے۔“
 آنجل سے ماہین کے آنسو پونچھتے ہوئے کہہ رہی تھی۔
 وہ خاموش رہے۔

”آئیے خالہ! ہم نیچے چلتے ہیں۔ مگر آپ اب رویے گا نہیں۔ نیچے سب آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔“
 نے ماہین کو شانوں سے پکڑ کر اٹھایا۔

وہ سسکیاں بھرتی اٹھ کھڑی ہوئی۔
 ”گڈ ٹائٹ پٹا روشنی نے ماہین کو ساتھ لے کر چلتے چلتے مڑ کر کہا۔

یادو علی خاں نے کھڑکیوں کی سمت دیکھا، جن پر پڑے پردے روشنی ہٹانا بھول گئی تھی۔ پھر اپنی جگہ
 سرکائے۔ اور باہر سڑک کا منظر دیکھنے لگے۔ جہاں اکاؤ کا گاڑیاں گزر رہی تھیں۔ ان کی سرخ آنکھوں میں
 بہت واضح تھا۔

عمارت پر گہرا تاریک خلاف چڑھا ہوا تھا۔
 حتیٰ کہ اندر کسی موم جی کی کو بھی ٹمنڈی دکھائی دے رہی تھی۔ مگر کتوں کے بھونکنے کی آوازاں میں انہیں
 کسی وقفے کا امکان تقریباً ناممکن ہی دکھائی دیتا تھا۔ سیاہ جیپ پھانک پر رُک گئی تھی۔ ہارن ایک تواتر سے بونا
 ایک منٹ کے اندر پھانک کھل گیا تھا۔ کھولنے والے کے ہاتھ میں طاقتور نارچ جگمگ رہی تھی۔ جیپ
 داخل ہو گئی تھی۔ اور پھانک کھولنے والا جیپ کے پیچھے سر پٹ دوڑا تھا۔ اور بڑی پھرتی سے ڈرائیونگ سٹارٹ
 تھا۔

”اس لڑکی کو بھی اُتارو۔“ تمبیر آواز تاریکی میں گونجی۔
 ”یہاں تو بہت اندھیرا ہے خان!“ جھومر کی آواز میں واضح لرزش تھی۔
 ”مگر تمہارے دماغ کے اندھیرے سے زیادہ نہیں۔“

”کل باز خان! نارچ ادھر دو۔ چلو لڑکی، آگے بڑھو۔“ تیمور علی خاں نے نارچ کی روشنی سے رہنمائی کی۔
 گلباز بھی ساتھ چل پڑا۔

”تم یہیں ٹھہرو۔ ہمارا انتظار کرو۔“ تیمور علی خاں نے اسے ٹوک دیا۔

”یہ ہال کرا ہے جھومر۔ اس کے ساتھ یہ دو کمرے۔ آگے جو راہداری ہے، اس کے اگلے سر پہنچے۔“
 عمارت میں تقریباً سات کمرے ہیں۔ چار نیچے اور تین اوپر۔ آج سے یہ سب تمہارے ہیں۔ یہاں جو کچھ
 ہے۔

سیونک یہ عمارت آبادی سے بہت دُور ہے۔ یہاں چالیس سال سے کوئی رہا نہیں، اس لیے یہاں بجلی، پانی جیسی جدید
 سہولتیں بھی نہیں ہیں۔ مگر تمہیں لائٹیں مہیا کر دی جائے گی۔ ادھر بڑے دالان میں البتہ ہینڈ پمپ موجود ہے۔ تمہیں پانی کا
 مسئلہ نہیں ہوگا۔“

صابن، تل وغیرہ تمہیں مل جائے گا۔ اور ایک بڑا آئینہ بھی۔ روز نہادھو کر اس میں اپنی شکل دیکھا کرنا۔
 اب آؤ واپس ہال کمرے کی طرف۔ یہاں ایک تخت موجود ہے۔ اسے ہی اپنا بستر سمجھو۔ گلباز یہاں کا پرانا چوکیدار
 ہے۔ اس علاقے میں ہماری بارانی زمینوں کی دیکھ بھال کرتا ہے۔ اب تمہاری نگرانی بھی کرے گا۔ ”کیلاش“ کا اجڈ ہے۔
 اسے آواز دینا نہ بھانسنے کی کوشش کرنا۔ شکل اس کی اڑانوں جیسی سہی، مگر خصوصیات درندوں جیسی ہیں۔ ہم نے یہ
 جربہ پہلی تمہارے حوالے کی۔ تم اس میں جیسے چاہو رہو۔ کوئی روک ٹوک نہیں۔ مگر صرف اندر۔ باہر کی طرف آنکھ اٹھانا
 مجازم ہے۔“

”یہ قلم ہے خان!“ جھومر کا ہنسی ہوئی اُن کی سست بڑھی۔
 ”ہم تمہیں خرید چکے ہیں۔ تم ہماری ملکیت ہو۔ ہم جیسے چاہے استعمال کریں۔ ہم نے تمہیں سر پر بٹھایا تھا۔ عزت دی
 مگر تمہیں راس نہیں آئی۔ اب تمہیں تمہارا اصلی مقام دے رہے ہیں۔ تاکہ تمہیں شکر اور ناشکری کے معنی پتا چلیں۔ ہر
 ہندوان بعد تمہارے باپ کو بھیج دیا کریں گے۔ جو تبدیلی اپنے اندر محسوس کرو اسے بتا دیا کرنا۔ خدا حافظ۔“ تیمور علی خاں
 ہٹ گئے۔

”خان۔ خدا کے لیے ٹھہریں، میزی بات سنیں۔“ جھومر اُن کے پیچھے دوڑی۔
 ”گلباز، اس نمک حرام کو سنبھالو۔ اس کی آواز سن کر دل چاہتا ہے، اس کی زبان کھینچ کر آگ میں جھونک دیں۔“ وہ
 ہنکارتے ہوئے حکم دے رہے تھے۔

”آپ اس طرح نہیں جاسکتے۔ میں مرجاؤں گی۔ پاگل ہو جاؤں گی۔ خدا کے لیے۔ وہ پھر دوڑی۔
 مگر گلباز تیزی سے درمیان میں آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں تیز دھار خنجر چمک رہا تھا۔
 ”اگر یہ تمہیں تنگ کرے تو اس کے اٹنے ہاتھ کی انگلیاں کاٹ کر کتوں کو کھلا دینا۔ پھر بھی باز نہ آئے تو سیدھے ہاتھ کی
 انگلیاں جھاڑ دینا۔ پھر بھی باز نہ آئے تو اس کی ناک جڑ سے کاٹ کر اپنے شیرے کو کھلا دینا۔“

وہ اس طرح غرار ہے تھے کہ آس پاس تازہ خون اور کچے گوشت کی باس محسوس ہونے لگی تھی۔
 جھومر نے تڑپ کر اپنی ناک پر ہاتھ رکھ لیا اور وحشت زدہ ہرنی کی طرح گلباز کی طرف دیکھنے لگی۔
 تیمور علی خاں کے قدموں کی آواز معدوم ہو گئی۔ اور تھوڑی دیر بعد جیپ اشارت ہونے کی آواز آئی۔
 گلباز نے اپنی سفاک آنکھیں اس پر جما کر نارچ سے ہال کمرے کی طرف اشارہ کیا جہاں بقول تیمور علی خاں کے اس
 کا بستر تھا۔

وہ محسوس کرنے لگی جیسے اس کا دل بیٹھ رہا ہے۔ اور ٹانگیں بے جان ہو رہی تھیں۔ وہ دیوار کا سہارا لے کر آگے بڑھنے

لگی۔ خوف و وحشت سے تو جیسے آنسو بھی خشک ہو چکے تھے۔

اس نے دروازے میں زک کرٹن اور فلاسک فرش پر رکھا اور چادر درست کی، پہلے دروازے پر آہستہ سے بڑی احتیاط سے دروازہ کھولا۔

”السلام علیکم!“ اس سے پیشتر کہ وہ سلام کرتی، سلام اس تک آ گیا تھا۔

وہ مارے گھبراہٹ کے منہ ہی منہ میں جواب دے کر رہ گئی۔

”وہ ہمارے یار کہاں رہ گئے؟ بڑی خالی خالی سی لگ رہی ہیں آج!“

”وہ ضروری کام سے صبح حیدر آباد چلے گئے تھے۔ کہہ رہے تھے، وہیں سے سیدھا ہاسپٹل پہنچوں گا۔“

ٹھکانے پر رکھتے ہوئے اپنی چادر سے چہرہ پونچھا۔

”اچھا! مگر آج تو شام بھی پھر مشکل سے ہوگی۔“ اس نے آنکھوں پر بازو رکھ لیا۔ ایک دم چپ لپٹا ہوا۔

پلٹ کر اس کی سمت دیکھا۔ ”بہت محبت ہے آپ کو اپنے دوست سے؟“

اس نے ٹنٹن کھولنا شروع کیا۔

خدا کے سامنے کس منہ سے جائیں گے خدا جانے

محبت کا کوئی دھبہ نہیں ہے جن کے دامن پر

وہی ہوا جس کا بالو کو خطرہ تھا۔ یعنی شعر آ گیا تھا۔

”اٹھیے! کھانا کھا لیجیے۔“ اس نے ٹرے میں ساتھ لائی ہوئی چیزیں رکھیں اور اس کے قریب آ کھڑی ہوئی۔

شکر کرنے لگی۔ کہ جتنی دیر کھانا کھانے میں مصروف رہے گا۔ وہ شعروں سے تو بچی رہے گی۔

وہ اُنھ کر بیٹھ گیا۔ اور ٹرے پر نظریں دوڑانے لگا۔ ”میرے حصے کی مرغیوں کو تو جان کی آمان دے دیں۔“

گیا ہوں میں اس چکن سے۔“ اس نے معصوم بچوں کی طرح کانخرا کیا تھا۔

”یہ آپ کے لیے بہت اچھی چیز ہے عارف بھائی۔ آپ کے دوست دیسی مرغی بنواتے ہیں۔ وہ کہہ رہے۔“

ڈاکٹروں نے کہا ہے، آپ کو زیادہ سے زیادہ گوشت استعمال کرنا چاہیے۔ آپ کا خون بھی بہت کمزور ہے۔“

بہت کمی ہو گئی ہے۔“ بالو نے شوہر کے الفاظ من و عن دہرا دیے۔

عارف ہاتھ دھونے ہاتھ روم جارہا تھا۔ بے ساختہ مسکرا دیا۔

”انشاء اللہ میری صحت یابی تک، آپ آدھی ڈاکٹر تو بن ہی جائیں گی۔“ وہ مسکرا کر کہہ رہا تھا۔

بالو اس کی مسکراہٹ سے ایک دم محتاط ہو گئی۔ اور اس کے ہاتھ روم جاتے ہی کرسی اس کے بیڈ روم سے اُڑا دی۔

اور خود اس کی پشت سے ٹیک لگا کر اس کے باہر آنے کا انتظار کرنے لگی۔

چند منٹوں بعد وہ باہر آ گیا۔

”بہنو جائیے بھابی۔ کھڑی کیوں ہیں؟“ وہ رومال جیب سے نکل کر ہاتھ پونچھنے لگا۔

”بالو نکالتے ہوئے اس کا پرس جیب سے نکل کر بیڈ کے نیچے جا پڑا۔ وہ ادھر ادھر دیکھنے لگا کہ کیا گرا ہے۔ ہاتھ پونچھ رہا

روال نکالتے ہوئے اس کا پرس جیب سے نکل کر بیڈ کے نیچے جا پڑا۔ وہ ادھر ادھر دیکھنے لگا کہ کیا گرا ہے۔ ہاتھ پونچھ رہا

روال نکالتے ہوئے اس کا پرس جیب سے نکل کر بیڈ کے نیچے جا پڑا۔ وہ ادھر ادھر دیکھنے لگا کہ کیا گرا ہے۔ ہاتھ پونچھ رہا

روال نکالتے ہوئے اس کا پرس جیب سے نکل کر بیڈ کے نیچے جا پڑا۔ وہ ادھر ادھر دیکھنے لگا کہ کیا گرا ہے۔ ہاتھ پونچھ رہا

روال نکالتے ہوئے اس کا پرس جیب سے نکل کر بیڈ کے نیچے جا پڑا۔ وہ ادھر ادھر دیکھنے لگا کہ کیا گرا ہے۔ ہاتھ پونچھ رہا

روال نکالتے ہوئے اس کا پرس جیب سے نکل کر بیڈ کے نیچے جا پڑا۔ وہ ادھر ادھر دیکھنے لگا کہ کیا گرا ہے۔ ہاتھ پونچھ رہا

روال نکالتے ہوئے اس کا پرس جیب سے نکل کر بیڈ کے نیچے جا پڑا۔ وہ ادھر ادھر دیکھنے لگا کہ کیا گرا ہے۔ ہاتھ پونچھ رہا

روال نکالتے ہوئے اس کا پرس جیب سے نکل کر بیڈ کے نیچے جا پڑا۔ وہ ادھر ادھر دیکھنے لگا کہ کیا گرا ہے۔ ہاتھ پونچھ رہا

روال نکالتے ہوئے اس کا پرس جیب سے نکل کر بیڈ کے نیچے جا پڑا۔ وہ ادھر ادھر دیکھنے لگا کہ کیا گرا ہے۔ ہاتھ پونچھ رہا

روال نکالتے ہوئے اس کا پرس جیب سے نکل کر بیڈ کے نیچے جا پڑا۔ وہ ادھر ادھر دیکھنے لگا کہ کیا گرا ہے۔ ہاتھ پونچھ رہا

روال نکالتے ہوئے اس کا پرس جیب سے نکل کر بیڈ کے نیچے جا پڑا۔ وہ ادھر ادھر دیکھنے لگا کہ کیا گرا ہے۔ ہاتھ پونچھ رہا

روال نکالتے ہوئے اس کا پرس جیب سے نکل کر بیڈ کے نیچے جا پڑا۔ وہ ادھر ادھر دیکھنے لگا کہ کیا گرا ہے۔ ہاتھ پونچھ رہا

روال نکالتے ہوئے اس کا پرس جیب سے نکل کر بیڈ کے نیچے جا پڑا۔ وہ ادھر ادھر دیکھنے لگا کہ کیا گرا ہے۔ ہاتھ پونچھ رہا

روال نکالتے ہوئے اس کا پرس جیب سے نکل کر بیڈ کے نیچے جا پڑا۔ وہ ادھر ادھر دیکھنے لگا کہ کیا گرا ہے۔ ہاتھ پونچھ رہا

روال نکالتے ہوئے اس کا پرس جیب سے نکل کر بیڈ کے نیچے جا پڑا۔ وہ ادھر ادھر دیکھنے لگا کہ کیا گرا ہے۔ ہاتھ پونچھ رہا

روال نکالتے ہوئے اس کا پرس جیب سے نکل کر بیڈ کے نیچے جا پڑا۔ وہ ادھر ادھر دیکھنے لگا کہ کیا گرا ہے۔ ہاتھ پونچھ رہا

روال نکالتے ہوئے اس کا پرس جیب سے نکل کر بیڈ کے نیچے جا پڑا۔ وہ ادھر ادھر دیکھنے لگا کہ کیا گرا ہے۔ ہاتھ پونچھ رہا

روال نکالتے ہوئے اس کا پرس جیب سے نکل کر بیڈ کے نیچے جا پڑا۔ وہ ادھر ادھر دیکھنے لگا کہ کیا گرا ہے۔ ہاتھ پونچھ رہا

روال نکالتے ہوئے اس کا پرس جیب سے نکل کر بیڈ کے نیچے جا پڑا۔ وہ ادھر ادھر دیکھنے لگا کہ کیا گرا ہے۔ ہاتھ پونچھ رہا

روال نکالتے ہوئے اس کا پرس جیب سے نکل کر بیڈ کے نیچے جا پڑا۔ وہ ادھر ادھر دیکھنے لگا کہ کیا گرا ہے۔ ہاتھ پونچھ رہا

روال نکالتے ہوئے اس کا پرس جیب سے نکل کر بیڈ کے نیچے جا پڑا۔ وہ ادھر ادھر دیکھنے لگا کہ کیا گرا ہے۔ ہاتھ پونچھ رہا

روال نکالتے ہوئے اس کا پرس جیب سے نکل کر بیڈ کے نیچے جا پڑا۔ وہ ادھر ادھر دیکھنے لگا کہ کیا گرا ہے۔ ہاتھ پونچھ رہا

روال نکالتے ہوئے اس کا پرس جیب سے نکل کر بیڈ کے نیچے جا پڑا۔ وہ ادھر ادھر دیکھنے لگا کہ کیا گرا ہے۔ ہاتھ پونچھ رہا

روال نکالتے ہوئے اس کا پرس جیب سے نکل کر بیڈ کے نیچے جا پڑا۔ وہ ادھر ادھر دیکھنے لگا کہ کیا گرا ہے۔ ہاتھ پونچھ رہا

روال نکالتے ہوئے اس کا پرس جیب سے نکل کر بیڈ کے نیچے جا پڑا۔ وہ ادھر ادھر دیکھنے لگا کہ کیا گرا ہے۔ ہاتھ پونچھ رہا

روال نکالتے ہوئے اس کا پرس جیب سے نکل کر بیڈ کے نیچے جا پڑا۔ وہ ادھر ادھر دیکھنے لگا کہ کیا گرا ہے۔ ہاتھ پونچھ رہا

روال نکالتے ہوئے اس کا پرس جیب سے نکل کر بیڈ کے نیچے جا پڑا۔ وہ ادھر ادھر دیکھنے لگا کہ کیا گرا ہے۔ ہاتھ پونچھ رہا

آپ کئی سوالات کر سکتی تھیں۔ مجھے اس جگہ بڑی حیرت ہے۔“ اس نے گلاس اٹھا کر منہ سے لگا لیا۔
”مگر خیر۔۔۔ یہ کوئی عیب نہیں۔ اچھی بات ہے۔ یہ بھی کسی انسان کا وصف کہلاتا ہے۔ بعض لوگوں کی ہوتی ہے خاموشی۔

وہ کیا کہا ہے۔ کسی بھٹے سے شاعر نے۔

ہم کریں بات دلیلوں سے تو زد ہوتی ہے
اُس کے ہونٹوں کی خاموشی بھی سند ہوتی ہے

تو شاید آپ ایسے لوگوں میں شامل ہوتی ہیں۔ آپ تنگ تو نہیں پڑتیں، میرے بولنے سے؟“ وہ سائل تھا۔

وہ اس کی آواز کی طرف متوجہ ہی کب تھی۔ اسے تو وہ اپنے خوابوں کا دلال نظر آ رہا تھا۔

”ہو۔۔۔ ہو۔۔۔“ بابا صاحب کی آواز سے فکر مندی چھٹکنے لگی۔
”خیر۔۔۔ خیر۔۔۔ تم فکر نہ کرو۔ بڑی زحمت ہو رہی ہے تمہیں۔ ہمیں بہت افسوس ہے۔“ وہ بیٹے سے مخاطب تھے۔
یہ بھی بات آج تک باری کی سمجھ میں نہیں آئی تھی کہ اُن کا رویہ تیمور علی خاں سے اس طرح کا یعنی سب سے کیوں

تف بہت ہے۔
”ہم بھی بولتے ہیں باری کو۔ اور کوئی بات۔“
”جی نہیں، شکریہ، خدا حافظ!“ فون بند کر دیا۔

باری نے احتیاط سے ریسور رکھ دیا۔

”باللہ اب کس حسینہ کے امتحان میں گرفتار ہونے والا ہوں۔“ اس نے چھت کی طرف دیکھ کر خود سے سوال کیا۔ اس کے کانوں میں تیمور علی خاں کی آواز گونج رہی تھی۔ ”لڑکی بہت خوبصورت ہے۔“

”بھائی۔۔۔ کیا میں ”لڑکی پروف“ ہوں؟“ اسے جانے کیوں ہنسی آ گئی۔ کسی بھی لمحے بابا صاحب کا بلاوا آنے والا

وہ بہت گمن انداز میں گشتا تا ہوا ہال کمرے کی طرف آیا تھا۔ رات کے بارہ بج کر چالیس منٹ ہو چکے تھے۔

دوست شارجہ سے اپنے گھر پہنچا تھا۔ وہ یہی کنفرم کرنا چاہ رہا تھا کہ آیا وہ گھر پہنچ چکا یا نہیں۔ تاکہ وہ صبح اس سے ملے۔
ہال کمرے میں گہرا سکوت طاری تھا۔ بے چاری کھوان شریر لڑکوں کا پھیلاوا بڑی تندہی سے سمیٹ رہا تھا۔
چلغوزے کے تھلکے۔ کہیں ٹوٹی ہوئی چوڑیوں کے ٹکڑے۔ کہیں لکھن کا مینار۔ کہیں اخبار، کہیں رسالے، کئی لڑا سوئے لگا۔

کنٹرول۔ تو کسی جگہ ویڈیو کیسٹ۔

باری نے سارے ”پھیلاوے“ پر نظر ڈال کر کھوکی سمت بڑی ہمدردی سے دیکھا اور فون کے ساتھ ہی رہے۔
بیٹھ گیا۔ بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے نہایت اطمینان سے ریسور اٹھایا اور ٹیون چیک کی مگر ایک دم چونک پڑا۔
چیت ہو رہی تھی۔

”گلابا زکی حالت بہت خراب ہے بابا صاحب! اس لیے کسی بھروسے کے آدمی کی فوراً ضرورت ہے۔“

”تمہارے پاس اتنے آدمی ہیں۔ ایک بھی بھروسے کا نہیں؟“ بابا صاحب پوچھ رہے تھے۔

”یہ بات نہیں ہے۔ آپ سمجھیں ناں! لڑکی بہت خوبصورت ہے۔“

”اچھا۔۔۔ اچھا۔۔۔ ہم سمجھ گئے۔ ٹھیک ہے۔ باری کو بھیج دیں؟“ وہ پوچھ رہے تھے۔

”میرے خیال میں باری ہی مناسب ہے۔“ وہ پہنچان چکا تھا۔ دوسری طرف کا کاجان یعنی تیمور علی خاں نے

”آپ اسے کہیے کہ وہ سیدھا سرائے آئے۔ اسے صبح سے پہلے بھیج دیں۔ آپ کو نہیں پتا مجھے یہاں؟“

بھاری لگ رہا ہے۔ موبائل پر آپ سے بات کر رہا ہوں۔“

”ارے۔۔۔ تو کیا تم خود وہاں موجود ہو؟“ بابا صاحب کی حیرت آمیز آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔

”تو پھر کیا کرتا؟ اس کے باپ کو بھیجتا تو وہ اُجڈاس کا گلا ہی گھونٹ دیتا۔“

مونا ماوا گھنٹی جھومتی ہال میں داخل ہوئی۔

”خان۔۔۔ آپ اور بیٹھے ہو۔ میں سارا اوپر دیکھ آئی۔ اور یہ بیسیوں کے ساتھ قلم ڈرامے دیکھتی رہتی ہے۔ اور پھر دیر

تک باؤ کر کام کرتی ہے۔ صبح ڈھول بجانے پر بھی نہیں اٹھتی۔“ ماما بیتی نے ایک اسٹیشن پر دوپروگرام نشر کیے۔ کٹو ہاتھ میں

”کیا کہہ رہی تھیں ماما؟“ باری نے اسے اپنی جانب متوجہ کیا۔

”بڑے خان نے یاد کیا ہے آپ کو۔“

”بہت ہی یاد کرتے ہیں وہ ہمیں۔“ وہ اٹھ کھڑا ہو۔

”بہت ہی یاد کرتے ہیں وہ ہمیں۔“ وہ اٹھ کھڑا ہو۔

”بہت ہی یاد کرتے ہیں وہ ہمیں۔“ وہ اٹھ کھڑا ہو۔

”آؤ بھی۔ جلدی آؤ۔“ بابا صاحب کی آواز سے بہت عجلت چھک رہی تھی۔

وہ اندر داخل ہو گیا۔ دلاور علی خاں کمر پر ہاتھ باندھے ٹہل رہے تھے۔ اُسے دیکھ کر رُک گئے۔
”باری!“

”جی خان!“

”اچھا۔۔۔ پہلے تم بیٹھو۔“ وہ اسے بیٹھنے کا کہہ کر خود بھی اپنے بستر پر بیٹھ گئے۔

”بات یہ ہے۔۔۔ تمہیں اسی وقت سرائے جانا ہوگا۔“

اس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو شاید اس کے منہ سے نکل جاتا کہ ”اس وقت؟“ مگر اس نے ہمیشہ کی طرح سکون سے ساتھ صرف اتنا کہا۔

”جی بہتر۔“

”ڈرائیور کو اٹھا دو۔ تم سارا دن کے تھکے ہوئے ہو، ڈرائیور مت کرنا۔“

”جی بہتر! کوئی اور حکم؟“ وہ اٹھنے کے لیے پرتولنے لگا۔

”نہیں۔۔۔ اب جو کچھ حکم دیں گے تیمور خاں دیں گے۔ تم جا سکتے ہو۔“ وہ بستر پر دراز ہو گئے۔
وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

”اور ہاں سنو!“ انہوں نے پھر پکارا۔

وہ رُک گیا اور پلٹ کر اُن کے قریب آیا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ سخت الجھن میں ہوں۔

”باری! ہمیں تم پر بہت بھروسہ ہے، تم جانتے ہو۔“

اس نے ہاں کہا اور نہ ہی ناں۔ بس خاموش رہا۔

”ظفیری نے دیوار سے ٹکریں مار کر اپنا سر پھاڑ لیا ہے، تم ہی تولائے تھے ڈاکٹر کو؟“

”جی، اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اچانک ظفیری کا ذکر کیوں شروع ہو گیا؟ اسے تو مختلف قسم کے درجے رہتے تھے۔“

”ہمیں اس کی بڑی فکر رہتی ہے۔ بڑی ذہن کی صحت تباہ ہو چکی ہے، اس کے غم میں۔“

وہ پھر گویا ہوئے۔ وہ پھر خاموش رہا۔

”اچھا۔۔۔ خیر۔۔۔ تم جاؤ۔ جتنی جلد ہو سکے۔“ انہوں نے دایاں ہاتھ مٹھی کی شکل میں اپنی پیشانی پر رکھ کر موند لیں۔

باری آہستگی سے دروازہ بند کر کے اپنے کمرے میں آیا۔ اور دو جوڑے کپڑے نکال کر بیگ میں رکھے۔ پھر بکس لے کر باتھ روم گیا۔ وہاں سے چیزیں سمیٹ کر ڈالیں۔ بظاہر وہ تیاری میں مگن تھا، مگر اس کا ذہن دوسرے شے

رہا تھا۔ کیا ہوا ہے وہاں؟ کیا ہو رہا ہے وہاں؟

بیت و اوج باندھتا ہوا باہر آیا اور ڈرائیور کے کوارٹر کی طرف بڑھنے لگا۔

بدر علی خاں تو اپنی عادت کے مطابق علی الصبح ہی بیدار ہوتے تھے۔ یہاں بھی ان کے معمول میں فرق نہ آیا۔

روزانہ کے امور نمٹا کر وہ لان میں چلے آئے تھے۔ ان کا خیال تھا، وہ کچھ دیر چہل قدمی کریں گے۔ مگر انہیں رُکنا پڑا۔

بیت کی کٹ نظر تھا۔

سند بڑی سی چادر سے خود کو ڈھانپے سفید ہی بنج پر آلتی پالتی مارے مابین چھوٹا سا کلام مجید پکڑے نہایت انہماک سے

حالت کر رہی تھی۔ رخساروں پر ایک تو اتر سے آنسوؤں کی لڑیاں گر رہی تھیں۔ جنہیں وہ گاہے گاہے اپنی چادر سے صاف کر

رہی تھی۔ اس کے بالکل برابر میں سفید پالتو بلی آرام دہ انداز میں مگر جیسے مالکن کے غم میں سوگوار سی بیٹھی ہوئی تھی۔

بدر علی کی وجہ سے مابین میں ایک محسوس کی جانے والی چمک سی پیدا ہو گئی تھی۔ وہ بلا ارادہ دیکھ رہے تھے۔

دعوات کے دوران آہستہ آہستہ مل بھی رہی تھی۔

ان کے ذہن کے پردے پر جھماکے سے ہونے لگے۔

مناں جان کی حقیقی بہن کا انتقال ہو گیا تھا۔ اسی سلسلے میں قرآن خوانی ہو رہی تھی۔ (حویلی میں) نازنین جو ادکی وجہ سے

بہار بیدارم میں لے آئی تھی۔

وہ دل کر کے باتھ روم سے باہر آئے تو ایک دم ٹھنک گئے تھے۔ شاید انہوں نے اس کا یہ روپ پہلی بار دیکھا تھا۔ سفید

کڑی ہوئی مٹائی چادر سے سر ڈھانپنے وہ نہایت خضوع و خشوع سے سیپارہ پڑھ رہی تھی۔

اڈا ڈرا سا کسماتا تو ایک ہاتھ سے تھپکنا شروع کر دیتی۔ اعلا پیمانے پر قرآن خوانی کا اہتمام تھا لہذا ادکی آیا سمیت

سب ملزمین مصروف تھے۔

اس کی نظر اچانک ہی سامنے اٹھ گئی تھی۔

جانے یا دلاور علی خاں کی نگاہ میں کیا تھا کہ اسے حجاب سا آ گیا۔ اس نے سیپارہ چہرے کے سامنے کر لیا تھا۔

”کون کون سے وارے بچیں گے ظالم۔“ وہ ہنس کر بالوں میں برش چلانے لگے۔

”اللہ کا ذکر ہو رہا ہے۔ کچھ ہوش کریں۔“ نازنین نے مصنوعی ناراضگی سے انہیں ٹوکا۔

”تو کیوں اتنے خطرناک جلوے دکھاتی ہو۔“ وہ اسے آئینے میں دیکھتے ہوئے چھیڑ رہے تھے۔

”توبہ!“ نازنین نے سر جھٹک کر پھر پڑھنا شروع کر دیا تھا۔

”زادہوں کی توبہ تو ٹوٹتی ہی ہے۔“ نازنینوں کے وضو بھی تو ٹوٹتے ہیں۔“

”خیر دار جو کبھی نامحرموں کے سامنے عبادت کی۔ شکر کرو۔ اس وقت کمرے میں تمہارا محرم ہے۔ ورنہ دوبارہ وضو کرنا

انہوں نے چونک کر مابین کے چہرے سے نظریں ہٹالیں۔ ان کے اپنے ہی منہ سے نکلے ہوئے الفاظ انہیں چڑانے

لگے۔ انہوں نے واپسی کے ارادے سے قدم بڑھا دیے۔

”آئیے ناں۔ یاد رہائی۔ بیٹھے۔ میں آپ کے لئے چائے بنا کر لاتی ہوں۔“ ماہین نے انہیں مخاطب کیا۔
سے پاؤں نیچے لٹکا دیے۔

”نہیں نہیں۔ آپ اپنا کام جاری رکھیے۔ چائے اتنی ضروری تو نہیں۔ اندر ملازم ہے۔ روشی ہے۔“ اس نے
بغیر وہ جواب دے رہے تھے۔

”تو بیٹھ جائیے ناں۔ واپس کیوں جا رہے ہیں؟“

”آپ حالت عبادت میں ہیں۔ مناسب نہیں لگتا۔“ وہ نظر پڑا کر سامنے درخت پر بیٹھی سرمستی چڑیا کو دیکھ کر
ماہین جیسے کچھ سمجھی نہیں۔ پھر کچھ وقت کے بعد مسکرا پڑی۔

”ارے بیٹھے آپ۔ آپ تو ہمارے محرم ہیں۔ ہم تو یہی سمجھتے ہیں۔“

یاد علی خاں شاید ہی زندگی میں کبھی اس طرح لا جواب ہوتے تھے۔ بنا کوئی جواب دیے آگے بڑھ گئے تھے۔
سوچنا چاہتے تھے اور نہ بولنا۔

اسے سپارہ مکمل کرنے میں پانچ سات منٹ مزید لگے۔ اندر داخل ہوتے ہوئے وہ ادھر ادھر جھانکتی رہی۔
کمرے کی طرف بڑھ رہی تھی مبادا کہیں یاد علی خاں بیٹھے ہوئے ہوں مگر وہ کہیں دکھائی نہیں دیے۔ نعمان بھی اپنے
میں نہیں تھا۔ آج سوئم تھا۔ ظاہر ہے وہ انتظامات میں مصروف ہوگا۔

”لنتاں۔ یاد رہائی کو اوپر چائے بھجوا دو۔“

”روشی بی بی لے گئی ہیں۔ ساتھ والی بیگم سارہ کے ہاں سے ناشتا آیا تھا۔ وہ اسی وقت چائے لے گئی تھیں اپنے
لیے۔“ ملازمہ نے تفصیل سے جواب دیا۔

ماہین کو روشی پر ڈھیر سارا پیار آ گیا۔ بڑی ذمہ دار ہو گئی ہے یہ روشی تو۔ بہت اچھی بات ہے۔ اس کے علاوہ اور کچھ
کون رکھے گا یاد رہائی کا۔

وہ زینے طے کر کے اوپر ان کے کمرے میں پہنچی۔ یاد علی خاں اخبار پر نظریں دوڑاتے ہوئے چائے بھی پی رہے تھے۔
روشی ان کے کپڑے پر پریس کر رہی تھی۔

”پتا۔ خالہ تو بہت زیادہ دکھی ہو گئی ہیں۔ بے چاری کا کوئی بھی نہیں رہا۔ نہ امی نہ ابو۔ پھر ہماری امی جیسی شہ
بہن۔ پتا نہیں تانا جان نے ابھی تک ان کی شادی کیوں نہیں کی تھی۔ شاید پڑھائی کی وجہ سے۔ مگر پڑھائی تو شادی کے
ہو سکتی ہے۔ شادی بھلا کیا کہتی ہے؟ بعض لوگ شادی سے پہلے بالکل بھی قابل ذکر نہیں ہوتے۔ مگر شادی کے بعد
بڑے کام کرنے لگتے ہیں۔ شاید اپنے قابل فاضل لائف پارٹنر کی وجہ سے۔ اچھے لائف پارٹنر سے موزوں سپورٹ جوتے
الگ۔ اگر خالہ کو اچھا لائف پارٹنر مل جائے تو وہ اور ایکٹو ہو جائیں گی۔“ ایم۔ آئی۔ رائیگ پتا؟“ اس نے پلٹ کر
دریافت کیا۔

”بکلی نہیں۔“ وہ ہنوز اخبار میں منہمک تھے۔

”جھینکس۔ پتا۔ خالہ کی شادی ہم کرائیں گے۔ کیا ہم ایسا کر سکتے ہیں؟“ وہ معصومیت سے، پوچھ رہی تھی۔
”کیوں نہیں۔ بالکل۔“ وہ اسی طرح مصروف انداز میں ٹکڑا لگا رہے تھے۔

”تو پھر۔“

”یہی ایسی باتوں کا ماحول نہیں ہے۔ تم اس طرح کی باتیں اور کسی کے سامنے نہ کرنا۔ اوکے؟“ انہوں نے اسے

درمیان میں ٹوک دیا۔

”نیک ہے۔“

”روشی تم نے چائے پی؟“ اب وہ زیادہ دیر دروازے کی آڑ میں کھڑی نہ رہ سکی اور اندر آ گئی۔

”آپ اس طرح کے تکلفات میں خود کو پریشان نہ کریں۔ یہ وقت اس طرح کی باتوں کے لیے سازگار نہیں۔ اور پھر یہ
اگر بگڑے۔ یہ اپنے کام خود کر سکتی ہے۔“ یاد علی خاں نے چشمہ اتار کر ہاتھ میں پکڑ لیا۔

”آئیے۔“

”روشی! اپنی خالہ کے لیے چائے لاؤ۔ فی الحال تمہیں ان کا خیال رکھنا ہوگا۔“

روشی نے باپ کا حکم سن کر فوراً استری کا پلگ نکال دیا۔

”میرا موڈ نہیں ہے۔ تم اپنا کام کرو۔“ اس نے روشی کو جانے سے روکا۔

”تم جاؤ روشی!“ انہوں نے روشی کو روانہ کر دیا۔

ماہین ان سے خاصے فاصلے پر پڑی کرسی پر بیٹھ گئی۔ اور اپنے ہاتھ مسلنے لگی۔

”یہ روشی بہت سادہ اور جذباتی ہے۔ کوئی ایسی ویسی بات کر بیٹھے تو آپ بُرا نہ منائیں گے۔ میرا مطلب ہے کوئی خیال نہ

”کچھ ہے۔“

”شکر ہے۔ آپ کچھ بیٹی کے بھی ہوئے۔ مجھے تو اس بات کی خوشی ہو رہی ہے۔“ ماہین نے پھینکی سی مسکراہٹ سے

”انسان سب سے زیادہ اپنی اولاد کا ہی ہوتا ہے۔ اولاد انسان کے اپنے وجود ہی کا تو پر تو ہوتی ہے۔ بہت بُرے گمان

”تو کریں۔ آپ امپریشنز ہی ایسے دیتے ہیں۔“ اس نے صفائی سے خود کو پچایا۔

”خیر۔ آپ کے تو ہم مشہور ہیں۔“ وہ اخبار تہ کرنے لگے۔

”اوکس سٹیل میں؟“ وہ واقع حیران ہوئی۔

”نہیں۔“ پھر کئی وقت انہوں نے ایک ٹاپیے کو اس کا متحیر سا چہرہ دیکھا۔

”کس وقت؟“ اسے جیسے بے چینی سی ہوئے لگی۔

”ابھی وقت کا تعین نہیں ہے۔“ انہوں نے پھر سرسری نگاہ سے اس کا چہرہ دیکھا۔

”تو کر لیجیے۔ اور بتا دیجیے۔“ وہ خاصی بے صبری نظر آئی۔

”اتنی جلدی تو میں کسی پڑھے ہوئے میمورنڈم پر بھی سائن نہیں کرتا۔“ انہوں نے سگریٹ سلگانا شروع کر دیا۔

ماہین نے گہرا سانس لے کر کرسی کی پشت سے ٹیک لگالی۔ جیسے ہار مان لی ہو۔

”حالانکہ بیورو کر لیسی کسی وقت کی محتاج نہیں ہوتی۔“ اس نے لطیف سا طنز کیا۔

یاور علی خاں بے ساختہ مسکرا دیے۔

”مجھے خوشی ہے، اتنا عرصہ باہر رہنے کا باوجود آپ اپنے نیشنل انٹرنل افیئرز سے بے خبر نہیں۔ اور اپنے ملک پر

بڑی پرسیر حاصل معلومات رکھتی ہیں۔“

”خیر، اب تو یہاں فوج ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت اختیار کر چکی ہے۔ آپ جانتے بھی ہوں گے فوجی راز

بارے میں کیا خیالات رکھتے ہیں؟“ وہ بڑی خود اعتمادی سے کہہ رہی تھی۔

”مگر اس سے سو ملین کی اہمیت پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔ خیر چھوڑیں۔ کسی نازک اندام خاتون کو رو بردہ ٹھکانا

بحث نہیں کرتے۔“ انہوں نے فوراً بحث سیمٹی۔

”جی؟“ اس نے چونک کر یاور علی خاں کی سمت دیکھا۔ وہ واقعی ان کا انداز سمجھ نہیں پاتی تھی۔

سفید کلف شدہ کاٹن کے شلوار سوٹ میں سگریٹ کا کش لگاتے ہوئے یاور علی خاں اسے نہ جانے کیوں بہ

محسوس ہوئے۔

”بعض اوقات آپ کی بات میری سمجھ میں نہیں آتی۔“ وہ چونکہ اپنی خاموشی پر خود ہی غلج تھی اس لیے دھند

لگی۔

یاور علی خاں نے سگریٹ کی راکھ الیش ٹرے میں جھاڑی اور سامنے گئے فیب احمد کے پورٹریٹ پر نظر ڈال دیا۔

”بات سمجھنا یا نہ سمجھنا کوئی مسئلہ نہیں۔ اصل بات سمجھنے کی کوشش ہے۔ ویسے ایک بات کا کریڈٹ میں آپ کو

گا۔ پچھلے بیس سالوں میں، میں نے اتنی گفتگو نہیں کی جتنی آپ مجھ سے کروانے میں کامیاب ہوئی ہیں۔ جیسے برا

آپ کے کنٹرول میں چلا گیا ہے۔“

”شکر کریں صرف ولیم سسٹم۔“ اس کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔

یاور علی خاں کے ہونٹوں پر مسکراہٹ سائے کی طرح ریختے گئی۔ وہ اپنے مخصوص دل آویز انداز میں شروع

دھواں بکھیر رہے تھے۔ پیشانی کی چند افقی چند عمودی لکیریں ان کے چہرے کو ایک انوکھا سا وقار عطا کرتی تھیں۔

مونچھوں تلے ہونٹوں پر سائے جیسی مسکراہٹ ان کی پوری شخصیت میں عجیب طرح کا طلسم پیدا کر رہی تھی۔

ماہین نے اُن کی پختگی میں دلبری سی محسوس کی۔ پھر وہ اپنے احساسات سے خود ہی خوفزدہ ہو گئی۔

”اچھا۔ میں چلتی ہوں۔ نیچے دیکھتی ہوں کیا ہو رہا ہے۔“ وہ چادر سر پر جما کر کھڑی ہونے لگی۔

”رہے۔ روشنی چائے لینے گئی ہے۔ کچھ نہیں ہو گا پانچ دس منٹ میں۔“

ان کے انداز میں ”انفرانہ پن“ عود کر آ گیا تھا لاشعوری طور پر۔ ہاتھ ہلانے کے انداز سے واقعی یوں محسوس ہو جیسے وہ

چائے پانی سے مخاطب ہوں۔

وہ بیٹھ تو گئی۔ پریوں لگا جیسے اس کی خود اعتمادی جواب دے رہی ہو۔

”پتا! مجھے تو آپ کے گھر میں کام کرنا بہت اچھا لگ رہا ہے۔ مجھے یقین ہے جب آپ ہمارے ہاں یعنی ہری پور

آئیں تو آپ کو بھی اچھا لگے گا۔ حویلی میں تو اس قدر نوکر ہیں کہ زندگی کا مزہ ہی نہیں۔ بعض اوقات تو دل چاہتا ہے کہ کلو اور

برہنہ کی طرح مل جل کر پتیلیاں مانجھوں۔“

بین جو غم اور پریشانی کی ملی جلی کیفیت میں مبتلا تھی بے اختیار مسکرا دی۔

ماہینہ کے چور چور اعصاب کب سے اسے یقین دلارہے تھے کہ اب وہ مدتوں نہ مسکرا سکے گی۔

”روزانہ مانجھنا پڑ گئیں تو پتا چل جائے گا۔“ اس نے بھانجی کو حقیقت کا چہرہ دکھایا۔

”انجھ لیں گے۔ بندہ اندر سے خوش ہو تو خود بخود اسٹیمنا پیدا ہوتا ہے۔ کیوں پتا؟“

”پتا۔“ وہ دلچسپی سے روشنی کو دیکھنے لگے۔

ماہین چائے پینے لگی تھی۔ اور روشنی نے استری کا پلگ پھر سے لگا دیا تھا۔

نیران پریشان ہونا تو اس نے مدتوں سے چھوڑ رکھا تھا۔ فی الحال تو بس ایک کوفت کا عالم تھا۔ وہ صبح پانچ بجے کے

نہیں بہاں پہنچا تھا۔ تیمور علی خاں ایک اڈیت اور ناگواری کے مرحلے سے گزر رہے تھے۔ اسے دیکھ کر طمانیت بھرا سانس

انہوں نے لیا تھا۔

”پریشان مت ہونا۔ زیادہ دنوں کی بات نہیں۔ دو تین دن ہی میں دماغ درست ہو جائیں گے۔ تمہیں بس اتنا خیال

رکھنا ہے کہ یہ بھاگنے کی کوشش نہ کرے۔ جو سامان تمہیں لانے کو کہا تھا، لے آئے؟“

وہ باری کے ساتھ آئے ہوئے سرائے کے ملازم سے مخاطب ہوئے۔

”یہ ایرنٹ ڈنوں میں جو کھانا ہے، یہ صرف تمہارے لیے ہے۔ یہ کچے کیلے ہیں۔ وہ کھانا مانگے تو یہ کیلے دینا۔ اس

کے علاوہ کچھ نہیں۔ پینے کے لیے پانی مانگے تو تھوڑا سا گرم کر کے دینا۔ ٹھنڈے پانی کا قطرہ بھی اس کے حلق میں نہیں جاتا

ہوئے۔ کل پرسوں تک ٹھیک ہو جائے گی۔ پھر حویلی ساتھ ہی لے جانا۔ ارزا یادہ ہی ڈھیٹ نکلی تو ہم تمہیں جلد بھجوا دیں گے۔

نیران چار دن میں گلہ باز کی طبیعت ٹھیک ہو جائے گی۔ یا سنبھل جائے گی۔ اچھا خدا حافظ۔“

وہ الٹ سٹا کر اس کی کچھ سنے بغیر بڑی عجلت میں اپنی جیب کی طرف بڑھے۔ جبکہ ملازم کو اشارے سے ساتھ کھڑی

بگڑی کی سمت متوجہ کیا۔

”یہ کچھ باری کے لیے رہنے دو۔ کوئی ضرورت پیش آ سکتی ہے ورنہ جب یہ واپس آئے گا تو ساتھ لے آئے گا۔ تم

جیپ ڈرائیو کرو۔ تھکن سے جوڑ جوڑ ڈکھ رہا ہے۔“

”وہ ہال کمرے میں ہے۔ باہر سے دروازہ چیک کر کے تم بھی آرام کر لو۔ تھک گئے ہو گے۔ ساری رات سو رہے۔“

تیمور علی خاں نے جیپ میں بیٹھ کر باقی ماندہ گفتگو مکمل کی۔ اور جیپ اسٹارٹ ہو گئی۔

”خدا حافظ خاں!“ اُس نے ہاتھ ہلایا۔ اور چاروں طرف پھیلے ہوئے اُجاڑے بیابان علاقے کو دیکھنے لگا۔

”یا الہی۔ ابھی کیا کیا دیکھا ہے اس آنکھ نے؟“ اس نے گہرا سانس اندر کھینچا اور کچھ فاصلے پر رکھے دونوں بڑھ کر اٹھالیے۔ تھکن اور نیند کا اس قدر غلبہ تھا کہ اسے رتی برابر دلچسپی نہیں تھی کہ ان تھیلوں میں کیا کچھ ہے؟ اس نے سے دونوں تھیلے اٹھا کر درمیان کے کمرے میں رکھی ایک کرسی پر ننگا دیے۔

ساری عمارت ہی ویرانی کا نشان تھی۔ گزارے لائق بھی سامان دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اب کیا فرش پر سوجھ بوجھ سر پر ہاتھ پھیرنے لگا۔

خیر۔ اور کمرے بھی چیک کرتے ہیں۔

اوہو۔ پہلے اُس کی چیکنگ تو کر لی جائے۔ جس کے سبب کالے پانی آئے ہیں۔ خدا جانے کون ہے بے چارہ؟ شامت آئی ہے؟

وہ ہال کمرے کی طرف آیا۔ دروازے کو بغور دیکھا جو ہلکے سے اُجالے میں واضح نہیں تھا۔ بہر حال وہ باہر سے پھر بھی اس نے ہاتھ لگا کر اطمینان کرنا ضروری سمجھا۔

پھر وہ باقی کمرے دیکھنے لگا۔

سب سے آخری کمرے میں بالآخر اسے ایک بان سے بنا ہوا پتنگ نظر آ گیا۔ سر ہانے تکیہ اور پائنتی پر ایک تکیہ رکھا ہوا تھا۔

اس نے پتنگ پر بیٹھ کر تکیے پر ہاتھ پھیرا اور سوچنے لگا کہ یہ تکیہ استعمال کر لیا جائے یا نہیں۔

پھر شاید دل مانا نہیں۔ اس نے تکیہ ایک طرف ہٹا کر تھیں تہ کر کے سر کے نیچے رکھ لیا اور دروازہ ہو گیا۔ تھکا ہوا جسم تھا۔ چند لمحوں میں غافل ہو گیا۔

عام دنوں میں اس کی نیند کا دورانیہ پانچ ساڑھے پانچ گھنٹے سے زیادہ نہیں ہوتا تھا۔ مگر آج آنکھ کھلی تو احساس ہوا وہ معمول سے زیادہ سویا ہے۔ وہ ایک دم اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔ پہلا خیال یہ آیا۔ وہ قیدی لڑکی رات سے اب تک بوجھ رہی ہے۔ یہ خیال آتے ہی اس نے پاؤں میں اپنی پشاور کی چٹیل پہن سائی اور تیزی سے ہال کمرے کی طرف آیا۔

زنگ آلود گنڈی بڑی محنت سے کھلی دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔ اچھا خاصا دن چڑھ چکا تھا مگر کمرے میں کہیں سے آتی دکھائی نہیں دی۔ نیم تاریک سا ماحول تھا۔ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چاروں طرف دیکھنے لگا۔

بہشت کی آسے آخری سرے پر بچھا تخت نظر آیا۔ اور اس تخت پر ایک وجود۔ سفید دودھیا ہاتھ اور پاؤں نیم تاریک ماحول میں چمک کر جیسے اس کی رہنمائی کر رہے تھے۔ اسے محسوس ہوا جیسے تخت پر موجود وجود ساکت ہے۔ یہ خیال نہایت ہی پریشان کن تھا۔ وہ بجلی کی تیزی سے تخت کے قریب پہنچا تھا۔

”زکی! اٹھو۔“ اُس نے آواز دی۔

جواب میں بدستور خاموشی چھائی رہی۔

”اٹھو زکی۔ دوپہر ہو چلی ہے۔ کچھ کھا پی لو۔“

بہت خاموش تھی۔

اب آنکھیں تخت پر لیٹے وجود کو واضح دیکھنے میں کامیاب ہو چکی تھیں۔ لڑکی کروٹ کے بل لیٹی ہوئی تھی۔ پاؤں بھی ملے ہوئے تھے۔ باریک طرف اس کی پشت تھی۔

اس نے آہستگی سے اس کا کاندھا ہٹھوا۔ ”اٹھو بھئی۔“

جسم میں اب بھی کوئی حرکت نہیں ہوئی۔

اب تشویش پیدا ہونا لازمی امر تھا۔ اس نے اس کا بازو سختی سے پکڑ کر اپنی طرف موڑا۔ وہ مٹی کے بُت کی طرح لڑھک گئی۔ سفید مٹی چہرہ اب اس کے سامنے تھا۔ مگر وہ تلکجے سے ماحول میں پہچان نہیں سکا۔

ایک لمحے کو وہ ساکت سا کھڑا رہ گیا۔

پھر فوراً ہی سر جھٹک کر دیواروں پر نظریں دوڑانے لگا۔ بڑے بڑے دریتچے دو طرف موجود تھے۔ اس نے ایک لمحے کی تاخیر کے بغیر دونوں دریتچے کھول ڈالے۔ دریتچے کھلتے ہی کمر روشن ہو گیا۔ وہ پلٹ کر لڑکی کی طرف آیا۔ اور بُری طرح چمک پڑا۔

”بھومر بھالی!“

دو اتنی بُری طرح چمکایا تھا کہ فوراً خود پر قابو نہ پاسکا۔ سر تمام کر رہ گیا۔ پھر جیسے کسی خیال سے چومک پڑا۔ اور اس کی گلاں تمام کربن ٹیبلٹوں کی جو گھبراہٹ میں زکی ہوئی محسوس ہوئی۔ اس نے بے ساختہ اس کے دل کی جگہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

ایک گونہ سکون اس نے محسوس کیا۔ دل دھڑک رہا تھا۔ وہ تیزی سے باہر آیا۔ اور پانی تلاش کیا۔ باہر دالان میں بیٹھ پڑا تو نظر آ گیا مگر آس پاس کوئی برتن دکھائی نہیں دیا۔ اب کچن تک رسائی ضروری تھی۔ وہ سامنے نظر آنے والے دروازوں کی سمت بڑھا۔ ان میں سے ایک کچن کا دروازہ تھا۔ کچن کیا تھا ایک نظر میں تو بھاڑ ہی محسوس ہوا۔ چولہے سے راکھ نکل کر دروازے تک آ رہی تھی۔

دیواریں اور چھت دھوئیں سے اٹی ہوئی تھی۔ چند ”قدیم“ قسم کے برتن ادھر ادھر لٹکے ہوئے تھے۔ بڑی سی چنگیر میں بجائے روٹیل کے کوٹے رکھے تھے۔ ایک طرف جھاڑ تو دوسری طرف لکڑیوں کا گٹھڑا۔ اس نے زمین پر سے ایک بے ہنگم قسم کا گلاس اٹھایا۔ اور بیٹھ پڑا کی طرف آیا۔

جلدی سے گلاس دھویا، پانی بھرا اور جھومر کے پاس آ گیا۔

پانی کے چھینٹے مارے۔ ہتھیلیاں سہلائیں۔ تلوے رگڑے۔ جو جتن کر سکتا تھا، کیے مگر اسے ہوش نہیں آ رہا۔
سہ بارہ پانی کے چھینٹے مارے۔

بے بسی کے احساس نے اس کے اعصاب شل کر دیے تھے۔

اس نے اس کی ناک کے آگے ہتھیلی کر کے سانس کی رفتار چیک کی جو بہت کم محسوس ہوئی۔ ایسی صورت میں سانس روکنے کا عمل کرنا خطرناک تھا۔ اس نے گلاس کا سارا پانی اس کے چہرے پر ڈال دیا۔ ”یا اللہ میرے دل“ کہیں ”قتل“ ہی گلے نہ پڑ جائے۔“ اس نے حلیف بے بسی میں دعا کی۔ اور دوبارہ گلاس بھرنے بینڈ پمپ کو جس تیزی سے آیا تھا اُسی تیزی سے واپس ہوا۔

دوبارہ چھینٹے مارے۔ اب اس نے بزرگوں کا ٹونکہ آزمایا۔ پاؤں سے چپل اتار کر بے چاری کی ناک پر کچھ نہ ہوا کہ سانس کا عمل ہی بے حدست تھا۔ وائے افسوس وہ اب بھی ٹس سے مس نہ ہوئی۔

پھر پانی اس کے چہرے پر پھینک دیا۔ اور آخری چارے کے طور پر مصنوعی سانس دینے کی تدبیر آزمایا۔ اس کا دل گوارا نہیں کر رہا تھا۔ مگر حویلی کے باختیاروں نے اُسے قطعی فیصلہ پر جیسے مجبور کر دیا۔

اسے یقین تھا اگر یہ مر بھی گئی تو اسے بچا لیا جائے گا۔ مگر بچنے کے باوجود معنی خیز نظروں کا سامنا آسان بات نہیں ہے۔ وہ بھی اُس شخص کے لیے جس نے کسی کے رخسار پر قہر کے الزام کے ساتھ زندہ رہنا تو پھانسی سے بھی بڑی سزا ہے۔

وہ دونوں ہاتھ تخت پر جما کر اس کے چہرے پر جھٹک گیا۔
اسی لمحے جھومر نے پٹ سے آنکھیں کھول دیں۔

اور باری کو یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے اُسے گند مٹھری سے ذبح کر دیا ہو۔ وہ ایک دم پورے قد سے کھڑا ہوا۔ پیشانی عرق آلود ہو رہی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ پہلا لفظ کیا بولے۔ کس طرح بتائے کہ وہ ایک بے بسی مدد کر رہا تھا۔ جھومر چند لمحے حیران پریشان آنکھیں پٹپٹا کر اسے دیکھتی رہی۔ پھر ایک دم اٹھ بیٹھی۔ اپنا دہلیکا سنبھالے اتر کر کھڑی ہو گئی۔ چہرے پر بھوک نے عجیب سی پیلاہٹ بکھیر دی تھی۔ ہونٹوں پہ پیاس نے چڑیاں جھار دی تھیں۔ آنکھوں میں حقارت کے جزبے نے بڑی قوت بھر دی تھی۔ اس نے فرش پر تھوک دیا اور دوسرے ہی لمحے اپنے دبوچ لیا۔

”ظفری کی بیوی نہیں ہوں۔ داشتہ ہوں۔

وہ کیسے؟ وہ ایسے کہ وہ نارمل نہیں ہے۔ اس پر شریعت کے کسی رکن کی پابندی کا اطلاق نہیں۔ جس کا مواخذہ کی پوچھ نہیں۔ کسی بھی عبادت کا حساب نہیں۔

پھر اس کا نکاح کیسے ہو سکتا ہے؟

درجہ نکاح ہی نہیں ہوا تو کون بیوی، کیسی بیوی؟ تم بھی موقع سے فائدہ اٹھاؤ خان۔ اس بھوک پیاسی، مجبور لڑکی پر اس نے نہیں بڑی قدرت حاصل ہے۔“

اس نے ایک اذیت کی تیز دھار تلوار اپنے وجود پر چلتی محسوس کی۔ اس نے ہونٹ کاٹتے ہوئے چہرہ پھیر لیا۔
”ہو! آپ پہلے میری بات تو سنیں۔“ اس نے اپنا گریبان مٹھراتے ہوئے جیسے درخواست کی۔

”خبردار جو مجھے بھابی کہا۔ یہ نکاحی رشتے ہیں۔ بغیر نکاح کے کوئی لڑکی کسی کی بھابی نہیں ہوتی۔ اور ابھی اپنی بھابی کی ہی تو عزت افزائی کر رہے تھے۔“

”ہوش ہو جائیں پلیز۔ آپ کو پہلے میری بات سن لینا چاہیے۔“ اس کی آواز میں صدے اور احساس توہین کا واضح اثر تھا۔

”جی! بات نہیں سنتا مجھے۔ سنا تم نے۔ تم حویلی کے کارندے ہو ان سب سے مختلف کیسے ہو سکتے ہو۔“ بولتے بولتے جھومر ہلکا ہوا۔ اس نے جھٹک کر تخت تھام لیا۔

”آپ بے ہوش تھیں؟“
”اور تم اس بے ہوشی کا ہی تو فائدہ اٹھا رہے تھے۔“ جھومر نے بھڑک کر اس کی بات کاٹ دی۔ باری نے بہت عجیب سی

دعا پڑائی تھی۔ اور اس پر جوانی بھی ٹوٹ کر آئی تھی۔ لڑکیوں کے ساتھ ہنسی مذاق بھی چلتے رہتے تھے۔ مگر اس طرح کی بات کو بہت بھی آسکتی ہے، یہ اس کے سان و گمان میں نہ تھا۔ اسے اپنی قوت برداشت پر بڑا ناز تھا۔ مگر خفیہ چاہ رہا تھا کہ

اس وقت اس بے وقعت سی لڑکی کا گلا دبا دے۔
”مجھے سٹی جانوں سے مت ٹاپیے۔ گھن آرہی ہے مجھے آپ سے۔ آپ میری بات سننے بغیر مجھے اس طرح ذلیل کرنے کا کوئی حق نہیں رکھتیں۔“

آپ کو معلوم ہے، آپ کتنے گھنٹوں سے غشی یا بے ہوشی کے عالم میں تھیں۔ اور یہ کہ اس وقت کیا بجا ہے دفاتروں میں آدھا کام اٹھنا کر لے کر رہے ہوں گے۔ میں صبح پانچ بجے سے یہاں ہوں۔ اور آپ گھنٹوں سے بے خبر۔

”میں آ رہی ہوں مجھے آپ سے یہ بات کہتے ہوئے۔ کہ اُس وقت آپ بے ہوش تھیں۔ اب تو ہوش میں ہیں۔ شادی کے لیے لیجیے اپنا جائزہ اور دیکھ لیجیے آپ کے ساتھ کیا کیا کچھ ہوا۔ آپ کا گواہ آپ سے بڑھ کر کون ہو سکتا ہے۔ اب

”کیوں لوں میں اپنے الفاظ واپس لے لیے۔“ اس کی نظروں سے خون چھلکنے لگا۔
”کیوں لوں میں اپنے الفاظ واپس لے لیں۔ ہوا نہیں تو کیا ہوا۔ ہو سکتا تھا۔ وہ تو اللہ نے مجھے بچا لیا۔“ جھومر کے لہجے میں

ظفر کا زہر گھٹا ہوا تھا۔
”آپ میں اگر سوجھ بوجھ کی کمی نہ ہوتی تو آپ یہاں قید کیوں کی جاتیں؟ کی ہوگی کوئی بڑی حماقت بڑے خانوں

آپ کی سانس بہت کم ہو چکی تھی۔ اور میں اس حویلی میں جادو کے زور پر کوئی آکسیجن سلنڈر پیدا نہیں کر سکتا۔ جس

طرح مجبوری میں مردار بھی حلال ہو جاتا ہے۔ کچھ اسی طرح کا عمل تھا۔ اب آپ یقین کریں یا نہ کریں مجھے نہیں۔

باہر دو تھیلوں میں کھانے پینے کی چیزیں ہیں۔ آپ استعمال کر سکتی ہیں۔ حالانکہ مجھے ہدایت ہے کہ آپ کھنے تک کچھ کھانے کو نہ دیا جائے۔ ویسے آپ نہ کھائیں تو بہتر ہے۔

شاید اس طرح آپ واقعی مرجائیں۔ یوں بھی ایسی زندگی کا کوئی فائدہ تو نہیں۔ مجھے افسوس ہو رہا ہے کہ بچانے کی کوشش کیوں کی؟ میں نے اس سے زیادہ بد صورت چہرہ آج تک نہیں دیکھا۔“

جھومر دونوں ہاتھوں کو تخت پر ٹکائے بمشکل بیٹھی ہوئی تھی۔ مسلسل فاقوں کا اثر تھا کہ اسے اب پھر چلنا آ رہا تھا۔ اس وقت تو جذباتی قوت نے جیسے اٹھا دیا تھا۔ مگر نقاہت کے سبب یہ کیفیت زیادہ دیر قائم نہ رہ سکتی تھی۔ اس نے تخت پر رکھا گلاس اٹھا کر اندر جھانکا۔ بہت تھوڑا سا پانی تھا۔ اس نے بے تابی سے گلاس منہ سے اٹھایا۔

عجیب سے ذائقہ والا۔ نمکین سا پانی۔ مگر اسے یوں لگا جیسے بہشتی مشروب ہو۔

پانی حلق میں پڑتے ہی جیسے کسی برقی قوت نے اندر اپنا کام شروع کر دیا۔ وہ کچھ دیر اسی طرح جھکے جھکے سانس لیتی رہی۔ پھر گردن موڑ کر دروازے کی سمت دیکھنے لگی جیسے یقین نہ آ رہا ہو کہ دروازہ کھلا ہوا ہے۔ پھر آہستہ سے اٹھی اور چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی باہر آ گئی۔ باہر آتے ہی چڑھی دھوپ کا اندازہ ہوا۔ دونوں سرے پوری طرح روشنی سے روشن تھے۔

اس نے کچھ دیر سوچا پھر دالان کی سمت کا راستہ اختیار کیا۔

باہر آ کر سب سے پہلے اس کی نظر ہینڈ پمپ پر پڑی۔ وہ سیدھی وہیں آئی۔ اور پمپ چلا کر ایک ہاتھ سے پھینٹے ڈالنے لگی۔ ٹھنڈے پانی کے احساس نے سارے وجود کو تقویت پہنچانا شروع کر دی۔ وہ مسلسل منہ پر پانی ڈالنے لگی۔ ایک دم کیا ہوا۔ پمپ سے پیشانی ٹکا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ جتنا رو سکتی تھی روئی حتیٰ کہ گئی۔

کافی دیر سسلیاں لیتی رہی۔ پھر دوبارہ چہرے پر پانی ڈالنا شروع کر دیا۔

اور بعد میں دوپٹے سے چہرہ پونچھا۔ اور گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ جیسے اٹھنے میں بڑی دقت تھی۔ ادھر ادھر دیکھتے ہوئے وہ واپس چل پڑی۔ راہداری سے گزرتے ہوئے درمیان کے کمرے میں کرکے بیک اسے دکھائی دیے۔ کانوں میں باری کے الفاظ گونجے۔ وہ جیسے نئے سرے سے زندہ ہو گئی۔ بیک کی قدموں میں خاصی تیزی آ گئی۔ اس نے بیک کھول کر اشیاء دیکھنا شروع کیں۔

بسکٹ کے پیکٹ، چپس، فریش ویل ایرٹائٹ ڈبوں میں کھانا۔ ڈبل روٹی کے پیکٹ۔ جیلی اور مارملیڈ کی بوتلی۔ اور جانے کیا کیا۔ وہ تو جیسے ایک دم حواس باختہ ہو گئی۔

یہ سب تبور خان نے اس کے لیے بھجوا یا ہے؟ ایسا نہیں ہو سکتا۔

یقیناً یہ باری اپنے ساتھ لایا ہوگا۔ اسے بہت اچھا رہنے کی عادت ہے۔ ظاہر ہے انتظام سے آیا ہے۔

اس نے ڈبل روٹی نکال کر انگلی سے جیلی لگا کر جلدی جلدی منہ میں ٹھونسی۔ جیسے جھین لیے جانے کا خطرہ ہو۔ بھوکے اور خالی پیٹ میں خوراک کیا پڑی جیسے آنکھوں میں روشنی آ گئی۔ اس نے چپس کا پیکٹ دوپٹے میں رکھا اور کمرے سے باہر آ گئی۔

باری ابھی بھی کہیں دکھائی نہیں دیا۔

دوہال کمرے میں جانے کے بجائے راہداری میں سیدھی چلی گئی۔ نیچے پاؤں تھیں۔ اس لیے چال بے آواز تھی۔ بیرونی اہلے میں بھی وہ نظر نہیں آیا۔ جہاں زمانے بھر کے جھاڑ جھنکار اگے ہوئے تھے۔

اچانک اس کی نظر کنڑی کے طویل و عریض پھانک پر پڑی۔ جس کا درمیانی کھڑکی نما راستہ کھلا ہوا تھا۔ یعنی پٹ نیم وا تھا۔ اس کے اندر نہ جانے تو انائی کا خزانہ محسوس کیا۔ ایک نظر اپنے نیچے پیروں پر ڈالی اور احتیاط سے ادھر ادھر دیکھتی پھانک تک آئی۔ اس سے قبل کہ کھڑکی نما دروازے سے باہر قدم رکھتی۔ اُس کا بازو آہنی شکنجے میں تھا۔ اس کے منہ سے بے اختیار چیخ نکلی۔

”تشریف لے چلے اندر۔ اور آئندہ اس قسم کی کوئی بہادری دکھانے کی کوشش کی تو نتیجے کی ذمہ دار آپ خود ہوں گی۔“ باری نے اُسے کھینچ کر اندر کیا اور زوردار آواز سے ذیلی دروازہ بند کیا۔

”شاید مجھے آپ سے ہمدردی ہو جاتی۔ مگر اب نہیں ہو سکتی۔ کوشش کیجیے گا جب تک میں یہاں ہوں، آپ میرے سامنے نہ آئیں۔“

اس نے دروازے میں تالا ڈالتے ہوئے ہزاری سے کہا۔

”اپنے اُلٹے ہاتھ کی طرف دیکھئے۔ یہ کتے بندھے ہوئے ہیں۔ حالانکہ انہیں کھلا رہنے کا حکم ہے۔ اب میرا اور آپ کا سامنا نہیں ہونا چاہیے۔“

وہ چابیاں اپنی ٹاسی میں دبوجتا اس سے پہلے آگے بڑھ گیا۔ وہ کارکی اوٹ سے اُسے جاتا دیکھتی رہی۔

اسے بننے کی ضرورت کیوں پیش آ رہی ہے۔ کیا میں نے اس کی اصلیت دیکھی نہیں۔ اس کے لبوں میں انکارے ناپنے لگے۔ ہونہ۔

اگر قدرت نے مجھے موقع دیا۔ پہلی فرصت میں اس کے منہ سے نقاب نوچوں گی۔

بال کمرے میں تو جیسے وحشت سی ہونے لگی تھی۔ وہ دوبارہ دالان میں آ گئی۔ پھر کچھ سوچ کر کچن میں چلی آئی۔

دھویں کی کارگزاری دیکھ کر تو جیسے اس کی وحشت اور بڑھ گئی۔ اس نے نیچے پڑے ہوئے برتن سمیٹے اور ہینڈ پمپ کی طرف آئی۔ اور ایک برتن میں مٹی لے کر برتن رگڑنے لگی۔

اچانک اس کا ذہن ماحول کی طرف متوجہ ہو گیا۔ بھری دوپہر کا عالم تھا۔ اس پر سے برگد اور کیکر کے درختوں پر بیٹھے

کوڑس کی کانیں کانیں نے بیابان اور سنائے میں عجیب قسم کی ناگواری سمودی تھی۔

تنہائی اور بیابانی کا اتنا گہرا اثر تھا کہ چند لمحوں کے لیے اس کے ہاتھوں کی گردش خود بخود رک گئی۔ وہ ہر گز ہوا کو ادھر ادھر دیکھنے لگی۔

پھر اسے ایک دم باری کا خیال آیا۔ دھڑکن پھر سے رواں ہو گئی۔ وہ دوبارہ برتن رگڑنے لگی۔

مگر وہ تو لیسرا ہے شاید۔ وہ کیا میرا تحفظ کرے گا۔ اس سے تو لاکھ درجے اچھا وہ بڑھا بڑھا کر تھا۔ تیور علی بن۔

کہہ رہے تھے۔ بہت ہی کوری پرکھ ہے خان کی۔ وہ تنگی سے مسکرائی۔

اچانک اس کی پیٹھ پر ایک چھوٹا سا پتھر لگا۔ برتن اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر زور چاڑھا۔

وہ خوفزدہ ہو کر کھڑی ہو گئی اور چاروں طرف دیکھنے لگی۔ مگر کوئی دکھائی نہیں دیا۔ وہ سب سے ہونے انداز میں دھڑکی۔

ابھی برتن اٹھانے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ پھر ایک کنکری اس کی پشت پر پڑی۔ اس نے تیزی سے پلٹ کر پیچھے دیکھا۔

اینٹوں کی دیوار کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیا۔ وہ خاصی دیر اسی طرف چہرہ کر کے دیوار کو گھورتی رہی مگر کچھ نہ ہوا۔ باز

بیٹھ گئی، مگر ذہن بہت الجھ گیا تھا۔

باری کو تو اس نے خود آخری کمرے میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا تھا۔ اگر وہ باہر آتا تو سامنے سے آتا۔

ہو رہا ہے۔ وہ گم صم سی بیٹھی سوچنے لگی۔ پھر ایک نرم سی چیز دھپ سے اس کی کمر سے ٹکرائی۔

اس نے مڑ کر کمر سے لگنے والی چیز کو دیکھا۔ سیاہ رنگ کا بلی کا مردہ بچہ تھا جس کی سبز آنکھیں باہر کواہلی ہوئی تھیں۔

جین نکل گئی۔ وہ بھاگتی ہوئی اس کمرے کی طرف آئی جہاں باری کو داخل ہوتے دیکھا تھا۔

باری ایک موٹی سی کتاب چہرے کے سامنے کیے لیٹا ہوا تھا۔

”باری۔ پتا نہیں کون مجھے بہت دیر سے تنگ کر رہا ہے۔“ وہ روہانسی ہو رہی تھی۔

”تو آپ سے کس نے کہا ہے آپ حویلی میں چہل قدمی کریں۔ جا کر لیٹے اپنے تخت طاؤس پر۔“ اس نے چہرے

سامنے سے کتاب ہٹائے بغیر تنگی سے جواب دیا۔

”وہ جو کوئی بھی ہے تمہیں بھی پریشان کر سکتا ہے۔“ وہ بگڑ گئی۔

”مائی فٹ!“ وہ بڑبڑایا اور خواہ مخواہ ہی صفحہ پلٹ دیا۔

”جائیے آپ، یہاں سے۔ فی الحال آپ نہیں مریں گی۔ اطمینان رکھیے۔“

وہ ہونٹ کاٹتی واپس ہینڈ پمپ کی طرف آ گئی۔ اس کی آواز سن کر کم از کم دُسر اہٹ کا احساس تو ہو گیا تھا اور کچھ

والا خوف معدوم ہو گیا تھا۔ اُس نے دُور پڑا برتن اٹھایا اور رُخ تبدیل کر کے مانجھنے لگی۔ اب جھٹے کے مقام کی طرف

چہرہ تھا۔ اب وہ برتن کی طرف کم اور دیوار کی طرف زیادہ متوجہ تھی۔

ہنر سنا چاہتی تھی۔ مگر یاد علی خاں کی کچھ منہجی مجبوریاں تھیں جو وہ زیادہ دیر وہاں رک نہیں سکتے تھے۔

ریش نے دبی زبان سے اُن کے حضور درخواست بھی پیش کی تھی کہ وہ اسے کچھ دن خالہ کے پاس رہنے کی اجازت دے

دیں۔ جس کا جواب اتنا نپا تلا آیا تھا کہ آگے بولنے کی گنجائش نہیں رہی تھی۔

”کیا اس وقت یہاں کے سوگوار ماحول سے تمہیں کیا حاصل ہوگا؟“

یہ نہیں آجاسکتی ہو۔ اور نہ ہی سیر و تفریح کرنا زریعہ دیتا ہے۔ تمہاری یہ چھٹیاں تمہیں خوشی کے بجائے نقصان کا احساس

دینا لگی ہیں۔ اس سے بہتر ہے کہ تم تعلیمی پروگرامیں بہتر کرو۔ اگلی بار موسم سرما کا کچھ سخت وقت ہم کراچی میں گزاریں گے۔“

”اگلی بار میں اندازہ کتنا وقت ہوگا۔ میرا مطلب ہے پتا۔ ہماری طرف تو تین مہینے زبردست سردی ہوتی ہے۔ یہ جتنے

کراچی سے جاتے ہیں۔ یہ تو یہی کہتے ہیں۔“

”اسی وقت کا تعین نہیں کیا جاسکتا۔“ انہوں نے اپنے دو ٹوک انداز میں جواب دیا۔ تو اگلے سوال کی گنجائش ہی ختم ہو گئی

تھی۔

پانہیں۔ پنا کی آنکھیں۔ بعض اوقات اتنی زیادہ ریڈ (سرخ) کیوں فیل ہوتی ہیں۔ ان کے سرد مہر تاثرات سے اس کا

مہو ہمارا دل دھک سے رہ جاتا تھا۔

جپ اور ڈرائیور ایئر پورٹ پر انہیں منتظر ملے تھے۔

جس وقت گھر میں داخل ہوئے تو دو پہر ڈھلان کے مرحلے میں آچکی تھی۔ روشنی کو سخت بھوک محسوس ہو رہی تھی۔ یاور علی

نما اپنے بڈروم کی طرف تو روشنی سیدھی کچن میں پہنچی تھی۔

”کوئی اچھی چیز ہے کھانے کی۔ مزے دار سا۔ بہت بھوک لگ رہی ہے۔ پلین میں تو بس کھانے کی ڈرینک ہی

ڈرینک ہوتی ہے۔ ٹیسٹ تو ذرا نہیں ہوتا۔“ وہ ہاتھ دھو کر کرسی کی طرف بڑھی۔

”آپ کو دو منٹ انتظار کرنا ہوگا بے بی۔ میں بڑے سرکار کو یہ چائے پہنچا دوں۔“ خانسا ماں نے مؤدبانہ درخواست کی۔

اور ڈال کی سمت اشارہ کیا۔

”مگر تم پہلے کھانے والے کا تو پوچھو پتا سے۔ بعد میں چائے دینا۔“

”نمس مری بات نہیں کر رہا ہوں بے بی۔ اُن کے والد صاحب کی بات کر رہا ہوں۔“ خانسا ماں نے وضاحت کی۔

روشنی کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ ”با۔۔۔ بابا صاحب!!!“

سوئم سے اگلے دن صبح کی فلائٹ سے ہی انہوں نے واپسی کا سفر اختیار کر لیا تھا۔ جبکہ روشنی ابھی کچھ دن اور باقی

”جی۔۔۔! خانساں اپنے کام کے مقام کی طرف بڑھ گیا۔
 دروازہ بڑی تیزی سے یاور علی خاں کے بیڈروم کی سمت آئی اور دروازے پر دستک دی۔
 ”نہیں!“ یاور علی خاں کی بھاری آواز سنائی دی۔
 دروازہ دھکیل کر اندر آگئی۔

”پتا آپ کو کچھ پتا ہے، بابا صاحب آئے ہوئے ہیں، اگر وہ آپ کو کچھ کہیں تو کہہ دیجیے گا، کہ روشی نے ضد کی تھی، مگر پہلے منہ نہ لے لے گا، انہیں ہمارے کراچی جانے کا پتا بھی ہے یا نہیں، ہو سکتا ہے انہیں پتا ہی نہ ہو اور پتا! مگر یہ بات بھی تو پہلے فرمے کہ باری کو کیسے پتا چلا کہ ہم کراچی گئے ہوئے ہیں۔ اُس نے مجھے وہاں فون کیا تھا۔ صرف یہی نہیں کہ اسے پتا ہے، بلکہ ہم لوگوں کو بھی پتا ہے، انہیں کیسے پتا چلا؟ بلکہ انہیں تو یہ بھی پتا ہے کہ نانا جان کی ڈیڑھ تھوڑی ہو گئی ہے۔ انہیں کس نے خبر دی؟ حیرت کی بات ہے۔ یہ تو بڑا کافینڈ نفل ٹرپ تھا اور ہاں۔۔۔!“

یاور علی خاں نے ہاتھ اٹھا کر اسے خاموش ہونے کا اشارہ کیا۔ اُسے جیسے بریک لگ گئے۔
 ”جہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، اٹ ایڈمائی اون ہیڈک۔۔۔“ وہ غالباً غسل کے ارادے سے وارڈ روب سے پڑے نکال رہے تھے۔

”مگر پتا بابا صاحب۔۔۔!“

”میں نے کہا ناں، کوئی پریشانی کی بات نہیں۔ جب مسائل حل کرنے کے لیے والدین موجود ہوں تو بچوں کو پریشان نہ ہونا چاہیے۔“ انہوں نے نرمی سے اُسے سمجھایا۔
 ”ٹھیکس، مگر آپ والدین نہ کہا کریں۔ صرف والد ہی کہا کریں مجھے رونا آ جاتا ہے۔ ہمیں کیا پتا، والدہ کیا ہوتی ہے؟“ اُس نے روہانی آواز میں کہا اور باہر آگئی۔

اس کا رخ پھر کچن کی جانب تھا، مگر اس مرتبہ چال میں وہ پہلا سا ذوق و شوق نہیں جھٹک رہا تھا۔

غرب کا وقت ہو رہا تھا اور وہ بھاڑ نما باورچی خانے میں لائین جلانے کی کوشش کر رہا تھا۔ جھومر کی دلدوز چیخ پر لائین کی چٹناں کے ہاتھ سے چھوٹ کر کرچی کرچی ہو گئی۔

”تیزی سے اپنے رہائشی کمرے کی طرف آیا جہاں گلاباز کی طاقت و نارج رکھی ہوئی تھی۔ نارج اٹھا کر وہ ہال کمرے میں ایک منٹ کی تاخیر کے بغیر پہنچا تھا۔ اس نے نارج کی روشنی کمرے میں چاروں طرف پھینکی۔ جھومر وہاں موجود نہیں تھی۔
 معائنہ نے محسوس کیا، کتوں کے بھونکنے میں کوئی خاص بات ہے۔ اس کا ماتھا ٹھنکا، وہ بیرونی احاطے کی طرف لپکا، مگر رہائشی نے اُسے رکتا پڑا۔

جھومر چاروں شانے چت عین درمیان میں بے ہوش پڑی تھی۔
 جال جال کر خاک ہو گئی، پھر بے ہوش۔۔۔ وہ اس کے نزدیک فرش پر بیٹھ گیا۔

☆.....☆.....☆.....☆.....☆.....☆

”کب آئے؟“ اُس کی تو بھوک ہی اڑ گئی۔

”صبح نو بجے آئے تھے۔“ خانساں نے جواب دیا۔

”انہوں نے ہمارے بارے میں پوچھا ہوگا، پھر تم نے کیا جواب دیا؟“ روشی بہت پریشان سی ہو گئی۔

”سر ہمیں کہہ کر گئے تھے کہ کوئی بھی پوچھے تو کہنا پشاور گئے ہیں ضروری کام سے۔“ خانساں نے ادب سے جواب دیا۔

روشی نے سکون کا سانس لیا۔ ”اچھا!“

”مگر باری کو کیسے پتا چلا کہ ہم کراچی میں ہیں؟“ وہ یہ سوچ کر نئے سزے سے پریشان ہوئی۔

”ہمارے جانے کے بعد باری کا فون آیا تھا کیا؟“ اُس نے الجھے ہوئے انداز میں سوال کیا۔

”باری؟“ خانساں سوالیہ انداز میں اُس کی شکل دیکھنے لگا۔

”بھئی باری۔۔۔ باری کو نہیں جانتے۔ ہر وقت تو ٹیلی فون کی تاروں میں دوڑتا رہتا ہے۔“ وہ جھلا کر بول۔

”جی!“ خانساں کچھ پریشان سا دکھائی دیا۔

”میرا سر، اچھا چلو، تم بابا صاحب کو چائے دے کر میرا کھانا تیار کرو۔ میں پتا کے کمرے میں ہوں۔“

وہ کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

چینی کیوں تھی اور بے ہوش کیوں ہوئی؟ اب یہ سوال ذہن میں گردش کر رہا تھا۔ ساتھ ہی وہ ٹارچ کی کرنے سے جاگڑا بھی لے رہا تھا۔ مگر بظاہر کوئی وجہ دکھائی نہیں دے رہی تھی۔

اُس نے بادل خواستہ اس کی نبض چیک کی اور جیسے بجلی کے جگے تاروں کو چھو لیا۔

اُس کی کلائی سے خون رس رہا تھا۔ اُس نے کلائی پر روشنی پھینکی۔ کلائی خون سے سرخ تھی۔

خودکشی! یہی خیال اُس کے ذہن میں آیا اور اس کے ساتھ ہی پچھلا ایک ایک واقعہ اس کے ذہن میں نمودار ہوا۔

اُس نے ٹارچ ایک طرف رکھ کر اسے اپنے بازوؤں میں اٹھالیا۔ دکھ اور ہمدردی سے اس کے دل کی غیب ہیرا بڑھتا جا رہا تھا۔

وہ احتیاط سے اسے ہال کمرے کی طرف لایا اور تخت پر لٹا دیا۔ اور درپچوں سے چھتکتے ہلکے سے اجالے میں

پراپنار و مال باندھ دیا۔

قدرے مایوسی اور افسوس کی حالت میں پانی لینے اندرونی احاطے میں آیا۔ باورچی خانے سے گلاس لیا، جس

بہت بہتر ہو چکی تھی، جو سر اسر جھومر کے زور بازو کا نتیجہ تھی۔

ہینڈ پمپ سے ایک جھٹکے میں گلاس بھرا، اور ہال کمرے کی طرف واپس آ گیا۔ اور اس کے منہ پر چھینے لگا۔

کیے اور اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ جب تھوڑی ہی دیر میں جھومر نے آنکھیں کھول دیں۔

”بڑی جنگ بنتی ہیں، بس اتنا ہی حوصلہ ہے، جب کلائی کاٹ ہی لی تھی تو چیخ مارنے کی کیا ضرورت۔ ٹھہر جاؤ۔

جائیں۔ جب مرضی سے مرتے ہیں تو چیختے نہیں ہیں۔“ اس نے گلاس وہیں اس کے قریب رکھ دیا اور واپس کے دروازے

پر پلٹا۔

”باری!“ جھومر نے جیسے سسکی بھری۔

”فرمائیے۔“ وہ بغیر پلٹے ترخ کر بولا۔

”باری! میں مر رہی ہوں۔“ اُس کی آواز بھرا رہی تھی۔

”میں کیا کر سکتا ہوں، مرضی ہے آپ کی۔ ویسے بھی ایسی مصیبت بھری زندگی کا کیا فائدہ؟“ نہ جانے اتنی سنت

میں کہاں سے آگئی تھی۔ اُس نے قدم بڑھا دیے۔

”باری! کیا وہ کالا کتا پاگل ہے؟“ وہ سسک رہی تھی، کراہ رہی تھی۔

”آپ سے مطلب؟“ وہ ہنوز تھکے انداز میں پوچھ رہا تھا۔

”روشنی ٹھیک کہتی ہے۔ حویلی کے آسیب ہو تم، انسان نہیں ہو۔“ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

روشنی کے ذکر پر اُس کے دل کو کچھ ہوا۔ اُس نے پلٹ کر روتی ہوئی جھومر کو دیکھا۔

”میں جو کچھ ہوں، اس سے آپ کو یا روشنی بی بی کو کوئی دلچسپی نہیں ہوتی چاہیے۔“

”باری! خون بہت بہہ رہا ہے۔“ وہ بری طرح رو رہی تھی۔

”پتہ لگائی کی رگ کاٹنے سے پہلے معلوم نہیں تھا کہ اس طرح کی حرکت کے بعد خون بھی بہتا ہے؟“ وہ جل کر پوچھ

”باری!“

”میں کا کاجان کو فون کرنے جا رہا ہوں نزدیکی قصبے میں، پھر وہ جانیں اور آپ۔“

”خدا کے لیے مجھے تنہا چھوڑ کر نہ جاؤ۔ میں نے کلائی کی رگ نہیں کاٹی ہے، کتے نے کاٹا ہے اور ایک جگہ تھوڑا ہی، دیکھو،

تو جھڑم ہیں۔“ وہ چیخ کر بولی۔

باری کو جھکسا آ گیا۔ ”اومائی گاڈ! یہ نئی مصیبت۔“ وہ راہداری سے ٹارچ اٹھانے کے خیال سے آگے بڑھا۔

”باری۔۔۔ پلیز!“

”آ رہا ہوں، ہوش ٹھکانے رکھیے۔“ اُس کے لہجے میں خاصی تبدیلی آ گئی۔

چند لمحوں کے بعد وہ واپس آیا۔

”اور کہاں کاٹا ہے؟“ اُس نے ٹارچ کی روشنی اُس کے وجود پر ڈالی۔

جھومر اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اور شلوار کا پانچواں پر کیا۔ پنڈلی بھی زخمی تھی۔ اُس نے پانچواں اور اوپر کھسکایا۔

”اچھا۔۔۔ اچھا ٹھیک ہے، اب جلدی سے اٹھیے۔ میں گاڑی کی چابی لے کر آتا ہوں۔ یہاں تو سرخ مرج بھی نہیں

ہے۔ ٹوئنگتے کے کانے کا فوری علاج یہی ہوتا ہے کہ زخم پر سرخ مرج لگا دی جائے پھر زہر نہیں پھیلتا۔

اُس پاس کوئی گھر بھی نہیں ہے، جلدی سے باہر آئیے، میں آ رہا ہوں۔“

”مجھ سے اٹھانیں جا رہا۔ سر میں دھماکے ہو رہے ہیں۔“ اُس نے بے بسی سے سر تھام رکھا تھا۔

”مگر میں یہاں کسی ڈاکٹر کو نہیں لاسکتا۔“ اُس نے معذوری ظاہر کی۔

”مجھے تھوڑا سا سہارا دو، مجھے چکر آرہے ہیں۔“ اس پر ابھی تک گویا خوف طاری تھا۔

”آ رہا ہوں ابھی۔“ اُس نے آہستگی اور قدرے نرمی سے کہا اور چابی لینے اپنے رہائشی کمرے کی طرف آیا۔ اندھیرا گہرا

ہو چکا تھا۔ وہ ٹارچ کی مدد سے اپنا کام کر رہا تھا۔ بستر سے چابی اٹھائی پھر ہال کمرے میں واپس آ کر اٹھنے ہاتھ میں ٹارچ

نہم سیدھا تھام اُس کی سمت بڑھایا۔

”اٹھیے!“

جھومر نے اُس کی پھیلی ہوئی ہتھیلی نظر انداز کر کے اُس کا مضبوط بازو دبوچنے کے انداز میں تھام لیا اور پاؤں تخت سے

ٹکا کر مشکل کھڑی ہوئی۔ وہ لاتعلقی انداز میں قدم آگے بڑھا رہا تھا۔ اپنی طرف سے صرف اپنے بازو کی حد تک وہ اس کی مدد

کر رہا تھا۔ باقی سارا بوجھ جھومر پر تھا۔ اس نے تو اپنا بازو تھامنے کی اجازت بھی گویا اس طرح دی تھی، جیسے احسان سا کر رہا

ہو۔

جھومر خود کو سنبھالتے ہوئے اُس کے قدم سے قدم ملتا رہی تھی۔ اُس کی سیدھی ٹانگ پر تو کئی زخم تھے، جن کی وجہ سے چلتے

ہوئے بہت شیف ہو رہی تھی۔

بمشکل اس کو احاطے تک لایا۔ کار کا پچھلا دروازہ کھول کر اُسے احتیاط سے بٹھایا اور دروازہ بند کر کے پچھلے دروازے پر گیا۔ جھومر بے دم انداز میں سیٹ پر لیٹ گئی۔

باری ڈرائیونگ سیٹ پر آ کر بیٹھا تو جھومر کی سسکاریاں گاڑی کے اندرونی ماحول کو ناقابل برداشت بنانے لگیں۔ نے چابی گھما کر کار کی اندرونی لائٹ آن کر دی اور گاڑی ریورس کرنا شروع کی۔

”شاید قصبے تک پہنچتے پہنچتے میں زندہ نہ رہ سکوں اور راستے ہی میں مر جاؤں۔“ جھومر کراہ کر بولی۔

”تو پھر جلدی جلدی اپنے گناہوں کی معافی مانگ لیں، مجھے آپ سے کوئی ہمدردی محسوس نہیں ہو رہی۔ میں آپ کی ہی خبردار کر چکا تھا کہ کتنے بہت خونخوار ہیں۔“ اُس نے خاصے بے رحم لہجے میں جواب دیا۔

”تم خانوں کے کارندے ہو۔ تم میں انسانیت ہو بھی کیسے سکتی ہے۔“ جھومر نے کراہتے ہوئے جلتا ہوا تیر چھڑا کر باری نے نچلا ہونٹ دبا کر جیسے خود پر ضبط کیا۔ گاڑی باہر آئی تو خود بھی گاڑی سے نکل آیا۔ پھاٹک بند کیا، بائیں

چابیاں بغلی جیب میں ڈال کر واپس گاڑی تک آیا اور ایک سرسری نظر پیچھے لیٹی جھومر پر ڈالی اور ڈرائیونگ سیٹ پر کھٹاک سے دروازہ بند کر لیا۔

”باری!“ جھومر نے سسکاری بھری۔

”جی۔“

”ایک بات کہوں؟“ وہ جیسے بہت اذیت میں بول رہی تھی۔

”بہتر ہے نہ کہیں اور خاموش رہیں۔ بولنے سے بھی خون زیادہ بہتا ہے۔“ اُس نے تلخی سے جواب دیا۔

جھومر شاید بات کی گہرائی سمجھ گئی تھی۔ ایک دم چپ ہو گئی۔

گاڑی نہایت ویران اور اندھیرے راستوں سے گزر رہی تھی۔

کھانا کھا کر وہ سو گئی تھی۔ نیند بھی اس قدر ٹوٹ کر آئی تھی، جیسے کئی دنوں سے سوئی نہ ہو۔ مغرب کی اذانوں کے ملازم نے دروازے پر دستک دے کر اُسے جگایا تھا اور وہ کلاک پر نظر پڑتے ہی ہڑبزا کر اٹھ بیٹھی تھی۔

اتنی دیر ہو گئی۔ بابا صاحب کیا سوچ رہے ہوں گے کہ سلام بھی کرنے نہیں آئی۔ باپ کے پاس آ کر بدل گئی۔ وہ جلدی جلدی وارڈ روب سے کپڑے نکالنے لگی۔ میرون رنگ کا سادہ سوتی سوٹ نکال کر ہاتھ روم میں مٹس مٹس میں بھی زیادہ دیر نہیں لگائی۔

البتہ تراشیدہ بالوں کو سنبھالنے سکھانے میں تھوڑی دیر ضرور لگی، پھر دوپٹا اٹھا کر باہر آ گئی۔

اندھیرا پھیل چکا تھا۔ سارے گھر کی لائٹس آن تھیں۔ ملازمین کی ٹلی جلی آوازیں، فون کی گھنٹیاں، مالی کے آتی بی بی سی پروگرام کی آوازیں، ڈرائیور کی بیوی کے کونے جو اس کے بچوں کی شرارتوں کے ساتھ لازم و ملزوم بنتے ہیں، بیشتر اس کے کوارٹر سے نشر ہوتے رہتے تھے۔

نے باپ کو بڑی توجہ دی تو بے ساختہ مسکرا دی اور سیدھی باپ کے بیڈ روم تک گئی اور دروازہ آہستہ سے کھینچ لیا۔

”اے بابا صاحب!“ وہ غلی خان کی خشک آواز آئی۔ شاید انہیں کسی ملازم کا گمان تھا۔ وہ اندر آ گئی۔

”اے بابا صاحب!“ وہ غلی خان کی خشک آواز آئی۔ شاید انہیں کسی ملازم کا گمان تھا۔ وہ اندر آ گئی۔

”اے بابا صاحب!“ وہ غلی خان کی خشک آواز آئی۔ شاید انہیں کسی ملازم کا گمان تھا۔ وہ اندر آ گئی۔

”اے بابا صاحب!“ وہ غلی خان کی خشک آواز آئی۔ شاید انہیں کسی ملازم کا گمان تھا۔ وہ اندر آ گئی۔

”اے بابا صاحب!“ وہ غلی خان کی خشک آواز آئی۔ شاید انہیں کسی ملازم کا گمان تھا۔ وہ اندر آ گئی۔

”اے بابا صاحب!“ وہ غلی خان کی خشک آواز آئی۔ شاید انہیں کسی ملازم کا گمان تھا۔ وہ اندر آ گئی۔

”اے بابا صاحب!“ وہ غلی خان کی خشک آواز آئی۔ شاید انہیں کسی ملازم کا گمان تھا۔ وہ اندر آ گئی۔

”اے بابا صاحب!“ وہ غلی خان کی خشک آواز آئی۔ شاید انہیں کسی ملازم کا گمان تھا۔ وہ اندر آ گئی۔

”اے بابا صاحب!“ وہ غلی خان کی خشک آواز آئی۔ شاید انہیں کسی ملازم کا گمان تھا۔ وہ اندر آ گئی۔

”اے بابا صاحب!“ وہ غلی خان کی خشک آواز آئی۔ شاید انہیں کسی ملازم کا گمان تھا۔ وہ اندر آ گئی۔

”اے بابا صاحب!“ وہ غلی خان کی خشک آواز آئی۔ شاید انہیں کسی ملازم کا گمان تھا۔ وہ اندر آ گئی۔

”اے بابا صاحب!“ وہ غلی خان کی خشک آواز آئی۔ شاید انہیں کسی ملازم کا گمان تھا۔ وہ اندر آ گئی۔

”اے بابا صاحب!“ وہ غلی خان کی خشک آواز آئی۔ شاید انہیں کسی ملازم کا گمان تھا۔ وہ اندر آ گئی۔

”اے بابا صاحب!“ وہ غلی خان کی خشک آواز آئی۔ شاید انہیں کسی ملازم کا گمان تھا۔ وہ اندر آ گئی۔

”اے بابا صاحب!“ وہ غلی خان کی خشک آواز آئی۔ شاید انہیں کسی ملازم کا گمان تھا۔ وہ اندر آ گئی۔

کسی نے کی تھی۔

وہ کھڑی دوپٹا سر ڈھاتی رہی۔
”آؤ بیٹی!“ وہ پھر مخاطب ہوئے۔

وہ ہنچ پاتی ہوئی اُن کے نزدیک چلی آئی اور بیڈ کے کنارے پر اس طرح ٹک گئی، جیسے موقع ملے ہی بوسہ دے۔
”سفر کیسار ہا۔ تمہارے نانا کا سن کر افسوس ہوا اور اس بات کا زیادہ کہ تم ایک بار پھر اپنے نانا سے ملنے آئے۔“
نے اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا۔

”ایک بات کہوں بابا صاحب! اگر آپ اجازت دیں، مگر مجھے ڈر ہے، آپ ناراض ہو جائیں گے۔“
ہوئے کہا۔

”تم کہو، ہم ناراض نہیں ہوں گے۔“ اُن کا لہجہ اُن کے الفاظ کا ساتھ نہیں دے رہا تھا۔ عجیب سے اندیشہ تھا، اُن کی آواز میں۔ پیشانی کی کیریں گہری ہو گئی تھیں۔

”آپ چاہتے تو میں زندگی میں کئی بار اپنے نانا سے مل سکتی تھی۔“ اُس نے بہت دھیمی آواز میں کہا تھا۔
بابا صاحب نے سینے میں سے ایک گہرا سانس خارج کیا۔

”بیٹی! ہمارے چاہنے نہ چاہنے کی بات نہیں تھی۔ تمہارا باپ نہیں چاہتا تھا۔“ انہوں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر جواب دیا۔

روشنی نے نظریں اٹھا کر بابا صاحب کا چہرہ دیکھا۔ اُسے یہ سوچ کر شرم آئی کہ بابا صاحب کو بھی جوں ضرورت پیش آ سکتی ہے؟ کتنے آرام سے انہوں نے سارا وزن اُس کے باپ پر رکھ دیا۔

اگر پتا نہیں چاہتے تھے تو پھر اب کیوں لے کر گئے تھے۔ فطری سوال ذہن میں آیا۔
”وہ کیوں نہیں چاہتے تھے؟“ اُس کے منہ سے سوال پھسل ہی گیا آخر۔

”ذمہ دار بیٹوں سے زیادہ سوال جواب اچھے نہیں لگتے۔ ہم نے اُن سے پوچھا ہی نہیں۔“ بابا صاحب۔
انداز میں جواب دیا۔

تو پھر اب پوچھے گا کہ پہلے کیوں نہ چاہا اور اب کیوں چاہا؟ اُس کے اندر کی گرمی پھر عود کر اُس کے ایک تپانے پر۔
دوڑنے بھاگنے لگی۔

اس قدر تا بعد از ہیں میرے پتا، ایسے باپ کے اور بابا صاحب انہیں یہ صلہ دے رہے ہیں۔ وہاں سے۔
خاطر ہو رہی تھی۔

”خاموش کیوں ہو گئیں، کوئی بات کرو بیٹی۔“
”میں کچھ سوچ رہی ہوں بابا صاحب!“ اس کے لہجے میں عجیب سی تھکن اتر آئی۔

”ماشاء اللہ! بہت لوگ ہیں تمہاری فکر کرنے والے، یہ تمہارے کھیلنے کھانے کے دن ہیں، بس تم خوش ہو۔“
یہ فکس ہے کہ اب ہمارا اُن کا تعلق پہلے والا نہیں، مگر تم سے، جو اد سے تو اُن کا رشتہ ہمیشہ کا ہے۔ اب یہ بتاؤ حویلی کب
پہنچے گی؟ انہوں نے اچانک موضوع بدل دیا۔
”میں تو موزوں نہیں ہوں۔“ اُس کا موڈ بے حد خراب ہو چکا تھا۔
”میں تو موزوں نہیں ہوں۔“ اُس کا موڈ بے حد خراب ہو چکا تھا۔
”میں تو موزوں نہیں ہوں۔“ اُس کا موڈ بے حد خراب ہو چکا تھا۔

تاکید کی ہے۔“

سفید پھنوں کے نیچے اُن کی چمکتی ہوئی نیلی آنکھیں روشنی کے چہرے پر ٹک گئیں۔

”ایک نہ ایک دن تو جانا ہی ہے حویلی، جلدی کیا ہے، اپنے پتا کے پاس ہی تو ہوں۔“ وہ ہاتھ مسلتے ہوئے رہی تھی۔

”مرضی ہے تمہاری، ہمارے پاس تمہاری بہنوں کا پیغام تھا، سو ہم نے پہنچا دیا۔“ وہ سر جھکائے کچھ سوچتی رہی۔

”آپ کتنے دن کے لیے آئے ہیں بابا صاحب؟ اگر آپ زیادہ دن کے لیے آئے ہیں تو پھر میں آپ چلوں، اگر جلدی جائیں گے تو میں بعد میں آ جاؤں گی۔ ابھی میرا دل نہیں چاہ رہا پتا کے پاس سے جانے کو، اُن دن دیکھے ہیں۔“ نہ جانے کیوں آواز بھرا گئی۔

”کوئی بات نہیں بیٹی، جب تک تمہارا جی چاہے رہو، ہم تو صبح چلے جائیں گے۔“ انہوں نے اسی طرح ہڈ سکون انداز میں جواب دیا، جس کا مظاہرہ وہ شروع سے کر رہے تھے۔

”اتنی جلدی؟“ اس نے چونک کر سر اٹھایا۔

”ہاں، مجبوری ہے، ادھر باری بھی نہیں ہے ناں آج کل، اور تمہارے بڑے ابا بھی کراچی گئے ہوئے ہیں۔ تمہارے رات بنکا ک جا رہے ہیں۔“ روشنی کا دل بھڑک اٹھا۔

”باری کہاں گیا ہوا ہے؟“ اُس نے اٹکتے ہوئے پوچھ ہی لیا۔

”سرائے گیا ہوا ہے۔ خدا معلوم اُسے وہاں کتنے دن لگ جائیں۔“ وہ خود کلامی کے انداز میں گویا ہوئے۔

”کیوں؟ وہاں کیا ہو گیا۔ کا کا جان تو اکیلے ہی بہت ہیں۔ جب گھر والے اُن سے اتنا ڈرتے ہیں تو،

چاری۔۔۔“ اُس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

”مگر تمہیں تو کسی سے ڈر نہیں لگتا۔ کیا تیمور نے تمہیں کبھی ڈانٹا؟“ وہ جانے کیوں بہت سنجیدگی سے پوچھنے لگے۔

”میں اُن کے سامنے ہی نہیں جاتی شروع سے۔ بڑی امی سب بچوں کو اُن سے ڈراتی تھیں۔“ اُس نے

سے جواب دیا۔

”اچھا! ہمیں علم نہیں، وہ ایسا کیوں کرتی رہی ہیں۔ ہر انسان کا اپنا الگ مزاج ہوتا ہے۔ تمہارے کا کا جان

سے گھر سے دُور رہے ہیں، پہلے بورڈنگ پھر ہاسٹل، پھر دوسرے ملک چلے گئے پڑھنے، اسی لیے گھر والے

سکے۔“

”مگر اپنے اسٹائل سے تو وہ شکاری ہی لگتے ہیں، جو بندوق تانے ہوئے نشانے پر دیکھ رہا ہو۔“ وہ پچھلے

مسکرا پڑی۔

”ایسی کوئی بات نہیں ہے۔“ بابا صاحب اُس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اتنی آہستگی سے گویا ہوئے کہ وہ نزدیک

بننے کے بجائے جوڑ بٹھل سکی۔

”کیا کا کا جان بہت زیادہ کوالیفائیڈ ہیں؟“ اُس نے جانے کیوں پوچھا تھا۔

”ہاں، اُسے ہمیشہ سے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا شوق رہا ہے۔“ دلاور علی خان نے عام سے لہجے میں جواب دیا۔

”اب ہمارے پتا سے بھی زیادہ کوالیفائیڈ ہیں؟“ اُسے الجھن سی ہوئی۔ وہ تو سمجھتی تھی، آس پاس اس کے پتا سے زیادہ

کوئی خیر نہ نہیں۔

”رواں کے تعلیمی میدان ذرا مختلف رہے ہیں۔ یادور علی خان کا علمی سفر ابھی جاری ہے۔ مختلف کورسز کرنے باہر

جاتے رہے ہیں۔ تمہارے کا کا جان بزنس میں پڑ گئے ہیں۔ بس یہ فرق ہے۔“ انہوں نے اسی طرح دھیمی آواز میں جواب

دیا جسے سننے میں دشواری ہوئی۔

”یہ تو چھانٹا فرق ہے۔ صاف ظاہر ہے، پتا زیادہ کوالیفائیڈ ہیں۔“ اُس نے بڑے فخر سے کہا۔

”کوئی شک نہیں۔“ دلاور علی خان نے اُس کی پشت تھپتھپائی اور مسکرا دیے۔ انہیں پوتی کا اس طرح فخر کرنا شاید اچھا لگا

نہ۔

”آپ کو خوشی نہیں ہوتی کہ پتا اتنے قابل ہیں؟“ اُس نے معصومیت سے سوال کیا۔

”بے حد۔۔۔ بے انتہا۔“

رواں نے چونک کر اُن کا چہرہ دیکھا۔ دلاور علی خان کی مسکراہٹ، اُن کی نرمی اُسے شک میں ڈالے دے رہی تھی۔

”باری کتنے دن کے لیے گیا ہے سرائے؟“ اُس نے اپنی نظروں کا زاویہ بدلا۔

”غیر مت۔۔۔ کوئی کام ہے اُس سے؟“ دلاور علی خان پوچھنے لگے۔

”دوب کے کام کا ہے، مگر میرے کسی کام کا نہیں ہے۔“ اُس نے برا سامنہ بنایا۔

”انکا بات نہیں ہے، بہت اچھا بچہ ہے۔ بے حد محنتی ہے۔ ہمیں یقین ہے، وہ یادور علی خان کی طرح بہت ترقی کرے

رواں کو خوش گمانوں کے جھونکے آنے لگے۔ دل بلیوں اچھلنے لگا۔

”کیا وہ ہمارا ملازم ہے بابا صاحب۔“

”نہیں۔“ دلاور علی خان کے لہجے میں قطعی پن تھا۔

”تو کیا ہمارا رشتہ دار ہے؟“ اُس نے ڈرتے ڈرتے اُن کی صورت دیکھی۔

”نہیں۔“ لہجہ ہنوز قطعی تھا۔

”تو کیا وہ ہمارے گاؤں کا ہے؟“ اُس نے پھر ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ مبادا دلاور علی خان پے درپے سوالات کرنے پر

نہیں ہو جائے۔

”نہیں۔“ اُن کا انداز بدستور تھا۔

اب وہ چاہنے کے باوجود کوئی نیا سوال نہ کر سکی۔ ماحول کو بد مزایا اُن اُس وقت اسے منظور نہیں تھا۔ سر جھکا کر بیڈیٹ کے ٹھلی پھولوں پر انگلیاں پھیرنے لگی۔ اُس کا دل چاہ رہا تھا، وہ خود سے باری کے تئیں اور وہ دیر تک اُس بے مہر کی باتیں سنتی رہے۔

اُسی دم دروازے پر دستک ہوئی۔ وہ چونک کر دروازے کی سمت دیکھنے لگی۔ ”ہوں!“ دلاور علی خان نے مخصوص انداز میں اندر آنے کی اجازت دی۔

دروازہ دھکیل کر اندر آنے والے یاور علی خان تھے۔ گہرے سرمئی شلوار سوٹ اور سفید واسکٹ میں اسمارٹ محسوس ہو رہے تھے۔

”آؤ بھئی۔“

”تم بھی بیٹھو پریس کانفرنس میں۔“ دلاور علی خان، بیٹے کو دیکھ کر جیسے نئے سرے سے تازہ دم ہو گئے۔

”یہی دیکھنے آیا کیونکہ خاصی دیر ہو گئی اسے آپ کے پاس آئے ہوئے۔“ وہ ہمیشہ کی طرح برائے ہنر گری پر بیٹھ گئے۔

”بس باتیں کر رہے تھے۔“ بابا صاحب نے مُسکرا کر روشی کی طرف دیکھا۔

”بابا صاحب نے کچھ بھی نہیں کہا پتا!“ روشی نے خوشی سے بتایا۔

”کس سلسلے میں؟ انہوں نے باپ کی طرف دیکھا۔

”کراچی والے سلسلے میں“ روشی نے جواب دیا۔

دونوں باپ بیٹے ایک دم بہت خاموش سے ہو گئے۔ کمرے میں گہرا سکوت طاری ہو گیا۔

”ہم نے اندازہ لگایا ہے کہ تمہیں اپنی خالہ بہت اچھی لگیں۔“ بابا صاحب نے ایک نیا موضوع نکالا۔

”ہماری امی بھی تو آپ کو اچھی لگی تھیں، جب ہی تو آپ انہیں حویلی میں لائے تھے۔ کوئی آپ کو پسند؟“

آسان بات تو نہیں، بس خالہ بھی اُنہی کی بہن ہیں۔“ وہ مُسکرا رہی تھی۔

جانے کیوں باپ کے سامنے خالہ کا ذکر کرتے ہوئے اب وہ بہت کانٹا سی ہو جاتی تھی۔ جواب میں۔

خاموشی طاری رہی۔

”اچھا! آپ یہ تو پوچھیں، مجھے ان کی کیا بات اچھی لگی؟“ اُس نے ان کی خاموشی سے مجبور ہو کر اپنی طرف اشارہ کیا۔

سوال تیار کر کے اُنہیں دیا۔

”شاید اس لیے کہ وہ بہت خوبصورت ہیں۔“ دلاور علی خان نے بہر حال خیال ظاہر کر دیا۔

”ارے نہیں بابا صاحب! خوبصورت تو ”مامائی“ بھی بہت ہے۔ بات یہ ہے کہ خالہ کم عمر ہونے کے باوجود عورتوں کی طرح میچور ہیں اور پھر وہ جتنی قابل اور لائق ہیں وہ علیحدہ خصوصیت ہے۔ پھر وہ ڈریسنگ بہت فائنڈ منڈے۔“

بہتر سٹ کا بہت سنیس ہے انہیں۔“

بغور اس کے خیالات سن رہے تھے۔ آخری جملے پر بے ساختہ مُسکرا دیے۔

”یہ کس قدر بچپنا ہے، بھلا اس کے فیصلوں پر بھروسہ کیا جاسکتا ہے؟“ اُنہوں نے

پنک وٹن کا تلبظ نظروں سے دیکھا۔

”پرسنٹ کہہ رہے ہیں۔“ یاور علی خان نے ہاں میں ہاں ملائی۔

”یہ تو بچی نہیں ہوں۔“ اُس نے مُنہ بنا لیا۔

”یہ بھی، یہ مطلب نہیں ہے ہمارا۔“ چنگلی عمر سے نہیں تجربات سے آتی ہے اور تجربات سے انسان آہستہ آہستہ گزرتا

ہے۔ فز میں بچی ہو، پھولوں میں سوئی ہو، ابھی سوچ ادھوری ہے۔ جست کرتے والوں کے فیصلوں کا احترام یہی سوچ کر

کرن پچے کہ جو جانتے ہیں پیچھے آنے والے ابھی نہیں جانتے۔“

نہ ندرے خوفزدہ ہو کر باپ کی شکل دیکھی۔

”بابا صاحب اس لیے ہے کہ اس کا ذہن کسی تبدیلی کے لیے تیار کیا جا رہا ہے۔ یہ اتنی دیر سے بابا صاحب جو اتنی شفقت

ان کو کاغذ کر رہے ہیں۔ اس کا غیر معمولی پن تو اس نے بہت پہلے ہی محسوس کر لیا تھا۔

”بچا نے اپنا ہیڈک آپ کی طرف منتقل کر دیا ہے؟“ بے اندازہ شک نے اس کا رنگ متغیر کر دیا۔ وہ بڑی گہری

فراں سے ہارلی ہارلی باپ اور دادا کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔

”نہہ ہم اپنے اپنے معاملات خود ڈیل کرتے ہیں۔“ یاور علی خان نے اپنی مخصوص سنجیدگی سے جواب دیا۔ وہ جیسے اس

ان کو پوچھتے تھے اور سوچ سکتے تھے کہ اُس نے یہ بات کس بنیاد پر کہی ہے۔

”پو تو خیر، یہ جہے خالہ کو پسند کرنے کی؟ ویسے وجہ تو بہت معقول ہے۔“ دلاور علی خان نے پھر بات پلٹی۔

”ایک اور وجہ بھی ہے۔“ اُس نے خاصی سنجیدگی سے کہا۔

”کیا؟“ دلاور علی خان نے بے ساختہ پوچھا۔ جبکہ یاور علی خان نے اس طرف سوالیہ نظروں سے دیکھنے پر ہی اکتفا

کیا۔ ”میرا خونی تعلق بھی ہے۔ وہ میری امی کی سگی بہن ہیں۔“ اُس نے بڑے دانشمندانہ انداز میں جواب دیا۔

”نہہ پ بیٹے ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر پھر خاموش سے ہو کر بیٹھ گئے۔“

”کیا یہ معقول وجہ نہیں؟“ اُس نے حیرت سے دونوں کی طرف دیکھا۔

”بہت معقول وجہ ہے، بلکہ یہی وجہ معقول ہے۔“ دلاور علی خان نے جوابا کہا۔

”یہ بابا صاحب! ڈائمنڈ روم میں چلتے ہیں، باقی باتیں وہیں ہوں گی۔“ یاور علی خان اُٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

”ابھی سے کھانا، ابھی تو بابا صاحب سے خالہ کی اور باتیں کرنے کو جی چاہ رہا ہے۔“ اُس نے کوفت بھرے

”وہیں کر لیں گے۔“ دلاور علی خان نہ جانے کیوں مسکرا رہے تھے۔
 دلاور علی خان سنی اُن سنی کے انداز میں باہر نکل گئے۔
 روشی نے چھڑی اٹھا کر بابا صاحب کو تھمائی۔

”شاید پتا کو خالہ زیادہ پسند نہیں آئیں۔“ اُس نے افسردگی سے کہا۔
 ”وہ کیوں؟“ دلاور علی خان چہل پاؤں میں ڈالتے ڈالتے اُس کی طرف دیکھنے لگے۔
 ”وہ یوں کہ جو بھی خالہ کی بات ہوئی ہے وہ بات کسی اور طرف موڑ دیتے ہیں۔“
 اس نے بڑے وثوق سے جواب دیا جیسے اسے اپنے اندازے پر سو فیصد یقین ہو۔
 ”اچھا۔ مگر ہمیں اندازہ ہے کہ ایسا نہیں ہے۔“ وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔
 وہ ان کے پیچھے پیچھے چل رہی تھی۔ اور بڑی گہری سوچ میں تھی۔

گریز کا نہیں قائل حیات سے لیکن
 جو بچ کہوں تو مجھے موت ناگوار نہیں

عارف، لال خان کے گھر واپس آ چکا تھا۔ لال خان اسے سہارا دے کر بٹھا رہا تھا۔
 ”اتنی دیر لگا دی آپ نے۔ جلدی کریں۔ ایسے تازہ تازہ کلیوں کے گجرے باندھے تھے سب مہربان
 بالو کر نکل کے لش لش کرتے، سنہری کام والے دوپٹے اور کرتے شلوار میں شعلہ و جوالہ بنی دروازے پر
 بھاری کام کے خاصے قیمتی سوٹ نے اسے ایک انوکھی سی چھب بخش دی تھی۔ سلیقے سے کیے ہوئے ہنر
 اس کے گندمی رنگ والے چہرے پر بلا کی تازگی محسوس ہو رہی تھی۔

”ذرا اس بے چارے کا انتظام تو کر دوں تاکہ یہ آرام سے سو جائے۔“ لال خان نے پلٹ کر بالو سے
 میں کہا۔

”سارے محلے میں سب سے پکی سہیلی میں ہوں سارہ کی۔ وہ تو مجھے بہت پہلے اس کے پاس پہنچے
 بارات کے بعد پہنچوں گی تو کتنا ناراض ہو گی وہ۔“ بالو نے عارف کے سامنے پہلی مرتبہ کھل کر لال خان سے
 ”ہاں۔ ہاں۔ چل رہے ہیں اب دیکھو ناں مریض کو بغیر انتظام کے چھوڑ کر بھی تو نہیں جاسکتا۔“
 رسائیت سے جواب دیا۔

”یہ تو مستقل قسم کے مریض ہیں، اب کیا ہم سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر بیٹھ جائیں؟“ بالو کی آواز آہستہ آہستہ
 لال خان گڑ بڑا کر یکدم سیدھا ہو گیا۔
 ”کیسی باتیں کر رہی ہو۔ چلتے ہیں ابھی۔ تم خیال نہ کرنا عارف!“ لال خان چل سا ہوا تھا۔
 ”ارے نہیں یار۔ ہم تو ہر طرح کے مزاج کے عادی ہیں۔“

واں دل میں کہ صدے دو، یاں جی میں کہ سب سہ لو
 اُن کا بھی عجب دل ہے، میرا بھی عجب جی ہے

”بستی سے ہنس دیا۔“
 ہانے مسکرا سے بوجھل پلکیں لکھنے بھر کو اٹھائیں۔
 ”میں باہر گاڑی میں بیٹھتی ہوں۔ آپ جلدی آ جائیں۔“ گاڑی سے مراد لال خان کی سوزوکی کنیری تھی۔ جو ابھی گھر
 کے دروازے میں موجود تھی۔
 ”یہ لگاس پانی میں گلو کوز ملا کر یہاں میز پر رکھ دو۔ پانی تو ویسے رکھا ہے یہاں۔ پھر بھی گلو کوز ملا پانی بھی رکھ جاتے
 ہیں۔“

نظر نہ کرنا میں تمہاری بھابی کو چھوڑ کر جلدی آ جاؤں گا۔“ وہ اسے تسلی دینے لگا۔
 بالو نہایت بددلی سے گلو کوز پانی میں ملا رہی تھی۔ چچ کے شور سے اس کے دانت پیسنے کا اندازہ لگایا جاسکتا تھا۔
 ”تمہاری بھابی کی بڑی عزیز سہیلی ہے۔ اس لیے جلدی مچا رہی ہے۔ ورنہ تمہیں تو معلوم ہے، کتنا خیال کرتی ہے
 نہ لال خان وضاحت در وضاحت کے عمل سے گزر رہا تھا۔
 ”میں تو سمجھ رہی تھی کہ جلدی سنہیل جائیں گے۔ اتنی مہنگی دوائیاں، اتنا آرام۔ پر لگتا ہے۔ انہیں ٹھیک ہونے
 کا کوئی شوق نہیں ہے۔ اور جب ان کی یہ حالت ہمیشہ کے لیے ہے تو کام کیوں روکیں۔ یہ اپنے حساب سے چلتے رہیں، ہم
 اپنے حساب سے۔“
 بالو نے گری پر رکھا پرس اٹھاتے ہوئے نہایت کڑوے لہجے میں کہا۔

مارے عجب کے لال خان کی آنکھیں پیشانی پر جا لگیں۔ وہ بے زبان سی بیوی کو یوں دیکھنے لگا جیسے شک ہو کہ یہ بالو ہی
 ہے؟
 ”تم کیوں پریشان ہو گئے لال خان۔ انسان شکھ اور خوشی کے موسم گزار رہا ہو تم ہم جیسے لوگ ماحول بد مزہ کرنے والے
 ہیں۔ خوش لوگوں کی طبیعت پر بوجھ پڑتا ہے۔ مزہ خراب ہوتا ہے۔
 وہ کیا کہا ہے شاعر نے کہ

ہم سے کہتے ہیں چمن والے عزیز بان چمن

تم کوئی اچھا سا رکھ لو اپنے ویرانے کا نام

”یہ حال ہے چمن والے تو ہمارے ٹھکانے کا نام بھی اپنی مرضی کا چاہتے ہیں۔ انہیں نام اچھا نہ ہونے ہی پر ہی
 غرض ہو گیا۔“ وہ ہنس دیا۔
 ”تم کوئی خیال نہ کرو۔ عارف یار! ہم یار ہیں تمہارے آخری سانس تک۔ کبھی جی نہ انا نہ کرنا میری طرف سے۔ اور آج

کے بعد تمہیں اپنی بھابی سے شکایت بھی نہیں ہوگی۔“ لال خان نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں سے کر کے دھرا۔
 ”تو ہم بھی تمہارے یار ہیں۔ قدر دان، وفا شناس۔ وفادار۔ اب ایسے کچے بھی نہیں کہ ذرا فراق سے ہلاک ہو جائیں۔
 میں۔ ہمارے ساز و سامان میں ایک وفائی تو ہنسی ہے۔ حالانکہ اس زمانے میں اس اصول شے کی کوئی قدر نہیں رہی۔
 مجروح لکھ رہے ہیں وہ اہل وفا کا نام
 ہم بھی کھڑے ہوئے ہیں گنگا کی طرح

بڑی خوار ہے وفا۔ جاؤ یا رادیر ہو رہی ہے۔ بھابی! میں بہت شرمندہ ہوں آپ سے کہ میری بیوی
 ہوئی۔“

بالو ماتھے پر شکنیں ڈال کر باہر نکل گئی۔
 عارف کے شانے پر تھکی دے کر لال خان بھی اس کے پیچھے پیچھے نکل گیا۔

بالو نے گاڑی کا دروازہ کھولا۔ اور بیٹھ کر کھناک سے بند کر لیا۔ جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ اس کا موڈ سخت خراب
 لال خان نے گاڑی باہر نکالی پھر گاڑی سے اتر کر گیٹ میں تالا ڈالا۔ حالانکہ اگر بالو چاہتی تو یہ کام خود
 گاڑی باہر آنے کے بعد تالا ڈال کر بھی بیٹھ سکتی تھی نہ کہ اندر کھڑی گاڑی میں بیٹھ گئی تھی۔

”آج کل تو بار بار تمیں بہت دیر میں پہنچتی ہیں۔ تم موڈ ٹھیک کر لو۔“ لال خان نس دوبارہ ڈرائیونگ سیٹ پر
 منانے کے انداز میں کہا۔

بالو نے منہ کھڑکی کی طرف پھیر لیا اور خاموش رہی۔

”خوشی میں حصہ تو سب ہی لیتے ہیں۔ دوست کو دکھ میں اس طرح نہیں چھوڑا جاتا۔ بہت احسان ہیں۔
 میرے بھائیوں نے تو سمجھو بھیک ہی منگوا دی تھی۔ خون کے رشتوں سے دغا دکھائی ہے میں نے اور اس غیر پرور
 ”ایک احسان تو ان کا میری جان پر بھی ہے۔ بھاری احسان۔“ بالو کے لہجے میں انکارے سنگ رہے تھے۔

”وہ کیا؟“ لال خان ٹرک ڈرائیوگر جیسی ریش ڈرائیوگر کر رہا تھا۔ اس کے اعصاب پر یہ بات سوار تھی۔
 وجہ سے بالو کا موڈ خراب ہے۔

”آپ سے میری شادی کرائی ہے۔ یہ احسان تو میں کبھی بھی اتار نہیں پاؤں گی۔“ اس کا لہجہ زبردست
 گاڑی کی اندرونی لائٹ آف تھی اور سڑک بھی تاریک۔ لال خان کی حیات اس کے پیٹ سے ڈگنی مانی
 ”ہا۔ ہا۔ ہا۔ ہا۔ ہا۔“ اس نے اپنا مخصوص بے ہنگم قبضہ لگایا۔

”ارے جان لال خان! یہ احسان اس نے تم پر نہیں ہم پر کیا ہے۔ اسی وجہ سے تو اس کی خدمت
 ہیں۔ زندگی اتنی رنگیں بھی ہوتی ہے، اندازہ نہیں تھا۔“ لال خان کی آواز جذبات سے بوجھل ہو گئی۔

بالو کے حلق میں آنسوؤں کے گولے اکنے لگے۔ اس نے بمشکل خود پر قابو پایا۔
 ”آپ کو پتا ہے کہ جب دل بے حد خوش ہو تو کیا محسوس ہوتا ہے؟“ اس کی آواز کرب سے پورے پورے

بہت بھی۔ ہر طرف پھول کھلتے ہیں۔ زندگی بڑی ہلکی ہو جاتی ہے۔ موت سے بڑا خوف آتا ہے۔ مرنے کو تو دل ہی
 میں ہلکا ہے۔ کچھ پہلے ایسا نہیں ہوتا تھا۔ کر فوہنگا مے ہوتے تھا۔ میں پروا نہیں کرتا تھا۔ باہر نکل جاتا تھا۔ یار دوست کہتے،
 ”میں تو دن گنگا جئے گی کسی دن۔ بڑا سورا مانا پھرتا ہے۔ اپنی پروا ہی نہیں کرتے تھے۔ مگر اب موت سے ڈر لگتا ہے۔“
 رچنے پونے بڑی عمر ہو اور تمہارا ساتھ ہو۔“

میرے دل میں ہوا۔ تنہائی ہو۔ عورت بھی بنی اس کے قریب ہو تو لطیف حیات خود کار طریقے پر جاگ پڑتی ہیں
 رخصت میں دنیا کا خوف بھی طاری نہیں ہو سکتا۔ دل و ذہن بھر پور آزادی کے احساسات سے رواں پانی کی طرح
 بہتے ہیں۔ یوں یا بتا کے تو روم روم میں قوس قزح ٹوٹی ہے۔ مگر وہ پتھر کے بت کی طرح ساکت تھی۔
 رات کے گھنٹہ موڈ کا اس پر کوئی اثر نہیں تھا۔

”بھئی! جب شوہر موت ووت کی باتیں کرتا ہے تو عام طور پر عورتیں بڑا دہشتی ہیں اور ”اللہ نہ کرے“ دس بار کہتی ہیں۔ اور
 نہیں بھی بوجھے نہیں میری موت زندگی سے کوئی دلچسپی ہی نہیں۔“
 لال خان اپنی جہالت کی وجہ سے خاصا ”محفوظ“ تھا۔ اب بھی ہنس کر کہہ رہا تھا۔
 بالو بھی خاموش رہی۔

”تمہاری سبیلوں میں سب سے اچھا جوڑا تمہارا ہوگا۔ قسمت والے ہی پہنتے ہیں اچھے جوڑے۔ جب میری شادی
 ہوئی تو مجھ کو محبوب کھا تھا اور ثناء اللہ کے ہاں بھاری بھاری جوڑے دیکھ کر سوچا کرتا تھا۔ جب میری شادی ہو جائے گی تو
 لال خان نے لہجے میں سے کپڑے لیا کروں گا۔ بڑی ورائٹی ہوتی ہے یہاں۔“

”آپ کی شادی ہوئی تو اس سے بھی اچھا سوٹ لا کر دوں گا۔ جو پورے خاندان میں اور کسی
 ”خوشامداتہ باتیں آپ خانوں“ سے کیجیے گا۔ میں آپ کے کسی کام کا نہیں۔“ اس نے ترشی سے اس کی بات کاٹ

”تمہاری انسانی تمہارے اندر زندہ ہوتی تو میرے کام آ سکتے تھے۔ کتے بندھے رکھتے یا خود مجھے کسی دارالامان
 میں بٹھاتے۔“ اس نے سسکاری بھری۔

”میرے دل آپ سے ہمدردی کا کوئی حساب نہیں نکلتا۔ خاموش رہیں۔“ وہ سنجیدگی کی انتہا کو چھو رہا تھا۔
 ”جسمیں کچھ ترس نہیں آیا مجھ پر کہ مجھے ظفیری جیسے انسان سے زبردستی باندھ دیا گیا ہے۔“ جھومر پھر گویا ہوئی۔

”میں نے وہ عورتیں بھی دیکھی ہیں جن کے شوہر معذور ہو جاتے ہیں یا غلط راستوں پر چل پڑتے ہیں مگر وہ انہیں
 خوش کرتی ہیں۔ مگر چلانے کے لیے نوکری کرتی ہیں۔ بچے پرورش کرتی ہیں۔ اپنے ہتھ کام بھی کام کرتی ہیں شوہر کے ہتھ
 کام کرتی ہیں۔“

”سے ہنس کر بولے۔
 ”میں نے اپنے ہتھ کی ہٹل میں کوئی تھنہ دیا تو پورے دس تو لے کا سیٹ بنوا کر دوں گا۔“

ماڈ پرست انسان کے پیار کے پیمانے بھی مادی ہی ہوتے ہیں۔ لال خان خوشی کے عالم میں اپنے محبت نوالہ شروع کر دیتا تھا۔ اور تول تول کر اس کی جھولی کی طرف اچھالتا جاتا تھا۔ وہ بدستور خاموش تھی۔

”کیا بات ہے! ابھی تک ناراض ہو۔ دیکھو اب اگر نہیں مانو گی تو بیچ سڑک پر۔ سمجھ رہی ہو؟“ اس نے فائل چوڑا کیا۔

”آپ جلدی مت آئیے گا۔ کبھی اپنے اس بے کار دوست کی خاطر بھوکے پیاسے چلے آئیں۔ اگر کوئی تو میں لٹاں کے ہاں منگو کر آپ کو کھلا دوں گی۔ فارغ کر دوں گی جلدی۔“

”بڑی مہربانی صاحب۔ بڑی اچھی قسمت بنائی ہے مولانا نے اپنی۔“

لال خان اتنے معمولی اور مشکوک قسم کے التفات پر ہی خوش ہو گیا۔ بالو جیسے اپنی ڈیوٹی بھٹکانا کر فارغ ہوئی۔ دوبارہ پُپ سادھ کر باہر دیکھنے لگی تھی۔

پچھلے سے گاہے گاہے جھومر کے کراہنے کی آوازیں آرہی تھیں۔

”جب بہادر ہیں نہیں تو پوز کرنے کی ضرورت کیا ہے۔ دریا بستی کی حویلی کا پچھواڑا نہیں ہے یہ۔“

وہ سب جیل تھی آپ کے لیے یہ سیزل جیل ہے۔ خطرناک قسم کے قیدیوں میں شامل ہو گئی ہیں آپ؟ کبہا باہر کی طرف آنے کی؟ کون سے پھول کھلے ہوئے تھے ادھر جنہیں دیکھنے کو طبیعت چل رہی تھی۔ یقیناً بھاگنے کے لیے اسی لیے جب میں اندر ہوتا ہوں تو باہر کتے کھول دیتا ہوں۔ یہ سوچ کر کہ آپ کھلے ہوئے کتے دیکھ کر باہر نہ مرنے نہیں کریں گی۔ مگر وہ آپ ہی کیا۔“

باری کو اس نئی دروہی سے بے حد کوفت ہو رہی تھی۔

”تم نے جان بوجھ کر کھولے تھے کتے؟ جھومر کراہی۔“

”ظاہر ہے۔ اس طرح کے کام غلطی سے تو نہیں ہوتے۔“ وہ جھٹلایا۔

”جب تمہیں حویلی میں چلتے پھرتے دیکھتی تھی تو یہی محسوس ہوتا تھا کہ تم اور سب سے مختلف ہو۔ بہت اچھے تمہاری شکل سے لگتا تھا۔ میں سوچتی تھی۔“

آپ کو بیٹھے بیٹھے کھانے پینے کو مل رہا تھا۔ اسی لیے نعمتوں کی قدر نہیں ہوئی۔“ اس نے بڑی تفصیل سے ملامت کیا۔

”ایسا لگ رہا ہے جیسے باری نہیں حویلی کا کوئی خان بول رہا ہے۔“ اس بار جھومر کی آواز بے حد بلند ہوئی۔

رہا۔

مجھے رات حویلی میں روشنی پسند ہے۔ وہ حویلی کے مردوں کی طرح بہادر ہے۔ دن میں کسی نہ کسی طرح میرے پاس

بات ہے۔ ایک کئی مرتبہ ظفیری کی امی اس پر ناراض ہو چکی ہیں۔

پس وہ کس پر غی ہے۔ شاید اپنی ماں پر۔“

جھومر بہت دھیمے دھیمے انداز میں کہہ رہی تھی۔

وہ سکرین پر روشنی نمودار ہو گئی۔ خوبصورت لباس میں نیچے نیچے تاثرات کے ساتھ۔ جس کی ستواں ناک میں پڑی

یہ رنگ کی چمک سیدھی دل پر پڑ رہی تھی۔ جیسے رنگ سے روشنی بالکل سیدھی گزرتی ہے۔ یہ لوگ اس نے پچھلی برتھ

نے پہلی رات سے کہا تھا۔

”آپ سے بات کر کے پچھتا رہا ہوں۔ اس انداز میں سہیلیوں سے باتیں کرتے ہیں۔ میں آپ کی سہیلی نہیں ہوں۔“

یہ بات کے معاملات میں خود کو شامل کرنا ذرا نہیں بھایا تھا۔ ”یہ نواتی باتیں ہیں۔ آخر آپ نے مجھے کچھ کیا رکھا ہے؟“

اس نے اچھی خاصی خبر لی تھی۔

”آپ دھیان آ رہا ہے۔ وہ لوگ واقعی تمہاری ناک میں بہت جھتی ہے۔ کس قدر دکھ منظر ہوتا ہے جب نخوت سے

نہایت ہوئی تم بے سرو پا باتیں بھی اس طرح کرتی ہو جیسے کوئی سائنس دان اپنی تازہ ترین ایجاد پر بڑے اعتماد سے فخر بکھاتا ہو۔“

”تم اس کار میں مرتبہ پر جا رہے ہو؟“ پچھلے سے جھومر کی تپتی ہوئی آواز آئی۔

”ایک دم جیسے کسی ماورائی دنیا میں ڈرائیو کرنا رہا۔“

”ہاں۔ میرے پیٹ پر جو زخم ہے، اس میں سے بہت خون نکل رہا ہے۔“ جھومر کی آواز میں بے بسی تھی۔

”تائیے مجھے کیا کروں؟ کار کو ہوائی جہاز میں تو تبدیل کرنے سے رہا۔ اس ہم کو پہنچنے کی دیر لے لے۔“

گرنے جیسے زچ کر جواب دیا۔

”تکلیف میں تو میں ہوں تمہیں کیا؟“ جھومر نے کراہتے ہوئے کہا۔

”آپ لیٹی ہوئی ہیں اس لیے آپ کو سامنے نظر آئے۔ والے لائٹس نظر نہیں آ رہیں۔“ باری نے جیسے اسے تسلی دی۔

”اچھا تو میلوں دور سے بھی نظر آ سکتی ہیں۔“ جھومر نے چڑ کر کہا۔

”ہاں ہاں جی چاہا۔ گاڑی کہیں دے مارے۔ کچھ مشکل نوڈ پر کنٹرول کیا اور خاموش رہا۔“

”مجھ کو کس سکوٹ طاری ہو گیا۔ کافی دیر گاڑی اندر چرے میں چلتی رہی پھر روشنیوں اندر چھن چھن کر آنے لگی۔“

”میں گاڑی ایک جگہ رک گئی۔“

”میں گاڑی سے کچھ ٹیکہ کھانے لگا۔“ باری نے دروازہ کھول کر اترتے ہوئے کہا۔

”میں گاڑی سے کچھ ٹیکہ کھانے لگا۔“

باری چند لمحوں ہی میں واپس آ گیا اور دو بارہ ڈرائیوگ سیٹ سنبھال لی۔ گاڑی چل پڑی۔ دو تین منٹ بعد پھر گاڑی رُک گئی۔

باری اپنی طرف کا دروازہ کھول کر باہر نکلا پھر کچھ سیٹ کا دروازہ کھولا۔

”آئیے۔“ وہ دروازہ تھام کر کھڑا ہو گیا۔

جھومرا اُنھ کر بیٹھ گئی۔

”باری۔ میری ٹانگ اکر رہی ہے۔ مجھے سہارا دو۔“ جھومر نے کمر ب سے نچلا ہونٹ دبا لیا۔ بارلی نے جھومرا اس کا بازو تھام کر باہر آ گئی اور کھڑی ہو کر اس کے بازو سے چپک گئی۔ وہ اسے سہارا دے کر اندر بڑھنے والے حصے میں داخل ہو گیا۔ عورتوں اور بچوں کی طویل قطار سامنے تھی۔ اس نے ایک بچہ پر ہاتھ رکھا۔

”میں ابھی ڈاکٹر سے بات کر کے آتا ہوں۔“ وہ فوراً ہی باہر کی طرف بڑھا۔

”آپ کیا یہاں عورتوں میں بے دھڑک چلے آئے یہاں پردے والی عورتیں بھی ہوتی ہیں۔“ ایک عورت نے اسے مخاطب کیا۔

”مجھ سے چپا نہیں جا رہا تھا۔“ جھومر نے وضاحت کے بجائے مجبوری بتانے پر اکتفا کیا۔

”تو پھر وہ آپ کو مردوں کی طرف لے جاتے۔“ بڑھیا ترخ کر بولی۔ شاید جھومر کے قیمتی ٹوٹ اور برون بڑھیا غصے کے باوجود آپ جناب سے بات کر رہی تھی۔ جھومر سے بیٹھ کر بولنا محال تھا۔ اُس نے آنکھیں ہلکی لگالی۔ تکلیف کی شدت کی وجہ سے اس نے نچلا ہونٹ دانتوں سے دبا رکھا تھا۔

”جھومر کون ہیں؟“ اچانک ایک طرف سے کمپوزر نمودار ہوا۔

جھومر نے آنکھیں کھول دیں۔ اور بمشکل اُنھ کھڑی ہوئی۔

”جی۔ میں ہوں۔“

”آئیے۔ آپ ساتھ والے پورشن میں آجائیے۔ ڈاکٹر صاحب وہیں آپ کو دیکھیں گے۔“ ان دروازے کی طرف اشارہ کیا۔

جھومر بمشکل چلتی ہوئی دروازے کی سمت بڑھی۔ تمام عورتیں کھاجانے والی نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگیں۔

”لو بتاؤ، سب سے آخر میں آئیں اور سب سے پہلے چل دیں۔“

”پیسے کا کھیل ہے۔“ وہی سب جگہ آگے ہوتا ہے۔“

”ہم باؤلے ہیں اتنی دیر سے بیٹھے ہیں۔“

”اے اے دیکھا نہیں، اس کا میاں شکل ہی سے بڑی بچی دلا رہا تھا۔“

”غریب کی تو ہر جگہ ہی خواری ہے۔“

”لگتا ہے۔ یہ عورت بڑی مٹی کی گاڑی میں بیٹھ کر آئی ہے۔“ ایک بچہ جو ابھی اچھا نہیں تھا۔

بچوں کے درمیان بول پڑا۔

”ڈاکٹر ہی رہا ہے۔ ہم تو پہلے ہی سمجھ گئے تھے۔“ وہی بڑھیا سُلگ کر بولی اور قیص اٹھا کر اپنے کمر بند میں بندھی۔

پہلے پچھلے سے پان چھالیہ نکال کر کھانے لگی۔

جھومر نے بھی پورشن میں داخل ہوتے ہوئے عورتوں کے جیلے سُن لیے تھے۔

”جی بی بی۔ یہاں لیٹ جائیے۔“ ڈاکٹر نے ایک طرف اشارہ کیا۔

”یو کفرم ہے ناں کہ کتا پاگل نہیں تھا؟“ ڈاکٹر باری کی طرف مڑا۔

”جی۔ پاگل نہیں تھا؟“ پالتو ہے۔“

”آپ کا اپنا مکتا ہے؟“ ڈاکٹر، جھومر کے قریب چلا آیا۔ جولیٹ چپکی تھی۔

”جی ہمارا اپنا کتا ہے۔“ باری نے اطمینان سے جواب دیا۔

”غیب ہے۔ آپ کے پالتو کتنے کو مالکوں کی سمجھ نہیں؟ اپنی مالکین پر ہی حملہ کر دیا۔“ ڈاکٹر نے گردن موڑ کر باری کی سمت دیکھا۔

”مرد تو عموماً گھر سے باہر ہوتے ہیں۔ زیادہ تر تو آپ کی بیگم ہی گھر پر ہوتی ہوں گی۔ اُسے تو سب سے زیادہ ان کی بچن ہونا چاہیے۔“ ڈاکٹر بے حد حیران تھا۔

ایک کوفت کی لہر برف بن کر باری کے خون میں دوڑنے لگی۔ اس نے بڑی زہریلی نظروں سے جھومر کی سمت دیکھا۔

”جی بھائی ہیں میری۔“ اسے نہ چاہتے ہوئے بھی وضاحت کرنا پڑی مبادا ڈاکٹر مزید کچھ کہہ اٹھے۔

”آئی۔۔۔ ایم۔۔۔ سوری۔“ ڈاکٹر نے قدرے شرمندگی سے کہا۔

”کہاں کہاں زخم ہے بی بی۔ ہاتھ رکھ کر بتائیے۔“ ڈاکٹر اب مکمل طور پر اس کی طرف متوجہ ہو چکا تھا۔

جھومر نے پیٹ پر ہاتھ رکھا۔ تو باری پردہ اٹھا کر باہر نکل گیا۔

”کبھی بڑے دل سے بدو عادی تھی روٹھانے یا ور علی خان۔ پوری دریا بستی اور سرائے میں صرف ایک زبان ایسی ہے جو بڑے بدو عادی سے ملتی ہے۔“

”ایک طرف بیٹھ کر سوچنے لگا۔“

”معمود نہیں۔ قیامت دریا بستی واپس آ گئی یا نہیں۔ حویلی میں نئے سرے سے زلزلے شروع ہوئے یا نہیں۔“

”نہیں چوہا نعیم۔۔۔“ وہ نعیم پر ترس کھانے لگا۔

”یہ دوست سے کہو کہ نعیم کا ذرا سا دل بہت بھاری پڑتا ہے۔ کیوں؟“

”دو چار ہندو غور و زنی دنیا کو بربشت سمجھتی ہیں۔ جس کا خیال ہے کہ ساری دنیا حویلی کے باسیوں کی طرح رہتی ہے۔“

”میں نے ان کے تجربات سے لوگ کس طرح مڑ رہے ہیں۔ جس کے پاس یہ سوچنے کی فرصت نہیں۔ جو کبھی دریا بستی کے

کسی کچے گھر میں نہیں گئی۔

جس کے بیڈروم کا پورٹریبل ٹکڑی۔ وی خراب ہو گیا تو بسور کر بولی۔

”باری! شہر جا رہے ہو؟ یہ ٹی وی بہت تنگ کر رہا ہے۔ بابا صاحب سے پیسے لیتے جاؤ۔ آتے ہوئے بڑا آنا۔“

اور ایک بار اس کی کسی فضول خرچی پر جب بڑی امی نے ناراضگی سے کہا تھا۔

”پیسہ کتنا ہی ہو گھر بجٹ سے چلائے جاتے ہیں۔“

تو اس نے تعجب سے کہا ”پھر باقی پیسوں کا کیا کرتے ہیں؟“ میں دس بار پٹواری بابا صاحب کو پیسے اکٹرا کر چند کو چھوڑ کر حویلی کی تمام اڑکیوں ہی کا یہ حال تھا۔ جب گن سی دنیا تھی اُن کی۔ ایک بار جب بیسے ٹکڑے چالیس دن تک صبح شام قندھاری انا رکا جوں نکال کر پیا کرے تاکہ اس کا رنگ صاف ہو جائے تو فاران نے منہ میں حاضرین کو اذیت دینا تھا کہ

”ایک روز کیس میں مس نے بچوں کو مضمون لکھنے کو دیا جس کا عنوان تھا ”غریب آدمی“ ایک بچے نے ضمنی طرح سے لکھا۔

”ایک آدمی بہت غریب تھا۔ اس کا مندر بھی غریب تھا۔ اس کا ڈرائیو بھی غریب تھا۔ اس کا لی بھی غریب۔ اس کے بچوں کی گورنس تو بہت ہی غریب تھی۔“

اس لطیفہ پر قہقہوں کا طوفان اُٹھا تھا۔ بے چاری بیسے ٹکڑی بن گئی تھی۔

اس بچے سے کم بے خبر نہیں حویلی کی لڑکیاں۔

تو کیا وہ غریب اور بے حس ہی نہ ہو؟ اس کی ذرا سی بات میں اتر چکی ہے۔ یہ نہیں دیکھا جاسکتا۔

محض تھوڑی وجہ سے میں ایک بھٹے مانس سے بڑے لگوں جس نے میرا پچھ نہیں بگاڑا۔ اس نے غصے سے سوچا۔

شاید یہ جذبہ میرے اندر گہرے بلکل مارے پڑا ہوتا رہتا۔ مگر کراچی میں تم نے مجھے بیسے کے لیے سب کچھ دیا۔ ”آپ بیسے کا مکر تے ہیں؟“ ایک اویس عمر آدمی نے اسے متوجہ کیا جو بہت دیر سے اس کا جاکو لے رہا تھا۔ وہ چونک پڑا۔

”جی نہیں!“ اس نے بہت آہستہ آواز میں جواب دیا۔

نیلی بدرنگ سی امریکن جینز اور سفید شرٹ میں ملبوس اور حویلی کے بیسے ہوئے استوا اور انداز نشست کی بدولت موجود تمام مردوں میں سب سے ممتاز نظر آ رہا تھا۔

”یہ بڑا چھوٹا سا قصبہ ہے۔ ہم نے آپ کو پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ آئے ہیں؟“ ایک اور صاحب نے کہا۔

کی سعادت حاصل کرنا چاہی۔

”جی نہیں۔ میں یہاں نہیں رہتا۔“ اس نے جان چھڑانے والے انداز میں جواب دیا۔

”آپ کو ڈاکٹر صاحب اپنی سیٹ پر بلا رہے ہیں۔ ادھر برابر میں۔“ کپوڑے آکر اس کی جیسے جان بچائی کہ اس وقت تک واقعی موڈ نہیں تھا کہ کسی قسم کی بھی گفتگو کرے۔

دوڑتی تیزی سے ڈاکٹر کے پاس آیا۔

”بابا بات یہ ہے کہ ضروری ٹرینٹ تو دے دی ہے مگر آپ کو اب روزانہ چیک آپ کے لیے لانا ہوگا۔“

”ہاں!“ اسے چکر سا آ گیا۔

”جی۔۔۔ زخم بہت گہرے ہیں۔“ ڈاکٹر نے جواب دیا۔

”بابا یہاں کہیں فون کی سہولت ہے۔“ اب اس کا دماغ تیزی سے کام کر رہا تھا۔

”جی ہاں میں میڈیکل اسٹور ہے۔ وہاں ہے یہ سہولت۔“

”میں بھی آیا۔۔۔“ وہ یہ کہہ کر تیزی سے باہر نکلا تھا۔

میڈیکل اسٹور والا اتنی ذور کی کال پر بشکل رضامند ہوا اور خاصے بھاری چار جز طلب کیے۔ اس وقت اسے ہر بات پر ذور لگتی تھی۔

اس نے نمبر ڈائل کیا۔

”ہری طرف کسی خاتون نے ریسیور اٹھایا۔“

”ہاں بات کر رہا ہوں۔ خان سے کہیے۔“

”سرے ہی لیے ایر میں سے تیمور علی خان کی آواز ابھری۔“ تیمور اذیت لگ گیا۔

”خان مسئلہ ہو گیا ہے۔ جھومر بھائی کو کہتے ہیں بہت زخمی کر دیا ہے۔“

”تم کہاں سے بات کر رہے ہو؟“

”تعبہ انجور!“ اسے۔۔۔ ڈاکٹر کے پاس لایا تھا۔ گلہ باز کی طبیعت اب کیسی ہے؟“ اس نے جیسے منتہی منتہی تھے۔

”انجور ٹھیک نہیں ہے۔ تم فکر نہ کرو۔ اور ہماری طرف سے اس تک حرام دہیہ پیغام پہنچا دو کہ ہم اگر ملحقہ گئے تو باقی بکتے ہم۔“ جھومر بھائی نے اس دو ٹوکے کی پٹواری نے ہمارا بہت قیمتی وقت برباد کیا ہے۔ ہم صرف بابا صاحب کی خاطر یہ بہت غصہ کرتے ہیں۔

”جی جیسے اس کے؟“ اب کیا بکتی ہے؟“ وہ نفرت آمیز لہجہ میں پوچھ رہے تھے۔

”جی کیا کرنا؟“ بھائی خان؟“ اس نے نہایت محول جواب دینے کی کوشش کی۔

”جی جی۔۔۔“ وہ کچھ دیر تک پہنچ گیا۔ اطمینان رکھو۔ دوسری طرف سے ریسیور کھڑکیا گیا۔

”جی جی۔۔۔“ وہ کچھ دیر تک پہنچ گیا۔ اطمینان رکھو۔ دوسری طرف سے ریسیور کھڑکیا گیا۔

”جی جی۔۔۔“ وہ کچھ دیر تک پہنچ گیا۔ اطمینان رکھو۔ دوسری طرف سے ریسیور کھڑکیا گیا۔

ساری عمارت پر گہری خاموشی کا غلاف چڑھا ہوا تھا۔

وہ بابا صاحب کے بدلے ہوئے انداز پر سوچ سوچ کر شل ہو چکی تھی۔ آنے والی کسی تبدیلی کے پیش
ہی اڑادی تھی۔

کہاں تو پتا اتنی رازداری برت رہے تھے۔ کہاں یہ کہ بابا صاحب کو سب پتا ہے۔ کیا چکر ہے یہ۔۔۔
کرکھڑکی میں آکھڑی ہوئی۔ کیا مجھے پتا کے ذریعے بے بس کر دیا جائے گا۔ کیا پتا کی محبت کی مجھے کوئی پروا
پڑے گی۔

مگر پتا تو زبان کے بڑے پکے سمجھے جاتے ہیں۔ پھر یہ کچھڑی سی کیا پک رہی ہے؟ معاملے وہی ان
کے بیڈروم کے درتچے روشن ہیں۔

پتا بھی جاگ رہے تھے ابھی تک۔۔۔۔۔ وہ کچھ سوچ کر کھڑکی سے ہٹ گئی۔

اس نے بیڈ سے دوپٹا اٹھایا۔ پاؤں میں چپل ڈالی اور بہت آہستگی سے دروازہ کھول کر باہر آ گئی۔

سیاسی صورت حال کیونکہ بہت کشیدہ ہو رہی تھی۔ اس لیے آج کل عمارت پر پہرا بھی سخت تھا۔

باہر گیٹ کی طرف سے کسی جیپ کے روانہ ہونے کی آواز کے ساتھ سپاہیوں کے باتیں کرنے کی آوازیں

تھیں۔ جس کی وجہ سے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے رات زیادہ نہیں ہوئی۔ جبکہ حقیقت یہ تھی کہ رات کا ایک ٹکڑا

ٹکے قدم رکھتی ہوئی بیڈروم تک آئی اور دستک دی۔

”کون؟“ یا در علی خان کی تھکی تھکی سی آواز آئی۔

”میں ہوں پتا۔ روشانی۔“

دوسری طرف مکمل خاموشی چھا گئی تھی۔ ماباد وہ دروازہ کھولنے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

چند سیکنڈ بعد دروازہ کھل گیا۔

سانے یا در علی خاں سیاہ ڈیرنگ گاؤں میں ملبوس قدرے حیرت سے روشنی کو دیکھ رہے تھے۔ ان کی آنکھوں کی سرخی
بہت بھری ہوئی تھی۔ روشنی کی ریزہ کی ہڈی میں ایک سرسبز لہر دوڑنے لگی۔ وہاں رواں کھڑا ہو گیا۔ اس نے محسوس کیا، اس
کے بپ کا چہرہ بہت غیہ معمولی محسوسات کی کہانی سن رہا تھا۔

”آپ ابھی تک جاگ رہے ہیں پتا؟ آپ کے بیڈروم کی لائٹ جل رہی تھی۔ میں سمجھ گئی، آپ جاگ رہے ہیں، اور نہ
سوتے ہو تو آپ بے محنت بلب بھی بجھا دیتے ہیں۔“

یا در علی خاں ایک طرف ہٹ گئے۔ گویا روشنی کو اندر آنے کا اشارہ کیا۔

”میرا خیمہ اندر آگئی۔“ کہوں نے فوراً ہی دروازہ بند کر دیا اور اپنے بیڈ کی طرف بڑھ گئے۔

”میرا خیمہ؟“ وہی ہوا بھی تھی۔ ”میرا خیمہ؟“ وہی خیمہ دروازہ پر گئے۔

”میرا خیمہ؟“ وہی خیمہ تھی۔ ”میرا خیمہ؟“ وہی خیمہ تھی۔ ”میرا خیمہ؟“ وہی خیمہ تھی۔

”میرا خیمہ؟“ وہی خیمہ تھی۔ ”میرا خیمہ؟“ وہی خیمہ تھی۔ ”میرا خیمہ؟“ وہی خیمہ تھی۔

”میرا خیمہ؟“ وہی خیمہ تھی۔ ”میرا خیمہ؟“ وہی خیمہ تھی۔ ”میرا خیمہ؟“ وہی خیمہ تھی۔

مستحق

موت قریب آگئے کہ لوگ کناہ بخشنا نے کی فکر کرتے ہیں اور یہاں --- "اُس نے جل کر جملہ ادھورا چھوڑ دیا اور باہر آ

اس کو دوادینے سے پہلے کچھ کھلانا پانا تھا، وہ اسی خیال سے درمیانی کمرے میں آیا تھا، جہاں کھانا پڑا ہوا تھا۔
ہوئی تھیں۔

چند سٹیکس اور پانی کا گلاس لے کر وہ پانچ منٹ بعد واپس اُس کے پاس آ گیا تھا۔
”اٹھیے، کچھ کھا لیجیے۔ پھر دو اکی باری آئے گی۔“

اُس نے ہاتھ میں پکڑی چیزیں تخت پر رکھ دیں اور واپسی کے ارادے سے قدم آگے بڑھائے۔
”باری۔۔۔!“

”جی۔۔۔!“

”بہت ناراض ہو؟“

باری کو جیسے کراٹ لگا۔ وہ مڑ کر جھومر کی شکل دیکھنے لگا۔

”معاف کر دو مجھے، میں نے شاید تمہارے ساتھ بہت زیادتی کی ہے۔ پلیز باری۔“

”کس بات کی معافی مانگ رہی ہیں آپ؟“ وہ بس یہی کہہ رکھا۔

”دراصل باری! میری جگہ کوئی اور بھی لڑکی ہوتی تو یہی سمجھتی، کیونکہ تم عورت نہیں ہو، اس لیے اُس احسان کا
پہنچ سکتے مگر میں تم سے معافی مانگ چکی ہوں۔“

”یہ اندازہ لگانے میں جلدی نہ کریں، ابھی تو نہ جانے کتنے دن مجھے اور آپ کو اکٹھا رہنا ہے۔“

”کاش! میں تم جیتے مرد کے ساتھ عمر بھر اکٹھا رہ سکتی۔ ظفیری کے بخشے ہوئے یہ زیور، گینے مجھے نہ ڈتے۔“
بھرائی۔

”پلیز! بھابی خاموش ہو جائیں، یہ دھماکا میری کل طاقت سے زیادہ ہے۔ میں اسے اس وقت بالکل بھی نہ
دے رہا ہوں کہ آپ کے ہوش و حواس قائم نہیں ہیں، لیکن اگر آپ نے آئندہ اس طرح کے الفاظ منہ سے نکالے تو
وہ رُک گیا۔ اُس کی پیشانی پر پسینے کے قطرے چمکنے لگے تھے۔ سانس کی رفتار خاصی تیز ہو گئی تھی۔ وہ اپنے
کبھی کھول رہا تھا، کبھی بند کر رہا تھا، جو اُس کی اضطرابی کیفیت کو ظاہر کرنے والا عمل تھا۔

”بھابی! میری بات غور سے سنیں، یہ سوچ کر بلکہ یقین کے ساتھ سوچ کر سنیں کہ فی الحال آپ کے
انسانوں میں، میں آپ کا واحد خیر خواہ ہوں۔“ وہ بولتے بولتے رُک گیا۔

”کیسے خیر خواہ ہو، میں تمہارے سامنے خونِ پڑی ہوں۔ اگر تم میرے خیر خواہ ہوتے تو پہلی فرصت میں
سے نکل بھاگنے کا موقع فراہم کرتے۔“ جھومر جیسے اُس پر برس پڑی۔

”میں صرف آپ ہی کا نہیں حویلی کے ایک ایک فرد کا خیر خواہ ہوں۔ آپ سے خیر خواہی کا مطلب یہ نہیں ہے
کہ ساتھ وفاداری کا معاہدہ منسوخ ہو گیا۔“ اُس نے بہت دھیمی آواز میں اُسے سمجھانے کی کوشش کی۔

جس توارزاں ترین سفاک ہے۔ میں دکانوں پر خریداری کرتی ہوں تو سودا میری مرضی سے طے ہوتا
ہے۔ اگر کے پاس باس تو وہ سب سے زیادہ توجہ مجھ پر دیتا ہے۔ بھیڑ میں ہوں تو لوگ ادھر ادھر ہٹ کر پہلے مجھے راستہ
بیتا۔

جس سے ہاتھ آروں تو مجھے شوق سے دیکھتے ہیں، شوق سے سنتے ہیں۔ ہم عمر لڑکیوں میں بیٹیوں تو مجھے چھو چھو کر دیکھتی
ہیں۔ بس میں آگے پیٹھتی تھی تو لڑکیاں زبردستی مجھے پیچھے بھیج دیتی تھیں۔۔۔ کہ ایک سیڈنٹ ہو جائے گا۔ ایسی جگہ بیٹھو
چونکہ کیوں نظر نہ پڑے۔

نہیں نے محسوس کیا ہے کہ تم پر کوئی اثر نہیں۔ تمہارے نزدیک باہر بندھا ہوا کالا کتا اور میں جیسے ایک سے ہیں۔“
جھومر کے لہجے میں قناعت اور لڑش تھی مگر نہ جانے کیوں وہ اتنا بولنا چاہ رہی تھی۔

”اور اس روز اس غلط فہمی کی وجہ بھی یہی تھی کہ شاید تم بھی میرے ”ظاہر“ پر۔۔۔!“ وہ بولتے بولتے چپ ہو گئی۔

باری ہی طرح پشت کیے دم بنو دسا کھڑا تھا۔ جب چند لمحوں تک مزید کوئی جملہ جھومر کی طرف سے نہیں آیا تو اس کے جسم
میں ہلچل ہوئی، وہ مڑا اور اس طرح کھڑا ہو گیا کہ اب مکمل طور پر جھومر کے روبرو تھا۔

حسین عورت کے ساتھ مرد کا ایک ہی رشتہ تو نہیں ہوتا۔ حسین عورت ماں، بہن، بیٹی، بہو، بھابی، پھوپھی، ممانی، چچی،
ننانا وغیرہ بھی ہو سکتی ہے اور ہر رشتہ اپنے اندر کچھ حد بندیاں اور احترام کے تقاضے محفوظ رکھتا ہے۔

آپ واقعی بہت حسین ہیں، مگر میرے لیے آپ کا حسن، آپ کی ذات کی طرح لائق احترام ہے۔ میں آپ کو بھابی کہتا
ہوں، آپ اسی رشتے کا رسپانس مجھے لوٹانا کیجیے۔“

اُس نے بہت ہد سکون انداز میں ٹھہر ٹھہر کر اسے مفصل جواب دیا۔ وہ جھومر کے بے رحم الفاظ کے حملے سے جیسے باہر آ
بُفہ در اسے اب خود پر مکمل کنٹرول تھا۔

جھومر نے دیر سے بند آنکھیں کھول کر اس کی طرف دیکھا۔

”یہ اس کے گریبان کا اوپری بٹن ٹوٹ گیا تھا کہ گریبان کشادہ ہو رہا تھا۔ ساتھ ہی سینے اور بائیں شانے پر خون کے
دبے نظر آ رہے تھے اور سفید شرٹ پر بہت نمایاں تھے۔ جھومر کو سہارا دیتے وقت غالباً اس کی کلائی سے بہنے والا خون وہاں
اندازاً مڑا رہا تھا۔

”مگر، میں تمہیں مطلع کر چکی ہوں، وہاں حویلی میں میرا کسی سے کوئی قانونی اور شرعی رشتہ نہیں ہے۔ تم یا کوئی اور مجھے
بہن یا بہتہ تو کہہ سکتی ہے مجھے۔“ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

”یہ بات نہیں باری۔۔۔ ڈاکہ پڑا ہے میرے باپ کے گھر میں۔“ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

”پہلے پوچھو کہ اس کا کھانا کھالیں پھر دو ابھی کھانی ہے۔ نیند کی گولیاں بھی ہیں کھالیں گی تو نیند آ جائے گی اور تکلیف کے
خوش سے نجات مل جائے گی۔“

”جس نے گھڑ طور پر باری باہر جانے کے بجائے اُس کی سمت بڑھا۔ اُس نے یک ہی اُس کی طرف بڑھائے۔

”یہ کھا لیجیے، مناسب ہے، ویسے آپ کی مرضی۔“

جھومر نے قدرے حیرت سے دیکھا، پھر ایک کیک پیس اٹھا کر آہستہ آہستہ کھانے لگی۔

موم بتی کے ٹکڑے سے اُجالے میں وہ الورا کے کھنڈرات سے برآمد ہونے والی اُجڑے شکلہ مگر حسین نورانی رہی تھی۔

باری وہیں تخت کے ایک کنارے پر ٹک گیا اور ایک طرف رکھی دوایاں اٹھا اٹھا کر دیکھنے لگا۔

وہ اُس کی طرف بغور دیکھ رہی تھی اور باری کو اچھی طرح اس کا دیکھنا محسوس ہو رہا تھا، اسی وجہ سے اُس نے اٹھانے کی کوشش نہیں کی۔

”باری! یہاں بہت گھٹن محسوس ہوتی ہے۔“ بالآخر وہ بولی۔

”یہ قید خانہ ہے، ظفری کا ایرکنڈیشنڈ بیڈروم نہیں۔“ اُس نے برجستہ کہا تھا۔

”ہونہ، دوزخ ہے وہ۔“ اُس نے گلاس اٹھا کر پینا شروع کر دیا۔

”تم کہاں سوتے ہو؟ تمہیں گرمی نہیں لگتی؟“

”میں دالان میں سوتا ہوں، گرمی ابھی کہاں۔۔۔“ وہ اتنے نرم انداز میں جواب دے رہا تھا کہ وہ ٹھٹھک کر بھول گئی۔

”نیند آ جاتی ہے؟“ اُس نے باری پر تفصیلی نظر دوڑائی۔

وہ سر جھکائے ہنوز دواؤں کے لیبل پڑھ رہا تھا یا پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

”آ جاتی ہے۔“ وہ نہ جانے کیوں آہستگی سے ہنس دیا تھا۔

”ڈر نہیں لگتا وہاں؟“ اُس دن والے ”پتھراؤ“ سے وہ ابھی تک خوفزدہ تھی جو ابھی تک راز ہی تھا۔

”ڈر۔۔۔؟“ باری نے بے ساختہ نظریں اٹھائی تھیں، ”کس چیز کا ڈر؟“

”سنا ہے دیرانوں میں بھوت اور آسب ٹھکانا بنا لیتے ہیں۔“ خوف سے اُسے جھرجھری سی آگئی۔

بھیا بک سا ہو رہا تھا۔

”بقول آپ کے کہ روشنی بی بی تو مجھے حویلی کا آسب کہتی ہیں۔ ایک آسب دوسرے آسب سے کیوں ڈرتا۔“

مسکرا دیا۔

”اور کچھ لیجیے ناں۔“ اُس نے جھٹ سے بات کا رخ موڑ دیا۔

”نہیں بس۔۔۔ لاؤ مجھے تم دوا دے دو۔ نیند کی ضرورت دینا۔ میں بہت بے خبر سوتا چاہتی ہوں۔ باہر کے شور۔“

گے البتہ روح کے زخم بہت بے چین رکھتے ہیں۔

اگر نیند کی ایک گولی آٹھ گھنٹے سلا سکتی ہے تو تم مجھے دودینا، میں سولہ گھنٹے اذیتوں سے بے دنیا سے غافل

ہوں۔ ہو سکتا ہے جی بھر کر سونے کے بعد میں خود کو زیادہ طاقت ور اور کارآمد محسوس کرنے لگوں اور شاید اپنے

سوں۔ تکلیف بھی بہت ہو رہی ہے، سیدھی ٹانگ میں بہت اکڑاؤ ہے۔“

اُس نے تکلیف کے احساس سے نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبایا۔

”بہتر۔۔۔۔۔ یہ لیجیے۔“ باری نے کئی قسم کی گولیاں اُس کی ہتھیلی پر رکھ دیں۔

”جتنی ساری گولیاں اتنے موٹے موٹے انجیکشن جو لگائے تھے، وہ کس لیے تھے؟“

”دربگ برگی گولیاں دیکھ کر بدک گئی۔“

”دو توڑ ہر پھلنے کے خطرے سے بچاؤ کے لیے تھے۔ یہ شاید زخموں کے لیے ہیں۔“ اُس نے پھر نرمی سے جواب دیا۔

”تمہارا انداز بتا رہا ہے، تم نے میری معذرت قبول کر لی، تم واقعی اچھے ہو۔“

”رائے قائم کرنے میں جلدی نہیں کرنا چاہیے۔ وہ بھی زندہ لوگوں کے بارے میں۔“ اُس نے مزید گولیاں اُس کی

دلی پر دھاتے ہوئے کہا۔

”نیند کتنی دیر میں آ جائے گی؟“ اُس نے تھکے تھکے انداز میں سوال کیا۔

”آپ دوا کھا کر لیٹ جائیں، جلدی آ جائے گی۔“ اُس نے نرمی سے جواب دیا۔

”مگر شاید یہاں دیر تک نیند نہ آئے بہت گھٹن ہے۔ یہ تخت دالان میں نہیں جاسکتا؟ اگر نہیں جاسکتا تو میں وہاں نیچے بھی

بن سکتی ہوں۔“ جھومر نے نقاہت سے کہا۔

”آپ اٹھیے، میں یہ تخت باہر نکالنے کی کوشش کرتا ہوں۔“ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

”اکیلے؟“ جھومر نے تعجب سے اُسے دیکھا۔

”ظاہر ہے، اب رات کے اس پہر فوج کہاں سے طلب کروں؟“ وہ تھوڑا سا جھلایا۔

”ماشاء اللہ بہت مضبوط ہو، اس میں کیا شک ہے، ایک مضبوط مرد، ایک عورت کے لیے کیا اہمیت رکھتا ہے۔ اس کا

احساس کسی ”بے چاری“ سی عورت ہی کو ہو سکتا ہے۔“ وہ آہستہ سے تخت سے نیچے اتر آئی اور دیوار کا سہارا لے کر کھڑی ہو

گئی۔

باری نے دواؤں زمین پر رکھیں اور تخت اٹھالیا۔

جھومر نے آنکھیں موند رکھی تھیں۔ باری تھوڑی دیر میں واپس آ گیا۔

”کیا تکلیف زیادہ ہو رہی ہے یا نیند آ رہی ہے؟“ چند لمحے انتظار کے بعد جب اُس نے آنکھیں نہ کھولیں تو اُسے بولنا

پڑا۔

”تکلیف تو خیر بہت ہے، مگر آنکھیں میں نے اس لیے بند کر لی تھیں کہ تم وزنی تخت اٹھا رہے تھے، کہیں تمہیں میری نظر

نہ لگ جائے۔“

”دیر سے بولی اور لنگڑاتے ہوئے آگے بڑھنے لگی۔“

باری نے آگے بڑھ کر اُسے تھام لیا۔

”نہیں، میں خود آپ کے ساتھ جاؤں گی۔“ اُس نے آہستہ سے کہا۔
 یاور علی خاں نے اخبار کا صفحہ اُلٹتے ہوئے ایک لکھنے کو اپنی بانی فوکل عینک کے اوپر سے اُسے دیکھا اور صفحہ درست کر کے
 دوبارہ منہ کرنے لگے۔

”اپنے باپ سے اجازت لے لی؟“ بابا صاحب بہت خوش دکھائی دینے لگے۔
 ”ہمیں تو ساری اجازتیں آپ ہی سے لینا ہوتی ہیں۔“ اُس نے ایک اچھتی سی نظر باپ پر ڈالتے ہوئے جواب دیا۔
 ”وہ اور طرح کے کیس ہوتے ہیں۔ اب تم یہاں ہو۔ یہاں ہر بات کی اجازت اپنے باپ سے لوگی۔ ہم کتنے ہی ذمہ
 دار کی مربا، باپ ہوتا ہے۔“ وہ مسکرا رہے تھے۔
 ”پتا کیا کہیں گے، اور انہیں فرق ہی کیا پڑتا ہے۔ سارے فرق تو ہمیں پڑتے ہیں۔“ اُس نے بدولی سے جواب دیا۔

”پھر بھی بیٹی۔“
 ”میں نے کبھی نہیں دیکھا کہ آپ کی موجودگی میں کسی اور گھر کے فرد سے اجازت لی گئی ہو۔“ اُس نے خاصے نکدر
 برے لہجے میں کہا۔

دلاور علی خاں خاموش سے ہو کر رہ گئے۔
 ”پتا!“ وہ یک دم یاور علی خاں کے قریب پہنچی۔ ”میں بابا صاحب کے ساتھ جا رہی ہوں اور پھر مجھے جانا تو ہے ہی۔“
 ”ٹھیک ہے۔“ انہوں نے نظریں اٹھائے بغیر بے تاثر سے انداز میں کہا۔
 روشی کے دل کو کچھ ہوا۔

”کاش! پتا اُسے رُکنے کو کہتے۔ کاش اُس سے پوچھتے کہ آخروہ اچانک کیوں جا رہی ہے۔“
 ”بابا صاحب! جواد کو چھٹیاں پڑتے ہی یہاں بھیج دیجیے گا۔ ایک ہفتے کے لیے فرانس جاؤں گا، اُسے ساتھ لے جاؤں
 گا۔ ذرا اسے پہنچ مل جائے گا۔“ یاور علی خاں، اخبار تہ کرتے ہوئے دلاور علی خاں سے مخاطب تھے۔

”ہاں، ہاں یاد ہے ہمیں، آجائے گا وہ۔“
 ”میں سوٹ کیس پیک کر رہی ہوں۔“

”روٹی۔۔۔ پہلے ناشتا کر لو۔“ یاور علی خاں نے اپنے مخصوص انداز میں اُسے ٹوکا۔
 ”ساتھ لے جاؤں گی، راستے میں کرلوں گی ناشتا۔“ اُس نے مجھے مجھے انداز میں جواب دیا۔
 ”بھئی روشی کا بھی کچھ پتا نہیں چلتا۔ کل تو جانے کی جلدی نہیں تھی اور آج جانے کی جلدی ہے۔“ بابا صاحب نے روشی
 کو اندر بڑھتے ہوئے دیکھا تو مختلف انداز میں بیٹے سے مخاطب ہوئے۔

”نہ جانے کیوں بابا صاحب مجھے کبھی کبھی یہ احساس ہوتا ہے جیسے میں اپنے بچوں کی توقعات پر پورا نہیں اتر رہا، یا
 مجھ سے بچے مجھ سے مایوس ہیں۔“ یاور علی خاں اخبار تہ کرتے ہوئے بڑے گم صم سے انداز میں باپ سے مخاطب ہوئے۔
 ”تمہارا انداز درست نہیں۔ تمہاری بیٹی تم پر بہت فخر کرتی ہے۔ وہ تو یہ ماننے کو تیار ہی نہیں کہ کوئی اُس کے باپ سے

”آہستہ آہستہ چلیں، جلدی کیا ہے؟“

وہ اُسے سہارا دے کر دالان تک لایا اور تخت پر ٹکا دیا۔

تھوڑے فاصلے پر اس کا پانگ پڑا ہوا تھا۔

”باری۔۔۔!“

”جی۔۔۔!“

”زحمت تو ہوگی، مجھے تھوڑا سا پانی اور پلا دو۔“

وہ اٹھ کھڑا ہوا اور چند منٹ بعد پانی لے آیا۔

جھومر ایک سانس میں پانی چڑھا گئی۔

”معلوم نہیں، اتنی پیاس کیوں لگ رہی ہے۔ کیا آگ بجڑک اُٹھی ہے اندر۔“ اُس نے گلاس کے اندر
 کمزور لہجے میں کہا اور جیسے تخت پر ڈھسے گئی۔

باری گلاس رکھ کر آیا اور آہستگی سے پانگ پر دراز ہو گیا۔

نیا چاند طلوع ہونے میں ابھی دو تین روز باقی تھے، راتیں اندھیری تھیں، مگر تاروں کی بن آئی تھی۔ بوجہ
 آسمان پر اربوں، کھربوں چراغ روشن تھے۔

موم بتیاں اُس نے بجھا دی تھیں۔ حویلی مکمل طور پر تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ ویرانے کی رات۔۔۔ لے
 سرسراہٹ، جھینگڑ اور مینڈکوں کی اعصاب شکن آوازیں کسی طرح بھی تو پُر سکون سانس لینے کی رعایت نہیں
 گردن موڑ کر ذرا فاصلے پر لیٹی جھومر کی طرف دیکھا۔

تخت پر گویا چراغ روشن تھا۔ ایک نامعلوم سا ڈکھ زینہ بہ زینہ اُس کے اندر اترنے لگا۔

دلاور علی خاں اپنی صبح کی چہل قدمی میں مصروف تھے۔ ان۔۔۔ سے کچھ فاصلے پر یاور علی خاں لان چہرہ
 معمول کے مطالعے میں مصروف نظر آ رہے تھے۔

روشی بہت تیز رفتاری میں آئی تھی اور سیدھی بابا صاحب کے پاس پہنچی تھی۔

”السلام علیکم، بابا صاحب!“

”وعلیکم السلام۔۔۔ جیتی رہو۔ بھئی ہمیں تمہاری یہ عادت بہت اچھی لگتی ہے کہ تم سویرے سویرے
 بشارت سے مسکرائے۔“

”آپ کتنے بچے تک روانہ ہوں گے؟“ اُس نے بھرپور سنجیدگی کے ساتھ سوال کیا۔
 ”ڈرائیور کسی کام سے گیا ہے، وہ آتا ہے اور ہم روانہ ہوتے ہیں۔ خیریت؟ کوئی پیغام ہے بہنوں کے
 نے چہل قدمی موقوف کر دی اور ایک جگہ ٹھہر گئے۔“

زیادہ لائق بھی ہو سکتا ہے۔“ بابا صاحب مسکرا رہے تھے۔

”اچھا۔“ یاور علی خاں دھیرے سے مسکرا دیے۔ ”مجھے لگتا ہے یہ کبھی بڑی نہیں ہوگی۔“

”ایسی بات نہیں، البتہ فی الحال وہ واقعی چھوٹی ہے۔“ دلاور علی خاں نے اپنی رائے دی۔

”آپ کے لیے تو مسئلہ نہیں بنتی۔“ نہ جانے کیوں وہ پوچھ بیٹھے۔

”وہ جو کچھ ہے ہماری اولاد ہے۔ تم یہ کیا فکر پالنے لگے۔ آج بہت اجنبی ہو رہے ہو، باپ سے کوئی شکایت سنجیدگی سے بغور یاور علی خاں کو دیکھنے لگے۔

”ارے نہیں بابا صاحب! بس یونہی آپ کی بڑھتی ہوئی عمر کا خیال آ گیا تھا۔ آپ نے جس طرح میری زندگی کی ہے، وہ حساب تو چکا ہی نہیں سکتا۔ کل تک روشی لان میں تتلیاں پکڑتی بھاگتی پھرتی تھی اور اب آنا نا بچہ میرے سامنے آگئی یہ جتنا بچ کا عرصہ ہے، مجھے نہیں احساس کہ کس طرح طے ہو گیا اور یہ سب آپ ہی کا حصہ ہے۔ مجھے کیا پتا بچے کیسے پرورش کرتے ہیں۔ میں نے کبھی آپ کا ہاتھ نہیں بنایا۔ جب کبھی حویلی جاتا تھا، بہانے بچوں کو لے کر آتی تھیں اور کہتی تھیں کہ پتا کو سلام کرو تو جیسے۔۔۔ میں نیند سے جاگتا تھا اور محسوس کرتا تھا کہ میرا باپ ہوں۔“ وہ بولتے بولتے مبہم سا مسکرائے۔

”یہ سارا قصہ بڑی ذہن کے ہاتھوں میں طے پایا ہے۔ حقیقت میں ہم نے کچھ نہیں کیا۔ ماں بن کر بازار دونوں بچوں کے۔ ماشاء اللہ بہت ذمہ دار ہیں۔ جب ہم نے بہو کی حیثیت سے انہیں پسند کیا کہ ہمارے اپنے ہاں ہیں تو تمہاری ماں نے بہت مخالفت کی تھی۔ وہ اپنی بھتیجی لانا چاہتی تھیں۔ وقت نے ثابت کر دیا کہ ہمارا فیصلہ درست بابا صاحب نے قدرے تفاخر سے کہا۔

یاور علی خاں نے گہری سانس لی۔

”پھر بھی بابا صاحب کوئی کمی تو رہ گئی ہوگی۔ مابین ٹھیک ہی تو کہتی ہیں۔“ وہ بولتے بولتے رک گئے اور آگے بڑھتے بڑھتے۔

”کیا کہتی ہیں؟“ وہ استفسار کرنے لگے۔

یاور علی خاں نظریں چرا کر ایک طرف دیکھنے لگے۔

دلاور علی خاں نہ جانے کیوں مسکرا دیے۔

”اس مرتبہ بات ہو تو ہماری طرف سے پوچھنا، وہ ان بچوں کی محبت میں کتنا آگے بڑھ سکتی ہیں۔ ہمیں ضرورت ہے تو البتہ تمہیں اپنا عندیہ دے ہی چکے ہیں۔ جب ہم تم سے کل شام کو یہ کہہ۔۔۔!“

”روشی آرہی ہے بابا صاحب!“ یاور علی خاں نے بہت دھیمی اور دبی ہوئی آواز میں باپ کو متوجہ کیا۔ وہ بولتے بولتے چپ ہو گئے۔

”میں بالکل تیار ہوں بابا صاحب! آپ ابھی تک یہیں ہیں؟“ وہ آتے ہی گویا ہوئی۔

”ہم بھی تیار ہی ہیں۔ تم نے ہاتھ رکھ لیا سامان میں؟“

”جی، اور اتنی زبردست چائے بنا کی ہے، راستے میں پیئیں گے تو مجھے شاباش دیں گے، کیونکہ آپ کی تو جیب بھی کھڑی ہے۔ بڑی امی کہتی ہیں، آپ کی جیب میں تو پیٹ میں پڑا پانی بھی نہیں ہلتا۔“ وہ اپنے لالہ بالی پن سے کہہ رہی تھی۔ دلاور علی خاں بے ساختہ ہنس دیے۔

”یہ تو ہمارے حق میں بہت ہی اچھا ہوا۔ ایک تو سفر تمہارے ساتھ کریں گے، دوسرے تمہارے ہاتھ کی بنی ہوئی چائے پیتے گے۔“

”پاپا میں جارہی ہوں۔“ اب وہ باپ کی طرف پلٹی۔

”اچھا بیٹے تمہاری مرضی، پھر موڈ بن جائے تو مطلع کر دینا، میں ڈرائیور کو بھیج دوں گا۔“ انہوں نے ایک نگاہ اس کے چہرے پر ڈالی۔

”بابا صاحب! پتا تو اپنی بیٹی کے ساتھ بھی مہمانوں کی طرح ڈیل کرتے ہیں۔ مجھ سے پوچھا تک نہیں۔“ وہ ایک دم رو پڑا۔

”کیا نہیں پوچھا؟“

”کیا کہ میں کیوں جارہی ہوں؟“ اُس نے دوپٹے سے آنکھیں پونچھیں۔

یاور علی خاں نے اُس کی طرف قدرے چوک کر دیکھا تھا۔

”ہاں بھئی، تمہیں پوچھنا تو چاہیے تھا۔“ دلاور علی خاں نے تائیدی۔

”میں نے تو اس لیے نہیں پوچھا کہ ہو سکتا ہے، یہ یہاں کی تنہائی سے بور ہو گئی ہو اور تو کوئی بات بھی نہیں ہوئی۔“ یاور علی خاں الجھ سے گئے تھے۔

”چلو اب پوچھ لیتے ہیں کہ کیوں جارہی ہو؟“ وہ اس کی طرف مڑے۔

”آپ بہت لیت ہو جاتے ہیں پتا۔ شاید انہی باتوں کی وجہ سے میری اتنی جلدی چلی گئیں۔“ اُس نے منہ بسور کر کہا تو۔

نہ جانے کیوں یاور علی خاں نظریں نہ اٹھا سکے۔ دلاور علی خاں اپنی چھڑی سے گھاس گریدنے لگے۔

”خان! گاڑی تیار ہے۔“ دلاور علی خاں کا ڈرائیور آچکا تھا۔

روشی سامان لینے کی نیت سے اندر دوڑ گئی۔

”تم ہمارا سامان رکھو، آرہے ہیں ہم۔“ دلاور علی خاں نے گمبھیر لہجے میں کہا۔

ڈرائیور اندر کی طرف بڑھ گیا۔

”بابا صاحب! کہیں روشی نفسیاتی کیس نہ بن جائے، مجھے اب فکر ہونے لگی ہے۔“ یاور علی خاں کے لہجے میں تشویش تھی۔

”بھئی یہ تم جیسے بہت پڑھے لکھے لوگوں کی فیشنی باتیں ہیں۔ ہم ان پر یقین نہیں رکھتے۔“ وہ کسی گہری سوزش سے کہہ رہی تھی۔

کر بولے۔

یاور علی خاں خاموش ہو رہے۔

”چلیں بابا صاحب!“ روشی اپنا پرس لئے واپس آ گئی تھی۔

”تمہارا سوٹ کیس؟“ وہ پوچھنے لگے۔

”ڈرائیور لے گیا ہے، آپ آئیے۔ اچھا پتا! کبھی کبھی ہمارا خیال کر لیا کریں، بعض لوگوں کو آپ سے کچھ پتہ ہو سکتا ہے۔“ وہ اتنا کہہ کر پورچ کی طرف بڑھ گئی۔

”حویلی کب آؤ گے؟“ دلاور علی خاں چلتے چلتے رک کر پوچھنے لگے۔

”ویک اینڈ پر ہی آ سکتا ہوں۔ ابھی تو فرانس جانے کا مرحلہ سامنے ہے۔ خیر۔“ وہ الوداع کہنے کے خیال سے کھڑے ہوئے۔

وہ روشی کے سر پر ہاتھ پھیرنا چاہتے تھے، مگر وہ جیب میں بیٹھ چکی تھی۔ وہ اذیت کی آگ سے جلتا ہوا سانس پڑے۔

خارج کر کے چپ چاپ کھڑے رہ گئے۔ آنکھوں کی سُرخنی بڑھنے لگی تھی۔

.....

”آپ اتنے کمزور تو نہیں ہیں کہ آپ نہا بھی نہ سکیں۔ بندہ صاف ستھرا ہو تو جلدی صحت یاب ہوتا ہے۔ آپ اپنے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے۔ بل کر پانی تو پی نہیں سکتے۔ پتا نہیں لال خان پر کون سے احسان اور کس طرح کر ڈالے ہیں۔ چارے سر نہیں اٹھا سکتے۔“

بالو اس کے تتر بتر کمرے کو سمیٹتے ہوئے تھی۔

مُسکرا کر خطاب کرتے ہو

عادتیں کیوں خراب کرتے ہو

اُس نے بالو کے انداز گفتگو پر بڑا لطیف سا طنز کیا تھا۔

”ایک تو سب سے پہلے آپ کی اس بیماری کا علاج ہونا چاہیے۔ مشین کی طرح شعر نکلتے ہیں آپ کے اندر۔“

جل کر بولی تھی۔

”اور یہ دلیہ ویسے کا ویسا رکھا ہے۔ جب کھانا نہیں ہوتا تو منع کر دیا کیجیے۔ مجھے گھر میں اور بھی تو کام ہوتے ہیں۔“

دوسرے کا وقت برباد کرنا۔ وہ بڑبڑاتی ہوئی دواؤں کی شیشیاں ترتیب سے نکال رہی تھی۔

”ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے آپ کو اپنی صحت سے کوئی دلچسپی ہی نہیں ہے۔ آپ اٹھنا ہی نہیں چاہتے۔“ وہ اس کی طرف پلٹ کر دیکھتے ہوئے بولی۔

”بیٹھے بیٹھے تو قارون کے خزانے بھی ختم ہو جاتے ہیں۔ آخر آپ کا کاروبار کیا ہے؟“

”بھئی یہ تم جیسے بہت پڑھے لکھے لوگوں کی فیشنی باتیں ہیں۔ ہم ان پر یقین نہیں رکھتے۔“ وہ کسی گہری سوزش سے کہہ رہی تھی۔

کر بولے۔

یاور علی خاں خاموش ہو رہے۔

”چلیں بابا صاحب!“ روشی اپنا پرس لئے واپس آ گئی تھی۔

”تمہارا سوٹ کیس؟“ وہ پوچھنے لگے۔

”ڈرائیور لے گیا ہے، آپ آئیے۔ اچھا پتا! کبھی کبھی ہمارا خیال کر لیا کریں، بعض لوگوں کو آپ سے کچھ پتہ ہو سکتا ہے۔“ وہ اتنا کہہ کر پورچ کی طرف بڑھ گئی۔

”حویلی کب آؤ گے؟“ دلاور علی خاں چلتے چلتے رک کر پوچھنے لگے۔

”ویک اینڈ پر ہی آ سکتا ہوں۔ ابھی تو فرانس جانے کا مرحلہ سامنے ہے۔ خیر۔“ وہ الوداع کہنے کے خیال سے کھڑے ہوئے۔

وہ روشی کے سر پر ہاتھ پھیرنا چاہتے تھے، مگر وہ جیب میں بیٹھ چکی تھی۔ وہ اذیت کی آگ سے جلتا ہوا سانس پڑے۔

خارج کر کے چپ چاپ کھڑے رہ گئے۔ آنکھوں کی سُرخنی بڑھنے لگی تھی۔

.....

”آپ اتنے کمزور تو نہیں ہیں کہ آپ نہا بھی نہ سکیں۔ بندہ صاف ستھرا ہو تو جلدی صحت یاب ہوتا ہے۔ آپ اپنے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے۔ بل کر پانی تو پی نہیں سکتے۔ پتا نہیں لال خان پر کون سے احسان اور کس طرح کر ڈالے ہیں۔ چارے سر نہیں اٹھا سکتے۔“

بالو اس کے تتر بتر کمرے کو سمیٹتے ہوئے تھی۔

مُسکرا کر خطاب کرتے ہو

عادتیں کیوں خراب کرتے ہو

اُس نے بالو کے انداز گفتگو پر بڑا لطیف سا طنز کیا تھا۔

”ایک تو سب سے پہلے آپ کی اس بیماری کا علاج ہونا چاہیے۔ مشین کی طرح شعر نکلتے ہیں آپ کے اندر۔“

جل کر بولی تھی۔

”اور یہ دلیہ ویسے کا ویسا رکھا ہے۔ جب کھانا نہیں ہوتا تو منع کر دیا کیجیے۔ مجھے گھر میں اور بھی تو کام ہوتے ہیں۔“

دوسرے کا وقت برباد کرنا۔ وہ بڑبڑاتی ہوئی دواؤں کی شیشیاں ترتیب سے نکال رہی تھی۔

”ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے آپ کو اپنی صحت سے کوئی دلچسپی ہی نہیں ہے۔ آپ اٹھنا ہی نہیں چاہتے۔“ وہ اس کی طرف پلٹ کر دیکھتے ہوئے بولی۔

”بیٹھے بیٹھے تو قارون کے خزانے بھی ختم ہو جاتے ہیں۔ آخر آپ کا کاروبار کیا ہے؟“

اس نے آنکھیں بند کر کے بڑی سرمستی میں غالب کو یاد کیا تھا۔

”لال خان۔ یار۔ ہم پہ ترس نہیں آتا۔ بالکل بے مزا کر کے رکھ دیا ہے ہمیں۔ کیسے یار ہو؟“ اس کی آنکھیں تھیں۔

”میں تمہیں اس طرح خودکشی کرتے نہیں دیکھ سکتا۔ اب تم اسے نہیں پی رہے تھے وہ تمہیں پی رہی تھی۔ میں مشکل تو ہوتی ہی ہے۔ مگر آہستہ آہستہ سنبھل جاؤ گے۔“ لال خان نے بڑی محبت سے اس کا ہاتھ دبایا۔

”دوپہر کے لیے کیسا دسٹر خوان ”پچوں؟“ بالوں نے دروازے میں رُک کر پھر انکارے چبائے تھے۔

”ہو۔ ہو۔ ہو۔ یار تمہاری بھابی آہستہ آہستہ کھل رہی ہے۔ واہ اتنی اچھی اردو بولتی ہے۔ ہو ہو۔ ہا۔ لال خان

کی قابلیت پر لوٹ پوٹ ہوا جا رہا تھا۔

کوئی خاص چیز بنانے کی ضرورت نہیں بھابی۔ جو گھر میں کپے کا کھالیں گے۔ آپ میرے معاملے میں لال خان نہ مانا کریں۔ یہ تو یونہی کرتا ہے۔“

عارف نے بے حد سنجیدگی سے کہا تھا۔ اس طرح کی سنجیدگی بالوں نے پہلی بار دیکھی تھی اس میں۔ ورنہ اس کی کبھی تلخی، کبھی طنز، کبھی استہزاء اور کبھی شوخی ہی ہوتی تھی۔ وہ سر جھٹک کر باہر نکل گئی۔

”رات بڑے اچھے اتار لایا تھا میں تمہارے لیے۔ تمہاری بھابی سے کہتا ہوں، وہ جوں نکال کر دے رہی ہے۔ اب میں چلتا ہوں۔“ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

”یار۔ کیوں بھابی کو تنگ کرتے ہو؟ ان کے پاس پہلے ہی کم کام ہوتا ہے۔“ اس نے پھر لال خان کو ٹوکا۔

”وہ اس گھر میں بہت عیش میں ہے۔ نعمتوں سے گھر بھرا پڑا ہے۔ اور یہ سب تمہاری وجہ سے ہے۔ اس میں ہے۔ سب سے بڑھ کر تم میرے یار ہو۔ اور ہم یار کی قدر پہچانتے ہیں۔ مت بولا کرو میرے معاملوں میں۔“

لال خان نے جھٹک کر اس کا کندھا زور سے دیا۔ ”اچھا۔ خدا حافظ۔ اپنی بھابی کو تنگ مت کرنا۔ جو دیکھتا ہے۔“ وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا باہر نکل گیا۔ عارف نے پھر آنکھیں موند لیں۔

نڈو زمین کے لیے ہے نہ آسمان کے لیے
تیرا وجود ہے صرف داستان کے لیے

وہ رفیع کا گایا ہوا ایک البیہ گیت گنگٹانے لگا۔ دس منٹ میں اس نے یہ گیت نہ جانے کتنی بار گنگٹایا تھا۔ بلاک فو
اور بے سوز آواز تھی۔

بالو جوس کا گلاس پکڑے ہوئے چند ٹاپے اسی طرح کھڑی رہ گئی۔

”ہاتھ میں پکڑاؤں یا رکھ کر چلی جاؤں؟“ اس نے کھر دے انداز میں اسے متوجہ کیا۔ عارف نے ہنسنے
کھول دیں۔

”رکھ دیں۔ شکریہ۔ یہ ساری خدمات مجھ پر قرض ہیں۔ زندگی رہی تو آپ کو مایوس نہیں کروں گا۔“

دو گھنٹے رکھ کر دروازے کی سمت بڑھ رہی تھی۔ ریک دم رُک گئی۔

”آپ دس بار میں اور دس بار پیدا ہوں تب بھی میرے قرض نہیں اُتار سکتے۔ کس خوش فہمی میں رہتے ہیں آپ؟“ وہ

بل کر رہی تھی۔

”ایسا تھا دیا ہے میں نے آپ کو؟“ عارف کی آنکھیں حیرت کا مظہر بن گئیں۔

”یہ کام کی محنت نہیں ہے۔ روح کی محنت ہے۔ روئیں روئیں میں اتر چکی ہے۔“ اُس کا گلہ زندہ گیا۔ وہ بچکی کی سی تیزی

سے بڑبڑاتی تھی۔

ہارل ششدر سا دروازے کی طرف دیکھتا رہ گیا تھا۔

اس کا ذہن بڑی طرح الجھ چکا تھا۔ کوئی سراہا تھا نہیں آ رہا تھا۔ وہ سوچ سوچ کر شل ہو گیا۔ اسے واقعی بالو کا انداز سمجھ میں

نہیں آتا تھا۔ اس کا آخری جملہ بار بار غھر کی طرح دماغ سے ٹکرا رہا تھا۔ بالآخر اس نے گہری سانس سینے سے خارج کی۔

روغن کا باب بھرا گلاس اٹھالیا۔

یوں گردشِ مدام سے گھبرا نہ جائے دل
انسان ہوں، پیالہ وسا غریب نہیں ہوں میں

”آہستہ آہستہ ہوس پینے لگا۔ مگر اس کی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ وہ بڑی طرح الجھا ہوا ہے۔

دوب کی تمازت کا احساس بہت گہرا تھا۔ اس کی آنکھ کھل گئی تھی۔ اور وہ ایک دم اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔ اچھی خاصی دھوپ

لگتی تھی۔ اس نے رست و اوج پر نظر ڈالی اور پلنگ سے اتر آیا۔ آتے ہی اس نے اپنے نہانے کا سامان تو سیٹ کر ہی لیا

فولہ اندا کر کے کی طرف بڑھا۔ جہاں اس کا بڑا سا بیگ رکھا ہوا تھا۔ اپنا شیو کا سامان اور آئینہ و تولیہ لئے باہر آیا اور دیوار میں

بنے خانے میں آئینہ رکھ کر شیو بنانے لگا۔ اس کا خیال تھا کہ تیمور علی خان شاید گلہ باز کو ساتھ لائیں اور آج اس کی جان بھٹوٹ

جائے۔ اسی امکان کو مدنظر رکھتے ہوئے اس کی صبح پروگرام سے شروع ہوئی تھی۔

مچ کی چائے تو کئی روز سے جھومر بنا رہی تھی۔ لکڑیاں جلا کر دھوئیں میں آنکھیں ملتے ہوئے چائے تیار کرنے پر وہ بغیر

ہوئے کے رہنے کو ترجیح دیتا تھا۔ آخر جب چائے دریافت نہیں ہوئی تھی تب بھی تو لوگ رہتے ہی تھے دنیا میں۔ اس نے اپنی

غیب کو بھلا لیا تھا۔ کریم سے جھاگ بناتے ہوئے اس نے آئینے میں پیچھے کی طرف دیکھا۔ جھومر دھت سورہی تھی۔

اسے نہ جانے کیا خیال آیا کہ تیزی سے اس کی طرف بڑھا تھا۔

قریب آ کر اس کی کلائی تمام کرنٹ محسوس کی۔ کیونکہ وہ کروٹ کے بل سورہی تھی۔ اس لیے اس کے سانس لینے کا

تھوڑا سا بوجھ ہوتا تھا۔ مگر ندرات کو جتنی بار بھی اس کی آنکھ کھلی تو وہ سیدھی ایک دم چت لیٹی ہوئی ملی اور اس کے جسمانی آثار

چمکاتے اس کے سانس لینے کا عمل واضح محسوس ہوا۔

غیر محسوس جگہ تھی۔ اور خون بھی کافی نکلتا تھا۔ اس لیے اسے خاصی تشویش تھی۔ کلائی تھمتے ہی جھومر نے آنکھیں کھول

”جھاگ رہی ہوں۔ اور زندہ بھی ہوں۔ مگر اٹھ بیٹھنے کو جی نہیں چاہ رہا۔“

باری نے اس کی کلائی چھوڑ دی۔ اور واپس اپنے ٹھکانے کی طرف بڑھا۔ ہاتھ بدستور گردش کر رہے تھے۔ جھاگ جھاگ ہو چکا تھا۔ اس نے ریزر اٹھا کر پانی میں ڈبویا۔

”آپ اٹھ جائیں بھابی۔ تاکہ میں تخت واپس ٹھکانے پر پہنچا دوں۔ کا کا جان خدا معلوم کس وقت آموں۔“ اس نے آئینے میں جھومر کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ”تمہارے پٹنگ پر لیٹ جاؤں۔“ وہ نقاہت بھرے انداز میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ جھومر دوبارہ سو گئی تھی۔

وہ نہادھو کر تیار ہو گیا۔ برائے نام ناشتا کیا۔ پھر تخت اٹھا کر ہال کمرے میں رکھ کر آیا۔ اب اس کا بس یہی کام تھا کہ بار بار گھڑی دیکھتا رہے۔

کافی دیر بعد اکتا کر بیرونی احاطے کی طرف چلا گیا۔ کتے کھول کر باہر کیے تاکہ وہ اپنا شکار خود کریں کہ ان کا خوراک کا ذخیرہ ختم ہو رہا تھا۔ سدھائے ہوئے کتے تھے۔ گھوم پھر کر واپس آ جاتے تھے۔ اس کام سے فارغ ہو کر ان کو موڑھا اور کتاب اٹھالایا اور بیرونی احاطے میں آ کر بیٹھ گیا۔ نہ جانے کتنا وقت گزرا۔ اس وقت چونکا جب جھومر لڑائی سامنے آ کھڑی ہوئی۔

”دوا بھی تو کھانا ہوگی باری! بہت دیر نہیں ہوگئی۔“ وہ دیوار سے پشت ٹکا کر گھڑی ہو گئی۔

”پہلے آپ ناشتا کر لیں۔ خالی پیٹ دوا نہیں کھاتے۔“ اس نے کتاب سے سر اٹھا کر اس کا چہرہ دیکھا۔ اس کا سفید چہرہ ہلدی کی طرح پیلا ہو رہا تھا۔

”اچھا!“ وہ پھر اندر چلی گئی۔

باری نے کچھ سوچا پھر کتاب موڑھے پر لٹی رکھ کر اس کے پیچھے چل دیا۔

”آپ بیٹھیں بھابی۔ میں آپ کو ناشتا بھی دیتا ہوں اور دوا بھی۔“ وہ اس کے پیچھے چلتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

”تم باز نہیں آؤ گے؟“ وہ پلٹ کر تھکے تھکے انداز میں بولی۔

”کیا مطلب؟“ وہ واقعی حیران ہوا۔

”جب سب کچھ بتا دیا ہے تو کیوں ”بھابی“ کہتے ہو؟“ وہ جیسے چڑ کر کہہ رہی تھی۔

”یہ میری مجبوری ہے۔ میں صرف ان اطلاعات پر کان دھرنے پر مجبور ہوں جو مجھے حویلی سے ملتی ہیں۔“

سے گویا ہوا۔ اور درمیانی کمرے میں داخل ہو گیا جہاں اشیائے خورد و نوش محفوظ تھیں۔

ابھی اسے ناشتا کرا کر دوا کھلانا شروع ہی کی تھی کہ باہر سے پے در پے ہارن کی آواز آئی۔

”میرے خیال میں کا کا جان آگے۔ کوشش کیجیے گا۔ آپ کی سزا آج کی تاریخ میں تمام ہو جائے۔ بات بڑھ جائے۔“

نقصان اٹھائیں گی۔ شرائط ان کی چلیں گی۔ آپ کی نہیں۔ اب آگے آپ کی مرضی۔“ اس نے کپسول اس کی جیب سے نکال کر دیکھا۔ آپ کی جیب دیکھی۔ آپ نے مجھے پڑھایا لکھایا۔ اور کبھی ڈانٹا بھی نہیں۔ اور

نہ بہت کھولنے چلا گیا۔

باری نے اس کی کلائی چھوڑ دی۔ اور واپس اپنے ٹھکانے کی طرف بڑھا۔ ہاتھ بدستور گردش کر رہے تھے۔ جھاگ جھاگ ہو چکا تھا۔ اس نے ریزر اٹھا کر پانی میں ڈبویا۔

”آپ اٹھ جائیں بھابی۔ تاکہ میں تخت واپس ٹھکانے پر پہنچا دوں۔ کا کا جان خدا معلوم کس وقت آموں۔“ اس نے آئینے میں جھومر کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ”تمہارے پٹنگ پر لیٹ جاؤں۔“ وہ نقاہت بھرے انداز میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ جھومر دوبارہ سو گئی تھی۔

وہ نہادھو کر تیار ہو گیا۔ برائے نام ناشتا کیا۔ پھر تخت اٹھا کر ہال کمرے میں رکھ کر آیا۔ اب اس کا بس یہی کام تھا کہ بار بار گھڑی دیکھتا رہے۔

کافی دیر بعد اکتا کر بیرونی احاطے کی طرف چلا گیا۔ کتے کھول کر باہر کیے تاکہ وہ اپنا شکار خود کریں کہ ان کا خوراک کا ذخیرہ ختم ہو رہا تھا۔ سدھائے ہوئے کتے تھے۔ گھوم پھر کر واپس آ جاتے تھے۔ اس کام سے فارغ ہو کر ان کو موڑھا اور کتاب اٹھالایا اور بیرونی احاطے میں آ کر بیٹھ گیا۔ نہ جانے کتنا وقت گزرا۔ اس وقت چونکا جب جھومر لڑائی سامنے آ کھڑی ہوئی۔

”دوا بھی تو کھانا ہوگی باری! بہت دیر نہیں ہوگئی۔“ وہ دیوار سے پشت ٹکا کر گھڑی ہو گئی۔

”پہلے آپ ناشتا کر لیں۔ خالی پیٹ دوا نہیں کھاتے۔“ اس نے کتاب سے سر اٹھا کر اس کا چہرہ دیکھا۔ اس کا سفید چہرہ ہلدی کی طرح پیلا ہو رہا تھا۔

”اچھا!“ وہ پھر اندر چلی گئی۔

باری نے کچھ سوچا پھر کتاب موڑھے پر لٹی رکھ کر اس کے پیچھے چل دیا۔

”آپ بیٹھیں بھابی۔ میں آپ کو ناشتا بھی دیتا ہوں اور دوا بھی۔“ وہ اس کے پیچھے چلتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

”تم باز نہیں آؤ گے؟“ وہ پلٹ کر تھکے تھکے انداز میں بولی۔

”کیا مطلب؟“ وہ واقعی حیران ہوا۔

”جب سب کچھ بتا دیا ہے تو کیوں ”بھابی“ کہتے ہو؟“ وہ جیسے چڑ کر کہہ رہی تھی۔

”یہ میری مجبوری ہے۔ میں صرف ان اطلاعات پر کان دھرنے پر مجبور ہوں جو مجھے حویلی سے ملتی ہیں۔“

سے گویا ہوا۔ اور درمیانی کمرے میں داخل ہو گیا جہاں اشیائے خورد و نوش محفوظ تھیں۔

ابھی اسے ناشتا کرا کر دوا کھلانا شروع ہی کی تھی کہ باہر سے پے در پے ہارن کی آواز آئی۔

”میرے خیال میں کا کا جان آگے۔ کوشش کیجیے گا۔ آپ کی سزا آج کی تاریخ میں تمام ہو جائے۔ بات بڑھ جائے۔“

نقصان اٹھائیں گی۔ شرائط ان کی چلیں گی۔ آپ کی نہیں۔ اب آگے آپ کی مرضی۔“ اس نے کپسول اس کی جیب سے نکال کر دیکھا۔ آپ کی جیب دیکھی۔ آپ نے مجھے پڑھایا لکھایا۔ اور کبھی ڈانٹا بھی نہیں۔ اور

”ہم جس پر مہربان تھے، وہ لڑکی کوئی اور تھی۔ آج جو سامنے بیٹھی ہے، یہ کوئی اور ہے۔ گستاخ، بے ادب، وہ غزائے۔“

”ہر انسان کا ایک دل بھی ہوتا ہے خان!“ اٹک اس کے رخساروں پر بہہ نکلے۔

”جب انسان فاقوں سے مر رہا ہوتا ہے، تب بھی تو یہ دل اس کے پاس ہوتا ہے۔ کیوں کام نہیں چلائے۔“

بھوک سے مر کیوں جاتا ہے؟“ وہ پھنکارے۔

”ہم سے زیادہ کلام کرنے کی ضرورت نہیں۔ احسان فراموشوں کی آواز انگارہ بن کر لگتی ہے کانوں میں۔ چلتے ہوئے بیرونی احاطے کی طرف بڑھ گئے۔“

”خان! وہ بھابی کی ٹریٹمنٹ کا کیا ہوگا؟“ باری نے قدرے ہچکچاتے ہوئے سوال کیا۔

”گلاباز کو گاڑی کی چابی دے دو اسے ڈرائیونگ آتی ہے۔“ انہوں نے فیصلہ سنایا اور جیب میں جا کر بیٹھے۔

باری آخری کمرے میں اپنا کچھ سامان اور چابی لینے کے لیے آگے بڑھ گیا تھا۔ اور خاصے جلّت آمیز انداز کی طرف آیا تھا۔

”باری!“ جھومر کی آواز زنجیر بن کر اس کے قدموں سے لپٹی تھی۔ وہ رُک گیا تھا۔

”جی۔“

”تم کیوں جا رہے ہو؟“

”یاد رہے، سزا آپ کاٹ رہی ہیں، میں نہیں۔ آپ کو شوق ہے۔ مجھے نہیں۔“ اس نے سرد مہر انداز میں جواب دیا۔

”میں آپ کو کا جان کے آنے سے پہلے ہی سمجھا چکا تھا۔ اور پھر آپ کو مجھ سے مطلب؟ میں خان کے ہوں۔ میں آپ کی خاطر تو یہاں خود سے نہیں آیا۔ آپ کو یہ قید تنہائی مبارک ہو کہ آپ کو پسند ہے۔ عمر بھر یہاں کوئی اعتراض نہیں۔“

وہ تلخی بھرے لہجے میں کہہ کر کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ جھومر نے پٹنگ پر لٹ کر آنکھیں موند لیں۔

”اگر اب حویلی میں واپس بھی گئی تو تمہاری خاطر جاؤں گی۔ حویلی صرف اس لیے خوبصورت ہے کہ۔“

بہر حال۔ ابھی مجھے بہت سوچنا ہے۔“ وہ خود کلامی کے انداز میں کہہ رہی تھی۔

باری مطلوبہ چیزیں لے کر باہر آیا اور لپٹی ہوئی جھومر پر ایک نظر ڈالی۔

”خدا حافظ بھابی۔ کاش آپ زندگی کی اہمیت کو سمجھ سکیں۔“ اتنا کہہ کر وہ بیرونی احاطے کی طرف آیا اور۔“

گلاباز کے حوالے کی۔ اور جیب میں تیمور علی خاں کے برابر میں بیٹھ گیا۔ ان کی جیب ڈرائیور ڈرائیو کر رہا تھا۔

”گلاباز! سمجھ چکے ہونا سب بات؟ لڑکی بہت چالاک ہے۔ بہت ہوشیاری سے۔ لو۔ یہ کچھ پیسے رکھ۔“

خاں نے جیب سے پرس نکال کر سوسو کے کچھ نوٹ گلاباز کو دیے۔

”میرے سائیں۔ آپ بالکل بے فکر رہو۔ لڑکی چالاک ہے، ہم اس سے زیادہ چالاک اے۔“

فرے فرے لوٹ جتنا شروع کر دیے۔

باری نے بیٹ سے ٹپک لگا کر آنکھیں موند لیں۔

”بہت صحت مند ہو گئی ہوگی۔ پر کیا کریں، مجبوری بڑی ہے۔ اب سرائے میں خوب آرام کرنا۔ جب اچھی طرح فریش ہو۔“

”بہت صحت مند ہو گئی ہوگی۔ پر کیا کریں، مجبوری بڑی ہے۔ اب سرائے میں خوب آرام کرنا۔ جب اچھی طرح فریش ہو۔“

نہرو علی خاں نے اس کے چہرے پر ایک گہری نگاہ ڈال کر کہا۔

باری خاموش رہا۔

”بہت صحت مند ہو گئی ہوگی؟ بہت احسان فراموش اور نمک حرام لڑکی ہے بغیر محنت کے سب کچھ مل گیا اس لیے قدر نہیں۔“

باری کے لہجے میں بلا کی ناراضگی تھی۔

”تو خیر اس نے بڑی کی ہے۔“

”محنت اپنا دل منانے اور بہلانے میں کرنی پڑتی ہے۔ اتنی محنت دُنیا کے کسی کام میں نہیں کرنی پڑتی۔“ باری نے

باری کو بل سانس سینے سے آزادی کی۔

نہرو علی خاں اپنے موبائل فون پر کسی سے بات چیت میں مصروف ہو گئے تھے۔

باری اس کھنڈر حویلی کی ویرانی اور جھومر کے حال پر غور کر رہا تھا۔

جیب جیسے ہی گیٹ میں داخل ہوئی پورچ کا فرش دھوئی ہوئی سرسوتی پائپ کھلا چھوڑ کر اندر بھاگ گئی۔

سامنے ہی صحن اپنے گیلے بال لہراتی مل گئیں۔

باری۔ روشنی بی بی آگئیں۔ روشنی بی بی آگئیں۔“ وہ بولی اور بغیر رُکے آگے دوڑتی چلی گئی۔

”لو۔ خیر آگئیں۔“ صحن نے اپنے گیلے بالوں میں انگلیاں چلائیں۔

چند لمحوں میں ہی وہ سب راہداری میں آکھڑی ہوئی تھیں۔

”کاش ہم بھی کسی ڈپٹی کمشنر کی بیٹی ہوتے۔“ صحن نے اپنے مخصوص انداز میں مسکرائیں۔

”ہم سب آیت کریمہ کا ختم کرا کے دعا کریں گے کہ آپ کسی ڈپٹی کمشنر کی بیگم بن جائیں۔“ روبی نے فوراً ہی

بہت جواب تلاش کر لیا تھا۔

”تو پھر یہ پروڈکٹول ہمیں سسرال ہی میں ملے گا۔ یہاں پھر بھی تم لوگ ڈنڈی مار دیا کرو گی۔“

صحن نہیں۔

باری نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا تو زری نے آنکھیں دکھا کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

روشنی اندر داخل ہوئی تو ان سب کو سامنے دیکھ کر ایک خوشی کا نعرہ مارا۔

”آپ سب۔ یہاں ہمارے استقبال کو آئی ہیں۔ بہت بہت شکریہ۔“ وہ گلو سے گلے ملتے ہوئے ہنس ہنس کر کہہ رہی

تھی۔

”اگر ہمیں پتا چل جاتا کہ تم آرہی ہو تم ہم نہر پر جا کھڑے ہوتے استقبال کو مگر ایک قباحت ہے یہ۔“
اداسی سے سر جھکا لیا۔

”وہ کیا؟“ کئی آوازیں بیک وقت ابھریں۔

”نہر کے پانی میں کوئی خاص آئینی اثر ہے۔ سو ہنا ماہی نکلا کر بھول جاتا ہے۔ ہو سکتا ہے، ہم نہر کے ہوتے اور یہ آنے کا پروگرام ملتوی کر دیتی۔“

وہ سب بے ساختہ ہنس پڑیں۔ وہ سب باری باری گلے مل رہی تھی۔ شیوہ چپکے سے آگے بڑھ گئیں۔
”بابا صاحب کے ساتھ آئی ہو؟“ زری نے استفسار کیا۔

”ظاہر ہے۔“ وہ مسکرائی۔ ”سنا ہے آپ لوگوں کو ہم بہت یاد آرہے تھے۔ اس لیے ہم جلدی آ گئے۔“

”ہاں، خیر۔ یاد تو تم بہت آرہی تھیں۔ مگر مامائی بہت یاد کر رہی تھی کہ میرے کھانوں میں کوئی نقص نہیں۔“
بوریت ہو رہی ہے۔ ”زری ہنس رہی تھی۔

”باقی سب لوگ کہاں ہیں؟“ روشی نے پوچھا۔

”اپنے اپنے ٹھکانوں پر۔“

”باری۔ سرائے گیا تھا۔ ابھی تک نہیں آیا۔ باقی ممبران وہی ہیں جو تم چھوڑ کر گئی تھیں۔“ شیوان سے ذرا
کھڑی مطلع کر رہی تھیں۔

روشی نے ایک سنگتی نگاہ ان پر ڈالی۔

”میں ابھی آتی ہوں بڑی امی کو سلام کر کے۔“ ہال کمرے کے نزدیک پہنچ کر اس نے دائیں طرف منہ کر کے
”ٹھیک ہے۔ ہنگامی دورے کی رپورٹ پیش کرنے بیٹھ جانا۔ جلدی آ جانا۔“ مریم نے تاکید کی۔

”ہاں۔ ہاں آرہی ہوں۔“ وہ جب گھر میں داخل ہوئی تو خون میں عجیب سی سرگرمی دوڑ رہی تھی۔ مگر اب
ڈھیلی ہو رہی تھی۔

”کیوں گیا ہے سرائے؟“

اور پھر ابھی تک آیا کیوں نہیں؟ پتا نہیں کیسا دل ہے اس کا کہ کسی مخصوص جگہ و ماحول کا محتاج ہی نہیں جاتا ہے۔
جاتا ہے۔ جاپانی مشین کہیں کا۔

اسے تو شاید یاد بھی نہیں رہتا ہو گا کہ حویلی کا ایک مستقل باشندہ کم ہے۔“ وہ عالجاب کی خواہش کی طرح
سوچ رہی تھی۔

رات کے آٹھ بج رہے تھے۔ وہ سب کسی پُر تجسس ڈرامے کی قسط دیکھنے میں مصروف تھیں۔ گاہے گاہے

زبانیں تھیں۔

پاک برطرف خاموشی طاری ہو گئی۔

کمرے میں عالجاب داخل ہوئی تھیں۔ سب ایک دم اپنے اپنے دوپٹے درست کر کے سنبھل کر بیٹھ گئیں۔
”بیٹی تمہارے نانا کا چہلم کس تاریخ کو ہے؟“ وہ ان سب کے درمیان بیٹھ گئیں۔ اور اپنی ٹانگ کے نیچے لکھن
”جی۔ جس سے اندازہ ہوا کہ وہ دیر تک بیٹھنے کے ارادے سے اور کسی خاص کام سے آئی ہیں۔ لڑکیاں یوں سنبھل کر
”بے بیٹھی تھیں، جیسے قرآن خوانی ہو رہی ہو۔“

”مجھے تو پتا نہیں بڑی امی۔ پتا ہی کو پتا ہو گا۔“ اس نے قدرے شرمندگی سے کہا۔

”ابلی، سرسوتی سے کہو، میرے کمرے سے چھوٹا سوٹ کیس اٹھالائے۔ میرے بستر پر رکھا ہے۔“ روبی دروازے کے
”بہن! اسی کی شامت آئی۔“

”بہر حال اندازہ تو یہی ہے کہ اگلے مہینے کی پندرہ سولہ تک ہو جائے گا۔“ وہ جیسے خود سے مخاطب ہو گئیں۔

”اب ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر رہ گئیں۔“

”ابلی، ابلی آ کر بیٹھ گئی تھی۔ اس کے بعد سرسوتی سوٹ کیس لے کر آ گئی۔“

”اللہ کی بیوی کراچی گئی تھی۔ میں نے اس سے کچھ کامدار سوٹ منگوائے تھے۔ اور بہاول پور سے سُمیہ بھی کچھ
”کے کام کے سوٹ لاتی تھی۔ تم ان میں سے پسند کر لو پھر سلنے کو بھی دینا ہے۔ اور سو بکھیرے ہوتے ہیں شادی کے۔“

نہیں نے سوٹ کیس کھول کر کپڑے نکال نکال کر اس کے سامنے ڈالنا شروع کر دیے۔

”اندازا کتنے دن رہتے ہیں روشی کی شادی میں؟“ لالی منمنائی۔ ”آخر ہم نے بھی تو تیاریاں شروع کرنا ہیں۔“

”نہ بھگ مہینہ تو لگ ہی جائے گا۔ پنڈی لے چلوں گی تمہیں۔“ انہوں نے تسلی دی اور ساتھ کپڑے بھی الٹ پلٹ
”ہم باڑے نہیں جائیں گے بڑی امی۔ دل بھر گیا ہے باہر کا کپڑا پہن پہن کر۔ اسلام آباد کے کسی فیشن بوتیک سے
”نہ بھگ کریں گے۔“ حنا نے لب کشائی کی جرات کی۔ سب نے تائید بھری نظروں سے حنا کی طرف دیکھا۔

”ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔ یہ تو بعد کی باتیں ہیں۔ اصل کام تو جہیز کی تیاری ہے۔“

”اللہ روشی کے تو مزے آ گئے کتنے سارے کپڑے بنیں گے اس کے۔“ بیہ نے رشک سے کہا۔

”اللہ! اللہ! اس طرح نہیں بولتے بیٹی۔ اللہ خوشیاں مبارک کرے۔ تمہاری باری آئے گی تو تمہارے بھی اتنے
”اللہ! اللہ! اس طرح نہیں بولتے بیٹی۔“

”اللہ! اللہ! اس طرح نہیں بولتے بیٹی۔ اللہ خوشیاں مبارک کرے۔ تمہاری باری آئے گی تو تمہارے بھی اتنے
”اللہ! اللہ! اس طرح نہیں بولتے بیٹی۔“

”اللہ! اللہ! اس طرح نہیں بولتے بیٹی۔ اللہ خوشیاں مبارک کرے۔ تمہاری باری آئے گی تو تمہارے بھی اتنے
”اللہ! اللہ! اس طرح نہیں بولتے بیٹی۔“

”اللہ! اللہ! اس طرح نہیں بولتے بیٹی۔ اللہ خوشیاں مبارک کرے۔ تمہاری باری آئے گی تو تمہارے بھی اتنے
”اللہ! اللہ! اس طرح نہیں بولتے بیٹی۔“

اس پر نشان لگا دیتا۔ ہم نے تو کہا تھا اس اہتمام کی کیا ضرورت ہے۔ اپنی مرضی سے بنوالیں، کہنے لگیں۔
پہنناہیں اُس کی پسند ہونا چاہیے۔“ انہوں نے گولڈن جلد کی بھاری سی کتاب اس کے سامنے ڈال دی۔
”ماشاء اللہ!“ بیہ نے بڑی امی کا پڑھایا ہوا سبق فوراً ہی دہرایا۔

لڑکیوں کی ہنسی چھوٹ گئی۔

روشنی دم بخود سی بیٹھی سب کچھ دیکھ اور سن رہی تھی۔

”ان سب کپڑوں پر بھاری کام ہے۔ شادی کے شروع دنوں میں تو اسی طرح کے کپڑے زیادہ استعمال ہوں گے۔ تمہاری ساس جس قدر محبت سے تمہیں لے جا رہی ہیں۔ اس سے تو لگتا ہے وہ تمہیں سال بھر دلہن بنا کر رکھیں گے۔
بچہ ہے اُن کا۔ کیا کیا ارمان ہوں گے اُن کے دل میں؟“

بڑی امی نے ایک آنکھوں کو خیرہ کر دینے والا عنابی سوٹ اس کے سامنے ڈالا۔

”مجھے اور تمہاری چچی کو تو یہ سوٹ بہت ہی پسند آیا۔ کام بھاری ہے مگر اس میں کس قدر باریکی اور نفاست ہے۔
”پھر آپ یا چچی جان ہی سلوالیں اسے۔ آپ پر بھی بہت اچھا لگے گا۔“ روشنی نے بے تاثر لہجے میں مشورہ کیا۔
وہ سب منہ دبا کر ہنسنے لگیں۔

بڑی امی نے کپڑے الٹ پلٹ کرنے کا کام موقوف کر کے قدرے الجھن بھری نظروں سے اُسے دیکھا۔
”الحق کہیں کی۔ جوڑے بٹ رہے ہیں کیا۔ یہ تمہاری شادی کی تیاری ہو رہی ہے۔ بے وقوف۔“
پھر اپنے کام میں لگ گئیں۔

”یہ گوٹے کے کام کا کالا سوٹ دیکھو، کس قدر خوبصورت کام ہے اور کتنا عمدہ کپڑا ہے۔ ہمارے ہاں تو فخر ہے۔
وہم نہیں کیے جاتے۔ مگر ہو سکتا ہے تمہاری ساس نئی دلہن کو کالا کپڑا پہننا پسند نہ کریں۔ اس لیے یہ رہنے دو۔ سب سے بہتر یہ ہے کہ
”بڑی امی، ہمیں ڈھولکی رکھوادیں۔“ سونی بے قرار ہو گئی۔ مونا نے نظروں ہی نظروں میں اُسے فہمائش کی۔
”رکھوادیں گے ڈھولکی۔ اب ایسی بھی آفت نہیں آرہی۔“

”مونا! ایسا سوٹ تو شاید تمہاری ماں نے بھی لیا ہے تمہارے لیے۔“ انہوں نے ایک سوٹ مونا کو دکھایا۔
استفسار کیا۔

”نہیں۔ بڑی ممانی! اس کا کلر دوسرا ہے۔“ مونا نے جواب دیا۔

”کھانا نہیں لگے گا آج؟“ روشنی نے سخت بیزار لگن انداز میں دریافت کیا۔

”اتنے اچھے کپڑے دیکھ کر بھی تمہاری بھوک نہیں اُڑی؟“ بیہ سچ مچ حیران تھی۔

”لو۔ مرد تو کب کے کھا چکے۔ مجھے بھی دھیان نہیں آیا۔ ماما نے کھانا کیوں نہیں لگایا؟“ بڑی امی بھی حیران تھی۔

”کلو کس کو نے کھد رے میں تھکی ہوئی ہے؟ آج تو اس نے ڈراما بھی قضا کر دیا۔ نری ہڈیاں ہوتی ہیں۔“

بڑبڑائیں۔

”میں دیکھتی ہوں۔“ گلو اٹھ کھڑی ہوئیں۔

”یہ تمہیں پسند آیا؟“ انہوں نے زرتار دوپٹا اس کے سامنے ڈالا۔

”وہ اندر سے بہت مگر جلی تھی۔ اب جیسے پھٹ پڑنے والی تھی۔ بڑی مشکل سے خود پر قابو پایا۔

”اچھا ہے۔“ وہ فی الحال کوئی خطرہ مول لینے کے حق میں نہیں تھی۔ سپاٹ سے لہجے میں جواب دیا تھا۔

”چلو۔ پھر نشانیں گے یہ معاملہ۔ فی الحال یہ پانچ جوڑے الگ کیے دیتی ہوں۔ اب تم لوگ کھانا دانا کھا لو۔ پھر عشاء کی

نری باقی ہے۔ اچھا میں چلتی ہوں۔

فیو۔۔۔ بیٹی۔۔۔ یہ سامان سرسوتی سے کہہ کر میرے کمرے میں پہنچا دیتا۔

روشنی۔۔۔ تم ڈیزائن پسند کر کے اور نشان لگا کر یہ مجھے صبح تک بھجوادو۔ کل پرسوں کوئی کراچی جائے گا تو لیتا جائے گا۔“

”کمرے سے نکل گئیں۔

جانے کون کون سے جذبوں کو دبائے لڑکیاں کپڑوں پر ٹوٹ پڑیں۔

”ہائے روشنی کیا شاندار سوٹ ہیں۔ مزے آگئے بھئی۔ ہر روز بس فینسی ڈریس شو ہوگا۔ نعیم بھائی انعام دیا کریں گے۔“

لالہ بی۔

”اور سٹوپورے پندرہ بیس ڈیزائنوں پر نشان لگاتا۔“ روبی نے مشورہ دیا۔

”بھئی انہیں کیا فرق پڑے گا۔ اُن کے ہاں تو پہلی اور آخری شادی ہے۔ پھر ہوگی تو بیس پچیس سال بعد تمہارے بچوں

کی ہوگی۔“ لڑکیاں ہنسیں تو روبی نے برامان کر وضاحت کی۔

”اور پھر ماں کے زیور تو عام طور پر بیٹوں کی بری میں ہی چڑھائے جاتے ہیں۔ اچھا ہے تمہارے بیٹوں کا بھی ساتھ

ساتھ انتظام ہو جائے۔“ تانیہ بڑی دُور کی کوڑی لائی تھی۔

”جو زیور تمہیں یہاں سے ملیں گے، وہ تم اپنی لڑکیوں کو دے دینا۔ لو بھی تمہارے تو آدھے مسائل یہیں بیٹھے بیٹھے حل

ہو گئے۔“ نعیم مسکرائیں۔ انداز وہی مخصوص تھا جس سے روشنی کی جان جلتی تھی۔

”کہتے ہیں دورانِ دلش عورتیں بچے پیدا ہوتے ہی اُن کے مستقبل کے لیے انتظام کرنا شروع کر دیتی ہیں۔ مگر تم اوگوں

کی دورانِ دلش کا جواب نہیں دے رہی۔ واہ بھئی واہ۔ بیہ وہ جو تم تنگ سیکھ رہی تھیں سمیہ بھابی سے، ہو گئی مکمل۔“ مونا نے سنجیدگی سے

پوچھا۔

”کیا تائون سوئٹرموزوں، ٹوپوں کا؟“

”لکے ہوئے ہیں۔“ بیہ کچھ سمجھی نہیں۔

”وہ بیک کر کے روشنی کے جہیز میں رکھ دینا۔ تب مکمل ہوگی تمہاری دورانِ دلش کی صلاحیت۔“ مونا مسکرا رہی تھی۔ بیہ

نے نمونے پر کھیا کر منہ بنا لیا۔

”ہاں۔۔۔ روشنی۔ تمہاری منگنی کی انگوٹھی کہاں ہے۔ بھی پہن کر رکھا کرو۔ کوئی سیر دو سیر وزن نہیں ہے اس کا۔“

مریم نے اس کے ہاتھ کی طرف دیکھ کر کہا تھا۔

”سٹ آپ۔ پلیز۔ آل آف یو۔“ وہ واقعی خود پر بہت ضبط کر رہی تھی۔

وہ سب حیران پریشان سی ہو کر اُس کی شکل دیکھنے لگیں۔

”ٹھیک ہی تو ہے۔ اسے پریشان نہیں کرو۔ کتنے دن کی مہمان ہے ہمارے پاس۔ نیچرل سی فیلنگو ہیں۔ اجے ہو جانا۔ اتنا آسان بھی نہیں ہوتا۔“

موتانے آگے بڑھ کر اس کا سراپنہ سینے سے لگالیا۔

اس کا جی چاہا چیخ چیخ کر رو پڑے۔ مگر نہ جانے آج کہاں سے اس میں اتنا ضبط کا مادہ سراعت کر گیا تھا۔ وہ بکھر ہوا جھپک کر آنسو روکنے کی کوشش کرنے لگی۔

رات ساڑھے بارہ بجے کے قریب تو وہ حویلی پہنچا تھا۔ سب ہی لوگ اپنے اپنے کمروں میں جا چکے تھے۔ ایک ہی جاگ رہی تھی۔ وہ ماما کو یہ بتا کر کہ وہ نہادھو کر آ رہا ہے۔ آپ کچن ہی میں کھانا لگائیں۔ فوراً ہی باتھ روم بند ہو گیا۔ اور اب کچن کی طرف بڑھ رہا تھا۔ بھوک بہت شدت سے لگ رہی تھی اور اس کے ساتھ ہی اسے تاریک حویلی پر جھومر کا دھیان آ رہا تھا۔

”پتا نہیں بے چاری نے کچھ کھایا بھی ہوگا یا نہیں؟ گلابز ڈاکٹر کے پاس لے گیا ہوگا یا نہیں۔ پتا نہیں انہوں نے کھائی ہوگی کہ نہیں؟“

اسے حویلی کی تاریکی اور ویرانی یاد کر کے جھر جھری سی آگئی۔ جیسے اب تصور بھی ناگوار گزر رہا ہو۔

”خاتون۔ حماقتوں کے سب سے عظیم ہیل سے گزر رہی ہیں آج کل۔“ وہ ترس کھا کر بس یہی سوچ سکتا تھا۔

معاودہ ٹھٹھک گیا۔ بلاشبہ سامنے سے روشنی ہی آرہی تھی۔

اس کی تمام حیات جاگ پڑیں۔ اور ایک شریر مسکراہٹ ہونٹوں پر کھیلنے لگی۔

”السلام علیکم!“ وہ اس کے نزدیک آئی تو باری نے سلام کرنے میں پہل کی۔

وہ بھی اسے دُور سے دیکھ چکی تھی۔ موڈ کیونکہ بے حد آف تھا یا کوئی اور مصلحت تھی۔ وہ اسے نظر انداز کر کے گزری۔

”وسلام!“ اس نے رکھائی سے کہا اور آگے بڑھ گئی تھی۔ اس کا رخ کچن کی سمت تھا۔

باری تیز قدم بڑھا کر اس کے برابر میں جا پہنچا تھا۔

☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆

”معارض ہیں؟“ وہ اس کے برابر چلنے لگا۔

”اگر ہوں۔۔۔ تو۔۔۔؟“ وہ ہنک کر گویا ہوئی۔

”اپنا تصور پوچھ سکتا ہوں؟“ اس نے نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبا کر مسکراتے ہوئے پوچھا۔

”بات نہیں کرو مجھ سے۔“ وہ بگڑ کر بولی۔

”یہ جو آپ کا مزاج ہے۔ اس کے کتنے موسم ہیں؟“ وہ چھیڑ رہا تھا۔

”ایک لاکھ بیس ہزار بھی ہوں تو تم سے مطلب؟“ وہ بھڑک اٹھی۔

”ماشاء اللہ۔ اچھا اثرن ہے۔ بزنس مین سے وابستہ ہونے کا عملی ثبوت۔ ”فیکر ز“ میں جواب آنے لگے ہیں۔“ وہ ہنس

روشنی نے اپنا چال میں تیزی پیدا کی اور اس سے پہلے کچن میں داخل ہو گئی۔

وہاں لٹانے کے لیے باری کی خستہ قہقہہ روشنی کو داخل ہوتے دیکھ کر قد رے حیران ہوئی۔

ماتن کہاں ہیں؟ کہہ رہے تھے، آ رہا ہوں۔“ وہ خود کلامی کے انداز میں گویا ہوئی، روشنی نے جواب دینا ضروری نہ

”ماما۔۔۔ نیند نہیں آرہی اور سر میں درد ہو رہا ہے۔ کافی بنا دیں۔“

”آپ کمرے میں چلیں۔ وہیں لے آتی ہوں۔“ ماما نے غصے سے کہا۔

”نہیں! یہیں دے دو۔ اب میں پھر اتنا لبا سفر کروں۔“ وہ ایک کرسی پر ڈھسے گئی۔ باری اندر آ چکا تھا۔

”آئیں خان۔۔۔!“ ماما جلدی جلدی میز پر کھانے کی چیزیں رکھنے لگی۔

”بھئی ماما۔۔۔ جلدی سے مجھے کافی دے دو پہلے۔“ روشی نے برا سا منایا۔

”کافی سے تو اور نیند اڑ جاتی ہے۔ کیا آج سونے کا ارادہ نہیں ہے؟“ باری نے اس بار سنجیدگی سے اُسے دیکھا۔ وہ خاموش بیٹھی اپنے رنگین ناخن گھورتی رہی۔

”خان۔۔۔ سرائے میں تو سب خیریت ہے نا۔۔۔؟ ماما نے الیکٹرک کیبل کا پگ لگایا۔

”ہتا نہیں۔“

”تو کیا آپ ”سرائے“ نہیں گئے تھے؟“ ماما نے تعجب سے اس کی صورت دیکھی۔

”نہیں۔۔۔ کام میرا کہیں اور تھا۔“ جھومر پھر نظروں کے سامنے آ گئی۔۔۔ ڈکھ اور تاسف کے احساس نے بوجھل ہو گیا۔ اس نے ایک اچھتی سی نظر روشی پر ڈالی۔

”کھانا کھائیے۔۔۔“ اس نے روشی سے اخلاق برتا تھا۔

وہ اسی طرح خاموش رہی۔ اور ماما کو کافی بنا تے دیکھتی رہی۔

”خان! کھیرے کا رائے بھی ہے، مگر فرق میں ہے۔ آپ ٹھنڈا ہی نہیں کھاتے۔ اس لیے پوچھ رہی ہوں۔“

”نہیں۔۔۔ بس ٹھیک ہے۔“ اس نے کھانا شروع کر دیا تھا۔

”ساری رات جاگ کر کیا شکرانے کے نفل پڑھیں گی؟“ وہ مزید خاموشی برداشت نہ کر سکا۔

”کس بات کا شکرانہ۔ لڑکیاں اپنی شادی پر شکرانہ خود نہیں پڑھتیں، اُن کے بزرگ پڑھتے ہیں۔“ ماما نے۔

باری نوالہ منہ کی طرف لے جاتے ہوئے درمیان ہی میں رُک گیا۔

”شادی۔۔۔؟“ اس نے اس مرتبہ غور سے روشی کی شکل دیکھی تھی۔

”انشاء اللہ بہت دھوم سے ہوگی۔ اب زیادہ دنوں کی بات نہیں رہی۔“ ماما کے چہرے پر خوشی اور کی طرف اشارہ تھی۔

باری نے نوالہ اس طرح منہ میں رکھا، جیسے کوئی کام زبردستی کرتے ہیں یا مجبوراً کرتے ہیں۔

”یہ تو اچھی خبر ہے۔“ اس نے بوتل سے پانی گلاس میں انڈیلا۔

”بہت اچھی کہیے خان! بڑے خان کی بیٹیوں کے بعد اس نسل کی لڑکیوں میں پہلی شادی ہے۔“

”بیڑے“ میں بارات اترے گی۔“

”نے تے ہوئے آلو کے قتلے اور کچپ کی بوتل باری کے سامنے لا کر رکھ دی۔ یہ اہتمام شامی کبابوں کے ساتھ تھا۔

”جنگ پو۔۔۔ ماما۔ بہت اچھے طریقے سے کھانا کھلاتی ہو۔“ باری نے گرجوٹی سے شکریہ ادا کیا۔

”ہاں۔۔۔ تو کیا کہہ رہی تھیں؟“ اس نے چور نظروں سے روشی کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”جی کہہ دی رونق رہے گی۔“ اس نے تیزی سے کافی چھینٹتے ہوئے بڑی سادگی سے کہا۔

”بڑی پیغم کہہ رہی تھیں۔“

”ہاں کہہ رہی تھیں۔ دھول کہہ رہی تھیں۔ بند کرو ماما! یہ سب باتیں۔ کافی دو مجھے جلدی سے۔“ روشی بھڑک اٹھی۔

ماما کرایک دم خاموش ہو گئی۔

”کہوں بے چاری ماما کو ایسے کہہ رہی ہیں۔ اس بے چاری کا کیا قصور؟“ باری نے دبے دبے انداز میں روشی کو ٹوکا، جو نہ بہت تھوڑے فاصلے پر کرسی پر بیٹھی تھی۔

”جس تو اچھی لگے گی ہی۔ آدمی آدمی رات کو باہر سے عیش کر کے آتے ہو۔ تو تمہیں گرم اور تازہ پکوان پیش کرتی ہے۔“ روشی نے نفوت سے ناک چڑھائی۔

”جو عیش کر کے آتے ہیں، وہ گھر بھوکے نہیں آتے۔ اطلاعاً عرض ہے۔“ وہ جانے کیوں مسکرا دیا۔

ماما نے کافی لا کر روشی کے سامنے رکھی۔ روشی کچھ بولنے لگی تھی، چپ ہو گئی۔

”ہاں تو ماما۔ کیا کہہ رہی تھیں؟“ باری کا لہجہ نہایت شریر تھا۔

”تمہیں میری شادی کے معاملے میں اتنی دلچسپی کیوں ہے؟“ وہ کڑے تیوروں سے اُسے گھور رہی تھی۔

”کیا نہیں ہونی چاہیے؟“ اس نے بہت دھیمی آواز اور عجیب سے لہجے میں پوچھا تھا۔

”بالکل نہیں ہونا چاہیے۔“ روشی کا لہجہ قطعی تھا۔

باری خاموشی سے کھانا کھانے لگا۔ اور روشی کافی کے سپ لینے لگی۔ ماما باہر نکل گئی تھی۔

باری نے بہت جلدی کھانا ختم کر لیا تھا۔ پانی پی کر وہ ہاتھ دھونے سنک کی طرف بڑھا۔

”ایک تو اس گھر کے بڑے بھی جھوٹ بولنے لگے ہیں۔ پوری حویلی میں یہی خبر بار بار نشر ہو رہی ہے کہ تم سرائے میں ہو۔ جب تم سرائے نہیں گئے تھے تو پھر کہاں گئے تھے؟“ روشی نے کپ ٹیمبل پر رکھ کر بہت تحکمانہ انداز میں پوچھا۔

”میں بے حد اچھی جگہ گیا ہوا تھا۔ وہاں بہت مزے میں تھا۔“ وہ اس کھنڈر حویلی کا تصور کر کے مسکرا دیا۔

”خیر، مزے میں تو آپ بھی تھیں۔ نور کیسار ہا۔۔۔؟“ وہ باہر نکلنے کے ارادے سے دروازے کی طرف بڑھ رہا تھا۔

”جب تم حویلی سے دُور چلے جاتے ہو تو کیا تمہیں حویلی یاد نہیں آتی؟“ روشی کے انداز میں اس مرتبہ قدرے نرمی تھی۔

”یعنی آپ کا مطلب ہے۔ حویلی کے کمرے۔ دالان۔ باغ۔ گول کمرے۔ پیچ۔ اسٹپس۔“ وہ انجان بن کر بڑی

مناہٹ سے سوال کر رہا تھا۔

”ہاں۔ یہاں کے گدھے، گھوڑے، خچر۔ بلیاں، کتے، مرغیاں۔“ روشی نے دانت پیسے اور کپ اور فر ہوئی۔

باری نے بمشکل اپنی مسکراہٹ ضبط کی۔ اور باہر نکل گیا۔

”ہونہ۔ پتا نہیں کس حساب میں مجھے اتنا ستاتا ہے۔“ جانے کیوں اس کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔

وہ کافی دیر کمرے میں ٹہل ٹہل کر گھڑی دیکھتی رہی۔

پھر جیسے کسی فیصلے پر پہنچ کر کمرے سے باہر آ گئی۔ اب اس کا رخ ہال کمرے کی طرف تھا۔ ہال کمرے نے لائٹ جلائی، اور بہت آہستگی سے ٹیلی فون سیٹ کی طرف بڑھی۔ ریسپورڈ اٹھا کر کان سے لگایا۔ اور پچھلے غور سے دیکھنے لگی۔ کافی دیر غور سے دیکھتی رہی جیسے حفظ کر رہی ہو۔ پھر زیرو سے کوئی نمبر ڈائل کیا۔ اس کا مطلب باہر کا کوئی نمبر ملتا رہی ہے۔ رات کے پونے دو بج رہے تھے۔ اس نے نمبر ڈائل کر لیا تھا۔ دوسری طرف بیل ہوئی ساتھ وہ دروازے کی طرف بھی دیکھ رہی تھی۔

چھٹی بیل پر دوسری طرف سے ریسپورڈ اٹھا لیا گیا تھا۔ اور نیند میں بھری مردانہ آواز سماعت سے گزرا۔ (ہیلو)۔

اس نے گلا صاف کرنے کے لیے ذرا سا کھنکارنا مناسب سمجھا۔

”مسٹر نعیم سے بات ہو سکتی ہے؟“ اس کی آواز بہت دھیمی تھی۔

”آپ پلیز اس چکر میں نہ پڑیں کہ میں کون ہوں۔ ممکن ہے تو نعیم صاحب سے بات کرادیں۔“

”جی۔۔۔ مجھے صرف مسٹر نعیم سے بات کرنا ہے۔ میں اس سے زیادہ اونچا نہیں بول سکتی، البتہ مسٹر نعیم کی بات کر سکتی ہوں۔“

وہ جمل کر بولی تھی۔ معا اس نے کھٹاک سے ریسپورڈ رکھ دیا۔ دروازے کے پچھلے باری کھڑا ہوا تھا۔ اور اسے اُسے دیکھ رہا تھا۔

روشی نظریں جھکائے ماتھے پر لاتعداد بیل ڈالے خاموش بیٹھی رہ گئی تھی۔

”سوری۔۔۔ میں اوپر جا رہا تھا۔ ہال کمرے کی لائٹ جلی دیکھی آف کرنے کے خیال سے آ گیا تھا۔“

اس کے معذرت خواہانہ انداز سے ظاہر تھا کہ اس نے ”کچھ“ منس لیا ہے۔

”آپ کو دروازہ بند کر لینا چاہیے تھا۔“ وہ واپسی کے ارادے سے پلا۔

”مجھے کیا کر لینا چاہیے اور کیا نہیں۔۔۔ تمہارے مفید مشوروں کی ضرورت نہیں۔“ وہ جیسے چٹ کر بولی۔

باری نے اس پر صرف ایک نگاہ ڈالنے پر اکتفا کیا اور قدم بڑھا دیا۔

”باری۔۔۔؟“ جانے کیوں اس نے آواز دے ڈالی۔

”جی۔۔۔؟“ وہ رک گیا۔ سفید کرتے پانچاے میں ملبوس نیند کا تاثر دیتی آنکھیں۔ مگر چہرہ صاف سلیٹ۔۔۔ وہ روٹ باز دینے پر لپٹے ہنجر کھڑا تھا۔

”وہ بات یہ ہے کہ۔۔۔“ وہ بولتے بولتے رک گئی۔

”جی۔۔۔؟“ وہ اس کے نزدیک چلا آیا۔

”مگر۔۔۔ تمہیں کیا۔۔۔؟“ اس نے سر جھٹک کر جیسے فیصلہ بدل دیا۔

”نہیں نہیں۔۔۔ آپ کہیے۔۔۔ شاید مجھے ”کچھ“ ہو۔۔۔“

روشی نے چونک کر نظریں اٹھائیں۔ وہ اپنے مخصوص انداز میں مسکرا رہا تھا۔

”کچھ نہیں۔۔۔ جاؤ تم۔۔۔ اور ہاں سنو۔۔۔ اگر میں مرجاؤں تو میرے جنازے کو کندھامت دینا۔۔۔ بی کا ز۔۔۔“

”بلیٹ ہو۔۔۔“ اس کے حرف حرف سے آج آ رہی تھی۔

”جی بہتر۔۔۔ ویسے اندازہ ہے کہ رش بہت ہوگا۔ میرا نمبر شاید ہی آئے۔“ وہ بدستور مسکرا رہا تھا۔ ”آپ بے فکر رہیں۔“

روشی کا جی چاہا کہ اسے گولی مار دے۔

”میں جا رہا ہوں، آپ اپنا کام کر لیں، غصہ خود بخود ختم ہو جائے گا۔ بہتر ہوگا کہ اندر سے دروازہ بند کر لیں۔“ یہ کہہ کر وہ نئی سے اس راستے کی طرف بڑھ گیا، جو اس کے کمرے کو جاتا تھا۔

نہ جانے کیوں اس کی آنکھوں میں آنسو جھلملانے لگے۔

اس نے لائٹ بند کی اور باہر آ گئی۔ اس کے قدم اپنی خواب گاہ کے بجائے حویلی کے پچھلے حصے کی طرف تھے۔ آہستہ آہستہ اس کے سارے ڈر ختم ہو رہے تھے۔ وہ کھوکھر کے کوارٹر کے بجائے دوسرے راستے سے باہر آئی تھی۔ سناٹا اور اندھیرا اسے اتنا نہیں ڈراتا تھا۔ جتنا کھوکھر کے خونخوار کتے سے اسے خوف آتا تھا۔

وہ بہت تیز تیز چلتی حویلی کے پچھلے حصے میں داخل ہوئی تھی۔ وہی مخصوص سی پراسراریت سارے ماحول پر چھائی ہوئی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے کوئی قیامت سوئی ہوئی ہے، جاگ پڑنے کے لیے۔

زرد روشنی، راہداری ڈور تک واضح کر رہی تھی۔ تمام دروازے بند تھے۔

مگر انسانی نفوس کی موجودگی کا احساس درود یوار سے اُٹتا تھا۔ وہ ظفیری کے بیڈروم کی طرف بڑھ رہی تھی۔ وہ جھومر کو بلائے پاتھ تھی۔ جھومر سے باتیں کر کے بہت سارا روٹا چاہتی تھی۔۔۔ جانے کیسی وابستگی سی ہو چلی تھی اس افسردہ سی لڑکی سے۔ رات کے اس پہر اس سے اچھا سمیت اسے شاید ہی مل سکتا۔

اس نے دروازے پر آہستہ سے دستک دی۔ ایک بار۔۔۔ دوبار۔۔۔ تین بار۔۔۔ عموماً دوسری دستک پر جھومر دروازہ یوں کھولتی تھی جیسے ہنجر ہی ہو۔

نہ نے چوتھی بار دستک دی۔ خاموشی بدستور تھی۔

اس نے ہینڈل کھمایا تو دروازہ کھل گیا۔

سامنے ظفری نیم دراز دروازے کی سمت گھور رہا تھا۔ منہ سے رال بہہ رہی تھی، اور آنکھوں میں سرخی تھی۔ جھرجھری آگئی۔

اس نے اشارے سے سلام کیا، کہ آخر کچھ تو کرنا تھا۔

روشنی اندر داخل نہیں ہوئی تھی، ہنوز دروازے ہی میں کھڑی تھی۔

”بھابی کہاں ہیں ظفری بھائی؟“ وہ انک انک کر پوچھنے لگی۔

ظفری کی آنکھوں میں وحشت ٹاپنے لگی۔ روشنی کا دھیان ایک دم اس کے سر پر بندھی پٹی کی طرف گیا۔

”آپ کے سر میں کیا ہوا ظفری بھائی؟“ اس نے پھر ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

ظفری کے منہ سے عجیب و غریب آوازیں نکلنے لگیں۔ جن میں سے اس نے ایک لفظ ”پانی“ سمجھا۔

اسے بے اندازہ ترس آگیا۔ حالانکہ پانی ظفری کے بالکل قریب ہی موجود تھا۔ مگر وہ جذبہ ہمدردی سے چھوڑا۔

نزدیک آئی، پانی کا گلاس اٹھایا اور اس کو تھمانے کے بجائے ہونٹوں سے لگا دیا۔

اور جیسے اس کی روح اس کے ہنجرے میں پھڑپھڑانے لگی۔ ظفری نے اس کے دونوں ہاتھ اپنی مضبوط گرفت میں لے لیے تھے۔ اس نے بمشکل اپنی چیخ پر قابو پایا۔

”یہ آپ کیا کر رہے ہیں ظفری بھائی۔ پلیز چھوڑ دیں مجھے۔“ اس کا خون خشک ہونے لگا۔ ”پلیز ظفری بھائی“

”ہیں آپ؟“

اس نے زور سے جھومر کو آواز دی۔

ظفری بھائی کے حلق سے عجیب و غریب آوازیں نکلنے لگیں۔ روشنی پوری جدوجہد کر رہی تھی مگر جیسے ظفری کی جڑوں

پوری طرح جاگی ہوئی تھی۔ لگتا ہی نہیں تھا کہ اس کے ہاتھ کسی انسانی گرفت میں ہیں۔ یوں جیسے وہ کسی درندے کی گرفت

آگئی ہو۔ اسی کشمکش میں اس کا دوپٹہ پلنگ سے نیچے گر پڑا۔ ظفری کے حلق سے بے ہنگم سی آوازیں نکل رہی تھیں۔

ماحول اور زیادہ بھیانک محسوس ہو رہا تھا۔ روشنی نے ایک لمحے کو ظفری کا چہرہ دیکھا۔ بے حد خوبصورت چہرہ کا ایک

تھا۔

”بھابی!..... بھابی..... کہاں ہیں آپ؟“ اس کی آواز کپکپا رہی تھی۔ ”ظفری بھائی..... دیکھیں۔“

”یا اللہ! تائیں بے کار ہونے پر اتنی طاقت ہے۔“ اس نے ظفری کی کھائی پر دانت گاڑ دیے۔ مگر جیسے اس پر

ہوا۔ گویا اس کے حواس ساتھ چھوڑے ہوئے تھے۔

بالآخر اس نے اپنی انتہائی قوت صرف کی جس کے نتیجے میں ظفری بیڈ سے نیچے گر پڑا، مگر اس نے اپنے

گیا تھا۔ شاید بیڈ کا کونا اس کے سر پر لگا تھا یا کوئی اور وجہ تھی۔

روشنی کا دوپٹہ اس کے بھاری بھرکم وجود کے نیچے دب گیا تھا۔ روشنی کا تو اس کی طرف دھیان ہی نہیں آتا تھا۔

بے بس بے سدھ سے ظفری کو دیکھا تھا۔ اور سر پٹ موڑ لی تھی۔

بے بس بے سدھ سے ظفری کو دیکھا تھا۔ اور سر پٹ موڑ لی تھی۔

بے بس بے سدھ سے ظفری کو دیکھا تھا۔ اور سر پٹ موڑ لی تھی۔

بے بس بے سدھ سے ظفری کو دیکھا تھا۔ اور سر پٹ موڑ لی تھی۔

بے بس بے سدھ سے ظفری کو دیکھا تھا۔ اور سر پٹ موڑ لی تھی۔

بے بس بے سدھ سے ظفری کو دیکھا تھا۔ اور سر پٹ موڑ لی تھی۔

بے بس بے سدھ سے ظفری کو دیکھا تھا۔ اور سر پٹ موڑ لی تھی۔

بے بس بے سدھ سے ظفری کو دیکھا تھا۔ اور سر پٹ موڑ لی تھی۔

بے بس بے سدھ سے ظفری کو دیکھا تھا۔ اور سر پٹ موڑ لی تھی۔

بے بس بے سدھ سے ظفری کو دیکھا تھا۔ اور سر پٹ موڑ لی تھی۔

بے بس بے سدھ سے ظفری کو دیکھا تھا۔ اور سر پٹ موڑ لی تھی۔

بے بس بے سدھ سے ظفری کو دیکھا تھا۔ اور سر پٹ موڑ لی تھی۔

بے بس بے سدھ سے ظفری کو دیکھا تھا۔ اور سر پٹ موڑ لی تھی۔

بے بس بے سدھ سے ظفری کو دیکھا تھا۔ اور سر پٹ موڑ لی تھی۔

بے بس بے سدھ سے ظفری کو دیکھا تھا۔ اور سر پٹ موڑ لی تھی۔

بے بس بے سدھ سے ظفری کو دیکھا تھا۔ اور سر پٹ موڑ لی تھی۔

بے بس بے سدھ سے ظفری کو دیکھا تھا۔ اور سر پٹ موڑ لی تھی۔

بے بس بے سدھ سے ظفری کو دیکھا تھا۔ اور سر پٹ موڑ لی تھی۔

بے بس بے سدھ سے ظفری کو دیکھا تھا۔ اور سر پٹ موڑ لی تھی۔

بے بس بے سدھ سے ظفری کو دیکھا تھا۔ اور سر پٹ موڑ لی تھی۔

بے بس بے سدھ سے ظفری کو دیکھا تھا۔ اور سر پٹ موڑ لی تھی۔

بے بس بے سدھ سے ظفری کو دیکھا تھا۔ اور سر پٹ موڑ لی تھی۔

بے بس بے سدھ سے ظفری کو دیکھا تھا۔ اور سر پٹ موڑ لی تھی۔

بے بس بے سدھ سے ظفری کو دیکھا تھا۔ اور سر پٹ موڑ لی تھی۔

بے بس بے سدھ سے ظفری کو دیکھا تھا۔ اور سر پٹ موڑ لی تھی۔

بے بس بے سدھ سے ظفری کو دیکھا تھا۔ اور سر پٹ موڑ لی تھی۔

بے بس بے سدھ سے ظفری کو دیکھا تھا۔ اور سر پٹ موڑ لی تھی۔

”مجھے یہ بتائیے اتنی رات کو آپ وہاں کس مرض کی دوا لینے گئی تھیں؟ نیند نہیں آتی تو نکل کر کمرے میں بیٹھ کر سو گئی۔“

وہ سچ گھسے میں تھا۔ اسی ماحول کا پروردہ تھا۔ اور بچہ بھی نہیں تھا۔ روشی کا حلیہ۔ گھبرایا ہوا لہجہ۔ خبر نہ کرنے کی تاکید اور بالآخر خساروں پر پھیلنے ہوئے آنسو۔

”یہ آپ کو سوجھی کیا تھا کہ نعیم صاحب کو فون کرتے کرتے پیچھے چلی گئیں؟“

نہ جانے کیوں اس نے اس مرتبہ روشی کا بہت تفصیل سے جائزہ لیا تھا۔

”دوپٹہ آپ کا وہیں ہے؟“ اس کا انداز بہت عجیب سا تھا۔

”ہیں.....؟“ روشی نے ہڑبڑا کر اپنے سر آپے پر نظر ڈالی۔ جی چاہا ز میں پھٹ جائے اور وہ اس میں نہ رہے۔ وہ اس کے شانے سے سر نکال کر بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

”آپ کو میرے ساتھ آنے کی ضرورت نہیں۔ آپ اپنے بیڈ روم میں چلے۔ دوپٹہ وہیں پہنچا دوں گا۔“ اس نے آہستگی سے روتی ہوئی روشی کو خود سے الگ کیا۔ گریبان کے مٹن بند کرتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

روشی نے ہتھیلیوں سے آنکھیں رگڑیں اور آہستہ قدموں سے اپنے کمرے کی طرف چل پڑی۔ سولہ کمرے میں پہنچ کر اس نے سب سے پہلے آئینے میں خود کو دیکھا۔ دل دھک سے رہ گیا۔ شانے

آستین سے اس کا سفید بازو تھوڑا سا جھانک رہا تھا۔ اب اس نے خود کو باری کی نظر سے دیکھا۔ ایک بوجھ مائل۔ ”کیا سہہ چڑ رہا ہوگا۔ میرا حلیہ دیکھ کر۔“ ملال و خجالت سے اس کی بری حالت ہو گئی۔

وہ وارڈ روب سے کپڑے نکالنے لگی۔ ”پتا نہیں یہ بھابی کہاں چلی گئیں؟“ کچھ دیر پہلے کی صورتحال۔ سرے سے جھرجھری آگئی۔ ”اف تو بہ کس قدر وحشت ہے ظفیری بھائی میں۔ بے چاری بھابی..... مگر وہ تو بھابی

بہن ہوں..... لا حول و لا قوۃ..... وہ تو اپنا رمل ہیں، انہیں کیا پہچان رشتوں کی.....؟ یا اللہ میری توبہ جو کبھی نہ جاؤں۔“ اس نے دہل کر کانوں کو ہاتھ لگایا۔

وہ کپڑے تبدیل کر کے بستر پر آئی ہی تھی کہ..... دروازے پر دستک ہوئی۔ وہ سمجھ گئی کہ باری ہے۔ شانوں پر پھیلا یا اور ہچکچاتی ہوئی دروازے تک آئی اور دروازہ کھول دیا۔

”یہ لیجیے اپنی امانت۔“ اس نے دوپٹہ روشی کو تھمایا۔ اور تیزی سے واپس پلٹ گیا۔ ایک لمحے کی تاخیر کے وہ اسے جاتا دیکھتی رہی۔

پھر عجب دل شکستہ سی کیفیت میں دروازہ بند کر کے اپنے بستر پر واپس آ گئی۔ نیند کا تو دور دور کا دور تھا۔ اس کروٹ کبھی اس کروٹ۔ کبھی اونڈھی کبھی سیدھی۔ ہر طرح کے جتن اس نے کر ڈالے تھے۔

”کیسا عجیب حلیہ ہو رہا تھا۔ کیا سوچ رہا ہوگا باری۔ کیا کچھ اس کے ذہن میں آ رہا ہوگا۔“ طرح طرح کے دوسووں نے اس کی جان ہلکان کر رکھی تھی۔ بولنا اور پوچھنا تو اس کی لغت میں شامل ہی نہیں ہے۔ کیا ہو سکتا ہے۔

”سب کچھ ان کی وجہ سے ہوا۔ اتنی رات کو کہاں نکل گئیں؟“

اس نے اپنے ہاتھ دبانا شروع کر دیے۔ اتنے وحشیانہ انداز میں ظفیری نے اس کی کھانیاں دبوچی تھیں کہ ابھی تک درد

دہلیا رہی۔ سوچتی رہی۔ یہاں تک کہ دریا بستی کی اکلوتی مسجد سے اذان کی آواز آنے لگی۔

اپنے سینے ہو رہی تھی۔ دودو ہانڈیاں چولہوں پر دھری تھیں۔ کسی میں کھد بد کسی میں چھن من ہو رہی تھی۔

بڑی سے ہری مرچیں بھی کاتی جاتی تھی۔ اور ہانڈی میں چچ بھی چلاتی جاتی تھی۔ گرمی جسم پر کم اور دماغ پر زیادہ چڑھ

رہی۔ ایک تھال میں آٹا بھی چھنا رکھا تھا۔ جسے ابھی گوندھنا تھا۔

”بھابی!..... خدا حافظ۔“

گچا تھ سے چھوٹے چھوٹے بچا..... اس نے کھڑکی کے پٹ پر ٹکٹا دوپٹہ کھینچا۔ اور مڑ کر دروازے کی طرف دیکھا۔

باہر بیٹ..... آف وہائٹ شرٹ اور ہاتھ میں براؤن چرمی بیگ تھا۔ عارف الوداع کہہ رہا تھا۔

”جی تو دل ہی دل میں وہ اسے جی بھر کر برا بھلا کہہ کر فارغ ہوئی تھی۔“

”آپ..... کہاں جا رہے ہیں؟“ اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

”کہنہ کہیں تو جائیں گے ہی۔ میں ذرا جلدی میں ہوں۔ ایسا نہ ہو خان آجائے اور پھر مجھے روک لے خدا حافظ۔“

”نہیں تو..... آپ اس طرح نہیں جاسکتے۔ آپ فکر نہ کریں۔ اور یوں بھی اب میں بہت بہتر محسوس کر رہا ہوں۔“

”مجھے۔“ ٹیک ٹھاک دکھائی نہیں دے رہا؟“

”اٹن کر ایک دم سیدھا ہو گیا۔“

اس کا تہ خاصا دراز تھا۔ بالوں کو سر اٹھا کر دیکھنا پڑا۔

اس نے پہلی مرتبہ عارف کا قدرے بشاش چہرہ دیکھا تھا۔ تازہ شیو کی نیلا ہٹوں کا عکس واضح تھی۔ مونچھیں نہایت

نہایت سے تراشی ہوئی تھیں۔ سیاہ گھوڑ آنکھوں میں چمک آگئی تھی۔ بالوں کا اسٹائل بہت نفیس اور پروقار تھا۔

”نہایت دیکھ رہی ہیں؟“ اسے اپنی جانب..... غور سے دیکھتا پا کر بے ساختہ مسکرا دیا۔ بالوں نے جھینپ کر اپنی نظروں

”نہایت کیا محنت..... بقول لال خان کے آپ کے بہت مقروض ہیں وہ۔“ بالوں نے نظریں جھکائے جھکائے رسائیت

بجز اخلاص کیا خوبی ہے اس میں!

”میں آپ کے ذہن سے بوجھ اتار دینا چاہتا ہوں۔“
 وہ بہت پر غصہ اور جیسے لہجے میں اس سے مخاطب تھا۔

ارے صاحب نیت نادار ہے دل!

”ہم تو درحقیقت یہی سمجھتے ہیں کہ اس کی محبت کے جواب میں ہم مفلس ہی ہیں۔ خیر جانے دیجئے۔“

”ارے سوال ہی پیدا نہیں ہوتا میرے پیچھے پڑ جائیگے وہ۔ وہ آجائیں پھر چلے جائیں تو ٹھیک ہے۔“

نہیں سنیں گے۔ کیوں میری جان مصیبت میں ڈال رہے ہیں آپ۔“ بالوں نے قطعی انداز میں اسے آگے بڑھ کر دیکھا۔
 ”پلیز بھابی..... مجھے جانے دیجئے۔“ عارف نے پلٹنے کو پر تو لے۔

”چلے جائیے گا۔ روک کون رہا ہے۔ مگر ”ان“ کے آنے کے بعد۔“ اس نے دوپٹے سے چہرہ پونچھ لیا۔

ہلکا سا مظاہرہ کیا۔ شاید یہ رعایت یوں ہوئی کہ وہ جارہا تھا۔

”اتنا تو خیر میں سمجھتی ہوں کہ مردوں کو بہت سے کام ہوتے ہیں۔ کتنے دن بیٹھ کر گزارا ہو سکتا ہے؟“

کرتے ہوں گے۔“ بالوں نے پلٹ کر ہانڈی میں چیخ بھلایا۔

”کام تو ہم سب کر چکے ہیں۔ اب تو بس اس دنیا سے روائگی کا انتظار ہے

منحصر مرنے پہ جو جس کی امید

ناامیدی اس کی دیکھا چاہیے

وہ دھیرے سے ہنس دیا۔

”اور ہاں بھابی۔ ایک سوال کا جواب آپ پر ادھار چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ جب کبھی میری طرف سے فائدہ

اطمینان ہو تو مجھے جواب سے ضرور نوازئیے گا۔ ورنہ خلش رہے گی۔“ وہ بیک رکھ کر دونوں ہاتھ سینے پر پلٹ کر

مخاطب تھا جیسے امید ہو کہ جواب ابھی مل جائے گا۔ وہ اس سے وضاحت طلب کرے گی۔ جواباً وہ سوال دہرائے

کے منہ سے بے ساختہ جواب نکل جائے گا۔

بالوں نے چونک کر اس کی صورت دیکھی۔ ”کیسا جواب؟“ اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

”آپ کو کیا کمی ہے؟ کسی بات کی فکر ہے؟ پھر آپ کی روح کیسے تھکن سے چور چور ہوگئی۔ جس دن سے

بات کہی ہے۔ میں سکون سے سو نہیں پایا۔ اور آپ مجھ سے مخاطب بھی یوں تھی جیسے خطا کار بھی میں ہوں۔ میرا

دکھ پہنچا۔“

بالوں نے گھبرا کر اس کی طرف سے پشت پھیر لی۔ ”خدا حافظ۔ کوئی بات نہیں۔ میں ان کو سمجھا لوں گی۔“

مجھ پر غصہ ہی کریں گے۔“ وہ چولہے کی آنچ بڑھا کر پوری تندہی سے مسالا بھوننے لگی۔

”میں بچہ نہیں ہوں بھابی! الٹرا ساؤنڈ مشین کا نام سنا ہے آپ نے؟ دنیا کے دھوکے اور دھکے کھا کر

گئی ہیں میری حسیں۔ آپ ٹالنا چاہیں تو دوسری بات۔ اگر اس سارے قصے میں میں ملزم نہ ہوتا تو آپ سے

کے سوالات نہ کرتا۔ مگر اس دن آپ نے مجھ پر براہ راست الزام لگایا تھا کہ میں نے آپ کی روح میں

تو عالم بے خبری میں بھی آپ کا بھلا چاہنے والوں میں سے ہوں۔ میری نیت خدا جانتا ہے۔ ہو سکتا ہے آپ

”پہلے سوال کا جواب نہیں آیا اور دوسرا سوال تیار۔“ عارف نے بیگ دوبارہ اٹھالیا۔ شاید اس

”پہلے سوال کا جواب نہیں آیا اور دوسرا سوال تیار۔“ عارف نے بیگ دوبارہ اٹھالیا۔ شاید اس

”پہلے سوال کا جواب نہیں آیا اور دوسرا سوال تیار۔“ عارف نے بیگ دوبارہ اٹھالیا۔ شاید اس

”پہلے سوال کا جواب نہیں آیا اور دوسرا سوال تیار۔“ عارف نے بیگ دوبارہ اٹھالیا۔ شاید اس

”پہلے سوال کا جواب نہیں آیا اور دوسرا سوال تیار۔“ عارف نے بیگ دوبارہ اٹھالیا۔ شاید اس

”پہلے سوال کا جواب نہیں آیا اور دوسرا سوال تیار۔“ عارف نے بیگ دوبارہ اٹھالیا۔ شاید اس

”پہلے سوال کا جواب نہیں آیا اور دوسرا سوال تیار۔“ عارف نے بیگ دوبارہ اٹھالیا۔ شاید اس

”پہلے سوال کا جواب نہیں آیا اور دوسرا سوال تیار۔“ عارف نے بیگ دوبارہ اٹھالیا۔ شاید اس

”پہلے سوال کا جواب نہیں آیا اور دوسرا سوال تیار۔“ عارف نے بیگ دوبارہ اٹھالیا۔ شاید اس

”پہلے سوال کا جواب نہیں آیا اور دوسرا سوال تیار۔“ عارف نے بیگ دوبارہ اٹھالیا۔ شاید اس

”پہلے سوال کا جواب نہیں آیا اور دوسرا سوال تیار۔“ عارف نے بیگ دوبارہ اٹھالیا۔ شاید اس

”پہلے سوال کا جواب نہیں آیا اور دوسرا سوال تیار۔“ عارف نے بیگ دوبارہ اٹھالیا۔ شاید اس

”پہلے سوال کا جواب نہیں آیا اور دوسرا سوال تیار۔“ عارف نے بیگ دوبارہ اٹھالیا۔ شاید اس

”پہلے سوال کا جواب نہیں آیا اور دوسرا سوال تیار۔“ عارف نے بیگ دوبارہ اٹھالیا۔ شاید اس

”پہلے سوال کا جواب نہیں آیا اور دوسرا سوال تیار۔“ عارف نے بیگ دوبارہ اٹھالیا۔ شاید اس

”پہلے سوال کا جواب نہیں آیا اور دوسرا سوال تیار۔“ عارف نے بیگ دوبارہ اٹھالیا۔ شاید اس

”پہلے سوال کا جواب نہیں آیا اور دوسرا سوال تیار۔“ عارف نے بیگ دوبارہ اٹھالیا۔ شاید اس

”پہلے سوال کا جواب نہیں آیا اور دوسرا سوال تیار۔“ عارف نے بیگ دوبارہ اٹھالیا۔ شاید اس

”پہلے سوال کا جواب نہیں آیا اور دوسرا سوال تیار۔“ عارف نے بیگ دوبارہ اٹھالیا۔ شاید اس

”پہلے سوال کا جواب نہیں آیا اور دوسرا سوال تیار۔“ عارف نے بیگ دوبارہ اٹھالیا۔ شاید اس

”پہلے سوال کا جواب نہیں آیا اور دوسرا سوال تیار۔“ عارف نے بیگ دوبارہ اٹھالیا۔ شاید اس

”پہلے سوال کا جواب نہیں آیا اور دوسرا سوال تیار۔“ عارف نے بیگ دوبارہ اٹھالیا۔ شاید اس

”پہلے سوال کا جواب نہیں آیا اور دوسرا سوال تیار۔“ عارف نے بیگ دوبارہ اٹھالیا۔ شاید اس

”پہلے سوال کا جواب نہیں آیا اور دوسرا سوال تیار۔“ عارف نے بیگ دوبارہ اٹھالیا۔ شاید اس

”پہلے سوال کا جواب نہیں آیا اور دوسرا سوال تیار۔“ عارف نے بیگ دوبارہ اٹھالیا۔ شاید اس

”پہلے سوال کا جواب نہیں آیا اور دوسرا سوال تیار۔“ عارف نے بیگ دوبارہ اٹھالیا۔ شاید اس

”پہلے سوال کا جواب نہیں آیا اور دوسرا سوال تیار۔“ عارف نے بیگ دوبارہ اٹھالیا۔ شاید اس

جیسے سب کچھ بھلا بیٹھی۔“

”ارے نہیں بھابی ایسی کوئی بات نہیں..... جدھر جدھر ہم پاؤں رکھ دیں، وہیں رونق ہو جاتی ہے۔ یہ تو بے ادب درمیں بھی آرام سے رہ سکتی ہے۔ مگر روشی کے ساتھ رہنا اس کی اپنی ”فرمائش“ ہے۔“

”ہے۔“

جی..... من رہا ہوں۔“

”یہ کیا ہے آپ کا؟“

میں کیا کہہ سکتا ہوں؟“

”سرور صاحب..... اگر اس کے معیار کے مطابق کوئی رشتہ مل جائے تو اور اچھا ہوگا۔“

”یہ نہیں۔ ہمیں اپنے اپنے گھر کی ہیں۔ اور میرے سامنے یہ پھیلا ہوا کاروبار۔ یہاں پاکستان میں مجھے سیٹ

نے شہر و رات لگ جائے گا۔ ہیلو۔

”جی۔ جی میں رہا ہوں۔“

”ابنہن والہس جلی گئی ہے۔ اپنے دادا کے ساتھ۔“

”جیہے..... آپ کا انتظار کروں گا۔ او۔ کے۔ گڈ نائٹ“۔ نعمان نے ریسیور رکھ دیا تھا۔ مگر یاد علی خان کے ہاتھ

۱۔ منیر بیبرقہ۔ ان کی آنکھیں گہری سوچ کی غماز تھیں۔

نہانے ایک ٹن پٹس کیا۔ ”ہاں..... جعفری..... دریا بستی ملاؤ۔ روشمانے سے بات کراؤ۔“

”چند چہرے انتظار کرتا ہوں۔ تب جا کر جعفری کی آواز سنائی دی۔“

”مگر دشمنانے..... بات کیجئے۔۔۔“ ”ہیلو!“ ان کی آواز خاصی دھیمی تھی۔

”میں نے“

”نہیں! کیسے ہیں آپ؟“ روشی کی آواز پر مرثدہ سی تھی۔

”جی ہاں بیٹے۔ تمہیں کیا ہوا۔ کیسی کمزوری آواز ہو رہی ہے۔ تمہاری طبیعت ٹھیک ہے؟“

میں بالکل ٹھیک ہوں۔ آپ نے اس وقت کیسے یاد کیا۔ شاید ابھی فرصت ملی ہوگی آپ

”بچہ ہمارے بات کرنے کیلئے فرما۔“

”موت کو بہت کرنے کیلئے فرمت کا انتظار کیا نہیں کیا جاتا۔ فرمت نکالی جاتی ہے۔“

تو محمدؐ سے انداز میں کہہ رہے تھے۔

تہذیب و تمدن کی شہرہ آفاق

”بہر حال میں ہوں گے؟“

”خیریت پیا؟“ روشانی کی آواز میں حیرت واضح تھی۔

”خیریت ہی ہے بیٹے۔ کوئی خاص بات نہیں۔ تم بتاؤ کب تک فارغ ہوگی؟“ ان کا انداز ہرستور۔
”میرے فارغ ہونے میں تو پندرہ بیس دن ہیں۔“ اس نے الجھے الجھے انداز میں جواب دیا، جیسے کہ وہ
”آخری پیر سے ایک دن پہلے مجھے مطلع کر دینا۔ ٹھیک ہے؟“

”میں کچھ سمجھ نہیں رہی پیا۔ آئی ایم سوری۔“ وہ ہچکچاتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

”میں ڈرائیور کو بھیج دوں گا۔ وہ تمہیں یہاں لے آئے گا۔“

”مجھے..... آپ کے پاس؟“ وہ حیرت سے پوچھ رہی تھی ”وہ کیوں؟“

”بچے اپنے باپ کے پاس کیوں رہتے ہیں؟“ وہ یہی کہہ سکے۔

”بالکل ٹھیک پیا۔ میں خود ہمیشہ کیلئے آپ کے پاس رہنا چاہتی ہوں۔ ورنہ مجھے کچھ ہو جائے گا۔“

گئی۔ ”آپ نے بہت مشکل وقت میں مجھے اچھی امید ہے دی۔ ٹھیکس فاریت۔“ وہ رونے لگی۔

”روشی..... کیا بات ہے؟“ وہ جیسے گہری نیند سے سنبھل گئے۔

”کچھ نہیں پیا..... آپ بھی اتنا یاد نہیں آتے جتنا امی یاد آتی ہیں۔“ وہ رو پڑی تھی۔

”کیا ہوا ہے؟ تم تو بہت خوش خوش گئی تھیں۔“ وہ مضطرب ہو گئے۔

”خوش نظر آنے اور خوش ہونے میں بہت فرق ہے پیا!“

”تم کیوں پر اہل خود پر سوار کرتی ہو۔ تمہیں میرا اعتبار نہیں۔ اور پھر تمہارا اپنا بھائی وہاں موجود ہے۔ تم۔“

کرتا ہے۔ تم اپنے معاملات اس سے شیر کر سکتی ہو۔“

”روشی..... بیٹے جب تم بہت چھوٹی تھیں تب تو تم نے مجھے کبھی ڈسٹرب نہیں کیا۔ اور اب اتنی سمجھدار ہو کر۔“

”پیا..... آپ مجھے گارنٹی دیں کہ آپ کبھی میری شادی نہیں کریں گے پھر ہی میں آپ کی کوئی بات سنوں۔“

فطری ضد عود کر آئی تھی۔

”خدا نہ کرے کہ تمہاری شادی کبھی نہ ہو۔ فی الحال کی گارنٹی دے سکتا ہوں۔ بیٹیاں اپنے گھر والوں سے۔“

”ہیں۔“

”لگتا ہے پھر کوئی بات ہو گئی ہے۔ کیا ہوا ہے؟“

”یہاں میری شادی کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ ایسی پریشانی میں میں سپردے سکتی ہوں۔“ وہ بسوری۔

یاور علی خان مسکرا دیئے ”لاحول ولا قوۃ۔“ بھئی ہم نے تو سنا ہے جس دن بیٹی پیدا ہوتی ہے اس دن سے

تیاریاں بھی شروع ہو جاتی ہیں۔ تمہاری امی کے پاس ایک بہت خوبصورت میروں دوپٹا تھا۔ سچے کام سے

مجھے دکھاتے ہوئے کہنے لگیں۔ یہ کام کبھی خراب نہیں ہوگا۔ یہ میں روشنی کیلئے رکھ رہی ہوں۔ تیاریوں کا

”ہیں۔“

روشی ہم خودی ہو گئی۔ جیسے اسے اپنے کانوں پر اعتبار نہ آرہا ہو۔ اس نے یاور علی خان کے منہ سے پہلی بار اپنی ماں کا ذکر
سنا۔ ”پیا۔“

”جی بیٹے۔“

”میری امی بہت حسین تھیں اور جب حسین عورت محبت نچھاور کرتی ہے تو اور بھی حسین ہو جاتی ہے۔ جب وہ مجھے پیار
کرتی ہیں گی تو کتنی پیاری لگتی ہوں گی۔ کیوں پیا؟“ روشنی کی رو بہک چکی تھی۔

بابا علی خان نے سانس اندر کھینچا۔ ”جواد حویلی میں ہے یا کہیں گیا ہوا ہے؟“ روشنی ڈھیلی سی ہو کر کرسی پر ڈھس گئی۔

”بہنہ اتنی جلدی یہاں سے وہاں ہو جاتے ہیں کہ بس۔ کیا تھا جو دو چار باتیں امی کی اور کر لیتے۔ اس نے منہ بنا لیا۔

”نیک ہے پیا۔ میں سپر کے بعد آ جاؤں گی۔ مگر ایک شرط ہے۔ آپ مجھے امی کی بہت ساری اچھی اچھی باتیں

”بیٹے۔“ وہ بچوں کی طرح مچلی۔

”ہو سکتا ہے ماضی کے مدفن کھودنے اور خوشی دریافت کرنے کی بجائے اللہ تمہیں۔ زندہ موجود اور تازہ خوشی سے نواز

دے۔ اس لئے اپنے باپ کو شرطوں میں ممت الجھاؤ۔“ ان کے لہجے میں ٹھکن اتر آئی۔

”شیر؟“ روشنی کی آواز میں حیرت آمیز خوشی تھی۔

”بی۔“ انہوں نے آہستگی سے کہا۔

”اگر ایسے امکانات ہیں تو میں کوئی شرط نہیں رکھوں گی۔“

”شاہش۔ بہت سمجھدار ہے میری بیٹی۔ اچھا..... خدا حافظ۔“ انہوں نے ریسور رکھ دیا۔ اور سگریٹ سلگانے لگے۔

”باز۔ جب روشنی کی شادی ہو جائے گی اور جواد باہر چلا جائے گا تو ہم کیا کریں گے؟“

”وہ کارپٹ پر گھٹنوں کے بل بیٹھی جواد کو بہت انہماک سے شوز پہنا رہی تھی۔

”مجھ کو خیال ہے تمہارا۔ دن بارہ بچے ٹھیک ہے۔ جو ہمارے اینڈ تک کام آتے رہیں۔“

”بیٹہ بڑا بڑا بڑا سے ٹیک لگائے اخبار دیکھ رہے تھے۔ نظریں اٹھائے بغیر کھڑا لگایا۔

”صوبہ آپ سے بھی۔ بات کیا ہوتی ہے آپ کیا بنا دیتے ہیں۔“ نازنین نے سر ہی پیٹ لیا تھا۔

”جی۔“ مجھے تو تمہاری محبت تمہارے حسن کا خیال ہے۔ ورنہ بچے بہت سارے ہوں تو خوب رونق رہتی ہے۔ ماں

”پہلے زندگی میں۔“ انہوں نے پھر چھینا تھا۔

”بہنہ!۔“ مجھے نہیں پسند ڈھیروں بچے جو ماں کو اتنا تھکا دیں کہ وہ ٹھیک سے ان کی تربیت بھی نہ کر سکے۔“ وہ ڈرینگ

”بچے سے کتنی غمناک لگتی اور جواد کے بال بنانے لگی۔

”جواد بچوں کے چھوٹے چھوٹے کاموں سے خوش ملتی ہے۔ وہ بھی غارت ہو جاتی ہے۔“ اس نے جواد کے پھولے

”پہلے چھوٹے پیار کیا۔“

یاد علی خان ایش ٹرے میں راکھ جھاڑ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ اور پتا سوکھ تھری ان دن کے قریب دیکھنے لگے۔ کبھی کبھی ان کا موڈ بنتا تھا۔

ایک ریکارڈنگ کرائیو نے سوئی ٹکائی اور واپس اپنے بیڈ پر آ گئے۔
کمرے میں مکیش کی پرسوز آواز پھیلنے لگی۔

جانے کہاں گئے وہ دن کہتے تھے تیری راہ میں
نظروں کو ہم بچھائیں گے
ان کی آنکھوں کی سرنخی بڑھنے لگی۔ سگریٹ سلگ سلگ کر اگلیوں تک آ پہنچا۔

وہ جی بھر کر سوئی تھی۔ شاید اس لئے کہ کئی راتوں سے بے آرام تھی۔

نہا دھو کر کمرے میں ناشتا کیا۔ ناشتے کے دوران ہی کلو بڑی امی کا پیغام لے کر آ گئی۔ کہ وہ ہال میں بلائی۔
اس نے کوفت بھرا منہ بنا کر چائے کا کپ ٹیبل پر رکھ دیا۔

”پھر لیے بیٹھی ہوں گی جوڑے گہنے۔ کیا مصیبت ہے۔“ اس نے دو پٹا شانوں پر پھیلا دیا۔ ”سوچ رہی ہو؟“
چائے اور پیوں گی۔ وہ بڑا تکی ہوئی باہر آ گئی۔

”ہال کمرے میں آئی تو منظر کچھ نئے انداز کا تھا۔ گلو شین لیے بیٹھی تھیں۔ مونا کروشیے سے گلے اور آستینیں
کر رہی تھی۔ زری کپڑے تراش رہی تھی۔ باقی لڑکیاں اسے گھیرے بیٹھی تھیں۔ بڑی امی صوفے پر بیٹھی تھیں۔
لیٹر پیڈ اور قلم لیے بیٹھا تھا۔

”السلام علیکم۔“ اس نے باری کی طرف سے نظریں چرا کر آہستگی سے سلام کیا۔

”وعلیکم السلام۔ جیتی رہو۔“

”بیٹی... دن چڑھے تک سونے سے نیستی ہوتی ہے۔ یاد رہے چار دن میں تمہاری عادتیں بگاڑ دیں۔ اور پھر
سب چل جاتا ہے۔ دوسرے گھر جاؤ گی تو سب ایک ایک بات نوٹ کریں گے۔ زندگی تو سب ہی کی گزر جاتی ہے۔
طرح گزارنے کی کوشش کرنا چاہیے۔ خواہ مخواہ کی بد مزگی سے فائدہ؟“
وہ ان سے تھوڑے فاصلے پر موڑھے پر بیٹھ گئی۔

”وہ میں نے تمہیں ایک کتاب دی تھی ڈیزائن پر نشان لگانے کو۔ لگا دیا؟ یہ باری جا رہا ہے دو دن کیلئے لکھنا
کام سے۔ اسی کے ہاتھ بھجوا دیتی ہوں۔ کچھ چیزیں میں بھی منگوا رہی ہوں۔ تمہاری ساس کو پیسے بھجوا رہی ہوں۔
باری کو دے دیں گے۔“

”تمہیں کچھ منگوانا ہو تو لکھواؤ۔“ انہوں نے اس کا چہرہ بغور دیکھا۔ ”طبیعت تو ٹھیک ہے؟ کتنی دیر تک بیٹھا
انہیں اس کا چہرہ بہت بدلا ہوا محسوس ہوا۔

”کچھ نہیں بڑی امی۔ ٹھیک ہوں میں۔ اور ڈیزائن پر نشان لگانا مجھے یاد نہیں رہا۔ آپ خود ہی لگا دیں۔“ وہ سرد مہری سے

”یہ کیا ہے اگر تمہارے نانا کا انتقال نہ ہوتا تو کل پرسوں تو تمہاری بارات بھی ہو جاتی۔ تمہیں ایسے کون سے کام
ہوتے ہیں۔ یاد نہیں رہا؟“ وہ ناراض ہو رہی تھیں۔ ”جدہ گئی۔ کلو کو بتاؤ کہاں رکھی ہوئی ہے کتاب۔ اٹھالائے گی۔ میں خود لگا
دوں۔“ اب دیکھو ناں اتنی دور سے بھجوائی ہے۔ کیا سوچیں گے وہ؟ پہلے کب ہم نے اس طرح پرواہ کی ہے کسی کی۔
بہت اہم ہے۔ آخر کو۔“

”یہ میرے کمرے میں انصاری پر رکھی ہے ایک سنہری جلد کی کتاب۔ لا کر بڑی امی کو دیدو۔“ اس نے بیزار کر

”رات میں یاد سے بات کرنا چاہ رہی تھی۔ مگر ان کے فون بڑی مل رہے تھے۔ تم ذرا اب ان کے دفتر ملا کر دیکھنا۔ اور
”یہ پیغام دے دینا کہ ایک آدھ روز کیلئے حویلی آ جائیں۔“ وہ روشنی سے مخاطب تھیں۔

”بڑے ہاتھ پر خراشیں کیسی ہیں۔ کہیں گر پڑی تھیں۔“ مالم تاب کی نظریں اس کے سیدھے ہاتھ کی پشت پر ٹھہر
نیز میں اس لئے بھی واضح ہو رہی تھیں کہ ان پر کھرٹا آچکا تھا۔

”نئے لائے ہاتھ سے سیدھا ہاتھ ڈھانپ لیا۔“ کچھ نہیں بڑی امی ایسے ہی۔“ اس نے قدرے گھبرا کر باری کی طرف
”یہ تو وہی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اسے اپنی طرف دیکھتا پا کر جھٹ سامنے سینٹری پر نظریں جمادیں۔

”بھڑک۔ دکھاؤ مجھے۔ تمہاری شادی کے دن قریب ہیں۔ اپنا خیال کرنا چاہیے اور لائے سیدھے نشان سجا کر بیٹھ رہی
”یہ تو مجھے کیا کر کے بیٹھی ہو۔“ انہوں نے تحکسانہ انداز میں اسے اپنے پاس آنے کو کہا۔ چاروٹا چاراسے اٹھنا پڑا۔

”کچھ نہیں بڑی امی۔ ٹھیک ہو جائے گا۔“

”مالم تاب نے اس کا ہاتھ تمام کر دیکھا۔“ کیا تاس مار رکھا ہے ہاتھ کا۔ کچھ لگاؤ اس پر۔ لگتا ہے کسی نے کھسوٹ ڈالا ہے۔
”یہ تو مجھے کیا کر کے بیٹھی ہو۔“ اس نے سیدھے کام کرتی پھرتی ہو۔

”گھر نہ کریں ان کی طرف سے۔ بہت بہادر ہیں۔“ باری نے پیڈ سے صفحہ پلیدہ کیا۔
”یہ تو مجھے کیا کر کے بیٹھی ہو۔“ انہوں نے تحکسانہ انداز میں اسے اپنے پاس آنے کو کہا۔ چاروٹا چاراسے اٹھنا پڑا۔

”یہ تو مجھے کیا کر کے بیٹھی ہو۔“ انہوں نے تحکسانہ انداز میں اسے اپنے پاس آنے کو کہا۔ چاروٹا چاراسے اٹھنا پڑا۔

”یہ تو مجھے کیا کر کے بیٹھی ہو۔“ انہوں نے تحکسانہ انداز میں اسے اپنے پاس آنے کو کہا۔ چاروٹا چاراسے اٹھنا پڑا۔

”یہ تو مجھے کیا کر کے بیٹھی ہو۔“ انہوں نے تحکسانہ انداز میں اسے اپنے پاس آنے کو کہا۔ چاروٹا چاراسے اٹھنا پڑا۔

”یہ تو مجھے کیا کر کے بیٹھی ہو۔“ انہوں نے تحکسانہ انداز میں اسے اپنے پاس آنے کو کہا۔ چاروٹا چاراسے اٹھنا پڑا۔

”نہیں..... بس..... روشنی کی ساس کو ہمارا بہت بہت سلام کہنا“۔ اگر وہ لوگوں تمہیں کھانے پر بلا کر تو بہت
 ”ٹھیک ہے“۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ ”اور کوئی حکم؟“
 ”نہیں۔ اور کچھ نہیں۔ بس کچھ بھولنا نہیں۔“

”ذرا سن گن لینے کی کوشش کرنا، وہ کس تاریخ میں دلچسپی لے رہے ہیں“۔ مونانے آہستگی سے کہا۔ اسے پہلے
 کی تیاری کیلئے وقت کا تعین کرنا تھا۔ کچھ روشنی کو بھی چھیڑنے کی کوشش تھی۔

”میں براہ راست بھی ٹاک کر سکتا ہوں۔ صرف اجازت درکار ہے“۔ وہ روشنی کے پاس سے گزرتے ہوئے
 منہ میں بولا۔

روشنی ٹیٹھی اپنی ہتھیلیاں مسلتی رہی۔

جیسے ہی عالم تاب باہر جانے کو اٹھیں۔ روشنی بھی ان کے پیچھے چل پڑی۔

”روشنی تم کہاں جا رہی ہوں؟“ زری نے ٹوکا۔

”آ رہی ہوں ابھی“۔ وہ تیزی سے عالم تاب کے پیچھے نکل گئی۔

بڑی امی اپنے کمرے کی طرف اور وہ اوپر جانے والے زینے کی طرف بڑھی تھی۔

باری تو لیہ گلے میں لٹکائے وارڈروب سے کپڑے نکال رہا تھا۔ وہ بہت خاموشی سے دروازے کے درمیان
 تھی۔

”میں تم سے لڑنے نہیں آئی ہوں باری، بس ایک بات کرنا ہے تم سے۔“

”مگر مجھے آپ سے کوئی بات کرنا ہے نہ سننا ہے۔ معافی چاہتا ہوں۔ یوں بھی مجھے ذرا جلدی ہے۔“

”اس طرح کیوں بات کر رہے ہو؟“ اسے رونا سا آگیا۔

باری اپنے کپڑے لے کر باتھ روم کی طرف بڑھا۔ ”مجھے افسوس ہے روشنی بی بی میں واقعی جلدی میں ہوں۔“
 سے باتھ روم میں داخل ہوا اور دروازہ بند کر لیا۔ دکھ کی ٹامانوس سی لہرنے جیسے اسے ہلکا کر دیا۔ وہ کھڑی کچھ دیر سوچتی رہی
 اندر آگئی اور دروازہ بند کر لیا اور اس کے بستر پر بیٹھ گئی۔ کچھ میگزین اور نصابی کتب سائیڈ ٹیبل پر رکھی تھیں۔ وہ ان
 لگی۔

جانے کتنا وقت گزرا۔ شاید دس منٹ، شاید پندرہ منٹ۔

وہ کچھ گنگناٹا ہوا تو لیے سے سر گرٹا ہوا بڑی ترنگ میں باتھ روم سے باہر آیا تھا۔ مگر فوراً ہی ٹھنک گیا تو
 نہیں۔

اور اسے مکمل نظر انداز کر کے اپنے کاموں میں مگن ہو گیا۔ پہلے بال سکھائے پھر سیٹ کئے۔ پھر سنری پینٹ
 سامان رکھنے لگا۔

ی دوران چلتے پھرتے چیزیں بیک میں ڈالتے ڈالتے پرفیوم بھی اسپرے کر لیا تھا۔ جس کی وجہ سے کمرے میں ایک
 منہ اور خوشواری مہک سرایت کر گئی تھی۔ سیاہ چینٹ اور اسکا کی بلیو شرٹ میں ملبوس وہ بہت تروتازہ محسوس ہو رہا تھا۔
 بیکمن بونا تھا جسے اسے اس کی موجودگی کا احساس ہی نہیں ہے۔

”بائی۔“

”جی۔“

”تم ایسے کیوں ہو رہے ہو؟“

”کیا ہو رہا ہوں۔ اچھا تو میں کبھی بھی نہیں لگا آپ کو۔ کیا آج زیادہ برا لگ رہا ہوں؟“ وہ مسکراتے ہوئے پوچھ رہا

”بہر افسوس صرف اتنا ہے کہ میں جھومر بھابی کی وجہ سے ظفیری بھائی کے بیڈ روم میں گئی تھی۔ اب مجھے کیا.....“

”بھابیہ جرات کر سکتا ہوں کہ آپ سے پوچھ گچھ کروں۔ فکر مند نہ ہوں۔“ اس نے بیک بند کیا اور سیدھا کھڑا ہو

”اور پھر یہ آپ کا گھر ہے“ آپ جدھر مرضی گھومیں پھریں۔ وقت بے وقت آپ کیوں پریشان ہو رہی ہیں۔“ وہ

دین سے پوچھ رہا تھا۔

”تم پہلے جیسے نہیں لگ رہے۔ بہت بدلے ہوئے لگ رہے ہو؟ کیا کیا ہے میں نے؟ کون سا گناہ ہوا ہے مجھ سے؟ تم
 لمبے بدل رہے ہو اور میں اپنی نظروں میں گر رہی ہوں۔“ اس کی آواز بھرا گئی۔

”بل رہے ہو۔ ارے“۔ وہ ہنس دیا اور اس کی طرف حیرت سے دیکھنے لگا۔ ”اور کیا میں اتنا قابل ذکر ہوں کہ آپ

بہت بڑے ٹرنے ٹھہرنے کا نوٹس لیں۔ اپنی توانائی ضائع نہ کیا کیجئے۔ آگے کام آئیگی۔“

”ہاں..... تم بہت ”ٹپیکل“ ہو۔ میری سمجھ میں نہیں آتے۔ مجھے تم سے بہت شرم آ رہی ہے میرا جی چاہ رہا ہے میں مر

”میں..... بہت ضبط سے اپنے آنسو روک رہی تھی۔ باری کا دل..... بشر کا دل تھا..... بہت ترنگ میں دھڑکا۔“

”کس بات کی شرم؟“

”تم نے مجھے عجیب سے طے میں دیکھا تھا۔ مجھے سوچ سوچ کر شرم آ رہی ہے۔ حالانکہ مجھے پتا ہے تم کسی سے نہیں کہو
 ”میں.....“ نظر میں جھکائے ہوئے کہہ رہی تھی۔“

”یہ کون کون کا؟“ اس نے انجان بن کر گویا اسے چھیڑا۔

”میں تو کبھی اپنے آپ سے بھی نہیں کہوں گا۔ آپ اطمینان رکھیں۔ اب مجھے اجازت۔“ وہ بیک اٹھا کر کھڑا

”اے..... یہ قدر کر کہ ایک گھر میں ہوتے ہوئے بھی کتنے جتن سے دکھائی دیتا ہے (

”میں.....“ اس روز نعیم کو جو میں فون کر رہی تھی۔“

”یہ آپ کا ذاتی معاملہ ہے۔ مجھے آپ کے ذاتی معاملات سے کوئی دلچسپی نہیں۔“
اس نے ہاتھ اٹھا کر روشنی کو بولنے سے روک دیا۔

☆.....☆.....☆.....☆.....☆.....☆

”کیوں نہیں ہے دلچسپی؟ تم اس گھر میں نہیں رہتے؟“ وہ پھر کر بولی۔

”لیکن گھر میں رہنے کی یہ شرط تو نہیں ہے کہ میں یہاں کے تمام معاملات میں انوالو ہوں۔“ وہ عجلت بھرے انداز میں کہہ اٹھا۔

”گھر میں رہنے والوں کیلئے ”جرم“ شرطیں نہیں باندھتا۔ خود بخود ذمہ داریاں ہر فرد پر آتی ہیں۔ سارے گھر کی ”بو“ روکنے پر امور ہو دلچسپی تو لینا پڑے گی۔“ وہ اٹل لہجے میں گویا ہوئی۔

”مجھے زبردستی ہے۔“ باری نے مسکرا کر شانے اچکائے۔

”مجھے معلوم ہے تمہیں میرے معاملات سے ہمیشہ دلچسپی رہی ہے، زیادہ سو مت۔“ اس نے منہ بناتے ہوئے کہا۔

”جو ضرور ہو، گز بھی نہیں ہوں کہ کوئی آسانی سے مجھ پر اثر انداز ہو سکے۔ خاصہ فوجیت ہوں۔ اب مجھے اجازت۔“ وہ مسکراتے ہوئے غصہ اٹھایا۔

”تو بڑا بہادور۔“ اس نے دانت پیسے۔

”اور اس کے علاوہ کوئی اور فرمائش؟ یعنی مزید کیا کر کے دیکھ لوں؟“ وہ ہنوز مسکراتا رہا تھا۔

”میں نے کیا کیا ہے؟ جو تم ایسے ہو رہے ہیں؟“ وہ پھر روہانسی ہو گئی۔

”نہ آپ نے کچھ کیا ہے نہ میں ایسا ویسا ہو رہا ہوں۔ میری فلاسٹ کا وقت ہو رہا ہے باقی لڑائی بھر اٹھائیں۔“ اس نے بیک اٹھالیا۔

”کوئی پیغام کراچی والوں کیلئے؟“ اس نے قدم آگے بڑھائے۔

”تمہارا سر؟“ وہ جھٹا اٹھی۔

”وہ تو میں ساتھ لئے جا رہا ہوں، اچھا خدا حافظ۔“ وہ باہر نکل گیا۔

وہ ہتھیلیاں مسلنے لگی، ساتھ ساتھ کچھ بڑبڑا بھی رہی تھی۔

ماہین راہداری کا مرکزی دروازہ چیک کر کے مطمئن انداز میں اپنے کمرے کی سمت بڑھی تھی۔

بہت مدہم سی کال بیل نے اسے چونکا دیا۔ اس کی نظر میں لاؤنج میں سامنے ہی لگے وال کاک پر جاگم۔ ڈیڑھ بجے کا غنم تھا۔

اس نے خود آگے بڑھنے کی بجائے نعمان کو جگانے کا قصد کیا، مگر ایک دم رک گئی۔ معلوم تو کر لوں ہے کہ چارے بھائی کی نیند خراب ہوگی۔ یہ سوچتے ہی راہداری کا دروازہ کھول کر باہر آئی اور گیٹ سے چند قدم دی۔

”جی..... کون؟“

”یاور.....؟“ آواز خاصی دھیمی تھی مگر رات کے اس پیر واضح تھی۔

”اوہ۔“ ایک انجانی سی خوشی اس نے اپنے اندر دوڑتی محسوس کی۔

”ایک منٹ!“ وہ چابی لینے اندر دوڑ گئی۔ جتنی تیزی سے اندر دوڑی تھی۔ اتنی تیزی سے بھاگتی ہوئی واپس آئی۔

تالا کھول کر اس نے ذیلی دروازہ فوراً ہی وا کر دیا تھا۔

سیاہ ڈنر سوٹ میں ملبوس ریڈ اینڈ وائٹ ڈائس کی ٹائی لگائے چھوٹا سا بہت خوبصورت اسٹائشنس قسم کا سوٹ لٹکائے یاور علی خان اس کے سامنے کھڑے تھے۔

”السلام علیکم۔“ اس کی خوشی چھپائے نہ چھپ رہی تھی۔

”وعلیکم السلام۔“ ایسے نہیں بھاگتے، گر بھی جاتے ہیں۔“ ان کی آواز دھیمی اور لہجہ سپاٹ تھا۔

ماہین شرمندہ کی ہو کر اپنا دوپٹہ درست کرنے لگی۔

”آئیے۔“ وہ انہیں لے کر آگے بڑھی۔

”کیا میرے آنے سے حفاظتی انتظامات مکمل ہو گئے ہیں؟“ انہوں نے کھلے ہوئے تالے کی طرف اشارہ کیا۔

”اوہ۔“ ماہین تالا لگنے لگی۔ یاور علی خان بھی رک گئے تھے۔

پھر دروازوں آگے پیچھے چلتے ہوئے لاؤنج میں پہنچے۔

”لڈیٹ لٹ تھی یا ناٹم ہی یہی تھا؟“ وہ ان کے مقابل کھڑی ہو چھ رہی تھی۔

”جوئی چاہے فرض کر لیں اب تو آپ ڈسٹرب ہو ہی چکی ہیں۔“ انہوں نے سوٹ کیس ایک طرف نکا دیا۔

”آپ کے آنے سے میں کبھی ڈسٹرب ہو ہی نہیں سکتی، آپ نوٹ کر لیں ہمیشہ کیلئے۔“ وہ بہت سادہ اور پرسکون انداز میں سڑکی تھی۔

”یاور علی خان نے ایک اچھی نظر اس پر دوڑائی۔ میروں کاٹن کے سفید کڑھائی والے کرتے شلوار میں ملبوس دوپٹے پہنی ہوئی بہت معصوم سی لگی۔

”جی بات اب آپ مجھے اس ٹوکے پر پہنچا دیں جہاں میں چھینچ کر سکوں۔“ وہ ٹارنل سے انداز میں گویا ہوئے۔

”اوہ۔“ ماہین قدرے جھینپ گئی۔

”پھر آپ اوپر ہی چلئے، جہاں پہلے ٹھہرے تھے۔“ ٹارنل سے بھی ہیں اور پراپیوٹیسی بھی۔“

”اتنا جھکتی ہیں آپ ہمیں۔“ وہ مبہم سا مسکرائے۔

”اس سے بھی کچھ زیادہ۔“ وہ شرارت سے گویا ہوئی اور زینہ کی طرف بڑھ گئی۔

یاور علی خان اس کے پیچھے چل رہے تھے۔

”پانچ کیوں میرا وجدان کہہ رہا تھا؟ آپ آئے رالے ہیں میں نے کمر اسی لئے بانٹل تیار کر دیا تھا۔“

”اچھی خاصی روحانی خاتون ہو گئی تو آپ تو۔“

”یہ بہت زیادہ ہے۔ ایسے خطابات کی اہل نہیں ہوں۔ اچھا یہ بتائیے، کھانا کھائیں گے یا چائے کافی۔“

”کوئی نہیں، بس ایک گلاس ٹھنڈا پانی پلا دیں اور پھر آرام کریں۔“

”بس؟“ اس کے منہ سے یونہی نکل گیا۔

”جی ہاں۔“

”پھر بھی یاد کر لیجئے۔ ہو سکتا ہے کوئی بہت ضروری چیز چاہیے ہو۔“ وہ جاتے جاتے رک گئی۔

یاور علی خان کوٹ اتارتے اتارے ایک دم رک گئے۔

”جسٹر جنریل بہت ضروری ہوتی ہیں، مگر موقع مکمل شرط ہوتی ہیں۔“ ان کا لہجہ بہت عجیب سا تھا۔ ماہین نے چونک کر تالا کی صورت دیکھی۔

”جی۔“

یاور علی خان اس طرح لا پرواہ انداز میں کوٹ اتار کر بستر پر ڈال چکے تھے جیسے کمرے میں ان کے علاوہ دوسرا کوئی موجود نہ ہو۔ ہندوستان کا ٹھہرنا بے معنی سا تھا۔

”انہوں نے ان کے ارادے سے کچن کی طرف جا رہی تھی۔“

اس نے برتن دھوئے اور چار پائی پراوندھے رکھ دیئے۔ ابھی سیدھی ہی ہوئی تھی کہ پٹاخ ایک پتھر کرنا
کرا دھرا دھرا دیکھنے لگی۔ مگر کچھ نظر نہ آیا۔

وہ فکر مند سے انداز میں اپنے دوپٹے سے ہاتھ پونچھنے لگی۔ الجھن کا اثر واضح طور پر اس کے چہرے پر نمودار
پٹاخ..... پھر ایک پتھر اس کی پیٹھ پر لگا۔ وہ تیزی سے پلٹی تھی اور اس طرف دیکھنے لگی تھی جہاں سے پتھر
تھا۔ مگر کچھ نظر نہ آیا۔

حیران پریشان سی کھڑی رہ گئی۔ یہاں آنے کے بعد یہ واقعہ دوسری مرتبہ تھا۔

وہ گھوم کر دیوار پر نظریں جما کر کھڑی ہو گئی۔ خوف سے بری حالت ہو رہی تھی۔ مگر آج وہ کسی نتیجے پر پہنچ نہ سکی
اس نے چاہا گل باز کو آواز دے، مگر یک دم رک گئی۔ اسے دیوار پر ایک بھوری سی چیز محسوس ہو رہی تھی۔
گھورنے لگی۔

اور اگلے ہی لمحے اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ دیوار کے اس سرے سے دوسرے سرے تک ہر ساڑ کا گندہ
رہا تھا۔ اس کی جان میں جان آئی گویا.....

اس نے نیچے سے ایک پتھر اٹھا کر ایک بندر کی طرف پھینکا۔ سارے کے سارے دیوار پر پانچے کوٹنے
میں کود گئے۔ ایک عجیب سی آفت مچ گئی۔

ایک بندر نے پٹنگ سے گلاس اٹھا لیا اور جھومر کی طرف پھینکنے کی دھمکی دینے لگا۔

تانبے کا بھاری گلاس تھا۔ جھومر ڈر کر پیچھے ہٹنے لگی۔

دو تین بندر اس کے آگے پیچھے تاپنے لگے وہ شیشی کرتی دور ہٹنے لگی۔

معا سے کسی سے ٹکرانے کا احساس ہوا۔ وہ یوں اچھلی جیسے کرنٹ لگا ہو۔ فوراً ہی پلٹی تھی۔ اور حیرت بھرا
نکلی تھی۔

”ب..... با..... باری..... بندر.....“

”لا حول ولا قوۃ! کوئی اچھی گالی نہیں تھی آپ کے پاس؟“ باری نے منہ بنایا۔

”مجھے ایسا لگتا ہے جیسے میں خواب دیکھ رہی ہوں۔ اوہ میرے خدایا!“

”آپ اندر چلیں، میں انہیں بھگا کر ابھی آتا ہوں۔“

جھومر یہ سنتے ہی اندر دوڑ گئی۔

باری نے جانے کون سی جیب سے پستول برآمد کیا اور ایک ہوائی فائر داغ دیا۔

بندروں میں کھلبلی مچ گئی۔ آن کی آن میں جانے کدھر غائب ہو گئے۔ اس نے پستول واپس جیب میں

کی سمت پلٹا۔

جھومر دھڑک رہی تھی باری کو اندر آتا دیکھ کر بڑے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔
تنبہ رہے ہاتھ میں ہتھیار دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی۔ ”وہ تخت کی طرف بڑھتے ہوئے کہہ رہی تھی۔
”تپا جوبلی والوں کے عصم پر“ خون“ بھی کرتے ہو؟“ وہ تخت پر ٹپک گئی۔

”نہیں صرف ارمانوں کا خون کرتا ہوں۔“ وہ روشنی کا چہرہ تصور میں نا کر مسکرا دیا۔

”پھر تو قاتلوں سے بھی بڑے قاتل ہو۔“ جھومر نے قدرے افسردگی سے کہا۔

”پھر جرم ہے؟“ میں اقبال جرم کرتا ہوں۔ اب بس آپ جلدی سے یہ بتا دیجئے، چنا ہے یا نہیں؟“ وہ ایک شکستہ سی کرسی

”ہاں؟“ جھومر نے چونک کر اس کی شکل دیکھی۔

”پتھر نے پرا اور کہاں؟“

”میں نے بھیجا ہے تمہیں؟“ کا کا جان نے یاد دہا صاحب نے؟“ جھومر کی آواز بہت دہسی تھی۔

”کسی نے تو بھیجا ہوگا، خود سے تو میں آ نہیں سکتا۔“ اس نے جواب دیا۔

”تو میرے ہمارے نصیب ایسے کہاں۔“ وہ بڑبڑانے کے انداز میں بولی۔

”باری کو سن نہیں دیا۔“

”کی میں ٹھیک سے سن نہیں سکا۔“ وہ آگے کی طرف جھک کر گویا ہوا۔

”اللہ میاں نہیں سنتے ہماری پھر تو تم بتاؤ۔“ جیسے چڑا کر بولی تھی۔

”کیا سنا، چاہتی ہیں آپ اللہ میاں کو؟“ وہ جواب دے کر کیوں مسکرا دیا۔

”چاہنا کیا چاہنے سے کیا ہوتا ہے؟“ اس کی آواز بھرانے لگی۔

”اچھا چلیں انھیں پلیز، انھیں یہاں سے۔“ باری کے انداز میں درخواست تھی

جھومر نے ہلکے سے سر ہلکا کر دیکھا۔

”کہاں سے رجا، مجھے؟“

”بجول سے؟“ جھومر نے باری کے پاس سے نظر اٹھا کر اس کی بات دہرائی۔

”اگرچہ اس شخص کا خانے میں لے کر جاتا ہوں تو پتہ نہیں چلتا۔“ جھومر نے ایک فیصلہ کن لہجے میں

”مجھے ڈر نہیں کہ مارمت دیں، مگر پتہ نہیں چلتا۔“ جھومر نے ایک فیصلہ کن لہجے میں

”میں نے بہت بچت ہو گئی۔“

”مجھے ڈر نہیں کہ مارمت دیں، مگر پتہ نہیں چلتا۔“ جھومر نے ایک فیصلہ کن لہجے میں

”چلو اور سیدھے دریا بستی چلو سرائے میں حاضری لگانے کی ضرورت نہیں اور تم مجھے دھوکے سے سرائے غلطی بھی نہ کرنا۔ کہیں میرے ہاتھوں تیمور علی خان اپنے انجام کو نہ پہنچ جائیں۔“ اس کی نگاہ میں بھی آتی تھی۔

”اچھا چلے چادر اوڑھنے زیادہ ملکہ جذبات بننے کی ضرورت نہیں۔“ وہ سرد انداز میں کہتا ہوا باہر نکل گیا۔ جھومر پاؤں لٹکائے کچھ دیر سوچتی رہی پھر ایک فیصلہ کن انداز میں اٹھ کھڑی ہوئی۔

چادر اوڑھ کر باہر آئی، گل باز بیک اٹھائے باہر کی طرف جارہا تھا، وہ اسی کے پیچھے چل پڑی۔ باہر بڑی ڈرائیونگ سیٹ پر اپنی طرف کا دروازہ کھولے اندر سے باہر آنے والے راستے کی طرف تک رہا تھا، گل باز پیچھے آتے دیکھ کر اس نے سکون کا سانس بھرا۔

”اس قدر وحشت ہوتی ہے اندر کہ مجھے جیب میں بیٹھ کر انتظار کرنا زیادہ پسند ہے، بہ نسبت اندر بیٹھنے کے۔“ اس نے جھومر کے بیٹھتے ہی انجن اشارت کر دیا اور بیک ویو مرر میں دیکھنے لگا کہ گل باز ایک طرف ہٹ گیا۔

”تم باری ہو اور میں جھومر ہوں۔ تمہیں کسی ظفیری کے پلے نہیں باندھا گیا۔ تمہارا دل محفوظ ہے، اسے کیڑا تمہاری روح آزاد ہے، یہ کسی درندے کو پیش نہیں کی گئی، لہذا تمہیں مجھ سے متاقلہ کرنے کی زحمت کی ضرورت نہیں۔“ جھومر نے ترخ کر اسے جواب دیا تھا۔

ایک لمحے کو تو باری بھی لا جواب سا ہو کر چکر کر رہ گیا تھا۔

”چل رہی ہوں میں اس جہنم میں، کرلیا ہے میں نے تمہاری پسند کا فیصلہ۔ اب دیکھنا ذرا۔“ جھومر نے سر سے کلپ کھسٹا، بال ہاتھ سے سمیٹے اور دوبارہ کلپ میں قید کر دیئے اور سر پر چادر جما کر غصے سے دیکھنے لگی۔

”یہ میری پسند سچ میں کہاں سے ٹپک پڑی۔ مجھ سے جو کہا جاتا ہے، میں وہ کرنے کا پابند ہوں۔“ گاڑی باہر آتے ہی اس نے بہت تیزی سے چلائی تھی، جیسے جھنجھلا رہا ہو۔

”غلامی کی زنجیریں توڑنا بھی انسان کا حق ہے، پیداؤشی حق۔“ جھومر نے تنگی سے کہا۔

”پیسے جمع کر رہا ہوں۔“ باری کا لہجہ بالکل سپاٹ تھا۔

جھومر نے حیرت سے اس کی شکل دیکھی، بڑا اچھیدہ سا جواب تھا۔

”پیسے.....؟“

”کس لئے؟“

”غلام پابند ہے کہ اپنے آقا کو منہ مانگی رقم دے اور آزاد ہو جائے۔“ اس کے لہجے میں بلا کی تپش تھی۔

”کیا نام لگا رہے ہیں تمہارے؟“ جھومر کے لہجے میں زہر گھلا ہوا تھا۔

”ان کی تو پوری جائیداد تمہارے سر سے دار کر صدقہ کر دی جائے تو بھی کم ہے۔“ وہ کھوئے کھوئے انداز میں بولی۔

”یہ کون سے سرخاب کے پر لگے ہیں مجھ میں۔“ اسے ایک دم غصہ آ گیا۔

”جہیں کیا ہے؟“ وہ بہت سکون سے کہہ رہی تھی۔

”مجھے اپنی حدود کا پتا ہے، میں عملی اور حقیقت پسند آدمی ہوں۔ اپنے بعض جذباتوں کے سامنے بے بس سہی، مگر ہتھیار۔“ وہ کون سے مقامات ہیں، جہاں میرا راستہ مکمل ہوتا ہے، مجھے اچھی طرح شعور ہے۔“

”نہیں، جہاں جذبات کی شدت سے سرخ ہو رہا تھا۔“

”نہیں، جہاں جذبات ہیں؟“ جھومر کے ہونٹوں پر استہزائیہ مسکراہٹ کھیلنے لگی۔

”مجھے بتاؤ گے وہ کون سے جذبات ہیں؟“

”یہ شاید میں اپنے آپ کو بھی بتانا پسند نہ کروں۔“ باری نے نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبا کر بڑے ضبط سے جواب دیا۔

”اب بات کہوں، آپ ماسٹڈ تو نہیں کریں گی؟“ اس نے طویل راستے کے بعد پہلا موڑ کاٹا۔

”ہوں، کہو! جہیں میرے برامانے کی فکر میں ہلکان ہونے کی ضرورت نہیں۔“ جھومر نے بے دلی سے سامنے دیکھتے ہوئے کہا۔

”پہچھے جا کر آرام سے لیٹ جائیے۔ ہو سکتا ہے، ٹھنڈے ماحول میں آپ کی خیند پوری ہو جائے اور آپ کا ذہن بہن ہو جائے۔“

”یونکہ سرائے جا کر گاڑی بدلنا ہے۔ یہ جیب کا کاجان کی ذاتی اور پسندیدہ سواری ہے۔ ان کی ”لینڈ کروزر“ کے بعد جو ناکل، صاحب کے استعمال میں ہے۔“ اس نے رسائیت سے کہا۔

”تم مجھے وہاں نہ لے کر جاؤ تو بہتر ہے۔ پھر میرے منہ سے کچھ نہ کچھ نکل جائے گا۔“

جھومر کی پیشانی پر ٹیل پڑ گئے۔

”مگر مجھے گاڑی لازمی بدلنا ہے۔ شاید وہ بھی آپ سے ملنا اور بات کرنا پسند نہ کریں، آپ گیٹ سے باہر کھڑی ہو جائیے۔“

”نہیں، میں دوسری گاڑی لے کر باہر آ جاؤں گا، اب آپ پیچھے جا کر آرام کیجئے۔“

”نہیں، میں چاہرہ امیر آرام کرنے کو تم چلاؤ گاڑی، میں تم سے کوئی بات فی الحال نہیں کر رہی۔“

باری نے ہونٹ بھیج کر رفتار قدرے بڑھا دی۔

.....

سب نیکیاں اندر ٹی وی دیکھ رہی تھیں۔ اس کا موڈ نہیں بن رہا تھا۔

”یہ سب نیکیاں انداز میں دوپٹا سنبھالتی ہوئی باہر آ گئی اور بیرونی برآمدے کی سیڑھیوں پر بیٹھ گئی۔“

”موتوں کا چاند تھا۔ وہ ہاتھوں میں چہرہ تمام کر چاند کی طرف مٹکلی باندھ کر دیکھنے لگی۔“

”موتوں کی گیت بند کر کے اس کے پاس سے گزرا، قدرے حیرت سے اسے دیکھا پھر آگے بڑھنے لگا۔“

”کو کھو“۔ اس نے کسی خیال سے باہر آ کر آواز دے ڈالی۔

”جی جی“۔ وہ تیزی سے اس کے قریب آیا۔

”چاند پورا ہے روشنی بہت ہے یہاں کی سب انٹیں بند کر دو“۔ اس نے حکم دیا۔

”جی اچھا“۔ وہ اندر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد برآمدے۔۔۔ باغ کی ساری انٹیں بند کر دیں۔

وہ پھر پہلے کے انداز میں بیٹھی ہوئی تھی۔ جانے کتنی دیر اسی طرح بیٹھی رہی۔

معاذہ چومک پڑی۔ کسی گاڑی کی ہیڈ لائٹس سے گیٹ روشن ہو گیا تھا۔

شاید بابا صاحب آ گئے ہیں۔

گاڑی باران دے رہی تھی۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا، کوئی لازم نظر نہیں آیا۔ جانے کیا سوچ کر وہ ٹوکی

ناصی تیزی سے ہلتی ہوئی گیٹ تک آئی اور گیٹ کھول دیا۔ تیز روشنی۔ نہ پر پڑی تو آنکھیں چند سیانیں۔

گاڑی ایک دم جیسے اس کے اوپر چڑھ دوڑی وہ انتہائی تیزی سے ایک طرف ہو گئی۔

”یہ کون بد تمیز قسم کا ڈرائیور ہے“۔ اس کا خون کھول اٹھا۔ گاڑی پارچہ میں جا کر رک گئی تھی۔

۔۔۔ کھولتی ہوئی گاڑی کی طرف بڑھی لئے لینے کے خیال سے مگر ٹھنک کر رک گئی۔ ایک طرف سے برقی دروازہ

سے جھومر اتر رہی تھی۔

”یہ۔۔۔ یہ کہاں سے آرہے ہیں؟ کہاں گئی ہوئی تھیں یہ جھومر بھابی؟“

اسے وہ چند دن پہلے والا واقعہ ایک دم سے یاد آیا ”تو یہ کہیں گئی ہوئی تھیں شاید اپنے بھائی کے مگر باری تو کراچی پر

انسان ہے یا ہوا؟“

”وہاں کیوں رک گئی آج سلام دعا بھی نہیں ہوگی“۔ جھومر نے اسے متوجہ کیا۔

”السلام علیکم“۔ وہ ناصی انجھی ہوئی تھی۔

”ایک سلام دے لیں“۔ جھومر نے اس کے رخسار پر بوسا دیا۔

”کہاں چلی گئی تھیں آپ ظفیری بھابی نے اپنا سر پھاڑ لیا ہے۔ آج وہ یہ کہیں نہیں ہسپتال سے کر گئے ہوں

ہیں وہ“۔

روشنی کا انداز اب بھی الجھا ہوا تھا۔

جھومر نے سکون کا ایک گہرا سانس لیا۔

”شکر کرو ہم آگئے بندہ جن کی خاطر آئے ہیں انہی کے ساتھ واپس آئے۔۔۔“

باری کو اپنے پاؤں کے نیچے سے زمین سرکتی ہوئی محسوس ہوئی۔

روشنی کو حیرت کا ایک شدید جھٹکا لگا، ایک فطری امر تھا۔ اس نے باری کی طرف دیکھا۔

”نیں کچھ سمجھ نہیں بھابی“۔ اسے ایک دم اپنا دل یاد ہوا محسوس ہوا۔ جھومر نے انداز میں

”وہ سمجھتی کیا ضرورت ہے؟ حویلی میں منڈی دل کی طرح انسان بھرا پڑا ہے۔ مگر باری جیسا کارآمد ایک بھی نہیں ہے۔

۔۔۔ سمجھتی کیا ضرورت ہے۔ باری ہے۔ اچھا شب خیر۔ اللہ کرے ظفیری اب ہسپتال ہی میں رہے۔“

۔۔۔ سب تیار باری۔ باری ہے۔ اچھا شب خیر۔ اللہ کرے ظفیری اب ہسپتال ہی میں رہے۔“

نے بچھے حصے کی جانب پیش قدمی کی۔

باری بڑی سے چیزیں نکال رہا تھا اور روشنی اپنی جگہ دم بخود کھڑی تھی۔

”جھومر بھابی کیا اول فول بک رہی تھیں؟“ معا اس نے تنکا کر پوچھا۔

”آپ کی بھابی ہیں اور بڑی بھابی“ ”بکتی“ نہیں۔ فرماتی ہیں۔۔۔ سمجھیں؟“

”مگر کچھ وہ کہہ کر گئی ہیں وہ کوئی بھابی نہیں فرما سکتیں“۔ وہ بھڑک اٹھی تھی۔

”ایک ایسا بل انسان کے ساتھ رہتی ہیں۔ کوئی نفسیاتی پیچیدگی پیدا ہو گئی ہوگی۔ آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت

نہیں۔۔۔ گویا تسلی دی۔

”مگر اس خوشی میں محترمہ کو اٹھائے اٹھائے پھر رہے ہو؟“ وہ پھر گئی۔

”دل دلاؤ“۔ وہ بس لا حول ہی پڑھ سکا۔

”نفسیاتی کیس بن گئی ہیں تو بابا صاحب کو اطلاع دو۔ پاگل خانے لے جا کر ان کا علاج کرائے، کو کھو میں اس قسم کی

ادویہ برداشت کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتی ان کو سمجھانے کی کوشش کرو کہ اپنی اوقات میں رہیں۔ ہم صرف اپنے بھائی

کا دھڑکاؤ دیتے ہیں۔ مگر نہ دوسری صورت میں ان کا ”ریٹک“ مانا جلی کے بعد ہی بنتا ہے۔

”جن لوگوں کو کبھی عزت نہ ملی ہو انہیں راس ہی نہیں آتی“۔

نصیحت اس کا سارا جسم کانپ رہا تھا۔

”آپ کیوں خواہنا وہ اپنا ٹیپر لوز کر رہی ہیں۔ جانے دیں“۔ باری نے رسائیت سے سمجھایا۔

”تم پر ان کی بے بودگی کا کوئی اثر نہیں ہوا“۔

”بھٹلہ بارنگاہوں سے اسے گھورنے لگی۔ بلیک اینڈ وائٹ پرنٹ کے شلوار کرتے اور دوپٹے میں دودھیا چاند کی روشنی

کھانی ہوئی وہ بڑی معصوم دکھائی دے رہی تھی۔

باری نے نظریں چڑا کر گاڑی کا لاک لگانا شروع کر دیا۔

”میر نے کچھ پوچھا ہے؟“ وہ پھنکاری۔

”بغرض مجھ پر کچھ اثر ہو کی بات کا۔ تو اس سے آپ کو کیا فائدہ یا نقصان ہے۔ یہ تو میری اپنی ذاتی واردات ہوگی۔“ وہ

۔۔۔ گویا سیدھا کھڑا ہو گیا۔

”تو مجھ میں بابا صاحب کو بتا کر ہی دم لوں گی“۔ اس نے دھمکی دی۔

”مگر وہاں سے جنگ کرنا کوئی اچھی بات نہیں“۔ باری نے اندر جانے کی نیت سے رخ موڑا۔

”نصیحت کے سہ پہے ہوان کی؟“ اسے جیسے کسی خوف سے صدمہ سا ہوا۔

”نہیں..... جن لوگوں کے ہونے اور نہ ہونے سے کوئی فرق نہ پڑتا ہو ان سے بات نہیں بڑھاتے۔“
رکتے ہیں۔ اس نے پھر سمجھانے کی کوشش کی۔

”خیر..... وماغ تو ان کا بھی ٹھکانے ٹھکانے دوں گی میں۔ ان کی ہمت کیسے ہوئی؟“
وہ کہاں باز آنے والی تھی۔

”مرضی ہے آپ کی۔ میری طرف سے اجازت ہے۔“ وہ مسکرا دیا۔ جیسے اسے چارہ ہور
”ہونہ۔“ وہ پاؤں بچ کر اس سے پیٹلے اندر بڑھ گئی۔ اور بال کمرے میں چلی آئی۔ لڑکیاں ہنوز دیڑھی
”تم کہاں چلی گئی تھیں؟“ یہ نے اس پر سرسری نظر ڈال کر دوبارہ اسکرین پر نظر پڑا ہماریں۔
”جنم میں۔“ وہ صوفے پر ڈھسے گئی۔

”ہاں..... کچھ..... سرخ سرخ سی تو ہو رہی ہو۔“ روبی نے شرارت سے دیکھا۔
”شاید۔“ حویلی کے غائب لوگ واپس آچکے ہیں۔“ شینو کا رپٹ پر بالکل چت لینی تھی۔
روشی نے ان کے لینے کے اسٹائل کو بڑی ناگواری سے دیکھا۔ اس پر مستزاد ان کا جملہ۔
”شینو آپا! آپ مجھ سے مخاطب نہ ہوا کریں۔“

اس نے خاصی بدتمیزی سے کہا۔ اس وقت وہ اس ماحول میں موجود ہی کب تھی۔ اس کے کانوں میں تو جھور
انگاریوں کی طرح ہنوز محسوس ہو رہے تھے۔

”گلو آپا! یہ ظفری بھائی ہاسپٹل سے کب واپس آئیں گے؟“ اس نے نظر کی عینک لگائے بغور ٹی وی دیکھنا
کیا۔

”خیریت؟“ گلو نے جیسے سے اسے گھورا۔

”ہاں خیریت ہی ہے۔ یونہی پوچھ رہی تھی۔“ اس نے بظاہر لاپرواہی سے کہا۔
”وہ ہاسپٹل میں ٹھیک نہیں ہوں گے۔ ان کا علاج گھر میں ہی ہے۔“ وہ مزید گویا ہوئی۔
”یعنی۔“ گلو واقعی نہیں سمجھیں۔

”یعنی یہ کہ جھر سر بھابی..... وہ گھر پر نہیں تھیں۔ انہیں فٹس پڑنے لگے۔ انہوں نے اپنا سر بھاڑ لیا۔“ اس نے
دی۔

”وہ کہاں چلی گئی تھیں؟“ گلو اٹھ کر بیٹھ گئیں۔ ٹی وی سے ان کی توجہ مکمل طور پر ہٹ چکی تھی۔
”یہ تو مجھے علم نہیں کہ وہ کہاں گئی تھیں۔ مگر بہر حال یہ مجھے پتا ہے کہ وہ کہیں گئی ہوئی تھیں اور اب واپس آ گئی۔“
باری کے ساتھ۔ اس نے سابقہ انداز میں جواب دیا۔

”باری کے ساتھ۔“ کئی متوجہ لڑکیوں کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

”کیا کراچی؟“ گلو حیرت سے پوچھ رہی تھیں۔

”نہی اب دہوا کیلئے مٹی ہوں گی۔“ شینو نے حسب توفیق حصہ لیا۔
باری کے ساتھ؟“ گلو انہیں گھور کر رہ گئیں۔

”وہ معنی خیز انداز میں بات ادھوری چھوڑ کر خاموش ہو گئیں۔
”نہیں کیسے پتا کہ وہ گئی ہوئی تھیں؟“ زری نے نکتہ اٹھایا۔

”لے کہ وہ میرے سامنے آئی ہیں۔“ اس نے آرام سے جواب دیا۔
باری کے ساتھ؟“ مریم نے سوال کیا۔

”نہ۔“ یہ کیا تم لوگوں نے مستقل قسم کی ٹیون بنالی ہے۔ باری کے ساتھ۔ باری کے ساتھ۔“ وہ بری طرح جھلا گئی۔
”ہم کہہ جوری تھیں۔“ مریم بد بدائی۔

”ہم تو میں نے کہا تھا۔ آپ نے سن لیا تھا۔ اب یہ گردان کیوں؟“ وہ بگڑی
”یقین نہیں آ رہا تھا۔“ مونانے مسکرا کر جواب دیا۔

”جی باری اس طرف آئے تو پوچھ لینا کہ بھابی کو سیر کرانے کہاں لے گئے تھے؟“ زری نے مشورہ دیا۔
”نہاری آنکھوں کے سامنے ہی تو کراچی روانہ ہوئے تھے۔“ شینو نے یاد دلایا۔

”بظاہر رکھتے ہیں بابا صاحب جھومر بھابی کا۔“ حنانے معصومیت سے کہا۔
”ب سے سخت ڈیوٹی بھی تو دیتی ہیں وہ۔“ روبی نے معنی خیر مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

”ہاں یہ تو فرق تو ان کا حق ہے۔“ یہ نے بھی بڑے بھولپن سے کہا۔
”وہی..... باری کے ساتھ۔“ شینو کہہ کر خود ہی قہقہہ لگا بیٹھیں۔

”ٹٹا پاؤں بٹختی خود کو کوستی باہر نکل گئی تھی۔

اس نے آہستگی سے دروازہ بجایا۔

”نہی! اندر سے آفسرانہ انداز میں اجازت ملی۔

”دروازہ کھول کر بڑے اٹھا کر اندر آئی۔

”السلام علیکم۔ صبح بخیر۔“

”السلام۔“ یاد دہلی خان نہا کر لٹکے تھے اور اب آئینے کے سامنے کھڑے بال بنا رہے تھے۔

”رات ماننا آپ بہت لیٹ آئے۔ میں خاصی دیر انتظار کرتی رہی۔ پتا نہیں کب آنکھ لگ گئی۔“ ماہین کے انداز میں

”تمہارا آپ کا نہیں میرا ہے۔“ اگر شرمندہ ہونا بہت ضروری ہے تو مجھے ہونا چاہیے۔“ وہ آسانی رنگ کے شلوار سوٹ میں
نہی ہٹا کر پیش محسوس ہوئے۔

”نہیں..... خیر..... ایسا بھی ضروری نہیں“۔ وہ ہنس پڑی۔ بڑی مترنم اور مدھنسی ہنسی۔

یاد علی خان نے قدرے چوک کر اس کی سمت دیکھا (کس قدر شناسائی ہنسی ہے) وہ کمری پر بیٹھ کر سرخ اور زرد پرنٹ کے جدید تراش کے سوٹ اور شو لڈر کٹ میرا اسٹائل میں وہ بہت دلکش دکھائی دے رہی تھی۔ وہ اسے آئینے میں دیکھ رہے تھے۔

”بجو کو تلاش کر رہے ہیں ہم میں؟“ اس نے ان کی نظروں کو محسوس کر لیا تھا۔

بڑی سادگی سے مسکرا رہی تھی۔

”میں کسی میں کسی کو تلاش نہیں کرتا۔ ہر انسان کا اپنا علیحدہ رنگ ڈھنگ ہوتا ہے“۔ وہ برجستہ کہہ کر آئینے سے ہٹ گئے تھے۔

”اب بتائیے۔ آپ کا کیا پروگرام ہے؟“ وہ بیڈ پر بیٹھ گئے۔

”میرا پروگرام“۔ اس نے حیرت سے ان کی سمت دیکھا اور چائے کا کپ ان کی طرف بڑھا دیا۔

”جی..... آپ کا پروگرام..... ہمارے ساتھ چلنے کا“۔ انہوں نے اطمینان سے کہا۔

”آپ کے ساتھ؟“ وہ مزید حیران ہوئی۔

”کیا نعمان سے آپ کی اس موضوع پر کوئی بات نہیں ہوئی؟“ اس بار حیران ہونے کی باری ان کی تھی۔

”نہیں تو“۔ اس کے چہرے سے فکر مندی جھلکنے لگی۔

”چلیں خیر پھر چھوڑیں اس موضوع کو۔ نعمان کے سامنے ہی بات کریں گے۔ چلیں۔ اب یہ بتائیں۔ آپ

پلاننگ کیا ہے“۔ انہوں نے ہکا ساسپ لیا۔

”فی الحال تو کچھ نہیں۔ ایگزیم میں تو خاصا ٹائم ہے۔ بس ہلکی پھلکی اسٹڈی ہو رہی ہے“۔ وہ اب الجھی ہوئی نظر آ رہی تھی۔

رہی تھی۔

”پھر..... اس کے بعد؟“ وہ مسلسل سوال کر رہے تھے۔

”کچھ نہیں۔ کچھ سوچا نہیں“۔

”تو پھر سوچنا شروع کر دیں۔ شاید نعمان آپ کی شادی کی فکر میں ہیں“۔ ان کا انداز عام سا تھا۔

”نعمان بھائی تو بس“۔ وہ خاصی جھینپ گئی۔

”انہوں نے مجھ سے بھی کہا ہے کہ اس کار خیر میں میں بھی حصہ لوں۔ لہذا پہلے اتنا تو معلوم ہو جائے کہ آپ

پارٹنر میں کیا کیا خوبیاں دیکھنا چاہتی ہیں؟“ وہ سنجیدہ تھے۔

”ماہین کو جیسے اچھنچھا ہوا تھا۔ جیسے اسے یاد علی خان سے اس انداز کی باتوں کی امید نہیں تھی۔

”خوبیاں جاننے کیلئے تو بہت زیادہ قریب رہنا ضروری ہے۔ دور دور سے تو بس اندازے ہی لگ سکتے ہیں۔

سکتے ہیں“۔ وہ مسکرا رہی تھی۔

بڑی سادگی سے مسکرا رہی تھی۔

یاد علی خان نے قدرے چوک کر اس کی سمت دیکھا (کس قدر شناسائی ہنسی ہے) وہ کمری پر بیٹھ کر سرخ اور زرد پرنٹ کے جدید تراش کے سوٹ اور شو لڈر کٹ میرا اسٹائل میں وہ بہت دلکش دکھائی دے رہی تھی۔ وہ اسے آئینے میں دیکھ رہے تھے۔

”بجو کو تلاش کر رہے ہیں ہم میں؟“ اس نے ان کی نظروں کو محسوس کر لیا تھا۔

بڑی سادگی سے مسکرا رہی تھی۔

”میں کسی میں کسی کو تلاش نہیں کرتا۔ ہر انسان کا اپنا علیحدہ رنگ ڈھنگ ہوتا ہے“۔ وہ برجستہ کہہ کر آئینے سے ہٹ گئے تھے۔

”اب بتائیے۔ آپ کا کیا پروگرام ہے؟“ وہ بیڈ پر بیٹھ گئے۔

”میرا پروگرام“۔ اس نے حیرت سے ان کی سمت دیکھا اور چائے کا کپ ان کی طرف بڑھا دیا۔

”جی..... آپ کا پروگرام..... ہمارے ساتھ چلنے کا“۔ انہوں نے اطمینان سے کہا۔

”آپ کے ساتھ؟“ وہ مزید حیران ہوئی۔

”کیا نعمان سے آپ کی اس موضوع پر کوئی بات نہیں ہوئی؟“ اس بار حیران ہونے کی باری ان کی تھی۔

”نہیں تو“۔ اس کے چہرے سے فکر مندی جھلکنے لگی۔

”چلیں خیر پھر چھوڑیں اس موضوع کو۔ نعمان کے سامنے ہی بات کریں گے۔ چلیں۔ اب یہ بتائیں۔ آپ

پلاننگ کیا ہے“۔ انہوں نے ہکا ساسپ لیا۔

”فی الحال تو کچھ نہیں۔ ایگزیم میں تو خاصا ٹائم ہے۔ بس ہلکی پھلکی اسٹڈی ہو رہی ہے“۔ وہ اب الجھی ہوئی نظر آ رہی تھی۔

رہی تھی۔

”پھر..... اس کے بعد؟“ وہ مسلسل سوال کر رہے تھے۔

”کچھ نہیں۔ کچھ سوچا نہیں“۔

”تو پھر سوچنا شروع کر دیں۔ شاید نعمان آپ کی شادی کی فکر میں ہیں“۔ ان کا انداز عام سا تھا۔

”نعمان بھائی تو بس“۔ وہ خاصی جھینپ گئی۔

”انہوں نے مجھ سے بھی کہا ہے کہ اس کار خیر میں میں بھی حصہ لوں۔ لہذا پہلے اتنا تو معلوم ہو جائے کہ آپ

پارٹنر میں کیا کیا خوبیاں دیکھنا چاہتی ہیں؟“ وہ سنجیدہ تھے۔

”ماہین کو جیسے اچھنچھا ہوا تھا۔ جیسے اسے یاد علی خان سے اس انداز کی باتوں کی امید نہیں تھی۔

”خوبیاں جاننے کیلئے تو بہت زیادہ قریب رہنا ضروری ہے۔ دور دور سے تو بس اندازے ہی لگ سکتے ہیں۔

سکتے ہیں“۔ وہ مسکرا رہی تھی۔

نہیں۔

”کسی کے ٹریفک سے کبھی کسی کی سوچ بدلی ہے۔“ وہ مبہم سا مسکرائے۔

ماہین پر اچانک آسمان ٹوٹا تھا۔ اس کی بدحواسی بے حد فطری عمل تھا۔

اسے دھیان آیا اس کے اور یاد علی خان کے درمیان بس ایک چھوٹی سی تپائی ہے۔ اسے بڑی طرح یاد آئی ہے۔

وہ ایک دم اٹھ کھڑی ہوئی۔

”ہاجرہ کو بھیجتی ہوں۔ وہ آپ کے کپڑے وغیرہ پر پریس کر دے گی۔“

اتنا کہہ کر وہ تیزی سے باہر آگئی۔

وہ غور کرنا چاہتی تھی۔ یہ کیا ہوا ہے۔ یہ عام بات تھی یا خاص؟

یہ کہ ان کا مطلب کچھ اور تھا۔ وہ کچھ اور سمجھتی ہے۔

یا پھر یہ کہ وہ بھی تو انہیں زچ کر دیتی ہے۔ آخر انہوں نے کچھ نہ کچھ تو کہنا ہی تھا۔

وہ تو بہت سادہ اور روڈ ہیں۔ حس لطیف تو شاید ان کے نزدیک بھی نہیں پہنچتی۔

مگر نہیں۔

مرد کہہ کر مکر جائے۔ وہ الگ بات۔

راہ دکھا کر راستہ بدل جائے۔ دوسری بات ہے۔

مگر مقابل بیٹھی عورت کو غلط فہمی نہیں ہو سکتی۔

اس لئے کہ جب عورت مرد کے مقابل ہو، تنہا ہو تو اس کا پورا وجود ٹاک، آنکھ، کان بنا ہوا ہوتا ہے۔

وہ سر جھٹکتی ہوئی نیچے اتر رہی تھی۔

لاحول ولا قوۃ۔

اس نے اپنا تجربہ پیش کر دیا۔

نہ خوشی تھی نہ رنج۔

نہ افسوس تھا نہ ملال۔

بس حیرت تھی۔ سوچ جیسے ایک مقام پر ٹھنک سی گئی تھی۔

اس نے کھڑکی سے دیکھ لیا تھا۔ وہ کتاب لے کر باغ کی طرف جا رہا تھا۔

وہ تیزی سے کمرے سے باہر آئی۔ اور تقریباً دوڑتی ہوئی اس تک پہنچی۔

وہ بھی قدموں کی دھمک پر رک کر پیچھے دیکھنے لگا تھا۔

”اوہ..... آپ؟“ اس نے گہرا سانس لیا۔

”بہت سہ ہے اب؟“ اس کا انداز خاصا روڈ تھا۔

”نہیں، بڑے مرد، بحران ہو۔ میں زیادہ لمبی بات نہیں کروں گی بس یہ بتاؤ۔ جھومر بھابی کراچی کیوں گئی تھیں۔ جبکہ

نہیں؟“ اس کا انداز بنوڑا ہے تھے؟“ وہ غرائی۔

”کراچی نہیں گئی تھیں۔“ اس نے مختصر جواب دیا۔

”تو پھر کراچی نہیں؟“ اس کا انداز بنوڑا تھا۔

”وہ ہوش رہا۔“

”مگر تو پوچھ رہی ہوں؟“ وہ مزید طیش میں آگئی۔

”پوچھئے، بلکہ پوچھتی رہیے۔ پوچھنے پر کوئی پابندی نہیں۔ مگر جواب دینا مجھ پر فرض نہیں۔“ وہ پرسکون انداز میں گویا ہوا۔

”کیوں فرض نہیں؟ جس سے سوال کیا جائے، وہ جواب دینے کا پابند ہوتا ہے۔“

”ہاں لکھا ہے؟“ وہ بالآخر مسکرا دیا۔

”جیسے سر میں۔“ وہ جھلا گئی۔

”ہاں۔ یہ کوئی حیرت کی بات نہیں۔ وہاں لکھا ہوا ہو سکتا ہے۔“ وہ حوصلے کی منڈیر پر بیٹھ گیا۔

”پھر زیادہ چلانے کی کوشش نہیں کرو۔“ وہ برہمی سے بولی۔

”آپ کیوں ہلکان ہو رہی ہیں؟“ وہ زچ سا ہو گیا۔

”ہلکان نہیں ہوں گی۔ تو کیا کالا چور ہلکان ہوگا؟ کیا اول فول بول رہی تھیں۔ رات جھومر بھابی۔ چکر کیا ہے؟“

”مجھے بائیس رات کیا بات ہوئی تھی۔“ وہ کتاب کھولنے لگا۔

”زیادہ انجان بننے کی کوشش نہیں کرو۔ تم ان کا وہ انداز، ضم کیسے کر گئے۔ سواگلی (So ugly) سوچیپ۔ نان سنس۔“

”لے نہ فحاش سے کہا۔“

”کوئی ایسا بات نہیں ہوئی۔ کیوں بے چاری جھومر بھابی کو برا بھلا کہہ رہی ہیں۔ یہ بھی بھلا کوئی بات ہے۔ اپنے قیاس

بہانے کر اپنی ذات کو دکھ دینا۔ وہ آپ کی طرح ذہین اور اتنی زیادہ پڑھی لکھی نہیں ہیں۔ نظر انداز کر دیں اور اپنی دنیا میں

گم ہو جائیں۔“

”میں نے کمال رسانیت اور مہربانی سے اسے سمجھایا۔“

”میں ان کے الفاظ کی طرف تو دھیان نہیں دے رہی۔ ان کا انداز میری آنکھوں کے سامنے گھوم رہا ہے۔“

”میں نے ان کی بات کو سمجھ لیا۔ مجھے پڑھنے دیں۔ حویلی کی تمام خواتین میرے لئے محترم ہیں۔ اور مستقبل قریب اور مستقبل

دور کے لئے میرا کوئی نیا رشتہ استوار ہونے کا امکان نہیں اور نہ ہی میں ایسا چاہوں گا۔“

”میں نے ان کے الفاظ کی طرف تو دھیان نہیں دے رہی۔ ان کا انداز میری آنکھوں کے سامنے گھوم رہا ہے۔“

”میں نے ان کی بات کو سمجھ لیا۔ مجھے پڑھنے دیں۔ حویلی کی تمام خواتین میرے لئے محترم ہیں۔ اور مستقبل قریب اور مستقبل

”تم..... شدید احساس کمتری کا شکار ہو۔ تم اس حویلی کے ملازم تو نہیں ہو۔ اور یہ کہ جب مجھ پر بھروسہ کر رہی تھیں، تمہیں ٹوکنا چاہیے تھا۔ اپنی ناراضگی کا اظہار کرنا چاہیے تھا۔“ وہ اسی سابقہ انداز میں گویا کہ ”جن کاموں سے نہ میرا فائدہ ہو رہا ہو نہ نقصان۔ میں ان میں کوئی رول ادا کرتا نہیں چاہتا۔“ اس نے اپنے مخصوص پرسکون انداز میں جواب دیا۔

”مگر تم یہ تو مانو کہ ان کا انداز غلط تھا۔“ وہ اپنی جگہ اڑی ہوئی تھی۔

”ہاں..... میں یہ مانتا ہوں یہ سب انہیں زیب نہیں دیتا۔“ اس نے بالآخر کہہ دیا۔

”تو بس مسئلہ ہی کوئی نہیں، مگر تم یہ ضرور جتنا کہ تم اس قسم کی باتیں پسند نہیں کرتے۔“ روشنی نے کہا۔

ہوئی تھی۔

”میں جتنا چکا ہوں۔“ وہ آہستگی سے گویا ہوا۔

”کب؟“ روشنی نے الجھ کر دیکھا۔

باری خاموش رہا۔

”میں کچھ پوچھ رہی ہوں۔ اس سے پہلے بھی وہ یہ حرکت کر چکی ہیں؟ اور کہاں؟“ اس نے جرح کی۔

”آپ چھوڑیں اس قصے کو جب بات ہی کوئی نہیں تو بات آگے لے جانے سے فائدہ؟“ وہ جھل سے کہنا۔

”مگر مجھے بہت غصہ ہے۔ میں ایک بار ان کی کسائی کروں گی ضرور۔ تم مجھے روکنا مت۔“ وہ ٹانہ ہلاتی۔

تھی۔

”مرضی ہے آپ کی۔“ وہ کتاب پر نظریں دوڑانے لگا۔

”اچھا ایک بات اور بتاؤ۔“ وہ اسی زاویے سے کھڑی ہوئی تھی۔

”پوچھ لیں۔ پوچھنے میں کیا جاتا ہے؟“ اس نے کتاب سے سر اٹھائے بغیر کہا۔

”تمہارا بندھن حویلی کی کسی خاتون سے کیوں نہیں بندھ سکتا۔ بابا صاحب مجھے کہہ رہے تھے۔ تم کو۔“

”ہو۔“ وہ اسے بغور دیکھ رہی تھی۔

”یہ ان کی شفقت و محبت ہے کہ وہ ایسا سوچتے ہیں۔ مگر مجھے اپنی حیثیت کا اندازہ ہے۔“

اس نے ایک لمحے کو نظریں اٹھائیں۔

”تمہیں اپنی حیثیت منوانے کی کوشش کرنا چاہیے۔“ اس نے مشورہ دیا۔

”مجھے جو حیثیت حاصل ہے، وہ بہت ہے، جس کے کیلئے میں خان کا بہت مشکور ہوں۔“ اس نے کہا۔

دیا۔

”شاید تم میں بہت کی کمی ہے۔“ اس نے چوٹ کی۔

”شاید۔“ باری نے کمال بے نیازی سے جواب دیا اور سامنے دیکھنے لگا۔

”میں طرح سے تم چچے تو نہیں ہو۔“ وہ تنک کر گویا ہوئی۔

”میں اس طرح سے تم چچے تو نہیں ہو۔“ وہ مسکرا دیا۔ ”اس میں تو میری بچت ہے۔“

”پتا تو ابھی زیادہ اچھی بات ہے۔“ وہ مسکرا دیا۔ ”اس میں تو میری بچت ہے۔“

”جتنی بھی ہے دو لمبے بالوں والی۔ اس نے تمہیں جیت لیا۔ میں سب سمجھتی ہوں۔ تم صرف اس کی وجہ سے ادھر ادھر نظر

نہایت۔“ روشنی نے زبردستی شوخی کا مظاہرہ کیا۔

”یہ میری لک ہے کہ اس نے مجھے پسند کیا۔ وہ تو خود اتنی خوبیوں کی مالک ہے کہ اس کا ساتھ کسی کیلئے بھی فخر کا باعث ہو

سکتا ہے۔“ باری نے مسکرا کر اس کی سمت دیکھا۔

”روشنی کے چہرے پر کئی رنگ آ کر گزر گئے۔“

”کیا کیاں خوبیاں ہیں اس میں؟ سر کے بل چلتی ہے؟“ وہ اپنا غصہ نہ چھپا سکی۔

”نہیں..... یہ خوبی نہیں ہو سکتی۔ یہ تو فالٹ ہے۔ بندہ جب تک ٹانگوں سے نہ چلے اس کی خوبصورتی نہیں کھلتی۔ اس کی

ہر ذرہ خوبصورت ہے۔“ باری ہنس دیا۔

”بہنہ..... جب اتنی خوبیوں کی مالک ہے تو پھر تمہیں الوبنا ہی ہے۔ اس کے اور طلب گاہ نہیں ہوں گے؟“ وہ دہک

نہیں۔

”اگر الوبنا ہی ہے تو بھی مجھے الوبنا پسند ہے۔ اتنی دلکش لڑکی کے ہاتھوں۔“ وہ ہنس رہا تھا۔

”اگر وہ تمہارے ہاتھ نہ آئی؟“ اس نے ایک اور سوال داغا۔

”تو کیا ہو۔ زندگی کامیابی اور ناکامی کے سلسلوں کا نام ہے۔“ وہ اس کی سمت دیکھنے لگا۔ مسکراہٹ ہنوز ہونٹوں پر کھیل

نہیں۔

”تمہیں دکھ تو ہوگا۔“ اس نے نظریں چرا کر پوچھا۔

”ظاہر ہے۔ بالکل فطری بات ہے۔ مگر جب دکھ ملیں تو برداشت کرنا چاہیے۔“ اس نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

”ہمت ہے تم میں؟“ وہ استہزائیہ انداز میں پوچھ رہی تھی۔

”ہاں۔“ اس نے اطمینان سے جواب دیا۔

”تو پھر اسے چھوڑ دو۔“

”آپ کے حکم پر اتنی اچھی چیز نہیں چھوڑی جاسکتی۔ آخر زبان بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔“

”زبان دی ہے تم نے اسے؟“ اس کی آواز آہستہ تھی۔

”ظاہر ہے..... قلرت تو نہیں کر رہا۔ اب میں پڑھ سکتا ہے؟“ اس نے جیسے اجازت طلب کی۔

”بہنہ۔“ روشنی جلدی سے پلٹ گئی۔

باری کتاب چھوڑی کے نیچے نکلے اسے دیکھتا رہا۔

ابھی تھوڑی دیر پہلے لال خان اسے تیار رہنے کیلئے کہہ کر گیا تھا کہ عارف کے ہاں چلنا ہے۔ اور اب تیار ہو رہی تھی۔ اس پر انکشاف ہوا کہ وہ اندر سے خاصی خوشی محسوس کر رہی ہے۔ وہ اپنے احساسات سے غافل خوبصورت ساڑھی اس نے نکالی تھی واپس رکھ دی۔ اور عام سرگھر میں پہننے والا سوٹ استری کرنے لگی۔ جس سے احتیاط کر رہی ہو۔

وہ شادی کے بعد سے بہت اہتمام سے تیار ہوتی تھی، خواہ کہیں بھی جانا ہو۔ مگر آج وہ بہت ساڑھی پہن رہی تھی۔ اپنے آپ سے ڈر لگ رہا تھا۔

وہ کپڑے تبدیل کر کے چادر اوڑھ کر وہیں کمرے میں بیٹھ رہی۔ اور لال خان کا انتظار کرنے لگی۔
”ارے تم تیار نہیں ہوئیں؟“ لال خان کمرے میں آ کر حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔
”کپڑے بدل تو لیے ہیں۔“ وہ بے زاری سے بولی۔

”کیا اور کپڑے نہیں ہیں تمہارے پاس؟ عارف کی ماں تمہیں پہلی بار دیکھے گی۔ کیا کہے گی۔ میرے پاس سوچے گی؟ کہ تمہیں کپڑے بنوا کر نہیں دیتا۔“ لال خان نے قدرے ناراضگی سے کہا۔
”کیا کپڑے کپڑے کئے جا رہے ہیں آپ۔ میرا دل نہیں چاہ رہا۔“ وہ بھی تنہی سے گویا ہوئی لال خان ہنسنے لگا۔
”کیا ہوا تمہارے دل کو؟“ وہ خفگی سے پوچھ رہا تھا۔

”دل کو تو کچھ نہ کچھ ہو ہی جاتا ہے۔ یہ کوئی اپنے بس کی بات ہے۔“ بڑبڑائی۔
”ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔ چلو۔ ایسے ہی چلو۔“ لال خان نے بڑی جلدی تھپار ڈال دیے اور کمرے سے باہر بالو پرس اٹھا کر اس کے پیچھے پیچھے چل پڑی۔
گاڑی گھر سے باہر ہی کھڑی تھی۔ اس نے گیٹ کو تالا ڈال دیا۔ لال خان گاڑی میں بیٹھ چکا تھا۔ وہ بھی ان میں آ بیٹھی۔

راستے بھران کے درمیان عجیب سی خاموشی حاکم رہی۔
تقریباً چالیس پچاس منٹ پر محیط فاصلہ تھا۔
وہ ایک نئی بستی میں آ گئے تھے۔ جہاں دور دور تک فلیٹ ہی فلیٹ نظر آرہے تھے۔
وہ ایک شاندار عمارت کے سامنے رک گئے تھے۔ عارف کا فلیٹ گراؤنڈ فلور پر ہی تھا۔
”لال خان نے کال بیل کا بٹن پش کیا۔ تقریباً دو منٹ بعد آف وہ اسٹ دروازہ وا ہوا۔ سامنے ہی عارف کھڑا تھا۔
”آہ..... آپ۔“ وہ لال خان کے گلے لگتے ہوئے بالو سے مخاطب تھا۔
”بہت بے ایمان ہو، بغیر بتائے چلے آئے۔ جی چاہتا ہے تم سے بات بھی نہ کروں۔ بے وقوف کو بھی بتا دو۔ یاروں کی پرواہ بھی نہیں کرتے۔“ لال خان نے شکوہ کیا۔

اے میرے جوش جنون عشق تیرا شکریہ
تو نے جو بخشی تھیں وہ رسوائیاں اچھی لگیں

لال خان کو کھائے کھائے اندر چلا گیا۔ بالو بھی ان کے پیچھے چل پڑی۔

رہنے کی سخت پر ایک نہایت ضعیف عورت بیٹھی آنکھیں سکیڑ کر غالباً آنے والوں کو پہچاننے کی کوشش کر رہی تھی۔

”سلام بیگم! اماں کیسی ہیں آپ؟“ لال خان نے قدرے نزدیک ہو کر سلام کیا۔

”بیگم السلام۔ جیتے رہو۔ لال خان ہے ناں۔“ عارف کی ماں نے کانپتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

”اب پہچانا اماں!“ لال خان پہچانے جانے پر بہت خوش نظر آیا۔

”یہ ساتھ میں کون ہے؟“ عارف کی ماں نے پھر دوسری جانب توجہ کی۔

”آپ کی بہو ہے..... بالو! سلام کرو۔“ وہ اس کی طرف پلٹا۔

”سلام بیگم اماں۔“ بالو نے یوں سلام کیا گویا اسے سلام کرنے کیلئے لال خان کے حکم ہی کی ضرورت تھی۔

”بھر پاس آ بیٹی..... مجھے دور سے صاف دکھائی نہیں پڑتا۔“ بڑی بی نے اسے پاس بلایا۔

”کتے دکھ کی بات ہے عارف بھائی۔ آپ کی ماں کی یہ حالت ہے اور آپ ان کی خاطر بھی خود کو نہیں سنبھالتے۔“ بالو

نات آمیز انداز میں عارف کو مخاطب کیا۔ اور بڑی بی کے پاس بیٹھ گئی۔

”ارے بھابی۔ سو طرح کی دلیلیں تو ہمارے دماغ میں بھی آتی ہیں۔ بس مگر..... وہ کیا کہیں کہ

درد تو جو کرے ہے جی کا زیاں

فائدہ اس زیاں میں کچھ ہے؟

”آتا ہے نہیں بھی یہ دھیان..... مگر کوئی مجبوری سی مجبوری ہے۔“ وہ ہنس دیا۔

اس نے منہ عمری پٹھانی اندر آئی۔ مگر مہمانوں کو دیکھ کر وہیں دروازے پر رک گئی۔

”آؤ تو بہار..... کوئی کام؟“ عارف نے اسے مخاطب کیا۔

”کپڑا سارا مل گیا ہے۔ اماں سے معلوم کرنا ہے آج کیا کہے گا۔“ اردو بولتے ہوئے اس کی زبان لڑکھڑاہی تھی۔

”آج کچھ نہیں کہے گا۔ مہمان آئے ہیں۔ سب کچھ باہر سے آئے گا۔ اس لیے کہ شاید ہمارے ہاں کا پکا ہوا بھابی کو پسند

نہ آئے۔ یہ بہت اچھا کھانا پکاتی ہیں۔“ عارف نے لا پرواہ انداز میں مسکرا کر کہا۔ پٹھانی واپس پلٹ گئی۔

”کیوں غصہ کرتے ہیں عارف بھائی۔“ بالو شرمندہ سی ہو گئی۔

”یہ یہاں سارے کام کرتی ہے؟“ لال خان کا اشارہ پٹھانی کی طرف تھا۔

”ہاں اماں کیلئے رکھا ہے۔ اب ان کی کام کرنے کی عمر نہیں۔ آنکھوں سے بھی کم دکھتا ہے۔“ عارف نے جواب دیا۔

”کھانوں سے بھلا ہے جس ماں کو۔ کوئی مستقل انتظام کیوں نہیں کرتے ماں کیلئے۔“ بالو نے فوراً اسے ٹوک دیا۔

”اسے نیکی..... اسی غم میں تو رو کر اندھی ہو گئی۔ پر اسے کوئی احساس نہیں۔ یہی دکھ مجھے کھائے جاتا ہے۔“ بڑی بی کی

آواز بھرا گئی۔
”آپ کو اپنی ماں کے جذبات کا خیال کرنا چاہیے عارف بھائی۔ کتنی بری بات ہے۔“

”آپ کو اپنی ماں کے جذبات کا خیال کرنا چاہیے عارف بھائی۔ کتنی بری بات ہے۔“
”بالو بڑی بی کے آنسوؤں سے ایک دم ہی موم کی طرح پکھلنے لگی۔
”انسانوں کو انسانوں سے شکایتیں تو رہتی ہی ہیں۔ کچھ کر لیجئے۔ اگر میں اماں کی بات مان لوں تو میری
شکایتیں ہو جائیں۔ اس لئے میں ان سب باتوں کی پرواہ نہیں کرتا۔“ عارف نے اپنی مخصوص بے نیازی سے زور
کیا کہا ہے شاعر نے۔

وہ فرشتے آپ تلاش کیجئے کہانیوں کی کتاب میں !!
جو برا کہیں نہ برائیں، کوئی ان سے خفا نہ ہو

”کیوں لال خان؟“ وہ مسکرا رہا تھا

لال خان بھی جوابا ہنس دیا۔ ”کوئی کوئی شعر تو تمہارا ہماری سمجھ میں آ ہی جاتا ہے۔“

”دیکھ لو..... اس طرح باتوں میں اڑا دیتا ہے۔ مجھے اپنی فکر نہیں ہے۔ میری تو گزر گئی۔ بس اسی کا خیال ہے۔
اگلیا ہو جائے گا میرے بعد۔ گھر میں بہو ہوتی۔ بچے کھیلتے۔“ بڑی بی نے آزر دگی سے کہا۔ ”آل اولاد ہو تو بہن۔
”لائی تو تھیں تم..... اسے تو تمہارے جذبات کا اتنا خیال تھا کہ پہلے بندوبست کر کے آئی تھی۔“ اماں۔
جاندار تھا۔

”بالو کھسیا سی گئی۔ لال خان عارف کے ساتھ شریک تھا۔

”بس یہ اسی کو پیٹے جائے گا۔ لوگ ایک جروا (بیوی) کے بعد دوسری نہیں کرتے؟“ بڑی بی کو غصہ آ گیا۔
”چھوڑو اماں! ان باتوں کو۔ گھر میں بہت اچھے مہمان آئے ہیں۔ یہ جو بھابی ہیں ناں، میری بہت کد
ہیں۔

اور بھابی آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے۔ کچھ کمی محسوس ہو رہی ہے آپ میں۔“ عارف اسے سر سے ہانڈ
لگا۔

بالو کے دل کی دھڑکن تیز ہونے لگی۔ حالانکہ وہ تو اپنی دھن میں تھا۔

مگر شاید اس کے اندر کوئی چور راستہ پیدا ہو گیا تھا۔

نا پسندیدہ ترین حالات میں انسان خود کو بالکل ہی اکیلا تصور کرنے لگتا ہے۔ نا پسندیدہ قرب نے گویا
تھا۔ جو ساتھ کھڑے ہوئے پیر پر ہی چڑھ جانا چاہتی ہے۔ اس نے دل ہی دل میں لا حول پڑھی۔

”گرمی بھی تو بہت پڑ رہی ہے دلہن! سوتی کپڑوں ہی میں چین پڑتا ہے۔ خیر سے دوجی سے تو نہیں ہو۔“
بالو کو بہت حیا آئی۔ وہ خاموش رہی۔

”دعا کرو اماں! سونے میں تول دوں گا اسے۔“ لال خان نے بے ہنگم سا قہقہہ لگایا۔

”ہاں بھونڈے اور کھلے سے انداز پر کڑھ کر رہ گئی۔ ایک عارف ہے بڑی سے بڑی بات کتنی نفاست سے کرتا ہے کہ
بہن! جان پر بھاری پڑنے لگتی ہے۔
”ہاں! وہ کون تھی۔ جس کے پیچھے عارف بھائی کی یہ حالت ہے؟“ عرصے کا تجسس آخر ہونٹوں پر آ گیا۔
”بس کیا بتاؤں بیٹی۔ کوئی خاندانی تو تھی نہیں۔ بہت بڑی حویلی میں کنیر تھی۔ اللہ نے حسن بہت دیدیا تھا۔ اس میں سما
نہیں رہا تھا۔ ارے بڑی چلتا پرزہ تھی۔ یہ تھا کم عمر اور سیدھا۔ جان کو روگ لگا بیٹھا۔
باریک تو کبخت کا حسن! اس پر حویلی کی عورتوں کی قیمتی اترن فتنہ بنی پھرتی تھی۔ جانے کس کس کا ستیا ناس کیا ہوگا۔ میرا
پڑ بھلی گیا میرے ہاتھوں سے۔ ناس مٹی کہیں کی۔“

بڑی بی کے زخم گویا ہرے ہو گئے۔

”آپ حویلی میں رہتی تھیں؟“

”ارے نہیں بیٹی! پٹواری تھا، میرا مرد گاؤں میں۔ بس آنا جانا تھا حویلی میں۔

کرموں جلی..... ذات کی کنیر..... پتا نہیں کیا سمجھتی تھی اپنے آپ کو۔“ بڑی بی کے لہجے میں کھولن در آئی۔

”کیا نام تھا اس کا؟“ بالو کا تجسس اب کمال پر تھا۔

”بھلا سا نام تھا۔ چھوڑیے۔ کیا رکھا ہے ان باتوں میں..... چائے..... آرہی ہے چائے پیجئے۔ بہت اچھی چائے بناتی
ہے ہماری پٹھانی۔“

عارف نے ایک دم اندر آ کر ماحول یکسر بدل دیا۔ بالو نے ایک گہرا سانس لیا۔ یہ اس کا تجسس کبھی بھی مٹنے نہیں دے گا۔

نہتا ہے نہ بتانے دیتا ہے۔ اس نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر آنکھیں موند لیں۔

لال خان عارف سے اپنی کاروباری باتوں میں مشغول ہو چکا تھا۔

وہ کسی کام کی دھن میں بڑی تیزی سے لاؤنج میں آئی تھی۔ وہاں یاوہری علی خان نعمان کے ساتھ گفتگو میں مصروف تھے۔

نگاہیں یونہی بے ساختہ مل گئی تھیں۔ جیسے بازار میں بھیڑ میں سے گزرتے ہوئے کسی سے بھی چار ہو جاتی ہیں۔

مگر اس کا رواں رواں کھڑا ہو گیا تھا۔ ایک دم ہی نئے احساس سے دو چار ہوئی تھی۔

”کہاں غائب ہیں بھئی۔ نہ چائے نہ ٹھنڈا۔“ نعمان نے ماہین کو مخاطب کیا۔

”مجھے پتا نہیں تھا آپ لوگ یہاں بیٹھے ہیں۔ ابھی بھجوا دیتی ہوں۔“ اس نے شرمندگی سے کہا اور واپس باہر جانے لگی۔

”رہنے دیجئے۔ ابھی میرا موڈ بھی نہیں..... باہر جا رہا ہوں فی الحال دو چار کام نمٹانے ہیں۔ روشنی کیلئے بھی دو چار چیزیں

نیچیں۔“ یاوہری علی خان نے اسے روک دیا اور وہ رک بھی گئی۔

”ماہین.....! یاوہری علی خان نے اسے مخاطب کیا۔

”گئی۔“ وہ نظر اٹھانے کا حوصلہ نہ کر سکی۔

”آپ تیار ہو جائیں۔ ذرا میرے ساتھ چلیں۔ میں نے کبھی روشی کی شاپنگ نہیں کی۔“

”پھر اب کیوں کر رہے ہیں؟“ اس کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔

”آپ نے بیٹی کو قریب جو کر دیا ہے۔“ وہ بہت دھیمی آواز میں کہہ رہے تھے۔

”ہاں..... ہاں..... تو چلی جاؤ ناں۔ یوں بھی تم کہیں نکلتی نہیں ہو۔“ نعمان نے بھی اس سے پر زور انداز میں ”ٹھیک ہے..... میں تیار ہو کر آتی ہوں۔“

یاد علی خان نے اپنی سرخ آنکھیں ایک لمحے کو اٹھا کر اس کی سمت دیکھا۔ کہ مرد پتا پھینک کر کئی بار عورت کا بازو ہے۔ اسے اگلے مرحلے کی تیاری کرنا ہوتی ہے۔

”آپ کتنا تاخیر دیں گے؟“ مابین آگے بڑھتے بڑھتے رک کر پوچھنے لگی۔

”جتنا مرضی لے لیں۔“ وہ برجستہ بولے۔

”میرا مطلب ہے آپ لیٹ تو نہیں ہو جائیگے۔“ وہ گھبرا کر نعمان کی طرف دیکھنے لگی۔

جواب میں صرف یاد علی خان نے اس کی طرف دیکھنے پر اکتفا کیا۔

مابین کا دل پھر ٹھنک گیا۔ اس نے دوپٹے سے چہرہ پونچھا۔

”میں ابھی آتی ہوں۔“ وہ یہ کہہ کر باہر نکل گئی۔

وہ دونوں پھر باتوں میں مصروف ہو گئے۔

مابین کم صم ہی اپنے کمرے میں آئی تھی۔ اور وارڈروب کھول کر خالی خالی نظروں سے کپڑوں کو دیکھنے لگی۔

ایک سرخ کاشن کا سوٹ نکال لیا۔

کپڑے بدلنے میں اسے بمشکل تین منٹ لگے ہوں گے۔ میچنگ وہ کرتی نہیں تھی۔ صرف ہم رنگ چل رہی تھی۔

پاؤں میں ڈالی تھی۔ لپ اسٹک لگاتے ہوئے اس کے احساسات عجیب سے ہو رہے تھے۔

عورت کی تیاری میں بھی عجیب سے بھید پوشیدہ ہوتے ہیں۔ حالانکہ دل کئی بار ٹوک چکا تھا اور پوچھ رہا تھا کہ

جب ناگواری بھی نہیں۔

جب خوش گواری بھی نہیں۔

تو پھر یہ سب کیا؟

جانتی ہو تمہاری سب سے بڑی بہن ان کے نکاح میں تھی۔

پتا ہے۔ ان کی بیٹی بیاہنے کی عمر کو آگئی ہے۔

خبر ہے۔ وہ تم سے کتنے بڑے ہیں؟

اس نے جھنجھٹا کر لپ اسٹک کا ڈھکن زور سے بند کیا۔ انہوں نے مجھے کہا ہی کیا ہے۔ میں کیوں اتنی کاٹتی

ہوں۔ بعض اوقات غلط فہمی بھی تو ہو جاتی ہے۔

دوسروں سے ہی اٹھ کھڑی ہوئی اور پرس ہاتھ میں لے لیا۔ بیڈ پر پڑی ہوئی چیزیں جلدی جلدی سمیٹ کر واپس لاؤنج

”جی“ اس نے نظریں اٹھائے بغیر کہا۔

خون نے جیب ٹول کر چالی نکالی اور یاد علی خان کو تھما دی۔ یاد علی خان اس کی طرف متوجہ ہوئے بغیر باہر پورچ کی

دہانے گئے۔

مرامیں ذرا سی بھی بصیرت ہو تو وہ عورت کی تیاری کے انداز سے اس کے دل کا بھید جان سکتا ہے۔ اسی لئے شاید انہیں

تجربہ بار بار دیکھنے کی ضرورت بھی نہیں رہی تھی۔

”بہن! آہستہ چلتی ہوئی گاڑی کی طرف آرہی تھی۔ دل پریشان سا بھی تھا کہ وہ ساتھ چل تو پڑی ہے۔ امتحان آ پڑا تو کیا

کے نا؟

یاد علی خان گاڑی میں بیٹھ چکے تھے۔

”بہن! میں بیٹھ گئی۔ مگر ایک دم چپ چاپ۔“

”آپ کو راستوں کا پتا ہے.....؟“ اس نے کسی دھیان سے چونک کر ان سے پوچھا۔

”آپ ساتھ تو ہیں۔“ بڑے سادہ انداز میں جواب آیا تھا۔

اس کا دل تو اچھل کر حلق میں آ گیا۔ شروعات ہی مشکل تھی۔

بہن! کوئی خیال سارے حواس پر غالب ہو تو ہر بات اسی کا پرتو محسوس ہوتی ہے۔ گاڑی کھلی شاہراہ پر آگئی تھی۔

”کراچی میں ڈرائیونگ بہت مشکل ہوتی جا رہی ہے۔ ڈرائیور اچھا خاصا اعصابی مریض بن سکتا ہے۔“ یاد علی خان

بیٹھ کر پتھر تے ہوئے گویا ہوئے۔

”جی“ مابین نے مختصر اتنا سید کی۔

”آبادی کے لحاظ سے یہاں کی پلاننگ صحیح خطوط پر نہیں ہے۔“ وہ پھر گویا ہوئے۔

”جی“ اس بار بھی اس کا جواب مختصر تھا۔

”ایک زمانہ تھا کہ یہ شہر سکون کے لحاظ سے آئیڈیل ہوا کرتا تھا۔“

”جی“ مابین کے منہ سے پھر ”جی“ ہی نکلا۔

”آج کل تو یہاں ہے۔ آخر آپ میری جی حضوری پر اتر آئیں۔“ وہ مبہم سا مسکرائے۔

”آپ مجھ کو کہہ رہے ہیں۔“ جی“ سے بہتر کوئی جواب میرے پاس نہیں۔“ وہ قدرے جھینپ گئی۔

”تم ان سے پہلے تو آپ کو مجھ سے شدید اختلاف رہا ہے۔“ وہ گاڑی آگے بڑھاتے ہوئے گویا ہوئے۔

”تو ان باتوں پر آج بھی ہے۔ مگر اختلاف کا مطلب ہمیشہ کا اختلاف نہیں ہوتا۔“

”نعمان! بات ہے اچھا کیا آپ نے بتا دیا۔ مجھے آگے سہولت رہے گی۔“ یہ پہلی مرتبہ ہوا تھا کہ یاد علی خان نے اس کی

بات کاٹی تھی۔

وہ باقی بات منہ میں ہی دبا کر رہ گئی تھی۔

”کس قسم کی سہولت؟“ اس نے زبردست شعوری کوشش کے بعد آخر کار اپنا اعتماد بحال کر لیا۔

”بتائیں گے..... کیا آپ کو جلدی ہے؟“ وہ آنکھوں پر سن گلاسز چڑھائے ہوئے تھے، آواز تو پہلے ہی سپان فو

”نہیں..... بھلا مجھے کیوں جلدی ہوگی؟ جب آپ کا موڈ ہو تو بتا دیجئے گا..... اچھا یہ بتائیں روشنی کیلئے آپ کی

؟“ اس نے کمال مہارت سے بات کا رخ موڑ دیا۔

”کچھ نہ کچھ تو لیں گے“ خواہش تو یہ ہے کہ آپ کے ہاتھ سے دلوائیں۔ کیونکہ مجھ سے تو وہ خفا رہتی ہے۔“

لجے میں بات کر رہے تھے۔

”تو آپ کو اس کی خفگی دور کرنے کی کوشش کرنا چاہیے۔“ اس نے فوراً ٹکڑا لگایا۔

”جو کچھ ہو رہا ہے وہ اسی کوشش کا حصہ ہے۔ مگر شاید آپ کو یقین نہ آئے۔“ وہ ایک جدید شاہنگ سنز کی لمب

رخ موڑتے ہوئے کہہ رہے تھے۔

”میں سمجھی نہیں۔“ وہ جان بچانے کو انجان بننا چاہ رہی تھی۔ اس لئے کہ ابھی وہ خود پر بھی واضح نہیں تھی۔

”اگر آپ اجازت دیں تو میں سمجھا سکتا ہوں۔“ انہوں نے فراخ دلی سے پیشکش کی۔

”ابھی موڈ نہیں کلاس لینے کا۔“ اس نے شرارت سے اپنی جان بچانے کی کوشش کی۔

وہ مسکرا کر خاموش ہو رہے۔

☆.....☆.....☆.....☆.....☆.....☆

سب سے پہلے وہ ایک وسیع بوتیک میں داخل ہوئے تھے۔

ہنسی ہنٹ گرین سلک کی ساڑھی پر نظر پڑی تھی جس پر سرخ موتیوں کا نہایت نازک کام بنا ہوا تھا۔

”یہ کیا ہے یہ ساڑھی؟“ انہوں نے پلٹ کر مایین کی سمت دیکھا۔

”بہت خوبصورت“ کیا روشنی ساڑھی پہننے لگی؟“ اس نے قدرے حیرت سے پوچھا۔

”تم آپ کیلئے کہہ رہا ہوں۔“ ان کا انداز بالکل سادہ تھا۔

”میں میرے لئے؟ مگر میں نے تو کبھی ساڑھی استعمال ہی نہیں کی۔ ہمارے ہاں عموماً شادی شدہ خواتین ہی

”تم نے کیا کیا؟“ اس نے جواب دیا۔

”تو نے کیا کیا بعد میں استعمال کر لیجئے گا۔“ ان کا انداز بدستور تھا۔

”تم نے کیا کیا؟“ اس نے ان کی بات مکمل ہوتے ہی جلدی سے کہا اور مسکراہٹ کے پردے میں اپنی

”تم نے کیا کیا؟“ اس نے ان کی بات مکمل ہوتے ہی جلدی سے کہا اور مسکراہٹ کے پردے میں اپنی

”تم نے کیا کیا؟“ اس نے ان کی بات مکمل ہوتے ہی جلدی سے کہا اور مسکراہٹ کے پردے میں اپنی

”جب آپ ہمیں گے تو کیسے لگیں گے؟“ وہ بے سچ بچ بتائیں۔ آپ آخری بار کب نے تھے۔“ مایین بھر موند

میں کامیاب ہو گئی۔

یاد علی خان کے چہرے پر اچانک سرد مہری جھلکنے لگی۔ ”ہنسنا کوئی مشکل کام تو نہیں ہے“ آپ کوشش کر سکتی ہیں۔“

آواز بھی بے تاثر تھی۔

”یا اللہ۔“ وہ بات پلٹ پلٹ کر عاجز آ چکی تھی۔ وہ تھے کہ پھر اس کے لئے نئی بات نکال دیتے تھے۔

”میں تو بہت کوشش کرتی ہوں جب بھی آپ سے ملاقات ہوتی ہے۔“

اس نے سنہل کر جواب دیا ”ہاں نہیں کیوں یوں محسوس ہوتا ہے جیسے آپ نے اپنے آپ پر خول چڑھایا ہو ہے۔“

بھی اتنا مضبوط کہ توڑنا مشکل۔“ اس نے قدرے جھجکتے ہوئے بالآخر کہہ دیا۔

”آپ میں گھس ہیں۔ آپ لوگوں کے خول توڑ سکتی ہیں۔“ ان کا انداز ہنوز سرد اور بے تاثر تھا۔

”خیر..... چلیں پہلے کچھ لے لیتے ہیں۔ واپسی میں ضروری بات کریں گے۔“ انہوں نے پارکنگ لائن

روک دی۔

”ضروری بات۔“ مایین کو نئے سرے سے گھبراہٹ ہونے لگی۔

انہوں نے لمبوسات پر نظریں دوڑاتے ہوئے سرسری سا اسے بھی دیکھا۔

”نہیں بھلا اعتراض کی کیا بات؟ بلاوجہ کی فضول خرچی، جبکہ ضرورت بھی نہیں۔“

اس نے دھیرے سے ہنس کر کہا۔

”جب چیز موجود ہوتی ہے تو اس کے استعمال کی جگہ بھی نکل آتی ہے۔ آپ اسے میرا اصرار سمجھیں۔“

گرل کو اشارے سے پیک کرنے کیلئے کہا۔

ماہین یک دم چپ سی ہو گئی۔

”یہ وہاٹ ڈریس دیکھئے۔ یہ روشی جیسی موڈی لڑکی کو بہت سوٹ کریگا۔ بہت خوبصورت ڈیزائن ہے۔“

طرف اشارے سے بتانے سے لگے۔

”جی۔“ وہ بس جی کر کے رہ گئی۔

”کیا مطلب؟“

”مطلب یہ کہ آپ خاصے چھپے رستم ہیں، سب کچھ تو پتا ہے آپ کو۔“ وہ ہنس دی۔

”ہاں تو میں نے کب کہا کہ مجھے کچھ پتا نہیں۔“ وہ بہت سنجیدگی سے جواب دے رہے تھے۔

”ظاہر تو آپ یہی کرتے ہیں۔“ وہ برجستہ بولی۔

”تو پھر لے لیں یہ؟“ وہ اس کی طرف دیکھنے لگے، گویا اس کی بات سنی ان سنی کر دی۔

”ضرور روشی بہت خوش ہوگی۔ اسے یہ ضرور بتائیے گا کہ یہ آپ کی پسند ہے۔“ ماہین نے نظریں چرا کر کہا۔

”آپ کہتی ہیں تو بتادیں گے، لیکن ایسا کیوں کرنا چاہیے۔“ وہ پوچھنے لگے۔

”آپ کی جانب سے محبت کا اظہار اسے خوشی سے پاگل کر دیگا۔“ مسکرائی۔

”بہتر۔“ وہ مخصوص انداز میں مسکرا دیئے۔

”آئیے اس کے علاوہ بھی دیکھتے ہیں اسے بہت زیادہ خوش کر دینا چاہیے۔“ وہ بائیں طرف مڑتے ہوئے۔

”ہاؤ اسٹریچ۔“ اس نے خوش دلی سے شانے اچکائے۔

”نہیں خیر ایسی بھی کوئی بات نہیں، اکلوتی بیٹی ہے میری۔“ انہوں نے اپنی مخصوص سنجیدگی سے جواب دیا۔

”بیٹا بھی اکلوتا ہے۔“ ماہین نے یاد دلایا۔

”ہاں، مگر وہ میرے ساتھ باہر جاتا رہتا ہے۔ اس کی پسند کی شاپنگ کرا دیتا ہوں۔“ انہوں نے اسی انداز میں۔

دیا۔

ماہین کو اس قدر واضح جواب ملنے کے بعد قدرتی طور پر خاموشی اختیار کرنا پڑی۔

تین سوٹ ایک فراک، ایک ساڑھی پیک کرا کر وہ باہر آئے۔

”تقریباً بیس منٹ انڈین قونسلٹ کے پاس صرف ہو گئے۔ آپ گاڑی میں بیٹھ کر انتظار کریں۔“

ماتھے سے اس سے قلمب ہوئے۔

”یہ۔۔۔ خیر ہے یہ تو بہت اہم ہے۔ میں چالیس منٹ انتظار کر سکتی ہوں۔“ اس نے مسکرا کر جواب دیا۔

”یہ۔۔۔ خیر ہے یہ تو بہت اہم ہے۔ میں چالیس منٹ انتظار کر سکتی ہوں۔“ اس نے مسکرا کر جواب دیا۔

”یہ۔۔۔ خیر ہے یہ تو بہت اہم ہے۔ میں چالیس منٹ انتظار کر سکتی ہوں۔“ اس نے مسکرا کر جواب دیا۔

”یہ۔۔۔ خیر ہے یہ تو بہت اہم ہے۔ میں چالیس منٹ انتظار کر سکتی ہوں۔“ اس نے مسکرا کر جواب دیا۔

”یہ۔۔۔ خیر ہے یہ تو بہت اہم ہے۔ میں چالیس منٹ انتظار کر سکتی ہوں۔“ اس نے مسکرا کر جواب دیا۔

”یہ۔۔۔ خیر ہے یہ تو بہت اہم ہے۔ میں چالیس منٹ انتظار کر سکتی ہوں۔“ اس نے مسکرا کر جواب دیا۔

”یہ۔۔۔ خیر ہے یہ تو بہت اہم ہے۔ میں چالیس منٹ انتظار کر سکتی ہوں۔“ اس نے مسکرا کر جواب دیا۔

”یہ۔۔۔ خیر ہے یہ تو بہت اہم ہے۔ میں چالیس منٹ انتظار کر سکتی ہوں۔“ اس نے مسکرا کر جواب دیا۔

”یہ۔۔۔ خیر ہے یہ تو بہت اہم ہے۔ میں چالیس منٹ انتظار کر سکتی ہوں۔“ اس نے مسکرا کر جواب دیا۔

”یہ۔۔۔ خیر ہے یہ تو بہت اہم ہے۔ میں چالیس منٹ انتظار کر سکتی ہوں۔“ اس نے مسکرا کر جواب دیا۔

”یہ۔۔۔ خیر ہے یہ تو بہت اہم ہے۔ میں چالیس منٹ انتظار کر سکتی ہوں۔“ اس نے مسکرا کر جواب دیا۔

”یہ۔۔۔ خیر ہے یہ تو بہت اہم ہے۔ میں چالیس منٹ انتظار کر سکتی ہوں۔“ اس نے مسکرا کر جواب دیا۔

”یہ۔۔۔ خیر ہے یہ تو بہت اہم ہے۔ میں چالیس منٹ انتظار کر سکتی ہوں۔“ اس نے مسکرا کر جواب دیا۔

”یہ۔۔۔ خیر ہے یہ تو بہت اہم ہے۔ میں چالیس منٹ انتظار کر سکتی ہوں۔“ اس نے مسکرا کر جواب دیا۔

”یہ۔۔۔ خیر ہے یہ تو بہت اہم ہے۔ میں چالیس منٹ انتظار کر سکتی ہوں۔“ اس نے مسکرا کر جواب دیا۔

”یہ۔۔۔ خیر ہے یہ تو بہت اہم ہے۔ میں چالیس منٹ انتظار کر سکتی ہوں۔“ اس نے مسکرا کر جواب دیا۔

”یہ۔۔۔ خیر ہے یہ تو بہت اہم ہے۔ میں چالیس منٹ انتظار کر سکتی ہوں۔“ اس نے مسکرا کر جواب دیا۔

”یہ۔۔۔ خیر ہے یہ تو بہت اہم ہے۔ میں چالیس منٹ انتظار کر سکتی ہوں۔“ اس نے مسکرا کر جواب دیا۔

”یہ۔۔۔ خیر ہے یہ تو بہت اہم ہے۔ میں چالیس منٹ انتظار کر سکتی ہوں۔“ اس نے مسکرا کر جواب دیا۔

”یہ۔۔۔ خیر ہے یہ تو بہت اہم ہے۔ میں چالیس منٹ انتظار کر سکتی ہوں۔“ اس نے مسکرا کر جواب دیا۔

”یہ۔۔۔ خیر ہے یہ تو بہت اہم ہے۔ میں چالیس منٹ انتظار کر سکتی ہوں۔“ اس نے مسکرا کر جواب دیا۔

”یہ۔۔۔ خیر ہے یہ تو بہت اہم ہے۔ میں چالیس منٹ انتظار کر سکتی ہوں۔“ اس نے مسکرا کر جواب دیا۔

”یہ۔۔۔ خیر ہے یہ تو بہت اہم ہے۔ میں چالیس منٹ انتظار کر سکتی ہوں۔“ اس نے مسکرا کر جواب دیا۔

”یہ۔۔۔ خیر ہے یہ تو بہت اہم ہے۔ میں چالیس منٹ انتظار کر سکتی ہوں۔“ اس نے مسکرا کر جواب دیا۔

”یہ۔۔۔ خیر ہے یہ تو بہت اہم ہے۔ میں چالیس منٹ انتظار کر سکتی ہوں۔“ اس نے مسکرا کر جواب دیا۔

”یہ۔۔۔ خیر ہے یہ تو بہت اہم ہے۔ میں چالیس منٹ انتظار کر سکتی ہوں۔“ اس نے مسکرا کر جواب دیا۔

ہیں۔ انہوں نے چہرہ موڑ کر اس کی سمت دیکھا۔

”پھر! میں کیا رول ادا کر سکتی ہوں۔ وہ خود کو سنبھال چکی تھی۔

”آپ کا تو بڑا میسرول ہے۔“ ان کے انداز میں بہت مضبوطی تھی۔

ماہین کا دل ایک مرتبہ پھر اچھل کر حلق میں آ گیا۔

”بابا صاحب ہری پور آئے تھے۔ جب میں اور روشی یہاں سے واپس گئے تھے۔“

”انہوں نے آپ کے نام سے ایک پیغام دیا ہے۔“ وہ بالکل سپاٹ انداز میں مخاطب تھے۔

”جی..... میرے نام۔“ اس نے بے ساختہ ان کے چہرے کی سمت دیکھا۔

”انہوں نے آپ سے معلوم کیا ہے آپ میرے بچوں کی محبت میں کتنا آگے بڑھ سکتی ہیں؟“

ماہین چند ثانیے خاموش رہی جیسے کسی گہری سوچ میں ہو۔ یاور علی خان بہت سکون سے ڈرائیو کر رہے تھے۔ جواب کا انتظار کر رہے تھے۔

”محبتوں کو ایکسپلاٹ کرنا بالکل بھی اچھی بات نہیں ہوتی۔“ آخر کار اس نے زبان کھولی۔

”بہت ساری وجوہات اکٹھی ہو کر کسی واقعے کی بنیاد بن جاتی ہیں۔ کمزوریاں ہی ایکسپلاٹ کرتی ہیں۔ اور محبت بہت ہی کمزور ہوا کرتی ہے۔“ یاور علی خان نے سمجھانے کے سے انداز میں کہا۔

”وہ محبت جو مجھے بچوں سے ہے؟“ ماہین نے الجھے ہوئے انداز میں سوال کیا۔

”اس کے علاوہ بھی ہو سکتی ہے۔“ برجستہ جواب آیا۔ اس کی نظریں جھک کر رہ گئیں۔

”کمال کی مقناطیسیت رکھنے والا مرد جسے دوسروں کے حواسوں پر چھانے کیلئے ذرا محنت نہ کرنا پڑے۔“ لہجے اور خوشگوار نظر کو خوش قسمتی کا پیمانہ سمجھا جاتا ہو۔ اس کی طرف سے اس طرح کا انداز اور جواب حواس کو توجہ دیتا ہے۔

خاصی دیر گاڑی میں خاموشی چھائی رہی۔ وہ اپنے اعصاب پر سکون کرنے کی کوشش میں لگی رہی۔ کامیاب بھی ہو گئی۔

”آپ بچوں کی ٹیڑھی نہ بناتے تو زیادہ بہتر تھا۔“ اس نے سنجیدگی سے کہا۔

”بات کا کوئی آغاز بھی ہوا کرتا ہے ابھی تو آغاز کیا ہے بات آگے بھی بڑھے گی میں تو آپ کے دوست ہوں۔“

”خاص احتیاط ہوں۔“ انہوں نے اچھلتی سی نظر اس کے پریشان سے چہرے پر ڈالی۔

”اتنا تو خیر آپ بھی تجزیہ کر سکتی ہیں کہ میرے بچے عمر کی وہ حدیں پار کر چکے ہیں جس کو بنیاد بنا کر رکھنا ہے۔“ ان کی سنجیدگی میں کوئی خلل واقع نہیں ہوا تھا۔

”پھر۔“ اس نے سر جھکا کر پوچھا۔

”پھر کیا اس سے تو ساری صورتحال واضح ہو جاتی ہے اور آسانی سے جواب دیا جاسکتا ہے خواہ وہ کتنا ہی

ہیں۔“

ماہین نے جواب آپ کی خواہش کے مطابق نہ ہوا تو آپ کی جاگیر دارانہ اور افسرانہ انا کو شدید زک پہنچے گی۔“ ماہین نے بے پرسکون انداز میں ان سے کلام کیا تھا۔

”شاید مگر مجھ میں برداشت کا مادہ ٹھیک ٹھاک موجود ہے۔ آپ اس کی فکر نہ کریں۔“

”میں اس وقت کسی بھی طرح کا جواب دینے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔ شاید آپ کو انتظار کرنا پڑے۔“

”میں کر سکتا ہوں۔“ یاور علی خان نے اس کی طرف ایک لچکے کود دیکھا۔

”دیے آپ سوچیں گی کیا؟ یہی کہ دنیا کیا کہے گی۔ جوان بچوں کے باپ سے شادی کیوں کی؟ مسئلہ کیا تھا۔ عمر کا فرق

بہت ہے۔ یہ..... اور..... وہ۔“ یاور علی خان مزید گویا ہوئے۔

”نہیں میں اپنا حساب کتاب رکھتی ہوں۔ مجھے یہ بات بالکل پسند نہیں۔ وہ تمام معاملات جو انسان کی زندگی پر مستقل

اثر ڈالتے ہوں انہیں دنیا یا زمانے کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا جائے۔ اتنی کچی بھی نہیں ہوں کہ دوسروں کے زیر اثر رہ کر فیصلے

کروں۔“

سٹائٹس کا ہلکا سا تاثر یاور علی خان کے چہرے پر نظر آیا۔

”جواب کیلئے میں آپ سے رابطہ نہیں کروں گا بلکہ بابا صاحب آپ سے اور ضرورت پڑی تو نعمان سے بات کریں گے

”آپ کو ڈر لگے گا؟“ وہ بے ساختہ ہنس دی۔

”ڈر تو سب ختم ہو چکے ہیں۔ اب تو صرف اپنے آپ سے ڈر لگتا ہے۔“

”کی گہرے خیال سے چونک کر بولے۔“

ماہین ہر طرح سے خود کو پرسکون کر چکی تھی۔ اس میں یاور علی خان کا بھی خاصا حصہ تھا۔ انہوں نے اتنی بڑی بات جس

اے سے کی تھی۔ اس کا اندازہ ماہین پہلے سے نہیں کر سکتی تھی۔

اس نے ترجمہ نظروں سے یاور علی خان کو دیکھا، مگر فوراً ہی سامنے دیکھنے لگی۔ اسے ان کے پراسرار اور مقناطیسی اثر سے خوف سا آتا تھا۔

”اسے شروع دن سے ہی نیا جہان محسوس ہوئے تھے جسے دریافت کرنے کی خواہش بے ساختہ بیدار ہوتی تھی

شام گہری ہو رہی تھی۔ اس نے نہادھو کر پنک کاٹن کا سوٹ زیب تن کیا، بال خشک کر کے میئر بینڈ لگایا۔ نہایت آرام دہ

ایک دم اسیان آیا کہ ریسٹ وائچ تو باندھی نہیں۔ کمرے میں واپس جانے کے خیال سے کوفت سی ہوئی۔ ایک لمحہ رک

ہو کر کمرے کے کوارٹر کی طرف بڑھ گئی۔

”ہیں مئی نہیں آپ؟ جو اتنا بدل کر آئی ہیں؟“ اُس نے قدرے ناگواری سے پوچھا۔
 ”جہاں میں بدلی ہوئی ہوں، مجھے تو پتا نہیں چلا۔ ویسے یہ بتاؤ یہ تبدیلی اچھی ہے یا بری؟“ جھومر کھٹکھٹائی۔
 ”نیکیال تو کچھ نہیں کہا جاسکتا۔“ جھومر نے دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو گئی۔ روشی نے اس کے پیچھے پیچھے چلتے

”کیوں فی الحال کیوں نہیں؟“ جھومر ٹنڈے سے رخ کمرے میں داخل ہو کر مزید خوشگوار موڈ سے گویا ہوئی اور بید پر
 ”بے چارے انداز میں لیٹ گئی۔“

”کیا ٹھٹھ ہیں آپ کے؟ ظفری بھائی کا شکریہ ادا کریں۔ کیا آپ تصور کریں گی اگر آپ کو ان تمام ہولتوں کے
 ”ساری سہولتیں تو دل کی ہوتی ہیں۔ ظفری موجود ہوں تو ایرکنڈیشنر ہیٹر بن جاتا ہے۔“ اُس نے قدرے تلخی سے

”آپ ظفری بھائی کے بجائے کس کو اس کمرے میں دیکھنا چاہیں گی؟“ روشی نے معرکے کا آغاز کیا۔

”بڑا خوبصورت جواب ہے میرے پاس۔ خوبصورت اس لیے کہ اُس کا دھیان میں آتا ہی سب سے بڑی
 ”دوہوں کھٹکھٹائی جیسے گدگدی ہو رہی ہو۔“

”شیم۔ شیم۔ جھومر بھابی آپ شادی شدہ ہیں یہ سب آپ کو سوٹ نہیں کرتا۔“ روشی کے لہجے میں بلا کی آنچ

”تم نے پڑھایا تھا میرا نکاح؟“ جھومر نے استہزائیہ انداز میں دریافت کیا۔

”کس نے تو پڑھایا ہوگا۔“ روشی نے تلخی سے کہا۔

”جھومر نکاح تو کسی نے پڑھایا دیا ہوگا۔ ظفری کو نکاح کے سچے آتے ہیں۔ کس قدر خود غرض ہو تم لوگ۔
 ”جھومر نے تمہاری آنکھوں پر کتنے موٹے موٹے پردے ڈال رکھے ہیں۔ سوچ کر بھی شرم آتی ہے۔“ جھومر نے بھی

”مگر شادی کا جو پردیس ہوتا ہے آپ اسی پردیس سے اُسی خالی سے گھر میں آئی ہیں۔“ روشی نے ہلے سے

”نئی۔ خوب۔ نکاح دو افراد کے بقائی ہوش و حواس قبولیت کے عمل کا نام ہے۔ جس کے ہوش و حواس ہی معطل
 ”مگر جو کچھ ہو، آپ کے گھروالوں کی رضا مندی سے ہوا۔ کسی نے آپ کی کنٹینی پر رپو اور تو نہیں رکھا

”اگر کسی نے رکھا تو اس نے آپ کی کنٹینی پر رپو اور تو نہیں رکھا۔“

کو اثر کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ وہ دھڑ سے اندر ہو گئی، مگر اسے ٹھٹھ کر کرکنا پڑا۔ سامنے ہی سرخ گھوڑے کی

دھڑ سے دروازہ کھلنے کی آواز پر دونوں نے چونک کر دروازے کی سمت دیکھا تھا۔

باری نے تو گہرا سانس لے کر نظریں واپس موڑ لی تھیں البتہ کھوکھر نے دست بستہ سلام عرض کیا تھا۔ دونوں

”کھوکھر! ہم پیچھے جا رہے ہیں کوئی پوچھے تو کہہ دینا اوپر ہیں۔ کوئی بلائے تو کہہ دینا جائے نماز پر بیٹھے ہوئے ہیں۔“

”چنگا جی! آکھ دیاں گا، پیچھے تہاں نماز پڑھن گئے او۔“ بے چارے نے بڑی سادگی سے جواب دیا تھا۔
 روشی نے دانت کچکچا کر اس کی سمت دیکھا۔

”باری! اسے سمجھا دینا۔“ اس نے خفگی سے کہا اور دروازے سے باہر نکل کر بہت بڑے ویران احاطے میں

قدرتی طور پر باری سمجھ چکا تھا کہ وہ کہاں جا رہی ہے۔ عجیب سی الجھن اس کے چہرے سے جھلکنے لگی تھی۔
 کھوکھر سے بات کر رہا تھا۔

روشی چلتے چلتے فوراً ہی ٹھٹھ کر رک گئی تھی۔ جھومر نیوی بلیو کرتے اور تنگ پاجامے پر بڑا سا زرد دھندلا
 ہوئی بالکل آخری کوٹھڑی سے باہر نکلی تھی۔ اور باہر تالا لگا رہی تھی۔ تالا لگا کر اس نے چابی اپنے گریبان میں ڈال
 بڑی بے نیازی سے بلکہ خود اعتمادی سے اپنے کمرے کی طرف بڑھی، مگر روشی پر نظر پڑتے ہی اپنی جگہ ٹھٹھ کر کھڑی
 تھی۔

”السلام علیکم۔“ روشی نے بڑی رسائیت کا منظر ہرہ کیا۔

”وعلیکم السلام۔ ٹھیک ہو؟“

جھومر نے جس شان بے نیازی سے حال دریافت کیا تھا۔ وہ بالکل نیا انداز تھا، پہلے جیسا۔ قدرے ماز۔
 بہت مشفقانہ انداز نہیں تھا۔

”کیسے آئیں؟“

”جیسے آتی ہوں۔“ اُس کی نظریں اس کوٹھڑی کی طرف لگی ہوئی تھیں، جہاں جھومر تالا لگا کر آ رہی تھی۔
 باتیں کرتے ہیں۔“ جھومر اپنے کمرے کی طرف بڑھتے ہوئے بولی۔

”ہاں، خیر آئی تو اسی لیے ہوں۔ ظفری بھائی ہسپتال سے آ گئے؟“ روشی جھومر کے پیچھے چل پڑی۔
 ”ارے کہاں فی الحال تو قسمت ہمارے ساتھ ہے۔“ جھومر نے قہقہہ لگایا۔

روشی نے تعجب سے جھومر کی شکل دیکھی۔ اس سے قبل اس نے اسے کبھی قہقہہ لگاتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔

”اس سے بڑا بھی ایک اسلحہ ہے بلکہ سب سے بڑا بم ہے“ اسے روٹی کہتے ہیں، سارے اسلحے اس سے زیادہ خطرناک ہیں۔ کیوں اچھا لگتا ہے، کیوں یاد آتا رہتا ہے۔“ پہلے اس کا پیٹ میں ہونا شرط تھا۔ کوئی فاقہ مست منہ تو فوج سکتا ہے۔ ہتھیار ایجاد نہیں کر سکتا۔ گھڑی ہڈی بننے سے سکوں سے جواب دیا تھا۔

”بھوکے کا پیٹ روٹی روٹی۔ اس وقت کوئی اس سے پوچھے کہ کیا ٹائم ہوا ہے تو وہ پونے ساڑھے کے بجائے چار بجے کے بجائے لہجے سے تو بڑی تجربہ کاری جھٹک رہی ہے۔ کون ہے وہ؟“

”روٹی کا ٹائم ہے۔“ جھومر ہنس پڑی۔ اُس کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی تھی۔

”اتنا بڑا بم انہوں نے میرے باپ کے پیٹ سے باندھ دیا تھا، بے چارہ کیا کرتا۔“ جھومر نے سوالیہ لہجے میں کہا۔

”اس کی جانب دیکھا۔“

”جب آپ ہتھیار ڈال چکی ہیں تو پھر اس بحث کا مطلب؟ بالکل بے کار ہے اور جس راستے پر آپ توجہ مرکوز کر رہے ہیں۔“

”جی ہاں وہاں دور تک انگارے بچھے ہیں۔ کیوں خود پر ظلم کر رہی ہیں؟“

”روٹی نے سنجیدگی سے اُسے سمجھانے کی کوشش کی۔“

”ہتھیار تو ڈال دیئے تھے مگر قید خانے کے قیدیوں ہی میں معرکہ شروع ہو گیا ہے۔“ جھومر نے گہرا سانس لیا۔

”چھت کی طرف دیکھا۔“

”ذہن کو ادھر ادھر بھی کرنے کی کوشش کرنا چاہیے۔ جس مقدمے میں جان نہ ہو، اس پر پیشیاں لگوان۔“

”فائدہ؟“

”روٹی نے بڑے دانشورانہ انداز میں اُسے سمجھایا۔“

”وکیل اچھا مل جائے تو مقدمے میں جان پڑ سکتی ہے۔“ جھومر مسکرائی۔

”مگر آپ کو اس ماحول میں اچھا وکیل کبھی نہیں مل سکتا۔“ روٹی نے اس کو امکان بھر مایوس کیا۔

”تم بن جاؤ۔“ جھومر نے اچانک اس سے خدمات طلب کر لیں۔

”وکیل بن سکتیں ہوں، مگر وکیل استغاثہ وکیل صفائی نہیں۔“ روٹی نے بے دردی سے جواب دیا۔

”کیوں، بھلا تمہارا کیا انٹرسٹ ہو سکتا ہے؟ تم تو بہت آگے بہت بلند ہو۔“

”یہ نہ پوچھیں، میں صرف یہی سمجھانے آئی ہوں کہ اپنی زندگی کو طوفان کے حوالے نہ کریں، اس لیے کہ کچھ نہ ہوگا۔“

”روٹی نے اس کی بات کاٹ کر جہت سرد مہری سے جواب دیا۔“

”مجھے اپنے معاملات طے کرنے دو، مجھ سے ہمدردی نہ کرو۔“ جھومر نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

”یہ صرف آپ کے معاملات نہیں ہیں۔ آپ کی وجہ سے کوئی دوسرا بھی مشکل میں پڑ سکتا ہے۔“ روٹی نے کہا۔

”جیسے اب اس سے برداشت نہ ہو رہا ہو۔“

”وہ تو پہلے ہی مشکلوں میں ہے اور پھر میں بد صورت بھی نہیں ہوں، اسے کوئی گھانا تو نہیں ہوگا۔“

”جھومر نے کہا۔“ بعض اوقات جب کوئی اچھا لگنے لگتا ہے تو اس کی وجہ صرف صورت نہیں ہوتی۔“

تھی۔

عارف آنکھیں موندے اپنی دھن میں بولے جا رہا تھا۔

”پھر سنا تھا آپ نے اُس کا گانا؟“ بالو نے عجیب سے دکھ میں دریافت کیا تھا۔

”ہاں سب سنے تھے جب اُس نے آخری گانا سنایا۔“

مجھے آئی نہ جگ سے لاج

میں اتنے زور سے ناچی آج کہ گھٹکر وٹوٹ گئے

تو میرا جی چاہا میں اسے اٹھا کر بھاگ کھڑا ہوں۔ کتنی زندگی تھی اُس کی آواز میں، میں اپنے ہوش کو بیٹھا تھا۔ نازنین بیگم نے مجھے آواز دے کر چونکایا کہ عارف یہاں کیوں بیٹھے ہو؟ کھانا کھایا تھا تم نے، تمہاری طبیعت تو بڑی ہے، وغیرہ وغیرہ۔ ”آہ نازنین بیگم“ اُس نے ایک ٹھنڈی سانس بھری تھی۔

”اُس کا نام نازنین تھا؟“ بالو نے چونک کر پوچھا۔

”ارے نہیں، وہ تو ہمارے مالکوں میں سے تھیں۔ اُس کا نام تو اتنا خوبصورت ہے کہ آس پاس سنے کو بھی نہیں گاہی۔“ اُس نے ایک لچلے کو آنکھیں کھولیں۔

تیرے ہونٹوں پہ تبسم کی وہ ہلکی سی لکیر

میرے تخیل میں رہ رہ کر جھلک اُٹھتی ہے

یوں اچانک تیرے عارض کا خیال آتا ہے

جیسے ظلمت میں کوئی شمع بھڑک اُٹھتی ہے

”نازنین بیگم چلی گئیں اور مجھے وہیں نیند آگئی۔ پھر میں چونک کر جاگا تو یوں کہ وہ میرا کندھا ہلا کر جاگتی تھی۔ ساری کہکشاں میرے کندھے پر اتر آئی تھیں۔ میں نے کہا ظالم! نیند میں ہم جیتے ہیں، جاگتے ہیں تو انکار، طلب بھی جاگتی ہے، کیوں جگا دیا؟“

وہ پھر ہنس پڑی تھی۔ حالانکہ پھر نہیں ہنستے۔

وہ بہت اونچی اڑان بھرتی تھی، جیسے چاہتی تھی رہتی تھی۔ اس میں کینروں والی کوئی بات نہیں تھی۔

”نام تو بتایا نہیں آپ نے اُس کا۔“ بالو نے وہیں کھڑے کھڑے ٹوکا۔

”بہت سے نام ہیں اس کے۔ روشنی، گیت، خوشبو، گھٹا، بجلی، پھول۔“

وہ ایک دم چپ ہو گیا۔

وہ انتظار کرتی رہی کہ پھر کچھ بولے گا مگر خاصی دیر ہو گئی تو اس نے ٹوکا۔

”اب کیا سوچ رہے ہیں؟“

آج مرجھا گیا اپنا دل

ہم خدائے بہار ہوتے تھے۔ آہ۔ ہا۔!

”یہ باتیں یہاں سو سکتا ہوں؟“ اس نے شک سے انداز میں پوچھا۔

”یہ باتیں یہاں سو سکتا ہوں؟“ اس نے شک سے انداز میں پوچھا۔

”یہ باتیں یہاں سو سکتا ہوں؟“ اس نے شک سے انداز میں پوچھا۔

”یہ باتیں یہاں سو سکتا ہوں؟“ اس نے شک سے انداز میں پوچھا۔

”یہ باتیں یہاں سو سکتا ہوں؟“ اس نے شک سے انداز میں پوچھا۔

”یہ باتیں یہاں سو سکتا ہوں؟“ اس نے شک سے انداز میں پوچھا۔

”یہ باتیں یہاں سو سکتا ہوں؟“ اس نے شک سے انداز میں پوچھا۔

”یہ باتیں یہاں سو سکتا ہوں؟“ اس نے شک سے انداز میں پوچھا۔

”یہ باتیں یہاں سو سکتا ہوں؟“ اس نے شک سے انداز میں پوچھا۔

”یہ باتیں یہاں سو سکتا ہوں؟“ اس نے شک سے انداز میں پوچھا۔

”یہ باتیں یہاں سو سکتا ہوں؟“ اس نے شک سے انداز میں پوچھا۔

”یہ باتیں یہاں سو سکتا ہوں؟“ اس نے شک سے انداز میں پوچھا۔

”یہ باتیں یہاں سو سکتا ہوں؟“ اس نے شک سے انداز میں پوچھا۔

”یہ باتیں یہاں سو سکتا ہوں؟“ اس نے شک سے انداز میں پوچھا۔

”یہ باتیں یہاں سو سکتا ہوں؟“ اس نے شک سے انداز میں پوچھا۔

”یہ باتیں یہاں سو سکتا ہوں؟“ اس نے شک سے انداز میں پوچھا۔

”یہ باتیں یہاں سو سکتا ہوں؟“ اس نے شک سے انداز میں پوچھا۔

”یہ باتیں یہاں سو سکتا ہوں؟“ اس نے شک سے انداز میں پوچھا۔

”یہ باتیں یہاں سو سکتا ہوں؟“ اس نے شک سے انداز میں پوچھا۔

”یہ باتیں یہاں سو سکتا ہوں؟“ اس نے شک سے انداز میں پوچھا۔

”یہ باتیں یہاں سو سکتا ہوں؟“ اس نے شک سے انداز میں پوچھا۔

”یہ باتیں یہاں سو سکتا ہوں؟“ اس نے شک سے انداز میں پوچھا۔

”یہ باتیں یہاں سو سکتا ہوں؟“ اس نے شک سے انداز میں پوچھا۔

”یہ باتیں یہاں سو سکتا ہوں؟“ اس نے شک سے انداز میں پوچھا۔

”یہ باتیں یہاں سو سکتا ہوں؟“ اس نے شک سے انداز میں پوچھا۔

”یہ باتیں یہاں سو سکتا ہوں؟“ اس نے شک سے انداز میں پوچھا۔

”یہ باتیں یہاں سو سکتا ہوں؟“ اس نے شک سے انداز میں پوچھا۔

صاحب کو نوالے بنا کر کھلاتا ہے۔ اس نے برا سامنہ بنایا۔

میں نے کہا: "میں نے یہ سب سنا ہے۔" وہ نے کہا: "میں نے یہ سب سنا ہے۔" وہ نے کہا: "میں نے یہ سب سنا ہے۔"

1۔ اہل ہندو۔ یعنی ممبر۔
 2۔ یہ ہے وہ اہل ہندو۔ کیوں بے وقوف بناتے ہیں حویلی کے بزرگ اپنے ہی بچوں کو۔ روشی کے انداز
 3۔ یہ ہے وہ اہل ہندو۔ کیوں بے وقوف بناتے ہیں حویلی کے بزرگ اپنے ہی بچوں کو۔ روشی کے انداز

”یہ سچے ہیں“۔ یاد علی خان نے دو ٹوک انداز میں جواب دیا۔
 ”یہ پوری طرح سمجھنا چاہیے“۔ وہ سابقہ انداز میں گویا ہوئی۔

”یاد رکھتے ہیں۔“ یاد علی خان نے دو ٹوک انداز میں جواب دیا۔

”پوری طرح سمجھنا چاہیے۔“ وہ سابقہ انداز میں گویا ہوئی۔

بہار ہے۔ پوری طرح سمجھیں گے۔ خوش؟“ وہ بات سمیٹنے کے انداز میں بولے۔ جیسے اسے بہلا رہے ہوں۔
 بہار! ان کا بریف کیس اور چھوٹا سا سوٹ کیس لئے اندر داخل ہوا۔ انہوں نے جیب سے چابی نکال کر
 برف بڑھائی۔

پہرہ پر حاوی۔

”ہوٹ کیس کھولو“۔

ہے فراہم کی تکمیل کی۔ اور سوٹ کیس کھول دیا۔

بارہی خان اپنی جگہ سے اٹھے اور سوٹ کیس میں رکھے کپڑے الٹ پلٹ کرنے لگے۔

بہنو غور سے ان کے ہاتھوں کی حرکت دیکھ رہی تھی۔

میرزا خان نے کپڑے نکال کر اس کے سامنے ڈال دیئے۔ ”امید ہے تمہیں پسند آئینگے۔“

”میں نے جلدی جلدی کپڑے پہیلائے۔ اس کی آنکھیں خوشی سے چمکنے لگیں۔“

پلے کریدے ہیں پہا؟“ اس کی آواز خوشی سے کانپ رہی تھی۔

”تپ کر رہی تھی؟“ اس نے بالکل کھٹکے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

”جوتہ رہتا ہوں“۔ انہوں نے مختصر جواب دیا۔

نہ کیس میں؟ اس کا زہن ماہین کی طرف چلا گیا۔

۱۰۰ -

اس سے کہیں کہیں گئے؟“ اس نے آہستگی سے پوچھا۔

”یہ باتیں گویا بستر میں بھی ضروری کام تھا۔“

”ابھی تو ہیں۔“ انہوں نے سگریٹ نکالتے ہوئے جواب دیا۔

”خالہ تو نانا جان کی باتیں کرتی رہتی ہوں گی۔ ہے ناں؟“

”نہیں۔ اور باتیں بھی کرتی ہیں۔ وہ مچھو رہیں۔ خود کو سنبھال لیا ہے۔“ انہوں نے سگریٹ سناٹا دیا۔

”ہاں خیر مچھو تو وہ بہت ہیں۔ میں بھی ان جیسی بننا چاہتی ہوں۔ مگر بن نہیں پاتی۔“ اس نے سناٹا دیا۔

”تم ایسے ہی ٹھیک ہو۔ بننا بھی نہیں۔ مشکل ہو جائیگی۔“ یاد علی خان نے کش لگایا۔

”کیا وہ مشکل میں ہیں؟“ اس نے معصومیت سے باپ کی شکل دیکھی۔

”نہیں..... کیونکہ وہ بائی نیچر ایسی ہیں۔“ یاد علی خان نے دھوئیں کے مرغولے میں غالباً مایہ کو دیکھ کر کہا۔

”یہ تو صحیح ہے پاپا۔ نیچر از نیچر۔ پاپا۔ یہ ڈریسز بہت خوبصورت ہیں۔ مجھے بہت پسند آئے۔“ اس نے کہا۔

فراک خود سے لگا کر دیکھتے ہوئے کہا۔

”تھینکس۔“ انہوں نے گہرا کش لگایا۔

”چلیں میری پرابلم تو سولو (حل) ہو گئی۔“ اس نے پرسکون انداز میں کہا۔

”کیسی پرابلم؟“

”وہ اکا کے بیٹے کی برتھ دے ہے ناں۔ سب لڑکیاں تیاریاں کر رہی ہیں مگر میرا موڈ نہیں بن پارہا تھا۔“

”کیوں موڈ نہیں بن پارہا تھا؟“ انہوں نے اس کی شکل بنوڑ دیکھی۔

”بس یونہی۔ بہت محتاج ہوں اپنے موڈ کی۔“ اس نے منہ بنا کر جواب دیا۔

”اوہ پاپا..... خالہ کچھ کہہ تو نہیں رہی تھیں؟“ اس نے پوچھا۔

”فی الحال تو کچھ نہیں کہا۔“ وہ سرسری سے انداز میں کہہ رہے تھے جیسے ان کا ذہن حاضر نہ ہو۔

”جی..... فی الحال کا مطلب؟“ اس نے حیرت سے انہیں دیکھا۔

”کچھ نہیں۔ سوال بہت کرتی ہو۔ یہ بتاؤ اسٹڈی کیسی ہو رہی ہے؟“ انہوں نے بات کا رخ موڑنے کی کوشش کی۔

”ٹھیک ہی ہے۔ پاپا! آپ خالہ کو ساتھ ہی لے آتے۔ وہ وہاں اکیلی بور ہوتی ہوں گی۔ ماموں تو بچے ہیں۔“ وہ ان کی کوشش ناکام بنا رہی تھی۔

”نیکسٹ ٹائم جاؤں گا تو کوشش کروں گا۔“

”انہوں نے آنے کی مجھ سے ملنے کی کوئی خواہش ظاہر نہیں کی۔“ اس نے بڑی پرامید نظروں سے ان کو دیکھا۔

”نہیں خیر..... یاد تو بہت کرتی ہیں تمہیں۔“ انہوں نے اس کی تقویت کیلئے الفاظ منتخب کئے۔

”بہت کیوٹ سی ہیں خالہ۔ کیا امی ان سے بھی زیادہ کیوٹ تھیں۔“ اس نے کپڑے سینٹا شروع کر دیے۔

”میں کمپیئر نہیں کرنا چاہتا۔ بلکہ اس موضوع پر بات ہی نہیں کرنا چاہتا۔“ انہوں نے سرد مہر انداز میں جواب دیا۔

”سوری لپٹا۔ مجھے احساس کرنا چاہیے۔ ظاہر ہے آپ کو امی کے ذکر سے تکلیف ہوتی ہوگی۔“ اس نے شرمندگی سے کہا۔

”بہت زیادہ ہوتی ہے۔“ انہوں نے ڈھیر سارا دھواں اپنے سامنے پھیلا لیا۔

”آئی ایم ریلی دیری سوری۔ میں آئندہ خیال رکھوں گی۔“

”اچھا یہ بتائیے۔ آپ کتنے دن کیلئے آئے ہیں؟“ اس نے خود ہی نئی بات شروع کر دی۔

”کل صبح ہوں۔“

”آپ زیادہ دنوں کیلئے یہاں کیوں نہیں آتے۔“

”میری ذمہ داریاں اجازت نہیں دیتیں۔“ انہوں نے دو ٹوک جواب دیا۔

”ٹھیک ہے۔ آپ تو خیر ڈی سی ہیں۔ مگر کا کا جان تو ڈی سی نہیں ہیں۔ وہ تو کبھی ایک رات بھی نہیں ٹھہرتے۔ صرف بابا

ہاں سے ملتے ہیں اور چلے جاتے ہیں۔ آپ کے پاس ہری پور جاتے ہیں؟“

”رڈی کپڑے سمیٹ چکی تھی۔“

”یاد علی خان خاموش رہے۔“

”چا۔“

”ہوں؟“

”ہاں نہیں مجھے کا کا جان سے اتنا ڈر کیوں لگتا ہے؟ میں تو ان سے بات بھی نہیں کر سکتی۔“

”یاد علی خان اس مرتبہ بھی خاموش رہے۔“

”حالانکہ ڈر تو بابا صاحب سے بڑے ابا سے آپ سے بھی لگتا ہے۔ مگر اتنا نہیں ان سے تو عجیب ہی قسم کا ڈر لگتا ہے۔“

”گمانے آجائیں تو میں بھاگ کھڑی ہوتی ہوں۔“

”واہ بات کہہ کر خود ہی ہنس دی۔“

”واہ ایسے کیوں ہیں بالکل غیروں جیسے؟“ اس نے معصوم سے انداز میں پوچھا۔

”اب تم باہر جاؤ گی تو ماما ملی سے کافی کیلئے کہہ دینا اور کہنا ڈسپرین بھی لیتی آئے۔“

”وہ سگریٹ کا گڑا الیش ٹرے میں بچھا کر اٹھ کھڑے ہوئے۔“

”رڈی ان کے سرد سے انداز اور اپنی بات نظر انداز کئے جانے پر کپڑے اٹھا کر کھڑی ہو گئی۔“

”ٹھیک ہے۔ پاپا۔ آپ آرام کریں۔ سوری فار دیٹ۔“

”مجھے مجھے انداز میں باہر نکل گئی۔ یاد علی خان کوٹ بیگ کر کرنے لگے۔“

.....

”میرے بہت بڑے بچے پر تھی کہ بابا صاحب کے پڑ پوتے کی سالگرہ تھی۔“

”ایک منٹ“۔ اس نے پیچھے سے آواز دے کر اسے روکا۔
 ”دو دن ہیں کھڑا ہو کر پوچھنے لگا۔
 ”نہری گردن کے نیچے کی جانب کیا کوئی زخم کا نشان ہے؟“ اس نے پلکیں جھپکے بغیر اس کی سمت دیکھا۔
 ”مجھے دھیان نہیں۔ خیریت؟“ وہ واقعی حیران ہوا۔
 ”آج اپنے میں دیکھ کر بتاؤ۔ ہے یا نہیں؟“ اس نے قطعی انداز میں کہا۔
 ”مگر کیوں؟“ وہ قدرے ہچکچایا۔

”پہلے دو کرو میں کہہ رہی ہوں“۔ اس نے خفگی سے کہا۔
 ”ہاں اگے بڑھ کر اس کی ڈریسنگ ٹیبل تک آیا اور چہرہ اوپر کر کے دائیں بائیں دیکھنے لگا۔ گردن سے خاصا نیچے واقعی زخم
 ”پہلے مل گیا۔ دراصل مجھے اس لئے دھیان نہیں رہا کہ میں خود کو آئینے میں غور سے نہیں دیکھتا“۔ وہ سادگی سے
 ”اب آپ یہ بتائیے آپ نے یہ نشان کب دیکھا تھا؟“ وہ اس کے نزدیک چلا آیا۔
 ”کھانا“ مجھے۔“ وہ اس کے مقابل آکھڑی ہوئی۔ اور اس کا سوال نظر انداز کر دیا۔ باری نے مسکرا کر کالرا ایک طرف سے
 ”نہری ایک انچ لمبا زخم کا نشان واقعی موجود تھا۔ اس کے دل کو کچھ ہونے لگا۔ اس نے سر اٹھا کر باری کی سمت دیکھا۔ وہ
 ”نہری کو دیکھ رہا تھا۔ سیاہ گھور آنکھیں جانے کس جذبے کے تحت مسکرا رہی تھیں۔ روشنی نے جیسے تاب نہ لا کر نظریں جھکا
 ”بیت پوچھو کہ مجھے کیسے پتا چلا۔ یہ بتاؤ کہ جھومر بھابی کو کیسے پتا چلا؟“
 ”ہاں ہاں اپنے بستر پر جا کر بیٹھ گئی۔
 ”ہاں کے چہرے پر لکھت بخیدگی چھا گئی۔
 ”آپ کے مطلب کے موضوعات نہیں ہیں۔ آپ اس طرح کی باتیں نہ کریں۔ بہتر ہے باہر آ جائیں۔ ہو سکتا ہے
 ”نہری نے اسی کاراستہ اختیار کرتے ہوئے بخیدگی سے کہا۔
 ”نہری نے سوال کا جواب دوپھر باہر جانا“۔ وہ حکمیہ انداز میں گویا ہوئی۔
 ”نہری نے کہنے لگے تھے جھومر بھابی کو؟“ وہ طنزیہ انداز میں پوچھ رہی تھی۔
 ”نہری نے صاحب سے پوچھ لیں۔ یہ ان کے معاملات ہیں“۔ اس نے دو ٹوک جواب دیا۔
 ”نہری نے جھومر بھابی کو روک دیا۔ بہرہ وپ بھر کر ہم سب کو بے وقوف بناتے ہو“۔ وہ دانت پیس کر بولی۔

یہاں سے وہاں تک انسانوں کا ٹھانٹیں مارتا سمندر نظر آتا تھا۔ دور پار کے عزیز تو ایک روز پہلے ہی آگے سفر
 روشنی نے اپنے پپا کا لایا ہوا ہاسٹ ڈریس پہنا تھا۔ ہلکا سا میک اپ بھی کیا تھا مگر چہرہ پھر بھی بجھا بچھا تھا۔
 کے باوجود اپنے کمرے سے باہر نہیں نکلی تھی۔ ہتھیلیوں میں چہرہ لئے وہ ساکت بیٹھی جانے کن سوچوں میں مگن تھی۔
 اسی دم ہلکی سے دستک ہوئی۔

”ہوں“۔ اس نے ہنکارا بھرا اور وہ بھی بڑی بیزاری سے۔
 دروازہ کھلا تو اس نے بغیر ہلے جلے صرف نظریں اٹھا کر دیکھا کہ کون آیا ہے۔
 وہاں شلوار قمیض میں ملبوس سامنے باری تھا۔
 ”کون پوچھ رہا ہے مجھے؟“ اس نے تنخی سے کہا۔
 ”کوئی نہیں“۔ اس نے بہت آہستگی سے جواب دیا۔
 ”کون بلا رہا ہے؟“ اس نے سابقہ انداز میں پوچھا۔
 ”کوئی نہیں“۔ اس کا انداز بھی ہنوز تھا۔

”پھر کیوں آئے ہو؟“ اس نے اس کی طرف دیکھے بغیر تڑخ کر پوچھا۔
 ”آپ کی خیریت معلوم کرنے آیا تھا۔ آپ نظر نہیں آرہی تھیں۔ اب تو کھانا بھی شروع ہو چکا ہے۔“
 ”شکریہ۔ پوچھ لی خیریت؟ اب جاؤ اور آئندہ اب خیریت بھی نہ پوچھنا۔“
 باری کے فریش سے چہرے پر لمحے بھر کو سایہ لہرایا مگر اگلے ہی لمحے وہ نارمل ہو گیا۔
 ”کوئی بات ہو گئی ہے۔ ساری رونق چھوڑ کر اندر بند کمرے میں بیٹھی ہیں؟“
 ”اپنے کمرے میں بیٹھی ہوں۔ کسی کے سر پر تو نہیں بیٹھی“۔ اس نے بڑے کڑوے انداز میں جواب دیا۔
 ”آئیے سب کے ساتھ کھانا کھا لیجئے“۔ اس نے بہت رسانیت سے کہا۔
 ”بھوک نہیں ہے مجھے۔“

”جب باہر نہیں آتا تو تیار ہو کر کیوں بیٹھی ہیں؟“ آخر اس نے کہہ دیا۔
 اس نے نظر اٹھا کر باری کی طرف دیکھا۔ بہت دلکش سادہ سے میسر اسٹائل کے ساتھ وہ بلا کا جاذب نظر دکھائی
 تھا۔ مونچھیں البتہ پہلے سے زیادہ گھنی محسوس ہو رہی تھیں۔ سفید بے داغ لباس میں وہ کسی بہترین کارمنٹس کمپنی کا ملازمین
 ہو رہا تھا۔

اس نے بے ساختہ نظریں جھکا لیں۔
 ”تمہاری طرح کوئی بھی میرے کمرے میں آ سکتا ہے۔ مہمانوں سے گھر بھر اڑا ہے“۔ اس بار اس کی آواز
 سادگی اور دھیما پن تھا۔
 ”نمیک ہے۔ آپ کی مرضی۔ مگر اس طرح ہونا نہیں چاہیے“۔ وہ جانے کے ارادے سے پلٹا۔

”وہ تو پہلے ہی کر رکھا ہے“۔ وہ زبردستی مسکرایا۔

”جھومر بھابی اب سے کچھ دن پہلے ایسی نہیں تھیں۔ کس بری طرح تمہارا بیچ ٹوٹا ہے، دکھ سے مہر ہے۔ امانتوں پر ہی ہاتھ صاف کرتے ہو۔ کتنے مضبوط بننے ہو پوز کرتے ہو۔ اندر سے کتنے کھوکھلے ہو۔ عمر بھر تمہاری شکل نہ دیکھوں۔“

وہ دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

باری اپنی جگہ دم بخود سا کھڑا تھا۔ اس وجہ سے نہیں کہ روشنی نے یہ سب کہا تھا۔ جو ہر شریف انسان کیلئے ہوتا ہو سکتا تھا۔ بات یہ تھی کہ دیلی کے کرتا دھرتا افراد کو اس کی سن گن مل گئی تو؟ اس پر سے جھومر کا بے خوف اور گراں قدر ابھی تو قیامت کی پہلی ہر روشنی تک آئی تھی۔

وہ آگے بڑھ کر روشنی کے قریب آیا۔

”آپ جو سنیں گی۔ اس پر آنکھیں بند کر کے یقین کر لیں گی؟ اگر آپ یہ کریں گی تو مجھے حویلی کے کمرے کی امید نہیں رکھنا چاہیے۔

میں مجرم کی طرح اپنی صفائی پیش نہیں کروں گا۔ نہ آپ مجھ سے اس طرح کی کوئی امید رکھیے گا۔“ اتنا کہہ کر باہر نکل گیا۔

روشنی نے سر اٹھا کر اسے جاتے ہوئے دیکھا۔ اور اس کے الفاظ ذہن میں دہرانے لگی۔ بلکہ ایک ایک لفظ کی۔

”یہ ڈھنائی ہے، غیرت ہے، اتا ہے؟“ اس کا تا تجربہ کار ذہن الجھ گیا تھا۔

”جھومر بھابی بلاشبہ بہت حسین ہیں۔ ان کی شخصیت بہت اپیل کرتی ہے۔ اور پھر وہ ایک بے ضرر اور صبر انسان سے وابستہ ہیں۔ سب سے بڑھ کر خود بڑی آمادہ ہیں۔ سوجان سے فدا ہیں۔ پتا نہیں محترمہ قریب ایسا نہیں۔ ویسے ان کا تعارف تو ہے نہیں۔ ہو سکتا ہے اوپر اوپر سے دیکھتی ہوں۔“

وہ..... اٹھ کر باہر آگئی۔ عجیب اضطراری سا انداز تھا۔

باہر آتے ہی آنکھیں جیسے چندھیسی گئیں۔ حویلی کا تو انداز ہی بدلا ہوا تھا۔ نوکرائیاں تو پھولوں سے لدی ہوئی تھیں۔

سامنے ہی آف وہاٹ شیروانی میں خوش باش کا نظر آگئے۔

”السلام علیکم اکا۔ مبارک ہو بیٹے کی سالگرہ۔“

”وسلام۔ میرا بیٹا تمہارا کچھ نہیں لگتا؟“ وہ مسکرا دیے۔ ”لڑائی تو سمیہ سے ہوتی ہوگی۔ بیٹے سے تو نہیں۔“

قبضہ لگایا۔

”جی نہیں۔ میں لڑنے والی نہ ہوں۔“ اس نے منہ بنایا۔

”پھر کون سی والی مند ہو؟“ وہ بہت خوش تھے، بات بے بات ہنس رہے تھے۔

”میں اچھی والی مند ہوں۔ انگلش مند ہوں۔ اپنے کام سے کام رکھتی ہوں۔“ بالآخر وہ بھی ہنس دی۔

”واہ..... بھئی واہ..... سنایا..... یہ اپنی روشنی تو بڑی حاضر جواب ہو گئی ہے۔“ وہ اس کے پیچھے کھڑے کسی شخص سے مخاطب ہوئے تھے۔

یہ تھا اس نے گردن موڑ کر دیکھا۔ مگر نورانی دوبارہ اکا کی طرف رخ کر لیا تھا۔ پیچھے باری کھڑا تھا۔

”وہ سرور دی صاحب بہت دیر سے آپ کا پوچھ رہے ہیں۔“ باری نے انہیں مطلع کیا۔

”کہاں بیٹھے ہیں؟ مجھے تو خود ان کی تلاش ہے۔ استقبالیہ ملاقات کے بعد تو وہ کہیں غائب ہی ہو گئے۔“

”سوری روشنائے۔“ وہ معذرت کر کے باری کے ساتھ آگے بڑھ گئے۔

روشنی خواتین کی طرف آگئی۔ مگر جیسے اسے دھچکا سا لگا تھا۔ سرخ پشواز اور سبز بھاری کام کے دوپٹے پانچاے میں ملبوس نور بڑی امی کے پاس بیٹھی تھی۔

پاؤں میں خوبصورت سی پازیب جو یقیناً سونے کی تھی۔ کلائیوں میں ڈھیروں چوڑیاں اور کنکرن۔ موچے کے گھنے ٹرے۔ وہ بہت ساری نظروں کا مرکز بنی ہوئی تھی۔ سب سے زیادہ تو حویلی کی لڑکیوں کی تمنگی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔

”آپ یہاں کیسے؟“ وہ بولے بغیر نہ رہ سکتی تھی۔

”ہمارے میاں بچپن ہی سے دوسرے ملک میں رہے ہیں۔ تاحال باہر ہیں۔ ہم اپنے سسرال والوں کی فرمائش پر قریب میں شرکت کرنے آئے ہیں۔ ہمارے میاں کو اگر برسوں سے خاندان والوں نے نہیں دیکھا تو کیا ہوا۔ ہمیں تو دیکھا جاسکتا ہے۔“

اس نے بڑا جاندار قبضہ لگایا۔ بڑی امی کی موجودگی میں یہ انتہائی درجے کی بدتمیزی تھی۔ اس پر سے نہایت کاٹ دار طعنے انداز۔ اس نے فوراً بڑی امی کے چہرے کی طرف دیکھا تھا۔

انگوری سلک کے قمیض شلوار میں ہم رنگ سنہری کناری والے دوپٹے کو اپنے مخصوص انداز میں اوڑھے ہاتھوں میں کانوں میں حسب توفیق سونا پہنے بالکل سپاٹ چہرے کے ساتھ اپنی خاص وضع سے جلوہ افروز تھیں۔

انہوں نے جھومر کے انداز گفتگو پر بھی کوئی تاثر نہیں دیا۔ یوں بیٹھی تھیں گویا برف کی سل ہوں۔

مگر ان کی خاموش تنبیہ کو حویلی کی لڑکیاں خوب سمجھتی تھیں اس لئے باوجود خواہش کے وہ جھومر سے کوئی خاص بات نہیں کر پاتی تھیں۔

”بڑی امی تو خزانے پر ناگ بنی بیٹھی ہیں۔ جب انہیں لا کر سے نکال ہی لیا ہے تو فیضیاب بھی ہونے دیں۔“ روبی نے کہا۔

”لا کر سے نہیں۔“ لاک اپ سے۔“ روشنی نے گرہ لگائی۔

”چپ کر۔“ مونا کو ”ڈرنے“ کی جلدی پڑی رہتی تھی۔ اس نے عادت سے مجبور ہو کر ٹوکا تھا۔ مبادا بڑی امی کچھ سن

لیں۔

”لو بھلا۔ اب ہم آپس میں بھی باتیں نہ کریں۔ کلاس ہو رہی ہے۔“ بیہ کو مونا کا استانی پن ناگوار گزارا تھا۔
 ”یہ جھومر بھابی کو اتنے ڈھیر سے زیور بڑی امی نے بنا کر دیئے ہیں؟“ تانیہ کو زیور غالباً زیادہ پسند آگئے تھے۔
 ”نہیں..... ظفیری بھائی ڈاکا مار کر لائے ہیں۔“ لالی کو اس کی بد عقلی پر تاؤ آ گیا۔ تانیہ تجلی سی ہو کر رہ گئی۔
 ”توبہ..... کس قدر حسین ہیں۔“ روبی نے بے ساختہ کہا تھا۔ ان سب کو ہنسی آ گئی۔

”توبہ کس بات کی؟ حسین ہونا گناہ ہو سکتا ہے۔ حسن کی تعریف کرنا تو گناہ نہیں۔ توبہ انہیں کرنا چاہیے ہمیں نہیں۔“
 نے شریر انداز میں کہا تھا۔

اتنے میں گلو خاص پریشانی میں ان کی طرف آ گئی تھیں۔

”ارے تم نے زری کو کہیں دیکھا؟“

”نہیں..... ہم تو سب آج ایک ہی شے دیکھ رہے ہیں۔“ روبی نے ٹٹنگی باندھ کر مبہوت ہونے کی اداکاری کی۔
 گلو نے اس کی نظر کا تعاقب کیا

”ہاں بھئی ضرور دیکھو۔ دیکھنے کے لائق ہیں۔ مگر مجھے فی الحال زری کا پتا بتا دو۔“ انہوں نے غلت بھرے انداز میں۔
 ”آپ پر کوئی اثر نہیں ہوا؟ کمال ہے۔“ لالی ان کی بے نیازی پر واقعی حیران تھی۔

”خاصی دیر زیر اثر رہنے کے بعد ہوش و حواس میں واپس آئی ہوں۔“ انہوں نے مسکرا کر مونا کو آنکھ ماری۔
 ”تم لوگوں کے اعصاب بحال کرنے کیلئے مرچوں کی دھونی دوں یہاں؟“ وہ نہیں۔

”لاحول ولا قوۃ۔ اتنے بھی کمزور اعصاب نہیں ہیں ہمارے۔ کہ مرچوں سے کم پر بات ہی نہ ٹھہرے۔ اب انہیں حسین نہیں ہیں۔“ شینو نے نخوت سے ناک چڑھا کر اپنے مخصوص اسٹائل میں کہا۔

”پتا نہیں..... اندر دل بھی ہے یا نہیں۔ چھوٹا بڑا ہونا تو بعد کا مسئلہ ہے۔“ روشی نے استہزائیہ انداز میں روبی کا
 میں کہا۔

”لو..... اب ایسی بھی ”بے دل“ نہیں ہو سکتی ہیں۔ تو کیا بے چاری تھرمل پاور اسٹیشن سے چل رہی ہیں؟“
 سرگوشی سن لی تھی۔

بے ساختہ ہنسی کی آوازیں ابھری تھیں۔

جھومر نے عجیب حسرت آمیز انداز میں ان ہنستی لڑکیوں کی طرف دیکھا تھا۔

پھر ایک سردی نگاہ عالم تاب پر ڈالی تھی۔

کھانا شروع ہو چکا تھا۔ اور اس دورانیہ کی مخصوص چہل پہل شروع ہو چکی تھی۔ جھومر نے عالم تاب کے کان نہ
 کہا۔ اور اٹھ کر پنڈال سے باہر نکل آئی۔ روشی تو پیشہ ور جاسوس کی طرح اس پر نظر جمائے ہوئے تھی۔ خود بھی دوسرے
 سے باہر آ گئی۔

جھومر حوض کی منڈیر پر جا کر بیٹھ گئی تھی۔ جہاں بہت سے بچے بھاگ دوڑ رہے تھے۔ اور جو ذرا دیر رک کر جھومر کو بھی
 اپنے گمے ختم۔ ایک حساب سے وہ تجلی ہوئی تھی۔ معا اس نے دیکھا جھومر نے ایک بچے کو بازو سے تھام کر ایک جانب
 دیر کیا۔ روشی اس سے خاصے فاصلے پر جامن کے درخت کے نیچے کھڑی تھی۔ بے تحاشا روشنیوں کے باعث ہر شے واضح
 تھی۔

اسے جانے کیوں حیرت نہیں ہوئی۔ جب اس نے بچے کے ساتھ باری کو آتے دیکھا۔ بس اندر کچھ ٹوٹ پھوٹ ضرور
 ہوئی تھی۔

باری حوض کے نزدیک ضرور آیا تھا۔ مگر سامنے دیکھتے ہی واپس پلٹ گیا تھا۔ روشی کو اس مرتبہ حیرت ہوئی تھی۔

وہ انسانوں کے اٹو دھام میں گم ہو چکا تھا۔ جھومر اپنی سینڈل اتار کر پانی میں پاؤں لٹکا کر بیٹھ گئی تھی۔

روشی الجھن کے عالم میں کھڑی رہ گئی تھی۔

”جھومر بھابی! اگر بے وقوف ہیں تو کیا ہوا۔ باری تو بے وقوف نہیں۔ ظاہر ہے انسان بھرے پڑے ہیں۔ کسی کی بھی
 غور پکتی ہے۔“

روشی اپنی تکتہ رسی پر بڑے مطمئن انداز میں واپس بڑھ گئی تھی۔

”کیسے کچے رنگ نکلے تمہارے۔ صرف صورت دیکھ کر ہی اپنا سب خزانہ ہار دیا۔“ اس کے دل سے ہوک سی اٹھی تھی۔

”ہیلو۔ السلام علیکم۔ آپ کون؟“

”خان دلاور علی خان بات کر رہا ہوں۔“

”عزت افزائی ہے میری۔“ نعمان کو حیرت کا جھٹکا لگنا قدرتی امر تھا۔

”کیا حال ہے بیٹے آپ کا؟“

”شکریہ۔ جی۔ بہت اچھا ہوں۔ دعا ہے آپ کی۔“ نعمان کی حیرت ہنوز قائم تھی۔

”ماہین بیٹی کیسی ہے؟“

”جی۔ وہ بھی اللہ کا کرم ہے بالکل ٹھیک ہے۔“

”بیٹے بات یہ ہے کہ ہماری طرف سے ایک دوروز میں تمہیں تفصیلی خط ملے گا۔ اس خط کو بہت سکون اور تحمل سے پڑھنا۔
 اور کچھ شورو کر کے ہمیں اس کا جواب بھیجنا۔ ٹیلی فون اس لئے کر رہے ہیں کہ مزید تاکید رہے۔ ہیلو۔ سن رہے ہو؟“

”جی۔ سن رہا ہوں۔ آپ فرمائیے۔“

”جی۔ سن رہا ہوں۔ آپ فرمائیے۔“

”جی۔ سن رہا ہوں۔ آپ فرمائیے۔“

”جی۔ سن رہا ہوں۔ آپ فرمائیے۔“

نعمان کا ذہن اب آنے والے خط کی طرف مستقل تھا۔ بظاہر دوسرے موضوع پر بات چیت کر رہا تھا۔
”ہاں یہ تو ہے اچھا۔ خبر۔ خدا حافظ۔“

دوسری طرف سے سلسلہ منقطع ہو چکا تھا۔

نعمان کے ہاتھ میں ریسیور چند سیکنڈ تک جوں کا توں رہا۔

”کس کا فون تھا نعمان بھائی؟“ مابین کچن سے ہاتھ پونچھتے ہوئے وہیں ٹاؤنچ میں چلی آئی۔

”خان دلاور علی خان صاحب کا۔“ نعمان کے انداز میں ہنوز گہری سوچ کا تاثر واضح تھا۔

”مابین چونک پڑی تھی۔ اس نے بڑی جانتی نظر نعمان پر ڈالی تھی۔ اور اسے گہری سوچ میں مبتلا پا کر دل بھی ہلکا ہوا۔“

”کیا فرما رہے تھے خان صاحب؟“ اس نے لب و لہجہ سے خاص تکلف ظاہر کرنے کی کوشش کی۔

”کچھ نہیں۔“ وہ اسی طرح سوچ میں گہرا ہوا تھا۔

”کچھ نہیں۔“ مابین نے تعجب سے اسے دیکھا۔

”ہاں۔ کہہ رہے تھے انہوں نے میرے نام کوئی تفصیلی خط لکھا ہے۔ میں سوچ رہا ہوں۔ خط تو انہوں نے کچھ نہیں لکھا۔ اب کیا معاملہ پیش آ گیا ہے۔“ اس کی الجھن بجا تھی۔

مابین کا دل دھیرے سے سکڑا۔ سمٹا۔ پھر اسی قوت سے پھیلا۔

”چائے لاؤں آپ کیلئے؟“ وہ واپس ہوئی۔

”لے آؤ۔“

”ویسے کیا تمہیں حیرت نہیں ہے؟“ نعمان نے اس کے نارمل انداز کو بہت محسوس کیا تھا۔ وہ بہت تعجب سے اس کا

نیاز رو یہ جانچ رہا تھا۔ دلاور علی خان کا فون اور خط آتا کوئی عام بات تو نہیں تھی۔

فون آنے کے بعد سے مابین ایک عجیب سے انتظار میں مبتلا ہو گئی تھی۔ حالانکہ نعمان تھوڑی دیر الجھ کر اپنے منہ

میں لگن ہو گیا تھا۔

”دو دن بعد ایک رجسٹرڈ لفافہ نعمان کے نام آیا تھا۔ نعمان گھر پر نہیں تھا۔ مابین کا بس نہ چتا تھا کہ لفافہ چیز ہو

دے۔ اس نے لفافہ نعمان کے کمرے میں سائیڈ ٹیبل پر رکھ دیا تھا اور پھر کمرے میں جب بھی کسی کام سے گئی لفافہ

نظر ڈالنا اپنا کوئی ضروری کام سمجھا۔

جانے کیوں کسی کام میں جی نہیں لگ رہا تھا۔ ذہن بس لفافے کی طرف ہی لگا ہوا تھا جیسے اس میں جانے کی

آٹھواں عجوبہ برآمد ہوگا۔

شام ڈھلے نعمان گھر آیا۔ تھا اور حسب عادت سیدھا اپنے کمرے میں چلا گیا تھا۔ مابین دم اٹکائے لاؤں کی

تھی۔ ہر دم یوں محسوس ہوتا تھا جیسے نعمان نے اسے آواز دی ہو۔

کون دیر گزرتی تھی کہ بعد بھی جب کچھ نہیں ہوا تو وہ دبے پاؤں دروازے پر تکیہ آئی۔ دروازہ بہت آہستہ سے

نہیں کمرے میں نہیں تھا۔ ہاتھ روم سے پانی گرنے کی آواز آرہی تھی۔ مابین نے سائیڈ ٹیبل کی طرف دیکھا۔

اسے ہاتھ میں لے کر کمرے میں نہیں تھا۔ اس کا جی چاہا۔ جلدی سے آگے بڑھے خط پڑھ ڈالے۔ مگر ہاتھ روم کی

فون بج رہی تھی۔ اب اس کا رخ کچن کی طرف تھا۔

فون بج رہی تھی تو بڑے صبر و سکون کا مظاہرہ کیا ہے۔ کیا لفافے میں کوئی خاص بات نہیں تھی؟

فون بج رہی تھی۔ اب اس کا رخ کچن کی طرف تھا۔

فون بج رہی تھی۔ اب اس کا رخ کچن کی طرف تھا۔

فون بج رہی تھی۔ اب اس کا رخ کچن کی طرف تھا۔

فون بج رہی تھی۔ اب اس کا رخ کچن کی طرف تھا۔

فون بج رہی تھی۔ اب اس کا رخ کچن کی طرف تھا۔

فون بج رہی تھی۔ اب اس کا رخ کچن کی طرف تھا۔

فون بج رہی تھی۔ اب اس کا رخ کچن کی طرف تھا۔

فون بج رہی تھی۔ اب اس کا رخ کچن کی طرف تھا۔

فون بج رہی تھی۔ اب اس کا رخ کچن کی طرف تھا۔

فون بج رہی تھی۔ اب اس کا رخ کچن کی طرف تھا۔

فون بج رہی تھی۔ اب اس کا رخ کچن کی طرف تھا۔

فون بج رہی تھی۔ اب اس کا رخ کچن کی طرف تھا۔

فون بج رہی تھی۔ اب اس کا رخ کچن کی طرف تھا۔

فون بج رہی تھی۔ اب اس کا رخ کچن کی طرف تھا۔

فون بج رہی تھی۔ اب اس کا رخ کچن کی طرف تھا۔

فون بج رہی تھی۔ اب اس کا رخ کچن کی طرف تھا۔

فون بج رہی تھی۔ اب اس کا رخ کچن کی طرف تھا۔

فون بج رہی تھی۔ اب اس کا رخ کچن کی طرف تھا۔

فون بج رہی تھی۔ اب اس کا رخ کچن کی طرف تھا۔

فون بج رہی تھی۔ اب اس کا رخ کچن کی طرف تھا۔

فون بج رہی تھی۔ اب اس کا رخ کچن کی طرف تھا۔

فون بج رہی تھی۔ اب اس کا رخ کچن کی طرف تھا۔

فون بج رہی تھی۔ اب اس کا رخ کچن کی طرف تھا۔

فون بج رہی تھی۔ اب اس کا رخ کچن کی طرف تھا۔

فون بج رہی تھی۔ اب اس کا رخ کچن کی طرف تھا۔

”پاپا چاہتے تھے کہ اب تم یوگنڈا نہ جاؤ۔ بلکہ مستقل یہیں پاکستان میں رہو۔ اب مجھے نہیں معلوم ہے۔ کیا سوچا ہے تم نے آگے کے بارے میں؟“ نعمان نے اچانک بات شروع کر دی تھی۔ وہ بیٹا کر رہا تھا۔

”پاپا تو یہ بھی چاہتے تھے کہ آپ کی شادی یہیں کر دی جائے پھر آپ اپنی دلہن کو لے کر یوگنڈا جائیں۔“ یہی کچھ انہوں نے تمہارے بارے میں سوچا تھا مگر فرق اتنا ہے کہ وہ تمہاری یوگنڈا لاپسی کے خیال تھا تمہیں اپنے لائف پارٹنر کے ساتھ یہیں رہنا چاہیے۔“ نعمان نے ایک سرسری نظر اس پر ڈالی۔ وہ خاموش بیٹھی ناخن کھرچتی رہی۔

”دلاور علی خان صاحب کا خط آ گیا ہے۔“ نعمان نے آہستگی سے مطلع کیا۔

”جی، وہ میں نے لفافے پر دیکھ لیا تھا۔“

”مجھے بڑی حیرت ہوئی ان کا خط دیکھ کر..... شاید انہیں اس طرح کی بات نہیں کرنا چاہیے تھی۔“

ہوئے کہا۔

”کس طرح کی بات؟“ ماہین نے اطمینان ظاہر کرنے کی کوشش کی۔

”انہوں نے یاد رہائی کیلئے تمہارا رشتہ مانگا ہے، ہے ناں تعجب کی بات؟“ نعمان بہت ہی سنجیدہ تھا۔

”کیوں؟ اس میں تعجب کی کیا بات ہے؟“ اس نے بہت دھیمی آواز میں سوال کیا۔

نعمان نے چونک کر اس کی شکل دیکھی۔ اور خاصی دیر دیکھتا رہا۔

”تمہیں حیرت نہیں ہوئی؟“ بالآخر وہ بولا۔

”اس سے پہلے بھی تو میرے رشتے آئے تھے۔“ ماہین نے اسی اطمینان کا مظاہرہ کیا۔

”مگر اس رشتے کی خاص بات یہ ہے کہ یہ ہمارے بہنوئی کا رشتہ ہے۔ دوسرے تمہاری اور ان کی طرف سے۔“

”تیسرے ہم تو ابھی ناز بھوکا معمہ حل نہیں کر پائے۔“ نعمان نے دلائل دیے۔

”ناز بھوکے مرقد سے تو میں ہو آئی ہوں۔ رہی آپ کی یہ بات کہ عمروں میں بہت فرق“۔ وہ بولنے لگا۔

نعمان بے تاب سے اس کے بولنے کا انتظار کرنے لگا۔

”ہاں ہاں بولو رک کیوں گئیں۔“

”انسان کی ایک فزیکلی عمر ہوتی ہے اور دوسری ذہنی۔ میں ان سے ذہنی فرق محسوس نہیں کرتی۔“

مشکل سے کہا۔

نعمان خود پر قابو پانے میں مہارت نہ رکھتا تو شاید اچھل پڑتا۔ وہ اس کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ ماہین ہنسنے لگی۔

”اگر کوئی کمٹمنٹ تھی تو مجھے آگاہ تو کیا ہوتا۔“ آخر کار وہ گم صم سے انداز میں گویا ہوا۔ ماہین خاموش رہی۔

”یہ ٹھیک ہے، وہ واقعی بہت ناکس ہیں، ہر لحاظ سے اور قابل بھی بہت ہیں مگر اب حویلی میں دوسری باتیں

نہیں ہے۔“

”اب وہ حویلی ناز بھوکے زمانے کی حویلی نہیں ہے۔“ وہ برجستہ بولی۔

”مگر دلاور علی خان آج بھی وہی ہیں اور وہیں ہیں۔“ نعمان کو بہت الجھن آپڑی تھی۔

”میں ناز بھوکے ہوں۔“ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

”بہت اعلیٰ اعتراف تھا۔ وہ اس کی شکل دیکھتا رہ گیا۔“

”بھوکا کہاں رہی ہو؟ ابھی تو بات ہو رہی ہے۔“ نعمان دھیمی آواز میں بولا۔

”بہت اعلیٰ اعتراف تھا۔ وہ اس کی شکل دیکھتا رہ گیا۔“

”مگر انہی بات کھل ہو چکی ہے۔“ وہ بھی بہت آہستگی سے گویا ہوئی۔

”میں تمہاری مگر جانے کیوں میں مطمئن نہیں۔“ الجھن کے آثار نعمان کے چہرے پر بہت واضح تھی۔

”آپ پریشان نہ ہوں بھائی۔ میں بچی نہیں ہوں۔ اور نہ حویلی والوں سے کسی طرح کمزور ہوں۔ مجھے ہر طرح کے

نہیں سے ڈیٹنگ آتی ہے۔“

نہ کہ کر وہ رک نہیں بلکہ تیزی سے باہر نکل گئی۔

نعمان حیران پریشان سا ہلتا پردہ دیکھتا رہ گیا۔

نہ کمرے کی دھواں نہ موتیوں کے ہار

نہ کوئی کیا سنگھار

ہر جگہ کتنی سندر ہو تم..... تم کتنی سندر ہو

باری مونا سا پاپ تھاے پودوں کو پانی دیتے ہوئے گنگنا رہا تھا۔

”کتاب ہاتھ میں لئے چپکے سے آ کر حوض کی منڈیر پر بیٹھ گئی تھی اور اس کا خوبصورت گیت دلکش آواز میں سن رہی تھی۔“

”یہ تو تم نے ٹھیک کہا۔ وہ واقعی اتنی حسین ہیں کہ انہیں کسی سنگھار کی ضرورت ہی نہیں۔“ اس نے کتاب ٹھوڑی کے نیچے ٹکا

نہایت سے انداز میں گرہ لگائی۔

دلیلی طرح چونک کر پلٹا۔ سرخ کاشن کے سوٹ میں ملبوس سبزے کے درمیان بیٹھی وہ ماحول میں عجیب سی دلکشی کا

دکھائی دیتی تھی۔

ہم نے کوئی جواب نہیں دیا۔ پھر سے اپنے کام میں مصروف ہو گیا تھا۔ البتہ گیت کا سلسلہ بند ہو گیا تھا۔

”سنگھار والے روز تو بہت ہی غضب ڈھار ہی تھیں۔“

”میں نے چند عیائی ہوئی آنکھوں سے اس کی سمت دیکھا۔“

”میں اس مرتبہ بھی بالکل خاموش تھا۔“

”مگر تو بہت مصروف تھے، تم نے شاید ہی دیکھا ہو۔“ حسن ہے، جیسے تو دیر ہو۔ وہ تو دھڑلے منہ سے ہوش اڑا سکتی ہیں۔

نعمان تو یہ سوال نے سنگھار کیا ہوا تھا۔ وہ پھر بولی۔

باری ہنوز خاموش تھا۔

”شاعر نے غالباً انہی کے لئے کہا ہے کہ تم جس رنگ کے کپڑے پہنو، وہ موسم کا رنگ، تم جس حرف پر روش ہو جائے۔“ وہ ہلکھلا کر ہنس دی۔

”کیا روشنی پھوٹی ہے ان سے؟“ وہ پھر ہنسی۔

”تمہارا بھی کوئی تصور نہیں، وہ چیز ہی ایسی ہیں۔“ وہ اس کی پشت کو گھور رہی تھی۔ باری پائپ کھینچتا ہوا دھڑکنے لگا۔

”ویسے آج کل ملاقات کی کیا سبیل بنتی ہے؟ حویلی سے باہر تو خیر تمہاری موج تھی۔“ وہ ہلکھلا کر ہنس رہی تھی۔

”ویسے یہ زخم لگا کیسے تھا۔ کیا بچپن میں گھوڑے سے گر گئے تھے؟ مگر یہ تو وہی مثال ہو گئی کہ ماروں گھٹنا بھولے اس طرح زخم لگنا تھا تو ہاتھ یا ٹانگ پر لگتا۔ ہو سکتا ہے بچپن میں تم لڑکوں سے بہت لڑتے رہے ہو۔ کیونکہ تم میں اسی ہی سے ہے..... ہے ناں؟“ وہ بے تکان بول رہی تھی۔

”اچھا یہ بتاؤ پہل کس نے کی تھی؟“

باری نے اگلی کیاری کی طرف قدم بڑھا دیئے تھے۔

”ویسے امکان ہے وہی مر مٹی ہوں گے پہلے یہ گیت گاتے ہوئے

پیار کے بدلے ہمیں پیار دیں گے

اور کیا ہمیں سرکار دیں گے

اس پہ یہ ناز تو بہ..... اف یہ انداز تو بہ.....

آپ تو جیتے جی ہی ماریں گے

وہ مسکرا رہی تھی جیسے اسے زچ کر کے دلی مسرت ہو رہی تھی۔

”بائے روشی تم یہاں ہو۔ پتا نہیں چلتا تمہارا۔ کلو تمہیں ڈھونڈ ہاری، بابا صاحب تمہیں بلا رہے ہیں۔“ روبرو اس سے دیکھ کر شروع ہو گئی تھی۔

اس نے منہ بنا کر روبرو کی طرف دیکھا۔ البتہ باری نے اطمینان بھری سانس لی۔ اور اپنے پاؤں پر پانی ڈالنے لگا۔

روشی برا سامنے بنا کر اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ روبرو اس سے پہلے اندر غائب ہو چکی تھی۔

اس نے بے دلی سے بابا صاحب کے بیڈروم کے دروازے پر دستک دی تھی۔

”ہوں آ جاؤ۔“ بابا صاحب کی بارعب بھاری آواز ابھری۔

وہ اندر آ گئی۔ بابا صاحب نظر کی عینک لگائے پتا نہیں کون سے کھاتے چیک کر رہے تھے۔

انہوں نے عینک اٹار کر اوپر سے جھانک کر آنے والے کو دیکھا۔

”آؤ ابھی روشی بہت دیر سے تمہیں بلا رہے ہیں۔ کہاں تھیں، کیا سو رہی تھیں؟“

باری نے ایک چمک چمک کر سائینڈ ٹیبل پر رکھ دی۔

باری نے اس میں پڑھ رہی تھی۔

باری نے بولتے ہوئے انسان کی آواز کا دم خم کہاں چلا جاتا ہے۔ اسے اپنی کمزوری پر خود ہی کوفت ہوئی۔

باری نے جوت بولتے ہوئے انسان کی آواز کا دم خم کہاں چلا جاتا ہے۔ انسان بھولتا نہیں۔ اور تمہارے باپ کو تو بہت شوق

باری نے بچے کی زبانوں کے ذمیر لگائیں۔ آج ایسا کرو تم ناشتا ہمارے ساتھ کرو۔

باری نے بچی جیرانی سے ان کی ست دیکھا تھا۔

باری نے مجھے کسی کام سے بلایا ہے بابا صاحب؟“ اس نے الجھ کر سوال کیا۔ لا محالہ اس کا ذہن اپنی شادی کے موضوع

پر مرکوز تھا۔

باری نے کام کرنے کو تھوڑے لوگ ہیں، تم سے آج تک کوئی کام کرایا ہے کسی نے؟“ وہ سکرائے۔

باری نے مزید حیران ہوئی۔

باری نے بتاؤ پہلے کہ تمہیں اپنے باپ سے کتنا پیار ہے؟“ وہ بیڈ کی پشت سے فیک لگا کر سکون سے بیٹھ گئے۔

باری نے زیادہ دیر سے خیال میں سب بچوں کو اپنے باپ سے بہت پیار ہوتا ہوگا۔ پتا بھی تو آپ سے بہت محبت کرتے

باری نے ان کا سوال عجیب لگا۔

باری نے لب لباب جواب ہے، مگر صحیح دیا ہے۔“ دلاور علی خان مسکرا دیئے۔

باری نے پھر الجھ کر ان کی ست دیکھا۔

باری نے نہیں پتا چلے کہ تمہارے باپ کو ایک وجہ سے خوشی مل سکتی ہے، تو تم کیا رد عمل ظاہر کرو گی؟“

باری نے ہنسی کا چہرہ دکھا رہے تھے۔

باری نے ماری دنیا سے لڑ کر انہیں وہ خوشی دینے کی کوشش کروں گی۔ میں اس عمر میں محسوس کر سکتی ہوں کہ پاپا نے کس قدر

باری نے اس نے بہت پر جوش انداز میں جواب دیا۔

باری نے تم واقعی دلاور علی خان کو اپنے بہت قریب محسوس کرتی ہو۔ تم ان کی بہت اچھی بیٹی ہو۔ انہوں نے خوشی سے

باری نے ان کی محبت کو ایک دم حلق میں آ گیا۔

باری نے اپنے سے بڑے بچے کی طرح اس طرح تو پاپا نے فاول کھیلا ہے، چیت کیا ہے مجھے، مگر یہ سب ان پر سو تو نہیں

باری نے اپنے سے بڑے بچے کی طرح اس طرح تو پاپا نے فاول کھیلا ہے، چیت کیا ہے مجھے، مگر یہ سب ان پر سو تو نہیں

باری نے اپنے سے بڑے بچے کی طرح اس طرح تو پاپا نے فاول کھیلا ہے، چیت کیا ہے مجھے، مگر یہ سب ان پر سو تو نہیں

باری نے اپنے سے بڑے بچے کی طرح اس طرح تو پاپا نے فاول کھیلا ہے، چیت کیا ہے مجھے، مگر یہ سب ان پر سو تو نہیں

باری نے اپنے سے بڑے بچے کی طرح اس طرح تو پاپا نے فاول کھیلا ہے، چیت کیا ہے مجھے، مگر یہ سب ان پر سو تو نہیں

باری نے اپنے سے بڑے بچے کی طرح اس طرح تو پاپا نے فاول کھیلا ہے، چیت کیا ہے مجھے، مگر یہ سب ان پر سو تو نہیں

روشی کو پھر ایک جھٹکا لگا۔ اب خالہ کا ذکر کیا معنی؟ اس نے کوفت بھرے انداز میں اپنے بال جھٹکے۔
 ”خالہ تو بہت ناکس ہیں، جواب ہی نہیں ان کا، بہت سو بڑ بہت کا سنڈ“۔ اس نے کوفت کے باوجود جواب دیا۔
 ”اگر ہم..... ہمیشہ کیلئے انہیں یہاں لے آئیں تو.....؟“ دلاور علی خان نے عینک اٹھا کر دوبارہ دہرایا۔
 ”ضرور لے آئیں، یہ میرے لئے بہت بڑی خوشی ہوگی، مگر کیسے؟“
 اچانک اسے دھیان آیا تو جیسے ہڑبڑا کر سیدھی ہو گئی۔
 ”تمہارے باپ سے نکاح کے بعد وہ ہمیشہ کیلئے یہاں آ سکتی ہیں“۔ انہوں نے اخبار سیدھا کر کے دیا۔
 ”کیا؟“
 ”جی ہاں، جتنی رہو اب تم جاسکتی ہو“۔ انہوں نے اجازت دی۔
 ”جی ہاں، یہ بہت جلدی، مگر سب کچھ بہت خاموشی اور سادگی سے ہوگا اور تم فکر نہ کرو۔ ماہین سب سے پہلے یہیں آئیں گی۔“
 ”جی ہاں، جیسے مستقل طور پر ہری پور لے جائیں“۔
 ”جی ہاں، بڑے مصروف سے انداز میں جواب دیا۔“
 ”جی ہاں، بہت جلدی سے احساس سے سرشاران کے بیڈروم سے باہر نکل گئی۔“

”توہ تم چائے پی لیں، لال خان بھی آنے والے ہیں“۔ بالونے پردے سرکائے اور لائٹ جلا دی۔
 ”اگر ہوں، میں بھلا نیند کہاں، بس کچھ اپنی تلاش ہے جانے کہاں کھو گئے ہیں ہم،
 تم سے تو دل کے پاس ملاقات ہو گئی
 میں خود کو ڈھونڈنے بہت دور تک گیا

بائے مینا لیا

”توہ تو عقل میں نہیں آتیں یہ باتیں جن کا حاصل نہ وصول، خواہ مخواہ کا پیٹنا۔ خوشی کوئی بھی آخری نہیں ہوتی، چلیں
 لگے، اب آجائیں، چائے ٹھنڈی ہو جائیگی۔“

جو آتا ہے خوشی کی انتہا پر

بہت روئے تھے اس آنسو کی خاطر

”اٹھ کر بیٹھ گیا اور بالوں کی طرف دیکھنے لگا، جوش لاش کرتے جا پانی کپڑے کے سوٹ میں یوں تیار تھی جیسے کہیں جاری

”تمہاری ہاں؟“

”جی ہاں، تمہارے ہاتھ تو تعریف کر دیا کرتے ہیں، ضرور پوچھنا ہے آنے جانے کا؟“ وہ جل کر بولی۔

”جی ہاں، تمہارے ہاتھ تو تعریف کر دیا کرتے ہیں، ضرور پوچھنا ہے آنے جانے کا؟“ وہ جل کر بولی۔

”جی ہاں، تمہارے ہاتھ تو تعریف کر دیا کرتے ہیں، ضرور پوچھنا ہے آنے جانے کا؟“ وہ جل کر بولی۔

”کیوں؟“ انہیں کیوں اعتراض ہے۔ کیا بھائی کو یہ احساس نہیں کہ پاپا نے کتنی ٹھنڈی لائف گزارا ہے
 پچھلے انیس سال سے نہیں ملی۔ بے رنگ زندگی کے انیس سال کم تو نہیں ہوتے۔ ایک سال کی تین سو پینسٹ
 کے آٹھ پہر اور آٹھ پہر کی ظالم بد صورتی۔“ روشی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

بابا صاحب دم بخود پوتی کی شکل دیکھ رہے تھے۔ جس رد عمل کی امید انہیں جواد سے تھی وہ روشی کا نہیں تھا۔
 ”بھائی کو اعتراض کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔ محض اس لئے کہ لوگ کچھ کہہ نہ دیں۔ ہم ایک جیتے جانے
 کے رنگ چھین لیں۔ جبکہ شریعت و فطرت کو کوئی اعتراض نہیں۔ میں بھائی سے بات کروں گی۔ انہیں ان کے
 کروں گی۔“ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ جانے کے ارادے سے۔

”ادھر آؤ بیٹی۔“ بابا صاحب نے اشارے سے اسے اپنے قریب بلایا۔

وہ ان کے قریب آ گئی۔

”بیٹھ جاؤ۔“ ان کا اگلا حکم تھا۔

عارف کی تمام حیات چوکس تھیں۔ نہایت دھیمی آواز کے باوجود بڑا ہٹ اس نے سن لیا تھا۔
بھول گیا تھا۔

باہر آمدے میں بالو چائے آگے سجائے۔ تھال میں والے ساف کر رہی تھی۔

اس نے نزدیک ہی واش بیسن میں ہاتھ منہ دھویا۔ وہ بہت الجھ گیا تھا۔ دماغ جو معنی سمجھا رہا تھا وہ آہستگی سے چلتا ہوا بالو کے سامنے آکر بیٹھ گیا۔

بالو نے تھرماس سے چائے انڈیلی اور اس کے سامنے رکھ دی۔ ساتھ ہی نمکو اور گلاب جاسن لیا۔
سرکائیں۔

”لال خان نہیں آیا ابھی تک؟“ اس نے چائے کا کپ اٹھا لیا، مگر نظریں نہیں اٹھائیں۔

”آہی جائے گا بوڑھا ہیرو“۔ بالو نے سلگ کر جواب دیا۔

عارف کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔

خاصی دیر وہ گوگو کی کیفیت میں رہا۔

”آپ کو اس طرح نہیں کرنا چاہیے اب تو آپ کے پاس اس کی امانت ہے۔“ عارف نے بڑی دھڑلے سے کہا۔

”ہونہہ! امانت! میں اسے کچھ نہیں دوں گی، اس کیلئے اتنی محنت کروں۔ اتنے دکھ اٹھاؤں؟ کر رہی ہوں۔“

”کیا کریں گی آپ؟“ عارف خوفزدہ سا ہو گیا۔

”میں اس کے بچوں کی ماں کبھی نہیں بنوں گی، ایک کانٹا مستقل میرے دل میں ہے، ایک کانٹا۔“
چاہیے۔ وہ بڑی سفاک نظر آ رہی تھی۔

”وہ آپ سے بے حد محبت کرتا ہے اور محبت کرنیوالوں کو دکھ نہیں دیتے۔“ عارف نے سمجھایا۔

”محبت کیوں نہیں کرے گا اس کی تو لائری نکل آئی ہے۔ پانچ روپے کے ٹکٹ پر پانچ لاکھ کا انعام۔“
آگ نکل رہی تھی۔

”یہ ہوش کی بات نہیں ہے۔“ عارف بس یہی کہہ سکا۔

”آپ تو خود بے ہوش رہتے ہیں۔“ بالو نے طنزیہ کہا۔

”ہمیں ہوش کے سبق پڑھا رہے ہیں۔“

”مگر میری بے ہوشی نقصان میں کسی کے نہیں، یہ بھی دن گنتی کرنے کا ایک انداز ہے۔“

اس نے بڑے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا

رات آکر گزر بھی جاتی ہے

اک ہماری سحر نہیں ہوتی

بے قراری سہی نہیں جاتی

زندگی مختصر نہیں ہوتی !!

نہنے چائے کا کپ اٹھا لیا اور آہستہ آہستہ گھونٹ بھرنے لگا۔

”ہم میں تو آپ بھی برابر کے شریک ہیں۔ کبھی کبھی توجی چاہتا ہے آپ کو کھانے میں زبردے دوں۔“ بالو کی آواز بھرا
میں نے اپنے والی تبدیلی سے وہ اور زیادہ قنوطی ہو رہی تھی۔

”نیزا احسان آپ مجھ پر نہیں کر سکتیں۔ ایسے نصیب کہاں ہمارے؟“ وہ ہنس دیا اور پھر چائے پینے لگا۔

”ہاں! آپ لال خان کا گھر سنانے کی بجائے اپنا گھر سالیے۔“ بالو گویا آج پھٹ پڑی تھی۔

”کے عجیب و غریب انداز پر عارف چونک پڑا تھا۔ اس کے ماتھے پر شکنیں ابھر آئی تھیں۔

نہ نے چہرہ اوپر اٹھانے کے بجائے صرف نظریں اٹھائیں اور بالو کو چند ثانیے دیکھا۔

اپنے ہمراہ جو آتے ہیں، ادھر سے پہلے!

دشت پڑتا ہے میاں عشق میں گھر سے پہلے

”کپ رکھ کر اٹھ کھڑا ہوا۔

”یوں سمجھیں میں آج آخری بار گھر یعنی آپ کے گھر آیا تھا۔ دماغ مرد کا خراب ہو یا عورت کا، دیر نہیں لگتی، خدا حافظ۔“

نہ نے قدم بڑھا دیے۔

”ظہر جائیں میں بھی آپ کے ساتھ ہی گھر سے نکلوں گی۔ آپ کے آنے کے امکان تو مجھے اس گھر میں روکے ہوئے

نہ نے یہاں رکھا کیا ہے؟“ وہ تھال رکھ کر اٹھ کھڑی ہوئی، مگر فوراً ہی گڑبڑا گئی۔

عارف اپنی جگہ پر پھر ہو گیا تھا۔ سامنے لال خان کھڑا تھا اور ششدر سا دونوں کو دیکھ رہا تھا۔

عارف نے نظریں بمشکل اٹھائی تھیں۔ لال خان اس کی طرف دیکھنے کی بجائے صرف بالو کی طرف دیکھ رہا تھا۔

”لال خان! میں دوست ہوں، ڈاکو نہیں ہوں۔ یہ کم عمر اور کم عقل ہے۔ اسے کچھ نہ کہنا۔ ذرا دیر کے بعد غصے میں بعض

نہ نے لال خان کی کہانیاں مل جاتی ہیں۔ جو نہ پلیں تو بہتر رہتا ہے۔ اب ہمیں ایک دوسرے سے نہیں ملنا چاہیے، خدا حافظ۔“

وہ تیزی سے آگے بڑھ گیا۔ لال خان نے اسے روکا نہیں۔ کچھ دیر ساکت کھڑا رہنے کے بعد وہ مردہ قدموں سے اپنے

نہ نے طرف بڑھ گیا۔

بالو نے جاتے ہوئے لال خان کو ایک نظر دیکھا اور کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس کے چہرے پر کسی قسم کا ڈر اور خوف نظر نہیں آ رہا

نہ نے بالو کی نظر آ رہی تھی۔ اس حد تک کہ اس نے چائے کپ میں نکال کر پینا شروع کر دی تھی۔ البتہ اس کا ہاتھ پاؤں

نہ نے ہاتھ کاٹا تھا کہ وہ کسی گہری سوچ میں ہے۔

گھر میں صرف ماہین کی دو سہیلیاں بطور مہمان موجود تھیں جبکہ نعمان کے دوست ابھی نہیں آئے تھے۔ تین دوست بھی مدعو تھے۔ جن سے ان کی برسوں کی دوستی تھی۔

ماہین اپنے مہندی لگے ہاتھ دیکھ کر جانے کیوں بار بار روئے جا رہی تھی۔ زندگی کا نیا موڑ مڑتے ہوئے تھا۔ کیا کیا یاد دلانے لگتے ہیں۔ دوسرے اسے نعمان کی کئی روزہ خاموشی بھی بہت ستا رہی تھی۔

شام کے ساڑھے سات بجے کے قریب دلاور علی خان دس بارہ افراد کے ساتھ گھر میں داخل ہوئے۔ غریب تاب، سمیہ اور یاور علی خان کی تینوں بہنیں تھیں۔ بھائی بھی دونوں یعنی ابا اور بصیر چچا شامل تھے۔

ان لوگوں کی آمد کا سن کر تو ماہین کے ضبط کے سارے بندھن ٹوٹ گئے۔ وہ بے تحاشا روئے جا رہی تھی۔ عالم تاب نوکرانی کے ساتھ کمرے میں داخل ہوئی اور رو کر پاگل ہوتی ماہین کو گلے سے لگالیا۔

”جب انسان کسی بڑی خوشی سے نوازا جاتا ہے تو وہ لوگ بہت یاد آتے ہیں جو اس خوشی میں سب سے زیادہ ہیں، لیکن یہ بھی زندگی ہے۔ یوں اپنی جان ہلکان نہ کرو۔ ہم بھی تمہارے اپنے ہیں۔ وقت بتائے گا کہ تم میں کون سا شائبہ چپ ہو جاؤ۔“

وہ اپنے دو پٹے سے اس کی آنکھیں صاف کرنے لگیں۔ ساتھ ہی نوکرانی کو چابی تھما کر سوٹ کیس کولنے کا ماہین کی دوست نے نوکرانی کے ہاتھ سے چابی لے کر خود سوٹ کیس کھولا۔

”یہ نکاح کا جوڑا اوپر ہی رکھا ہے۔ بہت اچھی سی دلہن بنانا ہماری ماہین کو۔ یاد رہے تو گلے میں ایک ہار لگی ہوگی۔“ مگر ہم نے ان سے کہہ دیا ہے جب دلہن کے پاس جاؤ تو گلے میں ہار ضرور ڈال لینا، آخر اس کے بھی ارمان ہوں۔ انہوں نے مسکرا کر اس کی پیشانی پر بوسہ دیا اور اٹھ کھڑی ہوئیں۔

ماہین کی سہیلیاں اسے دلہن بنانے کی تیاریاں کرنے لگیں۔ اسی دم نوکرانی نے آکر اطلاع دی کہ فون پر روشی آپ کو بلا رہی ہے۔ اس نے ماہین کی طرف اشارہ کیا۔

ماہین چونک پڑی۔

”کیا روشی آئی نہیں؟ اسے کیوں نہیں لائے؟ عجیب لوگ ہیں۔“

”رخشی! فون تو لاؤنج میں ہے یا بھائی کے کمرے میں؟“ اس کا چہرہ حیا سے چمکنے لگا۔

”وہ سب لان میں ہیں لاؤنج خالی پڑا ہے۔ البتہ یاد رہے بھائی اس طرح سے بیٹھے ہیں کہ لاؤنج ان کی نظر سے ہے اب یہ تمہارا مسئلہ ہے۔“

”پھر تو میں نہیں جا رہی۔ اسے ڈھیر ساری شرم آگئی۔

کچھ فطری دارواتیں ہوتی ہیں جو عقل سے ماورا ہوتی ہیں اور سب کیلئے ایک سی ہوتی ہیں۔

”میں کہہ دیتی ہیں کہ تم نکاح پر راضی ہو، مگر ساتھ جانے پر راضی نہیں ہو۔ جلدی اٹھو دوسری طرف ملنا۔“

رخشی نے اسے بازو سے پکڑ کر اٹھایا۔

”ترنہ تو کہہ رہی ہو۔“ وہ ہچکچا رہی تھی۔

”جواب زیادہ بنو مت، ایک گھنٹے بعد ان کے کندھے سے کندھا ملائے گاڑی میں بیٹھی ہوں گی اور جب ہم صبح جا کر

ترنہ نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

”ترنہ بدتمیزی نہیں۔“ اس نے حیا آمیز خفگی سے اسے ٹوکا۔ اور دو ہٹا سر پر پھیلا کر تیزی سے لاؤنج میں آئی تھی۔ اور

”پس!“ اس کی آواز میں حجاب سادہ آیا۔

”ہوں۔۔۔ السلام علیکم امی حضور!“ روشی کی کھٹکھٹاتی آواز ایریس میں ابھری، ماہین کا دل عجیب انداز میں

”پناہ کے ہاں تو تکمیل ڈالنے والی کوئی چیز ہی نہیں۔ آپ نے کیسے ڈالی؟“ وہ کھٹکھٹا رہی تھی۔

”روشیا پلیز!“ اس نے ہونٹ دانتوں تلے دبایا۔

”بے میرے پتا تو ہر قسم کی صورتحال میں بڑے رف سے محسوس ہوتے ہیں۔ آپ کو پر پوز کرتے ہوئے بھی ویسے ہی

”نہ!“ وہ سنور چمک رہی تھی۔

”تم نے یہ باتیں کرنے کیلئے اتنی دور سے فون کیا ہے؟“ ماہین بھی بالآخر فہم پڑی۔

”کی نہیں آپ کا حال احوال پوچھنے اور پاپا کی شکایت لگانے کیلئے فون کیا ہے۔“ وہ منہ بسور کر کہہ رہی تھی۔

”کیس شکایت؟“ ماہین ابھی۔

”اٹھنا شادی میں ہمیں کیوں نہیں لائے۔ ہم بھی تو دیکھیں نازک نازک جذبوں میں گھرے پاپا کیسے لگتے ہیں؟ کیا ہمارا

”نہ!“ وہ بیٹائی اداسی ظاہر کرتے ہوئے بولی۔

”تم کیسی ہو؟ خوش تو ہونا۔“ ماہین نے بڑے محتاط انداز میں پوچھا۔

”ایک ہنسٹ کلاس۔ خوشی سے پاؤں زمین پر نہیں ٹک رہے۔“ وہ ہنسی۔

”یا آپ دلہن بن چکیں؟“ وہ بڑی معصومیت سے پوچھ رہی تھی۔

”میں خاموش رہی۔“

”گناہ ہو گیا؟“ دوسرا سوال ہوا۔

”ترنہ کوئی اور بات کرو۔“ ماہین جھینپ گئی۔

”جو مجھے۔“ کوئی اور بات کرتے ہیں۔ یہ بتائیں پاپا کیسے لگ رہے ہیں؟“ وہ شریر ہوئی۔

”کیا وہاں آکر تمہاری کسی بیٹائی کرتی ہوں۔“ ماہین کے ہونٹوں پر شرکیں مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

”نہ!“ وہ پھر آ رہی ہیں ناں؟“ روشی کا قبضہ بہت جاندار تھا۔

ماہین نے ریسور رکھ دیا۔ اور گلزار چہرے کے ساتھ اوپر چلی آئی۔

”جب بیٹی نے یہ حال کر دیا ہے تو باپ کیا حال کریگا؟“ اس کی دوست تابندہ نے اس کے چہرے کا رنگ جانزہ لیا۔

ماہین اسے گھور کر رہ گئی۔

سیونٹھ سی (7th C) میں ایک نئی کہانی کا آغاز ہو رہا تھا۔

باہر سمندر کی جولانیاں تھیں اور اندر یاور علی خان کے اندر طوفان کروٹیں لے رہے تھے۔ انتہائی چمکدار اور شگفتہ دوپٹے اور تنگ پانچامے میں دلہن بنی ماہین گھر کی خواتین میں گھری ہوئی تھی۔ گھریلو ملازمین کے اطوار میں گھری تبدیلی پیدا کر رکھی تھی۔

دلاور علی خان رونمائی میں ہیرے کا ایک نگین دے کر اوپر اپنی خواب گاہ میں جا چکے تھے۔

یاور علی خان اپنے ایک ہم مرتبہ دوست کے ساتھ مصروف گفتگو ہونے کے باوجود ماہین پر ایک اڑتی پڑتی نظر آتے تھے۔ جس سے سمیہ جانے کون کون سے قصے بیان کر رہی تھی۔ آج سے برسوں پہلے بھی فیض احمد کی ایک نئی فلم گھر میں آئی تھی۔ جس کے فرشی غرارے کو چار ملازماؤں نے سنبھالا تھا۔ سچے کام سے بوجھل دوپٹے کو ان کی دیکھ رہی تھیں۔ ملازماؤں اور بہنوں کی وجہ سے وہ دلہن سے خاصے فاصلے پر چل رہے تھے۔ ڈومینوں نے استقبال کرتے تھے۔ ملازموں نے پھول اور سکے پھاند کر کے تھے۔

ان کی والدہ نے دلہن کے کمرے پر کھڑے ہو کر اس کی پیشانی پر بطور خوش آمدید بوسہ دیا تھا۔

گھر میں شور اس قدر تھا کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ بچوں کا شور و غل۔ نوکروں کا اودھم خواتین کی چٹائی ڈومینوں کے حلق پھاڑ قسم کے گیت اور اس سے بھی بلند ڈھولکی کی آواز۔

جبکہ آج پتا ہی نہیں چل رہا تھا کہ اس گھر میں نئی دلہن آئی ہے۔ جو خاصی پرسکون حالت میں بیٹھی تھی۔

جبکہ وہ دلہن سسرال پہنچ کر بھی کافی دیر روئی تھی اور کئی بار بے ہوش ہوئی تھی۔ یاور علی خان اس کے پاس جانے گھبرا رہے تھے۔ کہ نازک مزاج دلہن کہیں تماشا نہ بنو اے۔ جبکہ دلہن کے حسن کے چہ چوں نے انہیں بے مبرائت کی آنکھوں کے ڈورے لکھتے گہرے سرخ ہو گئے۔ انہوں نے سگریٹ سلگا لیا۔ آنکھوں میں خوشی اور سرمستی کے عجیب سی وحشت جھلکنے لگی۔

وہ معذرت کر کے وہاں سے اٹھ آئے۔ عالم تاب ان کے پیچھے پیچھے لپکیں۔

”کہاں جا رہے ہو یاور؟“ انہوں نے یاور علی خان کے شانے پر ہاتھ رکھ کر ٹھہرایا۔

”میرے سر میں شدید درد ہو رہا ہے۔ میں کچھ دیر آرام کروں گا۔ اور ہاں بھابی بیگم فی الحال مجھے کوئی ڈسٹرب نہیں۔“

میں کچھ دیر تیار ہونا چاہتا ہوں۔“

ماہین نے ان کے جھلسنے لگے تھے۔

جسے سمیہ نے دو لہا کسی لڑکی کا خواب نہیں ہوتے۔

جسے سمیہ نے دو لہا کسی لڑکی کا خواب نہیں ہوتے۔

جسے سمیہ نے دو لہا کسی لڑکی کا خواب نہیں ہوتے۔

جسے سمیہ نے دو لہا کسی لڑکی کا خواب نہیں ہوتے۔

جسے سمیہ نے دو لہا کسی لڑکی کا خواب نہیں ہوتے۔

جسے سمیہ نے دو لہا کسی لڑکی کا خواب نہیں ہوتے۔

جسے سمیہ نے دو لہا کسی لڑکی کا خواب نہیں ہوتے۔

جسے سمیہ نے دو لہا کسی لڑکی کا خواب نہیں ہوتے۔

جسے سمیہ نے دو لہا کسی لڑکی کا خواب نہیں ہوتے۔

جسے سمیہ نے دو لہا کسی لڑکی کا خواب نہیں ہوتے۔

جسے سمیہ نے دو لہا کسی لڑکی کا خواب نہیں ہوتے۔

جسے سمیہ نے دو لہا کسی لڑکی کا خواب نہیں ہوتے۔

جسے سمیہ نے دو لہا کسی لڑکی کا خواب نہیں ہوتے۔

جسے سمیہ نے دو لہا کسی لڑکی کا خواب نہیں ہوتے۔

جسے سمیہ نے دو لہا کسی لڑکی کا خواب نہیں ہوتے۔

جسے سمیہ نے دو لہا کسی لڑکی کا خواب نہیں ہوتے۔

جسے سمیہ نے دو لہا کسی لڑکی کا خواب نہیں ہوتے۔

جسے سمیہ نے دو لہا کسی لڑکی کا خواب نہیں ہوتے۔

جسے سمیہ نے دو لہا کسی لڑکی کا خواب نہیں ہوتے۔

جسے سمیہ نے دو لہا کسی لڑکی کا خواب نہیں ہوتے۔

جسے سمیہ نے دو لہا کسی لڑکی کا خواب نہیں ہوتے۔

جسے سمیہ نے دو لہا کسی لڑکی کا خواب نہیں ہوتے۔

جسے سمیہ نے دو لہا کسی لڑکی کا خواب نہیں ہوتے۔

جسے سمیہ نے دو لہا کسی لڑکی کا خواب نہیں ہوتے۔

جسے سمیہ نے دو لہا کسی لڑکی کا خواب نہیں ہوتے۔

اس نے مابین کے کان میں سرگوشی کی۔

مابین کے چہرے پر الوہی سے رنگ بکھر گئے۔

وہ دونوں زینے طے کر کے اوپر آئیں۔ اپنے پیچھے قدموں کی چاپ پر سمیہ نے پیچھے مڑ کر دیکھ کر کہا۔
بلا کی طرح سر پر منڈلا رہی ہیں۔“ سمیہ نے ڈپٹا۔

وہ ڈانٹ کھاتے ہی بھاگ لی۔

”بہت ہی شوق ہے اسے دہنیں دیکھنے کا۔ اب دیکھئے گا جب تک آپ میں سے ”تازہ دہن“ کی خوشبو سائے کی طرح آپ کے ساتھ لگی رہے گی۔ ذاتی تجربہ ہے۔“ سمیہ ہنسی اور دروازہ پر دستک دی۔
مابین بھی اس کی دلچسپی پر مسکرا رہی تھی۔

”کون؟“ یاور علی خان کی بوجھل آواز آئی۔

”ہم ہیں چچا..... آجائیں؟“

”ہوں۔“ غالباً یہ اجازت تھی۔

سمیہ نے دروازہ کھولا اور مابین کو تھامے اندر چلی آئی۔ یاور علی خان سفید کرتے پانچاے میں بیٹھ کر بیٹھے تھے۔ مابین کو دیکھ کر بھی ان کے انداز نشست میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔

”آپ کیلئے کافی بھجواؤں؟“ مابین کو بیڈ پر نکاتے ہوئے سمیہ یاور علی خان سے مخاطب تھی۔

”نہیں۔“ انہوں نے دونوں جواب دیا۔

”سمیہ، مابین کا ہاتھ دبا کر خاموشی سے باہر چلی گئی اس نے بہت آہستگی سے دروازہ بند کر لیا تھا۔

”مابین اس طرح بیٹھی تھی کہ یاور علی خان اس کی پشت پر تھے۔

”آپ چھینچ کر لیں اور ایزی ہو جائیں۔ برسوں بعد ذہن کچھ ریلیکس ہوا ہے۔ میں بہت سارا سونا ہوتا ہوں۔

اب سے دیر تک۔ امید ہے آپ اچھے لائف پائرنٹر کی طرح میرے احساسات کا پاس کریں گی۔“ غالباً وہ بیٹھ چکے تھے۔

الفاظ اگرچہ بہت منتخب تھے مگر اعصاب کیلئے اینٹ پتھر سے کم نہیں تھے۔

اس کے سارے لطیف احساسات ہوا ہو گئے۔

اس نے آہستگی سے دوپٹے کی ہنسی نکالنا شروع کر دیں۔ اتنے دلدرد۔ اتنا کٹ اور ایک نظر بھی نہیں۔

اس کی آنکھیں بھر آئیں۔

مرد بھی کیا ہے جیسے کوئی امتحانی پرچہ.....

ساری عمر حل کرتے رہو۔

یہ وہی ہیں۔ جو پر پوز کرتے وقت تھے۔ دموئی اس کے رخساروں پر ڈھلک آئے۔

پہلے تو مابین نے اپنے پیچھے قدموں کی چاپ پر سمیہ نے پیچھے مڑ کر دیکھ کر کہا۔
بلا کی طرح سر پر منڈلا رہی ہیں۔“ سمیہ نے ڈپٹا۔

وہ ڈانٹ کھاتے ہی بھاگ لی۔

”بہت ہی شوق ہے اسے دہنیں دیکھنے کا۔ اب دیکھئے گا جب تک آپ میں سے ”تازہ دہن“ کی خوشبو سائے کی طرح آپ کے ساتھ لگی رہے گی۔ ذاتی تجربہ ہے۔“ سمیہ ہنسی اور دروازہ پر دستک دی۔
مابین بھی اس کی دلچسپی پر مسکرا رہی تھی۔

”کون؟“ یاور علی خان کی بوجھل آواز آئی۔

”ہم ہیں چچا..... آجائیں؟“

”ہوں۔“ غالباً یہ اجازت تھی۔

سمیہ نے دروازہ کھولا اور مابین کو تھامے اندر چلی آئی۔ یاور علی خان سفید کرتے پانچاے میں بیٹھ کر بیٹھے تھے۔ مابین کو دیکھ کر بھی ان کے انداز نشست میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔

”آپ کیلئے کافی بھجواؤں؟“ مابین کو بیڈ پر نکاتے ہوئے سمیہ یاور علی خان سے مخاطب تھی۔

”نہیں۔“ انہوں نے دونوں جواب دیا۔

”سمیہ، مابین کا ہاتھ دبا کر خاموشی سے باہر چلی گئی اس نے بہت آہستگی سے دروازہ بند کر لیا تھا۔

”مابین اس طرح بیٹھی تھی کہ یاور علی خان اس کی پشت پر تھے۔

”آپ چھینچ کر لیں اور ایزی ہو جائیں۔ برسوں بعد ذہن کچھ ریلیکس ہوا ہے۔ میں بہت سارا سونا ہوتا ہوں۔

اب سے دیر تک۔ امید ہے آپ اچھے لائف پائرنٹر کی طرح میرے احساسات کا پاس کریں گی۔“ غالباً وہ بیٹھ چکے تھے۔

الفاظ اگرچہ بہت منتخب تھے مگر اعصاب کیلئے اینٹ پتھر سے کم نہیں تھے۔

اس کے سارے لطیف احساسات ہوا ہو گئے۔

اس نے آہستگی سے دوپٹے کی ہنسی نکالنا شروع کر دیں۔ اتنے دلدرد۔ اتنا کٹ اور ایک نظر بھی نہیں۔

اس کی آنکھیں بھر آئیں۔

مرد بھی کیا ہے جیسے کوئی امتحانی پرچہ.....

ساری عمر حل کرتے رہو۔

یہ وہی ہیں۔ جو پر پوز کرتے وقت تھے۔ دموئی اس کے رخساروں پر ڈھلک آئے۔

اس نے مابین کے کان میں سرگوشی کی۔

مابین کے چہرے پر الوہی سے رنگ بکھر گئے۔

وہ دونوں زینے طے کر کے اوپر آئیں۔ اپنے پیچھے قدموں کی چاپ پر سمیہ نے پیچھے مڑ کر دیکھ کر کہا۔
بلا کی طرح سر پر منڈلا رہی ہیں۔“ سمیہ نے ڈپٹا۔

وہ ڈانٹ کھاتے ہی بھاگ لی۔

”بہت ہی شوق ہے اسے دہنیں دیکھنے کا۔ اب دیکھئے گا جب تک آپ میں سے ”تازہ دہن“ کی خوشبو سائے کی طرح آپ کے ساتھ لگی رہے گی۔ ذاتی تجربہ ہے۔“ سمیہ ہنسی اور دروازہ پر دستک دی۔
مابین بھی اس کی دلچسپی پر مسکرا رہی تھی۔

”کون؟“ یاور علی خان کی بوجھل آواز آئی۔

”ہم ہیں چچا..... آجائیں؟“

”ہوں۔“ غالباً یہ اجازت تھی۔

سمیہ نے دروازہ کھولا اور مابین کو تھامے اندر چلی آئی۔ یاور علی خان سفید کرتے پانچاے میں بیٹھ کر بیٹھے تھے۔ مابین کو دیکھ کر بھی ان کے انداز نشست میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔

”آپ کیلئے کافی بھجواؤں؟“ مابین کو بیڈ پر نکاتے ہوئے سمیہ یاور علی خان سے مخاطب تھی۔

”نہیں۔“ انہوں نے دونوں جواب دیا۔

”سمیہ، مابین کا ہاتھ دبا کر خاموشی سے باہر چلی گئی اس نے بہت آہستگی سے دروازہ بند کر لیا تھا۔

”مابین اس طرح بیٹھی تھی کہ یاور علی خان اس کی پشت پر تھے۔

”آپ چھینچ کر لیں اور ایزی ہو جائیں۔ برسوں بعد ذہن کچھ ریلیکس ہوا ہے۔ میں بہت سارا سونا ہوتا ہوں۔

اب سے دیر تک۔ امید ہے آپ اچھے لائف پائرنٹر کی طرح میرے احساسات کا پاس کریں گی۔“ غالباً وہ بیٹھ چکے تھے۔

الفاظ اگرچہ بہت منتخب تھے مگر اعصاب کیلئے اینٹ پتھر سے کم نہیں تھے۔

اس کے سارے لطیف احساسات ہوا ہو گئے۔

اس نے آہستگی سے دوپٹے کی ہنسی نکالنا شروع کر دیں۔ اتنے دلدرد۔ اتنا کٹ اور ایک نظر بھی نہیں۔

اس کی آنکھیں بھر آئیں۔

مرد بھی کیا ہے جیسے کوئی امتحانی پرچہ.....

ساری عمر حل کرتے رہو۔

یہ وہی ہیں۔ جو پر پوز کرتے وقت تھے۔ دموئی اس کے رخساروں پر ڈھلک آئے۔

اس نے مابین کے کان میں سرگوشی کی۔

مابین کے چہرے پر الوہی سے رنگ بکھر گئے۔

وہ دونوں زینے طے کر کے اوپر آئیں۔ اپنے پیچھے قدموں کی چاپ پر سمیہ نے پیچھے مڑ کر دیکھ کر کہا۔
بلا کی طرح سر پر منڈلا رہی ہیں۔“ سمیہ نے ڈپٹا۔

وہ ڈانٹ کھاتے ہی بھاگ لی۔

”بہت ہی شوق ہے اسے دہنیں دیکھنے کا۔ اب دیکھئے گا جب تک آپ میں سے ”تازہ دہن“ کی خوشبو سائے کی طرح آپ کے ساتھ لگی رہے گی۔ ذاتی تجربہ ہے۔“ سمیہ ہنسی اور دروازہ پر دستک دی۔
مابین بھی اس کی دلچسپی پر مسکرا رہی تھی۔

”کون؟“ یاور علی خان کی بوجھل آواز آئی۔

”ہم ہیں چچا..... آجائیں؟“

”ہوں۔“ غالباً یہ اجازت تھی۔

سمیہ نے دروازہ کھولا اور مابین کو تھامے اندر چلی آئی۔ یاور علی خان سفید کرتے پانچاے میں بیٹھ کر بیٹھے تھے۔ مابین کو دیکھ کر بھی ان کے انداز نشست میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔

”آپ کیلئے کافی بھجواؤں؟“ مابین کو بیڈ پر نکاتے ہوئے سمیہ یاور علی خان سے مخاطب تھی۔

”نہیں۔“ انہوں نے دونوں جواب دیا۔

”سمیہ، مابین کا ہاتھ دبا کر خاموشی سے باہر چلی گئی اس نے بہت آہستگی سے دروازہ بند کر لیا تھا۔

”مابین اس طرح بیٹھی تھی کہ یاور علی خان اس کی پشت پر تھے۔

”آپ چھینچ کر لیں اور ایزی ہو جائیں۔ برسوں بعد ذہن کچھ ریلیکس ہوا ہے۔ میں بہت سارا سونا ہوتا ہوں۔

اب سے دیر تک۔ امید ہے آپ اچھے لائف پائرنٹر کی طرح میرے احساسات کا پاس کریں گی۔“ غالباً وہ بیٹھ چکے تھے۔

الفاظ اگرچہ بہت منتخب تھے مگر اعصاب کیلئے اینٹ پتھر سے کم نہیں تھے۔

اس کے سارے لطیف احساسات ہوا ہو گئے۔

اس نے آہستگی سے دوپٹے کی ہنسی نکالنا شروع کر دیں۔ اتنے دلدرد۔ اتنا کٹ اور ایک نظر بھی نہیں۔

اس کی آنکھیں بھر آئیں۔

مرد بھی کیا ہے جیسے کوئی امتحانی پرچہ.....

ساری عمر حل کرتے رہو۔

یہ وہی ہیں۔ جو پر پوز کرتے وقت تھے۔ دموئی اس کے رخساروں پر ڈھلک آئے۔

”آپ تو بس رہنے ہی دیا کریں آپا“۔ روبی نے جل کر انہیں دیکھا۔

”بھئی، ہمیں تو بالکل بھی یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ اس شادی میں سارے گھروالے کیوں شریک تھے۔؟“ مونا کو عدم شرکت کا بڑا قلق تھا۔

”دوسروں کی دلہنیں آئے دن دیکھتے رہتے ہیں۔ اپنے ہاں کی دیکھنے کو ملتی ہیں تو باسی۔“

”وہ آجائیں یہاں ہم انہیں تازہ کر لیں گے۔“ زری نے دلا سا دیا۔

”لو بھلا یہ ”دلہن“ تازہ کریں گی۔“ گلو منہ دبا کر نہیں۔

زری خفیف سی ہو کر رہ گئی۔

”ہائے لگی تو بڑی پیاری ہوں گی۔ سمیہ بھابی کے بڑے مزے ہیں۔ بڑی امی انہیں ہر جگہ ساتھ لگا لگاتے ہیں۔ اپنی قمیض کی کڑھائی کے دوران رشک کرنے کی فرصت ملی۔

”وہ بہو جو ہیں اس گھر کی“۔ بیہ نے یاد دلایا۔

”بہو ہونے میں بھی بڑے مزے ہیں۔“ لالی نے ٹکڑا لگایا۔

”فکر نہ کرو۔ تم بھی کل کو کسی کی بہو بنو گی۔ پھر یونہی ساس کے ساتھ لٹکو گی۔“ مونا نے دلا سا دیا۔

”ہائے مونا باجی۔ کچھ کریں نہ کریں آپ۔ باتیں بڑی اچھی کرتی ہیں۔“

لالی نے ایک آہ سرد کھینچی۔

”خاصی مایوس ہو۔ کس طرح افاقہ ہو سکتا ہے؟“ روبی نے ہمدردی کی۔

”ظاہر ہے جلد شادی ہی سے۔“ تانیہ بہت آخر میں حصہ لیتی تھی۔ اس وقت تو ویسے بھی نوٹس تیار کر رہی تھی۔

”مگر وہاں بھائی تو ابھی پڑھنے باہر جائینگے۔“

تانیہ بچپن ہی سے اپنے کزن وہاج سے منسوب تھی اس کی وجہ شاید ان دونوں کی مائیں تھیں جو کزنز ہونے کے باوجود گہری سہیلیاں بھی تھیں۔

”کہیں انہیں ہی وہاں کوئی پٹی پڑھانے نہ بیٹھ جائے۔ جیسے کہ کا کا جان لے آئے تھے۔ اپنے ساتھ گوروں کی غلطی۔“

”وہ صرف گوروں ہی کی غلطی نہیں تھی کا کا جان کی بھی غلطی تھی۔“

”ہینو کی ویسے بھی دوسرے کی غلطیوں پر نظر رہتی تھی۔“

”کیوں بے چاری تانیہ کو ڈرا رہی ہو۔ ویسے ہی ہوا سے مل جاتی ہے۔ کوئی روگ دگ لگ گیا تو سمجھو۔“

چاری۔“

گلو ہمیشہ سے ہی ہمدردانہ رول ادا کرنے کیلئے وقف تھیں یا خود کو کر رکھا تھا۔

”ایک تو تم لوگوں سے بھی حد ہے۔ ہم پاپا اور خالہ کے بارے میں بات کر رہے تھے۔“ زری نے صبر کا بیج بکھیر دیا۔

تھا۔

”ہم اسی طرف آرہے ہیں۔“ روبی نے تسلی دی۔

”مرح آئیں تو جانے کب پہنچو گی۔ وہ لوگ آج رات پہنچ رہے ہیں۔ اطلاعاً عرض ہے۔“ وہ جل کر رہ گئی۔

”بات کہاں سے شروع ہوئی تھی۔“

”پچھلے کس طرح استقبال کرو گی۔ جیسے فلموں میں پھنری ہوئی بیٹی ایک ہولناک چیخ مار کر ماں کے گلے لگتی ہے۔“ لالی

”بھئی، یہ کیا۔“

”مگر میں پھنری ہوئی بیٹی نہیں ہوں۔“ اس نے سلگ کر تصحیح کی۔

”میرزا ان کو ای کہوں گی نہ می۔ میں انہیں خالہ ہی کہوں گی۔ تبدیلی پاپا کی زندگی میں آئی ہے۔ وہ تو ان کے ساتھ ہی جا

”بیٹا۔ اس نے فیصلہ سنا دیا۔

”ارہا۔ تم تو ویسے بھی پرورش ہو چکیں۔“ بیہ نے گرہ لگائی۔

”پرانا چڑھ چکیں۔“ ہینو نے اپنی مخصوص ہنسی کے ساتھ تصحیح کی۔

”اللہ! گلو ہنس ہنس کر دہری ہو رہی تھیں۔ ان کی بچکانہ باتوں پر ان کی شفیق اور سنجیدہ طبیعت گدگدا کر رہ جاتی تھی۔

”اے۔۔۔ باری سے پوچھو۔ یا در ماموں کب پہنچیں گے؟“ مونا نے بیہ کو مخاطب کیا۔

”کیوں۔ کیا باری کے علاوہ اور کسی کو معلوم نہیں ہوگا خواجواہ کسی کو اتنی اہمیت دینا۔“ زری نے منہ بنایا۔

”ہینو نے چونک کر روشنی کی صورت دیکھی۔ پھر مسکرا کر گنگنا نے لگیں

جل کے دل خاک ہوا آنکھ سے رویا نہ گیا

”طبل ہمارے دشمنوں کے دل۔“ زری بڑبڑائی۔

”دو گنا گار ہی ہیں۔ تم ہر بات اپنے اوپر کیوں لے جاتی ہو۔“ زری نے ٹھنڈا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

”ہال۔ انہیں میری ہی کسی بات پر نعمات یاد آتے ہیں۔ بڑی آئیں کہیں کی میڈم نور جہاں۔“ اس نے اپنی فائل اور

”ایسے آج کل باری کی چہل نہل میں خاصی کمی واقع ہو گئی ہے۔ بڑا آرام دے رہے ہیں بابا صاحب۔“ گلو ہنس رہی

”کوئی بات تو ہے۔ اب تو دیکھ کر مسکراتا بھی نہیں۔“ تانیہ نے سادگی سے کہا۔

”جسٹ دیکھ کر مسکرایا تھا؟“ مونا نے شرارت سے اسے گھورا۔

”اگر کی تو نعمات ہے مسکرانے کی۔“ تانیہ جواباً گھور کر رہ گئی۔

”جسٹ دیکھ کر تو کبھی نہیں مسکرایا۔ ہم یہ سمجھ کر نظر انداز کرتے رہے کہ دانت پورے نہیں ہوں گے۔“ ہینو ہنسیں۔

”دانت تو ان کے بہت خوبصورت ہیں۔“ لالی نے معصومیت اور برجستگی سے کہا۔ ہال کمرے میں قبضہ ہوں کا

”اچھا یہ بتاؤ۔ پورے بتیس ہیں۔“ زری ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو رہی تھیں۔

”نہیں..... ابھی عقل داڑھ نہیں نکلی۔“ شینو نے کن اکھڑوں سے روشنی کی طرف دیکھا۔

”خیر وہ تو پورا ہی خوبصورت ہے۔“ روبی نے شریر انداز میں کہا۔

”کیا آپ لوگ ہر وقت باری باری کرتے رہتے ہیں؟“ روشنی نے تنخی سے ٹوکا۔

”بھئی اس نام کی تو سب کو عادت ہے فرق یہ ہے کہ کوئی منہ سے نکال دیتا ہے کوئی دل ہی دل میں لیتا ہے۔“

وہ سب ہی کور ہوتا ہے۔

شینو کب باز آنیوالی تھیں۔ ساتھ گنگنا تا بھی شروع کر دیا تھا

دل تم کو دیدیا ہے اس کا خیال رکھنا

”اسے دل دینے والا بڑا ہی بے وقوف ہوگا۔ گھوڑوں کے چارے میں گم کر دے گا۔“

روبی نے گرہ لگائی۔

”اس کا زیادہ وقت گھوڑوں میں گزرتا ہے۔ میں تو اس کے آگے چلتے ہوئے بھی گھبرا جاتی ہوں۔ کہیں پیچھے نہ

لٹک کی آوازیں نہ آنے لگیں۔“

بے ساختہ قہقہے ابھرے تھے۔

”ارے اب ایسا بھی گھوڑا پرست نہیں۔ بے چارے کی جاب ہی ایسی ہے۔“

تانیہ کو کسی کی درگت بننے دیکھ کر بڑی جلدی ترس آ جاتا تھا۔

”بعض انسانوں کی بھی پرستش کر سکتا ہے۔ گشس ہیں اس میں۔“ شینو نے قہقہہ لگایا۔

روشنی نے اپنی کتابیں اٹھائیں جو وہ نوٹس تیار کرنے کی غرض سے ساتھ رکھے ہوئے تھی اور باہر نکل گئی۔

”ہونہہ..... گشس ہیں۔ چیر ڈان (دکش او باش) نان سنس۔“

سامنے ہی پیازی رنگ کے کرتا شلوار میں ملبوس پاؤں میں سبک سی چپل ڈالے جھومر چلی آ رہی تھی۔

روشنی ٹھٹک کر رک گئی۔ ”یہ محترمہ ادھر کدھر؟“

”آپ یہاں کیسے۔“ وہ اپنی سرد مہری چھپانہ لگی۔

”بعض ضروری لوگ تو اس طرف آتے ہی نہیں۔ ہم نے سوچا ”چودھرائی صاحبہ“ کراچی گئی ہوئی ہیں اچھا سوچا۔“

طرف کی سیر کا۔

”یہاں کون سے غنچے چنگ رہے ہیں جو آپ سیر کی غرض سے تشریف لائی ہیں؟“

وہ بڑے تلخ اور طنزیہ انداز میں گویا ہوئی۔

”غنچے نہ سہی غنچہ تو چنگتا ہے۔“ وہ بڑے سرزدوں میں ہنسی۔

”مگر لگتا ہے آپ چنگٹے نہیں دیں گی۔“ اس کے لہجے میں زہرا بھرا آیا۔

”جھومر کو دیکھ کر چونک پڑی۔ چند ٹانے کو اپنی جگہ پر رک گئی۔

”روشنی نے ماما کو مخاطب کیا۔

”دو گاڑیاں جائینگلی ناں۔ ایک ڈرائیور لے کر جا رہا

”آپ بھی چلے جاؤ خان کے ساتھ خوشی کا موقع ہے۔“

”جھومر کی پیشانی پر شکنیں پڑ گئیں۔

”آپ کی توانائی ضائع نہ کریں۔ آپ کے مطلب کی ادھر کوئی بات نہیں۔“

”ذرا جلدی سے باری کو تو بلا دیں۔“ اس نے جھومر کی طرف رخ موڑ کر ماما کو مخاطب کیا۔

”اما جاتے جاتے ملٹی۔

”چلیں خوش ہو جائیں۔ آپ کا طوفانی دورہ بیکار نہیں گیا۔“

”جھومر کھلکھلائی۔

”میں بے شعلوں میں گھر گئی۔

”اس نے بظاہر مذاق کیا۔

”جیسے فیصلہ نہ کر پارہا ہو کہ انکے بڑھے یا واپس

”جھومر نے ہنس کر کہا۔ ”جھومر بن گئے؟“ روشنی بڑی زہریلی ہنسی ہنس کر بولی۔

”جھومر نے ہنس کر کہا۔ ”جھومر بن گئے؟“ روشنی بڑی زہریلی ہنسی ہنس کر بولی۔

”جھومر نے ہنس کر کہا۔ ”جھومر بن گئے؟“ روشنی بڑی زہریلی ہنسی ہنس کر بولی۔

”جھومر نے ہنس کر کہا۔ ”جھومر بن گئے؟“ روشنی بڑی زہریلی ہنسی ہنس کر بولی۔

”جھومر نے ہنس کر کہا۔ ”جھومر بن گئے؟“ روشنی بڑی زہریلی ہنسی ہنس کر بولی۔

”جھومر نے ہنس کر کہا۔ ”جھومر بن گئے؟“ روشنی بڑی زہریلی ہنسی ہنس کر بولی۔

”جھومر نے ہنس کر کہا۔ ”جھومر بن گئے؟“ روشنی بڑی زہریلی ہنسی ہنس کر بولی۔

”جھومر نے ہنس کر کہا۔ ”جھومر بن گئے؟“ روشنی بڑی زہریلی ہنسی ہنس کر بولی۔

”جھومر نے ہنس کر کہا۔ ”جھومر بن گئے؟“ روشنی بڑی زہریلی ہنسی ہنس کر بولی۔

”جھومر نے ہنس کر کہا۔ ”جھومر بن گئے؟“ روشنی بڑی زہریلی ہنسی ہنس کر بولی۔

”جھومر نے ہنس کر کہا۔ ”جھومر بن گئے؟“ روشنی بڑی زہریلی ہنسی ہنس کر بولی۔

”جھومر نے ہنس کر کہا۔ ”جھومر بن گئے؟“ روشنی بڑی زہریلی ہنسی ہنس کر بولی۔

”جھومر نے ہنس کر کہا۔ ”جھومر بن گئے؟“ روشنی بڑی زہریلی ہنسی ہنس کر بولی۔

”جھومر نے ہنس کر کہا۔ ”جھومر بن گئے؟“ روشنی بڑی زہریلی ہنسی ہنس کر بولی۔

یہاں سے وہاں کوئی دندنا تا نظر نہیں آئے گا۔ ایسا کیوں ہے؟

صرف اس لئے کہ کوٹ کوٹ کر میرے اندر یہ بات اتار دی گئی ہے کہ حویلی کی تمام چھوٹی بڑی خیریتیں واجب الاحترام ہیں۔ مجھے ہمیشہ ان سے احترام کا رشتہ استوار کرنا ہوگا۔ اس سے ہٹ کر میں کسی سے کچھ تصور بھی نہیں کر سکتا۔ اگر کوئی ایسا سوچتا ہے تو مجھے اس سے ہمدردی ہے۔ صرف اور صرف ہمدردی السلام علیہ۔

جھومر نے ایک خیال سے چونک کر بڑی پھلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ روشی کی طرف دیکھا۔

”میں ٹھیک کر لوں گی اسے۔ نسلاً افغانی ہوں جو جیتنے کیلئے لڑتے ہیں۔“

اس نے بڑے اعتماد سے کہا اور اس راستے کی طرف چل پڑی جہاں سے آئی تھی۔

روشی کی تو خاک سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس ذرا دیر میں ہوا کیا ہے۔

”اگلی ملاقات میں دیکھنا کیسے چھکے چھڑاؤں گی۔ تم بھی موجود رہنا۔ بڑا مزہ آئے گا۔“

وہ اس سے کچھ فاصلے پر گویا ہوئی اور پھر پلٹ کر چل دی۔

روشی حیران پریشان سی کھڑی رہ گئی تھی۔

رات گیارہ بجے تک لڑکیوں نے پورے جوش و خروش سے دلہن کا انتظار کیا تھا۔ ساڑھے گیارہ بجے تک انہیں جمائیاں آنے لگی تھیں۔ وہ ہال کمرے ہی میں ادھر ادھر ڈھیر ہو گئی تھیں۔

نواکروں کو جاتے رہنے کی ہدایت تھی۔ وہ ادھر ادھر آ جا رہے تھے۔ ان سب میں ماما لیلی کی کارکردگی سب پروردگار نے بارہ بجے کسی نے آ کر ہال کمرے میں ہلچل مچائی تھی کہ دلہن آ گئی۔ سب سے لمبی جست روشی کی تھی۔

میں پکڑے سر پٹ دوڑتی ہوئی پورٹیکو میں آئی تھی۔

آنے والے سب وہیں جمع تھے۔ سمیہ نے گود میں بیٹے کو لینے کے باوجود مایہن کو شانوں سے تمام رکھا تھا۔

روشی چند ٹانے اپنی جگہ پر ٹھنکی پھر ایک دم مایہن سے لپٹ گئی۔ وہ بری طرح رو رہی تھی۔ جوابی کارروائی نہ مایہن نے بھی رونا شروع کر دیا تھا۔

”ارے... یہ کیا کرنے لگیں۔ خوشی کا موقع ہے۔ خوشی کی طرح مناد۔“

عالم تاب نے دونوں کو الگ الگ کیا۔ ساری لڑکیاں اور خواتین بھی وہاں آ موجود ہوئی تھیں۔

”بری بات ہے۔ بھلا رونے کا کون سا موقع ہے۔“

”چلو... اندر۔“ بابا صاحب چھڑی نکالتے ہوئے سب سے پہلے آگے بڑھ گئے۔ باقی لوگ ان کے پیچھے کی طرف چل پڑے تھے۔

”ہال کمرے کی تمام لائٹیں آن کر دی گئی تھیں۔ میروں ساڑھی میں ملبوس مایہن چہرے سے بہت منفرد روشی اس کے پہلو میں بیٹھ گئی تھی۔ باقی لوگ ہڑے ہوئے بڑے پرشوق انداز میں دلہن دیکھ رہے تھے۔“

”آپ یقین کریں خالہ! مارے خوشی کے میری بری حالت ہے، میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ میں آپ سے کیا کر دوں۔“

”بھئی! میں نے، جین کا ہندی رچا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر کہا۔“

”جین کے لیوں پر پھلکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔“

”پتہ تو سفر سے بہت تھک گئی ہوں گی۔ کیا فلائٹ لیٹ تھی؟ باری تو جانے کب سے گیا ہوا تھا۔“

”جین نے جیت سے مایہن کا چہرہ دیکھا۔“

”ماما لیلی سے کہہ کر یاد رکھو کہ کمرے میں دودھ بھجوا دو۔“ عالم تاب نے بہو سے کہا۔ سمیہ فوراً باہر

”اب تم بھی آرام کرو۔ صبح سے بیٹھی ہوئی ہو۔ رونمائی وغیرہ سب صبح کر لیں گے۔ تعارف تو تمہارا سب سے بڑا کام ہے۔“

”ماہین نے مایہن کو شانوں سے تمام کراٹھایا۔“

”جاؤ لڑکیو! اب تم بھی سو جاؤ۔ صبح کو دلہن سے بات کرنا۔ چلو شاباش۔“

”میں بھی چلوں خالہ کے ساتھ؟“ روشی پر شوق انداز میں اٹھ کھڑی ہوئی۔

”اوپ ہوں۔ تم بھی آرام کرو، صبح عالم تاب نے اسے ٹوک دیا۔“

”ماہین کو لے کر یاد رکھو علی خان کے بیڈروم میں چلی آئیں۔“

”ماہین خان صوفے پر نیم دراز اسی طرح سوئڈ بونڈ سگریٹ کا دھواں اڑا رہے تھے۔ مایہن اور بھادوچ کو دیکھ کر اٹھ کر بیٹھ گئیں۔“

”طبیعت تو ٹھیک ہے ناں یا اور؟“ عالم تاب ان کے قریب جا کر پوچھنے لگیں۔

”میں جیسا بیگم۔ طبیعت ٹھیک ہے۔ اور اب ٹھیک ہو جانا چاہیے۔“

”ان کا انداز پر اسرار سا تھا۔ ابھی تک ایک نگاہ غلط بھی انہوں نے مایہن پر نہیں ڈالی تھی۔“

”تھوڑے دیر بعد تو نوٹ نہ لیا تو شروع ہوئی ہے۔ بہت سونا چاہتا ہوں۔“ ان کے لہجے میں جھکن کا تاثر تھا۔

”نہیں... بسوں بعد تو نوٹ نہ لیا تو شروع ہوئی ہے۔ بہت سونا چاہتا ہوں۔“ ان کے لہجے میں جھکن کا تاثر تھا۔

”جین نے جیت سے مایہن کا چہرہ دیکھا۔ مگر کچھ کھوج نہ سکی۔“

”جین نے جیت سے مایہن کا چہرہ دیکھا۔ مگر کچھ کھوج نہ سکی۔“

”جین نے جیت سے مایہن کا چہرہ دیکھا۔ مگر کچھ کھوج نہ سکی۔“

”جین نے جیت سے مایہن کا چہرہ دیکھا۔ مگر کچھ کھوج نہ سکی۔“

”جین نے جیت سے مایہن کا چہرہ دیکھا۔ مگر کچھ کھوج نہ سکی۔“

”جین نے جیت سے مایہن کا چہرہ دیکھا۔ مگر کچھ کھوج نہ سکی۔“

ماہین حیران پریشان ان کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ان کا مبہم سا پیغام اس کے خاک بھی پلے نہیں پڑا تھا۔

اپنے ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھ کر زیورات اتارنے لگی تھی مگر اس کی ساری حیات یا در علی خان کی طرف متوجہ تھیں۔
 نے ہڈیوں سمیت تمام زیورات اتار ڈالے تھے۔ صرف ایک کنگن دائیں کلائی میں رہنے دیا تھا۔
 یا در علی خان عین اس کے پیچھے آکھڑے ہوئے تھے اور ٹائی کی ٹاٹ ڈھیلی کر رہے تھے۔
 ”آپ کو بہت جھکن ہوگئی ہوگی؟“ انہوں نے آئینے میں اسے دیکھتے ہوئے مخاطب کیا۔
 ”ظاہر ہے پلین تو میں نے ہی کھینا تھا۔“ وہ باوجود کوشش کے اپنے لہجے کی تلخی نہ چھپا پائی۔
 یا در علی خان کے ہونٹوں پر مبہم سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔
 ”آپ نے سارے زیورات اتار ڈالے۔ ہم نے تو ٹھیک سے آپ کو دیکھا بھی نہیں۔“ وہ ٹائی کھینچ کر اتارتے ہوئے
 ”آپ کی طرف بڑھے۔“

”آپ کو ضرورت بھی نہیں ہے کچھ دیکھنے دکھانے کی۔“ وہ جگ کر بولی اور اٹھ کھڑی ہوئی۔
 نازم نے خاموشی اختیار کر لی۔ وہ قمیض اتار کر صوفے پر پھینک چکے تھے۔

ماہین کے سامنے یہ ان کی پہلی بے تکلفی تھی۔ ماہین نظریں چرا کر اپنا سوٹ کیس کھول کر جھک گئی تھی۔ ساڑھی نے اسے عاجز بنا دیا تھا۔ پہنی بھی پہلی مرتبہ تھی اس لئے بہت الجھ رہی تھی۔ وہ جلد سے جلد پیچھا چھڑا رہی تھی۔ جلد سے جلد کوئی آرام دہ لباس پہن لے۔

وہ بیڈ پر اس طرح بیٹھ گئے تھے کہ جیسے دیر تک اٹھنے کا پروگرام نہ ہو۔ دونوں ہاتھ پشت کی طرف کر کے ہوئے۔ وہ بغور اسے سوٹ کیس الٹ پلٹ کرتے دیکھ رہے تھے۔

”ماہین“

”جی“۔ اس کا انداز ہنوز سرد تھا۔

”بات سنو“

”سنائیے! سن رہی ہوں“۔ اس کے انداز میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔

”اس طرح نہیں یہاں آؤ“۔

ان کے لہجے میں ایک خاص کیفیت محسوس ہوتے ہی ماہین کا دل بہت تیز تیز دھڑکنے لگا۔

جب یہ انداز نہیں تھا تو بھی الجھن تھی۔ اب انداز بدلاتو بھی مشکل ہو رہی تھی۔ وہ سیدھی ہونے کے بجائے

مصرف رہی۔

”میں کچھ کہہ رہا ہوں ماہین“۔ ان کے انداز میں بلا کی رسائی تھی۔

”میں سن رہی ہوں ناں“۔ اس نے بھی قدرے دھیمے پن کا مظاہرہ کیا۔

”ماہین! پلیز ادھر آؤ“۔

ماہین عجیب بے بسی کے عالم میں سیدھی ہو گئی کہ بات مانے تو مشکل نہ مانے تو اس سے زیادہ مشکل۔

وہ سوٹ کیس اسی طرح کھلا چھوڑ کر ان کے قریب چلی آئی۔

”جی“

”بیٹھ جاؤ“۔ ان کے انداز نشست میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔

اس نے بیڈ پر نظریں دوڑا کر اپنے بیٹھنے کیلئے مناسب جگہ تلاش کی۔ پھر ان سے کچھ فاصلے پر بالکل کنارے پر

اس طرح سے کہ جیسے موقع پاتے ہی بھاگ کھڑی ہوگی۔ ان کے بدلے ہوئے لب و لہجے پر اس کی گھبراہٹ

اسی وجہ سے نظریں اٹھانے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔

”پتا نہیں کیوں یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے تو مجھ سے بہت ناراض ہو؟“

ان کی نظریں آج بالکل ہی دوسرا انداز لئے ہوئے تھیں جو اس کیلئے بالکل نیا تھا۔ لگتا تھا دل پلپٹاؤں

گاہ۔ ہتھیلیاں پسینے سے بھیگ رہی تھیں۔

”نہیں! ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ بس وہ میرا دل چاہ رہا تھا کہ کپڑے تبدیل کر کے جلدی سے سو جاؤں

نئے نوخر پہن کر بڑا نیا ملا جواب تلاش کیا۔

نئے نوخر پہن کر بڑا نیا ملا جواب تلاش کیا۔

نئے نوخر پہن کر بڑا نیا ملا جواب تلاش کیا۔

نئے نوخر پہن کر بڑا نیا ملا جواب تلاش کیا۔

نئے نوخر پہن کر بڑا نیا ملا جواب تلاش کیا۔

نئے نوخر پہن کر بڑا نیا ملا جواب تلاش کیا۔

نئے نوخر پہن کر بڑا نیا ملا جواب تلاش کیا۔

نئے نوخر پہن کر بڑا نیا ملا جواب تلاش کیا۔

نئے نوخر پہن کر بڑا نیا ملا جواب تلاش کیا۔

نئے نوخر پہن کر بڑا نیا ملا جواب تلاش کیا۔

نئے نوخر پہن کر بڑا نیا ملا جواب تلاش کیا۔

نئے نوخر پہن کر بڑا نیا ملا جواب تلاش کیا۔

نئے نوخر پہن کر بڑا نیا ملا جواب تلاش کیا۔

نئے نوخر پہن کر بڑا نیا ملا جواب تلاش کیا۔

نئے نوخر پہن کر بڑا نیا ملا جواب تلاش کیا۔

نئے نوخر پہن کر بڑا نیا ملا جواب تلاش کیا۔

نئے نوخر پہن کر بڑا نیا ملا جواب تلاش کیا۔

نئے نوخر پہن کر بڑا نیا ملا جواب تلاش کیا۔

نئے نوخر پہن کر بڑا نیا ملا جواب تلاش کیا۔

نئے نوخر پہن کر بڑا نیا ملا جواب تلاش کیا۔

نئے نوخر پہن کر بڑا نیا ملا جواب تلاش کیا۔

نئے نوخر پہن کر بڑا نیا ملا جواب تلاش کیا۔

نئے نوخر پہن کر بڑا نیا ملا جواب تلاش کیا۔

نئے نوخر پہن کر بڑا نیا ملا جواب تلاش کیا۔

نئے نوخر پہن کر بڑا نیا ملا جواب تلاش کیا۔

نئے نوخر پہن کر بڑا نیا ملا جواب تلاش کیا۔

نئے نوخر پہن کر بڑا نیا ملا جواب تلاش کیا۔

یاد علی خان نے سگریٹ بائیں ہاتھ میں پکڑ کر دایاں ہاتھ بڑھایا اور اس کا چھوٹا سا خوبصورت چہرہ
استحقاق استعمال کرتے ہوئے چھوٹی سی شرارت کر ڈالی۔

”بتائیے دو دن ہو گئے ہماری شادی کو اور مجھے یہ بھی معلوم نہیں کہ آپ کے ہاتھ اتنے خوبصورت ہیں۔“
اتنا اچانک حملہ تھا کہ مایہن شپٹا کر رہ گئی، مگر ہاتھ ان کی گرفت سے آزاد نہ کرا سکی۔

”جب کچھ ہماری مرضی کے مطابق نہ ہو رہا ہو تو بدگمان ہونے سے پہلے یہ بھی سوچ لینا چاہیے کہ اور
سے دو چار نہ ہو اسے کوئی الجھن نہ ہو اس کی طبیعت کسی وجہ سے ناساز نہ ہو۔“

”جو بدگمان ہونے میں جلدی کرتے ہیں وہ اچھے رفیق کیسے ہو سکتے ہیں؟“

مایہن نے ان کی مدلل قسم کی ذات کے سامنے آج پہلی بار مکمل طور پر خود کو بے بس محسوس کیا تھا۔ اس کی فکر
تھا کہ اس کی مہندی سے رچی تھیلی سے اتنا پسینہ پھوٹ نکلا تھا کہ یاد علی خان کا ہاتھ بھی نم ہو چکا تھا۔

”خان! مشکل وجہ تے اساں دی جان پے گئی اے کہ نہیں؟“ سرسوتی بیچ راہداری میں باری کو روکے ہوئے
میں مصروف تھی۔

”اس کے پاس چابی کہاں سے آئی؟“ بنیادی سوال باری کے ذہن میں فوراً ہی آیا تھا۔

”چابی تمہارے پاس سے اس کے پاس پہنچی کیسے؟“ باری کی پیشانی شکن آلود تھی۔

”اے ای تو تساں نوں دس رکی آں..... اساں نی تے نیندر (نیند) موت ورگی ہوندی اے میں اتھے نہیں
اتاں نے چابی.....!“

سرسوتی ہند کو میں اعتراف جرم کرتے کرتے پھر رک گئی۔

”تم اتالیٹ بتا رہی ہو مجھے۔“

”اتاں فی منتاں کر رکی ساں، پراونیں منے تے فیر مجبوری تساں نوں آکھ رکی آں، خاں بچا لیو وڈے ہاں
..... تساں نوں رب دا واسطہ اے خان، بہوتا چنگا جی اے تساں دا۔ دسومینوں میں کی کر ساں؟“ وہ رو رہی تھی۔

”کھانے کے وقت دروازہ کیسے کھلتا ہے؟“ باری نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

”اوہی کھول دے نے..... اوہی بند کر دے نیں..... بک نہیں مندے اساں نی۔“ وہ پھوٹ پھوٹ کر رہی تھی۔
”اب رونے کا کیا مطلب ہے؟ تم جاؤ میں ادھر کے کام منٹا کر پیچھے جاؤں گا، تم آرام سے سو جاؤ اور
دے دی تو تمہیں دے دوں گا، اگر..... خیر، تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، کچھ نہیں ہوگا، جاؤ تم۔“

”جیوندے روجی..... رب لمی عمر دے۔“ وہ فقیرانہ انداز میں دعا دیتی آگے بڑھ گئی۔

اور وہ کچن کی طرف آ گیا۔

میدان کارزار میں اترنے سے پہلے کچھ سوچنا تو تھا، اب تو بغیر پلاننگ کے وہ پیچھے جا ہی نہیں سکتا تھا۔

یہی تھی اس وقت اپنی مرضی کی چائے بناتے ہوئے اچھا خاصا غور و خوص کیا جاسکتا تھا۔ وہاں سے کچھ واڑے کی
بغیر ایک نوک کے اور ”دوسروں“ کی نظروں میں آئے بغیر جایا جاسکتا تھا۔

یہی دماغ ہوتے ہی بے چاری، ازلی مصروف، ماما ملی سے سامنا ہو گیا۔

”نہیجی بک سوئیں نہیں ماما؟“ اس نے پہلی رکاوٹ پر صبر کا گھونٹ بھرا۔

”آج زارا پر تو ہونا ہی تھی خان، گھر میں نئی دلہن آئی ہے۔“ ماما پر ابھی تک خوشی کا دورہ پڑا ہوا تھا۔

”ہوں۔“ وہ غائب دماغی سے ”ہوں“ کہہ کر رہ گیا۔

”چائے بناؤں خان؟“

”نہیں ماما، اب تم جا کر سو جاؤ، چائے دوائے میں خود بنا لوں گا۔“ وہ اس طرح گویا ہوا کہ جیسے وہ ماما کو بہت جلد وہاں
بغیر دیکھنا چاہتا ہو۔

”آپ۔ ہم ہیں ناں آپ کی خدمت کیلئے۔“ اس نے لاڈ کئے۔

”پہلی دفعہ نہیں بناؤں گا۔ بعض اوقات جب تم سو رہی ہوتی ہو تو میں بناتا ہی ہوں۔ یہ تمہارے آرام کا وقت ہے، تم
زور۔ جاؤ پلیز۔ کہہ رہا ہوں ناں میں۔“ اس نے قدرے حکمیہ انداز اختیار کیا۔

”ٹاٹا موٹی سے اپنا دوپٹا ٹھیک کرتی ہوئی باہر نکل گئی۔

باری نے نظریں دوڑا کر صاف سھرے اور سٹے ہوئے کچن کا جائزہ لیا۔ سوچ بورڈ کے ساتھ ہی اسے الیکٹرک کینل نظر
آئی۔ وہی تھی سے چائے بنانے میں مصروف ہو گیا۔

”اتنا وقت آگیا لوگوں پر خود کام کر رہے ہیں۔“

باری نے زور سے چائے کا ڈبا بند کیا تھا۔

”ٹٹا! کیا ہو گیا ہے یہاں کے لوگوں کو رات بھر جاگتے رہتے ہیں۔“

باری نے روشنی کی آواز پر شاید زندگی میں پہلی مرتبہ اتنی جھنجھلاہٹ محسوس کی تھی، مگر خاموش رہا تھا۔
”ٹٹا! میں تقریباً پوری ہی گھس گئی تھی۔“

”ٹٹا! ہے ماما کو میری دوائیں ادھر ادھر نہ کیا کریں، مگر.....!“ وہ بڑبڑا رہی تھی۔

”ٹٹا! کیا ہوا ہے انہیں۔“ باری نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

”بک کیو ہو گیا ہے آپ کو۔“ وہ پوچھے بغیر رہ نہ کا۔

”بک کیو ہو تھا میں“ ازلی بیمار ہوں۔“ وہ تڑخ کر گویا ہوئی۔

”ٹٹا! نا موٹ رہا۔“

”ٹٹا! میں آئی ہے مجھے ٹرک گولا نزل لیتی ہوں، اور کچھ۔“

”ٹٹا! میں آئی ہے میں آپ نے اپنی نیندیں، کمی کس چیز کی ہے آپ کے پاس؟“

وہ سنجیدگی سے کہتے ہوئے کپ میں دودھ ڈال رہا تھا۔

”کوئی اپنی نیند کا دشمن نہیں ہوتا، اگر کسی کی نیند غائب ہوتی ہے تو مجرم کوئی اور ہوتا ہے۔“ وہ بڑے بھستے انداز میں کہتی تھی۔

”کیا لیتی ہیں آپ؟“ اسے جیسے یہ جان کر ملی رنج ہوا تھا کہ وہ ممکن اذیت استعمال کرنے لگی ہے۔ اس نے خواب آور گولیوں کے نام گنوا دیئے۔

کپ باری کے ہاتھ میں لرز کر رہ گیا۔

”عمر دیکھی ہے آپ نے اپنی؟“ اس نے دکھ سے اس کی سمت دیکھا۔

”میں نے تو دیکھی ہے تم نے نہیں دیکھی؟“ اس نے گلاس میں پانی ڈالا اور ایک گولی منہ میں رکھی اور غٹاٹ پانی گئی۔

باری لا جواب سا ہو کر کرسی پر بیٹھ گیا اور ہلکے ہلکے سپ لینے لگا۔

”ایک مشورہ ہے آپ کیلئے اگر آپ ماسنڈ نہ کریں۔“ اس نے جاتی ہوئی روشنی کوٹھا طلب کیا۔

”جی فرمائیے۔“ وہ دروازے پر رک گئی۔

”آپ ہفتے میں ایک مرتبہ کسی اسپتال کا چکر لگایا کریں۔“

”اس سے نیند آنے لگتی ہے؟“ وہ تمسخرانہ انداز میں گویا ہوئی۔

”شاید آنے لگے وہاں آپ ایسے وارڈز کا دورہ کیا کریں، جہاں سیریس قسم کے مریض ہوتے ہیں۔ جن کو تیر دیکھنے والوں کیلئے بھی ناقابل برداشت ہوتی ہے، جو ایسے امراض میں مبتلا ہوتے ہیں کہ چھتے ہیں نہ مرنے ہیں۔ تب آپ چلے گا کہ آپ تو مراعات یافتہ طبقے میں ہی نہیں انسانوں میں بھی بے انتہا نعمت یافتہ ہیں۔ پھر آپ کو احساسِ فطرت میں بے حد ٹھہراؤ اور سکون آجائے گا اور خود بخود نیند سے آنکھیں بند ہونے لگیں گی۔“

اس نے بات ختم کر کے اس کی طرف دیکھنے کے بجائے چائے کا کپ اٹھا کر ہونٹوں سے لگا لیا۔

”بس؟“ اس نے طنز اُکھا۔

”بس۔“ اس نے بھی وہی انداز اختیار کیا۔

”نادان دوست! سارے دکھ ایک طرف، دل کا دکھ ایک طرف۔“ وہ اتنا کہہ کر دروازے سے باہر نکل گئی۔

باری نے ایک گہرا سانس لیا ”آخر انسان کی مت اتنی کیوں ماری جاتی ہے؟ باہر سب دوست ہی دوست ہوتے، انسان اپنا دشمن خود ہی بن جاتا ہے۔“

”نہ جانے کیوں، یوں محسوس ہوا جیسے کہیں سے آنچ آ رہی ہو اور دل موسم کی طرح پھیلنے لگے ہو۔“

اس نے جلدی جلدی چائے ختم کر کے اس کیفیت سے پیچھا چھڑایا اور کپ سنک میں رکھ کر دھوپ کھڑے کمرے میں سوچنے لگا۔ ایک نئے معرکے سے دو چار ہونے کا وقت قریب تھا۔

”میرے ہوسٹر باری؟“ کوئی اس کے اندر مسکرانے لگا۔

”میرے نہیں، کیا گھبراتا، جب سب سے بڑا نقصان ہو چکا۔ اب کسی شے کے کھو جانے کا خوف نہیں۔“

”اب میں سب سے بڑا بے فکر آدمی ہوں، گونا گوارو کر فارغ ہو چکا۔“ وہ مسکراتے ہوئے پرسکون انداز میں باہر

پہلی حویلی پر سناٹے اور تاریکی کا راج تھا۔ کتوں کے بھونکنے، گدھوں کے چونک کر رینگنے اور گھوڑوں کے ہنہانے سے جس عجیب سا محسوس ہو رہا تھا۔

دوبست مقام انداز میں طویل و عریض احاطہ پار کر کے حویلی کے عقبی حصے میں آیا تھا۔ مدتیں گزریں، وہ یہاں سے وہاں دوڑتا رہتا تھا اور آج قدم قدم پر کوئی زنجیری چھٹک رہی تھی۔

اور ہمداری میں پہنچا اور لائیں روشن کر دیں اور فوراً سب سے آخر میں بنی ایک کوٹھڑی میں جو غالباً اسٹور کی نیت سے بنی ہوئی کی طرف دیکھا۔ باہر آتی روشنی یہ بتا رہی تھی کہ کوٹھڑی کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔ وہ چند ثانیے اپنی جگہ کھڑا کچھ سوچتا رہا، بعد ازاں انداز میں آگے بڑھا۔

ایک درمیانی بند کمرے میں بڑا سا تالا جھول رہا تھا۔

اس نے جیب سے چابیاں نکال کر دیکھنا شروع کیں۔ بالآخر ایک چابی لگ گئی اور تالا کھل گیا۔ اس نے تالا نکال کر بغلی جیب میں ڈالا اور کوٹھڑی کی سمت دیکھا۔

دہان دیکھنے کو کچھ نہ تھا وہ چونکا پھرا لہجہ کر کچھ سوچنے لگا۔ پھر ایک دم دھیان ظفیری کے کمرے کی طرف گیا۔ اس نے سر اٹھا کر ظفیری کے کمرے کی طرف دیکھا۔ دروازہ بند تھا۔ وہ بڑی تیزی سے آگے بڑھا اور دروازے پر دستک دی۔ اندر سے کھسر بھر کی آوازیں آئیں پھر دروازہ کھل گیا۔

فیروز کی کرتے شلوار میں ملبوس جھومر بغیر دوپٹے کے اس کے سامنے کھڑی حیرت سے پلکیں جھپک رہی تھیں۔

”اے خوش نصیب ہیں ہم، یقین نہیں آ رہا۔“ وہ شرارت سے مسکرا رہی تھی۔

”مستہ دیجئے مجھے۔ میں اندر آنا چاہتا ہوں۔“ اس نے دروازے کے درمیان میں کھڑی جھومر سے بڑے کھر درے لہجے میں کہا۔

”بس یہ ہوتا، اس کھڑی تم آؤ گے تو کچھ اس طرح انتظام کرتے کہ تمہارا جملہ سن کر خوشی سے بے ہوش ہو جاتے، مگر تمہاری اہل ہاں ہم تمہیں اندر آنے کی اجازت نہیں دے سکتے۔ ایسا کرو، تھوڑی دیر بعد آنا۔“

”آپ عورت ہیں اور میں مرد مگر آپ کے حصے کی ”حیا“ بھی مجھے کرنا پڑتی ہے۔ بٹے ایک طرف۔“ اس کا مردانہ جلال

مگر جھومر نے غصے کا تھا۔

”مگر جھومر! تمہاری سے اپنی جگہ اڑی رہی۔“

”مجھے راستہ دیجئے اندر جانے کا۔“ وہ جیسے زچ ہو رہا تھا۔

”تم تو ہو ہی اندر تمہیں اجازت کی کیا ضرورت“۔ وہ بدستور شوخی سے بولی۔

”تو آپ نہیں بیٹیں گی؟“ اس نے برہمی سے جھومر کا چہرہ دیکھا

”نہیں، کیا کر لو گے“۔ وہ کھلکھلائی۔

”دیکھئے میں آپ سے کہہ رہا ہوں مجھے اندر جانے دیں“۔ اس نے جیسے بہت زیادہ رسائیت کا مظاہرہ کیا تو

”میں بھی جناب سے کہہ چکی ہوں تھوڑی دیر بعد تشریف لائیے گا“۔ وہ مسکرائی

باری نے کئی گہرے گہرے سانس لئے، پھر ایک جھٹکے سے جھومر کا بازو پکڑ کر آگے کی طرف کھینچا اور بائیں طرف

دیا۔ یہ دیکھے بغیر کہ اس کا کیا شہر ہوا۔ وہ کمرے میں داخل ہو گیا۔

وہ فساد کی جز بنخیر سمیت کھڑی ہوئی غالباً دونوں کی تکرار بغور سن رہی تھی۔

باری کو اندر آتے دیکھ کر اس نے نظریں جھکا لیں۔

باری نے اس پر نظر ڈالنا ابھی ضروری نہیں سمجھا۔ ”اپنے ٹھکانے پر چلو“۔

”جانا اس نے اپنے ٹھکانے پر ہی ہے۔ ذرا سی دیر آزاد بیٹھنے دو۔ تمہاری جیب سے کیا جاتا ہے“۔ جھومر اپنی

سہلاتی ہوئی اندر آگئی تھی۔

”آپ بڑے خان کے ذاتی معاملات میں مداخلت نہ کریں تو آپ کے حق میں بہتر ہے۔ آگے بڑھو“۔

”جو میرا جی چاہے گا میں کروں گی۔ دیکھو میں نے اس کا سر دھلایا ہے۔ بال بنائے ہیں، کرلو جو میرا کرنا ہے۔

جو میرا کھانا آتا ہے وہ بھی میں اسے کھلاتی ہوں، بلکہ ہم دونوں ساتھ ہی کھاتی ہیں۔

حیوانوں کی بستی میں ایک یہ انسان ہے اور ایک میں۔ جاؤ جا کر کہہ دو ان سے“۔

جھومر بستر پر بیٹھ کر اپنے دوپٹے سے کہنی سے خون صاف کرنے لگی۔ شاید چوٹ زیادہ لگ گئی تھی۔

باری اسی کی طرف متوجہ تھا۔ خون دیکھ کر عجب سے احساس جرم میں مبتلا ہو گیا۔ مگر ظاہراً نظر بچا گیا۔

”چلو“۔ اس نے عورت کو آگے چلنے کا اشارہ کیا۔

وہ آگے بڑھی، زنجیریں جھٹک اٹھیں۔

”کہاں جا رہی ہو میری موجودگی میں کسی کا کہنا ماننے کی ضرورت نہیں“۔ جھومر نے فرش پر پڑی ایک زنجیر توڑ کر

دیتے ہوئے کہا۔

”آپ مسئلہ نہ بنیں، ہمیں مسئلہ حل کرنا بھی آتے ہیں، چھوڑیں آپ“۔ اس نے بھی زنجیر تمام کر جھٹکا دیتے ہوئے

”ہمیں بھی مسئلہ پیدا کرنے آتے ہیں۔ ابھی یہاں کے اور بھی بند کمرے کھولوں گی بتا دینا“۔ وہ برہمی سے

”بھابی“۔

”بندی کو جھومر کہتے ہیں“۔ جھومر نے اس کی بات کاٹ دی اور کھلکھلا پڑی۔

”میں بہت برداشت کر رہا ہوں، ورنہ مجھ میں اتنی قوت ہے کہ آپ کو اسی کے ساتھ اسی کوٹھڑی میں بند کر دوں“۔

”تم تو ہو ہی اندر تمہیں اجازت کی کیا ضرورت“۔ وہ بدستور شوخی سے بولی۔

”تو آپ نہیں بیٹیں گی؟“ اس نے برہمی سے جھومر کا چہرہ دیکھا

”نہیں، کیا کر لو گے“۔ وہ کھلکھلائی۔

”دیکھئے میں آپ سے کہہ رہا ہوں مجھے اندر جانے دیں“۔ اس نے جیسے بہت زیادہ رسائیت کا مظاہرہ کیا تو

”میں بھی جناب سے کہہ چکی ہوں تھوڑی دیر بعد تشریف لائیے گا“۔ وہ مسکرائی

باری نے کئی گہرے گہرے سانس لئے، پھر ایک جھٹکے سے جھومر کا بازو پکڑ کر آگے کی طرف کھینچا اور بائیں طرف

دیا۔ یہ دیکھے بغیر کہ اس کا کیا شہر ہوا۔ وہ کمرے میں داخل ہو گیا۔

وہ فساد کی جز بنخیر سمیت کھڑی ہوئی غالباً دونوں کی تکرار بغور سن رہی تھی۔

باری کو اندر آتے دیکھ کر اس نے نظریں جھکا لیں۔

باری نے اس پر نظر ڈالنا ابھی ضروری نہیں سمجھا۔ ”اپنے ٹھکانے پر چلو“۔

”جانا اس نے اپنے ٹھکانے پر ہی ہے۔ ذرا سی دیر آزاد بیٹھنے دو۔ تمہاری جیب سے کیا جاتا ہے“۔ جھومر اپنی

سہلاتی ہوئی اندر آگئی تھی۔

”آپ بڑے خان کے ذاتی معاملات میں مداخلت نہ کریں تو آپ کے حق میں بہتر ہے۔ آگے بڑھو“۔

”جو میرا جی چاہے گا میں کروں گی۔ دیکھو میں نے اس کا سر دھلایا ہے۔ بال بنائے ہیں، کرلو جو میرا کرنا ہے۔

جو میرا کھانا آتا ہے وہ بھی میں اسے کھلاتی ہوں، بلکہ ہم دونوں ساتھ ہی کھاتی ہیں۔

حیوانوں کی بستی میں ایک یہ انسان ہے اور ایک میں۔ جاؤ جا کر کہہ دو ان سے“۔

جھومر بستر پر بیٹھ کر اپنے دوپٹے سے کہنی سے خون صاف کرنے لگی۔ شاید چوٹ زیادہ لگ گئی تھی۔

باری اسی کی طرف متوجہ تھا۔ خون دیکھ کر عجب سے احساس جرم میں مبتلا ہو گیا۔ مگر ظاہراً نظر بچا گیا۔

”چلو“۔ اس نے عورت کو آگے چلنے کا اشارہ کیا۔

وہ آگے بڑھی، زنجیریں جھٹک اٹھیں۔

”کہاں جا رہی ہو میری موجودگی میں کسی کا کہنا ماننے کی ضرورت نہیں“۔ جھومر نے فرش پر پڑی ایک زنجیر توڑ کر

دیتے ہوئے کہا۔

”آپ مسئلہ نہ بنیں، ہمیں مسئلہ حل کرنا بھی آتے ہیں، چھوڑیں آپ“۔ اس نے بھی زنجیر تمام کر جھٹکا دیتے ہوئے

”ہمیں بھی مسئلہ پیدا کرنے آتے ہیں۔ ابھی یہاں کے اور بھی بند کمرے کھولوں گی بتا دینا“۔ وہ برہمی سے

”بھابی“۔

”بندی کو جھومر کہتے ہیں“۔ جھومر نے اس کی بات کاٹ دی اور کھلکھلا پڑی۔

”میں بہت برداشت کر رہا ہوں، ورنہ مجھ میں اتنی قوت ہے کہ آپ کو اسی کے ساتھ اسی کوٹھڑی میں بند کر دوں“۔

لال خان ہنوز کمرے میں تھا۔ بالو بدستور برآمدے میں بیٹھی تھی۔

رات خاصی بھیگ چکی تھی، بالو کو صرف ایک ملاں گھیرے ہوئے تھا کہ وہ اب نہیں آئے گا۔ کبھی کبھی سنا کہ خواہش سے آزاد ہوتی تھی تو عجیب سا خوف رگ و پے میں اترنے لگا تھا کہ جیسے ابھی لال خان دعا پڑھ رہا ہو اور اپنے ریوالور سے اس پر فائر کر دے گا۔

موت کا کیا ہے وہ تو آتا ہی ہے مگر کچھ دل تو ٹھنڈا ہو۔

کبھی من چاہے موسم کی ہڈی والی تو چلے۔

کبھی گھڑی بھر کیلئے خواہش تعبیر کے نشان تک تو پہنچے۔

کبھی یوں بھی تو محسوس ہو کہ ہمیں بھی زندگی کی ہوائی چھو ہے۔

کبھی تو یہ احساس ہو کہ چاند کسی کی تشبیہ لے کر آیا ہے۔

کبھی تو روح وصل کی سرشاری میں سرمست ہو کر رقص کرے۔

کبھی تو انتظار حد سے گزرے، کبھی تو من چاہی آمد ہو۔

کبھی زندگی روئے تو آئندہ خوشی کا آسرا جاگے۔

کبھی دل بچلے تو من چاہی تسلیوں کی پھوار برے۔

کبھی مرجانے کو جی چاہے تو کوئی زندگی آنکھوں میں سجا کر لائے۔

کبھی نعمتیں تیاگ کر جوگ بھرنے نکلیں تو کوئی شہر سجا کر ہمیں گھیرے۔

کبھی پھوٹ پھوٹ کر روئیں تو کوئی کوٹ کوٹ کر خوشیاں دل کے دامن میں بھرنے آئے۔ کبھی شرمگاہ کاٹے۔

چاہے تو گلابوں کے ہار آئیں۔

کبھی ناامیدی کا اندھیرا بڑھے تو کوئی امکان کے چراغ روشن کرنے آئے۔

”ر“ سے روٹی اور ”ذ“ سے دل قاعدے میں ”ذ“ پہلے آتا ہے۔ اس کی جذباتیت خطرناک حد کو چھو رہی تھی۔

”بالو“۔ پشت سے لال خان کی آواز آئی تھی۔ وہ چونکہ نہایت گہرے خیالوں میں تھی۔ چونکہ کراچیل پڑی۔

طرح دھڑکنے لگا۔

”اندر کمرے میں آؤ۔ ضروری بات کرنا ہے۔ جلدی آؤ۔ میرے پاس وقت نہیں ہے۔“

وہ سرد اور بے تاثر لہجے میں اس سے مخاطب تھا۔

وہ آہستگی سے اٹھ کھڑی ہوئی اور اس کے پیچھے چل پڑی۔

لال خان بستر پر بیٹھ گیا تھا۔ وہ کھڑی رہی۔

”بیٹھ جاؤ۔“ اس نے قاصدے پر پڑی کرتی کی طرف اشارہ کیا۔

”تمہیں کیا دکھ ہے یہاں؟“ اس نے بہت افسردہ انداز میں اس سے سوال کیا تھا۔

”تمہیں بیٹھ سے دکھ ہیں۔ میرے دکھ کبھی دور نہیں ہوئے۔“ وہ بے خونی سے بولی۔

”تمہیں ”پینے کی کمی ہے؟“ مادی اور روحانی قوتیں الجھ پڑیں تو اس طرح کے سوال لازمی ہوتے ہیں۔

”جیک دل ہے میرا ہمیشہ سے ننگا بھوکا۔ میری بھی نہیں سنتا۔“ وہ سرد آہ بھر کر گویا ہوئی۔

منہ سے لال خان کا سیاہ چہرہ سرخ ہو کر تانبا بن گیا۔

”کوئی ملاں کوئی غیرت نہیں؟“ لال خان نے اس کا چہرہ دیکھ کر سوال کیا۔

”نہیں بڑی گھٹن تھی خوش ہوں کہ سچ بولنے کا وقت بھی آیا۔“ اس نے تلخ لہجے میں جواب دیا۔

”کب سے چل رہا ہے یہ چکر؟“ وہ بہت دھیمی آواز میں پوچھ رہا تھا۔

”جس دن اس نے میری رونمائی کرتے ہوئے شعر پڑھا تھا۔“ وہ اتنے آرام سے بولی کہ لال خان دم بخود سا رہ گیا۔

”پہل اس کی طرف سے ہوئی تھی؟“ اس کی آواز پر لرزش غالب آنے لگی۔

”نہیں! اے اللہ نے ایسی توفیق ہی نہیں دی۔ اسے تو مژدوں کو پینے کی عادت ہے۔“

اس نے جی گواہی دی کہ لال خان کے روم روم میں اس کی سچائیوں کا یقین اتر گیا ورنہ وہ اس پر الزام دھڑک کر آدھا ہو جھ

اس طرف بھی سرکا سکتی تھی۔

”کیا بات ہے اس میں ایسی؟“ احساس کمتری سے لال خان آدھا ہو گیا۔

”یہی تو میں اپنے آپ سے پوچھ رہی ہوں اب تک۔“ بالو کے سکون میں کوئی فرق نہیں آیا۔

”تمہیں معلوم نہیں بالو! عورت کی بے وفائی سے مرد اپنی نظروں ہی میں ذلیل ہو جاتا ہے۔ تم نے ہمیشہ کیلئے مجھے ذلیل

کر دیا ہے۔“ اس کی آواز میں شکستگی تھی۔

”تم مجھے گولی مار دو دھکے دے کر گھر سے نکال دو مجھے سب منظور ہے۔“ وہ بولی۔

لال خان نے اس کی مضبوطی اور اپنی کمزوری کو بے پناہ محسوس کیا۔

”شکر ہے کہ تم نے مجھے پورا مرنے سے بچا لیا۔ عورت کی دغا بازی کا دکھ بڑا اسی مگر دوست کا بھروسہ باقی ہے۔ میں اس

کی پہلے سے زیادہ عزت کروں گا۔ اپنی چھت کمزور ہو تو بارش کو برا بھلا کیوں کہیں؟

میری طرف سے اب تم پر کوئی پابندی نہیں۔ صبح یہ گھر چھوڑ دینا۔ اب تم اس کمرے سے جاسکتی ہو جو دکھ تم نے دیا ہے

مجھے ایک دن قدرت اس کا حساب خود لے گی۔“ وہ اس کی طرف سے پشت کر کے بستر پر دراز ہو گیا۔

بالو چپ چاپ کمرے سے باہر آگئی۔

”کہ خیال تو یہ تھا کہ ہنگامہ زبردست ہوگا“ صبح تک وہ اپنے زخم سینکے گی۔

لال خان تو بہت سمجھدار نکلا۔ وہ ڈرائیوگ روم کی طرف جاتے ہوئے ناپسندیدہ انسان کو پہلی مرتبہ سراہ رہی تھی۔

لڑکیوں کی جگہ دیکھنے کے قابل تھی، جیسے وہ دلہن کا دیدار نہیں کر سکتی بلکہ دلہن انہیں ہنسنے دے گی۔

”تمہارے پاس بلیو چوڑیاں ہیں تو وہ کیوں نہیں پہنیں؟“ تانیہ نے روبی کو ٹوکا۔

”کیا فونو گرافی بھی ہوگی؟“ روبی نے سادگی سے پوچھا۔

”جی..... فونو گرافی کی ایسی تھیں، جب تم نے میچنگ کی ہے تو پوری کرو۔ جب یہ دو کھوکا ہیر بینڈنگ بلیو کا ہے۔

نے چھیڑا۔

”خبردار جو تم اس ہیر بینڈنگ کی شان میں گستاخی کی۔ یہ ان کی عزیز از جان دوست پورا صدر سارا کو چھیڑا۔

تھیں پشاور سے۔“ بیہ نے تانیہ کو تادیبی انداز میں گھور کر کہا۔

”ہاں تو لائی تھی ناں، تم کیوں جل رہی ہو؟“ روبی نے خفگی سے کہا۔

”بھئی اس خوشی کے موقع پر یہ بکرا کیسی، جس کا جیسے دل چاہے تیار ہو جائے کوئی ثرائی تو نہیں ملے گی۔“ گلوبندہ

لہرانے کی عادت سے مجبور تھیں۔

”ارے کیا روشی آج سوئی رہے گی۔ جا کر اسے اٹھاؤ۔ ہم سب دلہن کے پاس جائیں اور وہ ہمارے ساتھ نہ ہونگا۔

سوچیں گی؟“ زری نے دوسری قسم کا داویلا شروع کیا۔

”میں گئی تھی اسے اٹھانے۔ یوں غرائی جیسے نکل لے گی۔“ حنان نے اپنی پتلا سائی۔

”ہیں، کیوں نہیں اٹھ رہی، کہاں تو مارے خوشی کے نیند نہیں آرہی تھی؟“ موتا نے حسب توفیق حیرت کا اظہار کیا۔

”باری سے کہو، وہ دستک دے کر بس آواز دے ڈالے دنیا کے اس کو نے پر بھی سوری ہوگی تو اٹھ جائیگی۔“

مسکرائیں۔

”بانگل بھی سوٹ نہیں کرتی آپا۔ آپ کی یہ چھیڑ چھاڑ۔ وہ دلاور علی خان کی پوتی اور یادر علی خان ڈی سی کی انکونی

ہے۔ مذاق بھی اس کے سٹینڈرڈ کا کیا کیجئے۔“ لالی نے ناگواری سے انہیں ٹوکا۔

”ہا..... آہ..... یہ کبخت اسٹینڈرڈ۔“ حنیو نے آہ بھری۔ بھلا وہ باز آئیوالی تھیں۔

”مگر آج کل وہ اتنی دیر تک کیوں سوئی رہتی ہے۔“ موتا پریشان بولی

”نشہ چڑھا ہوا ہے شاید۔“ حنیو نے پھر ہنس کر کھڑا کیا۔

”کس چیز کا؟“ حنان نے برامان کران کی طرف دیکھا۔

”بھئی، اتنی کیوٹ، اتنی سارٹ سی والدہ آئی ہیں۔“ حنیو نے ماحول کے تیور دیکھ کر بات بدل ڈالی۔ یوں بھی

موجود نہیں تھی۔ انہیں مزا نہیں آرہا تھا۔

”میں جا کر اٹھاتی ہوں دیکھتی ہوں کیسے نہیں اٹھتی۔“ گلوبندہ کھڑی ہوئیں۔

”کھٹائی لیتی جاؤ۔ سنا ہے کھٹائی سے نشہ ٹوٹ جاتا ہے۔“ حنیو ہنسیں۔

”پھر آپ اتر جائیں اس کے معدے میں یہ ٹونکہ زیادہ موثر ہوگا۔“ روبی بڑی دیر سے برداشت کر رہی تھی

بے بسی، بڑی ٹٹ میں ہال میں داخل ہوا اور دیوار میں فٹ ٹیلی فون کی طرف بڑھا۔

بے بسی، بڑی ٹٹ میں ہال میں داخل ہوا اور دیوار میں فٹ ٹیلی فون کی طرف بڑھا۔

بے بسی، بڑی ٹٹ میں ہال میں داخل ہوا اور دیوار میں فٹ ٹیلی فون کی طرف بڑھا۔

بے بسی، بڑی ٹٹ میں ہال میں داخل ہوا اور دیوار میں فٹ ٹیلی فون کی طرف بڑھا۔

بے بسی، بڑی ٹٹ میں ہال میں داخل ہوا اور دیوار میں فٹ ٹیلی فون کی طرف بڑھا۔

بے بسی، بڑی ٹٹ میں ہال میں داخل ہوا اور دیوار میں فٹ ٹیلی فون کی طرف بڑھا۔

بے بسی، بڑی ٹٹ میں ہال میں داخل ہوا اور دیوار میں فٹ ٹیلی فون کی طرف بڑھا۔

بے بسی، بڑی ٹٹ میں ہال میں داخل ہوا اور دیوار میں فٹ ٹیلی فون کی طرف بڑھا۔

بے بسی، بڑی ٹٹ میں ہال میں داخل ہوا اور دیوار میں فٹ ٹیلی فون کی طرف بڑھا۔

بے بسی، بڑی ٹٹ میں ہال میں داخل ہوا اور دیوار میں فٹ ٹیلی فون کی طرف بڑھا۔

بے بسی، بڑی ٹٹ میں ہال میں داخل ہوا اور دیوار میں فٹ ٹیلی فون کی طرف بڑھا۔

بے بسی، بڑی ٹٹ میں ہال میں داخل ہوا اور دیوار میں فٹ ٹیلی فون کی طرف بڑھا۔

بے بسی، بڑی ٹٹ میں ہال میں داخل ہوا اور دیوار میں فٹ ٹیلی فون کی طرف بڑھا۔

بے بسی، بڑی ٹٹ میں ہال میں داخل ہوا اور دیوار میں فٹ ٹیلی فون کی طرف بڑھا۔

بے بسی، بڑی ٹٹ میں ہال میں داخل ہوا اور دیوار میں فٹ ٹیلی فون کی طرف بڑھا۔

بے بسی، بڑی ٹٹ میں ہال میں داخل ہوا اور دیوار میں فٹ ٹیلی فون کی طرف بڑھا۔

بے بسی، بڑی ٹٹ میں ہال میں داخل ہوا اور دیوار میں فٹ ٹیلی فون کی طرف بڑھا۔

بے بسی، بڑی ٹٹ میں ہال میں داخل ہوا اور دیوار میں فٹ ٹیلی فون کی طرف بڑھا۔

بے بسی، بڑی ٹٹ میں ہال میں داخل ہوا اور دیوار میں فٹ ٹیلی فون کی طرف بڑھا۔

بے بسی، بڑی ٹٹ میں ہال میں داخل ہوا اور دیوار میں فٹ ٹیلی فون کی طرف بڑھا۔

بے بسی، بڑی ٹٹ میں ہال میں داخل ہوا اور دیوار میں فٹ ٹیلی فون کی طرف بڑھا۔

بے بسی، بڑی ٹٹ میں ہال میں داخل ہوا اور دیوار میں فٹ ٹیلی فون کی طرف بڑھا۔

بے بسی، بڑی ٹٹ میں ہال میں داخل ہوا اور دیوار میں فٹ ٹیلی فون کی طرف بڑھا۔

بے بسی، بڑی ٹٹ میں ہال میں داخل ہوا اور دیوار میں فٹ ٹیلی فون کی طرف بڑھا۔

بے بسی، بڑی ٹٹ میں ہال میں داخل ہوا اور دیوار میں فٹ ٹیلی فون کی طرف بڑھا۔

سوچ رہے ہوں گے۔“

”مگر میں کیا کروں..... گولی کھائی ہوئی ہے میں نے۔ میری آنکھیں نہیں کھلی رہیں۔“

کہہ دیتے، گا میری رات سے طبیعت خراب ہے۔“ وہ غنودگی سے بول رہی تھی۔

گلو نے اسے جھنجھوڑ کر سیدھا کر دیا۔

”کیا کرتی رہتی ہو الٹی سیدھی حرکتیں۔ کیوں کھائی گولی.....؟“ گلو سخت ہراسنسی سے پوچھ رہی تھی۔

”نیند نہیں آرہی تھی۔ اور یوں لگ رہا تھا کہ اگر چند گھنٹے اور جاگتی رہی تو میری دماغی شریانیں پھٹ جائیں گی۔“

وہ منہ دوسری طرف پھیرے بنوز خوابیدہ لہجے میں بول رہی تھی۔

گلو چند ٹانے بڑے فکر مندانہ انداز میں اس کی طرف دیکھتی رہی۔ پھر جھک کر اس کی پیشانی سے ہل پیلے۔

”روٹی..... میری جان..... کیوں نہیں آرہی تھی نیند؟ اور کیا سوچ رہی تھیں۔ کیوں سوچتی ہو اتنا کچھ۔“

پر۔ اور تم تو خالہ کے آنے پر بہت زیادہ خوشی تھیں۔ پھر؟“

گلو درحقیقت بہت پریشان ہو گئی تھی۔

”وہ تو میں ہوں۔ مگر آپ فکر مند نہ ہوں۔ یہ بات نہیں ہے۔ بلکہ کوئی بات نہیں ہے پلیر آپ مجھے۔“

اس نے ہاتھ جوڑ دیئے۔ ”سارے گھر میں سب سے بڑی مورل سپورٹر تو آپ ہیں میری۔ بس آج سوچنے لگی۔“

کیلئے جو کہیں گی، کرلوں گی۔ عمر بھر جاگ لوں گی۔“

وہ پھر اوندھی ہو گئی۔ گلو اٹھ کھڑی ہوئیں۔ وہ سمجھ گئی تھیں کہ بے کار محنت ہوگی۔ مشکل ہی ہے جو آئندہ۔

تک اٹھ سکے۔

وہ دروازہ بند کر کے پلٹیں تو باری پر نظر پڑی۔ وہ بابا صاحب کی خواب گاہ سے نکل رہا تھا۔

”اے..... باری کے بچے۔ ادھر آؤ۔“ انہوں نے مصنوعی قسم کی خفگی کے ساتھ اسے پکارا۔

”جناب۔“ وہ بھی مسکراتا ہوا ان کی طرف آیا۔

”یہ تم لا کر دیتے ہو اسے ٹرکولا نزر؟“

”فرد جرم ہے کہ تفتیش؟“ وہ شرارت سے مسکرایا۔

”بتاؤ..... بھاری ڈوز لے کر سو رہی ہے۔ ہاں نہیں اسے کیا ہو گیا ہے۔ یقیناً تم ہی سے منگائی ہوگی۔“

”انٹیلی جنس بیورو کو آپ جیسی اہلیت کے ہی لوگ درکار ہوتے ہیں۔ پر یقیناً اپنے شکوک کو ایمان نہ دے۔“

گدی پر ہاتھ رکھتے ہی الٹا لٹکانے والے۔ ایسا گھاس کھایا ہوا لگتا ہوں آپ کو۔ وہ منگائیں گی اور میں۔“

میرے سامنے ہی کچن میں فریق سے نکال کر محترمہ نے گولی کھائی ہے۔“

”تم نے روکا نہیں..... پوچھا نہیں؟“ گلو نے بنوز باراض لہجے میں سوال کیا۔

”اچھا..... میں چلتا ہوں..... دیر ہو رہی ہے۔“

”کا کا جان سے کہنا۔ اس مرتبہ ٹیپو کو چھٹیوں میں چند دنوں کیلئے یہاں بھیج دیں۔ بہت دن ہوئے ہیں۔“

نخرا دیکھے ہوئے۔ ”گلوٹس کرا آگے بڑھ گئیں۔“

”ماہین کیم پریشان ہو گئی۔“

”یہی نہیں چرچا ہو گیا تھا۔“ اس نے گڑبڑا کر عالم تاب کی طرف دیکھا۔

”اسے آرام کرنے دو۔ میں خود چلی جاؤں گی اس کے کمرے میں۔“ اس نے دھیمی آواز میں کہا۔

”اپنی ممانی کو لے جاؤ روشی کے پاس۔ ہو سکتا ہے یاد دہان کو لے کر ایک گھنٹے کے بعد ہری پوری روانہ ہو۔“

”یہاں گلوٹس غائب ہوئیں۔“

”یاد دہان کو لے کر آجائے گا۔ ابھی تو ہم نے ٹھیک سے دلہن کو دیکھا بھی نہیں۔“ حنا بسوری۔

”یہاں اس کے سر پر شفقت سے بھرے انداز میں ایک چپٹ لگائی اور ان کے باہر جانے سے پہلے خود چلی۔“

”یاد دہان کو لے روشی کے کمرے میں چلی آئیں۔“

”یاد دہان کو لے روشی کے کمرے میں چلی آئیں۔“

”یاد دہان کو لے روشی کے کمرے میں چلی آئیں۔“

”یاد دہان کو لے روشی کے کمرے میں چلی آئیں۔“

”یاد دہان کو لے روشی کے کمرے میں چلی آئیں۔“

”یاد دہان کو لے روشی کے کمرے میں چلی آئیں۔“

”یاد دہان کو لے روشی کے کمرے میں چلی آئیں۔“

”یاد دہان کو لے روشی کے کمرے میں چلی آئیں۔“

”یاد دہان کو لے روشی کے کمرے میں چلی آئیں۔“

”یاد دہان کو لے روشی کے کمرے میں چلی آئیں۔“

”یاد دہان کو لے روشی کے کمرے میں چلی آئیں۔“

”یاد دہان کو لے روشی کے کمرے میں چلی آئیں۔“

”یاد دہان کو لے روشی کے کمرے میں چلی آئیں۔“

”یاد دہان کو لے روشی کے کمرے میں چلی آئیں۔“

”یاد دہان کو لے روشی کے کمرے میں چلی آئیں۔“

”یاد دہان کو لے روشی کے کمرے میں چلی آئیں۔“

”یاد دہان کو لے روشی کے کمرے میں چلی آئیں۔“

”یاد دہان کو لے روشی کے کمرے میں چلی آئیں۔“

”یاد دہان کو لے روشی کے کمرے میں چلی آئیں۔“

”اب بھی فائلیں دیکھ رہے ہیں؟“
 آپ کو برا نہیں لگا؟“ اس نے تروتازہ اور خوشیوں کے نور سے نہائی ہوئی ماہین سے پوچھا۔
 ”میں تو ادھر آرہی تھی تم لوگوں کے پاس وہ اکیلے ہیں۔ اچھا ہے۔ مصروف ہیں۔“ ماہین نے سر ہلایا۔
 جواباً گلو نے مسکراہٹ لبوں پر بکھیری۔

روشی منہ ہاتھ دھونے ہاتھ روم میں چلی گئی۔

”بابا صاحب اور یاد ماموں نے ایک سے ایک چیز اس کو مہیا کی ہوئی ہے۔ مگر اس میں ذرا سیلینڈر بھی ہے۔“
 ڈریسنگ ٹیبل ٹھیک کرتے ہوئے ماہین سے مخاطب ہوئیں۔

”یہ دیکھیں۔ یہ ہیز برش۔ اس کا دستہ ہاتھی دانت کا ہے۔ یاد ماموں نے باہر سے لا کر دیا تھا۔“
 کے نیچے پڑا ہوا ہے۔

”آپ لوگوں کے نزدیک سونے چاندی ہاتھی دانت کی اہمیت ہوگی۔ جب بندے کا دل ہی خاک ہو تو سب چیزیں۔ ہیں تو ہیں۔ اب کیا سر پر رکھ کر ناچیں۔“ وہ تو لیے سے چہرہ پونچھتے ہوئے تنک کر کہہ رہی تھی۔
 ”خدا نخواستہ بھی تمہارا دل کیوں خاک ہونے لگا۔ بری بات۔ ایسے نہیں کہتے۔“ ماہین نے لوگ دیکھ کر
 روشنی نے عجیب سے انداز میں گہری سانس لی اور بالوں میں برش چلانے لگی۔
 ”آپ کہاں جا رہی ہیں گلو آپ؟“ اس نے باہر جاتی ہوئی گلو کو آئینے میں دیکھتے ہوئے مخاطب کیا۔
 ”ماما کو کہتی ہوں۔ تمہارا ناشتا بھجوا دے۔“

”تم کتنی لکی ہو روشنائی! سب تمہارا کتنا خیال رکھتے ہیں۔“ ماہین نے جیسے اس کا دل بڑھایا۔
 ”سب کیا..... بس یہ گلو آپ..... سب کا خیال رکھتی ہیں۔ بس عادت سے مجبور ہیں بے چاری۔ میں کتنی
 سب سے زیادہ یاد آتی ہیں مجھے۔ آپ کو معلوم ہے جن سے یہ انگیج ہیں وہ بڑے غصے والے ہیں۔“
 روشنی نے ماہین کو اطلاع دی۔

”اچھا! پھر تو نبھ جائیگی۔ خطرہ وہاں ہوتا ہے جب دونوں پارٹنر غصے والے ہوں۔ کیا نام ہے گلو کے شہزادہ؟“
 ”مصور۔ بڑی امی کے سگے بھتیجے ہیں۔ زری آپنی کے بھائی۔“
 ”اچھا اچھا۔“ ماہین فوراً سمجھ گئی۔
 ”گلو کا اصلی نام کیا ہے؟“

”گلزار زوار علی خان۔“ وہ مسکرا کر ماہین کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔
 ”آپ نے مہندی پارلر سے لگوائی تھی۔“ اس نے ماہین کا ہاتھ تھام لیا۔
 ”نہیں، میری دوست تابندہ نے لگائی تھی۔ بڑی ایکسپرٹ ہے وہ۔“
 ”واقعی بہت نفاست ہے ڈیزائن میں۔“ اس نے سراہا۔

”اب بھی فائلیں دیکھ رہے ہیں؟“
 آپ کو برا نہیں لگا؟“ اس نے تروتازہ اور خوشیوں کے نور سے نہائی ہوئی ماہین سے پوچھا۔
 ”میں تو ادھر آرہی تھی تم لوگوں کے پاس وہ اکیلے ہیں۔ اچھا ہے۔ مصروف ہیں۔“ ماہین نے سر ہلایا۔
 جواباً گلو نے مسکراہٹ لبوں پر بکھیری۔

روشی منہ ہاتھ دھونے ہاتھ روم میں چلی گئی۔

”بابا صاحب اور یاد ماموں نے ایک سے ایک چیز اس کو مہیا کی ہوئی ہے۔ مگر اس میں ذرا سیلینڈر بھی ہے۔“
 ڈریسنگ ٹیبل ٹھیک کرتے ہوئے ماہین سے مخاطب ہوئیں۔

”یہ دیکھیں۔ یہ ہیز برش۔ اس کا دستہ ہاتھی دانت کا ہے۔ یاد ماموں نے باہر سے لا کر دیا تھا۔“
 کے نیچے پڑا ہوا ہے۔

”آپ لوگوں کے نزدیک سونے چاندی ہاتھی دانت کی اہمیت ہوگی۔ جب بندے کا دل ہی خاک ہو تو سب چیزیں۔ ہیں تو ہیں۔ اب کیا سر پر رکھ کر ناچیں۔“ وہ تو لیے سے چہرہ پونچھتے ہوئے تنک کر کہہ رہی تھی۔
 ”خدا نخواستہ بھی تمہارا دل کیوں خاک ہونے لگا۔ بری بات۔ ایسے نہیں کہتے۔“ ماہین نے لوگ دیکھ کر
 روشنی نے عجیب سے انداز میں گہری سانس لی اور بالوں میں برش چلانے لگی۔
 ”آپ کہاں جا رہی ہیں گلو آپ؟“ اس نے باہر جاتی ہوئی گلو کو آئینے میں دیکھتے ہوئے مخاطب کیا۔
 ”ماما کو کہتی ہوں۔ تمہارا ناشتا بھجوا دے۔“

”تم کتنی لکی ہو روشنائی! سب تمہارا کتنا خیال رکھتے ہیں۔“ ماہین نے جیسے اس کا دل بڑھایا۔
 ”سب کیا..... بس یہ گلو آپ..... سب کا خیال رکھتی ہیں۔ بس عادت سے مجبور ہیں بے چاری۔ میں کتنی
 سب سے زیادہ یاد آتی ہیں مجھے۔ آپ کو معلوم ہے جن سے یہ انگیج ہیں وہ بڑے غصے والے ہیں۔“
 روشنی نے ماہین کو اطلاع دی۔

”اچھا! پھر تو نبھ جائیگی۔ خطرہ وہاں ہوتا ہے جب دونوں پارٹنر غصے والے ہوں۔ کیا نام ہے گلو کے شہزادہ؟“
 ”مصور۔ بڑی امی کے سگے بھتیجے ہیں۔ زری آپنی کے بھائی۔“
 ”اچھا اچھا۔“ ماہین فوراً سمجھ گئی۔
 ”گلو کا اصلی نام کیا ہے؟“

”گلزار زوار علی خان۔“ وہ مسکرا کر ماہین کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔
 ”آپ نے مہندی پارلر سے لگوائی تھی۔“ اس نے ماہین کا ہاتھ تھام لیا۔
 ”نہیں، میری دوست تابندہ نے لگائی تھی۔ بڑی ایکسپرٹ ہے وہ۔“
 ”واقعی بہت نفاست ہے ڈیزائن میں۔“ اس نے سراہا۔

”اب بھی فائلیں دیکھ رہے ہیں؟“
 آپ کو برا نہیں لگا؟“ اس نے تروتازہ اور خوشیوں کے نور سے نہائی ہوئی ماہین سے پوچھا۔
 ”میں تو ادھر آرہی تھی تم لوگوں کے پاس وہ اکیلے ہیں۔ اچھا ہے۔ مصروف ہیں۔“ ماہین نے سر ہلایا۔
 جواباً گلو نے مسکراہٹ لبوں پر بکھیری۔

روشی منہ ہاتھ دھونے ہاتھ روم میں چلی گئی۔

”بابا صاحب اور یاد ماموں نے ایک سے ایک چیز اس کو مہیا کی ہوئی ہے۔ مگر اس میں ذرا سیلینڈر بھی ہے۔“
 ڈریسنگ ٹیبل ٹھیک کرتے ہوئے ماہین سے مخاطب ہوئیں۔

”یہ دیکھیں۔ یہ ہیز برش۔ اس کا دستہ ہاتھی دانت کا ہے۔ یاد ماموں نے باہر سے لا کر دیا تھا۔“
 کے نیچے پڑا ہوا ہے۔

”آپ لوگوں کے نزدیک سونے چاندی ہاتھی دانت کی اہمیت ہوگی۔ جب بندے کا دل ہی خاک ہو تو سب چیزیں۔ ہیں تو ہیں۔ اب کیا سر پر رکھ کر ناچیں۔“ وہ تو لیے سے چہرہ پونچھتے ہوئے تنک کر کہہ رہی تھی۔
 ”خدا نخواستہ بھی تمہارا دل کیوں خاک ہونے لگا۔ بری بات۔ ایسے نہیں کہتے۔“ ماہین نے لوگ دیکھ کر
 روشنی نے عجیب سے انداز میں گہری سانس لی اور بالوں میں برش چلانے لگی۔
 ”آپ کہاں جا رہی ہیں گلو آپ؟“ اس نے باہر جاتی ہوئی گلو کو آئینے میں دیکھتے ہوئے مخاطب کیا۔
 ”ماما کو کہتی ہوں۔ تمہارا ناشتا بھجوا دے۔“

”تم کتنی لکی ہو روشنائی! سب تمہارا کتنا خیال رکھتے ہیں۔“ ماہین نے جیسے اس کا دل بڑھایا۔
 ”سب کیا..... بس یہ گلو آپ..... سب کا خیال رکھتی ہیں۔ بس عادت سے مجبور ہیں بے چاری۔ میں کتنی
 سب سے زیادہ یاد آتی ہیں مجھے۔ آپ کو معلوم ہے جن سے یہ انگیج ہیں وہ بڑے غصے والے ہیں۔“
 روشنی نے ماہین کو اطلاع دی۔

”اچھا! پھر تو نبھ جائیگی۔ خطرہ وہاں ہوتا ہے جب دونوں پارٹنر غصے والے ہوں۔ کیا نام ہے گلو کے شہزادہ؟“
 ”مصور۔ بڑی امی کے سگے بھتیجے ہیں۔ زری آپنی کے بھائی۔“
 ”اچھا اچھا۔“ ماہین فوراً سمجھ گئی۔
 ”گلو کا اصلی نام کیا ہے؟“

”گلزار زوار علی خان۔“ وہ مسکرا کر ماہین کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔
 ”آپ نے مہندی پارلر سے لگوائی تھی۔“ اس نے ماہین کا ہاتھ تھام لیا۔
 ”نہیں، میری دوست تابندہ نے لگائی تھی۔ بڑی ایکسپرٹ ہے وہ۔“
 ”واقعی بہت نفاست ہے ڈیزائن میں۔“ اس نے سراہا۔

”پھر اپنی دلچسپی کا نام بتاؤ۔“ ماہین نے کہا اور معنی خیز انداز میں ہنس پڑی۔
روشنی کا دل دھڑک گیا۔

”جی۔ میں سمجھی نہیں۔“ اس نے تجاہل برتا۔

”سمجھ تو گئے ہیں تمہارے اچھے خان اور فرشتے بھی۔ چلو مگر ہم فی الحال یہ موضوع موقوف کر دیتے۔
وقت میں بات کریں گے۔“ ماہین نے گلو کو آتے دیکھ کر موضوع بدلا۔

”بابا صاحب کہہ رہے ہیں دلہن کو ہال میں لے کر آؤ سب گھر والوں کے ساتھ تصویریں بنیں گی۔“
”کھینچے گا کون؟“ (دھیان اسی دشمن جاں کی طرف جاتا تھا)۔ اس نے پوچھا۔

”اکا۔ بڑی زبردست فوٹو گرافی کرتے ہیں۔“ گلو نے بتایا۔

”اکا؟“ ماہین نے سوالیہ انداز میں روشنی کی طرف دیکھا۔

”گلو آپا کے بڑے بھائی۔ سیمہ بھابی کے شوہر نامدار۔“ روشنی نے غائبانہ تعارف کا مرحلہ طے کیا۔
”روشنی تو ابھی ناشتا کرے گی۔“ ماہین نے گلو کی طرف دیکھا۔

”ہاں تو آجائے گی۔ وہاں ابھی دیر تک سیشن ہوگا۔“ گلو ہنس کر گویا ہوئیں۔

”چلیں آپ تو انھیں۔“ انہوں نے ماہین سے کہا۔ تو ماہین دو ہنسا سر پر درست کرتی اٹھ کھڑی ہوئی۔

”لال خان نہیں آیا؟“ بالو کی ماں نے اسے پہلی مرتبہ تنہا گھر میں داخل ہوتے دیکھ کر تعجب سے سوال کیا۔
بالو نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اور ساتھ لایا ہوا بیگ ایک طرف رکھ کر تھکے تھکے انداز میں بیٹھ گئی۔

”طبیعت کیسی ہے تیری؟ چہرہ اترا اتر الگ رہا ہے۔“ بالو کی ماں فکر مند سی ہوئی۔

”ابھی مجھ سے کوئی بات نہ کرو ماں۔ آرام کرنے دو مجھے۔“ اس نے بیزار سی کہا۔

”تو کیا مل چلا کر آ رہی ہے۔“ وہ بھی ہکو کر بولی۔

”رات بھر سوئی نہیں۔ نیند آ رہی ہے مجھے۔“

”کیا ملہار گاتی رہی ہے رات بھر؟“ اس کی ماں کھٹک سی گئی تھی۔

”ہاں۔ سارے پکے راگ گا کر آ رہی ہوں۔ بس تم چپ ہو جاؤ۔“ وہ اسی طرح بیزار کن انداز میں۔
اس کی ماں نے گھڑی بھر کو اس کے سر پرے پر نظر ڈالی اور باورچی خانے کی طرف بڑھ گئی۔
بالو آنکھوں پر بازو رکھ کر لیٹ گئی۔

”اری۔ تیری سونے کی چوڑیاں کہاں ہیں؟“

اس کی ماں دوبارہ آئی تو تنک۔ کھانیاں دیکھ کر ضبط نہ کر سکی۔ آخر سارے محلے میں اس کی بیٹی کی چوڑیاں۔
چوڑیوں کے چہرے تھے۔

”جس کی نہیں۔ دے آئی ہوں۔“ وہ سرد لہجے میں گویا ہوئی۔

”کس کی نہیں؟“ دو ایک دم بدحواس سی ہو گئی۔

”لال خان کی اور کس کی؟“

”اب دوپٹے کا چوڑیاں؟“ وہ حیرت سے بولی جس میں غصہ بھی تھا۔

”لو چپ رہی۔“

”کیا پوچھ رہی ہوں میں؟“ اس کی ماں کے تو اوسان خطا ہونے لگے۔

”ماں! چپ بھی ہو جاؤ۔ کیا چوڑیاں چوڑیاں لگا رکھی ہے۔ چوڑیاں نہیں تھیں۔ وہ آگ کی بیڑیاں تھیں۔ اتار آئی ہوں۔“

”بڑبڑے۔“

اس کی ماں جو باہر جانے لگی تھی۔ گرتی پڑتی پلنگ تک واپس آئی۔

”تو آئی ہے؟“

”تو آئی ہو تو چاہیے تھی۔ مگر ہوئی نہیں۔ بغیر لڑے آ گئی ہوں۔ تم فکر نہ کرو۔ پچیس ہزار مہر کے بھجوادے گا وہ۔“

”ہائے۔“ اس کی ماں نے سینے پر ہاتھ مارا۔ ”نامراد۔ کیا کاغذ لے آئی ہے؟“

”ہی بھو۔“ اس نے سکون سے جواب دیا۔

”کیوں بھوں یہی۔ جو ہوا ہے وہ بتا۔ گھر سے نکال دیا ہے اس نے تجھے؟“

اس کی ماں کا تودل بیٹھنے لگا۔ اس میں کھڑا ہونے کی سکت نہیں رہی۔ فرش پر بیٹھ گئی۔

”جو کچھ رہی ہے۔ وہی ہوا ہے اور کیا بتاؤں؟“ وہ چڑ کر بولی۔

”ارے وہ تو بڑا بھلا آدمی تھا۔ ایک اکی اسے کیا ہوا؟ کیوں کالک ملی اس نے ہمارے منہ پر؟۔ ارے..... اللہ.....

رے لٹ گئی میں..... برباد ہو گئی۔“

”دھنڑ سینے پر مار کر رونے لگی۔“

”یہ کیا بین کر رہی ہو۔ مر گئی ہوں میں؟“ وہ بے زاری سے بولی۔

”کسے کاش مرجاتی۔ تو نے تو ہمیں کہیں منہ دکھانے کے لائق نہ رکھا کرموں جلی۔“ وہ اور زور زور سے رونے لگی۔

”دیکھو..... اماں۔ بند کرو یہ رونا دھونا۔ جب مجھے کوئی دکھ نہیں تو تمہیں کیا ہے؟“ وہ گہری گہری سانس لیتی اٹھ کر بیٹھ گئی۔

”اے کتنی منحوس ہے تو۔ بھرا گھر اس نہ آیا تجھے۔“ عورت کا رونا کم نہ ہوا۔ ”ارے لٹ کر یہاں کیوں آئی۔ سمندر میں

نیک منظر مری۔ آدمی عمر تجھے بیٹھنے کی فکر میں گنوائی۔ آدمی دکھ میں جائے گی۔ کس منحوس گھڑی پیدا ہوئی تھی۔“

”اگر تمہیں اتنا دکھ ہے تو یہاں سے بھی چلی جاؤں گی۔ مگر خدا کیلئے تم چپ ہو جاؤ۔“

”کہاں چلی جاؤں گی۔ دوسرا محکم ڈھونڈ لیا ہے۔ کھوئی۔“ وہ مزید پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

بالو۔ دوبارہ لیٹ گیا۔

”اُسے بالو کے با۔ پہلے ہی کہا تھا۔ اچھی طرح دیکھ لو۔ نہیں سنی میری۔ آگنی سہ سینہ پر ہو جس دست۔
 بالو اٹھ کر دوسری طرف برآمدے میں پڑے تخت میں آکر لیٹ گئی۔ پادشہ کی دیوار پر آگنی تھیں جس نے
 آنکھوں پر بازو رکھ لیا تھا۔

رات ایک بجے کا عمل تھا۔

وہ بری طرح تھک کر سویا تھا۔ دروازے پر ہونے والی دستک پتھر کی طرح لگی تھی۔ اعصاب پر۔ جی تھک رہا تھا۔

مگر دستک..... انگوٹھی سے اور بڑی احتیاط سے دی جا رہی تھی۔ اس کا ذہن فوراً روشنی کی طرف مائل۔ اس نے دونوں ہاتھ پھیلا کر دعا کی۔ چھت کی طرف دیکھتے ہوئے چہرے پر ہاتھ پھیرا اور تھک آنے پر چٹنی لڑائی۔ اگلے ہی لمحے یوں اچھل کر پیچھے ہٹا تھا۔ جیسے بھوت کو دیکھ لیا ہو۔ سامنے جھومر کھڑی تھی۔

”آپ..... اس وقت؟“ اس کے منہ سے یہی نکل سکا۔

”بری گھڑی دیکھ کر نہیں آتی“۔ جہد مرتیز زور رنگ کا بڈا اسٹیکٹس سوٹ اور ایک ایک باشت کے طڈا کی آہ۔
بڑی بے خوفی سے مسکرا رہی تھی۔

باری نے قدرے شہناک کر سامنے اکا اور سمیہ کے بیڈروم کی طرف دیکھا۔

”کیوں آئی ہیں؟“ اس نے رکھائی سے پوچھا۔

”چاہی دو اس کو ٹھٹری کی۔ اس نے آج دن بھر کھانا نہیں کھایا ہے۔“

”میں صبح محترمہ کی خوراک کا انتظار کر کے گیا تھا۔ آپ ہلکان نہ ہوں۔“ اس نے دو ٹوک انداز میں جواب دیا۔

”جہومر نے کہنی تک بازو دروازے اور چوکھٹ کے درمیان اڑا دیا۔

باری نے بے بسی سے دروازہ پھر سے کھول دیا۔

“جی؟”

”چابی چاہیے۔ ہم رات کو باتیں کرتے ہیں۔ دکھ سکھ کہتے ہیں۔“

”وہ قیدی ہے بڑے خان کی۔ آپ ان سے چابی لے لیں۔ مجھے نہیں پتا۔“

”کون سے ضابطے کے تحت قیدی ہے وہ یہاں۔ ایک منٹ میں بڑے خان کو پھنسا سکتی ہوں۔ تمہارا نام؟“

ان کے ساتھ۔

”خدا کیلئے میرا نام تو ضرور لے دیں۔ مجھے تو واقعی آپ پھانسی لگوا دیں۔ بہت بڑا احسان ہو گا یہ مجھ پر۔“

یہ کہہ کر وہ بڑے ہنس مکھ بن کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

”بہن! یہ بھی ٹھیک ہے۔ کم از کم اس طرح ہی سے میرا مسئلہ حل ہو جائیگا۔“ اس نے جھومر کی جہان جلا کر خاک کر دی۔
 ”اب آپ جاییے اور چابی بڑے خان سے لیجئے۔ آپ مانگئے تو سہی۔ یقین کریں۔ وہ چاندی کی پلیٹ میں رکھ کر آپ
 کو دینا ہے۔“ باری نے بڑے سجاوے سے اپنے غصے کا اظہار کیا۔
 ”مگر میں تو تم سے لینے آئی ہوں۔“

... بہنوز چو کھٹ کو گھیرے کھڑی تھی۔ وہ دروازہ بند نہیں کر سکتا تھا۔ باری کے ذہن میں ایک دم ترکیب آئی۔ جیسے بجلی کا

”لے جایے چاہی۔ اور چھوڑیئے میری جان“۔ وہ پلٹا۔۔۔ اور اصطبل کی ایک کونٹھری کی چابی لا کر اسے تھما دی۔

”عمر یہ..... بے حد شکر ہے۔ کاش یہ تکرار کچھ دیر اور رہتی۔ بڑا اچھا لگ رہا تھا۔“

وہ دیر سے نہیں۔ باری نے موقعِ غنیمت جان کر چھٹ دروازہ بند کر لیا۔ جیسے ہی اندازہ ہوا کہ وہ دور جا چکی ہے۔ وہ بازو اٹھا کر بڑے ابا کی بیٹھک کی طرف چل دیا۔

”جان چھوٹ جانے کے احساس سے ایک عجیب سی طمانیت جسم و جاں پر طاری ہوگئی۔

بڑے بابا کی بیٹھک میں بڑا دبیز کارپٹ بچھا ہوا تھا۔ وہ تکیہ رکھ کر راز ہو گیا تھا۔

”اب اگر انہوں نے مزید پریشان کیا تو مقدمہ سپریم کورٹ کے حوالے کر کے میں فارغ ہو جاؤں گا۔“ فیصلہ کرنے کے بعد تو اور بھی ذہن پر سکون ہو گیا۔

بیشک نین چارمنٹ ہی ہوئے ہوں گے کہ دروازے پر دستک ہوئی۔

باری کا جی چاہا کہ دروازہ اکٹھا کر اپنے سر پر دے مارے۔

”کون ہے؟ کھلا ہے دروازہ۔“ اس کے لہجے میں نرمی، بے زاری اور جھٹکا ہٹ تھی۔

خانہ بابروں آؤتساں۔“ سرسوتی کی آوازیں خوف و گھبراہٹ کا مکمل اظہار کرتا تھا۔
وینور باہر آیا تھا۔

”کیا ہوگا؟“ اس نے قدرے رسوائیت سے پوچھا۔

اور کھڑے کیدی نہیں ساں۔ او بے ہوش ہوساں۔ تے خون بھی نکل ساں۔“

”خون نہ نکلا ہے۔ وہ بے ہوش ہو گئی ہے۔ اور خون بھی نکل گیا ہے“

باری بری طرح چونک پڑا۔

بہشت سے پہنچا۔

اس نے جیسے زچ ہو کر کچھ سوچا تھا اور اسٹول سے نیچے اتر آیا تھا۔
 ”وہ بظاہر خفک ٹھاک ہے آپ کو الہام ہوا تھا۔“ باری نے بغلی جیب سے چابیاں نکالتے ہوئے بڑبڑانے کے انداز
 میں جھومر سے کہا۔
 ”نہ کہ آواز سن کر اس اسٹول پر چڑھ کر اس سے باتیں بھی کی ہیں اور اسے دیکھا بھی ہے۔“

جمور سے کہا۔
 "میں نے اس کے رونے کی آواز سن کر اس اسٹول پر چڑھ کر اس سے باتیں بھی کی ہیں اور اسے دیکھا بھی ہے۔"
 اس کی بات مکمل ہونے تک وہ تالا کھول چکا تھا۔ اس نے کچھ فاصلے پر کھڑی سرسوتی کی طرف دیکھا۔
 "پانی لاؤ سرسوتی۔" وہ حکم دے کر کوٹھڑی میں داخل ہو گیا۔
 "کیا ہوا ہے تمہیں؟" اس نے خشک انداز میں عورت کو مخاطب کیا۔
 "کچھ نہیں خان! یہ ظفیری کی دلہن تو پریشان ہو جاتی ہیں۔" عورت ایک کراہ کے ساتھ چار پائی پر لیٹ گئی۔
 "باری چکر کر رہ گیا۔ عورت کا چہرہ خون سے لٹ پت ہو رہا تھا۔
 "یہ کیا کیا ہے تم نے؟" اس کی آواز بہت دھیمی اور نرم تھی۔
 "بہتر روز پھوڑتی ہوں آج خون نکل آیا۔"
 "کیوں پھوڑتی ہو سر! اس طرح انسان مرتا تو نہیں ہے؟" باری نے ادھر ادھر نظر دوڑا کر جانے کیا ڈھونڈا۔
 "خان! اب راتیں بڑی بھاری آگئی ہیں۔ سب لوگ خوش ہو چکے ہیں تو مجھے معافی کیوں نہیں مل رہی۔ نقصان تو سود
 کے ساتھ پورے ہو رہے ہیں ان سب کے پھر سے؟ خوشیوں کے جشن میں میری سزا میں کمی کا بھی تو اعلان ہو۔" اس کی کمزور
 آواز کانپ رہی تھی۔

باری نے پلٹ کر پیچھے کھڑی جھومر کو دیکھا۔ پھر وہ لی ہوئی آواز میں گویا ہوا۔
 ”کوئی نہیں ہوا جشن و ثمن‘ کام چلا رہے ہیں سب۔“

”ہائے یہ برف بنے لوگ“ کام چلانے کی خاطر بندے تک چلا دیتے ہیں۔“ جھومر نے ایک سرد آہ بھری۔
 ”بھابی! میں سرسوتی کے ہاتھ فرسٹ ایڈ باکس بھجوا رہا ہوں۔ آپ اتنی دیر میں اس کا زخم صاف کر دیجئے۔“
 ”کھلا چھوڑ جاؤ گے ہمیں، اور جو ہم بھاگ گئے؟“ جھومر مسکراتی ہوئی اس کے پہلو میں آکھڑی ہوئی۔
 باری نے سرسوتی کے ہاتھ سے پانی کا کٹورا لے کر عورت کو تھمایا اور ایک اڑتی پڑتی نظر جھومر پر ڈالی۔
 ”آپ نہیں بھاگیں گی! اتنے اچھے نصیب نہیں ہیں ہمارے۔“
 ”سرسوتی کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کر کے باہر نکل گیا۔
 ”جب عورت کی سرہم پٹی ہو جائے تو مجھے آکر بتا دینا، تانا میں خود لگاؤں گا۔“
 ”اس نے پہلو میں چلتی، تسکی ماندی سی سرسوتی کو منہ طلب کیا تھا۔

☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆

وہ خاصا پریشان ہو گیا تھا کہ کون کھڑی طور پر بالکل پرسکون نظر آ رہا تھا۔
 حویلی کے پچھلے حصے میں پہنچا تو جھومرا اپنے کمرے کے دروازے کے سامنے کھڑی تھی۔
 ”کیا ہوا ہے؟“ اس نے نظریں چا کر جھومر سے سوال کیا۔
 ”کیا بتائیں کہ کیا ہوا ہے؟“ اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔

”آپ کو کیسے پتہ چلا کہ اس عورت نے سر پھوڑ لیا ہے، خون نکل رہا ہے؟“ اس نے قدرے ہاراض انداز میں روایت کیا۔

”اس کی کوٹھڑی کے اوپر جالیاں بنی ہوئی ہیں، اسٹول پر چڑھ کر خود جھانک لو۔“ اس نے راہداری کے ایک کونے پر رکھے انتہائی بوسیدہ اسٹول کی طرف اشارہ کیا۔

باری نے مشکوک سی نظروں سے ان کی سمت دیکھا پھر کچھ سوچ کر آگے بڑھا۔ اسٹول گھسٹا اور چنہ برآمد رچھٹنے لگی۔ عورت جھٹکاسی چار پائی پر گھٹنوں پر سر دیئے بیٹھیں تھیں۔ کم پاور کے بلب کی وجہ سے کچھ صاف دکھائی بھی نہیں آتا۔

تقاً

گھونے ساری خواب آور گویاں بڑی صفائی اور خاموشی سے کہیں ضائع کر دی تھیں یا چھپا دی تھیں۔ کتابیں پڑھ پڑھ کر

کیٹشیں سن کر بھی رات بتادی مگر نیند نہ آتی تھی نہ آئی اور اب تو جیسے صبح ہوئی چاہتی تھی۔ ایک تو ان کو لیوں کی دھڑکی نہیں ہے۔ وہ کسی عادی نشے باز کی سی ہے جیسی کے ساتھ کچن کی طرف آئی تھی کہ شاید کوئی کھد سے آئی ہو۔ مگر سامنے سے آتے ہوئے باری اور سرسوتی کو دیکھ کر دل بڑے زور سے دھڑکا۔ یہ تو صاف ظاہر تھا کہ ”پچھلے“ ہیں۔ باری کی حد تک تو درست تھا مگر یہ سرسوتی جو ”سوئے مرے“ کی حقیقی تصویر ہوتی ہے یہ اس کے ساتھ کیا کر رہی ہے؟ ”کمیشن“ کما رہی ہے ”کرپٹ“ کہیں کی۔ اس نے دانت پیسے اور اپنی جگہ پر کھڑی ہوئی۔ ظاہر ہے انہیں سے کچھ پاس سے گزرنا تھا۔

باری تو اسے سامنے دیکھ کر ویسے ہی چکر اٹھ گیا تھا۔ بڑی جہنی تیاری کے ساتھ آگے قدم بڑھا رہا تھا۔ ”کہاں سے آرہی ہو سرسوتی؟“ وہ اس کے قریب پہنچتا تو اس نے سرسوتی کو مخاطب کیا۔ اور باری کو کمر نظر انداز کر دیا۔ سرسوتی تو ”سیکٹ سروس“ کی ادنیٰ سی کارکن تھی۔ اسے یہ تو پتا تھا کہ حویلی میں کس شخص سے کیا بات کر رہی ہے۔ چاری بری طرح گھگھکیا کر رہ گئی۔

”میں..... او..... گل..... اے ہے..... میں خان..... نال.....؟“ اس نے مدد طلب نظروں سے باری کی طرف دیکھا۔

”ڈرلگ رہا تھا خان کو؟ اس لئے تمہیں بطور ”کارڈ“ ساتھ لیے پھر رہے ہیں؟“ اس نے بڑے تیکھے لہجے میں سوال کیا۔ ”جی! اصل بات یہی تھی۔ اب پلیز آپ انکوائری ختم کر کے ہمیں آگے جانے دیں۔“ باری نے قہقہہ کو باہر کرنے کا انداز میں دو ٹوک لہجہ اختیار کیا۔

”میں تم سے مخاطب نہیں ہوں میں اپنی ملازمہ سے انکوائری کر رہی ہوں۔ تم جاسکتے ہو۔“ وہ بھی جوابا غرائی۔ ”جی! تو پھر جندی پوچھ لیجئے اسے ابھی بہت ضروری کام کرتا ہے۔“ اس نے سینے پر ہاتھ باندھ کر بڑی گہری سانس لی۔

”وہی پوچھ رہی ہوں اتنی رات کو کون سے ”ضروری“ کام ہو رہے ہیں؟“ اس نے سرسوتی کو گھورا۔ ”تم یہیں رکو سرسوتی میں ایک منٹ میں واپس آتا ہوں۔“ وہ بڑے جھجھکے ہوئے انداز میں تیزی سے آگے بڑھ گیا، کیونکہ اسے یہ تو اندازہ تھا کہ سرسوتی کیا کہہ سکتی ہے۔ نہیں۔

روشنی نے جاتے ہوئے باری پر ایک نگاہ غلط ڈالی اور پھر سرسوتی کی سمت متوجہ ہو گئی۔ ”جھومر بھابی کا کمر بند ہے یا وہ جاگ رہی ہیں؟“ اس نے سرسوتی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔ ”جاگ رہی ساں۔“ سرسوتی کے فرشتوں کو بھی خبر نہیں تھی کہ یہ چھان بین کس سلسلے میں ہو رہی ہے۔ بڑی سادگی سے جواب دیا تھا۔

”ہوں۔“ روشنی نے گہرا سانس لیا۔

جیہاں خیراتے ہیں تم چوکیداری کرتی ہو؟ کتنے پیسے دیتا ہے خان؟“ روشنی نے دھڑک دھڑک کر پوچھا۔ ”سرسوتی کے حلق میں کھلی پھنس گئی۔ وہ سمجھی کہ روشنی جھومر اور قیدی عورت کے متعلق بات کر رہی ہے۔“

”کیوں نہیں ہے مجھے؟ وہ تو خود چلتا پھرتا اعلان ہیں۔“ دکھ سے روشنی کا جی چاہا کہ مر جائے۔ ”جیہاں بات ہے سرسوتی ہے ناں؟“ روشنی کی آواز نکست خور وہ ہو گئی۔

”اے..... وج خان دا قصور نہیں اے..... اتنا نوے (خبر) دی نہیں سی اسان ای آکھیا سی..... بن تے قیدی (جیہاں) اب رو دیلے روندی اے تے جھومر بی بی اتناں دا حال چال پچھ لیندے نیں، ہو تے کوئی گل نہیں اے خان تے.....“

”پھر سوتی اور فور ابھاگ جاؤ۔“ باری نے مداخلت کی تھی اور سرسوتی کی بات ادھوری رہ گئی۔ ”ہیو“ ”جان بچی سولا کھوں پائے“ والی خوشگوار کیفیت میں باکس لے کر واقعی بھاگ گئی۔ ”اے ایک ابھی ہوئی نظر باری پر ڈالی جو باکس تھماتے ہی اپنے کمرے کی سمت روانہ ہو گیا تھا۔

”اے کچن جانے کا ارادہ ارادہ ترک کر دیا تھا۔ سرسوتی سامنے موڑ پر غائب ہو چکی تھی۔ اسے اب پچھلے حصے میں جانے دینا پڑا تھا۔

”بڑے جاتے تو اس پہر ڈر سا لگتا ہے۔ اندر سے جاتے تو کھوکھر کا دروازہ کھٹکھٹاتا پڑے گا۔“ ”سوتی کا تو ”روٹین درک“ ہے، اس لئے کبجٹ کوکتوں سے ڈر نہیں لگتا۔

”فون.....“ آخر وہ کس قیدی عورت کی بات کر رہی تھی۔ ”انچہ پنچس کی انتہاؤں پر پہنچ چکی تھی۔“ ”یہ فرسٹ ایل باکس کس خوشی میں اور کس کے پاس بھجوا دیا گیا ہے؟

”کھانیاں کے آتے ہی وہ بجلی کی سی تیزی سے زینے کی سمت بڑھی تھی جو باری کے کمرے کی طرف جاتا تھا۔ اندازہ پر ہونے والی دستک کے انداز ہی سے وہ سمجھ گیا تھا کہ کون ہے؟

”اے خود کو خاصا پرسکون رکھتے ہوئے دروازہ کھول دیا تھا۔

”جیہاں؟“ ”دوایوں کو یا ہوا جیسے اسے پہلے ہی سے اندازہ تھا کہ وہ آئے گی اور کچھ کہے گی۔

”اے کس کی خواہیدہ اور تھکی ہوئی نظر اٹھی تھی۔

سے جانا چاہتی ہوں۔ اگر نہیں گئی تو میرے دماغ کی شریانیں پھٹ جائیگی! ابھی..... اسی وقت مجھے پیچھے ہٹنا پڑا۔
وہ جذبات سے عاری برف لچھے میں اس سے مخاطب تھی۔

”سنیں روشنی بی بی۔ باری نے بڑی رسائیت سے اسے مخاطب کیا۔

”جن باتوں سے اگلی صدیوں تک آپ پر فرق پڑنے کا امکان نہیں۔ ان میں کیوں انٹرنیٹ ہیں۔ آپ میری بات کا یقین کیجئے، آپ کے جانے یا نہ جانے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔“

اس نے کمال رسائیت سے اسے سمجھایا۔

”ہو سکتا ہے فرق پڑے، بس میں کہہ رہی ہوں ناں، چلو میرے ساتھ۔“

وہ اپنی فطرت کے عین مطابق اپنی بات پر اڑی ہوئی تھی۔

باری نے ایک نظر اس کے چہرے پر ڈالی۔ انتہائی ستا ہوا اور بھجا بھجا سا تھا، جیسے وہ طویل عرصے سے تیار ہو رہی ہو۔

”میں معذرت خواہ ہوں۔ میں اس وقت اب وہاں نہیں جاسکتا۔“ اس نے صاف صاف بات کرنا مناسب سمجھا۔

”تمہارا خیال ہے تمہاری معذرت کے بعد میں اپنا ارادہ بدل دوں گی۔ حالانکہ تم مجھے اچھی طرح جانتے ہو۔“

تلخ لہجہ میں کہا اور پلٹ گئی۔

باری نے ایک لمحہ توقف کیا اور اس کے پیچھے چل دیا۔

اپنے پیچھے قدموں کی چاپ پر روشنی نے جان لیا تھا کہ وہ پیچھے آ رہا ہے، اس لئے وہ بیرونی احاطے کی طرف بھاگ گئی۔

مگر باہر پاؤں رکھتے ہی اندھیرے کی گھمبیر تار دیکھ کر رک گئی، جیسے باری کے قریب آنے کا انتظار کر رہی ہو۔

”آپ نہیں مانیں گی؟ کیوں الجھنیں مول لیتی پھرتی ہیں؟“ وہ اس کے قریب پہنچ کر قدرے ناراضگی سے کہنے لگی۔

روشنی نے کچھ بولے بنا قدم آگے بڑھا دیئے۔

جانے کہاں کہاں سے کتے سامنے آ کر بھوکے لگے، روشنی نے ڈر کر باری کا بازو تھام لیا۔

”چلیں واپس چلیں۔“ اس نے نہایت نرمی سے پھر اس سے کہا۔

”کہہ دو دیا ہے نہیں۔“ وہ بگڑی۔ اور باری کا بازو پکڑ کر تقریباً کھینچا۔

”ضد سے کچھ ملتا ہے؟“ اس نے زنج ہو کر کہا۔

”ہاں۔“ وہ جھجائی۔

باری نے بے بسی سے قدم آگے بڑھا دیئے۔ کتے ان کے پیچھے پیچھے برنی طرح بھونکتے ہوئے دوڑ پڑے۔

”ان کتوں کو گولی کیوں نہیں مارتے؟“ وہ باری کے قریب ہوتے ہوئے ناگواری سے کہہ رہی تھی۔

”کبھی ضرورت پیش آئی نہ دھیان آیا اور کیوں ماریں بے گناہوں کو؟“ وہ ہنسی سے گویا ہوا۔

”ابھی میری یا تمہاری ٹانگ پکڑ لی تو گناہ گار ہو جائیگے، پھر تم مار دو گے گولی؟“

”ابھی میری یا تمہاری ٹانگ پکڑ لی تو گناہ گار ہو جائیگے، پھر تم مار دو گے گولی؟“ وہ دوبارہ اپنے کام میں مشغول ہو گئی۔

”ابھی میری یا تمہاری ٹانگ پکڑ لی تو گناہ گار ہو جائیگے، پھر تم مار دو گے گولی؟“ وہ دوبارہ اپنے کام میں مشغول ہو گئی۔

”ابھی میری یا تمہاری ٹانگ پکڑ لی تو گناہ گار ہو جائیگے، پھر تم مار دو گے گولی؟“ وہ دوبارہ اپنے کام میں مشغول ہو گئی۔

”ابھی میری یا تمہاری ٹانگ پکڑ لی تو گناہ گار ہو جائیگے، پھر تم مار دو گے گولی؟“ وہ دوبارہ اپنے کام میں مشغول ہو گئی۔

”ابھی میری یا تمہاری ٹانگ پکڑ لی تو گناہ گار ہو جائیگے، پھر تم مار دو گے گولی؟“ وہ دوبارہ اپنے کام میں مشغول ہو گئی۔

”ابھی میری یا تمہاری ٹانگ پکڑ لی تو گناہ گار ہو جائیگے، پھر تم مار دو گے گولی؟“ وہ دوبارہ اپنے کام میں مشغول ہو گئی۔

”ابھی میری یا تمہاری ٹانگ پکڑ لی تو گناہ گار ہو جائیگے، پھر تم مار دو گے گولی؟“ وہ دوبارہ اپنے کام میں مشغول ہو گئی۔

”ابھی میری یا تمہاری ٹانگ پکڑ لی تو گناہ گار ہو جائیگے، پھر تم مار دو گے گولی؟“ وہ دوبارہ اپنے کام میں مشغول ہو گئی۔

”ابھی میری یا تمہاری ٹانگ پکڑ لی تو گناہ گار ہو جائیگے، پھر تم مار دو گے گولی؟“ وہ دوبارہ اپنے کام میں مشغول ہو گئی۔

”ابھی میری یا تمہاری ٹانگ پکڑ لی تو گناہ گار ہو جائیگے، پھر تم مار دو گے گولی؟“ وہ دوبارہ اپنے کام میں مشغول ہو گئی۔

”ابھی میری یا تمہاری ٹانگ پکڑ لی تو گناہ گار ہو جائیگے، پھر تم مار دو گے گولی؟“ وہ دوبارہ اپنے کام میں مشغول ہو گئی۔

”ابھی میری یا تمہاری ٹانگ پکڑ لی تو گناہ گار ہو جائیگے، پھر تم مار دو گے گولی؟“ وہ دوبارہ اپنے کام میں مشغول ہو گئی۔

”ابھی میری یا تمہاری ٹانگ پکڑ لی تو گناہ گار ہو جائیگے، پھر تم مار دو گے گولی؟“ وہ دوبارہ اپنے کام میں مشغول ہو گئی۔

”ابھی میری یا تمہاری ٹانگ پکڑ لی تو گناہ گار ہو جائیگے، پھر تم مار دو گے گولی؟“ وہ دوبارہ اپنے کام میں مشغول ہو گئی۔

”ابھی میری یا تمہاری ٹانگ پکڑ لی تو گناہ گار ہو جائیگے، پھر تم مار دو گے گولی؟“ وہ دوبارہ اپنے کام میں مشغول ہو گئی۔

”ابھی میری یا تمہاری ٹانگ پکڑ لی تو گناہ گار ہو جائیگے، پھر تم مار دو گے گولی؟“ وہ دوبارہ اپنے کام میں مشغول ہو گئی۔

”ابھی میری یا تمہاری ٹانگ پکڑ لی تو گناہ گار ہو جائیگے، پھر تم مار دو گے گولی؟“ وہ دوبارہ اپنے کام میں مشغول ہو گئی۔

”ابھی میری یا تمہاری ٹانگ پکڑ لی تو گناہ گار ہو جائیگے، پھر تم مار دو گے گولی؟“ وہ دوبارہ اپنے کام میں مشغول ہو گئی۔

”ابھی میری یا تمہاری ٹانگ پکڑ لی تو گناہ گار ہو جائیگے، پھر تم مار دو گے گولی؟“ وہ دوبارہ اپنے کام میں مشغول ہو گئی۔

”ابھی میری یا تمہاری ٹانگ پکڑ لی تو گناہ گار ہو جائیگے، پھر تم مار دو گے گولی؟“ وہ دوبارہ اپنے کام میں مشغول ہو گئی۔

”ابھی میری یا تمہاری ٹانگ پکڑ لی تو گناہ گار ہو جائیگے، پھر تم مار دو گے گولی؟“ وہ دوبارہ اپنے کام میں مشغول ہو گئی۔

”ابھی میری یا تمہاری ٹانگ پکڑ لی تو گناہ گار ہو جائیگے، پھر تم مار دو گے گولی؟“ وہ دوبارہ اپنے کام میں مشغول ہو گئی۔

”ابھی میری یا تمہاری ٹانگ پکڑ لی تو گناہ گار ہو جائیگے، پھر تم مار دو گے گولی؟“ وہ دوبارہ اپنے کام میں مشغول ہو گئی۔

”ابھی میری یا تمہاری ٹانگ پکڑ لی تو گناہ گار ہو جائیگے، پھر تم مار دو گے گولی؟“ وہ دوبارہ اپنے کام میں مشغول ہو گئی۔

”ابھی میری یا تمہاری ٹانگ پکڑ لی تو گناہ گار ہو جائیگے، پھر تم مار دو گے گولی؟“ وہ دوبارہ اپنے کام میں مشغول ہو گئی۔

”ابھی میری یا تمہاری ٹانگ پکڑ لی تو گناہ گار ہو جائیگے، پھر تم مار دو گے گولی؟“ وہ دوبارہ اپنے کام میں مشغول ہو گئی۔

”یہ کون ہے؟ اسے کیا ہوا؟“ روشی تعجب سے انہیں دیکھ رہی تھی۔

”اس کے جواب باری کے پاس ہیں، وہ نہیں ملا تمہیں؟“ جھومر نے قہقہے سے ہنسنے کی کوشش کی۔
میں جواب دیا۔

”سرسوتی! باری باہر کھڑا ہے، بلا کر لاؤ۔“ اس نے سرسوتی کو حکم دیا۔

سرسوتی یوں بھاگ گئی جیسے منتظر ہی تھی۔

چند منٹوں بعد باری اندر داخل ہوا۔

”آپ کا کام مکمل ہو گیا۔“ وہ براہ راست جھومر سے مخاطب ہوا۔

”ہاں، ہمارا کام مکمل ہو چکا، مگر تمہارا کام شروع ہے۔“ اس نے روشی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے معنی سمجھا کر کہا۔

باری الجھ کر روشی کو دیکھنے لگا۔

”کون ہے یہ؟“ اس نے بڑی خوفناک سنجیدگی کے ساتھ اس سے سوال کیا۔

باری خاموش رہا۔

”کیا پوچھ رہی ہوں میں؟ کون ہے یہ؟ اسے کیا ہوا ہے؟ اس کے پاؤں میں بیڑیاں کس نے ڈالی ہیں؟“
وہ ہذیانی انداز میں چیخا۔

”یہ کچھ نہیں بتائے گا روشی بی بی! بلکہ میں بھی نہیں بتاؤں گی کہ میں کون ہوں؟ یہ آپ کے راستے نہیں ہیں۔“
خوشیوں بھری زندگی کی طرف پلٹ جائیں، آپ کیلئے یہی بہتر ہے۔“ عورت اپنا سر پکڑ کر چارپائی پر ڈھلے گئی۔
روشی ساکت سی کھڑی اسے دیکھتی رہی، پھر مزید آگے بڑھی۔

”کیا نام تمہارا؟“ اس نے حاکمانہ انداز میں نام پوچھا۔
”بد نصیبی، روسیای، اندھیرا، تاریکی، کنیز، غلام زادی۔“ عورت نے جیسے چکراتے ہوئے سر کو تھما۔
”میں نے تمہارے تخلص نہیں، نام پوچھا ہے۔“ وہ سختی سے گویا ہوئی۔

”آپ نام جان لیں گی، کیا فرق پڑے گا، مجھے یا آپ کو۔۔۔۔۔ آہ!“ وہ کراہتے ہوئے بولی۔

”جھومر بھابی! کیا نام ہے اس کا؟ کون ہے یہ؟“ وہ جیسے ہذیانی ہو گئی۔

”روشی بی بی! آئیے واپس چلیں، آپ کچھ دیکھنا چاہتی تھیں، آپ نے دیکھ لیا، لائیے جھومر بھابی! یہ باکس مجھے۔“

ری کا سکون کمال تھا۔

تیزی سے باری کی جانب بڑھی اور اس کا بازو پکڑ کر زور سے جھٹکا دیا۔

”جاؤں گی اس وقت تک جب تک مجھے یہ پتہ نہ چل جائے کہ یہ کون ہے اس کا نام کیا ہے؟“ وہ پھر بولنے لگی۔

”سب کا پتہ نہ تھا۔“ وہ اپنے بازو سے ہٹایا۔ وہ اتنی حیران پریشان تھی کہ وہ اندر اندر پڑنے لگا۔ اس کا نرم
پیرا پیرا جسم کون سے نہ چھوٹتا ہو۔ پھر اس کی طرف دیکھا۔ وہ دم بخود سی اسے ہی دیکھ رہی تھی۔ اسے برسوں کی
سب کا پتہ نہ تھا۔

”سب کا پتہ نہ تھا۔“ وہ اپنے بازو سے ہٹایا۔ وہ اتنی حیران پریشان تھی کہ وہ اندر اندر پڑنے لگا۔ اس کا نرم
پیرا پیرا جسم کون سے نہ چھوٹتا ہو۔ پھر اس کی طرف دیکھا۔ وہ دم بخود سی اسے ہی دیکھ رہی تھی۔ اسے برسوں کی
سب کا پتہ نہ تھا۔

”سب کا پتہ نہ تھا۔“ وہ اپنے بازو سے ہٹایا۔ وہ اتنی حیران پریشان تھی کہ وہ اندر اندر پڑنے لگا۔ اس کا نرم
پیرا پیرا جسم کون سے نہ چھوٹتا ہو۔ پھر اس کی طرف دیکھا۔ وہ دم بخود سی اسے ہی دیکھ رہی تھی۔ اسے برسوں کی
سب کا پتہ نہ تھا۔

”سب کا پتہ نہ تھا۔“ وہ اپنے بازو سے ہٹایا۔ وہ اتنی حیران پریشان تھی کہ وہ اندر اندر پڑنے لگا۔ اس کا نرم
پیرا پیرا جسم کون سے نہ چھوٹتا ہو۔ پھر اس کی طرف دیکھا۔ وہ دم بخود سی اسے ہی دیکھ رہی تھی۔ اسے برسوں کی
سب کا پتہ نہ تھا۔

”سب کا پتہ نہ تھا۔“ وہ اپنے بازو سے ہٹایا۔ وہ اتنی حیران پریشان تھی کہ وہ اندر اندر پڑنے لگا۔ اس کا نرم
پیرا پیرا جسم کون سے نہ چھوٹتا ہو۔ پھر اس کی طرف دیکھا۔ وہ دم بخود سی اسے ہی دیکھ رہی تھی۔ اسے برسوں کی
سب کا پتہ نہ تھا۔

”سب کا پتہ نہ تھا۔“ وہ اپنے بازو سے ہٹایا۔ وہ اتنی حیران پریشان تھی کہ وہ اندر اندر پڑنے لگا۔ اس کا نرم
پیرا پیرا جسم کون سے نہ چھوٹتا ہو۔ پھر اس کی طرف دیکھا۔ وہ دم بخود سی اسے ہی دیکھ رہی تھی۔ اسے برسوں کی
سب کا پتہ نہ تھا۔

”سب کا پتہ نہ تھا۔“ وہ اپنے بازو سے ہٹایا۔ وہ اتنی حیران پریشان تھی کہ وہ اندر اندر پڑنے لگا۔ اس کا نرم
پیرا پیرا جسم کون سے نہ چھوٹتا ہو۔ پھر اس کی طرف دیکھا۔ وہ دم بخود سی اسے ہی دیکھ رہی تھی۔ اسے برسوں کی
سب کا پتہ نہ تھا۔

”سب کا پتہ نہ تھا۔“ وہ اپنے بازو سے ہٹایا۔ وہ اتنی حیران پریشان تھی کہ وہ اندر اندر پڑنے لگا۔ اس کا نرم
پیرا پیرا جسم کون سے نہ چھوٹتا ہو۔ پھر اس کی طرف دیکھا۔ وہ دم بخود سی اسے ہی دیکھ رہی تھی۔ اسے برسوں کی
سب کا پتہ نہ تھا۔

”سب کا پتہ نہ تھا۔“ وہ اپنے بازو سے ہٹایا۔ وہ اتنی حیران پریشان تھی کہ وہ اندر اندر پڑنے لگا۔ اس کا نرم
پیرا پیرا جسم کون سے نہ چھوٹتا ہو۔ پھر اس کی طرف دیکھا۔ وہ دم بخود سی اسے ہی دیکھ رہی تھی۔ اسے برسوں کی
سب کا پتہ نہ تھا۔

”سب کا پتہ نہ تھا۔“ وہ اپنے بازو سے ہٹایا۔ وہ اتنی حیران پریشان تھی کہ وہ اندر اندر پڑنے لگا۔ اس کا نرم
پیرا پیرا جسم کون سے نہ چھوٹتا ہو۔ پھر اس کی طرف دیکھا۔ وہ دم بخود سی اسے ہی دیکھ رہی تھی۔ اسے برسوں کی
سب کا پتہ نہ تھا۔

”سب کا پتہ نہ تھا۔“ وہ اپنے بازو سے ہٹایا۔ وہ اتنی حیران پریشان تھی کہ وہ اندر اندر پڑنے لگا۔ اس کا نرم
پیرا پیرا جسم کون سے نہ چھوٹتا ہو۔ پھر اس کی طرف دیکھا۔ وہ دم بخود سی اسے ہی دیکھ رہی تھی۔ اسے برسوں کی
سب کا پتہ نہ تھا۔

”سب کا پتہ نہ تھا۔“ وہ اپنے بازو سے ہٹایا۔ وہ اتنی حیران پریشان تھی کہ وہ اندر اندر پڑنے لگا۔ اس کا نرم
پیرا پیرا جسم کون سے نہ چھوٹتا ہو۔ پھر اس کی طرف دیکھا۔ وہ دم بخود سی اسے ہی دیکھ رہی تھی۔ اسے برسوں کی
سب کا پتہ نہ تھا۔

”سب کا پتہ نہ تھا۔“ وہ اپنے بازو سے ہٹایا۔ وہ اتنی حیران پریشان تھی کہ وہ اندر اندر پڑنے لگا۔ اس کا نرم
پیرا پیرا جسم کون سے نہ چھوٹتا ہو۔ پھر اس کی طرف دیکھا۔ وہ دم بخود سی اسے ہی دیکھ رہی تھی۔ اسے برسوں کی
سب کا پتہ نہ تھا۔

”سب کا پتہ نہ تھا۔“ وہ اپنے بازو سے ہٹایا۔ وہ اتنی حیران پریشان تھی کہ وہ اندر اندر پڑنے لگا۔ اس کا نرم
پیرا پیرا جسم کون سے نہ چھوٹتا ہو۔ پھر اس کی طرف دیکھا۔ وہ دم بخود سی اسے ہی دیکھ رہی تھی۔ اسے برسوں کی
سب کا پتہ نہ تھا۔

”سب کا پتہ نہ تھا۔“ وہ اپنے بازو سے ہٹایا۔ وہ اتنی حیران پریشان تھی کہ وہ اندر اندر پڑنے لگا۔ اس کا نرم
پیرا پیرا جسم کون سے نہ چھوٹتا ہو۔ پھر اس کی طرف دیکھا۔ وہ دم بخود سی اسے ہی دیکھ رہی تھی۔ اسے برسوں کی
سب کا پتہ نہ تھا۔

”سب کا پتہ نہ تھا۔“ وہ اپنے بازو سے ہٹایا۔ وہ اتنی حیران پریشان تھی کہ وہ اندر اندر پڑنے لگا۔ اس کا نرم
پیرا پیرا جسم کون سے نہ چھوٹتا ہو۔ پھر اس کی طرف دیکھا۔ وہ دم بخود سی اسے ہی دیکھ رہی تھی۔ اسے برسوں کی
سب کا پتہ نہ تھا۔

”سب کا پتہ نہ تھا۔“ وہ اپنے بازو سے ہٹایا۔ وہ اتنی حیران پریشان تھی کہ وہ اندر اندر پڑنے لگا۔ اس کا نرم
پیرا پیرا جسم کون سے نہ چھوٹتا ہو۔ پھر اس کی طرف دیکھا۔ وہ دم بخود سی اسے ہی دیکھ رہی تھی۔ اسے برسوں کی
سب کا پتہ نہ تھا۔

”سب کا پتہ نہ تھا۔“ وہ اپنے بازو سے ہٹایا۔ وہ اتنی حیران پریشان تھی کہ وہ اندر اندر پڑنے لگا۔ اس کا نرم
پیرا پیرا جسم کون سے نہ چھوٹتا ہو۔ پھر اس کی طرف دیکھا۔ وہ دم بخود سی اسے ہی دیکھ رہی تھی۔ اسے برسوں کی
سب کا پتہ نہ تھا۔

”سب کا پتہ نہ تھا۔“ وہ اپنے بازو سے ہٹایا۔ وہ اتنی حیران پریشان تھی کہ وہ اندر اندر پڑنے لگا۔ اس کا نرم
پیرا پیرا جسم کون سے نہ چھوٹتا ہو۔ پھر اس کی طرف دیکھا۔ وہ دم بخود سی اسے ہی دیکھ رہی تھی۔ اسے برسوں کی
سب کا پتہ نہ تھا۔

”سب کا پتہ نہ تھا۔“ وہ اپنے بازو سے ہٹایا۔ وہ اتنی حیران پریشان تھی کہ وہ اندر اندر پڑنے لگا۔ اس کا نرم
پیرا پیرا جسم کون سے نہ چھوٹتا ہو۔ پھر اس کی طرف دیکھا۔ وہ دم بخود سی اسے ہی دیکھ رہی تھی۔ اسے برسوں کی
سب کا پتہ نہ تھا۔

”سب کا پتہ نہ تھا۔“ وہ اپنے بازو سے ہٹایا۔ وہ اتنی حیران پریشان تھی کہ وہ اندر اندر پڑنے لگا۔ اس کا نرم
پیرا پیرا جسم کون سے نہ چھوٹتا ہو۔ پھر اس کی طرف دیکھا۔ وہ دم بخود سی اسے ہی دیکھ رہی تھی۔ اسے برسوں کی
سب کا پتہ نہ تھا۔

”مطربہ! اتنا خوبصورت نام کون ہو تم؟“ روشی بے قرار سے انداز میں اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کا چہرہ بڑھ گیا۔

عورت خاموش رہی۔

”باری! یہ کون ہے؟“ اس کی تشویش قابل دید تھی۔

”میں آپ کو بتا دوں گا، مگر شرط یہ ہے کہ آپ اس وقت میرے ساتھ چلیں۔“
موقع سے فائدہ اٹھانا اس کی مجبوری تھی۔

”اور جو نہیں بتایا؟“ وہ اس کی طرف سے پرامتہ نہیں تھی۔

”میں نے کہا ناں، بتا دوں گا، آئیے پلیز!“ نیند سے اس کی بری حالت ہو رہی تھی۔
روشی آگے بڑھتے ہوئے ہنکچا رہی تھی۔

”باری!“ جھومر نے آواز دی۔

باری جو پلٹ چکا تھا، آگے بڑھتے بڑھتے رک گیا۔ مگر مزا نہیں۔

”اب کب آؤ گے؟“

روشی کا وجود جیسے آگ میں جلنے لگا۔ اس نے نہایت سلتکی ہوئی نظریں اٹھا کر جھومر کی طرف دیکھا۔

”مانسڈیور بزنس بھابی! آپ کو باری کے آنے جانے سے کوئی دلچسپی نہیں ہو، چاہیے۔“

”باہر آئیے آپ مجھے تالا لگانا ہے، چلو سر سوتی باہر نکلو۔“ باری نے باہر نکل کر سر سوتی کو حکم دیا۔
سر سوتی شتم پشتم باہر آگئی۔

”میں باہر نہیں آسکتی، یہ پیاسی نہ مر جائے۔“ جھومر نے انکار کر دیا۔

”تالا لگانے کی کوئی ضرورت نہیں، کہیں بھاگے نہیں جا رہے ہم۔“ وہ تنک کر بولی۔

باری کی جھلاہٹ نیند کی وجہ سے سوا تھی۔ اس نے دھڑ سے دروازہ بند کیا اور کھٹاک سے سنڈلی لگا کر

چابیاں جیب میں ڈالتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔ روشی اس کے پیچھے پیچھے دوڑی۔

”ارے جھومر بھابی کو بھی بند کر دیا۔“

”آپ چاہیں تو آپ بھی ان دونوں کے پاس قیام کر سکتی ہیں۔“ وہ جھلایا۔

روشی تقریباً بھاگتی ہوئی اس کے پہلو میں پہنچی۔

”حد ہو گئی ہے تم سے بھی.....!“ وہ بڑبڑائی۔

”میں صبح کو آپ کیلئے ’سلیپنگ پلز‘ کے پیک لے آؤں گا۔ چھپا کر رکھ دیجئے گا سب سے۔“

کریں گی۔

وہ باہر آچکے تھے اور کتے ”اودور ٹائم“ پر کام شروع کر چکے تھے۔

نیم رات پہنچنے کے بعد وہ حویلی کی راہداری میں پہنچ چکے تھے۔
نیم رات کون ہے یہ عورت؟“ وہ وہیں رک گئی۔

”اب نواب نہیں ہے میرا بھائی بچی کچی نیند بھی ضائع کر دوں۔ ہر رات کی صبح بھی ہوتی ہے شاید آپ بھول گئیں۔“
”ہے کرے میں جانے کے ارادے سے تیزی سے چلتا ہوا زینے کی طرف بڑھ گیا۔

”بیسے میں رہ گئی۔“

”بہن چاہتا ہے کہ وہ کروں تمہارے ساتھ کہ عمر بھر یاد رکھو۔ پھر سوچتی ہوں، مرے کو کیا مارنا۔ بہت ترس کھانے کی

”بہن! تم پر اگر عجیب طبیعت ہے۔ بدلہ لئے بغیر سکون نہیں آئے گا۔ اتنی ڈھیر ساری راتیں قرض ہیں تم پر۔“

”نہیں! جاؤ گے۔ میری اب کوئی دعا نہیں ہے سوائے اس دعا کے.....!“

”اے! اس سے پہلے صرف یہ دیکھ سکوں کہ تم ”بار“ کر کیسے لگ رہے ہو۔ تمہارا ضبط ٹوٹ رہا ہے، تم حالت بے بسی

”میرا زور دی دو، تمہاری جادو اثر آنکھیں، تمہاری مستحکم چال، میرے سامنے ریت کی طرح نکھری پڑی ہے۔“

”نہیں! اب تو سکون تب ہی آئے گا۔“

”ہے کرے کی جانب بڑھتی ہوئی ایک ان دیکھی آگ میں بھڑبھڑا رہی تھی۔“

”نہیں! تیرا مرد کیا ”دوسری“ کے چکر میں تھا؟“ ”نانی حنیفہ پر“ ”سوت“ آئی تھی۔ اس کی تان دوسری اور تیسری پر ہی

”نہیں! کہاں تھے اس میں کہ آسانی سے جان چھوٹ جاتی (بالو جل کر سوچ رہی تھی۔ برتن رگڑنے میں مزید تیزی آ

”نہیں! اس کے پاؤں دھو کر چیتا تھا۔ اس نمک حرام کا مقدر ہی خراب ہے۔“

”نہیں! ناف گولان کو دھوپ لگا رہی تھی۔ وہیں سے ترخ کر بولی۔“

”نہیں! تروالیہ اس نے۔“ ”بی جن کو جیسے سونا جانے کا بڑا دکھ تھا۔“

”نہیں! تروالیہ اس نے۔“ ”بی جن کو جیسے سونا جانے کا بڑا دکھ تھا۔“

”نہیں! تروالیہ اس نے۔“ ”بی جن کو جیسے سونا جانے کا بڑا دکھ تھا۔“

”نہیں! تروالیہ اس نے۔“ ”بی جن کو جیسے سونا جانے کا بڑا دکھ تھا۔“

”نہیں! تروالیہ اس نے۔“ ”بی جن کو جیسے سونا جانے کا بڑا دکھ تھا۔“

”نہیں! تروالیہ اس نے۔“ ”بی جن کو جیسے سونا جانے کا بڑا دکھ تھا۔“

”نہیں! تروالیہ اس نے۔“ ”بی جن کو جیسے سونا جانے کا بڑا دکھ تھا۔“

کھسکاتے ہوئے مزید کر رہا تھا۔

”اب کوئی اتنے پریشان کیوں نہیں ہو رہا؟“ خوشی پر خوشی کیوں نہیں ہیں۔ آپ کو میرے لیے دوپٹے سے ہاتھ پونچھتے ہوئے چمکے ہوئے سے محراب ہوئی۔

”خوشی! کوئی اتنے غیب سے اس کی صورت دیکھی۔“

”یہ تو خوشی ہے؟ اور تو اور یہ وہ کوئی ہوتو نہیں ہے۔ کیا زبان ہوئی ہے ہاتھ ہرکا ہرکا؟“

”جیسے نہ تھے تو تھے وہاں۔ میں وہاں میں کھینچتی تھی۔ ہم نے خود دیکھ کر تھک کر اتر کر اس کے روبرو میں ایک۔ یہ ہاتھ تک راضی نہیں تھی، مگر لال خان کے طور پر جیتے ہوئے ساتھ ساتھ بھٹے تھے کہ ایک دن وہاں دیکھنے کو نہیں ملتے۔ بد نصیب کے نصیب میں کبھی نہیں ہے۔ پھر سا آ بیٹھا ہے چھاتی پر۔

اس کا باپ تو پہلے ہی بیمار تھا۔ اب تو یہ صدمہ میرے منہ میں نہ کہ اسے کھائی جائیگا۔

پھر کمرے کا بھرا ہوا گھر فریج تک تو وہ بڑے والا، ٹیلی ویژن رنگ والا بڑا مہنگا آتا ہے وہ دودھ اسٹریکٹ پر بنانے کی شربت گھولنے (جوس) بجلی کی مشین، کپڑے دھونے کی یہ بڑی سی مشین اسی میں دھواؤں میں کھانے جان کر نہیں لگواتا تھا کہ اپنے سیدھے لوگ اس کی عورت کو چھیڑیں گے اکیلی کا رہتی رہا۔

اس کی ماں کلس کلس کر نعین یاد کر رہی تھی۔

”ٹھیک کہہ رہی ہے یہ ایسا بھرا گھر محلے کی کسی لڑکی کو نصیب نہیں ہوا۔“ تانی حنیف نے تائیدی۔

(اور وہ بھرے گھر والا۔۔۔ بڑی تو ند اور پانچ مصنوعی دانٹوں کے ساتھ امریکہ کا صدر نظر آتا تو جیسے نہ ہو۔)

آدھا گھنٹہ اس کے ساتھ۔ بڑی بی ”جن پری“ کا میل کیا تھا، میرے باپ نے مشینوں سے بیٹی بیاہی تھی۔ ہنہ۔ ”اری! اگر جھگڑا ہوا ہے تو کوئی بات نہیں۔ میاں بیوی جھگڑا کیا ہی کرتے ہیں۔ ابھی ”کانڈ“ تو نہیں ہوا۔ دو چار لوگ بچے میں پڑیں تو صلح صفائی ہو سکتی ہے۔“ اماں جن نے روشنی کی کرن ڈھونڈنے کی کوشش کی۔

”مجھے نہیں کرنی صلح صفائی۔ آپ لوگ اپنے دماغ میرے مسئلے میں نہ کھپائیں۔ مہربانی ہوگی۔“ دو ٹوک انداز۔

”دیکھ لو اماں! اس کے رنگ ڈھنک۔“ اس کی ماں نے شکایتی انداز میں بڑھیا سے کہا۔

”کیوں اپنے باپ کا وزن بڑھا رہی ہے۔ کل کو نیا ”جی“ تیری گود میں کھیلے گا۔ تیرے باپ کو جی ”تانی“

حنیفہ تارخگی سے بولی۔

”کوئی نہیں کھیلے گا میری گود میں اپنے لئے میں کسی فیکٹری میں نوکری کر لوں گی۔“ اس نے فوراً جواب دیا۔

”طلاق لینے سے تجھ میں ہیرے موتی ٹنکس گے؟“ بڑھیا برا فرودختہ ہوئی۔

”ہاں۔“ وہ مزخ کر بولی اور اندر کمرے میں چلی گئی۔

”تو چاہ تو کر بالو کی ماں بات کیا ہوئی ہے؟“ اماں حنیفہ تشویش سے بولی۔

”میں تو اس کا باپ لال خان مل کر ہی نہیں دے رہا۔“ اس کی ماں مایوسی سے بولی۔

”خود چاہو تو لال خان مل کر رہے گا۔ اسی کی سن کر آجائیگا۔“ اماں جن نے مشورہ دیا۔

”مگر یہ بد نصیب تو وہاں جانے پر راضی ہی نہیں۔“ اس کی ماں بے چارگی سے گویا ہوئی۔

”تو چاہو تو سنو! یہ بعد کی باتیں ہیں۔“ تانی حنیفہ نے زور لگایا۔

”چھوٹی چوٹی کی دغا کرنا تم۔“

”میں بڑھوں نے اسی وقت آنچل پھیلا کر دغا کرنا شروع کر دی۔ جیسے واقعی دودھا کیلئے کسی تاکید کی منتظر تھیں۔“

”بنو اور باور علی خان ہری پور جانے کیلئے تیار ہی تھے کہ بابا صاحب کا حکم آ گیا۔“

”یہ کسے سرال والے تاریخ لینے آرہے ہیں اس لئے وہ ایک دن مزید رک جائیں۔“

”بنو جب یہ حکم ملا وہ بال کی طرف آرہی تھی۔ الوداعی ملاقات کی غرض سے چال کا انداز ایک دم ہی بدل گیا۔“

”تاریخ لینے، مگر روشنی ابھی تو اس سے کھل کر بات کرنا تھی۔ پھر باور علی خان سے ڈسکس کرنا تھا۔“

”اب روٹیں تھی تو روشنی کے معاملات سے غیر متعلق تھی، مگر اب وہ اس کے اہم ترین فرائض میں شامل تھی۔“

”بہت آہستہ آہستہ چلتی ہوئی ہال میں داخل ہوئی۔“

”نیکوں نے اسے دیکھتے ہی خوشی سے نعرہ مارا۔“

”اسلام ٹیکم۔“ اس نے بیٹھنے کی جگہ تلاش کرنے کے ساتھ ساتھ لڑکیوں پر نظر دوڑا کر روشنی کو بھی تلاش کیا۔

”خوشی! پتہ لگی آپ کو؟“ یہ نے خوشی سے سرشار آواز میں مابین سے سوال کیا۔

”خوشی! کسی شہری؟“ اس نے قدرے انجان بن کر سوال کیا۔

”کسے! آپ کو نہیں پتا؟ حالانکہ آپ کو تو سب سے پہلے پتا چلنا چاہیے۔ روشنی کے سرال والے تاریخ لینے آرہے ہیں۔“

”میرے لیے یہ اندیشہ نہیں۔ وہ لوگ عید سے پہلے شادی کرنا چاہ رہے ہیں۔“

”آپ تیسے کون سی تاریخ مناسب رہے گی؟“

”خوشی سے پھولی رہا ہی تھی۔“

”یہ تو روشنی سے ہی ڈسکس کرنا ہوگا۔“ مابین بے ساختہ مسکرا دی۔

”کسے! کونسا روشنی کو کیا آج اصطبل نمنا کر سوتی ہے۔“ روبی نے آواز لگائی۔

”میں نے تو کہا کہ جو کس جگہ جاؤ۔ ہونٹیں نیندیں پوری۔“ روبی نے بیہ کو مخاطب کیا۔

”میں نے تو کہا کہ جو کس جگہ جاؤ۔ ہونٹیں نیندیں پوری۔“ روبی نے بیہ کو مخاطب کیا۔

”میں نے تو کہا کہ جو کس جگہ جاؤ۔ ہونٹیں نیندیں پوری۔“ روبی نے بیہ کو مخاطب کیا۔

”میں نے تو کہا کہ جو کس جگہ جاؤ۔ ہونٹیں نیندیں پوری۔“ روبی نے بیہ کو مخاطب کیا۔

”میں نے تو کہا کہ جو کس جگہ جاؤ۔ ہونٹیں نیندیں پوری۔“ روبی نے بیہ کو مخاطب کیا۔

”میں نے تو کہا کہ جو کس جگہ جاؤ۔ ہونٹیں نیندیں پوری۔“ روبی نے بیہ کو مخاطب کیا۔

ہیں۔ یہی گھر میں۔ آپ فکر نہ کریں۔ ایسی کوئی خاص بات نہیں ہے۔ میں خود آپ سے تفصیلی بات کرنے کیلئے بے

میں ہوں۔“

آہستہ سے اپنا ہاتھ چھڑا کر باہر چلی گئی۔

”کیا یہ ابھی سے تیار ہونے چلی گئی؟“ دور کونے میں اوندھی لیٹی میگزین الٹ پلٹ کرتی لالی نے واک مین کا ہاتھ سے آہستگی سے اپنا ہاتھ چھڑا کر باہر چلی گئی۔

Male پر پس لرے میراں کے۔
 ”ہونہ۔ ابھی سے۔“ شیو نے ننگ کے دوران استہزائیہ ”ہونہ“ کہنے کی فرصت نکالی۔ ”اب تو خیر وہ تیار نہیں ہو رہی۔ وہ ”تب“ بھی تیار نہیں ہوگی۔“

یہ وہ "تب" جسے تیار کریں ہوں۔
وہ بظاہر بے نیازی سے کہہ کر چھٹے لٹے دوسیدھے کر۔ نے لگیں۔ وہ سینر میں بے حساب ننگ کیا کرتی تھیں۔
"کیوں تیار نہیں ہوگی۔ کیا شرمائے گی؟ تو منع کیا ہے کسی نے۔ تیار ہو کر شرمائے۔" مریم کو "بدشگونی" سے نہایت
تکلیف ہوتی ہوئی۔

”وہ نہیں شرماتی ورماتی۔ اسے تو اپنے حصے کا کام دوسروں پر ڈالنے کی عادت ہے۔ نعیم سے کہہ دے گی۔ میرے حصے کا تم شرمالو۔ میرا موڈ نہیں ہو رہا۔“ زری نے کچھ علیحدہ نقشہ پیش کیا۔

ساری لڑکیاں کھٹکھٹا کر ہنس پڑیں۔ مگر ماہین مصروف سی شینو کو جانچ رہی تھی۔ جن کا انداز یوں تو دوسروں سے تھا ہی مختلف۔ مگر روش سے متعلق تو وہ خاصی پہنچی ہوئی لگ رہی تھی۔

جلد ہی محسوس ہوا جیسے لڑکیاں اس کی ”چپ“ سے خاصی تشویش میں مبتلا ہو گئی ہیں۔ وہ فوراً ہی سنبھل گئی۔
سب شام کی تیاری کا موضوع لے کر باتیں کرنے لگیں۔

”سرسوتی“۔ اس نے گودام سے نکلتی سرسوتی کو آواز دی۔

”آسمان..... بی بی“۔ وہ رات کی وجہ سے بہت ڈری ہوئی تھی۔ گودام کا دروازہ کھلا چھوڑ کر بھاگی چلی آئی۔

”خان کدھر ہے؟“

”تساں کھلو جاؤ۔ ہن آساں“۔ وہ اصطلیل کی طرف دوڑ گئی۔

”گلو..... وہ ڈریسنگ کا آئینہ صاف نہیں ہوا تجھ سے دودن میں“۔ باغ سے آتی ہوئی لہراتی بل کھاتی کلو کو اس نے ٹوکا۔
 ”وہاں دھن میں تھی جس کے فرشتوں کو بھی افسوس نہیں تھی کہ وہ لوہوں راہ میں کھڑی ہوگی“۔ وہ دہل کر اپنی جگہ رک گئی تھی۔

”میں بھول گئی تھی بی بی۔ ماما نے مجھے سبزی لینے بھیج دیا تھا۔ پھر کھوکھر کہنے لگا کہ اس کی عورت بیمار ہے ذرا ہنڈیا چڑھا۔“

”اچھا چپ کر۔ اداؤں اور بہانوں کی پوٹلی۔ بقول نبی امی۔ اللہ تو بے کلو کی ادائیں نہ رکھی جائیں نہ اٹھائی جائیں۔“

شادی کے دن میں قریب

بنو ذرا دھیرے سے بولو

تانیہ، روٹی، لہک لہک کر گانے لگیں۔

روشی نے الجھ کر ماہین کی سمت دیکھا۔

”کس کی شامت آرہی ہے اب؟“ وہ منہ بنا کر مابین کے برابر میں بیٹھ گئی۔

”تمہارے سسرال والے آرہے ہیں تاریخ لینے“۔ ماہین نے سنجیدگی سے اسے مطلع کیا۔ ساتھ ساتھ یہ بھی
کا بھی بغور جائزہ لے رہی تھی۔

روشی تو جیسے ایک دم سناٹے میں آگئی۔ چند ثانیے تو اس سے ہوا ہی نہیں گیا۔

”سسرال والے“۔ کس قدر اجنبی سا محسوس ہوا تھا یہ لفظ۔

”کس بات کی تاریخ لینے“۔ وہ طیش پر قابو پاتے ہوئے بس اتنا ہی بول سکی۔

”جنگ کی“۔ روپی جل کر بولی۔

”اللہ نہ کرے۔ اچھی بات منہ سے نکالو“۔ مگھو نے ٹوکا۔

”آج شام چار بجے تک یہاں پہنچ جائیگے۔ تم اچھی طرح تیار ہو جانا“۔ مونہ نے کہا۔

”ٹھیک ہے‘ اعشاریہ تین چھ کا ایک ریوا اور سیون ایم ایم کی ایک رائفل وہ بھی لوڈو‘ مجھے دے دیجئے گا۔“

سے اچھی تیاری ہوگی۔“ اس نے کھولتے ہوئے لہجے میں کہا۔

مگلو زری، شیخو اور ماہین نے اس کے لہجے کا زہریلا پن یوں محسوس کیا تھا جیسے وہ ان کی ذات سے انحراف

لایا ابالی لڑکیوں نے اسے اس کا مخصوص ”اسٹائل“ سمجھ کر نظر انداز کر دیا تھا۔

ماہین نے بڑی ہی ”مطالعاتی نگاہ“ سے ان کا جائزہ لیا۔ پھر اس کا نرم گدے جیسا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام لیا۔

”بی ہیو یور سیلف۔ اپنا ٹیمپر لوڑ نہیں کرو۔“

”کیوں نہ کروں۔ انسانوں کو بھی یوں استعمال کرتے ہیں جیسے کچن میں ہلدی مرچ“۔ دو پڑا ہوا۔

’اس کا مطلب ہے شام کو کھانے پر بڑی مزیدار ڈشز ہوتی۔‘ مریم تصویر کو دوسرے رخ سے دیکھ رہی تھی۔

’رات کو‘۔ بیہ نے صحیح کی۔

’ہاں بھئی۔ وہی وہی‘۔ مریم نے صلح جو انداز میں جواب دیا۔

’جاؤ تم اپنے کمرے میں۔ میں وہیں آتی ہوں۔‘ مابین نے شور شراب کا مکدہ اٹھا کر پیچھے سے مار دیا۔

’ابھی تو میں اپنے ایک اہم مشن پر جا رہی ہوں۔ ابھی فی الحال آپ‘

ہے۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

مشن..... کیسا مشن۔ کیا تھرے باہر جا رہی ہوں؟“ مابین ابھی۔

”تو پیچھے جاتی ہے کیا؟“ (اس کا اشارہ حویلی کے پچھلے حصے کی طرف تھا)

”نہ جی..... میرا کیا کام۔ ایک بڑھا آتا ہے ادھر۔ وہ جھانڈو دے کر چلا جاتا ہے۔ سرسوتی کو ہوتے ہیں وہاں کام۔ جب دیکھو۔ آ رہی ہے۔ جب دیکھو جا رہی ہے۔“

”پیشہ وارانہ جیسی“ یہاں بھی تھی۔ کھونے ناک بھوں چڑھانے کا موقع گونا گونا مناسب نہیں سمجھا۔
”اور کس کو آتے جاتے دیکھا۔؟“

رات کے واقعے نے اس کی کھوپڑی الٹ کر رکھ دی تھی۔ نعیم کے گھر والوں کی آمد تک جیسے اس کیلئے عام بات ہو گئی تھی۔ جسے جب چاہے وہ اپنے طریقے سے ہینڈل کر سکتی تھی۔ دوسرے اسے اس معاملے میں اس لئے بھی تقویت ملے کہ یاور علی خان گھر پر موجود تھے۔ اور مابین کی شکل میں اسے مضبوط واسطہ میسر آچکا تھا۔ اس کا تو حال ماضی مستقبل جس نے گرد گھوم رہا تھا اس کیلئے اصل مسئلہ تو یہ تھا۔

”نہیں ادھر کوئی نہیں جاتا۔ بڑے خان کا حکم نہیں ہے۔ اور جی ادھر رکھا بھی کیا ہے۔ بس خان جی (باری) آتے پاتے ہیں ہر جگہ۔ وہ تو جی پوری حویلی میں پھرتے ہیں۔ بڑے کام ہوتے ہیں جی انہیں۔“

کھونے بڑی اپنائیت و دلسوزی سے کہا۔ (ہاں اسی کے کندھوں پر رکھی ہوئی ہے حویلی)

”او۔ خان..... اور نہیں اسے۔“ سرسوتی دوڑتی ہوئی واپس آئی۔ اس کا سانس بری طرح پھول رہا تھا۔
”تو پھر پیچھے گیا ہوا ہے؟“ اس نے سرسوتی سے پوچھا۔

”ایس ویلے تو وہ کدی نہیں جاؤندے نہیں۔“ سرسوتی نے نظریں چڑا کر جواب دیا۔

جانے کیوں اسے یوں محسوس ہوا جیسے سرسوتی جھوٹ بول رہی ہے۔ اور وہ اصطبل میں باری سے باقاعدہ بات کرے آ رہی ہے۔

”اور کون کون ہے اصطبل میں باری کے علاوہ۔“ اس نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

”ڈاکٹر ڈاکٹر (جانوروں کا ڈاکٹر) کوکھراے۔ دین محمد چوکیدار اے۔ اور چاچا پترانی۔“ وہ انھیوں پر گن کر سادگی سے بتانے لگی۔

”جانوروں کو انجکشن خان لگا رہا ہے یا ڈاکٹر؟“

”ڈاکٹر لگا رہا ہے۔ خان تے۔“ معاوہ ڈر کر رک گئی۔ اس کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔ روشنی اس گنوار کی رو بہ کار اپنے مقصد میں کامیاب ہو چکی تھی۔

سرسوتی خوفزدہ نظروں سے اسے دیکھنے لگی تھی۔ ساری لڑکیوں میں نوکروں کو اسی سے سب سے زیادہ خوف محسوس ہوتا تھا۔

روشنی چند ثانیے سرسوتی کو دیکھتی رہی۔

”اچھا۔ جاؤ تم۔“ اس نے پرسکون لہجے میں اسے جانے کو کہا۔ سرسوتی نے نہایت تعجب سے اسے دیکھا تھا۔ پھر اڑنے

تہ بند کئے۔ آخر نہیں آئی تھی۔
”چند لمحوں کی سوچ رہی۔ پھر وہاں میں جانب مڑ گئی۔ یہ راستہ اصطبل کو جاتا تھا۔“

باری ایک سفید گھوڑے کی پشت پر ہاتھ بھرتے ہوئے ڈاکٹر سے محو گفتگو تھا۔
”ایک ایک کون سے برآمد ہوتے دیکھ کر ٹھٹھک گیا بلکہ اپنی بات ہی بھول گیا۔“

”سرسوتی۔“ روشنی نے قریب پہنچ کر ڈاکٹر کو سلام کیا۔

”ہیکو سلام۔“ اس نے جواب دیتے ہوئے سوالیہ نظروں سے باری کی جانب دیکھا۔

”حویلی کے مالکوں میں سے ایک ہوتی ہیں۔“ باری نے سنبھل کر تعارف کرایا۔ ڈاکٹر ایک دم کانٹھس ہو گیا۔ اور خاصا سرب نظر آنے لگا۔

”بازی مڑ تو خاصا ٹھیک ہے۔ البتہ تاگ مٹی بہت ست ہے۔ جب سے سمن فروخت کیا ہے یہ اپنی ساری چوکڑی دہائی ہے۔“ باری نے سرے سے ڈاکٹر سے مخاطب ہوا۔

”روپوتی کا حال سنائیں۔ بچے کے صدمے سے سنبھلی یا نہیں؟“ ڈاکٹر اصطبل میں نظریں دوڑ کر پوچھنے لگا۔

”کوئی اسماعی نام نہیں تھا بے چاری کیلئے؟“ روشنی نے مداحات کی۔

”وہ اندر حویلی میں بہت ہیں۔“ باری نے ذوقی بات کہی۔ ڈاکٹر نے بے ساختہ قہقہہ لگایا تھا۔
روشنی برا سامہ بنا کر ادھر ادھر دیکھنے لگی۔

”ڈاکٹر سامنے ایک گھوڑے کی طرف بڑھا۔“

”کیسے زحمت کی؟“ باری نے من آنکھوں سے اس کی صورت دیکھی۔

”جھومر بھائی کا پوچھنے آئی ہوں۔ آزاد ہو گئیں؟“

”ابو ماشا اللہ خاصی آزاد ہیں۔“ وہ مسکرا کر ڈاکٹر کی حرکات و سکنات دیکھنے لگا۔

”میں نے ان بات کے حوالے سے بات کر رہی ہوں۔“ وہ جس کر بولی۔

”تعمیرات آپ طے کرے آئی ہیں۔ اتنا ہی فاصلہ پیچھے جانے کیلئے طے کرنا پڑتا ہے۔“ باری نے کچھ جتانے کی کوشش کی۔

”ہاں ہے مجھے۔ مجھے تم سے کچھ اور بھی پوچھتا ہے۔“ وہ ناگواری سے گویا ہوئی۔

”تہ۔ پوچھئے۔“ باری نے بنور ڈاکٹر پر نظریں جمائی ہوئی تھیں۔

”ڈاکٹر کون ہے؟“

”آپ صاحب سے پوچھئے۔ میں واقعی اسے نہیں جانتا۔“ باری نے واضح معذرت کی۔

”کیسے ممکن ہے کہ تم نے جاننے کی کوشش ہی نہ کی ہو؟“ اس نے مشکوک نظروں سے اسے دیکھا۔

”آپ مجھ پر یقین کریں مجھے کچھ نہیں معلوم۔ شاید اس نے جھومر بھائی کو بتایا ہو۔ آپ ان سے پوچھ لیجئے۔“ وہ خود کو

صاف پکارا تھا۔

”ان کو کیوں اس عورت سے نکرادیا۔ پوری حویلی کو بلیک میل کرتی پھر رہی گی۔“ صاحب سمیت پوچھا۔
وہ تم پر بہت آسانی سے قابو پالیں گی۔ مگر شاید تم بھی یہی چاہتے ہو۔“ روشی نے اس کے چہرے پر نظر نہ کیا۔
”یقین کیجئے۔ اس قصے میں میرا کوئی حصہ نہیں۔ اب وہ چاہے جو بھی کرتی پھرے۔“ باری نے سہانے لہجے میں جواب دیا۔

”کیا اس عورت نے بھابی کو سب کچھ بتا دیا ہوگا؟“ اس کی ذہنی روپٹ گئی تھی۔

”شاید۔ انہیں بہت انیسیت ہو چکی ہے اس سے۔“ باری نے جواب دیا۔

”انیسیت تو انہیں تم سے بھی بہت ہو چکی ہے۔“ روشی نے طنز سے مسکرا کر کہا۔

باری خاموش رہا۔ اور قریب کھڑے سفید ٹھوڑے کی پشت سہلانے لگا۔

”ایک بات سنو باری۔“

”جی؟“ وہ اس کے نئے انداز پر سنبھلا۔

”میں اتنی احمق نہیں ہوں جتنا تم نے سمجھ رکھا ہے۔ اس عورت کا انداز بتا رہا تھا کہ تم اس کے محرم راز ہو۔“
بڑے اعتماد سے کہا۔

”لا حول ولا قوۃ۔ ثقیل اردو استعمال کرنے کے شوق میں جانے آپ کیا کیا بول جاتی ہیں۔ کہ آپ کو احراز ہوتا۔“ وہ کھسیا کر بولا۔

”کیوں کیا بول گئی ہوں؟“ وہ بگڑی۔

”کچھ نہیں۔ بہر حال میں معذرت خواہ ہوں۔ کسی بھی قسم کی خدمت سے قاصر ہوں۔“ باری نے دونوں اندازوں میں دیکھو باری۔ اگر مجھے پتا چل گیا تھا کہ تمہیں سب کچھ پتا ہے تو اچھا نہیں ہوگا۔“ اس نے دھمکی دی۔ ہائیڈرو
اپنی مسکراہٹ ضبط کی۔

”ایک بات کہوں۔“ اس نے جاتی ہوئی روشی کو مخاطب کیا۔

روشی رک کر اس کی بات کا انتظار کرنے لگی۔

”اب تک جو کچھ ہوا ہے۔ واقعی اچھا نہیں ہوا ہے۔“ وہ شرارت سے گویا ہوا۔

”پتا چلے گا تاں تمہیں۔“ اس نے دانت پیسے۔

باری کا قبہ بے ساختہ تھا۔

وہ پاؤں پٹختی ہوئی وہاں سے واپس ہوئی تھی حالانکہ بات کچھ بھی نہیں تھی۔ اگرچہ جی تو حویلی کی دوسری طرف تھی۔
اپنے کام سے کام بھی رکھ سکتی تھی۔ مگر دماغ ہی کچھ ایسا تھا کہ جس بات کی ٹھان لی تو بس ٹھان لی۔
کتنی خوبصورت عورت۔ مگر پاؤں میں بیڑیاں۔ خون میں ڈوبا ہوا چہرہ۔ اس کے باوجود اس کی خوبصورتی بے حد تھی۔

”نہیں بیٹی۔ ایک اور خید تراش کے ہونٹ۔ اور۔ کس قدر منفرد اور حسین نام۔“ ”مطربہ“ اتنا شاعرانہ نام اسے کس نے دیا ہوگا۔
جس کی قوت سے تمام سوچیں اسی پر آکر ٹھہر رہی تھیں۔

”یہ بات غلط نہیں۔ دوسری شروع ہوئی۔ بڑے میاں کو بیٹے کو شادی کے علاوہ اور کوئی کام ہی نہیں۔ دنیا میں اور بھی
بہت کچھ ہوتے ہیں کرنے کیلئے۔ وہ تو خیر میں خالہ کو سب کچھ پتا کر نٹ لوں گی۔ دیں گے انہیں تاریخ۔ کہہ دوں گی شیو
ہے براہین ہم کی شادی۔ انہیں بہت متاثر کرتے ہیں انگریزی میں بات کرنے والے لوگ۔ وہ تو چھینک بھی انگریزی
میں کرتے ہیں۔“

”بڑا کڑوا جی ہوئی پچھلے حصے کی جانب بڑھ رہی تھی۔“

”سب سے پہلے وہ جھومر کے کمرے کی طرف بڑھی۔ ہاتھ روم کا دروازہ بند تھا۔ اندر سے پانی گرنے کی آواز آرہی تھی۔
لہجہ باری تھی۔“

”اگر ہی پڑھے گئی۔ یا اللہ۔ میری مدد کر۔ جس پلین میں وہ لوگ آرہے ہیں۔ اسے ہائی جیک کرا دے یا پھر پلین کا رخ
بدلتی ایگل“ کی جانب پھیر دے۔ جہاں داخل ہوتے ہی جہاز غائب ہو جاتے ہیں اور ان کا کبھی پتا نہیں چلتا۔“

اس نے خالی بیٹھنا مناسب نہ سمجھا اور دعائیں شروع کر دی۔

”ماہر سے دروازہ کھلا۔ سرسوتی ہانپتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔“

”بائی۔“ جمیتی جلو“ (جلدی چلو) بڑی بیگم۔ وہ رک کر سانس درست کرنے لگی۔

”ادھر آ رہی ہیں بڑی امی؟“ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

”سوتی نے نفی میں گردن ہلائی۔“

”مجھے بلارہی ہیں؟“

”سوتی نے اثبات میں گردن ہلا دی۔“

”انہیں کس نے بتایا کہ میں یہاں ہوں؟“ وہ ابھری۔

”ننان نے؟“ وہ ہانپتے ہوئے بولی۔

”بہن نے؟“ اس نے نہایت حیران ہو کر اس کی شکل دیکھی۔

”سوتی نے زور زور سے اثبات میں گردن ہلائی۔“

”روشنی کی شریانوں میں جیسے جوار بھانا اٹھنے لگا۔“

”سوتی کو ایک طرف ہٹائی ہوئی کمرے سے باہر آگئی۔ غصے سے اس کی بری حالت ہو رہی تھی۔“

”اب حرکت بڑی امی کی خواب گاہ میں داخل ہو گئی تھی۔“

”تیلی امی نماز کی چوکی پر جیسے فخر بیٹھی تھیں۔ کریم مکر کے قیمتی ریشمی شلوار سوٹ اور نازک سی کشمیری براؤن شال میں وہ
جس کا رخ صورت مسکوں ہو رہی تھیں۔“

”السلام علیکم“۔ اس نے سنجیدگی اور بے خوفی سے سلام کیا۔

”وعلیکم السلام۔ چٹھو“۔ انہوں نے بھی نہایت خشک اور سنجیدہ انداز میں سلام کیا۔
وہ فوراً ان کے بیڈ پر بیٹھ گئی۔

”کیا کر رہی تھیں؟“ ان کی سپاٹ آواز ابھری۔

”کچھ نہیں“۔ اس نے نظریں چرائیں۔

”پیچھے کیا کرنے گئی تھیں؟“ انہوں نے اس کا چہرہ بغور دیکھا۔

روشی خاموشی سے اپنے پاؤں دیکھتی رہی۔

”میں نے کچھ پوچھا ہے تم سے؟“ وہ ناراض لہجے میں گویا ہوئیں۔

”جھومر بھابی کے پاس گئی تھی“۔ بالآخر وہ بولی۔

”کسی کی بھابی نہیں ہے وہ۔ بس وہ ظفیری کیلئے ہے۔ باقی حویلی والوں سے اس کا کوئی تعلق نہیں“۔ وہ بولیں۔

”جب وہ ظفیری بھائی کی دلہن ہیں تو سب کی رشتے دار تو خود بخود ہو گئیں“۔ اس نے بھی خاصی ناراضگی سے کہا۔
”تمہارے رشتے دار بس وہی ہیں جو ہم کہیں کہ یہ تمہارے رشتے دار ہیں۔ جن کا انکار ہم کر رہے ہوں وہ تمہارے نہیں گتے“۔ وہ برہمی سے بولیں۔

”رشتے قدرتی ہوتے ہیں۔ کسی کے کہنے یا نہ کہنے سے رشتے نہیں بنتے“۔ اس نے بے خوفی سے جواب دیا۔

”یعنی تمہارا باز آنے کا کوئی ارادہ نہیں؟“ وہ اس کی بے خوفی سے مزید غصے میں آ گئیں۔ وہ خاموش رہی۔

”روشانے..... تم ہمارے لئے مسئلہ بن رہی ہو۔ جس کا صحیح حل بابا صاحب نے ڈھونڈ لیا ہے۔ ہم تو سرال والوں کو کوئی قریبی تاریخ دے دیں گے۔ مگر جب تک تمہاری بارات نہیں آ جاتی۔ تم پیچھے نہیں جاؤ گی۔ اگرچہ تو ہم تمہیں تمہارے باپ کے پاس بھجوا دیں گے۔“

”مجھے منظور ہے۔ میں آج ہی ہپا کے ساتھ جانے کو تیار ہوں۔ مگر مجھے صرف یہ بتا دیجئے۔ ظلم اور دبدبائی کے ساتھ چل سکتے ہیں؟“ اس نے آہستہ آواز میں سوال کیا۔

”کیا مطلب ہے تمہارا؟“ وہ برہم ہوئیں۔

”کسی مندر کے ساتھ ایک خوش مند لڑکی کو باندھ دینا۔ یا کسی کنویر کو ہر قانون سے بالاتر ہو کر قید رکھنا“۔ وہ باندھنا۔ ایک ظلم کے علاوہ اور کیا نام دیا جاسکتا؟“

جائے اتنی جرات اس میں کہاں سے آگئی تھی۔ بابا صاحب کی طرف سے اس کے حواس کھڑکے تھے۔
”تمہیں بابا صاحب کے ذاتی معاملات میں چھان بین کی اجازت نہیں ہے۔ اپنے کام سے کچھ نہ کہو۔“

ظلم تب چندہ لئے دھنک رہے تھے کہ بعد اچانک غصے سے بولیں۔

”بڑی بے خوف انداز میں کارپٹ پاؤں کے انگوٹھے سے کریدتی رہی۔“

”چو..... تیاری کرو۔ ہم آج ہی تمہیں یاور کے ساتھ ہری پوری بھیج رہے ہیں۔ ہو سکتا ہے تمہاری بارات وہیں ہے۔“ وہ باری سے کہہ کر چوکی سے اترنے لگیں۔

”بڑی اٹھ کھڑی ہوئی۔ چند لمحے کچھ سوچتی رہی پھر تیزی سے باہر نکل گئی۔“

”سنا صحیح اندازہ ہے میرا۔ اس ساری ملی جھگڑ میں باری کا پورا پورا حصہ ہے۔ ظاہر ہے اس کے علاوہ اور کس نے

مدد دی ہوگی کہ میں پیچھے گئی ہوں۔ بنتا کتنا معصوم ہے۔ اسے عورت کے بارے میں سب پتا ہوگا۔ نمٹ لوں گی اس سے

بھی۔ بڑا صاحب باقی ہے اس کا۔ چھوڑ دوں گی تو نہیں۔ انسان تو نہیں ہے۔ ہے ہی گھوڑا۔ بابا صاحب کا وفادار گھوڑا۔“

وہ کھلتی ہوئی اپنے کمرے کی طرف بڑھ رہی تھی۔

یاد علی خان براؤن ہاتھ گاؤن پہنے ہاتھ روم سے برآمد ہوئے تھے۔

ماہین کو بیڈ پر بیٹھے دیکھ کر نمٹک گئے۔

”آپ واپس بھی آ گئیں؟“

”جی..... نیا کام جو آ پڑا ہے۔ آپ سے مشورہ بھی تو کرنا ہے۔“ اس نے ان کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

”نیا کام؟ خیریت؟“

”وہ روشی کے سرال والے آرہے ہیں ناں تاریخ لینے۔“ اس نے اس مرتبہ غور سے ان کا چہرہ دیکھا۔

”ہوں۔“ یاد علی خان کے چہرے پر یکجہت گہری سنجیدگی جھلکنے لگی۔

”روشی سے مل کر آرہی ہیں؟“ وہ گویا ہوئے۔

”ہوں..... ہال میں سب ہی لڑکیاں تھیں۔“ اس نے یہ باور کرا دیا کہ وہ روشی سے تنہائی میں نہیں ملی ہے۔

یاد علی خان مزید کچھ بولے بغیر بالوں میں برش چلانے لگے۔

”ایک بات کہوں آپ سے؟“ ماہین نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

”ہوں۔“ گویا اجازت دی گئی۔

”میں محسوس کر رہی ہوں کہ روشی اس رشتے سے خوش نہیں ہے۔“ اس نے اپنی دانست میں دھماکہ کیا۔

”ہوں۔ ٹھیک۔ پھر؟“ وہ بہرستور برش چلاتے ہوئے گویا ہوئے۔

”آپ جوئے نہیں۔ حیرت نہیں ہوئی۔“ ماہین نے انہیں تعجب سے دیکھا۔

”اس میں جوئے کی کیا بات ہے۔ جھوٹے سے بچنے کی بھی پسند نہ پند ہوتی ہے۔ وہ تو خیر ماشاء اللہ بڑی ہنسی ہے۔“ وہ

خوشی سے مسرور انداز میں گویا ہوئے تھے۔

”کچھ جو کچھ ہو رہا ہے۔ وہ نہیں ہوتا چاہیے۔“ ماہین کا انداز قطعی تھا۔ یاد علی خان خاموش رہے۔

”میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ اس سے بڑی عمر کی لڑکیاں حویلی میں موجود ہیں تو اس کی شادی کی اتنی جلدی کیوں ہے۔“
 ماہین نے الجھ کر سوال کیا۔

”ان میں سے اکثر کے رشتے گھر پر طے ہیں۔“ یاور علی خان نے بڑے سکون سے جواب دیا۔

”تو روشی کا رشتہ باہر کیوں کیا۔ کیا وہ گھر کے لڑکوں کے قابل نہیں ہے؟“ ماہین نے جرح کی۔

”جس لڑکے سے روشی کا رشتہ طے ہوا ہے، وہ اکلوتا ہے۔ ذاتی کاروبار میں بہت آگے جا چکا ہے۔ انٹر نیشنل

تجارت کر رہا ہے۔ گڈ لکنگ ہے۔ اس کا باپ بابا صاحب کو بہت عزیز ہے۔ وہ بھی بابا صاحب کا جانثار ہے۔ اسی سے

کر لیں کہ بیٹا اتنا کامیاب ہے۔ اس کے باوجود عظیم الدین بابا صاحب کیلئے کراچی میں خدمات انجام دے رہے ہیں۔

شکر گزاری کے تحت بابا صاحب نے نعیم کے کاروبار کیلئے لاکھوں کالون دلویا تھا۔ انہی چھوٹی چھوٹی باتوں سے انسان کے

اندر کا پتا چلتا ہے۔ گزشتہ بتیس سالوں سے عظیم الدین بابا صاحب کے ساتھ ہیں۔ کبھی ایک پیسے کی گڑبڑ نہیں ہوئی۔ ہر

با اصول اور صاف ستھرے انسان ہیں۔“

”مگر اس کا کیا کریں کہ روشی راضی نہیں ہے۔“ ماہین نے بے صبری سے ان کی بات کاٹ دی۔

”تو آپ کر لیجئے ناں راضی۔“ یاور علی خان نے آن واحد میں سارا بوجھ اس پر لا دیا۔

”یہ تو زبردستی ہوئی۔“ ماہین نے برا منایا۔

”ابھی اس کی عمر اتنی قابل اعتبار نہیں ہوئی کہ اس کے فیصلوں پر بھروسہ کیا جاسکے۔“ یاور علی خان نے دلیل دی۔

”تو پھر اس عمر کا انتظار کرنا چاہیے۔ اگر یہ ناپسندیدہ ڈھول اس کے گلے میں ڈال دیا جائے گا تو مجبور بجائے کی نہیں

پھاڑ ڈالے گی۔“ ماہین کو ان کا انداز بے حس محسوس ہو رہا تھا۔

”اے اچھی راہ دکھانا۔ برا بھلا سمجھانا ہمارا فرض ہے۔ ہمارے اس کے رشتے کا تقاضا ہے ہم اس کے لئے بہتر سوچیں

اور مہیا کریں۔“ یاور علی خان نے ماہین کو سمجھانے کی کوشش کی۔

”جب اس کی عمر نا قابل اعتبار ہے تو پھر اسے اہم فیصلوں سے نہیں گزارنا چاہیے عظیم نقصانات بھی ہو سکتے ہیں۔“ ماہین

پران کی کسی بات کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔

یاور علی خان آہستہ آہستہ چلتے ہوئے اس کے پہلو میں آ کر بیٹھ گئے۔

”اس کے ساتھ بہت اچھا ہو رہا ہے۔ وہ جب ان لوگوں میں جا بے گی تو بہت مطمئن اور خوش ہو گی۔ آپ بیٹن

کریں۔“ وہ سگریٹ سلگانے کے دوران گویا ہوئے۔

”اسے یہ وہم ہو گیا ہے کہ بابا صاحب سزا کے طور پر اس کی شادی کر رہے ہیں۔“

”سزا کے طور پر؟“ ماہین نے حیرانی سے اس کی بات کاٹ دی۔

”کیسی سزا..... اور کس بات پر سزا؟“ وہ بے تاب ہو گئی۔

یاور علی خان..... سر جھکائے کش پر کش اگاتے رہے۔ پھر انہوں نے اپنی سرخ آنکھیں ماہین کے چہرے پر جمائیں۔

”میں نے سنا ہے کہ بات نہیں تھی۔ وہ اپنے ہاتھوں سے کھیلنے لگی۔“
 ماہین نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

”انہوں نے بہت دھیمی آواز میں اسے حیرت انگیز بلکہ

میں نے سنا ہے کہ بات نہیں تھی۔ وہ اپنے ہاتھوں سے کھیلنے لگی۔“

ماہین نے اس سے پہلے تو کبھی ذکر نہیں کیا۔“ ماہین اچھی طرح سیٹ ہو کر بیٹھ گئی۔ گویا اب وہ بھرپور تفصیلی

مباحثوں کا کوئی موقع محل نہیں بنا۔ پھر تکلیف دہ باتوں کا دہرانا کیا معنی۔“ وہ دھواں اڑانے لگے۔

”جہاں جہاں کتنی بات پر جان پر کھیل جاتی ہے۔“

”جہاں جہاں کتنی بات پر جان پر کھیل جاتی ہے۔“

”جہاں جہاں کتنی بات پر جان پر کھیل جاتی ہے۔“

”جہاں جہاں کتنی بات پر جان پر کھیل جاتی ہے۔“

”جہاں جہاں کتنی بات پر جان پر کھیل جاتی ہے۔“

”جہاں جہاں کتنی بات پر جان پر کھیل جاتی ہے۔“

”جہاں جہاں کتنی بات پر جان پر کھیل جاتی ہے۔“

”جہاں جہاں کتنی بات پر جان پر کھیل جاتی ہے۔“

”جہاں جہاں کتنی بات پر جان پر کھیل جاتی ہے۔“

”جہاں جہاں کتنی بات پر جان پر کھیل جاتی ہے۔“

”جہاں جہاں کتنی بات پر جان پر کھیل جاتی ہے۔“

”جہاں جہاں کتنی بات پر جان پر کھیل جاتی ہے۔“

”جہاں جہاں کتنی بات پر جان پر کھیل جاتی ہے۔“

”جہاں جہاں کتنی بات پر جان پر کھیل جاتی ہے۔“

”جہاں جہاں کتنی بات پر جان پر کھیل جاتی ہے۔“

”جہاں جہاں کتنی بات پر جان پر کھیل جاتی ہے۔“

”جہاں جہاں کتنی بات پر جان پر کھیل جاتی ہے۔“

”جہاں جہاں کتنی بات پر جان پر کھیل جاتی ہے۔“

”جہاں جہاں کتنی بات پر جان پر کھیل جاتی ہے۔“

”جہاں جہاں کتنی بات پر جان پر کھیل جاتی ہے۔“

”جہاں جہاں کتنی بات پر جان پر کھیل جاتی ہے۔“

”ٹھیک ہے۔ میں جاتی ہوں۔“ وہ بہت بھاری بوجھ اپنے کندھے پر اٹھا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

☆.....☆.....☆.....☆.....☆.....☆

اور ستر پائونڈ بی بی تھی۔

”مومن ہو رہا ہے؟“ ماہین نے قریب پہنچ کر اسے مخاطب کیا۔

”نہیں! رازی ہیں اپنی قسمت کو“۔ وہ سیدھی ہو گئی۔

”بات نیل نامعری کی باتیں نہیں کرتے۔“

”یہ وہاں اٹھا کر بڑے سکون سے بیٹھ گئی۔“

نہ سب سے پہلے اس کا انداز نشست دیکھا۔

”ہو کر آئی ہیں؟“ یہ مسکرا پڑی۔

”میں نے جوتی پہن لی۔“ مائین بھی جواباً مسکرا دی۔

”جیہاں میں ہم پائے ہیں؟“

نہایت پرکرم اور از ہوئی۔

ہمیں اس دن سے ایک غلطی ہو گئی ہے۔

ماہین نے بغور اس کا چہرہ دیکھا۔

”چھوڑیں خاں! کیا فائدہ ایسی باتوں کا“۔ وہ طرح دے گئی۔

”تم نعیم سے شادی پر ناخوش کیوں ہو؟ اچھا خاصا تو ہے“۔ ماہین نے ماحول حق میں پا کر پچھوڑا۔

”میں نے کب کہا ہے کہ وہ ”اچھا خاصا“ نہیں ہے“۔ اس نے ہلنے کے انداز میں جواب دیا۔

”تو پھر؟“ ماہین کی حیرت فطری تھی۔

”سب“ اچھے خاصے ”لوگ سب کو اچھے خاصے نہیں سمجھتے“۔ وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبے ڈوبے گویا بولی۔

”پھر تمہیں کون اچھا لگتا ہے حالانکہ اس سوال کا اب کوئی فائدہ تو نہیں۔“

ماہین نے کن اکھیوں سے اس کی جانب دیکھا۔

”کیوں فائدہ نہیں ہے؟“ روشنی کی تمام حسیات متحرک ہو گئیں۔

”بھئی آج تو تمہاری شادی کی تاریخیں دی جا رہی ہیں“۔ ماہین نے بظاہر بڑی لا پرواہی سے کہا۔

”کون دے رہا ہے؟ خیر جو بھی دے رہا ہے دیتا رہے شادی تو میرے اقرار سے ہی مکمل ہوگی۔ اور میں اقرار نہیں۔ اگر یہ لوگ گھر کی بات باہر سنوارنے کے خواہش مند ہیں تو مجھے بھی کوئی اعتراض نہیں۔“ اس نے بے خوفی اور

سے کہا۔

”یہ تو بہت بری بات ہے روشنائے۔ یہ سب تم سے بے پناہ محبت کرتے ہیں۔ کیا محبت کرنے والوں کے روبرو

کرتے ہیں“۔ ماہین نے بہت سنجیدگی سے کہا۔

”میں نہیں مانتی ان کی محبتوں کو۔ مستقل دکھ دینے کے انتظامات کرتے ہیں اور محبتوں کے دعوے کرتے ہیں۔

کی وکالت نہ کریں یہ کسی کے نہیں ہیں انہیں اپنی ہی کرنے دیں میں بھی انہی میں سے ہوں میں بھی اپنی ہی کروں گا۔“

”مگر تہمتان میں پھر بھی تمہارا ہی حصہ زیادہ ہوگا۔“

ماہین کا انداز ہنوز تھا۔ اس میں ابھی تک کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ وہ شاید اس لئے کہ فی الوقت سب سے

کے پاس محفوظ تھا۔

”اور یہ بات کہ زندگی کے سب سے دشوار سب سے زیادہ دکھ مجھے اپنے حقیقی باپ سے ملا ہے میں انہیں

نہیں کروں گی۔ ان کی بس اتنی ہی تواہمیت رہی ہے میری زندگی میں کہ ضروری کا نڈا اتنا دانا پر باپ کے غم سے

نام نکھ جاتا ہے۔“

”چونکہ تمہیں ہر کام میں جلدی ہوتی ہے۔ حتیٰ کہ نازک ترین مسائل کا نتیجہ بھی تم اتنی ہی جلدی چاہتی ہو جتنی

ایک کپ چائے کی ہوتی ہے مگر روشنائے! زندگی ایک چائے کا کپ تو نہیں ہے۔ مسائل کو درجہ بدرجہ سمجھنے کی

تمہارے پاپا تم سے اور جواد سے اتنا ہی پیار کرتے ہیں جتنا کہ دنیا میں دوسرے باپ اپنی اولاد کو پیار کرتے ہیں۔

دیکھو وقت بہت کم رہ گیا ہے بالکل صاف صاف بات ہو چاہیے اس لئے کہ پھر بابا صاحب سے بات

نہایت صرف ہوگا۔

روشنی نے ماہین کی شکل دیکھنے لگی۔

”تمہارے پاپا نے مجھ سے کہا ہے کہ میں تمہاری ”دلچسپی“ کا نام پتا کر کے انہیں بتا دوں تاکہ معاملہ منطقی انداز میں حل

ہو۔ میں یہ کہہ دینے سے کہ روشنی شادی پر آمادہ نہیں بابا صاحب کو ان کے ارادے سے نہیں روکا جاسکتا۔“

روشنی نے پچھلے پچھلے دیکھنے لگی تھی۔

”پاپا نے کہا ہے“۔ اسے خود کو یقین دلانا مشکل ہو رہا تھا۔

”ہوں تو اب جلدی سے بتاؤ“۔ ماہین مسکرا رہی تھی۔

”پاپا نے... خالہ...؟“ اس کی سولی جیسے انگ گئی تھی۔

”اہں بھئی“۔ ماہین کو اس کی حالت پر ہنسی آ رہی تھی۔

روشنی چند لمحے کسی سوچ میں ڈوبی رہی پھر ایک دم چونک پڑی۔

”اتنے عزیز ہو گئے ہیں آپ کو پاپا! اپنے حصے کا کریڈٹ بھی ان کے نام لگا رہی ہیں خالہ دی گریٹ“۔ وہ جیسے اپنی نکتہ

نہا خود ہی ہوش ہوئی۔

”ارے نہیں ایسی کوئی بات نہیں وہ ایسے نہیں ہیں کہ آرام سے کسی کی باتوں میں آجائیں“۔ ماہین بر جستہ بولی۔

روشنی ایک دم کسی گہری سوچ میں ڈوب گئی۔

”تمہیں تو خوش ہونا چاہیے کہ قدرت تمہارا کام آسان کر رہی ہے“۔ ماہین نے گہری نظروں سے اسے ٹٹولا۔

روشنی نے سوچ میں ڈوبی ہوئی نظروں سے ماہین کی جانب دیکھا۔

”کیا واقعی خالہ! پاپا نے ایسے کہا ہے؟“ اس کی آواز میں بہت دھیمپا پن اور بے یقینی تھی۔

”بھئی مجھے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے؟“ ماہین مسکرائی۔

روشنی پھر خاموش ہو گئی۔

”اس میں اتنا الجھنے کی کیا بات ہے بھئی نام بتا دو اور بس“۔ ماہین نے کہا۔

”نیک خالہ! شاید نام بتا کر اور مشکل ہو جائے بجائے کام سنورنے کے“۔ روشنی نے خاصے مایوس کن لہجے میں کہا۔

”کیا کیا بات ہوئی... نہ یوں... نہ یوں... نام بتانے سے کیا مشکل ہوگی؟ اس کے بعد تو بس تمہارے پاپا کا کام

”یہ بات نہیں ہے خالہ!“ اس نے تھکے تھکے انداز میں کہا۔

”نہ پھر نہ نام بتاؤ تو شاید بابا صاحب مجھے شوٹ کر دیں۔ بالآخر کسی کوئی معجزہ ہی ہو جائے اور یہ سب میرے حق میں

”اگر میں نے نام بتا دیا تو شاید بابا صاحب مجھے شوٹ کر دیں۔ بالآخر کسی کوئی معجزہ ہی ہو جائے اور یہ سب میرے حق میں

”اگر میں نے نام بتا دیا تو شاید بابا صاحب مجھے شوٹ کر دیں۔ بالآخر کسی کوئی معجزہ ہی ہو جائے اور یہ سب میرے حق میں

کبھی قبول نہ کر سکوں۔“

ماہین بری طرح چومک پڑی۔ شینو کے کچھ معنی خیز جملوں کو اس نے فوراً سمجھنا دیکھ لیا۔
”کیا باری.....؟“

روشی کا دل بری طرح دھڑک گیا (کتنی ذہین ہیں خالہ) وہ نظریں ہٹکا کر رہ گئی۔
”یہ تم نے کیا کیا روشا نے؟“ وہ بس یہی کہہ سکی۔

چند لمحوں تک دونوں کے درمیان گہرا سکوت طاری رہا۔

”تو پھر! بتا دوں تمہارے پاپا کو۔“ بالآخر ماہین نے خاموشی توڑنے میں پہلی کی۔

”کوئی فائدہ تو ہے نہیں! آپ بس یہ کریں کسی طرح میری شادی کا قصہ ختم کر دیں۔ میں بیٹھ بیٹھ پاپا
رہوں گی۔“ روشی نے بچھے بچھے سے انداز میں کہا۔

ماہین یک دم چپ سے ہو گئی۔

پھر ایک دم کھڑی ہوئی۔

”وہ واقعی بہت اچھا ہے! اس کی عادات بہت پسندیدہ ہیں مگر افسوس..... خیر میں تمہیں کسی جھوٹی تلوار
چاہتی۔ اچھا میں چلتی ہوں۔“

روشی دوبارہ نیم دراز ہو گئی۔ بہت کچھ ہونے کے باوجود کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔

ماہین واپس اپنے بیڈ روم میں آئی تو دیکھا یاور علی خان باقی فوکل گلاسز ناک پر لٹکائے فائلیں دیکھ رہے تھے۔
فورا سے بیشتر فائلیں بند کر دیں۔

”آئیے جناب! وقت بہت کم ہے بڑی دیر لگا دی ہے۔“ انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے پاس آکر بلایا۔

ماہین ان کے پاس بیٹھنے کے بجائے تھوڑے فاصلے پر رکھی کرسی پر بیٹھ گئی۔

اس کا خاموش اور سرد سا انداز انہوں نے محسوس کر لیا تھا اور اب وہ اس کی آواز سننے کے منتظر تھے۔

”ایک درخواست کروں آپ سے؟“ اس کے انداز میں اعتدال کے بجائے جھجک تھی۔

”خیریت؟“ وہ اس کے چہرے پر نظریں جما کر کچھ کہنے کی کوشش کر رہے تھے۔

”کسی طرح بھی آپ سے ہو سکے! بس روشی کی شادی کا معاملہ ختم کر دیں! ورنہ وہ بہت دکھانے لگی۔“

قیمتی نہیں ہوتا چاہیے انسان کی اتنا کو۔“

وہ بہت دھیمی آواز میں ٹھہر ٹھہر کر بول رہی تھی۔

”میں نے آپ کو کوئی کام دے کر اس کے پاس بھیجا تھا۔“ ان کی سوالیہ نظریں اس کا چہرہ ٹوٹنے لگیں۔

”جو میں نے آپ سے کہا! اس کی بنیاد پر بابا صاحب سے کوئی واضح فیصلہ کرایا جاسکے۔“

پاپا صاحب! وہاں بھی معاملہ ناممکن ہے اور نعیم سے تو وہ ایک سے لاکھ تک..... آمادہ نہیں۔“
پاپا صاحب! وہاں بھی معاملہ ناممکن ہے اور نعیم سے تو وہ ایک سے لاکھ تک..... آمادہ نہیں۔“

پاپا صاحب! وہاں بھی معاملہ ناممکن ہے اور نعیم سے تو وہ ایک سے لاکھ تک..... آمادہ نہیں۔“

پاپا صاحب! وہاں بھی معاملہ ناممکن ہے اور نعیم سے تو وہ ایک سے لاکھ تک..... آمادہ نہیں۔“

پاپا صاحب! وہاں بھی معاملہ ناممکن ہے اور نعیم سے تو وہ ایک سے لاکھ تک..... آمادہ نہیں۔“

پاپا صاحب! وہاں بھی معاملہ ناممکن ہے اور نعیم سے تو وہ ایک سے لاکھ تک..... آمادہ نہیں۔“

پاپا صاحب! وہاں بھی معاملہ ناممکن ہے اور نعیم سے تو وہ ایک سے لاکھ تک..... آمادہ نہیں۔“

پاپا صاحب! وہاں بھی معاملہ ناممکن ہے اور نعیم سے تو وہ ایک سے لاکھ تک..... آمادہ نہیں۔“

پاپا صاحب! وہاں بھی معاملہ ناممکن ہے اور نعیم سے تو وہ ایک سے لاکھ تک..... آمادہ نہیں۔“

پاپا صاحب! وہاں بھی معاملہ ناممکن ہے اور نعیم سے تو وہ ایک سے لاکھ تک..... آمادہ نہیں۔“

پاپا صاحب! وہاں بھی معاملہ ناممکن ہے اور نعیم سے تو وہ ایک سے لاکھ تک..... آمادہ نہیں۔“

پاپا صاحب! وہاں بھی معاملہ ناممکن ہے اور نعیم سے تو وہ ایک سے لاکھ تک..... آمادہ نہیں۔“

پاپا صاحب! وہاں بھی معاملہ ناممکن ہے اور نعیم سے تو وہ ایک سے لاکھ تک..... آمادہ نہیں۔“

پاپا صاحب! وہاں بھی معاملہ ناممکن ہے اور نعیم سے تو وہ ایک سے لاکھ تک..... آمادہ نہیں۔“

پاپا صاحب! وہاں بھی معاملہ ناممکن ہے اور نعیم سے تو وہ ایک سے لاکھ تک..... آمادہ نہیں۔“

پاپا صاحب! وہاں بھی معاملہ ناممکن ہے اور نعیم سے تو وہ ایک سے لاکھ تک..... آمادہ نہیں۔“

پاپا صاحب! وہاں بھی معاملہ ناممکن ہے اور نعیم سے تو وہ ایک سے لاکھ تک..... آمادہ نہیں۔“

پاپا صاحب! وہاں بھی معاملہ ناممکن ہے اور نعیم سے تو وہ ایک سے لاکھ تک..... آمادہ نہیں۔“

پاپا صاحب! وہاں بھی معاملہ ناممکن ہے اور نعیم سے تو وہ ایک سے لاکھ تک..... آمادہ نہیں۔“

پاپا صاحب! وہاں بھی معاملہ ناممکن ہے اور نعیم سے تو وہ ایک سے لاکھ تک..... آمادہ نہیں۔“

پاپا صاحب! وہاں بھی معاملہ ناممکن ہے اور نعیم سے تو وہ ایک سے لاکھ تک..... آمادہ نہیں۔“

پاپا صاحب! وہاں بھی معاملہ ناممکن ہے اور نعیم سے تو وہ ایک سے لاکھ تک..... آمادہ نہیں۔“

پاپا صاحب! وہاں بھی معاملہ ناممکن ہے اور نعیم سے تو وہ ایک سے لاکھ تک..... آمادہ نہیں۔“

پاپا صاحب! وہاں بھی معاملہ ناممکن ہے اور نعیم سے تو وہ ایک سے لاکھ تک..... آمادہ نہیں۔“

پاپا صاحب! وہاں بھی معاملہ ناممکن ہے اور نعیم سے تو وہ ایک سے لاکھ تک..... آمادہ نہیں۔“

پاپا صاحب! وہاں بھی معاملہ ناممکن ہے اور نعیم سے تو وہ ایک سے لاکھ تک..... آمادہ نہیں۔“

پاپا صاحب! وہاں بھی معاملہ ناممکن ہے اور نعیم سے تو وہ ایک سے لاکھ تک..... آمادہ نہیں۔“

”یہ تو مجھے نہیں معلوم، مگر ڈرنے والی کوئی بات نہیں، شاباش! او میرے ساتھ۔“

اس نے روشنی کا ہاتھ تھاما۔

وہ اٹھ کر مایین کے ساتھ ہوئی۔ مایین نے محسوس کیا، جیسے اس کی چال میں غیر معمولی دھیر ہوئی۔ کمرے میں مایین پہلے داخل ہوئی اور اس کے پیچھے پیچھے روشنی۔

”السلام علیکم پیا۔“

اس نے ان سے بہت فاصلے پر بیٹھنے کیلئے جگہ تلاش کی۔

”والسلام۔ ٹھیک ہو؟“ ان کا انداز بے تاثر تھا۔

”جی، تھینکس۔“ وہ صوفے پر بیٹھ گئی۔

”میں تم سے اس موضوع پر بات کرنا تو نہیں چاہ رہا تھا جس پر کرنے جا رہا ہوں اس لئے یہ چکا ہو گا کہ نعیم کے والدین تاریخ لینے آرہے ہیں۔“ انہوں نے مختصر تمہید کے بعد فوری بات شروع کر دی۔ روشنی خاموش رہی۔

”اور اب بھی میں تم سے ٹو دی پوائنٹ بات کرنا چاہوں گا اور یہ بھی کہ تم بھی واضح ایک دیکھو مجھے اپنی کہی بات اچھی طرح یاد ہے تمہاری انگلیج منٹ والی رات میں نے تم سے کہا تھا، میں تمہارے

مگر یہ شرط ہے کہ کوئی بات، کوئی پوائنٹ ہمارے اسٹیشن سے اپوزٹ نہ ہو۔ میں آج بھی اپنی بات بتانا کرنا چاہتا ہوں۔ مایین بتا رہی تھیں کہ وہ لوگ جن کا تذکرہ غالباً تم نے ان سے کیا ہے ان پر ہم لوگ ان لوگوں کے تعارف کے بعد مایین نے جو اندازہ لگایا ہے وہ یقیناً انہوں نے اپنے طور پر کچھ محسوس کیا۔ وہ جج منٹ جو یہ کر سکی ہیں، کیا اس گھر کا فرد ہونے کے ناتے تم نہیں کر سکتی تھی؟“ وہ بہت نرم انداز میں

”لوگ..... کون لوگ؟ کیا بتا دیا ہے خالہ نے؟“ اس نے اچھے ہوئے انداز میں مایین کی سمت دیکھا۔

”میں سمجھی نہیں پیا، آپ کن لوگوں کی بات کر رہے ہیں؟“ اس نے مایین کی طرف قدرے پیش قدمی کی۔

ہوئے باپ سے سوال کیا۔

”انہی لوگوں کی جن کے بارے میں تم نے مایین سے بات کی ہے۔“ اس بار وہ خامے جیسے لہجے میں

”لوگ؟“ اس نے مایین کی طرف دیکھا۔

”میری“ ان سے ابھی وضاحت کے ساتھ بات نہیں ہوئی ہے۔

اس نے روشنی کو کچھ سمجھانے کی کوشش کی۔

روشنی سر جھکا کر ہاتھ مسلنے لگی۔

”کون لوگ ہیں وہ؟ کہاں رہتے ہیں؟“ یاد اور علی خان نے اس کی طرف صرف ایک نگاہ دوڑائی تھی۔

”وہ“ لوگ“ نہیں ہیں پیا۔“ اس نے قدرے ہچکچا کر جواب دیا۔

”میرا غراب نہیں کروڑو شائے، سیدھی سیدھی بات کرو۔“

”میرا غراب نہیں کروڑو شائے، سیدھی سیدھی بات کرو۔“ جیسے یہ ایک بے ساختہ خاموش تاکید تھی۔

”میرا غراب نہیں کروڑو شائے، سیدھی سیدھی بات کرو۔“

”میرا غراب نہیں کروڑو شائے، سیدھی سیدھی بات کرو۔“ جیسے یہ ایک بے ساختہ خاموش تاکید تھی۔

”میرا غراب نہیں کروڑو شائے، سیدھی سیدھی بات کرو۔“ جیسے یہ ایک بے ساختہ خاموش تاکید تھی۔

”میرا غراب نہیں کروڑو شائے، سیدھی سیدھی بات کرو۔“ جیسے یہ ایک بے ساختہ خاموش تاکید تھی۔

”میرا غراب نہیں کروڑو شائے، سیدھی سیدھی بات کرو۔“ جیسے یہ ایک بے ساختہ خاموش تاکید تھی۔

”میرا غراب نہیں کروڑو شائے، سیدھی سیدھی بات کرو۔“ جیسے یہ ایک بے ساختہ خاموش تاکید تھی۔

”میرا غراب نہیں کروڑو شائے، سیدھی سیدھی بات کرو۔“ جیسے یہ ایک بے ساختہ خاموش تاکید تھی۔

”میرا غراب نہیں کروڑو شائے، سیدھی سیدھی بات کرو۔“ جیسے یہ ایک بے ساختہ خاموش تاکید تھی۔

”میرا غراب نہیں کروڑو شائے، سیدھی سیدھی بات کرو۔“ جیسے یہ ایک بے ساختہ خاموش تاکید تھی۔

”میرا غراب نہیں کروڑو شائے، سیدھی سیدھی بات کرو۔“ جیسے یہ ایک بے ساختہ خاموش تاکید تھی۔

”میرا غراب نہیں کروڑو شائے، سیدھی سیدھی بات کرو۔“ جیسے یہ ایک بے ساختہ خاموش تاکید تھی۔

”میرا غراب نہیں کروڑو شائے، سیدھی سیدھی بات کرو۔“ جیسے یہ ایک بے ساختہ خاموش تاکید تھی۔

”میرا غراب نہیں کروڑو شائے، سیدھی سیدھی بات کرو۔“ جیسے یہ ایک بے ساختہ خاموش تاکید تھی۔

”میرا غراب نہیں کروڑو شائے، سیدھی سیدھی بات کرو۔“ جیسے یہ ایک بے ساختہ خاموش تاکید تھی۔

”ایزی پلیز! دیکھیں آپ اپنا ٹیمپرز لوز نہ کریں، میں بابا صاحب سے بات کرتی ہوں، وہ جو کچھ کہیں گے۔“
پلیز۔ اس کا انداز التجائیہ تھا۔

”میں جانتا ہوں، وہ نہیں مانیں گے۔ اٹ دل بی ویسٹ ٹائم.....!“ ان کی پیشانی پر شکنیں کی پٹیاں تھیں۔
”صرف انکار ہی نہیں ہے، اپنے اسٹینس کا بھی خیال نہیں ہے۔ وہ دوسری سزا دیں گے اسے۔“ وہ بڑبڑاتے ہوئے۔
”آؤ روشی! میرے ساتھ آؤ۔“ مایین نے روشی کا بازو پکڑ کر اٹھایا۔
”آپ وہاں نہیں جائیگی مایین۔“ یادوعلی خان نے اسے ٹوکا۔
وہ پھر رک گئی۔

”اچھا ٹھیک ہے، میں وہاں نہیں جا رہی، مگر ابھی آتی ہو ویسٹ می۔“
مایین صلح جو انداز میں کہہ کر روشی کا ہاتھ تھام کر کمرے سے باہر چلی گئی۔

وہ روشی کو لے کر اس کے کمرے میں داخل ہوئی۔

”خالہ! میں ایک جیتی جاگتی انسان ہوں، پاپا کو سمجھائیے اور یہ بھی کہ ان کے تمام مفادات میری زندگی پر ہیں ناں۔“ وہ کمرے میں داخل ہوتے ہی تیزی سے بولی۔

”خبردار! جو تم نے کوئی الٹی سیدھی پہلے جیسی کوئی حرکت کرنے کی کوشش کی۔“ مایین نے ڈر کر اس کی صورت پر نظر ڈالا۔
”خالہ! جس شخص کے نام ہی سے میرے اعصاب ٹوٹنے پھوٹنے لگتے ہیں اس کے ساتھ عمر کیے کن کن کرنا۔“
شادی کوئی اتنی اہم بات نہیں کہ تمام لوگ اپنی قیمتی توانائیاں صرف اس موضوع پر مرکوز کر دیں۔ شادی کے بعد سچ جاتی ہے، کبھی شوہر کے انتقال سے بھی عورت پر تنہائی کی نوبت آ جاتی ہے۔ وہ بہت دکھ سے کہنے لگی۔
”یہ بات نہیں ہے روشی! اولاد بہت بڑی ذمہ داری ہوا کرتی ہے اور بڑوں کی خواہش ہوتی ہے کہ ان کے بچے خوشیوں بھری زندگی گزاریں۔“ مایین نے سمجھانے کی کوشش کی۔

”مگر پاپا تو میرے لئے کانٹوں بھری زندگی کا انتظام کر رہے ہیں۔“ وہ سلگ کر گویا ہوئی۔
”یہ تمہاری وقتی سوچ ہے، وہاں تمہیں اتنا پیار اور آرام ملے گا کہ تم سب کچھ بھول جاؤ گی۔“

مایین نے اس کے نزدیک بیٹھ کر اس کا ہاتھ تھام لیا۔

”آپ بھی خالہ؟ آپ بھی.....؟“ اس کی آواز بھرا گئی۔

مایین نے بے ساختہ اس کا سر اپنے شانے سے لگا لیا اور اس کی پشت پر ہاتھ پھیرنے لگی۔
”تمہارا کیس بہت کمزور ہے روشی! اگر مجھے ایک فیصد بھی امکان محسوس ہوتا تو میں تمہارے پیار کی ہر پابندی نظر انداز کر دیتی اس لئے کہ محض تمہاری ذات نے تو مجھے ان سے قریب کر دیا ہے، اگر تم یا جو ادب نہ ہوتے تو میں جیونہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔“

”اچھا! ایک بات بتاؤ، کیا باری سے تمہاری باقاعدہ کوئی کمیشنٹ ہے؟“
اس کی آواز اتنی دھیمی تھی، بس روشی ہی سن سکتی تھی۔
روشی خاموش رہی۔

”روشی پلیز!“ مایین نے اسے شانوں سے پکڑ کر اپنے مقابل کیا۔
”خالہ! میری تو خود سمجھ میں نہیں آتا، وہ تو ہرگز بھی اس لائق نہیں ہے۔“
وہ عجیب سی بے بسی سے گویا ہوئی۔

”ہیں کیا مطلب؟“ مایین کو اس نے گھما کر رکھ دیا۔

”بے وقوف کہیں کی، ابھی مجھے بھی مرداد بیتیں۔“ مایین نے اس کے رخسار پر ہلکی سی چپٹ لگائی۔
”وہی تو میں سوچ رہی تھی۔“ مایین تو بڑا ذمہ دار، سنجیدہ اور بڑا دانش مند سا ہے، وہ اس طرح کی حماقت کیسے کر سکتا ہے؟“
مایین خودکامی کے انداز میں گویا ہوئی تھی۔

”کیا گھوڑوں کو قابو کرنے سے انسان دانش مند ہو جاتا ہے۔“ طنز و تضحی اس کے لہجے سے ظاہر تھی۔

مایین کی بے ساختہ ہنسی چھوٹ گئی۔

روشی نے منہ بنا لیا۔

مایین نے بے ساختہ اسے گلے سے لگا لیا۔

”روشی! چندا! یہ سب یہاں نہیں ہو سکتا۔“

”تو پھر وہ بھی نہیں ہو سکتا، جو یہ لوگ کرنا چاہ رہے ہیں۔“ وہ اس کے شانے پر سرزنکائے نکائے قطعی انداز میں گویا ہوئی۔
”ہوں یہ قابل عمل ہے، میں تمہارے پیار کو کنوینس کرنے کی کوشش کرتی ہوں۔“

اپنے لہجے کے کھوکھلے پن پر وہ خود ہی شرمندہ ہو گئی، پھر اٹھ کھڑی ہوئی۔

”اچھا ٹھیک ہے، تم اطمینان سے اپنے کام کرؤ گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں، ٹھیک ہے؟“
وہ اس کا شانہ تھپتھا کر باہر چلی گئی۔

اور روشی اس کی جانب متوجہ ہونے کے بجائے گہری سوچ میں تھی۔

شام کے چار بجے تھے لڑکیوں پر گویا آفت اتری ہوئی تھی۔ کلو تو دو بجے سے اور نچ کلر کا گونے کناری والا سوٹ پہن کر
بہانہ دیا کہ بے مقصد چکر کاٹ چکی تھی۔ روشی یونہی دل بہلانے کے خیال سے ہال کی طرف آئی تھی۔ وہاں بیوٹی پارلر کھلا
ہوا تھا۔ کوئی آئی بیوٹن نے میں مصروف تھی تو کوئی پلچنگ کے عذاب میں مبتلا تھی۔
”تم کچھ نہیں کر رہی؟“ روبی نے ہاتھ پکڑے آئینے میں اس دیکھا۔
”سوچ رہی ہوں کچھ کرنے کا۔“ اس نے برا سامنے بنا کر جواب دیا اور واپس باہر آ گئی۔

اس کا رخ بیرونی برآمدے کی طرف تھا۔ وہ باغ میں جا رہی تھی غالباً۔

اس کی چال سے اس کی ذہنی حالت کا پتا چل رہا تھا۔ وہ بے حد کم مہم تھی۔

اس کے باہر آتے ہی پھانک کھلا تھا اور باری جیب لے کر اندر داخل ہوا تھا۔ وہ باغ کی طرف مڑنے کے بعد۔

سنگ مرمر کے زینے پر بیٹھ گئی۔

باری اسے دیکھ چکا تھا اس لئے بڑے محتاط انداز میں برآمدے کی طرف بڑھا تھا مگر اس کی حیرت کی انتہاء نہ تھی اس کے پاس سے گزر بھی گیا، مگر اس کے انداز نشست میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی اور نہ ہی اس نے بارے کی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کی۔ وہ اللہ کا شکر ادا کرتا ہوا اپنے کمرے کی سمت بڑھتا چلا گیا۔

جانے کس احساس کے تحت اس کے رخسار بھیگتے چلے گئے۔ جانے کتنی دیر وہ اسی طرح بیٹھی رہی۔

معاً اس نے دیکھا۔ کا کا جان کا درائیو شیرگل پرانی وضع کی ایک طرف کھڑی ہوئی جیب کی جانب بڑھ رہا تھا۔ ایک خیال بجلی کی طرح اس کے ذہن میں کوندا تھا۔ وہ تقریباً بھاگتی ہوئی شیرگل کے پاس پہنچی تھی۔

”شیرگل! ایک منٹ بات سنو۔“

”جی میم صیب۔“ وہ مودبانہ گویا ہوا۔

”تم کہاں جا رہے ہو؟“

”ام سرائے واپس جاتا ہے۔“ اس نے ابھی ہوئی نظروں سے روشنی کو دیکھا۔

”کا کا جان ہیں سرائے میں؟“ اس نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے آہستگی سے پوچھا۔

”کا کا جان! اچھا اچھا! تیمور خاناں۔“ شیرگل تھوڑا سا الجھ کر بات سمجھ گیا۔

”ہاں ہاں!“ اسے اس کی کندھنی پر جھلاہٹ سی ہوئی۔

”آؤ..... تو سندھ گیا اے شکر پر کوئی پیغام؟“ اس نے اپنی چٹنی ازان کے حساب سے سوال کیا۔

”ہوں..... خیر تم اپنی جیب باہر نکالو دیتے ہیں پیغام۔“ وہ اس سے ذرا دور ہٹ گئی پھر تیزی سے اندر دوڑ گئی۔

بے چارا حیران پریشان سا اپنی جیب کی طرف بڑھا۔ چونکدار نے گیٹ کھول دیا۔

”وہ جتنی تیزی سے اندر گئی تھی اتنی تیزی سے واپس آئی تھی۔ اس مرتبہ اس نے بڑی سی چادر پہنی ہوئی تھی اور ہاتھ

عورتوں کی طرح چہرے پر بھی سیٹ کر رکھی تھی۔

شیرگل جیب میں بیٹھا ہوا اس کے ”پیغام“ کا انتظار کر رہا تھا۔

دین محمد چونکدار گیٹ بند کر کے مالی سے بات چیت میں مصروف تھا۔ اس نے صرف ایک اچھٹی سی نظر پڑائی تھی۔

روشنی پڑ ڈالی تھی۔

اس نے جیب کا دروازہ کھولا اور پھرتی سے بیٹھ گئی تھی۔

”تم کیا کرتا ہے کون اے؟“ شیرگل بے چارہ بدحواس ہو کر رہ گیا۔

اس کا رخ بیرونی برآمدے کی طرف تھا۔ وہ باغ میں جا رہی تھی غالباً۔

اس کی چال سے اس کی ذہنی حالت کا پتا چل رہا تھا۔ وہ بے حد کم مہم تھی۔

اس کے باہر آتے ہی پھانک کھلا تھا اور باری جیب لے کر اندر داخل ہوا تھا۔ وہ باغ کی طرف مڑنے کے بعد۔

سنگ مرمر کے زینے پر بیٹھ گئی۔

باری اسے دیکھ چکا تھا اس لئے بڑے محتاط انداز میں برآمدے کی طرف بڑھا تھا مگر اس کی حیرت کی انتہاء نہ تھی اس کے پاس سے گزر بھی گیا، مگر اس کے انداز نشست میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی اور نہ ہی اس نے بارے کی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کی۔ وہ اللہ کا شکر ادا کرتا ہوا اپنے کمرے کی سمت بڑھتا چلا گیا۔

جانے کس احساس کے تحت اس کے رخسار بھیگتے چلے گئے۔ جانے کتنی دیر وہ اسی طرح بیٹھی رہی۔

معاً اس نے دیکھا۔ کا کا جان کا درائیو شیرگل پرانی وضع کی ایک طرف کھڑی ہوئی جیب کی جانب بڑھ رہا تھا۔ ایک خیال بجلی کی طرح اس کے ذہن میں کوندا تھا۔ وہ تقریباً بھاگتی ہوئی شیرگل کے پاس پہنچی تھی۔

”شیرگل! ایک منٹ بات سنو۔“

”جی میم صیب۔“ وہ مودبانہ گویا ہوا۔

”تم کہاں جا رہے ہو؟“

”ام سرائے واپس جاتا ہے۔“ اس نے ابھی ہوئی نظروں سے روشنی کو دیکھا۔

”کا کا جان ہیں سرائے میں؟“ اس نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے آہستگی سے پوچھا۔

”کا کا جان! اچھا اچھا! تیمور خاناں۔“ شیرگل تھوڑا سا الجھ کر بات سمجھ گیا۔

”ہاں ہاں!“ اسے اس کی کندھنی پر جھلاہٹ سی ہوئی۔

”آؤ..... تو سندھ گیا اے شکر پر کوئی پیغام؟“ اس نے اپنی چٹنی ازان کے حساب سے سوال کیا۔

”ہوں..... خیر تم اپنی جیب باہر نکالو دیتے ہیں پیغام۔“ وہ اس سے ذرا دور ہٹ گئی پھر تیزی سے اندر دوڑ گئی۔

بے چارا حیران پریشان سا اپنی جیب کی طرف بڑھا۔ چونکدار نے گیٹ کھول دیا۔

”وہ جتنی تیزی سے اندر گئی تھی اتنی تیزی سے واپس آئی تھی۔ اس مرتبہ اس نے بڑی سی چادر پہنی ہوئی تھی اور ہاتھ

عورتوں کی طرح چہرے پر بھی سیٹ کر رکھی تھی۔

شیرگل جیب میں بیٹھا ہوا اس کے ”پیغام“ کا انتظار کر رہا تھا۔

دین محمد چونکدار گیٹ بند کر کے مالی سے بات چیت میں مصروف تھا۔ اس نے صرف ایک اچھٹی سی نظر پڑائی تھی۔

روشنی پڑ ڈالی تھی۔

اس نے جیب کا دروازہ کھولا اور پھرتی سے بیٹھ گئی تھی۔

”تم کیا کرتا ہے کون اے؟“ شیرگل بے چارہ بدحواس ہو کر رہ گیا۔

ماہین ڈرینک ٹیبل کے سامنے کھڑی ہوئی بھاری کامدار دو پٹائیٹ کر رہی تھی۔
یاد علی خان نیم دراز گہری سوچوں میں غرق سگریٹ کا دھواں اڑا رہے تھے۔
”ہوں..... لیس!“ انہوں نے دستک کا جواب دیا تھا۔

عالم تاب اندر داخل ہوئیں۔

یاد علی خان سنبھل کر بیٹھ گئے۔ ”آئیے بھابی بیگم۔“

”تیار ہو گئیں ماہین؟ مہمان بھی آچکے ہیں۔ ایسا کرو۔ روشی کو بھی کہہ دو کپڑے وغیرہ تبدیل کر لے گی۔“
کی ساس اس کے پاس جائیں یا اسے بلوائیں۔ پھر تم مہمانوں کے پاس آ کر بیٹھ جانا۔ سب لوگ بابا صاحب سمیت
روم میں ہیں۔“

”جی بہتر میں تو تیار ہوں کہہ دیتی ہوں روشی سے۔“ بولتے بولتے ماہین کی آواز بے حد دھیمی ہو گئی۔

”یادو! تم نہیں آرہے ہو؟“ انہوں نے ڈرینک گاؤن میں ملبوس یاد علی خان کو قدرے حیرت سے دیکھ کر پوچھا۔
”آ رہا ہوں۔ بلکہ ہم“ آرہے ہیں۔“ انہوں نے ماہین کی طرف دیکھ کر جواب دیا۔ عالم تاب کمرے سے باہر
گئی۔

”آپ روشی کو تاکید کرتی آئیں۔ میں چھینچ کرتا ہوں اتنی دیر میں۔ ٹھیک ہے؟“

ان کا انداز ہنوز گرم سم سا تھا۔ جیسے وہ اندرونی خلفشار کا شکار ہو۔

”جی۔“ ماہین نے ایک نظر خود کو آئینے میں دیکھ کر جواب دیا۔

یاد علی خان اٹھ کر باتھ روم میں چلے گئے۔ اور ماہین روشی کے بیڈ روم میں چلی آئی۔

روشی بیڈ روم میں موجود نہیں تھی۔ اس نے آگے بڑھ کر باتھ روم کے دروازے پر دستک دی۔ اندر محسوس کی بانٹ
خاموشی تھی۔

اس نے دو تین بار دروازے پر دستک دے کر دھکیلا اور روشی اور آواز دی۔ مگر جواب میں بدستور خاموشی تھی۔

اس نے اندر جھانکا۔ باتھ روم خالی تھا۔ وہ الجھے ہوئے ذہن کے ساتھ کمرے سے باہر آ گئی۔

سامنے سرسبز ساڑھی باندھے سرسوتی پزیر کرتی آرہی تھی۔

”سرسوتی۔“ اس نے آواز دی۔

”ہلاں بی بی۔“ وہ اس کی طرف تیزی سے بڑھی۔

”ذرا دیکھنا۔ کیا روشی ہال میں ہے؟“

”جی ہاں آساں۔“ وہ حکم پا کر ہال کی طرف بڑھی۔ ماہین وہیں کھڑی رہی۔ دو منٹ بعد سرسوتی ہال سے واپس آئی۔

دیکھتی دیتی۔

”اور تے نہیں آے بی بی۔ پرتساں کھلو جاؤ ہا۔“ ہورتھاں اتاں نوں دیکھ ساں۔“

”بہن بی بی۔“ ماہین کو حویلی کے پچھلے حصے کی طرف گئی تھی۔

”جی۔“ وہ کونہ بنے کیوں پریشانی سی ہونی لگی تھی۔ عجیب سے دوسرے دل میں آنے لگے تھے۔

”نہایت۔“ ماہین۔ یہاں کیوں کھڑی ہو۔“ عالم تاب اوپر سے آرہی تھیں۔ زینے طے کرتے کرتے انہوں نے

ذہن حیرت سے پوچھا تھا۔

”بہن کو بلواری ہوں۔ اپنے کمرے میں تو نہیں ہے۔“ ماہین نے دھڑکتے دل سے جواب دیا۔

”تو ہر ہال میں ہوگی۔ سب بچیاں وہیں ہیں۔“ انہوں نے بے نیازی سے کہا۔

”دیکھ آئی ہے سرسوتی۔ وہاں نہیں ہے۔“ ماہین نے اپنی بات کے دوران عالم تاب کے چہرے کے تاثرات کا بھی

نوٹ لیا۔

”جی؟ باتھ روم میں تو نہیں تھی۔“ عالم تاب کے چہرے پر الجھن کے تاثرات نمودار ہوئے۔

”دوسرے سوئی گئی ہے کسی اور جگہ دیکھئے۔“ ماہین نے دبی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

”کہاں؟“ عالم تاب کے ذہن نے امکان بھرا ان بھری۔

”نہایت نہیں۔“ ماہین نے جواب دیا۔

”ہوں۔“ عالم تاب نے پر فکر انداز میں ہنکارا بھرا۔

کی دم باری تیزی سے زینے طے کرتا ہوا نیچے آیا اور ان دونوں کو بیچ راستے میں کھڑا دیکھ کر ٹھٹھک گیا۔

”نہایت؟“ اس نے باری باری دونوں کے چہرے دیکھے۔

”تم نے روشی کو تو نہیں دیکھا باری۔ باغ میں یا ادھر ادھر؟“ عالم تاب نے حویلی کے سب سے بارسوخ فرد سے اس

شک کے ساتھ استفسار کیا کہ وہ ضرور کچھ نہ کچھ نشاندہی کرے گا۔

”اپنے کمرے میں نہیں ہیں وہ؟“ وہ چونک پڑا تھا۔

”نہ کمرے میں ہے نہ ہال میں۔“ ماہین نے جلدی سے بتایا۔

”ہو سکتا ہے بھابی (سمیہ) کے کمرے میں ہوں۔“ اس نے امکان ظاہر کیا۔

”میں وہیں سے آرہی ہوں۔“ عالم تاب نے اس کا اندازہ فوراً غلط ثابت کر دیا۔

”تو کج۔“ اس کا ذہن فوراً جھومر کی طرف گیا۔ اس نے معنی خیز انداز میں عالم تاب کی طرف دیکھا تھا۔

”جی سرسوتی اس طرف۔“ انہوں نے ماہین کے چہرے پر سرسری نظر دوڑا کر باری کو جواب دیا۔

”جی۔“ اس کی بات ہے؟“ عالم تاب نے واپس آیا تو وہ برآمدے میں زینے پر بیٹھی ہوئی تھیں۔

”ایک منٹ سے تو کم ہی ہوا ہوگا۔“

”جی سرسوتی تقریباً بھاگتی ہوئی آئی۔“

”اور وی نہیں ہے۔“ وہ پھون پھولی مائوس کے دوران بولی۔

”جاؤ باری۔“ راوی بھویا ہوا صوب کے کمرے میں تو نہیں ہے۔“

ماہین نے بڑی بائٹتی ہوئی نظروں سے باری کو سر سے پاؤں تک دیکھا تھا۔ بلیو جینز اور سکاٹی بلیو میں شرٹ میں وہ بہت چاک و چوبند محسوس ہو رہا تھا۔

وہ تیزی سے بابا صاحب کے کمرے کی طرف بڑھا تھا۔ وہ دونوں ہنوز اپنی جگہ کھڑی ہوئی تھیں۔ اور اپنی بات میں الجھی ہوئی تھیں۔

”یہ لڑکی تو مسئلہ بن گئی ہے۔ حالانکہ اسے سب پیار کرتے ہیں۔ سب خیال رکھتے ہیں۔“ عالم تاب خود کو باری میں بول رہی تھیں۔

ماہین بس ان کی طرف دیکھ کر رہ گئی۔

باری جلد ہی واپس آ گیا۔ اس کی چال سے اس کا ذہنی الجھاؤ ظاہر تھا۔

”آپ لوگ چلے میں دیکھتا ہوں۔ وہ بابا صاحب کے کمرے میں بھی نہیں ہیں۔“

عالم تاب دھک سے رہ گئیں۔ وہ اس کی شدید طبیعت سے بخوبی واقف تھیں۔ طرح طرح کے دوسرے ان ہنوز گئے۔

”تم اپنے کمرے میں جاؤ! میں تمہیں بلوالوں گی۔“ وہ متشکرانہ انداز میں ماہین سے مخاطب ہوئیں اور سامنے طرف بڑھ گئیں۔

ماہین بھی آہستہ آہستہ چلتی اپنے بیڈروم میں آ گئی۔

یاد علی خان تیار ہو کر صوفے پر بیٹھے ایک امپورٹڈ میگزین کا جائزہ لے رہے تھے۔ دروازہ کھلنے پر سامنے دیکھا۔

چاپ سی ماہین کو اندر آتے پایا۔

”روشی کیا کر رہی ہے۔ تیار ہو گئی؟“ انہوں نے ماہین کے چہرے سے جیسے کچھ پڑھ لیا تھا۔ جو روشی سے متغیر شروع کر دیئے تھے۔ یوں بھی جس طرح کی صورتحال درپیش تھی۔ انہیں کانٹھس ہونا ہی چاہیے تھا۔

”وہ اپنے کمرے میں تو نہیں ہے۔ سرسوتی اور باری وغیرہ دیکھ رہے ہیں۔“ اس نے کھوئے کھوئے منہ سے جواب دیا۔

”دیکھنے کا کیا مطلب۔ وہاں ہال میں ہوگی لڑکیوں کے ساتھ۔“ یاد علی خان نے کھوجنے والی نگاہوں سے جواب دیکھا۔

”ہوں۔“ ماہین نے فی الوقت ان سے مزید بات کرنا مناسب خیال نہ کیا۔

”ابھی..... معلوم ہو جائے گا۔ ظاہر ہے گھر میں ہی ہوگی۔“ اس نے خود پر قابو پا کر عام سے انداز میں جواب دیا۔

”ہو سکتا ہے جواد کے پاس گئی ہو۔“ وہ اندازہ لگانے لگے۔

”جی۔ ہو سکتا ہے۔“ اس نے تائید کرنا فائدہ مند سمجھا۔

”پانی تمہاری کیوں ہیں؟“ ان کی حیات بڑی شارپ تھیں۔

”نہیں تو۔“ وہ زبردستی مسکرا دی۔

”کوئی بات تو نہیں؟“ وہ مشکوک سے نظر آئے۔

”نہیں نہیں۔ کوئی بات نہیں۔ آپ فکر مند نہ ہوں۔“ اس نے بڑی واضح مسکراہٹ کے ساتھ انہیں تسلی دیتے ہوئے کہا۔

”فکرمندی تو ہو سکتی ہے۔ وہ ہے ہی نہایت بے وقوف لڑکی۔“ وہ بڑبڑائے۔

ماہین کے پاس خاصی معقول دلیل تھی مگر وہ چپ رہی کہ اس طرح ایک نئی بحث کا آغاز ہو سکتا تھا۔ جس سے ماحول میں کھینچ پیدا ہو سکتی تھی۔

دونوں نہایت خاموشی سے کسی نئی اطلاع کا انتظار کرنے لگے۔

یاد علی خان کی انگلیوں میں سگریٹ پھنسا ہوا تھا۔ وہ ادھر ادھر لائٹ تلاش کرنے لگے تھے۔

ماہین اٹھ کر ادھر ادھر لائٹ تلاش کرنے میں جیسے ان کی مدد کرنے لگی۔ بکلیہ اٹھایا تو لائٹ مل گیا۔ اس نے ان کے موڈ کو دیکھتے

وئے ماحول میں کچھ خوشگوار پیدا کرنے کے خیال سے کھٹاک سے لائٹ جلا کر ان کے سامنے کیا۔ اسے خود بھی اس عمل میں مدد مل رہی تھی۔

یاد علی خان نے آگے جھک کر سگریٹ سلگایا۔

”ٹھیکس!“ انہوں نے دھواں اس کے منہ پر چھوڑ دیا۔ ماہین مسکرا کر پیچھے ہٹ گئی۔ رگ و پے میں عجیب سی لطافت پائی تھی۔

”اسی دم دروازہ بجا۔“ ماہین کے دل میں عجیب سی پکڑ دھکڑ شروع ہو گئی۔

”نہیں۔“ یاد علی خان نے اجازت دی تھی۔

عالم تاب اندر داخل ہوئی تھیں۔ اور بڑے سرسیمہ انداز میں۔

”یاد۔“ روشی حویلی میں کہیں نہیں ہے۔“ وہ دل پکڑ کر صوفے پر ڈھکے گئیں۔

”یاد کے پاؤں کے نیچے سے زمین سرک گئی۔“ وہ ٹوٹی ہوئی شاخ کی طرح بیڈ پر گرنے کے انداز میں بیٹھی تھی۔

یاد علی خان دم بخود سے بیٹھے رہ گئے۔

”وہ کچن میں۔“ ماہین نے کچھ اور جھجھکوں کا نام لینا چاہا۔ جہاں وہ جاسکتی تھی۔

”سب جگہ دیکھ لیا۔ سب جگہ..... ہائے۔“ انہوں نے سینے پر ہاتھ مارا۔

یاد علی خان نے قہقہے میں قہمت نہیں کہ بابا صاحب کو کچھ بتاؤں۔ ارے میرے اللہ۔ یہ ہمارا کیسا امتحان ہے۔“ وہ چہرے پر

”نہیں! کچن میں دیکھ لیں۔“

”نہیں! کچن میں دیکھ لیں۔“ وہ صراحت کریں۔ کہاں جائے گی بھلا وہ..... خود کو سنہا لیں۔“

وہ اٹھ کر ان کے پاس آکھڑے ہوئے اور ان کے شانے پر ہاتھ رکھ کر تسلی دی۔
”ارے نہیں یاور! وہ کچھ کر گزری ہے۔“ وہ اور زیادہ رونے لگیں۔

یاد علی خان کی پیشانی پر لکیریں گہری ہو گئیں۔ انہوں نے آگے بڑھ کر سگریٹ الٹش ٹرے میں مثل دیا۔
”آپ فکر نہ کریں بھابی بیگم۔ اگر وہ واقعی کچھ کر گزری ہے تو یاد رکھئے۔ میں اسے ڈھونڈ نکالوں گا۔ اگر وہ زندہ ہے تو ہاتھ سے اسے شوٹ کروں گا۔“

ان کے لہجے میں جیسے کوئی درندہ غرار ہاتھ تھا۔

”ارے..... مگر اب کیا کریں؟ گھر میں مہمان آئے ہوئے ہیں۔“ وہ روتے روتے گویا ہوئی تھیں۔
”گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ میں ہینڈل کر لوں گا۔“

”ماہین۔ بھابی بیگم کہ پانی پلاؤ۔ میں بابا صاحب کے پاس جا رہا ہوں۔“

وہ ساکت بیٹھی ماہین کی طرف پلٹ کر گویا ہوئے اور تیزی سے کمرے سے باہر نکل گئے۔

یاد علی خان نے بابا صاحب کی خواب گاہ کے دروازے پر دستک دی اور اجازت کا انتظار کئے بغیر دروازہ کھول کر داخل ہو گئے۔

”آؤ۔ آؤ یاور بھی۔ ہم تمہیں بلوانے ہی والے تھے۔ وہ مہمان تو آچکے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ رات کے کمانے پہلے تمام معاملات طے کر لئے جائیں۔ مہر وغیرہ بھی طے کرنا ہوگا۔ جو تمہاری مرضی ہو لکھوا لینا۔“

بابا صاحب ایک بھاری بھر کم سار جٹر کھولے بیٹھے تھے۔ بیٹے کو دیکھ کر ایک دم پر جوش سے ہو گئے اور حیرت زدہ سر کا دیا۔ عینک اتار کر جیب میں اٹکا لی۔

”سب کچھ آپ ہی کرتے ہیں۔ آپ ہی نے کیا ہے۔ مہر وغیرہ کا مسئلہ بھی آپ ہی نمٹا لیجئے گا۔“

”وہ سرد سے انداز میں جواب دے کر ان کے سامنے پڑی ایک پر شکوہ کرسی پر بیٹھ گئے۔

بابا صاحب نے چونک کر ان کی شکل دیکھی جہاں ہر طرح کے تاثرات مفقود تھے۔

”نہیں بھئی۔ آخر تم باپ ہو۔ مجھے تمہیں بھی حصہ لینا چاہیے۔“ وہ پھر اسی سابقہ انداز میں گویا ہوئے۔

”ہاں بات تو ہوں۔ مجھے انکار نہیں ہے۔ مگر باپ کی حیثیت سے آپ ہمارے بارے میں ہر قسم کے فیصلے کرتے ہیں۔ مگر ہم باپ کی حیثیت سے اس طرح کا کوئی حق استعمال نہیں کر سکتے۔ مجھے نہیں معلوم کہ مجھے باپ کی حیثیت سے کیا کرنے کی اجازت ہے۔“ وہ اسی طرح سرد لہجے میں گویا ہوئے۔

اس مرتبہ دلاور علی خان نے غور سے ان کی صورت دیکھی۔

”نہ جانے کیوں آج ہمیں تم بہت بد لے ہوئے محسوس ہو رہے ہو؟“ وہ اپنی حیرت ظاہر کئے بغیر نہ دے سکے۔
”میں وہی ہوں حتیٰ کہ میری قسمت بھی وہی ہے۔“ انہوں نے دونوں ہاتھ ایک دوسرے میں پھنسا کر سر کے نیچے

نے برقی کی پشت پر قیب لگا لی۔

”یہ بات ہے بیٹے؟“ بابا صاحب کے لہجے میں بلا کی نرمی اتر آئی۔

”مجھ میں نہیں آتا۔ بابا صاحب، کیا میری اولاد پوری کی پوری ماں پر ہی جائیگی؟“ اس کے لہجے میں بلا کی شستگی تھی۔

”یہ مطلب ہے تمہارا؟“ وہ ویسے ہی یاد علی خان کے پراسرار انداز سے فکر مند تھے۔ بری طرح چونک پڑے۔

”مطلب یہ ہے بابا صاحب! اس مرتبہ سارا نقصان میرا نہیں ہوا۔ اس مرتبہ نقصان میں پوری حویلی ہی حصے دار ہے۔“

”یہ بات کہہ رہے تھے۔“

”میرے بچے کھا بیٹھی ہے؟“ بابا صاحب کی پیشانی پر شکنیں گہری ہو گئیں۔

”کاش کھا لیتی۔“ یاد علی خان دکھ سے گویا ہوئے۔

”مکھ کر بات کرو یاور!“ دلاور علی خان کے ضبط کا پیمانہ چھلکنے کو ہو گیا۔

”دو جلی سے چلی گئی ہے۔“ انہوں نے بڑے سکون اور آہستہ آواز میں اطلاع دی۔

”کہاں؟“ دلاور علی خان کا دل دھڑکنا بھول گیا۔ ان کا اونچا شملہ آندھی کی زد پر تھا، پھر حواس کیوں نے جواب

”یہ معلوم ہوتا تو مسئلہ ہی کیا تھا۔“ وہ اسی درجہ سکون سے گویا ہوئے۔

”مگر کیوں؟“ ان کا فشار خون بلند ہونے لگا۔

”اباں شادی نہیں کرنا چاہتی تھی۔“ یاد علی خان نے جواب دیا۔ اب وہ سینے پر بازو لپیٹے خاصے پر سکون نظر آ رہے

”تمہارے علم میں تھی یہ بات؟“ انہوں نے اپنی آواز کی لرزش پر قابو پانے ہوئے استفسار کیا۔

”نہیں۔“ انہوں نے مختصر جواب دیا۔

”نہیں کیوں نہیں بتایا تھا؟“ اب ان کے وجود پر لرزش طاری ہونے لگی تھی۔

”کیونکہ وہ... وہ سب لہجے میں بولے۔“

”یہ مطلب؟“ دلاور علی خان نے قدرے ناراضگی سے پوچھا۔

”مطلب یہ ہے کہ آپ نے میرے کرنے کے بعد بدلتے نہیں ہیں۔ لہذا بات آپ تک پہنچانا بے کار ہی ہوتی۔“ انہوں نے

”میرے بچے کی ہمیں باخبر تو رکھنا چاہیے تھا۔ ہم نہیں کہہ دیتے اس کا دماغ۔ اس کی ماں ہماری بہو تھی۔ مگر وہ ہمارا خون

”نہ جانے کیوں آج ہمیں تم بہت بد لے ہوئے محسوس ہو رہے ہو؟“ وہ اپنی حیرت ظاہر کئے بغیر نہ دے سکے۔

”میں وہی ہوں حتیٰ کہ میری قسمت بھی وہی ہے۔“ انہوں نے دونوں ہاتھ ایک دوسرے میں پھنسا کر سر کے نیچے

”یہ بات کہہ رہے تھے۔“

”کیا وہ کہیں اور“۔ دلاور علی خان بولتے بولتے رُک گئے۔ ان کے چہرے پر پسینے کی ہوندیں برسرِ تھیں۔

”شاید“۔ یاور علی خان کی نظریں جھک گئی۔ ان کے شاید میں بڑا یقین چھپتا ہوا تھا۔

”کون ہے وہ..... کیا گھر میں؟“ وہ آن کی آن میں جیسے بڑھا پے کی انتہاؤں کو چھونے لگے۔

”مجھے ٹھیک سے پتا نہیں۔ میں نے ماہین کے ذریعے پتا کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس سے بس اتنا اندازہ ہوا کہ ہمارے اسٹیشن کا نہیں ہے۔“

یاور علی خان نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔

”لاحول ولا قوۃ۔ کس درجہ ناشکری اولاد دلی ہے ہمیں۔“

یاور علی خان جواباً خاموش رہے۔

”ہمیں جیتے جی مار دیا ہے اس لڑکی نے یاور! تم یقین کرو۔ تمہاری بہنوں کو ہم نے اتنی چاہت اور توجہ دی ہے کہ روٹی کو دی۔ اس لئے کہ تم بھی اس سے دور تھے اور اس کی ماں بھی نہیں تھی۔“

وہ بری طرح ٹوٹ رہے تھے۔

یاور علی خان اس مرتبہ بھی خاموش رہے۔

”یاور..... پہاڑ ٹوٹ گیا ہے۔“ ان کی آواز کانپ رہی تھی۔

”گھر میں مہمان آئے ہوئے ہیں۔“

”ہمت سے کام لیجئے بابا صاحب! مہمانوں سے ضرور ملیے اور انہیں کوئی تارخ دے کر روانہ کیجئے۔ ہائیڈروجن ہیں۔“ یاور علی خان نے مشورہ دیا۔

”اب کیا بات ہوگی ہم سے۔ دل ڈوب رہا ہے ہمارا۔“ وہ گاؤں سے قریب لگا کر نیم دراز سے ہو گئے۔

یاور علی خان نے اٹھ کر گلاس میں پانی اٹھایا۔ اور باپ کو سہارا دے کر پانی پانے لگے۔

”وہ کم درجہ لوگ اسے مل کہاں گئے؟ وہ تو لڑکیوں کے کالج میں پڑھتی ہے۔“ وہ چھت کو گھورتے ہوئے قہقہے بولے۔

”مجھے کچھ معلوم ہے نہیں۔“ یاور علی خان نے گلاس سائیڈ ٹیبل پر رکھتے ہوئے جواب دیا۔

”ماہین کو پتا ہو۔ ضرور پتا ہوگا۔ بلاؤ انہیں۔“ بابا صاحب کی آواز میں تیزی سی آگئی۔ جیسے ان کی سانس بند ہو۔

”کوئی فائدہ نہیں اب..... بے کار ہے۔ فی الحال تو آپ خود کو سنبھالیں اور ہمت سے کام لیں۔“

مہمانوں سے تو معاملات منٹ سکیں۔ انہوں نے باپ کے شانے پر ہاتھ رکھ کر سمجھایا۔

”آفرین ہے یاور تمہاری برداشت پر..... بیٹے۔“

”کیا کروں بابا صاحب۔ اگر برداشت نہ کرو۔ آپ آرام کیجئے۔ تھوڑی دیر میں میں آپ کو آکر لے جاؤں گا۔“

نے ہاتھ تلخ کوششوں کرنے کی کوشش کے ساتھ جواب دیا۔

”پتا نہیں ہم سے اٹھا بھی جائے گا یا نہیں۔ کاش یہی بستر ہمارا بستر مرگ بن جائے اور ہم کسی اگلی بری خبر کو سننے کیلئے

”یاد رہی نہ ہیں۔“ ان کی آواز میں کپکپاہٹ بڑھ گئی۔

”ٹھیک ہے بھرم مہمانوں کو یہیں لے آئیے۔“ یاور علی خان جس ضبط سے کام لے رہے تھے۔ یہ انہی کو پتا تھا۔

یاور علی خان واپس اپنے کمرے میں آ گئے۔

”وہ لڑکیاں اور ملازما نہیں روٹی کا پوچھنے کئی بار یہاں آچکی ہیں۔“ ماہین نے انہیں دیکھتے ہی نئے مسئلے سے آگاہ کیا۔

”پھر کیا کہا آپ نے؟“ وہ تھکے تھکے انداز میں گویا ہوئے۔

”کچھ نہیں بچی کہہیں ہوں گی۔“ ماہین نے ان کی طرف ہمدردانہ نظروں سے دیکھا۔

”آپ ایسا کیجئے۔ کسی ایک سمجھدار لڑکی کو ساری صورتحال بتا دیجئے۔ ورنہ کہیں انہی لڑکیوں کی وجہ سے کوئی مسئلہ نہیں نہ

ہوئے گا۔“ وہ جیسے ٹوٹ رہے تھے۔

”اگر بھائی بیگم نے۔“ وہ کچھ کہتے کہتے رُک گئی۔

”میں کہہ رہی ہوں ناں آپ سے۔ پھر آپ کو فکر مند ہونے کی کیا ضرورت ہے۔“ وہ دند رے چڑ کر گویا ہوئے تھے۔

”بین نوربال کی طرف چل پڑی۔“

”یوں میں اسے دیکھ کر کھنسی سی مچ گئی۔“

”کھنسی جان! روٹی کا تو پتا ہی نہیں چل رہا۔“ مونا بہت پریشان تھی۔

”اوہ شاید تیار بھی نہیں ہوئی۔“ مریم کو اپنی تیاری بے مزا معلوم ہو رہی تھی۔

”اپنے کمرے میں تو نہیں ہے۔“ بیہ نے تفتیش کا نتیجہ پیش کیا۔

”نکاحی سے اس کا موڈ آف ہو رہا تھا۔“ تانیہ نے بتایا۔

”اور تو اور ہاری کو پتا نہیں جو یہ بتا سکتا ہے کہ حویلی کی زمین کی تہہ میں کون کون سی معدنیات نکالی جاسکتی ہیں۔“ روبی کی

”میت ذرا دھری قسم کی تھی۔“

”میں چپ چپ سی گلو کے پاس بیٹھ گئی۔“

”میں نے گلا کھار کر صاف کیا۔“

”آپ سب کیلئے ایک افسوسناک خبر ہے۔“ وہ بولتے بولتے رُک گئی۔

”لوکیوں کے منہ کھلے کھلے رو گئے۔“ وہ بولتے بولتے رُک گئی۔

”شاید شاید کچھ ہو گئی ہے۔“ ماہین کی آواز بہت دھیمی تھی۔

”میں نے نہ سمجھا تھا کہ گویا کوئی ذی نفس موجود نہ ہو۔“

”کیوں؟“ مونا کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

شیونے دوبارہ سلاخیاں اٹھا کر تنگ شروع کر دی۔

”کہاں چلی گئی؟“ بیہ تو فوراً رونے کو ہو گئی۔

”کیا اسے بابا صاحب نے کچھ کہہ دیا تھا؟“ لالی کا تو وجود ہی جیسے نچڑ کر رہ گیا تھا۔

”علوم نہیں..... بس آپ لوگوں سے یہ کہنا تھا کہ نعیم کے والدین گھر میں موجود ہیں۔ کوئی بات لے لیں۔

کہ..... مجھ رہی ہیں ناں آپ لوگ۔“

ماہین نے ان کے ستے ہوئے چہرے بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

جواب میں خاموشی چھائی رہی۔

چند ثانیے خاموشی کے بعد ایک جانب سے سسکیاں ابھرتا شروع ہوئیں۔

ماہین نے نظریں دوڑائیں تو گلو کو روٹے ہوئے پایا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر گلو کے پاس آ گئی۔

”یہ کیا بات ہوئی بھلا۔ آجائے گا گھر۔ بری بات۔“ وہ گلو کو چپ کرانے لگی۔

اسی دم عالم تاب اندر داخل ہوئیں۔ لڑکیاں اپنی اپنی جگہ سنبھل کر بیٹھ گئیں۔

”ماہین۔“

”جی؟“ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

”تم یاور کے ساتھ ڈرائنگ روم میں آ جاؤ۔ مہمان وہیں ہیں۔“ وہ بے حد غصہ سے نظر آ رہی تھی۔

ماہین وہیں سے چلی آئی۔ سامنے ہی بارتی آتا دکھائی دیا۔

”ڈھونڈ لیا حویلی میں؟“ اس نے بے تاثر لہجے میں یونہی سوال کر دیا۔

”جی..... چھان ماری ہے۔“ وہ سادگی سے گویا ہوا۔

”بڑا نقصان ہوا ہے ہمارا۔ تمہاری وجہ سے۔“ وہ سابقہ انداز میں گویا ہوئی۔

”جی۔“ اسے جیسے زلزلے کا جھٹکا محسوس ہوا تھا۔

ماہین نے اس سے مزید بات چیت کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ اور آگے بڑھ گئی۔ باری حیران پریشان اسے ہانپ رہا تھا۔

”مجھے تو اس کی صورت بری لگنے لگی ہے۔ منہس۔ ناشکری کہیں کی۔“

بالو کی ماں غلام محمد کو کھانا دیتے ہوئے بڑبڑا رہی تھی۔

”بھانگوان۔ سب نصیب کی بات ہے۔ کیوں کستی رہتی ہے اسے ہر وقت۔“

”تم نے ہی کلمو ہی کو سرچڑھا رکھا ہے۔“ اس نے بھڑک کر خاوند کی بات کاٹی تھی۔

”وہ چڑ کر بولا۔“

”تمہاری جگہ کوئی اور باپ ہوتا تو چوٹی سے پکڑ کر واپس چھوڑ آتا۔ تم نے تو الٹی آؤ بھگت شروع کر دی۔“ وہ تلخی سے

کہہ رہا تھا جی خانے میں ٹھس گئی۔

بالو نے دروازے میں پھٹک رہی تھی۔ ماں کی کڑکڑ سے اس کا سر پھٹنے لگا۔

”ابا..... اماں کو سمجھا لو۔ ٹی بی کر دیں گے یہ مجھے۔“ وہ بڑکل دروازے تک آ کر کمزوری آواز میں گویا ہوئی تھی۔

”ارے ہم کیا کریں گے تجھے ٹی بی۔ تو خود کینسر بن کر آگئی ہے ہماری جان کو۔“

اس کی ماں باورچی خانے ہی سے چلائی۔

بالو نے لوہے کا دروازہ دھڑ سے بند کر دیا۔

”یہ نخرے دکھا جا کے اپنے ہوتے سوتوں کو۔“ اس کی ماں حلق پھاز کر چیخی۔

”یہ لال خان کی بلڈنگ نہیں ہے۔ اکیلا کمر اٹھیرا کر لیٹ گئی ہے۔ ٹھنڈ ہو رہی ہے۔ بچے کیا حرکت پر سوئیں گے۔ نواب

زادی۔“ اس کی ماں ہنوز چلا رہی تھی۔

”آگئی ہے ہمیں نخرے دکھانے۔ آج اکیلی ہے۔ کل دو ہو جائینگے۔ بڑی کمائی کر کے لائی ہے۔ ارے کیسے پھوٹے

نقب ہیں میرے۔ خوشی کے دن اس ہی نہیں آتے۔ ارے کسی کی آئی اسے آ جاتی۔“ اس کی ماں برابر چلا رہی تھی۔

بالو نے کانوں پر ہاتھ رکھ لیے۔

”نواب زادی کہتی ہے۔ بڑھا ہے۔ خود کو بڑی بادشاہ کی اولاد ہے۔ نخرے تو دیکھو۔ شکل نہ صورت میں تیری مورت۔

کھانے کو ل رہا تھا بیٹھے بیٹھے۔ فاقے لگیں گے تو پتا چلے گا۔ کانا دجال روٹی پر کان کی میل بھی رکھ دے گا تو کھالے گی

نہ۔“

بالو کے اعصاب چنچنے لگے۔ اس نے سر سے پٹی تو باندھ رکھی تھی۔ چادر اٹھا کر پلیٹ لی اور باہر آ گئی۔

”ابا..... میں ڈاکٹر کے پاس جا رہی ہوں۔ میری طبیعت بہت خراب ہے۔“ وہ باپ سے مخاطب ہوئی۔

”اندر میرا ہورہا ہے بھائی کو ساتھ لے جا۔“ غلام محمد نرم آواز میں بولا۔

”نہیں..... رہنے دو۔ ڈاکٹر کون سا دور ہے۔ نگر پر تو اس کی دوکان ہے۔“

دو تفری سے باہر نکل گئی۔

اس کی ماں نے بڑی زہریلی نظروں سے اسے دیکھا تھا۔

بالو گھر سے نکل کر سیدمی بس اسٹاپ کی طرف بڑھی تھی۔

”یہ کونسا اقبال جا سکی؟“ اس نے کنڈیکٹر سے دریافت کیا تھا۔

”نابا..... یہاں سے کوئی بس سیدمی گمشدہ اقبال نہیں جاتی۔ تم یہاں سے صدر چلی جاؤ۔ وہاں سے تمہیں بہت دیکھیں

نہ۔“

”یہ صدر جائیگی.....؟“ وہ کچھ پریشان ہو گئی۔ گریبان میں ہاتھ ڈال کر بٹا نکالا اور ہاتھ میں پکڑ لیا۔
”ہاں۔ جائے گی۔“

وہ تیزی سے ویکن میں سوار ہو گئی تھی۔

”صدر پہنچ کر..... ویکن کے چکر میں پڑنے کے بجائے اس نے رکشہ لے لیا۔

پہلی مرتبہ اس طرح تنہا نکلنے کا اتفاق ہوا تھا اس لئے خوف سا طاری تھا۔

رکشہ خاصی دیر چلنے کے بعد اس کے بتائے ہوئے مقام پر رک گیا۔ اچھا خاصا کرایہ بن گیا تھا۔ اس نے اگلے دروازے پر
نکال کر اسے دیا اور باقی پیسے واپس لے کر سڑک پار کر کے ایک عمارت کے سامنے پہنچ گئی۔ پہلے کھڑے ہو کر اس نے دروازے
پہچاننے کی کوشش کی پھر اس راستے پر چل پڑی جو اس کی سمجھ میں آ گیا تھا۔ آف وہاٹ دروازے پر پہنچ کر اس نے گلاب
بٹن پیش کیا۔ دو تین مرتبہ پیش کرنے بعد دروازہ کھلا۔

”کون ہے بھائی۔ ہم کہاں آئے اہم ہیں کہ کوئی ہمیں یاد کرے اور آئے۔“ دروازہ کھولتے کھولتے اچھی نہ پہچان
گئی تھی۔

دروازہ کھولنے والا..... اچھل کر پیچھے ہٹا تھا۔

”آ..... آپ.....!“

”راستہ تو دیجئے۔ بخار سے مجھے چہرہ آ رہے ہیں۔“

یا گردش: درواں کو کوئی کام نہیں ہے

یا میری ہی تقدیر میں آرام نہیں ہے

اس نے بے ساختہ شعر کہتے ہوئے راستہ دیدیا تھا۔ حیرت اتنی تھی۔ آنکھیں جیسے ماتھے پر جا لگی تھیں۔

”ارے بیٹا عارف! کون ہے؟ کس سے باتیں کر رہا ہے؟“ اس کی ضیف آنکھوں کے نور سے محروم مالک

ہوئی آواز آئی تھی۔

”مہمان آئے ہیں ماں۔ کہتے ہیں مہمان کے آنے سے برکت ہوتی ہے۔ ہمارے بھی دن پھرے ہیں۔“

کے سلسلے بڑے ہیں۔“

وہ شکستہ سی آواز میں جواب دے کر چٹنی لگانے لگا۔

”مہمان؟ کون مہمان۔ ارے بولتا کیوں نہیں؟“ بڑی بی جھلائیں۔

”بتاتے ہیں ماں۔ بتاتے ہیں۔“

”آئیے..... اندر آجائیے۔“ وہ یوں گویا ہوا جیسے کہہ رہا ہوں ”کیا کریں مجبوری ہے۔“

”کیسے ہیں آپ؟“ وہ اس کے پیچھے پیچھے چل پڑی۔

تو اپنی شیشہ گری کا ہنر نہ کر ضائع
میں آئینہ ہوں مجھے ٹوٹنے کی عادت ہے

روپوش دیا۔

”اے ہے بخار ہو رہا ہے؟ ارے عارف! اسے گولی دے دے چائے کے ساتھ۔“
 بڑی بی پریشان ہو گئیں۔

عارف نے بھی تشویش بھری نظروں سے اسے دیکھا۔

”آئیے بھابی! ادھر کمرے میں آجائیے۔ ہم تو ویسے بھی آپ کے مقروض ہیں۔“ وہ اٹھ کھڑا ہو۔ اور ایک طرف کھلے دروازے کی جانب اشارہ کیا۔

بالو بمشکل تمام کھڑی ہوئی اور اس کے پیچھے چل پڑی۔

”آئیے یہاں لیٹ جائیے میں چائے لے کر آتا ہوں۔“ وہ اٹنے قدموں باہر نکل گیا۔

بالو کرنے کے انداز میں بستر پر بیٹھ گئی، پھر آہستگی سے لیٹ گئی۔

بخار بہت تیز ہو چکا تھا۔ جانے کتنی دیر غفلت رہی۔

”یہ چائے پہلے کچھ کھا لیجئے پھر گولی کھا لیجئے گا۔“ اسے عارف کی آواز بہت دور سے آتی محسوس ہوئی۔

وہ اٹھنے کی کوشش کرنے لگی۔ عارف چند ثانیے اس کی بے بسی دیکھتا رہا۔ پھر ٹرے تپائی پر رکھ کر اس کی طرف بڑھا۔

”اگر آپ ماسٹرنہ کریں تو آپ کو اٹھنے میں مدد دوں۔“ وہ اس کے قریب کھڑا اجازت مانگ رہا تھا۔

”اف.....! الفاظ من چاہے مگر نیت و ارادے کا اثر کچھ اور۔“ وہ چپ رہی۔

عارف نے اس کے سر کے نیچے ہاتھ رکھ کر اسے اٹھنے میں مدد دی۔

کچھ وہ خود کوشش کر کے بیٹھ گئی۔

عارف نے ٹرے اس کے سامنے رکھ دی۔ چائے کے ساتھ سکٹ اور کیک پیش تھے۔ اس نے ایک چھوٹا سکٹ اٹھا کر

چائے میں بھگوایا اور منہ میں رکھ لیا۔

پھر چائے اٹھا کر پینے لگی۔

”اور لیجئے ناں۔“ عارف نے کرسی کھینچ کر اس کے سامنے بالکل قریب بیٹھ چکا تھا۔

اس نے نفی میں گردن ہلا دی۔

عارف نے آگے جھک کر اس کی پیشانی کو چھوا۔ پھر ایک دم چونک کر ہاتھ ہٹا لیا۔

”خدا ہو گئی۔ کس قدر تیز بخار ہو رہا ہے۔ بھلا کیا ضرورت تھی اس حال میں گھر سے نکلنے کی۔ آپ کو تو چلنا بھی مشکل ہو گا۔ میں خود جا کر دوائے لے کر آتا ہوں! اگر ڈاکٹر ساتھ آ گیا تو اسے لانے کی کوشش کروں گا۔“ وہ باہر کی طرف بڑھا۔

”رہنے دیجئے۔ مت کیجئے تکلیف مرنے دیجئے مجھے۔ مجھے کیا کرنا ہے زندگی کا۔“

وہ شکتہ آواز میں اسے روک رہی تھی۔

عارف نے جاتے جاتے پلٹ کر دیکھا۔

ہم چراغ در مفلس تو نہیں ہیں جو ہمیں

☆.....☆.....☆.....☆.....☆.....☆

”السلام علیکم اماں!“ بالو بڑی بی کے سامنے تھکے تھکے انداز میں بیٹھ گئی۔

”جیتی رہو کون؟“ بڑی بی ہنوز ابھی ہوئی تھیں۔

”میں ہوں اماں بالو۔“ وہ کمزوری آواز میں گویا ہوئی۔

”بالو..... کون بالو؟“ بڑی بی کا حافظہ بالکل ہٹ ہو چکا تھا۔

”لال خان کی بیوی!“ عارف نے ابھی ہوئی نظروں سے بالو کی طرف دیکھا۔

”ارے اچھا..... اچھا! اکیلی آئی ہو لال خان نہیں آیا رات تو گھنٹی ہو رہی ہے۔“ بڑی بی کو یاد آ گیا۔ بالو جو بہت

خاموش رہی۔

”بیٹی! اس وقت کیسے آئی؟ ٹھیک تو ہے ناں؟“ بڑی بی کی فکر مندی فطری تھی۔

بالو پھر خاموش رہی۔

”کھانا انا بھی کھایا؟“ بڑی بی نے ٹٹول کر اس کے گھٹنے چھوئے۔

”مجھے بخار ہو رہا ہے بہت تیز میں کہیں لیٹ جاؤں۔“ وہ کمزوری آواز میں بولی۔

یوں سرشام ہی پھونگوں سے بچھایا جائے

وہ اتنا کہ کر باہر نکل گیا۔

بالوں نے ٹرے ایک طرف کھسکا کی اور پھر ڈھے گئی۔

اس پر بے ہوشی طاری ہو گئی۔ خاصی دیر بعد عارف ڈاکٹر کے ہمراہ کمرے میں داخل ہوا تھا۔

”بہت تیز بخار ہے برف ہے گھر میں؟“

”جی“۔ عارف نے فکر مندی سے بالوکا چہرہ دیکھا۔

”آپ ایسا کیجئے بہت ٹھنڈا پانی بنا کر ان کی پیشانی پر پٹیاں رکھئے۔ فکر کی بات اس لئے بھی ہے کہ یہ پریکٹس ڈاکٹر اسٹیتھو اسکوپ سے چیک اپ کرنے کے دوران گویا ہوا۔ عارف بڑی تیزی سے باہر نکل گیا تھا ڈاکٹر نے بڑی توجہ سے معائنہ کیا اور دو انیس لکھ دی تھیں۔

”اس سے قبل بھی آپ نے اپنی وائف کا چیک اپ کرایا ہے؟“ عارف پانی اور پٹیاں لے کر اندر داخل ہوا تو زبانی سوالیہ جملہ ہوا۔

وہ کچھ بولنے ہی لگا تھا مگر پھر جانے کیا سوچ کر خاموش ہو گیا۔

”پہلے یہ دو انیس منگوا لیجئے“ انجکشن لگا دیا ہے فکر کی بات نہیں تسلی رکھئے۔“

ڈاکٹر نے اپنا پھیلا یا ہوا ”پھیلاوا“ سمینا شروع کیا۔

عارف نے پانی کا برتن تپائی پر رکھ دیا۔ جس میں برف کے ٹکڑے تیر رہے تھے۔

”آئیے میرے ساتھ ہی چلئے“ میں راستے میں آپ کو کسی میڈیکل سنٹر پر ڈراپ کر دوں گا، بچپن ساتھ کے پٹنہ دکھائی دینے والا ڈاکٹر۔ بہت شفیق اور مہربان محسوس ہوا۔

”شکریہ آئیے پلیز“۔ عارف نے اپنے رد عمل سے جذبہ شکرگزاری ظاہر کی اور دونوں کمرے سے باہر نکل گئے۔

عارف کو گھر واپس آتے آتے آدھا گھنٹہ سے زیادہ لگ گیا تھا۔ برف بھی ساری پکمل چکی تھی۔

آتے ہی اس نے پہلے بالوکو دوا دی پھر پانی میں دوبارہ برف ڈال کر پٹیاں بھگو بھگو کر اس کی پیشانی پر رکھنے لگا۔

بالو پر تقریباً بے ہوشی طاری تھی۔ چہرہ بخار سے لال ہو رہا تھا۔ عارف کے چہرے سے فکر و ہمدردی کا ملاحظہ ہوتا تھا۔

”عارف..... عارف..... ارے او عارف..... لال خان کی بیوی کا بخار اب کیسا ہے۔ تو کیا کر رہا ہے؟ کہاں ہے؟“

”بڑی بی نے شور مچا دیا۔

عارف زچ ہو کر بڑی ماں کے پاس چلا آیا۔

”سو جاؤ! اماں چپ چاپ“۔

”کیا کر رہا ہے تو؟“ بڑی بی کو کھوج ہوئی۔

”جبت مار رہا ہوں“۔ وہ جھلایا۔

”کیا دوسری؟“

”بے ہوش پڑی ہے فی الحال“۔ وہ قدرے تلخی سے گویا ہوا۔

”تو کیا کر رہا ہے؟“ بڑی بی نے تعجب سے دریافت کیا۔

”دائے بھون رہا ہوں سو جاؤ تم اب آواز مت دینا“ میں خود آ جاؤں گا تھوڑی دیر میں“۔ وہ تاکید کر کے دوبارہ بالوکے پاس آ گیا۔

اور اس کی پیشانی پر رکھی پٹی ہٹا کر دوسری رکھنے لگا۔

اس کا عمل ہمدردانہ سی مگر آنکھوں میں بے شمار سوال تھے۔

رات کی گہری تاریکی میں جپ حویلی کے مین گیٹ پر پہنچی تھی۔

اعصاف اتنے شل تھے کہ نیند آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس نے بیٹھے بیٹھے پر شکوہ سی حویلی کا جائزہ لیا۔

چوکیدار نے گیٹ داکر دیا تھا۔ جپ اندر دور تک چلی پھر جگمگاتے شیڈ کے نیچے رک گئی۔

”اتر آؤ بی بی“۔ ڈرائیور کی آواز پر وہ چونک پڑی۔

اور چادر سنبھالتی اتر آئی۔

”اندرب بی کو بولو بڑی حویلی سے مہمان آئے ہیں“۔

ڈرائیور نے دور کھڑے ملازم کو آواز دی۔

وہ اپنی جگہ کھڑی رہی جیسے اندر سے اجازت ملنے کا انتظار کر رہی ہو۔

ملازم چند منٹوں میں واپس آ گیا۔

”بی بی کہتا ہے مہمان کو گیسٹ روم میں پہنچاؤ خان آ کر خود ملیں گے“۔

ملازم ڈرائیور سے مخاطب ہوا اور پھر اس کی جانب پلٹا۔

”آؤ بی بی“۔

وہ اس کے پیچھے پیچھے چل پڑی۔

ملازم نے گیسٹ روم کھول کر اسے اندر جانے کا اشارہ کیا۔

وہ اندر داخل ہوئی۔ انتہائی شاندار گیسٹ روم تھا۔ مکمل گولڈن فرنیچر، گولڈن جم جم کرتے پردے، سرخ قالین، سرخ ہی بیٹھن اور نیچے سرخ گدیوں والی اونچی نیچی پشتوں والی چار کرسیاں، ہر شے نہایت صاف ستھری۔

اس نے ایک طرف بنے دروازے کو پر شوق انداز میں دھکیلا اور سر اندر کر کے جھانکا نہایت ہی صاف ستھرا

خوبصورت سفید پانکوں والا باتھ روم، گولڈن ٹپس، گولڈن فریم کا آئینہ اور گولڈن ہی تولیہ اسٹینڈ۔ یوں محسوس ہوا جیسے کسی فرمانروا

کابڈ روم ہو۔ اس کا جی چاہا فوراً ہی غسل کر لے مگر کپڑے.....؟ اس نے مایوس انداز میں اپنے لباس پر نظر ڈالی۔
”جب تک کا کا جان نہیں آجاتے، کپڑوں کا مسئلہ بھی حل نہیں ہوگا۔ کس قدر بد اخلاق ہیں کا کا جان کی سہیلیاں۔
والوں کا بھی لحاظ نہیں کرتیں، پتا نہیں وہی ”میم“ ہیں یا کوئی اور ہیں۔ کا کا جان تو بے حد ”مسٹر لیس“ ہیں۔ پتا نہیں کون ہے۔
جہاں میں رہتے ہیں۔ مجھے تو ویسے ہی اتنا خوف آتا ہے، پتا نہیں کیسا سلوک کرینگے مجھ سے۔“

اس نے آگے بڑھ کر کمرے کا دروازہ بند کر دیا۔ اور احتیاط سے بستر پر بیٹھ گئی۔ لباس گرد آلود ہونے کی وجہ سے اس کا شس ہو رہی تھی۔

حلق میں کانٹے چبھ رہے تھے۔ اب ملازم کو کیسے بلائے؟ یا باتھ روم میں جا کر ٹوٹی سے منہ لگا کر پانی پی لے۔ اور
میں تھی۔ اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی۔
”ہوں کون ہے؟ آ جاؤ۔“

دروازہ کھلا اور وہی ملازم جو اسے یہاں پہنچا کر گیا تھا، ٹرے میں جگ گلاس لئے اندر داخل ہوا۔ اور خاموشی سے اسے
سائیڈ ٹیبل پر رکھ دی۔

روشنی نے نہایت بے تابی سے پانی گلاس میں اٹھایا اور غٹا غٹ چڑھا گئی تھی۔ پورا گلاس پی کر اس نے گہرا سانس
کر ملازم کی طرف دیکھا۔

”کیوں کھڑے ہو؟“

”آپ کھانا کھا ئیگی؟“ وہ شپٹا کر رہ گیا۔

”ہاں ہاں بھی کیوں نہیں کھائیں گے؟ بڑا مزے دار کھانا چھوڑ کر آئے ہیں، لہذا تم کھانا اچھا سا، مگر جلدی لانا ہو۔
نے دم نکال دیا ہے۔“

اس نے پنی چادر جھاڑ کر بیڈ پر پھیلائی اور لیٹ گئی۔

”دروازہ بند کر کے جانا، پہلے بھول کر چلے گئے تھے۔ کسی نے ادب آداب نہیں سکھائے تمہیں؟ ویسے تو کا کا جان کا
سخت ہیں۔“

بے چارہ ہکا بکا اس کی شکل دیکھنے لگا۔ مہمانوں کا تو نہیں البتہ مالکوں کا انداز ضرور تھا۔

”جاؤ بھی، کیا شکل دیکھ رہے ہو؟“ وہ ناگواری سے گویا ہوئی۔

وہ جلدی سے باہر نکل گیا، مگر اس مرتبہ دروازہ بند کرنا نہیں بھولا۔

روشنی چھت پر لگے فانوس پر نظریں جما کر کچھ سوچنے لگی۔ بڑی حویلی اس کے دماغ پر روشن تھی۔

”کیا ہو رہا ہوگا وہاں۔ ایک آفت اتری ہوگی، گلو اور مونا تو رو رو کر پاگل ہو رہی ہوں گی، پپانے کس طرح رہی ایک؟
ہوگا؟“

بابا صاحب تو راتفل لوڈ کر چکے ہوں اور بڑی امی! وہ مجھے کچا چبانے کے منصوبے بنا رہی ہوں گی۔

اور قالہ..... دو درحقیقت پریشان ہوں گی۔ پپا کو کچھ سمجھا رہی ہوں گی۔ کیا مجھے گلٹی ٹیل کرنا چاہیے؟
بڑی نہیں، میں حویلی کے امپبل میں بندھی قیدی گھوڑی نہیں ہوں، مجھے انسان ہونے کے ناتے اپنے حقوق کا تحفظ کرنے
کا پورا اختیار ہے۔ میں کس خوشی میں عمر بھر کا رونا اپنے سر لگاؤں، انہیں پتا چلنا چاہیے، اپنے لئے تو یہ حال کہ کھانے میں نمک
نہیں، بالکل درست ہو در نہ کھانا اٹھا کر پھینک دیں۔ دوسروں کی زندگی نمک سے بھی گئی گزری ہے۔

نمک بالکل درست ہو در نہ کھانا اٹھا کر پھینک دیں۔ ساری دنیا اس کی تولد بھر عقل کی محتاط ہو، اسے تو میں وہ سبق سکھاؤں
اگر کا کا جان نے مجھے دوبارہ حویلی بھوانے کی کوشش کی تو اسی حویلی میں جان دے دوں گی اور اسے بھی ذرا پتا چلنے دو،
انفادون کی اولاد چلتا کیسے ہے، جیسے زمین رو نہ رہا ہے۔ ساری دنیا اس کی تولد بھر عقل کی محتاط ہو، اسے تو میں وہ سبق سکھاؤں
میں اس کی سلیس یاد رکھیں گی، بڑا آیا وہاں سے، مجھے تلاش کرنے کے بہانے جھومر بھابی سے باتیں بنا رہا ہوگا، اللہ کرے، یہ
مارا معاملہ بابا صاحب کو پتہ چل جائے پھر پتا چلے نواب کو، بڑا پتا پھرتا ہے حویلی کا ریموٹ کنٹرول۔“

اب سارا نزلہ باری پر گر رہا تھا۔

”جھکا کر رکھ دیا ہے اس معمولی شخص نے مجھے۔ اس کا تو سب سے برا حشر ہونا چاہیے۔ حویلی کی خواتین کا احترام کرتا
ہے۔ جھومر بھابی اس کی ”ڈٹیش“ لگتی ہیں۔“

پتا نہیں ان غریبوں کا کیا ہوگا جو مٹھائی کے ٹوکے لئے حویلی آئے ہوں گے۔ تاریخ لینے، بھولے نہیں سارے۔ خان
دلاور خان کی پوتی بیاہ کر لے جائینگے۔ ہونہہ..... ”خوش فہموں کا ٹولہ۔“

وہ خاصی دیر ”غائبانہ“ بڑی حویلی میں گھومتی رہی، دل و دماغ میں جھکڑ سے چل چل رہے تھے۔ اتنا بڑا قدم اٹھا تو لیا تھا
مگر سکون ذرا نہیں تھا۔

جانے کتنی دیر خیالی دنیا میں گزری تھی۔ وہ اس وقت چونکی، جب ملازم ٹرائی سمیت کمرے میں داخل ہوا۔ وہ اٹھ کر بیٹھ
گئی۔

”کا کا جان کب تک آئیں گے؟“ اس نے ملازم سے دریافت کیا۔

”کا کا جان! اوہ.....! خان کو پوچھتا ہے آپ؟ وہ تو سندھ گیا ہے۔“

اس نے اپنی جانب سے اطلاع بہم پہنچائی۔

”پتا ہے مجھے آئیں گے کب تک؟“ وہ چڑ کر بولی۔

”خیر نہیں، وہ شکار پر گیا ہے دوستوں کے ساتھ۔“ ملازم نے سادگی سے جواب دیا۔

”اچھا جاؤ تم، تمہارے ہاں باری ٹاپ کی کوئی چیز نہیں ہے۔“ وہ بستر سے اترتے ہوئے استہزائیہ انداز میں پوچھنے
لگی۔

”تمی۔“ بے چارہ نہایت پریشان نظر آیا۔

”نہرے جاؤ بابا!“ وہ جھلا کر کہتی ہوئی منہ دھونے باتھ روم کی طرف بڑھ گئی۔
ملازم باہر نکل گیا۔

قلو پطرہ ہاتھ سوپ کی خوشبو سے سارا ہاتھ روم مہک رہا تھا۔ اس نے بڑے خوشگوار احساسات کے ساتھ ہاتھ دھو کر اور سفید تولیے سے منہ پونچھتے ہوئے باہر آگئی۔

ڈوگوں کے ڈھکن اٹھا اٹھا کر اس نے ڈشز کا اندازہ لگایا۔ ایک میں قیمہ مٹر دوسرے میں بھنے ہوئے چکن تیسرے میں آلوکا بھرتا۔ اس نے چھت کی طرف دیکھتے ہوئے گویا کھانے سے پہلے اللہ کا شکر ادا کیا۔ چھوٹی کی کٹوری پر چائیز سلا بھی تھا جو اسے یوں بھی بے حد پسند تھا۔

”واہ بھئی کھانے کے معاملے میں تو ہماری چچی جان بڑی باذوق ہیں چلو یہ تو بہت ہی اچھا ہے۔ کم از کم کھانا تو بہت ملے گا۔“

وہ بہت آرام دہ حالت میں بیٹھ کر کھانا کھانے لگی۔ اس کی ذہنی کیفیت میں اس لئے بھی کوئی تبدیلی نہیں تھی کہ ایک روز سے وہ اپنے ہی گھر میں تھی۔

ابھی وہ کھانا کھانے میں مصروف ہی تھی کہ ملازم پھر چلا آیا۔

”آپ چائے یا کافی پئے گا؟“

”نہیں بھئی کھانا کھا کر تو بس اب لمبی تان کر سوئیں گے۔“ اس نے بڑے مصروف انداز میں جواب دیا۔

”سنو۔“ اس نے جاتے ہوئے ملازم کو آواز دی۔

”جی؟“ اس نے بڑی دلچسپی سے روشنی کو دیکھا۔

”تمہارا نام کیا ہے؟“

”سمندر خان۔“ اس نے بڑی سادگی سے کہا۔

”اوہ! اتنا طویل و عریض نام۔“ وہ ہنس پڑی۔

”جی۔“ وہ بے چارہ خاک..... نہیں سمجھا۔

”سنو! اپنی مالکن سے کہو۔ ہم ان سے ملنا چاہتے ہیں۔ ہم کوئی غیر نہیں ہیں، خان تیمور علی خان کی سگی بیٹی ہیں۔ خان باہر علی خان کی صاحبزادی جاؤ ہمارا پیغام اپنی مالکن کو پہنچا دو۔“

ملازم چلا گیا وہ پھر کھل توجہ سے کھانا کھانے لگی۔

کھانا ختم کرنے کے بعد اس نے برتن واپس ٹرالی میں رکھے اور ہاتھ دھوئے ہاتھ روم میں چلی گئی۔

جب ہاتھ دھو کر باہر آئی تو ملازم اس کا انتظار کر رہا تھا۔

”بی بی بولتا ہے آپ خان کے آنے تک انتظار کرو ابی وہ کسی سے نہیں ملے گا۔“

سمندر خان نے حرف بہ حرف اس تک پہنچا دیا۔

روشنی کو بے انتہا انسلٹ محسوس ہوئی۔

”سنو! کیا تمہاری مالکن بہت حسین ہیں؟“ وہ تلخی سے پوچھ رہی تھی۔

”سنو! خاموش رہا۔ بس تعجب سے اس کی شکل دیکھتا رہا۔“

”چھو بیٹو تم نے اپنی مالکن سے کیا کہا تھا؟“ اسے پیغام رسانی کے معاملے میں کچھ گڑبگ خدشہ تھا۔

”جواب نے بولا تھا وہی بولا تھا۔“

”ای تو پوچھ رہی ہوں کیا؟“ وہ جھلائی۔

”جواب خان تیمور کی سگی بیٹی ہو اور خان یاور علی خان کی صاحبزادی ہو۔“

”ابھی بے چارہ پریشان ہو گیا تھا۔“

”یوں۔“ روشنی نے کچھ سوچنے کے انداز میں ہنکارا بھرا۔

”سوچنے کے بعد بھی تمہاری مالکن پر کوئی اثر نہیں ہوا؟“ اس نے حیرت سے پوچھا تھا۔

”نہیں۔“ وہاں سے بڑا نکاسا جواب آیا تھا۔

”اس بنا کر رہ گئی۔“

”پھر میں ہی ہے؟“ اس نے موضوع بدل دیا۔

”نہیں! چھو خان (آٹل) ہاسٹل میں ہے۔“ سمندر خان نے جواب دیا۔

”چھو! جاؤ تم یہ ٹرالی لے جاؤ اور صبح مجھے اٹھانے مت آنا چاہے کا کا جان بھی آجائیں تب بھی۔ میں اپنی مرضی سے رہاں۔“

سمندر خان ٹرالی دھکیلتا کمرے سے باہر چلا گیا۔

ماٹل نے اٹھ کر دروازہ اندر سے بند کیا لائیں بجھائیں اور بستر پر اوندھ گئی۔

تین گھر سے بعد اسے فطری نیند آرہی تھی۔

.....

.....

.....

.....

.....

.....

.....

.....

.....

میں تو اس پر کسی دکھ کا سایہ برداشت نہیں کر سکتا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر اس رات مجھے نیند نہیں آئی۔
بچپن میں جب وہ تتلیاں پکڑتی بھاگتی بھاگتی گر جاتی۔ اس کے گھٹنے اپنی قمیض کے دامن سے صاف کرتے۔
کے آنسو اپنی ہتھیلیوں سے پونچھتا تھا۔ اس کو ہنسانے کیلئے کیا کیا جتن کرتا تھا۔ مجھے کیا پتا تھا کہ وہ حقیقی لڑکی تھی۔
ترسے گی۔

وہ کس عذاب میں ہوگی؟

کہاں ہوگی؟

کس حال میں ہوگی؟

اگر اسے کچھ ہو گیا؟ یہاں پہنچ کر اس کا دماغ ماؤف ہو رہا تھا۔

”افوہ! تم یہاں ہو؟ میں حیران کرا لئی گئے تو کہاں گئے؟“

جھومر کی آواز پر تو اس کے بچے کچھ حواس بھی جواب دینے لگے۔

”وہ کبخت سرسوتی تو کب کی مرکب مٹی۔ ہمیں یہاں سے وہاں تک حویلی چھاننا پڑ گئی۔“ وہ اس کے رازوں

کلی۔

باری نے نہایت بے زار کن انداز میں اس کی جانب دیکھا۔

”فرمائیے کیسے زحمت کی؟“ وہ اپنے لہجے کی تنخی کو چھپانے میں ناکام رہا۔

”وہ تمہاری قیدی اور سرسوتی کی ”کیدن“ بخار میں دھت پڑی ہے۔“

”مجھے تو تمہاری طبیعت بھی اچھی محسوس نہیں ہو رہی۔“ جھومر واقعی اسے بہت شدت سے محسوس کرتی تھی۔

ماحول میں بھی اس کی کیفیت محسوس کر چکی تھی۔

”میں آپ کو ایک ٹیبلٹ دے دیتا ہوں آپ اسے کھلا دیں۔“ وہ بولا۔

”مگر تالا تو تم کھولو گے؟“ جھومر نے تعجب سے اس کو دیکھنے کی کوشش کی۔

”میں آپ کو چابی بھی دے رہا ہوں کھول لیجئے گا۔“ وہ دھیمی آواز میں بولا۔

”ہیں؟“ جھومر کی حیرت کی کوئی انتہا نہیں تھی۔

”اور جو وہ بھاگ گئی؟“ اس نے قدرے تسخرانہ انداز میں سوال کیا۔

”بھاگ جائے۔“ وہ بے زاری سے کہتا ہوا حویلی کے اندرونی حصے کی طرف بڑھا۔

”سخت موڈ آف ہے؟“ جھومر دھیرے سے ہنسی۔

باری خاموش رہا۔

”ایسے کیوں ہو رہے ہو کچھ کھو گیا ہے؟“ وہ پھر دھیمے سروں میں ہنسی۔

”کیا لیس گی آپ خاموش رہنے کا؟“ وہ سخت خفگی کے عالم میں مخاطب ہوا۔

”جو نہ چاہیے وہ تم دو گے کب؟“ وہ پھر۔

”تہہ را تو آج مال ہی عجب ہے بواز بردست اسراف۔“ وہ آج ہم پر۔ وہ پھر ہنسی۔

باری چونک پڑا۔ کیا اسے پتا چل چکا؟ چاہنے کے باوجود اس نے کوئی سوال نہیں کیا۔

”وہ تو تمہارے مالکوں میں سے ہے۔ اتنے اونچے خواب دیکھتے ہو؟“ وہ استہزائیہ انداز میں ہنس رہی تھی۔

باری کو زمین اپنے پاؤں کے نیچے سے سرکٹی محسوس ہونے لگی۔

”کیا مطلب ہے آپ کا؟“ وہ سختی سے بولا۔

”اب تو نہیں ہو سکتا کہ تم ہمارا مطلب نہ سمجھو۔“

دبے عجب بے وقوف لڑکی ہے۔ اسے تو تمہارے ساتھ جانا چاہیے تھا۔“

باری کو یا چار سو چالیس دولت کا جھٹکا لگا تھا۔

”آپ کو کیسے پتا چلا؟ اور آپ ایک معصوم لڑکی کو کیوں مجھ سے منسوب کر رہی ہیں؟ آپ سب کی عزتوں کو تماشاً سمجھتی

ہیں؟“ وہ بس اتنا ہی کہہ سکا۔

”کی ہوتا ہی ناقابل برداشت ہے۔ ایک روز وہ بہت برامان کر مجھے سمجھا رہی تھی۔ مجھے کیا پتا تھا کہ اس نے اپنا کانا ڈالا

وہ اور اس طرف دو طرفہ کارروائی ہے۔

نئی سخت سردی میں تم نے اسی باغ میں میلوں کا سفر طے کر لیا ہے۔ ادھر بیڑھیوں پر آدمے گھٹنے سے بھی زیادہ ہو گیا۔

لڑکی نہیں دیکھ رہی تھی۔ جو خود لٹا ہوا ہودہ دوسرے سے ہوئے کو پہچاننے میں غلطی نہیں کر سکتا۔ حضور والا ورنہ اس وقت تو

اسے فرشتے بھی سوچکے ہوتے ہیں۔ رات پونے دو بج رہے ہیں۔“ جھومر کے انداز میں اعتماد استہزاء دکھ اپنی نکتہ رسی پر

درجائے کیا کیا تھا۔

”آپ ان کیلئے یہ انداز دلجو اختیار نہ کریں تو بہتر ہے۔ میں اس حویلی کا ایک فرد ہوں۔ یہاں ہونے والا کوئی بھی حادثہ

میرے ہی طرح۔ نماز ہو سکتا ہے جیسے کہ دوسروں پر آپ اسے الٹے سیدھے معنی پہنانے سے باز رہیے۔ اس طرح کسی

نہایت کرنے کی اجازت آپ نے کہاں سے حاصل کی ہے۔ یہاں اتنی بڑی بات ہو گئی ہے آپ کو ہنسی کی سوجھ رہی ہے۔

تجربہ فوس کی بات ہے۔“ باری چلتے ہوئے کہتا جا رہا تھا۔

”بزدل مٹی ہے اس حویلی کو میری میرا بس چلے تو چھت پر جا کر رقص کروں اور منوں مٹھائی تقسیم کروں۔ غریبوں کو کھانا

دے دوں۔ پس اشرافیاں ہوں تو تمہارے سر سے صدقہ اتار کر دلہیز پر پھینک دوں۔ پورے چالیس دن نئے کپڑے پہنوں۔“

نہایت خونی کراؤں اور اس کا ثواب رشتی کی ماں کو پہنچاؤں۔ کیا ”شیرنی“ پیدا کی ہے۔ کم از کم میں تو مرتے دم تک اس

نہایت خونی کراؤں کی اس کی وجہ سے میرے کیلئے کچھ ٹھنڈک پڑی ہے۔

”بزدل مٹی کے طور پر البتہ اس کا خیال آ رہا ہے۔ جوان بھی ہے اور خوبصورت بھی کہیں جلدی ہی کوئی ہاتھ صاف نہ کر

سکتا۔ یہ تو وہ خون خرابا کرنے کی حد تک بہادر ہے۔ مگر ہے تو پھر بھی لڑکی۔“

ایک دل کہہ رہا ہے خدا کرے اسے کچھ نہ ہو۔ دوسرا کہتا ہے خدا کرے لٹ کر ہی اس جویلی میں ملے اس جویلی کی شان.....؟“

ایک زنائے دارطمانچہ اس کے رخسار پر پڑا تھا۔ ابھی وہ سنبھلی بھی نہیں تھی کہ دوسرے رخسار پر ایک اور جویلی میں آپ کا گلابانے کی نیت پر ہوں دفع ہو جائیے یہاں سے اگر آپ نے آئندہ مجھ سے بات نہ کی تو حشر لگا دوں گا۔ اس قیدی کے ساتھ کچھ نہیں ہوا جو آپ کے ساتھ ہوگا۔“

باری کی رگ رگ میں انگارے دبک رہے تھے۔ اس کی آنکھوں میں خون اتر اہوا تھا۔ وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا تھا۔

وہ زینے طے کر رہا تھا۔ جھومر رخسار پر ہاتھ رکھے ششدر دیکھ رہی تھی۔

نیند تو خیر مابین کو بھی نہیں آرہی تھی مگر یاور علی خان جس طرح دھواں چھوڑنے والا انجن بنے ہوئے تھا۔ انتہائی اذیت ناک تھا۔

کبھی رائٹنگ ٹیبل پر بیٹھ کر فائلیں دیکھنے لگتے۔ کبھی کمرے میں ٹہلنے لگتے، کبھی صوفے پر نیم دراز ہوتا۔ سے نیچے اتر آئی اور ان کے قریب چلی آئی

”اتنے ٹینس نہ ہوں اللہ پر بھروسہ رکھیں۔“ اس نے ان کی پیشانی پر اپنا نازک سا ہاتھ رکھ کر ملاٹھا ہے۔ یاور علی خان نے اپنی سرخ آنکھیں لمبے بھر کو کھول کر اس کی سمت دیکھا۔ نہایت ہلکے آسانی رنگ کی نئی کڑی بالوں میں وہ بہت اپنی اپنی محسوس ہو رہی تھی۔ کمرے میں ٹائٹ بلب کی کمزوری روشنی اسے مزید پرکشش کرتی تھی۔ ”ماہین! یہ کوئی معمولی بات تو نہیں ہے۔“ انہوں نے آنکھوں پر بازو رکھ لیا۔

”تو میں کب کہہ رہی ہوں کہ یہ کوئی چھوٹی سی بات ہے۔ مگر ہمیں یہ بھی تو زیب نہیں دیتا کہ اپنی قوت ٹھکانے جائیں۔“

بات پیدا ہوتی ہے تو آگے بھی چلتی ہے پھر کسی منطقی انجام تک بھی پہنچتی ہے۔ ہمیں امید رکھنا چاہیے۔ ہمارے حق میں ہوگا۔“

اس نے اپنا ایک ہاتھ ان کے بازو پر اور دوسرا ان کے سینے پر رکھ کر بہت اہمیت سے کہا۔ ”وہ کمزوری سڑکی ہے مابین اور لڑکی بہت بڑی ذمہ داری ہوتی ہے۔ صدیوں کی محنت داؤ پر لگی ہوئی ہے۔ ہمارے ساتھ بہت زیادتی کی ہے۔“ یاور علی خان کے لہجے میں بلا کی تھکن تھی۔

”وہ جہاں کہیں بھی ہوگی خیریت سے ہوگی نادان نہیں ہے اپنی حماقت کر سکتی ہے۔“ مابین نے سمجھنے سے کہا۔

”نادان نہ ہوتی تو یہ حرکت کرتی؟ سخت اسحق لڑکی ہے حماقت و حماقت کر رہی ہے۔“ یاور علی خان غصے سے

بوجے آپ تمام سمجھیں۔“ انہوں نے بے زاری سے کہا۔

”آپ کی طرح سوچتے رہیں گے؟ اس سے کیا مسئلہ حل ہو جائے گا؟“ وہ گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

”مابین! جانیے آرام کیجئے۔“

”مابین! طرف دیکھتی ہوئی بستر کی طرف بڑھی اور دراز ہو گئی۔

”مابین! نے پھر سرکٹ سلگالی اور صوفے سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

”مابین! کیفیت میں کمرے میں ٹہل رہے تھے۔ ٹہلتے ٹہلتے وہ اچھتی سی نظر مابین پر ڈال لیتے تھے۔

”مابین! نے دور تک کھلے ہوئے بال پھیل گئے جو برابر کے تکیے پر بکھر گئے تھے۔ سرخ ٹائلی میں ایک دمکتا وجود نیند کی

میر قند۔

”مابین! نے چوڑیوں سے بھر ہاتھ سینے پر رکھا ہوا تھا۔ انہوں نے فائل بند کر دی تھی اور بستر کی طرف بڑھ آئے تھے اور

بے ہوش گئے تھے۔

”مابین! تھی دیوہ یونہی دیکھتے رہے پھر وہ اس کے چہرے پر جھک گئے۔

”مابین! کسسا کر آنکھیں کھول دی تھیں۔

”مابین! جاگ رہے ہیں؟“ وہ غنودگی سے پوچھ رہی تھی۔

”مابین! کیا تمہیں تو اپنی نیند سے غرض ہے عمر بھر کی بیداری بخش کر کیا ٹھاٹھ سے سوتی ہو؟“ وہ سیدھے ہو کر بیٹھ گئے۔

”مابین! نے بڑے ناز سے کروٹ بدل لی تھی۔

”مابین! کیلے ہوتی ہے دو چاہنے والوں کیلے نہیں۔“ انہوں نے اس کا بازو پکڑ کر اس کا رخ اپنی جانب موڑ لیا تھا۔

”مابین! یہی سخت نیند آ رہی ہے۔“ اس نے پھر کروٹ لینے کی کوشش کی۔

”مابین! سے آدمی ہمیں بھی دید و تا کہ ہم بھی سو جائیں۔“ انہوں نے اسے کروٹ لینے سے باز رکھا۔

”مابین!۔“ وہ بسوری تھی۔

”مابین! نے رات کو نہیں چلے گا۔ سمجھیں میڈم سنیر کیسبرج؟“

”مابین! نے جواز تک کرتا ہے اور رات کو آپ۔“ وہ پھر بسوری تھی۔

”مابین! نے جواز تک کرتا ہے اور رات کو آپ۔“ وہ پھر بسوری تھی۔

”مابین! نے جواز تک کرتا ہے اور رات کو آپ۔“ وہ پھر بسوری تھی۔

”مابین! نے جواز تک کرتا ہے اور رات کو آپ۔“ وہ پھر بسوری تھی۔

”مابین! نے جواز تک کرتا ہے اور رات کو آپ۔“ وہ پھر بسوری تھی۔

”مابین! نے جواز تک کرتا ہے اور رات کو آپ۔“ وہ پھر بسوری تھی۔

جی فرمائیے۔ کیوں رو رہی ہیں آپ؟“ اس نے خود بھی ایک نشست سنبھال کر سوال کیا۔ اس نے بار بار آنکھیں کچھ تلاش کرنے کی جستجو میں بڑی بے تاب نظر آئیں۔

”باری..... کیا..... یاد؟“ سائیکی پراہلم“ ہیں۔“ اس نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔

”جی؟ نہیں تو..... سارے گھر میں ایک وہی تو بیلنس نظر آتے ہیں۔“ وہ دھیرے سے نفس دیا۔

”کوئی مسئلہ ہو گیا ہے؟“ اس نے مابین کا چہرہ بغور دیکھا۔

”باری! انہوں نے میری بہت انسٹ کی ہے۔“ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔

”کیا کہتے ہیں۔“ باری کو جیسے اس کے ساتھ زیادتی کا بہت دکھ ہوا۔

”مجھے یہ بتاؤ کہ عموماً گھروالوں کے ساتھ یہ کیسا ”بی ہو“ کرتے ہیں؟“ اس نے آنکھیں پونچھیں۔

”ہی ازاے دیوی ناکس اینڈ جنٹلمین۔ ویل میزڈ۔ ڈیننگو میں بہت ایزی ہیں۔“

وہ کہہ رہا تھا۔ ساتھ ساتھ الجھن بھری نظروں سے اس کے چہرے کے تاثرات بھی دیکھ رہا تھا۔

”یاد کرو شاید کبھی ایسا ہوا ہو کہ انہیں کوئی دورہ دورہ۔“

”نہیں۔ میں نے ہمیشہ ان کو فٹ دیکھا ہے۔“ باری نے تیزی سے جواب دیا۔

”آپ مجھے بتائیے اس وقت وہ کیا کر رہے ہیں؟“ اسے بہت الجھن ہو رہی تھی۔

”مجھے کیا پتا۔ میں تو اس وقت تمہارے پاس بیٹھی ہوں۔“ اس نے جھلا کر جواب دیا۔

”میرا مطلب ہے جب آپ اپنے بیڈ روم سے باہر آئیں تو وہ آپ کے ساتھ کیسا بی ہو کر رہے تھے؟“

”کمرے سے نکال دیا ہے انہوں نے مجھے۔“ اس نے اطلاع بہم پہنچائی۔

”جی۔“ باری کو جیسے شاک لگا۔

”جی۔“ مابین نے بھی اس کی نقل اتاری۔

”آپ لوگوں کی لڑائی ہو رہی تھی۔“ اس نے بے حد جھجکتے ہوئے پوچھا تھا۔

”لاحول ولاقوہ..... کاش ہوتی۔ تو اس طرح نکالے جانے پر اتنی حیراتی کیوں ہوتی۔“ اس نے سنا کر بار بار۔

”پھر کیا ہوا تھا؟“ باری کی حیرت بجا تھا۔

”اسی لئے تو تمہارے پاس آئی ہوں کہ تم یہاں کے سب سے باخبر شخص ہو۔ بالکل ٹھیک ٹھاک تھے۔

اب روشنی کی وجہ سے ٹینشن ہے وہ تو فطری ری ایکشن ہے۔ مگر میرے ساتھ بالکل نارمل تھے۔ البتہ ٹینشن تھی۔ مجھے سونے کا کہہ کر کمرے میں ٹہل رہے تھے۔ میں ویسے ہی آنکھیں بند کر کے لیٹی ہوئی تھی۔ غائب ہو گئے۔

میں تو میں کیسے سو سکتی تھی۔ پھر پتا نہیں کیا ہوا۔ انہوں نے مجھے کہا کہ فوراً کمرے سے باہر چلی جاؤں۔

میں تو ایک دم پریشان ہو گئی۔ کہ الہی انہیں کیا ہو گیا؟“

”ہوں۔“ باری نے ایک گہری سانس لی۔ اور مابین کی سمت دیکھا۔ وہ سوچ میں کہیں دور پہنچ گیا تھا۔

جی نے بہت غصے میں کہا تھا؟“ باری ہنوز گہری سوچ میں تھا۔

”نہیں۔“ مابین کو پھر رونا آ گیا۔

”پتہ نہیں ہوں۔ وہ صبح تک نارمل ہو جائیگے۔“ باری نے تسلی دی۔

”ج رات کی صبح کتنی مشکل ہوگی۔ تمہیں اندازہ ہے؟“ وہ بولی۔

”پتہ ایسا کیجئے۔ گیٹ روم میں جا کر سو جائیے۔“ باری نے مشورہ دیا۔

”سونے کا مسئلہ نہیں ہے۔ سونے کا کیا ہے۔ کہیں بھی سو جاؤں گی۔ مجھے تو یہ پریشانی ہے کہ انہیں ایک دم سے کیا ہو گیا۔“ وہ ہنوز فکر مند تھی۔

”شاید وہ روشنی بی بی کی وجہ سے بہت پریشان ہیں۔“ باری نے دھیمی آواز میں کہا۔

روشنی کے نام پر مابین نے چونک کر اس کا چہرہ دیکھا۔

”تو بھلا اس میں میرا کیا قصور ہے؟“ اس نے آزدگی سے کہا۔

باری خاموش رہا۔

”باری۔“ اس نے گہری نظروں سے باری کو دیکھا۔

”جی؟“ وہ نظریں جھکائے ہوئے تھا۔

”کیا روشنی سے تمہاری کوئی بات ہوئی ہے؟“ اس نے فوراً مینٹر ابد لا تھا۔

”ان سے تو باتیں ہوتی رہتی ہیں۔“ اس نے تجاہل عارفانہ سے کام لیا۔

”بناؤ نہیں مجھے۔ تمہیں پتا ہے کہ میں تم سے کیا پوچھ رہی ہوں۔“ اس نے جیسے ڈپٹ کر کہا۔

باری خاموش رہا۔

”کیا پوچھ رہی ہوں میں؟“

باری پھر خاموش رہا۔

”کیا وہ تمہیں پسند کرتی ہے؟“ اس مرتبہ وہ کھل کر بولی۔

”اگرچہ میں کسی لائق نہیں ہوں۔“ اس کے انداز میں جیسے اقرار گناہ تھا۔

”تم بھی اسے پسند کرتے ہو؟“ وہ مزید آگے بڑھی۔

باری پھر خاموش ہو گیا۔

”بھئی جواب دو۔“ وہ اس کی خاموشی سے چڑھ گئی۔

”میں نے بھی اس زاویے سے سوچا نہیں۔ میرے خیال میں مجھے اس طرح سوچنا بھی نہیں چاہیے۔“ اس نے بڑے سہجائے جواب دیا۔

”نہی طرف دیکھ کر جواب دو۔ کیا مجرموں کا سا انداز بنا رکھا ہے۔“ اس نے کہا۔

”جی۔ میں سچ کہہ رہا ہوں۔“ اس نے نظریں اٹھا کر مایہن کی سمت دیکھا۔

”سچ محسوس ہو جاتا ہے۔ اس کے اپنے منہ سے اعلان کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ تمہارے الفاظ ہموار ہیں۔“ انداز کچھ اور کہہ رہے ہیں۔“ اس نے بڑے اعتماد سے کہا۔

”نہیں جی! ایسی کوئی بات نہیں ہے۔“ وہ مسکرا دیا۔

”میری بات ہوئی ہے روشی سے باری۔ مجھ سے جھوٹ نہ بولو۔“ وہ سنجیدگی سے بولی۔

”انہوں نے مجھے تسلیم کیا ہے؟“ وہ چونک پڑا۔

”وہ بڑی بہادر اور کھری لڑکی ہے۔ اتنے چھوٹے کام نہیں کر سکتی۔“ مایہن نے بڑے وثوق سے کہا۔

”پھر؟“ باری کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔

”پھر یہ کہ مجھے بتاؤ۔ تمہیں اس کے احساسات کی خبر ہے؟“

باری خاموش رہا۔

”باری..... پلیز۔ فارگٹ ڈسک۔“ وہ جھلائی۔

”جی۔“ نہ جانے کیوں اس سے جھوٹ نہ بولا گیا۔

”تم نے کس طرح ری ایکٹ کیا ہے آج تک؟“ اس نے پوچھا۔

”میں نے کبھی ان کی حوصلہ افزائی نہیں کی بلکہ کوشش کی ہے کہ وہ مجھ سے مایوس ہو جائیں

اس نے سچائی سے جواب دیا۔

”کیوں؟“ اس نے حیرت سے پوچھا۔

”جس بات کا انجام واضح ہو۔ اسی حساب سے ری ایکٹ کرنا چاہیے۔“ اس نے بڑے اعتماد سے جواب دیا۔

”تمہیں ذرا دکھ نہیں ہے۔“ مایہن نے بڑے دکھ سے پوچھا۔

باری خاموشی سے اپنے ہاتھ مسلتا رہا۔

”باری۔ کیا تمہیں مجھ پر ذرا بھروسہ نہیں؟“ وہ ابھی۔

”دکھ کا نہ پوچھیں۔ یہ ہمش کا ہے۔“ بالآخر وہ کہہ گیا۔

”اتنے بزدل ہو؟“ مایہن نے گہرا سانس لیا۔

بات بزدلی کی نہیں۔ احسان شناسی کی ہے۔“ وہ بہت آہستگی سے گویا ہوا۔

”میرے خیال میں تمہارے ہاں وہ جذبہ نہیں ہے جو روشی کے پاس ہے۔ ورنہ کوئی راستہ نکل ہی آتا۔“ مایہن نے نتیجے پر پہنچ گئی۔

باری نے خاصے تعجب سے اسے دیکھا۔ مگر بولا کچھ نہیں۔

”تم نے اسے زندگی بھر کا دکھ دیا ہے۔ تمہیں احساس تک نہیں۔“ مایہن نے افسردگی سے کہا۔

میں نے تو انہیں دکھوں سے بچانے کی ہر ممکنہ کوشش بڑی روشن ضمیری کے ساتھ کی۔ اب یہ انسان کا نصیب۔“ اس نے سونے کی پشت سے ٹپک لگالی۔

”ذرا سوچو تو اس کا کیا ہوگا؟“ مایہن نے اس کا چہرہ بغور دیکھا۔

”وہ کی آخری حد یہ ہے کہ تم اس کے کیلئے کچھ کرنا بھی تو نہیں چاہتے۔“ مایہن نے سرد آہ کھینچی۔

”وہ بہت جلد باز اور جذباتی ہیں۔ ان کی جذباتیت نے راستے بہت مشکل بنا دیے۔ شاید کوئی راستہ نکل ہی آتا۔ جو آج

ہو رہے ہیں ہمیشہ تو نہیں ہوتا۔ پھر بھی ایک سے نہیں ہوتے۔ آٹھ پہر کی آٹھ صورتیں ہوتی ہیں۔ بندے کو تھوڑا صابر اور

بیٹا والا بھی ہونا چاہیے۔“

مایہن نے خوشگوار حیرت کے ساتھ اسے دیکھا۔ وہ بہت آرام دہ حالت میں بیٹھا ہوا تھا۔ سفید کائٹز کا شلوار سوٹ جس پر

نئیں پڑ چکی تھیں۔ اسے بہت تھکا ہوا اور نڈھال ظاہر کر رہا تھا۔

”تم اسے یہی سمجھا دیتے۔ کم از کم یہ نوبت تو نہ آتی۔“ مایہن نے کہا۔

”مرد سمجھاتا اگر مجھے ذرا بھی اندازہ ہوتا کہ وہ یہ سب کر گزریں گی۔“ اس نے یوں کہا جیسے اپنے کسی جرم کا اعتراف کر

رہا۔

”یہ نرم گوشہ اس لئے ہے کہ وہ تمہاری طرف متوجہ ہے۔ یا تم بھی؟“ مایہن بہت سنجیدہ تھی۔

”میں آپ سے درخواست کروں گا یہ نہ پوچھئے پلیز۔“ اس نے نظریں جھکا لیں۔

”پلو ٹھیک ہے۔ فی الحال یہ دعا کرو کہ وہ ساتھ خیریت کے گھر واپس آ جائے۔ پھر دیکھنا میں کیا کرتی ہوں۔“

باری نے چونک کر مایہن کی شکل دیکھی۔ ”کیا کریں گی آپ؟“

”کیوں بتائیں۔ اچھا جاؤ تم آرام کرو۔ ہم بھی آرام کرتے ہیں۔ آخر صبح کو میاں سے جھگڑا بھی تو کرنا ہے رات کو وہ

بڑی کر رہے ہیں دن کو ہم کریں گے۔“ مایہن نے خود کو ہلکا پھلکا کرنے کی کوشش کی۔

باری اٹھ کھڑا ہوا۔

”آئیے۔ میں گیسٹ روم کھول دوں۔“ وہ آگے بڑھ گیا اور مایہن اس کے پیچھے چل پڑی۔

”اب یہ کپڑے یہاں سے سمیٹو۔“ مگلو نے روبی کو مخاطب کیا۔

”بہا نغاری ہوں دھیان نہیں رہا تھا۔“ وہ بچھے بچھے انداز میں بولی۔

”صرف اٹھاؤ نہیں۔ کہیں دفن کر دو۔“ لالی چنچ کر گویا ہوئی۔

”نہ نہ کر۔“ بگبگی باتیں کر رہی ہو۔ آجائے گی۔ بصورت دیگر ڈھونڈ لیا جائیگا۔“ مونا ہول کر بولی۔

”آپ تو سدا کی خوش فہم ہیں۔ وہ آنے کیلئے گئی ہے۔ جانا اتنی بڑی بہادری نہیں ہے جتنا کہ واپس آنا۔ بابا صاحب تو

نہ نہ نہیں پھرتے گئے۔“ تانیہ اداسی سے بولی۔

”ایسا نہیں ہوتا جیسے کہ ہم سوچتے ہیں۔ اس وقت تک کے غصے ہیں جب تک وہ سامنے نہیں آجاتی۔“

”ویسے اس نے بہت غلط حرکت کی۔“ رری کو غلطی نظر آگئی، کافی دیر سے خاموش بیٹھی تھی۔
 ”اب تو جو ہو چکا..... ہو چکا..... آگے کا سوچو۔ نعیم کے گھر والے تو ڈھونڈ لیں گے۔“
 ”ہائے میرا پانچ ہزار کا شرارہ۔“ رروبی نے آہ بھری۔
 ”لاکھوں لگ گئے ہوں گے اس پر لڑکی پر۔ اس طرح بھی سوچو۔“ لالی تنک کر بولی۔
 ”مہینو آپا..... کب جان چھوٹے گی آپ کی اس تنگ سے۔ کتنی بے حس ہیں آپ۔“ حنا نے چٹ کر مہینو کو دیکھا۔
 ”میں ہاتھ پر ہاتھ رکھ بیٹھ جاتی ہوں۔ گارنٹی دو۔ وہ اس طرح آجائے گی۔“ وہ ہاتھ روک کر تنگی سے گویا ہوئی۔
 ”یہ الٹی پڑی ہیں۔“ رروبی بڑبڑائی۔

”یا در ماموں تو بہت غصے ہو رہے ہوں گے۔“ مونو کو ان کے غصے کا خوف محسوس ہوا۔
 ”سارا غصہ بے چاری ممانی پر اتر رہا ہوگا۔“
 ”بھلا ان بے چاری کا کیا قصور؟“ گلو بولیں۔
 ”یہ کون دیکھتا ہے۔“ زری اداس انداز میں مسکرائی۔
 ”وہ گئی کہاں ہوگی؟“ رروبی کو ایک دم دھیان آیا۔
 ”شاید کراچی۔“ حنا نے معصومیت سے کہا۔
 ”وہ بے وقوف ہے مگر اتنی بھی نہیں۔“ زری چڑ کر بولی۔

”ہائے۔ بے چاری نے پتا نہیں کھانا بھی کھایا ہوگا کہ نہی۔“ بیہ کو اس کے کھانے پینے کی فکر ہوئی۔
 اسی دم باری ہال میں داخل ہو لاور لڑکیوں پر ایک نظر دوڑائی۔
 ”آپ کو بڑی امی بلارہی ہیں۔“ وہ گلو سے مخاطب ہوا۔

”مہینو نے کن اکھیوں سے اس کی سمت دیکھا۔ اس کی شیو بڑھی ہوئی تھی۔ البتہ کپڑے بدلے ہوئے تھے۔
 پینٹ پر آف وائٹ شرٹ اور چمکتے ہوئے جوتے پہن رکھے تھے۔
 ”کہیں جا رہے ہو؟“ مہینو نے بظاہر بے نیازی سے پوچھا۔
 ”جی۔ کچھ منگنا ہے؟“ اس نے بڑی سادگی سے دریافت کیا۔
 ”نہیں..... فی الحال تو کھوئی ہوئی چیز مل جائے تو یہی بہت ہے۔“ وہ معنی خیز انداز میں مسکرائی۔
 ”باری تمہارے ہوتے ہوئے وہ کیسے نکل گئی۔“ مونو کو خاصا تعجب تھا۔
 ”کیوں۔ مجھ میں ایسی کیا خاص بات ہے؟ گھر میں تیس بتیس افراد اور بھی ہیں؟“
 اس نے قدرے ناگواری سے جواب دیا۔ رات بھر جاگنے کی وجہ سے اس کے اعصاب ویسے ہی مثل تھے۔

”مہینو مسلسل حرکت میں رہتے ہو۔“ شیو مسکرائیں۔
 ”مہینو سمجھیں تو میری دوستی ہیں۔ جدھر جاتا ہوں ساتھ ہی لے کر جاتا ہوں۔“ وہ بے تاثر لہجے میں کہہ رہا تھا۔
 ”باری بھائی..... روشی کو ڈھونڈنے جا رہے ہیں؟“ بیہ نے بڑی سادگی سے پوچھا۔
 ”شیو ہلپی ضبط کرتے ہوئے سلاخیوں پر جھک گئیں۔
 باری نے ایک نگاہ بیہ پر ڈالی اور واپس پلٹ گیا۔
 گلو اس کے پیچھے چل پڑی تھیں۔
 ”سارے لڑکے جو ادھیت کتنی انسلٹ فیل کر رہے ہوں گے۔“ زری نے بڑبڑانے کے انداز میں کہا۔
 ”اور ان سب کے درمیان جو ادھیت کیا حالت ہوگی؟“ مہینو نے اگلا نکتہ اٹھایا۔
 ”وہ ویسے ہی غصے کے تیز ہیں۔ اگر روشی سامنے آگئی تو دیکھئے گا شوٹ کر دیں گے۔“ رروبی نے بڑے دکھ سے کہا۔
 ”دیکھا نہیں رات سے اب تک کسی قسم کا شور شرابا نہیں ہوا اس طرف۔“ لالی نے توجہ دلائی۔
 ”پتا نہیں بڑی امی نے گلو آپا کو کیوں بلوایا ہے۔“ تانیہ نے سوچ کا رخ موڑا۔
 ”روشی کے سلسلے میں کوئی بات کرنا ہوگی۔“ رروبی نے سوچ کا اندازہ لگایا۔
 ”اب کیا بات رہ گئی ہے۔“ شیو تسخرانہ مسکرائیں۔
 رروبی جل کر ایک میگزین اٹھا کر دیکھنے لگیں۔
 اتنی لڑکیاں تھیں ہال میں مگر ایک محسوس کیا جانے والا سا ناٹا طاری تھا۔

.....
 ”آپ ساری رات جاگتے رہے ہیں کیا؟“ بالونے اسے کرسی پر بیٹھے دیکھ کر بڑی شرمندگی سے کہا۔
 ”اس طرح نہ کریں مجھے کیا ہو جائے گا۔ کیا ہو سکتا ہے۔ ٹھیک ہو جاؤں گی لوٹ پوٹ کر۔ آپ اس طرح۔ میرے لئے تکلیف نہ کریں۔“

یہ وفائیں ساری دھوکے پھر یہ دھوکے بھی کہاں
 چند دن کی بات ہے پھر لوگ ہم سے بھی کہاں
 دو کرسی سے اٹھتے ہوئے ہنس دیا۔

”انٹرن کرے۔ اب تو جو ہو بس ٹھہرنے کیلئے ہو۔“ بالونے بے ساختہ کہا۔
 طائف کے ہونٹوں پر بڑی بے ساختہ سی مسکراہٹ آئی تھی۔ پہلی مرتبہ بالونے اس کے کسی شعر پر ”رد عمل“ ظاہر کیا تھا۔
 ”بہت دن ہو گئے تھے سکون ٹھہرے ہوئے۔ طبیعت بڑی حیران تھی۔ بار بار یہ شعر یاد آ رہا تھا۔
 خدا محفوظ رکھے آفتوں سے!

کئی دنوں سے طبیعت شادمان ہے

وہ مسکراتے ہوئے اس کے نزدیک آیا۔ اور اس کی کلائی تھام لی۔

”کیسی طبیعت ہے اب۔ کیسا محسوس کر رہی ہے؟“ سفید شلوار قمیض میں ملبوس اور بڑھی ہوئی شیشے کے برقعہ بہت اپنائیت اور ہمدردی سے اس کا حال پوچھ رہا تھا۔

بالو ایک ٹک اس کی طرف دیکھتی رہ گئی۔ بڑا ہی من چاہا سے در آیا تھا۔

”خدا کا شکر ہے۔ اب تو طبیعت اچھی معلوم ہوتی ہے۔ آپ ہاتھ منہ دھولیں۔ میں ناشتہ لاتا ہوں۔ پر آپ کھانی ہے۔“

وہ اس کی نظر سے انجان بن کر شائستگی اور ملائمت سے کہہ رہا تھا اور بہت غیر محسوس طریقے سے اس کی کوئی بات نہ تھی۔

”آئیے۔ میں آپ کو ہاتھ روم کا راستہ دکھا دوں۔“

”آپ نے مجھ سے کچھ پوچھا نہیں۔“ بالو نفاہت بھرے انداز میں بیٹھتے ہوئے بولی۔

”مثلاً..... کیا پوچھنا چاہیے تھا مجھے؟“ اس نے تجاہل برتا۔

”بہت کچھ ہے پوچھنے کیلئے۔“ اس نے دبی زبان سے کہا۔

”آپ ہوش و حواس کی دنیا میں پورے قدم تو رکھیں۔ پوچھ لیں گے۔ بلکہ پوچھنا کیا آپ خود ہی بتا دیجئے؟“

کوئی دم اور بیٹھے ہیں یہ فرصت پھر کہاں لوگو

چلے آؤ جو سنی ہو ہماری داستان لوگو

کی مثال بن کر۔ کیا خیال ہے؟ آئیے۔ وہ ہنس دیا تھا۔

”آپ کو کوئی حیرت نہیں ہوئی مجھے یہاں دیکھ کر۔“ بالو حیرانی سے پوچھ رہی تھی۔

”اب حیران ہونا بھی چھوڑ دیا ہے۔ پریشان ہونا بھی چھوڑ دیا ہے۔ مشتاق ہونا بھی چھوڑ دیا ہے۔“

سکیش کاروبار عشق خواباں

بہت نقصان ہوا ہے اے دل اے دل

وہ کمرے سے نکلنا تو بالواس کے پیچھے آہستہ آہستہ چل پڑی۔

”عارف! لال خان کی بیوی کا بخار اتر گیا کہ نہیں۔“ بڑی بی نے قدموں کی چاپ محسوس کرتے ہوئے فوراً سانس لیا۔

”اتر گیا ہے اماں۔“

”تو نے چائے پانی کا پوچھا؟“ ان پر میزبانی کا دورہ شروع ہوا۔

”صرف پوچھا ہی نہیں ہے۔ پیش بھی کر رہا ہوں۔“ اس نے رسانییت سے جواب دیا۔

”ہاں تو پھر تو ہی پیش کرے گا۔ اور ہے کون یہاں تیرے سوا۔ میں ٹھہری آنکھوں سے کوری۔“ بڑی بی نے جواب دیا۔

بہت ہی شوق تھا۔

”تو نے یہ نہیں پوچھا اس سے کہ لال خان ساتھ کیوں نہیں آیا۔ کہیں ”بدلی“ (ٹرانسفر) تو نہیں ہو گئی اس کی۔“

”ہیں..... ڈپٹی کمشنر لگا ہوا ہے وہ۔“ ”بدلیاں“ کیوں نہیں ہوں گی اس کی؟“

عارف مسکراتے ہوئے کچن کی طرف بڑھ گیا تھا۔

بنو نے سب سن لیا تھا۔ جان جل کر خاک ہو گئی تھی اس کی۔

(ہونہ..... بڑی بی کو لال خان کے علاوہ کوئی بات ہی نہیں سوچھتی)

بٹمنے کے بعد وہ کافی دیر تک کمرے میں ٹہل کر اشیا کا جائزہ لیتی رہی۔ پھر اکتا کر ایک دم دروازہ کھول کر باہر نکل آئی۔

خوبصورت لاں میں بے حد خوشنما پھول کھلے ہوئے تھے۔ ایک دم آنکھوں میں تراوٹ سی آ گئی۔ گیٹ کے پاس بڑا

خوبصورت سا چوکیدار رائل کاندھے سے لٹکائے ٹہل رہا تھا۔ دو چار ملازمین آتے جاتے دکھائی دے رہے تھے۔ وہ چلتی ہوئی

بن کے بچوں سے آگئی۔

مور کی شکل کی سنگی بیچ پر بیٹھ گئی۔ نظر کے سامنے ساری حویلی تھی۔ یہاں سے وہاں تک نظریں دوڑانے لگی۔

”آپ کون ہیں؟“

وہ ایک دم چمک پڑی۔ سامنے دس گیارہ سال کی بے حد خوبصورت بچی بڑی معصوم حیرت سے اسے دیکھ رہی تھی۔

ہائٹ پینٹ سرخ و دہن جرسی و ہائٹ جوگرز سنہری بالوں کی تقریباً ایک فٹ لمبی پونی۔

”اف کتنی کیوٹ بے بی ہے۔“ روشی کو بے ساختہ پیارا آ گیا۔

”ہوں۔ پہلے آپ بتائیے آپ کون ہیں؟“ اس نے بچی کا ہاتھ تھام لیا۔

”ہم۔ صوفی ہیں۔ صوفیاشان۔“ اس نے بڑی شاہانہ تمکنت سے جواب دیا۔

”کا کا جان کی بیٹی ہو؟“ اس نے دلچسپی سے پوچھا۔

”کا کا جان؟ ہوا؟“ اس نے ناک چڑھائی۔

”بابا صاحب کو جانتی ہو؟“ روشی کا اشتیاق سواہور ہا تھا۔

”بابا صاحب کو جانتی ہو؟“ روشی کا اشتیاق سواہور ہا تھا۔

”جی۔ وہ ہمارے بابا صاحب ہیں۔ مائی لوگ گریڈ فادر۔“ اس نے بڑی شان استغنا سے جواب دیا۔

”اوو۔“ روشی کو اپنے ہر سوال کا جواب مل گیا۔

”آج اسکول نہیں گئیں؟“ اس نے بہت محبت سے اس کا چہرہ دیکھا۔

”نہیں..... ہم آج کار حویلی آئے ہوئے ہیں۔ ہم یہاں نہیں پڑھتے ہیں۔ ہمارا اسکول..... سوئٹزر لینڈ میں ہے۔“ اس

نے سابقہ نماز میں جواب دیا۔

”اوو۔“ روشی کو اس کا منفرد سا انکس لہجہ سمجھ میں آ گیا۔ سوکس ایجوکیڈ اپنے لہجے کی انفرادیت سے پہچان لئے جاتے

ہیں۔

”وہاں آپ کے ساتھ آپ کے اور بہن بھائی بھی پڑھتے ہیں؟“

”نہیں۔ بس وہاں ہم پڑھتے ہیں۔ ہمارے بہت سے دوست ہیں وہاں ہمارا جو سب سے میں نے یاد کیا۔“

وہ بڑی بے تکلفی سے بتا رہی تھی۔

”آپ کون ہیں؟“

”ہم بابا صاحب کی وہی ہیں جو ان کی آپ ہیں۔“ روشی ہنس پڑی۔

”ہیں؟“ بچی نے تعجب سے اسے دیکھا۔

”بڑی حویلی سے آئے ہیں ہم۔“ اس نے وضاحت کی۔

”بڑی حویلی؟“ وہ پھر الجھی۔

”ہوں۔ بابا صاحب کے گھر سے۔“

”اوہ..... آپ ان کے ساتھ ہی رہتی ہیں۔“ وہ معصوم انداز میں پوچھ رہی تھی۔

”ہوں۔“

”وہ آپ کے ساتھ کیوں رہتے ہیں۔ یہاں کیوں نہیں رہتے ہیں؟“ اسے جیسے جیسی لیل ہوئی۔

”یہ ان سے پرچھے گا۔“

”آپ بڑے ابا کی بیٹی ہیں؟“ اس نے انگلیش میں پوچھا۔

”نہیں۔“

”بصیرانگل کی بیٹی ہیں؟“ بچی مکمل معلومات رکھتی تھی۔

”نہیں۔“

”ترنمیں آنٹی کی بیٹی ہیں؟“

”نہیں۔“

”رئیسہ آنٹی کی؟“

”نہیں۔“

”جی..... پھر آپ کس کی بیٹی ہیں؟“ وہ جھنجھلا کر رہ گئی۔ روشی کھٹکھٹا کر ہنس دی۔

”آپ سب کو جانتی ہیں۔ اپنے یاورانگل کو نہیں جانتیں؟“ اس نے پوچھا۔

”یاورانگل؟ اچھا..... بائی نیم جانتی ہو۔ بائی فیس نہیں کیونکہ ہم تو یہاں رہتے ہی نہیں ہیں۔“ اس نے جیسے غور سے

کیا۔

”ہاں تو میں تو آپ جانتی ہیں؟“ اسے بھی خاصی حیرت ہوئی۔

”ہاں تو وہ تو ہم سے ملنے جواتے ہیں۔“ اس نے بتایا۔

”میتے ہیں؟“ روشی کو حیرت ہوئی کیونکہ اسے تو کبھی پتا نہیں چلا کہ بڑی حویلی سے لوگ کب سرائے آئے یا گئے۔

”جوتے ہیں۔“ کہہ کر اسے گڑبڑ میں لے کر آتے جاتے تو ضرور ہیں۔ اس سے تو آج تک کسی نے جھوٹوں۔ بھی نہیں کہا۔

”بے چارے۔ کہہ کر اسے گڑبڑ میں لے کر آتے جاتے تو ضرور ہیں۔ اس سے تو آج تک کسی نے جھوٹوں۔ بھی نہیں کہا۔“

”اچھا! تو آپ کا بھائی ہے ناں؟“

”وہ شیورمائی ڈیئر برادر۔“ بڑا دل موہ لینے والا انداز تھا۔

”آپ یہاں کیوں بیٹھی ہیں؟ آپ نے ہمارے ساتھ اور می کے ساتھ بریک فاسٹ کیوں نہیں لیا؟“

”بھی بات یہ ہے کہ اجازت.....“

”بے بی! آپ ادھر کیا کرتا اے؟ ہم آپ کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر تھک گیا۔ آپ کامی پریشان اے۔“

”جی سی فراک پنے اور ڈھیروں زیور لادے ہوئے ملازمہ ان کے قریب آگئی۔“

”اوہ! ہم گھری میں ہیں۔ کوئی باہر تو نہیں گئے۔“ وہ جھنجھلائی۔

”آپ کامی بلاتا اے۔“ ملازمہ نے منت سے کہا۔

”مئی سے کہہ دو ہم گیسٹ سے باتیں کر رہے ہیں تھوڑی دیر میں آتے ہیں۔“

”پہلے آپ می کا بات سن لو پھر آ جانا۔“ ملازمہ نے چکارا۔

”اوہ! آپ یہیں بیٹھے ہم می کی باتیں کر بھی آتے ہیں۔“

”جیسے بہت مجبوری سے بولی۔“

”روش نے مسکرا کر گویا میٹھے رہنے کا وعدہ کر لیا۔“

”نوشاں چلی گئی اور روشی اس کی واپسی کا انتظار کرنے لگی۔“

”جی! بھی تو بے لیا بالکل فٹ تھی“۔ اس کے منہ سے تعجب سے جملہ پھسلا تھا۔
روزمقربین جھکا کر واپس ہو گیا۔

تاؤ خیر مجھے اندازہ ہے کہ چپا اور کا کا جان کے تعلقات ٹھیک نہیں ہیں۔ یقیناً ماں و دولت ہی کا کوئی مسئلہ ہو گا میرے
پہلو پر بھی لاپٹی نہیں ہیں۔ البتہ کا کا جان ہر زاویے سے مشکوک لگتے ہیں۔ میں نے تو زندگی میں کبھی انہیں مسکراتے
ہئے نہیں دیکھا۔ پتا نہیں کن خوش قسمت لوگوں نے ان کی مسکراہٹ دیکھی ہو گی؟ اللہ کی دی ہوئی ہر نعمت تو ان کے پاس
ہے۔ پھر کیوں موڑ آف رہتا ہے۔ حتیٰ کہ شادی تک اپنی مرضی کی کی تھی۔ بالکل انگریزوں کی طرح ”بے رس“ اور خشک
بے غماہ ہے محبت کا اثر ہے۔

لیجے بیٹھے بٹھائے پچی کی طبیعت خراب کر دی
اور حتیٰ ہوئی گیسٹ روم کی طرف بڑھ رہی تھی۔

ماہین صبح گیسٹ روم سے نکل کر عالم تاب کے بید روم میں آگئی تھی۔

وہ اتنی صبح اپنے کمرے میں دیکھ کر قد رے چوٹک پڑی تھی۔

”تمام رات نیند نہیں آئی“۔ ماہین نے ان کے پاس بیڈ پر بیٹھتے ہوئے گویا وضاحت کی تھی۔

”ہاں! کیا کریں بات ہی ایسی ہے“۔ انہوں نے سرد آہ بھری۔

ماہین سر جھکا کر اپنے ہاتھ مسلنے لگی۔

”یاد رکھی جاتے رہے ہوں گے؟“ عالم تاب نے اس کا ستا ہوا چہرہ بغور دیکھا۔

”ظاہر ہے“۔ ماہین نے نظریں چرائیں۔

”کیا کریں آزمائش ہی آزمائش ہے پورا گھر مل کر رہ گیا ہے“۔ وہ دکھ سے گویا ہوئیں۔

”ناشتا تو نہیں کیا ہو گا ابھی؟ یاد رکھ گئے؟“ وہ پوچھنے لگی۔

”نہیں اور دل بھی نہیں چاہ رہا“ چائے منگوا لیجئے۔ صرف۔ یاد رکھا معلوم نہیں میں تو بہت دیر سے باہر ہوں“۔ اس نے
ہنسنے کے انداز میں جواب دیا۔

”معروف بھی تو بہت رجتے ہیں۔ حویلی آتے ہیں تو سمجھو۔ دو چار دن آرام کر لیتے ہیں۔ تم بیٹھو میں ماما سے چائے کا
نوشہ منگواؤں“۔ انہوں نے سر ہانے لگے بین کو پیش کرتے ہوئے کہا۔

”نوشہ منگواؤں“۔

”نوشہ منگوائے آؤ اور ذرا جلدی باتیں بنانے مت بیٹھ جانا“۔ انہوں نے تنبیہ کی۔

”یاد رکھو! میں نے تو پریشان کر کے رکھ دیا ہے۔ پتا نہیں کیا چاہتی ہے؟“ وہ

☆.....☆.....☆.....☆.....☆.....☆

جانے وہ کتنی دیر خیالات میں کھوئی رہی۔

معاوہ چوٹک انھی۔ اطراف میں چمکیلی دھوپ پھیل چکی تھی اور صوفشاں ابھی تک نہیں آئی تھی۔ اس نے مگ ہا
دیکھا۔ رائفل بردار چوکیدار ٹپکتے ہوئے گا ہے گا ہے اس کی جانب دیکھ لیتا تھا۔

اس نے ایک اور ملازم کو فیروزی سوٹ پہنے ہنستے مسکراتے گیسٹ میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا اس نے ”جی“
رکھے تھے۔ غالباً سودا سلف لے کر آ رہا تھا۔

روشنی تیزی سے اپنی جگہ سے انھی اور اسے اشارے سے اپنی جانب متوجہ کیا۔

”سنو! اندر سے صوفی کو بھیج دو۔ کہنا بہت دیر سے انتظار کر رہی ہوں“۔

ملازم نے اسے سر سے پاؤں تک دیکھا، مگر بولا کچھ نہیں، اور اندر کی طرف بڑھ گیا۔ روشنی کو فٹ بھرے ملازم نے
رکھی۔

”بتائیے یہ سگے چچا کا گھر ہے۔ جیسے آزاد کشمیر والے غلطی سے مقبوضہ کشمیر میں پھنس گئے ہوں“۔

وہ جل کر سوچ رہی تھی۔ ساتھ ساتھ اس طرف بھی نظر ڈال رہی تھی جہاں ملازم غائب ہوا تھا۔ چند منٹوں بعد وہ
کی جانب آتا دکھائی دیا۔

”بے لیا کا طبیعت ٹھیک نہیں ہے وہ آرام کرتا اے“۔

ملازم یوں گویا ہو جیسے ٹیپ چلا ہو۔

جینا بڑھنے سے فوراً اٹھ کھڑی ہوئی۔

جہاں جا رہی ہو چائے آ رہی ہے۔“ عالم تاب الجھ کر اسے بغور دیکھنے لگیں۔

”جی ہاں، ابھی۔“ اس نے جیسے بمشکل کہا۔ اور تیزی سے باہر نکل گئی۔ اور سیدھی اپنی خواب گاہ میں چلی آئی۔

پینہ پڑا رک بیوسوٹ کیس تیار حالت میں موجود تھا۔ اس کا مطلب تھا ابھی وہ کمرے میں آئیں گے، مگر ہو سکتا ہے وہ اسے منو لیں۔ اس کا دل چاہ رہا تھا۔ جتنی جلدی ہو سکے وہ اپنے دل کا غبار نکال ڈالے ان سے بہت سارا لڑے اور دل پروردے۔ آخر اس کا جرم کیا ہے۔ وہ آنسو پیتے ہوئے بیڈ پر بیٹھ گئی۔

اسی لمحے ملازم نے دروازہ کھول کر اندر جھانکا اور اسے موجود پا کر قدرے جھل سا ہو گیا۔

”آ جاؤں بی بی؟“

”یہ کون سا طریقہ ہے اندر آنے کا، اونٹ کی طرح منہ اٹھا کر گھسے چلے آ رہے ہو۔“

”ملازم پر برس پڑی۔“ آ جاؤ اب صورت کیا دیکھ رہے ہو۔“

بے چارہ سہمے ہوئے انداز میں سوت کیس کی طرف بڑھا، پھر رک گیا۔

”بی بی! وہ صاحب کہہ رہے ہیں، آپ نے اگر ان کی چیک بک کہیں اٹھا کر رکھی ہو تو دے دیں، مل نہیں رہی۔“ وہ ٹپکتے ہوئے اس سے مخاطب ہوا۔

”مجھے نہیں پتا کسی چیک بک کا۔“ وہ برہمی سے گویا ہوئی۔

بے چارہ کان دبا کر سوٹ کیس لے کر باہر چلا گیا۔

غصے میں کہہ تو دیا تھا، مگر پھر چین بھی نہیں پڑا۔ اٹھ کر چیک بک تلاش کرنے لگی۔

تمام درازیں دیکھ ڈالیں، مگر کہیں نظر نہ آئی۔ پھر اس نے ٹیبل پر رکھی فائلیں کھول کر دیکھنا شروع کیں، وہ اتنی منہمک تھی کہ اسے یاد علی خان کی کمرے میں آمد کا پتا تک نہ چل سکا۔

آخر دو فائلوں کے درمیان رکھی نظر آ گئی۔ ماہین نے چیک بک ہاتھ میں لی، پلٹتا ہی چاہتی تھی کہ..... یاد علی خان نے بیک بک اس کے ہاتھ سے اچک لی۔

”خدا حافظ۔“ یہ ان کے منہ سے نکلنے والا واحد جملہ تھا، جو خاص کر اس کیلئے تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ سنبھلتی یاد علی خان کے کمرے سے باہر جا چکے تھے۔

تین خود پر کنٹرول کرتے ہوئے در پیچے میں آ کھڑی ہوئی۔ یہاں سے پورٹیکو واضح نظر آتا تھا۔

یاد علی خان پر وقار انداز رفتار سے پورٹیکو میں نمودار ہوئے۔ ڈرائیور دروازہ کھولے منتظر کھڑا تھا۔ وہ جیب میں بیٹھے اور جینز کی جیب نظروں سے اوجھل تھی۔

تین کے اعصاب شل ہو رہے تھے۔

وہ تمام کرینڈ پر گرنے کے انداز میں بیٹھ گئی۔

بڑبڑانے کے انداز میں گویا ہوئیں۔

ماہین خاموش رہی۔

”بتاؤ، کیسی جگہ ہنسائی کے سامان کئے ہیں۔“ وہ پھر بولیں۔

”کیا کہہ سکتے ہیں۔“ ماہین نے نپا تلا جملہ ادا کیا۔

”اور بھی تو حویلی میں لڑکیاں ہیں، پتا ہی نہیں چلتا کہ یہاں لڑکیاں بھی ہیں۔“ وہ ہنوز تبصرے کر رہی تھیں۔

”اتنے ملازم ہیں، کسی نے بھی اسے جاتے ہوئے نہیں دیکھا، کیسی چھو منتر ہو گئی۔“

اسی دم دروازے پر دستک ہوئی۔

”ہوں، آ جاؤ ابھی کون ہے؟“ وہ بے زار کن لہجے میں گویا ہوئیں۔

دروازہ کھلا اور یاد علی خان اندر آ گئے۔

ایک لچکے کو ماہین کی نظر ان سے ملی۔ اس نے فوراً ہی چہرہ موڑ لیا۔

”السلام علیکم۔“ ان کی آواز بے حد دھیمی تھی۔

”وعلیکم السلام خوش رہو۔“ عالم تاب بھی آہستگی سے گویا ہوئیں۔

”بتاؤ، اب کیا کرو گے تم، کیسے تلاش کرو گے؟“

”میں کوئی تلاش ولاش نہیں کروں گا۔ میں کل ہی سے فرض کر چکا ہوں کہ میرے ہاں کوئی بیٹی ہی پیدا نہیں ہو سکتی۔“

سے کوئی اس موضوع پر بات نہ کرے۔“

یاد علی خان نے تندی سے بھابھ کی بات کاٹ کر کہا۔

ایک لمحے کو تو وہ دونوں ہی ہکا بکار ہو گئیں۔

ماہین تو ان سے خفگی کا اظہار کرنے کیلئے بے چین تھی۔ ادھر ہنوز رات والی صورتحال تھا۔

”یہ تو وقتی جذبہ ہے، آخر کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی ہو گا۔“ عالم تاب نے مضبوط اعصاب کے ساتھ ان کا سامنا کیا۔

”ہاں تو ٹھیک ہے۔ آپ لوگوں کے پاس اگر وقت اور طاقت ہے تو جو چاہیں کر لیں۔ میں کب منع کر رہی ہوں۔“

اس وقت اس لئے حاضر ہوا تھا کہ آپ کو اور ماہین کو بتا سکوں کہ میں ابھی اسی وقت ہری پور روانہ ہو رہا ہوں۔“

ماہین نے چونک کر ان کی شکل دیکھی۔ آف دہانٹ بے شکن شلوار قمیض، سیاہ واسٹ میں سیاہ پٹا داری قمیض۔

میں دہلا دینے والی گہری سرخی۔

”کیوں ماہین کو ساتھ نہیں لے جا رہے؟“ عالم تاب نے تعجب سے پوچھا۔

”نہیں، بس آپ ذرا جلدی سے ایک کپ چائے کا پلا دیں۔“ انہوں نے آستین اوپر کر کے ریٹ دیا۔

”آ رہی ہے چائے، میرا خیال ہے کہ ماہین۔“

”پلیز بھابی بیگم! میں کوئی کام بغیر سوچے سمجھے کرنے کا عادی نہیں ہوں۔“

”ایسے مارا تھا بھو! آپ کو ان لوگوں نے؟“

مگر میں یوں نہیں مروں گی، ٹھیک ٹھاک سبق سکھاؤں گی انہیں۔“ اس نے جیسے ایک نیا عزم باندھ لیا تو۔

ہجوم غم میری فطرت بدل نہیں سکتا

میں کیا کروں میری عادت ہے مسکرانے کی

”شکر ہے آج آپ بالکل ٹھیک نظر آرہی ہیں۔ اب آپ ایسا کریں فنانٹ تیار ہو جائیں۔“ وہ ناشتا کر کے فارغ ہی ہوئی تھی کہ عارف آمو جو دہوا۔

”تیار..... کیوں کہاں لے جائیں گے مجھے؟“ بالو نے حیرانی سے سوال کیا۔

”ہم نے بھلا کہاں لے جانا ہے آپ کو۔ یہ آنا جانا تو زندگی کے ساتھ ہے بھابی۔ نہ آتے ہوئے یہ حیرت نہ ہوئے پر تعجب، پھر بھی ہر انسان ایک ٹھکانے پر پہنچتا تو ہے۔ اس کے پاؤں کا چکر کہیں ٹھکتا تو ہے ورنہ جگہوں کے سبب حل ہوتے ہیں۔“

وہ کیا کہتے ہیں کہ.....

پرندے دھوپ کی شدت سے گھر کے آنگن میں

پلٹ کے آئے تو دیکھا کہ مسئلہ تھا وہی

مگر پھر بھی ٹھکانہ پھر ٹھکانہ ہے۔

”میں سب ٹھکانے کھو آئی ہوں عارف بھائی! کسی نے ٹھکانے تک فی الحال بے ٹھکانا ہوں۔“ اس کی آواز زندہ عارف نے سوچتی ہوئی نظریں اس کی صورت پر جمادیں۔ اس کی آنکھوں کی چمک بالو نے اپنے چہرے پر کوئی لمحہ کی۔ اس کی نظریں کسی انجانے بوجھ سے جھک کر رہ گئی۔

”لال خان نے گھر سے نکال دیا ہے؟“ عارف کی آواز اندیشے سے چور تھی۔

”اس بے چارے میں اتنی ہمت کہاں تھی۔ خود نکل آئے ہیں ہم۔ بلکہ اس بے چارے کو مشکل سے نکال دیا ہے۔“ تلخی سے مسکرائی۔

”کیوں؟ اس نے آپ کے ساتھ اس دن کوئی بہت بری بدسلوکی کی تھی۔“ عارف کا اشارہ اس دن کی طرف تھا۔

روز وہ دونوں محو گفتگو تھے اور لال خان آگیا تھا۔

”نہیں۔“

”پھر.....؟“

بالو خاموش رہی۔

”کیا میں نے آپ کو کسی خوش فہمی یا غلط فہمی میں مبتلا کرنے کا گناہ کیا ہے؟“ وہ سر جھکائے پوچھ رہا تھا۔

بالو نے ایک جھٹکے سے سراٹھایا۔ اس کی آنکھوں سے جیسے چنگاڑیاں نکلنے لگی تھیں۔

”آپ تو مجرم نمبر ایک ہیں۔ لال خان تو آپ کے مقابلے میں پھر بھی بے گناہ ہی ہے۔“ بالو کی آواز زندہ گئی۔

”آپ یقیناً پہلے والا الزام دہرائیں گی جو میں سن ہی چکا ہوں۔ لیکن اگر آپ نے مجرم..... اچھا..... آپ یقیناً پہلے والا الزام دہرائیں گی جو میں سن ہی چکا ہوں۔ لیکن اگر آپ نے

پہلے اپنے والد سے سوال جواب کیجئے۔ ایک خیر خواہ اور ہمدرد کی حیثیت سے میں

بڑے سنے کا تیرہ کر لی لیا ہے تو سب سے پہلے اپنے والد سے سوال جواب کیجئے۔ عارف نے اسی طرح سر جھکائے ہوئے کہا۔

”نہیں مسئلہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ بس یہی میرا گناہ ہے۔“ عارف نے اسی طرح سر جھکائے ہوئے کہا۔

”خیر خواہ بھڑا پیسے ہوتے ہیں خیر خواہ؟ ساری دنیا میں آپ کو صرف لال خان ہی ملا تھا۔ دوسروں کا مسئلہ حل کرتے

ہے آپ کو دھیان تک نہ آیا کہ ایک عورت کا مسئلہ پیدا ہو رہا ہے۔“ اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

”بھابی! جس ماحول سے آپ کا تعلق ہے وہاں ایسا ہی ہوتا ہے، بس کہیں بھی لڑکیوں کی شادی کر دی جاتی ہے یہ دیکھ کر

بھابی! جس ماحول سے آپ کا تعلق ہے وہاں ایسا ہی ہوتا ہے، بس کہیں بھی لڑکیوں کی شادی کر دی جاتی ہے یہ دیکھ کر

بھابی! جس ماحول سے آپ کا تعلق ہے وہاں ایسا ہی ہوتا ہے، بس کہیں بھی لڑکیوں کی شادی کر دی جاتی ہے یہ دیکھ کر

بھابی! جس ماحول سے آپ کا تعلق ہے وہاں ایسا ہی ہوتا ہے، بس کہیں بھی لڑکیوں کی شادی کر دی جاتی ہے یہ دیکھ کر

بھابی! جس ماحول سے آپ کا تعلق ہے وہاں ایسا ہی ہوتا ہے، بس کہیں بھی لڑکیوں کی شادی کر دی جاتی ہے یہ دیکھ کر

بھابی! جس ماحول سے آپ کا تعلق ہے وہاں ایسا ہی ہوتا ہے، بس کہیں بھی لڑکیوں کی شادی کر دی جاتی ہے یہ دیکھ کر

بھابی! جس ماحول سے آپ کا تعلق ہے وہاں ایسا ہی ہوتا ہے، بس کہیں بھی لڑکیوں کی شادی کر دی جاتی ہے یہ دیکھ کر

بھابی! جس ماحول سے آپ کا تعلق ہے وہاں ایسا ہی ہوتا ہے، بس کہیں بھی لڑکیوں کی شادی کر دی جاتی ہے یہ دیکھ کر

بھابی! جس ماحول سے آپ کا تعلق ہے وہاں ایسا ہی ہوتا ہے، بس کہیں بھی لڑکیوں کی شادی کر دی جاتی ہے یہ دیکھ کر

بھابی! جس ماحول سے آپ کا تعلق ہے وہاں ایسا ہی ہوتا ہے، بس کہیں بھی لڑکیوں کی شادی کر دی جاتی ہے یہ دیکھ کر

بھابی! جس ماحول سے آپ کا تعلق ہے وہاں ایسا ہی ہوتا ہے، بس کہیں بھی لڑکیوں کی شادی کر دی جاتی ہے یہ دیکھ کر

بھابی! جس ماحول سے آپ کا تعلق ہے وہاں ایسا ہی ہوتا ہے، بس کہیں بھی لڑکیوں کی شادی کر دی جاتی ہے یہ دیکھ کر

بھابی! جس ماحول سے آپ کا تعلق ہے وہاں ایسا ہی ہوتا ہے، بس کہیں بھی لڑکیوں کی شادی کر دی جاتی ہے یہ دیکھ کر

بھابی! جس ماحول سے آپ کا تعلق ہے وہاں ایسا ہی ہوتا ہے، بس کہیں بھی لڑکیوں کی شادی کر دی جاتی ہے یہ دیکھ کر

بھابی! جس ماحول سے آپ کا تعلق ہے وہاں ایسا ہی ہوتا ہے، بس کہیں بھی لڑکیوں کی شادی کر دی جاتی ہے یہ دیکھ کر

بھابی! جس ماحول سے آپ کا تعلق ہے وہاں ایسا ہی ہوتا ہے، بس کہیں بھی لڑکیوں کی شادی کر دی جاتی ہے یہ دیکھ کر

بھابی! جس ماحول سے آپ کا تعلق ہے وہاں ایسا ہی ہوتا ہے، بس کہیں بھی لڑکیوں کی شادی کر دی جاتی ہے یہ دیکھ کر

اس کی نظریں ہنوز جھکی ہوئی تھیں
بالو خاموش رہی۔

”کیا آپ نے لال خان سے علیحدگی کا پکا پکا فیصلہ کر لیا ہے؟“

بالو نے چونک کر سر اٹھایا۔ خوش فہمی کے لطیف سے جھونکے نے اسے چھوا۔

”فیصلہ؟ آگئی ہوں اس کی بخششوں کو لات مار کر۔“

تو پھر چلے، میں آپ کو غلام محمد کے پاس واپس چھوڑ آؤں۔“

”بغیر ہر جانے جرم مانے کے؟“ بالو نے زہریلی مسکراہٹ کے ساتھ..... سوال کیا۔

”نہیں، پورا ہر جانہ ادا کرنے کی ایمانداری کوشش کروں گا۔“ اس کی آواز بہت آہستہ تھی۔

بالو کا دل دھک دھک کرنے لگا۔

”آپ کیلئے کوئی ایسا شخص ڈھونڈ کر لاؤں گا جو آپ کے خوابوں سے ہٹ کر نہ ہو، جس کی عمر بھی کم ہو اور جو آپ

بھی دے سکے۔ یہ میرا آپ سے وعدہ ہے بشرط زندگی۔“

بالو کا دل پوری قوت سے سستا، پھر اسی قوت سے پھیلا۔

”شکریہ بہت بہت برائے مہربانی آپ مجھے تنہا چھوڑ دیں، میں سونا چاہتی ہوں۔“

اس نے ترشی سے کہا اور پلنگ کی طرف بڑھ گئی۔

”شاید آپ کو پتا نہیں، میں لال خان کے گھر سے نہیں اپنے باپ کے گھر سے آپ کے ہاں آئی ہوں، جانے پہچانے

سے۔“

اس نے بد لحاظ لہجے کے اگلے پچھلے تمام ریکارڈ توڑ ڈالے۔

عارف چند لمحے مبہوت سا اسے دیکھتا رہ گیا۔

”آگے کا کیا سوچا ہے؟“ اس نے دم بخود سے لہجے میں سوال کیا۔

”آپ اس وقت مجھے تنہا چھوڑ دیجئے۔“ اس نے سابقہ انداز میں جواب دیا اور پلنگ پر لیٹ گئی۔

”مگر اس طرح تو نہیں چلے گا۔“ بالآخر اس نے کہا۔

بالو خاموش رہی۔ اس کی خاموشی جیسے کہہ رہی تھی ”جاؤ یہاں سے۔“

”آپ یہاں اس طرح کیسے رہیں گی؟“ وہ ہچکچاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

”رہ لوں گی۔ میری در بدری کے ذمہ دار آپ ہیں۔ اب تو جو سوچتا ہے آپ کو سوچتا ہے۔“ اس نے مزاح زدہ

”آپ جانتی ہیں، میرا دل کیا ہے؟ میرے دل میں کیا ہے؟“ وہ شکستہ لہجے میں گویا ہوا۔

”جانتی ہوں کوئی کلمہ ہی آباد ہے اس دل میں، جس نے آپ کو کبھی کچھ نہیں دیا اور نہ دے سکتی ہے، جنہم میں

بالو جل کر بولی۔

”خدا کرے کوئی معجزہ ہو وہ نکلے آپ کے دل سے۔“

کب نکلا ہے کوئی دل میں اتر جانے کے بعد

اس گلی کے دوسری جانب کوئی رستہ نہیں ہے

دو تیزی سے کمرے سے باہر چلا گیا۔

”جاک ہو جائے نامراد..... جو میرے جیتنے کی چیز تھی، کوسوں دور جیتے بیٹھی ہے۔“

”وہ آنکھوں پر بازو رکھے بڑبڑانے لگی۔

دھاتی شام کے سائے تھے جب جواد نے دروازے پر دستک دی۔

”ہوں کون ہے آجاؤ۔“ ماہین نے کروٹ لے کر دوپٹا اٹھایا اور کسمندی سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔

جواد نے کمرے میں داخل ہو کر لائیں جلائیں۔

ماہین اسے دیکھ کر چونک پڑی۔

”جواد..... تم!“

”جی میں السلام علیکم۔“ وہ گہری سنجیدگی کے ساتھ صوفے پر بیٹھ گیا۔

”پتاہری پور چلے گئے؟“ اس کی سنجیدہ آواز کمرے میں گونجی۔

”ہاں چلے گئے۔“ اس کے انداز سے اداسی جھلکے لگی۔

”آپ نہیں گئیں؟“ اس نے عام سے انداز میں سوال کیا۔

”نہیں۔“ وہ اتنا کہہ کر اپنی آنکھوں سے کھینے لگی۔

”کیوں؟“ وہاں سے فوراً سوال آیا۔

”بس ایسے ہی۔“ اس نے نظریں چرا لیں۔

”اتنا بڑا حادثہ ہو گیا۔ پتاہری پور کوئی اثر نہیں ہوا؟“ جواد نے جیسے دکھ سے کہا۔

ماہین کے پاس اس بات کا کوئی جواب نہیں تھا۔

”کیسے تو خیر، انہیں شاید کسی کی پرواہ نہیں ہے، مگر آپ کا بھی کچھ رول بنتا ہے۔“

اس نے گویا ماہین پر تنقید کی تھی۔

”بدمعاش ہونے میں جلدی نہیں کرتے جواد“ اس نے دھیرے سے کہا۔

”خیر آنے والی حقیقت کو بدمعاشی کہنا سب سے بڑی خود فریبی ہے خالہ۔“ جواد نے بہت اکھڑے انداز میں کہا۔

”آپ تو روشنی سے بہت قریب ہو کر اس کا مسئلہ پوچھ سکتی تھیں۔“ جواد نے سارا وزن اس پر ڈال دیا۔

”نہیں، نہ نظریں اٹھا کر اس کی سمت دیکھا۔ بلیک پینٹ اور لیسن کلر کی شرٹ میں ملبوس وہ بہت شکستہ سا نظر آیا۔ اس نے

نظر میں جھکا لیں۔

”پوچھا تھا“۔ اس نے دھیرے سے جواب دیا۔

”صرف پوچھا تھا، حل کرنے کی ذمہ داری کیوں نہیں لی“۔ اس نے فوراً کہا۔

”وعدہ کیا تھا، مگر اسے شاید اعتبار نہیں ہے“۔ اس نے دکھ سے کہا۔

”اعتبار دلانے جاتے ہیں، ویسے مسئلہ کیا تھا؟“ اس نے جیسے چونک کر سوال کیا تھا۔

”بہت ٹھیکر“۔ مایہن کے منہ سے بہت ہی بے ساختہ نکلا تھا۔

”جواد چونک پڑا“۔ وہ کیا؟

”بتا نہیں سکتی۔ یہ اس سے ہمدردی نہیں دشمنی ہوگی“۔ اس نے بہت واضح معذرت کی۔

”کیا یہ مسئلہ صرف آپ کے علم میں ہے یا پاپا بھی باخبر ہیں؟“ جواد نے گہری سانس لی۔

”نہیں“ صرف مجھے پتا ہے اور گھر میں کسی کو نہیں پتا۔

”مجھے کیوں نہیں بتایا جاسکتا۔ میں اس کا سکا بھائی ہوں“۔ جواد الجھ رہا تھا۔

”اسی لئے تو نہیں بتایا جاسکتا“۔ مایہن نے برجستہ کہا۔

”کسی کو پسند کرتی ہے؟“ جواد سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں بات کی گہرائی تک پہنچا۔

مایہن کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا (یہ جواد تو بہت چمپور ہے)

وہ کچھ نہیں بولی خاموش رہی۔

”کیا اسی کے ساتھ گئی ہے؟“ جواد کا لہجہ نہایت شکستہ تھا۔

”نہیں، نہیں جواد! ایسی کوئی بات نہیں ہے“۔ وہ تیزی سے بولی۔

”خدا کی قسم اس طرح کی کوئی بات نہیں ہے“۔

”کون ہے وہ؟“ جواد نے ہونٹ کاٹتے ہوئے پوچھا

مایہن جواب میں خاموش رہی۔

”آپ جواب کیوں نہیں دیتیں؟“ وہ الجھ کر کہہ رہا تھا۔

”دے نہیں سکتی“۔ وہ دھیرے سے گویا ہوئی۔

”کسی کا دباؤ ہے آپ پر؟“ جواد نے قدرے ناراضگی سے دریافت کیا۔

”میرے ضمیر کا کہ میں کسی بھی قسم کی بدامنی کی ذمہ داری اپنے سر لینا نہیں چاہتی“۔ اس نے بڑی صاف گوئی سے کہا۔

”آپ جانتی ہیں خالہ کہ میں حویلی میں اپنے کزنز کے درمیان کس طرح ہو گیا ہوں، جیسے میں کوئی مجرم ہوں اب؟

گناہ گار“۔ وہ دکھ سے بوجھل لہجہ میں کہہ رہا تھا۔

”یہ تمہاری ذاتی فیملنگز ہیں جواد وہ صرف تمہاری بہن ہی نہیں ہے بلکہ حویلی کے ہر فرد سے ہی اس کا کوئی نہ کوئی رشتہ

ہے۔ میں نے اسے سنبھالنے کی کوشش کی۔

”جی چاہتا ہے وہ سامنے آجائے تو اسے شوٹ کر دوں۔ پپا نے تو اپنی غفلت اور دوری کا ہر جانہ اس طرح دیدیا کہ وہ

ذاتی بن گئے۔ لوگ کہتے ہیں کہ صرف جاگیردار ہی کا نہیں کہ بڑے آفیسر کا بھی بیٹا ہوں۔ لوگ ان کے آگے پیچھے پھرتے

ہیں اور قہر بھاری ہوتی ہے مگر یہ روش تو سیدھا سیدھا نقصان کا سودا کر کے گئی ہے۔“

اس نے بہت افسردہ سے انداز میں کہا۔

”یوں دل چھوٹا نہیں کرو جواد آجائے گی، گئی کہاں ہوگی بیس۔ ادھر ادھر بس اپنی ناراضگی کا اظہار کر رہی ہے۔“ مایہن

نے تلی دی۔

”اب اسے کوئی ضرورت بھی نہیں آنے کی اگر آگئی تو اس کے حق میں اچھا نہیں ہوگا۔“

”ایزی جواد تم ابجو کیڈ بندے ہو کیا جاگیرداروں کی طرح بڑکیں مار رہے ہو؟“

مایہن نے مہر کی تلقین کی۔

”بڑکیں نہیں ہیں خالہ، میں اسے شوٹ کر دوں گا۔ اتنی عیش و عشرت کی زندگی کے بعد اسے اس طرح کا کوئی قدم اٹھانے

کا کوئی حق نہیں تھا۔ کیا کی تھی اسے یہاں سب سے بڑھ کر اتنے عزت دار باپ، دادا دنیا میں کچھ نہ ملے تو تھوڑی ”کمی“ لیکن

اُزٹ نہ ملے تو سب سے بڑی ”کمی“ ہوتی ہے۔“

اس نے بڑے مدبرانہ انداز میں جواب دیا۔

”تمہاری بات سنٹ پر سنٹ درست ہے، مگر دنیا میں ہر طرح کے امکانات موجود رہتے ہیں، اس لئے گنجائش رکھ کر

بغض کن انداز اپنانا چاہیے۔“

”میں نہیں مانتا یہ لوجک، عورت محفوظ ہے، عیش میں ہے تو بس پھر اسے اور کچھ چاہئے کیلئے اتنا کریزی، اتنا شدید نہیں

ہونا چاہئے۔“ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

”اگر وہ مل جائے تو اسے حویلی میں نہیں آنا چاہیے، ورنہ پپا کا بہت نقصان ہو جائیگا۔“

وہ اٹھتے ہوئے چہرے کے ساتھ کہتے ہوئے کمرے کا دروازہ جھٹکے سے کھول کر باہر چلا گیا۔

مایہن دم بخود بیٹھی رہ گئی۔ ان جاگیرداروں سے کچھ بعید نہیں۔ اسے خوف سا محسوس ہوا۔ یہ جواد سے دلاور علی خان

سے بھی آگے جا رہا ہے۔

جائے آگے دیر دو گہری سوچوں کے درمیان گھری رہی۔

دواڑ سے پرہیز دھنگ ہوئی تھی۔

”ہوں!“ اس نے بڑے بے زار سے انداز میں آنے والے کو اجازت دی تھی۔

دواڑ کھول کر آنے والی کھو تھی۔

”نہا! آپ کو بڑے خان بلار ہے ہیں۔“ اس نے انگلیوں میں آنچل پھنسا کر مروڑتے ہوئے خاصا لہرا کر کہا۔

گہرا براؤن شلوار سوٹ پہنے ہوئے تھی۔ ماہین کو تو جیسے اسے کپڑوں میں سے ”ڈھونڈنا“ پڑا۔
 ”بابا صاحب! چلو آ رہی ہوں میں۔“ اس نے قدرے فکر مندی سے کہا۔

”ہنا نہیں کیوں بلار ہے ہیں؟ اب کیا مسئلہ ہو گیا؟“

کلو واپس چلی گئی۔ وہ منہ پر پانی کے چھینٹے مارنے کے خیال سے ہاتھ روم میں گھس گئی۔ ہاتھ روم سے باہر
 میں جلدی جلدی برش چلایا۔ ذہن مسلسل کچھ سوچ رہا تھا۔
 پھر اچھی طرح سر پر دوپٹا جما کر باہر آ گئی۔ اور خاصی تیز چلتی ہوئی بابا صاحب کے بیڈ روم کی طرف آئی اور دستک دی۔

”آ جاؤ۔“ ان کی بارعب آواز کسی قسم کے تاثر سے عاری تھی۔

وہ اندر چلی آئی۔ وہ ٹیلی فون پر کسی سے گفتگو میں مصروف تھی۔ اشارے سے اسے بیٹھنے کو کہا۔

”نہیں۔ وہ آج صبح ہری پور چلے گئے۔ بہر حال تم میرا نام لے کر کہہ دینا کہ میں نے بھیجا ہے۔ دیے وہ فراموش
 ہی چلتا ہے۔ تم بھی اس بات کا خیال رکھتے ہوئے بات کرنا۔ نہیں، نہیں گھبرانے کی بات نہیں۔ کام تو تمہارا ہی جا رہا۔
 انشاء اللہ..... اچھا اچھا..... ٹھیک ہے۔ ہاں ہاں۔ اوکے۔“ انہوں نے ریسورر رکھ دیا۔

”دلہن! یہ یاد رکھا بہت جلدی میں گئے ہیں۔ ہمیں تو دوپہر کو پتا چلا۔“ وہ خامسے حیران ہو رہے تھے۔
 ”شاید۔“ اس نے رکھائی سے جواب دیا۔

”کیوں تم سے کچھ نہیں کہا؟“ انہیں جیسے اچنچھا ہوا۔

”نہیں مجھ سے انہوں نے کوئی بات نہیں کی۔“ اس نے سچ سچ کہا۔

”پھر تو کوئی ایرجنسی ہی ہوگی۔ ملک کے حالات بھی تو ایسے ہی چل رہے ہیں آج کل۔“

ماہین کے پاس ان کی اس بات کا کوئی جواب نہیں تھا۔

”تم ساتھ نہیں گئیں ہاں مگر تم کیسے جاسکتی تھیں۔ گھر میں تو صف ماتم پنچھی ہے۔“ انہوں نے سگدلی سے کہا۔
 (اللہ نہ کرے) ماہین ہول کر رہ گئی۔

”ہونہہ! اہتمام بھی خود کرتے ہیں اور ماتم بھی۔“

”یاد رکھ قدر پریشان رہے ہوں گے رات بھر کاش یہ لڑکی پیدا ہوتے ہی مر جاتی۔“

انہوں نے انتہائی دکھ سے کہا۔

ماہین بس ایک گہری سانس لے کر رہ گئی۔

”اللہ سے دعا کرتے ہیں، مرتے دم تک ہمیں اس کی صورت دیکھنا نصیب نہ ہو۔“ وہ بہت بڑھاپا نظر آنے لگی۔
 (یہ بد دعائیں سنانے کو بلایا ہے مجھے؟) اس کی جان جل کر رہ گئی۔

”دلہن۔“ وہ سوچتے ہوئے مخاطب ہوئے۔

”جی۔“ اسے بادل خواستہ جواب دینا پڑا۔

”اس لڑکی کا معاملہ کیا ہے؟ کچھ تم سے کہا سنا اس نے؟“ انہوں نے بغور ماہین کا چہرہ دیکھا۔

”جی مجھ سے تو اس نے کچھ زیادہ بات نہیں کی۔ جہاں تک میرا اندازہ ہے، وہ نعیم سے شادی پر۔ رضامند نہیں تھی۔“ اس
 نے بہت سوچ سمجھ کر جواب دیا۔

”کیوں وہ انوکھی روح ہے حویلی میں؟ ہمارے ہاں لڑکیوں کو کبھی اتنی آزادی نہیں دی گئی بڑے جو فیصلے کرتے ہیں، وہ
 بڑی قبول کرتی ہیں۔“

وہ بھی سے گویا ہوئے۔

(ہونہہ!) ”بخوشی“ ان کے پاس کمپیوٹر ہے کوئی جو دوسروں کی ٹھیک ٹھیک فیکر دیتا ہے۔ قربان جائیے اس اعتماد کے بلکہ
 (غیر ذہنی اعتماد کے)

”جس کے ساتھ چاہتی تھی کیا اس کے ساتھ گئی ہے؟“ ان کی آواز بے حد پست تھی۔

”خدا خواستہ ایسی کوئی بات نہیں۔“ اس نے تیزی سے کہا۔

”یہ بات تم یقین سے کیسے کہہ سکتی ہو؟“ انہوں نے مشتبہ نظروں سے اس کی جانب دیکھا۔

”اس لئے کہ میں نے اسے ہرزادے سے ٹٹولا تھا۔ ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ بس وہ نعیم سے شادی پر رضامند نہیں تھی۔“
 نے اپنے یقین کو دلیل سے ثابت کیا۔

”مگر نعیم مل کر کیا برائی ہے، شکل و صورت کا اچھا ہے۔ تعلیم یافتہ ہے۔ پیسہ بہت ہے۔ دنیا گھومتا ہے۔ دنیا کی ہر نعمت اس
 کے پاس ہے۔“

دوسرے پاؤں تک حیرت میں ڈوبے ہوئے تھے۔

”جس طرح یہ انگریزی بہت بولتی ہے، وہ بھی اسی کی طرح انگریزی بہت بولتا ہے۔“

اس بار بڑی سادہ اور معصوم سی دلیل آئی تھی۔ ماہین بے ساختہ مسکرا دی تھی۔

”بابا صاحب! بعض باتیں دل کو منظور نہیں ہوتیں اور سب کچھ بے کار لگتا ہے، اور جب ہر طرح کا عیش و آرام ہو تو بس

نہی کی کرنے کو جی چاہتا ہے۔ کیونکہ مادی چیزیں تو بغیر خواہش اور جستجو کے پاس ہی ہوتی ہیں، اس لئے دل اس طرف بڑھتا

ہے جہاں ہونے اور نہ ہونے کا خوف ہوتا ہے اور ایسے مقام پر انسان کامیاب ہونے کا شدید خواہش مند ہوتا ہے۔ دل و

ذہن فطری مصروفیت مانگتے ہیں کہ مصروفیت ہی ان کی زندگی ہے اور پھر حاصل چیزوں میں وہ کشش نہیں ہوتی جو لا حاصل

قدار میں ہوتی ہے۔ شاید اس نے کچھ اور خواب سوچے ہوں۔“

ماہین نے نہایت سنبھل سنبھل کر جواب دینے کی کوشش کی۔

”نہیں! ہم مانتے ہیں تم بہت پڑھی ہوئی ہو، مگر بیٹی، عورت بس عورت ہے، پردے کی چیز، گھر کی زینت، اسے تحفظ اور

”تسلیم نہ کیا، اور کسی چیز کا مطالبہ نہیں کرنا چاہیے۔“ ان کا لہجہ اس بار بے حد شفیق تھا۔

”گستاخی معاف بابا صاحب! عورت ایک وجود ایک زندہ اور اہتمام سے تخلیق کیا ہوا وجود ہے۔ ہر کتاب میں موضوع ہوتا ہے۔ ہماری پاکیزہ الہامی کتاب قرآن پاک کا موضوع ”انسان“ ہے۔ نہ کہ ”مرد“ اور انسان میں دونوں شامل ہوتے ہیں اور اس کتاب میں تو انسان کے حقوق پر بحث ہے۔ قوانین ہیں، حدود ہیں، میرے خیال کے مطابق ایک دوسرے کے جذبات و احساسات کا خیال رکھا جائے تو کبھی کسی کو کسی سے کوئی شکایت نہ ہو۔“

”بچے نا سمجھ ہوں تو کمال ذمہ داری سے ان کی بھلائی کیلئے اقدامات کرنا بھی تو ایک طرح سے شرعی اصول ذمہ داری ہے۔“

انہوں نے اس کی بات نہایت تحمل سے کاٹ کر بڑی بھاری دلیل دی کہ ایک لمحے کو تو مایہن بھی چکرا کر رہی۔

”جی! مگر جب بچے نا سمجھ ہوں، انسانی زندگی میں ایک مقام ایسا بھی آتا ہے کہ اطراف کے لوگوں کو اس کی پڑتی ہے۔ اس کے ذاتی ذہن کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا اور انسان کے اپنے بنائے ہوئے بے بنیاد اصولوں کی روشنی میں انسان کی پوری زندگی کا فیصلہ نہیں کیا جاسکتا۔ یہ تو استحصال کا خوبصورت چہرہ ہے۔ جس کے باطن میں صرف بدمعاشی و رزق کی زیادتی اور کمی تو اللہ کا ذاتی کام ہے۔ اس بنیاد پر تو فیصلہ یوں بھی کمزور ثابت ہوتا ہے۔“

مایہن نے دبے دبے لہجے میں کہا۔

”کیا وہ کوئی غریب لڑکا ہے، مگر تم تو کہہ رہی تھیں ایسی کوئی بات نہیں۔“ وہ بری طرح چومک پڑے تھے۔

”میرا مطلب یہ نہیں تھا۔“ مایہن بوکھلا گئی۔

”میرا مطلب یہ ہے کہ ان اصولوں کی بنیاد پر جہاں جہاں انسان کا استحصال ہوتا ہے کیونکہ اکثر اسی طرح کی بنیاد پر فیصلے ہوتے ہیں۔“ اس نے سنسبھل کر بات بنائی۔

”نام نسب بھی بڑی محنت کی کمائی ہوتی ہے بیٹی۔“ وہ بردباری سے گویا ہوئے۔ پتا نہیں یہ کیا بات ہے جب ان کا عظیم ترین پریشانی سے گزر جاتا ہے تو اس کی برداشت بھی عظیم ہو جاتی ہے۔

”بالکل صحیح فرمایا آپ نے۔ مگر ہر نسب ایک آغاز سے گزر کر آگے بڑھتا ہے۔ اگر کسی شاخ کی پوند کاری سے خوبصورت و خوشنما پھول آنے کی قوی امید ہو تو پوند کاری عیب نہیں ہو سکتی۔“

وہ بھلا ہار ماننے والی تھی۔ اور کچھ یہ بھی ہے کہ جب خلوص سو فیصد ہو تو خود بخود بات پیدا ہوتی رہتی ہے۔

”لیکن جب ایسی کوئی بات ہی نہیں تو اس طرح کی بات کیا معنی؟“ وہ پھر الجھے۔

”ممکن ہے وہاں اس طرح کی کوئی بات ہو اور وہ کسی وجہ سے ہم سے نہ کہہ سکتی ہو۔ ہمیں ہر طرح کا امکان دیکھنا چاہیے۔“ اس نے ڈرتے ڈرتے کہا تھا۔

”جو بات اس نے ہم تک پہنچائی نہیں، اس باپ کے پیچھے اس نے خاندان کو ذلیل کرنے کیلئے اتنا بڑا قدم نہیں اٹھایا۔“

ہم اسے کبھی معاف نہیں کر سکتے۔“ ان کے لب و لہجے سے جلال لپکنے لگا۔

اسی دم دروازے پر دستک ہوئی۔

”جی۔“ بابا صاحب اسی انداز میں گویا ہوئے۔

دروازہ کھول کر باری اندر آیا تھا۔

”جین کی نظروں سے اس کی نظر ایک لمحے کو ملی تھی۔ وہ فوراً نگاہ چرا گیا تھا۔“

”اس کا اتنا پتا مل بھی جائے کہیں سے تو کہہ دے رہے ہیں، ذہن ہم تک خبر نہ پہنچے یا تو ہم اسے شوٹ کر دیں گے۔ یا

بڑے خوبی کے پیچھے ڈال دیں گے۔“

دروازہ جلال انداز میں گویا ہوئے۔

مایہن نے چومک کر ان کی صورت دیکھی۔ اس کی نظروں میں اس تاریک رات کا منظر گھوم گیا۔ ایک بے کس زنجیروں میں بند عورت آج تک اس کے ذہن سے محو نہیں ہو سکی تھی۔ روشنی کا ایسا حشر تصور کر کے اسے جھرجھری آگئی۔

کیا وہ بھی بے چاری کوئی ماضی کی ”روٹی“ ہے۔ وہ کہیں اور کھو گئی۔

”وہ کیل آیا ہوا ہے۔ کیا آپ کل کچھری چل سکیں گے؟“ باری کی سنجیدہ اور گم صم آواز نے ماحول میں ارتعاش پیدا کیا۔

”نہیں فی الحال ہم کہیں نہیں جاسکتے۔ ہمارا ذہن بالکل مفلوج ہے، تم اسے فارغ کر دو۔ کہہ دینا ہم خود فون کر کے اسے

تذہن گے۔ دعا کرو۔ ہم جلد اس کی آخری رسم ادا کریں۔ تاکہ ہمارا دماغ معمولات میں مصروف ہو سکے۔“

مایہن نے نہایت دکھ سے باری کی سمت دیکھا۔ اس کا چہرہ بھی بالکل پھیکا پڑ چکا تھا۔

”اگر خودکشی حرام نہ ہوتی تو ہم خود ہر کھا لیتے۔“ وہ بڑبڑائے۔

”ذہن!“

”جی بابا صاحب!“

”کوئی کام تو نہیں کر رہی تھیں؟“ ان کی آواز سے بہت اضمحلال ظاہر تھا۔

”نہیں۔۔۔ خیریت؟“ اس نے سوالیہ نظروں سے ان کی سمت دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”کچھ نہیں۔ بس یہ کہہ رہے تھے کہ ہمارے پاس بیٹھی رہو۔ باتیں کرتی رہو۔ ہماری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ ہم کیا کریں۔“

”اب بس سے گویا ہوئے۔“

”مایہن کا نرم دل پھٹل کر رہ گیا۔“

”ٹھیک ہے میں آپ کے پاس بیٹھی ہوں۔ ویسے بھی یہاں مجھے کام ہی کیا ہے، سوائے کتابیں پڑھنے کے۔“ وہ زبردستی

شش توڑیوں پر محسوس کر رہی تھی گویا بڑے معمول کے حالات ہوں۔

رات کا کھانا کھانے سے قبل تک وہ کمرے میں موجود تمام میگزین دیکھ چکی تھی۔

آٹھ گھنٹہ بھی بڑا دعوتی قسم کا آیا تھا۔ چکن بریانی، کوفتے، سلاد، کھیر، گلاب جامن، پھل۔ ڈٹ کر کھانا کھانے کی وجہ

اسی دم دروازے پر دستک ہوئی۔

سے نیند بھی بڑی زبردست آئی تھی۔

گہری نیند کا ٹوٹنا اس وقت آسان نہ تھا مگر دروازے پر دستک یوں ہو رہی تھی گویا کوئی دروازہ اکھاڑنے سے ہے۔ اس نے کھاک کی سمت دیکھا۔ رات کے ساڑھے گیارہ بج رہے تھے۔

”کون؟“ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی اور چادر اوڑھنے کی نیت سے اٹھالی۔

”دروازہ کھولو روشانی!“ ایک بھاری مردانہ آواز سماعت سے ٹکرائی۔

آواز نامانوس سی محسوس ہوئی مگر ذہن فوراً کا کا جان کی سمت گیا۔

”وہ اٹھ کر دروازے کے نزدیک آئی۔

”کون..... کا کا جان؟“ اس نے یقین کر لینا مناسب سمجھا۔

”ہوں!“ وہاں سے بڑا سرد جواب آیا۔

اس نے دروازہ کھول دیا۔ بلیو جینز اور بلیو چیسٹر میں ملبوس اپنی بارعب مونچھوں کے ہمراہ سامنے تیمور علی خان کھڑے تھے۔

”السلام علیکم!“ اس نے نظریں جھکا کر چادر سنبھالی۔

”وسلام۔ کس کے ساتھ آئی ہو؟“ انتہائی خشک لہجہ تھا۔ ساتھ ہی اسے اشارہ کیا کہ دروازہ بند کر دے۔ اس نے تعمیل کی۔

”کسی کے ساتھ نہیں۔ وہ ڈرائیور شیر گل کے ساتھ بس۔“

”کس لئے..... میرا مطلب ہے کس وجہ سے یہاں آئی ہو؟“ ان کے لہجے میں تشویش تھی۔ روشنی خاموش رہی۔

علی خان ایک کرسی پر فروکش ہو گئے اور اسے بھی بیٹھ جانے کا اشارہ کیا۔ وہ جلدی سے بیڈ کے کنارے پرٹک گئی۔

”حویلی میں پتا ہے کہ تم یہاں آئی ہو۔“ وہ بہت الجھ رہے تھے۔

”نہیں۔“ اس نے دھیرے سے جواب دیا۔

”کسی کو بھی نہیں؟“ تیمور علی خان بری طرح چونک پڑے تھے۔

”جی نہیں۔“ اس نے پھر واضح جواب دیا۔

”تم نے ایسا کیوں کیا؟“ ان کی حیرت بجا تھی۔

”اس لئے کہ..... میں بس یہی کر سکتی تھی۔“ اس کی آواز بھرا گئی۔

”مسئلہ کیا ہے۔“ وہ بغور اس کی شکل دیکھنے لگے۔

”وہ میری شادی کر رہے ہیں۔“ اس نے بھی سیدھی سیدھی بات کرنا مناسب سمجھا۔

”تو پھر کیا ہوا۔ لڑکیوں کی شادی تو کرنا ہی ہوتی ہے۔“ ان کا استعجاب سوا ہو گیا۔

”مگر میں شادی کرنا نہیں چاہتی۔“ اس کی آواز بہت دھیمی تھی۔

”میری کرنا نہیں چاہتی تو کیا پلین اڑانا چاہتی ہو؟“ ان کو روشنی کی بات انتہائی احمقانہ لگی۔ روشنی خاموش رہی۔

”میری کرنا نہیں چاہتی تو کیا پلین اڑانا چاہتی ہو؟“ ان سے زیادہ بہتر کوئی اور تمہارا مسئلہ نہیں سمجھ سکتا۔“

”میری کرنا نہیں چاہتی تو کیا پلین اڑانا چاہتی ہو؟“ ان سے زیادہ بہتر کوئی اور تمہارا مسئلہ نہیں سمجھ سکتا۔“

نہیں نے جس انداز میں یاور علی خان کا ذکر کیا۔ روشنی کو یوں محسوس ہوا جیسے بابا صاحب کی دو بیویاں تھیں اور اس کے

پہلو پر چکی الگ الگ مائیں۔ جانے کیوں اسے بے انتہاد دکھ ہوا تھا۔

”یہ بابا صاحب کا فیصلہ ہے۔ وہ کیا کر سکتے ہیں۔“ ناچار وہ گویا ہوئی، جانے کیوں اسے آج تیمور علی خان سے خوف

لین نہیں ہو رہا تھا۔

”تم نے یہ جو حقائق کی ہے اندازہ ہے کہ پیچھے حویلی میں کیا قیامت برپا ہوگی۔ تمہارا جب تک جی چاہے یہاں رہ سکتی

ہو۔ میں ابھی حویلی فون کر کے مطلع کرتا ہوں کہ تم یہاں ہو۔“ وہ فوراً اٹھ کھڑے ہوئے۔

روشنی بھی گھبرا کر کھڑی ہو گئی۔

”کا کا جان! پلیز ہیلپ می۔ آپ میری یہ ساری بھاگ دوڑ بیکار نہ کیجئے۔“ اس کے آنسو بہنے لگے تھے۔

”کون ہے وہ؟“ وہ جاتے جاتے رک گئے تھے اور ایک دم پینتر ابد لا تھا۔

”کون؟“ روشنی بالکل نہیں سمجھی۔

”وہی جس نے تمہیں اتنا بھادور بنا دیا ہے۔“ وہ ہنوز اس سے رخ موڑے کھڑے تھے۔

روشنی کی نظریں جھک کر رہ گئیں۔

”کون ہے وہ سورا۔ جس نے تمہیں اتنی جراتیں بخش دیں کہ تم نے حویلی کی عزت خاک میں ملانے میں ذرا دیر نہ لگائی

”اٹھا کوئی بات نہیں کا کا جان۔“ اس کے حلق میں کچھ اٹکنے لگا۔

”بےوقوف مت بناؤ۔ سیدھے سیدھے بتاؤ کون ہے وہ؟“ وہ برہم ہوئے۔

”آپ میرا یقین کیجئے کا کا جان ایسی۔“

”دیکھو روشانی! زیادہ غلغلہ نہ بن کر دکھانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ گھاس نہیں کھاتے ہم۔ ایک عورت اتنی جرات مند

نبی بن سکتی ہے جب کوئی واضح ٹارگٹ اس کے پاس ہوتا ہے۔ ورنہ لڑکیاں بڑی خوشی خوشی شادی کر کے چلی جاتی ہے اور

نہیں کہ ہندو کو اپنی قسمت سمجھ لیتی ہیں۔

”کیا رہتا ہے۔ کہاں رہتا ہے؟“ وہ اپنی بات پر مستقل تھے۔

”کا کا جان! آپ میری بات۔“

”شب آپ روشانی۔ اس کا نام اور ٹھکانہ بتاؤ۔“ وہ برہم ہو گئے۔

روشنی نے سر ہٹا کر آنسو بہتی رہی۔

”تم سے ہیلپ کیوں مانگ رہی ہو؟ تم کیا سمجھتی ہو کہ تم بے وقوف بناؤ گی اور ہم بن جائینگے۔ ہماری عمر کا زیادہ حصہ

”تم سے ہیلپ کیوں مانگ رہی ہو؟ تم کیا سمجھتی ہو کہ تم بے وقوف بناؤ گی اور ہم بن جائینگے۔ ہماری عمر کا زیادہ حصہ

”میں کہہ رہی ہوں ناں اٹھالو۔ جلدی کرو۔“ وہ ناراضگی سے بولی۔

سرسوتی نے دسترخوان ٹرے پر ڈالا اور خوفزدہ انداز میں ٹرے اٹھالی اور ماہین کی سمت دیکھتے ہوئے باہر کی طرف بھاگی۔

وہ آگے آگے اور ماہین پیچھے پیچھے چل پڑی۔

ایک عظیم الشان دروازہ پار کر کے جب وسیع و عریض احاطے میں انہوں نے قدم رکھے تو یوں محسوس ہوا جیسے

ماہین کا حیرت سے برا حال تھا کہ یہ سرسوتی کہاں جا رہی ہے؟

اس پر مستزاد کتوں کی بھوں بھوں۔ ماہین کو تو ان کے بھونکنے سے نہایت خوف محسوس ہوا۔ جبکہ سرسوتی بہت جلدی جا رہی تھی۔ وہ تیزی سے آگے بڑھ کر سرسوتی کے برابر چلنے لگی۔ کتوں نے ایک آفت اتار دی تھی۔ احاطہ پار کر کے ایک دیو ہیکل دروازے سے گزریں۔ اندر قدم رکھتے ہوئے ماحول میں بلا کی پراسراریت محسوس ہوئی۔ ایک غیر وحشت۔ بھاری بھاری بند دروازے۔ جا بجا تاریکی۔ اور ایک ہولناک خاموشی۔ ماہین قدرے خوفزدہ اور بہت زیادہ

تھی۔

”سرسوتی کی راہداری میں داخل ہوئی جہاں دور تک صرف ایک بلب روشنی پھیلا رہا تھا۔ سرسوتی ایک دروازے

سامنے جا کر رک گئی اور پلٹ کر ماہین کی طرف دیکھا۔

ماہین نے اشارے سے اسے اندر چلنے کو کہا۔

سرسوتی ایک راہداری میں داخل ہوئی جہاں دور تک صرف ایک بلب روشنی پھیلا رہا تھا۔ سرسوتی ایک دروازے

سامنے جا کر رک گئی اور پلٹ کر ماہین کی طرف دیکھا۔

ماہین نے اشارے سے اسے اندر چلنے کو کہا۔

سرسوتی دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گئی۔ اس کے پیچھے ماہین نے قدم بڑھائے۔

”تو یہ ہے سرسوتی! اتنی دیر کر دی۔ بھوک سے برا حال ہو رہا ہے۔ رات کا کھانا دیا کا دیا واپس کروا دینا

نے۔ آج ”بڑی بی“ کو جلانے چرانے کا زبردست موڈ ہو رہا تھا۔ ویسے ہی ڈراتی رہتی ہوں انہیں کہ ایک دن خود کٹی کر دے۔“

بات کے اختتام پر بے ساختہ کھلکھلانے کی آواز آئی۔

ماہین حیران پریشان اندر داخل ہوئی۔ اندر کا منظر دیکھ کر تو جیسے چکرا کر رہ گئی۔ سرخ ویلوٹ کے بھرے کام کے

میں ایک حسین و جمیل شوخ و شنگ سی لڑکی بیڈ پر آلتی پالتی مارے بیٹھی تھی۔ اس سے ذرا فاصلے پر ڈھلتی عمر کی ایک عورت

جس کے کپڑے بوسیدہ مگر بال بنے ہوئے تھے۔ اور ایک بھاری سی زنجیر کا رپٹ پر پڑی نظر آ رہی تھی۔ اس نے زیادہ تر

پتا چلا زنجیر کا دوسرا سر اور ت کے پاؤں سے بندھا تھا۔ آٹا فانا اس کا ذہن اس رات تاریکی میں نظر آنے والی پاب زنجیر

کی طرف گیا۔ حواس جیسے ایک دم سے کم ہو گئے تھے۔

”السلام علیکم!“ جھومر بوکھلا گئی تھی ”آپ“۔

”میں دی روٹی اے۔“ سرسوتی ٹرے رکھتے ہوئے سرگوشی سے گویا ہوئی۔

”میں نے بری طرح چوک کر سر سے پاؤں تک ماہین کو دیکھا تھا۔ آف وہاٹ سرخ کڑھائی کے ڈھیلے ڈھالے کاٹن

مٹریں۔ بہت قیمتی ہیرے کی ناک میں دکتی لونگ اور وجود سے اٹھتی دھیمی دھیمی

تے سٹ میں بلوس خوبصورت تراشیدہ ہیرا سٹائل۔ بہت قیمتی ہیرے کی ناک میں دکتی لونگ اور وجود سے اٹھتی دھیمی دھیمی

تے سٹ میں بلوس خوبصورت تراشیدہ ہیرا سٹائل۔ بہت قیمتی ہیرے کی ناک میں دکتی لونگ اور وجود سے اٹھتی دھیمی دھیمی

تے سٹ میں بلوس خوبصورت تراشیدہ ہیرا سٹائل۔ بہت قیمتی ہیرے کی ناک میں دکتی لونگ اور وجود سے اٹھتی دھیمی دھیمی

تے سٹ میں بلوس خوبصورت تراشیدہ ہیرا سٹائل۔ بہت قیمتی ہیرے کی ناک میں دکتی لونگ اور وجود سے اٹھتی دھیمی دھیمی

تے سٹ میں بلوس خوبصورت تراشیدہ ہیرا سٹائل۔ بہت قیمتی ہیرے کی ناک میں دکتی لونگ اور وجود سے اٹھتی دھیمی دھیمی

تے سٹ میں بلوس خوبصورت تراشیدہ ہیرا سٹائل۔ بہت قیمتی ہیرے کی ناک میں دکتی لونگ اور وجود سے اٹھتی دھیمی دھیمی

تے سٹ میں بلوس خوبصورت تراشیدہ ہیرا سٹائل۔ بہت قیمتی ہیرے کی ناک میں دکتی لونگ اور وجود سے اٹھتی دھیمی دھیمی

تے سٹ میں بلوس خوبصورت تراشیدہ ہیرا سٹائل۔ بہت قیمتی ہیرے کی ناک میں دکتی لونگ اور وجود سے اٹھتی دھیمی دھیمی

تے سٹ میں بلوس خوبصورت تراشیدہ ہیرا سٹائل۔ بہت قیمتی ہیرے کی ناک میں دکتی لونگ اور وجود سے اٹھتی دھیمی دھیمی

تے سٹ میں بلوس خوبصورت تراشیدہ ہیرا سٹائل۔ بہت قیمتی ہیرے کی ناک میں دکتی لونگ اور وجود سے اٹھتی دھیمی دھیمی

تے سٹ میں بلوس خوبصورت تراشیدہ ہیرا سٹائل۔ بہت قیمتی ہیرے کی ناک میں دکتی لونگ اور وجود سے اٹھتی دھیمی دھیمی

تے سٹ میں بلوس خوبصورت تراشیدہ ہیرا سٹائل۔ بہت قیمتی ہیرے کی ناک میں دکتی لونگ اور وجود سے اٹھتی دھیمی دھیمی

تے سٹ میں بلوس خوبصورت تراشیدہ ہیرا سٹائل۔ بہت قیمتی ہیرے کی ناک میں دکتی لونگ اور وجود سے اٹھتی دھیمی دھیمی

تے سٹ میں بلوس خوبصورت تراشیدہ ہیرا سٹائل۔ بہت قیمتی ہیرے کی ناک میں دکتی لونگ اور وجود سے اٹھتی دھیمی دھیمی

تے سٹ میں بلوس خوبصورت تراشیدہ ہیرا سٹائل۔ بہت قیمتی ہیرے کی ناک میں دکتی لونگ اور وجود سے اٹھتی دھیمی دھیمی

تے سٹ میں بلوس خوبصورت تراشیدہ ہیرا سٹائل۔ بہت قیمتی ہیرے کی ناک میں دکتی لونگ اور وجود سے اٹھتی دھیمی دھیمی

تے سٹ میں بلوس خوبصورت تراشیدہ ہیرا سٹائل۔ بہت قیمتی ہیرے کی ناک میں دکتی لونگ اور وجود سے اٹھتی دھیمی دھیمی

تے سٹ میں بلوس خوبصورت تراشیدہ ہیرا سٹائل۔ بہت قیمتی ہیرے کی ناک میں دکتی لونگ اور وجود سے اٹھتی دھیمی دھیمی

تے سٹ میں بلوس خوبصورت تراشیدہ ہیرا سٹائل۔ بہت قیمتی ہیرے کی ناک میں دکتی لونگ اور وجود سے اٹھتی دھیمی دھیمی

تے سٹ میں بلوس خوبصورت تراشیدہ ہیرا سٹائل۔ بہت قیمتی ہیرے کی ناک میں دکتی لونگ اور وجود سے اٹھتی دھیمی دھیمی

تے سٹ میں بلوس خوبصورت تراشیدہ ہیرا سٹائل۔ بہت قیمتی ہیرے کی ناک میں دکتی لونگ اور وجود سے اٹھتی دھیمی دھیمی

تے سٹ میں بلوس خوبصورت تراشیدہ ہیرا سٹائل۔ بہت قیمتی ہیرے کی ناک میں دکتی لونگ اور وجود سے اٹھتی دھیمی دھیمی

تے سٹ میں بلوس خوبصورت تراشیدہ ہیرا سٹائل۔ بہت قیمتی ہیرے کی ناک میں دکتی لونگ اور وجود سے اٹھتی دھیمی دھیمی

کیا۔

”ہوں..... تم جانتی ہو بھوکو؟“ ماہین کے اندر جیسے طوفان برپا ہو گیا۔
”وہ حویلی کا روشن چراغ“۔ عورت افسردگی سے مسکرائی۔

”تم کون ہو؟ تمہیں کیوں قید کیا ہوا ہے ان لوگوں نے؟“ اس نے تیزی سے پوچھا۔ آج تو دیرینہ تجربہ کار
موقع مل رہا تھا۔

”نمک خوار ہوں..... ایک..... بس“۔ وہ خاموش ہو گئی۔

”کیا یاد رکھتا ہے کہ تم کون ہو۔ اور تمہیں یہاں قید کیا ہوا ہے“۔ اس کے ذہن میں جھگڑ چلنے لگے۔
”میں کون ہوں یہ تو انہیں پتا ہے۔ اور یہاں قید ہوں یہ بھی انہیں پتا ہے“۔ عورت نے اداسی سے کہا۔
ماہین کا دل دکھ سے جیسے پھٹنے لگا۔ وہ تو یاد علی خان کو حویلی میں سب سے مختلف سمجھتی رہی تھی۔
اتنی اہم سیٹ پر بیٹھنے والا اتنا بڑا قانون شکن۔

”تمہارا قصور کیا ہے؟“ وہ خود پر قابو پا کر پوچھ رہی تھی۔

”ایک نہیں ہے“۔ وہ آہستگی سے بولی۔

”پھر بھی“۔ ماہین کا انداز اصرار کرنے کا تھا۔

”یہ لیجئے“۔ جھومر نے خوبصورت گلاس میں اسے کوکا کولا مشروب پیش کیا۔

”شکریہ..... میرا موڈ نہیں ہے“۔ اس نے اپنے نفیس انداز میں معذرت کی۔

”جھومر وہ گلاس خود لے کر دوبارہ بیڈ کے کنارے پرٹک گئی۔

”مجھے افسوس ہے کہ میں کچھ بھی نہیں بتا سکتی“۔ عورت کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔

”میرا اتنے دنوں کا دوستانہ۔ میرا مطلب ہے فرینڈ شپ ہے۔ مجھے نہیں بتایا آج تک۔ پوچھو تو رونے لگا ہے۔

پوچھنا بھی کیا۔ صاف ظلم کا شکار لگتی ہے“۔ جھومر کی زبان پھر قینچی کی طرح چلی۔

”مجھے بات کرنے دو پلیز“۔ اس نے بمشکل اپنے ناگواری کے تاثرات کنٹرول کئے۔ جھومر کانٹے سے ٹالنے لگی۔

کھانے میں مصروف ہو گئی۔

”ہاں..... بتاؤ ناں۔ تمہارا جرم کیا ہے۔ کس بات کی سزا مل رہی ہے تمہیں؟“ وہ اس کے پاؤں میں بندھی زنجیر

دل پر کوڑے کی طرح برستا محسوس کر رہی تھی۔ ایک انسان کے ساتھ اس طرح کا سلوک۔ اس کے تو اعصاب جل رہے تھے۔

”آپ کیا کر لیں گی؟ جبکہ یہ سزا میری خوشی میرا سکون بھی ہے“۔ وہ بھرائی آواز میں گویا ہوئی۔

”پھر بھی“۔

”آپ اصرار نہ کریں۔ آپ کو بھی دکھ ہوگا۔ نئی نئی شادی ہوئی ہے آپ کی۔ اللہ مبارک کرے یاد رہے ناں۔

بہت گہرے ہیں۔ ان کے اندر کا پتا نہیں چلتا۔ اللہ بخشے ہماری مالکن کو یعنی آپ کی ساس کہا کرتی تھی۔ نو مہینے پیٹ
میں رہے۔ اپنے ہاتھوں اٹھایا مگر اسے میں بھی نہیں سمجھ سکی۔ سارے لوگ ان سے بہت ڈرتے تھے۔ نوکر تو ان کا نام سن کر
پہننے لگے۔ جہانگیر بھی زور سے بھی نہیں چپے۔“

”بہت کچھ جانتی ہو یاد علی خان کے بارے میں۔ میری بہن کے ساتھ کیسے تھے؟“

ماہین نے نہایت تاک کر سوال کیا تھا۔

”مطرب نے چونک کر ماہین کی صورت دیکھی۔

”بہت محبت کرتے تھے ان سے“۔ اس کی آواز نہایت ہی دھیمی تھی۔

”اور بابا صاحب؟“ ماہین جانے کیا جانتا چاہ رہی تھی۔

”وہ اور اماں جی تو اپنے ہاتھوں بیاہ کر لائے تھے انہیں۔ اپنی بیٹیوں سے بڑھ کر پیار کرتے تھے۔ حویلی کی سجاوٹ تھیں
نیا کیڑیا کی طرح جی رہتی تھیں کہ آنکھیں سیر نہیں ہوتی تھیں“۔ وہ پھر خیالوں میں کھو گئی۔

”پھر کیا ہوا؟“ ماہین نے پتا پھینکا۔

”پھر جی..... پھر کچھ بھی نہیں ہوا“۔ وہ خیال سے چونک کر ایک دم ٹپٹا گئی۔

”تم کس حساب میں سزا کاٹ رہی ہو۔ تمہاری باتوں سے تو میں اس نتیجے پر پہنچ ہوں تم بہت منہ چڑھی بار سوخ قسم کی
نہ فرمائیں۔ پھر تمہارے ساتھ یہ سلوک کیوں ہوا؟“ ماہین کا تجسس کمال کو پہنچا ہوا تھا۔

”بس جی یہ نہ پوچھیں“۔ وہ پھر مغموں نظر آئی۔

”میں کسی سے کہوں گی تو نہیں۔ اعتبار کرو میرا“۔ ماہین نے دوسرا طریقہ آزمایا۔

”بات اعتبار کی نہیں ہے۔ دراصل کوئی فائدہ نہیں ہے“۔

”یہ نہیں بتائے گی۔ ہر طرح کی کوشش کر چکی ہوں“۔

جھومر منہ سے پٹری کی کریم صاف کرتے ہوئے گفتگو میں شریک ہوئی۔

”کیا تم کو نہ بتانے کیلئے دباؤ ہے؟“ آخر اسی فیصد تو وہ وکیل تھی ہی۔

مطرب خاموش رہی۔

”اس حویلی میں کون ہے جو دباؤ سے بچا ہوا ہے؟ ابھی تو آپ نے اس طرف کا ایک ڈراما دیکھا ہے۔ فرصت سے آئے

گئے۔ درہنہ پکڑ کھاؤں گی“۔

مطرب ہاتھ دھوئے کیلئے باتھ روم کی جارہی تھی۔ رک کر کھڑا لگا گیا۔

”تو“۔ ماہین کو جیسے جکڑ آ گیا۔ ابھی اس طرف اور بھی بہت کچھ ہے۔ جھومر کی خود اعتمادی بلکہ ڈھنائی اسے بہت محسوس

ہوتی تھی۔

”تم بہت سنجیدہ لگتی ہو۔ ڈر نہیں لگتا؟“ وہ واپس آئی تو ماہین کہے بنانہ رہ سکی۔

☆.....☆.....☆.....☆.....☆.....☆.....☆.....

وہ مہبت سی اپنی جگہ کھڑی رہ گئی۔

یہ کیوں آیا ہے؟ شاید اسے شک پڑ گیا ہو۔ ویسے بھی بڑا پہنچا ہوا ہے۔ ہو سکتا ہے اپنے معمول کے کام سے آج پہنچا۔
 بھی آتا رہتا ہے یہاں۔ اس نے خود کو تسلی دینے کے سو بہانے تراشنے شروع کر دیئے۔

باری نے جو کیدار سے کچھ بات چیت کی۔ پھر اس طرف بڑھ گیا جہاں سے زینہ اوپر کی طرف جاتا تھا۔ رشتہ
طمانیت بھرا سانس سینے سے خارج کیا۔ اس کا مطلب ہے سب خیریت ہے۔ وہ تیز تیز چلتی ہوئی واپس اپنے رہائش گاہ
میں آگئی۔

جانے کیوں احساسات عجیب خوشگوار سے ہو گئے تھے۔ سارا وجود ایک دم ہلکا پھلکا سا ہو گیا تھا۔ جی چاہ رہا تھا کہ وہ دم کرتی اوپر جائے اور اس سے جی بھر کر الجھے۔ جو اب اس کی پرسکون مسکراہٹ اور لہجے سے اپنی جان جلائے۔ خوب کے لئے اور پھر اسے چکنا گھڑا پا کر جی بھر کر روئے۔ اس کے بعد وہ اپنی بیسی پھوار سے لہجے میں اسے سمجھائے۔ بڑی بے بسی سے کا چہرہ دیکھے۔

اس نے چادر اتار کر ایک طرف ڈالتے ہوئے جانے کیا سوچ ڈالا۔

اس نے چادر اتار کر ایک طرف ڈالتے ہوئے جانے کیا سوچ ڈالا۔
وہ رات کو بہت بے سکون رہی تھی۔ یہاں تک کہ فجر کی اذان ہو گئی تھی۔ لہذا پھر وہ نماز پڑھ کر عیسیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا پڑھی۔

ہوئی تھی۔ مگر ہر بار بڑی آہستہ اور سرسری سی دستک تھی۔ لیکن اس مرتبہ
 بیرونہ ویری طرح دھڑ دھڑایا گیا تھا۔ اس نے وال کلاک کی طرف دیکھا۔ دن کے ساڑھے دس بج رہے تھے۔ وہ کسٹمنڈی
 سے ابھی اور دوپٹا سنبھالتی دروازے تک آئی۔ اور دروازہ کھول دیا۔ سامنے گہری نیلے سوٹ میں کلو کھڑی دانت نکوس رہی تھی۔
 ”السلام علیکم! آپ کا ٹیلی فون آیا ہے۔“ وہ حسب عادت لہرا کر گویا ہوئی۔

”السلام علیکم! آپ کا ٹیلی فون آیا ہے۔“ وہ حسب عادت لہرا کر گویا ہوئی۔

ماہینے نے نیند بھری آنکھوں سے اس کی ست دیکھا۔

”کس کا فون ہے؟“ (شاید نعمان بھائی)

”پچھلی مرتبہ بھی آپ ہمیں لاگ ڈرائیو پر لے کر نہیں گئے تھے جبکہ پراس کیا تھا۔“ وہ ایک کرسی پر بیٹھ کر بھروسہ
”سوری۔ جلدی میں تھا۔“ اس نے فوراً معذرت کی۔

”جی نہیں، صرف سوری سے کام نہیں چلے گا۔“ وہ بڑے ناز سے گویا ہوئی۔
”پھر؟“ وہ مسکرانے لگا۔

”پھر یہ کہ اس مرتبہ آپ جلدی میں نہیں ہوں گے اور اپنا پراس۔ نو بل پراس پورا کریں گے۔ اوکے۔“ وہ کھٹکھٹا
”اوکے۔“ وہ بھی ہنس دیا۔

”باری بھائی۔“ وہ کچھ سوچ رہی تھی۔
”ہوں۔“

”وہ ادھر بابا صاحب کی بڑی حویلی میں بھی تو ہم جتنے بچے ہوں گے۔ وہ بھی آپ کے ساتھ اس طرح باقرا
ہیں۔ ان کی فرینڈ شپ ہے آپ کے ساتھ؟“ وہ بڑی سنجیدگی سے پوچھ رہی تھی۔
”نہیں۔ وہاں آپ جتنے بچے نہیں ہیں۔ اکا کا بیٹا چھوٹا ہے۔ بہت چھوٹا اور باقی سب بڑے ہیں۔“ وہ مسکرا دیا۔
بزرگانہ سنجیدگی پر۔

”باقی سب کتنے بڑے ہیں۔ جتنی بڑی یاد اور انکل کی بیٹی ہیں؟“ اس نے باری کا چہرہ بغور دیکھا تھا۔
باری نے بری طرح چونک کر صوفشاں کو دیکھا۔

”یاد اور انکل کی بیٹی؟ دیکھا ہے انہیں؟ آپ ملی ہیں ان سے صوفی؟“ اس کے سامنے تو جیسے زمین گھونٹنے لگی تھی۔
”دیکھا بھی ہے۔ ملے بھی ہیں۔ بہت کیوٹ ہیں۔ بولتی بھی بہت ہیں۔ مگر پتا نہیں می ہمیں ان کے پاس کیوں نہ
جانے دیتیں۔ ہمارا دل چاہتا ہے ہم ان سے بہت سی باتیں کریں۔ لاگ ڈرائیو پر جائیں گے ناں تو چپکے سے اٹھا
ساتھ لے جائیں گے۔ کیوں ٹھیک ہے ناں؟“ وہ اپنے آئیڈیا پر خود ہی خوش ہو کر بولی۔
باری کا تو دم سینے میں اٹک گیا تھا۔

”آپ کب ملی تھیں ان سے صوفی؟“ وہ گم صم انداز میں پوچھ رہا تھا۔
”کل..... کل ہی تو۔“ وہ بے نیازی سے گویا ہوئی۔

”آپ کی می ملی ہیں ان سے؟“ اس کے حواس ٹھہر رہے تھے۔
”پتا نہیں۔ مگر وہ ہمیں تو ملنے نہیں دے رہے۔“ اس نے منہ بتایا۔
”باری بھائی۔ می کیوں ملنے نہیں دے رہیں؟“ وہ جیسے جھلا گئی۔

”پتا نہیں۔ ہیں کہاں وہ؟“ وہ کھوئے کھوئے انداز میں پوچھ رہا تھا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے سر سے کوئی بہت بڑا
اتر گیا ہو۔ اور اطراف کے سارے منظر واضح ہو گئے ہوں۔ نکھر گئے ہوں۔
”گیسٹ روم میں۔“ صوفی نے بتایا۔

”اوپر؟“ باری نے معلومات کیں۔
”نہیں۔ وہاں تو آل ریڈی پپا کے فرینڈ ہیں۔ وہ نیچے والے گیسٹ روم میں ہیں۔ لان کے ساتھ ہیں ناں وہ دو گیسٹ

”اوپر۔“ اس نے مزید اطلاع بہم پہنچائی۔
”اچھا۔ اچھا۔“

اسی دم سمندر خان ناک کر کے چائے کی ٹرے کے ساتھ اندر داخل ہوا۔
”اوہ بے بی! آپ یہاں ہو۔ اور آپ کامی پریشان ہے۔ سب ڈھونڈ رہا ہے آپ کو۔“ جیسے ہی سمندر خان کی نظر

نوشاں پر پڑی وہ بے ساختہ بولا۔

”ہم کوئی حویلی سے باہر جاتا ہے۔ جومی پریشان ہوتی ہیں۔“ وہ برامان کراٹھ کھڑی ہوئی۔
”خان۔ چائے بناؤں۔“ سمندر خان نے ٹرے رکھ کر باری کو مخاطب کیا۔

”ہوں۔ ہاں۔ ہاں۔“ وہ جیسے کسی دھیان سے چونکا۔

”باری بھائی! دیکھیں۔ اس مرتبہ آپ پراس پورا کئے بغیر واپس نہیں جائیں گے۔“ اس نے جاتے جاتے انگلی اٹھا کر باری
کو تاکید کی۔

”اوکے۔ اوکے۔“ باری ہاتھ اٹھا کر مسکرایا۔

”سمندر خان! وہ نیچے جو گیسٹ روم میں مہمان ہیں انہوں نے ناشتا کر لیا۔“ باری کی آواز بہت دبی تھی۔

”وہ..... نیچے والا مہمان۔ اوہ۔ خان وہ تو کوئی لڑکی ہے۔ بڑا حکم چلاتی ہے۔ بڑا غصہ کرتی ہے۔ تیمور خاناں کا کوئی رشتہ
دار ہے۔ ام پیلے اسے نہیں دیکھا۔ اور وہ شیر گل کے ساتھ آیا تھا۔“

سمندر خان چائے بناتے ہوئے بڑی سادگی سے بتا رہا تھا۔

”اوہ۔“ باری نے گہری سانس لی۔ جیسے مزید مطمئن ہو گیا ہو۔

”کا کا جان ملے ہیں اس سے؟ وہ تو سندھ گئے ہوئے تھے۔“ باری کو یکدم دھیان آیا۔

”یام کو علوم (معلوم) نہیں۔“ اس نے چائے کا کپ باری کی طرف بڑھاتے ہوئے جواب دیا۔

”اچھا..... اچھا ٹھیک ہے۔ تم جاؤ۔ میں ذرا کام کر رہا ہوں۔ ابھی خان کے ساتھ کچہری بھی جاتا ہے۔“

”بھلا ہر سمندر خان سے مخاطب تھا۔ مگر ذہن کہیں دور اڑائیں بھر رہا تھا۔

.....
”بہت عجیب انداز میں گیسٹ روم کے دروازے تک آیا تھا اور بہت آہستگی سے دستک دی تھی۔

”ہوں..... آ جاؤ بھئی۔“ آواز میں زمانے بھر کی بیزار سی سائی ہوئی تھی۔ آج تو وہ باری کی موجودگی کے احساس سے باہر
نہیں نکلی تھی۔ اس وجہ سے موڈ کچھ زیادہ ہی آف ہو رہا تھا۔ وہ ترچھے زاویے سے بیڈ پر بیٹھی ہوئی تھی۔ پہلو میں گاؤ نکلیہ
تھ۔

”سمندر خان! رات بڑی حویلی سے جو بندہ آیا تھا واپس گیا یا نہیں؟“ اس نے مڑے بغیر استفسار کیا۔
 ”اوہ..... محترمہ کو ہماری آمد کی اطلاع بھی ہے۔“ اس کی موجودگی کے یقینی احساس سے باری کے احساس میں
 سبک ہو رہے تھے۔

اس نے کھنکھار کر گلا صاف کیا۔

”السلام علیکم۔“

روشی بدحواس ہو کر پلٹی تھی۔

ایک لمحے کو تو اس سے کچھ بولا ہی نہیں گیا۔ نظریں جھک کر رہ گئیں۔

”واہ صاحب..... بندے کی قسمت میں ٹھاٹھ ہوں تو کون اس سے چھین سکتا ہے۔“ باری نے کمرے میں داخل ہو کر
 دوڑا کر شریر لہجے میں کہا۔

”اتنے گہرے لگتے ہیں کا کا جان۔ ایک ذرا سارا ہضم نہ کر سکے۔“ وہ تلخی سے کہہ کر چادر اوڑھنے لگی۔

”انہوں نے تو مجھ سے کچھ نہیں کہا۔ بالی گاڈ۔“

”پتا ہے..... موکل ہیں تمہارے قبضے میں سب خبر دے دیتے ہیں۔ مگر ذرا سست ہیں ورنہ ہوتا تو یہ چاہے تو کیا۔“
 جیب کے پیچھے تمہاری جیب ہوتی۔“ وہ طنزیہ کہہ کر کھڑکی میں جا کھڑی ہوئی۔

”آپ کو اچھا لگتا ہے اس طرح سے دوسروں کو پریشان کرنا۔ کتنے افسوس کی بات ہے۔ آپ کو سوائے اپنے دل کے
 کچھ اور کوئی یاد نہیں رہتا۔ ادھر حویلی میں ایک قیامت برپا ہے۔ رات رات بھر کوئی سو نہیں سکتا۔ ایسے لگتا ہے وہاں کوئی ہون
 ہوئی ہو۔“

”تو مر گئی ہوں ناں۔ میں سب کیلئے موت ہی تو ہوں۔“ وہ اس کی بات کاٹ کر غرائی اور اگر تم نے وہاں جا کر یہ
 دی کہ میں سرائے میں ہوں تو میں یہاں سے بھی چلی جاؤں گی۔“ اس نے دھمکی دی۔

”کیا ہو گیا ہے آپ کو؟ ایسا تو کچھ ہوا بھی نہیں۔“

”شب آپ باری۔ جی چاہ رہا ہے تمہارا منہ نوج ڈالوں۔ تمہارا وجود تار تار کر دوں۔ میرا زندہ محسوس کرتا ہو
 لوجیکل اور روایتی انداز میں کسی کو پیش کیا جا رہا تھا اتنی کمزور نہیں ہوں میں۔ ایک باری کی موت منظور ہے۔ روز روز کی نہیں۔“

”لیکن آپ کی شادی تو کہیں نہ کہیں۔ کسی نہ کسی کے ساتھ۔“

اس کی بات ابھی پوری نہیں ہوئی تھی کہ وہ بھوکے شیرنی کی طرح اس کی طرف لپکی۔ ایک زور کا ہاتھ اس کے پیچھے
 اور اس برے طریقے سے اس کا گریبان پکڑ کر کھینچا کہ سارے بدن ایک جھٹکے میں ٹوٹ ٹوٹ گئے۔ اور گریبان دامن کی طرح
 چلا گیا۔

”گیٹ آؤٹ فرام ہیئر۔ بی آف فاریور۔“

اس نے نہایت وحشت کے عالم میں اسے دروازے کی جانب دھکا دیا۔ اور اپنی پیشانی دیوار سے مارنے لگی۔ جیسے:

پہرے پر بے بہت سوار ہو گیا تھا۔
 باری تو اس اچانک افتاد پر بری طرح بوکھلا کر رہ گیا تھا۔ اس نے خود اپنی حالت پر سے نظر ہٹا کر اس کی جانب دیکھا تو
 نڈریش روشنی کی پیشانی خون آلود ہو چکی تھی۔ وہ اس کی جانب بڑھا ہی تھا کہ اسی دم دروازہ کھلا۔ اور تیمور علی خان نے اندر
 نہرے۔

ایک لمحے کو تو اندر کی صورتحال نے انہیں ٹھنکا کر رکھ دیا۔ پھر روشنی کی پیشانی سے بہتے ہوئے خون نے جیسے ان کی بیٹری
 چارج کر دی تھی۔ وہ سر پھوڑتی روشنی کی سمت تیر کی طرح بڑھے اور اس کا بازو تھام کر اپنی طرف موڑا۔

”روشانے۔ ہوش کرو۔ کیا ہوا ہے؟“

”کا کا جان! وہ ان کے سینے سے لگ کر بلک بلک کر رونے لگی۔

”کیا ہوا؟ کیا کہا ہے باری نے؟“ انہوں نے عجیب سی الجھن میں باری کی سمت دیکھا۔

باری تو ویسے ہی مجرم بنا چپ کھڑا تھا۔ تیمور علی خان کی آواز پر اسے مزید خفت سی محسوس ہونے لگی۔

”روشانے بتاؤ بھی۔ کیا ہوا ہے؟ اور یہ کیا حرکت کی ہے تم نے۔“ تیمور علی خان کی سفید کلف دار قمیض کا گریبان خون
 سے لہجھا ہوتا جا رہا تھا۔

ان کے وہ مخصوص تاثرات والا چہرہ جانے کس اوٹ میں چلا گیا تھا۔ اس وقت تو ان کے چہرے پر تفکرات کا جال پھیلا
 ہوا۔ روشنی تھی کہ قابو میں نہیں آ رہی تھی۔ اس کی پیشانی پر ٹپیں خون سے چپک گئی تھیں۔ تیمور علی خان نے نہایت احتیاط سے
 ٹپوں کی پوروں سے ہال ہٹائے تو ان کی انگلیوں پر بھی خون لگ گیا۔

”کیا دیوانگی ہے روشنانے؟ اب تم بچی بھی نہیں ہو۔ چیچ چیچ۔ باری وہ پھول خان سے کہو۔ میرے کمرے سے فرسٹ ایئر
 کالے آئے۔“

انہوں نے باری کے سراپے پر ایک معنی خیز اور جتنا ہی ہوئی نظر ڈالتے ہوئے کہا تھا۔

”کا کا جان۔ مجھے مر جانے دیں پلیز۔ یہاں کوئی میرا اپنا نہیں ہے۔ یہ رشتے رشتے نہیں ہیں کا کا جان۔ میری جان
 سے بڑی ہوئی چٹکیں ہیں۔ انہیں اپنی زندگی کیلئے میرا خون چاہیے۔ مجھے نفرت ہے ان سب سے۔ مجھے کسی رشتے، کسی تعلق
 کی ضرورت نہیں ہے۔ اور آپ اسے کہیے کہ اس کی صورت مجھے کبھی نظر نہ آئے۔ ورنہ میں اس پر پٹرول چھڑک کر آگ لگا
 دوں۔ مجھے دنیا میں سب سے زیادہ اس سے نفرت ہے۔ یہ انسان نہیں درندہ ہے۔“

”اس کی طرح روئی۔ اس قدر پھوٹ پھوٹ کر کہ تیمور علی خان تو امتحان میں پڑ گئے۔ وہ کڑے تیوروں سے باری کی
 منہ مٹانے لگے۔

”کیا کہتا ہے تم نے اسے؟ اور یہ تمہارا حلیہ کیا ہو رہا ہے؟“ ان کے لہجے میں محسوس کی جانے والی کاٹ اور چھین تھی۔

”نمبر سے جیسے کے بارے میں روشنی بی بی ہی آپ کو بتائیگی۔ میں پیغمبر نہیں ہوں خان کہ میرے لئے اوپر سے گواہی

اس نے اتنی سنجیدگی، اعتماد اور وقار سے کہا کہ تیمور علی خان بے ساختہ روشنی کی طرف متوجہ ہو گئے۔ خون منہ میں نہ تھا۔ انہوں نے قمیض کی بغلی جیب سے سفید رومال نکال کر اس کی پیشانی پر رکھا تو وہ فوراً سرخ ہو گیا۔ وہ اس کو دیکھ کر لے ہوئے بیڈ تک آئے۔

”سلی گرل!“ عجیب سا دکھ ان کے چہرے سے جھلکنے لگا تھا۔ وہ اس کے ساتھ ہی بیڈ پر بیٹھ گئے تھے۔ انہوں نے خون آلود ہاتھ کو ایک نظر دیکھا۔ پھر اپنی سفید قمیض کے دامن سے ہی صاف کر لیا۔ باری باہر نکل گیا تھا۔

”تم نے یہ سب کیوں کیا روشانی؟ حالانکہ رات ہم نے تم سے تمہاری بات سننے کا وعدہ کیا تھا۔“ وہ التجے ہوئے رہے تھے۔

”کا کا جان! اگر میرا بس چلے اور صرف ایک خون کرنے کی اجازت ہو تو میں پہلی فرصت میں اسے ٹوٹ کر ڈال دوں گی۔“

”کس کو؟ باری کو؟“ تیمور علی خان کے لہجے میں استفسار اور استعجاب دونوں تھے۔

وہ کچھ بولی نہیں سسکیاں لیتی رہی۔

”وہ تو بڑا ہارم لیس (بے ضرر) سا بندہ ہے۔ اپنے کام سے کام رکھتا ہے۔“

وہ کہہ رہے تھے مگر ذہن کی اسکرین پر اس کا کچھ دیر قبل کا سراپا روشن ہو رہا تھا۔ لہجہ خود بخود دست و کمر درسا ہو گیا۔

”بالکل بے کار۔ تل ایک دم۔ سیلفش سوائے دکھ دینے کے اسے کچھ نہیں آتا۔“

”کیا کہا ہے اس نے تمہیں۔ تم لاوارث نہیں ہو کہ اکیلی دکھ جھیلو۔ ہم پر اعتبار کرو روشانی۔ تم ہمارا خون ہو۔“

نے اس کے سر پر محبت سے ہاتھ پھیرا۔

جسم و جان پر پھواری برس پڑی۔ یہ بالکل نیا روپ تھا تیمور علی خان تھا۔

”کا کا جان! آپ مجھے واپس بڑی حویلی تو نہیں بھیجیں گے نا؟“ وہ ہنوز ان کے سینے سے لگی ہوئی تھی۔

”ہم تمہارے پیٹیفلس کو سپورٹ کریں گے روشانی۔ مگر تمہیں یہ سب نہیں کرنا چاہیے تھا۔“ وہ اس کی پشت سے ہونے لگا ہوا۔

اسی دم پھول خان فرسٹ ایڈ باکس لے کر کمرے میں داخل ہوئے۔

”ایک برتن میں گرم پانی لاؤ اندر سے۔“ انہوں نے ہاتھ روم کی طرف اشارہ کیا۔ پھول خان سائیڈ ٹیبل سے گواہ کر ہاتھ روم میں چلا گیا۔

تیمور علی خان باکس کھول کر ضروری چیزیں نکالنے لگے۔

پھول خان پانی لے کر آیا۔ تیمور علی خان نے روٹی بھگو کر اس کا چہرہ صاف کرنا شروع کیا۔ روشنی چپ بیٹھی۔

بھرتی رہی۔

تیمور علی خان نے کسی ماہر کپاؤنڈر کی طرح زخم کی بینڈیج کی تھی۔

”پھول خان! ایک گلاس گرم گرم دودھ لاؤ۔“

”جہاں سے پاس اور کپڑے نہیں ہیں روشانی؟“ انہوں نے اس کی قمیض پر لگے ہوئے خون کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”خیر۔ ہم اندر سے ابھی کپڑے بھجوا دیتے ہیں۔“

”ہم اندر کیوں نہیں جاسکتے کا کا جان؟“ وہ آہستگی سے پوچھ رہی تھی۔

”تم دودھ پی کر ڈریس چینج کر لینا اور آرام کرنا۔ بے فکر ہو تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ اب یہ سب دوبارہ نہیں ہوتا ہے۔“

وہ باکس بند کر کے اٹھ کھڑے ہوئے۔ وہ اس کی بات صاف نظر انداز کر گئے۔

”کا کا جان! وہ باری بڑی حویلی جا کر سب کو بتا دیگا۔ بابا صاحب اور پاپا یہاں آجائیں گے اور پھر وہی کریں گے جو ان اہل چاہے گا۔“ اس نے اپنے اندیشے ظاہر کئے۔

”بڑی روشانی۔ باری وہی کرے گا جو ہم اسے تاکید کریں گے۔ ڈونٹ وری۔ دیکھو۔ اب پھر یہ سب نہیں ہوتا ہے۔ اب باری بھی یہاں نہیں آئے گا۔ ویسے وہ یہاں آ کیسے سکتا تھا۔ اسے پتا کیسے چلا؟ تم نے بلایا تھا؟“ وہ جاتے بنے پلے۔

”نہیں..... میں نے نہیں بلایا تھا۔ بائی گاڈ کا کا جان۔ میں تو صبح سے باہر بھی نہیں گئی۔ بیوی۔“ وہ یقین دلانے کی کوشش کرنے لگی۔ آواز میں ابھی تک آنسوؤں کا تاثر تھا۔ تیمور علی خان باہر نکل گئے تھے مزید کچھ کہے نہ۔

باری لباس تبدیل کرنے کے بعد بری الجھن میں بیٹھا ہوا تھا۔

”خان..... تیمور خان! اپنے کمرے میں آپ کو بلا رہے ہیں۔“ سمندر خان نے آکر اسے پیغام دیا۔

وہ یاد دہانی سے الجھتا ان کے کمرے میں آیا تھا۔

دروازے کی چڑچڑاہٹ پر تیمور علی خان نے سر اٹھایا تھا۔ وہ بھی کپڑے تبدیل کر چکے تھے اور لائٹ براؤن شلوار قمیض پہن چکے تھے۔

باری شلوار قمیض چینج کر کے سیاہ پیٹ اور وہائٹ شرٹ زیب تن کر کے آیا تھا۔

”آؤ باری..... کام تو آج بھی بہت ہے۔“ انہوں نے سگار منہ سے نکالے بغیر کہا اور اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

”وہ امام زین الدین والاکیس تو میرا خیال ہے ہفتہ دس دن میں نمٹ جائے گا۔ ایک پیشی پرسوں ہے اعوان ایڈووکیٹ کہہ رہا ہے۔“

”نہیں! تم کوئی ٹینشن نہیں ہے۔ مگر بابا صاحب نے اس کیس کو خود پر طاری کیا ہوا ہے۔“

”فائل بھجوائی ہے انہوں نے؟“

”جی ہاں۔“ وہ بہت کانشس تھا۔ اسے خوب احساس تھا کہ تیمور علی خان کچھ دیر قبل کا واقعہ فراموش کر کے اس سے

مرد اب تک زندہ ہے تو آپ نے اس سے شادی کیوں نہیں کر لی۔ اگر اس میں کس بل تھے تو اب تک توکل گئے
ہیں۔ وہ اسی سابقہ انداز میں بولی

کوئی ہمیں بھی یہ سمجھاؤ ان پر دل کیوں رتجھ گیا

جیسے چتون، ہانگی چھب والے سمیترے پھرتے ہیں

ن سے شادی ہو نہیں سکتی تھی ورنہ اسی سے کرتے۔ عارف مسکرا دیا۔

کیوں اس نے آپ کی ماں کا دودھ پیا تھا اور یہ انکشاف بہت بعد میں ہوا تھا۔ بالوسلگ کر بولی۔
”حوالہ لا تو“۔ عارف جھلا کر رہ گیا۔

”کہاں رہتی ہے وہ؟“ ہالو جانے آج کیا ٹھان کر آئی تھی۔

”یہاں سے بہت دور ایک بہت بڑے محل میں۔“ عارف کے لہجے سے کرب چھلکنے لگا۔

روپ سروپ کی جوت جگانا اس مگری میں جو حکم ہے

چاروں کھونٹ بگولے بن کر گھور اندھیرے پھرتے ہیں

”آئی او جی جگہ ہاتھ مارا تھا آپ نے؟“ بالو تسخرانہ انداز میں گویا ہوئی۔

”آہ۔“ عارف نے آہ بھری مگر بولا کچھ نہیں۔

”کیا نام ہے اس جگہ کا؟“

”دریا بستی۔ خیر آباد سے پہلے پڑتی ہے۔ بڑا سرسبز علاقہ ہے۔ بستی چھوٹی کھلیان بڑے۔ انسان بھی خوبصورت اور

بہنہ لگی۔ جو ایک مرتبہ وہاں بس جائے۔ پھر اس کا کہیں اور دل نہیں لگ سکتا۔ جب ہی تو یہاں رہ کر بھی وہیں پہنچے رہتے

۔۔۔ جیسے تصور میں ایک ایک منظر دیکھنے لگا۔

”آئیں گئے تھے وہاں سے؟ جبکہ آپ کا تو سب کچھ وہیں ہے۔“ وہ چیخ کر بولی۔

”گالے پانی کی سزا پر آئے ہوئے ہیں۔“ وہ ہنس دیا۔

”کب ختم ہوگی یہ سزا؟“ وہ زہریلے لہجے میں پوچھ رہی تھی۔

”موت پر۔“ وہاں سے برجستہ جواب آیا۔

”نہ نہ کرے۔ ان کیلئے کیوں نہیں جیتے جنہیں آپ کی قدر ہے؟“ وہ افسردہ سی ہو گئی تھی۔

درد مندوں کو وفاؤں کا صلہ مل کر رہا

چند ایثار کے پیکر مگر ہار گئے

ہاتھ نے پھر شاعرانہ انداز میں جواب دیا۔

”آپ کا دل بھی نہیں چاہتا کہ کبھی وہاں ہو آئیں۔ میں نے تو کبھی آپ کو اس شہر سے باہر جاتے ہوئے نہیں

دیکھا۔ جب آپ وہاں رہتے تھے لازمی آپ کا گھر بھی ہو گا وہاں۔۔۔۔۔؟“ بالو کے سوال ختم ہونے والے نہیں تھے۔

باری اس قدر لا جواب شاید کبھی ہوا ہو گا۔ تیمور علی خان کی آنکھیں اسے حساس ترین کیمرہ محسوس ہونے لگیں۔
ٹائیے خاموش ہو کر رہ گیا۔

”کا کا جان! دیکھئے میری طرف سے تو کوئی بات ہی نہیں ہوئی۔ یہ تمام صورتحال کری ایٹ ان کی جانب
ہے۔ کیا یہ بہتر نہیں ہو گا کہ بیک ریزن انہی کی طرف سے معلوم ہے۔“ باری نے بڑے پنے سے انداز میں غور
کوشش کی۔

”پھر اس کے بعد کا کا جان جو کچھ آپ مجھ سے پوچھیں گے۔ میرے لئے درست جواب دینا آسان ہو گا۔
خان چند لمحے اس کی جانب دیکھتے رہے۔

”پھر تم آج بڑی حویلی مت جانا۔ ہم بابا صاحب کو فون کر دیں گے۔ یہ بہت بڑا مسئلہ ہو گیا ہے باری۔
بڑی حویلی کیلئے تو یہ تباہ کن موڑ ہے۔ تم سمجھ رہے ہونا؟“

”جی۔۔۔۔۔ جی۔ بہت اچھی طرح۔“ باری نے جلدی سے اتفاق کیا۔

”ٹھیک ہے پھر کچھری چلتے ہیں۔ بعد میں بات ہوگی۔“ تیمور علی خان بیڈ سے اترتے ہوئے گویا ہوئے۔
کھڑا ہوا۔

بالو دروازے پر دستک دیئے بغیر اندر آ گئی تھی۔

”کیا کر رہے ہیں؟“ وہ وہیں دروازے پر رک کر پوچھنے لگی۔

دوست یہ کیوں ہے یہ کیا ہے؟ مجھے کچھ سوچنے دے

ہر طرف حرص و ہوا ہے مجھے کچھ سوچنے دے

”سوچ رہے ہیں بھابی۔“

”آپ کے دوست سے میری علیحدگی ہو چکی ہے۔“ بھابی سن کر بالو کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔

ہم کو یہ کب تم پہ گماں تھا شاعر بھی ہو انشا جی

اب تک تو جس بھیس میں دیکھا لگتے تھے معقول میاں

رشتے تو ایک بار ہو جاتے ہیں اور بس ہو جاتے ہیں۔ کیا سمجھائیں اور کتنا سمجھائیں۔“

وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔

”یقین کریں جب بھی آپ کو دیکھتا تھا تو یہی ذہن میں آتا تھا کہ آپ بہت سیدھی سادھی سمجھوتہ کرنے والے
وقت سے حوصلے کے ساتھ نمٹنے والی ہیں۔“

”چلانے کی ضرورت نہیں اس طرح آپ کے جرم معاف نہیں ہو سکتے۔“ وہ تلخی سے کہتے ہوئے ایک کڑی
ہو گئی۔

انجان فضاؤں میں سردشت حوادث
اس واسطے ٹھہرا ہوں کہ کس واسطے گھر جاؤں

”وہاں جانے کا کوئی فائدہ نہیں ہے اس لئے جانا نہیں چاہتا۔“ وہ بہت سنجیدہ ہو گیا تھا۔
”اگر وہ مجھے کبھی مل گئی تاں تو میں اس کا گلا دبا دوں گی۔ زندہ انسانوں سے کھیلتی پھرتی ہے۔ گناہ ہے کہ پڑا ہو۔ اس نے آپ پر۔“

”آپ ناشتا کر چکیں؟“ عارف یوں بولا جیسے اس کی بات ہی نہیں سنی۔

”ہوں۔ آپ کی اماں کو بھی کرا دیا تھا۔ بے چاری کچھ کھاتی ہی نہیں ہیں۔ پریشان کر کے رکھا ہوا ہے ان کو۔“
آپ کو تو ترس بھی نہیں آتا ماں پر بالو بڑائی۔

”ان کے سارے کام اپنے ہاتھ سے کرتا ہوں۔ بہو ہوتی تو ہزار باتیں سنا کر ایک روٹی کھاتی۔ انہیں چاہیے۔ ان کی ناقدری نہیں کرائی۔“ عارف نے بڑے سکون سے جواب دیا۔

”یہ خیر آباد کہاں ہوتا ہے عارف بھائی۔“ وہ اچانک کسی دھیان سے چوکی۔

”سرحد میں ہوتا ہے۔ خیریت؟“ عارف کی مسکراہٹ میں حیرت بھی تھی۔

”یونہی پوچھ رہی تھی۔ کیا گاؤں محل بھی ہوتے ہیں؟“ وہ پھر سے کھوجنے لگی۔

”ہاں! محل جیسی حویلیاں ہوتی ہیں۔“ عارف نے ایک اچھتی سی نظر اس پر ڈالی۔

”آپ جاتے تھے حویلی میں اس کے پاس۔ آپ کو کوئی روکتا نہیں تھا؟“ وہ حیرت سے بولی۔

”بابا۔ ہم تو سمجھیں رہتے ہی وہیں تھے۔ آ۔۔۔۔۔ ہا۔۔۔۔۔ کیا دن تھے۔“

اس حویلی میں اتنے پھول ہوتے تھے کہ حویلی پھولوں میں چھپ جاتی تھی۔ اور ان پھولوں کے درمیان جھونکا

وہ۔ اتنے حسین منظر آنکھ کیسے بھلا دے۔

”وہ کون؟ وہی منحوس؟“ بالو جل کر بولی۔

”اس کا نام مطربہ ہے بھابی۔ محبت کے گیت چھیڑنے والی۔“

”زہر گھول دیا ہے جس نے آپ کی زندگی میں۔“ وہ سگی۔

”عارف خاموش رہا۔ بالو بھی خاموشی سے انگلیاں مروڑنے لگی۔

”میں سوچ رہا ہوں آج غلام محمد کے پاس جا کر اسے سمجھانے کی کوشش کروں۔ پھر آپ کو وہاں چھوڑ کر آؤں۔“

کے ساتھ کوئی زیادتی نہ ہو۔“ عارف نے موقع غنیمت جان کر موضوع بدل دیا۔

”کوئی ضرورت نہیں آپ کو وہاں جانے کی۔ پہلے میرے حساب کتاب سیدھے کریں۔ میرے نقصان پر ہے۔“

کیا سوچ رہے ہیں اتنی آسانی سے معاف کر دوں گی؟“ وہ بل کھا کر کھڑی ہو گئی۔

”میں یاد رکھتا ہوں۔ تم بات کیوں نہیں کر رہیں؟ ہو سکتا ہے اسے کوئی ضروری کام ہو۔“ عالم تاب اس
مرید خونی تھا۔

”میں کو بستر سے اترنا پڑا۔“ اس نے طنزیہ انداز میں کہا تھا جس کا عالم تاب نے نوٹس نہیں لیا تھا کہ آج کل ان کی
”جی۔ کوئی ضروری کام ہی ہوگا۔“ اس نے طنزیہ انداز میں کہا تھا جس کا عالم تاب نے نوٹس نہیں لیا تھا کہ آج کل ان کی

”جی۔ دھارے دوسری سمت بہ رہے تھے۔“
دو نہایت بد مزاجی کیفیت میں ہال میں داخل ہوئی۔ خلاف معمول ہال میں لڑکیاں نظر نہیں آئیں صرف شیوے صبح کے
نہایت میں دھنی ہوئی دکھائی دیں۔

”اسلام علیکم۔“ اس کی آواز ہر قسم کے تاثرات سے عاری تھی۔

”سلام۔ طبع ٹھیک ہے۔“ یاد علی خان کی آواز میں تشویش تھی۔

”ٹھیک ہوں۔ کوئی ضروری کام تھا آپ کو مجھ سے۔ کیسے یاد فرمایا؟“ وہ اپنا موڈ چھپا نہیں پائی۔

”اوہ! موڈ آف ہے۔ پریشان لوگوں کو مزید پریشان کرنا یہ کیسی لائف پارٹنر شپ ہے؟ وجہ نہیں پوچھ پاتے تو یونہی
”بہر کر لیتے۔“ یاد علی خان سنجیدگی سے کہہ رہے تھے۔

”ب کچھ تو مجھے ہی کرنا ہوگا۔ آپ پر کسی طرف سے کوئی ذمہ داری نہیں۔ وہ سابقہ لہجے میں گویا ہوئی۔

”تم تو بہت وسیع ذہنی کیونٹس رکھتی ہو۔ عام سی مشرقی عورت نہیں ہو۔“ یاد علی خان نے قدرے دکھ سے کہا تھا۔

”خو کی بیٹیوں کے بھی بعض تقاضے مشترک ہیں اور فطرت پر ہیں۔ آپ میرے علم و تعلیم کو کارڈ بنا کر مجھے فطری وحسین

طف جذبات کی قربانی پر مجبور نہیں کر سکتے۔ اتنی سخت زیادتی آپ نے میرے ساتھ کی اور آپ کو احساس تک نہیں بلکہ الٹا

بہت خوب۔“ وہ ناراضگی سے کہہ رہی تھی۔

”احساس نہ ہوتا تو فون کیوں کرتا؟“ ان کی گھمبیر آواز ایر پیس میں ابھری۔

مابین کے دل کی دھڑکنوں میں خوشگوار تلاطم برپا ہوا۔

”بہت لیٹ ہو جاتے ہیں آپ۔ چاہے کوئی مر ہی جائے۔“ اسے رونا آ گیا۔

”اتنی انسلٹ تو ہم نے کبھی اپنے ملازمین کی نہیں کی بڑی بڑی غلطیوں کے باوجود۔“

”سوری اگین۔ تمہیں کیا پتا کہ۔“ وہ کچھ کہتے کہتے رک گئے۔

”کیا۔۔۔؟“ مابین تجسس ہو گئی۔

”کچھ نہیں۔۔۔۔۔۔“ وہ ہل گئے۔

”روٹی کھانے کیا کر رہے ہیں؟“ مابین کو پتا تھا کہ اصرار کے باوجود وہ کچھ نہیں بتائیں گے۔

”فون روٹی؟“ یاد علی خان کی آواز سے تلخی جھلکنے لگی۔

”یاد صاحب پلیز۔“

”ماہین۔ آج کے بعد تم کبھی مجھ سے روشنی کا ذکر نہیں کرو گی۔“

”یہ کیسے ہو سکتا ہے..... کہ..... آخر“۔ وہ بولتے بولتے اٹکنے لگی۔

”میں سوچتا نہیں ہوں مابین تمام عمر دوسروں کے پھیلائے ہوئے کوڑے کرکٹ سمٹا رہوں۔ بیالیس برس ذہن۔ نکال دیا ہے اسے دل سے بھی۔ دماغ سے بھی۔ تم اپنا خیال رکھنا۔ موڈ ہو تو آ جانا۔ خدا حافظ۔“

ماہین ریسیور ہاتھ میں تھامے خاموش سی بیٹھی رہ گئی۔ اب تک کی بات چیت سے جو تاثر اس کے حواس پر تھا، یہی تھا کہ یاور علی خان اس وقت غم سے چور چور ہیں۔ واقعی کتنی بری بات ہے۔ مجھے ایسے میں ان کے ساتھ ہونا ہی نہیں بڑی شرمساری محسوس کی۔ ان پر اتنی بڑی آفت ٹوٹی ہے کہ ان سے جو سرزد ہو کم ہے۔ اپنی انسلٹ کے احساں مجھے کچھ یاد ہی نہیں رہا۔

”خدا معلوم وہ کیا کیا۔ اور کس کس ایٹکل سے سوچ رہے ہوں گے۔

”ماموں جان تو خیریت سے ہیں ناں ممانی جان؟“ مشینو نے اخبار نیچے کر کے مابین کو گم صم بیٹھا دیکھ کر پوچھا۔

”آ..... ہاں..... وہ ٹھیک ہیں۔ باقی سب کہاں ہیں شیو؟“

”کچھ تو معمول کے مطابق کالج اور کچھ حالت سوگ میں اپنی اپنی ماؤں کے پاس۔“ وہ اخبارتہ کرنے لگیں۔

”خدا نہ کرے سوگ ہو“۔ مابین کو ان کا جملہ نہایت شاق گزرا۔

”اور کیا نام دیں۔ آپ ہی بتائیں؟“ وہ کہاں ہار ماننے والی تھیں۔

”بے نام رہنے دو شیو! اس قصے کو نام دینے سے کوئی فائدہ تو ہو گا نہیں۔“

”ماموں جان کیا کہہ رہے تھے۔ آپ نے پوچھا تھا ناں کہ کیا کر رہے ہیں روش کیلئے؟“

(ایک تو اس گھر میں کوئی اپنے میاں سے بات بھی نہیں کر سکتا فون پر) ماہین کی جان بخل کر رہی تھی۔

”ہوں..... کہہ رہے تھے کہ کر رہا ہوں کوشش“۔ اس نے جواب دیا اور تیزی سے باہر نکل آئی۔ مبادا کوئی!

آجائے۔

روشنی ہر ہر دستک پر چومک پڑتی تھی۔ ایک چنی خلفشار سے مسلسل گھیرے ہوئے تھا۔ کھانا بھی ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ سوچ سوچ کر اس کا ذہن ماؤف ہو رہا تھا کہ 'ا' کا جان اس سے کیا کچھ پوچھیں گے؟ اور وہ انہیں کیا جواب دے گا؟

”کیا وہ انہیں سب کچھ بتا دے؟ مگر کس طرح؟ کن الفاظ میں؟“

وہ کبھی اس کروٹ لیٹی تھی، کبھی اس کروٹ، سر الگ دکھ رہا تھا۔

اسی دم دروازہ پر دستک ہوئی۔ ”روشانے“۔

”آجائیں گا کا جان“۔ اس کی آواز بہت دھیمی تھی۔

تیورل خان اندر آ گئے۔ آج ہی ان کی نظر برتنوں پر پڑی۔
 شاید پیش بندی تھی۔

”کہا: ”کھالیا؟“ ان کا انداز سرد سا تھا۔ شاید پیش بندی تھی۔

”جھوک ہی نہیں مگی“۔ اس نے نظریں چرائیں۔

”بھوک ہی نہیں مگی۔ اس نے ریدہ کو دیکھ کر کہا۔ چلو تھوڑا سا کھاؤ۔“ انہوں نے حکمیہ کہا۔

”جائے کیا کیا جائیں اس میں ہرگز۔“ اس نے آہستگی سے کہا۔

”نہیں، میں رات کے پھر کب کھاؤں گی؟“

”بھئی..... میں کھالوں گی۔“ اس نے منت کے انداز میں کہا۔

”طبیعت کیسی ہے اب؟ سر میں دکھن تو نہیں ہو رہی؟..... اگر ہو رہی ہو تو یہ ٹیمپلیٹ لے لیتا۔“

انہوں نے قمیض کی اوپری جیب سے چھوٹا سا لفافہ نکال کر اس کے سامنے ڈال دیا۔

”ٹھمنکس“۔ اس نے لفافہ سائیڈ ٹیبل پر رکھتے ہوئے کہا۔

”میں ذرا جلدی میں ہوں۔ صرف یہ پوچھنے آیا ہوں کہ تم نے اپنے اور باری کے ساتھ ایسا سلوک کیوں کیا.....؟“ وہ

ان کے سامنے بیٹھ چکے تھے۔ ”یوں بھی مجھے تم سے بہت کچھ پوچھنے آنا ہی تھا۔ تمہیں اندازہ ہے بڑی حویلی میں کتنا ٹینشن

ہوگا۔ بہر حال میرے پہلے سوال کا جواب دو۔“

روشی خاموش رہی۔

”مجھے اپنے سوال کا جواب نہ پا کر بہت غصہ آتا ہے روشنانے۔“ ان کی آواز میں سختی آگئی۔

”بس ویسے ہی غصہ آ گیا تھا کا کا جان؟“ وہ بہت پست آواز میں بولی۔

”زیادہ چلانے کی ضرورت نہیں۔ ویسے ہی کچھ نہیں ہوا کرنا۔ مجھ سے لو جک کے ساتھ بات کیا کرو۔“

”وہ مجھے سمجھا رہا تھا۔“ معا سے جواب سوچھ گیا۔

”اگر میں سمجھاؤں گا تو یہی حیر پھاڑ میرے ساتھ ہوگی؟“ وہ برہم ہوئے۔

”کاجان..... بلیر..... آپ خود کو اس سے کمبیر نہ کریں۔“ وہ خفیف سی ہو گئی۔

”یہاں بات تھی؟“ ان کا انداز مستحکم تھا۔

”میں“۔ روپولی۔

”ہرگز ہرگز یہ بات نہیں ہے۔ میری صبح باری سے بات ہوئی ہے۔ اگرچہ اس نے مجھے کچھ بتایا نہیں، مگر جس انداز میں

اسے جواب دیا۔ اس سے اندازہ ہوا کہ بات عام نہیں ہے عام ہوتی تو بغیر بحث کے بتادی جاتی۔

میں نے کہا: "اے خدا! اگر وہ اس قدر عادت نہیں ہے۔ اس لئے زیادہ مت آزماؤ۔ ہم ابھی اسی وقت تمہیں بڑی حویلی چھوڑ کر

یہاں کا چمڑا سرخ ہو گیا۔

جان! کس جویلی جانے کو تیار ہوں۔ بس میری اتنی ہیلپ کر دیجئے کہ نعیم کے ساتھ میرا رشتہ ختم کر دیجئے۔ میری

شادی کا سلسلہ روک دیجئے۔ میں وہاں جانے اور ہر طرح کے برے سلوک کو فیس کرنے کیلئے تیار ہوں۔ اس کی تکفیر آنسو بہنے لگے۔

”میں مہیا کرو۔ تمہیں فلی سپورٹ دینے کیلئے تیار ہیں۔“

”یہی میں ہے کا کا جان کہ میں اس رشتے سے خوش نہیں ہوں۔ بس اس نے تاکہ پونجی۔“

”خوش نہ ہونے کی وجہ؟ اتنا معقول رشتہ تو کسی کسی کو ملتا ہے۔ ہر طرح سے ریلیکس رہو گی۔ نہ رشتوں کا جو بوجھ دار یوں کا۔“

”مجھے نعیم پسند نہیں۔ بائی گاڈ کا جان۔“ وہ پھر رودی۔

”ہوں۔“ تیمور علی خان گہری سوچ میں ڈوب گئے۔

”تمہارے پرنس کیا کہتے ہیں۔ مطلب یہ کہ تمہارے پاپا تمہاری اسٹیپ مڈ کے ساتھ اس موضوع پر بات ہوئی؟“

(ابھی ابھی کا کا جان کتنے اپنے اپنے سے لگ رہے تھے اور ایک دم کتنے غیر اور اجنبی سے لگنے لگے تھے)

”جی..... مدر سے۔“ اس نے مختصر جواب دیا۔

”روشانے! تم اس خاندان کی واحد لڑکی ہو جو اپنا اختیار استعمال کر رہی ہو۔ اور ہمارے ہاں یہ اچھا نہیں سمجھا جاتا۔“

”کے باوجود ہم تمہارے ساتھ کوئی ”مس بی ہیو“ نہیں کر رہے۔ مرد لوگ مسئلے فیس کرتے ہیں۔ تمہاری مدر نے بات آگے بڑھائی؟“

”شاید۔“ وہ آہستگی سے بولی۔

”شاید کیا؟“ انہیں اس کا ”شاید“ نہایت بھاری گزرا۔

”میرا مطلب ہے۔ کچھ ہوا تو نہیں۔“ وہ سنبھل کر گویا ہوئی۔

”ہوں۔ خیر۔ تم کھانا کھاؤ۔ پھر بات ہوگی۔“ وہ جانے کیا سوچ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔

”یا اللہ.....“ پھر اس نے سر کو تھام کر گہرا سانس لیا، غلطی تو خیر میری ہی ہے میں ہی بات آگے بڑھا نہیں پاری۔“

..... پھر تو آئے گا۔“

تیمور علی خان اسے کھانا کھانے کی تاکید کرتے ہوئے باہر چلے گئے۔

.....

تیمور علی خان اسٹڈی میں خاصی دیر تک ٹہل ٹہل کر کچھ سوچتے رہے۔ بالآخر اپنی آرام دہ کرسی پر بیٹھ گئے۔ اور ٹیبلٹ

سیٹ اپنے سامنے کھسکا کر ایک نمبر ڈائل کیا اور ریسپور کان سے لگا کر پشت کرسی کی پشت سے نکالی۔

”ہیلو۔“

”جی..... میں کلو بول رہی ہوں۔“ کلو سے ان کا براہ راست کبھی واسطہ نہیں پڑا تھا اس لئے وہ ان کی آواز پہچان نہیں

پائی۔

”جی بی بی گھبراہٹ میں ہیں؟“

”جی صاحب۔ اپنے کمرے میں ہیں۔“ دوسری طرف سے جواب آیا۔

”ان سے کہو کراچی سے نعمان صاحب کا منیجر کا فون ہے۔“ وہ بہت آہستہ سے بول رہے تھے۔

”آپ ٹھہریں جی۔ میں بلا کر لاتی ہوں۔“ کلو کی اپنی ذاتی لغت تھی۔

انہیں تقریباً دو منٹ سے کچھ کم انتظار کرنا پڑا۔

”ہیلو۔“ ماہین کی حیران پریشان آواز ان کی سماعت سے ٹکرائی۔

”السلام علیکم۔ ہم تیمور خان بات کر رہے ہیں ”سرائے“ سے۔“

”جی۔“ ماہین کو مزید اچھٹا ہوا تھا ”کلو تو کہہ رہی تھی۔“

”اس نے وہی کہا جو ہم نے اسے کہا۔ اب آپ ہماری بات غور سے سنیے۔ ہماری آپ کی کبھی ملاقات نہیں ہوئی۔ مگر

امید ہے کہ آپ ہمیں جانتی ہوں گی۔ خان صاحب یعنی بابا صاحب کے چار بیٹے اور بیٹیوں میں ہمارا چوتھا نمبر ہے۔ ہمارے

خیال میں اس سے زیادہ تعارف کی ضرورت نہیں۔ آپ سن رہی ہیں؟“

”جی..... جی میں سن رہی ہوں۔“ وہ جیسے چونک کر بولی۔

”ہماری اس ٹیلی فونک گفتگو کا ذکر بھی آپ کسی سے نہیں کریں گی۔ اس سے بہت سے لوگوں کو افادہ و آرام رہے گا۔“

بات صرف یہ ہے کہ ہمارے خاندان پر روشی کے ہاتھوں بہت برا وقت آچکا ہے۔ ہم اس موضوع پر آپ سے بات

جیت کر ناچار رہے ہیں۔“

”جی..... جی..... ضرور کیجئے۔“ روشی کے ذکر پر اس کے سارے حواس چوکس ہو گئے۔

”آپ کی اور اس کی کتنی انڈر اسٹینڈنگ ہے؟“ وہ گویا حملہ آور ہوئے۔

”بہت اچھی..... ہم بالکل دوستوں کی طرح ہیں۔“ وہ جلدی سے بولی۔

”لگتا تو نہیں۔ اگر ایسا تھا تو یہ سب کیوں ہوا؟“ ان کا اندازہ قطعی تھا۔

”اتنے ڈھیر سارے رشتوں کی موجودگی میں میرا کیلا تعلق کیا کرتا؟“ اس نے وضاحت کی۔

”آپ اپنے بزنس کو اعتماد میں لے سکتی تھیں۔ کام آسان ہو جاتا۔“ وہاں سے دلیل آئی۔

”میں نے کوشش کی تھی۔“ وہ مجرموں کے انداز سے بولی۔

”کوشش کی تھی یا کھل کر بات کی تھی؟“ بڑا ہی دو ٹوک انداز تھا۔

”کوشش پہلا درجہ ہوتی ہے۔ کھل کر بات کرنے کی نوبت بعد میں آتی ہے۔“ وہ بولی۔

”گویا کھل کر بات کرنے کی نوبت ہی نہیں آنے دی گئی؟ کیوں.....؟“ وہ گویا ہوئے۔

”جی..... جی..... آپ ٹھیک سمجھے۔“ وہ تیزی سے بولی۔

”یعنی کوئی بات ہے جس کے آگے بڑھنے کی نوبت ہی نہیں آئی۔“ وہ ماہین کو گھیرنے میں کامیاب ہو چکے تھے۔

ماہین گز بڑا کر رہ گئی..... نہ ہاں کہہ سکی نہ ناں۔ خاموش ہو کر رہ گئی۔

”دیکھئے ہماری منیٹیجی یہاں والوں سے تھوڑی سی ڈفرنٹ ہے۔ آپ ہم پر بھروسہ کر سکتی ہیں اور یہ سوچ کر افسوسناک ہے۔ ہم روشنانے کے حقیقی چچا ہیں۔ اور اپنے معاملات میں ہم سے زیادہ محتاط باہر کا کوئی بندہ نہیں ہو سکتا۔“

وہ کہہ رہے تھے، ہو سکتا ہے، انہوں نے عام معنوں میں یہ بات کی ہو مگر ماہین کو محسوس ہوا گویا وہ کچھ جبار ہے۔

”ہیلو۔“

”جی.....جی.....سن رہی ہوں۔“

”وہ کیا بات ہے جس کو منہ سے نکالنے کا مرحلہ ہی نہیں آیا؟“

”اب کیا فائدہ..... جس کی بات ہے، جب وہی نہیں۔“ ماہین آزر دگی سے گویا ہوئی۔

”وہ ہماری حدود سے دور کہیں بھی نہیں جاسکتی۔ ایک دن لاکھڑا کریں گے اسے آپ کے سامنے۔“

”کیا وہ آپ کے پاس موجود ہے؟“ وہ ایک دم مشکوک ہو گئی۔

”یہ بات چھپانے والی تھی؟ ہم نے کہا ناں، وہ ہماری رنج سے باہر نہیں ہو سکتی۔ اس لئے ہم چاہتے ہیں کہ حالات نہ مکمل طور پر باخبر ہوں اور جب وہ ہمارے اختیار میں آجائے تو ہم پوزیٹو ڈیل کر سکیں۔ سمجھ رہی ہیں ناں آپ؟“

”جی ہاں۔“

”جی..... تو وہ مسئلہ کیا ہے؟“

”وہ..... دراصل یہاں شادی پر رضا مند نہیں ہے۔“ اس نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

”ہمیں علم ہے..... اصل مسئلہ یہ ہے کہ اس کی کسی سے کٹ منٹ ہے؟“ انہوں نے اس کی بات کاٹ دی تھی۔

”کٹ منٹ تو نہیں کہہ سکتے۔“ وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی ”مگر اس بات کی کیا شیورٹی ہے کہ سب کچھ جان کر رہا؟“

آپ سے کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔“ وہ آہستگی سے پوچھ رہی تھی۔

”تیمور علی خان کی پیشانی پر ہل پڑ گئے۔ ”امید ہے آپ ماسند نہیں کریں گی۔ وہ آپ سے زیادہ ہماری ہے۔“

”لیکن آپ کے ہاں عزت و وقار کی خاطر اسے خون کو شوٹ کرنے کی روایتیں بھی موجود ہیں۔“ اس نے اپنی زبان

کر کہا۔

”حالات و ماحول بہت تبدیل ہو چکا ہے۔ ہم آج کے دور سے صدائے رسالت نہیں جانتے۔“

لجے میں آنچ آنے لگی۔

ماہین پھر بھی خاموش رہی۔

”ہیلو..... وہ آپ بات کر رہی تھیں کہ کٹ منٹ نہیں ہے۔ پھر کیا ہے؟“

”میرا خیال ہے آپ شاید ہوں گے۔“ وہ مسلسل ہچکچا رہی تھی۔

”ہیز“ تیمور علی خان کے لہجے سے ظاہر تھا کہ وہ خود پر کنٹرول کر رہے ہیں۔

”پتیر“ تیمور علی خان کے بچے تھے۔ اس نے دھیمی آواز میں کہا۔
”شاید وہ اپنے آئیڈیل کی شبیہ ”باری“ میں دیکھ رہی ہے۔“ اس نے دھیمی آواز میں کہا۔

دوسری جانب ایک نخت سناٹا طاری ہو گیا۔ ماہین کو ہول آنے لگے۔

”پلو“۔ بالآخر خاموشی ٹوٹ گئی۔ اس مرتبہ ان کی آواز ایک دم سپاٹ تھی۔

”حی“

”جی“۔
 ”ہماری اور آپ کی گفتگو کا علم اور کسی کو نہیں ہونا چاہیے۔ یوں سمجھ لیجئے۔ یہ روشنی کے حق میں اچھا ہوگا۔ یہاں تک کہ یا اور

بدلتی کو بھی نہیں۔ اوکے۔ خدا حافظ۔“

ماہینہ ریسپور ہاتھ میں تھامے کم مسمی بیٹھی رہ گئی۔

”آپ کے میکے سے فون آیا تھا بی بی؟“ کلو آس پاس ہی منڈلاری تھی۔

”جاؤ..... تم اپنا کام کرو۔ تم نے کیا رپورٹ لکھنا ہے؟“ وہ الجھے ہوئے انداز میں بولی۔ بات تو ہو گئی تھی۔ مگر وہ الجھن

میں پھنس گئی تھی۔

”کیا اس نے ٹھیک کیا؟ روشنی کے چچا پر اعتبار کرنا کہیں مہنگا تو نہیں پڑے گا۔“

”مکران کے خلوص پر کیسے شبہ کیا جاسکتا ہے؟ ودا اتنی دور بیٹھ کر یہاں کے طوفان کو محسوس کر رہے ہیں۔ یاد رکھو دیکھئے۔

بے بسی اور ڈھکریٹھ گئے ہیں؟“

وہ خود کو پرسکون کرنے کی کوششیں کرتی وہیں ہال میں بیٹھ گئی اور میگزین کی ورق گردانی ہونے لگی۔

لان کی اکثر لائٹس کی جاچلی تھیں۔ باری نے کلاک کی سمت دیکھا بارہ بج کر چند منٹ ہوئے تھے۔ اس نے رسٹ وائچ اٹھا کر کھائی میں ڈالی۔ اور آہستہ سے دروازہ بند کر کے باہر نکل آیا۔

”گیٹ رزم کے دروازے پر دستک دی۔“

”دروازہ کھلا ہوا“۔ روشی کی تھکی تھکی سی آواز آئی۔

وہ اندر داخل ہو گیا۔

”کیسی طبیعت ہے؟“

روشن آنکھوں پر بازور کھے لیٹی تھی۔ اس نے چومک کر بازو آنکھوں سے ہٹایا۔ مگر بولی کچھ نہیں۔

”کھل جویں واہس جا رہا ہوں۔ کیا پیغام دینگی وہاں کیلئے۔“

”اگر تم نے وہاں جا کر بتایا کہ میں یہاں ہوں تو اچھا نہیں ہوگا۔“ وہ غرائی۔

”کیا کا کا جان نہیں بتائیں گے؟“ باری نے تعجب سے اسے دیکھا۔

تک..... جب تک میری مرضی نہیں ہوگی، وہ نہیں بتائیں گے۔“

”اوہ۔ باری کے منہ سے استعجابیہ انداز میں آواز نکل۔

”پھر کب تک یہاں رہنے کا ارادہ ہے؟“ اس نے کہیں بیٹھنے کی کوشش نہیں کی۔

”جب تک کا کا جان چاہیں گے اور معاملات میرے حق میں ہو جائیں گے۔ دوسری صورت میں اس مرتبہ ہاں ہونا۔“
کہ کنوؤں میں بانس ڈلوائیں گے تو بھی نہیں ملوں گی۔ اب تم بھی جاؤ یہاں سے نہ مجھے تمہاری ضرورت ہے نہ تمہاری ضرورت۔
دیکھنے کی۔“

”پہلے تھی کیا؟“ وہ شریر ہوا۔ ”بہر حال میں اس وقت آپ سے لمبی چوڑی بات چیت کرنے نہیں آیا تھا۔ بس آپ خیریت معلوم کرنا تھی۔ دعا کرتا ہوں وہی ہو جو آپ چاہیں یقین کریں۔ مجھے آپ کے دکھ پر خوشی نہیں ہو سکتی۔“
”آپ آرام کریں۔ یہ بھی بہت ہے کہ کا کا جان جیسے لف اور اسٹریک آدی آپ کو سپورٹ کر رہے ہیں۔ شب بخیر۔“
”باری۔“ اس نے بے ساختہ آواز دی
”جی؟“

”دیکھو..... حویلی جا کر زیادہ ہوشیاری دکھانے کی کوشش کی تو پھر تم مجھے جانتے ہو۔“ اس نے گویا دھمکی دی۔
”پتا ہے مجھے..... اور مجھ سے زیادہ آپ کو کوئی نہیں جانتا۔ یہ بھی پتا ہے۔ او۔ کے۔“ وہ باہر نکل گیا۔

تیمور علی خان اسٹڈی کے آگے بنی بالکنی میں یونہی سگاہ پینے کی غرض سے آکھڑے ہوئے تھے اور کچھ سوچنا چاہ رہے تھے۔
ماہین سے بات کرنے کے بعد تو انہیں مسئلہ سمجھنے میں کوئی دشواری ہی نہیں ہوئی تھی۔ مگر وہ لائحہ عمل ترتیب دے رہے تھے۔
گیسٹ روم کا دروازہ کھلا تو روشنی باہر تک آئی اور کمرے سے باہر آنے والے کو پہچاننے میں انہیں کوئی دشواری نہ ہوئی۔

بالکنی کی لائٹ آن تھی۔ وہ فوراً واپس اسٹڈی میں چلے گئے۔

اور واپس اپنی کرسی پر بیٹھ گئے اور فوراً مٹن پش کیا۔ سمندر خان کو ان سے پہلے سونے کی اجازت نہیں تھی۔
فوراً ہی اندر آ گیا تھا۔ ”خان۔“

”باری کو بھیجو ادھر اسٹڈی میں۔“ وہ ٹائپ رائٹر کے مٹن خوانخواہ پش کرنے لگے۔ ان کے چہرے کے تاثرات لمحہ بلمحہ تبدیل ہو رہے تھے۔

تقریباً پانچ منٹ بعد باری اندر داخل ہوا۔

”جی خیریت؟“

”ہاں ہاں..... سب خیریت ہے..... بیٹھو۔“ انہوں نے اسے اپنے سامنے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

”سونے لگے تھے کیا؟“ انہوں نے سگار کا کش لے کر دھوئیں کے مرغولے بنائے۔

”نہیں تو۔“

”پھر کیا کر رہے تھے؟“
”ویسے ہی شام کے اخبار دیکھ رہا تھا۔ عادت ہے سونے سے پہلے کچھ پڑھنے کی۔ ادھر حویلی میں ہوتا ہوں تو پیرز کی چارنی کیلئے اسٹڈی کرتا ہوں۔“
”کب ہو رہے ہیں تمہارے پیچرز؟“
”اگلے ماہ۔“

”پھر پریکٹس کرو گے؟“

”انشاء اللہ..... اگر بابا صاحب نے اجازت دی۔“

”تم تو بڑے کام کی چیز بنے جا رہے ہو۔ وہ کیوں منع کریں گے؟ میرا خیال ہے وہ تو تمہیں بار ایٹ لاکھیلے باہر بھی بھیج دیں گے۔ ہم جنہیں بیرسٹری دیکھنا چاہتے ہیں۔ موریلی سپورٹ کی ضرورت ہوئی تو ہم بیٹھے ہیں ناں یہاں۔“ انہوں نے پھر نکل گیا۔

”ٹھیک ہو۔“ اس مرتبہ باری کچھ الجھ کر انہیں دیکھ رہا تھا۔ اسے یاد نہیں آ رہا تھا کہ تیمور علی خان نے کبھی اس کی ذات سے متعلق اتنی تفصیل سے گفتگو کی ہو۔

”خیر یہ تو ضمنی سی بات ہے۔ اصل بات کی طرف آتے ہیں۔“

”جی؟“ اس بار وہ واقعی پریشان ہو گیا۔

”کل کیا دن ہے؟“

”جی.....؟ سو موار۔“

”اچھا..... ٹھیک ہے۔ کل تمہارا نکاح ہے۔ یہی بتانے کیلئے ہم نے تمہیں بلایا تھا۔“

کوئی آسمان ٹوٹا تھا اس کے سر پر۔

”جی..... کا کا جان.....؟“ وہ اپنی جگہ جم کر رہ گیا۔

”روشانے یاور علی خان کے ساتھ۔ اور کچھ یابس.....؟“ ان کا انداز انتہائی پرسکون تھا۔

”آپ پہلے میری بات تو سن لیں۔“

”سب کچھ سن لیا ہے۔ سارا الزام ایک کمزور لڑکی پر ڈال کر بری ہونا چاہتے ہو؟“ ان کا انداز سرسرا ہو گیا۔

”یہ بات نہیں ہے۔ اگر وہ میری وجہ سے کسی نقصان سے بچ سکتی ہیں تو بڑے سے بڑا نقصان اٹھانے کو تیار ہوں۔ مگر بیٹے۔ مجھے اپنے فیصلے کی مٹن تو بتائیے۔“ وہ از حد پریشان ہو رہا تھا۔

”تم خوش نہیں ہو..... یاور علی خان کی اکلوتی بیٹی؟“

”اگر خود غرضی سے سوچوں تو اس وقت مجھے انتہائی خوشی ہونا چاہیے۔ پلیز دور تک سوچئے ان کا بہت بڑا نقصان ہو جائے گا۔ شاید ان کے سارے قریبی رشتے ٹوٹ جائیں۔“

باری نے تصویر کا دوسرا رخ دکھانے کی کوشش کی۔

”یہ نہایت مشکل فیصلہ ہے۔“ وہ مزید گویا ہوا۔

”اتنے بزدل ہو باری!.....“ انہیں غصہ آ گیا ”لڑکی کہیں کی نہیں رہی اس سے زیادہ کیا نقصان ہوگا اس کا؟“

”وہ بہت جذباتی ہیں۔ میں نے انہیں بہت سمجھانے کی کوشش کی۔“

”تو اسے اس راہ پر لائے کیوں تھے؟“ وہ برہمی سے گویا ہوئے۔

”میں نے انہیں، کبھی ان کے حوصلے بڑھانے کی کوشش نہیں کی اس لئے کہ واقعی وہ مجھے بہت عزیز ہیں۔ ظلم کا یہ تو یہ ہے کہ جنہیں آپ عزیز رکھیں، دور تک ان کی بہتری سوچیں۔ صبح آپ میری حالت زار دیکھ ہی چکے ہیں۔ اگر میری غرضی کا مظاہرہ کرتا تو بڑی حویلی سے وہ تنہا باہر نہ نکلتیں۔ میرا ساتھ اور میری حوصلہ افزائی بھی ان کے ساتھ ہوتی۔“

اس نے اتنی وزنی دلیل دی کہ تیمور علی خان جیسا ”لوجیکل بندہ“ چکرا کر رہ گیا۔

”اچھی بات..... ہمیں تمہاری بات پسند آئی۔“

مگر فیصلہ ہو چکا۔ اب جو بھی مرحلے ہیں، وہ تم ہمارے ساتھ طے کرو گے۔ فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ چیز آپ شاباش۔ یہ معاملہ منٹ جانے دو۔ باقی تفصیل ہم تمہیں بعد میں بتا دیں گے۔“

باری نے بڑی مشکل سے نظر اٹھا کر انہیں دیکھا۔

سیاہ نائٹ گاؤں میں ملبوس تیمور علی خان کے لب گھنی ڈارک براؤن مونچھوں اتنے مسکرا رہے تھے۔

”کا کا جان! پھر سوچ لیں۔“

”یہی تو ہمارا مرض ہے۔ بہت ہی فیصلہ کن قسم کے بندے ہیں ہم۔ بر فانی علاقوں میں شکار کھیلتے ہیں۔ صرف ابد چیسٹر ہین کر۔ جو کبھی نہیں کھیلا، مگر زندگی جواری کی طرف گزاری ہے۔ اور ہمیشہ دوسرے ہی کو ”شو“ کروانا پڑا۔ ہم کبھی ہارے۔ البتہ ایک بازی ضرور ہارے۔ مگر رہے اس طرح جس طرح جیتنے والے رہتے ہیں۔ جیتنے والوں کو خوش نہیں ہونا دیا۔“

”یہ تو جذباتیت ہے کا کا جان ”لوجک“ تو نہیں۔“ اس نے صاف کہہ دیا۔

”یہی تو لوجک ہے بندہ خدا۔ ہمارے ہم جانے والے پھر عمر بھر ہارتے چلے جاتے ہیں۔ نفسیاتی خوف کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ہم صرف کامیابیوں کو گنتے ہیں۔ خیر۔ تم آرام کرو۔ کل تمہاری زندگی کا اہم ترین دن ہے۔“

باری سوچوں کے ایک اثر دھام میں سے باہر نکلا تھا۔

اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ۔ وہ کس طرح خوش ہو۔ تیمور علی خان اس کی ”بیک“ پر آکھڑے ہوئے تھے۔ یہ تو بہت بڑی بات تھی۔ وہ بھی اس کی ذاتی محنت کے بغیر۔ پتا نہیں روشنی کو اطلاع دے دی گئی یا صبح کو یہ ہم وہاں پھوڑا جائے گا۔

وہ بے ساختہ مسکرا دیا۔ اتنی بڑی تبدیلی اسٹڈی سے خواب گاہ آنے تک وہ روشنی کو ”بی بی“ لگائے بغیر سوچ رہا تھا۔

”ہو سکتا ہے بابا صاحب اور یاد رہ چکا کو نہایت ہی صدمہ ہو۔ مگر ان کے صدمات کا تعلق میری ذات سے ہے۔ ایک چیز

جو زندگی بڑی بڑی لگا بیٹھی ہے۔ اسے ٹھوکریں کھانے کیلئے تنہا چھوڑ دینا کتنا سفاک ظلم ہے۔ جبکہ قدرت اس کی بہتری کے بندوبست کر رہی ہے اور میں اسے رونے کیلئے چھوڑ دوں؟ نمک حرامی بہت بڑی گالی ہے مگر تیسرے دن تو مردار بھی مر جاتا ہے۔ ایک زندہ وجود۔ اپنی ذات کی حفاظت کرتے کرتے اسے داؤ پر لگا دوں؟

یہ بے نہ ہوتا تو بھی دوسرے راستے نکل آتے۔ مگر اب تو بات ہی اور ہے۔ اب تو شاید بڑی حویلی میں ان کی واپسی تیار ہے۔

کبھی مرے تو کا کا جان یہاں بھی نہیں۔ کہہ رکھ نہیں سکتے۔ خیر یہ ان کا ہیڈک ہے۔

”آپ تو بہت کچھ ہیں۔ ہم میں کیا نظر آ گیا آپ کو؟“

”کتنی میں آ گیا تھا۔ اور گیسٹ روم کے بند دروازے سے مخاطب تھا۔“

”کاش میں دیکھ سکتا اس خبر کو سننے کے بعد اس کے تاثرات کیا ہیں۔؟“ وہ مسکرا رہا تھا۔

”السلام علیکم کا کا جان!“ وہ تیمور علی خان کو اچانک سامنے دیکھ کر ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔

”السلام۔ ناشتا کر لیا تھا ٹھیک سے؟“

”مبارک رہے ہیں کا کا جان۔ اب تو لچ ٹائم ہونے والا ہے۔“ وہ دھیرے سے مسکرائی۔

”اچھا تم ذرا چادر اوڑھ لو۔ کچھ لوگ اندر آرہے ہیں۔“

”اٹھ کر کھانا کھا لیں۔ (کہیں بڑی حویلی سے تو نہیں)۔“

”گگ۔ کیوں کا کا جان؟“ وہ جلدی سے چادر اٹھا کر اوڑھتے ہوئے بدحواسی سے گویا ہوئی۔

”گواہیں وکیل ہیں قاضی صاحب ہیں۔ نکاح پڑھا کیٹے تمہارا۔“

(واللہ! کیا مصیبت ہے؟ ساری دنیا ہی کو فکر ہو گئی ہے میرے نکاح کی بیاہ کی) اسے چکر آنے لگے۔ جس جہ سے وہاں سے اٹھی۔ یہاں بھی وہی.....

”تمہارا نکاح باری کے ساتھ ہو رہا ہے۔ امید ہے تمہیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ پھر بھی رضامندی کا یہ مرحلہ طے ہونا چاہیے۔“

نہیں اس کے شانے پر تھپکی دی۔ اور آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔

”آئیے صاحب!“

پہلے جب نے پھر سابقہ الفاظ دہرائے۔

”مبارک ہو خان صاحب؟“ اس نے قاضی کی آواز سنی۔

جن میں ایک دم ہلکا سا ہوا۔ میں نے اس کی طرف دیکھا تو وہ میری طرف سے ہاتھ رکھ دیا۔

نور علی خان اس کی پشت تھمھانے لگے۔ اور وہ بے ہوش ہو کر ان کی آغوش میں ڈھسے گئی۔

”پھر کھانا مہمانوں کے ساتھ کھاتے ہوئے اس نے بے ساختہ سوچا تھا۔ آج اس اہم ترین دن..... اس نے کھانا بچے کھایا ہوگا۔؟“

”اچھا..... تم یہاں کھڑے ہو۔ کتنے بچے وہیسی کا ارادہ ہے؟“ تیمور علی خان اچانک اس کی پشت پر آکھڑے ہوئے۔

”ہاں شام کے ہونے چوتو بج رہے ہیں۔ ٹھیک ہے۔ میرا خیال ہے تمہیں کسی ہدایت یا تاکید کی ضرورت تو نہیں؟“ وہ لگا بکا جھواں اڑا رہے تھے۔

”بانا..... اگر تم جانے سے پہلے روشانی سے ملنا چاہو تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ کپڑے وغیرہ میں نے اس کے لئے تحفے تھے۔ کچھ بازار سے اگلی مرتبہ..... تم آؤ اور اپنی طرف سے کچھ لانا چاہو تو مرضی ہے تمہاری..... او۔ کے۔؟“ وہ اس سے عجیب سا انتظار کے بغیر والہیں پلٹ گئے۔

اس نے مچھلیاؤں کے ڈانٹ تلے دبا کر رینگ پر بازو ٹکا کر جھکنے کے انداز میں گیٹ روم کا بند دروازہ دیکھا۔ اس کی

روٹی اپنی جگہ دم بخود بیٹھی رہ گئی۔ یوں لگا جیسے تمام حیات سو گئی ہوں۔

”بیٹی روشا نے بنت یاور علی خان! تمہیں حق مہر شرعی ساڑھے تیس روپے عبد الباری بن عبد العلی کے نکاح میں ہے۔ قبول ہے؟“

”بولوروشانے“۔ انہوں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔

”روشانے“۔ اس نے پھر کا کا جان کی آواز سنی۔

”بولو بیٹی“۔ قاضی صاحب کی آواز اس کے کانوں میں آئی۔

مگر وہ تو جیسے کسی خواب کے عمل میں تھی۔

کمرے میں اس قدر سناٹا طاری تھا جیسے وہاں کوئی نہ تھا۔

آنکھوں میں شریر سی چمک در آئی تھی۔

لاکھ "آپ آپ" کرتا رہا تھا، مگر تھا تو آخر مرد..... ایک دم سیدھا کھڑا ہو گیا۔ اس وقت وہ سفید لٹریٹ میں ملبوس تھا۔

"کیا ایسے ہی خالی ہاتھ؟" اچانک اسے خیال آیا۔ "خیر کون سا سب کچھ پلاننگ سے ہوا ہے اور نہ ہی موقع آیا ہے۔"

تیزی سے زینہ طے کر کے وہ نیچے آیا تھا۔
آج اس کی چال کا انداز ہی کچھ اور تھا۔
اس نے بہت آہستگی سے دستک دی تھی۔

جانے کتنی دھول مٹی اتار کر وہ اسی دم ہاتھ روم سے برآمد ہوئی تھی۔ سرخ کڑھائی کی گہری زرد فراک اور سرخ ڈبل وہ خود کو بالکل تازہ دم محسوس کر رہی تھی۔ اس کے باوجود گھٹنوں سے ایک اعصابی کشاکش جاری تھی۔
اس نے بیڈ پر پڑا سرخ دوپٹہ اٹھا کر گلے میں ڈالا۔ گیلے بال تو لیے میں لپٹے ہوئے تھے۔
"ہوں"۔ اس کا خیال تھا سمندر خان چائے لے کر آیا ہوگا۔

باری دروازہ کھول کر اندر آ گیا۔
دھک..... وہ سامنے ہی دیکھ رہی تھی۔ اس نے بے ساختہ سینے پر ہاتھ رکھا تھا۔ جیسے دل کہیں کھل کر بواہ خواجہ ہی آنکھیں جھکتی چلی گئیں۔ اندازہ کرنے کی نوبت ہی نہیں آئی تھی کہ اس طرح کا وقت بھی زندگی میں آتا ہے۔
"السلام علیکم"۔ باری کی شریر آواز اس کے کانوں میں آئی۔
وہ خاموش رہی..... بولا ہی نہیں گیا۔ بس یہی دھیان آیا کہ دوپٹا درست کر لینا چاہیے۔

باری کو اسے اس انداز میں دیکھ کر بہت لطف آرہا تھا۔
"مسلمان سلام کا جواب دے کر بہت سا ثواب حاصل کرتے ہیں"۔ اس کے لہجے میں بلا کی شرارت تھی۔
اس نے باری کی طرف سے فوراً پشت کر لی "دے دیا ہے دل ہی دل میں"۔ اسے اپنی حالت اور احساس تھا۔
غصہ آ گیا۔ اسے اپنی مغلوبیت بالکل بھی اچھی نہیں لگ رہی تھی۔

"کاش باقی سب کچھ بھی دل ہی دل میں کر لیا کریں۔ کم از کم اتنی تکلیف تو نہ اٹھائیں"۔ وہ کرسی کی طرف دوڑا۔
"بیٹھ سکتا ہوں؟"

"مجھے پتا نہیں"۔ وہ فطری حیا کے حصار میں آچکی تھی کہ ہر تعلق کچھ مخصوص احساسات کا فطری پابند ہوتا ہے۔
"یعنی..... سیدھا سیدھا مطلب ہے بیٹھ جاؤ"۔ وہ باز نہیں آ رہا تھا۔ وہ دوبارہ ہاتھ روم طرف بڑھ گئی۔
سے آزاد کرنے لگی تھی۔

پتا نہیں یہ کیا ہے۔ میں نے تو اس کے سامنے کبھی کسی بات کی پرواہ نہیں کی۔ آج بال جھگڑتا عجیب لگا رہا ہے۔

پتا نہیں یہ کیا ہے۔ میں نے تو اس کے سامنے کبھی کسی بات کی پرواہ نہیں کی۔ آج بال جھگڑتا عجیب لگا رہا ہے۔

آپ بالکل بھی پریشان نہ ہوں۔ بالکل ریلیکس رہیں۔
اب بالکل بھی نہیں رونا۔“

روشی کو نئے رشتے کی قربت بہت محسوس ہونے لگی۔ وہ اس کی گرفت سے اپنے ہاتھ چھڑانے لگی۔
”یہ دلہن کی کلائیاں تو بالکل خالی ہیں۔“ اس کے دونوں ہاتھوں میں روشی کے دونوں ہاتھ تھے۔
”ابھی میں دلہن نہیں ہوں۔“ اس نے ہاتھ چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے سادگی سے کہہ دیا۔
”پھر کب.....؟“ اس کے لہجے میں عجیب سی آج تھی۔

”باری۔“ وہ پھر روہانسی ہونے لگی۔

”اچھا چلو مزید تنگ نہیں کرتے۔“ باری نے اس کے ہاتھ چھوڑ دیئے۔ ”اچھا خدا حافظ۔“ وہ تیز پتہ پر
باہر نکل گیا۔

کتنا دباؤ تھا اس کے ہاتھوں میں..... اس کے دبیز اور نرم ہاتھوں پر سرخی پھیلنے لگی تھی۔ دل کی دھڑکنیں
ہو گیا تھا۔

”کیسا ہے..... لگتا تو نہیں تھا۔“ چہرے پر حیا کا طلسم چھا رہا تھا۔

اس نے خود کو آئینے میں دیکھا اور خود کو بہت نئی سی لگی۔

باری کی جیب اندر داخل ہوئی تو منتظر کھڑی ماہین درتے پچے سے ہٹ کر بڑی تیز چلتے ہوئے باہر آئی۔
رک کر سوچنے لگی۔ ضروری تو نہیں باری ہو کوئی اور بھی ہو سکتا ہے۔ ابھی وہ اپنے خیالات میں الجھی ہوئی تھی۔
آگیا۔

”السلام علیکم۔“

”وعلیکم السلام۔ شکر ہے تم آگئے۔ سرائے گئے ہوئے تھے ناں؟ کل دراصل میں بری پور چلی جاؤں گی۔
انتظار کر رہی تھی۔“ وہ بہت دھیمی آواز میں بات کر رہی تھی۔

”خیریت؟“ باری کی ساری ترنگ حیرت میں بدل گئی۔

”وہ..... بات یہ ہے کہ تم سرائے ہی میں تھے اور تیمور علی خان کا فون میرے لئے آیا تھا۔“

وہ یوں گویا تھی جیسے اس سے کوئی جرم سرزد ہو گیا ہو۔

باری گڑبڑا کر رہ گیا۔ (کیا انہیں باخبر کر دیا گیا؟)

”جی..... مگر آپ کیلئے کیوں.....؟“ وہ خود پر قابو پاتے ہوئے بغور ماہین کو دیکھتے ہوئے پوچھنے لگا۔

”روشی کے سلسلے میں بات کر رہے تھے کہ اس نے یہ حرکت کیوں کی؟ مجھے ضرور علم ہوگا..... اگر نہیں.....“

تھا۔ وہ فہم سے شادی پر رضامند کیوں نہیں ہے؟ آیا کسی کو پسند کرتی ہے؟“

باری بری طرح الجھ گیا تھا اسے ماہین کا انداز سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

”باری بری طرح الجھ گیا تھا اسے ماہین کا انداز سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔“
”باری بری طرح الجھ گیا تھا اسے ماہین کا انداز سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔“

”باری بری طرح الجھ گیا تھا اسے ماہین کا انداز سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔“
”باری بری طرح الجھ گیا تھا اسے ماہین کا انداز سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔“

”باری بری طرح الجھ گیا تھا اسے ماہین کا انداز سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔“
”باری بری طرح الجھ گیا تھا اسے ماہین کا انداز سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔“

”باری بری طرح الجھ گیا تھا اسے ماہین کا انداز سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔“
”باری بری طرح الجھ گیا تھا اسے ماہین کا انداز سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔“

”باری بری طرح الجھ گیا تھا اسے ماہین کا انداز سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔“
”باری بری طرح الجھ گیا تھا اسے ماہین کا انداز سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔“

”باری بری طرح الجھ گیا تھا اسے ماہین کا انداز سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔“
”باری بری طرح الجھ گیا تھا اسے ماہین کا انداز سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔“

”باری بری طرح الجھ گیا تھا اسے ماہین کا انداز سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔“
”باری بری طرح الجھ گیا تھا اسے ماہین کا انداز سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔“

”باری بری طرح الجھ گیا تھا اسے ماہین کا انداز سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔“
”باری بری طرح الجھ گیا تھا اسے ماہین کا انداز سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔“

”باری بری طرح الجھ گیا تھا اسے ماہین کا انداز سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔“
”باری بری طرح الجھ گیا تھا اسے ماہین کا انداز سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔“

”باری بری طرح الجھ گیا تھا اسے ماہین کا انداز سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔“
”باری بری طرح الجھ گیا تھا اسے ماہین کا انداز سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔“

”باری بری طرح الجھ گیا تھا اسے ماہین کا انداز سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔“
”باری بری طرح الجھ گیا تھا اسے ماہین کا انداز سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔“

”باری بری طرح الجھ گیا تھا اسے ماہین کا انداز سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔“
”باری بری طرح الجھ گیا تھا اسے ماہین کا انداز سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔“

”باری بری طرح الجھ گیا تھا اسے ماہین کا انداز سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔“
”باری بری طرح الجھ گیا تھا اسے ماہین کا انداز سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔“

”باری بری طرح الجھ گیا تھا اسے ماہین کا انداز سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔“
”باری بری طرح الجھ گیا تھا اسے ماہین کا انداز سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔“

”باری بری طرح الجھ گیا تھا اسے ماہین کا انداز سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔“
”باری بری طرح الجھ گیا تھا اسے ماہین کا انداز سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔“

”باری بری طرح الجھ گیا تھا اسے ماہین کا انداز سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔“
”باری بری طرح الجھ گیا تھا اسے ماہین کا انداز سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔“

”باری بری طرح الجھ گیا تھا اسے ماہین کا انداز سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔“
”باری بری طرح الجھ گیا تھا اسے ماہین کا انداز سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔“

”باری بری طرح الجھ گیا تھا اسے ماہین کا انداز سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔“
”باری بری طرح الجھ گیا تھا اسے ماہین کا انداز سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔“

”باری بری طرح الجھ گیا تھا اسے ماہین کا انداز سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔“
”باری بری طرح الجھ گیا تھا اسے ماہین کا انداز سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔“

”باری بری طرح الجھ گیا تھا اسے ماہین کا انداز سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔“
”باری بری طرح الجھ گیا تھا اسے ماہین کا انداز سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔“

جی رولی۔ بالوکی جان جل کا خاک ہو گئی۔
 ”چائے والا۔ گرم چائے۔“ ایک آدمی پانچ سات کلو کی کیتلی کے ساتھ جانے کہاں سے نمودار ہوا۔

”ای اچائے پیوں گی۔“ لال فراک والی بھی بڑبڑائی۔

”ای!..... میں بھی۔“ لڑکے نے بھی اوپر سے آدھا دھڑیچے لٹکایا۔

”پپ کم بختوں..... نشہ ٹوٹا جا رہا ہے انچیوں کا۔“ چائے والے نے رک کر ”بادرانہ صلواتیں“ سنیں اور ”کاروبار“ کا

اندازہ کیا۔ پھر باقی چہروں پر نظر ڈالتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

بچی بالوکی گود سے اتر کر فرش پر ٹوٹنے لگی۔ ”چائے پیوں گی۔“ حالانکہ تھوڑی دیر قبل ہی سب بچے ماں سمیت بوتلیں

لے کر فارغ ہوئے تھے۔

”اٹھ رہی ہے کہ لگاؤں دو.....؟“ ماں نے کینو کی پھانک منہ میں ڈال کر آنکھیں نکالیں۔ کیونکہ صرف ”دو“ کی

دراںک تھی۔ اور بچی ڈھیٹ تھی۔ لہذا مطلق اثر نہ ہوا۔

بچی کی ریں ریں سے اعصاب چٹختے لگے۔ اس نے بے چارگی سے اطراف میں نظر دوڑائی۔ دو تین خیمہ برقعوں اور

”میر عمر پٹھانیاں اور ایک اردو اسپیکنگ بوڑھی عورت بھی بالوکی طرح بچی کی ریں ریں سے عاجز نظر آرہی تھیں۔

”لے دو تاں اسے چائے۔ امارا تو سر پٹ (پھٹ) رہا ہے۔ شور سے۔“ ایک پٹھانی سے براشت نہ ہوا۔

”تم نے پیدا نہیں کئے یا بے اولاد ہو۔ بچے تو کرتے ہی ہیں اس طرح۔“ عورت پھاڑ کھانے کو دوڑی۔

”خانہ خراب.....!“ پٹھانی بڑبڑا کر رہ گئی۔

”آپ کدھر جا بیٹھے؟“ بالو نے ماحول کے اثر سے نکلنے کی خاطر پٹھانی سے بات چیت شروع کر دی۔ حالانکہ گھنٹوں

سے ساتھ بیٹھی تھیں۔ مگر ”جہاں آرا اینڈ کو“ نے وہ آفت مچائی ہوئی تھی کہ الامان۔

”لوشہرہ چھاؤنی۔“

”اور یہ.....؟“ اس نے دوسری پٹھانی کی طرف اشارہ کیا۔

”یہ امارا بڑی بہن اے۔ ہم دونوں کا شادی ایک ہی گھر میں ہو یا اے۔“

”آپ سرال جا رہی ہیں۔“ بالو نے بات برائے بات کی۔

”امارا سرال میکہ سب لوشہرہ میں ہے۔ امارا مرد کراچی میں فروٹ کا کام کرتا اے۔“

”پھر تو بڑی آمدنی ہوگی۔ فروٹ والے تو منڈی سے ڈبل ریٹ پر بیچتے ہیں۔ ویسے اتنا منافع بھی جائز نہیں۔ رزق

”جہاں ایک طرح سے۔“ جہاں آرا بیچ میں نکل ہوئی۔

”حرام خور تو ام کو تو لگتا ہے..... کیسا اپنا مرد کا پیسہ پھینکتا اے جو بچہ مانگتا اے خریدتا ہے۔ امارا مرد فجر کو اٹھتا اے۔

”تو نے مجھے حرام خور کہا۔ سود خور کی قوم سے ہے اور مجھے حرام خود کہتی ہے۔ مرد تو کما تا ہی اپنے بچوں کیلئے ہے۔ لعنت

”جی ہونا تو چاہیے۔ اور میرا خیال ہے۔ کہ ہے بھی۔ ابھی آپ اندازے لگانے میں جلدی نہ کریں۔“ احتیاط سے بات کی۔

”ایک بات کہوں، مائنڈ تو نہیں کرو گے؟“ ماہین نے بغور اس کا چہرہ دیکھا۔

”نہیں نہیں۔ آپ کہیے۔“ وہ ایک دم اسمارٹ ہو گیا بالکل چوکس۔

”نمبر ایک جب کوئی آئیں بائیں، شائیں کرتے ہیں تو میں سمجھ جاتی ہوں کہ مجھے ٹاپک چھوڑ دینا چاہیے۔“ وقوف ہرگز نہیں ہوں۔

نمبر دو..... مجھے نہایت دکھ سا محسوس سا ہو رہا ہے کہ کہاں تو تمہیں نیند نہیں آرہی تھی۔ راتوں کو بھی آنسو

میں اتنے محو اور مگن ہو کہ یہ بھی یاد نہیں کہ روشنی ہنوز لاپتا ہے۔“ ماہین کے لہجے میں بہت افسوس تھا۔

”یہ بات نہیں ہے۔ آپ لوگوں کی خاطر بھی ہم گھر کے مردوں کو اپنے اعصاب کنٹرول کرنا چاہیں۔“ وہ بڑبڑاتی

والی بات ہے۔

پلیز آپ آرام کیجئے۔ پھر آپ کو صبح لمبا سفر کرنا۔ دس یو گنڈ لک۔“

وہ اس کے پاس سے تیزی سے گزر گیا۔

اور وہ کھڑی یہ سوچ رہی تھی۔ کہ اس کو اس گفتگو سے کیا کچھ اخذ کرنا چاہیے جو کہ نہایت بے ربط اور بے فائدہ تھی۔

”دیکھو آیا..... تمہارا بچہ اوپر برتھ سے گر جائے گا۔“

بالوکی جان سولی پر لٹک رہی تھی۔ بچہ آنے سے سامنے کی برتھوں کو اس طرح استعمال کر رہا تھا۔ جیسے فرش پر لیٹا

رہا ہو۔ ہر بار بالو کو یوں محسوس ہوتا تھا۔ کہ اب آیا نیچے کہ تب۔

”کیا آپ آپا لگا رکھی ہے۔ میری عمر کی ہو بہن۔ جہاں آرا نام ہے میرا۔ باز نہیں آئے گا۔ عبد الحفیظ لک گیا۔“

”یہ آپ کی لڑکی بار بار کھڑکی سے باہر سر نکال رہی ہے۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔“ بچی کے کھبوں کے پار سے

یا گھنی جھاڑیوں کے قریب سے تو واقعی بالو کا دم اٹک جاتا۔

”سنے گی نہیں..... کی بچی (موٹی سی گالی)۔ بالو کی نشاندہی پر عورت کو چھٹا ہوا کیونکہ کھانا عذاب ہو گیا۔“

تیسری بچی کوٹے سے لت پت لال فراک میں ملبوس بالو کی گود میں چڑھ گئی۔

”میں بھی باہر دیکھوں گی۔“ دوسری کھڑکی کے سامنے بالو کی سیٹ تھی۔

”اندھیرا ہو رہا ہے کیا دیکھے گی؟ تیرا باپ ناچ رہا ہے باہر۔ چل ترینچے ادھر آ کر بیٹھ۔“ عورت نے اسے

نکالے اور پہلے سے فرش پر پڑے ہوئے چھٹکوں کے درمیان گویا مزید موتی ٹانگے۔

”یہ جو خالی شاپ۔“ آپ چھٹکے اس میں ڈال لیتیں۔“ بالو سے رہا نہ گیا۔

”بہن! ہم نے تو چوبیس گھنٹے گزارنے ہیں، تم شاید یہاں رہنے آئی ہو یا یہ ڈبہ ریل کا ساتھ لے رہی ہو۔“

تیری شکل پر۔

جہاں آرا نے زبردست ”بھرائہ“ لیا۔

”کس پر لعنت بھیجتا ہے۔؟“ پٹھانی نے آگے بڑھ کر جہاں آرا کا گریبان دبوچ لیا۔

بالو کی طبیعت اندر کسی زاویے سے مطمئن ہوئی کہ اب ملا ہے اس جہاں آرا کی بیٹی کو سوا سیر۔ پٹھے دو کجبت کہہ رہا ہے۔

مگر جب دونوں طرف سے ہاتھ پائی شروع ہو گئی۔ اور بچوں نے چیخنا چلانا شروع کر دیا تو وہ زیادہ دیر نہ رہا۔ دوسری خواتین بھی بالکل غصہ بیٹھی ہوئی تھیں۔ بلکہ دوسرے کپارٹمنٹ کی خواتین نے بھی آکر جھانکنا شروع کر دیا۔ اٹھ کر بیچ بچاؤ کرانے لگی۔

پٹھانی نے ایک ہاتھ سے اسے پرے دھکیل دیا۔ وہ دھپ سے سیٹ پر جا گری۔

دوسری پٹھانی نے کھڑے ہو کر دونوں کو الگ الگ کیا کہ وہی کر سکتی تھی۔

”چوڑو (چھوڑو) اس کو لعنت کرو بیٹو (بیٹھو) آرام سے۔“ اس نے اپنی بہن کو سیٹ پر بٹھایا۔

جہاں آرا کلائی سے ٹوٹی ہوئی چوڑیاں جھاڑنے لگی۔ اس کے روکھے بال جھاڑ جھنکاڑ بن چکے تھے۔ بچے ہم کرال۔ قریب آ بیٹھے تھے۔

تھوڑی دیر کو وہاں سناٹا طاری ہو گیا تھا۔ صرف ٹرین کی چھکا چھک سنائی دے رہی تھی۔

”تم پشاور جا رہی ہو۔؟“ اردو اسپیکنگ بڑی بی نے بالو کو مخاطب کر کے خاموشی توڑی۔

حالانکہ ابھی وہاں ”جنگ“ کا ماحول طاری تھا۔ دونوں حریف گاہے گاہے ایک دوسرے کو خونی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

”ٹکٹ“ والا کہہ رہا تھا۔ پشاور سے تمہاری منزل دور پڑے گی۔ اس سے پہلے کسی اسٹیشن پر اتر کر بس یا کوئی اور سوانہ لے لینا۔

پشاور سے پہلے کیا کیا آتا ہے؟“ اس نے سادگی سے پوچھا۔ بڑی بی تعجب سے بالو کو دیکھنے لگیں۔

”نوشہرہ..... حسن ابدال۔ ایک۔“

”ہاں..... ہاں..... میں حسن ابدال اتروں گی۔“ اس نے بڑی بی کو بیچ میں روک دیا۔

”پہلی مرتبہ جا رہی ہو.....“ بڑی بی بڑی پہنچی ہوئی تھیں۔

”لگتا ہے یہ تو ریل گاڑی میں ہی پہلی مرتبہ بیٹھی ہے۔“ جہاں آرا نے گدھے کے کان اٹینے جانے کیا کہا کہ بچہ آگے

اس کی ماں نے۔

دانش مند بڑی بی نے باقی ”انٹرویو“ موخر کر دیا۔

”کو۔ ماہین نے عالم تاب کی خواب گاہ سے نکلتی کلو کو آواز دی۔

”بی بی“

”سرسوئی کو بھیجا میرے پاس۔ ابھی۔“ ماہین اسے کہہ کر اپنے کمرے میں آگئی اور وارڈ روب کھول کر کپڑے نکالنے

لے۔ بیج کی چاری تھی۔

تھوڑی دیر بعد سرسوئی نے دروازے پر دستک دی۔

”آ جاؤ۔“

”بی بی“

”سرسوئی مجھے جمومر کے پاس جانا ہے۔“

”ہاں بی بی..... تے فیر چلو..... (تو پھر چلو)۔“ وہ مستعد ہو گئی۔

”ابھی نہیں۔ ابھی تو سب جاگ رہے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد آنا۔ میں اتنے میں پیکنگ کر لوں۔ کوک وغیرہ رکھ لینا بہت

لڑے بنتی ہے۔“

سرسوئی واپس چلی گئی۔ ماہین سٹوٹ کیس میں کپڑے رکھنے لگی۔

اس کے چہرے پر اتنے سوال بکھرے ہوئے تھے کہ امتحانی پر چہ بیٹا ہوا تھا۔

”ہری پور جانے سے پہلے چند سوالوں کے جواب چاہتی تھی۔ جس نے اس کو فلجان میں جتلا کر رکھا تھا۔

اس نے کپڑے رکھنے کے بعد اور دوسری ضروری اشیا بھی رکھیں۔ اچھا خاصا ٹائم ہو گیا تھا۔

”پھر سرسوئی آگئی۔ اس کے ہاتھ میں کھجور کی باسکٹ تھی جس میں کھانے پینے کی چیزیں تھیں۔

”آف دہانٹ بڑی سی چادر اچھی طرح اوڑھ کر سرسوئی کے ساتھ چل پڑی۔ اور مخصوص راستے سے گزر کر جمومر کے

لڑے تک پہنچ گئی۔

سرسوئی نے دستک دی۔ اندر سے کوئی جواب نہ آیا۔

ماہین نے خود آگے بڑھ کر دروازہ دھکیلا۔ کمر خالی تھا۔

”شاید ہاتھ دروم میں ہے؟“

”تساں بہ جاؤ۔ بہن ای آئی۔“ سرسوئی باسکٹ رکھ کر باہر چلی گئی۔

ماہین کرسی پر بیٹھ گئی۔ اور انتظار کرنے لگی۔

سرسوئی فوراً ہی جمومر کو لے کر آگئی تھی۔

”کہاں جم؟“ اس نے مسکرا کر جمومر سے دریافت کیا۔

”وہاں۔“ لگتا ہے جوڑ سیکل کے پاس۔ لگتا ہے آپ کا بھی دل لگ گیا ہے ہمارے گروپ میں۔“ جمومر ہنس پڑی۔

”جسم۔“ ”دور اہل مجھے اس عورت سے ملتا ہے جس کا بڑا شاعرانہ سا نام ہے وہ میری بہن کے عہد کی عورت ہے

..... اور..... خیر کیا وہ سو گئی؟“

ماہین نے بات ادھوری چھوڑ کر سوال کیا۔

”نہیں..... اس بے چاری کو نیند کہاں۔ اور وہاں بیٹھنے کی جگہ کہاں۔ ایسا کرتی ہوں اسے سیکھا ہے۔“

منٹ۔ وہ تیزی سے باہر نکل گئی۔

ماہین سامنے لگی پینٹنگ کو خالی خالی نظروں سے دیکھنے لگی۔

تھوڑی دیر بعد زنجیریں پھٹنے کی آواز آنے لگی۔ دکھ سے ماہین کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی۔

”السلام علیکم“ عورت نے اندر قدم رکھتے ہی سلام کیا۔ اور دو قدم آگے آ کر کارپٹ پر بیٹھ گئی۔

”وعلیکم السلام“۔ ادھر اوپر بیٹھ جاؤ۔“ ماہین نے صوفے کی طرف اشارہ کیا۔

”کیا سمجھ رہی ہیں آپ..... غلام زادی ہوں، نام پر نہ جائیں۔ آپ نے سنا نہیں۔ آنکھ سے اندھے ہرگز نہیں۔“

جھومر بی بی ہیں جو کہنے کے باوجود فرق مٹا کر بات کرتی ہیں۔ کہتی ہیں۔ میں تم ہی میں سے ہوں۔ حالانکہ مالک۔ تو ہماری مالکن ہی ہوئیں۔“

انسانوں کو ترسی عورت بغیر سانس لئے بولتی چلی گئی۔

”آئے نہیں ظفری“۔ ماہین نے جھومر کی طرف دیکھا۔

”یوں تو نہ کوئیں مجھے“۔ وہ باسکٹ سے چیزیں نکالتے ہوئے سر پیٹ کر گویا ہوئی۔ ماہین تو ایک لمحے کو ڈانٹا۔

”روٹی بی بی کا پتا چلا؟“ عورت کو کتنی دلچسپی تھی حویلی کے معاملات سے۔

”نہیں“۔ ماہین نے دکھ سے کہا۔

”بے چارے یا در خانان“۔ عورت کے لہجے میں بھرپور تاسف تھا۔

”کیا مطلب بے چارے؟“ ماہین نے کھوجنے کے انداز میں اس کا چہرہ دیکھا۔

”مطلب یہ کہ ان کی ایک ہی تو بیٹی تھی۔“

”ہے“۔ ماہین نے اس کی بات درمیان میں کاٹ دی۔ دل ہول کر رہ گیا۔

”مجھے سب یاد ہے۔ میں کچھ نہیں بھولی“۔ مطربہ کی آواز بھر اگئی۔

”مجھ سے بہت محبت کرتی تھیں۔ بہت بھروسہ کرتی تھیں، کہتی تھیں، مطربہ تیری شکل کتنی پیاری ہے۔“

پرست ہوں۔ خوبصورتی کے بیچ رہوں تو خوش رہتی ہوں۔ اس پاس حسن نظر نہ آئے تو یوں ہو جاتی ہوں جیسے کسی نے

خود ہی ہنس پڑتی تھیں۔ وہ بہت خوش رہتی تھیں۔ بہت ہنستی تھیں۔“

مطربہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

ماہین جھومر اور سرسوتی حیران پریشان اسے دیکھنے لگیں۔

”آپ کو بتا دوں ان کی ہنسی میں نے جھینپی تھی۔ انہیں باسی سبزی میں نے بنایا تھا۔ انہیں جیتے جی میں نے مار دیا۔“

بچے ہوئے کہہ رہی تھی۔

ماہین کو وہ مکروہ اور بد صورت لگنے لگی تھی۔

”کیا کیا تھا تم نے ان کے ساتھ.....؟ میں تو سمجھ رہی تھی وہ ہنستی ہوئی چلی گئیں۔ جیسے کہ لوگ چلے ہی جاتے ہیں۔“

ماہین کو ہراساں لگا تھا۔ وہ تو اپنی بہن کے ماضی کے قصے سننے آئی تھی۔ وہ یوں کہ یاد علی خان کی مختلف بدلتی کیفیات

نے اسے الجھن میں ڈال دیا تھا۔

”یہ پوچھیں کہ میں نے کیا کیا.....؟“

یہ دم دروازے پر دستک ہوئی۔ ماہین کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔

جھومر تیزی سے دروازے کی سمت بڑھی اور دروازہ تھوڑا سا کھول کر جھانکا۔

”آپ تو رعایت سے ناجائز فائدہ اٹھاتی ہیں۔ یہ سیاسی قیدی نہیں جسے آپ ”اے سی“ میں بٹھاتی ہیں۔ لائیے چابی

بچے۔ بہت ہو چکا تماشا۔ اور اسے بھی باہر نکالیں۔“ ماہین کے کالوں میں باری کی آواز آئی۔

اس کے ساتھ ہی اس نے ہاتھ مار کر دروازہ دھڑ سے کھول دیا۔ اور ایک دم ٹھنک کر رہ گیا۔

”آپ..... یہاں اس وقت؟“ وہ بس یہی کہہ سکا۔

مطربہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ ماہین نظریں جھکا کر رہ گئی۔

”اے کج وقت کہتا باری..... میں نے بلوایا تھا۔“ اس نے آہستگی سے کہا۔

مطربہ آگے چل پڑی۔

باری کچوا بھی اور کھوجتی نظروں سے ماہین کی سمت دیکھ رہا تھا۔

”آپ اسے کیسے جانتی ہیں۔ اسے خاصی تشویش تھی۔“

”ایک گھر میں رہتے ہوئے واقفیت ہو جانا کوئی تعجب کی بات تو نہیں۔“ ماہین کو بر محل جواب سوچھ گیا۔

”لائیے۔ چابی مجھے دیجئے۔“ اس نے جھومر کو مخاطب کیا۔

”ایک منٹ۔ دے رہی ہو۔ آج کل تو جناب والا یوں بھی اپ سیٹ ہوں گے۔ پریشان لوگوں کو اور کیا پریشان کرنا۔“

جھومر نے بند سے چابی اٹھا کر اسے چھاتے ہوئے بڑے معنی خیز انداز میں کہا۔

”پتہ کچا؟“ باری نے ماہین کو مخاطب کیا۔ گویا جھومر کی بات سنی ان سنی کر دی۔

”نہیں اٹھ کھڑی ہوئی۔ تھکی تھکی سی کہ خلش اپنی جگہ موجود تھی۔“

”غدا صبح جھومر! کل تو میں ہری پور چلی جاؤں گی۔ اللہ کرے روشنی کا پتا لگ جائے۔ دعا کرنا۔“

باری نے ہر دائیں طرف مڑ گیا تھا، غائبانہ آواز لگانے گیا تھا۔ سرسوتی بھی اپنی باسکٹ اٹھا کر ڈرتی سہتی ماہین کے پہلو میں؟

”تمہارا منہ کھلا کر اپنا پڑے گا سرائے۔ بہت زیادہ کام کرنے لگی ہو کیشن پر۔“ باری ان کی طرف واپس مڑتے ہوئے

سرسوئی سے مخاطب ہوا۔

”میں لائی تھی اسے۔ پلیز کچھ نہ کہنا۔“ مایین نے سفارش کی۔

”مت سرچڑھائیے اتنا۔ اس حویلی کو سرچڑھی خادما میں اس نہیں آتی۔“ وہ جانے کس دھن میں کہہ رہا تھا۔ وہ بات جو کمرے میں ادھوری رہ گئی تھی۔ اس میں اور باری کے جملے میں کتنا واضح ربط تھا۔

”مثلاً، میرا مطلب ہے یعنی؟“ مایین بھلا چپ رہتی۔

”یعنی کچھ نہیں، آپ صبح کتنے بجے روانہ ہوں گی؟“ اس نے عام سے لہجے میں بات پلٹ دی۔

”تم یہاں کے سب سے بڑے بھیدی ہو، بے وقوف سمجھتے ہو مجھے۔“ وہ چڑ گئی۔

”خدا نخواستہ۔ آپ اتنی سیریس نہ ہوں۔ ایسی کوئی بات نہیں۔ روشی بی بی والا قصہ ہی فی الحال کافی ہے۔“ ایک خوبصورت سا احساس اس پر چھا گیا تھا جیسے چاند کے گرد ہالہ۔

”ہاں یہ تو ہے، مجھے تو یاد اور صاحب کی فکر پڑ گئی ہے۔ کہیں ٹینشن زیادہ نہ لے لیں۔“ مایین فکر مندی سے بولی۔

”جی..... خیر پریشانی کو ذہن سے جھٹک کر اچھی امید رکھئے کہ اچھی خبر ہی سننے کو ملے گی۔ انشاء اللہ۔“

اس کے ہونٹوں پر بڑی مبہمی مسکراہٹ تھی جو اندھیرے میں مایین کو نظر نہیں آ سکتی تھی۔

”آمین۔“ مایین نے دل و جان سے کہا۔

رات کے دو بجے کا عمل تھا۔ جب عالم تاب نے مایین کے کمرے کا دروازہ دھڑ دھڑایا، مایین کو یونہی جھومک کی آواز وہ بدحواس ہو کر اٹھ بیٹھی۔

”کون؟“

”میں ہوں۔ باہر آؤ جلدی سے بابا صاحب بلارہے ہیں۔ ان کی حالت اچانک بگڑ گئی ہے۔“ بند دروازے کے پیچھے سے سب کچھ کہہ دیا گیا۔

مایین دوپٹا سنبھالتی بڑی تیزی سے دروازہ کھول کر باہر آئی تھی۔

”جلدی آؤ مایین! وہ اس سے آگے آگے چل پڑیں۔“

کمرے میں بہت سے لوگ جمع تھے۔ بڑے بابا اور بصیر چچا دائیں بائیں بیٹھے ہوئے تھے۔ جبکہ وہ تمام لڑکے جن سے اتفاق سے پہلے راؤنڈ میں ملی تھی۔ وہاں موجود تھے تمام لڑکیاں، سمیہ بھابی اور بابا صاحب کی بہنیں بیٹیاں بھی دم ہارے کھڑی ہوئی تھیں۔

”بابا صاحب! یہ مایین آگئیں۔“

اسی دم دروازہ کھلا اور باری اندر داخل ہوا۔

”فون کر دیا دونوں کو؟“ عالم تاب نے استفسار کیا۔

”جی۔“

”آؤ مایین وہاں راستہ دو۔“ عالم تاب نے کہا۔ وہاں فوراً ایک طرف ہو گیا۔

مایین دم بخود ہی ان کے قریب چلی آئی۔ اور بیڈ کے کنارے ٹک گئی۔

”ہاں! ہم نے کچھ نہیں کمایا۔ روشی نے ہمیں تلاش کر دیا۔ دیکھو بس ہمارے دماغ کی شریان پھٹنے والی ہے۔“

ہم دنیا کے مفلس ترین لوگوں میں سے ہیں۔“ ان کی آنکھوں سے دو موٹی ڈھلک گئے۔

”دیکھو یاد رہت دیکھی ہیں۔ ان کا خیال رکھنا۔ اور سب کے پاس سب کچھ ہے۔ اس کے پاس صرف تم اور جواد ہو۔“

”ہم تم سے کچھ نہیں چھپائیں گے ہم نے عالم تاب کو تاکید کی ہے کہ۔“

”گھڑی تیار ہے خان۔“ ڈرائیور نے اندر آ کر باری کو مخاطب کیا۔

جواد وہاں، مصور باری بابا صاحب کو اٹھانے کیلئے آگے بڑھے۔ باقی لوگ ایک طرف ہو گئے۔

بشکل بابا صاحب کو گاڑی تک لے جایا گیا۔ جتنے لوگ لینڈ کروزر میں سہا سکتے تھے بیٹھ گئے۔

ساری حویلی کی لائٹیں جلا دی گئی تھیں۔

عالم تاب وہیں ستون سے ٹک لگا کر رونے لگیں، وہ ان کے سر ہی نہیں حقیقی تایا بھی تھے۔

”ہائے روشی تو ہی چلی جاتی دنیا سے اب تو تیری دی ہوئی ذلت بھی ہے اور بے سائبانی بھی۔“

مایین کے احساسات عجیب سے ہو گئے۔

وہال کمرے کی طرف آگئی۔ سب لڑکیاں بھی جاگ چکی تھیں۔ اور بالکل چپ چاپ بیٹھی ہوئی تھی۔

”اگر خدا نخواستہ بابا صاحب کو کچھ ہو گیا تو عمر بھر کیلئے یہ بات ہو جائے گی کہ روشی کی وجہ سے یہ سب ہوا۔“ رو بی نے

داخل پر چھائی خاموشی توڑی۔

”اور کیا۔ اللہ کرے بابا صاحب ٹھیک ہو جائیں۔“ تانیہ نے جلدی سے دعا کی۔

”انہائی سیلفش نہیں ہے کہ انسان اپنے علاوہ اور کسی طرف دھیان ہی نہ دے۔“ شینو تنخی سے گویا ہوئی۔

”اس طرح کی باتیں اس وقت کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ بہتر ہے کہ بابا صاحب کیلئے دعائے صحت کی جائے۔“ گلو نے

بیشکی طرح بہت سوچ سمجھ کر بات کی۔ کچھ لڑکیاں اسی وقت وضو کرنے چلی گئیں۔

مایین کا روال روال جھلائے اندیشہ اور دعا گو تھا کہ کسی طرح بابا صاحب ٹھیک ہو جائیں ورنہ روشی ہمیشہ کیلئے باپ

کو مٹا دے گی۔

اس کا زہن تو پہلے ہی الجھا ہوا تھا۔ جاتے جاتے بابا صاحب اور الجھا گئے تھے۔ وہ کیا ہے جو آج تک چھپایا گیا۔ اور اس

کا کچھ سے کیا تعلق؟ وہ مزید الجھن میں پڑ گئی تھی۔

اسنے لوگوں کی موجودگی میں مسلسل خاموشی بھی بہت محسوس ہونے لگتی ہے۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی کہ اس طرح بیٹھنے کا فائدہ

نہیں ہے۔ وہ گاندھ قضاے حاجت ہی پڑ لے۔ اسے اگر دور تک کی فکر تھی تو بس روشی کی تھی۔ بس یہی دھیان میں آئے جا رہا تھا

کہ بابا صاحب کو کچھ نہیں ہونا چاہیے۔

دستک اتنی زور سے ہو رہی تھی کہ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی تھی۔

”جی..... کون؟“

”دروازہ کھولو روشانی!“ تیمور علی خان کی آواز آئی۔

وہ ساری جان سے کانپ گئی۔ اس وقت۔ کا کا جان۔ وہ اچھل کر بیڈ سے نیچے آئی۔ بڑی بدحواسی سے دروازہ کھولا۔

”جی کا کا جان؟“

”چادر اوڑھو روشانی۔ اور چلو۔“ وہ انتہائی سنجیدہ تھے۔

”جی کہاں؟“ وہ بے حد پریشان ہو گئی۔

”وقت نہیں ہے بالکل۔ ہری اپ۔“ وہ قدرے برہم انداز میں گویا ہوئے۔ روشی سہم گئی۔ جلدی سے پاؤں میں ڈالی اور دوپٹہ گلے میں ڈال کر چادر اوڑھ لی۔ اور تیمور علی خان کے پیچھے پیچھے چل پڑی۔

ڈرائیور جیب کے پچھلے دروازے کھولے ہوئے منتظر کھڑا ہوا تھا۔ تیمور علی خان نے پہلے روشی کو بیٹھنے کیلئے کہا پھر خود کے برابر بیٹھ گئے۔

موبائل فون ان کے ہاتھ میں تھا۔

”شیر گل! اندر کی لائن جڑو۔“ تیمور علی خان نے فون سیٹ کیا۔

فورا اندر روشنی ہو گئی۔ تیمور علی خان نمبر پیش کرنے لگے۔

روشی کبھی ان کے چہرے کی طرف، کبھی ان کی ان متحرک اگلیوں کی طرف دیکھ رہی تھی۔

”ہاں۔ کون۔ بیہ؟“

”ہوں راستے میں ہوں۔ کون سے ہاسپٹل میں؟ ٹھیک ہے! اچھا دیکھو۔ ہاسپٹل سے فون آئے تو نمبر لے لیتا تھا۔

کال کروں گا۔ اوکے۔“

روشی دم بخود ان کی شکل دیکھ رہی تھی۔ کا کا جان بیہ سے بات کر رہے تھے۔ جس سے ظاہر تھا کہ بڑی حوصلہ شکنی ہے۔ کون بیمار ہے؟ تیمور علی خان کے چہرے سے جو تاثرات اسے نظر آ رہے تھے ان کی وجہ سے اس کی بہت کمزوری ہو رہی تھی۔

”بابا صاحب کی حالت بہت خراب ہے روشانی! اگر انہیں کچھ ہو گیا تو ان کا قتل تمہارے ذمے۔“ وہ بہت ڈر سے کہہ رہے تھے۔

روشی کی تو جیسے جان نکل گئی۔ یوں بھی اس کا مسئلہ حل ہو چکا تھا۔ ذہن کی اسکرین سے خواہش اُٹھ جیسے جذبات بادل صاف ہو چکے تھے۔ اپنے تمام پچھلے اقدامات کی بد صورتیاں سامنے سرقد آکھڑی ہوئی تھیں۔

”مجھے کچھ تران کی حالت اور بھی ہو سکتی ہے کا کا جان؟“ وہ ڈرتے ڈرتے بولی۔

”اب یہ کریں نہ ہر گز تم ہوں اور تریاق بھی۔“

”میں اس وقت موجود رشتوں میں سوائے اپنے باپ کے اور کوئی نظر نہیں آ رہا“ ان سے دکھ بھی ملے ہیں، مگر سب سے

”میں بھی ہم نے ہی پائی ہیں۔“

”وہاں کہہ کر خاموش ہو گئے۔“

”بابا صاحب اس لئے بیمار تو نہیں ہوں گے کہ انہیں میرا فراق ستا رہا ہوگا۔ وہ تو اس لئے بیمار ہوئے ہوں گے کہ لوگ کیا

”نہیں گے۔ ٹھیک ہے“ میں خود سر ہوں لیکن ایک انسان کی حیثیت سے میرا حق نہیں کہ میری بات سنی جائے۔ مجھ میں بہت

”نہیں جی مگر اتنی جرات تو نہیں تھی کہ میں باری کا نام لے کر حویلی میں بازگشت کا اہتمام کر دیتی۔“

”مجھے علم ہے شادی کرنا تھی نہ اب ج سے نہ زید سے نہ بکر سے۔ میں کسی ان چاہے مرد کو خود سے قریب برداشت ہی نہیں

”رہتی تھی۔ مجھے کوئی بوجھ جیسا رشتہ برداشت نہیں ہو سکتا نہ عمر بھر کا بوجھ بابا صاحب اتنا تو کر لیتے کہ میری بات سن لیتے۔“

”حیثیت تو ہمیں دی جائے۔ ہم ان کی جاگیر کی زمین کے ٹکڑے تو نہیں ہیں۔ جیتے جاگتے انسان ہیں۔ ایک شخص جس

”نہایت سے مجھے انیت نہیں۔ اسے اپنی انمول ذات اپنی انا سوئپ دوں؟ کیا میں انسان نہیں؟ استعمال ہونے والی شے

”ہاں۔“

تیمور علی خان نے اسے احساس جرم میں مبتلا کیا تو اندر سے ”آگئی“ کا واویلا شروع ہو گیا۔

”افغوی اپنی وجہ سے بیمار ہوئے ہیں۔ بے وزن دیواروں جیسے اصول بنانے والے آخر کار زحمت اٹھاتے ہیں۔“

”انسان کی ذات کو تو روشن اور بڑے بڑے درپچوں اور دروازوں والی عمارت کی طرح ہونا چاہیے۔“

”کلفنا ماحول موسم ہر تبدیلی کا پتا چلتا رہے۔ تدبیر اور انتظام ہوتا رہے۔“

”یہ بھڑکھڑکانے والے راستے پر ڈالنا ہی نہیں چاہیے تھا کہ اپنی ذات کے ہونے کا احساس ہی نہ ہوتا۔“

”اگر کوئی بات کرنا چاہے تو اس کی بات تو سننا چاہیے۔ باقی مراحل تو بعد کی باتیں ہیں۔“

”کیلو۔ ہوں۔ واسلام۔“

”ہاں۔ گلو۔ ایک منٹ۔ انہوں نے جیب سے قلم نکالا اور روشی کا ہاتھ تھام کر تھیلی سامنے کی۔ پہلے تو وہ سمجھی نہیں۔ گڑبڑا

”آپ بولے کا کا جان! میں لکھتی ہوں۔“ اس نے قلم ان کے ہاتھ سے لے لیا۔ تیمور علی خان نے دو نمبر نوٹ کرائے

”مگر تیری تھی ایمر جنسی میں ہیں اور ابھی کچھ پتا نہیں چلا کہ کیسی طبیعت ہے۔ شی ہاسپٹل میں ہیں۔“

”شیر گل! شی ہاسپٹل چلنا ہے۔“

”نہیں! وہاں کید کر کے ایڑی ہو کر بیٹھ گئے۔“

روشی نے قلم ان کی طرف بڑھایا۔ جو انہوں نے جیب میں اٹکالیا۔

وہیں جھٹلائیں گے۔ مگر کسی بھی صورت میں وہ اسٹرونگی ری ایکٹ نہیں کر سکتے کہ تم ہماری سپورٹنگ بیس پر ہو۔
اس کو جیسی طور پر تیار کرنے کیلئے وہ اس سے آہستہ آہستہ مخاطب تھے۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے ان کی سمت دیکھ رہی تھی۔
نہی۔ کا کا جان! آپ تو نہیں تھے۔ اب کیوں ہو گئے ہیں ایسے۔
وہ تو بچہ ہی سے انہیں دیکھ کر خوفزدہ ہو جاتی تھی۔ حالانکہ انہوں نے کبھی کچھ نہیں کہا تھا۔ وہی کیا حویلی کے سب ہی بچے ان سے ڈرتے تھے۔

انہیں بڑی حویلی میں پا کر ادھر ادھر ہو جاتے تھے۔ ایک بصیر چچا ہیں جن کے کان کی میل تک گھر کے بچوں نے چپک کر لی ہوگی۔ بچوں میں بچے بنے رہتے تھے۔ تیمور علی خان تو پھر ان سے چھوٹے تھے۔

اس نے بے ساختہ تیمور علی خان کا ہاتھ تمام کر ہاتھ کی پشت پر بوسہ دیا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔
"کا کا جان! میں اپنی نظروں میں گر چکی ہوں، میں اس طرح کے سلوک کی حقدار نہیں ہوں۔ مجھے میرے حصے کی سزا دیں۔" وہ بھرائی ہوئی آواز میں گویا ہوئی۔ اور جیب سے نیچے اتر آئی۔
تیمور علی خان آگے اور وہ ان کے پیچھے چل پڑی تھی۔

کارڈیوڈ میں پہنچ کر اس کی رہی سہی جان بھی نکلنے لگی۔ گھر کے تقریباً سب ہی لڑکے اور مرد وہاں موجود تھے۔ اس نے بہت نظریں جھکا لی تھیں۔ یوں جیسے انتہائی قبیح فعل کی مجرمہ۔ بھری عدالت میں ہو۔
تیمور علی خان ایک لمحے کیلئے بھی نہیں رکے سیدھے چلتے گئے۔ ان کی تھلید میں وہ بھی۔
بابا صاحب بالکل ست لیٹے ہوئے تھے۔ چہرہ سرخ اور محتار ہوا تھا۔ آنکھیں بند تھیں۔ وہ تیمور علی خان کی پشت پر تھی۔
نہوں نے برآمد آنے کا اشارہ کیا۔

اس کی ہاتھیں لرز رہی تھیں۔ اور اس پر یہ احساس کہ شیشے کے اس پار سب کھڑے دیکھ رہے ہیں۔
تیمور علی خان نے باپ کا ہاتھ آہستگی سے اپنے ہاتھ میں لیا تو انہوں نے فوراً آنکھیں کھولیں۔ تیمور علی خان ان پر جھکے ہوئے تھے۔ سیدھے ہو گئے اور روشنی کی طرف اشارہ کیا۔

بابا صاحب کی آنکھوں کی پتلیاں لچکے بھر کو ساکت ہو گئیں۔ جیسے انہیں یقین نہ آرہا ہو۔ چند لمحے انہوں نے اس کی طرف دیکھا۔ پھر آنکھیں موند لیں اور گہرا سانس لیا۔

"دو شائے! تم جیب میں بیٹھو۔ بڑی حویلی ہم خود چھوڑ کر آئیے۔" وہ سرگوشی والی آواز میں گویا ہوئے۔
دو دروازہ کھول کر باہر آنے لگی۔ مگر ایک دم رک گئی اور پلٹ کر تیمور علی خان کی طرف دیکھنے لگی۔ وہ بھی اس کی طرف دیکھنے لگے تھے۔

وہ ان کے قریب چلی آئی۔

"کا کا جان! وہ۔ چپا۔ جواد بھائی۔" وہ جیسے ان کے کان میں بولی۔

"اؤ۔ تیمور علی خان نے شیشے کے پار دیکھا۔ اور گویا ہوئے۔"

کئی گھنٹے کا کرب انگیز سفر تمام ہوا۔ سٹی ہسپتال کے پارکنگ لائٹ میں جا کر جیب رک گئی۔ اپنے ہاں کی پڑی روشنی نے دور ہی سے پہچان لیا تھا۔ یہ تو گاڑی ہی میں پتا چل گیا تھا کہ بابا صاحب کی حالت اب خطرے سے دو ہے۔ جہاں یہ بات باعث طمانیت تھی وہاں آگے پیش آنے والے حالات اسے اعصابی خلجان میں جھٹکے ہوئے ہوئے تھے۔
"تم یہیں بیٹھو رو شائے! ہمارا انتظار کرو۔" تیمور علی خان نے جیب سے اترتے ہوئے اسے مخاطب کیا۔
تیمور علی خان کی شخصیت میں ایسی بات تو تھی کہ وہ اس سے خوش نظر نہیں آ رہے تھے۔ متشکر بھی تھے۔ اس کے ہاتھ کی ذات سے عجیب تقویت کا احساس بہر حال مل رہا تھا۔
وہ اندر چلے گئے۔

وہ باہر نظریں دوڑانے لگی۔ شیر گل بھی اتر کر ٹہل رہا تھا۔
معا اس نے محسوس کیا کہ پیچھے کوئی گاڑی آئی ہے۔ اس نے صرف گردن موڑ کر پیچھے دیکھا مگر فوراً ہی سیدھی ہوئی۔
پوٹھو ہار جیب سے یاور علی خان اتر رہے تھے۔

اس کا دل بڑے زور سے دھڑکا تھا۔ اس نے چادر پیشانی پر مزید کھسکا لی تھی۔ یہ ایک بے ساختہ مگر اضطراری عمل تھا۔
پھر اس نے یاور علی خان کو کارڈیوڈ کی طرف بڑھتے اور ایک طرف مڑتے ہوئے دیکھا۔
"یہاں تو کچھ اور ہی سن نہ ہو جائیں۔" اسے اندیشے ستانے لگے۔
اسے تقریباً آدھا گھنٹہ ہو گیا۔ کوئی باہر آتا دکھائی نہیں دیا تھا۔ شیر گل بھی ایک بیخ پر بیٹھ چکا تھا۔
معا اس کی نظر وہاں پر پڑی جو میڈیکل اسٹور کی طرف بڑھ رہا تھا۔
"یا اللہ۔ کیا سب آئے ہوئے ہیں؟" وہ مزید فکرمند ہو گئی۔

وہاں کے اندر جاتے ہی اس نے دیکھا۔ تیمور علی خان باہر آ رہے ہیں۔ وہ ایک دم سنبھل کر بیٹھ گئی۔
تیمور علی خان نے اس کی طرف کا دروازہ کھولا۔

"آؤ رو شائے! ان کا چہرہ نہ جانے کیوں نیا محسوس ہوا جیسے وہ کوئی اور ہوں۔"

"کا کا جان!"
"ایزی۔ نو پر اہلم۔ ہم نے کہہ دیا ہے کہ تم نے ہمیں فون کر کے اپنی پریشانی بتادی تھی۔ اس لئے ہم نے شیر گل کو تمہیں "سرائے" بلوایا تھا۔ درمیان میں کچھ امیر جنسیز ہو گئیں، اس لئے ہم بڑی حویلی پہنچ کر بات نہیں کر سکے۔ ہم نے بات کرنا چاہتے تھے۔"

دراصل جو امیر جنسیز ہم نے بابا صاحب کو بتائیں، وہ اتنی رٹیل اور سچی ہیں کہ ان کو یقین کرنا پڑے گا۔ کہ یہ سب وہ دوسری صورت میں اگر وہ یقین نہیں بھی کریں تو تمہیں کیا فرق پڑے گا؟

”بھابی بیگم! آئیے آپ کے کمرے میں چلتے ہیں۔“

”روشنی! تم اپنے کمرے میں جاؤ۔ شاہباش۔“

”بابا صاحب کیسے ہیں تیمور؟ تم یہ بتاؤ؟“ انہوں نے برہمی اور ناگواری سے جاتی ہوئی روشنی کو دیکھا۔

”بابا صاحب اب ان کی حالت خطرے سے باہر ہے۔ آئیے بھابی بیگم۔“

”شکر ہے اب ان کی حالت خطرے سے باہر ہے۔ آئیے بھابی بیگم۔“

”یہ کیا؟“ کہاں سے اٹھالائے۔ گولی کیوں نہ ماری تم نے۔ تم بھی تو اسی خاندان سے ہو۔ کس منہ سے آئی ہے یہاں۔“

”مگر پہلے کچھ بات چیت تو کر لیں آپ سے۔ آئیے۔“

”اگر آپ کہیں گی تو واپس اسے اپنے ساتھ لے جائیگے ہم۔ مگر پہلے کچھ بات چیت تو کر لیں آپ سے۔ آئیے۔“

”عالم تاب نے ان کے جملے پر بری طرح چونک کر ان کی شکل دیکھی تھی۔“

”تیمور۔ تم؟“

”ہلیز بھابی بیگم؟“ وہ جیسے زچ ہو گئے۔

”لڑکیاں انتہائی ذوق و شوق سے تیمور علی خان کی شکل دیکھ رہی تھیں اور ان کی دلی خواہش یہ تھی کہ ان کے منہ سے کوئی ایسا جملہ نکل جائے جس کا تعاقب کرتے ہوئے حقیقت کا سراغ وہ خود لگالیں کہ واقعہ کیا ہوا۔“

”مگر وہ بے دل سی ہو گئیں کیونکہ عالم تاب تیمور علی خان کو ساتھ لے کر ہال سے باہر چلی گئی تھی۔“

”چلو روشنی کے پاس چلتے ہیں۔“ بیہ نے تڑپ کر کہا۔

”وہ دروازہ کھولے گی جب ہی تو اس تک پہنچو گی۔“ شیو نے اپنا تمام تر تحیر و استعجاب دبا کر طنز یہ کہا۔

”میں ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ مشکل ہے جو وہ دروازہ کھولے؟“

”گوئے شیو کا طنز یہ لہجہ نظر انداز کر کے ان کے صحیح اندازے کی تائید کی۔“

”چلو! مین ممانی کے پاس چلتے ہیں۔ انہیں خبر بھی دیتے ہیں اور پھر ساتھ لے کر روشنی کے پاس چلتے ہیں۔ وہ کہیں گی تو“

”وہ دروازہ ضرور کھولے گی۔“ مونا کے تڑپتے شوق نے تدبیر سمجھائی۔

”ہاں کل ٹھیک۔“ وہ سب کی سب کھڑی ہو گئیں سوائے شیو کے۔

”آپ نہیں چل رہیں شیو آپ؟“ روبی نے پوچھا۔

”تم لوگ چلو۔ دروازہ کھلو۔ آتی ہوں میں۔ اگر اسٹوری کا شروع تھوڑا سا نکل جائے تو بعد میں تم سنا دینا۔“ وہ

”سکرائیں۔“

”یہ مت بھول جانا، فجر کی نماز باقی ہے ابھی ”شیطان“ اسی طرح وار کرتا ہے۔“ وہ معنی خیز انداز میں بولیں۔

”اللہ سے زعم پارسائی تعلق اپنائیت، انیسیت بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ کتنا بد صورت ہو جاتا ہے انسان دوسروں کے کردار پر

”مل کر کرتے ہوئے۔“

”نماز پڑھنا تو بڑا آسان ہے۔ کٹھن مرحلے تو اندر کا انسان ایسے ہی موقعوں پر طے کرتا ہے۔ اخلاقی..... خوبصورتیاں نہ

”آؤ ہمارے ساتھ۔“

”سیاہ شلوار قمیض، نازک وضع کی مگر مضبوط چپل پہنے ہوئے تیمور علی خان اپنی ٹھٹھکا دینے والی مراگھی کے ساتھ۔“

”سائبان سامحوس ہو رہے تھے۔ مگر نہ جانے کیوں اسے تاثرات میں وہ بہت سرد محسوس ہو رہے تھے۔“

”وہ آگے بڑھے اور دروازہ کھول کر باہر نکلے تو اس نے لپک کر ان کا بازو تھام لیا۔ سامنے یادائیں بائیں رہیں۔“

”میں ہمت نہیں تھی۔ بس ان کا بازو تھامے چلتی چلی گئی۔“

”کارڈور سے باہر آ کر اس نے تیمور علی خان کا بازو چھوڑ دیا۔“

”شیر گل انہیں آتا دیکھ کر رخ سے کھڑا ہو گیا۔“

”بڑی حویلی چلو شیر گل۔“ وہ جیب کا دروازہ کھولتے ہوئے گویا ہوئے اسے جیب میں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

.....

”حویلی میں داخل ہوتے ہی اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔“

”بھائی صاحب (بڑے ابا) اور بصیر چچا کو میں نے سمجھا دیا ہے۔ وہ تم سے اس موضوع پر بات نہیں کریں گے۔“

”وری۔“

”اور پاپا؟“ وہ پوچھنا چاہتی تھی جانے کیا سوچ کر چپ ہو رہی۔

”آؤ۔“ صبح نمودار ہو چکی تھی۔ ہلکا ہلکا اجالا پھیل رہا تھا۔

”وہ تیمور علی خان کے پیچھے پیچھے چلنے لگی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ کسی کے گھر پہلی مرتبہ آئی ہو۔ بار بار۔“

”عالم تاب“

”خسونت بھرا چہرہ سامنے آ رہا تھا۔ سرسوتی جانے کس کام سے باہر آئی تھی روشنی کو دیکھ کر اٹھے پاؤں دوڑ گئی۔ اس کی آواز۔“

”نیک آ رہی تھی۔“

”روشنی بی بی آساں۔ تیمور خاناں نال۔ بیگم جی روشنی بی بی۔“

”اندر جیسے کھلبلی مچ گئی۔“

”عالم تاب لڑکیوں کے ساتھ ہال میں ہی تھیں۔ جہاں نوافل کا سلسلہ جاری تھا۔“

”تانیہ تو نیت توڑ کر بھاگی۔“

”جونیت سے آگے کے مراحل۔“ طرہ کر چکی تھیں، انہیں سلام پھیرنے کی جلدی ہو گئی۔ البتہ عالم تاب نے بڑے سکون سے

”نماز مکمل کی۔“ باقی خواتین اپنے اپنے کمروں میں تھیں۔ سمیہ بچے کو دودھ پلانے جا چکی تھی۔ مابین بھی اپنے اپنے کمرے میں تھیں۔

”تیمور علی خان ہال میں داخل ہوئے۔“

”جوڑ کیا سلام پھیر چکی تھیں وہ اپنی اپنی جگہ بکے گئیں۔“

”السلام علیکم۔“ تیمور علی خان نے اپنے مخصوص سائل میں بھانج کو سلام کیا۔ مختلف کونوں سے آوازیں ابھریں۔

”السلام علیکم کا کا جان۔“

ہوں تو بدنی عبادت بھی مسترد ہے۔ عبادت کی جزا تو اخلاقیات سے مشروط ہے۔ نہ خالی اخلاق سے بات بنتی ہے نہ عبادت ہے۔ شیطان سے زیادہ تو کسی کی عبادت کا ڈنٹ نہیں ہوئی۔ پھر بھی مردود کر دیا گیا۔ انہیں تو غالب کا یہ شعر یاد ہو۔
فریم کرا کر دینا چاہیے غور و فکر کرنے کیلئے۔

وفاداری بشرط استواری اصل ایمان ہے

مرے بت خانے میں تو کعبے میں گاڑو برہمن کو!

نانا ابا کہا کرتے تھے۔ نماز رابطے کا سلیقہ ہے عام کنکشن ہے اور تہجد کی نماز ہاٹ لائن۔

نماز بھی رابطہ ہے اخلاقیات بھی رابطہ۔ ایک کا تعلق خدا سے اور دوسرے کا خدا کی مخلوق سے۔

گلو کوھیو کی بات سے دلی تکلیف ہوئی تھی۔ وہ ماہین کی خواب گاہ تک سو جتی ہوئی کیفیت میں پہنچی تھی۔

ماہین پہلی دستک پر باہر آئی تھی۔ اس نے بڑی فکر مندی سے ان کے چہرے دیکھے سب کی سب ایک ساتھ اس کے

بیٹھنے لگا۔

”ممائی جان! روشنی آگئی ہے؟“ مونا نے لب کشائی کی۔

”ہیں۔“ اسے سماعت کا دھوکا محسوس ہوا تھا۔

”جی۔ روشنی آگئی ہے۔“ گلو نے بھی کہا۔

”کیسے؟“ اس کی حیرت کی کوئی حد نہیں تھی۔

”کا کا جان کے ساتھ اور کچھ تو ہمیں بھی نہیں پتا۔“ روبی نے کہا۔

”کا کا جان؟“ وہ ابھی۔ سارا اعصابی نظام الٹ پلٹ ہونے لگا تھا۔

”جی۔ کا کا جان تیمور علی خان۔“ زری نے وضاحت کی۔

”وہ۔“ سرائے والے؟“ اس نے پوچھا

”جی جی۔ وہی۔“

”پرسوں رات۔ ایک بجے ان سے بات ہوئی۔ آج روشنی ان کے ساتھ۔“ وہ ابجھنے لگی۔

”کہاں ہے وہ؟“ وہ سنبھل کر بولی تمام لڑکیاں بغور اس کی شکل دیکھ رہی تھیں۔

”اپنے کمرے میں ہم آپ کے پاس اس لئے آئے ہیں کہ آپ کو اطلاع بھی دیدیں اور ساتھ لے کر اس سے ملنے چلیں۔“

”ہاں۔ ہاں۔ چلو۔ وہ ہسپتال سے کوئی فون دوں آیا؟“ وہ ایک دم جیسے کسی دھیان سے چوگی۔

”فون بھی آیا تھا۔ کا کا جان بھی بتا رہے تھے کہ اب حالت بہت بہتر ہے۔ وہ وہیں سے آرہے ہیں۔“ بیٹے نے بتایا۔

”روشنی بھی۔ روشنی بھی گئی تھی ہسپتال؟“ اس نے چلتے چلتے قدرے حیرت اور غمی سے اندیشے کے ساتھ پوچھا۔

”شاید! آئی تو وہ کا کا جان کے ساتھ ہی ہے۔“ تانیہ نے کہا۔

”جی۔“ ماہین کا زہن الجھ گیا تھا۔

”تہرے کا کا جان کیا واپس چلے گئے؟“ اس نے مونا کی طرف دیکھا۔

”نہیں۔ وہ بڑی مائی کے پاس ہیں۔“ اس نے روشنی کے کمرے کی طرف بڑی مشتاق نظروں سے دیکھتے ہوئے جواب

”ہیں نے آہستہ سے دروازے پر دستک دی۔

”کون؟“ روشنی کی جھکی جھکی آواز آئی۔

”میں ہوں ماہین۔ دروازہ کھولو۔“

”جی کرنے کی آواز تو آئی مگر دروازہ نہیں کھلا۔

ماہین نے دروازہ پیش کیا تو وہ کھل گیا۔ وہ اندر داخل ہوئی۔

”السلام علیکم۔“ اللہ تمہیں توفیق دے اور ستاؤ ہمیں۔“

اس نے سرخ و زرد کنٹراسٹ کے خوبصورت نئے لباس میں ملبوس روشنی کو بڑی دلچسپی سے دیکھا اور آگے بڑھ کر گلے

دیا۔

”دشانی نے بہت ضبط کیا مگر جانے کہاں سے ڈھیر سارے آنسو ابل پڑے وہ ماہین کے گلے سے لگی سسکیاں بھر رہی تھی۔

یہ کہتا تھا: ”وہ نڈھال سے انداز میں بولی۔“

سے شکایتی انداز میں ماہین کو مخاطب کیا۔

ماہین نے اس کے فصیح و بلیغ انداز پر اسے بڑی دلچسپی سے دیکھا۔
”پڑھی لکھی ہو؟“

”جی ان پڑھ ہوں۔ مگر اب وقت پڑا ہے تو وقت ہی پڑھا رہا ہے۔“ وہ تلخی سے ہنسی۔
”اتنی دور سے سیدھی یہیں آرہی ہو؟“ ماہین کو یکدم ایک خیال آیا۔
”جی۔“ اس نے مختصر کہا۔

”ایسا کرو۔ تم نہادھو لو۔ میں تمہارے ناشتے کا بندوبست کرتی ہوں۔ کپڑے تو تمہارے پاس ہیں۔ سوٹ نکالتی ہوں۔ ٹھیک ہے؟ پھر تمہیں مطربہ سے ملوائیں گے۔ فکر نہیں کرو۔“
وہ اٹھ کر وارڈروب کی طرف بڑھ گئی۔

”آپ مالکن ہیں یہاں کی؟“ وہ پوچھے بنانہ رہ سکی۔

”ہاں مگر دوسرے نمبر کی۔“ وہ کوئی مناسب سا سوٹ تلاش کرتے کرتے ہنس کر بولی۔
”آپ کا نام تازمین ہے؟“ بالو کو عارف کی زبان سے لکھا ہوا حرف از حرف۔
ماہین وارڈروب کھلی چھوڑ کر چونک کر پلٹی۔

”نہیں۔ مگر تم انہیں کیسے جانتی ہو؟“ وہ الجھن بھرے انداز میں پوچھ رہی تھی۔

”بس نام سنا ہے۔ مگر آپ وہ کیسے ہو سکتی ہیں۔ وہ تو بڑی پرانی بات ہے۔ وہ تو آپ سے بہت بڑی ہوں!“
سوچتے ہوئے بول رہی تھی۔

”پھر بھی کس سے سنا تھا نام؟ تم تو کراچی میں رہتی ہو؟ ماہین کی حیرت بجا تھی۔

”بس..... وہیں سے سنا ہے سب کچھ؟“ وہ سادگی سے بولی۔

”کس سے؟“ ماہین اپنا کام بھول کر پھر سوالوں میں الجھ گئی تھی۔

”عارف بھائی سے۔“ وہ سکون سے گویا ہوئی

”یہ کون ہیں؟“ اس کی حیرت بڑھتی جا رہی تھی۔

”آپ یہاں مالکن ہیں۔ آپ نہیں جانتیں انہیں؟“ اس مرتبہ حیرت بالو کو ہوئی۔

”مجھے زیادہ دن نہیں ہوئے یہاں آئے ہوئے۔ ہاں۔ تو عارف کون ہیں؟“ اس نے وضاحت کے ساتھ پوچھا۔
کیا۔

”جب آپ انہیں نہیں جانتی تو بیکار ہے۔ آپ مجھے مطربہ سے تو ملوا سکتی ہیں۔ ہو سکتا ہے وہ آپ کو بتائے۔“

اس نے اس بھری نظروں سے ماہین کی طرف دیکھا۔

”ہاں ہاں میں تمہیں ملوائوں گی۔“ وہ کسی دھیان سے چونکی اور پلٹ کر پھر وارڈروب میں نظر دوڑانے لگی۔

”اس سے پہلے مطربہ سے کب ملی تھیں؟“ اس نے ایک سوٹ نکال ہی لیا۔

”میں ان سے پہلے کبھی نہیں ملی۔“ وہ فطری سادگی سے بولی۔

”اب کیا ضرورت پیش آگئی؟“ اس نے سوٹ اس کی طرف بڑھایا۔

”ضرورت ہی ضرورت ہے بیگم صاحبہ پوری زندگی داؤ پر لگی ہے۔“ وہ تلخی سے مسکرائی۔

”اچھا چلو۔ تم پہلے نہادھو کر ناشتہ کر لو۔ پھر تم۔۔۔ آرام سے بات ہوگی۔ ایک منٹ ٹھہرو۔“ اس نے دو قدم آگے بڑھ کر
دو دروازے پر ایک بین دو تین بار پیش کیا۔

”فیروز بی بی! میں کلو اندر داخل ہوئی۔ گہرے فیروزی سوٹ میں ملبوس پازیب چھٹکتی ہوئی۔

”جی بی بی۔“

”دیکھو۔ یہ بے چاری بڑی دور سے آئی ہے۔ اسے باہر کا ہاتھ روم دکھا دو پھر ناشتا کرا دینا۔ ٹھیک؟“ اس نے کلو کو تاکید کی۔

”جی؟ کون ہے؟“ اس نے اپنا استعجاب ظاہر کر دیا۔

”اپنے کام سے کام رکھو تمہیں اس سے کیا۔“

”اور ہاں سنو۔“ وہ بالو کی طرف پلٹی۔ ”یہاں اور کسی سے کوئی بات نہ کرنا۔ جو بات ہو صرف مجھ سے کہنا۔ ورنہ تمہارا مسئلہ ہونا مشکل ہے۔“ اس نے بالو کو سمجھایا۔ کہ اس کی اپنی تہ تر دلیپن اس میں تھی۔

یاد علی خان جیب سے اتر کر بڑی تیزی سے اندر داخل ہوئے تھے۔ سامنے ہی سرسوتی نظر آگئی۔

”سرسوتی۔“ ان کا لہجہ برہمی کے تاثر سے مغلوب تھا۔

”ہاں صاحب۔“ وہ ان کے قریب تقریباً بھاگتی ہوئی آئی۔ لو کر لوگ اپنے صاحب کے موڈ کے بارے میں بہت حساس ہوتے ہیں۔

”رہنمائے کہاں ہے؟“

”اپنے کمرے قاعے صاب۔“

یاد علی خان اسی رفتار سے روشنی کے کمرے کی طرف بڑھ گئے۔

دروازے پر دستک بڑی بھرپور تھی۔ روشنی ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی تھی۔
”کون؟“

”دروازہ کھولو۔“ ان کا لہجہ غضبناک تھا۔

روشنی کا دل گویا دھڑکنے لگا۔ دروازہ تو کھولنا ہی تھا۔ اس نے تمام تر ہمت یکجا کر کے دروازہ کھول دیا۔

”السلام علیکم۔“ اس کی آواز بہت دھیمی تھی۔

”نہایت خوش آمدید۔“ اس نے ایک سوٹ نکال ہی لیا۔

”تیو کو کہاں ملی تھیں تم؟“ وہ اپنے غصے کو ضبط نہیں کر پار ہے تھے۔

”کہیں نہیں..... میں خود سرائے گئی تھی۔ شیر گل خان کے ساتھ۔“ وہ نظریں جھکا کر کہہ رہی تھی۔

”مطلب کیا ہے تمہارا ان حرکتوں سے؟ سیدھے سیدھے بات نہیں کر سکتیں۔ کیا ضرورت تھی۔ یہ ڈراما کس کے لیے؟“

”آرام سے نہیں رہا جاتا تم سے؟ اور لڑکیاں نہیں ہے۔ تم میں کوئی زیادہ سرخاب کے پر لگے ہوئے ہیں۔ مگر عذاب میں مبتلا کر رکھا ہے۔ زندگی کی سب سے بڑی سزا بن گئی ہو۔ کتنے دن اس گھر کے لوگ سوئے نہیں۔ بابا صاحب! زندگی موت کا سوال پیدا ہو گیا ہے۔ کیا تم اتنی بچی اور کم عقل ہو کہ اپنے کام کے نتائج کا اندازہ نہیں کر سکتیں۔“

”فائدہ محبتوں اور رشتوں کا جو کسی کی خوشی و زندگی کا احساس تک نہ کریں۔“ اس نے رخ موڑ کر آنسو بھرے لہجے میں کہا۔

”شٹ اپ۔ کیا کمی ہے تمہیں؟ باہر نکل کر دیکھو۔ لوگ پیٹ سے پتھر بھی باندھتے ہیں اور غلابی بھی کرتے ہیں۔“

”انسان کو اپنے پیدا ہونے پر اختیار نہیں۔ جو جہاں پیدا ہوتا ہے۔ اللہ کی مرضی سے ہوتا ہے۔ پھر اس کا ذہن اسی ماحول کا عادی ہوتا ہے۔ اگر اسے نعمتیں ملتی ہیں تو وہ ان کو اپنا پیدائشی حق سمجھ کر وصول کرتا ہے۔ اگر فاقے ملتے ہیں تو وہ اپنی بدقسمت سمجھ کر اسے قبول کر لیتا ہے۔“

جاگیرداروں میں پیدا ہونا میرا قصور نہیں، مجھے معاف کر دیجئے۔ مجھے اس بات کی سزا ضرور دے سکتے ہیں کہ میرا شوہر کیوں جاگتا ہوا ہے۔ میں مطلوبہ ڈمی کیوں نہیں۔ مجھے اپنے ہونے کا احساس کیوں ہے؟“

”بالکل بے شعور ہوتم۔ لسوں کی ناموس سے کھینچنے والی جاہل اور بے حس لڑکی۔“ وہ غرائے۔

”اقدام پر غور کیوں کرتے ہیں؟ وجہ اقدام پر کیوں غور نہیں کرتے۔ شرع اور قانون کی کون سی دفعہ یا شق ہے جس نے تحت اولاد ”انسان“ میں شامل نہیں ہوتی۔ عدالت کسی مذہب کی ہو یا بزن کے ساتھ کارروائی شروع کرتی ہے۔“

”یہ زبان درازی بے حیائی اور بے ادبی ہے۔ میں تمہیں اس دانشوری پر ایوارڈ نہیں دے سکتا۔ کان کھول کر سن لو۔“

”کا کا جان اسی لئے شاید بڑی حویلی میں کس اپ نہیں کر سکے کہ۔“

”مت لویہ نام میرے سامنے۔“ وہ عصبناک ہوئے۔

”نہیں لیتی۔ کہ مجھے پتا ہے بڑی حویلی میں ”اچھوں“ کا گزرا نہیں۔“

”روشانے! میں تمہیں شوٹ بھی کر سکتا ہوں۔ سمجھیں۔“ وہ اسی سابقہ انداز میں گویا ہوئے۔

”اس شخص کے ساتھ تمہیں دیکھ کر میری برداشت کی تمام طاقتیں جواب دے چکی ہیں۔“

”وہ آپ کے۔“

”میں نیا یا دوبارہ پیدا نہیں ہوا ہوں۔ اپنی اطلاعات اپنے پاس رکھو۔ بابا صاحب کی طبیعت ایک دور دراز میں سمجھو۔“

جائے گی۔ ہذا تم اپنا سوٹ کیس پیک رکھو۔ آج کے بعد تم میرے ساتھ رہو گی۔ میں اپنا کھیت خود کاٹوں گا۔ تم میرے باپ کو موت کے منہ میں پہنچانے کی آخری حد بھی آزما چکی ہو۔ تم نے میری رعایتوں کا ناجائز فائدہ اٹھایا ہے۔ اگر تم میرا بھگتان ہو تو میں خود بھگتوں گا۔ پھر اس کے بعد تم کبھی یہاں نہیں آؤ گی۔ تم میری اولاد ہو میں تم سے نمٹنا جانتا ہوں۔

یہ بات ذہن میں رکھتے ہوئے تیاری کرو کہ۔ یہ تمہارے دادا کا گھر ہے۔ تمہارے باپ کا نہیں۔“

وہ تیزی سے دروازہ کھول کر باہر نکل گئے۔

ماہین کھر سوتی کے ذریعے اطلاع مل چکی تھی یا در علی خان آچکے ہیں۔

یہ جان کر کہ وہ روشی کے پاس ہیں وہ افتاں و خیزاں اپنے کمرے سے باہر آ کر منزل مقصود کی سمت بڑھی تھی مگر یا در علی خان کو راستے میں پا کر ٹھک کر رک گئی۔

”اسلام علیکم۔“ اس نے قدرے جھکتے ہوئے ان کے چہرے کا بھی جائزہ لیا۔

”سلام۔“ وہ بغیر کے آگے بڑھتے گئے۔

”وہ بھی پیچھے پیچھے چل پڑی۔“

یا در علی خان نے کمرے میں داخل ہو کر شرٹ اتار کر بیڈ پر پھینکی تھی اور اسے سی آن کر دیا تھا۔

”پانی پلاؤ ماہین! بہت ٹھنڈا سا۔“ انہوں نے بنیان اتار کر صوفے پر پھینکا۔

ماہین نے بیڈروم فریج کھول کر سب سے ٹھنڈی بوتل تلاش کی۔ درحقیقت اس کے ہاتھ پاؤں پھول رہے تھے۔ آج

یا در علی خان پھر ایک نئے انداز میں سامنے آئے تھے۔

ماہین گلاس بھر کر ان کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔

”بابا صاحب کی طبیعت اب کیسی ہے؟“ انہوں نے جیسے ہی خالی گلاس اس کے ہاتھ میں تھمایا۔ اس نے فوراً دریافت کیا۔

”ٹھیک ہیں اب۔ میرا کوئی سلپنگ سوٹ نکال دو۔ میں آرام کرنا چاہتا ہوں۔“

ماہین رو بوٹ کی مانند وارڈروب کی سمت بڑھ گئی۔

سوٹ نکالتے ہوئے اس کا ذہن روشی کی طرف بھٹکنے لگا۔ اس نے سوٹ ان کو تھماتے ہوئے سوچا یہ جلدی سے لیٹ جائیگا تو روشی کی خیریت معلوم کرنے بھاگے۔ اللہ خیر کرے ان کا موڈ تو ایب نارمل ہے۔ اسے مختلف قسم کے دوسو سے ستانے

گئے۔

”میرا خیال ہے ماہین! تم روشی کو آج ہی ڈرائیور کے ساتھ ہری پور بھجوا دو۔ ہم تو کل پرسوں ہی جا سکیں گے۔“

”تم؟“ اسے جیسے اچنچا ہوا۔

”میں نہیں چاہتا۔ اب وہ بابا صاحب کے سامنے آئے۔ اسی میں سب کی بہتری ہے۔“

”اگر؟“

”کچھ نہیں کرے گی اب وہ اسٹوپڈ“۔ انہوں نے سختی سے اس کی بات کاٹ دی۔

”ٹھیک ہے۔ میرے خیال میں ابھی وہ آرام کر رہی ہے۔ تھوڑی دیر میں۔“

”اچھا..... اچھا..... ایسا کرؤ یہ پردے کھینچ دو۔ اندھیرا کر دو کمرے میں ٹھیکس۔“

وہ سلپنگ سوٹ اٹھا کر باتھ روم میں چلے گئے۔ اس نے پردے کھینچے اور بیڈ روم سے باہر آگئی۔ سوچنے لگی۔

سب لڑکیاں مغموم صورت بنائے بیٹھی تھیں۔

”آیا تو کروگی ناں روشی“۔ روبی نے انتہائی غمناک انداز میں پوچھا۔

”ہاں نہیں۔“ اس نے بڑے سے سوٹ کیس میں اپنے کپڑے لگاتے ہوئے کم صم سے انداز میں جواب دیا۔

”جاکو رہی ہو؟“ تانیہ ہاتھوں کے پیالے میں ٹھوڑی ٹکائے اداسی سے گویا ہوئی۔

”ہاں نہیں۔“

”کیا تمہاری شادی وہیں ہوگی؟“ بیہ نے اپنے غرارے شرارے کے تصور میں ڈوب کر پوچھا۔

روشی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ڈریسنگ ٹیبل سے چیزیں اٹھا اٹھا کو ایک بیگ میں بھرنے لگی۔ اس کے چہرے پر ہلکا سا

سکون تھا۔

ماہین اس کی تیاری کے مراحل چیک کرنے کے خیال سے کمرے میں آئی تھی۔

”تیار ہو گئیں روشی؟“

”میں کا جان سے بات کرنا چاہتی ہوں خالہ۔ وہ یہاں ہیں یا ہاسپٹل میں؟“ اس نے روبی سے استفسار کیا۔

”وہ تو تمہیں چھوڑنے کے فوراً بعد دوبارہ ہاسپٹل چلے گئے تھے۔“ اس نے جواب دیا۔

”کوئی بات ہے تو باری سے کہہ دو۔ وہ ادھر میج دیدے گا۔“ ماہین نے حل بتایا۔

وہ خاموشی سے چیزیں بیگ میں ڈالتی رہی۔

”بلواؤں باری کو۔ ہو سکتا ہے تھوڑی دیر بعد ہاسپٹل چلا جائے۔“ ماہین نے پھر پوچھا۔

”نہیں۔“ اس نے ہر ایک سے نگاہ چرا کر بیگ بند کیا۔ اور ڈریسنگ ٹیبل کی درازیں کھول کھول کر دیکھنے لگی۔

”بابا! بیٹھ کر دو چار باتیں بھی کر لو۔ اگر کچھ رہ بھی گیا تو بعد میں لے جانا۔“ گلو کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔

”ساری باتیں ہی ختم ہو گئیں۔ کچھ یاد ہی نہیں آ رہا۔ کیا باتیں کریں آپا۔“ وہ مسکراتی ہوئی ان کے قریب چلی آئی۔

”اچھا یہ بتاؤ“ کا جان والا گھر کیسا لگا؟“ گلو نے پیار سے اس کے ہاتھ تھام لئے۔

”اندھے تو دیکھا نہیں۔ جس گیسٹ روم میں میرا قیام تھا۔ اس سے البتہ انداز ہو گیا تھا کہ گھر اندر سے کیسا ہوگا۔“

”ایک دفعہ بھی اندر نہیں گئیں؟“ تانیہ نے تعجب سے اس کی بات کاٹ دی۔

”لگتا ہے پاپا اور کان جان میں زبردست ٹینشن ہے۔ پھر بھی کا جان“ ”مڈ دل“ حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے۔

”میں نے سب سے ان کی وائف مجھ سے مس بی ہو کر تیں۔ اسی خدشے کے سبب انہوں نے مجھ سے ملوایا نہیں، خیر ہمیں کیا۔ ہمیں

”میں نے سب سے مطلب ہے۔“

”ہم نے تو کبھی مل نہیں کیا کہ یاد ر ماموں اور کا کا جان میں کوئی ٹینشن ہے۔ کا کا جان کا تو اسٹائل ہی ہمیشہ سے ایسا

”میں نے سب سے مطلب ہے۔“

”میں نے سب سے مطلب ہے۔“

”میں نے سب سے مطلب ہے۔“

”میں نے سب سے مطلب ہے۔“

”میں نے سب سے مطلب ہے۔“

”میں نے سب سے مطلب ہے۔“

”میں نے سب سے مطلب ہے۔“

”میں نے سب سے مطلب ہے۔“

”میں نے سب سے مطلب ہے۔“

”میں نے سب سے مطلب ہے۔“

”میں نے سب سے مطلب ہے۔“

”میں نے سب سے مطلب ہے۔“

”میں نے سب سے مطلب ہے۔“

”میں نے سب سے مطلب ہے۔“

”میں نے سب سے مطلب ہے۔“

”میں نے سب سے مطلب ہے۔“

”میں نے سب سے مطلب ہے۔“

”میں نے سب سے مطلب ہے۔“

”میں نے سب سے مطلب ہے۔“

”میں نے سب سے مطلب ہے۔“

”میں نے سب سے مطلب ہے۔“

”میں نے سب سے مطلب ہے۔“

”میں نے سب سے مطلب ہے۔“

”میں نے سب سے مطلب ہے۔“

”میں نے سب سے مطلب ہے۔“

”ہاں ہو گئی جب ہی تو“۔ ماہین نے معنی خیز انداز میں بات ادھوری چھوڑ دی۔

”باقی تو سب ٹھیک ہے؟“ اس کی تشویش صرف روشنی سمجھ رہی تھی۔ وہ بایک سے نیچے اتر آیا تھا۔

”بیہ! کھوکھر سے کہہ دیا کہ روشنی کے کمرے سے سامان لے آئے“۔ ماہین نے بیہ سے دریافت کیا۔

”جی“۔

”کس کے ساتھ جارہی ہیں روشنی بی بی؟“ باری نے ماہین سے پوچھا۔

”ڈرائیور کے ساتھ“۔ ماہین نے جواب دیا۔

”بہت جلدی ہے کیا“۔ وہ پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈال کر کھڑا ہو گیا۔ وہ نہادھو کر کپڑے بدل چکا تھا۔ جس سے
تھا اسے خاصی دیر ہو گئی حویلی آئے ہوئے۔

”ہاں شاید..... چلو روشنی بیٹھو..... گھبرانا نہیں۔ ہم پرسوں انشاء اللہ پہنچ جائیں گے“۔ ماہین نے روشنی سے کہا۔

روشنی پچھلا دروازہ کھول کر بیٹھ گئی۔ اس نے وہاں موجود لڑکیوں میں سے کسی سے بات نہیں کی تھی۔

تھوڑی دیر میں کھوکھر اس کا سوٹ کیس اور بیک لے کر آ گیا۔

باری نے چورنگا ہوں سے روشنی کی سمت دیکھا پھر لڑکیوں پر نظر ڈالی۔ چند ٹاپے کچھ سوچا پھر بایک سے چابی کھڑا

کی طرف بڑھ گیا۔

”یہ سب لڑکیاں کہاں ہیں۔ کچھ پتا ہے؟“ معنیو سامنے آ گئیں۔

”وہ روشنی بی بی کو الوداع کہہ رہی ہیں باہر پور فیکو میں“۔ اس نے مختصر کہا۔

”اب کہاں جارہی ہیں موصوف؟“ معنیو ہکا بکا رہ گئیں۔

”ہری پور“۔ اس نے پھر اختصار سے کام لیا۔

”مگر یاد رکھو ماموں اور ممانی تو یہیں ہیں“۔ ان کی حیرت قابل دید تھی۔

”یاد رکھنا چکا کے حکم پر ہی روانگی ہو رہی ہے“۔ اس نے جان چھڑانے والے انداز میں جواب دیا۔

”لیکن کس کے ساتھ جارہی ہے؟“ ان کی حیرت بدستور تھی۔

”ڈرائیور کے ساتھ“۔ وہ یہ کہہ کر آگے بڑھا۔

”تم چھوڑ آتے۔ کیا یہ مزید خطرہ مول لینے والی بات نہیں ہے“۔ ان کے طویل جملے نے اسے آگے بڑھنے سے روکا۔

”اب کوئی خطرہ نہیں ہے۔ آپ اطمینان رکھیں“۔ وہ جانے کس دھن میں کہہ گیا۔

”اچھا“۔ ان کا انداز بلا کا معنی خیز تھا ”تمہاری“ ”باخبری“ ”پر تو ہمیں رشک آتا“۔ وہ دھیمے سروں میں ہنس پڑا۔

باری ایک دم کانٹھس ہو گیا۔

”باری..... اب تو وہ غالباً وہیں رہے گی؟“ معنیو کی آنکھیں تک مسکرا رہی تھی۔

”تو یہاں ان کے باپ کا گھر ہے“۔ وہ بھی زبردستی مسکرایا اور تیزی سے آگے بڑھ گیا۔ مبادا کوئی اور جملہ آجائے۔
دھیمے مسکراہٹ دباتے ہوئے برآمدے کے زینے اترنے لگیں۔

”کون ہے یہ لڑکی؟“ عالم تاب سخت لہجے میں کھوکھر سے مخاطب تھیں۔

”جی..... وہ ماہین بی بی کی ملنے والی ہیں اور تو مجھے پتا نہیں“۔ کھوکھر گھمبیر رہی تھی۔

”ہاں اور انداز میں پڑی کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھی ہوئی کیلے بال سلجھا رہی تھی۔ اسے یہاں کے قاعدے قوانین کا

بہاؤ اور ادراک تھا۔ اس نے بال سلجھانے کے دوران ہی بیٹھے بیٹھے سونے جواہر سے دکتی دکتی عورت کو اپنے حساب سے اس

جوبلی کی اہم شخصیت سمجھتے ہوئے سلام کر لیا تھا۔ عالم تاب کی شاہانہ نازک طبع پر اس کا یہ انداز بہت گراں گزرا تھا۔ اس لئے

لہجے میں خود بخود سختی آ گئی تھی۔

”کہاں سے آئی ہو تم؟“ وہ سرد مہری سے گویا ہوئیں۔

”کراچی سے“۔ اس نے ہاتھ روک لئے۔

”میرا مطلب ہے تمہاری ہوئی کہاں ہو؟“ وہ جیسے چڑ گئیں۔

”جی۔ سیدھی یہیں آئی ہوں؟“ وہ قدرے ہچکچائی۔

”اوہ..... ماہین سے ملاقات ہو گئی؟ کیسے جانتی ہو ماہین کو؟“

”جی..... وہ“۔ اسے ماہین کی ہدایات یاد آ گئیں۔ ”آپ ان سے پوچھ لیں۔ انہیں سب پتا ہے۔“ وہ بس یہی کہہ سکی۔

”کیا مطلب؟ تمہیں اپنا نہیں پتا؟“ تعجب سے ان کی ہنسیوں اور چڑھ گئیں وہ خاموش رہی۔

”بلا کے لاؤں ماہین بی بی کو“۔ کھوکھر نے خدمات پیش کیں۔

”نہیں۔ میں خود جارہی ہوں ان کے پاس۔ تم بھی کتنی چوٹی کر کے وہیں آ جانا“۔

ماہین بی بی ہال میں ہیں جی۔ یاد رکھنا سورہے ہیں ناں“۔

”یاد رکھ آئے؟“ عالم تاب چوٹیں۔

”تو یہاں رہو گئی ہے آپ آرام کر رہی تھیں۔ روشنی بی بی کو سب خدا حافظ کہہ کر ہال میں بیٹھی ہوئی ہیں چائے بنانے جا

رہی ہیں۔ سب کیلئے آپ کیلئے بناؤں؟“ کھوکھر کے سخت موڈ کو جلد سے جلد نرم دیکھنا چاہ رہی تھی۔

”سب ہی کو ان کے آف موڈ سے ڈر لگا تھا کہ قصور وار بے قصور سب ہی کی شامت آ جاتی تھی۔

”نہیں“۔ وہ ہال پر ایک تفصیلی نظر ڈال کر ہال کی طرف بڑھ گئیں۔

”سب انہیں ہال میں موجود پا کر ایک دم سنبھل گئیں۔

”یہاں کے ہچکل سے؟ کیا کہہ رہی تھے؟“ وہ ماہین سے مخاطب ہوئیں۔

”کہہ رہے تھے اب تو حالت کنٹرول میں ہے فکر کی کوئی بات نہیں“۔

”یہ لڑکی کون ہے؟“ وہ فوراً اپنے مقصد کی طرف آگئیں۔

”کون؟“ ماہین نے بے ساختہ ادھر ادھر دیکھا۔

”وہ جو نہادھو کر غالباً تمہارے کپڑے پہنے باہر بیٹھی ہے۔“ وہ بڑے غور سے ماہین کو دیکھ رہی تھیں۔

”اوہ۔“ ماہین کو یکدم دھیان آگیا۔ اس نے فوراً عالم تاب کا چہرہ دیکھا۔ انہیں اپنی جانب دیکھتا پا کر بیڑے اترے۔

”جی۔ ہماری جاننے والی ہے۔“

”جاننے والی۔ کیا مطلب؟“ وہ الجھ گئیں۔

”کراچی سے آئی ہے۔“

”ہاں ہاں۔ وہ تو مجھے پتا چل گیا ہے۔“ وہ بات اچک کر بولیں۔

”ہماری کام کرنے والی ہے ناں اس کی بہن ہے۔“

”مگر یہاں کیا کرنے آئی ہے؟“ ان کی حیرت بجا تھی۔

”اپنے کسی سسرالی رشتے دار کے ہاں آئی تھی۔ اس کا گھر نہیں ملا۔ احتیاطاً میرا پتا لے آئی تھی۔ اس لئے یہاں مل گئی۔“

لگتا ہے اس کے ساتھ کوئی مسئلہ ہے یا اس کے حالات خراب ہیں۔ آپ فکر نہ کریں۔ چلی جائیگی۔“ ماہین نے بہت سہجے جواب دیا۔

”نہیں خیر اس کے یہاں رہنے سے مجھے کیا فرق پڑتا ہے۔ اتنے نوکر پھر ان کی آل اولاد مجھے تو کتنوں کی تعداد میں نہیں۔ ایک یہ بھی ہوئی۔ وہ تو میں اس لئے پوچھ رہی تھی کہ بالکل نیا چہرہ۔ مقامی بھی نہیں لگ رہی تھی۔“

ماہین نے طمانیت کا گہرا سانس لیا۔

عالم تاب ہال سے باہر چلی گئیں۔ کچھ سوچ کر ماہین بھی انھی اور پیچھے پیچھے چل پڑی۔ کچن سے ملحق راہداری میں بال اور کلو باتیں بتا رہی تھی۔

”کلو! اسے ناشتا کرو اور سب سے اوپر جہاں تمہارا کمرہ ہے۔ وہاں کسی کمرے میں اسے پہنچا دو۔ اتنا لبا سز کر آئی ہے تھک گئی ہوگی۔“

”بالو..... تم ناشتا کر کے آرام کرو اور بالکل فکر نہ کرنا تمہارا کام میں کردوں گی۔ بس اس بات کا دھیان رکھنا جو مجھ سے کہا ہے۔ کسی اور سے نہ کہنا اور نہ تمہارا کام کبھی بھی نہیں ہو سکے گا اور تمہیں ایسے ہی واپس جانا ہوگا پھر..... سمجھ رہی ہو۔ میری بات۔“

اس نے بالو کی شکل دیکھی۔ کلو وہاں سے جا چکی تھی۔

”جی..... جی۔“ بالو چوٹی میں بل ڈالنے لگی۔

مطربہ کے حوالے سے وہ اس کیلئے بہت اہم ہو گئی تھی۔ اس کی بہن عجیب پر اسرار انداز میں دنیا چھوڑ گئی تھی۔

”بیک بات ایک ایک حرکت اسے چونکا رہی تھی محض یہی ایک بات اسے پہلی بار کشاں کشاں دریا بستی کھینچ لائی تھی۔“

”بیک بات پوچھوں تم سے؟“ اچانک اسے دھیان آیا۔

”جی پوچھئے۔“ بالو نے گم صم سے انداز میں جواب دیا۔

”تمہارا چہرہ بالکل کم عمر لڑکیوں جیسا ہے لیکن جب تم میرے کمرے سے نکل رہی تھیں۔ مجھے جانے کیوں محسوس ہوا کہ تم

بڑی شہر ہو۔“ ماہین کی آواز بہت دھیمی تھی۔

بالو نے چونک کر ماہین کی شکل دیکھی۔ پھر ایک دم نظریں جھکا لیں۔

”آپ کے کتنے بچے ہیں بیگم صاحبہ؟“

”ایک بھی نہیں۔“ اس نے زیادہ لمبی بات کرنا مناسب نہ سمجھا۔

”پھر بھی آپ کی نگاہ۔“ وہ جھجک کر رک گئی۔

”وہ بزرگ کہتے ہیں کہ ”یہاں نہیں کیا بارائیں تو دیکھی ہیں۔“ یہ کوئی ایسی مشکل بات تو نہیں۔“

”میں اس لئے بھی پوچھ رہی تھی کہ مجھے تمہارے حالات سے مکمل طور پر باخبر ہونا چاہیے۔ ورنہ میرے اپنے لئے مسئلہ ہو سکتا ہے۔“

”وہاں ہمارے ہاں کراچی میں ایک سیانی ہے مائی خیراں۔ بڑا اچھا علاج کرتی ہے۔ کتنی بے اولاد عورتیں۔“

”(لا حول ولا قوۃ) تم ناشتا کر کے اوپر آرام کرو۔ میں موقع مناسب دیکھ کر تمہیں بلواؤں گی۔ جب تک میں نہ بلاؤں“

نچ مت آنا۔ ٹھیک؟“

اس نے فطری انداز میں جھجک کر اس کی بات کاٹ دی تھی۔

”ٹھیک ہے۔ جیسے آپ کہیں گی ویسے ہی کروں گی۔“ بالو نے کنگھے سے بال نکال کر تھکا کرنا شروع کیا۔

ماہین دوبارہ ہال کی صحت پر مدد گئی تھی۔

اس نے کلو کو بالو کا خیال رکھنے کی ہدایت کر دی تھی۔ اسے بس رات کا انتظار تھا پچھلی رات کیونکہ بہت پریشان گزری تھی۔

بازار میں سب جلد ہی اپنے کمروں میں چلے گئے تھے۔

بازار میں سب جلد ہی اپنے کمروں میں چلے گئے تھے۔

”کافی تھوڑا آپ کیلئے؟“ اس نے یونہی پوچھ لیا تھا۔ آخر نا تم بھی تو گزارنا تھا۔

”میں تو نہیں ہے۔ سونا چاہو تو سو سکتی ہو۔“

اس نے محض نوٹس ا

نہیں دیا۔ نہ ہی بد امنایا بلکہ شاید اسے اچھا لگا تھا۔ حقیقی قربت کا احساس جاگ اٹھا تھا۔

اکثر اوقات تو وہ اسے اتنے پر تکلف محسوس ہوئے تھے کہ لگتا تھا ان کے آفس میں بیٹھی ہوئی ہو۔
 ”فی الحال تو نیند نہیں آرہی۔ شاید روشنی بھی جاگ رہی ہو۔ فون کر لوں اسے؟“
 ”کیا ضروری ہے؟ اتنے نخرے مت اٹھاؤ۔ اس کا آل ریڈی دماغ خراب ہے۔“
 انہوں نے کوفت بھرے انداز میں کہا۔

”اول..... ہوں..... یوں نہ کہیے۔ سب کی سنا چاہیے۔ جانا کیا ہے۔“

”اب آپ موصوفہ اپنی وکالت سے میری رات کالی کر رہی تھیں؟ جائیے کر لیجئے۔“

انہوں نے جیسے جان چھڑائی۔ یا پھر یہ کہ کوئی سوٹ کارز موجود تھا۔

”ٹھیکس۔“ اس نے جانے سے پہلے فریج سے چھوٹا سا پانی کا جگ نکال کر ان کے قریب رکھا۔ ساتھ ہی

اور خاموشی سے دروازہ کھول کر باہر آگئی۔

ہال میں آئی تو دیکھا۔ باری فون کرنے میں مصروف تھا۔ سرسوتی سمیٹا سٹائی میں مصروف تھی جس سے

اوپر ”مہمان“ کے ساتھ باتیں بنا رہی ہے۔

”صبح ہو سکتے ہیں یہ سب کام۔ تمہیں صبح سب سے پہلے اٹھنا ہوتا ہے۔ سو جایا کرو۔“ اس نے ہمدردانہ انداز میں

”کہاں اٹھتی ہے یہ صبح۔ ماما بلی سے پوچھئے کس طرح اٹھاتی ہیں اسے؟“

باری نے ڈائل کرنے کا عمل موقوف کیا اور ریسیور کان سے ہٹالیا۔

”خیریت ہے ناں؟“ اس نے مایہن سے استفسار کیا۔

”ہاں خیریت ہے۔ بس وہ ایک فون کرنا تھا ہری پور۔ روشنی کو۔ مجھے یقین ہے وہ جاگ رہی ہوگی۔“ وہ زور سے

پر بیٹھے ہوئے بولی۔

”مجھے بھی یقین ہے۔“ وہ بے ساختہ انداز میں گویا ہوا تھا۔ مگر اپنی بے ساختگی پر شرمندہ نہیں تھا۔

مایہن نے بغور اس کا چہرہ دیکھا تھا۔

”بڑی خوار ہے لڑکی۔ بس کرو۔“ وہ ہنس رہی تھی۔

”ذرا ڈائل تو کرو۔ کہیں ریکارڈنگ تو نہیں لگی ہوئی۔ السلام علیکم اطلاقاً عرض ہے اس وقت تمام لائنیں بند ہیں۔“

مہربانی تھوڑی دیر بعد ڈائل کیجئے۔“ اس نے بڑے انداز سے نقل اتاری۔

باری بڑے بھرپور انداز میں ہنس دیا۔ پھر نمبر ڈائل کرنے لگا۔

”کیا بات ہے بڑے خوش نظر آ رہے ہو۔“ مایہن نے کچھ محسوس کر ہی لیا تھا۔

”خوش رہنا چاہیے۔ اگر نہیں تو خوش رہنے کی کوشش کرنی چاہیے۔“ وہ نمبر ملاتے ہوئے بھی جواب دینے سے

”جناب۔ مسز یاد علی خان مس روشانی سے بات کر رہی تھی۔“ نمبر مل گیا تھا۔

”آجائے۔“ ہولڈ کر لیا ہوا ہے۔ بڑی خوبصورت دھن لگی ہوئی ہے۔“ اس نے مایہن کو بلایا۔

”جیسے تمہاری بات کرنا مال چال پوچھ لو۔“ وہ مسکراتی ہوئی قریب آگئی۔

”اب بھی چہرہ کر رہی تھی؟“ اس نے ریسیور مایہن کو تھما دیا۔

”ہاں ہنسنے ہے۔“ اس نے مسکراتے ہوئے ریسیور کان سے لگا لیا۔

باری دین بیٹہ کر اخبار ابٹ پلٹ کرنے لگا۔

”ہوں۔“ دیکھ السلام۔“

”سوئی تھی۔ سو سو سو۔“ رینا دیری سو سو۔“ باری دی وے۔ کیا یہ ٹیکو لائزر کا کمال ہے۔ ہمارا تو خیال تھا شاید تم تہذیبی

”نہ زری بند سو سو تھی؟ یہ تو بہت اچھی بات ہے اس کا مطلب ہے کہ بالکل بھی ٹینس نہیں ہو۔ ویری گڈ ہونا بھی نہیں

پہلے یہ سن کر بہت خوش ہوئی۔“

”ٹیک ہے۔ ان کے موڈ کا کچھ پتا نہیں چلتا۔ نہیں تم سے متعلق انہوں نے مجھ سے کوئی بات نہیں کی۔“

”ہاں ہے بات کرو گی؟“ مایہن نے باری کی سمت دیکھا جس نے جھکا سر اٹھا کر کوئی تاثر نہیں دیا۔

”ہاں ہیں۔ ہال میں مجھ سے چندفٹ کے فاصلے پر۔ نہیں۔ مرضی ہے تمہاری۔ اچھا چلو اب تم سو جاؤ۔ مجھے تمہاری

”نہی معلوم کرنا تھی۔ اوکے۔ اللہ حافظ۔“ اس نے ریسیور اٹکا دیا۔

”اچھا جناب۔ اب خبر لینا ہے تمہاری۔ مجھے سے چھپانے کی کیا ضرورت تھی کہ روشنی سرائے میں بحفاظت موجود ہے۔“

”لب بھالی بیگم نے بتایا تو مجھے واقعی تم پر بہت غصہ آیا۔ تم بھی ڈرامہ کرتے ہو.....؟“

”یوں کہ چھپانے والی بات تھی؟ وہ اپنے حقیقی چچا کے ہاں تھی جبکہ وہ گئی سی وہیں تھی۔ درمیان میں کوئی بلینڈر بھی نہیں

”ہاں۔“

”تو کہ جب اس پر انکشاف ہوا تھا تو اس نے فوراً باری سے متعلق براگمان نہیں کیا تھا..... یہی دھیان آیا تھا کہ سرائے

”تو کہ جب اس پر انکشاف ہوا تھا تو اس نے فوراً باری سے متعلق براگمان نہیں کیا تھا..... یہی دھیان آیا تھا کہ سرائے

”تو کہ جب اس پر انکشاف ہوا تھا تو اس نے فوراً باری سے متعلق براگمان نہیں کیا تھا..... یہی دھیان آیا تھا کہ سرائے

”تو کہ جب اس پر انکشاف ہوا تھا تو اس نے فوراً باری سے متعلق براگمان نہیں کیا تھا..... یہی دھیان آیا تھا کہ سرائے

”تو کہ جب اس پر انکشاف ہوا تھا تو اس نے فوراً باری سے متعلق براگمان نہیں کیا تھا..... یہی دھیان آیا تھا کہ سرائے

”تو کہ جب اس پر انکشاف ہوا تھا تو اس نے فوراً باری سے متعلق براگمان نہیں کیا تھا..... یہی دھیان آیا تھا کہ سرائے

”تو کہ جب اس پر انکشاف ہوا تھا تو اس نے فوراً باری سے متعلق براگمان نہیں کیا تھا..... یہی دھیان آیا تھا کہ سرائے

”تو کہ جب اس پر انکشاف ہوا تھا تو اس نے فوراً باری سے متعلق براگمان نہیں کیا تھا..... یہی دھیان آیا تھا کہ سرائے

”تو کہ جب اس پر انکشاف ہوا تھا تو اس نے فوراً باری سے متعلق براگمان نہیں کیا تھا..... یہی دھیان آیا تھا کہ سرائے

”ویسے باری۔ یہ تیمور علی خان کی شخصیت کچھ مسٹر لیس ی نہیں ہے؟ مجھے تو بہت عجیب غریب مر رہا ہے۔ یا تو اس موضوع پر بات ہی نہیں کرتے۔ شاید ان کے درمیان کوئی پر اپنی ڈس بیوٹ (تنازعہ) ہے۔“ جی میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ یقین کیجئے میں یہاں بھی اتنا اناؤں نہیں ہوں جتنا آپ سمجھ رہی ہیں۔“ لوگوں کو چونک کر بولا تھا۔

ماہین چونکہ اسے بغور دیکھ رہی تھی۔ اس لئے گہرا سانس لے کر ایزی ہو گئی۔

”ستو باری۔“ بنے بنائے ”کو نہیں بناتے۔“ اس کے انداز میں شکایت تھی۔

”خدا خواستہ..... یہ مجال نہیں ہے میری آپ تو ماشاء اللہ بہت جینکس ہیں۔“ وہ مسکراتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

”تم بھی تو کوئی نمبر ڈائل کر رہے تھے جب میں نے مداخلت کی تھی۔ پھر تم نے دوبارہ ڈائل نہیں کیا۔ کیا مجھے؟“

ماہین نے یاد دلایا۔

”نہیں..... پوسٹ پونڈ کر دیا ہے۔ شاید میرا دوست سوچکا ہو۔“ اس نے جیسے بات کی نہیں۔ بلکہ اڑا لی۔

”معا ملے میں بہت کانشس ہوتے ہیں۔ ان کی ٹائمنگ کا خیال رکھتے ہیں۔“ ماہین نے معنی خیز انداز میں اسے لہجہ ”یاد رکھوں گا۔“ وہ مسکرا دیا۔

”تم سوتے کب ہو؟“ جاتے جاتے وہ پلٹ آئی۔

”خیریت؟“ وہ الجھا۔

”ویسے ہی پوچھ رہی تھی۔ کیونکہ ہمیشہ جاگتے ہوئے ہی ملتے ہو۔“ وہ بولی۔

”سوتا بھی ہوں مگر بڑی جلدی فریش ہو جاتا ہوں۔ مجھے لمبی نیند کی خواہش نہیں ہوتی۔ ہمیشہ سے۔ اب سنا

رہا ہوں صبح پانچ بجے اٹھ جاؤں گا۔ لیکن آپ کا جاگنا معنی خیز ہے۔ اب تو الحمد للہ سب خیریت ہے۔“

”ہاں۔ خیر اللہ کا شکر ہے۔ ویسے ہی کبھی کبھی نیند نہیں آتی۔ اچھا شب بخیر۔“ وہ باہر آ گئی۔

سرسوتی پگن میں برتن دھو رہی تھی۔

”سرسوتی۔ دیکھو اوپر سے کلو اور مہمان کو بلا لاؤ۔ میں یہیں ہوں ادھر ہی لے آؤ۔“

سرسوتی ہاتھ دھو کر فوراً چلی گئی۔ ماہین فریج سے پانی نکال کر پینے لگی۔

وہ سارا دن اپنی سرگرمیوں میں مصروف رہی تھی مگر ایک لمحے کیلئے بھی اس کا ذہن بالو کی طرف سے نہیں ہٹا۔

ذہن تجسس کے دائرے میں گھوم رہا تھا۔ اتنی دور سے یہ مطربہ کی تلاش میں کیوں آئی ہے۔ اس عورت کی تلاش میں

نظر میں برسوں پہلے مرچکی۔ اس لڑکی کا کیا انٹرسٹ؟ ایک بے دست و پا عورت اس کے کس کام کی؟

وہ کرسی پر بیٹھ کر تانے بانے بننے لگی کہ اسے کس کس پوائنٹ پر بات کرنا ہے۔ اور آج ہر صورت مطربہ کے راز سے

اٹھانا ہے۔ کہ ان راہوں سے گزرتے ہوئے ہو سکتا ہے۔ اسے تازنین کے بارے میں کچھ پتا چل جائے۔

تین اس سے حاصل کیا ہوگا۔ جو پردے میں ہے وہ پردے سے باہر آ بھی گیا تو کیا ہوگا۔ وہ کیا کر سکتی ہے۔ وہ کیا کر

سکتی ہے۔ شاید کوئی بڑا نقصان ہو جائے۔ شاید کوئی بڑا فائدہ ہو جائے کہ غیر واضح ذہن بھی تو انسان کی توانائیاں توڑتا رہتا ہے۔

نہ کو زندگی کے اگلے راستے واضح نظر آرہے ہوں تو اس کے حال اور مستقبل کے احساس میں ایک سکون کا احساس در آتا

ہے۔ خواہ نقصان کے سودے ہی ملے ہو مگر ایک ذہن بن جاتا ہے اور پھر وہ تو ایک متوازن اور آرام دہ ماحول میں پلٹی ہوئی

نہی۔ اسے تو معمولی ٹینس بھی بھاری گزرتا تھا۔ شاید اس کی حقیقی بہن کا معاملہ نہ ہوتا تو وہ یہاں کی کسی بات کا گہرائی سے

باز بھی نہ لیتی۔

بس کچھ تھا جو اسے محسوس ہوتا تھا۔

حالانکہ جس کی سمت دیکھتی تھی وہ بڑا پاک صاف اور غیر جانبدار نظر آتا تھا۔ پھر بھی جانے کیا محسوس کرتی تھی۔ اس

حساس سے بڑی وحشت ہوتی تھی کہ یہاں ہر معاملے میں غیر ضروری رازداری برتی جاتی تھی۔ وہ تو اس سوچ کی حامل تھی کہ

بہ انسان پسند نہیں کرتا تو کانشس بھی نہیں ہوتا۔

”جی بی بی!“ اسے کلو کی آواز آئی۔

اس نے اپنے دھیان سے باہر آ کر ان کی سمت چند ٹاپے خالی خالی نظروں سے دیکھا۔

”ہاں..... تم جاؤ۔ کلو آرام کرو۔ آؤ بالو! تم یہاں بیٹھو۔ سرسوتی تم جلدی سے اپنے برتن نمٹالو۔ پھر پیچھے چلنا ہے۔“

کلو باہر نکل گئی۔ مگر چند لمحوں کے بعد اگلے قدموں اندر آئی۔

”بی بی۔ یاد رہا ناں بلار ہے ہیں آپ کو۔“

”اوہ۔ ائی گاڈ!“ اس نے پیشانی پر ہاتھ مارا۔ بالکل بھی دھیان نہیں رہا کہ انہیں جاگتا چھوڑ کر آئی تھی۔

”ابھی آئی ہوں۔ تم لوگ یہیں میرا انتظار کرو۔“

”یہ کون ہیں جو آپ کو بلار ہے ہیں؟“ بالو نے پونی کسی ہوئی ماہین سے استفسار کیا

”نہیں ہیں میرے۔ اور اس وقت کس کی ہمت ہو سکتی ہے بلانے کی؟“ وہ ہنستی ہوئی باہر چلی گئی۔

اس چھوٹے سے دل و دماغ والی لڑکی نے کتنے رشک سے اس کی سمت دیکھا تھا۔

”کتنی خوش ہیں یہ۔ ان کامیاب ہوگا۔ ایسا کہ وہ خوش ہوں۔“ اسے جانے کیا کیا یاد آ گیا۔ آنکھوں کے کنارے بھیگنے

لگے۔

تین بہت تیز چلتی ہوئی بیڈروم میں آئی تھی۔ اندر ٹائٹ بلب جل رہا تھا۔

”کئی خیریت؟“

”خیریت کیا۔ آرام کیا کرو۔ کیا کر رہی ہو؟“ انہوں نے کروٹ بدل کر اس کی سمت دیکھا۔

”میں ذرا ہال میں ہوں۔ ابھی آکر سوتی ہوں۔“ اس نے دروازے کے نزدیک کھڑے کھڑے جواب دیا۔
”ہال میں کیا ہو رہا ہے؟ کیا لڑکیاں ابھی تک جاگ رہی ہیں؟“

”کچھ نہیں ہو رہا۔ بس میں ابھی تھوڑی دیر میں آتی ہوں۔“ اس نے جانے کے ارادے سے قدم بڑھائے۔
”ٹھیک ہے؟“

”اچھا اچھا۔ یہ ٹائٹ بلب بند کرتی جانا۔ پلیز۔“

”ماہین نے ٹائٹ بلب آف کر دیا اور باہر آ گئی۔“

”بالو اور سرسوتی اس کی منتظر تھیں۔ حسب ہدایت کولڈ ڈرنک کی لیٹر بوتل سرسوتی سینے سے لگائے کھڑی تھی۔
”چلو۔“ اس کے سینے میں ایک آتش شوق بھڑکنے لگی تھی۔

وہ دونوں خاموشی سے اس کے پیچھے چل پڑیں۔

چند منٹ کی واک کے بعد اپنی منزل تک پہنچ گئیں۔

جھومر انہیں راہداری ہی میں مل گئی۔ اس نے قدرے حیرت سے بالو کی سمت دیکھا جو ماہین کے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔
لہذا اس پر نوکرائی کا احتمال نہیں ہو رہا تھا۔

”السلام علیکم۔“ اس نے ماہین کو سلام کیا تھا۔

”وعلیکم السلام۔ ٹھیک ہو؟“

”جی۔ الحمد للہ۔ آپ سائیں بزرگوار کیسے ہیں؟“ وہ عجب سرخوشی میں مسکرا رہی تھی۔

”اللہ کا شکر ہے۔ خطرے سے باہر ہیں۔ تم کہاں دیرانے میں چہل قدمی کرتی پھر رہی ہو؟“ ماہین نے بھی ٹکا ہوا
ایک نگاہ ڈالی۔

”بس جی قسمت میں یہی لکھا ہے۔“ وہ بالو کی سمت دیکھنے لگی۔

”کیا یہ؟“ بالو نے ماہین کی سمت ہنچکاتے ہوئے دیکھا۔

”نہیں نہیں۔ یہ مطربہ نہیں ہے۔ اسے دیکھ کر تو تمہیں بہت دکھ ہوگا۔ جھومر۔ مطربہ کو لے آؤ اپنے کمرے میں۔“
نے کہا۔

”آج تو بہت ہی ناممکن ہے۔ خان باری خود تالا لگا کر گئے ہیں۔ ان سے چابی کون لائے۔ سنبھالنا بھی نہیں ہے۔“
کراڑا لائیں۔“

”اوہ۔ یہ تو مسئلہ ہو گیا۔“ ماہین الجھن میں پڑ گئی۔ ”یہ تو بے چاری دور دراز سے دھکے کھاتی مطربہ سے ملنے آئی ہے۔“
سارا وزن ”بے چاری“ پر پڑا وہ اپنے شوق و تجسس کا تواظہار کر نہیں سکتی تھی۔

”پھر اب کیا کریں؟“ وہ خود کلامی کے انداز میں بولی۔

”کیا اسے یہاں قید میں رکھا ہوا ہے۔ عارف بھائی تو۔“ بالو کچھ کہتے کہتے رک گئی۔

”تو زسالی بی بی۔“ سرسوتی نے خدمات پیش کیں۔
”ہاں۔ چلو تو دو اس کے علاوہ کوئی چارہ بھی تو نہیں ہے پہلے ایسا کرو پھانک بند کر آؤ تاکہ شور باہر نہ جائے۔“ ماہین

نے کہا۔

”نہیں باری۔ وہ۔ مجھ پر چڑھائی کر دے گا۔“ جھومر نے منہ بنا کر کہا۔

”تم کو نہیں کرو۔ میں اس سے خود بات کر لوں گا۔“ ماہین نے تسلی دی۔

”جاؤ تم کوئی بھاری سا پتھر لے آؤ۔“ اس نے سرسوتی سے کہا۔ وہ بے چاری پتھر کی تلاش میں چل پڑی۔

”یہ کہاں سے آئی ہیں؟“ جھومر نے بالو کی بابت دریافت کیا۔

”کراچی سے۔“ ماہین نے مختصراً کہا۔

”اتنی دور سے۔۔۔۔۔ صرف مطربہ سے ملنے؟“ جھومر کو بڑی حیرانی ہوئی۔

”رشتے دار ہو مطربہ کی؟“ فطری سوال تھا۔

”نہیں۔“ اس نے تھکے تھکے انداز میں ماہین کی سمت دیکھا۔

”یہ ان کا گھر ہے۔“ اس نے جھومر کی طرف اشارہ کر کے ماہین سے پوچھا۔

”ہوں۔“ ماہین نے ٹالنے والے انداز میں جواب دیا۔

بالو نے جھومر کی اس مرتبہ بڑے غور سے دیکھا۔ اندھیرے گھنے جنگل یا دیرانے کے بیچوں بیچ رکھی کوئی قندیل۔

وہ بہت کچھ پوچھنا چاہتی تھی سب سے پہلے تو یہی کہ آپ کے اس گھر میں وہ بے چاری کیوں قید ہے؟ آپ کا گھرا تاتا

دیران کیوں ہے؟ اور سب سے اہم یہ کہ مطربہ آپ کی کیا لگتی ہے؟ اتنا مبہوت کر دینے والا حسن جلوہ آرا کیوں نہیں۔ اور یہ کہ

انہی دیرانی دوشت میں آپ کیسے ہنس لیتی ہیں؟ مگر وہ چپ رہی۔ سرسوتی کچھ دیر بعد ہانپتی کانپتی آ موجود ہوئی۔

”جلدی کرو سرسوتی۔ پتا نہیں کتنی دیر بعد لوٹے گا۔“ ماہین نے پختہ چٹائی پتھر دیکھ کر پر جوش ہو گئی۔

سرسوتی گویا تالے پر ٹوٹ پڑی۔

”کون؟“ مطربہ کی سوئی سوئی آواز۔

”گھبراؤ نہیں۔ ہم تالا توڑ رہے ہیں۔“ جھومر نے دوستانہ انداز میں تسلی دی۔

”کیوں اٹھا جان مصیبت میں ڈالتی ہو۔ بھلا فائدہ کیا ہے۔ جاؤ سو جاؤ۔“

”تمہارے مہمان آئے ہیں ذرا صبر کرو۔ ابھی بوٹ جاتا ہے۔“

”مہمان؟“ اس کی حیرت آمیز آواز آئی۔ آواز کا وہ کھویا کھویا پن اڑن چھو ہو گیا تھا۔

”ایک منٹ صبر۔ ابھی دیکھ لینا۔“ جھومر نے تالے کو غور سے دیکھ کر ”کامیابی“ کا اندازہ لگانے کی کوشش کی۔

اندسے آواز آتا بند ہو گئی۔

”خیر ابھی بالکل خاموشی تھیں۔ پتھر کی ضرب تالے پر پڑتی تھی اور سناٹے میں ایک آفت سی کوشش کی۔“

”اندر سے آواز آتا بند ہو گئی۔

وہ تینوں بھی بالکل خاموش تھیں۔ پتھر کی ضرب تالے پر پڑتی تھی۔ اور سناٹے میں ایک آفت کی اتر آتی تھی۔
”شکر..... جھومر‘ سرسوتی کو کولڈ ڈرنک پلاؤ۔“ ماہین نے سرسوتی کا شانہ تھپک کر خوشی کا اظہار کیا اور کولڈ ڈرنک سے پہلے خود اندر داخل ہو گئی۔

ایک لمحے کو تو سر ہی چکرا گیا۔ سیلن اور بو سے کوٹھڑی کا ماحول اس کیلئے ناقابل برداشت تھا۔ پھر چھپ چھپا کر کے کوٹ چڑھا تکیہ اس پر مستزاد نہایت کم پاؤر کا بلب۔

”السلام علیکم بی بی!“ مطربہ کی آواز نے اس کے حواس قدرے بحال کیے۔

”وعلیکم السلام۔“ یہ کراچی سے اقبال بیگم آئی ہے۔ تمہارا پوچھ رہی ہے۔“

ماہین نے جلدی سے تعارف کرایا۔

”اقبال بیگم۔ کون؟“ اس نے بغور بالو کو دیکھا۔ جو دم بخود کی کھڑی تھی۔ لیکن میں نے تو اسے پہلے بھی نہیں دیکھا۔ وہ حیرت زدہ تھی۔

”میں عارف بھائی کے گھر سے آئی ہوں۔“ اس نے بمشکل حلق صاف کر کے آواز نکالی۔

”یہ..... یہ..... مطربہ۔“ بالو نے بڑے ششدر سے انداز میں ماہین کی طرف دیکھ کر استفسار کیا تھا۔

”عارف..... وہ زندہ ہے؟ کیا لگتی ہو تم عارف کی؟ اس کی کوئی بہن تو تھی نہیں۔ تو کیا بیوی۔“ وہ بولنے بولنے رک گیا۔

ماہین کے جواب دینے سے پہلے ہی وہ شروع ہو گئی تھی۔

بالو کی حالت عجیب و غریب ہو رہی تھی۔ وہ تو مطربہ کا جانے کون سا سنہری سا تصور لئے یہاں تک آئی تھی۔ وہ مطربہ جس کیلئے وہ صرف شعر کی زبان استعمال کرتا تھا۔

”میں اس کی کچھ نہیں لگتی، تم نے انہیں کسی کا کچھ لگنے کے قابل ہی کہاں چھوڑا ہے۔“ اس کے اندر تخیل سوئی ہوئی تھی۔ ایک دم جاگ اٹھی۔

ایسا کرو مطربہ۔ جھومر کے کمرے میں آ جاؤ۔“ ماہین زیادہ جس زدہ ماحول برداشت نہ کر سکی۔ یوں بھی آئے۔“ کا۔“

”جھومر! انہیں اپنے کمرے میں لے آؤ۔“ وہ کہتی ہوئی باہر آ گئی اور جھومر کے کمرے میں پہنچ کر اس نے اسے کوننگ بڑھائی۔ دونوں ٹوب لائیں جلائیں۔ سوواٹ کا ایک بلب بھی تھا۔ اس نے وہ بھی جلا دیا اور گہری مہمانیت سانس لے کر صوفے پر ڈھلے گئی۔

اودہ میرے خدا۔ بے چاری مطربہ۔ کاش میں اسے تازہ ہوا میں لاسکوں۔ اس کے منہ میں کتنی خوش قسمت ہیں وہ ڈنگر اور گھوڑے جو اصطبل میں بندھے ہیں۔ ایک دکھ اس کی رگ و پے میں اتر گیا۔

چند منٹوں بعد وہ تینوں بھی اندر آ گئیں۔ جھومر اپنے بیڈ پر اور وہ دونوں کارپٹ پر دروازے کے قریب بیٹھ گئیں۔

”میں نے تمہیں اور تہذیب میں تھی کہ کہاں بیٹھے۔“

”ہاں بیٹھ جاؤ۔ کوئی بات نہیں۔ اس حویلی میں سب سے زیادہ بھائی چارہ تمہیں میرے کمرے میں دیکھنے کو ملے گا۔“

”میں چاہتا ہوں کہ سکتے ہیں۔“ جھومر نے اپنے مخصوص قبضے کے ساتھ اپنے بیڈ پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

”جین کو بھی اسی آگنی (بڑے دل گردے والی ہے جھومر)“

بالو نے جھپٹتے ہوئے قدم بڑھائے اور بہت احتیاط سے ایک کونے پر ٹک گئی۔ پھر جیسے ایک دم چونک پڑی۔ اس کو ٹھنڈی یاد آئی۔ ایک موت محسوس ہو رہی تھی۔ مگر یہ کیا۔ اتنے موزوں نین نقش جیسے کوئی تصویر ہو۔

”تم عارف کی کیا لگتی ہو؟“ مطربہ اس سے زیادہ بے چین نظر آئی۔

(تم نے اسے اس قابل ہی کہاں چھوڑا ہے کہ کوئی اس کا کچھ لگے) بالو نے اس پر ایک نگاہ کی۔

”کچھ نہیں..... میں تو تم سے یہ کہنے آئی ہوں، کیوں برباد کر دیا اسے؟ تمہیں ملا کیا؟“ اس کی آواز میں تیزی تھی۔

مطربہ نے حیرت سے اسے دیکھا۔ ”جب تم اس کی کچھ نہیں لگتی تو کہاں پالیا اسے؟“

”ہاں کہاں ہے؟ پانے کے جتن ہیں۔ جب وہ یہاں سے گئے تو تم نے ان کے سامنے سارے دروازے بند کر کے

کیوں نہ دکھادیے؟ کس امید نے انہیں آج تک تنہا کیا ہوا ہے؟“ وہ تلخی سے گویا ہوئی۔

”میں تو اسے ہمیشہ سے مایوس کرتی رہی ہوں۔ اگر وہ سر پھرا ہے تو میں کیا کروں؟ جو کچھ ہوا اس کے سامنے ہوا۔“

مطربہ نے بابت بھرے لہجے میں جواب دیا۔

”یہ عارف کون ہے؟“ ماہین سے اور زیادہ صبر نہ ہو سکا۔

”یہیں ہوا کرتا تھا۔ خواب دیکھنے والا میری طرح۔ ایک بے وقوف۔ اگر وہ حسن پرست تھا تو بھی احمق تھا۔ باقی نہ

رہنے والی چیز کا سایہ بننا چاہتا تھا۔“ مطربہ نے افسردگی سے کہا۔

”کیا یہاں حویلی میں؟“ ماہین نے سوال کیا۔

”ہاں۔ سمجھ لیں۔ گاؤں کے چند پڑھے لکھے لڑکوں میں سے ایک تھا۔ سنو تم اس کے پاس واپس جاؤ تو کہہ دینا جو

زنجیر اس کے سامنے پہنائی تھیں وہ آج بھی میرے پاؤں میں ہیں۔ وہ خوش خبریاں جو وہ پوٹلی میں باندھے پھر رہا ہے۔

”میرے کسی کام کی نہیں۔ میری طرف سے اجازت ہے کہ تمہیں دے دے۔“ مطربہ کی آواز بھر ا گئی۔

”مجھے تو بڑی جلدی ہے۔ میں تو یہ دیکھنے آئی تھی کہ وہ کس آس پر ہر طرف سے آنکھیں بند کئے بیٹھے ہیں۔“ بالو نے

مطربہ کی تہ یوں پرتر تم آ میر نظر ڈالی۔

”تم عارف عارف کر رہی ہو حالانکہ وہ تمہارا کچھ نہیں لگتا۔ پھر بچہ کس کا ہے؟“

ماہین کے بغیر نہ سکی۔ دوسرے یہ کہ نووارد لڑکی سے وہ خود اپنا تعلق ظاہر کر چکی تھی۔ اور یوں براہ راست اس پر ڈے

”نہایت تھی۔ ایک تولو کی مشکوک دوسرے عالم تاب کی کھوجی نظریں۔ اس کا اس قدر کانٹا ہونا فطری تھا۔

”چوتھو میرے خاندان کا ہے جی۔ آپ غلط مت سوچیں۔“ بالو نے نہایت دکھ سے کہا۔ وہ ماہین کے انداز پر بہت کچھ سمجھ

چکی تھی۔

”پھر..... یہ عارف کا کیا قصہ ہے۔ کیا وہ مطربہ۔“ ماہین کو حقیقت حال جاننے کی بہت بے چینی تھی۔ کہہ کر اعتراف کر چکی تھی کہ وہ نازنین کی مجرم ہے اور اسی وجہ سے قید تنہائی کی سزا ہوئی ہے۔ کیا معلوم عارف کے قصے میں کبھی اس لئے تجسس اپنے کمال پر تھا۔

”وہ میرا قاتل ہے۔ میرا خون ہے اس کے ذمے۔ اور یہ اسے پاک صاف نہیں ہونے دے رہی۔“ بالوچہ بفر سے ڈھانپ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

”جھومر ماہین اور سرسوتی حیران پریشان بیٹھی رہ گئیں۔ مطربہ البتہ بالکل پرسکون تھی۔

”تو اسے یہاں لے آتی ناں۔ کر دیتی اس بے وقوف کو پاک صاف۔“ اس نے سپاٹ لہجے میں بالو سے کہا۔

”میرے اس کے بیچ پابندی والا کوئی رشتہ کبھی قائم نہیں ہوا۔ وہ تو بہت چھوٹا آدمی تھا اور مجھے اونچے خواب دیکھنے عادت تھی۔“ وہ تلخ لہجہ اور مسکراہٹ سے گویا ہوئی۔

”مگر تم تو شادی شدہ ہو۔“ ماہین ٹو کے بنانہ رہ سکی۔

”اسی نے یہ پھندا میرے گلے میں ڈالا تھا۔ جب ہی تو کہتی ہوں وہ میرا قاتل ہے۔“ بالو بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

”تمہاری میاں سے بنتی نہیں ہے؟“ ماہین ٹھیک اندازے کے قریب پہنچی۔

”میں بنانا نہیں چاہتی۔“ وہ تڑخ کر بولی۔

”پسند نہیں ہے۔“

”نہیں۔“

”نکھٹو ہے؟“

”مارتا ہے؟“

”نشہ کرتا ہے؟“

”بس جی..... مجھے اچھا نہیں لگتا شروع سے۔ بہت بڑا ہے عمر میں مجھ سے۔“ اس نے آنکھیں رگڑیں۔

”تو اس سے کیا ہوتا ہے۔ میرے میاں بھی مجھ سے بہت بڑے ہیں۔“ ماہین کا انداز سمجھانے کا تھا۔ کہ وہ نادان تھا۔

ثابت ہو رہی تھی۔

”مگر وہ آپ کو اچھے لگتے ہوں گے۔“ بالو نے بے پرواہی سے کہا۔

”ہاں۔ خیر یہ تو ہے۔“ وہ ہنس پڑی۔

”تمہارا میاں کیا بد صورت ہے؟“ جھومر جو دم بخود بیٹھی سن رہی تھی۔ ایک دم بولی۔

”جب دل ہی نہیں چڑھا۔ تو کیا کریں۔“ بالو نے ایک ناک چڑھائی۔

”عادت کا کیسا ہے۔ ایمانداری سے بتاؤ۔ سچ سچ۔“ ماہین نے اس کی صورت بغور دیکھی۔

”جی کم عمر اور کیری بیوی ملی تھی۔ عادت تو آپ ہی اچھی ہونی تھی جی۔“ بالو نے ڈنڈی ماری۔

”خیر یہ تو عادت کیلئے شرط نہیں۔ بڑی بڑی حسین بیویاں ہوتی ہیں مگر عادت خراب ہو تو مرد نہیں بدلتا۔ تم نے اسے بڑا بدلتا۔ بدلتی کا۔ تمہارے مگر والوں کی رضا مندی ہوگی۔ تب ہی تو بارات لے کر گیا ہوگا۔ تمہیں اغوا تو نہیں کیا ناں۔“

ماہین نے کڑوا ج بولا۔ بالو نے گڑبڑا کر اس کی شکل دیکھی مگر بولی کچھ نہیں۔

”اس کا تو کوئی قصہ نہیں۔ اسی لئے تو شروع میں شادی سے پہلے ہی یہ بات طے کرنے کا حکم ہے۔ تاکہ بعد میں اس طرح کی صورتحال پیدا نہ ہو۔ مگر ہمارے ہاں اس بات کا خیال ہی نہیں رکھا جاتا۔ بارات والے دن رضا مندی معلوم کی جاتی ہے۔ جب سو آدمی دروازے پر آ موجود ہوتے ہیں۔ پھر لڑکی کیا کرے گی۔ اتنے اہم مقام پر شرع کو نظر انداز کیا جاتا ہے۔

بہن کی زندگیاں داؤ پر لگی ہوتی ہیں۔“

ماہین نے ہنس سے کہتے ہوئے جھومر کی طرف دیکھا جو دردمشترک کے احساس سے کم صم ہی بیٹھی تھی۔

”کیا عارف کا حویلی میں آنا جانا تھا؟“ اس نے مطربہ سے دریافت کیا۔

”اس کی ماں حویلی میں ہی رہتی تھی۔ اس کا باپ پٹواری تھا۔ بڑے خان ہی عارف کو پڑھا لکھا رہے تھے تاکہ باپ کے دربار میں سنبھالے۔“ مطربہ نے جواب دیا۔

”کیا تمہارے اس قصے سے میری بہن کا بھی کوئی تعلق ہے؟ وہ کسی خیال سے چونکی۔

مطربہ چند ثانیہ خاموش رہی۔

”بس کیا کہوں۔ ان کا بڑا نقصان کیا ہے میں نے۔“ وہ رونے لگی۔

”موز آگیا تھا جس کے لئے ماہین نے تنگ و دو شروع کی ہوئی تھی وہ ایک دم سنبھل گئی۔

بے قرار ہو۔ ماہین بی بی کو مجھ سے کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔
 بھروسہ عادت کھلکھلائی۔ اس بات سے قطع نظر کہ ماہین اور بالوا اپنے اپنے حصے کی قیامت سے گزر رہی ہے۔
 بات کچھ اس طرح سے شروع ہوتی ہے بی بی! ”مطر بہ نے کچھ سوچتے ہوئے کہنا شروع کیا۔

”تو بوجہ..... بتاؤ چھاجوں پانی برس رہا ہے۔“
 خالہ سولہ آنے بھیگی نچڑی ہانپتی کانتی گھر میں داخل ہوئیں۔ نام تو بے چاری کا اچھا بھلا انوری بیگم تھا۔ مگر اپنے تکیہ کلام کی وجہ سے سولہ آنے مشہور ہو گئی تھیں۔
 ”کوئی دقت سے ریل پکڑتیں سولہ آنے۔ ایک تو اندھیر مگرمی دوسرے بارش۔“
 ایک کونے میں بڑے پلنگ پر بیمار بڑی بی بی کراہتے ہوئے بولیں۔
 ”ارے کیا بتاؤں پھوپھی۔ گھر سے تو حساب سے ہی چلی تھی۔ مگر کیا کروں ضلع اکبر اعظم تحصیل پٹارو موضع منج بخش کے اس چھوٹے سے گاؤں اللہ وسایا تک پہنچنا آسان سی بات ہے۔ میں تو تمہارا تار ملتے ہی اٹھ کھڑی ہوئی۔ کس کا علاج کر رہی ہوں؟“

خالہ سولہ آنے نے سر سے برقعہ کھینچ کر نچوڑنا شروع کیا۔

”ارے وہی حکیم چلن والا۔ اور کون سے شاہی طبیب آئیں گے یہاں۔“ بڑی بی بی تکلیف سے عاجز برے حال پر قابو پا کر جل کر بولیں۔

”خبر یوں تو نہ کہو پھوپھی۔ بڑے بڑے شاہی طبیبوں نے نبض ٹٹولی ہے تمہاری۔“ خالہ سولہ آنے نے گلے سے دوپٹہ بھی اتار کر نچوڑنا شروع کر دیا تھا۔

”کجنت کب کی باتیں لے بیٹھی۔ کچھ کھاپی لے کپڑے بدل کر بھوکی پیاسی مر رہی ہوگی۔ ارے زیتون بانو۔ کدھر ہے رٹی۔ خالہ آئی ہیں۔“ بڑی بی بی نے پوری طاقت اکٹھی کر کے چیخ و پکار شروع کی۔

چند منٹوں بعد ایک بجلی کا جھماکا ہوا تھا۔

”السلام علیکم..... خالہ..... میں تو چھت پر بارش میں نہا رہی تھی۔“ وہ خوشی سے نہال نظر آرہی تھی۔

”بڑا مرتبہ کہا ہے وقت بے وقت کوٹھے پہ مت کٹری ہوا کر۔ پرسوں بھی تجھے اصغر لوہاری کا لونڈا چھیڑ رہا تھا۔ باز نہ آئی۔“ زیتون سے۔“ بڑی بی بی کا پارہ چڑھ گیا۔

”اب کیا کرے غریب عمر ہی چھڑوانے کی ہے۔“ خالہ نے قہقہہ لگایا۔

”لاؤ خالہ! چابی دو۔ تمہارے کپڑے نکال دوں۔ ان کی عادت ہی ہے بہانے بہانے سے ڈانٹنے کی۔“ زیتون بانو نے خالہ کے سامنے ہاتھ پھیلا دیا۔

”بھئی! کیا اٹھان لی ہے لونڈیا نے۔“ خالہ نے بھیگے کپڑوں میں جانے کس انجانی خوشی سے چور چور مومی گڑیا کو دیکھا۔

☆.....☆.....☆.....☆.....☆

وہ چاروں اس کی سمت بخوردیکھ رہی تھیں۔

خدا کے لئے مطربہ۔ اب بس کرو۔ کہہ ڈالو۔ ماہین نے بہت زچ ہو کر کہا تھا۔

تم کیوں مجھے ڈھونڈتی ہوئی آئی ہو۔ اس نے

ماہین کی بے چینی نظر انداز کر کے بہت سکون سے کہا۔ میں تو تمہیں ساتھ لے جانے کے لئے آئی تھی کہ تم نہ

اتنا کہہ دو کہ تم نے اسے آذا کر دیا۔ اسے رہا کر دو۔ ایسے کہ وہ تمہاری آس میں جینا چھوڑ دے۔ بس اپنے لئے یہ بات

لے جو اس کے ساتھ جینا چاہتے ہیں۔۔۔

بالو ایک تو اتر سے بولی اس کی آواز بھرا گئی تھی۔ اس کی جانتی تھی بلا کہ ماہین کس عذاب سے گزر رہی ہے۔ مگر

اسے ہمیشہ مایوس کیا ہے۔ کب اسے اپنا پابند کیا ہے۔ کیوں خواخواہ مجھ مری ہوئی کو درے لگا رہا ہے۔ ایک بات سنو

کا دماغی توازن درست نہیں رہا۔ تم بالکل جوان ہو۔ کوئی اور گھائے کا سودا مت کر بیٹھنا۔۔۔

مطر بہ نے بڑے خلوص سے مشورہ دیا تھا۔ اور ایک سچے چاہنے والے کی ساکھ بری طرح مجروح کر کے رکھتی تھی

بھئی، تم یہ قصہ کل پہ اٹھا رکھو مطربہ! مجھے بتاؤ۔ کیا کہہ رہی تھیں؟ ماہین سے مزید برداشت نہ ہو سکا۔

کیا سننا چاہ رہی ہیں آپ؟ پتہ نہیں آپ کی برداشت کی حد کہاں تک ہے؟ وہ پھر اطمینان مگر قدرے سختی سے

تم میری فکر نہیں کرو ماہین نے جلدی سے تسلی دی۔

جھومر کے سامنے ہی بتا دوں۔ کہیں یہ تختہ النانہ کر دے۔ مطربہ دھیرے سے مسکرائی۔

”بہن! جیسے مومن والے کے پاس دوا لینے جاؤ تو کم بولنے کی بھی کوئی دوا لیتی آنا۔ طاقت کی مت لانا۔ وہ تو تمہارے
 دے گا۔“

”یہ تو کام چاہتی ہے“۔ زیتون بانو نے جھلا کر کہا تھا۔

”وہ تو جس کی زبان کیسی چلنے لگی۔“ نامراد! قد کے ساتھ ساتھ کیا زبان بھی بڑھ رہی ہے۔ اب میری استانی بنے گی۔“

”نہی نہی بڑا لے گئیں۔“

”نہی نہی بڑا لے گئیں۔“

خالہ نے گریبان سے بٹوا نکالا اور اس میں سے چابی نکال کر زیتون بانو کو تھمائی۔ وہ اپنی تعریفیں سن کر کھلمکھلا رہ گئی۔

”اے چھوڑنا مراد کا قصہ۔ جان جلتی ہے میری اس کے نام پر۔“

بڑی بی نے اپنی جان ناتوان سے خواہ مخواہ ایندھن خرچ کیا۔

”بھوہم۔ شہر بانو کتنی دیر میں چکر لگاتی ہے اب؟“ وہ بڑی بی کی چار پائی پر ایک طرف بیٹھ گئی۔ وہ کیوں چکر لگانے لگی۔ ہم نے ان کو کون سا اس کے قرضے دینے ہیں۔ بھولے بھٹکے منی پر ڈر آ جاتے ہیں۔ کبھی کبھار۔ میں تو خدا سے چاہتی ہوں کہ وہ آئے ایسی قیمتی ساڑھی پہن کر سونے میں پہلی ہو۔ آتی تھی کہ مہینوں گاؤں میں ہم صفائیاں پیش کرتے پھریں۔ ہر طرف سے تو مرچکی مردار اور تو سنا تیری کیسی گزر رہی ہے؟“

”بس ٹھیک گزر رہی ہے۔ بڑی مشکل سے فرصت نکال کر آئی ہوں حویلی میں خان کے بیٹے کی شادی کی تیاریاں سو رہی ہیں۔ بڑی تک مک سے درست بہتو ڈھونڈی ہے سولہ آنے۔ دیکھی تو نہیں میں نے مگر چہ چہ بہت ہیں۔ بڑی زبردست جہاں ہو رہی ہیں۔ بری کی تیاری تو جو ہے سو ہے سولہ آنے گھر بھر اپنی اپنی بری بنا رہا ہے۔ بڑی نے چار سونے کے بنوائے بنوائے ہیں۔ تین تین جوڑے نوکروں کے بنے ہیں۔ میرے لئے بھی کرن پھول بنوائے ہیں۔ بڑی بہونے کہ تمہاری پرانی اور بااعتماد مک خوار ہو۔“

”اے تیرے تو مزے آگئے۔“ بڑی بی پہلی مرتبہ مسکرائیں۔

”اڑے کیا مزے۔ اپنی بھی کوئی زندگی ہے۔ دوسروں کی صورت دیکھ دیکھ کر کٹ رہی ہے۔ نیند آ رہی ہے تو بھی مالکوں سے پیسے نہیں سو سکتے۔ غلامی بڑا بھاری بوجھ ہوتا ہے پھوپھی۔ تم مزے کہہ رہی ہو۔“

میں نے۔ اب تو زیتون بانو تیرے ساتھ جا رہی ہے۔ تیرا وزن کم ہو جائے گا۔ بجلی سے چلتی ہے یہ۔ آکس تو بالکل بھی نہیں ہے۔ جتنی مرضی کام کرنا ہو۔“ بڑی بی بی نے تسلی کے ضمن میں تعریف کی۔

”بہت پوچھ رہی تھی۔“ بڑی بی بی کے انداز میں محبت تھی۔

خوشبوئیں گے۔ میرا کیا ہے آج میرا کام؟
 تم نے نہیں فرمنا کہ..... سردار علی مجھے لے جائے گا۔ دس مرتبہ کہہ گیا ہے کہ اماں لونڈیا کا ٹھکانہ بنا دو کہیں پھر میں تمہیں
 تو میں کو سہارا لیا ہو گا پھر بھی؟ تم سے تو مل کر پانی نہیں پیا جاتا۔“ خالہ نے تشویش ظاہر کی۔

اس کی طرف کیا دیکھتی ہے۔ بس خوف خدا کر کے اس کا خیال رکھنا۔ کوئی جواز کا بڑا

”ہاں ہاں..... بہری نہیں ہوں“۔ وہ چڑ کر بولی۔
 ”تو کاٹ کھانے کو کیوں دوڑ رہی ہے۔ آواز دبا کر بولا کر۔ جوان لونڈیوں کے یہ ڈھنگ اچھے نہیں ہوتے۔“

تاراض ہو گئیں۔

”تو کاٹ کھانے کو کیوں دوڑ رہی ہے۔ آواز دبا کر بولا کر۔ جوان لونڈیوں کے یہ ڈھنگ اچھے نہیں ہوتے۔ ناراض ہو گئیں۔

مذہبات سے عالم تاب سمجھ گئی تھیں۔ قہقہہ لگا کر ہنس پڑیں۔

”میں نہیں سروں گی وہاں کے کسی نوکر چاکر سے شادی کہ ساری عمر بیکیوں کی ارن ہی۔“

”دیکھ لیا تائی اماں۔ کیسے پہنچے ہوئے ہیں آپ کے صاحبزادے۔“
 ”اللہ خیر کی گھڑی لائے۔ یونہی خیال آگیا تھا۔“

”یونہی فکر کرتی ہیں تائی اماں۔ جن سے دل لگانا ہے ان کا اطمینان تو دیکھیں۔ جیسے مقابلے کے امتحان کی پہلی نظر ہو۔“
 عالم تاب ہنس پڑیں۔
 یاور علی خان بھی قدرے جھینپ کر مسکرا دیے۔

”اتنی خوشیاں اتنی رونق میرے دل کی بے سکونی بڑھاتی ہیں۔“ اماں جی اچانک غمگین نظر آنے لگیں۔
 ”وہ کیوں تائی اماں؟“ عالم تاب حیرت سے انکی شکل دیکھنے لگیں۔ یاور علی خان بھی الجھن بھری نظروں سے اس طرف دیکھنے لگے۔

”کب آئے گا تیمور..... وہ کیسے جان پائے گا کہ اپنے جب خوشیاں مناتے ہیں تو دل کیا محسوس کرتا ہے؟“
 میں کیسے رہتے ہیں۔ زنجیر جیسے رشتوں میں بندھنے کے دکھ سکھ کیا ہوتے ہیں۔ یہاں نوکر چاکر نعیتیں کھاتے ہیں۔ چائے ڈبل روٹی کھاتا ہوگا۔ اپنے جوتے خود پالش کرتا ہوگا۔ کبھی دیر سے آنکھ کھلتی ہوگی تو بھوکا گھر سے نکل جاتا ہوگا۔
 چند قطرے ان کی آنکھوں سے ٹپک کر چہرے کی جھریوں میں گم ہو گئے۔

”ہائے تائی اماں۔ اسے وہاں کوئی کمی نہیں۔ وہ کون سا نوکر کر رہا ہے۔ صرف پڑھتا ہی تو ہے۔ ہر مہینے دس ہزار روپے بھجواتے ہیں بابا صاحب۔ وہ اسے بہت ہیں۔ وہ تو یہ کہتا ہے کہ وہ یہاں سے زیادہ خوش رہتا ہے وہاں۔ آپ خواتین کو نہیں جانتے ہیں۔ بتائیے ذرا۔ آپ کو تو خوش ہوتا چاہیے کہ آپ کا بیٹا کتنا لائق ہے۔ آپ تو بڑی قسمت والی ماں ہے تائی اماں آپ نے سارے بیٹے لائق ہیں۔ میری طرف دیکھیے۔ ایک بد نصیب ماں ہوں جس کے ایک نہیں دو دو بیٹے۔“ ان کی آواز بھراؤنی تھی۔
 ”یہ لیجیے۔ اماں جی کہ سمجھاتے سمجھاتے آپ شروع ہو گئیں۔ بھابی بیگم۔“ یاور علی خان نے جیسے زچ ہو کر کہا۔
 ”ان کا علاج ہو رہا ہے۔ وہ ٹھیک ہو سکتے ہیں۔ آپ کیوں مایوس ہیں۔“ یاور علی خان نے تسلی دینے کے انداز میں کہنے پر ہاتھ رکھا۔

”ہاں عالم تاب! دل چھوٹا نہ کیا کرو۔ انشا اللہ بچے ٹھیک ہو جائیں گے۔“
 اماں جی بھی اپنا قصہ بھول کر ان کی دل جوئی کرنے لگیں۔

”ہائے اماں جی اتنا سامان جائے گا کراچی۔“ تزئین نے مارے پریشانی کے اٹھتے ہوئے پوچھا۔
 ”سامان اتنا کیسے نہ ہوگا۔ تم لوگوں کے کپڑے کی کوئی حد ہے کھانے، سونے، نہانے، کھانے، چھیننے تک کے چیزیں سارے ہیں۔“ وہ جل کر بولیں۔

”اب ایسا بھی نہیں ہے۔ بڑے بھائی کی شادی پر ہم خاصے چھوٹے تھے۔ اور پھر بڑے بھائی کی شادی پر چھوٹے تھے۔“
 ہوئی کہ آپ کا تلے والا دو پٹا پہن کر بھاگ کر بارات میں بیٹھے۔

”ہاں اماں نے دیکھا تھا۔ چہار سانس پھول رہا تھا۔“ سائرہ بھابی (عالم تاب کی سگی بھابھی) تے ٹکرا گئی۔
 ”ترے میں بے ساختہ قہقہے گونجنے لگے۔“

”اماں جی اس نے تو تیرا کی کلباس بھی سلوایا ہے۔ وہاں سیونٹھی کے سامنے ہی تو سمندر بہہ رہا ہے۔ خوب ڈبکیاں مارتی ہیں۔“ سائرہ کی جھٹپٹ نے گویا چنگی بھری۔
 ”میں نے کپڑا رام ہے۔“ سائرہ کی جھٹپٹ نے گویا چنگی بھری۔
 ”دو کلباس ہوتا ہے؟ اور اسے کیا آفت آئی ہے۔ بلیاں لگانے کی۔“

اماں جی غصے سے ایک ایک کی صورت دیکھنے لگیں۔
 ”اور کیا اماں جی ٹھیک تو کہہ رہی ہیں۔ تمہیں تو چلو بھر کافی ہے۔“ تزئین سے بڑی رئیسہ نے گرہ لگائی۔
 ”سمندر تو زیادہ رہے گا۔“

”دیکھیں اماں جی۔ آپا کو۔“ تزئین نے شکایتی انداز میں ماں کو دیکھا۔
 ”توہ کیا بچوں کی طرح الجھتی ہیں۔ اپنا اپنا سامان دیکھو۔ پھر وہاں پہنچ کر غدر اتارو گی۔ دن کتنے رہ گئے ہیں۔“
 ”اماں جی۔ یاور کہہ رہے تھے میں سہرا و ہر انہیں باندھوں گا۔ ہندو باندھتے ہیں۔“ رئیسہ بیگم نے جیسے کسی دھیان سے ہنسنے لگی۔

”اچھا۔ ایسے کہہ رہا تھا۔ بھی ہم تو اپنے ہوش سے ایسا ہی دیکھتے آرہے ہیں۔“ اماں جی واقعی چونک گئی تھیں۔
 ”کردوں کی آبادی میں اکیلے یاور ہی کو دھیان آیا کہ یہ ہندو باندھتے ہیں۔ یہاں تو دلہنوں کے بھی ان کے قد جتنے باندھتے ہیں۔ ارے تو سہرا تو اس لئے باندھتے ہیں کہ بھڑ میں پتہ لگے گا کہ دولہا کون ہے۔ کوٹ پتلون جو موٹے لٹا پٹتے ہیں۔ وہ نہیں پہنتے یہ لوگ۔ ارے میں تو لال گلابوں کا سہرا ضرور باندھوں گی اپنے بیٹے کو اصل بات تو نکاح کی ہے۔ اور تاقی پڑھائے گا۔ یا نہیں؟ پھرے تو نہیں لگوا رہی۔ اللہ دین ایمان سلامت رکھے۔ یہ تو خوشی کے رنگ ڈھنگ ہیں۔ جیسے مرضی انسان خوشی منالے۔ اللہ اپنا کرم رکھے ایسے کچے ایمان نہیں ہیں ہمارے کہ ہار پھولوں کی بحث میں گم ہو گئے۔“

اماں جی کے ارمان تو جیسے سرے ہی میں اٹک رہے تھے۔
 ”چھوڑو اماں جی! ایسا کوئی ضروری تو نہیں۔ نہیں مان رہے تو نہ سہی۔ شادی ان کی ہو رہی ہے۔ ان کے موڈ کا خیال نہ کرنا۔“

تزئین جو موجود خواتین میں سب سے زیادہ تعلیم یافتہ تھیں۔ بھائی کے احساسات کے قریب قریب تھیں۔
 ”ہاں بھئی تم بہت پڑھی ہوئی ہو۔ اسی کا دماغ رہا ہے تمہیں۔ اسی لئے نباہ نہیں ہوتا تمہارا کسی سے۔“
 ”خوش تھیں۔ ان کے منہ سے نکل گیا۔ تزئین یکدم خاموش ہو کر رہ گئیں۔ کہنے والی ان کی حقیقی ماں تھی۔ وہ لب نہ بول سکتی تھیں۔“
 ”اماں جی! اصرار کرتی ہیں آپ۔ قصہ کیا ہوتا ہے۔ آپ بات کیا نکال بیٹھتی ہیں۔ پڑھا لکھا ہونا کون سی بری بات ہوتی ہے۔“

ہے۔ روشنی چرانے جیسی ہستی بن جاتی ہے انسان کی۔ اب ان لوگوں کا تو ہمارے پاس کوئی علاج نہیں جو اسے زندہ کر دیتے ہیں۔“

”رہنے دیں آیا! آپ میرے حصے کی صفائیاں پیش نہ کریں۔ ہم جس سوسائٹی میں رہتے ہیں وہاں طلاق دینا عورت کی ذمہ دار صرف عورت سمجھی جاتی ہے۔ اماں جی اپنے حساب سے ٹھیک ہیں۔“

ترنم نے دکھ سے رئیسہ بیگم کی باٹ کاٹ دی اور خاموشی سے باہر نکل گئیں۔

”حد کرتی ہیں اماں جی آپ بھی۔ آپ سے بھی اسے دکھ ہی ملے گا کیا؟“

رئیسہ بیگم دکھ سے گویا ہوئیں۔

”مجھ سے زیادہ دکھ کسے ہو سکتا ہے؟ غصہ مجھے اس بات پر آتا رہتا ہے کہ ایک ہی طرف ہو کر رہ گئی ہے وہ جس کی شادی کر چکا ہے۔ کبھی بیٹے سے ملنے کی بھی کوشش نہیں کی۔ نئی دنیا بسائے بیٹھا ہے۔ یہ کیوں اس طرح لکیر پٹی رہے ہیں؟ ظہیر میں؟ اس طرح کیسے وقت کٹے گا۔ آگ لگے ایسی پڑھائی کو جو ہٹ دھرم ہی بنا دے۔ کون کی ماں خوش ہو جائے بیٹی دیکھ کر۔“ اماں جی آبدیدہ ہو گئیں۔

”اماں جی! ابھی دکھ نیا نیا ہے۔ زخم تازہ ہے۔ ذرا سنبھلے گی تو ہم منالیں گے۔ وہ بچی کی وجہ سے منع نہیں کر دی ہے۔ کسی سے بھی دوسری شادی کیلئے فی الحال تیار نہیں۔ کیا نام ہے بچی کا۔ ہاں شاید پیار سے شیو بولتے ہیں۔ وہ تو بچی کا تانی کے پاس رہتی ہے۔ اس کا کوئی مسئلہ نہیں۔ بات ہوئی تھی میری ظہیر بھائی سے۔ کریں گے وہ انتظار آپ تہا ہوں۔“

رئیسہ بیگم نے ماں کا چہرہ چھو کر محبت سے سمجھایا۔

”مجھے تو صبر ہے بیٹی۔ وہ تمہارے بابا صاحب جو روز پڑتال شروع کر دیتے ہیں، تمہیں شاید معلوم نہیں۔ مرد دنیا سخت ہو اور ماشاء اللہ بڑے کنبے والا ہو تو اس کی عورت تو جیسے ہر وقت عدالت میں کھڑی رہتی ہے۔ جیسے کس سے بچے۔ نافرمانیاں کر رہے ہوں۔“

”بچے بڑے ہو جائیں تو اکثر مرد بچیوں سے براہ راست پوچھ گچھ کے بجائے اپنی عورت ہی کو گری سردی دے دیتے۔“

”مجھ بڑھی پر رحم کرو اب تم لوگ۔“

وہ آزدگی سے گویا ہوئیں۔

”فکر نہ کریں اماں جی! یاد اور کی شادی ہو لینے دیں۔ پھر گھیرتے ہیں ہم ترنم کو۔“ سائرہ بھابی نے بھی دلا سنا۔

”ہماری سات پستوں میں یہ پہلا قصہ ہے بیٹی۔ ایک پھانس سی انکی رہتی ہے ہر دم۔“ وہ تھکے تھکے انداز میں ہوئیں۔

”اس دنیا میں روز ہی کچھ نیا ہو جاتا ہے۔ کسی بات نے پہلی مرتبہ تو ہونا ہی ہوتا ہے۔ ہاں یہ ہے کہ دعا کرنا چاہیے۔“

ہوا تو دوبارہ نہ ہو۔ اور کسی کے بھی ساتھ نہ ہو۔ رئیسہ بیگم بولیں۔

”اماں جی! ہاں جی بچوں کی طرح بہل گئیں۔“

”اماں جی! ہاں جی سو گئیں۔“ خالہ سولہ آنے نے برقعہ اتار کر پنگھٹا تیز کیا۔

”بیٹی! جوندہ رے تعجب سے زینون بانو کی باف متوجہ تھیں ایک دم چونک اٹھیں۔“

”خالہ سولہ آنے! آج کل تو شادی کی تیاریاں زوروں پر ہیں۔ سب دیر سے سوتے ہیں۔ سب ہال میں بیٹھی ہیں۔ یہ لڑکی کون ہے؟“ وہ جواب دیتے دیتے اپنے مطلب پر آ گئیں۔

”اماں جی کے ساتھ۔ یہ لڑکی کون ہے؟“ وہ جواب دیتے دیتے اپنے مطلب پر آ گئیں۔

”اری زینون بانو۔ سلام کر ماما کو۔ تیری افسر ہیں یہ۔“ خالہ ہنستے ہوئے اپنا بٹو ا نکال کر پان کھانے لگیں۔

”سلام عظیم۔“ اس نے لمبی آنکھوں والی نوجوان عورت کو جواب اپنے حلیے سے بہت باوقار محسوس ہوتی تھی، سلام کیا۔

”عظیم السلام۔ تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا سولہ آنے۔“

”ارے اپنی ہی لوث بٹا ہے۔ یہیں رہے کی اب۔ میرے خیال میں اماں جی منع تو نہیں کریں گی؟ یوں تو بڑی ہمدرد ہیں۔“

”خالہ نے سوالیہ انداز میں ماما کی طرف دیکھا۔“

”اب کیا کہہ سکتی ہوں۔ یہ تو اماں جی کا مسئلہ ہے۔“ ماما نے جواب دیا۔

”روداد یو کیا ابھی سے سو گئی؟“ خالہ نے چاروں طرف نظر دوڑائی۔

”ارے نہیں۔ سروسٹی کو بڑا تیز بخار چڑھا ہے اس کی پٹی سے لگ کر بیٹھی ہے۔“

”کیا لگتی ہے یہ تمہاری؟“ ماما لمبی کوندہ جانے کیوں نوراد لڑکی غیر معمولی محسوس ہو رہی تھی۔

”بھانجی ہے میری رشتے میں پھوپھی تاجور کے پاس رہتی تھی۔ ان کی طبیعت اب اچھی نہیں رہتی۔ پھر جوان جہاں لڑکی

”نوراد لڑکی اور وہ بوڑھی جان۔ اسی لئے بلوایا تھا انہوں نے مجھے۔“

”خالہ سولہ آنے نے اپنی تمباکو کی ڈبیا ڈھونڈنے کے دوران جواب دیا۔“

”اماں باپ نہیں ہیں اس کے؟“ ماما نے اس کے ترتیب وار حسن کو بڑی تفصیل سے دیکھا۔

”مرحومپ گئے۔ اب کیا انٹرویو لئے جاؤ گی۔ بھوکے ہیں ہم کھانا بھی کھائیں گے۔ کیا کچھ پکا لیا آج؟“ خالہ نے جیسے

”نوراد لڑکی تھی اماں جی نے۔ سارے گاؤں میں کھانا بھجوا دیا ہے۔ آج کھانا باہر دیگوں میں پکا تھا۔ بکرے کے گوشت کا

”نوراد لڑکی تھی اماں جی نے۔ سارے گاؤں میں کھانا بھجوا دیا ہے۔ آج کھانا باہر دیگوں میں پکا تھا۔ بکرے کے گوشت کا

”نوراد لڑکی تھی اماں جی نے۔ سارے گاؤں میں کھانا بھجوا دیا ہے۔ آج کھانا باہر دیگوں میں پکا تھا۔ بکرے کے گوشت کا

”نوراد لڑکی تھی اماں جی نے۔ سارے گاؤں میں کھانا بھجوا دیا ہے۔ آج کھانا باہر دیگوں میں پکا تھا۔ بکرے کے گوشت کا

دعوت ہوگئی ویسے تو خیر حویلی میں آئے دن ہی دعوتیں ہوتی ہیں۔ چل اٹھ اماں جی سے ملواتی ہوں۔

”خالہ دو پٹاسر پر جما کر اٹھ کھڑی ہوئیں اور باہر کی طرف قدم بڑھا دیئے۔ زیتون نے بھی ان کی تہنید۔“

”سولہ آنے تمہارا سامان پہنچا دوں تمہارے کمرے میں۔“ ماما نے ٹوکا۔

”ہاں ہاں ماما۔ بڑی مہربانی تمہاری۔“ وہ بغیر رکے بولیں۔

ایک تنگ راہداری میں بیس پچیس قدم چل کر خالہ ایک بڑے سے کھلے دروازے میں داخل ہوئیں۔ پیچھے پیچھے بانو بھی۔

ہال میں جیسے زندگی اپنی پوری طاقت کے ساتھ گردش کر رہی تھی۔ اماں جی تخت پر بیٹھی جوڑوں کی ”نگاہ“ چبھتی تھیں۔ باقی خواتین نیچے قالین پر مختلف قسم کے کاموں میں مصروف تھیں۔

اماں جی کیونکہ عین داخلی دروازے کے سامنے تھیں اس لئے ان کی نظر فوراً خالہ پر پڑی تھی۔

”آگنی سولہ آنے“ چل شکر ہے میں تو سوچ رہی تھی کہنے کے دودن ہیں۔ معلوم نہیں ہفتہ لگائے۔۔۔۔۔ کہ پندرہ۔“

”السلام علیکم“۔ خالہ نے اماں جی سمیت تمام بیگمات کو سلام کیا۔ زیتون بانو تو جیسے اندر کا نقشہ دکھ کر ہنسی۔

دروازے ہی میں ایک کر رہ گئی تھی۔

وہ کپڑے جو وہ بیاہ باراتوں میں پہننے کا تصور نہیں کر سکتی تھی۔ بیگمات عام حالات میں پہنے بیٹھی تھیں۔ ہر ایک کی کپڑوں، گنگنوں، چوڑیوں سے سنہری تھیں۔ ایسے قرینے سے بنے ہوئے بال، ناکوں میں دکتی لوگوں کے لٹکارے۔۔۔۔۔

ساڑھے گیارہ بجے ایسی تیاری۔ وہ بھی گھر کے ماحول میں۔ یوں لگتا تھا۔ جیسے کسی شادی میں شامیانے تلے مہمان بیٹھے۔

”علیکم السلام! یہ بچی کون ہے پتھر پڑے ہیں تیری عقل پر سولہ آنے“ اتنی خوبصورت بچی کو لئے رات کے اندر۔

میں آرہی ہے۔ صبح نہیں ہونی تھی کیا؟“ اماں جی نے جا بختی نظروں سے زیتون بانو کو دیکھتے ہوئے جھار پلائی۔

”اماں جی! مجھے ڈر نہیں لگتا۔ کوئی ٹیڑھی آنکھ سے دیکھتا تو اس کی اپنے سروتے سے آنکھیں پھوڑ دیتی کیا سمجھتے؟“

نے مجھے؟“

”کس قدر بھروسا ہے سولہ آنے کو اپنے ”ہتھیار“ پر۔“ رئیسہ بیگم نے سراہا۔

”خیر بھروسا تو اللہ پر ہے بی بی جان! آپ کو یاد نہیں رمضان کی گائے گھیری تھی میں نے ”مردوں“ نے شاہین نے۔“

خالہ نے ماضی کا ایک اہم کارنامہ بطور ثبوت پیش کرنا ضروری خیال کیا۔

”وہ بے چاری تو ”گائے“ تھی۔“ امینہ بھابی نے خالہ کو چھیڑا۔ سب ہنسنے لگیں۔

”یہ کون ہے خالہ تم نے بتایا نہیں؟“ تزئین نے بڑی ستائشی نظروں سے زیتون بانو کو دیکھا۔ باقی سب نے بھی۔

نوش لیا تھا۔

”بھانجی ہے میری چھوٹی بی بی جان! اماں جی سے اجازت لینے آئی ہوں میں اسے اپنے ساتھ رکھنا چاہتی۔“

ہوشیار ہے سب کاموں میں۔ آپ اس کے کام دیکھیں گی تو خوش ہو جائیں گی۔ سولہ آنے۔“ خالہ نے حالت اچھے

رہنے سے شروع ہی میں پورا زور لگایا۔

”تو تیرے بہن بہنوئی کہاں ہوتے ہیں؟“ اماں جی نے فطری سوال کیا۔

”وہ نہیں ہیں اب اس دنیا میں۔“ خالہ نے دھیمی آواز میں کہا۔

”تو اب تک کہاں رہ رہی تھی یہ؟“ اماں نے تعجب سے پوچھا۔

”وہ میں آپ سے اپنی پھوپھی بھی کر ڈر نہیں کرتی؟“

”ہاں! ہاں وہ کوئی دور پرے کی۔“ اماں جی نے بات کاٹی۔

”جی! ان کے پاس رہ رہی تھی۔ اب ان کا بڑا حیا اس پر آئے دن کی بیماریاں اسی واسطے بلوایا تھا انہوں نے تار بھیج کر

۔“

”اچھا۔۔۔۔۔ اچھا ٹھیک ہے سمجھا دینا اسے یہاں کے طور طریقے“ کچھ پڑھی ہوئی ہے۔“ اماں جی پھر کپڑوں کو الٹ پلٹ

رہنے لگیں۔

”جی! پانچ جماعتیں پڑھی ہے قرآن بھی پڑھا ہے“ گاؤں میں بس ایک ہی پرائمری سکول ہے شہر دور ہے اس لئے

انہیں پڑھی۔“ خالہ نے جواب دیا۔

”کھانا کھا لیا تم نے؟“ عالم تاب نے جوڑے میں ٹانگا لگاتے ہوئے سراٹھایا۔

”کھالیں گے جی! اماں جی کو سلام کرنے حاضر ہوئے تھے۔“

”لڑکی تو بہت خوبصورت ہے۔“ سائرہ بی بی نے تزئین کو ٹھوکا دیا۔

”ہوں وہی دیکھ رہی ہوں۔ پوری کیل کانٹے سے لیس ہے۔“ وہ سرگوشی میں کہتے ہوئے مسکرائیں۔

”مردانے میں نہ بھیج دینا غلطی سے آفت مچ جائیگی۔“ عالم تاب مسکرائیں۔

”سب دہلی دہلی ہنسنے لگیں۔“

”کیا کیا کام آتے ہیں تمہیں؟“ رئیسہ بیگم اس کی جانب متوجہ ہوئیں۔

”سب کام کر لیتی ہوں۔“ وہ گھبرار رہی تھی۔

”تو ہم دیکھ رہے ہیں“ کام تمام کر دیتی ہوگی۔“ امینہ بھابی نے پھلجھڑی چھوڑی۔

”وہ سب تہقید مار کر ہنس پڑیں۔“

”ہوں ہوں۔“ اماں جی نے تنبیہی انداز میں گھورا۔

”اماں جی نے انہیں جانے کا اشارہ کیا، دونوں باہر نکل گئیں۔“

”نونا! کیا نیکی کی لڑکی ہے چھڑا ہوا کوئی خوبصورت گیت۔“ تزئین نے جاتی ہوئی زیتون بانو پر نظر دوڑائی۔

”شاعر ہوگئی آن واحد میں؟“ عالم تاب مسکرائیں۔

”کیونکہ خط کہہ رہی ہوں بھابی بیگم؟“ وہ بھی جوابا مسکرائیں۔

”نہیں خیر غلط تو نہیں کہہ رہیں۔ خوبصورت تو بہت سے چہرے ہوتے ہیں مگر اس میں ایک بڑی خاصیت ہے۔“
 ”جو سمجھ میں نہیں آرہی۔“
 وہ کچھ سوچتے ہوئے بولیں۔

”ارے ہٹاؤ بھی کیا قصہ لے کر بیٹھ گئیں، عمر ہی ایسی ہے۔ جوانی تو گدھی کو بھی خوبصورت بنا دیتی ہے۔“
 اماں جی پر اپنی فکریں سوار تھیں، انہیں اس بحث سے الجھن ہوئی۔
 ”مگر اماں جی! وہ زیتون بانو ہے گدھی نہیں۔“ امینہ بھابی نے ٹکڑا لگایا۔
 ”ہاں! ہاں! مجھے پتا ہے۔“ وہ بڑے مصروف انداز میں بولیں۔
 ”کمر انسانی آوازوں اور قہقہوں سے گونج اٹھا تھا۔“
 ”سیدھی سادی اماں جی حیران ہو کر ان کی صورتیں دیکھتے لگیں کہ آخر انہوں نے ایسا کیا کہہ دیا۔“

حویلی کے دو تہائی افراد تو کراچی روانہ ہو چکے تھے۔

ملازم عورتوں میں صرف روپادیوی اور زیتون بانو حویلی میں تھیں۔ اتنے سارے لوگوں کے چلے جانے کے بعد
 میں عجیب سا سناٹا محسوس ہونے لگا تھا۔

نئی ہونے کی وجہ سے زیتون بانو حد درجہ محتاط تھی۔ رات کو چونک چونک کر اٹھ بیٹھتی تھی اور جا کر دروازے اور بالکونی
 دیکھنے لگتی تھی کہ تالے لگے ہوئے ہیں یا نہیں۔ روپادیوی تو ”ایام نجات“ منار ہی تھی۔ نوبے ہی پڑ کر سو جاتی تھی۔
 نیند نہ آتی تو پکچن کے کینٹ صاف کرنے بیٹھ جاتی تھی۔ کوئی کام دھیان میں نہ آتا تو باہر باغ میں بیٹھ جاتی تھی
 خواجواہ کی سوچوں میں الجھ جاتی تھی۔

اس وقت بھی وہ کام سے فارغ ہو کر باغ کی سمت چلی آئی تھی۔

”اسی دم گیٹ پر گاڑی کی ہیڈ لائٹس جھمکائی تھیں، ایک تو اتر سے ہارن بجا تھا۔“

”اس نے ادھر ادھر چوکیدار کو دیکھا پھر دوڑتے ہوئے غلام رسول کی کوٹھڑی کی سمت بھاگی کہ شاید چوکیدار وہاں۔“
 غلام رسول سائیکس تھا۔

”چاچا! وہاں پھانک پر کوئی موٹر آئی ہے۔“ اس نے ہانپتے ہوئے کہا۔

”وہ ادھر اچھوڑا یور کے ساتھ حقہ پی رہا ہوگا“ تم رکو میں اس سے چابی لاتا ہوں۔“

چاچا غلام رسول اپنی کوٹھڑی کے پیچھے چلا گیا۔

وہ وہیں کھڑی ہو کر انتظار کرنے لگی۔

”چند لمحوں بعد ہی چوکیدار گر تاپڑتا اپنی سمت آتے ہوئے دکھائی دیا اور تیر کی طرح اس کے سامنے گزر گیا۔“

وہ بھی چل پڑی اور جامن کے گھنے درخت کے نیچے کھڑی ہو کر گیٹ کی سمت دیکھنے لگی۔

چوکیدار نے بڑی پھرتی سے گیٹ کھولا تھا۔
 ”کیا نہیں علم نہیں تھا کہ شبیر خان (ڈرائیور) ہمیں لینے گیا ہوا ہے۔ تم نائٹ وائچ میں ہو، تمہیں ادھر ہونا چاہیے تھا۔“

”بغش۔“

ایک نوجوان جو پینٹ شرٹ میں ملبوس تھا بری طرح چوکیدار پر برس رہا تھا۔

”خان! ام ابی ابی ادھر حقہ تازہ کرنے گیا تھا، ام تو یہیں ہوتا ہے۔“ چوکیدار نے چھوٹی سی کھٹولی کی سمت اشارہ کیا۔

”حقہ پینے کا وقت ہے نان سنس۔“ نوجوان بھناتے ہوئے آگے بڑھ گیا تھا۔

غلام رسول سائیکس بھی وہاں آکھڑا ہوا تھا۔ اس کی نظردم بخود سی زیتون بانو پر پڑی۔

”زیتون بانو اندر جاؤ، خان کو روٹی پانی پوچھو۔ روپادیوی تو اپنی کوٹھڑی میں ہوگی۔ اسے تو یوں بھی نیند بہت آتی ہے۔“

”جی..... جی..... چاچا! یہ کون ہیں؟ مجھے تو ڈر لگ رہا ہے۔“ اس کی واقعی بہت بری حالت ہو رہی تھی۔

”ارے کوئی ڈرنے کی بات نہیں، خان تمہکا ہوا ہے۔ ولایت سے آیا ہے لمبا سفر کر کے، تو جلدی سے اندر جا، کہیں موڈ اور

خراب نہ ہو جائے۔“

چاچا غلام رسول نے اس میں ”قمرل“ پیدا کرنے کی کوشش اور وہ واقعی اندر دوڑ گئی۔

اندر پہنچ کر اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ کس کمرے میں کہاں جائے۔ جانے خان اتنی بڑی حویلی میں کہاں گم ہے؟

معا کی طرف سے گھنٹی زور سے جینتی۔ اس کی تور ہی سہی جان بھی نکل گئی۔

وہ تو خود یہاں نئی نئی تھی۔ اسے گھنٹیوں کا کوئی اندازہ نہیں تھا۔ وہ بذحواس ہو کر ایک کمرے سے دوسرے کمرے کی طرف
 بھاگنے لگی۔

نیچے کے سارے کمرے بھاگ بھاگ کر دیکھ لئے۔ اب بگسٹ زینے کی طرف بھاگی۔ آخری زینہ طے کرتے ہی اس کا

اوپر کا سانس اوپر نیچے کا نیچے رہ گیا۔ وہی نوجوان عین سامنے کھڑا تھا۔

”کس..... کس..... سلام علیکم!“ اس نے تھر تھر کانپتے ہوئے سلام کیا۔

”کیا تم ادھر کام کرتی ہو؟“ سلام کے جواب کے بجائے کرخٹ۔ نیچے میں سوال آیا۔

”جی..... جی..... وہ مجھے پتا نہیں چل رہا تھا کہ آپ کس طرف ہیں؟“ اس نے باقاعدہ رونا شروع کر دیا۔

نان نینس! اور ملازم کیا مر چکے ہیں، کوئی پرانا ملازم دکھائی نہیں دے رہا۔“

”تم! وہ سب کراچی گئے ہوئے ہیں، باقی جو ہیں وہ سو رہے ہیں۔“ اس نے خود پر قابو پاتے ہوئے جواب دیا۔

”یہاں کسی نے نہیں بتایا کہ ہم آ رہے ہیں؟ تم جاؤ اور ٹھنڈا پانی لاؤ۔“

”شاید اس کے آنسوؤں نے اثر کر دکھایا تھا۔ آواز اس مرتبے قدرے نرم تھی۔“

”آپ کس کمرے میں ہیں؟“ اس نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

اگر سامنے انہوں نے ایک سمت اشارہ کیا۔

وہ جلدی سے پانی لینے بھاگ گئی۔ انتہائی ٹھنڈے پانی میں اس نے مزید برف ڈال دی اور تیز تیز چلنے پر کمرے میں آگئی۔

وہی نو جوان سوٹ کیس بیڈ پر رکھے بغیر قمیض کے بغیر بنیان کے صرف چٹلون میں جھکا ہوا تھا۔
”خان پانی“ اس نے متوجہ کیا۔

وہ قدرے چونک کر پلٹا اور سیدھا ہو گیا۔ اس کی پیشانی پر بل پڑے ہوئے تھے۔

”اسٹوڈنٹ..... ال میزڈ..... کیا تمہیں کسی نے نہیں بتایا کہ کمرے میں دستک دے کر آتے ہیں؟“
”جی؟“ ٹرے اس کے ہاتھ میں کانپنے لگی۔

نو جوان نے تولیہ اپنے کاندھوں پر پھیلا لیا تھا۔

”دروازے پر دستک دیئے بغیر کسی کے کمرے میں داخل نہیں ہوتے..... جاہل لڑکی.....“ وہ برہمی سے کہہ رہا تھا۔
وہ تو اتنی بدحواس تھی کہ اسے تو احساس بھی نہیں ہوا تھا کہ وہ کس حلیے میں ہے۔ اس نے ٹرے تپائی پر کھڑکی اور گاہکوں میں پانی اٹھیل کر اس کی طرف آئی۔

وہ پورے قد سے کھڑا تھا۔ اس نے اپنا وجود اس کے سامنے چھوٹی سی گڑیا کی طرح محسوس کیا۔

نو جوان نے گلاس اس کے ہاتھ سے لے کر..... ہونٹوں سے لگا لیا۔

وہ جگ اٹھانے پلٹ گئی اور چند لمحوں کے بعد ہی جگ سمیت پھر اس کے سامنے..... آکھڑی ہوئی۔

نو جوان نے گلاس خالی کر کے اس کے سامنے کر دیا۔ اس نے فوراً پانی اٹھیلنا شروع کر دیا۔

”کھانا کھائیں گے؟“ اس نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ نو جوان کے چہرے پر نظر ڈالنے کی ہمت ابھی تک نہیں ہوئی تھی۔

”ہوں..... مگر ادھر تو شاید بہت ہیوی ڈائنٹ ہوگی اور رات بہت ہو چکی ہے۔ ایسا کرو دو سلاٹس اور ایک گلاس“ وہ لے آؤ بس، مگر بیس منٹ بعد آنا۔ میں ہاتھ لے رہا ہوں۔“

نو جوان نے گلاس واپس کرتے ہوئے بڑی رسائیت سے جواب دیا۔ یوں لگتا تھا جیسے واقعی کوئی آگ بجڑ رہی ہو۔ جس پر ٹھنڈا پانی پڑ گیا تھا۔

اسے ہاتھ داتھ تو سمجھ میں نہیں آیا بس یہ خیال ہوا کہ بیس منٹ بعد آنا ہے۔ اس نے واپس کچن میں آکر دودھ گرم کرنے کو رکھ دیا۔ مکھن فریج سے نکالا جو پتھر بنا ہوا تھا۔

”یہ تو شاید بیس منٹ میں نرم نہ ہو۔“ بہر حال اس کی ترکیب نکالنے کی کوشش تو کی۔ تل کا سادہ پانی لے کر ایک پیالے میں اس میں مکھن کی رکابی چھوڑ دی اور پنکھا (پیڈل) چلا کر پیالہ اس کے سامنے رکھ دیا اور توس سینکے لگی۔

دماغ ہنور نو وارڈ نو جوان میں الجھا ہوا تھا۔ یا اللہ..... اس کو خوش رکھنے کیلئے گھر والوں کو بہت جتن کرنا پڑتے ہوں گے۔ وہ بھی سوچنے لگی کہ اس کی مطلوبہ اشیا اس انداز سے لے کر جائے کہ وہ خوش ہو جائے۔ اما کے ساتھ کچن میں بٹھنے

بٹھنے۔ اس لئے رکھی ہوئی تمام اشیا کا پتا تو چل چکا تھا، اس لئے چھوٹی الائچی ڈھونڈے میں اسے کوئی خاص دقت نہ ہوئی۔ ایک چھوٹی سی اسٹیل کی چٹلی لے کر اندازے سے ایک گلاس دودھ اس میں ڈالا اور دو تین الائچیوں کو باریک کوٹ کر

اس میں ڈال دی اور دودھ پکنے کیلئے رکھ دیا۔ دو کے بجائے چار سلاٹس سینک کر..... خوبصورت سی پلیٹ میں رکھے اور انہیں

دھرنی بھاری پلیٹ سے ڈھانپ دیا تاکہ دیر تک گرم رہیں۔ اتنی دیر میں دودھ کھول چکا تھا اس نے چولہا بند کر دیا اور دودھ کی

بٹلی بھی پیچھے کے سامنے لا کر رکھ دی۔ پھر ایک چمچ شکر خوبصورت وضع کے گلاس میں ڈال کر گھڑی کی طرف دیکھنے لگی۔ جو

ایک طرف دیوار پر بہت اونچا لگی ہوئی تھی۔ اس تمام کارروائی میں بارہ منٹ صرف ہوئے تھے ابھی اس کے پاس آٹھ منٹ

باقی تھے۔ اس نے سوچا وہ ٹھیک دو منٹ پہلے کچن سے نکل کھڑی ہوگی تاکہ پورے بیس منٹ پر کمرے میں موجود ہو۔

اس نے اپنا دوپٹا درست کیا۔ ٹرے میں چیزیں سیٹ میں، دودھ چھان کر گلاس میں ڈالا اور دھڑکنیں سنبھالتی آہستہ آہستہ منزل مقصود کی طرف بڑھی۔

دروازے پر پہنچ کر اس نے سانس درست کیا اور آہستگی سے دروازے پر دستک دی۔
”ہوں! کم ان“۔ اندر سے سرد لہجے میں جواب آیا۔

وہ اندر داخل ہو گئی۔
میرن ہاتھ گاؤن میں وہ نو جوان کرسی پر بیٹھا۔ کیلے بال پیشانی پر جھکے ہوئے تھے۔

زخون بانو نے ٹرے بیڈ پر رکھ کر تپائی نو جوان کے سامنے رکھی۔ پھر ٹرے اٹھا کر تپائی پر رکھ دی اور خود سرو قد ہو کر ہاتھ

مسلے لگی۔
”سلاٹس پر جیلی گاؤ بٹر پسند نہیں ہے ہمیں“۔ حکم صادر ہوا۔
وہ جلدی سے کارپٹ پر بیٹھ گئی عین اس کے مقابل۔

جیلی لگاتے ہوئے اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ وہ بغور اس کی جانب دیکھ رہا تھا۔
”کیا نام ہے تمہارا؟“

”زخون بانو“۔ اس نے پھنسی پھنسی آواز میں جواب دیا۔
”تم لوگوں کے کیلئے تو چھوٹا سا نام کافی ہوتا ہے اتنے بڑے بڑے نام رکھنے کی کیا ضرورت ہوتی ہے کسی ایمر جنسی میں

کال کرنا ہو تو نام لینے ہی میں اچھا خاصا بائیم ویسٹ ہو جائے۔“
”کب گئے تھے یہ لوگ کراچی؟“ وہ اکھڑ لہجے میں بات کرتے ہوئے سوال کرنے لگا۔
”آج ہی گئے ہیں“۔ وہ گھبرائے ہوئے انداز میں بولی۔
”گھر کے لوگ تھے یا باہر سے بھی مہمان آئے ہوئے تھے؟“ اس نے ایک اور سوال کیا۔
”جی میں تو نہیں ہوں مجھے زیادہ نہیں پتا“۔ اس نے ڈرتے ڈرتے جواب دیا۔
”کیا اس سے آگے ہو؟“ اس نے جیلی لگا سلاٹس پلیٹ سے اٹھا لیا۔

”جی میں خالہ سولہ آنے کی رشتے دار ہوں، بہت دور کے گاؤں سے آئی ہوں۔“ اس نے نظریں اٹھائے بغیر جواب دیا۔
 ”پیرنٹس نہیں ہیں تمہارے؟“ دوسرے ہاتھ سے اس نے گلاس اٹھالیا تھا۔
 ”جی؟“ وہ گھبرا کر نوجوان کی صورت دیکھنے لگی۔

”والدین۔“ نوجوان نے انتہائی اختصار سے کام لیا اور دودھ کا گھونٹ بھرا۔
 ”نہیں جی۔“

”ہوں یہ دودھ میں کوئی فلیورکس کیا ہے؟ بہت اچھا ہے؟“

زیتون بانو خاموش رہی، بس یہی سمجھ سکی کہ دودھ اسے پسند آ گیا ہے، سکون سا محسوس ہوا۔

”بس دو کافی ہیں۔“ نوجوان نے تیسرا سلاس اٹھاتے دیکھ کر اسے روکا۔ زیتون بانو نے جھٹ سلاؤں والی رکھ دی۔
 ”اور سنو! ہم بہت دیر تک سوئیں گے، کوئی فون وون آئے تو ہمیں ڈسٹرب مت کرنا، ہاں کرنے والے کا نام لوں۔“
 لینا، ہم خود کال بیک کر لیں گے اٹھ کر کوئی ہمیں جگانے نہ آئے۔ چاہے ہمیں کتنی دیر ہو جائے۔“

بہت ہی عجیب تھا، اتنے دن ہو گئے تھے ان سے حویلی میں آئے ہوئے مگر کوئی بھی اس انداز میں اس سے پیش نہیں آیا۔
 حویلی کے مردوں میں کوئی بھی اس جیسا نہیں تھا۔ صورت، شکل، قد، کاٹھ، انداز اطوار ہر طرح سے مختلف محسوس ہوتا تھا۔
 سب سے زیادہ خوفزدہ وہ بابا صاحب سے مل کر ہوئی تھی، مگر اب یہ ان سے بھی زیادہ خوفزدہ کرنے والی ”ٹے“ محسوس ہو رہا تھا۔

وہ سر جھکا کر بیٹھ گئی تھی۔ اس کی طرف نظر دوڑانے کی تو ہمت ہی نہیں تھی۔

چند منٹوں بعد اس نے دودھ کا خالی گلاس ٹرے میں رکھا تو وہ چونکی اور فوراً کھڑی ہو کر ٹرے اٹھانے لگی۔

”آ..... آ..... آپ بڑے خان کے رشتہ دار ہیں؟“ اس نے جاتے جاتے ہمت کر کے پوچھ لیا۔ نوجوان نے غامض حیرت سے اس کی جانب دیکھا۔

”بے وقوف لڑکی! بیٹے ہیں ہم ان کے سب سے چھوٹے بیٹے۔“

یہ سن کر تو زیتون میں جیسے نئے سرے سے بجلی دوڑ گئی۔ وہ افتاں و خیزاں باہر نکلی تھی۔

”خان کو چائے ناشتے کا نہیں پوچھنا اے زیتون بانو۔“

دوپہر ہونے کو تھی روپا دیوی کی تشویش درست تھی۔

”انہوں نے منع کیا تھا۔ جب وہ انھیں گے تو خود گھنٹی بجادیں گے۔“ اس نے برتن دھوتے ہوئے جواب دیا۔
 راہداری میں گھنٹی جینج اٹھی۔

”اوپروں و جی اے۔“ روپا دیوی بدحواس انداز میں دوڑ گئی، اسے اس لیے روپا دیوی کا دم غنیمت لگا۔ شکر ہے اس نے جان چھوٹی۔

پہن منٹوں بعد روپا دیوی دوبارہ اندر داخل ہوئی، گھبرائی ہوئی۔

”خان تین نوں بلاساں، کہند اے رات والی کڑی نوں بلاؤ۔“ وہ جیسے اب اپنی خیر منار ہی تھی۔

زیتون بانو کے تو جیسے چھکے چھوٹ گئے۔ اس نے برتن ایک طرف کئے، جلدی جلدی ہاتھ دھوئے اور دوپٹا درست کر کے

نزدیک جاتی ہوئی اوپر پہنچی۔

خان بستر پر دراز تھا۔

”السلام علیکم۔“ اس نے بڑے سنبھل کر کہا۔

”تمہیں چائے لے کر آنا چاہیے تھا۔ بالکل سینس لیس ہو۔ اس کو اس لئے واپس کیا تھا کہ اسے ہماری بات سمجھ نہیں آتی۔“

”ہمیں اس کی۔“

”وہ..... جی مجھے پتا نہیں تھا کہ آپ صبح کی چائے پیتے ہیں یا نہیں۔ اب تو دن کے گیارہ بج رہے ہیں۔“

”ہم نے تمہیں اس لئے نہیں بلایا کہ تم ٹائم بتاؤ۔ کمرے میں وال کلاک اور ٹیبل پر رسٹ و اچ موجود ہے۔“

”دیکھو پہلے تو چائے لاؤ پھر یہ کپڑے پر لیں کرنا۔ اس کے بعد ناشتا۔ دو ہاف بوائے انڈے، ایک گلاس دودھ اور بس۔“

اس نے خان کی طرف دیکھا۔ وہ احکامات صادر کر کے ایک موٹی سی انگریزی کتاب میں گم ہو گئے تھے۔

بہت خوبصورت سنہری پھولوں والے سیاہ ٹائٹ گاؤن میں وہ پورے ماحول پر چھا رہا تھا۔ اس کی مونچھیں حویلی کے

”ہم“ ”خانوں“ کی طرح ڈرانے والی تو نہیں تھیں مگر بہت گھنی تھیں جن کی وجہ سے اس کا اوپری ہونٹ بمشکل نظر آتا تھا۔

چراغ بھرا تھا۔ جس پر سرخی غالب تھی۔ بال بہت قرینے سے جھے ہوئے تھے۔

وہ آہستگی سے پلٹ گئی۔

چائے تیار کرتے وقت اس پر عجیب طرح کی عجلت سوار تھی۔

”خان بڑا غصہ کرتا ہے خیال کریں کڑیے۔“ روپا دیوی نے اسے باخبر کیا۔

”ہاں ہاں چل گیا ہے مجھے، تم اور ڈراؤ۔“ اس نے چڑ کر کہا تھا۔

چائے تیار کر کے وہ کمرے میں آئی۔ وہ ہنوز اسی زاویے سے لیٹا تھا۔

”خان چائے۔“ اس چمچ سے کپ بجایا۔

”ہوں رکھ دو۔“

”ناشتا کتنی دیر میں لاؤں؟“

”پھر وہ منٹ میں لے آتا، یہ کپڑے لے جاؤ، ہم شام کو کراچی فلائی کر جائیگے، ڈرائیور کو کہنا کہ وہ کہیں نہ جائے۔“

”کی ٹھیک ہے۔“ وہ تابعداری سے کہہ کر نکلنے لگی۔

”ننگی! وہ کیا نام ہے تمہارا۔ ہاف بوائے کا مطلب پوچھ لینا روپا دیوی سے، الٹا سیدھا ناشتہ لائیں تو ذرا دھیان سے

”کچھ نہ ہو۔“ اس نے میگزین سے نظریں ہٹا کر زیتون بانو کو دم کی آمیزتا کید کی۔

”جی۔ اس کے منہ سے بس اتنا ہی نکل سکا۔ دل دھک دھک کرنے لگا تھا۔ وہ فوراً کپڑے اٹھا کر باہر آئی۔
”یا اللہ! حویلی کے پندرہ بیس لوگ پتا نہیں چلتے اور یہ اکیلا ”خان“ ان سب پر بھاری لگ رہا ہے۔ کراہ رہا ہے۔
ہورہا ہے۔“

وہ دھک دھک کرتے دل کے ساتھ سوچ رہی تھی۔

”تو بتانی! تمہیں بھی ابھی بیمار پڑنا تھا۔ یہ اتنی بڑی حویلی، بھی سجائی، کھانوں کی خوشبوؤں اور پھولوں کی مہک۔ بڑی ہوئی۔“

ادھر وہ کچا کوٹھا..... چار برتن دو چار پائیوں والا جہاں وہ خود کو ملکہ کی طرح محسوس کرتی تھی۔ ایک دم احساس ہوا۔
اس کے ساتھ کچھ اچھا نہیں ہوا۔

”ہائے اللہ! اماں جی! تیسرے آئے ہیں۔“

مہندی گوندھتی ہوئی ریسر بیگم اٹھ کر بھاگی تھیں اور بھائی کے سینے سے لپٹ گئی تھیں۔ آنا فانا ”سیونتھی“ کے بڑے
کھدروں میں خبر پہنچ گئی تھی۔

یاور علی خان بھی آ موجود ہوئے تھے۔

”یار! اطلاع تو کردی ہوتی۔“ وہ ان کو سینے سے لگا کر گویا ہوئے۔

”سوچا تھا شاید ہم کچھ اہمیت رکھتے ہیں مہذب اسر پر از دے کر دیکھیں۔“ وہ بھائی کی پشت پر تھپتھا کر مسکرائے۔

”کتنی مبارک شادی ہے یاور علی! سب موجود ہیں۔“ ریسر بیگم خوشی سے نہال ہو کر کہہ رہی تھیں۔

”کوئی اور نہیں ہے تمہارے ساتھ۔“ سائرہ بھابھی نے سنجیدگی سے پوچھا۔

”کیا مطلب؟“ تیمور خاں حیران ہوئے۔

”بھئی کوئی میم ویم؟“ وہ مسکرائیں۔

”ابھی تو نہیں۔“ انہوں نے معنی خیز انداز میں آنکھ مار کر کہا۔

”کیا مطلب۔“ ابھی سے! وہ ڈپٹ کر گویا ہوئیں۔

”مطلب یہ کہ ابھی تو ہم چھوٹے ہیں۔“ انہوں نے ڈرنے کی ایکٹنگ کرتے ہوئے جواب دیا۔

بے ساختہ قہقہے بر سے تھے۔

”بابا صاحب کہاں ہیں؟“ تیمور علی خان نے باپ کے بارے میں پوچھا۔

”ارے وہ بصیر (یاور علی خان سے چھوٹے) کے ساتھ فیکٹری گئے ہوئے ہیں۔ علیم الدین آئے تھے۔ ان کے رشتے

چلے گئے میں نے کہا بھی کہ بیٹے کی شادی ہے لوگ آ جا رہے ہیں پھر ہو جائیں گے کاروبار مگر وہ سنتے کہاں ہیں۔“

نے شکوہ کیا۔

”بھرا مردانے میں جاؤ وہاں سب ہیں سب بہت خوش ہوں گے تمہیں دیکھ کر۔“ عالم تاب نے کہا۔

”یاور علی خان کے ساتھ مردانے کی طرف بڑھ گئے۔“

”نہ سولہ آنے اماں کو یاد دلادو تیمور لال مرچ والا سالن نہیں کھائیں گے۔“

”نہ سولہ آنے اماں کو یاد دلادو تیمور لال مرچ والا سالن نہیں کھائیں گے۔“

”نہ سولہ آنے اماں کو یاد دلادو تیمور لال مرچ والا سالن نہیں کھائیں گے۔“

”نہ سولہ آنے اماں کو یاد دلادو تیمور لال مرچ والا سالن نہیں کھائیں گے۔“

”نہ سولہ آنے اماں کو یاد دلادو تیمور لال مرچ والا سالن نہیں کھائیں گے۔“

”نہ سولہ آنے اماں کو یاد دلادو تیمور لال مرچ والا سالن نہیں کھائیں گے۔“

”نہ سولہ آنے اماں کو یاد دلادو تیمور لال مرچ والا سالن نہیں کھائیں گے۔“

”نہ سولہ آنے اماں کو یاد دلادو تیمور لال مرچ والا سالن نہیں کھائیں گے۔“

”نہ سولہ آنے اماں کو یاد دلادو تیمور لال مرچ والا سالن نہیں کھائیں گے۔“

”نہ سولہ آنے اماں کو یاد دلادو تیمور لال مرچ والا سالن نہیں کھائیں گے۔“

”نہ سولہ آنے اماں کو یاد دلادو تیمور لال مرچ والا سالن نہیں کھائیں گے۔“

”نہ سولہ آنے اماں کو یاد دلادو تیمور لال مرچ والا سالن نہیں کھائیں گے۔“

نہ۔

”اپنے تیمور ماموں عرف کا کا جان کو پہن کر دکھائیں گے کہ آپ جہاں پڑھتے ہیں وہاں تو بڑی عورتیں بھی اتنا

نہ سولہ آنے اماں کو یاد دلادو تیمور لال مرچ والا سالن نہیں کھائیں گے۔“

نہ سولہ آنے اماں کو یاد دلادو تیمور لال مرچ والا سالن نہیں کھائیں گے۔“

نہ سولہ آنے اماں کو یاد دلادو تیمور لال مرچ والا سالن نہیں کھائیں گے۔“

نہ سولہ آنے اماں کو یاد دلادو تیمور لال مرچ والا سالن نہیں کھائیں گے۔“

نہ سولہ آنے اماں کو یاد دلادو تیمور لال مرچ والا سالن نہیں کھائیں گے۔“

نہ سولہ آنے اماں کو یاد دلادو تیمور لال مرچ والا سالن نہیں کھائیں گے۔“

نہ سولہ آنے اماں کو یاد دلادو تیمور لال مرچ والا سالن نہیں کھائیں گے۔“

نہ سولہ آنے اماں کو یاد دلادو تیمور لال مرچ والا سالن نہیں کھائیں گے۔“

نہ سولہ آنے اماں کو یاد دلادو تیمور لال مرچ والا سالن نہیں کھائیں گے۔“

نہ سولہ آنے اماں کو یاد دلادو تیمور لال مرچ والا سالن نہیں کھائیں گے۔“

سب ہنس کر لوٹے لگیں، مگر اماں جی کی سنجیدگی میں کمی واقع نہ ہوئی ہوئی۔

”ارے ذری کے جوتے بھی لینے جانا تھا بازار پہنچے نہیں ڈرائیور ہے یا نہیں؟“ شفیقہ بھابھی کو معایا دیا۔
”اب آپ ایک جوتے کے لئے بھی بازار جائیں گی؟ زوار بھائی کو کہ دیجئے۔ اسکوڑ بھی تو ہے جا کر پہنچ جائے۔“
”ترغص نے مشورہ دیا۔“

”عالیاب! تیمور سیدھے یہاں آئے ہیں یادریا بستی گئے تھے پہلے۔ یہ تو پوچھ لیتی تم وہاں سب ٹھیک ہے۔“
جی اٹھتے اٹھتے پھر بہو سے مخاطب ہوئیں۔

”ایک دو دن میں کیا ہو گیا ہوگا؟ بس آپ کو بھی فکریں لگی رہتی ہیں۔“ وہ بولیں۔

”یہ سولہ آنے، ماما کے پاس گئی تھی یا انگلینڈ پہنچ گئی؟“ اماں جی کو معایا دیا۔

”آگئی اماں جی! ماما اوپر تھی۔ بچیاں نہ رہی ہے ناں اور ہاں وہاں باغ میں خسرے آئے بیٹھے ہیں۔“
نے نئی اطلاع دی۔

”ارے تو باغ میں بیٹھا چھوڑ آئی، کیا بارات میں لے کر جائے گی۔ آٹا، چینی، پانچ روپے دے کر فارغ کرانیں۔“
چکر بولیں۔

وہ کہہ رہے ہیں، شنگھائی سائٹن کے دو جوڑے لے کر جائیں گے، چودھریوں کی شادی ہے۔

”لو اور سنو! شنگھائی سائٹن کے جوڑے..... ایک بھی نہیں بلکہ دو دو اتنا منہ پھاڑتے ہیں کراچی کے خسرے۔“
اور غصے کے ملے جلے تاثرات سے گویا ہوئیں۔

”ترغص! وہ دینے دلانے والے کپڑوں میں سے کوئی جوڑا نکال دو سولہ آنے کو اوپر دس روپے رکھ دو۔ بارہ آنے کو آٹا آتا ہے۔ دس بارہ سیر آٹے کے پیسے کیا بہت نہیں؟ سیر بھر چینی اور سو جی رکھ دینا۔ جلدی سے فارغ کر کے آنے..... بہتیرا کام پڑا ہے۔“

وہ خود کلامی کے انداز میں بولتی ہوئی باہر چلی گئیں۔

بارات کا ڈرنیپ احمد نے ہوٹل میں دیا تھا۔

نکاح تو صبح دس گیارہ بجے کے دوران ہو گیا تھا۔ صرف گھر کے مرد اور اماں جی گئی تھیں۔

ڈونیاں پہلے سے گیت چھیڑے بیٹھی تھیں۔

،، ترغص! آپا! بھئی مجھے دلہن دکھائیں۔ میں اور زیادہ صبر نہیں کر سکتا،،

تیمور دلہن کو صوفے پر بٹھاتے ہی آن وارد ہوئے۔

،، لو بتاؤ، دلہا سے زیادہ بے صبر ہے ہو،؟ سارہ بھابھی نے چھیڑا۔

،، بھئی، ان کا سامان ہیں، سنبھالتے رہیں گے، کیوں کی تھیں، آپ لوگوں نے اتنی تعریفیں، بس سب سے

بجائے۔“
اس کے ایک طرف یادریا علی خان، دوسری طرف تیمور علی خان بیٹھے تھے۔ گھر کے دوسرے مرد کرسیوں پر براجمان اور
ذخیرہ فرنی ہوئی دلچسپی سے ترغص اور تیمور کی نوک جھونک دیکھ رہے تھے
”یادریا علی خان! اجازت ہے،؟“ ترغص نے شرارت سے مسکرا کر یادریا علی خان کو دیکھا۔
”ہوں۔ ہوں۔ ترغص۔ کیا کر رہی ہو پہلے یہ تو پوچھو بھابھی کو دے کیا رہے ہیں رونمائی میں،؟ سارہ بھابھی نے ذہنی
سندھ کا مظاہرہ کیا۔

”یادریا علی خان! ہم جاب لیس ہیں Depended ہیں، ایسے ہی دیدار کرادیکھئے، ثواب ملے گا۔“ وہ شریر ہوئے۔
”جی نہیں۔ جی نہیں۔ اگر کچھ نہیں ہے تو کلائی سے گھڑی اتار کر دیکھئے۔ وہ بعد میں بیچ کر انگوٹھی بنوا لیں گی،، ایک رشتہ
بیرم سے مننائی۔

”کیکٹ۔۔ کون ہیں یہ ماہر معاشیات؟ سامنے آئیں۔“ یادریا علی خان نے آواز اٹھائی۔
”یادریا علی خان! ہم جاب لیس ہیں، ایسے ہی دیدار کرادیکھئے، ثواب ملے گا۔“ وہ شریر ہوئے۔

”یادریا علی خان! ہم جاب لیس ہیں، ایسے ہی دیدار کرادیکھئے، ثواب ملے گا۔“ وہ شریر ہوئے۔
”یادریا علی خان! ہم جاب لیس ہیں، ایسے ہی دیدار کرادیکھئے، ثواب ملے گا۔“ وہ شریر ہوئے۔

”یادریا علی خان! ہم جاب لیس ہیں، ایسے ہی دیدار کرادیکھئے، ثواب ملے گا۔“ وہ شریر ہوئے۔

”یادریا علی خان! ہم جاب لیس ہیں، ایسے ہی دیدار کرادیکھئے، ثواب ملے گا۔“ وہ شریر ہوئے۔

”یادریا علی خان! ہم جاب لیس ہیں، ایسے ہی دیدار کرادیکھئے، ثواب ملے گا۔“ وہ شریر ہوئے۔

”یادریا علی خان! ہم جاب لیس ہیں، ایسے ہی دیدار کرادیکھئے، ثواب ملے گا۔“ وہ شریر ہوئے۔

”یادریا علی خان! ہم جاب لیس ہیں، ایسے ہی دیدار کرادیکھئے، ثواب ملے گا۔“ وہ شریر ہوئے۔

”یادریا علی خان! ہم جاب لیس ہیں، ایسے ہی دیدار کرادیکھئے، ثواب ملے گا۔“ وہ شریر ہوئے۔

”یادریا علی خان! ہم جاب لیس ہیں، ایسے ہی دیدار کرادیکھئے، ثواب ملے گا۔“ وہ شریر ہوئے۔

”یادریا علی خان! ہم جاب لیس ہیں، ایسے ہی دیدار کرادیکھئے، ثواب ملے گا۔“ وہ شریر ہوئے۔

”یادریا علی خان! ہم جاب لیس ہیں، ایسے ہی دیدار کرادیکھئے، ثواب ملے گا۔“ وہ شریر ہوئے۔

”یادریا علی خان! ہم جاب لیس ہیں، ایسے ہی دیدار کرادیکھئے، ثواب ملے گا۔“ وہ شریر ہوئے۔

”یادریا علی خان! ہم جاب لیس ہیں، ایسے ہی دیدار کرادیکھئے، ثواب ملے گا۔“ وہ شریر ہوئے۔

”یادریا علی خان! ہم جاب لیس ہیں، ایسے ہی دیدار کرادیکھئے، ثواب ملے گا۔“ وہ شریر ہوئے۔

”یادریا علی خان! ہم جاب لیس ہیں، ایسے ہی دیدار کرادیکھئے، ثواب ملے گا۔“ وہ شریر ہوئے۔

”تیور! فوٹو کھنچو کر ہی اٹھو گے۔ ہماری بھی باری لگنے دو۔“ بصیر علی خان نے فوراً بات بدلنے کی کوشش کی۔
”دلہن تھک گئی ہوگی۔ آرام کرنے دو۔“ اماں جی نے کہا۔

”منہ دکھائی تو ہونے دیں اماں جی۔ سب دلہن دیکھنے کے شوق میں کھڑے ہیں۔“

دلہا کی اماں تیرے ڈوروں کے صدمے

باہر سے ڈومینوں کی آوازیں آرہی تھی۔

”ارے! انہیں پپ کرواؤ۔ صبح سے حلق پھاڑ رہی ہیں۔ اکیلی دلہا کی اماں ہی باراتن ہیں۔ نامراد کون سے لڑکے دیکھ لئے انہوں نے میری آنکھوں میں۔“ اماں جی سادگی سے جھلا کر بولیں تھیں۔
بے ساختہ قہقہے گونجنے لگے۔

منہ دکھائی کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ یاور علی خان اٹھ کھڑے ہوئے۔

”پتہ ہے۔ مگر فی الحال یہاں میرا تو کوئی رول نہیں۔“ وہ مسکرا کر گویا ہوئے۔

”صحیح کہہ رہے ہیں۔ انکارول بعد میں شروع ہوگا۔“ عالم تاب نے چھیڑا۔

وہ مسکرا ہٹ دباتے باہر چلے گئے۔

یاور علی خان باتھ روم میں تھے۔ نازنین اپنے بال سکھا رہی تھی۔ معاذ دروازے پر دستک ہوئی۔

نازنین یکدم سنبھل کر بیٹھ گئی اور ڈوپٹہ اٹھا کر سر پر پھیلا لیا۔ اور دروازے کی سمت دیکھنے لگی۔

دستک دوبارہ ہوئی۔ اسکی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ دروازہ کھولے یا وہیں سے آنے والے کو اجازت دے کہ وہ بیڈ سے نیچے اتر آئی۔ اور دروازہ کھول دیا۔

وہ بیڈ سے نیچے اتر آئی۔ اور دروازہ کھول دیا۔

سامنے ہی تیمور علی خان کھڑے شرارت سے مسکرا رہے تھے۔

”اسلام علیکم۔ ہمارے ہاں کی پہلی صبح آپ کو مبارک ہو۔“

نازنین ایک دم اچانک ایک سسرالی نوجوان کو سامنے پا کر ندوس سی ہو گئی۔

”اسلام علیکم۔“ وہ بس سلام ہی کر پائی۔ ”وہ تو ہم آپکو کر چکے ہیں۔ آپ بڑی بھابی ہیں ہماری۔ آپ ہمارے“

جواب دیجیے۔ وہ تنک کر رہے تھے۔

”وعلیکم السلام۔“ وہ دانتوں تلے ہونٹ داب کر بہت آہستگی سے بولی۔

”اندر آنے کو نہیں کہیں گی۔ ہم تو رات سے اس وقت کا انتظار کر رہے ہیں کہ آپ سے کب بات ہو۔“

میں تیرا حسن، حسن بیاں تک دیکھوں

”بھائی کہاں ہیں۔ کیا کر رہے ہیں۔ پہلے ہی دن آپ سے دروازہ کھلا دیا۔ ابھی پوچھتے ہیں ہم۔“

نازنین انکی برجستگی اور بے تکلفی پر قہرے گھبرا کر ایک طرف ہو گئی۔ تیمور علی خان اندر داخل ہو گئے تھے۔

”اب یہاں چلے گئے؟“ وہ ادھر ادھر نظر دوڑانے لگے۔

”نہیں نے اچھے اشارے سے بتایا کہ باتھ روم میں ہیں۔“

”جس میں خامے لٹ ہو گئے۔ اس وقت تک تو انکا ناشتہ بھی ہضم ہو جاتا ہے۔ اوہ۔۔۔ آپکے ہاں تو ابھی چائے بھی

پینے کی عادت ہوگی تو اس وقت آپ کا دل چاہ رہا ہوگا۔ ہے ناں؟“

تیمور علی خان نے آگے بڑھ کر بیل رنگ کی۔ نازنین نظریں جھکا کر بیڈ کے ایک کونے پر تنک گئی۔

”کچھ تو بولے۔ سلام کے جواب سے کچھ سہی پتہ نہیں لگا۔“ وہ شریر ہو رہے تھے۔

”کس چیز کا؟“ بلا خردو آہستگی سے بول پڑی۔

”ابھی بتائیں گے“ آپکو کہ کس چیز کا؟ اچھا پہلے یہ بتائیے کہ آپ ارلی مارننگ اٹھنے کی عادی ہیں؟“

”ہوں! نازنین نے اثبات میں جواب دیا۔

”ہر کیا کرتی ہیں؟“

”تاز پڑھتی ہوں۔“ اسکی آواز سے اسکے وجود کی نفاست ٹپک رہی تھی۔

”ہاں؟“

”نہیں نے مسکرا کر تیمور علی خان کی سمت دیکھا۔

”بہا اس طرح کا اتر دوسب لیں گے ہمارا؟“

”اب!۔“ تیمور علی خان کا قہقہہ بے حد جاندار تھا۔ ”اب بنی ہے بات۔ ماشا اللہ۔ اچھا بولیں گی۔“

”نہیں جھپ کر رہ گئی۔“

نہیں ماما اندر داخل ہوئیں۔ تیمور علی خان کو وہاں پہلے سے موجود پا کر جیسے انہیں خوشگوار حیرت ہوئی۔

”مہو گئی ماما! وی! وی! آئی۔ بیڑا بھی تنک چائے سے محروم ہیں۔ یہ ہماری کوا ایفائیڈ بھابی صاحبہ جو اسٹوڈنٹ لائف

نے گزارنے ایک دم ہمارے ہاں ٹرانسفر ہو گئیں۔ انہیں صبح کی چائے کتنی اچھی لگتی ہوگی۔ آپ کو تو پتا ہے اسٹوڈنٹ

بھائی کے کتنے عادی ہو جاتے ہیں۔ ماما۔ سسرال میں بھابی کے ساتھ پہلی زیادتی۔“

تیمور علی خان کٹن سر کے نیچے رکھ کر اطمینان سے صوفے پر دراز ہو گئے۔

”نہیں ایڈی بیگم نے کہا تھا جب تک یاور خانناں خود نہ لائیں، کمرے میں کوئی نہ جائے اس لئے۔“ ماما نے وضاحت

”نہیں!۔“ اچھا۔ اب چائے لے آئیں۔ صرف دو دلہا دلہن کیلئے نہیں۔ ہمارے لئے بھی۔ ہے تو مدخلت بے

اندیشہ ہوگی۔ بھابی!۔ آپ ہمارے آؤ بھگت کیجیے بطور میزبان۔ پتا نہیں پھر کب

”نہیں!۔“ اچھا۔ اب چائے لے آئیں۔ صرف دو دلہا دلہن کیلئے نہیں۔ ہمارے لئے بھی۔ ہے تو مدخلت بے

”نہیں!۔“ اچھا۔ اب چائے لے آئیں۔ صرف دو دلہا دلہن کیلئے نہیں۔ ہمارے لئے بھی۔ ہے تو مدخلت بے

”کیا مطلب؟“ نازنین یکدم چوٹک پڑی۔

”بھئی۔ ہم مکمل آداب غلامی سیکھ رہے ہیں۔ یعنی انگلینڈ میں زیر تعلیم ہیں۔“

”مگر مجھے تعلیم کا اثر خاص نظر نہیں آ رہا۔“

یاد علی خان براؤن ہاتھ گاؤن میں سفید ٹاول سے سر رکھتے ہوئے ہاتھ روم سے باہر آ گئے تھے۔

”ہماری ریپوٹیشن خراب مت کیجیے! ہم ال میئر ڈاور“ اوڈلی ہیو“ بہر حال ہرگز نہیں ہیں۔“ تیمور علی خان نے بہت محبت اور چاہ سے دیکھا۔

”بھئی، ہم تو تعلیم سے متعلق بات کر رہے ہیں لگتا ہے تم۔ ادھر کچھ خاص کورسز کر رہے ہو گے۔ اچھا کچھ نہیں۔“

”تم میں۔“

یاد علی خان کا لہجہ معنی خیز اور شرارت آمیز تھا۔

”یہ دیکھیے۔ ہونہار لوگوں کی یہ قدر ہے یہاں۔ کس قدر شک و شبہ۔“ تیمور علی خان نے شکایتی انداز میں نازنین کو دیکھا۔

کیا۔ جوان دونوں کی نوک جھونک سے محفوظ ہو رہی تھی۔

”بھائی! آپ کو چائے کا کہہ کر ہاتھ روم میں بند ہونا چاہیے تھا۔ بے چاری کب سے چائے کا انتظار کر رہی۔“

”واقعی؟“ یاد علی خان نے تعجب سے نازنین کو دیکھا۔

اس کی نظریں حیا سے جھک کر رہ گئیں۔

”آپ دونوں بھائی کیا اسی طرح میری درگت بنایا کریں گے؟“ خود اعتمادی تو اس میں بہت تھی بس باطنی طور پر۔

آواز اور الفاظ محتاط تھے۔

”ہم تو خیر چلے جائیں گے۔ پھر یہ اکیلے ہی بنایا کریں گے۔“

تیمور علی خان نے بڑے معصومانہ اور سنجیدہ انداز میں جواب دیا۔ یاد علی خان کا قہقہہ بے ساختہ تھا۔ نازنین نے

مہندی سے رچے ہاتھ چہرے پر رکھ لئے تھے۔

”چھوئیے بھائی۔ بھائی کو تنگ مت کیجیے۔ گڈول ڈیج ہو رہی ہے۔“ تیمور علی خان نے بہت دلچسپی سے

دلنشین ادا کو دیکھا تھا۔

ای دم ماما چائے کی کشتی کے ہمراہ اندر داخل ہوئیں۔

”ادھر لائیے ماما۔ آج بھائی بھائی کی خدمت کا آغاز کریں گے۔“ تیمور علی خان نے تپائی سمجھ کر اپنے

کوششی رکھنے کا اشارہ کیا۔

”بہت ہی اہم تبدیلی ہے۔ مل کر پانی نہ پینے والے چائے بنا رہے ہیں۔“ یاد علی خان نے بالوں میں

ہوئے آئینے میں تیمور علی خان سے کلام کیا۔

”سارے گھر میں روشنی ہے خوشبو ہے تبدیلی سے حیرت کیا۔“ تیمور علی خان نے گویا چھینرخانی کی۔

”یہ ہمارے حصے کے ڈائلاگ ہیں۔“ یاد علی خان نے مصنوعی خفگی سے بھائی کو دیکھا۔

”بھئی۔ ہم مکمل آداب غلامی سیکھ رہے ہیں۔ یعنی انگلینڈ میں زیر تعلیم ہیں۔“

”مگر مجھے تعلیم کا اثر خاص نظر نہیں آ رہا۔“

یاد علی خان نے چائے کی تیاری کے دوران وضاحتی جواب دیا۔

نازنین جو تیمور علی خان کے بے دھڑک انداز گفتگو سے بڑی جزبہ ہو رہی تھی۔ تیمور علی خان کے سادہ اور بے ریا انداز پر

بہت محبت اور چاہ سے دیکھا۔

”بھئی، ہم تو تعلیم سے متعلق بات کر رہے ہیں لگتا ہے تم۔ ادھر کچھ خاص کورسز کر رہے ہو گے۔ اچھا کچھ نہیں۔“

”تم میں۔“

یاد علی خان کا لہجہ معنی خیز اور شرارت آمیز تھا۔

”یہ دیکھیے۔ ہونہار لوگوں کی یہ قدر ہے یہاں۔ کس قدر شک و شبہ۔“ تیمور علی خان نے شکایتی انداز میں نازنین کو دیکھا۔

کیا۔ جوان دونوں کی نوک جھونک سے محفوظ ہو رہی تھی۔

”بھائی! آپ کو چائے کا کہہ کر ہاتھ روم میں بند ہونا چاہیے تھا۔ بے چاری کب سے چائے کا انتظار کر رہی۔“

”واقعی؟“ یاد علی خان نے تعجب سے نازنین کو دیکھا۔

اس کی نظریں حیا سے جھک کر رہ گئیں۔

”آپ دونوں بھائی کیا اسی طرح میری درگت بنایا کریں گے؟“ خود اعتمادی تو اس میں بہت تھی بس باطنی طور پر۔

آواز اور الفاظ محتاط تھے۔

”ہم تو خیر چلے جائیں گے۔ پھر یہ اکیلے ہی بنایا کریں گے۔“

تیمور علی خان نے بڑے معصومانہ اور سنجیدہ انداز میں جواب دیا۔ یاد علی خان کا قہقہہ بے ساختہ تھا۔ نازنین نے

مہندی سے رچے ہاتھ چہرے پر رکھ لئے تھے۔

”چھوئیے بھائی۔ بھائی کو تنگ مت کیجیے۔ گڈول ڈیج ہو رہی ہے۔“ تیمور علی خان نے بہت دلچسپی سے

دلنشین ادا کو دیکھا تھا۔

ای دم ماما چائے کی کشتی کے ہمراہ اندر داخل ہوئیں۔

”ادھر لائیے ماما۔ آج بھائی بھائی کی خدمت کا آغاز کریں گے۔“ تیمور علی خان نے تپائی سمجھ کر اپنے

کوششی رکھنے کا اشارہ کیا۔

”بہت ہی اہم تبدیلی ہے۔ مل کر پانی نہ پینے والے چائے بنا رہے ہیں۔“ یاد علی خان نے بالوں میں

ہوئے آئینے میں تیمور علی خان سے کلام کیا۔

”سارے گھر میں روشنی ہے خوشبو ہے تبدیلی سے حیرت کیا۔“ تیمور علی خان نے گویا چھینرخانی کی۔

بندوبانی نے بے تابی سے دراز کھینچی۔ اور ایک نیوی بلیوٹلی ڈبہ باہر نکالا۔
 دینے کے وقت بھرے انداز میں کھولا۔ تقریباً سب ہی ڈبے پر جھک گئیں۔
 سر: فوٹی انتہائی تیس نازک بہت مختصر سی اونچائی والا تاج ان سب کے سامنے تھا۔
 ”اے زبردست“

”ہوں۔ اشارے کی زبان میں کہا ہے کہ حویلی کی ”وہ“ والی ملکہ تو جب بنیں گی تب بنیں گی۔ دل کی ملکہ البتہ بنالیا
 ہے۔ ساز و سما بھی نے دور کی کوڑی لانے میں سبقت حاصل کی۔
 ”ویسے کہا بھی ہوگا“۔ تزئین نے شرارت سے ٹکڑا لگایا۔ نازنین کا چہرہ کلکوں ہو گیا۔
 ”چہرہ ہماری بات کی تصدیق کر رہا ہے“۔ روشن آراء نے بھی حصہ بٹایا۔
 نازنین نے بے ساختہ دونوں ہاتھ چہرے پر رکھ لیے۔
 خواتین کی مترنم سکرابٹ سے ماحول یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے دنیا میں غم نہیں ہوتے۔ اس سیارے میں خوشی کا سورج
 ڈھلکا ہوا ہے۔

ای شام حویلی واپسی ہو گئی۔ اماں جی کا دل کراچی میں ویسے بھی نہیں لگتا تھا۔ انہیں اپنی حویلی کی مصروفیات بہت عزیز
 تھیں۔
 ”کراچی میں تو میرے ہاتھ پیر بندھ جاتے ہیں۔ یہاں تو کوئی کام ہی نہیں ہوتا اور حویلی میں میرے کام ختم نہیں
 ہوتے۔“

ان ہی کی طرف سے جلدی واپسی کا تقاضا تھا جبکہ ولیمہ تو چار روز کے بعد یعنی اتوار کو تھا۔ کہ بابا صاحب کے بااثر
 بہت احباب شمول بیوروکریٹس کی چھٹی کا دن ہوتا تھا۔

زعین بانو تزئین کا بخشا ہوا گہرا جامنی سفید سلے کے کام سے سجاوٹ پہنے استقبالیہ عملے میں نہایت ممتاز نظر آرہی
 تھیں۔ دیکھنے کے اشتیاق نے اسکے چہرے پر عجیب سی تہمتا ہٹ پیدا کر رکھی تھی۔

”زعین بانو! دھر پیچھے سے آکر دلہن کا غرارہ سنبھالو“۔ تزئین نے مستعدی زیتون بانو کو حسب دلخواہ اعزاز بخشا۔
 ”مادامہ کی میزبیاں ایک جست میں پھلانگی تیمور علی خان برق رفتاری سے اپنا بیگ اٹھائے سب سے پہلے اندر
 بڑھنے کی کوشش میں آگے بڑھے تھے۔

زعین بانو کی نظر ”درمیانی اشیاء“ کو دیکھ ہی کب رہی تھی اسکی نظر تو براہ راست دلہن پر تھی۔ اس بری طرح تیمور علی خان
 سے۔ وہ۔ چوت تو نہیں لگی۔ دیکھ کر چلا کرو۔ اچھا چلو شام باش اٹھو“۔ مختلف قسم کی آوازیں ابھریں۔
 ”نہیں نہیں“۔ دم بخود سے تیمور علی خان نے بس اتنا ہی کہا۔

بس ایک دم ہمیں اپنی بھابھی کا خیال آ گیا۔“

”اللہ کی شان۔ ہمیشہ ایک جراب ہاتھ میں لے کر دوسری کی ڈھونڈ مچانے والے کس قدر زبردست ہوتے ہیں۔
 یوں کن اطلاع ہے کہ ناز بھابھی کی جو دو شادی کے قابل نہیں ہیں انکی منگنیاں ہو چکی ہیں۔“

بصیر علی خان سے چھوٹی بہن روشن آراء نے بڑی دلسوزی سے کہا۔

”لاحول ولا قوۃ۔ ہماری تو معلومات زیر و ہیں بھابھی کی فیملی کے متعلق۔ ہمارے لئے تو بہنوں کی اطلاع کم از کم
 فنیوں کی بھی۔“

وہ تمام چوکس خواتین کو خود پر حملہ آور پاکراٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

”بھئی آپ لوگ اسے کچھ نہ کہیں۔ واقعی اس نے ہمیں عین طلب کے وقت بہت اچھی چائے بنا کر پائی ہے۔“
 یاد علی خان نے خواتین کو اگلے حملے سے باز رکھنے کی کوشش کی۔

”زرا جبکہ دو۔ میں حیرت سے نہ گرجاؤں“۔ تزئین دھپ سے بیڈ پر بیٹھ گئیں۔

”ہائے اللہ اس نے تو بہت تنگ کیا ہوگا“۔ رئیسہ بیگم نے پیار سے نازنین کو ٹھوڑی اونچی کر کے بوسہ دیا۔

”ہم تو بہت پروگرام بنا کر آئے تھے۔ مگر کیا کریں بھائی ہاتھ روم سے جلدی آ گئے۔“ تیمور علی خان بار بار
 زرارے سے مخاطب ہوئے۔

وہ سب ہنس پڑیں۔ یاد علی خان بھی کپ رکھ کر آہستگی سے باہر نکل گئے۔ بہنوں سے تو نہیں بھابیوں سے کیا
 منت خطرہ تھا۔

”ہائے۔ ابھی تنگ زیور نہیں پہنا۔ تزئین ذرا زیور اٹھانا۔ دلہن کے گہروالے بھی آتے ہی ہوں گے۔“

عالم تاب، نازنین کے مقابل بیٹھ گئیں۔

”آپ پہلے چوڑیاں پہنائیں۔ میں بھابھی کے بال سلجھاتی ہوں۔“۔ تزئین نازنین کی پشت کی طرف جھکی۔
 ”بھئی۔ کیا زیورات میں اضافہ نہیں ہوا؟، امینہ بھابھی زیورات ٹوٹنے لگیں۔

”مجھے تو نظر نہیں آ رہا۔ میرا خیال ہے۔ صرف معلومات میں اضافہ ہوا ہے۔“

روشن آرا شوخی سے بولیں۔ خواتین کے مترنم قہقہے بہت بھرپور تھے۔ نازنین کے چہرے پر سرخی چھلکنے لگی۔
 ”بھئی ہم زیادہ دیر سسپنس برداشت نہیں کر سکتے،۔ تزئین نے نازنین کے سر سے ڈوٹھنا اتار کر ایک طرف

اسکے گھٹے دراز بال اگلیوں سے سلجھانے لگی۔

”بھئی ہمیں یاد اور خاناں جیسے چھپرے کا کارنامہ دیکھنے کی بڑی جلدی ہے۔“

عالم تاب، نازنین کی کلائیوں میں کنگن اور چوڑیاں ڈالنے لگیں۔

”بھابی پلیز“۔ تزئین نے آگے کی طرف جھک کر نازنین کا چہرہ چھوا۔

نازنین نے سائیڈ ٹیبل کی دراز کی طرف اشارہ کیا۔ یعنی خود ہی دیکھ لو۔

”چھوڑو جانے دو۔ تم گرے تو نہیں۔ گری تو یہ بے چاری ہے۔“ امینہ بھابھی نے تیمور علی خان کا مونہہ کھینچ کر
کوشش کی۔

”گر بھی سکتا تھا۔ وہ پے بھاگنے دوڑنے کی کوئی لوجک تو نہیں ہے ادھر۔“

انہوں نے بدحواسی زیتون بانو کے چہرے پر خشک انداز میں نظریں دوڑائیں۔

”یہ عمر بغیر لوجک کے ہے تیمور خاناں۔“ تزئین نے شوخی سے دھیان دیا۔

”ہو۔“ وہ سر جھٹک کر آگے بڑھ گئے۔

وہ بھی کھیائی ہوئی دلہن کے پیچھے آکھڑی ہوئی۔

دلہن کو ہال میں پہنچا کر وہ ماما کے ساتھ کچن میں مصروف ہو گئی تھی۔ سب سے پہلے تو سب کو چائے پلانے کا مہموز
”ماما! اب آپ آگئی ہیں۔ تیمور خاناں کے کام آپ ہی کرتا۔ مجھے ان سے بڑا ڈر لگتا ہے۔ ابھی اگر سب لڑیں تو وہ مجھے تھپڑ ضرور مارتے۔“ اس نے کپ دھو کر ٹالی میں لگایا شروع کئے۔

”ارے نہیں۔ ایسے نہیں ہیں۔ کبھی کبھی تو تقریباً سب لوگ ہی چڑچڑے ہو جاتے ہیں۔ یہ تو سب کو خوش رکھنے کا
صاحب کے سامنے بھی نہیں چوکتے۔ باہر پڑھتے ہوئے اتنے دن ہو گئے ہیں۔ حویلی کی تو ساری عاداتیں ختم ہو گئیں۔
میں۔ اپنے بہت سے کام خود ہی کر لیتے ہیں۔ وہاں کراچی میں مجھے اندازہ ہوا تھا۔“ ماما نے تسلی دی۔

”پھر بھی ماما۔“ وہ کسی وضاحت سے مطمئن نہیں ہوئی۔

”اچھا اچھا ٹھیک ہے۔ میں خود ہی دیکھ لیا کروں گی۔ ویسے آج تو توپری لگ رہی ہے۔“

ماما نے اسے محبت سے دیکھا۔

”چھوڑو ماما! آپ بھی کیا بات کرتی ہو۔ نانی کے سامنے کوئی میری تعریف کرتا ہے تو پتہ ہے۔ نانی کیا کہتی ہے۔“

نہی۔

”کیا کہتی ہے“ ماما کے انداز میں دلچسپی تھی۔

”کہتی ہے جنگل میں مورناچ رہا ہے۔“ وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

ماما بھی مسکرا دی۔ ”اللہ تمہارے بھاگ جگائے۔ وہاں کچھ بھی ناممکن نہیں۔“

انہوں نے شفقت سے دیکھ کر دعائیہ کہا۔ چند دنوں میں وہ انہیں بہت عزیز ہو گئی تھی۔ اسکی وجہ سے انہیں بگڑنے

معنی معلوم ہونے لگے تھے۔

اسی دم روپا دیوی اندر داخل ہوئی۔

زیتون بانو۔ تیمور خاناں بلاساں تیاں نو۔“

زیتون بانو کے تو حلق میں گھٹلی پھنس گئی۔

”میں وہاں جاتی ہوں۔ چائے دیکھ لینا۔“ وہ باہر چلی گئی۔

زیتون بانو کے دم میں دم آیا۔ اس کے ہاتھ تیزی سے چلنے لگے۔

پہنچا کر وہ ماما واپس آگئی۔ اس نے آتے ہی زیتون بانو کو ابھی ہوئی نظروں سے دیکھا۔

”زیتون بانو! خان تمہیں بلارہے ہیں۔“

”م۔ مجھے۔“ وہ گھبرا کر پلٹی۔ ”کیوں؟“

”پہنچا کر مجھے تو یہی حکم دیا کہ زیتون بانو کو بھیج دو۔“

اس نے جلدی سے ہاتھ پونچھے۔ بری طرح گھبرا رہی تھی۔ اسی حالت میں باہر نکل گئی۔ اس نے ہاتھ میں پڑی

پینٹل اٹھائی سے دستک دی۔

”ہیں۔“ اندر سے خان کی نارمل آواز آئی۔ اس نے ڈوپٹہ درست کیا اور اندر داخل ہو گئی۔

”جی۔ خان۔“

”او۔ زیتون بانو۔ بات یہ ہے کہ تم کریمز بہت اچھی بناتی ہو۔ یہ پینٹ استری کر دو ہمیں زرا باہر جانا ہے۔“ خان نے بیڈ

پینٹ کی طرف اشارہ کیا۔

”جی اچھا۔“ وہ خان کے نرم انداز پر سنبھل گئی۔ اور آگے بڑھ کر پینٹ اٹھالی۔

”چوٹ تو نہیں لگی تمہیں؟“ اس کے آگے بڑھتے قدم خان کی آواز پر تھم گئے۔

اس نے حیرت سے مڑ کر دیکھا۔ خان ایزی چیئر پر جمو لے ہوئے بغور دیکھ رہا تھا۔

اس نے مزید آنکھیں پھاڑ کر دیکھا۔ آیا یہ خان ہی ہے۔

”نہیں۔“ اس نے نظریں جھکا کر کہا۔

”تم کونسی تھی ناں۔ اس لئے پوچھ رہے تھے۔“ لہجہ تو عام ہی تھا۔

”نہیں۔ مجھے چوٹ نہیں لگی بس وہ ذرا گھٹنے میں درد ہوا ہے۔“

”پلو۔ اچھا ہوا۔ مگر تمہارا سر ہمارے سینے سے بہت زور سے ٹکرایا تھا۔ خاصی تکلیف ہو رہی ہے۔“ لہجہ میں عجیب سی

لمبیر تھی۔

اس نے بدحواس ہو کر خان کی طرف دیکھا تھا۔ مگر وہ تو پرسکون اور نارمل تھا۔

”وہی۔ آپ باہر نکلیں۔“ اس نے سادگی سے کہا۔

”او۔ جی۔“ وہ مرہم ہوتا ہے ناں بڑی تیزی خوشبو ہوتی ہے اس میں۔“

”ماما نے اپنا دانت میں سمجھانے کی کوشش کی۔“

”تمہارا مطلب ہے کس۔ نہیں خیر اب ایسا بھی نہیں ہے کہ محنت کی جائے۔ اچھا خیر تم جاؤ۔ آتے ہوئے چائے ضرور

کرنا۔ بہت اچھا کام کرتی ہو۔ ہمیں ڈر ہے اگر ہم یہاں زیادہ دن رہ گئے تو ہماری عادتیں نہ بگڑ جائیں۔“

”مگر تمہارا مطلب ہوا تھا خان۔ اسے وحشت سی ہونے لگی۔ وہ تیزی سے باہر نکل آئی تھی۔“

پہلے میں خبری انگوٹھے والی چہل ڈال کر جب وہ نیچے آئی تو تزئین سمیت کئی خواتین راہداری میں کھڑی تھیں برسا رہی تھیں۔ سب ایک دم اپنے سامنے پا کر اسے اپنی آرائش بہت محسوس ہونے لگی۔ حجاب سا طاری ہو گیا اس کی رفتار خود بخود آہستہ ہو گئی۔

میں نے کہا۔ "ابھی تو کہہ رہی تھیں کہ وہ زیتون بانو،، تزئین نے بے ساختہ سراہا تھا۔ خدا کے لئے باہر نہ
جائے۔ ارے کیا اتار کلی بنی ہوئی ہو آج۔ واہ زیتون بانو،، تزئین نے بے ساختہ سراہا تھا۔ خدا کے لئے باہر نہ
جائے۔ آپ سے باہر ہو گیا تو کہیں اپنی نور جہاں نہ بنا لے،،
سازدجا بھی کو انجانے خطرے کی کھنٹی سنائی دینے لگی۔

”جی۔۔۔ وہ ایک دم دل شکستہ ہو گئی کہ بیکار گئی ساری محنت جب اسے محفل میں گھومنے پھرنے کی اجازت ہی نہیں۔“

”اقتل۔ مذاق بھی نہیں سمجھتی۔ خوشی کا دن ہے۔ ناچو گاؤ گھومو پھرو۔ اگر جلدی فارغ ہو گئے تو تمہارا گانا بھی ضرور سنیں۔“

”بھاری نمی تمہاری آواز بہت خوبصورت ہے۔ اس جگہ میں گاؤ گی تو گانا سننے کا مزہ ہی کچھ اور ہوگا۔“

”بڑا بڑب نام ہے تمہارا بالکل بھی سوٹ نہیں کرتا تم پر۔ تمہارا نام تو ”مطربہ“ ہونا چاہیے۔“

”آج تمہیں ہم اسی نام سے پکاریں گے۔ کیا خیال ہے بھابھی۔ کیسا نام ہے؟“ تزئین نے سارہ کو مخاطب کیا۔

”اے اتاسر نہ چھاؤ۔ کہیں لینے کے دینے نہ پڑ جائیں“۔ امینہ کے اعصاب ہر قسم کی صورت حال میں کنٹرول میں

اُسے نہیں بھابھی یہ تو بڑی بے وقوف اور سادہ سی لڑکی ہے۔ چلو اب تم ہمارا شکریہ ادا کرو۔ ہم نے تمہیں کتنا
مناہ دیا ہے۔ مطربہ..... محبت کے گیت چھیڑنے والی۔“ تزئین بہت فراخ دل تھیں۔
اور خیران کی شکل دیکھئے گی۔

ادبیت سرخوشی کے عالم میں باہر باغ میں آئی تھی۔ جو نگاہ بھی اس کی جانب انٹھی تھی پر ستائش اور سوالیہ تھی۔ کون ہے؟
نیز..... واقعہ..... جیل میں مگر پھر تنہا.....

میر..... واقعی..... جویلیں میں بھی اتنی خوبصورت کینٹریں ہونے لگیں؟ عجیب طرح کی چہ میگوئیاں تھیں۔ وہ یہاں
عالمِ فحش کی ہانڈاڑی اڑی پھرنے لگی۔

وہاں پر موجود خواتین کے لباس جتنا قیمتی نہیں تھا۔ مگر روپ بڑا انمول تھا۔
 ان کی ہر گت کی سمت بھی مٹی۔ اسے شاید خود بھی پتہ نہ تھا کہ وہ ایسا کیوں کر رہی ہے۔
 شہر کی حکومت قرض وصول کرتی تھی۔

میں نے اس کو دھوکا دیا تھا۔
 میں نے اس کو ارادہ ہے ارادہ اسے سراہا تھا مگر اسے مزہ نہیں آیا تھا۔ کوئی اور بھی ادھر روشنی بنا گھوم رہا تھا۔ اس کی روشنی
 میں نے کب آتا تھا۔
 میری ہر ہلنے کے باوجود اس کی تمنا پوری نہیں ہوئی تھی۔
 میرا ایک جہد ہو گیا تھا۔

کھانا شروع ہو چکا تھا۔ غیر معمولی ہلچل مچی ہوئی تھی۔ کھانے کی خوشبوئیں بھی اسے متوجہ کرنے میں کامیاب ہوئی۔ کھانا ختم بھی ہو گیا لوگ آہستہ آہستہ واپس ہونے لگے۔ سہری فرش غارے میں ملبوس نازنین بھی کچھ پہنچادی گئی تھی۔

”تو نے کھانا کھا لیا زیتون بانو۔؟“ گہرے نیلے کپڑوں میں ملبوس کرن پھول پہنے ہوئے ہونٹ ہاں سے بولیں۔
خالہ سولہ آنے اس کے سر پر کھڑے اس کو تعجب سے دیکھ رہی تھیں۔

”کھالوں کی خالہ..... ابھی بھوک نہیں ہے۔“ وہ بددلی سے بولی۔

”کب کھائے گی۔ کیا سویرے۔ آدھی رات ہو چلی۔ چل اٹھ۔ چھوٹی بی بی جان بلار ہی ہیں۔“ وہ بولیں۔
”کون ترنیں بی بی۔“ وہ چونکی۔

”ہاں ہاں اور ادھر ہال میں ہیں سب۔ جلدی سے چلی جا۔ دوبار بول چکی ہیں مجھے۔ مجھے کیا خبر تھی کہ تو یہاں ہے۔ ڈھونڈتی پھر رہی تھی ادھر ادھر۔ چل شاہاش۔“ وہ اندر کی طرف بڑھ گئیں۔

وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ اور آہستہ آہستہ چلتی ہوئی ہال میں آگئی۔ وہاں کا تو منظر ہی اور تھا۔

دلہن صوفے پر بیٹھی ہوئی تھی۔ کچھ خواتین کرسیوں پر کچھ نیچے براجمان تھیں۔ تہقے اور ہنسی کی آوازوں سے ہال گونج رہا تھا۔ وہ ترنیں کے بائیں طرف آکھڑی ہوئی۔

”جی بی بی جان!“

ترنیں جو اپنی کسی بات میں محو تھیں ایک دم چونکیں۔

”لو بھئی..... مطربہ آگئی۔“

”مطربہ..... یہ سب تمہارا گیت سننے کے گئے بے تاب بیٹھی ہیں۔ بھی جب ماما نے بتایا کہ بڑی سرلی اور بڑا ہے۔ لگتا ہے کوئی بڑی ہنرمند گلوکارہ گا رہی ہو۔ ہم نے تو اسی وقت فیصلہ کر لیا کہ اس کے گیتوں سے محفل ضرور جائزہ لے گا۔“

”مم..... مجھے گانا نہیں آتا بی بی جان۔ ماما تو ویسے ہی کہہ رہی ہوں گی۔“ وہ اتنے جھوم کی نظریں خود پر پڑے ہوئے آکر بوکھلا گئی۔

”اچھا اب گلوکاروں والے نعرے نہ کرو۔ چلو جلدی سے سنا دو شاہاش۔“ ترنیں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے منہ پر لیا۔

وہ چپ چاپ بیٹھ گئی۔ حلق میں جیسے کچھ انک رہا تھا۔

”بات نہیں کریں گے ہم تم سے۔“ ترنیں خفا ہونے لگیں۔

اس نے چند منٹ تھوک نکلنے میں لگا دیئے۔ پھر بالآخر اس نے گیت گانا شروع کر ہی دیا۔

آئے گا..... آئے گا..... آئے گا آنے والا

آئے گا آنے والا

دیکھ بھیک سے پروانے جل رہے ہیں

کوئی نہیں چلاتا اور تیر چل رہے ہیں

زپے گا کوئی کب تک بے آس بے سہارے

لیکن یہ کہہ رہے ہیں دل کے میرے اشارے

آئے گا..... آئے گا

محفل پر ایک سکوت طاری ہو گیا تھا۔ کیا غضب کی آواز تھی بلا کا سوز اور رچاؤ تھا۔ پختگی کا یہ عالم گویا روزانہ ریاض کرتی رہاں پر مکمل کنٹرول۔ جیسے ندیا کا پانی رواں ہوا اور کوئی معمولی سی بھی رکاوٹ سامنے نہ ہو۔
اس کے خاموش ہوتے ہی جیسے سب سوتے سے جاگ پڑے۔

”اے!..... بڑی زبردست شہ در یافت کی ہے۔“ روشن آرا نے پلٹ کر دروازے کے پاس بیٹھی ماں کو داد دی۔

”بی بی جان اسے کہیں۔ وہ سنائے۔ تنہائی بنایا کرتی ہے کچھ بیتے دنوں کا فسانہ۔“

”ہاں۔ ہاں۔ سناؤ۔ ہم نے نہیں سنا کبھی یہ گیت۔ گیت ہے یا غزل ہے؟“ سائرہ نے اشتیاق اصرار کا فوری مظاہرہ

”گیت ہے۔ میں نے بچن میں سنا تھا۔ مجھے بتا رہی تھی کہ میں نے کسی کے ہاں گراموں فون پر سنا تھا سا ہیوال۔“ ماما نے جواب دیا۔

”جلدی سے سناؤ مطربہ دیکھو دلہن بھابی کتنے شوق سے سن رہی ہیں۔ یقیناً تمہیں انعام بھی دیں گی۔“

ترنیں شہر انداز میں گویا ہوئیں۔ نازنین نے جھینپ کر نظریں جھکا لیں۔

”دیکھیں بھئی۔ سب موجود ہیں۔ غور سے سن لیں ہم نے اس کا نام بدل دیا ہے۔ آج سے سب اسے مطربہ کہیں گے۔“

”واہ ترنیں کتنا بجا رانا ہے۔ اپنی آنے والی نسل کے لئے ہی سنبھال رکھتیں۔“ عالم تاب نے برجستہ کہا۔

ترنیں نے جیسے سنا ہی نہیں۔ بس ایک سایہ سا چہرے پر لہرا کر رہ گیا۔

”ہاں تو شروع کرو ناں۔ کیوں اتنی منتیں کروا رہی ہو۔“ سائرہ بھابھی نے قدرے خشکی سے کہا۔ مہمان خواتین کی طرف سے مگر سراہا ہوا۔

نہ کی سنایا کرتی ہے کچھ بیتے دنوں کا فسانہ

خیزوں کا کسی سے کمرانا اک دم سے وہ دل کا رک جاتا

کچھ تو کسی کی چاہت میں جیسے کو مصیبت کر لینا

کچھ تو کسی کو گھبراتا بھلائے کوئی تو رو دینا

”بی بی جان۔“ روپا دیوی گھبرائی ہوئی ہال میں داخل ہوئی۔

”سب چونک پڑیں۔ کیا ہوا؟“

”تیور خاناں لوں سانپ ڈنگ ساں۔ تے او بے ہواں ساں۔ تہاں جھیتی جلو“۔

”ہائے اللہ۔ ارے“۔ مختلف قسم کی آوازیں ابھریں۔ سب ہی کچھ بھول گیا۔ وہ سب گرتی پڑتی باہر ہو گئیں۔ دیوی ان کے آگے آگے دوڑ رہی تھی۔ وہ بڑے بھائی کی بیٹھک کی طرف جا رہی تھی۔

ابھی وہ سب دروازے کے قریب پہنچی تھیں کہ بڑے بھائی اور یاو علی خان۔ تیور کو اٹھائے ہوئے گاڑی کے دروازے پر نظر آئے۔

ترکین تو جیسے تیور آکر گرنے لگی۔

”دیکھو ماما! اماں جی کو پتا نہ لگے اور دیکھو تم دلہن کو ان کے کمرے میں پہنچا دو“۔

”ہائے اللہ۔ کیا ہو گیا یہ عالم تاب نے مضبوط اعصابی کا مظاہرہ کرتے ہوئے احکامات جاری کئے۔

ترکین روشن آرا رئیسہ دہیں بیٹھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ ابھی مہمانوں کی چہل پہل موجود تھی۔ بارگاہی نظر سے روشن تھا۔ مگر اب چہار سو وحشت سی طاری ہو گئی تھی۔

گاڑی باہر جا چکی تھی۔

”ترکین۔ خود کو سنبھالو۔ انشاء اللہ کچھ نہیں ہوگا“۔ ترکین کی غیر حالت دیکھ کر عالم تاب نے ان کا سراپے بنے ہاتھ دلا سادیا۔

زیتون بانو کو تو جیسے سکتہ ہو گیا تھا۔ وہ برآمدے کی سیڑھی پر دم بخود کھڑی تھی۔

بمشکل سب واپس اندر آئیں اور ٹیلی فون کے قریب بیٹھ گئیں۔ انسانوں سے گھر بھر اڑا تھا۔ مگر ایک ہولناک آواز سو پھیلا ہوا تھا۔

نازنین اپنے کمرے میں بری طرح رو رہی تھی۔ اس کے میکے والے اپنے رشتے داروں کے ہاں پڑا دروازہ پر تھے۔

یہاں کے دقیانوسی ماحول کو دیکھتے ہوئے ایک خوف اس کے وجود میں خون بن کر دوڑ رہا تھا۔

خدا نخواستہ تیور علی خان کو کچھ ہو گیا تو ہمیشہ کیلئے منحوس کا ٹھپہ اس پر لگ جائے گا۔ اور یہ داغ دھوئے نہ دھوئے گا۔ فوراً سے پیشتر لباس تبدیل کیا۔ زیورات اتارے۔ نسل پاش صاف کر اور وضو کر کے نفل پڑھنے میں مصروف ہو گئی۔

اماں جی تو دس بجے ہی اپنے کمرے میں جا چکی تھیں کہ وہ بہت تھک چکی تھیں۔ دوسرے عشا کی نماز بھی پڑھ چکی۔ زیتون بانو بے قرار سے انداز میں ٹہلتی رہی۔ یوں کہ کوئی معجزہ ہو جائے اور تیور علی خان اپنے پاؤں پر چلے ہوئے

میں داخل ہوں۔ اور وہ اپنے تھکے ہوئے وجود کو بستر پر ڈال کر پرسکون ہو کر سو جائے۔

کافی دیر ٹھننے کے بعد وہ اندر چلی آئی۔ بجائے ہال میں جانے کے وہ نازنین کے کمرے میں چلی آئی۔

دروازے پر دستک دی تو نازنین کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ جلدی جلدی دعا پوری کی چہرے پر ہاتھ پھیرا۔

بنت اپنے کے بجائے گرتی پڑتی دروازے تک آئی اور کانپتے ہاتھ سے دروازہ داکیا۔

”ہو۔ زیتون بانو کو سامنے دیکھ کر اس نے گہرا سانس لیا اور سوالیہ نظروں سے اس کی سمت دیکھا۔

”خیریت بہناں“۔ عجیب سہا انداز تھا۔

”پہنیں چھوٹی بیگم۔ ابھی تو کچھ خیر نہیں“۔ اس نے کم صم سے انداز میں کہا۔

”اندر آ جاؤ زیتون بانو۔ میرا دل بہت گھبرا رہا ہے اکیلے میں“۔ وہ بستر کی طرف پلٹتے ہوئے روہاںسی آواز میں گویا

”دروازہ بند کر کے چلی آئی اور کارپٹ پر بیٹھ گئی۔

”ہاں نہیں سانپ کہاں سے آ گیا۔ کیا اس سے پہلے بھی سانپ نکلے ہیں یہاں؟“ نازنین نے پوچھا۔

”ہاں نہیں۔ مجھے بھی زیادہ دن نہیں ہوئے یہاں آئے۔ اتنا بڑا باغ ہے۔ پھول پودے ہیں۔ سانپ تو ہو سکتے ہیں۔ سنا بہات کی رانی جہاں ہوتی ہے وہاں سانپ آ جاتے ہیں۔ باغ میں تو رات کی رانی بکھڑی پڑی ہے۔ پوری حویلی مہکی ہوئی بنے رات کو“۔ زیتون بانو نے جواب دیا۔

”تم کہاں سے آئی ہو؟“ نازنین نے اس کے حسمین اور اداس حسن کو سر سے پاؤں تک دیکھا۔

”بہت دور کے ایک گاؤں سے آئی ہوں۔ ہمارے گاؤں میں بھی بڑے سانپ نکلتے ہیں۔ کھیتوں میں پانی لگاتے رات کو عام طور پر بڑے لوگوں کو ڈستے ہیں۔ مگر وہ لوگ انتظام رکھتے ہیں۔ ہمارے گاؤں میں ایک بڑا سیانا حکیم ہے۔ بیکیم چلن والا بولتے ہیں۔ اس کو جی بڑا ہنر ہے۔ کوئی دوا لگاتا ہے اور پتا نہیں کیا کھلا کر الٹی کراتا ہے۔ ذرا دیر میں نکل پڑتا ہے۔ میرے ہوش میں تو جی آج تک وہاں سانپ کے ڈسنے سے کوئی نہیں مرا۔ بس زیادہ ہوتا ہے تو بندہ ہوش ہو جاتا ہے“۔ اس نے تفصیل سے جواب دیا۔

”دعا کرو۔ تیور صحت سلامت واپس آئیں۔ ورنہ میں تو گئی تھی کام سے“۔ نازنین نے بے قرار لہجے میں کہا۔

زیتون بانو نے چونک کر اس کی شکل دیکھی۔ ہلکا انگری ہلکے کام کا سوٹ پہنے ہوئے اور پیشانی تک دو پٹا سیدھا ہوئے

”کتنی“۔ (سانپ نے تو تیور خاناں کو ڈسا ہے خدا نخواستہ یا در خاناں کو تو نہیں) دماغ میں بنیادی جت سوار ہوئی۔

”تو نازنین نے اس کے حیرت آمیز سوال کا کوئی جواب نہیں دیا۔ بس خاموشی۔ سے اپنی ہتھیلیاں دیکھنے لگی۔

”تو نازنین نے اس کے حیرت آمیز سوال کا کوئی جواب نہیں دیا۔ اس نے زیتون بانو کے استغراق میں مداخلت کی۔

”تو نازنین نے اس کے حیرت آمیز سوال کا کوئی جواب نہیں دیا۔ اس نے زیتون بانو کے استغراق میں مداخلت کی۔

”تو نازنین نے اس کے حیرت آمیز سوال کا کوئی جواب نہیں دیا۔ اس نے زیتون بانو کے استغراق میں مداخلت کی۔

”تو نازنین نے اس کے حیرت آمیز سوال کا کوئی جواب نہیں دیا۔ اس نے زیتون بانو کے استغراق میں مداخلت کی۔

”نہیں۔“

”گاؤں میں ہیں؟“

”نہیں۔“

”پھر۔“ نازنین نے تعجب سے اس کی صورت دیکھی۔ کسی خبر کے آنے تک جو اندر کی وحشت تھی اسے بھی تو بہرہ رکھنا تھا۔ اس لئے وہ اس سے سوال جواب کرنے لگی تھی۔

”مجھے میری ثانی نے پالا ہے چھوٹی بیگم۔“ اس نے بڑے سجاؤ سے جواب دیا۔

”ماں مرچکی تمہاری؟“ نازنین نے تاسف بھرے لہجے میں کہا۔

”سمجھ لیں۔“ بڑا عجیب انداز تھا۔

”ہیں؟“ نازنین نے بغور اسے دیکھا۔ ”یا تو بندہ زندہ ہوتا ہے یا مرا ہوا۔ یہ سمجھ لیں۔ کیا ہوتا ہے؟“

”بعض لوگ کسی کیلئے جیتے جی مرجاتے ہیں چھوٹی بیگم!“ اس نے خاصی تلخی سے لہجہ آلودہ کر کے جواب دیا تھا۔

”اور باپ؟“

”اسے بھی مرا ہوا سمجھ لیں۔“ وہ زہر خند سے گویا ہوئی۔

نازنین کا جی چاہا ”سر پیٹ لے۔“

”اچھا چلو چھوڑو۔ جاؤ باہر دیکھ کر آؤ کہ کوئی فون دون آیا۔“ اسے پھر وسوسوں نے آگھیرا۔

زیتون بانواٹھ کھڑی ہوئی۔ ”اللہ اپنا کرم کرے جی۔“ وہ خود کلامی کے انداز میں کہتی ہوئی باہر چلی گئی۔

نازنین بستر سے اتر کر درپے میں آکھڑی ہوئی۔ یہاں سے پورج کا منظر صاف نظر آرہا تھا۔ باغ میں لگے ہوئے رنگ برنگ فلتے بھی جیسے دھندلا رہے تھے۔

وہ سر سے پاؤں تک دعا بنی ہوئی تھی۔ جان سولی پر لٹکی ہوئی تھی۔ اس کی خوش قسمتی اور بد قسمتی آج کے واقعے سے مراد ٹھہری تھی۔

خوشی سے نہال زندگی گزارتے گزارتے۔ یہ عجیب و غریب موڑ آیا تھا۔ ذہن ان مقامات پر اڑان بھر رہا تھا۔

گوشوں کو بے نقاب کر رہا تھا جو شاید وہ کبھی خواب میں بھی نہ سوچتی۔

اسے نئی آگئی ہوئی کہ ہر تبدیلی اپنے اندر معلومات و احساسات کے ہزار ہا پہلو لئے آتی ہے۔ ورنہ شاید عمر بھر اسے یہ چل پاتا کہ خوش قسمتی و بد قسمتی بھی مشروط ہوا کرتی ہے۔ اور لوگوں کی رائے پر زندگی کا انحصار بھی ہوا کرتا ہے۔ اتنا ہے کہ

ہے انسان؟ اس کے اعصاب شل ہونے لگے۔

وہ سر تھام کر صوفے پر بیٹھ گئی۔ جانے کتنی دیر بیٹھی رہی۔ عجیب بے خبری تھی۔ اسی دم یاور علی خان دروازہ کھول کر داخل ہوئے۔

”نازنین چونک کر اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔“

”ننگ۔“ کہے ہیں تیمور؟“ اس نے یاور علی جان کا چہرہ گہری نظروں سے دیکھا۔

”اللہ اللہ۔ ڈاکٹر بتا رہا تھا کہ ذہر بڑی تیزی سے پھیل رہا تھا۔ مگر معجزہ ہوا ہے۔ اب ٹھیک ہیں مگر پتہ نہیں کیوں ایک دم

تیز بچر ہو گیا ہے۔“ وہ فکر مندی سے بولے۔

نازنین کو احساس ہوا جیسے اس کے اعصاب کسی شکنجے میں کسے ہوئے تھے۔ ایک دم آزاد ہو گئے۔ ہلکا پھلکا ہونے کا احساس اسے پوری شدت سے ہوا۔ بے اختیار آنسو بہنے لگے۔

یاور علی خان شیردانی کے بٹن کھول رہے تھے۔ ایک دم رک گئے اور تیزی سے نازنین کے قریب آئے۔ ”کیا ہوا۔“

”نازنین نے دونوں ہاتھوں سے چہرہ ڈھانپ لیا۔ اور ہچکیوں سے رونے لگی۔“

”ناز۔ کیا بات ہے زندگی؟“ وہ بے حد فکر مند ہو گئے۔

”کچھ نہیں۔ خوشی کے آنسو ہیں۔ اب سے کچھ دیر پہلے میں بہت ٹینس تھی۔ خدا خواستہ تیمور کو کچھ ہو جاتا تو میں شاید آپ

کی جوبلی کے کتے سے بدتر ہوتی۔“ وہ خود پر قابو پا کر کہہ رہی تھی۔

”ہائیں..... مگر وہ کیوں؟“ یاور علی خان دم بخود رہ گئے۔

”آپ کے ہاں تو سب مجھے منحوس کہنے لگتے۔“ وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔

”اوہ..... مائی..... گاؤ۔ بھروسہ کرنے میں اگرچہ دن تو لگتے ہیں لیکن آغاز تو ہونا چاہیے۔ ایسے لگتے ہیں ہم آپ کو

؟ ہماری رائج میرج ہے مگر ہم کو تو پہلی پہلی شب سے ہی لومیرج لگ رہی ہے۔“

وہ شرارت سے اس کی ٹھوڈی انگلیوں سے اٹھا کر اٹک صاف کرنے لگے۔

”آپ کی بات نہیں کر رہی۔ ماحول کے حساب سے ایک سوچ آئی تھی۔“ وہ جھینپ کر دھیرے سے مسکرائی تھی۔

”بس جب ہم آپ کے ساتھ ساتھ ہیں تو آپ کو دوسروں کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ تعلق میں اعتبار نہ ہو تو پھر خوشی

کیا۔“ وہ جیسے اس کی دلکش مسکراہٹ پر ثار ہو گئے۔

”شکریہ۔“ اس نے اعتبار دلانے والے کے سینے پر ہاتھ رکھ گہرے سکون کا احساس کر کے کچھ دیر پہلے کی اذیت کا مداوہ

کرنے کی کوشش کی۔

.....

بغیر کیا تھا چنے بھن رہے تھے۔ تازمین نے سب کو سونے کے لئے بھیج دیا تھا اور خود تیمور کی پیشانی پر پٹیاں رکھ رہی تھی۔ زہن بانواٹھ کھڑی ہوئی دیر بعد پانی بیل لے کر آئی۔

”اے اللہ..... جراثیم ابھی تک چڑھی ہوئی ہیں۔ ذرا اتارنا۔“ تازمین کی نظر معاً تیمور علی خان کے پاؤں پر پڑی تھی۔

”تازمین بانواٹھ سرعت سے آگے بڑھی اور جراثیم کھینچنے لگی۔ گلابی گلابی پیروں کو اس نے نرمی سے چھوا۔ پھر ایک دم سے گھبرا

کر ٹھیک طرف دیکھا۔ وہ اپنے کام میں منہمک تھیں۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

”آپ آرام کریں بی بی جان۔ پٹیاں میں رکھ دیتی ہوں۔“ اس نے تھکی تھکی سی تازمین کو مخاطب کیا۔

”بس اب آرام ہی کرتا ہے۔ شکر ہے، اللہ نے میرے بھائی کے حال پر رحم کیا۔ ہم سب پر رحم کیا۔“۔ تم نے کچھ کھاؤ گے۔ وہ اٹھتے ہوئے پوچھنے لگیں۔

”آپ آرام کریں آپا۔ اب پہلے سے بہتر ہیں ہم۔ یوں بھی سارا دن مصروفیت رہی ہے۔“ وہ بہت رنجش سے جواب دیا۔

”چاند، میرے میں بالکل بھی تھکی نہیں ہوئی نہیں ہوں۔ تم فکر نہ کرو۔“ انہوں نے تیمور علی خان کا چہرہ محبت سے پھیر دیا۔

”پھر بھی۔ رات بہت ہو گئی ہے۔ اماں جی تو ٹھیک ہیں ناں۔ نظر نہیں آئیں۔“ معا انہیں ہال کا دھیان آیا۔

”وہ اپنے کمرے میں جا چکی تھیں۔ انہیں بتایا نہیں، وہ تو ایسے ہی دل کی مریضہ ہیں۔ انہیں تو سنبھالنا پڑا۔“

جاتا۔“۔ ترمین نے جواب دیا۔

”بہت اچھا کیا۔“ تیمور علی خان نے آنکھیں موند لیں۔

”بی بی جان۔ اٹھیے۔ آرام کیجیے۔ میں خان کے پاس ہوں۔ جب تک خان میں نہیں گے میں یہاں سے انگوٹھ جاؤں گی، آپ اطمینان رکھیے۔“ اس نے پھر کہا۔

”ٹھیک ہے۔ بہت کام کرتی ہے یہ۔ بڑی محنتی ہے۔ اماں جی کہہ رہی تھیں، یہ تو میرے ہاتھ پاؤں بنتی جا رہی ہے۔“

ہے میں نے اس کا نام زیتون بانو سے بدل کر مطربہ رکھ دیا ہے۔ سب کو بہت پسند آیا۔“ ترمین بھائی سے ہلکی پھلکی بات کرنے لگی۔

”بہت خوب۔ آپ اپنی صلاحیت۔ منو ای لیتی ہیں آپا۔ اس کا نام بدلنے کا تو ہم بھی سوچ رہے تھے۔ بڑا بہنام منہ اس کا۔ وہ کون سی بانو۔ انہوں نے ایک لمبے لمبے آنکھیں کھول کر سامنے دیکھا۔ ”زیتون بانو۔“ ترمین نے مسکرا کر ان کی پٹائی سے پٹی ہٹا کر دوسری رکھی۔

”ہوں۔ جائیے آپ آرام کیجیے۔ ہم پہلے سے بہت بہتر محسوس کر رہے ہیں۔“

”اچھا۔ ایک منٹ ذرا تمہارا ٹمپریچر نوٹ کر لیں۔“

انہوں نے سائیڈ ٹیبل سے تھرما میٹر اٹھا کر جھٹکا اور تیمور علی خان کے منہ میں دے دیا۔

”ایسا کرو۔ تیمور کے لئے ایک کپ چائے بنا لاؤ۔ انہوں نے تو شاید کھانا بھی نہیں کھایا تھا۔“۔ ترمین نے زیتون بانو سے کہا تو وہ ایسے باہر نکل گئی جیسے ملتھر ہی تھی۔

پانچ سات منٹ بعد واپس آئی تو ترمین بدستور پٹیاں کرنے میں مصروف تھی۔

”اب بخار کیسا ہے خان کا بی بی جان۔“ اس نے کپ انہیں تھماتے ہوئے پوچھا۔

اسے بھی گویا تھرما میٹر کے رزلٹ سے بڑی دلچسپی تھی۔

اللہ کا شکر ہے، اب تو بہت فرق ہے۔ میرا خیال ہے دس پندرہ منٹ اور پٹیاں رکھی جائیں تو بہت زیادہ فرق پڑے گا۔“

”ٹھیک ہے۔ میں بدل دوں گی۔ آپ آرام کریں۔“

”جی۔ تیمور، تم یہ چائے پی لو۔ کچھ کھاؤ گے۔“ وہ اٹھتے ہوئے پوچھنے لگیں۔

”نہیں۔“ انہوں نے آنکھیں کھولے بغیر نفی میں سر ہلا دیا۔

”نہیں کمرے سے باہر چلی گئی۔“

”نہیں۔“ اس نے ڈرتے ڈرتے ان کا چہرہ دیکھا۔

”بہت تکلیف ہوتی ہے؟“ اس نے ڈرتے ڈرتے ان کا چہرہ دیکھا۔

”نہیں۔“ انہوں نے بے تاثر لہجے میں جواب دے کر چائے کا گھونٹ بھرا۔

”نہیں۔“ انہوں نے کھلتے ہوئے سبز دوپٹے کے بالے میں اس کا پر نور چہرہ ایک لٹکلے کو دیکھا۔

”کینڑوں اور غلاموں سے مالک یہ سوال تو کبھی نہیں کرتے۔“ اس کے منہ سے بلا ارادہ نکل گیا۔

”ہوں۔۔۔۔۔ ہمارا خیال ہے حویلی میں اتنے غلام ہیں کہ کسی ایک پر سارا برڈن نہیں ہو سکتا۔ مگر ہم دیکھتے ہیں تم سب سے زیادہ حرکت میں نظر آتی ہو۔ کبھی اس بیڈروم میں۔ کبھی اس بیڈروم میں۔ کبھی ڈرائنگ روم میں۔ کبھی ہال میں کبھی باغ میں کبھی بیڑیوں پر کبھی کچن کی طرف۔“

”اوہ جی۔۔۔۔۔ جب کوئی بلاتا ہے تو جاتا ہی ہوتا ہے۔“ وہ آہستگی سے گویا ہوئی۔

”سب تمہیں ہی آواز دیتے ہیں۔“ تیمور علی خان نے دلچسپی سے اسے دیکھا۔

”وہ۔۔۔۔۔ گھنٹی بجتی ہے۔ اور آپ تو بلاتے ہی مجھ کو ہیں۔“ اس کے منہ سے بے ساختہ جملہ نکل گیا۔

”وہ تو اس لئے کہ ہم اتنے عرصے بعد حویلی آئے تو تم سے ٹڈ بھٹڑ ہوئی۔ بس اس لئے کوئی کام دھیان میں آتے ہی نہ خیال آ جاتا ہے۔“ وہ اس کی طرف دیکھے بنا لا پرواہی سے جواب دے رہے تھے۔

”تم چاہو تو جاسکتی ہو۔ بخار خاصا کم ہے۔“ چند منٹ کی خاموشی کے بعد وہ کپ اسے تھماتے ہوئے نڈ حال انداز میں

”نہیں۔“ اس نے ڈرتے ڈرتے ان کا چہرہ دیکھا۔

”نہیں۔“ اس نے ڈرتے ڈرتے ان کا چہرہ دیکھا۔

”نہیں۔“ اس نے ڈرتے ڈرتے ان کا چہرہ دیکھا۔

اس نے پہلے دونوں لیپ روشن کئے پھر دونوں ٹیوب آف کر دیں۔ اور خود کار مشین کی طرح دوسری ہڈی نکالتے ہوئے اسے بالکل احساس نہیں تھا کہ جب وہ پٹی رکھنے یا ہٹانے کیلئے جھکتی ہے تو اس کا گوٹے سے جو حمل آگیا ان کے چہرے کو چھوا جاتا ہے۔

معا تیمور علی خان نے پٹی پیشانی سے خود اتار کر اس کی طرف بڑھائی۔

”یہ لو..... ہمارا خیال ہے کہ اب ضرورت نہیں۔ اور تم فوراً یہاں سے چلی جاؤ۔“ وہ ہکا بکا ان کی سمت دیکھنے لگی۔

”کک..... کوئی غلطی ہوگئی؟“ اس کے حلق میں کانٹے اٹکنے لگا۔

”نہیں..... ایسی کوئی بات نہیں۔ سسٹم ہی غلط ہے۔“ وہ جیسے خود سے گویا ہو۔

”جی؟“ وہ مزید حیران ہوئی۔

تم سے نہیں کہہ رہے جاؤ تم اور ہاں سنو۔“

وہ جاتے جاتے رک گئی۔

”جی؟“ دل بری طرح دھک دھک کر رہا تھا۔ سمجھ میں جو نہیں آ رہا تھا کچھ۔

”آئندہ حویلی کے کسی لڑے یا مرد کی طبیعت خراب ہو تو رات تین بجے اپنی خدمات پیش کرنے سے باز رہنا۔“ وہ بھابی بیگم سے ہم بات کر لیں گے۔ مگر تم بھی نوٹ کر لو۔ اب جاؤ۔“

وہ حیران پریشان باہر نکل آئی۔ ایک ایک کی۔ یہ کیا ہوا یہ کتنی اس سے تو نہیں سلجھ رہی تھی۔

بس یہی سوچ آ رہی تھی کہ خواہ کچھ ہو مگر تیمور علی خان کو اس سے ناراض نہیں ہونا چاہیے۔ شاید یہ برداشت نہ کر سکے۔

اس کی جگہ پر کوئی بھیجی ہوئی پختہ ذہن ہا شعور عورت ہوتی تو شاید خان کی بڑائی پر ثار ہو جاتی۔

مگر وہ تو عظمتوں، مرتبوں کی پرکھ پچان سے بہت دور محض لطف و سرور، خوشی و سرخوشی کے بہانے کھوجنے کی عمر میں تھی۔

بس کچھ بہت اچھا ہونا چاہیے۔ خوشی کا احساس مسلسل ہو۔ من چاہا کھانے کو ہو۔ اس سے کوئی غلطی نہ ہو۔ کہ کوئی اور کچھ آواز میں اسے ڈانٹے۔

انسانوں کی پیشانی پر پڑے بل اسے جن بھوتوں سے زیادہ ہولاتے تھے۔ خان کے نرم انداز سے گر چہ اطمینان دیتے۔

تھا مگر عجیب الجھن سی تھی۔ کہ آخر بڑی بیگم سے وہ ”بات“ کیا کریں گے؟

”بس اماں جی! یہ تو بعد میں پتا چلا کہ نامراد پان کی نیل کے نیچے بل بنائے بیٹھا ہے۔ مارا ایک ڈر بیٹھ گیا سب کے درمیان۔“

میں۔

رات برات بندہ آخر اٹھتا ہی ہے۔ رات بھر اٹکنائی میں آدازیں آتی تھیں۔ ادھر لیٹا ہوا اپنے برابر والے کو جگا تا۔

اٹھیوز را میرے سنگ غسل خانے تک۔ اب آپ خود سوچو برابر والے کو جگائے گا تو اسکے برابر والا بھی جاگ جائے گا۔

میت دن بھر کام رات بھر ہول اور جگائی۔“

”سولہ آنے نے کنٹر کٹر چھالیہ کاٹتے ہوئے سلسلہ کلام جاری رکھا۔

”اسے خدا نخواستہ کسی کو ڈسا تو نہیں؟“ اماں جی نے تشویش بھرے لہجے میں پوچھا۔

”جی مئے میرے تایا۔ ڈیوڑھی میں بیٹھے لوٹے سے وضو کر رہے تھے۔ سامنے نظر آ گیا۔ تایا نے لوٹا ہی کھینچ مارا۔ نامراد بچ

پ۔ ڈھونڈنے پھرے۔ میری خالہ (کوٹے) کوٹے سے آئی ہوئی تھیں۔ دوسری مرتبہ انہوں نے دیکھا۔ بچے کا ننگوٹ غسل

خانے میں دھونے جاری تھیں آدمی رات کو۔ پاؤں کے نیچے آتے آتے بچا مار چھینیں مچا دیں۔ گھر تو گھر محلہ جاگ گیا۔

آؤت الٹی پڑ گئی۔ ہمسائے چیخوں سے سمجھ کجخت چور کھس گیا ہے۔ ڈنڈے لئے گلیوں میں دوڑتے پھرے۔ اور گھر

کے مرد ڈنڈے سولے لئے اٹکنائی میں بھاگے پھرے۔ کجخت پھر بچ گیا۔“

اماں جی..... دو پٹا منہ پر رکھ کر خوب ہنسیں۔

”توبہ..... سولہ آنے۔ خوب سنائی تو نے۔“ ان کا بھاری بھر کم وجود تھل تھل مل رہا تھا۔

”اچھا تو پھر مارا پکڑا کس نے؟“

”خالہ ہی نے مارا ہوگا۔“ ترین نے اندر داخل ہو کر چھیڑا۔

”نہیں بی بی جان! سانپ بچھو سے بڑا ڈرتی ہوں۔ بھلے پہاڑ میں سوراخ کروالو مجھ سے۔ ڈنگر قابو کرالو۔ کھلے دشمن

سے ہٹ سکتی ہوں۔ کجخت سانپ بچھو تو بے خبری میں ڈسے ہیں۔ اگلے گاؤں سے میری پھوپھی کا دیور جناور (جانور) بیچنے آیا

ہوا تھا۔ ایک رات ہمارے ہاں ٹھہرا۔ جو سانپ سانپ کا شور سنا تو صبح ہی سے لگ گیا۔ لوہتا و پان کی نیل کے نیچے مل بنایا ہوا

فلاس نے ہی کوئی ترکیب کی۔ موڑی مل سے نکلنے لگا۔ وہیں سر کچل دیا۔ توبہ توبہ دنوں کی نیندیں پوری ہوئیں پھر۔

”اب جورات چھوٹے خان کا۔“

”توبہ خالہ..... کچھ نہیں رکنا پیٹ میں۔“ ترین نے ایک دم ٹوکا۔

”ہاں بس تم لوگ مجھ سے ہر بات چھپایا کرو۔ پتا چل گیا ہے مجھے صبح باغ میں گئی تو چوکیدار سے پتا چلا کہ رات کیا ہوا

میں تو یونہی نکل گئی تھی۔ مجھ سے پوچھنے لگا تیمور خاناں کی طبیعت کیسی ہے؟ میں حیران کہ کیا پوچھ رہا ہے؟ رات کو میرا بچہ

بزدل کہتا پھر رہا تھا۔

”میں نے کہا کیا ہوا دشمنوں کو؟

”کاکھ کا پورا بولا ہے چوہدرانی جی دشمن تو موج میں ہے تیمور خاناں کو رات سانپ نے ڈس لیا تھا۔

اسے میں تو کھڑی کر گئی۔

”جی!“ ترین نے دانت کچکچائے۔

”میری حالت دیکھ کر بولا۔ رات ڈاکٹر نے زہر نکال دیا تھا مگر اس کو بخار چڑھ گیا تھا۔ یہ حرکتیں کیا کرو تم لوگ۔ اگر میرا

بچہ میرے سنگ غسل خانے تک۔ اب آپ خود سوچو برابر والے کو جگائے گا تو اسکے برابر والا بھی جاگ جائے گا۔

تجربہ رکھنے والے ہوں۔ جب کچھ ہوتا ہے ہوتا یونہی مت ماری جاتی ہے۔

”بچے! صاحب کو ہلکا دو کہ دو بار۔“

”اس مہر کی باری بھابی“۔ ترمین نے سچی خوشی کے جذبے سے نہاں ہو کر نازنین کو گلے سے لگایا۔ اور تھام کر اماں

”خوش رہو۔“

بزمین ساس کے پہلو میں ہی بیٹھ گئی۔

”کل تو تم بہت تھک گئی ہوگی۔“

”میں نے بھی حد کردی تھی تیرے تئیں، گھٹنوں لگا دیئے دلہن تیار کرنے میں۔ مہمان پوچھ پوچھ کر تھک گئے۔ جان جل گئی

رہا۔ کیا دوبارہ سے بننا ہی تھیں؟“

”ارے میری بھولی اماں جی!“ تزئین نے ماں کے گلے میں ہانپیں ڈال کر ان کے شانے سے سر ٹکا دیا۔

”لہٰذا، لہٰذا“ کہتی ہے اماں جی۔ سر سے پاؤں تک سجا بنا پڑتا ہے۔

”نیک کہہ رہی ہیں بی بی بھجان“۔ خالہ سولہ آنے نے ٹکڑا لگایا۔

”تو چپ کر سولہ آنے۔ کوئی دین ایمان نہیں تیرا بھی ادھر اُدھر۔ میری بہو کو تو اللہ نے سجا بنا کر بھیجا ہے۔“

امالہمی نے شفقت سے نازنین کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

اکی دم زخون بانو افتاں و خیزاں اندر داخل ہوئی۔

”السلام علیکم“۔ وہ اماں جی دیر سے سوئی تھی ناں تو صبح صبح آنکھ نہیں کھلی۔

کول بات نہیں۔ بتا دیا تھا تزئین نے۔ اور سونا ہے تو سو جا، جا کر کام تو ہوتے رہتے ہیں۔ جو میرے بچوں کو سکھ دیں۔

خدا کرے۔ اللہ تعالیٰ مجھے کرے ہوتا ہے مجھے تو کام چور نہیں ہے۔

”میں بھی چلو اماں جی..... ماما بتا رہی تھی کنک (گندم) رکھی ہے پھٹکنے کو“۔ خالہ سولہ آنے بھی اپنا پانڈاں بند کر کے اٹھ رہی تھی۔

.....

نزعان بنوا اور جانے کیلئے زینے کی طرف بڑھی تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ ایک لڑکا مین کا صندوق لئے اوپر جا رہا تھا۔
سے اوپر بے تکلف انداز میں وہ اسے پہلی مرتبہ دیکھ رہی تھی۔

”اے۔ کون ہو تم۔ اوپر کس سے پوچھ کر جا رہے ہو۔“ اس نے اپنی دانست میں بڑی ذمہ داری کا منہ دیکھا۔

”آپ یہاں لیڈی پولیس لگ گئی ہیں؟“ لڑکے نے بڑی دلچسپی سے دیکھا تھا۔

”تم کس سے پوچھ کر آئے ہو اندر؟“ وہ سختی سے پوچھ رہی تھی۔

”ہم پوچھ کر نہیں آتے۔ اپنی مرضی کے مالک ہیں۔“ شان بے نیازی سے جواب آیا۔

”حویلی میں بہت مرد نوکر ہیں مگر ہر کوئی اندر نہیں آ سکتا۔ تمہیں تو پھر پہلی مرتبہ دیکھ رہی ہوں۔ کیسے جانے۔“ وہ ڈٹ گئی تھی۔

”آپ کو محنت کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں خود چلا جاؤں گا اوپر۔“ وہ مسکراہٹ دبا کر مزید ایک زبے پہنچا۔

”صحیح بتاؤ کون ہو تم۔ ورنہ شور مچا کر بلالوں کی سب کو۔“ اسے تو وہ ایک دم مشکوک لگنے لگا۔

”بلالو۔ میں بھی دیکھوں شور مچاتے ہوئے کیسی لگو گی۔ ویسے تو خیر اچھی ہو۔“ شرارت لڑکے کی آنکھوں سے ہر

تھی۔

اتنا بے لگام وہ بھی پہلی دفعہ میں وہ غصے اور حیرت سے ٹکر کر دیکھنے لگی۔

”ارے..... عارف..... آگئے تم؟“ جانے کس طرف سے رئیسہ بیگم نکل آئی تھیں۔

☆.....☆.....☆.....☆.....☆.....☆

ابھی تھوڑی ہی دیر ہوئی ہے۔ گھر پہنچا تو پتا چلا۔ کوٹھے کی مرمت ہو رہی ہے۔ بس ادھر ہی ہیں۔ یہ ”بچی“ کون ہے مجھے
لوہا جانے نہیں دے رہی؟“ اس نے بظاہر بڑی سنجیدگی سے سوال کیا تھا۔

”کیوں تم کیا اپنی سرپرستی میں لینا چاہتے ہو؟ بچی نظر آرہی ہے یہ تمہیں؟“ رئیسہ بیگم مسکراہٹ چھپا کر ڈھٹ کر بولیں۔
”اچھا..... وہ..... میں نے غور سے نہیں دیکھا تھا۔ حرکتیں تو بچیوں والی تھیں میری قمیض پیچھے سے پکڑ لی اور کہنے لگی نہیں۔“

”کیا نہیں نہیں؟“ رئیسہ بیگم نے تعجب سے پہلے مطربہ اور پھر عارف کو دیکھا۔

”مطلب یہ کہ مجھے اوپر جانے سے منع کر رہی ہیں۔“

”مگر کیوں رئیسہ بیگم نے مھورا۔“

مطربہ ڈر گئی۔ ”وہ جی مجھے پتہ نہیں تھا کہ یہ کون ہیں؟“ احساس تو ہیں سے اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔

”عارف!“ رئیسہ بیگم جاتے جاتے پلٹیں۔

”اوپر سے اپنی ماں کو بھیجتا۔ میں اماں جی کے کمرے میں ہوں“ وہ دوبارہ چل پڑیں۔

”جی..... اب فرمائیے اجازت ہے۔ اوپر جا سکتا ہوں؟ وہ ایک ذینہ طے کر کے آگے بڑھا۔

اس نے رخ موڑ کر اپنی آنکھوں میں آئے ہوئے چند قطرے انگلیوں کی پوروں سے صاف کئے۔

”آپ رورہی ہیں۔ معاف کیجیے گا۔ میرا خیال ہے کہ ایسی کوئی بات تو ہوئی نہیں ہے جس سے آپ کی توہین ہو۔ مگر نہیں۔ بعض انسان ایسے مغرور ہوتے ہیں کہ انہیں یہ دوسری بات اپنی توہین محسوس ہوتی ہے۔ ولیم السلام۔“ وہ تیزی سے زینے طے کر گیا۔ وہ حیران پریشان سے انداز میں اوپر ایک موڑ پر اسے غائب ہوتا دیکھ رہی تھی۔

”مطر بہ تیمور کا کمرہ اتنا گندہ ہوتا ہے کہ رات کو وہ کہہ رہا تھا۔ میرا بستر باغ میں ڈال دیں وہاں کم از کم گندگی کا احساس نہیں ہوگا۔ دودن کو میرا بچہ آیا ہے۔ اتنی شکایتیں دل میں لے کر جائے گا۔ دل کرے گا بھلا دوبارہ آنے کو۔“

”اماں جی میں نے پرسوں ہی تو بستر کی چادریں بدلی تھیں۔“ اس کا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔

”وہ خواہ مخواہ تو بات کرتا نہیں۔ جاسب سے پہلے اس کا کمرہ اور غسل خانہ چمکا کر آ پھر کوئی دوسرا کام کرنا۔“ انہوں نے حکم دیا اور پھر اپنی وارڈروب میں جانے کیا تلاش کرنے لگیں۔

وہ ڈرتی ڈرتی اوپر آئی اور آہستگی سے دروازے پر دستک دی۔

”ہوں۔ اجازت آگئی۔“

وہ اندر داخل ہو گئی۔ ”السلام علیکم“ اس نے دن کا پہلا سلام کیا۔

”ہوں۔ والسلام۔“ وہ رائٹنگ ٹیبل پر بیٹھے بڑی تیزی سے کچھ لکھ رہے تھے۔

”کیسے آئی ہو؟ انداز ہو؟“

”وہ جی..... صفائی کرتا ہے۔ اماں جی نے کہا ہے۔“ وہ ڈرے ڈرے انداز میں گویا ہوئی۔

”خاک صفائی کرتی ہو۔ جس چیز پر ہاتھ رکھو دھول مٹی۔“ وہ چڑھ کر بولے۔

”جاؤ پہلے ہاتھ روم کی ٹیپس۔ صاف کرو۔ اگر فرائیل ہے تو ہاتھ روم کی دیواریں اور فرش اچھی طرح دھوؤ۔ ایک ایک چیز اس طرح چمکنی چاہیے جیسے نئی ہو۔“ انہوں نے حکم صادر کیا۔

”اوہ وہ جی..... ٹیپس کیا ہے؟ اس نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

”ٹوئنٹی بھٹی۔ کچھ پتہ نہیں۔ بالکل گنوار ہو۔“ وہ جھلائے۔

وہ جلدی سے باہر کی طرف بھاگی۔

”کہاں جا رہی ہو؟ انہوں نے تعجب سے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔

”وہ جی..... فرائیل لینے جا رہی ہوں ماما سے۔“ وہ ڈر کر رونے کو ہو گئی۔

”ہوں“ وہ دوبارہ اپنے کام میں مصروف ہو گئے۔

تھوڑی ہی دیر میں وہ فرائیل کا ڈبہ لے کر واپس آگئی تھی۔ پائینے چڑھائے..... دوپٹہ کسا..... اور ہاتھ روم میں تھمتھی۔

اپنی ساری ٹوئیاں تھمتھی۔ وہ کھول کر الجھ گئی۔ شاور بند کرنا مسئلہ ہو گیا۔ ایک بند کرتی۔ تو کبھی دوسری۔ بری طرح بھیگ

”جان..... وہ بند نہیں ہو رہا۔ اوپر والا بند کرتی ہوں تو نیچے والی ٹوئنٹی میں پانی نہیں آتا۔ ٹوئنٹی بند کرتی ہوں تو وہ کھل جاتا ہے۔ دروازے انداز میں گویا ہوئی۔

”کیا..... وہ کیا؟ وہ جھلائے۔“

”نوار جی۔ بڑی تیزی کا پانی آرہا ہے۔“ وہ بولی۔

”وہ بیزار کن انداز میں اٹھ کر ہاتھ روم میں آئے۔ وہ ایک دم سائیڈ میں ہو گئی۔

تیمور اندر داخل ہوئے شاور فل کھلا ہوا تھا۔ وہ گھستے ہی بھیگ گئے۔ موڈ بری طرح آف ہو گیا۔ ”نان سینس۔ گھر میں کوئی ڈمک کا نوکر بھی نہیں ہے۔“ انہوں نے شاور بند کیا اور بڑبڑاتے ہوئے باہر آئے۔

”اب کسی ٹیپ کو کھولنے کی ضرورت نہیں ہے۔ کام کے لئے پانی چاہیے تو صرف نیچے والا ٹیپ کھولنا۔ کسی اور ٹیپ کو ممانے کی ضرورت نہیں۔“

میرے کمرے میں کام کے لئے آیا کرو تو ضروری معلومات لے کر آیا کرو۔ میرا دماغ فالتو نہیں ہے۔ کہ میں ملازموں کو کوئی بھی کروں یا انہیں ٹریننگ دوں۔ اینڈ بی آف ناؤ۔ فرام ہیئر۔۔۔ وہ جھلا کر پانی سر سے جھاڑتے ہوئے بولے۔

کچھ میں تو کچھ نہیں آیا سوائے اس کے کہ فوارہ بند ہو گیا ہے اور اسے کام شروع کر دینا چاہیے۔ وہ اندر گھس کر بری طرح بت گئی۔ اس قدر جانفشانی کا مظاہرہ کیا کہ ہاتھ روم کی ٹائلوں سے آئینہ پن جھلکنے لگا اور دیوار پر لگا بڑا سا آئینہ روشنی میں ٹھک کرنے لگا۔ اس نے چاروں طرف نظر دوڑا کر اطمینان کیا اور باہر آگئی۔

”خان“ وہ ڈرتے ڈرتے مخاطب ہوئی۔

”پھر کھل گیا؟ وہ جیسے برس پڑے۔“

”نہیں۔ وہ آپ دیکھ لیں۔“ اس نے چند سانس بمشکل آزاد کیے۔

”کیا دیکھوں؟ وہ چیمبر پر گھوم گئے اور اس کی طرف دیکھنے لگے۔“

بیکے ہوئے کپڑوں میں خوفزدہ سی حالت میں وہ جانے کیا محسوس ہوئی۔ پیشانی پر بھیگی ہوئی ٹیپس چپکی ہوئی تھمتھی۔ ٹیپس یوں جھگی ہوئی تھمتھی۔ گویا گویا منوں جو جھبھو کہ پلکیں اٹھانا محال ہو۔

ایک چادر سارے چڑھ کر بولنے لگا۔

”جی..... جوانی کا لباس ہے۔ جوانی حسن سے بوجھل ہو تو دلفریبی کا معاملہ مسئلہ فیما غورٹ سے زیادہ گھمبیر ہو جاتا ہے۔

بہانہ دینی کام کرنا۔“ ان کے لہجے میں پھر حیرت سے مار دینے والی رسائیت اتر آئی۔ اب وہ کمرے میں مصروف ہو گئی تھی۔

تیمور خان نے لکھنا بند کر دیا تھا اور ریڈیو آن کر کے کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر کچھ پڑھنے لگے تھے۔

تیور علی خان باہر نکل گئے۔

اس نے تھوک نکل کر حلق تر کیا۔ گہرا سانس کھینچا۔ اور فرنیچر پر کپڑا مارنے لگی۔ کوئی احساس تھا کہ جسٹس کی زندگی ختم ہو گئی تھی۔

وہ روتی نہیں تھی۔ اسے رونا آتا ہی بہت کم تھا۔ جب کبھی روئی تھی تو وجہ بھی معلوم تھی۔

لیکن اس وقت ایک تو اتر سے اشک رخساروں پر بہ رہے تھے اور اسے احساس بھی نہیں تھا۔ دل دکھ کے درخت شاخ میں جانا تھا۔

درخت بھی وہ جس کی شاخیں آسمان چھوتی تھیں۔

”اماں جی! اتوار کی اتوار ٹوٹنی جاتے تھے سارے محلے کی عورتیں۔ تانگہ بھر جاتا تھا۔ ایک دن بڑی بڑی ہڈیاں گھسیا۔ سب سے زیادہ بلوکی اماں کو چوٹیں آئیں۔ پنڈلی کی ہڈی کھسک گئی۔ چھ مہینے بستر پر پڑی رہی بے چارہ۔ چھپ کر جاتی تھی اس سے الگ ہوتی تھی۔“

خالہ سولہ آنے نہایت تیزی اور مہارت سے لحافوں میں ڈورے ڈال رہی تھی۔ اماں جی نئے بن کر آنے والی تکیوں کے منہ بند کر رہی تھیں۔

”ارے آگ لگے ایسے شوق کو۔ کہ انسان ہلکان ہو جائے، اب یہاں گھر ہی میں دیکھ لو۔ بفتح کی رات کھوٹا جاتی ہے کہ فلم آرہی ہے۔ نوکر باغ میں ٹیلی وژن رکھ رہے ہیں۔ یہ تمام لڑکیاں اسے جلدی جلدی کام سناری بناتی ہیں۔ چھوٹی جا رہی ہو“

میں نہیں بھاگی کبھی ان چیزوں کے پیچھے۔ تمہارے بڑے خان کہتے بھی تھے تو مجھے حیا آ جاتی تھی۔

ان کا چہرہ مگھلوں ہو گیا۔

”اپنے مرد کے ساتھ بھی اماں جی؟“ خالہ نے ایک ذرا رک کر لطیف سی شرارت کی۔

”ہاں بھئی۔ حیا تو مجھے آج بھی آتی ہے ان سے۔ اب بھی کبھی مجھے اپنے کمرے میں بلواتے ہیں تو قدم نہ رکھتا ہوں۔ اور فلموں میں تو ایسے منہ پھاڑ کر بولتے ہیں کہ ڈوب مرنے کو جی چاہے۔ جب گھر میں یہ بات سنی تو تمہارے خان پر خفاء ہوئی تھی کہ لڑکیوں پر برا اثر نہ ہو۔ وہ باتیں جو ہم بیابانی عورتیں نہ کر سکیں۔ فلموں میں بن جاتی ہیں۔ پڑھ کر تھی۔ بھئی مجھے تو بڑی حیا آتی ہے۔“

”خان تنگ نہیں پڑے اماں جی! آپ کی اس طبیعت سے“ خالہ شریہ ہوئیں۔

بڑی بے لگام ہے تو سولہ آنے اوہ تو خود اتنے مسرور آدی ہیں۔ بھول جاتے تھے کہ گھر بار بھی ہے۔ ساری عورتیں ہی ایسی تھیں۔ کوئی میں اکیلی ایسی تو نہیں تھی۔ جو انہیں کوئی تعجب ہوتا۔

”آپ تو بہت ہی سیدھی ہیں۔ آپ کی تو بارہ پشتوں میں محبت کی شادی نہیں ہوئی ہوگی۔“ خالہ نہیں۔

”دل دلتو“۔ اماں جی بری طرح شپٹا گئیں۔ ”ہمارے ہاں تو پالنے ہی میں رشتے ہو جاتے تھے اب دلوں کے بھید۔“

”جی ہاں۔ اسی میں ہو جاتی ہوگی یہ نامراد محبت۔ اپنے تو سمجھ میں ہی نہیں آیا یہ چکر۔“

ان کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

”آپ کو نہیں ہے بڑے خان سے محبت؟“ خالہ نے چھیڑ خانی کی۔

اماں جی کے چہرے پر قوس قزح جھلکنے لگی۔

”مزمزم سولہ آنے۔ اپنی اور میری عمر دیکھ۔ اس عمر میں مجھ سے ٹھنڈی کرتی ہے؟“

”تو یہ گناہ تو نہیں ہے۔ بلکہ اپنے مرد سے محبت کرنے میں تو بڑا ثواب ہے۔“ خالہ باز نہ آئیں۔

”ایک عورت عمر بھر کسی کا گھر سنبھالے بیٹھے تو یہ سب کیا ہے۔ یہی اس کے دل کا بھید ہے۔ پتھر پڑے ہیں تیری عقل۔ ان کے چہرے پر روشنی سی بکھر گئی۔ خالہ ان کی سادگی پر ہنس ہنس کر لوٹ گئیں۔

”السلام علیکم۔ خیریت تو ہے خالہ؟ کیوں اتنا ہنس رہی ہیں۔“ آتش گللابی بھاری سوٹ پہنے نازنین اندر داخل ہوئی۔

”خوش رہو۔ پھولو پھلو۔ اس کی تو عادت ہے اوٹ پٹانگ باتیں کرنے کی۔ خود ہی ہنس ہنس کر دوہری ہوتی ہے۔“ اماں لڑکھائیں۔

یہ لہجہ چھوٹی لہن اماں جی کے نزدیک یہ اوٹ پٹانگ باتیں ہیں جن کے دم سے زندگی میں دم ہے۔ میں تو کہہ رہی تھی

”چپ کر سولہ آنے! بچوں کے سامنے کسی باتیں کرتی ہے،، اماں جی نے گھبرا کر خالہ کو روکا۔ خالہ کی پھر ہنسی چھوٹ گئی۔

”اماں۔ جی۔ میں وہ والی بات تھوڑا ہی کر رہی تھی۔ میں تو یہ کہہ رہی تھی کہ،،

”میں کہہ رہی ہوں نا چپ ہو جا۔ نہ وہ والی نہ یہ والی۔ اور دلہن تم سناؤ۔ ٹھیک تو ہونا۔ جی تو نہیں گھبراتا تمہارا۔ نئی جگہ ہے نا۔ خیر تمہارے ماں باپ تم سے دور نہیں جب جب چاہے ہوئی جہاز میں بیٹھو اور مل آؤ۔ ڈیڑھ دو گھنٹے میں ادھر سے ”مگر کہتا ہے۔“ انہوں نے مسکرا کر گویا تسلی دی۔

”نہیں اماں جی! میرا دل نہیں گھبراتا۔“ ماشا اللہ اتنے لوگ ہیں کہ وقت کا پتہ ہی نہیں چلتا۔ رات بھی ایک بج گیا باتوں میں۔ سب بال میں بیٹھی ہوئی تھیں۔ وہ تو ماما نے ٹائم بتایا تو پتہ چلا۔

”نہیں نے اپنی شفقت سی ساس کو جو بات سلی دینا ضروری خیال کیا۔“

”یکل شام سے تو زمین دکھائی نہیں دی۔ رات میں اسکی طرف گئی تو ماما نے بتایا کہ سورہی ہے۔“

”جی۔ کئی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ کل ہمارے پاس بھی نہیں آئی رات کو۔“ نازنین نے جواب دیتے ہوئے کہا۔

”اماں جی خاموش ہو کر رہ گئیں۔ پھر توقف کے بعد گویا ہوئیں۔

”تو نہ دیکھو مٹی! اب تم اس حویلی کی ایک فرد ہو۔ مجھے اس لڑکی کی طرف سے بہت پریشانی ہے۔“

”کیوں کیا ہوا؟“ وہ چونک سی گئی۔ ”اتنی خوش اطوار اور خوش شکل سی ترمین۔ بھلا اسے کیا ہوا۔“

”اس کا رشتہ آیا ہوا ہے۔ شاید یا اور نے تمہیں بتایا ہو۔ شادی کے ایک سال بعد ہی طلاق لے لی تھی اس نے۔ بھئی یہ تو اللہ کو ہی معلوم ہے۔ مگر مجھے یہ لگتا ہے۔ اسے پڑھائی کا دماغ ہے۔ اور لڑکیوں سے زیادہ پڑھی ہے۔ اور ہے۔ مرد عورت کو بیوی بنا کر لاتا ہے استانی تھوڑا ہی۔ وہ ذرا اس سے کم پڑھا ہوا تھا۔ مگر تھا تو اپنا ہی۔ بہت بڑی لڑکی ہے ان کی۔ خیر اب اس کا ذکر کیا۔ جو رشتہ آیا ہوا ہے۔ یہ بھی ہمارے دور پرے کے عزیز ہوتے ہیں۔ بیوی مر جائے۔ پڑھے ہوئے بھی بہت ہیں۔ تمہارے بابا صاحب بتا رہے تھے۔ ایک چھوٹی سی بچی ہے شیو نام لے رہے تھے۔ یہ تمہارے بابا صاحب۔ کراچی میں اوزار بنانے والی فیکٹری ہے۔ اچھا کھاتے پیتے ہیں سب کچھ ہے اللہ کا دیا ہو۔“

”ترمین کیا کہتی ہے؟“ نازنین نے اماں جی کے خاموش ہوتے ہی فوراً سوال کیا۔

”مان نہیں رہی۔ کہتی ہے کہ میں تو اس کی بچی کی ماں بن جاؤں گی مگر کیا وہ میرے بیٹے کو باپ کا پیار دے سکے گی۔ کچھ ہوا تو کیا میرا بیٹا مجھے معاف کر دے گا؟ اب یہ بال دھوپ میں تو سفید نہیں کیئے بیٹی۔ سنا ہے آدمی اور بھری بچاں پر مشکل ہے مگر زندگی بہت سے تجربوں کے سائے میں آگے بڑھتی ہے۔ بہت بھلا مانس ہے۔ دور قریب کے سب ہی اچھا کہتے ہیں۔ پڑھا لکھا ہے۔ صورت شکل اچھی ہے۔ اب تم لوگ اسے اس طرح سمجھاؤ کہ وہ خوشی سے رہی جائے۔ ظہیر میں بھی ہزار خوبیاں ہیں۔ اسکی عورت مر گئی ہے دنیا کی ہمدردیاں بھی ساتھ ہیں۔ اسے تو بیوی کہیں نہ کہیں مل جائے گی۔ لیکن اسے طلاق ہوئی ہے۔ اسے آگے مشکل پڑ جائے گی۔“

ان کی آواز بھرا گئی۔

”آپ فکر نہ کریں اماں جی۔ ہم سب ترمین کی بہتری کے لئے جو کچھ ممکن ہو سکا کریں گے۔ آپ ٹھیک کر دیں۔“

”نازنین نے اپنے نپے تلے لہجے میں ساس کو تسلی دی۔“

”یہ اطر بہ مطربہ پر نظر پڑی تمہاری سولہ آنے؟“ اماں جی نے خالہ کو پانی کا گلاس اور جگ لئے اندر داخل ہونے پر دیکھا تو فوراً پوچھا۔

”ہوگی یہیں کہیں کسی کام دھندے میں۔ بلاؤں کیا؟“

”تیمور کے کمرے کی صفائیکر نے گئی تھی۔ بہت دیر ہو چکی۔ تم روپا دیوی کو اور اسے ساتھ لگا لو۔ یہ تین رضا بنائیں۔“

”اے لو..... وہ آہی گئی۔“ خالہ نے مطربہ کو اندر داخل ہوتے ہوئے پہلے دیکھا۔

اس نے نازنین کو دیکھ کر سلام کیا اور پڑی سنجیدگی سے اماں کی طرف متوجہ ہوئی۔

”اماں جی۔ تیمور خان کا کمرہ تو صاف کر دیا ہے۔ آپ ماما سے چیک کروالیں۔“

”ہیں؟“ اماں جی نے تعجب سے اس کی شکل دیکھی۔

”صاف کر دیا اچھا کیا۔ اب یہ چیکنگ کیوں کوئی کلکٹر ڈپٹی کلکٹر آرہے ہیں انعام بانٹنے۔“ وہ اس کی اچھے انداز سے

”جی جی۔“

”یہ خبر خالہ کو کہہ رہے تھے ناں۔“

”یہ کیا کہہ رہے تھے؟“ اماں جی کی حیرت مزید بڑھی۔

”وہ کہہ رہے تھے۔ یہ میرا کام نہیں ہے کہ میں صفائیاں چیک کروں۔ ماما کو دکھا دینا۔“

”ہاں تو ٹھیک تو کہا انہوں نے۔ تو جو کھڑی ہو گئی ہوگی سوال جواب کرنے۔“ خالہ فوراً سے پیشتر سمجھ گئیں۔

”بے وقوف! مگر کے مرد گھر میں رہتے ہیں۔ صاف ستھرے گھر میں۔ عورتوں کی موجودگی میں گھر کی صفائیاں نہیں

لے۔ یہ کام گھر کے نوکر کرتے ہیں یا گھر کی عورتیں۔ کیا کیا بتاؤں تجھے۔“

”عورتیں صفائی کرتی ہیں اور مرد صفایا۔“ نازنین نے شوخی سے ٹکڑا لگایا۔ مطربہ تو الجھ گئی۔ خالہ البتہ حسب عادت خوب

میا۔

”یہ بھی بتا دیجئے۔ چھوٹی دہن پیگم اسے کہ صفایا کا کیا مطلب ہوتا ہے؟“ خالہ نے ہنسی کو بریک لگایا۔

”سیدھا سا مطلب ہے۔ مرد کے ہاتھ میں آکر تو ایک ذمہ دار سمجھدار عورت کا تو واقعی صفایا ہو جاتا ہے۔ بڑی مشقت

نہ ہے گزشتہ۔“ اماں جی نے مسکرا کر بہو کی طرف دیکھا۔

”تیرے دھندے نٹ گئے کہ نہیں۔ یہ ڈورے ڈلوامیرے ساتھ کہ کام نمٹے۔ اور دیکھو یہ روپا دیوی کیا کسی دیوار میں

ٹپٹی۔ رات نوبے سے غائب ہے۔ دن چڑھ گیا بھلا۔ اسے ساتھ لے کر آ۔“ خالہ نے اسے مزید کام سے لگایا۔

”تو بہ خالہ! خود بھی اس عمر میں ڈورے ڈالتی ہو اور لڑکی کو بھی راہ پر لگاتی ہو۔“

ترمین اپنے صحت مند اور خوبصورت سے بچے کو گود میں بھرے کمرے میں آچکی تھی۔

”چھوڑیں بی بی جان! ہم تو پالنے سے سیدھے بڑھا پے میں کودے ہیں۔ یہ بچ کے اتنے برس جنے کون چرا لے گیا۔ ہو

مابا تو ساس کے بعد اب رہے تھے۔

”نمن برس کی تھی بی بی جان میں چولہا جلانا شروع کر دیا تھا۔“

”اب اتنی بھی نہ ہانکا کر سولہ آنے! تین برس کی بچی سے کون چولہا جلوائے گا؟“

اماں جی نے ٹوکا۔ ان کے حساب سے تو مبالغے کا ریکارڈ ٹوٹ رہا ہے تھا۔

”بھری بات تو سنیں اماں جی۔ گھر میں اور کوئی بچہ جو نہیں تھا۔ گاؤں کے کسی بھی گھر سے آگ مانگ کر لاتی تھی تو ماں

نہ بولتی تھی۔“ خالہ نے وضاحت کی۔

”خوب کی سولہ آنے۔ اگلے وقتوں میں آگ تک مانگی جاتی تھی۔ اب تو بغیر مائٹے لگ جاتی ہے۔“ ترمین نے

ترمین کے پردے میں غیر شعوری تمنی کو چھپاتے ہوئے ٹکڑا لگایا۔

”ترمین بہت لطیف مذاق و مزاج رکھتی تھی۔ اس نے ننھی تلی نگاہ ترمین پر ڈالی۔

”خالہ! یہ تمہارا صاحب؟“ اس نے پیار سے بچے کا رخسار چھو کر ماحول کا رنگ بدلنے کی کوشش کی۔

”آ رہی ہیں خالہ! روپا دیوی۔ بکری کا دودھ نکالنے لگی ہوئی تھی۔ اس کی لڑکی چتا ہے ناں۔“

”اب تم بتاؤ کیا کرتا ہے۔“ وہ سب کو نظر انداز کر کے خالہ کے مقابل بیٹھ گئی۔

”تیری طبیعت تو ٹھیک ہے۔ کیسا رویا رویا چہرہ! ہو رہا ہے۔ دکھاؤ ذرا بخار تو نہیں ہے۔“ خالہ کو اس کی چہرہ سے تشویش ہوئی۔

”میں ٹھیک ہوں۔ کچھ نہیں ہے مجھے۔“

”ہاں۔ خیر یہ تو میں بھی نوٹ کر رہی تھی کہ آپ یہ بہت چپ چپ ہے۔“ تزئین نے بھی خالہ کی تائید کی۔
”نہیں بھی۔ گھنٹہ پہلے تو بہت چہک رہی تھی۔ شاید تھک گئی ہے۔ جعفر ج میں ٹھنڈی لسی رکھی ہوگی جا کر پڑا۔“
جی نے بڑی شفقت سے اس کی جانب دیکھا۔

”پی لوں گی۔ اماں جی! خالہ کا تھوڑا ہاتھ تو بنا دوں۔“ اس نے خالہ کے ہاتھ سے سوا لے لیا۔

”یہ آج آپ کے دیور صاحب کہاں غائب ہیں؟ بہت تنگ تو نہیں کرتے۔ تیمور آپ کو۔“ تزئین نے بڑی بے پرواہی سے جواب دیا۔

”ارے نہیں۔ ان کی وجہ سے تو گھر میں بہت رونق ہے۔“ نازنین نے کہا۔

”ہاں..... ماشاء اللہ میرا بچہ جہاں بیٹھتا ہے۔ رونق ہو جاتی ہے۔ مگر کیا کروں۔ تمہارے باپ نے کتنا درد کرنا۔“
”وہ کیا پڑھاتے ہیں جو یہاں والے نہیں پڑھا سکتے۔“ اماں جی کا کھہرا ہو گیا۔

”میرا خیال ہے پندرہ دن بھی نہیں رہے جانے میں۔ ہے ناں اماں جی!“ تزئین بھی بھائی کی جدائی کے جذبات سے افسردہ ہو گئیں۔

”ارے کہاں۔ گیارہ دن۔ بارہویں دن تو صبح کو چلا جائے گا۔“ اماں جی تو اٹھلیوں پر دن سوتے مٹی کی تھیں۔

”تزئین! تم کہنا بھائی سے شاید تمہاری بات سمجھ میں آجائے۔ تم بھی پڑھی ہوئی ہو۔“

”کیا اماں جی؟“

”یہی کہ زیادہ پڑھنے کی ضرورت نہیں۔ دماغ کی طاقت خرچ ہوتی ہے اور تمہارا تو کام زمینداری ہے۔“
سرکار کی جوتیاں سیدھی کرنا ہیں۔“ تزئین ماں کے بھولپن پر مسکرا دیں۔

”کہہ دوں گی اماں..... مگر وہ مانیں تب۔“

”صبح صبح مجھے اپنے بچوں پر دم کر کے کیسا سکون ملتا تھا۔ اور اب چہروں کو ترستی ہوں۔ یہ تو بہت جھوٹا۔“
تمہارے باپ نے مجھ سے دور کر دیا تھا۔“ اماں جی نے پیشگی رخصتی منانا شروع کر دی۔
”کتنے دن کیلئے جاتے ہیں تیمور خاناں باہر ملک؟“ اس نے بے اختیار پوچھ لیا تھا۔

”ماں! بڑی بات ہوتی تو کیا بات تھی۔ سالوں سرستی ہوں اپنے بچے کی صورت کو۔“ اماں جی افسردہ سے انداز میں

”ماں جی! تو آپ کیلئے فخر کی بات ہونا چاہیے کہ آپ کو لوگ کہیں کہ آپ کتنے لائق بچوں کی ماں ہیں۔ یہ تو کسی بھی بچے کی فخر کی بات ہوتی ہے۔“ نازنین کا انداز دلا سادینے کا تھا۔
”تو اپنے وطن میں سب تالائق ہوتے ہیں؟“ اماں جی نے فوراً جواب کر دیا۔
”مجھے ذرا اور بھی کھانا رہتا ہے۔“

”ہائے اماں جی..... ڈر پڑا۔ وہ کیا؟“ تزئین زچ ہو گئیں۔

”کمی ایم کے چکر میں نہ پڑ جائے۔“ وہ فکر مندی سے بولیں۔

”کیا پڑ بھی گئے ہوں اور اسے کہہ کر آئے ہوں کہ بس آ رہا ہوں دو چار دن میں۔“

”بڑی عیال۔ کمزوروں کی پناہ گاہ۔“

”مائے کا گولہ ہاتھ سے چھوٹ کر کرسی کے نیچے لڑھکتا چلا گیا۔ جیسے کوئی اس سے پیمان باندھ گیا ہو اور دعا بازی کا ہوا ہو۔ دھچکا تو یوں لگا تھا۔ تزئین کے شوخ جملے سے ذات کے اندر ایک اور چور در پیچہ وا ہوا۔ نارسائی اور محرومی کی گرم باندھانے لگیں۔ خوب لوچنے لگی۔“

”آپ غرمندہ ہوں۔ اگر میم بھی کریں گے تو کوئی اچھی ہی کریں گے۔ ہمیں پوری امید ہے۔“ خالہ نے ٹکڑا لگایا۔

”نمے سے نہ میں خاک سولہ آنے۔ مجھے نہیں چاہیے نیچے سر کی پرکھی۔ اس دن کے لئے اولاد جوان کی ہے۔“ اماں جی تو

”اے اماں جی زنجیریں پہنا کر رکھئے۔ آپ پہنا سکتی ہیں۔ کسی کو بھی تہس نہس کرے رکھ سکتا ہے آپ کا تخت جگر (اسے) نہ طرف سے ٹھنڈی ہوا کے جھونکے آنے لگے۔“

”کیوں مڑ کرے گی میم کی خدمت؟“ تزئین شرارت سے ہنسیں۔ ”تو تو بڑی خوش ہوگی؟“

”آپ لوگ ہوں گے تو میں بھی ہو جاؤں گی۔“ وہ دھیرے سے بولی۔

”تو نہ جان جاؤں تیری اطاعت گزاری کے۔“

”تو نہ کیا بد قالیں نکال رہی ہو۔ میرے بچے کیلئے۔ کوئی کمی ہے اسے لڑکیوں کی؟“ اماں جی نے ڈانٹا۔

”تو نہ اپنی اتری ابھی تک؟“ معا انہیں دھیان آیا۔

”تو نہ شہر گئی ہوئی ہے اسپتال۔ اس کی آنکھوں میں کئی دن سے تکلیف ہے۔ اس کا لڑکا لے کر گیا ہے۔“ خالہ

”آپ کو کیا کام تھے۔ تیمور بھی تو گئے ہیں شہر۔“ تزئین نے بتایا۔

”تو نہیں چاہا!“ وہ تھیلا کھینچتی ہوئی اندر چلی۔
 ”وہ بچہ کیوں تھا؟“ وہ متعجب ہوا۔
 ”وہ خراب ہے میری۔“ اس نے بھی پیشانی پر ہاتھ رکھ کر مونٹ مذکر میں ہیر پھیر کی۔
 ”چوکیدار! ہمیں چار کر اسے دیکھنے لگا۔“

”نوابوں کی اولاد ہے بھابی۔ لیکن اتوار کی اتوار میرے اپارٹمنٹ کی صفائی کرتی ہے۔ میری جرابیں تک دھوتی ہیں۔“
 ”یورپی خان نے فخر یہ بتایا۔“
 ”آہستہ..... اماں جی نہ سن لیں..... ابھی کل ہی انگریز بہو کے اندیشے سے کانپ رہی تھیں۔“ نازنین نے ہونٹوں پر
 لہجہ کرناہستہ سے کہا۔
 ”انگریز بہو.....! ابائیں انہیں کس نے بتایا.....؟“ وہ حیرت زدہ ہو گئے۔
 ”انہیں کچھ بتانے کی کسی کو ضرورت نہیں۔ انہیں گھر بیٹھے ہی سب پتا ہے۔“ نازنین ہنسی۔
 ”یہ تو بڑی گڑبڑ ہے بھابی۔ آپ انہیں بتا دیجیے کہ انگریز ضرور ہے مگر سات گز کا دو پٹا اوڑھتی ہے۔“
 ”سات گز لبا جھوٹ نہیں بول سکتی۔“ نازنین نے صاف انکار کیا۔
 ”مگر یہ تو بھلائی ہے۔ اور بھلائی نیکی ہوتی ہے۔“ تیمور نے دلیل دی۔
 ”مگر میں اپنی سیدمی سادھی ساس کے ساتھ مشکوک قسم کی بھلائی نہیں کر سکتی۔ آپ اپنا مقدمہ خود لڑیں۔“ اس نے واضح
 اور محضرت کی۔
 ”وہ بھی بہت سیدمی ہے۔ ہم نے اسے بتایا۔ ہماری ماں کو پائے بہت پسند ہیں۔ کھانے میں تو کہنے لگی۔ ہفتے میں کتنی
 کرسیوں کا خرچہ ہے؟“
 ”نازنین! فحش فحش کر دو ہری ہونے لگی۔“
 ”مطربہ ماما کا بتایا ہوا سوپ لے کر ہال میں داخل ہوئی تھی۔ تیمور علی خان بھادج کو ہنسا کر مسکراتے ہوئے سر کھتیار ہے
 تھے۔“

مطربہ نے تپائی پر پڑے رکھ دی۔

”وہ کیا نام ہے تمہارا لڑکی..... کیا لائی ہو؟“ تیمور علی خان یکدم سنجیدہ ہو گئے۔
 ”اکثر لوگ نام کے معاملے میں بلا کے غیر محتاط ہوتے ہیں۔ حالانکہ نام ہر انسان کی آرائش ہوتا ہے اور اسے بہت عزیز
 ہے۔“

”جو لوگ کسی کے دل میں سوتے جاتے ہیں ان کے منہ سے اپنا نام سننا ایک سعادت لگتا ہے اور اگر وہی نام بھولنے
 کے بعد انسان اپنی نظروں میں خود کو بہت بے توقیر لگتا ہے۔“

”اس کے کرنے کے نہیں تھے۔ دوپٹے رنگے کو گئے تھے وہ منگانے تھے۔“ اماں جی کی سوئی سے دھماکہ مچا کر
 نے بنا کچھ کہے سوئی دھا کہ مطربہ کی طرف بڑھایا۔
 ”اماں جی۔ یہ چھوٹا ہے پھر نکل جائے گا بڑا ڈال دوں؟“ اس نے پوچھا۔
 ”ہاں ہاں ڈال دو۔“
 ”تزمین اور نازنین اپنی باتوں میں مصروف تھیں۔“

”لڑکی! بات سنو۔“ وہ بڑے پھانک کی طرف جارہی تھی۔ چونک کر رک گئی۔
 پلٹ کر دیکھا۔ عارف تھیلا اٹھائے کھڑا تھا۔ پیشانی پر شکنیں پڑ گئیں۔
 ”دو نام ہیں میرے۔ زیتون بانو اور مطربہ۔“ وہ چیخ کر گویا ہوئی۔
 ”یہ تو تین ہیں۔ کتنی آتی ہے؟“ وہ مسکرا کر جان جلا رہا تھا۔
 ”اور یہ مطربہ کیا نام ہوا۔ جیسے ٹیکسلا ہڑپہ۔ مگر کھنڈ راستے بھی خوبصورت نہیں ہوتے۔“
 ”کام بتاؤ۔“ وہ بھڑک کر بولی۔
 ”کرو گی؟“ وہ بہت شوخ تھا۔
 ”اماں جی سے شکایت کر دوں گی اگر زیادہ بات کی۔“ وہ مزید بھڑک گئی۔
 ”کیا کہو گی؟“ اس نے دلچسپی سے اس کا سراپا جانچا۔
 ”یہی کہ یہ لڑکا مجھے چھیڑتا ہے۔“ وہ اسے گھور رہی تھی۔
 ”میرا نام عارف ہے۔ ایک ہی نام ہے میرا۔“ اس نے قرض لوٹایا۔
 ”آئندہ مجھے مت روکنا۔ میں ہر کسی سے بات نہیں کرتی۔“ وہ تیزی سے آگے بڑھی۔
 ”ارے بھئی ہڑپہ! موئن جو دڑو بات تو سنو۔ یہ تھیلا ماما ملی تک پہنچا دو۔ وہ انتظار کر رہی ہو گی۔“ عارف نے غمزہ
 رکھ دیا۔

”اس میں کیا ہے؟“ وہ تڑخ کر بولی۔

”سانپ بچھو ہیں آج ماما تمہیں چینی ڈش بنا کر کھلائیں گی۔“
 ”آخ۔“ مطربہ کو قے آنے لگی۔ ”تم بدتمیز ہو وہ الگ بات گندے بھی بہت ہو۔“ وہ جل بھن کر باب ہو رہی تھی۔
 ”تم واقعی اتنی بھولی ہو یا بنتی ہو۔“ عارف کو پھر گدگدی ہوئی۔

”خالہ! خالہ! یہ لڑکا۔“ اس نے شور مچا دیا۔

”لاحول ولا قوۃ..... عجیب لڑکی ہو۔“ وہ اصطل کی طرف بھاگ گیا۔

”کیا ہو گیا۔ زیتون بانو؟“ چوکیدار آ موجود ہوا۔

”خان.....“ مطلب میں بہت خوبصورت گھوڑیاں ہیں۔ اس نے ایک پیالے میں سوپ نکالا۔
”پھر.....؟“ وہ الجھے۔

”ان کے بہت خوبصورت نام ہیں۔ وہ آہستگی سے بولی نازنین بھی حیرت سے اس کی شکل دیکھ رہی تھی۔
”پھر.....؟“ ان کا پارہ چڑھنے لگا۔

”ان کے نام خانوں کو ایک دفعہ میں یاد ہو جاتے ہیں۔ آپ مجھے بھی کوئی گھوڑی سمجھ لیں۔“
اس نے تپائی ان کے نزدیک رکھ دی۔

نازنین ششدری اس کی شکل دیکھنے لگی۔ تیمور علی خان خاموش سے ہو گئے۔

”یہ سوپ ہے ماما نے بنایا ہے۔ آپ کیلئے چائے بنا کر لاؤں چھوٹی بیگم۔“ وہ نازنین کی سمت مڑی۔

”نہیں..... میں اس وقت چائے نہیں پیتی۔ البتہ یاد رکھیں صاحب سے پوچھ لو۔ وہ اپنے بیڈروم میں اسٹڈی کر رہے ہیں۔“
اس نے ملائمت سے کہا۔

مطربہ ایک لمحہ رکے بغیر باہر نکل گئی۔

”کچھ سمجھ نہیں آئی۔“ اس نے تیمور علی خان کی چپ کو بہت محسوس کیا۔

”ویسے خاصی بے وقوف سی ہے۔ آپ جانے دیجئے کچھ کہیے گا نہیں۔“ اس کو مطربہ کے حشر کی فکر پڑ گئی تھی۔

”اس کو زیادہ آئینہ نہیں دیکھنا چاہیے۔ بھابی..... ورنہ گڑبڑ ہو جائیگی۔“ وہ بہت ناراض سے انداز میں گویا ہوئے۔

”کیا فرق پڑتا ہے۔ بے حیثیت انسان کتنا ہی حسین ذہین ہو مگر ہے تو پھر بھی بے چارا..... اور بے چاروں کے رنہ درگزر کرنا بڑائی کی بات ہے۔ ویسے میں سمجھا دوں گی۔ آپ ریلیکس ہو جائیں۔“ نازنین نے ان کا موڈ بحال کرنے کی کوشش کی۔

ترنمین بالآخر تیمور علی خان کے دلائل کے سامنے بے بس ہو ہی گئیں۔

اماں جی کا خیال تھا۔ تیمور علی واپسی سے پہلے ترنمین کا نکاح ہو جائے تو اچھا ہے، دو بھی ایک اور اہم خوشی میں شریک جائیں۔

لیکن یہ حقیقت ہے کہ انسان جس سے غیر مشروط محبت کرتا ہے وہاں محبت ہی سب سے بڑی دلیل بن جاتی ہے۔ دور ہونے کی وجہ سے دلوں کے مزید قریب آ گئے تھے۔ پھر یہ کہ کر بہن کی خیر خواہی کے جذبے نے ان میں مزید تحریک رکھ دی تھی۔

نکاح بے حد سادگی سے ہو رہا تھا۔ صرف گھر کے افراد اور چند بہت قریبی دوست احباب شریک تھے۔ ترنمین نے سختی سے منع کر دیا تھا کہ نکاح سے پہلے کی کوئی رسم وغیرہ نہیں ہوگی۔ نہ ڈھولکی بجے گی۔ نہ وہ ایشن ملیں گی۔ خالہ سولہ آنے ایشن کا پیالہ لے کر روپا دیوی کی کوٹھڑی میں چلی گئیں۔ تاسف کا یہ عالم تھا کہ گویا ترنمین رسم سے ناواقف تھیں۔

”خان.....“ مطلب میں بہت خوبصورت گھوڑیاں ہیں۔ اس نے ایک پیالے میں سوپ نکالا۔
”پھر.....؟“ وہ الجھے۔

”ان کے بہت خوبصورت نام ہیں۔ وہ آہستگی سے بولی نازنین بھی حیرت سے اس کی شکل دیکھ رہی تھی۔
”پھر.....؟“ ان کا پارہ چڑھنے لگا۔

”ان کے نام خانوں کو ایک دفعہ میں یاد ہو جاتے ہیں۔ آپ مجھے بھی کوئی گھوڑی سمجھ لیں۔“
اس نے تپائی ان کے نزدیک رکھ دی۔

نازنین ششدری اس کی شکل دیکھنے لگی۔ تیمور علی خان خاموش سے ہو گئے۔

”یہ سوپ ہے ماما نے بنایا ہے۔ آپ کیلئے چائے بنا کر لاؤں چھوٹی بیگم۔“ وہ نازنین کی سمت مڑی۔

”نہیں..... میں اس وقت چائے نہیں پیتی۔ البتہ یاد رکھیں صاحب سے پوچھ لو۔ وہ اپنے بیڈروم میں اسٹڈی کر رہے ہیں۔“
اس نے ملائمت سے کہا۔

مطربہ ایک لمحہ رکے بغیر باہر نکل گئی۔

”کچھ سمجھ نہیں آئی۔“ اس نے تیمور علی خان کی چپ کو بہت محسوس کیا۔

”ویسے خاصی بے وقوف سی ہے۔ آپ جانے دیجئے کچھ کہیے گا نہیں۔“ اس کو مطربہ کے حشر کی فکر پڑ گئی تھی۔

”اس کو زیادہ آئینہ نہیں دیکھنا چاہیے۔ بھابی..... ورنہ گڑبڑ ہو جائیگی۔“ وہ بہت ناراض سے انداز میں گویا ہوئے۔

”کیا فرق پڑتا ہے۔ بے حیثیت انسان کتنا ہی حسین ذہین ہو مگر ہے تو پھر بھی بے چارا..... اور بے چاروں کے رنہ درگزر کرنا بڑائی کی بات ہے۔ ویسے میں سمجھا دوں گی۔ آپ ریلیکس ہو جائیں۔“ نازنین نے ان کا موڈ بحال کرنے کی کوشش کی۔

ترنمین بالآخر تیمور علی خان کے دلائل کے سامنے بے بس ہو ہی گئیں۔

اماں جی کا خیال تھا۔ تیمور علی واپسی سے پہلے ترنمین کا نکاح ہو جائے تو اچھا ہے، دو بھی ایک اور اہم خوشی میں شریک جائیں۔

لیکن یہ حقیقت ہے کہ انسان جس سے غیر مشروط محبت کرتا ہے وہاں محبت ہی سب سے بڑی دلیل بن جاتی ہے۔ دور ہونے کی وجہ سے دلوں کے مزید قریب آ گئے تھے۔ پھر یہ کہ کر بہن کی خیر خواہی کے جذبے نے ان میں مزید تحریک رکھ دی تھی۔

نکاح بے حد سادگی سے ہو رہا تھا۔ صرف گھر کے افراد اور چند بہت قریبی دوست احباب شریک تھے۔ ترنمین نے سختی سے منع کر دیا تھا کہ نکاح سے پہلے کی کوئی رسم وغیرہ نہیں ہوگی۔ نہ ڈھولکی بجے گی۔ نہ وہ ایشن ملیں گی۔ خالہ سولہ آنے ایشن کا پیالہ لے کر روپا دیوی کی کوٹھڑی میں چلی گئیں۔ تاسف کا یہ عالم تھا کہ گویا ترنمین رسم سے ناواقف تھیں۔

ترنمین بالآخر تیمور علی خان کے دلائل کے سامنے بے بس ہو ہی گئیں۔

اماں جی کا خیال تھا۔ تیمور علی واپسی سے پہلے ترنمین کا نکاح ہو جائے تو اچھا ہے، دو بھی ایک اور اہم خوشی میں شریک جائیں۔

لیکن یہ حقیقت ہے کہ انسان جس سے غیر مشروط محبت کرتا ہے وہاں محبت ہی سب سے بڑی دلیل بن جاتی ہے۔ دور ہونے کی وجہ سے دلوں کے مزید قریب آ گئے تھے۔ پھر یہ کہ کر بہن کی خیر خواہی کے جذبے نے ان میں مزید تحریک رکھ دی تھی۔

نکاح بے حد سادگی سے ہو رہا تھا۔ صرف گھر کے افراد اور چند بہت قریبی دوست احباب شریک تھے۔ ترنمین نے سختی سے منع کر دیا تھا کہ نکاح سے پہلے کی کوئی رسم وغیرہ نہیں ہوگی۔ نہ ڈھولکی بجے گی۔ نہ وہ ایشن ملیں گی۔ خالہ سولہ آنے ایشن کا پیالہ لے کر روپا دیوی کی کوٹھڑی میں چلی گئیں۔ تاسف کا یہ عالم تھا کہ گویا ترنمین رسم سے ناواقف تھیں۔

ترنمین بالآخر تیمور علی خان کے دلائل کے سامنے بے بس ہو ہی گئیں۔

اماں جی کا خیال تھا۔ تیمور علی واپسی سے پہلے ترنمین کا نکاح ہو جائے تو اچھا ہے، دو بھی ایک اور اہم خوشی میں شریک جائیں۔

لیکن یہ حقیقت ہے کہ انسان جس سے غیر مشروط محبت کرتا ہے وہاں محبت ہی سب سے بڑی دلیل بن جاتی ہے۔ دور ہونے کی وجہ سے دلوں کے مزید قریب آ گئے تھے۔ پھر یہ کہ کر بہن کی خیر خواہی کے جذبے نے ان میں مزید تحریک رکھ دی تھی۔

نکاح بے حد سادگی سے ہو رہا تھا۔ صرف گھر کے افراد اور چند بہت قریبی دوست احباب شریک تھے۔ ترنمین نے سختی سے منع کر دیا تھا کہ نکاح سے پہلے کی کوئی رسم وغیرہ نہیں ہوگی۔ نہ ڈھولکی بجے گی۔ نہ وہ ایشن ملیں گی۔ خالہ سولہ آنے ایشن کا پیالہ لے کر روپا دیوی کی کوٹھڑی میں چلی گئیں۔ تاسف کا یہ عالم تھا کہ گویا ترنمین رسم سے ناواقف تھیں۔

ترنمین بالآخر تیمور علی خان کے دلائل کے سامنے بے بس ہو ہی گئیں۔

اماں جی کا خیال تھا۔ تیمور علی واپسی سے پہلے ترنمین کا نکاح ہو جائے تو اچھا ہے، دو بھی ایک اور اہم خوشی میں شریک جائیں۔

لیکن یہ حقیقت ہے کہ انسان جس سے غیر مشروط محبت کرتا ہے وہاں محبت ہی سب سے بڑی دلیل بن جاتی ہے۔ دور ہونے کی وجہ سے دلوں کے مزید قریب آ گئے تھے۔ پھر یہ کہ کر بہن کی خیر خواہی کے جذبے نے ان میں مزید تحریک رکھ دی تھی۔

”وہ نیچے تو ہال میں بڑا ہنگامہ ہے۔ وہاں کام کرو گی تو صبح تک ہی ہوگا، یہیں استری کر لوں۔“
 ”وہ بنا کچھ بولے استری اور بچھانے کیلئے دری چادر وغیرہ لینے چلی گئیں۔

اتنی دیر میں تیمور علی خان ہاتھ روم میں بند ہو چکے تھے۔

وہ خاموشی سے واپس آ کر استری کرنے لگی۔ ہتھیلیوں سے اٹھتی مہندی کی مہک سے اس کا دل بھر بھر آ رہا تھا۔
 محنت ہی اکارت ہو گئی تھی۔

اماں جی کتنی اچھی ہیں۔ ماما کام کرنے کیلئے بلانے آئی تو اماں جی نے کتنی محبت سے کہا تھا۔ کام تو یہ روز کرتی۔
 لگانے دو اسے مہندی۔ شوق کی عمر ہے۔ حویلی کی سب سے بڑی تو وہ ہیں۔ انہیں تو بالکل بھی غور نہیں۔ وہ خاموشی سے نہ
 بہاتے ہوئے سوچ رہی تھی۔

تیمور علی خان غسل سے فارغ ہو چکے تھے اور ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑے تویلے سے سر رگڑ رہے تھے۔ ڈریسنگ
 ٹیبل کے وسیع آئینے میں وہ بالکل واضح نظر آرہی تھی۔

کبھی دوپٹے سے ناک پونچھتے ہوئے کبھی آنکھیں..... وہ چونک کر مڑے۔
 ”کیا بات ہے؟ کیوں رو رہی ہو؟“

وہ ہڑبڑا کر ان کی طرف دیکھنے لگی۔ اپنی دانست میں تو بڑی ”خفیہ“ اٹک باری تھی۔
 ”کچھ نہیں.....“ اسے بوکھلاہٹ میں کوئی مناسب جواز بھی نہ سوچھا۔
 ”ہمیں اپنی بات دہراتا پسند نہیں۔ کیا مسئلہ ہے؟“ وہ واقعی حیران تھے۔
 ”ک..... کچھ نہیں خان..... وہ..... بس۔“

”اتنا عذاب لگتا ہے تمہیں کام کرنا کہ رو پڑتی ہو۔ ہمیں ڈیکوریشن پس نہیں چاہیے۔ ہم اماں جی سے کہہ دیں گے۔
 ہوتے ہی واپس چلی جانا۔ جہاں سے آئی ہو۔ رہنے دو یہ کپڑے و پڑے۔ جاؤ آرام کرو۔“ وہ ڈریسنگ ٹیبل کی طرف ہنپ
 گئے۔ وہ برہم ہوئے۔

”اٹھو بھی..... نہیں کروانا ہمیں تم سے کام۔“ وہ برہم ہوئے۔

”خ..... خان..... میں کام کی وجہ سے تو نہیں رو رہی۔“ وہ اتنا کہہ کر بلک بلک کر رو پڑی۔
 ”نان سنس..... پھر کس وجہ سے رو رہی ہو۔ سچ بتاؤ ورنہ ہم صبح کو تمہاری صورت نہ دیکھیں گے۔“ وہ اب ہنپ
 ہونے کے بجائے پریشان تھے۔

”وہ..... مم..... مہندی..... لگائی تھی ناں۔“ اس نے ہتھیلیاں پھیلا کر وضاحت کرنا چاہی۔

”مائی گڈنس..... کیا مہندی دوبارہ نہیں لگ سکتی؟“ وہ متعجب ہوئے۔

اس نے سفید کرتا پانچاے میں ملبوس مشین جیسے انسان کو دکھ سے دیکھا۔

شوق کی ایک ان چھوٹی گھڑی ہوتی ہے اس میں خوشی کا جو ہر ڈھلتا ہے۔ اس گھڑی کو ادھر ادھر نہیں ہونا چاہیے۔

یہ کچھ جاسم عمر کی پوری نہیں ہوتی۔ اگر یہ گھڑی خطا ہو جائے۔

اس بے رحم آقا کو کیسے سمجھائے..... کہ کام کرنے کیلئے طاقت و قوت چاہیے اور طاقت و قوت شوق کی گھڑیوں سے
 بننے جی۔ خوشی کے کنوئیں سے کھینچتے ہیں۔ شوق بار بار نہیں جاتے میرے مالک۔ اس نے ساعتوں میں عمر کی جانے کتنی
 مڑیں پھاگ لی تھیں۔ شعور کیلئے دکھ کتنے ضروری ہیں۔
 تیمور علی خان تو اس کے انداز پر چکر اکر رہ گئے۔

ان کے آرنلک مزاج پر کسی شوق کی قربانی کا بھاری وزن آ پڑا۔

وہ سمجھ نہیں بولے۔ عجب سے احساس سے ملامت سے دوچار ہو گئے۔ اب ان کے پاس کہنے کو کچھ نہیں تھا۔
 ”ہم بابا صاحب کہ کمرے میں ہیں کوئی پوچھے تو بتا دینا۔“ وہ کمرے سے باہر نکلتے ہوئے بولے۔

نلی فراک ’سرخ پانچاے اور دوپٹے میں وہ بہت مصروف تھی۔

بارت آنے میں ابھی وقت تھا۔ وہ تزیین کیلئے کچھ بے بنا رہی تھی۔ کہ خالہ آگئیں۔

”تو یہاں بیٹھی ہے؟“ وہ تعجب سے منہ پر ہاتھ رکھ کر بولیں۔

”اور کہاں بیٹھوں.....“ وہ تنک کر بولی۔

”کیا تھک گئی؟“

”کیوں؟“ وہ پھر تھکے لہجے میں گویا ہوئی۔

”کات کھانے کو نہیں ڈسنے کو جی کرتا ہے..... زہر بھر رہا ہے میرے اندر۔“ وہ اطمینان سے گویا ہوئی۔

”اولیٰ۔“ خالہ نے ناک پر انگلی رکھی۔ ”کیوں بول رہی ہے اتنا۔ کسی نے کچھ کہہ دیا؟“

”کوئی کچھ کہتا ہی کہاں ہے۔ ہم اس قابل ہیں کہ ہمیں کوئی کچھ کہے۔ کھری کھری سناتے ہیں لوگ۔“ وہ خالہ کی
 بدحواسی پر بالآخر مسکرا دی۔

”کون سناتا ہے..... کتنا خیال رکھتے ہیں سب تیرا۔ تیرا دماغ ہی عرش معلیٰ پر رہتا ہے۔ اچھا چل اٹھ وہاں ہال میں بلا
 رہی ہیں۔ چھوٹی دہن اور بڑی بی بی جان۔“

”ہیں..... دونوں ایک ساتھ..... مگر کیوں؟“ وہ حیران ہوئی۔

”یاد تو زبان کاٹ کر پھینک دے یا یہ“ کیوں“ نکال دے اپنی زندگی سے کھڑی ہو۔“ جلدی سے وہ ڈانٹ کر واپس چل
 گئیں۔

اس نے معمولی کے پھول واپس باسکٹ میں ڈالے اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

بال میں آئی تو گھر کی خواتین اور مہمان خواتین نے خوب شور برپا کر رکھا تھا۔ اس کے داخل ہوتے ہی سناٹا چھا
 گیا۔ مہمان خواتین اسے سر سے پاؤں تک دیکھ رہی تھیں۔

”یہ ہے مطربہ..... مطربہ سلام کرو..... مہمان ہیں۔“ ریکسہ بیگم نے اسے ساکت کھڑے ہوئے دیکھ کر لڑکھائی۔
چونک کر آداب بجالایا۔

”بھئی، بڑی تعریف ہوئی ہے تمہاری آواز کی۔ یہ سب مہمان تمہارا گیت سننا چاہتی ہیں۔ روشن آرائے کیا۔“ جی۔ وہ شپٹا گئی۔

”اب جی جی مت کرو۔ جلدی سے کوئی اچھا سا گیت سنا دو۔ بارات بھی آنے والی ہے۔“ عالم تاب نے ٹوکا۔
وہ ان کا قطعی حکم یہ انداز دیکھ کر وہیں دروازے کے قریب بیٹھ گئی۔ اور اپنی بھیگی رنگت والی مہندی پر نظریں جمادیں۔
”کوئی خوشی والا سنا تا۔“ کسی طرف سے فرمائش آئی۔

”خوشی۔“ اسے ایک دم کھوئے سامان کی طرح خوشی یاد آئی۔
وہ خوشی کے گیت یاد کرنے لگی۔ جو اسے بھولتے جا رہے تھے۔

اس نے کھنکھار کر گلا صاف کیا

ایک تو جو ملا ساری دنیا ملی

کھلا جو میرا من ساری بکيا کھلی

کتنی میٹھی مدھر آواز تھی۔ سب ہی محو ہو چکے تھے۔

گیت ختم ہوتے ہی ایک اور گیت کی فرمائش زور و شور سے ہوئی۔ تیمور علی خان نیچے اتر کر باہر کی سمت بڑھنے لگا۔
تھے، ٹھنک کر رک گئے

اوڑھ کے تاروں کا یہ آئینہ

پیروں میں بانگمی میں نے پائل۔ ہو..... او..... او.....

آج نہ رو کو دل کی اڑان کو!

رستہ نیا..... آہا..... ہا..... ہا.....

آج پھر جینے کی تمنا ہے

آج پھر مرنے کا ارادہ ہے

اتنی دلفریب آواز..... اتنی رواں اور نفیس جیسے کوئی پائے کی مغنیہ..... کون گارہا ہے؟ بے حد فطری تجسس تھا۔ مگر خانے کی طرف بڑھتے ہوئے جھجک تھی کہ آج اس طرف مہمان خواتین بھی تھیں۔

اسی دم ماما ملی دالان کی طرف سے اندر داخل ہوئیں۔

”ماما..... ایک کپ چائے مل سکتی ہے۔“ انہوں نے ماما ملی کو روکنے کا جواز پیدا کیا۔

”کیوں نہیں خان..... ابھی لائی..... کیا آپ اپنے کمرے میں ہیں؟“

”ہوں..... باغ کی طرف جا رہا ہوں، پانچ منٹ میں واپس آتا ہوں..... اور ہاں..... ماما..... یہ کون گارہا ہے؟“

ماما کا دھیان ابھی اس طرف نہیں گیا تھا۔ تیمور علی خان کے سوار پر وہ متوجہ ہوئیں، پھر مسکرا دیں۔
”یہ مطربہ ہے۔“ وہ بے نیازی سے گویا ہوئیں۔ جیسے یہ کوئی معمول کی بات ہو۔
”مطربہ۔“ انہیں اچنچا ہوا۔

”اتنی ہنستہ اور رواں آواز..... واقعی ماما؟“

”جی خان..... جتنی خوبصورت وہ خود ہے، اتنی ہی خوبصورت آواز بھی ہے۔ میرے باورچی خانے میں تو اس کی وجہ سے
”جی آگے ہیں۔“ وہ مسکرا کر آگے بڑھ گئیں۔

”ابھی کسی دھیان میں گم باہر کی طرف بڑھے، کانوں میں نقرئی گھنٹیاں بج رہی تھیں۔“

آج پھر جینے کی تمنا ہے، آج پھر مرنے کا ارادہ ہے

کیا غضب کی آواز ہے۔ ایک لفظ کو بھی نظر انداز نہیں کی جاسکتی۔ جی تو چاہ رہا تھا گیت پورا سنیں۔ مگر یوں سر راہ کھڑے
ہونے میں بھی قناعت تھی۔

”کیا بات ہے عارف! کسے ڈھونڈ رہے ہو؟“ یادو علی خان بڑے تھکے تھکے انداز میں اپنے بیڈروم کی طرف جا رہے
تھے۔ عارف کو ادھر ادھر جھانکتا پا کر چونک پڑے۔

”وہ..... خان باہر موٹر میں ایک عورت آئی ہے۔ کہہ رہی ہے، خالہ سولہ آنے کی بھانجی سے ملنا ہے۔“ اس نے بڑے
بے نیاز انداز میں مطلع کیا۔

”اندھ کیوں نہیں بلایا؟“ ان کا تھکا ہوا ذہن موٹر اور عورت سن کر ایک دم مستعد ہو گیا۔

”وہ اندھ نہیں آ رہی۔ کہہ رہی ہے۔ اسے یہیں بلا لاؤ۔ اس کے ساتھ دو آدمی بھی ہیں۔ خوب ہٹے کٹے سے۔“ عارف
نے مزید اطلاع بہم پہنچائی۔

”یادو علی خان چونک پڑے۔ آدمی؟“

”پلو میں دیکھتا ہوں۔“ وہ آگے بڑھنے کی بجائے بیرونی دروازے کی طرف چلے۔ عارف بھی ان کے پیچھے ہولیا۔

بھانگ سے باہر آئے تو تیمور علی خان وہاں ان سے پہلے موجود تھے گاڑی کا پچھلا دروازہ کھلا تھا۔ روشنی ناکافی ہونے کی
بجائے اندر چمکی عورت واضح نہیں تھی۔

”کیا بات ہے تیمور..... کون ہے یہ؟“ انہوں نے بھائی سے سوال کیا۔

”نیکم میں پوچھ رہا ہوں۔“ چوکیدار نے بتایا ہے کہ یہ مطربہ کو بلا رہی ہے۔“ تیمور علی خان نے الجھن بھری نظروں سے ان
کو دست دیکھا۔

”السلام علیکم۔“ یادو علی خان تیمور کے پہلو میں آکھڑے ہوئے اور سلام کیا۔
”وہ نعم السلام۔“

”جی فرمائے..... کیا مسئلہ ہے؟“

”یہاں حویلی میں ایک سب سے خوبصورت لڑکی ہے مجھے اس سے ملتا ہے اتنی خوبصورت کہ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ آپ کے ہاں کی خواتین میں سے کوئی بھی اس کے برابر نہیں ہوگی..... یہی اس کی نشانی ہے۔ اس کا حسن ہی اس کا بہترین ہے۔“

شاہانہ انداز میں بیٹھی ہوئی عورت نے بڑے عجیب انداز میں کلام کیا۔

”آپ کو اس سے کیا کام ہے؟“ یادوعلی خان نے پر تشویش انداز میں سوال کیا۔

”آپ اسے بلائیں تو سبھی..... پتا چل جائے گا سب۔“

”ہم معذرت خواہ ہیں..... اس طرح اسے یہاں نہیں بلا سکتے..... آپ اندر تشریف لے آئیں۔ اور اس سے ملاقات کر لیں۔ ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔“

تیمورعلی خان نے اگلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے پہلوان نما آدمیوں پر نگاہ ڈال کر جواب دیا۔

عورت نے کچھ دیر سوچا پھر گاڑی سے اتر آئی۔

”غیرت خان..... ابھی آتے ہیں ہم۔“ اس نے دونوں آدمیوں میں سے کسی کو مخاطب کیا پھر ان کی طرف متوجہ ہوئی۔

”پہلے“۔ یادوعلی خان اور تیمورعلی خان اس کے دائیں بائیں چلنے لگے۔ اور نزدیکی ڈرائنگ روم میں آگئے۔ عارف ان کے پیچھے پیچھے آ رہا تھا۔

تیمورعلی خان نے ڈرائنگ روم میں پہلے داخل ہو کر تمام لائش آن کر دیں۔ اور پچھلے بھی چلا دیے۔ اور ملے کر ٹھنک

سے گئے۔ سفید پلین ساڑھی میں ملبوس بالوں میں کلائیوں میں موچے کے گجرے پہنے۔ انتہائی دلکش شائل میں بال بنائے۔

وہ ایک انتہائی طرح دار عورت نظر آئی۔ میک اپ اتنا بھرپور اور نفاست سے کیا ہوا تھا کہ اس پر تصویر کا گمان غالب آتا تھا۔ جو

مصور کے برش سے وجود میں آئی ہو۔

سر سے پاؤں تک اتنی مرتب۔ ایک لچلے کیلئے تو تینوں کے حواس ہی جواب دے گئے۔

”تشریف رکھئے“۔ یادوعلی خان نے سنبھل کر صوفے کی سمت اشارہ کیا۔

”مطربہ جیسی غلام زادی سے اس کا کیا تعلق ہو سکتا ہے؟“ تیمورعلی خان کے ذہن میں یہ سوال باادگر کی طرح چکر اڑا

تھا۔

”جاؤ عارف! مطربہ کو بلا لاؤ.....“۔ بالآخر انہوں نے عارف کو حکم دیا۔ وہ جیسے منتظر ہی تھا۔ فوراً ہار نکل گیا۔

یادوعلی خان نے تیمور کی سمت دیکھا۔ دونوں الجھن میں تھے کہ اس سے کیا بات کریں۔

”آپ سے تعارف ہو جائے تو کیا یہ مناسب نہ ہوگا۔“ عورت نے باری باری دونوں کی سمت دیکھا۔

”ہم دونوں بھائی ہیں..... یہ ہماری حویلی ہے اور مطربہ ہماری خادمہ۔“

یادوعلی خان نے بڑے وقار سے مختصر جواب دیا..... انداز یوں تھا کہ ہمیں آپ سے گفتگو کرنے کا کوئی شوق نہیں ہے۔

یہ ذہن ظاہر سے دو پیسے ہی مغرور محسوس ہوتے تھے۔

”ہمیں غلوں میں رہنے والوں کو یہ شوق کیوں ہوتا ہے کہ ان کی خادمائیں تک حسین ہوں، دراصل برابر کی حسین ہوتی ہیں۔ اور خود پر غالب نہیں آنے دیتی کسی کو۔ جبکہ خادمہ تو محل کی دیوار میں لگے اینٹ پتھر کے برابر ہوتی ہے۔ اس پر آسانی ہے.....“

”داخل دلائقہ“۔ دونوں بھائی شیشا گئے۔ بظاہر طرح دار عورت کس قدر بھونڈی گفتگو کر رہی تھی۔

”وہ ہماری درخواست پر یہاں نہیں پہنچائی گئی۔ بلکہ ہماری والدہ نے ایک حساب سے اسے ٹھکانا دیا ہے۔ آپ پہلی

بیت میں صبح کر لیں۔ یادوعلی خان کی پیشانی شکن آلود ہو گئی۔

”ایکبلٹ..... یہ تو بہت اچھی بات بتائی آپ نے..... بلکہ ایک طرح سے میرا بوجھ کم کر دیا۔ شکریہ۔“ عورت نے

بیکم کر دیا مال نکالا اور چہرہ تھپتھپانے لگی۔

دونوں بھائیوں نے اس کی حرکات و سکنات سے نتیجہ نکال کر یہ فیصلہ کر لیا کہ وہ اپنے طور پر اس عورت سے کوئی بات نہیں

کرے گی۔

اکی دم دروازے سے مطربہ کے بجائے خالہ سولہ آنے نمودار ہوئیں۔ عورت کو دیکھ کر ان کا چہرہ اچھکا پڑ گیا۔ انہوں نے

نذر انداز میں یادوعلی خان اور تیمورعلی خان کی سمت دیکھا۔

”تم کیوں آئی ہو؟“ وہ سوال عورت سے کر رہی تھیں اور شکلیں دونوں بھائیوں کی دیکھ رہی تھیں۔

”میں تو باہر سے واپس ہو جانا چاہتی تھی مگر تمہارے مالک اندر لے آئے۔ میرے لئے یہ کوئی نئی بات نہیں..... ساری

دن کی لکھی ہوئی آؤ بھگت دیکھی ہے اپنی۔“ وہ تباہی سے گویا ہوئی۔

دونوں بھائی اپنی اپنی جگہ ایک دوسرے سے بلا کی شرمندگی محسوس کرنے لگے۔

”محترمہ! آپ صرف کام کی بات سمجھئے۔“ تیمورعلی خان کا لہجہ ٹھیک تھا۔

”کس سے کروں؟ جسے بلایا تھا وہ تو آئی نہیں۔“ اس نے نخوت بھرے انداز میں جواب دیا۔

”وہ نہیں آئے گی۔“ خالہ نے قطعی انداز میں جواب دیا۔

”جس جوان جسم کو تم نے مشقت پر گار کیا ہے وہ میرے پیسے سے پروان چڑھا ہے۔ اس کی پیدائش کا شوقلیٹ میرے

ہاتھ میں ہے۔ پرچہ کٹوا دیا تمہارے خلاف تہذیب خوار ہو جائیگا۔“ وہ پھنکاری۔

”جوئی میں آئے کرلو۔ یہاں بھی محنت کے لائق ہوں۔ جیل میں بھی چکی پیس لوں گی۔“ خالہ نے بڑے بڑا انداز

میں جواب دیا۔

”اپنے جاگیرداروں پر بھول رہی ہو؟“ اس نے سسواؤں کی۔ وہ زہریلے لہجے میں گویا ہوئی۔

”کیا کچھ لو؟“ خالہ کا انداز ہنوز تھا۔

”آپ ہمیں متاثر کیا ہے؟“ یادوعلی خان کی بحث دور تک لا حاصل نظر آئی تو بول پڑے۔

”خان۔ یہ مطربہ کو لینے آئی ہے۔“ خالہ نے نہایت ناگواری سے عورت کی جانب دیکھا۔
”کیوں..... کس حیثیت سے؟“ سوال عین فطری تھا۔

”ماں ہوں اس کی۔“ دروازے میں کھڑا عارف بدحواس سا ہو گیا اور عورت کو گھورنے لگا۔ دونوں بھائیوں نے ہنسا
اس عورت کا جائزہ لیا..... ماں۔“

اتنی عمر جو عورت؟

”اگر آپ اس کی ماں ہیں تو یہ نوبت ہی کیوں آنے دی کہ وہ حویلی میں چلی آئی؟“ تیمور علی خان نے ناگوارگی
کی کوشش نہیں کی۔

”فراڈ کیا ہے ان لوگوں نے میرے ساتھ..... راتوں رات اسے یہاں پہنچا دیا۔“ عورت نے غضبناک نظروں سے
خالہ کی جانب دیکھا۔

”مگر انہیں نے ایسا کیوں کیا..... بظاہر تو اس میں ان کا کوئی فائدہ نہیں؟“

تیمور علی خان کی استدلالی قوت پوری طرح کام کر رہی تھی۔

”کیوں..... پیسے نہیں دیئے ہوں گے آپ نے۔ اس لالچی عورت کو۔“ عورت نے جان جلا کر رکھ دی۔

”دیکھئے محترمہ! آپ ذرا احتیاط سے گفتگو کیجئے۔ ہمارے نانوالے فیصد ملازمین وہ ہیں جن کے باپ دادا ہمارے
بیروں کے ملازم تھے۔ ہم کبھی منڈی سے انسان خریدنے نہیں گئے۔ وہ ایک فیصد وہ ہیں جن کو کہیں بھی ملازمت چاہئے
ہمارے ہاں کام مل گیا تو یہاں رہنے لگے۔ یہ جب چاہیں نوکری چھوڑ کر جاسکتے ہیں۔ ان پر کوئی زبردستی نہیں۔ اب یہ بھلا
ہیں..... ان کے تمام پچھلوں نے حویلی میں کام کیا ہے۔“

یاور علی خان نے خود پر کنٹرول کر کے وضاحت کی۔

”اب بھی تسلیم نہیں ہوئی.....؟“ خالہ نے خود اعتمادی کی نئی رمت اپنے اندر محسوس کی۔

”تو پھر کوئی مسئلہ ہی نہیں۔ آپ فی الفور میری بیٹی کو میرے حوالے کیجئے۔ یہ دیکھئے میں تو اسے ہر قیمت پر مانگوں۔
جانے آئی ہوں۔“

عورت نے چیک بک پرس سے نکال کر ان کے سامنے لہرائی۔

”خان! اگر آپ حج اکبر کا ثواب کماتا چاہتے ہیں تو اللہ کے واسطے زمین بانو کو اس کے ساتھ مت بھیجئے گا۔“ خالہ نے
ہاتھ جوڑ دیئے۔

”مت بولواتا..... تمہیں یہ حق دیا کس نے ہے؟“ عورت غرائی۔

”خان! آپ کو اندازہ تو ہو گیا ہو گا یہ کون ہے..... خان! وہ بچی بہت معصوم ہے۔“ خالہ کی آواز بھر مٹی۔

”اوں..... ہوں..... ایک منٹ۔“ یاور علی خان نے انہیں خاموش کرایا۔

”دیکھئے..... آپ کا کیس بہت کمزور ہے۔ اس کیلئے ایک ہی دلیل کافی ہے کہ اگر وہ آپ کی بیٹی ہے تو آج تک

بہن بھائی اور آپ کو آج سے پہلے کیوں خیال نہ آیا کہ اپنی اولاد کو اپنے ساتھ رکھنا چاہیے؟“
”میری معذرت مجھے اس بات کی اجازت نہیں دیتی تھیں کہ میں بچے کی نگہداشت کر سکوں۔ مگر میں اس کی پرورش کا
مخبرہ معاذ اللہ کرتی رہی ہوں۔“

عورت نے سازشی کی فال درست کرتے ہوئے بے نیازی سے جواب دیا۔

”اگر وہ معاذ اللہ واپس کر دیا جائے.....؟“ تیمور علی خان بولے۔ عورت کے لبوں پر طعنیہ مسکراہٹ پھیل گئی۔

”آپ تو کہہ رہے تھے ہم انسان خریدنے منڈی نہیں جاتے؟“

”بمردہ آزاد کرنے کا ہمارے مذہب میں بڑا اجر ہے۔ خالہ ٹھیک کہہ رہی ہیں کہ اس کی نیچر کچھ اور ہے۔ وہ آپ کے
ذہن کیلئے یا آپ کا ماحول اس کیلئے مناسب نہیں ہے۔“ یاور علی خان اب مکمل پرسکون حالت میں بات کر رہے تھے۔ ان کی
یونٹا مل بات آگئی تھی۔

”ہم آپ کو کھل کر دے سکتے ہیں کہ ہماری آپ سے کوئی سودے بازی نہیں ہوئی۔“

”وہ میری اولاد ہے۔“ ”بمردہ“ تمہیں ہے۔ کیا آپ کو شک ہے؟ مگر میں آپ کا شک دور کر سکتی ہوں۔“ عورت پرس
دلے لگی۔

”نہیں..... نہیں ہمیں کوئی شک نہیں۔“ تیمور علی خان نے جلدی سے کہا۔ ان کے کانوں میں سریلی گھنٹیاں بج رہی
تھیں۔

آج پھر جیسے کی تمنا ہے آج پھر مرنے کا ارادہ ہے

”آپ لوگ خواتین وقت ضائع کر رہے ہیں۔ اسے حاصل تو میں ہر قیمت پر کروں گی۔ ہم بااثر لوگوں کی پرواہ
نہیں کرتے۔ انہیں لوگوں سے تو ہمارا چولی دامن کا ساتھ ہے۔“ عورت کے انداز میں بلا کی خود اعتمادی تھی۔

یاور علی خان کے سنجیدہ ذہن نے عورت کے تیور بھانپ لئے تھے۔ وہ محض ایک ملازمہ کی خاطر عدالتوں کے چکر میں پڑنا
نہ چاہتے تھے۔

بابا صاحب تک وہ معاملہ پہنچانا نہیں چاہیے تھے کہ ذہرہ کھولنے کا نہیں بلکہ ڈوری توڑنے کا مزاج رکھتے تھے۔

”عارف! مطربہ کو بلا کر لاؤ۔ بہتر ہے کہ اس سے پوچھ لیا جائے کہ وہ کیا چاہتی ہے۔ اور خالہ آپ کو بھی اتنا جذباتی
نہیں کرنا۔“ انہوں نے ایک لمحے میں فیصلہ کن مرحلہ طے کیا۔ یہ سراسر ماں بیٹی کا معاملہ ہے

تیمور علی خان نے کچھ بولنا چاہا تو یاور علی خان نے ہاتھ نے اشارے سے انہیں خاموشی کی تلقین کی۔ عارف مطربہ کو
منہ پھانکا تھا۔

”اگر اس نے آپ کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا تو آپ اس کے ساتھ زبردستی نہیں کریں گے۔“ یاور علی خان نے
لہجہ کی طرف اشارہ کیا۔ خالہ ایک دم غصہ کر رہ گئی تھیں۔

”کیس میں اس کی ماں ہوں۔ زبردستی بھی کر سکتی ہوں۔“ اس نے غرور سے ناک چڑھائی۔

☆.....☆.....☆.....☆.....☆.....☆.....☆.....

جہیز کے جہیز پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ اس نے گھبرا کر خالہ کو دیکھا تھا۔

موت اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

میری زندگی میں ایک دم خالہ کے پہلو میں جا کھڑی ہوئی۔

”پہچان جائے گی..... اس کا بھی تصور نہیں۔ ساری عمر میری ماں اور اس کی تانی دیوار بنی جو کھڑی رہی ہمارے بچ۔“

میں نہیں جانتی آپ کو۔ خان میں جاؤں۔“ وہ بہت گھبرا رہی تھی۔

آواز: ”تمہیں کوئی کچھ نہیں کہہ رہا۔ گھبراؤ نہیں۔“ یاور علی خان نے پرسکون لہجے میں بات کی۔

آپ قسم لے لیں خان۔ میں انہیں نہیں جانتی۔“ وہ روہانسی ہو گئی۔

افانہ ایٹا میں ناں خان کو۔ اس نے خالہ سے مدد و طلب کی، جو لب بستہ کھڑی تھیں۔

”شہر بالو! تم وقت ضائع کر رہی ہو۔ یہ تمہارے ساتھ نہیں جائیگی۔“ خالہ نے ناگواری سے دھوکہ دیا۔
”تم چپ رہو..... میں کون کہہ خواؤا۔ یہ میرا اور اس کا معاملہ ہے۔ ابھی اسے پوری بات ہی پتا نہیں چلی۔“ عورت نے خالہ کو ڈانٹ دیا۔

”مجھے پتا ہے پوری بات۔ مجھے نانی نے بہت پہلے سمجھا دیا تھا کہ..... میں آپ کے ساتھ نہیں جاؤں گی۔“ عورت پر قابو پا کر قدرے سکون سے جواب دیا۔

”یہاں غلامی ہے میری جان اور جہاں میں تجھے لے جا رہی ہوں وہاں تیری بادشاہت ہوگی۔ رات ہو کہ دن مالکوں جیسے سینکڑوں تیرے پاؤں چھوئیں گے۔ موٹا جھوٹا وہ کھائیں پہنیں جن کا کوئی نہ ہو۔ میرے پاس تو جو ہے سب تیرا ہے۔ تو راج کرنے کیلئے پیدا ہوئی ہے۔ غلامی کرنے کیلئے نہیں۔ میری اپنی ماں نے میرے ساتھ دیکھا ہے۔ میری پھول جیسی بچی کو بیگار پر لگا دیا ہے۔ میرا تو کلیجہ پھٹتا ہے۔ ماں کا یہ حال جو جوتی اپنے ہاتھ سے نہیں ہٹا دوسروں کی جوتیاں سیدھی کرتی ہے۔“ عورت نے لہجے میں بڑا دکھ سمو کر کہا۔

”ماں ایسی نہیں ہوتی۔ مجھے ماں کے بغیر رہنے کی عادت ہے۔ اور میں خوش ہوں۔“ اس نے خالہ کا بازو تھام کر سکون سے جواب دیا۔

”اپنا ایک ٹکڑا سیدھا کرنے کیلئے خوب پٹی پڑھائی ہے میری اولاد کو۔ خالوں کو خوش کرنا تھا خود پیدا کر لی ایک ہونہ۔“ حلوائی کی دکان پر دادا جی کی فاتحہ ہو رہی ہے۔
عورت نے غضبناک لہجے میں خالہ پر چڑھائی کی۔

”دھیان سے بات کرو بی بی۔ منہ سالو (سنجاولو) میں نے کسی کو کوئی پٹی نہیں پڑھائی۔ تم تو اس قابل بھی نہ تمہارے پیٹھ پیچھے تمہارا ذکر کیا جائے۔“

خالہ نے از حد بردامان کر جواب دیا۔

”ہونہ..... میری ماں کی سرچڑھی ہو۔ وگرنہ کیا حیثیت ہے تمہاری۔ تمہارے جیسی دو ہیں میرے پاس۔“ عورت نے ایک دم ہینئر ابدلا۔
کرتی ہیں میرے سر اور بدن کی۔ چلوڑ کی بہت ہو گیا۔ باہر گاڑی میں بیٹھو۔“ عورت نے ایک دم ہینئر ابدلا۔
مطر بہ خوفزدہ سے انداز میں اس صوفے کے پیچھے آکھڑی ہوئی جس پر دونوں بھائی بیٹھے ہوئے تھے۔
”دیکھئے محترمہ۔ زبردستی کچھ نہیں ہوگا۔ اگر یہ آپ کے ساتھ جانا چاہے تو جاسکتی ہے۔ اگر نہ جانا چاہے تو نہیں برداشت نہیں کریں گے۔“

تیور علی خان نے نہایت برہم لہجے میں مداخلت کی۔
”تو پھر ابھی قاضی کو بلوا لیجئے اور میرے سامنے نکاح کر لیجئے اس سے۔“
ڈرائنگ روم میں رواں دواں سانسیں یکھت ساکت ہو گئیں۔ اتنا غیر متوقع حملہ تھا کہ خالہ تو مارے غزا کاپنے لگیں۔ مطربہ کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا تھا۔

”ہونہ..... میری ماں کی سرچڑھی ہو۔ وگرنہ کیا حیثیت ہے تمہاری۔ تمہارے جیسی دو ہیں میرے پاس۔“ عورت نے ایک دم ہینئر ابدلا۔
کرتی ہیں میرے سر اور بدن کی۔ چلوڑ کی بہت ہو گیا۔ باہر گاڑی میں بیٹھو۔“ عورت نے ایک دم ہینئر ابدلا۔
مطر بہ خوفزدہ سے انداز میں اس صوفے کے پیچھے آکھڑی ہوئی جس پر دونوں بھائی بیٹھے ہوئے تھے۔
”دیکھئے محترمہ۔ زبردستی کچھ نہیں ہوگا۔ اگر یہ آپ کے ساتھ جانا چاہے تو جاسکتی ہے۔ اگر نہ جانا چاہے تو نہیں برداشت نہیں کریں گے۔“

تیور علی خان نے بڑی ذہانت سے صورتحال سنبھالی۔
”ہونہ..... میری ماں کی سرچڑھی ہو۔ وگرنہ کیا حیثیت ہے تمہاری۔ تمہارے جیسی دو ہیں میرے پاس۔“ عورت نے ایک دم ہینئر ابدلا۔
کرتی ہیں میرے سر اور بدن کی۔ چلوڑ کی بہت ہو گیا۔ باہر گاڑی میں بیٹھو۔“ عورت نے ایک دم ہینئر ابدلا۔
مطر بہ خوفزدہ سے انداز میں اس صوفے کے پیچھے آکھڑی ہوئی جس پر دونوں بھائی بیٹھے ہوئے تھے۔
”دیکھئے محترمہ۔ زبردستی کچھ نہیں ہوگا۔ اگر یہ آپ کے ساتھ جانا چاہے تو جاسکتی ہے۔ اگر نہ جانا چاہے تو نہیں برداشت نہیں کریں گے۔“

”ہونہ..... میری ماں کی سرچڑھی ہو۔ وگرنہ کیا حیثیت ہے تمہاری۔ تمہارے جیسی دو ہیں میرے پاس۔“ عورت نے ایک دم ہینئر ابدلا۔
کرتی ہیں میرے سر اور بدن کی۔ چلوڑ کی بہت ہو گیا۔ باہر گاڑی میں بیٹھو۔“ عورت نے ایک دم ہینئر ابدلا۔
مطر بہ خوفزدہ سے انداز میں اس صوفے کے پیچھے آکھڑی ہوئی جس پر دونوں بھائی بیٹھے ہوئے تھے۔
”دیکھئے محترمہ۔ زبردستی کچھ نہیں ہوگا۔ اگر یہ آپ کے ساتھ جانا چاہے تو جاسکتی ہے۔ اگر نہ جانا چاہے تو نہیں برداشت نہیں کریں گے۔“

”ہونہ..... میری ماں کی سرچڑھی ہو۔ وگرنہ کیا حیثیت ہے تمہاری۔ تمہارے جیسی دو ہیں میرے پاس۔“ عورت نے ایک دم ہینئر ابدلا۔
کرتی ہیں میرے سر اور بدن کی۔ چلوڑ کی بہت ہو گیا۔ باہر گاڑی میں بیٹھو۔“ عورت نے ایک دم ہینئر ابدلا۔
مطر بہ خوفزدہ سے انداز میں اس صوفے کے پیچھے آکھڑی ہوئی جس پر دونوں بھائی بیٹھے ہوئے تھے۔
”دیکھئے محترمہ۔ زبردستی کچھ نہیں ہوگا۔ اگر یہ آپ کے ساتھ جانا چاہے تو جاسکتی ہے۔ اگر نہ جانا چاہے تو نہیں برداشت نہیں کریں گے۔“

”ہونہ..... میری ماں کی سرچڑھی ہو۔ وگرنہ کیا حیثیت ہے تمہاری۔ تمہارے جیسی دو ہیں میرے پاس۔“ عورت نے ایک دم ہینئر ابدلا۔
کرتی ہیں میرے سر اور بدن کی۔ چلوڑ کی بہت ہو گیا۔ باہر گاڑی میں بیٹھو۔“ عورت نے ایک دم ہینئر ابدلا۔
مطر بہ خوفزدہ سے انداز میں اس صوفے کے پیچھے آکھڑی ہوئی جس پر دونوں بھائی بیٹھے ہوئے تھے۔
”دیکھئے محترمہ۔ زبردستی کچھ نہیں ہوگا۔ اگر یہ آپ کے ساتھ جانا چاہے تو جاسکتی ہے۔ اگر نہ جانا چاہے تو نہیں برداشت نہیں کریں گے۔“

”ہونہ..... میری ماں کی سرچڑھی ہو۔ وگرنہ کیا حیثیت ہے تمہاری۔ تمہارے جیسی دو ہیں میرے پاس۔“ عورت نے ایک دم ہینئر ابدلا۔
کرتی ہیں میرے سر اور بدن کی۔ چلوڑ کی بہت ہو گیا۔ باہر گاڑی میں بیٹھو۔“ عورت نے ایک دم ہینئر ابدلا۔
مطر بہ خوفزدہ سے انداز میں اس صوفے کے پیچھے آکھڑی ہوئی جس پر دونوں بھائی بیٹھے ہوئے تھے۔
”دیکھئے محترمہ۔ زبردستی کچھ نہیں ہوگا۔ اگر یہ آپ کے ساتھ جانا چاہے تو جاسکتی ہے۔ اگر نہ جانا چاہے تو نہیں برداشت نہیں کریں گے۔“

”ہونہ..... میری ماں کی سرچڑھی ہو۔ وگرنہ کیا حیثیت ہے تمہاری۔ تمہارے جیسی دو ہیں میرے پاس۔“ عورت نے ایک دم ہینئر ابدلا۔
کرتی ہیں میرے سر اور بدن کی۔ چلوڑ کی بہت ہو گیا۔ باہر گاڑی میں بیٹھو۔“ عورت نے ایک دم ہینئر ابدلا۔
مطر بہ خوفزدہ سے انداز میں اس صوفے کے پیچھے آکھڑی ہوئی جس پر دونوں بھائی بیٹھے ہوئے تھے۔
”دیکھئے محترمہ۔ زبردستی کچھ نہیں ہوگا۔ اگر یہ آپ کے ساتھ جانا چاہے تو جاسکتی ہے۔ اگر نہ جانا چاہے تو نہیں برداشت نہیں کریں گے۔“

روپا دیوی کے سر پر تھال تھا اور مطربہ کے ہاتھ میں باسکٹ دونوں کھلکھلاتی ہوئی بڑے پھانک کی طرف تھیں۔
نئی صبح کا تاثر ابھی قائم تھا۔

”پھول خان“۔ تیمور علی خان نے سنگی بیچ پر بیٹھے بیٹھے مالی کو آواز دی۔ وہ کھربا درانتی پھینک کر دوڑا چلا۔
”جی خان“۔

”دیکھو وہ کالے کپڑوں میں جوڑکی ہے اسے بلاؤ“۔ انہوں نے کتاب گھنٹوں پر الٹ کر رکھ دی۔
”وہ تو زیتون بانو ہے سرکار“۔

”ہاں ہاں..... وہ جو کوئی بھی ہے بلاؤ“۔ وہ جھلائے۔ مالی دوڑتا ہوا ان دونوں کی طرف گیا اور انہیں روک کر
خان کی سمت متوجہ کیا۔

مطربہ نے ٹوکری وہیں رکھ دی۔ شاید وزنی تھی اور قدرے ڈرے ڈرے انداز میں ان کی طرف چلی آئی۔
”السلام علیکم خان!“ اس کی آواز سہمی ہوئی تھی۔

”ہوں..... کہاں جا رہی ہو؟“ انہوں نے اس کے سلام کا نوٹس نہیں لیا۔

”وہ جی..... ملکوں کے گھر جا رہے ہیں۔ کچھ کھانے پینے کی چیزیں ہیں۔ اماں جی بھجوا رہی ہیں وہاں۔“ اس نے
آہستہ آواز میں بتایا۔

”دماغ تو خراب نہیں ہے تمہارا؟ تمہاری عمر کی لڑکیاں اتنی احمق بھی نہیں ہوتیں۔ حویلی سے باہر قدم بھی نہ لگنا
کیا تم رات کا واقعہ بھول گئیں؟“

ان کے انداز میں بلا کی ناراضگی تھی۔

”نہیں جی..... وہ مگر“۔ وہ بوکھلا کر یکدم خاموش ہو گئی۔ خالہ کی ہدایات یاد آگئی تھیں۔

”اٹھا کر لے جائے گی وہ عورت تمہیں۔ اگر تمہیں کوئی اعتراض نہیں تو سیدھے راستے سے اس کے ساتھ جاؤ۔
ہمارے لئے کیوں درد سر پیدا کرتی ہو؟“

وہ اسی آف موڈ میں بات کر رہے تھے۔

”میں کیوں جاؤں اس کے ساتھ۔ خالہ کہہ رہی تھیں وہ صحیح نہیں ہے۔“ اس نے اتنی سادگی اور معصومیت سے کہا

علی خان کا غصہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔

انہوں نے ایک اچھتی سی نگاہ اپنے اطراف میں ڈالی پھر ایک لمحہ کو اس کی سمت نظر اٹھائی۔ مگر فوراً ہی واپس ہونے لگی۔
”تمہیں پتا ہے یہ صحیح غلط کا کیا مطلب ہے؟“ ان کی حس لطیف میں تحریک ہوئی۔

”پوچھا تھا میں نے خالہ سے۔“

”جی ہاں“۔ تیمور علی خان نے گھٹنے پر پڑی کتاب سیدھی کی۔

”جی ہاں“۔ تیمور علی خان نے گھٹنے پر پڑی کتاب سیدھی کی۔
”جی ہاں“۔ تیمور علی خان نے گھٹنے پر پڑی کتاب سیدھی کی۔

”جی ہاں“۔ تیمور علی خان نے گھٹنے پر پڑی کتاب سیدھی کی۔
”جی ہاں“۔ تیمور علی خان نے گھٹنے پر پڑی کتاب سیدھی کی۔

”جی ہاں“۔ تیمور علی خان نے گھٹنے پر پڑی کتاب سیدھی کی۔
”جی ہاں“۔ تیمور علی خان نے گھٹنے پر پڑی کتاب سیدھی کی۔

”جی ہاں“۔ تیمور علی خان نے گھٹنے پر پڑی کتاب سیدھی کی۔
”جی ہاں“۔ تیمور علی خان نے گھٹنے پر پڑی کتاب سیدھی کی۔

”جی ہاں“۔ تیمور علی خان نے گھٹنے پر پڑی کتاب سیدھی کی۔
”جی ہاں“۔ تیمور علی خان نے گھٹنے پر پڑی کتاب سیدھی کی۔

”جی ہاں“۔ تیمور علی خان نے گھٹنے پر پڑی کتاب سیدھی کی۔
”جی ہاں“۔ تیمور علی خان نے گھٹنے پر پڑی کتاب سیدھی کی۔

”جی ہاں“۔ تیمور علی خان نے گھٹنے پر پڑی کتاب سیدھی کی۔
”جی ہاں“۔ تیمور علی خان نے گھٹنے پر پڑی کتاب سیدھی کی۔

”جی ہاں“۔ تیمور علی خان نے گھٹنے پر پڑی کتاب سیدھی کی۔
”جی ہاں“۔ تیمور علی خان نے گھٹنے پر پڑی کتاب سیدھی کی۔

”جی ہاں“۔ تیمور علی خان نے گھٹنے پر پڑی کتاب سیدھی کی۔
”جی ہاں“۔ تیمور علی خان نے گھٹنے پر پڑی کتاب سیدھی کی۔

”جی ہاں“۔ تیمور علی خان نے گھٹنے پر پڑی کتاب سیدھی کی۔
”جی ہاں“۔ تیمور علی خان نے گھٹنے پر پڑی کتاب سیدھی کی۔

”جی ہاں“۔ تیمور علی خان نے گھٹنے پر پڑی کتاب سیدھی کی۔
”جی ہاں“۔ تیمور علی خان نے گھٹنے پر پڑی کتاب سیدھی کی۔

”جی ہاں“۔ تیمور علی خان نے گھٹنے پر پڑی کتاب سیدھی کی۔
”جی ہاں“۔ تیمور علی خان نے گھٹنے پر پڑی کتاب سیدھی کی۔

”جی ہاں“۔ تیمور علی خان نے گھٹنے پر پڑی کتاب سیدھی کی۔
”جی ہاں“۔ تیمور علی خان نے گھٹنے پر پڑی کتاب سیدھی کی۔

”جی ہاں“۔ تیمور علی خان نے گھٹنے پر پڑی کتاب سیدھی کی۔
”جی ہاں“۔ تیمور علی خان نے گھٹنے پر پڑی کتاب سیدھی کی۔

”جی ہاں“۔ تیمور علی خان نے گھٹنے پر پڑی کتاب سیدھی کی۔
”جی ہاں“۔ تیمور علی خان نے گھٹنے پر پڑی کتاب سیدھی کی۔

”جی ہاں“۔ تیمور علی خان نے گھٹنے پر پڑی کتاب سیدھی کی۔
”جی ہاں“۔ تیمور علی خان نے گھٹنے پر پڑی کتاب سیدھی کی۔

”آپ لوگ تو بہت خوش قسمت ہیں کہ اماں جی جیسی عورت آپ کی ساس ہے۔“
خالہ سولہ آنے نے عالم تاب اور نازنین کو خوش قسمتی کا احساس دلایا۔

”ارے..... بہویں تو گھر کی رونق ہوتی ہیں۔ گھر کی بہار ہوتی ہیں۔ مجھے تو اپنی بہویں بہت پیاری ہیں۔ مگر نازنین
روشن آرا اور رئیسہ کو کہتی ہوں کہ تم دوسرے گھروں کی رونق ہو۔ میری تو بہویں ہی بیٹیاں بھی ہیں۔ یہ کچھ ادا میں پڑیں۔
ریس کرنے کی ضرورت نہیں۔ انہیں تو جو کچھ کرنا ہے اسی گھر میں کرنا ہے۔ اللہ سے دعا کیا کرو۔ اللہ تمہارے بھائی بھائی
ہری بھری رکھے۔“ اماں نے اپنے مخصوص سادہ انداز میں کہا۔

”اماں جی! میری امی بہت شفیق اور محبت والی ہیں۔ میں ان کے بغیر ایک دن نہیں رہتی تھی۔ مگر آپ نے تو مجھے بہت
بھلا دیا۔“ نازنین نے بہت محبت سے ساس کو دیکھا۔
”اللہ انہیں خوش رکھے۔ کتنی اچھی تمیز دی ہے تمہیں۔ بات کرتی ہو تو کلیجے میں ٹھنڈ پڑ جاتی ہے۔ وہ کیا کہتے ہیں بھائی
مائی ویسی جاتی۔“

اماں جی نے ہاتھ بڑھا کر نازنین کے سر پر پھیرا۔

”میں تو اپنی نوکرانوں سے اونچی آواز میں بات کرنا پسند نہیں کرتی۔ بہویں تو اس گھر کی شان ہیں۔
”یہ عالم تاب اتنا کام کرتی ہے۔ بہت کہتی ہوں کیوں اپنی جان ہلکان کرتی ہے، بہویں کام کے لئے تو نہیں لے
جب ذمے داری پڑتی ہے تو سب ہی اچھا برا کر لیتی ہیں۔ کام دھام کے پیچھے کیا فصیحہ کرنا جس کا موقع لے کر لے لے
ہو تو سب کام نمٹ جاتے ہیں۔“

”تو بہ اماں جی۔ میری ساس تو خالی بیٹھا دیکھ ہی نہیں سکتی تھی۔ بچے کو دودھ پلاتے پلاتے کبھی دوپہر کو اٹھ جاتی تھیں
مار کر اٹھاتی تھی۔ کہ حرام خور اٹھ۔ شام کیلئے آنا نہیں لے۔ ختم آئے گا تو کیا ریت بھانکے گا۔“

خالہ نے ایک اور زیادتی یاد کی۔

”اے ہے چچ چچ۔“ اماں جی کو تو بہت ہی دکھ ہوتا۔

”بچے والی عورت کی تو جان یوں بھی تھکی ہوئی ہوتی ہے۔ اللہ تو بہ۔“

”بچہ بھی چلا گیا اللہ کے پاس۔ دادی کی کل کل کھا گئی اسے۔ پھر تو گود ہری ہی نہ ہوئی۔“ خالہ آواز بھرائی۔

”یہ بچے بھی تیرے ہیں سولہ آنے۔ آج تک تجھ سے نوکرانی سمجھ کر تو تراخ سے بات کی کسی نے؟“ اماں نے
بھرائی آواز پر تڑپ کر رہ گئیں۔

”اماں جی۔ آپ نے تو پیر کی جوتی کو سر پر بٹھایا ہے۔“ خالہ نے آنکھیں پونچھیں۔

”ہاں خالہ! ہمیں تو تم ہنستی اچھی لگتی ہو۔ دودن کو گاؤں کیا گئیں ہماری تو حویلی ہی سونی ہو گئی۔“ رئیسہ نے

دھیان بنایا۔

”یہ زیتون بانو نظر نہیں آئی صبح سے۔“ معا عالم تاب کو دھیان آیا۔

”میں نے بھیجا ہے اسے روپا دیوی کے ساتھ ملکوں کے ہاں۔“ اماں جی نے جواب دیا۔
”مطر بہ اندر داخل ہوئی۔“

”آئی؟ کچھ کہہ رہی تھی ملکانی؟“ اماں جی نے پوچھا۔

”میں نہیں گئی خان نے باہر جانے سے منع کر دیا ہے۔ روپا دیوی اکیلی گئی ہے۔“ مطربہ خالہ کے مقابل بیٹھتے ہوئے
مہمان سے بولی۔

”خان نے؟ کون سے خان نے؟“ اماں جی متعجب ہوئیں۔

”تیور خانہ نے۔“ اس نے بے نیازی سے کہا۔

”ہائیں..... کیوں؟“ انہیں خاک سمجھ نہیں آئی۔

”وہ کہہ رہے تھے۔“

”ہاں..... ہاں ہر جگہ لوٹے لپاڑے کھڑے رہتے ہیں۔ اس لئے منع کر دیا ہو گا خان نے۔“

خالہ نے انتہائی حاضر دماغی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ٹکڑا بھی لگایا اور چھاج اس کے گھٹنے پر زور سے رکھا گویا خاموش
ہلکی تھپکی۔ مطربہ نے چونک کر خالہ کی شکل دیکھی اور چاولوں میں ہاتھ مارنے لگی۔

”تاؤ..... یہ تیور کب سے اتنا ذمہ دار ہو گیا۔“ اماں جی کو جیسے بہت خوشی ہوئی تھی۔

”بہت پیچھے ہوئے ہیں۔ انگلستان میں رہتے ہیں اماں جی جو پوری دنیا کو غلام بنا کر بھی نہیں تھکے۔“ نازنین ہنس کر گویا

”واقعی یہ گورے تو بہت ہی ہوشیار ہوتے ہیں۔“ اماں جی نے تائید کی۔ مگر تیور میں چالاکی ولا کی نہیں بہت سیدھا ہے
بچہ۔“

”سب ماؤں کو اپنے بچے سیدھے لگتے ہیں اماں جی۔“ رئیسہ بیگم شرارت سے بولیں۔

”لو۔ تو تم نے کچھ دیکھا ہے اس میں۔ ایک کونہ لئے پڑا رہتا ہے۔ زیادہ ہوتی ہے تو ماں بہنوں بھاد جوں سے چھیڑ
بھڑکتا ہے۔“ اماں جی مذاق دل پر لے گئیں۔

”اماں جی..... برا مان گئیں؟ آپ کا بیٹا ہے تو میرا بھائی ہے۔ بہنوں کو بھی اپنے بھائیوں میں کوئی برائی نظر نہیں
آتی۔ رئیسہ بیگم نے ماں کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔

”میں جوتیا کیسے تیرے تیور خانہ۔“ رئیسہ بیگم یونہی پوچھ بیٹھیں۔

”مجھے توئی ان سے بڑا ڈر لگا ہے۔“ وہ بے ساختہ بولی۔

”مگر کی تعریف ہو رہی ہے؟“ تیور علی خان کتابیں ہاتھ میں لئے بال میں داخل ہوئے۔

”بھائی بڑی عمر ہے۔“ عالم تاب مسکرائیں۔

”مگر اچھی ہونا چاہیے یعنی جیسی ہم چاہیں ورنہ کیا فائدہ لمبی عمر کا“۔ وہ ماں کے پہلو میں بیٹھ گئے۔
 ”ماشاء اللہ..... اچھی ہی گزر رہی ہے۔ کفر نہیں بولتے بیٹے“۔ اماں جی نے شفقت سے سر پر ہاتھ بھرا۔
 ”آخر ذکر خیر کس سلسلے میں ہو رہا تھا؟“ انہوں نے بہن کی سمت دیکھا۔

”ارے یونہی الٹی باتیں کرتی رہتی ہیں۔ ان کی بھلی چلائی۔ لو اس بچی سے پوچھ رہی ہیں جسے اور معنی سمجھ رہی ہیں۔
 کہ تیمور کیسے ہیں؟“ اماں جی نے اپنے سیدھے پن میں ٹھیک ٹھیک..... رپورٹنگ کی۔
 تیمور علی خان کی آنکھوں میں الجھن اور ہونٹوں پر مبہم سی مسکراہٹ تھی۔ انہوں نے سوالیہ نظروں سے روبرو کر دیکھا۔

”اور اس باؤلی کو بھی دیکھو سوال گندم جواب چتا۔ کہہ رہی تھی مجھے تیمور خاناں سے ڈر لگتا ہے۔ اب کوئی اس سے ہٹا
 کہ مارتا ہے تجھے؟“ اماں جی مزید گویا ہوئیں۔
 مطربہ کے چہرے پر شرمندگی کا عکس جھلکنے لگا۔ وہ مزید تیری سے چادلوں میں ہاتھ مارنے لگے۔ تیمور علی خان نے ہاتھ
 دوپٹے کے ہالے میں اس کا صبیح اور شرمندہ شرمندہ سا چہرہ ایک لمحے کو دیکھا۔
 ”لیکن ہمارے کریکٹر سٹوڈنٹ پر اتنی اہم اسٹیپ لگانے کی ضرورت کس سلسلے میں پیش آئی“۔ ان کا انداز بدل
 طرح پر اعتماد تھی۔
 ارے ویسے ہی ہنسی مذاق ہو رہا تھا۔ ان لڑکیوں کی تو عادت ہی ہے اوٹ پٹانگ باتیں کرنے کی“۔ اماں جی نے ہاتھ
 کوتاہ کرنے کا انداز اختیار کیا۔

”کیوں بھی۔ تمہیں کیوں ڈر لگتا ہے ہم سے؟“ تیمور براہ راست مطربہ سے مخاطب ہوئے۔

وہ خاموش رہی مگر دل بہت زور زور سے دھڑکنے لگا تھا۔

”اب بتا دے کیوں ڈر لگتا ہے؟“ خالہ نے بھی زور ڈالا۔

وہ چپ چاپ اپنا کام کرتی رہی۔

”ارے ہٹاؤ..... بچی ہے ویسے ہی کہہ دیا ہوگا۔ کیوں ہاتھ دھو کر پیچھے پڑ گئے غریب کے“۔ اماں جی کی ہرکھم
 تکرار بوجھ بن رہی تھی۔

”نہیں نہیں اب تو بتانا ہی ہے.....“۔ اماں جی نے شرارت سے تیمور کی سمت دیکھتے ہوئے کہا۔

”کیا پتا کوئی کام کی بات معلوم ہو جائے۔ بروقت ہمیں لا جواب کرتے رہتے ہیں“۔ وہ ہنسی۔ ”ماں جی! کیا پتا ہے؟“

”آپ سے زیادہ ہمیں اشتیاق ہو رہا ہے بھابی جان“۔ تیمور علی خان بھلا ہار ماننے والے تھے۔

مطربہ اسی طرح خاموش رہی۔

”نہیں بولے گی اب شرط لگاؤ“۔ عالم تاب گویا ہوئیں۔

”ابھی بلواتا ہوں۔ ایک ویک پوائنٹ ہے میرے پاس“۔ تیمور علی خان گردن موڑ کر بھادج سے مخاطب ہوئے۔

”کیا نام ہے تمہارا لڑکی؟“ وہ بڑی سنجیدگی سے مخاطب ہوئے۔

”آپ“ لڑکی“ ہی کہہ لیا کریں۔“ وہ گلوگیر آواز میں بول اٹھی۔

”ہاں میں بے ساختہ قہقہے گونج اٹھے۔ تقریباً سب ہی نے تیمور کا یہ انداز دیکھ رکھا تھا۔ بس اماں جی اور خالہ نہ سمجھ سکیں اور
 بہت سے سب کو دیکھنے لگیں کہ بھلا ہنسنے کی کیا بات ہے؟“

”لائیے ہمارا انعام“۔ تیمور نے عالم تاب کے سامنے اپنا دایاں ہاتھ پھیلایا۔

”جی نہیں..... پہلے یہ پتا چلنا چاہیے کہ یہ تم سے خوفزدہ کیوں ہے؟“ وہ بھی اپنے نام کی ایک تھیں۔

”یہ چیٹنگ ہے بات بلوانے کی ہو رہی تھی۔ کیوں معزز خواتین؟“

”نہیں نہیں اصولی بات ہے بھابی بیگم ٹھیک کہہ رہی ہیں“۔ ریکیہ بیگم نے انصاف کا میزان سیٹ کیا۔

”چلیں یہ بھی کر لیتے ہیں۔ ہاں بھئی کیوں ڈرتی ہو ہم سے؟“ وہ اس سے مخاطب ہوئے۔

”آپ مالک ہیں جی اور مالکوں سے سب ہی ڈرتے ہیں“۔ وہ ہلکے ہلکے کر رو پڑی تھی۔

”یک ٹاپے کو تو سب ہی سناٹے میں رہ گئے۔“

”حد ہو گئی۔ خواخواہ بچی کو پریشان کر دیا۔ کیا کہتی ہے غریب؟“ اماں جی کو نہایت دکھ ہوا۔

”اسے ناحق ستانا کہتے ہیں۔“ وہ خفگی سے گویا ہوئیں۔ ”چپ کر جا بچی۔ چل اٹھ۔ جاشاباش۔ پانی پی جا کر۔ حد ہو گئی

م لوگوں سے بے ماں باپ کی بچی ہے۔ خیال کرنا چاہیے“۔ ان کا انداز ہنوز خفگی بھرا تھا۔

”آپ کو کس نے بتایا کہ بے ماں باپ کی ہے؟“ تیمور علی خان نے خالہ پر سرسری نگاہ ڈال کر ماں سے سوال کیا۔

”لوسیدھی سی بات ہے ماں باپ ہوتے تو سولہ آنے کے ساتھ کیوں بندھی ہوتی۔ کیوں سولہ آنے“۔ وہ تخت سے
 اترتے ہوئے بولیں۔

خالہ خاموش رہیں۔

”مطربہ آنسو پونچھتی ہوئی باہر نکل گئی۔“

”اچھا بھئی ہم بھی چلتے ہیں“۔ تیمور اٹھ کھڑے ہوئے۔ ”اماں جی ہم ایک رات کیلئے سرائے جا رہے ہیں وہاں سے

دوستوں کے ساتھ شکار کر پروگرام ہے۔“

”بیٹے کیوں بے زبانوں کو خون میں نہلاتے ہو۔ جینے دو جب اللہ نے انہیں زندگی دی ہے۔ تمہیں کیا بھاری ہے۔ کیا
 کہہ رہے ہیں تمہیں“۔

”نہیں! اللہ نے انہیں جان دی ہے۔ تیمور علی خان بھلا ہار ماننے والے تھے۔“

”تیمور فیس دیئے۔“

”اماں جی! یہ جو عربی لوگ ہیں ناں۔ ایک کھیل کھیلتے ہیں جوئے شے کی طرح کا۔ اونٹوں پر انسانوں کے معصوم بچوں کو

باندھ کر اونٹ بھاگاتے ہیں۔ بچہ ڈر کر چیختا ہے تو اونٹ اور تیزی سے بھاگتا ہے۔ جس کا اونٹ سب سے آگے نکل جاتا ہے وہ

”سہا ہاں ہی پکڑ لیتی ہے خان۔“ ماما کو ان کی کیفیت سے ڈر محسوس ہونے لگا۔
 ”اچھا جاؤ اور یاد بھائی سے گاڑی کی چابی لے کر آؤ۔“ وہ جھلا کر بولے۔
 ”اے انتہائی تعجب سے ان کی شکل دیکھی پھر کچھ بولے بنا باہر نکل گئی۔
 جب کمرے میں ٹپکنے لگے۔

جلدی واپس آگئی تھی۔ اس نے چابی تیمور علی خان کو تھما دی۔ وہ بجلی کی تیزی سے باہر نکلے تھے۔

”ماہی طرح الجھ گئی تھی۔ اسے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کیا ہے؟

وہ اپنے کام میں ضرور مصروف تھی مگر ذہن بہت الجھ رہا تھا۔ کہ آخر مطربہ کے باہر جانے میں کیا قیامت ہے؟
 اسی دم تینوں راہداری سے گزرتی نظر آئیں۔ مطربہ نے دونوں ہاتھوں میں سامان اٹھا رکھا تھا۔ وہ ہال کی طرف بڑھ
 رہی تھیں۔ ماما تقریباً بھاگتی ہوئی ان کے قریب آئی۔

”بی بی جان..... وہ تیمور خان آپ کو راستے میں نہیں ملے؟“

تینوں کی تینوں اپنی جگہ ٹھنک گئیں۔

”خیریت؟“ رئیسہ پریشان ہو کر پوچھنے لگیں۔

”وہ آپ لوگوں کو لینے گئے ہیں شاید۔“ ماما نے جلدی سے کہا۔

”ہمیں لینے؟ مگر کیوں تم نے بتایا نہیں کہ ہم ڈرائیور کے ساتھ گاڑی میں گئے؟“ نازنین نے حیرت سے سوال کیا۔

”وہ جی نہیں پتا ہے۔“ ماما کی سمجھ میں خود نہیں آ رہا تھا کہ اپنی بات کس طرح سمجھائے۔

”جی..... کیا ہو گیا ہے ماما۔ مسئلہ کیا ہے؟“ رئیسہ بیگم زچ ہو گئیں۔

”وہ جی..... انہوں نے مطربہ کا پوچھا تھا۔ میں نے بتایا آپ کے ساتھ بازار گئی ہے تو غصہ کرنے لگے کہ اس کے جانے
 کی کیا ضرورت تھی۔ پھر پوچھا۔ آپ لوگوں کو گئے ہوئے کتنی دیر ہوئی ہے۔ جب میں نے بتایا۔ دو تین گھنٹے ہو گئے تو مجھ سے
 یاد خانہ کی گاڑی کی چابی منگوائی اور فوراً حویلی سے چلے گئے۔“ ماما نے تفصیل سے بتایا۔ وہ دونوں مطربہ کی شکل دیکھنے
 لگیں۔

”تجھے کوئی کام کہہ رکھا تھا؟“ رئیسہ بیگم کو بھائی کی نازک مزاجی کا دھیان آیا تو مطربہ سے پوچھنے لگیں۔

”نہیں جی۔ میں ان کے کسی کام میں دیر نہیں کرتی۔“ اسے کیونکہ احساس تھا کہ یہ سب کچھ کیوں ہوا اس لئے نظریں
 بٹھا کر آہستہ سے بولیں۔

”پھر؟“ نازنین اور رئیسہ بیگم دونوں الجھ گئیں۔

”تو ضرور اس کا کوئی اہم کام بھول گئی ہوگی۔“ رئیسہ بیگم کو اس کی یادداشت پر شک ہوا۔

”آپ قسم لے لیں۔ میں نے تو صبح سے انہیں دیکھا بھی نہیں۔“ وہ بری طرح گھبر رہی تھی۔

”ہمناہٹ۔“ ہال میں سامان تو رکھ۔ اور ذرا دماغ پر زور ڈال، ہو سکتا ہے کل رات کوئی کام کہا ہو۔“

جیت جاتا ہے۔ اور جب اونٹ تیزی سے بھاگ رہے ہوتے ہیں تو بچے گربھی جاتے ہیں۔ اور اونٹ بچوں کو دھکا دیتے
 ہیں۔ معصوم بچے ہمیشہ کیلئے معذور ہو جاتے ہیں۔“

”ہائے میرے اللہ۔“ اماں جی سینے پر ہاتھ رکھ کر دوبارہ تخت پر بیٹھ گئیں۔

”کون ظالم اپنے بچے ان کو دیتے ہیں۔ کیا اندھیر ہے۔“

”وہے گا کون؟ یہ الگ کاروبار ہے بچے اغوا کر کے سمگل کر دیئے جاتے ہیں۔ بعض ملکوں میں اتنی غربت اور بے روزگاری
 کہ ماں باپ خود اپنی اولاد کو بیچ دیتے ہیں۔“ تیمور نے مزید معلومات بہم پہنچائیں۔

”میں نہیں مانتی..... یہ اغوا والی بات تو خیر صحیح ہو سکتی ہے۔ مگر ماں باپ اپنی اولاد کو بیچ دیں تو بہ کرو۔ اتنا اندھیر ہو گیا ہے۔“
 اماں جی دہل کر رہ گئیں۔

”کیا واقعی تیمور؟“ عالم تاب نے بھی دکھ اور تعجب کا اظہار کیا۔

”جی..... بھابی بیگم۔ یہ سب ہو رہا ہے۔“ انہوں نے یقین دلایا۔

”کیا قیامت ہے۔ لڑکیوں، بچوں کا دھیان رکھا کرو۔ اللہ اپنا کرم کرے سب پر۔“ اماں جی کو پوتوں، نواسوں اور
 نواسیوں کی فکر پڑ گئی۔

”اچھا بیٹے! جب بچے معذور ہو جاتے ہیں تو پھر ان کا کیا کرتے ہیں۔“ اماں جی تو اپنے سب کام بھول بیٹھیں۔

”کیا کرتے ہوں گے یتیم خانوں میں ڈال دیتے ہوں۔“ تیمور کو افسوس ہونے لگا کہ ناحق ماں کے سامنے یہ بات کہی۔

”اللہ کسی کو اولاد کا دکھ نہ دکھائے سب کی ماما ٹھنڈی رکھے۔“ وہ ہاتھ پھیلا کر دعا کرنے لگیں۔

تیمور نے ماں کے ہاتھ تھام کر چوم لئے۔ ”دنیا میں جتنی روشنی نظر آتی ہے شاید ماؤں کی دعاؤں کی وجہ سے ہے۔“

اماں جی شفقت سے ان کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگی۔

”ماما..... مطربہ نظر نہیں آئی صبح سے۔“ تیمور نے اخبار سے نظریں ہٹا کر ماما بلی کی سمت دیکھا۔

”وہ تو چھوٹی دلہن اور بڑی بی بی جان کے ساتھ بازار گئی ہوئی ہے کوئی کام ہو تو میں حاضر ہوں۔“ ماما نے برتن بچے

ہوئے اپنی خدمات پیش کیں۔

”بازار گئی ہے۔ کب گئی تھیں یہ لوگ بازار؟“ انہوں نے اخبار میز پر رکھ دیا اور فکر مندی سے گویا ہوئے۔

”دو تین گھنٹے۔ مائی گڈنیں۔ کیا خریدنے گئی ہیں ایسا؟ اور کون ڈرائیور ان کے ساتھ گیا ہے۔“ وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔

”جی..... یہ تو مجھے پتا نہیں۔“ ماما نے لاعلمی ظاہر کی۔

”موتی بازار گئی ہیں؟“ وہ اضطرابی انداز میں پوچھ رہے تھے۔

”شاید۔“ ماما اب پریشان ہو گئی۔

”اسے ساتھ لے جانے کی کیا ضرورت تھی اسے کیا خریدنا ہوتا ہے۔“ وہ جھنجھلا رہے تھے۔

رئیسہ بیگم کی سوئی ایک جگہ انک گئی تھی۔ اس کے علاوہ کوئی بات ان کے دھیان میں نہیں آ رہی تھی۔
 مطربہ آگے بڑھ گئی اسے دماغ پر زور ڈالنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ اسے سب علم تھا کہ یہ سب کیوں ہوا ہے۔
 اسے خوف محسوس ہو رہا تھا کہ معلوم نہیں تیمور علی خاناں اس کے ساتھ کس طرح پیش آئیں گے؟
 اس نے سرخ محفل کی چادر اور گاؤں کیوں سے آراستہ تخت پر تھیلے پھینکنے کے انداز میں رکھے اور چادر اتر کر گولہ باندھ کر
 ایک طرف رکھ دیا اور پنکھا چلا کر پسینہ سکھانے لگی۔ گھبراہٹ بھی بہت تھی۔
 تھوڑی دیر بعد گھر کی تقریباً تمام خواتین ہال میں چلی آئیں۔ کی ہوئی شاپنگ پر ابھی تبصرے باقی تھے۔
 ”مطربہ! ٹھنڈا پانی تو پلا۔ تو بہ حلق میں کانٹے پڑ گئے۔“ رئیسہ بیگم ایک صوفے پر لیٹ گئیں۔ ”اور ماما سے کہنا چاہئے کہ
 جلدی بنائے۔“

وہ دوپٹا سنبھالتی باہر چلی گئی۔ راہداری میں اس نے ڈرے ڈرے انداز میں ادھر ادھر دیکھا اور جلدی سے کچن کی طرف
 بڑھ گئی۔

فرق سے پانی کی بوتل نکالی اور دو تین گلاس ٹرے میں رکھے پھر ماما کی طرف پلٹی۔

”ماما! بی بی جان کہہ رہی ہیں کہ چائے ذرا جلدی بنالو۔“

”تیرا چہرہ کیوں اتر ا ہوا ہے؟ کیا تھک گئی؟“ ماما نے ہمدردی سے پوچھا۔

”ماما۔“ اس نے ماما کا سوال نظر انداز کر دیا۔

”ہوں؟“ ماما سر سے پاؤں تک متوجہ تھی۔

”کیا تیمور خاناں غصے میں تھے؟“ وہ دل سنبھالنے کے جتن کر رہی تھی۔

”تھے تو غصے میں۔ بات کیا ہے مطربہ! مجھے بتادے کسی سے نہیں کہوں گی۔“ ماما اس کے قریب چلی آئی۔

”کوئی بات نہیں ماما۔ بس تم خالہ کو ذرا سمجھا دو کہ مجھے گاؤں بھجوا دیں۔ میرا دم گھٹنے لگا ہے حویلی ہیں۔ یہ بھی کوئی زندگی
 ہے۔ جیسے کوئی گناہ کر کے چھپتے پھر رہے ہیں۔“ اس کی آواز بھرا گئی۔ وہ تیزی سے باہر نکل آئی۔

مغرب کی نماز کی وجہ سے حویلی میں ایک سکوت طاری تھا۔

وہ اماں جی کے کمرے میں چلی آئی۔ اماں جی ابھی نماز میں مصروف تھیں۔ وہ دروازے کے قریب بیٹھ کر ان کے قریب
 ہونے کا انتظار کرنے لگی۔

اماں جی نماز سے فارغ ہو کر طویل دعا میں مصروف ہو گئیں۔ وہ ان کے پہلو کی طرف آکھڑی ہوئی۔

”اماں جی! آپ کے پاس تو سب ہی کچھ ہے آج دعا چھوٹی مانگ لیں۔“ اس سے رہا نہ گیا اور بول پڑی۔

اماں جی نے جلدی جلدی دعا پوری کی چہرے پر ہاتھ پھیرا اور نہایت حیرت کے ساتھ اس کی طرف دیکھا۔

”کیا بات ہے؟“

”ہاں جی۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔“ اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

”کس سے؟“ وہ مزید حیران ہو گئیں۔

”تیمور خاناں سے۔“ اس کی آواز میں بھی آنسوؤں کا اثر تھا۔

”آ۔۔۔ ادھر بیٹھ میرے پاس۔“ اماں جی کے چہرے پر فکر مندی جھلکنے لگی۔

”وہاں پر بیٹھ جی“ آپ کی نماز کی جگہ ہے میرا وضو نہیں ہے۔“ اس نے فاصلے پر بیٹھنے کی توجیح پیش کی۔

”کیوں ڈر لگ رہا ہے تجھے تیمور سے؟“ وہ بہت تشویش سے پوچھ رہی تھیں۔ اس کا حسین چہرہ انہیں ہولانے لگا۔

”وہیں بی بی جان کے ساتھ بازار چلی گئی تھی۔“

”تو کیا ہوا اس سے پہلے بھی تو گئی تھی۔“ ان کا ذہن ادھر ادھر بھٹکنے لگا۔ کل بھی اس نے روپا دیوی کے ساتھ جانے سے

انکار کیا تھا۔ اس نے تو آج تک کسی کے آنے جانے پر پابندی نہیں لگائی۔ حتیٰ کہ کبھی دھیان بھی نہیں دیا۔ اس کی تو اپنی ایک
 نیا دنیا ہے۔ وہ یکدم سوچ میں پڑ گئی تھیں۔

”آپ کہہ دیں کہ آئندہ نہیں جاؤں گا میری توبہ۔“ وہ رو پڑی۔

”ہے ہاں بے وقوف۔ کہہ دوں گی بھلا اس میں رونے کی کیا بات ہے۔ پاگل تو نہیں ہے۔ کھا نہیں جائے گا تجھے۔ پر
 مجھے بھی تو ہوتا چلے کہ وہ تیرے باہر جانے پر غصہ کیوں کرنے لگا ہے۔“

ان کی تشویش بجا تھی۔ انتہائی لا پرواہ انسان ایک معمولی ملازمہ پر اتنی توجہ کیوں دے رہا ہے۔ کچھ تو بات ہے ورنہ اس
 لڑکے سے سارا گھر باہر کودنے لگے تو وہ نہ پوچھے۔

”آپ خود ہی پوچھ لینا اماں جی۔ میں تو آج آپ کے کمرے سے باہر نہیں جاؤں گی۔ یہیں پر ہی پڑی رہوں گی۔“

”خدا نخواستہ بندوق تانے بیٹھا ہے تجھ پر پاگل کہیں کی۔“ وہ ناراض ہو گئیں۔

”اماں جی مجھے کسی کا غصہ بھی برداشت نہیں اور خان کا تو بالکل بھی نہیں۔ مجھے ہر کسی کے غصے سے ڈر لگتا ہے۔ اللہ کی قسم
 کہ جی۔“

”توبہ ہے زیتون بانو! رانی کا پہاڑ بتا رہی ہے۔ کہہ دوں گی میں اس سے کہ تجھ سے آرام سے بات کیا کرے۔ تیرا دل
 خراب ہے۔“ جواب۔ شاباش کا کام کر۔“

”کیونکہ حقیقت حال سے بے خبر تھیں اس لئے نیازی فطری تھی۔“

”نہ ماما اندر داخل ہوئی۔“

”تیمور خاناں بلارہے ہیں تجھے۔“ وہ مطربہ سے مخاطب ہوئی۔

”اماں جی! اس نے بے چارگی سے ان کی طرف دیکھا۔“

”تیمور کو یہیں بھیج دو ماما۔“ اماں جی اپنی نماز کی چوکی پر بیٹھ گئیں۔
 مطربہ سبے پاؤں باہر نکلتے گئی۔

”بہن خالہ! لائی تھیں آپ نے انٹرویو کیا تھا کہ یہ کون سے
کے فیلڈ۔“

جئے تیں؟“ دو ماں کی طرف پلٹے۔
 ”نہرہو کیا کرنا تھا بیٹے! خالہ چودہ سال سے حویلی میں ہے۔ عزت دار بے گھر عورت ہے۔ آج تک کوئی ایسی ویسی
 نہ نہیں کی۔ محنت کر کے کھاتی ہے۔ خوشی خوشی خدمت کرتی ہے۔ محنتی ہے۔ اس سے بھلا کا ہے کے سوال جواب کرتی۔“
 انہی نے خاصی حیرت سے ان کی صورت دیکھی۔
 ”لیکن جب کوئی حویلی میں آئے آپ کو اس کا اتا پتا معلوم کرنا چاہیے۔“ تیمور نے اسی انداز میں کہا۔
 ”بس یہ اتا پتا بہت ہے کہ یہ سولہ آنے کی بھانجی ہے۔ اور سولہ آنے ایک بھلی دکھیا عورت ہے۔“ اماں جی نے سادگی
 سے جواب دیا۔

"نہ نے بنی لی کوئی سی وہ ہے! سنا وہ پریت پڑا ہے۔ یہ بہت کم عمر اور بے وقوف ہے۔ اور کوئی بھی صحیح سوچ رکھنے والا
 "اماں جی! ہمیں اس سے کوئی شکایت نہیں ہے۔ یہ بہت کم عمر اور بے وقوف ہے۔ اور کوئی بھی صحیح سوچ رکھنے والا
 سان کی دوسرے انسان کے ساتھ زیادتی برداشت نہیں کر سکتا۔ یہ تو پھر اس حویلی کی ملازمہ ہے۔ اگر اس کے ساتھ زیادتی
 ہوئی تو ہمیں بہت دکھ ہوگا۔" وہ اتنا کہہ کر باہر چلے گئے۔
 مطربہ کو تو یہ جملہ بڑی محنت کی کمائی لگا۔ یہاں وہاں رنگ برنگی آتش بازی چھوٹی محسوس ہوئی۔
 جن کا دھیان و خیال ہر آن رہتا ہو۔ ان کی خبر گیری کے انداز تھکن اتارنے کو کافی رہتے ہیں۔
 "لو بتاؤ، الجھا کر رکھ دیا ہے مجھے۔ بیٹھی معمرہ سیدھا کرتی رہوں۔ تو بتا اگر کوئی بات ہے۔" سیدی سادی اماں جی بہت
 الجھ رہی تھیں۔

جن کا دھیان و خیال ہر آن رہتا ہو۔ ان کی خبر گیری کے انداز تھکن اتارنے کو کافی رہتے ہیں۔
 ”لو بتاؤ۔ الجھا کر رکھ دیا ہے مجھے۔ بیٹھی معہ سیدھا کرتی رہوں۔ تو بتا اگر کوئی بات ہے۔“ سیدھی سادی اماں جی بہت
 الجھتی تھیں۔
 مگر بے نظریں اٹھا کر ان کی سمت دیکھا۔

”آپ خالہ سے پوچھ لینا اماں جی! مجھے تو خود بھی کچھ پتا نہیں۔“ وہ آہستگی سے بولی۔

”تیری بات تجھے نہیں پتا تو سولہ آنے کو خاک پتا ہوگی۔“ اماں جی جھلا سئیں۔

”آپ یقین کریں اماں جی انہی کو پتا ہے سب۔ بھیجوں انہیں آپ کے پاس؟“ وہ باہر کی طرف بڑھی۔

”ہاں..... ہاں..... بھیج دے۔ تو یہ میرا تو سر دکھنے لگا ہے۔“ اماں جی نے سر تھام لیا۔

”آپ نے بلایا ہے اماں جی؟“ خالہ کمرے میں داخل ہوئیں۔
 ”ہاں..... آسولہ آنے۔ بیٹھ۔“ اماں جی نے بھی نشست کا آرام دہ انداز اختیار کیا۔
 ”جی۔“ خالہ قالمین پر بیٹھ کر اپنا بیان کا بٹوا کھولنے لگیں۔

بیٹے اگر اس سے کوئی غلطی ہو گئی ہے تو آئندہ نہیں ہوگی۔ اب تم میرے پاس بیٹھ کر ہنسی خوشی کی باتیں کرو۔ جاؤ چائے،
کر لے آخان کیلئے۔“

اماں جی نے امن کی فاختہ کارول یوں ادا کیا جیسے کوئی یاد کیا ہوا سبق سنا رہا ہے۔ کیونکہ وہ خود اونچی آوازوں اور بڑے
ہوئے تیوروں سے گھبراتی تھیں۔ اس لئے بھی مستعدی قابل ذکر تھی۔

”اماں جی۔“ تیمور علی خان زچ سے ہو گئے۔

”تمہیں ہم نے کہا تھا ناں کہ حویلی سے باہر قدم نہ نکالنا۔ تمہاری سمجھ میں نہیں آتا؟“ وہ ماں کو جواب دینے کی بجائے اس سے مخاطب ہوئے۔

”شپاٹ۔ جب تمہیں کہہ دیا تھا تم باہر نہیں

”شپاٹ۔ جب تمہیں کہہ دیا تھا تم باہر نہیں جاؤ گی نہ کیلی نہ کسی کے ساتھ۔ حویلی یہاں عزت کی علامت ہے۔ تم جہنم میں جاؤ مگر ہم تمہیں اپنے خاندان کیلئے مصیبت نہیں بنا سکتے“۔ وہ برہم ہوئے۔

”کیا بات ہے بیٹے! کچھ مجھے بھی تو بتاؤ۔ آخر معاملہ کیا ہے۔ خدا نخواستہ کیا بات ہوئی ہے کہ عزت کا مسئلہ اُبل رہا ہے؟“

”سولہ آنے تو نے بتایا تھا اس بچی کے ماں باپ مرکھپ گئے؟“ اماں جی خالہ کو گہری نظروں سے دیکھنے لگیں۔
خالہ ایک دم ٹھنک گئیں مگر نظریں نہیں اٹھائیں۔

”مرے ہوئے ہی سمجھ لیں۔ خیریت؟ آپ کو یہ کیا دھیان آیا۔“ ان کے لہجے میں فکر مندی کا تاثر تھا۔
”سیدھا سیدھا جواب دے سولہ..... کیا سمجھ لوں۔“ اماں جی کا تو ویسے ہی سر دکھنے لگا تھا۔ ناراضگی سے بولیں۔
”کوئی بات ہوگئی اماں جی؟“ خالہ کی آواز بہت دھیمی تھی۔

”مجھے تو نہیں پتا لیکن لگ رہا ہے کہ کوئی بات ہوگئی ہے۔ تیمور غصہ کر رہے تھے زیتون بانو پر اور بار بار یہ کہہ رہے ہیں۔
یہ گھر سے باہر نہیں جائیگی۔ کیوں کہہ رہے ہیں ایسا۔ تجھے ضرور پتا ہوگا۔“ اماں جی گویا ہونٹیں۔
خالہ سر جھکائے سوچتی رہی۔ پھر گلا صاف کر کے بولیں۔

”اماں جی آپ کو تفصیل اس لئے نہیں بتائی تھی کہ بچی کو حویلی والے ذلیل نہ سمجھنے لگیں۔ وہ تو معلوم ہے بے قصور ہے۔“
”ہیں؟“ اماں جی کاؤتیکے سے نکلی ہوئی تھیں چونک کر اٹھ بیٹھیں۔

”یہ میری سگی بھانجی نہیں ہے۔ مگر ہے بہت مظلوم۔ ہندوستان میں اس کی نانی کا گھر میرے میکے کے برابر تھا۔
داروں سے بڑھ کر سلوک تھا دونوں گھروں میں۔ پاکستان بنا تو ہجرت بھی ساتھ کی۔ پھر ایک ہی جگہ رہے۔ اس کی نانی
انبالے کی نامی گرامی بھانجی والی تھی۔ مشتری انبالے والی کے نام سے سارے ہندوستان میں مشہور تھی۔

ایک سید زادہ اس پر فدا ہو گیا۔ دلی کے رئیسوں میں سے ایک تھا اس کا گھرانہ۔ اس نے زیتون کی نانی سے چپ کر
شادی کر لی تھی اور کہا تھا کہ آہستہ آہستہ وہ راستہ بنا کر اپنے خاندان میں لے جائیگا اس سے شادی کے بعد مشتری انبالے والی
نے دکان بڑھالی اور گمنا می میں چلی گئی تھی۔ مگر تھی بالا خانے میں ہی اپنی ماں کے پاس۔ بہت بھرتا تھا رئیس اس کی ماں کو جب
ہی تو چپکی ہو بیٹھی۔

وہیں زیتون بانو کی ماں شہر بانو پیدا ہوئی۔ مشتری کی ماں مانو آپ کی کتنی لالچی ہوتی ہیں یہ عورتیں اس کی تو بڑی مائی
روح فنا ہو رہی تھی کہ سید زادہ مشتری کو جب اپنے ساتھ لے جایگا تو حلوے ماڈے کیسے چلیں گے۔ مکار نے بچی چھپائی اور
اس کے آدمی کو کہہ دیا کہ لونڈا پیدا ہوا تھا۔ مگر فوراً ہی مر گیا۔ آپ جانو اماں جی ان عورتوں کی چالاکیاں۔ کچھ عرصے بعد مشتری
کو اس کا مرد لے گیا۔ مگر اس بدنصیب کو چار دن بھی خوشی دیکھنا نصیب نہیں ہوئی۔ اس کے مرد کو کسی نے دشمنی میں گولی مار
دی۔ اس کے گھر والوں کو تو مشتری ایک سے لاکھ تک منظور نہیں تھی۔ اکلوتی اولاد کے سامنے جھک گئے تھے۔ جب بیٹائی نہ
رہا تو وہ کیا لگتی۔ ان کی عدت بھی پوری کرنے نہیں دی کھڑے کھڑے دو کپڑوں میں نکال باہر کیا۔ یوں وہ ہمارے پردوں میں
آ آباد ہوئی۔ میرے ابا نے بہن کہہ دیا یوں ہم سب اسے پھوپھی کہنے لگے۔ محنت مزدوری کر کے پیٹ پالتی رہی۔

ایک روز دلی میں اسے اپنے وہاں کا خوبہ سرا لکھ گیا۔ اس نے بھید کھول دیا پھوپھی پر کہ اس کے وہاں لونڈا نہیں لونڈ
ہوئی تھی اور وہ زندہ ہے اور تیری ماں اس کی ٹریننگ کر رہی ہے۔ پھوپھی کے تو چھکے چھوٹ گئے۔ اس نے سید زادہ سے
سہانے حلف اٹھایا تھا کہ مرجائے گی مگر دوبارہ اس دنیا میں نہیں جائے گی۔ اب اس کی اولاد وہاں تھی۔ اس بے چاری کی تو

”اماں جی! ایک دن ٹھنک کٹا کر انبالہ پہنچی خوب فضا بہت ہوا مگر وہ مکار بڑھیا بھلا اس کی چلنے دیتی بس اتنا مانی کہ آ کر مل لیا کر
پہرے میں شہر بانو زیادہ اڑی کی تو ملنے بھی نہیں دوں گی۔ پھوپھی بے چاری اکیلی کمزور عورت اگر سسرال والوں سے بھی مدد
نہیں ملے گی اس کی بات کا اعتبار کرتے۔ گواہیاں دینے والا تو منوں مٹی تلے سو رہا تھا۔

”اماں جی! اس کی بات کا اعتبار کرتے۔ گواہیاں دینے والا تو منوں مٹی تلے سو رہا تھا۔
”اماں جی! اس کی بات کا اعتبار کرتے۔ گواہیاں دینے والا تو منوں مٹی تلے سو رہا تھا۔

”اماں جی! اس کی بات کا اعتبار کرتے۔ گواہیاں دینے والا تو منوں مٹی تلے سو رہا تھا۔
”اماں جی! اس کی بات کا اعتبار کرتے۔ گواہیاں دینے والا تو منوں مٹی تلے سو رہا تھا۔

”اماں جی! اس کی بات کا اعتبار کرتے۔ گواہیاں دینے والا تو منوں مٹی تلے سو رہا تھا۔
”اماں جی! اس کی بات کا اعتبار کرتے۔ گواہیاں دینے والا تو منوں مٹی تلے سو رہا تھا۔

”اماں جی! اس کی بات کا اعتبار کرتے۔ گواہیاں دینے والا تو منوں مٹی تلے سو رہا تھا۔
”اماں جی! اس کی بات کا اعتبار کرتے۔ گواہیاں دینے والا تو منوں مٹی تلے سو رہا تھا۔

”اماں جی! اس کی بات کا اعتبار کرتے۔ گواہیاں دینے والا تو منوں مٹی تلے سو رہا تھا۔
”اماں جی! اس کی بات کا اعتبار کرتے۔ گواہیاں دینے والا تو منوں مٹی تلے سو رہا تھا۔

”اماں جی! اس کی بات کا اعتبار کرتے۔ گواہیاں دینے والا تو منوں مٹی تلے سو رہا تھا۔
”اماں جی! اس کی بات کا اعتبار کرتے۔ گواہیاں دینے والا تو منوں مٹی تلے سو رہا تھا۔

”اماں جی! اس کی بات کا اعتبار کرتے۔ گواہیاں دینے والا تو منوں مٹی تلے سو رہا تھا۔
”اماں جی! اس کی بات کا اعتبار کرتے۔ گواہیاں دینے والا تو منوں مٹی تلے سو رہا تھا۔

”اماں جی! اس کی بات کا اعتبار کرتے۔ گواہیاں دینے والا تو منوں مٹی تلے سو رہا تھا۔
”اماں جی! اس کی بات کا اعتبار کرتے۔ گواہیاں دینے والا تو منوں مٹی تلے سو رہا تھا۔

”تو کیا نکاح کے بعد اسے پتا نہیں چلا ہوگا کہ اس کی عورت کے کچھ ہونے والا ہے؟“ اماں جی کو یہ سب سمجھ کر ہنس رہی تھی۔

”اب کیا پتان کے چکروں کا۔ ایسا غیر مت مند ہوتا تو بیاہ کر عورت کو اس ماحول میں چھوڑتا ہی کیوں؟“ عورت نے ہنس دیا۔

”ہے تو تو بہت سمجھ والی سولہ آنے۔“ اماں جی نے خالہ کی نکتہ رسی کو بڑی فراخ دلی سے سراہا۔

”بتاؤ یہاں وہاں اپنی اولاد چھوڑتے پھرتے ہیں۔ کیسے مرے ہوئے ضمیر ہوتے ہیں لوگوں کے۔ تیور تہہ بہہ ہوتی ہیں۔ میں اتنی غربت ہے کہ لوگ پیٹ کی خاطر اپنی اولاد بیچ دیتے ہیں۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا مگر اب آ رہا ہے۔ پڑاؤ کلام میں بھی لکھا ہے کہ بعض لوگوں کے دلوں پر مہر لگی ہوتی ہے اندھے بہرے کہتا ہے اللہ ایسے لوگوں کو۔“

”جج..... جج..... جج..... بتاؤ بے قصور بچے۔ میرے بچوں کو بخار چڑھ جائے تو مجھے ساری رات نیند نہیں آتی۔“ عورت نے حشر کی آخری چار آیتیں پڑھ کر اپنے بچوں پر دم نہ کروں تو چین نہیں آتا۔ میں تو دم کے بغیر بچوں کو باہر نہیں نکلتی۔ پڑاؤ بری آگ ہوتی ہے اولاد کی۔ کتنا مہنگا ہوتا ہے سہاگ کا جوڑا۔ اسے پہننے کے بعد عورت اپنے لئے کب رہتی ہے۔ کیسے کیسے لوگ ہیں دنیا میں۔ کس قدر حسین بچی اور کتنی بد نصیب۔“ اماں جی کی جان کو ملال لگنے لگے۔

”آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں اماں جی؟“ خالہ نے دبے دبے لہجے میں کہا۔

”کس بات پر؟“ وہ حیران ہوئیں۔

”زیتون بانو کے حویلی میں رہنے پر؟“ خالہ نے ڈرتے ڈرتے ان کی طرف دیکھا۔

”بھلی کہی۔ یہ تو میرے اونچے نصیب ہیں کہ کسی دکھیا بے آسرا کو میری چھت کے نیچے اماں ہے۔ اللہ میرے ہاتھوں کا بھلا کرے۔ یہ تو فیت خوش بختوں کو ملتی ہے۔“

اس کی نانی کے نام کی روٹی بھی بھجوا دیا کر ہر جمعرات کو غریبوں میں۔ نیاز فاتحہ بھی دلایا کر اس کے نام کی۔ پڑاؤ ہوتی ہیں یہ عورتیں۔ معلوم نہیں کیا کیا مجبوریاں ہوتی ہوں گی انہیں۔ تجھے پتا نہیں زمانے کا حال۔ کتوں کو صوفے پر غور کھلاتے ہیں۔ اور ان عورتوں کی چادریں خود اتارتے ہیں۔ اور پھر..... اب کیا کہوں سولہ آنے۔ بہت بری ہے پڑاؤ۔ میری اکیلی جان۔ اور اتنے دکھ۔ اور اچھا سن۔ یہ تیور کو کیسے پتا چلا۔ تو نے بتایا تھا؟“ اماں جی کو دھیان آیا۔

”مجھے کیا ضرورت پڑی اماں جی۔ پرسوں آئی تھی وہ بد نصیب۔“ خالہ نے بے زاری سے کہا۔

”کون؟“ اماں جی سمجھیں نہیں۔

”وہیں..... شہر بانو..... اس کی ماں۔“ خالہ نے ناگوار تاثرات کے ساتھ بتایا۔

”ہیں..... کب..... تو نے مجھے کیوں نہیں ملوایا۔“

”بس مجھے یہی خیال تھا کہ حقیقت کھلنے پر کہیں بے چاری در بدر نہ ہو جائے جو اسے اتنی توجہ اور محبت ملی ہے۔“

جائے۔ اب بھی اماں جی آپ سے یہی درخواست ہے حویلی میں اور کسی کو نہیں بتائیے گا۔“

”بے مجھے کیا پتانے کی پڑی ہے۔ اتنا پرانا ساتھ ہے میرا تیرا اب بھی نہیں سمجھتی مجھے۔ مگر یہ تو بتا کیوں آئی تھی وہ۔“

”اماں جی نے تعجب سے سوال کیا۔“

”ہیں..... میں نے کبھی کوئی آئی تھی۔ عمر ڈھل رہی ہے پورا نہیں پڑ رہا ہوگا۔“ وہ جل کر بولیں۔

”ہیں..... میں نے کبھی کوئی آئی تھی۔ عمر ڈھل رہی ہے پورا نہیں پڑ رہا ہوگا۔“ وہ جل کر بولیں۔

”تو ہاں انتظار..... کیسی پھول جیسی معصوم بچی ہے۔ کتنی پتھر ہوتی ہیں عورتیں۔ پھر کیا ہوا۔“

”تو ہاں انتظار..... کیسی پھول جیسی معصوم بچی ہے۔ کتنی پتھر ہوتی ہیں عورتیں۔ پھر کیا ہوا۔“

”تو ہاں انتظار..... کیسی پھول جیسی معصوم بچی ہے۔ کتنی پتھر ہوتی ہیں عورتیں۔ پھر کیا ہوا۔“

”اماں جی نے جواب دیا۔“

”اماں جی نے جواب دیا۔“

”اماں جی نے جواب دیا۔“

”اماں جی نے جواب دیا۔“

”اماں جی نے جواب دیا۔“

”اماں جی نے جواب دیا۔“

”اماں جی نے جواب دیا۔“

”اماں جی نے جواب دیا۔“

”اماں جی نے جواب دیا۔“

”اماں جی نے جواب دیا۔“

”اماں جی نے جواب دیا۔“

”اماں جی نے جواب دیا۔“

”اماں جی نے جواب دیا۔“

”اماں جی نے جواب دیا۔“

”اماں جی نے جواب دیا۔“

”اماں جی نے جواب دیا۔“

”اماں جی نے جواب دیا۔“

”اماں جی نے جواب دیا۔“

”اماں جی ٹھیک نہیں کہتی تھیں۔ کہتے ہیں تیر۔ مہاری ایک ایک حرکت سے ظاہر ہے کہ خوش ہو رہی ہیں۔“

رئیس بیگم نے بہت ہی پیار سے راکل بلیواریہ شلواریاں پہنے میں ملبوس کھلکھلاتی ترمین کو دیکھا۔

”شروع میں تو سب ہی اچھے ہوتے ہیں۔ ترمین میں۔“

”پھر وہی بدشگونی کی باتیں۔“ اماں جی نے اناں۔

”جب خوش ہوتے ہیں تو بس خوش ہوتے ہیں۔ اناپن پوچھ نہیں سوچتے۔“ ترمین نے ترمین کی جھمکیوں سے بہرہ درست کرتے ہوئے ان کے رخسار پر ہنسی بھری۔

”چھوٹی بھابی کو دیکھ کر تو فرشتے دنیا کے بارے میں سب اچھا ہے“ کی رپورٹ لکھتے ہوں گے۔“ ترمین نے اناں سے کہا۔

”اماں جی! آج آپ نے ہمارے لئے کیا پکوا یا ہے۔ وہاں سسرال میں تو مارے تکلیف کے بھوکے مر رہے ہیں۔“

”ہے ناں ناشکری۔ کیوں کرتی ہے تکلف۔ تیرا گھر ہے وہ۔“

”ہائے اماں جی اتنے مہمان رکے ہوئے تھے وہاں کہ بس۔ مجھ سے نہیں کھایا جاتا نئے لوگوں کے ساتھ کھا ہوتا۔“

”جب اندر سب اچھا ہو تو باہر بھی سب اچھا نظر آتا ہے۔“ ترمین نے شوخی سے انہیں چھیڑا۔

”دعا دیں میرے بھائی کو۔ مہینوں میں عالم فاضل بنا دیا ہے آپ کو۔“ ترمین نے بھی جوابی کارروائی کی۔ ترمین کے چہرے پر حیا کے رنگ بکھر گئے۔

”کون سے والے بھائی کی بات کر رہی ہیں آپ؟“ تیموران سب کو ڈھونڈتے ہوئے وہیں آگئے تھے۔

”جن کا یہ سامان ہیں ظاہر ہے انہی کی بات کریں گے۔ تمہارا کارنامہ دیکھنے کا اشتیاق ضرور ہے مگر ابھی اس میں ان ہیں۔“ ترمین کھلکھلائی۔

”نہیں! آپ حکم کریں تو ابھی یعنی جلدی دکھا دیتے ہیں کارنامہ۔“ وہ بڑی سعادت مندی سے گویا ہوئے۔

”جی نہیں۔۔۔۔۔ ہمارے ہاں جو تیاں گھس کر دلہن لانے کا رواج ہے۔ آپ روایات تو ذکر انقلابی بننے کی کوشش نہ کریں۔“

”بعض اوقات انقلاب بہت ضروری ہوتے ہیں آپا؟“ تیمور نے مصنوعی سنجیدگی کے ساتھ سمجھانے کی کوشش کی۔

”یہ“ والا لائے تو بہت برا ہوگا۔“ رئیس بیگم نے دھمکی دی۔

”آپ لوگوں کو نئے نئے طے جو تو سینڈلوں کا اتنا ہی شوق ہے تو فکر مند نہ ہوں اپنا اپنا تاپ دے دیجئے گا۔“ انجمن جوتے

سینڈلیں بہت خوبصورت ہوتی ہیں۔ وہاں سے بھجوا دیں گے۔“

”اماں جی۔۔۔۔۔ ماما پوچھ رہی ہیں کھانا لگا دوں۔“ مطربہ تیمور کی پشت کی طرف کھڑی اماں جی سے مخاطب تھی۔

”مردانے میں لگوادو۔ ابھی تو لڑکیاں ہنسی مذاق کر رہی ہیں۔ تھوڑی دیر بعد لگا دینا۔ روپا دیوی کو ساتھ لگا لو کیوں کہ

بانہاں ہو رہی ہو۔“

”اماں جی۔۔۔۔۔ مجھے تو گڑبڑ کی بو آ رہی ہے۔ بس آپ تیمور کا نکاح فوراً پڑھوا دیں۔ باندھ دیں جلدی سے۔ اس سے

پہلے کی بات بھلا کر انقلاب لے آئیں۔“ ترمین نے ساس کو مشورہ دیا۔

”تیمور جو پکا سفید آگیا تو مسئلہ ہو جائے گا۔ اماں جی کو اس عمر میں انگلش سیکھنا پڑے گی۔ کیونکہ ہماری اماں جی اشارے

نہیں کرنا دیتے بھی پسند نہیں کرتیں۔“ ترمین زور سے ہنسیں۔

”ارے آگ لگے اس انگریزی کو اتنی مشکل سے تو جان چھوٹی ہے میری۔ شادی سے پہلے میرے باپ کے پاس

بٹیں ہوتی انگریزوں کی۔ گولے کی طرح لگتی ہے میرے دماغ پر۔“ اماں جی بے زاری سے بولیں۔

”جب ہی تو کہہ رہے ہیں اس مرتبہ باندھ کر بھیجیں۔“

”چلو تو تم لوگ بتا دو۔ کسے بھانج بنائیں تمہاری۔ خاندان ملنے جلنے والے سب ہی کی لڑکیاں دیکھ رکھی ہیں تم بہنوں

۔“ اماں جی نے مسکرا کر گویا شرارت میں بیٹیوں، بہوؤں کا ساتھ دیا۔

”جاؤ بیٹے مردانے میں۔ کھانا لگ رہا ہے پہلے کھانا کھاؤ۔“ اماں جی نے کہا۔

”بھوک نہیں ہے۔ ویسے بھی ہم پر سفر سوار ہے۔ ایک گھنٹے بعد ہم سرائے روانہ ہو جائیں گے۔“

”اس اند میرے اتنی دور کا سفر کرو گے۔ عجیب کام دھندے ہیں تمہارے بھی۔“

”اماں جی! کراچی سے ٹیلی فون آیا ہے۔“ مطربہ پھر آگئی تھی۔

”کس کا۔۔۔۔۔ کون سے ٹیلی فون پر۔ پوچھا تھا تو نے۔“ اماں جی کھڑی ہو گئیں۔

”تیمور خاناں کے کوئی دوست ہیں۔“ وہ آہستگی سے بولی۔

”پاگل ہی ہے بالکل۔ مجھ سے باتیں کرے گا تیرے خان کا دوست؟“ اماں جی ماتھے پر ہاتھ مار کر دوبارہ بیٹھ گئیں۔

”اسے تیمور سے ڈر لگتا ہے ناں! اس لئے آپ کی لائن پر بات ہو رہی ہے۔“ ترمین ہنسیں۔

تیمور جھلا کر تقریباً پاؤں بیٹھے اندر کی سمت بڑھے تھے۔ مطربہ ان کے پیچھے پیچھے چل پڑی تھی۔

ان دنوں بڑے پھانک پر ترمین گولیاں چلنے کی آواز آئی۔ تیمور علی خان جو مطربہ کو اپنے پیچھے آتا محسوس کر چکے تھے۔ ایک دم

نہانی سے پلے۔

”اندھا جاکر لڑکی!“

”تہا ربا زرخی ہے۔ تم اندر جاؤ۔ ہم دیکھتے ہیں۔“ تیمور علی خان کا انداز قطعی تھا۔
 ”ای دم ایک گولی شعلے کی صورت ان کی طرف آئی۔ صرف ایک لمحے کی بات تھی۔ اگر تیمور تیزی سے ایک طرف نہ
 ہٹے ہوتے تو کبھی پھاڑتی نکل جاتی۔
 ”خان..... اللہ کا واسطہ آپ اندر جاؤ۔ بڑا خان ام کو گولی مار دے گا۔ اگر آپ کو کچھ ہو گیا۔“ چوکیدار نے منت کی۔
 ”وہ بے کچھ نہیں ہو گا مگر اس بحث میں کچھ نہ کچھ ہو جائے گا۔“ تیمور علی خان چڑ کر گویا ہوئے۔
 ”ام ذیعی (ڈیوٹی) پر ہے خان۔“ چوکیدار کو حملہ آوروں سے زیادہ ”بڑے خان“ کا خوف تھا۔
 اسی دم بابا صاحب اپنی نئی گن کے ساتھ باہر آتے نظر آئے۔ ساتھ ہی باہر سے فائرنگ پھر شروع ہو گئی۔
 ”تیمور! ہوا دھرے۔“ بابا صاحب کی گرج دار آواز سنائی دی۔
 ”کا کا جان..... خون۔“ گلو گلابی فراک پہنے، فرش پر گیند مارتی، اچھلتی کودتی برآمدے میں آئی تھی، چوکیدار کے بازو سے
 بہت خون دیکھ کر ایک دم ڈر کر چیخی۔
 ایک لمحے کو تیمور علی خان کی تمام اعصابی قوت ایک دم ہوا ہو گئی ایک طرف بابا صاحب کا حکم دوسری طرف چوکیدار اور
 ہر گویا جی۔

”بابا صاحب..... پلیز آپ گلو کو اندر لے جائیں.....“ اس وقت سب سے پریشان کن مرحلہ بچی کی وجہ سے آیا تھا اور
 بس اتنی ہی دیر میں۔

چوکیدار ایک دیو کی گرفت میں آ چکا تھا۔
 ”ٹھک..... گولی چلی تھی اور گن تیمور علی خان کے ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا گری تھی۔ صاف ظاہر تھا کہ نشانے پر تیمور علی
 خان نہیں بلکہ ان کی گن تھی اور مقصد انہیں نہبتا کرتا تھا۔ اس سے قبل کہ وہ سنبھلتے، دو فلا دی بازو انہیں جکڑ چکے تھے۔ چوکیدار کا
 انداز غلط تھا۔ وہ دو نہیں چار تھے۔ دو نے پھانک پر مورچہ سنبھال رکھا تھا اور وہ تیمور علی خان اور چوکیدار کو گرفت میں لے
 ہوئے تھے۔

بابا صاحب نے گلو کو انداز دھکیلا تھا، بس اتنی مہلت حملہ آوروں کیلئے کافی تھی۔
 ”گولی چلانے سے پہلے اتنا ضرور سوچ لینا خان۔ چھوٹا خان ہمارے نشانے پر ہے..... ادھر تم گولی چلاؤ اور ام
 ہٹے گا۔“ پھانک پر کھڑے ہوئے دیو قامت ”انسان نما“ نے دھمکی دی۔
 ”کون ہو تم لوگ؟ کیا ارادہ ہے تمہارا؟ ہماری کسی سے دشمنی نہیں۔“

بابا صاحب کا ایک پاؤں برآمدے کی پہلی سیڑھی پر اور دوسرا دوسری سیڑھی پر تھا۔ انہوں نے فکر مندی سے تیمور علی خان
 کی جانب دیکھتے ہوئے سوال کیا۔
 ”تھارے پاس سوال جواب کا ٹیم نہیں ہے خان۔ لڑکی امارے حوالے کر کے اپنا بیٹا زندہ سلامت اندر لے جاؤ۔“ ان
 میں سے ایک نے ترشی سے کہا۔

☆.....☆.....☆.....☆.....☆.....☆

مطربہ تو گویا سر پر پاؤں رکھ کر بھائی۔
 باغ میں بیٹھی ہوئی دیگر خواتین میں بھی کھلبلی مچ گئی۔ وہ اسی طرف حویلی کے پچھلے حصے کی طرف دوڑ گئیں۔ رہبر بننا
 اماں جی کا بازو تھام رکھا تھا۔ دلوں میں گویا پتکھے لگے ہوئے تھے۔ اماں جی بلند آواز سے آیت الکرسی کا ورد کرتی جاری تھی۔
 ”ارے یہ تیمور بڑا نشانے باز بنتا ہے۔ کہیں پھانک کی طرف نہ چلا گیا ہو۔ مار کون سی فوج آگئی۔ اللہ رحم کرے۔“
 جی کو یک دم تیمور علی خان کا دھیان آیا۔

”اب اتنے بھی احمق نہیں ہیں تیمور..... اماں جی، کیا ہوائی پستول چلا سکتے؟ کون سا ہر دم اپنے ساتھ ہتھیار لے کر
 ہیں۔“ نازنین نے حواس پر قابو پا کر ساس کو تسلی دی۔

”ارے اس کا کوئی بھروسہ نہیں۔ آگے پیچھے نہیں دیکھتا۔“ اماں جی کی پریشانی کم نہیں ہوئی۔
 ”آپ اندر تو چلیں۔“ ترنم جھلائی۔

دوسری طرف تیمور علی خان اندر سے گن لے کر واپس بھی آ چکے تھے اور تیزی سے پھانک کی طرف بڑھے
 چوکیدار اندھا دھند فائرنگ کر رہا تھا۔ جب کہ اس کے بائیں بازو سے گاڑھا گاڑھا سرخ خون دور ہی سے بہت نظر آ رہا تھا۔
 ”خان! آپ اندر چلو..... ام نیٹ لے گا۔ صرف دو ہیں.....“ چوکیدار نے اذیت پر قابو پاتے ہوئے تیمور علی خان
 مخاطب کیا۔

”لڑکی..... کون لڑکی“۔ اتنے اونچے شملے والوں کے ہاں سے اتنی کھلم کھلا لڑکی کی طلب..... ایک لمحے کو تو اس نے پسینہ آگیا۔

”زیتون بانو..... شہر بانو کی لڑکی.....“۔ فوراً جواب آیا۔

”کیا بک رہے ہیں یہ لوگ تیمور؟“ بابا صاحب گرجے۔ (اس قدر فتنہ انگیز ہے اس لڑکی کا حسن؟)

”وہ ہماری نوکرانی ہے، تمہیں اس سے مطلب؟“ وہ اپنی الجھن پر قابو پا کر بڑے دجنگ انداز میں گویا ہوئے۔

”جاستی (زیادتی) کرتا ہے تم اس کے ساتھ..... اس کی ماں کا چار کوٹھی اے..... وہ مالکن اے امارا..... دیر میں کراؤں گا“ (مذاق) ہمیں اے تمہارے ساتھ امارا۔

”دومنٹ میں لڑکی باہر لاؤ ورنہ خان کو گولی لگے گا“۔ پھانک پر کھڑا بدبیت دیو غرایا۔

”کیا بک رہے ہیں یہ لوگ تیمور؟“ بابا صاحب غصہ ناک ہوئے۔

”زیتون بانو کو لینے آئے ہیں“۔ تیمور علی خان نے پرسکون انداز میں جواب دیا۔

”مگریوں؟“ ان کی مجال کیسے ہوئی کہ وہ حویلی کی کسی لڑکی کا نام اپنی زبان پر لائیں۔ خواہ وہ ہماری اولاد ہو یا نوکرانی۔

..... دونوں حویلی کی عزت ہیں۔

بابا صاحب منہ سے جھاگ اڑانے لگے۔ ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ فائر کر دیں۔

”دیر نہیں کرو خان..... ٹیم نہیں ہے“۔ ایک غنڈے نے خشونت بھرے انداز میں کہا۔

”بابا صاحب..... نہیں..... آپ اسے باہر نہیں لائیں گے“۔ تیمور علی خان بلا کے نڈر ثابت ہو رہے تھے۔

”تو پھر ٹھیک ہے۔ ام اڑتا لیس گھنٹے دیتا اے۔ خان کو ساتھ لے جا رہا اے..... لڑکی کو اس کے گھر پہنچا دو..... ام دنیا

سے لے جائینگے۔ ابھی خون خرابہ کرنے کا آرڈر نہیں ہے۔ اگر دو دن میں لڑکی نہیں پہنچا تو ام بڑی عزت کے ساتھ خان کاٹاں اور چوڑ جائینگے۔ اب کچھ بولنے کا نہیں۔ چلو خان۔“

ان میں سے ایک نے اپنی بات مکمل کر کے تیمور علی خان کو آگے دھکیلا۔

مطربہ ہال کمرے کی کھڑکی سے ناک لگائے باہر کی کارروائی بغور دیکھ رہی تھی اور تھر تھر کانپ رہی تھی۔ گمان کیا تھا کہ بس بابا صاحب اب بلوانے ہی والے ہیں۔

مگر باہر کا بدلتا منظر دیکھ کر جانے کیا ہوا۔ باہر کی جانب سرپٹ دوڑی۔

”رکو..... رکو..... ٹھہرو۔ خان کو چھوڑو..... میں چل رہی ہوں تمہارے ساتھ۔“

بابا صاحب کیلئے یہ اچانک افتاد تھی۔ وہ سنبھلے بھی نہ پائے کہ وہ پھانک پر پہنچ گئی۔ اس سے قبل کہ وہ کوئی اگلا قدم اٹھائے

’وہ دو عدد غنڈوں کی گرفت میں تھی۔

جب تک جیب اشارت نہیں ہو گئی انہوں نے تیمور علی خان کو نہیں چھوڑا۔ بابا صاحب گن اٹھانے کے باوجود کچھ نہ

سکے۔ جیب دھیرے سے آگے بڑھی۔ دونوں غنڈے تیمور علی خان کو چھوڑ کر چلتی جیب میں کود گئے۔

نور علی خان ہنٹ کانٹے ہوئے دھول اڑاتی جیب کو دیکھنے لگے مگر پھر شکستہ قدموں سے باپ کی سمت بڑھے جو

پہلے زمرہ لے اس کی کوٹھڑی کی طرف جا رہے تھے۔ بے چارے چوکیدار کا خون بہہ گیا تھا۔

بابا صاحب کو سستی حیرت اور دلچسپی سہی اس واقعے سے مگر چوکیدار کی جان بچانے کے عمل سے زیادہ اہم تو اب کچھ بھی

نہ تھا۔ اس طرح کے معاملات بہت آسانی سے ڈیل کر لیتے ہیں۔ اس لئے دونوں باپ بیٹے دسواں و

نڈر کا کاروبار نہیں تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ انہیں کیا کرنا ہے، کس طرح بہتا خون روکنا ہے۔

”ہاں..... اس بے وقوف کا بچی نے سارا محنت ای بے کار کر دیا“۔ چوکیدار نے تکلیف پر قابو پاتے ہوئے جیسے بہت

سوں کر کہا تھا۔

دونوں خاموش رہے جیسے انہوں نے کہا سنا ہی نہیں۔

.....

خانمیں اندر آیات کا ورد کر رہی تھیں۔

”یا اللہ..... کیسی ناگہانی ہے..... پتا تو کراؤ کہ تیمور اور تمہارے بابا صاحب کہاں ہیں؟ میرا دل بہت گھبرا رہا ہے۔ بتاؤ

میں کھل کر رہی ہے حویلی کے سارے نوکر آج کل زمینوں پر ہوتے ہیں۔ گھر پر تو صرف تیمور۔ اور تمہارے بابا صاحب

بٹھے۔ ظہیر اور بصیر تو شہر کی طرف گئے ہوئے ہیں۔“

اماں جی کے دل میں تو جیسے پچھلے گئے ہوئے تھے۔

”تو آپ مردانے میں کھانا کس کیلئے لگانے کو کہہ رہی تھیں؟“ نازنین نے پوچھا۔

”تمہارے بابا صاحب تو وقت پر کھاتے ہیں ظہیر اور بصیر بھی کہہ کر گئے تھے کہ وہ کھانے کے وقت تک واپس آ جائینگے۔

نور علی سرائے جا رہا تھا اس لئے کہہ رہی تھی۔“

اسی دم اماں جی کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کا چہرہ استا ہوا تھا۔

”اماں جی..... بابا صاحب آپ کو اپنے کمرے میں بلا رہے ہیں۔“ اس نے پیغام دیا۔

”تیمور کہا ہے؟“ انہوں نے پیغام نظر انداز کر کے پہلی فرصت میں بیٹے کی بابت دریافت کیا۔

”ننان بھی وہیں ہیں۔“ اماں نے جواب دیا۔

”اماں جی..... آپ جائیں ناں۔ چاہیں بابا صاحب نے آپ کو کیوں بلایا ہے؟“

”میں“ کے فوراً بعد اماں جی کی طلبی بڑی معنی خیز تھی۔ فطری طور پر سب ہی کو تجسس تھا کہ اب سے کچھ دیر پیشتر ہونے

والے وقت کا مجھ کیا ہے؟

”ننان تو ہے ناں اماں.....؟“ اماں جی کی چھٹی حس جیسے چارج ہو چکی تھی۔

”یوں لگتا ہے ابھی تک نہیں آئی پٹوارن کے ہاں سے؟“ انہوں نے اماں کے ساتھ کمرے سے باہر نکلتے ہوئے پوچھا۔

”نہیں! ابھی نہیں آئی۔“ ماما نے اسی سابقہ انداز میں جواب دیا۔

”بتاؤ..... اندھیرا ہو گیا اس کی باتیں ختم نہیں ہوتیں..... ماما! تجھے پتا چلا کہ گولیاں کون چلا رہا تھا؟“

”پتا نہیں اماں جی۔“ ماما کا جواب مصلحت آمیز تھا۔

”توبہ..... میری تو جان نکل گئی۔ سیدھی سی بات ہے مجھے اپنے بچے کی فکر مار رہی تھی کہ بارے جوش کے پورے ہو۔ شکر ہے میرے رب کا۔ میرا بچہ محفوظ ہے۔ یا اللہ کل کی خیر ہو۔“ وہ دعائیں مانگتے ہوئے بابا صاحب کے کمرے داخل ہوئیں۔

”آؤ ریمسہ کی ماں۔“ بابا صاحب گاؤں کے لگ کر بیٹھ گئے۔

”خیریت تو ہے۔“ اماں جی نے پر تشویش نظروں سے باری باری باپ بیٹے کی طرف دیکھا۔

”یہ کون گولیاں چلا رہا تھا۔ میرے تو ہاں پیرا بھی تک ٹھنڈے پڑے ہیں۔“

اماں جی تیمور کے پہلو میں بیٹھ گئیں۔ کمرے میں ایک محسوس کیا جانے والا معنی خیز سناٹا طاری تھا۔ فضا میں ایک غیر معمولی پن چھایا ہوا تھا۔

”یہ زیتون بانوکس علاقے سے تعلق رکھتی ہے؟“ بابا صاحب نے وہ سوال کیا جو اماں جی کے دماغ میں دور دور کی طرح ہوسکتا تھا۔

وہ بری طرح چونک گئیں۔

”خیریت؟“ سولہ آنے کی بھانجی ہے۔ اسی کے گاؤں سے تعلق ہے۔“ ان کے دل میں عجیب دھکڑ پکڑ ہونے لگی۔

”سولہ آنے کدھر ہے؟ اسے بلوائیں۔“ بابا صاحب کا لہجہ قطعی بے تاثر تھا۔

”آپ مجھ سے پوچھیں جو پوچھنا ہے۔ مجھے سب پتا ہے۔“ وہ بے حد پریشان ہو گئیں۔

”کیا پتا ہے؟ کیا آپ کو یہ بھی پتا ہے کہ اس کا کسی شہر بانو نامی عورت سے کوئی تعلق ہے؟“ ان کی انداز لگاتاری

تھا۔

”جی..... پتا ہے۔“ وہ مجرموں کے سے انداز میں بولیں۔

تیمور علی خان نے چونک کر ماں کی شکل دیکھی۔ خان دلاور علی خان بھی الجھے۔

”ماں لگتی ہے وہ زیتون بانو کی۔“ وہ بہت آہستہ آواز میں گویا ہوئیں۔

”تو کیا مائیں اس طرح بیٹیوں کو غنڈوں سے اٹھواتی ہیں؟“ ان کے انداز میں محسوس کی جانے والی ناگواری تھی۔

”ہیں؟“ اماں جی دہل کر رہ گئیں۔ ”کک کہاں ہے زیتون بانو؟“

”وہ گولیاں اسی لئے چل رہی تھی اماں جی۔“ تیمور نے بہت تھکی تھکی آواز میں انہیں کچھ سمجھانے کی کوشش کی۔

”کک..... کیا مطلب؟“ اس کا چہرہ خوف سے سفید پڑنے لگا۔

”لے گئے ہیں وہ اسے۔“ تیمور علی خان نے مطلع کیا۔

”رے میرے اللہ۔“ اماں جی نے سر پٹ دوڑتے دل کو پکڑنے کی کوشش کی۔ ”آپ لوگوں کے سامنے؟“ انہوں نے غیب سے شہر کی صورت دیکھی۔

”یہاں سے اٹھنے کے بعد پہلے تو صدقہ بانٹنے گا اپنے بیٹے کی جان کا۔ شکر منائے زندہ سلامت آپ کے سامنے بیٹھا۔“ آپ اپنے طور پر بڑے بہادرانہ کام انجام دیجئے۔ انسان کو کسی معاملے میں ہاتھ ڈالنے وقت چاروں طرف سے ہنر لینا پڑیے۔ آپ نے ہمیں اندھیرے میں رکھ کر اچھا نہیں کیا۔ اگر آپ کے بیٹے کو کچھ ہو جاتا خدا نخواستہ۔“

”خان دلاور علی خان کے انداز سے ہنوز ناراضگی ٹپک رہی تھی۔

”خدا نخواستہ..... وہ بھی بے آسرا بچی ہے۔“ وہ سر پر دوپٹہ درست کرتے ہوئے نظریں جھکا کر آہستگی سے گویا ہوئیں۔

”اس حویلی سے باہر لاکھوں انسان مسائل سے دوچار ہیں۔ کیا ہم پر تمام لوگوں کی ذمہ داری ہے؟

میں اس بات سے الجھن ہے کہ یہ واقعہ ہمارے ہوا ہی کیوں؟ اس کی سراسر ذمہ داری آپ پر آتی ہے۔“ بابا صاحب کو یہ بات کرنا ہوتی تھی۔

”جب آپ نے اسے حویلی میں رہنے کی اجازت دی تو کیا آپ اس کے تمام حالات سے باخبر تھیں؟“ انہوں نے ان کے نرم اور پریشان چہرے پر ایک اچھتی سی نگاہ کی۔

”پہلے تو نہیں تھی باخبر..... البتہ بعد میں سب کچھ معلوم ہو گیا تھا۔“ وہ دھیرے سے گویا ہوئیں۔

”مثلاً کیا معلوم ہوا بعد میں؟“ خان صاحب کی مجبوری تھی کہ وہ اس سادہ مزاج اور دھیمی عورت کے سامنے کھل کر سچی باتیں نہیں کر سکتے تھے۔

اماں جی نے تیمور علی خان کی سمت دیکھا۔

”بیٹے! تم بتاؤ ناں اپنے بابا صاحب کو۔“ وہ بھولپن سے کہہ رہی تھیں۔

”لیکن اماں جی..... مجھے بھی تو صرف اتنا پتا ہے کہ وہ شہر بانو کی بیٹی ہے اور بس۔“ تیمور علی خان نے انہیں بتایا تو وہ ہنس پڑ گئیں۔

”جانے دیجئے اب اس قصے کو..... وہ بد نصیب تو اپنے انجام کو پہنچ گئی۔ اب ان باتوں سے کیا حاصل؟ ہائے..... اس کی زندگی بہت کم ہے۔ اس پر بے عمل ہے۔ اللہ اسے امان دے۔“

”بتاؤ..... آپ دونوں کے سامنے وہ اسے لے گئے؟..... ایسی بزدل پل میں رو دینے والی..... کیا حال ہو رہا ہوگا اس کا؟“

”بتاؤ..... لڑکیوں کو کتنا دکھ ہوگا۔ کتنا پیار کرنے لگی تھیں سب اس سے..... کم از کم اس بے حیائی کی زندگی سے توجہ جاتی۔“

”تیمور! جاؤ بیٹے تم اپنا کام کرو۔ اب کیا ہو سکتا ہے۔“ بابا صاحب نے کہا۔

تیمور کی ہمدردی سوچ سے جاگے تھے پھر بنا کچھ بولے کمرے سے باہر نکل گئے تھے۔

”آپ ادھر آئیں ہمارے پاس“۔ بابا صاحب نے اماں جی کو اپنے پاس بلایا۔ وہ آنکلی سے چلتی ہوئی آکر بیٹھ گئیں۔

”یہ حد سے زیادہ نرمی دلی جہاں آپ کی بہترین خوبی ہے وہاں آپ ہی کے حق میں وبال بھی ہے نرم دلی اچھی چیز ہے لیکن یوں بھی نہیں ہونا چاہیے کہ انسان اصول سے ہی ہٹ جائے۔ اگر ہمیں آپ سب کچھ بتا دیتیں تو ہم کچھ انتظام تو کرتے۔“

”بس غلطی ہو گئی..... مجھے اندازہ نہیں تھا کہ یہ سب بھی ہو سکتا ہے۔“ وہ جیسے جرم کا اقرار کر رہی تھیں۔

”کیا آپ کچھ نہیں کر سکتے اس کیلئے؟“ انہوں نے مدد طلب نظروں سے شوہر کی طرف دیکھا۔

”غیروں کے ساتھ معاملہ ہوتا تو بہت کچھ کیا جاسکتا تھا۔ لیکن بقول آپ کے کہ یہ حرکت تو اس کی اپنی ماں کی ہے۔ ہی الٹا کسی مشکل میں پھنس سکتے ہیں۔ چار کوٹھیوں کی مالک عورت اپنے ہاتھ پیر چلانا بھی جانتی ہوگی۔“

وہ جیسے کچھ سوچتے ہوئے بول رہے تھے۔

”اماں جی نے چونک کر خان صاحب کی شکل دیکھی۔“

”چار کوٹھیوں کی مالک.....؟“ آپ کو کس نے بتایا؟“ وہ متوجہ تھیں۔

”وہی جو اسے لینے آئے تھے انہی کے منہ سے سنا ہے۔“

”اتنی باتیں بھی ہو گئیں آپ سے؟“ ان کی حیرت میں اضافہ ہو گیا۔

بابا صاحب نے اپنی سیدھی سادی بیوی کو یک ٹانے کیلئے بغور دیکھا۔

”کیا خاندان ہے سولہ آنے کا؟“

اماں جی کا دل بڑے زور سے دھڑکا..... اضطرابی انداز میں دوپٹہ درست کرنے لگیں۔ مزید سچ اگلے کامرطہ لڑتی تھیں۔

”وہ سولہ آنے کی سگی بھتیجی نہیں ہے۔ اس کی نانی سے سولہ آنے کے خاندان کا منہ بولا بہنا چل رہا تھا۔ سولہ کی طرف ایک دوسرے کے ہیں مدتوں سے۔“ وہ دھیمے لہجے میں بتا رہی تھیں۔ ”پاکستان بننے سے پہلے کے تعلقات ہیں ان کے۔“

”کیا یہ لڑکی ان لوگوں سے تعلق رکھتی ہے جہاں صرف نانیاں ہوتی ہیں ”دادیوں“ کا کوئی اتا پتہ نہیں ہوتا؟“

صاحب نے گہری نگاہ ان کے چہرے پر جمادی۔

”زیتون کے باپ نے اس کی ماں سے نکاح کیا تھا۔“ اماں جی نے زیتون بانو کی ساکھ بھال کرنے کی کوشش کی۔

”آپ کے پاس امانت رکھا ہے اس کی ماں کا نکاح نامہ؟“ بابا صاحب کا موڈ آف ہو گیا۔ انہیں پتا تھا کہ ماں کی

فحش کی بات کا اعتبار کر لیتی ہیں۔

اماں جی ایک لمحے کو خاموش ہو کر رہ گئیں۔

”آپ کو تمام باتوں کا کیونکہ علم نہیں ہے اس لئے آپ اس طرح کی باتیں کر سکتے ہیں۔“ اماں جی نے حقیقت بتائی۔

انداز اختیار کیا، انہیں کیونکہ علم تھا کہ خان صاحب آسانی سے مطمئن نہیں ہوتے اس لئے وہ یہی کہہ سکتی تھیں۔

”آپ ہمیں بات بتائیے، اگرچہ اب اس کا کوئی فائدہ تو نہیں ہے۔ مگر اس بہانے آپ ہمیں کچھ وقت ہی دیں۔“

”نہیں دروازہ ہو گئے۔“

”عورت کو شاید بچے ہی چاہیے ہوتے ہیں۔ سب کچھ ہی بھول جاتی ہیں۔“ انہوں نے ہاتھ بڑھا کر حقہ قریب کیا اور

”خون کے منہ سے لگائی۔“

”بچے بھی بہت بڑی ذمہ داری ہوتے ہیں۔ بڑے کام ہوتے ہیں گریہ سستی کے۔“ وہ نظریں جھکا کر گویا ہوئیں۔

”اتنے بڑے کنبے کی ذرا ذرا سی بات کا خیال رکھنے والی کو کبھی اپنے مرد کی تنہائی کا خیال نہیں آتا؟“ جملے کے اختتام پر

”خون کے منہ سے لگائی۔“

”آپ کے اپنے کام دھندے ہیں۔ اتنے مصروف رہتے ہیں کہ مجھے تو آپ کی تھکن کے خیال سے بڑا ملال ہوتا ہے۔“

”بہن! لے کتی رہتی ہوں کہ کھانا بڑے خان کی مرضی کا بنایا کر۔ اب بے چاروں کو گھر کا کھانا ہی تو کھانا ہوتا ہے۔ مجھے

دس ہے کہ بڑے رتبے بڑے کام مانتے ہیں۔ ماشاء اللہ بیٹے جوان ہیں۔ جاگیر کے کام ان پر ڈالے۔ آپ نے بھی تو

بہن! عمر میں یہ سب کچھ سنبھالا تھا۔“

”سادگی سے کہہ رہی تھیں اور ان کی نیک تمنائیں ان کے چہرے پر نور جگا رہی تھیں

خان صاحب کا سارا غم ساری کوفت ہوا ہو چکی تھی۔

”آپ نے زمانے کے ہزار رنگ دیکھے مگر کوئی اثر نہیں ہے۔ آپ تو ویسی کی ویسی ہو رہی ہیں۔“ بابا صاحب کو ان

بے رحم ہنسی کی ایک ایک ادایا دآنے لگی۔

اماں جی قدرے شیشا گئیں۔

”مجھے اس بچی کا دھیان آرہا ہے۔“ انہوں نے بات بدلنے کی کوشش کی۔

”ہاں تو آپ بتا رہی تھیں اس کی کہانی..... بتاؤ تاکہ ہمیں بھی پتا چلے اندازہ ہو کہ کون کتنا چلا گیا آپ کو.....؟“

”سولہ آنے مجھ سے جھوٹ نہیں بولتی۔ کیا میں اسے جانتی نہیں۔ چار دن کا ساتھ تو نہیں ہے میرا اس کا..... اس کا کیا

پتا ہے اس بچی سے؟ رہنے کو ٹھکانا، روٹی، کپڑا، پان، چھالیہ سب اسے ملا ہوا ہے۔“

”بات دراصل یہ ہے۔“ اماں جی نے خالہ سولہ آنے کی وکیل صفائی کا کردار ادا کرنے کے فوراً بعد حقیقت بیانی شروع

کر دی۔

”اماں جی کہاں ہیں؟“ تزئین نے کچن میں آکر پوچھا۔

”میں نے خان سے بلایا تھا ناں وہیں ہیں۔“ ماما کا چہرہ ستا ہوا تھا۔

”کیا تمہیں ”سرا“ چلے گئے؟“ وہ جاتے جاتے پھر پلٹیں۔

”نہیں مجھ نے خان بھی اپنے کمرے میں ہیں۔“ ماما نے جواب دیا۔

نہ ہے ان لیا۔ لیکن اس کی ماں کو اس طرح سے لے جانے کی کیا ضرورت تھی؟ اگر وہ اماں جی سے بات کر کے
 بڑا کون سا اماں جی اسے روک لیتیں؟“ تزئین کی الجھن کسی طرح کم نہیں ہوئی۔
 ”ابو جدے طرح سے لے آئی تھی مگر ہم نے اور یاور بھائی نے شاید اس کے بارے میں غلط اندازہ لگایا تھا۔“
 ”آپ لوگ لے ہیں اس سے؟ کب؟ کہاں؟“ تزئین سر سے پاؤں تک مستعد ہو گئیں۔
 ”ہیمن جولی میں..... آئی تھی وہ۔“ تیمور نے جواب دیا۔
 ”تو میں کیوں نہیں ملوایا؟ ہم بھی تو دیکھتے۔ ویسے کیسی ہے؟“ تزئین کے انداز میں اشتیاق اٹھ آیا۔
 ”جیسی اس علاقے کی عورتیں ہوتی ہیں۔“ تیمور علی خان نے بہن سے نظریں چرا لیں۔
 ”کس علاقے کی؟“ تزئین کی سوچ وہاں تک نہیں پہنچ سکتی تھی جس طرف تیمور علی خان اشارہ کر رہے تھے۔
 ”آپ نے اس کے گیت سنے ہیں۔ کیسی آواز ہے اس کی؟“ انہوں نے سوال کر دیا۔
 ”اے..... بہت خوبصورت آواز ہے۔ میں تو سن کر حیران رہ گئی تھی۔ سچ فنکشن وغیرہ میں گائے۔ تو لاکھوں کھرے کر
 لے۔ وہ مسکرائیں بے ساختہ۔

”اس کی ماں کر رہی ہے لاکھوں کھرے۔“ تیمور علی خان نے بے ساختہ کہا۔
 تزئین یک دم سناٹے میں رہ گئیں۔

”تیمور۔“

”جی..... امید ہے آپ سمجھ گئی ہوں گی۔“

”ہوں..... کچھ سمجھی ہوں..... کچھ نہیں۔ اس کی تانی تو خالہ سولہ آنے کی پھوپھی ہے۔ اور خالہ سولہ تو سر سے پاؤں
 ”بے سر“ ہیں۔ اس علاقے میں خالائیں تو ہو سکتی ہیں مگر پھوپھیاں نہیں۔“ وہ درحقیقت الجھ گئی تھیں۔

”گلتا ہے خالہ اماں جی کو سب کچھ بتا چکی ہیں۔ اماں جی کو سب معلوم ہے۔ مزید معلومات ان ہی سے مل سکتی ہیں آپ
 ”تیمور نے انہیں الجھن سے نکالنے کی کوشش کی۔

”وہ اسے زبردستی خطرہ مول لے کر گئی ہے۔ جب کہ مطربہ اس کے سامنے اس کے ساتھ جانے سے انکار کر چکی تھی۔“
 تیمور بولے۔

”پتا نہیں..... ان عورتوں کا بھرتا کیوں نہیں۔ کتنا جی لے گی؟ کتنا کھالے گی؟ کون سا خاندان بنا کر بیٹھی ہے کہ آل
 ”میں قریب کما رہی ہو۔“ جی جی۔ یہ مطربہ تو بہت معصوم بہت ہی بیوقوف ہے۔ بڑی زیادتی ہو گئی اس کے ساتھ تو۔“ تزئین کو
 بہت غلط ستانے لگے۔

”اگر وہ ان کا کہا نہیں مانے گی تو اور مصیبت۔ یہ لالچی اور حریص قوم۔ یہ لوگ تو تشدد بھی بہت برا کرتے ہیں۔ ایسی
 ”میں نے بڑا بڑا کر کے۔ کم بخت کو ابھی پورا ہوش بھی تو نہیں آیا۔ تیمور! کچھ ہو نہیں سکتا؟ مجھے تو بڑا ترس آ رہا ہے غریب پر۔“
 تیمور بولے۔

”ہیں..... ویسے تو بڑی جلدی ہو رہی تھی۔ یہ مطربہ بھی اتنی دیر سے نظر نہیں آئی۔ کچھ پتا چلا مانا۔ یہ فائرنگ کیس تھی۔“
 ”چھوٹے خان سے پوچھ لیں بی بی جان۔“ ماما نے پیٹھ موڑے موڑے جواب دیا۔

تزئین ذہنی طور پر اتنی منتشر تھیں کہ وہ ماما کے غیر معمولی انداز پر دھیان نہ دے سکیں۔ اور سوچتے ہوئے انداز میں
 کے کمرے میں جانے کیلئے زینے کی طرف بڑھیں۔ کمرے کے دروازے کے باہر کھڑے ہو کر سوچا بہت آہستہ سے
 دی۔

”ہوں..... کون ہے؟“ تیمور علی خان کے انداز میں جھلاہٹ تھی۔ تزئین دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گئیں۔
 ”آپ..... آئیے آپا۔“ تیمور بستر پر نیم دراز سر کے نیچے ہاتھوں کا تکیہ بنائے جانے کس دھیان میں تھے۔ لیکن کوئی
 اٹھ بیٹھے۔

”گئے نہیں؟“ وہ نزدیکی کرسی پر بیٹھ گئیں۔

”کہاں؟“ وہ گم صم انداز میں ان کی طرف دیکھنے لگے۔

”سرائے..... اور کہاں؟ کہاں تو تم پر سفر سوار تھا کہ کھانا بھی نہیں کھا رہے تھے۔“

”ہوں..... بس..... ویسے ہی موڈ نہیں بن رہا اب۔“ وہ نظریں چرا کر گویا ہوئے۔

”یہ فائرنگ کیسی تھی تیمور؟ وہ ادھر ساری خواتین ابھی تک سہمی بیٹھی ہیں۔“

وہ جانے کیوں ٹھنک گئی تھیں۔ اس پر سے تیمور کا روانگی ملتوی کرنا، پھر گم صم سا نظر آنا۔ ان کے بے نام شبہات کو تو
 مل رہی تھی۔

”ایک حادثہ ہو گیا ہے آپا۔ حیرت ہے آپ ابھی تک بے خبر ہیں۔ کسی ملازم نے بھی نہیں بتایا۔“ وہ بہت آہستہ
 میں بات کر رہے تھے۔

”کیا؟ کیسا حادثہ؟“ وہ ڈر کر بھائی کی صورت دیکھنے لگیں۔

”مطربہ کو اس کی ماں کے ”کارندے“ اٹھا کر لے گئے ہیں۔“ انہوں نے گویا دھماکہ کیا۔

”ہیں..... اس کی ماں کے کارندے؟ کیا کہہ رہے ہو؟ اس کی کوئی ماں والی نہیں ہے۔“ انہیں تیمور کی ناقص معلومات
 افسوس ہوا۔

”آپ کو دراصل حقیقت حال کا علم نہیں ہے۔ اس لئے آپ ایسا کر رہی ہیں۔ اس کی ماں بھی ہے اور یقیناً دیا ہے۔“
 کونے میں باپ بھی ہوگا۔“ وہ پرسکون انداز میں بہن کی معلومات میں اضافہ کر رہے تھے۔

”پتا نہیں کہاں سے سن کر آرہے ہو۔ خالہ سولہ آنے کبھی بھی ہم میں سے کسی کے ساتھ غلط بیانی نہیں کر سکتی۔“ تزئین
 طور ماننے کو تیار نہ ہوئیں۔

”ہو سکتا ہے انہوں نے اماں جی کو بتایا ہو اور آپ سب سے چھپایا ہو اماں جی غالباً اسی قسم کا اندر دے رہی ہیں۔“
 صاحب کے کمرے میں۔ وہاں سے آئیں تو پوچھ لیجئے گا۔“ تیمور نے پر زور انداز میں کہا۔

”ماں بیٹی کا معاملہ نہ ہوتا تو بہت کچھ ہو سکتا تھا۔ اب تو مشکل ہے۔“ تیمور نے مایوس کرنے میں ذرا دیر نہ لائی۔
”ہائے..... تیموریہ تو بہت ہی برا ہوا۔ چچ چچ۔“

”اب کیا بھی کیا جاسکتا ہے؟“ وہ عام سے انداز میں گویا ہوئے۔

”توبہ..... کتنا ڈرتی تھی تم سے۔ خدمت گزار کتنی تھی۔ آدمی رات ہو یا دن۔ ایک سا انداز تھا کام کرنے کا۔ بچہ ہوں۔ اماں کو دیکھتی ہوں۔ وہ تو یوں بھی دل پر لئے بیٹھی ہوں گی۔“ اب انہیں ماں کی فکر پڑ گئی۔
”کھانا یہیں بھجوا دوں؟“ وہ دروازے کے قریب جا کر رک گئیں۔

”نہیں..... صرف ایک گلاس دودھ بھجوا دیجئے گا۔“ تیمور نے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر کہا۔
”وہ بیڈ سے اتر کر رائٹنگ ٹیبل کی طرف بڑھتے ہوئے ہوئے۔“

ترنین باہر نکل گئیں۔

تیمور رائٹنگ ٹیبل کے نزدیک پہنچ کر چند ٹائمنے کور کے تھے پھر واپس پلٹ کر در پہچے میں آکھڑے ہوئے تھے۔
پھانک کے نزدیک ایسا تادہ مرکزی گلوبز کی روشنی میں پورج تک منظر واضح تھا۔
ایک لڑکی نیگے پاؤں دوڑتی ہوئی جیپ میں بیٹھ رہی تھی۔ بار بار اس منظر کی تکرار سے ان کا دماغ سن ہونے لگا۔
وہ اس کا دیوانہ وار..... ٹڈر بے خوف انداز۔ وہ در پہچے سے ہٹ گئے۔

”اوہو..... ہو.....“ بچے گئے چاچا۔ گولی ذرا ادھر ادھر ہو جاتی۔ ہو گیا تھا تمہارا تو کام۔“ عارف چوکیدار سے تھکے ہوئے
رپورٹ وصول کر رہا تھا۔

”ام چوڑا تائیں۔ ادھر وہ بڑا خان آگئی۔ ام ذرا ادھر سوچی۔ غنڈہ لوگ فائدہ اٹھا گئی۔ افسوس کابات ہے اماں! خان بے
کار گئی۔ چوکر تو پھر بھی چلا گیا۔ چوٹا خان نشانے پر تھی ورنہ ام سمجھ لیتی۔ ابی ہم بوڑھا ہے پر ایسا بی نہیں۔“ چوکیدار اپنی ساک
بحال کرنے کی کوشش میں بولے چلا جا رہا تھا۔

”مگر جب بڑے خان گن اٹھائے ہوئے تھے تو لڑکی کیسے چلے گئی لالہ؟“ عارف نے نکتہ اٹھایا۔

”بس وہ اندر سے بھاگتا ہوا آیا اور جیپ میں بیٹھ گیا۔“ چوکیدار نے بڑے معصومانہ انداز میں بتایا۔

”خود ہی۔“ عارف کی حیرت بڑھ رہی تھی۔

”خود ہی..... ام دیکھتا رہ گیا بس۔“ چوکیدار نے آنکھیں جھپکا کر کہا۔

”خان نے پیچھا نہیں کیا؟“ عارف نے الجھ کر سوال کیا۔

”بڑا تیزی میں معاملہ ہوا۔ کچھ سمجھ ای نہیں آیا۔“ چوکیدار نے سادگی سے جواب دیا۔

عارف چند ٹائمنے کم صم سا کھڑا کچھ سوچتا رہا۔

اسی دم روپادیوی اپنے مخصوص گھما گھرے میں ملبوس سر پر ٹوکری بغل میں بچہ دبائے پھانک سے اندر داخل ہوئے۔

”بڑا بیٹی! اندر خالہ سولہ آنے ہوں گی، انہیں کہو عارف آیا ہے۔“ عارف نے بڑی بے تاب سی کیفیت میں پیغام دیا

چہ منوں بعد سفید چادر میں جھکی چھپی خالہ باہر آتی دکھائی دیں۔ ان کی چال سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ بہت نڈھال

”ہاں بیٹے! کہو کیا بات ہے.....؟“ وہ قریب آ کر تھکے تھکے انداز میں بولیں۔

”میں نے سنا ہے کل؟“

”نہیں سنا ہے بچے۔ لونڈیا کے نصیب پھوٹ گئے۔ کہاوت ہے، ماواں ٹھنڈیاں چھاواں۔ ایک اس حرافہ جیسی ماں
بیٹے بے غیرت، بے ضمیر۔“ وہ رونے لگیں۔

”ارے میں تو تیری ماں کی خیریت پوچھنے گئی۔ دکھیا سے باتیں کرنے میں دیر ہو گئی۔ اور ادھر یہ سب ہو گیا۔“ وہ پھوٹ
پٹ کر رونے لگیں۔

”اس کا کوئی اتنا پتا نشانی بتائیں۔ کچھ کرتا ہوں۔“ وہ بے حد سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔

”میں مددے۔“ خالہ نے بے اختیار اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

”پرانے وقتوں کی طرح کوٹھے تھوڑا ہی سجاتی ہے۔ نئے فیشن سے دھندا کرتی ہے۔ بڑے بڑے سرکاری افسروں سے
نٹ ہے۔ تو اس کے آگے کل کا بچہ..... اللہ تیری ماں کا کلیجہ ٹھنڈا رکھے۔“ انہیں عارف پر ڈھیروں پیارا آ گیا۔

بول بھی عظیم دکھ کے دور لیے میں عملاً دکھ بیٹانے والے یوں محسوس ہوتے ہیں جیسے اندھیرے میں ستارے۔

”لیکن خالہ..... اس طرح ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جانا تو اس کے ساتھ بہت زیادتی ہے۔ وہ بہت فکر مندی سے کہہ رہا
ن۔“

”آپ مجھے اس کی نانی کا پتا دیں، وہ ضرور کچھ نہ کچھ کر لے گی۔“ وہ پھر گویا ہوا۔

”ہائے..... اس کے پاس چلے بھی نہ جانا۔ غریب سنتے ہی دم دے دے گی۔ اس کی تو ساری محنت ہی ٹھکانے لگ
گئی۔“ خالہ نے پیشانی پر ہاتھ مارا۔

”یہ تو ہمارا ہوگا کہ اس کی ماں سندھ، پنجاب، سرحد، بلوچستان چاروں صوبوں میں سے کس میں رہتی ہے۔“ اس کی سوچ
میں خالہ کی باتوں سے کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی تھی۔

خالہ نے شفقت سے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔

”پچلے کیل نہ کچھ بھوٹا؟ تیرے ساتھ ہی بیاہ دیتی۔ پھر تو وہ حرام خور ساری زندگی کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ ایسا شریف۔
ہٹے ہوئے تھیں۔ شکل صورت بھی بھلی۔“

عارف ہونٹ کاٹا ہوا واپس پلٹ گیا۔ خالہ کی آنکھوں سے ایک تو اتر سے آنسو بہنے لگے۔

”اماں جی..... آپ نے ہم سے یہ سب کچھ کیوں چھپایا تھا؟“ تزنین نے شکایت آمیز انداز میں کہا تھا۔
 ”ارے میں نے کہا رات گئی بات گئی۔ کیا کسی کے دکھوں سے مرے لینا۔ یہ کوئی اچھی بات تو نہیں ہوتی۔“
 ”سولہ آنے تو غم نہ کر۔ تیرے بڑے خان سے کہا ہے میں نے کچھ کریں۔“ وہ انشاء اللہ کچھ نہ کچھ ضرور کریں گے۔
 اماں جی نے سبزی بناتی ہوئی خالہ کولب بستہ بیٹھے دیکھ کر کہا۔

”آہ..... ہا..... اماں جی..... کھیل تو پورا ہو گیا۔ اب تو یہ خود کو دھوکا دینے والی باتیں ہیں۔ اس کے نصیب کی خرابی میرا ہمارا آپ کا کیا دخل؟“ خالہ نے قطعی مایوسی کا اظہار کرتے ہوئے اپنا کام جاری رکھا۔

”نہ..... مایوس نہیں ہوتے۔ اللہ کے پاس ہر مشکل کا حل ہے۔ مشکل تو انسانوں کیلئے ہوتی ہے بس دعا کر۔ اللہ ہی اپنے حفظ و امان میں رکھے آمین۔“ اماں جی کی فطرت میں مایوسی کا عنصر کبھی بھی نہیں آیا تھا۔

”ایک عورت ہی تو ہے خالہ۔ کیا کر سکتی ہے۔ ٹھیک ہے اس نے اپنا سارا زور دکھا دیا ہے اب جب بابا صاحب کو کریں گے تو ظاہر ہے کچھ اچھا ہی بندوبست کریں گے۔“
 تزنین نے بھی انہیں مایوسی سے نکالنے کی کوشش کی۔

”وہ عورت بہت پہنچ رکھتی ہے۔ بڑے بڑے لوگوں سے سلامتی لیتی ہے اپنے جوتے پر۔“ وہ تنخی سے مسکرائیں۔
 ”کوئی کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو سولہ آنے۔ نعوذ باللہ۔ اللہ سے بڑا تو نہیں ہو سکتا۔ اگر وہ کسی کی مدد کرے تو کوئی روکے گا اسے۔ بری بات۔ اللہ پر بھروسہ رکھ تو نے رات بھی کھانا نہیں کھایا۔ کچھ کھاپی لے۔“

اماں جی کا دل ان کی حالت پر پچھلے چلا رہا تھا۔
 ”بھوک ہی نہیں لگ رہی۔ نہ نیند آرہی ہے۔ جیسے سکتہ سا ہو گیا ہے۔ میرا تو منہ ہی نہیں اب کہ اس کی نانی کو بتا سکوں کہ تیرا آبدار موتی۔“ ان کی آواز حلق میں پھنس گئی۔

”آپا..... وہ میرا بلیو سوٹ کیس ہے ناں..... اس کا لاک خراب ہو گیا ہے۔ کوئی اچھا سا سوٹ کیس ہو مگر میں تو نکلوں دیں پلیز۔“

تیمور علی خان دالان میں داخل ہو کر تزنین سے مخاطب ہوئے۔
 ”ابھی تو چار پانچ روز ہیں تمہاری رواجی میں..... اتنی جلدی پینٹنگ شروع کر دی۔“ تزنین نے تعجب سے ان کی بات دیکھا۔

”اس دوران جو کچھ یاد آتا رہے گا وہ رکھتا رہوں گا۔ کسی چیز کے مس پلٹس ہونے کا خطرہ تو نہیں رہے گا۔ بھروسہ بہت کوفت ہوتی ہے۔“

”تمہارے بابا صاحب کے کمرے میں دو تین سوٹ کیس ہیں۔ بہت خوبصورت ہیں۔ اور بڑے بڑے ہیں ان سے کوئی لے لو۔“

”کہاں جا رہے ہو اس وقت؟“ تیمور علی خان فل سوئچ کئے ہوئے تھے اس لئے اماں جی نے پوچھا۔

”بیک وقت کے ہاں..... بہت ضروری ملنا ہے۔“ انہوں نے سرسری نگاہ خالہ پر ڈال کر جواب دیا۔
 ”بت تھوڑے دن رہ گئے ہیں تمہارے جانے میں۔ زیادہ سے زیادہ میرے پاس بیٹھا کرو۔ موت، زندگی کا کیا

بندوبست ہے۔ جانے بھرماں کی شکل دیکھ بھی سکو کہ نہیں۔“
 ”اماں جی..... ایسی باتیں نہیں کرتے جہاں ہم پڑھتے ہیں ناں وہاں دنیا کے کونے کونے سے لڑکے آئے ہوئے ہیں۔ اور ان سب کی مائیں ہیں۔ جو اس خوشی میں جدائی برداشت کرتی ہیں کہ ان کے بچے اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ ہم تو مرد ہیں اماں جی وہاں تو دوسرے ملکوں سے لڑکیاں آئی ہوئی ہیں پڑھنے کیلئے۔ وہاں دو بیسٹ فرینڈ ہیں لڑکیوں

میں ہماری کلاس فیوز ہیں۔“ تیمور نے تزنین کی طرف دیکھ کر جھٹ وضاحت بھی کر ڈالی۔
 ”ایک تو مشہور ایڈیٹر ایکٹر لیس کی بیٹی ہے۔ دوسری اٹالین ہے۔ نسلا انگلش ہی ہے مگر پیدا اٹلی میں ہوئی تھی۔ اٹلی کے

کے دوراں وہ گاؤں میں ہوتی ہے اس کی ماں۔ دیکھیں اماں جی وہ بھی تو ماں ہے۔“
 ”یہ تو ہمیں کیا ضرورت ہے لڑکیوں کو سہیلیاں بنانے کی۔ لڑکے پورے نہیں پڑتے؟“
 اماں جی کو یہ لڑکیوں کے ساتھ دوستی کی بات بالکل نہ بھائی۔

”اماں جی دوست سہیلیاں تو بس خود بخود بن جاتے ہیں۔ اچھا ہم چلتے ہیں دیر ہو جائیگی۔“ وہ پینٹ کی جیبوں میں نوڈال کر ماں کے پہلو سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

”بیٹے..... وہ اپنے بابا صاحب پر دباؤ بڑھاؤ۔ دیکھو خالہ کا کیا حال ہو گیا ہے نہ کھاتی ہے نہ پیتی ہے نہ سوتی ہے۔“
 اماں جی کو یہاں بابا صاحب ان کی بہت سنتے ہیں۔ تیمور علی خان نے بائیں ابرو چڑھا کر کن اکھیوں سے خالہ کی سمت دیکھا۔

”کیا ہم بھی آپ سے وہیں جملہ کہیں جو سب کہہ رہے ہیں کہ ”فکر نہ کریں“ دیکھئے وہ اس حویلی میں کام کرتی تھی سب کے خوش تھے۔ اس کی خدمات کے صلے میں اس کا حق بنتا ہے ناں کہ اس کیلئے کچھ کیا جائے۔“ تیمور علی خان کے انداز میں لڑکائی و قار جھلک رہا تھا۔

خالہ نے چھری رکھی اور تیزی سے اٹھ کر تیمور علی خان کے ہاتھ تھام کر چوم لئے۔ ان کی آنکھوں سے چند قطرے بھی تیمور علی خان کے ہاتھوں پر پک گئے تھے۔ سب نے خالہ کو تسلی دی تھی مگر ایسا مضبوط دلاسا کہیں سے نہیں آیا تھا۔

”اتنی خوشیاں دے رب اللعالمین آپ کو کہ آپ سے سیٹی نہ جائیں۔“
 ”آمین۔“ اماں جی نے بے ساختہ کہا۔

”تھی دعائیں دیتی ہے تو سولہ آنے میرے بچوں کو..... تو نے تو خرید لیا ہے مجھے۔“ اماں جی نہال نظر آئیں۔
 ”ہائے نہیں اماں جی۔ آپ کے پیر کی جوتی ہوں۔“ خالہ نے آنکھیں پونچھیں۔

تیمور علی خان صمد دروازے کی طرف بڑھ رہے تھے۔
 ”پہلے تیمور اور بابا صاحب کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا گھر میں؟“ یاوہر علی خان سفر کی جھکن اتار کر سو کر فارغ ہوئے تو

نازنین نے انہیں مطلع کیا۔ وہ ایک دم خاصے پریشان نظر آنے لگے۔

”لیکن وہ لوگ چوکیدار بابا صاحب اور تیمور کے ہوتے ہوئے اندر کیسے آ گئے؟ صرف صدر دروازے کی طرف تو گزر (بند و قید) لگی ہوئی ہوتی ہیں۔ اور ہر گزرنے والے نے پہلے وہیں سے گزرنا ہوتا ہے۔ اس پر گیت پر موجود گن میر جتنی دیر وہ گن مین سے الجھے ہوں گے۔ اتنی دیر اندر موجود لوگوں کیلئے کافی تھی۔ جب کہ تیمور اور بابا صاحب تو بہتر تھے۔“

یاور علی خان کو اس نکتے پر سخت الجھن ہو رہی تھی۔

”چوکیدار بے چارہ تو جلد ہی زخمی ہو گیا تھا۔“ نازنین نے تاسف سے کہا۔

”تو کیا وہ بابا صاحب اور تیمور کو قابو کر کے اندر گھس گئے تھے؟“ یاور علی خان درحقیقت بہت فکر مند نظر آ رہے تھے۔ اس معصوم سی لڑکی کے ساتھ زیادتی کا انہیں بھی بہت دکھ تھا۔

”وہ اندر نہیں آئے۔ مطربہ خود بھاگ کر ان کی جیب میں بیٹھ گئی تھی۔“ نازنین نے کہا۔

”یار.....“ یاور علی خان نے بے بسی سے نازنین کی طرف یوں دیکھا۔ گویا اس کی ذہنی صحت پر شبہ ہو۔

”پوری بات تو سنیں..... یہ اپنی شیطان..... گلو کی بچی اس طرف آنکلی تھی۔ اس نے شور کر دیا، بس اتنی سب مہلت سے فائدہ اٹھا کر انہوں نے تیمور پر قابو پا لیا۔ بابا صاحب بھی کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ وہ لوگ تیمور کو اغوا کر کے لے جا رہے تھے۔ بس شاید اس وجہ سے مطربہ خود ہی باہر آ گئی۔ بہت ہی نمک حلال نکلی اس نے سوچا ہوگا۔ کیوں اپنی وجہ سے مالکوں کو نقصان پہنچائے۔ ایسی بزدل دکھائی دیتی تھی۔ مگر حیران کر گئی۔“

نازنین نے چائے تیار کر کے یاور علی خان کے سامنے رکھی۔

”وہ جذبہ بہت ہی طاقتور ہوتا ہے جو دوسروں یا کسی کی خاطر جان کی بازی لگانے پر آمادہ کرتا ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے؟“

یاور علی خان نے بیوی کی سمت تائید طلب نظروں سے دیکھا۔

”وہ بیوقوف ضرور ہے۔ میرا خیال ہے مگر اتنی بھی نہیں..... آپ نے اتنی بڑی بات کس بنیاد پر کہہ دی۔“ نازنین نے الجھ کر پوچھا۔

”اتنی ڈر پوک سی لڑکی۔ جو کسی قیمت پر بھی ماں کے پاس جانے کیلئے راضی نہیں تھی۔ ادھر اس پر کوئی پریشر بھی نہیں تھا۔ اور آپ کی اطلاع کیلئے عرض ہے کہ بے وقوف لوگوں ہی سے اس طرح کی احمقانہ و بے سرو پا حرکتوں کی توقع کی جا سکتی ہے۔“

یاور علی خان سگریٹ ہونٹوں میں دبا کر جیبوں میں لائٹس ٹولنے لگے۔

”وہ تیمور کا بالکل مالکوں کی طرح احترام کرتی ہے۔ لگھی تو بندھ جاتی ہے ان کے سامنے۔“ نازنین نے ان کے خیال سے بالکل اتفاق نہیں کیا۔

جیسا کہ ہم اس سے بہت متاثر ہوئے کہ اس نے ہمارے بھائی کو کسی مشکل میں پھنسنے سے بچا لیا۔ کوشش کریں۔“

”جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا تھا، اسے دیں جس مشکل میں ہے اسے نکالنے کی کوشش کریں۔“

”تو کیا وہ بابا صاحب اور تیمور کو قابو کر کے اندر گھس گئے تھے؟“ یاور علی خان نے سگریٹ سلگا کر فضا میں دھواں بکھیرا۔

”تو کیا وہ بابا صاحب اور تیمور کو قابو کر کے اندر گھس گئے تھے؟“ یاور علی خان نے سگریٹ سلگا کر فضا میں دھواں بکھیرا۔

”تو کیا وہ بابا صاحب اور تیمور کو قابو کر کے اندر گھس گئے تھے؟“ یاور علی خان نے سگریٹ سلگا کر فضا میں دھواں بکھیرا۔

”تو کیا وہ بابا صاحب اور تیمور کو قابو کر کے اندر گھس گئے تھے؟“ یاور علی خان نے سگریٹ سلگا کر فضا میں دھواں بکھیرا۔

”تو کیا وہ بابا صاحب اور تیمور کو قابو کر کے اندر گھس گئے تھے؟“ یاور علی خان نے سگریٹ سلگا کر فضا میں دھواں بکھیرا۔

”تو کیا وہ بابا صاحب اور تیمور کو قابو کر کے اندر گھس گئے تھے؟“ یاور علی خان نے سگریٹ سلگا کر فضا میں دھواں بکھیرا۔

”تو کیا وہ بابا صاحب اور تیمور کو قابو کر کے اندر گھس گئے تھے؟“ یاور علی خان نے سگریٹ سلگا کر فضا میں دھواں بکھیرا۔

”تو کیا وہ بابا صاحب اور تیمور کو قابو کر کے اندر گھس گئے تھے؟“ یاور علی خان نے سگریٹ سلگا کر فضا میں دھواں بکھیرا۔

”تو کیا وہ بابا صاحب اور تیمور کو قابو کر کے اندر گھس گئے تھے؟“ یاور علی خان نے سگریٹ سلگا کر فضا میں دھواں بکھیرا۔

”تو کیا وہ بابا صاحب اور تیمور کو قابو کر کے اندر گھس گئے تھے؟“ یاور علی خان نے سگریٹ سلگا کر فضا میں دھواں بکھیرا۔

”تو کیا وہ بابا صاحب اور تیمور کو قابو کر کے اندر گھس گئے تھے؟“ یاور علی خان نے سگریٹ سلگا کر فضا میں دھواں بکھیرا۔

”تو کیا وہ بابا صاحب اور تیمور کو قابو کر کے اندر گھس گئے تھے؟“ یاور علی خان نے سگریٹ سلگا کر فضا میں دھواں بکھیرا۔

تیور علی خان کو گویا زبردست شاک لگا تھا۔

”ارے بھائی..... کیا نام ہے وہ؟ اندر چلو جلدی“۔ انہیں اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔
”پ..... پ..... پانی.....“ اس نے جیسے کسی کی کوئی بات سنی ہی نہیں۔

”یہاں سے تو اٹھو..... پانی بھی ملے گا“۔ وہ جھلائے اور خود آگے بڑھ کر کھلا گیسٹ بن گیا۔
وہ بس سے مس نہ ہوئی۔

”پ..... پانی..... میں مر رہی ہوں خان..... پانی.....“

”اسی دم خان بابا بڑے سے گلاس میں پانی لے کر بھاگتا ہوا آ گیا۔ اور جبک کہ مطربہ کو گلاس تمنا یا جو فراموش کر گیا۔
ہاتھ سے چھوٹ گیا۔

”مائی گڈ نیس..... اٹھو“ تیور علی خان نے اس کا بازو تھام کر اٹھایا۔

”بابا..... پانی، بیٹھک میں لے آؤ“۔

وہ نزدیکی کمرے کی طرف بڑھے۔ مطربہ ان کے ساتھ جیسے تھسٹی جا رہی تھی۔

کمرے میں داخل ہو کر وہ وہیں دلیز پر بے دم انداز میں بیٹھ گئی۔ چونکہ ابھی پانی لے کر پہنچ چکا تھا۔

”خان بابا..... خود پلاؤ اسے“ تیور علی خان نے کمرے کی لائٹس آن کرتے ہوئے کہا۔

چونکہ دار نے تعمیل کی..... اتنا بڑا گلاس مطربہ ایک ہی سانس میں پینے لگی۔

تیور لائٹس آن کر کے پلٹے تو بری طرح چونک پڑے۔ مطربہ کے ہونٹوں کے دونوں کناروں پر خون جم کر جاگ رہا تھا۔

شکل اختیار کر چکا تھا۔ اس کے سارے چہرے پر دم محسوس ہو رہا تھا۔

”چاچا..... ایک گلاس اور“ وہ تیز تیز سانس لینے لگی۔

چونکہ دار ایک دم تیزی سے اٹھ کر باہر چلا گیا۔

تیور دوزانو ہو کر اس کے قریب بیٹھ گیا۔

”وہ..... کیا نام ہے..... مطربہ..... کیا ہوا ہے؟ کہاں سے آرہی ہو؟ وہ بغور اس کی شکل دیکھنے لگے۔

”خان پنکھا تیز کر دیں..... آگ لگ رہی ہے اندر“۔ اس نے دوپٹہ اتار کر دوڑ پھینکا۔

تیور علی خان روبوٹ کے انداز میں اٹھے اور پچھلے کی اسپینڈ بڑھا دی۔ پھر دوبارہ اس کی طرف چلے آئے۔

چونکہ ابھی اندر داخل ہوا۔ مطربہ ہتھیلیاں کارپٹ پر جمائے بے دم انداز میں جھکی ہوئی تھی۔

”زیون بانو..... لو پانی پیو.....! وہ چونا خان..... اس کا تمیض تو خون سے خراب ہے“۔ چونکہ ابھی اس کے

لگاتے ہوئے بدحواس ہو کر بولا۔

تیور علی خان نے اس کی پشت کی طرف نگاہ کی تو واقعی سنائے میں رہ گئے۔ ”گڈ گاڈ“۔

انہوں نے فوراً ہاتھ بڑھا کر اس کی نبض دیکھی۔ پھر ایک دم اٹھ کھڑے ہوئے۔

”ہم بھی آتے ہیں“۔

”نہ تیراٹھے قدم رئیسہ بیگم کے کمرے کی طرف تھے۔

ان کی دست میں خاصا شور تھا۔

”کون؟“ ان کے بہنوئی کی آواز آئی۔

”ہم ہیں تیمور..... بی بی جان کو بھیجئے“۔

نورے سے توقف کے بعد دروازہ کھلا تھا۔ رئیسہ بیگم نیند بھری آنکھوں سے ان کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

”خیریت..... کیا بات ہے تیمور؟“ وہ پریشان ہو گئیں۔

”ہمارے ساتھ آئیے“۔ وہ بس اتنا کہہ کر پلٹ گئے۔ رئیسہ بیگم حیران پریشان ان کے پیچھے چل پڑیں۔ دونوں آگے

بچے چلے ہوئے بیٹھک میں داخل ہوئے۔ مطربہ بڑھال انداز میں کارپٹ پر ڈھیر ہو چکی تھی۔

”ہائے اللہ“۔ رئیسہ بیگم سینے پر ہاتھ رکھ کر جہاں تھیں وہیں تھم گئیں۔ ”یہ مطربہ ہے تیمور“۔ وہ بدحواس ہو گئی تھیں۔

”جی..... بی بی جان یہ بہت زخمی ہے۔ اس کے کپڑے تبدیل کرائیے۔ خون لگا ہوا ہے۔ ہم فرسٹ ایڈ باکس بھجواتے

ہیں۔ اور کوئی ٹیلٹ وغیرہ دیکھتے ہیں“۔

وہ رئیسہ بیگم کو ششدر کھڑا چھوڑ کر باہر گئے۔

”بی بی جان۔ اس کو بموت خون نکلی ہے۔ کمزوری ہو گیا ہے“۔ چونکہ دار نے دکھ سے کہا۔

”مطربہ.....“ رئیسہ بیگم نے اس کا رخسار دھیرے سے کچھوا۔ کتنی جلدی سب کے منہ پر اس کا نیا نام چڑھ گیا تھا۔

”مطربہ..... دیکھو۔ میں ہوں تمہاری بی بی جان“۔ ان کے لہجے میں بلا کی محبت تھی۔ مطربہ نے ذرا دیر کو آنکھیں کھول کر

ان کی سمت دیکھا۔

”بی بی جان“۔ اس کی آواز آنسوؤں میں ڈوب گئی۔

”ہاں..... ہاں بہت تکلیف ہو رہی ہے۔ گھبراؤ نہیں۔ ابھی دوا لگاتے ہیں۔ فوراً آرام آ جائیگا۔ انشاء اللہ“۔

”ہمت کرو۔ اس طرف آ جاؤ۔ ہم کشن رکھ دیتے ہیں۔ تمہارے سر کے نیچے۔ آؤ شاہاش“۔

انہوں نے مطربہ کو اٹھنے میں مدد دی۔ اور اسے عین پچھلے کے نیچے لاکر لٹا دیا اور صوفے سے کشن اٹھا کر اس کے سر کے

نیچے کھڑا۔

”بی بی جان..... میں مر رہی ہوں“۔ اس کی آواز پر آنسو غالب آ گئے۔

”خیر نہیں..... ایسے نہیں کہتے بری بات..... تمہارے کپڑے تو خالہ کی کوٹھڑی میں ہوں گے۔ ٹھہرو ہم اپنا کوئی جوڑا

دے دیتا۔ وہ باہر نکلتے لگیں تو تیمور آ گئے۔

”آپ کہاں جا رہی ہیں؟“ انہوں نے حیرت سے پوچھا۔

”کپڑے لینے جا رہی ہوں۔ جگہ جگہ خون لگا ہوا ہے“۔ وہ کہتی ہوئی باہر نکل گئی۔

”خان بابا! کسی بڑے برتن میں پانی لاؤ..... ہلکا گرم کر کے..... بی بی جان اس کے زخم صاف کریں گے۔“
ایک گلاس میں پانی پہلے دے جاؤ۔ یہ ٹیبلٹ بھی کھانا۔“

مطربہ نے آنکھیں موندے موندے تیور علی خان کی مہربان آواز کی تمام روشنیاں اپنے اندر چار لیں۔ یہ دوا تیرے لیے تھی تو ہرگز بھی نہیں تھے جن کے چہرے پر برف جمی رہتی تھی۔ جن کے حافظے میں اس کا نام محفوظ نہیں ہو پاتا تھا۔ کتے پرانے بلند نظر آتے تھے۔ وہ اسے ”لڑکی“ کہتے ہوئے۔

چوکیدار پانی لے آیا تو انہوں نے دو ٹیبلٹس اپنی ہتھیلی پر رکھ کر اس کے سامنے کیں۔
”لو یہ کھا لو..... درد کم ہو جائے گا۔“

وہ کہنیوں کے بل اونچی ہوئی، بمشکل پہلے ان کی ہتھیلی سے ایک گولی اٹھا کر منہ میں رکھی اور پانی کے چند گونے پر پھر دوسری گولی اٹھائی۔

”خان بابا۔ ہم اپنے کمرے میں جا رہے ہیں۔ بی بی جان آرہی ہیں۔ ان سے کہنا کسی طرح کوشش کر کے رہ پھنچا دیں۔ پھانک میں تالا ڈالو اب پھانک اس وقت تک نہیں کھلے گا جب تک ہم اجازت نہ دیں۔“
وہ اپنے مخصوص لب و لہجے میں حکم دے کر باہر چلے گئے۔

صبح کو ہال کمرے میں ایک بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ مختلف آوازوں سے ایک شور سا ہورہا تھا۔ خالہ گاہے گاہے اے پھوڑا رہی تھیں۔ جیسے اسے سامنے دیکھ کر یقین نہ آرہا ہو۔

”بتاؤ..... بچی کا کیا حال ہو گیا۔ بیٹی! کیا بہت تکلیف ہو رہی ہے؟“ اماں جی اس کی حالت پر بہت اذیت محسوس رہی تھیں۔

”یہ اتنے زخم تھے آئے کیسے؟“ خالہ بے قراری سے پوچھ رہی تھیں۔

”بہت مارا ہے انہوں نے۔“ مطربہ نے تکلیف سے کراہتے ہوئے کہا۔

”اے ہے..... ستیا ناس ہو کم بختوں کا۔ کیا حشر کیا ہے پھول سی بچی کا۔“ خالہ آبدیدہ ہو گئیں لے یہ جانے ڈنڈا کھالے۔

”رات تو میں امتحان میں پڑ گئی اماں جی۔ کپڑے زخموں سے چپکے ہوئے تھے۔“ ریشم بیگم نے بتایا۔

”تو یہ تو بتا ان خونوں سے بچ کر کیسے آگئی؟ بڑی ہمت دکھائی تو نے۔“ اماں جی کہہ رہی تھیں۔

”کوٹھی میں کوئی فنکشن تھا۔ وہ چڑیل ادھر لگی ہوئی تھی۔ اس کے کتے سمجھے میں بے ہوش پڑی ہوں اور اتنی زخمی ہو مجھ سے اٹھا بھی نہیں جایگا اور مجھ سے واقعی اٹھا بھی نہیں جا رہا تھا۔ پتا نہیں کہاں سے اتنی ہمت آگئی۔“

”ہاں بس اللہ ہی ہمت دیتا ہے۔“ اماں جی نے بڑی دلسوزی سے کہا۔

”مگر انہوں نے تجھے مارا کیوں؟ تو کیا بھاگتے ہوئے پکڑی گئی تھی؟“ ترنم بھی گم مہم حالت میں باہر آئیں۔

”مجھے لینا ہی تھی۔ میں نے کہہ دیا کہ میں کسی سے شادی نہیں کروں گی۔ میں نے زیور کھڑکی سے باہر پھینک دیا۔“

”دوسرا لے آئی اور مجھے زبردستی کپڑے پہنانے لگی۔ میں نے اس کے منہ پر تھوک دیا۔“
”میں نے جیسے ہی لفظ ”تھوک“ سنا اپنے اپنے سینوں میں ٹھنڈ پڑتی محسوس کی اور اس کے اس ”کارنامے“ پر اسے

”ہر۔۔۔“ نامزنین نے بے تابلی سے پوچھا۔

”ہاں اس نے دو طمانچے میرے منہ پر..... آہ۔“ مطربہ کراہی۔

”میں نے بھی کہہ دیا کہ انشاء اللہ مجھے کفن پہنا کر ہی بھیجو گی اس ”بھینسے“ کے گھر۔ ہائے بی بی جان ایسا موٹا.....
آرام نہ تھا۔ وہ تو بہت چھپا رہی تھی لیکن میں بھی بڑی چالاک ہوں۔ آہ..... ہائے۔“

”تیری چالاکی ہو شکاری کے تو ڈنکے پٹ رہے ہیں۔“ خالہ نے اس کے بازو پر مرہم لگاتے ہوئے جل کر کہا۔

”میں نے یہ بھی کہہ دیا کہ اتنا ہی اچھا ہے تو تم خود کرو نکاح۔ کیوں اماں جی، صحیح نہیں ہے؟“
ب کے ہونٹوں پر بے ساختہ مسکراہٹ آگئی تھی۔

”ہاں..... ہاں صحیح کیوں نہیں ہے؟“ اماں جی نے شفقت سے اس کا دل رکھا۔

”دو تیرے“ آئیڈیے“ پر بڑی خوش ہوئی ہوگی۔“ ترنم نے مسکراہٹ دبا کر سنجیدگی سے کہا۔

”کہاں بی بی جان۔ دو اور لگا دیئے۔ اف۔“

”ثالثت بھیج اس کالے موٹے پر۔ میں نے تیرے لئے بڑھوٹا لیا ہے۔ تیرے جوڑ کا ہے رنگ بھی گورا ہے۔ ادب لگتا ہے۔“ خالہ نے ٹوب بند کر کے ایک طرف رکھتے ہوئے لا پرواہی سے کہا۔

”بی بی ایک لے کو بھونچ کر رہ گئے۔ مطربہ تو اپنی تکلیف ہی بھول گئی اور پٹ آنکھوں سے خالہ کو دیکھنے لگی۔

”خالہ۔ کیا کر چکی ہو چپکے۔ ہم سے بھی چھپاتی ہو؟“ ترنم نے شاکی انداز میں کہا۔

”پتہ تو نہ پتا ہے۔ آپ سے کیوں چھپاؤں گی؟ جو کروں گی؟ آپ سب کی اجازت سے ہی کروں گی۔“ خالہ نے

”نہ جواب دیا۔“

”خالہ! اماں جی بھی خوشگوار حیرت سے پوچھ رہی تھیں۔

”مگر نہ کریں۔“

”میں نے انہیں نظر آنے کی تھی۔ اور جیسے اپنی تکلیف ہی بھول گئی تھی۔

”اجنبی ہے سولہ آئے۔ جتنی جلدی ہو سکے تیرا وزن کم ہو۔“ اماں جی نے فطری خلوص کا اظہار کیا۔

”میں نے سولہ آئے۔ جتنی جلدی ہو سکے تیرا وزن کم ہو۔“ اماں جی نے فطری خلوص کا اظہار کیا۔

”میں نے سولہ آئے۔ جتنی جلدی ہو سکے تیرا وزن کم ہو۔“ اماں جی نے فطری خلوص کا اظہار کیا۔

ترنمین نے ایک نگاہ اس کے زخموں پر ڈالی۔

”ہماری تمنا ہماری ”آقا“ ہوتی ہے بی بی جان۔“ ”آقا“ جتنا زوردار ہو غلام کو اتنا ہی تابعدار ہونا پڑا ہے۔ بہت کمزور اور ڈرپوک ہوں۔“

اس نے اتنی سنجیدگی سے کہا کہ وہ سب ہکا بکا ہو کر اس کی شکل دیکھنے لگیں۔

”تو تو زخمی ہو کر بڑی گہری باتیں کرنے لگی۔“ نازنین نے مسکراتے ہوئے گویا داد دی۔

”وہ کون سی تمنا ہے جس کی تو باندی بن گئی ہے۔“ ترنمین کو اس کے جملے پر ابھی تک حیرت تھی۔ مطربہ خاموش رہی۔ بلکہ آنکھیں موند لیں۔

”رہیمہ..... اپنے بابا صاحب سے کہہ کر اس کا کوئی بندوبست کرو۔ وہ بہت خطرناک عورت ہے۔“ اماں نے بہت سے یہ بات کہنا چاہ رہی تھیں۔

تیور علی خان کو دو منٹ ہوئے تھے اس طرف آئے ہوئے۔ وہ اس کا جملہ سن کر تحیر سے دروازے ہی میں اٹھ گئے تھے۔

”ہو گیا ہے بندوبست۔ اسے کراچی بھجوا دیتے ہیں۔ وہاں بھی تو ملازموں کی ضرورت رہتی ہے یہ بہت نختی ہے۔“ کی دیکھ بھال بھی اچھی طرح کرے گی۔ اشرف کی ماں وہاں پہلے ہی ہے۔ یہ بھی نہیں ہے کہ وہاں یہ اکیلی ہوگی وہاں کچھ بھال کر لے گی اور یہ کوشی کی اور ہم آپ کو یہ بتانے آئے ہیں کہ ہم سرائے جارہے ہیں۔ رات ایک بجے تک ہی وہاں بولہ فکرت کیجئے گا۔ حویلی پر پہرہ ہے۔ اطمینان رکھئے۔“ وہ اتنا کہہ کر واپس پلٹ گئے۔

”پہرہ اللہ کا بیٹے..... جسمیں بھی اللہ کی امان میں دیا۔“ اماں جی نے دعا دی۔

”میں اکیلی رہوں گی کراچی میں؟“ مطربہ نحیف آواز میں پوچھ رہی تھی۔

”اور کیا بارات لے کر جائیگی۔ اشرف اور اس کی ماں گاؤں کے ہیں اپنے۔ بھلی عورت ہے۔“ خالہ نے ٹوکا۔

”مگر میرا تو دل نہیں لگے گا۔“ وہ کراہتے ہوئے بولی۔

”جان کی خیر منا..... جان کے ساتھ ہیں دل لگانے کے سودے۔“ خالہ نے ڈانٹا۔ ”یہ کیا کم ہے کہ اللہ راتے لگا ہے۔ لگا لچو دل،‘ وقت پڑا ہے۔“

”یہ لڑکیاں تو آتی جاتی رہتی ہے۔ اور اب تو چھوٹی دہن بھی جاتی رہتی ہیں۔ ان کا تو میکہ ہے وہاں۔“ اماں نے سمجھایا۔

”تو کیا بصیر خاناں کی شادی میرے پیچھے ہو جائے گی..... آہ۔“

”ہڈی پھلی ایک ہوئی پڑی ہے۔ مگر دل ہے کہ شادی بیاہ میں انکا پڑا ہے۔“ خالہ نے لڑا۔

”لیکن میں کراچی کس کے ساتھ جاؤں گی؟“

”اب یہ ہمارا مسئلہ ہے تو کیوں ہلکان ہو رہی ہے؟“ رہیمہ بیگم نے ڈانٹ پلائی۔

”میں جی..... آپ مجھے بہت یاد آئیں گی۔“ وہ روہا سی ہو گئی۔

”خالہ جی..... آپ مجھے بہت یاد آئیں گی۔“ وہ روہا سی ہو گئی۔

”میں نہیں کروں گی بیاہ دیاہ۔ نہ گورے نہ کالے سے۔“ وہ بڑبڑائی۔

”میں نہیں کروں گی بیاہ دیاہ۔ نہ گورے نہ کالے سے۔“ وہ بڑبڑائی۔

”میں نہیں کروں گی بیاہ دیاہ۔ نہ گورے نہ کالے سے۔“ وہ بڑبڑائی۔

”میں نہیں کروں گی بیاہ دیاہ۔ نہ گورے نہ کالے سے۔“ وہ بڑبڑائی۔

”میں نہیں کروں گی بیاہ دیاہ۔ نہ گورے نہ کالے سے۔“ وہ بڑبڑائی۔

”میں نہیں کروں گی بیاہ دیاہ۔ نہ گورے نہ کالے سے۔“ وہ بڑبڑائی۔

”میں نہیں کروں گی بیاہ دیاہ۔ نہ گورے نہ کالے سے۔“ وہ بڑبڑائی۔

”میں نہیں کروں گی بیاہ دیاہ۔ نہ گورے نہ کالے سے۔“ وہ بڑبڑائی۔

”میں نہیں کروں گی بیاہ دیاہ۔ نہ گورے نہ کالے سے۔“ وہ بڑبڑائی۔

”میں نہیں کروں گی بیاہ دیاہ۔ نہ گورے نہ کالے سے۔“ وہ بڑبڑائی۔

”میں نہیں کروں گی بیاہ دیاہ۔ نہ گورے نہ کالے سے۔“ وہ بڑبڑائی۔

”میں نہیں کروں گی بیاہ دیاہ۔ نہ گورے نہ کالے سے۔“ وہ بڑبڑائی۔

”میں نہیں کروں گی بیاہ دیاہ۔ نہ گورے نہ کالے سے۔“ وہ بڑبڑائی۔

”میں نہیں کروں گی بیاہ دیاہ۔ نہ گورے نہ کالے سے۔“ وہ بڑبڑائی۔

”میں نہیں کروں گی بیاہ دیاہ۔ نہ گورے نہ کالے سے۔“ وہ بڑبڑائی۔

”میں نہیں کروں گی بیاہ دیاہ۔ نہ گورے نہ کالے سے۔“ وہ بڑبڑائی۔

”میں نہیں کروں گی بیاہ دیاہ۔ نہ گورے نہ کالے سے۔“ وہ بڑبڑائی۔

”میں نہیں کروں گی بیاہ دیاہ۔ نہ گورے نہ کالے سے۔“ وہ بڑبڑائی۔

”میں نہیں کروں گی بیاہ دیاہ۔ نہ گورے نہ کالے سے۔“ وہ بڑبڑائی۔

”میں نہیں کروں گی بیاہ دیاہ۔ نہ گورے نہ کالے سے۔“ وہ بڑبڑائی۔

”میں نہیں کروں گی بیاہ دیاہ۔ نہ گورے نہ کالے سے۔“ وہ بڑبڑائی۔

”میں نہیں کروں گی بیاہ دیاہ۔ نہ گورے نہ کالے سے۔“ وہ بڑبڑائی۔

”میں نہیں کروں گی بیاہ دیاہ۔ نہ گورے نہ کالے سے۔“ وہ بڑبڑائی۔

”میں نہیں کروں گی بیاہ دیاہ۔ نہ گورے نہ کالے سے۔“ وہ بڑبڑائی۔

”آؤ۔۔۔“ تیمور علی خان کی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔ وہ لاؤنج کی طرف بڑھ رہے تھے۔ وہ گھبرا کر ان کے پیچھے نہ نکلے گا۔ گویا بھڑ میں گم ہو جانے کا خوف ہو۔ لاؤنج میں الگ ہی نظارہ تھا۔ لوگ جیسے اپنے گھر کے ڈرائنگ روم میں بیٹھے

دو تین بچوں نے غالباً پکڑم پکڑائی شروع کر رکھا تھا۔ پورے لاؤنج میں بھاگے پھر رہے تھے۔ وہ دونوں جس مسکن بیٹھے تھے اس کی پشت پر آکر ایک بچے نے چیخ ماری۔ وہ تو یوں بھی بوکھلائی ہوئی تھی ایک دم اچھل پڑی۔ پھر اٹھ کر حرکت پزیر ہی شرمندہ ہو گئی۔ اس وقت تو بچے گھروں میں بے خبر سوئے ہوتے ہیں۔ ادھر تو جیسے پتنگ ہو رہی تھی۔

معا اس کا دھیان گا ہے گا ہے ہونے والی اناؤنسمنٹ کی طرف گیا جب وہ متوجہ ہوئی تو اناؤنسمنٹ انگلیں میں ہونے لگی۔

”خ..... خان! شاید کسی کا بچہ کھو گیا“ اعلان ہو رہا ہے۔ وہ بہت آہستگی سے گویا ہوئی تھی۔

تیور علی خان نے گہری سانس لے کر چہرہ موڑا تھا۔ گویا اپنی جھلاہٹ پر قابو پایا تھا۔

”ابھی اردو میں بھی بولے گی۔ غور سے سن لیتا“۔ وہ اس خیال سے گویا ہوئے تھے کہ وہ مزید گویا فاشانی نہ کریں۔ کیونکہ اس کے پہلو میں ایک بڑی فیشن ایبل خاتون گود میں شیر خواہ اٹھائے براجمان ہو چکی تھی۔ اور اس کے پہلو میں نابا اسی کی بہن تھی۔ دونوں کی شکل میں خاصی مشابہت تھی۔

”ایکسکیو زمی انکل! آپ کے اس سائیڈ میری بال ہے“۔ ایک بچہ گھٹنوں کے بل جھکا ہوا صوفے کے نیچے جھانک رہا تھا۔

”ہوں..... ہوں..... وہاں کیا کر رہے ہو تیمور؟“ سامنے صوفے پر بیٹھی ایک طرح دار خاتون نے بچے کو پکارا۔ تیمور علی خان نے دلچسپی سے اپنے ہم نام بچے کو دیکھا اور ایک طرف کو ہو گئے تاکہ بچہ آسانی سے اپنی بال نکال سکے۔

”سوری انکل..... ادھر نہیں ہے“ آپ کی آنٹی کے پاؤں کی طرف ہے۔“ بچے نے قدرے غجالت سے کہا اور طرح کی طرف ہو کر ہاتھ ڈال کر گیند اٹھانے لگا۔ پھر ایک دم اٹھا۔ اب اس کے ہاتھ میں وہاٹ لکڑی چنگ پانگ بال تھی۔

”تھینک یو آنٹی“۔

”ڈیر بابا۔ یہ انکل کی آنٹی نہیں ہیں آپ کی آنٹی ہیں۔ انکل کی تو غالباً“ وہ“ ہیں۔“

مطربہ کے حسن سے دم بخود پہلو میں بیٹھی ہوئی عورت بچے کو تھپکتے ہوئے مسکرائی۔ جو بھی متوجہ تھا مسکرا دیا۔

”کراچی جا رہی ہیں آپ؟“ وہی خاتون مطربہ کے چہرے کو پر شوق نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔

”جی“۔

”شادی شدہ ہیں ناں؟“ اس مرتبہ اس نے پروقار بہت شاندار سے تیمور علی خان کی سمت دیکھا تھا۔

مطربہ نے نفی میں گردن ہلا دی۔

”پھر یہ آپ کے کون ہیں؟“ خاتون کچھ دیر قبل بولے گئے جملے پر شرمندہ نظر آئی۔

مطربہ خاموش رہی۔

”کزن ہیں؟“

مطربہ خاموش رہی۔

”جی ہاں ہیں؟“

مطربہ خاموش رہی۔

تیمور علی خان نے بے چینی سے پہلو بدلا۔

”ہیڈم! ہم زمیندار قسم کے لوگ ہیں۔ ہمارے ہاں کی زیادہ تر خواتین اردو انگلیش نہ سمجھتی نہ بولتی ہیں۔ یہ صرف مقامی

بہن ہیں۔“

”سوری قاریٹ“۔ عورت غلجی ہو کر بیک سے پانی کی فیڈر نکالنے لگی۔

مطربہ نے بھی اطمینان کا گہرا سانس لیا۔

اسی وقت کوئی فلائٹ کیلئے اناؤنسمنٹ ہوئی اور مطربہ کے پہلو میں بیٹھی ہوئی دونوں خواتین اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔

”جب کوئی بات کرتا ہے تو جواب ضرور دینا چاہیے۔ ابھی وہ اپنے میاں کو کہہ کر سیورٹی والوں کو بلوالیتی کہ لڑکی اغوا کر رہی ہے جا رہی ہے۔ نان سنس۔ ایسولوٹلی پرا بلیم“۔ تیمور علی خان کی طبع نازک برہم ہو گئی۔

ان کے انداز پر تو اس کا دل دھک سے رہ گیا تھا۔

”خان! مجھے سمجھ ہی نہیں آ رہی تھی کہ میں کیا جواب دوں؟“ وہ روہانسی ہو گئی اس خوف سے کہ جانے کب تک وہ ناراض رہے گا۔

”اگر کوئی اور پوچھ لے تو کیا جواب دوں؟“ وہ سہمے ہوئے لہجے میں پوچھ رہی تھی۔

”بس اب کوئی نہیں پوچھے گا۔ فلائٹ کا ٹائم ہو رہا ہے۔“ وہ اسی طرح آف موڈ میں گویا ہوئے۔ وہ پھر درست کرنے

”خان..... وہ بیک تو آپ نے انہیں دیدیا ہے۔ اس میں میرے دو سو روپے بھی تھے۔ کہیں وہ نکال نہ لیں۔“ معاوہ

بیٹن ہو گئی۔

”بچے بیک میں رکھنے کی کیا ضرورت تھی؟“ وہ جھلائے۔

”میرے پاس کوئی بٹوہ نہیں ہے۔ مجھے پیسوں کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔ اماں جی سب کچھ دلا دیتی ہیں۔ کبھی بی بی

بہن! دیکھتی ہیں“۔ وہ ڈرتے ڈرتے کہہ رہی تھی۔

تیمور علی خان اس کی آواز کے زیر و بم میں اتر گئے۔ چہرہ موڑ کر ایک ٹاپے کو اس کی سمت دیکھا۔ سفید چہرہ عتابی کا نیچے

ہاتھ ہاتھ کا ٹھیک ٹھاک ٹھوٹھٹ۔

نہر حسن کی شعاع میں جل کر خاک ہو گیا۔

”کزن میٹر..... کوئی نہیں نکالے گا۔ ڈومیسٹک فلائٹ میں اتنی چھان بین نہیں ہوتی۔“

”ٹھیک ہے“۔ پانچویں صبح کے آثار دیکھنے لگے۔

”اگر وہ کچھ سمجھ نہ آیا سوائے اس کے کہ پیسے کوئی نہیں نکالے گا۔“

”اور یہ دوسروں پر تمہارے پاس آئے کہاں سے۔ ٹھیک ٹھاک رقم ہے۔ ایک جوڑی سونے کے ہندسے آگئے ہیں۔“

”خالہ نے دیئے تھے اور خالہ کو نانی نے دیئے تھے۔ اور نانی کو۔“

”کنٹی نیوٹرول (مسلسل سفر) اسٹاف پلیز۔ اب کراچی جا کر خیرات کر دینا۔ جان چھڑا لیتا اس وزن سے۔“

پوائنٹ بات کرنے والے تیمور علی خان سچ مچ جھلا کر رہ گئے۔

وہ سہم کر خاموش ہو رہی۔ اور دل ہی دل میں سوچنے لگی۔ جاتے ہی اشرف کی ماں کے حوالے کر دے گی۔

وہ سیونٹھ سی میں داخل ہوئی تو سراپا حیرت تھی۔ راستے میں جھاگ اڑا تا سمندر دیکھ کر تو وہ دم بخود رہ گئی تھی۔ ایک پل سے بہتا دریا بھی دیکھا تھا۔ اور دریائے جہلم بھی اتنا بڑا سمندر۔ اف خدایا۔

وہ کوشی میں داخل ہوئے تھے اشرف مضطرب۔

”خان آپ کے دوست رات کو آگئے تھے میں نے انہیں بتا دیا تھا کہ آپ صبح آئیں گے۔“

”اچھا۔ کیا سو رہا ہے؟“

”جی..... رات کو لیٹ شو دیکھ کر آئے تھے۔ زیبا، محمد علی کی نئی فلم لگی ہے ناں اتوار سے وہی دیکھ کر آئے ہوں۔“

مطربہ نے نظر اٹھا کر دیکھا۔ ٹھیک ٹھاک حماقت برس رہی تھی چہرے پر۔

”بات مختصر کیا کرو۔“ تیمور علی خان ناگواری سے ٹوک کر آگے بڑھنے لگے۔ وہ بھی ان کے پیچھے پیچھے ہی چل پڑی۔

اسی دم ایک سمت سے ایک ادھیڑ عمر عورت نمودار ہوئی۔ اور بہت ادب سے جھک کر تیمور علی خان کو سلام کیا۔

”یہ تمہارے ساتھ رہے گی صابرہ۔ اس کا خیال رکھنا تمہاری سب سے خاص ڈیوٹی ہے۔ باہر کے کسی کام سے پیٹھ نہ پھرنی۔“

جانیگی۔ یہاں کے کاموں میں تمہارا ہاتھ بٹائے گی۔ باقی ہدایات اماں جی فون پر تمہیں دیدیں گی۔ ہم بہت تھے ہوئے۔

آرام کریں گے۔ ہمیں کوئی ڈسٹرب نہ کرے۔“ وہ گول چکر دار زینے کی جانب بڑھ گئے۔

اشرف کی ماں دم بخود کھڑی مطربہ کو سر سے پاؤں تک دیکھ رہی تھی۔

”تنت..... تمہیں خان حویلی سے لائے ہیں؟“ عورت کا ذہن اس کا حسن دیکھ کر کچھ اور ہی سوچ رہا تھا۔

”ہوں..... میں وہاں کام کرتی تھی۔ خالہ سولہ آنے کی بھانجی ہوں۔“ اس نے آہستگی سے بتایا۔

”ارے..... تو سولہ آنے کی بھانجی ہے۔ میں صدقے۔ پھر تو میری بھی بھانجی ہے۔ سولہ آنے نے کہاں چھپا کر رکھا۔“

تھایہ دانہ۔ صابرہ نے اسے اپنے سینے سے لگا کر بھینچ لیا۔

”آہ..... ہا..... آ..... خالہ میرا جسم بہت دکھ رہا تھا زخم کچے ہیں۔“ وہ اذیت سے دوہری ہو گئی۔

صابرہ نے بدحواس ہو کر اسے ایک دم خود سے الگ کر دیا۔

”ز..... ز..... ز..... کیسے آئے زخم بیٹی؟“ وہ بری طرح پریشان و مضطرب نظر آئی۔

”ہندوں کی خالہ..... اب تو تمہارے ساتھ ہی رہوں گی۔ سب کچھ بتا دوں گی..... آئے۔“ اس نے درد کی ٹیس پر قابو

پانے بیٹے جواب دیا۔

”اچھا..... تو یہاں بیٹھ جا۔“ اس نے مطربہ کو آہستگی سے تمام کر صوفے پر بٹھادیا۔

”ہشتالاؤں تیرے لئے؟“ وہ اس کی پیشانی سے بال سمیٹ کر بہت محبت سے پوچھ رہی تھی۔

”نہیں..... بس میں سوؤں گی۔ ناشتا جہاز میں کر لیا تھا۔ بہت نیند آرہی ہے۔ پتا نہیں کتنی راتیں ہو گئیں۔ ٹھیک سے

سوتیلیں مل رہی۔“ اس کی آواز میں ڈھیروں جھکن اتر آئی۔

”پل آ جا پھر..... میرے بستر پر آرام سے سو جا۔ اور جتنا مرضی سو۔ تجھے کوئی نہیں اٹھائے گا۔ جب تو سو کر اٹھے گی تو

میرے جتنے بہت اچھا سا پلاؤ کھلاؤں گی مرغی والا۔“

جانے اس کی صورت میں کیا جادو تھا کہ وہ موم کی طرح پگھل رہی تھی۔ اس سے بہت محبت سی محسوس ہو رہی تھی۔

”یہاں کام ہی کتنا ہوتا ہے بیٹی۔ کام تو بندوں سے ہوتا ہے۔ جب چودہ رانیاں ادھر آتی ہیں تب ہوتی ہے بڑی

رائی۔ رات ایک ایک بجے تک سونا نہیں ملتا۔ ویلا بندہ بھی پریشان ہو جاتا ہے۔ وہ آتی ہیں تو میں بڑی خوشی ہوتی ہوں۔

لالچی کہتی ہوں صابرہ گھر چکا کر رکھا کر۔ کہ بسا ہوا نظر آئے۔ تم ادھر ادھر دیکھ لینا۔ اس پاس کی کوئی کوشی ہماری کوشی کی

طرح نہیں چمکتی۔ جیسے آج ہی بنی ہو۔ بڑے خان دو سال میں ایک دفعہ تو لازمی پوری کوشی میں رنگ و روغن کرواتے ہیں۔

میری بڑی بہو جب کرپچی (کراچی) آتی ہے تو مذاق کرتی ہے کہ اماں یہ تو تیری کوشی ہے۔ خانوں کا تو بس نام ہے۔ بسی

ہوئی تو تو ہے اس میں۔“

صابرہ اسے اپنے کمرے تک لے جاتے ہوئے ایک تو اتار سے بولے چلی جا رہی تھی۔

”اور آج سے تو یہ کچھ کہ یہ تیری بھی ہے۔“ صابرہ قل قل کر کے ہنس پڑی۔

(اے..... آگے پیچھے کوشیاں بنی ہیں میرے تو۔ مگر دل حویلیوں کو ٹھیوں پر راضی ہی کب ہے۔ یہ تو وہ ضدی بچہ ہے جو

ان کی دلی ہوئی مٹھائی پھینک کر تیز مریج مانگ رہا ہو) وہ تھکے تھکے ذہن سے سوچ رہی تھی۔

.....

”اوشام پانچ بجے کے قریب سو کر اٹھی تھی۔ گہری نیند سے جاگنے کی وجہ سے کچھ دیر تو اسے سمجھ ہی نہ آئی کہ کہاں ہے۔

نہیں درجست کو گھورتی رہی۔ پھر ایک دم اٹھ بیٹھی۔ دوپٹا سنبھالتی باہر آئی۔ سامنے ہی ڈائننگ ہال میں واش بیسن لگا تھا۔ وہ

سست بیٹھ گئی۔ بازو میں ہنوز تکلیف تھی۔ اس نے بمشکل منہ دھویا۔ بازو اور کمر میں درد کی لہریں اٹھ رہی تھیں۔ وہ کراہ کر

بہوٹ ہوئی تو محسوس ہوا وہاں کوئی اور بھی موجود ہے وہ چونک کر مڑی سامنے تیمور علی خان چھوٹا سا بیک پکڑے کھڑے تھے۔

”اس میں تمہاری دوائیاں اور بیٹوس ہیں۔ اشرف کی ماں سے کہہ کر زخموں پر دوا لگو الینا۔ ویسے اب حال کیا ہے؟“ وہ

بیک ایک کمری پر کھٹے ہوئے گویا ہوئے۔

”استغواب بھی بہت ہے خان اور الٹا بازو تو بہت دکھ رہا ہے۔“ وہ اپنے دوپٹے کو دائیں ہاتھ سے چہرے پر پھیرتے

ہوئے کہہ رہی تھی۔

”ہوں۔“ وہ کچھ سوچ رہے تھے۔

”ویسے ہماری حیرت کسی طرح کم نہیں ہو رہی کہ اس رات تم نے اتنی ایجنڈا حالت میں اتنا لمبا سفر کیے کر لیا۔“
ہے تمہاری ماں کا گھر حویلی کے نزدیک تو نہیں ہو سکتا۔ پہلے تم شہر آئی ہوگی پھر وہاں سے اتنی رات کو پیدل گاؤں۔“
”میں پیدل نہیں آئی تھی خان۔“ اس نے فوراً تیمور علی خان کی بات کاٹ دی۔

”پھر..... اتنی رات کو تمہیں سواری مل گئی تھی؟“ وہ متعجب ہوئے۔

وہ خاموش کھڑی رہی۔

”بولو۔“ وہ چڑ گئے۔

”مجھے ایک آدمی چھوڑ کر گیا تھا خان۔“ وہ بہت آہستہ بول رہی تھی۔

”تمہاری ماں کی طرف کا آدمی؟“ وہ مزید حیران ہوئے۔

”نہیں..... جب میں دیوار کو دربار آئی تو ایک آدمی اپنی دواؤں کی دکان بند کر کے تالا لگا رہا تھا۔ اس نے مجھے دھار سے کودتے دیکھ لیا تھا۔ وہ دکان چھوڑ کر بھاگ کر میرے پاس آیا۔ وہ سمجھا تھا کوئی چور ہے۔“

شہر بانو کو ادھر سب جانتے ہیں۔ میں نے اسے بتا دیا تھا کہ یہ عورت مجھے اغوا کر کے لائی ہے اور میں بہت زخمی ہوں۔ میرے کپڑے خون میں تر ہیں۔ بے چارے کو بہت دکھ ہوا۔ کہنے لگا ”یہ عورت بہت خطرناک ہے۔ نہ میں تمہیں کسی اسپتال لے جا سکتا ہوں نہ اپنے گھر۔ میرا بھی جوان بیٹیوں کا ساتھ ہے۔ یہیں میرا گھر ہے۔ یہیں کاروبار۔ البتہ میں تمہیں وہاں ضرور پہنچا سکتا ہوں جہاں سے تم آئی ہو۔ میں اپنی بیوی کو بتا کر آتا ہوں اور گاڑی بھی لے کر آتا ہوں اپنی تم اتنے ٹم دکان کے اندر بیٹھ جاؤ۔ میں باہر سے بند کر کے جاؤں گا۔ گھبرانا نہیں۔“

پھر خان میں دکان میں بیٹھ گئی۔ اس نے مجھ سے پتا پوچھا۔ مجھے تو خود صحیح سے معلوم نہیں تھا۔ میں نے کہا دربارستان لے چلو۔ وہاں سے تو میں بتا سکتی ہوں۔

تھوڑی دیر میں وہ آگیا تھا اس نے مجھے دکان سے نکال کر گاڑی میں بٹھایا۔ پیچھے اور دکان میں تالا ڈالا۔ حویلی سے بہت دور ہے اس کا گھر بہت دیر گاڑی چلی تھی۔ میں تو پتا نہیں سو گئی تھی یا بے ہوش ہو گئی تھی۔

راستے میں اس نے گاڑی میں پٹرول بھی ڈلوایا تھا۔ میں لیٹی ہوئی تھی۔ پیچھے مجھ سے بولا اٹھ کر بیٹھ جاؤ کہیں کسی کو نہ شک ہو جائے۔

”خان..... وہ بہت نیک آدمی تھا۔ اس نے مجھے حویلی سے تھوڑی دور اتار دیا تھا۔ میں نے اسے کہا بھی تھا کہ ہمارے خانوں سے مل لیں۔ وہ بہت اچھے ہیں۔ کہنے لگا بیٹی بھلائی کا زمانہ نہیں۔ نیکی گلے پڑ جاتی ہے۔ ایک تو تم جوان تھو پھر اس پر اس قدر زخمی۔ اس لئے اللہ کا نام لے کر خطرہ مول لیا۔“

”واقعی وہ بہت اچھا آدمی تھا۔ یا یہ کہ تمہاری لک (قسمت) بہت اچھی ہے اس پر دوج فل خاتون سے چھوٹ جاتا۔“

”قسمت نہیں تھی۔“
”قسمت اچھی ہوتی تو کہیں اور پیدا ہوئے ہوتے۔“

”قسمت اچھی ہوتی تو کہیں اور پیدا ہوئے ہوتے۔“

پہلی عمر میں بہت بڑی بات تھی۔ تیمور علی خان تو یک ٹانے کو دم بخود سے رہ گئے۔
”پہلی عمر میں بہت بڑی بات تھی۔ تیمور علی خان تو یک ٹانے کو دم بخود سے رہ گئے۔“

”اس نے تم پر اتنا تشدد کیوں کیا تھا؟“ وہ جاتے جاتے پھر رک گئے۔
”ایک مونس سے میری شادی کر رہی تھی۔ میں نے تو کھانا بھی نہیں کھایا تھا وہاں اس پر بھی بڑا غصہ تھا اسے۔ ایک پڑا ہوا بھی تھا وہاں۔ اس سے کہہ رہی تھی کہ ایک دفعہ یہ وہاں جا کر واپس آئے سارا زور ٹوٹ جائے گا گردن جھکا کر نہیں کر چکے گی۔ سارا نشہ ہرن ہو جائیگا بس ایک دفعہ بس چل جائے اس پر کسی کا۔ اس لئے جلدی کر رہی ہوں۔ ورنہ بڑی بیکاری مر جائے گی۔“

طریقہ نہایت سادگی سے حرف بہ حرف بتا رہی تھی۔

”انیس بات میں کوئی لفظ اتنا وزنی تھا کہ تیمور علی خان کی پلکیں بوجھل ہو گئی تھیں۔ وہ نگاہ اٹھائے بغیر باہر نکل گئے تھے۔“
”خیر اٹھ گئی۔ دیکھ تو سہی تیرے آنے سے کتنی رونق ہو گئی ہے کونھی میں۔ تیرے اٹھنے کے انتظار میں بیٹھی ہوئی تھی۔“
”مگر کرم بکڑے بیٹے ہیں اور چٹنی جیسی ہے۔ باہر لو کروں کو بھی دے کر آئی ہوں۔ سب بڑے خوش ہوئے۔ بندہ اکیلا ہو تو کہاں دل کرتا ہے اس طرح کھانے پینے کو۔“

صابرہ اندر داخل ہوتے ہی شروع ہو گئی۔ احساس تشکر کی سینے میں ایک موج سی اٹھی تھی۔ اس نے بہت اپنائیت سے صابرہ کو دیکھا تھا۔

”خان کو تو میں نے پکڑے نہیں بھجوائے۔ لال مرچوں کی چیزیں پسند نہیں کرتے تان وہ تو اب یاد آیا کہ خان کا دوست آؤ آیا ہوا ہے رات سے۔ اسے ہی بھجوا دیتی مگر اب تو وہ چائے پی چکے۔“

”کیا ہے؟ تیرا ہے؟“ صابرہ کی بات کرتے کرتے نظریک پر پڑی۔

”دائیاں ہیں اس میں میری۔ اور مرہم ہے۔ جو تم ہی لگاؤ گی۔ کام بڑھ گیا ہے تمہارا۔“ وہ زبردستی کے انداز میں

”مصلحتے جاؤں۔ بھلا یہ بھی کوئی کام ہے۔ مگر۔ صابرہ بولتے بولتے رک گئی۔“
”نیکو! یہ زخم تھے آئے کیسے؟“ وہ بہت فکر مند سی سے پوچھ رہی تھی۔

”کہاؤں نے؟“
”کہاؤں نے؟“
”کہاؤں نے؟“

”کہاؤں نے؟“
”کہاؤں نے؟“
”کہاؤں نے؟“

”کہاؤں نے؟“
”کہاؤں نے؟“
”کہاؤں نے؟“

”اچھا..... آجا۔“ صابرہ اسے کچن کی لے کر چکی۔

صابرہ اللہ جانے کہاں غائب ہو گئی تھی، وہ جلے پاؤں کی ملی بنی ایک ایک کمرہ جھانک رہی تھی۔ ایک کونے پر کمرے کا دروازہ نیم وا تھا اور روشنی ایک لکیر کی صورت باہر آرہی تھی۔

اس نے آہستگی سے دروازہ دھکیلا اور دھک سے رہ گئی۔ ایک نوجوان جسے جوان مرد ہی کہا جاسکتا تھا بنیان اور ریشہ میں کوئی نقشہ سا پھیلائے بیٹھا تھا بیڈ پر۔ اس نے دروازے کی جڑ پر چوک کر سر اٹھایا تھا۔ اور ٹھک سا گیا تھا۔

”جی..... تشریف لائیے۔ آپ کون؟“ اس نے ہاتھ میں پکڑی پنسل نقشے پر ڈال دی اور سیدھا ہو کر فیض پینے لگا۔

”جی..... وہ..... جی..... السلام علیکم۔“ وہ بوکھلاہٹ میں بے ربطی ہو گئی۔

”وعلیکم السلام رحمت اللہ وبرکاتہ۔ زہے نصیب۔“ اس شخص کی آنکھیں تک مسکرا رہی تھیں۔

”وہ جی..... تیمور خاناں ادھر نہیں ہیں؟ میں سمجھی۔“ وہ پلٹنے لگی۔

”سنئے۔“ اس شخص کی دھیمی آواز سماعت سے ٹکرائی۔

”آپ تیمور کی کون ہیں؟“ وہ دلچسپی سے اسے دیکھ رہا تھا۔

”اس قدر آپ جناب سے گھبرا کر وہ تو آدمی ہو گئی۔“

”میں جی..... کوئی بھی نہیں ہوں ان کی۔“ وہ بہت گھبرا رہی تھی۔

”جب کوئی کسی کو ڈھونڈتا ہے یا پوچھتا ہے تو وہ اس کا ضرور کچھ نہ کچھ ہوتا ہے۔“ وہ بہت اطمینان سے کہہ رہا تھا۔

”آپ یقین کریں۔“

”اس انداز میں یقین نہ دلائیے۔ کہ مجھے ہی کسی تعلق کی ضرورت محسوس ہونے لگے۔“ عجیب شرارتی سا انداز تھا۔

اس کے دوسرے گزر گیا۔ اسے ایک دم اپنی اوقات یاد آ گئی۔

”آپ مہمان ہیں خان کے؟ چائے بھجواؤں آپ کیلئے۔“ اس سے نجات کی یہی آسان صورت نظر آئی۔

”چائے ہی پلوانا ہے تو بھجوائیے نہیں۔ خود لے کر آئیے۔“

وہ دھک دھک کرتے دل کے ساتھ نیچے آئی۔ صابرہ اب بھی منظر پر نہیں تھی۔ وہ کچن میں چلی آئی۔

”اسے یہاں کا کچھ پتا نہیں تھا۔ چینی کہاں رکھی ہے، پتی کہاں رکھی ہے۔ اول تو ذرا سا چلنے ہی سے اسے خاموشی

محسوس ہونے لگی تھی۔ وہ ایک طرف تک کر گہری سانس لینے لگی تھی۔

”بیٹی! تو یہاں کیا کر رہی ہے۔ کچھ چائے تھے۔ جا تو آرام کر، میری آنکھوں میں تو ابھی تک تیرے زخم

ہیں۔ ہے ہے۔ ظالم کو اپنی اولاد پر رحم نہ آیا تو اوروں کے ساتھ کیا کرتی ہوگی۔“

”کہاں چلی گئی تھیں خالہ! میں تمہیں ڈھونڈتی پھر رہی تھی۔ پریشان ہو گئی تھی میں تو۔“

وہ روہانسی ہو کر صابرہ کے گلے سے لگ گئی۔

”بچیں بند کئے پڑی تھی۔ میں سمجھی سو رہی ہے۔ میں پڑوس کی کونھی میں چلی گئی۔ وہاں اماں حنیفہ کام کرتی ہے۔ چھ

بچے کے بعد پوچھا ہوا ہے۔ مبارکباد دینے گئی تھی۔ ابھی تو گئی تھی۔ زیادہ دیر بھی نہیں ہوئی۔ اتنی رونق والی جگہ سے آئی ہے

بچے سے گھبرا گئی ہوگی۔“

”اوپر کوئی مہمان ہے چائے کا کہہ رہا ہے۔“ وہ پرسکون ہو کر ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔

”جی جی اوپر؟“ صابرہ نے چونک کر پوچھا۔

”ہاں ہاں۔ تمہیں ڈھونڈے گئی تھی۔“

بیٹی ادیکہ تیرے بھلے کو کہہ رہی ہوں۔ ہر ایرے غیرے کے سامنے نہ جایا کر۔ اللہ نے تجھے بہت روپ دیا ہے یہ تو

کو آؤ اس میں ڈالنے والی بات ہوئی۔ جتنا خود کو چھپا سکتی ہے چھپا۔ اللہ تجھے ساتھ خیریت کے اپنے گھر کی کرے۔

”اے آؤں گی چائے۔“ صابرہ نے بڑی محبت سے سمجھایا۔

”تیمور خاناں بھی پتا نہیں کہاں چلے گئے۔“ وہ بڑبڑائی۔

صابرہ نے کیتلی اٹھاتے ہوئے ایک دم مڑ کر اس کی سمت دیکھا اور بہت بغور دیکھا۔

”ایک بات اور گرہ میں باندھ لے بیٹی۔ مالکوں کی کمی۔ دوری، قریبی، حاضری، غیر حاضری محسوس نہیں کرتے۔ نوکر

کو جانتا نہیں ہے۔ تو لاکھ پیسے والی کی اولاد سی مگر ادھر تو نوکر ہے۔ یہ عیب کی بات ہے بیٹی! برا نہ منانا۔“

مطربہ خاموشی سے ہاتھ ملنے لگی جیسے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ہو۔

صابرہ نے باتیں کرتے کرتے چائے تیار کی۔ مطربہ ہوں ہاں کرتی رہی، اوپر والے مہمان کے انداز رہ رہ کر دھیان میں

ہے تھے۔

”یک بیک پچا رکھا ہے، صبح کو باسی ہو جائیگا۔ کھائے گی؟“ صابرہ نے سنہری پلیٹ میں رکھا کیک اس کے سامنے رکھا۔

نوٹو بصورت دستے والی چھری تھی۔ وہ گم مسم سے انداز میں کیک پر چھری چلانے لگی۔ صابرہ چائے لے کر باہر نکل گئی۔

”اے! میں ایک ہیں پورا کھایا بھی نہیں تھا کہ صابرہ ٹرے سمیت پھر سے موجود تھی۔

”کیوں۔ چائے نہیں پی مہمان نے؟“ اس نے حیرت سے پوچھا۔

”کہہ رہا ہے اب دل نہیں چاہ رہا۔ باہر جا رہا ہوں۔“

”اللہ نکل دے لوگوں کو۔ اب میں ایسی بڑھی بھی نہیں ہوں کہ سٹھیا ہی گئی ہوں۔ اس کی دی ہوئی عقل تھوڑی بہت

نہیں پک چکی ہے۔ ہر کوئی ہمارے خانوں جیسا تھوڑا ہی ہوتا ہے۔“

صابرہ نے تان واپس رکھتے ہوئے بڑبڑا رہی تھی۔

سات کو کیک وہ جلدی سو گئی تھی اس لئے صبح پو پھٹتے ہی آنکھ کھل گئی تھی۔ وہ منہ ہاتھ دھو کر باہر باغ میں چلی آئی۔ آج

نہیں کئی فیصلوں میں بہت کی محسوس ہو رہی تھی۔ اعصاب بھی قدرے پرسکون تھے۔ وہ مور کی شکل میں بنی ایک سنگی بچ پر بیٹھ

گئی۔

اس کے سامنے حویلی کی صبح کا منظر اجاگر ہو گیا تھا۔ کیسی ہڑبومک مچی ہوتی تھی۔ صبح کچن میں ماما..... بدلاؤ کی آواز سنائی دیتی تھی۔ وہ خود۔ مشین بنی ہوتی تھیں۔ تقریباً حویلی کے سارے ہی مرد صبح صبح ناشتا کرتے تھے۔ چائے کی اسے لٹ نہیں تھی۔ مگر وہ دھوٹے ہی کام میں لگ جاتی تھی۔ ایک افسردگی سی اس کے ذہن پر چھانے لگی۔

”آپ نے خود ہی چائے کیلئے کہا تھا۔“

وہ بری طرح اچھل پڑی۔ رات والا مہمان سنہری ڈریسنگ گاؤں کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے سامنے کھڑا تھا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

”السلام علیکم جی۔“ وہ گھبرا کر یہی کہہ پائی۔

”وہ چائے..... ویسے علیکم السلام۔“ وہ پر شوق نگاہوں سے اس کا جائزہ لے رہا تھا۔

”وہ..... خالہ لے کر تو گئی تھیں۔“ اس نے مودبانہ کہا۔

”مگر مجھے خالہ کی بنی ہوئی چائے سے تو کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ مجھے تو چائے کیلئے آپ نے کہا تھا۔“ وہاں سے وہ بڑبڑاتی ہوئی کا منظر ہرہ ہوا۔

”مگر..... خالہ مجھ سے اچھی چائے بناتی ہیں۔“ وہ اس کی نگاہوں سے بہت گھبرا رہی تھی۔

”اچھی بری کا سوال نہیں ہے۔ چائے بنانے اور لانے والے کا مسئلہ ہے۔“

”آپ خان کے رشتے دار ہیں؟“ اس نے خود پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے سوال کیا اور ماحول کا ہڈبڈلاؤ لاشعوری کوشش کی۔

”آپ خان کی کون ہیں؟“ وہاں سے الٹا سوال کر دیا گیا۔

”میں ان کی ملازمہ ہوں۔“ وہ بڑے سکون سے اور اعتماد سے گویا ہوئی۔

”اوہ!“ مہمان نے سیٹی بجانے کے انداز میں ہونٹ سکڑے۔ اور پہلے سے زیادہ بے خوف انداز میں اس کے برابر کا جائزہ لیا۔

”بڑے خوش قسمت ہیں یہ خان زادے، میں حسد کی آگ میں جلنے لگا ہوں۔“ مہربانہ کی پیشانی پر پسینے کی بوندیں

ہونے لگی تھیں۔ اہل جنہ میں سے محسوس ہو رہا تھا وہ۔ اس کے وجود سے آنیوالی آنچ اس کا تن میں جھلسا رہی تھی۔

”ویسے ایک بات بتائیں۔ ہم بھی خان زادے ہی ہیں۔ بس قبیلہ کا فرق ہے۔ مگر تم خان زادوں میں فرق کرنے

بیٹھ جانا۔“ وہ فوراً آپ سے تم پر آ گیا تھا۔

سرخ و فیروزی پھولوں کا کرتا شلوار اور سر پر خوبصورت کڑھائی والا سیاہ آنچل۔ صبح کے نو خیز اجالے میں اس کی

سچے موتی کی طرح چمک رہی تھی۔

”ایک بات بتاؤ۔“ وہ جیب سے سگریٹ کا پیکٹ اور لائٹرنکالٹے ہوئے اس کے چہرے پر نظریں جما کر مہربانہ

”مہربانہ! اس کی بات کا انتظار کرنے لگی۔“

”مہربانہ! اور خان زادوں سے خوش ہو؟“ اس کا انداز عجیب سا تھا۔

”جی بہت خوش ہوں، سب میرا بہت خیال رکھتے ہیں۔“ وہ ازلی نمک حلائی کا مظاہرہ کر رہی تھی۔

”کیا مجھے بتاؤ گی کہ کس طرح کا خیال رکھتے ہیں؟“ وہ دھواں اس کے چہرے کی سمت اڑا رہا تھا۔

”جیسا کہ رکھنا چاہیے۔ میں اسی وجہ سے اپنے خانوں کی بہت عزت کرتی ہوں کہ وہ سب عورتوں کی عزت کرتے ہیں

اس نے اپنی عمر سے بڑی بات بہت سنجیدگی سے کہی۔ شاید وہ مہمان کی نظروں سے آن کی آن میں علمی درجات طے کر

گئی۔

”شاید تمہارے خانوں کی نزدیکی نظر کمزور ہے۔“ اس نے سرو قد آتش فشاں پر بھر پور نگاہ ڈالی۔

(تمہاری اس بات سے تو مجھے بھی پورا پورا اتفاق ہے) وہ صرف سوچتی رہی بولی کچھ نہیں۔

”میں اندر جاؤں؟“ اس نے ناگواری چھپاتے ہوئے خادمانہ انداز میں اجازت چاہی۔

”اس شرط پر کہ اوپر چائے لے کر تم آؤ گی۔“ اس نے پھر ڈھیروں ڈھیر دھواں اڑایا۔

”میں آپ سے معافی چاہوں گی۔ خالہ منع کرتی ہیں۔“ اس کی ازلی سادگی عود کر آئی۔

”کون خالہ..... وہ بڑی بی جوادہر کام کرتی ہیں؟“ اجنبی مہمان نے ناگواری سے پوچھا۔

”جی۔“ وہ دھیرے سے بولی۔

”ہوں..... مگر خالہ ہے تمہاری۔“ لہجہ قدرے اکھڑا اکھڑا تھا۔

”نہیں..... مگر اماں جی نے انہیں میرا خیال رکھنے کو کہا ہے۔“ وہ اسی سادہ انداز میں گویا ہوئی۔

مہمان کے دل پر تو کھڑے کھڑے ڈاکہ پڑا۔ ایسا دو ٹوک اور خالص انداز۔

”اماں جی..... تیمور کی والدہ؟“ مہمان قدرے الجھا۔

”جی۔“ وہ نظریں جھکا کر بولی۔

”یعنی خالہ تمہارا خیال رکھ رہی ہیں۔ ہوں۔ اچھی بات ہے۔ نایاب پھولوں کے گرد خاردار باڑھ ضرور ہونا چاہیے اماں

کی بہت کچھ عورت ہیں۔“

”جی..... ماشاء اللہ سے انہیں اللہ نے بڑی عقل دی ہے۔“ وہ تندہی سے مالکن کی تعریف میں جت گئی۔

اتنی سادگی۔ کہ مہمان کو حیا آ گئی۔ جانے اپنی کس کس سوچ پر۔

”لمحہ ہے..... تم جاؤ..... ہم تم سے چائے کیلئے نہیں کہیں گے۔“

اس نے حیرت سے مہمان کی شکل دیکھی۔ بہت ہی محسوس کی جانے والی تبدیلی تھی۔ وہ آہستگی سے گھاس کا قطعہ پار کرنے

وہ کچن میں تھی کہ خالہ نے کہا اسے تیمور خاناں بلارہے ہیں۔
 وہ تو جیسے دوڑتی ہوئی لاؤنج میں آئی تھی۔ پورے چوبیس گھنٹے ہو گئے تھے انہیں دیکھے ہوئے۔
 ”جی..... جی خان“۔ وہ اندر داخل ہوئی تو اس کی سانس پھول رہی تھی۔
 ”اماں جی تم سے بات کریں گی“۔ تیمور علی خان مڑ کر اس کی سمت دیکھنے لگے۔ ان کے ہاتھ میں ریسیور تھا ”آگئی ہے اماں جی۔ بات کریں۔“
 ”ہائے اللہ..... اماں جی“۔ وہ دُور شوق سے گرتی پڑتی آگے بڑھی۔
 ”السلام علیکم اماں جی۔ اللہ کا شکر ہے ٹھیک ہوں جی۔ جی۔ نہیں آپ فکر نہ کریں۔ صابرہ خالہ بہت اچھی ہیں۔ جی۔ مجھے تو خان کل سے دکھائی نہیں دیئے۔ پھر خیال کیا رکھوں۔ نہ انہوں نے کل گھر میں چائے پی نہ کھایا کھایا۔ نہیں نہیں۔ ہاں چائے تو پی تھی۔ کوئی مہمان بھی ہے ناں گھر میں اس کے ساتھ۔
 جی مجھے تو نہیں پتا۔ شاید خان کے دوست ہیں۔
 نہیں ہیں۔..... بالکل نہیں روئی۔ بس آپ بہت یاد آ رہی ہیں۔ جی خان تو باہر چلے گئے ہیں۔“
 ”اچھا..... خدا حافظ“۔ اس نے اداس سی کیفیت میں ریسیور رکھ دیا۔
 وہ باہر آئی تو کچن کی طرف بڑھنے لگی۔
 ”مطربہ“۔ اسے پشت سے آواز آئی۔
 وہ چونک کر مڑی ”جی خان“۔
 ”زخم کیسے ہیں اب؟“ وہ عام سے لہجے میں پوچھ رہے تھے۔
 ”پہلے جیسے دکھ نہیں ہیں، مرہم بہت اچھا ہے“۔ وہ خاکساری کے انداز میں گویا ہوئی۔
 ”وہ ایک بات ہے“۔ وہ کچھ کہتے ہوئے ہچکچا رہے تھے۔
 ”جی خان..... حکم“۔
 ”دیکھو..... کوشی میں ادھر ادھر نہیں گھومنا۔ بس صابرہ کے ساتھ رہو اور اپنے کام سے کام رکھو“۔
 ”جی خان“۔
 ”اوپر بھی نہیں جانا جب تک ہم یہاں ہیں“۔ وہ بہت دھیمی آواز میں بات کر رہے تھے۔
 اس نے چونک کر تیمور علی خان کا چہرہ دیکھا۔ دل بہت تیز تیز دھڑکنے لگا تھا۔
 ”گئی تو نہیں تھیں اوپر؟“ وہ جاتے جاتے پھر پلٹے۔
 ”وہ گڑبڑ آگئی۔ بلکہ پسینے پسینے ہو گئی“۔ وہ..... جی..... جی نہیں..... نہیں تو۔ وہ جی مجھے تو کوئی ضرورت ہی نہیں اوپر جانے کی۔ اس کی آواز تھرا گئی۔

تیمور علی خان اپنے کسی خیال میں گم تھے۔ اس کی طرف نہیں دیکھ رہے تھے۔ اس کی خوف سے بری حالت ہو رہی تھی۔ اگر دیکھ لیتے تو ضرور کھٹک جاتے۔
 ”ہوں۔ ٹھیک ہے“۔ وہ اپنی راہ پر چل دیئے۔
 وہ چند ٹاپے سانس درست کرتی رہی۔ اور پیشانی آنچل سے پونچھتی رہی۔
 اور جو جھوٹ کھل گیا؟ ادھر حویلی میں تو کسی پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ کام کے وقت تو نوکرانیاں بھی مردانے میں چلی جاتی ہیں۔ اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ وہ الجھے الجھے انداز میں چل رہی تھی۔
 تیمور علی خان دور دلش کی تیاریوں میں از حد مصروف تھے کہ دروازے پر دستک ہوئی۔
 ”ایس؟“ وہ اسی طرح مصروف رہے۔
 ”اوہ..... علی آؤ..... نہیں یار۔ ایسا کوئی خاص بڑی نہیں۔ یہ سب روانگی کی تیاریاں ہیں۔“
 ”ابھی کھانا لگنے کی اٹاؤنسمنٹ تو نہیں ہوئی“۔ تیمور علی خان سوٹ کیس بند کر کے مسکراتے ہوئے پوچھ رہے تھے۔
 ”چھوڑو یار۔ تمہیں کھانے کا بھلا کیا ذوق۔ کچی سبزی زیادہ ہائی جینک ہوتی ہے۔ چبا کر اوپر سے ایک چمچ کالی مرچ پھانک لیا کرو“۔ علی نے جل کر کہا۔
 تیمور علی خان کا قبضہ بے حد جاندار تھا۔
 ”سو۔ فنی۔ چلو تمہیں تو کھانے کا ذوق ہے ناں۔ دوپہر کو بھی تمہارے لئے بڑے پائے اور تلوں والی روٹی کا اہتمام کیا تھا۔ اب بھی دیکھنا صابرہ نے ٹھیک ٹھاک مشرقی مسالہ جات کا استعمال کیا ہوگا۔ ہمیں پورا یقین ہے۔“
 ”یہ تو ہے یار۔ یہ صابرہ کھانے بہت اچھے بناتی ہے۔ پلاؤ تو کل اتنا مزے دار تھا کہ میں نے بے اختیار پوچھا تھا کہ اس کی ضرورت کوئی اسپیشل ٹرک ہوگی۔ کہنے لگی جیسے پکاتے ہیں ویسے ہی پکایا ہے بس دہی اور کٹی ہوئی ہری مرچ زیادہ ڈالی ہے۔
 ویسے یار کھانا بنانا بھی بہت بڑا آرٹ ہے۔ ویسے وہ جو میرے پاس بڑی بی بی ہے اس کی عمر اتنی ہو گئی ہے کہ اس سے زیادہ محنت کا کام ہوتا نہیں ہے۔ اب اتنے دنوں سے کام کر رہی ہے کہ نکالتے ہوئے اچھا محسوس نہیں ہوتا۔ پھر یہ کہ اصل کام تو بچے کی دیکھ بھال کا ہے۔ جو وہی کر رہی ہے۔“
 ”شادی کر لو..... بہت سے پرائیمر آٹھویں کلاس ہو جائیں گے“۔ تیمور علی خان نے اٹھ کر جگ سے پانی اٹھایا اور پینے لگے۔
 ”ہاں یار! اب تو میں خود بھی سوچ رہا ہوں۔ سول سروسز کے ایگزیم کارزلٹ بھی آنے والا ہے۔ یوں بھی فراغت ہو گئی ہے۔“
 ”تو پھر دیر کس بات کی ہے؟“ تیمور علی خان نے دریافت کیا۔
 ”ذیر تو خیر کس بات کی نہیں ہے۔ اچھو کلی جو میرے ساتھ پرائیلم ہے وہ تو تمہیں پتا ہی ہے۔ گلے سے پھڑی بھیڑ

ہوں۔ آل ریڈی شادی شدہ ہوں۔“

”ڈزن میٹر..... سو واٹ..... نو پر اہلم۔“ تیمور علی خان بے نیازی سے گویا ہوئے۔

”میرے راجہ اندر..... میری جان..... یہ لندن یا یورپ نہیں ہے۔ بنی دینے والے بال کی کھال نکالنے پر اور شک کا فائدہ تو ذرا نہیں دیتے۔“ علی نے ٹیبل سے میگزین اٹھا کر زور سے ٹیبل پر دو بارہ رکھ دیا۔

”ایک بچے کا باپ۔ جس سے اس کے خاندان قبیلے والے نہیں ملتے۔ کیوں نہیں ملتے۔ اس کا جواب ملے پوچھنا ہندو معذور بیٹی بھی نہیں دے گا۔ اور اس سیدھے سادھے جواب میں شک کی سوشلیس برآمد کر لی جائیگی۔ جو ہمارے فرشتوں کو فیڈ بھی نہیں کی گئی ہوں گی۔“

یار مجھے پتا چل جاتا کہ وہ اتنی جلدی چھوڑ جائیگی تو میں اتنا بڑا رسک ہی نہ لیتا۔ مہندی تو کہتے ہیں کہ ان کی شان و بے لگا گیا ہوں۔“

”ارے نہیں پارٹنر..... خواجواہ وہم نہ کرو، ٹرائی کرو۔“ تیمور علی خان اتنی باریکیوں سے پریشان سے ہو گئے۔

”بھئی جب تم فیر ہو جھوٹ نہیں بول رہے تو سچائی کی قدر کرنا چاہیے۔“ وہ حیران سے تھے۔

”پتا نہیں کون سی دنیا میں ہو تم۔ بہر حال لگتا ہے اچھی دنیا میں ہو۔“ علی نے ٹھنڈی سانس بھری۔ ”خوش رہو۔“

”اس طرح تو بات نہیں بن رہی۔ پر اہلم فیس کرو۔ سولوشن نکالو پارٹنر۔“ تیمور علی خان نے سمجھانے کی کوشش کی۔

”ہاں تو کرو ناں پر اہلم سولو۔“ علی نے صوفے پر نیم دراز ہو کر اطمینان سے کہا۔

”تم جو کہو ہم مدد کرنے کو تیار ہیں۔ اگر ہمارے اختیار میں ہوا۔“

”بس اب تم تمہارے ہی اختیار میں ہے ڈیر۔“ علی نے بات مکمل ہونے سے پیشتر کاٹ دی۔

”واٹ۔“ حیرانی سے تیمور علی خان گلاس رکھنا بھول گئے۔

”ہاں یار..... بات تھوڑی سی غیر معقول تو ہے مگر۔“ علی نے کچھ توقف کیا۔

”ہوں ہوں..... کہو۔“ تیمور علی خان اچھے اچھے سے قریب آ گئے۔

”یار..... قسمت نے اسے ملازمہ بنا دیا ہے۔ مگر کسی طرح ملازمہ نہیں لگتی۔“ علی نے بات کرتے کرتے نظریں جھکا لیں۔

”کون؟“ تیمور حقیقت میں نہیں سمجھے۔

”نام تو مجھے پتا نہیں۔ البتہ جانا وطن ملکہ لگتی ہے۔“

”یار..... کیوں الجھا رہے ہو۔“ تیمور زچ ہو گئے۔

”واقعی..... مجھے اس کا نام نہیں معلوم۔ اس کا نام تو تم بتاؤ گے۔ بہت چھوٹی عمر ہے۔ گھبراتی بھی بہت ہے۔ بات کچھ سمجھتی ہے۔ کچھ نہیں۔“

تیمور علی خان چونک پڑے۔ اور ششدر سے علی کی شکل دیکھنے لگے۔

”مطربہ۔“ ان کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

”بی گڈ نہیں..... واٹ اے فینٹسی..... سو پر بی نیم۔“ علی تو اٹھ کر بیٹھ گیا۔

”یہ واقعی یہ اس کا نام ہے۔ بہت ہی باذوق تھا جس نے بھی یہ نام اسے دیا ہے۔“ علی کی نگاہ و لہجے میں ستائش تھی۔

”تو نہیں..... ہے..... تو کمین آپا نے دیا ہے اسے یہ نام۔“ وہ جیسے گہرے کنویں سے بول رہے تھے۔

”تو پھر کیا خیال ہے۔ کوئی قباحت تو نہیں ہے ناں؟ علی کی آتش شوق بھڑکنے لگی تھی۔

”نہیں..... کوئی قباحت نہیں ہے۔ ہم سب تو خود اس کی وجہ سے بہت پریشان ہیں اور چاہتے ہیں کہ اس کی شادی

کل کی ہوتی آج ہو جائے۔ پر اہلم سولو ہو جائیگی۔ یہ بڑی سیریس بات ہوتی ہے۔ تمہارا مزاج ذرا رنگین سا ہے۔ کیا

واقعی تم اس سے شادی کرنا چاہتے ہو؟“ تیمور علی خان نے ابھی ہوئی نظروں سے علی کو دیکھا۔

”ابھی کرادو یار!“ علی کا جواب بڑا بے ساختہ تھا۔

”بہت سی سنٹی منٹل ہو۔ دراصل ادھر بھی کچھ پر اہلم ہے۔ پہلے حقیقت جان لو۔ پھر غور کر کے فیصلہ کرنا۔“

”مجھے غور نہیں کرنا بس شادی کرنا ہے۔ یار کام سے لگ رہے ہیں، لگنے دو۔“ علی نے جھلا کر کہا۔

”ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہے۔ اب تو اپنی نوکرانی کے طور پر اسے ہمارا ذہن بھی قبول نہیں کرتا۔ اور ہم یہ بھی چاہتے

ہیں کہ جلد از جلد اس کی شادی ہو جائے مگر۔ تم پہلے تمام حقائق جان لو۔“

”تمہیں اتنا اصرار ہے تو جلد سے جلد بتا دو اور نوٹ کر لو مجھے کسی بات سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ بچھاؤ رات

جنہیں ملے کر کے مجھے منزل تک جانا ہے۔“ علی کے انداز میں بڑی بے صبری تھی۔

تیمور علی خان نے جا بختی نظروں سے علی کی طرف دیکھا۔ ”اتنی بے تابی۔ کہاں دیکھ لیا تم نے اسے؟“

”چھوڑو یہ قصہ۔ حقائق بتاؤ۔“ علی نے کوفت بھرے انداز میں کہا۔

”اس کا بیک گراؤنڈ ریڈ لائنٹ ایریا“ سے ملتا ہے۔ مگر وہ بہت انوسنٹ ہے۔ وہ نہ اس ماحول میں رہی نہ گروں

اپ (پرورش) ہوئی۔ اس کی نانی نے چھوٹے سے گاؤں میں اسے پالا۔ نکاح ہوا تھا اس کے چیرنس کا۔ ہماری بہت

پانی ملازمہ کے تعلقات ہیں اس کی نانی وغیرہ سے۔ اس کی نانی نے ہماری حویلی میں کام کیلئے بھیج دیا۔ کیونکہ وہ اسے

اس ماحول میں بھیجنا نہیں چاہتی تھی۔ البتہ اس کی اپنی ماں ریڈ لائنٹ ایریا ایکٹیویٹر میں اب بھی بڑی ہے۔ وہ اسے لینے

ہماری حویلی آئی تھی مگر یہ اس کے ساتھ گئی نہیں۔ مگر بعد میں وہ اسے اغوا کر کے لے گئی۔ شی ازاے ویری لگی۔ وہاں سے

فرار ہونے میں کامیاب ہو گئی اور حویلی واپس آ گئی۔ اس کی ماں کی وجہ سے ہی اسے کراچی شفٹ کرنا پڑا۔ اب گھر میں

سب ہی یہ چاہتے ہیں کہ اس کی جلد سے جلد شادی ہو جائے۔ اسی صورت اس کا پیچھا اپنی ماں سے ہمیشہ کیلئے چھوٹ سکتا

ہے۔“

”چھو پھر آج ہی کر لیتے ہیں شادی۔“ علی نے گہری سوچ سے چونک کر بڑی ہی بشارت سے کہا۔

”واقعی؟“ تیمور علی خان نے مسکرا کر پوچھا۔

”لیس..... آف کورس..... شی از..... انوسنٹ ویسٹ انف (وہ معصوم ہے۔ یہی کافی ہے)۔“

”مگر فی الحال تو وہ اسٹریڈ (زخمی) ہے۔ تمہیں پر اہلم ہوگی۔“ تیمور علی خان شرارت سے مسکرائے۔

علی نے تعجب سے ان کی طرف دیکھا۔ ”مین۔“

”انگو! کے بعد بہت تار چڑھ گیا تھا ان لوگوں نے۔“ تیمور علی خان نے بتایا۔

”والس مین۔ لوگوں نے۔“ علی نے الجھ کر پوچھا۔

”ہرمد رائنڈ ہرٹس۔“ تیمور علی خان نے وضاحت کی۔

”یار..... پھر بے چاری کی مرہم پٹی بھی ہو رہی ہے یا۔“

”ایک دن میں اس قدر ہمدردی۔“ تیمور علی خان قہقہہ لگا کر ہنس دیے۔

”یار! تمہاری رضامندی کے بعد اب تو جائز ہے۔“ علی کا میاں بی کے نشے سے سرشار تھا۔

”ٹھیک ہے پارٹنر! صبح ہم بابا صاحب سے بات کریں گے اور کوشش کریں گے ہماری لندن واپسی سے پہلے یہ کام ہو جائے۔“ تیمور علی خان نے مزید تقویت بہم پہنچائی۔

”یار تیمور! ایک بات ہے۔ یونہی ذہن میں آئی ہے۔ تم کچھ اور نہ سمجھ لینا۔ میں لائن پر جما ہوا ہوں اب کوئی مینڈی پوائنٹ مجھے افیکٹ نہیں کر سکتا۔“

”ہوں۔“ تیمور علی خان بھی سنجیدگی سے متوجہ ہوئے۔

”ابھی تم کہہ رہے تھے کہ اس کے پیرنس نے نکاح کیا تھا۔ تو اس کا باپ۔“

”وہ سندھ کی کوئی بڑی آسامی ہوتا ہے۔ وہ بیوی، بیٹی دونوں کو ڈس اون کر چکا ہے۔ ڈونٹ وری۔ یہ سب معلومات ہمیں بابا صاحب سے ملی ہیں اور انہیں اماں جی سے۔“ تیمور علی خان نے درمیان سے ہی بات اچک لی۔ ”مطلب یہ کہ پس ہے۔“ انہوں نے شرارتا کہا۔

”اتنی کنجوسی بھی اچھی نہیں ہوتی الفاظ ہی تو ہیں۔ ماسٹر ہیں کہو۔“ علی کی خوشی اس کے ایک ایک انداز سے چھلک رہی تھی۔

”اگر سندھ کی طرف سے پہلو تو پھر ماسٹر ہیں کہنا زیادہ سوٹ ایبل ہے۔“ دونوں کے مشترکہ قہقہے سے کرا گونگ اٹھا۔

”یار! ہم تو یونہی چھوٹے موٹے سرکاری افسر ہیں تب تم ہمیں رتھیں مزا جی کا الزام دیتے ہو۔ اصل کام تو مینڈول لارڈز دکھاتے ہو۔“

”ہمیں نکال دو پارٹنر۔ یقین کرو ہم خاصے ٹھیک ٹھاک ہیں۔“ تیمور نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”لگائیں گے عنقریب ہم لندن کا بھی ایک چکر۔ دیکھیں گے تمہارے رنگ ڈھنگ۔“ علی نے اپنے اگلے پروگرام سے باخبر کیا۔

”فکر ہی کوئی نہیں۔“ تیمور علی خان نے اطمینان سے جواب دیا۔ وہ خوبصورت سی کرسی پر علی کے عین مقابل بیٹھے ہوئے تھے۔

”خان۔“ دروازے پر دستک ہوئی اور صابرہ کی آواز آئی۔

”ہوں۔“

”اب آگ گیا ہے۔ اور وہ جی مہمان اپنے کمرے میں نہیں ہیں۔“ صابرہ نے مزید کہا۔

”ہم ایک وقت میں دو جگہ کیسے ہو سکتے ہیں کیونکہ ہم تو یہاں ہیں۔“ علی کے ایک ایک انداز میں تازگی کا اثر محسوس ہو رہا تھا۔ اور تیمور علی خان کو اس پر قطعاً کوئی حیرت نہیں تھی۔

”امنائی کیلئے ہاتھ میں ڈسٹر لئے لاؤنچ میں آئی تھی۔ تیمور علی خان فون پر مصروف تھے۔ خالی بیٹھے بیٹھے وہ اکتا گئی۔

صابرہ نے تو اسے بہت منع کیا تھا اور آرام کی تاکید کی تھی۔

”ایک منٹ پلیز۔“ تیمور علی خان نے فون کرتے کرتے ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھ دیا۔

”وہ..... کیا نام ہے ابھی ہم فون کر رہے ہیں۔ بعد میں ادھر آنا

اس نے ایک انفرادی کیفیت میں گلدان واپس کارنر ٹیبل پر رکھ دیا اور خاموشی سے باہر نکل گئی۔

”جی بابا صاحب! اچھا۔ فون پر دمکی آپ کو دی گئی یا کسی اور بات ہوئی تھی؟

اچھا..... اچھا۔ ہماری قانونی حیثیت کمزور سی۔ لیکن ہم اسے جیتنے نہیں دیں گے انشاء اللہ۔

پروزل۔ اچھا۔ عارف اچھا لڑکا ہے۔ لیکن ابھی کلیئر نہیں ہے کہ کیا کرے گا۔ ہمارا خیال ہے ابھی اس کی عمر خاصی

کم ہے۔ جی وہ تو ٹھیک ہے۔ وہ ملازمہ ہے۔ تسلیم۔ لیکن اب وہ اپنے سارے بیک گراؤنڈ سے باخبر ہے۔ اس کی جان

پانے کیلئے شادی کا وقتی کھیل کھیلنا بہت بے اصولی کی بات ہوگی ہمارا خیال ہے۔ تمام حالات سے باخبر ہونے کے بعد

اس کی ٹیٹلی لٹی (طرز فکر) بہت چمچ ہو گئی ہوگی۔ اور وہ اتنی آسانی سے کمپروماز لائف نہیں گزارے گی۔ ہمارے پاس

الٹرنیٹ ہے ناں تب ہی تو آپ سے اتنی بات کی ہے۔ ہم تو خود ابھی آپ کو رنگ کرنے والے تھے۔

”جی جی۔ بتا رہے ہیں۔ وہ علی ہے ناں۔ جی جی۔ مہندی۔ اس کو بہت پسند آگئی ہے۔ رات ہی اس سے بات

ہوئی ہے۔ جی۔ نہیں نہیں۔ وہ گھر لانا چاہ رہا ہے۔ ہم نے اس سے تفصیلی بات کی ہے۔

جی اسے سب بتا دیا ہے۔ اے ٹو زیڈ۔ اب یہ تو وہ خود بہتر سمجھتا ہوگا۔ ہم نے تو اس سے کچھ نہیں چھپایا۔ کیا برابری

کرے گی ہماری۔ ہمارا اور علی کا خاندان حسب نسب سب ڈفرنٹ ہے۔ آپ اتنی گہرائیوں میں مت جائیں۔ دنیا بہت

اگے جا چکی ہے۔ اگر نسب کی اہمیت ہر شے سیدھ کر ہے۔ سو واٹ۔ وہ بڑی خاندانی ثابت ہو چکی ہے۔ یہ تو اس کے

اپ کے سوچنے کی بات تھی۔ ہمیں کیا.....؟

نہیں نہیں..... بابا صاحب وہ سیریس ہے۔ اگر وہ درخت پر بھی اگی ہے تو اسے منظور ہے۔ ڈونٹ وری۔

نہیں۔ ابھی اسے نہیں معلوم۔

جی جی..... بہت بہتر ہوگا۔ وہ اس لئے کہ ہماری واپسی میں بھی چند دن رہ گئے ہیں۔ ٹھیک ہے جب فیصلہ تقریباً ہو

چکا ہے تو ضرور اماں جی کو بھی ساتھ لے آئیں۔ ظاہر ہے وہ انہیں خالہ کہتی ہے۔ وہ بھی ضرور آئیگی۔

اس کی اب فکر نہ کریں اس سے ہم خود بات کر لیں گے۔ یوں سمجھئے کہ کوئی مسئلہ پیرا ہی نہیں ہوا تھا۔

او۔ کے۔“

انہوں نے بہت ریلیکس انداز میں ریسور رکھ دیا۔ اور لاؤنج سے باہر آ گئے۔
”صابرہ۔“

”جی خان! صابرہ فوراً کہیں سے نمودار ہو گئی۔“

”دیکھو۔ اسے تکلیف ہے۔ اس سے کام مت کراؤ۔ اسے ریٹ دو اور کھانے پینے کیلئے اچھی چیزیں دو۔ جس سے انرجی گین ہوتی ہے۔ ہمارا مطلب ہے۔ طاقت آتی ہے۔ اسے جلد سے جلد فریش ہونا چاہیے۔ لہجہ پر بہت اچھی چیزیں تیار کرنا۔ تاکہ مہمان خوش ہو۔“

”اتنا خیال کر رہے تھے تیمور خاناں اس کا۔ اسے اپنی آنکھوں اور کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ وہ جیسے چکا چوند کر دینے والی روشنی میں آکھڑی ہوئی تھی۔“

انگ انگ میں سرسستی سی اترنے لگی۔

”اماں جی نور بابا صاحب۔ ممکن ہے رات کو آجائیں ورنہ صبح کو ضرور آجائیں گے۔ ان کا کمر اچیک کر لینا اور کے ہم باہر کام سے جارہے ہیں۔ علی واپس آئے تو اسے کہنا لہجہ پر ملاقات ہوگی۔“

وہ جیب میں چابیاں ٹٹولتے آگے بڑھ گئے۔

”ہائے اللہ..... اماں جی آ رہی ہیں۔“ مطربہ تو جیسے خوشی سے ناچ اٹھی۔

”جو بات سب سے پہلے بتانا چاہیے تھی وہ بعد میں بتائی۔ تیمور خاناں بھی بس۔ اماں جی کو انڈے آلودہ والی بھائی بہت پسند ہے۔ میں خود بناؤں گی۔ اماں جی کیلئے۔ انہیں کچھ دوی اور پودینے کی چٹنی بھی بہت پسند ہے۔ یہ بھی بنا کر لے گئے۔ ٹھیک ہے ناں خالہ۔“ وہ سر سے پاؤں تک خوشی سے چور تھی۔

”ہاں..... ہاں کیوں نہیں۔ ہماری مالکن تو بہت ہی سادہ ہے۔ کتنا لمبا دسترخوان ہے حویلی کا۔ اور اماں جی کے کھانے میں بھی سادگی۔ میں تجھے غور سے دیکھ رہی تھی ابھی۔ کتنی محبت کرنے لگی ہے تو اماں جی سے۔“

صابرہ نے اس کی شکل خوشگوار حیرت کے ساتھ دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

”لو..... وہ ہیں ہی اتنی اچھی۔ نہ گالی دیتی ہیں۔ نہ اونچا بولتی ہیں۔ نہ طعنے بوجائے تو انجان بن جاتی ہیں۔ اکیسے میں سمجھاتی ہیں۔ اگر اماں جی مجھے کہیں کہ ساری رات میری ٹانگیں دبا تو میں ساری رات دباؤں۔“ وہ سادگی سے کہتی کچھ میں گھس گئی۔

”اس میں تو کوئی شک نہیں کہ اماں جی بہت اچھی ہیں۔ مگر تو بھی بڑی اکیل ہے۔ محبتوں کی قدر پہنچاتی ہے۔ اللہ تیرے نصیب اچھے کرے۔“

سیب کاٹ کر دوں۔ کھائے گی۔ تیمور خاناں کہہ کر گئے ہیں۔ تجھے اچھی چیزیں کھلاؤں۔“ صابرہ نے فریج کھولنے سے کہا۔

”پتا نہیں کون سے اکھاڑے میں بھیجیں گے مجھے خان۔ فالٹو کی طاقت کا کیا کروں گی میں؟“ وہ شرارت سے ہنسنے لگی۔

بہن سترائی۔

بہن ہنس کر لوٹ گئی۔

”بہن! کبھی طاقت بھی فالٹو ہوتی ہے۔“

”جی جی کہتی ہیں کہ بجلی سے چلتی ہوں۔ تھکتی نہیں ہوں۔“

”جی جی! اس طرح منہ بھر کر نہیں بولتے۔ اللہ کا شکر کرتے ہیں۔ اپنی بھی نظر لگ جاتی ہے بندے کو۔“ صابرہ نے ہنس کر کہا۔

”بہن! کی کھلائی پلائی کا کمال ہے۔ اچار مرے کھانے نہیں دیتی تھی کہ کھٹائی زیادہ کھانے سے روگ لگ جاتے۔ بہت جلدی ڈھل جاتی ہے۔ بیسی روٹی پر کھن کا پیرا صبح صبح کھلاتی تھی اور چمٹالے کر بیٹھ جاتی تھی کہ سارا کھانا کھا جائے۔“

”بہن! کھانے بھی نہیں پینے دیتی تھی کہ خون جلاتی ہے۔ میں چھپ کر سردار ماموں کے ہاں پی آتی تھی۔“

”خالہ۔“ وہ بولتے بولتے چپ ہو گئی۔

صابرہ جو بڑے دھیان سے اس کی باتیں سن رہی تھی ایک دم چونکی۔ ”ہوں؟“

”خالہ! میں اپنی نانی کو کب دیکھوں گی؟“ اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ ”میں نے خالہ سولہ آنے سے کہا بھی تھا کہ نانی کب آئیں گی۔“

”اماں جی بے چاری تو کچھ بھی نہیں کہیں گی۔“

”اماں جی بے چاری تو کچھ بھی نہیں کہیں گی۔“

”اماں جی بے چاری تو کچھ بھی نہیں کہیں گی۔“ وہ نانی کو یاد کر کے کہنے لگی تھی۔

”اماں جی بے چاری تو کچھ بھی نہیں کہیں گی۔“

”اماں جی بے چاری تو کچھ بھی نہیں کہیں گی۔“

”اماں جی بے چاری تو کچھ بھی نہیں کہیں گی۔“

”اماں جی بے چاری تو کچھ بھی نہیں کہیں گی۔“

”اماں جی بے چاری تو کچھ بھی نہیں کہیں گی۔“

”اماں جی بے چاری تو کچھ بھی نہیں کہیں گی۔“

”اماں جی بے چاری تو کچھ بھی نہیں کہیں گی۔“

”اماں جی بے چاری تو کچھ بھی نہیں کہیں گی۔“

”اماں جی بے چاری تو کچھ بھی نہیں کہیں گی۔“

”اماں جی بے چاری تو کچھ بھی نہیں کہیں گی۔“

”اماں جی بے چاری تو کچھ بھی نہیں کہیں گی۔“

”اماں جی بے چاری تو کچھ بھی نہیں کہیں گی۔“

”آج رات یا کل صبح وہ یہاں آ جائیگی۔ تمہاری لائف چنچ ہو جائیگی تو سب کچھ ٹھیک ہو جائیگا۔“
”اچھا..... یہ بتاؤ..... تم اور پرگنی تھیں؟“ وہ اصل موضوع پر آ گئے۔

مطربہ کا دل بڑے زور سے دھڑکا۔ ٹانگیں کاہنے لگیں۔
”آپ نے تو منع کر دیا ہے۔“ وہ بمشکل گویا ہوئی۔

”غالبا ہمارے منع کرنے سے پہلے تم اوپر کا چکر لگا آئی تھیں۔“ وہ بہت غور سے اس کا چہرہ دیکھ رہے تھے۔
مطربہ کی پیشانی پر موتی چمکنے لگے۔ (خان کو کیسے پتا؟)
وہ خاموش رہی کچھ بولا ہی نہیں گیا۔

”جواب دو بھی۔“

”جج..... جی۔ وہ خالہ کو ڈھونڈنے گئی تھی۔“ اس کی آواز کانپ رہی تھی۔

”کوئی ملا تھا تم سے؟“ وہ سینے پر بازو لپیٹے اطمینان سے پوچھ رہے تھے۔

”نہیں تو۔“ ڈر سے اس کی حالت غیر ہونے لگی۔

”جھوٹ بول رہی ہو تم۔“ وہ ناراض ہوئے۔

”خان! اللہ کی قسم مجھے تو پتا نہیں تھا۔ خالہ نے منع کر دیا تھا۔ ورنہ میں چائے لے آتی۔“ وہ رو پڑی۔

”چائے۔ نان سنس۔ یہ چائے کہاں سے آگئی؟“ وہ الجھے۔

”چائے ہی کی تو بات ہوئی تھی۔ مہمان نے کہا تھا کہ چائے خود لے کر آنا، مگر خالہ کہنے لگیں۔ خان لوگ تو اپنے ہاں تو ہر کسی کے سامنے مت جایا کر اسی لئے میں نہیں گئی تھی، خالہ چائے خود لے کر چلی گئی تھیں اور انہوں نے اسی بات پر۔“
”میری شکایت لگائی ہوگی۔“ وہ روتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

”ہم سے کسی نے شکایت نہیں کی۔“ تیمور علی خان نے بمشکل اپنی مسکراہٹ چھپائی۔

”ہیں۔“ وہ ہکا بکا ان کی شکل دیکھنے لگی۔

(یہ کیا کر دیا اس نے خود ہی ساری بات کھول دی)

”تم نے اندازہ لگایا کہ کیسا ہے وہ شخص؟“ وہ سنجیدگی سے پوچھ رہے تھے۔

وہ خاموش کھڑی آنکھیں صاف کرتی رہی۔

”کچھ پوچھ رہے ہیں ہم تم سے۔“ وہ پھر گویا ہوئے۔

وہ ہونٹ کاٹنے لگی۔ ”وہ آپ کے مہمان ہیں آپ برامانیس گئے۔“ وہ بہت ہچکچاتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

”نہیں، ہم بالکل برانہیں مانیں گے۔“ انہوں نے اطمینان دلایا۔

”وہ..... پتا نہیں کیسی باتیں کرتے ہیں، دل کو اچھی نہیں لگتیں، کل صبح باغ میں۔“ وہ بولتے بولتے ایک دم

ہو گئی۔

”ہوں تو باغ میں بھی ملاقات ہوئی ہے۔“ تیمور کا لہجہ معنی خیز تھا۔

”میں جانتی تھی۔“ اس کی آواز پھر رندھ گئی۔

”اب ان باتوں کا کوئی فائدہ نہیں، بس تمہیں یہ بتانے کیلئے بلایا ہے کہ تمہاری شادی ہو رہی ہے اس مہمان کے
جن کی زندگی ہے کہ ایک تعلیم یافتہ شخص تم سے شادی کا خواہشمند ہے، ہم تمہیں یہ سمجھانا چاہتے ہیں کہ تم تعلیم
پہنچیں ایڈجسٹ کیلئے بہت محنت کرتا ہوگی۔ امکان ہے کہ جلد ہی وہ مزید اعلیٰ عہدہ حاصل کرے گا اور تمہیں
بہتر ملے گی۔ شادی ایک نو بل اور ڈیوٹی فل ہمارا مطلب بڑی ذمہ داری ہے۔ اس وقت وہ صرف تمہارے
پر ہوتا ہے اور اس شادی کی بنیاد ہی تمہاری صورت شکل ہے لیکن جب لائف پریکٹیکل ہو جاتی ہے یعنی وہ کیا
پریکٹیکل صورتحال بدل جاتی ہے۔ حسن صورت بیک گراؤنڈ میں چلا جاتا ہے۔ جب ضروری اور حقیقی تقاضے
پیدا ہوتے۔ تو مسائل پیدا ہو جاتے ہیں۔ ہمارے کہنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ بائی لک جب ایک اچھا ساتھی
ہو جائے تو اسے کسی موڑ پر پھنساؤ کا احساس نہ ہونا ہے دینا۔ مضبوط شادی تمہارے اپنے حق میں ہر طرح سے
ہو۔ جس میں اس شیم فل بیک گراؤنڈ سے ہمیشہ کیلئے چھٹکارا مل جائے گا۔ تم پڑھنا لکھنا شروع کر دینا۔ آس پاس
باجو دار خواتین سے کچھ سیکھنے کی کوشش کرنا تاکہ تمہارے ساتھی کو زندگی میں کبھی بھی اپنے فیصلے پر ندامت محسوس

ناگوار میں بھی ایک پروپوزل ہے تمہارے لئے، شاید تم نے اس لڑکے کو دیکھا بھی ہو، عارفہ، نام ہے، مگر ہم
تمہارے ساتھ جو قسمت کے ہاتھوں ظلم ہوا ہے، جس کے ذمہ دار تمہارے والدین ہیں اس میں مزید اضافہ نہ
کریں، ایک اچھی زندگی گزارنے کا موقع مل رہا ہے تو ہمیں زیادتی سے کام نہیں لینا چاہیے۔ آفر آل تم ایک بڑے

لڑکے جا رہے تھے اور مطربہ ششدر آنکھیں پھاڑے ساکت و صامت ان کی سمت دیکھ رہی تھی۔

”مگر ہم کے تیری پردوں میں آگ لگ گئی تھی۔ کمرے میں تندور کی سی تپش تھی۔“

”غیر کی صورت یوں محسوس ہو رہی تھی، جیسے کوئی سفاک و بے رحم قاتل کسی کو مار کر مردہ جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کر

رہا۔“ اس کی آواز جیسے کسی کنویں سے برآمد ہوئی۔

”نہیں، ایک عزت دار تھی تو حویلی کی نوکر کیوں ٹھہری، کسی تخت پر کیوں نہ بٹھا دیا حویلی والوں نے مجھے۔“ پتا
”نہیں، عزت دار تھی اس میں ایک لمحہ کو تو تیمور علی خان بھی چکرا کر رہ گئے۔“

”موت میں تم سے کوئی اور رشتہ قائم کر لیا جاتا۔ حویلی میں جو نوکری کی غرض سے داخل ہو گا، وہ نوکر ہی
ہو گا۔“ وہ قدر خفا

”پھر مجھے نوکر بنی رہنے دیجئے“ میں اسی میں خوش ہوں۔“ اس کے سینے سے ایک ہوک سی اٹھی۔
(مجھے صاف اٹھرا بھی کہتے ہو خان بڑے آدمی کی بیٹی ہونے کا اعتبار بھی کرتے ہو پھر بھی میرے ہونے سے)

ہو۔ تمہیں دیکھ کر پوچھا پاٹ کی وجہ سمجھ میں آگئی روپا دیوی۔ ہومان کی مورتی کے آگے ہاتھ جوڑتی ہے شہر ہوتی ہے۔
میں۔ اتنا اللہ کو دھیان میں رکھتی تو اللہ والی ہو جاتی۔ بیماروں کو پانی دم کر کے دیتی تو انہیں شفا ہو جاتی۔
کون سے سمندر سے چٹان سے بنے ہو۔ کبھی کچھ احساس نہیں ہوا؟)

”ہم نے تمہیں اس لئے بلایا ہے کہ تمہیں فیصلہ سنا لیں اور آگے کی اونچ نیچ سمجھائیں۔ تم ہمیں کوئی پتہ نہیں
گی۔ تمہیں پتا ہے تمہاری ماں وہاں جوہلی میں بابا صاحب کو فون پر دھمکی پر دھمکی دے رہی ہے۔ تمہاری بہن نے
لوگوں کی لائف ڈسٹرب ہو رہی ہے۔

تمہارے احمق پن کی انتہا تو یہ ہے کہ تمہیں اپنی خوش قسمتی کا اندازہ نہیں ہے۔“

”خان! میں آپ کے آگے ہاتھ جوڑتی ہوئی۔ مجھے کینئر ہی رہنے دیں۔ اختیار اور عزت والی زندگی چاہتی ہوں۔
ایک بات کی کمی عمر بھر ستائے گی۔“

تیور علی خان کو وہ لکھت ہی بہت بردبار اور بڑی محسوس ہوئی۔

”ایک ٹھیک ٹھاک بندے سے تمہاری شادی پر جانا ہو طرح سے تمہارے حق میں ہے۔ تم ہمیشہ کیلئے اس عورت سے
چھٹکارا پا لوگی۔“

”خان!“

”شٹ اپ مطربہ! تمہارے پاس دو ہی راستے ہیں۔ ایک تو یہ کہ تمہاری شادی ہو جائے یا پھر یہ کہ تم انہما
ساتھ واپس چلی جاؤ۔ ہم انگلینڈ جا رہے ہیں۔ بصیر بھائی زیادہ تر سرائے میں ہوتے ہیں۔ یاد رہے بھائی اور بھتیجی
ہوتے رہتے ہیں۔ ہم بابا صاحب کیلئے مفت کا درد سر چھوڑ کر جانا نہیں چاہتے۔ بڑے بھائی ہیں تو وہ وہاں
سیدھے سادھے ہیں۔ صبح اماں جی آجائیں گی۔ دونوں میں سے جو تجویز بھی پسند آئے۔ اماں جی کو بتا دینا۔“

کھڑے ہوئے۔

”خان۔ کوئی تیسرا راستہ؟“ اس کی آواز بھر اگئی۔

”بہت۔ بلکہ سب سے آسان ہے۔ مگر ہمارا ضمیر ہمیں اجازت نہیں دیتا۔ وگرنہ یہ آسان راستہ ہم تمہیں
بتاتے۔ فی الحال۔ رات پڑی ہے۔ دونوں راستوں پر خوب غور کرو۔ جوہلی میں کبھی اتنا ٹینشن نہیں ہوا تمہاری ماں
سب ڈسٹرب ہوئے ہیں۔ نوکر بننے پر اصرار تو کرتی ہو مگر نوکر بننا نہیں آیا تمہیں۔ اس میں ہماری غلطی ہے۔
غلطی ہے۔“

وہ اس کے واضح انکار پر سخت برہم نظر آرہے تھے۔

”ہم نے اپنی زندگی میں اتنا احمق کوئی نہیں دیکھا۔“ وہ یہ کہہ کر باہر نکل گئے۔

وہ بے دم انداز میں کارپٹ پر بیٹھ گئی۔

مجھے خان کہ میں غلط ہوں۔ مگر۔
میں غصے میں چہرہ چھپا کر وہ رو پڑی تھی۔

رات کو دھن بدلتے گزر گئی تھی۔
نہ جانے نور کے تڑکے آنکھ لگی تھی۔

یہ کہ نہیں اٹھایا تھا وہ خود ہی جاگئی تھی۔ اتنا سونے کے باوجود سر بھاری سا محسوس ہو رہا تھا۔

دیرانی دھشت تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا پیدائش سے لے کر کل رات تک وہ ایک حسین خواب کے طلسم میں تھی۔
ہنر پڑھ رہی تھی، حصار باندھ کر پڑھائی میں کچھ بھول ہو گئی۔ حصار ضائع ہو گیا۔ طلسم ٹوٹ گیا۔
ذہن تک احساس زیاں تمام محنت کا حاصل رہا۔

بجائے بیرونی برآمدے میں آئی تو بے ساختہ خوشی اس کے خون میں دوڑنے بھاگنے لگی۔

اس میں اماں جی، ترمین اور تازمین بیٹھی خوش گپیوں میں مصروف تھیں۔

نے سب کو مشترکہ سلام کیا اور اماں جی کے سامنے سر جھکا دیا۔

مانے شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

بیت اچھی نہیں ہے شاید تیری۔ بہت دیر سوئی۔ میں تو سوچ رہی تھی کہ تو پھانک پر کھڑی ہوگی۔“

لی اماں جی۔ میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ اس نے جھک کر ان کے پاؤں تھام لئے۔ اور فرش پر بیٹھ گئی۔

یہ ہو گیا؟“ ترمین نے پوچھا۔

انہوں میں بہت دھن ہو رہی ہوگی۔ کیوں؟“ اماں جی نے ہمدردی اور دکھ سے اس کی سمت دیکھتے ہوئے

لی اماں جی۔ اتنی دھن تو زندگی میں کبھی نہیں ہوئی۔“ وہ ان کے گھٹنوں پر حزن لگا کر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔

”وہ بھئی بات یہ ہے کہ اس طرح نہیں کھڑے ہوتے۔“
 وہ قدرے الجھ کر گویا ہوئے، جیسے اپنی بات کہنے میں انہیں بہت دقت ہو رہی ہو۔
 ”کس طرح خان؟“ اس کے ہونٹوں پر تلخ سی مسکراہٹ ابھری اور فوراً ہی معدوم ہو گئی۔
 ”بھئی وہ تمہاری شادی ہو گئی ہے۔“ وہ اپنی بات کہہ نہیں پار رہے تھے۔
 ”شادی کے بعد کیا ٹھنڈی ہوا میں کھڑے نہیں ہوتے؟“ اس کا لہجہ زہریلا تھا۔
 تیمور علی خان کی طبع کے برعکس تھا یہ سب، مگر انہوں نے بہت ضبط کیا۔
 ”اہم کمر ہے ہیں ناں کہ کمرے میں جاؤ۔“ انہوں نے نرم لہجے میں کہا۔
 وہ اس سے مس نہ ہوئی جیسے کچھ سنا ہی نہیں۔
 ”آپ مجھے کچھ نہ کہیں خان! ورنہ میں نیچے چھلانگ لگا دوں گی۔“ اس کے اندر سے جیسے آتش فشاں ابل پڑا۔
 ”نان منس۔ نہایت احمق اور احسان فراموش قسم کی لڑکی ہو۔ شاید ہم غلط جگہ پر بھلائی کر بیٹھے ہیں۔“
 ”غور بادی! آپ نے میرے ساتھ کی ہے۔ میں اسے کبھی نہیں بھول پاؤں گی۔“
 ایک جھٹکے سے مزی اور غرارے میں الجھتی کمرے میں چلی گئی۔

شام کو ہی نکاح ہو گیا تھا۔

تیمور علی خان اپنی جگہ دم بخود سے کھڑے رہ گئے۔ ایک بھاری پتھر وہ ان کے اعصاب پر مار گئی تھی۔ نہیں آ رہا تھا کہ وہ یہ سب کہہ گئی ہے۔ وہ کچھ دیر اسی طرح کھڑے رہے پھر آگے بڑھ گئے۔

علی پھولوں کا ہار ہاتھوں میں تھامے کتنی دیر سے اسے تک رہا تھا۔

”خوش قسمتی کا یقین نہ آئے تو کیا کرنا چاہیے محترمہ؟“ وہ آہستہ آہستہ چتا اس کے قریب آیا۔ جواب میں سکوت طاری رہا۔

”یہ تو چھو منتر ہوا ہے۔ سنا ہے لوگ تو عشق کی راہ میں بڑے کٹھ کرتے ہیں پھر بھی گوہر مقصود ہاتھ نہیں ملتا۔ واقعی آپ میرے سامنے بیٹھی ہیں یا مرنے کے بعد سیدھا سیدھا جنت میں پہنچ گیا ہوں؟ وہاں ایک شوخی کا عالم تو زور۔ ”ٹھہریے“ ابھی چھو کر دیکھتا ہوں۔ شاید پھر یقین آجائے۔“ وہ آہستگی سے بیڈ پر بیٹھ گیا۔

”کوئی ضرورت نہیں ہے مجھے چھونے کی۔“ وہ جیسے چٹچٹ چٹ گئی۔

”واہ..... کیا بولی ہیں۔ ویسے پتا ہے کہ آپ زخمی ہیں۔ مگر خیر کوئی بات نہیں۔ اب مرہم رکھنے کیلئے ہم جو ہیں۔ ہنر سے مرہم رکھیں گے کہ زخم زخم پھول بن جائے گا۔“ وہاں ایک شرارت ہنوز تھی۔

”یقین کیجئے۔ آپ نے تو ہمیں مار ہی دیا ہے۔“ اس نے مطربہ کا ہاتھ تھام لیا۔

مطربہ کو جیسے بچھونے ڈنک مار دیا۔ ایک دم اچھلی تھی۔

”آپ مجھے ہاتھ نہیں لگائیں۔“

”اتنے سستے میں کون ہاتھ لگانے کی اجازت دیتا ہے۔ نان نفقے کی ذمہ داری لی ہے عمر بھر کیلئے۔ اگرچہ آپ حساب سے بہت معمولی سی بات ہے۔ آپ تو موتیوں میں تولنے کے لائق ہیں۔ سچ تو یہ ہے۔“ وہاں انداز بدستور تھا۔

”دیکھئے پہلی بات تو یہ ہے کہ میں آپ کو بالکل نہیں جانتی۔“

”میں آپ کو اس بات کی اجازت بالکل نہیں دوں گا کہ آپ مجھے الٹی چھری سے ذبح کریں، مرے کو کیا مارا؟“ علی تو اس کے انداز پر اپنے حواس ہی کھو بیٹھا۔ اور اس کی بات بے ساختہ کاٹ دی تھی۔

”دیکھئے۔ میں بہت دکھی ہوں۔“ مطربہ بے بسی سے چہرہ ہاتھوں میں چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی تھی۔

”آپ کے ایک ایک دکھ میں شریک ہونے کا وعدہ کرتا ہوں۔ ہر بھر کیلئے آپ کو اپنا لیا ہے۔“ وہ قدرے سنجیدہ ہو کر

”آپ میرا دکھ دور نہیں کر سکتے۔“ اس نے بہتے اشک صاف کئے۔

”کم کرنے کی کوشش تو کر سکتا ہوں۔“

علی جیسے حاضر جواب مرد کے سامنے اس کی سادگی بے بسی میں بدلنے لگی۔

”مجھے آپ کے تمام حالات کا پتا ہے۔ یہ بھی کہ ایک لکھ پتی کروڑ پتی لڑکی معمولی خادمہ بن کر کیوں رو رہی ہے کے اس جذبے نے تو جیسے مجھے خرید ہی لیا۔ ایسا موتی جو سیپ کی کوکھ سے باہر ہی نہیں آیا۔ جسے سورج کی کرن

پر بھی نہیں۔ مجھے تو اپنی اس پہلی نظر پر شرمندگی ہے جو بے حجاب آپ کو سر سے پاؤں تک چھو گئی تھی۔ جتنی نفاست و زینت آپ کے ظاہر میں ہے اس سے کہیں زیادہ آپ کے باطن کی آرائش ہے۔ مجھے اپنی خوش قسمتی پر ناز ہو رہا ہے کہ نہ بتائی کو چھونے والی پہلی روشنی کی کرن میں ہوں۔

میں آپ کو سونے چاندی میں تولنے کا وعدہ نہیں کرتا۔ مگر یہ ضرور کہوں گا کہ آپ کی خوشی میرا مقصد ہوگی۔ میرا ایک بیٹا ہے۔ آپ کو پتا ہوگا۔ بہت چھوٹا ہے ابھی۔ بہت پیارا بچہ ہے۔ آپ اس ذمہ داری میں میرا ہاتھ بٹائیں گی تو میں ہمیشہ ذرا آپ کا مقروض سمجھوں گا اور چاہوں گا کہ بدلے میں آپ کو ہر طرح سے خوش رکھ سکوں۔

اسے ابھی ٹھیک طرح سے بولنا نہیں آیا۔ وہ آپ کو امی کہے گا تو آپ کو بہت اچھا لگے گا۔ آپ اسے پیار دیں گی تو میں اور پیاری ہو جائیگی۔

اس نے آج تک لفظ ”امی“ نہیں بولا۔ مجھے خوشی ہے کہ جب وہ ہوش کی عمر میں آئے گا تو اس کے پاس سب کچھ ہو گا۔ ماں باپ اور دنیا کی دوسری ڈھیروں نعمتیں۔ ہماری دنیا اب بہت مکمل اور خوبصورت ہوگی۔ میرا خواب ہے کہ آپ کو برے گھر میں ہر طرح کا آرام ملے۔“

اس نے باتیں کرتے کرتے ایک خوبصورت انگلی اس کی انگلی میں ڈال دی۔

مطربہ ہنر کے بت کی طرح ساکت بیٹھی تھی۔ بمشکل اس کے لب پھڑ پھڑائے۔

”آپ کا بچہ کہاں ہے وہ؟“ اس کی آواز میں لرزش تھی۔

”یہ قیمتی رات تو آپ کی ہے۔ وہ بھلا یہاں کیوں آ سکتا ہے۔ کسی نو خیز لڑکی کے خوابوں کا حاصل ہوتی ہے یہ رات۔ میں کم از کم یہ زیادتی تو نہیں کر سکتا تھا آپ کے ساتھ۔ وہ حیدر آباد میں ہے اپنی آیا کے پاس۔ جب ہم حیدر آباد جائیگے تو وہ اپنی خوبصورت مسکراہٹ کے ساتھ ہمارا استقبال کریگا۔ وہ اتنا پیارا ہے کہ شاید آپ ہمیں بھول جائیگی لیکن آپ ایسا کریگی تو بہت لڑائی ہوگی۔“

علی نے اس کا ہاتھ تھام کر پہلی بار اپنے استحقاق کی مہر ثبت کی۔

مطربہ کی جان کانپ کر رہ گئی۔ ابھی تک وہ غائب دماغی کی کیفیت میں مبتلا تھی۔

”آپ کا بچہ..... تو آپ کی بیوی؟“ اس کا دل جانے کیوں ڈوب رہا تھا۔

”وہ اب اس دنیا میں نہیں ہے۔ اگر وہ ہوتی تو خان زادہ اتنی آسانی سے آپ کو میرے حوالے کیسے کر دیتا؟“ علی نے پورنگاہ اس کے چہرے پر ڈالی۔

”خان زادہ؟“ مطربہ نے چونک کر پلکیں اٹھائیں۔

”تیمور علی خان۔ میری جان! یہ بھی نہیں جانتیں؟“ وہ ہنس دیا۔

مطربہ کا چہرہ جیسے یک دم پتھر کا ہو گیا۔ باطنی کیفیت کی ایک ایک لہر چہرے پر جیسے نقش ہو گئی۔

”ایک بات ہے۔“ اس کی آواز قطعی بے تاب تھی۔

”ہم اللہ..... ارشاد ہو۔“ علی گاؤں کی پہلو میں لے کر نیم دراز ہوتے ہوئے شوخی سے گویا ہوا۔

”جب آپ مجھ سے بات کریں تو حویلی کے کسی شخص کا ذکر بیچ میں نہ لائیں۔“

اس کی آواز میں کسی پاتال کی سی گہرے دکھ کی کاٹ تھی۔

عجیب تاثیر ہے نکاح کے چند بولوں کی دوا جنہی رفاقت کی ہر لہر کو دل سے گزرتا محسوس کرنے لگتی ہیں۔ قریب قریب جگہ آپ بنانے لگتی ہیں۔

حالانکہ اس نے کتنا معصوم ارادہ کیا تھا کہ وہ علی کو ہر طرح سے مایوس کرے گی۔ تہہ اوڑھ لے گی۔ بگاڑی لپیر لے گی۔

اور علی کے وارفتہ اور اپنا بیت بھرے لب و لہجہ نے اسے بے حد کمزور کر دیا تھا۔ اس پر سے وہ ”نفسیاتی ٹریٹمنٹ“ جو عموماً دلہن کو دی جاتی ہے۔ تزئین نے اسے یہاں پہنچانے سے پہلے جانے تہی قسم کی نصیحتیں کی تھیں۔ علی کیلئے اس کے دل میں ایک دروازہ بے آواز کھولنے کی کوشش کی تھی۔ اس وقت تو وہ بغاوت و نفی کے مرحلے طے کر رہی تھی۔ تزئین کا ایک ایک لفظ اسے چھلنی کر رہا تھا۔ مگر علی کے لب و لہجہ کی خواب پرور حلاوت یادداشت کے خفیہ گوشوں سے تزئین کے غریب داؤ بیچ ڈھونڈ لائی تھی۔

ایک بے توقیر اور حقیقی رشتوں کی محبت سے محروم اور پھر بے حد کم عمر اتنی پختگی کہاں تھی کہ ایک بھر پور مرد کا مقابلہ پاتی۔

اس پر مستزاد ایک بے ماں کے معصوم بچے کا ذکر۔ اس کی تمام تر دنیا کمرے کے اندر گردش کرنے لگی۔

”آپ کی بیوی“۔ اس نے کچھ بولنا چاہا۔

”وہ تو اب آپ ہیں“۔ وہاں سے برجستہ جواب آیا۔

”میرا مطلب ہے کہ“۔ حیانے اس کی قوت منتشر کر کے رکھ دی۔

”وہ عشق کرتی تھی مجھ سے۔ میرے اپنے قبیلے کی تھی۔ بچپن کی مانگ تھی مگر پھر ایسا ہوا کہ ہمارے خاندانوں میں قتل کی وجہ سے دشمنی ہو گئی اور دشمنی بھی اعلیٰ درجے کی۔ اس وقت میں پڑھ رہا تھا اس دشمنی کے نتیجے میں ہماری متعلقہ بھی ختم ہو گئی۔ دکھ تو خیر مجھے بھی بہت تھی۔ میں کیونکہ مرد تھا اور میرے باپ دادا مجھے صبح شام غیرت و مردانگی جس کا مطلب خون کے بدلے خون تھا۔ کا سبق پڑھاتے تھے۔ اس لئے میری توجہ کئی جگہ بٹ گئی تھی۔ مگر اس کی توجہ صرف ایک سمت تھی۔ یعنی میری طرف۔ وہ مجھ سے جدا ہونے پر کسی قیمت پر راضی نہیں تھی۔ ایک رات وہ ڈھیروں سوتا پہن کر میرے کمرے میں آ گئی اور فرار ہونے کیلئے ضد کی۔ اس کی شادی کہیں اور طے کر دی گئی تھی۔ وہ بہت جذباتی ہو رہی تھی۔ میں نے اسے بہت سمجھانے کی کوشش کی تو اس نے مجھے بزدلی کا طعنہ دیا اور کہا اگر میں نے اس کا ساتھ نہ دیا تو وہ کنوئیں میں چھلائی دے گی یا اپنی شہ رگ کاٹ لے گی۔ وہ جس انتہا پر پہنچ چکی تھی، کچھ بعید نہیں تھا۔ وہ یہ کچھ کر گزرے گی۔ میں اٹھ کھڑا ہوا۔ مجھے اس کی شدید محبت نے سب کچھ بھلا دیا۔ پانچ ہزار روپے اور ایک راتفل لے کر میں اپنے قبیلے کو ہمیشہ کیلئے چھوڑ گیا۔ ہمیشہ کیلئے اس لئے کہ اس اقدام کے بعد نہ میں اپنوں کیلئے قابل قبول تھا اور نہ اس کے رشتے داروں کیلئے۔ بھی وہ میرے سر کی قیمت لگائے ہوئے ہیں۔“

مطربہ نے لرز کر پہلی مرتبہ اس کی سمت بغور دیکھا۔ تپتا ہوا سرخ رخساروں والا صحت مند چہرہ، گھور سیاہ مگر روشن کھلی آنکھیں۔ مہری تراش کے خوبصورت ہونٹ پر سیاہ گھنی مونچھیں جھکی ہوئی تھیں۔ اس نے مطربہ کو بغور اپنی سمت دیکھتے پا کر بدن ثرارت آنکھوں میں سو کر جواباً اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

”ساتھی پسند آیا؟“ بہت اعتماد سے سوال ہوا۔

مطربہ نے جھینپ کر پلکیں جھکا لیں۔ ”پھر؟“ اس کے لبوں نے جنبش کی۔ اس کے حساب سے ابھی بات مکمل نہیں ہوئی تھی۔

”پھر یہ کہ ہم نے پہلی فرصت میں شادی کر لی۔ میں نے تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا۔ اس دوران چھوٹی موٹی ملازمت بھی کر رہا ہوں۔ دو برس بعد ہمارے ہاں بیٹا پیدا ہوا۔ اور ٹھیک اس کی پیدائش کے ایک سال بعد وہ مجھے اور اپنے بیٹے کو ہمیشہ بیڑ کیلئے چھوڑ کر اپنی حقیقی منزل کی طرف لوٹ گئی۔“

مجھے اس کے چلے جانے کا بہت دکھ تھا۔ وہ مجھے چاہے جانے کے عظیم جذبے کی لذت سے آشنا کر گئی تھی۔ اس نے صرف مجھے دیا۔ مجھ سے کبھی کچھ مانگا نہیں۔ انسانوں کی اس بستی میں اس نے مجھے ہر ہر موڑ پر بہت اہم ہونے کا احساس دلایا تھا۔ بہت خود پسند بنا دیا تھا اس کی محبت نے مجھے۔ میں نے اسے کچھ دینے کا جب بھی سوچا تو محسوس ہوا کہ میں تو بال بال اس کا مقروض ہوں۔ قرضے اترتے تو کچھ دینے کے مرحلے آتے۔ اس سے پیشتر کہ ایسا کچھ ہوتا وہ چلی گئی۔

آپ بھی تو مجھے اس کے حوالے سے ملی ہیں۔ اس رات وہ اپنی جذباتی طاقت سے مجھے قبیلے سے نہلاتی تو میرے پ کے ملنے کے لمحے کیونکر آتے۔ ایک پیارا سا بیٹا اور ایک بے حد حسین اور سادہ جیون ساتھی۔ یہ اسی کی طرف سے لے ہوئے بیٹل بہا تھے ہیں۔

مجھے امید ہے کہ آپ اس پردہ کی ہوئی بہت اچھی عورت سے کبھی رقابت محسوس نہیں کریں گی۔“

”جی؟“ مطربہ سمجھی نہیں۔

”مطلب یہ کہ آپ کو اس کا ذکر کرنا گوارا تو نہیں گزر رہا؟“ علی کے انداز میں سنجیدگی تھی۔

”وہ کھوئی اور بزدل نہیں تھی۔ اتنی اچھی عورت تو ہوتی بھی نہیں ہے۔“ اس نے سادگی سے کہا۔

”میں نے بے ساختہ اس کا مہندی سے سرخ ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام لیا۔“

”جسٹے کا صاف پانی دیکھا ہے؟“

مطربہ نگاہیں جھکائے خاموش رہی۔

”آپ کو دیکھ کر اس کا خیال آتا ہے۔“ وہ بھرپور جذبے سے مسکرایا۔

”آپ مجھے آپ آپ کیوں کہہ رہے ہیں۔“ اس نے ہچکچاتے ہوئے ٹوکا۔

”عرب حسن کے آگے بے بس ہوں۔“ وہ شریر ہوا۔

”آپ کو میں نے اپنی عزت بنایا ہے۔ میں صرف آپ سے محبت نہیں کروں گا بلکہ آپ کی عزت بھی کروں گا۔“

”یہ بکر پہلا اور سچا وعدہ ہے آپ سے۔“

”ہر نو دیکھو۔ افق کے اس پار بھی لے جائینگے۔ ہمارے علی مہندی صاحب۔“ نازنین کھٹکھٹا کر ہنسی تھی۔
مطر بہ کو تیمور کی موجودگی کے خیال سے کچھ زیادہ ہی حیا آگئی تھی۔

”ہوں..... نانی تو نانی اب تو تم اس کے ساتھ اپنی ماں کے پاس بھی ملنے جاسکتی ہو۔ اب تمہیں پتا چلے گا کہ ہم نے
نہارے ساتھ بھلائی کی ہے یا برائی۔“ تیمور علی خان کی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔
”بعض انسانوں پر اتنی مشکلیں آپڑتی ہیں کہ انہیں بھلائی، برائی کی تیز ہی نہیں رہتی۔“
”عجب سے انداز میں بیگ بند کر کے ایک طرف رکھتے ہوئے بولی۔

”ذہن تو تو بہت ہے مطربہ! کوئی حیرت کی بات نہ ہوگی اگر تو کچھ دن بعد علی مہندی کی استانی نہ ہوگئی۔“ تزئین
نے اپنی حیرت کو شوخی میں چھپایا۔

”ارے تم لوگ یہاں ہو۔ بتاؤ۔ مطربہ بھی ہے۔ اس کا سامان دیکھ لیا۔“

”تیمور! میں نے تمہارے بابا صاحب سے کہا تھا کہ علی کو کچھ نقد دے دیں اپنی طرف سے۔ گھر کی ضرورت کی
چیزیں مطربہ اپنی پسند سے لے لے گی۔ اب اتنی جلدی کیا ہو سکتا تھا۔“

”اماں جی! دو سو روپے ہیں میرے پاس۔“ وہ سادگی سے بولی۔

نازنین تزئین کے قہقہے بلند اور اماں جی اور تیمور علی خان کی مسکراہٹیں مبہم تھیں۔

”گویا ابھی تک پچھا نہیں چھوٹا ان دو سو روپے سے۔“ تیمور علی خان صوفے پر بیٹھ گئے۔

”اماں جی! علی نے کچھ بھی لینے سے انکار کر دیا ہے۔ بابا صاحب نے بہت اصرار کیا تھا مگر وہ نہیں مان رہا تھا۔“

”اماں جی! کیا ضرورت ہے۔ میری اوقات سے بڑھ کر سلوک کیا ہے آپ نے؟“ مطربہ کی آواز بھرا گئی۔

”یوں نہیں کہتے۔ تیرا نانا تو قول نباہنے والا اصل تھا اور کیوں نہ ہوتا۔ سید زادہ تھا۔ کم نسب تو نہیں ہے تو..... اللہ لگتی
تو ہے کہ تو نوکر ذات ہو کر بھی ہی نہیں تھی۔ اللہ نے تیرا نصیب کھول دیا۔ خوش رہ۔“

”مرزا واقعی بہت ہیں اماں جی! جو اس کی حقیقت بتا ہی دیتے ہیں۔“

تیمور علی خان کے لہجے میں جانے کیا تھا۔ اس نے بے ساختہ ان کا چہرہ دیکھا تھا اور انہوں نے پہلی مرتبہ اس سے
ٹائیں چرائی تھیں۔

”دیکھ بیٹی۔ اپنے مرد کی توجہ و محبت چاہیے تو اس کی اولاد کو اپنا کر لینا پھر دیکھ کتنی قدر کرے گا تیری۔ بچہ ضرور ہے
اس کا مگر اتنی عمر نہیں ہے علی کی۔ تیمور سے سال دو سال ہی بڑا ہوگا۔“

کوئی بات ہو..... کوئی مثال ہو۔ یہ تیمور کہاں سے آجاتے ہیں بیچ میں جبکہ یہ کبھی بیچ میں نہیں ہوں گے۔

”اور میری بات سن..... ہر صورت نباہ کرنا ہے۔ کوئی مشکل پڑے تو جان چھڑانے کی جلدی نہیں کرنا۔ سمجھ رہی
ہے۔ مرد نباہنا آسان نہیں ہوتا لیکن نباہنا آجائے تو عورت کی ساری زندگی سنور جاتی ہے۔ خدمت اور محبت دو ہی ہتھیار
ہیں اللہ نے عورت کو۔ ان سے کام لینا سیکھ گئی تو بھلی گزر جائیگی۔“

اماں جی بعور اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے سمجھا رہی تھیں۔

وہ اٹھ کر بیٹھ گیا اور کوٹ اتارنے لگا۔

مطر بہ کو جانے ایک دم کیا ہوا۔ اس کا سارا وجود کانپنے لگا۔ وہ دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر
پڑی۔

علی کوٹ صوفے پر اچھال کر اس کی سمت متوجہ ہوا۔

”مطر بہ..... جان..... کیا ہوا؟“

وہ مزید ہچکیاں لے کر رونے لگی۔

”پلیز بتاؤ ناں! کیا میری کسی بات سے تمہیں تکلیف ہوئی؟“ وہ بہت پریشان ہو گیا۔

”نہیں جو کچھ آپ مجھے دے رہے ہیں۔ وہ میری اوقات سے بہت زیادہ ہے۔“

”بڑی قناعت پسند ہو! ابھی کچھ دیا ہی کب ہے۔“ وہ ہنس دیا۔

”دیکھو! چپ ہو جاؤ ورنہ مجھے تین سو ساٹھ طریقوں سے چپ کرانا آتا ہے۔ اپنے اشکال میں چپ کرنا تو گہرا
نہیں پھر اور نہ مجھے کوئی الزام دینا۔“

مطر بہ کے تمام حواس اس کی وارفتگی کے سامنے ڈھیر ہو رہے تھے۔

”بی بی جان! کیا یہ کپڑے بھی رکھ لوں؟“ مطربہ نے بیگ کی سمت اشارہ کیا۔

”بے وقوف۔ اب یہ کپڑے پہنے گی؟ اماں جی نے دس بارہ سوٹ جو دیئے ہیں تجھے اور تیرے ”وہ“ بھی تولائے
ہیں اتنے کپڑے۔ ابھی تو! تو روز نیا جوڑا پہنے گی۔“ نازنین ہنسی۔

”مطر بہ! اللہ کی قسم قیامت لگ رہی ہے۔ ویسے رات کو خیریت تو رہی تھی ناں۔ ویسے تجھے بے ہوش انسانوں کو
ہوش میں لانے کی ترکیبیں تو آتی ہیں ناں؟“ تزئین شرارت سے ہنسی۔

مطر بہ کے چہرے پر حیا کے رنگ بکھر گئے۔

”اب بتا..... اب بھی رویا کرے گی؟“ تزئین نے چھیڑا۔

اسی دم تیمور علی خان ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے۔ وہ اسی سمت رخ کئے کھڑی تھی۔

”السلام علیکم خان۔“ اس کی آواز اتنی دھیمی تھی کہ بمشکل سنی جاسکتی تھی۔

”وسلام..... آپا..... اماں جی کہاں ہیں؟“ انہوں نے اچھتی سی نگاہ اس پر سے دوڑانے ہوئے تزئین سے پوچھا۔

”برآمدے میں ہی تو بیٹھی ہوئی تھی۔ وہاں نہیں ہیں کیا؟“ تزئین کی بجائے نازنین نے جواب دیا۔

”نہیں! وہاں تو نہیں ہیں۔“ انہوں نے پھر ایک الجھی ہوئی نگاہ مطربہ پر ڈالی۔

گہرے میروں کا مدانی سے مرصع سوٹ میں ایک نئی زندگی کا انکشاف اس کے ایک ایک نقش پر ثبت تھا۔ اس نے
یکدم تیمور علی خان کی سمت سے رخ موڑ لیا تھا۔

”بی بی جان۔ اگر میں ان سے کہوں تو کیا یہ مجھے نانی سے ملا۔ نے لے جائینگے۔“

”سن رہی ہے ناں میری بات؟“

”جی اماں جی۔“

”اللہ بھاگ جگائے رکھے۔ نصیب اچھا کرے۔ حویلی کے دروازے کھلے ہیں۔ جب چاہے ملے آجیو کر۔ بہت آئیگی مجھے۔ بڑی خدمت کی ہے میری۔“

”اماں جی! آپ ایسی باتیں نہ کریں۔ مجھے رونا آرہا ہے۔“ وہ رونے کو ہو گئی۔

”اچھا اچھا۔ دھیان سے اپنی چیزیں رکھ لے۔ کبھی بعد میں پریشان ہو۔ چھوٹی دلہن۔ وہ شال بھی دیدوا سے جوڑ لائی تھی۔ ساتھ ہی رکھ لے گی۔ کبھی بعد میں دھیان نہ رہے۔“

”وہ رکھ دی ہے اس کے کپڑوں میں۔“ نازنین نے جواب دیا۔

”یہ علی کہیں گیا ہوا ہے؟“ معاً انہیں دھیان آیا۔

”پتا نہیں میں تو صبح سے اوپر نہیں گئی۔“ وہ اپنی مخصوص سادگی سے بولی۔

”یوں؟“ تزئین نے شوخی سے سرگوشی کی۔

وہ حیا آمیز انداز میں خاموشی سے کپڑے تہ کرنے لگی۔

”پاگل..... کیوں نہیں گئی اوپر۔ اس کا سامان نہیں باندھے گی۔“ اماں جی مسکرائیں۔

”اصل سامان تو ساتھ بندھا چلا جا رہا ہے۔“ نازنین بہت سروں میں بنیں۔

”یہ چلی جائے گی تو تم بھی اپنے میکے ہو آنا۔“ اماں جی نازنین سے مخاطب ہوئیں۔

”جی اماں جی۔ امی بھی فون پر پوچھ رہی تھیں کہ کب آؤ گی۔ تزئین بھی رات کو اپنے سسرال جا بیٹگی پھر آپ اکیلا کیا کریں گی آپ میرے ساتھ چلے گا۔“

نازنین نے ساس کو بہت محبت سے دیکھا۔

”ہاں خیر ملنے تو مجھے بھی جانا چاہیے۔ چلوں گی۔“ وہ بولیں۔

”آپ کے کپڑے استری کرنے کو دے دوں؟“ تزئین بولی۔

”ہماری بھی سن لیجئے۔ سیٹ کنفرم ہو گئی ہے ہماری پرسوں رات کی فلائٹ ہے۔ آج ہم حویلی جا رہے ہیں۔ پرسوں شام کو پہنچیں گے واپس۔ ہم سے الوداعی ملاقات جس جس کو کرنا ہے۔ ابھی کرلو۔“

”پرسوں..... بس جا رہا ہے؟“ اماں جی نے دہل کر ان کی سمت دیکھا۔

”جانا تو ہے اماں جی!“

”تجھے مجھ پر ترس نہیں آتا تیمور۔“ وہ آبدیدہ ہو گئیں۔

”اماں جی..... پھر وہی..... ہم ہمیشہ کیلئے تو نہیں جا رہے۔ آنے کیلئے جا رہے ہیں جہاں اتنی ہمت دکھائی ہے تجھ کو۔“

اور سہی۔

وہ ماں کے قریب آ کر بیٹھ گئے۔

”یہاں کی ہمت۔ کھل گئی ہوں تیری جدائی میں۔“ ان کی آنکھوں میں پانی تیرنے لگا۔

”مطربہ کا جی ایک دم چاہا۔ وہ مڑ کر تیمور علی خان کو دیکھے مگر نہ جانے پھر کیا ہوا۔ وہ مزید تندہی سے کپڑے تہ کرنے لگی۔ ان کی سمت سے بالکل پشت کر لی۔“

”رات مئے حیدر آباد پہنچے تھے۔ سارا شہر نیند کی آغوش میں تھا۔ تیمور علی خان نے گاڑی مع ڈرائیور ان کے ساتھ کی۔“

”نئی۔ پرانی وضع کا گھر تھا جس کے باہر ایک زرد رنگ کا بیمار سابلنگ لگا ہوا تھا۔ دستک پر ایک بوڑھی عورت کی آواز سنائی۔“

”کھولو اماں۔ میں ہوں علی۔“

دروازہ فوراً ہی کھل گیا تھا جس شوق سے بوڑھی عورت دروازے میں آئی تھی اتنی ہی حیرت سے پیچھے ہٹی تھی۔ کاہی بڑھوت اور سنہری بارڈر والی چادر پھولوں کی خوشبو۔ چوڑیوں سے بھری کلاسیاں۔ اور جھکی ہوئی آنکھیں۔ اس پر مستزاد حسن بھی غیر معمولی۔

”اندرا نے نہیں دوگی اماں۔ فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔ آپ کے پیارے کیلئے ماں لایا ہوں۔“

علی کے انداز میں اس کی فطری شوخی جھلک رہی تھی۔

عورت پیچھے ہٹ گئی مگر حیرت اپنی جگہ بدستور تھی۔

”اماں! ڈرائیور بہت تھک گیا ہوگا۔ بیٹھک کھول دو اور اسے چائے پانی کا پوچھو۔“

”وہ تو پوچھ لوں گی۔ مگر یہ۔“

”افوہ۔ یقین نہیں آیا ابھی تک جب ہی تو دلہن کے سر پر ہاتھ پھیر کر دعا نہیں دی۔ تمہاری قسم اماں۔ نکاح کیا ہے۔“

بڑی بی کے اوسان ذرا بحال ہوئے۔ وہ آگے بڑھیں اور مطربہ کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

”کہاں سے ملی یہ چاندی دلہن۔ سارے گھر میں روشنی سی ہو گئی ہے۔“ وہ بہت پر شوق انداز میں جائزہ لے رہی تھیں۔ ”آؤ بیٹی۔ یہاں بیٹھ جاؤ۔“

انہوں نے اسے تمام کراہیک کرسی پر بٹھا دیا۔

”میں نے آپ کو بیٹی کہا۔ آپ نے برا تو نہیں منایا۔ دراصل علی میاں نے میری عادت بگاڑ دی ہے۔ ہوں تو میں ڈیرہ مگر مجھے ماں کی طرح عزت دیتے ہیں۔“

”تو اماں! تم بھی تو ہمارا میرا مطلب ہے ہم باپ بیٹے کا اتنا خیال رکھتی ہو جیسے سکے رکھتے ہیں۔“

اس کی تو خود نوکر ذات سے بڑی اونچی ترقی یلخت ہوئی تھی۔ اس نے نگاہ اٹھا کر اب اپنی ملازمہ کو دیکھا۔ ایک دم

بوسے کیوں دل بھر آیا۔ وہ تیزی سے پلکیں جھپکا کر آنسو چھپانے لگی۔

”میں میاں! دلہن بہت پسند آئی۔ اللہ مبارک کرے خوشیاں دکھائے۔ آمین۔“ وہ دعا دیتے ہوئے باہر نکلنے لگیں۔

”کہاں جا رہی ہو؟“ علی نے کوٹ اتار کر ان کی سمت بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

مطربہ نے درمیان ہی میں اٹھ کر کوٹ تھام لیا۔ علی نے بہت خوشی اور دلچسپی سے اس کی سمت دیکھا۔
”منہ تو میٹھا کرادوں۔ دہن پہلی بار گھر آئی ہے۔“ وہ رکے بغیر آگے بڑھتے ہوئے بولیں۔

وہ علی کا کوٹ بازو پر لٹکا کر ادھر ادھر لٹکانے کی جگہ تلاش کر رہی تھی۔ نظروں ہی نظروں میں۔

”اتنا حسین روپ، سروپ اور پھر یہ ادائیں۔ محترمہ بندہ ہلاک بھی ہو سکتا ہے۔ میں تو یوں بھی ابھی خواب دوہم کے سلسلوں میں بھٹک رہا ہوں۔ ابھی تک یقین نہیں آ رہا۔“ علی نے اپنے بازو اس کے شانوں پر لٹکا کر اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

”اماں آجائیگی۔“ اس نے گھبرا کر دروازے کی سمت دیکھا۔

”تو کیا ہے۔ آنے دو۔“ علی نے شرارت سے نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبایا۔

”شرم نہیں آتی آپ کو۔“ حیا سے اس کی حالت غیر ہو گئی۔

”دھیان نہیں دیا کبھی اس پوائنٹ پر۔“ اس نے قہقہہ لگا کر بازو ہٹا لئے۔ مطربہ سے پلکیں اٹھانا دو بھر ہو گیا۔

”فی الحال تو یہی ہے گھر میں۔ شام کو بچے کیلئے یہ کسٹرڈ بنایا تھا۔“ اماں ٹرے اٹھائے تھوڑی دیر بعد اندر آ گئی تھیں۔

”اماں! تم نے بیٹھک کا دروازہ کھول دیا؟ بہت سامان آیا ہے کھانے پینے کا ان کی طرف سے کھانا بھی ہے۔ پل

بھی ہیں ڈھیروں مٹھائی ہے۔ صبح اٹھ کر محلے میں بانٹنا شروع کر دیتا۔ کئی دن میں بٹے گی۔ تب جا کر ختم ہوگی۔“

علی نے قمیض کے اوپری بٹن کھول کر کسٹرڈ پیالی میں ڈالتے ہوئے لا پرواہی سے کہا۔

”ماشاء اللہ بڑے دل والوں کی اولاد ہے۔“

مطربہ کا چہرہ یکانخت سفید سا پڑ گیا۔ ان دیکھے روشن چراغوں کی لوئیں ٹھٹھانے لگیں۔

”یہ لیجئے محترمہ۔“ علی نے بہت شوخ انداز میں اس کے سامنے پیش کی۔ اس پر اماں کے جملے نے کوئی اثر نہیں ڈالا

تھایا پھر اسے اپنے اعصاب و افعال پر بہت کنٹرول تھا۔

مطربہ نے پیالی تھام لی۔

”کھانے کیلئے دی ہے۔“ علی نے اسے پیالی کی سمت گھورتے دیکھ کر چونکا یا اور وہ حقیقت میں چونک پڑی۔

”کس دھیان میں ہیں آپ؟ یہ دنیا بڑے دل والوں کیلئے ہے۔ چھوٹے حوصلے اور چھوٹے دل والے ان خوشیوں

سے بھی محروم رہتے ہیں جن پر ان کا جائز حق ہوتا ہے۔ بہت تنگ کرتی ہے انہیں یہ دنیا۔ کسی قسم کی فکر خود پر طاری کرنے

کی ضرورت نہیں۔ میں آپ کو ہمیشہ خوش دیکھوں۔ جس دن کسی غم میں مبتلا دیکھا۔ بہت لڑائی ہوگی۔ اور اپنا جفہ دہانے

میں ڈال کر سو جایا کروں گا۔ لوگ پوچھیں گے کہ باہر کیوں سو رہا ہوں تو صاف کہہ دیا کروں گا کہ بیوی کہنا نہیں مانتی۔“

مطربہ نے منہ پر ہاتھ رکھ کر بمشکل ہنسی ضبط کی۔

”ابھی ہم آپ کو اپنے بیٹے سے ملائیں گے۔ بڑا پتکچوکل (وقت کا پابند ہے۔ نوبت ہی سو جاتا ہے۔ صبح چہرے

پہلے ہی جاگ جاتا ہے۔ بڑی فوجیوں کی سی عادت ہے۔ لگتا ہے پکا نمازی بھی بنے گا اور باقاعدہ جماعت سے نماز پڑھے

”یہ تو بہت اچھی بات ہے۔“ مطربہ نے دھیرے سے کہا۔ وہ مسکرا رہی تھی۔

”بھی ہم آپ کو ایک اور سر پرانز دیں گے۔ چلیں بتا دیتے ہیں۔ آپ کیلئے پیور کائن کے بہت خوبصورت ٹائٹ

بٹن لائے ہیں کراچی سے۔ بہت ترس آتا ہے آپ پر۔ یہ چھینے والے کپڑے پہن کر نیند کیسے آ جاتی ہے۔“

مطربہ نے پیالی واپس رکھ دی تھی۔

”آئیں چلیں۔ پہلے اپنا ہونہار دکھاتے ہیں آپ کو۔“ علی نے اٹھ کر اسے اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔

وہ بچے چپے چل پڑی۔

علی اوپر جانے کیلئے زینے کی طرف بڑھ رہا تھا۔

وہ بھی اس کی تھید میں زینہ طے کرنے لگی۔

زینہ طے کرتے ہی چندفٹ کی خالی جگہ کے بعد سامنے ہی کمر تھا۔ علی آہستگی سے دروازے پر دباؤ ڈال کر اندر

داخل ہو گیا۔ اور پھر وہ بھی۔

چوہا سا کمرہ بہت خوبصورتی سے سجا ہوا تھا۔ دیواروں پر خوبصورت بچوں اور جانوروں کی تصویریں اور وال پیپر۔

رکس میں سجے بے شمار کھلونے کارپٹ پر اوٹھ سیدھے پڑے بھالو گھوڑا اور بٹھیں۔ کھڑکی پر گلابی جالی کا پردہ۔ وہاں

چوہا سا سنگل بیڈ اور اس کے ساتھ ہی وہاں الماری۔ کھڑکی کے ساتھ لگی سفید میز پر بچے کی کتابیں قاعدے وغیرہ۔

ایک بچے کیلئے اس قدر اہتمام یہ تو اس نے حویلی میں بھی نہیں دیکھا تھا۔ وہاں ایک کمرے میں کم از کم دو تین بچوں کا

اہتمام ہوتا تھا اور اسی حساب سے بے ترتیبی بھی ہوا کرتی تھی۔

”یہ رہے ہمارے ولی عہد۔ وہ جو آپ ہمیں دیں گی وہ ان کے جانشین ہوں گے۔“

”ہائے اللہ۔“ مطربہ کو تو مارے حیا کے قدم اٹھانا مشکل ہو گیا۔ ”یہ علی تو بس بولے غلے جاتے ہیں۔“

”آؤ بھئی۔ رک کیوں گئیں۔ دیکھئے کیسے ٹھاٹھ سے سو رہے ہیں۔ باپ کی تو ذرا پرواہ نہیں۔“

مطربہ نے بچے پر نگاہ ڈالی۔ دو ڈھائی سال کا نہایت صحت مند اور خوبصورت بچہ تھا۔ بے خبر سویا ہوا۔ اسے بے

مناظرہ پار آ گیا کہ وہ ان بچوں میں سے تھا جنہیں راستہ چلتے ہوئے بھی پیار کرتے ہیں۔“

اس نے آہستگی سے اس کی پیشانی سے بال سمیٹے اور جھک کر بوسہ دیا۔

”محترم عبدالباری مہندی! دیکھئے کتنی اچھی امی لائے ہیں آپ کیلئے۔“ علی نے مطربہ کو شانوں سے تھام کر سرگوشی

کی۔

چند روز قبل تک یہ شخص اس کو کتنا بھاری تھا۔ محض عزت و محبت نے جو وہ اسے دے رہا تھا۔ سمجھوتے کی راہ کتنی آسان

نہ تھی۔

غواب کے ظلم اتنی آسانی سے کب جان چھوڑتے ہیں۔ مگر محبت بھی ایک قیامت ہے انقلاب ہے بشرطیکہ محبت

”کیسا لگا آپ کو ہمارا بیٹا؟“

”ماشاء اللہ۔ بہت پیارا ہے۔“ اسے واقعی بچہ دیکھ کر بہت خوشی ہوئی تھی۔

”آپ کی دعا ہے اماں جی۔“ اس نے نظریں جھکا کر کہا۔
”ابہ خوش رکھے۔ ایک جنجال سے عمر بھر کو تیری جان چھوٹ گئی۔“ وہ جذبہ تشکر سے چور انداز میں جیسے خود کلامی کر رہا تھا۔

”آج کل تو بڑا کام ہو گا حویلی میں۔“ اس نے بچے کو تھکپتے ہوئے کہا۔
”ہاں۔ مگر ہم تجھ سے کام نہیں کروائیں گے۔ تیرا مرد کس بنادے گا ہم پر آخر پولیس والا ہے۔“ اماں جی نے بھی

”نہ کیا۔“

”نہیں اماں جی۔ میں تو اب بھی آپ کی باندی ہوں۔“ وہ بہت دھیمی آواز میں کہہ رہی تھی۔

”ہاں باندیاں تو تیری بارہ پشتوں میں ہوتی آئی ہوں گی۔ ایک ذرا آزمائش تھی بس تجھ پر۔“

”جن بارہ پشتوں کا ایک ڈھیلے کا رزق نہ کھایا میں نے۔ میں کیا جانوں ان کو؟“ وہ بہت اعتماد سے کہہ رہی تھی۔

”دیکھا اماں جی! ایک مہینے میں ہی کتنی سنجیدہ باتیں کرنے لگی ہے۔“ تزئین نے ہنس کر کہا۔

”نہیں خیر سمجھ والی تو ہے یہ۔“ اماں جی نے شفقت آمیز انداز سے اسے دیکھا۔

”مگر تمہارے کہتے ہیں کہ سر سے گزر جاتی ہیں اس کے ہماری باتیں۔ بہت آسان انداز میں بات کرنا پڑتی ہے اس سے۔“ نازنین نے کہا۔

”مطربہ جیسے ایک دم چونک پڑی۔ یہ تو خیال ہی نہیں آیا کہ نان سنسن۔ احمق کہنے والا اب اس حویلی اس وطن ہی میں ہے۔“

اسے حویلی میں یکا یک بہت بڑی کمی کا احساس ہوا۔

”جڑی بوٹیوں کی چرچہ اہٹ۔ زینہ اترتے ہوئے قدموں کی مخصوص دھمک ان کی آمد سے قبل ہی ان کی آمد کا اعلان یہ مخصوص خوشبو کی زبانی۔ ایک خاص انداز کی کھنکار۔“

جانے کیا کیا کام ہو گیا تھا حویلی میں۔ اس کے اندر وحشت کے گولے ناچنے لگے۔ اسے محسوس ہوا کہ علی کی ذات اتنی بگڑا ہوا اور پر جوش و پر شور ہے کہ ذات کے بند دروازے کھلنے کی فرصت اور مہلت نہیں ملتی۔ محض اتنی سی دوری نے اندر اکھاڑ بچھاڑ شروع کر دی تھی۔

اس نے گہرا کر بچے کی پیشانی پر بوسہ دیا تھا۔

”بچے کا نام کیا ہے۔“ اماں جی کو وہ بہت اچھی لگی بچے کو پیار کرتے ہوئے۔

”باری۔“ اس نے دوبارہ اس کی پیشانی پر بوسہ دیا۔

”بڑا نیک رہا ہے یہ نام بچے پر۔“ تزئین نے بہت خوش ہو کر اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا۔

”نمبر سے خیال میں تو پورا نام عبد الباری ہو گا۔“ وہ پھر گویا ہوئیں۔

”جی۔ عبد الباری مہندی۔“ اس نے تائید کرتے ہوئے پورا نام بتایا۔

”اب صاحب! کیا بارعب نام ہے۔“ نازنین نے بچے کا رخسار چھو کر کہا۔

اسے حیدر آباد میں رہتے ہوئے ٹھیک ایک ماہ ہو رہا تھا۔ دس دن پہلے علی اسے نانی سے ملوا کر لایا تھا۔ نانی بہت تھی اسے بہت دکھ ہوا تھا۔ اس نے کہا بھی تھا کہ وہ ساتھ چلے اب تو اس کا اپنا گھر ہے۔ مگر اس کی ”ناناں“ کو وہ ہاں نہ بدل سکی تھی۔

سردار ماموں نے علی کی بہت آؤ بھگت کی تھی۔ زندگی میں پہلی بار مطربہ کو گلے سے لگایا تھا سر پر ہاتھ پھیرا تھا۔ بچے ہوئے ایک جوڑا اور دس روپے بھی دیئے تھے۔ اور ساتھ ہی کہا تھا کہ تھوڑے بہت پیسے اس نے کفن دفن اور سردار کے بچوں کیلئے اٹھار کھے ہیں۔ کفن دفن کا سن کر اسے بہت رونا آیا تھا۔ وہ بہت بو بھل دل کے ساتھ واپس ہوئی تھی۔ یوں محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے یہ اس کی آخری ملاقات تھی نانی سے۔

چلتے ہوئے نانی نے کہا تھا۔

”زیتون بالو۔ علی تیرا مرد ضرور ہے مگر یہی میری عمر بھر کی کمائی ہے۔ عمر بھر کوشش کی کہ اس کا احسان میرے سر پر نہ ہو اپنی محنت مزدوری کی روٹی کھاؤں مگر سولہ آنے اور حویلی والوں نے جو احسان کیا ہے میرے پاس اس کا بدلہ نہیں ہے۔ سوائے اس دعا کے کہ حویلی کی جتنی بینیاں ہیں۔ اللہ ان کے نصیب اچھے کرے۔“

وہ حیدر آباد آ کر بہت دن اداس رہی پھر ایک روز علی نے اسے خوشخبری سنائی کہ بصیر علی خان کی شادی ہو رہی ہے۔ آج آفس میں اماں جی کا ٹیلی فون آیا تھا۔ انہوں نے کہا ہے کہ پہلی فرصت میں مطربہ کو حویلی بھجوادوں۔ اسے بصیر علی خان کی شادی کا بہت انتظار تھا اور یہ بھی کہ کوئی تیاری کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے اس کیلئے کپڑے بنوائے ہیں۔ اماں جی کے اس اپنائیت بھرے پیغام پر اس کی آنکھیں بھر آئی تھیں۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ بہت مضبوط جگہ کی بیٹی ہے۔

علی نے تو کوئی ایسا تاثر نہیں دیا تھا کہ وہ بچے کو ساتھ لے کر جائے اس نے خود کہا تھا وہ بچے کو ساتھ لے کر جائیگی۔ اور جب وہ گلابی سوٹ اور سرخ چادر میں بچہ گود میں اٹھائے حویلی میں داخل ہوئی تو وہاں ایک خوشی کی لہر پھیلی گئی۔ ایک لمحے کو تو اسے یقین ہی نہیں آیا کہ وہ حویلی والوں کو اتنی پیاری ہے۔

”واہ مطربہ۔ کیا ریڈی میڈ اولاد ملی ہے۔ ماشاء اللہ کتنا پیارا بچہ ہے۔“

تزئین نے بے اختیار بچہ گود میں لے کر رخسار چوم لیا تھا۔

”ماشاء اللہ۔ بڑی جلدی مل گیا تجھ سے۔“ بچے نے منہ بسور کر مطربہ کی طرف ہاتھ بڑھائے تو اماں جی نے بہت خوشی سے کہا۔

”آخر کس باپ کی اولاد ہے۔ جو اس سے ایک لمحے کو مل گیا تھا۔“ نازنین کی خوبصورت ہنس فضا میں بکھری تھی۔

”اچھی تو ہے؟“ اماں جی نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے محبت سے اسے دیکھا۔

”اسے نیند آ رہی ہے۔ اوپر سلا آؤں نیچے تو بہت شور ہے۔“ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

”سولہ آنے کی کوٹھڑی میں نہ چلی جانا۔ اماں جی نے اوپر آخروالا کمرہ کھلوایا ہے۔“ عالم تاب بھی آگئی تھیں۔

”دودھ پلا دے پہلے۔ آرام سے سوتا رہے گا۔“ اماں جی نے تاکید کی۔

”ڈبے کا پلائی ہوگی۔“ تزئین نے شرارت سے کہا۔

”جی۔“ وہ جھینپ کر مسکرا دی۔

”لو اس عمر میں تو یوں بھی اپنا چھوٹ جاتا ہے۔“ اماں جی مذاق نہیں سمجھیں سیدھے پن میں کہہ گئی تھیں۔

”ہیں۔ اماں جی ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے۔“ نازنین مسکرائیں۔

”ارے میں بچے کی بات کر رہی ہوں۔ ماشاء اللہ دو سال کا تو ہو گیا ہے ناں؟“ اماں جی نے پھر سادگی سے

وضاحت کی۔

”جی.....“ ”یہ“ بتا رہے تھے کہ دو سال کچھ مہینے کا ہو گیا ہے۔“ وہ بولی۔

”ہائے ظالم کیا آفت لگی ہے۔“ ”وہ“ ”ان“ کہتے ہوئے۔ اب بتا بہت رو رہی تھی کہ شادی نہیں کروں گی۔

تزئین نے کھنچائی کی۔

واقعی لگ رہا تھا کہ عین نکاح کے وقت انکار کر دے گی۔“ نازنین بھی گویا ہوئیں۔

مطربہ کا چہرہ ایک دم بے تاثر ہو گیا۔ نئے سرے سے جیسے حواسوں پر برف پڑ گئی۔ اس کی نظریں بے ساختہ اس

درست کی طرف اٹھ گئیں جہاں سے چھپ کر اس نے دل کی ویرانی کا پہلا مرحلہ طے کیا تھا۔ زرخیز زمین پر پہلی بار مل چلا

تھا۔ سبزے کے شوق میں جیسے زمین کو روندے جانے کی تکلیف نہیں ہوئی یا یہ کہ روئید گئیاں پھوٹنے کی لذت ہر لذت

بھلا دیتی ہے۔ ایسی روئید گئیاں پھوٹی تھیں کہ بے پھل پھول کے جھاڑا گے تھے۔

اس نے خود پر قابو پا کر بچے کو شانے سے لگایا اور اندر کی ست بڑھ گئی۔

”کیسا ہے؟“
(ٹائیڈ زندگی میں کبھی پوچھ نہی لو کہ تم کیسی ہو؟)

”جی ٹھیک ہیں۔“

”اچھا سنو۔ پہلے ناز بھائی کو بلاؤ پھر تین چار منٹ کے وقفے کے بعد اماں جی کو بلا لانا۔“

عجب طرح کا پیغام تھا اس نے ریسور رکھ دیا۔ عین اسی لمحے نازنین ہال میں داخل ہوئی۔

”آپ کا فون ہے۔ چھوٹے خان ہیں۔“ اس نے سنجیدگی سے کہا۔

”اوہ..... تیمور۔“ نازنین دُور شوق سے آگے بڑھی۔ ”ہیلو تیمور۔“ ”علیکم السلام۔“ اچھا۔ ٹھیک ہونا؟ ہاں..... ہاں

”بتاؤ۔“

”بولتے بولتے ایک دم رکی اور ماؤ تھ پیس پر ہاتھ رکھ کر مطربہ کو وہاں سے جانے کا اشارہ کیا۔ وہ تو یوں بھی جانے

وانی تھی۔ اماں جی کو بلانے۔ ہدایت کے مطابق دو منٹ کا وقفہ گزار رہی تھی۔ عجیب الجھے ہوئے انداز میں وہ اماں جی کے

کمرے کی طرف بڑھی تھی۔

تیمور کی آواز نے ایک مرتبہ پھر اس کا اعصابی نظام تپٹ کر کے رکھ دیا تھا۔ علی کی سہاگن ہونے کے احساس کے

مانٹا آج وہ سنورنے کا ہر شوق پورا کرنا چاہ رہی تھی۔ مگر اب ایسی کیفیت ہو رہی تھی گویا کوئی لمبی بیماری کاٹ کر اٹھا ہو۔

وہ اپنی سوچوں میں گم اماں جی کے کمرے میں آئی تھی۔

”اماں جی..... چھوٹے خان کا فون ہے۔“ اس نے عام سے انداز میں مطلع کیا۔

”اچھا؟“ وہ ایک دم پلنگ سے اتر آئیں۔ ”بتاؤ۔“ کچھ دن اور رک جاتا۔ بھائی کی شادی میں شریک ہو جاتا۔ اس

ٹکے کی بھی اپنی الگ دنیا ہے۔ تیری بات ہوئی تھی تیمور سے؟“ خوشی سے وہ جیسے اپنا آپ بھول رہی تھیں۔

”جی۔“ وہ ان کے ساتھ باہر نکلتے ہوئے بولی۔

”بہت خوش تھا تیرے بیاہ سے۔“ کہ اماں جی۔ بہت اچھا کام کرایا ہے اللہ نے میرے ہاتھوں۔ مطربہ ٹھکانے پر پہنچ

گئی۔ اتنا خوش تو میں نے اسے کبھی نہیں دیکھا۔ یوں بھی گھر بسا نا وہ بھی کسی مجبور کا بڑے ثواب کا کام ہے۔ بھلی نیکی کی

بوسے بچے نے..... اللہ اسے خوشیاں دے۔“

اماں جی ساتھ چلتے ہوئے بولتی جا رہی تھیں۔ دعائیں دے رہی تھیں اور وہ زمان و مکان سے ماورا۔ جہاں میں

کچھ شمس آئے والے دکھ کی چھاؤں میں بیٹھ گئی تھی۔

”جی عجیب بات ہے کسی کی عظیم خوشی، کسی کا عظیم دکھ۔ جیسے ایک تصویر کے دو رخ۔ تمہاری تو دین دنیا سنور گئی تیمور

نہاں۔ میری داؤد پگلی ہوئی ہے کوئی کسی کو کتنا سمجھا سکتا ہوگا۔ جتنا میں خود کو سمجھاتی ہوں علی۔ میری بھنور میں پھنسی کشتی کا

نہاں۔ حالانکہ میں اس پر قربان ہونا چاہتی ہوں۔ میں اسے خوشیاں ہی خوشیاں دینا چاہتی ہوں۔ مگر مجھے اپنی سمجھ

نہاں۔

”اماں جی کو ہال تک چھوڑ کر اپنے ٹھکانے کی طرف چل پڑی تھی۔“

”کون؟“

”کون نہیں تیمور علی خان۔“ دوسری طرف سے آواز آئی۔ وہ تو جیسے اچھل پڑی۔

”السلام علیکم خان۔“

”مطربہ؟“ وہاں سے استفسار ہوا۔

”جی خان۔“ اس کا لہجہ سرد ہو گیا۔ (شکر ہے آپ کو میرا نام تو یاد ہوا۔)

ویسے کی شام وہ روپہلی کام کے اور نچ شلوار کرتے میں ڈھیروں پھول پہنے باری کو گود میں اٹھائے پنڈال سے بہرے۔
کھڑی علی کو ڈھونڈ رہی تھی جو صبح ہی حویلی پہنچا تھا۔

”خیریت سے ہو مطربہ؟“ ایک جانی پہچانی آواز پر وہ چونکی بائیں جانب براؤن پینٹ اور سفید قمیص میں مزید عارف کھڑا تھا۔

”ہوں۔ خیریت سے ہوں۔“ اس نے ادھر ادھر نظریں دوڑاتے ہوئے لاپرواہی سے کہا۔
”تم تو بڑی خوش ہوگی۔ سنا ہے۔ کسی پولیس والے سے شادی ہوئی ہے۔“ وہ اس کے سراپے کا بغور جائزہ لے رہا تھا۔

”جس طرح انسان پیدا ہوتا ہے۔ کھاتا پیتا ہے اسی طرح ایک دن سب کاموں کی طرح شادی بھی ہو جاتی ہے۔ اس میں خوشی غمی کا کیا سوال۔ انسان کو خوش رہنے کا شوق ہو تو شادی کے بغیر بھی خوش ہو لیتا ہے اور نہ ہونا چاہے تو شادی سے بھی کیا ہوتا ہے۔“

اس نے قدرے سرد مہری سے اسے دیکھ کر جواب دیا۔
”لیکن وہ تو اپنی شادی پر بہت خوش ہوتا ہوگا جسے اپنی مرضی کا ساتھی ملتا ہوگا۔ جیسے کہ تمہارا خاوند۔“ وہ بظاہر مسکرا رہا تھا۔

”شاید۔ مجھے تو یوں بھی یہاں وہاں ہر شخص ہی خوش دکھائی دیتا ہے۔“ اس نے بے نیازی سے جواب دیا۔
”ہاں..... دراصل تمہیں غور سے دیکھنے کی عادت نہیں ہے۔“ اس نے ہنس کر کہا۔
”تو ضرورت بھی کیا ہے۔ اور ہاں سنو تم مجھے تم نہیں کہو۔ میرے میاں نے سن لیا تو برا منائیں گے۔ وہ بھی مجھے تم نہیں کہتے۔ گھسیارے نہیں ہیں۔ خاندانی ہیں۔“

اس نے ناگواری سے ٹوکا۔ اسے عارف کا یوں تفصیلی بات کرنا بہت کھل رہا تھا۔
”تمہاری چال سے لگتا تھا کہ تم بہت اونچے خواب دیکھتی ہوں۔ خوشی کی بات ہے۔ خواب پورے ہو گئے۔“
بہت سادہ انداز میں کہہ رہا تھا۔

”شاید تمہیں میرے اونچے خوابوں پر اعتراض تھا۔“ وہ قدرے تلخی سے مسکرائی۔
”آپ یہاں کیوں کھڑی ہیں۔ کیا تنگ کر رہا ہے؟“ علی کسی سمت سے نمودار ہوا اور باری کی طرف دیکھا۔
”نہیں، تنگ تو نہیں کر رہا۔ میں یہ کہنا چاہ رہی تھی کہ آپ کھانا کھا چکیں تو اسے لے جائیے گا۔ میں اطمینان سے کھا لوں گی۔“

”میں آپ سے کہہ بھی رہا تھا کہ اماں کو ساتھ لے جائیں۔ خیر۔ ٹھیک ہے۔ اور ہاں آپ کو اس طرح باہر نہیں نکلنا چاہیے ابھی خطرہ موجود ہے۔ میرا شناختی کارڈ آپ کے ماتھے پر لگا ہوا نہیں ہے۔“
وہ پھر شوخ ہوا چاہتا تھا۔ مگر ایک دم سنبھل گیا۔

”آپ کی تعریف؟“ اس نے مطربہ سے سوال کیا تھا۔
”یہاں گاؤں میں ہی رہتے ہیں پڑھنے لکھنے کا بہت شوق ہے انہیں۔ حویلی میں بھی آتے جاتے ہیں۔ ان کے والد کے فنانس کے خاص آدمی ہیں۔ صحیح بتایا ہے ناں؟“

”مصلحتی۔ علی کی ایک بھر پور ستائشی نگاہ نے پھر اسے بہلا دیا تھا۔
”کلیں بتایا ہے۔“ وہ دھیمے لہجے میں بات کرتا تھا۔ بہت غور سے اس نے علی کا جائزہ لیا تھا۔
”اچھا جلیں اب آپ اندر جائیں۔ باہر آنے کی قطعی کوئی ضرورت نہیں۔ ٹھیک؟“
وہ بیٹا سے کہہ کر پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈال کر ٹیبلٹ کے انداز میں مردانے کی طرف بڑھ گیا تھا۔
مطربہ بھی عارف پر نگاہ ڈالے بغیر پلٹ گئی تھی۔

اور عارف جوتے کی ٹوہ سے گھاس مسلتے ہوئے جانے کس دھیان میں تھا کہ ایک لڑکے نے اسے متوجہ کیا۔
”یہاں اکیلے کھڑے کیا سوچ رہے ہو یا ر؟“
وہ بہت دقار سے مسکرایا تھا۔

کتنی آوازوں کے اسرار تھے پنہاں ان میں
آج تک سوچ رہا ہوں وہ سُرِ ملی آنکھیں!

علی تو اگلے ہی دن چلا گیا تھا۔ مطربہ کو خالہ سولہ آنے نے دو تین دن کیلئے روک لیا تھا۔ شادی کا ہنگامہ سرد پڑ چکا تھا۔
بیٹوں کی تحسین اتر رہی تھی۔ بہت جلد سب پڑ کر سو جاتے تھے۔ وہ گرم پانی کا فلاسک لے کر اوپر چڑھنے لگی تو نازنین مانے آگئی۔

”مطربہ۔“
”جی۔“ وہ رک گئی۔
”بچہ سو گیا یا سلاؤ گی ابھی؟“ عجیب پیش بندی کا سا انداز تھا۔
”او تو جی سو چکا۔ کوئی کام؟“

”ہاں۔ وہ بات یہ ہے کہ تیور کا لندن سے فون آئے گا۔ بہت تھوڑے ٹائم کیلئے اور یاور مجھے بلارہے ہیں اس لئے تیرا ہال میں بیٹھ سکتی۔ ماما اور روپا دیوی سے میں یہ کام نہیں لینا چاہتی کہ اماں جی کو پتا چل گیا تو ان کا جی برا ہوگا کہ سہارن پور سے بات کیوں نہ کرانی۔ آج دراصل یہ ممکن نہیں ہے۔ کیا تم گھنٹہ آدھ گھنٹہ یہاں ہال میں بیٹھ سکتی ہو؟ بچے سہارن میں روپا دیوی کو بھیج دیتی ہوں۔ ٹھیک ہے۔“

”ٹھیک ہے جی۔“ وہ درحقیقت کچھ سمجھی نہیں تھی۔
”ہاں۔ جب مجھے بلانے آؤ تو کچھ کہنا مت، بس دستک دینا۔ میں آ جاؤں گی ٹھیک؟“
”جی۔“ اب ذرا سی پریشانی اس کے چہرے پر جھلکنے لگی تھی۔

نازنین دوپٹہ سر پر ڈالتے ہوئے پرسکون انداز میں آگے بڑھ گئی۔

اور وہ صوفے پر بیٹھ گئی سوچنے لگی کہ بغیر کسی کام کے گھنٹہ بھر کیسے بیٹھا جاسکتا ہے؟ اس نے کارپٹ سے کٹن انوار صوفے پر رکھے اور دروازہ ہو گئی۔ ذہن میں بے ترتیب سوچیں گردش کرنے لگیں۔

وہ تو اپنے حق میں بہتر ہی سمجھ رہی تھی کہ تیمور علی خان وطن میں نہیں تھے۔ ان کی موجودگی اسے گاہے گاہے بے سوس ضرور کرتی۔

مگر اب پھر ان کی آواز سننا تھی۔ جو وہ اب کبھی سننا نہیں چاہتی تھی۔

وہ جانے کیا کیا سوچتی رہی اور جانے کب اونگھ آگئی۔

فون کی بیل جانے کب سے بج رہی ہوگی۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھی تھی اور بدحواس انداز میں ریسور اٹھایا تھا۔

”جی خان..... السلام علیکم۔ جی میں کافی دیر سے انتظار ہی کر رہی تھی آپ کے فون کا!“ اس کی آواز میں نیند کا لہجہ

ہنوز تھا۔

”کون سے خان کے فون کا انتظار کر رہی تھیں۔ حالانکہ اب تو صرف میرے فون کا انتظار کرنا چاہیے آپ کو۔“

وہ دھک سے رہ گئی دوسری طرف علی تھا۔

”آپ؟“ اس کے منہ سے بس یہی نکلا۔

”کوئی شک؟ کیا میرا فون آنا کوئی حیرت کی بات ہے؟“ وہ دوسری طرف بڑی سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔

”نہیں تو۔ وہ جی۔ بس۔ وہ یہ ہے کہ۔“ وہ گھبراہٹ میں بے ربط ہو گئی۔

”باری کہاں ہے؟“ وہ بہت بد لے ہوئے لہجے میں بات کر رہا تھا۔

”سورہا ہے۔“

”اکیلا؟ اس کی آیا کو یہاں چھوڑ گئی ہیں آپ؟“

”نہیں، وہ روپا دیوی ہے اس کے پاس۔“ وہ جانے کیوں اس کے بدلے ہوئے انداز پر گھبرا رہی تھی۔

”نام کیا ہوا ہے اس وقت؟“ وہ اپنی نیند کا اندازہ کرنا چاہ رہی تھی۔

”حیرت ہے آپ کو نہیں پتا؟ باری کی فوج سے اس وقت فون کرنے کا خیال آ گیا تھا۔“

”کہاں سے فون کر رہے ہیں؟“ اس نے یونہی پوچھ لیا۔

”اسٹیشن سے آج ابھی تک یہاں ہی ہوں۔ ہو سکتا ہے۔ صبح تک یہاں ہی رہوں۔ بچے کا خیال رکھنا۔ مجھے بہت کم

ہے۔ خدا حافظ۔“

وہ۔ وارنٹی۔ وہ بے ساختگی۔ آج کچھ بھی نہیں تھا۔ جن کو بھرپور چاہت ملنے کا ادراک ملتا ہے وہ کسی بیشی کا ادراک

اس سے کہیں زیادہ رکھتے ہیں۔ اس کا گم صم ہونا عین فطرت تھا۔ یہ چند دنوں کی قربتیں اس کی زندگی کا اہم موضوع

سادہ سے سادہ عورت کو بھرپور مرد کی بھرپور رفاقت جو شعوری ترقی دیتی ہے وہ کسی کے سکھائے پڑھائے سے

آسکتی۔ اس نے بے دلی سے ریسور رکھ دیا تھا۔

ریسور کھینچے ہی تھئی جی تھی۔ اس نے فوراً ریسور اٹھایا تھا۔ اور بہت محتاط انداز میں بولی تھی۔ ”ہیلو کون؟“

”اس وقت بھی اتنا بڑی ہوتا ہے فون۔“ دوسری جانب تیمور علی خان جھلارہے تھے۔

”السلام علیکم ابلا کر لاتی ہوں خان۔ ہولڈر کھنکھناتے۔“

اس نے کوئی بات کرنے اور سننے سے پہلے ہی ریسور ہولڈ کر دیا اور تیزی سے یاور علی خان کی خواب گاہ کی سمت

بڑی تھی۔

بہت آہستگی سے دستک دی تھی۔

”ٹھیک ہے مہربان۔ چلو آ رہی ہوں۔ ایسا کرو تم اوپر چلی جاؤ۔“ وہ دروازہ کھول کر باہر آتے آتے اپنی بات مکمل کر

جی تھی۔

مہربان کچھ بولے بنائے اپنے راستے پر چل پڑی تھی۔

رات اس کی بہت کل کٹی تھی۔ نہایت فطری امر تھا کہ ایک شخص اس کی زندگی کا اہم حصہ بن چکا تھا۔ وہ اپنے والہانہ

مذاز اس پر نچھاور کئے تھے۔ چاہے جانے کی عظیم لذت سے آشنا تھا۔ صرف ”دینا“ کیا ہوتا ہے یہ قیمتی آگئی بخشی

تھی۔ پھر اس کا بدلا ہوا انداز اس پر کیونکر اثر انداز نہ ہوتا۔

مجی اس نے اماں جی سے کہہ دیا تھا کہ اسے حیدر آباد بھجوادیں۔

”ہیں! یہ ایکا ایکا کیا ہوا؟ دو چار روز کیلئے تو تو اپنی خوشی سے رکی تھی۔ نہیں رکنا تھا تو علی کے ساتھ ہی چلی جاتی

۔“ دھمکی سے بولی تھیں۔

”بس اماں جی امیرادل چاہ رہا ہے جانے کو۔“

”آہم!“ ترنمین شرارت سے کھنکھاریں۔

”اب تجھے بچے کے ساتھ اکیلا بھیجنے سے تو رہی۔ علی نے کہا تھا علیم الدین کے ساتھ بھیج دیجئے گا۔ حیدر آباد ایر

ہاٹ سے ملے جاؤں گا۔ خیر میں تیرے خان سے بات کرتی ہوں۔ تو فکر نہ کر۔ تیرا تو جو بلی سے زیادہ کہیں دل ہی

نہیں لگتا تھا۔“ اماں جی مسکرائیں۔

”اب بتا۔ بہت رو رہی تھی کہ شادی نہیں کروں گی۔“ نازنین نے چھیڑا۔

اس نے جانے کس دھیان سے چونک کر نازنین کی سمت دیکھا۔ پھر خالی خالی نظروں سے اماں جی اور ترنمین کو باری

باز دیکھا۔

”کل کیا ہوتا ہے۔ کسی کو پتا توڑا ہی ہوتا ہے۔“ وہ سنجیدگی سے بولی۔

ترنمین کو اس میں کوئی خاص بات محسوس ہونے لگی۔

”اچھا اچھا۔ مگر نہ کر۔ کرتی ہوں بندوبست۔ اس سے اچھی کیا بات ہے کہ تجھے اپنے گھر کا خیال ہے۔“

”گھر بھی۔ کیا کوئی بات ہو گئی ہے؟ مجھے تو بڑی چپ چپ سی لگ رہی ہے۔“ ترنمین نے پوچھا۔

”نہیں بی بی جان اویسے ہی کچھ طبیعت سی خراب ہے۔“ اس نے خالی خالی نگاہوں سے نازنین کی سمت دیکھا تھا۔

”کمان جی! میں سامان باغیچہ ہی ہوں۔ بس آپ مجھے بھجوا دیں۔“

”ہاں ہاں۔ کہہ تو دیا۔ تیرے سفر کا انتظام ہو جائے تو علی کو بھی فون کروادوں گی ٹھیک ہے۔ تسلی رکھ۔“

”طیم الدین کو بھی تیری وجہ سے جلدی جانا پڑے گا۔ تیرے بڑے خان اکیلی کو تو بھیجیں گے نہیں۔“

وہ خاموش رہی۔ اسے کسی اور کے مسئلے سے دلچسپی نہیں تھی۔ سوائے اس کے کہ وہ اس شخص کو قریب سے ایک مرتبہ بھر دیکھنا چاہ رہی تھی جو اس کے سونے والے دھان جیسے وجود پر ابرہ بن کے برس رہا تھا۔ اتنا گھنا گھرا ہوا دل کہ اس کی سیریلیا کی طلب بڑھ گئی تھی۔ ضرورت طبع بن گئی تھی۔ اسے کچھ دیے بغیر بہت کچھ مل رہا تھا۔ ایسا نسخ کا سودا کہ خسارے کے خیال ہی سے گھبراہٹ ہونے لگی تھی۔

علی اس کو لینے آیا تھا۔ جیب ڈرائیو ڈرائیو کر رہا تھا۔ اس لئے رکی بات چیت کے علاوہ انہوں نے آپس میں اور کوئی بات نہ کی تھی۔

مگر رکی بات چیت کے دوران بھی علی اسے بہت دور محسوس ہوا تھا۔ اس لئے اس کی ہمت نہیں بڑی تھی کہ وہ خود سے کوئی عام سی بات بھی کر لیتی۔

حالانکہ اسے بہت صحن محسوس ہو رہی تھی۔ مگر پھر بھی اس نے کھانا خود بنایا تھا۔ علی اس کو گھر چھوڑ کر دوبارہ اپنے اسٹیشن جا چکا تھا۔ اور یہ بھی نہیں بنایا تھا کہ وہ گھر واپس کب آئے گا۔

وہ باری کو سلاتے سلاتے خود بھی سو گئی تھی۔ حالانکہ ایسا ارادہ تو نہیں تھا۔ رات کو اچانک آنکھ کھلی تو وہ ہڑا کر اٹھ بیٹھی تھی۔ ریک پر رکے نام نہیں پر نگاہ ڈالی۔ رات کا سوا ایک بج رہا تھا۔ اس نے باری کے ہاتھ پاؤں درست کئے اور اٹھ کھڑی ہوئی نیچے کارپٹ پر اماں بے خبر سو رہی تھی۔ وہ آہستہ سے زینہ اتر کر اپنی خواب گاہ میں آئی۔ خواب گاہ میں روشنی تھی۔

علی جاگ رہے ہیں؟ وہ حیرت سے سوچنے لگی۔

اور دھیرے سے دروازہ کھول کر جھانکا۔ علی اپنے دفتری کام میں مصروف تھا۔ مگر اس نے دروازہ کھلنے کی بجلی کی آواز سن لی تھی اور سر اٹھا کر سامنے دیکھا تھا۔

”باری کو سلاتے سلاتے میں خود ہی سو گئی تھی؟“ اس نے دروازہ بند کرتے ہوئے غیر اہم وضاحت کی۔

”کھانا بھی نہیں کھایا تھا آپ کے انتظار میں۔ آپ نے کھالیا ہے ناں؟“

وہ وارڈروب سے علی کا پسندیدہ خوابی کا لباس نکالتے ہوئے بولی۔

”ظاہر ہے آدھی رات گزر چکی ہے۔ ایسا کریں کھانا کھالیں۔ صبح ہونے میں بہر حال کافی وقت ہے۔“

وہ مصروف انداز میں اس کی سمت دیکھے بغیر گویا ہوا۔

”آپ آگئے تھے تو مجھے اٹھایا کیوں نہیں؟“ وہ اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے بولی۔

”میں نے سوچا۔ آپ تھکی ہوئی ہیں۔“ وہ اسی طرح مصروف انداز میں قلم استعمال کر رہا تھا۔

وہ لباس تبدیل کر کے واپس آئی تو علی کمرے میں نہیں تھا۔ طبیعت اور بھی پریشان ہو گئی۔ وہ بیڈ پر بیٹھ کر اس کے ہاتھ کی بات پلٹ کرنے لگی۔

تقریباً آٹھ دس منٹ کے وقفے کے بعد دروازہ کھلا اور علی اندر داخل ہوا۔ اس کے ہاتھوں میں ڈرے تھی۔

”یہ آپ نے کیا کیا؟“ وہ بہت شرمندگی محسوس کرنے لگی۔

”نہ جانے کیوں محسوس ہو رہا تھا کہ آپ کھانا نہیں کھائیں گی۔ کچھ اچھا نہیں لگا۔“ طربہ نے آگے بڑھ کر ڈرے تمام

لی۔

”اس طرح نہ کریں آپ میرے ساتھ۔ میں اس قابل نہیں تھی۔“ اس کی آواز بھرا گئی تھی۔

”علی جواب میں خاموش رہا اور دوبارہ اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ وہ تھوڑا سا سالن پلیٹ میں نکال کر کھانے لگا۔ حالانکہ دل تو بالکل بھی نہیں چاہ رہا تھا۔

”آپ..... آپ۔ کی طبیعت تو ٹھیک ہے ناں؟“ وہ ہچکچاتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔

”الحمد للہ۔ بالکل ٹھیک ہوں۔“ وہاں سے بر جستہ جواب آیا۔

”پھر کیا بات ہے؟“ اس نے مزید ہمت کی۔

”کوئی بات نہیں۔ کیوں؟“ وہاں انداز قلمی سادہ تھا۔

”جب انسان کچھ کہنا چاہتا ہے تب ہی اس طرح ہوتا ہے۔“ نوالہ اس کے قلم میں اٹک رہا تھا۔

”مثلاً کس طرح کا؟“ وہ بہت پرسکون تھا۔

”جس طرح آپ ہو رہے ہیں؟“ وہ روٹھ گئی۔

”اچھا۔“ مگر اہٹ بہت مصنوعی تھی۔

”کوئی بات نہیں ہے تو آپ فکر مند کیوں ہیں؟“ بہت سکون سے سوال ہوا۔

”فکر مندی کی تو بات ہے۔ آپ بہت بد لے ہوئے محسوس ہو رہے ہیں۔“ وہ بہت ہمت کر رہی تھی۔ مگر دل بہت

نیز و دھڑک رہا تھا۔

”وہم ہے آپ کا۔ دراصل مصروفیت بہت ہے۔“ علی نے سادہ لہجے میں کہا۔

”نہیں وہم نہیں ہے۔ دراصل وہ جو ہیں ناں یا درخاناں کی بیگم۔ نازنین نام ہے ان کا۔“

”ہوں..... پھر؟“ علی نے قدرے دلچسپی ظاہر کی۔ مگر اس کی طرف دیکھا نہیں۔

”میں پھر صوفے پر لیٹ کر فون کا انتظار کرنے لگی۔ جب آپ کا فون آیا تو میں یہی سمجھی..... تیمور خاناں کا فون آیا ہے۔“ وہ سادگی سے کہہ رہی تھی۔

”ہوں۔“ علی کی ہوں بہت لمبی اور گہری سوچ کا اظہار تھی۔
 ”یہ تیمور کیسا انسان ہے تمہاری نظر میں؟“ علی کا سوال قطعی غیر متوقع تھا۔ وہ بری طرح چونک پڑی۔
 ”بہت شریف آدمی ہیں۔ اچھے ہیں۔ آپ کو نہیں پتا“ آپ کے تو دوست ہیں۔“ وہ حیرانی سے بولی۔
 ”میں بھی مرد ہوں، وہ بھی ایک مرد ہے ایک عورت کی رائے لے رہا ہوں کہ کوئی عورت اسے کس درجے کا مرد سمجھتی ہے؟“ علی کا لہجہ عام سا تھا۔

”میں نے تو ان میں کوئی ایسی بات نہیں دیکھی، جیسے حویلی کے دوسرے مرد ہیں، ویسے ہی وہ ہیں۔“ دو کچھ سوچتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

”البتہ..... بابا صاحب کی طرح ذرا سخت ہیں۔ غصہ بڑی جلدی آجاتا ہے۔“ وہ مزید گویا ہوئی۔

”ناز بھابی کی شادی تو ان کے سامنے ہی ہوئی ہے۔ حویلی میں پہلے سے آنا جانا تھا ان کا؟“ علی کا سوال بڑا عجیب سا لگا اے۔ وہ الجھ کر اس کی سمت دیکھنے لگی۔

”میرا خیال ہے نہیں۔ جب میں حویلی آئی تھی تو اس وقت یادو خاناں کی شادی کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ بعد میں بھی ایسی کوئی بات نہیں ہوئی کہ جس سے پتا چلتا۔ وہ حویلی میں پہلے بھی آتی تھیں۔ میرا خیال ہے وہ لوگ بالکل غیر ہیں۔ ناز بھابی کی امی تو بڑی فیشن ایبل ہیں۔ ان کے بال بھی کٹے ہوئے ہیں۔ وہ زیادہ تر ساڑھیاں پہنتی ہیں۔ حویلی میں تو ان کی عمر کی عورتیں ساڑھیاں نہیں پہنتی ہیں۔ اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ غیر لوگ ہیں۔ کیوں؟ یہ کیوں پوچھ رہے ہیں آپ؟“ وہ ابھی۔

”یونہی“۔ علی مسکرا دیا۔

”آپ سکرائے کیوں؟“ وہ کچھ سمجھی نہیں۔

”چلو نہیں مسکراتا۔ برا لگتا ہوں مسکراتے ہوئے؟“

”نہیں“۔ وہ جھینپ گئی۔

”اچھا لگتا ہوں؟“ وہ شرارت کے موڈ میں آچکا تھا۔

مطربہ کے سر سے جیسے کوئی بہت بڑا بوجھ سرک گیا تھا۔ اس نے حیا آمیز انداز میں اثبات میں سر ہلایا تھا۔

★.....★.....★.....★.....★.....★.....★.....★.....

☆.....☆.....☆.....☆.....☆.....☆.....☆.....☆

”وہ میرے پاس آئیں اور بولیں۔ تیور خانوں کا فون آئے گا۔ میں نیچے کے پاس روپا دیوی کو بھیج دیتی ہوں۔ تم یہاں ہال میں بیٹھی رہو۔ فون آئے تو مجھے بلا لانا۔ اور کسی کو پتا نہ چلے کہ تیور خانوں کا فون آیا تھا۔“

وہ ایک تواتر سے بول رہی تھی۔ علی بغور اس کا چہرہ دیکھ رہا تھا جو ہر طرح کی باطنی کشش سے صاف تھا۔

”ہوں..... پھر؟“ علی کا چہرہ اس کی گہری سوچ کا مظہر تھا۔

اور پھر زندگی بے حد مصروف ہو گئی۔ علی نے بھی ترقی کے کئی مدارج طے کئے اس دوران کئی شہروں میں ٹرانسفر ہوئے۔ حال ہی میں وہ لوہا ب شاہ آئے تھے۔ ایس بی کی حیثیت سے علی نے چند روز ہوئے چارج سنبھالا تھا۔ جو علی یوں تو دو کئی مرتبہ مگر ایک بار دونوں سے زیادہ قیام نہیں رہا۔ علی کے ساتھ گئی اور اسی کے ساتھ واپس آ گئی۔

حال ہی میں جواز کی سائنس کا دعوت نامہ ملا تھا۔ اس کے سامنے جو بی کی تقریبات کے سلسلے میں ناظر محکم گئے۔ وہ

رہنہ عہد نے انہیں پر سکون کرنے کی کوشش کی۔ مطربہ گہرے جانتی رنگ کا ہماری کامدار آٹھل سر پر رکھ رہی تھی۔
 ہاتھ ایک لمحے کو فضا ہی میں معلق ہو کر رہ گیا۔
 احوال پر یقین دہندگی چھا گئی۔ اے اپنے آپ سے خوف آنے لگا۔ ہر روز ہی کوئی نہ کوئی بات سنی ہو جاتی تھی۔ ہر
 ہاتھ بچلے دن سے کچھ مختلف ضرور آتا تھا۔ دن کی کل کچھ اور رات کی کچھ ہوتی تھی۔ اتنے ڈھیر سارے بدلے ملنے متاثر
 ہو کر ہر رنگ کا مہر کیوں نہیں بدلتا۔ نہ دھندلاتا ہے۔

بہن نہ بھی کہیں نہ کہیں اس کے مختلف رنگ اس کے سامنے موجود ہونے کا احساس دلائی دیتے ہیں۔
اس نے دیر سے آچل مر پر جمایا۔ زخموں پر جی کھرڑ میں پھر کھنچاؤ محسوس ہونے لگا۔
”کہاں چلی ملریہ؟“ وہ اٹھنے لگی تو کئی آوازیں ابھریں۔
”ہاری کو دیکھتی ہوں۔ کہیں اٹھ نہ گیا ہو۔“ وہ آہستگی سے گویا ہوئی۔ احسان کی تاریخ کا غیر متوقع اعلان ہو گیا تھا۔
اے احسان سے پہلے کی تیاری درپیش تھی۔

”خاں سولہ آنے دیکھا ابھی آج تو ہم تجھ سے گمانش گئے۔“ تزئین کے اعزاز میں اصرار تھا۔
 ”نہیں جب وہ جاگ جاتا ہے تو میرے بغیر بہت گھبراتا ہے۔“ اس کا اعزاز بھی قطعی تھا۔
 ”یوں کیوں نہیں کہتی کہ تجھے خود نیند آرہی ہے۔“ وہ خنکی سے گویا ہوئیں۔
 ”واقعی بی بی جان! مجھے نیند آرہی ہے۔ سڑکی وجہ سے صحن بہت ہے۔“
 ”ابھی کچھ دیر پہلے تو بہت فریش لگ رہی تھی۔“ نازنین نے حیرانی سے کہا۔
 ”نیند نیند ہے۔ پوچھ کر تھوڑا سی آتی ہے۔“ وہ بے دلی سے مسکرائی۔

”اے سونے دواے۔ کیوں زور ڈال رہی ہو۔“ اماں جی نے محبت سے اس کی سمت دیکھا۔
 ”تو بھی جتنے کی ضرورت ہے؟“ خالہ سولہ آنے نے بڑے سے پان نکالتے ہوئے جیسے تعجب سے پوچھا۔
 ”انسان ہی جتنے ہیں خالہ۔“ وہ اداسی سے مسکرائی جیسے گہرے بادلوں کے بیچ ذرا کی ذرا کو چاند۔
 ”تاؤ۔ ہم تو سوچ رہے تھے تجھ سے گانا سنیں گے۔“ روشن آرا نے مایوس انداز میں نشست کا انداز بدلا۔
 ”گانا تو میں نہیں سناؤں گی۔ نہ آج نہ کل۔“ اس کا انداز واضح اور قطعی تھی۔
 ”ہیں۔۔۔ وہ کیوں؟“ سب کی سب بھونچکی رہ گئیں۔

گنگا ملی ناراض نہ ہوں۔ بقول اماں جی کہ بعض اوقات چھوٹی چھوٹی باتوں پر کھر بکڑ جاتے ہیں۔“ وہ بہت آہستہ آغاز میں بات کر رہی تھی۔

”خدا خواستہ“۔ اماں جی تو دہل کر رہ گئیں۔

”تو۔۔۔ ملی کو کتے کا کون کہتے تھے؟“ مازنین نے کہا۔

”بھڑ بھی۔۔۔ ان سے چوری تو ہوئی ناں؟“

مازنین ماں بن کر کچھ اور نکھر گئی تھی۔ دوسرے بچوں کا بھی خاندان میں اضافہ ہو چکا تھا۔ تزئین کی ہنسی اسی طرح جلتی رہی تھی۔

ہاری کے ساتھ کھینے کو اب کئی بچے تھے جنہیں گودوں میں دیکھا تھا وہ بھاگتے پھر رہے تھے اور کئی ایسے تھے جنہیں وہ پہلی بار دیکھ رہی تھی۔

اسے وہی گیسٹ روم ملا تھا جس میں اس نے شادی کی پہلی رات گزاری تھی۔
 ”توبہ..... مٹریہ..... تو تو بالکل ہی کھلی نکلی۔ تیری فیکٹری میں کچھ نہیں بنا ابھی تک؟“ تزئین نے چھیڑا۔
 ”توبہ ہے یہی جان!“ وہ بھری محفل میں ٹو کے جانے پر لالو لال ہو گئی۔
 ”علی نے تو نہیں کہا۔ ایک ہی ٹھیک ہے۔“ روشن آرا نے اصل کھوج لگانے کی کوشش کی۔
 ”نہیں وہ تو نہیں کہتے۔ وہ تو کہتے ہیں۔“ وہ کچھ کہتے کہتے ایک دم رک گئی جیسے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ہو۔
 ”ہاں..... ہاں۔ کیا کہتے ہیں۔“ نازنین نے اس کی بات پکڑی۔
 ”کچھ نہیں۔“ اپنی حماقت پر وہ بری طرح تجل ہو رہی تھی۔
 ”ہمیں بھی نہیں بتائے گی۔“ تزئین نے مصنوعی خنکی ظاہر کی۔
 ”وہ خاموش رہی۔“

”مجھے پتا ہے وہ کیا کہتا ہوگا۔“ روشن آرا نے اطمینان سے کہا۔
 ”کیا؟“ وہ سب سنجیدگی سے ان کی سمت دیکھنے لگیں۔
 ”یہی کہ مہندریوں نے مجھے اپنے قبیلے سے نکال دیا۔ اب میں اپنا قبیلہ الگ بناؤں گا۔“ وہ اتنے اعتماد اور سنجیدگی سے بولیں۔ گویا ان کے سامنے ہی یہ بات ہوئی ہو۔
 بے ساختہ قہقہے برسنے لگے تھے۔

”تو آپا! دیر نہیں ہو گئی کچھ؟ اتنی دیر سے قبیلہ بننا شروع ہوا تو مسئلہ ہو جائیگا۔ اسے تو بڑی دیر تک کام کرنا پڑے گا۔“

مین ٹگر معدی نے گویا ہوئیں۔

ایک مرتبہ بھرہنی کا طوقان برپا ہوا تھا۔ مطربہ کا چہرہ گھل ہو گیا۔
 ”ارے لڑکیوں! کتنے بجے کا جہاز ہے تیور کا؟“ اماں جی ڈرائنگ روم میں داخل ہو کر بے قراری سے پوچھ رہی تھی۔

”اماں جی ارات دو بجے کی فلاٹ ہے۔ مگر پہنچے پہنچے انہیں چار بج جائیگے۔ آپ آرام سے سو جائیں۔“

ایک روپہلی روشن دودھیا ہاتھ اس کے قلب سے نمودار ہوا۔ ایک طمانچہ اس کے رخسار پر رسید کیا۔ وہ قہر کر رہی تھی۔
”آپ لوگ مجھے معاف کر دیجئے۔ پھر سنا دوں گی، کل ان کا فون آئے گا تو پوچھ لوں گی۔“ وہ سادگی سے کہہ کر باہر نکل گئی۔

”واہ صاحب! کیا اطاعت ہے۔ سیدھی جنت میں جائیگی۔“ روشن آرائے ہنس کر کہا۔

”ہاں تو اچھی بات ہے ناں۔ اپنے مرد کا خیال رکھنا چاہیے۔“ اماں جی نے اس کی اس خوبی کو سراہتے ہوئے کہا۔
”بہت ہی سیدھی ہیں اماں جی آپ بھی۔ اس طرح کی گھریلو مغللوں میں تو سب جگہ چلتا ہے۔ کسی کی آواز اچھی ہوتی ہے تو اس سے گانا سن لیتے ہیں مگر لگتا ہے کہ یہ بہت گہری ہو گئی ہے۔ ہمیشہ کیلئے اندر سے اداس۔ اس کی ”بے خبری“ اس کا سب سے بڑا سکھ تھی۔“

ترنم کا تجزیہ دل کو لگ رہا تھا۔

محفل میں عجیب اداسی اتر آئی تھی۔

رات نیند بار بار ٹوٹی تھی۔ اور صبح باری کے جلد اٹھ جانے کی وجہ سے اسے بھی اٹھنا پڑا تھا۔ کونسی میں سناٹا ماری تھا۔
یوں لگتا تھا سب سو رہے ہیں۔ وہ باری کی انگلی تمام کرچکن میں آگئی تھی۔ صابرہ معمول کی مصروفیات میں مگن تھی۔
”ناشتا کر لگی مگر یہ؟“ وہ اس کی شکل دیکھتے ہی گویا ہوئی۔

”نہیں خالہ! مجھے تو بس ایک کپ چائے دیدو۔ البتہ باری کو ناشتہ کراؤں گی۔ ایک اٹھ اہال دو ہاف بوائے۔ اٹے میں میں تو س سیکتی ہوں۔“ وہ تھکے تھکے انداز میں باری کو کرسی پر بٹھا کر ٹوسٹر آن کرنے لگی۔

”میں کر لوں گی سب۔ رہنے دو۔“ صابرہ نے ٹوکا۔

”کوئی بات نہیں خالہ۔ اٹنے میں تم ایک کپ دودھ ٹھنڈا کر لو۔ چینی ہلکی ڈالنا۔“ وہ اسی کیفیت میں گویا ہوئی تھی۔

”طبیعت ٹھیک نہیں لگتی تیری۔“ صابرہ غور سے اس کی شکل دیکھ کر بولی۔

”نہیں ٹھیک ہوں۔“ وہ ہنسی سی ہنسی کر بولی۔

”گھر والا یاد آ رہا ہوگا؟“ صابرہ نے ماحول خوشگوار کرنے کی کوشش کی۔

”وہ بھولتا ہی کب ہے۔ وہی تو اب راستے کی روشنی ہے۔ کیسے بھولوں؟“ وہ یاسیت سے گویا ہوئی۔

”آج تو سب دیر سے اٹھیں گے۔ تیمور خان! رات ساڑھے تین بجے آئے تھے۔ سب صبح تک جاگتے رہے۔ اب دیکھو ناشتا کتنے بچے ہوگا۔“ صابرہ جیسے خود کلامی کر رہی تھی۔

اس کا دل بھر بڑی زور سے دھڑکا۔ ”آگئے۔“ وہ بے ساختہ بولی تھی۔

”ہاں..... ماشاء اللہ بڑی اچھی صحت ہو رہی ہے۔ بہت خوبصورت لگ رہے تھے۔ کالے کوٹ پہننا تھا۔“

صابرہ کے انداز میں جاشار ملازم کا وارفتہ بے لوث تاثر تھا۔

”اس کے سامنے دیوار پر ایک ٹکس روشن ہو گیا۔ وہ جلدی سے باری کی سمت آئی۔ وہ اگر گھر دووں کی سرگرمیاں دیکھ

نہیں اس کے خاموش، معصوم انداز پر اسے بے ساختہ پیار آ گیا۔ اس نے باری کا رخسار چوم لیا۔
”اللہ نظر سے بچائے۔ بڑا نصیب والا بچہ ہے۔ قسمت سے ہی سوتیلی ماں اچھی ملتی ہے۔“ صابرہ کو اس کی بے ساختہ اچھی لگی۔

”بڑے ترے چڑھادیے ہیں اس کے باپ نے مجھ پر۔ بہت ہوشیار ہے جیتنا آتا ہے اسے۔“

دو تیس پرکھن لگاتے ہوئے عجیب اداس انداز میں مسکرائی۔

”دو مردی کیا جو عورت کو نہ جیت سکے۔“ صابرہ دودھ میں چینی ملاتے ہوئے ہنسی۔

”بعض لوگ تو کھیل میں شریک ہوئے بغیر بھی جیت جاتے ہیں۔“ وہ کہہ رہی تھی۔

”تیری بات سمجھ میں نہیں آئی۔“ صابرہ تعجب سے اس کی شکل دیکھنے لگی۔

”وہ خاموش رہی اور باری کو ناشتہ کرانے لگی۔“

”ویسے اس کا باپ تو خوش ہے ناں تمھ سے؟“ صابرہ نے جانے کیوں پوچھا۔

”بس وہی تو خوش ہے۔“ وہ پھر عجیب انداز میں مسکرائی۔

”کیوں تو خوش نہیں ہے؟ اتنا بڑا نافر ہے وہ تو۔“ صابرہ کو حیرت ہوئی تھی۔

”نہیں..... میں بھی خوش ہوں۔ بلکہ مارے خوشی کے برا حال ہے۔“ وہ کھلکھلائی۔

صابرہ بھی اس کی بڑبڑکی پر مسکرا دی۔

”اسے کہتے ہیں بھاگ جاگنا۔ جب دل مل جائیں۔“ وہ گویا ہوئی۔

”اچھا؟“ اس کا چہرہ یلکھت ساٹ ہو گیا تھا۔

وہ باری کو نہلا کر خود بھی نہلا دھو کر باغ میں چلی آئی تھی۔ صبح کے ساڑھے نو بج رہے تھے۔ چمکیلی دھوپ نے باغ میں

بہت حسن پیدا کر دیا تھا۔ ابھی دھوپ میں تیزی نہیں تھی۔ وہ باری کے ساتھ بیٹ ہال ڈالائی تھی۔ چھوٹا سا اور اس کا

ہائٹ گھوڑا بھی کہ جانے کس موڈ میں کیا طلب کر بیٹھے۔ بیٹ بغل میں تھا اور گھوڑا سینے سے لگا ہوا تھا۔ اور چھوٹی سی گیند

اتھ میں پکڑ ہوئی تھی جبکہ باری پیچھے بھاگتا ہوا آ رہا تھا۔ بہت ہی دلچسپ منظر تھا۔

”اکی..... دھوڑا..... دھوڑے پٹھوں دا۔“ وہ بھاگتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

”بیٹا! گھوڑے پر بیٹھ کر کرکٹ نہیں کھیل جاتی۔ البتہ گھوڑے پر بیٹھ کر ہاکی کھیلتے ہوئے تصویروں میں دیکھا ہے۔“

”اچھا! بولی کتنی جلدی تھی“ اب بتا دو گھوڑے پر بیٹھنا ہے یا کرکٹ کھیلتا ہے۔“

”اسے پوچھو کہتے ہیں۔ جس کی آپ بات کر رہی تھیں یعنی گھوڑے پر بیٹھ کر ہاکی کھیلتے کی۔“

سائیکل کی بیچ سے ایک وینا حتی جمائے کانوں تک آیا۔

”بڑی طرح چونک پڑی۔ بھلا یہ آواز نہ پہنچا تھا۔“

”السلام علیکم خان!“ سامنے تیمور علی خان اسے نئے انداز میں دیکھ کر خفیف سا مسکرا رہے تھے۔

”وسلام۔ ٹھیک ہے۔ لگتا ہے بہت دوستی ہو گئی ہے بچے سے؟“ انہوں نے بچے کی طرف دیکھ کر پوچھا۔
”دشمنی تو ہماری بس اپنے آپ سے ہے۔ دوستی بہت جلدی ہو جاتی ہے سب سے۔“ وہ خود کو سنبھال کر بہت دھمکی
آواز میں گویا ہوئی۔

”علی کیا ہے؟“ انہوں نے بزرگڑوں میں ملیوں بھیکے بالوں والی طرف دیکھ کر پوچھا۔
”اجے ہیں۔ خوش ہیں۔“ اس نے خاصی بے توجہی سے جواب دیا۔
”یعنی تم نے خوش رکھا ہوا ہے۔ گڈ۔“ انہوں نے کسی استاد کی طرح شاباشی دی۔
”آپ کا اماں جی کا حکم ہے۔“ اس نے مبہمی کھنی کے ساتھ جواب دیا۔
”یعنی تمہارا دل نہیں چاہتا کہ اتنے اچھے شوہر کا خیال رکھو۔“ انہوں نے تعجب سے سوال کیا۔
وہ خاموش رہی۔

”ہماری اس سے دو تین بار فون پر بات ہوئی۔ ہمیں یہ جان کر بہت خوشی ہوئی تھی کہ وہ تم سے بہت خوش ہے کہ تم
اس کے بیٹے سے بہت پیار کرتی ہو۔“

”اتنا پیارا بچہ ہے۔ اسے تو سب ہی پیار کرتے ہیں۔ پھر میں کیوں نہ کروں گی کہ یہ اس شخص کی اولاد ہے جس نے
مجھے عزت دی۔“ وہ زہریلے انداز میں مسکراتی رہی تھی۔
تیوڑی خان نے اس کی سمت سناٹے نظروں سے دیکھا۔ ان کے سامنے وہ الہیہی طرف نہیں تھی بلکہ ایک سمجھداز
دار بیوی کھڑی تھی۔

”یعنی بات محل میں آگئی۔ اچھی بات ہے۔“ وہ اخبار رول کرنے لگے۔
”بعض لوگ دوزخ گیاں گزارتے ہیں خان ایک محل کے ساتھ۔ ایک دل کے ساتھ۔ اور یہ بڑا مشکل کام ہوتا ہے۔“

وہ گھاس پر بیٹھ کر باری کے گھوڑے کو دیکھنے لگی۔

تیوڑی خان ایک ٹاپے کو دم بخود سے رہ گئے۔ انہیں ہرگز یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ مطلب ہے۔ بلا کی پراپیٹا ڈبے ہزار
و بے خوف۔ مگر بہت ناراض ناراض سی۔ کیوں؟

وہ گئے جنگل میں شکار کھیل سکتے تھے مگر اس کیوں کے صحرا سے انہیں ہمیشہ خوف آتا تھا۔ وہ اس کی سرحدوں کے
پاس سے بھی گزرتا نہیں چاہتے تھے۔ تھوڑی بہت خوفزدہی سب ہی کو جانتا ہے۔

”تو یہ بے وقوفانہ حرکت کی ضرورت ہی کیا ہے۔ کیوں خود کو مشکل میں ڈالتی ہو۔ اتنے اچھے پارٹنر کے ساتھ تو ہوں
بھی زندگی بہت آسان ہو سکتی ہے۔“

وہ اپنے فطری مالکانہ سجاوے کو گویا ہونے کا حال نکھاب وہ ان کی کنیر نہیں تھی۔

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اور بچے کی طرف ساری توجہ کر لی۔ تیوڑی خان کو اس کے اس انداز سے بہت
احساس تو ہوا۔ مگر برداشت کیا کہ اس مقام تک وہ اسے خود ہی تو لائے تھے۔ وہ بے امان زخون ہاتھ نہیں تھی۔ بس

بہت ہی ہمدردی کی پیغم تھی۔ سخت مشکل مرحلہ تھا۔ وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ وہ یوں گن رہی تھی وہ وہیں موجود ہی نہیں
تھی۔

وہ اماں جی کو ڈھونڈتی ہوئی ڈانٹنگ ہال میں آئی تھی۔ وسیع و عریض ڈانٹنگ ٹیبل پر تیوڑی خان اور نازنین آہستہ
ہستہ ہاتھ کر رہے تھے۔ وہ جھج کر رک گئی تھی۔
”آؤ طریقہ۔ کوئی کام۔“ نازنین فوراً متوجہ ہوئی۔ کسی بات پر دونوں مسکرا رہے تھے۔ مسکراہٹ کا تاثر ابھی تک
ان کے چہرے پر تھا۔

”جی۔ وہ اماں جی کو دیکھ رہی تھی۔“ وہ جانے کیوں گڑباز رہی تھی۔
”کہاں چلی گئیں اماں جی۔ یہیں نیچے برآمدے میں تو تھیں۔“ نازنین نے کہا۔
”جی نیچے تو کہیں نہیں ہیں۔ سب جگہ دیکھ لیا۔“ وہ پلٹنے لگی۔ اسی دم ڈرانگ روم میں رکھے ٹیلی فون سیٹ کی کھنٹی
”مطلبہ اذرافون سننا۔ شاید امی کا ہے۔“

نازنین نے گھوم کر اسے مخاطب کیا۔ ڈرانگ اور ڈانٹنگ کے بیچ صرف ایک پردہ تھا۔ وہ بھی ہٹا ہوا تھا۔ اس نے
راٹھایا۔ ”ہیلو۔“

”کیا حال ہے پیگم صاحبہ کے۔“ دوسری طرف علی کی شوخ آواز ابھری۔

”السلام علیکم۔“ شوخی کا جواب بڑا سادہ سا تھا۔

”کیا ہو رہا ہے؟“

”کچھ نہیں۔ اماں جی تو اب مجھ سے کوئی کام کراتی نہیں ہیں۔ یہاں والوں کا خیال ہے آپ برا مانیں گے۔“ وہ
آہستہ آواز میں بات کر رہی تھی۔

”بالکل برا مانیں گے۔ بہت سمجھدار ہیں حویلی کے لوگ۔“ اسی سابقہ انداز میں علی کی بڑبڑکھی تھی۔

”خیر یہ بات تو ہے مگر یہ سب لوگ مجھ سے سچ سچ محبت کرتے ہیں۔“ وہ مسکرائی۔

”سب کی محبتوں کا ٹھیک ٹھاک اندازہ ہے سوائے ہماری محبت ہے۔“ وہ حد پار کرنے لگا۔

”اول۔۔۔۔۔ ہوں۔۔۔۔۔ اکیلی نہیں ہوں میں ادھر۔“ اس نے گھبرا کر ٹوکا۔

”کون کون بیٹھا ہوا ہے؟“ لا پرواہی کے انداز میں سوال ہوا۔

”تیوڑی خان آئے ہوئے ہیں۔ اپنی بھابی سے ہاتھ کر رہے ہیں۔“

”اس نے گردن موڑ کر پیچھے دیکھا۔“

”پچھلے ہی کیوں نہ بتا دیا۔ بلاؤ تیوڑی کو۔“

”خان آپ کو بلا رہے ہیں۔“ اس نے ماؤنڈ میں پر ہاتھ رکھ کر بلند آواز سے کہا۔

”کون؟“ وہ اٹھتے ہوئے پوچھ رہے تھے۔

”یہ ہیں۔“ اس نے نظریں جھکا کر جواب دیا اور ریسورہیلڈ اپ کر دیا۔

”خاندان تو چھوٹا ہی تھا۔ نام بھی چھوڑ دیا پارٹنر؟“ تیمور علی خان نے مسکرا کر گفتگو کا بے ساختہ آغاز کیا۔

”کیا مطلب؟“ علی کے لہجے میں حیرت آمیز استفسار تھا۔

”مطلب یہ کہ آپ کی بیگم صاحبہ سے پوچھا۔ فون پر کون ہے تو فرماتی ہیں۔ ناؤن (Noun) فم ہونڈر (Pro Noun) سے گزرا اور ہا ہے۔“

”بس یار! ہم تو اسے بھی ادا ہی کہتے ہیں۔ اس قدر حسن ہو تو پھر ہر ادا ہی بھتی ہے۔“ علی کا تہہ بلند ہوا۔

”بس اپنی اپنی قسمت بھی ہے۔ تم تو ڈارنگ کہہ کر انشاء اللہ بلائے جاؤ گے اور ہمیں ”یہ“ ”وہ“ پر گزارا کرنا پڑے گا۔“

وہ تیمور کو ہنستا مسکراتا اور نازنین کو فون بند ہونے کا منتظر چھوڑ کر باہر نکل گئی تھی۔

سالگرہ کا ہنگامہ رات گئے تک جاری رہا۔ اس نے کھانا بھی لیٹ کھایا تھا اور شاید پانی پے بغیر ہی سو گئی تھی۔ اس لئے کہ وہ نہایت گہری نیند سے چونک کر جاگی تو دھیان آیا شاید پیاس لگی ہے۔

اس نے ٹیبل پر رکھے جگ کی سمت دیکھا۔ پھر کچھ سوچ کر کمرے سے باہر آ گئی۔ اس وقت نہایت ٹھنڈا پانی پینے کا خواہش ہو رہی تھی۔ وہ زینہ اتر کر نیچے آئی تو یہ دیکھ کر بڑی حیرانی ہوئی کہ لاؤنج اور ڈرائنگ روم کی لائٹیں روشن تھیں اور دھیرے دھیرے باتیں کرنے کی آوازیں بھی آرہی تھیں۔ دل تو پہلے ہی گھبرا رہا تھا اس کی گھبراہٹ مزید بڑھ گئی۔

اس نے کمر کی کھشے سے یونہی چلتے چلتے جھانکا تو حیرت سوا ہو گئی۔

اماں جی! بابا صاحب اور تیمور علی خان نہایت فکر مندی بلکہ سکتے کی سی کیفیت میں بیٹھے ہوئے تھے۔ اسے دشت ہوئی تھی۔ وہ بے ساختہ اور بلا ارادہ دروازے سے اندر داخل ہو گئی تھی۔

”کیا ہو گیا اماں جی۔ اتنی رات ہو گئی آپ سوئیں نہیں، بھی تک؟“

اسے ان کا چہرہ دیکھ کر ڈر سا لگنے لگا۔ وہ خالی خالی آنکھوں سے اس کی سمت دیکھ رہی تھیں۔ مرجھائی ہوئی لکڑیاں تک اس کے بالوں میں جھول رہی تھیں۔ مٹے مٹے میک اپ کے نشان باقی تھے۔ نیند سے جاگنے کی وجہ سے آنکھیں ہو رہی تھیں۔ پپے بوجھل تھے۔

”ادھر آ میری بیٹی۔ میرے گئے سے لگ جا اماں جی کی آواز بھر رہی تھی۔“

”اول..... ہوں۔ کیا کرتی ہیں آپ۔ بیٹی ہے۔ رات کا وقت ہے۔“ بابا صاحب کا سستہ ٹونہ۔ تیمور نے فوراً قراری سے پہلو بدلا۔

اس کا دل پیٹھ گیا۔ ”کیا ہوا اماں جی؟“ اس کی آواز لرز رہی تھی۔

”کچھ نہیں۔“ بابا صاحب نے تیمور کی سمت دیکھا۔

”نہیں تو آپ سب اتنی رات کو کیوں جاگ رہے ہیں؟“ اس کا دل تیز تیز دھڑکنے لگا تھا۔

”نہیں تاں میں نے تو کیا کالے چور کو بتائیں گے۔“ اماں جی کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔

”بچے ناں خان! کیا ہوا ہے؟“ اس کی نیند ایک دم ہوا ہو گئی تھی اور ٹانگیں کاپنے لگی تھیں۔ جانے کیوں اس کا

”بچے ناں خان! کیا ہوا ہے؟“ اس کی نیند ایک دم ہوا ہو گئی تھی اور ٹانگیں کاپنے لگی تھیں۔ جانے کیوں اس کا

”بات یہ ہے کہ علی زخمی ہو گیا ہے۔ ڈاکوؤں سے مقابلے میں۔ وہ ہاسپٹل میں ایڈمٹ ہے۔ گھبرانے کی بات نہیں

”بات یہ ہے کہ علی زخمی ہو گیا ہے۔ ڈاکوؤں سے مقابلے میں۔ وہ ہاسپٹل میں ایڈمٹ ہے۔ گھبرانے کی بات نہیں

”اے رتی برادر! ان کی بات پر یقین نہیں آیا۔ اماں جی کے چہرے پر کچھ اور بے رحم سچائیاں تھیں۔ وہ وحشت بھری

”اے رتی برادر! ان کی بات پر یقین نہیں آیا۔ اماں جی کے چہرے پر کچھ اور بے رحم سچائیاں تھیں۔ وہ وحشت بھری

”فون سے صرف انہی کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔

”فون سے صرف انہی کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔

”اماں جی! مجھے سمجھ رہا ہے کہ اس نہیں آتے۔ یہی بات ہے ناں؟“ اس کے حلق سے بمشکل آواز نکل رہی تھی۔

”اماں جی! مجھے سمجھ رہا ہے کہ اس نہیں آتے۔ یہی بات ہے ناں؟“ اس کے حلق سے بمشکل آواز نکل رہی تھی۔

”اماں جی کی آنکھوں سے چند قطرے ٹپک کر جھریوں میں گم ہو گئے۔ اور اتنے زور کے جھکڑ چلے کہ بادبان ہی ٹوٹ

”اماں جی کی آنکھوں سے چند قطرے ٹپک کر جھریوں میں گم ہو گئے۔ اور اتنے زور کے جھکڑ چلے کہ بادبان ہی ٹوٹ

”اس پر سکتے کی کیفیت طاری ہو گئی۔

”اس پر سکتے کی کیفیت طاری ہو گئی۔

”مطربہ بی! احوصلہ رکھ۔ خبردار جو تو نے کسی کے کہنے پر چوڑیاں اتاریں۔ یہ سب ہندوانہ رسم و رواج ہیں۔ کتنی بھتی

”مطربہ بی! احوصلہ رکھ۔ خبردار جو تو نے کسی کے کہنے پر چوڑیاں اتاریں۔ یہ سب ہندوانہ رسم و رواج ہیں۔ کتنی بھتی

”نیزلی! کیا ان رنگ برنگی چوڑیوں سے۔“ اماں جی اسے سینے سے لگا کر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑیں۔

”نیزلی! کیا ان رنگ برنگی چوڑیوں سے۔“ اماں جی اسے سینے سے لگا کر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑیں۔

”ایک بھر کی سل کی طرح ان کے سینے سے لگی ہوئی تھی۔ آنکھیں صحرا کی طرح خشک تھیں اور تیمور علی خان پر جی

”ایک بھر کی سل کی طرح ان کے سینے سے لگی ہوئی تھی۔ آنکھیں صحرا کی طرح خشک تھیں اور تیمور علی خان پر جی

”اب بتایا ہے تو اسے رلاؤ بھی۔ ورنہ اس کی جان کے لالے بھی پڑ سکتے ہیں۔“

”اب بتایا ہے تو اسے رلاؤ بھی۔ ورنہ اس کی جان کے لالے بھی پڑ سکتے ہیں۔“

”بابا صاحب نے اس آواز میں گھمبیر خاموشی توڑی۔

”بابا صاحب نے اس آواز میں گھمبیر خاموشی توڑی۔

”مطربہ۔“ انہوں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔

”مطربہ۔“ انہوں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔

”بیٹی! بہت سی عورتیں یہ دکھ اٹھاتی ہیں اور پھر تیز دھوپ میں بڑے حوصلے سے راستہ کاٹتی ہیں۔ دکھ کتنا ہی بڑا

”بیٹی! بہت سی عورتیں یہ دکھ اٹھاتی ہیں اور پھر تیز دھوپ میں بڑے حوصلے سے راستہ کاٹتی ہیں۔ دکھ کتنا ہی بڑا

”نہ نہ تو جیانا تو پڑتا ہے۔“ اماں جی نے اس کا سراپے سینے سے لگا کر گلوگیر آواز میں سمجھایا۔

”نہ نہ تو جیانا تو پڑتا ہے۔“ اماں جی نے اس کا سراپے سینے سے لگا کر گلوگیر آواز میں سمجھایا۔

”گلی چلے گئے اماں جی؟“ اس کی آواز بہت گہرے کنویں سے آئی۔

”گلی چلے گئے اماں جی؟“ اس کی آواز بہت گہرے کنویں سے آئی۔

”سب نے جانا ہے بیٹی! وہ رو پڑیں۔“

”سب نے جانا ہے بیٹی! وہ رو پڑیں۔“

”اب تو جب جانا ہے جانا ہے۔ مگر آپ خان سے پوچھئے۔ انہیں کھینے کو میں ہی ملی تھی؟ آپ انہیں کوئی بڑی سی گڑیا لا

”اب تو جب جانا ہے جانا ہے۔ مگر آپ خان سے پوچھئے۔ انہیں کھینے کو میں ہی ملی تھی؟ آپ انہیں کوئی بڑی سی گڑیا لا

”اماں جی۔ یہ میرے دل کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑے ہیں۔ ذرا ان کی طرف دیکھئے، قصائی نظر آرہے ہیں۔ اماں

”اماں جی۔ یہ میرے دل کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑے ہیں۔ ذرا ان کی طرف دیکھئے، قصائی نظر آرہے ہیں۔ اماں

”میں نے وہ بات پسند ہے جس سے میرا دل کانپ جائے۔ جس سے میری آواز کمزور پڑ جائے۔ جس سے میری

”میں نے وہ بات پسند ہے جس سے میرا دل کانپ جائے۔ جس سے میری آواز کمزور پڑ جائے۔ جس سے میری

”میں نے وہ بات پسند ہے جس سے میرا دل کانپ جائے۔ جس سے میری آواز کمزور پڑ جائے۔ جس سے میری

”میں نے وہ بات پسند ہے جس سے میرا دل کانپ جائے۔ جس سے میری آواز کمزور پڑ جائے۔ جس سے میری

اُمیں رو جو رہی ہوں۔“

وہ ہلک ہلک کر رو دی۔

تینوں اپنی جگہ دم بخود سے بیٹھے تھے جیسے حرکت محال ہو۔ بابا صاحب ابھی ہوئی نظروں سے اس کی جانب دیکھتے تھے۔

”اماں جی! مجھے تو چھنے کا شوق تھا۔ یہ رونا کیوں پڑ گیا ہے؟ اماں جی! میں نیلے کی کلیاں پہنوں گی۔ میں نہیں ہنسنے کی سفید کپڑے۔ خان۔ میری جان کے دشمن۔ اللہ کرے۔“

”ہوش کر مطربہ! اماں جی نے بے ساختہ اپنا ہاتھ اس کے منہ پر رکھ دیا۔ کلیجہ کانپ کر رہ گیا تھا ان کا۔“

”بیٹی وہ کسی سے پوچھ کر تھک رہی نہیں لگتا۔ حیران خان اسے تیرے لئے خوشی بنا کر لایا تھا۔ تیرا گھر بسا یا تھا بیٹی۔“

”میرا دل اجاڑا تھا اماں جی!۔ وہ چھپیں مار مار کر رونے لگی۔

بابا صاحب کو ایک گہری چپ نے گھیر رکھا تھا۔ تیمور اپنی انگلیاں چٹکار رہے تھے۔ نہایت اضطراری کیفیت تھی۔ شاید کوئی اور موقع ہوتا تو دلاور علی خان اس کی زبان پر انگارہ رکھوا دیتے مگر اب یہی سمجھا جا رہا تھا کہ اہاں کہہ دے سے اس کا ذہنی توازن بگڑ گیا ہے۔

”یہی لائے تھے اسے میرے لئے۔ انہوں نے قسمت کا فیصلہ کیا تھا۔ وہ تو یوں بھی گولی کے نشانے پر تھے۔ دو لے کھتا تھا کہ مہندی اس کے نام کی گولی سنبھال کر رکھے ہوئے ہیں۔ وہ مجھ سے مذاق میں کہتا تھا۔ کبھی بھی خدا حافظ کہہ سکا ہوں۔ ہر ملاقات کو آخری سمجھا کر وہ ڈاکوؤں کی گولی سے نہ مرتا تو مہندی اسے مار دیتے۔ اماں جی! انہوں نے مجھے اجاڑنے کیلئے بسا یا تھا۔ اماں جی! انہیں مجھ سے بہت چڑ ہے۔ انہیں میرا ہر کام غلط لگتا تھا۔ پتا نہیں کہاں کہاں کا خطر نکلا ہے انہوں نے مجھ پر۔۔۔۔۔ ہائے میرے اللہ۔ علی۔“

وہ بری طرح دھڑکیں مار مار کر روئی۔

”تیمور! بابا صاحب کی آواز بہت دھیمی تھی۔

”جی بابا صاحب!۔ وہ کسی دھیان سے چوکے۔

”بیٹے! تم اس کے سامنے سے ہٹ جاؤ۔ یہ اپنے ہوش میں نہیں ہے۔ جاؤ اور پتا کرو میت یہاں کب تک پہنچے گی۔“

وہ بہت دھیمی آواز میں بول رہے تھے مگر اس نے سن لیا۔

”میت۔۔۔۔۔ ہائے اماں جی! وہ تیمور اکراقلین پر ڈھے گئی تھی اور اسی لمحے دوسرے گھر والے القال و خیراں اندر داخل ہوئے تھے۔ سب سے آگے بدحواسی کے عالم میں خالہ سولہ آنے لگی تھیں۔

”کیا ہوا اماں جی! تو تمہیں حواسہ باختہ نظر آرہی تھیں۔

”پانی لاؤ سولہ آنے سے ہوش میں لاؤ۔“ اماں جی نے جیسے ترنمین کی بات نہیں سنی۔ خالہ سولہ آئے پتھر پتھر رہ گئیں۔

”ہاں جی! بابا صاحب کیا ہوا ہے؟“ رئیسہ بیگم کے چہرے پر بھی ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

”علی!۔ اب دنیا میں نہیں ہے بیٹی۔“ بابا صاحب نے بہت وقار سے مضبوط لہجے میں سب کے سروں پر ہم

بھلا ”جی! کیا؟“ مختلف قسم کی آوازیں گونجنے لگیں۔

”بس نے بتایا؟“ نازنین نے بہت دکھ سے مطربہ کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”منون آیا تھا اس کے اسٹیشن سے۔ وہاں گھر پر کیا ہوگا۔ ملازم نے یہاں کا نمبر دیا ہوگا۔ تیمور نے سنا تھا۔“

انہوں نے بھوکے مت ایک نگاہ اپنے مخصوص انداز میں ڈال کر جواب دیا۔

”ہمیں بہت دکھ ہوا۔ نئی زندگی بگڑی ہے۔ جتنا غم کرے کم ہے۔“ وہ تاسف بھرے انداز میں کہہ رہے تھے۔

”اللہ ہے مہربان والا۔ ورنہ مرنے والے کے ساتھ مر جائیں لوگ۔ مجھے تو فکر ہو گئی ہے۔ اس کا دماغ نہ پلٹ جائے۔“ اماں جی بھرائی ہوئی آواز میں کہہ رہی تھیں۔

ایم خالد سولہ آنے جگہ گلاس لئے ہوئے تیزی سے اندر داخل ہوئیں۔ رئیسہ بیگم نے جگ ان کے ہاتھ سے لے

لہا ہر جلدی جلدی اس کے منہ پر چھینٹے ڈالنے لگیں۔ ترنمین بھی دوڑا تو بیٹھ کر اس کے رخسار چھپانے لگیں۔

”مطربہ!۔ اٹھو۔ دیکھو۔ یہاں سب ہیں۔ دیکھو اماں جی! بہت پریشان ہو رہی ہیں۔ شاہاش!۔“

مردوں نے مس نے ہوئی۔

”ظہیر! آج اس طرح کام نہیں چلے گا۔ ہم میڈیکل ٹریٹمنٹ کرتے ہیں۔“ تیمور ہا ہر نکل گئے۔

”ہائے۔۔۔۔۔ کیسی مشکل آئی ہے بیٹی پر؟“ اماں جی کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

”آپ اپنے آپ کو سنبھالو رئیسہ کی ماں۔ ورنہ بیٹی کو سنبھالنا مشکل ہو جائیگا۔“

دلاور علی خان کو بیوی کے بہتے آنسوؤں سے اور طرح کی پریشانی لاحق ہوئی۔

”میرا تو دل پھٹ رہا ہے۔ شام کو نیلی ستاروں بھری ساڑھی میں کسی ہنستی کیلپی پھر رہی تھی۔ ناز کی طرف کی عورتیں

کہہ رہی تھیں۔ ایسا حسن نہیں دیکھا۔ کہیں کوئی کی نہیں۔ نظر لگی ہے غریب کو۔“

”اماں جی! پلیز آپ کچھ نہ بولیں۔“ تیمور علی خان اندر داخل ہوتے ہوئے گویا ہوئے۔

”اس طرح تو وہ دوبارہ بے ہوش ہو جائیگی۔“

”تیمور ٹھیک کہہ رہا ہے رئیسہ کی ماں؟“

تیمور نے روئی میں کوئی دوا لگا کر اس کے تھنوں کے قریب کی مطربہ نے تڑپ کر چہرہ ادھر ادھر کیا۔ پھر دوبارہ ساکت

نہوئے پھر عمل دہرایا۔ مطربہ کے جسم میں زور سے جھٹکا لگا اور اس نے آنکھیں کھول دیں۔ تھوڑا فوراً اٹھ کھڑے

”مطربہ! اٹھو شاہاش! ترنمین نے بہت پیار سے کہا اور اسے سہارا دے کر بٹھایا

”بی بی جان! وہ ان کے شانے سے لگ کر پھر بلک بلک کر رودی۔ ترائین کی آنکھوں سے بھی آنسو بہنے لگے۔ تیمور علی خان فوراً ہا ہر نکل گئے۔

”یہ کہاں گئے ہیں۔ کیا علی کو لینے گئے ہیں۔“ وہ زور سے چیخی۔

اماں جی اپنی جگہ سے اٹھیں۔ ”خود کو سنبھال بیٹی، چل اپنے کمرے میں۔“

”اٹھو۔“ رئیسہ بیگم نے بھی اسے اٹھایا۔

”بی بی جان! اسے اوپر نہ لے کر جائیں۔ بچا اٹھ گیا تو اور مشکل ہو جائیگی۔“ ترائین نے رئیسہ بیگم سے کہا۔

”ہاں ٹھیک کہتی ہو، چلو اسے میرے کمرے میں لے چلو۔“ ترائین نے رئیسہ بیگم کے ساتھ مل کر اسے بھٹک کر لایا۔

”بی بی جان! باری کو تو بتا دیں کہ اس کا باپ تیزی دکھا گیا۔ ہائے اماں جی میں بچے کا کیا کروں گی؟“

وہ بے ربط ہو گئی۔ وہ سب خاموش رہیں۔

”کیا کرتے ہیں بچے کا۔ تیرے مرد کی اولاد ہے۔ تو رکھے گی اس کا خیال اور کون رکھے گا۔“ اماں جی نے بہت دکھ سے کہا۔

وہ باہر آئیں تو دیکھا تیمور علی خان پشت پر ہاتھ باندھے برآمدے میں ٹہل رہے تھے۔

”وہ بچہ مجھ سے زیادہ ان کا ہے۔ انہیں دیدیں۔ یہ لائے تھے ناں؟ انہوں نے ہی باندھی تھی یہ ٹخنوں میرے لے میں۔ انہی کے ہوتے سوتے کا ہے وہ بچہ۔ میرا کچھ نہیں لگتا۔“

وہ تیمور علی خان پر نظر پڑتے ہی پھر ہڈیاں ہونٹیں۔

”اب دیکھئے گا۔ اگر ایک دن میں نے بھی اپنے گلے میں بھینٹا ڈال کر نہ دکھایا انہیں۔ دیکھ لینا آپ سب! دیکھئے گا کتنا خوش ہوں گے۔“

وہ پھر بے ہوش ہو کر رئیسہ بیگم کے بازوؤں میں آ رہی۔

تیمور علی خان نے ماں کی طرف دیکھا۔

”میں نے تو اسے بتا دیا تھا کہ میت یہیں آ رہی ہیں۔ اچانک دیکھتی تو اور برا ہوتا۔“ وہ شرمندگی سے وضاحت کرنے لگیں۔

قرآن خوانی ہو رہی تھی۔ جنازہ برآمدے میں تھا غسل دیا جا چکا تھا، ماحول میں کافور اگر بیٹی کی خوشبو ہر سوسو گواری پھیلا رہی تھی۔

مطربہ بڑی سی کالی چادر پہنے کمرے میں بت بنی بیٹھی تھی۔ اور نیچے اسی کا انتظار ہو رہا تھا کہ ردا لگی کے سارے

انتظامات مکمل تھے۔ ترائین اسے دو مرتبہ نیچے آنے کا کہہ آئی تھیں اب اور کسی میں ہمت نہیں تھی کہ اسے بلا لائے۔

ہاں صاحب بار بار گھڑی دیکھتے تھے پھر اماں جی کی طرف دیکھتے تھے مگر وہ کیا کر سکتی تھیں۔

آدھا گھنٹہ اسی ککھش میں گزر گیا۔

برائی خالہ سولہ آنے کے پاس تھا۔

تھوڑی دیر بعد نہینے پر قدموں کی چاپ ابھری۔ سب نے چونک کر سر اٹھائے تھے۔ قیامت حسن سیاہ راز میں

بٹمناتے ہوئے کچھ اور ہی رنگ میں آ گیا تھا۔ وہ دھیرے دھیرے قدم رکھتی جنازے کے قریب پہنچی۔ سب کے دل

تیز تر دھڑکنے لگے۔

پہلوں میں گھبراہٹ کا چہرہ دکھ کر احساس ہوتا تھا گویا گہری نیند سو رہا ہو اس نے جھک کر بغور دیکھا۔

”اجی خوبصورت چمکدار آنکھیں۔ اب انہیں کبھی نہیں دیکھیں گے۔ میں تو ویسے ہی دیکھ نہیں پاتی تھی۔ کیا بجلی تھی ان

آنکھوں میں۔“ تیمور خاناں! اسے دور کھڑے تمہیں کو مخاطب کیا۔ ساری خواتین تھرا کر رہ گئیں کہ جانے کیا بول

پڑے۔ مگر سے باہر کی خواتین بھی قریبی لاؤنج میں بیٹھی تھیں۔

”آپ نے بڑی زیادتی کی تھی اپنے دوست کے ساتھ۔ میں اس کے قابل نہیں تھی کھوٹا سکے۔ دھول۔ بے قیمت۔

میں مجھے معاف کر دیجئے گا۔ میں کیکر تھی اس لئے مجھے پھل نہیں آئے۔ مجھے معاف کر دیجئے۔“

دو چہرہ ہاتھوں میں چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔

اماں جی اٹھ کر اس کے قریب آئیں۔

”بس زیتون ہاؤس اب خدا حافظ کہہ دے۔ مردانہ تنقار میں کھڑے ہیں۔“

انہوں نے شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ پھر انہوں نے تیمور کو اشارا کیا کہ مردوں کو بلا لو۔ پھر مطربہ کو

اٹھایا۔

”جلواندر چلتے ہیں۔“ دوسری تمام خواتین بھی اٹھ کھڑی ہوئیں۔

اماں جی اسے لے کر لاؤنج کی طرف بڑھ گئیں۔ وہ اب بالکل بت بن چکی تھی۔ ایک دم خاموش اور بے تاثر۔

اسی دم مکمل طیبہ پڑھنے کی آوازیں بلند ہوئیں۔ ترائین نے گھبرا کر مطربہ کی طرف دیکھا۔

”میں نے غلطی سے معافی مانگ لی ہے۔ کیا مرا ہوا انسان معاف کر دیتا ہے؟“ اس نے سپاٹ لہجے میں اماں جی کو

مخاطب کیا۔

”اسے تجھ سے کوئی شکایت نہیں تھی۔ وہ تجھ سے بہت خوش تھا۔ بہت تعریف کرتا تھا۔“ انہوں نے دلاسا دیا۔

”اکی بات پر تو رونا پڑ گیا ہے۔ مگر کسی کے میری بات سمجھ میں نہیں آئے گی۔“

”مجھے ٹیلی فون پر کہتا تھا۔ اماں جی آپ سب کا بہت بہت شکریہ۔ مطربہ بہت اچھی ہے۔ تو کیوں پریشان ہوتی ہے؟“ وہ پھر گویا ہوئیں۔

مطربہ نے سر آہ بھری۔

”آئینہ جتنا صاف ہو۔ شکل کے عیب بھی اتنے ہی صاف دکھائی دیتے ہیں۔ وہ بہت صاف آئینہ تھا اماں جی۔“ وہ

دوبارہ گورہتے ہوئے بولی۔

”تجھے تو وہ دنوں میں پڑھا گیا، مشکل باتیں کرنا سیکھ گئی ہے۔“ انہوں نے اسے صوفے پر بٹھا دیا۔

”اماں جی! جب کوئی عورت بیوہ ہوتی ہے تو سب سے زیادہ دکھ اس کی ماں کو ہوتا ہوگا۔“

اماں جی خاموش رہیں۔

”پتا نہیں وہ سب بھی کیوں یاد آ رہے ہیں جنہیں یاد نہیں آنا چاہیے۔“ وہ بڑبڑا رہی تھی۔

”اماں جی! علی کو یہ لوگ کب لے جائیں گے؟“ وہ پوچھ رہی تھی۔

سب نے چونک کر اس کی شکل دیکھی اور شکر ادا کیا کہ وہ بے خبر ہے۔

شاید جنازے کی روانگی کے وقت وہ ذہنی طور پر ماحول سے کٹی ہوئی تھی۔

حالانکہ کلمہ پڑھنے کی آوازیں دیر تک اندر آتی رہی تھیں۔

”لے جائیں گے آرام سے۔ تم یہاں بیٹھو۔“ ترائین نے کہا۔

سوئم کے بعد وہ لوگ حویلی واپس آ گئے تھے۔ جبکہ روشن آرا اور ترائین اپنے اپنے سرال چلی گئی تھیں۔ وہ کہیں بھی ہوتی تھی اسے ترائین ہمیشہ ہر وقت یاد آتی تھیں۔ ان کی شوح ہنسی چھیڑ چھاڑ کرنے کی عادت۔ کنو نہیں بخشتی تھیں۔ اماں جی تک سے سہیلیوں کی طرح مذاق کرتی تھیں اسی وجہ سے ان کی غیر موجودگی بہت عرصے تک محسوس ہوتی تھی۔ اور اب تو پھر اور طرح کا موسم تھا۔

اسے ایک گہری چپ لاحق ہو چکی تھی۔ جانے کیا سوچتی رہتی تھی۔ جہاں بیٹھتی تھی بس بیٹھی رہ جاتی۔ خالہ سولہ آنے ہی باری کو سنبھال رہی تھیں یا وہ اماں جی کے پاس رہتا تھا۔

اتنے عرصے میں اس کا تیمور سے سامنا نہیں ہوا تھا۔ یوں بھی عدت میں تھی۔ اماں جی کی ہدایت تھی کہ گھر کے نوکروں کے بھی سامنے نہ آئے۔ اسے نیچے آخری بالکل کونے کا کمرہ ملا ہوا تھا۔ جہاں وہ زیادہ وقت گزارتی تھی۔ باقاعدگی سے قرآن پاک پڑھ رہی تھی غالباً ایصالِ ثواب کیلئے۔ آخر عدت پوری ہوئی مگر اس کے طور طریقوں میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ اب بھی اس کا زیادہ وقت اسی کمرے میں گزرتا تھا۔ اماں جی اسے بہت کہتی تھیں کہ سب کے ساتھ اٹھا بیٹھا کرے کھانا کھایا کرے۔

آج وہ سورج چھپنے سے کچھ دیر پہلے باغ میں آئی تھی۔

باری بچوں کے ساتھ ٹھیل رہا تھا۔ کسی بچے کے ساتھ شرارت کر کے پناہ کی تلاش میں اس کی طرف بھاگا۔

”امی! امی!“ وہ اس کی ٹانگوں سے لپٹ گیا۔

”باری! مجھے تنگ نہیں کرو۔“ اس نے افسردگی و بیزاری کے طے جلتے تاثرات کے ساتھ اسے پیچھے ہٹایا۔

مگر اس پر کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ پہلے سے زیادہ گرم جوشی سے لپٹ گیا۔

”ہنو باری! خدا کیلئے میرا پیچھا چھوڑ دو۔“ اس نے چٹاخ ایک طمانچہ اس کے پھول سے رخسار پر رسید کیا۔

پہلی مرتبہ اس کا یہ بد صورت رویہ بچے نے دیکھا تھا۔ سہم کر اس کی شکل دیکھنے لگا۔ اسی دم تیمور علی خان اس کی پشت سے سامنے آئے۔ اور باری کا ہاتھ تھام کر اس کے مقابل کھڑے ہو گئے۔

”ہم آئندہ یہ سب برداشت نہیں کریں گے۔ ہمیں علی کی بیوہ سے زیادہ اس کے بچے کی فکر ہے۔“

اور پھر تم کسی ایسے شہید کی بیوہ نہیں ہو جو جنگ کے دوران کافروں کے ہاتھوں شہید ہوا ہو۔ اگرچہ وہ بھی درجہ شہادت پر فائز ہوا ہے مگر اس کا رنگ اور ہے۔ تمہاری شادی کبھی بھی کسی اور کے ساتھ ہو سکتی ہے مگر اس بچے کا نہ سگا باپ ہے نہ ماں۔ ہم اس کے ساتھ معمولی سی زیادتی بھی برداشت نہیں کریں گے۔ جانتی ہو اس کے باپ سے ہماری دوستی کب ہوئی تھی۔ جب ہم پانچ سال کے تھے۔ گھر کے بڑے بچوں اور بابا صاحب کے ساتھ خیر آباد چھٹیاں گزارنے جاتے تھے۔

جس شخص نے تمہیں دنیا میں سب سے زیادہ عزت دی۔ اس کی اولاد سے تم اس طرح کی بدسلوکی کرو گی؟“

”میرا دل بہت پریشان ہے خان! کچھ سمجھ نہیں آتا۔ آپ کو برا تو ضرور لگے گا مگر آئندہ آپ یہ شادی بیاہ کی باتیں میرے سامنے کبھی نہ کیجئے گا۔ آپ سے درخواست ہے۔ ناحق تو حیوان کو ستانا بھی جائز نہیں۔ کیا میں آپ کی گھوڑیوں سے بھی گزری ہوں؟“

وہ علی کی دی ہوئی شناخت کے بعد اب بہت اعتماد سے بات کرتی تھی پھر حویلی میں بھی اس کی ”ترقی“ ہوئی تھی۔ اس کا اثر بھی اس کی بول چال پر تھا۔ اور وہ ”فیشن ایبل“ عورت جو اس کی ماں تھی۔ اس کی ذات میں حلول ہو کر رہ گئی تھی۔ جس کی وجہ سے ذات میں ایک معرکہ برپا رہتا تھا۔ اس کا اثر بھی چہرے سے جھلکتا تھا۔ تیمور ”بہت کچھ“ کے خود بھی ذمہ دار تھے۔ اس لئے برداشت کا عمل ایک اصولی بات تھی۔

بچے ان کے ارد گرد کھڑے حیرت سے دیکھ رہے تھے۔

”کا کا جان! باری کی پٹائی کیوں ہوئی؟“ ایک بچے نے افسوسناک لہجے میں دریافت کیا۔

”جاؤ، کھلو آپ لوگ۔ جاؤ بیٹا آپ بھی۔“ انہوں نے باری کا ہاتھ چھوڑ کر نرمی سے کہا۔

”حویلی میں رہنا ہے تو بچے سے بہت پیار کرنا ہوگا۔ اب تم اسے جو چاہے سمجھ لو۔ تم یا حویلی میں کوئی اور اس کے ساتھ معمولی سی بدسلوکی کرتا پایا گیا تو اسی دن سے ہماری اس سے دشمنی طے ہو گئی۔ یہ ہم اس لئے کہہ رہے ہیں کہ تمہیں پتا چلے کہ یہ بچہ ہماری نگاہ میں کتنا اہم ہے امید ہے بات سمجھ میں آگئی ہوگی۔“

وہ اتنا کہہ کر پورج کی طرف بڑھ گئے۔

اسے اب کوئی کسی کام کیلئے تو نہیں کہتا تھا۔ وہ خود ہی کچھ نہ کچھ کرتی رہتی تھی۔ آج اس نے ہال میں سب سے تمام پلاسٹک کے پھول سرف کے جھاگ میں دھوئے تھے۔ اور باغ میں سکھائے تھے۔ اب سمیٹ کر ہال میں آئی تھی۔ دروازے ہی میں اسے نازنین مل گئی۔

”تیمور اپنے کمرے میں ہیں مطربہ؟“ اس نے رک کر پوچھا۔

”جی! مجھے تو نہیں پتا۔ اب تو مجھے اوپر کوئی کام ہی نہیں ہوتا۔“ وہ سنجیدگی سے کہہ کر اندر داخل ہو گئی۔

”اچھا ہم اوپر ہیں۔ پلیز اچھی سی چائے بھجوا دینا۔“ وہ غلت بھرے انداز میں بولی۔

”خان کے کمرے میں؟“ اس نے جاننا ضروری خیال کیا۔

”ہوں۔ وہیں۔“

وہ تیزی سے آگے بڑھی۔ سنہری کام کا آف وہائٹ پانجامہ اس پر بہت اٹھ رہا تھا۔ دوپٹہ سینے پر پڑا تھا اور ناگن جھینسی چوٹی پشت پر لہرا رہی تھی۔ چال میں عجیب سرمستی و بے نیازی تھی۔ مطربہ نے گہری سانس اندر کھینچی اور پھول میز پر ڈال کر چائے بنانے کیلئے کچن میں آگئی اور بجائے ماما یا خالہ سے کہنے کے خود چائے بنانے لگی۔

”کس کیلئے بنا رہی ہو؟“ ماما نے یونہی پوچھا۔

”چھوٹی دلہن نے کہا ہے۔“ اس نے جواب دیا اور ٹرے میں برتن رکھنے لگی۔

”لاؤ میں بنا دیتی ہوں۔“ ماما نے آگے بڑھ کر کہا۔

”کیوں اتنا تکلف کرنے لگی ہوں ماما۔ میں وہی ہوں کم ذات۔“ وہ تلخی سے مسکرائی اور اپنا کام کرنے لگی۔

ماما نے خالہ کی سمت بہت دکھ بھری نظروں سے دیکھا تھا۔ مگر خاموش ہو رہی تھی۔

اس نے بہت اہتمام سے چائے بنائی اور ٹرے اٹھانے سے قبل ماما کی طرف بڑھی۔

”ماما! اچھے اچھوں کی بیٹیاں بیوہ ہو کر میکے واپس آ جائیں تو کر کے کھاتی ہیں۔ میں تو پھر؟“

وہ ادا سی سے مسکرا دی اور ٹرے اٹھا کر باہر نکل گئی۔

حالانکہ وہ بڑی سیدھی اور صاف نیت سے چائے تیار کر کے لائی تھی۔ مگر تیمور علی خان کے کمرے کے قریب پہنچ کر جانے کیا ہوا۔ دروازے سے کان لگا کر کھڑی ہو گئی۔ اس نے ایسا کیوں کیا۔ یہ شاید اسے خود بھی پتا نہیں تھا۔

”مجھے تو اس کی آواز ہی اتنی پیاری لگی تھی کہ بس کیا بتاؤں۔ ویسے بہت دیر ہو گئی ہے۔ آپ کو اب گھر میں بتا دینا چاہیے۔“ نازنین کہہ رہی تھی۔

”وہ تو ٹھیک ہے۔ بابا صاحب کے ہاں تو پھر بھی گنجائش ہو سکتی ہے۔ اصل فکر تو ہمیں اماں جی کی ہے۔ یقین کریں سخت ٹینشن ہے۔“ تیمور کی آواز بہت سنجیدہ تھی۔

”آپ بابا صاحب کو ہینڈل کر لیں۔ باقی وہ خود سنبھال لیں گے۔“ نازنین نے نکتہ سمجھایا۔

”ہوں۔ یہ تو ہے۔ اماں جی بہت اموشنل ہیں۔ کہیں بات بہت سیریس نہ ہو جائے۔“

”آپ کی شادی کی بات پر تو شاید اتنی سیریس نہ ہو لیکن یہ جان کر انہیں بہت دکھ ہوگا کہ ان کا بہت پیارا سا پوتا ایک آپریشن کے بعد دنیا میں نہیں رہا۔ اس کے دادا، دادی اس معصوم کی شکل تک نہ دیکھ سکے۔“

نازنین نے بہت افسردہ لہجے میں کہا۔

مطربہ کی ٹانگیں لرز رہی تھیں۔

”شادی! پوتا۔“ اس کا دماغ گھوم کر رہ گیا۔

تیمور خاناں کی شادی بھی ہو چکی۔ بچہ بھی ہو گیا۔ وہ گم صم کھڑی تھی۔

”اس دن اس سے بات ہوئی۔ بہت خوشی ہوئی مشرقی اداؤں کی مغربی لڑکی ملی ہے۔ آپ سے تو عشق کرتی ہے۔“

میرا خیال ہے دھماکہ کر ڈالیں اور بلوالیں امید ہے اماں جی کو پند آ جائیگی۔“ نازنین کی آواز آئی۔

”سوچ تو ہم بھی رہے ہیں۔ وہ بھی اصرار کر رہی ہے۔ بچے کی ڈیڑھ کے بعد بہت ڈپریشن ہو گئی ہے۔ ہمیں آنے

ی نہیں دے رہی تھی۔ بہت مشکل تھی۔“ تیمور علی خان کی آواز میں تھکن سی تھی۔

”پہلے تو وہ ماں بننے پر ہی آمادہ نہیں تھی۔ کہتی تھی جو کچھ ہوگا۔ پاکستان میں ہوگا۔ ہم نے اسے سمجھایا کہ بچے کے ساتھ قبولیت کا مرحلہ آسانی سے طے ہو سکتا ہے۔ خیر پھر سمجھ گئی تھی۔ مگر ہوا وہی جو قسمت میں تھا۔“

مطربہ کی نگاہوں کے سامنے تیمور علی خان کے مختلف انداز گھومنے لگے۔ جس کا دل جگر جگر آباد ہو۔ اسے دلوں پر ٹوٹتی قیامتوں کا کیا اندازہ ہو سکتا ہے؟ اس کے دل سے ہوک سی اٹھنے لگی۔ چکر سا آ رہا تھا۔ اس نے بے اختیار دروازہ دھڑ

دھڑا کر بجا دیا۔

”یہیں۔“ تیمور علی خان کی آواز ابھری۔

وہ اندر داخل ہو گئی۔ دونوں دیویر بھابی ایک دوسرے کے مقابل بیٹھے تھے کمرے میں وہ خاموشی چھا گئی جو اچانک آجانے والے تیسرے فرد کیلئے ہوتی ہے اور گفتگو اپنے تسلسل کیلئے اس تیسرے فرد کے واپس جانے کا انتظار کرتی ہے۔

”ارے۔ تم کیوں۔ لے آئیں۔ تمہاری تو طبیعت بھی ٹھیک نہیں ہے۔ کسی سے کہہ دیتیں۔“

نازنین نے میز پر پڑے رکھتی ہوئی مطربہ کو مخاطب کیا۔

”کوئی بات نہیں خالی بیٹھنے سے تو طبیعت اور الجھ جاتی ہے۔“ وہ سپاٹ لہجے میں بولی۔

”چائے بناؤں؟“ وہ خود کو کمرے میں بوجھ محسوس کر رہی تھی۔ جیسے وہ دونوں اس کے باہر جانے کا انتظار کر رہے

ہوں۔ اسے یقین تھا کہ نازنین کہے گی، ہم خود بنالیں گے اور وہی ہوا۔ نازنین نے کہہ دیا تھا کہ وہ خود بنالے گی۔

مطربہ نے سیدھے کھڑی ہو کر آچل درست کیا اور تیمور علی خان پر ایک نگاہ ڈالی۔

دل ان کی طرح آباد ہو تو بندے کو ادھر ادھر دیکھنے کی کب فرصت ہوتی ہے۔ وہ لیمن کلر شرٹ اور بلیک پینٹ میں بہت نکھرے نکھرے محسوس ہو رہے تھے۔

اسے کیا پتا تھا آگے کون سے انکشافات کی کھائی ہے۔ اسے تو نازنین کے پراسرار انداز ہی چونکا رہے تھے۔ آج

چلا۔ وہ سب تو ہم رازی کی ادا کیں تھیں۔

وہ خاموشی سے باہر آ گئی۔ جانے کیوں تیمور کی آبادی پر دل میں محشر برپا ہو گیا تھا۔ اس کے ذہن میں اس طرح

نیچان برپا ہو گیا جس طرح کا علی کے انتقال والی رات ہوا تھا۔ وہ سیدھی باغ میں آگئی اور سر پکڑ کر ایک درخت کے نیچے بیٹھ گئی۔

تیمور علی خان اپنی انگریز بیوی کے ساتھ اسے باغ میں چہل قدمی کرتے نظر آنے لگے۔ وہ مسکرا رہے تھے۔ ایک

انسان کے وجود پر طاری تھی۔ وہ دنیا کے مطمئن ترین انسان دکھائی دے رہے تھے۔

اسے ان کے لہجے کی رتی رتی سفاکی یاد آئی۔ دل کے معاملے کو اتنی اہمیت دینے والے کو دوسروں کے دلوں

ساتھ اتنی زبردستی زیب دیتی ہے۔ اسے اپنی شادی کی پہلی رات بھی یاد آئی جب وہ دوزخ کی آگ میں جل رہی تھی

اور زہر کھا کر مر جانے کا جی چاہتا تھا۔

کاش اماں جی مان کر ہی نہ دیں۔

اس کے دل میں شرارے اٹھنے لگے۔ علی کی سادگی اور سچائی پر وہ کس طرح دن میں سو سو بار مرتی تھی۔ اس کی محبتوں کے بوجھ سے آج تک اس کی کمر ٹوٹی جاتی تھی۔

وہ ابھی تک سیاہ لباس پہنتی تھی۔ سیاہ رنگ، سوگ، کارنگ اندر آج تک جنگ ہوتی تھی کہ روگ کی نوعیت کیا ہے؟ اس کا جی چاہا۔ جلد سے جلد انکشاف ہو جائے۔ اور تیمور علی خان ہمیشہ کیلئے حویلی سے نکال دیئے جائیں۔ انہیں اتنے دکھ ملیں کہ وہ اس کے دکھوں پر غور کرنے لگیں۔ رابطے کا یہ سلسلہ بھی بہت ہوگا۔ کسی طرح تو وہ ان کے دھیان میں آئے گی۔

”مطربہ! یہاں کیا کر رہی ہے؟ یہ باری اتنی دیر سے تجھے ڈھونڈتا پھر رہا ہے۔ بہت رو رہا ہے۔“

خالہ سولہ آنے کی آواز اسے خیالات کے جنم سے باہر کھینچ لائی۔ وہ باری کی انگلی تھامے سامنے کھڑی تھیں۔ باری کے رخساروں پر اشک رواں تھے۔ وہ ہچکیاں بھر رہا تھا۔

”یہ مجھے سامنے نہ پائے تو دکھ محسوس کرتا ہے۔ کتنا گہرا رشتہ ہے میرا اس کے ساتھ۔“ اس نے باری کا ہاتھ کھینچ کر اسے اپنے سینے سے لگا لیا۔

”کیا ہوا میری جان! کیوں رویا میرا بیٹا؟“ وہ اس کی پیشانی سے بال ہٹا کر چومتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔

”آپ کہاں چلی گئی تھیں امی؟“ وہ ہچکیاں لیتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

”میں آپ کے بغیر باہر نہیں جاتی جان۔ آپ کو پتا نہیں۔ تو پھر آپ کیوں روئے؟ اس طرح نہیں روئے۔ اماں پریشان ہو جاتی ہیں۔“

”یہ تیری ذمہ داری ہے اب۔ دھیان رکھ کر۔ میں دیکھ رہی ہوں۔ تو بہت الگ الگ رہنے لگی ہے۔“

”یہ زندگی تو خود بھاری جنازے کی طرح میرے کندھوں پر دھری ہے۔ اس پھول کا کیا بوجھ خالہ۔“ وہ تلخی سے سکرائی۔ اور باری کا رخسار چوم لیا۔

”اللہ نہ کرے ابھی تیری عمر ہی کیا ہے۔ قسمت کا لکھا تو ہو کر ہی رہتا ہے۔ حویلی والوں نے تو اپنے ظرف بڑھا کر ری بہتری چاہی تھی۔ کسی کی دشمنی تو نہیں تھی تیرے ساتھ۔ ایک عزت دار آدمی سے بیباک تھا۔ اب تقدیر کو کیا کہیں۔ کیا نہیں کہ یہ دھوپ چھاؤں کیوں ہوئی؟“ وہ افسردگی سے گویا ہوئیں۔

مطربہ خلا میں گھورنے لگی۔

”خالہ! بعض لوگوں کی بات بات میں عزت جاتی ہے۔ وہ انجانے میں بدلے لیا کرتے ہیں۔“

”پتا نہیں کیسی باتیں کرتی ہے۔ میری تو سمجھ میں نہیں آتیں۔“ وہ جھلا کر بولیں۔

”خالہ! اسے دودھ کے ساتھ کچھ دیا تھا؟“ اس نے باری کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

”ہاں بس ایک توں کھایا تھا۔ وہ کیا کہتے ہیں لگا کر دی سیب کی بنی ہوئی کھٹی کھٹی۔“ وہ دماغ پر زور ڈالنے لگیں۔

”چچہ جلی۔“

”ہری! اب آپ کو سکول میں داخل کر رہے ہیں اور اسکول جانے والے بچے روتے نہیں ہیں۔ بڑے ہو جاتے ہیں۔“ وہ بہت شفقت بھرے لہجے میں اس سے ہم کلام تھی۔

”ہیش! اللہ۔“ سب ہی پیار کرتے ہیں اس سے۔ بڑے خان جو حویلی کے بچوں کو ساتھ لے کر نہیں جاتے۔ وہ بھی بڑے جگہ ساتھ لے جاتے ہیں۔ سب کتنا ڈرتے ہیں بڑے خان سے۔ یہ نہیں گھبراتا۔ بے دھڑک ان کے کمرے میں پہنچتا ہے۔ کہتا ہے۔ ”خان! گھوڑے کی سیر کرائیں۔“

”بڑے خان کہتے ہیں بیٹا! آپ ہمیں بابا صاحب کیوں نہیں کہتے۔ خان کیوں کہتے ہیں؟ تو پتا ہے کیا جواب دیا؟“

”میں کر پوچھنے لگیں۔“

”کہنے لگا ائی بھی تو آپ کو خان کہتی ہیں۔“ بڑے خان بہت ہنسے۔ بڑے خان کہتے ہیں بہت ذہین بچہ ہے۔

”اس کا باپ کم حاصر جواب تھا کہ وکیلوں کو ہر ادے۔ مجھے تو اس کے سامنے جواب ہی نہیں سوچتے تھے۔ اور جو باب سوچتے بھی تو لگتا تھا۔ اس سے جھوٹ بول رہی ہوں۔ اس لئے چپ ہی رہی تھی۔“

اس کی آواز بھرا گئی۔ چند قطرے آنکھوں سے ٹپکے اور باری کے سیاہ بالوں میں جذب ہو گئے۔

”اس طرح اکیلی نہ بیٹھا کر۔ ورنہ یہ سوچیں تجھے کھا جائیگی۔“ خالہ نے اسے سمجھایا۔

”یہ چھوٹی دہن پتا نہیں کہاں ہیں۔ یا درخاناں دو تین مرتبہ پوچھ چکے ہیں۔“ انہیں اٹھتے ہوئے دھیان آیا۔

مطربہ نے خالی خالی نظریں خالہ کے چہرے پر جمادیں۔

”وہ خوشیوں میں شریک ہیں۔ تو اب کما رہی ہیں۔“ اس کی آواز بھی بے اثر تھی۔

”ہائیں۔“ خالہ سولہ آنے تعجب سے اسے دیکھنے لگیں۔ ”کیا بولی؟“

”کچھ نہیں۔ آؤ باری! اندر چلیں۔“ اس نے باری کو گود سے اتارا اور کھڑی ہو گئی۔

وہ بارہ دسلا کر در پہنچے میں کھڑی جانے کن سوچوں میں مستغرق تھی۔ نازنین اور تیمور علی خان کی شام کی گفتگو بار بار ان کے دماغ کے کمرے میں گونجتی تھی۔

ایک لمحے رو پا دیوی اندر داخل ہوئی۔

”اماں جی بلا رہی ہیں۔“ اس نے پیغام پہنچایا۔

مطربہ نے کارنس پر رکھے ٹائم پیس کی سمت دیکھا۔ رات کے دس بج رہے تھے۔

”چلو آئی ہوں۔“ وہ باری کی طرف آئی۔ اسے درست کیا۔ اوپر بڑی چادر ٹھیک کی۔ اور کھوئی کھوئی سی اماں جی کے سرے میں چلی آئی۔

”اماں جی۔“ وہ ان کے قریب جا بیٹھی۔ اماں جی تسبیح پڑھ رہی تھیں۔ انہوں نے اشارے سے اسے صبر سے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

وہ خاموش ہو کر اپنی انگلیاں چٹنی نے مٹی۔

”باری سو گیا؟“ اماں جی نے تسبیح پوری کر کے چہرے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھا۔
”جی۔“ اس نے اختصار سے کام لیا۔

”تیری طبیعت کیسی ہے؟“

”ٹھیک ہے۔ مجھے بھلا کیا ہوگا۔“ وہ تلخی سے بولی۔

”اللہ نہ کرے۔ عمر پڑی ہے آگے۔ اپنے آپ کو سنبھال۔ ماں بھی مرے ہوئے بچے کے ساتھ قبر میں جا رہی نہیں لیکنی اور دنیا میں ماں کی محبت سے بڑی کوئی محبت نہیں۔ کیا تجھے احساس ہے کہ تیری یہ کالی چادر مجھے کتاب کو دینے سے“ اماں جی نے بہت دکھ سے کہا۔

”اب کیا کریں۔ اس میں ہمارا تصور کیا۔“ وہ بے دلی سے بولی۔

”کر کیوں نہیں سکتے۔ اللہ کی ذات راستے بنانے والی ہے۔“ اماں جی کا اندازہ تمہید باندھنے کا ساتھ۔

وہ چونک کر ان کی شکل دیکھنے لگی۔ دل وسوسوں میں گھرنے لگا۔

”شرع میں حکم ہے کہ بیواؤں اور طلاق والی عورتوں کے گھر سامنے میں جلدی کرو۔“

اماں جی نے کبنا شروع کیا۔

اس کا دل تیز تیز دھڑکنے لگا۔ اب کیا سونے والا ہے اب کون عزت دار آ گیا ہے؟

”پنوارن آئی تھی میرے پاس۔ عارف نام ہے اس کے لڑکے کا۔ پہلے بھی پیام دیا تھا اس نے مگر تیرے پاس زیادہ بہتر ہے۔ اس کی زندگی خطروں میں گھری ہوئی ہے۔ اسے کوئی مضبوط سہارا چاہیے۔ اب قسمت کا تو کوئی پتہ نہیں ہوتا۔ علی کی موت والے دن تو جو بولی سب کے سامنے۔ وہ تو شاید تجھے یاد نہ ہو۔ تجھے ہوش ہی کہاں تھا۔ مگر عجیب بات اللہ کی بات دیوانے پن میں ہی منہ سے نکل جایا کرتی ہے۔ تو نے اپنے سارے دکھ کی ذمہ داری تیرے سر ڈال دی تھی۔ مگر دنیا کی عدالت ہو یا اللہ کی۔ یہی بات ظاہر ہوگی کہ اس نے تیرا بھلا چاہا تھا۔ تو اس گھر کی نوکرائی بن کر آئی تھی۔ تجھے اس نے اپنے دوست کی بیوی بنایا تھا۔

میں نے تیرے تیرے تیرے سے ذکر کیا تھا۔ تیرے بہت خوش ہوا کہ اللہ نے تیرے آباد ہونے کا پھر سے امر پیدا کیا۔ کچھ لگا اماں جی پہلی فرصت میں نکاح کر دیجئے۔“

”یہ کہا تھا خان نے؟“ اس نے سپاٹ لہجہ میں پوچھا۔

”ہاں یہی کہا تھا۔ کیوں؟“ وہ حیرانی سے اسے دیکھنے لگیں۔

”کتنی خیال ہے انہیں میری خوشیوں کا۔“ اس کا انداز بدستور تھا۔

”کیوں نہیں۔ اسے سب کی خوشیوں کا احساس رہتا ہے۔“ وہ خوش ہو کر بڑے فخر سے کہہ رہی تھیں۔

”تو پھر سب سے زیادہ انہیں اپنی ماں کی خوشیوں کا احساس کرتا چاہیے۔ کیوں؟“

وہ استہزاء سے انداز میں مسکرائی۔

”پاکل۔ بہت خیال رکھتا ہے میرا بچہ۔ اللہ خوشیاں دکھائے۔“ وہ دعائیں دینے لگیں۔

”پنوارن کہہ رہی تھی کہ عارف بچے کو بھی اپنے ساتھ رکھنے پر تیار ہے۔ بس اسے تو یہ ہے کہ اس کی شادی کسی طرح

تیرے ساتھ ہو جائے۔ ہر شرط پر راضی ہے۔“

”بہت خوش نظر آ رہی تھی۔“

”ہر شرط پر؟“ وہ طنز یہ لہجہ میں پوچھ کر مسکرائے لگی۔

”ہاں۔ ہاں۔ یہی کہہ رہی تھی پنوارن۔ تیرے اور تیرے بڑے خان بچے کو تو شاید اب کبھی حویلی سے نہ جانے دیں۔

اب ذب کچھ ہے تو فکر نہ کر۔“

”اس سے کہنے گا۔ ہر شرط کی بات نہ کرے۔ معاملات میں زیادہ ہی سچائی آگئی تو رسی تزا کر بھاگ جائیگا۔“ اس

کے یوں پر زہریلی مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

”ہیں۔ کیا باتیں کر رہی ہے؟ سب کچھ پتا ہے انہیں۔ خدا نخواستہ کوئی ایسی بات نہیں ہوگی کہ دنیا سے چھپاتے

بھریں۔ تیری ماں تو اس کے سامنے ہی آئی تھی۔“ اماں جی کو الجھن ہوئی۔

”تیرے کہہ رہا تھا کہ بس جلد سے جلد کر دیں۔ سب سے الگ تھگ رہنے لگی ہے۔ کہیں وہ مریض نہ بن جائے۔ کیا

کہتے ہیں۔“ وہ درماغ پر زور ڈالنے لگیں۔ ”ہاں“ نفسیاتی۔“

”وہ کہہ رہا تھا۔ اس سے بہت مسئلے ہو جاتے ہیں۔“ وہ سادگی سے بولیں۔ وہ خاموش رہی۔

”کچھ تو بول۔“ اماں جی کو اس کی گہری خاموشی کھلنے لگی۔

”اماں جی! مجھے بہت تجھن محسوس ہو رہی ہے۔ باری کو بھی اکیلا چھوڑ کر آئی ہوں۔ جاؤں۔“ وہ یوں گویا ہوئی جیسے

ان کے درمیان کوئی خاص بات نہیں ہو رہی تھی۔

اماں جی نے تجب سے اس کی طرف دیکھا۔ یہ ان کی اتنی اہم بات کا جواب دیا تھا۔

”اچھا۔۔۔ چارم کر۔ غور کر لیا۔“ وہ کچھ الجھن میں پڑ گئی تھیں۔

وہ کچھ کہے باہر آ گئی۔ اس کے قدموں کا رخ اپنے کمرے کے بجائے تیرے حویلی خان کی خواب گاہ کی طرف تھا۔

وہ زینہ سے گر کر گھر آئی۔ پند لکھ کر کچھ سوچا پھر آہستہ سے دروازے پر دستک دی۔

”بس۔ دروازہ کھلا ہے۔“ تیرے حویلی خان کی آواز سے ایسا محسوس ہوتا تھا گویا وہ مصروف ہوں۔

وہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی۔

”السلام علیکم خان!“

”والسلام علیکم۔“ وہ راتنگ نیل پر مصروف تھے۔ اس کی آواز پر ریوٹنگ چیئر کا رخ اس کی سمت موڑ کر۔

تیرے حویلی سے اسے دیکھ رہے تھے۔

انہوں نے چپا کر روتی ہوئی پلٹ گئی۔ خرید ہی لیتے مربعوں کے عوض۔ آخری جملہ کیا تھا۔ بارود کا سلسلہ تھا۔

تھے کہ آج وہ کیسے عجب رنگ میں تھی۔ جیسے ہوش بھلائے ہوئے تھی۔

تجربہ مند اور گستاخ۔ بڑے خوف۔ وہ اپنا کام جاری رکھنے کے قابل نہ رہے تھے۔

”یہاں بیٹھی ہے۔ لے لے۔ سب ڈھونڈ رہے ہیں تجھے۔“ پوارن خالہ سولہ آنے کے ساتھ باغ کے انتہائی کونے میں بیٹھ جاتی چلی آئی تھی۔

اس نے بڑی بے رحم سرد نگاہوں سے پٹوارن اور خالہ سولہ آنے کو دیکھا اور پاؤں کی انگلیوں سے کھینے لگی۔

”نیک بخت سلام کر“۔ خالہ سولہ آنے نے ٹوکا۔

”مت خوش کیا کرو خالہ! یہ جھوٹے نام رکھ کر۔ نام رکھنے سے کیا قسمت بدل جاتی ہے؟“ اس کا حرف حرف سلگ رہا۔ نام بچر بھی نہیں کیا تھا۔

”میں مدقے جاؤں۔ اللہ نے چاہا تو قسمت ضرور بدلے گی۔ یہ دھوپ چھاؤں کا کھیل تو سب ہی کے ساتھ ہے میری۔ پوران نے آگے بڑھ کر اس کا چہرہ ہاتھوں میں تھام لیا اور پیشانی چوم لی۔

؛ گواہی لاشمار گشتوں کی صورت اس کی پیشانی پر نمودار ہوئی مگر وہ خاموش رہی۔

”مجھ سے میرا دل کر رہا تھا اپنی بیٹی کی صورت دیکھ کر آؤں۔ اب اتنی دیر سے تجھے ڈھونڈ رہے تھے۔ ہمیں کیا پتا تو یہاں نہ ہے۔ چل اندر چل سب فکر میں بیٹھے ہیں کہ جانے کہاں گئی؟“ پٹوارن نے اس کا ہاتھ تھاما۔

”یونہی..... فکر..... سب کو بس فکریں ہی ہیں۔“ وہ ہاتھ چھڑا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

”باری کہاں ہے؟“ اس نے خالہ کی طرف دیکھا۔

”بڑے خاں کے ساتھ گیا ہے۔“ خالہ نے بڑی کھوجتی نظروں سے اس کی سمت دیکھا۔

”اچھا۔۔۔ وہ کسی دھن میں چل پڑی۔ وہ دونوں اس کے پیچھے پیچھے آرہی تھیں۔“

نائبہ کر کے وہ برآمدے میں آئیں تو یاد علی خان اور تیمور علی خان انہیں دروازے کے عین سامنے کھڑے باتیں سن رہے۔

”بہال سے آرہی ہیں آپ؟“ یاور علی خان نے قدرے حیرانی سے پٹوارن کی طرف دیکھا تھا۔

نکسبانی میں تھے۔ خان! "خالہ نے مودبانہ انداز میں جواب دیا۔

یاد رکھیں جانے کون سے ہمارے ہی تھے اسے ڈھونڈنے گئے تھے۔ وہ مزید گویا ہوئیں۔

”اگر آپ کی شادی زبردستی کر دی جائے جبکہ آپ کہیں اور شادی کرنا چاہ رہے ہوں تو کیا آپ سب کی بات مانیں گے۔ اگر مان لیں گے تو آپ کے دل کا کیا حال ہوگا۔“

وہ بہت ٹھہر ٹھہر کر مگر بے خوف انداز میں بول رہی تھی۔

”تم کہاں کرنا چاہتی ہو؟“ انہوں نے جلد ہی اپنے مضبوط اعصاب ہونے کا ثبوت دیا۔ لہجے میں واضح غصہ تھا۔

رہی تھی۔

مطربہ نے ایک ٹائمنے کو ان کی سمت دیکھا۔ بہت خوبصورت سنہری پروں والا پرندہ۔ جو بہت بلندی پر اڑان بوجھ تو۔ اس کے دل کے قید خانے میں صرف اس کے حسن کی یادداشت محفوظ رہ سکتی تھی۔ اس سے زیادہ اور کچھ نہیں۔

”کہیں نہیں خان۔ کہیں بھی نہیں“۔ وہ بے ساختہ بول پڑی تھی۔

”ہم جانتے ہیں تمہارا دکھ تازہ ہے اور جب انسان بہت دکھی ہو یا بہت خوش ہو تو اس کا ذہنی توازن قائم نہیں رہتا اور اس کے فیصلوں پر بھروسہ نہیں کیا جاسکتا۔ فی الحال تم آرام کرو۔ دراصل باری کی وجہ سے تم ہمارے لئے پہلے سے کہیں زیادہ

ابم ہو گئی ہو۔ ہم اس بچے کو اپنی ذمہ داری سمجھتے ہیں۔“

”وہ مجھ سے تو کیا ہوا، سرداروں کی اولاد اور میں ٹھہری۔ ہونہ۔ میں شادی نہیں کروں گی خان۔ آپ سن لیجیے۔“

”وہ تو تمہیں کرنا پڑے گا۔“ حد ہو گئی تھی۔ وہ ایک دم کھڑے ہو گئے۔ احساس توہین سے ان کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔

”اماں جی نے آپ کیلئے شیخ رفیع کی لڑکی پسند کی ہے، آپ وہاں شادی کر لیجیے۔ پھر جہاں آپ کہیں گے، وہاں چلے جائیے۔“

”تیو علی خان دم بخود سے اس کی صورت دیکھنے لگے۔

”تم علی کی بیوہ ہو اس لئے برداشت کر رہے ہیں۔ مت دکھاؤ ہمیں اپنی کم ظرفی کے رنگ۔ ایک بے حیثیت نر نے ہم تمہاری ماں سے چند مریخ کے عوض خرید بھی سکتے تھے۔ یہ صلہ ہے ہماری مہربانیوں کا۔“ وہ جی جی مئے۔

”ہم سے برابری کرنے چلی ہو۔ ہم یہ کریں تو تم وہ کرو گی۔ تم ہوں کون؟ فوراً یہاں سے چلی جاؤ۔ بندہ“

(احسان کرتے تو سہی۔ آپ کے قدموں میں سر رکھ دیتے پھر کبھی نہ اٹھاتے)

ایک دھن دولت والا آدمی اپنے سے کمتر کے ساتھ جو بھی کرے وہ احسان۔ کاش میں یہ رسم کا پتہ نہ لیتا تو کیا جانتا کہ ظلم و احسان میں فرق کیا ہوتا ہے۔ جن پر احسان کیا گیا ہے اس کے دل کا کیا معاملہ ہے۔ یہ احسان بڑبڑاتا ہے۔

۔ اب بھی یا نہیں۔ اپنی وراثت میں احسان کرنے والے کو مشورہ کس حلیم سے دیا تھا۔ تیس اوں کا جواب
میں ابھی آپ کے سامنے ہی نہ آتی۔“

”ہاں..... اس کا خیال رکھنا چاہیے یہ بہت الگ تھلگ رہنے لگی ہے۔“ یاور علی خان نے ہمدردانہ نگاہ اس پر ڈالتے ہوئے کہا۔

”خیال رکھنے کی کوشش تو کر رہے ہیں۔ پٹوارن تو اسے بیٹی سمجھنے لگی ہے۔“ خالہ نے جواب دیا۔

”سمجھنے سے کیا ہوتا ہے۔ یوں تو میں بھی جانے کیا کیا سمجھ لوں۔“ وہ یہ کہہ تیزی سے آگے بڑھ گئی۔

وہ چاروں ایک لمحے کو خاموش سے ہو کر رہ گئے۔ اس کا گستاخانہ انداز یاور علی خان نے پہلی بار دیکھا تھا۔ انہوں نے ایک اچھتی نگاہ بھائی پر ڈالی تھی۔

”ڈپریشن ہے۔“ تیمور علی خان نے بظاہر لا پرواہی سے کہا۔

”میرے خیال میں اماں جی کا فیصلہ درست ہے۔“ یاور علی خان نے پٹوارن کی طرف دیکھ کر جیسے کسی نتیجے پر پہنچ رہی ہو کہا۔

”ہمارا بھی یہی خیال ہے۔“ تیمور نے تائید کی۔

”ہمارا خیال ہے آج نہیں۔“ تیمور علی خان کے انداز میں الجھن تھی۔

”جو کام آخر، نا ہی ہے اس میں پھر آج اور کل کیا؟“ یاور علی خان نے حیرت سے کہا۔

”مسئلہ ہے۔ یاور بھائی! فی الحال یہ ذہنی طور پر تیار نہیں ہے۔ آپ نے دیکھا نہیں ہر طرح سے بد لحاظ ہو گئی ہے۔ طرز بہت آتا ہے مگر اس کے دکھ کا اندازہ کر کے برداشت کرنا پڑتا ہے۔“

لیکن جلد تبدیلی اسے جلد تبدیل کر دے گی۔ یہ سب تو کچھ نہ ہونے تک ہے۔ یاور علی خان کیونکہ قطعی غیر جانبدار تھے اس لئے ان کا ذہنی رویہ بہت واضح تھا۔

”ہوں..... تو کوشش کر دیکھیے۔“ تیمور نے گویا اتفاق کر لیا تھا۔

”میرا خیال ہے۔ اماں جی پیچھے دالان میں ہیں۔“ یاور علی خان نے اپنی شکل دیکھتی دونوں خواتین کو گویا احساس دلایا

کہ انہیں یہاں سے اب چلے جانا چاہیے۔

وہ دونوں فوراً وہاں سے آگے بڑھ گئیں۔

پٹوارن تو یاور علی خان کی صورت اتنے انہماک سے دیکھ رہی تھی کہ گویا وہی دن تاریخ دیں گے۔

”ہاں تو تم کیا کہہ رہے تھے تیمور؟“ یاور علی خان نے گفتگو کا سلسلہ جوڑا۔

روپا دیوی تیمور علی خان کے کمرے میں یہ پیغام لے کر آئی تھی کہ اماں جی نے فوراً بلایا ہے۔

وہ چونک پڑے تھے۔ جب انسان خود اپنے اندر بڑے دھماکہ خیز راز لئے پھر رہا ہو تو ہر بات پر چونک پڑتا ہے۔

کہیں کسی کو بھٹک تو نہیں پڑ گئی۔ وہ بھی بڑی الجھی الجھی کیفیت میں ماں کی طرف آئے تھے۔

لیکن کمرے میں پہنچتے ہی انہوں نے گہرا سانس سینے سے خارج کیا۔ سامنے ہی مطربہ بیٹھی تھی اور دوپٹے سے اپنے منہ

صاف کر رہی تھی۔ وہ سمجھ گئے کہ معاملہ کیا ہے۔

”جی..... اماں جی..... اس وقت کیسے یاد کیا؟“ انہوں نے متشکرانہ انداز میں نگاہ مطربہ پر ڈالی تھی۔

”آؤ..... بیٹا..... ایک بات ہے۔ میں چاہتی ہوں تمہارے بابا صاحب تک نہ پہنچے۔ اسی کمرے میں نمٹ جائے۔“

”پریشان نظر آ رہی تھیں۔“

”غیر مت۔“ انہوں نے بغور ماں کا چہرہ دیکھا۔

”اسے سمجھاؤ۔ قسمت ہمیشہ ساتھ نہیں دیتی۔ ایک ہی بچہ ہے۔ اپنی ماں کا اور پٹوارن بھی بہت سیدھی سادھی ہے۔

وہ بڑے مددگار ہو رہی ہے اس پر۔ لڑکا بھی بخوشی راضی ہے۔ مگر یہ نہیں مان رہی۔ روئے چلی جا رہی ہے۔ اور مجھ سے کسی کا

رواں نہیں دیکھا جاتا۔ بہت بے وقوف ہے یہ۔“

اماں جی نے انہیں بلانے کی وجہ تفصیل سے بیان کی۔

”بے وقوف تو ہے یہ اس میں کوئی شک نہیں۔ آپ اس کے انکار اقرار پر نہ جائیں اور کوئی مناسب تاریخ سیٹ کر لیں۔

بد میں ٹھیک ہو جائے گا سب۔“

”ٹھیک ہے پھر اماں جی! مجھے سمجھ آ گئی ہے۔ میں ایک غلام زادی ہوں۔ مجھے اپنی اوقات پہچان لینا چاہیے تھی۔ مگر آپ

لوگوں کے رویے نے مجھے اپنی اوقات بھلا دی تھی۔ علی کی موت کے بعد گورنمنٹ نے جو پیسہ دیا ہے۔ وہ میں آپ لوگوں کے

حوالے کرتی ہوں۔ اسے میری آزادی کی قیمت سمجھیں یا کچھ اور۔ بس مجھے اجازت دیں۔“

وہ چادر سنبھال کر آنکھیں پونچھتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی۔

”آپ نے مجھے بہت پیار دیا۔ میں کبھی نہ بھول پاؤں گی۔“

”کیا مطلب؟“ اماں جی ہکا بکا اس کی شکل دیکھنے لگیں۔

”مطلب یہ کہ حویلی میں میرا دانہ پانی اتنا ہی تھا۔“ اس نے قدم بڑھا دیئے۔

”ایک قدم آگے بڑھایا تو ٹانگیں توڑ دوں گی تیری“ آئی کہیں سے پیسے والی۔“ اماں جی سچ سچ غضبناک ہو گئیں۔

”اٹھا اٹھا ہاں! نہیں پہچانتی پتھر پڑے ہیں عقل پر۔ چل بیٹھ یہاں۔“ انہوں نے ڈانٹا۔

”اماں جی! آپ سب اب جو کام مجھ سے لے رہے ہیں۔ وہ میری طاقت، ہمت سے بہت زیادہ ہے۔ مجھ میں طاقت

نہیں ہے اماں جی۔ میں اندر سے بالکل ختم ہو چکی ہوں۔“ وہ اماں جی کے پیروں پر جھک کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

”بھلا۔ اس میں طاقت ہمت کی کیا بات۔ گھر بس جائے گا تیرا۔ ٹھکانے لگے گی۔“

”وہ دوسری طرح روئی تو اماں جی کا دل پکھل پکھل گیا۔ انہوں نے شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

”تیمور۔ بیٹے اسے سمجھاؤ۔“

”انہیں میرے معاملے میں مت ڈالیں بلکہ انہیں کہیے یہ جتنی جلد ہو سکے۔ شیخ رفیع کی لڑکی سے شادی کر لیں۔ آپ کو

نہ شادی کا بھی تو بہت ارمان ہے۔“ وہ چیخ پڑی۔

اماں جی تو ایک لمحے کو چکرا کر رہ گئیں۔ بھلا اس وقت شیخ رفیع کی لڑکی کا ذکر کیا معنی جبکہ یہاں تو مقدمہ ہی اور ہے۔

”اماں جی! اس سے کہیے کہ ہمارے ذاتی معاملات میں مداخلت نہ کرے۔“ تیمور علی خان کا پارہ چٹختے ہوئے۔
 ”ارے یوں نہ کہو! اسے بھی تو اپنے چھوٹے خان کے بیاہ کا ارمان ہوگا۔ اس لئے کہہ رہی ہے۔ میں نے شرفیلا لڑکی یونہی تو پسند نہیں کر لی۔ صورت، سیرت، تعلیم ہر طرح نازنین سے میل کھاتی ہے بلکہ وہ تو تازہ سے زیادہ پرمی ہوئی ہے۔ بھلا کیوں انکار کرے گا۔ ابھی کہوں تو ابھی چل دے گا۔“

اماں جی کے لہجے میں بلا کا مان اور اعتماد تھا۔

”تو پھر ذرا کہہ کر دیکھیے۔“ وہ بیڈ کے کنارے پر تک کر استہزائیہ انداز میں گویا ہوئی۔

”لے لے بتا کہوں تو جب کہ مجھے شک ہو۔ تو اپنی بات کر۔“ وہ مسکرائیں۔

”گوٹو ہیل۔“ تیمور علی خان بھنا کر کھڑے ہو گئے۔ ”ہمیں اس احمق کے معاملے میں مت ڈال لے اماں جی۔ ہمیں اس سے کوئی سروکار نہیں ہم چلتے ہیں۔ آئندہ آپ اس سے متعلق کوئی بات ہم سے نہیں کیجیے گا۔“ انہوں نے قدم آگے بڑھا دیے۔

”تیمور..... بیٹے..... اس نے ایسی تو کوئی بات نہیں کی کہ تم برا مان گئے ہو۔“ سیدھی سادی اماں جی شش و پنج میں پڑ گئیں۔

”ہم نے کہا تاں اماں جی۔ ہماری طرف سے یہ جہنم میں جائے۔ بس آئندہ آپ اس کے معاملے میں ہم سے کوئی بات نہ کیجیے گا۔ بلکہ ہم آپ کو صحیح مشورہ دیں۔“ وہ بولتے بولتے رک گئے۔

”ہاں ہاں..... بولو۔“ وہ ہمہ تن گوش ہو گئیں۔

”آپ اسے اس کے حال پر چھوڑ دیں۔“ وہ بولے۔ آواز میں جھنجھٹا ہٹ تھی۔

”لو ایسے کیسے چھوڑ دوں۔ میں نے تو روپا دیوی تک کا بیاہ اپنے ہاتھوں کیا ہے۔“

”اچھا..... زیتون بانو..... جا تو آرام کر۔ باری کو دیکھ پھر بات کریں گے تجھ سے۔ آؤ تیمور۔ تم یہاں بیٹھو۔ ہمارے پاس۔“

انہوں نے جاتے ہوئے بیٹے کو بے صدا صراہ روکا۔ جوان کے لہجے سے جھٹک رہا تھا۔

تیمور ماں کے قریب جا بیٹھے۔ وہ باہر نکل آئی۔ مگر جانے کیوں دل بہت اندیشہ مند سا تھا۔ وہ دروازے کے ایک طرف

کھڑی ہو گئی۔ آخر اس کی زندگی بھر کی بات تھی۔ اتنی حساس محتاط کیوں نہ ہوتی۔

”اماں جی! ہماری مائیں اتنے خڑے اٹھانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ سیدھے سیدھے ان لوگوں کو بلا لیں اور نکاح

پڑھوا دیں۔ ایسی کون سی اعلیٰ کچھ کل لڑکی ہے۔ جسے ایڈجسٹمنٹ میں مشکل ہوگی نہ ہی باشعور اور با اختیار ہے۔ اس طرح؟

انسان بہت آسانی سے ہر رنگ میں ڈھل جاتا ہے۔ شروع شروع میں ذرا مشکل ہوتی ہے۔ آپ گھبراہٹیں نہیں۔

کرین۔“

مطربہ کی روح اس کے وجود میں یوں پھڑپھڑاتی محسوس ہوئی جیسے خالی برتن میں چکراتی ہوئی۔ کوئی تسمی۔

اس سے حواس کی ایک لہر اتنی بانہر، بیتجان خیز اور بے اختیاری تھی کہ اس نے شعور کے اس مقام سے استحصال، توہین اور
 جتنی کاہل کرکے کیا جس مقام پر پاؤں دھرنے کا خیال عام حالات میں نہیں آتا تھا۔
 دنیا کی جاگیر ان کی دل ان کا خوشی ان کی میرا اور ان کا خدا ایک ہی تو ہے۔
 جب کوئی تقاضا نہیں۔

مطالبہ نہیں۔

خاموشی ہے بے چارگی کے اعتراف کے ساتھ ایک کونہ منظور ہے تو انہیں کیا حق پہنچتا ہے کہ میں نے سرے سے ٹانگا

بٹھا دیا۔ ہر روز نئے سرے سے خود سے لڑوں؟ جبکہ مجھے دنیا سے کچھ طلب کرنے کی خواہش نہیں۔

اپنے دل کا اتنا خیال۔ ہر صورت جیت کر خوش ہو کر ایک ذرا دور ہیں تو اداس ہو جاتے ہیں۔ بھانوج کے دکھڑے

روتے ہیں۔ جانے کی جلدی ہے۔

بتاتی ہوں تیمور علی خان تمہیں اچھی طرح کر کے دیکھو میرے ساتھ زبردستی۔

وہ ان دیکھی آگ میں بھڑبھڑ جلتی اپنے ٹھکانے کی طرف بڑھ گئی تھی۔

”بندر کوادرک ملی کہے میں پنساری۔“ خالہ سولہ آنے نے پان کا بیٹا نکال کر کھولا اور بڑبڑانے لگیں۔

”یوں نہ بول سولہ آنے۔ نئی نئی مصیبت ہے۔ زخم ہرے ہیں۔ بچی ہے۔ پھر مرد بھی وہ ملا تھا کہ اس نے کبھی خواب میں

میں نہ سوچا ہوگا۔ بہت دکھ ہے اسے۔“ اماں جی کے لہجے میں بہت افسوس تھا۔

”تو ہم بھی تو اس کے دکھ دور کرنے کے جتن کر رہے ہیں۔ اسے سنبھلی چاہیے ہماری۔“ خالہ کا موڈ ہنوز آف تھا۔

”سمجھ جائیگی۔ ہمیں بھی اتنی جلدی نہیں کرنی چاہیے۔ تو کیوں غصہ کرتی ہے۔ قسمت کا غصہ۔ اس پر کم ہے؟ اور دکھی ہو

گی۔ اکیلی محسوس کرے گی۔ اب کچھ نہ کہنا اسے۔ میں سمجھا لوں گی۔“ اماں جی کے انداز میں بلا کا ٹھہراؤ تھا۔

”باری سنو گے نہیں؟ ٹھہرا بھی بتاتی ہوں۔“ باری بھاگتا ہوا دالان میں آیا تھا اور مطربہ ایک کرتا ہاتھ میں پکڑے پیچھے

پچھے تھی۔ باری نے پانجامہ اور بنیان پہنا ہوا تھا۔ اور شرارت کے موڈ میں تھا۔

”دیکھنا ڈنڈے سے پٹائی کروں گی..... اماں جی دیکھ رہی ہیں آپ؟“

”باری بیٹے..... کیوں تنک کر رہے ہو ماں کو۔ آمیرے بچے میں پہناؤں تجھے کرتا۔“ اماں جی مسکرا رہی تھیں۔

وہ بھاگتا ہوا اماں جی کی آغوش میں دبک گیا۔ ”میں نہیں پیوں دانیہ۔ کا کا جان والا سوٹ پیوں دا۔“ وہ کہہ رہا تھا۔

اماں جی نے اسے بانہوں میں بھر لیا اور اس کی پیشانی کو بوسہ دیا۔

”میرے چاند اتنے بڑے پکڑے تجھے نہیں آئیگے۔ میں سلوا دوں گی کا کا جان جیسا سوٹ..... لازیتوں بانو مجھے دے

رہا۔ میں اپنے بچے کو خود پہناؤں گی۔ میرا لال اپنی اماں جی کا کہنا مانے گا ناں۔“

”تیرے بڑے خان سے کہوں گی وہ ابھی تیرا سوٹ لے آئیں گے اور گھوڑے کی سیر بھی کرائیں گے۔“

اماں جی نے اسے باتوں میں لگا کر کرتا پہنا دیا۔
 ”اماں جی! میں کا کا جان جیسی ملی والی (بڑی والی) رانفل بھی لوں دا۔“ اس نے منہ بسورا۔
 ”ہاں ہاں..... تجھے رانفل بھی لا کر دیں گے۔“
 ”اور میں کا کا جان والے شوزی (شوز) بھی لوں دا۔“

”لو بتاؤ..... تیرے کا کا جان کی تو دلہن بھی آنے والی ہے۔ تو تو کہے گا کہ میں بھی ایسی دلہن لوں گا۔“ خالہ سولہ آنے لگیں۔

اماں جی بھی مسکرانے لگیں۔

اسی دم تیمور علی خان ماں کو تلاش کرتے ہوئے دالان میں چلے آئے۔

”ماشا اللہ اتنے مرد ہیں حویلی میں۔ مگر جب نام لے گا کا کا جان کا۔“ خالہ نے تیمور علی خان کی طرف دیکھ کر کہا۔
 ”کیا ہو رہا ہے پارٹنر؟“ تیمور علی خان نے باری کا رخسار چھوا۔

”تنگ کر رہا ہے ماں کو۔ کپڑے نہیں بدل رہا تھا کہ کا کا جان جیسا سوٹ پہنوں گا۔“ اماں جی نے بتایا۔

”ارے ہم ضرور بنوائیں گے اپنی جان کے سوٹ۔ ہمیں کیا فرق پڑتا ہے۔ تمہارا باپ تمہارے لئے بہت کچھ چھوڑ کر گیا ہے۔ عیش کرو پارٹنر۔“

”تیمور علی خان نے اس کا سر تھپتھپایا۔ اور ایک اچنتی ہوئی نظر کھڑی مطربہ پر ڈالی۔

”اماں جی! آپ فوراً اس کی پسند کے کپڑے سلوائیں۔“

”بیٹے! بچوں کو بہلایا کرتے ہیں۔ ہر ضد پوری نہیں کرتے۔ آگے مشکل ہو جاتی ہے۔ کل تمہارے اپنے بچے ہوں گے تو اتنی توجہ اس پر دے سکو گے؟“

”اگر ایسی بات ہے تو یہ ہمارا پہلا بچہ ہوگا۔ اماں جی ہماری اتنی گہری دوستی کبھی کسی سے نہیں ہوئی۔ اس دوستی میں بھی اس کے باپ ہی کا زیادہ حصہ ہے۔ ہر طرح کے عیب ہنر بنانے کی ساری ہی ادائیں تھی۔“

”چلو باری..... باہر چلتے ہیں۔“ انہوں نے اپنی اداسی پر فوراً بشارت کا پردہ ڈالا۔

”اسے کہاں لے جاؤ گے؟“

”کچہری جارہے ہیں ہم بابا صاحب کے ساتھ۔ ہم تو پھر وہاں سے شہر چلے جائیں گے۔ یہ بابا صاحب کے ساتھ آجایگا۔ چلو پارٹنر۔“

باری فوراً تخت سے نیچے اتر آیا۔

”کا کا جان امی بھی۔“ اس نے مطربہ کی طرف دیکھا جو اپنی کالی چادر درست کر رہی تھی۔

”نہیں..... جان..... وہاں امی نہیں جاتیں۔“

”امی کہاں جاتی ہیں؟“ اس کی نگاہوں میں معصوم سی حیرت تھی۔

”امی مگر رہتی ہیں۔“ وہ دھیرے سے گویا ہوئے۔

”باہر پولیس پکڑ لیتی ہے؟“ اس نے تعجب سے سر اٹھا کر تیمور علی خان کی سمت دیکھا۔

”پکڑا تو تھا ایک پولیس والے نے تیری ماں کو..... آہ..... ہا.....“ خالہ سولہ آنے لگیں۔

باری جی چھوڑ دی۔

”ماحول پر یکفخت سکوت طاری ہو گیا۔“

باری نے خوفزدہ ہو کر مطربہ کی طرف دیکھا تھا۔ وہ خالہ کی بات سمجھنے کی اہلیت نہیں رکھتا تھا۔

تیمور علی خان نے باری کا ہاتھ اپنے مضبوط ہاتھ میں تھام لیا۔ ”آؤ بیٹے۔ خالہ! بچوں کے سامنے اس طرح کی باتیں نہیں کرتے۔“ وہ بہت آہستگی سے کہہ کر آگے بڑھے۔

”امی..... آپ یہیں رہیں۔ میں آپ کیلئے چاکلیٹ اور آئس کریم لے کر آؤں گا۔“

اس کے حساب سے اس کی ماں باہر نہ جانے پر نہایت غمگین تھی اور اسے تسلی دے رہا تھا۔

بہت بزرگانہ سنجیدہ اور بردبار انداز تھا۔ مطربہ اس معصومانہ محبت کی ادھر اندر سے بکھر کر رہ گئی۔

اس کی آنکھیں بھر آئی تھیں۔

”کوئی نہیں کہہ سکتا کہ یہ اس بچے کی سوتیلی ماں ہے۔ کتنا پیار کرتا ہے اس سے۔ حویلی میں مچھتے ہی اسے ڈھونڈتا ہے۔“

خالہ نے اماں جی سے اس انداز میں کہا گویا وہ ان تمام باتوں سے بے خبر ہوں۔ مطربہ نے اندر کی طرف قدم بڑھا دیے۔

”کہاں چل پڑی..... ادھر آ میرے پاس بیٹھ جایا کر۔ نہ جانے کہاں گم رہتی ہے۔“ خالہ نے ٹوکا۔

”کئی کے پاس بھی بیٹھنے کو جی نہیں چاہتا۔ ایک ہی بات رہ گئی ہے سب کے پاس۔“ وہ بے زاری سے بولی۔

”یہ تیرے بھلے نصیب ہیں کہ سب کو تیری فکر ہے۔ کون کرتا ہے ورنہ اتنی پرواہ۔“ خالہ نے بہت ناراضگی سے کہا تھا۔

”بھلے نصیب ہوتے تو۔“ وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی۔

”اچھا چل..... ادھر آ کر بیٹھ..... نہیں کریں گے ہم وہ باتیں جو تجھے بری لگ رہی ہیں۔“ اماں جی کا اندازہ صلح کن تھا۔

ادھر آہستگی سے چلتی ہوئی آئی اور اماں جی کے پہلو میں بیٹھ گئی۔

”کتنی کمزور ہو گئی ہے۔ اچھی طرح وقت سے کھایا پیا کر۔“ اماں جی نے شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔

ان کا نام نازنین دالان میں بڑی تیز رفتاری سے آئیں۔

”ہائیکس سب ملازم کہاں چلے گئے۔ تیمور کہاں ہیں؟ اپنے کمرے میں بھی نہیں ہیں۔ ان کا فون آیا ہے۔“ وہ خاصی بے چین نظر آ رہی تھی۔

”تو اپنے باپ کے ساتھ کچہری گیا ہے۔ کس کا فون ہے؟“ اماں جی نے بہو کی شکل سرسری دیکھ کر جواب دیا۔

”اماں جی! خان کے کسی دوست کا ہوگا اور کس کا ہوگا۔“ خالہ سولہ آنے لگیں۔

”ہاں تو کہہ دو کام سے گیا ہے۔“

”کب تک آنے کا کہا ہے؟“ نازنین کی فکر مندی چھپائے نہ چھپی۔

مطر بہ نے چونک کر ان کا چہرہ دیکھنے کی کوشش کی۔

”لندن سے آیا ہوگا۔“ اس نے سرد لہجے میں ٹکڑا لگایا۔

اس بار نازنین نے چونک کر اس کی سمت دیکھا تھا۔ (اسے کیسے پتا؟)

”لندن سے۔“ اماں جی نے ہول کر پوچھا تھا۔

”نہیں..... اماں جی..... لندن سے نہیں ہے۔“ وہ عجلت میں کہتی ہوئی باہر چلی گئیں۔ ظاہر ہے دوسری طرف کوئی منہر تھا۔

”ہونہہ..... چھوٹی دلہن آپ کے تو چہرے پر لکھا ہے کہ فون لندن سے آیا ہے۔ اور تینا بیگم صاحبہ کا ہوگا۔“

اس کے اندر لالاؤ بھڑکنے لگے۔ آنکھوں سے تیش آنے لگی۔

وہ ہال کی صفائی کی غرض سے جھاڑن ہاتھ میں لئے اندر آئی تھی مگر ٹھٹھک کر رک گئی تھی۔ تیمور علی خان نہایت روانی سے انگریزی میں فون پر بات کر رہے تھے۔ اس کی آمد کا انہوں نے کوئی نوٹس نہیں لیا تھا۔ انگریزی یوں بھی اس کی سمجھ میں نہیں آ سکتی تھی۔ مگر ان کا راز دارانہ اپنائیت بھرا انداز چغلی کھارہا تھا کہ وہ کس سے مخاطب ہیں۔ یوں لگ رہا تھا کہ وہ کسی کے کان میں سرگوشی کر رہے ہوں۔ عجیب سے رنگ ان کے چہرے پر بکھرے ہوئے تھے۔ جو اس کیلئے بالکل نئے تھے۔ یہ چہرہ جو کئی بار خواب میں اسے اپنے قلب میں جگمگا تا نظر آیا تھا۔ ہوش کی دنیا میں انہی رنگوں کے ساتھ کہیں اور متوجہ تھا۔

وہ بے خبری کیفیت میں انہیں دیکھتی رہی۔

”وہ بھی کیا نام ہے۔ کیسے۔ کھڑی ہو؟“

وہ ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھ کر سرد لہجے میں مخاطب ہوئے۔

وہ چونک پڑی۔ ”کام کر رہی ہوں خان۔ آپ فکر نہ کریں میرے انگریزی سمجھ میں نہیں آتی۔“

وہ طنزیہ مسکرا کر ڈیکوریشن پیس پر کپڑا پھیرنے لگی۔

”جانے کیوں تیمور علی خان بھنا کر رہ گئے۔ مگر کچھ مزید بولے بغیر دوبارہ فون میں مصروف ہو گئے۔“

”نو..... نو..... ڈارلنگ..... ڈزن میٹر..... کنٹی نیو پلیز۔ ہوں۔ ہوں۔ یس۔“

”دل کسی گڑھے میں پھنسا تھا۔ اس نے چادر درست کی اور کام ادھورا چھوڑ کر باہر آ گئی۔“

”مطر بہ..... تیمور کو دیکھا ہے کہیں؟“ سامنے ہی اسے یاور علی خان مل گئے۔ بہت زبردست سونگ کر رکھی تھی۔

”خان ہال میں ہیں۔ لندن بات کر رہے ہیں۔“ وہ بے تاثر لہجے میں بولی۔

”اوکے..... وہ دیکھو ایک کپ چائے میرے کمرے میں بھجوا دو۔ ذرا جلدی۔“

دہریے کے قریب کھڑے تھے۔ جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ اوپر سے آرہے ہیں۔

”جی..... خان۔“ وہ جھاڑن ایک طرف ٹکا کر کچن کی طرف بڑھ گئی۔ وہ خود چائے تیار کرنا چاہ رہی تھی۔

اماں جی نے اس سے بہت سی باتیں کیں مگر اسے کچھ سنا ہی نہیں دے رہا تھا۔ جانے ذہن کہاں اڑا پھر رہا تھا۔

ایک خوبصورت مرد کے ساتھ شادی شدہ زندگی گزارنے کے بعد وہ اس طلسمی لب و لہجے سے خوب آشنا کی رکھتی تھی۔

فرہوں کے زیرِ ہم اس پر کھل چکے تھے۔ ایک عجیب سا ملال اس پر طاری تھا۔ اس نے بہت اہتمام سے چائے بنائی تھی۔ اسے پتہ تھا یاور علی خان چائے میں کوکو بہت پسند کرتے ہیں۔

اس نے قبوے میں کوکو ملا کر ٹی کوزی ٹی پاٹ میں ڈھانپ دی تھی۔ اور ان کے کمرے میں چلی آئی تھی۔

یاور علی خان صوفے پر بیٹھے کوئی فائل دیکھ رہے تھے۔ وہ کارپٹ پر بیٹھ کر چائے بنانے لگی۔

”چھوٹی دلہن کیا بازار گئی ہوئی ہیں خان؟“

”آں..... ہاں..... شاید..... پتا نہیں۔“ وہ اپنی مصروفیت کے دوران قدرے چونکے۔

”آپ کو نہیں پتا؟“ وہ تعجب سے مسکرائی۔

”وہ خود حویلی میں بہت مصروف رہتی ہیں۔ پتا ہے۔“ وہ اسی انداز میں گویا ہوئے۔

”جی آپ کے ساتھ تو وہ کم ہی نظر آتی ہیں۔ میرے خیال میں تیمور علی خاناں سے ان کا مزاج زیادہ ملتا ہے۔ اسی لئے بس انہی کے ساتھ رہتی ہیں۔“

وہ بے تاثر چہرے کے ساتھ ان سے مخاطب تھی۔

”ہوں..... یہ تو ہے۔“ انہوں نے اسی مصروف انداز میں تائید کی۔

”ایک دن کہہ رہی تھیں کہ تیمور خاناں اس گھر میں نہ ہوتے تو حویلی میں رہنے کا کوئی مزانہ ہوتا۔ وہ پڑھے لکھے زیادہ ہیں اور باتیں بھی بہت اچھی کرتے ہیں۔ پھر بولیں۔ کاش حویلی کے سب مرد تیمور خاناں جیسے ہوتے۔“

اس نے چائے کا کپ یاور علی خان کے سامنے رکھتے ہوئے سادگی سے بتایا۔

”ہوں۔“ یاور علی خان کے انہماک میں کوئی کمی نہیں آئی۔

”اماں جی سے کہہ رہی تھیں کہ یاور تو بس بزرگ بنے رہتے ہیں۔ ہر وقت کتابیں اور فائلیں۔“

روپا دیوی کہنے لگی کہ ”اگر ان کی شادی تیمور خان سے ہو جاتی تو جوڑا بہت سیٹ بنتا۔“

”شٹ اپ..... واٹ اے نان سینس۔“ یاور علی خان نے فائل صوبے پر پٹخ دی۔ ”اتنی بڑی ہو چکی ہو تمہیں ابھی تک بات کرنے کی سینس نہیں ہے کہ کس سے کس طرح کی بات کرنا چاہیے۔“

اس روپا دیوی کو بھیجنا ادھر کرتا ہوں اس کا بھی دماغ سیٹ۔ یاور علی خان یکدم غضبناک ہو گئے تھے۔ ”ان نوکروں کی اتنی ہمت۔“

حیرت کی بات تھی کہ ان کے غصے کا اس پر کوئی اثر نہیں تھا۔ ایسی سکون کی کیفیت میں تھی جیسے کوئی بات ہی نہیں تھی۔

”جاؤ تم یہاں سے۔ ہری اپ۔“ وہ اسی آف موڈ میں کہہ رہے تھے۔

”خان..... حویلی کے سارے نوکر سب سے زیادہ آپ سے پیار کرتے ہیں۔ اس لئے کہ آپ ادھر بہت کم ہوتے ہیں۔ نوکروں کو بہت کم بلاتے ہیں۔ کسی کو کچھ نہیں کہتے۔“ وہ اٹھتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

”اچھا بس جاؤ۔“

”خان آپ غصہ نہ ہوں۔ مجھے بہت افسوس ہو رہا ہے۔ ہم آپ کے دشمن نہیں ہیں کہ آپ کو مفت میں پریشان کریں۔ بھلے آپ تیمور خاناں سے پوچھ لیں۔ وہ کبھی بھی شیخ رفیع کی لڑکی سے شادی نہیں کریں گے۔ بلکہ آپ لوگ اگر نہیں کہیں کہ پاکستان کے بادشاہ کی لڑکی سے شادی کر لیں تب بھی نہیں کریں گے۔“ وہ یہ کہہ کر کی نہیں بلکہ تیزی سے باہر نکل آئی۔

”بیسو ٹوٹی ال لڑیری گرل۔ اتنا بھی نہیں پتا۔ پاکستان میں بادشاہت نہیں۔“ انہوں نے جھٹکا کرکٹ کاغذات سینٹا ٹرونا کر دیئے۔

”تم نے کچھ کہا ہے اس نے؟“ اماں جی پریشان ہو گئی تھیں۔

”کہتے تو وہ کسی سے کچھ نہیں ہیں۔ آپ خیر ان سے بات کر لیں۔“

نازنین کے ہونٹوں پر دبی دبی مسکراہٹ تھی۔ یاد علی خان کی نظریں مسلسل اسے فوکس کئے ہوئے تھیں۔

تھوڑی دیر بعد تیمور علی خان اندر داخل ہوئے۔ بہت دلکش انداز میں انہوں نے حاضرین کو..... السلام علیکم کہا تھا۔

”آؤ..... آؤ..... تیمور کہاں ہو تم۔ مہمان کب سے تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔“

مالم تاب نے ہمیشہ کی طرح بہت محبت و شفقت سے انہیں مخاطب کیا۔

”سیدھی سیدھی بات کریں بھابی بیگم ان سے۔ ڈرنے کی ضرورت نہیں۔“ روشن آرا نے بھانجے میں اکساہٹ پیدا کی۔

”ہیں۔ کون سی بات؟“ تیمور ماں کے پہلو میں بیٹھ کر کچھ حیران نظر آئے۔

”آپ کی معنی کی رسم ادا کرنے اکٹھے ہوئے ہیں یہ سب۔ بس چلنے کا عالم ہے۔ اب تو آپ بھی کچھ اچھی سو سوئنگ کر

لیجئے۔“

یاد علی خان بغور بھائی کی شکل دیکھتے ہوئے بظاہر مسکرا رہے تھے۔

”مثنیٰ!“ تیمور علی خان کو گویا شاک لگا تھا ”وہاٹ۔“

”کیوں اس میں حیرت کی کیا بات ہے کیا لوگوں کی سنگینیاں میرا مطلب ہے مثنیٰ نہیں ہوتی۔“ یاد علی خان نے جوابی حیرت کا مظاہرہ کیا۔

”پلیز..... ٹاپک چن کر لیں۔ بالکل بھی اچھا ٹاپک نہیں ہے۔“ تیمور علی خان کے لہجے میں بلا کی لا پرواہی تھی جیسے انہیں درحقیقت اس قسم کے موضوع سے کوئی دلچسپی نہ ہو۔

”تو اسی ٹاپک کیلئے تو سوشلی آپ کو یہاں بلوایا گیا ہے۔“ نازنین کے چہرے پر شرارت کھیل رہی تھی۔

تیمور علی خان کے چہرے سے یکدم سنجیدگی جھٹکنے لگی۔

”سوری..... فی الحال ہم اس ٹاپک پر بات کرنا پسند نہیں کریں گے۔ کوئی اور بات کریں آپ لوگ۔“ وہ غیر معمولی سنجیدہ نظر آ رہے تھے۔

”واہ..... کیوں اور بات کریں۔ ہم نے تمہیں یہاں بلوایا ہی اسی لئے ہے کہ تمہیں بتائیں کہ کل ہم سب شیخ رفیع کے ہال جا رہے ہیں۔ اور بس۔“ اماں جی کا انداز قطعی فیصلہ کن تھا۔

”ہرگز نہیں..... فی الحال ہم لندن واپس جا رہے ہیں۔ ہمارا شادی مثنیٰ کا دور دور تک پروگرام نہیں۔ آخری بات کے طور پر اماں جی آپ سے عرض کر رہے ہیں۔ آپ کے ملنے والوں میں کہیں کوئی لڑکی ایسی نہیں جس سے ہم شادی مثنیٰ کریں۔“

”خوبصورت ہے۔ نازنین جیسی انگریزی بولتی ہے۔ بڑے خاندان کی ہے اور کون پسند آئیگی۔ کون سے سرخاب کے پر

گئے ہوں گے اس میں؟“

نازنین..... اماں جی کے دوپٹے پر کروٹ کی تیل بنارہی تھیں اور جملے بازی بھی چل رہی تھی۔

”یہ تیمور پٹھے پر ہاتھ ہی دھرنے نہیں دے رہا۔ اب تم ہمیں بھانجیل مل کر اسے گھیرو۔ شیخ رفیع کے گھر والے بھی گیارہ جٹا چکے ہیں کہ ان کی لڑکی کے بہت پیار آپ کے ہیں۔ وہ لوگ جلد کوئی فیصلہ کرنا چاہ رہے ہیں۔“ اماں جی نے روشن آرا سے کہا تھا۔

”ارے چھوڑیں اماں جی۔ ایک منٹ میں سمجھالیں گے انہیں۔ فکر ہی نہ کریں۔ مگر وہ ہیں کہاں؟ بلوائیں انہیں پھر دیکھیں کیسا تماشا دکھاتے ہیں آپ کو ابھی۔“

روشن آرا کے لہجے میں بلا کا اعتماد تھا۔

”ارے رو پا دیوی۔ دیکھنا تیرے چھوٹے خان کدھر ہیں؟ کہنا گھر میں مہمان آئے ہوئے ہیں۔“

اماں جی نے رو پا دیوی کو برتن اٹھا کر باہر جاتے دیکھا تو ساتھ ہی نیا کام بتا دیا۔

”ان کے انداز کچھ اور کہہ رہے ہیں بلا وجہ محنت کر رہے ہیں آپ لوگ۔“ نازنین نے دھاگے کا لڑھکتا ہوا گولہ سنبال کر کٹڑا لگایا۔

یاد علی خان نے لاشعوری طور پر نگاہ ایک لمحے کو نازنین کے چہرے پر جمادی تھی۔

”ارے یوں نہ کہو اماں جی کی تو جان انکی ہوئی ہے شیخ رفیع کی لڑکی میں۔“ مالم تاب نے ٹوکا۔

اماں جی کا خواب چکنا چور کیا ہوا، صدے سے ان کا لہجہ تھر تھرانے لگا۔ انہیں جیسے یقین نہیں آ رہا تھا۔
یاور علی خان کی سوئی نازنین جیسی پرانگی ہوئی تھی۔ حالانکہ کوئی بات بھی تو نہیں تھی۔ اس سے پہلے ہزار مرتبہ اس حیرت
ساتھ گزری تھیں۔ اور وہ بھی جو نازنین کی تیمور کے ساتھ گزری تھیں۔ انہیں از سر نو ہر واقعہ یاد آ رہا تھا۔ جب نازنین ان کے
گھر میں موجود ہونے کے باوجود تیمور کے ساتھ بیٹھی باتیں کرتی ملتی تھی۔ مطربہ..... اس نے زندگی میں کوئی فالو بات نہیں کی
ہوگی۔ کم از کم ان سے تو ہر گز بھی نہیں۔ اتنی ڈر پوک، بزدل لڑکی۔ اتنی بڑی بات بلا وجہ کیسے منہ سے نکال سکتی ہے جبکہ اس کی
واحد جائے پناہ یہ حویلی ہے۔

”اچھا تو یہ شرط ہے کیا کہ تمہاری دلہن بالکل چھوٹی بھابی جیسی ہونا چاہیے۔“ روشن آرا نے استفسار کیا۔

”ان کے جیسی تو شاید ہی کوئی ہو۔ مشرق کا نادر نمونہ۔ جب دس سیروزنی کام کا سوٹ پہن کر انگریزی میں بات کرتی
ہں تو بس دیکھنے والی چیز ہوتی ہیں۔“

تیمور علی خان نے اپنے مزاج کے مطابق بہت کھل کر اپنے تاثرات بیان کئے۔

سب خواتین کھلکھلا کر ہنس پڑی تھیں۔ ”میرے خدا دس سیروزنی کام کا سوٹ۔“ عالم تاب کی بھانج شفیقہ ہنس ہنس کر
بٹ پوٹ رہی تھیں۔

”آپ کوئی تبصرہ نہیں کریں گے یاور بھائی! آپ کی نیگم کی تعریف میں زمین آسمان ایک ہو رہے ہیں۔“ روشن آرا نے
سوچ میں گم یاور علی خان کو چونکا یا۔

”ایسا تو بہت عرصے سے ہو رہا ہے۔ شاید ہم لوگوں نے دھیان نہیں دیا۔“

”ہماری چھوڑیے اپنی کہیے۔ آپ نے واقعی نہیں دیا ہوگا۔ آپ کو اپنی کتابوں سے فرحت کہاں۔ کتابیں سامنے ہوں تو
آپ بندوں سے گزر جاتے ہیں۔“

روشن آرا نے تنقید کی۔ یاور علی خان کا جملہ درمیان ہی میں کٹ گیا تھا۔

”واہ آپا..... کیا شاعرانہ وزن میں جملہ کہا ہے۔“ تیمور علی خان نے بے ساختہ داد دی۔

”اچھا..... تم باتیں نہ بناؤ۔ نہ ہمیں چلاؤ۔ سیدھی بات کرو۔ کیوں منع کر رہے ہو۔ کیوں نہیں کرنا چاہتے شادی۔“ اماں
جی پر درمیان میں در آنے والی جملے بازی کا کوئی اثر نہیں تھا۔ ان کا ذہن ہنوز ایک نقطے پر اٹکا ہوا تھا۔

”کہہ تو دیا ہے اماں جی۔ ابھی نہیں کر رہے ہم شادی۔ جب کرنا ہوگی، ہم خود کہہ دیں گے۔“

”پھر کب کرو گے۔ اچھی لڑکیاں اتنی آسانی سے بھی نہیں ملتیں۔ اپنی بہنوں بھانجوں سے پوچھ لو۔ دیکھی ہوئی ہے

انہوں نے۔ کیوں ناز؟“ انہوں نے محسوس کیا کہ سب سے مضبوط گواہی نازنین کی ہو سکتی ہے۔

”یاور علی خان نے فوراً نازنین کی سمت دیکھا۔ وہ خاموش تھیں اور یاور علی خان کو اس کی خاموشی پر کوئی حیرت نہیں ہوئی۔

”ہمارا دور وور تک شادی کرنے کا کوئی ارادہ نہیں۔ سوری۔ آگین۔“ انہوں نے اس مرتبہ پھر دو ٹوک انداز اختیار کیا۔

”اماں جی..... یہ لندن جا کر قابو سے باہر ہو گئے ہیں۔ بگڑ گئے ہیں۔“ عالم تاب کی چھوٹی بھانج سائرہ نے تصویر کا
بڑھانے کی کوشش کی۔

”یہ بھی تو ہو سکتا ہے (یاور علی خان چونک کر بھائی کا چہرہ بغور دیکھنے لگے۔

”آپ لوگ جو مرضی کہیں مگر شادی کا نام نہ لیں۔“ ان کا موڈ آف ہونے لگا تھا۔

”تیمور..... یوں نہ کر میرے بچے۔ بڑی خوشی ہے یہ میری۔ ایسے نہیں کرتے بیٹے۔“

اماں جی کی آواز میں صدے کی کیفیت محسوس کی جاسکتی تھی۔

”اماں جی ہو جائیں گی آپ کی خوشیاں پوری۔ فی الحال میری خوشی کی خاطر یہ معاملہ ختم کر دیں۔“ وہ بیزار کن لہجے میں

کہا ہوئے۔

”ختم کر دیں۔“ اماں جی سنائے میں رہ گئیں۔

”جی۔“ تیمور علی خان کے انداز میں غصہ و جھلاہٹ واضح تھی۔ یاور علی خان بہت جانچتی نظروں سے بھائی کو دیکھ رہے

تھے۔

”چلو ٹھیک ہے۔ فی الحال معاملہ تو موخر کر دیتے ہیں۔ مگر کچھ عرصہ کے بعد تو کرو گے ناں شادی؟ یہ انکار ہمیشہ کیلئے تو

نہیں ہے؟“

انہوں نے بہت رسائیت سے تیمور علی خان سے سوال کیا۔

”ماشاء اللہ ہم اتنے بہن بھائی ہیں۔ سب ہی کی شادیاں ہو چکی ہیں اور دھوم دھام سے ہوئی ہیں۔ ہم نہ کریں تو کیا کی

ہے۔ شادی تو انسان کی اپنی ذات کیلئے ہوتی ہے۔ جب ہمارا موڈ ہی نہیں ہے تو پھر مسئلہ کیا ہے؟“

بہت ہی پیچیدہ و عجیب و غریب جواب تھا۔

”شادی کا موڈ سے کیا تعلق ہے؟ ماں باپ کے فرائض میں شامل ہے کہ وہ وقت پر اپنے بچوں کے نکاح کا بندوبست

کریں۔“

اماں جی کے لب و لہجے سے شدید قسم کی ناراضگی کا اظہار تھا۔

”آپ نے آغاز و عملی اہتمام کر کے اپنا فرض پورا کر دیا۔ آپ نے تو اپنی طرف سے فرض ادا کرنے میں کوتاہی نہیں کی۔

اب تو یہ ہمارا فعل ہے اچھا ہے یا برا ہم خود ہی ذمے دار ہوں گے ناں۔ آپ پر تو کوئی الزام نہیں ہے۔ پھر آپ کیوں فکر کرتی

تھیں؟ پلیز اماں جی۔ آپ اتنا سیریس نہ لیں ہمارے انکار کو۔“

تیمور علی خان نے ماں کے ہاتھ تھام کر گویا انہیں منانے کی کوشش کی۔

”وکیل بننے کی ضرورت نہیں میرے سامنے۔ میں نہیں آنے کی تمہاری باتوں میں۔“

انہوں نے ناراضگی سے منہ موڑ لیا۔

”اماں جی کبھی بھی کوئی بات ہمیشہ کیلئے نہیں ہوتی۔ گنجائش ہوتی ہے۔ بہت وقت ہے۔ سمجھیں اماں جی۔“ تیمور علی خان

نے پھر ماں کو منانے کی کوشش کی۔

”کوئی خیال نہیں ہے تمہیں میرا۔ بس اوپر اوپر سے ہو۔“ ان کی ناراضگی اتنی آسانی سے کیے ختم ہو سکتی تھی۔ ایک انسان جس کی ہر امید اللہ نے پوری کی ہو اس کیلئے تو خلاف امید کچھ ہو جاتا سانچے سے کم نہیں ہوتا۔“

”آپ سمجھائیں ناں یا اور بھائی پلیر۔“

”ضرور ہیلپ کریں گے۔ مگر ریزن تو بتائیں۔ موصوف۔“

یاور علی خان کی جتنی کیفیت اعلیٰ درجے کے انتشار سے دوچار تھی۔ وہ ”سب اچھا ہے“ سننے کے عادی تھے۔ انہیں سننے کی آرزو تھی۔ وہ یہ خوفناک اکھاڑ پچھاڑ برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ انہیں عجلت تھی کہ ”سب اچھا ہے“ جلد سے جلد جانے اور وہ مطربہ کو سر عام کوڑے لگوائیں۔ انہوں نے بہت اچھی امید کے ساتھ بھائی سے ریزن دریافت کی تھی۔ تیمور علی خان نے ایک لپٹے کو تازمین کی ست نظریں اٹھائیں۔ ”سوری ابھی ہم کوئی ریزن نہیں دے سکتے۔“

یاور علی خان کے دل میں کچھ ہوا۔ وہ ایک دم اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

”جو ہونا ہے وہ ہو جائے گا۔ سب ایک روز سامنے آجائے گا آپ لوگ کیوں بے کاری بحث کر رہے ہیں۔“ وہ تھکے انداز میں کہہ کر کمرے سے باہر نکل گئے۔

تیمور علی خان اور تازمین ان کے اس انداز پر چونک سے گئے تھے اور خاصی حیرت سے انہیں جاتے ہوئے دیکھتا تھا۔

آج وہ سگریٹ پر سگریٹ پھونک رہے تھے۔ حال ہی میں انہیں یہ لت لگی تھی مگر آج تو چین اسو کر بنے ہوئے تھے۔ اسی دم دروازے پر دستک ہوئی۔ وہ کسی دھیان سے چونک پڑے۔

تازمین تو نہیں ہو سکتی کہ وہ اپنی خواب گاہ میں دستک دے کر کیوں آنے لگی۔

”لیس..... کم ان۔“ وہ دروازے کی سمت دیکھنے لگی۔

دروازہ کھلا اور مطربہ اندر داخل ہوئی۔

”خیریت۔“ وہ بہت عرصے بعد ان کے بیڈروم میں بن بلائے داخل ہوئی تھی۔

”جی۔ سب کیلئے چائے بنائی تھی۔ خیال آیا کہ آپ تورات دیر تک لکھنے پڑھنے کا کام کرتے ہیں۔ آپ کو بھی پوچھ لوں۔“

”ہوں..... ٹھیک ہے لے آؤ۔“

”وہ واپس مڑ گئی۔“

”مطربہ۔“ انہوں نے بے ساختہ انداز میں آواز دی تھی۔

”جی خان؟“ وہ پلٹی۔

”تمہاری چھوٹی دلہن کیا کر رہی ہیں؟“

”ایک لمحے کو کچھ سوچنے کے انداز میں کھڑی ہو گئی۔“

”جان۔ وہ تو چھوٹے خان کے ساتھ شطرنج کھیلنے اوپر چلی گئی ہیں۔ بہت دیر ہو گئی۔ میں انہیں بھی چائے دینے جاؤں۔“

”آپ کیسے تو سمجھیں؟“

”شطرنج کھیلنے۔ اس وقت؟“

”نہیں کوئی ضرورت نہیں۔ ٹھیک ہے تم جاؤ اور ہاں سنو۔“ انہیں پھر کچھ یاد آیا۔

”جی۔“

”ہاں لوگ سو گئے؟“

”نہیں بجاگ رہے ہیں۔ اماں جی اپنے کمرے میں نماز پڑھ رہی ہیں۔“

”اچھا ٹھیک ہے۔“ وہ سگریٹ کا کش لینے لگے۔

مطربہ خاموشی سے باہر نکل گئی۔

”پنوارن جواب لینے کیلئے چکر پہ چکر لگا رہی ہے۔ دیر سے آئی بیٹھی ہے۔ بتاؤ کیا جواب دوں؟ اس کی تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہی۔“

اماں جی آج خود حویلی چل کر تیمور کے کمرے میں آئی تھیں۔

مطربہ نے پنوارن کو بھی دیکھ لیا تھا اور اماں جی کو بھی تیمور کے کمرے کی طرف جاتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ فوراً سے پیشتر اندازے سے کان لگا کر کھڑی ہو گئی تھی کہ آخر اسے اپنی اوقات اپنے اختیار کی حدود کا پتا تھا۔

”ایک ٹان سنس لڑکی کو آپ نے درد سر بنا لیا ہے۔ ناٹ اے بزنس۔ نارے جاب۔ آپ پنوارن کو جمعرات یا جمعے کو ٹالنے کا کہدیں۔ اینڈ ڈٹس آل۔“ وہ جھلا کر گویا ہوئے۔

”یہ انگریزی میں اتنا آسان لگ رہا ہے۔ اردو میں اتنا آسان نہیں ہے۔“

اماں جی کی جان جل کر رہ گئی تھی۔ جھلا کر بولی تھیں۔

”تو پراہم اماں جی۔ آپ غیر ضروری حد تک کاسٹ ہانڈ ہیں۔ میرا مطلب ہے نرم ہیں۔ کیا کر لے گی جب اس کے تمام اندکسور ہو جائیں گے اور ہول ایٹ موسفیر۔“

”خدا کا واسطہ تیمور۔ میرے کانوں میں انکارے اترتے ہیں۔ اس مردار انگریزی سے۔ اس سے تو بہتر ہے تم مجھ سے۔“

”سوئی اماں جی۔ ہمارا مطلب ہے آپ دن تارخ طے کر دیں اور پنوارن سے کہیں زیادہ شور و غل کرنے کی ضرورت نہیں۔“

”خدا کا واسطہ تیمور۔ میرے کانوں میں انکارے اترتے ہیں۔ اس مردار انگریزی سے۔ اس سے تو بہتر ہے تم مجھ سے۔“

”شوٹ کر دیں گے ہم اسے۔ اسے اچھے برے کی تمیز آج نہیں ہے تو کیا ہوا کل تو ہوگی۔ پتا چل جائے گا کہ ہم نے اس کے ساتھ اچھا کیا تھا یا برا۔ اور وہ جو اس کی نام نہاد ماں ہے۔ اگر اسے ہوا لگ گئی کہ بیٹی ”فارغ“ ہے تو کچھ بھیجے نہیں اس سے یوں بھی اس کا بگڑا ہی کیا ہے۔ بچہ ہے تو وہ کون سا اس کا اپنا ہے۔“

”خیر یہ تو تمہاری بات ٹھیک ہے۔ مگر ایک سوچ یہ آتی ہے کہ اللہ جانے وہ دوسری شادی سے کیوں انکار کر رہی ہے کہیں کوئی اور وجہ نہ ہو اور وہ ہمیں کہہ نہ پار ہی ہو۔“ اماں جی کا انداز ابھی تک فیصلہ کن نہیں تھا۔

”ہم آپ کو کہہ رہے ہیں ناں۔ چلیے۔ ہم خود بابا صاحب سے بات کرتے ہیں۔ وہ خود کہہ دیں گے پٹواری سے۔ نہ آپ۔ اب آپ پر سکون ہو جائیے اور ذہن سے ہر قسم کا بوجھ اتار دیجیے۔ پٹواریں سے کہہ دیجیے کہ بابا صاحب خود بات کر لیں گے وہ اب زحمت نہ کرے۔“

”آئیے۔ بہت کوفت ہوتی ہے ہمیں دیکھ کر کہ ایک خواہ مخواہ کی پریشانی میں مبتلا ہیں آپ۔ آپ چلیے اپنے کمرے۔ ہم بابا صاحب کے پاس جا رہے ہیں۔“

مطربہ فوراً دروازے سے ہٹ کر سیڑھیوں کی طرف بھاگی اور بھاگتی ہوئی سیدھی باغ میں ڈھلے گئی اور گہری گہری سانس لینے لگی۔

”جمعے کو نکاح ہو گا میرا۔ اس سینک سلائی پڑھا کو کے ساتھ۔ بچے کے ساتھ راتوں کو میں نے میٹھی میٹھی قربان کیں اور میرا نہیں۔“

جتنا تیز سانس چل رہا تھا اس سے ہزار گنا تیز اور دماغ میں جھکڑ چل رہے تھے۔

”اب میں اپنے دل کے ساتھ زبردستی نہیں ہونے دوں گی۔ اب کسی کے پہلو میں بیٹھ کر میں تمہیں نہیں چھوؤں گی تیرے علی خان۔ اب یہ نہیں ہو گا کہ کوئی قریب ہو اور میں تمہاری خوشبو محسوس کروں۔ تم چاہنے والی ماں کے احساس کو محسوس کر سکتے ہو تو پھر میرے کیا لگتے ہو؟“

اس جمعے کو تمہارا نکاح ہو تو کیا خوب تماشا ہو۔ دل صرف جاگیر دار ہی کا ہوتا ہے۔ اب کچھ نہیں ہو گا۔ جو ہونا تھا وہ ہو چکا۔“

ایک ان دیکھی آگ لے شعلوں میں وہ جل کر خاک ہو رہی تھی۔

”تم..... اس وقت؟“ یاوری علی خان نے چونک کر گھڑی دیکھی۔

”جی خان..... آپ کو دیکھنے آئی تھی۔ آپ یقیناً چھوٹی دلہن کا انتظار کر رہے ہیں۔“ وہ دروازے کے قریب قریب تھی۔

یاوری علی خان جو اب خاموش رہے۔

”خان..... آپ بہت اچھے ہیں۔ بہت نیک آدمی ہیں۔ مجھے بھی آپ کے ساتھ اس زیادتی کا دکھ ہے۔“

”یہ کی بات ہے۔“ وہ چونکے۔

”یوں زیادتی؟“ وہ چونکے۔

”خیر خان کو آپ کے ساتھ یہ نہیں کرنا چاہیے۔ انہیں ایک سے ایک پڑھی لکھی بیوی مل سکتی ہے۔ پھر آپ تو ان کے

روئے۔ سنے افسوس کی بات ہے۔“ مطربہ کے انداز میں تاسف تھا۔

”یاوری علی خان کا ضبط جواب دے گیا۔“

”آپ جتنا غصہ کریں کم ہے خان۔ میں حویلی کے ہمدردوں میں سے ہوں اور آپ تو اتنے اچھے ہیں کہ میں آپ کے

تو یہ زیادتی برداشت ہی نہیں کر سکتی۔ آپ یہ نہ سمجھیں کہ میں پیٹھ پیٹھ لگائی بجھائی کر رہی ہوں۔ آپ مجھے تیمور خانوں اور

پٹواریوں کے سامنے بھی لا کر کچھ پوچھیں گے تو میں حاضر ہو جاؤں گی۔ اور مجھ سے جو پوچھیں گے میں ان دونوں کے

جواب دوں گی۔“ یاوری علی خان۔ ایک سکتے کی کیفیت میں اس کی صورت دیکھ رہے تھے۔

”آپ پاہیں تو ابھی بلو لیں۔ میں یہیں ہوں آپ کے کمرے میں۔“ وہ بہت سادگی سے کہہ رہی تھی۔

”میں اب بھی تمہاری بات نہیں سمجھا۔“ یاوری علی خان کی شریانوں میں طوفان برپا ہو چکا تھا۔

”مجھ تو خیر آپ گئے ہیں خان۔ مگر آپ کو یقین نہیں آ رہا۔ اور ابھی کیسے سکتا ہے۔ یہ کوئی چھوٹی سی بات تو نہیں ہے۔

پان دونوں کو ابھی میرے سامنے بلوا سکتے ہیں۔“

”آئی بزدل لڑکی۔ یہ سب کہہ رہی تھی۔ سامنا کرنے کو تیار تھی۔ ان کی ہستی آخر کیسے تھیں نہیں نہ ہوتی۔“

”کیوں کر رہی ہو تم یہ سب؟“ وہ بہت تھکی تھکی آواز میں پوچھ رہے تھے۔

”اس لئے کہ آپ بہت اچھے ہیں۔ کسی کو کچھ نہیں کہتے۔ میں آپ کی سب سے زیادہ عزت کرتی ہوں۔ بس مجھ سے

دشمن نہیں ہوا یہ سب۔“

”یہ جانتی ہو تم..... تم یوں بھی خاصی بے وقوف لڑکی ہو۔“ وہ ہنوز کسی اچھی آس میں مبتلا تھے۔

”بے وقوف ضرور ہوں خان۔ مگر چھوٹی سی بچی نہیں ہوں۔ شادی کی تھی آپ لوگوں نے میری۔ ایک عقلمند آدمی کے

”نہ۔“ کوئی سے گویا ہوئی۔

”تمہیں کیا حاصل ہو گا اس ہمدردی سے؟“ وہ دکھ سے پوچھ رہے تھے۔

”اٹھائی برداشت کی بات ہے۔ مجھ سے نہیں ہو رہا برداشت۔ مجھے پتا ہے تیمور خانوں مجھے گولی بھی مار سکتے ہیں۔ میں

بے ہوش ہوتی ہوں چاہ رہی تھی۔ میں نے تو آپ کو موقع دیا کہ آپ خود دیکھ لیں سب کچھ اور میں اس معاملے میں نہ

”میں غلط ہوں۔“ وہ بولتے بولتے رک گئی۔

”تمہیں علم ہے۔ یہ کتنی بڑی بات ہے۔ اگر غلط ثابت ہوئی تو تمہارا انجام کیا ہو گا؟“ انہیں اتنی آسانی سے یقین آیا تو

”نہ۔“ وہ بولتے بولتے رک گئی۔

”فیک ہے ناں خان۔ مجھے ہر سزا منظور ہوگی۔“ وہ بولی۔

یاور علی خان تو جیسے کوما میں چلے گئے۔ ایک ڈانٹ سے تھر تھر کانپنے والی لڑکی ایک دم اتنی ٹھنڈی ہو گئی۔ یہ تو بہت مراد اور معصوم لڑکی ہے۔ درحقیقت جو کچھ وہ کہہ گئی وہ کوئی بے وقوف ہی کہہ سکتا ہے۔ ورنہ اچھے اچھوں کی بہت جہیں ہو سکتی کہ وہ اتنے با اختیار لوگوں کے سامنے ایسی حقیقت پیش کر سکیں۔ جو سچ ہونے کے باوجود انہیں نقصان پہنچا سکتی ہو۔

”سنو“۔ یاور علی خان نے اسے مخاطب کیا۔

”جی خان“۔

”آئندہ..... ہم سے اس قسم کی بات نہ کرنا۔ ہم میں جتنی برداشت ہے وہ ہم کر چکے۔ مگر ہو سکتا ہے ہم آئندہ یہ سب نہ کر سکیں اب تم جاؤ۔“

وہ ان کے تیور دیکھ کر ایک لمحے کو تو واقعی خوفزدہ ہو گئی تھی اور جلدی سے باہر نکل گئی تھی۔

”آپ نہیں چلیں گے خیر آباد؟“ نازنین نے کوفت بھرے انداز میں یاور علی خان سے پوچھا۔

”نہیں..... نہیں کا مطلب نہیں ہوتا ہے ناز بیگم۔“

”دیکھیے اماں جی۔ یہ کراچی بھی نہیں گئے تھے میرے ساتھ۔ دو دن کی تو بات ہے۔ آپ کہیے ناں انہیں۔“ ہرے انداز میں زبردست اصرار تھا۔

”چلے جاؤ یا اور۔ بروقت اپنی نہیں کرتے“۔ اماں جی نے بھی بہو کا دل رکھا۔

”تیمور جار ہے ہیں ناں..... بس ٹھیک ہے۔“

”یہ لیجیے۔ آپ آپ ہیں، تیمور تیمور ہیں۔ ہم آپ کو ڈسٹرب نہیں کرتے تو اس کا مطلب ہے آپ بالکل ہی چھٹی ہو گئے۔“ وہ بسوری۔

”مطربہ اماں جی کے پیچھے بیٹھی ان کے کرتے کی تریپائی کر رہی تھی۔ اور ان کی عمر اسے بے نیاز نظر آ رہی تھی۔

”دل اور سا ہو جاتا ہے۔ ادھر ادھر سیر تفریح کرنے سے۔ یہ پڑھائی تو بہو کی سوت بتا رکھی ہے تم نے۔“ اماں جمانے قدرے ناراضگی سے کہا۔

”یہ بات نہیں ہے اماں جی..... ان کی سیر و تفریح پر ہزاری غیر حاضری سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ میں انہیں تو سنائیں
کر رہا۔“ وہ بہت بے دلی سے کہہ رہے تھے۔

”ٹھیک ہے پھر میں نہیں جا رہی“۔ ہارنن کا موڈ آف ہو گیا۔

”بیٹے۔ بہو دوسرے جی سے ہے، کیوں جان جلاتے ہو اس کی۔ ایک دو دن سے ہو کیا جاتا ہے۔“ اماں جی کا انداز سمجھانے کا سا تھا۔

”میری اور ان کی ملاقات ایک گھنٹہ صبح اور ایک گھنٹہ رات کو ہوتی ہے۔ چھ گھنٹے یہ رات کو سوتی ہیں اور دو گھنٹے روز کو۔“

پڑھ پڑھ کر ہر بات کتابی ہو گئی ہے۔ کیا حساب نکالا ہے۔ بیٹے تم خود اتنے مصروف رہتے ہو وہ بے چاری کے ساتھ اعداد و شمار و پڑتال کا انداز پسند نہیں آیا۔ نازنین بھی چپ سی ہو کر رہ گئی تھی۔ اسے بھی کتاب کتاب اچھا نہیں لگا تھا۔

کے سامنے یہ حساب کتاب اچھا نہیں لگتا۔ وہ دوپٹہ سنبھال کر کھڑی ہو گئی۔
 "پتہ تو نہ جائیں مگر اس طرح سب کے سامنے اسلٹنگ وے پر تو نہ آ جائیں۔" وہ آپ ان سے کہنے ہمیں بھی اپنے ساتھ ہی کہیں
 "ہم تہہ نہیں جانتے اماں جی..... ایک کونے میں پڑے رہیں گے۔ آپ ان سے کہیں ہمیں بھی اپنے ساتھ ہی کہیں
 "کری بھی بالکل ان کے برابر ہونا چاہیے۔" وہ ناراضگی سے کہہ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

ردائے پر ہلکی سی دستک ہوئی اور دروازہ فوراً ہی کھل گیا۔ یاور علی خان نے چونک کر کتاب سے سر اٹھایا تھا۔ حیرت منانے لگا۔ جی تھیں۔ وہ ایک دم سنبھل گئے۔

”آب اماں جی..... خیریت..... مجھے بلوایا ہوتا آپ نے کیوں زحمت کی؟“

”ناہ۔ مرد کی شادی ہوتی ہے تو بیوی کے پیچھے سب بھول جاتا ہے۔ مگر جس کو بیوی دھیان نہ پڑتی ہو وہ ماں باپ کا ہر دھیان کرتا ہوگا۔ آگ لگے اس پڑھائی کو۔ تم اتنے دور محسوس ہوتے ہو کہ لندن گیا ہوا تیسوڑ قریب لگتا ہے۔“

وہ نرند اور شکاتی لہجے میں بولتی ہوئی ان کے قریب ہی بیڈ پر بیٹھ گئیں۔

”بہت ناراض لگ رہی ہیں؟“ وہ زبردستی مسکرائے تھے اور ماں کو بہت محبت سے دیکھا تھا۔

”مراض نہ ہوں تو پھر کیا کروں۔ کتنی غلط بات کی تم نے تپسوئی دلہن کے ساتھ۔ اس نے رو رو کر برا حال کر لیا ہے۔ نہ
موت ہے نہ جی ہے۔ سب کے سامنے اس نے اپنی بہت بے عزتی محسوس کی ہے تمہیں اس طرح نہیں کرنا چاہیے تھا۔ انکار
مادر بھی بہت سے طریقے ہوتے ہیں۔ مجھے تم سے ایسی بے تکی حرکت کی امید نہیں تھی۔ وہ میری پسند ہے۔ بڑے ارمانوں
پر بیاہ کر لائی تھی۔ اور سچی بات مجھے اپنی پسند پر کبھی پچھتاوا نہیں ہوا۔ اتنی انگریزی پڑھی ہوئی ہے مگر حویلی کے اصولوں پر
ثابہ۔ کتنے نوکر ہیں گھر میں مگر میرے کام اپنے ہاتھ سے کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ اپنے ہاتھوں میری کنگھی چوٹی کرتی
ہے۔ تم کو کیا کیا طاقت کی چیزیں بنانا کر مجھے کھلاتی ہے۔ بیٹے! گھر میں اس کی جڑیں مضبوط ہو چکی ہیں۔ ہمارے پوتے
نہیں ہے۔ پہلے سے زیادہ اس کا رشتہ گہرا ہو چکا ہے ہم سے۔ مت پریشان کیا کرو اسے مجھے تکلیف ہوتی ہے۔“

”اب بت سنجیدہ تمہیں۔“

تکلیف الٰہی جی..... اب تو سب کچھ اسی کا اس گھر سے وابستہ ہے۔ گھر آباد ہو جائے تو خاص بات نہیں ہوتی۔ دل آباد ہو
بے توفیق کھل ہو جاتی ہے۔ انسان قیامت تک کیلئے پرسکون ہو جاتا ہے۔ بعض اوقات دل کا معاملہ اتنا گہرا ہوتا ہے کہ
سرد و خوش فہم جنت و دوزخ دنیا آخرت سب اس دل سے مشروط ہو جاتی ہے۔ پھر انسان کسی نفع نقصان کی پرواہ نہیں کرتا

”یہ نہیں کیا زمین آسمان کی جوڑ رہے ہو۔ بات کیا ہو رہی ہے۔ کہاں ملارہے ہو۔ اللہ کا شکر ہے اس کا دل تم سے آباد

ہے۔ ایک عمر شہر میں گزارنے کے بعد وہ یہاں ہم میں رہ رہی ہیں اس طرح جیسے ہمیشہ ایسے ہی ماحول میں رہی ہوں۔
 ”اسے فرق کیا پڑا ہے اماں جی..... حویلی میں بھی پڑھا لکھا ماحول ہے۔ کھیتوں میں مل چلانے تو نہیں جاری ہاں؟“
 وہ قدرے جھلائے جیسے وہ اس موضوع پر بات کرنا نہیں چاہے ہوں۔

”تمہیں کوئی شکایت ہوگئی ہے اس سے؟“ اماں جی نے گہری نظروں سے ان کا چہرہ دیکھا۔

”ایسی کوئی بات نہیں۔ میں دراصل بہت مصروف ہوں۔ میرے ایگزام ہونے والے ہیں۔“ انہوں نے نگاہیں تہا لیں۔

”نہیں اگر کوئی بات ہے تو مجھے بتاؤ۔“ وہ شاید گہرے وجدان کے تحت بات کر رہی تھیں۔

”اماں جی! کوئی بات نہیں ہے۔ آپ فکر مند نہ ہوں۔“

”فکر مند کیسے نہ ہوں۔ میری بہو پریشان ہے، رو رہی ہے۔ حد کرتے ہو تم۔“ وہ ناراضگی سے بولیں۔

”اٹھو۔ چلو میرے ساتھ۔ ایسے ساتھ یہاں لے کر آؤ۔“ وہ اٹھ کھڑی ہوئیں۔ ”چلو۔“

”آپ اسے لے آئیں۔ پھر میں سنبھال لوں گا۔“ وہ جزبہ زور سے تھے۔

”نہیں..... تم میرے ساتھ چلو..... اٹھو شاباش۔ یہ کوئی ناک کی بات نہیں ہے۔ ایسا کرنے سے گھر مضبوط ہوتے

ہیں۔ خوشی ملتی ہے۔ آؤ۔“

”اماں جی کے انداز میں قطعی حکم تھا۔ وہ ناچار بیڈ سے اتر آئے۔

اماں جی چل پڑیں اور وہ ان کے پیچھے ہو لیے۔

ان کا خیال تھا کہ اماں جی ہال کی طرف جائیگی مگر وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھ رہی تھیں۔

”واقعی بہت ذہین ہونا زمین بیگم۔“ وہ دل ہی دل میں گویا ہوئے۔

اماں جی کے پیچھے وہ کمرے میں داخل ہوئے۔ مگر پھر ڈھیر غبار میں گھر گئے۔ نازنین اماں جی کے بستر پر نیم دراز تھی اور تیور علی

خان کرسی پر ان کے قریب جھکے ہوئے آہستہ آہستہ کچھ کہہ رہے تھے۔ جبکہ نازنین کی آنکھیں رو رو کر متورم ہو رہی تھیں۔

”کیا ہوا؟ طبیعت خراب ہے؟“ وہ یکسر انجان بن کر پوچھنے لگے۔ آواز بالکل سپاٹ تھی۔

نازنین خاموش رہی۔

”یہاں اماں جی کے کمرے میں کیوں لیٹی ہو؟ اپنے بیڈروم میں چلو۔“ وہ پھر اسی سرد سپاٹ انداز میں گویا ہوئے۔

نازنین پھر خاموش رہی۔

”ہاں بیٹی..... جاؤ اپنے کمرے میں آرام کرو۔ میرے کمرے میں تو سب کا آنا جانا لگا رہتا ہے۔“

اماں جی بہت محبت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔

”اماں جی! میں یہیں ٹھیک ہوں۔“ اس نے منہ دوسری طرف موڑتے ہوئے ناراضگی سے کہا۔

”ہوں! ضد کر رہی ہیں؟ یہاں آپ کو آرام نہیں ملے گا۔ ہر دوسرے منٹ تو یہاں کوئی نوکر ہدایت لینے آ جاتا ہے۔“

پھر اور بھائی آپ کو لینے آئے ہیں۔“ تیور علی خان کے لہجے میں شرارت تھی۔

”یہ میری وجہ سے ڈسٹرب ہوں گے یوں بھی انہیں کام بڑے ہوتے ہیں۔“ وہ سابقہ انداز میں گویا ہوئی۔

”پلیز..... جھکنا نہیں۔ آپ اس طرح کی صورتحال زیادہ دیر انفرڈ نہیں کر سکیں گی۔“ تیور علی خان مسکراہٹ چھپا کر کہہ

رہے تھے۔

نازنین بے دلی سے اٹھ بیٹھی۔ ”ٹھیک ہے پھر آپ بھی چلیں ہمارے ساتھ بیڈروم میں۔“ اس نے دوپٹا سنبھالا۔

”ڈرگ رہا ہے؟ یاد رہائی ڈانٹنے کا نہیں۔“ وہ پھر شرارت سے گویا ہوئے۔

”جی نہیں۔ میرا دل گھبرا رہا ہے۔ آپ سے باتیں کر لیں گے۔“ اس کے انداز میں ابھی بھی خفگی کا تاثر تھا۔

”ہاں چلو تیور! یوں بھی ان کی سب سے زیادہ انڈر اسٹینڈنگ تم ہی سے ہے۔“ یاد علی خان نے بھی خشک انداز میں

کہا۔

”تو اس میں شک بھی کیا ہے۔“ نازنین نے منہ بنا کر کہا۔

”اگر کسی کے ساتھ انڈر اسٹینڈنگ نہ بھی ہو تو پیدا کرنے کی کوشش تو کی جاسکتی ہے۔“

تیور علی خان اس وقت مکمل شرارت کے موڈ میں تھے۔ ذومعنی بات کہہ رہے تھے۔

یاد علی خان اس کے قدم بڑھانے سے پہلے باہر نکل گئے تھے۔

”بات بڑھانے کا کیا فائدہ دلہن؟ جب وہ چل کر تمہارے پاس آ ہی گیا تھا۔“

اماں جی نے سمجھانے کے انداز میں کہا۔

”اماں جی ٹھیک کہہ رہی ہیں بھابی۔ یاد رہائی اچکے نکل بہت سیریس ہیں۔ آپ نہ اتنا سیریس ہوا کریں۔ خواجواہ کی

پرالم کری ایٹ ہوتی ہے۔“

انہوں نے بھی ماں کی ہاں میں ہاں ملائی۔

”بہت روڈ اور موڈی ہیں یاد۔ اگر آپ جیسے کانسڈ اور سوٹ نیچر لوگ حویلی میں نہ ہوتے تو میں بہت پریشان ہو جاتی

۔“ وہ ناراضگی سے کہہ کر چل پڑی۔

”کیا بولی دلہن؟“ اماں جی نے الجھ کر تیور سے پوچھا۔

”آپ کی تعریف کر رہی تھیں۔“ تیور علی خان مسکرا رہے تھے۔

”وہ تو “لوگ“ کہہ رہی تھی؟“ ان کی فکر مندی بڑھ رہی تھی۔

”تو یہاں لوگوں کی سردار تو آپ ہی ہیں ناں۔“ تیور علی خان نے وضاحت کی۔

”مجھے نہیں چاہیے سرداری۔ میرے بچے خوش رہیں اور کیا چاہیے مجھے۔ جاؤ تمہیں بلاگئی ہے۔ اس کا موڈ ٹھیک نہیں

ہے۔ کہیں یاد سے نہ الجھ پڑے۔ خواجواہ بات بڑھے گی۔

اماں جی نے تیور علی خان کو اس طرح کہا کہ وہ اٹھنے میں مزید دیر نہ کریں۔

”کچھ نہیں ہوتا اماں جی۔ بھابی اتنی اچھی ہیں کہ یاد رہ جائی ان سے زیادہ دیر ناراض رو ہی نہیں سکتے۔ آپ پریشان نہ ہوں۔ بہر حال چلا جاتا ہوں۔“
وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔

کوئی سایہ کھڑکی سے فوراً ہٹا تھا۔ جس کا گمان ابھی تک ماں بیٹے کو نہ ہوسکا تھا۔

”اماں جی! پتہ دارن سے کہیے ایک مہینہ ٹھہر جائے۔ ابھی میرا دل ٹھکانے نہیں ہے، دماغ پریشان رہتا ہے۔“
مطر بہہ کار پٹ پر آلتی پالتی مارے بیٹھے تھی اور باری کوچہ سے کوئی دلیہ وغیرہ کھلا رہی تھی۔

اماں جی نے خوشگوار حیرت سے اس کی سمت دیکھا تھا۔

”تیرا دل ہی تو ٹھکانے لگانا چاہ رہے ہیں۔ بے ٹھکانہ جو ہو گیا ہے۔“ خالہ نے ہنس کر کہا۔ وہ بھی جیسے خود کو بہت بچا پھلکا محسوس کرنے لگی تھیں۔

”لو وہ تو ٹھہر جائیگی۔ وہ تو ہمیں ہی جلدی ہے۔“ اماں جی نے بہت مسرور انداز میں کہا۔

”آپ کو کیوں جلدی ہے؟“ اس نے قدرے خشک لہجے میں پوچھا۔

”ہمیں تو تکلیف کپڑوں میں ہستی کھلتی اچھی لگتی ہے۔ ان کالے کپڑوں میں تو بہت بے رونق ہو گئی ہے۔“ ان کے انداز میں حد درجہ جلالت و اپنائیت تھی۔

”اماں جی بعض اوقات رنگ تو دوسروں ہی کیلئے ہوتے ہیں۔ کسی کو کیا پتا چلے کہ ماتم تو رنگوں میں بھی ہوتا ہے۔ انسان کو اپنے دیکھنے کا اتنا اعتبار بھی نہیں ہونا چاہیے۔ غیب کا حال اللہ جانتا ہے یونہی تو نہیں کہہ دیا کسی نے؟“ اس نے یاسیت سے کہا۔

”ٹھیک ہے۔ مگر اپنے آس پاس موجود بندوں کو خوشی دینے سے بھی انسان کو سچی خوشی مل جاتی ہے۔ ایسی ہی خوشی کے پاؤں بھی ہوتے ہیں جم کر کھڑی ہو جاتی ہے۔ تیری عمر کیا ہے ابھی تجھے زندگی پوری سمجھ نہیں آئی۔“

اماں جی نے پوری سنجیدگی مگر مخصوص نرمی سے کہا۔

”ہمیشہ ایسا نہیں ہوتا۔ یہ اللہ والوں کی باتیں ہیں۔ آپ کر سکتی ہیں، خالہ کر سکتی ہیں۔“ اس نے قدرے تجنی سے کہا تھا۔

”چل چھوڑ اس بحث کو۔ مہینہ چھوڑ دو مہینے کا کہہ دوں گی پتہ دارن سے۔ تو اتنے میں اپنا دل سنبھال، خود کو سنبھال۔ یہ بھی بہت ہے کہ ”ہاں“ پر تو آئی۔“

اماں جی نے بات سمیٹنے کی کوشش کی ان کے حساب سے جو اس پر ہو گزری تھی، بہت کٹھن تھی۔ اسے رعایت ملنا چاہیے۔
کہ دکھ بڑا ہے عزم ہے۔

”اماں جی! اب آپ چھوٹے خان کی شادی بھی جلدی سے کرنے کی کوشش کیجیے۔ ایسا نہ ہو کہ کسی میم پر ان کا دل آجائے۔“ مطربہ نے نیپکن سے باری کا منہ صاف کیا۔

”میں تو آج کر دوں مگر تیرا خان ابھی راضی نہیں ہے۔ بہنوں نے بہت گھیرا مگر وہ نہیں سن رہا۔“
”کیا کہتے ہیں؟“ وہ بظاہر لا پرواہی سے پوچھ رہی تھی۔
”کہا کیا ہے۔ کہ ابھی پڑھ رہا ہوں۔“ وہ بے بسی سے بولیں۔

”تو کیا ہوا۔ شادی کے بعد بھی تو پڑھ سکتے ہیں۔ انہوں نے کون سا گھر چلانے کیلئے نوکری کرنا ہے۔ کیوں خالہ؟“
”لو بھلا..... ہم کون ہوتے ہیں انہیں مشورے دینے والے۔ وہ ہمارے مالک ہیں جو چاہیں کریں۔ اللہ رکھے ان کے

ماں باپ ہیں۔ ان کا بھلا سوچنے والے۔ اتنی باتیں نہ کیا کر خان کو پسند نہیں۔“ خالہ نے جھاڑ پلائی۔

”آپ کو پتا ہے خان کو کیا پسند ہے؟“ اس نے معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ سوال کیا۔

”میں جاننے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ وہ مناسب سمجھیں گے تو خود بتا دیں گے۔ انسان کو اپنی حیثیت کے ساتھ بات کرنی چاہیے۔ امیری غریبی سے انسان کی عزت نہیں ہوتی۔ انسان اپنا مقام پہچان کر بات کے تو سب جگہ اس کی عزت ہوتی ہے، بھلے امیر ہو کہ غریب۔“

”خالہ نے ناصحانہ انداز اختیار کیا۔ انہیں کچھ اچھا نہیں لگا تھا کہ وہ خان کی شادی کے موضوع پر اماں جی سے بات چیت کرے۔

”کیوں ٹوک رہی ہے؟ سیدھی بچی ہے۔ اسے اپنے خان کی شادی کا ارمان ہے۔ اس میں بھلا کیا برائی ہے؟“ اماں جی نے اس کا دل رکھا۔

”کیا کریں۔ اس نے تو اپنی ماں ہی کا دل توڑ دیا۔ مجھے تیمور سے یہ امید نہیں تھی۔ تو نے دیکھی ہے سولہ آنے! شیخ رفیع لڑکی؟ میں تو خیالوں میں اسے حویلی میں چلتا پھرتا بھی دیکھ چکی۔“ اماں جی کا لہجہ مغموم ہو گیا۔

(ہاں اماں جی..... جو ماں کا دل توڑ دے وہ کس کا دل رکھے گا؟) وہ باری کو گود میں بھر کر کھڑی ہو گئی۔

”یہ کیا تو اسے گود میں لیے لیے پھرتی ہے؟ ماشاء اللہ بھانگے کھیلنے والا بچہ ہے۔ بڑا ہورہا ہے۔“ خالہ نے ٹوکا۔

”بس مجھے اچھا لگتا ہے۔ سارے یقین کھو چکے ہیں۔ اسے ساتھ لگا کر کچھ زندگی کا یقین سا ہونے لگتا ہے۔“ مطربہ نے باری کا رخسار آہستگی سے چوما۔

”دیکھیں اماں جی۔ اتنی بڑی بڑی باتیں کرنا اسے کہاں سے آگئیں۔“

خالہ نے بڑی حیرت سے پہلے اسے پھر اماں جی کو دیکھا۔

”وقت سب کچھ سکھا دیتا ہے سولہ آنے۔“ اماں جی نے گہری سوچ کے دوران جواب دیا۔

”جا..... اسے بڑے خان کے پاس چھوڑ دے اور تو باورچی خانے میں ماما کا ہاتھ بٹا دے دوپہر کے کھانے پر بڑے خان نے کچھ لوگوں کو بلایا ہے۔“

”رہنے دے سولہ آنے۔ اسے کام کو نہ کہا کر۔ تیمور منع کرتا ہے۔ کہتا ہے اب یہ ہماری ملازمت نہیں ہے۔ دوست کی بیوہ ہے۔ اس کے بیٹے کی ماں ہے۔ اپنا گھر سمجھ کے اپنی خوشی سے کچھ کر لے وہ دوسری بات ہے۔“ اماں جی نے خالہ کو ٹوک دیا۔

”بغیر مانگے کی مہربانیاں بارش کی طرح برتی ہیں۔ مگر جب دل کسی چور ہے پر کھڑا کسی ایسی مہربانی کا انتظار کر رہا ہو جو دعائے نیم شبی کا عطر ٹھہری ہو تو بن مانگی مہربانیاں اسی چور ہے پر غبار بن کے اڑتی ہیں۔“

اس کے سینے سے سانس یوں خارج ہوئی جیسے دیر بعد راستہ ملا ہو۔ پھر ایک دم باہر نکل گئی۔

”مطربہ۔“ وہ بڑے انہماک سے دوپٹے پر کروٹیا کی نیل بنا رہی تھی۔ یاد علی خان کی آواز پر تقریباً چھل پڑی۔ اور ایک دم کھڑی ہو گئی۔

”جی خان۔“ اس نے آٹھل سر پر ڈال کر مودبانہ جواب دیا۔

”کام کر رہی ہو؟“ وہ ایک کرسی پر اطمینان سے بیٹھ گئے۔

”جی..... بس ایسے ہی۔“ وہ انگلیاں مروڑنے لگی۔

”ہوں..... باری کہاں ہے؟“ انہوں نے سرسری انداز میں پوچھا۔ جیسے خاص بات سے پہلے پیش بندی کی جاتی ہے۔

”وہ جی بڑے خان کے پاس ہے۔ زیادہ انہی کے پاس رہتا ہے۔ بہت پیار کرتے ہیں خان اس سے۔“

اس نے قدرے الجھ کر ان کی جانب کھوجتی نظروں سے دیکھا تھا۔

”وہ پنوارن والا کیس نمٹ گیا؟“

اس نے بڑی حیرت سے یاد علی خان کی سمت دیکھا تھا۔ اپنے کام سے کام رکھنے والے یاد علی خان اس کے ذاتی معاملات میں اتنی دلچسپی لے رہے تھے کہ خود چل کر آئے تھے۔

”نمٹ ہی گیا خان۔“ وہ بے زاری سے گویا ہوئی۔

”ہوں اچھی بات..... اچھا ہے تم جلد سے جلد پھر سے شادی شدہ ہو جاؤ۔ تمہاری ماں سے تو بروقت کا خطرہ ہے ہی۔“ وہ خاموش رہی۔

”اور کوئی بات تو نہیں ہوئی تمہارے سامنے؟“ وہ ہچکچاتے ہوئے پوچھ رہے تھے۔

”کیسی بات خان؟“ وہ نئے سرے سے حیران ہوئی۔

”کس قدر بے وقوف لڑکی ہو۔ ہماری زندگی میں آگ لگا کر کتنی معصومیت سے پوچھ رہی ہو کیسی بات؟ ایک بات بتائے دیتے ہیں تمہیں اگر تمہاری اطلاع غلط ثابت ہوئی تو پھر شہر جانے والے چوک پر تمہارے کوزے لگوائے جاسکتے ہیں۔“ ان کا انداز برہم بھی تھا اور شکستہ بھی۔

”خان..... بھلا مجھے ایسی بات کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ کیا مجھے اندازہ نہیں کہ میں کیا کہہ رہی ہوں۔ پھر آپ نے میرے ساتھ کیا برائی کی ہے۔ اگر میں جھوٹ بولتی تو آپ سے یہ کیوں کہتی کہ مجھے چھوٹے خان کے سامنے بلوا کر پوچھ لیں۔“

”میں تو شاید اس طرح سوچتی بھی ناں۔ وہ تو علی نے بھی اس طرح کے شک کا اظہار کیا تھا۔“

”علی نے؟“ یاد علی خان کی دنیا میں پھر زور سے زلزلے کا جھٹکا لگا۔

”علی..... کیا کہا تھا علی نے؟“ ان کی آواز میں بلا کی شکستہ تھی۔

”وہ میں حویلی آئی ہوئی تھی ناں۔ تب چھوٹے خان لندن میں تھے ایک رات چھوٹی دلہن میرے پاس آئیں اور کہنے لگیں۔ یاد جاگ رہے ہیں۔ میں اپنے کمرے میں جاؤں۔ لندن سے تیمور کا فون آنے والا ہے۔ تم رو پا دیو کو باری کے پاس چھوڑ کر ہال میں بیٹھ جاؤ۔ جیسے ہی تیمور خان کا فون آئے مجھے بلا لیتا مگر کچھ بولنا نہیں۔ اور نہ حویلی میں کسی کو بتانا کہ تیمور خان کا فون لندن سے آیا تھا۔ میں تیمور علی خان کے فون کا انتظار کر رہی تھی کہ اتنے میں علی کا فون آ گیا۔ میں کبھی چھوٹے خان میں۔ میں نے ”جی خان“ بول دیا۔ علی شک میں پڑ گئے کہ اتنی رات کو میں کس خان کے فون کا انتظار کر رہی تھی۔ جب میں واپس گئی تو وہ چپ چپ تھے۔ تب میں نے ساری بات ان کو بتا دی۔ انہوں نے مجھ سے کئی سوال کئے پھر کہنے لگے۔ ہاں تیمور تازمین کا بہت ذکر کرتا ہے۔ مجھے لگتا ہے اس کے ساتھ زیادتی ہوئی ہے۔ اب تو شاید وہ زندگی بھر شادی نہ کرے۔“

وہ ایک تواتر سے بولتی جا رہی تھی اور یاد علی خان کے پاؤں کے نیچے سے زمین کا تختہ دھیرے دھیرے سرک رہا تھا۔

”اور۔“ ان کی آواز کسی پاتال سے ابھر رہی تھی۔

”اور کچھ نہیں خان! جو کچھ تھا وہ میں پہلے بتا چکی ہوں۔“ وہ آرام سے بولی تھی۔

”مگر..... جانے کیوں دل نہیں مانتا۔“ وہ خود کلامی کے انداز میں کہہ رہے تھے۔

”جلدی مان جائے گا..... آپ ساتھ عزت کے اپنی جان چھڑالیں خان۔ پھر دیکھیں تیمور خان کیا کرتے ہیں۔ آپ دیکھ لیجئے گا۔ وہ حویلی چھوڑ دیں گے۔ چھوٹی دلہن کی خاطر۔ آپ نے دیکھا نہیں وہ ایک سے لاکھ تک شادی پر راضی نہیں ہیں۔ اماں جی کہتی ہیں۔ شیخ رفیع کی لڑکی بہت خوبصورت ہے۔ بہت پڑھی لکھی ہے پھر بھی چھوٹے خان راضی نہیں۔“

”بس خاموش ہو جاؤ مطربہ۔ سر پھٹ جائے گا میرا۔“ واقعی ان کا سر گھوم رہا تھا۔

”خان..... یہاں میں ایک بے حیثیت لڑکی ہوں۔ اپنی اوقات پہچانتی ہوں۔ پھر بھی آپ سے یہی کہوں گی کہ آپ ملکی فرمت میں بات صاف کر لیں۔ اگر آپ دونوں سے اکیلے اکیلے بات کریں گے تو وہ کبھی نہیں مانیں گے۔ آپ ایسا کیجیے گا بھی نہیں بلکہ آپ جب بھی بات کریں مجھے بلوالیں۔ میں نے ہی بات شروع کی ہے۔ پھر آپ کیوں برے نہیں؟“

یاد علی خان نے عبور اس کی شکل دیکھی۔ اتنی جرات ایسی ہمت۔ کہاں سے آئی اس میں؟ بھلا اس سارے قصے میں اس کا ہنا کیا فائدہ؟

”تم اتنا بڑا خطرہ مول کیوں لے رہی ہو۔ تمہیں شوٹ بھی کیا جاسکتا ہے۔“ انہوں نے اپنی دانست میں اہم نکتے کی طرف توجہ مبذول کرائی۔

”بھلے سے..... یوں بھی یہ زندگی بھی کوئی زندگی ہے۔“ وہ بے زاری اور بے خونی سے گویا ہوئی۔

”ہوں۔“ وہ زانوؤں پر ہاتھ کا دباؤ ڈال کر اٹھ کھڑے ہوئے۔

”اور کیا کہنا چاہتی ہو؟“ وہ ریزہ ریزہ ہو رہے تھے۔ بے وقعت لڑکی کے سامنے اب وہ تھے ہی کیا۔

”کہنے کو تو بہت کچھ ہے خان۔ مگر کہنے کی ہمت نہیں ہے۔“

وہ خود فراموشی کے عمل میں تھی۔ ورنہ بے دم سے ضمیر میں کسی رکی ہوئی رفق کے تحت تھوڑا بہت تو کچھ ہوتا۔

یا ورعلی خان تھکے تھکے قدموں سے باہر نکل گئے۔

وہ بے حس سے انداز میں دوبارہ نبل بنانے لگی۔

”بھئی! وہ کیا نام ہے تمہارا۔ ہاں مطربہ! دیکھو لندن سے فون آنے والا ہے۔ کوئی فون پر بات کرے تو زیادہ دیر فون بزی نہ رکھنا۔ بہت مشکل ہو جاتی ہے۔“

”تم بیٹھی ہوتاں یہاں پر؟“ وہ جاتے جاتے پلٹے۔

”جی۔“ وہ نگاہ اٹھائے بغیر گویا ہوئی۔

”اوکے۔ فون پر کوئی خاتون ہوگی۔ وہ مجھے بلائیں گی۔ سمجھ رہی ہوتاں؟“ وہ پھر اسی عجلت بھرے انداز میں گویا ہوئے۔

”جی۔“

تیورعلی خان تیزی سے باہر نکل گئے۔

”ہونہہ..... خاتون..... جانتی ہوں۔ کون خاتون ہوں گی۔ کاش تم سے پوچھ سکوں تیورعلی خان۔ کیسی لگی ہے دل پر؟ کیوں پھر رہے ہو مارے مارے۔ سارے سکھ چین لندن میں گروی رکھ کر آئے ہو۔ قرض بہت ہے۔ اتارے نہیں اتر رہا۔ دل تو سب کا ایک جیسا ہوتا ہے۔ تیورعلی خان تمہارے بھی دل پر نہ لگائی تو نام نہیں۔“ اس کی رگ رگ میں آگ دہکنے لگی تھی۔

”تم کچھ نہیں کر سکتے مگر کسی کو اس کے حال پر تو چھوڑ سکتے ہو۔“

وہ سر جھکائے نبل بناتی رہی۔ سوچتی رہی۔ جانے کتنا وقت گزر گیا اسے احساس تک نہ ہو سکا۔

فون کی نبل ہوئی تو چونک پڑی۔ اور تیزی سے فون کی طرف بڑھی۔

دوسری طرف کسی مرد کی آواز تھی۔

”آصف حسین خان اسپیکنگ۔ تیور ہیں؟ لندن سے کال ہے۔“

”بلائی ہوں۔“ اس نے ریسیور رکھ دیا۔ یہ تو کوئی آدمی ہے۔ خان تو کہہ رہے تھے کسی عورت کا فون آئے گا۔ وہ الجھتی

ہوئی تیورعلی خان کو بلانے چل پڑی۔

وہ بھی شاید انتظار کی کوفت سے بے زار ہو کر خود ہی آرہے تھے۔ راہداری میں ہی مل گئے۔

”فون آگیا ہے خان!“ وہ سپاٹ لہجے میں بولی۔ ”مگر کسی آدمی کا ہے۔“

”ہوں..... آصف ہوگا۔“ وہ جیسے خود سے کہہ رہی تھے۔ رفتار ایک دم تیز ہو گئی تھی۔

”وہ بھی پیچھے پیچھے چلی آئی۔“

تیورعلی خان نے بڑی عجلت میں ریسیور اٹھایا تھا۔

”ہوں۔ ہیلو۔ بول رہا ہوں..... ہوں..... ہوں..... بات کراؤ۔“

پھر وہ اس کی جانب پلٹے۔

”وہ کیا ہے کہ تم باہر جاؤ۔“

”کوئی بات نہیں خان۔ مجھے پتا ہے۔ آپ اپنی انگریز بیوی سے بات کر رہے ہیں۔ فکر نہ کریں۔ مجھے انگریز ہی نہیں آتی

”تسخیرانہ انداز میں مسکرا کر بڑی بے نیازی اور ڈھٹائی سے کارپٹ پر بیٹھ گئی۔ اس نے تیورعلی خان کے تاثرات دیکھنے

کی بھی کوشش نہیں کی اور نئے سرے سے نبل بنانے لگی۔

”تیورعلی خان بہت آہستہ آواز میں بات کر رہے تھے اور دوسری طرف شاید بات سمجھ میں نہیں آرہی تھی اس لئے خان کو

بات دہرانا پڑ رہی تھی۔

تین چار منٹ بعد انہوں نے ریسیور رکھ دیا۔

”کیا کہہ رہی تھیں تم۔“ اسے پشت سے ان کی غضبناک آواز سنائی دی۔

”کب؟“ وہ چندرا کر پوچھ رہی تھی۔

”ابھی کچھ فرما رہی تھیں آپ۔“ وہ چبا چبا کر کہہ رہے تھے گویا یوں کہہ رہے ہوں کہ کیا بک رہی تھیں آپ؟“

”ہم کیا فرما سکتے ہیں خان۔ ہم تو نوکر ہیں آپ کے۔ بھلا ہماری کیا مجال۔“ بلا کا بے خوف انداز تھا۔

”آپ بے فکر رہیں۔ کسی سے نہیں کہوں گی۔“ وہ مسکرا رہی تھی۔

”اس طرح کی بکواس کرنے کی تمہیں ہمت کیسے ہوئی۔“ وہ بے حد براہم ہو رہے تھے۔

”جی بھی کبھی چھپا ہے خان..... بے چاری اماں جی کو اتنا نہ آزمائیں۔ اگر آپ انہیں بتادیں تو کچھ بھی نہیں ہوگا۔ تھوڑا

سار پریشان ہو کر رو لیں گی پھر انہیں صبر آ جائے گا۔“ وہ بے حد پرسکون تھی۔

”کس نے دی ہے تمہیں یہ غلط خبر؟“ لگتا تھا غصے سے ان کی شریانیں پھٹ جائیں گی۔

”ہم بھلا اس قابل کہاں کوئی ہمیں خبر دے۔“ اس نے دھاگہ انگلی میں لپیٹتے ہوئے بہت سکون سے جواب دیا۔

”ہمارا صبر مت آزماؤ۔ کیوں اپنا ٹھکانا کھونے پر تل گئی ہو؟“ وہ بمشکل خود پر قابو پارہے تھے۔

”مجھے پتا ہے۔ آپ کو حیرت ہے کہ مجھے اتنی اہم خبر کیسے مل گئی۔ چھوٹی دہن آپ کی رازدار ہیں۔ مگر جب وہ اپنے میاں

سے بات چھپا سکتی ہیں تو مجھے کیوں بتائیں گی۔ میں بھلا ان کی کیا لگتی ہوں۔ آپ ان پر شک کیجیے گا بھی نہیں۔“

”پھر۔“ وہ ضبط کی اعلیٰ حدود سے گزر رہے تھے۔

”پھر کچھ بھی نہیں۔ چائے لاؤں آپ کیلئے؟“ وہ اٹھ کر ان کے سامنے آگئی۔ سیاہ چادر کے گھونگھٹ سے اس کا صبح چہرہ

بہت تر و تازہ محسوس ہو رہا تھا۔ ہونٹ تو ہونٹ آنکھیں تک مسکرا رہی تھیں۔

”اپنے پاس رکھو اپنی خدمات۔ چند دنوں کی بات ہے پھر دیکھتے ہیں تمہیں۔“ وہ اس سے پہلے باہر نکل گئے۔

وہ باری کو بہت خوبصورت لوری سناتے ہوئے تھپک رہی تھی۔ دن بھر کے مناظر اس کی آنکھوں کے سامنے سے ایک تسلسل سے گزر رہے تھے۔ اس کے چہرے پر بلا کا سکون تھا۔ اسی دم دروازے پر دستک ہوئی اور وہ اپنے دھیان سے ہونک پڑی۔

”کروٹ لے کر دروازے کی سمت دیکھنے لگی۔ گہرے سبز کپڑوں میں فکر مندی نازنین اندر داخل ہو رہی تھی۔ وہ ایک دم اٹھ بیٹھی۔

”آپ..... مجھے بلوایا ہوتا۔“ وہ گہری نظروں سے نازنین کا چہرہ دیکھتے ہوئے بہت انجان بن کر کہہ رہی تھی۔ ”کیا فرق پڑتا ہے۔ آج کل تو تم ہم سب پر حکومت کر رہی ہو۔“ نازنین پہلی بار بہت طنزیہ انداز میں اس سے جواب ہوئی تھی۔

”خیریت؟ بہت ناراض دکھائی دے رہی ہیں۔“ وہ پھر بڑے انجان پن سے پوچھ رہی تھی۔

”خیریت کہاں..... ہم تو اس تبدیلی کا سرا ڈھونڈنے آئے ہیں جو تم میں آنا فانا آگئی ہے۔“ وہ بہت تلخ ہو رہی تھی۔

”کیوں ناراض ہیں؟ مجھ سے کوئی غلطی ہو گئی ہے۔“ وہ بڑے بھولپن سے پوچھ رہی تھی۔

”غلطی تو ہم حویلی والوں کی ہے کہ ایک کم ظرف پر اپنا خلوص نچھاور کیا۔ انسان بنیاد سے صحیح ہو تو برے ماحول میں بھی

اچھائی ڈھونڈ نکالتا ہے۔ بنیاد غلط ہو تو اچھے ماحول سے بھی کچھ نہیں لے پاتا۔“ نازنین کی برہمی بہت واضح ہو گئی۔

”آپ مجھے گالی نہ دیں۔ نکاح کیا تھا میرے باپ نے میری ماں سے اور میرے نانا نے میری نانی سے۔“

”نکاح گناہ کی طرح رات کے اند میرے میں چھپ کر ہوں تو نکاح نہیں ہوتے دل کا بہلاوا ہوتے ہیں۔“

نکاح وہی ہوتا ہے جس کی گواہی دور دراز تک پھیلے۔ ٹوہ لیتی پھرتی ہو حویلی میں۔ حویلی والوں کو آپس میں لڑانے کی کوشش کرتی ہو۔ کیا ملے گا تمہیں ایسی حرکتوں سے؟“ نازنین جیسے پھٹ ہی پڑی۔

”ہر وقت سودے بازی نہیں ہوتی۔“ وہ طنزیہ مسکرائی۔

”میری سمجھ میں نہیں آرہا۔ مجھ سے کیا حرکت ہو گئی ہے۔ آپ کیوں مجھ سے خفا ہو رہی ہیں؟“

”بنو مت۔ کیوں بدتمیزی کی تم نے تیمور سے۔ اس شخص سے جس نے تم پر احسان کی انتہا کر دی۔ ڈوب مرو کہیں شرم

سے۔“ نازنین کا غصہ واقعی بہت انتہا کو چھو رہا تھا۔

”میں غلام زادی ہوں چھوٹی دلہن۔ میری کیا مجال؟“ وہ پھر بڑے بھولپن سے گویا ہوئی۔

”ہاں تو پچھانو اپنی اوقات۔ کیوں مالکوں کے منہ لگتی ہو۔ اللہ جو کرتا ہے بہتر کرتا ہے۔ سرداروں کی اولاد تمہاری کوکھ سے پیدا نہیں ہوئی تو بہت ہی اچھا ہوا۔ تم تو کسی سردار کی ماں بن کر ہمیں نکلے سیرنچ کھاتیں۔“

”آپ گالیاں ہی دیے جائیں گی یا میرا قصور بھی بتائیں گی۔“ وہ بہت ہی اطمینان سے بول رہی تھی۔

”زیادہ انجان بننے کی ضرورت نہیں۔ مجھے صرف یہ جاننے کی بے چینی ہے کہ تم نے تیمور سے بدتمیزی کیوں کی؟“

نازنین نے اپنی پھری ہوئی سانسیں کنٹرول کیں۔ تم کون ہو ان سے سوال جواب کرنے والی؟“

مطربہ خاموشی سے باری کو تھکپنے لگی۔

”انہوں نے شادی کی ہے گناہ تو نہیں کیا۔ یہ اور بات ہے کہ انہوں نے بھی اس طرح کی شادی کی جس طرح کی

برے مانیا باپ نے کی تھی اور۔ آپ تو ایسی شادی کو مانگی ہی نہیں ہیں۔“ وہ بہت آرام سے چھریاں چلا رہی تھی۔

”نیک ہے انہوں نے شادی کی۔ تو تمہیں کیا تکلیف ہے۔ تم نے کس حیثیت سے ان سے یہ بات کی۔ تمہارے لئے

دب بھی ہے کہ تمہیں تمہارے اصل مقام پر رکھا جائے اور یہ بچہ تم ہمارے حوالے کرو۔ ہم خود پال لیں گے۔“

نازنین نے آگے بڑھ کر باری کو اٹھانا چاہا۔

”تو یوں کہیں ناں..... آپ کو خان نے اس کام کیلئے بھیجا ہے۔ حد ہو گئی۔ آخر میں نے کیا کہہ دیا۔ آخر ایک دن تو ان کی

مادی کا تباب کو لگ جائے گا اور لگنا بھی چاہیے۔ شادی کوئی بری بات تو نہیں ہے۔“

وہ نازنین کے غصے کی پرواہ کئے بغیر بہت رسائیت سے کہہ رہی تھی۔

”یہ ہمارا دوسرا ہے۔ تمہیں ہلکان ہونے کی ضرورت نہیں۔“ نازنین جیسے برس پڑی۔

”ادھر لاؤ۔ باری کو مجھے دو۔ تیمور اسے تمہارے پاس چھوڑنے پر راضی نہیں ہیں۔“ نازنین نے باری کو اٹھانے کی

کوشش کی۔

”آپ اسے نہیں لے جاسکتیں چھوٹی دلہن۔ خان سے کہہ دیجیے۔ بچہ میرے مرحوم شوہر کا ہے۔ دوست دوست ہوتا

ہے۔ اور شوہر شوہر ہوتا ہے۔ ان کا حق میرے حق سے زیادہ نہیں۔“ اس نے باری کو گود میں بھر لیا۔

”یہ ان کا حکم ہے۔“ نازنین چیخ چیخ گئی

”میں ان کی نوکر نہیں ہوں، عبدالعلی مہندی کی بیوہ ہوں۔ وہ خود ہی تو کہتے ہیں۔“ وہ ناگواری سے کہہ رہی تھی۔

”مگر تم دوسری جگہ شادی کی حامی بھر چکی ہو۔ اب تمہارا علی کی چیزوں یا اس کی اولاد پر کوئی حق نہیں ہے سمجھیں۔“

نازنین پھر گئی۔ اس سے یہ گستاخی برداشت نہیں ہو رہی تھی۔

”کس نے کہا؟“ وہ تسخرانہ انداز میں مسکرائی۔

”کیا؟“ نازنین سمجھی نہیں۔

”نیک کہ میں اس سوکھے اچھور سے شادی کی حامی بھر چکی ہوں۔“ مطربہ کا انداز خون کھولا دینے والا تھا۔

”تمہارے بڑے چکی ہو مطربہ۔ حویلی سے تمہاری چھٹی بھی ہو سکتی ہے۔“ نازنین نے دھمکی دی۔

”اے بچی چھٹی۔ چلی جاتی ہوں میں بچے کو لے کر۔“ وہ اطمینان سے گویا ہوئی۔

”بچہ بچہ کرنا چھوڑو۔ کچھ نہیں ہے اب یہ تمہارا۔ ادھر دو مجھے ورنہ تیمور خود آکر لے جائیگے اور جو تمہارا حشر ہو گا وہ علیحدہ

”میں کہیں نہیں جاؤں گی۔ جب تک یادِ خاناں مجھے کہیں جانے کو نہیں کہیں گے میں یہاں سے ایک قدم بھی نہیں

نہیں گئی۔“

”وہ بڑی بے خوفی سے گویا ہوئی۔“

”ان کا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں۔ ہم نے بابا صاحب سے بات کر لی ہے۔ جاؤ تم جا کر تیاری کرو۔ ناؤ گیٹ

ت۔“ وہ مشکل اپنے غصے پر قابو پا رہے تھے۔

”انہوں نے مجھے منع کیا ہے۔ آپ پوچھ لیں ان سے۔“ وہ نڈر انداز میں بات کر رہی تھی۔

”کیا منع کیا ہے؟“ غصے کی جگہ حیرت نے لے لی۔

”یہی کہ میں حویلی سے کہیں نہیں جاؤں گی۔ آپ پوچھ لیں ناں ان سے۔“

”کیا بدتمیزی ہے۔“ وہ مشتعل ہو گئے۔

”آؤ..... ہمارے ساتھ۔“

”تیزی سے باہر کی طرف بڑھے وہ بھی پرسکون انداز میں ان کے پیچھے چل پڑی۔“

تیور علی خان اس سے کہیں پہلے یادِ علی خان کی خواب گاہ تک پہنچ گئے تھے اور دستک دے چکے تھے۔ وہ ان سے تھوڑے

لمحے پر کھڑی ہو گئی۔

دروازہ نازنین نے کھولا تھا۔

”یادِ بھائی جاگ رہے ہیں؟“ تیور کا انداز ناراض ناراض سا تھا۔

”ہوں..... پڑھ رہے ہیں۔ البتہ میری آنکھ ابھی ابھی لگی تھی نازنین نے حیرت سے پہلے انہیں پھر مطربہ کو دیکھا۔“

”سو رہی بھائی۔ بس ایک ایمر جنسی ہے۔“ انہوں نے مہذبانہ انداز میں معذرت کی۔

”کوئی بات نہیں۔ آ جاؤ۔ مگر یہ یہاں کیا کر رہی ہے؟“

نازنین نے ناراضی نظر اس پر ڈالی۔ اور دروازے کے ایک طرف ہو گئی۔ یادِ علی خان آوازوں کے سبب دروازے

نہایت متوجہ ہو چکے تھے۔ تیور کو سامنے پا کر چونک سے گئے۔ کچھ ان کا چہرہ بھی غیر معمولی تاثرات کا حامل ہو رہا تھا۔

”نہایت مزید بڑھ گئی۔ جب مطربہ کو بھی اندر داخل ہوتے ہوئے دیکھا۔“

”نہایت؟“ انہوں نے ابھی ہوئی نگاہ سے بھائی کا چہرہ پڑھنے کی کوشش کی۔

”نہایت ہی تو نہیں ہے۔ کس عذاب کو داخل کیا تھا اماں نے حویلی میں۔“ وہ برہمی سے گویا ہوئے۔

”یادِ علی خان؟“ وہ پھر الجھے۔

”سوائے سرائے بھیج رہے ہیں۔ یہ حویلی میں پرالیم کری ایٹ کر رہی ہے۔ اپنی حیثیت بھول چکی ہے۔ محترمہ فرما رہی

ہے کہ یہ حویلی سے باہر نہیں جائیگی۔“

”محترمہ فرما رہی ہیں۔“ یادِ علی خان نے قلم میز پر رکھ دیا اور بہت آرام سے گویا ہوئے۔

“

نازنین نے شعلہ بارنگا ہوں سے اسے گھورا۔

”مجھے مت ڈرائیے۔ اب مجھے کسی بات سے ڈر نہیں لگتا۔“ وہ بے خوفی سے بولی۔

”ٹھیک ہے میں بتا دیتی ہوں تیور کو۔ وہ خود منٹ لیں گے۔“

”آپ اتنی ناراض کیوں ہو رہی ہیں۔ مجھے تو خان کی شادی کی بات کب سے پتا ہے۔ میں نے تو کسی سے نہیں کہا۔“

اگر چاہتی تو کہہ سکتی تھی۔“

وہ جان جلانے والے انداز میں کہہ رہی تھی۔ نازنین سلگ کر رہ گئی۔ چند لمحوں کے توقف کے بعد بڑی تیزی سے باہر

چلی گئی۔

مطربہ باری کو کاندھے سے لگائے بڑی عجلت میں باہر آئی اور اماں جی کے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

وہ بہت دیر اماں جی کے کمرے میں بیٹھنے کے بعد واپس اپنے کمرے میں آئی تھی اس کا خیال تھا تیور علی خان اس کی

جھاڑ جھپاڑ کرنے جلد ہی آئیگی لیکن خاصا وقت گزرنے کے بعد جب محسوس ہوا کہ وہ نہیں آئیگی تو اطمینان سے واپس کمرے

میں آ گئی تھی۔

اسی دم رو پا دیوی کمرے میں چلی آئی۔

”تیور خاناں تسانوں بلاساں۔“

”کہاں ہیں؟“ اس کا دل دھڑک اٹھا۔

”اپنے کمرے وچ۔“ وہ رو بوٹ کی طرح پیغام دے کر باہر نکل گئی۔

مطربہ نے باری پر ایک نگاہ ڈالی اور چادر اٹھا کر لپٹی اور گہری سوچ میں تیور علی خان کے کمرے میں چلی آئی۔

”جی خان۔“ اس نے دستک دے کر ان کی اجازت کا انتظار بھی نہیں کیا تھا اور فوراً ہی اندر آ گئی تھی۔

”سنو..... کیا نام ہے تمہارا۔ ہم تمہیں سرائے بھیج رہے ہیں۔ اب تم ہمیشہ وہیں رہو گی۔ تیاری کر لو۔ صبح تمہیں ڈرائیو

چھوڑ آئے گا۔ اور پھر جب تک ہم اجازت نہ دیں۔ تم دریاہستی واپس نہیں آؤ گی۔“

”میں..... میں خان؟“ وہ ایک لمحے کو چکرا کر رہ گئی۔

”ہاں صرف تم..... باری نہیں جائیگا..... وہ یہیں رہے گا۔“ وہ حتی انداز میں گویا ہوئے۔

”مگر وہ میرے بغیر نہیں رہ سکتا۔“ وہ بھی قطعی انداز میں گویا ہوئی۔

”جب وہ اپنی سگی ماں کے بغیر رہ سکتا ہے تو تمہارے بغیر بھی رہ سکتا ہے۔ اب ہم تم سے کوئی مزید بات نہیں کر

پاچے۔ تم جاسکتی ہو۔“

”وہ بہت ناراض لہجے میں ہمکلام تھے۔“

”جی؟“ تیمور علی خان تو گویا حیرت کے مارے جامد ہی ہو کر رہ گئے۔

”آپ نے سنا ناں کہ ہم نے کیا کہا“۔ انہیں یاد علی خان کا سائل یکسر بدلا ہوا لگا۔

”جی جناب..... اس لئے کہ بفضل خدا بہرہ نہیں ہوں“۔ ان کی پیشانی شکن آلود ہو گئی۔

”یاد بھائی پلیز..... آپ بہت سادہ دل انسان ہیں۔ آپ کو پتا نہیں کہ“۔

”خیر یہ تو پتا ہے کہ بہت احمق ہوں۔ بتانے کی ضرورت نہیں“۔ یاد علی خان نے خشک لہجے میں کہا۔

”پلیز یاد! آپ تیمور کی بات سنیں تو سہی“۔ نازنین کو یوں لگا کہ یاد علی نے بھائی کی جی بھر کے توہین کی ہو۔

”غالباً..... آپ کی اور تیمور کی رائے ایک ہے۔ ایک بے حیثیت سی لڑکی۔ کیا تکلیف پہنچ رہی ہے آپ کو اس سے۔

ایک کونے میں پڑی ہوئی ہے کیا کہتی ہے کسی کو؟“

ان کا انداز گفتگو بہت چبھتا ہوا تھا۔

”آپ فرصت نکالیں تو ہم بتائیں کہ مسئلہ کیا ہے“۔ نازنین نے برامان کر کہا۔

”میرے پاس واقعی فرصت نہیں ہے۔ بس اسے میری درخواست یا سفارش سمجھ لیا جائے کہ اسے کہیں نہ بھیجا جائے۔“

”یاد بھائی۔ اس نے ہماری مہربانیوں کا مطلب بہت غلط لے لیا ہے اس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو“۔

”تم نے تو اسے احسانات تلے دبا دینا چاہا تا کہ یہ تمہاری ممنون و مشکور ہو مگر بے چاری کی قسمت ہی کچھ ایسی نکلی۔“

”انہوں نے بہت مبہم سے تلخ لہجے میں تیمور علی خان کی بات کاٹ دی۔

”آپ کو اندازہ نہیں ہے یاد بھائی“۔

”ڈونٹ ڈسٹرب مور۔ پلیز“۔ یاد علی خان جھلائے۔

”آپ بھی اس لڑکی کے سامنے ہماری انسلٹ نہیں کیجیے۔ ہمیں حیرت ہے آپ ہماری بات سننے کے بجائے صرف ان

کی بات کو اہمیت دے رہے ہیں“۔ تیمور علی خان کے لہجے سے ناراضگی بہت واضح تھی۔

”بات یہ نہیں ہے۔ اصول کی بات ہے۔ کہاں تو اس پر اتنی مہربانی ہوئی۔ کہاں یہ سلوک، کیوں اتنی اہمیت دے رہے

ہو۔ یہ کہیں بھی رہے کیا فرق پڑتا ہے“۔ یاد علی خان کا لہجہ دھیمہ ہو گیا۔

”پہلے آپ تیمور کی بات تو سن لیں“۔ نازنین کو پھر مدخلت کرنا پڑی۔

”آپ سے سن لیں گے۔ ایک ہی بات ہے“۔ وہاں ہنوز ایک ضدی پن تھا۔

”یہ وہ نہیں ہے جو آپ سمجھ رہے ہیں“۔ نازنین نے زچ ہو کر کہا۔

”اور ہم بھی اتنے بے وقوف نہیں ہیں جتنا آپ لوگ سمجھ رہے ہیں“۔ یاد علی خان نے ایک کتاب اٹھا کر دنی گردانی

کرتے ہوئے خفگی بھرے لہجے میں کہا۔

”خدا نخواستہ۔ کیا ہو گیا ہے آپ کو..... پہلے تو کبھی آپ نے ایسے نہیں کیا“۔ نازنین کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔

”ضروری نہیں ہمیشہ وہی ہو جو پہلے ہوا ہو۔ یہ کہیں نہیں جائے گی۔ یہ ہرگز اتنی اہم نہیں ہے کہ ہم لوگ اپنا وقت

”نہیں۔ نازنین آل“۔

”یہ مطلب نہیں ہے یاد۔ اس کا اسٹائل آپ نے نہیں دیکھا۔ بہت گستاخ ہو گئی ہے۔ چند دنوں بعد ہی سب کیلئے

”نہیں۔ نازنین آل“۔

”چند دنوں بعد ناں؟ دیکھ لیں گے“۔ یاد علی خان نے نازنین کی بات کاٹ کر بے نیازی سے کہا۔

”بس جو تیمور کر رہے ہیں وہ کرنے دیں۔ میں کہہ رہی ہوں ناں آپ سے؟“ نازنین ہار نہیں مان رہی تھی۔

”تبدیلی ہی ضروری ہے تو پھر آپ کراچی چلی جائیں۔ ہماری طرف سے اجازت ہے“۔ وہاں سے پھر بے نیازی سے

”دب ظاہر“۔

”یاد آپ اس طرح میری انسلٹ نہیں کر سکتے“۔ نازنین کی آواز بھرا گئی۔

”یاد ناں..... یہ لوگ مجھ سے بچہ بھی چھین رہے ہیں“۔ مطربہ نے اتنی دیر میں پہلی مرتبہ زبان کھولی تھی۔

”صد ہوئی ظلم کی۔ یہ بچے کے قاتل نہیں تھی تو پہلے اس پر مہربانی کرنے کی کیا ضرورت تھی؟“ یاد علی خان کی پیشانی پر

”نہیں۔ نازنین آل“۔

”دیکھیں یاد بھائی آپ کو اس طرح نہیں کرنا چاہیے۔ بھابی کا خیال کیجیے“۔ تیمور علی خان ضبط کے کڑے مرحلوں سے

”نہیں۔ نازنین آل“۔

”تم ان کا خیال کر سکتے ہو۔ اجازت ہے“۔ وہ سابقہ انداز میں بولے۔

”یہ آج کیا ہو گیا ہے؟“ نازنین پر حیرت کا دورہ پڑنے لگا۔

”آج ہوا نہیں۔ اظہار ہوا ہے۔ اس سے پہلے آپ کی اتنی واضح یک جہتی بھی تو دیکھنے میں نہیں آئی“۔

”مزید بات کرنے کا کوئی فائدہ نہیں بھابی۔ ہم بابا صاحب سے بات کر لیں گے“۔

تیمور علی خان ناراضگی سے کہتے ہوئے پلٹے۔

”مطربہ کے موضوع پر ان سے بات کرنے کی ضرورت نہیں۔ تم اپنی بھابی کے کراچی جانے کا انتظام کرو۔ جب کسی

”نہیں۔ نازنین آل“۔

ایک ٹائپ کو نازنین ششدر سی ان کی صورت دیکھتی رہ گئی۔

تیمور علی خان بھی ٹھٹھک کر رک گئے۔

”ہم کسی کی نمک حرامی کی وجہ سے بھابی کے ساتھ یہ زیادتی نہیں ہونے دینگے“۔

”بٹ لاسٹ یو..... آئی مین آل آف یو“۔

”نہیں۔ نازنین آل“۔

نہیں ہم بخود کھڑے رہ گئے۔ شادی کے بعد پہلی مرتبہ نازنین نے ان کی اتنی بلند آواز سنی تھی۔ تھرا کر رہ گئی۔

”یاد ہو گیا ہے یاد آپ کو“۔ وہ بہت ہمت کر کے آگے بڑھی۔

یاور علی خان نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بس گہری گہری سانسیں لینے لگے۔

”بھابی..... فی الحال اسے کہیں اپنی شکل گم کر لے۔ جی تو چاہ رہا ہے اس شکل پر تیزاب پھینک دیں۔“ تیمور علی خان نے انتہائی نفرت سے کہا۔

مطربہ نے نازنین کو بولنے کی زحمت نہیں دی اور تیزی سے چلتی ہوئی باہر نکل گئی۔

”دکھ اٹھاؤ تیمور علی خان..... انسان کو دکھ بھی اٹھالینا چاہیں۔ کوئی ہرج نہیں۔“ کس درجہ سفاکی اتر چکی تھی اس نے اندر۔ جیسے اس کا ذہنی توازن بگڑ چکا ہو۔

”دکھ دینے اور دکھسنے میں کیا فرق ہوتا ہے بندہ بشر کو جاننا چاہیے۔“

وہ بڑے نڈر انداز میں سوچتی ہوئی اپنے ٹھکانے کی طرف بڑھ رہی تھی۔

”بچہ چھین سکتے ہیں؟ اسے تو میں تمہاری طرف کا جرمانہ سمجھتی ہوں۔ میرے دکھوں کا حساب ہوگا اس کے ذریعے۔“

نازنین تیمور کے پیچھے پیچھے نکل آئی تھی۔

”تیمور کیا ہو گیا ہے انہیں؟“ وہ روہانسی آواز میں کہہ رہی تھی۔

”کچھ نہیں بھابی! ہم سب نے زبردست دھوکا کھایا ہے۔“ وہ درحقیقت بہت پریشان تھے۔

”کیسا دھوکا؟“ وہ حیران ہوئی۔

”یہ لڑکی بہت ہوشیار نکلی ہے سب اسے بہت انوسینٹ سمجھ رہے تھے۔“ وہ فکرمندی سے گویا ہوئے۔

”یاد اس کو اتنا سپورٹ کیوں کر رہے ہیں؟ وہ تو اس سے بات بھی نہیں کرتے تھے۔“ وہ عجیب سے اندیشوں میں گم ہوئی تھی۔

”پریشان نہ ہوں۔ پینڈل کر لیں گے۔“ وہ جیسے اس کے دل کی بات سمجھ رہے تھے۔

”کس قدر تو ہیں کی ہے انہوں نے میری بھی اور تمہاری بھی۔ مگر میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا وہ ایسے کیوں ہو رہے ہیں۔ مجھ سے کیا غلطی ہو گئی ہے؟“ وہ بھرائی ہوئی آواز میں کہہ رہی تھی۔

”تیمور..... کبجٹ حسین بھی تو بہت ہے۔“ نازنین اندیشوں سے باہر نہیں آ رہی تھی۔

”بھابی! کیا سوچنے لگی ہیں؟ یاد اور بھائی ایسے نہیں ہیں۔ ڈزن میٹر۔“ وہ بھابھ کی دل جوئی کرنے لگے۔

”اماں جی کا اندازہ غلط ہے تیمور۔ یہ شادی پر ابھی بھی رضامند نہیں ہے۔ مجھ سے اس نے خود کہا۔ کیا مطلب ہوا پھر اس کا؟“ وہ گھبرا کر پوچھ رہی تھی۔

”کچھ مطلب نہیں ہے۔ بات کچھ اور ہے۔ ہم یاد اور بھائی کو جانتے ہیں۔ وہ اس طرح کی کوئی حرکت نہیں کر سکتے۔ ایک دم جاہل گنوار ان پڑھ لڑکی۔ یاد اور بھائی اس طرح کی کمپنی کبھی نہیں پسند کر سکتے۔ صرف حسن سے کیا ہوتا ہے؟“ وہ سمجھانے کے انداز میں کہہ رہے تھے۔

”مگر ہم نہیں مجھے کیوں ڈر لگ رہا ہے۔ پہلی فرصت میں بات بابا صاحب تک پہنچائیں تاکہ معاملہ کھلے۔“ وہ بہت

پیشانی پر ہاتھ رکھ کر کہتی تھی۔ ہم بھی سوچ رہے ہیں۔ اب اس کی حرکتیں بڑوں سے چھپانا بہت ہی حماقت ہوگی۔“

”میرا تو سر پھٹ جائیگا۔ یاد رہے کبھی اس طرح نہیں کیا۔“ وہ بولی۔

”چپ چل جائے گا وہ ایسا کیوں کر رہے ہیں۔“

”ایسا کریں پہلی فرصت میں اپنی شادی ڈیکلئر کر دیں اس طرح اس کی بلیک میلنگ سے تو نجات ملے گی۔ پھر دیکھ لیں۔“ وہ جلد بازی کے انداز میں گویا ہوئی۔

”ہماری شادی کا اس معاملے سے تو بظاہر کوئی تعلق نظر نہیں آتا۔ مگر چلیں یہ بھی کر لیتے ہیں۔ کچھ دن بعد نہ سہی۔ آج ہی“ انہوں نے گویا نازنین سے اتفاق کر لیا۔

”ہمیں بس اماں جی کا خیال تھا۔ باقی تو آسانی سے پینڈل کیا جاسکتا ہے۔“ وہ سوچتے ہوئے بولے۔

”آخر ایک دن تو اماں جی کو پتا چلنا ہی ہے۔ بس دیر نہ کریں۔ میں زیادہ دیر یاد رکھ کر یہ رویہ برداشت نہیں کر سکتی۔“ وہ اپنی ہوئی۔

”بھابی۔ اپس اینڈ ڈاؤن..... یہ تو زندگی میں آ ہی جاتے ہیں۔ سب ٹھیک ہو جائیگا۔“ وہ تسلی دے رہے تھے۔

”آمین..... خدا کرے۔“ وہ بے ساختہ بولی۔

”اچھا۔ اب آپ اپنے کمرے میں جائیں۔ اور ریلیکس ہونے کی ٹرائی کریں۔“ انہوں نے نرمی سے اسے مشورہ دیا۔

”مجھے تو ڈر لگ رہا ہے یاد رہے۔ پھر کوئی بات نہ ہو جائے۔“ وہ واقعی خوفزدہ تھی۔

”اول..... ہوں..... کچھ نہیں ہوگا۔ آپ فکر نہ کریں۔ کوئی مسئلہ ہو تو ہم حاضر ہیں۔ آپ اکیلی تو نہیں ہیں۔“ وہ اس کو مطمئن کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

نازنین نے چند لمحوں پر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ کمرے میں داخل ہوئی تو یاد اور علی خان سوئی ہوئی حالت میں لٹائے۔ اس نے سکون کا گہرا سانس لیا۔

اماں جی بہت فکرمندی بابا صاحب کے کمرے میں داخل ہوئی تھیں۔

یاد اور علی خان باپ کے پہلو میں اخبار کھولے بیٹھے تھے۔ دلاور علی خان اپنی چھڑی سے قالین کرید رہے تھے۔

”کی؟ خیر تو ہے۔ اتنی صبح صبح مجھے کیوں بلایا؟“ وہ ان کے سامنے صوفے پر بیٹھ گئیں۔

”ناظروری کام پڑ گیا ہے آپ سے۔“

”میں آواز میں بات کر رہے تھے۔ پیشانی پر شکنوں کا جال بن گیا تھا۔ ایک دکھ کا تاثر چہرے سے واضح تھا۔

”کی..... کی..... نہ جانے کیوں ان کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔“

”آپ..... آپ نے چھوٹی دہن کو یاد کیلئے پسند کیا تھا۔ کیا بات اچھی لگی تھی آپ کو؟“
وہ کچھ سوچتے ہوئے مخاطب تھے۔

”جی..... کیا مطلب؟ یہ کیا سوال ہوا۔ ساری دنیا میں مائیں بہویں پسند کرتی ہیں۔ میں نے کون سا لکھا کام کیا تھا؟“
وہ بہت ہی حیرت سے شوہر کو دیکھ رہی تھیں۔

”یقیناً آپ ان کے حسن و جمال سے متاثر ہوئی ہوں گی۔“ وہ جیسے خود ہی کسی نتیجے پر پہنچ گئے۔

”یہ کیا بات ہوئی۔ حسن و جمال زیتون بالو کا کیا کم ہے؟ صرف حسن دیکھ کر اتنے بڑے فیصلے نہیں ہوتے۔ ماشاء اللہ انگریزی پڑھی ہوئی ہے اور خاندان بہت اچھا ہے۔ پشتوں سے کھاتے پیتے لوگ ہیں۔ ان کی ماں بہت وضع دار عورت ہیں۔ یوگنڈا جانے سے پہلے وہ ہمارے ہاں آکر رہیں۔ آپ سے بھی بات چیت رہی۔ اب تک تو ان سے آپ کی بس سلام دعا ہی ہوئی تھی۔ آپ نے نہیں دیکھا کتنی عقل مند اور طریقے کی عورت ہیں۔ اور شادی کے اتنے دنوں بعد بھلا کون سوچا نے کی جھان پھٹ کر رہا ہے۔ یہ آپ کو کیا سوچھی؟“ ان کی حیرت سواتھی۔

”خاندان تو خیر بہت اچھا ہے یہ تو ہم بھی جانتے ہیں۔“ وہ کچھ کہتے کہتے رک گئے۔

”یہ بتائیے۔ کیا وہ مطربہ کو پسند نہیں کرتیں؟“ انہوں نے بالکل ہی مختلف سوال کر دیا۔

اماں جی ہکا بکا ان کی صورت دیکھنے لگیں۔ ”کیا مطلب؟ ایسی تو کوئی بات نہیں۔ مطربہ تو ناز سے بہت مت کرتی ہے۔ اس کے کام اپنے ہاتھ سے کرتی ہے۔ اس کا بس چلے تو وہ دہن کے بال بال موتی پر وئے۔“ انہوں نے دھڑکنے لگا۔
”پتا نہیں آپ کون سی دنیا میں رہتی ہیں؟ اتنی محبت ہے۔ جب ہی اس کا وجود حویلی میں برداشت نہیں۔“ وہ قدرے ناراض ہوئے۔

”ہیں؟“ وہ پھر دھک سے رہ گئیں۔ ”نہیں نہیں ایسا نہیں ہے۔ آپ لوگوں کو غلط فہمی ہو گئی ہے۔“ انہوں نے باری باری بیٹے اور شوہر کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”اور بھلا مطربہ سے کسی کو کیا بیر۔ نہ تین میں نہ تیرہ میں۔ حد ہو گئی۔“ انہوں نے پیشانی پر ہاتھ مارا۔
”ہوا کیا ہے؟ کبھی آپ چھوٹی دہن کی بات کرتے ہیں۔ کبھی زیتون بالو کی۔ سیدھی سیدھی بات بتائیں مجھے۔“
پریشانی چھپانے پائیں۔

”بقول آپ کے وہ چھوٹی دہن سے بہت محبت کرتی ہے۔ پھر چھوٹی دہن اس کی دشمن کیوں ہو رہی ہیں؟“ بابا صاحب نے دریافت کیا۔

”کیا دشمنی ہو گئی ہے۔ کل دوپہر تو وہ ناز کے بالوں میں تیل ڈال رہی تھی۔ دونوں ہنسی خوشی باتیں کر رہی تھیں۔“ اماں جی کا حیرت سے برا حال تھا۔

”کل دوپہر کی نہیں کافی دن پہلے کی بات ہوگی۔ آپ شاید بھول رہی ہو ریسہ کی ماں۔“

”سیدھے سیدھے کہیں سھلیا گئی ہوں۔“ اماں جی برا مان گئیں۔

”جی! اگر ایسی بات ہے تو وہ اسے حویلی سے نکالنے پر اصرار کیوں کر رہی ہیں۔“ انہوں نے بالآخر اصل معاملہ سامنے

”ہیں! وہ پھر سچا کہیں۔“ ایسی کوئی بات نہیں ہوئی کہ نبوت یہاں تک پہنچے۔ لو بھلا بتاؤ۔“ وہ بڑبڑائیں۔
”صرف نکال ہی نہیں رہیں۔ بچہ اس سے لے رہی ہیں؟“ بابا صاحب نے مزید انکشاف کیا۔

”بچہ تو اس کے مرد کا ہے کوئی کیسے لے سکتا ہے اور بچے سے اسے کیا لچکی۔ اس کا اپنا بچہ اس کی گود میں کھیل رہا ہے۔“
”ان کی حیرت بڑھتی ہی جا رہی تھی۔

”ہم نے آپ کو اس لئے بلایا تھا کہ آپ سے ضروری معلومات حاصل کریں گے۔ مگر یہاں تو بے خبری ہی بے خبری ہے۔“
”وہ کسی دھیمان میں گم کھڑے تھے۔

”یاد رہے..... کیا بات ہو گئی ہے۔ تمہارے بابا صاحب تو مجھے الجھا رہے ہیں۔ میرا دل یوں بھی بہت کمزور ہے۔“ وہ
بازار خان کی طرف متوجہ ہوئیں۔

”بابا صاحب کو سب علم ہے یہی آپ کو بتائیں گے ای جی۔ میرا تو اپنا دماغ پھٹنے کو ہے۔“ ان کی آواز سے شعلی ظاہر
نہی۔

”ہیں۔“ اماں جی دہل کر رہ گئیں۔

ان کا دل خوفناک اندیشوں سے سوکھے پتے کی طرح کانپنے لگا۔ یاد علی خان کی ٹوٹ پھوٹ ان کے ایک ایک غلبے
نماز گئی تھی۔

”تیور اور چھوٹی دہن کسی قیمت پر بھی مطربہ کو حویلی میں رکھنے پر تیار نہیں ہیں۔ ان کا بس چلے تو وہ ابھی اس کا ہاتھ پکڑ کر
حویلی سے باہر کر دیں۔“

”ہیں..... اب تیور بھی آگیا سچ میں۔“ اماں جی نے بابا صاحب کا جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی بے تابی سے کہا۔
”کیا بات آپ کو سمجھانا چاہ رہے ہیں کہ بات کچھ اور ہو گئی ہے۔ ان دونوں کو مطربہ کا وجود حویلی میں گوارا نہیں ہے۔ یہ
بات البتہ کچھ میں نہیں آ رہی کہ وہ بچہ اس سے کیوں لینا چاہ رہے ہیں۔“ بابا صاحب نے بتایا۔

”دوسری بات..... یاد رکھ رہا ہے اب وہ حویلی میں نہیں رہ سکتا۔“ انہوں نے بہت دھکی انداز میں اماں جی کو مطلع کیا۔
اماں جی حیران پریشان دلاور علی خان کی شکل دیکھ رہی تھیں۔ استغواب اتنا عادی تھا کہ وہ کچھ بولنے کے قابل نہ رہی
میں۔

”آپ مطربہ کو بلاؤ..... اپنے اکیلے میں..... اس سے بات کرو پوچھو حقیقت کیا ہے اس لئے کہ جو کچھ ہم نے سنا
ہے ہم اس کا یقین نہیں کر پارہے اور خدا کرے جو سنا ہے وہ غلط ہو۔“

”بیٹے..... دہن انگریزی پڑھی ہوئی ہے۔ تھوڑی آزاد خیال ہے۔ طبعیت میں ذرا غفلت اور لا پرواہی ہے۔ تم اتنا
اگے باکڑے سوچو۔“

دلاور علی خان نے یادور علی خان کے شانے پر ہاتھ رکھ کر بہت شفیق لہجے میں کہا۔

”میں قیامت تک اس طرح کی کسی بات کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ مگر بابا صاحب مطربہ جیسی بے وقوف اور بزدل لڑکی ان دونوں کے سامنے اپنی کئی ہوئی بات دہرانے کو تیار ہے۔ اس کا کیا مطلب ہوا؟ وہ بے وقوف ہے مگر اتنی نہیں کہ اسے اندازہ نہ ہو۔ وہ کیا کہہ گئی ہے اور بات غلط ثابت ہونے پر آپ کے ہاتھوں اس کا کیا حشر ہو سکتا ہے۔ آپ اس پوائنٹ پر غور کریں۔“ یادور علی خان نے تھکے تھکے انداز میں سمجھانے کی کوشش کی۔

”اسی بات نے ہمیں بے حد پریشان کر دیا ہے۔ وہ ہمارے ہوئے انداز میں گویا ہوئے۔“

”اماں جی!“ نہایت سہجے ہوئے انداز میں دونوں کو دیکھ رہی تھیں ان کا وجدان کسی بہت بڑے خطرے کی گھنٹی بجا رہا تھا۔ جس کے سبب ان کی قوت گویائی سب ہو کر رہ گئی تھی۔

”اب یہی ہے کہ تمہاری اماں مطربہ سے تنہائی میں حقیقت معلوم کرنے کی کوشش کریں۔ اس کے بعد ہی سوچا جاسکتا ہے کہ آگے کیا کرنا چاہیے۔“

”کیا پوچھنا ہے زیتون بانو سے؟“ اماں جی کی آواز کانپ رہی تھی۔

”یہی کہ وہ بات جو اسے آپ سے کرنا چاہیے تھی اس نے یادور سے کیوں کی؟ کیوں اسے پریشان کیا؟ ہو سکتا ہے جو کہ اس نے سمجھا وہ صرف اسی کی احمقانہ سوچ ہو۔“

طوفان سر پر پہنچا ہوا محسوس ہو رہا ہو تو پھر دعا طوفان ہلنے والے کسی معجزے کی ہوتی ہے۔ معجزہ بھی وہ جو اگلے ہی لمحے ہو۔ اب خان دلاور علی خان معجزے کے مرحلے پر آگئے تھے۔ انہیں اب صرف معجزہ چاہیے تھا۔ ایسے میں خود فریبی ہی پہلا مرحلہ ہوتی ہے معجزے کا۔

”کیا بات کی اس نے یادور سے؟“ اماں جی کی معصوم آنکھوں سے خوف اور تشویش برسنے لگی۔

حالانکہ وہ بات جو ان تک پہنچنے والی تھی اس نوعیت کا خیال تو انہیں بہت گہرائی میں جا کر بھی نہ آسکتا تھا۔ ان کا دھیان کسی اور ہی سنگین قسم کے جرم کی طرف آ رہا تھا۔

”یہی کہ تازہ یادور کے ساتھ خوش نہیں ہے اور تیمور۔“

”ارے۔ آسان پھٹ جائیگا۔ کچھ خوف خدا کریں۔“

ان کی حیات تو اتنی چوکس تھیں کہ ادھوری بات سے انہوں نے پوری کہانی اخذ کر لی۔

”لا حول ولا قوت۔ میں مری نہیں حیرت ہے زندہ ہوں۔۔۔۔۔ ارے میرے اللہ۔“ وہ ایک طرف ڈھلک گئیں۔ دونوں

باپ بیٹے ان کی طرف تیزی سے بڑھے۔

”یادور! اپنی اماں کو بستر پر لٹاؤ۔“ دلاور علی خان نے ملازم کو بلانے کیلئے گھنٹی بجائی۔

”یہی خطرہ تھا ہمیں۔“ وہ کہہ رہے تھے۔

”یادور! تمہاری اماں کا دل بہت کمزور ہے بیٹے۔“ وہ دکھ سے گویا ہوئے۔

”مجھے اسی بات کا تو خطرہ تھا۔ بابا صاحب۔ اسی لئے تو آپ سے کہا تھا مجھے خاموشی سے خدا حافظ کہہ دیں۔“ وہ کہتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔

”مگر ایسے کیسے کہہ دیں۔ تم اولاد ہو ہماری۔ پہتا ہوا کپڑا تو نہیں۔“

وہ اماں جی کے منہ پر پانی کے چھپٹے مارتے ہوئے کہہ رہے تھے۔ یادور علی خان ماں کے تلوے سہلا رہے تھے۔ چند لمحوں بعد روپا دیوی کمرے میں داخل ہوئی۔

”روپا! بڑی دلہن کو بلاؤ۔ اور ایک گلاس پانی گلو کوڑ ملا کر لاؤ۔“ دلاور علی خان نے فوراً حکم دے کر اسے اپنے پاؤں

روانہ کیا۔

مطربہ سوپ لئے دبے پاؤں کمرے میں داخل ہوئی۔ مگر قدم ایک دم من من بھر کے ہو گئے۔ سامنے ہی تیمور علی خان

ماں کے بالکل قریب بیٹھے تھے۔ انہوں نے دروازے کھلتے ہوئے دیکھا پھر مطربہ کو اندر آتے ہوئے۔

وہ بڑے تپائی پر رکھ کر اماں جی کو بغور دیکھنے لگی کہ آیا جاگ رہی ہیں یا سو رہی ہیں۔ تیمور علی خان نے کوئی رد عمل ظاہر نہیں

کیا۔ خاموش بیٹھے اماں کا ہاتھ سہلاتے رہے۔

”اماں جی! آپ جاگ رہی ہیں؟“ اس نے براہ راست اماں جی کو مخاطب کیا۔ تیمور علی خان کو مخاطب کرنے کی جرات نہیں ہوئی تھی۔

”کون؟ زیتون بانو؟“ اماں جی نے آنکھیں کھول دیں۔

”جی۔۔۔۔۔ سوپ بنایا ہے بڑی بیگم نے آپ کیلئے۔“ وہ دھیمی آواز میں کہنے لگی۔

”لے جا اپنا سوپ دوپ۔ میرا جی نہیں کر رہا کسی چیز کو۔“ وہ بے زاری سے گویا ہوئیں۔

”تموڑا سالے لیں۔۔۔۔۔ آپ نے دوپہر کو کھانا بھی نہیں کھایا۔ مرغی کا سوپ ہے۔“ وہ اصرار کے انداز میں گویا ہوئی۔

”مرغی کا ہو یا اونٹ کا۔ کہہ دیا ناں۔ میرا دل نہیں کر رہا۔ لے جا یہاں سے۔“ وہ اسی سابقہ بیزار کن انداز میں گویا ہوئیں۔

”لے لیجئے اماں جی۔۔۔۔۔ کمزوری بڑھ جائے گی۔ پلیز۔“ تیمور علی خان نے بہت خوشامد انداز میں کہا۔

”یا تو آپ پریشانی بندھیے یا سوپ لے لیجیے۔ پتا تو چلے ناں آپ کیوں پریشان ہیں۔“ تیمور علی خان نے محبت سے ماں کا ہاتھ دبایا۔

”کچھ نہیں۔ جاؤ تم بھی اپنا کام کرو۔ میں ٹھیک ہوں۔“ انہوں نے بے زاری سے جواب دیا۔

”ایسے کیسے چلے جائیں۔ اتنی دیر سے پوچھ رہے ہیں کہ آپ کو کیا پریشانی ہے۔ آپ بتائیں گی تو دور کرنے کی کوشش کریں گے۔“

وہ بھلا باز آنے والے تھے۔ وہ خاموشی سے گہری سانسیں لینے لگیں۔

”مجھ سے زیادتی برداشت نہیں ہوتی تیمور۔ تم اس بے آسرا بچی کو کیوں پریشان کر رہے ہو۔ کیوں نکال رہے ہو۔“

حویلی سے۔۔۔ وہ جیسے پھٹ پڑیں۔

”کال تو نہیں رہے۔ سرائے بھیج رہے ہیں۔ یہ آہستہ آہستہ مسئلہ بن رہی ہے۔ اب آپ کو کیا بتائیں اور کیا نہ بتائیں۔“

”اس کی جگہ کوئی اور انسان ہوتا تو وہ ہمارے لئے نعمت بن جاتا۔ ہمیں بھی سکون پہنچاتا اور خود بھی سکون سے رہتا۔ مگر اسے مہربانیاں راس نہیں آئیں۔ ہم تو لندن چلے جائیگے۔ مگر پھر یہ آپ کیلئے مسئلہ بن جائیگی۔ اماں جی آپ نے جو مہربانی اس کے ساتھ کی۔ ہم سب کو ہنگی پڑ رہی ہے۔ یہ اپنا آپ بھول بیٹھی ہے۔ برابری کرنے لگی ہے۔ ٹھیک ہے ہم ہی اسے برابر لے آئے تھے۔ مگر کچھ اس کو بھی تو سوچنا چاہیے۔ آپ نے اس کی گستاخی دراصل دیکھی نہیں ہے۔“

”ارے ایک کونے میں پڑی ہوئی ہے کیا کہہ رہی ہے کسی کو۔“ اماں جی نے ان کی بات کاٹ دی۔

”کاش ایک کونے میں پڑی رہنے والی ہوتی۔ حویلی کے معاملات میں مداخلت کرنے لگی ہے۔ یہ ہم برداشت نہیں کر سکتے۔“

☆.....☆.....☆.....☆.....☆

تیور علی خان ماں کی حالت کے پیش نظر اٹھ کر تو آگئے تھے مگر بہت الجھ گئے تھے۔ پتا نہیں انہیں کیوں محسوس ہو رہا تھا کہ اس پر وہ کوئی بڑا طوفان متحرک ہے جو سامنے آنے ہی والا ہے۔

وہ پھر بے کل انداز میں ماں کے پاس دوبارہ آگئے تھے۔ یہ ان کیلئے مزید بہتر ہوا کہ وہاں مطربہ نہیں تھی۔

اماں جی آنکھیں موندے لیٹی تھیں وہ خاموش انداز میں ان کے قریب بڑی کرسی پر آکر بیٹھ گئے تھے۔

”میرا بیٹا ایسا نہیں ہو سکتا۔ ہمارے ہاں تو کئی بھی سرزحاک کر پھرتی ہیں۔ اور بڑی آبرو کے ساتھ بیاہی جاتی ہیں۔“ وہ بے اختیار بڑبڑا رہی تھیں۔

”میرے اللہ تو مان رکھ لے میرا۔ میری عزت رکھ لے۔“ وہ پھر بڑبڑا گئیں۔

تیور علی خان بری طرح چومک پڑے۔ جانے کیا کیا ان پر الہام ہونے لگا۔ پھر کسی یوسف کا دامن پیچھے سے پھنسا ہے؟ نہایت مضبوط اعصاب ہونے کے باوجود ان کی نگاہوں کے سامنے تاریکی چھانے لگی۔ ان کی آنکھیں کھلیں۔

وہ حق جامل لڑکی۔ اتنا نہیں مگر سکتی۔ لیکن کیا پتا مرگئی ہو؟ رات کی تاریکی میں چھپ کر کسی سوگند سے نکاح کرنے والا ایسا روشن ضمیر ہوتا تو نکاح روشنیوں میں ہوتا۔

بڑوں ماں بیٹے اپنی اپنی خاموشی میں کچھ ڈھونڈنے لگے تھے۔ دونوں کو ادراک ہوا تھا کہ بات وہ ہے جو سمجھی جا چکی ہے۔
 ہر دہائی وہ ہے جو سمجھائی جا چکی ہے۔ بلکہ بات تو وہ ہے جنوک زبان پر آنا ہر طرف کسی مرحلے سے کم نہیں۔
 دیکھو خوشی دونوں کیفیات ان محنت موثر رکھتی ہے ان کی لاتعداد منزلیں مقرر ہیں۔ مرحلے متعین ہیں۔
 دونوں ماں بیٹے۔ اس وقت دو علیحدہ علیحدہ کیفیات سے گزر رہے تھے۔

اماں جی کی حیرت تکلیف دہ الجھن میں تبدیل ہو چکی تھی۔
 "ہم تپ سے پوچھ رہے ہیں اماں جی کہ ناز بھابی کا اس قے سے کیا تعلق؟ ہم تو اس بے حس و بے ضمیر لڑکی کا ذکر کر رہے ہیں جس نے ہمیں آپ کی نظروں سے گرانے کی کوشش کی ہے۔ پھر یہ بھادو جوں کا یاد یور بھابی کے رشتے کا ذکر درمیان میں کہاں سے آگیا؟"

ارنچے چوڑے تیمور علی خان کے سینے میں ایک ذرا سے دل نے تباہی مچا رکھی تھی۔ وہ بات جو سمجھ میں آرہی تھی اتنی
 ذہناک تھی کہ اس وقت انہیں اعلیٰ درجے کی معجزاتی امداد درکار تھی جو انہیں کسی انتہائی اقدام سے باز رکھ سکے۔
 "آپ چپ کیوں ہیں اماں جی؟ ایک بات بتادیں، ہم آپ کو اگر ہم اس کے سوکڑے یاور بھائی کے سامنے نہ کریں تو
 پھر کیسے گا۔"

وہ مٹھیاں پیچنے اٹھ کھڑے ہوئے۔

"اتنی اہم اس کم ظرف کی۔ ابھی نمٹتے ہیں۔"

اماں جی روکتی رہ گئیں مگر وہ باہر نکل گئے تھے۔

سامنے ہی ماما ملی آگئی تھی

"ماما! مگر یہ کہاں ہے؟"

سنا ہے جب انسان پر خون سوار ہوتا ہے تو اس کے خون سے بھاپ اٹھ رہی ہوتی ہے۔ ماما کو ان کے وجود سے کچے
 گوشت کی بو آنے لگی۔ کہ ان کی آنکھیں اندر کا بھید بتا رہی تھیں۔
 ماما تو قمر قمر کا بیٹا ہے۔

"خ.....خ.....خان۔ ابھی تو یہیں تھیں۔ باورچی خانے میں۔ نہیں نہیں اپنے کمرے میں میں نہیں وہ ادھر باغ
 میں۔ ماما کی بدحواسی نے گویا جلتی پرتیل کا کام کیا۔"

"ماما! ہمیں ٹھیک جگہ بتاؤ ورنہ ہم تمہیں شوٹ کر دیں گے۔"

ان کی غراہٹ بتا رہی تھی کہ بشریت کے دائرے سے نکل کر اتنی دور آگئے ہیں کہ انہیں واپس لوٹانے کی کوشش میں اعلیٰ
 درجے کی ناکامی ہوگی۔

"اکی دم اماں جی بھی ہانپتی کانپتی چلی آئی تھی۔"

"اسے میرے بچے میری بات تو سن..... تو نے بات تو سنی نہیں۔" وہ یوں چکارنے لگیں جیسے چھوٹے بچے کو بہلاتے

خان کا غدی صوب سے کیا ہوتا ہے۔ کہہ تو دیا سر کاٹنے والے نے کہ تقویٰ سے بلند کوئی نسب نہیں۔ آ تو گئی ہے وضاحت
 ۱۰۔ کی ماری خطبہ حجتہ الوداع میں۔ یہ ہم زنگ کھائے ہوئے انسان ابھی تک نسب کی حقیقت سمجھ ہی نہیں پا رہے۔
 تو یہ بات ہے۔ اگر یہ بات ہے تو پھر کارروائی کا آغاز کس سے ہونا چاہیے۔ ہم نہیں چھوڑیں گے اسے۔ ان کی آنکھوں
 سے لہو پھٹنے لگا۔

"اماں جی! ہم خاصے آزاد خیال، تھوڑے سے نافرمان اپنے حقوق کی حفاظت کرنے کے معاملے میں تھوڑے سے
 لچک اور سنگدل ضرور ہیں۔ مگر اس درجہ کہنے اور گھٹیا نہیں ہیں۔"

وہ خود پر کنٹرول کھوپچے تھے اور کچھ اس بات کی بھی جلدی تھی کہ ماں کو تکلیف دہ کٹکٹش سے نجات دلا دیں۔ جس کے
 سبب ان کی جان پر بنی ہوئی ہے۔ انہوں نے بے اختیار ماں کا ہاتھ تمام لیا تھا۔ ان کی آواز شدت جذبات سے لرز رہی تھی۔
 اماں جی نے چونک کر آنکھیں کھول دی تھیں۔ تیمور کے جملے نے انہیں تڑپا کر رکھ دیا تھا۔

"ہاں، مجھے یقین ہے میرا بیٹا ایسا نہیں ہو سکتا۔" اماں جی کی آنکھوں میں نئے سرے سے جھلکا ہٹ آگئی۔

"جب آپ کو یقین ہے تو پھر آپ کی یہ حالت کیوں ہوئی؟" تیمور علی خان کے انداز میں شکوہ تھا۔

"یہ تو اس بات کا صدمہ ہے کہ میرے گھر میں اس طرح کی بات ہوئی کیوں۔ غلط خواہ صحیح۔ ہمارے ہاں ایسی بات کا
 بھی بھی تصور نہیں کیا جاسکتا۔"

اماں جی میں نئے سرے سے توانائی آتی محسوس ہو رہی تھی۔

"تو پھر جھگڑا کیا ہے۔ جب کوئی بات ہی نہیں ہے۔ پڑی ہوئی ہے ایک طرف تمہارا کیا لٹنی ہے بیٹے۔ چھوڑ دو اسے
 لے حال پر۔"

وہ تیمور علی خان سے گویا سفارش کر رہی تھیں۔

"حد ہوگئی اماں جی..... ابھی بھی آپ کی اس کی سفارش کر رہی ہیں۔ اب تو آپ کو چاہیے کہ پہلی فرمت میں اسے
 یہاں سے شفٹ کر دیں تاکہ آئندہ اس قسم کا کوئی مسئلہ دوبارہ سر نہ اٹھا سکے۔ اتنی گھٹیا الزام تراشی وہ بھی ہم پر۔ فحش اور دکھ کی
 ملی جلی کیفیت تھی اس وقت ان کی۔"

"کم عقل ہے..... سمجھا دوں گی اسے۔ بے سہارا بچی ہے۔ اسے بھرے کنبوں میں رہنے کا تجربہ بھی نہیں اور رشتوں کی
 نزاکتوں تک اس کے دماغ کی پہنچ نہیں۔ جانے کس بات کو کس رنگ میں لے بیٹھے۔"

"میں تمہارے بابا صاحب کو یہی سمجھانا چاہ رہی تھی کہ اس طرح غصے اور تیزی میں نہیں سوچیں۔ میرا تیمور اپنی بھادو جوں
 کی جتنی عزت کرتا ہے شاید ہی کسی دیور نے کبھی کی ہو۔ نہ ہی نازنین کوئی ایسے گھرے پڑے گھر کی ہے جہاں گدھے گھوڑے
 ایک ہو رہے ہوں۔"

"یہ ناز بھابی کا اس قے میں کیا ذکر؟" تیمور علی خان نے تعجب کا مظاہرہ کیا۔ اگرچہ اندر کہیں ایٹم بم گرا تھا۔

اماں جی ان کی شکل غور سے دیکھنے لگیں۔ (تو پھر کس کا ذکر؟) مگر وہ معاً چپ ہو کر رہ گئیں۔

”ابا صاحب کی پر جلال آواز گونجی۔ اماں جی تو تابعدار بچے کی طرح جھٹ بیٹھ گئیں۔ اس آس میں کہ خان صلب
بہادری سے ٹکالنے کیلئے کوئی بہترین اقدام کرنے والے ہیں۔ ان کی نازک طبع اس قدر تازہ و زیادہ دیر برداشت نہیں کر سکتی

یاد علی خان باپ کے قریب پڑی کرسی پر آ بیٹھے۔ تیمور علی خان بادل خواستہ صوفے پر بیٹھ گئے۔

”تم ادھر آؤ لڑکی..... ہمارے سامنے کھڑی ہو۔“

وہ اپنی چھری پر دونوں ہاتھ مضبوطی سے جمائے کھڑے تھے۔ بغیر حرکت کیے انہوں نے مطربہ کو مخاطب کیا۔
مطربہ سر پر چادر نکالتی آہستہ چلتی ہوئی ان کے بہت قریب آ کھڑی ہوئی۔ اس زائے سے کہ دونوں بھائی کسی بھی وقت
اُسے نقصان پہنچانے کی کیفیت میں آجائیں تو بابا صاحب سے گزرے بغیر اس تک نہ پہنچ سکیں۔

بابا صاحب کا بیڈ داخلی دروازے سے کافی فاصلے پر درجے کے بالکل ساتھ لگا ہوا تھا۔ دیوار اور بیڈ کے درمیان بمشکل
تھوڑا سا فاصلہ تھا۔ جہاں کچھ دیر قبل مطربہ پھنسی ہوئی تھی۔

جس صوفے پر تیمور بیٹھے تھے۔ وہ داخلی دروازے کے بالکل ساتھ تھا اور جس کرسی پر یاد علی خان بیٹھے تھے۔ وہ کسی بیڈ
کی پٹنی کی طرف تھی۔

جبکہ یاد علی خان اور مطربہ کے درمیان بابا صاحب سر و قد کھڑے تھے۔ اماں جی یاد علی خان کے قریب بیڈ پر تکی ہوئی
تھیں۔ اور نہایت حواس باختہ تھیں۔ کبھی اضطرابی انداز میں دوپٹہ سنبھالتی تھیں۔ کبھی بیڈ کی شکلیں دیکھنے لگتی تھیں۔

”جہیں نہ آداب غلامی آتے ہیں نہ آداب مختاری۔ اے بد نصیب لڑکی تمہیں اتنی جرات ہو، کیسے کہ تم یاد علی خان سے
نام کی بات کر سکو جرات کو بھی نظر انداز کر دیں تو یوں کیوں نہ کہیں کہ تم اس قدر بے حیا ہو چکی ہو۔ عورت کے پاس حیا کے
لغوی کون سا ہوتا ہے۔ ہمارے منہ میں خاک اگر کسی قسم کی سن گن تمہیں مل ہی گئی تھی تو کیا تمہیں یہ زبردستی ہے کہ تم
ان کے ہوتے ہوئے گھر کے لڑکوں سے براہ راست بات کر دو۔“

”مجھے بالکل چہرہ بھی اس کی پیٹھ میں اتار دو جس نے تمہاری بھوائی کیلئے سب سے زیادہ جرات دکھائی۔ عملی کام کیا؟
”کیوں کی تم نے یہ حرکت؟“ وہ بغیر نگاہ اٹھائے مطربہ سے مخاطب تھے۔

”خاموش کھڑی انگلیاں پٹختی رہی۔“

”کیا تمہیں ادھر حویلی میں کسی نے مشورہ دیا تھا کہ یاد علی خان سے تم خود بات کر دو۔“ وہ پھر خاموش کھڑی رہی

”دیکھ رہے ہیں آپ اس کی ڈھٹائی؟“ تیمور علی خان نے شعلہ بارنگا ہوں سے اسے گھورا۔

مطربہ نے نگاہیں اٹھا کر تیمور علی خان کی سمت دیکھا۔

”تم بچے کا بچہ پر لڑتی تھی خان۔ تمہارے شعلے میں مسموم نے لگ رہے تھے۔ تمہارا دوست صبح اٹھنا تھا جیسے جنت سے

انقلاب تم نے مجھ پر احسان کیا یا اتنے سرے سے مجھے بچ ہونے کا احساس دلایا۔ خود تو تم نے کبھی محسوس نہیں ہونے دیا کہ

میں کی ہستی ہے مجھے تو گھڑی گھڑی بڑی خاموش تاکید کی گئی کہ اپنی اوقات پہنچانوں۔“

ہیں۔

مگر تیمور علی خان کو کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔

اسی دم مطربہ باری کی انگلی تھامے ایک موڑ سے راہداری میں نمودار ہوئی۔ وہاں کی صورت حال پر قدرے حکی میسے ہو کر

”تیمور علی خان اس کی طرف عقاب کی طرح جھپٹے تھے۔ مطربہ کے حواس اتنے چوکس تھے کہ وہ آن کی آن میں بہت کچھ
سمجھ گئی۔“

وہ باری کو وہیں چھوڑ کر بابا صاحب کے کمرے کی طرف سر پٹ بھاگی۔

دلاور علی خان ٹیلی فون پر کوئی بہت ضروری بات راز دارانہ انداز میں کر رہے تھے۔ دروازہ دھڑ سے کھلا اور مطربہ گرتی
پڑتی اندر کھستی نظر آئی تو انہوں نے مخاطب کو مطلع کئے بغیر ریسور رکھ دیا۔

”کیا بد تمیزی ہے لڑکی؟“ وہ حیران بھی تھے اور ناراض بھی مگر صرف ناراضگی ظاہر کر رہے تھے۔

”خ..... خان!“ وہ ان کے بیڈ کی پشت پر آ کھڑی ہوئی۔ خان وہ تیمور خاناں۔ مجھے بچالیں۔“

ابھی وہ اتنا ہی بول پائی تھی کہ تیمور ست قدموں سے اندر داخل ہوئے۔ باپ کی موجودگی کو شاید وہ کسی بھی موڑ میں نظر
انداز نہیں کر سکتے تھے۔ عجیب بے بسی ان پر چھا گئی تھی۔

ادھر اماں جی نے ”امدادی کارروائی“ کا کورم پورا کرنے کی غرض سے یاد علی خان کو پکار لیا تھا۔

”کیا ہوا بیٹے۔ ہوش میں آؤ۔ عورت ذات ہے۔“

وہ بہت ہی گھبرائے ہوئے انداز میں تیمور علی خان کو جھنجھوڑ رہی تھیں۔ یاد علی خان بھی بابا صاحب کی خواب گاہ میں
داخل ہوئے۔

”یہی بھول ہم سب سے ہو گئی ہے۔ یہ عورت ذات نہیں ہے۔“

عزت نفس پر ایسی کاری پڑی تھی کہ سارا اکتساب۔ ساری سیکھ اڑن چھو ہو گئی تھی۔ اب تو منظر بہ یک خوش شکل جوان نرا
رہا تھا۔

”بیٹے! اس نے کچھ نہیں کیا۔ کچھ نہیں کہا۔ تم میری بات تو سنو۔“ اماں جی پھر بچتی انداز میں تیمور علی خان کی تھوڑی مہر
کر بولیں۔

”اچھا اس نے کچھ نہیں کیا۔ پھر ایسا کیا ہے کہ یاد بھائی ہماری شکل سے بیزار ہیں۔ بات ابھی ابھی سمجھ میں آئی ہے۔
وہ خود پر قابو پاتے ہوئے بمشکل گویا ہوئے۔“

”ہمارا نام مت لو تیمور۔ ہم تم سے پہلے اسے مطلع کر چکے ہیں کہ غلط بیانی ثابت ہوئی تو اس کا انجام ہمارے ہاتھوں بہت
عبرت ناک ہوگا۔ یہ بے وقوف ضرور ہے پاگل نہیں ہے۔“ یاد علی خان کا لہجہ قطعی غیر جانبدار اور سپاٹ تھا۔

”آپ لوگ بیٹھ جائیں۔“

اور نہیں۔ تو مجھ ادکھن لیا تھا۔ بغیر آواز کے تو بغیر کچھ دیے ایک طرف ہو جاتے۔ نہیں۔ نہیں۔ تم کچھ پانگے تھے۔
 اے مجھے زادی تھی۔ حفاظت کیلئے اور دوسرے راستے بھی تھے۔

نیراتن رونا کیا ہے۔ میرے دل کی کوئی قیمت نہیں ہے۔ میں بغیر خوشی کے رہ سکتی ہوں تو اور سب کیوں نہیں رہ سکتے؟ جب میں برباد ہو کر سانس لے سکی ہوں تو اور دوسرے ایسا کیوں نہیں کر سکتے۔ مدتیں ہوئیں مکی آنکھوں کی پینے دیکھتی ہوں۔

اگر یہ سب بے قصور ہیں تو میں بھی بے قصور تھی۔ ان کی کوئی اور دنیا اور کوئی اور خدا نہیں ہے۔

تمہیں کیا پتا خان۔ اپنا وجود پیش کرنا عورت کی سب سے بڑی عفت اور سب سے بڑی ہمار ہے۔ مگر یہ ہمار مرضی کی ہوتی عورت گلاب اگاتی ہے اور مرضی کی نہ ہوتی اس ڈاکے پر کبھی خود کو معاف نہیں کرتی۔ میرے اندر آگ دھک رہی ہے۔ میرا بہت نقصان ہوا ہے۔ میں کسی پر رحم نہیں کھاؤں گی۔ سب کچھ جلا کر خاک کر دوں گی۔ جب میں رو سکتی ہوں تو دوسرے کیوں نہیں رہ سکتے۔ جب میں مر مر کے جی سکتی ہوں تو اور کیوں ایسا نہیں کر سکتے۔

جب میری ہنسی کے بغیر آس پاس خوشی برس سکتی ہے۔ جب علی کے بغیر اس کے جیتے جی اس کے ماں باپ زندہ رہ سکتے ہیں۔ جب اس کے بغیر اس کا ٹکڑہ چل سکتا ہے۔ جب میرے بغیر میری ماں زندہ رہ سکتی ہے۔ جب میرا باپ اپنا سب ایک طوائف کی جھولی میں ڈال سکتا ہے تو پھر سب کچھ ہو سکتا ہے۔ وہ میرے ہاتھ تو آئے پھر بتاؤں گی اسے بھی بھول کی قیمت۔

”بے ارب..... کیا گنگی بنی کھڑی ہے۔ کیا پوچھ رہے ہیں تیرے بڑے خان؟“

اماں جی نے اس کی مسلسل خاموشی پر نہایت ناراضگی سے ٹوکا۔

”کیا؟“ وہ بری طرح چونک کر ان سب کی صورتیں دیکھنے لگی۔ ”جی خان..... کیا پوچھا آپ نے؟“

”تو نے یاور علی خان سے کیا الٹی سیدھی بات کی۔ شرم آنا چاہیے تجھے خانوں سے اس طرح کی بات کرتے ہوئے؟“

اماں جی کو اندازہ تھا کہ دلاور علی خان اس وقت خون کے گھونٹ پی رہے ہیں لہذا انہوں نے شریک حیات کی معاونت کی۔

”یاور خاناں بہت مہربان بہت نیک انسان ہیں۔ وہ سب کی عزت کا حق پہچان کر بات کرتے ہیں۔ مجھے اچھا نہیں لگا کہ ان کا اپنا بھائی ان کے ساتھ اتنی بڑی زیادتی کر رہا ہو اور انہیں خبر بھی نہ ہو۔“

کمر اہلا تھا یا پوری حویلی۔ یا چھت سر پر آ رہی تھی۔

کمرے میں اس طرح کی خاموشی تھی جیسے کسی مرنے والے کی آخری ہنگامی سے پہلے ماحول میں سکوت چھایا ہوا ہوتا ہے۔ جبکہ اس کے پٹنگ کے پاس ہر طرح کا رشتہ موجود ہوتا ہے مگر لب بستہ ہوتا ہے۔

تیمور علی خان یوں بیٹھے اسے دیکھ رہے تھے جیسے کسی تصحیح کے منتظر ہوں جیسے وہ بولنا کچھ اور چاہ رہی ہو اور بول کچھ اور نہ ہو۔ یہ پھر انہیں مغالطہ ہی ہوا ہو۔

”آپ خود بتائیں بڑے خان! میں یہ بات اور کسی سے کیوں کہتی۔ اس کا کیا فائدہ ہوتا؟ یاور خاناں ہی اپنی بیوی سے

بہت رشتے تھے۔ میں بہت دفعہ بہت کچھ دیکھ چکی تھی۔ جب مجھ سے برداشت نہیں ہوا تو میں نے یاور خاناں سے کہہ دیا۔“

یاور علی خان نے جوتے کی ٹوہ سے قالین کو مسلا پھر ایک جھٹکے سے اٹھ کر باہر نکل گئے۔

اماں جی سکتے کی کیفیت میں دل پر ہاتھ رکھے بیٹھی تھیں۔

تیمور علی خان دکھ اور حیرت سے پتھر اکر رہ گئے تھے۔

دلاور علی خان انتہائی شکستہ انداز میں بیوی کے پہلو میں بیٹھ گئے۔

پتھر ہنوز چھری پر مضبوطی سے جیسے تھے مگر سر جھکا ہوا تھا۔

”بے کی ماں! اس سے پوچھو یہ ایسا کیوں کر رہی؟“

ان کی کمزوری آواز کمرے میں ابھری۔ اگر ایسا کچھ تھا بھی تو اسے زبان سینا چاہیے تھی یا یہ سب کرنا چاہیے تھا۔

اماں جی خالی خالی آنکھوں سے مطربہ کی شکل دیکھ رہی تھیں۔

چند ہیے بعد تیمور علی خان اپنی جگہ سے اٹھے اور آہستہ آہستہ چلتے ہوئے مطربہ کے قریب آئے۔ بابا صاحب نے اپنے

دراشت میں کوئی تبدیلی نہیں کی۔ اماں جی میں سکت نہ تھی۔

مطربہ چھل کر دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔

تیمور علی خان تیرہ پونڈ مالیت کی بلیک اسٹاکس پتلون اور لیمن کلر شرٹ میں ملبوس بلا کے خوبصورت اور پرکشش نظر آ رہے تھے۔

”کیا چاہیے تمہیں؟“ ان کی آواز میں کوئی اتار چڑھاؤ نہیں تھا۔

مطربہ سر جھکائے ہونٹ کاٹ رہی تھی۔ بابا صاحب کی موجودگی میں تھوڑی بہت تقویت ضرور تھی مگر تیمور علی خان سے

نفاقت ہر طرح کی امید کی جاسکتی تھی۔

”ہم پوچھ رہے ہیں تم سے کچھ۔ کیا چاہیے تمہیں؟ بابا صاحب! اماں جی اس وقت یہاں موجود ہیں ہم تمہیں اس بات کی

انتہا دیتے ہیں کہ ہم میں کوئی بھی تمہیں کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچائے گا۔ مگر شرط یہ ہے کہ تم ہم تینوں کی موجودگی میں صرف

بتاؤ کہ تمہیں کیا چاہیے؟ زمین..... حویلی..... یا.....“ وہ قدرے جھجک کر رکے۔ ”یا تیمور علی خان۔“

جیسے ہڑول پڑا ہوا تھا۔

نگلی دکھانے کی دیر تھی۔ ایسی بھڑ بھڑا کر آگ لگی کہ تن من خاکستر ہونے لگا۔

اور قدم مزید پیچھے ہٹ گئی۔

اماں جی نے دونوں ہاتھوں سے سر تمام لیا تھا۔ جیسے وہ کہیں اکڑ کر بھاگا جا رہا ہو۔

بابا صاحب پورے حطم اور وقار سے صورتحال کا سامنا کر رہے تھے۔

”خود غرض لڑکی! تم اتنا آگے نکل جاؤ گی۔ ہمیں یہ امید نہیں تھی۔ انسان کا پہلا کفرٹ روٹی کے بعد یہ ہے کہ سوسائٹی

نہ نہ عزت ہو۔ دل کی تمام خواہشات اس کے بعد آتی ہیں لوجیکل۔ ہم نے اسی کا بندوبست کیا تھا۔ تمہارے پاس آل

میں نے کہا ہے مجھے سزا دیدیں۔ مجھے جو کہنا تھا کہہ دیا۔

میں نے اس کی ٹھوڑی کے نیچے انگلی لگا کر چہرہ اونچا کیا۔
اس کی حرمت سے بھنی آنکھیں تیمور علی خان کے چہرے پر ٹپک گئیں۔
وہ تو ”بے خبری“ کے ماتم کرتے کرتے پاگل ہو گئی۔ مگر یہاں تو خبری خبر تھی۔
پہلے کہیں اتنا بھی ہو جاتا تو وحشتیں یہ مقام کیوں دیکھتیں۔ اس کی تو دنیا ہی بدل گئی تھی۔ اس نے یوں تیمور علی خان کو دیکھا جیسے قربان ہو جائیگی۔

”یہ تم اس سے کس طرح کی باتیں کرنے لگے تیمور؟“ بابا صاحب زیادہ دیر خاموش رہ نہ سکے۔ بڑی بات ٹپک اُڑتی تھی۔

”تم تو اس قابل بھی نہیں ہو کہ ہم تم پر تھوک ہی دیں۔ بتاؤ۔ بابا صاحب کو یاد رہی کہ کون سا بھائی کو تم نے نہایت گوارا حرکت کس لئے کی؟ بولو۔ خاموش کیوں کھڑی ہو؟“ ان کی آواز بہت دھیمی تھی۔

”بتاؤ۔ ورنہ ہم تمہارا حشر کر دیں گے۔“
ایک زمانے دار تھپڑ انہوں نے مطربہ کے گلابی رخسار پر جڑا تو پانچ انگلیوں کے نشان واضح طور پر ابھرا۔
اماں جی کانپ کر کھڑی ہو گئیں۔ اور مطربہ اور تیمور علی خان کے درمیان کھڑی ہو گئیں۔

”یہ نہ کرو میرے بچے تم نے کبھی ایسا نہیں کیا۔“ انہوں نے تیمور علی خان کے دلوں ہاتھ تھام لئے۔
”پہلے کبھی ایسا ہوا بھی تو نہیں۔ اماں جی! ہم کھڑے کھڑے لٹ رہے ہیں۔ آپ درمیان میں نہ آئیں۔ پلیز۔“
وہ بمشکل خود پر قابو پا کر مخاطب تھے۔

”آپ ادھر آرام سے بیٹھ جائیں۔“ بابا صاحب نے بھی انہیں ٹوکا۔
مطربہ رخسار پر ہاتھ رکھ کر نظریں جھکائے چپ کھڑی تھی۔

”تم بھی ادھر آؤ تیمور۔“
جتنی بات ہم سمجھتے ہیں اس حوالے سے ہم خود اس سے بات کرتے ہیں۔ دلاور علی خان چھری پر زور ڈال کر انہیں کھڑے ہوئے۔

”اپنا مقام پہنچا ہی ہو لڑکی۔ یہ وہ جاگیر دار ہے جسے انگلستان کا کوئی لارڈ بھی خوشی سے بیٹی دے دے گا۔“
”تم نے یہ سب اندازہ کر لیا تھا تب ہی یہ گند اڑا ماکھلا۔ کیا تیمور صحیح کہہ رہا ہے؟ ہم ٹھیک سمجھتے ہیں؟“
وہ بہت دسمانیت سے پوچھ رہے تھے۔ مطربہ نے نظریں اٹھا کر تیمور علی خان کی سمت دیکھا۔

نفرت سے اس کا چہرہ اجلس رہا تھا۔ پھر اس نے بابا صاحب کی سمت دیکھا۔
”جو بات آپ کے بس میں نہیں چھوٹے خان۔ وہ آپ نے منہ سے بھی کیوں نکالی؟ میں نے تو کبھی آپ سے کچھ نہ کہا۔“

”بابا صاحب۔“ تیمور علی خان باپ سے مخاطب ہوئے۔
”تمہارا اپنے کمرے میں جا کر آرام کرو۔ ہم خود دیکھ لیں گے۔“
اس وقت ہی جائیگے جب اپنے ماں باپ کی نظروں سے سرخرو ہوں گے۔ یہ بہت مکار ہے۔ ہمیں مزید انتظار ہے آپ یاد کریں۔ تاریخ گواہ ہے میدانوں میں جیتی ہوئی جنگیں عورتوں کی سیاست سے ہمارے تبدیل ہوتے ہیں۔ آئی اور فتح شکست میں بدل گئی۔ حالانکہ نے بہادری میں کی تھی نہ ہتھیاروں میں۔“

ریڈی یہ سب کچھ ہوتا تو ہم تمہاری دوسری ضروریات کو اہمیت دیتے مگر تم علم و فضل کی پیداوار ہو تمہارا یہ کتنے کچھ ممکن نہ

”بتاؤ بابا صاحب کو کہ یہ اصل میں تمہیں کیا چاہئے۔ بتاؤ؟“
انہوں نے اس کی ٹھوڑی کے نیچے انگلی لگا کر چہرہ اونچا کیا۔
اس کی حرمت سے بھنی آنکھیں تیمور علی خان کے چہرے پر ٹپک گئیں۔
وہ تو ”بے خبری“ کے ماتم کرتے کرتے پاگل ہو گئی۔ مگر یہاں تو خبری خبر تھی۔
پہلے کہیں اتنا بھی ہو جاتا تو وحشتیں یہ مقام کیوں دیکھتیں۔ اس کی تو دنیا ہی بدل گئی تھی۔ اس نے یوں تیمور علی خان کو دیکھا جیسے قربان ہو جائیگی۔

”یہ تم اس سے کس طرح کی باتیں کرنے لگے تیمور؟“ بابا صاحب زیادہ دیر خاموش رہ نہ سکے۔ بڑی بات ٹپک اُڑتی تھی۔

”تم تو اس قابل بھی نہیں ہو کہ ہم تم پر تھوک ہی دیں۔ بتاؤ۔ بابا صاحب کو یاد رہی کہ کون سا بھائی کو تم نے نہایت گوارا حرکت کس لئے کی؟ بولو۔ خاموش کیوں کھڑی ہو؟“ ان کی آواز بہت دھیمی تھی۔

”بتاؤ۔ ورنہ ہم تمہارا حشر کر دیں گے۔“
ایک زمانے دار تھپڑ انہوں نے مطربہ کے گلابی رخسار پر جڑا تو پانچ انگلیوں کے نشان واضح طور پر ابھرا۔
اماں جی کانپ کر کھڑی ہو گئیں۔ اور مطربہ اور تیمور علی خان کے درمیان کھڑی ہو گئیں۔

”یہ نہ کرو میرے بچے تم نے کبھی ایسا نہیں کیا۔“ انہوں نے تیمور علی خان کے دلوں ہاتھ تھام لئے۔
”پہلے کبھی ایسا ہوا بھی تو نہیں۔ اماں جی! ہم کھڑے کھڑے لٹ رہے ہیں۔ آپ درمیان میں نہ آئیں۔ پلیز۔“
وہ بمشکل خود پر قابو پا کر مخاطب تھے۔

”آپ ادھر آرام سے بیٹھ جائیں۔“ بابا صاحب نے بھی انہیں ٹوکا۔
مطربہ رخسار پر ہاتھ رکھ کر نظریں جھکائے چپ کھڑی تھی۔

”تم بھی ادھر آؤ تیمور۔“
جتنی بات ہم سمجھتے ہیں اس حوالے سے ہم خود اس سے بات کرتے ہیں۔ دلاور علی خان چھری پر زور ڈال کر انہیں کھڑے ہوئے۔

”اپنا مقام پہنچا ہی ہو لڑکی۔ یہ وہ جاگیر دار ہے جسے انگلستان کا کوئی لارڈ بھی خوشی سے بیٹی دے دے گا۔“
”تم نے یہ سب اندازہ کر لیا تھا تب ہی یہ گند اڑا ماکھلا۔ کیا تیمور صحیح کہہ رہا ہے؟ ہم ٹھیک سمجھتے ہیں؟“
وہ بہت دسمانیت سے پوچھ رہے تھے۔ مطربہ نے نظریں اٹھا کر تیمور علی خان کی سمت دیکھا۔

نفرت سے اس کا چہرہ اجلس رہا تھا۔ پھر اس نے بابا صاحب کی سمت دیکھا۔
”جو بات آپ کے بس میں نہیں چھوٹے خان۔ وہ آپ نے منہ سے بھی کیوں نکالی؟ میں نے تو کبھی آپ سے کچھ نہ کہا۔“

”بابا صاحب۔“ تیمور علی خان باپ سے مخاطب ہوئے۔
”تمہارا اپنے کمرے میں جا کر آرام کرو۔ ہم خود دیکھ لیں گے۔“
اس وقت ہی جائیگے جب اپنے ماں باپ کی نظروں سے سرخرو ہوں گے۔ یہ بہت مکار ہے۔ ہمیں مزید انتظار ہے آپ یاد کریں۔ تاریخ گواہ ہے میدانوں میں جیتی ہوئی جنگیں عورتوں کی سیاست سے ہمارے تبدیل ہوتے ہیں۔ آئی اور فتح شکست میں بدل گئی۔ حالانکہ نے بہادری میں کی تھی نہ ہتھیاروں میں۔“

اپس اپتال جاری ہے۔ یاد رکھاں ہونا بہت ضروری ہے مگر وہ ہے کہاں؟“ وہ خود کلامی کے انداز میں کہہ رہے

خبر علی خان خاموش رہے۔

بابا صاحب چند دن پہلے کچھ سوچتے رہے پھر باہر چلے گئے۔

چاند کا روہلی اجالا ٹھیک سے پھیلا بھی نہیں تھا کہ حویلی میں خبر آگئی کہ یاد علی خان ایک بہت خوبصورت بیٹی کے بچے

پہن گئے ہیں۔ بیٹے کی پیدائش کے بعد بیٹی کی خبر بہت خوشی کے ساتھ سنی گئی۔

مگر بے خوشی منانے والے افراد کے درمیان بابا صاحب اور تیمور علی خان بہت پریشان تھے کہ رات سے اب تک یاد

علی خان کا کچھ پتا نہ تھا۔

تمام مکہ بھوں پر فون کر ڈالے تھے مگر سب جگہ سے لاعلمی کا اظہار کیا گیا نازنین بار بار یاد علی خان کا پوچھ رہی تھی۔

برہنہ علی ہور رہی تھی۔ تیمور علی خان ہزار پریشان سہی مگر ان کے حواس بے حال نہیں تھے۔ باری کو ماما ملی کے پاس پہنچا کر

پہلے مطربہ کا کمرابا ہر سے بند کروادیا تھا۔ ان کا وجود ان دیکھی آگ میں سلگ رہا تھا۔ وہ بھتیجی کو دیکھنے اسپتال بھی نہیں

لے گئے۔ جانے کیوں نازنین کے سامنے جانے کا حوصلہ وہ خود میں نہیں پارہے تھے۔ ایک دم ہی اس سے بہت فاصلہ محسوس

ہونے لگا تھا۔

ایک دھشت یہ بھی تھی کہ یاد علی خان کچھ نہ کر نہ بیٹھیں کیونکہ ان کے انداز سے محسوس ہو رہا تھا کہ انہیں مطربہ سے مکمل

فراق ہے اور اس میں حیرت کی بات بھی نیا تھا ایک کمزور لڑکی اتنے مضبوط لوگوں کے درمیان انتہائی جرات سے کچھ کہہ

نے تو سننے والے دماغ کچھ نہ کچھ سوچنے پر مجبور ہو سکتے ہیں۔

اسی سبب انہیں بھائی کی طرف سے بہت زیادہ پریشانی ہورہی تھی۔ وہ کچھ بھی کام کرنے کے قابل نہیں تھے۔

انہیں اسپتال سے کئی فون آچکے تھے۔ اماں جی انہیں بلارہی تھیں۔ باقی خواتین واپس حویلی آچکی تھیں۔

جب ٹپٹے ٹپٹے ان کا وجود سن ہونے لگا تو بالآخر کوئی فیصلہ کر کے اندر آ گئے۔ اپنے کمرے سے بائیک کی چابی اٹھائی اور

نورے قافلے پر موجود شہر کے اس اسپتال کا رخ کیا جہاں نازنین موجود تھی۔

ماترے ہی میں اماں جی مل گئیں۔

”ہمارک ہو۔ اللہ نے بہت پیاری بھتیجی دی ہے۔“ کتنی کھوکھلی ہورہی تھی ان کی آواز۔

”شکر یہ اماں جی..... آپ کو بھی مبارک ہو۔“ ان کا اندازہ بھی بجھا بجھا سا تھا۔

”یاد کی کوئی اطلاع آئی؟“ اماں جی نے ان کی شکل بغور دیکھی۔

انہوں نے غمی میں سر ہلا دیا۔

اماں جی کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

بابا صاحب اور اماں جی چونک کر تیمور علی خان کا چہرہ دیکھنے لگے۔ دل تو یہی کہتا تھا کہ تیمور یہ سب نہیں کر سکتے۔ انہوں نے الٹا مطربہ کو مورد الزام ٹھہرایا تھا۔ جس کے بعد بھی بیان نہیں بدلا تھا۔ مگر یہ بزدلی لڑکی ہنوز اپنی بات پر قائم رہے۔ اب کیا نازنین کو بھی بلائیں۔ اس خیال سے دونوں ہی کو شرم آ رہی تھی کہ وہ بہو سے اس موضوع پر بات کریں۔

دلاور علی خان بہت سوچ سمجھ کر اگلا قدم اٹھانا چاہتے تھے۔

”دیکھو تیمور..... ہم بلا سوچے سمجھے تم سے بدگمان کیوں ہوں گے جبکہ حقیقت ابھی بھی پوشیدہ ہے۔“

”کچھ بھی پوشیدہ نہیں ہے بابا صاحب۔ ہم اس کی تمام سیاست سمجھ چکے ہیں۔“ وہ برہم ہوئے۔

”وہ ہم اس سے قبول کروالیں گے مگر یاد رکھنا۔ جاؤ بیٹے آرام کرو۔ ہم تمہارے ساتھ کسی قسم کی زیادتی

برداشت نہیں کریں گے۔ آپ بھی آرام کیجیے۔ اس بات کا خیال رہے کہ اس واقعے کی ہوا بھی نازک نہ لگے۔“

بابا صاحب نے اماں جی سے بہت نرمی سے کہا۔

”ابی..... اب کیسا آرام۔ ارے زیتون بانو بھلی نیکی کی بیٹی تو نے ہمارے ساتھ۔“

اماں جی کی اندرونی ٹوٹ پھوٹ ان کے چہرے سے عیاں تھی۔

ایک لمحے کو مطربہ کے دل کو کچھ ہوا۔ بے ساختہ اس کا جی چاہا ”اماں جی کے پاؤں تمام کرمعافی مانگ لے۔ مگر دونوں

خانوں کی سمت نگاہ ڈالی تو تھرا کر رہ گئی۔ اب تو زندگی کی شرط ہی زبان پر قائم رہنا ٹھہری تھی۔

پھر تیمور علی خان کی موجودگی میں تو وہ یوں بھی بہت سنگدل ہو جاتی تھی۔

”اب تو جو ہونا تھا ہو چکا۔“ مطربہ نے گہری سانس لے کر تیمور کی سمت دیکھا تھا۔ اسی دم عالم تاب گہرائی ہوئی اندر

داخل ہوئیں۔“

”اماں جی نازکی طبیعت بہت خراب ہے میں نے ڈرائیور سے گاڑی نکلوانے کو کہہ دیا ہے آپ بھی چلے۔“

اماں جی ایک دم کمزری ہو گئیں۔ ”یاد رکھاں ہے؟“

”وہ تو کہیں دکھائی نہیں دے رہے بس آپ جلدی کیجیے۔ اسی اسپتال چلنا ہے جہاں ناز نے نام لکھوایا ہے۔“

وہ دبے لہجے میں گویا ہوئیں۔ وہ اتنی پریشان تھیں کہ انہوں نے کمرے کی غیر معمولی صورتحال کی طرف بھی توجہ نہیں دی

تھی۔

”اوہ! اماں جی کی سمجھ میں بات آگئی۔ انہوں نے بابا صاحب کی طرف دیکھا۔

”مجھے چھوٹی سی بات کے ساتھ بے تاب ہوگا۔ آپ فکر نہ کریں۔ کوئی ایسی بات نہیں۔“ وہ عالم تاب کے پیچھے نکل گئیں۔

”لڑکی تم بھی جاؤ۔ باری کو ہمارے پاس چھوڑ جاؤ۔ آج سے اس کا تمہارے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ مزید توجہ

ساتھ کیا کرنا چاہیے سوچ کر بتائیے۔“

”بابا صاحب کا لہجہ بالکل سرد و سپاٹ تھا۔

”اب تم جا سکتی ہو۔“ گویا انہوں نے جتا دیا تھا کہ اب اس کی کوئی بات نہیں سنی جائیگی۔ وہ فوراً باہر نکل گئی۔

”مجھے تو ناز کے سامنے جاتے ہوئے بہت گھبراہٹ ہو رہی ہے۔ اللہ اسے ہر بری چیز سے بچائے۔ تم ایسا کرو کہ اس سے یہ کہہ دو کہ اسے اچانک ضروری کام سے حسن ابدال جانا پڑ گیا۔ کوئی سرکاری مسئلہ ہے ایک دو دن میں آجائے گا۔“ اماں جی نے راہ بھائی۔

”وہ دعو کی موت کی جگہ لڑکھڑکھال پڑی ہے۔ اسکو بس ہر طرح سے پرسکون کرنا ہے۔ سمجھ رہے ہوں امیر کی بات۔“ ان کا انداز درخواست گزار کا سا تھا۔

”جی..... جی۔ آپ فکر نہ کریں۔ کس طرف ہے ان کا کرا؟“ انہوں نے اپنے منتشر ذہن کو بحال سمیٹ کر پوچھا۔
”آؤ..... میرے ساتھ۔“ اماں جی نے اپنی چادر درست کر کے چہرہ اڑھانپ کر ایک طرف کو ہل پڑیں انہوں نے بھی تھکی۔

طویل راہداری میں وہاٹ دروازوں کا ایک طویل سلسلہ تھا اماں جی ایک دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی تھیں۔ اور انہوں نے اندر قدم رکھتے ہوئے چند لمحے رک کر کچھ سوچا تھا اپنے چہرے پر نقش ہر تحریر مٹانے کی کوشش کی تھی۔ اندر داخل ہوئے تو نازنین کو ہاتھ روم کے دروازے سے باہر آتے دیکھا۔ ایک نرس اس کو سہارا دیے ہوئے تھی۔

اس کے سر پر ڈھیر سارا تیل بھینا اماں جی کی ہدایت پر ہی ڈالا گیا تھا۔ خوب کس کر چوٹی بندھی ہوئی تھی۔ ہلکے بڑکڑان میں وہ بہت ہی زرد محسوس ہو رہی تھی۔

کان، ناک، گردن ہر طرح کی جیولری سے آزاد تھے۔ حتیٰ کہ کھانیاں تک سونی پڑی تھیں۔ اس کے باوجود اس کا حسن اسی طرح دو آئینہ تھا جس طرح بھی بنی حالت میں ہوتا تھا۔

وہ تیمور کو دیکھ کر بڑے پھیکے انداز میں مسکرائی۔

”السلام علیکم“۔ تیمور نے سلام کیا۔

”وعلیکم السلام“۔ تم تو بڑے لبرل اور ماڈ ہو۔ کیا بھتیجی کی پیدائش سے خوشی نہیں ہوئی۔ ایک اور بھتیجا چاہیے تھا؟“

وہ نقاہت بھری آواز میں بولتے ہوئے بیڈ سے نکل گئی۔

”ایسا نہیں ہے۔ سنا تھا کہ آپ کی طبیعت خاصی ناساز ہے۔ سنبھلنے کا انتظار کر رہا تھا۔“ انہوں نے جلدی سے سنبھل کر جواب دیا۔

”چلو خیر..... تم تو چچا ہو کر پھر بھی آگئے۔ باپ کو تو ابھی تک ہوش نہیں۔“ وہ دکھ چھپاتے ہوئے مسکرائی۔

”کیسی باتیں سوچنے لگی ہیں بھابی۔ امیر جنسز بھی ہماری زندگی کا حصہ ہوتی ہیں۔ آتے ہی ہوں گے باور بھائی اتنی جلدی دل برا نہیں کرتے۔“

”اچھا بناؤ نہیں مجھے۔ کیا تمہیں پتا نہیں ان کا موڈ کیسا ہو رہا تھا؟“

”یہ تو قتی باتیں ہوتی ہیں بھابی آپ خواتین وہ اپنا ذہن نہ الجھائیں! بڑی لعل کریں۔“

وہ کہتے ہوئے کاٹ کی طرف بڑھے۔

اماں جی دونوں کو بات کرتے ہوئے بڑے غور سے دیکھ رہی تھیں

”بیڈ“ کہنے معصوم ہیں میرے بچے..... ارے زیتون بانو اللہ تجھے ہدایت کی روشنی دکھائے۔“ ان کا دل بھر آیا۔

”اماں جی! آپ بیٹھ جائیے ناں۔“ نازنین نے کسی دھیان سے چونک کر ساس سے کہا۔

”میری بیٹی! تو دل اچھا رکھ۔ یاد رکھ کی طرف سے تو پریشان نہ ہو۔ اس کی تو ہمیشہ سے عادت ہے یونہی ایک دم کہیں نہ کہیں چل پڑتا ہے۔ اپنی تو سمجھ میں اس کے کام آتے نہیں۔ مگر بیٹی تو تو پڑھی ہوئی ہے۔ تو ہی سمجھنے کی کوشش کر۔“

انہوں نے آگے بڑھ کر نازنین کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ بس ہاتھ پھیرنا غضب ہو گیا۔

وہ اماں جی کے گلے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

”اماں جی! وہ مجھ سے بہت ناراض ہیں۔ وجہ بھی نہیں بتاتے“ مجھے ان سے بہت ڈر لگنے لگا ہے اسی لئے میں نے رات کو کمرے میں سونا بھی چھوڑ دیا تھا۔ اوپر بستر لگوا لیا تھا۔ کھلی ہوا کا بہانہ بنا کر۔“

”اماں جی میرا قصور کیا ہے؟“ وہ ہلکے ہلکے کر رو پڑی۔

”میں مدتے واری جاؤں اپنی بیٹی کے۔ میری بیٹی بہت اچھی ہے۔ زندگی میں چھوٹی موٹی پریشانی تو آتی ہی رہتی ہیں۔ سب ہی کے ساتھ ہوتا ہے۔ سب ٹھیک ہو جائیگا تو اپنا دل سنبھال۔ دودھ پینے والی بچی گو د میں آگئی ہے۔ اللہ نصیب اچھے کرے۔ تو خوش ہوگی تو بچی کی صحت پر اچھا اثر پڑے گا۔“

وہ بہت شفقت و محبت سے اس کی پشت سہلا رہی تھیں۔

”کیسے خوش رہوں اماں جی؟“ وہ بری طرح روتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

”بھابی! بہت غلط بات ہے۔ اتنی جلدی ہمت ہار دیتی ہیں۔ یہ سب قتی ہے۔ دیکھئے! آپ کی روتی ہوئی آواز سن کر گڑیا نے بھی رونے والا منہ بنا لیا ہے۔“

”ہمیں پتا چلا ہے ابھی تک آپ لوگوں نے اس کا نام سیٹ ہی نہیں کیا

وائس اے پرائیلم..... اماں جی ہم آپ کی اجازت سے گڑیا کا نام رکھ رہے جو ہمیں بے حد پسند ہے۔ روشانے۔
”روشانے یاور علی خان۔ ہے ناں بڑا بارعب سا نام؟“

”بڑا خوبصورت نام دیا ہے چچا نے۔ سب سے اچھا تحفہ۔ کیوں بیٹی؟ مجھے تو بہت اچھا لگا۔“ اماں جی نے خوش ہو کر نازنین کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور پیشانی پر بوسہ دیا۔

”ایسے تو وہ گھبراتے ہیں جو اکیلے ہوتے ہیں۔ حویلی میں جتنے ہیں۔ سب تیرے اپنے ہیں۔ تیری خوشی کی خاطر سب ہنسنے لگتے ہیں۔“

واقعات خواہ کچھ ہوں..... اماں جی کا معاملہ ان کے اپنے دل کی گواہی کے ساتھ ساتھ تھا۔ نازنین کا روتا ان کیلئے ناقابل برداشت تھا۔ مگر رے دنوں میں کیا ہوا! کیا سنا۔ اس وقت ان کے ذہن سے محو ہو چکا تھا۔

”تو اور کیا..... ٹھیک کہہ رہی ہیں اماں جی! جب تک آپ کی پریشانی دور نہ کر دیں۔ حویلی کے ایک ایک فرد پر مسکراہٹ

جرم ہے۔ کیا سمجھ رہی ہیں آپ اور جو آپ کی خوشی آپ کے سکھ چھیننے کی کوشش کرے۔ اس کا کوشت ہم چیل کوئل کو کھلا دیں گے۔

اب اگر آپ پھر روئیں تو بہت غلط بات ہوگی۔ اس کا مطلب ہوگا۔ آپ یہاں خود کو تنہا سمجھتی ہیں۔ دیکھئے ہم کس طرح سے یاد رہائی کو برآمد کر کے آپ کے حضور پیش کریں گے۔ معافی مانگیں گے وہ آپ سے۔ آپ فوراً معاف مت کر دیجیے۔ تھوڑی سختی دکھائیے گا تاکہ آئندہ اس قسم کی زیادتی کرنے سے پہلے وہ سوا بار سوچ لیں۔ ٹھیک ہے؟

وہ نازنین کے قریب آ کر بہت اپنائیت و خلوص سے کہہ رہے تھے۔

”مگر وہ ایسا کیوں کر رہے ہیں؟“ اس کی الجھن بدستور تھی۔

”آپ اس بات کو اہمیت نہ دیں۔ ہم آپ سے کہہ رہے ہیں ناں۔ انشاء اللہ آئندہ ایسا نہیں ہوگا بس۔“

”اماں جی کا دل بہت کمزور ہے۔ بہت جلدی پریشان ہو جاتی ہیں۔ ان کی خاطر خود کو سنبھال لیجئے۔ پلیز۔“

نازنین دوپٹے سے آنکھیں صاف کرتے ہوئے اماں جی سے الگ ہو گئی۔

”اچھا یہ بتائیے۔ آپ کا کھانا پر بیڑی تو نہیں بن رہا؟ تاکہ ہم ماما سے کوئی اچھی سی ڈش بنا کر بھجوائیں۔“

”بتاؤ۔ کیا زچہ کو سری پائے کھلاؤ گے ابھی اس کو اور کچھ نہیں کھانا بس۔ ہلکی پھلکی طاقت کی چیزیں۔“

”میں نے اپنے ہاتھوں سے گوند بنایا ہے۔ دیکھنا کیا گھوڑوں کی سی طاقت آ جائیگی۔“

اماں جی نے تیمور کو بڑی تفصیل سے بتایا۔

”پھر تو ہم بھی کھا سکتے ہیں؟“ تیمور نے برجستہ کہا۔

”پہلے..... اس طرح کے کام تو کرو۔“ اماں جی نے مسکرا کر بچی کے پھیلے ہوئے کپڑے بیک میں رکھنے لگیں۔ نازنین

پشت پھیر کر مسکرائے لگی۔

تیمور علی خان کھیا کر سر کھجانے لگے تھے۔

نازنین نے روٹی کو اماں جی کے ہاتھوں میں دیا۔ وہ اپنے کام سے۔ ایسے دنوں میں حویلی میں بڑی

بڑی دقت سی ہوا کرتی تھی۔

”آج تو بس غضب ہو رہا ہے سب پر۔ ایک وہ ہمارا بھائی میں آپ کی جگہ ہوتی ناں تو کب کی ان کی

پہلے جانی..... آج تو بس غضب ہو رہا ہے سب پر۔ ایک وہ ہمارا بھائی میں آپ کی جگہ ہوتی ناں تو کب کی ان کی

نازنین نے روٹی کو اپنی گود میں بھر کر چٹ چٹ کئی بوتے لئے۔

”تیمور بھی نہیں ہے۔ بڑی بے روتی سی ہے۔ ہے ناں؟“ وہ نازنین سے تائید لے رہی تھی۔

”ہاں۔“ تیمور نے گھٹے ہوئے انہیں پشاور گئے ہوئے۔“ نازنین نے سر آہ بھری۔

”تیمور! اور کچھ سیکھ بھی ہوئے ہوں گے جب حساب ہی کرنا ہے تو پورا پورا کریں۔“

نازنین نے اماں جی کے گھٹنوں کے ذکر پر اپنا تعجب چھپا کر مسکرا کر نکلا گیا۔

ایم اماں جی نے کمرے میں آ کر اطلاع دی کہ تیمور علی خان آگئے ہیں۔ نازنین نے چونک کر ان کے چہرے کی ایک

پہلے میں کچھ ڈھونڈنے کی کوشش کی۔ اماں جی جیسے کھلی کتاب جیسی عورت کچھ چھپانے میں کامیاب ہو بھی نہیں سکتی تھی۔

نازنین نے اپنے اندر دکھ کی گہری کاٹ محسوس کی۔

”ابھی ہم لوگ ذکر ہی کر رہے تھے۔ بھابی تو اٹھائیں گھٹنے گن کر بیٹھی تھیں۔ کیا کر رہے ہیں تیمور؟ ہم سے ملنے بھی نہیں

لئے۔“

نازنین نے روٹی کو اماں جی کے گود میں ڈالا اور بیڈ سے اترتے ہوئے شکوے کے انداز میں گویا ہوئیں۔

”تم ابھی یہیں بیٹھو۔ بھائی تھکا ہوا آیا ہے بیٹی۔ نہاد صو لے پھر مل لینا۔“

اماں جی کی آواز کی لرزش صرف نازنین محسوس کر سکتی تھی۔

اس نے مشکل اپنے آنسو ضبط کئے تھے۔

”چائے بھجواؤں تم دونوں کیلئے۔“

اماں جی کے قدم جو من من بھر کے ہو رہے تھے چلتے چلتے ایک ٹاپے کور کے۔

”گودا دیجیے اماں جی..... بلکہ روشن آیا وغیرہ کو یہیں بھیج دیجیے۔ بھابی بھائی کیلئے بہت اداس ہیں۔ ذرا ان کا دل پہلے گا

نازنین نے شرارت سے کہا۔

”بھینکتی ہوں۔ اللہ تمہیں خوش رکھے۔“

اماں جی میں اتنی ڈھیر ساری ہمت جانے کہاں سے آئی تھی۔ بہت مضبوط محسوس ہونے لگی تھیں۔

اماں جی باری کو کھانا کھلا رہی تھیں۔ وہ بہت ضدی موڈ میں تھا۔ بمشکل قابو میں آ رہا تھا۔

”نظر کی طبیعت زیادہ خراب ہے اماں جی؟“ نازنین اماں جی کے دوپٹے میں نازک سی تیل ٹانک رکھ رہی تھی۔

”ہوں“۔ انہوں نے ہنکارا بھرنے پر اکتفا کیا۔

”ایسے ہی بخار وغیرہ ہے۔“ وہ جھوٹ بولتے ہوئے بہت الجھن محسوس کر رہی تھیں۔

”یاور بھائی کب تک آجائیے؟ اگر ظہیر آگئے تو ان سے تو ملاقات نہ ہو سکے گی۔“

اماں جی کی آنکھوں میں پانی تیرنے لگا۔

’لے بیٹا! تھوڑا سا اور کھالے۔ شاباش‘۔ اماں جی نے توجہ ادھر ادھر کی۔

”اماں جی! بھابی کچھ کم صم سی لگی ہیں اس مرتبہ۔ کیا بیٹی کی پیدائش پر خوش نہیں ہیں؟“۔

”نہیں۔ تمہارا وہم ہے۔ کمزوری ہے۔ نڈھال ہے۔ دو چار روز میں ٹھیک ہو جائیگی۔“ اماں جی نے نوالہ بنا کر باری کے منہ میں دیا۔

”آپ کہتی ہیں تو مانے لیتی ہوں۔ مگر مجھے تو کچھ اور محسوس ہو رہا ہے۔ روشن آپا بھی کہہ رہی تھیں۔“ تزئین کو یقین نہیں آ رہا تھا۔

اسی دم ماما ہال میں داخل ہوئی۔

”بی بی جان! آپ کو بڑی بیگم اپنے کمرے میں بلا رہی ہیں۔“

”اچھا..... چلو..... آ رہی ہوں۔“ وہ دو ہاتھ تپائی پر رکھ کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔

”جی..... شیروانی صاحب۔ جی تیمور علی خان بات کر رہا ہوں۔ بتاتا تھا آپ کے بی اے نے؟“

”جی جی..... ہوں۔“

”پر سوں..... کچھ بتایا نہیں کہ پھر کہاں چلے گئے؟ ہوں۔ ٹھیک۔

اب کب آنے کا امکان ہے؟ کچھ اندازہ تو ہوگا؟

”جی۔ جی۔ ٹھیک ہے۔ ٹھینکس۔ او۔ کے۔“

تیمور نے ریسیور بے دلی سے کریڈل پر ڈال دیا۔ اماں جی تو کان کھڑے کسے بڑی توجہ سے سن رہی تھیں۔

’پرسوں کہاں آیا تھا؟‘ وہ بے تابی سے پوچھ رہی تھیں۔

”نوشہرہ چھاؤنی“۔ انہوں نے نہایت اختصار سے جواب دیا۔

اب کہاں ہے؟“ اماں جی تو اس احساسِ مے تحت کہ باورِ علی خان کو کہیں تو دیکھا گیا ہے۔ ہاتھ پر پھلا بیٹھیں۔

’یہ ہتا چل جائے تو مسئلہ کیا ہے؟‘ وہ تھکے تھکے انداز میں گویا ہوئے۔

”جیسا۔“

”اگر جی مدے جا کے یہاں ہے تو یہی“

یہاں سے کچھ کہتے تو..... شوٹ کر دیتے ہمیں۔ مگر اب جو کر رہے ہیں۔ اس کے ساتھ کیا کیا عذاب چھپے ہوئے

”ازدواج نہیں ہے انہیں؟“

کے ہاتھوں میں بلا کی جھلکی تھی۔

ہوایا نہیں ہے۔ زیتون بانو جو سب کے سامنے اول فول بولی۔ یہ بڑی بات ہے۔ اس کی جگہ کوئی بھی ہوتا۔ وہ رک

یہ ایسا تو نہیں کہ صدمے سے زیتون بانو کے دماغ میں فرق آگیا ہو اور اسے خود بھی نہ پتا ہو کہ وہ کیا کر رہی

میں ان کے دماغ میں نیا خیال آیا۔

بکھاناں علی کی موت والے دن بھی اس کے حواس جواب دے گئے تھے۔ کتنے ٹیکے لگائے تھے ڈاکٹر نے۔ وہ مزید

-6

علی خان نے سبکدستی ہوئی نگاہ ماں پر دوڑائی۔

تسید می ہیں اماں جی آپ ہم سب آپ کا کیا کریں۔ وہ قدرے تلخی سے گویا ہوئے۔

رہیں بھابی کا خیال نہ ہو تو اس کا دینی توازن تو آج بحال کر دیں۔ مگر ہم نہیں چاہتے کہ بھابی کے کان میں اس قسم کی

بھئی پہنچے۔ اماں جی نے بغور بیٹے کی شکل دیکھی۔

ج کی نیک فطرت کا اندازہ لگانے والا کج رو بھلا کیسے ہو سکتا ہے؟

مجھے تینوں بانو کے کمرے کی چابی دو۔ میں اس سے پوچھوں تو کہ اس نے اس طرح کی بات کس دشمن کی شہ پر منہ

1

اے ماں جی..... ہم خود منٹ لیں گے۔ بس ذرا یاور بھائی ہاتھ لگ جائیں۔ ان کے بغیر دراصل کچھ بھی نہیں

یہاں موجود ہوتا بہت ضروری ہے۔ وہ بہت الجھے ہوئے تھے۔

گناہت ہو چکا تھا۔ اماں جی نماز کیلئے اٹھنے والی تھیں۔ انہوں نے رومال سے باری کا منہ صاف کیا۔

بیٹے! کا کا جان سے باتیں کرو۔ اماں جی اتنے میں نماز پڑھ لیں۔ میرا پھول سا بچہ چند دنوں میں کیسا مرجھا گیا

مانسہ ہاری کی پیشانی سے بال سمیٹتے ہوئے نہایت دکھ سے کہا۔

راز و پارٹنر۔ تیمور علی خان نے باری کو بلایا۔

تمہا ہستہ چلتا ہوا ان کے قریب چلا گیا۔

”آپ کو میری بات کا اعتبار نہیں۔ یہ تیمور بیٹھے ہیں۔ ان سے پوچھ لیجیے۔“ یاد نے میرے اور ان کے سامنے کھلم کھلا ہڈ بٹ کیا تھا۔ اور ان کی شہ پر اس نے مجھ سے اور تیمور سے کتنی بدتمیزی کی تھی۔ پوچھ لیجیے۔ بتائیے تیمور اماں جی کو۔ کیوں پھرتے ہیں ان سے حقیقت۔ اماں جی۔ مجھے وہ ناگن چاہیے۔ ورنہ صبح ہونے سے پہلے میرے دماغ کی شریان پھٹ جائیگی۔“

”اهاں جی! وہ صرف خوبصورت ہی تو ہے۔ اور تو کسی چیز میں وہ میرے برابر نہیں ہے۔“

ہازنین! ماں جی کے شانے سے سر نکا کر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔
 ”پاگل نہیں تو۔ یہ کیسے وہم ستانے لگے بنی! لاحول ولا قوۃ۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ تو کہے تو میں قسم کھالوں گی تیری
 نلی کو۔“

اماں جی نے اسے اپنے سینے سے لگا لیا۔

”تیور! آپ کیوں چپ ہیں۔ بتائیں ناں اماں جی کو کہ افس بات کیا ہے؟ یہ بڑی مجرمانہ خاموشی ہے اس وقت آپ کی۔ مجھے اس وقت آپ کی مورل سپورٹ کی سخت ضرورت ہے اور آپ ہیں کہ چپ پا پ بیٹھے ہیں۔ بتائیں ناں اماں جی کہ جو کچھ ہوا تھا۔“

”آپ ہم میں سے کسی سے بھی بدگمان نہ ہوں۔ یہاں موجود ہر شخص دل و جان سے آپ کا مخلص ہے۔ پھر آپ کیوں پریشان ہو رہی ہیں۔“

تیور علی خان نے بہت رسائیت سے صورتحال پر قابو پانے کی کوشش کی۔

”نہیں نہیں۔ آپ میرے سامنے بتائیں اماں جی کو“۔ وہ جیسے کچھ سننے کو تیار نہ تھی۔

”بیٹی! مجھے سب پتا ہے۔ یقین کرو بات وہ نہیں جو تم سمجھ رہی ہو۔“

”تو پھر بات کیا ہے؟“ اس نے تیزی سے اماں جی کی بات کاٹ دی۔

اماں جی تیمور کی سمت ایک نگاہ ڈال کر خاموش ہو گئیں۔

”نہیں بات یہی ہے۔ پھر وہ کہاں ہے۔ یہ باری اکیلا کیوں ہے۔ آپ کے پاس کیوں ہے؟ یہ دیکھیں اسے کھانا بھی آپ نے کھلایا ہے اس نے ٹرے کی سمت اشارہ کر کے کہا۔

”آپ لوگ سمجھنے کی کوشش کریں۔ یہ اس کے خون کا تقاضا ہے۔ کچھ انہونی نہیں ہوئی۔ گھرا جاؤ تا اس کی غلیظ فطرت کا تقاضا ہے۔“

”ہر بات جی ایوں کسی کے نام نہ کو گالی نہیں دتے۔“

”اماں جی نے اس کی پشت پر ماتھ پھیرتے ہوئے اسے ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی۔

اگل کے آنسو گنے کا نام نہیں ہے۔

”کیسی چل رہی ہے پڑھائی لکھائی؟ مس پڑھاتی ہیں۔ سر پڑھاتے ہیں؟“

”کا کا جان! نہ وہ مس ہے نہ سر ہے۔ وہ تو بلیا (بڑھیا) ہے۔ انہیں میڈم کہتے ہیں۔“ وہ بنجیدگی سے تیار ہوتا۔

ایسے اعصاب شکن ماحول میں مسکراہٹ کا تصور بھی محال تھا۔ مگر وہ اپنے ہونٹوں پر آنکالی بے ساختہ مسکراہٹ ادا نہیں سکے۔

”دیکھا..... ماشا اللہ کیسی پیاری باتیں کرتا ہے۔“ اماں جی بھی مسکرائیں۔

”کا کا جان“۔

”میری جان؟“

”امی! ڈاکٹر کے پاس سے کب آئیگی؟“ اس کی آواز بھرا رہی تھی۔

”آجائیگی..... پانڈنر..... یہ اتنے سارے لوگ آپ کے پاس ہیں۔ آپ اکیلے تو نہیں ہیں۔“ انہوں نے اس کا رخسار چھو کر کہا۔

”ہم آپ کو گھوڑے کی سیر کرا ئیں گے۔ آپ کو شیر دکھانے لے جائیں گے۔“

”کتنے؟ بہت سارے شیر؟“ باری کے اندر ایک نیا جوش پیدا ہو گیا۔

”بہت سارے تو نہیں۔ ایک شیر۔ ایک شیرنی اور ان کے دو بچے۔“

”شیرنی بچوں کی امی ہوتی ہے؟“ وہ معصومیت سے پوچھ رہا تھا۔

”کر لو اور دو چار روز امی امی پانثر۔ ان کے بعد تو تمہیں ایسا بنا دیں گے کہ آگے چل کر تم دوسروں کا سہارا بنو اور خود کسی سہارے کی آس رکھو اور نہ جستجو۔“ وہ پھر کسی خیال میں ڈوب گئے۔

”کیسی باتیں کر رہے ہوں‘ تیمور؟ اللہ نے چاہا تو سب ٹھیک ہو جائیگا۔“

اماں جی جاتے جاتے پلیٹیں اور بہت فکر مندی سے گویا ہوں۔

تیمور علی خان بڑی تلخی سے مسکرائے تھے۔ عین اسی لمحہ نازنین نے اندر قدم رکھے تھے۔

وہ بالکل سادہ سوتی لباس میں تھی۔ اس کے بالوں میں تیل چمک رہا تھا۔ جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ کچھ دیر قبل مسنہ ہو
تھا۔ مال کھلے ہوئے تھے۔ سوائے ناک میں چمکتی ہرے کی لوہنگ کے کسی قسم کے زبور کا بوجھ نہیں تھا۔

ماؤں میں ربڑ کی وہ چیل تھی جو ماتھ روم کے استعمال کے لیے مخصوص تھی۔

”اماں جی! کہاں سے وہ۔ منحوس؟“ اس کے انداز میں اک دہوائی سی تھی۔

”کون بنی؟ بری بات، کسی کو نخوس نہیں کہتے“۔ اماں جی نے گھبرا کر اسے شانوں سے تھام لیا۔

”کہاں چھپا دیا ہے آپ لوگوں نے اسے۔ اگر نہیں تو پھر جان لیجیے کہ وہ یاور کے ساتھ چلی گئی ہے۔“

”نہ اس کا پتا ہے نہ یاد رکھا۔ اماں جی دیکھیے گا۔ میں اس ناگن کا پھن کیسے کپلوں گی؟ آئے تو سہی میرے ماٹے۔“

”تیور علی خان حیران پریشان باری کو صوفے پر نکا کران دونوں کی سمت بڑھے۔
 ”بائی گاڈ بھابی! اس طرح کی کوئی بات نہیں ہے۔ ہم آپ کو اس سے ملوادیں گے۔ وہ یہیں ہے ہمارے پاس۔“
 نازنین نے بے یقینی کے انداز میں ان کی سمت دیکھا۔
 ”کہاں ہے؟“ اس کی بے تابی قابل دید تھی۔
 ”بابا صاحب نے اسے حویلی سے بے دخل کر دیا ہے۔ اب یہاں چلتی پھرتی وہ نظر نہیں آئیگی۔ البتہ ہم آپ کو اس سے ملوادیں گے۔“

مگر بابا صاحب نے اسے بے دخل کس وجہ سے کیا ہے اسی وجہ سے ناں جو میں کہہ رہی ہیں؟“
 ”نہیں..... بات کچھ اور ہے..... بائی گاڈ..... پلیز آپ میری زبان کا اعتبار کریں۔“
 ”پلیز تیمور..... آپ مجھے بتائیں کہ کیا بات ہے؟ فارگاڈ سیک پلیز۔“

اماں جی بلا ارادہ تیمور کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ مگر تیمور کو ان کا دیکھنا بہت محسوس ہو رہا تھا۔
 وہ نگاہ چرا کر ایک طرف ہو گئے۔ دکھ سے اماں جی کا کلیجہ پھٹنے لگا۔ یہ کیسا وقت ہے۔ کیسی بات ہے جو زبان سے ادا ہونا محال ہے۔ اور وہ بد نصیب کتنے آرام سے کہہ گئی۔

”آپ مجھے ابھی اسی وقت اس سے ملوائیں۔“ نازنین بچوں کی طرح مچل گئی۔

”ایزی..... بھابی۔ ایزی پلیز۔ ہم کہہ رہے ہیں ناں کہ ضرور ملوائیں گے۔ آپ کو ہماری زبان پر اعتبار کرنا چاہیے۔
 بابا صاحب نے اس سے ملنے پر پابندی لگائی ہوئی ہے۔ وہ اس سے کچھ اگلوانا چاہتے ہیں۔“
 ”دیکھئے یہ باری بھی ہمارے پاس ہے۔ پلیز آپ آرام کریں۔“ وہ اسے پرسکون کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔
 ”کیا اگلوانا چاہ رہے ہیں بابا صاحب؟ وہی ناں جو ہم سوچ رہے ہیں۔“ نازنین نے تڑپ کر ان کی طرف قدم بڑھائے۔

”ہرگز نہیں۔ جو آپ سوچ رہی ہیں وہ تو ہرگز بھی نہیں ہے۔ اماں جی آپ بھابی کو لے کر ان کے کمرے میں جائیں۔ آؤ باری۔ باہر چلتے ہیں۔“

انہوں نے سہمے ہوئے باری کی سمت ہاتھ بڑھایا تو وہ جلدی سے صوفے سے اتر آیا۔

تیور علی خان اسے لے کر باہر نکل گئے۔ اور ان کے پیچھے اماں جی نازنین کو شانوں سے تھام کر چل پڑیں۔

”ماما! مطربہ کے کمرے کی چابی آپ کے پاس ہے کھانا تو آپ ہی لے کر جاتی ہیں۔“

تیور علی خان کچن کے دروازے میں کھڑے ماما سے مخاطب تھے۔

”جی خان..... آپ ٹھہریں میں اپنے کمرے سے لے کر آتی ہوں۔“ ماما دوپٹا درست کرتی باہر نکل گئی۔

تیور علی خان راہداری میں پشت پر ہاتھ باندھ کر ٹھہرنے لگے۔ تھوڑی دیر بعد ماما واپس آگئی۔ اور چابی انہیں تھما دی۔

تیور علی خان ایک لمحہ ضائع کئے بغیر مطربہ کے کمرے کی سمت بڑھے تھے۔ جو انتہائی کونے میں بنا ہوا تھا۔ جہاں حویلی کا دروازہ تھا۔ وہاں تمام ہو جاتا تھا اور ایک دروازہ بس پھر ایک وسیع احاطے میں کھلتا تھا جسے طے کرنے کے بعد حویلی کا دوسرا فتر دروازہ ہوتا تھا۔ جو حویلی کے ملازمین کے تصرف میں زیادہ رہتا تھا۔ اس طرف زیر زمین اور بالائے زمین بڑے بڑے کمرے موجود تھے۔ فہلوں کی کٹائی کے زمانے میں اس طرف زیادہ چہل پہل ہو جاتی تھی۔
 تیمور علی خان نے تالا کھول کر بہت آہستگی سے دروازہ دھکیلا۔ مطربہ بغیر دوپٹے کے درتپے میں کھڑی تھی۔ دروازہ کھلنے پر وہ ہلچل مچا کر پلٹی تھی۔

مانے تیمور علی خان کو دیکھ کر یکبارگی دل بہت زور سے دھڑکا تھا۔ اس نے بے ساختہ ان کے ہاتھوں کی سمت دیکھا۔
 ”کیوں بھئی پتول نظر نہ آیا۔ اس نے قدرے حیرانی سے ان کی سمت دیکھا تھا۔
 ”دیکھو لڑکی..... وہ کیا نام ہے تمہارا۔ ہم تمہارے پاس آخری بار آئے ہیں۔ خود پر رحم کرنے کا یہ آخری موقع دینے

”نہیں کرنا مجھے خود رحم اور کسی سے کوئی بات بھی نہیں کرنا۔ آپ کے پاس دولت اور خاندان کی طاقت ہے۔ آپ اسی سے کام لیں۔“ وہ بھڑک کر بولی تھی۔ ان کا خیال غلط نکلا۔ اس کا دماغ درست ہونے کے بجائے اور زیادہ خراب ہو چکا تھا۔
 ”کیا چاہتی ہو تم۔“ وہ بہت ضبط سے کام لے رہے تھے۔

”اب کچھ نہیں چاہتی۔“ وہ سابقہ۔ اچھے میں پھنکاری۔

”دیکھو ناز بھابی کی حالت بہت خراب ہے۔ انہوں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے انہیں کس بات کی سزا مل رہی ہے۔ ہم نے نہاری شادی ایک بہترین انسان سے۔“

”بس بھی کریں خان! وہ آدمی بہترین تھا مان لیا۔ شیخ رفیع کی لڑکی بھی تو بہترین ہے۔ کیوں قبول نہیں ہے وہ آپ کو۔
 ”میرے لڑکی سے نکاح کرتے ہوئے آپ نے سوچا تھا کہ اماں جی کو اس پر کتنا اعتراض ہوگا۔ مگر اپنے دل سے ہار گئے تھے۔

”اگر وہی دل جیت گیا۔ کیا دل صرف آپ ہی کے پاس ہے؟“

”اگر وہ انگریز لڑکی ہماری بیوی ہے تو صرف ہماری وجہ سے نہیں بلکہ وہ خود بھی ہمارے لئے اتنی ہی پیور ہے سنسیر ہے۔
 ”نہیں اس کے ساتھ ہیں۔ یہ دونوں طرف کی بات ہے۔“

”جس میں اپنے حسن پر غیر ضروری اعتماد یا غرور تھا۔ اسی وجہ سے تمہارا دماغی توازن بگڑ گیا ہے کیونکہ غرور بھی پاگل پن کی علامتوں میں سے ایک ہے۔ صرف حسن سے بات نہیں بنتی مطربہ بیگم۔“

تیور علی خان کے انداز میں واضح سفاکی جھلک رہی تھی۔

”ہم تم پر مرکز بھی ظاہر نہ کرتے کہ ہم تمہارے دل کی بات شروع سے ہی سمجھتے ہیں۔ مگر نوبت یہاں تک آگئی ہے کہ تم نے اپنا غرور غرضی کی آگ میں ہمارے بھائی کا گھر بھی جلانے کی کوشش کر ڈالی ہے۔“

”مطربہ بیگم ایسے نہیں ہوتا جیسے تم سوچ رہی تھیں۔ جی تو چاہتا ہے تمہیں ہمیشہ کیلئے یہاں سے دور کر دیں اور اخبار میں

لا کمڑا کیا تھا۔

”تاثر میں بھائی بالکل بے قصور اور منظم ہیں اور بھائی بھی۔ ہم سے انتقام ہی کیا: غصہ اور کوئی اور تدبیر سوچنا۔ وہ ایک

دم شکستہ حال نظر آئے۔

”میں کیوں کسی سے انتقام لینے لگی؟“ وہ بدستور زوٹھے پن سے گویا ہوئی۔

ایسا عظیم الشان سا جاگیردار اس کے سامنے بے بس کھڑا تھا۔ اندر کہیں سلگتے کوئلوں پر پانی پڑ رہا تھا۔ جمن جمن..... جمن۔
”کیا ہمیں اپنے بھائی کا گھر بچانے کیلئے تم سے شادی کر لینا چاہیے؟“ وہ اتنی آسانی سے ہار ماننے والے بھی نہیں تھے۔

مطر بہ نے چونک کر پوری قوت سے گھوم کر ان کی سمت دیکھا تھا۔

گلے میں گلابوں کے ہار ڈالے یہ حسین شہزادہ اسے محبت سے دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔

مگر باوجود کوشش کے یہ تصور جما نہیں۔ یہ مسکرائے گا؟ ہرگز نہیں..... ایک ذرا اقبال جرم کی دیر ہے۔ اس کے ایک ایک مسام سے روح کھینچی جائیگی۔ یہ جاگیردار ہیں۔ لینے والے انہیں دینا نہیں آتا۔ یہ احسان کرتے ہیں، نوازتے ہیں، بخشے ہیں، دیتے نہیں ہیں۔ دینا تو یہ ہے کہ جواب میں کوئی طلب نہیں ہو۔ احسانات سے بوجھل کا ندھے۔ جھکی کمریں ان کی جاگیر کی آرائش ہیں۔ ہیبت ہیں، حشمت ہیں۔

”آخر کار انجام یہ ہے کہ میرا اس چیل کوؤں کو کھلایا جائے گا۔ جب یہ طے ہے تو آپ کیوں اپنے مقام سے نیچے آتے ہیں؟“ وہ سرد سپاٹ لہجے میں کہہ کر پھر پلٹ گئی۔

”یہ تو بہت ”منجھ“ گئی ہے۔“ انہوں نے اپنے کھولتے ہوئے لہو پر قابو پانے کی کوشش کی۔

”ہم تمہیں آسان موت سے مرنا ہوا نہیں دیکھیں گے۔ اگر نقصان ہوئے کہ جو ابھی محض اندیشے ہیں تو یاد رکھنا۔ ہم نے بے گناہوں کو نقصان سے بچانے کیلئے اپنی حیثیت تک فراموش کر دی۔ مگر..... دیکھو ابھی وقت ہے۔“ وہ بمشکل ضبط کے راستوں سے گزر رہے تھے۔

”کیا چاہتے ہیں آپ؟“ وہ ان کی طرف سے پشت کئے کھڑی تھی۔

”پتا ہے تمہیں کیا چاہتے ہیں ہم۔“

”مجھے اور کچھ نہیں کہنا۔ سزا سنا دیجیے۔ جو بالآخر آپ نے سنا ہے۔“ اس میں کسی طرح کی کوئی پک محسوس نہیں ہو رہی تھی۔

”از روئے حساب جو سزا تمہاری بن رہی ہے وہ تو یہ ہے کہ تمہیں اس طرح زندہ رکھا جائے کہ موت کے دروازے تم پر بند کر دیئے جائیں لیکن تم اس طرح جیو کہ سوائے موت کی دعا مانگنے کی دعا مانگتے کے تمہیں کچھ یاد رہے۔“

تیور علی خان اب زیادہ دیر اپنی مستقل اندرونی کیفیت چھپانہ سیکہ جو پہلے روز سے ان کے اعصاب چٹخا رہی تھی۔ ایسا محسوس ہوا کہ وہ اس کے وجود کے ایک ایک خلیے کو موت و زندگی کی کشمکش میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ ان کی آنکھیں لہو چھلکاتی محسوس ہو رہی تھیں۔

”اب بھی اس سے کم نہیں ہو رہا۔“ وہ بے خونی سے گویا ہوئی۔

”پتا چلے گا تمہیں۔ حشر تو تمہارا اسی وقت کرنے کو جی چاہ رہا ہے مگر یاد رہی بھائی کی غیر موجودگی ہمیں۔ بے بس بنائے ہوئے ہے۔ تم پر تشدد کر کے ایک منٹ میں اصلیت معلوم کی جاسکتی ہے۔ کہ اس صورتحال میں بڑے بڑے مجرموں کی پیش نیں جاتی۔ تم تو کیا چیز ہو۔ مگر وہ یہیں سمجھیں گے کہ تمہیں مجبور کر کے ہم اپنی مرضی کا بیان لے رہے ہیں۔ بدگمان دل ہے۔ بدگمانی کے راستوں پر چل نکلا ہے۔ اتنی آسانی سے ہماری طرف نہیں پلٹے گا۔ لہذا۔ ہم یہ کڑوا گھونٹ صرف ان کی آمد تک پی رہے ہیں۔ جو کارروائی کریں گے ان کے سامنے کریں گے۔ تب تک خیر مناؤ۔“

وہ ایک دم تیزی سے پلٹ کر باہر نکل گئے۔

ان کے لہجے کی غراہٹ ان کے آئندہ کے عزائم کا پتہ دے رہی تھی۔

تیور علی خان تھکے تھکے قدموں کے ساتھ گہری سوچ میں مستغرق بابا صاحب کے کمرے کی طرف آئے تھے۔

دستک بھی اس انداز میں دی تھی گویا ہاتھوں میں کوئی وزن اٹھا رکھا ہو۔

”ہوں..... کون ہے آجاؤ۔“ بابا صاحب کی آواز میں بھی تھکن واضح تھی۔

تیور علی خان اندر داخل ہو گئے۔ بابا صاحب نیم دراز حالت میں حقے کا پائپ منہ سے لگائے دروازے کی سمت دیکھ رہے تھے۔ تیور علی خان کو دیکھ کر ایک دم چونک سے گئے۔

”آؤ..... تیور! ہم تمہارے بارے ہی میں سوچ رہے تھے کہ جانے تم اس وقت کیا کر رہے ہو۔ یہ تمہارے ہاتھ میں چابی ہے۔ کہیں سے آرہے ہو؟“ انہوں نے الجھ کر بیٹے کی شکل دیکھی۔

تیور علی خان نے چونک کر اپنے ہاتھ کی سمت دیکھا۔

”اوہ..... یہ..... یہ اسی شقی القلب اور منحوس کے کمرے کی چابی ہے۔ ہمیں دھیان ہی نہیں رہا۔ دروازہ کھلا چھوڑ آئے ہیں۔ کہیں وہ فرار نہ ہو جائے۔ ہم ابھی آتے ہیں۔“ وہ پلٹنے لگے۔

”رہنے دو۔ ہم ماما کو بلاتے ہیں۔ وہ تالا لگا کر آئے گی۔ بے فکر رہو وہ فرار نہیں ہوگی۔ اس کے انداز فرار ہونے والوں کے سے نہیں۔ ہم نے تو تالا اس لیے ڈالا ہے کہ اسے یاد رہے کہ اس سے تمام مراعات واپس لے لی گئی ہیں۔ اب اس کی حیثیت وہ نہیں جو پہلے تھی۔“

”بابا صاحب! آخر آپ اس کی کھال کیوں نہیں اتار دیتے۔ ہمیں تو بس مصلحتیں روکے ہوئے ہیں۔ آپ اتنا ضبط کیوں کر رہے ہیں؟“ وہ اپنے مثل اعصاب کے ساتھ گرنے کے انداز میں بیٹھ گئے۔

”نیکم کچھ ہمارے ساتھ ہے۔ کچھ وقت جاتا ہے۔ کریں گے اس کے ساتھ بھی حساب کتاب۔“ وہ نرمی سے گویا ہوئے۔

”آپ کے انداز سے ظاہر ہے کہ آپ کو ہم پر کتنا اعتماد ہے۔ یاد رہی بھائی بھی تو ہمارے سگے بھائی ہیں۔ آپ کو کیا پتا ہے اتنا ہی ہمیں کس عذاب میں ڈالے ہوئے ہے۔“ وہ بہت شکستہ لہجے میں باپ سے مخاطب تھے۔

”حوصلہ رکھو تیمور۔ سب ٹھیک ہو جائیگا۔“ بابا صاحب نے شفقت کے ساتھ بیٹے کو تسلی دی۔

”ہم نے زندگی میں کبھی گمائی نہیں سنی۔ یہ اتنی نگلی گالی۔؟“ وہ ڈوٹے ہوئے لہجے میں گویا ہوئے۔

”اس لڑکی کے بارے میں سب کے اندازے غلط ہو گئے۔ ہماری اسات ہشتوں میں ایب فتنہ نہیں گزرا۔ مگر انشا اللہ۔“

”مگر کیسے؟ یہ تو بھائی نے تو بدی کر دی ہے۔ وہ ہماری بھابی ہیں، ہم انہیں اتنا جانتے ہیں۔ ان کی تو بیوی ہیں۔ ابھی تک نہیں پہچانے۔“

”کوئی بات نہیں۔ دنیا میں سب کچھ ہو سکتا ہے۔ ضروری نہیں ساتھ رہنے والے ایک دوسرے کو بڑے پیار کے ساتھ پہچان لیں۔ بائبل تو ایک ہی تزل ہوئی تھی پھر اس کی کئی شکلیں کیسے ہو گئیں۔ اس کی جتنی شکلیں ہیں، وہ سب حضرت عیسیٰ کے حواریوں سے ہی موصوم ہیں۔ ہر کے آرمیوں سے نہیں، یہ مٹا کی بائبل کچھ بتاتی ہے۔ مٹی کی بائبل کچھ کہتی ہے۔ یہ تو حواری تھے۔ پیغمبر کے ساتھ تھے۔ کیا یہ بھی پیغمبر کو نہیں سمجھتے تھے۔ درندہ آسانی پیغام کئی شکلوں میں کیسے تبدیل ہو جاتا؟

بات انہونی تھی کہ خیر، باپ کے انسان کا جنم کیسے ہو گیا؟ سمجھ میں نہیں آئی تو حسب توفیق دماغ کو استعمال کر کے حقیقت مسخ کر دی۔ سب کے پاس الگ الگ دماغ ہے۔ سب اپنے اپنے حساب سے سوچتے ہیں۔ تم سوچنے سے بدگمان ہونے کے بجائے اس سے ہمدردی محسوس کرو۔ اصل عذاب تو اس کی جان پر پڑا ہے۔“

تیمور علی خان باپ کے قریب ہی جا بیٹھے تھے۔ بابا صاحب نے ان کی پشت پر ہاتھ رکھ کر بڑے تحمل سے سمجھایا تھا۔

”انشاء اللہ وہ جلد آ جائیگا۔ اچھا ہے۔ تنہا، دیکھا تو سہولت سے غور و فکر کریگا۔“ وہ مزید گویا ہوئے۔

”بابا صاحب! آپ سے ایک بات کرنا ہے۔ اسونا تو کوئی ٹینشن والی بات موجودہ صورتحال میں کرنا ایک مجراہ نفل ہے مگر..... مگر جو بات ہم آپ سے کرنے جا رہے ہیں اس کی اہمیت کا تعلق موجودہ صورتحال ہی سے ہے۔“ وہ بولتے بولتے رک گئے۔

بابا صاحب نے بیٹے کے لب و لہجے سے کچھ پالیا تھا۔ ان کے حواس ایک دم مرکب ہو گئے کہ حوالہ موجودہ صورتحال کا تھا۔

”ہاں۔ ہاں۔ کبوتر۔“ وہ بظاہر بہت پرسکون نظر آ رہے تھے۔

”ہم ایک نافرمانی کر بیٹھے ہیں۔ شاید آپ ہم سے ہمیشہ کیلئے ناراض ہو جائیں۔“ وہ پھر رک گئے۔

دلاور علی خان ہلکی جھپکنا بھول گئے۔ ان کا لاڈلا بیٹا نافرمانی کا اعتراف کر کے کون سی اعصاب شکن خبر سنانے جا رہا تھا کہ ہمیشہ ان کی ناراضگی پیدا ہونے کا امکان کسی چھوٹی موٹی بات سے تو نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ کچھ بولے نہیں بلکہ تیمور علی خان کے بولنے کا انتظار کرنے لگے۔

”بابا صاحب! ہم وہاں لندن میں شادی کر چکے ہیں۔ دراصل صورتحال ایسی ہو گئی تھی کہ ہمیں یہ انتہائی قدم اٹھانا پڑا۔“

وہ پھر خاموش ہو گئے۔

کمرے میں شور مچا تا سنا تا متحرک ہو گیا۔ بابا صاحب نے دو تین مرتبہ حقہ گڑا یا۔

”کون ہے وہ؟“ آخر کار ان کی آواز کمرے میں گونجی۔ بالکل سپاٹ لہجہ تھا۔

”عجربہ ہے۔ ماں سوئس ہے۔ باپ انگریز تھا۔“ تیمور علی خان کی آواز مجرموں کی طرح دھیمی تھی۔

”خدا کیا مطلب؟“ بابا صاحب کا انداز ہنوز سپاٹ تھا۔

”وہ فوجی تھا۔ جہاز کے ایک حادثے میں چل بسا تھا۔ وہ ایک لینڈ لارڈ کی واحد نرینہ اولاد تھی۔ اس کے علاوہ اس کی

بہن ہیں۔“

”صورتحال کیا تھی؟“ اس مرتبہ بابا صاحب کے انداز میں غلٹ تھی۔

”اس کی ماں نے وہیں دوسری شادی کر لی تھی۔ جس شخص سے اس نے شادی کی تھی۔ اس نے وراثت میں ملنے والی

بان کے لالچ میں دوسری شادی کر لی تھی۔ مگر پراپرٹی ہماری وائف کے نام ہے۔ جب یہ بات مکمل تو وہ ہماری وائف کے

رہنہ پالیں چلے گا۔ اسے مدتوں دور افتادہ فارمز میں رکھا گیا۔ اس کی زندگی اس طرح گزر رہی تھی گویا وہ زیر حراست ہو۔ وہ

رہے جو تیرے۔ ہماری ملاقات لاہور میں ہوئی تھی۔ سب لوگوں پر اس کا تاثر لینڈ لیڈی کا تھا۔ اس کے ساتھ ہمیشہ

اراز ہوتے تھے۔ یہ بعد میں پتا چلا کہ درحقیقت وہ گارڈز اس کے سوتیلے باپ کے مسلط کردہ تھے۔ یعنی ایک خاموشی دھمکی

نے کے ساتھ چلتی تھی۔ وہ اس قدر شاطر ذہن کا آدمی ہے کہ اپنے ہاتھ صاف رکھتا ہے۔ قانون کو جمل دینا اس کے ہائیں ہاتھ

بیل ہے۔ اس کی ماں کی حیثیت اس کے ہاتھ میں کھلونا کی سی تھی۔ وہ تو اتنی خوفزدہ تھی کہ یہ تمام حقائق اس نے ہمیں لکھ

رہائے تھے۔ زبان سے ایک لفظ نہیں نکالا تھا۔ کہتی ہے۔ مجھے تو ہر وقت محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی دیوار سے کان لگائے کھڑا

ہو۔ اور وہ ہر وقت گن پوائنٹ پر ہو۔“

”ہوں۔“ بابا صاحب نے ہنکارا بھرا۔ ”کیا نام ہے لڑکی کا؟“

”لیزا..... ہمارا مطلب ہے ایلزبتھ ولیم براؤن۔“

”کیا تم نے اس سے چرچ میں شادی کی ہے؟“ دلاور علی خان نے عجیب سے لہجے میں سوال کیا۔

”کیا؟ کیا مطلب۔“ تیمور علی خان کچھ سمجھے نہیں۔

”ہمارا مطلب ہے اس نے اسلام قبول نہیں کیا؟“

”پہلے اس نے اسلام قبول کیا۔ بعد میں ہمارا نکاح اسلام سنٹر میں ہوا تھا۔“ انہوں نے نظریں جھکا کر جواب دیا۔

”مگر پھر اس کا نام مسلمانوں والا کیوں نہیں؟“

بابا صاحب کے پرسکون سے انداز سے تیمور علی خان کے اعصاب کا تناؤ ڈھیلا پڑنے لگا۔

”نام تو اس کا ہم نے عائد رکھا ہے۔ بس وہ عادتاً منہ سے لیزا نکل جاتا ہے۔“ وہ قدرے جھک کر گویا ہوئے۔

”اور تم اسے اتنے خطرات میں چھوڑ کر یہاں آرام سے اتنا وقت گزارتے ہو؟ پھر تم سے اسے شادی کر کے کیا فائدہ ہوا

دلاور علی خان نارمل انداز میں کہہ رہے تھے جیسے ان کے درمیان کوئی انوکھی یا غیر معمولی بات نہ ہوئی ہو۔

”اسے بچپن ہی سے نفسیاتی مریضہ بنا دیا گیا تھا۔ اس کی عملی پادریز ہو کر رہ گئی تھی۔ مگر نہ وہاں قانونی تحفظات حاصل کرنا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ بشیر طیکہ آپ خود ذہنی طور پر مضبوط اور پر اعتماد ہوں۔ ہم نے اپنی ذمہ داری خوش اسلوبی سے نبھانے کی کوشش کی ہے۔ ہمارا وہاں ایک ہم وطن دوست ہے بار ایٹ لاء کیا ہوا ہے۔ اس کی بیوی بھی پاکستانی ہے۔ وہاں ہم اسی کے ساتھ رہتے ہیں۔ لیز ابھی انہی کے پاس ہے۔ جس ڈاکٹر نے اس کا نفسیاتی علاج کیا ہے۔ اس نے قانونی تحفظات حاصل کرنے میں اہم رول ادا کیا ہے۔ اب لیز خود بھی اتنی پر اعتماد ہے کہ پرابلم فیس کر سکتی ہے۔ وہ تو یہاں آپ لوگوں کے ساتھ رہنا چاہتی ہے۔ ہم اس مرتبہ اسے یقین دلا کر آئے ہیں کہ حویلی میں اس کی جگہ بنا کر بی لندن والوں کو جائینگے۔ کئی مرتبہ ہم نے کوشش کی۔ مگر اماں کی وجہ سے ہر بار رک جاتے تھے۔ وہ بہت جلدی پریشان ہو جاتی ہیں۔ اور ان کی صحت کا مسئلہ پیدا ہو جاتا ہے۔ آج سے پہلے ہم نے یہی فیصلہ کیا تھا آپ کو سب کچھ بتا دیں گے پھر آپ خود ہی اماں جی کو ہینڈل کر لیں گے۔ ہم نے یہی فیصلہ کیا ہے کہ آپ کو سب کچھ بتا دیں گے۔ پھر آپ خود ہی اماں جی کو ہینڈل کر لیں گے۔ ہم ان سے براہ راست بات کریں گے ہی نہیں۔ ہمیں پتا ہے ہمارے اس اقدام سے آپ کو صدمہ ضرور پہنچا ہوگا۔ مگر بابا صاحب شادی تو انسان کا سب سے زیادہ پرسٹل معاملہ ہوتی ہے۔ دو انسانوں نے ایک عمر ساتھ گزارنی ہوتی ہے۔ انٹر فیر کرنے والوں کا کیا رول ہو سکتا ہے؟“

تیور علی خان نے اعتراف خطا کے ساتھ ساتھ اپنی صفائی کا بھی بندوبست کیا۔

”ہوں۔“ بابا صاحب نے ہنکارا بھر کر حقہ گڑا یا۔

”صدمہ تو ہمیں واقعی ہوا ہے کہ ہمارا عزیز ترین بیٹا گھر بسا کر بیٹھ گیا اور ہمیں پتا تک نہ چلا۔ اپنے بچوں کی بارانہ لے جاتے ہوئے ماں باپ کے جو احساسات و جذبات ہوتے ہیں۔ وہ خوشی جو دو لہا کے باپ کو ہوتی ہے وہ تو ہر باپ کا آسمانی اور جائز حق ہے۔ بڑے انتظار کے بعد ماں باپ وہ دن دیکھتے ہیں۔ اپنی زندگی ہی میں اس سے محروم ہونا۔ بڑی کی رہ جاتی ہے۔ بیٹے زندگی میں۔“

”مقام شکر یہ ہے کہ تم نے ولایت میں بھی نام و نسب والوں ہی سے رشتہ جوڑا۔ اگر کسی درجہ سوم کی لڑکی کو بیوی بنا لیتے تو شاید یہ دکھ ہمیں قبر میں لے جاتا۔ جو ہوا سو ہوا۔ اب کیا کریں کیا کہیں۔ اتنا بڑا طوفان حویلی میں اٹھ چکا ہے کہ ہر طوفان اس سے چھوٹا محسوس ہوتا ہے۔ تم ایسا کرو جتنی جلد ہو سکے عائشہ کو حویلی میں بلو الو۔ اب یہ بہت ضروری ہو گیا ہے۔ ہم کوشش کرتے ہیں کہ یاد سے کسی طرح رابطہ ہو اور ہم اسے تمہاری لومیرج کی اطلاع دیں۔ اب یہ فتنہ بہت آسانی سے رفع کیا جاسکتا ہے۔“

تیور علی خان کی سمجھ میں فوراً ہی یہ بات آگئی کہ اتنی اہم خبر پر دلاور علی خان نے اتنے صبر و سکون کا مظاہرہ کیوں کیا۔ ان کی لومیرج تو حویلی کے حق میں غیبی امداد ثابت ہو رہی تھی۔

مدتوں سے وہ جس ذہنی دباؤ کا شکار تھے۔ وہ ایک دم ہوا ہو گیا۔ انہیں محسوس ہوا وہ ٹھن سے نکل کر اچانک کسی پرندہ مقام پر آ گئے ہوں۔

”ہم لیز کو ابھی فون کر کے خوش خبری سناتے ہیں۔“ وہ چاق و چوبند سے کھڑے ہو گئے۔
”ہائیکو۔“ بابا صاحب نے ٹوکا۔
”سوری۔“ تیمور علی خان قدرے جھینپ گئے۔ پھر باہر نکل گئے۔

”پادشاہ والی کہانی سنائیں اماں جی!“ باری اماں جی کے بازوؤں میں مچل گیا۔

”دن میں کہانیاں نہیں سناتے بیٹے! راستہ بھول جاتے ہیں۔ رات کو سنائیں گے کہانی۔“ اماں جی نے پیار سے اس کی پٹائی پر سے بال سمیٹے۔

”یاد رکھو دن میں کہانی نہیں سنا دی تھی۔ اماں جی کبھی بھول سے؟“

روپا دیوی نازنین کے سر میں مساج کر رہی تھی۔ ماما بلی ہال کمرے کے درازے کے قریب بیٹھی بیٹھی دھل کر آئے ہوئے کپڑے گن رہی تھی۔ خالہ گم صم بیٹھی چھالیہ کتر کتر کر بڑے میں ڈال رہی تھیں۔

”اماں جی! آپ بولو تو میں پاؤں پڑ کے آپ سے بڑے خان سے معافی مانگ لوں۔ اللہ سے دعا کر رہی ہوں۔ اللہ برابر وہ ڈھک لے گا۔“ ان کی آواز بھرا گئی۔

اماں جی نے خالہ کو ٹھوکا مار کر اشارا دیا کہ نازنین موجود ہے۔ خاموش رہو۔

”کیوں آپ کو کیا ہوا ہے؟ آفت تو ہم پر ٹوٹی ہے۔“ نازنین نے ترخ کر کہا

خالہ پھر پھرا کر رہ گئیں مگر اماں جی کی تاکید کے سبب خاموش رہیں۔

”ہماری تو عقل حیران ہے۔ یادو جیسا سو بر بندہ۔ آخر انہیں ہوا کیا ہے۔ ایسے تو کہیں بھی نہیں ہوتا۔“ وہ بڑبڑانے کے ناز میں گویا ہوئی۔

”تم اپنے دماغ پر زور مت ڈالو۔ بچی پر برا اثر پڑے گا۔ اللہ بہتر کریگا۔“

”بچی صرف میری تو نہیں اماں جی۔ جو اچھے برے اثر کا صرف میں ہی سوچوں۔“

وہ بہت جھنجھلاہٹ اور ہدمزاجی کا شکار ہو رہی تھی۔

”ماں کے کام بڑے ہیں اس لئے درجے بھی بڑے ہیں۔ اللہ تمہیں ہر طرح کی خوشیاں دے۔ (آمین)۔“

”اماں جی! کسی بات سے دل نہیں بہل رہا۔ عجیب سے دوسو سے ستار ہے ہیں۔“

وہ ایک دم شکستہ خاطر نظر آنے لگی۔

”ماشاء اللہ بھرے گھر میں بیٹھی ہو۔ پریشان ہونے کی کیا بات ہے۔“ وہ تسلی دینے سے زیادہ کیا کر سکتی تھیں۔

”اس کم ذات سے میری ایک مرتبہ بات تو کرائیں اماں جی۔ ذرا پوچھوں تو اوقات بھول کر مالک پر سمجھ گئی۔ تیمور پر سمجھ جاتی۔ وہ تو اکیلے اور فارغ ہیں۔ میرا میاں ہی ملا تھا پھانسنے کو۔“

نازنین کی ذہنی حالت گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ دگرگوں ہوتی جا رہی تھی۔ ایک تو زچگی سے ذہنی و جسمانی کمزوری

دوسرے یہ اتنی بڑی پریشانی۔ جب تک نوزائیدہ بچے کا باپ بچے کے چہرے پر مسکراتی نظر نہ ڈالے بچے کی ماں کی جھنجھوٹ اترتی۔ بچہ تو پیدا ہونے سے پہلے ہی قبول کر لیا جاتا ہے۔ جب ہی تو اپنے باپ کے گھر میں پیدا ہوتا ہے۔ مگر انسانی زندگی کے چھوٹے چھوٹے جذباتی موڑ ایسے ہیں جن سے گزرے بغیر اندر کی تشنگی دور نہیں ہوتی۔

”ہیں۔ یہ کیا اولی بولی بولنے لگیں؟“ اماں جی بھونچکاسی رہ گئیں۔

”ایسی کوئی بات نہیں میری بچی۔ تو کہے تو قسم اٹھا لوں۔“

اماں جی اپنی جگہ سے اٹھ کر نازنین کے قریب چلی آئیں۔

”تو پھر کیا بات ہے۔ اتنا تو خیر میں محسوس کر سکتی ہوں جو بات بھی ہے وہ آپ کو بابا صاحب کو اور تیمور کو پتا ہے مگر میں تو اپنا ذہن دوڑا دوڑا کر تھک گئی۔ سراہا تھ نہیں آ رہا۔“ نازنین نے سر تھام لیا۔ ”وہ کیا بات ہے جو آپ لوگ مجھ سے چھپا رہے ہیں۔“

اماں جی بحث میں گفتی بھول گئی۔ ایک لچلے کو ساس، بہو کی طرف دیکھا۔ پھر دوبارہ سے کپڑے گنتے لگی۔

روپا دیوی اپنے سر پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گئی کہ کب نازنین اپنا تھا ماہو اسر آزاد کرے اور وہ پھر سے مساج شروع کرے۔

”اماں جی! چھوٹی دلہن آپ سے لڑائی کر رہی ہیں؟“

باری اماں جی کی پشت پر کھڑا ہوا تھا اور قدرے پریشان کن انداز میں دونوں کو دیکھ رہا تھا۔ اماں جی نے اسے کچھ کراہی گود میں بھر لیا۔

”ماں صدقے نہیں بیٹے لڑائی تو گندے لوگ کرتے ہیں۔ ہم تو بات کر رہے ہیں۔“

”چھوٹی دلہن کہہ رہی تھیں یا اور خاناں رستہ بھول گئے ہیں؟ آپ نے انہیں دن میں کہانی سنائی تھی اماں جی؟“

وہ انک انک کر بڑی معصومیت سے پوچھ رہا تھا۔ ایک لمحے کو وہ سب دم بخود ہو گئیں۔

”ماشاء اللہ..... اللہ نظر سے بچائے کتنا ذہین ہے۔ ہر بات پر دھیان دیتا ہے۔“ اماں جی نے اس کا منہ چوم لیا۔

خالہ سولہ آنے منہ ڈھا تک کر بے اختیار رونے لگیں۔

”اماں جی! مجھے معاف کر دیں۔ وہ فتنہ میں ہی لے کر آئی تھی۔“

”سولہ آنے! بچوں سے گئی گزری ہو گئی۔ پیغمبروں کے ہاں بھی صرف پیغمبر نہیں ہوئے۔ نوح کا بیٹا بھی نافرمان تھا ہے

اللہ نے طوفان میں غرق کر دیا تھا۔ وہ کون سا تیری اولاد ہے۔ جو تجھے کوئی کہے گا کہ ٹھیک سے نہیں پالی اور وہ بھی بچی ہے بے

وقوف کم عقل۔ اپنی کم عقلی کا احساس ہوگا تو خود ہی معافی مانگے گی شرمندہ ہوگی۔“

”چاہے میں اتنے میں برباد ہو جاؤں۔“ نازنین تلخی سے گویا ہوئی۔

”اللہ نہ کرے۔ اللہ میرے بیٹے کو سلامت رکھے۔ اس سے تجھے عمر بھر خوشیاں ملیں۔ آمین۔ بری بات بیٹی ایسے نہیں

کہتے۔ میرا دل بہت کمزور ہے۔“

انہوں نے نازنین کے ہاتھ تھام لئے۔

”جب ہی تو آپ خود کو دھوکا دینے کی عادی ہیں۔ کبوتر کے آنکھیں بند کر لینے سے بلی بھاگ نہیں جاتی۔“

”بھابی پلیز! آپ اماں جی سے اس طرح بات نہیں کریں یہ بھی آپ کی طرح بہت پریشان ہیں۔“ تیمور علی خان اندر داخل ہوئے۔

”کوئی بات نہیں بیٹے۔ بیٹی ہے یہ میری۔ اس کا دل ٹھکانے نہیں ہے۔ میں اس کی باتوں کا برا نہیں مانتی۔“ اماں جی

نے بہت دسوزی سے کہا۔

”تم کہاں جا رہے ہو؟“ انہوں نے تک سک سے درست تیمور علی خان کی طرف دیکھا۔

”جی۔ ہم کو ہاٹ جا رہے ہیں۔ پتا لگا ہے یا در بھائی پرسوں وہاں پہنچے ہیں۔“

”اچھا! اماں جی کے چہرے سے خوشی چھلکنے لگی۔“ وہاں پہنچتے ہی فون کرنا اور یا در سے میری بات ضرور کرانا۔“

”جی ضرور..... انشاء اللہ..... بس ہم آپ کو یہی اطلاع دینے آئے تھے۔“

”ٹھیک ہے جاؤ۔ خیر کی خبر لاؤ۔ اللہ کی اماں میں دیا۔“

”کا کا جان! یا در خانا رستہ بھول گئے ہیں۔ اماں جی نے انہیں دن میں کہانی سنائی تھی۔ ہے ناں اماں جی؟“ باری نے

بڑی سنجیدگی سے کہا۔

تیمور علی خان نے ابھی ہوئی نظروں سے ماں کی سمت دیکھا۔

”کا کا جان..... میں بھی آپ کے ساتھ چلوں گا۔ یا در خاناں کا ہاتھ پکڑ کر لے آؤں گا۔ مجھے راستہ پتا ہے۔“

باری اماں جی کی گود سے نکل کر تیمور علی خان کے سامنے جا کھڑا ہوا۔

”انہیں ہم لے آئیں گے۔ آپ یہاں روشی کے پاس رہو۔ ورنہ وہ رونے لگے گی۔“ انہوں نے اس کا سر چھو کر کہا۔

”کا کا جان۔ روشی آئیں کریم کیوں نہیں کھاتی؟ آئیں کریم تو اچھی ہوتی ہے۔“ اس نے قدرے پریشانی سے پوچھا۔

”جب وہ آپ کی طرح بھاگنے لگے گی تو آئیں کریم بھی کھائے گی۔“

”اور لگ ہیں (مرغی کی ٹانگ) بھی؟“ وہ ان کی بات کاٹ کر بے تاب سے بولا۔

”اوہ..... شیور..... پارٹنر..... ضرور کھائے گی۔“

”اچھا ہم چلتے ہیں۔ بالکل پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ خالہ آپ سب کا خیال رکھیے گا۔“ وہ خالہ سولہ آنے سے خطاب ہوئے۔

”بیٹے! میں تو یہاں کسی سے آنکھ ملانے کے قابل نہیں ہوں۔“ وہ رندھے ہوئے گلے سے مخاطب ہوئیں۔

”ایسا نہیں سوچیں۔ کوئی بات نہیں۔ اچھا اماں جی۔ بھابی۔ خدا حافظ۔“

”خدا حافظ کا کا جان!“ باری بڑی بردباری سے مخاطب ہوا۔

”خدا حافظ پارٹنر..... اماں جی کو پریشان نہیں کرنا۔ ٹھیک؟“ وہ باہر نکل گئے۔

”چلو شکر ہے یہ تو پتا چلا کہ وہ کہاں ہے۔“

اماں جی نے سکون کا سانس لیا مگر نازنین کا چہرہ اسی طرح بے تاثر رہا۔

”یہاں ہر کسی کو کوئی نہ کوئی مسئلہ ہے۔ یہ انسان کی تقدیر ہے۔ اور ایسا قیامت تک ہوگا۔ اب ہم ہیں۔ اللہ نے غنی کر دیا ہے۔ مگر اور دوسری الجھنیں ہمارے ساتھ ہیں۔ جو بعض اوقات اس قدر بڑھ جاتی ہیں کہ غنی ہونے کا احساس تک منادیتی ہیں۔ مال و دولت کے ڈھیر ہونے کا سارا نشہ ہرن ہو جاتا ہے۔“

”ہزار طرح کے جھیلے ہیں۔ دشمنیاں ہیں تو ان کے اپنے ڈھنگ۔ دوستیاں ہیں تو علیحدہ آزمائش دوستی دشمنی ”یار ماری“ کے ساتھ ساتھ اولاد کے مسئلے مسائل۔“

”کہیں یہ سب نہیں ہے تو روٹی کا مسئلہ ہے۔ جہیز کا مسئلہ ہے۔ کہیں یہ کچھ بھی نہیں ہے تو۔ بے اولادی کا دکھ ہے۔ زندگی میں مسئلے مسائل تو چلتے رہیں گے۔ انسان کو ہمت سے کام لینا چاہیے۔“

”اب کیا ہو گیا؟“ اماں جی کا دل کانپ کانپ گیا۔ بات سے پہلے اتنی لمبی پیش بندی۔ اللہ خیر کرے۔

”کچھ نہیں ہوا۔ خبر تو اچھی ہے۔ آپ برا بنا لو وہ دوسری بات ہے۔“ دلاور علی خان نے کہا۔

اماں جی کے دل کو کچھ تقویت پہنچی وہ خبر کا انتظار کرنے لگیں۔

”ماشا اللہ ہمارے چار بیٹے ہیں۔ تین بچوں کی آپ باراتیں لے کر گئیں۔ اللہ نے بڑی عزت دی۔ ہمیں اس کا شکر ادا کرنا چاہیے۔ اب اگر تیمور اپنی پسند سے وہیں ولایت میں شادی کر لے تو کیا حرج ہے؟ وقت اور زمانہ صرف ہمارا نہیں

ہمارے بچوں کا بھی ہے۔ سب سے بڑھ کر اگر کسی مشین کے ذریعے آپ کو ٹھیک ٹھیک بتا دیا جائے کہ آپ کا بچہ اپنی زندگی کی سب سے بڑی خوشی حاصل کر چکا ہے تو یہ بات خوشی کی ہونا چاہیے نہ کہ افسوس کی۔ بچوں کی خوشیاں تو ماں باپ کی عمر بھر کی کمائی ہوتی ہیں۔“

”مجھے پتا ہے وہ شیخ رفیع کی لڑکی سے شادی نہیں کرنا چاہتا۔ اگر آپ اس کی مرضی پر خوش ہیں تو میں بھی خوش ہوں۔“

”مگر یہ کیسا ستم ہے میں اپنی آنکھوں کی تارے کی دہن سے کبھی دل کی بات نہ کر سکوں گی۔ وہ تو انگریزی بولے گی۔“

وہ آنکھوں پر آنچل رکھ کر رونے لگیں۔ وہ اپنے دکھ پر کسی اور بہانے سے رو رہی تھیں۔ دلاور علی خان نے انہیں شانوں سے تمام لیا۔

”ہمارا بیٹا انگریزوں میں اٹھتا بیٹھتا ہے۔ عقل کا کورا نہیں ہے۔ وہ اسے اردو سکھائے گا۔ وہ آپ سے اردو میں بات کرے گی۔“

”آپ کو بھی تو ہم ریاست رامپور سے یہاں لائے تھے۔ کیا چھٹی ہوئی اردو بولتی تھیں۔ اب کس طرح مقامی بولی بولتی ہیں کہ اپنی اصل زبان بھول چکی ہیں۔ ہمارے رشتے پر آپ کی بھابیوں اور بہنوں نے کتنا اعتراض کیا تھا کہ نسل افغان پٹھان کو بیٹی دے کر آپ کے گھر والے گناہ کبیرہ کر رہے ہیں۔ ان کی تو عقل موٹی ہوتی ہے۔ گھر میں فارسی آمیز پشتو بولی جاتی ہے۔ جبکہ آپ کو اردو کے علاوہ کوئی زبان نہیں آتی تھی۔“

”ہمارے خاندان میں آپ کے علاوہ کوئی باہر کی عورت نہیں تھی۔ مگر کوئی کہہ سکتا ہے کہ آپ اس خاندان کی نہیں ہو؟“

دلاور علی خان مزاج آسانی کے سبب جن دلائل کو استعمال کر رہے تھے اس سبب اماں جی بہت پرسکون اعصاب کے

”جب سے لڑکیاں (روشن آرا، تزئین) گئی ہیں گھر بالکل ہی سوتا ہو گیا ہے۔“

اماں جی عالم تاب سے مخاطب ہوئیں۔

”بابا صاحب نے بلایا ہے آپ کو۔ وہ کہہ رہے ہیں شام کی چائے آپ ان کے کمرے میں ہی پیئیں۔“

عالم تاب نے ان کی بات سنی ان سنی کرتے ہوئے اپنی سوچ سے باہر آ کر ساس کو پیغام دیا۔

اماں جی کا دھیان پوری طرح مطربہ کی طرف گیا۔

”کیا کچھ بول پڑی زیتون بانو؟ کیوں اسے کمرے میں بند کر رکھا ہے۔ کہیں نہیں جانے کی وہ۔“

”اماں جی! کسی فتنے کے ساتھ اتنی نرمی رعایت نیکی نہیں بہت بڑا گناہ ہے آگ لگا رہی ہے وہ حویلی میں اور آپ ہیں کہ۔“

عالم تاب کی آواز سے ناراضگی واضح تھی۔

اماں جی..... بچے کی طرح گھبرا کر چپ ہو گئیں۔

”اچھا میں عصر کی نماز پڑھ لوں۔ اپنے بابا صاحب کو کہلوادو۔ آتی ہوں ابھی۔“

وہ دھیمی آواز میں کہہ کر وضو کیلئے چل پڑیں۔ عالم تاب روپا دیوی کو بلا کر بابا صاحب کہ پیغام پہنچانے لگیں۔

اماں جی نے عصر کی نماز کے بعد معمول کے مطابق تسبیح پڑھی۔ اپنے کانپتے دل کو قرار ملنے کی دعا کی اور بابا صاحب کے کمرے میں آ گئیں۔

”آؤ۔ رئیسہ کی ماں۔ بہت دیر لگا دی۔“

”نماز پڑھ رہی تھی۔“ اماں جی نے سر پر دوپٹہ درست کرتے ہوئے نظریں جھکا کر جواب دیا۔

”آؤ بیٹھو۔ بہت سی باتیں جمع ہو گئی ہیں جو آپ سے کرنا ہیں۔“

بابا صاحب نے اپنے پہلو میں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

”اتنے سے دنوں میں کتنی باتیں جمع ہو گئیں۔“ وہ بڑے مودبانہ اور حیا آمیز لہجے میں پوچھ رہی تھیں۔

”ایک تو آپ ساری عمر شے کا سامان بنی رہیں۔ آپ سے کوئی بات کرنا ہو تو ہر طرف سے انتظام کرنا پڑتا ہے۔“ بابا

صاحب نے آج واقعی جھلا کر کہا تھا۔

اماں جی سہم کر رہ گئیں۔

”کوئی شکایت ہو گئی مجھ سے؟“ وہ سادگی سے پوچھ رہی تھیں۔

دلاور علی خان اٹھتے ہوئے جھاگ کی طرح پھر بیٹھنے لگے۔

”رئیسہ کی ماں۔ یہ دنیا مشقت گاہ ہے۔ ہر وقت مرضی کی خبریں نہیں آتیں۔“

ساتھ ہمہ تن گوش تھیں۔

”پھر آپ مجھے لندن بھجوادیتجئے تیمور کے ساتھ۔ خود اپنے ہاتھوں بیاہ لاؤں گی۔ شیخ رفیع کی لڑکی۔“

”بس آج کے بعد شیخ رفیع کی لڑکی کا ذکر ان معنوں میں حویلی میں نہیں ہوگا۔ ختم کرو اس قصے کو ریسہ کی ماں۔“ دلاور علی خان نے قطعیت سے کہا۔

”پتا نہیں اس کی عادتیں کیسی ہوں گی۔“

ان کے منہ سے بلا ارادہ نکل گیا۔ خلاف توقع خبر پر عجیب طرح کی بے اختیاری تھی۔ وہ تو دلاور علی خان کا پرسکون انداز اور بیٹے کی حمایت میں دلائل کے ساتھ کی گئی پیش بندی کی وجہ سے ان کے اوسان خطا نہیں ہوئے تھے۔ مگر جانے کیوں اندر کچھ ٹوٹا ہوا محسوس کر رہی تھیں۔

”ریسہ کی ماں! تمہارے بیٹے کا گزارا اس کی عادتوں سے ہو سکتا ہوگا۔ تب ہی تو اس نے اتنا بڑا قدم اٹھایا ہے“ انہوں نے سمجھایا۔

اماں جی سر جھکا کر کسی سوچ میں گم ہو گئیں۔

”آ..... آپ نے۔ اس طرح کی باتیں کبھی پسند نہیں کیں۔ سچی سچی کہیں۔ جب آپ کو پہلے پہل یہ خبر ملی ہوگی تو کیا آپ کو صدمہ نہیں ہوا ہوگا۔ حالانکہ میرے حساب سے تو آپ کو غصہ آنا چاہیے۔“

وہ چند لمحوں کے توقف کے بعد گویا ہوئی تھیں۔

دلاور علی خان جواب میں خاصی دیر خاموش رہے۔

”آپ ہماری شریک حیات ہو۔ شریک راز ہو۔ اللہ سے دعا ہے کہ وقت آخر یہی اخلاص بھرا چہرہ آنکھوں کے سامنے ہو۔ ایک بات بتا رہے ہیں آپ کو“ وہ بہت گہری سوچ میں ڈوب کر مخاطب ہوئے تھے۔

”جب زیتون بانو نے ہمارے سامنے زبان کھولی اور بعد میں تیمور نے اس پر الزام لگایا..... ہمارے آپ کے سامنے۔ تو ہمارے دل کو بہت دوسووں نے گھیر لیا تھا۔“

یہی خیال دل میں جم رہا تھا کہ تیمور سے غلطی ہو سکتی ہے ورنہ ایسی کمزور و بے سہارا لڑکی ہمارے سامنے اس طرح کی جرات کم از کم نہیں کر سکتی۔ یقین جانو ریسہ کی ماں اس رات ہم ایک لمحے کو بھی نہیں سوئے۔ اگرچہ ہم نے مصلحتاً یہی ظاہر کیا تھا کہ ہم تیمور کو بالکل بے قصور مان چکے ہیں۔ جو خطا ہے اسی لڑکی کی ہے۔

اس مضبوط دوسوے کے پیچھے بھی بہت سی حقیقتیں ہیں۔ تیمور ماشاء اللہ موجود لوگوں میں سب سے حسیں جواں مرد ہے۔ انگلستان میں رہتا ہے۔ بات کرنے کا ڈھنگ جانتا ہے۔ اس پر کسی کا دل آجانا ایسی کوئی انہونی بات نہیں۔ نازنین ہو کہ زیتون بانو یہ کم عمر لڑکیاں ہیں۔ غلطی ہو سکتی ہے۔“

”اللہ سے پناہ مانگتی ہوں خان صاحب‘ نازنین ایک ہیرا ہے جو ہمیں نصیب سے ملا ہے۔“ اماں جی تھرا کر رہ گئیں۔ دلاور علی خان جیسے حوصلے وہ کہاں سے لاتیں۔

”آپ بات تو مکمل ہونے دو خیال ہی ہے اسے تو آکر گزرتا ہی ہوتا ہے پھر اللہ نے ہماری مدد کی تیمور کی شادی کی سامنے آگئی۔“

اب یہ خبر آپ حویلی کے چپے چپے پر پھیلا دیں کہ تیمور اگلے ماہ اپنی دلہن انگلستان سے لا رہے ہیں۔

تیمور خود بخود تمام الزامات سے بری ہو رہا ہے ریسہ کی ماں۔ اب اس لڑکی کو یہ بتاتے ہی بن پڑے گی کہ اس نے یہ سب یوں کیا۔ وہ کیا چاہتی ہے؟ اب صرف اور صرف یاد رکھنا ہے۔ سوچنے کا مقام ہے جس بات نے دوسوے کی شکل میں کئی باتیں جگائے رکھا۔ یاد رکھنا کیا حالت ہوگی۔ بات بنتے دیر..... لگتی ہے نہ بگڑتے۔ آسمان سے فرشتے نہیں آتے ثبوت و دہائی لے کر۔ ہمیں اس کی اتنی فکر ہے کہ بیان سے باہر ہے۔ کم حوصلہ ہوتا تو شاید خود کو گولی مار لیتا۔ بس اسی فکر نے چین حرام کیا ہوا ہے۔“

دلاور علی خان کی پیشانی کی لکیں گہری ہو گئیں۔

اماں جی کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔

”اللہ میرے بچے کا حامی ناصر ہو۔“ وہ بے اختیار ہاتھ اٹھا کر بولیں۔

”تیمور گیا تو ہے کوہاٹ۔ بتا رہا تھا کہ پتا چلا ہے یاد روہاں ڈپٹی کے ڈاک بنگلے میں ہے۔ اللہ کرے وہیں ہو۔ ہمارے روال سے یہ مصیبت ٹل جائے۔ میں تو زیتون بانو کو کراچی میں صابرہ کے پاس ہی بھیج دوں گی وہیں ٹھیک ہے۔“

”اب یہ ہمارا کام ہے ہم خود طے کر لیں گے کہ اسے کس مقام پر رکھنا ہے۔ خواہ کچھ ہو باری اب اس کے ساتھ نہیں رہے گا۔ ہم خود اس کی پرورش کریں گے۔ وہ سورمانسل کا ”پٹھا“ ہے ہم اٹی سیدھی گود میں اسے ضائع نہیں ہونے دیں گے۔“ دلاور علی خان نے بیوی کی بات کاٹ کر تفصیلاً کہا۔

”وہ اسے بہت یاد کرتا ہے۔“ وہ دبے دبے لہجے میں بولیں۔

”ہم اسے سب کچھ بھلا دیں گے۔ آپ فکر نہ کرو۔“

”کم عقل ہے۔ معافی مانگ لے تو معاف کر دیتجئے گا۔“ ضمانت قبل از گرفتاری کے انداز میں سفارش کی گئی۔

”ریسہ کی ماں! جرم کا نتیجہ خود اپنی گنجائش بتا دیتا ہے۔ حقیقت کو سامنے آنے تو دو۔“ وہ دور خلا میں کوئی نوشتہ پڑھنے کی کوشش کر رہے تھے۔

”بس دھیان رہے کوئی زیادتی نہ ہو جائے۔ ہم بھی بال بچوں والے ہیں۔“ انہوں نے قدرے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

”ہوں..... فی الحال تو زیادتی ہمارے ساتھ ہو رہی ہے ہمارے بچے اپنے اپنے کام بھول کر در بدر ہیں۔“ دلاور علی خان نے کھوئے کھوئے انداز میں بیوی کی طرف دیکھا۔

”انشاء اللہ۔ فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ تیمور نے اطمینان دلایا ہے کہ لڑکی اچھے باپ دادا کی اولاد ہے مسلمان ہو چکی ہے عائشہ نام رکھا ہے۔“

”تو کیا نماز انگریزی میں پڑھتی ہوگی؟“ وہ بڑی معصومیت سے پوچھنے لگیں۔

”جب آئے گی تو پوچھ لینا۔ نماز تو سب کو ایک ہی طرح پڑھنا ہوتی ہے۔ خواہ انسان کسی قوم کا ہو۔“

”خیر قرآن تو میں اسے خود پڑھاؤں گی۔ ساری حویلی کی لڑکیوں کو قرآن میں نے ہی پڑھایا ہے۔“ وہ خاصی پرسکون محسوس ہو رہی تھیں۔

”اچھی بات ہے۔“ دلاور علی خان نے حقے کا پائپ اٹھا کر منہ سے لگایا۔ ”آپ کہاں چلیں؟ چائے نہیں پئیں گی؟“

”وہ ہی دیکھنے جا رہی ہوں، کیا کر رہی ہے ماما بلی۔“ وہ دوپٹہ درست کرتے ہوئے چل پڑیں۔ مگر ایک گہری سوج کا عکس ان کی چال سے واضح تھا۔

.....

نازنین کمرے میں بچی کو فیڈ کر رہی تھی۔ ماما بلی نے ایک سفید سالنفا سے لاکر دیا کہ آپ کے نام ہے۔ یوگنڈا اس کے نام کی ڈاک آنا معمول کی بات تھی۔ اس نے لفافے پر سرسری نگاہ ڈالی اور روشنی کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگی۔

”تیور آگئے؟“

”نہیں، ابھی تو نہیں آئے۔“ ماما نے بہت بچھے ہوئے انداز میں جواب دیا۔

”جیسے ہی آئیں، مجھے فوراً اطلاع دینا۔“ اس نے کہا۔

”جی بہتر۔“ ماما نے مودبانہ کہا اور باہر نکل گئی۔

نازنین نے فیڈ کرنے کے بعد روشنی کو آہستگی سے کاٹ میں لٹایا اور لفافہ اٹھا کر الٹ پلٹ کرنے لگی۔ دل ایک دم ہلکا ہونے لگا۔

تیزی سے پھیلا تھا۔ حیرت و خوشی سے اس نے ”سینڈر“ کا نام پڑھا۔

”یاور۔ اوہ مائی گاڈ۔“ اس نے بے تاب سے لفافہ چاک کیا، کئی کاغذ نکل کر قالین پر گر پڑے۔

اس نے نسبتاً ہلکا کاغذ اٹھا کر کھولا۔ اس کے نام خط تھا۔ وہ انداز تھا طرب پر چونک پڑی۔

محترم نازنین منیب احمد!

السلام علیکم۔!

آپ کی خیریت کی نیک تمنا کے ساتھ بات بڑھاتا ہوں۔ ممکن ہے حویلی میں میری غیر حاضری سے بہت پریشانی ہو رہی ہو۔ مگر میں اس ماحول سے دور اس لئے چلا آیا تھا کہ میں بہت کچھ سوچنا چاہتا تھا۔ اس طرح کہ کوئی شخص بھی میری سوج پر اثر انداز نہ ہو اور مجھ سے کوئی بہت بڑی بھول نہ ہو جائے۔

یہ تو میں شروع ہی سے محسوس کرتا آ رہا ہوں کہ آپ تیور کی کمپنی کو حویلی میں سب سے زیادہ پسند کرتی ہیں، میرے لئے۔ خوشی کی بات تھی کہ میں اس تعلق کو پاکیزگی اور وقار کے واسطے سے دیکھتا اور محسوس کرتا تھا۔ ہم بھائیوں میں جو جذباتی وابستگی ہے، اس میں اماں جی کی تربیت کا بہت دخل ہے۔ اس لئے قیامت تک کوئی الٹی سیدھی سوج مجھے ڈسٹرب نہیں کر سکتی تھی۔

لیکن حویلی کا ایک بہت مظلوم اور بے بس کردار مطربہ ہے۔ وہ اتنی سادہ اور تاس لڑکی ہے جس کے ایک ایک انداز سے تابعداری ظاہر ہوتی ہے۔ ہماری اس سے بہت کم بات ہوئی ہے اس نے بھی کبھی ہم سے غیر ضروری بات نہیں کی۔ اس نے

جس انداز سے حویلی میں خدمت کا حق ادا کیا۔ وہ کوئی پوشیدہ بات نہیں۔ ہمارے موزے اور رومال دھو کر استری کر کے جب ہماری روانگی کے وقت سوٹ کیس میں رکھتی تو ہمیں اس کی خدمت کی یہ ادا بہت اچھی لگتی تھی۔ کیونکہ ہم ہمیشہ یہ دو چیزیں ہٹ کیس میں رکھنا بھول جاتے تھے۔ ہماری اتنی چھوٹی چھوٹی باتوں کا دھیان رکھنے والی لڑکی جس نے کبھی ہم سے اپنی لذات کے جواب میں کسی قسم کی رعایت نہیں مانگی۔ رات بارہ ایک بجے تک ہماری چائے کافی کا دھیان رکھنے والی نے ہم سے سلام کے علاوہ کبھی کوئی بات کرنے میں پہل نہیں کی۔

جب تیمور علی خان نے اپنے دوست سے اس کے نکاح کا عندیہ دیا تو ہمیں دلی خوشی ہوئی تھی کہ ہمارے بھائی نے ایک طرح سے بہت بڑی انسانیت کی خدمت کی ہے اتنی اچھی لڑکی کے ساتھ ایسا ہی ہونا چاہیے۔

پھر آپ کے ساتھ اس کا پیار۔ وہ آپ کیلئے ہمیشہ ان تھک ہو جاتی تھی۔ ہم نے اسے آپ سے بہت محبت کرتے دیکھا ہے۔ وہ آپ کی دوست محسوس ہوتی تھی، ہمیں اس بات کی خوشی تھی کہ حویلی میں آپ کو اچھی کمپنی مل رہی تھی، اور آپ خوش نہیں۔

ہم نے تو یہ دیکھا کہ حویلی کا ہر فرد مطربہ سے پیار کرتا تھا۔ تیمور سے وہ بہت ڈرتی اور گھبراتی تھی۔ مگر جب تیمور نے اپنے دست کیلئے اسے پسند کیا تو ہمیں تیمور کے اچھے اقدام پر بہت خوشی ہوئی تھی۔

لیکن پھر ایسا کیسی یہ کیا ہو گیا؟ آپ اور تیمور اس کے دشمن بن گئے۔ اس کے نام سے آپ دونوں پر ہم نظر آنے لگے۔ وہ بے وقوف، سادہ خیالی لڑکی ایک دم آپ کے زیر عتاب آ گئی۔

میں نے اس میں کبھی کوئی ”چھوٹی بات“ نہیں دیکھی، جس نے عزت دار زندگی حاصل کرنے کیلئے اپنی زندگی خطرے میں ڈال دی۔ آج بھی اس کے وجود پر زخموں کے نشان اس کی نیت کی گواہی دے رہے ہوں گے۔ وہ موم جیسی نرم لڑکی آپ دونوں کی آنکھوں میں کھلنے لگی۔ کیوں؟ ہم اس بات کی طرف آرہے ہیں۔

وہ میرا خیال تو شروع دن سے رکھ رہی تھی مگر اس نے خیال رکھنے میں حد ہی کر دی۔ ہمیں حقیقت کے دروازے تک لے آئی۔ اس لئے کہ شاید وہ واقعی خیر خواہ ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ جو بات اس نے میرے سامنے کہی، وہی تیمور اور بابا صاحب کے سامنے کہی۔

ایسا بھی ہوا کہ آپ کے انتظار میں گھنٹہ بھر راستہ دیکھا مگر آپ تیور کو کمپنی دے رہی تھیں۔ تیمور اس قابل ہیں کہ دل ان کے راستے میں بچھائے جاتے ہوں گے۔ میں اپنے بھائی کو تا تصور وار نہیں مانتا جتنی کہ آپ ہیں۔ عورت کی آمادگی کے بغیر مرد کی کوئی تدبیر کارگر نہیں ہو سکتی۔

مرد کی پہل اس کے جیت جانے کی علامت نہیں ہوا کرتی۔ مرد کی جیت عورت کے تعاون کے بغیر ممکن ہو ہی نہیں سکتی۔ میں نے یہ بھی دیکھا ہے کہ میری موجودگی میں آپ بہت چپ ہوتی تھیں۔ جبکہ تیمور کے ساتھ آپ کو اتنا خوش اور ہنستا ہوا دیکھا کہ کسی اور کے ساتھ کبھی نہیں دیکھا۔ مگر تب بھی میرے ذہن میں کوئی نیکیو خیال اس لئے نہیں آیا کہ مجھے خود پر ہمیشہ بہت اعتماد رہا ہے۔

مطربہ نے جب اس پوائنٹ کی طرف میری توجہ دلائی تو میں نے بغور جائزہ لیا، شک کو یقین میں بدلنے کی دیر لگتی ہے۔ اس رات تو اچھا خاصا یقین ہو چلا جب آپ دونوں مطربہ کو حویلی سے نکالنے کے درپے تھے۔ کہ پوری حویلی میں شاید یہی مظلوم حقیقت سے باخبر تھی اور اسی وجہ سے آپ دونوں کی آنکھوں میں کھلنے لگی۔

مگر اس رات بھی میں نے خود کو سمجھالیا کہ ابھی مجھے مزید تحقیق سے کام لینا چاہیے مگر جس روز اس نے تیمور کے سامنے بابا صاحب سے واشکاف الفاظ میں اپنی بات دہرائی تو پھر بتائیں اب کیا رہ جاتا ہے؟

کوئی لاکھ بے وقوف ہو مگر خان دلاور علی خان کے سامنے غیر ذمہ دارانہ بات کرنے کی جرات نہیں کر سکتا نہ کہ وہ ایک کمزور، بزدل اور بے سائبان لڑکی۔ سوچنے کی بات ہے۔ تیمور تو اس کے محسن ٹھہرے۔ ان کے ویلے سے تو اس نے با اختیار 'عزت دار زندگی کی لذت چکھی۔ وہ محسن کشی کیوں کر رہی تھی؟ پھر آپ سے تو اس کی بڑی دوستی تھی۔ مگر بے وقوف انسان نہایت نیوٹرل ہوتا ہے مصلحتوں سے عاری ہوتا ہے

فقیر مصلحت میں سے وہ رند بادہ خوار اچھا

یا شاید وہ نرم دل تھی کہ کسی کے ساتھ کوئی خوفناک زیادتی برداشت نہیں کر سکتی تھی۔

نازنین منیب احمد!

میرا واسطہ دن رات قانون دان حضرات کے ساتھ رہتا ہے۔ میں انصاف کے تقاضوں سے بے بہرہ نہیں ہوں۔ مگر حویلی کی عظمت کے کنگرے اتنے بلند ہیں وہاں گواہیاں خرید لی جائیں گی۔ اس قسم کا انصاف ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا جس سے حویلی کی عظمت پر آج آتی ہو، میں جانتا ہوں بابا صاحب اپنے حسب نسب کی زیبائش میں کسی قسم کی کوئی کی برداشت نہیں کریں گے۔ وہ اپنی اولاد کو قربان کر دیں گے مگر باپ دادا کی محنت کو ضائع نہیں جانے دیں گے۔

ان میں اتنا دم اتنی قوت ہے کہ وہ تیمور کو راتوں رات لندن بھیج سکتے ہیں۔ اور اپنے شملے کا ایک ایک بل بجانے کیلئے وہ مجھے اور آپ کو ایک جگہ جانوروں کی طرح باندھ رکھنے پر صرف اصرار ہی نہیں کریں گے بلکہ ایسا کر کے دم لیں گے۔ مگر میں یہ اذیت ناک زندگی نہیں گزار سکتا۔ ایک ذرا سی پھانس چھ جائے تو ذہن کام سے ہٹ جاتا ہے۔ یہ عمر بھر کا معاملہ ہے۔

مجھے افسوس ہے کہ ہمارا ساتھ اتنا مختصر رہا۔ اسی لحاظ سے کوشش کی ہے کہ اس مختصر رفاقت کے سبب سے کوئی سنا، چھوٹا جملہ آپ کیلئے استعمال نہ کروں۔ بابا صاحب کے نام ایک الگ لفافہ ہے۔ اس میں بھی لکھا ہے اور آپ سے بھی استدعا ہے کہ اس مظلوم پر اتنا تشدد (ٹارچر) نہ کیا جائے کہ وہ خوفزدہ ہو کر سچ بولنا ہی چھوڑ جائے۔

آپ کا نوٹ سے فارغ التحصیل ہیں۔ حویلی کا ماحول یوں بھی آپ کیلئے بڑا اجنبی سا تھا۔ مگر میں نے کوشش کی تھی کہ آپ کو ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ رفیق سفر کا اعتماد حاصل ہو مگر۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ واقعی آپ کے ساتھ زیادتی ہوئی ہو اور مجھے آپ نے اپنے آئیڈیل سے بہت مختلف پایا ہو۔ کتنی حیرت کی بات ہے ہم چاروں بھائی ایک دوسرے سے کس قدر مختلف ہیں۔ نازنین منیب احمد! کیا آپ یقین کریں گی کہ آج میں بہت دنوں بعد خود کو بالکل پرسکون محسوس کر رہا ہوں جیسے دیرینہ دھوپ میں چلنے والا سائے میں آ بیٹھا ہو۔ میری سمجھ میں یہ نہیں آ رہا کہ مجھے آپ سے معذرت کرنا چاہیے یا آپ کو میرا شکریہ

ہے۔ کیونکہ کاغذات پہلے تیار کرائے ہیں خط بعد میں لکھ رہا ہوں۔ اس لئے میں اس میں کسی بوجھ جیسے تعلق کا شائبہ نہیں ہے۔ اسی سبب آپ کو نازنین منیب احمد کے نام سے مخاطب کیا ہے۔

نہیں ہے۔ مجھے امید ہے آپ اس معاملے میں مجھے نہیں الجھائیں گی۔ جب عورت حقیقی معنوں میں ماں کا بچہ ہوتی ہے تو دوسری دلچسپیوں کی اسے فرصت ہی کب ہوتی ہے..... اللہ حافظ

یادور علی خان

پانچ ماہ میں نازنین نے پورا خط بقاعی ہوش و حواس پڑھا بھی تھا یادور میان ہی میں پتھر اگئی تھی۔ ماما روشی کو دیکھنے آئی تو نازنین نے اذیت نہی ہوئی تھی۔ خط اس کے ہاتھ میں تھا۔

ماما تو یہی سمجھی کہ وہ کاغذات لئے بیٹھی ہے اور اپنا کوئی ذاتی کام کر رہی ہے یا یادور علی خان کی چیزیں سنبھال رہی ہے۔ "روشی سوری ہے چھوٹی دلہن" بصیر خاناں اور ان کی دلہن کراچی سے آگئی ہیں۔ اماں جی نے کہلوایا ہے آپ اماں جی کے لئے آجائیں۔ ساری حویلی میں ہلچل مچی ہوئی ہے۔ تیمور خاناں کی دلہن انگریز ہے۔ وہ اسے لینے جا رہے ہیں۔ بابا خاناں کا انتظار ہے۔

ماما نے سوئی ہوئی روشی کے چہرے پر محبت بھری نگاہ ڈالتے ہوئے اپنی دھن میں کہا۔ "اماں جی کہہ رہی تھیں کہ ناز کو یہ خبر کیسے سناؤں، وہ کہے گی میری پریشانی کا کسی کو کوئی احساس نہیں۔ اپنی اپنی پڑی ہے۔" جواب میں پھر خاموشی تھی۔

"بصیر خاناں کی دلہن کی صحت پہلے سے بہت اچھی ہوگئی ہے۔ ماشاء اللہ۔ اب تو سب سے باتیں بھی کرنے لگی ہیں۔ یہ بہت چپ رہتی تھیں۔"

ال مرتبہ ماما چونگی۔ جواب میں کوئی رد عمل ہوتا یا نہ ہوتا۔ وجود میں کوئی حرکت تو ہوتی جو انسان عام حالات میں فطری طور پر کرتا ہے۔ ماما قریب چلی آئی۔ مگر خوفزدہ ہو کر نازنین کو دیکھنے لگی تھی۔ نازنین کے دونوں ہاتھ جن میں خط تھا۔ گود میں لے گئے۔ دوزانو انداز میں وہ بیٹھی ہوئی تھی اور آنکھیں وال پیپر پر بنے کرتے آبشار پر لگی ہوئی تھیں۔ ایک نگاہ میں تو کسی مجسمے کا گمان ہوتا تھا۔

"چھوٹی دلہن"۔ ماما نے خوف و تعجب سے اسے چھوا۔ اب وہ لائے پاؤں سر پٹ بھاگی تھی۔ عالم تاب سامنے سے آتی نظر آ گئیں۔ وہ خود ماما ملی کے بدحواس انداز پر ٹھک کر بیٹھ گئیں۔

"کیا بات ہے ماما؟" وہ پریشان نظر آئیں۔ یادور علی خان کے اچانک چلے جانے سے یوں بھی ایک دھڑکا سادل کو لگا ہوا تھا۔

"بڑی نیگم! وہ چھوٹی دلہن پتا نہیں انہیں کیا ہو گیا ہے آپ چل کر دیکھیں۔"

”بہل میں“۔ ماما نے مختصر جواب دیا۔

”بہاؤ شاہؒ“ ڈمیروں ناکرہ گناہوں کے ملال ان کے قلب پر خون آشام جنگلی پرندوں کی طرح منڈلانے لگے۔
 ”بہاؤ شاہؒ“ ٹوٹ نہیں رہا۔“ وہ دھیمی آواز میں اس طرح مخاطب ہوئی جیسے اس حادثے میں اس کا اپنا قصور

”سید؟“ وہ لٹ۔ ”کیا یاد رہا آگئے؟“ ایک خیال بجلی کے کوندے کی طرح ان کے ذہن میں لپکا۔

”نہیں شاید اسی مدے سے“۔ وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی۔ اپنے مقام کا ادراک کرتے ہوئے اسے بات ادھوری

”کیا ہوا تھا؟ کب کی بات ہے؟“

ایک وہیں رکھ کر پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈال کر کھڑے ہو گئے تھے۔ پریشانی کی ایک ایک لہر ان کے چہرے سے

من

”ہاں جی، میں تو روشی بی بی کو دیکھنے لگی تھی۔ چھوٹی دلہن بہت سے کاغذ لئے بیٹھی تھیں۔ میں سمجھی، یاور خاناں کے کاغذ

ہاں ہیں۔ میں نے ان سے دو چار باتیں کی۔ وہ کچھ بولیں نہیں پھر میں نے انہیں دیکھا تو پھر بنی بیٹھی تھیں۔ میں

کر بڑی بیگم کو بلا لائی۔ وہ بولیں: یہ تو سکتے میں ہے۔ بڑی بیگم اور میاں خان (بڑے ابا) انہیں موٹر میں ڈال کر اسپتال

.....بیسیر خاناں بھی ساتھ ہیں۔ موٹروں ہی چلا رہے تھے۔

میں جب ٹیلی فون آیا تو باقی لوگ بھی اماں جی کے ساتھ چلے گئے۔ بوڑھے خان مغرب کی نماز کے بعد گئے تھے۔

۱۔ تفصیلی رپورٹ پیش کی۔

قالہ سولہ آنے کو بڑا تیز بخار ہے، وہ اوپر لیٹی ہیں۔“ ماما نے مزید بتایا۔

ہوں۔“ تیمور علی خان نے گہری سوچ میں ڈوبے ڈوبے ہنکارا بھرا۔

”بھابی کو اسپتال لے جانے کے بعد کوئی یاد اور بھائی کے بیڈروم میں گیا تھا؟“

انہی سچے ہوئے پوچھ رہے تھے۔

لبالب جان بھی اسپتال گئی ہیں؟“ تیمور علی خان نے قدرے چونک کر پوچھا۔

اکیس بیسیر خاناں کے ساتھ ابھی تھوڑی دیر ہوئی واپس آئی ہیں۔

بیمہ بھائی کہاں ہیں؟ آج ہی آئے ہیں کراچی سے؟“

یوہیک ہمارے کمرے میں پہنچا دینا۔ ہم بی بی جان کے پاس ہیں۔ اسپتال سے فون آئے تو ہمیں بتانا۔“ وہ نہایت

کے لیے کی طرف بڑھے تھے۔

اسے مکرے کا دروازہ چو پٹ کھلا ہوا تھا۔ اور وہ جائے نماز پر بیٹھی ہوئی باہر ہی سے نظر آ رہی تھیں۔

پھر بھی انہوں نے اخلاقاً دستک دی کہ شاید ان کے بہنوئی کمرے کے کسی حصے میں موجود ہوں۔
رئیسہ بیگم دونوں ہاتھوں میں چہرہ ڈھانپے بیٹھی تھیں۔ دستک پر چونک پڑی تھیں۔

تیور کو دیکھ کر ان کی نظریں جھک گئیں۔ جھکتی نظریں ہزار معنی رکھتی ہیں۔ بعض اوقات تو مقابل کمرے فرد کی قوت کو بلی سب کر لیتی ہیں۔

”ہم اندر آ سکتے ہیں۔“ وہ بہن کی آواز سن کر جلدی سے کسی نتیجے پر پہنچنا چاہتے تھے۔
”ہوں۔“ وہ بس ہوں کہہ کر رہ گئیں۔

”آپ اپنا کام پورا کر لیں۔ ہم بیٹھے ہیں۔“ وہ بظاہر اطمینان سے گویا ہوئے۔
”کر لیا ہے میں نے اپنا کام تم سناؤ کب پہنچے۔ ملاقات ہوئی یا ورے؟“
وہ جائے نماز کا کونہ موڑ کر ان کے قریب چلی آئیں۔

”ابھی آئے ہیں اب کیا ہوا ہے بی بی جان؟“ انہوں نے آدھے سوال کا جواب دے کر اپنی طرف سے سوال کر دیا۔
”بس اب تو کھیل ختم ہو گیا۔ اب تو بس نئے آغاز ہوں گے فی الحال تو دور تک پریشان نظر آتی ہے۔“
وہ بھائی کے پہلو میں بیٹھ کر نہایت دل گرفتہ انداز میں گویا ہوئیں۔

”کیا مطلب؟ ناز بھابی؟“ ایک خوفناک خیال سے ان کی جڑیں تک مل گئیں۔
”فی الحال تو موت سے لڑ رہی ہے۔“ وہ دکھ سے بولیں۔

”پھر۔ آپ کی بات کا کیا مطلب لینا چاہیے؟“ وہ بے قراری سے پوچھ رہے تھے۔

رئیسہ بیگم نے جیسے خود پر قابو پایا۔ ایک خیال یونہی اچانک آ گیا تھا جو سر اسر چھٹی حس کے تحت تھا۔
”بابا صاحب تو نہیں آئے ناں ابھی؟“ یہ سوال اسی خیال کے تحت تھا۔

”شاید نہیں۔“ تیور نے جلدی سے کہا جیسے کہہ رہے ہوں چھوڑیے اس بات کو اصل بات بتائیں۔
”ہوں۔ میرا خیال ہے رات ختم ہونے سے پہلے ناز کو ہوش آ جائے گا۔“

”آپ ہماری بات کا جواب دیجئے بی بی جان! دور تک پریشانی کیوں نظر آرہی ہے؟ ناز بھابی کی یہ حالت کیوں ہوئی؟
ہمیں پتا چلا ہے جب ان کی یہ حالت ہوئی تو وہ کچھ کاغذات لئے بیٹھی تھیں اور ان کے اسپتال جانے کے بعد صرف آپ ان کے کمرے میں گئی تھیں۔ کیسے تھے وہ کاغذات آپ نے اٹھائے ہوں گے۔ پڑھے بھی ہوں گے؟ بتائیے ہمیں۔“ وہ بہت قطعی اور ضدی لہجے میں بہن سے مخاطب تھے۔

رئیسہ بیگم بری طرح گھبرا رہی تھی۔ انہوں نے اپنے لاڈلے دلارے لائق فائق خوبرو وجہ بھائی کو سہی ہوئی نظروں سے دیکھا تھا۔ ان کی جان تو اسی دن سولی سر لنگ گئی تھی جب ان کی ماں نے بڑی بیٹی کی حیثیت سے انہیں شریک غم کیا تھا۔

”کچھ بھی نہیں،“ پچھلے سے ادھر ادھر اڑ رہے تھے۔ انگریزی تو مجھے کوئی خاص نہیں آتی۔ میں نے سمجھ کر بابا صاحب کو دے دیئے تھے۔“ وہ نظریں چرا کر کمزوری آواز میں گویا ہویا۔

”ہیں۔ معاف کیجئے گا۔ آپ کی بات پر یقین نہیں آیا۔ آپ کی ایک ایک بات سے ظاہر ہے آپ ہم سے کچھ چھپا رہے ہیں؟“ وہ ناراض سے انداز میں گویا ہوئے۔

”میں کیا چھپاؤں گی میری جان۔ میرے چاند۔“ وہ تیور کے کاندھے سے پیشانی ٹکائے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

تیور علی خان کی ساری اعصابی قوت ریزہ ریزہ ہونے لگی۔ انہوں نے بہن کو اپنے بازو کے حصار میں لے لیا۔
”آپ ہمیں بتادیں پلیز۔ جو کچھ بھی ہے ہم اطمینان سے سنیں گے۔“

”کچھ بھی نہیں ہے بس ناز کی طبیعت خراب ہے ناں تو دل بہت پریشان ہے۔“ وہ دوپٹے سے آنکھیں پونچھنے لگیں۔
”آپ ایسا کیوں کر رہی ہیں بی بی جان؟ جو بات آپ برداشت کر سکتی ہیں۔ کیا ہم نہیں کر سکتے؟“ وہ بے بسی سے گویا ہوئے۔

”جب کوئی بات ہی نہیں تو کیا بتاؤں۔ ناز کی وجہ سے۔“

”بی بی جان! ہم کوئی دودھ پیتے بچے نہیں ہیں۔ ٹھیک ہے جس کی وجہ سے ہمارے گھر کا سکون برباد ہوا ہے ہم ابھی آپ کے سامنے اسے خون میں نہلا دیں گے۔ آپ اسی خوف کے سبب حقیقت چھپا رہی ہیں ناں۔ تو دیکھئے۔“

انہوں نے دائیں طرف کی جیب (پینٹ کی) ہاتھ ڈالا۔ جدید وضع کا دلائی پستول ان کے ہاتھ میں چمک رہا تھا۔
رئیسہ بیگم ہائیں ہائیں کرتی رہ گئیں مگر انہوں نے اتنی پھرتی کا مظاہرہ کیا تھا کہ وہ بس بے بسی سے انہیں کمرے سے نکلتا دیکھتی تھیں اور پھر ننگے پاؤں ان کے پیچھے دوڑی تھیں۔

”تیور..... بات تو سنو۔“ مگر وہ آندھی طوفان کی مانند زینہ عبور کر گئے تھے۔ رئیسہ بیگم بھی شاید زندگی میں کبھی اتنا تیز لڑی ہوں گی۔

طرہ کے کمرے کا دروازہ لاکھٹا تھا۔ تیور علی خان نے وحشت بھرے انداز میں ایک فائر لاک پر کیا۔ پھر دوسرا کیا اور
”دروازہ کھولا۔ اتنے میں رئیسہ بیگم بھی ان کے قریب جا پہنچی تھیں۔“

طرہ پہلے فائر پر تو سمجھی نہیں تھی مگر دوسرے فائر پر اس نے سامنے کی دیوار کی طرف ایک شعلہ جذب ہوتے دیکھا تو بجلی
لٹری سے ساری صورتحال سمجھ گئی۔ ایک سرعت سے اس نے درتپے کے پٹ کھولے اور چوکھٹ پر ہاتھ جما کر اچکنے کی
اٹش کی مگر مضبوط گرل دیکھ کر جو جھٹکے کی شکل میں لگی ہوئی تھی۔ آنکھوں کے سامنے موت کا اندھیرا چھانے لگا۔

تیور کے پستول سے شعلہ نکلا اور اس کے بائیں شانے میں جذب ہو گیا۔

”تیور۔“ رئیسہ بیگم کے حلق سے ایک چیخ ابھری اس چیخ میں طرہ کی چیخ بھی شامل ہو گئی۔ ایسی دردناک چیخ کہ دل
ہل جائے سن کر۔

رئیسہ بیگم نے تیور کو دونوں بازوؤں میں دبوچ لیا۔

”اس ٹمک حرام کی وجہ سے میں تمہیں برباد نہیں ہونے دوں گی۔ تیور میرے شہزادے۔ میرا پیارا بھائی۔“

”چھوڑیئے بی بی جان آپ ہمیں۔“

”خان..... مجھے ایک موقع دیں۔ میں۔ آپ۔“

دوسرے یہ کہ تیمور اس طرح کھڑے تھے کہ مطربہ بھاگ کر کمرے سے باہر بھی نہیں جاسکتی تھی۔

☆.....☆.....☆.....☆.....☆.....☆

تیمور علی خان نے نہایت بے بسی سے اپنا ٹھپلا ہونٹ کاٹ ڈالا۔

انہیں کمزور پڑتا پا کر ریسیہ بیگم نے بڑی سرعت سے ریو الوران کے ہاتھ سے لے لیا۔ اور ماما کو مطربہ کی طرف اشارہ کر کے تیمور کو لے کر باہر نکل گئیں۔

”کچھ ہو جاتا تو اچھا تھا بی بی جان! اب یہ آگ ہمیں عمر بھر بے کل رکھے گی۔“ وہ نڈھال سے انداز میں کہہ رہے تھے۔
”اور جو ہمیں عمر بھر کے روگ لگ جاتے اس کا تمہیں ذرا خیال نہیں۔“ وہ شاکی انداز میں گویا ہوئیں۔
اچھا اب تم اپنے کمرے میں جاؤ۔ ہمیں اب اس کی فکر ہے۔ خون بہت بہہ رہا ہے۔ کہیں واقعی کوئی مسئلہ نہ ہو جائے۔“ وہ زینے کے قریب ٹھہر کر بولیں۔

تیمور علی خان دھیرے دھیرے زینہ طے کرنے لگے۔ ان کچال سے ان کا اپنا ذہنی خلفشار بہت واضح تھا۔
ریسیہ بیگم لائے پاؤں مطربہ کے کمرے میں واپس آئی تھی۔ ماما نے اسے بیڈ پر لٹا دیا۔ اور اپنا دوپٹہ پھاڑ کر بچے زخموں سے خون روکنے کی جدوجہد میں مصروف تھی۔

مطربہ بے ہوش ہو چکی تھی۔ اس کا زرد چہرہ آہستہ آہستہ سفید پڑتا جا رہا تھا۔ ریسیہ بیگم کے تو ہاتھوں کے طوطے اڑے جا رہے تھے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا پہلے باپ کو مطلع کریں یا کسی ڈاکٹر کو۔ ایک ڈاکٹر جو حویلی آتا تھا اس کا نمبر نہیں یاد نہیں تھا۔ عجیب طرح کی بدحواسی ان پر طاری ہو رہی تھی۔ روپا دیوی حویلی سے باہر تھی۔ جو مرد ملازم تھے وہ اس وقت کسی چوپال پر بیٹھے ہوئے تھے۔ حویلی کے اندریوں بھی انہیں بے تکلف آنے کی اجازت نہیں تھی۔

معائنہ کے ذہن نے بالکل درست کام کیا کہ وہ بابا صاحب کو مطلع کریں اور کہیں کہ وہ ڈاکٹر ساتھ لیتے آئیں۔
وہ بڑی تیزی سے ہال میں آئیں اور اس ہسپتال کا نمبر ڈائل کیا کہ وہ بابا صاحب کو مطلع کریں اور کہیں کہ وہ ڈاکٹر ساتھ لیتے آئیں۔

وہ بڑی تیزی سے ہال میں آئیں اور اس ہسپتال کا نمبر ڈائل کیا جہاں تازنین ایڈمٹ تھی۔ ایک ایک لمحہ پہاڑ محسوس ہو رہا تھا۔

حالانکہ اگلے دو منٹوں میں خان دلوار علی خان کی آواز ریور سے خارج ہوئی تھی۔

”بابا صاحب۔ میں ریسیہ۔ گھر سے بات کر رہی ہوں۔ آپ جلدی سے گھر آئیں۔ کسی ڈاکٹر کو ساتھ لے کر۔ وہ مطربہ کے گولی لگ گئی ہے۔“

”لگ گئی ہے یا کسی نے ماری ہے؟“

ان کی سپاٹ آواز ریسیہ بیگم کے کانوں سے ٹکرائی۔

خیر آ رہے ہیں ہم۔ تیمور کہاں ہے؟“ انہوں نے جیسے چونک کر پوچھا تھا۔

”وہ اپنے کمرے میں ہے۔ بس آپ جلدی آ جائیں۔“ انہوں نے ریور بے دھیانی میں پٹا اور تیز تیز چلتی ہوئی دایاں مطربہ کے کمرے میں آئیں۔

”ماما! خون تو بہت بہہ گیا ہے۔ کہیں“ وہ بولتے بولتے لرز کر خاموش ہو گئیں۔“

”دل دھڑک رہا ہے بی بی جان۔ میں دیکھ رہی ہوں برابر زخموں کے اوپر نیچے میں نے کس کے پٹیاں باندھ دی ہیں تا کہ خون نہ بہے۔ یہ دیکھیں۔“ ماما نے انہیں زخموں کی طرف متوجہ کیا۔ ”ہاں ہاں ٹھیک ہے۔ بہت ہمت دکھائی اس وقت تم نے وزن میرے تو اس وقت حواس جواب دے رہے ہیں۔ یا اللہ ہمارے حال پر رحم کرنا۔ بھلا کیا ملا ہے اسے چاروں طرف آگ لگا کر؟“ ان کی آواز بھرا گئی۔

”اس کو ہسپتال لے کر کون جائے گا بی بی جان؟“ ماما نے تشویش بھرے انداز میں اس پر نگاہ دوڑائی۔

”بابا صاحب ڈاکٹر کو لے کر آ رہے ہیں۔“ وہ نکھیں پونچھ کر گویا ہوئیں۔

”آپ نے انہیں گولی کا بتا دیا ہے۔ ناں؟ تاکہ ڈاکٹر انتظام کے ساتھ آئے۔“ ماما نے پوچھا۔

”ہاں ہاں بتا دیا ہے۔“ وہ پریشانی کے عالم میں بولیں۔

”پریشان تو نہیں ہوئے خان؟“ ماما نے دریافت کیا۔ وہ بہت مضبوط اعصاب ثابت ہو رہے تھی۔

”ہاں نہیں۔ اب فون پر کیا پتا چلتا ہے۔“ وہ کھوئے کھوئے انداز میں بولیں۔

ریسیہ بیگم بے قرار سے انداز میں کمرے سے باہر نکل گئیں۔

ماما مطربہ کے سر ہانے بیٹھ گئیں۔

چند لمحوں بعد ہی روپا دیوی، ماما کو ڈھونڈتی ہوئی بوکھلائی ہوئی کمرے میں آئی۔

گولی وجی اے اتانوں کی ہوساں ماما۔“

توسیریں کرتی پھر تجھے کیا۔ ہوش نہیں تجھے کہ حویلی خالی پڑی ہے۔ جیسی تو ہے ویسا تیرا مرد دونوں جانے کہاں گم رہتے ہیں۔“ ماما نے جھاڑ پلائی۔

”بابا نے دیسی اندروں گولی چلی اے۔ میں تے ڈوکروں دے گھر ٹھے لین گئی ساں ماما۔“ وہ مجرموں کی طرح سر جھکا کر بولی۔ اس نے دو بھیڑیں پالی ہوئی تھی۔ غالباً انہیں کے لئے چارالینے گئی تھی۔

مطربہ کے بستر پر خون دیکھ کر وہ خود ہی سمجھ گئی تھی کہ حادثہ کس کے ساتھ ہوا ہے۔

اچھا۔ اچھا۔ دیکھ خان آتے ہوں گے انہیں لے کر سیدھی ادھر آ۔“

ماما نے اسے روانہ کر دیا۔ جبکہ وہ ماما سے تفصیلات جاننے کے لئے بے چین ہو رہی تھی اور بہت فکر مندی سے مطربہ کی طرف دیکھ رہی تھی۔

”اے زندہ اے کی مر گئی؟“ وہ بہت احمقانہ انداز میں پوچھنے لگی۔

”خاک پڑ تیری عقل پر۔ بات کرنے کا ڈھنگ نہیں۔ زندہ ہے تو جا یہاں سے۔“ ماما کا دل کانپ کانپ گیا۔ سچ مج سے غصہ آ گیا تھا۔

روپا دیوی جلدی سے باہر نکل گئی۔

تقریباً آدھا گھنٹہ انتظار کے بعد بابا صاحب ڈاکٹر کے ہمراہ حویلی میں داخل ہوئے۔ باغ میں بچے آنکھ مچولی کھیل

رہے تھے۔ ان کا ٹیوٹر گرمیوں میں سب کو وہیں باغ ہی میں پڑھاتا تھا۔ کچھ دیر قبل ہی اس نے بچوں کو چھٹی دی تھی اور خود گھر سے باہر کھڑا ہوا تھا۔

دلاور علی خان نے اچنتی سی نگاہ اس پر ڈالی تھی۔ غالباً وہ اس کے چہرے پر کچھ پڑھنا چاہ رہے تھے۔

”منیر صاحب خیریت۔ آپ ابھی تک؟“

”جی خان۔ آج ادھر کوئی حویلی میں نظر ہی نہیں آیا۔ اجازت کے لئے آپ کا انتظار تھا۔ تیمور خاناں شاید آرام کر رہے ہیں۔“ اس نے مودبانہ انداز میں کہا۔

”ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔ جاؤ تم۔“ انہیں اس کی بے خبری کی طرف سے اطمینان ہوا۔ راہداری میں ریسیہ بیگم بڑی بے تاب سے ان کی راہ دیکھ رہی تھی۔ باپ کے ساتھ ڈاکٹر کو دیکھ کر فوراً چہرہ ڈھانپ کر آڑ میں ہو گئیں۔

”اپنے کمرے میں ہے وہ بابا صاحب۔“ وہ مطلع کر کے زینے کی طرف بڑھ گئی تھی۔ تیمور کے کمرے کے سامنے گزرتے ہوئے وہ ایک ٹائیپ کورکس پھر کچھ سوچ کر آگے بڑھ گئیں۔

بڑی کی طرف سے کسی اطلاع کا انتظار کر رہی تھیں۔ خالہ تو اماں جی کی خراب حالت کے پیش نظر ان کے ساتھ ساتھ نہیں۔ اماں جی کو سب ہی نے ہسپتال جانے سے منع کیا تھا۔ مگر وہ کیسے رک سکتی تھی۔ ان پر تو ایک قیامت نازل تھی۔

تیمور علی خان نے کھانا بھی نہیں کھایا تھا۔ بس فون سے لگے بیٹھے رہے۔ اب تک دونوں بہن بھائی مطربہ کے موضوع پر زنی بات نہیں کی تھی۔ ریسیہ بیگم نے البتہ یہ ضرور بتا دیا تھا کہ بابا صاحب مطربہ کو لے کر ہسپتال گئے ہیں جبکہ تیمور علی خان نے جواب میں یہ پوچھا تھا کہ ناز بھابی کی طبیعت کے بارے میں بابا صاحب نے کیا بتایا۔ ریسیہ بیگم کو یہ پوچھنے کا موقع ہی نہیں ملا تاہم وہ کیا جواب دیتیں۔

کتنی دیر دونوں بہن بھائی خاموش بیٹھے بس ایک دوسرے کے وجود کو محسوس کرتے رہے تھے تب کہیں جا کر رات پونے گیارہ بجے گاڑیاں حویلی میں داخل ہوئیں۔ وہ دونوں گاڑیاں رکنے کی آواز پر فوراً باہر آ گئے تھے۔

سب سے پہلے اماں جی خالہ سولہ آنے کے ساتھ اگلی گاڑی سے اترتی نظر آئیں۔ ریسیہ بیگم بیتابی سے ماں کی طرف بڑھیں۔

”کیسی طبیعت ہے اماں جی ناز کی؟“

”اچھی ہے۔ ٹھیک ہے۔ ہوش میں ہے۔“ وہ نڈھال سے انداز میں گویا ہوئیں۔

تیمور علی خان اتنا سنتے ہی آگے بڑھے اور ڈرائیور سے چابی مانگنے لگے۔

”بیٹے! کہاں جا رہے ہو۔ بہت رات ہو گئی ہے صبح چلے جانا۔“

وہ پلٹ کر تیمور علی خان سے مخاطب ہوئیں۔

”اسے روکو ریسیہ! کہیں ایسا نہ ہو، اسے دیکھ کر ناز کی حالت پھر بگڑ جائے۔“

وہ بہت کمزوری محسوس ہونے لگی تھیں۔

”تمہارے بابا صاحب آگئے کیا؟ پتا نہیں اسپتال سے ایک دم کہاں چلے گئے تھے۔“

”ہاں تیمور! اماں جی ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ رات ہو رہی ہے۔ صبح چلے جانا۔“

”یہ رات صبح کی نزاکتوں کا ماحول نہیں ہے بی بی جان۔ کمال لوگ ہیں آپ۔“

وہ جھلائے اور جھٹکے سے کار کا دروازہ کھول کر بیٹھ گئے۔ چونکدار نے گاڑی کی لائٹیں آن ہوتی دیکھ کر پھرتی سے پھانک

دا کر دیا۔ تیمور علی خان زن سے گاڑی لے اڑے۔ وہ سب دیکھتے رہ گئے۔

پہلے تو ڈاکٹر نے ان سے درخواست کی تھی کہ ابھی وہ مریضہ کے پاس نہ جائیں لیکن جب انہوں نے قطعی انداز میں کہا کہ وہ صرف انہیں دیکھنا چاہتے ہیں اور کوئی بات چیت کا ارادہ نہیں ہے تو تھوڑی سی پس و پیش کے بعد انہیں ناز کے کمرے میں جانے کی اجازت مل گئی۔

ڈاکٹر ابتدائی طبی امداد کے بعد فوراً ہسپتال میں ایڈمٹ کرنے کا مشورہ دیا تھا جسے یہ بتاتی تھی کھون بہت چکا ہے۔ ایک لمحے کو تو خان دلاور علی خان سوچ میں پڑ گئے۔ سیاسی صورت حال خاصی سخت جا رہی تھی۔ ایوب خان کی حکومت ختم ہو چکی تھی۔ یحییٰ خان مسند اقتدار پر متمکن ہو چکے تھے۔ ایک جرنیل گیا تھا دوسرا آ گیا تھا۔ سیاسی فضا بہت مبہم تھی اختیار و سونگ کا استعمال بہت احتیاط کا تقاضا کر رہا تھا۔ بیوروکریسی کے اہم مہرے جگہ بدل چکے تھے فوجی حکومت میں اثر و سونگ رکھنے والے بھی کم اعتماد ہو جاتے ہیں۔ اگر یہ ہوش میں آ کر کچھ بول پڑی؟ اب تو اسے انتقام لینے کا زیادہ اچھا موقع مل رہا ہے۔

”بہتر ہے کہ اسے مرنے دیا جائے۔ اس طرح قصہ ہی تمام ہو جائے گا۔ لیکن اگر یہ مر گئی تو اس کی خطرناک ورثہ جاگیر داروں کو کسی مصیبت میں نہ بھنسا دے۔“

انہیں بہت دور تک سوچنا تھا۔ وہ کم عمری سے جاگیر کا انتظام چلا رہے تھے۔ وہ کوئی پہلو نظر انداز نہیں کر سکتے تھے۔

جبکہ مطربہ تو ایک مسئلے کی شکل میں ثابت ہو چکی تھی۔

”کیا سوچنے لگے خان صاحب؟ جتنی دیر ہوگی اتنی مشکل ہو جائے گی۔“

ڈاکٹر انہیں سوچ میں ڈوبا دیکھ کر قدرے حیران ہوا۔ کہاں تو انہیں اتنی جلدی تھی کہ ایک منٹ کی تاخیر برداشت نہیں ہو رہی تھی۔

”ہوں۔ اللہ مالک ہے۔ اچھا اچھا چلے ہیں۔ ماما ہم نوکروں کو بھیجتے ہیں۔ تم روپا سے کہہ کر کوئی ہلکا پنک کمرے میں منگوا

لو اور اسے پنک پر لٹا دو اور چادر ڈال دو۔ وہ پنک اٹھا کر پورچ میں نے آئیں گے ہم اللہ بخش سے کہہ کر بڑی گاڑی نکلاوے ہیں۔“

وہ جھڑی نکاتے ہوئے راہداری کے موڑ پر غائب ہو گئے۔ ڈاکٹر ان کے پیچھے چل پڑا تھا۔ ریسیہ بیگم اوپر بالکنی میں ماما

وہ کمرے میں داخل ہوئے تو دیکھا، ناز چٹ لینی چھت کو گھور رہی تھی۔ ڈرپ لگی ہوئی تھی۔ نرس کرسی پر بیٹھی ایک ننگ دیوار کی سمت دیکھ رہی تھی۔ تیمور علی خان کو اندر داخل ہوتا دیکھ کر وہ چونک کر کھڑی ہو گئی۔

”آپ“

”جی۔ ہم۔ پریشن سے آئے ہیں آپ چاہیں تو یہیں تشریف رکھئے۔ چاہیں تو کمرے سے باہر جاسکتی ہیں۔“ وہ خشک انداز میں کہہ کر بیڈ کے نزدیک آ گئے۔

”کیسی ہیں بھابی آپ؟“

نازنین نے خالی خالی نظریں انکے چہرے پر لگا دیں۔ نظر کا انداز بتا رہا تھا کہ اس کا دماغ حاضر نہیں ہے۔ خاصی دیر خاموشی چھائی رہی۔

”کیا فیل کر رہی ہیں؟“ وہ بہت دھیمی آواز میں پوچھ رہے تھے۔ نازنین نے پھر ان کے چہرے کی سمت خالی خالی نگاہیں دوڑائیں۔

”اوکے۔ آپ آرام کیجئے۔ ہم یہاں کچھ دیر بیٹھتے ہیں۔ پھر چلے جائیں گے۔“ وہ کرسی پر بیٹھ گئے۔ نازنین۔ ان کی طرف اسی سابقہ انداز میں دیکھتی رہی۔ تیمور علی خان نے نظریں جھکا لیں۔ جانے کتنا وقت گزرا تھا دس منٹ یا پندرہ منٹ۔ بالآخر مسلسل خاموشی نے انہیں واپس جانے پر مجبور کر دیا۔ وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔

”اچھا ہم چلتے ہیں۔ صبح آئیں گے۔“ انھوں نے قدم بڑھا دیئے۔

”تیمور!“ وہ دروازے کے قریب پہنچے تو ناز کی آواز نے انہیں بری طرح چونکا دیا۔

”جی۔“ وہ نہایت تیزی سے اس کے بیڈ کے قریب دوبارہ آئے۔

”تیمور!“ اس کی آواز بہت آہستہ تھی۔

”جب انسانوں کے دلوں میں وسعتیں نہیں ہوتیں تو وہ اپنے گھر کا ماحول اس طرح کا کیوں بناتے ہیں؟ سگے بھائیوں سے بیوی کو پردہ کیوں نہیں کراتے۔ اندر اتنی بے اعتباریاں ہوتی ہیں تو ظاہر کیوں نہیں کر دیتے ایک لمحے میں باوقار عورت کو کتیا بنا دیتے ہیں۔ کیوں آئے ہیں آپ یہاں۔ ہم عدت میں ہیں۔ اتنی عمر دار عورتیں ہیں حویلی میں کسی نے نہیں سمجھایا آپ کو۔ حویلی کے اسی دو غلے پن نے آج ہمیں اس مقام تک پہنچایا ہے۔ وہ کلف لگا ہوا بیر و کریٹ یا وری علی خان اس سے اچھا تو وہ اصبطل کا جاہل سائیس ہے جس کی بیوی تنہا کھیت میں کام کرتی ہے۔ رات نہر سے پانی لے کر آتی ہے۔ گاؤں سے شہر کو تانگے والے کے ساتھ بچہ گود میں لے کر چلی جاتی ہے۔ فیضو پنساری کے ساتھ گھنٹوں باتیں بناتی ہے۔ اور وہ ہے کہ اس کے ناز اٹھاتے نہیں تھکتا۔ یہ اعتبار کے، اعتماد کے رشتے ہوتے ہیں تیمور علی خان ضمیر کی آواز کے بندھن ہوتے ہیں۔“

ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وہ دل و جان سے بھڑ آس نکال رہی ہے۔ تیمور علی خان تو پتھر کے بت کی طرف ساکت و صامت ہو گئے تھے۔ ہم عدت میں ہیں“ جیسے ہتھوڑے کی ضرب انکے دماغ پر پڑ رہی تھی۔

”کیا مطلب ہے آپ کا؟“ وہ بشکل گویا ہوئے۔

”مطلب بتانے کو حویلی میں لوگ کم ہیں؟ آپ چلے جائیں یہاں سے۔ یہ ہماری اور آپ کی آخری ملاقات ہونا چاہیے۔“ نازنین نے بازو آنکھوں پر رکھ لیا۔

”بھابی!“ وہ حیرت سے اسے دیکھنے لگے۔

”اب میرا آپ کا کوئی رشتہ نہیں۔ صرف آپ اپنے بھتیجے و بھتیجی کے چچا ہیں اور بس جائیے آپ یہاں سے۔“ وہ بے زار کن لہجے میں گویا ہوئی۔

”آپ ہم سے اس طرح کیوں بی ہو کر رہی ہیں۔ ہمارا کیا قصور ہے؟“ عظیم صدے سے وہ چور چور ہو گئے۔ آواز بشکل طلق سے نکل رہی تھی۔

قصور تو میرا ہے کن بے بصیرت لوگوں میں آپھنسی تھی۔ دیکھئے عظیم ذلت سے آنکھیں تک پتھر اگئیں۔ اب ان میں کوئی آنسو نہیں۔ واہموں نے اتار لایا کہ حقیقت پر رونے کو آنسو نہیں بچے۔ دیکھ رہے ہیں آپ میرا حوصلہ۔ کبھی بھائی سے ملاقات ہو تو کہہ دیجیے گا۔ قیامت کا قرض چڑھایا ہے۔ قیامت کے دن ہی اتاروں گی تب تک وہ میرے مجرم ہیں انشاء اللہ سکھ کی آس میں عمر تمام ہو جائے گی مگر سکھ نہیں ملے گا۔“

”بھابی!“

”اب اگر آپ نے مجھے بھابی کہا تو یہ گلاس توڑ کر اپنی رگ کاٹ لوں گی۔“

اس نے بہت پرسکون انداز میں دھمکی دی۔

تیمور علی خان بے بسی سے اس کی شکل دیکھنے لگے۔

”پھر کیا کہیں ہم آپ۔“ وہ کس قدر شکستگی سے پوچھ رہے تھے۔

”اپنے بھائی کی پسند کی کوئی گالی دیجئے۔“ وہ اذیت بھری آواز میں گویا ہوئی۔

”بھائی بھائی ہے۔ ہم۔ ہم ہیں۔ آپ بھی جانتی ہیں۔ یہ زیادتی ہے۔“ وہ تڑپ کر بولے۔

”تیمور! میں آپ کو خبردار کر رہی ہوں میرا ذہنی توازن بگڑنے والا ہے۔ کچھ ہو جائے گا۔ اس سے پہلے آپ یہاں سے چلے جائیں پلیز۔“

تیمور علی خان گھبرا کر باہر نکل گئے۔

پھر وہ کہیں ٹھکے بغیر پتھر سے بغیر تیزی سے اپنی گاڑی میں آ کر بیٹھ گئے۔

”ہو تو وہ سب ہو گیا۔ مطربہ۔ خوب نمٹیں گے تم سے۔ اور یاد رہے۔ بھابی تو بھابی۔ ہم بھی قیامت تک آپ کو معاف نہیں کریں گے۔ ہمارا آپکا آج سے کوئی تعلق نہیں۔ یاد رہے علی خان نام کا کوئی بھائی نہیں ہے۔ آپ نے بھابی کو نہیں ہمیں گالی دی ہے۔ ایسی بنگی گالی جس پر قتل جائز ہو جائے۔ ہم کوشش کریں گے کہ زندگی بھر آپکا چہرہ دیکھنے کے گنہگار نہ ہوں۔ اگر کبھی دیکھ لیا تو دوبارہ وضو کریں گے۔ بھائی ایسا نہیں ہوتا۔ جو ایسا ہوتا ہے وہ بھائی نہیں ہوتا۔“

تیمور علی خان کی رگ رگ میں آگ بھڑک اٹھی تھی۔

اماں جی کلچر تھا بٹھی تھیں۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ اب حد ہو گزری ہے اور انہیں کچھ ہونے والا ہے۔
روپا دیوی انہیں دودھ دینے آئی تھی۔ اور اپنی حماقت میں انہیں مطربہ والے حادثے کی اطلاع کر گئی تھی۔ انہوں نے
رئیسہ بیگم کو بلا بھیجا تھا۔ ان کی حالت غیر ہوئی جارہی تھی۔

رئیسہ بیگم تھکے تھکے قدموں سے ماں کے کمرے میں داخل ہوئیں۔

”آپ نے بلایا اماں جی؟“ وہ ماں کے قریب بستر پر بیٹھ گئیں۔

”ہاں۔ تم لوگ کیا ہمیں بچہ سمجھتے ہو جو اتنی اہم باتیں چھپاتے ہو۔“ وہ ناراضگی سے گویا ہوئیں۔

”ایسی تو کوئی بات نہیں اماں جی! آپ تو ویسے ہی پریشان تھیں۔ سوچا اور کیا پریشان کریں۔“ انہوں نے وضاحت کی۔

”تمہیں میری قسم۔ یہ بتاؤ وہ زندہ ہے۔ خون تو نہیں ہو گیا میرے بیٹے سے؟“ وہ بے قراری سے پوچھ رہی تھیں۔

”اللہ نہ کرے اماں جی۔ وہ تو شکر کریں گھر میں، میں موجود تھی۔ ورنہ تو تیمور پر واقعی خون سوار تھا میرے تو قابو ہی میں
نہیں آ رہا تھا۔“

وہ یاسیت سے بولیں۔

”تو اسے تم نے بتا دیا تھا کہ۔“ ان کی آواز بھرا گئی۔

”میں کیسے بتا سکتی تھی۔ باہر ماما ہی سے سوال جواب ہوئے تھے اسی سے اس نے کچھ نتیجہ نکال لیا ہوگا۔ پہلے تو مجھ سے
پوچھتا رہا پھر۔“ وہ بولتے بولتے رک گئیں۔

”پھر کیا؟“ اماں جی نے بے تابی سے پوچھا۔

”پھر کیا اماں جی۔ آگے تو آپ کو ہتا چل ہی گیا ہے۔“ رئیسہ بیگم جیسے تھکن سے چور چور تھیں۔

”سچ تو جائے گی ناں۔ گولی کہاں لگی۔“ وہ خوفزدہ انداز میں بیٹی کو دیکھنے لگیں۔

”بس۔ اللہ نے کرم کیا۔ میری کھینچا تانی میں نشانے خطا ہوتے رہے۔ بس ایک منٹ کی اگر دیر ہو جاتی تو۔ وہ تو پکا
نشانے باز ہے۔“ رئیسہ بیگم نے دھیمی آواز میں بتایا۔

”بتاؤ۔ ناحق کسی کا خون سر لگ جاتا۔“ اماں جی نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

”خیر ناحق تو نہیں۔ حشر تو س کا بہت برا ہونا چاہئے۔ چاروں طرف آگ لگا دی ہے۔ محسوس ہے۔ اللہ کرے مرنے دم
تک سکون کی سانس کو ترسے۔ زمیں اسے نہ قبولے۔ جنم جنم میں کیڑے پڑیں۔ بس یہ کہیں اللہ نے میرے بھائی کے گندا
خون نہیں لگایا۔“

”یوں نہ کو سو۔ پہنچ جائے گی اپنے انجام کو تم کیوں اپنی زبان خراب کرتی ہو۔ بدی کا تو یوں بھی انجام برا ہی ہے۔
قدرت کا اصول ہے۔“

اماں جی اپنی فطرت سے مجبور تھیں۔ دہل کر بیٹی کو ٹوکنے لگیں۔

”یہ بھی فطرت کا اصول ہے اماں جی! انسان کو دکھ پہنچتا ہے تو اس کے منہ سے پھول نہیں جھڑتے۔ تیرے بددعا میں ہی نکلتی
بے وقوفی پانے والوں کے لئے برباد ہو گئے ہم سب۔“ رئیسہ بیگم ناراض لہجے میں بولیں۔

اب مر بھی جائے تو ہمیں کیا فائدہ ہے؟ جو تباہی ہونا تھی وہ ہو چکی۔ ڈس لیا ناگن نے۔

رئیسہ بیگم پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ اماں جی اپنے آنسو روک کر بیٹی کی کمر سہلانے لگیں۔

”میری طرف بھی دیکھو رئیسہ! مر جانے کو جی چاہتا ہے۔ کٹ گئے سکھ کے دن۔ اب اندھیرے میں جانے کہاں تک چلنا
میری بیٹی میں بوڑھی ہوں۔ مجھے تو حوصلہ دو۔“

ان کی آنکھوں سے اشک جاری ہو گئے۔ رئیسہ بیگم ماں سے لپٹ گئیں۔ دونوں طرف طفیلیانی آگئی۔ یوں بلک بلک کر
بہاؤ گھر میں کوئی فوت گئی ہو گئی ہو۔

”ہم نہ گئے اماں جی!“ رئیسہ بیگم کی چیخیں نکل گئیں۔ ”اماں جی میرے بھائی۔ ہائے اماں جی میرے بھائی۔“ دونوں
بی بیں۔ آنسو پونچھنے والا کوئی نہ تھا۔

”ارے زیتون بانو۔ کیا مل گیا۔ تجھے۔ یا اللہ میرے کس گناہ کی سزا ہے۔“ اماں جی سسکیاں بھرنے لگیں۔

لانا کی کام سے کمرے میں آئی اور اٹنے پاؤں بھاگ گئی اور بصیر علی خان کے کمرے کا دروازہ۔ دھڑ دھڑایا۔ وہ چند
نہیں بعد اماں جی کے کمرے میں تھے۔ ان کی بیوی بھی ان کے پیچھے آنے لگیں۔ تو انہوں نے وہیں کمرے میں رکنے کی تا
ہی۔ ابھی ان کے اور حویلی کے درمیان بہت سے حجاب تھے۔ ان کے سامنے کھل کر باتیں نہیں ہوتی تھیں۔

”کیا بوابی بی جان۔ چپ ہو جائے۔ دیکھئے اماں جی کی حالت خراب ہو جائے گی۔“ انہوں نے بمشکل ماں بہن کو جدا
کیا۔

”لو کیا تمہیں نہیں پتا کیا ہو گیا۔“ رئیسہ بیگم کراہیں۔

”کمراس طرح بھی تو بات نہیں بنے گی بی بی جان۔“ وہ بہن کے پہلو میں بیٹھ گئے۔

”ہات تو بگڑ گئی میری جان اب نہیں بنے گی۔“

”بصیر علی خان کے شانے سے پیشانی ٹکا کر پھر رونے لگیں۔

”میرے بھائی عظیم دکھ، عظیم رسوائی۔ ذرا سوچو کیا ہو گیا ہمارے ساتھ۔“

”اس طرح پریشان ہونے سے بھلا کچھ ہو سکتا ہے؟ حوصلہ کیجئے۔ اماں جی کی طرف دیکھیے انہیں ہمت دلائیے بی بی
بی۔“

بصیر علی خان نے بڑی بردباری سے سمجھایا۔

”مطربہ کا بھی اتنا تصور نہیں ہے بصیر! جتنا کہ یاد رکھا ہے۔ بہت خود غرض ثابت ہوا ہے۔ قربانی کا جذبہ ہوتا تو بہت کچھ
نہ نہ لیتا۔ ہماری خاطر اپنے بچوں کی خاطر۔ اتنا بڑا قدم اٹھالیا۔ اسے کسی کا خیال نہیں آیا۔ اپنی بوڑھی ماں کا بھی
بہتر سے رو پڑیں۔“

بصیر علی خان کی قوت گویائی جیسے سلب ہو گئی۔ وہ بہن کا شانہ سہلانے لگے۔

”ساری جاگیر بہن رکھ کر بھی نقصان پورے نہیں ہو سکتے۔ ذرا سوچو بصیر۔“

”رہنہ یوں دہائی نہ دے بیٹی! میرا دل رک جائے گا۔ میری خاطر چپ ہو جا بیٹی اور مجھے کچھ ہو جائے گا۔“ اماں جی نے بڑی ہمت سے اپنے آنسو روکے۔

”دیکھو تیمور آتا ہوگا۔ خود کو سنبھالو۔ جانے کیا کہہ سن ہوئی ہوگی وہاں۔ کس حال میں گھر آئے۔ جاؤ تم اپنے کمرے میں۔ ماما سے کہنا تمہارے بابا صاحب آجائیں تو مجھے بتادے۔ پتا نہیں کس پریشانی میں ہوں گے۔ چلو اٹھو شاہاں بیٹی۔“ اماں جی کتنی ہمت کا مظاہرہ کر رہی تھیں۔ جس کی امید کسی کو بھی نہیں ہو سکتی تھی۔

”بصیر! تم تیمور کا راستہ دیکھو۔ بھائی کو سنبھالنا ہوگا بیٹے۔ بڑی گردش ہے اس پر۔“

”ٹھیک ہیں اماں جی! آپ فکر نہ کریں۔ ادھر بیٹھک میں ہوں میں۔ آپ آرام کیجئے آئیے بی بی جان۔ آپ بھی آرام کر لیجئے۔“

بصیر علی خان نے انہیں زبردستی اٹھایا تو وہ اٹھ کھڑی ہوئیں۔

اماں جی اپنی نماز کی چوکی کی طرف بڑھ گئیں۔ ان کی چال سے لگتا تھا گویا خود کو گھسیٹ رہی ہوں۔

بصیر علی خان بہن کو اپنے بازو کے گھیرے میں لے کر کمرے سے باہر نکل گئے۔

دروازے پر دستک ہوئی۔ اماں جی یہی سمجھیں کہ ماما روپا دیوی ہے۔ انہوں نے رخ موڑے بغیر ہی اندر آنے کی اجازت دی۔ وہ ہنور جائے نماز پر بیٹھی تسبیح پڑھ رہی تھی۔

دروازہ کھلنے کی آواز تو آئی مگر آنے والا کچھ بولا نہیں۔ کارپٹ پر قدموں کی چاپ تو محسوس ہوتی نہیں۔ وہ خود ہی بول پڑیں۔

”ہوں۔ کیا بات ہے آگے تیرے خان۔“

”ہم ہیں اماں جی۔“ تیمور علی خان کی آواز نہایت دھیمی اور افسردہ تھی۔

ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب اماں جی جواب میں متوجہ ہونے کے بجائے دوبارہ تسبیح پڑھنے میں مصروف ہو گئیں۔

وہ بے قرار سے انداز میں چوکی کے بالکل ساتھ کارپٹ پر بیٹھ گئے۔

”ایک تو آپ کے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے یوں محسوس ہوتا ہے گویا مسجد میں داخل ہو رہے ہوں۔ طبیعت خواہ مخواہ جھٹکا ہو جاتی ہے اور اگر اس پر آپ کلام نہ کریں تو آنے والے کی تو ہمت ہی جواب دے جاتی ہے۔ ناراض ہیں آپ؟“

تمہاری ہمت جواب نہیں دے سکتی۔ بڑی ہمت دی ہے تمہیں اللہ نے تم تیمور علی خان ہو۔ خوفناک درندوں پر گولی چلاتے ہو خنجر سے ان کا سینہ چاک کرتے ہو۔ ان کی کھال اتارتے ہو پھر اپنا خاص شکار کا کمرہ اس کھال سے سجاتے ہو۔

مرنے ہوئے شیر پر ٹانگ رکھ کر تصور کھینچتے ہو پھر اسے بڑی ساری بنا کر شکار والے کمرے کی دیوار پر لگاتے ہو میل جول اپنے تمہاری بہادری کی داد دیتے ہیں۔ تمہیں بہادر مشہور کرتے ہیں۔ تمہاری ہمت کیسے جواب دے سکتی ہے؟“

اماں جی ایوں نہ کریں۔ ظالموں کی اس بھیڑ میں آپ شامل نہ ہوں۔ پلیز اماں جی! ہم پر بہت بڑی مصیبت آئی ہے۔

”اتنا بڑا دکھ ہے دل چاہتا ہے خود کو شوٹ کر لیں۔“

اس سے زیادہ اماں جی میں برداشت کی طاقت نہیں تھی۔ انہوں نے بے اختیار ان کا سر اپنے سینے سے لگا لیا۔

”کیا ضرورت تھی اس پر گولی چلانے کی؟ قسم کھالی ہے میرے بیٹوں نے ماں کو جی بھر کے دکھ دینے کی؟“ وہ آنسو پیٹے ہوئے کہہ رہی تھیں۔

”آپ کو کیا معلوم ہمیں کتنا افسوس ہے اس کے زندہ بچ جانے کا۔“ وہ پھر اشتعال میں آنے لگے۔

”بیٹے! خون خون ہوتا ہے۔ ایسی باتیں نہیں چھپتیں۔ ایسی ہری بھری عمر ہے۔ اسے کال کوٹھری کے نام لگا دینا چاہتا ہے۔ آج پہلی جیسے بات نہیں ہے۔ مسلمانوں کا اتنا بڑا لیڈر اسے کس طرح گھیرا جس کے اتنے چاہنے والے ہیں۔ یاد نہیں مولانا مودودی کا معاملہ جاگیر دار بہت پہنچ والا ہوتا ہے مگر دشمن بھی ایسے ہی موقعوں سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ انسان کا خون رنا کوئی کھیل ہے۔ تم سے زیادہ لمبے ہاتھ ہیں اس کی ماں کے۔ اس ملک کا بادشاہ تک اس کا گانا سنتا ہوگا۔ مولانا کی قسمت اچھی تھی۔ ورنہ بہت بری طرح گھیرے گئے تھے۔ پھانسی لگا رہا تھا بادشاہ (صدر) ارے میں کس کس کے دکھ کو روؤں گی رحم کر دے حال پر۔ آگے پیچھے دکھ بچھ گئے ہیں۔ مگر میں قربان۔ اللہ نہ کرے میرے بیٹے مجھے اپنی جوانیوں پر رونے پیچھے بھڑ جائیں میرے منہ میں خاک۔“

ان کی آواز آنسوؤں میں بھیگی ہوئی محسوس ہونے لگی۔

”اماں جی! ہم انسان ہیں فرشتہ نہیں ہیں۔“

”بیٹے! بس مجھ پر رحم کرو۔ حد ہو چکی ہے اب۔“

”آپ کو کیا پتا آج تو سچ مچ مر جانے کو جی چاہ رہا ہے۔ جب ہمیں ناز بھابی نے کہا کہ انہیں آئندہ بھابی نہ کہیں۔ آپ کیا تائیں اماں جی؟“

ٹھیک ہی تو کہہ رہی ہے وہ۔ اب اس کے سامنے مت جانا۔ عدت شروع ہو چکی ہے اس کی۔ اس وقت بھی روک رہی تھیں آہ بیٹے! مجھے سہارا دے کر بستر تک لے چلو۔ ہر چیز گھومتی ہوئی محسوس ہو رہی ہے۔“

انہوں نے تیمور علی خان کا شانہ تقریباً دوپٹے ہوئے کہا۔ وہ ایک دم گھبرا گئے۔ ان کو سہارا دیا اور بستر پر لٹا کر جگ سے ہٹا کر باغیچہ میں لے گیا۔

”پانی پی لیجئے اماں جی۔“

اماں جی نے محض چند گھونٹ پئے اور دوبارہ تکیے پر سر ڈال دیا پھر گہرے گہرے سانس لینے لگیں۔

”تیور! دیکھنا تمہارے بابا صاحب آگے؟ اب تو بہت رات ہو گئی ہے۔ جانے کن حالوں میں ہیں۔“ وہ بدلت گویا ہوئیں۔

”بچا ہم دیکھتے ہیں۔“ جانے کس احساس کے تحت ان کی نظریں جھک گئیں۔ ”آپ کے پاس ماما کو بھیجتے ہیں۔ آپ کی طبیعت ٹھیک تو ہے ناں اماں جی؟“

”ہاں۔ میں ٹھیک ہوں تم اپنے باپ کی خبر کرو۔ جاؤ بیٹے۔“ وہ الجھن بھرے انداز میں کمرے سے باہر نکلے تھے۔

حویلی میں اگر انجان آدمی داخل ہوتا تو پہلا تاثر یہ ہوتا کہ یہاں کوئی نہیں رہتا۔

سجا سجایا باغ، تراشیدہ گھاس پھولوں کے تختے، گھنے سایہ دار درخت۔ سفید سنگ مرمر کے برآمدے دستوں چنگے ہوئے جیسے ابھی دھوئے گئے ہوں۔ سیاہی مائل جم جم کرتے ہوئے دروازے جو مختلف سمتوں اور گزرگاہوں کا پتہ دیتے محسوس ہوتے تھے۔ سرخ بجری والی گزرگاہ جو شاندار پورٹیکو تک جا کر تمام ہوتی تھی۔ شام کا سلوانا پن بڑھتے ہی برقی روشنی کا نہایت خوبصورت اور مرتب سلسلہ۔ صفائی اتنی کہ تنکا پڑا نظر نہ آئے۔

اس کے باوجود اتنی گہری خاموشی اور ویرانی تھی کہ بعض اوقات مکینوں کے دل وحشت سے پھڑپھڑانے لگتے تھے۔ روشن مستقل طور پر حویلی آگئی تھیں۔ ان کے شوہروں کہیں سینٹ فیکٹری لگا رہے تھے۔ وہ اپنی دونوں بیٹیوں روٹی اور لالی (جو گود میں تھی) کے ساتھ وہیں آگئی تھیں۔ اس میں اماں جی کے اصرار کا بھی بہت دخل تھا۔ تزئین اپنے شوہر کے امریکہ چلے جانے کے بعد خاص طور پر دونوں بچوں شیو اور حماد کو لے کر معمول کے انداز میں آگئی تھیں۔ انہیں کیا خبر تھی کہ کن قیامت کی گھڑیوں میں انہوں نے حویلی میں قدم رکھا ہے۔

ہر طرف ہڈ کا عالم محسوس ہوتا تھا۔ ہنسی تو بڑی بات تھی مسکراہٹیں تک گم ہو گئی تھیں۔ ہر فرد یوں کان دبائے پھرتا نظر آتا تھا جیسے کوئی جرم کر بیٹھا ہو۔ کھانے کے وقت ابتدائی مرحلہ جو بچوں کے سلسلے میں ہوتا صرف اس وقت کچھ چہل پہل اور شور محسوس ہوتا تھا۔ بچوں کے کمرے میں گھنٹے ہی پھر سکوت طاری ہو جاتا تھا۔ صرف برتنوں کی کھڑپڑ باقی رہ جاتی تھی۔

مطربہ کے بارے میں خان دلاور علی خان کسی سوال کا جواب نہیں دیتے تھے۔ نازنین کمرے میں محصور ہو کر رہ گئی تھی۔ ہر کوئی اس کے پاس جاتے ہوئے ڈرتا تھا۔ باری کوروشی آراہی سنبھال رہی تھیں۔

تیور علی خان دن کی روشنی میں دکھائی نہیں دیتے تھے۔ وہ چند دنوں کے لئے لندن جانا چاہتے تھے۔ مگر بابا صاحب نے اجازت نہیں دی بلکہ بہو کو خود فون کر کے تسلی دے دی تھی۔

یاد علی خان ہنوز لاپتا تھے۔ خالہ سولہ آنے کے سردتے کی کٹ کٹ سنائی نہیں دیتی تھی۔ نہ وہ کسی کے پاس بیٹھی رکھائی دیتی تھیں۔

ان ہی وحشتوں میں عدت کے دن گزرتے رہے صرف ماما بی بی نازنین کے کمرے میں آتی جاتی تھی۔ یا اماں جی۔ تین چکر لگاتیں تھیں مگر وہ بالکل خاموش رہتی تھی۔ لہذا وہ تھک کر واپس آٹھ آتی تھیں۔ ان کی اپنی طبیعت گری گری رہتی تھی۔

نہ بھی باں بیٹیاں اکٹھی بھی ہو جاتی تھیں تو یوں خاموش رہتی تھیں گویا خاموشی کے راستے ایک دوسرے کے حال سے بہت حاصل کر رہی ہوں۔

اماں جی کی سرو آہیں انہیں کوئی بات کرنے سے روک دیتی تھی۔

ہاں جب ان کے درمیان اماں جی نہیں ہوتی تھیں تو جی بھر کر مطربہ کو کوستی تھیں رئیسہ بیگم تو باقاعدہ کوستے ہوئے آچل پھلانی تھیں۔ پھر بری طرح رو پڑتی تھیں۔

درد و رنج اس ویرانی اور خاموشی کا تو نظر نہیں آ رہا تھا۔ زندگی گویا ایک جگہ ٹھہر گئی تھی۔

بہن کی عورتوں کی آمد و رفت نہ ہونے کے برابر رہ گئی تھی۔ مہمانوں کا آنا بہت کھلنے لگا تھا عارضی مہمان داری ایک عین بن جاتی۔ حویلی کا ہر فرد چاہتا تھا کہ گھر میں مہمان نہ آئیں۔

عدت ختم ہونے میں چند دن باقی رہ گئے تو بابا صاحب نے ایک رات تیور علی خان کو بلوا بھیجا۔ کافی دنوں بعد دونوں پہلے ایک دوسرے کے آئے سامنے تھے۔ خان صاحب اس حادثے کے بعد کھانا اپنے کمرے ہی میں کھا رہے تھے۔

”جی؟“ تیور علی خان کا سر مجرم کی طرح جھکا ہوا تھا۔

”ابھی تک ناز کے والدین کو اس حادثے کی اطلاع نہیں پہنچائی۔ اب تم سے مشورہ کرنا ہے۔ کہ اب کیا اسٹیپ لیا جائے۔“

”ان کے کوئیکٹ کا انتظار کر لیں۔ جو ہم سب میں عالم فاضل ہیں۔“ تیور علی خان گویا پھٹ پڑے۔

خان صاحب دایاں ابرو چڑھا کر جھکا سر اٹھائے بغیر نظریں اٹھائیں اور بیٹے کے چہرے کا جائزہ لیا۔ اور چند ثانیے انڈر رہے۔

”اس طرح مسئلوں کے حال نہیں نکلتے۔ اب کچھ سوچنا ہے۔ کچھ کرنا ہے تیور!“

”میرے کچھ کرنے کی تو اب اس مسئلے میں گنجائش نہیں ہے۔ آپ بتائیے آپ کیا کرنا چاہتے ہیں۔“

انہوں نے ناگواری پر قابو پا کر باپ کی بات کاٹ دی۔

”تمہارا کیا خیال ہے۔ منیب احمد کو اس حادثے سے مطلع کر دیا جائے۔ ان کے اس دوران میں دو تین فون آچکے ہیں۔

انہوں نے ناز کو نہیں بتایا۔ ہر مرتبہ عالم تاب ہی کی ان سے بات ہوئی۔ اس نے کہہ دیا ناز یا اور کے ساتھ سیر کرنے سوات گئی ہے۔ ہمارا خیال ہے ناز۔ اب ان سے خود بات کرنا چاہیے گی۔“

”اتنا کہہ کر خاموش ہو گئے جیسے کچھ سوچنے لگے ہوں۔“

”ظاہر ہے وہ انہیں یہی اطلاع دینے کے لیے فون کرے گی۔“

”پھر خاموش ہو گئے۔ تیور علی خان بات آگے بڑھنے کا انتظار کرنے لگے۔“

”فعلی ممکن ہے کہ اس کے بعد وہ بچوں کو لے کر یوگنڈا چلی جائے۔ اور ہم چاہتے ہیں کہ بچے حویلی سے باہر نہ جائیں۔“

”نہ کے وارثوں میں ہیں۔“

اور ہم یہ بھی نہیں چاہتے کہ ہمارے وارث کی ماں باہر کے کسی آدمی کے ساتھ دوسرا نکاح کرے۔ وہ پڑھے ہوئے سمجھدار لوگ ہیں اس بات کا ہمیشہ خطرہ رہے گا کہ وہ قانون کے راستے سے بچے حاصل کرنے کی کوشش کریں گے۔ پھر ہم بچے حویلی سے باہر نہیں چانے دیں گے۔

ہم اپنے خون کو در بدر نہیں ہونے دیں گے۔“

وہ اتنا کہہ کر پھر خاموش ہو گئے اور سوچ میں پڑ گئے۔

”ہاں تو ٹھیک ہے۔ بچوں کے نامی گرامی والد کو آنے دیجئے ان کا انتظار کیجئے۔ دن رات قانون دانوں کے ساتھ کیے ہیں۔ بڑا ہی صائب مشورہ دے سکتے ہیں آپ کو۔“

تیمور علی خان تلخی سے گویا ہوئے۔

”یہ جلتے پھولے پھوڑنے کا وقت نہیں ہے تیمور! حقیقت کا سامنا اور مقابلہ کرنے کا وقت ہے۔“

”آپ کے خیال میں ہم کیا رول ادا کر سکتے ہیں؟“ وہ جیسے زچ ہو کر پوچھ رہے تھے۔

پھر ایک بے معنی خاموشی دونوں کے درمیان حائل ہو گئی۔

”ہمارے ہاں پیچھے۔ بزرگوں کی دودھن تین بیویاں رہی ہیں۔ مرد جوان ہو، غنی ہو تو بہت آسانی سے دو بیویاں بنا سکتا ہے۔“

بہت مشکل بات تھی بہت مشکل سے کہی تھی۔

تیمور علی خان نے بے تحاشا چونک کر باپ کی سمت دیکھا۔ جیسے انہیں سماعت کا دھوکا ہوا ہو۔ ان کی تو گویائی ہی سلب ہو گئی۔

”ہم نے بہت سوچا ہے تیمور۔ بڑی راتیں جاگ کر سوچا ہے۔ دیکھو۔ بہو کے ساتھ زیادتی کی حد ہو گئی ہے۔ ہمیں مداوا کرنے کی کوشش کرنا چاہیے۔“

”کیجئے بابا صاحب! ضرور مداوا کیجئے۔ مگر ہم بھی اتنے ہی بے تصور ہیں جتنی کہ ناز بھابی۔ آپ تو کم سے کم ہمارے ساتھ زیادتی نہ کیجئے۔“

وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔

”بیٹے بات سمجھنے کی کوشش کرو۔“ خان صاحب نے بڑی نرمی سے کہا۔

”بابا صاحب! ہمارا جی چاہ رہا ہے۔ ہم بھی یاد اور بھائی کی طرح لاپتہ ہو جائیں۔ پلیز بابا صاحب بھائی کی چھوڑی ہوئی کسر میں آپ شریک نہ ہوں۔ ورنہ ہمیں آپ سے عمر بھر کے لئے شکایت ہو جائے گی۔ جو کچھ ہوا ہے، وہ بھی رسوائی کی بات ہے اور جو آپ کہہ رہے ہیں یہ اس سے بھی بڑی رسوائی ہے۔ مفادات سے ہٹ کر ذرا سکون سے سوچیے۔ مفادات انسانوں کے لئے نہیں ہوتے۔ ہمیں آپ کی بات سے کتنا دکھ ہوا ہے۔ ہم بیان نہیں کر سکتے۔ ہمیں اجازت دیجئے اور یہ وعدہ بھی کیجئے کہ آئندہ آپ ہم سے اس طرح کی کوئی بات کبھی نہیں کریں گے۔“

”بیٹے جاؤ تیمور!“ دلاور علی خان کی آواز میں تحکم تھا۔

تیمور علی خان نے بے بسی سے باپ کی شکل دیکھی۔

”تم اپنی عمر کے حساب سے ٹھیک ہو مگر ہماری بات بھی نظر انداز نہیں کی جاسکتی نہ ناز حویلی سے باہر قدم رکھے گی اور نہ بچہ۔ تم غلط ہو نہ یاد۔ جو مجرم ہے۔ ہم اس کا بندوبست کر چکے ہیں۔“

”یہ رشتہ بہت حساس، بہت نازک ہوتا ہے تیمور! اعتبار کی اینٹیں چنتے چنتے بازو شل ہو جاتے ہیں۔ اس کے باوجود ایک بے رحم ہو جاتا ہے۔“

بارخ بختانی ہے کہ بہت سی اطلاعات مشکوک سمجھ کر نظر انداز کر دی جاتی ہیں مگر اس طرح کی افواہ پر زمانے کو اعتبار کرنے کی بڑی جلدی ہوتی ہے۔

ہماری طرف دیکھو تیمور! پرکھوں کی محنت ٹھکانے لگ رہی ہے۔ ہمارا سکھ چین حرام ہو چکا ہے۔“

”اس کے باوجود آپ اس کی جان بچا رہے ہیں۔ شکاری کتے چھوڑیئے آپ اس پر ہمارے گلے پر پھندا کیوں کسا ہے۔“

”ہم نے جو کہنا تھا کہہ دیا۔ اس لیے نہیں کہنا تم سے تمہارا فیصلہ آج ہی سنیں۔ تم غور کرو۔“

ہم وقت دے رہے ہیں۔ پھر بات ہوگی۔ تم جاسکتے ہو۔“

خان دلاور علی خان نے حقے کا پائپ منہ سے لگا کر گویا زبان بندی کا اشارہ دیا۔ تیمور علی خان نے بے بسی سے باپ کو دیکھا ایک گہری سانس کھینچ کر کمرے سے باہر نکل گئے۔

انہیں ایسا لگا جیسے صحیح کی مصیبت میں اب گھیرے ہوں۔ جی تو چاہ رہا تھا۔ اماں جی کے سامنے جا کر بے مکان بولیں۔ بل کی بھڑاس نکالیں۔ زیادتی در زیادتی پر دہائی دیں۔

انکے ہی خیال نے سارے جھاگ بٹھا دیے۔

”علی دورخی، دولخی زندگی۔ جب ہم بنیاد سے، اندر سے ابھی وہ نہیں جو اپنے ظاہر سے دکھائی دیتے ہیں تو ایسا تو ہو سکتا۔ ابھی تک یہاں عورت اتنی کمزور و کمکی سمجھی جاتی ہے جسے ابھی تک خواہش کی تکمیل سے لے کر نسوانی پندار کا نصاب از بر ہوا۔ نا قابل بھروسہ بے وقوف جذباتی۔“

”ابھی یہاں عورت کو وہ اعتماد ہی کہاں دیا گیا ہے۔ اس کی نگرانی کی جاتی ہے کہ وہ خاندان کی عزت پامال تو نہیں کر رہی؟ اسے یہ اعتماد دے کر پروان نہیں چڑھایا جاتا کہ دوسرے اس کی نگرانی کیوں کریں؟ وہ اپنی نگرانی خود کیوں نہ کرے۔“

”سوچیں نہیں یقین دلایا جاتا کہ سوسائٹی میں حیثیت، عزت حاصل کرنے کا اسے بھی اتنا ہی اختیار و حق ہے جتنا مردوں کو۔“

”نہ صرف اور پندار اس کا بھی اتنا ہی اہم ہے جتنا مرد کا۔ ہم اپنی عورت کو تعلیم دیتے ہیں اعتبار نہیں دیتے۔ اس کی نگرانی سنسنی میں اس کی حفاظت کرتے ہیں۔ اس کی طرف سے چوکس رہتے ہیں۔ کہیں کوئی اس میٹھی گولی کو چپکے سے نگل نہ لے۔“

اس کو یہ شعور۔ یہ مان کیوں نہیں دیتے کہ وہ اپنی عزت نفس کی حفاظت کے معاملے میں تمام خیر خواہوں سے زیادہ محتاط اور حساس ہے۔ انسان خود سے زیادہ کسی کو نہیں چاہتا۔ اس لیے اپنے پندار اپنی عزت نفس کا معاملہ اس سے بہتر کوئی دوسرا کیسے طے کر سکتا ہے۔

اس حقیقت کا ثبوت وہ دلیل یہ ہے کہ پھر یہ جذباتی اندھیرے کیوں آتے ہیں۔ خون خون سے دھاندلی کیوں کرتا ہے؟ نگرانی دہرے کے باوجود رفاہی و فلاحی اداروں کے باہر چھو لے کیوں لگا جاتے ہیں۔ جیتی جاگتی زندگی کو سفاکی کی بیخود چڑھانے سے بچانے کے لیے یہ اقدام کیوں کیے جاتے ہیں؟

تربیت یہ نہیں کہ دوسرے نگرانی کریں۔ تربیت یہ ہے کہ اپنی نگرانی انسان خود کرے۔

ابھی ہم نے اپنی عورت کو یہ اعتماد نہیں دیا۔ اس لیے جب چاہیں اسے نگلی گالی دے دیتے ہیں۔ اس کا حوصلہ توڑ دیتے ہیں۔ اس کا اعتماد چھین لیتے ہیں۔

دوسروں کی دیکھا دیکھی ہم اپنی عورت کو پڑھا رہے ہیں۔ اکیلا نکلنے کی اجازت دے رہے ہیں۔ اس کی گردن صاف ہوتے دیکھ رہے ہیں۔ اور اپنے شعور کی گرد پر دھیان نہیں۔

جب عورت پر اس طرح کی الزام تراشی ہوتی ہے۔ ہم پہلی فرصت میں یقین کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ کہ ہم نے ابھی تک اس حقیقت کو دل سے تسلیم نہیں کیا۔ یہ بھی اس کائنات کا باشعور اور انتہائی اہل جز ہے۔

یہ دوغلی زندگی کا عذاب ہے۔ حویلی میں ابھی پر اعتماد، اعلیٰ تعلیم یافتہ عورت کی جگہ نہیں بنی۔ اور اس وقت تک نہیں بنے گی جب تک ادھر کے مرد یہ امر تسلیم نہیں کر لیتے کہ باشعور عورت عام عورت سے زیادہ مضبوط اور صاحب پندار ہوتی ہے۔

یہ دہری سوچ کا عذاب ہے۔ اندر کی کشمکش کا نتیجہ ہے۔ وہ گہرا تجزیہ کرتے کرتے اپنے کمرے میں پہنچ گئے تھے۔

کو تا ہی اپنی جگہ حقیقت اپنی جگہ۔ بابا صاحب نے انہیں نئے عذاب کا راستہ دکھایا تھا۔ اتنی مشکل بات نہایت آسانی سے کہہ گئے تھے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ سنی ہوئی بات کس طرح ذہن سے کھرچ ڈالیں۔ اور پرسکون ہو جائیں۔ یہ

دل تو ان کی طاقت سے زیادہ محسوس ہو رہی تھی۔ وہ اس بات پر ہچکچاتے رہے تھے کہ ایک عمر دیا غیر میں بسر کرنے کے بعد وہ

یہاں آئے کیوں؟

افیت سلسلہ دار بڑھ رہی تھی۔ کوئی ایسا حل نہیں تھا جس سے حالات معمولات پر آنے کا امکان روشن ہو۔

وہ اب سو نہیں سکتے تھے۔ کبھی کتابیں ٹٹولنے لگتے۔ کبھی درتے تھے میں آن کھڑے ہوتے۔

”توبہ توبہ۔ رسوائی سی رسوائی ہے۔ اس سے تو بہتر ہے کہ اسی رسوائی کو برداشت کر لیں۔“

اماں جی نے پھڑکتے کلیجے پر ہاتھ رکھ کر بے اختیار کہا تھا۔

”ریشہ کی ماں۔ وہ ابھی کم عمر ہے۔ اللہ نے شکل اچھی دی ہے۔ باپ کے پاس پیسے کی کمی نہیں۔ اگر وہ یہاں سے جاتی ہے تو اس کے ماں باپ ہر صورت اس کا نکاح کریں گے۔ ہمارے ہاں جو عورت آتی ہے پھر وہ غیر خاندان میں نہ

جاتی ہے۔ اگر وہ بچوں کو ساتھ لے گئیں؟ ہمارے بچے دوسرا مرد پالے گا۔ ہرگز نہیں۔ ہم اپنے بچوں کو درد بردہ نہیں ہونے دیں گے۔“ ان کا انداز قطعی تھا۔

”دیا کیا کہے گی۔ ایک بھائی نے طلاق دی، دوسرے نے نکاح کر لیا۔ اس مشکل کو سمجھیں۔“

اماں جی کی آواز کمزور اور لرز رہی تھی۔

”اب کیا مصلحتوں کی خاطر اپنی اولاد کو گنوا دیں؟ کسی غیر مرد کے حوالے کر دیں۔“

”میں یہ ذلت بھری زندگی نہیں جی سکتی خان صاحب۔ دعا کریں اللہ میرے پردے ڈھک لے۔“ وہ رونے لگیں۔

”آپ صورت حال سمجھنے کی کوشش کرو ریشہ کی ماں۔ بڑا نازک، بہت مشکل وقت ہے۔“

”یہ بڑی شرم کی بات ہے خان صاحب۔ تیور بھی اس پر کبھی راضی نہیں ہوگا۔“ وہ روتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔ ”یاور

کس مشکل میں ڈال دیا ہے تم نے ہمیں۔“

”یہ کڑا وقت ہے اس میں بڑا حوصلہ چاہئے۔ آپ عورتیں بہت چھوٹے دل کی ہوتی ہو۔ دور تک نہیں دیکھ سکتیں۔ دور

تک کی سوچ ریشہ کی ماں۔“ دلاور علی خان نے نرمی سے سمجھایا۔

”نکاح کے بعد ہم اسے سرائے بھیج دیں گے۔ یہاں رکھیں گے۔ آپ اس تک ہماری بات پہنچاؤ۔ اسے اونچ نیچ

سمجھاؤ۔ ساتھ میں یہ بتاؤ کہ ہم اسے اس صورت میں یہاں سے جانے دیں گے جب وہ دوسرا نکاح نہ کرنے کا وعدہ کرے۔

ہر دو صورتوں میں ہم اسے بچے ساتھ لے جانے نہیں دیں گے۔ بلکہ اسے یقین دلاؤ کہ ہم اس کے ہمدرد ہیں۔ ہمارے بیٹے

نے اسے جو زخم لگایا ہے۔ ہم اس پر مرہم رکھنا چاہتے ہیں۔ اسے اپنا سمجھتے ہیں۔ اس کے تحفظ اور بہتری ہی کے لیے یہ سب

کرنا چاہتے ہیں۔“ وہ مزید گویا ہوئے۔

”میں تو اسے اپنی بیٹی ہی سمجھتی ہوں۔ اسے اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھنا چاہتی ہوں۔ اسے ایک نظر میں یاد رکھنے کے لیے

پند کیا تھا۔ میں کب چاہتی ہوں کہ وہ یہاں سے جائے آپ اسے دیکھیں گے تو پہچان نہیں سکتے۔ میرا کلیجہ پھٹتا ہے۔ مجھ

سے بات تک نہیں کرتی۔ میں جاتی ہوں تو سوتی بن جاتی ہے۔ میرے دکھ کا اسے یقین نہیں آ سکا نہ وہ حساب کر سکتی ہے۔

جب وہ مجھے دیکھ کر منہ موڑتی ہے تو برچھی سی دل پر پڑتی ہے۔“

اماں جی کی آواز پر آنسو غالب آ گئے۔

ایک ٹائیے کو دلاور علی خان بھی گم صم سے نظر آئے۔

”اگر آپ سے یہ کام نہیں ہو سکتا تو ریشہ یا عالم تاب سے کہو۔ وہ بات کریں گی۔“

انہوں نے دوسرا حل بتا دیا۔

”بے کار ہے وہ نہیں مانے گی۔“ اماں جی آنکھیں پونچھنے لگیں۔

”ہم منوالیں گے۔ ہم کوئی کھلونا نہیں ہیں کہ بیٹے بہویں ہم سے کھیلیں۔ یہی سوچا ہے یہی ہونا چاہیے۔ جو بیٹا ہم سے

اختلاف کرے، وہ جاگیر چھوڑ دے۔ بہت ہو چکا۔ یا تو یہ ہو جو ہم نے سوچا ورنہ کوئی ہم سے تعلق نہ رکھے۔“

خان دلاور علی خان۔ اب مزید ضبط سے کام نہ لے سکے اور اپنی حاکمانہ وضع پر واپس آ گئے۔ نازک سی اماں جی دہل کر رہ گئیں۔

”اس حادثے سے پہلے تک کی ہماری نرمی مصلحت تھی اور مصلحت یہ تھی کہ یہ حادثہ نہ ہو۔ مگر حادثہ ہو چکا ہے۔ اب آپ احکامات کی تعمیل کرائیے۔ بس۔“

خان دلاور علی خان اس وقت پوری طرح جلال میں آ گئے تھے۔ اماں جی کھڑی ہو گئیں۔

”ٹھیک ہے۔ میں آپ کی بات پہنچا دیتا ہوں۔“

”پہلے اونچ نیچ اور مصلحت بتاؤ۔ نہ مانے تو صرف ہمارا حکم سناؤ۔ جس کو ہمارے فیصلے سے اختلاف ہو، وہ حویلی چھوڑ دے۔ اس کا ہم سے کوئی تعلق نہیں۔“

منجائش رکھ کر بات کیجئے خان صاحب۔“ اماں جی لرز کر بولیں۔

”ختم ہو گئی منجائش۔ الفتنة الا کبر من القتال (فتنہ قتل سے بڑا جرم ہے) یہ اللہ کا فرمان ہے۔ ہم ایک فتنے سے گزر رہے ہیں۔ حادثہ برا ہے۔ بڑے حوصلے سے بڑے فیصلے کرنے ہیں یہ کل کے بچوں کی بات نہیں اب آپ جاؤ اور جیسا ہم نے کہا ہے ویسا کرو۔“

وہ فون نزدیک سرکا کر کوئی نمبر ملانے لگے۔

اماں جی چل پڑیں۔ قدم من من بھر کے ہو رہے تھے۔

رئیسہ بیگم کی تو ہمت نہیں پڑی تھی ناز کے پاس جانے کی کہ وہ یاد رکھی بہن تھیں اور ڈرتی تھیں کہ بھائی کی طرف سے اس طرف جو غبار ہے وہ ان پر نہ ڈال دیا جائے۔ اور تلخی نہ بڑھ جائے۔

لہذا عالم تاب تنہا کمرے میں آئی تھیں۔

ناز روشانے کو کاٹ میں لٹا رہی تھی۔ ابھی ہوئی چوٹی سے ظاہر تھا کہ کئی دنوں سے سر میں کنگھی نہیں ہوئی۔

اس نے دروازے کھلنے کی آواز پر گردن موڑ کر دیکھا تھا۔ مگر بولی کچھ نہیں۔ عالم تاب چپ چاپ اس کے بستر پر بیٹھ گئیں۔

”آپ کو ابھی بلوانے ہی والی تھی بھابی بیگم!“ وہ بے تاثر آواز میں کہتی ہوئی ان کی طرف پلٹی عالم تاب کے چلنے میں کچھ اٹکنے لگا۔ وہ کچھ کہے بغیر اس کی سمت دیکھنے لگیں۔

”محسوس تو یہی ہوا ہے کہ آپ لوگوں نے میری بدبختی کی خبر میرے مئی پاپا کو نہیں پہنچائی۔“

اگر ایسا ہے تو بہت مہربانی آپ سب کی۔ یہ اندازہ مجھے اس لیے ہو رہا ہے کہ اگر انہیں اطلاع ہو گئی ہوتی تو وہ حویلی آچکے ہوتے۔

دنیا میں شادیاں بھی ہوتی ہیں علیحدگیاں بھی ہو جاتی ہیں مگر یاد رہے میرے ساتھ جو شرمناک سلوک کیا ہے۔ جس طرح

مجھے میری نظروں میں گرایا ہے وہ میں اپنے ماں باپ کو نہیں بتا سکتی کیسے بتاؤں انہیں کہ یہ شخص جس کے گن گاتے آپ لوگ نہیں جانتے اتنا سفاک ہے۔ اتنا خود غرض اس قدر ظالم۔

ایک خزانہ کی اولاد کے اتنے اعتبار و یقین۔ بھابی بیگم میرے اندر ایک آگ دہک رہی ہے۔ ایک پیغمبر کی عالی مرتبت

زوجہ پر بہتان لگتا ہے تو آسمان سے گواہی آ جتی ہے۔ اور آئندہ اس قسم کا ظلم روکنے کے لیے ساتھ ہی قانون بھی آتا ہے۔ جو ہم چاہی کم تر اور بے مقام عورتوں کے لئے ہوتا ہے۔ مگر۔ کون لیتا ہے اس قانون سے کام۔ وہ کتاب مقدس میں بند پڑا ہے۔

میرا جی چاہ رہا ہے میں یاد رہے ایسا بھیا تک انتقام لوں۔ اس ذلت کا کہ چوک پر کھڑی ہو کر چیخ کر کہوں۔ کہ یہ بچی بھی نہاری نہیں ہے۔ اس مفت کی ذلت میں یاد رہے نام کے بھی ڈنکے بجیں۔ وہ ایسے ہی ذہنی غدا ب سے گزر رہے جس سے

میں گزر رہی ہوں۔ بھابی بیگم مجھے موت کیوں نہیں آ جاتی۔“

وہ عالم تاب کے شانے سے لگ کر سسک پڑی۔

عالم تاب کی آنکھوں میں بھی نمی تیر گئی۔ وہ اس کی پشت سہلانے لگیں۔

”بھابی بیگم! میری ماں کا دل بہت نازک ہے۔ میرا باپ بہت شفاف ہے۔ وہ جیتے جی مرجائیں گے۔ بتائیں میں کیا کروں۔ کہاں جاؤں۔ تیور نے اسے گولی کیوں مار دی؟ اسے اتنی آسان موت کیوں دی؟ میں اسے ایڑیاں رگڑتے دیکھنا چاہتی تھی۔ موت کی وعائیں مانتے دیکھنا چاہتی تھی۔“

عالم تاب نے اس کی پیشانی چومی۔

”مجھے بابا صاحب نے تمہارے پاس بھیجا ہے ناز! جو میں کہہ رہی ہوں بہت صبر اور حوصلے سے سننا۔ اس یقین کے ساتھ کہ یہاں سب تم سے بہت پیار کرتے ہیں۔“

”یا اللہ۔ پھر کوئی امتحان؟“ وہ عالم تاب سے الگ ہو کر خوفزدہ انداز میں ان کا چہرہ دیکھنے لگی۔

”نہیں کوئی امتحان نہیں۔ بابا صاحب نے بچوں کے مفادات سامنے رکھ کر ایک فیصلہ کیا ہے کہ تمہارا نکاح۔“

”بھابی بیگم! حد ہو گئی۔ اگر یہ نکاح حلالہ کے چکر میں کرنے کا مکروہ پروگرام ہے تو سن لیجیے۔ یاد اور قیامت تک کے لیے میرے دل سے نکل چکے ہیں۔ آپ لوگ کچھ کر لیں۔ میں زندگی کے کسی موڑ پر ان سے کسی مصلحت کے نام پر کوئی سمجھوتہ نہیں

کروں گی۔ آگ رجمہ پر ڈکٹیٹر شپ ایلانی کی گئی تو میں خودکشی کر لوں گی۔ میں شرفاء کی اولاد ہوں بازار کا مال نہیں ہوں۔“

”بات تو پوری سن لو۔“ عالم تاب نے اس کا ہاتھ تھام کر ملاحت سے کہا۔

”اگر اس سے ہٹ کر ہے تو سنائیے اگر اس طرح کی کوئی منسوب بندی ہے تو مجھے کچھ نہیں سننا۔“

وہ ضدی انداز میں بولی۔

عالم تاب نے اس کے زرد اور ویران چہرے کو بغور دیکھا اور ٹھنڈی سانس بھری۔

”یاد رہے بہت کڑا اور قطعی قسم کا انسان ہے۔ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ وہ کبھی اپنے فیصلے پر پھپھکتا ہے۔ لہذا اس طرح کی بات نہ ہم نے سوچی نہ تم سوچو۔“

نازنین نے اپنی شفاف وحسین آنکھیں حیرت سے ان کے چہرے پر جمادیں۔ جیسے کہہ رہی ہو پھر؟

”بابا صاحب کا خیال ہے اگر تم اپنے والدین کے پاس چلی گئیں تو وہ ضرور تمہاری دوسری شادی کر دیں گے۔ اور ہمارے ہاں ہمارے وارثوں کی ماں غیر خاندان میں نہیں جاتی۔ خواہ بیوہ ہو یا طلاق یافتہ۔ جو عورت جاگیر میں داخل ہو جاتی ہے پھر اس پر کسی اور خاندان کا حق نہیں رہتا۔

تیمور کی بیوی انگریز ہمدہ وہیں رہے گی۔ تیمور دوسری بیوی یہاں رکھ سکتا ہے۔“
بات بہت مشکل تھی اور بڑی مشکل سے کہی گئی تھی۔

☆.....☆.....☆.....☆.....☆.....☆.....☆

عالم تاب تو جیسے دھماکہ کر کے اپنی جگہ سہم کر رہ گئی تھیں۔ ان کی جھکی نظروں کا اٹھنا اب محال تھا۔ انہیں طویل ہوتی خاموشی سے خوف سا آنے لگا۔ مگر آواز پھر بھی نہ نکلی۔ انہیں اندازہ تھا کہ وہ کیا کہہ چکی ہیں کہ انہوں نے بخت اس طوفان کی زد میں لڑ رہے ہیں۔

مازمین نے نہ نظریں اٹھائیں نہ سر۔ اپنی ہتھیلیوں کو غور سے دیکھتی رہی۔

”آپ کو اندازہ ہے بھابی بیگم! آپ کیا کہہ گئی ہیں۔؟“ بالا آ خر خاموشی ٹوٹ گئی۔ نازنین کا لہجہ بالکل سپاٹ تھا۔

عالم تاب جواب میں خاموش رہیں۔

ایک مرتبہ پھر دونوں کے درمیان خاموشی حائل ہو گئی۔

”ابھی مجھے کچھ مر حلے طے کرنا ہے۔ آپ لوگ انتظار کریں۔“ اس نے بہت سکون سے کہا۔

عالم تاب نے کمال حیرت سے اس کی سمت دیکھا ان کا تو خیال تھا کہ ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوگا۔ وہ جانے کیا کیا بولے گا، لحاظ و ادب کی ہر منزل طے کر جائے گی مگر اس کے سکون نے تو انہیں پریشان کر دیا وہ نور اٹھ کھڑی ہوئیں۔ جیسے کچھ ہوا

نہیں تو ہو جانے کا ڈر ہو، ایک لفظ منہ سے نکالے بغیر وہ بڑی تیزی سے کمرے سے باہر چلی گئی تھیں۔

اس مرتبہ اس کا انداز پر اعتماد تھا۔

”ہمیں ان کے ذکر میں بھی حصہ نہیں لینا۔“ تیمور علی خان کا انداز قطعی تھا۔

”یہ مینگ ان کے ذکر کے لیے نہیں ہو رہی۔ بات یہ ہے، اس نام سے گزرے بغیر بات آگے بھی تو نہیں بڑھ سکتی۔“ اس نے نگاہ اٹھا کر تیمور علی خان کو دیکھا۔ ان کی نظریں ہنوز نیچی تھیں۔ وہ چند لمحے ان کی سمت دیکھتی رہی۔ وہ اس کی

نظریں محسوس کر رہے تھے اس لیے نظر اٹھا نہیں رہے تھے کہ نگاہ ملانے کا مرحلہ بہت اذیت ناک تھا۔

”بابا صاحب نے ایک کیشن دیا ہے۔ آپ کو معلوم ہے؟“ نازنین نے بہت ہی دھیمی آواز میں کہا۔ تیمور علی خان گویا بنائے میں رہ گئے۔ ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔ کہ وہ اس موضوع پر براہ راست بات کرے گی۔ وہ لب بستہ سے بیٹھ رہ گئے۔

”میرے خیال میں بہت ہی مناسب حل نکالا ہے۔ انہوں نے اس کراس کا۔ آپ کا کیا خیال ہے؟“ وہ ٹارٹل

انداز میں بولی۔

”ہمارا خیال ہے، اب تو حویلی میں دور دور تک مذاق کا ماحول نہیں ہے۔“ ان کا انداز اس مرتبہ قدرے تیکھا اور برا

منانے والا تھا۔

”میرا خیال ہے۔ نکاح شادی کی باتیں مذاق میں صرف پاگل ہی کرتے ہوں گے، میرے اس عظیم نقصان میں آپ کا برابر کا حصہ ہے، میری زندگی کے اگلے مرحلے آپ کے نام، آپ کی ذات کے ذکر کے بغیر کیسے طے ہو سکتے ہیں؟“ اس کے لہجے میں بھی طوفان کے آثار جھلکنے لگے۔

”لیکن ہم قسم کھا سکتے ہیں کہ ہم نے کبھی آپ کو نقصان پہنچانے کا تصور تک نہیں کیا، نہ کر سکتے ہیں۔“

وہ یکدم اجنبی محسوس ہونے لگے۔

”تو پھر میرے بارے میں بھی قسم کھائیے کہ میں نے کبھی کسی کو نقصان پہنچانے کا نہ کبھی پلان بنایا نہ عملاً کچھ کیا۔“ وہ جیسے پھٹ پڑی۔

تیمور علی خان یکدم خاموش سے ہو کر رہ گئے۔

”پھر۔ اس مسئلے کا صرف یہی تو حل نہیں ہے۔“

”مسئلہ تو کسی کے لیے ہے ہی نہیں۔ مسئلہ تو ہے ہی صرف میرا۔ حل بھی مجھے چاہئے۔ حویلی کے ہر فرد کی اپنی اپنی ایک محفوظ اور لگی بندھی زندگی ہے، کچھ عرصہ میرے نقصان پر سب ماتم کر کے پھر گمن ہو جائیں گے۔ آپ لندن تشریف لے جائیں گے، وہاں آپ کی اپنی ایک الگ زندگی شروع ہو جائے گی، میں حویلی سے صرف راشن پانی پاتی رہوں گی اور گاہے گاہے میرے ذکر خیر سے محفلوں میں رونق ہو جایا کرے گی۔ یہ ہے میری باقی ماندہ زندگی کا نقشہ۔“

وہ تلخی سے ان کی بات کا ایک تسلسل سے بولی۔

”ایسا بھی نہیں ہے۔ آپ کی زندگی بھی نئے موڑ سے شروع ہو سکتی ہے۔ اب سے پہلے ایسا بہت ہوا ہے۔ یہ روئے

وہ کئی بار روشنائے کو گود میں اٹھا کر کمرے سے باہر تو نکلی مگر پھر دوبارہ واپس آگئی ایسی اضطراری کیفیت تھی جس میں انسان کو خود اندازہ نہیں ہوتا کہ وہ کیا چاہتا ہے۔

چند لمحوں بعد جیسے وہ کسی نتیجے پر پہنچ گئی اور روشنائے کو کاٹ میں لٹا کر ہال کی سمت آئی اور دروازے سے اندر جھانکا۔ کوئی ملازمہ نظر نہیں آئی۔ وہ وہاں سے دلالان کی طرف بڑھی، وہاں روپا دیوی فرش دھوتی نظر آگئی۔

”روپا۔!“ اس نے اپنی تمام منتشر قوت کو اکٹھا کر کے آواز دی۔ اپنی دھن میں مگن روپا دیوی نے چونک کر ادھر ادھر دیکھا پھر نازنین کو دیکھ کر جھاڑو پھینک کر دوڑی آئی۔ کتنے عرصے بعد اس نے نازنین کو پہلے جیسی بے تکلف حالت میں دیکھا تھا۔

”ہلاں چھوٹی دلہن جی۔؟“

”تیمور خاناں سے کہنا، چھوٹی دلہن نے بلایا ہے۔ اور یہ بھی کہنا، جب بھی آئیں۔ دن میں آئیں، رات یا شام کے وقت آنے کی ضرورت نہیں۔“

وہ روپا دیوی کے تاثرات دیکھنے کے لیے رکی نہیں بلکہ یہ کہتے ہی واپس پلٹ گئی۔ ابھی وہ اپنے کمرے میں پہنچ کر دروازہ روپ کھول کر کھڑی ہی ہوئی تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی۔

”ہوں۔ کون ہے آجاؤ۔“ وہ اسی مصروف انداز میں گویا ہوئی تھی اور فوراً ہی دروازہ کھل گیا تھا۔

اس کا خیال تھا۔ روپا دیوی کوئی جوابی پیغام لے کر آئی ہے۔ مگر جب آنے والے نے دیر تک کچھ نہ کہا تو وہ لامحالہ پلٹ کر دیکھنے پر مجبور ہوئی۔

مگر ایک دم ہی بدحواس ہو گئی۔ جانے سارے اعتماد و اعتبار کہاں گم ہو گئے تھے۔

تیمور علی خان پشت پر ہاتھ باندھے نظریں جھکائے کھڑے تھے۔ نازنین کی کمزوری غالباً ان پر عیاں ہو گئی تھی۔

”السلام علیکم۔!“ انہوں نے کھٹکار کر گلا صاف کیا اور پہل کی۔

”وعلیکم السلام۔ بیٹھیے۔“ اس نے دوپٹہ درست کیا۔

تیمور علی خان بڑے اعتماد سے آگے بڑھے۔ کاٹ میں لپٹی روشنائے کے رخسار چھو کر پیار کیا اور صوفے پر بیٹھ گئے۔

نازنین جیسے کسی لمحے میں منجمد ہو کر رہ گئی تھی۔ ایک بے خبری کی کیفیت تھی۔

”آپ بیٹھیے ناں۔ بھا۔!“ وہ بولتے بولتے ایک دم رک گئے۔ نازنین جیسے گہری نیند سے جاگی اور اپنے بیڈ پر ٹپک گئی۔

”آپ نے یاد فرمایا تھا۔“ وہ اس کی خاموشی سے الجھنے لگے۔

”جی۔ سنا ہے۔ آپ کو بھی یادور علی خان سے اتنی ہی شکایتیں ہیں جتنی ہمیں ہیں۔ سو آپ تو ہمارے کپ کے آؤ

ہیں۔“

زمین کا نیا واقعہ نہیں ہے، دوسری شادی کسی اور سے آپ کی بھی ہو سکتی ہے۔

”ہاں ہو سکتی ہے۔ مجھے طلاق ہوئی ہے اور عورتوں کو طلاق ہوئی رہتی ہے۔ لیکن اس طلاق کے پیچھے جو ریزن ہے۔ آپ کی سوسائٹی کی نظر میں اس قدر قبیح فعل ہے کہ بہت وسعت سے مجھے اپنانے والا بھی مجھ سے اس احسان کا خراج مانگ رہے گا۔

میں کسی ایسے شخص کی رفاقت برداشت نہیں کر سکتی جو رات کو میرے ہاتھ روم جانے پر بھی چونک اٹھے۔ میں کسی کے ساتھ منگھوک زندگی گزارنے سے بہتر یہ سمجھتی ہوں کہ اپنے بچوں کو لے کر ایسی گمنامی کی زندگی میں گم ہو جاؤں کہ مر جاؤں تو رونے والوں میں کوئی میرا جاننے والا نہ ہو۔“

بولتے بولتے نازنین کی آواز بھرا گئی۔

”صرف اور صرف آپ ہی واحد انسان ہیں، جس کی نگاہ میں میری اصلیت روشن ہے اور وہ مجھے وہی سمجھتا ہے جو میں ہوں۔ یا تو میری اتنی مدد کیجئے کہ مجھے حویلی سے بچوں کے ساتھ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نکل جانے دیجئے یا پھر۔“ وہ خاموش ہو کر آنسو پینے لگی۔

”یوگنڈا میں تو قریب کی شناسائیاں نہیں ہیں، ادھر تو صرف آپ کے والدین ہیں اور والدین تو۔“

”جی ہاں۔ وہاں میرے والدین ہیں۔ جن کی نگاہ میں یا ورکا انیج اتنا پوزیٹو ہے۔ کہ وہ بھی مجھ میں کچھ ڈھونڈتے رہیں گے۔ صرف ذلت کی شکل بدلے ذلت عزت میں نہیں بدلے گی، دو چار روز کی بات ہو تو انسان بڑے دکھ سے بھی گزر جائے۔ میں اسے ٹوڑیڈ بے قصور ہو کر کیوں مجرموں کی طرح شرمندگی کی زندگی گزار دوں؟“ وہ پھر رونے لگی۔

”بالفرض ایسا ہو جائے تو کیا زندگی میں کبھی آپ کو افسوس نہیں ہوگا کہ ہمارے ساتھ آپ نے بہت زیادتی کر دی ہے؟“ تیمور علی خان نے بہت شکستہ انداز میں پوچھا۔

”نہیں۔ اس لیے کہ آپ نے اپنے بھائی کو سمجھے بغیر اپنی زندگی کے اصول کیوں بنائے، دکھ آدھا آدھا بٹ جائے گا تو وزن کم ہو جائے گا۔ میرے دل پر بددعاؤں کا کام کم پڑ جائے گا۔ بددعا منہ سے نہیں دی جاتی، دکھا دل خود ایک بددعا کی گزر گاہ ہوتا ہے۔“

وہ بدستور رو رہی تھی۔ تیمور علی خان کم مسم بیٹھے تھے۔

(کتنا خوفناک موڑ ہے زندگی کا سارے بے رحم فیصلوں کا رخ ہماری طرف ہے۔) وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔

”ہمارا خیال ہے آپ کی بات ہم تک پہنچ گئی ہے۔ اب ہمیں چلنا چاہیے۔“

نازنین نے سر نہیں اٹھایا بس آنچل سے آنکھیں پونچھتی رہی۔

تیمور علی خان بہت آہستہ آہستہ دروازے کی سمت بڑھے تھے، جیسے وہ کوئی تیسری تجویز بتانے کے لیے ان کو آواز دے

رات کا ابتدائی مرحلہ تھا۔ کھانا کھانے کا سلسلہ ابھی ابھی تمام ہوا تھا۔ تیمور علی خان باپ کے پیچھے پیچھے کمرے میں پہنچے۔ بابا صاحب نے قدرے الجھے ہوئے انداز میں مڑ کر ان کی طرف دیکھا تھا۔ اور اپنا شملہ اتار کر بیڈ کے ایک طرف لیٹے۔

بابا صاحب نے سر پر اس طرح ہاتھ پھیرنے لگے جیسے کچھ جھاڑ رہے ہوں۔

یہی اندرونی خلفشار کا ایک اشارہ ہوا کرتا ہے کہ انسان بے وجہ بے ترتیب حرکات و سکنات کرتا پایا جائے۔

تیمور علی خان سینے پر ہاتھ لپیٹے اس بات کے منتظر تھے کہ کب ان کو بیٹھنے کا حکم ملے۔

”بیٹھو بیٹے اکھڑے کیوں ہو۔“ بڑا خراں ہوں نے کہا۔

”کیا بات ہے۔ کچھ کہنا چاہتے ہو؟ اتنا تو وہ بھی ادراک کر سکتے تھے کہ بیٹے کو جس امتحان میں ڈال چکے ہیں، وہ کوئی ہوشیار امتحان نہیں ہے۔ جس میں حواس بھی گم ہو سکتے ہیں اور الفاظ بھی اس لیے بات کی ابتدا میں حوصلہ بڑھانا بھی انہی کے لیے کام ہے۔

”جی!“

”ہوں، تو پھر کہو، جو بھی کہو گے ہم بہت غور سے سنیں گے، تمہارے سامنے تو یوں بھی ہم بہت کمزور پڑ جاتے ہیں۔ تم ہمیں اپنی سب اولادوں میں سب سے زیادہ عزیز ہو۔ یہ بات ہمارے بھی سمجھ میں نہیں آئی کہ کیوں؟ تمہاری ماں کہتی ہیں شاید اس لیے کہ تم سب سے چھوٹے ہو۔ شاید وہ ٹھیک کہتی ہوں۔“ وہ یوں مخاطب تھے جیسے اپنے آپ سے باتیں کر رہے ہوں۔

”بھابی نے بلایا تھا ہمیں۔“

”عالم تاب نے؟“

”جی نہیں۔ ناز بھابی نے۔“

”اب وہ تمہاری بھابی نہیں ہے۔“ بابا صاحب گاؤں کی بے پشت ٹکا کر نیم دراز ہو گئے۔

”یہ رشتہ بہت مضبوط ہو کر منقطع ہوا ہے۔ وہ یاور بھائی کے بچوں کی ماں ہیں۔ بچے ہمارے بھتیجے ہیں ہمارا خون ہیں اور وہ ان کی ماں ہیں۔ اس لیے۔“

”خیر۔ چھوڑو تم اس بات کو۔ یہ کہو اس نے کیوں بلایا تھا؟“

آپ کی بات ان تک پہنچ گئی ہے۔ وہ نظریں جھکا کر بیٹھتے ہوئے گویا ہوئے۔

”انہوں نے تو مجھے حیران بلکہ پریشان کر دیا ہے۔“

بابا صاحب نے حیرت آمیز انداز میں سوال نظروں سے کیا۔

تیمور علی خان اس طرح خاموش ہو گئے جیسے الفاظ ترتیب دے رہے ہوں۔

”ہم آپ کی بات سن کر پریشان ضرور ہوئے تھے مگر اس قدر نہیں جتنے اب ہیں۔ ہمارا خیال تھا وہ آپ کے اس پر پوزل کو پہلی فرصت میں مسترد کر دیں گی اور معاملہ از خود رفع دفع ہو جائے گا۔ ہم آپ سے غیر ضروری بحث کیوں کریں۔ مگر۔“

وہ بولتے بولتے چپ ہو گئے۔

بابا صاحب اسی طرح خاموش تھے، انہوں نے نظریں اٹھا کر گویا تیمور علی خان کو بات جاری رکھنے کا اشارہ دیا۔

”انہوں نے آپ کے پروپوزل سے اتفاق کر لیا ہے۔ اور جو بات بتائی ہیں ہم انہیں تسلیم نہیں کرتے ہمارا خیال ہے، وہ یا در بھائی سے انتقام لینا چاہتے ہیں، اسی لیے انہوں نے یہ پروپوزل منظور کرنے میں ذرا دیر نہیں لگائی۔“ انہوں نے مشکل اپنی بات تمام کی۔

”ہوں۔ وجوہات کیا بتائی ہیں؟ یہ جان کر ہی ہم تم سے اتفاق کر سکتے ہیں کہ تمہارا خیال درست ہے۔“

انہوں نے کروٹ بدل کر مکمل طور پر ان کی طرف رخ کر لیا۔

تیمور علی خان نے اسی انداز میں بلکہ مزید آہستہ آواز میں نازنین کی کبھی ہوئی ایک ایک بات دہرا دی۔

”ہوں۔!“ بابا صاحب نے سوچنے کے انداز میں ہنکارا بھرا۔

”ہم تمہارے خیال سے اتفاق نہیں کرتے، کوئی بھی بات ہو ہمیشہ کے لیے دفن نہیں ہوتی۔ کبھی بھی سامنے آ سکتی ہے، جو امکانات اس نے ظاہر کیے ہیں ان سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔“

”اب تمہارا کیا خیال ہے؟ اسے حویلی سے نکلنے میں مدد دے یا حویلی میں رہنے کا بندوبست کرو گے؟“

انہوں نے بہت رسائیت سے سوال کیا تھا۔

”بابا صاحب! یہ اتنا آسان نہیں ہے۔ پلیز، ہمارا خیال کیجئے۔“

”تم بھی ہماری اولاد ہو اور جو ادا اور روشا نے بھی ہمارا خون ہیں ہمیں ان کا بھی خیال کرنا ہے۔ ہم یا نازنین تمہیں اس بات پر مجبور تو نہیں کر رہے کہ تم عائشہ (لیزا) کو چھوڑ دو۔ بلکہ نوے فیصد تم اس کے رہو اور دس فیصد نازنین کے۔ بچوں کی خاطر، ہماری خاطر، ہم تو تمہیں یہ بھی نہیں کہہ رہے کہ نازیبا بچوں کے خرچ حساب کتاب تک تم کرو ہم تمہیں اس ذمہ داری سے بھی سبکدوش کرتے ہیں۔ اپنا بن کے سوچو تیمور۔“

”لیزا کسی صورت میں نہیں مانے گی۔“

”ہم سمجھ لیں گے اسے“ بابا صاحب نے فوراً بات کاٹ کر کہا۔

”آپ اسے نہیں سمجھتے، ہم بتا رہے ہیں ناں آپ کو وہ اور طرح کی لڑکی نہیں ہے، اس معاملے میں وہ بالکل عام لڑکی ہے۔ وہ خود کشی کر سکتی ہے۔“ انہوں نے گویا باپ کو ہلایا۔

بابا صاحب نے قدرے پریشانی سے اپنے سر پر ہاتھ پھیرا۔

”تو پھر اس کو چھوڑ دو، کیونکہ اس کو چھوڑنے میں کوئی نقصان نہیں ہے، اب اس کے سوا کوئی راستہ نہیں۔“ انہوں نے کٹنا

”تم فیصلہ صادر کیا تھا۔“

تیمور علی خان ساکت سے ہو کر باپ کی شکل دیکھنے لگے۔

”جہاں کیوں آں واحد میں مطربہ ان کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔“

”میرا بڑا نقصان ہوا ہے تیمور خاناں! مجھے انگاروں میں پھینک کر دوست کی زندگی میں پھول کھلائے تھے؟“

تیمور علی خان جیسے دنوں سے سو رہے تھے ایک دم جاگ گئے۔

”وہ فساد کی جڑ کہاں ہے بابا صاحب؟“

”اب کسی کو اس سے کوئی مطلب نہیں ہونا چاہیے۔ مزید تاکید ہے کہ ہم سے اس کے موضوع پر کوئی بات نہ کرے۔“ ان کے لہجے سے ناراضگی جھلکنے لگی۔

”مری نہیں ہے زندہ ہے۔ اپنی طرف سے تو تم نے بھی ہمیں مزید آزمائش میں ڈالنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔“

تیمور علی خان خاموش رہے۔

”یہ تو بہت لیٹ ہوا ہے بابا صاحب! ہماری جگہ کوئی اور ہوتا تو وہ بہت پہلے اس دنیا سے جا چکی ہوتی۔ اس کے دل کی نہیں ہوئی تھی تو کیا ہوا۔ اس کے ساتھ بھلائی تو ہوئی تھی۔ ورنہ اس کی حیثیت تو یہ تھی کہ اسے کسی کئی، چوکیدار، یا سائس کے پلے

باندھا جاتا ہم نے جو کیا، وہ عین نیچرل ری ایکشن ہے۔“

تیمور علی خان نے خود ہی خاموشی کو توڑ کر بہت اعتماد اور بے نیازی سے جواب دیا۔

”لیکن جب کچھ ہو چکا ہوتا ہے تو نقصانات پر غور کر کے وقت ضائع کرنا حماقت ہوتی ہے۔ نقصان کا توڑ تلاش کیا جاتا

ہے۔“

بابا صاحب نے زندگی میں بہت اہم اور بڑے فیصلے کیے تھے، عمر جوش کی منزل عبور کر چکی تھی، وہ اتنی آسانی سے جوان خون

سے اتفاق نہیں کر سکتے تھے۔

”ہماری آپ سے درخواست ہے کہ آپ فی الحال کوئی حکم صادر نہ کریں اور کچھ غور کریں۔ پلیز۔“ انہوں نے زچ ہو کر

استدعا کا انداز اختیار کیا۔

ہوں۔ ہم غور کر چکے ہیں۔ جب غور زیادہ ہوتا ہے تو پھر کچھ نہیں ہوتا۔ ہم تمہیں مشورہ دیتے ہیں کہ سکون سے تھوڑا غور

کر دو اور خاندان کو سامنے رکھ کر غور کرو، عائشہ کو نہیں۔ ذاتی اجتماعی مفادات کو اہم بتاتی ہے۔ اب تم جاؤ۔ آرام کرو۔ ہم بہت

تھک چکے ہیں۔ البتہ تھوڑا سکون محسوس کر رہے ہیں۔ کہ ناز نے ہمارا راستہ آسان کر دیا ہے۔“

وہ دوبارہ یہ دہرا کر پھاڑ پھاڑ کر لیٹ گئے اور آنکھیں موند لیں۔

تیمور علی خان بے بسی سے ہونٹ کاٹ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔

”جب فطری محبت میں بھی اتنا دم نہیں کہ وہ فیصلہ اپنے حق میں کرائے تو پھر محبت کے ہونے اور نہ ہونے سے کیا فرق

پڑتا ہے۔“

”زندہ نہ ہوتی تو ہم یہاں نہیں اسلام آباد میں ہوتے۔ آپ کو بتا رہے ہیں کسی کو پتا نہیں ہے۔ حویلی کے آس پاس بہت بڑوں سے باہر کے لوگ نظر آتے رہتے ہیں۔ لوگ بتاتے ہیں کہ وہ دریا بہتی کے بندے نہیں ہیں۔ اگر وہ ہمیں ہونے کے لیے کوئی چال چلتی ہے تو ہم اس کا بھی بندوبست کر چکے ہیں۔ اور یہ بندوبست اسی وقت فائدہ دے گا کہ وہ زندہ ہو۔ امید ہے آپ کی تسلی ہوگئی ہوگی۔“

”کہا وہ اسے اٹھانے کو پھرتے ہیں۔“ اماں جی دہل کر رہ گئیں۔

ہر خیال ہے کہ اس کو بیٹی کی بیوگی کی خبر مل گئی ہے کیونکہ جب تک وہ یہاں واپس نہیں آئی تھی۔ اس طرح کے مشکوک خیالوں کی خبر بھی نہیں آئی تھی۔ اس طرح کی عورتوں کی بہت پہنچ ہوتی ہے۔ جن کے پاس بہت پیسہ ہوتا ہے وہی ان عورتوں کو کہہ سکتے ہیں یا جو حکومتیں بیٹھ کر قلم دوات کنٹرول کرتے ہیں۔“

بہر حال یہ سب آپ کے بکھیرے نہیں ہیں بس آپ تو ہم پر مہربانی کر دو۔ بیٹے کو کسی طرح راضی کر لو۔ ہم حکم دے کر یہ کام کر سکتے ہیں۔ لیکن پھر کام کمزور رہے گا۔ پھر اس میں ہمیشہ کا کوئی خطرہ لگا رہے گا اور ساری بھاگ دوڑ بے کار جاسکتی ہے۔“

بابا صاحب نے حقے کا پائپ دوبارہ منہ سے لگا لیا۔

”کوشش کروں گی، ناز نے بھی بچوں ہی کا سوچا ہوگا۔ ورنہ اتنی آسانی سے کیسے راضی ہو جاتی؟“ وہ خود کھامی کے انداز میں کہہ رہی تھیں۔“

بابا صاحب جواب میں خاموش رہے۔

”میں چلوں۔ کوئی کام تو نہیں ہے کسی سے؟“ وہ تھکے تھکے انداز میں اٹھ گئیں۔

”نہیں۔ بس یہی کام ہے جو آپ سے کہا ہے۔“ وہ کہہ کر حقہ گڑ گڑانے لگے۔

تیور ماں کے بلاوے پر سمجھ تو گئے تھے کہ ان سے وہ کیا بات کریں گی، مگر یہ بھی خیال تھا کہ شاید کوئی اور بت ہو۔ اور انہوں نے ان تک مکمل طور پر پہنچی ہی نہ ہو، دل تو ان کا کئی دنوں سے چاہ رہا تھا کہ ماں کے سامنے دل کا غبار نکال ڈالیں کہ وہ کتنے دلی ہیں۔ زندگی بہت الجھن میں پھنس گئی تھیں۔ دو تین دن سے نازنین کی جھلک بھی دکھائی نہیں دی تھی۔ ایسی ہی تھی جیسے بہت پانی ایک جگہ ٹھہر گیا ہو، مگر ماں کے پیغام نے جیسے ماحول میں دوبارہ ارتعاش پیدا کر دیا تھا۔

انہوں نے کھلے دروازے پر ہلکی سی دستک دی۔ اماں جی اپنی نماز کی چوکی پر بیٹھی دعا مانگ رہی تھیں۔ وہ اندر آ کر ان کے سر پر ہنسنے لگی۔

بہت طویل دعا ہوتی تھی اماں جی کی۔ تمام زندہ اور مرحومین کا ان کی دعا میں حصہ ہوتا تھا۔ اس لیے تیور علی خان بہت جلد ان کی دعا مکمل ہونے کا انتظار کرنے لگے۔

تیور علی دیر بعد اماں جی نماز کی چوکی سے اتر آئیں۔

”اچھا! اماں جی کی آنکھیں خوشی سے چمکنے لگیں۔“ میری تو نیندیں اڑی ہوئی تھیں کہ بچوں کو لے کر وہ چلی جائے گی۔ وہ بھی غیر ملک، بچوں کو ترستی ہوئی مرجاؤں گی۔“

”مگر یاور۔؟“ ان کی آواز بھرا گئی۔ اس کی صورت کیونکہ دیکھوں گی، بہت زیادتی ہوئی ہے اس کے ساتھ۔“

”اس نے اپنے ساتھ خود زیادتی کی ہے۔ ہم میں سے کسی پر اعتبار کرنا کچھ کہتا سنتا تو بات سنہل بھی سکتی تھی۔“

بابا صاحب نے حقہ گڑ گڑایا۔

”اگر یہ سب ہو جاتا ہے تو وہ۔“

اس نے اپنی اولاد کی فکر نہیں کی۔ وہ بھی ہمیں کرنا پڑ رہی ہے۔ مگر خیر آئے گا اسے ایک دن ہوش، مگر افسوس وہ کتنا تنہا رہ جائے گا۔“

بابا صاحب نے واقعی بہت تاسف سے کہا۔

”ایسا تو نہیں بات اور بگڑ جائے؟“ وہ پھر خدشات میں گھر گئیں۔

اب بگڑنے کو کچھ نہیں بچا جب ہی تو بگاڑ پر سمجھوتا کر رہے ہیں۔“

انہوں نے پائپ منہ میں سے ہٹا کر بہت بردباری اور متانت سے جواب دیا۔

”پھر تو شاید وہ کبھی گھر نہ آئے۔“ اماں جی کو بیٹا یاد آیا تو وہ سب کچھ بھول بیٹھیں۔“

”آئے گا۔ ضرور آئے گا۔ اس کا بھی بندوبست کریں گے کہ وہ بے دھڑک یہاں آنے لگے۔ آپ بے کار اپنا داغ نہیں الجھاؤ۔ فی الحال تو مشکل حل نہیں ہوئی۔ تیور راضی نہیں ہے۔ وہ ایک مرتبہ باغیانہ فیصلہ کر چکا ہے۔ اس کی جھک ٹوٹ چکی ہے۔ اب صرف آپ ہی اس سے بات منوا سکتی ہو۔ یہی سمجھانے کے لیے آپ کو بلایا ہے۔“

انہوں نے اماں جی کی طرف بہت تجزیاتی نگاہ سے دیکھا۔

”میں کمزوری عورت۔ میری کون سنے گا۔؟“ وہ شکستہ سے انداز میں بولیں۔

”انسان ہار کا اندیشہ رکھ کر میدان میں اترے تو ضرور ہارتا ہے۔ آپ کے پاس محبت کی وہ طاقت ہے۔ جسے آپ کمزوری کہہ رہی ہو۔“ بابا صاحب نے نکتہ سمجھایا۔

”اب تک تو یہ طاقت میرے کسی کام نہ آئی۔ ریتوں بانو ہی کو دیکھیں۔ کیا خوب انعام دیا ہے میری محبت کا۔“ ان کی آنکھوں میں اشک چمکنے لگے۔ آپ مجھے یہ تو بتائیں کہ وہ ہے کہاں۔“

”اب کوئی ہم سے اس کے موضوع پر گفتگو نہ کرے۔“ بابا صاحب کی پیشانی پر شکنیں پڑ گئیں۔ ”سب کو حکم ہے آپ سے درخواست ہے۔“ بابا صاحب کو اماں جی کی سہمی ہوئی صورت پر نظر ڈال کر لہجہ نرم کرنا پڑا۔

”زندہ تو ہے ناں؟“ وہ ڈرتے ڈرتے بولیں۔

”السلام علیکم اماں جی!“

اماں جی نے ان کا چہرہ ہاتھوں پر لے کر پیشانی پر بوسہ دیا۔

”وعلیکم السلام کہاں ہو تم؟ دن بھر دکھائی نہیں دیے؟“

”ابھی تک اس قید خانے میں پھڑپھڑا رہے ہیں آزادی کے دن بہت یاد آرہے ہیں اماں جی!“ ان کے لہجے کی شکل پر اماں جی تڑپ اٹھیں۔

”تاشکری ہے بیٹھے، گھر میں ہو یہاں سب ہی تم سے محبت کرتے ہیں۔“

”رہنے دیجیے اماں جی۔ ہم باز آئے ان محبتوں سے بہت فیکس بھر رہے ہیں ہم ان محبتوں کا“ انہوں نے جھلا کر قلع کلامی کی۔

ایک ٹاپے اماں جی خاموشی ہو کر رہ گئیں۔

”آپ نے ہمیں یاد کیا“ ماں کی خاموشی پر جیسے وہ کسی احساس جرم میں مبتلا ہو گئے۔

”یاد تو ہر وقت ہی آتے ہو۔ کیسی مشکل پڑی ہے میرے بچوں پر۔“ اماں جی نے اداسی سے کہا۔

”یوں کہنے بچے کی وجہ سے دوسرے بچے پر۔“ تیمور علی خان کے لہجے میں زہر گھل گیا۔

”یوں نہ بولو بیٹے! میرا کیجہ پھٹنے لگتا ہے۔“ اماں جی کی آواز رندھ گئی۔

”دیکھو بیٹے! مشکل بڑی ہے۔ مگر زندگی کا راستہ بھی اسی میں سے نکالنا ہے۔“

اماں جی نے ان کا شانہ تمام کر نرمی سے کہا۔

”ہم سمجھ گئے آپ نے ہمیں کیوں بلایا ہے کم از کم آپ ہم سے اس موضوع پر کوئی بات نہ کریں ہم آپ کے احسان مند ہوں گے۔“

وہ عاجز آنے والے انداز میں گویا ہوئے۔

”مت مارو مجھ کو، تم سب چاروں طرف سے۔“ اماں جی بھی خلاف توقع ناراض ہو گئیں۔

”اب تو میری اور تمہاری بات ہوگی تو یہی اور اس وقت تک ہوگی جب تک تم ہاں نہیں کرو گے۔“

ہم اپنا سامان اپنے گھر میں رکھنا چاہتے ہیں۔“

وہ اسی طرح خفا خفا لہجے میں بولیں۔

”رکھیے شوق سے رکھیے مگر یقین کیجئے ہم بالکل بے گناہ ہیں آپ کی قسم اماں جی!“ اس بار لہجہ ہتھی سا تھا۔

”تو تمہیں قصور وار کون کہہ رہا ہے۔“

”تو پھر سزا کیوں دے رہے ہیں؟ سزا تو قصور وار کو دی جاتی ہے۔“ وہ خفگی بھرے لہجے میں کہہ رہے تھے۔

”میری زندگی ماں تو تیرے دکھ پر اندر سے مر رہی ہے مگر دکھ کتنے ہی بڑے ہوں، اس نے زندگی لکھی ہو تو بدلنا

”ہے۔“

ماں جی ان کے شانے سے پیشانی ٹکائے پھوٹ پھوٹ کر رو دیں۔

”میرے اختیار میں ہو تو مر جاؤں۔ بڑے بیٹے معزور بچے دوسرا صحت مند بچوں کا باپ بنا۔ ماشاء اللہ تو انہیں بے سایہ رہا۔ اللہ گواہ ہے ہر نماز میں دعا مانگتی ہوں کہ ربنا والا تحملنا مالا طاقتہ لنا بہ (اے ہمارے رب ہم پر ہماری طاقت سے بوجھ نہ

تھارے پر نمانے بچپن میں ہمیں سورہ بقرہ کی آخری دس آیات زبانی یاد کرائی تھیں۔ انہیں میں سے ایک یہ بھی ہے۔ یہ بھی طاقت ہے جب ہی آزمائش ایک کے بعد ایک آرہی ہیں، مگر کسی وقت میری ہمت جواب دے سکتی ہے بیٹے! سنجال لو۔ یہ گھر بکھر رہا ہے، بات بگڑ رہی ہے۔ اس وقت جس کو ذرا سا بھی ہوش ہے اس پر ذمہ داری بھی بڑی ہے۔ چاروں طرف بگڑ رہا ہے۔ اس کی زبان، رہن سہن طور طریقے سب ہم سے الگ ہیں۔ وہ ہماری ہو کر بھی ہم میں سے نہیں ہو رہے تو اب ہماری ہے اسے غیر نہ کرو۔“

”یہ ہمارے بوجھ ہمارے لیے کیوں، وہ جو روپوش ہیں ان کی ذمہ داری کچھ نہیں؟“ تیمور علی خان بات کاٹ کر تنگی سے لے۔

”بیٹے! اصول ہے کہ پانی ڈھال کی طرف بہتا ہے۔ اس طرف ڈھال نہیں ہے چڑھائی ہے، تمہاری سمجھ میں بات نہیں ہے اور کچھ ہو سکتا ہے۔“

اماں جی محبت بھرے لہجے میں دلیل سے کام لیا۔

”یہ آپ کیسے کہہ سکی ہیں کہ ہماری سمجھ میں بات آ سکتی ہے۔ نہیں آرہی ہماری سمجھ میں بات۔“ انہوں نے جھلا کر کہا۔

”جان کر انجان بن رہے ہو تیمور! یہ دوسری بات ہے۔“ اس مرتبہ اماں جی کا لہجہ بہت شکستہ تھا۔ ”آپ یقین کریں اماں

تمہاری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔ دکھ تو اس بات کا ہے، وہ ہمارے ساتھ اس زیادتی میں کتنی آسانی سے شریک ہو گئیں۔!“

”وہ“ کا صیغہ استعمال ہوا تھا جو اس بات کی علامت تھا کہ ذہن میں چور راستے سے کوئی تبدیلی در آئی ہے وہ افسردگی کا کہہ رہے تھے۔

”وہ عورت ہے بیٹے! اس کے سر پر آسمان ٹوٹ پڑا ہے۔ اسے اس وقت سنجالا بھی چاہیے اور سہارا بھی۔“

اماں جی نے ابھی تک ہار نہیں مانی تھی نہ ان کا لہجہ تبدیل ہوا تھا۔

”اماں جی! آپ ماں ہیں ہماری، ہماری طرف بھی دیکھیے۔“

”تمہاری ماں ہو۔ ان بچوں کی بھی تو کچھ ہوں۔“

”کچھ نہیں ہو گا اماں جی! بچوں کے باپ میں اتنے گھٹس ہیں کہ وہ بچوں کو اپنی کھڑکی میں لے سکتے ہیں۔“

”اس کا کیا کروں وہ نہ یہاں رہنے کو تیار ہے نہ اپنے ماں باپ کے پاس جانے کو۔“ اماں جی نے بے چارگی سے سر

اٹھا کر کہا۔ ”ماں صاحب چاہیں تو ان کو ہینڈل کر سکتے ہیں مگر آپ لوگ ایسا چاہتے ہی نہیں ہیں۔“ ان کا انداز خفا سا تھا۔

”ٹھیک ہے بیٹے! تم اس کی در بدری پر پرسکون رہ سکتے ہو تو اچھی بات میں تمہارے باپ تک تمہاری بات پہنچا دوں گی۔ اب تم جاؤ مجھے کچھ اور نہیں کہنا۔“

انہوں نے پاؤں اوپر کر کے لیٹنے کا ارادہ ظاہر کیا۔

یہ حلیم الطبع ماں کی خفگی کا بہت واضح انداز میں تھا۔ تیمور علی خان نے اتنی بے بسی محسوس کی کہ جی چاہا خود کو شوٹ کر لیں۔ وہ ست سے انداز میں اٹھ کھڑے ہوئے اور کچھ بولے بنا باہر نکل گئے۔

عصر کی نماز کے بعد حویلی میں چہل پہل شروع ہو جانا روزانہ کا معمول تھا۔ گاڑیوں کے ہارن بچوں کی اچھل کود چائے کے برتنوں کی کھٹکناہٹ گھوڑوں کی ہنہناہٹ۔

اس لیے سب نہیں تو حویلی کے بہت سے لوگوں نے بازمین کے کمرے سے سامان لٹکا دیکھا۔ تو چونک پڑے۔ ایک بڑا سا سوٹ کیس ایک بیک ایک پرام۔ جو نوکر اٹھا کر بڑے پھانک کے سامنے کھڑے تانگے کی طرف لے جا رہے تھے، سیاہ بڑی سی چادر میں آدھا چہرہ چھپائے گود میں روشانی کو لیے جو ادکی انگلی تھامے بازمین اپنے کمرے سے نکل کر اماں جی کے کمرے کی طرف بڑھی مگر اماں جی درمیان ہی میں ٹل گئیں ننگے پاؤں کھلے سر حواس باختہ پیچھے پیچھے عالم تاب، رئیسہ بیگم اور بدوشن آراء۔

اماں جی نے چیل کی طرح جھپٹ کر جو اد کو اپنی جانب کھینچا۔

”کہاں جا رہی ہے بیٹی! بغیر کچھ کہے بغیر کچھ سنے۔“

وہ بھڑکی ہوئی آواز میں مخاطب ہوئیں۔ ان کا پورا وجود سوکھے پتے کی طرح لرز رہا تھا۔

”میرا اس گھر سے کوئی رشتہ نہیں اماں جی! مگر میں آپ کی محبتوں کی مقروض ہوں۔ میں بچوں کو آپ سے ملانے کبھی بھی آجایا ہوں گی۔ مگر اس شرط پر کہ آپ لوگ میرے ماں باپ کو اس حادثے کی اطلاع نہیں دیں گی، اگر آپ لوگوں نے ایسا کیا تو نہ میں اپنے ماں باپ سے طوں گی اور نہ بچے آپ سے۔“

اس نے سپاٹ لہجہ میں کہا۔

”مگر آپ جا کہاں رہی ہیں چھوٹی بھابی!“

روشن آراء نے آگے بڑھ کر بازمین کے شانے تھام لیے۔

”کیوں کہہ رہی ہیں آپ مجھے چھوٹی بھابی۔ کالک لگی ہے میری شکل پر اور ایسی عورت سے کسی کو رشتہ قائم کرنے میں کوئی خوشی نہیں ہوتی۔“

وہ اسی طرح سرد مہری سے گویا ہوئی۔

”ہمیں پتا ہے تم کیا ہو۔ تم ہماری ہو۔ ہمیں تم پر فخر ہے کہ اتنے آزاد ماحول میں پرورش پانے کے بعد بھی تم نے حویلی میں خوش رہنے کے طریقے سیکھ لیے۔ یہاں کے ہر قاعدے قانون کو اپنایا سب سے بڑھ کر ہم سب کے دل جیت لے چھیں

دیکھو تو ہمارے سینوں میں ٹھنڈک پڑ جاتی ہے۔“

”کہاں اپنایا یہاں کے قانون قاعدوں کو اسی کی تو سزا بھگت رہی ہوں بس اتنی سی غلط فہمی میں ماری گئی کہ ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ آدمی کی بیوی ہوں۔ وہ اس دور کی آگاہ اور پراعتماد عورت کی فضیلت سمجھتا ہے۔ آپ لوگ مجھے نہ روکیں۔ اگر ایسا کریں تو بیکار کریں گے کیونکہ مجھے ہر صورت جانا ہے۔“

آپ لوگ مجھے الوداع کہہ دیں میں بچوں کو آپ سے ملانے جلد ہی آؤں گی۔“ اس کا لہجہ قطعی انداز ظاہر کر رہا تھا۔ اماں جی روتی ہوئی آگے بڑھی تھیں۔ اور بازمین کو لپٹا لیا تھا۔

”میں بے موت مر جاؤں گی میری بیٹی۔“

”یقین کریں اماں جی مجھے آپ کو دکھ پہنچا کر خوشی نہیں ہو رہی، مرا بس چلے تو میں آپکو ہمیشہ کی خوشی دوں آپ کی دوائیں لوں، مجھے جانے دیں۔ اماں جی میں مجبور ہوں۔“

تیمور علی خان تانگے میں سامان دیکھ کر چونکے تو تھے مگر دوسرا خیال یہی آیا تھا کہ شاید کوئی مہمان آیا ہے۔ مگر ہال کے سامنے کشادہ اور طویل راہداری میں ان سب کو کھڑا دیکھ کر خاص طور پر سیاہ جادر میں چھپی ہوئی عورت کے گلے لگی روتی ہوئی ماں کو دیکھ تو جیسے ان میں بجلی سی بھڑکی، جو اد کو رئیسہ بیگم نے گود میں اٹھا لیا تھا۔

”کیا ہوا ہے بھابی بیگم؟“ وہ بری طرح پریشان ہو گئے۔

”بازمین جا رہی ہے۔ تم بھی خدا حافظ کہہ دو۔“

رئیسہ بیگم نے شکایتی سے انداز میں بھائی کو جیسے کچھ بتایا۔ جیسے واقعی وہ اس حادثے کے ذمہ دار ہوں۔

”کہاں؟“ ان کی مضبوط اعصابی قوت امتحان میں پڑ گئی۔

”یہ نہیں بتا رہی۔“

”کیوں!“ وہ درحقیقت بری طرح پریشان ہو رہے تھے۔

”کیا کیوں لگا رکھی ہے۔ جاؤ تم اپنا کام کرو۔“

رئیسہ بیگم نے جو اد کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے ناراض لہجہ میں کہا۔

”تو کیا بچوں کو بھی۔“

”خدا ہو گئی سیلفش نیس کی۔“ روشن آراء نے کچھ جتانے کے انداز میں بھائی کو گھورا۔

”یعنی تمہاری طرف سے یہ چلی جائے بچوں کو چھوڑ جائے؟ بچے اتنے چھوٹے ہیں کہ انہیں ماں سے جدا کرنا گناہ کبیرہ کے برابر ہے۔ ہم تو اس کے ساتھ یہ ظلم نہیں کر سکتے۔ اول تو ہم اسے جانے ہی نہیں دے رہے بالفرض اگر یہ جاتی ہے تو بچے اس کے ساتھ جائیں گے۔ ہمیں بچوں سے کتنی محبت سہی مگر ہم اس سے زیادہ تو اس کی اولاد کو نہیں چاہ سکتے۔“ عالم تاب نے گنگائی گویا ان کی جھاڑ جھاڑ کی۔

اماں جی نے ہنوز بازمین کا سراپے سینے سے لگا رکھا تھا۔

”ہمارا مطلب یہ نہیں تھا۔“

”تیور! تم ہمارے معاملات میں حصہ نہ لو۔ کیوں اپنا قیمتی وقت ضائع کرتے ہو۔“ رئیس بیگم نے بھی بھانج کی ہاں میں ہاں ملائی۔

”آپ کو اس طرح نہیں کرنا چاہئے۔“ تیمور علی خان نے بہت دکھ سے نازنین کو مخاطب کیا۔

”پھر کس طرح کرنا چاہئے۔ مزید مفت کی ذلت کا انتظار کرنا چاہیے؟“

اس مرتبہ اماں جی بولی تھیں اور نازنین نے ان کی طرف حد درجہ عقیدت و محبت سے دیکھا تھا۔ اس کے لبوں تک آج جملہ اماں جی نے کہہ دیا تھا۔

”خدا نخواستہ۔ اگر یہ اپنے گھر جانا چاہتیں تو ہم خود سارے انتظامات کرتے، مگر اس طرح تو ہم بھی انہیں نہیں جانے دی گے۔ پلیز آپ اپنے کمرے میں چلیے، اماں جی سامان اتر دئیے۔“

”ہم جو اد کو لے کر باہر جا رہے ہیں۔“ انہوں نے جو اد کی طرف ہاتھ بڑھائے۔

”میں بچی نہیں ہوں، جو آپ کے الفاظ کے بہر پھیر میں الجھ جاؤں۔ آپ مجھے نہیں روک سکتے۔ آپ لوگ مجھے مزید پریشان نہ کریں حق مہر کا چیک میرے پاس ہے میں بچوں کی کسٹڈی کا مقدمہ لڑا سکتی ہوں۔“

آؤ جو اد! اس نے بیٹے کو پھوپھی کی گود سے اتارنے کی کوشش کی۔

”ہم بابا! صاحب کو لے کر آتے ہیں تب تک آپ انہیں رد کیے۔“ تیمور علی خان کو یہی حل بھائی دیا۔

”کوئی ضرورت نہیں ہے بابا صاحب کو بلانے کی۔ بات نہ الجھائیں کوئی فائدہ نہیں۔ آؤ بیٹے! اس نے ہر جواد کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

رئیس بیگم نے روشن آراء کو آنکھ بچا کر اشارہ کیا کہ وہ بابا صاحب کو بلا لائیں۔

اس طرح جانا مناسب نہیں ہے ناز۔ آرام سے بیٹھ کر بابا صاحب سے بات کرو۔ وہ تمہاری ہر ممکن مدد کریں گے۔ تمہاری بات سنیں گے۔ کوئی ایسا حل نکالیں گے جو تمہارے حق میں ہر طرح سے بہتر ہوگا۔“

رئیس بیگم نے بہت نرم لہجے میں بہت اپنائیت کے ساتھ اسے سمجھایا۔

روشن آرا اس موقع سے فائدہ اٹھا کر کھسک گئی تھیں۔

تیمور علی خان اب خاموش کھڑے تھے۔

”اؤ بیٹی! تم میرے کمرے میں چلو۔ آرام سے بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔“

اماں جی نے اسے شانوں سے تھام کر کہا۔

”مجھے معاف کر دیجئے اماں جی! اب بس مجھے جانے دیں۔“ نازنین کی نرمی میں صند پوشیدہ تھی۔

”ہاں تو ٹھیک ہے۔ ہم تمہیں یہاں نہیں رکھیں گے۔ خود گھر در کا انتظام کر کے دیں گے۔“ عالم تاب نے چکارنے کے انداز میں کہا۔

تیمور علی خان نے الجھ کر عالم تاب کی طرف دیکھا۔ انہوں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں زبان بندی کا اشارہ کیا۔

”نہیں! نہیں! اچانک سامنے دیکھ کر ایک لمحے کو تو چکر اکر رہ گئی۔ اس نے آج تک ان سے بھی دو بدو بات نہیں کی تھی۔“

”یہ ہو گیا۔؟“ وہ انجان بن کر پوچھ رہے تھے، روشن آرا نے نہایت اختصار سے انہیں مکمل رپورٹ دے دی تھی۔ ان ہونڈ پریش رہائی ہو گیا تھا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ اور کانوں کی لوؤں سے لگتا تھا۔ خون ٹپک رہا ہے۔

”یہ جانے کا کون سا انداز ہے ناز۔ ہمیں تمہارے اس اقدام سے بہت دکھ ہوا۔“

”سب کے دکھ دور ہو جائیں گے۔ مگر میرے دکھ میری موت تک بڑھتے رہیں گے۔“

نازنین نے بے بسی سے کہا۔ اس کی آواز بھرا گئی تھی۔

”ہم تمہیں اس طرح کیسے جانے دے سکتے ہیں؟ اگر تم یوگنڈا جانے پر راضی ہو، تو ہم انتظام کیے دیتے ہیں۔“ انہوں نے ہنسل خود پر قابو پایا۔

”اگر وہاں اس حادثے کی اطلاع ہوئی تو میں زہر کھالوں گی۔“

بابا صاحب ایک ٹائیپے کو خاموش ہو کر رہ گئے۔ سب کھڑے ہوئے افراد ان کی شکل دیکھنے لگے۔ ”تم بے قصور ہو۔“

فلت کی بربادی ہے ہم چاہتے ہیں کہ کسی بھی صورت تمہارے تحفظ کا بندوبست کریں۔ تم نقصان کے سودے اپنے ساتھ لے کر چلی گئیں۔ تو ہم خود کو کبھی معاف نہیں کر سکیں گے۔“

”عزت اور موت کا نقصان کبھی پورا نہیں ہوتا۔ یہ ہمیشہ کے نقصان ہوتے ہیں بابا صاحب۔“

نازنین کے رخساروں پر اشک رواں ہو گئے۔ چاروں طرف بھیانک سناٹا چھا گیا۔

”آپ اسے اپنے کمرے میں لے کر چلو۔ اس کو اچھے کپڑے پہننے کو دو۔ خوشبو لگاؤ۔ دلہن بناؤ۔“ وہ اماں جی سے ناظم ہوئے۔

”جاؤ تیمور! تم بھی نہادھو کر تیار ہو جاؤ۔ مغرب و عشاء کے درمیان تمہارا نکاح ہے۔ اپنے دو تین دوستوں کو بلاؤ۔“ پھر ”عالم تاب کی سمت بڑھے“ کھانے میں اچھا سا میٹھا بناؤ۔ خوشی کی تقریب میں خوشی نظر آنا چاہئے۔ اسے ہمارا حکم سمجھا جائے۔“

”چھتری نکاتے ہوئے واپس پلٹ گئے۔ تیمور علی خان تو سکتے کی کیفیت میں باپ کو جاتا دیکھتے رہے رئیس بیگم نے روشا سے لاپٹی گود میں لے لیا۔

نازنین کی کیفیت اس کی اپنی سمجھ سے بالاتر تھی۔ اس کو یوں محسوس ہو رہا تھا کہ اس کے وجود کی کائی کٹ رہی ہو۔ وہ نکھر اُڑے مگر نظر پر طلوع ہو رہی ہو۔

”آخر کر دی تمہاری ساری زندگی حرام یا اور علی خان تمہاری اولاد۔ تمہاری جاگیر، تمہارا بھائی سب کچھ میرا ہے۔ تم نے

بڑی بے رحمی سے میرے سر سے چادر اتار دی تھی۔ میں نے بہت کوشش کی کہ کسی طرح میرے دل کی عدالت میں بے گناہ ثابت ہو جاؤ۔ اور یہ نہ ہو جو میں مجبوراً چاہ رہی ہوں۔ مجبوری یہ ہے کہ میں اپنے اندر کی کھولن کو ٹھنڈا نہیں کر رہی۔ یہ تب ہی ٹھنڈی ہوگی جب تمہاری ہمیشہ کی نیندیں حرام ہوں گی۔“

”آؤ بیٹی! اندر چلتے ہیں۔“ اماں جی نے اسے تھام کر بہت محبت سے کہا۔

نہ جانے کیوں تیمور کی طرف دیکھ کر انہیں یوں محسوس ہوا تھا۔ کہ ان کا دل کسی اتھاہ میں اترتا جا رہا ہو۔
”اگر میں ایسی ہوں جیسا تم نے سمجھا اور مجھ پر طلاق کا داغ لگایا تو پھر ایسی ہی سہی۔“
وہ اماں کے ساتھ چلتے ہوئے طمانیت سے سوچ رہی تھی۔

”آج ہی کیوں۔ دو چار روز بعد چلے جائیں گے۔“ اماں جی نے ہچکچا کر دلاور علی خان کی طرف دیکھا۔

”نہیں آج ہی۔ آج کہانی کا باب مکمل ہوا۔ نئی کہانی۔ نئی جگہ سے۔ آپ اگر کچھ روز ان کے ساتھ گزارنا چاہتے ہوں تو ان کے ساتھ چلی جاؤ۔ ہماری طرف سے اجازت ہے۔ فی الحال ہم بچے ان کے ساتھ نہیں بھیج رہے تاکہ وہ دونوں چند دن بالکل تنہا رہیں۔ اور ایک دوسرے کے لیے گنجائش پیدا کریں۔ اور حقیقت کا سامنا کرنے کے لیے اپنے آپ کو تیار کریں اور دور تک کی سوچیں۔“

ہمارا خیال ہے ان دونوں کے درمیان آپ کی موجودگی انہیں اپنی ذمہ داری کا احساس دلانے میں کارآمد و مفید رہے گی۔“

وہ کہہ کر اس طرح خاموش ہو گئے جیسے اب ان کے پاس کہنے کو کچھ نہ رہا ہو۔ اماں جی زینے کی طرف بڑھ گئیں۔

تیمور علی خان کا کمرہ کھلا ہوا تھا۔ رئیسہ اور بصیر علی خان کی دہن دروازے ہی میں کھڑی تھیں۔

”خیریت اس طرح بیچ دروازے میں کیوں کھڑی ہو۔“ وہ حیرانی سے بولیں، آواز میں افسردگی کا تاثر بھی تھا۔

”بہت رورہی ہے تازہ۔ دوسرے بے ہوش ہو چکی ہے۔ ابھی اسے سکون کی دوا دے کر لٹایا ہے۔“

دیکھ لو بے ہوش تو نہیں ہے؟ اماں جی گھبرا گئیں۔

تیمور کہاں ہے؟ انہوں نے پوچھا۔

”ہاں نہیں۔ ابھی تو سوٹ کیس پیک کر رہے تھے۔“ بصیر علی خان کی دہن بولیں۔

”اچھا میرے بھی دو تین جوڑے رکھ دو۔ اماں جی بہت اداس نظر آ رہی تھیں۔“

”آپ کے۔ کیوں؟“ رئیسہ بیگم حیران ہوئیں۔

تمہارے بابا صاحب کہہ رہے ہیں۔ کہ مجھے ساتھ جانا چاہئے۔“

اسی لمحے تیمور علی خان تیزی سے اپنے کمرے کی سمت آتے دکھائی دیے۔

انہیں دروازے میں کھڑا دیکھ کر ٹھٹکے، پھر بغیر بات کئے انکے درمیان راستہ بنانے کی کوشش کرتے ہوئے کمرے میں

نہ بن سکے۔

وہ اب بھی ان کے پیچھے کمرے میں داخل ہو گئیں۔

بازمین پر خوبصورت کھیس ڈالا ہوا تھا۔ دہن بننے کی کوئی علامت اس کے چہرے پر نہیں تھی۔ سوائے اس کے کہ بالوں

نہ ہوں گے ہوئے تھے۔ تیمور علی خان وارڈروب کھول کر کچھ تلاش کر رہے تھے۔

”مرد کھانا کھا رہے ہیں تم پہلے کھانا کھا لو تیمور۔“ رئیسہ بیگم نے انہیں متوجہ کیا۔

”جوک نہیں ہے ہمیں۔“ وہ سپاٹ لہجے میں کہہ کر پھر ادھر ادھر ہاتھ مارنے لگے۔

”تھوڑا بہت تو کھا لو بیٹے۔ بہت دور جانا ہے۔“ اماں جی کا انداز خوشامدانہ تھا۔

تیمور علی خان نے کچھ نکال کر وارڈروں کی، ایک نگاہ تازمین پر ڈالی۔

”سفر بہت دور کا ہے بی بی جان، اگر ان کی طبیعت تھیک نہیں ہے تو۔“

اب تو بہت دنوں تک اس کی طبیعت اسی طرح رہے گی۔ تھوڑا تماشا ہوا ہے۔ اس کے ساتھ بڑی گاڑی ہے، پیچھے لیٹ جائے گی، تم فکر نہ کرو۔“

انہوں نے دکھ بھرے انداز میں تسلی دی۔

تیمور علی خان نے ماں کی طرف دیکھا۔

”خوش ہیں ناں اماں جی آپ؟“ ان کے انداز میں جانے کیا تھا۔ اماں جی تیزی سے آگے بڑھیں۔ اور ان کا سر سینے

ے لگا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ ”بیٹھے احسان کیا ہے تو بار بار نہ جتنا اماں جی مر جائے گی۔“

”اماں جی۔ چپ ہو جائیں۔“ رئیسہ بیگم نے گھبرا کر پہلے تازمین کی طرف دیکھا، پھر دونوں کو الگ کیا۔

”اب اتنے بھی کہیں نہیں ہیں اماں جی! کہ آپ سے بدلے لیں۔“ تیمور علی خان نے انگلیوں کی پوروں سے ماں کے

الٹ صاف کیے۔

”میں صدمے جاؤں اپنے بچے کے۔“ وہ پھر رونے لگیں۔

”تم تھوڑا سا کھانا کھا لو تیمور۔“ رئیسہ بیگم نے اصرار کیا۔ ”ورنہ اماں جی بوچھ محسوس کرتی رہیں گی۔“

”ٹھیک ہے ہم کھالیں گے آپ فکر نہ کریں۔“ وہ اپنا سوٹ کیس کھولنے لگے۔

”تاز کا سامان رکھ دیا رئیسہ۔؟“ اماں جی نے پوچھا۔

”جی وہ تو شام ہی کو رکھ دیا تھا۔ ماما ساتھ جائے گی۔ آپ فکر نہ کریں۔ وہ سب سنبھال لے گی۔ انہوں نے اماں کو تسلی

دی۔

اسی لمحے تازمین کسمسا کر اٹھ بیٹھی۔ اور سر جھٹک کر چاروں طرف دیکھنے لگی۔

”کیا نا تم ہوا ہے؟ میں کہاں ہوں۔“ وہ گھبرا کر پوچھ رہی تھی۔

”سب تیزی سے اس کی طرف بڑھیں۔“

”تم یہاں حویلی میں ہو۔ تیمور کے کمرے میں۔“ یہ کہتے ہوئے رئیس بیگم کے دل کو کچھ ہوا۔
اور نازنین گویا ایک دم حواسوں میں آگئی۔ ”اماں جی! روٹانے کہاں ہے؟“
”وہ عالم تاب کے پاس ہے بیٹی۔ دودھ پی کر سو چکی ہے۔“
”اماں جی میں بچوں کو یہاں چھوڑ کر نہیں جاؤں گی۔ مجھے وہم آ رہا ہے۔“
اس نے اماں جی کی طرف التجا کے انداز میں دیکھا۔

”ارے نہیں بیٹی۔ بچے اپنے گھر میں ہیں۔ تمہارے بابا صاحب کی تو جان ہے بچوں میں۔ جب وہ باری کو اتنا پیار کرتے ہیں تو پھر روشی اور جواد تو ان کی اولاد ہیں تم فکر نہ کرو۔“
اماں جی نے شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔
”میرا دل نہیں مان رہا۔“ وہ ضد کے انداز میں گویا ہوئی۔

”تمہارے بابا صاحب کا حکم ہے بیٹی؟ انہوں نے سوچ سمجھ کر ہی کہا ہوگا“ انہیں نے سمجھانے کی کوشش کی۔
”جواد تو پھر بھی بڑا بچہ ہے اماں جی! روشی بہت چھوٹی ہے مجھے چین نہیں آئے گا۔“
”اماں جی! آپ بچوں کو ساتھ لے چلیں۔ کوئی فرق نہیں پڑتا۔“

تیمور علی خان نے مداخلت کی۔ ”اور پھر سب کچھ بچوں کے نام پر تو ہوا ہے۔ ہم بھی بچوں کو یہاں چھوڑنے کے حق میں نہیں ہیں۔“

وہ کسی کی طرف دیکھے بغیر باہر نکل گئے۔

کمرے میں ایک دم سناٹا چھا گیا۔

”کتنا اونچا ہو گیا ہے، ایکالکی مرا تیمور۔ رئیس! سب سے چھوٹی اولاد ہے یہ میری۔ سب کا پیارا، آنکھوں کا تارا۔ اور کام بڑے پڑ گئے ہیں اس پر۔“

اماں جی روتی ہوئی بڑبڑاتی ہوئی خود بھی باہر نکل گئیں۔

سرائے آئے انہیں ایک ہفتہ ہونے کو آیا تھا۔ ماما بلی اماں جی بچوں کے ساتھ لگی رہتی تھیں۔ نازنین زیادہ تر اپنے بندے روم میں بند رہتی تھی۔ تیمور علی خان دن کی روشنی میں دکھائی نہیں دیتے تھے۔ رات کے پہلے پہر ان کی جیب پورٹیکو میں داخل ہوتی تھی۔

آج تو کچھ زیادہ ہی وقت ہو گیا تھا۔ پریشانی فطری تھی۔ روشی کو ایک نظر دیکھ کر جب وہ واپس آئی تو دل بڑا پریشان سا تھا۔ وہیں دروازے سے ٹیک لگا کر کھڑی ہو گئی۔

تیمور علی خان جانے کب خاموشی سے اوپر چلے آئے تھے۔

”خیریت۔ یہاں اس طرح کیوں کھڑی ہیں آپ؟“ وہ چونک پڑے۔

”ایسے ہی۔“ وہ سرد آہ بھر کر دروازے سے ہٹ گئی۔

”آپ لندن کب جا رہے ہیں۔“ اس نے گیلے بالوں کا جوڑا کھول کر بال پھیلائے اور پنکھے کی ہوا میں سکھانے لگی۔
”یہ نہیں جا رہے۔“ انہوں نے کوٹ اتار کر بیڈ کی طرف اچھالا۔ جو فوراً ہی نازنین نے آگے بڑھ کر اٹھا لیا اور ہینگ کرنے لگی۔

”اب آپ کو چلے جانا چاہئے۔“

تیمور علی خان نے ٹائی کی گرہ ڈھیلی کرتے ہوئے قدرے چونک کر اس کی سمت دیکھا۔ زرد کرتے سرخ دوپٹے شلوار میں لبوں ٹھنوں سے نیچے لٹکتے ہوئے ریشمی سیاہ گھنے بال میک اپ سے عاری سادہ مگر ہوش ربا چہرہ۔ رشتہ بدل گیا تھا۔ تو رکھنے کا انداز بھی بدل گیا تھا۔ کسی طرح بھی دو بچوں کی ماں محسوس نہیں ہوتی تھی۔ رشتہ ابھی صرف کاغذ پر نقش ہوا تھا۔ ذہن پر بھرے نقش اتنی آسانی سے نہیں مٹتے۔

انہیں یاد تھا لیزا سے نکاح کے بعد اس سے ملاقات کی کس درجہ بے قراری تھی۔ ایک ایک بل پہاڑ بگر گزر رہا تھا۔ لیزا ان کی شدتوں پر گھبرا اٹھی تھی۔ باقاعدہ اس نے ہاتھ جوڑے تھے۔ اور وہ اس کی اس ادھر بٹا رہا ہو کر رہ گئے تھے۔

مغربی لڑکی کا کس درجہ مشرقی حیا آمیز انداز تھا۔

ناز سے ان کے نکاح کو سات دن ہو گئے تھے۔ رات کے آخری پہر بستر پر آتے ہوئے وہ ایک نامعلوم سے احساس جرم میں گرفتار ہو جاتے تھے صبح آنکھ کھلتی تو وہ بستر پر نہیں ہوتی تھی۔

نازنین ان کے اس طرح دیکھنے پر گھبرا سی گئی تھی۔

”کیوں اب ہمیں کیوں چلے جانا چاہئے؟“

”وہ آپ کا دن گن گن کر انتظار کر رہی ہوگی۔ اور پھر سب کچھ قابو میں آچکا ہے۔ یہی میرا گھر ہے۔ یہی میری مرقد ہے۔ میں ہمیشہ ہمیشہ آپ کی مشکور رہوں گی۔ اور اتنا یقین رکھیے۔ کبھی بھی آپ کی پرسکون زندگی اور خوشیوں بھری زندگی میں کوئی الجھن ڈالنے درمیان میں نہیں آؤں گی۔ میرے لیے یہ احساس ہی کافی ہے کہ میں بے ٹھکانہ نہیں ہوں۔ یہ سرائے ہے مگر اوروں کے لیے۔ میں احساس ملکیت عطا کرنے پر ایک بار پھر آپ کی مشکور ہوں۔“

بری عورت سے کوئی شریف مرد شادی نہیں کرتا۔ آپ نے مجھ سے نکاح کر کے مجھ پر پڑے چھینٹے بہت حد تک صاف کر دیے ہیں۔ اس حد تک کہ نفسیاتی طور پر میں جس احساس بے بسی و تنہائی سے دوچار ہو گئی تھی، وہ دور ہو چکا ہے۔ اب آپ لندن چلے جائیں اور اپنی حقیقی زندگی گزاریں۔“

وہ کوٹ لٹکا کر پھر پنکھے کے نیچے کھڑی ہو گئی۔

”بس۔؟“ تیمور علی خان نے ٹائی بھی بستر پر اچھال دی۔ اور شرٹ اتارنے لگے، روزانہ وہ لباس تبدیل کر کے اسٹڈی ٹسٹ چلے جاتے تھے مگر آج بیڈ پر بیٹھ گئے۔ جیسے انہیں کہیں جانیکی جلدی نہ ہو۔

”بس۔“ وہ انہی کے انداز میں گویا ہوئی۔

”نکاح ایک ذمہ داری کا نام ہے۔ ہم اسے کھیل تماشا نہیں سمجھتے۔“ وہ بدباری سے گویا ہوئے۔
”مگر یہ نکاح اور طرح کا ہے۔ اس میں سیکنڈ پارٹی آپ سے کوئی تقاضا نہیں کر رہی۔“
اسی لمحے فون کی گھنٹی بجی۔ اتنی رات کو دونوں ہی چونک پڑے تھے۔

یہ بھی طے ہو چکا تھا کہ وہ کبھی ڈائریکٹ فون ریسیو نہیں کرے گی۔ اس لیے وہ اسی انداز میں بیٹھ رہی تھیں اور علی خان نے ہی آگے بڑھ کر فون اٹھایا تھا۔

”ہیلو۔ السلام علیکم۔ کیا حال ہیں۔ اتنی رات کو فون کیا آپ نے خیرت؟“

”کب؟ ابھی۔ ابھی۔ لگ گیا ان کا سراغ۔ ہمارے حصے کی جنگ ان سے لڑنا اب آپ پر فرض ہے، اگر آپ نے ایسا نہیں کیا تو یہ بے مثال نا انصافی ہوگی۔“

”جی۔ جی۔ ہم سن رہے ہیں۔“

”ایسا نہیں ہو سکتا وہ قیامت تک اس پر راضی نہیں ہوں گی، ظاہر ہے آپ کی خاندانی آن محفوظ ہوگئی کوئی عورت ہمارے خاندان میں آ کر واپس غیر خاندان میں نہیں گئی، آپ کا کام ہو گیا، اس لیے آپ ان کی وکالت کر رہے ہیں، بچے ان کے پاس نہیں جائیں گے، وہ کسی قیمت پر رضامند نہیں ہوں گی۔“

”جی۔ جی۔ وہ پریشرائز کر رہے ہیں آپ کو۔ آپ ان سے پوچھئے پہلے ان پوائنٹس پر غور کیوں نہیں کیا تھا۔ بچے یہیں رہیں گے ان سے کہیے جو کرنا ہے کر لیں۔“

”نہیں بس۔ پلیز آپ بہت کچھ کرنے کی پوزیشن میں ہیں کر سکتے ہیں۔“

”جی۔ جی۔ جی ہاں۔ ہم سن رہے ہیں۔ تو ٹھیک ہے انہوں نے کسریٰ کیا چھوڑی ہے، یہ تماشا بھی کر کے دیکھ لیں، بل لیں گے ہم انہیں کوڑٹ میں۔“ تیمور علی خان نے شدت جذبات میں ہونٹ کاٹے۔

نازنین سینے پر ہاتھ دھرے ساکت و صامت کھڑی تیمور علی خان کی سمت دیکھ رہی تھی۔

تیمور علی خان فون بند کر کے اس کی سمت متوجہ ہوئے تو اسے پتھرائی ہوئی حالت میں دیکھ کر ایک دم کھڑے ہوئے۔ اس کی طرف بڑھے اور بے ساختہ اسے شانوں سے تھام لیا۔

”کچھ نہیں ہوگا پریشان نہ ہوں ڈونٹ وری۔ ہمیں اندازہ تھا کہ ایسا ہو سکتا ہے۔ ہم تو منتظر تھے کہ کچھ ان تک پہنچے“ منظر پر آئیں اور یہ معاملہ بھی ہمیشہ کیلئے نمٹ جائے۔ آخر کب تک انڈر گراؤنڈ رہتے؟ یا شاید انہیں ہوش ہی اب آیا ہو کہ بچے یوگنڈا نہ پہنچ گئے ہوں۔ مگر اتنا اندازہ تو انہیں بھی ہوگا کہ بابا صاحب کے جیسے جی بچے حویلی سے باہر نہیں جاسکتے۔ ان کے حساب سے تو آپ یوگنڈا پہنچ چکی ہوں گی۔“

”تیمور! مجھ پر احسان کی انتہا کر دیجئے۔ بچوں کا مسئلہ ہمیشہ کے لیے حل کر دیجیے۔“ اس نے تیمور علی خان کی سمت التجا کے انداز میں دیکھا۔

”آپ کیوں وقت سے پہلے اتنا پریشان ہو رہی ہیں۔ ایزی پلیز۔“

میں آپ کو بتا رہی ہوں تیمور۔ اگر مجھے سے بچے چھین لیے تو میں حویلی والوں کے لیے بھی مرجاؤں گی۔ بچے میرے ہیں۔ تو کم از کم وہ اپنی ماں کو جانیں گے تو سہی۔ سمجھیں گے تو سہی۔ جو انہیں معلوم ہوگا کہ ان کی ماں ان کے چچا کے نکاح میں ہے جبکہ باپ زندہ ہے تو وہ اپنے باپ کی طرح مجھ سے پیش آئیں گے۔ میں بالکل خالی بیچاؤں گی تیمور۔ وہ میرے پاس ہوں گے۔ تو میں انہیں اسٹیپ بائی اسٹیپ تمام صورت حال تو سمجھا سکوں گی۔ پلیز تیمور۔“

”ہم نے آپ سے کہا ناں۔ آپ پریشان نہ ہوں۔ انہوں نے ایک جذباتی لمحے میں ٹھہر کر دور تک راستے دشوار کر دیے ہیں۔ ہم انکی زندگی میں کوئی آسانی آنے نہیں دیں گے، اطمینان رکھیے۔“

جذبات کی شدت سے ان کا چہرہ تھمتانے لگا۔

”اور کیا کہہ رہے تھے بابا صاحب؟“ اس نے خوف زدہ ہرنی کی طرح تیمور علی خان کی سمت دیکھا۔

”کچھ نہیں۔ یہی کہ بیوروکریٹ صاحب فرما رہے تھے۔ بچے بغیر کسی ہنگامہ کے ان تک پہنچ جائیں ورنہ قانونی مدد سے وہ بہت آسانی سے بچے حاصل کر لیں گے۔ اور یہ کہ مقدمہ میں ہم کمزور پارٹی ہیں۔ کوئی اچھا وکیل سرے سے مقدمہ لے گا ہی نہیں، کیونکہ ان کی ایکس وائف ان کے حقیقی بھائی کے نکاح میں ہے جو کیریکٹر وائز از خود۔“

جب ہمارا مقدمہ ہی کمزور ہے تو آپ مجھے جھوٹی تسلیاں کیوں دے رہے ہیں؟“

نازنین کا دل بیٹھنے لگا، یہ سب سن کر۔ اس نے بے تابی سے ان کی بات کاٹ دی تھی۔

یہ تو ان کا جائزہ ہے غور کرنے پر پوائنٹس ہمارے ذہن میں بھی آسکتے ہیں۔ اس لیے ڈونٹ کئیر۔ کوئی ضرورت نہیں زیادہ سوچیں، ہم دیکھ لیں گے سب۔ اب آرام کیجئے۔

”میری تو پھر نیند اڑ گئی ہے۔ اور کیا انہیں پتا چل گیا ہے کہ۔“

وہ کہتے کہتے جھجک کر رک گئی۔

”ہوں۔ تب ہی تو سختی سے ایکشن لے رہے ہیں۔“ تیمور علی خان کے لبوں پر تلخ مسکراہٹ پھیل گئی۔

جمن جمن۔ اندر کہیں دھکتے کوٹلوں پر پانی کے چند چھینٹے پڑے۔

”مجھے ڈر لگ رہا ہے تیمور۔“ اس کا دل کانپنے لگا۔

”کچھ نہیں ہوگا۔ ہمیں کچھ اندیشے تھے، اسی وجہ سے ہم لندن نہیں گئے۔“ وہ گویا ہوئے۔

”اسی وجہ سے صرف۔؟“ نازنین کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔

”ظاہر ہے۔ یہ وجہ کوئی چھوٹی وجہ نہیں۔“

”یہ بھی ٹھیک کہا آپ نے بچوں کے صدقے میں کھونا ملا ہے۔ اللہ میرے بچوں کو بردہ خوشی دے جو مجھے نہیں ملی۔“

وہ آگے بڑھی اور برتن اٹھا کر بال سلجھانے لگی۔

تیمور علی خان یکدم گم صم سے ہو گئے تھے۔

”آپ ان سے ملیں گی۔“ بالوں نے حیرت سے پوچھا۔

”یاور باہر جیب میں ہے بچوں کو لینے آیا ہے۔ بات سمجھنے کی کوشش کرو بنی! بچے تو وہ کورٹ کے ذریعے بھی لے گئے گا۔ مگر بیٹی آگے تھوڑی رسوائی ہو چکی دو سکے بھائی کورٹ میں دلاور علی خان کی بہو سمیت دیکھو بیٹے بات اونچی آواز کے بغیر نہیں انجام کو پہنچ سکتی ہے۔ بس اب تماشا ختم ہو جانا چاہیے۔ ہم صرف یہ کر سکتے ہیں کہ اس پر حویلی کے دروازے بند کر سکتے

”آل ریڈی چھکے چھوٹے ہوئے ہیں۔ اور بھی کئی لوگ ہیں ادھر چھکے چھڑانے کے لیے۔“ وہ زربلب مسکراتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

”غالباً“۔ لوگ ہری پور پہنچے ہوئے ہیں۔“ ماہین رکی اور پلٹ کر بولی۔ باری بڑی بے ساختگی سے منہ دیا۔
یاد علی خان تین دن کراچی گئے ہوئے تھے۔ اس لیے اسے کمرے میں جاتے ہوئے تو کوئی الجھن نہیں تھی۔ نہ ز
انکھوں میں نیند تھی کہ سونے کی جلدی ہو۔ لہذا غسل کر کے پہلے نماز پڑھی پھر قرآن کی تلاوت کرنے لگی۔ نہ جانے کیوں جیسے
ہی سورۃ فتح شروع کی آواز بھرا گئی اور آنکھوں سے ایک تواتر سے آنسو بہنے لگے۔ بمشکل سورۃ تمام کی اور قرآن کو بوسہ دے کر
رکھ دیا۔

اس کی کیفیت خود اس کی سمجھ سے بالاتر تھی۔ اس کا جی چاہ رہا تھا وہ اڑ کر سرائے پہنچے اور تازمین کے گلے لگ کر دل کھول
کر روئے۔

وہ بے قرار سے انداز میں باہر نکل آئی اور ہال کی طرف بڑھی۔ وہاں فون کے ساتھ چھوٹی سی ڈائریکٹری رکھی ہوئی تھی۔
وہ بے تابی سے سرائے کا نمبر تلاش کرنے لگی۔ ”ایس“ کے کالم میں سرائے کے حساب سے دیکھا۔ پھر ٹی (T) کا کالم دیکھا
کہ شاید تیمور علی خان کا نمبر درج ہو۔ پھر کے (K) کا کالم کہ شاید ”خان“ کے حساب سے نمبر درج ہو۔ مگر کسی طرح بھی کوئی نمبر
ہاتھ نہیں لگا۔ مارے کوفت کے اس کا جی چاہا ڈائریکٹری دیوار پر دے مارے۔

معا سے خیال آیا کہ چلتی پھرتی ڈائریکٹری تو باری کی صورت میں موجود ہے۔ اور اس سلسلے میں تو وہ کوئی بہانہ بنا ہی نہیں
سکتا۔ اس کے اندر جیسے برقی رود و گئی۔ وہ تقریباً بھاگتی ہوئی اوپر پہنچی۔ اور آہستگی سے دروازے پر دستک دی۔

”باری اپنے کمرے میں نہیں ہے ماہین! اسے تو میں نے کچھ دیر ہوئی باہر جاتے دیکھا تھا۔“ اسے پست سے عالم تاب
کی آواز آئی۔

وہ چونک کر پلٹی۔ دل میں کچھ عجیب سی پکڑ دھکڑ ہونے لگی۔

”وہ۔ مجھے یاد اور صاحب سے بہت ضروری بات کرنا تھی مگر ان کا نمبر مجھ سے کہیں مس ہو گیا ہے میں نے سوچا شاید باری
کو پتا ہو۔“ وہ فوراً سنبھل گئی۔

”ہاں اسے سب نمبر پتا ہوتے ہیں مگر اس وقت تو وہ باہر ہے۔ کوئی پریشانی کی بات تو نہیں۔“ وہ بغور اس کا چہرہ دیکھ رہی
تھیں۔

”نہیں بھابی بیگم! پریشانی کی تو کوئی ایسی بات نہیں۔ بس بھوتے ہیں کچھ پرستار۔“ وہ زبردستی مسکرائی۔

”ہاں، جب میں نماز پڑھ کر نیچے گئی تو وہ باہر جاتا دکھائی دیا تھا۔ جانے کون کون سے کام اپنی جان کو لگا رکھے ہیں، منج
ہوتی ہے اور بس شروع۔ میں تو بس اسے مصروف ہی دیکھتی ہوں۔ اللہ اسی طرح چلتا پھرتا رکھے۔ صحت تندرستی دے، ماشاء
اللہ کسی کام سے نہیں گھبراتا۔ جب ہی بڑے خان اس کی اتنی قدر کرتے ہیں۔ دو چار روز کو کراچی یا سرائے چلا جائے تو بڑے
خان کو بات بے بات غصہ آنے لگتا ہے۔ وہ آگے سے آگے ان کے کام سنبھال لیتا ہے۔“

عالم تاب بہت محبت سے اس کا ذکر کر رہی تھیں۔

”مگر میرا خیال ہے یاد اور صاحب تو اسے بہت معمولی آدمی سمجھتے ہیں۔“ اس نے عجیب سے لہجے میں کہا۔ عالم تاب اس
لہجے سے کچھ چونکی تھیں۔ اور اس کی شکل بغور دیکھ رہی تھیں۔

”نہیں۔ ایسی تو کوئی بات نہیں۔ یاد اور کا انداز تو سب ہی کے ساتھ بہت تکلف والا ہوتا ہے۔ خیر آؤ میرے کمرے میں،
ہاں چائے پیتے ہیں۔ یہ تو بیٹھک میں جا چکے ہیں۔ ماما چائے بنا رہی ہے۔“

وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھتے ہوئے بولیں۔ ماہین چب چاپ ان کے پیچھے چل پڑی۔
”ہماری ساس کی کوئی تصویر نہیں ہے بھابی بیگم۔ حیرت کی بات ہے۔“ وہ ان کے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بے

اعتبار پوچھ بیٹھتی۔

عالم تاب کی حیرت فطری تھی۔ اتنے دن گزر جانے کے بعد آج اسے یہ کیا خیال آیا تھا۔ مگر انہوں نے حیرت چہرے
سے ظاہر نہیں کی۔

”اللہ بخشے اماں جی کو، بہت ہی شرم و حیا والی تھیں۔ کبھی تصویر نہیں کھینچوائی۔ بڑا سخت پردہ کرتی تھیں اصل میں ان کی تر
یت ہی اس طرح کے ماحول میں ہوئی تھی۔ تمہیں حیرت ہوگی یہ سن کر کہ وہ زندگی میں کبھی بازار نہیں گئیں۔“

ان سے کبھی پوچھتے کہ آپ کا دل نہیں چاہتا کہ گھوٹ میں پھریں، خریداری کریں تو بڑی ہی سادگی سے کہتی تھیں کہ عورت کو
گر کے کام ٹھوڑے ہیں۔ گھر سے اچھا کچھ نہیں ہوتا۔“

”سنا ہے وہ بہت اچھی تھیں، بہت ہی اچھی۔“

عالم تاب نے ایک مرتبہ پھر تعجب سے اس کی صورت دیکھی۔ (آج یہ صبح اماں جی کیسے یاد آ گئیں؟)

”خیریت۔ کیا رات خواب میں آئی تھیں اماں جی؟“ وہ کہے بنا رہ نہ سکیں۔

”یہی سمجھ لیں۔“ وہ بھی مسکرا دی۔

”ہاں وہ بہت بھلی عورت تھیں۔ ٹھنڈی چھاؤں۔ محبت کا سمندر۔ حویلی کا اجالا۔ بس صدے اتنے طے کہ سہہ نہ سکیں
حسرت ہی رہی کہ ہم ان کی خدمت کرتے۔ بس ایک رات سوتے ہی میں چل بسیں۔ بڑے خان کو پہلے اتنی جلدی غصہ نہیں
آتا تھا۔ بڑا صبط تھا ان میں۔ کہتے تھے کہ غصہ تو بہت آتا تھا مگر اس بھلی عورت کی موجودگی کے احساس سے خود بخود جھاگ کی
طرح بیٹھ جاتا تھا۔ نہ ان میں شور تھا نہ اونچی آواز۔ بہت دبی چال چلتی تھیں۔ اس کے باوجود گھر کے کونے کونے میں محسوس
ہوتی تھیں۔“

”وہ صدے کیا تھے جو انہیں لے کر ہی ملے؟“ ماہین نے ان کے جیلے پر گرفت کر لی تھی۔

”ہزار باتیں ہوتی ہیں گھروں کی۔ میرے بچوں کا تو بہت غم کرتی تھیں۔“ عالم تاب نظریں اٹھائے بغیر یوں بولیں جیسے
کس موضوع بدلنے کی جلدی ہو۔

”بہت خوش قسمت لوگ ہیں جنہوں نے ان کے ساتھ وقت گزارا۔“ ماہین نے عام سے انداز میں ٹکڑا لگایا۔

عالم تاب خاموش ہو کر اپنی ہتھیلیاں غور سے دیکھنے لگیں۔ یہ حرکت غمازی کر رہی تھی کہ وہ کچھ سوچ رہی ہیں۔
 ”اچھا میں نے ایک بات اور نوٹ کی کہ تازہ بجو کی بھی تصویریں نہیں ہیں۔ امی تو بتاتی ہیں انہیں تصویریں کھنچوانے کا بہت شوق تھا؟“ جانے کیوں بلا ارادہ اس کے منہ سے کچھ نہ کچھ نکل جاتا تھا۔
 اسی دم ماما بڑے اٹھائے اندر داخل ہوئی۔

”ماما! باری نظر آئے تو اسے کہنا مامین بلا رہی ہیں۔ انہیں کوئی کام ہے۔“ عالم تاب نے ماما کو تاکید کی۔
 ماما خاموشی سے چائے تیار کرنے لگی۔

”ہاں بس۔ حویلی میں رواج نہیں ہے عورتوں کی تصویریں وغیرہ لگانے کا۔ ہوں گی تو سہی بس رکھی ہوں گی ادھر ادھر دیکھوں گی میں۔“

وہ ٹالنے کے انداز میں جواب دے رہی تھیں۔

ماما نے کپ اٹھا کر پہلے عالم تاب کو تھمایا پھر مامین کو۔

”جس زمانے میں بجو یہاں تھیں۔ اس وقت تو ماما بی ایک دم جوان ہوں گی۔ کیوں بھابی بیگم؟“

مامین نے دلچسپی سے ماما کا سراپا دیکھا۔ ”شادی کیوں نہیں کی ماما تم نے؟“ اس نے ماما کے نرم و صبیح چہرے کو بغور دیکھا۔ ”تمہارے تو بہت رشتے آئے ہوں گے؟“

”ضروری تو نہیں کہ ہر عورت کی شادی ہو۔ شادی کرتے نہیں ہیں مامین بی بی شادی تو ہوتی ہے۔ اب دیکھیں آپ کا ابتلا وقت یوگنڈا میں گزرا۔ کتنے لوگ ہوں گے جو آپ کو وہاں پسند کرتے ہوں گے مگر آپ کا دانہ پانی تو حویلی میں لکھا تھا۔ کیوں بڑی بیگم۔“ ماما بہت شفیق انداز میں مسکرا رہی تھیں۔

”بڑی موتیوں میں تو لے جانے والی بات کہی ہے ماما تم نے؟“ عالم تاب نے تائید کی۔

”کبھی دل تو چاہا ہوگا ماما کہ تبدیلی آئے۔“ مامین نے ماما کو چھیڑا۔

”دل کے چاہنے کو چھوڑیے مامین بی بی۔ دل تو جانے کیا کیا چاہتا ہے۔ دل کے چاہنے پر چلیں تو زندگی بہت مشکل ہو جاتی ہے۔ جو گھڑی خیر کی گزر جائے شکر ہے۔“ ماما گھٹنوں پر ہاتھ جما کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

”آج مامین بی بی کو جانے کیا کیا خیال آرہے ہیں۔“ وہ مسکراتے ہوئے عالم تاب سے مخاطب ہوئی۔

”یہی میں سوچ رہی ہوں۔ دراصل آج کل یاد نہیں ہیں تنہائی میں غور و فکر ہو رہا ہوگا۔“ عالم تاب بھی مسکرائیں۔

”باری کا دھیان رکھنا ماما۔ ملے تو کہنا مامین بی بی بلا رہی ہیں۔“ عالم تاب نے مزید تاکید کے طور پر کہا۔

”جی اچھا۔ ویسے مشکل ہے خان اگر باہر گئے ہیں تو دوپہر سے پہلے نہیں آئیں گے۔ انہیں کچھری جانا تھا نشی سے

تاریخ لینے۔ ناشتا انہوں نے کچن میں کیا تھا۔ بتا رہے تھے۔“ ماما باہر نکلتے ہوئے بولی تھی۔

”چلیں خیر۔ کوئی بات نہیں اگر میں سو گئی تو انہیں روک کر رکھنا آ جائیں۔ تو ویسے بھی ادھر پاؤں میں چکر ہے۔“ مامین

نے کپ اٹھا کر گھونٹ بھرا۔

”اپا سونے کا پروگرام ہے اس وقت۔ رات دیر سے سوئی تھیں؟“ عالم تاب نے الجھن بھرے انداز میں سوال کیا۔
 ”جی۔ بس نیند ہی نہیں آئی رات بھر۔“ اس نے نظریں جھکا کر جواب دیا۔

”روشنی کی طرف سے فکر ہوگی۔ مگر فکر کرنے کی ضرورت نہیں وہ اب دودھ پیتی پچی نہیں ہے۔“ عالم تاب نے خود ہی سوال پر ذرا ذہنی تسلی دی۔

”بہت ضد ہے اس کی طبیعت میں۔ لڑکیوں میں ضد اچھی نہیں ہوتی۔ عورت کی تو تمام عمر سمجھوتے کرتے گزرتی ہے تم سمجھانا۔ یاد رہی بہت اٹل ہے اور باپ سے الجھنا تو یوں بھی کوئی اچھی بات نہیں ہوتی۔“ عالم تاب نے اسے روشنی کی تلاش کے لیے تیار کرنے کی کوشش کی۔

”بات تو سننا چاہیے بھابی بیگم۔ عورت مرد کا فرق کیا معنی۔ تقاضے تو دونوں ہی کے مشترک ہوتے ہیں اور باپ کو تو ہر طور پر اپنی اولاد کو سمجھنے کی کوشش کرنا چاہیے، تب ہی وہ سمجھانے کی پوزیشن میں آ سکتا ہے۔“ مامین نے نرم انداز میں اختلاف کیا۔

عالم تاب نے ایک نظر مامین کو دیکھا اور مصلحت آمیز خاموشی اختیار کی۔

شام ڈھلنے میں کچھ دیر تھی مگر حویلی میں مکمل طور پر روشنی ہو چکی تھی۔ تب تھکے ہارے باری نے حویلی میں قدم رکھا تھا۔
 مارے کے قریب سے گزرے بغیر وہ اپنے کمرے میں نہیں جاسکتا تھا۔ فون کی بیل اس کے راہداری میں قدم رکھنے سے پٹن شروع ہو چکی تھی۔ اس نے تھکے تھکے انداز میں دروازے کی سمت دیکھا اور اندر داخل ہو کر ریسوور اٹھالیا۔

”ہیلو۔“

”کون؟ باری؟“ دوسری طرف روشنی تھی۔

باری کے اونگھتے جھوٹے حواس ایک دم جاگ پڑے، ”مائی گاڈ۔“

”جناب!“ خود بخود اس کا لہجہ شریر ہو گیا۔

”جناب کے کچھ وہ۔ یہ کیا طریقہ ہے فون تک نہیں کیا؟“ روشنی کے لہجے میں بلا کی ناراضگی تھی۔

”خیر۔ جناب کے کچھ نہیں اب تو سب ہی کچھ ہیں۔ مگر یہ تو بتائیے، فون کس سلسلے میں کرنا چاہیے تھا۔ میں کچھ سمجھا

”نہ؟“

”باری! میں رو رو کر پاگل ہو چکی ہوں۔ مجھے مزید تنگ نہیں کرو۔“ وہ روہانسی ہو گئی۔

”تمنا ہے۔ آپ کو تنگ کر کے مجھے کتنے نفلوں کا ثواب ملے گا۔ مگر آپ یہ تو بتائیں مجھے فون کیوں کرنا چاہیے تھا۔؟“ وہ ہنسنے والی باتوں تلے دبا کر مسکرا دیا۔

”باری! میرا دل چاہ رہا ہے میں مرجاؤں۔“

”واہ صاحب! کیا دل ہے آپکا۔ موت بھی ایسے چاہ رہا ہے جیسے آکس کریم۔“

”تم بونہی میری جان جلانے والی حرکتیں کرتے رہنا۔ بعد میں میری قبر کے سر پہ کڑکڑوتے رہنا۔“ وہ جھلائی۔

”سر پکڑنے کی پابندی ہوگی؟“ وہ بڑی سادگی سے پوچھ رہا تھا۔

”تمہارے بس کی بات تو کچھ بھی نہیں تھی۔ کاغذ کے شیر ہو۔ یہ تو میری جراتوں کا نتیجہ ہے۔“

وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی جیسے کوئی اور خیال آ گیا ہو۔ توقف کے بعد پھر بولی۔

”باری! میں بے لگام نہیں ہوں اور میں نے کسی غلط نیت سے قدم گھر سے باہر نہیں نکالے تھے۔

میں تو کا کا جان کے پاس اس لیے گئی تھی کہ وہ مجھے سمجھیں پھر حویلی والوں کو سمجھائیں۔ مجھے پتا ہے بابا صاحب کا کا جان کی بات کو بہت اہمیت دیتے ہیں۔ یہ سب تو کا کا جان نے خود۔“ اس نے جیسے خود کو روکا۔

باری بہت توجہ اور دلچسپی سے اس کا ایک ایک لفظ سن رہا تھا۔ اس لمحے اپنے پندار کا تحفظ کرتی روشنی بن کر اس کے حواسوں پر چھانے لگی۔

”آپ کیا ہیں، کس وجہ سے ہیں مجھے سب پتا ہے۔ آپ کیوں خود کو اتنا الجھاتی ہیں میری جان؟“

اس نے بہت آہستگی سے اسے تنگ کرنے کی انتہا کر دی تھی اور زیر لب مسکرا رہا تھا۔

”یہ کیا بد تمیزی ہے؟“ روشنی ایک دم حواس باختہ سی ہو گئی۔ محسوس ہوتا تھا کہ دل پسلیاں توڑ کر باہر نکل بھاگے گا۔

”مجھ سے آئندہ اس طرح بات مت کرنا۔“ اس نے ناراض انداز میں درحقیقت گھبرا کر فون بند کیا تھا۔ باری نے

ریسورکان سے ہٹا کر سر کھجاتے ہوئے ریسور کو کچھ دیر گھورا۔ پتا نہیں کیا کہنا چاہتی ہوگی کیوں فون کیا تھا۔

”غلطی ہو گئی میڈم۔ مگر معاف کیجئے گا، بالکل بے کار ہیں آپ۔ ایک جملہ نہیں سہہ سکیں۔“

اس نے ریسور کریڈل پر ٹکا دیا اور پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈال کر سیٹی پر کوئی خوبصورت سی دھن بجاتا اپنے کمرے کی طرف چل پڑا۔ سارا اضمحلال، ساری تھکاوٹ اڑن جھو ہو گئی تھی۔ چال بتا رہی تھی کہ طبیعت بہت ہلکی ہے۔

”خان! آپ کا فون ہے“ سرسوتی نے دروازے سے جھانک کر باری کو مخاطب کیا۔

باری نے چونک کر کتاب بند کی۔ ”کس کا ہے؟“ اس کا دھیان روشنی کی طرف گیا تھا۔

”جی یا درخاناں کا ہے۔ کراچی سے“ وہ اتنا کہہ کر پلٹ گئی۔

باری سوچنے کے انداز میں اٹھ کھڑا ہوا۔ اب تو ہر بات ہی چونکا رہی تھی۔ انسان بہت سے رازوں کا بوجھ اٹھائے پھر رہا

ہو تو خواہ مخواہ کے دھڑکے لگے رہتے ہیں۔

وہ بڑی تیزی سے زینہ طے کر کے نیچے آیا تھا۔

”السلام علیکم خان۔“ اس نے ماؤتھ پیس میں کہا۔

”وسلام۔“ لکچرنگیلی ایسا ہے باری کہ تمہیں ہری پور جانا ہے۔ وہاں میرے پی۔ اے شیخ اسد اللہ سے کہنا کہ وہ جوہن

سٹ فائل ہوا تھا۔ اس کی تاریخ پتا کر کے بتائیں اور اس کی فائل تمہیں دے دیں۔ میں واپس دریاہنستی پہنچوں گا اور یہ

پتہ لے کر پشاور جاؤں گا۔ حویلی میں بھی کچھ کاغذات ہیں، وہ لیے بغیر میں پشاور نہیں جاسکتا۔ میرے پاس وقت بہت کم

ہے۔ تم فوراً رینو کر کے ہری پور جاؤ۔ یہ فائل نہایت اہم ہے۔ بہت احتیاط کرنا۔ وہاں موجود اگر کوئی شخص تم سے فائل لے کر

بھاگ جائے تو ہرگز ایسا نہ ہونے دینا۔ اسوشلی میں اس کام کے لیے تمہیں بھیج رہا ہوں۔ جب تم ہری پور پہنچو تو شیخ اسد اللہ سے

پتہ لے کر اچھی رنگ کر لیں۔“

باری توجہ سے ہدایت سن رہا تھا۔

”جی خان۔ اور کچھ؟“

”نہیں۔ مابین ٹھیک ہیں؟ ان کو بتا دینا میں پرسوں صبح حویلی پہنچوں گا۔ اوکے۔“ انہوں نے فون بند کر دیا تھا۔

باری نے ریسور رکھتے ہوئے کچھ سوچا اور مسکرا دیا۔

”اللہ کی مہربانی ہے اور کیا ہے۔ کسی کی پریشانی میں کسی کا سکون پوشیدہ ہوتا ہے۔ نیارے کھیل ہیں میرے مولا۔“ اس

کا ایک ایک لفظ سن رہا تھا۔

وہ پلٹا تو مابین کو کھڑے پایا۔

السلام علیکم۔ ٹھیک ہیں آپ۔ ڈی سی کی لائف بہت بڑی (Busy) ہوتی ہے۔ بیگم صاحبہ۔“

”ہو سکتا ہے پریشانی بھی بہت ہوتی ہو مگر ڈی سی صاحب ظاہر نہ کرتے ہوں۔“

مابین ہلکی سی ہنس کر گویا ہوئی۔

”آپ کے ساتھ تو پریشان نہیں ہونا چاہیے، اب تو انہیں بہت ایزی فیل کرنا چاہیے“ باری نے مسکراتے ہوئے برجستہ

کہا۔

”اور کوئی کہے تو کوئی بات نہیں۔ مگر تم نہ کہو۔ تمہاری پیورٹی تمہارا سٹنس (جوہر) ہے۔ دوغلی بات تمہیں سوٹ نہیں

لگتی۔“ مابین اپنے لہجے کی تلخی پر قابو نہ رکھ سکی۔

باری کی مسکراہٹ ایک دم ہوا ہو گئی۔ اس نے بہت الجھ کر مابین کی طرف دیکھا۔

آج وہ اسے بہت بدلی بدلی محسوس ہو رہی تھی۔ بدلے بدلے انداز تو گزشتہ کئی دنوں سے نوٹ کر رہا تھا مگر اس کے

خود اواب سے پہلے تک سابقہ انداز میں بات کرتی رہی تھی۔ تبدیلی جو دوسروں کے ساتھ اس نے نوٹ کی تھی وہ یہ تھی کہ وہ

ایک ایک خواتین سے بہت دور دور نظر آنے لگی تھی۔ زیادہ تر اپنے کمرے میں بند رہتی تھی۔

”یا در صاحب کا فون تھا۔“

”جی۔“ اس نے سنجیدگی اور احتیاط سے جواب دیا۔

”مجھ سے بات کرنے کی خواہش نہیں کی تمہارے خان نے؟“ وہ بے تاثر لہجے میں مخاطب تھی۔

”وہ بہت جلدی میں تھے۔ آپکا پوچھ رہے تھے اور آپ کے لیے میج دیا ہے کہ پرسوں صبح حویلی پہنچیں گے۔“ اس نے

ماہین کا چہرہ دیکھ کر اندازہ لگانا چاہا کہ صبح کے بعد کیا تبدیلی آئی ہے۔ مگر وہ بالکل شمس محسوس ہوئی۔

”باری۔“

”جی؟“

”وہ تمہارے تیمور خاناں جو ہیں۔ ان کی حویلی کا فون نمبر ڈائریکٹری میں نہیں ہے۔ میں نے بہت تلاش کیا۔ تم تو اس حویلی کے آپریٹر بھی ہو۔ تمہیں تو زبانی یاد ہوگا“ ماہین نے بہت مہارت سے اسے گھیرا۔

”تیمور خاناں۔ آپ کیا بات کرنا چاہتی ہیں ان سے؟“ وہ واقعی گڑبڑا گیا۔

”کیوں۔ کیا میں ان سے بات نہیں کر سکتی؟ وہ یادور صاحب کے حقیقی چھوٹے بھائی ہیں۔ میری ان سے بہت قریبی رشتے داری ہے۔“

ماہین نے تیکھے انداز میں جواب دیا جس کی وجہ سے باری کو بات کرنے میں دشواری محسوس ہوئی۔

”اگر آپ مائنڈ نہ کریں۔ تو ایک بات کہوں آپ سے؟“ وہ ہنچکپاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

”جب بات کہے بنا چارہ نہ ہو تو یہ پرواہ نہیں کرتے کہ کوئی مائنڈ کر جائے گا۔ بس بات کر دینا چاہیے۔“

وہ بہت ناراض ناراض سی محسوس ہوئی۔

”وہ بات صرف اتنی ہے کہ آپ تیمور خاناں سے بات کرنے سے پہلے یادور خاناں سے اجازت لے لیں۔ میرا خیال ہے اگر آپ نے ان کی اجازت کے بغیر بات کر لی تو وہ ناراض ہوں گے۔ میں آپ کو کسی خوانخواہ کی الجھن سے بچانے کے لیے اویسٹلی۔ یہ مشورہ دے رہا ہوں۔ یا پھر آپ بڑے خان سے ڈسکس کر لیں۔“

”کیوں؟ یادور صاحب کیوں اعتراض کریں گے۔ میں فیملی ممبر ہوں۔ کسی دوسرے فیملی ممبر سے بات کرنے میں کیا حرج ہے۔ یہ تو رومین لائف کا ایک حصہ ہے۔“

وہ تو یوں بھی دلیل دینے میں ایکسپٹ تھی۔ خفا خفا سے انداز میں گویا ہوئی۔

”آپ ابھی تک نہیں سمجھیں۔ دونوں بھائیوں کے تعلقات ٹھیک نہیں ہیں۔ اس لیے آپ کو یہ مشورہ دیا تھا۔ وہ زنج ہونے لگا۔

”کیوں؟ کس وجہ سے؟“ اس نے باری کے چہرے پر نگاہیں جمادیں۔

”شاید پراپرٹی وغیرہ کا مسئلہ ہوگا۔ فیوڈل لارڈز میں اس طرح تو ہوتا رہتا ہے۔“ وہ نگاہیں جرات سے ہوئے کہہ رہا تھا۔

”بابا صاحب کی موجودگی میں اس طرح کا مسئلہ تو نہیں ہو سکتا۔ کوئی اور بات ہوگی۔“ وہ بدستور اسے بغور دیکھ رہی تھی۔

”میں تو اندازے سے بات کر رہا ہوں۔ حقیقت کیا ہے وہی جانتے ہوں گے۔“ وہ جان چھڑانے والے انداز میں گویا ہوا۔

”باری! مجھے فون نمبر چاہیے“ وہ قطعی انداز میں بولی۔

”آپ یقین کریں پرمیشن نہیں ہے۔ کیوں مجھے حویلی سے نکلاؤں گی۔“ وہ سنجیدگی سے انکار کر رہا تھا۔

”کوئی نہیں نکالے گا۔ یادور صاحب کو تو میں خود ہینڈل کر لوں گی۔“ وہ مصر تھی۔

”بڑی براہ کرم ہو جائے گی۔ پلیز، آپ سمجھیں۔“

”ہاں، اگر اجازت دیں تو میں بڑے خان سے بات کرنے کے بعد آپ کو نمبر دے سکتا ہوں۔“

اس نے جان چھڑانے کے لیے ایک وقتی حل نکالا۔

اور ماہین واقعی اس کے دام میں آ گئی۔

”ٹھیک ہے تم ابھی بڑے خان سے بات کرو اور مجھے نمبر دو۔ میں تمہارا انتظار کروں گی۔“ وہ واپسی کی نیت سے پلٹ

گئی۔

”دیے اف یو ڈونٹ مائنڈ آپ تیمور خاناں سے بات کیا کرنا چاہتی ہیں، ہو سکتا ہے اس سلسلے میں آپ کی پروپرٹیز پر ہیلپ کر

یں۔“ اس نے قدرے ہنچکپاتے ہوئے پوچھا۔

”ساری حویلی میں صرف تم ہی پروپرٹیز پر ہیلپ کر سکتے ہو۔ مگر افسوس تم کرو گے نہیں۔ فی الحال تو پروپرٹیز پر ہیلپ یہی ہی کہ تم

یہ تیمور علی خان کا نمبر دے دو۔“ وہ یہ کہہ کر چل پڑی۔

باری ایک دم کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا تھا۔

ایک تو طویل ڈرائیور دوسرے ماہین کا بدلا بدلہ انداز پھر اس کا تیمور علی خان کے فون نمبر کے لیے اصرار۔ ہری پور پہنچتے

ہئے اس کے اعصاب شل ہو چکے تھے، ساری سرمستی ہوا ہو چکی تھی۔ رات کو دس بجے وہ ہری پور پہنچا تھا۔ سبزے کی کثرت

نے احوال میں رات کے وقت گہرے اندھیرے پھیلا دیے تھے۔ وہ کونٹھی میں داخل ہوا تو صرف ایک ملازم جاگتا ہوا ملا۔ اس

ناتواشی نگاہیں اہرا دھر بھٹک کر ملازم پر آ کر ٹھہر گئیں۔

”سب سو گئے؟“

”جی خان۔ سر نہیں ہوتے تو سب جلدی سونے چلے جاتے ہیں۔“ ملازم نے مودبانہ انداز میں جواب دیا۔

”اور۔ وہ تمہاری روشنی بی بی؟“ اس نے دبے دبے انداز میں پوچھا۔

”وہ جی۔ ان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ کمرے سے باہر نہیں نکلتیں۔ آج تو انہوں نے نہ دوپہر کو کھانا کھایا اور نہ رات کو

بہت فکر ہو رہی ہے مجھے۔“

ملازم کا انداز بہت اپنوں جیسا تھا۔

”چائے وغیرہ پی؟“ باری کی پریشانی چہرے سے ظاہر ہونے لگی۔

”نہیں جی انہوں نے تو دروازہ ہی نہیں کھولا۔“

”مائی گڈنیس۔ آواز وغیرہ تو سنی تم لوگوں نے۔“ وہ ایک دم بہت پریشان ہو گیا۔

”جی خان۔ جب دستک دیتے ہیں تو بولتی ہیں۔ کوئی ضرورت نہیں اس طرف آنے کی۔“ ملازم نے فکر مندی سے

جواب دیا۔ "میں تو دعا کر رہا تھا سر جلدی سے آجائیں یا بیگم صاحبہ ہی آجائیں۔" وہ مزید گویا ہوا۔

"اچھا تم ایسا کرو۔ کھانا گرم کرو۔ میں ذرا ہاتھ لے لوں۔ چھینج کر کے آتا ہوں۔" وہ تیزی سے گیسٹ روم کی طرف بڑھ گیا۔ ایک رات ہی تو تھی اس کے پاس۔

جلدی جلدی ہاتھ لے کر شپ خوابی کا ہی لباس پہن لیا تھا اور تولیے سے بال خشک کر کے تولیہ کندھے پر پھیلا لیا اور بال بنائے بغیر باہر آ گیا۔ ملازم ٹرائی سمیت اسے منتظر ملا۔

"کس طرف ہے بی بی کا کمر؟"

ملازم نے ایک سمت اشارہ کر دیا۔

"آؤ میرے ساتھ۔" وہ تیزی سے آگے بڑھ گیا۔ ملازم ٹرائی گھسٹا پیچھے پیچھے چلنے لگا۔

باری نے کمرے کے سامنے رک کر ملازم کی طرف دیکھا جیسے پوچھ رہا ہو کہ۔ یہی ہے؟"

ملازم نے اثبات میں گردن ہلا دی۔

باری نے دروازے پر دستک دی۔ کوئی جواب نہیں ملا۔ اس نے دوبارہ دستک دی۔ جواب میں وہی خاموشی۔ باری نے دروازہ دھڑ دھڑایا۔

"کیا بد تمیزی ہے ڈی سی کے ملازم ہو یا جو کی؟" روشی کے جھلانے کی کیفیت عیاں تھی۔

باری نے پھر دروازے پر دستک دی۔

"کہہ دیا ناں مجھے پریشان نہیں کرو۔ جاؤ یہاں سے" وہ بری طرح دھاڑی۔

"بی بی! خان آئے ہیں آپ سے ملنے" باری کو مسلسل خاموش دیکھ کر ملازم سے رہانہ گیا تو بول ہی پڑا۔

"تم نے بتایا نہیں تھا۔ پاپا کو کہ میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے" روشی کی ٹھکی ٹھکی سی آواز آئی اور اس کے ساتھ ہی دروازہ کھل گیا۔ روشی ایک دم چونک کر پیچھے ہٹی تھی۔

وہ اس طرح باری کو دیکھ رہی تھی جیسے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آ رہا ہو۔

باری نے آگے بڑھ کر دائیں بائیں سوچ بچ بولڈ تلاش کیا پھر لائٹ آن کر کے ٹائٹ بلب آف کر دیا۔

کمرے میں تیز روشنی ہو چکی تھی۔ روشی ابھی تک حیران پریشان کھڑی آنکھیں چھپک رہی تھی۔

"یہ ٹرائی یہاں لے آؤ اور جا کر ایک کپ کافی بناؤ اچھی سی۔" باری نے منتظر ملازم کو مخاطب کیا۔ وہ مشینی انداز میں فوراً

ٹرائی کمرے کے درمیان میں چھوڑ کر باہر نکل گیا۔

روشی ابھی تک جیسے ساکت سی کھڑی تھی۔

باری نے قدم بڑھا کر دروازہ بند کر دیا۔

"دروازہ بند نہیں کرو۔" وہ بے ساختہ انداز میں ٹوک رہی تھی۔

"دروازہ تو پہلے ہی بند تھا۔" باری نے ایک نگاہ پر شوق اس کے چہرے پر ڈالی۔ وہاں کاشن کا سوٹ جس پر پٹنوں

بال بن چکا تھا۔ پہنے وہ بہت زرد اور بیماری محسوس ہوئی۔ بال بھی بے ترتیب تھے البتہ ناک میں پڑی ڈائمنڈ کی لوہنگ

بند سے بڑی آرائش تھی۔ بہت جتنی تھی اس پر۔

"پیلے میں اکیلی تھی۔" وہ روشے روشے انداز میں بولی۔

"واقعی پہلے آپ اکیلی تھیں مگر اب ہم دور ہیں مگر ایک ہیں باری ایک کرسی پر بیٹھ گیا اور شانوں پر پڑا تولیہ اٹھا کر سر رگڑ

رہا۔

بتائیے، یہ بھی کوئی انداز ہے۔ بندہ اتنی دور سے آیا ہے تھکن سے چور چور ہے۔ نہ سلام نہ دعا نہ خیر خیریت۔ پھاڑ دے کو دوزخ ہے ہیں لوگ۔ لوگوں کا بھی کیا قصور۔ دوپہر سے بھوکے ہیں آخر۔"

دو تولیے سے سر رگڑتے ہوئے ایک تو اتر سے کہہ رہا تھا۔

"کس نے کہا تھا آنے کو۔ میں نے تو نہیں کہا تھا۔ اپنے کسی کام یا مطلب ہی سے آئے ہو گے۔ یقیناً میری وجہ سے یا

ہرانا خاطر تو زحمت نہیں کی۔ میں قسم کھا کر کہہ سکتی ہوں۔"

دو دوپٹا درست کر کے کھڑے کھڑے کہہ رہی تھی۔

باری نے اس کی سمت قدرے حیرت سے دیکھا تھا۔ ایسی گہرائی کہ اندازے ٹھیک ٹھیک لگانے لگی۔

"اچھا بتائیں۔ کھانا کیوں نہیں کھایا؟" باری نے اس کا دھیان ادھر ادھر کرنے کی کوشش کی۔

"آگے بڑے وہاں سے خیال رکھنے والے۔ جاؤ باری یہاں سے، تمہیں۔ یہاں دیکھ کر مجھے بہت غصہ آ رہا ہے۔ خون مار رہا ہے میرا۔" وہ آنسو پینے کی کوشش کرتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"اب کیا خطا ہو گئی؟" وہ اٹھ کر ڈریسنگ ٹیبل کی طرف گیا اور برش اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ اجازت ہے؟"

اس نے جیسے جل کر پشت کر لی۔

"ہلیر آپ کھانا کھالیں۔"

"باہر ڈیٹا بندھا ہے، اسے ڈال دو۔ اور چلے جاؤ یہاں سے۔ مجھے لاوارثی کے احساس کے ساتھ زندہ رہنا ہے۔ مجھے

نہ پاپے کی کی ہمدردی، کسی کا ساتھ۔" اس کی آواز آنسوؤں میں ڈوب گئی۔

آپ بھی کمال ہیں۔ اپنائیت کا اظہار کر دو تو فرماتی ہیں" کیا بد تمیزی ہے؟ نہ کرو تو طعنے مار مار کر ہلاک کرنے کی کوشش

نہیں۔"

"بالوں میں برش چلاتے ہوئے آئینے میں اسے دیکھتے ہوئے شریر لہجے میں کہہ رہا تھا۔

"گود میں جا کر کرنا یہ الجھانے والی باتیں۔ جتنا الجھاؤ گے۔ اتنے پیسے ملا کریں گے۔ مجھے سے بات کرنے کی کوئی

انتہ نہیں۔" وہ آنسو پیتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"واللہ۔ مدد۔ اب کس بات کا غصہ ہے؟" وہ اس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ وہ خاموش رہی۔

"کھانا کھالیں پلیز۔ روشانے۔ کیوں بلا وجہ کی اذیت دیتی ہیں مجھے؟" وہ بہت ہارے ہوئے انداز میں بولا۔

”ہونہ۔ اذیت۔ تمہیں اذیت کے معنی بھی پتا ہیں؟ اذیت؟ اس نے سر جھٹکا۔

”زندگی بچوں کا کھیل نہیں ہے۔ روشا نے۔ بڑی تکلیفوں سے بچنے کے لیے چھوٹی موٹی تکلیفیں برداشت کر لیں۔ پھر بھی۔
وقت خوشی کی خاطر پائیدار مفادات کو قربان کرنا کہاں کی عقلمندی ہے۔“

”یہاں فون ڈائریکٹ نہیں ہے۔ اور میں بلا وجہ کی بہادری دکھا کر آپکو مصیبت میں ڈالنا نہیں چاہتا۔“

”مجھے احساس ہے آپ نے فون کی ہر گھنٹی پر دوڑ لگائی ہوگی کہ باری کا فون ہوگا حویلی سے مجھے آپکے جذبات و احساسات کا اندازہ ہے۔“

”حد ہوگئی خوشی نہیں کی۔“ روشی نے ناک سکڑی۔

”اچھا۔ کوئی بات نہیں۔ ہو جاتی ہے انسان کو۔ یہ بھی ایک مرض ہے۔ خیر آپ کھانا کھالیں۔ میں تیار ہو کر آ رہا ہوں۔
دیر ہو جائے گی حویلی پہنچتے پہنچتے۔ بابا صاحب پریشان ہو جائیں گے۔“ وہ برش رکھ کر پلٹا جیسے بہت جلدی میں ہو۔

اس وقت؟ کیا صبح نہیں ہوگی۔ ڈرائیور ہے ساتھ میں؟“ وہ فکرمندی سے پوچھ رہی تھی۔ سب بھول بھال گئی تھی۔

”نہیں۔ خود ہی ڈرائیو کی تھی۔ خیر آپ کھانا کھائیں۔ میں چلتا ہوں۔“ وہ عجلت بھرے انداز میں گویا ہوا۔

”کیا نوکر ہو حویلی والوں کے۔ یہ کوئی انسانیت ہے۔ رات کے اندھیرے میں دوڑیں لگوار ہے ہیں۔ اتنی طویل ڈرائیو۔
بغیر ریست و وقفے کے۔ کوئی ضرورت نہیں ہے اس وقت جانے کی۔ تمہیں بھی تابعداری کرنے کا کچھ زیادہ ہی شوق ہے۔

کتنے بجے چلے تھے وہاں سے؟ کھانا کھایا تھا؟“

وہ کتنی فکرمند نظر آئی تھی کہ باری نے خود کو بمشکل کنٹرول کیا۔

”کہاں کھانا کھایا۔ دو بسکٹ کھائے ہوئے ہیں شام سے۔“ وہ بڑی سادگی سے بولا۔

”یہ کھانا ہے تو کیوں نہیں کھا رہے؟“ اس کے انداز سے بڑی اپنائیت جھلکنے لگی

”جب آپ کھائے بغیر رہ سکتی ہیں اور یہ آسان کام ہے تو میں بھی یہ آسان کام کر سکتا ہوں۔“ ہونٹوں پر آئی

مسکراہٹ روک کر کہا۔ روشی کی حالت ہی ایسی ہو رہی تھی کہ جیسے کسی عظیم مشکل میں پھنس گئی ہو۔

”آپ کھائیں گی تو تھوڑا سا ہم بھی کھالیں گے اس نے گویا اس پر احسان کیا۔ انداز تو ایسا ہی تھا۔ روشی چپ چاپ بیٹھ

گئی۔ اور ایک خالی پلیٹ اس کے سامنے رکھ دی۔

”ویسے اس وقت اگر کا کا جان آ جائیں تو خوب تماشا ہو۔ وہ سمجھیں گے کہ اب ہم اسی طرح کھانا کھانے لگے ہیں۔

جل کر۔“ وہ شریرا انداز میں اس کا چہرہ دیکھنے لگا۔

روشی کا دل تیز تیز دھڑکنے لگا۔ باری کی قربت اسے بہت محسوس ہونے لگی۔

”کھانا شروع کیجیے ناں۔“ وہ اسے ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا دیکھ کر ٹوکنے لگا۔

”میں نہیں کھا رہی تمہارے ساتھ۔ مجھ سے نہیں کھایا جائے گا۔“ اس کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔

”پھر میں بھی نہیں کھا رہا۔“

”میں کھالوں گی باری۔ سچ۔ پراس۔“ اس کے چہرے پر حیا کے رنگ بہت کھل رہے تھے۔

”پراس کا مطلب جانتی ہیں؟“ باری نے اپنا ہاتھ اس کے سامنے پھیلایا۔

روشی نے اپنی مٹھایاں یوں بند کر لیں جیسے وہ زبردستی اپنے ہاتھ پر وعدہ لے لے گا۔ وہ اس کے مقابل اپنے بیڈ پر بیٹھی

ہوئی تھی۔

”اچھا میں چلتا ہوں۔ آپ حسب وعدہ کھانا کھائیے۔“

”تھوڑا سا تو کھا لو۔“ روشی کے تو جیسے سارے کس بل نکل چکے تھے۔ (اتنی جلدی جا رہا تھا)

”میں کھا چکا ہوں۔ اونٹلی۔ آپ کی خاطر دوبارہ بیٹھ گیا تھا۔ مگر آپ تو ہمارے سامنے خیر۔ ساری عمر ساتھ ہی کھانا

ہے۔ کبھی کبھی خیال آتا ہے تو ڈر سا لگنے لگتا ہے کہ ساری زندگی آپ کے ساتھ گزارا کرنا ہے۔“

روشی نے گھور کر اس کی طرف دیکھا مگر دیکھ نہ سکی فوراً ہی نظریں جھکا لیں۔

”اچھا۔ گڈ نائٹ۔ صبح ناشتے پر ملاقات ہوگی۔ اب آپ آرام سے کھانا کھائیں۔ فی الحال میرا قیام آپ کی کونٹھی کے

گیٹ روم میں ہے۔“

روشی منہ کھولے اس کی سمت دیکھ رہی تھی۔ وہ خوشی جو چھپائے نہ چھپ سکتی تھی آنکھوں سے عیاں تھی۔

”فراڈ ایک دم“ اس نے ٹرائی دھکیل کر ایک طرف کر دی۔ ”بیشہ ستاتے ہو۔ کیا بگاڑا ہے میں نے تمہارا؟“ اس کی

آنکھیں بھر آئیں۔

”بتاؤں تفصیل۔ کیا کیا بگاڑا ہے؟“ وہ دوبارہ چیخ پر مگر کرنے کے انداز میں بیٹھ گیا۔

”ویسے یادور خاناں بھی کیا مہربان انسان ہیں۔ دل سے دعائیں نکل رہی ہیں۔ اللہ ان کے دل کو بھی ایسے ہی خوش

رکھے جیسے انہوں نے میرا دل خوش کیا ہے۔ کیا ماحول ہے۔ اتنی بڑی کونٹھی۔ سوئے ہوئے ملازم۔ ویسی پھولوں کی مہک۔

گہری رات اور۔ بڑی زبردست نیند۔“

وہ ایک دم کھڑا ہو کر جمائیاں لینے لگا۔ روشی کی جان میں جان آئی۔ کتنا نیا سا انداز تھا اس کا، وہ تو ڈر ہی گئی تھی۔

صبح آٹھ بجے وہ یادور علی خان کی رہائش گاہ سے نکلا تھا۔ حویلی پہنچنے کی اسے بہت جلدی تھی روشی سو رہی تھی۔ اس نے

اسے جگانے کا خیال ملتوی کر دیا تھا۔ اسے فائل لے کر یادور علی خان سے پہلے حویلی پہنچنا تھا۔ اسے اندازہ تھا وہ اس سے ملے

بغیر جا رہا ہے۔ اگلی ملاقات میں اس کا کیا حشر ہوتا ہے۔

حویلی پہنچا تو راستے ہی میں شینو مل گئیں۔ بڑی سی چادر لپٹے، کتابیں اٹھائے اوپر سے آ رہی تھیں۔

”السلام علیکم“ اس نے فوراً سلام کیا۔

”الحمد للہ۔ سب خیرت ہے۔“ وہ طرح دے کر مسکرایا۔

”روشی کا دل لگ رہا ہے بہت سے اہم لوگوں سے دور ہے مثلاً اس کی جگ اور نئی نویلی ماں“ شینو کا لب و لہجہ اسے ہمیشہ

بہت محسوس ہوتا تھا۔ مگر اب صورت حال بہت تبدیل ہو چکی تھی۔ ان کی معنی خیز باتیں اب اسے ہولاتی نہیں تھیں۔ دلچسپ لگتی تھیں۔

”پاسنیل۔ میری ان سے زیادہ بات نہیں ہوئی۔ آئندہ ملاقات ہوئی تو پوچھ لوں گا۔“ اس نے جانے کے لیے قدم بڑھائے۔

”وہ۔ یاور خان! آگئے؟“ وہ کچھ سوچ کر پھر ہینو کی طرف پلٹا۔

”نہیں۔ بڑی امی ماما ملی سے کہہ رہی تھیں وہ آنے والی ہیں۔ اب مزید پتا نہیں۔ ویسے یاور ماموں کو یہ نہیں کرنا چاہیے تھا۔ بے چاری روشی کو قید تنہائی میں ڈال دیا۔ ممانی کو بھی ساتھ ہی بھیج دینا چاہیے تھا۔ اب انہیں روشی کے ساتھ ہی رہنا چاہیے۔ یاور ماموں تو ویسے بھی ان لوگوں میں سے ہیں جن کا بریف کیس چوبیس گھنٹے تیار رہتا ہے کہ پتا نہیں کب اگلے سفر کے لیے نکل کھڑے ہوئے۔“

”یہ باپ بیٹی کا معاملہ ہے ہم کیا کہہ سکتے ہیں“ اس نے جان چھڑائی۔

”ویسے تم بھی کمال ہو۔ یہاں روشی کی ڈھنڈیا پڑ رہی تھی اور تم نے بتایا تک نہیں کہ وہ سرائے میں ہے۔ بابا صاحب نے تمہیں آڑے ہاتھوں نہیں لیا۔“

ہینو کی تیز نگاہیں اس کے وجود کے آر پار ہو رہی تھیں۔

”لیس گئے“ وہ ہونٹ دبا کر مسکرایا۔

”بہت نڈر ہو گئے ہو۔ کیا ہوا ہے؟“ ہینو کی مسکراہٹ طنز سے بوجھل تھی۔

”دراصل میں تو سرائے جاتا رہتا ہوں۔ اور وہاں میرا قیام بہت مختصر ہوتا ہے۔ ضروری نہیں کہ سرائے میں ہونے والا ہر حادثہ یا واقعہ میرے علم میں لایا جائے۔ مجھے کا کا جان نے حویلی کے لیے کوئی سیج دیا ہوتا تو میں ضرور پہنچتا۔“ اس نے بہت شائستگی سے جواب دیا اور چل دیا۔

(یہ ہینو تو اس حویلی میں زیر و زبر و سیون بنی رہتی ہیں۔ بڑا مشکل ہو جاتا ہے انہیں فیس کرنا۔)

ماہین سو کر انھی تو باتھ روم سے پانی گرنے کی آواز سن کر سمجھ گئی کہ یاور علی خان آگئے ہیں۔ اس نے کچھ سوچا پھر ہاتھ بڑھا کر سائینڈ ٹیبل سے ہیسیر بینڈ اٹھا کر بالوں کو سمیٹا اور وارڈروب سے کپڑے نکالنے لگی۔ اس کے چہرے پر ہلاکی بیچیدگی اور ٹھکر تھا۔

یاور علی خان باتھ روم سے باہر آئے تو اس نے رخ بدلے بغیر سلام کیا۔

”وسلام۔ ٹھیک ہیں؟“ وہ تولیے سے سر خش کرتے ہوئے اس کے قریب آئے۔

”جی۔ آپ تو اگلے سفر کے لیے سفر سے لوٹ آئے ہیں میرے لیے بھی اگلا حکم صادر فرمائیے۔ جب میرا ٹھکانا ہری پور ہے تو میں یہاں کس خوشی میں رکھی گئی ہوں؟“ وہ نہایت خشک انداز میں بات کر رہی تھی۔

”آپ کو اپنے ساتھ لے کر جائیں گے وہاں۔ ڈونٹ وری“ وہ بدستور اپنے بال خشک کر رہے تھے۔

”میں روشی کے ساتھ بھی جاسکتی تھی۔ آپ کو اسے تنہا نہیں بھجنا چاہیے تھا۔ کتنی حیرت کی بات ہے، بابا صاحب نے بھی بولی اعتراض نہیں کیا۔“

”خیریت۔ خیال کچھ جلدی نہیں آگیا؟“ وہ مسکرائے۔ بڑے دنوں بعد مسکرائے تھے۔

ماہین پران کے خوشگوار موڈ کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ اپنے کپڑے نکالنے میں مصروف رہی۔

”بس اب ہری پور ہی چلیں گے۔ چند گھنٹے پشاوڑ پھر ہری پور۔“ انہوں نے تولیہ ماہین کو تھما دیا۔ اور بریف کیس کھول کر کچھ تلاش کرنے لگے۔

”میرا خیال ہے باری آچکا ہوگا۔“ وہ خود کلامی کے انداز میں کہہ رہے تھے۔

ماہین خاموش رہی۔

”چائے نہیں پلو انیس گئی؟“ یاور علی خان اپنی تمام حسیات سے اس کے اندر خاموشی سے در آنے والی تبدیلی کو محسوس کر رہے تھے۔ گمان یہی تھا کہ ان کی عدیم الفرصی کی وجہ سے اس کا موڈ آف ہے۔

”کہتی ہوں ماما سے“ وہ بیڈ سے دوپٹا اٹھا کر سر پر جمانے لگی۔

”آپ تیاری مکمل کر لیں۔ ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔“ ماہین کچھ نہیں بولی۔ باہر نکل گئی تھی۔

یاور علی خان نے کچھ دیر بریف کیس الٹ پلٹ کیا پھر بند کر دیا۔ اسی لمحے دستک ہوئی، وہ سمجھے کوئی ملازمہ ہوگی۔ وہ ہوں کہہ کر برش چلانے لگے۔

دروازہ کھول کر آنے والا باری تھا اس کے ہاتھ میں براؤن بڑا سا لفافہ تھا۔

”السلام علیکم خان۔“

”ہوں۔ وسلام۔ کوئی مسئلہ تو نہیں ہوا“ وہ بہت اہتمام سے بالوں میں برش کر رہے تھے۔

”جی نہیں۔ سب ٹھیک ہے“ وہ عام سے انداز میں جواب دے رہا تھا۔

”روشی تو پراہلم نہیں کر رہی۔ ملازم بتا رہا تھا وہ کھانا وغیرہ کھانے میں کچھ ٹیکل نہیں ہے۔ شی رزناٹ بے بی ناؤ۔ مگر اس لڑکی نے بہت ہی پراہلمز کری ایٹ کی ہیں میرے لیے۔ اب بس جلد سے جلد اس کی شادی ہو جانا چاہیے نان سنس۔“

انہیں نئے سرے سے پھر کچھ یاد آگیا تو موڈ آف ہو گیا۔

باری ان کے چہرے کے اتار چڑھاؤ بہ نظر غائر دیکھ رہا تھا کہ ماہین واپس آگئی۔ اسنے باری باری دونوں کے چہرے دیکھ کر اندازہ لگانا چاہا کہ اس کی غیر موجودگی میں کیا بات ہو رہی تھی۔

”اچھا۔ میں بابا صاحب کے کمرے میں ہوں۔ آپ چائے وہیں بھجوا دیجیے گا“

یاور علی خان یہ کہہ کہ وہ فائل جو باری لے کر آیا تھا اور دورے کچھ کاغذات سمیت کمرے سے باہر نکل گئے باری نے بھی ہانے کو قدم بڑھائے۔

”آپ کدھر چلے مسٹری باری تشریف رکھیے“

باری کے چہرے پر قدرے بے بسی کے تاثرات نمودار ہوئے۔ وہ ناچار بیٹھ گیا۔

”ایک کام لگایا ہوا آپ کے ذمے۔ شاید آپ بھول گئے۔“ وہ کپڑے ہاتھوں میں لیے اس کے مقابل بیٹھ گئی۔

باری یکدم گہری سوچ میں ڈوب گیا پھر جیسے کسی دھیان سے چونک کر مابین کو دیکھنے لگا۔

”آپ ماسٹرنہ کریں تو ایک گزارش کروں۔“

”یہاں تو ہر دوسری بات پر ماسٹرنہ کرنا ہوتا ہے اسکی فکر نہ کرو۔ کہو۔“ وہ قدرے بے لحاظ انداز میں گویا ہوئی۔

”آپ کیا کریں گی چھوٹے خان کا نمبر لے کر۔ جب یاد خانان ان سے تعلق ختم کیے ہوئے ہیں تو آپ کا ان سے کیا حساب بن رہا ہے۔ یہ میں نہایت خلص دل سے کہہ رہا ہوں کہ آپ کسی الجھن میں نہ پڑ جائیں مفت کا کوئی دوسرا پلیز میری بات پر غور کیجیے۔ وہ بڑے سبھو سے بات کر رہا تھا۔

”حساب تو بہت بن رہے ہیں۔ مسٹر عبدالباری مہمدی۔ آپ تو بس یہ بتائیے آپ ہماری یہ بہت بڑی خدمت کر سکتے ہیں یا نہیں۔ تاکہ ہم کوئی دوسرا راستہ تلاش کریں۔ آپ کے انکار کی صورت میں۔“

”آپ اس راستے کی طرف نہ جائیں۔ میرا پر خلوص مشورہ ہے“ اپنا پورا نام مابین کے منہ سے سن کر وہ بری طرح چونک پڑا تھا مگر یہاں بھی اس نے اپنی سیلف کنٹرول پاور سے کام لیا تھا اور بہت سکون سے اس سے ہم کلام ہوا تھا مگر اندر عجیب سی کھد بد شروع ہو گئی تھی۔ اس چار دیواری میں خلوص راس نہیں آتا ہے۔ میں ایسی دلدل میں آ پھنسی ہوں کہ آس پاس کوئی گراہو اور خست نہیں ہے کہ کوئی امکان روشن ہو۔ صرف جواد اور روشانی کا مضبوط بندھن جو مجھ سے ہے مجھے کسی انتہائی فیصلے سے روکے ہوئے ہے۔ میں اب اپنے ان پیاروں کو فطری محبتوں سے مزید محروم نہیں کرنا چاہتی۔ ان کی اتنی عمر نہیں ہے۔ جتنے امتحان سے گزر رہے ہیں۔ میں ان کے عظیم دکھوں اور محرومیوں پر بہت سارا رونا چاہتی ہوں۔“

اس کی آواز بھر آ گئی۔

باری کا خود پر اختیار اب ختم ہو چکا تھا۔ وہ حیرت سے سانس لے رہا تھا۔ اس کی صورت دیکھ رہا تھا۔

”آپ۔“ اس نے کچھ کہنا چاہا۔

”مجھ سے کوئی اور بات نہیں کرو باری۔ بس یہ بتاؤ نمبر دے رہے ہو یا نہیں۔ دیکھو میں بہت سکون سے وہ سب کچھ کرنا چاہتی ہوں جو میرے ذہن میں ہے لیکن اگر مجھے مسلسل بندشوں سے گزرنا پڑا تو میں تمام مصلحتیں بالائے طاق رکھ دوں گی۔ جواد اور روشانی نے سرے سے اس کی زد میں آ سکتے ہیں۔“ وہ ناراض سے لہجے میں گویا ہوئی۔

”آپ ایسا کریں یا اور خانان سے اس سلسلے میں کھل کر بات کر لیں۔ یہ بہت آسان راستہ ہے۔“

”وہ انتہا پسند شخص ایک حملے میں میرے پرکٹ کر رکھ دے گا۔ اور مجھے اب کام بہت ہے۔“ اس نے سابقہ انداز میں جواب دیا۔

”کیا آپ مجھے اس لائق سمجھتی ہیں کہ مجھے اپنے کام کے بارے میں کچھ بتادیں۔ ہو سکتا ہے میں اس انداز میں آپ کی

ہلپ کر سکوں۔ جو آپ کے ذہن میں نہ ہو۔ مگر جب میں ایسا کروں تو آپ اسے قبول کر لیں۔“

”نہیں۔ مجھے کسی سیکنڈ تھرڈ پرسن کو انوائس نہیں کرنا۔“ مابین نے دو ٹوک کورسا جواب دے دیا۔

اسی وقت سرسوتی دروازہ بجا کر اندر آ گئی۔

”آپ کو بڑے خان بلاساں بی بی!“

”مجھے؟“ اس نے الجھ کر باری کی طرف دیکھا۔ ”چلو تم۔ کہو آتی ہوں۔“

وہ کپڑے صوفے پر ڈال کر کھڑی ہو گئی۔ ”باری مجھے آج ہر صورت میں نمبر چاہیے۔ یا تمہارا صاف انکار۔“

دو دو ہندوستان کرتی باہر چلی گئی۔ سرسوتی اس سے پہلے نکل چکی تھی۔

باری کی آنکھوں سے پریشانی جھلکنے لگی تھی۔ وہ سیدھا ہال میں چلا گیا۔

اب وہ نمبر ڈائل کر رہا تھا۔

”خان ہیں؟“ وہ ماؤتھ پیس میں کہہ رہا تھا۔

چن لحوں کی خاموشی کے بعد تیمور علی خان کی آواز اتریں میں ابھری تھی۔

”باری بات کر رہا ہوں خان حویلی سے۔“ اس نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے قدرے آہستہ آواز میں کہا۔

”خان۔ وہ مابین بی بی آپ سے کونٹیکٹ کرنا چاہتی ہیں۔ اور آپ کا نمبر مجھ سے مانگ رہی ہیں۔ کسی اور سے اس

موضوع پر بات نہیں کر رہیں۔ مجھے کیا کرنا چاہیے؟“

”نمبر دے دو۔ ڈزن میٹر۔ اب کسی بات سے پریشانی نہیں ہوتی باری تم ایزی رہو۔ نو پراہلم۔“ فیس کر لیں گے ہم۔“

”مگر خان! ان کے اپنے لیے تو پراہلم ہو سکتی ہے۔“ وہ ہچکچاتے ہوئے گویا ہوا۔

”وہ اتنی ہوش مند تو ہیں کہ اپنا نفع نقصان سوچ سکیں۔ خیر ان شارٹ۔ تم نمبر دے دو۔“

”تمہیں کوئی برڈن لینے کی ضرورت نہیں ہے۔۔ پارٹر۔ او۔ کے۔“

انہوں نے مزید کوئی بات کہے بغیر فون بند کر دیا تھا۔

باری ریسور ہاتھ میں تھامے کچھ سوچنے لگا۔

”آج کل بہت سوچنے لگے ہو۔“ وہ گلو کی آواز پر چونک کر بہت قریب سے آئی تھی۔

”سوچنا، سمجھنا تو اچھی بات ہوتی ہے“ وہ مسکرایا بڑی تازہ دم مسکراہٹ تھی۔ جیسے کوئی بوجھ ذہن سے اتر گیا ہو۔

”زیادہ سوچنے سے قوت عمل کمزور پڑ جاتی ہے اور خدا نخواستہ یہ تمہارے ساتھ ہو گیا تو ہمارا کیا ہوگا۔“ وہ اپنی مخصوص نرم

مسکراہٹ کے ساتھ ہم کلام ہوئیں۔

”ہم تو تمہیں دیر سے تلاش کر رہے ہیں۔ ہری پور سے آئے ہو۔ بتاؤ کیسی ہے؟ ویسے یاد ماموں کو اس طرح اکیلا نہیں

چھوڑنا چاہیے تھا۔ اب تو اس کی طرف سے دھڑکے ہی لگے رہتے ہیں۔ کتنی بے وقوفی کر چکی ہے پہلے بھی۔“ وہ فکر مندی سے

گویا ہوئیں۔

سامان گاڑی میں رکھا جا رہا تھا۔ ماہین حویلی کی خواتین سے الوداعی ملاقات کر رہی تھی مگر اس کی متلاشی نگاہیں باری کو جانی کر رہی تھیں۔ کئی بار ذہن اڑاؤں بھر کے حویلی کے پچھواڑے بھی پہنچا تھا۔ جی چاہا تھا مطربہ سے دو چار باتیں اور پوچھ کر دن کی روشنی میں ایسا ممکن نہ تھا۔ وہ بڑی غائب دماغی کی کیفیت میں سب کے درمیان بیٹھی تھی۔

”اس لڑکی کو ساتھ لے کر جا رہی ہو؟“ عالم تاب کا اشارہ بالو کی طرف تھا۔

”جی۔ وہاں بھی تو ملازمہ کی ضرورت ہوگی یا در صاحب بتا رہے تھے، وہاں تو سب مرد ملازم ہیں اچھا ہے ایک عورت بھی ہو جائے گی۔ یوں بھی یہ بے سہارا بے ٹھکانا ہے۔ جانے کہاں کہاں ٹھوکریں کھاتی پھرے گی۔“ ماہین نے بڑے اعتماد سے تسلی جواب دیا۔

”اس طرح کسی انجان پر بھروسہ ٹھیک نہیں ہوتا۔ آگے پیچھے دیکھ لیا نا۔“ روشن آرا نے دبے لفظوں میں گویا خبردار کیا۔

”جی میں سمجھتی ہوں۔ آپ فکر نہ کریں۔“ وہ ان کے اس طرح کے اشارے اب بھی نہ سمجھتی۔

”بعض لوگ بہت سیدھے نظر آتے ہیں مگر ہوتے نہیں ہیں۔“

بصیر علی خان کی دلہن نے بھی حصہ لیا۔ وہ جوان بیٹیوں کی ماں تھیں مگر آج بھی بصیر خاناں کی دلہن کہلاتی تھیں۔ حنا، تانیہ کہا کرتی تھیں بلکہ چھیڑتی تھیں کہ ہم آپ کو دلہن امی کہا کریں گے۔

”جی بھابی جان! ایسا بھی ہوتا ہے۔ آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔“ ماہین نے اختلاف نہیں کیا۔

”فون کرتی رہنا۔ یہاں سے تو جب فون کرتے ہیں۔ بڑی ملتا ہے۔ اگر ملتا ہے تو پھر آ پر بیٹھتا ہے۔ جو اطلاع دیتا ہے کڑی سی صاحب بڑی ہیں۔“ سائرہ ممانی (عالم تاب کی بھانج) نے ہنستے ہوئے بتایا۔

”جی۔ میں فون کرتی رہوں گی۔“ ماہین نے تسلی دی۔

”روشنی بہت ضدی ہو گئی ہے۔ ذرا تدبیر سے اسے قابو کرنا۔ ہم کوشش کر رہے ہیں کہ جلد سے جلد اس کی شادی ہو جائے۔ یاد رکھو بہت پریشان کیا ہے اس نے۔ الجھ کر رہے گئے ہیں۔“ عالم تاب فکر مندی سے گویا ہوئیں۔

”جی۔ آپ فکر نہ کریں۔“ اس نے پھر بے قراری سے ادھر ادھر نظر دوڑائیں۔

”سامان رکھ دیا ہے بی بی۔ یاد خاناں بلا رہے ہیں۔“ گلو نے آکر مطلع کیا۔

اتنے میں تمام لڑکیاں بھی آگئیں۔ جو روشنی کے لیے مختلف قسم کے پیغامات دے رہی تھیں۔

”ممانی جان! آپ جب بھی حویلی آئیں روشنی کو ضرور ساتھ لائیے گا خواہ آپ کو یاد ماموں کے ساتھ لڑائی کرنا پڑے۔ روبی نے تاکید کی۔ سب مسکرا دیے۔

”یعنی ماموں، ممانی کی لڑائی کرانے کے درپے ہو۔“ گلو نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”یہی سمجھ لیں۔“ روبی نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

”بری بات۔ اللہ انہیں شاد و آباد رکھے۔“ عالم تاب نے بڑی شفقت سے ماہین کے سر پر ہاتھ رکھا۔

وہ آنکھوں پر گلاسز چڑھا کر بڑی سی چادر لپیٹے پرسینے سے لگائے پورج کی سیڑھیاں اتری تو باری کو یاد علی خان کے

”آپ فکر مند نہ ہوں۔ وہ ٹھیک ہیں۔ زندگی سے بہت محبت ہو گئی ہے۔ دو سو سال مزید جینا چاہتی ہیں۔“ وہ شرر لبہ میں ان سے مخاطب ہوا۔

”ہیں۔ کیا واقعی؟ یہ بڑا گولڈن ریولوشن ہے۔ مگر کیا اسی طرح اکیلے؟ کیا دو سو سال میں پور نہیں ہو جائے گی؟“ گلو نے چھوٹا سا ہتھکڑیا لگایا۔

جواب میں باری کا ہتھکڑیا بھی بڑا بے ساختہ تھا۔

”یہ پوچھ لیجئے گا ان سے۔ فون پر بھی بات نہیں ہوئی ان سے؟“ اس نے پوچھا۔

”بات۔ ایک کال اور سات کی لائن پیچھے۔ صرف آواز ہی سن سکتے ہیں اس طرح سے تو۔“ وہ پھر ہنس پڑیں۔

”کیا واقعی وہ خوش ہے؟“ انہیں جیسے یقین نہیں آ رہا تھا۔

”فون کر کے دیکھ لیں۔ بری حالت ہے خوشی سے“ اس نے جانے کے لیے قدم بڑھائے۔

”مگر کیوں؟“ گلو کی حیرت بجا تھی۔

”ویسے ہی کہہ دیا۔ خوش محسوس ہوئی تھیں۔“ اس نے ٹال دیا۔

”کچھ کہہ رہی تھیں؟“

”نہیں۔ زیادہ بات نہیں ہو سکی مجھے حویلی پہنچنے کی جلدی تھی۔ صبح جب میں وہاں سے روانہ ہوا تو سورہی تھیں۔“

”ویسے صحت کیسی لگی تھیں۔ کمزور تو نہیں ہو رہی؟“

انہیں باتوں کے دوران پتا ہی نہ چلا کہ بالو آ کر کھڑی ہو گئی ہے۔

”وہ جی ماہین بی بی کہاں ہیں؟“

وہ دونوں آواز کی طرف متوجہ ہوئے۔

”اپنے کمرے میں ہوں گی۔“ گلو نے جواب دیا۔

”نہیں وہ اپنے کمرے میں نہیں ہیں۔ بابا صاحب کے کمرے میں ہیں۔ وہاں یاد خاناں بھی ہیں۔“

باری نے مطلع کیا۔

”یہ ابھی تک یہیں ہے؟“ باری نے گلو سے استفسار کیا۔

”ہوں۔ بلکہ میرا خیال ہے۔ ممانی اسے ہری پور ساتھ لے کر جائیں گی۔“

”کوئی خاص وجہ۔ اتنا اعتبار کیسے کر لیا اس پر؟“

”اب کیا کہہ سکتے ہیں ویسے تو بڑی سیدھی سادی لڑکی ہے۔“ گلو نے کہا۔

”اف یہ سیدھے سادے لوگ۔“ باری نے گہری سانس لی۔

گلو نے کچھ الجھ کر باری کی طرف دیکھا مگر کچھ بولیں نہیں۔

ساتھ باتوں میں مصروف پایا۔ گہری سانس لے کے رہ گئی۔ بہت ہوشیار ہے یہ باری۔

اسے آتا دیکھ کر یاور علی خان پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ ڈرائیور نے ان کی طرف کا دروازہ بند کیا۔ اور مابین کیلے دوسری طرف کا کھول دیا لیکن مابین گاڑی کی طرف بڑھنے کے بجائے باری کی طرف بڑھی۔

”وہ ایک درخواست کی تھی آپ سے۔“ اس نے قدرے جتانے والے لہجے میں بہت آہستگی سے باری کو مخاطب کیا۔
 ”پابند انسانوں پر طنز نہیں کرتے۔ گناہ ہوتا ہے“ وہ دھیرے سے بولا۔ لبوں پر ہلکی سی بلکہ مبہم مسکراہٹ تھی۔
 ”یہ آپ کی کتاب۔ انٹرنیشنل لاء۔“ اس نے ایک بلیو جلد کی کتاب اس کی طرف بڑھائی۔ ”اس میں آپ کا مطلوب نمبر ہے۔“ وہ سرگوشی کے انداز میں کہہ کر دور ہٹ گیا۔

مابین نے اناٹا نا خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کیا۔ نئے سرے سے وجود میں توانائی دوڑنے لگی جیسے کھڑے کھڑے کسی عظیم کامیابی سے ہمتا رہی ہو۔

بڑی تیزی سے وہ گاڑی کے کھلے دروازے تک آئی اور ہاتھ ہلا کر برآمدے میں کھڑی خواتین کو خدا حافظ کہا اور بیٹھ گئی۔

یاور علی خان بہترین سونگ کیے ہوئے اور کوئی لا جواب خوشبو لگائے ہوئے تھے۔ گاڑی کے بند ماحول میں ایک خوبصورتی اتر آئی تھی۔ ایسا حسن جو بیرونی دنیا سے بے گانہ کر کے رکھ دے۔

”اس طرح کی فارمیٹرز سے مجھے بہت الجھن ہوتی ہے۔ صرف خدا حافظ کہنے میں تیس پینتیس منٹ صرف ہو گئے یاور علی خان کے لہجے میں ناگواری تھی۔

”کیا یہ مراقصور ہے؟ مابین کو ان کے آف موڈ پر غصہ آ گیا۔

یاور علی خان کچھ بولے نہیں۔ بلکہ اس کے ہاتھ میں تھی کتاب کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ مابین ہڑبڑا کر رہ گئی۔

”آپ کے کس کام کی۔ آپ تو ایسی کتابیں گھول کر پی چکے ہوں گے۔“ اس نے کتاب اس طرح سینے سے لگائی جیسے کسی قیمت پر انہیں نہیں دے گی۔

”پڑھی ہوئی کتاب میں سے وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بہت سے پوائنٹس ذہن سے نکل جاتے ہیں۔ دکھائیے ذرا۔ ابھی تو فاصلہ بھی طے کرنا ہے۔“ انہوں نے کتاب کی طرف پھر ہاتھ بڑھایا بلکہ کتاب کو تقریباً پکڑ ہی لیا۔

مابین نے بے بسی سے کتاب کی طرف دیکھا اور کتاب پر سے ہاتھ ہٹا لیا۔

”آپ کتنے آرام سے انسان کی توہین کرتے ہیں اور پھر آپ کو کچھ فیل بھی نہیں ہوتا۔“

اب ایک یہی تدبیر رہ گئی تھی کہ وہ انہیں کسی بحث میں الجھا دے تاکہ وہ کتاب کی طرف متوجہ ہی نہ ہوں۔

”میں سمجھا نہیں۔“ وہ واقعی حیران ہوئے۔ گاڑی گیٹ سے باہر نکل چکی تھی۔

”کیسے لائف پارٹس ہیں آپ۔ گاڑی تک میں تو پارٹزشپ بنا نہیں سکتے آپ کتاب پڑھیں۔

میں کیا کروں؟“ وہ خفا خفا سے انداز میں بولی۔

”پڑھ تو نہیں رہا۔ صرف سرسری دیکھ رہا ہوں۔ دراصل کتاب میری کمزوری ہے۔ کتاب دیکھ کر بڑی بے اختیاری نیت ہو جاتی ہے۔ او۔ کے۔“

انہوں نے تو جھگڑا ہی ختم کر دیا۔ اور بیک سے بریف کیس کھینچ کر کتاب اس میں رکھ دی۔

”ظاہر ہے آپ بھی اسے منزل پر پہنچ کر پڑھیں گی۔ اس لیے رکھ دی ہے۔ چلیے اب پارٹزشپ کے تقاضے پورے کرتے ہیں۔ یہ بتائیے وقت کیسے گزرا۔ حویلی کی خواتین سیآپ کو کوئی شکایت تو نہیں ہوئی۔“

انہوں نے بریف کیس واپس پیچھے رکھتے ہوئے بہت خوشگوار موڈ میں گفتگو شروع کی۔ وہ ذہنی طور پر اتنی الجھ گئی تھی کہ اس نے جیسے یاور علی خان کا ایک لفظ بھی نہیں سنا۔ خالی خالی نگاہوں سے اپنی ہتھیلیاں دیکھنے لگی۔

”کہاں گم ہیں۔ واپس آئیے۔“ ان کا لہجہ بہت دھیمہ تھا۔ جیسے سرگوشی کر رہے ہوں۔

”آں۔ ہاں۔ کہیں نہیں۔ میں سوچ رہی تھی۔ پشاور سے روشی کے لیے کچھ کپڑے وغیرہ لے لوں گی۔ ریڈی میڈ۔ اس کے پاس سیزن کے پکڑے نہیں ہیں۔“ اس نے پریشان ذہن کے بات بنائی۔

”ہوں۔ ٹھیک ہے۔ پانچ گھنٹے ہوں گے ہمارے پاس۔ میں اپنا کام کروں گا۔ آپ شاپنگ کر لیجیے گا۔ او کے۔“ انہوں نے فوراً معقول حل سے نواز دیا۔

”ویسے سچ بتائیں۔ آپ کو کبھی اپنی مصروفیات میں خیال آتا ہے۔ کہ روشی کو اس عمر میں کس چیز کی خواہش ہوگی اور وہ خواہش وہ کس طرح پوری کرتی ہوگی۔ انسان اپنے پیرنٹس سے بے دھڑک ڈیمانڈ کر سکتا ہے۔ ہر کسی سے تو نہیں۔ اور آپ تو اسے کبھی کبھی میسر آتے ہیں۔ وہ اپنی خواہشات کا اظہار بجا بیگم یا بابا صاحب سے کس حد تک کرتی ہوگی؟“ مابین نے ان کا ذہن ادھر ادھر کرنے کی کوشش میں یونہی روشی کا ذکر چھیڑ دیا۔

”آپ اس کا ذکر نہ کریں۔ اس نے مجھے جتنا ہرٹ کیا ہے، جتنی میری انسلٹ کی ہے شاید میں عمر بھی اسے معاف نہ کر سکوں۔“

یاور علی خان کی پیشانی کی لکیں گہری ہو گئیں۔

”کیا کیا ہے اس نے۔ ذہنی لحاظ سے ابھی وہ بچی ہے۔ ماں سے محرومی باپ سے دوری نے اسے کامپلیکس میں مبتلا کر لیا ہے۔ جو اس کے نقصان ہیں۔ وہ بھی شاید آپ کے سرخ فیتے کی نذر ہو گئے ہیں۔“

”وہ ایک کمفرٹ لائف گزار رہی ہے۔ اسے باپ دادا کی وجہ سے سوسائٹی میں امتیازی حیثیت حاصل ہے۔ اور انسان کو کیا چاہیے ہوتا ہے؟“

ان کے لہجے سے خفگی کا تاثر بدستور چھلک رہا تھا۔

”سر پر رکھ کر ناچے انسان ایسے امتیاز کو۔ جب انسان انتشار اور دکھ کی ایسی سطح پر پہنچ جائے کہ اسے کمفرٹس کی موجودگی کا احساس تک نہ رہے تو کمفرٹس ہونے یا نہ ہونے سے کیا فرق پڑتا ہے۔ اگر آپ اس سے خفا ہوئے تو وہ اندر سے مزید چور چور ہو جائے گی۔ تو کیا آپ کو دکھ نہیں ہو گا؟“

ہری پور پہنچنے سے پہلے اسے برین واشنگ کا اچھا موقع ملا تھا۔

”کوئی گنجائش نہیں ہے اب اس کے لیے بہت برا کیا ہے اس نے۔“ ان کے لہجے میں ایک قطعی پن تھا۔

”اپنے خون، وہ بھی بیٹی سے برابری کی بنیاد پر اس طرح جنگ تو نہیں لڑی جاتی ہو سکتا ہے۔ اسے فراغت میں وہ چھپیدگیاں ملی ہوں جن کے نتیجے میں آج اس سے غلطیاں ہو رہی ہوں۔ ہو سکتا ہے وہ اندر سے کبھی بھی ریلیکس نہ رہی ہو۔“

ہین نے بھی قدرے آف موڈ میں جواب دیا۔

”آپ اس کی وکالت نہ کریں۔ اب میں جو کر رہا ہوں۔ مجھے کرنے دیں۔“ انہوں نے فیصلہ کن انداز اختیار کیا۔

ماہین خاموش ہو گئی اور کھڑکی سے باہر جھانکنے لگی۔

”میں سوچتی ہوں، انسان سے کس قسم کا عمل سرزد ہوتا ہوگا کہ پھر اسے زیادتی راس آ جاتی ہے۔ پھر زیادتی در زیادتی۔“ وہ کچھ توقف کے بعد گویا ہوئی۔

یادو علی خان کے لہو سے آنچ آنے لگی۔ ان کے کانوں کی لوؤں سے گویا خون ٹپکنے لگا۔ اتنی بڑی بات کہہ دی گئی تھی انہیں۔ وہ بھی اتنے آرام سے۔ مگر انہوں نے ڈرائیور کی موجودگی کو فراموش نہیں کیا اور کمال ضبط سے کام لیا۔

”اتنی پرانی شادی نہیں ہوئی ہماری کہ کہنے کوئی خوبصورت بات نہ بچی ہو۔“

”کہاں ہے یہ شادی۔ یہ تو کوئی پراجیکٹ ہے۔ جس پر آپ مرحلہ وار کام کر رہے ہیں۔“ وہ بات کاٹ کر بہت آہستہ آواز میں بولی۔

”کچھ تاری ہی ہیں غالباً۔“ ان کا لہجہ یکدم برف ہو گیا۔

”ارے نہیں۔ جو ادور روشانی کی موجودگی میں کبھی اس فیصلے پر کچھتاوے کا احساس نہیں ہو سکتا میرے پیارے میرے اپنے میرے قریب ہیں۔“ وہ دھیرے سے مسکرا دی۔

”میری تو کہیں جگہ ہی نہیں بن رہی۔ پراجیکٹ تو پھر آپ کا ہوا؟“ یادو علی خان کے لہجے میں واضح تخی تھی۔

”سودے بازی میں تو ایسا ہی ہوتا ہے۔ ضروری نہیں کہ ہر مرتبہ متوقع منافع ہو۔ ویسے آپ ایک بات بتائیے۔“

”ٹاپک بہت سینسٹو ہو چکا ہے۔ میرا خیال ہے بات گھر پر ہونا چاہیے۔“

یادو علی خان کی تمام حسیات شارپ ہو کر خطرے کا الارم بج رہی تھیں۔

ماہین خاموش ہو گئی۔

پشاور سے ہری پور پہنچتے پہنچتے تھکن سے بری حالت ہو چکی تھی۔ مگر روشی کو سامنے پا کر جیسے وہ ایک دم تازہ دم ہو گئی تھی۔ گہرے رنگوں کے پرنڈ کپڑوں میں سبزے کے درمیان کھڑی روشنی اسے قدرتی حسن کا ایک حصہ محسوس ہوئی۔

”بہت خراب ہیں آپ اب آرہی ہیں؟“ وہ ماہین کے گلے لگ کر شکوہ کناں ہوئی۔

”تمہیں پہلے اس لیے بھیج دیا تھا کہ کوئی تو ہمارے استقبال کے لیے موجود ہو۔“ وہ اس گرم جوشی سے لپٹا کر بولی۔

”اف خدایا۔ آپ آئی ہیں تو لگا ہے کہ گھر ہے یہ۔ تھوڑے دیر پہلے کیا وحشت تھی۔ وہ اسی طرح گلے گلے کہہ رہی تھی۔“

نہیں۔

اسی دم یادو علی خان پاس سے گزرے تو روشی ماہین سے الگ ہو گئی اور ڈرتے ڈرتے ان کی طرف دیکھا اور سلام کیا۔

یادو علی خان نے اس کے سلام کا جواب نہیں دیا۔ اور تیزی سے آگے بڑھ گئے۔ روشی نے ماہین کی طرف دیکھا۔

”انداز تو ہمیشہ ہی یہ رہا ہے خالہ! مگر پہلے سلام کا جواب دے دیا کرتے تھے۔“ اس کی آواز بھرا گئی۔

”ایک بار پاپا سے دور ہو جاؤں خالہ پھر کوشش کروں گی کہ مرتے دم تک سامنے نہ آؤں۔ کا کا جان اتنے روڈ لگتے ہیں

نہیں نہیں۔ میں ایک بار ان کے گلے لگی تو ایسا لگا جیسے وہ کوئی ٹھنڈی چھاؤں ہوں۔ اتنے اچھے ہیں۔ کہ کبھی انداز نہیں ہوا۔

پاپاں سے کیوں ناراض ہیں۔ لگتا ہے پاپا تو بس سب ہی سے ناراض ہیں۔ شاید اپنے آپ سے بھی۔“

وہ بہت دل گرفتہ انداز میں کہہ رہی تھی۔

ماہین خاموشی سے سنتی رہی۔

”بڑی بات ہے روشی! اپنے باپ سے زیادہ کوئی نہیں ہونا چاہیے۔ باپ پھر باپ ہوتا ہے۔“

ماہین کا اخلاقی فرض تھا، وہ ساتھ رہنے والوں کے درمیان فاصلے پیدا نہ ہونے دے۔ لہذا وہ اسے سمجھانے لگی۔

”چھوڑیے خالہ۔ آپ کو کیا پتا مجھے پاپا سے کتنی محبت ہے۔ مگر وہ اتنی مرتبہ میرا دل توڑ چکے ہیں کہ ستیا ناس ہو گیا ہے

برا۔“

وہ اس طرح بولی کہ ماہین بے ساختہ مسکرا دی۔

لاؤنچ کی طرف روشی کے ہمراہ جاتے ہوئے معاہدہ کسی خیال کے تحت چوک پڑی۔ وہ کتاب میں تیمور علی خان کا فون

نمبر اور کتاب یادو علی خان کے بریف کیس میں ہے۔ یقیناً وہ اب سب سے پہلے غسل کریں گے۔ بہترین موقع ہے کہ

کتاب بریف کیس سے نکالی جاسکتی ہے۔

شام کے چھ بج رہے تھے۔ مگر سبزے کی کثرت کی وجہ سے شام گہری محسوس ہو رہی تھی۔ لگتا تھا بس رات ہونے والی

ہے۔ اس نے گم صم سی روشنی کی طرف دیکھا۔

”روشنی۔ جان اچھی سی چائے پلوؤ۔ جب تک میں باتھ لے لیتی ہوں۔“

وہ کمرے میں آئی تو یادو علی خان کوٹ اور ٹائی اتار کر بستر پر دراز تھے۔ سلگتا ہوا سگریٹ ان کی انگلیوں میں دبا ہوا تھا۔

”اؤں کی سوچ میں تھے، وہ کمرے میں داخل ہو گئی مگر انہوں نے توجہ نہ کی۔“

”طبیعت ٹھیک ہے آپ کی؟“ اس نے قدرے حیرت سے دریافت کیا۔ ان کی عادت تھی وہ باہر سے آ کر پہلی فرصت

مُٹا کر کرتے تھے بعد میں کوئی اور کام کرتے تھے۔

”کیوں کیا ہوا میری طبیعت کو؟“ انہوں نے سرد مہری سے دریافت کیا۔ ماہین اس عجیب سے جواب پر شپٹائی گئی۔

”میرا مطلب ہے آپ نے باتھ نہیں لیا۔ وہاں میں چائے کے لیے کہہ آئی ہوں۔ اس لیے پوچھ رہی تھی کہ آپ

چائے ابھی نہیں گے یا ہاتھ لینے کے بعد؟“ اسے ایک دم جواب سوجھ گیا۔

”کوئی بات نہیں۔ کبھی کبھی یوں بھی ہو جاتا ہے۔ آپ چائے منگوا لیجیے۔“ ان کا انداز بدستور تھا۔

”ماہین۔“ ان کے سرد سے انداز سے فضا میں عجیب سوگواری سی رچ گئی۔

”جی۔“

”آپ کو کچھ اندازہ ہے کہ روشی علیم الدین کے ہاں رشتے پر کیوں رضامند نہیں ہو رہی؟“

بڑا ہی غیر متوقع سوال تھا۔

”جی۔ وہ مجھے کیا پتا۔ شاید نعم اسے پسند نہ ہو۔“ اس نے گڑ بڑا کا جواب دیا اور ان کے سامنے پڑی کرسی پر بیٹھ گئی۔

”کیوں کیا وہ اس کے جوڑ کا نہیں؟“ ان کے ماتھے کی شکنیں گہری ہو گئیں۔

”میرا خیال ہے، شاید وہ اس سے کچھ چھوٹا ہے“ اس نے جھجکتے ہوئے ان کی سمت دیکھا۔

”نان سنسن۔ مرد بھی کبھی چھوٹا ہوتا ہے۔ واٹس اے جوک؟ ایز یوم دیٹ۔ اگر ایسا ہے بھی تو وہ کون سا اور اتنا ہو چکی

ہے؟ جزی ریشن گیپ تو نہیں ہے۔ اس کی شادی یہیں ہری پور میں ہوگی۔ آپ اس کا مائنڈ میک اپ کریں۔ ساتھ ہی شادی کی

تیاری بھی۔ جواد کے ایگزٹم ختم ہونے والے ہیں۔ اسے بھی ہم یہیں بلا رہے ہیں۔ ویسے بھی میں اسے مزید تعلیم یہاں نہیں

دلانا چاہتا۔ وہ یورپ جانا چاہتا ہے۔ تعلیم کے لیے اور میں بھی یہی چاہتا ہوں۔ اور یہ بھی چاہتا ہوں کہ وہ بعد میں وہیں میٹل

ہو جائے اور بس۔“

وہ یہ کہہ کر کش لگانے لگے۔

ماہین خاموشی سے سنتی رہی۔

’میرا خیال ہے بابا صاحب سے مشورہ کر کے روشی کی شادی اگلے مہینے کی کسی تاریخ کو ٹھہرا دیتے ہیں۔“

”احساس ذمے داری کے تحت ایسا چاہ رہے ہیں یا اسے خود سے دور رکھنے لیے غصے میں یہ فیصلہ کر رہے ہیں۔“ اس نے

ان کی بات کاٹ دی۔

”کچھ بھی سمجھ لیں۔ شادی کوئی بری چیز نہیں ہوتی۔ اچھا ہے وہ اپنی عملی زندگی کا آغاز جلد سے جلد کر دے۔“

”اتنی جلدی تو شاید وہ۔“

”مجھے کچھ نہیں سننا۔ میری ساری زندگی پر اہلم فیس کرنے میں گزری ہے۔ اب میں ٹھہراؤ چاہتا ہوں۔ آپ اسے مطلع

کر دیں۔“

بعض اوقات انسان کے پراہلمز اس کی اپنی کسی غلطی کی وجہ سے بھی ہو سکتے ہیں۔ اس کا بدلہ دوسروں سے تو نہیں لینا

چاہیے۔“ ماہین کہے بنا رہ نہ سکی۔

سو وہاٹ۔ پھر فیس بھی تو انسان خود ہی کرتا ہے۔ اگر میں بدلہ لے رہا ہوں تو بہت اچھا بدلہ لے رہا ہوں۔ اس کی شادی

کر رہا ہوں۔ شوٹ تو نہیں کر رہا۔“ وہ قدرے برہم انداز میں گویا ہوئے۔

ماہین مطلع خاموش ہو گئی۔ وگرنہ دل تو چاہ رہا تھا کہ آج کھل جائے۔

اسی لمحے ملازم نے دروازے پر دستک دی۔

”آ جاؤ۔“ ماہین نے ٹیبل پر سے میگزین ہٹا کر ٹرے کے لیے جگہ بنائی۔

یاد علی خان بھی اٹھ کر فیک لگا کر بیٹھ گئے۔

ملازم نے ٹرے میز پر رکھ دی اور اگلے حکم کے انتظار میں کھڑا ہو گیا۔

”ہوں۔ بس جاؤ تم۔“ ماہین نے ٹرے اپنے آگے کھسکا کر اسے فارغ کیا۔

”وہ ایکسٹ ٹھہرو۔ روشی کو چائے دی؟“ اس نے جاتے ہوئے ملازم کو روک کر سوال کیا۔

”چائے مس صاحبہ نے بنائی ہے اور وہ وہیں پی رہی ہیں۔“ ملازم نے مودبانہ جواب دیا۔

”اب تو زیادہ تر دوپہر کو کھانا وہ خود ہی بناتی ہیں کسی کو بھی کچن میں آنے نہیں دیتیں ہیلپ کے لیے۔“

دیری ٹائٹس۔ گڈ چیئنج۔“ ماہین نے بے ساختہ یاد علی خان کی سمت دیکھا۔

وہ چہرہ صاف سلیٹ کی طرح تھا۔

ملازم ایک منٹ مزید رک کر باہر چلا گیا۔

”باپ کا گھر آ خرابا پ کا گھر ہوتا ہے۔ یہ احساس آپ کی ناراضگی بھی اس سے نہیں چھین سکتی۔“ ماہین چائے بناتے

ہوئے کہہ رہی تھی۔

”باپ کے گھر کا احساس کر سکتی ہے۔ باپ کا نہیں۔“ وہ خفگی بھرے انداز میں کہہ کر سرکریٹ الیش ٹرے میں مسلنے لگے۔

”بدگمانی حد سے بڑھ جائے تو انصاف کی حس مزید ہو جاتی ہے۔ حق چھپ جاتا ہے۔ فریب چھا جاتا ہے۔“ ماہین نے

ہائے میں شکر ملاتے ہوئے خفا خفا سے لہجے میں کہا۔

”آپ کا مینٹل لیول اتنا ہائی ہے کہ سم ٹائم میں اپروچ نہیں کر پاتا۔“ یاد علی خان نے قدرے تلخ لہجے میں کہا۔

ماہین خاموشی سے چائے میں شکر ملانے لگی۔ پھر اس نے چائے کا کپ ان کی طرف بڑھایا دیا۔ یاد علی خان نے کپ

ٹالیا۔

معاہین کی نگاہ کھلے ہوئے برف کیس کی طرف پڑی۔ جوان کے پہلو میں رکھا تھا اور اس میں سے کاغذات جھانک

رہے تھے۔ اس نے ادھر ادھر نگاہ دوڑائی۔ مبادا انہوں نے کتاب نکال کر باہر رکھ دی ہو۔ مگر اسے کتاب نظر نہ آئی۔

وہ بریف کیس میں سے کتاب تو نکال دیجیے جو باری نے دی تھی۔“ کتاب ہاتھ میں لینے کا یہ موقع وہ گنونا نہیں چاہتی

تھی۔

یاد علی خان نے کپ سائیڈ ٹیبل پر رکھا اور ٹیکے کے نیچے سے کتاب نکال کر اس کی طرف بڑھادی۔

”بڑی عام سی کتاب ہے مگر آپ جانے کیوں اتنی کانٹش ہو رہی ہیں؟“ انہوں نے عام سے لہجے میں کہا اور دوبارہ

ہائے کا کپ اٹھالیا۔

ماہین نے خاموش رہنا مناسب سمجھا اور کتاب کھول کر دیکھنے لگی۔ وہ تیزی سے صفحات اڑا رہی تھی کہ فون نمبر والا کارڈ سامنے آجائے۔ مگر کئی بار صفحات ادھر ادھر کرنے کے باوجود کارڈ نظر نہ آیا۔ اس کا دل تیز تیز دھڑکنے لگا۔ وہ بار بار صفحات ٹٹولنے لگی۔ بدحواسی میں اتنا دھیان بھی نہ رہا کہ یاد علی خان اس کی حرکات و سکنات بغور دیکھ رہے ہیں۔

انہوں نے نیکی کے نیچے دوبارہ ہاتھ ڈال کر کچھ نکالا؟ اس کتاب میں سے یہ کارڈ گر گیا تھا میں نے باری کا سمجھ کر الگ رکھ دیا تھا۔ کسی وکیل صاحب کا ہے دو نمبر تو پرنٹ ہیں اور ایک نمبر ہاتھ سے لکھا ہوا ہے۔ کہیں آپ یہی تو تلاش نہیں کر رہیں؟

ماہین اپنی حماقت پر سرپیٹ کر رہ گئی۔ مگر اس نے فوراً ہی خود پر کنٹرول کر کے بڑے اعتماد سے کارڈ ان کے ہاتھ سے لے لیا تھا۔ مگر بولی کچھ نہیں کہ بعض اوقات صفائی پیش کرنے سے الجھنیں پیش آنے لگتی ہیں۔

البتہ دل ہی دل میں حیران تھی کہ آئے ہوئے زیادہ دیر تو نہیں ہوئی مگر یاد علی خان نے اتنی دیر میں بریف کیس بھی کھول لیا کتاب بھی دیکھ لی۔ اور پھر یہ بھی نہیں پوچھا کہ ایک مقامی ایڈوکیٹ کے کارڈ کی ضرورت کیوں پیش آگئی؟ اسے یوں محسوس ہوا کہ جیسے وہ جان بوجھ کر اس معاملے کو نظر انداز کر رہے ہیں۔ اس خیال کے تحت عجیب سی فکر نے اسے مضطرب کر دیا۔

اس نے کارڈ کو بظاہر لاپرواہی سے سائیڈ ٹیبل کی دراز میں ڈال دیا اور واپس اپنی کرسی پر آ کر بیٹھ گئی اور چائے پینے لگی۔ دونوں کے مابین خاموشی کی زبان میں بڑی تیز و تند گفتگو ہونے لگی۔

ماہین صبح ہی سے بہت مصروف تھی۔ کچھ گھر کی سینک اپنی سہولت و مرضی سے کی تھی دوسرے کچن بہت اپ سیٹ محسوس ہوا تھا۔ وہاں ملازم کے ساتھ مل کر کام کیا تھا۔ روشی ابھی تک کمرے سے باہر نہیں آئی تھی۔ یاد علی خان کا سوٹ اس نے رات ہی تیار کر دیا تھا۔ رات سے اب تک اس کی ان سے کوئی بات نہیں ہوئی تھی دو مرتبہ وہ بیڈروم میں گئی تھی مگر اس کا انداز بہت مصروف تھا یا یہ کہ کام کی دھن سوار تھی دوسری مرتبہ وہ چادر اور اپنا بیگ لینے بیڈروم میں گئی تھی۔ اور بہت عجلت کے انداز میں انہیں بتایا تھا۔

کہ وہ نزدیکی بازار جا رہی ہے۔ ملازم کے ساتھ کچھ گھر کی بہت ضروری اہم چیزیں لینے۔ یہ بتا کر اس نے یاد علی خان کے جواب کا بھی انتظار نہیں کیا تھا۔

وہ راہداری میں آئی تو سامنے سے ایک خوش شکل و خوش لباس نوجوان آتا دکھائی دیا۔ اس نے بہت آہستگی سے ماہین کو سلام کیا اور ایک طرف ہو کر اسے راستہ دیا۔

”یہ کون ہے خوش دل؟“ اس نے افغان ملازم کی سمت دیکھا۔

”ڈی۔ سی صاحب کا آپریٹر ہے بیگم صاحبہ، خوش دل نے مودبانہ جواب دیا۔

”کیا نام ہے ان کا؟“ اس نے یونہی پوچھ لیا تھا۔

”سب لوگ عثمانی صاحب بولتا ہے۔ امارا زیادہ بات نہیں ہے بیگم صاحبہ۔“

”اچھا۔ اچھا۔ خیر۔ زیادہ دور تو نہیں ہے بازار؟ ٹیکسی کر لیں؟“ اس نے پوچھا

”زیادہ دور تو نہیں ہے۔ ویسے آپ گاڑی لے لیں۔ ڈرائیور موجود ہے۔“ ملازم نے مشورہ دیا۔

”یہ صاحب کے آفس جانے کا ٹائم ہے وہ ڈسٹر بہوں گے۔ اور مجھے تو یہ گھریلو شاپنگ خود ہی کرنے کی عادت ہے۔

اس لیے بازار کا رستہ دیکھنا چاہتی ہوں۔ مجھے دوسروں کا لایا ہوا سودا سلف پسند نہیں آتا۔“

”ادھر حویلی میں بھی آپ ہی لاتا ہے سب سامان۔“ خوش دل نے تعجب سے اسے دیکھا۔

”نہیں۔ وہاں نہیں۔ شادی سے پہلے کیونکر گھر کی ذمہ داری مجھ پر آ پڑی تھی۔ بہنوں کی شادیاں ہو گئی تھیں۔ والدہ کی

بٹھ ہو گئی تھی اس لیے عادت ہے سب کچھ کرنے کی۔ حویلی میں تو بہت سے لوگ ہیں۔ مگر یہ تو میرا اپنا گھر ہے یہاں تو مجھے

ی سب کچھ سنبھالنا ہے۔“ اس نے گیٹ عبور کرنے کے دوران یہ سب کچھ کہہ دیا تھا۔

”آپ اجازت دیں تو ایک بات عرض کروں؟ خوش دل بہت جھجکتے ہوئے اجازت طلب کر رہا تھا۔

”ہوں۔ اسے اس مودب ملازم سے کسی حماقت کی توقع نہیں تھی۔ اس لیے بہت اطمینان سے اجازت دے دی تھی۔

”آپ بس مس صلیبہ کو سنبھال لیں۔ ام اس کی بہت فکر کرتا ہے۔“

”کیوں کیا کیا ہے اس نے؟“ اس نے تشویش کے انداز میں قدرے چوٹ کر سوال کیا۔

”بہت غصہ کرتا ہے۔ پھول دان برتن توڑ دیتا ہے۔ ام یہ سب ڈی سی صاحبہ کو نہیں بولا ہے۔ پھر وہ کھانا وانا کچھ

نہیں کھاتا ہے۔ ام فکر کرتا ہے۔ پر ام کیا کر سکتا ہے۔

ایک روز مس صلیبہ نے صبح سے کچھ نہیں کھایا اور بہت رویا۔ وہ اللہ نے خان کو ادھر بھیج دیا۔ وہ اس کو کھانا کھلایا رات کو۔“

”وہ ادھر حویلی میں ہوتا ہے۔ کبھی کبھی اور آتا ہے۔ آپ نہیں جانتا؟“ خوش دل نے حیرت سے پوچھا۔

”باری۔؟“ اس نے اندازے سے پوچھا۔

”جی۔ اور سب اس کو خان بولتا ہے۔ بڑا اچھا ہے۔ بہت پڑھا ہے۔ ابھی وکیل بنے گا وہ۔“ خوش دل نے اپنی

دانت میں اطلاع بہم پہنچائی۔

”اوہ۔“ ماہین نے گہرا سانس لیا۔

”پھر وہ صبح صبح چلا گیا تھا۔ مس صلیبہ نے اٹھ کر پوچھا خان کدر گیا۔ ام بتایا وہ واپس چلا گیا تو وہ بوت غصہ کیا۔ پتا نہیں

کیا کیا بولا؟“

”ہوں۔“ ماہین کو یا گہری سوچ میں چلی گئی۔

”پھر اس کے بعد تو بھوک ہڑتا نہیں کی روشی نے؟“ اس نے دریافت کیا۔

”نہیں۔ پر وہ اس طرح کھانا نہیں کھاتا ہے۔ بس جب دل چاہتا ہے کھا لیتا ہے۔ ام اس کی بہت فکر کرتا ہے بیگم

صاحبہ۔ امارا دو بیٹی ہے اس کے برابر کا۔ ڈی۔ سی صاحبہ بھی اس سے پتا نہیں کیوں بات نہیں کرتا ہے۔ ام بوت افسوس کرتا

ہے۔ آپ مس صلیبہ کا خیال کرو بیگم صاحبہ۔“

وہ بہت ہمدردی اور دلسوزی سے کہہ رہا تھا۔ اس کی اپنائیت نے مایہ کے دل پر بہت اثر کیا۔

”ہاں خوش دل! اب مجھے صرف اسی کا خیال کرنا ہے۔ میرا تو اثاثہ ہیں یہ بچے۔ میرا بس چل تو ان کا ایک ایک دکھ اپنے نام کر لوں۔ میں ان کی دوسری ماں ہوں اور یہ رشتہ بہت کمزور ہے مگر میں ان کی سگی خالہ بھی ہوں اور یہ رشتہ بہت مضبوط ہے۔ تم فکر نہ کرو۔ ٹھیک ہو جائے گی وہ۔“

اس نے آج تک کسی گھریلو ملازم سے اتنے قریب ہو کر بات چیت نہیں کی تھی۔ مگر اس بوڑھے میں اس نے بلا کی جانثاری محسوس کی تھی۔

”دراصل وہ اکیلے میں گھبراتا ہوگا۔ اب آپ آگئی ہیں تو وہ ٹھیک ہو جائے گا۔“

خوش دل نے مایہ کے انداز سے بہت اچھی امید باندھ لی تھی۔ اس لئے مطمئن انداز میں کہا تھا۔

سارا دن کی ادھیڑ بن سے اس کے اعصاب شل ہو چکے تھے۔ یادِ علی خان اپنی فائلوں میں مگن تھے۔ وہ کافی دیر ادھر ادھر بھلتی رہی۔ روشی دس بجے ہی کمرہ بند کر چکی تھی۔ اس کا اپنا موڈ بھی نہیں تھا۔ باتیں کرنے کا ورنہ وہ دروازے پر دستک بھی دے سکتی تھی اور روشی کو باتوں میں لگا سکتی تھی۔

وہ سر پر آئینہ جھکا کر دے پاؤں باہر چلی آئی۔ یادِ علی خان سے یہ کہہ کر روشی کے پاس جا رہی ہے وہ آپریٹر کے چیمبر میں چلی آئی تھی۔

آپریٹر، مایہ کو دیکھ کر سرو قد کھڑا ہو گیا۔ ”السلام علیکم میڈم۔“

”والسلام۔ اتنی لمبی ڈیوٹی ہوتی ہے آپ کی؟“ وہ سامنے پڑی لیدر کی کرسی پر بیٹھ گئی۔

”جی نہیں۔ ایکچوٹلی میں پانچ بجے آف ہو جاتا ہوں۔ اس کے بعد گل صاحب آ جاتے ہیں۔ مگر آج ان کے ساتھ پرابلم ہو گئی ہے۔ کبھی کبھی ایسا ہو جاتا ہے۔ کبھی ان کے ساتھ کبھی میرے ساتھ وہ بڑے مود بانہ انداز میں جواب دے کر مسکرایا۔

”ہوں۔“

”بھئی، مجھے تو یہ لائف باؤنڈری محسوس ہوتی ہے۔ دم الجھتا ہے اپنے کمرے میں خود فون ڈال کرنے کا مزاجی کچھ اور ہے۔“

اس نے بند ٹھی کھول کر کارڈ اس کے سامنے کیا جو اس نے دراز سے نکال کر پہلی فرصت میں اپنے پرس میں رکھ لیا تھا۔ محض بے نیازی ظاہر کرنے کیلئے یادِ علی خان کے سامنے دراز میں ڈال دیا تھا۔

”یہ تیسرا نمبر جو پنڈرائٹنگ میں ہے۔ یہ ملا دیجیے۔“

”آپ نے زحمت کی آپ اپنے بیڈروم سے حکم فرماتیں۔ میں ملا دیتا۔“ آپریٹر حیرانی سے کہہ رہا تھا۔ ”نہیں۔ بس میں

ذرا پرائیویسی میں بات کرنا چاہتی ہوں۔ آپ بھی پلیز نمبر ملا کر یہ چیمبر خالی کر دیجیے گا۔“ اس نے قدرے تحکمانہ انداز اختیار کیا۔

”کے میڈم!“ وہ نمبر ڈائل کرنے لگا۔ پھر لائن کاٹ کر مایہ کی سمت قدرے سوچتے ہوئے انداز میں دیکھا اور اچانک سے کہنے لگا۔

”جی۔ ہیلو۔ فرام ڈی۔ سی ریز یڈنسی۔ یہ ایک نمبر ہے کیا کوڈ نمبر سے ڈائل ہوگا۔ جی۔“

”جیہ؟“ اس نے مایہ کی سمت دیکھا۔

”سوائے۔“ مایہ اس کے مزید بولنے سے پشتر بول پڑی۔ آپریٹر کے بھی شاید ہاتھ پاؤں پھول گئے تھے۔ یادہ کچھ آپریٹر نے کہا تھا۔ ورنہ جگہ پوچھ کر کوڈ خود ہی برآمد کر سکتا تھا۔

نذرے بچل سا ہو کر وہ نمبر ڈائل کر رہا تھا۔

”ہیل جارجی ہے میڈم! کس سے بات کیجیے گا؟“ اس نے ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔

”تیور علی خان سے۔“

”اوہ۔ نہیں۔ نہیں۔ آپ یوں کہیے کہ حویلی سے بڑی بیگم عالم تاب، بیگم تیمور سے بات کرنا چاہتی ہیں۔“ اس نے اصل کے گھوڑے دوڑانے کی کوشش کی۔

آپریٹر نے نظریں جھکا کر اپنی حیرت چھپائی اور ایر پیس میں آنے والی آواز کی سمت متوجہ ہو گیا۔

”ہیں۔ ہیلو۔ مزہ تیمور سے بات کرایئے۔ جی حویلی سے فون ہے بڑی بیگم عالم تاب کا۔ یس۔“

آپریٹر نے ریسور مایہ کی سمت بڑھایا اور خود کرسی کھسکا کر کھڑا ہو گیا اور پھر باہر نکل گیا۔

ریسور میں ہنوز سناٹا طاری تھا۔

چند لمحوں بعد سوئی سوئی سی نسوانی آواز ایر پیس میں ابھری۔ ”جی بیگم السلام علیکم۔“

مایہ کا دل بڑی تیزی سے دھڑکا تھا۔ ایک لمحے کو تو جیسے گویائی ہی سلب ہو کر رہ گئی تھی۔

”ہیلو۔ ہیلو!“ دوسری جانب سے نازنین ہیلو ہیلو کر رہی تھی۔ ایسی دلکش آواز، صاف چھنی ہوئی۔

ناعت کو اعلا درجے کا خوشگوار تاثر دیتی ہوئی۔

مایہ نے کھنکار کر گلا صاف کیا۔

”السلام علیکم۔“ اس نے بمشکل سلام کیا۔ بڑی عجیب سی کیفیت ہو رہی تھی۔

”بیگم السلام۔ آپ کون؟“ نازنین ایک نامانوس آواز محسوس کر کے بری طرح چونک پڑی تھی۔

”میں جو کوئی بھی ہوں، کیا آپ سے بات کرنے کی سعادت حاصل کر سکتی ہوں۔“

”آپ کا نام؟“ وہ بے تابی سے اس کی بات کاٹ کر پوچھ رہی تھی۔

”نام بتانے کے بعد فون بند تو نہیں کر دیں گی؟“ مایہ بہت دھیمی آواز میں پوچھ رہی تھی۔

”نہیں میں خاموشی چھا گئی۔“

”ہیلو!“ مایہ کا انداز بے قراری لیے ہوئے تھا۔

”جی۔ کون محترمہ بات کر رہی ہیں؟“ معاریسور سے تیمور علی خان کی آواز ابھری۔

ماہین بری طرح شٹنگی۔ اس نے بے ساختہ ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھ دیا۔ وہ اضطرابی کیفیت میں ہونٹ کاٹ رہی تھی۔ ”ہیلو!“ تیمور علی خان مسلسل ہیلو بولو کر رہے تھے۔

اس کی خود اعتمادی انتشار میں بدل چکی تھی اس لیے اس نے یہی مناسب سمجھا کہ فون بند کر دے اور ہر پہلو سے اچھی طرح سوچ کر پھر کوئی قدم اٹھائے۔ اس نے ناکامی کے تھکا دینے والے احساسات کے ساتھ ریسور کریڈل پر رکھ دیا اور باہر نکل آئی۔ اسے آپریٹر اس پاس کہیں دکھائی نہیں دیا۔

وہ دکھ کے گہرے سمندر میں غوطے لگا رہی تھی۔ ”آپ کا نام“ ایک نقش ہو جانے والی آواز نے اس کا رہاسکون بھی درہم برہم کر دیا تھا۔

”ایکسکیوز می میڈم۔ یہ آپ کا رڈ۔“ اسے پشت سے آپریٹر کی آواز آئی اور اس نے گویا اپنا سر پیٹ لیا تھا۔ غائب دماغی اعلیٰ درجے کی ہو تو اس طرح کے نازک کام کرنا کسی طرح مناسب نہیں ہوتا۔

”تھینکس۔“ اس نے کارڈ اس کے ہاتھ سے لے کر چند قدم کے فاصلے پر موجود اپنے بیدروم کے بند دروازے کی سمت دیکھا تھا۔ اور گویا اطمینان کا سانس لیا تھا۔

اند آئی تو یاور علی خان ہنوز اپنے کام میں مصروف تھے۔ سیاہ ٹائٹ سوٹ میں ملبوس گریبان کھولے بائی فوکل گماز لگائے گویا وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر تھے۔ انہوں نے اس کی آمد کو محسوس تو کر لیا تھا مگر کوئی رد عمل ظاہر نہیں کیا تھا۔ نہ ہی ہاتھ میں پکڑے قلم کی رفتار میں کوئی فرق آیا تھا۔

وہ وارڈروب سے اپنا شب خوابی کا لباس نکال کر ڈریسنگ کی طرف بڑھ گئی۔

واپس آئی تو ادھر انداز ہنوز تھا۔ وہ برش اٹھا کر بالوں میں چلانے لگی۔

ڈریسنگ ٹیبل بیڈ کے بالکل برابر میں تھی وہ ان سے بہت کم فاصلے پر کھڑی آئینے میں خود کو دیکھ رہی تھی۔

”روشی کو وہ سب بتا دیا جو میں نے آپ سے کہا تھا۔؟“ یاور علی خان نے خاموشی توڑنے میں پہل کی۔

”ہوں۔“ وہ غائب دماغی کی کیفیت سے دوچار تھی۔

”سو گئی وہ۔؟“

”آپ کی بلا سے۔“ وہ بہت نرم انداز میں سخت بول گئی۔

”کیا بات ہے پھر لڑائی کا موڈ ہے؟ آئی ایم سوری۔ مجھے احساس ہے۔ میں نے بہت دنوں سے آپ کو وقت نہیں دیا۔

چلیں۔ آج صرف اپنی باتیں کریں۔“

انہوں نے واقعی فائلیں سمیٹ کر ایک طرف رکھ دیں۔

بے خبری کے دنوں میں ان کا یہ انداز شاید اسے لوٹ لیتا۔ مگر آج اس انداز پر اس کا دل بھرا آیا۔

یوں بھی آج سماعت پر صرف ایک آواز کی دستک ہو رہی تھی۔ ”آپ کا نام؟“

”مجھے نیند آرہی ہے میں سونا چاہتی ہوں۔“ اس نے سرد مہر انداز میں جواب دیا۔

”لیکن میں آپ سے باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ دن میں آپ کے پاس سونے کے لیے بہت وقت ہے۔“ ان کا انداز قطعی

نہ۔ ”کیا یہ زیادتی نہیں؟“ اس کے لہجے سے آئینے آنے لگی۔

”زیادتی تو آپ کر رہی ہیں میرے ساتھ۔“ انہوں نے ہاتھ بڑھا کر ٹیبل لیپ آف کر دیا۔

ماہین کا جی چاہ رہا تھا ان سے دور بہت دور بھاگ جائے۔ وہ اسے بہت غیر بہت اجنبی سے محسوس ہونے لگے تھے۔ یک عجیب سی وحشت نے اسے گھیر لیا۔

وہ دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر ہچکیوں سے رونے لگی۔

یاور علی خان نے پہلے ٹیبل لیپ آن کی پھر کمرے میں تیز روشنی کر دی۔ وہ خاصے پریشان دکھائی دیے تھے کہ ماہین کے رانے کا انداز بہت غیر معمولی تھا۔ جس کا غیر معمولی پن وہ اپنی تمام حیات سے محسوس کر رہے تھے۔

”ماہین!“ وہ اسے شانوں سے تھام کر بیڈ تک لائے۔

”کیا ہوا ہے؟ مجھے نہیں بتائیں گی تو پھر کسے بتائیں گی؟“ وہ اس کا سراپے شانے سے لگائے بہت نرمی سے مخاطب تھے۔

”کچھ نہیں۔ بس ویسے ہی نعمان بھائی بہت یاد آ رہے ہیں“ اس نے خود پر بمشکل کنٹرول پا کر جواب دیا۔

”والس اے جاب۔ یہ بھی کوئی بات ہے۔ اگر وہ کراچی آچکے ہیں تو آپ چلی جائیے گا کچھ دن ان کے پاس رہ آئیں اٹا کو بھی اپنے ساتھ لے جائیے گا۔ یہ بھی کوئی مسئلہ ہے۔ ڈونٹ بی سلی۔

اچھا یہ بتائیں۔ حویلی میں نعمان کو یاد کر کے کتنی مرتبہ روئیں۔“ وہ نیچے کے نیچے سے رومال نکال کر اس کے آنسو صاف کرنے لگے۔

”کاش اس شخص کے اور میرے درمیان وہ سب کچھ نہ ہوا ہوتا جو ہو چکا ہے تو یہ آنسو پونچھنے والے ہاتھ کتنے نورانی۔ کتنے ماورائی لگتے۔ جن کو عقیدت سے بوسہ دینے کے لیے انسان کتنے نقصان کے سودے منظور کر لیتا ہے۔ وہ نقصان جو

اسے اور ہاتھوں کے درمیان پھیلے راستے میں کہیں بھی کسی بھی موڑ پر پیش آ سکتے ہیں۔ محبت کا وہ عظیم ادراک جو ایسے لمحے کا مکمل ہوتا ہے جسے پا کر جان سے گزر جانے کو جی چاہے اس لا جواب اور کامل حسن کے بعد کسی بد صورت وقت کا سامنا نہ

ہو جائے۔ ایسے ادراک کے بعد اندر کا ہر تقاضا کھوکھلا اور بے معنی ہو جاتا ہے۔ عظیم الشان محبت کا ادراک عظیم الشان احساس مکمل ہے۔ پھر اس کے بعد رہ ہی کیا جاتا ہے؟

”میں سونا چاہتی ہوں پلیز یاور صاحب!“ اس نے التجا کے انداز میں کہا۔

”اوکے۔“ یاور علی خان کو اس کی بتائی ہوئی رونے کی وجہ پر اعتبار نہیں آیا تھا۔ انہیں محسوس ہو رہا تھا کہ بات کچھ اور ہے۔ نکتے پران کا ذہن ماؤف ہو رہا تھا۔ انہوں نے رومال رکھ دیا اور اٹھ کر لائیں آف کرنے لگے۔

بابا صاحب نے باری کو بلایا تھا۔ ان کا رات گئے بلانا کوئی معنی رکھتا تھا۔ وہ سوچوں میں الجھا ہوا ان کی خواب گاہ پر آیا تھا اور بہت آہستگی سے دستک دی تھی۔

”ہوں۔ آ جاؤ۔“ بابا صاحب کی آواز آئی۔

وہ اندر داخل ہو گیا۔

”جی خان۔ آپ نے یاد کیا۔“

”ہاں بھئی۔ ہم نے ہی یاد کیا۔ آؤ بیٹھو۔“ وہ نیم دراز لیٹے ہوئے حقہ کڑکڑا رہے تھے۔ باری ان کے بیڈ کے قریب پڑی کرسی پر بیٹھ گیا۔

”آج شام یاد رکھو آ یا تھا۔“ وہ یہ کہہ کر رک گئے جیسے کچھ سوچ رہے ہوں۔ باری ان کی بات آگے بڑھنے کا انتظار کرنے لگا۔

”وہ کہہ رہے ہیں کہ روشی کی شادی اگلے مہینے کی کسی تاریخ کو ٹھہرا دیں۔ مگر ایک الجھن جو ہمیں پریشان کر رہی ہے وہ یہ ہے کہ تیمور ہمیں دو تین مرتبہ کہہ چکے ہیں کہ لب روشی کی شادی میں جلدی نہ کریں۔ ہم نے وجہ پوچھی تو کہنے لگے۔ کچھ دن بعد بتائیں گے ہماری پریشانی کی وجہ یہ ہے کہ تیمور اس معاملے میں اتنی دلچسپی کیوں لے رہے ہیں اور وہ کیا وجہ ہے جو انہیں معلوم ہے اور کسی کو معلوم نہیں یا ورعلی خان روشی کے باپ ہیں۔ اہمیت انکی بات کی ہے۔ ہم ان کی بات کیسے نظر انداز کر سکتے ہیں۔ ہمارا ذہن تو سوچ سوچ کر تھک چکا ہے۔ تم ہی بتاؤ ہمیں کیا کرنا چاہیے؟“

وہ بڑے بے بس سے انداز میں پوچھ رہے تھے۔

”آپ کا کا جان سے کہہ دیں کہ یا ورعلی خاناں کا یہ ارادہ ہے اس لیے جو وجہ ہے، وہ دیر کیے بغیر بتا دیں۔“

باری نے قدرے جھجکتے ہوئے نظریں اٹھائے بغیر جواب دیا۔

”ہوں۔ یہ درست ہے لیکن فرض کرو اگر تیمور نے ایسی وجہ بتائی جس سے شادی میں مزید تاخیر ہو سکتی ہے۔ تو یاد رکھو اس طرح سمجھایا جائے گا؟“

”یہ تو وجہ ظاہر ہونے کے بعد خود بخود واضح ہو جائے گا کہ اب کیا کرنا ہے؟“ باری نے بڑی حاضر دماغی کا مظاہرہ کیا۔

”ہم سوچ رہے ہیں۔ وجہ کیا ہو سکتی ہے کہیں نازنین۔ آخر وہ بھی تو اس کی ماں ہے“ بابا صاحب نے اتنی آہستہ آواز

میں کہا گویا دیواروں سے بھی احتیاط کر رہے ہوں۔

باری خاموش رہا۔ اس کے اور دلاورعلی خان کے مابین آج تک نازنین کے موضوع پر کبھی براہ راست بات چیت نہیں ہوئی تھی۔

جب کبھی سرائے جاتے تھے تو اس کے ساتھ جاتے تھے کہ باری کل صبح سرائے جاتا ہے بہت دن ہو گئے ہیں ناز سے

ملے ہوئے۔ تیمور تو خود ہی آ جاتے ہیں ہم سے ملنے کے لیے۔ کیسی اذیت ناک زندگی کا انتخاب کیا ہے ناز نے اپنے لیے۔“

وہ خاموشی سے سنتا رہتا تھا۔

”باری! کتنا بھاری پتھر رکھا ہے اپنے دل پر ناز نے۔ روشی سرائے گئی۔ کئی دن رہی اور وہ پھر بھی سامنے نہ آئی۔ جب یہ

دیکھیں اندر سے بری طرح کاٹنے لگتا ہے تو ہمارا دل چاہتا ہے کہ ایسی نیند سوئیں کہ پھر کبھی صبح نہ دیکھیں۔“ بابا صاحب کی آواز دکھ سے بوجھل تھی۔

ایسے زور آور بابا اختیار شخص کی حالت بے بسی پر باری نے بھی بہت تاسف کیا۔ دل ہی دل میں اسے واقعی ترس آنے لگا

مگر مسئلہ یہ ہو گیا تھا کہ وہ اب ان کی دلجوئی کے لیے مناسب الفاظ استعمال کرتے ہوئے بھی ڈر رہا تھا کہ آنے والے

دلوں میں اس کے اپنے الفاظ اس کے لیے طعن بن سکتے تھے۔ وہ مجرموں کی طرح سر جھکائے ہوئے بس بیٹھا سنتا رہا۔

”باری۔ بیٹے! ہم کیا کریں۔ بتاؤ۔ ہماری کوئی تدبیر دونوں بھائیوں کے دلوں کے فاصلے کم نہیں کر سکتی۔ ہمیں حیرت

ہے اتنے بڑے دکھوں کے درمیان ہم ابھی تک زندہ کیسے ہیں۔“

”آپ اتنا مت سوچیں۔ میں فون کر دیتا ہوں۔ کا کا جان کو بلوا لیتا ہوں۔“ وہ آپ سے بات کریں گے۔ تو ضرور کوئی نہ

کوئی حل نکل آئے گا۔“ باری نے تسلی دی۔

”صرف ایک پریشانی تو نہیں ہمیں۔ ہو سکتا ہے ہمارا وہم ہو۔ مگر ہمیں یوں محسوس ہوتا ہے کہ تیمور بھی علیم الدین کے ہاں

روشی کے رشتے پر رضامند نہیں ہے۔ اور اس کے رضامند نہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ناز رضامند نہیں ہے ہمارے اختیارات

ابھی ہمارے پاس ہیں۔ ہم اپنی بات دونوں سے منوا سکتے ہیں۔ کل ہی روشی کو رخصت کر سکتے ہیں۔ لیکن بحیثیت باپ یہ

احساس ہمیں بے اختیار کر دیتا ہے کہ کہیں ہمارے بچوں کے دکھوں میں مزید اضافہ نہ ہو جائے۔ اور وہ ہم سے اتنی نفرت

کرنے لگیں کہ ہماری موت کے بعد ہمیں ایصالِ ثواب پہنچانے کے لیے ہاتھ اٹھانا بھی گوارا نہ کریں۔“

ہم تیمور کے سامنے بہت کمزور پڑ جاتے ہیں باری۔ جو زبردستی ایک بار اپنی خود غرضی کے سبب اس کے ساتھ کر چکے

ہیں۔ وہ خود غرضی ہمیں اندر سے دیمک کی طرح آج بھی چاٹ رہی ہے۔ اس نے نکاح کے بعد سے آج تک ایک حرف

شکایت کوئی گلہ۔ ہم سے نہیں کیا۔ نہ اپنے کسی دکھ کا اظہار کیا۔ وہ عائشہ کے پاس لندن چلا گیا تھا تو ہم نے کچھ سکون محسوس کیا

تھا۔ مگر وہ عورت بہت بے وقوف نکلی۔ سچے موتی جیسا ہمارا بیٹا۔ قدر نہیں پہچانی اس نے۔ خود بھی دکھوں کے سودے کر لیے

اٹلے بیٹے کو بھی دکھی کیا۔

باری! یہ بھی گمان آتا ہے وہ روشی کے معاملے میں مداخلت کر کے کہیں یاد رکھو اذیت دینا تو نہیں چاہتا انسان ہی تو

ہے۔“

”نہیں خان۔ وہ ایسا ہرگز نہیں کر سکتے۔ وہ بھی روشی بی بی کے ساتھ جوان کی نگاہ میں قطعی بے قصور ہیں۔“ باری نے بے

ساختہ کہا تھا۔

”ہاں خیر دل تو ہمارا بھی یہی کہتا ہے۔“ دلاورعلی خان نے تائید کی۔

”ہماری تو نیند ہی اڑ گئی ہے۔“ وہ اتنا کہہ کر حقہ گڑ گڑانے لگے۔

”صبح آپ کا جان کو بلوائیں۔ بے فکر ہو جائیں۔ وہ ضرور آپ کا خیال کریں گے۔“ باری تسلی دیتے ہوئے ایک انجانے احساس جرم سے چور چور تھا۔

”ہاں کچھ تو کرنا ہی پڑے گا۔ کاش یہ شادی پہلے ہو جاتی اور یہ نیا مسئلہ پیدا نہ ہوتا۔“ وہ تاسف سے گویا ہوئے۔

باری اٹھ کھڑا ہوا۔

”مسکوں کو ختم کرنے لئے بڑے بڑے فیصلے کیے مگر مسئلے اپنی جگہ موجود ہیں۔“ وہ خود کلامی کے انداز میں بڑبڑا رہے تھے۔

”ہم اس لیے منع کر رہے ہیں اس رشتے سے کہ روشی اس رشتے پر راضی نہیں ہے۔“ تیمور علی خان ظہر سے پہلے حویلی پہنچ چکے تھے اور اب باپ بیٹا بند کمرے میں بات چیت کر رہے تھے۔

”اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ہمارے ہاں ان معاملات میں لڑکیوں کو اتنی اہمیت نہیں دی جاتی۔ یہ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔“ بابا صاحب نے ان کا موقوف یکدم مسترد کر دیا۔

”مسئلہ ہے بابا صاحب! نازنین نے صاف کہہ دیا ہے کہ اپنی بیٹی کے ساتھ ڈھور ڈھگرو والا سلوک وہ برداشت نہیں کریں گی۔ روشی عاقل و بالغ ہے۔ وہ جو قدم اٹھائے گی وہ بحیثیت گارجین اسکو سپورٹ کریں گی۔“ تیمور علی خان نے دبے لفظوں میں بتایا۔

”نہ وہ بے وقوف لڑکی عاقل ہے اور نہ ناز اس کی گارجین۔“ بابا صاحب نے پیشانی پر لہلہا ہوا ہاتھ ڈال کر جواب دیا۔

اسے یاد دلایا ہوتا کہ وہ خود کو بچوں کے لیے مار چکی ہے۔ جب وہ ہے ہی نہیں تو یہ مداخلت کیا معنی؟“ وہ ناراضگی سے مزید گویا ہوئے۔

”لیکن یہ بھی تفکیک ہے کہ وہ زندہ ہیں۔ اور اپنے بچوں کے ساتھ زیادتی پر رد عمل کر سکتی ہیں۔“

”یہ زیادتی ہے؟ اچھے گھر میں شادی کر رہے ہیں ہم اس کی بیٹی کی۔ اکلوتا لڑکا ہے وہ۔ سب کچھ اسی کا ہے۔ صورت شکل، تعلیم سب ہی کچھ تو ہے“ وہ ہنوز ناراض لہجے میں بات کر رہے تھے اور قطعی پن تھا۔

”مگر اس طرح کی جنونی اور نا سمجھ لڑکی کی زبردستی شادی سے دو خاندان بہت مسائل کا شکار بھی ہو سکتے ہیں۔“ تیمور علی خان نے سمجھانے کی کوشش کی۔

”کیا ہو گیا ہے تمہیں۔ یہ سب شادی سے پہلے کی باتیں ہیں۔ شادی کے بعد لڑکی مصلحتی اپنے اندر بہت سی تبدیلیاں پیدا کر لیتی ہے۔“

”یہ لڑکی ایسی نہیں ہے۔“ تیمور علی خان نے باپ کی بات کاٹ دی۔ ان کے انداز میں بڑی مضبوطی اور قطعی پن تھا۔

”یہ محض تمہارے اندیشے ہیں۔“ دلاور علی خان اپنی بات پر اسی طرح قائم تھے۔

”یہ اندیشے نہیں ہیں بابا صاحب! آپ جانتے ہیں ہم نے جو اداور وروشانے کے معاملات میں زندگی میں کبھی مداخلت نہیں کی اور نہ ان کے قریب آنے کی کوشش کی۔ حالانکہ وہ ہمارا خون ہیں۔ مگر جب بھائی۔ خیر چھوڑیے اس بات کو۔ اصل بات یہ ہے کہ روشی نے سرائے ہمارے پاس ہماری مدد حاصل کرنے کی آئی تھی۔ جس پر ہمیں آج بھی حیرت ہے کہ اس نے ہم سے اتنی زیادہ پوزیٹو امیدیں کیسے وابستہ کر لیں؟ اس کے ذہن میں یہ کیسے آیا کہ ہم اس کے لیے کچھ کر سکتے ہیں۔“ تیمور علی خان جیسے سوچ سوچ کر بول رہے تھے۔

”کس قسم کی مدد لینے گئی تھی وہ تمہارے پاس؟“ بابا صاحب کا لہجہ ایک دم تبدیل ہو گیا۔ بڑی تشویش سی تھی۔ ان کے

انداز میں۔

”یہی کہ ہم آپ سے کہہ کر نعیم سے اس کا رشتہ ختم کر ادیں۔“ تیمور علی خان نے یہ جملہ بہت مشکل سے کہا تھا۔

”تم سے براہ راست کہا تھا اس نے؟“ دلاور علی خان حیرت سے ساکت ہو گئے۔

تیمور علی خان گہری سانس لی۔ اور بہت آہستہ سے کہا۔ جی۔

کمرے میں یکدم صحرائی سکوت طاری ہو گیا۔ دونوں باپ بیٹے خاموشی کا توڑ تلاش کرنے لگے۔

”اور تم کل کی لڑکی کی بات ہم سے منوانے لگے۔ کیا فرض بننا تھا تمہارا؟ کہ اس کو سمجھاتے۔ تابع واری کے اندر نکھاتے۔ بڑوں کے فیصلوں پر اعتماد کا درس دیتے۔ الٹا ہمیں قائل کرنے کے چکر میں پڑ گئے۔“ بلا کی ناراضگی تھی دلاور علی خان کے لہجے میں۔

”بابا صاحب! بہت کچھ ہونے کے باوجود ایک بہت بڑی کمی ہے ہماری زندگی میں۔ اور یہ کمی ہم سے کہیں اور برداشت نہیں ہوگی اور وہ بھی اپنے بچوں کی زندگی میں۔“

آپ نے اور بھائی میاں نے ہمیں یقین دلایا تھا کہ ظفری کے شادی کے بعد ٹھیک ہونے کے ناکئی نائن پرسنٹ چانسز ہیں۔ میڈیکل کے مطابق اسے کوئی فزیکل پر اہلیہ نہیں ہے۔ ہم نے بھتیجے کے لیے خود غرضی کا مظاہرہ کیا۔ اور آپ کی بات ان لالہ۔ جموہر آپ کے حوالے کر دی کہ اس کا باپ دس ہزار روپے میں ساٹھ سال کے بوڑھے سے اس کا نکاح کر رہا تھا۔ ہم نے سوچا کہ تھوڑے دنوں کی تکلیف کے بعد نسبتاً اسے بہتر اور یگ پارٹنر تو مل جائے گا۔ تھوڑا سا ڈس۔ اہل سہی، اس بوڑھے سے تو بھر بھی بہتر ہے۔ مگر جموہر ایڈجسٹ نہیں ہو سکتی۔ ہم تھوڑا سا گھٹی فیل کر رہے تھے۔ بہت تھوڑا سا۔

مگر روشی نے تو ایک رات میں اکیس سال پہلے کے تیمور علی خان کو زندہ کر دیا۔ وہ بے حسی جو ہم نے اپنے آپ سے انتقام لینے کے لیے اوڑھ لی تھی۔ اس لڑکی نے نوج ڈالی ہے۔

ہماری ذات اس لڑکی کی بہت سی محرومیوں کی ذمہ دار ہے۔ ہماری اولاد ہے۔ ہمارے وجود کا حصہ ہے۔ ہمارے بخشے ہوئے نقصانات نے کبھی اسے کھل کے خوش نہیں ہونے دیا۔ اس کے والد محترم اسے بڑے استحقاق کے ساتھ لائے تھے مگر کیا ہم نے ان کو کتنا قرب حاصل رہا۔ آپ ہمارے باپ ہیں ہم بھی آپ کی غلطیوں کی نشان دہی نہیں کریں گے۔ خود اپنے آپ کو تو نعن طعن کر سکتے ہیں۔ اپنے گناہوں کا اعتراف تو کر سکتے ہیں۔ تاہم تو ہو سکتے ہیں؟ مدد ادا کرنے کو

کوشش تو کر سکتے ہیں؟

تیمور علی خان کے لہجے سے تپش آرہی تھی۔ دکھوں کا ایک الاؤ تھا جس میں کراہیں سوکھی لکڑیوں کی طرح چر رہی تھیں۔ دلاور علی خان تو جیسے سانس لینا ہی بھول گئے تھے۔

”ہم اپنے ہاتھوں اسے مزید دکھ نہیں دے سکتے۔ آپ ہمیں معاف کر دیں۔“ وہ اتنا کہہ کر پھر خاموش ہو گئے۔ دونوں کے درمیان ایک بے معنی خاموشی چھا گئی۔

”تم خیر خواہ کی حیثیت سے اسے اچھا برا سمجھا تو سکتے ہو تیمور۔“ دلاور علی خان نے چند منٹوں پر محیط خاموشی بالآخر توڑ ڈالی۔

”ہم نے چونکہ اس کی بات سمجھ لی ہے۔ اس لیے یہ کافی ہے۔ یہی ہونا چاہیے تھا۔ یا تو وہ ہماری بات سمجھ لیتی یا ہم اس کی بات سمجھ لیتے۔“

”یعنی تمہارا مطلب یہ ہے کہ علیم الدین کو جواب دے دیا جائے؟ مگر کیا تم ہمیں یہ بتانا پسند کرو گے کہ اس نے ہمیں کیا بات سمجھائی ہے؟“ بابا صاحب نے سوال کیا۔

”ہم آپ کے احسان مند ہوں گے۔ آپ پہلی فرصت میں یہ رشتہ ختم کر دیجیے۔ آپ کے مکمل سوال کا یہی مکمل جواب ہے۔“

”اب یہ اتنا آسان نہیں ہے تیمور۔ یاد فوراً اسے جو شتر اس کی شادی چاہ رہے ہیں۔“ دلاور علی خان۔ بہت الجھ گئے تھے۔

”آپ رشتہ ختم کر دیں گے تو وہ کیا کر سکیں گے۔ رشتہ طے بھی تو آپ ہی نے کیا تھا۔“ تیمور علی خان تو فیصلہ کن حالات میں تھے اس لئے ان کا ہر جواب دو ٹوک اور بے دھڑک تھا ہر قسم کی مصلحت سے عاری۔

”کیا بدلہ لے رہے ہو بیٹے ہم سے؟“ دلاور علی خان نے جیسے شکست مان لی۔

”اتنے بڑے گمان کر کے ہمیں اپنی ہی نظروں میں نہ گرائیں بابا صاحب بس اتنا چاہتے ہیں کہ دکھوں کا سلسلہ کہیں رک جائے۔“ تیمور علی خان کا لہجہ بھی شکستہ تھا۔

”بہت مسئلہ ہو جائے گا تیمور۔ سمجھنے کی کوشش کرو۔“ بابا صاحب گویا ہوئے۔ اگر اس مسئلے کا نتیجہ کسی حقیقی خوشی کی صورت میں نکلتا ہے تو بابا صاحب مسئلہ ہو جانے دیں۔“ وہ اپنے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے قطعی انداز میں کہہ رہے تھے۔

دلاور علی خان نے آنکھیں موند لیں۔ ان کی ممکن آلود پیشانی سے ظاہر تھا وہ کسی گہری سوچ میں ہیں۔

”ہم ذرا بی بی جان سے مل لیں۔ وہ کئی دنوں سے ہمیں بلارہی تھیں۔“ تیمور علی خان اٹھتے ہوئے گویا ہوئے۔

”ہوں۔!“ دلاور علی خان نے غائب دماغی کی کیفیت میں ہنکارا بھرا۔ تیمور علی خان کمرے سے باہر آ گئے۔ حویلی کی راہداریوں میں سناٹا تھا۔ دوپہر کا وقت تھا، سب اپنے اپنے کمروں میں بند ہو چکے تھے۔ ملازمین بھی اس وقت

بچتے تھے۔

تیمور علی خان کے چرمی جوتوں کی چرچاہٹ اس خاموشی میں بہت واضح تھی۔ باری کے کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔

”اس چرچاہٹ ہی سے اندازہ لگا لیا تھا کہ تیمور علی خان کا رخ اس کے کمرے کی طرف ہے وہ مستعد اور چوکس سا ہو گیا۔“ اور چند لمحوں بعد۔ تیمور علی خان واقعی دروازے میں تھے۔

”ابھی کچھ پروسیڈ نہیں ہوا پارٹنر۔ اپنا رویہ حسب معمول رکھو۔“

ڈارک براؤن پینٹ اور بکسٹی کلر کی شرٹ میں ملبوس تیمور علی خان کا انداز بہت پرسکون تھا۔ باری نے ان کے چہرے کی

نہیں دیکھا تھا اس کی نظریں ان کے ڈارک براؤن چمکتے ہوئے جوتوں پر جمی تھیں مگر اس نے محض ان کے لہجے سے محسوس کیا کہ کوئی۔“ گڑبڑ نہیں۔

”ہم بی بی جان کے کمرے میں ہیں۔ کوئی بات ہو تو کہہ سکتے ہو۔“ وہ پلٹ گئے۔

”جب کچھ پروسیڈ“ ہی نہیں ہوا تو بات کیا کریں خان۔“ وہ دھیرے سے مسکرا دیا۔ دل ہی دل میں کہہ کر۔ اور اپنے

کمرے کا دروازہ بند کر لیا۔

”یہ کیا کہہ رہے ہیں بابا صاحب آپ۔؟“ تیمور علی خان تو جیسے سناٹے میں رہ گئے۔ مابین اپنے سر میں مساج کر رہی

نہ اس کے گردش کرتے ہاتھ رک گئے۔

”مگر کیوں؟ کل تک تو اس لڑکے میں دنیا جہان کی خوبیاں تھیں؟ انہیں واقعی بڑا شاک پہنچا تھا۔ بابا صاحب سے یہ سن

رک وہ علیم الدین کو جواب دے چکے ہیں۔

”میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا کل تک تو سب ٹھیک تھا آٹا فانا سب غلط کیسے ہو گیا۔“ وہ اپنی جھلاہٹ پر بمشکل قابو پار ہے

”ٹھیک ہے۔ آ جاؤں گا ویک اینڈ پر۔ جی۔ سب خیریت ہے“ انہں نے بے دلی سے خدا حافظ کہہ کر ریسیور رکھ دیا۔

”کیا ہو گیا؟“ مابین اٹھ کر قریب چلی آئی۔

”علیم الدین کو جواب دے دیا ہے۔ وجہ بھی نہیں بتائی۔ حویلی بلایا۔ کیا زندگی ہے۔ مسئلہ در مسئلہ۔“ انہوں نے فائل

میں سے اٹھا کر ادھر چٹائی۔

”کوئی تو وجہ ہوگی۔ جائیں گے تو پتا چل جائے گا۔ غصہ کرنے سے کیا ہوتا ہے۔“

مابین تو جیسے اپنی خوشی چھپا نہیں پارہی تھی۔ دل چاہ رہا تھا ایک لمحے کی تاخیر کیے بغیر روشنی کو یہ خوش خبری سنا دے۔

”بس۔ ادھر ہی ہوتی ہے ہر وجہ۔ واٹس اے لائف،

بس اب کوئی شادی وادی نہیں ہوگی اس کی۔ پاسپورٹ بنو رہا ہوں۔ اس کا جواد کے ساتھ اسے بھی بھیج دوں گا اسٹور کے لیے۔ آپ کہہ دیں اس سے کہ وہ ماسند میک اپ کر لے۔ گوہیل۔ شادی۔ وہ بری طرح جھلار ہے تھ۔ مایہن تیل کی بوتل بند کر کے تیزی سے کمرے سے باہر نکل گئی۔ مزید تاخیر اس کی برداشت سے باہر تھی۔ اس نے دروازے پر دباؤ ڈالا تو وہ کھل گیا۔ روشی ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑی بالوں میں برش کر رہی تھی۔ مایہن دیکھ رک دھیرے سے مسکرا دی۔

”آئیں خالہ! پاپا نے ہمارے پاس آنے کی اجازت دے دی؟“
 ”اچھا بند کرو یہ طعنے بازی۔ ایک اچھی خبر لے کر آئے ہیں۔ موڈ خراب نہیں کرو۔“
 ”اچھی خبر۔ ادھر بھی ایسا ہونے لگا ہے؟“ وہ استہزائیہ انداز میں مسکرائی۔
 ”بابا صاحب کا فون آیا تھا ابھی تمہارے پاپا کے پاس۔“

روشی کے کان کھڑے ہو گئے مگر بظاہر بے تاثر چہرہ لیے کھڑی رہی۔
 ”بھئی۔ سمجھ میں نہیں آ رہا مبارک باد دیں یا افسوس کریں۔ مایہن اس کے بستر پر گرنے کے انداز میں بیٹھ گئی۔ روشی ہنوز خاموش رہی۔“

”تمہارے پاپا تو بہت غم ناک بیٹھے ہوئے ہیں۔“ وہ مزید گویا ہوئی۔
 ”کیوں سنسنس کری ایٹ کر رہی ہیں۔؟ روشی مزید ضبط نہ کر سکی۔“

”علیم الدین صاحب کی امیدوں پر پانی پھر گیا ہے ڈی سی صاحب ان کے سمدھی بنتے بنتے رہ گئے۔ افسوس۔“ مایہن نے مسکرا کر افسوس کا اظہار کیا۔

روشی نے حیرت آمیز خوشی سے مایہن کی سمت دیکھا۔ ”کیا سچ خالہ۔؟“

”بالکل سچ۔ کیسی لڑکی ہو تم۔ مگنی ٹوٹنے پر خوش ہو رہی ہو؟“ مایہن نے گویا ملامت کی۔

”اگر یہی وہ خبر ہے جو آپ سنا لے آئی ہیں۔ تو آپ کے منہ میں کھی شکر۔ مگر یہ بتائیں بات ختم ہو گئی ہے۔ یا خاتمے کی طرف بڑھ رہی ہے۔ اگر بڑھ رہی ہے تو یہ خبر کچھ اچھی نہیں ہے۔ کیونکہ پھر کوئی گڑبڑ ہو سکتی ہے۔“ روشی نے مایہن کے قریب آ بیٹھی۔

”ہر خوشی کا اختتام کسی دکھ پر ہوتا رہا تو خوشی پر۔ سے اعتبار اسی طرح اٹھ جاتا ہے۔ ابھی یہ تو علم نہیں کہ بابا صاحب نے اچانک اس طرح کا فیصلہ کس وجہ سے کیا۔ مگر کیونکہ فیصلہ ان کا ہے اس لیے یہ بات بہت اہم ہے۔“ مایہن نے پیار سے روشی کے بال سینے۔

”خدا کرے ایسا ہی ہو۔“ روشی نے سوچتے ہوئے کہا۔

اب بس اس بات کا تجسس ہے کہ بات کیا ہوئی ہے۔ یہ فیصلہ کیوں کیا گیا؟“ مایہن کے لہجے میں گہری سوچ کا تاثر

تھا۔

اور روشی کے ذہن میں جیسے ایک جھماکا ہوا۔ تیمور علی خان اس کے تصور کے پردے پر مسکرانے لگے۔ اس نے طمانیت کی گہری سانس لی۔

”اور کوئی بات نہیں کی کا کا جان نے۔؟“ اس نے بے دھیانی میں سوال کیا۔

”کا کا جان نے؟“ مایہن نے حیرت سے پوچھا۔ ”کا کا جان کا کیا ذکر۔“ وہ بڑی تشویش بھری نظروں سے روشی کو دیکھنے لگی۔

”آں۔ ہاں۔ وہ میرا مطلب ہے بابا صاحب نے۔“ روشی ایک دم ٹپٹا گئی۔

”تمہارے ذہن میں اچانک کا کا جان کا خیال کیسے آیا؟“ مایہن نے کھوجتی نظریں اس کے چہرے پر جمادیں۔

”پتا نہیں۔ یونہی منہ سے نکل گیا۔“ روشی نے جھل سے انداز میں بات بنانے کو کوشش کی۔

”وہ ہر شخص کے خیال میں آسانی سے آ سکتے ہیں۔ مگر تمہارے والد صاحب جواد اور تمہارے خیال میں بلا وجہ نہیں آ سکتے۔“ مایہن درحقیقت کسی دوسو سے میں مبتلا ہو چکی تھی۔

دونوں چند لمحوں کے لیے اپنی اپنی جگہ خاموش ہو کر بیٹھ رہیں مگر کسی اہم بات کے دوران اچانک آنے والی خاموشی بہت محسوس ہوا کرتی ہے۔ دونوں سوچنے لگیں کہ اب کیا بات ہو۔

”روشی۔!“ مایہن از حد سنجیدہ ہو رہی تھی۔

”ایک بات پوچھنا ہے تم سے۔ وعدہ کرو جھوٹ نہیں بولو گی۔“ مایہن نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر بڑی نرمی سے پوچھا۔

”آپ پوچھیے۔ اور میں آپ سے کیوں جھوٹ بولوں گی؟“ اس نے نظریں جھکا کر جواب دیا۔

”تم سرائے گئی تھیں؟۔ وہاں کئی دن ٹھہری بھی تھیں۔ وہاں کس کس سے ملیں؟“

مایہن سوال تو کر رہی تھی مگر جیسے جواب اسے پتا تھا۔ اگر روشی نازنین سے ملی ہوتی تو ماحول میں زبردست تبدیلی آ چکی ہوتی۔ اگر اس سے چپ رہنے کے وعدے بھی لے لیے جاتے تو اس کا چہرہ بہت کچھ بتا رہا ہوتا۔

کم از کم اس کے سامنے ضرور کھل جاتی۔ کسی نہ کسی زاویے سے پھر بھی جانے کیوں اس نے پوچھ لیا تھا۔

”کسی سے نہیں، وہاں تھا کون۔ کا کا جان کی بیٹی تھی صوفشاں اور وہ جو کا کا جان کی وائف ہیں انہیں تو ہم نے کبھی دیکھا ہی نہیں۔ گلو آ پاتا رہی تھیں کہ جب ہم بہت چھوٹے تھے تو وہ ایک مرتبہ حویلی آئی تھیں۔ اماں جی کیونکہ کا کا جان کی شادی پر

خوش نہیں تھیں، اس لیے شاید وہ دوبارہ پھر کبھی حویلی نہیں آئیں۔ گلو آ پانے بتایا تھا۔ کہ ان کا نام لیزا تھا۔ مگر کا کا جان نے ان کا اسلامی نام عائشہ رکھا تھا۔ شاید۔ اماں جی کا بی بیوئیر انہوں نے پسند نہیں کیا ہوگا۔ ماسٹڈ کیا ہوگا اسی لیے دوبارہ کبھی نہیں

آئیں۔ بلکہ وہ تو لگتا ہے حویلی کے سب ہی لوگوں سے ناراض ہیں کیونکہ میں جتنے دن بھی سرائے میں رہی وہ مجھ سے نہیں ملیں۔“

روشی نے بڑی تفصیل اور سادگی سے جواب دیا۔

ماہین گویا سانس روکے اس کی بات سن رہی تھی۔ روشی خاموش ہوئی تو اس نے گہرا سانس سینے سے آزاد کیا۔
”تو کیا وہ اتنے دن کمر بند کر کے بیٹھی رہیں؟“ اس نے تعجب سے پوچھا۔

”ہاں نہیں۔ البتہ مجھے حویلی کے اندر جانے کی اجازت نہیں تھی۔ میں گیسٹ روم میں تھی یا پھر باغ میں چلی جاتی تھی۔ صوفشاں سے میری ملاقات باغ ہی میں ہوئی تھی۔ بڑی کیوٹ بنی ہے۔ کا کا جان کی۔ ان کے بیٹے ٹیپو کو تو ہم نے دیکھا ہوا ہے۔ بہت چھوٹا تھا۔ ایک مرتبہ جب بابا صاحب اسے حویلی میں لائے تھے۔ انگریزی میں بات کرتا تھا، اور ان دنوں ہمیں گزارے لائق انگریزی سمجھی نہیں آتی تھی۔“
روشی اپنی بات کے اختتام پر ہنس پڑی۔

”بہت انجوائے کیا تھا ہم نے۔ بڑا مزہ آیا تھا۔ چھوٹی بی بی جان (ترنین) سے ٹراسلیں کراتے تھے۔“
وہ بھی ہنس پڑی۔

”تم نے کوشش بھی نہیں کی ان کی وائف کو دیکھنے کی۔؟“

ماہین کے چہرے پر اس کی ہنسی کے جواب میں مسکراہٹ بھی نہ آئی۔

”میں اتنی پزل تھی کہ بس کچھ سوچتا ہی نہیں تھا۔ اور پھر آرڈر کا کا جان کا تھا اور میں ان کی ناراضگی کا خطرہ مول نہیں لے سکتی تھی۔“ وہ بڑی روانی سے جواب دے رہی تھی۔

”ہوں۔ ملازموں سے بھی تم نے ان کی وائف کے متعلق بات چیت نہیں کی۔؟“

”ملازم۔؟“ روشی ہنس پڑی۔ ”جتنے پر اسرار کا کا جان نظر آتے ہیں، ان کے ملازم ان سے زیادہ پر اسرار لگتے ہیں۔ روبوٹ جیسے۔ جذبات سے عاری ایک دم بلیٹک۔“ وہ اب بات بات پر ہنس رہی تھی۔

”اچھا صوفشاں سے تمہاری کیا باتیں ہوئیں؟“ ماہین کسی دھیان سے چونک کر پوچھنے لگی۔

”ار۔ خالہ کیا یاد دلایا۔ کیا زبردست بچی ہے۔ اتنی پیاری باتیں کرتی ہے کہ دل چاہتا ہے اس سے باتیں کیے جائیں۔

اس پر اس کے ڈر۔ سز۔ غضب کی میچنگ۔ کیا باذوق خاتون ہیں کا کا جان کی وائف۔ سچ اب تو آپ دیکھئے گا۔ میں کا کا جان سے ضد کروں گی کہ وہ مجھے ان سے ضرور ملوائیں۔ کیا زبردست پہل ہے ہمارے خاندان کا۔“

”آہستہ بولو۔ مت کرو کا کا جان، کا کا جان۔ تمہیں پتا نہیں تمہارے پاپا ان کا نام سن کر کتنے اری ٹیٹ ہو جاتے ہیں۔“
ماہین نے اسے ٹوک دیا اور اسے واقعی بیک لگ گئے تھے۔

”واٹس اے مسک۔ ہم نے بہت اہم بات مس کی ہوئی ہے۔ اور وہ کیا بات ہے کوئی نہیں بتاتا۔ بابا صاحب جیسی اتھارٹی بھی دونوں بھائیوں کا پرابلم سولوشن کر سکتی۔ ہاؤ اسٹریج۔ کیوں خالہ؟“

”اچھا۔ تمہیں اتنا انوالو ہونے کی ضرورت نہیں۔“ ماہین نے اسے جیسے ڈانٹ دیا۔

”افوہ۔ واقعی می بن گئی ہیں۔ ڈانٹنے بھی لگی ہیں پپا سے کہوں گی۔“ روشی نے کھکھلاتے ہوئے اس کے گلے میں ہانپیں

ڈال دیں۔

”ہینز۔“ ماہین نے جھینپ کر مسکراتے ہوئے ہلکی سی چپت رسید کی۔

”اچھا خالہ! یہ بتائیں آپ کا دل چاہتا ہے کا کا جان کو دیکھنے کا، ان سے باتیں کرنے کا؟“ روشی ابھی تک اس کے گلے میں ہانپیں ڈالے ہوئے تھی۔

”نہیں۔ مجھے کوئی شوق نہیں۔“ ماہین نے اس کی ہانپوں کا حصار توڑتے ہوئے مسکرا کر جواب دیا۔

”ج۔ آپ ان سے ضرور ملیے گا۔“

”مجھے کوئی ضرورت نہیں ہے۔ دیکھ لیا تھا البتہ میں نے جب تم نے حویلی میں طوفان اٹھایا تھا اور بابا صاحب ہاسپٹل

پلے گئے تھے۔“

”مجھے تو اب کا کا جان سے اچھا کوئی نہیں لگتا۔“ روشی اٹھ کر دوبارہ آئینے کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔

”اسی بات پر خفا ہیں تم سے تمہارے پپا۔“ ماہین کے لہجے میں نامعلوم سی اداسی اتر آئی۔

”کوئی بھی باپ اپنی اولاد سے زیادہ دیر خفا نہیں رہ سکتا۔ میں کسی غیر کی تعریف تو نہیں کر رہی ہوں۔

کا کا جان ان کے سگے بھائی ہیں۔ وہ میرے کا کا جان ہیں تو پپا ہی کی وجہ سے ہیں۔“

”اچھا اب خاموش ہو جاؤ۔ میں تو تمہیں خوش خبری سنانے آئی تھی۔ صاحب میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔

گڈ نائٹ۔ اللہ نگہبان۔“

ماہین ایک دم کم صم سی نظر آنے لگی تھی۔

”بہت جیتی ہیں آپ۔ پپا کو صاحب کہتے ہوئے۔ روشی کھکھلا کر ہنس پڑی۔“ ویسے بٹڈل آف تھکنس فار پی پی نیوز۔“

”جیر آپ مائی ڈیر۔“ ماہین زبردستی کی مسکراہٹ کے ساتھ گویا ہوئی اور باہر نکل گئی۔

ابھی ویک اینڈ میں دو دن باقی تھے کہ حویلی سے پھر ایک زبردست خبر آگئی کہ گلو کا نکاح ہو رہا ہے کیونکہ مصور ہار اسٹڈی کے لیے باہر جا رہے ہیں۔ اس لیے فیصلہ کیا گیا ہے۔ کہ ان کو نکاح کے بندھن میں باندھ کر روانہ کیا جائے۔ غالباً تیمور علی خان کے ماضی میں کیے گئے اقدام کی وجہ سے اب ہر باہر جانے والے لڑکے کا خصوصی خیال ”رکھا جاتا تھا۔

روشی تو سنتے ہی بے تاب ہو گئی۔ ”خالہ! جلدی چلیں۔ وہاں کتنا مزہ آرہا ہوگا۔ اور یہ خالی نکاح کی کیا تک ہے۔ گلو پا کو

مصور بھائی کے ساتھ ہی بھیج دیں۔ پتا نہیں کتنے سال بعد لوٹیں۔“

”یہ تو وہاں جا کر ہی پتا چلے گا کہ صرف نکاح کیوں ہو رہا ہے۔ رخصتی کیوں نہیں ہو رہی۔“

”خالہ پپا سے کہیں وہ ہمیں آج ہی حویلی بھجوادیں۔ پلیز خالہ!“

ماہین کچن کے کام سے فارغ ہو کر ڈائننگ میں اپنے حساب کتاب سے الماریوں میں برتن سینٹ کر رہی تھی۔ روشی بجائے ہاتھ بٹانے کے اس کے پیچھے پیچھے منت کے انداز میں پھر رہی تھی۔

”وہ کہہ رہے ہیں ہم بس نکاح والے روز جائیں گے۔ وہ بہت بڑی ہیں۔“ ماہین نے بہت مصروفیت کے عالم میں

جواب دیا۔

”فرسٹ کزن کا نکاح ہے۔ محلے کی شادی تو نہیں ہے۔ حد ہوگئی۔“ وہ بری طرح جھلا گئی۔

”ہاں تو صبح سے چلے جائیں گے۔ اب وہ عام آدمی تو نہیں ہیں کہ جب چاہے کہیں چل دیں۔ ایک حساس اور ذمہ دار سیٹ ہے۔ ان کی۔ میں اصرار کروں گی تو یہی کہیں گے کہ پڑھ لکھ کر جاہل بن رہی ہو۔“ اس نے سمجھانے کی کوشش کی۔

”تو آپ ان سے یہ کہیں، وہ ہمیں ڈرائیور کے ساتھ بھیج دیں۔“ روشی کے انداز میں ضد تھی۔ سب ان سے ڈرتے ہیں۔ آپ تو اتنا نہیں ڈریں آپ کی بات تو وہ سن لیں گے۔“

”وہ مجھے فیصلہ سنا چکے ہیں مجھے تو وہ ڈرائیور کے ساتھ بھیج سکتے ہیں۔ مگر تمہارے بارے میں ان کا کہنا ہے۔ تم جہاں جاؤ گی، ان کے ساتھ جاؤ گی۔“

ماہین نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

”تو پھر میں نکاح والے دن بھی نہیں جاؤں گی۔“ وہ دھم سے ڈانٹنگ ٹیبل کی کرسی پر بیٹھ گئی۔

”ہو سکتا ہے آنے والے کل میں تمہیں ان سے اس سے بھی زیادہ اہم بات منوانا پڑ جائے۔ ان کا غصہ بڑھاؤ گی تو خود ہی مشکل میں پھنسو گی۔“

”اب بھی کوئی آسانی ہے۔ جیل میں ڈال دیا ہے اٹھا کر۔“ اس کی آواز بھرا گئی۔

ماہین الماری کھلی چھوڑ کر تیزی سے اس کے قریب آئی۔

”بری بات ہے روشی! اتنا قنوطی ہونے کی ضرورت نہیں۔ وہ اپنی بیٹی کو بس ہر جگہ اپنے ساتھ رکھنا چاہتے ہیں تو برائی کیا ہے۔ انہوں نے تمہیں پڑھایا لکھایا ہے۔ تمہاری شادی بھی اچھی جگہ کریں گے۔ تمہیں زندگی میں خدا نخواستہ سرد گرم پیش آئیں گے۔ تو ڈھال بنیں گے۔ کوئی تمہارے ساتھ زیادتی کرنے کی کوشش کرے گا تو اس سے سختی سے نمٹیں گے۔ خود تمہیں سختی سے کہہ لیں گے، مگر کسی دوسرے کو کبھی اس طرح کی حرکت کی اجازت نہیں دیں گے۔ حتیٰ کہ اگر میں بھی تمہارے ساتھ زیادتی کر بیٹھوں تو وہ مجھے بھی معاف نہیں کریں گے۔“

وہ اسے گلے سے لگا کر بہت محبت سے سمجھا رہی تھی۔

”آپ کو واقعی پتا ہے بہت محبت ہے۔ اور مجھے اس بات پر افسوس نہیں بلکہ خوشی ہے اس لیے کہ میرے باپ نے ایک طویل زندگی دیران اور بے رنگ گزاری ہے۔ بہت اچھی وکیل ہیں آپ پاپا کی۔“

روشی نے دوپٹے سے آنکھیں پونچھیں۔

”بد تمیز نہیں تو۔“ ماہین نے اس کے سر پر ہلکی سی چیت رسید کی۔

”اس طرح بولتے ہیں باپ کے ”پرسنلو“ پر؟ بے وقوف۔ اور میں کیوں ان کی وکالت نہیں کروں گی۔ جس کا کھاتے ہیں، اس کا گاتے ہیں۔“ وہ ہنس پڑی۔ ”چلو موڈ ٹھیک کرو۔ پھر شاپنگ کرنے چلیں گے۔ تمہیں نکاح پر پہننے کے لیے کوئی اچھا سا سوٹ دلوادیتے ہیں۔“

”یہی نہیں ہوں میں جو آپ مجھے بہلا لیں گی۔“ وہ منہ بسور کر بولی۔

”اچھا میں ان سے اصرار کروں گی کہ وہ ہمیں حویلی اس طرح پہنچا دیں کہ ہم نکاح سے پہلے ایک رات لڑکیوں کیساتھ بزم گئے والے تو گالیں۔ ٹھیک۔ ویسے مجھے پتا تو ہے کہ تمہیں حویلی پہنچنے کی جلدی کیوں ہے۔“ وہ رک کر شرارت سے ہنسی۔ ”بہت ہی مشکل پسند لڑکی ہو۔“

”خالد۔ آپ شادی سے پہلے بھی اتنا ہی کام کرتی تھیں۔ یا ہمارا گھر ہی آپ کو بہت بے ترتیب لگا ہے۔ کیونکہ جب آپ آئی ہیں صبح سے شروع ہو جاتی ہیں۔“ اس نے فوراً بات بدل دی۔

”نہیں بھی تمہارا گھر تو بہت خوبصورت ہے۔ بس یونہی ذرا چینج کر کے دیکھ رہی ہوں۔ ویسے بات بدلنے سے خیال نہیں بدلتا۔“ ماہین نے اسے شرارت سے چھیڑا۔

”پھر شاپنگ کے لیے کب چلیں گی۔؟“

”بتا دوں گی۔ پہلے تمہارے پاپا سے ایک دن پہلے جانے والی بات تو ٹھہرا لوں؟ اگر انہوں نے انکار کر دیا تو خواخواہ ٹپک بے کار جائے گی۔“

”ہاں بس یہ بات ضرور منوائیں۔ ورنہ میں واقعی نہیں جاؤں گی۔“

”اچھا بابا۔ ویسے تم اپنے پاپا سے سوری ضرور کرو۔ کتنی بری بات ہے وہ تم سے ناراض ہیں، اور تم نے ابھی تک ان سے سوری نہیں کیا۔ اس طرح کی ہٹ دھرمی سے تو بڑوں کا غصہ اور بڑھتا ہے۔“

”کر لوں گی سوری۔ مگر میرے سوری کرنے سے ان کی ناراضگی ختم نہیں ہوگی۔ کیونکہ معاملہ کا کا جان کی انوالومنٹ کا ہے۔ اور مجھے تو ان سے بہت سے سوری کرنا ہیں اکٹھے کر لوں گی۔ اس نے دھیمی قدرے شرمندہ سی آواز میں کہا۔

”کیا مطلب؟“ ماہین نے بری طرح چونک کر اس کی صورت دیکھی، اسے وہ بہت عجیب سی محسوس ہوئی تھی۔

”کچھ نہیں۔“ وہ یہ کہہ کر ایک لمحہ کے بغیر باہر نکل گئی۔

”سوری تو ڈی۔ سی صاحب کتنوں کے آپ پر ادھار ہیں کیا کروں کبھی آپ پر ترس آنے لگتا ہے اور کبھی دل چاہتا ہے کہ ہمیشہ کے لیے آپ کی نظروں سے اوجھل ہو جاؤں کیا قسمت ہے ہم دونوں بہنوں کی۔ ہماری تقدیر میں کھل کر خوش ہونا نہیں لکھا۔ یا یہ کہ حویلیاں، ہمیں راس نہیں۔“

مصلحتوں کی جکڑ بند یوں سے پریشان دل بہانے بہانے سے رسیاں تڑانے لگتا تھا۔

بہت عرصے بعد یاوری علی خان نے فور وہیل ڈرائیور جیب خود ڈرائیو کی تھی۔ ماہین نے پوچھا بھی تھا۔ ڈرائیور کو کیوں نہیں لے جا رہے؟“

”ایسے ہی۔ یہ جواب تھا ان کا۔“

ماہین تو ان کے برابر میں ہی بیٹھی تھی، جبکہ روشی عین اس کے پیچھے بیٹھی۔ بظاہر میگزین پڑھنے میں مصروف تھی۔ یوں بھی

یاور علی خان کی موجودگی میں اب وہ ضرورت سے زیادہ کانٹس ہو جاتی تھی۔

کوشش کرتی تھی کہ ان سے کم سے کم سامنا ہو۔ بس کچھ اندر کے چور ہوتے ہیں جو انسان کی خود اعتمادی پھین لینے ہیں۔ وہ جیت بھی سکتا ہے مگر ہار جاتا ہے۔ اس نے کئی بار نظریں اٹھا کر ان کی طرف دیکھا تھا۔ گرے سوٹ میں ملبوس۔ نفیس ہیرا اسٹائل۔ اسٹیرنگ پر جے مضبوط ہاتھ۔ ایک ایک شے سے بلا کی نفاست جھلک رہی تھی۔ اس پران کی مخصوص خوشبو۔ چہرہ مگر ایک دم برف۔ سپاٹ۔ سرخ رہنے والی آنکھیں وڈ اسکرین پر اس انداز میں جمی تھیں کہ نیم و امحسوس ہو رہی تھیں۔ ایک دم اس کا دل بھر آیا۔ اس کا دل چاہا جان ہار کر باپ کو منالے۔ آنسو ایک تو اتر سے رخساروں پر بہہ نکلے۔ وہ ہونٹ کاٹ کر آنسو روکنے کی کوشش کرتی رہی۔

”روٹی کچھ کھانے کا موڈ ہو تو باسکٹ سے لے لینا۔ فنگر چپس بھی ہیں۔“ ماہین نے گردن موڑے بغیر اسے متوجہ کیا۔ وہ خاموش رہی۔

”وہ اسٹور کی چابیاں تم نے کچن سے اٹھالی تھیں۔؟“ معما ماہین کو ایک اور فکر نے ستایا۔

”جی۔“ روٹی نے خود پر قابو پاتے ہوئے بمشکل کہا۔

ماہین کو یہ فکر بھی ہو رہی تھی کہ وہ بورنہ ہو رہی ہو۔ اس لیے وہ بات برائے بات بھی کر رہی تھی۔ اور اسے بات کرنے کا حوصلہ بھی بخش رہی تھی۔

”وہ بکس رکھ لی تھیں تم نے جو تم کہہ رہی تھیں کہ یہ کو دینا ہیں۔“ ماہین نے پھر ایک سوال کیا۔

”جی۔!“ اس نے جلدی سے رخسار اور آنکھیں چادر سے پونچھ ڈالیں۔ مبادا ماہین گردن موڑ کر اس کی طرف دیکھ لے۔

یاور علی خان نے مرر میں دیکھ لیا تھا۔ ان کے دل کو کچھ ہوا تو تھا۔ دل تو چاہا تھا کہ پوچھیں کہ کیا دکھ رہا ہے؟ مگر پھر وہی اذیت ناک منظر وڈ اسکرین پر لگا۔ چادر میں لپٹی روٹی تیمور علی خان کا بازو تھا۔ ان کے سامنے سے گزر گئی تھی۔ ان کی آنکھوں کی سرخی گہری ہونے لگی۔

ماہین اپنی سوچوں میں الجھی ہوئی تھی۔ ”گھر کی اہم تقریب ہے کیا تیمور علی خان شریک ہوں گے؟“

رات گیارہ بجے کے قریب وہ حویلی پہنچے تھے۔ باہر کا تو کوئی مہمان نہیں تھا۔ حویلی کے کیمین ہی ماشاء اللہ اتنے تھے کہ اکٹھے بیٹھے دکھائی دیتے تو عام حالات میں تقریب کا گمان ہونے لگتا تھا۔

فاران اور شریک پر ہی مل گئے۔ ماہین کو دیکھ کر بہت خوشی سے مسکرائے تھے۔ اور یاور علی خان کی موجودگی کا احساس کر کے ذرا احتیاط سے باتیں کر رہے تھے، ورنہ ماہین سے تو وہ خاصے بے تکلف ہو چکے تھے۔

بالوان کی آمد کا سن کر بھاگی چلی آئی۔

”السلام وعلیم ماہین بی بی۔ آپ تو کہہ رہی تھیں کہ دو ایک روز میں بلوالوں گی۔“

اس نے چھوٹے ہی شکوہ کیا۔ اس روز وہ تیار تھی مگر یاور علی خان نے ماہین سے کہا تھا کہ اسے ڈرائیور سے کہہ کر بعد میں بلوالینا۔ وہ یہی وعدہ کر کے گئی تھی مگر مصروفیت میں دھیان ہی نہیں آیا۔

”ہاں بھئی، واقعی میں مصروفیت میں بھول گئی تھی، خیر اب چلنا۔“ اس نے تسلی دی۔ اور روشن آرا کی طرف بڑھ گئی، جو استقبال کے لیے پورچ تک چلی آئی تھیں۔ روشی انہیں سلام کر کے اندر بھاگ گئی تھی۔ جہاں لڑکیوں میں اس کی آمد کی خبر نے تہلکہ مچا دیا تھا۔

یاور علی خان بھی اندر کی طرف بڑھے تھے، کہ ایک اور گاڑی پورچ میں داخل ہوئی ماہین روشن آرا اور بالو ایک طرف ہٹ گئی تھیں۔

”اوہ۔ تیمور۔؟“ روشن آرا نے گویا صرف گاڑی پہچان کر کہا تھا اور بے ساختہ اندر کی طرف جاتے ہوئے یاور علی خان کی سمت دیکھا تھا۔ ماہین نے جیسے اندر جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ قدم ہی زمین نے پکڑ لیے تھے۔ روشن آرا نے ماہین کی سمت دیکھا، وہ کچھ پریشان سی نظر آنے لگی تھیں۔

تیمور علی خان پچھلا دروازہ کھول کر باہر آ چکے تھے۔ بہن پر نظر پڑی تو ان کی طرف ہی چلے آئے۔

”السلام علیکم بی بی جان!“ ساتھ ہی ماہین کی سمت دیکھا تھا۔

”علیکم السلام! انھوں نے اسی پریشانی کے انداز میں جواب دیا۔

”السلام علیکم ماہین۔!“ اس نے مسکرا کر بہت ہی زیادہ اختصار سے کام لیا۔ وہ بہت دلچسپی سے تیمور علی خان کو سر سے پاؤں تک دیکھ رہی تھی۔

”والسلام۔!“ تیمور علی خان نے گویا الجھ کر بہن کی طرف دیکھا تھا۔ انہوں نے نظروں ہی نظروں میں سمجھا دیا کہ یاور علی خان آئے ہوئے ہیں۔ ٹیلی فونک رابطے سے انہیں حویلی کی سب خبریں ملتی رہتی تھیں دوسرا ذریعہ باری تھا جن دنوں یاور علی حویلی میں مقیم ہوتے تھے۔ وہ اس طرف آنے سے احتراز ہی کرتے تھے۔ کہ زخموں کے ٹانگے کھلنے کے سوا اس مڈ بھیڑ سے اور ملتا ہی کیا۔

”ہم ادھر گیٹ روم میں ہیں بی بی جان! آپ بابا صاحب کو بتادیں۔“

انہوں نے ماہین کو یکسر نظر انداز کر کے بہن سے کہا اور آگے بڑھ گئے۔

”بہت خاص بات ہے اس میں ہمارے مصور بھائی بھی ادھورا کام کر رہے ہیں یعنی صرف نکاح بتائیے سینکڑوں کا یہ حال ہے۔“ روشنی نے بڑے تاسف سے کہا۔

”یعنی مطلب یہ کہ تمہیں نکاح پسند نہیں ہے حاضرین غور سے سن لیں بلکہ فرمائش نوٹ کر لیں“ روبی نے چاروں طرف سرگھما کر گویا اعلان کیا۔

”چلو ٹھیک ہے کتنا ہی شارٹ نوٹس کیوں نہ ہو روشنی کا صرف نکاح نہیں کریں گے بلکہ رخصتی بھی ساتھ ہی کریں گے“ روشن آرا نے مسکراتے ہوئے کہا اور گویا اپنی کیفیت میں تبدیلی پیدا کرنے کی شعوری کوشش کی۔

”امید ہے چین آگیا ہوگا۔ آخر بی بی جان نے کہا، بڑی مضبوط تسلی ہے“ زری نے شرارت سے کہا۔
روشنی ایک ٹائیپ کو چپ ہو گئی تھی اور نگاہیں بے ساختہ دروازے کی سمت اٹھ گئی تھیں کہ جیسے وہ وہاں سے ہر دم ہی گزرتا رہتا ہو۔

”میرے خیال میں ہال میں سانپ آگیا ہے“ بیہ نے سنجیدگی سے کہا۔
لڑکیاں گویا اچھل پڑیں ”کیا مطلب“ وہ ادھر ادھر دیکھ رہی تھیں باغ میں کبھی کبھی سانپ نکل آتے تھے بس اسی وجہ سے غالباً بیہ کا مذاق نہیں سمجھی تھیں۔ روشن آرا اور مایہن بھی تشویش بھری نظروں سے ہال میں نظر دوڑانے لگی تھیں۔

”بھئی روشنی پتھر کی ہو چکی ہے میں سمجھی سانپ سوگھ گیا ہے۔“
”بدتمیز“ سب جھینپ کر دوبارہ اپنی اپنی جگہ پر ٹپک گئیں۔

”امی بتا رہی تھیں ایک مرتبہ کا جان کو بھی سانپ نے ڈس لیا تھا۔ بہت حالت خراب ہوئی تھی ان کی“ زری نے اطمینان کا سانس بھرتے ہوئے گویا اپنے ڈر جانے کی توضیح پیش کی تھی۔
”ہیں بی بی جان“ تانیہ نے پھوپھی سے تصدیق چاہی۔

”ہوں“ روشن آرا نے ٹالنے والے انداز میں ہنکارا بھرا اور مایہن پر اچھتی ہوئی ایک نگاہ ڈال کر اٹھ کھڑی ہوئیں ایک مرتبہ پھر وہ کم صم سی نظر آنے لگی تھیں۔

”آؤ مایہن۔ اوپر بھائی بیگم کے پاس چلتے ہیں وہ بہت شدت سے تم لوگوں کے آنے کا انتظار کر رہی تھیں“ عجیب سرد مہری سی محسوس کی تھی مایہن نے ان کے لہجہ میں۔ اب تو وہ حویلی والوں سے اتنی واقف ہو چکی تھی کہ نہ کسی انداز پر چوکتی تھی اور نہ الجھن میں پڑتی تھی۔ اسے اندازہ تھا کہ اس وقت حویلی میں کسی قسم کی کھلبلی مچی ہوئی ہے شاید دوسری خواتین تو دم سادھے بیٹھی ہوں گی۔ وہ اطمینان بھرے انداز میں ان کے پیچھے پیچھے چل پڑی تھی۔

کھانے سے فراغت کے بعد لڑکیوں نے جلدی جلدی عشاء کی نما پڑھی پھر باقاعدہ ڈھولکی لے کر بیٹھ گئیں تھیں سوائے عالم تاب کے تمام خواتین بھی وہیں آگئیں تھیں۔

روشنی گلو کو بھی کمرے سے گھسیٹ لائی تھی اس کا جوش و خروش حالانکہ خاصا سرد پڑ چکا تھا، تین گھنٹے ہونے کو آئے تھے وہ دشمن جان ابھی تک نظر نہیں آیا تھا پہلے تو کسی بہانے سے اس کا ذکر بھی کر لیتی تھی اب تو خیال ہی سے زبان پر تالے پڑ جاتے

”روشنی بتاؤ ناں کون سا گانا گائیں اب؟“ حنا کو کوئی گانا یاد نہ آیا تو اس نے روشنی سے تعاون چاہا۔

”وہ والا گانا بڑی پیاری لے ہے اس گانے کی چاندنی میں آئیو میاں بنے“

”مگر آہستہ گانا۔ ان کا کمرہ زیادہ دور نہیں ہے اس طرف سے سچ مچ آ بھی جائیں گے یہ کہتے ہوئے کہ جی فرمائیے کیسے پڑھائیے؟“ مونا تہقہہ لگا کر گلو کے شانے سے ٹپک گئی۔ گلو کے چہرے پر ان گنت رنگ بکھر گئے۔

”بہت شیطان ہیں یہ“ تزئین نے اندر داخل ہوتے ہوئے سب کچھ سن لیا تھا۔

”چھوٹی بی بی جان سے پوچھو انہیں بہت گانے آتے ہیں“ لالی نے ٹکڑا لگایا۔

”تمہاری امی کو بھی کم نہیں آتے“ تم پڑی روتی رہتی تھیں اور یہ گھر کی شادیوں میں بیٹھی ڈھولکی بجاتی رہتی تھیں“ تزئین نے اس کر روشنی آرا کو چھیڑا۔

”ہیں بی بی جان صحیح کہہ رہی ہیں امی؟“ لالی نے حیرت سے ماں کو دیکھا۔

”ارے تو یہ کرو مجھے کہاں آتے ہیں گانے وانے۔ اسے ہی سدھ بدھ نہیں رہتی تھی نہ کھانے کا ہوش نہ پینے کا۔ بیٹھی ڈھولکی بجاتی رہتی تھی“ روشن آرا نے مسکرا کر مایہن کو دیکھتے ہوئے کہا۔

اچھا بتائیں۔ آپ کے زمانے میں جب حویلی میں شادیاں ہوتی تھیں تو سب سے اچھے گانے کون گاتا تھا“ حنا نے بڑی نیچرگی سے سوال کیا تھا۔

خواتین کے چہروں سے مسکراہٹ ایک دم غائب ہو گئی تھی تزئین نے روشن آرا کی طرف بے ساختہ دیکھا تھا۔ ایک اہٹ ناک سی خاموشی مایہن نے ماحول میں محسوس کی تھی اس نے سب کے چہرے پر باری باری ایک بہت ہی گہری نگاہ ڈالی تھی وہ سوچ رہی تھی وہ پڑھ رہی تھی۔

”بتائیں ناں امی؟“ روبی نے روشن آرا کو متوجہ کیا۔

”اے کیا بے کاری باتیں کرنے لگیں چلو گانے گاؤ“ روشن آرا نے جھلا کر کہا۔

”کوئی مزے دار سا گانا یاد نہیں آ رہا“ حنا ذہن پر زور ڈالنے لگی روشنی ڈھولکی پر تھاپ لگانے لگی۔ بیہ نے دف بجانا شروع کر دیا۔

”گھر آنا سے پوچھو۔ نہیں تو یہ نہیں کون کون سے بھولے گانے یاد آ رہے ہوں گے“ تانیہ نے چھیڑا۔

”مایہن ممانی سے پوچھ لو“ سونی سے پہلی بار مشورہ دیا۔

نہ نہ انہیں تو عمر بھر ممانی میں آتے ہوں گے یا ”اس“ میں۔ یوگنڈا میں کون سی زبان بولی جاتی ہے ممانی“ روبی نے لگے بغیر معلومات میں اضافہ کرتا چاہا۔

بال میں پھر جتن رنگ بجنے لگے تھے۔ حنا نے راکھ سے ایک چنگاڑی جو نکالی تھی وہ پھر راکھ تلے دب گئی۔ مگر مایہن کے اندر چنگاڑیاں نہیں الاؤ روشن تھے۔

اندر ایک مستقل سی کیفیت کا قیام عمل میں آچکا تھا وہ بظاہر ہال میں تھی مگر ذہن کبھی اپنے بیڈروم میں سیرکناں ہوتا تو کبھی گیسٹ روم میں۔ پھر اگلے ہی لمحے سرائے میں اس نے روشی کی سمت دیکھا، فیروزی جھگمگاتے کپڑوں میں ایک مرتبہ پھر اس کی آنکھوں میں روشنیاں اتر آئی تھیں۔

”یہ باری کہاں ہے۔ ابھی تک دکھائی نہیں دیا“ وہ کسی دھیان سے چونک پڑی۔ تھاپ گویا ڈھونڈنے پر نہیں روشی کے دل پر پڑی تھی۔ اس نے بڑی شکر گزار نظروں سے ماہین کی سمت دیکھا اتنی دیر میں کسی نے اس کا نام تو لیا۔

”خوشی کی تقریب ہے اب تو مصروفیات میں گونا گوں اضافہ ہو گیا ہوگا“ مہینو کے بستہ لبوں پر بھی جنبش ہوئی۔

”صبح مصور کے ساتھ ہی دیکھا تھا بانیگ پر جا رہے تھے دونوں کہیں“ رئیسہ بیگم نے بھانج کو جواب دینا بہت ضروری خیال کیا۔

”خوشی کا موقع ہے بی بی جان، جھومر کو بھی ادھر بلوایا کریں“ ماہین کو مطربہ کی تنہائی کا دھیان آتے ہی جھومر کا خیال آیا۔

”بابا صاحب نے چند دنوں کیلئے اسے کوہاٹ بھیج دیا ہے“ ظفری کراچی ہسپتال میں داخل ہو گیا ہے ناں۔ دو تین مہینے تو اسے وہاں لگ جائیں گے“ رئیسہ بیگم بہت آہستہ آواز میں بات کر رہی تھیں۔

”کوہاٹ میں اس کامیکہ ہے؟“ ماہین نے دریافت کیا۔

”میکہ ہی سمجھ لو بوڑھے نانائانی رہتے ہیں خود ہی کہا تھا وہاں جانے کو“ رئیسہ بیگم بولیں۔

”کس سے؟ بابا صاحب سے؟“ ماہین نے جانے کیا سوچ کر پوچھا۔

”نہیں۔ بھابی بیگم سے کہتی ہے جو کچھ کہنا ہوتا ہے“ وہ ترین کی سمت دیکھتے ہوئے کچھ منتشر سی کیفیت میں کہہ رہی تھیں۔

اسی لمحے لڑکیوں نے گیت چھیڑ دیا۔

سن ری سکھی موہے بجا بلائے

وہ سب یکدم لڑکیوں کی سمت متوجہ ہو گئیں، بلکہ ترین تو گلو اور روشی کے درمیان جگہ بنا کر خود بھی گانے میں شریک ہو گئیں اور اشارے سے مہینو کو بھی حصہ لینے کیلئے کہا۔ ساتھ ہی ماہین کو بھی اپنے برابر بیٹھنے کیلئے اشارتی اصرار کیا۔

مہینو تو اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہ ہوئیں، ماہین نے مصنوعی مسکراہٹ کے ساتھ ہاتھ اٹھا کر معذرت کر لی۔

اسی دوران باری اندر داخل ہوا تھا، روشی ڈھونڈنے بجانے میں اور سرتال ملانے میں اتنی منہمک تھی کہ اس نے اندر داخل ہوتے ہوئے باری کو نہیں دیکھا تھا اور جب وہ رئیسہ بیگم کو باہر آنے کا کہہ کر ایک بھر پور نگاہ روشی پر ڈال کر واپس پلٹ رہا تھا تو روشی جیسے کسی خواب کے عمل سے باہر آئی تھی مگر اب اس کی سمت باری کی پشت تھی وہ کیمل کلر کے ملبے شوار سوٹ میں لبوں تھا۔ کپڑوں پر پڑی بے تحاشہ شکنیں اس کی دن بھر کی مصروفیت کی چغلی کھا رہی تھیں، رئیسہ بیگم بھی اس کے ساتھ چل پڑی تھیں غالباً بابا صاحب نے طلب کیا تھا۔

”ارے ستیاناس کر دیا گانے کا بار بار ایک ہی مصرعہ دہرائے جا رہی ہو“ لڑکیوں نے شور مچا دیا وہ کچھ کہہ رہی تھیں روشی

تہا اور گارہی تھی جیسے ریڈیو سے بیک وقت دو اسٹیشن سنائی دے رہے ہوں۔

”اچھا بھلا گارہی تھی کیا ہو گیا ایک دم؟“ روبی نے برامان کر پوچھا۔

ماہین کے ہونٹوں پر بڑی دلفریب مسکراہٹ رقص کرنے لگی۔

مہینو کھنکھار کر لڑکیوں کے کپڑوں پر بنا کام چیک کرنے لگیں۔ انداز تو بڑا ناقدانہ تھا، یہاں وہاں ادھر ادھر ہر طرف کپڑے ہی نظر آ رہے تھے، ماہین نے نوٹ کیا گانے بجانے میں اب روشی کی دلچسپی برانے نام تھی۔

”ذرا میں صاحب کو دیکھ لوں ورنہ کہیں گے اپنی مصروفیات میں میرا خیال ہی نہیں کیا“ ماہین نے بصیر علی خان کی بیگم جو ابھی تک دلہن کہلاتی تھیں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

”روشی وہ والا گائیں“

جب ساون گھر گھر آئے کوکیا گائے

بلم تو آ جانا..... بچن تو آ جانا

حنا کو اپنا ایک پسندیدہ گیت یاد آیا۔

”پھر تو انہیں پاکستانی موسم کی خبروں کیلئے بہت کانشس رہنا ہوگا“ کوئی آسان سی شرط لگاؤ“ زری نے بڑبستی کا مظاہرہ کیا، بس پڑی تھیں مگر روشی کے لب مسکراہٹ سے بھی عاری تھے۔

”میرا خیال ہے روشی تھک گئی ہے“ خفیہ بیگم نے روشی کی بدلتی کیفیت کو شاید سب سے زیادہ محسوس کیا تھا، وہ عالم تاب کی مٹی بھانج اور گلو کی ہونے والی ساس بھی تھیں۔

”امی ٹھیک کہہ رہی ہیں“ زری نے تائید کی ”واقعی اب یہ بالکل ڈھیلی محسوس ہو رہی ہے“

”انتالبا سفر کر کے آئی ہے بیٹھے بیٹھے بھی انسان تھک جاتا ہے“ روشی اپنے آپ کو موضوع بننا دیکھ کر قدرے شپٹا گئی۔

”ارے نہیں رات پڑی ہے سونے کیلئے ایک کپ کافی پی لوں گی سب تھکن بھاگ جائے گا بناؤں کافی؟ کون کون پئے گا؟“ اس نے سب حاضرین کو آفر کی۔

”ماما سے کہہ دو بنا لے گی“ روشن آرا بولیں۔

”نہیں کافی تو میں خود بناتی ہوں“ اسے وہاں جیسے ایک دم تھکن سی محسوس ہونے لگی تھی، بس وہ جلدی سے باہر نکل جانا چاہتی تھی۔

یہ بھی عمر کا ایک ایسا موڑ ہوتا ہے جب سنگ کھیلی سکھوں کے بیچ تنہائی اور وحشت ہونے لگتی ہے یا تو تنہائی اچھی لگتی ہے یا نہ“ جس کی ذات میں دوستی کے سارے رنگ جھلمل جھلمل کرتے ہیں۔ جس کے ساتھ باتیں کرنا بھی اچھا لگتا ہے اور فائوٹ بیٹھنا بھی۔

”بھئی عجیب لڑکی ہو، تھکن بھی ہے اور کام بھی کرنا چاہ رہی ہو؟ بالو سے کہہ دو بہت اچھی چائے کافی بنا لیتی ہے“ زری کو نکل سے اس کا اٹھنا اچھا نہیں لگا تھا۔

”ابھی آجاتی ہوں آپ! بیٹھے بیٹھے ٹانگیں بھی جڑ گئی ہیں“ اس پر کسی کے اصرار کا مطلق اثر نہیں تھا۔ وہ تیزی سے باہر نکل آئی تھی، عجیب سی بے کلتی تھی، جی چاہ رہا تھا کہ وہ سامنے آجائے۔

کافی کا کہہ کر آئی تھی کافی تو بنانا ہی تھی، مگر کچھ سوچنا بھی تھا، بہت سی خوبصورت سوچوں سے کیف کشید کرتا تھا۔ وہ بڑی بے خبری کیفیت میں کچن میں داخل ہوئی تھی، مگر مسرت کے احساس سے جیسے پتھر اسی گئی۔

سائیڈ پر پڑی ڈائننگ ٹیبل کے سامنے باری بیٹھا کھانا کھا رہا تھا۔ یہ تو اس کے دھیان میں بھی نہیں آیا تھا کہ وہ یہاں بھی ہو سکتا ہے، بالو ماما اور کلو اوون کے سامنے کھڑی جانے کن خوش گپیوں میں مصروف تھیں، سرسوتی سنک کے سامنے کھڑی برتن دھو رہی تھی۔

”خیریت روشی بی بی۔ ہم سب بھی تو ایک جگہ اکٹھی ہو گئی، وہاں آوازیں پڑ رہی ہوں گی“ سب سے پہلے ماما ملی کی نظر دروازے میں ایستادہ روشی پر پڑی، ایک دم گڑبڑا کر گویا ہوئی۔

”کوئی نہیں بلارہا، میں تو کافی بنانے آئی ہوں“ وہ باری کو نظر انداز کرتے ہوئے آگے بڑھی، جیسے اسے دیکھا ہی نہ ہو۔

”میں بنا لیتی ہوں کافی۔ سب پیئیں گی؟“ ماما نے اپنے مخصوص خادمانہ انداز میں کہا۔

”دو تین کے علاوہ تقریباً سب ہی پیئیں گی۔ مگر کافی میں خود بناؤں گی“ آپ لوگوں کو ہمارے گانے اچھے نہیں لگے غائب جب ہی کچن کو ”جائے پناہ“ بنالیا۔ وہ مسکرا کر نظروں ہی نظروں میں الیکٹرک کیبل تلاش کرتی ہوئی گویا ہوئی۔

”ہم تو گانے سننے کیلئے ہی کچن کا کام جلدی جلدی سمیٹ رہے تھے“ آپ لوگ تو بہت اچھا گانے گاتی ہیں بڑے اچھے اچھے گانے آتے ہیں آپ کو“ بالو نے بھی مسکرا کر جواب دیا۔

”ہم نکلنے ہی والے تھے یہاں سے کہ خان آگئے“ ان کیلئے کھانا گرم کیا، سرسوتی کہہ رہی تھی کہ اس کے بغیر یہاں سے نہ نکلیں۔“ کلو نے مزید تفصیل بیان کی۔

”ہاں بھئی۔ خان تو ہیں ہی سر سے پاؤں تک بے ترتیب کوئی وقت ہی نہیں، جب دل چاہا کھالیا۔ جب جی چاہا سو گئے“ باری بظاہر کھانے میں بہت منہمک تھا، مگر اس کی ساری توجہ اسی سمت گر کی طرف تھی جو اس کی روح کی غذا بن چکی تھی۔

”بے مہار تنقید بھی بے ادبی میں شامل ہوتی ہے، مرشد فرماتے ہیں عورت بے ادب ہو تو گھر سے برکت اٹھنے لگتی ہے“ اس نے کانٹے میں کھیرے کا ٹکڑا پھنساتے ہوئے بڑی شریر مسکراہٹ کے ساتھ حصہ بنایا۔

سرسوتی تو خاک نہیں سمجھی۔ ماما کی صرف آنکھوں تک مسکراہٹ محدود رہی البتہ بالو دوپٹے میں منہ چھپا کر ہنسنے لگی۔ روشی کا دل دھک سے رو گیا۔ یہ تو بڑا ”جرات مند“ ہو گیا ہے۔ بتاؤ ملازموں کے سامنے ہی شروع ہو گیا۔

”خان! مرشد نے تو بیوی کیلئے کہا ہوگا ہر عورت کیلئے تھوڑا ہی اس طرح کی باتیں تو گھر والی کے لئے کی جاتی ہیں“ بالو نے اپنی ہنسی پر قابو پاتے ہوئے گرہ لگائی۔

”اچھا؟ ہو سکتا ہے آپ ٹھیک فرما رہی ہوں مگر یہ بیویاں اتنی بے ادب کیوں ہوتی ہیں کہ ان کیلئے اس طرح کی باتیں فرمانا پڑتی ہیں“ وہ بڑی سادگی سے کہہ رہا تھا، یعنی بننے کی انتہا کر دی تھی۔

”سب ایسی تھوڑا ہی ہوتی ہیں“ بالو نے اپنے حساب سے جیسے اسے تقویت پہنچانے کی کوشش کی۔

”مگر جس بے چارے کی قسمت میں ایسی بے ادب بیوی ہوگی وہ تو سمجھو بے موت مارا گیا، محلے والے سمجھتے ہوں گے“ مورت اپنے سب سے چھوٹے بچے کو ڈانٹ رہی ہے۔ یہ نہیں معلوم اندر شوہر نامہ ارزیر عتاب ہیں۔ ویسے سنا ہے بہت گناہ ہوتا ہے۔“ دبی دبی سی مسکراہٹ بلا کی شرارت ظاہر کر رہی تھی۔

روش کیل کیل کا سوچ آن کر چکی تھی، ”ماما تم کپڑے میں رکھ لو“ وہ یوں گویا ہوئی جیسے کچھ سنا ہی نہ ہو۔

”آپ فکر نہ کریں خان۔ انشاء اللہ آپ کا جوڑا اللہ نے اچھا ہی اتارا ہوگا“ ماما نے ہنس کر اسے تسلی دی۔

”فکر تو برحق ہے ماما۔ تکلیف کی دو صورتیں ہیں۔ ایک آزمائش، دوسری سزا۔ نیک لوگوں کی تکلیف آزمائش ہوتی ہے اور گناہگار کی تکلیف عذاب و سزا۔ آزمائش تو ہو سکتی ہے نامیری۔ کیوں روشی بی بی؟“ اس نے اتنی دیر میں پہلی مرتبہ روشی کو براہ راست مخاطب کیا۔

”مجھے کیا پتا۔ آپ کے پاس تو فرشتے پروگریس کارڈ لے کر حاضری لگاتے ہیں، ابھی ہمارا مرتبہ بہت چھوٹا ہے اس لئے ہمارے پاس نہیں آتے۔“ اس نے جیسے جل کر جواب دیا۔

”اللہ کسی کی پر خلوص محنت ضائع نہیں کرتا“ آپ کوشش کرتی رہیے شاید آپ کے پاس بھی آنے لگیں“ اس نے بہت تھوڑا سا بادام کا حلوہ نکالا تھا اور دو تین چمچے کھا کر ٹینکین سے ہاتھ پونچھتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

”آپ کافی پیئیں گے خان۔“ کلو نے پوچھا

روشی اس کے قارل انداز پر پہلے ہی جل کر خاک ہو رہی تھی اب باہر جانے کیلئے اس کا جلجت بھرا انداز اسے اپنی توہین محسوس ہوا تھا۔ وہ تو سوچ رہی تھی کہ وہ تو اب وہاں سے اٹھائے نہ اٹھے گا۔

”ارے نہیں بھئی۔ میری مرنے کے ساتھ بڑی انڈر شینڈلنگ ہے جلدی سونا چاہتا ہوں آج۔ بہت ٹھکن ہے۔ اوپن جپ میں سینکڑوں کلو میٹر طے کئے ہیں۔ یوں بھی رات کو چائے کافی پینا کوئی اچھی بات نہیں ہوتی، سارا دن ہوتا ہے کھانے پینے کیلئے رات سونے کیلئے ہوتی ہے، دو ہستیاں ہی رات کو جاگتی اچھی لگتی ہیں۔ ایک اُلوا دوسرا عاشق۔ نہ میں اُلوا ہوں اور نہ عاشق۔ حالانکہ دونوں میں کوئی خاص فرق نہیں“

”تو بہ خان آپ تو پوری کتاب ہی پڑھ کر سنانے لگے۔ سیدھے سیدھے ”نہ“ کر دیں“ ماما کی ہنسی چھوٹ گئی، مگر روشی کا تو اس بے مہرنے دل توڑ کر پھر موڈ آف کر دیا تھا۔

اس کی نیندیں اس کے کام اس کے کاڑوہ ان سب کے بعد ہے۔ کیسا اذیت ناک احساس ہوا تھا کہ آنکھیں بھرا آئی تھیں، اس کا سب سے بڑا ثبوت تو یہی تھا وہ اتنی دور گیا تھا اور اس سے طے بغیر واپس آیا تھا۔ یہ تک نہیں سوچا کہ خدا معلوم دوبارہ کب ملتا ہو۔

”ماما یہ کافی اندر لے جانا، اگر کوئی میرا پوچھے تو کہہ دینا میرے سر میں درد ہو رہا ہے۔ آرام کر رہی ہوں۔“ وہ کافی بنانے کا پروگرام ملتوی کر کے اس سے پہلے کچن سے باہر نکل گئی۔ ماما ہکا بکا اسے جاتے دیکھتی رہی۔

”روٹی بی بی کا بھی پتہ نہیں چلتا، خود ہی تو کافی بنا رہی تھیں اب خود ہی چھوڑ کر چلی گئیں“ ماما نے باری کی طرف دیکھتے ہوئے جیسے بڑے الجھے ہوئے انداز میں کہا۔

باری بھی کسی گہری سوچ سے جاگا۔

”حویلی کی ساری لڑکیاں بڑی سادہ اور عام سی ہیں۔ حویلی میں شہزادی تو صرف روٹی بی بی ہیں۔ بڑا شاہانہ اور نازک مزاج ہے اور شاہوں کے ہاں دلیل تو نہیں ہوتی۔ موڈ ہوتا ہے، وہ مسکراتے ہوئے ماما کو سمجھا رہا تھا، دوسرے معنوں میں ماما کی حیرت کو ختم کر رہا تھا۔

”یہ تو ہے، مجھے تو شروع ہی سے ان سے ڈر لگتا ہے، ہر وقت خفا خفا ہی نظر آتی ہیں“ کلونے باری کی ہاں میں ہاں ملائی۔

”اب پتہ نہیں خود کافی پیسے کی یا نہیں“ ماما خود کلامی کرتے ہوئے کافی بنانے لگی، باری کچن سے باہر جا چکا تھا۔

ماہین تو اپنے اندر کی ادھیڑ بن سے گھبرا کر ہال سے باہر آئی تھی، یاد علی خان کو دیکھنے کا تو بہانا تھا۔ بے اختیار اس کی نظریں گیسٹ روم کی طرف اٹھ رہی تھی۔ جی چاہ رہا تھا بھاگ کر وہاں جا پہنچے اور تیمور علی خان کو بتا دے کہ وہ سب جانتی ہے، پہلی فرصت میں اپنی بہن سے ملنا چاہتی ہے وہ تو اسے سرائے لے چلیں ابھی اسی وقت۔

وہ برآمدے کی سیڑھیاں اتر کر گھاس پر ٹپٹنے لگی وہ اضطراری انداز میں اپنے ہاتھ مسل رہی تھی۔

اسے خود سمجھ نہیں آرہی تھی کہ وہ کس حساب میں اتنی مصلحت سے کام لے رہی ہے زیادہ سے زیادہ یاد علی خان کے غصے کی انتہا یہ ہوگی کہ وہ اسے چھوڑ دیں گے۔

وہنی عذاب تو یوں بھی ہے اور یوں بھی۔ روٹی کی شادی ہو جائے گی، جواد باہر چلا جائے گا، اسے تو اب ہمیشہ ان سے دور ہی رہنا ہے۔ کم از کم اتنا تو ہو جائے گا کہ بچے اپنی ماں سے مل لیں، ناز بجا اپنے بچوں کو ایک بار سینے سے لگا لیں۔

وہ بے اختیار سی کیفیت میں گیسٹ روم کے دروازے تک چلی آئی تھی، اس احساس سے بے خبر کہ کسی نے اسے اس طرف آتے ہوئے دیکھ نہ لیا ہو۔

اس نے دروازہ ٹاک کیا۔

کوئی آواز سنائی نہ دی، اس نے دروازہ دوبارہ ٹاک کرنا چاہا، ابھی ہاتھ فضا میں ہی تھا کہ دروازہ کھل گیا۔ تیمور علی خان کو درحقیقت شاک لگا تھا۔

”اندر آنا چاہتی ہوں“ اس نے نگاہوں میں نگاہ جما کر بے خوفی سے کہا۔

”تشریف لائیے“ انہوں نے الجھن بھرے انداز میں ایک طرف ہو کر اسے راستہ دیا۔ وہ اندر چلی آئی اور پلٹ کر خود دروازہ بند کیا بلکہ مٹن پش کر کے لاک لگا دیا۔ تیمور علی خان اس کی ایک ایک حرکت دیکھ رہے تھے۔ ”بیٹھ سکتی ہوں؟“ اس نے اجازت طلب کی۔

”اوہ شیور۔ فیک یور سیٹ پلیز“ انہوں نے بہت مہذبانہ انداز میں صوفے کی طرف اشارہ کیا۔ چہرے پر الجھن کے آثار ہنوز تھے۔

”میں غیر ضروری تمہید میں نہیں الجھتا چاہتی اور اصل بات کرنا چاہتی ہوں“ اس نے سنجیدگی سے کہا اور ان کی سمت دیکھنے لگی۔

”پلیز آپ بھی تشریف رکھیے۔ اس طرح مجھے بات کرنے میں دشواری ہوگی“

تیمور علی خان ایک طرف ایک بیڈ پر بیٹھ گئے، بے تابی ان کی نظروں سے پھٹکنے لگی تھی۔

”ایک درخواست ہے آپ سے“ وہ کہتے کہتے رک گئی۔

”جی فرمائیے“..... بے قراری سوا ہونے لگی۔

”آپ مجھے میری بہن سے فون پر بات کرنے دیجئے، اگر میں ان سے ملنا چاہوں تو مجھے ملنے دیجئے پلیز“

تیمور علی خان اس کی طرف یوں دیکھ رہے تھے گویا سماعت کا دھوکا ہو رہا ہو۔

”جی۔ بہن۔ آپ“ ان کے پاس جیسے الفاظ ختم ہو گئے وہ رک گئے۔

”جی میری حقیقی“ میری بے گناہ اور محروم بہن۔ وہ بیس سال سے غلطی کر رہی ہیں، آپ ان کی غلطی میں ان کا ہاتھ بنا رہے ہیں۔ آپ۔ صرف آپ ہی تو انہیں سمجھا سکتے تھے، کتنی زیادتی کی ہے آپ نے بچوں کے ساتھ، اس کی آواز بھرانے لگی۔

تیمور علی خان کی گویائی سلب ہو گئی۔ وہ اس کی جانب بغور دیکھ رہے تھے۔ کتنی شباشتھی اس میں نازنین کی، جب ہی تو ایک لمحے کیلئے بھی اجنبی محسوس نہیں ہوئی تھی۔

”بیس سال بعد اچانک حویلی والوں کو کیا ہو گیا؟ آپ کے ساتھ یہ مہربانی کس نے کی، خیر۔ اگر آپ ان سے مل بھی لیں تو کیا ہوگا۔ وہ خود تو کسی سے ملنا نہیں چاہتیں“ تیمور علی خان بہت ٹھہر ٹھہر کر بول رہے تھے۔

گرے ٹائٹ سوٹ پر سلور پرنٹ کا گاؤن پہنے گہری سوچوں میں گرفتار وہ آج بھی اتنے جاذب اور حسین نظر آ رہے تھے جتنا بیس سال پہلے مطربہ کے ہوش اڑانے کیلئے تھے۔

”ان کا چاہنا چھوڑیے، میرے چاہنے پر توجہ فرمائیے۔ ماہین بے ساختہ کہہ رہی تھی۔

”ہماری will کوئی معنی نہیں رکھتی۔ ہم آپ کی خواہش ان تک پہنچا دیں گے اور جو بھی ان کا جواب ہوگا آپ تک پہنچ جائے گا۔“

”خواہش نہیں پہنچائیں گے۔ اصرار کریں گے ان سے۔ پریشاں کریں گے ورنہ میں خود سرائے پہنچ جاؤں گی۔ چاہے روٹی کے پیانے مجھے ہمیشہ کیلئے چھوڑ دیں“ ماہین کا انداز قطعاً جذباتی تھا۔

”ہم نے کہا ناں۔ ہم انتہائی کوشش ضرور کریں گے۔ آپ کو اطلاع ہو جائے گی۔ انہوں نے قدرے پرسکون انداز میں کہا“ حویلی میں کسی کو معلوم ہے آپ یہاں ہیں؟ وہ قدرے ہچکچاتے ہوئے پوچھ رہے تھے۔

”نہیں، اس لئے کہ حویلی میں کسی کو یہ بھی پتہ نہیں کہ مجھے معلوم ہے۔ ناز بجا الحمد للہ زندہ ہیں“ اس نے بڑے سکون سے جواب دیا۔

تیور علی خان چونک پڑے ”پھر آپ کو کیسے پتہ چلا؟“ ان کی حیرت بجا تھی۔

ماہین مسکرا کر اٹھ کھڑی ہوئی ”کیا کریں گے جان کر۔ اور پھر فائدہ بھی کیا“

”ہم آپ سے ایک بات کہیں غور ضرور کیجئے گا“ تیور علی خان بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔

”جی فرمائیے“ ماہین نے قدم روک لئے۔

”زندگی نئے موڑ لے چکی ہے ہر تبدیلی پرانی ہو چکی ہے، تسلسل اسی طرح رہنے دیجئے“ نئے اقدامات سے صرف متی اثرات ہوں گے۔ اگر کچھ ہوا بھی تو یہ کہ نقصان کی فہرست طویل ہو جائے گی“

”شکریہ میں ضرور غور کروں گی“ اس نے گہری سوچ میں ڈوب کر جواب دیا اور دروازہ کھول کر باہر آگئی تھی۔

یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے بہت دنوں سے کوئی بوجھ اٹھائے پھر رہی تھی وہ آج تھوڑا سا اتر گیا تھا۔

”مہندی لگانے میں تو خالہ سولہ آنے ماہر تھیں خود بھی مہندی لگانے اور پھول پہننے کی بہت شوقین تھیں، اماں جی کہتی تھیں توبہ سولہ آنے تو ہر وقت چوتھی کی دہن بنی رہتی ہے۔ انہوں نے کبھی مرتے دم تک یہ حقیقت تسلیم نہیں کی کہ وہ بیوہ ہیں۔ ان کا خیال تھا کہ اس کے شوہر فسادات میں لاپتہ ہو گئے ہیں اور ایک روز انہیں ڈھونڈتے ہوئے حویلی میں آ پہنچیں گے۔“

”رنگ اتنا نہیں چڑھا جتنا مہندی کی تعریف تھی“ تزئین گلو کے مہندی سے رچے ہاتھ دیکھ کر تمبرہ کر رہی تھیں۔

”انہیں خالہ سولہ آنے کیوں کہتے تھے۔“ ایک روپیہ“ کیوں نہیں کہتے، بی بی اماں“ تانیہ نے آج پوچھ ہی لیا۔

تزئین کی ہنسی چھوٹ گئی ”بھئی ان کا تکیہ کلام تھا سولہ آنے۔ جانے کس نوکرانی نے انہیں مذاق میں سولہ آنے کہا شروع کیا پھر تو سب ہی انہیں چھیڑتے تھے۔ انہوں نے تو تکیہ کلام ترک کر دیا مگر لوگوں نے یہ ان کا نام ہی رکھ چھوڑا۔ سب لوگ مذاق میں کہا کرتے تھے مگر اماں جی تو بڑی سنجیدگی سے انہیں سولہ آنے کہتی تھیں۔

کوئی ایسی عمر بھی نہیں تھی۔ برسات کے موسم میں انہیں ڈاڑیا ہو گیا تھا وہی موت کا بہانہ بن گیا۔

یوں بھی اماں جی کی رحلت کے بعد وہ بہت غمگین رہنے لگی تھیں۔ بہت محبت کرتی تھیں اماں جی سے اور اماں جی کو بھی بہت لگاؤ تھا ان سے۔ ہمیشہ ہمیں تاکید کی کہ خالہ کا احترام کریں انہیں نوکر نہ سمجھا جائے، مگر کافر دسمجھیں، حویلی کی شادیوں میں ان کا بھرپور رول ہوتا تھا۔ اللہ جانے کیا کیا ملا تھیں انہیں مہندی میں۔ مایوں کے بعد مہینوں دہن کے وجود سے خوشبوئیں پھوٹی رہتی تھیں“ تزئین بڑی افسردگی سے خالہ سولہ آنے کا ذکر کر رہی تھیں۔

”گمانے بھی وہ گاتی تھیں کہ بس۔ بڑی رونق تھی ان کے دم سے حویلی میں۔ گلو ایک دفعہ اور لگا دوں مہندی۔ ر۔۔۔ درتیز ہو جائے گا“ انہوں نے گلو سے کہا۔

”رہنے دیں بی بی جان۔ بس ٹھیک ہے“ وہ سر جھکا کر دھیرے سے گویا ہوئیں۔

”اور کیا بی بی جان۔ کیوں بے چاری گلو آپا کو باندھ کر بٹھائیں۔ کون سا رخصتی ہو رہی ہے“ مونانے کہا۔

”کا کا جان آئے تھے کیا چلے گئے ہیں بی بی جان؟“ زری نے پوچھا۔

”لو تقریب اٹینڈ کئے بغیر کیسے چلے جائیں گے“ مونانے تعجب سے پوچھا۔ تزئین خاموش رہیں۔

”ہو بھی سکتا ہے وہ کب امپورٹینس دیتے ہیں حویلی کو۔ بالکل دور کے مہمان محسوس ہوتے ہیں۔ بہت ہی سنجیدہ ہیں۔

نہیں کیوں ان سے اتنا ڈر لگتا ہے بابا صاحب سے بھی زیادہ“ روبی نے بھی حصہ لیا۔

تزئین ہنوز خاموش تھیں۔

”یاد رہا میں اتنے اچھے ہیں پھر پتہ نہیں کا کا جان سے ان کی ان کیوں ہے؟ آج تک کسی نے بتایا نہیں جس سے

بھی پوچھ بیٹھو ڈانٹنے لگتا ہے“ بیہ نے منہ بسور کر کہا۔

”ہاں تو پھر بچوں کا کیا واسطہ۔ کوئی ضروری ہے بچوں کو ہر بات بتائی جائے؟“ اس مرتبہ تزئین نے ٹوک دیا کہ بات

ملات اختیار کر رہی تھی۔

لوکیاں تزئین کا آف موڈ دیکھ کر خاموش ہو گئیں۔ اگرچہ ان کے لئے نئی بات نہیں تھی جب بھی کبھی وہ اس موضوع پر

آتی تھیں انہیں اسی طرح ٹوک دیا جاتا تھا۔

”گلو تم ایسا کرو نہ لو۔ پھر تمہیں چوڑیاں بھی پہنانا ہیں، تمہیں چوڑیاں بہت مشکل سے چڑھتی ہیں“ تزئین جیسے کسی

پہانے سے وہاں سے اٹھ جانا چاہتی تھیں۔

”چوڑیاں تو ہم سب نے بھی پہنا ہیں بی بی جان۔ روز کل کل کرتے آج کا دن آپہنچا“ بیہ نے یاد دلایا۔

”میرے خدا۔ وہ اتنے چوڑیوں کے جوڑ میر پڑے ہیں۔“ تزئین نے گویا سر پیٹ لیا۔

”وہ تو سب پرانی ہیں اتنی اہم تقریب ہے کیا پرانی پہنیں گے؟“ وہ بسور کر بولی ”آپ چلیں ناں ہمارے ساتھ امی

سے کہہ دیں ورنہ وہ بھی آپ کی طرح کہہ دیں گی کہ وہی پرانی پہن لو“ روبی نے جیسے خوشامد کی۔

”اچھا ٹھیک ہے دیکھتی ہوں۔ ماہین کو کہتی ہوں وہ تم لوگوں کے ساتھ چلی جائیں گی، ایک تو ابھی تک منہ سے ماہین نکل

جاتا ہے بھابھی لکھتا ہی نہیں“

”حالانکہ سولہ آنے بھابی ہیں“ زری شرارت سے بولی۔

”ہاں اب تم خالہ کی جگہ سنبھال لو“ تزئین مسکرا کر باہر نکل گئیں۔

”ارے روشی کو تو دیکھو۔ اسے نہ بھول جانا ورنہ موڈ آف کر کے ساری تقریب کا ستیا ناس کر دے گی۔“ زری نے توجہ

دلائی۔

”ابھی جاتی ہوں۔ اس کے بغیر کیا مزا آئے گا“ بیہ بھاگ کر باہر نکل گئی۔

تھوڑی دیر بعد اعلان ہوا کہ باہر گاڑی تیار کھڑی ہے لڑکیاں تو جیسے خوشی سے دیوانی ہو کر چادریں اوڑھ کر باہر

برائیں۔

روش اور روبی باہر آئیں تو گاڑی کچھا کچھ بھر چکی تھی۔ البتہ ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ ابھی خالی تھی۔ وین میں اچھی

فلمی گنجائش تھی مگر لڑکیاں بھی تو تقریباً ساری تھیں۔ شیو اور گلو کے علاوہ۔

”تم دونوں آگے بیٹھ جاؤ“ ماہین نے پرس سے گلاسز نکال کر چادر سے صاف کرتے ہوئے کہا۔

وہ اگلا دروازہ کھول کر بیٹھ گئیں۔ ”ذرا ٹھیک سے بیٹھو میں تو گیس پر ہی چڑھ گئی ہوں“ روشی نے روبی کو ٹوکا۔
 ”ذرا احتیاط سے کہیں ڈرائیور کی گود میں نہ چڑھ جانا“ پیچھے سے ایک شرارتی آواز آئی۔
 ”کوئی بات نہیں اگر ڈرائیور گل شیر ہے تو چلے گا۔ بچے بڑوں کی گود میں بیٹھ سکتے ہیں“ روشی نے بھلا ہارنا سیکھا تھا۔
 اسی شور شرابے میں پتا ہی نہ چلا۔ بلیو جینز پنک شرٹ میں ملبوس آنکھوں پر ڈارک گلاسز چڑھائے باری ڈرائیور کی گود میں بیٹھ کر روشی کی طرف کا دروازہ کھول رہا تھا۔ تقریباً ایک ساتھ ہی سب کی نظر پڑی تھی۔ سب ہنس ہنس کر لوٹنے لگیں۔
 ”روشی یہ کیسا ڈرائیور ہے؟“ پیچھے سے مونا کی آواز آئی۔ روشی تو پہلے ہی جڑ بڑھ رہی تھی۔ اتنی زور سے پہلو بدل کر روبی کی طرف ہوئی کہ روبی بلبلا کر رہ گئی۔

”دورازہ کھول کر پاؤں لٹکا کر بیٹھ جاؤں؟“ وہ جھلائی۔

”کوئی مضائقہ نہیں یہ کوئی پلین نہیں کہ ایر پریش سے حادثے کا خطرہ ہو“ پیچھے سے پھر حنا نے گرہ لگائی تھی۔
 چوکیدار گیٹ وا کر کے منتظر کھڑا تھا۔ باری نے گاڑی تیزی سے بیک کی اس پر گویا لڑکیوں کے جملے بازی کا مطلق اثر نہیں تھا۔

باری نے کچے سے گاڑی گزار کر ٹیپ ریکارڈ آن کر دیا تھا بہت دھیمے سروں کی غزل تھی۔ آواز بھی بہت آہستہ تھی۔
 ”باری آواز تو تیز کر دو“ کیا صرف روشی روبی کو سن رہی ہے ہو“ مونا نے باری کو ٹوکا۔

”نہیں میں خود سن رہا ہوں بابا صاحب کو پتہ چلا کہ لڑکیوں کو غزلیں سناتا ہوا بازار لے گیا تھا تو کورٹ مارشل ہو جائے گا میرا۔“

”تو پھر روشی روبی کو روٹی لے دو اپنے کانوں میں ٹھونس لیں گی“ کچھ نہ کچھ تو دونوں سن ہی رہی ہوں گی“ لالی نے جیسے جمل کر کہا۔

”کیا خیال ہے؟“ اتنی دیر میں پہلی بار براہ راست باری نے روشی کو مخاطب کیا۔

روشی کی آنکھوں میں پانی اتر آیا، غلطی میری ہی ہے میں نے اسے خواہ مخواہ میں اہم بنا دیا ہے، اتنے مضبوط تعلق کے باوجود اس کی کوئی فیلنگز نہیں ہوتیں۔ پہلے سے بھی زیادہ دور اور اجنبی ہو گیا ہے۔

زندگی یوں تھی کہ جینے کا بہانہ تو تھا

ہم فقط زیب حکایت تھے فسانہ تو تھا

سلی آغا کی آواز میں فراز کی غزل کے اشعار سماعت سے نکل رہے تھے روشی نے ہاتھ بڑھا کر ٹیپ آف کر دیا۔

”بند کر دیا۔ کیوں بھی؟“ پیچھے جینے کا شروع ہو گئی۔

”روشی کو غزل پسند نہیں آئی“ روبی نے اطلاع پہنچائی۔

”چلو باری تم خود ہی کچھ گنگنا تے چلو“ ماہین نے کافی دیر میں لب کشائی کی۔

”ممبئی ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ روشی کی یہی سزا ہے“ لالی بولی۔

”منظور ہے؟“ باری نے لمحے بھر کو چہرہ اس کی طرف موڑا۔

”بات نہیں کرو مجھ سے“ وہ غرائی۔

”لڑائی ہو رہی ہے ممانی“ روبی نے پیچھے اطلاع پہنچائی۔

”دوران ڈرائیورنگ ڈرائیور سے لڑائی روز اینڈ ریگولیشن کیخلاف ہے، پیئرز زندہ بچے تو انشاء اللہ رٹ دائر کریں

م۔“ لالی نے قانون کے تحت بات کرنا مناسب سمجھا۔

”بہت مطلبی دنیا ہے مطلب نکل جائے تو لوگ پہچاننے سے ہی انکار کر دیتے ہیں“ باری نے اتنی آہستگی سے کہا کہ

صرف روشی ہی سن سکے۔

اس کا بھی تو بھڑاس نکالنے کے چاہ رہا تھا مگر سب شیطان کی خلائیں اس طرف متوجہ تھیں، وہ خون کا گھونٹ پی کر رہ گئی۔

زرد کی شہر کا بازار آ بھی گیا، نوک جھونک میں پتہ بھی نہ چلا۔

وہ سب بڑی سرخوشی کی کیفیت میں اتر رہی تھیں۔ ماہین چاہنے کے باوجود اپنا موڈ خوشگوار نہ کر پا رہی تھی۔ بس رات

ہی کا منظر آنکھوں کے سامنے گردش کئے جا رہا تھا۔ اسے بہت سے ملال تھے کہ اس نے یہ نہیں کہا وہ نہیں کہا، اسے یہ بھی کہہ دینا

چاہئے تھا، اسے وہ بھی کہہ دینا چاہئے تھا۔ روبی اتری تو وہ بھی کھسکنے لگی۔

مگر جیسے جان نکل کر رہ گئی۔ باری نے گیس سے ہاتھ ہٹا کر اس کا ہاتھ تھام لیا تھا، اور اتنی مہارت سے کہ باہر کھڑے کسی

فحص کی نگاہ اس کی اس حرکت پر نہیں پڑ سکتی تھی۔

روشی تو دم بخود بیٹھی رہ گئی تھی۔

باری کے وجود سے اٹھتی ہوئی دھیمی سی مہک اسے آنچ کی طرح محسوس ہونے لگی۔ اس کے ہاتھ کی گرمی سے روشی کا وجود

سنگٹے لگا۔

”بہت رش ہے گھر میں۔ میں آپ سے بہت سی باتیں کرنا چاہتا ہوں“ میرا دل بہت ضبط کر چکا، بہت ہو گئی، اگر آپ

رات کو میرے کمرے میں نہیں آئیں تو حویلی چھوڑ کر چلا جاؤں گا“ اس کی سرگوشی کرتی آواز سے اس کے اوسان خطا ہونے

لگے۔

”میں ہی ملا ہوں بے وقوف بنانے کیلئے“ وہ کہہ رہا تھا۔

”میرا ہاتھ چھوڑو۔ یہ کیا طریقہ ہے“ خوف، جھک، غصہ، جانے کیا کیا تھا اس کے لہجے میں۔ ”سب ادھر دیکھ رہے ہیں“

”دیکھنے دیں۔ میں خود چاہتا ہوں دیکھ لیں قصہ تمام ہو۔ تخت ہو یا تختہ۔“

”میں کا کا جان سے کہہ دوں گی“ اس کے حلق میں کانٹے پڑنے لگے تھے۔

”انہوں نے ہی تو یہ ہاتھ ہاتھ میں دیا ہے“ اس نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔

”اللہ بس ختم کر دے“ یہ نے قریب آ کر کچھ متعجب اور غصے سے ان کی طرف دیکھا۔

”روشی بی بی کا دوپٹا پھنس گیا ہے ہینڈ بریک میں آپ لوگ اتنے برے گمان کیوں کرتے ہیں۔“

اس کا ہاتھ ہٹتے ہی جیسے روشی کی جان میں جان آگئی۔ وہ تیزی سے گاڑی سے اتر گئی تھی۔
 ”چڑھی بھی تو بیٹھی تھیں پنڈر یک پر“ بیہ کو مزید دیر ہونے پر کوفت ہو رہی تھی، جل کر بولی تھی۔

روشی نے دو پٹہ سر پر اوڑھا، چادر شانوں پر سیٹ کی۔ ابھی تک اس کی حالت غیر تھی، جلدی میں گلے میں پڑا دو پٹہ اتارنا بھول ہی گئی تھی، اسی پر چادر اوڑھ لی تھی اور اب گاڑی سے اتر کر دونوں کا استعمال طریقے سے کر لیا تھا۔ تھوڑی دور کھڑی مابین بہت غور سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس نے یہ بات خصوصی طور پر نوٹ کی تھی کہ روٹی کے اتر جانے کے باوجود روشی کا انداز نشست ہنوز تھا ورنہ بڑی فطری سی بات ہے۔ دو افراد اگلی سیٹ پر بیٹھے ہوں تو ایک کے اتر جانے کے بعد دوسرا فوراً ایزی ہونے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ اسی طرح باری کے بالکل قریب بیٹھی ہوئی تھی، اس نے روشی کے ہلے ہوئے ہونے بھی دیکھے تھے جس سے واضح ہوتا تھا دونوں کے درمیان بات چیت ہو رہی ہے۔ وہ بس اتنا دیکھ کر رخ موڑ کر کھڑی ہو گئی۔
 نکاح تو عصر مغرب کے درمیان ہو گیا تھا، مہمان کچھ زیادہ نہیں تھے، زیادہ تر گھر کے افراد اور جاگیر کے اہم کارندے تھے۔ مابین کو اس بات کی بے چینی تھی کہ آیا تیمور علی خان اور یاور علی خان محفل میں اکٹھے موجود ہیں یا نہیں؟ اس نے چلے بہانے سے کھوکھر (ملازم) سے دریافت کیا تھا مگر اس نے صرف تیمور علی خان کی موجودگی کی اطلاع دی تھی، یاور علی خان کے بارے میں لاعلمی ظاہر کی تھی۔

وہ اپنے بیڈروم میں بھی نہیں تھے، فکر کی بات تو تھی کہ پھر کہاں ہیں۔ وہ بہت مضطرب سی تھی، اپنے اضطراب کی وجہ تو اسے خود بھی معلوم تھی، وہ اوپر چلی آئی اور بالکنی میں کھڑی ہو کر باہر کا جائزہ لینے لگی۔ بہت سے لوگ باغ میں بیٹھے اور چلے پھرتے نظر آرہے تھے۔ اسے تو تیمور علی خان بھی دکھائی نہیں دیئے، صرف پچانک کی طرف کھڑا ہوا باری نظر آیا، وہ چونک پڑی وہ آج پہلی مرتبہ اسے پینٹ کوٹ میں نظر آیا تھا۔ سیاہ ڈنر سوٹ، سرخ اور سیاہ دھاریوں والی ٹائی کوٹ کو اوپری جیب سے جھانکتا سرخ رومال دور سے خوبصورت پھول محسوس ہو رہا تھا۔ مصور اور فاران سے ہنس کر باتیں کر رہا تھا۔ تھوڑے فاصلے پر جواد بڑے ابا کے ساتھ بڑی سنجیدگی سے محو گفتگو تھا۔

پتہ نہیں روشی کی نظر باری پر پڑی کہ نہیں۔ آج تو نیا ہی رنگ ہے۔ یونہی بے ساختہ اسے خیال آیا تھا اور اپنے خیال پر وہ خود ہی چونک کر مسکرا دی تھی۔ معاً اسے پیچھے قدموں کی چاپ سنائی دی۔

اس نے صرف گردن موڑ کر پیچھے دیکھا۔ تیمور علی خان کا رخ اس کمرے کی طرف تھا جو حویلی میں ان کیلئے مخصوص تھا۔ وہ ایک دم پوری گھوم گئی۔

”السلام علیکم۔ مزاج بخیر“ وہ بہت دوستانہ اور مہربان انداز سے مسکرا رہی تھی۔

تیمور علی خان تو جیسے اسے سامنے پا کر الجھن میں پڑ گئے تھے۔ اس پر اس کا پرانے شناساؤں جیسا انداز۔

”مزاج کہاں بخیر؟ رات بھر نہیں سو سکے ہم اتنی پسند آگئی تھی آپ کو حویلی کہ آنا فانا یہیں مستقل قیام کا فیصلہ کر لیا۔ الجھنیں آہستہ آہستہ معدوم ہو رہی تھیں۔ حادثات کا اثر دھندلا رہا تھا۔ آپ نے آکر زخم ہرے کر دیئے۔ یوں محسوس ہوتا ہے ان پاسٹ پر فیکٹ ہماری آپ کی خاندانی دشمنی رہی ہے۔ صدیوں پہلے۔ آپ راکھ کیوں کر پید رہی ہیں۔ اتنی مشکل سے بیٹ

اپ ہوا ہے آپ کیوں آپ سیٹ کر رہی ہیں؟“ تیمور علی خان کے گویا اعصاب جواب دے چکے تھے۔ عجیب سی شکستگی ان کے لہجے میں سج رہی تھی۔

”اگر مجھے یہ سب معلوم ہو گیا ہوتا تو میں حویلی میں آنے کی بجائے بہت آزادی سے وہ سب کرتی جو میں اب کرنا چاہتی ہوں۔ میں یہ جاننے کے بعد کہ میری بہن زندہ ہے اس سے ملے بغیر کیسے رہ سکتی ہوں۔ وہ تو اتنی خالی اتنی تنہا ہیں کہ میرے ضمیر کا تقاضا ہے کہ میں ان کے قریب ہوں۔ وہ مدفن اکھاڑ پھینکیں جس میں وہ خود کو زندہ دفن کر چکی ہیں۔ یاور علی خان کا بت لوٹ چکا ہے۔ اب مصلحتاً ان کے ساتھ تعلق ہے۔ وہ میرے ارادوں میں مزاحم ہوں گے تو میں سرانے کے مدفن سے اپنی بہن کو لے کر کراچی چلی جاؤں گی۔ ایک اپنائیت کے احساس کے ساتھ ایک دوسرے کے آنسو پونچھتے ہوئے عمر کاٹ لیں گے“ ان کا انداز قطعی اور جارحانہ تھا۔

”آپ نقصانات میں ہمارا حصہ نظر انداز کر کے یہ سب کیسے کر سکتی ہیں؟ ہم بھی تو کچھ کر سکتے ہیں؟“ تیمور علی خان نے غمی سے کہا۔

”شیور۔ آپ ضرور کچھ کریں۔ مگر ہمیں بھی کچھ کرنے سے نہ روکیں“ اس کا لہجہ ہر مصلحت سے عاری تھا۔

”آپ کو احساس ہے کہ بچوں پر اس نئے حادثے کا کتنا گہرا اور جان لیوا اثر ہو سکتا ہے؟ یہ آپ کی ہمدردی نہیں اعلیٰ درجے کا ظلم ہے، کیا فائدہ اب ان باتوں سے کیا حاصل ہے؟“

”ظلم تو میری بہن نے کر ہی دیا ہے بلکہ ظلم کی انتہا کر دی ہے۔ آپ مجھے ان سے ملائیں تو سہی تاکہ میں ان کو یہ کہہ سکوں کہ خود غرضی کی کیا اعلیٰ مثال قائم کی ہے اپنی عزت نفس کی حفاظت کیلئے خود کو مار لیا کہ بچے ان کو غلط نہ سمجھیں۔ ابھی تک سوائے بچوں کے بھپ کے کسی نے انہیں غلط نہیں سمجھا۔ آپ نے بھی نہیں۔ تو پھر بچے کیسے غلط سمجھ لیتے؟ حویلی والوں کا آج تک جو ان کے ساتھ رویہ ہے بابا صاحب سمیت کیا بچوں کے اطمینان کیلئے یہ کافی نہیں تھا۔ یاور علی خان غلط ہو کر شملے میں بھندے لٹکا کر پھر رہے ہیں اور بچے اپنے باپ کو اتار سمجھ بیٹھے ہیں۔ میری بہن صحیح ہو کر محروم ہے جو غلط ہے۔ وہ غلط سمجھا جائے۔ جو صحیح ہے وہ صحیح سمجھا جائے۔ ضمیر کی آواز تو ہی ہونا چاہئے۔ یاور علی خان نے زیادتی کی ہے ان کا چہرہ زیادتی کا چہرہ ہونا چاہئے۔ کیوں سجا رہے ہیں حویلی والے ان کے سینے پر اسٹارز۔ وہ اس کے بالکل مستحق نہیں ہیں“ وہ جیسے پھٹ پڑی تھی۔

ہمارے ساتھ تو جو ہوا یعنی ہم سب کے ساتھ اس میں مزید اضافہ ہو جائے گا مگر آپ کیوں بلا وجہ آگ میں کود رہی ہیں؟ کوئی فائدہ دور دور نظر نہیں آ رہا سوائے آپ کے نقصانات کے۔ غور کیجئے ہماری بات پر“ تیمور علی خان سپاٹ لہجے میں گویا ہوئے۔

آپ ہمیں ان سے ملائیے تو سہی، نفع نقصان بھی ملے ہو جائیں گے۔ آپ کو میری ذہنی اذیت کا اندازہ ہے؟ میں اپنے وطن میں بالکل تنہا ہوں جبکہ میری سگی بہن موجود ہے، میں یہ حقیقت کیسے نظر انداز کر دوں؟ اس کی آواز بھرا گئی۔

تیمور علی خان چند ثانیے کیلئے خاموش کھڑے رہے۔

”ہم تو آپ کے لیے کا نشس ہو رہے ہیں۔ ورنہ ہم تو متاثرین کے گروپ میں آل ریڈی شامل ہیں۔“ ان کے انداز سے گنجائش چھلکنے لگی تھی۔

”دوسری بات یہ کہ ہم اپنے ساتھ آپ کو سرائے کیسے لے جاسکتے ہیں۔ جب تک وہاں آپ کا تعلق قائم ہے۔ آپ آزاد نہیں ہیں۔ اور آپ نے کیا سوچا ہے ہمیں اس کا اندازہ نہیں ہے تیمور علی خان نے فیروزی کتان کی ساڑھی میں لمبوس بھاری زیورات سے آراستہ ماہین کی سمت ایک اچھتی نگاہ ڈالی تھی۔

”میں کراچی چلی جاؤں گی کچھ دن کے لیے آپ بچو کو وہیں لے آئیے گا؟“ اس نے بہت خوش ہو کر تیمور علی خان کی سمت دیکھا تھا۔

”اگر وہ رضا مند نہیں ہوں گی؟“ تیمور علی خان نے امکان ظاہر کیا۔

”اف اتنی پتھر ہو چکی ہیں۔ بچو۔“ ماہین نے بڑے دکھ سے بے ساختہ کہا تھا۔

”تو پھر میں وہاں سے ڈائریکٹ سرائے خود پہنچ جاؤں گی۔“ اس نے فوراً دوسرا راستہ بتا دیا تھا۔

”بولڈلی میں آپ کے ساتھ یہاں سے بھی جاسکتی ہوں۔ مگر یہاں بہت خوفناک زلزلے کی کیفیت پیدا ہو سکتی ہے۔ جب ایک کام سکون سے ہو سکتا ہے۔ تو بلاوجہ کی ٹینشن کری ایٹ کرنے کا کیا فائدہ۔ سکون ہو گا تو ہو سکتا ہے کچھ بیفٹ ہاتھ لگ جائیں۔ یوں بھی ٹینشن ہو تو پوزیٹو پاور زیر ہو جاتی ہے۔ اس تعاون کے لیے میں ہمیشہ تھینک فل رہوں گی۔ آپ کی۔“

اس کے سر سے گویا بہت بڑا بوجھ سرک گیا تھا۔ وہ بہت پرسکون دکھائی دے رہی تھی۔

”اب بھی نہیں بتائیں گی کہ حویلی میں کون آپ کا راز دار نگہسار پیدا ہو گیا ہے۔“ تیمور علی خان کے ذہن میں اس سوال کی پھانس اپنی جگہ تھی۔

”بتا دیں گے پھر کسی اچھے وقت میں۔“ وہ مسکرائی۔ ماضی کی تمام کہانیوں کے رنگ وہ تیمور علی خان کے وجود میں دیکھ رہی تھی۔

معاں اس کی نگاہ سامنے زینے کی طرف پڑی۔ یادوری علی خان آخری اسٹیپ سے واپس پلٹ رہے تھے۔

ایک لمحے کو تو جیسے وجود یکدم بے روح ہو گیا۔ اچانک پہنچنے والے شاک کے سبب اس کا منہ تھوڑا سا کھلا ہوا تھا اور پلکیں جھپکنا بھول گئی تھی۔ تیمور علی خان اس کی یہ کیفیت دیکھ کر پیچھے مڑ کر دیکھنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ اتنی دیر میں مگر یادوری علی خان زینے کے اگلے موڑ پر گم ہو چکے تھے۔

”کون تھا؟“ انہیں یکدم اپنی غلطی کا احساس ہوا کہ وہ عین درمیان میں کھڑے ماہین سے گفتگو کر رہے تھے۔ باری نے تو انہیں بتایا تھا کہ یادوری علی خان خیر آباد گئے ہوئے ہیں تو پھر ماہین نے کس کو دیکھا

”یادور صاحب۔“ ماہین کے منہ سے بمشکل آواز نکلی۔

”اوہ۔“ تیمور علی خان نے فکر مندی سے ماہین کا چہرہ دیکھا۔

”وزن میٹر۔ آپ فکر نہ کریں۔ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ اوکے۔ پھر میں آپ سے کوئٹ کروں گی اور کراچی والا شیڈول آپ سے ڈسکس کروں گی۔“ وہ کھٹ کھٹ کرتی زینے کی سمت بڑھ گئی۔

تیمور علی خان کی پیشانی پر تنگ کی لکیریں واضح ہو رہی تھیں۔

انسان کا کوئی ہمارا دوست ہو تو وہ پیٹ میں درد کرنے والی بہت سی باتیں کر کے ہلکا ہو جاتا ہے۔ اس کی تو یہ مشکل تھی کہ کسی سے اشارے کنائے تک میں کوئی ذکر نہیں کر سکتی تھی۔ البتہ شیو کو دیکھ کر دل چاہا کہ کہہ دے۔

آپا۔ ہو گیا ہے وہ سب کچھ جس کے اندیشوں سے آپ لرزتی رہتی تھیں۔ اب میں آپ کو بتاؤں کہ آج دوپہر اس نے کیا۔ پھر میں یوں ہو گئی۔ آپ بتائیں اس سے ملنے جاؤں یا نہیں۔ آفر آل وہ میرا شوہر ہے۔ بڑا غیر مشکوک اور مضبوط کالج ہے۔ میرا۔ میرے سگے چچا نے کرایا ہے۔ میں نے دل و جان سے ہاں کی ہے۔

مگر آپا۔ کہیں یہ سب سن کر تم ہیرا نہ چاٹ لو طیش میں آخر۔ وہ حویلی میں یہاں سے وہاں تک یونہی بے مقصد گھوم رہی تھی۔

عجیب عجیب سے خیالات کی یلغار تھی۔

اس کے ہاتھ کی گرمی ابھی تک ہاتھ میں تھی۔

یہ تو بہت خراب ہے۔ لگتا تو نہیں ہے ایسا۔ یعنی ہم خود سے ان کے پاس ہوں تو انہیں ہری ہری سوچنے لگے۔ کبھی خود سے زرد کیا کہ میرا حال پوچھ لیا جائے۔ میں کیوں جاؤں؟ قیامت تک نہیں وہ جیسے خواہش اور رانا کی جنگ میں پھنس گئی تھی۔ ہونہو اب صاحب۔ گھوڑے دماغ سے اتر گئے تو بھولے بھٹکے میرا خیال آ گیا۔ مجھے تمہاری توجہ چاہیے باری تمہارے وجود سے اہم تمہاری توجہ ہے۔ تمہارا خلوص تمہاری شدت۔ میں تمہیں چاہوں یا نہ چاہوں۔ مگر تم صرف مجھے چاہو۔ جب تک مجھے تمہارے خلوص اور انتہائی توجہ کا یقین نہیں آ جاتا۔ میں یونہی بے کل بے زار پھرتی رہوں گی۔ ہو سکتا ہے مر ہی جاؤں۔ ایک دم ہی دل بھر آیا۔

”بھئی پلاؤ پک رہا ہے یا کچھڑی؟“ شیو جانے کب سے کچن میں اور کیوں تھیں۔ غالباً وہیں سے راہداری میں نمودار ہوئی تھیں۔

”کچھڑی آپ پکائیں ہمیں تو پلاؤ پسند ہے۔“ اس نے جی بنی شیو کو پر شوق نگاہوں سے دیکھا لائٹ پنک حیدر آبادی لڑکس میں وہ آج درحقیقت بہت اچھی لگ رہی تھیں۔

”خیریت۔ اکیلے بالکل تنہا۔ کوئی بات ہو گئی ہے؟ وہ اسے نظروں میں تو لے لگتیں۔“

”نہیں ویسے ہی۔ بیٹھے بیٹھے تھک گئی تھی۔“ وہ زبردستی مسکرائی۔

”بتائیں کیوں بہت الگ تھلگ محسوس ہونے لگی ہو۔ پہلے تو یہ تھا کہ تمہاری شادی زبردستی ہو رہی تھی اب تو سنا ہے۔ بابا صاحب نے بات ختم کر دی ہے۔ اب تو تمہیں خوش رہنا چاہیے۔ پھر اب کیا ہوا؟“ وہ جیسے کچھ اگوانے کے درپے تھیں۔

”کچھ نہیں۔“ اب وہ انہیں کیا کہتی۔

”ماہین ممانی تو تمہاری سگی خالہ ہیں۔ دوستوں کی طرح ہیں کوئی بات ہے تو ان سے کہہ دو۔“ انہوں نے غصے سے منہ مڑا دیا۔

روٹی نے چونک کر ان کی صورت دیکھی۔ آج تو بڑی خیر خواہ محسوس ہو رہی تھیں۔

”کوئی بات نہیں ہے شیوہ آپا۔ آپ گید رنگ انجوائے کریں۔ میں بھی آتی ہوں۔ شیوہ اپنی خیر خواہی کے باوجود اسے بہت بھاری محسوس ہو رہی تھیں۔

”فرنگولا نزلے لو کوئی۔ ڈپریشن کم ہو جائے گا۔“ وہ جاتے جاتے پھر مشورہ دے گئیں۔

اس نے کچھ دیر قبل یاور علی خان کو باہر جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ جانے کیا یاد آ گیا تھا۔ کچھ طبیعت اس وجہ سے بھی اداں تھی۔ وہ غیر ارادی طور پر ٹپٹنے ٹپٹنے ان کے کمرے کے سامنے آکھڑی ہوئی تھی۔ دروازے کے ہینڈل پر دباؤ ڈالا تو وہ کھل گیا۔ اس نے سر اندر کر کے جھانکا تو بہت سی ملی جلی خوشبوؤں کے جھونکے اس تک آئے۔ کچھ دیر پہلے ماہین تیار ہوئی تھی۔ یہ خوشبوئیں اسی تیاری کی گواہ تھیں۔

سامنے سائیڈ ٹیبل پر یاور علی خان اور ماہین کی شادی کی تصویر بڑے خوبصورت فریم میں بھی ہوئی تھی۔

وہ کشاں کشاں اندر چلی آئی اور تصویر اٹھا کر دوپٹے سے صاف کرنے لگی۔

”بہت اچھی لگ رہی ہیں آپ پیارے ساتھ۔ مگر۔ میری امی کی تصویر بھی تو دوسرے کونے پر ہونا چاہیے۔ انسان مٹی کے جسم و فنا دیتے ہیں تصویریں تو نہیں۔ پتا نہیں کیوں محسوس ہوتا ہے۔ امی کی تصویر کی صورت کمرے ہی میں نہیں پنا کے دل میں بھی نہیں ہیں۔“

اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپکے اور فریم کے شیشے پر آ گئے۔ اس قدر زبردست قحط پڑا ہے میری زندگی میں محبت کا۔ بظاہر تو سب ہی محبت کرتے دکھائی دیتے ہیں پھر مجھے یقین کیوں نہیں آتا۔ ایسا لگتا ہے فرض ادا ہو رہا ہے۔ بے اختیاری اور بے ساختگی محسوس نہیں ہوتی۔ وہ جس کو میری وجہ سے رات دیر تک جاگنا چاہئے۔ وہ بھی کام نہ مٹاتے ہی پڑ کر سو جاتا ہے۔ اگر میں اس کی خواہشوں میں ہوں تو وہ میرے پندار کو بار بار نہیں کیوں پہنچاتا ہے۔ نہ مان رکھتا ہے نہ دل۔ آنسو ایک تو اتار سے بہنے لگے۔

جی چاہتا ہے اسے اپنی عظیم جدائی سے آشنا کروں پھر دیکھوں کہ میں اس کی خواہشوں میں کس حد تک شامل ہوں۔

ماحول میں اتنی اجنبیت کیوں ہے۔ حقیقی اور خوبصورت رشتوں کی موجودگی کے باوجود۔

وہ اپنی کیفیات سمجھ نہیں پا رہی تھی۔ حالانکہ یہی ہوتا ہے۔ جب انسان اپنی شدید خواہش کی تسکین کے سارے راستے بند دیکھتا ہے تو غم و اندوہ اس پر غالب آنے لگتے ہیں۔ اور کسی ایک غم کے بہانے جانے کتنے پرانے اور مدفون غم حافظہ کی اسکرین پر نمایاں ہو جاتے ہیں۔ آنسو اس قدر تو اتار سے بہہ رہے تھے۔ کہ اگر اس نے میک اپ کیا ہوتا تو سب دھل جاتا۔

آپ تو باپ ہیں پاپا۔ میری تقدیر کے نامہ وار راستے آپ کے علم میں نہیں آسکتے۔ میرے مزاج کے کچے گھر وندے تو

آپ کی دسترس میں ہیں۔ ہونا چاہئیں۔ ہو سکتے ہیں۔

وہ سوچتے سوچتے چونک پڑی۔ دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی تھی۔

”کون؟“ وہ جلدی جلدی چہرہ دوپٹے سے پونچھنے لگی۔

دروازہ ہلکی سی جھجھک کے ساتھ وا ہوا تھا۔ اس نے گردن موڑ کر آنے والے کو دیکھا تھا۔ چہرے پر رونے والی ماری ملائیں موجود تھیں۔ اس لیے اس نے نیچی نظروں سے دیکھنے پر اکتفا کیا تھا۔ مگر گھبرا کر دوبارہ رخ موڑ لیا تھا۔ سامنے تو ہینڈل پر ہاری کھڑا تھا۔

”اصل میں تو میں یادور خاناں کی تلاش میں آیا تھا۔ مگر آپ کی آواز سنی تو بغیر اجازت دروازہ کھول لیا۔ آئی۔ ایم سوری۔

خیریت سے ہیں آپ؟“ وہ اپنے مخصوص شریر لہجے میں مخاطب تھا۔

وہ بہت احتیاط سے چہرہ پونچھنے لگی کہ سمجھے گا اس کے لیے رو رہی ہوں۔

”میں نے خیریت پوچھی ہے۔“ وہ بھلا باز آنے والا تھا۔

”اپنی خیریت اپنے پاس رکھو۔ باہر بہت لوگ ہیں۔ جا کر پوچھ لو ان کی خیریت۔“ اس کی آواز اس کے آنسوؤں کی چغلی

کھاری تھی۔ باری چونک پڑا تھا۔ دونوں کے درمیان ایک بے معنی سی خاموشی حائل ہو گئی تھی۔

وہ ہنوز پشت کیے کھڑی تھی۔

”کیوں رو رہی ہیں۔ یادور خاناں نے کچھ کہہ دیا۔؟“ وہ سنجیدگی سے پوچھ رہا تھا۔

”جسہیں کیا۔“ وہ تنک کر گویا ہوئی۔

”اب میں آپ کو کیا بتاؤں کے مجھے یہ ہے مجھے وہ ہے۔“ وہ پھر شکستگی کے رنگ میں ڈھلنے لگا۔

”اچھا بس جاؤ۔ دیکھ تو لیا کہ پتا نہیں ہیں ادھر۔“ اس نے آنکھ بچا کر تصویر واپس ٹیبل پر رکھتے ہوئے بڑی بے لیاغی سے کہا۔

”میرا سوال اپنی جگہ ہے کہ کیوں رو رہی ہیں۔ حالانکہ رونا تو گلوبی بی کو چاہیے کہ ان کا نکاح ہو رہا ہے اور نکاح کے وقت فریاد ساری ہی لڑکیاں روتی ہیں اور بعض تو بے ہوش ہو جاتی ہیں۔ جیسے آپ ہو گئی تھیں۔“ وہ بہت شرارت بھرے لہجے میں مخاطب تھا۔

روٹی کا دل دھک سے رہ گیا۔ اتنا اہم موڑ میری زندگی میں آچکا ہے اور یہ میرا سب کچھ ہو چکا ہے تو پھر کچھ محسوس کیوں

نہیں ہوتا۔ صرف ایک گھٹن۔ ایک دکھ۔ اور کچھ کیوں محسوس نہیں ہوتا؟

”خیر مبارک ہو۔ باہر تمام کام بخیر و خوبی انجام پا چکے ہیں۔ آپ اور گلوبی بی ایک کشتی میں سوار ہو چکی ہیں۔ دیکھیں پہلے

لنگ پار اترتا ہے۔ سچ پوچھیں میرا دل تو یہ چاہ رہا ہے پہلے آپ کی کشتی پار لگے۔ اصولی طور پر کہ نکاح پہلے آپ کا ہوا ہے۔

تمہارا کرنا کا حوصلہ کیجئے۔“

”ہاں بس دعا ہی کر سکتے ہو اور کر بھی کیا سکتے ہو۔“ مارے غصے کے وہ اول قول بول گئی۔

خاک کے مول کر رہا تھا۔ وہ قیامت کیا اسے بکھیرنے کو کم تھی کہ نبی اُفتاد آن پڑی تھی۔

وہ خوف کی اس انتہا پر تھی جب احساسات منجمد ہونے لگتے ہیں۔ اور بے حسی نجات کا راستہ دکھائی دیتی ہے۔
”روشانے۔“

”جی پتا!“ بمشکل اس کی آواز نکلی تھی۔

”تم مجھے اپنا فادرادون کرتی ہو یا کوئی شبہ ہے؟“ ان کا لہجہ سرد تھا۔

اس نے دہل کر ان کی صورت دیکھی۔ چھٹی جس نے تو پہلے ہی خبردار کر دیا تھا کہ اب ضرور کچھ ہوگا۔
”میں سمجھی نہیں پتا!“ اس کی آواز لرز رہی تھی۔

”پتا! اس وقت میری بہت بُری حالت ہے۔ آپ اس طرح کی باتیں نہ کریں۔ بس جو پوچھنا ہے پوچھ لیں۔“ اس نے اپنی آواز کی لرزش پر قابو پانے کی کوشش کی۔

”تو پھر تم میرے کچھ پوچھنے کا انتظار نہ کرو۔ خود ہی بتا دو جو بات بھی بتانے والی ہے۔ ورنہ میری شریان بھی پھٹ سکتی ہے۔“

یادِ علی خان کے لہجے میں کوئی اُتار چڑھاؤ نہیں تھا۔ مگر وہ اندر سے کانپ کر رہ گئی۔ بات اتنی بڑی تھی کہ اب اندازہ ہو رہا تھا کہ کیا کچھ ہو چکا ہے۔

”آپ نے اگر باری کی بات سن لی ہے تو پھر یہی ہے کہ آپ جو سمجھتے ہیں وہی ہوا ہے۔“

”انتہا کیا ہوئی؟“ یادِ علی خان نے تیزی سے بات کاٹی تھی۔

روشی خاموش رہی۔ درحقیقت اس کی سمجھ میں یادِ علی خان کا سوال نہیں آیا تھا۔

”تمہاری شادی باری کے ساتھ کرنے کا وعدہ کیا گیا ہے؟ تم نے خود تیمور سے اپنی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ صرف زبانی معاملہ طے ہوا ہے یا عملی طور پر کچھ ہو چکا ہے؟“ بلا کی روانی تھی طرزِ مخاطب میں۔
روشی ہنوز خاموش تھی۔

”روشانے! میرا وقت ضائع نہ کرو۔“ اس مرتبہ وہ برہم ہو کر پوچھ رہے تھے۔

”نکاح ہوا ہے پتا۔“ اس کی جان ٹانگوں کی حد تو نکل چکی تھی۔

کوئی بلاسٹ نہیں ہوا تھا۔ بلکہ ایک ہولناک سناٹا کمرے میں چھا گیا تھا۔

”صرف نکاح ہی ہوا ہے ناں؟“ یادِ علی خان نے خاصی دیر بعد خاموشی توڑی تھی۔ ان کی آواز میں گہری سوچ کا عکس تھا۔

”صرف“ وہ سمجھی نہیں ڈرتے ڈرتے نگاہ اٹھا کر ان کی طرف دیکھا تھا۔

”جی۔ بس نکاح ہوا ہے۔“ اب اسے کچھ تو کہنا تھا۔

”نکاح۔ سرائے میں ہوا تھا۔ میرا مطلب ہے چھوٹی حویلی میں؟“ یادِ علی خان جس قدر سکون انداز میں پوچھ رہے

نہ اسے حیران کرنے کو کافی تھا۔

”جی؟“

”کون کون شریک ہوا تھا؟“ اس مرتبہ ذرا ان کا لہجہ گہری کھوج کی چٹلی کھا رہا تھا۔

”جی بس۔ کا کا جان اور اُن کے دوست تھے۔ بس۔“ خوف سے اس کا دل بیٹھا جا رہا تھا۔

”مگر کی یا باہر کی کوئی خاتون؟“ یادِ علی خان کے انداز میں کچھ ہچکچاہٹ تھی۔

”نہیں تو۔ کوئی خاتون نہیں تھیں۔ کا کا جان کی وائف تو مجھ سے ملیں تک نہیں۔“

اس نے پھر ڈرتے ڈرتے ان کی سمت دیکھا۔ وہ بڑی گہری سوچ میں ڈوبے نظر آئے۔ اور اس کی بات مکمل ہوتے ہی ایک گہرا سانس لیا اور ایزی ہو کر بیٹھ گئے۔

”تم اور کچھ تو نہیں کہنا چاہتیں؟“ انہوں نے ابرو اٹھا کر اس کی سہمی ہوئی صورت دیکھی۔

اس نے نفی میں گردن ہلا دی۔

”او۔ کے اب میری بات غور سے سنو۔“ ان کے انداز سے پھر سرد مہری پھلکنے لگی۔

روشنی کا دل زخمی پرندے کی طرح پھڑپھڑانے لگا۔ وہ ہمت نہ کوش تھے۔

”تم سرکشی دکھا چکیں۔ اپنی سی کر چکیں۔ ایک احق انسان سے صرف حماقت ہی کی توقع کی جاسکتی ہے۔ تمہارے پاس عقل ہوتی تو یہ سب کیوں ہوتا؟ ٹھیک؟“

”اب یہ ہے کہ اسی وقت بتاؤ۔“ باری یا باپ“ تمہیں ہمیشہ کے لیے ان دونوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا ہے۔“

وہ اتنا کہہ کر خاموش ہو گئے۔ اپنا غضب انہوں نے کس سکون سے ظاہر کیا تھا اور اپنے فولادی اعصاب ہونے کا ثبوت دیا تھا۔

”آپ ایسے نہیں کریں پتا۔“ اس کی آنکھوں سے اشک بہنے لگے۔

”تم جو چاہے کرو نہ باپ کی انا کا خیال نہ اس کی سالوں کی ریاضت کا احساس میں کوئی لمبی چوڑی بات یا تقریر نہیں کروں گا مگر مجھے جواب ابھی چاہیے۔“

غضب بلا کا مگر انداز دھیمہ تھا۔ جس انتہائی فیصلے پر اصرار تھا وہ میانہ روی کی زد میں تو نہیں آتا۔

”پلیز پتا!“ وہ زار و قطار رونے لگی۔

”یہ تو باری ہے۔ باغی اور اُن کلچر ڈباپ کی اولاد اگر تیمور علی خان تمہارے لیے کسی پرنس کا رشتہ بھی لاتے تو میں قبول نہ کروں۔ اتنا انفر فیر تو اُسے کرنا بھی نہیں چاہیے تھا اصولاً۔ خیر۔ کیا فیصلہ ہے تمہارا۔ اگر باری کا ساتھ منظور ہے تو یاد رکھنا یہ

ہماری آخری ملاقات ہے۔“ ان کی آواز میں اس مرتبہ بہت تلخی تھی۔

”پتا پلیز۔ ابھی مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔ آپ بابا صاحب سے تو ڈسکس کیجئے۔“

”شیم یور سیلف۔ تمہارے کارنامے ڈسکس کرتا پھروں۔ یو فو ل ٹان سنس۔ مجھے تمہارا جواب مل گیا ہے۔ ہمیشہ کے

لیے دور ہو جاؤ میری نظروں سے۔ گیٹ آؤٹ۔“

یاد علی خاں خود پر قابو پاتے ہوئے بمشکل کہہ پارہے تھے۔

”پپا! آپ ساری بات سنے سمجھیں بغیر اتنی سخت سزا نہیں سنا سکتے۔ فارغا ڈسک۔“

وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور کارپٹ پر بیٹھ کر ان کے گھٹنے تھام لیے۔

”ہوتا ہے مجھے پوری بات۔ باری اگر چیف جسٹس کا بیٹا بھی ہوتا تو میں اس کا پروپوزل مسترد کر دیتا۔ احمق لڑکی تم ابھی بہت چھوٹی ہو۔ فیصلے کرنے کی عمر نہیں ہے تمہاری۔ تم نے میری اتنی انسٹلٹ کی ہے کہ جی چاہتا ہے خود کو شوٹ کر لوں اور ایسا ہو بھی سکتا ہے اگر کسی رات ضبط جواب دے گیا۔“

”مائی گڈ نیس!“ روشنی نے بدحواس ہو کر ان کی صورت دیکھی۔ ”پپا! میں آپ کو کیسے یقین دلاؤں کہ مجھے آپ سے کتنی محبت ہے۔ آپ کی انورٹس کے باوجود میں نے گھر میں ہمیشہ آپ کی راہ دیکھی ہے۔ آپ کا انتظار کیا ہے۔ کتنے کتنے دن آپ کی ایک جھلک کو ترستی ہوں۔“

وہ ان کے گھٹنوں پر پیشانی ٹکا کر مڑی طرح رو رہی تھی۔

”جن سے انسان محبت کرتا ہے انہیں کبھی عظیم دکھ نہیں بخشتا۔“ انہوں نے بے رحمی سے اس کی بات کاٹ دی۔

”پپا! میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ یہ بات آپ کے لیے عظیم دکھ کا باعث ہو سکتی ہے۔ مجھے یہ تو پتا تھا آپ اتنا بڑا قدم اٹھانے پر خفا ضرور ہوں گے۔ مگر بات یہ ہوئی کہ کا کا جان کی انوالومنٹ کی وجہ سے یہ سب ممکن ہو گیا۔ پپا! کا کا جان بہت کائنات بہت سو فٹ۔“

”شٹ آپ۔“ یاد علی خاں اسے ایک طرف ہٹا کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ ”تم چلی جاؤ اسی کائنات شخص کے پاس۔ میرا تمہارا اب کوئی تعلق نہیں ہے۔“

وہ اتنا کہہ کر کمرے سے باہر نکل گئے۔

وہ ششدر سی دروازے کی سمت دیکھ رہی تھی۔

کالج کے وقت لڑکی کے وکیل کی حیثیت سے بھی وہ گلو کے اور دوسری لڑکیوں کے مشترکہ کمرے میں آئے تھے۔ وہ اس وقت گلو کے پاس ہی بیٹھی تھی۔

آخر کب تک ٹھہرتی، ماما بلی نے کئی بار راہداری سے گزرتے ہوئے اس کی سمت تعجب سے دیکھا تھا مگر کچھ بولی نہیں تھی۔

تقریباً ساڑھے بارہ بجے اس نے اپنی خوابگاہ میں قدم رکھا تھا۔ یاد علی خاں شب خوانی کے لباس میں بیڈ کی بیک سے پٹ نکائے ہوئے فائل میں غم تھے۔ انہوں نے اندر داخل ہوتی ہوئی ماہین کو گلاسز سے جھانک کر صرف لمحے بھر کر دیکھا تھا اور پھر مصروف ہو گئے تھے۔

ماہین نے البتہ بخور ان کی سمت دیکھا تھا۔ ان کی انگلیوں میں سلکتا سگریٹ دبا ہوا تھا اور ایش ٹرے سگریٹ کے ٹکڑوں سے بھری ہوئی تھی جو ان کے ذہنی انتشار کا واضح ثبوت تھا۔

وہ چپ چاپ آگے بڑھ کر شب خوانی کا لباس وارڈروب سے نکالنے لگی۔ نائی نکال کر اس نے بیڈ پر ڈالی اور ڈریسنگ ٹیبل کی طرف رخ کر کے جیولری اتارنے لگی۔ وہ اسے سرخنی آئینے میں دکھائی دے رہے تھے۔ وہ آئینے میں غور سے ان کے چہرے کے اتار چڑھاؤ پڑھنے کی کوشش کرنے لگی۔

”آپ روشنی کی وجہ سے اس حویلی میں داخل ہوئیں اسی کی وجہ سے غالباً میری زندگی میں بھی۔ یا پھر کہیں گے کہ یہ پوائنٹ بھی میں کرتا ہے۔“ اچانک ہی انہوں نے کہنا شروع کر دیا۔

آویزہ اتارتے اتارتے وہ ٹھٹھک کر رک گئی تھی۔ کسی کھنچی ہوئی تصویر کی صورت۔

”مطلب؟“ اُن کا انداز دل جلانے والا تھا تو اس کا بھی لہجہ تیکھا ہو گیا۔

”غالباً آپ دونوں خالہ بھانجی کی انڈر اسٹینڈنگ بھی بہت ہے؟“ پھر طنزیہ استفسار تھا۔

”جو کہتا ہے بس وہی کہیے اور جلدی کہیے۔“ وہ بے تاب سے انداز میں ان کے قریب چلی آئی۔

”سرائے سے واپسی کے بعد آپ کی روشنائی سے باز پرس والی کوئی بات چیت تنہائی میں ہوئی تھی؟“ یاد علی خاں نے گلاسز اتار کر سائینڈ ٹیبل پر لگا دیے۔

”ایک مرتبہ؟ نہ جانے کتنی مرتبہ۔“ ماہین نے بے نیازی و اعتماد سے جواب دیا۔

”تو پھر اس کا مطلب ہے آپ کو سب کچھ معلوم ہے۔ بلکہ آپ اس کے ساتھ اس تمام قصے میں۔ شریک ہیں۔“

”کون سا قصہ۔ کیسا قصہ؟“ ماہین دھپ سے بیڈ پر بیٹھ گئی۔

”پلیز میرے ساتھ یہ ڈراما نہ کریں۔“ یاد علی خاں نے بڑی ناگواری سے ہاتھ اٹھا کر گویا اسے مزید سے روکا۔

”آپ اس طرح بغیر ثبوت و تحقیق مجھے بلیم نہیں کر سکتے۔“ ماہین کو شدید غصہ آ گیا۔

”بلیم نہیں کر رہا۔ بالکل شیور ہوں۔ یقیناً سب کچھ آپ کی نالچ میں ہے۔ جب اتنی اہم باتیں حقیقی باپ سے چھپائی

ہائیں تو پھر اس رشتے کی حیثیت ہی کیا رہ جاتی ہے۔“ وہ بھی ناراضگی سے گویا ہوئے۔

”کیا ہے میری نالچ میں آپ کے حساب سے۔ بتا دیجئے مجھے۔ بلکہ دہرا دیجئے پلیز میرا تو دماغ پھٹ جائے گا ان

ماہین کب سے ادھر ادھر بے مقصد آ جا رہی تھی۔ اپنی خواب گاہ میں داخل ہونے سے پہلے اس نے تمام ممکنہ سوالات کے جواب تیار کرنا تھے۔ سب ہی ہیں گھر میں۔ کچھ ہونہ جائے۔ پھر کوئی نیا تماشا نہ ہو۔ یاد علی خاں سے ہر طرح کی امید کی جا سکتی ہے۔ نہ اس میں حوصلے کی کمی تھی نہ فیصلہ کرنے کی طاقت سے محروم تھی۔ مگر وہ اندھاؤہند کچھ بھی کرنا نہیں چاہتی تھی۔ اب بھی سارے قصے میں روشنی اور جواد کی اہمیت سب سے زیادہ تھی۔ ان کے دور تک کے مفادات پیش نظر تھے۔

تقریب کے اثرات دھندلا رہے تھے۔ حویلی میں آہستہ آہستہ آوازیں معدوم ہو رہی تھیں۔ روشنیاں دھیرے دھیرے ٹل ہو رہی تھیں۔ لڑکیاں تھکی ہاری ادھر ادھر گری پڑی نظر آ رہی تھیں۔ اور وہ الگ ادھیڑ بن میں تھی۔ یاد علی خاں تقریب میں کسی وقت بھی حصہ لیتے نظر نہیں آئے تھے۔ البتہ تیمور علی خاں کو اس نے کئی جگہ مختلف اوقات میں موجود پایا تھا۔

پہیلیوں میں۔“ ماہین نے سر تھام لیا۔

”یہی کہ میری بیٹی شادی شدہ ہو چکی ہے۔“ وہ تیزی سے گویا ہوئے۔

ماہین بھونچکی سی ہو کر ان کی شکل دیکھنے لگی جیسے اسے سننے میں مغالطہ ہوا ہو۔

”جی؟“ اس کا چہرہ یکدم سفید پڑ گیا تھا۔

”جی!“ وہ شعلہ بارنگا ہوں سے اسے گھورنے لگے۔ ماہین نے تاب نہ لا کر نظریں جھکا لیں۔ دل بُری طرح دھک دھک کر رہا تھا۔

”اٹس اے ویری شاکنگ نیوز فارمی۔ اوپنٹلی۔ مجھے کچھ نہیں پتا بیوی۔“ اس کی آواز مجرم کی طرح پست تر ہوتی چلی گئی۔

”آپ جس طرح چاہے تفتیش کر لیں۔ عنقریب ثابت ہو جائے گا کہ میں قطعی لاعلم اور بے گناہ ہوں۔ بلکہ میرے لیے تو عظیم دُکھ کی بات ہے کہ مجھے اس قابل نہیں سمجھا گیا کہ میرا اعتبار کیا جاتا۔“ اس کے لہجے میں واقعی دُکھ گہرا تھا۔

”کیا آپ مجھے بتانا پسند کریں گے کہ ایسا کیسے ہوا۔ کب ہوا؟ اور وہ کون ہے۔“ وہ اتنی شرمندگی سے پوچھ رہی تھی گویا اس سے کوئی بہت بڑا جرم سرزد ہوا ہو۔

”مجھ سے یہ ڈراما نہیں کرو۔ سوال ہی نہیں پیدا ہوتا کہ تمہیں یہ سب معلوم ہی نہ ہو۔ اتنا بڑا کام وہ اتنے حوصلے سے کر ہی نہیں سکتی۔“ یاور علی خان نے بڑی ناگواری سے اسے ٹوک دیا۔

”آپ کو یقین دلانے کا کیا پیمانہ ہے؟ کون سی قسم کھائی جائے کہ آپ کو یقین آجائے۔ یہ نیوز جتنی شاکنگ آپ کے لیے ہے اتنی ہی میرے لیے۔“ ماہین نے بے بسی سے کہا۔ ”اگر ایسا ہوا ہے تو اس نے کم از کم میرے ساتھ تو بہت ہی بُرا کیا ہے۔ میں آپ کو کیسے سمجھاؤں۔“ وہ بہت دُکھ سے کہہ رہی تھی۔

یاور علی خان نے نظریں اٹھا کر اس کا چہرہ بغور دیکھا۔ جہاں صرف تفکر ہی تفکر تھا۔

”بتائیے ناں۔ وہ کون ہے؟ جس نے اسے اتنا بہادر بنا دیا۔ کہ اسے بابا صاحب تک کا خوف نہیں رہا۔“ اس نے منت کے انداز میں کہا۔

”اسے بڑی مضبوط بیک ملی ہے۔ انتقام لیا گیا ہے مجھ سے۔ مگر میں یہ اسکیم فیل کر دوں گا۔ جیتنا دو بھر کر دوں گا۔“ وہ غضبناک ہو کر کہہ رہے تھے۔

”آپ کسی ملازمہ سے کہہ کر باری کو بلوائیں۔ ابھی سامنے آجائے گا سب کچھ۔“

ماہین حیران پریشان سی اٹھ کھڑی ہوئی ”باری! ابھی بلوائیتی ہوں۔“

وہ تیزی سے باہر کی سمت بڑھی۔ اس کے انداز سے محسوس ہوتا تھا کہ اسے بہت کچھ جاننے کی بہت جلدی ہے۔ چند منٹوں بعد وہ واپس آگئی تھی۔ ”ماما گئی ہے بکالانے۔“ اس نے اطلاع دی اور صوفے پر بیٹھ کر گاہے گاہے یاور علی خان کا چہرہ دیکھنے لگی۔

پانچ سات منٹوں بعد دروازے پر دستک ہوئی۔

”آ جاؤ باری!“ ماہین نے بے تاب سے کہا۔

یاور علی خان نیا سگریٹ سلگا رہے تھے۔

دروازہ کھلا اور باری اندر آ گیا۔ اس کے قدم رُکے رُکے اور نظریں جھکی ہوئی تھیں۔

”السلام علیکم!“ اس نے یاور علی خان کی سمت دیکھ کر سلام کیا۔ یاور علی خان نے سلام کا جواب نہیں دیا۔ اور کس لگانے لگے۔

”بیٹھ جاؤ باری!“ ماہین نے اپنے قریب کی نشست کی سمت اشارہ کیا۔ باری فوراً بیٹھ گیا۔

”یہ۔ ماہین تمہاری اور روشانی کی کارگزاری سے لاعلم ہیں۔ ذرا انہیں تفصیل سے بتاؤ۔“ یاور علی خان نے آغاز کیا۔

ماہین کا منہ حیرت سے کھلا کا کھلا رہ گیا۔

”باری!“ وہ حیرت سے بس اس کا نام ہی لے پائی۔

باری خاموشی سے سر جھکائے بیٹھا رہا۔

”خاموشی ٹوٹ چکی ہے باری! سازش منظر عام پر آ چکی ہے۔ ماہین کا کہنا ہے کہ یہ کچھ نہیں جانتیں تمہارے بیان سے

تصدیق ہوگی کہ یہ غلط کہہ رہی ہیں یا درست۔“

یاور علی خان نے سر دلچسپی میں باری کو متوجہ کیا۔

”درست کہہ رہی ہیں۔ انہیں کچھ معلوم نہیں۔“ باری کی آواز کمرے میں گونجی۔

”مگر مجھے یقین نہیں۔ ہو سکتا ہے یہ بھی کوئی کٹ منٹ ہو اور تم انہیں بچانے کے پابند ہو اس کٹ منٹ کے تحت۔“ یاور

علی خان کو کسی طور یقین نہیں آ رہا تھا۔

”یہ سچ ہے۔ انہیں کچھ پتا نہیں۔ مجھے روشانی بی بی کا جان اور ان کے دو تین دوست اور وہیں کے چند ملازمین کے

علاوہ کسی کو اس واقعے کا علم نہیں۔“

اس نے اس مرتبہ بہت ہلکے سکون انداز میں جواب دیا تھا۔ شام سے اب تک وہ ایک ذہنی عذاب سے دوچار تھا۔ بھید نہیں

کھل رہا تھا کہ روشنی کے ساتھ یاور علی خان نے کیا معاملہ کیا۔ اور حیرت اس بات پر تھی کہ بابا صاحب کے دربار میں اب تک

اسے پیشی کے لیے کیوں نہیں بلوایا گیا۔ اور اب آخر کار وہ کٹھنرے میں آ کھڑا ہوا تھا۔ اور اس کے باوجود ہلکے سکون تھا کہ شام

سے اب تک کسی کٹمنٹ و ذہنی اذیت سے نجات مل گئی تھی۔

”تم سے تیمور علی خان نے کس طرح کہا۔ اور کس انداز میں تمہیں اس کے لیے تیار کیا۔ تم پر تو بابا صاحب اندھا بھروسا

کرتے ہیں۔ تم نے تیمور علی خان کی سازش کا حصہ بنتے ہوئے یہ نہیں سوچا کہ اس کے بعد بابا صاحب تمہارے ساتھ کیا

سلوک کریں گے۔ تم نے اتنی آسانی سے تیمور علی خان کی بات کس طرح مان لی؟ آدمی جاگیر تمہارے نام کرنے کا وعدہ کیا تھا

اس نے تمہارے ساتھ۔ یا بیوی اماؤنٹ۔“

بہ سے حویلی میں کسی قسم کا انتشار نہیں پھیلانا چاہتا تھا۔ بہت سے حقیقی رشتوں کے بغیر جب زندگی برداشت کی جاسکتی ہے تو ہر مزید کسی نئے من چاہے تعلق کے بغیر بھی گزاری جاسکتی ہے۔ دنیا میں بہت سے لوگ گزارتے ہیں۔

مگر روشی بی بی نے سب کچھ کہہ دیا۔ جس سے یہ بات آشکار تھی کہ اگر بندھ نہ باندھے گئے تو وہ حویلی والوں کو کسی نئے بہت بڑے امتحان میں ڈال سکتی ہیں۔ جو کچھ ہوا ہے وہ اس سے بہت کم ہے جو وہ کرنے کا ارادہ رکھتی تھیں۔ آپ کو یاد ہو گا وہ راجہ میں سوسائیز (خودکشی) کی کوشش کر چکی ہیں۔ ان کے ہاں کوئی لچک یا گنجائش نہیں ہے۔ کا کا جان نے تو بات سنبھالی ہے۔

”یہ تو میں ہی جانتا ہوں کہ موصوف نے بات کتنی سنبھالی ہے اور کتنی بگاڑی ہے۔“

اچھ نکلی تم بہت زمین ہو تم نے بہت سلیقے سے رپورٹ پیش کی ہے۔ مگر میرے لیے یہ بہت ہے کہ تم میرے یا صاحب کے نہیں اس کے دوست کے بیٹے ہو۔ اسی کو سپورٹ بھی کرو گے اور صرف اسی کی بات مانو گے۔ تم چھوٹی حویلی میں ہو یا بڑی حویلی میں تم صرف اس کے آدمی ہو بلکہ اس کے خاص آدمی ہو۔“

یاد علی خان کی شریانوں میں جو جوار بھانا اٹھ رہا تھا وہ ان کے طرز تخاطب سے آشکار تھا کہ ماہین بھی آج ”تم“ تھی اور تیمور علی خان بھی ”اُس“ ”اِس“ ہو رہے تھے۔

باری خاموش رہا کہ وہ آٹا فانا ان کے خیالات تبدیل نہیں کر سکتا بلکہ اختلاف یا تردید اس وقت جلتی پرتیل چھڑکنے کے مترادف تھا۔

”سب لوگ اتفاق کریں یا اختلاف مگر میں اپنی جگہ قائم ہوں۔ یہ صرف سازش اور انتقام ہے۔ محض مجھے اذیت پہنچانے کے لیے ہے۔ مگر آپ سب کو بہت مایوسی ہوگی۔“

محترمہ! وہ ماہین کی سمت یلکھت متوجہ ہوئے۔ ”آپ کو میں نے تیمور علی خان سے خود بات کرتے دیکھا ہے۔ مجھے اب بھی اسی صحت کے ساتھ مکمل یقین ہے کہ آپ اس سارے قصے سے صرف واقف ہی نہیں باقاعدہ اس میں آپ کا رول ہے۔“

آپ کا انداز اس بات کی گواہی دے رہا تھا کہ تیمور علی خان سے آپ کی وہ پہلی ملاقات نہیں ہے۔

بابا صاحب کی موجودگی میں یہ ڈراما اپنے منطقی انجام کو پہنچے گا ورنہ تینخ نکاح کے لیے کورٹ سے رجوع کیا جائے گا۔ انہوں نے گویا فیصلہ سنا دیا۔

”مت دیکھیے یہ خواب۔ نکاح اس کی اپنی مرضی سے سکے چچا کی موجودگی میں ہوا ہے۔ میں جا رہی ہوں بھابی بیگم کے کمرے میں۔ اب آپ مجھے تب ہی بلائیے گا اور مخاطب کیجئے گا۔ جب میرا جرم ثابت ہو جائے۔“

ماہین نے شب خوابی کا لباس اٹھایا، دو چار چیزیں ڈریسنگ ٹیبل سے اٹھائیں اور ادھر ادھر دیکھے بغیر تیزی سے کمرے سے باہر نکل گئی۔

باری اور یاد علی خان چند ٹائیے خاموش رہ کر ایک دوسرے کو محسوس کرتے رہے۔

”پلیز۔ یاد خان! تفصیل جانے بغیر اور میرا جواب سنے بغیر آپ بات کو یہیں روک دیں۔ پلیز۔“ اس نے بے اختیار ان کی بات کاٹ دی۔

ماہین ششدر سی بیٹھی کبھی یاد علی خان کو دیکھنے لگتی۔ کبھی باری کو اس کے اپنے حلق میں تو بہت برا سا گولہ پھنس چکا تھا اور وہ بات کرنے کے قابل تو کیا کوئی ٹکڑا لگانے کے قابل بھی نہیں تھی۔

”آپ اس پوچھناٹ پر بھی غور کیجئے کہ روشی بی بی سرائے خود اپنی مرضی سے گئی تھیں۔ کہ وہ نعیم سے شادی کرنے پر قطعی آمادہ نہیں تھیں۔ اور ان کا انکار حویلی کے تمام اہم لوگوں کے علم میں تھا آپ سمیت۔ کا کا جان ان کو پہلی فرصت میں بڑی خوشحالی واپس بھیجنا چاہتے تھے کہ حویلی میں ان کی غیر موجودگی سے قیامت برپا ہو رہی ہوگی۔ انہوں نے حویلی واپس جانے سے صاف انکار کر دیا۔ لا محالہ کا کا جان نے ریزن طلب کی اور روشی بی بی نے انہیں سب کچھ بتا دیا۔“

”تو اس کا مطلب یہ ہے کہ نعیم سے شادی نہ کرنے کی وجہ تم تھے؟“

یاد علی خان نے برہم انداز میں اس کی بات کاٹ دی۔

باری ایک لمحے کا خاموش سا ہو گیا۔

”آپ یقین نہیں کریں گے پھر بھی میں یہ ضرور کہوں گا کہ میری ان سے کبھی کسی قسم کی کوئی کٹ منٹ نہیں ہوئی تھی۔ میں تو اپنے معمول کے کام سے سرائے گیا تھا۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ روشی بی بی وہاں ہو سکتی ہیں۔ اس لیے کہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“

وہ بولتے بولتے ایک دم چپ ہو گیا۔ ماہین نے ایک گہری نگاہ اس کے چہرے پر دوڑائی۔ اور ایک گہری سانس لی اور صوفے کی پشت سے ٹیک لگا کر آنکھیں موند لیں۔ اس کے اندر تو قیامتیں برپا ہو رہی تھیں۔

”تو پھر روشانے نے تیمور علی خان کو وجہ بتا دی کہ وہ تمہاری وجہ سے نعیم کے ساتھ شادی کرنے پر رضامند نہیں۔ اور انہوں نے تمہاری خدمات کے اعتراف میں کھڑے کھڑے تمہارا نکاح پڑھوا دیا۔ یعنی حد ہو گئی، کیا خیال ہے تمہارا۔ گھاس کھاتا ہوں میں؟“ یاد علی خان برہمی کی انتہا کو چھونے لگے۔

”ریزن تو سے بی پاسیل یہی ہو مگر باقی سب کچھ اس طرح نہیں ہوا۔ کا کا جان نے مجھ سے تفصیلی بات چیت کی تھی۔“

”مثلاً انہوں نے تمہیں بہت خوبصورت خواب دکھائے اور ہر صورت تمہیں اس نیک کام کے لیے آمادہ کیا۔“ یاد علی خان نے تلخی سے کہا۔

”نہیں انہوں نے میرے ساتھ کسی قسم کی زبردستی یا دباؤ سے کام نہیں لیا۔ میں اگرچہ اس رشتے سے بہت خوش ہوں۔ بلکہ یہ میری خواہش کی تکمیل ہے لیکن جس طرح یہ سب ہوا یہ میرے لیے بالکل غیر متوقع تھا۔ میری خواہش قیامت تک نہ میری زبان پر آ سکتی تھی نہ ہی میرے کسی عمل سے ظاہر ہو سکتی تھی۔ اس کے باوجود کہ میں بہت آسانی سے اپنا مقصد پورا کر سکتا تھا۔ کیونکہ سیکنڈ پارٹی کی بھی یہی خواہش تھی۔ مگر بابا صاحب نے جو ضابطے بنائے ہوئے ہیں۔ اس میں اس طرح کی خواہش پوری ہونے کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ خواہش بہت طاقتور سی مگر میں حویلی والوں سے ٹکرانے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا تھا اور اپنی

”باری! بہتری اسی میں ہے کہ تم اسے آزاد کر دو۔ وہ تمہیں ملے گی کبھی محض یہ تمہارا خواب ہے۔ زندہ بچے کی تو تمہیں ملے گی۔ یہ میری انا کا سوال ہے۔ اس وقت میری ذہنی کیفیت اتنی آؤٹ آف کنٹرول ہے۔ کہ میں اپنی انا کی بڑی سے بڑی قیمت دینے کو تیار ہوں۔ تم پر تو اس حویلی کی پرت پرت عیاں ہے۔ کیوں کو د پڑے اس آگ میں؟ کس قدر احمق ثابت ہوئے ہو تم۔“

یاد علی خان کے لہجے میں تاسف بھی تھا اور برہمی بھی۔

”میری اپنی رضا مندی تھی ورنہ آگ میں کو دنا کون پسند کرتا ہے۔“ باری نے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں پھنسا کر اور گردن جھکا کر بہت دھیمی آواز میں گویا اعتراف جرم کیا۔

”اسی لیے تو احمق کہا ہے تمہیں۔ وہ یاد علی خان کی بیٹی ہے۔“ یاد علی خان نے بڑی سختی اور عنوت سے کہا۔

”مگر خیر۔ اگر کسی نے ہار جیت کا کھیل شروع ہی کر دیا ہے تو میں پیچھے نہیں ہٹوں گا۔ اس میں کسی کا کوئی رول نہیں ہے۔ روشی بی بی کی فیصلہ کن نیچر کا بس سب سے اہم رول ہے۔“

”سب وزن اس پر ڈال کر اپنی جان بچا رہے ہو۔ کاش یہ جملہ وہ بے وقوف اپنے کانوں سے سنتی۔“ یاد علی خان برس پڑے۔

”اب ایسی بھی کوئی بات نہیں ہے۔ میں تو ان کا شکر گزار ہوں۔ اب اگر نقصان بارش کی طرح برسیں تو مجھ پر برسیں۔ روشی بی بی کا رول تو اب ختم ہو چکا ہے۔ اب تو صرف رول ہی میرا ہے۔ وہ بہت بہادر اور فیصلہ کن ہیں۔ میں گستاخی اور بے ادبی نہیں کروں گا۔ ان کے لیے مورل سپورٹ حاصل کروں گا۔ تھرو پرو پر جھیل۔ میں ہر قسم کی سزا کے لیے خود کو ذہنی طور پر تیار کر چکا ہوں۔ آپ جو چاہیں میرے لیے سزاتجویز کریں سوائے اس کے کہ میں انہیں آزاد کر دوں۔“

وہ کھڑا ہو گیا اور یاد علی خان کی کسی اگلی بات کا انتظار کرنے لگا۔

”لوگ اسٹیش حاصل کرنے کے لیے صبح سے شام تک جائز کو نا جائز اور نا جائز کو جائز کرتے رہتے ہیں۔ تم بھی کچھ دیر کے لیے خود کو بہادر شوکر لو تو کیا فرق پڑتا ہے۔“

یاد علی خان نے تلخی سے کہا اور کش لگانے لگے۔ باری نے ہونٹ کاٹتے ہوئے ان کی سمت دیکھا۔

”میں نے آپ سے کبھی کوئی غیر ضروری بات نہیں کی مجھے افسوس ہے کہ آج میں بہت کچھ کہہ بیٹھا ہوں مگر کیا کروں۔ یہ راستہ بھی میرے سفر میں پڑتا ہے۔“ اتنا کہہ کر وہ باہر نکل گیا تھا۔ یاد علی خان کا انداز بھی یہ تھا کہ فی الحال جو کہنا تھا وہ کہا جا چکا اور اب وہ کچھ آگے کی سوچ رہے ہیں۔

تیمور علی خان رات گئے سرائے پہنچے تھے۔ نازنین گہری نیند سوئی تھی۔ دستک پر وہ اوجھستی جھومتی اٹھی تھی اور دروازہ کھول کر پھر بستر میں دبک گئی تھی۔ انہوں نے بہت آہستگی سے دروازہ بند کیا تھا اور بہت احتیاط سے وارڈ روب سے ٹائٹ ڈریس نکال کر ڈریسنگ کی طرف چلے گئے تھے۔ لباس تبدیل کر کے باہر آئے تو ہاتھ میں کف لکس اور ریٹ واج تھی جو انہوں نے

بہت احتیاط سے سائیڈ ٹیبل پر رکھی تھی۔ ساتھ ہی ایک نگاہ نیند کی آغوش میں پہنچی ہوئی نازنین پردالی تھی اور کچھ سوچنے کے انداز میں ایزی چیئر پر بیٹھ گئے تھے۔ وہ تو تقریب ختم ہونے سے پہلے ہی وہاں سے چل پڑے تھے۔ گاڑی چونکہ ڈرائیور ذرا پیڑ کر رہا تھا اس لیے وہ کچھ دیر راستے میں سو بھی چکے تھے۔ حالانکہ ذہن بہت منتشر سا تھا۔ آنے والے کسی پریشان کن واقعے نے ان کے وجود میں شورش برپا کر رکھی تھی۔ وہ سوئی ہوئی نازنین کو بغور دیکھ رہے تھے۔ اور اس کے حوالے سے جانے کیا کیا خیال آرہے تھے۔

نازنین نے خاصی دیر بعد کروٹ بدلی تھی۔ جانے تیمور علی خان کے کسی مرکز خیال کی قوت تھی کہ اس کی نیند ٹوٹ گئی تھی۔ اس نے نیند بھری آنکھوں سے اپنے پہلو میں نظر دوڑائی تھی۔ جہازی سائز بیڈ دور تک خالی نظر آیا تھا۔ جس پر غالباً وہ چونک پڑی تھی اور کمرے میں نظر دوڑانے لگی تھی۔ سامنے ایزی چیئر پر تیمور علی خان اسے کسی دھیان میں گم نظر آئے۔

”حوالی سے آرہے ہیں؟“ اس کی نیند میں ڈوبی ہوئی آواز کمرے میں ابھری تھی۔

”ہوں۔“ انہوں نے صرف ہنکارا بھرا تھا۔

”روشی آئی تھی؟“ اس نے جانے کس خیال کے تحت پوچھا تھا۔

”ہوں۔“ انہوں نے پھر ہنکارا بھرا۔

”اور وہ بد نصیب۔“ اس کی آواز نیند کے سبب بھاری تھی۔

”ہم کون ہوتے ہیں کسی کے نصیب کا فیصلہ کرنے والے۔“ تیمور علی خان نے تلخ لہجے میں جواب دیا۔

نازنین کی نیند بھک سے اڑ گئی۔ آج پھر اشائل بدلا ہوا تھا۔ گویا پھر سے محنت پڑنے والی ہے۔

اتنے عرصے سے یہی تو ہوتا آیا تھا۔ وہ اس موڈ میں آتے تھے تو اسے کتنی ریاضتیں درپیش ہونے لگتی تھیں۔ اُن کی پُپ کو توڑنا ایک مرحلہ بن جاتا تھا۔ وہ اُٹھ بیٹھی۔

”طبیعت کیسی ہے؟“ اس نے بہت جھجکتے ہوئے پوچھا تھا۔

”آپ سو جائیں۔ ٹھیک ہیں ہم اور اب ہمیں مزید کیا ہوگا۔ بہت ہو چکا ہے ہمارے ساتھ۔“

”مجھے اس سے اختلاف نہیں کہ آپ کے ساتھ بہت ہو چکا۔ مگر اب نئے سرے سے نیندیں ویران کرنے کا کیا فائدہ؟“

سو جائیں آپ بھی۔“ وہ کھوجتی نظروں سے ان کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔

”کوئی بات تو نہیں ہوئی؟“ وہ بیڈ سے اتر کر اُن کے قریب چلی آئی۔

”کچھ نہیں ہوا۔ آپ پریشان نہ ہوں۔ پلیز۔“ وہ تقریباً جھلا گئے۔

”اتنا تو مجھے شعور ہے کہ آپ کی یہ کیفیت نیچرل ہوتی ہے۔ دیوالیہ کاروباری گا ہے اپنے نقصان یاد کرتا ہے اور

آہیں بھرتا ہے۔ مگر آپ کی اس کیفیت سے جو نئے سرے سے مجھ پر احساس کا بوجھ پڑتا ہے تو میری کمر ٹوٹنے لگتی ہے۔“ اس

کی آواز بھڑا گئی۔

تیمور علی خان یکدم اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑے ہوئے۔

”آپ کی طبیعت یوں بھی ٹھیک نہیں رہتی۔ اتنا ڈیپ میں کیوں چلی جاتی ہیں۔ ایسا کچھ نہیں ہوا کہ آپ وہم میں پڑ جائیں۔ جو عام سے واقعات ہوئے ہیں وہ ہم آپ کو صبح بتائیں گے۔ پلیز آپ آرام کریں۔“

وہ نازنین کو تھام کر بیڈ تک لائے۔ زیر و پاؤں کے بلب کی روشنی میں نازنین سیاہ تائی پہنے ہوئے بالکل سفید محسوس ہو رہی تھی۔

”یہ سیاہ کمرمت پہنا کریں۔ اس سے ڈپریشن بڑھتا ہے۔“ وہ اُسے لٹاتے ہوئے بہت رسانیت سے کہہ رہے تھے۔

”قسمت کا رنگ سیاہ ہو تو کیا کرتے ہیں؟“ وہ آزدگی سے پوچھ رہی تھی۔

”یہ تو ان ڈائریکٹ آپ ہماری کوتاہیوں کی نشان دہی کر رہی ہیں۔“ وہ اس پر کھیل ڈالتے ہوئے بہت رسانیت سے کہہ رہے تھے۔

”آپ کو تو نمبر پچر ہے؟“ وہ اس کی پیشانی چھو کر تشویش سے گویا ہوئے۔

”ہاں نہیں کب ٹھنڈا ہو گا یہ وجود۔“ نازنین نے یہ کہہ کر ان کی طرف سے پشت کر لی۔

”بہت ذہن پر زور ڈالتے ہیں۔ کسی طرح وہ نام یاد آ جائے جس نے ہمیں اذیت نہ دی ہو۔“ سائینڈ ٹیبل کی دراز سے کوئی ٹیبلٹ نکالتے ہوئے بڑے ڈکھ سے کہہ رہے تھے۔

ایک گلاس میں پانی جگ سے اٹھایا جو بیڈ کے سرہانے ہی رکھا ہوا تھا۔

”یہ لیجیے یہ ٹیبلٹ لے لیجیے۔“ انہوں نے اسے اٹھنے میں مدد دی۔ ”ایک تو یہ آپ کے گیسوئے دراز آدھا بیڈ تو صرف انہی کے لیے وقف ہوتا ہے۔“

وہ احتیاط سے اس کے بال ایک طرف ہٹاتے ہوئے اپنے بیٹھنے کی جگہ بنا رہے تھے۔

”لگتا ہے ان ہی کی نحوست ہے زندگی میں۔ نہ کسی کے ایسے بال ہیں نہ ایسی قسمت۔“

اس نے بے نیازی سے ان کی ہتھیلی سے ٹیبلٹ اٹھا کر منہ میں رکھی۔ اور گلاس ان کے ہاتھ سے لے منہ سے لگایا۔ اور دو تین گھونٹ لے کر واپس دے دیا اور گرنے کے انداز میں دوبارہ لیٹ گئی۔

”اتنا تھک کر آپ آئے اور بجائے آرام کرنے کے چیز پر بیٹھ کر کچھ سوچنے لگے اس کا مطلب کچھ ہوا ہے وہاں۔“ اس کی سوچ ایک ہی جگہ ٹھہری ہوئی تھی۔

تیور علی خان سر کے نیچے ہاتھ باندھ کر چٹ لیٹے چھت کی سمت تک رہے تھے۔

”کچھ نہیں ہوا۔ جو خوشگوار واقعات ہمیں پیش آئے ہیں صبح بتائیں گے آپ کو۔“ وہ بے تاثر لہجے میں گویا ہوئے۔

”خوشگوار۔؟“ کس قدر خوبصورت لفظ ہے اس کے حسن کی اہمیت کوئی ہم سے پوچھے۔“

”اب تو اس گھر میں روشنی صرف آپ کی وجہ سے ہے۔ کیوں عمر بھر کی ریاضتوں کو غیر اہم کر رہی ہیں۔ اب ٹھیک ہونے کی امنگ رکھیں گی تو کچھ امپر ومنت ہوگی اگر یہ ذہن بنالیں گی کہ بس کھیل ختم ہو جانا چاہیے تو زندگی تو خود بخود ہاتھ چھڑا کر بھاگے گی۔ اب ہماری طرف بھی دیکھیے۔ کچھ ہمارا بھی خیال ہونا چاہیے۔“ تیور علی خان کے لہجے میں بلا کی جھکن اتر

”ضوئی ابھی بہت چھوٹی ہے۔ آپ اسی کا خیال کر کے زندگی کی طرف بڑھیں۔“

”بات بات پر آپ مجھے خود غرض ہونے کا احساس دلادیتے ہیں تیمور۔ ضوئی کے ساتھ آپ کو ٹیپو کا بھی ذکر کرنا چاہیے۔ میں نے تو اسی کے لیے جو ادنیٰ طرح کی فیلنگ رکھی ہیں۔ اور یہ تو آپ کی قربانیوں کا ریٹرن ہے کہ میں نے ضوئی پر اسے وقت دی ہے۔ مگر میں کیا کروں۔ زندگی جوں جوں ناراض ہوتی جاتی ہے میرے اندر سکون اُترتا جاتا ہے۔ یوں لگتا ہے ٹھنکیں آسان ہونے والی ہیں۔“ اس کی آواز آنسوؤں میں ڈوب گئی۔

”ہر شخص اپنے دل کی کر لیتا ہے۔ کہہ لیتا ہے۔ ہمارے دل کی جانے کب ہوگی۔ کب لوگوں کو اس بات کا یقین آئے گا کہ ہم بھی اللہ کے بندے ہیں۔ نہ فرشتے ہیں اور نہ ہی کسی میٹل (دھات) سے بنے ہیں۔“ انہوں نے بازو آنکھوں پر رکھ لیا۔

”آئی ایم سوری تیمور۔ ہماری طرف سے تو آپ کو صرف ڈکھ ہی ملتے ہیں۔ مگر جس کے پاس جو ہو گا وہی تو دوسرے کو دے گا۔“

نازنین نے رُخ موڑ کر ان کے بازو پر دھیرے سے ہاتھ رکھ کر بڑی ندامت سے کہا تھا۔

ساری رات کروٹیں بدلتے گزر گئی تھیں۔ عالم تاب نے از خود خود سے اس سے کچھ پوچھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ ان کا خیال تھا کہ ہو جاتی ہے بعض اوقات میاں بیوی میں بد مزگی۔ نہ انہوں نے کچھ پوچھا نہ اس نے کچھ بتایا۔ وہ نماز کے لیے اٹھیں تو وہ بھی اٹھ گئی تھی۔ ماما چائے لے کر آئی تو دونوں نے بہت خاموشی سے ایک دوسرے کے مقابل بیٹھ کر چائے پی۔ عالم تاب نظر بچا کر اس کے چہرے کا جائزہ تو لے رہی تھیں مگر کچھ پوچھنے کی جیسے ہمت نہیں تھی۔ پرسوں سے دونوں بیک وقت حویلی میں تھے تو حویلی میں کچھ پیش آ جانے کے خوف سے ہر فرد اندر سے سہا ہوا تھا مگر تیمور کے چلنے جانے کے بعد کیا ہوا ان کی موجودگی میں تو کچھ نہیں ہوا۔ پھر ان کے جانے کے بعد کیا ہوا؟ یہ جاننے کی خواہش پیدا ہونا فطری امر تھا۔ مگر جاننے کے لیے سوال کرنے کی ہمت نہیں تھی۔

اس نے بھی انہیں زیادہ دیر امتحان میں مبتلا نہیں رکھا اور ادھر ادھر کی معمول کی بات چیت کر کے روشنی کے کمرے کی طرف آ گئی۔ دروازہ لاک تھا۔ اس نے کئی بار دستک دی تب جا کر گھٹلا۔ بڑی گہری نیند تھی۔ ساری رات کی کشمکش کے بعد صبح ناز کے تڑکے تو آنکھ لگی تھی۔ لہجہ تھوڑی دیر بعد ہی ماہین نے آ کر اٹھا دیا تھا اور یہ اتنا غیر معمولی تھا کہ خوف سے اس کا دل بیٹھ گیا تھا۔ بلکہ رات اس حیرانی میں گئی تھی کہ خالہ ابھی تک کیوں نہیں آئیں یا اسے بلوایا کیوں نہیں؟

ایسا تو ممکن ہی نہیں کہ پاپا کے کمرے میں قیامت برپا ہوا اور خالہ کو خبر نہ ہو۔ اس نے بغیر کچھ کہے ایک طرف کوہٹ کر ماہین کو اندر آنے کا راستہ دیا۔ وہ اندر آ گئی تو دروازہ دوبارہ لاک کر دیا اور وہیں کھڑے کھڑے ماہین کا چہرہ دیکھنے لگی جو کس کے بستر پر پاؤں اٹھا کر بیٹھ گئی تھی۔

”کیوں کھڑی ہو۔ ادھر آ کر میرے پاس بیٹھو۔“ ماہین نے اسے مخاطب کیا۔
وہ چپ چاپ اس کے مقابل بیٹھ گئی۔

”اتنا سب کچھ کر کے بیٹھی ہوئی ہو اور مجھے پتا تک نہیں۔ میرے لیے کتنی مشکلات کھڑی کر دی ہیں مجھ پر اعتماد نہیں تھا؟ جب دل کی بات پہنچاتی تھی مجھ تک خاموشی کی زبان ہی سے سہی تو اتنا سب کچھ بھی بتا دیا ہوتا۔ تو یہ نئی مشکلیں ایسے اے ہاں میرے اور تمہارے لیے کھڑی نہ ہوتیں۔ بلکہ اب تک تو بہت سارے حل بھی نکل چکے ہوتے۔“
ماہین ناراضگی سے کہہ رہی تھی۔

”وہ شخص تو ازلی بدگمان ہے، کیسے یقین دلاؤں گی، کیسے سنبھالوں گی یہ سب۔ یہ کوئی فائدہ نہیں پرلے درجے کی حماقت ہے۔ کیا ضرورت تھی اس طرح سے کرنے کی۔ ادھر تو پہلے ہی گھمسان کارن پڑا ہوا تھا۔“
ماہین شدید ناراضگی کا اظہار کر رہی تھی۔ اور روشی بس ہاتھ مسلتے ہوئے سنے جا رہی تھی۔
”خالہ! میں اس لیے باہر نہیں نکلی تھی۔ بلیوی۔“ بالآخر اس نے لب کشائی کی۔

”اتنی بڑی بات بغیر سوچے سمجھے پروگرام بنائے بغیر کیسے ہو سکتی ہے؟ اب اتنا پامگل بھی نہیں بناؤ۔“ ماہین نے ناراضگی سے کہا۔

”خالہ! آپ کا جان سے ساری بات پوچھ لیں۔ ان کا تو اعتبار کریں گی ناں آپ۔“ اسے معقول جملہ سوجھ گیا جس سے مزاج میں تبدیلی متوقع تھی۔

”ان کا کیا ذکر۔“ ماہین نے تفصیل جاننے کے شوق میں انجان بنا پسند کیا۔ باری کے اختصار میں ساری تفصیل وہ اخذ کر چکی تھی۔

”ان ہی کی وجہ سے تو یہ ناممکن سا کام انجام کو پہنچا ہے۔“ اس نے نظریں جھکا کر جواب دیا۔

”مگر ان تک تمہارے دل کی بات پہنچی کیسے؟“ ماہین کی حیرانی بجاتی تھی۔

”پتا نہیں۔ وہ تو خود ہی سمجھ گئے تھے۔“ اس نے قدرے جھپٹے ہوئے انداز میں جواب دیا۔

”سبحان اللہ۔ بڑے ولی اللہ ہو گئے ہیں تمہارے کا جان۔“ اس بے سرو پا جواب پر ماہین نے جل کر کہا تھا۔

اب روشی سے ماہین کا یہ انداز مزید برداشت نہیں ہو سکا۔ وہ ماہین کے گلے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

”خالہ! اتنے اجنبیوں کی بھیڑ میں آپ تو ایسے نہ کریں۔ مجھے تو کا جان نے منع کیا تھا کہ ہم کسی سے اس واقعے کا ذکر نہ کریں وہ خود ماحول حق میں کر کے یہ سب کچھ ہینڈل کریں گے۔ مجھے بھی تاکید کی تھی اور باری کو بھی۔ آپ میری بات کا یقین کیوں نہیں کر رہی ہیں؟“ وہ بڑی طرح رو رہی تھی۔

”کیسے کروں۔ کوئی سرچیر ہے بھلا۔ کا جان کو الہام ہوا تھا کہ تم باری میں انٹر سٹڈ ہو؟“ ماہین کی سوئی بنو ایک جگہ آگئی ہوئی تھی۔

”صحیح طریقے سے بتاؤ مجھے۔ دماغ نہیں گھماؤ۔“ اس کے اس بڑی طرح رونے سے ماہین ہلچلی گئی تھی۔

”کیا بتاؤں۔ کوئی بات ہو تو بتاؤں؟“ وہ روتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

”روشی! یہ نہیں کرو میرے ساتھ۔ تمہیں پتا ہے میں آل ریڈی کتنے عذابوں سے گزر رہی ہوں۔ کس دلدل میں وحشی ہوئی ہوں۔ کسی لمحے میں میری شادی ختم ہو سکتی ہے۔ تمہارے پتا کو ایک پل میں اجنبی بن جانے کا ہنر آتا ہے۔ اب یہ پانچم۔ اب تو کوئی کسر ہی نہیں رہ گئی۔“

روشی نے چونک کر اس کے شانے سے سر اٹھایا اور دم بخود ہی اس کی صورت دیکھنے لگی۔

”خالہ! آپ نے کیا کیا ہے؟ پتا آپ کے ساتھ اس قدر زیادتی نہیں کر سکتے۔ ان کو تو تھینک فل ہونا چاہیے کہ انہیں اتنا اچھا پارٹر ملا ہے۔ آپ کی وجہ سے وہ کتنے مکمل کفن لگے ہیں۔ اب کیا کی ہے ان کے پاس بچے بھی ہیں۔ پارٹنر بھی ہے۔ ایٹنس بھی ہے۔ کیا ہوا ہے انہیں۔؟“

وہ خود پر پڑی بھول گئی۔ جذب سے اس کا چہرہ اتسمانے لگا تھا۔ ماہین کو بھی اس پر بے ساختہ پیار آ گیا۔ اس کی آنکھوں میں نمی اتر آئی۔

”میری جان۔ بے خبری بھی بڑی نعمت ہے۔ نہ زیادہ کی کھوج کرنا کہ پھر کھائی کا سفر پڑتا ہے۔ اتنی بہادری دکھانے سے پہلے یا فوراً بعد ہی مجھے بتا دیتیں تو شاید کوئی آسانی کی راہ نکل آتی۔ کچھ طے کر کے چلتے تو منزل آسان ہو جاتی۔“
”مگر جو انکشاف اچانک ہوا ہے۔ یہ ذہول آندھی کی طرح ہے کہ کچھ سمجھائی نہیں دے رہا۔ بیک وقت کتنے لوگ ٹینشن میں آگئے ہیں۔“ ماہین نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

”زبردستی اور بلا وجہ کی ٹینشن ہے خالہ۔ نکاح ہوا ہے کا جان کی موجودگی میں۔ کورٹ میرج تو نہیں ہوئی۔ اور نہ میں اس طرح کے ارادے سے حویلی سے چھوٹی حویلی گئی تھی۔ کا جان کا بھی تو وہی خاندان ہے۔ وہی خون ہے جو میرا اور پپا کا ہے۔ انہیں تو کوئی اعتراض نہیں۔ اس کا صاف مطلب تو یہ ہے کہ پپا صرف ضد میں میری اور کا جان کی مخالفت کرتے ہیں لو جیکل نہیں۔ یہ تو قطعی اوپنیشن نہیں ہے۔ بہت بڑی زیادتی ہے۔ اگر وہ کم تر ہے تو اس کے برابر گاڑی میں۔ ڈانگ میں کیوں بیٹھتے ہیں۔ اسے بیڈروم کیوں دیا ہوا ہے، کوٹھڑی کیوں نہیں دی۔ اسے اعلیٰ تعلیم کیوں دلوائی جا رہی ہے؟“
وہ ناراض انداز میں تواتر سے بول رہی تھی۔

”ٹھیک ہے مگر نکاح تمہارے پپا اور بابا صاحب کی رضامندی کے ساتھ بھی تو ہو سکتا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ تھوڑی محنت کرنا پڑتی انہیں قائل کرنے کے لیے۔“

”نہیں ہو سکتا تھا قیامت تک۔ اس کا اندازہ کا جان کو بھی ہو گا، تب ہی تو انہوں نے یہ فیصلہ کیا۔ میرے اصل گارجین بس وہی ہیں جنہوں نے میری فیلنگ کو سمجھا اور بڑی ہمت اور حوصلے کے ساتھ ایک پروپر کام کیا۔ جوزاٹ کی تاریکی میں نہیں ہوا تھا دن کی روشنی میں ہوا تھا۔ پپا تو میرے قادر محسوس ہی نہیں ہوتے۔ وہ صرف قانونی کاغذات اور شناختی کارڈ میں میرے والد محترم ہیں۔ وہ اتنی بے رحمی سے فیصلے سناتے ہیں کہ لگتا ہے الٹی چھری سے ذبح کر رہے ہوں۔“

اس نے تیزی سے ماہین کی بات کاٹ کر بہت تلخ انداز میں کہا تھا۔

”باپ ہونے کے ناتے وہ بہت سے حقوق محفوظ رکھتے ہیں۔ وہ کبھی تمہارا نام تو نہیں چاہیں گے۔ پہلے ان کے سامنے یہ سب کچھ مشورے کے لیے پیش تو کیا جاتا تب کہیں جا کر اس اقدام کا جواز بنتا تھا۔“

ماہین نے پھر اسے قائل کرنے کی کوشش کی۔

”اگر ایسا ہوتا تو وہ محض ضد میں خیر آباد کے کسی مزارع سے مجھے بیاہ دیتے۔ کا کا جان بھی تو انہیں جانتے ہیں آخر ان کے سکے بھائی ہیں۔ کا کا جان جیسے آدمی سے ان کی ناراضگی صرف یہی یقین دلاتی ہے کہ اس میں بھی قصور پکا ہوگا۔ انہی کی زیادتی ہوگی۔“ اس نے گویا فیصلہ سُنا دیا۔

حیرت سے ماہین کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ اتنا تیز وجدان ہے اس کا۔ حقیقت کو کھوجے جانے بغیر اس نے کیسا نشانے پر تیر چلایا تھا۔

”روشی! جس طرح یہ سب ہوا ہے اس طرح نہیں ہونا چاہیے تھا۔ تم نے اگر یہ سب کر ہی لیا تھا تو کم از کم مجھے تو مطلع کر دیتیں۔ میں اپنے طور پر کچھ تو کرتی، مجھ سے پہلے ہی بہت کام پڑے ہوئے تھے۔ بہت گڑبڑ کر دی ہے تم نے جیت کر بھی ہار سکتی ہو۔ یاد رکھو صاحب اتنی آسانی سے شکست تسلیم نہیں کریں گے۔“

ماہین زچ ہو کر کہہ رہی تھی۔

”پاپا اب کچھ نہیں کر سکتے جو ہونا تھا وہ ہو چکا۔ اگر وہ چاہیں تو پھویشن سنبھال سکتے ہیں۔“ اس بار اس کے لہجے میں بہت سکون تھا۔

وہ پھویشن کیوں سنبھالیں گے۔ اب تو مزہ چکھانے کا موقع ملا ہے انہیں۔ ”ماہین نے تلخی سے مسکرا کر کہا۔“

”آپ فکر نہ کریں۔ میں کلیئر کر دوں گی کہ اس تمام قصے میں آپ کی کوئی انوالومنٹ نہیں ہے۔ وہ آپ کو ہماری وجہ سے پریشان نہ کریں۔“ اس نے ماہین کی ٹھوڑی چھو کر کہا۔

”تم کہو گی اور جیسے وہ یقین کر لیں گے۔ حیرت ہے تم انہیں نہیں سمجھ پائیں ابھی تک۔“ وہ افسردہ لہجے میں کہہ رہی تھی۔

”وہ تو خود بخود ظاہر ہو جائے گا۔ ظاہر ہے اب معاملہ بابا صاحب کے سامنے پیش ہوگا۔ اور تمام تفصیلات سامنے آئیں گی۔“ روشی نے اطمینان سے کہا تھا۔

”یہ تو خیر جانتے ہوں گے وہ کہ میں اس معاملے میں شریک نہیں تھی۔ مگر یہ خیال ان کے دل سے کیسے نکالا جائے گا کہ نکاح کے بعد تم نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہوگا۔ اور میں نے خاموش رہ کر تمہیں سپورٹ کیا ہے۔ ناراضگی کا سبب تو یہی ہے ناں۔“ ماہین نے جیسے تنگ آ کر کہا۔

”کچھ نہیں ہوگا۔ بلکہ اب آپ نے مجھے سپورٹ کرنا ہے۔ پتا جو چاہ رہے ہیں۔ وہ میں نہیں کروں گی۔“ اس نے قطعی انداز میں جواب دیا تھا۔

”مگر باری پریشاں ہو سکتا ہے۔“ ماہین بیڈ سے اترتے ہوئے بولی۔

”وہ ایسا نہیں کرے گا۔ اگر وہ ایسا کرنے کی نیت ظاہر کرے گا تو میں خود ہمیشہ کے لیے اس سے الگ ہو جاؤں گی۔“

”بہنہ پھر یہ وہ باری نہیں ہوگا جس کے لیے میں نے اتنا بڑا قدم اٹھایا تھا۔ اس کی ثابت قدمی اور کردار کی پختگی ہی تو اس کی وہ خصوصیت ہے جس کی خاطر اتنا بہادر بنا جاسکتا ہے۔ اگر وہ اس طرح کا ثابت نہیں ہوتا تو پھر اس میں اور فیضو تاکے والے میں فرق کیا رہ جاتا ہے۔ پھر میں اپنی غلطی تسلیم کر لوں گی اور سب سے معافی مانگ لوں گی۔ اور ساری زندگی غلط انتخاب کے پھتادے کے ساتھ گزار لوں گی۔“

اس کے لہجے میں پختگی تھی، ماہین اٹھ کھڑی ہوئی۔

”کسی کے ثابت ہونے کا یقین نہ ہو تو اتنا بڑا رسک نہیں لینا چاہیے۔ مگر کیا کریں۔ تمہارے پتا تو ہر طرح سے ثابت ہوتے نظر آ رہے تھے پھر بھی یہ شادی خطرے سے دوچار ہے۔ اب یہ قسمت ہی تو ہے۔ بہر حال ابھی کچھ بھی نہیں کہا جاسکتا۔ اب تو بس یہ ہے کہ ممکن حد تک لوگوں کو ریزہ ریزہ ہونے سے بچانا ہے۔ اب تو ہر مرحلے پر تمہارے کا کا جان کی انوالومنٹ ضروری ہوگئی ہے۔ پھر باری کو بھی ٹولنا ہے کہ وہ کس حد تک جرأت مند ہے۔ خیر۔ تم فکر نہ کرو۔ حل بھی انہی کرائس میں ہو گا۔“ وہ سوچنے کے انداز میں ہم کلام تھی۔

وہ خواب گاہ میں داخل ہوئی تو تیمور علی خان کو آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر ٹائی باندھتے ہوئے پایا۔

وہ پر عجز تھری پیس شلوار سوٹ میں ملبوس بہت نکھری نکھری نظر آ رہی تھی۔

”یہ لیجئے۔ آپ تو کہیں جانے کی تیاری کر رہے ہیں۔ آپ نے تو کہا تھا کہ صبح کو بڑی حویلی میں پیش آنے والے ”خوشگوار“ واقعات بتائیں گے۔“ نازنین نے تعجب سے ان کی طرف دیکھا۔

”بتائیں گے۔ صرف تھوڑی دیر کے لیے جارہے ہیں۔ پولیس اسٹیشن تک۔“ انہوں نے ناٹ درست کرتے ہوئے گلت بھرے انداز میں کہا۔

”اب مجھ سے صبر نہیں ہوگا۔ آپ مجھے ابھی بتائیے۔ آپ کو کیا پتا کہ صبح کے انتظار میں رات کیسے کٹی ہے۔“

وہ ان کی پشت کی طرف جا کھڑی ہوئی اور انہیں آئینے میں دیکھتے ہوئے مخاطب تھی۔

”روشی آپ کو کیسی محسوس ہوئی۔ خوش یا اُداس؟“ وہ آہستگی سے گویا ہوئی۔

”فی الحال تو خوش ہی ہوگی۔ ماہین کی موجودگی میں وہ خوش ہی نظر آتی ہے۔“

”ہاں..... ماہین کے متعلق آپ نے مجھ سے کوئی بات نہیں کی۔ کاش مجھے اندازہ ہوتا کہ یہ سب بھی ممکن ہو سکتا ہے تو میں صرف اسے بچانے کے لیے بڑی حویلی میں پہنچ جاتی دوبارہ زندہ ہو کر۔ میرے تو..... وہم و گمان میں بھی نہیں آ سکتا تھا کہ وہ اس قدر رات بوجھ و فرس ہونے کے باوجود اس پتھر کے ساتھ شادی کرنا پسند کرے گی۔ یہی خیال تھا بھانجے بھانجی سے مل کر واپس چلی جائے گی اور پھر اپنی رنگوں بھری زندگی میں واپس پلٹ جائے گی۔“

”خون ایک ہو تو ضروری نہیں کہ قسمت بھی ایک ہو۔ اس کا بھی اتنا تصور نہیں جتنا تصور بابا صاحب بھائی میاں اور بھابی بیگم کا ہے۔ ان سب کو مزاحمت کرنا چاہیے تھی۔ کیا ہمیشہ اس شخص کے ہی دل کی ہوگی۔؟ اور صرف اسی شخص کے ہاتھوں لوگ

برباد ہوتے رہیں گے۔“ اس کی آواز بولتے بولتے بھڑانے لگی۔
تیور علی خان نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا۔

”اب ان سب باتوں کا فائدہ نئی بات تو یہ ہے کہ وہ آپ سے ملنا چاہتی ہیں۔“
”مم۔ مجھ سے۔؟“ وہ مارے حیرت کے دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔

”آپ سب کچھ بتا چکے ہیں اسے۔ یہ آپ نے کیا کیا؟ ساری ریاضتیں ہی مٹی میں ملا دیں۔ یہی سب کچھ کرتا تھا تو وہ سب کیوں کیا تھا؟ تھک گئے یا انتقام کا جوش چڑھا ہے؟ اب تو وہ جوان ہیں۔ اب تو انہیں ماں کی نہیں لائف پارٹنر کی ضرورت تھی۔ مگر تیور علی خان میں تماشا نہیں بنوں گی۔ یوں بھی زندگی مجھ ناراض ہو رہی ہے۔ بہت مایوسی ہوگی سب کو۔ یہ آپ نے کیا کر دیا۔؟“

وہ نڈھال سے انداز میں کرسی پر بیٹھ گئی سپیشلی پر پسینہ چمکنے لگا تھا۔

تیور علی خان نے دوسری کرسی کھینچ کر اس کے مقابل کی اور بیٹھ گئے۔ ان کی سیاہ جادو اثر آنکھیں نازنین کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

”یا تو کسی کو سمجھنے کا دعوا نہیں کرتے اور جب دعوا کر لیتے ہیں تو گنجائش رکھ کر بات کرتے ہیں۔ ہم بھلا اُن سے اتنے قریب کس حساب میں ہوں گے؟ اور کیوں اپنی اُبھی ہوئی زندگی میں مزید پریشانیاں مول لیں گے۔“
وہ اپنی بھاری اور جذب ہونے والی آواز میں اس سے دھیرے دھیرے مخاطب تھے نازنین نے الجھ کر ان کی سمت دیکھا۔

”آپ ہی کی طرح ہمیں بھی یہ سوال پریشان کر رہا ہے کہ ان کے سامنے حقائق سے پردہ کس نے اٹھایا ہے؟ کسی پرانے ملازم کی تو یہ جرأت نہیں ہو سکتی؟ حویلی کے ذمہ دار افراد یہ حرکت نہیں کر سکتے۔“ وہ سوچتے ہوئے کہہ رہے تھے۔
نازنین کو فوراً ہی اعتبار آ گیا تھا۔

”آئی۔ ایم۔ سوری تیور علی خان!..... پھر کس نے یہ حرکت؟“

اگر ”وہ“ زندہ ہوتی تو میں سمجھتی یہ نیا شر و فساد پھر اس کی طرف سے آیا ہے کہ اس کا خیر ہی شر سے بنا تھا۔“ اس کی رگ رگ میں آگ اُترنے لگی۔

تیور علی خان چونک پڑے۔ (مالی گڈنٹس۔ بے بی پاسیل)

ظاہر ہے یاور علی خان تو یہ سب کچھ نہیں کر سکتے۔ اس سارے واقعے میں سب سے زیادہ قصور وار وہی تھے۔ وہ اپنا یہ پہلو کس طرح ماہین کے سامنے پیش کر سکتے ہیں؟ اس میں تو سراسر نقصان ان کا ہوتا نظر آتا ہے (دیش پوائنٹ) انہوں نے شکر یہ کی ایک نگاہ نازنین کے چہرے پر ڈالی۔ ایک الجھن سے بیٹھے بیٹھے نجات ملی تھی۔ ہو سکتا ہے وہ زنجیر چھٹکانی رات کے اندھیرے میں پھر باہر آگئی ہو تازہ ہوا میں سانس لینے اور ماہین اتفاق سے اسے مل بیٹھی ہو۔

”اچھا! آپ اسے ایک طرف ہٹائیں اور ہماری بات غور سے سنیں۔“ انہوں نے سمجھانے کے انداز میں مخاطب کہا۔

”آپ کی بات ہمیشہ ہی غور سے سنتے ہیں۔ مگر آپ اس سے ملنے کے لیے نہیں کہیں گے۔ اُس رات اس کی آواز نے جو اذیت پہنچائی وہ میں آپ کو کیسے بتاؤں۔ مجھے رشتے کہاں راس ہیں تیور! صرف سترہ سال کی عمر میں آپ کی حویلی میں آگئی تھی۔ ماں باپ سے جدا ہو کر۔ باپ سفر میں رہتا تھا پہلے ملک کے اندر پھر ملک سے باہر میں مری کا ٹونڈ۔ میں ماں سے دور۔ پھر شادی ہوئی اور جو کچھ ہوا آپ کے سامنے ہے۔ زندگی کی ڈور آپ سے بندھی تو میں نے ڈھیلی کر کے آپ کو زبردستی فاصلے پر بھیج دیا لیزا کے پاس۔ کہ میں نے تو صرف اس شخص کو اذیت پہنچانے کے لیے آپ سے کاغذی رشتہ استوار کیا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ اذیت مجھ پر دوہری پڑ گئی۔ ادھر تو کوئی فرق نہیں پڑا۔ بلکہ اس شخص نے تو مجھ سے نئے انداز میں نئے سرے سے انتقام لیا۔

پھر لیزا کی نادانی کے سبب آپ عرصے بعد پلٹ کر آئے۔ ضوئی گود میں آئی۔ تو زندگی کی خشکی کی خبر مل گئی۔ کیا میں غلط کہہ رہی ہوں؟“

تیور علی خان سر جھکائے سن رہے تھے۔

”آپ نے ہمیشہ اپنے فیصلے کو درست سمجھا ہے جو سوچا وہی کیا ہے مگر اب آپ کو ہماری بات سننا ہوگی۔ کیا اب بھی تھوڑی سا حق نہیں بنتا آپ پر۔ تیور علی کا انداز دو ٹوک تھا۔

”آپ ان سے مل لیں مسائل شیر کرنے کے لیے نہیں صرف اس لیے کہ وہ آپ کی حقیقی بہن ہیں وہ محرم راز ہو ہی گئی ہیں تو کیا فرق پڑتا ہے۔ شاید ہی کسی نے خود سے اس قدر شدید انتقام لیا ہو۔ ہماری پارٹنرشپ میں تو آپ کے جذبات سرد ہی ہوئے ہوں گے۔ تھوڑی سی حرارت اپنے اندر پیدا کرنے کے لیے آپ ان سے مل لیں۔ پلیز۔“

”جلسے فرض کریں میں کر چکی ملاقات پھر اس کے بعد بلاوجہ کا ٹینشن جو دوسروں کو ہوگا۔ سب سے زیادہ پرالیم تو خود ماہین کے ساتھ ہو سکتی ہے کیونکہ ہو سکتا ہے۔ وہ شخص بہت مہارت کے ساتھ اسے بے وقوف بنا رہا ہو اور وہ ان کے ساتھ خوش گمانیاں ہو۔“

”نہیں ہیں وہ خوش۔ وہ بس آپ سے ملنا چاہتی ہیں۔ بہن کی حیثیت سے۔ آپ کے اندر اس طرح کی خواہش نہیں ابھرتی؟ حیرت ہے۔“

تیور علی خان نے قدرے تاسف سے کہا اور اٹھ کر بالوں میں مُدش چلانے لگے۔

”آپ کے اندر ابھرتی ہے؟“ نازنین کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا تھا۔

”ہمارے اور آپ کے کیس میں بہت فرق ہے۔“ اس لیے ہماری آپ کی فیلنگ یکساں نہیں ہو سکتیں ہمارے ساتھ زیادتی ہوئی ہے۔ انہوں نے آپ کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کی ہے۔ اور ہم آپ کو کنوینس اس لیے کر رہے ہیں کہ اگر آپ ان سے ملنا بھی نہیں چاہیں گی وہ تب بھی آپ سے ملیں گی۔ وہ صرف ہمارے جواب کا انتظار کر رہی ہیں اگر انہیں ہمارا جواب ملنے میں تاخیر ہوئی تو وہ کسی بھی وقت یہاں پہنچ یہاں گی۔“

”اُسے سمجھایا ہوتا۔ مُردوں پر تو فاتحہ پڑھتے ہیں ان سے ملنے پر اصرار نہیں کرتے۔“ اس کی آواز آنسوؤں میں ڈوب

گئی۔

”میری بچی باہر باغ میں ٹہل رہی تھی۔ اور میں اسے دیکھ رہی تھی۔ تیمور! میں..... ضبط کے ان راستوں سے گزر آئی ہوں جن کے پیش آنے کے خوف سے لوگ اقدام خودکشی کرنے کا سوچنے لگتے ہیں۔ مجھے خود پر جبر کرنے میں مہارت ہوگئی ہے۔ آپ یہ سب مابین کو سمجھا دیجئے، کیونکہ وہ صرف ملاقات کرنے نہیں آئے گی۔ بلکہ بہت سی تبدیلیوں کے منصوبے ساتھ لائے گی۔ ابھی اس نے دنیا آنکھیں کھول کر دیکھی نہیں ہے اس لیے اس بڑی خوش گمانیاں ہوں گی۔ اسے کہئے وہ بس اپنی زندگی بنا ہے۔ جو فیصلہ کر کے حویلی میں داخل ہوئی ہے اس فیصلے کی آبرو سنبھالے۔ روشی کا خیال رکھے اور لیس۔ اور یہ کہ روشی کا باپ اس کی خوشیوں میں حائل ہو تو اسے اس کے حق میں قائل کرے وہ کم عمر بیٹا ہے تھوڑی سی کوشش سے اپنی بات منوا سکتی ہے سن رہے ہیں ناں آپ۔ اسے مایوس کر دیجئے گا یوں بھی ہم تو اب گئے کہ تب گئے۔“

اس نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر آنکھیں موند لیں۔

”انسان اپنے گھر میں پالتو جانور رکھتا ہے تو ان سے محبت کرنے لگتا ہے۔ بیمار ہوتے ہیں تو ان کا علاج کرتا ہے۔ ان سے ایچ منٹ محسوس کرتا ہے ایک حسین خاتون جو ہمارے گھر میں عرصے سے ہے وہ جس رشتے میں بندھ کر بڑی حویلی میں آئی تھی وہ رشتہ تو ہمارے اور اس کے درمیان گفتی کے چند سالوں پر کنسٹ کرتا ہے۔ اور جو دوسرا رشتہ ہے وہ تو بڑی طویل رفاقت کا سلسلہ ہے۔ اصل رفاقت تو مینٹل میں پر ہوتی ہے۔ اس میں ڈسٹینس ڈسکس نہیں ہوتا۔ ہم اپنے نقصان بھول کر زندہ رہنا چاہتے ہیں۔ تو آپ کیوں بار بار یاد دلاتی ہیں۔ اللہ سے رحم مانگتے رہتے ہیں۔ کیا آپ سے بھی اس قسم کی ریکویسٹ کیا کریں۔ فارگا ڈسک۔“

گزرے ہوئے بیس سالوں میں ایک مرتبہ بھی انہوں نے نام لے کر مخاطب نہیں کیا تھا۔ اس طرح سے ہمکلام ہوئے تھے۔ کہ نام استعمال کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوتی تھی۔

”ڈرائیور بہت دیر سے ہمارا ویٹ کر رہا ہے۔ ہم ایک ڈیڑھ گھنٹے میں واپس آتے ہیں۔ پھر آرام سے بات کریں گے۔ اوکے۔“ وہ ایک اچھٹی نگاہ اس پر ڈال کر باہر نکل گئے۔

”اچھا۔ تو باقاعدہ مالی بھی بن گئے ہو۔ ماشاء اللہ۔“

وہ جھومر کی آواز پر نرئی طرح چونک پڑا تھا۔ اور مزہ کر بیچھے دیکھا تھا۔

”پودوں درختوں سے دوستی رکھنا چاہیے۔ قدردان ہوتے ہیں۔ اچھا سلوک کرنے پر دعا دیتے ہیں۔“

”بھئی تمہیں تو گھوڑے بھی بہت دعائیں دیتے ہوں گے۔ تمہیں دعاؤں کی بھلا کیا کمی۔“ وہ کھٹکھٹائی۔

”آپ صبح صبح تشریف لے آئیں اس کا مطلب ہے۔ منہ اندھیرے گاڑی میں بیٹھی ہوں گی۔ بڑی جلدی واپسی

ہوگئی؟“ باری نے پائپ سنبھالتے ہوئے پوزیشن بدلی۔

”حویلیوں میں رہنے کی عادت ہو جائے تو چھوٹے گھروں میں دل نہیں لگتا اور ہمیں تو بڑے اصرار اور منت سے حویلی

والوں نے قبول کیا ہے۔“ وہ پھر کھٹکھٹا کر ہنس پڑی۔

”اس میں کیا شک ہے۔“ باری بھی مسکرا دیا۔

”اور سنا بیٹے صاحب۔ سنا ہے کل بڑی خوشی کی تقریب ہوئی۔ یہ تو یہاں آ کر معلوم ہوا۔ خیر۔ ویسے بھی یہاں خوشیوں کا قحط ہے۔ حویلی والوں کا ذائقہ بھی بدلا ہوگا۔ وہ تو ہمیں مابین بی بی کی شرم ہے ورنہ مزے لینے کے دن تو اب آئے تھے۔“

باری نے الجھ کر اس کی سمت دیکھا۔

”خیر چھوڑو۔ یہ بتاؤ کیسی گزر رہی ہے آپ کی روشی بی بی کے کیا حال ہیں؟“ وہ چھیڑنے کے انداز میں مسکرائی۔

”صرف روشی بی بی کے۔“ وہ بھی انجان بن کر مسکرا دیا۔

”ان سے پوچھنے کی کیا ضرورت ہے بھابی میرا حال مجھ سے ڈائریکٹ پوچھ لیا ہوتا۔“

روشی کی آواز بہت قریب سے سنائی دی دونوں چونک پڑے۔ اس نے اوپر بالکنی سے دونوں کو باتیں کرتے دیکھا تو

بے اختیار نیچے چلی آئی تھی۔

باری نے گہری نگاہوں سے اس کا جائزہ لیا۔ کنبے کپڑے ستا ستا چہرہ جو اس کی شب بیداری کی چغلی کھا رہا تھا۔

”بالکل۔ بڑا اونچا مقام ہے میرا حویلی میں۔ پچھواڑے ایک پُر شکوہ بیڈروم۔ بہت سارے قیمتی ڈیکوریشن پیس اور انہی میں سے ایک میں۔ تم لوگ مقام دو گے؟ مقام تو اپنا میں خود بناؤں گی۔ بلکہ چھین کر حاصل کروں گی۔ ایسے ہی تو خوش نہیں رہتی۔ اپنے حصے کی خوشی اسی حویلی میں رہ کر چھینوں گی۔ نہ تاج نچایا بڑی پک والوں کو تو نام بدل دینا۔ مجھے تو باری پر حیرت ہے۔ عجیب جوان کا بچہ ہے کولہو کا تیل بنا ہے۔ جوانی ٹھکانے لگانا ہے تو کشمیر چلا جائے۔ مجاہد بن جائے۔ شیر کی سی طاقت سے کوئی تو فائدہ اٹھائے۔“ جھومرتخی سے بولی۔

”آپ دے دیجیے ناں اسے مشورہ۔“ روشنی کی رگ رگ میں محسوس ہوا تھا۔

اسی دم ہر سوئی ان کی سمت چلی آئی۔

”نساں نوں بڑی بیگم بلاساں۔“ وہ جھومر سے مخاطب ہوئی۔

”یقیناً بھری بیٹھی ہوں گی بڑی بی۔ مگر مجھے سب پر ترس آتا ہے۔ ڈر نہیں لگتا۔“ وہ ہنستی ہوئی آگے بڑھ گئی۔

روشی تیز تیز چلتی باری کے قریب پہنچی۔

”تم اندر نہیں جاسکتے تھے۔ تم پانی نہیں دو گے پودوں کو تو انہیں پانی نہیں ملے گا؟ کیوں اتنا پوز کرتے ہو کہ حویلی تمہارے کندھوں پر کھڑی ہے؟“ وہ بُری طرح برس پڑی۔

”کس حساب میں آپ میرے کان اینٹھ رہی ہیں۔ ابھی میرا اور آپ کا تعلق متنازعہ ہے۔ مجھ سے پرہیز کریں۔“ وہ مسکراہٹ دباتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ نگاہ بدستور پودوں پر تھی۔

”وہ تو شروع ہی سے متنازعہ ہے۔ نئی بات کیا ہے؟“ وہ جمل کر بولی۔

”کم از کم ایک بات پر تو اتفاق ہوا تھا ناں۔ سرائے میں چار گواہ موجود ہیں۔“ وہ شرارت سے کہہ رہا تھا۔

روشی ایک ٹائیے کو لا جواب سی ہو کر پُچھ ہو گئی۔

”خدا را آپ اندر جائیے۔ کسی کی نگاہ نہ گئی تو آج ہی سوٹ فائل کر دیں گے یا اور خاناں۔ اور آپ سے بڑی آسانی سے اقرار کروالیں گے عدالت میں کہ یہ نکاح جبری ہے۔“

”ہونہہ کہلوا ہی نہ لیں کہیں۔“ وہ ناک سکڑ کر نخوت بھرے انداز میں بولی۔

”اور جو کہلوایا لیا؟“ وہ مسکرا رہا تھا۔

”نہ وہ کہوں گی جو وہ کہلوائیں گے اور نہ وہ کہوں گی جو تم کہو گے۔“

”مگر اس طرح کے کیس میں تیسرا راستہ تو پڑتا ہی نہیں۔“ وہ درحقیقت حیران ہوا۔

”پڑتا ہے۔ مگر میں تمہیں کیوں تھلاؤں۔ تاکہ وکیل صاحب پہلے سے تیاری کر لیں؟“

”ابھی وکیل صاحب کہاں۔ ایڈووکیٹ اپنے نام کے ساتھ اس دن لگائیں گے جب حویلی والوں سے آپ کو جیتیں گے۔ ورنہ تو ڈگری اور بریکٹس لائسنس دونوں کو آگ لگا دیں گے۔“

اس نے بائیں ایک کپاری میں چھوڑ دیا اور اس کی سمت دیکھ کر بہت دل آویز انداز میں مسکرایا جو کم مہم ہی کھڑی تھی جیسے

☆.....☆.....☆.....☆.....☆.....☆

”چلو تم ہی سے پوچھ لیتے ہیں تمہارا دل۔ سناؤ کیسی گزر رہی ہے۔ شکر ہے حویلی میں بھی خوشگوار تہذیبیاں شروع ہوئیں۔ لگتا ہے تمہاری روانگی بھی شروع ہونے والی ہے۔ وہ اپنی لٹاں کے اکلوتے نعیم صاحب۔ کیا خیر خبر ہے وہاں کی؟“

اس نے گہری نگاہ روشنی کے چہرے پر دوڑائی۔ باری پائپ کھینٹنا دُور چلا گیا۔

”لگتا ہے باری کو یہ موضوع پسند نہیں۔ حصہ لینے کا ارادہ نہیں۔“ جھومر پھر کھلکھلائی تھی۔“ بے چارہ باری اور کربھی کیا سکتا ہے۔ تم نے وہ بیل تو دیکھا ہی ہوگا۔ جس کی آنکھوں پر چمڑے کے ”ڈھکن“ لگے ہوتے ہیں؟“ جھومر کا انداز بے باک اور جارحانہ تھا۔

”مگر یہ باری ہے بل نہیں ہے۔“ روشی نے تنہا کر جواب دیا۔

”مگر مجھے تو کوئی خاص فرق محسوس نہیں ہوتا۔“ جھومرنے ہنس کر مزید دُور ہوتے ہوئے باری کو دیکھا۔

روٹی کا چہرہ جذب سے پتنے لگا۔ جھومر کی حسین صورت سے اسے وحشت ہونے لگی۔

”اس نے آپ کا کیا بگاڑا ہے بھابی! جو آپ اتنی انسلٹ کر رہی ہیں؟“ وہ کہے بنا رو نہ سکی۔

”ہائے یہ تو وہ ہیں کہ بگاڑیں تو اگلے سنور جائیں۔“ جھومر نے ایک آہ سرد کھینچی۔ روشی کا ضبط جواب دینے لگا۔

”یہ تو بہت ہی گری ہوئی بات ہے بھابی۔ آپ کو اپنے مقام کا تو خیال کرنا چاہیے۔“

اپنے کانوں پر اعتبار نہ آ رہا ہو۔

”جو کسی کی جستجو میں ہوتے ہیں ان کے سکون میں بھی بے قراری ہوتی ہے۔ جو کہہ رہے ہو وہ محسوس نہیں ہوتے۔ کچھ نہ کہو مگر محسوس تو ہو۔ میں تو آج تک جو محسوس کرتی رہی ہوں وہی بعد میں سچ بھی نکلا ہے۔ مثلاً میں سمجھتی تھی کہ میں خواہ مخواہ پتا سے بدگمان رہی ہوں۔ ان کے بارے میں میرے احساسات غلط ہیں وہ سخت دل نہیں ہیں شاید مجھے لگتے ہیں مگر اب تو ثابت ہو رہا ہے کہ وہ وہی ہیں جو میں محسوس کرتی تھی۔“

”ذہن پر بہت زیادہ دباؤ ہو تو انسان وہم کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس کی Will ختم ہو جاتی ہے۔ اس کے ہاں شک کی پوٹنسی وہی ہوتی ہے جو صحیح ذہن رکھنے والے پر سکون انسان کے ”یقین“ کی ہوتی ہے اس طرح کے ذہنی امراض میں جھکا ہونے والے بعض اوقات اتنے آؤٹ آف کنٹرول ہو جاتے ہیں کہ پیئری کے دعوے کر بیٹھتے ہیں۔ اپنے خیالات و احساسات پر حقیقت کو Base مت کیجئے نفسیاتی مر فیض بن جائیں گی۔“

باری نے اس کی بات کاٹ کر سمجھانے کے انداز میں اسے مخاطب کیا۔

”جو پیش آئے اسے فیس کیجئے۔ افلاطون بننے کی کوشش میں مت بھی ماری جاتی ہے بندے کی۔“ اس نے مزید کہا۔

”تمہیں تو تسلی دینا بھی نہیں آتی۔“ اس کے مشینی انداز پر اسے رونا آ گیا۔ اسے اندازہ ہی نہیں کہ وہ کتنی پریشان ہے۔

”ہم تسلیوں پر نہیں رکھتے۔“ اس کا لہجہ معنی خیز تھا۔ روشنی کو نہ جانے کیوں اس کے لہجے پر ٹوٹ کر حیا آ گئی۔

وہ آگے بڑھ گیا تھا مگر اس کے اپنے مقدم من من بھر کے ہو رہے تھے۔

دل کی دھڑکن بھی غیر معمولی طور پر تیز ہو چکی تھی۔ پتا نہیں کس کے لیے رکھتا ہے سینت سینت کراتنی دلفریب باتیں۔ وہ بھی دھیرے دھیرے قدم بڑھانے لگی۔ معاوہ اپنے دھیان سے چونک پڑی ماہین سے ٹکراتے ٹکراتے بچی تھی۔

”یہ دلیری نہیں حماقت ہے۔ ایسی کون سی ایمر جنسی تھی کہ بچوں بچ کھڑی ہو کر اس سے باتیں کرنے لگیں۔ اس طرح کی حماقتیں کرو گی تو بنتی بات بھی بگڑ جائے گی۔ اسے تمہاری سرکشی سمجھ کر سب بڑے اپنی انا کا مسئلہ بنالیں گے۔ ایک حساب سے یا اور صاحب ٹھیک ہی کہتے ہیں۔ اس طرح کے فیصلہ کن اقدام کرنے کی عمر نہیں تھی تمہاری۔“ ماہین سخت ناراض نظر آ رہی تھی۔

”وہ جھومر بھابی اس سے باتیں کر رہی تھیں مجھ سے رہا نہیں گیا تو میں بھی اس طرف آ گئی۔“

اسے بس یہی جواب سوچا۔ نظریں جھکا کر شرمندگی سے کہہ رہی تھی۔

”جھومر اس سے بات کر رہی تھی تو کیا ہوا۔ وہ بھی میری طرح حویلی کی بہو ہے۔ کسی سے بھی بات کر سکتی ہے۔ تمہیں کیا فرق پڑتا ہے اس کی بات چیت سے؟“ ماہین نے ناراضگی اور حیرت کے ملے جلے تاثرات سے اس کی جانب دیکھا تھا۔

”آپ لوگ سمجھتے ہیں انہیں بہو۔ وہ نہیں مانتیں خود کو یہاں کی بہو۔“ وہ زچ ہو کر کہہ رہی تھی۔

”تمہیں کوئی ضرورت نہیں اس معاملے میں الجھنے کی۔ تم صرف اپنی فکر کرو۔ اور مزید الجھنیں نہیں پھیلاؤ۔ اب کیا تم اس کو پابند کرو گی کہ وہ تمہارے علاوہ کسی سے بات بھی نہ کرے۔ حد ہو گئی۔ پہلے اعتبار کا رشتہ پھر نکاح کا رشتہ۔ بھاگا جا رہا ہے کہیں۔ یاہر صاحب مجھ سے کہیں زیادہ کو ایفائیڈ اور خوبصورت خواتین سے صبح سے شام تک ملتے ہیں۔ اس کا کیا مطلب

ہے کہ میں ان کے پیچھے سراغ رساں چھوڑ دوں؟ مرد ہزاروں عورتوں سے ملتے ہیں ہزاروں سے شادیاں تو نہیں کرتے؟ اور وہ اتنا میاں گزرا ہے کہ بھابی سے ”علیک سلیک“ شروع کر دے گا؟ وہ تو کچھ ہے تب ہی تو تم نے اتنا بڑا قدم اٹھایا ہے ورنہ شکل و نیم کی بھی بہت اچھی ہے۔ روشی اس وقت بہت احتیاط کی ضرورت ہے۔ تمہارے پتا کی رگ رگ میں خون کے بجائے بارود بھرا ہے۔ ہوش کے ناخن لو۔“ ماہین بہت بخیدہ تھی۔

”مجھے پتا ہے خالہ! مگر آپ کو یہ بھی پتا: دونا چاہیے۔ اب وہ ہرگز نہیں ہوگا جو کہ بابا صاحب اور پتا چاہیں گے۔ نقصان کے سودوں میں عمر کئی ہے مجھے کسی بات سے خوف نہیں آتا۔ میں ڈوبنے کا حوصلہ رکھتی ہوں مگر ڈوبنے سے پہلے کشی کو ایک بار اچھالا ضرور دوں گی۔ جسے آپ پوز نیوٹرائی بیسٹ کہہ سکتی ہیں۔“

روشی کے لہجے میں دُور دُور تک کسی مصلحت کا نام و نشان نہیں تھا۔

”خاک ہے تمہاری ٹرائی بیسٹ ایک دم کنڈم۔ ٹیکو ایسلوٹلی۔“ ماہین جھلا پڑی۔ ”عین میدان میں کھڑی تم ٹرائی بیسٹ کا نہیں بلکہ حماقت بیسٹ کا مظاہرہ کر رہی ہو۔ خود سے دشمنی کر رہی ہو مجھ پر اعتماد نہیں۔ مجھے پرو پر چھینل سے کام کرنے دو۔ جاؤ اندر اور بے سکون رہو۔ اور سٹو جب تک کام فائل نہ ہو جائے اس سے ملنے اور بات کرنے کی ضرورت نہیں۔“

ماہین کا انداز حتمی تھا۔ روشی چند ثانیے کھڑی سوچتی رہی پھر اندر کی سمت بڑھ گئی۔

ماہین بھی کچھ دیر کسی دھیان میں رہی پھر جیسے کوئی فیصلہ کر کے اندر کی سمت بڑھی۔ سامنے ہی کلو ٹرابلی دھکیلتی نظر آ گئی۔

”کلو!“ اس نے آواز دی۔

”جی چھوٹی دلہن!“ وہ اپنی جگہ تھم گئی۔

”دیکھو۔ باری کو نور امیرے کمرے میں بھیج دو اور اسے کہنا یاہر خان باہر گئے ہوئے ہیں۔“ وہ اتنا کہہ کر اپنے کمرے کی

سمت بڑھ گئی۔ اور خواب گاہ میں داخل ہو کر درتپے میں جا کھڑی ہوئی۔

تقریباً پانچ منٹ بعد ہی دروازہ بجا تھا۔

”ہاں۔ آ جاؤ۔“ وہ عجیب تھکے تھکے انداز میں کہہ کر صوفے پر بیٹھ گئی۔ باری قدرے فکر مند انداز میں کمرے میں داخل

ہوا۔

”آؤ۔ نادان لڑکے۔ بیٹھو۔“ ماہین مبہم سے انداز میں مسکرائی۔

باری اس طرز کلام پر قدرے شپٹایا تھا۔ اور سر جھکا کر اس سے خاصے فاصلے پر بیٹھ گیا تھا۔

”خیریت؟“ اس نے ہچکچاتے ہوئے ماہین کی سمت دیکھا۔

”اپنی شامت کو خود آواز دیتے پھر رہے ہو بھلا خیریت کیسے ہو؟“ ماہین کے لہجے میں ناراضگی واضح تھی۔

باری الجھ سا گیا مگر کچھ بولا نہیں۔

”دیکھو سب کچھ منظر عام پر آ چکا ہے۔ تیمور علی خان اور میں بہت سبھاؤ سے کوششیں شروع کر چکے ہیں مگر تم نوگوں کی نادانیاں ہمیں فلاپ کر دیں گی۔ کیا ضرورت تھی اسے لے کر باغ میں کھڑے ہونے کی۔ تم تو اس کے مقابلے میں بہت مجبور

ہو۔ سر پٹنے کو دل چاہ رہا ہے میرا۔“ مایہن نے بدستور ناراض انداز میں کہا۔

”مجھے تو واقعی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ میں تو روٹین نمٹا رہا تھا۔ پہلے بھابی آگئیں پھر ”محترمہ۔“

باری کے ساری بات سمجھ میں آئی تو اس نے سکون کا گہرا سانس لے کر مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

دیکھو باری! صورت حال تم پر واضح ہے کتنی نازک پچویشن ہے۔ معمولی سی غفلت بہت سارے لوگوں پر اثر انداز ہو سکتی ہے اور ایسے بگاڑ بھی پیدا ہو سکتے ہیں جو کبھی ٹھیک نہ ہوں خدا نخواستہ۔“ مایہن فکر مند انداز میں گویا ہوئی۔

”آپ فکر مند نہ ہوں۔ میری جانب سے آپ بے فکر رہیں۔ بس محترمہ کو تھوڑا فیڈ کر دیجئے۔ باقی خیر ہے۔ مجھے اجازت؟ یا کوئی اور بات باقی ہے ابھی؟“ وہ اٹھتے ہوئے مایہن سے مخاطب ہوا۔

”نہیں۔ بس یہی فکر تھی کہ کیا کرے رہے ہو تم لوگ۔ اور ”محترمہ“ سے تو خیر میں ہنٹ لوں گی۔ مگر ایک بات تو یاد محترمہ کی کون سی خوبی ہے جس نے سماج سے ٹکرانے کا حوصلہ پیدا کر دیا۔ تم جیسا گہرا اور پچھو رہندہ صرف شکل و صورت کی بنیاد پر تو اس طرح آگ میں نہیں کود سکتا۔“ مایہن بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔ اب اس کے لبوں پر بڑی دلفریب مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

”کئی بار یہ سوال میں نے اپنے آپ سے بھی کیا ہے۔“ وہ بھی شرارت بھرے لہجہ میں جواب دہ ہوا۔

”ان کے پاس چاہنے کی ایک پاد ہے غالباً۔ یہ جس سمت بھی رخ کرے گی غالب ہو جائے گی۔ وہ ہر کام بہت توجہ سے کرتی ہیں۔“ وہ سنجیدگی سے کہتے کہتے یکدم ہنس پڑا۔

”کام؟“ مایہن بھی بے ساختہ مسکرا دی۔

”چاہتا تو یہاں الزام ہے جو تم اُس پر لگا رہے ہو۔ تمہیں احساس ہے؟“ مایہن نے بغور اس کا چہرہ دیکھا۔

”وہ یہ الزام مجھ پر لگا کر حساب برابر کر سکتی ہیں؟“ اس نے پھر مسکرا کر جواب دیا۔ اب وہ بہت مودبانہ سے انداز میں خمیدہ کھڑا تھا۔

”اچھا؟ بہت ذہین ہو۔ مانتے ہیں۔ کیا قیامت ہے اور کس قیامت کا سکون ہے تم میں۔ کامیابی سے پہلے اہل ارادہ بجائے خود ایک خوشی سکون ہے۔ مجھے حیرت ہے یاد علی خان جیسا سنجیدہ اور بہت گہرائی میں سوچنے والا شخص جو ہمیں بہت پسند کرتا رہا ہے۔ اس نئے رشتے پر ساری دنیا سے جنگ کرنے کے درپے ہیں۔ شاید روشی کا یہ خود مختار انداز ان کے لیے چیلنج بنائے۔ ہاں۔ یہی بات ہو سکتی ہے۔“

اس نے خود ہی اپنے خیال کی تائید کی۔ ”بات ہے بھی غلط۔ ابھی مارجن تھا اتنی جلدی یہ انتہائی قدم نہیں اٹھانا چاہیے تھا۔“ بہر حال وہ ایک نتیجے پر پہنچ گئی۔

”یہ بات نہیں ہے۔ مارجن نہیں تھا ورنہ کم از کم میں ان کے اس انتہائی قدم میں ان کا ساتھ نہ دیتا۔ اور یہ بات آپ بھی بہت اچھی طرح جانتی ہیں کہ یاد خانوں مجھے سونے کا تاج تو پہنا سکتے ہیں بحیثیت داماد مجھے قبول نہیں کر سکتے۔ اس لیے کہ میں تیمور خانوں کے ہیٹ فرینڈ کی انکوٹی اولاد ہوں۔ ان کے حساب سے تو تیمور خانوں ہی کی اولاد ہوں۔ کیونکہ میرا باپ انہیں بہت عزیز تھا۔“

آپ انجان بن کر مجھ سے سوال نہ کیا کریں! مجھے اچھا نہیں لگتا۔ میں جانتا ہوں آپ کیا اور کتنا جانتی ہیں۔“ مایہن تعجب سے دیکھ رہی تھی۔ اتنی صاف گوئی کی گویا اسے امید نہیں تھی۔ باری نے چند ثانیے اس کے بولنے کا انتظار کیا پھر جیڑی سے دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔

”می اوہ جو بڑی کیوٹ سی لڑکی بڑی حویلی سے آئی تھی۔ وہاٹ ہر نیم؟“ وہ دماغ پر زور ڈالنے لگی۔

نازنین نے چونک کر وضوٹاں کی شکل دیکھی۔ دل سوکھے پتے کی طرح لرزنے لگا۔

یہ آج اسے کیا دھیان آیا؟ وہ خاموشی سے ضوفی کے بالوں میں برش چلاتی رہی۔

”بتائیں ناں مچی۔ ریکی آئی فار کوٹ ہر نیم“

”روشانے۔ مائی ڈارلنگ“ نازنین اس طرح گویا ہوئی جیسے کسی مجرم کا ارتکاب کر رہی ہو۔

”مام۔ ڈارلنگ آپ نے کسے کہا۔ ہمیں یا روشانے کو؟“ ضوفی نے گھوم کر ماں کا چہرہ دیکھا۔

”نئی بات۔ بڑی ہے وہ تم سے۔ باجی کہہ سکتی ہو۔ آپی کہہ سکتی ہو۔“ نازنین نے تم صم سے انداز میں فہمائش کی۔

”آئی ایم ساری۔ وہ دوبارہ بھی آئی تھیں؟ یعنی ان مائی ایب سنس۔ (میری غیر موجودگی میں)؟“ اس نے فوراً

معذرت کی اور وہ ”وال کیا جو نام پوچھنے کا محرک تھا اور درمیان میں کم..... ہو گیا تھا۔

”نہیں۔“

”وہ تو بہت اچھی! بہت نائس ہیں پھر آپ نے پٹانے ہمیں ان سے ملنے سے کیوں روکا؟ وہ تو بہت دلیل مینڈ ہیں۔

بیوی۔ بہت تمیز والی ہیں۔ باری بھائی نے بھی پٹا کے ساتھ مل کر منع کیا تھا اور خود وہ دوبار ان کے کمرے میں گئے تھے۔ ہم نے اوپر باگشی سے خود دیکھا تھا۔“

”کیوں یاد رکھ ہوئے ہو۔ اتنی پرانی بات؟ کتنے مہینے ہو گئے۔ جب مچی پٹا کسی بات سے منع کر دیتے ہیں تو بچے

وہاٹے وہاٹ کر کے انہیں پزل نہیں کرتے۔“ نازنین نے جھنجھائے ہوئے انداز میں اسے سرزنش کی تھی۔

”جب ہم نے بھی ان سے بات نہیں کرنا اور آپ نے بھی تو پھر وہ ہمارے گھر کیوں آئی تھیں؟ کیا ان کے مچی پٹا نہیں

ہیں؟“ وضوٹاں پر نازنین کی تنبیہ کا کوئی اثر نہیں ہوا۔

نازنین خاموشی سے ضبط کی منزیلیں طے کرنے لگی۔

”کیوں پریشان کرتے ہو بیٹا! ماں کو۔ آل ریڈی ان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“ تیمور علی خان تو لیے سے سر گرڑتے

ہوئے ہاتھ دم سے برآمد ہوئے تھے۔

نازنین نے تھپکتے آنسو وضوٹاں کی نظر بجا کر صاف کیے۔

”بچوں کو مچی پٹا کے افیئر ز میں انوالو نہیں ہونا چاہیے۔“ انہوں نے ایک اچھتی نگاہ نازنین پر ڈالی۔

”پپا! کیا وہ باری بھائی کی کزن ہیں؟“ پپا تھی بس ایک دھن میں آ گئی تھی۔

نازنین نے اسے بازو سے اپنی طرف موڑا اور چٹاخ چٹاخ پے در پے دو تھپڑ اس کے پھول سے رخساروں پر جڑویے۔ تیسرے تھپڑ کی نیت سے ہاتھ فضا میں گیا ہی تھا کہ تیمور علی خان نے درمیان ہی میں تھام لیا اور دوسرے ہاتھ سے ضوئی کو اپنی طرف کھینچا جو فوراً سہم کر ان سے لپٹ گئی تھی۔ اور بلک بلک کر رو رہی تھی۔

”تمہارے تو خاندان کی عادت ہے کیجے گھر چنا۔“ عجیب سی وحشت نازنین کے چہرے پر برسنے لگے تھی۔

ضوئی باپ سے لپٹی تڑپ تڑپ کر روز رہی تھی۔ ”پتا! نمی بہت خراب ہیں۔“

”میری جان! نمی کو ایسے نہیں بولتے۔ نمی کی طبیعت خراب ہے جب نمی کسی بات سے منع کرتی ہیں۔ تو بچوں کو مان جانا چاہیے۔“

”جاگیرداروں کے ہاں جاگیر دار ہی پیدا ہوتے ہیں۔ اپنی منوانے والے۔ اپنی منانے والے۔ خواہ مائیں باہر سے ہی لے آئیں۔ مٹی نہیں بدلے گی۔ اسے اچھی طرح سمجھا دیجئے۔ آئندہ مجھ سے کوئی ایسی سیدھی بات نہ کرے۔“

نازنین کے سانسوں کی بے ترتیبی بتا رہی تھی کہ اس وقت وہ اپنے حواس کھو چکی ہے۔ تیمور علی خان نے ہاتھ میں پڑے تو لیے سے ضوئی کا چہرہ صاف کیا اور اس کی پیشانی پر بوسا دیا۔ جو مری طرح سے سک رہی تھی۔

”آؤ بیٹا! آپ کے کمرے میں چلتے ہیں۔“ انہوں نے ضوئی کا ہاتھ تھاما اور وضع داری فراموش کر کے ہاتھ گاؤن ہی میں بیڈروم سے باہر چلے گئے۔

نازنین بیڈ پر گرنے کے انداز میں لیٹ گئی۔ اس کی آنکھوں سے اشک رواں تھے۔ پہلی مرتبہ کسی بچے پر اس نے ہاتھ اٹھایا تھا۔ اب اس کا اپنا دل کٹ رہا تھا۔ وہ مری طرح رو رہی تھی۔

پندرہ بیس منٹ کے دور ایسے کے بعد تیمور علی خان اندر داخل ہوئے۔

”آئی ایم ساری تیمور! پتا نہیں میں کیا اول فول بول گئی۔“

تیمور علی خان خاموش رہے اور وارڈروب سے اپنے کپڑے نکالنے لگے۔

”بہت ہی سوال جواب کرنے لگی ہے۔ تنگ آ جاتی ہوں میں۔ میرے اپنے اندر کیا کم سوال جواب ہوتے رہتے ہیں۔“

تیمور علی خان بدستور خاموش رہے۔

”اب مجھے آپ کی ناراضگی کی بھی پروا نہیں۔ اب میری کشتی کو ایک اچھالے کی بھی ضرورت نہیں۔ اب میں بے خوف خطر ہوں۔ میں انیکسی میں چلی جاؤں گی۔ مجھے اپنی ناراضگی کے خنجر سے مزید بولہ بان مت کریں۔“ اس کی آواز بھڑک اٹھی۔

”جو آپ کا دل چاہتا ہے آپ وہی کرتی ہیں۔ لہذا جودل چاہ رہا ہے کر ڈالیں۔“ تیمور علی خان نے بہت آہستہ آواز میں اور بے تاثر لہجے میں کہا تھا۔

مگر سب چہرے نے اسے اختیار دینا ان کے انتہائی غضب کا بھید تھا۔

”تو بہت جلدی کر سکتی ہیں۔ بچی کی معصومانہ ضد سے اتنی جلدی میسر ہو کر گئیں۔ ہم اسے ہمیشہ کے لیے سمجھا

رہے تھے۔ پانچ منٹ کی محنت سے مسئلہ حل ہو جاتا مگر۔ کیا طے پا گیا اسے مار چر کرنے کے بعد؟

ہم اپنی اولاد کے ساتھ یہ سب برداشت نہیں کر سکتے۔ آپ اپنی اُلجھنیں دور کرنے کے لیے ہماری بیٹی کو استعمال نہیں کریں گی۔ ہماری بیٹی بہت چھوٹی ہے بہت تنہا ہے۔“ تیمور علی خان کے لہجے سے دکھ ناراضگی کمال ظاہر تھی۔

”میری بھی تو بیٹی ہے کیا میرا اس پر کوئی حق و اختیار نہیں۔ افسوس مجھے بھی ہے مگر کبھی کبھی بچوں کے ساتھ ایسا کرنا بھی پڑتا ہے۔“ نازنین نے بھی ناراضگی سے جواب دیا۔

”وہ صرف ہماری بیٹی ہے۔ آپ تو۔ حقوق و فرائض کا پاس تو صرف ہم ہی نے کیا ہے۔ آپ تو خود کو تھر کی صورت میں ڈھال کر بہت سارے جواز کی ڈھال بنا کر ہمیشہ بچت کرنے کی عادی رہی ہیں۔“

وہ ڈرینگ کی سمت بڑھ گئے۔ نازنین ساکت سی بیٹھی رہ گئی۔ ان کے ایک لفظ میں کئی کئی معنی ڈھونڈنے کی عادت تو یوں بھی ہو چکی تھی۔

”شکر ہے کہ زندگی کا چکر عنقریب پورا ہوا چاہتا ہے۔ ہمارے بعد دیکھیں کون اگلا بد نصیب نشانے پر ہوگا۔ کہ چھوٹا بڑا ہر الزام اس کے سر۔“

اس نے قدرے اونچی آواز میں تیمور علی خان کو سنانے کی غرض سے کہا اور پیاز کے چھلکوں جیسی رنگت والے پاؤں سیاہ گرگایوں میں پھنسا کر دوپٹا گلے میں ڈال کر کچھ اور بھی بڑبڑائی ہوئی خواب گاہ سے باہر نکل گئی۔

تیمور علی خان ڈرینگ سے باہر آئے تو ان کی پیشانی پر بھی شکنیں پڑی ہوئی تھیں۔ شرٹ کے بٹن بند کرتے ہوئے وہ جیسے الجھ رہے تھے۔

ماہین غسل کر کے ابھی ابھی باتھ روم سے باہر آئی تھی کہ بیڈروم کے دروازے پر دستک ہوئی۔

”کون؟“ اس نے ہاتھ گاؤن میں لپٹے اپنے سر اپنے پر نگاہ دوڑا کر قدرے الجھ کر پوچھا۔

”میں ہوں جی بالو۔ آ جاؤں۔؟“

”اوہ۔ ہوں۔ آ جاؤ۔“ اس نے تالیے سے بالوں کو آزاد کرتے ہوئے جواب دیا۔

بالو اندر آ گئی۔

”خیریت۔ کوئی کام؟“ ماہین نے اٹھکیوں سے بال سلجھانے شروع کر دیے۔

”جی۔ ماہین بی بی۔ آپ سے اجازت لینے آئی ہوں۔ اب نہ میں ہری پور جاؤں گی اور نہ یہاں رہوں گی۔“

”کیوں بھئی۔ کیا ہوا۔ کیا کام بہت کرنا پڑتا ہے یہاں؟ اور تمہاری کنڈیشن ایسی نہیں کہ تم اب در بدر پھرو۔“ ماہین نے ہنک کر اس کی طرف دیکھا تھا۔

”نہیں جی۔ میں در بدر نہیں پھروں گی اس کے پاس جاؤں گی جس نے در بدر کیا ہے۔“ بالو دوزانو ہو کر بمشکل کارپٹ پر بیٹھی۔

”عارف کے پاس۔ کیوں کیا قاضی لیے تمہارے انتظار میں بیٹھا ہوا ہے؟“ مایین نے قدرے تلخ لہجے میں سوال کیا۔
”ساری بات سمجھ میں آگئی ہے بی بی! وہ تو اب اس کے کسی کام کی نہیں۔ کوشش کروں گی کہ اس سودا کی خواری ختم ہو جائے۔“

”سودا کی وہ کم تم زیادہ ہو۔ لال خان تم سے عمر میں بہت بڑا ہے تو عارف کون سا تمہارے برابر کا ہے۔ اس میں کیا نیا م بات ہے؟ فلمی ہیروئن مت بنو۔ بچے کے سر پر اس کے باپ کا سایہ رہے اسی میں عافیت ہے۔“ مایین نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

”اس کی عمر کا بھید تو اب کھلا ہے مجھ پر۔ مگر جی آپ بھی اسے دیکھو تو حیران ہو جاؤ۔ ڈبلا پتلا بالکل لڑکوں جیسا لگتا ہے بالوں میں بھی سفیدی نہیں۔ سچی۔“ بالو کے پاس جواب تیار تھا۔

”کیا کھاتا ہے بھئی؟ وہ تو آج سے بیس سال پہلے بھی جوان تھا۔ بالوں کو ڈائی کرتا ہوگا۔ تیمور علی خان سے کچھ ہی چھوٹا ہوگا۔ ان کے بھی سر میں ہلکی ہلکی سفیدی جھلکنے لگی ہے۔“ وہ بڑے تعجب سے تجزیہ کرنے میں الجھ گئی تھی۔

”کیا کرتا ہوتا ہوگا؟“ بالو کی سمجھ میں نہیں آیا تو پریشان ہو کر پوچھنے لگی۔

”میرا مطلب ہے بالوں کو رنگ لگاتا ہوگا۔“ مایین نے وضاحت کی۔

”ایسا تو میں نے نہیں دیکھا، پر کیا خبر جی۔ دنیا ہی دھوکے کی ہے۔“ بالو نے اس سے اتفاق کر ہی لیا۔

”ایک بات کہوں بی بی! آپ مرنے تو نہیں مانیں گی؟“ بالو نے جھمکتے ہوئے سوال کیا۔

”ہوں۔ پوچھو۔“ مایین نے برش سے بال سلجھانا شروع کر دیئے ساتھ ہی اندازہ بھی لگانا شروع کر دیا کہ وہ کیا سوال کرتا چاہ رہی ہے۔

”یادور خانوں بھی تو آپ سے عمر میں بہت بڑے ہیں مگر آپ تو بہت خوش ہیں۔“

مایین کے گردش کرتے ہاتھ یکدم رُک گئے۔ چہرہ متحیر سا ہو گیا۔

”یہ تو بہت اچھی خبر ہے میرے لیے کہ میں بہت خوش نظر آتی ہوں۔“ وہ خیال سے باہر آ کر بڑی بے ساختگی سے مسکرائی۔

”بالو! یکنخت وہ سنجیدہ ہو گئی۔“

”جی بی بی؟“ بالو ہمہ تن گوش تھی۔

”بالو۔ شادی بس ایک اشیاق ہے۔ یا ایک سودے بازی ہے۔ جو کبھی مرضی سے ہوتی ہے کبھی مجبوری سے۔ مثلاً ہم ایک لاکھ روپے کے مالک ہیں۔ اگر جیولر سے ایک لاکھ کے ہیرے خریدتے ہیں تو بہت خوش ہوتے ہیں کیونکہ ہم نے اپنا پیسہ خوشی سے خرچ کیا ہوتا ہے۔ اگر اسی پیسے سے ہم اپنے گردے یا دل کا علاج کراتے ہیں اور یہ پیسہ اسپتال میں خرچ ہوتا ہے تو ہمیں تمام عمر ایک قلق رہتا ہے کہ ہمارا اتنا سارا پیسہ استقبال میں چلا گیا۔ ہیرے خریدیں تو خوشی، بیماری میں خرچ کریں تو مجبوری۔“

بے وقوف ”عورت“ نے خرچ ہی تو ہونا ہوتا ہے۔

عورت تو بس ایک رات ہی کے لیے ہوتی ہے۔ ایک رات کی ہوتی ہے۔ مگر تیری سمجھ میں شاید بات آئے گی نہیں۔
”الانکہ آنا چاہیے کہ ٹو اپنے حصے کی رات گنوا چکی ہے۔ اب تجھ کون سے اشتیاق لاحق ہیں؟“ وہ جیسے جل کر پوچھ رہی تھی۔
”بی بی! دل کی بھی تو کوئی آبادی ہوتی ہے۔“ بالو کی آواز بھر ا گئی۔

”چھوڑ اس دل کا پیچھا۔ نری خواری۔ تجھے خبر نہیں کتنے ضروری کام رہ جاتے ہیں اس دل کے پیچھے۔ اپنے بچے کی فکر کر۔ اب صرف ماں بن کر سوچ۔ اب بھی سبق نہیں پڑے گی۔ پچھواڑے پڑی ہوئی ہے۔ دل برباد لے کر دیکھا نہیں ہے؟“ مایین کے لہجے میں ترشی آگئی تھی۔

”بی بی! اللہ آپ کو ہمیشہ خوش رکھے۔ آپ کا دل آباد رکھے۔ یادور خانوں کی لمبی عمر ہو۔ آپ کا دل آباد ہے۔ خالی جگہ کا ذوق آپ کو کیا پتا؟“ بالو نے بڑے کرب سے کہا۔

”میں تجھے کیسے سمجھاؤں بالو۔ تیرے اندر زندگی پروان چڑھ رہی ہے مگر تیرے اندر کی ماں ابھی تک نہیں جاگی؟ بس تجھے اپنے بچے سے زیادہ کسی کا خیال نہیں ہونا چاہیے۔ چاہے عورت خوشی سے خرچ ہو یا مجبوری سے ”ماں“ کے معنی نہیں بدلنا پائیں۔ سُن رہی ہے ناں میری بات؟“

عورت آخر کار صرف ماں ہے جو عورت ماں نہیں ہوتی۔ ماں ہونے کو محسوس نہیں کراتی۔ اس کی قسمت کے اندھیرے مرتے دم تک دور نہیں ہوتے تو کیا سمجھتی ہے؟ میں ماں نہیں ہوں؟ میں اپنی بہن کے بچوں کی ماں ہوں۔ تو کہہ رہی ہے ناں کہ میں خوش نظر آتی ہو۔ میں ان بچوں کی وجہ سے خوش ہوں۔ ان کو ملنے والی خوشیوں کے خیال سے خوش ہوں، میں بچوں کے باپ کی وجہ سے خوش نہیں ہوں۔“ مایین نے پھر سے بالوں میں برش چلانا شروع کر دیا۔

”تو آپ کی شادی زبردستی ہی ہوئی تھی یا دور خانوں آپ کو پسند نہیں؟“ بالو نے جھمکتے ہوئے پوچھا۔

”شادی تو زبردستی ہی ہوتی ہے۔ کہیں دل زبردستی کرتا ہے کہیں گھر کے لوگ۔“ مایین عجیب سی تلخی کے ساتھ ہنس پڑی۔

بالو اس مبہم جواب پر اس کی صورت دیکھ کر رہ گئی۔

”ایک بات اور پوچھ لوں بی بی! آپ غصے تو نہیں ہوں گی۔“ اس نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

”ہاں۔ ہاں پوچھ لو۔ بہت سوال پیدا ہونے لگے میں تمہارے ذہن میں بھی اللہ رحم کرے۔“ وہ پھر بے معنی انداز میں مسکرائی۔

”مجھے اور سرسوتی کو باہر بھیج کر وہ آپ کو کیا باتیں بتاتی تھی۔ سرسوتی تو یہ بھی بتا رہی تھی کہ بی بی تو بہت دن سے اس کے پاس رات کو جا رہی ہیں؟“

”بس چُپ ہو جا۔ آئندہ پھر اس طرح کی بات تیری زبان پر نہ آئے۔ سرسوتی کو دیکھا ہے بس اسی کی طرح اندھی بہری کوگی ہو جا۔“ مایین نے اسے راہ ہی میں ٹوک دیا۔ ”یہ تیرے سوچنے کرنے کی باتیں نہیں۔ میں تم لوگوں کو پہرے کے لیے ماتھے لے جاتی تھی۔ حویلی کے بھیدوں میں حصہ دلانے نہیں۔ حویلی کے نوکروں کے منہ میں زبان نہیں ہوتی۔“

”بی بی! میں کب حویلی کی نوکر ہونا چاہتی ہوں۔ بس آپ تو مجھے واپس جانے کی اجازت دے دیں۔“ بالو نے منت سے کہا۔

”میرا تم پر کیا زور..... مگر اس حالت میں تمہیں حویلی سے نکالنے کو میرا دل نہیں مانتا۔“

”آپ اپنے دل کی نہ مانیں۔ میری مان لیں۔ مجھے جانے دیں۔“ بالو نے منت کی۔

”ہاں مجھے پتا ہے۔ تجھے کچھ سمجھ نہیں آئی۔ اسی کے چکر میں لکنا چاہ رہی ہے۔“ مایین نے ناراضگی سے کہا۔ بالو خاموش رہی جیسے کچھ سوچ رہی ہو۔

”کیا سوچ رہی ہے؟“ مایین نے بالوں کو چھو کر ان کے خشک ہونے کا اندازہ لگایا۔

”کچھ نہیں بی بی۔ انسان کے پاگل پن کو سوچ رہی ہوں۔ جیسے تلاش اس کا نصیب ہو۔ آگے کا نظر نہیں پڑتا دور کی کھوج رہتی ہے۔ جوں جاتا ہے اُس پر دھیان نہیں ہوتا جو نہیں ملتا اس سے دھیان نہیں ہوتا۔ میرا بھی بڑا اچھا گھر تھا دو منزلوں والا۔ اس کے کئی کمرے تو میں نے کھول کر بھی نہیں دیکھے تھے ساری مشینیں تھیں۔ یہاں حویلی میں تو بہت پانی ہے۔ میرے گھر میں پانی کا مسئلہ تھا۔ مگر لال خان موٹر لے آیا تھا۔ میرے باورچی خانے میں بھی ساری مشینیں تھیں۔ آم کا جوس بنانے والی سبب کا جوس بنانے والی۔ گیلا مسالا پیسنے والی الگ۔ سوکھا پیسنے والی الگ۔ قیمہ بنانے والی آلو پیاز کانٹے والی۔ پانچ صوفے تھے تین ڈرائنگ روم میں ایک ٹی۔ وی والے کمرے میں جو باورچی خانے کے ساتھ تھا ایک اُس کمرے میں جہاں ہم سوتے تھے۔

کیسا بھرا گھر تھا بی بی۔ پر مجھے وہاں نیند کیوں نہیں آتی تھی؟ میرے باپ کا آدھا پکا آدھا کچا گھر تھا۔ وہاں تو مجھے بہت نیند آتی تھی۔ ماں چیختی رہتی تھی۔ کہ مر دار اتنا نہ سویا کر نیت ہوتی ہے۔ مگر میں سنتی کب تھی۔

کہاں گئی میری نیند بی بی؟“ وہ پھوٹ کر رونے لگی۔

مایین کے دل میں بھی لہریں اٹھنے لگیں۔

”پپ کر جا بالو۔ دل کی کر کے تو بغض اوقات جنم میں رہتا پڑ جاتا ہے کسی وحشت تھی کہ تجھے قدم قدم پر بکھرے منہ نظر نہیں آئے۔“ اس نے بڑے ڈکھ سے بالو کی سمت دیکھا۔

”ایسی ویسی بی بی! وحشت تو اب بھی وہی ہے۔ فرق یہ ہے کہ دنیا کچھ اور سمجھ میں آئی ہے۔ مگر وحشت تو کم نہیں ہوتی۔“

”بابو! اس بچے کی خاطر خود کو روک لے بس۔ ایک خاندان کی سات پشتیں تیری احسان مند ہوں گی۔ مت بھٹک۔ میرا

بس چلے تو تیرے ہاتھ پاؤں باندھ کر پھوڑے ڈال دوں۔“

مایین کو بھی اندازہ تھا کہ ان وحشتوں میں سمجھ ہی تو سب سے پہلے ساتھ چھوڑتی ہے۔ مگر ایک امتیاز کے سہارے اگلا قدم تو انسان اٹھاتا ہی ہے۔ اس نے بھی سمجھانے کی کوشش کی تھی۔

”بی بی! دُعا کرنا کہ یہ باپ پر نہ ہو اگر یہ باپ پر چلا گیا تو میں اس سے محبت کیسے کروں گی؟“ بالو کے انداز میں ہلاکی

سادگی تھی۔

”مجھے تو یہ خطر ہے کہ کہیں یہ اس پر نہ ہو جس کے دھیان میں تو ہر دم رہتی ہے۔“ مایین یونہی سرسری سا مسکرائی۔

”ہائے اللہ۔ ایسا بھی ہوتا ہے۔“ بالو نے گھبرا کر پوچھا۔

”ہوں۔ مگر اللہ نہ کرے کہ ایسا ہو۔ گالی بن کر پیدا ہونے سے بہتر تو ہے کہ بندہ پیدا ہی نہ ہو۔

اب حویلی کے مردوں کے سامنے نہ پڑنا۔ یاد صاحب کو مطمئن کرنا مشکل ہو جائے گا۔ مجھے کام بہت پڑے ہیں ورنہ

میں تو ہری پور کے بجائے تجھے کراچی پہنچا دیتی۔“

”آپ بھجوا ہی دیں۔“ بالو نے پھر اصرار کیا۔

”میرا بھائی ابھی گھر پر نہیں ہے۔“ مایین نے بتایا۔

”تو کیا آپ مجھے اپنے بھائی کے پاس بھیجیں گی؟“ میں آپ کے میکے جانے کے لیے تھوڑا ہی کہہ رہی ہوں۔ میں تو

بس اپنے شہر واپس جانا چاہتی ہوں۔“ بالو نے وضاحت کی۔

اسی دم یاد علی خان دروازہ کھول کر ماکانہ بے نیازی کے ساتھ اپنی دھن میں داخل ہوئے۔ وہ شلوار قمیض میں ملبوس

تھے۔ جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ حویلی ہی میں موجود تھے۔

مایین بری طرح گڑبڑا کر رہ گئی۔ بالو کا انداز نشست ایسا تھا۔ کہ اس کا چہرہ اور وازے کی طرف تھا۔ اس کی حالت ایسی تھی

کہ وہ گھبرانے کے باوجود پھرتی سے اٹھ نہ سکی۔ اور بمشکل کھڑی ہوئی تھی۔ چوڑا سا چادر نما دوپٹہ اس کے ہاتھ میں تھا جو اس

نے کانپتے ہاتھوں سے اوڑھنا شروع کر دیا تھا۔ عجیب سے خوف نے اسے پسینے میں بھگو دیا تھا۔

”السلام علیکم جی۔!“ اس کی آواز بھی کانپ رہی تھی۔

یاد علی خان نے اس پر ایک نگاہ ڈالی تھی ان کی ایک نگاہ بھی بہت تھی۔

”کون ہے یہ.....؟“ انہوں نے عام سے انداز میں مایین سے دریافت کیا۔

”بالو ہے۔ ایسے ہی ٹپری طور پر حویلی میں کام کرتی ہے۔“ مایین کی آواز بہت آہستہ تھی۔ اسے اپنی ہمدردانہ طبیعت

پر پہلی مرتبہ غصہ آیا۔

بالو دوپٹہ اچھی طرح لپیٹ کر باہر چلی گئی۔

یاد علی خان صوفے پر بیٹھے تھے اور مایین کھڑی تھی۔

”کس نے کی تھی یہ ٹپری اپنا ٹکٹ؟“ ان کا لہجہ بہت ٹیکھا تھا۔

”کراچی سے آئی تھی حویلی کا پتا پوچھتی ہوئی۔ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ اس لیے۔ میں نے بھابی بیگم سے سفارش

کی تھی۔“

”یعنی حد ہو گئی۔ کتنے دن سے قیام ہے حویلی میں محترمہ کا؟“ یاد علی خان نہایت سنجیدہ تھے۔

”چند ماہ ہوئے ہیں۔“ مایین نے اسی طرح کھڑے کھڑے جواب دیا۔

”یعنی آپ کی صورت میں حویلی کوئی لٹاں جی مل گئی ہیں۔ کیا بیگ گراؤنڈ ہے اس کا؟ شوہر کہاں ہے؟ کیا کام کرتا ہے؟ یہ اس سے دور اس حال میں کس حساب میں یہاں نظر آرہی ہے۔“

”سپریش ہو چکی ہے۔ ماں باپ بہت غریب۔“

”یعنی کوئی بھی خاتون اس حال میں اس حویلی میں آرام سے قیام کر سکتی ہیں۔ نکاح نامہ پٹو میں باندھے پھر رہی ہیں محترمہ..... مجھے یاد آیا۔ غالباً انہی کوہری پور ساتھ لے جانے کے لیے آپ کہہ رہی تھیں۔ اس وقت میں بہت ٹینس تھا۔ میں نے اس کیس پر توجہ نہیں دی تھی۔ مگر مجھے آپ سے اس قسم کی حماقت کی امید نہیں تھی۔“

وہ مشرقی شوہر ہونے کی حیثیت سے یہ حق محفوظ رکھتے تھے کہ جب موڈ ہو بیوی کو جا ملے ہونے کا احساس ضرور دلائیں۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ عورت کا شوہر تو بہت بے تاب رہتا ہے کہ کسی طرح ثابت کر دے کہ بیوی کا شعور اور ڈگریاں سب بے کار ہیں وہ جا ملے اس لیے کہ عورت ہے۔

احساس تو ہیں سے چند گھڑیاں لب بستہ رہ کر گزریں۔

”کیا نام بتایا ہے اس نے اپنے بچے کے باپ کا؟“ یاد علی خان کی آنکھوں سے فکر مندی جھٹک رہی تھی۔

”لال خان۔ معمولی پڑھا ہوا کاروباری آدمی ہے۔ ٹھیک ٹھاک پیسے والا ہے۔“ مایین ناراض سے انداز میں گویا ہوئی۔

”وہ پیسے والا ہے اور یہ یہاں اس حال میں جھک مار رہی ہے۔ کوئی سرپرہ ہے اس اسٹوری کا؟“ یاد علی بڑی طرح جھلا گئے۔

”بتایا تو ہے سپریشن ہو گئی ہے۔“ مایین نے سابقہ انداز میں جواب دیا۔

”اور ہاں..... ایک پوائنٹ تو مس ہو رہا ہے۔ حویلی کا پوچھتی کیوں آئی ہے۔ کیا حویلی میں اس کا کوئی رشتے دار ملازم ہے۔“ یاد علی خان ایک دھیان سے چونکے۔

”غلطی ہو گئی مجھ سے۔ ذرا سا بھی اعتماد نہی ہے مجھ پر۔ کٹہرے میں آکھڑی ہوں جیسے۔ نوکروں سے کہیں وہ اُسے دھکے دے کر حویلی سے باہر نکال دیں جیسے کہ آپ کے ہاں کا دستور ہے۔“ اب مایین کا ضبط جواب دے گیا تھا۔

”اس قسم کی ہمدردیاں گلے پڑ جاتی ہیں۔ کیوں نہیں سمجھ میں آتی یہ بات آپ کو؟“ یاد علی خاں سیلف کنٹرول کا مظاہرہ کر رہے تھے۔

”فیوڈل لارڈز ہمارے سسٹم میں ہر قانون و بندش سے آزاد ہوتے ہیں۔ کوئی آپ کا کیا بازو سکتا ہے؟ اگر کچھ بگڑے گا تو اسی بے چاری کا بگڑے گا۔“ مایین نے تلخ انداز میں جواب دیا۔

”فیوڈل لارڈز کی کوئی ریپوٹیشن بھی ہوتی ہے“ یاد علی خان نے مزید دلیل دی۔

”ہونہر۔ ریپوٹیشن؟ گن پوائنٹ پر جیسی چاہے ریپوٹیشن بنوالیں۔“ مایین کا موڈ تو گویا ہمیشہ کے لیے آف ہو چکا تھا۔

”میں بہر حال کہہ چکا ہوں اب یہ لڑکی ایک دن بھی یہاں نہیں رہے گی اور آئندہ کوئی لڑکی یا عورت بابا صاحب سے

ملے بغیر ملازم نہیں ہوگی۔ حویلی میں ملازم رکھنے یا نکالنے میں حویلی کی کوئی عورت حصہ نہیں لے گی۔“

”ایک قانون اور بنالیں کہ آئندہ حویلی کے مرد باہر سے شادی کر کے عورتیں حویلی میں نہیں لائیں گے۔ اپنے فرسودہ کزن میرج سسٹم پرائل ہو جائیں گے اور اس سے کبھی نہیں ٹینس گے۔“ مایین نے ان کی بات کاٹ کر ٹکڑا لگایا تھا۔

یاد علی خان سگریٹ سلگا رہے تھے انہوں نے شعلے سے نگاہ ہٹا کر مایین کی سمت دیکھا تھا۔ ایسے کہ نگاہ میں کوئی جستجو تھی۔

”جب میں نے آپ سے شادی کی تھی تو سوچا تھا ایک فریش اور کوائیٹ بنگ لڑکی مجھے اندر سے اتنا سیراب کر دے گی کہ سارے ملال مٹ جائیں گے اور خوشیاں رنگ بن کر مجھ پر بریں گی۔“

”سب کچھ اپنا ہی سوچا تھا۔ اس ”کوائیٹ بنگ“ لڑکی کا بھی کبھی سوچا ہوتا۔“ مایین نے بمشکل آنسو پیئے۔

”عرصے سے حیرت میں تو ہوں۔ گہرے رنگوں میں ملبوس گرم جوشی لڑکی کا ہاتھ جب میرے ہاتھ میں آتا ہے تو برف کیوں ہو جاتا ہے اسے میری کمزوری کا پتا ہے کہ میں سوئے ہوئے بندے کو جگانا پسند نہیں کرتا۔ اس لیے وہ نوبے سے ہی پڑ کر سو جاتی ہے؟“

گویا چارج شیٹ کھل گئی تھی۔

مایین سر نہ کھکائے سن رہی تھی۔

”ایک بیوی میں اُس طرح کی کمی سب سے بڑی کمی ہوتی ہے۔ میں ان بیس سالوں میں آپ جتنے قد والی ایک ڈمی بھی اپنے بیڈروم میں سجاسکتا تھا۔“

”مجھے یاد آ رہا ہے کہ بالو کے موضوع پر ہماری پہلے بھی بات چیت ہوئی تھی مگر تب آپ نے ایسا کوئی خاص نوٹس نہیں لیا تھا۔ اب کہاں کا غصہ کہاں نکالا جا رہا ہے جس بات پر غصہ ہے وہی بات کیجیے ناں۔“ مایین نے خفگی بھرے لہجے میں کہا تھا۔

”اب اندر غصے کے جذبات کے علاوہ دوسرے جذبات رہے کہاں ہیں۔ آج تو یوں بھی گیم کا فائنل ہے۔“ وہ تلخ لہجے میں کہہ کر کش لگانے لگے۔

مایین نے چونک کر ان کی صورت دیکھی۔

”گیم..... کون سا گیم؟“ اس کی نظر میں سوال تھا۔

”بابا صاحب خیر آباد سے واپس آ گئے ہیں۔ آرام کر رہے ہیں۔ روشنی کا معاملہ آج فائنل ہو جائے گا۔ اگر وہ باری کے لیے کوئی پلک یا نرمی ظاہر کریں گے تو ان سے بھی اس موضوع پر دوبارہ کبھی بات نہیں ہوگی۔ پھر کورٹ ہی میں معاملہ نہ مٹے گا۔ رہی اس لڑکی کی بات کیا نام ہے اس کا۔ مجھے اگر علم ہوتا کہ آپ نے ایسی لڑکی کو پناہ دی ہے جو ماں بننے والی ہے تو میں بہت پہلے ری ایکٹ کر چکا ہوتا۔ یہ بات آپ کو میرے علم میں لانا چاہیے تھی۔ مگر آپ تو مجھ سے ہر بات چھپانے کی عادی ہیں۔ کیسی احمقانہ پارٹنرشپ ہے ہماری۔ اعتبار و اعتماد کی کس قدر کمی ہے۔“

انہوں نے سگریٹ کی راکھ جھاڑتے ہوئے جھاڑ چھاڑ کی۔
 ”میں آپ کو یقین دلانے کی مزید کوشش ہرگز نہیں کروں گی“ کہ روشی کے کیس میں جتنے لاعلم آپ تھے اتنی ہی میں تھی
 تھی۔ البتہ اتنا علم ضرور تھا کہ وہ نعیم سے شادی پر رضامند نہیں ہے۔“

”جو ہو چکا ہوتا ہے میں اس پر زیادہ غور نہیں کرتا۔ جو کرنے کا ارادہ ہوتا ہے میری ساری امینشن اس پر ہوتی ہے۔“ یاد
 علی خاں نے دو ٹوک انداز میں کہا۔ ”پتا ہے مجھے۔“ مایین بڑبڑائی۔

”مگر یہ آپ کی بیٹی کا معاملہ ہے۔ انسان خود کو جانتا ہو تو اپنی اولاد کا بھی ٹھیک ٹھیک اندازہ لگا سکتا ہے۔ دنیا کو سمجھنے کا دعوا
 نہیں کیا جاسکتا۔ مگر اپنی اولاد کو آسانی سے پڑھا جاسکتا ہے۔ اس کو جانے بغیر آپ کورٹ میں جائیں گے تو یہ بہت بڑی
 پھوک ہوگی۔“ مایین نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی۔

”اتنا نادان میں بھی نہیں ہوں۔ اسے سیٹ کر لوں گا پھر کورٹ میں جاؤں گا۔ اس لیے کہ یہ ایک مضبوط پلاننگ ہے۔
 باری کی بیک بھی بہت مضبوط ہے۔ میں سب سمجھ رہا ہوں۔“ یاد علی خاں نے بڑے اعتماد سے کہا۔

”مثلاً۔ کیا سمجھ رہے ہیں؟“ مایین نے گرم لوہے پر چوٹ لگانے کی کوشش کی۔

”میں اس موضوع پر آپ سے بات نہیں کرنا چاہتا۔ بھابی بیگم کی تاکید ہے ان کا کہنا ہے۔ آئندہ مایین اپنے بیڈروم
 سے باہر نہ سوئے۔ آپ نے انہیں کچھ نہیں بتایا تو کیا خیال ہے وہ اتنا بھی نہیں سمجھتیں کہ میں بیڈروم میں موجود ہوں اور آپ
 بیڈروم چھوڑ کر کہیں اور رات گزاریں۔“

میں آپ کی ناراضگی سے خائف نہیں ہوں۔ مگر معاملے کی تک پہنچنے سے پہلے آپ سے بگاڑ بھی نہیں چاہتا۔ بہتر ہے
 کہ اس موضوع پر ہماری بات نہ ہو۔ یہ ہم دونوں کے لیے ہی اچھا نہیں ہے۔“

یاد علی خاں خشک لہجے میں بات کر رہے تھے۔

”بات تو میرا خیال ہے مجھ سے ہی ہوگی آپ نہیں کریں گے تو بابا صاحب کریں گے۔ مگر میرے ہاتھ صاف ہیں۔ مجھے
 مطلق اسی بات کی پروا نہیں کہ کوئی مجھ سے اس موضوع پر بات کرتا ہے یا نہیں۔“
 مایین نے بھی قطعی انداز میں بات کی۔

”میرا آپ سے خود بات کرنا اس بات کا ثبوت ہے کہ میں اس معاملے میں سرے سے آپ کو انوالو ہی نہیں کرنا
 چاہتا۔“

”انوالو تو آپ مجھے کر چکے ہیں یہ کہہ کر کہ میں اس پلاننگ میں شامل ہوں۔“ مایین نے بُرا مان کر کہا۔
 ”بات آگے بڑھے گی تو ثابت ہو جائے گا کہ آپ شامل ہیں یا نہیں۔ اس سے پہلے میں آپ سے کوئی بات نہیں کرنا
 چاہتا۔ اسٹاپ دس ٹاپک۔“

یاد علی خاں اٹھ کر میز کی طرف بڑھے جیسے کچھ تلاش کرنا چاہتے ہوں۔
 ”لیکن اگر یہ ثابت ہو گیا کہ میں اس معاملے میں شامل نہیں ہوں تو آپ کو مجھ سے معذرت کرنا پڑے گی۔“ مایین نے

رہی ہے کہا۔
 ”یہ طے ہے۔“ یاد علی خاں نے مصروف سے انداز میں جواب دیا۔
 ”ایک مرتبہ پھر کوئی بڑا نقصان ہو سکتا ہے آپ کو ہر قدم بہت سوچ سمجھ کر اٹھانا ہوگا۔ آپ کی ایک ہی بیٹی ہے۔“ مایین
 بے پائندہ سکی۔

”اگر دس بھی ہوتیں تو میرا طریقہ کار اور ردِ عمل یہی ہوتا۔ مگر ”ایک مرتبہ پھر۔“
 آپ کا کیا مطلب ہے؟“ وہ مڑ کر سوالیہ انداز میں اس کی سمت دیکھ رہے تھے۔
 ”اس پر آپ غور کریں گے۔ میں نے جو کہا ہے بقا کی ہوش و حواس کہا ہے۔“ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ اور یاد علی خاں کی
 رت دیکھے بنا باہر نکل گئی۔ یاد علی خاں گہرے تفکر میں ڈوبے نظر آ رہے تھے۔

”تم لوگ اس بے چاری سے اب کام نہیں لیا کرو۔ بڑی لتاں یا خالہ نے تم لوگوں سے کچھ نہیں کہا۔ اتنے سارے
 کپڑے لے کر اوپر جا رہی تھی۔ میں نے اس سے لے لیے۔ دیکھو ناں یہ تو زیادتی ہے۔“

وہ اپنی دھن میں بولتے ہوئے کچن میں داخل ہوئی۔ باری چائے کا کپ سامنے رکھے کیک کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے
 بانٹے ہوئے جانے کس سوچ میں گم تھا اس کی آواز پر چونک پڑا۔

”بالو کی بات کر رہی ہیں آپ بی بی! میں نے سرسوتی سے کہا تھا کہ بے چاری کے بچہ ہونے والا ہے اس سے کام نہ
 کراؤ۔ مگر بی بی اوہ خود بھی تو باز نہیں آتی۔“ کلو نے صفائی پیش کی۔

”لاحول ولا قوۃ۔“ روشی باری کے سامنے اتنی کھلی بات پر جیسے گڑ کر رہ گئی۔

”ایک تو تجھے بات کرنے کا ڈھنگ جانے کب آئے گا۔“ وہ جھلکا کر یہی کہہ سکی۔

کلو حقوں کی طرح اس کی شکل دیکھنے لگی کہ ٹھیک تو بات کہی ہے پھر اعتراض کیا معنی؟

”میں اوپر اپنے کمرے میں جا رہا ہوں میری چائے وہیں پہنچا دو۔“ وہ کرسی کھسکا کر کھڑا ہو گیا۔ روشی نے چونک کر اس
 کی شکل دیکھی۔

”اور آئندہ میرا کھانا وقت پر بابا صاحب کے ساتھ ہوگا اور چائے میرے کمرے میں اور ناشتا بھی۔ کچن میں آنے کی
 ہریرہ ہوتی تھی کہ کھانے پینے میں میرا نام مقرر نہیں تھا۔ مگر اب میں نے سیٹ کر لیا ہے۔ ماما کو بھی میری وجہ سے بہت پریشانی
 ہوئی تھی۔ اگر میں پڑھنے کے لیے باہر چلا گیا تو تم لوگ اور ریزی فیل کرو گے۔“ وہ تکلفاً مسکرایا اور باہر نکل گیا۔

روشی حیران پریشان اس کے الفاظ پر غور کرتی رہ گئی۔ کلو اور سرسوتی جانے کیا باتیں کر رہی تھیں۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں
 آ رہا تھا۔ ”پڑھائی کے لیے باہر“ بس یہی بازگشت تھی۔

”آپ چائے پیئیں گی بی بی؟“ کلو نے اس کے کھڑے ہونے کی یہی وجہ اخذ کی۔
 ”جنم میں گئی چائے۔“ وہ جھنجھلاتی ہوئی باہر کی طرف بڑھی۔

چند منٹوں کے بعد وہ اس کے کمرے کے دروازے پر دستک دے رہی تھی۔ دو چار مرتبہ دستک دینے کے بعد دروازہ کھل گیا۔

”مائی گاڈ..... سامنے روشنی کو دیکھ کر گویا وہ چکر گیا۔

”آپ کو اب اس طرح نہیں آنا چاہیے۔“ اس نے پہلے سامنے پھر زینے کی سمت دیکھتے ہوئے دہلی آواز میں کہا۔

”پھر کس طرح آنا چاہیے۔ گھوڑے پر بیٹھ کر یا پہلی کا پٹر میں؟“ وہ اس کے سردمہر انداز پر چڑ کر بولی۔

”آپ سمجھتی کیوں نہیں۔ کس قدر ٹینشن ہے ماحول میں۔ ہماری وجہ سے۔ بات کو کسی واضح سمت رخ تو کرنے دیں۔ مزید الجھن پیدا ہو سکتی ہے۔ اب تو سب الجھے ہوئے ہیں۔ مزید الجھنوں کے دم خم نہیں ہیں ان میں کیا کر سکتے اب۔“ روشنی کی عادت تھی کہ جب کسی مسئلے میں الجھتی تھی تو ہر مصلحت بالائے طاق رکھ دیتی تھی۔

”یہ صرف آپ کا خیال ہو سکتا ہے۔“ بارتی دروازے میں ڈٹا ہوا تھا۔ اس کے انداز سے ظاہر تھا کہ وہ کسی طور پر اسے کمرے میں آنے نہیں دے گا۔

”ہاں ظاہر ہے اس لیے کہ میں آنسٹ (Honest) ہوں۔ جو آنسٹ ہوتا ہے اسی کے پاس اسٹریٹجی بھی ہوتی ہے اور Will بھی اسی کی ہوتی ہے۔ تم تو پڑھائی کے بہانے یہاں سے فرار ہونے کے چکر میں ہو۔ صرف پاپا سے ایک شنگ ہوئی ہے اور تمہاری ”ہارس پاور“ ہوا ہو گئی ہے۔

مگر میں تمہیں بتا دوں کہ میں تم سے بہت اچھی طرح نمٹ لوں گی۔ کسی غلط فہمی میں نہ رہنا۔“ اس کا چہرہ یکدم سرخ ہو گیا۔

”مجھے ٹھیک ٹھیک اندازہ ہے کہ میں بُری طرح گرفتار بلا ہوں۔ میں فی الحال کہیں فرار نہیں ہو رہا“ آپ غم نہ کریں۔ اب پلیز آپ مزید یہاں نہ کھڑی ہوں۔ کیس اور مشکل ہو سکتا ہے۔ سمجھیں آپ۔“

”اب کیا مشکل۔ اچھا ہے بات کھل گئی۔ میرا تو دم گھٹنے لگا تھا۔ اتنا بہادر شو کرنے کی ضرورت کیا تھی جب ابھی سے تھر کا نپ رہے ہو۔ میں کا کا جان کے ہاں اس لیے تو نہیں گئی تھی۔ تم انکار کر سکتے تھے۔ کیوں نہیں کیا؟۔ میں کبھی اس بات پر یقین نہیں کر سکتی کہ کا کا جان کسی کے ساتھ اس طرح کی زبردستی کر سکتے ہیں۔“

”آپ نے ٹھیک کہا۔ کیا میں اپنے کمرے کا دروازہ بند کر سکتا ہوں؟“ بارتی نے سنجیدگی سے کہا۔ وہ ہر قیمت پر وہاں سے اُسے ہٹانا چاہتا تھا۔

اسی لمحے سرسوتی زینے کی طرف سے نمودار ہوئی۔

”نساں لوں بڑے خان بلا ساں۔“ وہ بارتی سے مخاطب تھی۔

روشنی سرسوتی کی آواز پر بے ساختہ دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔

”اکیلے ہیں یا اور کوئی بھی ہے اُن کے پاس۔؟“ اس کے چہرے پر سنجیدگی کے نشان ظاہر تھے۔ سوال میں فکر کا عکس

بھی تھا۔

”جی۔ یاد راناں ہیں۔ بس۔“

روشنی نے چونک کر بارتی کی سمت دیکھا۔ پریشانی اس کے چہرے سے جھلکنے لگی۔

بارتی نے ہاتھ پیچھے کر کے دروازہ بند کر دیا۔

”چلو تم آ رہا ہوں۔“ اس نے سرسوتی کو توراوند کیا۔

آپ بھی چلیں۔ آرام کریں۔ اور دعا کریں۔ کہ ہماری اگلی باتیں کمرے سے باہر نہ ہوں بلکہ کمرے کے اندر ہوں۔“

بالآخر اس کا فکر سے گھبرایا ہوا چہرہ دیکھ کر بارتی کا دل موم ہو ہی گیا۔ وہ بہت مبہم سا مسکرا رہا تھا۔

”بابا صاحب تمہارے ساتھ جانے کا کیا بی بیو کریں۔ میں بھی چلوں؟“ وہ فکر مند سی سے بارتی کی شکل دیکھ رہی تھی۔

”آپ تو پوں میں گولے ڈالیں گی۔ کیوں پریشان ہوتی ہیں یہ تو ایک دن پیش آنا ہی تھا جس دن خیر سے نکاح نامہ پر

دستخط کیے تھے سر پر کفن باندھ کر کیے تھے۔

مگر..... روشانی..... حویلی میں ایک پاگل سی لڑکی ہے جس کا دل بہت بے ایمان ہے۔ اس لڑکی میں جیت جانے کے

مارے گئیں موجود ہیں۔“

”باری.....! وہاں دونوں ہیں پتا بھی اور بابا صاحب بھی۔“ اس کا دل تیز تیز دھڑکنے لگا تھا۔

”وہاں اور دوسرے بھی ہو سکتے ہیں۔ آ سکتے ہیں۔ مثلاً بڑے بابا۔ اٹا۔ مصور۔ بصیر چچا۔ اور دوسرے مگر بات تو

کرنا ہے ناں۔“ وہ نارمل تھا۔

وہ تمہیں پزل کر دیں گے۔“ روشنی درحقیقت بہت پریشان تھی۔

”ابھی تک تو صرف ایک ہستی ہی ہمیں پزل کر سکی ہے۔“ وہ مسکرایا اور آگے بڑھا۔ ”بارتی۔“ اس نے جاتے ہوئے

باری کو آواز دی۔

”اوہ۔ جانے دیں مجھے۔“ ادھر“ جائیں گے تو ”ادھر“ آئیں گے۔“ وہ بہت ہنس مکھ لہجے میں اس سے شرارت کر رہا

تھا۔

”کا کا جان کو فون کر دوں۔“ بارتی کی آنکھوں میں جانے کیا تھا کہ اس کی نظریں خود بخود جھک گئی تھیں۔

”حد ہو گئی۔ ویسے تو بڑی توپ چیز بنتی ہیں۔ بندے کے دم خم کا ٹھیک اندازہ ہمیشہ کراسس میں ہوتا ہے۔ پول کھل رہی

ہے آپ کی۔“ وہ آگے بڑھتے ہوئے گویا ہوا۔

”مجھے تو تمہاری فکر ہے کہیں تمہیں کوئی نقصان نہ ہو۔ یہ لوگ بہت سخت ہیں۔“ وہ بے ساختہ بولی۔

”ایسی بے موقع بات کرتی ہیں کہ بندہ انجوائے بھی نہیں کر سکتا۔ سپاہی محاذ پر جا رہا ہو اور کوئی اسے عید کا چاند دکھا کر کہے

کہ کل عید ہے۔ ایسی ہی مضحکہ خیز جویشن ہے یہ۔“ وہ بولتے بولتے زینے کے پہلے موڑ پر غائب ہو گیا۔

روشنی اب اس دھن میں تھی کہ کس طرح بابا صاحب کے کمرے میں ہونے والی گفتگو خود اپنے کانوں سے سُنے۔

”السلام علیکم!“ چرکی آواز سے دروازہ دھوا اور باری اندر داخل ہوا۔

بابا صاحب نے اشارے سے جواب دیا۔ یاد علی خان نے اتنی زحمت بھی نہیں کی۔ کمرے میں کچھ دیر معنی خیزی خاموشی چھائی رہی۔

”باری!“ بابا صاحب کی آواز میں عجیب سی لرزش تھی۔

”جی خان۔“ وہ ہنوز کھڑا ہوا تھا۔

”بیٹھ جاؤ۔“ انہوں نے مقابل پڑی ٹرے کی سمت اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ باری ادھر ادھر دیکھے بنا خاموشی سے بیٹھ گیا۔

”محرم راز ہو حویلی کے تمہاری عمر کے کتنے وارث ہیں۔ ہماری حویلی ہیں؟ کسی پر اتنا اعتماد و اعتبار نہیں کیا گیا۔ یہ اعزاز تمہیں اس لیے دیا گیا تھا کہ ذمہ داری اور فرض شناسی کا جو ہر جو تمہارا خاصا ہے۔ بہت بچپن میں ہم نے اسے جانچ لیا تھا۔ اور ہماری جانچ تمہاری بڑھتی عمر کے ساتھ ثابت ہوتی گئی۔

مگر یہ کیا کر دیا۔ ہمیں یقین نہیں آ رہا۔ ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ یاد ہم سے خواب میں مخاطب ہوئے تھے۔ کیا ہم نے جو سنا ہے درست سنا ہے؟“

دلاور علی خان ڈکھ کی تصویر بنے ہوئے تھے۔ چند لمحوں کے لیے ماحول میں سکوت سا چھا گیا۔

”آپ نے جو جانچ میری کی تھی وہ بھی صحیح ہے اور جو سنا ہے وہ بھی درست ہے۔“ باری اتنا کہہ کر چپ ہو گیا۔

”ہمیں یقین کیوں نہیں آ رہا؟“ دلاور علی خان نے بڑی بے بسی سے یاد علی خان کی سمت دیکھا تھا۔

”کیسے آسکتا ہے۔ کوئی معمولی ڈکھ ہوتا ہے جب اعتبار ٹوٹتا ہے۔ اور سانپ آستین میں سے نکلتا ہے۔“ یاد علی خان کے لہجے میں ہلاکی تلخی تھی۔

”اگر آپ اجازت دیں تو کچھ عرض کروں۔“ باری نے بابا صاحب کی سمت دیکھا۔ جواب میں خاموشی چھائی رہی۔

”حویلی کی چہار دیواری کے اندر جو قانون اور ضابطے ہیں۔ ان کے حساب سے یہ نہایت سنگین جرم ہے۔ لیکن بحیثیت انسان میرے تمام حقوق اسی طرح محفوظ ہیں۔ جیسے کہ دوسرے انسانوں کے اگر آپ نے بچپن ہی میں میرے ایک پاؤں میں بیٹری ڈال دی ہوتی تو میں کتاب اٹھانے کے بجائے تیشہ اٹھالیتا۔ کہ اس وقت تو مجھے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ میں کون ہوں اور میرا باپ کون ہے۔ مگر آپ نے تو میرے ہاتھ میں کتاب دی تھی۔ کتاب سے تو انسان کی ”میں“ کا آغاز ہوتا ہے۔ میں نے اپنی ”میں“ استعمال کرنے کی جرأت کی ہے خان۔ اگر چند فیصد بھی یہ یقین ہو جاتا کہ آپ اور یاد خان تھوڑے سے ٹینشن کے بعد مان جائیں گے تو میں وقت کا صبر سے انتظار کرتا۔ لیکن مجھے اور کا کا جان کو بہت اچھی طرح پتا تھا۔ کہ آپ لوگ قیامت تک رضا مند نہیں ہوں گے۔ اس لیے۔“

”اس لیے تم نے ہمیشہ کے لیے داغ لگا دیا۔“ یاد علی خان نے نکرا لگایا۔

”بات تو ہماری سمجھ میں آ گئی ہے۔ تیمور کی وہ باتیں جو بچپن میں ملاقات میں سمجھ میں نہیں آئی تھیں۔ اب سمجھ میں آ گئی

ہیں۔

کیا تمہیں ناز اور تیمور نے پریشاں کیا تھا؟“ بابا صاحب نے ایک اچھتی نگاہ یاد علی خان پر ڈال کر یوں پوچھا جیسے ان کے سامنے نام لے کر گناہ ہو گئے ہوں۔

”ایک جوان صحت مند باشعور انسان پر جبر و باؤ۔ اس کی سب سے بڑی توہین ہے خان! اس لیے کہ اس عمل سے وہ ناپید ثابت ہو جاتا ہے، مانس ہو جاتا ہے۔ میں یہ بات اپنے ساتھ پسند نہیں کر سکتا اور نہ ہی کسی اور کے ساتھ۔

بات صرف اتنی ہے کہ ادھر روٹانے یاد علی خان کے ہونے کو تسلیم کیا گیا۔ ورنہ مجھ میں ایسی کوئی خاص بات نہیں تھی کہ وہ لوگ روٹی بی بی کے لیے مجھے پریشاں کرتے۔ جب کہ آل ریڈی ایک بیسٹ پروپوزل موجود تھا۔“

باری بہت اعتماد اور ٹھہرے ٹھہرے انداز میں کلام کر رہا تھا۔ پیش ہونے کی تیاری تو اسی دن سے شروع ہو گئی تھی جس دن نکاح ہوا تھا۔ اس دن سے اندر ایک کارر از تخلیق ہو چکا تھا۔ جب تک جاگتا تھا چوکھی لڑتا رہتا تھا۔

”ہم تو صرف یہ سنا چاہتے ہیں کہ تم یہ اعتراف کرو کہ تم نے ایک بھیا تک جرم کا ارتکاب کیا ہے اور تمہیں اپنی غلطی پر سخت ندامت ہے۔ واقعہ بہت بڑا ہے ہماری استطاعت و حوصلے سے بہت زیادہ ہے مگر اس واقعے سے پہلے جو انداز تمہارا

ہمارے ساتھ رہا ہے وہ ہمیں فیصلہ کن حالت میں آنے سے روک رہا ہے۔ تم میں ایسی کوئی خامی نہیں تھی کہ ہم تمہیں یکلخت نظر انداز کر دیتے۔ تم قابل غور ہو سکتے تھے۔ مگر یاد روٹانے کے سر پرست ہیں۔ اس کے باپ ہیں انہیں یہ رشتہ اے ٹو زیڈ

نامنظور ہے۔ ہم اس کمرے میں ہمیشہ کے لیے یہ واقعہ بھلا دینا چاہتے ہیں۔ کسی بھیا تک خواب کی طرح۔ امید ہے تم ہماری بات سمجھ چکے ہو۔“

دلاور علی خان سارا ماضی ان گھڑیوں میں استعمال کر رہے تھے۔ سارے تجربات کا نچوڑ یہ تھا کہ وہ انتہائی دھیمے انداز میں اس سے ہم کلام تھے۔

”اس واقعے میں سرائے کے مکین بھی شامل ہیں۔ ان کی غیر موجودگی میں میں کوئی بات کرنا نہیں چاہتا۔ بات سٹے یا پھیلے۔ میں ان کی موجودگی میں بات کرنا چاہتا ہوں۔“

”مگر میں سرائے کے مکینوں کو اپنی بیٹی کے معاملات میں مداخلت کی اجازت کسی طور نہیں دوں گا۔ اپنی بیٹی کا معاملہ نمٹانے کے لیے میں اکیلا کافی ہوں آئندہ میرے سامنے سرائے کے ذکر سے پرہیز کیا جائے۔“ یاد علی خان نے ناگوار لہجے میں اتنی دیر میں پہلی مرتبہ لب کشائی کی۔

”یہ واقعہ آپ سب کے لیے جتنا بڑا ہے میرے لیے بھی اتنی ہی اہمیت کا حامل ہے۔ آپ مجھے معاف کر دیں۔ میں اس وقت کوئی بات نہیں کرنا چاہتا بلکہ آپ سے درخواست کروں گا کہ آپ سب کچھ غور کریں کچھ سوچیں یہ بچوں کا کھیل نہیں ہے۔“ باری بہت محتاط میں انداز بات کر رہا تھا۔

”ہمیں کچھ نہیں سوچنا غور کرنا ہے۔ بات یہاں ختم کرنا ہے یا کورٹ میں صرف اس کا جواب دو؟“ یاد علی خان نے غضب ناک انداز میں دریافت کیا۔

”بات کیسے ختم ہو سکتی ہے۔ اس کیس کا اہم فریق ہماری میننگ میں شامل نہیں ہے۔“ باری کے انداز پر کوئی اثر نہیں ہوا وہ بدستور تھا۔

”باری۔ مجھے دکھ نہ دو۔ میں تمہارے ساتھ نہیں کرنا چاہتا۔“ بابا صاحب کے انداز میں شکستگی تھی۔

”دکھ کی بات تو میرے لیے ہے۔ آپ کی عزت افزائی صرف ایک غلام کے لیے تھی۔ یہ احساس کس قدر اذیت ناک ہے۔ میرے دکھ کی کوئی حد نہیں۔“

”بابا صاحب! مجھے الجھنا نہیں ہے۔ فیصلہ سننا ہے۔ یادو علی خان نے خفگی بھرے انداز میں اس کی بات کاٹ دی۔

”دراصل میرے ذہن میں اس طرح سے کبھی نہیں آیا تھا کہ مجھے تنہا اس موضوع پر آپ سے اور خان سے بات کرنا پڑے گی۔ میں چاہتا بھی نہیں تھا کہ اس کیس پر آپ سے براہ راست بات کروں۔ کا کا جان کی ایڈوائس تھی کہ میں ان کی اجازت کے بغیر کسی سے کوئی بات نہ کروں اس لیے آپ لوگ اس وقت مجھ پر بگڑیں ناراض ہوں تھی کہ کوئی سزا بھی سنا ڈالیں۔ تب بھی میں کوئی فیصلہ آپ کو نہیں سنا سکتا۔ البتہ اس کارز سے میں آپ کو اطمینان دلادینا چاہتا ہوں۔ کہ میری جانب سے کوئی گستاخانہ جملہ نہیں آئے گا۔“

وہ سکون لہجے میں اپنی بات کہہ کر خاموش ہو گیا۔

”سن لیا بابا صاحب؟ اب بھی آپ کو کوئی شک ہے کہ یہ پلاننگ نہیں ہے۔ کتنی واضح بات ہوئی ہے۔“ یادو علی خان نے اپنا خیال درست نکل آنے پر باپ کی سمت فخریہ انداز میں دیکھتے ہوئے کہا۔

”باری! ہمیں تم سے یہ امید نہیں تھی۔ تمہیں انگلی پکڑ کر چلنا سکھایا۔ پھر گھوڑا دوڑانا بتایا۔ تمہیں اپنے دل میں وہ مقام دیا۔ جس کا تصور بھی ایک بے نام و نشان انسان نہیں کر سکتا۔“ یادو علی خان کی آواز میں عجیب سی شکستگی تھی۔

”میں بے نام و نشان نہیں ہوں خان! مہندی سرداروں میں کسی نمبر پر میرا بھی نام ہے میرا نشان تو اتنا گہرا تھا کہ آپ نہ چاہتے ہوئے بھی حویلی میں مجھے جگہ دینے پر مجبور ہوئے۔ میں نے کتنی مرتبہ آپ سے اپنے قبیلے والوں سے ملنے کی اجازت مانگی۔ لیکن آپ نے فرمایا کہ وہاں میری جان کو خطرہ ہے اور آپ مجھ سے اتنی محبت کرتے ہیں کہ مجھے کھونا نہیں چاہتے۔“ وہ آہستہ آواز میں بولتے بولتے رُکا اور قمیض کی جیب میں کچھ ٹونے لگا۔ پھر ایک کارڈ نکال کر بابا صاحب کے سامنے کیا۔ ”یہ میرے والد عبدالعلی مہندی کے محکمے کا کارڈ ہے۔ ایک مرتبہ کا کا جان کے ہاں کاغذات سمیٹتے ہوئے ہاتھ لگا تھا۔ ان کی لائبریری میں۔ اس وقت میں ناکھ کلاس میں تھا۔“

اکثر ایسا ہوا ہے کہ مجھے خود اپنے بے نشان ہونے کا گمان ہونے لگا۔ اس لمحے میں یہ کارڈ نکال کر دیکھ لیا کرتا ہوں۔ اور میرا اعتماد بحال ہو جاتا ہے۔“

وہ بڑے اعتماد سے کہہ رہا تھا۔

”ایک کرپٹ آدمی کا دوست بھی کرپٹ تھا۔ تمہارے باپ نے بھی کسی کی لڑکی کو بہکایا تھا۔ خون کی وہی تاثیر تم تک پہنچی۔“ یادو علی خان نے تنگی سے ٹکڑا لگایا۔

سمرے کی فضا مہیب سی محسوس ہونے لگی جیسے وہاں بھوت ناچ رہے ہیں، ایسا سناٹا جو کسی طور ٹوٹا دکھائی نہ دیتا تھا۔ یادو علی خان کے لب ایک دوسرے میں اس طرح پیوست تھے گویا اب انہیں کھولنے کا کوئی ارادہ نہ ہو۔ سر بھی تھوڑا خمیدہ تھا۔ باری کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ جذبات میں تلاطم برپا تھا کہ الفاظ ترتیب دینا ایک مرحلہ بن چکا تھا۔

”یہ کرپشن اسی وقت ختم کر دی جاتی تو کیا بہتر تھا۔ حویلی میں مجھے رکھنے کا فیصلہ کس کا تھا۔ مجھے خبر نہیں۔ لیکن یہ طے ہے کہ فیصلہ اتھارٹی ہی نے کیا ہوگا۔ مجھے انسان ہونے کا احساس دیا گیا۔ اگر نہ دیا جاتا تو محرم راز نہ بنایا جاتا۔“

”ان تمام احسانات کا قرض ہی تو چکا یا ہے تم نے۔“ یادو علی خان کا حرف حرف زہر ملا تھا۔

”کرپٹ تو میں اس وقت ثابت ہوتا۔ جب اپنی من مانی کر کے یہاں سے جا چکا تھا۔ یا ہم سرائے سے ادھر واپس نہ آئے ہوتے۔ ہماری کورٹ میرج نہیں ہے۔“ باری کا انداز بہت دونوک اور بے حد سنجیدہ تھا۔

”تمہارے مفادات اسی حویلی سے مشروط ہیں۔ یادو علی خان کے صرف دو بچے ہیں اور جو کچھ میرا ہے یقیناً وہ سب ان دونوں بچوں کا ہے۔“ یادو علی خان پھر تلخ لہجے میں گویا ہوئے۔

”مجھے اندازہ تھا کہ مجھے یہ سب بھی سنا ہوگا۔ بلکہ اس سے بھی بہت زیادہ۔ آپ مجھے اجازت دیجئے۔ میں سرائے جانا چاہتا ہوں۔ اصولاً تو مجھے وہیں ہونا چاہیے تھا۔ میرا اگر حقیقی ٹھکانا ہونا چاہیے تو وہ جگہ سرائے ہے۔ کیونکہ وہاں میرے باپ کا

”ست ہے۔“

”تمہاری روشانی سے شادی کے متعلق بات چیت کتنا عرصہ قبل ہوئی تھی، کیا اس کی منگنی سے پہلے۔ یا کراچی میں جب اس نے خودکشی کی کوشش کی تھی۔ اس سے بھی پہلے۔“

یادو علی خان کی خاموشی بھی بالآخر ٹوٹ گئی۔ شاید اتنی دیر سے وہ کڑیاں ملارہے تھے۔

”شادی یا نکاح کے موضوع پر ہماری براہ راست کبھی بات نہیں ہوئی نہ واضح اور نہ ہی اشارتاً یہ ٹاپک اتنا حساس ہے کہ تم آپ کے اطمینان کی خاطر حلف بھی اٹھا سکتا ہوں۔“ باری کا انداز ہنوز ہر اعتماد تھا۔

یادو علی خان اور یادو علی خان دونوں ہی بڑی طرح چونک پڑے۔ وہ تو اپنے حساب سے جانے ان کی کتنی خفیہ بات بہت کاریکار ڈبائے ہوئے تھے کہ تو میرج کا مرحلہ تو بہت سے مراحل طے کرنے کے بعد ہی آتا ہے۔

”شاید ابھی تم حلف اٹھانے کا مطلب نہیں جانتے۔“ بابا صاحب نے ابرو اٹھا کر اس کی سمت دیکھ۔

”میں کیونکہ مظلوم ہوں اس لیے ہرزائیے سے شک کرتا آپ کا حق ہے۔“ باری نے سنجیدگی سے کہا۔

”کتنی آفر ہے تیمور کی طرف سے؟“ یادو علی خان نے پہلو بدل کر طنز یہ پوچھا۔

باری۔ خاموش بیٹھا کچھ سوچتا رہا۔

”خان۔! بہترین کھانا، بہترین لباس یہاں مجھے ہمیشہ ملا ہے۔ مرسیڈیز لینڈ کروزر، پچارو ضرورت کے تحت استعمال

کرتا رہا ہوں۔ لاکھوں کاکیش یہاں وہاں لے کر گیا ہوں۔ ڈیرہ اسماعیل خان میں ایک کروڑ کی ڈیلنگ حال ہی میں میرے

لڑیلے ہوئی۔ وہ کون سی ماڈی انٹرکشن ہے جسے میں نے چھو کر محسوس نہ کیا ہو۔ یہ تمام چیزیں تو آل ریڈی مجھے حاصل تھیں۔

☆.....☆.....☆.....☆.....☆.....☆.....☆.....☆.....☆.....☆

نہیں ان چیزوں کے کبھی نہ کبھی چمن جان کا امکان تھا مگر اب تم نے مستقل طور پر اپنے پینفٹس محفوظ کرنے کا اہتمام کرنے کی کوشش کی تھی۔“ یاور علی خان نے پھر طنز کا تیر چھوڑا۔

”میرا پروگرام یہ ہے کہ مجھے سب کچھ برداشت کرنا ہے جسے اپنی عزت بنایا ہے اس کی عزت کی خاطر ہر طرح کی توہین پر ضبط کرنا ہے۔ میں تو ”اس“ کا نام تک ان کرائس میں استعمال کرنا پسند نہیں کروں گا، سامنے لا کر بٹھانا تو دُور کی بات۔“

زندگی میں پہلی بار بارتی نے روشنانے کے لئے لفظ ”اس“ استعمال کیا تھا۔ انداز میں استحقاق کی آمیزش تھی۔

”آپ اسے کورٹ میں لے جاسکتے ہیں۔ اس کا تماشا بن سکتا ہے مگر میں خود کو بے گناہ ثابت کرنے کے لیے اس کو کبھی آپ کے سامنے بھی نہیں بلواؤں گا۔ حقیقی رشتوں کا میل ملاپ عمر بھر کا۔ وقتی کرائس میں وہ الفاظ منہ سے نکل جاتے ہیں کہ پھر جب بھی سامنا ہوتا ہے وہ جملے شرمسار کر دیتے ہیں۔ یہ واقعہ اپنے منطقی انجام تک تو لازماً پہنچے گا۔ احتیاط کے راستوں سے گزر کر پہنچے تو بہت ہی عمدہ ہے۔“

بابا صاحب نے جیسے دم بخود ہو کر اس کی صورت دیکھی تھی۔ اتنی پختگی، اتنا ٹھہراؤ اور دُور اندیشی۔ حقیقت کی تاثیر یہ ہے کہ موثر بہر حال ہوتی ہے۔ ان کی تجربات سے لبالب عمر اس کے سکون کے سامنے بچکانہ محسوس ہو رہی تھی۔

”میرا خیال ہے یاور بیٹے! مجھے آگے بات کرنے دو۔“

”مجھے نہیں کرنی آگے بات۔ کسی سازشی سے۔“ یاور علی خان نے خراب موڈ کے سبب باپ کی بات ہی کاٹ دی۔

وہ پیچھے پیچھے پوچھتی جا رہی تھی۔ ”میرا دم اٹکا ہوا ہے۔ تمہیں کوئی فکر ہی نہیں ہے۔“ اب اسے غصہ آ گیا تھا۔
باری ٹھہر گیا پھر اس کی طرف پلٹا۔

”ہم اُجد قبا کی لوگ ہیں۔ عورت کو استعمال کر کے اپنے لیے آسانیاں پیدا کرنا بہت شرم کی بات سمجھتے ہیں۔ جو کچھ ہوگا، آپ کے سامنے آ جائے گا۔ فی الحال میں بابا صاحب کے حکم پر سرائے جا رہا ہوں۔ اور میرے خیال میں یہ بہت بہتر ہے۔“
کا کا جان کو ہٹا چل جانا چاہیے کہ بات مکمل چکی ہے۔ اب آپ جائیں۔ آپ نے پہلے ہی اپنی بہادری دکھا کر مجھے شرمندہ کیا ہوا ہے۔“ وہ اتنا کہہ کر تیزی سے زینہ چڑھنے لگا۔

وہ کابکا اسے زینہ چڑھتے دیکھ رہی تھی۔
”خیریت۔ کیا پتھروں نے پتھر کر دیا ہے؟“ شیو جانے کہاں سے نکل آئی تھی۔ ایک نگاہ زینے پر ڈال کر انہوں نے اپنی مخصوص مسکراہٹ کے ساتھ پوچھا تھا۔

روشی ایک دم چونک پڑی۔ اس نے خالی خالی نگاہوں سے شیو کی سمت دیکھا۔

”شاید آپ کو احساس نہیں کہ آپ کے سوال کا جواب نہیں ہوتا۔ مگر کیا کریں ذوق سوال سے آپ پیچھا نہیں چھڑا سکتیں۔“ وہ تلخی سے مسکرا کر گول کمرے کی سمت بڑھ گئی۔
شیو اس کی جانب دیکھنے کے بجائے زینے کی سمت دیکھ رہی تھیں۔

روشی نے کلو کے ہاتھ مابین کو بیچ بھیجا تھا۔ ”میں آپ کے پاس نہیں آ سکتی۔ آپ میرے کمرے میں آ جائیں بہت ضروری بات ہے۔“

مابین تو پیغام ملتے ہیں لٹم لٹم دوڑی آئی تھی کہ آج کل تو اس کے لیے ہر پیغام ہی بہت اہم تھا۔
وہ کمرے میں داخل ہوئی تو روشی کو بے قراری سے ادھر ادھر ٹپکتے پایا۔ اس نے تشویش بھری نظروں سے اس کی سمت دیکھا اور ہاتھ پیچھے کر کے دروازہ بند کر دیا۔

”خالہ! آپ کہاں تھیں۔ اتنے اہم وقت پر غائب۔ بابا صاحب اور پاپا نے باری کو بلایا تھا۔ پتا نہیں اس سے کیا کہا ہے کہ وہ حویلی سے جا رہا ہے۔“ وہ جلدی جلدی بولی۔

”حویلی سے جا رہا ہے۔ کہاں؟“ زمین مابین کے پیروں تلے کھسکنے لگی۔

”سرائے۔ کا کا جان کے پاس۔“ وہ بہت پریشان تھی۔

”اوہ۔ یہ تو بہت اچھا ہوا۔ اکیچو نیلی وہ سامان بھی تیمور علی خان کا ہے۔“ مابین نے طمانیت بھرا سانس لیا۔

”جی۔ کیا مطلب؟“ روشی کی حیرت بجا تھی۔ مابین کا جملہ اس کے لیے مبہم تھا۔

”وہ تو ہمیشہ سے حویلی ہی میں ہے۔ کا کا جان سے اس کا کیا تعلق؟“ اس کے حلق میں الفاظ پھنسنے لگے۔ ”اس کے ماں باپ کون ہیں؟ کہاں ہیں؟“ یہ سوال تو اسے کبھی کبھی بہت ڈسٹرب کرتا تھا۔

”میں اُس طرف کی بات نہیں کر رہا ہوں۔ ادھر حویلی ہی میں۔ بڑے نقصان کے بعد تو مزید نقصان کا حوصلہ نہیں ہوتا..... بیٹے۔“

”باری!“ دلاور علی خان۔ بات کرتے کرتے اس کی سمت متوجہ ہوئے۔

”جی خان؟“ اس کی نگاہ میں الجھن تھی۔

”ایسا ہے کہ فی الحال تم سرائے شفٹ ہو جاؤ۔ باقی باتیں ہم تم سے بعد میں کریں گے۔“ ان کا انداز حکمیہ اور فیصلہ کن تھا۔ یادور علی خان بے چینی سے پہلو بدل کر رہ گئے۔

باری اُٹھ کھڑا ہوا۔ یوں محسوس ہوا گویا قید سے رہا ہوا ہو۔

”خدا حافظ۔“ اس نے جیسے بہت دکھ سے کہا تھا۔

یادور علی خان کی آنکھوں کی سرخی بڑھ رہی تھی۔ وہ سوالیہ انداز میں بلکہ شکایتی انداز میں باپ کی طرف دیکھ رہے تھے۔
باری کمرے سے باہر جا چکا تھا۔

روشی جی بھر کر خواہش کے باوجود اندر ہونے والی گفتگو نہ سن سکی تھی کہ دروازے سے کان لگا کر کھڑی ہوتی تو دوسرے کمرے کے مکین آتے جاتے اسے دیکھتے اور لازماً اس سے کھڑے ہونے کی وجہ دریافت کرتے اور یہ بھی ممکن تھا کوئی اسے ”کی ہول“ سے کان لگائے دیکھ بھی لیتا۔ اگر وہ پیچھے کی طرف جاتی تو کوئی فائدہ نہیں تھا کہ دونوں کھڑکیاں ایریاٹ تھیں جو لازماً صبح کے وقت ہی کھلتی تھیں۔

وہ بے بسی سے تڑپ کر رہ گئی۔ سرسوتی سے پتا چلا تھا کہ مابین اوپر بھائی بیگم کے پاس ہے۔ وہاں اسے مطلع کرنے بھی نہیں جاسکتی تھی۔

ایک ایک گھڑی وہ جیسے کانٹوں پر چلی تھی۔

دروازہ کھلا اور گویا اس کا دل بند ہوا تھا۔ وہ زینے کے چکر کی بناوٹ میں کھڑی ہوئی تھی۔ صرف باری باہر آیا تھا اور اس نے باہر آتے ہی دروازہ دوبارہ بند کر دیا تھا۔ اس نے بہت غور سے باری کی شکل دیکھی۔ بظاہر تو کچھ بھی نظر نہ آیا۔ سوائے اس کے کہ کسی گہری سوچ کے سائے کی جھلک تھی۔

وہ بڑی تیزی سے اس کے سامنے آئی تھی۔

”خیریت ہے نا؟“

”اوہ!“ وہ دھیان سے چونک پڑا۔ ”فی الحال تو خیریت ہے لیکن اگر آپ نے بیج راہ میں خیریت پوچھنے کا سلسلہ ترک نہ کیا تو ”خیریت“ کو سنگین خطرات لاحق ہو سکتے ہیں۔“

وہ رُکے بغیر آگے بڑھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ وہ بھی تیز تیز اس کے پیچھے چل پڑی تھی۔

”کیا کھو گیا ہے تمہارا“ کیا ڈھونڈنے جا رہے ہو؟ بات تو سنو میری۔ کیا کہہ رہے تھے بابا صاحب۔“

اس نے عجیب ڈرے ڈرے انداز میں ماہین کی صورت دیکھی تھی۔ ”تیور علی خان کا سامان۔“

”مطلب یہ کہ وہ ان کے دوست کا بیٹا ہے۔ اس موضوع پر میں اس سے زیادہ بات نہیں کر سکتی۔ تمہاری دینی اُلجھن کو دیکھتے ہوئے اس کی پوزیشن کچھ کلیئر کی ہے۔ یہ اور بات کہ تمہیں اس طرح کی معلومات سے کوئی دلچسپی نہیں۔“ ماہین نے بے نیازی سے کہا اور اس کے بیڈ پر بیٹھ گئی۔

”یہاں تو شاید یہ بات کسی کو نہیں پتا۔ آپ کو کیسے پتا چلی؟“ روشی نے حیرانی سے سوال کیا۔ ”یہاں تو وہ یوں سمجھا جاتا ہے کہ جیسے بابا صاحب اسے منڈی سے خرید کر لائے تھے۔ اور کا کا جان کا دوست تو لازماً انہی کے اسٹیشن کا ہو سکتا ہے۔ والٹس اسے پزل؟“ روشی سر تا پا سوال ہو رہی تھی۔

”میں نے کہا ناں۔ میں اس موضوع پر فی الحال تم سے کوئی بات نہیں کر سکتی۔ لیکن بہر حال یہ بہت اچھا ہوا کہ وہ سرائے جا رہا ہے۔ یہ بہت اچھی خبر سنائی تم نے۔ میں عجیب سا سکون محسوس کر رہی ہوں۔“ ماہین کے انداز میں بہت سکون تھا۔

”لیکن خالہ! یہ بھی تو پتا چلے کہ بابا صاحب نے اس سے کیا معاملہ کیا ہے۔ اسی سے تو آئیڈیا ہو گا کہ آگے کیا ہونے والا ہے۔ سمجھیں ناں آپ؟“

”سمجھ لیں گے ہم۔ جب بات بڑوں تک پہنچ ہی گئی ہے تو اب یہ تمہاری در دوسری نہیں رہی۔ میں جا رہی ہوں اس کے پاس۔ تمہیں اُلجھنے کی ضرورت نہیں۔“ ماہین نے پاؤں نیچے کر کے سیلپر پہنے۔

روشی خاموشی رہی مگر فکر مندی اس کے چہرے سے مترشح تھی۔

ماہین باہر آ کر سیدھی باری کے کمرے کی سمت بڑھی۔ دروازے پر دستک دی اور جواب کا انتظار کیے بغیر دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گئی۔

باری سوٹ کیس پر جھکا ہوا تھا۔ چونک کر پلٹا تھا۔ ماہین کو دیکھ کر خفیف سے انداز میں مسکرایا۔

”ہیلو جنٹلمین۔ کہاں کی تیاری ہے؟“ وہ بھی جواباً مسکرائی۔

”اپنے لیگلٹی فادر کے پاس۔“ اس نے مسکرا کر کہا اور سوٹ کیس میں چیزیں رکھنے لگا۔

”یہ کیا ہوتا ہے؟“ وہ بیڈ پر بکھرے سامان پر نظریں دوڑا رہی تھی۔

”غالبا باپ کا دوست ہوتا ہے۔“ وہ شرارت سے مسکرا کر کہہ رہا تھا۔

”ابھی ہم قانون کے ”بچے طالب علم“ ہیں مگر تمہاری اپروچ ٹھیک ٹھاک ہے۔ تمہارا خوشگوار موڈ بتا رہا ہے کہ بابا صاحب سے بڑے اچھے لطیفے سن کر آرہے ہو۔ ایک آدھ ہمیں بھی سناؤ۔“ وہ ایک طرف پڑی لیدر چیئر پر بیٹھ گئی۔

باری نے ایک نگاہ اس کے چہرے پر دوڑائی اور یکدم سنجیدہ ہو گیا۔ ”غالبا آپ کو ہیڈ لائن مل گئی ہیں۔ خان لطیفے سناتے ہیں نہ سنتے ہیں۔ وہ تو تعزیر استوری یا بستی و سرائے مجریہ ایکٹ انیس سو لاکھ اور فلاں سناتے ہیں۔“

”یا اللہ! تمہارے تو ایک ایک خلیے میں وکالت سا گئی ہے۔ بہت برائٹ فوچر نظر آ رہا ہے۔“ ماہین نے سر ہما کر کہا۔

”اب یہ بتاؤ۔ تم پر ان کے مجریہ قوانین میں سے کون سی دفعہ لگتی ہے۔ جو یہ پکینگ ہو رہی ہے؟“ وہ اصل بات کی

مرز آئی۔

”بے دخلی کی دفعہ نمبر ایل۔ ن۔“ وہ مسکراتے ہوئے کپڑے تہہ کرنے لگا۔

”ہاں یہاں کے آئین کے پہلے صفحے پر بے دخلی کے قانون کی تشریح ہے۔“ ماہین نے طنزیہ انداز میں مسکراتے ہوئے

کہا۔ ”آپ نے یہاں کا آئین اتنی جلدی کیسے اسٹڈی کر لیا۔ حیرت ہے۔“ اس نے جلدی جلدی کپڑے سوٹ کیس میں

ٹونے۔

”اپنی اپنی ریڈنگ پاؤر ہے۔ دل بڑا ہے تو داد دو۔ سوال نہ کرو۔“ ماہین نے بڑے انداز سے کہا۔

”اوکے۔“ باری بے ساختہ ہنس دیا۔ ”بعض اوقات وقت کی کمی کے سبب جان بوجھ کر انجان بننا پڑتا ہے سو اس وقت ہی قسم کی صورت حال ہے۔“

”تمہارا اطمینان دیکھ کر رشک پیدا ہو رہا ہے۔ اتنا اعتماد ہے اپنی ذہانت پر؟“ ماہین نے سنجیدگی سے پوچھا۔

”ذہانت پر نہیں اللہ پر۔ نصر اللہ نہ ہو تو ذہانت کی ایسی تیسی ہو جاتی ہے۔“

”ماشاء اللہ کلین شیو مولانا بھی ہو۔ ہمیں اپنے داماد کی اس اضافی خوبی پر دلی مسرت ہوئی۔“

ماہین۔ خاصی دیر کی گھنٹن کے بعد کھلکھلائی تھی۔

باری بھی جھینپ کر مسکرا دیا تھا۔

”وقت سفر ایسے نیک ٹھہر بڑی تقویت کا باعث ہوتے ہیں۔“ اس نے شریر انداز میں کہتے ہوئے سوٹ کیس بند کر دیا۔

”سرائے میں سب سے تمہاری اسی طرح دوستی ہے جس طرح حویلی میں ہے؟“ ماہین نے اچانک اس سے غیر متوقع

سوال کر دیا۔

باری چند لمحوں کے لیے ساکت سا ہو گیا تھا۔ ہونٹ بھیج کر اس نے ماہین کی سمت دیکھا تھا۔

”جی۔ افسوس۔ خان کے بچوں سے۔“ اس سے جھوٹ نہ بولا گیا۔

”کتنے بچے ہیں خان کے؟“ ماہین جیسے کسی گہری نیند سے جاگی۔

”دو۔ یہ تو معلوم ہونا چاہیے تھا آپ کو یا میرا امتحان لے رہی ہیں؟“ اس نے اس سے نظریں پھراتے ہوئے سوال کیا۔

”اب اتنی بھی سولڈ انفارمیشن نہیں ہیں میرے پاس۔“ ماہین نے قدرے افسردگی سے جواب دیا۔ ”کیا نام ہے ان کے

اور کتنی عمریں ہیں؟“ اس نے موقع سے فائدہ اٹھایا۔

”ٹیو یعنی منصور علی خان، عمر بارہ سال۔ ضوفشاں عمر آٹھ یا نو سال۔“

”کون سی بیوی کے بچے ہیں؟“ ماہین نے بڑے اعتماد سے سوال کیا تھا۔

باری نے چونک کر اس کی صورت دیکھی تھی۔ لیکن اس طرف اس طرز کی نگاہ تھی کہ اس کی نگاہیں جھک گئیں۔

”بیٹا ان کی فارز بیوی کا ہے اور بیٹی۔“ وہ کہتے کہتے رک گیا۔

”زندہ درگور بیوی۔“ مایین نے طنزیہ انداز میں اس کا ادھر اوجھلہ مکمل کر دیا۔

”چلو خیر۔ بہت خوشی ہوئی یہ جان کر کہ ان کا کسی سے تو کوئی تعلق ہے۔“ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ ”تم پہنچو۔ ہم بھی آرہے ہیں سرائے۔“

اگرچہ باری ٹھنکا تھا مگر اس نے چہرے سے کچھ ظاہر ہونے نہیں دیا تھا۔ اور خاموشی سے اپنے کام میں مصروف رہا تھا۔

”باری!“

”جی!“

”جب تم وہاں جاتے ہو تو کیسا محسوس کرتے ہو؟“ مایین نے گہری سوچ میں ڈوبے ڈوبے اس سے یونہی پوچھ لیا تھا۔

”کچھ بھی نہیں میرا تو وہاں کوئی ضروری کام ہوتا ہے تو وہاں جاتا ہوں۔ خان سے ملنا ہوتا ہے اور بس۔“

”خیر اور بس تو نہیں۔ وہ تو عنقریب ہم خود ہی دیکھ لیں گے۔“ وہ باری کو دارڈوب چھانٹے ہوئے بغور دیکھ رہی تھی۔

”چھوڑو ان سب باتوں کو مجھے راز کی بات بتاؤ کہ اتنے بڑے واقعے سے ہو گزرنے کے بعد پھر بڑے خان سے ملنے کے بعد تم پر تو کوئی اثر ہی دکھائی نہیں دیتا۔ حالانکہ مجھے اندازہ ہے کہ انہوں نے کس انداز میں تم سے بات کی ہوگی۔ اس کا ثبوت بھی یہ ہے کہ تم حویلی سے جا رہے ہو۔ اگر تم اس وجہ سے خود کو نارمل ظاہر کر رہے ہو اور حقائق کو مجھ سے اور روشی سے چھپا رہے ہو کہ ہم پریشان ہوں گی تو میری حد تک یہ غلط ہے۔ اس لیے کہ مجھ سے چھپاؤ گے تو خود مشکل میں پھنس جاؤ گے۔ میں تو تمہاری مقدور بھرہیلپ بھی کر سکتی ہوں۔ اس لیے کہ اگر نکاح میں روشی کی ماں کی مرضی اور موجودگی ثابت نہ ہوتی تو ہم بھی اس فعل پر روشی کو شاباشی نہیں دے سکتے تھے۔ مگر اب تو میرا فرض بنتا ہے کہ میں اس کی ہیلپ کروں اور تم ہو کہ ہنوز ”پراسرار بندے“ بنے ہوئے ہو۔ بتاؤ مجھے کیا بات ہوئی ہے؟“

وہ بالا خر اصل ٹارگٹ پر جم گئی تھی۔ باری کو امید نہیں تھی کہ وہ یہ ٹرن لے گی۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ بہل گئی ہے اس کے کچھ ظاہر نہ کرنے سے۔

وہ ہاتھ روم کی طرف بڑھ چکا تھا شیونگ کی چیزیں اٹھانے کی غرض سے۔ مگر مایین کا حرف حرف اس نے بغور سنا تھا۔

”کچھ بھی نہیں۔ بہر حال اتنا نہیں ہوا جتنا کہ ہونا چاہیے تھا۔ کہ خان کا اعتبار ریزہ ریزہ ہوا ہے۔ اصل میں میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے۔ تیمور خانوں نے کہا تھا کہ وہ اسٹیپ بائی اسٹیپ آگے بڑھیں گے۔ فرسٹ نعیم سے معنی توڑنے کے لیے بڑے خان سے بات ہوگی پھر اس کے بعد وہ اس کیس پر بات کریں گے کہ اس میں روشی اور روشی کی۔“ وہ بولتے بولتے یکدم رک گیا۔

”ہاں ہاں۔ ٹھیک ہے میں سمجھ رہی ہوں۔ روشی اور روشی کی مٹی کی پسند اور انو الو منٹ ہے۔“

”کیوں کہ ابھی تک تیمور خانوں کا اسٹیٹ منٹ بڑے خان کے سامنے نہیں آیا۔ اس لیے بڑے خان بہت ڈکھ میں ہیں اور مجھ سے اس قدر ناراض کہ ان سے بولا بھی نہیں گیا۔ اصولی سی بات ہے۔ میں اپنے حساب میں درست ہوں تو وہ اپنے لحاظ سے ٹھیک ہیں۔ یہ المیہ صرف فیوڈل سسٹم کا نہیں ہے۔ لوئر منڈل حتیٰ کہ لوئر میں بھی مل سکتا ہے۔ ہم جس پر خرچ کرتے ہیں

سب سے پہلے اس کا وہ پاسپورٹ ضبط کرتے ہیں جس پر اس کی شناخت بحیثیت انسان ہوتی ہے۔ اور تمام انسانی حقوق صرف انہی کے لیے مختص ہوتے ہیں جو خرچ کرنے کی پاور رکھتے ہیں۔ اور ہمارے ہاں تو چنگی بھر نمک کا خمیازہ منسل درنسل جھٹتا ہوتا ہے۔ ایک نمک کی خاطر پورا کا پورا انسان گروی ہوتا ہے۔ اس کی وفا کا معیار یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے تمام فطری حقوق سے دستبرداری کا مظاہرہ کرے۔

اس لحاظ سے تو وہ اپنی جگہ درست ہیں۔ تیمور خانوں نے میرے انسان ہونے کو تسلیم کیا ہے۔ یا کوئی اور بات ہے مجھے نہیں معلوم لیکن انہوں نے مجھے محسوس یہی کرایا ہے کہ میں ان سے الگ نہیں ہوں۔ بنیادی چیز یہی ہے۔ اصلی تعلق میرا تیمور خانوں سے ہے۔ لیکن بڑے خان نے بھی مجھ سے بہت محبت کی ہے۔ اور محض ان کی محبت کی وجہ سے ہی شروع سے حویلی میں ہوں۔ تیمور خان کو تو میں بہت فاصلے پر محسوس کیا کرتا تھا۔ مجھے یاد ہے بڑے خان مجھے خود اپنی گود میں اٹھا کر گھوڑے پر بٹھاتے تھے۔ میری باتوں پر ہنستے تھے۔ خوش ہوتے تھے۔ غلام سے تو مالک اتنا بے تکلف نہیں ہوتا۔ اب بھی مجھے یقین ہے کہ بڑے خان واقعی میں مجھ سے بہت محبت کرتے ہیں۔ ورنہ میری جگہ کوئی اور ہوتا تو جانے کیا کچھ ہو چکا ہوتا۔ انہوں نے نرمی سے پیش آ کر یا در خانوں کے غصے کو بڑھا دیا ہے۔“

باری مایین کے مقابل بیٹھ کر بہت تفصیل سے اپنے خیالات کا اظہار کر رہا تھا۔ شاید پہلی بار۔ اسی میں مایین کے بہت سے سوالات کے جواب بھی موجود تھے۔ وہ بہت غور سے سن رہی تھی۔

”اور حقیقت یہ ہے کہ اندر کی لڑائی سے میرے ”کاز“ کو سخت نقصان پہنچ رہا ہے۔“ وہ مسکرایا اس جملے سے واضح تھا کہ وہ جانتا ہے مایین کہاں تک اپروچ رکھتی ہے۔

”باری! جی تو چاہ رہا ہے میں بھی تمہارے ساتھ چلوں۔ بلکہ روشی کو بھی ساتھ لے چلوں۔ ہمارا حویلی میں کیا کام مگر صرف روشی کی خاطر مجھے بہت محتاط ہونا پڑ رہا ہے۔ یا در علی خان کی صف میں کھڑے ہو کر مجھے روشی کی جنگ لڑنا ہے۔ جو ظلم اس کے ساتھ ہوا ہے جب گہرائی میں سوچنے لگتی ہوں تو ایسا لگتا ہے ڈکھ سے دل بند ہو جائے گا۔“

”میں جانتا تھا کہ رات کے پچھلے پہر آپ حویلی کے پچھواڑے ہوتی ہیں۔ میں جان کر انجان بنا رہا کہ شاید آپ کی وجہ سے وہ بدگمانی کی دوزخ ٹھنڈی ہو جائے جس کی تپش سے بے گناہ و گناہ گار ایک ساتھ جھلس رہے ہیں۔“ باری نے مایین کو جملہ مکمل کرنے نہیں دیا۔

”میں نے بہتر سمجھا کہ جاتے جاتے آپ کو بتا دوں۔“ وہ مسکرا رہا تھا۔

”باری! تیاری رکھنا۔ مجھے خدشہ نہیں یقین ہے یا در صاحب کیس ضرور کریں گے۔“

”اللہ نہ کرے۔ اللہ سے دعا کریں کہ اب حویلی میں مزید قماشے نہ ہوں۔“ باری نے بے ساختہ ٹکڑا لگایا تھا۔

”آمین۔ تم آمین۔“ مایین نے ایک ایک حرف پر زور دے کر کہا۔

”ویسے دوسری پارٹی بہت مضبوط ہے۔ اس نے حویلی کے در و دیوار ہلا دیے ہیں۔ جارحانہ جنگ کرنے والوں کو دفاعی جنگ پر مجبور کر دیا ہے۔“ وہ مسکرا رہا تھا۔

”ہوں۔ تو یہ وجہ ہے کہ مسکراہٹ ساتھ نہیں چھوڑتی۔ وہ فیصلہ کن انتہا پسند اور بڑا اعتماد لوگوں کی اولاد ہے۔ فارمولا تو مٹی کا سیم ہی ہوگا۔ اولاد تو آئینہ ہوتی ہے۔ اگر اس آئینے میں اپنی صورت اچھی محسوس نہ ہو تو یہ جھنجھلاہٹ کا نہیں غور کرنے کا نام ہوتا ہے۔ قرآن میں واضح لکھا ہے کہ اللہ کی سنت تبدیل نہیں ہوتی۔ ریسرچ کہتی ہے ہر شے اپنی فطرت پر پیدا ہوتی ہے۔ یوں بھی ہوتا ہے کہ کئی پشتوں کے بعد کوئی بچہ پیدا ہوتا ہے وہ اپنے بچھلے کسی دادا کی شکل پر ہوتا ہے نہ ماں کی شکل کا نہ باپ کی شکل کا۔ لوگ تبصرہ کرتے ہیں کہ یہ اپنے فلاں دادا پر گیا ہے۔ کتنے تعجب کی بات ہے لوگ صورت پر تو تبصرہ کرتے ہیں عادات کی مماثلت پر کم توجہ دیتے ہیں۔ اب یہاں المیہ یہ ہے کہ باپ دادا سے مماثلت رکھنے والا بچہ لڑکا نہیں ہے لڑکی ہے۔ اب یہ اس کی مصلحت ہے۔ کیوں؟“ ماہین بہت سنجیدہ تھی۔

”اختلاف کے لیے اپنے پاس کوئی دلیل نہیں پاتا۔ آپ کے پاس تفکر کرنے والا ذہن ہے۔ آپ نے ضرور اس طرف غور کیا ہوگا۔“ باری نے خوبصورت انداز میں اتفاق کیا۔

”ہمیں تو لوگوں کی بہادری نے شرمندہ کر کے رکھ دیا ہے۔ کوشش کر رہے ہیں مدد اور کرسیں اپنی کسی کوتاہی کا۔“ اس نے اٹھ کر سوٹ کیس لاک کیا۔

”ابھی چلے جاؤ گے؟“ ماہین نے پوچھا۔

”شیور۔“ وہ ہاتھوں سے اپنے بال سیٹ کرتے لگا۔

”بہت میچور ہو باری۔ اللہ تمہیں ہمت دے۔ اور خدا کرے کہ یہ معاملہ باعزت طریقے سے خوشگوار انجام سے ہمکنار ہو۔“ ماہین اٹھ کھڑی ہوئی۔

”ہاں اب تو یہی دعا کر رہے ہیں کہ ہمکنار کرے یا بے کنار کرے۔“ وہ ہنس دیا اور وزنی سوٹ کس کھینچ کر نیچر کھا۔

”کوئی پیغام تو نہیں دینا اس طرف؟“ باری نے سوٹ کیس اٹھا کر اس کا وزن جانچتے ہوئے پوچھا۔

”نو ٹھینکس۔ اب ہم خود ہی پہنچیں گے۔ اچھا میں بھی چلتی ہوں۔ روشی میرا انتظار کر رہی ہوگی۔“ ماہین نے سر پر دوپٹا درست کیا۔

باری کسی خیال میں گھوم گیا تھا۔

”بس ایک بات ہے پسند فرمائیں تو پہنچا دیجئے گا۔ کہ کوشش میں کس نہیں ہوگی لیکن جو نتیجہ سامنے آئے اسے قبول کر لیں اور مزید کوئی ایسا قدم نہ اٹھائیں جو حویلی والوں کے لیے ناقابل برداشت سزا ہو۔ کسی کے اعمال کی باز پرس کر کے سزا تجویز کرنے والے ہم کون ہوتے ہیں۔ بحیثیت انسان ہم اپنے حق کے لیے صرف جدوجہد کر سکتے ہیں۔ بس۔“

”خدا حافظ“ وہ سوٹ کیس اٹھا کر باہر نکل گیا۔ ماہین لب بستہ سی کھڑی تھی۔

اتنی لمبی ڈرائیور کے بعد تو پھر پھر ہونا فطری سی بات تھی۔ کچھ اندر کی اکھاڑ بچھاڑ سے بھی اعصاب شل تھے۔ اس نے ملازمین سے بھی کوئی بات چیت نہیں کی۔ ان میں سے ایک کو سوٹ کیس اپنے کمرے میں پہنچانے کا کہہ کر تیزی سے زینہ

چڑھ گیا تھا۔

وہ غسل کر کے تھکن اتارنے کے موڈ میں تھا۔ اس کا کمر صاف ستھرا تھا ہمیشہ کی طرح جیسے اس کی آمد کا منتظر ہو۔ دریا بستی میں اس کا بیڈروم بہت سادہ اور عام سا تھا جبکہ سرائے کی چھوٹی حویلی میں اس کی خواب گاہ نہایت پُر شکوہ تھی۔ اکثر اس کے علم میں لائے بغیر یہاں تبدیلیاں بھی کر دی جاتی تھیں جو اتنی خوبصورت ہوتی تھیں کہ قدم اندر رکھتے ہی محسوسات خوشگوار ہو جاتے تھے۔ خواب گاہ کی ایک چابی ہمیشہ اس کے پاس ہوتی تھی۔ جب کبھی آدھی رات کو وہ یہاں آتا تھا تو صرف ایک آدھ ملازم ہی کو اس کی آمد کی خبر ہو پاتی تھی۔ وہ گیٹ کے اندر داخل ہو کر اور گاڑی پور ٹیکو میں پہنچا کر سیدھا اپنے کمرے کی طرف بڑھ جاتا تھا۔ دن چڑھے گھر کے مینوں کو اطلاع ملتی تھی کہ باری آیا ہوا ہے۔

آج اتنی رات نہیں ہوئی تھی تقریباً تمام ملازمین نے اسے دیکھ لیا تھا۔ اس کا سوٹ کیس کمرے میں پہنچ چکا تھا مگر یہاں وارڈروب میں بھی اس کے کپڑے موجود تھے۔ وہ شب خوابی کا لباس نکال کر فوراً ہی باتھ روم میں چلا گیا تھا۔

نہانے دھونے سے طبیعت میں کچھ تازگی کا احساس بیدار ہوا تھا۔ وہ تو لیہ گلے میں لٹکا کر بکھرے بھیکے بالوں کے ساتھ سوٹ کیس کھول کر کارپٹ پر دوڑا نو بیٹھا اپنی پڑھنے لکھنے کی چیزیں نکال کر ایک طرف ڈھیر کر رہا تھا۔ کہ دروازے پر دستک ہوئی۔

”کون؟ آ جاؤ۔“

دروازہ کھلا اور سرائے کی بہت پرانی اور بوڑھی ملازمہ اندر داخل ہوئی۔

”سلام خان!“

”ہوں۔ والسلام۔ خیریت کیسے آئی ہو بے بے؟“ وہ مصروف انداز میں پوچھ رہا تھا۔

”سمندر خان دیسی سی ٹی آئے ہو۔ میں کیا روٹی پائی کچھ لوں۔“ ملازمہ نے ادب و محبت سے جواب دیا۔

”بھوک نہیں مجھے۔ بس ایک گلاس گرم دودھ پہنچا دینا۔“ وہ ہنوازا اپنے کام میں مصروف تھا۔

”چنگا جی۔“ وہ مزید کچھ بولے بغیر واپس پلٹ گئی۔

اسے گئے پانچ منٹ بھی نہیں ہوئے تھے کہ دروازے پر پھر دستک ہوئی۔ اس نے جھنجھلا کر دروازے کی سمت دیکھا اتنی جلدی دودھ لے آئی۔ یہاں سے کچن تک پہنچنے ہی میں پانچ منٹ لگ جاتے تھے۔

”ہاں بھئی۔ آ جاؤ۔“ سوٹ کیس کا سارا سامان کارپٹ پر بکھر چکا تھا۔

”اس مرتبہ لگتا ہے قیام طویل ہوگا۔ مگر کیسے ہوگا۔ ہم تو ابھی تک تمہیں بھگتا دوڑتا دیکھتے رہے ہیں۔ اور ماشاء اللہ کہتے رہے ہیں۔“

نازنین کی آواز پر وہ ایک دم سرودھ کھڑا ہو گیا۔

”السلام علیک۔“ وہ قدرے جھینپ سا گیا تھا۔

”میں سمجھا۔ کوئی ملازم ہے۔“ اس نے وضاحت کی۔

”بے بے ہی نے مجھے بتایا کہ تم بہت سارا سامان بڑے سے ”پٹی“ میں لائے ہو۔ اور کھانا کھانے سے انکار کر رہے ہو۔ کیا راستے میں کھالیا تھا؟ جس وقت وہاں سے چلے سو گے تو شام ہوگی۔ اور رات کے کھانے کا وقت بھی نہیں ہوگا۔“ نازنین دروازے ہی میں کھڑی تھی۔

”کھایا تو نہیں ہے مگر بھوک نہیں ہے۔ دودھ پی لوں گا۔ اب تو بوں بھی سونے کا وقت ہے۔ خان سو گئے؟“

”مجھے کیا پتا۔ دودن سے نہیں دیکھا انہیں۔“ اس کا موڈ لکھت بدل گیا۔

”شکار پر گئے ہوئے ہیں؟“ وہ اس کے انداز سے الجھن میں پڑ گیا۔

”خدا معلوم۔“ وہ ناگواری سے گویا ہوئی۔

باری خاموش سا ہو گیا۔ اسے ماحول میں ٹینشن محسوس ہوا تھا۔

”اور کیا خبر ہے۔ تمہارا سامان دیکھ کر عجیب عجیب سے وہم آ رہے ہیں۔ روشی مابین وہیں ہیں یا ہری پور چلی گئی ہیں؟“ وہ فکر مندی سے پوچھ رہی تھی۔

”وہیں ہیں۔ شاید کل پرسوں چلی جائیں۔“ وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دے رہا تھا۔

وہ اسے بغور دیکھ رہی تھی۔ براؤن ویلوٹ کے گاؤں میں وہ اسے بہت زیادہ سفید محسوس ہوئی۔ بال کھلے ہوئے تھے۔ چہرے پر اضمحلال واضح تھا۔

”بابا صاحب نے تمہیں طویل قیام کی اجازت کیسے دے دی؟ تم تو راستے میں ہی ہوتے ہو اور ان کے فون آنا شروع ہو جاتے ہیں۔“ اس کے انداز میں ایک کھٹک سی تھی۔

”کبھی کبھی وہ بھی ہوتا ہے جو کبھی نہیں ہوا ہوتا۔ اب کی بار ایسے بھی سہی۔“ وہ ہنس دیا۔

”سچ بتاؤ۔ کچھ ہوا تو نہیں؟“ وہ ہنوز ایک جگہ ٹھہری ہوئی تھی۔

”نہیں بھابی! کچھ نہیں ہوا۔ آپ زیادہ زور نہ دیا کریں ذہن پر۔ آپ کی طبیعت یوں بھی سیٹ نہیں رہتی۔“

نازنین کچھ سوچ کر بے ساختہ مسکرا دی۔ ”تمہارے منہ سے بھابی سننے کا لطف ہی کچھ اور ہے۔ ابھی تم بولنا ہی سیکھ رہے تھے کہ مجھے سب کی دیکھا دیکھی بھابی کہنا شروع کر دیا تھا۔ بچوں میں تو کوئی بھی مجھے بھابی نہیں کہتا تھا علاوہ تمہارے۔ جب تم بھابی کہتے تھے تو سب بہت ہنستے تھے۔ کہ اسے منع کرو۔ لوگ کہیں گے تمہاری ساس کے ابھی تک بچے پیدا ہو رہے ہیں۔ مگر بھی تم باز نہیں آئے۔ حالانکہ میں تو کسی رشتے سے بھی تمہاری بھابی نہیں ہو سکتی۔“

وہ جانے کتنے عرصے بعد مسکرا رہی تھی۔

”کیا کریں۔ اب تو عادت ہو چکی ہے۔“ باری نے مجبوری ظاہر کی۔

”چلو خیر۔ یہ تو طے ہے کہ تم اتنے سارے سامان کے ساتھ آنے کی وجہ تو بتاؤ گے نہیں۔ تم سے مزید بات بے کار ہے۔

میں چلتی ہوں۔ بے بے سے دودھ کے لیے کہہ دوں گی۔“

”جی۔ رات خاصی ہو رہی ہے۔ آپ بھی سو جائیں۔“ باری نے جلدی سے کہا۔

”باری۔“ وہ جاتے جاتے پلٹی۔

”جی؟“

”اپنے کا کاجان سے کہنا وہ مجھے دکھ نہ دیا کریں۔ میرے ساتھ مہمان جیسا برتاؤ کریں۔ تمہاری تو وہ بہت سنتے ہیں۔

سچ کل بھی مجھے ساری رات نیند نہیں آئی۔“

وہ خود کلامی کے انداز میں کہتی ہوئی باہر چلی گئی۔ باری چند ٹائیپ کے لیے ساکت سا بیٹھا رہ گیا۔

دودن بعد تیمور علی خان اپنے بیڈروم میں داخل ہوئے تھے اور نازنین سے کوئی بات کیے بغیر کپڑے وارڈروپ سے نکال کر باہر روم میں چلے گئے تھے۔ نازنین بیڈ پر کروٹ کے بل لیٹی خاموشی سے ان کی حرکات و سکنات کا جائزہ لیتی رہی۔ اس نے خود بھی انہیں مخاطب کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ سوچوں کی یلغار سے یوں بھی اعصاب اتنے شل تھے کہ نگاہ کرنے سے بھی تھکن ہوتی تھی۔

وہ تقریباً بیس منٹ بعد باتھ روم سے باہر آئے تھے اور باتھ کے بعد کے اعمال سرانجام دے رہے تھے۔ اسی دم فون کی بیل خوبصورت سُروں میں بجنے لگی۔ بیل کی آواز بھی کم کی ہوئی تھی اس وجہ سے کمرے میں معمولی سا ارتعاش ہوا۔

تیمور علی خان نے ریسور اٹھا لیا تھا۔

”السلام علیکم۔ جی خیریت ہے۔ بچے ابھی گھر پر ہی ہیں۔“

وہ بولتے بولتے بیڈ پر بیٹھنے کی جگہ تلاش کرنے لگے۔ نازنین بالکل سرے ہی پر لیٹی ہوئی تھی۔ اس نے تیمور علی خان کا مدعا جان لیا تھا اور پیچھے کھسک گئی تھی۔ تیمور علی خان بیٹھ گئے۔

”جی۔ کب۔ آج۔ نہیں میری ملاقات نہیں ہوئی۔“ انہوں نے ایک نگاہ نازنین پر ڈالتے ہوئے فون پر مخاطب کو

جواب دیا۔

”دراصل ہم خیر آباد سے ابھی تھوڑی دیر ہوئی واپس آئے ہیں۔ ہوں پہنچ گیا ہوگا اپنے کمرے میں ہوگا۔ خیریت؟“ نازنین خاموش لیٹی ان کے چہرے کے اتار چڑھاؤ نوٹ کر رہی تھی۔ وہ فون کرنے والے کی طرف مکمل طور پر متوجہ تھے۔

”اوہ!“ ان کے منہ سے بے ساختہ نکلا تھا۔

”آپ کی خفگی بالکل بجا ہے برحق ہے۔ لیکن آپ کو تمام صورت حال معلوم نہیں۔ آپ ہمیں موقع دیں کہ ہم کچھ گوش

گزار کر سکیں۔“ ان کی آواز سے ان کے اندر کی تبدیلی عیاں تھی۔

”ہم فون پر نہیں بتا سکتے اور آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ فی الحال حویلی پہنچنا بھی ٹھیک نہیں ہے۔ ہو سکے تو آپ ہر صورت

انہیں کورٹ پہنچنے سے روکیں۔ ان کا کیس بہت کمزور ہوگا۔“

”ہم بتا رہے ہیں ناں آپ کو۔ دو ہی صورتیں ہیں کہ یا تو روشی کو شوٹ کر دیا جائے یا جاگیر میں مزید تماشا کیا جائے۔“

ان کے لہجے سے برہمی جھلکنے لگی۔

”وہ کیس پہلی پیشی پر ہی ہار جائیں گے۔ اور یہ شکست ان سے برداشت نہیں ہوگی اور جو کچھ ہوگا اس کا سب سے زیادہ دکھ آپ ہی کو ہوگا۔“ وہ بدستور خفگی بھرے لہجے میں کلام کر رہے تھے۔

نازنین اٹھ کر بیٹھ گئی تھی۔ اس کا چہرہ مزید سفید پڑ چکا تھا۔ وہ بے تابی سے فون بند ہونے کا انتظار کرنے لگی۔

”آپ ان کے ہری پور روانہ ہوتے ہی ہمیں مطلع کیجئے ہم پہلی فرصت میں حاضر ہوں گے۔“

”بابا صاحب! مزید کرائس کی ہمارے ہاں گنجائش نہیں۔ فارگا ڈسک۔ اپنے اصولوں سے نظر ہٹا کر فطری اصولوں پر توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ ہمارے خود ساختہ اصول کسی وقتی مصلحت سے پیدا ہوتے ہیں جبکہ فطری اصول کا فارمولہ بیلنس ہوتا ہے اور اس سے ہی کرائس کا خاتمہ ہوتا ہے۔ آپ خود کو ٹینس ہونے سے بچائیے۔ ہرگز نہیں یہ سب ہماری انگریزی سوچ کی اختراع نہیں۔ انگریزوں کا خدا بھی وہی ہے جو ہمارا ہے۔ ہم نے کہا ناں ہم خود حاضر ہوں گے۔ خدا حافظ۔“

تیور علی خان ریسور ہاتھ میں تھام کر جانے کیا سوچنے لگے۔

”روٹی کو کچھ ہوا تو پوری حویلی کو عدالت میں کھڑا کرادوں گی یہ بھی کہہ دیجئے ادھر۔ اس کی صورت مجھ سے مختلف ہے۔ اس کی قسمت بھی مجھ سے مختلف ہونا چاہیے۔ نازنین کا حویلی میں کوئی نہیں تھا مگر روشانے حویلی ہی کی ایک اینٹ ہے۔“

”کچھ بھی نہیں ہوگا۔ ہم حویلی میں پولیس بھیج کر روشی کو یہاں بلوا سکتے ہیں مگر بابا صاحب کی موجودگی میں ہم پروپر چیل سے کام کرنا چاہتے ہیں۔ ان کو قاتل کر کے وقت کی نزاکت کا احساس دلا کر۔ اُس وقت کی نزاکت کا جب یہ اقدام کیا گیا تھا۔“

”آپ کی ہم سے ناراضگی اس کیس پر اثر انداز تو نہیں ہوگی؟“ ان کی بات کے اختتام پر نازنین سے فوراً ٹکڑا لگایا تھا۔

”لاحول ولا قوۃ۔ جس بات پر ناراضگی جائز تھی جب وہاں نہیں ہوئی تو۔ جی تو یہی چاہتا ہے واقعی آپ سے بات نہ کریں۔ مگر اب تو فطرت ہمیں ایکسپلاٹ کر رہی ہے۔“

وہ شانے سے تولیہ اٹھا کر بال خشک کرنے لگے۔

”باری کب پہنچا کچھ پتا ہے؟“ وہ پوچھ رہے تھے۔

”گیارہ بجے سے پہلے پہنچ گیا تھا۔ وہ تو میں پہلے ہی کھٹک گئی تھی کہ اتنا سامان لے کر تو وہ کبھی نہیں آیا۔ اب بابا صاحب کے فون سے میرا خدشہ درست ثابت ہو رہا ہے۔ کیا ہوا ہے؟“ وہ ان کی طرف بغور دیکھ رہی تھی۔

”وہی جو ایک روز ہونا ہی تھا۔ روشی کے والد صاحب کو پتا چل گیا ہے۔ روشی کے نکاح کا۔ اب وہ ہم پر مقدمہ دائر کرنے والے ہیں۔ ڈی سی صاحب اس گمان میں ہیں کہ عدالتیں ان کی جیب میں ہیں۔ ہو سکتا ہے مگر بیٹی ان کے ہاتھ میں نہیں ہے۔“

”مگر وہ گھیریں گے تو۔“ نازنین نے پریشانی ظاہر کی۔

”تو پھر اپنے آپ گھریں گے۔ اس مرتبہ حساب کتاب دوسرا ہے۔ مقابل کوئی اور نہیں انہی کا آئینہ ہے۔ ہم نے

توانجانے میں ان کے ساتھ بھلائی کی ہے۔ روشی کا وہ موڈ اور انداز جو ہم نے دیکھا تھا۔ انہوں نے نہیں دیکھا۔ وہ تو احمقانہ حد تک بہادر ہے۔ وہ خود کو بھی نقصان پہنچا سکتی تھی۔ انہیں زیادتیوں کی عادت ہے ان کے ہاتھوں ایک اور زیادتی ہونے والی ہے۔ اگر باری کا مسئلہ نہ ہوتا تو ہمیں پھر بھی ایک امید ہوتی کہ بابا صاحب کی مداخلت سے یہ معاملہ منٹ سکتا ہے مگر ڈی سی صاحب کی صاحبزادی کے لیے باری کو ووٹ وہ بھی نہیں دس سکتے تھے کیونکہ اس کا باپ ہمارا دوست تھا۔ حویلی میں اس کو اس قدر آزادی اسی میں پر ملی ہوئی تھی کہ سب کو یقین تھا حویلی کی کسی لڑکی کے لیے اس کا پروپوزل نہیں دیا جاسکتا کہ وہ سرداروں کی اولاد سی ایک ملازمہ کی گود میں اس گھر میں داخل ہوا تھا۔ مگر ہم نے کبھی اسے ملازمہ سے ریلیٹڈ محسوس نہیں کیا۔

”میرے سامنے نام نہ لیا کریں نہ ذکر کیا کریں اُس جہنمی کا۔“ نازنین نے تڑپ کر ان کی بات کاٹ دی۔

”تاریخ کی کتاب میں روشن باب کے ساتھ ساتھ سیاہ واقعات کا باب بھی ہوتا ہے اور عموماً ایک ہی جلد میں ہوتا ہے۔“

تیور علی خان نے تلخی سے کہا۔

”مگر میں نے کچھ دیکھا نہ سوچا اگر سوچا تو صرف یہی کہ میری بیٹی کو خوشی ملنا چاہیے۔ اسی لیے میں نے آپ پر دباؤ ڈالا۔ اپنے ظالمانہ فیصلوں کی تلافی کرنے کی کوشش کی۔ اور یہ بھی کہا کہ باری مجھے ہمیشہ سے پسند ہے وہ اتنا بیلنس میچو راور اسارٹ ہے کہ مجھے ہمیشہ اسے دیکھ کر خیال آتا تھا کہ کاش روشی کی شادی اس سے ہو سکتی۔ میری بیٹی کو ایسا ہی پارٹنر ملنا چاہیے۔ تیور۔ دیکھیں۔ اب میرے بچوں کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں ہونا چاہیے۔ اگر خدا نخواستہ روشی کو کسی قسم کا نقصان پہنچا تو میں تمام مصلحتیں بالائے طاق رکھ دوں گی اور یاد علی خان کے طلق میں انک جاؤں گی۔ جس نہں کر دوں گی سب کچھ۔“

مارے جذب کے اس کا چہرہ اتمتہا لگا۔

”ایزی۔ ایزی۔ آپ اتنا کانشس نہ ہوں۔ ہمیں اندازہ ہے کہ نیکسٹ کیا کرنا ہے۔“ تیور علی خان نے تسلی دی۔ اور اس کے قریب آکھڑے ہوئے۔

”ضوئی کا موڈ کیسا ہے؟ یہ بتائیں آپ۔“

”بچے اپنی ماں سے زیادہ دیر موڈ آف نہیں کرتے۔ آپ خواخواہ اتنا اموشنل ہو گئے تھے۔ بالکل بھی سوٹ نہیں کرتا آپ کو۔ کتنی اذیت ناک گزری ہیں یہ پچھلی راتیں۔“ نازنین کی آواز بھڑا گئی۔

”کتنی پیاری، کتنی انوسٹ ہے ہماری بیٹی۔ ہم اس پر نارچہ برداشت نہیں کر سکتے۔ ہمیں علم ہے آپ ٹیپو کو کبھی نارچہ نہیں کریں گی ایک حساب سے ہمارا خیال کیا جائے گا۔ اس کے کیس میں آپ بہت۔ کانشس ہوں گی۔ ضوئی کو ٹوٹلی اپنی ملکیت سمجھتے ہوئے جیسا چاہیں گی سلوک کر ڈالیں گی۔ مگر ضوئی بھی ٹیپو کی طرح صرف ہماری بیٹی ہے۔ آپ نے خود پر ظلم کرنے خود کو سزا دینے کے لیے جو دوزخ اپنے چاروں طرف بھڑکا لی تھی۔ اس میں ہمت کر کے قدم ہم نے رکھا تھا۔ خواہ اس کی وجہ یہ بھی ہو کہ ہم اس اذیت ناک احساس سے نجات چاہتے تھے کہ ہمیں بہت بے دردی سے استعمال کیا گیا ہے۔ ہمیں کسی طرح کا کوئی توریلیف چاہیے تھا۔ کہ جس محبت پر اعتماد کر کے ہم لندن واپس پہنچے تھے۔ اور سچ بیانی سے کام لیا تھا۔ پہلے ہی مرحلے میں وہ جڑ سے اکھڑ گئی تھی۔ دوسرے لوگوں کے الزامات سے ایسی اذیت نہیں پہنچی تھی جتنی اس الزام سے پہنچی کہ

فیوڈل لارڈز ہوتے ہی عیاش ہیں۔ بہت سمجھایا تھا اس امید پر کہ غصے اور ناراضگی کی دھول کے نیچے محبت کا آئینہ تو ہے۔ صرف ایک ایسا رشتہ جو محض کاغذ پر تھا۔ رقابت کا یہ حال تھا۔ کہ نازنین احمد وہاں لندن میں ہمارے بیڈروم میں ہر وقت موجود ہوتی تھی۔

ہم۔ زندہ وجود ہیڈ ٹوٹو۔ اس کے پاس موجود۔ اس کی فل اپروچ میں اور اسے ہمارے ہونے کا یقین نہیں تھا۔ کیسا مقام حیرت ہے۔ محبت کے اس سراب سے گزرنے کے بعد تو ہم بالکل خالی ہاتھ تھے۔ دولت جاگیر بیٹا۔ پھر بھی خالی ہونے کا اذیت ناک احساس۔ واپس آئے تو ایک خالی وجود کے خالی پن کو اس طرح محسوس کیا جیسا کہ محسوس کرنا چاہیے تھا۔ وہ خالی وجود جو خود ساختہ مقبرے میں قید تھا۔ جسے اپنے نقصانات گننے کے دوران کبھی ہمارے نقصانات گننے کا خیال نہ آیا۔ پھر وہ ضوئی پرانہ حق جتائے تو ہمیں کیسے غصہ نہ آئے۔“

نازنین حیرت سے تیمور علی خان کو دیکھ رہی تھی۔ ایسا اور اتنا تو وہ کبھی نہیں بولے تھے۔ بڑی سے بڑی بات پر ان کے ہاں خاموشی ملتی تھی۔ جتنی بڑی بات اتنی گہری خاموشی۔

”یقین کریں ہم نے تو کبھی آپ سے کچھ نہیں چاہا۔ بس اتنا ہی چاہا تھا کہ دکھ دینے والے کے گرد ہمیشہ کے لیے ایک آگ بھڑکا دوں مگر آپ لندن میں اپنے پارٹنر کے ساتھ خوش رہیں۔ میں تو مر کے نکلی تھی ناں اس حویلی سے یہ اور بات کہ والدین سے خط و کتابت یہاں آ کر بھی کچھ عرصہ جاری رکھی۔ اپنی موت کا پیغام بھی خود بھجوا دیا اور پھر بابا صاحب کو مطلع کیا۔ پابند کیا۔ مجبور کیا۔

تو اس میں حیرت کیا۔ یا در علی خان نے تو میرے وجود سے روح اسی دن کھینچ لی تھی۔ جس دن۔“ وہ یکدم خاموش ہو کر آنسو پینے لگی۔

”مگر ہم نے تو آپ کو زندہ وجود تسلیم کیا۔ جو آپ کا حق بنتا تھا وہ دینا چاہا۔ وگرنہ لیزا کے سامنے آپ کے وجود کا ذکر ہی کیوں کرتے تو آپ نے خود کو بے روح دوسروں سے تسلیم کر دیا تھا ہم سے نہیں۔ مردے نکاح نامے پر دستخط نہیں کرتے۔“ تیمور علی خان کے لہجے سے تلخی ٹپکنے لگی۔

نازنین۔ چند ثانیے کو خاموش سی ہو کر رہ گئی۔

”نکاح کے وقت جو سوچ آپ کی تھی وہ صرف آپ کی تھی ہماری نہیں۔ جو کچھ ہوا جن حالات میں ہوا۔ اس کے لیے ہم نے عرصے تک اپنا مائنڈ میک اپ کیا ہے۔ آپ کیا سوچتی ہیں۔ آپ کیا کرنا چاہتی ہیں ہمیں اس سے کوئی سروکار نہیں۔ رہا روشی کا معاملہ۔ اس کی آپ فکر نہ کریں۔ ہم فیس بھی کریں گے ہینڈل بھی کریں گے۔ ہم جلد ہی حویلی پہنچیں گے۔ مگر اب آپ کو احساس ہو جانا چاہیے کہ انسان فرض کر لینے سے نہیں مرنے۔ آپ زندہ ہیں۔ انہی کرائس میں یہ حقیقت بھی سامنے آ سکتی ہے۔ اس کے بارے میں سوچا ہے؟“

تیمور علی خان بالوں میں برش کرتے ہوئے سوال کر رہے تھے۔

”جھینکس گاڈ۔ جھوٹ بس سچ ہوا ہی چاہتا ہے۔ میرا جواب اب بہن کی ذمہ داری ہوگی وہ بچوں کو ہینڈل کر لے گی۔

مجھے یقین ہے وہ ان کو یہ یقین دلانے میں کامیاب ہو جائے گی کہ ان کی ماں کے کردار پر کوئی داغ نہیں۔ ایک طالع آزمائے کچھ اپنی سی کوشش کی تھی مگر منہ کی کھائی ہے۔

میرے پاس چھت بھی ہے اور ایک بہت حساس ذمے دار لائف پارٹنر بھی۔ کہ میرے آنسو زمین پر نہیں اُس کے دامن پر گرتے رہے ہیں۔ وہ نہ ہوتا تو احساس تذلیل سے میں پاگل ہو کر گلیوں کی خاک چھانٹی۔ میں اتنی مطمئن تو ضرور ہو گئی کہ مجھے اوروں کی عزت افزائی کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ میں اس خواب کے ساتھ اس گھر میں آئی تھی کہ آپ لندن میں وقت گزاریں گے اور میں روشی اور جواد کے ساتھ رہوں گی اور یہ کہ لٹاں جی اور بابا صاحب کی موجودگی میں بچے مجھ سے کوئی نہیں چھین سکے گا۔ مگر کسی نے بھی کچھ نہیں کیا۔“ اس کی آواز آنسوؤں میں ڈوب گئی۔“ تو پھر جیتے جی میں نے مر جانا ہی بہتر جانا۔ کہ کس منہ سے بچوں کا سامنا کروں گی۔ ایسی شرمناک باتیں سنیں گے تو نفسیاتی طور پر تباہ ہو جائیں گے۔ ڈھیروں کزنز کی موجودگی میں ان کی گردنیں جھکی رہیں گی۔ یہ سب اُس شخص کو سوچنا چاہیے تھا مگر مجھے سوچنا پڑا آپ علاج کے لیے مجھے امریکہ جانے پر زور دے رہے ہیں جبکہ مشکل کو آسانی میں۔ ڈھلتے دیکھ کر میں خوشی سے سرشار رہتی ہوں۔“

”یہ تو خود کشی ہے۔ خود غرضی ہے۔ ضوئی کی خاطر بھی آپ کے اندر جینے کی امنگ بیدار نہیں ہوتی؟“ تیمور علی خان فاصلے پر پڑی کرسی پر بیٹھ چکے تھے۔

”روشانے اور جواد کے باپ سے بہت بہتر ضوئی کا باپ ہے۔ میرے بغیر وہ پرورش ہو سکتے ہیں تو پھر ضوئی تو زیادہ بہتر ماحول میں ہے۔“

”آپ ان دلائل سے خود کو بہلا سکتی ہیں۔ مگر ہم اسے صرف آپ کی خود غرضی کہیں گے۔“ وہ اٹھے اور بیڈ کی دراز سے سگار نکالنے لگے۔

”اتنی بڑی بڑی باتیں سنی ہیں۔ یہ تو بڑا معصوم سا الزام ہے۔“ نازنین پر گویا کوئی اثر نہیں ہوا۔

”ماہین بھی کسی روز بس یہاں پہنچنے والی ہیں۔ اس طرف کچھ سوچا؟“

انہیں معلوم تھا کہ یہ موضوع کبھی مکمل نہیں ہوگا لہذا انہوں نے موضوع ہی بدل دیا۔

”بے چاری ماہین۔ کیا عمر ہے اور کیا جو کسم۔ جتنی دیر جاگتی رہتی ہوں یہی سوچتی رہتی ہوں۔ سینے میں اذیت کی لہریں اٹھتی رہتی ہیں۔ کیا دیکھا تھا اس نے۔ کیا جاگیر؟ مگر دل نہیں مانتا۔ بس ایک بات ہی ہے جس پر دل گواہی دیتا ہے۔ اس شخص کے اندر ایک انتقام کی آگ روشن تھی۔ بیس سال سے کہ میں نے اس الزام کو سچ کر دکھایا تھا۔ میں نے تو اس لیے کیا تھا کہ اس نے ناحق میری چادر تار تار کی تھی مگر اُس نے میری بہن کو گھیر کر بیس سال پُرانا قرض چکانے کی کوشش کی ہے۔ اس شخص کے اندر جذبات صرف ایک شکل میں ہیں اور وہ ہے انتقام۔“

”کیا فائدہ ان باتوں کو بار بار دہرانے کا۔“ تیمور علی خان سگار سٹکا چکے تھے۔ انہوں نے پھر گفتگو کا موڈ تبدیل کرنے کی کوشش کی۔

”کتنی پیاری آواز ہے اس کی۔ خود کتنی پیاری ہوگی۔ جانے کون ہے وہ جس نے اسے بھید دیا ہے۔ کون ہے حویلی میں

اس کا ہمدرد۔ مگر یہ ہمدرد اس وقت کہاں تھا جب ڈی سی صاحب اس سے شادی کر رہے تھے۔ جیسے ہی یہ خیال آتا ہے۔ کیسے ہاتھ ملتے ہوں۔

کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ بھی مجھے لعن طعن کرنے آ رہی ہو؟“ ایک نیا خدشہ بیدار ہوا۔

”مائی گڈنٹس۔ ایسا کچھ فیل نہیں کیا ہم نے۔ وہ جتنا ہمیں اپنا سمجھ رہی تھیں، ہم انہیں نہیں سمجھ رہے تھے۔ شی ازاے ویل میچور پر سنا لٹی۔“

تیور علی خان نے اسے ریلیکس کرنے کی کوشش کی۔

”پتا نہیں میرے احساسات کہاں جاسوئے ہیں۔ کچھ بھی تو نہیں جاگتا اندر۔“ اس کی آنکھیں بھر آئیں۔

”اوہ۔ نو۔“ مونتا کے حلق سے چیخ نکلی تھی۔ ”تم نے خود سنا؟“ روبی سوئی سے دریافت کر رہی تھی۔

”بڑی امی، بھیر چچا کی کی دلہن سے باتیں کر رہی تھیں۔ اوپر لاؤنچ میں۔ سچی میری تو ٹانگیں کانپنے لگیں۔“

”مائی گاڈ۔ یہ نہیں پتا چلا کہ یہ عظیم واقعہ کب ہوا۔ مگر یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ حویلی میں روشی ہمارے ساتھ ہوتی ہے۔ اکیلی کہیں بھی نہیں جاتی۔ ہری پور میں باری نہیں ہوتا۔“ مونتا نے اندازہ لگانے کی کوشش کی۔

”افوہ۔ پوری بات تو سنیں مونتا باجی!“ سوئی جھنجلا گئی۔

”کا کا جان کے ہاں نہیں گئی تھی روشی؟ اس نے سوالیہ انداز میں یاد دلایا۔

”ہوں۔ ہوں۔“ بیک وقت کئی آوازوں نے تائید کی۔

”ان دنوں کی بات ہے۔“ سوئی نے بات مکمل کی۔

”لیکن۔ ایسا کیوں ہوا۔ کا کا جان نے حصہ کیوں لیا وہ تو یادور ماموں سے نہیں ملتے پھر روشی۔“ لالی نے ایک اور نکتہ اٹھایا۔

”یہ بھی ہو سکتا ہے کہ دونوں نے نکاح کر کے کا کا جان کے ہاں پناہ حاصل کی ہو۔“ حنا کی سوچ ایک اور انداز میں ظاہر ہوئی۔

”لو نکاح بھی قتل کے برابر ہو گیا کہ مفروروں کو پناہ کی تلاش ہوئی۔“ تانیہ کو اس خیال پر سب سے زیادہ اعتراض ہوا۔

”ہائے نی۔ میں تمہارے جاواں۔ اڑیے گوی چا پدی نے نہیں۔“

مریم نے شوخی کے پردے میں اپنی حیرت ظاہر کی۔ اور زور سے سینے پر ہاتھ مار کر کہا تھا۔

”اچھا اسی لیے وہ نعیم کا ذکر تک سنا پسند نہیں کرتی تھی۔ اب سب کو اس کے موڈ کی ریزن سمجھ آنے لگیں۔

”اوہ۔ مجھے تو چکر آ رہے ہیں۔“ نازک طبع مونتا نے سر ہٹا لیا۔

”گلو آپا کہاں ہیں۔ انہیں بھی تو پتا چلنا چاہیے۔“ حنا نے معاگلو کی غیر حاضری کی طرف متوجہ کیا۔

”سے بی پاسیل۔ انہیں آل ریڈی پتا ہو۔ مگر کی خواتین انہیں رازداری کے معاملات میں شامل رکھتی ہوں۔ کیوں

زری آپا۔ کہیں آپ کو بھی تو پہلے سب خبر نہیں تھی۔“ بیہ نے پوچھا۔

”مائی گڈنٹس۔ میں تو ابھی تک حیرت سے پتھر بنی ہوئی ہوں۔ الزام لگانے سے پہلے صورت دیکھو۔“ زری نے بدگمانی پر دہائی دی۔

اسی دم گلو اندر داخل ہوئیں۔ بغل میں دھاگے کا گولہ تھا۔ دھرا دھڑ کر دھیا کی بنائی ہو رہی تھی۔ ان سب کا انداز پست دیکھ کر وہ ٹھٹھکیں کہ اکٹھی تو اکثر ہی نظر آتی تھیں۔ مگر آج تو ایک دوسرے میں یوں گھسی بیٹھی تھیں کہ جیسے شہد کی مکھیاں چھتے پر

درنگ آدور میں دکھائی دیتی ہیں۔ ایک دوسرے پر چڑھ دوڑتی ہوئیں۔“

”اب آ رہی ہیں جب خبر بھی پڑانی ہو گئی۔“ حنا نے ان میں تھرل دوڑانے کی کوشش کی۔

”چلو۔ اب کوئی تازہ خبر آئے تو جلدی بلو الینا۔“ وہ ہنستی ہوئی دُور صوفے پر جا بیٹھیں۔

”نکاح کے بعد تو گویا امریکہ ہی دریافت ہو گیا۔ کولبس کے سارے تجسّس ہی ختم ہو گئے۔“ لالی کو گلو میں اشتیاق نہ پا کر سخت مایوسی ہوئی۔

”آپ تھیں کہاں صبح سے؟“ تانیہ نے غیر حاضری کی طوالت کا اندازہ کرتے ہوئے سوال کیا۔

”ماین مائی کراچی جا رہی ہیں۔ ان کی ہیلپ کر رہی تھی پیننگ میں۔ اس سے پہلے اپنی امی کا ہاتھ بٹا رہی تھی اور اس سے بھی پہلے روشن خالہ کے ساتھ کپڑے کٹوا رہی تھی اور۔“

”بس۔ بس۔ ہمیں پتا ہے اس سے پہلے آپ حکومت کا ہاتھ بٹا رہی تھیں۔ کیا کہنے آپ کی سرکاری شہرہ سرکاری اور غیر سرکاری مصروفیات کے۔“ مونتا نے چڑ کر بہن کو ٹوکا۔ ”مگر کسی کام کی نہیں آپ کی مصروفیات۔ ناک کے نیچے سے اونٹ پُرا

لے گئے لوگ۔“ جانے کون سی متروک لغت سے محاورہ نکالا گیا تھا۔

”اتنا چھوٹا سا اونٹ تھا؟“ وہ مسکرائیں۔

”روشی بھی جا رہی ہے ممائی کے ساتھ؟“ بیہ نے پوچھا۔

”نہیں وہ ماموں کے ساتھ ہری پوری جا رہی ہے۔“ گلو نے جواب دیا۔

”ممائی کے ساتھ کیوں نہیں جا رہی؟ اب کون سا اس کے ایگزام ہو رہے ہیں۔ یا رخصت ہونے سے پہلے تاجی کی خدمت کا حق ادا کرنے کا ارادہ ہے۔“

”آپ کے ذہن میں یقیناً آیا ہوگا کہ نعیم کے ساتھ رخصت ہونے والی ہیں محترمہ۔ جی نہیں انہیں باری صاحب ظالم سماج سے دُور لے جانے والے ہیں۔“ مونتا کو گلو تک بات پہنچانے کی بہت جلدی تھی۔

”بھئی، لڑکی کو کسی نہ کسی کے ساتھ رخصت تو ہونا ہی پڑتا ہے۔ نعیم نہ سہی باری سہی۔“ گلو نے ایک اور پھندا قابو کرتے ہوئے بہت رسائیت سے جواب دیا۔

”دیکھا، ہم تو پہلے ہی کہہ چکے تھے کہ آپا کو پتا ہوگا۔ انہیں بڑا اعتبار حاصل ہے حویلی میں پہلی فرصت میں ہمارا بنایا جاتا ہے۔“

”ظاہر ہے وہ بے چارے کیا کرتے۔ دونوں نے انہیں بھی دھمکی دی ہوگی کوئی۔ بے چارے ایکسپلاٹ ہو گئے ہوں۔“

”کا کا جان نہ ایکسپلاٹ کرتے ہیں نہ ہوتے ہیں۔ اطلاعاتاً عرض ہے۔ وہ اپنے کام سے کام رکھتے ہیں۔ اور دوسری قابل غور بات یہ ہے کہ جب دونوں نے نکاح ہی کرنا تھا یعنی خود اپنے زور بازو پر تو سرائے جا کر کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ وہ کہیں بھی کر سکتے تھے۔ اہمیت تو اس پوائنٹ کی ہی ہونا چاہیے کہ نکاح سرائے میں کیوں ہوا؟“ لالی بہت دُور کی کوڑی لائی تھی۔

اور یہ نکتہ ایسا تھا کہ چند لمحوں کے لیے گہرا سکوت طاری ہو گیا جیسے سب کچھ سوچنے لگی ہوں۔

”کا کا جان اتنا ریکی کام کیسے کر سکتے ہیں۔ آل ریڈی ان کے تعلقات یا در ماموں سے خراب ہیں۔ خبر ہمیں کیا۔ اصل بات تو یہ ہے کہ باری ایسا چھپا رستم نکلا۔ رہتے تو وہ دشمنوں کی طرح تھے۔ روشی کو تو اس کی ہر بات بُری لگتی تھی۔“

”یہ بھی ایک انداز ہو کرتا ہے۔“ مثنیو ہنسی۔ آج تو سر سے پاؤں تک زہر سے نیلی ہو رہی تھیں۔

”کچھ بھی ہے۔ ہے دعا بازی۔ روشی نے ہم سے اتنی اہم بات چھپائی۔“

”خطرے بھی تو بہت ہیں۔ اس لیے چھپائی ہوگی۔ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ یا در ماموں اس نکاح کو رخصتی کے انجام تک پہنچنے دیں۔“ مثنیو نے مضبوط پیش گوئی کی۔

”اللہ نہ کرے۔ باری سے کسی کی کیا دشمنی۔ اتنا اچھا تو ہے۔“ بیہ نے معصومیت سے کہا۔

اسی وقت ماہین اندر داخل ہوئی۔ ”اچھا ابھی ہم تو چلے۔ روشی کا خیال رکھنا۔ ویسے تو وہ بھی رات کو ہری پور چلی جائے گی۔“

زرد لپٹلک کے پھولوں والے ریڈ سوٹ میں ملبوس ماہین گہرے رنگوں کے باوجود بہت بھیجی محسوس ہوئی۔

”واپسی کب ہوگی؟“ وہ سب کھڑی ہو گئیں۔

”دیکھو۔“ وہ زبردستی مسکرائی تھی۔ ”کوئی اہم مینگ ہو رہی تھی۔“ وہ اتنے قریب قریب بیٹھی تھیں کہ دیکھنے والا یہی محسوس کرتا کہ وہ چپکے چپکے کوئی بات کر رہی ہیں۔

”روشی آپ کے ساتھ نہیں جا رہی؟“ تانیہ نے پوچھا۔

”نہیں۔ اس کے پاپا کی مرضی نہیں۔ خیر۔ بہت مزا آتا ہے جب یہاں آتی ہوں تم لوگوں سے باتیں ہوتی ہیں۔ جو دیر تک یاد آتی ہیں۔“

اچانک بالو سیاہ بڑی سی چادر لپیٹے ماہین کے پیچھے آ کھڑی ہوئی۔ ”بی بی۔ خان کہہ رہے ہیں کہ جلدی کریں۔“

”یا در ماموں آپ کو کراچی چھوڑنے جا رہے ہیں؟“ گلہ نے پوچھا۔

”ایر پورٹ تک جا رہے ہیں۔ بالو جا رہی ہے میرے ساتھ۔“ ماہین نے بتایا۔ ”کراچی میں اس کی ماں کا بھی گھر ہے۔ اسے اس کی ماں کے پاس چھوڑ کر آؤں گی۔ سفر سے انسان کو بہت عقلیں آتی ہیں۔ اسے ایک سفر نے بہت عقلمند بنا دیا ہے۔“

”اچھا۔ کب سے پتا ہے آپ کو؟“ تقریباً سب ہی نچل سے نظر آنے لگی تھیں۔

”آج ہی پتا چلا ہے۔“ ان کے چہرے پر قدرے سنجیدگی نظر آنے لگی۔

”آپ کو حیرت نہیں ہوئی؟“ حنا نے تعجب سے پوچھا۔

”حیرت نہیں دکھ۔ کہ اتنا پیار کرتی ہے روشی مجھ سے اور اس نے اتنی اہم خبر اپنی زندگی کا اہم واقعہ مجھ سے چھپایا۔“ گلہ نے دکھ بھرے لہجے میں کہا تھا۔

”ایسی باتیں تو کبھی چھپتی نہیں ہیں۔ ہم تو برس ہا پہلے جانتے تھے کہ ایسا کچھ ہوگا۔“

مثنیو ہمیشہ کی طرح بولتی ہوئی اندر داخل ہوئیں۔ کن سوئیاں لینے کی عادت میں اتنی پختہ تھیں کہ اندر داخل ہونے سے پہلے ہی بہت کچھ سُن لیا کرتی تھیں۔

”فرشتوں سے راہ و رسم ہوگی آپ کی۔ ہم نے تو کبھی کوئی ایسی بات نہیں دیکھی۔“

روبی کو ان کا یہ جملہ محض نمبر بنانے کی ایک فضول سی کوشش محسوس ہوا۔

”یا در ماموں سخت غصے میں ہیں۔ باری سرائے جا چکا ہے۔ کا کا جان آنے والے ہیں۔“ مونہ نے خصوصی بلٹن نشر کیا۔

”کا کا جان کی انوالومنٹ کے معنی سمجھ میں نہیں آرہے۔“ زری نے گلو کی سمت دیکھا۔

”میرے اللہ! اتنی بڑی بات روشی کب سے پیٹ میں لیے پھر رہی تھی اس کا پیٹ بھی نہیں پھولا۔ اگر ہمارا نکاح ہو جاتا تو ہمیں تو ہر ایک کو بتانے کو جلدی ہوتی کہ اب ہم تھے بیل نہیں رہے۔“

”گائے۔“ تانیہ نے روبی کے جملے میں گرہ لگائی۔ تذکیر و تانیہ کی خامی پر متوجہ کیا۔

”اے۔ ذرا ہمت کرو۔ روشی کو تو ٹیلا کر لاؤ۔ اس کی کھنچائی کرتے ہیں۔ پھر تو وہ ہری پوری چلی جائے گی۔“ مریم نے کہا۔

”شاید وہ آئے نہیں تو؟“ حنا نے سوال کیا۔

”تو پھر ہم چلیں گے اس کے کمرے میں۔“ بیہ نے فوری حل دیا۔

”اس بے چاری کا کیا قصور۔ باری نے اسے کیسے پٹالیا۔ اسے بابا صاحب کا خوف بھی محسوس نہیں ہوا۔“ سو فی سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی۔

”اسے خدا کا خوف نہیں آیا۔ تم بابا صاحب کی بات کر رہی ہو۔ جس تھالی میں کھانا اس میں چھید کرنا۔“ مثنیو کے لہجے کی تمنی آج بہت بڑھی ہوئی تھی۔

”یہ کون سے رحمانی یا انسانی قانون میں لکھا ہے کہ نکاح کرنے سے تھالی میں چھید ہو جاتے ہیں۔“ مونہ نے تنک کر

پوچھا۔

”نکاح کرنے سے نہیں۔ نکاح کرنے کے طریقہ کار سے۔“ مثنیو بھلا ہارنے والی تھیں۔

”نان سنس۔ روبی بتا رہی تھی۔ کا کا جان نے خود نکاح پڑھوایا ہے۔“ زری نے جواب دیا۔

ماہین مسکرا کر بالوکی سمت دیکھنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو چپکنے لگے۔
تمام لڑکیاں ماہین کو باہر تک خدا حافظ کہنے آئیں۔

روشی اوندھی لیٹی جانے کن سوچوں میں گم تھی۔ دروازے پر بڑے زور کی دستک ہوئی۔ اس کا دل دھک سے رہ گیا۔
ماہین کے چلے جانے سے ایک تو خود کو بہت تنہا اور غیر محفوظ محسوس کر رہی تھی۔ کہیں بابا صاحب کا بلاوا تو نہیں آ گیا۔ وہ
لرزتی ٹانگوں کے ساتھ دروازے تک آئی اور دروازہ کھول دیا۔

”اوہ!“ ان سب کو سامنے پا کر اس نے گہرا سانس لیا۔ اور ایک طرف ہو گئی۔

”پھر کہیں جانے کا پروگرام ہے؟“ وہ ان کو ایک ساتھ دیکھ کر یہی کچھ سمجھی۔

”ہاں۔ پیا گھر جانا ہے۔“ روٹی تیزی سے بولی۔

وہ دل ہی دل میں حیران سی ایک کونے میں جا بیٹھی۔

”میدان مار کر کونے میں چھپی بیٹھی ہو۔“ گلو نے ایک دھپ لگائی۔ اور بیٹھ گئیں۔

اس نے حیرت سے باری باری سب کو دیکھا۔ کچھ کچھ سمجھ میں تو آیا۔ مگر وہم کو یقین کرنے کا حوصلہ نہ تھا۔ خود کو بہلایا کہ
کوئی اور بات ہوگی۔

”آخر اسے حویلی سے بے دخل کروا کر ہی دم لیا۔“ مونانے ڈانٹنے کے انداز میں کہا۔ روشی کے سینے میں عجیب سی دھکڑ
پکڑ ہونے لگی۔

”دونوں نے یہ پروگرام بنایا تھا کہ پہلے تم سرائے پہنچو پھر وہ۔ اور پھر نکاح ہو جائے۔ مگر یہ کا کا جان پر کون سی جادو کی
چھڑی گھمائی کہ بھاگ کر قاضی کو پکڑ لائے۔“ زری نے بھی جھاڑ جھاڑ میں شرکت کی۔

”خیر جب یہ ہو ہی گیا تھا تو واپس آنے کی کیا ضرورت تھی۔ وہاں سیاسی پناہ کی درخواست کیوں نہیں دی؟“ روٹی نے
ایک فاش غلطی کی طرف متوجہ کیا۔

”سماجی پناہ کی۔“ لالی نے تصحیح کی۔

”چلو وہی۔ اب دریا کیسے پار ہوگا۔ تمہارے پاس کچا گھڑا بھی نہیں۔ حشر نشر کر دیں گے یا در ماموں۔“ مریم نے امکانی
نتیجے سے خبردار کیا۔

روشی سر جھکائے سب کی سن رہی تھی۔ مگر خاموش تھی۔

”تم تو اپنی ہو۔ سب سیٹ کر لیں گے۔ سیٹ ہو جائیں گے۔ وہ بے چارہ تو مفت میں مارا گیا۔ کیا ہو گیا تھا تمہیں۔ اتنا
بے خوف کر دیا تھا تمہیں اس نے۔ کیا خواب دکھائے تھے۔ ایسا لگتا تو نہیں تھا۔“ زری نے پھر کہا۔

”ہائے اللہ کتنی رونق تھی اس سے حویلی میں۔“ مونانے گم گشتہ رونقیں یاد آنے لگیں۔

”کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ تم لوگ تو مسلسل تاریک پہلو پیش کیے جا رہی ہو۔“ گلو نے روشی کے چہرے پر نظر ڈال کر ان

سب کو ٹوک دیا۔

”ہے تو سچ بہت اچھا۔ جب بن ٹھن کر کچہری جاتا ہے تو چاروں طرف بہار نظر آنے لگتی ہے۔“ روٹی نے حصہ لیا۔

”ہوں تو تم بھی خاص اینگل سے اسے دیکھتی رہی ہو۔“ تانیہ نے روٹی کو گھورا۔

”لو بتاؤ۔ جو اچھا ہوتا ہے سب ہی کو اچھا لگتا ہے۔ ہمارے ساتھ تو اس کا بی بیویر ہمیشہ ایسا رہا جیسے کہ ہمارا ”مانوں“
ہو۔“ روٹی چڑ کر بولی۔

”واہ رے۔ تقویٰ۔ اپنا بھی بھائی نہیں بنایا۔ سیدھے سیدھے اپنی ماں کا بنا دیا لو بھئی! ان کے ہاں تو شروع سے کوئی
گنجائش ہی نہیں تھی۔“

بیہ ہنس ہنس کر لوٹ گئی۔ وہ سب بھی ہنسنے لگیں۔

”مگر ہمیں تو گلو آپا سے بھی بڑی والی آیا محسوس ہوتا رہا ہے۔ اسے ہم اپنی ہی کوئی کی سمجھیں گے وہ تو ”پورا“ ہے۔“

”لاحول ولا قوۃ۔“ گلو نے گویا سر پیٹ لیا۔

”یہ تو تم لوگوں کو شروع سے جو محسوس ہوا ہے وہ بتایا ہے۔ اب روشی سے پوچھتے ہیں کہ شروع سے اسے کیا محسوس ہوتا
تھا۔“ تانیہ نے ٹوکا۔

”لو یہ کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ اسے شروع سے جو لگا ہو گا اسی پر تو فائل کیا ہے۔“

بیہ نے لطیف نکتہ اٹھایا۔ بے ساختہ قہقہے گونجنے لگے۔

روشی ہنوز خاموش بیٹھی تھی۔

”لوگ تمہارے احساسات کی ترجمانی کر رہے ہیں۔ تم بھی تو کچھ بولو۔“ گلو نے اسے ٹھوکا دیا۔

روشی نے گلو کے شانے سے سر نکا دیا اور پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ ”خاموش ہو جائیں آپ لوگ۔ سب کی سب شینو آپا
بن گئی ہیں۔“

وہ روتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ سب کی سب ایک دم شرمساری ہو کر ایک دوسرے سے نگاہ ہٹاتے لگیں۔

”ارے تم تو مذاق کر رہے تھے۔ سچ ہمیں تو کوئی اعتراض نہیں۔ واقعی وہ تو بہت اچھا ہے۔ بلکہ ہم تو حیرت سے فوت
ہونے کے قریب ہیں یہ اتنا بڑا کام کیسے ہو گیا؟“

گلو نے اس کے بالوں پر بوسہ دیتے ہوئے چکارا۔

”سچ ہم تو نکاح کی کہانی تمہاری زبانی سننے آئے تھے۔ اور تمہاری میچورٹی کو سراہنے آئے تھے کہ کسی حرکت سے بھید نہیں
دیا کہ تم دونوں کے سچ کوئی خاص رشتہ قائم ہو چکا ہے۔ واہ بھئی واہ۔“

”اچھا یہ بتاؤ۔ بابا صاحب نے تو تمہیں نہیں بلوایا ابھی تک؟“ گلو نے پوچھا۔

روشی نے نفی میں سر ہلایا۔

”بلائیں گے تو خیر ضرور۔“ مریم نے وثوق سے کہا۔

”ظاہر ہے ڈانٹ ڈپٹ کے لیے بلائیں گے۔ فیصلہ تو انہی کے پاس محفوظ ہے۔“ لالی نے کہا۔ ”ان کے حساب سے تو یہ ایک قیامت ہے۔“

”کوئی محفوظ نہیں ہے۔ فیصلہ بس ہو چکا۔ ایک بڑی سیدھی سی بات تھی جو ان سب نے مل کر الجھادی۔ زیادہ سے زیادہ شوٹ کر دیں گے۔“ روشی نے آنسو پونچھتے ہوئے قطعی انداز میں کہا۔

”نہی بات۔ اچھا چھوڑو۔ یہ بتاؤ یہ سب ہوا کیسے۔ آئیڈیا کس کا تھا؟“ گلو نے اپنے آنچل سے اس کی آنکھیں پونچھیں۔

مگر روشی کے چہرے سے ظاہر تھا کہ اس کا کچھ بتانے کا موڈ نہیں ہے۔

”بی بی! ہوائی جہاز میں تو مجھے بہت ڈر لگ رہا تھا۔ میں تو بس کلمہ پڑھتی رہی۔ اتنا تیز اڑتا ہے مگر پتا تو نہیں چلتا۔ توبہ اللہ۔“ بالو ماہین کے سر میں تیل ڈالتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ ”لو پتا بھی نہیں چلا کراچی آ گیا۔ اتنی دیر میں تو کورنگی سے اورنگی پہنچتے ہیں ویگن میں۔“

ماہین مسکرا دی۔ ”میں تو سمجھ رہی تھی تجھے مزا آئے گا۔ مگر تیری تو جان سولی پر لگی ہوئی تھی۔“

”تو بی بی! جہاز بھی تو آسمان سے لٹکا ہوتا ہے۔“ وہ سادگی سے بولی۔

ماہین نے بہت لطف محسوس کیا۔

”بی بی! اتنے بڑے گھر میں صرف نوکر رہتے ہیں۔“

”ہاں زیادہ تر۔ دو تین مہینے کے لیے میرے بھائی آتے ہیں۔ یہ جو بڑی بی بی ہیں۔ یہ پاکستانی نہیں ہیں یہ اہی کی خاص ملازمہ تھیں یوگنڈا میں۔ نعمان بھائی انہیں یہاں لے آئے۔ گھر کے مالک کی طرح دیکھ بھال کرتی ہیں۔ بلکہ میری تو پرورش ہی ان کے ہاتھوں میں ہوئی ہے۔ وہ جوڑ کا ہے۔ وہ بیہل کا ہے۔ ایک عورت صبح کو آتی ہے وہ رات تک رہتی ہے۔ دیکھو کیسا چمک رہا ہے گھر۔“

”نام کیا ہے ان بڑی بی بی کا؟“

”رائنا! ماہین نے بتایا۔“

”جیسے ڈانٹا ہوتا ہے۔ لو بتاؤ۔ کہاں ڈانٹ کہاں ڈانٹا۔“ بالو اپنی نکتہ رسی پر خود ہی ہنسی۔

ماہین بھی مسکرا دی۔ ”بھئی وہ ڈانٹا نہیں ہے ڈیانا ہے۔ گیارہ بج گئے مائی گاڈ۔ اچھا تم جا کر سو جاؤ۔ میں ایک ضروری فون کر لوں۔“ وہ ہڑبڑا کر کارپٹ سے اٹھی۔

”کہاں۔ اپنے سرال کریں گی۔؟“ بالو نے تیل کی بوتل کا ڈھکنا لگاتے ہوئے پوچھا۔

”سسرال بھی سمجھ لو اور میکہ بھی۔“ وہ دوپٹا اٹھا کر فون کی سمت بڑھی۔ دل میں ایک عجیب سی دھکڑ پکڑ شروع ہو چکی تھی۔ اتالیٹ فون وہ جان بوجھ کر کر رہی تھی تاکہ تیمور علی خان گھر سے باہر گئے ہوئے ہوں تو واپس آ جائیں۔ گیارہ کا نام بھی کچھ

اتنا زیادہ نہیں تھا۔ اب بھی خدشہ تھا کہ شاید وہ نہ ملیں۔ کہ اسے یقین تھا نازنین اس سے کسی طور بات نہیں کرے گی۔

اس نے دھڑکتے دل سے نمبر ڈائل کیا۔ دو تین مرتبہ کی تیل کے بعد ریسپورڈ اٹھایا گیا تھا۔

”ہیلو! تیمور علی خان کی آواز سماعت سے نکرائی۔ ماہین نے طمانیت کا سانس بھرا۔

”السلام علیکم۔ ماہین فرام کراچی۔“

”والسلام۔ کراچی پہنچ گئیں۔ خیریت۔ اکیلی یاروشی بھی ساتھ ہے؟“

اس مرتبہ تو تیمور علی خان بالکل اپنے اپنے سے محسوس ہوئے۔ ایسا تپاک تھا گویا اس کے فون ہی کا انتظار کر رہے تھے۔

”جی بالکل اکیلی سب وہیں چھوڑ آئی ہوں۔“ وہ بولی۔

”کیا مطلب؟“ تیمور علی خان کے لہجے سے یوں محسوس ہوا جیسے انہیں دھچکا لگا ہو۔

”آپ تک پہنچنے کے لیے شارٹ کٹ اختیار کیا۔“ وہ ہنسی۔

”یہ شارٹ کٹ ہے؟“ تیمور علی خان اس جملے سے محظوظ ہوئے تھے۔

”چلیں ٹھیک ہے۔ آپ کے حساب سے یہ بہتر اقدام ہوگا۔ اب یہ بتائیے کب پہنچ رہی ہیں۔ ہم منتظر ہیں۔“

”واقعی۔ بہت خوشی ہوئی یہ سن کر۔ آپ یہ بتائیں ان کو بھی لے آئے ہیں راہ پر باتوں باتوں میں۔“ وہ اس مرتبہ مکمل

کرہنسی۔

”یہ بہت اجنبی زبان کی کتاب ہے۔ بیس سال سے ایک ایک کر پڑھ رہے ہیں۔“ تیمور علی خان بہت دلچسپ ہمارے

میں جواب دے رہے تھے۔

”بہت خوب آپ کفرم ڈیٹ ہمیں دیجئے گا کل صبح تک۔ کیونکہ کل سہ پہر ہم بڑی حویلی جا رہے ہیں۔ بابا صاحب نے

بلایا ہے۔ آپ کو تو معلوم ہی ہے کہ کس سلسلے میں۔“

”جی۔ جی۔ بلکہ جتنا جلد پہنچ سکتے ہیں پہنچ جائیں۔“

”جی۔ ماہین ہیں۔ بات کریں گی؟“ تیمور علی خان ماہین کے بجائے کسی اور کی سمت متوجہ تھے غالباً نازنین کی طرف۔

ماہین کا دل چلا تھیں مارنے لگا۔ بلکہ اس کے سارے وجود پر لرزش سی طاری ہو گئی جو اس کی جذباتی کیفیت کی غماز تھی۔

اس کی ایک ایک حس سماعت بن گئی۔

”ہیلو! ایک نرمی اور احتیاط تھی آواز میں۔

”السلام علیکم۔“ ماہین کو خود پر قابو پانا مشکل ہو گیا۔

”وسلام۔ کیسی ہو؟“ آواز بہت دھیمی تھی۔

”میں تو ٹھیک ہوں۔ آپ کیسی ہیں؟“ وہ بہت اشتیاق اور خوشی سے کلام کر رہی تھی۔

”ٹھیک ہوں میں بھی۔ کب آرہی ہو ادھر؟“ اس کی آواز آنسوؤں میں ڈوب چکی تھی۔

”آپ کو بھلا میرے آنے سے کیا دلچسپی؟ آپ تو تمام جذباتی تقاضے ایک انتقام کے عوض رہن رکھ چکی ہیں۔“

ماہین کی آواز بھی بھرا گئی۔ دوسری طرف سے سسکیوں کی آواز سنائی دی پھر فون بند ہو گیا۔ ماہین نے بھی تھکے تھکے انداز میں ریسیور کرڈل پر رکھ دیا۔

بالو کمرے سے جا چکی تھی۔ ماہین انگلیوں کی پوروں سے آنسو پونچھتے ہوئے کسی گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی۔ روشی نے بہت چھوٹا سا نوٹ کیس پیک کیا تھا۔ وہ بہت بجھی بجھی تھی۔ کلونے اسے یاوری علی خان کا پیغام پہنچا دیا تھا کہ وہ ٹھیک ساڑھے دس بجے پورج میں پہنچ جائے۔ ابھی دس بج کر بیس منٹ ہوئے تھے۔ وہ اپنے کمرے سے نکل آئی۔ اس کے قدم گلو اور مونا کے مشترکہ بیڈروم کی طرف اٹھ رہے تھے۔

اس نے دروازہ کھٹکھٹایا۔

دروازہ مونا نے کھولا۔ گلو نماز پڑھ رہی تھیں۔

”آؤ روشی! ہم تمہارے پاس آنے ہی والے تھے۔ روبی وغیرہ بھی نماز پڑھ رہی ہیں۔“ مونا اسے لیے اپنے بیڈ تک آئی۔

”مجھے آپ سے ایک بات کرنا ہے مونا جی!“ روشی نے بہت آہستہ آہستہ آواز میں کہا۔ وہ نماز پڑھتی ہوئی گلو کا بھی جائزہ لے رہی تھی۔

”ہوں۔ کہو۔“ مونا نے بھی اس کا انداز دیکھ کر سرگوشی میں کہا۔

”اگر ہو سکے تو آپ باری سے فون پر رابطہ کیجئے گا۔ اسے کہئے گا کہ اگر اس نے ہارمان لی۔ تو میرے باپ دادا بھی ہمیشہ کے لیے مجھے کھودیں گے۔ پیا بہت کچھ کر ڈالیں گے۔ وہ سب کچھ کرنے کی کوشش کریں گے جس سے وہ فتح مندی کا ٹائٹل جیت سکیں۔“

”جس کے ساتھ اتنا بڑا قدم اٹھایا ہے۔ کمال ہے اسے نہیں جانتیں۔ اس کے پاس برداشت اور ذہانت کے بڑے موثر ہتھیار ہیں۔ اس کی فریش ذہانت تھکی ہوئی ذہانتوں کے مقابل ہے اسے ملنے زور دینے تاکید کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔“ گلو سلام پھیر کر کیونکہ اس کی سمت متوجہ تھیں۔ فوراً ٹکڑا کر اگلی رکعتوں کے لیے کھڑی ہو گئی تھیں۔

”آپا ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ تم فکر نہ کرو۔ مفت کے اندیشے مت پالو۔ پسو باقی سب سے مل لو۔“

”اوہ!“ وہ وال کلاک پر نظر ڈال کر ایک دم ہوش میں آئی۔ ”بہت تھوڑا وقت رہ گیا ہے۔“ وہ مونا کے ساتھ باہر آ گئی۔ گلو کے بے نیاز انداز اور اعتماد جملے نے تو اس میں نئی روح پھونک دی تھی۔

”جلدی جلدی سب کو خدا حافظ کہا اور پورج میں آ گئی۔ سامان ڈکی میں رکھا جا چکا تھا۔ یاوری علی خان بچھلی سیٹ پر فروکش تھے۔ وہ ڈرائیور کے پیچھے والی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ عالم تاب اور رئیس بیگم وہاں موجود تھیں۔ اس نے شیشہ نیچے کر کے الوادی انداز میں ہاتھ ہلایا۔ عالم تاب کا انداز انتہائی سرد جبکہ رئیس بیگم کا معمول کے مطابق تھا۔

گاڑی پورج سے باہر نکل گئی مگر وہ عالم تاب کے انداز پر ہی غور کر رہی تھی۔

”گلاس اوپر کرو۔“ یاوری علی خان کا انداز حکمیہ اور بہت روڈ تھا۔ اس نے گھبرا کر جلدی سے شیشہ اوپر کر دیا۔ وہ اس کے برابر میں بیٹھے ہوئے تھے۔ اس کا سارا اعتماد ہوا ہور ہا تھا۔

یا اللہ ڈھائی تین گھنٹے پیا کے برابر میں بیٹھ کر کیسے کٹیں گے۔ یہ تو ہے کہ اس وقت وہ پرسنل بات چیت سے گریز کریں گے کہ ڈرائیور ساتھ ہے۔ اس پر اپنی خفگی کا اظہار بھی نہیں کریں گے۔ حتیٰ کہ شاید اس سے سرے سے بات بھی نہ کریں مگر اسے برابر میں بیٹھے ہوئے باپ سے ایک نفسیاتی اور فطری خوف محسوس ہو رہا تھا۔

آدھا گھنٹہ تو اس نے مسلسل اپنے دل کی دھک دھک اپنے کانوں سے سنی۔ بالآخر اس نے خود ہی خاموشی کو توڑا۔

”پپا۔ رئیس پھو پھونے کا کافی کا فلاسک بھی رکھا ہے۔ آپ کافی پییں گے؟“
”تو تھینکس۔“

انہوں نے جیب سے گولڈن ہاف فریم کی نظر کی عینک تاک پر نکائی اور لیڈر کی فائل کھول کر اپنے زانوؤں پر رکھی پھر جیب سے پنسل مارچ نکالی قلم فائل کی جیب سے کھینچا اور پنسل مارچ فائل پر ڈال کر مطالعہ کرنے لگے۔ گاڑی کی مدہم روشنی میں غالباً وہ احتیاط کے ضمن میں پنسل مارچ استعمال کر رہے تھے۔ اس لمحے وہ اسے اتنے اجنبی اور دور محسوس ہوئے کہ زندگی میں کبھی محسوس نہیں ہوئے تھے انتہا درجے کی غیریت تھی۔ اس نے سیٹ کی بیک سے پشت ٹکا کر آنکھیں موند لیں۔ اس کے رخساروں پر پھسلنے ہوئے آنسوؤں کے قطرے اجنبیت کے مہیب اندھیرے میں وہ نہیں دیکھ سکتے تھے۔

تیور علی خان تو صبح دس بجے ہی بڑی حویلی پہنچ چکے تھے مگر بابا صاحب کہیں گئے ہوئے تھے۔ عالم تاب کی خواب گاہ میں وہ بڑے بھائی بصیر علی خان عالم تاب اور رئیس بیگم کے ہمراہ بیٹھے تھے۔ وہ چاروں تیور علی خان سے اس حیرت ناک واقعے پر گفتگو کر رہے تھے۔

”تمہیں تو اس معاملے میں پڑنا ہی نہیں چاہیے تھا۔ کم ہوئی ہے تمہارے ساتھ؟“ بڑے ابا سنجیدگی سے کہہ رہے تھے۔
”ہم کسی ایک فرد کے لیے کچھ نہیں کر رہے تھے۔ ہمارے سامنے ساری حویلی کا سوال تھا۔“ تیور علی خان نے بھی اسی انداز میں جواب دیا۔ ”وہ بے وقوف لڑکی بہت کچھ کرنے کے درپے تھی۔ ہم نے تو بہت سے الزام اپنے سر لے کر بہت سے لوگوں کو ریلیف دیا ہے۔ ان میں وہ بھی شامل ہیں جن سے قیامت تک کسی بھلائی کی ہمیں امید نہیں۔“

اور پھر اصولاً غیر فطری وغیرہ انسانی طرز عمل مشکلات ہی پیدا کرتا ہے۔ مسائل حل نہیں کرتا۔ اگر ہم اسے یہاں پہنچا دیتے اور وہ بعد میں کہیں اور چلی جاتی تو اس نقصان کو تلافی کیونکر ممکن ہوتی۔ ہم جان چکے تھے کہ وہ اپنے فیصلے پر بہت مضبوط ہے۔ اسے سمجھایا نہیں جاسکتا۔“

”بڑی حویلی میں صرف یاوری علی خان نہیں رہتے۔ اور بہت سے لوگ بھی ہیں جن کی محنت سے بڑی حویلی کا بھرم قائم ہے۔ ضد کے جواب میں ضد یہ کوئی دانا تو نہیں۔ تمہیں چاہیے تھا کہ تم بابا صاحب سے رابطہ کرتے تمہیں اپنے سر مصیبت مول لینے کی کیا ضرورت تھی۔“ بصیر علی خان نے بھی اپنی دیر پا خاموشی توڑی۔

”بصیر ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“ رئیس بیگم نے جلدی سے یوں کہا جیسے وہ بھی یہی کہنا چاہ رہی تھیں۔

”یہ صرف ہمارا فیصلہ نہیں تھا۔ اس کی ماں بھی موجود ہے۔ جو ہمیشہ سے اپنے بچوں کو اپنے ساتھ رکھنے کی خواہش مند تھی۔ بچوں کے چھین لیے جانے پر جس نے ساری دنیا چھوڑ دی۔ روشا نے کی ماں زندہ ہے اس حقیقت کو کیوں بھول جاتے ہیں آپ لوگ۔“ وہ زچ ہو کر گویا ہوئے۔

”ٹھیک۔ تو پھر تمہیں چاہیے تھا کہ اسے سرائے میں روک لیتے اسے واپس حویلی میں بھیجنے کی ضرورت نہیں تھی۔“ بڑے ابا نے اپنا خیال پیش کیا۔

”مجھے ہمیشہ اس لڑکی کی سرکشی سے خوف آتا تھا۔ میں بابا صاحب سے کہا کرتی تھی کہ یاد رہے کہیں وہ روٹی واپس ساتھ رکھا کریں۔ اپنی گرائی میں اس کی پرورش کریں مگر وہ ہمیشہ نال دیتے تھے۔“

عالم تاب نے اپنی سنہری چوڑیوں کو ہاتھ سے ادھر ادھر کرتے ہوئے ناگوار لہجے میں کہا۔

”بھائی بیگم اس طرح کے کیسز میں تو بچے کا مپلیکس کا شکار ہو ہی جاتے ہیں۔“ بصیر علی خان نے سمجھایا۔ ”ہم تو یہ دیکھ رہے ہیں کہ انہیں یہ انتہائی قدر نہیں اٹھاتا چاہیے تھا۔“

”جب وہ خود کو ہمیشہ کے لیے پس منظر میں لے جا چکی ہے تو اسے اکیٹو ہونے کا کیا حق پہنچتا۔ بچے اس کے بغیر ہی بہت سے اہم مرحلوں سے گزرے ہیں۔“ بڑے ابا نے خامسے شد لہجے میں کہا۔

”اس نے بہت سے فیصلے دیئے اور اے کیسے ہیں اور ایسے فیصلے ہمیشہ دکھ پہنچاتے ہیں۔ گناہ گارو بے گناہ سب لپیٹ میں آ جاتے ہیں۔“ رئیس بیگم کا لہجہ تھا۔ تیمور علی خان نے بہن کا چہرہ بغور دیکھا۔

”اب ان باتوں کا مطلب بی بی جان؟ جملے ہوئے زخموں کی راکھ پر بیٹھ کر تعمیر نو کی منصوبہ بندی کی جاتی ہے۔ صرف ماتم نہیں۔“

”یاد رہائی رات اسے ساتھ لے گئے ہیں۔ تعمیر نو کے سارے منصوبے خاک میں ملے سمجھو۔“ بصیر علی خان نے اپنی دانست میں حقیقت کی جانب توجہ دلائی۔

”ہمارے لیے یہ اطمینان کافی ہے کہ وہ انہی کی اولاد ہے۔ اتنی آسان نہیں ہوگی ان کے لیے۔ محض وقت ضائع کریں گے۔ ہم نے ایک نگاہ میں اسے تول لیا تھا اور وہ اپنی اولاد کو نہیں سمجھ سکتے۔“ تیمور علی خان کے لہجے میں تلخی تھی اور استہزا بھی۔

”یہ تو اسے شہد دیے والی بات ہوئی۔ یوں کہو اس راستے تم نے بھی اپنی کبھی کی بھڑاس نکال پیے۔“

رئیس بیگم ایک کل کی لڑکی کو اتنی اہمیت دینے پر بھائی پر برس پڑیں۔ تیمور علی خان نے ایک نگاہ بہن پر ضرور ڈالی مگر خاموش رہے۔

”یاد رہا تو بھائی نہیں جاسکتا۔ مقدمے بازی ہوگی ایک تماشائے گا۔ حاصل نہ وصول۔“ بڑے ابا کسی گہری سوچ سے باہر آئے۔

”یہ منطق ہماری سمجھ میں آج تک نہیں آئی کہ انہیں سمجھنا سب ناممکن کیوں سمجھتے ہیں۔ اور ہمیں سمجھانے کو سارا زمانہ اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ وہ زیادتی در زیادتی کر گزریں کوئی انہیں کچھ نہ کہہ سکے۔ ہم نے یہ قدم ہی اسپرٹ کے تحت ہی اٹھایا ہے

کہ ان کے ہاتھوں زیادتی کا سلسلہ اب رک جائے۔ ہمیں اس بچی سے اپنی اولاد ہی کی طرح ہمدردی ہے جو والدین کی فطری محبت سے محروم رہی ہے۔ دوسروں کی زیادتی کا براہ راست شکار ہوئی ہے۔ ہم اس بچی کی زندگی کا اگلا سوز خوشگوار دیکھنا چاہتے ہیں۔ ہم سب کچھ فیس کریں گے مگر اس بچی کا دل ہمیشہ کے لیے اداس نہیں کریں گے۔ نہ ہم خوفزدہ ہیں۔ نہ ہار ماننے کے موڈ میں ہیں۔“

”تم نے جس معاشرے میں پرورش پائی ہے حویلی کا ماحول اس سے یکسر الٹ ہے۔ ہمارے ہاں لڑکیوں کو اتنی ذہنی آزادی دینے کا رواج نہیں۔“ بڑے ابا نے دو ٹوک انداز میں قطع کلامی کی۔

”پہلے تو ہمیں یہ طے کر لینا چاہیے کہ ہمارا ضابطہ حیات مذہب کے تحت ہونا چاہیے۔ یا اپنے بنائے ہوئے۔ رواجوں کے مطابق۔ دو کشتیوں میں سوار ہو کر کتنی دور تک سفر کیا جاسکتا ہے۔“

”مذہب لڑکیوں کے گھر سے فرار ہونے کی حوصلہ افزائی نہیں کرتا۔“ عالم تاب جیسے تڑپ کر بولیں۔

”وہ فرار نہیں ہوئی تھی۔ ہمارے پاس آئی تھی۔ شادی کرنے کی نیت سے نہیں صرف اس خیال سے کہ اس کی شادی جو زبردستی کی جا رہی ہے اسے روک دیا جائے اور ہم اس کی نظر میں شاید اس قابل تھے کہ اس کے خیالات بابا صاحب تک پہنچا دیں اور شادی روکوا دیں۔“

”تو پھر تمہیں یہی کرنا چاہیے تھا۔ تم بابا صاحب سے بات کرتے ناں۔“ رئیس بیگم نے فوراً ان کی بات پکڑی۔

”مگر ہم تصویر کا دوسرا رخ بھی تو دیکھ رہے تھے کہ وہ شادی کیوں کرنا نہیں چاہتی۔ اور پھر ہمیں اپنے طور پر پتا چل گیا کہ وہ عظیم الدین کے ہاں شادی پر کیوں رضا مند نہیں ہے۔ اور اصل پیچیدگی تو یہیں سے شروع ہوتی ہے۔“

”اپنے طور سے کیا مطلب؟“ بصیر علی خان نے چونک کر بھائی کی شکل دیکھی۔

”ہم وضاحت سے معذور ہیں مگر بات کا اعتبار کیا جائے۔“ تیمور علی خان جڑبڑ ہو گئے۔

”ہمارے ہاں اس قسم کی آزادی لڑکیوں کو نہیں دی جاتی۔“ عالم تاب ناگوار لہجے میں گویا ہوئیں۔

”وہ کسی قسم کی معیوب حرکت میں منوث نہیں پائی گئی۔“ تیمور علی خان نے بے ساختہ انداز میں دفاع کیا۔

”یہ کیا کم معیوب حرکت ہے کہ وہ بلا اجازت حویلی سے نکل کھڑی ہوئی اور پیچھے پیچھے وہ چل دیا۔“ عالم تاب سابقہ انداز میں گویا ہوئیں۔

”اسے بابا صاحب نے کام سے بھیج دیا۔“ تیمور علی خان نے روٹی کے وہاں موجود ہونے کا علم نہیں تھا۔ یہ بات ہم وثوق سے کہہ سکتے ہیں۔ تیمور علی خان منہ پر لہجے میں کہہ رہے تھے۔

”وہ یاد رہی خان کی بیٹی ہے۔ اس کے معاملے میں تم نے مداخلت کر کے بہت بُرا کیا۔ کاش یہ بات تمہاری سمجھ میں آ سکتی۔“ بڑے ابا زچ انداز میں کہہ رہے تھے۔

”وہ ہماری بھی کچھ لگتی ہے۔ ہم اس کے وجود کی حقیقت تسلیم کرتے ہیں۔ جبکہ دوسرے اسے اپنے اپنے حصے کی دھول میں لپیٹ رہے ہیں صرف اپنا اپنا سوچ رہے ہیں۔ یہ انتہائی ظلم ہے۔ ہمیں اپنے اقدام پر رتی برابر افسوس نہیں ہے۔“

تیور علی خان نے بڑی جرأت سے جواب دیا۔

”تم نے برسوں پہلے بھی ایک صحیح قدم اٹھایا تھا۔ اس کے زخم تمہیں آج بھی تنگ کرتے ہیں گے۔“ رئیس بیگم تنگی سے گویا ہوئیں۔

”اسی سبب تو اب دوسروں کو زخم خوردہ دیکھنے کے خواہش مند نہیں ہیں۔ زخم کھایا ہے تو زخم کی سمجھ آئی ہے اس کا ذائقہ چا چلا ہے۔“ تیور علی خان کا سکون کمال تھا۔

”تمہارے پاس اپنے دکھ کیا کم تھے جو ادھار مانگنے نکل کھڑے ہوئے۔ میرے چاند جیسے بھائی میرے راج دلارے۔ میرے کلیجے کی ٹھنڈک۔ میری آنکھوں کے نور۔“

رئیس بیگم بے تابی سے اٹھ کھڑی ہوئیں اور تیور علی خان کا سر اپنے سینے سے لگا کر ان کے سر پر بوسہ دیتے ہوئے پھوٹ پھوٹ کر رو پڑیں۔

”تم سے تلخ بات کرتی ہوں تو احساس گناہ سے مرمر جاتی ہوں۔ غصہ تو اس بات پر آتا ہے کہ تمہیں اپنے آپ پر رحم کیوں نہیں آتا۔؟“ وہ زار و قطار رو رہی تھیں۔

”تم مجھ سے اتنے چھوٹے ہو کہ تمہارا الزکھڑا کے چلنا بھی یاد ہے۔ جب اونچے پورے ہو کر میرے سامنے آئے تو میں نے نظر بھر کر دیکھنا چھوڑ دیا۔ اور دعائیں مانگتی تھی کہ اللہ تمہیں نظر بد سے بچائے۔ میرے شیر جیسے بھائی کو اپنی حفظ و امان میں رکھے۔ میرا بھائی قدم قدم پر سکھ پائے۔ مگر۔“ وہ بک رہی تھیں۔

تیور علی خان نے انہیں تمام کر اپنے پہلو میں بٹھالیا۔ اور جیب سے رومال نکال کر ان کے آنسو پونچھنے لگے۔

”پلیز۔ بی بی جان ادھ بھی ہماری اپنی ہے۔ خیر خواہی کے یہی جذبات اس کے لیے بھی ہونا چاہئیں۔“

”میری جان! مجھے تو اس وقت تمہاری پڑی ہوئی ہے۔ تمہاری نا آسودگی کے احساس سے میرا کلیجہ پھٹنے لگتا ہے۔“

وہ تیور علی خان کے شانے سے پیشانی ٹکا کر پھر رونے لگیں۔ سب دم بخود سے انداز میں دونوں بہن بھائی کو دیکھ رہے تھے۔

”آپ ہماری فکر نہ کریں۔ ہم بہت خوش ہیں۔ مت پریشان ہوا کریں۔ آپ روتی ہیں تو ہم بہت گلٹی ٹیل کرتے ہیں۔

اب تو ہم بالکل سیٹ ہیں۔ ہمارا مقصد حیات ہمارے بچے ہیں۔ بالآخر انسان کا نصب العین اس کی اولاد ہی ہوتی ہے۔

باقی سب کچھ تو سنگ میل کی طرح راہ میں آتا ہے۔ اویسیلی اب ہم سیٹ ہیں بڑی بڑی ٹری یوزفل (مفید) ہو گئی ہے لائف۔“ وہ اپنے مخصوص انداز میں کہہ رہے تھے۔ وہ بہت کوشش کرتے تھے کہ ان کی گفتگو میں انگریزی شامل نہ ہو مگر ایک عرصہ دیا و غیر میں گزارنے..... کی وجہ سے ان کا مخصوص انداز گفتگو پختہ ہو چکا تھا۔ وہ بہن کو بہت دسوزی سے سمجھا رہے تھے بہلارہے تھے۔

اسی دم مامانی اجازت ملے کر اندر داخل ہوئی۔

”چھوٹے خان کو بابا صاحب بلارہے ہیں۔ وہ کہہ رہے ہیں کہ وہ دیر سے انتظار کر رہے ہیں۔“ ماما ایک مشینی انداز میں

پیغام پہنچا کر معمول کی طرح پلٹ گئی۔

بڑے بابا اور بصیر علی خان بھی تیور علی خان کے ساتھ ہی اٹھ کھڑے ہوئے۔

عالم تاب اور رئیس بیگم اپنی جگہ بیٹھی ہوئی تھیں۔ تیور علی خان نے ایک طرف ہو کر پہلے بڑے بھائیوں کو گزرنے کا راستہ دیا۔ یہ بھائیوں کی جذباتی وابستگی ہی تھی کہ وہ تیور علی خان کو باپ کے سامنے تنہا نہیں چھوڑنا چاہتے تھے۔

تینوں بابا صاحب کی خواب گاہ میں داخل ہوئے تو انہوں نے تینوں کے چہرے پر باری باری نظر دوڑائی تھی۔ اُلجھن ان کے چہرے سے واضح تھی۔ وہ شملہ اُتار کر اپنا سر سہلانے لگے تھے۔ تینوں کے سلام کا جواب بھی انہوں نے اشارے سے دیا تھا۔

”آؤ بیٹھو۔ بہت بے تابی سے تمہارا انتظار کر رہے تھے۔“ ان کے لہجے میں کوئی خاص کیفیت نہیں تھی معمول کا انداز تھا۔

”اندازہ تو ہو گا تمہیں کہ کیوں بلایا ہے؟“ انہوں نے اچھتی سی نظر بیٹے پر ڈالی۔

”جی!“ تیور علی خان جی کہہ کر خاموش ہو گئے۔ وہ اور بصیر علی خان خاصے فاصلے پر تھے جبکہ بڑے بھائی باپ کے پہلو میں بیٹھ گئے تھے۔

”جو کچھ ہو چکا اس کی تفصیل دہرانا بے معنی ہے۔ ہم کس صدمے سے گزر رہے ہیں۔ یہ بتانا بھی ضروری نہیں۔ بات تو بس یہ ہے کہ اس مسئلے کا کیا حال نکالا جائے۔ تمہیں بُرا بھلا کہنے سے اگر مسئلہ حل ہو سکتا تو بُرا بھلا ہی کہہ لیتے۔ یہ کیا کر دیا تیور؟“ وہ بڑے تسلسل سے بولتے بولتے یکدم خاموش ہو گئے۔

”مسئلہ تو یہی ہے بابا صاحب کہ حویلی میں مسئلہ تو پیدا ہوتے ہیں مگر ان مسئلوں کا کوئی پراپر سلوشن نہیں نکالا جاتا بلکہ مسئلے کے جواب میں نیا مسئلہ پیدا کر دیا جاتا ہے۔ روشانی کی شادی ہونا تھی اس کی ماں کی پسند سے ہو گئی بس۔“ تیور علی خان کا انداز قطعی دو ٹوک اور ہر سکون تھا۔

”اور بس نہیں۔ روشانی کا باپ زندہ ہے الحمد للہ اور موجود ہے۔“ بابا صاحب کے لہجے میں ناراضگی تھی۔

”اگر اس نکاح میں پوائنٹ آف آنکیشن یہ ہے کہ اس کی ماں نے اس کیس میں حصہ لیا اس کے باوجود کہ اس نے بیٹی کی پرورش میں حصہ نہیں لیا تو یہ بالکل فضول ہے۔ اگر ماں نے اس کی پرورش میں حصہ نہیں لیا تو اس کے باپ..... نے بھی اس کے گروں آپ ہونے تک لا تعلقی اختیار رکھی۔ اس کی پرورش بڑی بی بی جان نے کی ہے۔ اگر پرورش کر نیوالے کی پوزیشن ڈسکس ہو رہی ہے اور صرف اس کا رول ہی اپورٹنٹ ہے تو پھر بڑی بی بی جان کے علاوہ اس کیس میں کسی کو حصہ نہیں لینا چاہیے۔“

”ہمارے موجود ہوتے ہوئے کوئی بھی اپورٹنٹ نہیں ہے۔ یہ ہمارے خاندان کا مسئلہ ہے جس کی باگ دوڑ ہمارے ہاتھ میں ہے۔ علیم الدین کے ہاں رشتہ ہم نے طے کیا تھا یا دور سے مشورہ تک نہیں مانگا تھا۔ صرف اطلاع دی تھی۔ اور اس نے تسلیم کیا تھا اس نے ہمیں ایک لحظے کے لیے بھی احساس نہیں دلایا تھا کہ وہ روشانی کے باپ کی حیثیت سے صرف خود کو

فیصلہ کرنے کا مستحق سمجھتا ہے۔ اور وہ جسے ہم نے بیٹے کو قربان گاہ پر چڑھا کر خاندانی تحفظ دیا اس نے اتنی زحمت بھی نہیں کی کہ ہم سے اس موضوع پر بات چیت کرتی۔ آج وہ خود کو مکمل فیوڈل لیڈی سمجھ کر فیصلے کر رہی ہے جیسے سب مرچے ہوں۔ اس کا کوئی بڑا سر پر موجود نہ ہو۔“

بابا صاحب کے انداز سے غیض و غضب جھلکے لگا۔

”یہ فیصلہ کن پوزیشن شاید ہم نے انہیں دی ہے ان کا کوئی قصور نہیں۔ وہ تو ایک مٹی کے کھلونے جیسی پوزیشن کے ساتھ ہمارے حوالے کی گئی تھیں۔ ہم چاہتے تو توڑ کر رکھ دیے۔ افسوس وہ ہمدردی کے سارے رشتے ڈسکلیٹ ہو چکے تھے ان سے۔ مگر بیس سال کی طویل رفاقت کوئی معنی رکھتی ہے۔ انہوں نے تو جی بھر کے ہم نے لاطعلی کا اظہار کیا۔ ان کی ہم سے کبھی کوئی ڈیمانڈ نہیں رہی۔ مگر ہم جانتے ہیں وہ ان دونوں بچوں کے لیے کتنا روٹی ہیں جنہیں محض اتفاقاً ان سے دور کیا گیا۔ انہوں نے پہلی بار ہم سے کچھ مانگا وہ بھی اپنی ذات کے لیے نہیں اپنی بیٹی کے لیے۔ جو ماں خود ظلم کا شکار ہوئی ہو وہ اپنی اولاد کے ساتھ زیادتی کے احساس ہی سے پاگل ہو جاتی ہے۔“

”مگر تم نے ہم سے تو کچھ کہا ہوتا۔“ بابا صاحب نے بات کاٹ دی۔

”اگر کوئی اچھا امکان نظر آتا تو ہم پہلی فرصت میں آپ سے بات کرتے۔ بابا صاحب! باری۔ عبد اللہ مہندی کی اولاد ہے۔ ہمارے دوست کا بیٹا۔ اور ہمارے بھائی کا تو یہ حال ہے کہ سرائے سے گزر کر آنے والی ہوا میں سانس لینا بھی پسند نہ کریں۔“ تیمور علی خان کا لہجہ تلخ ہونے لگا۔

”یہ غلط ہے۔ یاد باری کے لیے بہت نرم گوشہ رکھتے تھے۔“ بابا صاحب نے اختلاف کیا۔

”مگر کسی معتبر انسانی رشتے کے حوالے سے نہیں ایک غلام کی اندھی تابعداری اور ایفی شنسی کی وجہ سے۔“ تیمور علی خان نے فوراً کہا۔

”استے پڑھے لکھے روشن دماغ غلام بھلا کہیں ملتے ہیں۔“ تیمور علی خان نے بھی بہت خفی سی ناراضگی کا مظاہر کیا۔

”یہ تو تم ہمیں الزام دے رہے ہو۔ ہم نے اس سے بہت محبت کی ہے۔ اسے اپنے ساتھ بٹھایا ہے۔ کھانا کھلایا ہے۔ وہ کہیں سے واپس آیا تو یہ تک نہیں پوچھا کہ کہاں سے آیا ہے۔“ بابا صاحب کے غصے نے ڈکھ کی جگہ لے لی۔

”جب وہ اتنا معتبر اور معتمد ہے تو پھر جھگڑا کیا معنی؟“ تیمور علی خان نے فوراً کہا۔

”جھگڑا یہ ہے کہ خاندانی لوگوں کے ہاں نکاح بیاہ اس طرح نہیں ہوتے۔“

بابا صاحب نے تائید طلب نظروں سے بڑے بیٹے کی سمت دیکھا۔ جن کی غیر جانبداری مسلم تھی۔

مگر خاندانی لوگوں کے ہاں پوزیشن اس طرح کی ہو کہ جیسے کہ ہماری اور روشائے کی تمی کی ہے تو پینٹ فارمولے کرش ہو جاتے ہیں۔ اور بہت سی عجیب و غریب باتیں کبھی بھی سامنے آ سکتی ہیں۔“ تیمور علی خان کی حاضر دماغی عروج پر تھی۔

”تیمور! تمہیں احساس ہے کہ ہم کس عظیم ڈکھ سے دوچار ہیں؟“ بابا صاحب کی آواز سے شگستگی سی پہنچنے لگی۔

”تم نے تو ہمارا جلال ہماری آن ہمارا اعتماد مٹی کر دیا۔ اتنی محبتوں کے جواب میں یہ حق بنتا تھا ہمارا؟ یاد کرو ہم سمجھا سکتے

ہیں نہ بہلا سکتے ہیں۔ البتہ تم سے کچھ اچھی امیدیں تھیں۔“

”بابا صاحب! معذرت کے ساتھ جب پہلی بے اصولی ہو جاتی ہے تو پھر اصول کی بات مذاق بن جاتی ہے۔ ایک نسل جو مقدر کے طے شدہ ڈکھوں سے گزرتی یہاں تک آ پہنچی ہے۔ اسے اپنی نئی نسل کی خوشی کا اہتمام کرنے کی پاداش میں ڈکھوں کی عظیم انتہا تک لے جانا کون سی اصول پرستی ہے۔ اصل سے اصول وضع ہوتے ہیں۔ اصل کے معنی حقیقت اور فطرت کے ہیں۔ محض اپنے اندیشوں کے سبب حقیقت کو مسخ کرنا اور اس طرح کے فیصلے کرنا جو انسانوں کو زندہ درگور کر ڈالیں۔ یہ فطرت کا حقیقت کا کون سا رخ ہے؟ حقیقت تو یہ ہے کہ کسی بھی قسم کے نقصان سے بچا جائے۔ ڈکھوں کا سلسلہ روکنے کی اوسطی کوشش کی جائے۔“

بصیر علی خان نے ٹائی کی ٹاٹ ڈھیلی کرتے ہوئے بالآخر خاموشی توڑ ڈالی۔

بابا صاحب نے چونک کر بصیر علی خان کی سمت دیکھا۔

”یاد رہائی نے جو کیا اس کا ان کے پاس کوئی ثبوت نہیں تھا۔ ایک بہت اچھی کارآمد شاندار باشعور خاتون ضائع ہو گئی کہ انہوں نے اپنی ذات مائینس کر دی مگر آپ کی وجہ سے تیمور کی وجہ سے وہ ہولناک جہاں سے بچ گئیں۔ انہیں کچھ ریلیف ملا۔ مگر یہ فیکٹ ہے کہ وہ موجود ہیں۔ ان کے کان اپنی اولاد کے مسائل کی طرف لگے رہتے ہیں۔ ایک جیتا جاگتا انسان وراثت نہیں ہو سکتا۔ حد درجہ ڈکھ اٹھانے والی خاتون ان سے کوئی اچھی امید نہیں کر سکتی تھی۔ ان کے فیصلے کو ماضی کے تناظر میں دیکھا جائے۔“

بصیر علی خان نے کسی منجھے ہوئے وکیل کی طرح تیمور کے حق میں دلائل دیے۔

تیمور علی خان بھی جیسے یکسر احساس تنہائی سے باہر نکل آئے۔

”وہ اپنی بیٹی کو لے کر جا چکا ہے۔“

بڑے بٹانے گویا اطلاع دی اور یوں ظاہر کیا جیسے وہ سب لا حاصل بحث کر رہے ہوں۔

”سوڈ ہاٹ۔ اب وہ کچھ نہیں کر سکتے۔ یہ وہ کیس ہے جس میں ان کی سیٹ بھی ان کی کوئی مدد نہیں کرے گی۔“ تیمور علی خان نے اطمینان سے کہا۔

مگر ایک لا حاصل رستہ کشی تو شروع ہو گئی۔ ”بڑے بٹا مزید گویا ہوئے۔“

”وہ نہیں مانے گا تیمور!“ بابا صاحب بھی تھکے تھکے انداز میں گویا ہوئے۔

”اب ان کے نامنے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ آروہ بورت میں جا سکتے ہیں تو ہم بھی ڈائریکٹ آئی جی سے بات کر سکتے ہیں۔“

تیمور علی خان کا انداز بھی دونوں تھا۔

”کچھ خوف خدا کرو۔ اپنے باپ کی عزت کا احساس کرو۔“

بابا صاحب آرزوگی سے کہہ رہے تھے۔ جوان اور فیصلہ کن اولاد کے سامنے ایک باپ کا آخری ہتھیار یہی ہوتا ہے۔

”آپ ابھی بے بس نہیں ہیں۔ فیصلہ کن پوزیشن میں ہیں۔ آپ انہیں کہیے کہ وہ رخصتی کی تیاری کریں بلکہ انہیں تاریخ دیں۔“ تیمور علی خان نے بحث سمیٹی۔

”کاش یہ اتنا آسان ہوتا۔ وہ ہمیشہ کے لیے حویلی تو چھوڑ سکتا ہے مگر۔“ وہ کچھ کہتے کہتے خاموش ہو گئے۔

”تو چھوڑ کیوں نہیں دیتے۔ جذباتی وابستگی کی حس تو یوں بھی نہیں ہے ان میں کچھ فرق نہیں پڑے گا ان پر۔“ تیمور علی خان کے لہجے میں بلا کی بے رحمی تھی۔

”یہ تم کہہ سکتے ہو۔ بالآخر اولاد ہے ہماری۔ اس نے تو خود کو تنہا کر لیا ہے۔“ بابا صاحب ڈکھ سے کہہ رہے تھے۔

”وہ صرف نیکو سوچتے ہیں۔ گنجائش نہیں چھوڑتے۔ ایک کم عمر اور عملی لڑکی کو بھی وہ استعمال کر گئے۔ حد ہوتی ہے سنگدلی کی۔ ایک کو تار چر دینے کے لیے دوسرے کو استعمال کرتے ہیں۔ قدرت نے روشا نے کی صورت میں انہیں بہت جواب دیا ہے۔ اس کا رز سے ہم بھی ریلیکس نہیں کر رہے ہیں۔ آخر ہم بھی انسان ہی ہیں۔“

تیمور علی خان بہت سفاکی سے کہہ رہے تھے۔

”تو کیا تم نے اس کی بنی ہو استعمال نہیں کیا۔ بھید تو پھر یوں کھلتا ہے۔“

بابا صاحب نے مشکوک نظروں سے بیٹے کو دیکھا۔

”نیچرلی ایسا ہوا ہے اور ہم حیران ہو گئے ہیں۔ ماہین سے البتہ ہمیں ہمدردی ہے اور آپ سے گلہ ہے۔ یہ مزاحمت جو آپ روشا نے کے لیے کر رہے ہیں۔ ماہین کے لیے کرنا چاہیے تھی۔“ تیمور علی خان شاکی نظر آئے۔

”ہم تو اس کی بنجر و ویران زندگی پر افسردہ تھے۔ سوچا تھا وہ زندگی میں حصہ لینا چاہتا ہے تو ہم دیوار کیوں بنیں۔ پھر اس میں ماہین کی اپنی خواہش کا سب سے اہم رول ہے۔“

بابا صاحب تو جیسے آج بیٹوں کے سامنے نہیں خود اپنے ضمیر کی عدالت میں جواب دے رہے تھے۔ جانے کہاں جا سویا تھا ان کا طنطنہ۔

”بہر حال آپ انہیں قائل کیجئے کہ اپنے اسٹیشن کا خیال کیجئے اور کورٹ میں جانے کا خیال چھوڑ دیجئے۔ ہم قسم کھا کر کہہ سکتے ہیں روشا نے ان کے خلاف ہی بولے گی۔ وہ پہلی پیشی ہی میں ہار جائیں گے۔ خواہ وہ کتنا ہی پریشرا کر کے روشا نے کو کورٹ میں لے جائیں۔“

”ہمیں اندازہ ہے۔ مگر وہ روشا نے کو رخصت نہیں کرے گا۔ یہ بھی طے ہے۔“

”وہ ہم کرائیں گے۔“ تیمور علی خان نے تیزی سے ٹکڑا لگایا۔

”ابھی بات کھلی نہیں ہے۔ اندر ہی یہ قصہ ختم ہو سکتا ہے۔ تم اپنی جان کو مشکل میں کیوں ڈالتے ہو۔“ بابا صاحب نے سمجھانے کی کوشش کی۔

”یہ قصہ ختم نہیں کرنا چاہتے۔ کچھ لوگوں کی پوری زندگی کی خوشیاں اس قصے پر ڈھنڈ کر رہی ہیں۔ آپ ان سے کہہ دیجئے۔ کہ آپ اب کچھ نہیں کر سکتے۔ اپنا قیمتی وقت ضائع نہ کریں۔“

”اگلے ہفتے کی کوئی تاریخ لے لیں ان سے۔ آٹھ دن بعد ورنہ ہم خود لے آئیں گے۔ اب وہ ان کی کسڈی سے نکل چکی ہے۔ اور دوسرے شخص کی کسڈی میں آگئی ہے جس نے قانونی اور شرعی طور سے یعنی پراپر چینل سے اس کی ذمہ داری قبول کی ہے۔ اب ہمیں اجازت دیجیے۔“

تیمور علی خان قطعی انداز میں اپنی بات کہہ کر اٹھے کھڑے ہوئے۔

”اگر مزید کوئی گڑبڑ ہوئی تو ہم مرتے دم تک تم دونوں کی صورت نہیں دیکھیں گے۔“

بابا صاحب نے شملہ اٹھا کر سر پر جمایا اور پائپ (حقے کا) اٹھا کر منہ میں ڈالیا اور اپنا فیصلہ بھی سنا دیا۔

تیمور علی خان ایک ٹاپے کو ساکت سے کھڑے رہ گئے۔ پھر نگاہ اٹھا کر دونوں بھائیوں کی سمت دیکھا۔

”انشاء اللہ کوئی گڑبڑ نہیں ہوگی۔ اگر صرف باری کا مسئلہ ہوتا تو شاید ہم بھی سیلفش ہو جاتے۔ مگر ہماری اپنی بچی کا دل بھی تو ہمارے سینے میں دھڑک رہا ہے۔“

تیمور علی خان کے لہجے میں جانے کیا تھا کہ دلاور علی خان مہبوت سے ہو کر ان کی صورت دیکھنے لگے۔

”ہمیں خوشی ہے کہ تمہارا سینہ اتنا فراخ اور دل اتنا بڑا ہے۔ کاش تم تھوڑی سی گنجائش بھائی کے لیے بھی رکھتے۔“ وہ مغموم آواز میں کہہ رہے تھے۔

”ہم انسان ہیں بابا صاحب! خدا نہیں ہے۔ ہم سے اتنی ڈیمانڈ کیجئے جو بطور انسان ہماری رنج میں ہو۔“

”خدا حافظ۔“ انہوں نے بھائیوں سے مصافحہ کیا۔

”دوپہر کا کھانا کھا کر چلے جاتے۔“ بصیر علی خان نے کہا۔

”بہت ضروری کام ہے۔ تین بجے تک نوشہرہ پہنچنا تھا۔ ایکچیک کی لیٹ ہو گئے ہیں۔“

وہ بہت تیزی سے باہر نکل گئے تھے۔

ماہین کی فلائٹ پشاور کے لیے شام کی تھی۔ وہ گاڑی خود ڈرائیو کر کے بالو کو اس کے گھر پہنچانے جا رہی تھی۔ بالو اسے گاڑی چلاتا دیکھ کر بہت خوش ہو رہی تھی۔ اور بہت حیرت سے اس کی ایک ایک حرکت نوٹ کر رہی تھی۔ ساتھ ساتھ راستہ بھی بتا رہی تھی۔

”جب میں روڈ پہ گاڑی چلاتی ہوئی عورتوں کو دیکھتی تھی تو وہ مجھے بہت اچھی بھی لگتی تھیں اور عجیب بھی۔ مجھے کیا پتا تھا ایک دن میں بھی ایک خوبصورت کار میں بیٹھوں گی جسے ایک عورت چلا رہی ہوگی۔ میں سوچتی تھی کار چلانے والی عورت بہت مغرور ہوتی ہوگی۔ مگر آپ تو اتنی بڑی حویلی میں رہتی ہیں اور بالکل بھی مغرور نہیں ہیں اور پھر خوبصورت بھی تو ہیں۔“

”اچھا!“ ماہین بے ساختہ ہنس پڑی۔ ”یعنی حد ہوگئی۔ مجھے تم بتا رہی ہو کہ میں خوبصورت ہوں۔ میرے میاں نے تو بہنی مون ہیریڈ میں بھی مجھے احساس نہیں دلایا کہ میں خوبصورت ہوں۔ اور جب تک اپنے میاں سے پتا نہ چلے کہ کتنے خوبصورت ہیں یقین نہیں آتا کہ ہم خوبصورت ہیں۔“

وہ مزاح انداز میں کہہ رہی تھی۔

”میرا میاں تو میری تعریف میں زمین آسمان ایک کر دیتا تھا۔ وہ میری تعریف کرتا تھا تو مجھے زمانے بھر کا جھوٹا لگتا تھا۔ میں کہاں کی خوبصورت ہوں۔“ بالو نے شگ کر کہا۔ ”بہت غصہ آتا تھا مجھے۔“

”اسے تو لگتی ہوگی۔“ ماہین مسکرا دی۔

”بے کار۔ سب رام کرنے کے چونچلے ہیں۔“ بالو کا یکدم موڈ آف ہو گیا۔

ماہین بھی خاموش ہی ہو گئی۔ گاڑی مناسب رفتار سے گاڑن تھی۔ بالو نے ایک مصروف سڑک سے ٹرن لینے کو کہا۔ اور ایک کشادہ سی سڑک کے سامنے بنے اپارٹمنٹس کے سامنے رکوادی۔

ماہین کو حیرت سی ہوئی کہ یہ تو بتا رہی تھی کہ بہت مفلوک الحال قسم کے مزدور کی بیٹی ہے۔ یہ تو ٹھیک ٹھاک قسم کا رہائشی علاقہ ہے۔ بہر حال وہ کچھ بولی نہیں اور انجن بند کر کے نیچے اتر آئی اور گاڑی لاک کر دی۔ بالو چل پڑی تھی۔ اس نے بھی تھلید میں قدم بڑھا دیے۔

اس نے گراؤنڈ فلور پر بنے دائیں طرف کے پارٹمنٹ کی بیل رنگ کی۔ مگر دروازہ نہ کھلا۔ دو تین مرتبہ پھر بجائی تب کہیں جا کر دروازہ کھلا۔ کھولنے والا جتنی تیزی سے آگے آیا تھا اس سے زیادہ تیزی سے پیچھے ہٹا تھا۔ ماہین فاصلے پر کھڑی بغور یہ سب دیکھ رہی تھی۔

”السلام علیکم۔ آپ کی حویلی سے مہمان اساتھ لائی ہوں۔ اتنی حیرت سے کیا دیکھ رہے ہیں۔ اندر آنے کو کہتے۔“ بالو کے انداز میں بلا کا اعتماد تھا۔

عارف کو تو جیسے یہ سن کر سکتہ ہی ہو گیا۔ ماہین بھی الجھ کر بالو کی سمت دیکھ رہی تھی۔

”یہ عارف ہیں ماہین بی بی۔“ بالو نے بتایا۔

ماہین نرمی طرح چونک پڑی۔ اس کے تو وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ بالو اسے عارف سے ملوائے گی۔ ششدر سی کھڑی رہ گئی۔

اس کی آواز پر عارف جیسے کسی دھیان سے چوٹا۔

”آئیے۔ پلیز اندر تشریف لائیے۔“ اس نے جلدی سے ایک طرف ہو کر راستہ دیا۔ ماہین جیسے بادل خواستہ آگے بڑھی۔ بالو البتہ بہت اکیٹو نظر آرہی تھی۔

”یہ ماہین بی بی ہیں۔ یادور خاناں کی بیگم۔“ بالو نے اندر داخل ہو کر باضابطہ تعارف کرایا۔

”ان کی بیگم کا نام تو۔“ عارف کچھ بولتے بولتے رک گیا۔

”ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔ میں ان کی دوسری بیگم ہوں۔ آپ پریشان نہ ہوں۔“ ماہین نے جلدی سے ہاتھ اٹھا کر اسے جیسے آگے بولنے سے باز رکھا۔

عارف نے ایک معنی خیز نگاہ اس پر ڈالی۔

یارب غم عشق کیا بلا ہے
ہر شخص کا تجربہ نیا ہے

وہ گریساں ان کی سمت کھسکاتے ہوئے بڑبڑا رہا تھا۔ ماہین نے نظر اٹھا کر ایک باذوق مگر بے حال انسان کا جائزہ لیا۔ مگر خاموش رہی۔

”یہاں کیوں آئی ہو مجھے لے کر۔“ اس نے بیٹھتے ہوئے سرگوشی میں بالو سے دریافت کیا۔

”ان سے ملانے۔“ اس نے جواب دیا۔

”مگر میں نے تو تم سے اس قسم کی کوئی بات نہیں کی تھی۔“ وہ ناراضگی سے گویا ہوئی۔

”میں نے سوچا آپ انہیں دیکھ لیں۔ شاید آپ کچھ کر سکیں میرے لیے۔“

عارف ایک بغلی دروازے میں غائب ہو چکا تھا۔ بالو پھر بھی بہت افسانگی سے کہہ رہی تھی۔

”وہ تو ب اپنا بھی نہیں ہے۔ تمہارا کیا خاک ہوگا۔“ ماہین نے ناراضگی سے کہا۔ ”کیوں لائی ہو مجھے اس کے پاس۔ تمہاری عقل میں ابھی تک میری بات نہیں آئی۔“

”میں بے ٹھکانا ہو گئی ہوں بی بی! مجھے ٹھکانا دلوا دیں۔ میری ماں میرا جینا حرام کر دی۔ میں یہی سوچ کر آپ کے ساتھ کراچی آئی تھی۔ آپ کو میری ماں کا پتا نہیں۔“

”مائیں۔ سب ایک جیسی ہوتی ہیں۔ صرف اپنی اولاد پر ہی تو حکمرانی ہوتی ہے ان کی جو چاہتی ہیں کہہ لیتی ہیں مگر محبت بھی خالص صورت میں یہیں ہوتی ہے۔ خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں خود بھی تمہاری خیر خبر لیتی رہوں گی۔“

”آپ اس سے بات تو کر کے دیکھیں۔“ بالو نے ہچکچاتے ہوئے اس کی بات کاٹ دی۔

”تیری جانے اس سے کتنی باتیں ملاقاتیں ہوئی ہیں مگر تو ابھی بھی نہیں سمجھی۔ اور میں ایک نظر میں اسے جان گئی ہوں۔

اس کا دل برباد ہے۔ جس کا دل برباد ہوا اسے گھر آباد کرنے سے دلچسپی نہیں ہوتی۔ جس کا یہ سودائی ہے اسے تو دیکھ آئی ہے۔

جاگیردار جانے کیسے بچ گئے۔ کیا ششے میں رنگ بھرے تھے قدرت نے اس کا دماغ ایسے ہی خراب نہیں ہے۔ مجبور ہے بے

چارا۔ چل اٹھا اپنے گھر نے چل۔ مجھے تین بجے ایرپورٹ پہنچنا ہے۔“

”بی بی! ایک دفعہ کی کوشش میں کیا حرج ہے۔“ بالو کے لہجے سے یاسیت سننے لگی۔

”بیگم صاحبہ ٹھیک کہہ رہی ہیں بھابی!“ عارف دو کوئلہ ڈرنگس ہاتھوں میں تھا اسے اندر داخل ہوا۔

بالو نے اس کے منہ سے بھابی سن کر وہ اذیت محسوس کی جس کی ششہ وہ الفاظ میں کبھی نہیں کر سکتی تھی۔ گویا اس نے ان کی باتیں سن لی تھیں۔

”ابھی تو مرض میں ذرہ بھر افاقہ نہیں ابھی تو حالت بدستور ہے۔ ابھی تو ہم اپنے قبل بھی نہیں۔

تھکتا جب گزشتہ پر بوجھ بولی ہوئی

پھر اس کے بعد ہی محفل صید خواب

بس ایک خوب سلسل میں رہ رہ نہ گی کٹ رہی ہے اب تو۔ ایک ماں بھی کبھی بھی وہ حقیقت حال میں گھسیٹ لاتی تھی۔ وہ بھی اپنی بہشت میں دلپس ہوئی۔

بالوں نے چونک کر اس کی صورت دیکھی وہ اسے بوتل تھما رہا تھا۔

ماہین اس کی ذہنی اثران بھانپ کر بالوں کی حماقت پر جی بھر کر سر پیٹ لینا چاہتی تھی۔

”کس قدر خوار کرتی ہیں خود کو یہ بسی بسائی لڑکیاں۔ کہاں وہ ایک کلاسیکل ذہن کا مس فٹ انسان۔ کہاں یہ جس کی سمجھ میں اس کی سیدھی بات بھی مشکل سے آئے۔

اپنی ذات پر حکومت کرنے والا سوداء۔ تقاضوں سے ماورا۔

کہاں یہ۔ جسے آسائش بھی چاہے اور خوش شکل اظہار محبت کرنے والا جیون ساتھی بھی۔ اور یہ دونوں حالتوں میں مکمل مایوس کرنے والا۔

اس نے جلدی جلدی دو تین گھونٹ بھرے اور بوتل تپائی پر رکھ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

”چلو بابو! جلدی کرو۔ مجھے دیر ہو رہی ہے۔“ اس کا اتنا بے ساختہ اور قطعی انداز تھا۔ کہ بالو ہڑبڑا کر کھڑی ہو گئی۔

”بہت اچھا ہوا۔ آپ انہیں مل گئیں۔ وہ کویت چلا گیا ہے۔ مگر میں اسے سمجھا سکتا ہوں۔ آپ انہیں سمجھا لیجئے، ابھی کوئی نکھائی پڑھائی نہیں ہوئی ہے۔ میں کیونکہ بے ایمان نہیں ہوں اس لیے میری آواز میں طاقت ہے۔ میں اسے گریبان سے پکڑ کر بھی لاسکتا ہوں۔“

”کیا صورت بہت زیادہ اچھی ہو تب ہی کسی کی محبت ملتی ہے؟“ بالو بھڑائی ہوئی آواز میں کہتے ہوئے چادر ٹھیک کر رہی تھی۔

”یہی سوال لال خان آپ سے کرے تو آپ کیا جواب دیں گی بھابی؟“

عارف نے سوال کیا مگر اس کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔ ماہین نے تو مسلمی نظروں سے عارف کو دیکھا۔ کیا برجستگی تھی۔

”یہ جو ہم کسی پر ایک بار مر مٹ جانے والے لوگ ہوتے ہیں ناں بھابی! بہت پارسا ہوتے ہیں۔ بہت مغرور بنا دیتا ہے ہمیں عشق۔ اپنی دیانت داری پر خود کو شاہاں دیتے رہتے ہیں۔ اس کا پناہ نہ ہے۔ اور لوگوں کو اس گھر میں وحشت و دیرانی محسوس ہوتی ہے۔ کوئی ہم سے پوچھے کیا رونق مگی رہتی ہے دھر۔

کبھی وہ لال کپڑوں میں اس کرسی پر ہوتی ہے۔

کبھی گہرے ہرے لباس میں ادھر باورچی خانے میں۔

میں سو جاتا ہوں اور وہ میرے گھر میں گھومتی ہے۔ میں آنکھیں موندے اس کی چوڑیوں کی چھن چھن سناتا رہتا ہوں۔

صبح آنکھ کھلتی ہے تو وہ پودوں کو پانی دیتے ہوئے بہت خوبصورت گیت گنگنا رہی ہوتی ہے۔

کبھی کبھی وہ روتی بھی بہت ہے۔ آدمی رات کو ایک دم میرے چہرے پر اس کے آنسو گرتے ہیں۔ میری آنکھیں پٹ

سے مکمل جاتی ہیں۔

ایک رات وہ بہت بلک بلک کر رو رہی تھی۔ میں اس کے سامنے دامن پھیلا کر اس طرح بیٹھ گیا جیسے نماز کے وقت بیٹھتے ہیں۔ میرا سارا دامن بھیک گیا۔ اور پھر میں گھٹنوں پریشان رہا کہ کہیں یہ سوکھ نہ جائے۔

بیگم صاحبہ۔ برسوں ہو گئے، کبھی ایسا نہیں ہوا کہ وہ میرے ساتھ نہ ہو۔“

ماہین کی آنکھوں سے بے ساختہ آنسو رواں ہو گئے۔ اس نے جلدی سے چہرہ موڑ کر گلاسز آنکھوں پر چڑھالے۔

”آؤ بالو!“ اس نے ہکا بکا کھڑی بالو کو متوجہ کیا۔ وہ کشاں کشاں حیران پریشان ماہین کے پیچھے چل پڑی۔

”خدا حافظ عارف!“ ماہین نے بھی کسی خواب کی کیفیت میں باہر نکلتے ہوئے کہا تھا۔

”یہ بڑے خاص بڑے نایاب لوگ ہوتے ہیں۔ ان کی زیارت کی جاتی ہے۔ ملاقات نہیں کی جاتی ابھی یہ اور اڑان

بھرے گا۔ اور پھر اپنے اصل کی جانب بہت خالص ہو کر بہت نکھر کر پہنچے گا۔ ان ایمان دار لوگوں کی دنیا میں غل نہیں ہوتے۔“

”یہ کوئی بزرگ تو نہیں ہے۔“ بالو نے غم صم کیفیت سے باہر آ کر قدرے تلخی سے کہا۔

”مٹی بڑی زرخیز ہے۔ تو یہ کہ توفیق ملنے کی دیر ہے۔ یہ راستہ تیری منزل کی طرف نہیں ہوتا۔ چل تو مجھے اپنے گھر کا پتا

بتا۔“

”لے چلو۔ بی بی! گھر۔ میری ہڈیوں کا سرمہ بنادے گی ماں۔“ بالو دل گرفتہ انداز میں گویا ہوئی۔

”کچھ نہیں کہے گی۔ میں جو ساتھ جا رہی ہوں۔ وہ تو اتنی پریشان ہو گی کہ جانے کتنی منٹیں مان کر بیٹھی تیری راہ دیکھتی ہو گی

۔ ماں کی سمجھ اس وقت اچھی طرح آتی ہے جب عورت خود ماں بن جاتی ہے۔ سارے خوف نکال پھینک آگے کی سوچ۔ یہ بتا

لال خان نے تجھے تین طلاقیں دی تھیں یا کاغذ پر کچھ لکھ کر دیا تھا؟“

ماہین خاصی تیز ذرا نیو کر رہی تھی۔

”اس کا اب کیا ذکر؟“ بالو ناگواری سے بولی۔

”اسی کا تو ذکر رہ گیا ہے اب تیری زندگی میں۔ سائے کے پیچھے دوڑ رہی ہے ہوش نہیں ہے۔

جب کسی کے دل میں مطربہ جیسی عورت بس جاتی ہے پھر اس دل میں کوئی اور نہیں بستا۔ وہ تو ہر آن ہر لمحے اس کے ساتھ

جی رہا ہے۔ نہ اس کا گھر خالی ہے نہ دل۔

تیرے ساتھ معاملہ دوسرا ہے۔ تیرے دل پر اب ایک بچہ قبضہ جمائے گا۔ پھر تو جوگ جائے گی۔

اگر یہ بچہ بھی تجھے نہ جگاسکا تو تیرا دل وہ نہیں جو محبت کے لیے خاص ہوتا ہے۔ جب دل خاص نہیں تو ”واردات“ بھی

خاص نہیں۔

پھر وقت اور حالات تجھے خود بخود سب کچھ بھلانے پر مجبور کر دیں گے۔ مگر۔ کاف۔ رن۔ غمی۔ تجھے یاد نہیں رہے گا۔ ہوا

در اصل کچھ یوں ہے کہ طبیعت لال خان سے۔ بیزار تھی۔ بس اس کا رد عمل ہوا ہے۔ قریب تریں عارف ہی تھا۔“

ماہین خود کلامی کے انداز میں گویا ہوئی۔

”جی؟“ بالو ٹھیک سے سن نہیں پائی۔

”کچھ نہیں۔ اب کس طرف جانا ہے اورنگی ٹاؤن تو آ گیا۔“ ماہین نے سر جھٹک کر جیسے خیالات کی یلغار سے جان چھڑاتے ہوئے پوچھا۔

”مین مارکیٹ کی طرف۔ چاند بابو کے ہوٹل کے پیچھے۔“ بالو پتا سمجھانے لگی مگر اس کا انداز بہت دلگرفتہ سا تھا۔

ماہین کی گاڑی گلی میں داخل ہوئی تو کھیل کود میں مگن ڈھیروں بچوں نے گاڑی کو گھیر لیا۔ انہی میں بالو کا بھائی بھی تھا۔ جو بالو کو گاڑی میں دیکھ کر ماں کو خبر دینے دوڑ گیا تھا۔

ماہین نے گاڑی لاک کر کے بچوں کے ”اجتماع“ پر ایک تشویش بھری نظر دوڑائی۔

”یہ گاڑی کو کوئی نقصان تو نہیں پہنچائیں گے۔“ اس نے فکر مندی سے بالو کی طرف دیکھتے ہوئے گلاسز اتار دیے۔

”نہیں بی بی! گاڑی اچھی ہے اس لیے شوق سے دیکھ رہے ہیں۔ آپ فکر نہ کریں! میں اپنے بھائی سے کہہ دوں گی کہ گاڑی کا دھیان رکھے۔“

بالو یکدم بہت متعجب نظر آنے لگی تھی۔ تسکین اور شکست خوردہ سی۔

وہ ماہین سے آگے چلتے ہوئے اپنے گھر کے دروازے پر پہنچ گئی تھی۔ بد رنگ لوہے کے دروازے پر اس نے ہچکچاتے ہوئے ہاتھ رکھا تھا اور دباؤ ڈالتے ہوئے پلٹ کر ماہین کی سمت دیکھا تھا۔

دونوں آگے پیچھے اندر داخل ہوئیں۔ ماں کو اظہارِ مل گئی تھی وہ حیرت سے کم بالو کے بجائے ماہین کی سمت متوجہ تھی سکتے کی سی کیفیت میں۔ ایسے ستانے میں گھر گئی تھی جو گھٹا چھانے کے بعد پہلی بوند پڑنے سے پہلے ہوتا ہے۔

اس کا باپ نظر نہیں آیا دوسرے بہن بھائی ماں کے ارد گرد اس طرح کھڑے ہو کر دونوں کو دیکھ رہے تھے۔ جیسے جیل کی آواز سن کر چوڑے مرغی کے پاس دوڑتے ہوئے پہنچتے ہیں۔

”السلام علیکم لتاں۔“ بالو کی آواز نہایت پست تھی۔

بالو کی ماں آٹا ٹانا گہری نیند سے جاگ گئی۔ اس نے شاید بالو کا سلام سنا نہیں تھا۔ مگر خود اس نے ماہین کو حیرت چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے سلام کیا۔

”کہاں سے لائی ہیں آپ اس منوں کو؟“

وہ ایک کونے سے موڑھا اٹھا کر ماہین کی طرف بڑھی۔ تمام حسیات کے بیدار ہوتے ہی منہی مثبت بھی اجاگر ہونے لگا۔

”ایسے نہ کہیں۔ بگڑی بات کو بتانے ہی سے زندگی میں سہولت آتی ہے۔ آگ پر آگ ڈالنے سے تو آگ بجھتی ہی تیز ہوتی ہے۔ ہو جاتی ہے انسان سے غلطی۔ آپ اس کی ماں ہیں۔“

”نہیں ہوں میں اس کرموں جلی کی ماں۔ ایسے گھر میں بیاہ کر گئی تھی کہ سارے محلے میں ہماری عزت بن گئی تھی۔ ناشکری بد نصیب۔“

بالو کی ماں کی آواز بلند ہونے لگی۔

ماہین موڑھے پر بیٹھنے کے بجائے اس کی ماں کی طرف از خود بڑھی اور اس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔

”یہ میرے پاس آ گئی تھی۔ اور بالکل خیریت رہی۔ اگر اب آپ نے سختی کی تو اس کے سامنے صرف سمندر ہے اس لیے کہ اب یہ میرے پاس بھی نہیں آ سکتی۔ اب یہ اس حال میں ہے کہ سوائے آپ کے کوئی اس کا خیال نہیں رکھ سکتا۔ بیٹی ہے یہ آپ کی۔ لوگ تو غیروں کو معاف کر دیتے ہیں۔ یہ تو آپ کا اپنا خون ہے۔ آپ اس کے تباہ کو عارف کے پاس بھیجئے۔ لال خان کویت چلا گیا ہے۔ عارف خود اسے سمجھائے گا۔ یا تو لال خان خود پاکستان آ جائے گا یا پھر عارف کوشش کر کے اسے لال خان کے پاس بھجوا دے گا۔ مگر اس وقت آپ اس کا خیال کیجئے۔ یہ اپنے شوہر کے بچے کی ماں بننے والی ہے۔“

”بیگم صاحبہ!“ بالو کی ماں نے کچھ بولنے کی کوشش کی۔

”میں خود بھی عارف سے ملوں گی۔ وقت نکال کر۔ اور یہاں بھی آؤں گی۔ اس کا حال احوال معلوم کرنے۔“

”اس سے غلطی ہوئی۔ آپ کو بھی پتا ہے مجھے بھی پتا ہے۔ میں پھر بھی اس کا بھلا چاہتی ہوں۔ کیا آپ نہیں چاہتیں۔ بیٹی ہے یہ آپ کی۔ میرا خیال ہے پندرہ بیس دن باقی ہیں۔“

ماہین نے افلاس سے اٹنے گھر پر ایک نگاہ ڈالی اور پرس کھول کر ہزار کے پانچ نوٹ نکال کر اس کی ماں کے ہاتھ پر رکھ دیے۔

”یہ بالو کے ہیں۔ وقت قریب ہے ضرورت ہوگی۔“

”آپ بیٹھے تو سہی بیگم صاحبہ۔“

تنگدستی کے تھیرنوں سے ہلکان عورت کے چہرے پر یکدم زندگی دوڑنے لگی۔ اس کا انداز ولہجہ یکدم بدل گیا۔ کچھ ماہین کی شائستگی کچھ مالی امداد کا فوری اثر تھا۔

”مجھے جلدی ہے۔ دوسرے شہر جانا ہے۔ کچھ دنوں بعد کراچی آؤں گی تو بالو کی خیریت معلوم کرنے ضرور آؤں گی۔“

اب یہ گھر سے باہر جب بھی جائے گی آپ کے ساتھ جائے گی۔ آپ لوگ لال خان سے رابطہ کرنے کی کوشش کریں۔ اور جتنی جلد ہو سکے کریں۔“

پھر وہ بالو کی طرف ہنسی۔

”دکھنے والے دکھ دینے والوں سے کبھی نہ کبھی یہ ضرور سنا چاہتے ہیں کہ دکھ دینے والے شرمندہ ہیں۔ اپنی غلطی پر شرمسار ہیں۔ اپنی ماں سے معافی مانگو۔ ماں کو دکھ دینے کے بعد جھولیاں خالی ہو جاتی ہیں۔ ہر شے سے برکت اٹھ جاتی ہے۔ بے وقوف مذاق نہیں ہے۔ ماں ہے یہ تیری۔“

ماہین نے بالو کو اس کی ماں کی طرف دھکیلا۔

بالو کی ماں بالو کے بجائے ماہین کے گلے سے لگ کر بڑی طرح رونے لگی۔

”بیگم صاحبہ۔ مجھے نہیں پتا پیٹ بھر روئی کھا کر کیسا لگتا ہے۔ مجھے نہیں پتا۔ بے فکر ہو کر نیا کپڑا کیسے خریدتے ہیں۔ یہ پیسے والے گھر میں گئی تو مجھے یہ لگا کہ میں رنج گئی ہوں۔ کھاتی یہ اور پیٹ میرا بھر جاتا۔ پہنتی یہ اور مست میں ہوتی۔ چھلنی کر دیا ہے اس نے مجھے اندر سے۔“

وہ بلک بلک کر رہی تھی۔ مابین کی آنکھیں بھیگ گئیں۔
وہ اس کی پشت تھپتھا کر تسلی دینے لگی۔

.....
ماہین نے چونکہ۔ تیمور علی خان کو ٹیکس کر دیا تھا اس لیے مطمئن انداز میں سفر تمام ہوا تھا۔ وہ صرف ایک چھوٹا سا سوٹ کیس ہمراہ لائی تھی اس لیے اسے کسی ٹرائی کی ضرورت بھی پیش نہیں آئی۔ وہ سوٹ کیس اٹھا کر باہر آ گئی تھی۔ دروازے سے باہر نکلتے ہوئے اس نے تجسس نظریں رنگتے ہوئے منتظر لوگوں پر دوڑائیں تو عین سامنے تیمور علی خان کو پایا۔ دل میں عجیب سا سکون در آیا۔ وہ قریب آئی تو تیمور علی خان کا سلام آیا۔ وہ مسکرا دی۔
”کیسی ہیں آپ؟“ تیمور علی خان نے سوٹ کیس اس کے ہاتھ سے لے لیا۔
”ٹھیک ہوں۔ بہت خوش ہوں۔“

اس نے تیمور علی خان کے سر آپے پر نظر دوڑاتے ہوئے جواب دیا۔ سیاہ شلوار قمیض آف وہائٹ ویسٹ کوٹ۔ سیاہ چمکدار پشاور چل۔ آنکھوں پر سیاہ گلاسز، گھنی سہا موٹھیں وہ ایک قبائلی سردار کی تصویر نظر آ رہے تھے۔
”فلائٹ ایکوریٹ ٹائم پر آ گئی۔“ انہوں نے اطراف پر نگاہ ڈال کر گھاسڑا تار دیے۔ اور جیب میں انگلیے۔ سورج سرخ ہو چکا تھا۔ اس کا احساس شاید انہیں اب ہوا تھا۔
”گھر کتنی دیر میں پہنچ جائیں گے؟“ ماہین نے ریست واج دیکھتے ہوئے پوچھا اور ان کے پیچھے پیچھے چل پڑی۔ وہ پارکنگ لاٹ کی طرف بڑھ رہے تھے۔

شاندار لینڈ کروزر کا پچھلا دروازہ کھول کر سوٹ کیس کھینچ لیٹ پر رکھ دیا اور اگلا دروازہ کھول کر مابین کو اشارے سے بیٹھنے کے لیے کہا۔

”بس سمجھ گھر پہنچ گئے۔“ وہ ڈرائیونگ سیٹ سنبھالتے ہوئے گویا ہوئے۔

”کوئی مسئلہ تو نہیں ہے نا؟“ مابین نے جانے کس خیال کے تحت پوچھا۔

”ڈونٹ کیئر۔“ وہ گاڑی اسٹارٹ کر کے بڑی مشاقی سے گاڑیوں کے جھوم میں سے باہر لا رہے تھے۔

”انہیں پتا ہے میری آمد کا۔“ مابین نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔

”نہیں۔ ہم نے جان بوجھ کر نہیں بتایا۔“

”کچھ دیر خاموشی چھائی رہی۔“

”بابا صاحب سے ملاقات ہو گئی؟“ بالآخر مابین ہی نہیں پہل کی۔

”جی!“ بڑا مختصر جواب آیا۔

مختصر ترین جواب اس وقت بہت پزل کرتا ہے جب کوئی تفصیلی بات کرنے کے موڈ میں ہوتا ہے۔ تب یوں محسوس ہوتا ہے گویا دوسرا فریق گفتگو کرنے سے باز رکھنا چاہتا ہے۔ کچھ دیر کے لیے وہ خاموش ہو گئی کہ شاید وہ خود ہی کچھ بات کریں۔

”پھر کچھ طے ہوا؟“ اس سے رہا نہ گیا پھر سوال کرتی تھی۔

”نپولین کو وائز لو میں شکست ضرور ہوئی تھی مگر ایک فاتح کی حیثیت سے اس کا نام آج تک نہیں دھندلایا۔ ہمیں اس کا ایک جملہ ہمیشہ سے بہت اٹریکٹ کرتا ہے۔ کہ ”جسے ہارنے کا ڈر ہے وہ ضرور ہارے گا۔“ کیونکہ ہمیں ہارنے کا ڈر نہیں ہے اس لیے ہمیں کوئی اور ڈر بھی نہیں ہے۔ ابھی کچھ پروسیڈ نہیں ہوا ہے۔ مگر سب کچھ اوپن ہو گیا ہے۔ یہ بھی بہت ہے۔“
”مگر آپ کے لیے بہت مشکل وقت ہو گا۔ جب بابا صاحب سے بات کر رہے ہوں گے۔“ مابین نے ان کے خاموش ہوتے ہی پھر سوال کیا۔

”اب تو کوئی مشکل مشکل نہیں رہی۔“ تیمور علی خان کے لبوں پر ایک معنی خیز مسکراہٹ کھیلنے لگی۔

”بہت ناراض ہو رہے ہوں گے بابا صاحب؟“ مابین کا اپنا دل تیز تیز دھڑکنے لگا۔

”بہت ناخلف ہیں ان کے بیٹے۔ یعنی ہم سب۔ بہت تھک گئے ہیں بابا صاحب۔“ تیمور علی خان کی اپنی آواز میں بھی شکستہ در آئی۔

”روٹی چلی گئی ہری پور؟“ معا سے دھیان آیا۔

”جی۔ چلتے چلتے یہ خبر بھی سُنی ہے کہ روٹی کے والد صاحب کی پوسٹنگ ہو رہی ہے۔ ایزاے کشر۔“

ماہین نے چونک کر ان کی سمت دیکھا۔ ”مجھ سے تو انہوں نے اس قسم کی کوئی بات نہیں کی۔ کس شہر میں؟“
”اسلام آباد۔“

”اچھا۔“ اسے عجیب عجیب دسو سے آنے لگے۔ وہ گم صم سی ہو گئی۔

”غالباً ہاٹ آرڈرز ہیں۔ جیسے کہ عموماً ایمر جنسز میں ہوا کرتا ہے۔ آپ پریشان نہ ہوں۔ فون پر بات کر لیجئے گا۔“
کتنی شارپ حیات تھیں تیمور علی خان کی۔ وہ فوراً ہی مابین کی پریشانی سمجھ گئے تھے۔

”نہیں۔ میں سوچ رہی تھی۔ روٹی کو مسئلہ ہو گا۔ نئے گھر کی سیٹنگ آسان کام نہیں ہوتا۔“ اس نے جلدی سے بات بنائی۔

”آپ مجھے یہ بتائیں۔ بابا صاحب نے کس طرح کاری ایکٹ کیا آپ سے۔ گنجائش رکھ کے بات کی ہے یا پریشانی بڑھ گئی ہے۔“

ماہین نے اپنی کیفیت پر قابو پا کر جلدی سے سابقہ موضوع چھیڑ دیا۔

”روٹی کو ہم خیال بنائے بغیر وہ کورٹ میں کیسے جائیں گے۔ اور وہ احتمالاً حد تک ضدی اور جذباتی ہے۔ یہ گیم وہ نہیں کھیل سکیں گے۔ انشاء اللہ آپ کو شاید علم ہو جب آپ پہلی بار بڑی حویلی آئی تھیں اور اسے زبردستی کراچی بھیج دیا گیا تھا تو اس نے سوسائٹی کی کوشش کی تھی۔ اتنی معمولی سی بات پر۔ اس کیس میں تو اس کے سارے انٹرسٹ پلس ہو گئے ہیں۔“

تیمور علی خان نے گاڑی ایک طویل شاہراہ پر ڈال دی۔

”ہوں۔ محسوس تو میں نے بھی کیا تھا کہ روٹی کو کانشسلی مجھ سے دُور رکھا جا رہا ہے۔ سمجھ نہیں پائی تھی میں۔ شاید اس کی

وجہ یہ ہوگی کہ میں نازنجو سے متعلق بہت سارے کراس کو کچن کروں گی۔ کہیں روشی کو کچھ محسوس نہ ہو جائے۔ یعنی میں تو کھر واپس چلی جاؤں اور وہ حویلی والوں کی جان عذاب میں کر دے۔

اگر ایسے ہی خدشات تھے تو یاد علی خان نے مجھے عمر بھر کے لیے اپنے گھر لانے کی کوشش کیوں کی۔ اس طرح تو سب کچھ اوپن ہونے کا خطرہ زیادہ تھا۔

ماہین اُلجھی۔

”جب مرد نکاح کے عوض عورت پر اختیار حاصل کر لیتا ہے۔ تو پھر سارے خطرے عورت کے لیے رہ جاتے ہیں۔ ان کے خطرات کی حدود ہاں تک تھی جہاں تک آپ ان کی دسترس سے دور تھیں۔“ اب“ کر لیں جو کچھ کرنا ہے۔“

تیور علی خان بے ساختگی سے دھیمے انداز میں منس دیے۔

ماہین کے لبوں پر بھی غصت آمیز مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

”اتنا تو خیر میں اندازہ کر سکتی ہوں۔ کہ وہ یاد علی خان کی بیٹی ہے۔ مگر میں تو بابا صاحب کی طرف سے کی جانے والی کسی مزاحمت کی بات کر رہی تھی۔“

”وہ ہمارے کسی بھی کیس میں نہیں ہوئے۔ پتا نہیں ہماری لک ہے یا واقعی وہ ہم سے بہت بلکہ سب سے زیادہ محبت کرتے ہیں۔ انہوں نے صرف ایک بار ہم پر جبر کیا۔ اور پھر اس کے بعد تو انہوں نے مدتوں ہم سے نگاہ نہیں ملائی۔ ہم جانتے ہیں کہ وہ بہت مجبور تھے۔ مگر شاید انہوں نے ابھی تک خود کو معاف نہیں کیا۔

آپ بالکل پریشان نہ ہوں۔ ہم کس لیے ہیں؟“

ماہین کو ان کے اس جملے سے اتنی تقویت محسوس ہوئی کہ باہر کے نظاروں کی خوبصورتی دھیان میں آنے لگی۔

باہر نرک کھڑے تھے۔ سامان لاوا جا رہا تھا۔ روشی تھک کے پڑ رہی تھی۔ ملازم سے چائے کا کہہ کر وہ لاؤنج میں آ بیٹھی۔ اس درجہ بوری تھی کہ مر جانے کو جی چاہتا تھا۔ یاد علی خان اسے صبح سے نظر نہیں آئے تھے۔ ملازموں ہی سے اسے پوسٹنگ اور پیکنگ کی اطلاع ملی تھی۔

اسے ہر قدم پر ماہین یاد آ رہی تھی۔ خالہ ہوتیں تو وہ آرام سے پڑی سوتی رہتی۔ ”انہیں تو یوں بھی گھر کی مصروفیت بہت اچھی لگتی ہے۔ ملازم کی لائی ہوئی مرچیں تک انہیں پسند نہیں آتیں۔ چادر اوڑھ کر خود کر یا نہ اسٹور جا پہنچتی ہیں۔ وہ تو بہت خوش ہوتیں اس اٹھانچ سے۔ ابھی جانا رہ گیا تھا کراچی۔ میں تو کچھ نہیں کروں گی اسلام آباد جا کر۔ بندھا پڑا رہے گا سامان۔ خود کریں گی آ کر۔ وہ کوفت بھرے انداز میں پاؤں کرسی پر رکھے بیٹھی تھی۔ آتے جاتے کسی ملازم نے کسی وجہ سے اسے مخاطب کرنے کی کوشش کی تو اس نے تھوڑا کر ہاتھ ہلا دیا۔

”پتا سے بولو جو بولنا ہے۔“

پھر کسی نے اس سے کلام کرنے کی جرأت ہی نہیں کی۔ ملازم چائے کے ساتھ یاد علی خان کا پیغام بھی لایا تھا کہ اپنے بند

روم میں بلارہے ہیں۔ پیغام سن کر اس کا دل تو دھڑکا تھا مگر بظاہر خشک انداز میں بولی تھی۔

”کہہ دینا چائے پی کر آتی ہوں۔“

جتنی دیر چائے پیتی رہی ادھیڑ بن ہوتی رہی۔ یہ کہیں گے تو وہ کہوں گی۔ وہ کہیں گے تو یہ کہوں گی۔ خالہ آپ نے اچھا نہیں کیا ایسے موسم میں اکیلا چھوڑ گئی ہیں۔ پندرہ بیس منٹ بعد جب اس نے بیڈروم کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ تو تھیلیوں میں پسینہ اُتر آیا تھا۔

”یس!“ اجازت ملتے ہی وہ اندر داخل ہو گئی۔ مخصوص قسم کی خوشبو نے اس کا خیر مقدم کیا۔

”جی پتا۔ آپ نے بلایا؟“ اس نے بندائے۔ سی کی جانب دیکھا یوں محسوس ہوا گویا مٹی کے دن آ گئے ہوں۔

”ہوں۔ کوئی زیادہ لمبی چوڑی بات نہیں ہے۔ یہ کچھ پیپر ہیں ان پر سائن کرنا ہیں۔“

وہ میز کے نزدیک جا کھڑے ہوئے۔ جہاں ایک فائل رکھی تھی۔

”کس چیز کے پیپر ہیں؟“ اس نے گھبرا کر ان کی سمت دیکھا۔

بلیک پیٹ اور آف وہاٹ شرٹ و بلیک ٹائی جس میں لگی قیمتی ٹائی پن کر جگہ گاہٹ کا عکس ان کے چہرے تک پہنچ رہا تھا کے ساتھ وہ نہایت معتدل متوازن مہذب اور اسماٹ نظر آ رہے تھے۔ مگر روشی کو محض ایک بے شناخت سائے کی طرح محسوس ہوئے۔

”پڑھ سکتی ہو۔“ وہ ایک طرف ہو گئے گویا اسے قریب آنے کا عندیہ دیا۔

وہ بھی بے اختیار ٹیبل کے پاس آ گئی بڑی بے تابی اور خوف کی کیفیت میں اس نے فائل کھولی یاد علی خان اپنی ریوالونگ جیسر پر بیٹھ چکے تھے۔

روشی نے فائل کھولی اور یوں بدک کر پیچھے ہٹی گویا پھوٹنے ڈنک مارا ہو۔

”میں اس پر سائن نہیں کر سکتی پتا۔ ہاں اگر آپ کہیں تو میں زہر کھا سکتی ہوں خود کو کوٹ کر سکتی ہوں۔

مجھے یقین نہیں آ رہا کہ میں اپنے باپ کے گھر میں ہوں۔ ایسا لگ رہا ہے کہ اسٹیٹ ڈس پیوٹ میں مجھے کڈنیپ کیا گیا ہے اور گن پوائنٹ پر اپنے مطالبات تسلیم کرائے جا رہے ہوں۔ نہ بڑی بی بی جان ہیں یہاں جو ایک بار مجھے ڈانٹتی ہیں تو بعد میں دس بار میری پیشانی پر کس کرتی ہیں۔ نہ جو ادب بھائی ہیں جن سے میں لڑ بھی لیتی ہوں اور بہت سارے پیسے بھی مانگ لیتی ہوں۔

اگر آپ ہیں سودا ہاٹ؟ زندگی میں کبھی لگا ہی نہیں کہ آپ میرے پتا ہیں۔ آپ حویلی آئے تھے تو بی بی جان کہتی تھیں۔ تمہارے پتا آئے ہیں سلام کر آؤ۔ بس میں آپ کو سلام کر آتی تھی۔ میرے اور آپ کے بیچ صرف ”سلام“ ہے۔ آپ کو احساس دلایا گیا کہ میں خوش ہوں۔ مگر آپ کیوں میری خوشی کا احساس کریں گے۔ آپ کے کوٹ کی اندرونی جیب میں رکھا ہوا جیسے ایک ریوالور ہوں میں۔ ہیکڈ ایمونیشن جسے آپ خود کو ڈیفینڈ کرنے کے لیے جب چاہے استعمال کریں۔“

”شت آپ۔“ پوری قوت کے ساتھ انہوں نے اس کے رخسار پر ٹھانچہ رسید کیا تھا۔ ”جانتا ہوں میں کس کی زبان بول

رہی ہو۔“

روٹی رخسار پر ہاتھ رکھے دم بخود کھڑی ہو گئی۔ ”پپا۔ پپا۔“

”روشانے۔ میں خود کو شوٹ کر لوں گا۔ تمہارے اور کسی اور کے سامنے نہیں کہ مجھے بلیم کیا جائے۔ ایموشنلی بلیک میل کر رہا ہوں۔ تم میری اولاد ہو وہی کرو گی جو میں کہوں گا۔“

”آپ کو یقین ہوگا کہ میں آپ کی اولاد ہوں مگر مجھے یقین نہیں کہ آپ میرے والد ہیں۔ آپ دونوں بھائیوں کی جنگ ہے تو آپ مجھے کیوں استعمال کر رہے ہیں۔ کھل کر ایک دوسرے سے کیوں نہیں لڑتے۔ میں ایک ادھوری ذات ہوں۔ نہ ماں کے معنی جانتی ہوں نہ باپ کے۔ باری بھی مجھ جیسا ہے۔ ہم میں بہت سی باتیں کا من ہیں۔ ہم انڈر اسینڈ کر سکتے ہیں ایک دوسرے کو۔“

جب آپ اٹھارہ سال تک بھلائے رکھتے ہیں کہ آپ کی کوئی بیٹی بھی ہے تو باقی زندگی بھلائے رکھنے میں کیا حرج ہے۔“

اس نے وحشت بھرے انداز میں چھپٹ کر فائل سے کاغذ نوچے اور پرزے پرزے کر دیے۔ اور منہ ہاتھوں سے ڈھانپ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

”پپا۔ میری آپ سے کوئی جنگ نہیں ہے۔ مجھے صرف ایک بار خوش ہو لینے دیں۔ پپا مجھے فیوڈل سسٹم کا پارٹ نہیں بننا۔ مجھے اپنے کشنر باپ پر فخر نہیں کرنا۔ مجھے تو بس خوشی کا اعتبار چاہیے۔ آپ یہ سب نہ کریں۔ میں آپ سے پراس کرتی ہوں کہ میں دونوں حویلیوں میں زندگی بھر قدم نہیں رکھوں گی۔“

کیا ہوا تھا آپ کے ساتھ کہ آپ کے سینے میں دل نہیں رہا۔ آپ مجھے ہی نہیں سب کو ایک مہمان جیسے کیوں محسوس ہوتے ہیں؟ آپ اپنے کیوں نہیں لگتے؟“

یاور علی خان پشت پر ہاتھ باندھے ہوئے اپنے ہونٹ چبار ہے تھے جیسے ان کی سمجھ جواب دے گئی ہو۔ روٹی بے ساختہ ان کے سینے سے لگ گئی تھی۔ اور بڑی طرح زور ہی تھی۔

”پپا۔ پلیز پپا۔ یقین کریں مجھے کسی نے استعمال نہیں کیا پریشاں نہیں کیا۔ اگر آپ کہیں گے تو میں زندگی بھر کسی سے نہیں ملوں گی۔ جب ماں باپ کے بغیر رہ سکتی ہوں تو ہر رشتے کے بغیر رہ سکتی ہوں۔ کا کا جان سے بھی نہیں ملوں گی کبھی۔ پپا کسی طرح سے تو مجھے یقین دلائیں کہ میں آپ کی بیٹی ہوں۔“

اس کے آنسو یاور علی خان کا گریبان بھگور رہے تھے۔

اس کا ایک جملہ ان کی ہستی تھیں نہس کر رہا تھا۔

”کیا ہوا تھا آپ کے ساتھ کہ آپ کے سینے میں دل نہیں رہا؟“

وہ ان کی بیٹی تھی۔ طمانچہ کھا کر انہی کے سینے سے لگی رو رہی تھی۔

”روشانے! تم نے غلط جگہ کٹ منٹ کی ہے۔“ بالآخر انہوں نے آہستگی سے اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔ ان کی

آنکھوں کی سُرخمی گہری ہونے لگی۔

”ٹھیک ہے۔ لیکن۔ آج کے بعد نہ تم بڑی حویلی جاؤ گی نہ چھوٹی حویلی۔ وہ یہیں آئے گا۔ ہمارے ساتھ رہے گا۔ اور جب تمہارے شایان شان ریزیڈنسی کا بندوبست کرنے میں کامیاب ہو جائے گا تو تمہیں اس کے ساتھ جانے کی اجازت ہوگی۔ لیکن دونوں حویلیوں سے رابطہ وہ بھی نہیں رکھے گا۔ اسے میری بیٹی کی وجہ سے اونچی مسند ملی ہے۔ اسے صرف مجھ سے تعلق رکھنا ہوگا۔ اگر اس کے قبیلے والے اس کی سرداری کا حق تسلیم کریں اور سردار بنانا چاہیں تو تمہیں میرا گھر چھوڑنے کی اجازت ہوگی۔ تم اس کے ساتھ اس کے قبیلے جاسکتی ہو مگر دریا بستی یا سرائے نہیں۔“

جانے کون کون سی مصلحتیں انہیں کس کس پیش بندی پر مجبور کر رہی تھیں۔

روٹی ایک دم ان سے دُور ہٹ کر بے یقینی سے دیکھنے لگی۔ جیسے سماعت کا دھوکا ہوا ہو۔ وہ کچھ کہہ رہے ہوں۔ وہ کچھ اور

سمجھ رہی ہو۔

”میرا خیال ہے مجھے کبھی اپنی بات دُہرانے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ اب تم جاسکتی ہو۔ بی ایزی۔ بی پیپی۔“ وہ چیئر پر دوبارہ بیٹھ گئے۔ اور کاغذ کے ٹکڑے سینٹے لگے۔ روٹی کو یوں محسوس ہوا کہ اس نے باپ کے ساتھ بہت زیادتی کی ہے۔ ایک ٹخن ایک شکستگی اُن کے چہرے سے آشکار تھی۔

وہ حویلی میں داخل ہوئے تو باری کو منتظر پایا۔

وہ ماہین کو سامنے پا کر بہت خوش دلی سے مسکرایا۔

”السلام علیکم۔ بہادر خواتین بہت اٹریکٹو ہوتی ہیں۔ مگر میڈل دینے کی پوزیشن نہیں ہے۔“ وہ کہہ رہا تھا۔

”یہ ہمیں بتانے کی بات نہیں ہے۔ جب میڈل دینے کی پوزیشن میں آؤ تو پہلے اُدھر میڈل دینا۔ واہ صاحب کیا ٹھاٹھ

ہیں۔“

ماہین اندر کی اکھاڑ بچھاڑ کے برعکس خود کو بہت فریش ظاہر کر رہی تھی۔ اس کی نظریں سامنے بالکونیوں پر یوں پڑ رہی

تھیں گویا وہ کسی بالکنی میں کھڑی اس کو نظر آ جائے گی۔

”اللہ کا شکر ہے جی۔ کرم ہے اس مالک کا۔“ اسی لمحے تیمور علی خان اس کے قریب آ گئے۔ ”ہمیں علم ہے پارٹنر سے ٹھیک

ٹھاک فرینڈ شپ ہے۔ سونائس۔ ٹھیک ہو پارٹنر۔ خیریت رہی۔“ وہ باری کی سمت متوجہ ہوئے۔

”جی۔ بالکل خیریت رہی۔“ وہ چاہتے ہوئے بھی ان سے ”خیریت“ نہ پوچھ سکا۔

”اب ایسا ہے کہ اس وقت بڑا موشنلی پیریڈ ہے۔ ہم اسٹڈی میں جاتے ہیں تم انہیں اپنی ”بھابی“ کا ٹھکانا دکھاؤ۔ آپ

چلیں کچھ دیر بعد آپ سے ملاقات ہوگی۔“

”بھابی؟“ وہ حیران ہو کر تیمور علی خان کی سمت دیکھنے لگی۔

”بھئی یہ ”انہیں“ بھابی کہتے ہیں۔ بہت کوشش کی مگر کچھ بات بنی نہیں۔“

”بہت خوب۔ اب یہ ساس کو بھائی کہا کریں گے۔“

ماہین باری کے پیچھے پیچھے چل پڑی۔ دل کی جو کیفیت تھی وہ خود بھی نہیں سمجھ پارہی تھی۔ سارے وجود پر ایک لرزش سی تھی۔ جانے وہ کس طرح ملیں گئی جہاں باری کے قدم ٹھہرے تھے۔ باری نے منقش سیاہ آنسو چمکتے ہوئے دروازے پر ہلکی سی دستک دی اور خود اشارے سے اسے اندر جانے کا کہہ کر واپس پلٹ گیا۔

ماہین نے دھڑکتے دل کے ساتھ دروازے کا ہینڈل گھمایا اور سر آگے کر کے بہت احتیاط سے اندر جھانکا۔ جسم و جان کو معطر کرنے والی ایک دل پذیر خوشبو نے اس کا سواگت کیا۔

دستک سن کر نازنین دروازے ہی کی سمت متوجہ تھی۔ ماہین کو دیکھ کر ایک دم بجلی کی سی تیزی سے بیڈ سے اتر آئی۔ ماہین اندر داخل ہو چکی تھی۔

”السلام علیکم!“ ماہین نے بانہیں پھیلا دیں۔

کھلتے ہوئے زرد رنگ کے لباس میں لمبوس اپنی دراز بھیگی ہوئی زلفوں کے ساتھ ماہین کو اس حیرت میں مبتلا کر رہی تھی۔ جو غیر معمولی حسن کے نفاذ کے لیے مخصوص ہوتی ہے۔ اس کا ہاتھ سینے پر رکھا ہوا تھا۔ وہ اپنی جگہ پتھر کر رہ گئی تھی۔ ماہین کی گھلی بانہوں کی جانب اس کی توجہ نہیں تھی۔

ماہین مزید آگے بڑھی اور خود نازنین کو گلے سے لگا لیا۔

”آپ اگر کسی پتھر سے ڈھلی ہیں تو کیا ہوا۔ ہم پتھر سے نہیں ڈھلے۔ کبھی کسی لمحے دھیان بھی نہیں آیا ہوگا کہ کسی باپ کی زندگی اولاد کی جواں مرگی کی اطلاع پا کر کس کرب مسلسل سے گزرتی ہے۔ ایسا چاند جیسا روپ کسی کو سوچتے ہوئے وہ جس اذیت سے گزر رہے ہوں گے۔“ وہ بہت تھا ان کے لیے۔ کتنی بے رحم ہیں۔ بچو آپ؟“ ماہین کے سارے بند ٹوٹ گئے تھے۔

نازنین نے لفظ بچو پر عجیب سی دھڑکن کا ترانہ سنا۔ شاہین اور جبین اسے بچو کہا کرتی تھیں۔ اس نے تو اپنے ہوش میں مجھے دیکھا تک نہیں۔

اس نے بہت محبت سے ماہین کے گرد اپنے بازو کا حلقہ مضبوط کیا۔ اس کی پیشانی پر بوسہ دیا۔

”بس کرو ماہین۔ میری جان! یقین کرو روز اتنے ویک ہو گئے ہیں۔ کہ زندہ انسانوں کی طرح کوشش کے باوجودری ایکٹ نہیں کر پاتی۔“

نازنین کی سانس دھونکی کی طرح چلنے لگی۔ پسینے سے اس کا چہرہ ابھگ گیا۔

ماہین ایک دم گھبرا گئی۔ اور جلدی سے اپنی آنکھیں پونچھ ڈالیں۔ اور اسے تمام کر بیڈ تک لائی اور آہستگی سے لٹا دیا۔ اور سر ہانے رکھے جگ سے پانی گلاس میں انڈیلا اور اس کا سرواںچا کر کے لبوں سے لگا دیا۔ نازنین ایک سانس میں پی گئی اور تکیے پر سر رکھ کر آنکھیں موند لیں۔

ماہین نے اپنے آنچل سے اس کے چہرے کا پسینہ پونچھا۔

”آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے بچو؟“ وہ اس کا ہاتھ تمام کر بہت فکر مندی سے پوچھ رہی تھی۔

”ہاں۔ بس ایسی ہی رہتی ہے۔“ وہ نحیف سی آواز میں کہہ رہی تھی۔

”ماہین۔ بہت دنوں تک اندر گھسنا کارن رہا۔ تمہارا شادی کی خبر تو جیسے ہمیں لے ہی ڈوبی۔ مگر پھر آہستہ آہستہ قدرت کی حکمت سمجھ میں آنے لگی۔ میرے بچوں کو تم سے بہت تقویت رہے گی۔ سب سے بڑھ کر تم انہیں سمجھا سکو گی۔ انہیں قائل کر لو گی کہ ان کی ماں ہرگز بڑی عورت نہیں تھی۔ جب وہ بچپور ہو جائیں گے اور حقیقت ان کے سامنے آئے گی جو کہ ایک دن آئے گی ضرور۔ تو تم مجھے مکمل ڈیفینڈ کر سکو گی۔ یقین کرو اب میرے اندر کوئی جنگ نہیں ہے۔ بہت بڑے سکون ہوں میں۔ دیکھو اب کچھ ہو جائے حویلی سے تانا توڑنا۔ ورنہ میرے بچوں کے سر ہمیشہ کے لیے ٹھک جائیں گے۔ ہو سکتا ہے وہ شخص تمہارے حق میں بُرا نہ ہو۔ ضروری تو نہیں کہ ایک ماں کی کوکھ سے جنم لینے والے بچوں کی قسمت بھی ایک جیسی ہو۔ کیوں۔ تمہارا کیا خیال ہے؟

دو بچے بڑی حویلی میں ہیں اور دو ادھر ہیں۔ اور میری امانت ہیں تمہارے پاس۔“

وہ بولتے بولتے خاموش ہو گئی اور آنکھیں موند لیں۔

”کیسی باتیں کر رہی ہیں آپ۔ خدا نہ کرے کہ آپ کو کچھ ہو۔“ ماہین بہت پریشان ہو گئی۔

”جو ہونا تھا ہو چکا۔ تیمور علاج کے لیے ہمیں نیویارک لے کر تو جا رہے ہیں اور ہم پہلی بار ان کا دل رکھ رہے ہیں کہ وہ بھی کیا یاد کریں گے۔“ نازنین کے لبوں پر پھینکی سی مسکراہٹ نظر آئی۔

ماہین تو جیسے سب کچھ بھول گئی۔ حواس باختہ سی ہو کر نازنین کی صورت دیکھنے لگی۔

”آپ کو کیا ہوا ہے۔ بچو؟“

”کاش یہ ضوفشاں کی پیدائش سے پہلے ہو جاتا۔“ نازنین کی آنکھیں ہنوز بند تھیں۔

اسی دم دروازے پر دستک ہوئی اور ساتھ ہی مکھل گیا۔ تیمور علی خان اندر داخل ہوئے۔ وہ بہت محتاط انداز میں داخل ہوئے تھے مگر کمرے کی صورت حال بھانپ کر تیزی سے آگے بڑھے۔

”کیا ہوا۔ مائی گڈنئس۔ آئی ایم سوری۔ ہمیں بالکل دھیان نہیں رہا کہ آپ کو کسی قسم کا سر پر اثر نہیں دینا چاہیے۔“ وہ اسٹول کھیٹ کر نازنین کے قریب بیٹھ گئے اور اس کی گلایا تمام کر نبض چیک کی۔ پیشانی چھو کر دیکھی۔

”یہ کہتے ہیں کہ مجھے کوئی خطرناک بیماری نہیں۔ اور ہائی پوٹینسیز کی دوائیں کھلاتے ہیں۔ میں اندر سے دیمک۔ کھائی کڑی کی طرح کھوکھلی ہو چکی ہوں۔ کیا مجھے اندازہ نہیں کہ ہر صبح زندگی سے کتنی دُور جا پہنچتی ہوں۔ یعنی حد ہو گئی۔“

وہ تیمور علی خان کے چہرے پر نظر ڈال کر دھیرے سے ہنس پڑی۔

ماہین نے تشویش بھری نظروں سے تیمور علی خان کی طرف دیکھا۔ وہ نظر چراگئے اور ماہین کا دل بیٹھنے لگا۔

”بات سنیں۔ کیوں پریشان ہوتے ہیں دُنیا میں بہت سارے لوگ ایسے بھی ہیں کہ ان کی دل پسند بیویاں انہیں بہ نقصان پہنچا دیتی ہیں اور وہ زندہ رہتے ہیں۔ ہمارے پاپا کی مثال سامنے ہے۔ کیوں ماہین! اور ہم پر تو دل پسند ہونے

کا بھی الزام نہیں۔ آپ کے احسانات نے اس قدر زیر بار کیا ہوا ہے کہ بتائیں سکتے۔

ماہین! میری جان دل کا کھلنا کائنات کی سب سے بڑی سرمستی ہے۔ میری بیٹی کا دل بکھنا نہیں چاہیے۔ اس میں Will تو ہے مگر ہے تو بچی۔ اس کا دل کھل گیا۔ ناں تو سمجھ میں کامیاب ہو گئی۔ کتنی پیاری ہے میری بیٹی۔ اس کے دل میں میری تصویر اس طرح سجانا کہ جب اسے میرا دھیان آئے تو وہ دل سے میری بخشش کی دعا کرے۔ جو اذیتوں میں نے دیکھا ہی نہیں۔ اپنے باپ اور چچاؤں ہی پر ہوگا۔ چھوٹا سا تھا تو سب کہتے تھے بابا صاحب جیسا ہے۔ میرا بیٹا۔ ماہین۔ میں نے سنا ہے وہ اپنی عمر سے زیادہ سنجیدہ ہے۔ بہت کم گو ہے۔

جوانی وہ ہے جو پوری بہادر دیکھے کبھی سرنگوں نہ ہو۔ پارسا ماں کا جوان بیٹا تو اصل میں جوان ہوتا ہے اسے بتا دینا اللہ کی قسم میں بے گناہ ہوں۔“

نازنین تڑپ تڑپ کر رونے لگی۔

”مائی گاڈ!“ تیمور علی خان مری طرح سے پریشان ہو گئے۔

”نہی! اس طرح نہ کریں۔ آپ کو تیمور خاناں پر رحم نہیں آتا؟“ ماہین کی آواز بھر اگئی۔

”ارے۔ ہمارا بس چلے تو چوک پران کا جتسمہ نصب کرادیں۔ بہت دکھ دیے ہیں انہیں ہم نے۔“ وہ اپنے آنسو پونچھنے لگی۔

”آپ انہیں سنبھالیے۔ ہم ڈاکٹر کو فون کرتے ہیں۔“ تیمور علی خان فون کی طرف بڑھے تو فون کی بیل بج اٹھی۔ تیمور علی خان نے ریسپورڈ اٹھایا۔

”ہیلو“

”السلام علیکم۔ جی ہم ہی ہیں۔“

”جی۔ ابھی آیا تھا؟“

”جی۔ جی اور کچھ نہیں کہا؟“

”جی ہم سمجھ گئے۔ ٹھیک ہے۔ خدا حافظ۔“

انہوں نے ریسپورڈ رکھ دیا۔ اور پلٹ کر ماہین کی سمت دیکھا۔

”بابا صاحب کا فون تھا۔“ ان کے انداز میں عجیب سی ہچکچاہٹ تھی۔ ماہین تو ان کے انداز ہی سے کچھ محسوس کر چکی تھی۔

”ہری پور سے فون آیا ہے بابا صاحب کے پاس۔ کہ باری سے کہیں وہ کراچی سے آپ کو لے کر اسلام آباد پہنچ جائے۔“

”مجھے۔ باری۔“ وہ حیرت سے اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی۔ پھر قدرے جھل ہو کر نازنین کی سمت دیکھا اور دوبارہ بیٹھ گئی۔

تیمور علی خان نے اشارے سے اسے خاموش رہنے کی تاکید کی۔ اور مڑ کر فون ڈائل کرنے لگے۔

نازنین نے ماہین کا چہرہ دیکھا اور مسکرا دی۔

”میں سب جانتی ہوں۔ سب سمجھتی ہوں۔ جب آپ سب میرا خیال کرتے ہیں تو میں اپنے آپ سے پوچھتی ہوں کیا میں اس قابل ہوں کہ میرا خیال رکھا جائے۔ یہ شخص بہت بلند بہت عظیم ہے۔ ماہین! ان کی بہت عزت کرنا۔ انہوں نے تمہاری بہن کو سائبان دیا۔ عزت دی۔ اور ایک بہت پیاری گڑیا سی بیٹی ہے ہماری۔ مجھے امکان اچھا نظر آیا ہے کہ صرف تمہیں نہیں باری کو بھی بلایا ہے۔ بہت سمجھدار ہے باری۔ وہ مجھے ہمیشہ سے اچھا لگتا ہے۔

اگر میں نیویارک چلی جاؤں تو دلہن بنی روشی کی تصویریں ضرور بھیجنا۔“

نازنین کی طبیعت ایک دم سنبھلتی محسوس ہوئی۔

”چپ کیوں ہو ماہین؟“ نازنین کے انداز میں بلا کی اہنایت تھی۔

”کچھ نہیں بچو۔ بہت کچھ سوچ کر آئی تھی کہ آپ سے یہ کہوں گی وہ کہوں گی۔ مگر۔“ اس نے دکھ سے نازنین کی طرف

دیکھا۔

”مجھے علم ہے تم کیا کہنا چاہتی ہو۔ ظلم کے جواب میں ظلم کیا ہے۔ مگر انجام کو بھی تو پہنچ گئے ہیں۔ بیس سال زندہ دوزخ میں جلنے کے لیے کم تو نہیں ہیں۔“ وہ بہت کرب سے بولی۔

”سچ ہے بچو۔ ہم تو خالی ہو گئے ہیں۔ کچھ کہنے کو رہا ہی نہیں۔“ ماہین نے بہت دکھ سے کہا۔

”ہمیں تو یہ آہستہ خرابی سے واپسی کا سفر بہت پسند آ رہا ہے۔ مگر یہ۔“ اس نے گردن گھا کر تیمور علی خان کی جانب دیکھا اور خاموش ہو گئی۔

”ہاں بس۔ آپ تو بس ہمیشہ اپنے لیے ہی سوچیں گی۔“ ماہین کہنے بنا رہ نہ سکی۔ نازنین نے ایک گہری نگاہ اس کے چہرے پر ڈالی۔

”سہارا ہوا سننے میں اور سننے میں بہت فرق ہے ماہین! لطف یہ ہے کہ نہ سننے والے غلط ہیں اور نہ سننے والے۔ اپنے اپنے مورچوں پر اپنے حساب سے جنگ جاری ہے۔ مجھے اب کسی بات کی پروا نہیں۔ صرف یہی خواہش ہے کہ میرے بچے جب بھی یہ داستان سنیں تو انہیں یہ یقین رہے کہ ان کی ماں غلط عورت نہیں تھی۔“

تیمور علی خان دوبارہ ان کی جانب آ چکے تھے۔ اور فکر مندی سے نازنین کی جانب دیکھ رہے تھے ان کے انداز میں اہنایت کا جو واضح تاثر تھا وہ ماہین کو بہت اچھا لگ رہا تھا۔ ان کی کشادہ چمکدار سیاہ بھونرے جیسی آنکھوں میں جو تشویش تھی وہ ان کی ذات کو بہت معتبر بنا رہی تھی۔

”آپ باتیں کریں۔ ہم ابھی آتے ہیں۔“ وہ کچھ دیر کی خاموشی کے بعد گویا ہوئے اور باہر چلے گئے۔

”نہی! حقیقت یہ ہے کہ تیمور علی خان شاید بنے ہی آپ کے لیے تھے۔ آپ تو دیکھنے کی ”چیز“ ہیں۔ اور بیس سال سے

بس وہی آپ کو دیکھ رہے ہیں۔“

ماہین نے ماحول کی اداس کیفیت مٹانے کی کوشش میں ہلکی پھلکی بات کی۔

”اچھا۔“ نازنین اداسی سے ہنس پڑی۔ ”پتا نہیں انہوں نے کبھی ہمیں دیکھا بھی ہے یا ہمیں کسی دوسرے کے عکس میں

قید کر کے دیکھتے رہے ہیں۔ مگر یقین کرو مایہن۔ ہم نے انہیں آج تک نظر بھر کر نہیں دیکھا۔ شرمندگی سے نظریں نہیں اٹھتیں ان کے روبرو۔ کوئی ایک قرض ہو۔ ہمارے ذمے ان کا تو کہیں۔“

اس نے پھر نقاہت بھرے انداز میں آنکھیں موند لیں۔

”مایہن۔ روشی کے پتا کو ابھی بھی نہیں دینا کہ تم سب احوال سے واقف ہو چکی ہو۔ کہیں وہ جواز از در جواز کا سلسلہ شروع نہ کر دیں اور کچھ ہونہ جائے۔ مجھے تمہاری موجودگی کا یقین چاہیے۔ تم مجھے خود غرض کہہ سکتی ہو۔ مجھے ہر قیمت پر تمہاری موجودگی چاہیے۔ اپنے لیے بھی اپنے بچوں کے لیے بھی۔ حالانکہ غلط ہوا تھا مگر اب صحیح ہو گیا ہے۔ پلیز مایہن۔ ہر قسم کی جذباتیت سے پرہیز کرنا۔ سمجھ رہی ہوں میری بات؟“

”جی ہن۔ بس اب تو ویلفیر شپ کا ٹوکن ہے ہمارے پاس۔ فی الحال تو زندگی کا مقصد یہی ہے۔“ وہ اداسی سے مسکرائی۔

”کسی مطربہ کی آمد سے پہلے وہ شخص بہت اچھا تھا۔ خدا نخواستہ تمہاری راہ میں کوئی مطربہ کوئی زیتون بانو نہیں ہے۔ تم اسے اپنے حق میں اچھا کر سکتی ہو۔ راستے ہی میں بدل نہ ہو جانا۔ اللہ سے دعا ہے وہ شخص تمہیں نہال کر دے۔“

نازنین کی آواز بھڑائی۔

مایہن نے بے اختیار اس کے ہاتھ تھام لیے۔ اس کا ہنسا دل بھرا آیا تھا۔

وہ باری کے ساتھ وہیں سے اسلام آباد روانہ ہو گئی۔ فون پڑاؤ ریس وغیرہ لے لیا تھا۔ انہیں اپنی آمد کی اطلاع اس لیے نہیں دی تھی کہ اگر وہ خود لینے آ گئے تو پتا چل جائے گا کہ وہ پشاور سے آرہی ہے۔ اور پھر وضاحت دروضاحت کا سلسلہ شروع ہو جائے گا۔

یوں بھی حواس پر عجیب سی تھکن طاری ہو رہی تھی۔ تیور علی خان نے اسے بتایا تھا کہ نازنین معدے کے کینسر میں مبتلا ہے۔ اور انتہائی اسٹیج پر ہے۔ السر کی شکایت تھی جو بگڑ کر کینسر میں تبدیل ہو گئی ہے۔

بس اتنی ذرا سی دیر کی بات تھی۔ ہمارے اور ان کے بچ۔ کیا خواب سارشتہ رہا ہے۔ یقین نہیں آتا۔ تصویروں میں جو دیکھا تھا وہ کچھ بھی نہیں تھا۔ کیسی حسین تصویر، کیسی سنگین تقدیر۔

”باری!“ اس نے باری کی سمت دیکھا۔ جو اپنی الجھن کو اخبار میں مدغم کرنے کی کوشش میں مصروف تھا۔

”تم کب سے اس اسرار اس راز میں شریک ہو؟“ اس نے باری کی سوالیہ نظروں کے جواب میں سوال کیا۔

”شروع سے۔ پہلی مرتبہ بڑے خان کے ساتھ بھابی سے ملے سرائے آیا تھا۔ پھر جب تک لٹاں جی زندہ رہیں ان کے ساتھ آکر رہا کرتا تھا۔ لٹاں جی بھابی سے بہت پیار کرتی تھیں۔“ وہ افسردگی سے کہہ رہا تھا۔

”جب میں چھوٹا تھا تو بھابی مجھ سے روشی اور جواد کی باتیں کیا کرتی تھیں۔ کہتی تھیں روشی کا خیال رکھا کرو۔“

”تم نے کہا ہو گا آپ فکر نہ کریں۔ میرا ہمیشہ کے لیے خیال رکھنے کا پروگرام ہے۔“ مایہن نے برجستگی سے کھڑا لگایا۔

باری جھینپ کر مسکرا دیا۔

”تم اتنے چھوٹے تھے۔ بڑی حویلی میں باتیں پہنچا سکتے تھے۔ اتنا اعتبار کیسے کر لیا تمہارا ان سب نے؟“ مایہن کو حیرت ہوئی۔

”جب بڑے خان مجھے پہلی بار سرائے لے کر گئے تو انہوں نے مجھ سے کہا تھا۔ باری تم اچھے ہو اس لیے ہمیں پسند ہو۔ ہم نے تمہارا کمر اسجایا ہے۔ تمہیں اپنے گھوڑے دے دیے ہیں۔ لیکن اگر تم نے بڑی حویلی کے بچوں کو سرائے کی کہانیاں سنائیں تو ہم تم سے سب کچھ واپس لے لیں گے۔ اور تمہیں ہاسٹل بھجوا دیں گے۔ وہاں گھوڑے نہیں ہوتے۔“

پھر جیسے جیسے بڑا ہوتا گیا تو تنبیہ اور تاکید کے انداز بھی بدلتے گئے۔ اور بات سمجھ میں آتی گئی تو تنبیہ و تاکید کی ضرورت ہی نہیں رہی۔ شاید آپ کو یقین نہ آئے بڑے خان نے سب کچھ مجھے خود بتایا ہے۔ ان کی آنکھوں میں آج تک کسی نے آنسو نہیں دیکھے۔ مگر میں نے ان کی بھیگی آنکھیں کئی بار دیکھی ہیں۔ مطربہ کے لیے انہوں نے مجھے مخصوص کیا تھا۔ اس سے پہلے مامائی اس کی دیکھ بھال کرتی تھی۔ حویلی میں اور کسی کو اس طرف جانے کی اجازت نہیں تھی۔“

”تم سے مطربہ نے کبھی تمہارے باپ کے متعلق بات کی؟“ مایہن نے اچانک پوچھ لیا۔

باری ایک دم خاموش ہو گیا۔ اور اخبار رول کرنے لگا۔

”آپ کو اندازہ ہے کہ یاد خانوں نے کس موڈ میں ہمیں اسلام آباد بلایا ہو گا؟“ اس نے بہت خوبصورتی سے موضوع ہی بدل دیا۔

مایہن نے گہری سانس کھینچی۔ اور آنکھیں بند کر لیں۔ ”ہمیں بھی چلاتے ہو باری؟ خیر مرضی ہے تمہاری۔“

سوچ تو میں بھی رہی ہوں کہ مجھے تو جب چاہے کال کر سکتے ہیں۔ مگر ساتھ میں تمہیں طلب کیا ہے اللہ خیر کرے۔ روشی بالکل اکیلی ہے۔ نہ جانے کی مسئلہ ہے؟ تمہیں کوئی پریشانی تو نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے وہ اپنی مرضی کا فیصلہ تم سے کرانا چاہیں۔ اس طرف بھی سوچا۔“ مایہن نے توجہ دلائی۔

”جی سوچا ہے۔ لیکن جو طے ہے اسے تو کوئی بھی نہیں بدل سکتا۔ آپ میری طرف سے اطمینان رکھیں۔ اگر بات کسی طرح نہ بنی تو میں روشا نے کو لے کر اپنے قبیلے میں واپس چلا جاؤں گا۔“ وہ کن اکھوں سے مایہن کی سمت دیکھ کر بڑے شریر لہجے میں گویا ہوا۔

”ہوں۔ یعنی ہمارے سامنے ہماری لڑکی کو اڑانے کی بات۔“ وہ مصنوعی خفگی سے گویا ہوئی۔

باری ہنس دیا۔ ”جب فیس کرنا ہے تو پھر پہلے سے خود کو کیا الجھا ہوا۔“ وہ سنجیدہ ہو گیا۔

”ہوں۔“ مایہن گہری سوچ میں ڈوب گئی۔

”تو بہ خال! میں تو شل ہو گئی۔ سرف سامان کو دیکھ دیکھ کر۔ پتا نہیں لوگ کس طرح اتنے بڑے بڑے گھر آٹا فانا سیٹ کر لیتے ہیں۔ میں نے تو کبہ دیا تھا ملازموں سے مجھے مفت میں پریشان کرنے کی ضرورت نہیں گھر کی مالکن آئیں گی تو انہی کا سر کھاتا۔“

روٹی ماہین کے گلے میں بائیس ڈالے لاپرواہی سے اپنی کہے جارہی تھی۔

”گھر داری کا شوق نہیں۔ بس گربسانے کا شوق ہے۔ تمہارے بچوں کو تو بارہ مہینے نزلہ و زکام رہا کرے گا۔ گرمیوں میں پانی کے ٹب میں کھیلنے رہیں گے۔ لٹاں جان پڑی سو رہی ہوں گی۔ سردیوں میں گرم کپڑے اتار کر گھومیں گے۔ تو والدہ کو ہوش نہیں ہوگا۔

بتاؤ۔ میرے انتظار میں سارا کام پھیلا رکھا ہے۔“ اس نے ہنس کر روٹی کے چیت رسید کی۔

”لیکن خالہ! گھر میں میرے علاوہ دوسرے لوگ بھی تو ہوں گے جو بچوں کا خیال رکھیں گے۔ کم از کم ناک تو پونچھ ہی دیا کریں گے۔“ وہ کھلکھلائی۔

باری اچانک دونوں ہاتھوں میں سونٹ کیس اٹھائے ان کے قریب سے گزر کر آگے بڑھ گیا۔

”اوہ۔ آپ کے ساتھ؟“ روٹی بڑی طرح گڑبڑا کر ماہین کی سمت دیکھ رہی تھی۔

”جی میرے ساتھ۔“ ماہین نے مسکراہٹ ضبط کی۔

”پتہ پتہ کہا تھا یا خود۔ آپ۔“ روٹی کی حالت ہی بدل چکی تھی۔ خوشی بھی تھی اور الجھن بھی۔

”مجھے یقین ہے پتہ پتہ بلایا ہے۔ فیصلہ ہو گیا ہے خالہ!“ روٹی اسے لے کر لاؤنج کی طرف بڑھی۔

”کیسا فیصلہ؟“ ماہین کچھ سمجھی نہیں۔

”پتہ پتہ کہا ہے۔ باری ہمارے ساتھ رہے گا۔ نہ سرائے جائے گا نہ دریا بستی۔ اگر چاہے تو اپنے دادا کے پاس جاسکتا ہے اپنا حق مانگنے۔“

وہ تفصیل سے اپنے اور یاور علی خان کے ماہین ہونے والی گفتگو ماہین کے سامنے دہرانے لگی۔

ماہین بہت توجہ سے سن رہی تھی۔

”اور اگر باری نے اس پابندی کو اپنی انا کا مسئلہ بنا لیا؟“ ماہین نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے فکر مندی سے روشانی کا چہرہ دیکھا۔

”تو خالہ! آپ سمجھانا۔ ناں۔“ روٹی ایک دم پریشان سی نظر آئی۔

”بعض اوقات مرد بہت سمجھدار ہوتا ہے۔ مگر پھر بھی سمجھ کے بجائے موڈ سے کام لیتا ہے۔“ ماہین سوچتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

”تمہارے پتہ۔ ابھی تک نہیں آئے۔“ ماہین نے رست و اوج دیکھی۔

”نہیں۔ فون آیا تھا دو مرتبہ۔ ایک مرتبہ پوچھا تھا کہ میں نے کھانا کھالیا یا نہیں۔ دوسری مرتبہ تاکید تھی کہ سینک وغیرہ تمہاری خالہ کر لیں گی، الجھنے کی ضرورت نہیں۔“ اپنی بات کے اختتام پر وہ ماہین کی صورت دیکھ کر کھلکھلا اٹھی۔

”ہوں۔ خالہ نے ٹینڈر بھرا ہے ناں تمہارے والد محترم کا گھر جانے کا؟“

”وہ تو بھرا ہے۔ اس میں کیا شک ہے۔“ روٹی پھر کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

”ماشاء اللہ۔“ ماہین نے دل ہی دل میں کہا۔ اس کے انگ انگ سے خوشی پھوٹ رہی تھی۔

”چلو اٹھو۔ دیکھو۔ باری کیا کر رہا ہے کہاں بیٹھا ہے۔ گھر تو ایسا ہو رہا ہے جیسے آفت زدگان کے لیے امدادی سامان آ یا رکھا ہو۔“

”میں نہیں جا رہی۔ آپ ہی دیکھ لیں۔“ روٹی فطری حیا کے عکس میں ماہین کے دل میں اتر گئی۔ اس کی نظریں بھی جھک گئی تھیں۔

”اچھا چلو۔ چائے تو بناؤ۔ میں دیکھتی ہوں۔“ ماہین اٹھ کھڑی ہوئی۔

”میں پہلے اپنے بیڈروم کا جائزہ تو لے لوں۔“

”اس کی آپ فکر نہ کریں۔ وہ تو پتہ پتہ اپنی نگرانی میں سیٹ کر لیا تھا۔ بہت خوبصورت بیڈروم سیٹ لیا ہے آپ کے لیے۔“ روٹی نے اس کا اشتیاق بڑھا دیا۔

”چلو جلدی سے میرے ساتھ۔“ ماہین نے بھی بہت مسرت اور اشتیاق کا مظاہرہ کیا۔ روٹی اسے لے کر اوپر ٹیرس سے ملحق خواب گاہ میں آ گئی۔

طبیعت واقعی خوش ہو گئی۔ وہ باٹ و گولڈن کا بہت دلکش امتزاج تھا۔ روٹی اسے کمرے میں چھوڑ کر چائے کی غرض سے فوراً باہر نکل گئی تھی۔

ماہین۔ وارڈروپ کے دروازے کھول کر جائزہ لینے میں مصروف تھی کہ یاور علی خان نے اندر قدم رکھا۔ غالباً ان کو اطلاع دی جا چکی تھی۔ اسی لیے ان کا انداز نارمل رہا۔

ماہین ان کے قریب چلی آئی۔

”السلام علیکم!“ اس نے کوٹ ان کے ہاتھ سے لیتے ہوئے بہت دوستانہ موڈ میں سلام کیا۔

یاور علی خان نے اپنی پوری حیات کے ساتھ اس کے اندر ہونے والی کسی عظیم تبدیلی کو محسوس کیا۔

”وسلام۔ انقارم کیوں نہیں کیا۔“

”بس یونہی۔ دیکھنا تھا کہ آپ اچانک ہمیں سامنے پا کر کیسا ریسپانس کریں گے۔“

سیاہ جار جٹ کی پلین ساڑی اور سُرخ فل آستین ہائی نیک بلاؤز تراشیدہ کھلے ہوئے بالوں میں گلاب کی ادھ کھلی کلی۔

سُرخ چمکدار لپ اسٹک۔ ایک ایک چیز اس کے پُر جوش اور بھرپور موڈ کا مظہر تھی۔ وہ کوٹ تھامتے ہوئے ان کے بہت نزدیک آ کھڑی ہوئی تھی۔

”خیریت۔ میرا مطلب ہے خیریت تو ہے ناں؟“ انہوں نے اس کے سر آپے پر معنی خیز نظر ڈالتے ہوئے پوچھا۔ وہ

مسکراہٹ جو صرف اپنے پارٹنر کے لیے مخصوص ہوا کرتی ہے ان کے لبوں پر نظر آئی۔ ماہین بھی حیا آمیز انداز میں مسکرا دی۔

”اتنے دنوں بعد آپ سے ملاقات ہونا تھی۔ آپ کے لئے تیار ہوئے ہیں۔“

وہ وارڈروپ کی طرف کوٹ لٹکانے کی غرض سے بڑھتے ہوئے بڑے ناز سے گویا ہوئی۔

”مائی گڈنئس۔ جلدی سے کام بتا دیجئے۔“ وہ صوفے پر بیٹھ کر شوز اتارنے لگے۔

”کیا سارے بیوروکریٹس ٹیکو کریٹس اتنے ہی ہٹکی ہوتے ہیں؟ دراصل کریٹشن بھی تو بہت بڑھ گیا ہے ناں۔“ مایین ان کے برابر بیٹھ گئی۔

”ٹنک بھی بلا وجہ نہیں ہوتے۔ جو شے وجود نہیں رکھتی محسوس بھی نہیں ہوتی۔ خیال میں بھی نہیں آ سکتی۔“ یاور علی خان بہت سنجیدگی سے کہہ رہے تھے۔

”چلیں چھوڑیں۔ اتنے دنوں بعد ملاقات ہوئی ہے۔ اپنی باتیں کریں بحث کے لیے تو عمر بڑی ہوئی ہے۔

باری سے ملاقات ہوئی۔ آپ کی؟“

”نہیں۔“

”آپ نے بات سنبھال لی۔ بہت اچھا کیا۔ مجھے خوشی ہے اور میں ٹھینک فل بھی ہوں۔ اب میرے اور آپ کے بیچ کوئی ٹینشن نہیں آنا چاہیے۔ چاہے مجھ سے حماقتیں سرزد ہو جائیں یا میں آپ کو تنگ کروں۔ ہر صورت میں ہتھیار آپ کو ڈالنا ہیں۔ آپ کو مجھے منانا ہے۔ آپ کو میرا خیال رکھنا ہے۔ ساری دنیا چھوڑ دی ہے آپ کے پیچھے۔ آپ کا فرض ہے کہ میرا اور میرے دل کا خیال رکھیں۔“

بے پایاں اعتماد نے اسے یاور علی خان پر غالب کر دیا تھا۔ اور اس بار تو وہ واقعی ساری کشتیاں جلا کر فیصلہ کن پوزیشن میں ادھر داخل ہوئی تھی۔

ایک نصب العین ایک مقصد حیات کا تعین کر کے۔ اپنی ذات کی نفی کر کے۔

”بہت خوب۔ سب کام تو ہمیں کرنا ہیں آپ کو پھر کیا کرنا ہے۔“ وہ اپنی حیرت کو چھپانے میں ٹھیک ٹھاک کامیاب تھے۔

”وہ بھی بتا دیں گے۔“

”مایین!“

”جی؟“ وہ ان کی یکنخت بدلتی آواز پر چونک گئی۔

”وہ کیا الجھن تھی جواب سلجھ گئی ہے؟“ یاور علی خان کا سوال اپنی جگہ جائز تھا۔

”کچھ نہیں۔ سر۔ غوطہ لگا کر اپنی ذات سے باہر ابھر آئے ہیں۔ حساب کتاب کی دنیا تو بہت چھوٹی سی ہے۔ بڑے کاموں کی طرف توجہ دینا چاہیے۔“

اس نے دونوں ہاتھ ان کے شانے پر رکھ دیے پھر ان پر اپنا سر نکلادیا۔ آنکھوں میں نمی اتر آئی تھی۔

جس شخص سے بندھن توڑنے کے لیے اس نے کئی راتیں اعصابی جنگ میں گزار دی تھیں۔ آج اسی شخص سے اس طرح

کے اظہار کی ضرورت پیش آ گئی تھی۔ حالانکہ اپنی بہن کے خون کے چھینٹے اسی دامن پر نظر آ رہے تھے۔ مگر اسی بہن کی خاطر اپنی ذات کی نفی کی ضرورت پیش آ گئی تھی۔

”میرا خیال ہے اس سنڈے کو ڈنر رکھ لیتے ہیں۔ چھ دن باقی ہیں۔ بابا صاحب اور جو اد کو بھی بلا لیتے ہیں۔ روشی کی رخصتی بس جلدی کر دیتے ہیں۔“

”صرف جواد اور بابا صاحب کو اور دوسرے لوگ۔“ مایین نے چونک کر سر اٹھایا۔

”باری کے وہ لوگ کچھ نہیں لگتے ہیں۔ مگر روشی کے تو لگتے ہیں۔“ مایین نے اعتراض کیا۔

”شادی کے بعد روشی کی انوالومنٹ بھی ختم ہو جائے گی ان لوگوں سے۔“ یاور علی خان سے فوراً اس کی بات کاٹ دی۔

”آپ باری کے سرائے میں آمدورفت پر پابندی لگا دیں مگر بڑی میں حویلی سے ان کا ناتا کیوں توڑنا چاہتے ہیں؟ وہ

سب روشی کے اپنے ہیں۔ سب نے روشی کی پرورش میں حصہ لیا ہے۔ وہ سب اس سے بہت پیار کرتے ہیں۔“ مایین نے جرح کی۔

”کچھ مصلحتیں ہیں میں نہیں چاہتا وہ آئندہ زندگی میں ڈسٹرب ہو۔“

”کیا ہیں وہ مصلحتیں۔ مجھے بتائیں۔ اعتبار کریں مجھ پر۔“ مایین نے ان کے شانے پر ہاتھ رکھ کر دباؤ ڈالا۔

یاور علی خان اٹھ کھڑے ہوئے۔ ”آپ کو کیا کسی کو بھی بتائی جاسکتی ہے۔“

”پہلے مجھے آپ پر غصہ آتا تھا۔ مگر اب ترس آتا ہے۔ اس لیے کہ یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ آپ نے پلاننگ نہیں کی

بلکہ آپ پلاننگ کا شکار ہوئے ہیں۔“ مارے جذبات کے مایین کے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔

شرٹ کے بٹن کھولتے کھولتے یاور علی خان کے ہاتھ ساکت ہو گئے۔ انہوں نے ایک دم پلٹ کر مایین کی سمت دیکھا جو

تانسف سے ہونٹ چبار ہی تھی۔

”صاف صاف بات کریں مجھ سے۔“ انہوں نے اسے بازوؤں سے تھام کر جھٹکے سے اپنے مقابل کھڑا کیا۔ مایین

خاموشی سے ہونٹ چباتی رہی۔

”کیا کہہ رہا ہوں میں؟“

”مجھ سے کچھ نہ پوچھیے۔ بس اتنا بتا دیجیے ہوں آپ کو کہ بہت مشکل ہے کہ وہ زندہ بچیں۔ کچھ نہیں بچا ان میں۔ پھینک

دیجیے سارے اندیشوں کی چادر اتار کر۔“ یاور علی خان نے اس کے بازو چھوڑ دیے۔

”غصے کی حالت میں دل گواہی کے فرض سے دستبردار ہو جاتا ہے۔ مگر بیس سالوں میں کسی رات کے ستائے میں یہ ضرور

بولتا ہوگا۔ مجھے یقین ہے“ مایین ان کے شانے پر دھیرے سے ہاتھ رکھ کر ان کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔

یاور علی خان دم بخود سے کھڑے تھے۔ جیسے ان کے حواس معطل ہو گئے ہوں۔

وہ ایک ٹنک مایین کا چہرہ دیکھ رہے تھے۔

”یہ فطرت ہے۔ اگر کہیں کچھ ہوتا ہے تو کبھی نہ کبھی سامنے ضرور آتا ہے۔ اس میں حیرت کیا۔“ مایین نظریں جھکا کر کہہ

رہی تھی۔

دونوں کے مابین ایک گہری اور بے معنی خاموشی چھا گئی۔

”میں نے بُرا کیا تھا ماہین۔ تو انہوں نے بہت بُرا کیا تھا۔“ وہ دوبارہ بٹن کھولتے ہوئے بیڈ پر بیٹھ گئے۔ لہجے میں بلا کی جھکن تھی جیسے میلوں پیدل چل کر آئے ہوں۔

”دو افراد جو بیک وقت غصے کی حالت میں ہوں تو دونوں سے بُرا ہی ہوتا ہے۔ میں آپ سے اس موضوع پر کوئی تفصیلی بات نہیں کرنا چاہتی۔ میں تو اب آپ کے ساتھ ہوں ہمیشہ کے لیے۔ دم بہ دم، ہم قدم۔ میری تو اتنی گزارش ہے کہ رابطے توڑنے کی روایت اب ختم کیجئے۔ بچے پیچور ہیں۔ ہر بات کے اچھے بُرے پہلو پر کھ سکتے ہیں۔

آپ نے بابا صاحب کو کبھی بلیم کیا۔ جن کے ایکٹو ہوئے بغیر یہ سب ہو ہی نہیں سکتا تھا جس پر آپ کو اعتراض ہے؟“

ماہین نے ایک اور پٹا پھینکا۔

”جی ہنسور میں ہوتا ہے ہاتھ پاؤں مارنا اس کا حق بھی ہوتا ہے اور مجبوری بھی۔ تیور نے بابا صاحب کی بات کیوں مانی؟ وہ بے اختیار کبھی نہیں تھا۔“ یاور علی خان کے لہجے میں زہرا منڈ نے لگا۔

”آپ نے بھی تو روشی کی بات مانی ہے۔ حالانکہ آپ نے تو نہ ماننے کی گویا قسم اٹھالی تھی۔“ بڑا برجستہ جواب آیا۔

کچھ ایسا ہو جاتا ہے کہ بات ماننے بغیر چارہ نہیں رہتا۔“

”اچھا چلیں چھوڑیں۔ میں پرامس کرتی ہوں کہ یہ موضوع کبھی رپیٹ نہیں کروں گی۔ مگر آپ بھی میری ایک بات مان لیجئے۔ رابطے توڑنے کی عادت چھوڑ دیجئے۔ ہر مسئلے کا ایک ہی حل نہیں ہے کہ رابطہ توڑ دیا جائے۔

اس سارے کیس میں اگر ناقابل تلافی نقصان۔ کسی کو پہنچا ہے تو وہ ہیں تیور علی خان۔“

”نہیں۔ ہمارا بھی بہت بڑا نقصان ہوا ہے۔ ہمارا ایک بہت عزیز چھوٹا بھائی تھا۔ جسے ہم کھو چکے۔“ یاور علی خان نے فوراً ماہین کی بات کاٹ دی۔ بلا کا کرب تھا ان کے لہجے میں۔

ماہین چپ ہو گئی۔ اسے احساس تھا کہ یہ وہ کیس ہے جس میں دو سنگے بھائیوں کی غیرت کا سوال ہے۔ اور وہ کبھی ایک دوسرے سے ہاتھ نہیں ملا سکتے۔

وہ اپنی جگہ سے اٹھی۔ اور یاور علی خان کے پہلو میں آ کر بیٹھ گئی۔

”بہت سے نقصانات واقعی ناقابل تلافی ہوتے ہیں۔ مگر جملے ہوئے خیموں کی راکھ پر تعمیر نو کے خاکے کھینچنا بھی عین فطرت ہے۔ اب تو ساری توجہ کا مرکز آپ کے اپنے بچے ہونا چاہئیں۔ آپ کی بہترین صلاحیت اپنے بچوں کی خوشی اور تحفظ میں صرف ہونا چاہیے۔“ وہ بہت ملائمت سے کہہ رہی تھی۔

یاور علی خان خاصی دیر سر جھکائے خاموشی سے سوچتے رہے۔ ماہین نے انہیں ڈسٹرب نہیں کیا۔ پھر ایک خواب کی سی کیفیت میں گویا ہوئے۔

”ماہین! آپ کا دل بہت وسیع ہے یا کوئی مصلحت ہے۔ اگر مصلحت بھی ہے تو آپ کے حوصلے کی مظہر ہے دونوں صورتوں میں میں آپ کو ایڈ مار کرتا ہوں۔“

وہ مسکرا دی۔ ”خدا کرے آپ کی آنکھوں کی سُرخی اب ختم ہو جائے۔ حالانکہ بہت سچی ہے آپ پر۔“ وہ ان کے شانے

سے ٹپک گئی۔

”مصلحتیں مجبتیں کب بنتی ہیں۔ یہ بڑا غور طلب سوال ہے۔“ وہ اپنے مخصوص بُرے تکلف انداز میں رسمی سا مسکرائے۔

”جب انسان ذات کے چھوٹے دائرے سے نکل کر گردش کرتا ہوا بڑا دائرے میں آ جاتا ہے تو اس دائرے کا نام مقصدِ حیات ہے۔ چھوٹے دائرے میں انسان تنہا ہوتا ہے اور بڑے دائرے میں ساری کائنات اس کی ہم رکاب ہوتی ہے۔“ وہ آنکھیں موندے بہت کرب آمیز لہجے میں کہہ رہی تھی۔

ماہین اور یاور علی خان کسی سرکاری ڈنر کے سلسلے میں جیسے ہی گھر سے باہر نکلے۔ روشی باری کو ڈھونڈتی ہوئی سارے گھر میں چکر لاتی پھری۔ ملازم سے پتا چلا کہ ”صاحب“ لان میں ہیں۔ وہ تقریباً بھاگتی ہوئی لان میں آئی تھی۔

”یہاں بیٹھے ہوئے ہو۔“ وہ پھولی ہوئی سانسوں پر قابو پاتے ہوئے گویا ہوئی۔

”گھر تو آپ ہی کے والد محترم کا ہے۔ حکم کیجئے کہاں بیٹھوں؟ آپ کہیں تو راول ڈیم کے کنارے ڈور ڈال کر بیٹھ جاؤں۔ اگر وہاں مچھلیاں پائی جاتی ہوں۔“

وہ بہت انہماک سے نوٹ بک میں کچھ لکھ رہا تھا۔ اس کی مداخلت پر چونک پڑا تھا۔

”تمہیں ہر وقت مذاق کی پڑی رہتی ہے۔ دیکھو سب کچھ ٹھیک جا رہا ہے۔ اگر کوئی گڑبڑ ہوئی تو تمہاری طرف سے ہوگی۔ اب کیا سب کچھ میں ہی کیے جاؤں؟“

”خیر سب کچھ آپ اکیلی تو نہیں کر سکتیں۔ یہ بتائیے میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں۔“

”بس اسی آپ جناب میں لگے رہنا کچھ کرنا کرانا نہیں۔ بس جو پتا کہیں تو تم کہنا ٹھیک ہے۔ او۔ کے۔“

”یعنی وہ کہیں کہ آپ سے دستبردار ہو جاؤں تو میں کہوں او کے۔“ وہ بہت دلچسپی سے اس کا سراپا دیکھ رہا تھا۔ روشی نے گھور کر اس کی سمت دیکھا۔

”کہہ کر تو دیکھو او کے۔“

”لیجئے۔ آپ ہی تو کہہ رہی ہیں۔“

”دیکھو۔ اب میں تم سے پتا کے یا خالہ کے سامنے بات نہیں کر سکتی۔“

”کیوں؟“ وہ شرارت سے اس کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔

”تم نے یہ جاننے کی کوشش کی کہ پتا نے تمہیں کیوں نکالیا ہے؟“ وہ سنجیدگی سے پوچھ رہی تھی۔

”انتظار کر رہا ہوں ان کا۔ فکر کرنے سے کیا حاصل۔ جو ہوتا ہے وہ تو ہوتا ہے۔ وہ زیر لب مسکرا رہا تھا۔

روشی چڑ گئی۔ ”تمہیں تو کوئی جتنو ہی نہیں۔ حالانکہ تمہیں فکر مند ہونا چاہیے تھا۔“

”اچھا۔ مجھے اکٹھا ہی بتا دیجئے کہ مجھے اور کیا کیا ہونا چاہیے۔“ وہ شریر لہجے میں کہہ رہا تھا۔

”تمہیں مجھ سے پوچھنا چاہیے تھا کہ پتا نے مجھ سے کیا بات کی۔ کیا معاملہ ہوا؟“

”وہ تو آپ کے چہرے پر لکھا ہوا ہے کہ کیا معاملہ ہوا ہے۔ میں آپ کی خالہ کے ساتھ لاؤنج میں بیٹھا ہوا تھا۔ ابھی کچھ دیر قبل۔ اور دیکھ رہا تھا آپ پاؤں رکھتی کہیں ہیں اور پڑتا کہیں ہے۔ خوشی سے حالت غیر ہے۔ مگر یہ بتائیے آپ اتنی خوش کیوں ہیں؟“ وہ بڑی سنجیدگی سے گویا ہوا۔

”مجھ سے تو کسی نے کوئی ایسی بات نہیں کی جس سے کسی خوشی کا سراغ ملتا ہے۔ یا درختانوں نے بھی مجھ سے کوئی خاص بات نہیں کی۔ بس میری خیر خیریت پوچھی اور کچھ کاغذات پر سائن کرنے کو کہا۔“

”کسی قسم کاغذات پر؟“ روشی ایک دم حواس باختہ ہو گئی۔

”پتا نہیں۔ میں نے پڑھنے کی کوشش کی تو ڈانٹ کر کہنے لگے پڑھو مت۔ صرف سائن کرو۔ تمہیں اسی لی بلایا ہے۔“ وہ بہت سنجیدگی سے بتا رہا تھا۔

”تت۔ تم نے نہ دیکھا؟“ روشی کا چہرہ اڑھلے لٹھے کی طرح سفید پڑ گیا۔

”تو پھر کیا کرتا۔“ باری نے بلا کی مجبوری غابری کی۔

روشی پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھنے لگی۔

”اس سے پہلے کا کا جان نے اپنے گھر میں سائن کرنے کو کہا تھا تو کر دیے تھے۔ یہاں پر یا درختانوں نے کہا تو ان کی بات مان لی۔ ہمیں تو سب کی ماننا ہے۔“

روشی کا ایک ہاتھ ہونٹوں پر دوسرا دل پر تھا۔ وہ گنگ سی کیفیت میں کھڑی تھی۔

”میرا خیال ہے یا درختانوں نے اسی لیے بلایا تھا مجھے۔“ وہ خیال آرائی کرنے لگا۔ مگر نظریں جھکی ہوئی تھیں۔

”تم نے سائن کر دیے؟“

”جی۔“

روشی کی ٹانگیں بے جان ہو گئیں۔ وہ بمشکل گھاس پر بیٹھ گئی۔

”پاپا اس طرح نہیں کر سکتے۔ وہ تو بہت کلیئر فیس کرتے ہیں۔ مگر وہ بہت مایوس ہوں گے۔“ وہ دم بخود سی کیفیت میں خود

کلامی میں مبتلا تھی۔

”آپ کیوں پریشان ہیں؟“ وہ سادگی سے پوچھ رہا تھا۔

”اس لیے کہ تم پریشان نہیں ہو۔ بزدل، مصلحت کوئی دنیاوی آسائش کے لالچی۔ تم جیسے فضول انسان کے لیے میں نے

اپنے پیارے ٹکڑی۔“

”واقعی۔ مگر آپ کو ان سے یہ بدسلوکی نہیں کرنا چاہیے تھی۔“ وہ معصوم سے انداز میں حیرت و تاسف کا اظہار کر رہا تھا۔

روشی نے نوٹ بک بچ سے اٹھا کر ہڈے ہڈے کر دی۔ پھر دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔

”میں آج ہی سرائے چلی جاؤں گی۔ نہ تمہاری صورت دیکھوں گی نہ پیپا اور بابا صاحب سے کبھی ملوں گی۔ سب نے مل

کر میرا تماشا بنایا ہے۔“

وہ اس بُری طرح روئی کہ باری گھبرا گیا۔

”اور تمہارا تو جینا حرام کر دوں گی۔“ اس نے روتے روتے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا جیسے چلر آرہے ہوں۔

”اوہ۔ مائی گاڈ۔ روشا نے۔ پلیز۔ اٹ ازا۔ جوک۔ اونٹی جوک۔“

وہ اس کے قریب ہو گیا۔ وہ تیوراً اس کی بانہوں میں آ رہی۔

اس نے ادھر ادھر دیکھا کہ شاید کوئی ملازم نظر آ جائے اور وہ اس سے پانی منگا لے۔

وہ اسے اٹھا کر اندر بھی نہیں لے جاسکتا تھا کہ اندر دو ملازم کام میں مصروف تھے۔ ان کے دیکھنے کے بعد ”واقعہ“ بہت

مشہور ہوتا تھا۔ خود کو لعنت ملامت کرنے لگا۔

”محترمہ! ہار گئے آپ سے۔“ وہ اس کے رخسار تھپتھپائے ہوئے کہہ رہا تھا۔

اسی دم ملازم کی نگاہ اس گوشے پر پڑی تھی۔ وہ ڈسٹ بن جھاڑنے کی نیت سے باہر کا رخ کر رہا تھا۔ باقاعدہ جست لگا

کر ان تک آیا تھا۔

”کی ہوا بی بی کو؟ سانپ تو نہیں ڈس لیا۔ ادھر بہت سانپ نکلتے ہیں۔“

وہ روشی کو تشویش بھری نظروں سے دیکھنے لگا۔

”صاحب کوفون کر دیں؟“

”بھاگ کر ایک گلاس پانی لاؤ۔ سانپ وانپ نے نہیں ڈسا خدا نخواستہ۔ جلدی۔ ہری آپ۔“

ملازم تیزی سے اندر چلا گیا۔

باری تشویش بھرے انداز میں اس کی سمت دیکھ رہا تھا۔ عجیب سی شرمندگی اس کی آنکھوں سے عیاں تھی۔

ملازم پانی لے کر آیا تو اس نے چھینٹنے کے انداز میں اس سے گلاس لے لیا۔

”روشا نے!“ وہ پانی کے چھینٹنے بھی مار رہا تھا اور آواز بھی دے رہا تھا۔ چند لمحوں کے بعد روشی نے آنکھیں کھول دیں

اور باری کو خالی خالی نظروں سے دیکھنے لگی جیسے کچھ سمجھ نہ پا رہی ہو۔

”اوہ۔ تھینکس گاڈ!“ باری نے سکون کا سانس لیا۔ اور ملازم کو وہاں سے جانے کا اشارہ کیا۔ وہ فوراً ہی پلٹ گیا۔

”خود موت کا کھیل کھلتی ہیں اور دنیا کو آزمائش میں ڈالتی ہیں۔ دوسرا کوئی مذاق بھی نہیں کر سکتا۔ اٹھیے پلیز۔ یا درختانوں آ

گئے تو مشکل ہو جائے گی۔“

روشی اسے پٹر پٹر گھورتی رہی مگر کوئی حرکت نہیں کی۔

”پلیز۔ گیٹ آپ۔ اٹ داؤ اونٹی اے جوک۔ کیا میں آپ سے مذاق بھی نہیں کر سکتا؟“ اس نے ایک طرف پڑا دوپٹا

اٹھا کر روشی پر یونہی ڈال دیا۔

اور روشی جیسے حواسوں میں واپس آ گئی۔

”مذاق۔ جوک۔ ٹان سنس۔ مجھ سے ہر طرح کا مذاق کر لینا۔ مگر یہ والا نہیں۔ ساری پونجی اس جوئے میں لگا دی ہے۔“

اگر کسی سرمایہ دار کو اس کا ٹوٹل سرمایہ ڈوبنے کی خبر مذاق میں بھی دی جائے تو اس کا ہارٹ فیل ہو سکتا ہے۔
میرا ہارٹ فیل بھی ہو سکتا تھا۔

وہ بمشکل اٹھ کر بیٹھ گئی اور دوپٹا درست کرنے لگی۔

”کیا سمجھوں اسے اور کیا کہوں اسے۔“ باری بہت قدردانی کے ساتھ مسکرایا۔

”اللہ جہیں توفیق تو دے۔ جان نکال دی لے کے۔“ اس کی آواز بھڑکنی تھی۔

”دل چاہ رہا ہے عمر بھر بات نہ کروں تم سے۔“ وہ آنکھیں پونچھنے لگی۔

”بہت مشکل ہو جائے گی۔ بچے عموماً ماں ہی کے ذریعے اپنی بات باپ تک پہنچاتے ہیں۔ ان کے لیے درحقیقت مسئلہ ہو جائے گا۔ یہ بھی سوچ لیں۔“

روشی کی پلکوں پر جیسے منوں بوجھ آ پڑا۔ اسے باری سے اس طرح کے مذاق کی امید نہیں تھی۔ وہ جس حیثیت میں اس سے قریب تھا وہ بڑی مضبوط تھی۔

”تم مجھے اتنا تنگ کیوں کرتے ہو؟“ اس نے جلدی سے بات کا رخ پھیرا۔

”کسی اور کو کرنے لگا تو آپ پھر اموٹل ہو جائیں گی۔ اگر اجازت ہو تو۔“

روشی اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کی نظریں ہنوز جھکی ہوئی تھیں۔

”پتا جو کہیں مان لینا۔ کوئی گڑبڑ مت کر دینا۔ پتا کہہ رہے ہیں اگر تم اپنے قبیلے واپس جانا ہو تو جاسکتے ہیں۔ تم کہہ دینا ٹھیک ہے۔“

”مگر میں اپنے قبیلے کیوں جاؤں۔ میری تمنا ہے کچھ دن تو آپ کے ساتھ پریشانی میں گزریں۔ قبیلے واپس گئے تو وہاں آپ اکیلی رہ جائیں گی۔ آپ کو تو جیولری پہننے کا بہت شوق ہے۔ ہمارے ہاں بیوہ عورت جیولری نہیں پہن سکتی۔ سفید کپڑے پہنتی ہے۔ اگر سردار کے بیٹے کی ماں ہو تو بیٹے کے جوان ہونے تک موتی کھڑ رہتی ہے۔ اور مکمل پردے میں حکومت کرتی ہے۔ دوسری شادی نہیں کرتی۔“

روشی آنکھیں پھاڑ کر اس کو دیکھنے لگی۔ ”بیوہ؟“

”کتنے بے رحم ہو باری!“ اس نے باری کو سر سے پاؤں تک بھیگی نظروں سے دیکھا۔

”کہتی رہیے۔ ایک دن آپ کے سارے اُدعار چکائیں گے تو آپ کو کہیں پناہ نہیں ملے گی۔ ہمارا مسئلہ یہ ہے کہ کام اپنے وقت پر کرتے ہیں۔ جیسے صبح اٹھ کر وقت پر نماز پڑھتے ہیں۔ پھر سب سے پہلے سُست اور بیمار گھوڑوں کی خیریت دریافت کرتے ہیں۔ اس کے بعد کچھ اسٹڈی کرتے ہیں۔ پھر ناشتے کا وقت ہو جاتا ہے۔“

”اچھا بس بس۔ زیادہ چنگوٹلی کا رعب جھاڑنے کی ضرورت نہیں۔ باری پلیز پنا سے بحث نہیں کرنا۔ پلیز۔ دیکھو یہ سب آسان نہیں تھا۔ بہت مشکل سے ہوا ہے۔“ وہ جانے کے لیے قدم بڑھاتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

یہ کون بولا ہے عدم اتنی چاہ سے

احساس برتری سے خدا ہو گیا ہوں میں

وہ بڑی بے ساختگی سے منگتا یا تھا۔

”روشانے! آپ نے تو مجھے اپنی تلاش پر لگا دیا ہے۔ میں خود میں وہ ہنر ڈھونڈتا ہوں جس کے سبب فوقیت کی دستار ہاتھ لگتی ہے۔“

وہ نوٹ بک کے ٹکڑے سمیٹتے ہوئے خود کلامی سے دوچار تھا۔

ڈنر میں اگرچہ ایک ہنگامہ تھا۔ سارے شہر کی کریم جمع تھی مگر مایہ ناز کے اندر جو گھمسان کارن پڑا تھا اس سبب ایک مستقل بے کلی تھی۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد وہ رسٹ واج پر نظر ڈال کر یاور علی خان کے سمت دیکھ لیتی تھی۔ جو ہوم فیسٹر کے ساتھ بات چیت میں اتنے مصروف تھے کہ انہیں شاید یہ بھی یاد نہیں تھا کہ مایہ ناز ان کے ساتھ ہے۔

مایہ ناز کے اندر ایک اکھاڑ بچھاڑ تھی کہ مدھم نہیں پڑ رہی تھی۔ پہلی بار بے پناہ اپنائیت کے اظہار کے بعد اندر ہولناک جنگ چھڑ گئی تھی۔

غائب دماغی کا یہ حال تھا کہ خالی پلیٹ لے کر وہ گوشے میں کھڑی ہو گئی تھی اور خالی الذہن کیفیت میں لوگوں کو دیکھ رہی تھی جو کھانے کے مقابلے کے پارٹی سپاٹ دکھائی دے رہے تھے۔ اگر میزبان کی نظر اس پر نہ پڑتی تو شاید اور دیر تک اسی طرح کھڑی رہتی۔ یاور علی خان اسے گہری دُھند میں نظر آ رہے تھے۔ اور سفید لبادے میں نازنین ان کے آگے بادل کی طرح اڑتی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔

وہ دوچار نوالے زہر مار کر کے پھر گوشے میں جا بیٹھی۔ یاور علی خان کی اچانک ہی اس پر نظر پڑ گئی۔ تھی۔ وہ پلیٹ ہاتھ میں تھامے ہوئے اس کے قریب چلے آئے۔

”کھانا نہیں کھا رہی ہیں آپ؟“

”کھا چکی ہوں۔“ اس نے ان کی طرف دیکھے بغیر جواب دیا۔

”کیا بات ہے۔ طبیعت ٹھیک ہے؟“ انہوں نے کچھ محسوس کیا۔

”ٹھیک ہے۔ مگر کتنی دیر میں چلیں گے؟“

”دس پندرہ منٹ میں چلتے ہیں۔ آپ باسٹر رضوی کی بیگم سے ملیں۔ انہیں آپ سے ملنے کا بہت اشتیاق تھا۔ سب تو مجھے بھی نہیں معلوم؟ آئیے۔“

”پلیز۔ اس وقت میں کسی سے نہیں ملوں گی۔ بس گھر چلیں۔ میں بہت تھک گئی ہوں۔“

اس نے کسی مصلحت کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے جواب دیا۔

یاور علی خان نے ایک گہری نگاہ اس کے چہرے پر کی اور پلیٹ واپس رکھنے ٹیبل کی طرف بڑھ گئے۔

گاڑی میں بھی وہ آنکھیں موندے پشت بیک سے لگائے گم صم رہی۔ یاد علی خان نے بھی اسے مخاطب کرنے کی کوشش نہیں کی۔

گھر آ کر مابین نے بہت غلت میں شب خوابی کا لباس تبدیل کیا تھا اور بیڈ پر چلی گئی تھی۔ یاد علی خان اس کی کیفیت نوٹ تو کر رہے تھے مگر خاموش تھے۔ خیالات کی یورش تو ان پر بھی تھی۔ مگر بیس سال کی بے چلی مشقت نے انہیں ایک مستقل شکل میں ڈھال دیا تھا۔

لباس تبدیل کرنے کے بعد وہ اسٹڈی کے دروازے کی طرف بڑھے جو بیڈروم ہی کے ایک کونے میں کھلتا تھا۔ پھر قدرے مڑ کر مابین کی سمت دیکھا جو کروٹ کے بل بلیکٹ تانے سونے کی تیاری میں تھی۔

”سفر سے واقعی تھکن ہو جاتی ہے۔ شام کو آپ نے حیران کر دیا تھا۔ اب قدرے پریشانی ہے۔ آپ سے بہت سی باتیں کرنا ہیں۔ چلیں آج آپ آرام کریں۔ کل سہی۔“

وہ اسٹڈی میں چلے گئے اور جاتے جاتے بیڈروم کی لائٹ آف کر گئے۔ مابین کو بالکل اندھیرے میں سونے کی عادت تھی جبکہ یاد علی خان ٹائٹ بلب کی روشنی میں سونے کے عادی تھے۔ مگر مابین کی خاطر سب سے پہلے انہوں نے اپنی یہ عادت ترک کی تھی۔ ایک وقت وہ بھی تھا وہ گھپ اندھیرے میں سونا چاہتے تھے اور نازنین ہلکی روشنی پر اصرار کرتی تھی۔ اور آج انہیں گھپ اندھیرے سے وحشت ہوتی تھی اور نیند بہت دیر میں آتی تھی۔

مابین نے ان کے آخری جملے سنے تھے مگر یوں ظاہر کیا گویا پڑی سو رہی ہے۔ اس شخص کو چھو کر اپنے پن کا احساس دلا کر تو گویا وہ کسی امتحان سے دوچار ہو گئی تھی۔

یہ۔ جو مجھے محض اپنی بیس سال کی دہکتی آگ کو ٹھنڈا کرنے کے لیے اپنے گھر میں گھیر کر لایا ہے۔ میں کس دل سے اس سے محبت کروں۔ بہت بڑا دل کر کے شام کو اس کے گھر میں داخل ہوئی تھی۔ مگر حوصلہ پھر ٹوٹ رہا ہے۔

سب سے مضبوط لوگ وہ ہوتے ہیں جو روحانی راستوں پر چلنے کی لگن رکھتے ہیں۔ ان بڑے لوگوں کو بھی کسی پیر طریقت کا دامن تھا منہ پڑتا ہے۔ جو ان وسعت افلاک کے حامل قلوب کو مزید وسعت کی طرف لے جاتا ہے۔

خواجہ معین الدین چشتی نے بیس سال اپنے مرشد کے ہاں پانی بھرا تھا اور بیسیویں سال ان کے مرشد نے پوچھا تھا۔ لڑکے تیرا نام کیا ہے؟ آتش پر شوق قلب میں نہ دھک رہی ہوتی تو اصولی جواب یہ بنتا کہ بیس سال میں آج نام پوچھ رہے ہیں مگر روشنی و ہدایت کے خواستگار ہجر گزیدہ نے اپنے طرف و تابعداری سے اپنے روشن مستقبل کا پتہ دیا اور مودبانہ عرض کیا۔ معین الدین۔

بیس سال بے نام رہنے والے راہ نما کی نظر التفات کا انتظار کرتے ہیں۔ اور شرح صدر کی خاطر بیس سال صرف پانی بھرتے ہیں۔ میں ’ممد و مجبور‘ کمزور بیس سال تو بڑی بات ’نحو‘! میرے پاس تو ریاضت کی بیس گھڑیاں بھی نہیں۔ کتنے جوش میں آپ کی خاطر آپ کا مان رکھنے پھر پلٹ آئی تھی۔ مگر پھر پھر رہی ہوں۔ دل بڑا کرنے کے لیے اور اتنا بڑا کرنے کے لیے وہ مرشد کہاں کہاں سے لاؤں کہ شرح صدر کا مرحلہ طے ہو۔ ظرف و وسعت تک رسائی ہو۔

ان حالات میں عام سے دل کام نہیں کر سکتے۔ فیل ہو سکتے ہیں۔ یاد علی خان اپنا سوچتے ہیں۔ آپ اپنا سوچ رہی ہیں۔ اور میرا کون سوچے۔

اس نے پھر کروٹ بدلی۔

”یاد علی خان آپ تو اتنی بے دردی سے مجھے روند رہے ہیں۔ کہ حیرت سے میرے احساس پر برف جم رہی ہے۔ نحو۔ بہت مشکل ہے وعدہ ایفاء کرنا۔ کتنا بے حس انسان ہے۔ اس انکشاف کے بعد کہ میں سب حقیقت جان چکی ہوں۔ مجھے ڈر میں لے جاتا ہے۔ کچھ کلٹی فیل نہیں کرتا۔ کیا صرف ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم بگاڑ پھیلانے والوں کو ریلیف دیں۔ کیوں۔ کس حساب میں؟“

وہ بے چین ہو کر اٹھ بیٹھی۔ اور بستر سے نیچے اتر آئی۔ اس کے قدم اسٹڈی کی طرف بڑھ رہے تھے۔

اس نے دروازے پر آہستہ سے دباؤ ڈالا تو وہ کھل گیا۔ اسے یہ دیکھ کر حیرت کا ایک چھٹکا سا لگا۔ یاد علی خان صوفہ کم بیڈ پر دراز تھے۔ ٹیبل لیپ کی ہلکی روشنی میں ان کی انگلیوں میں سلکتا ہوا سگریٹ صاف نظر آ رہا تھا۔ ٹیبل پر نہ کوئی کتاب اور نہ ہی تھی نہ کوئی فائل موجود تھی ہر شے اسی طرح اپنی جگہ تھی جس طرح چھوٹے سے قبل ہوتی ہے۔

یعنی وہ اپنی ”جنگ“ اس مورچے میں لڑ رہے تھے۔ وہی اندرونی جنگ جس سے بڑی کوئی جنگ نہیں ہوتی۔ بغیر بارود کی جنگ، مگر سب سے ہولناک آتشزدگی اسی جنگ میں ہوتی ہے۔ سب کچھ خاکستر ہو جاتا ہے۔ حوصلہ عزم۔ جوش امید۔ سب کچھ۔

وہ ننگے پاؤں تھی اور پاؤں کے نیچے کارپٹ تھا۔ یاد علی خان کو اس کی آمد کا پتا نہیں چل سکا کہ بیڈروم میں بھی اندھیرا تھا۔ روشنی ہوتی تو دروازہ کھلنے پر اندر آتی۔ وہ آہستگی سے چلتی ہوئی ان کے قریب آئی۔

”اٹھیے یاد علی خان۔ کچھ حساب کتاب کی باتیں کرتے ہیں۔“ اس کے لہجے میں آنسوؤں کی نمی بھی تھی اور وحشت و بے چلی بھی۔

یاد علی خان کے عین سر پر کوئی دھماکا ہوا تھا۔ جانے خیال کے کس پاتال سے ان کو لوٹنا پڑا۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئے اور اپنی گہری سرخ آنکھوں سے مابین کا چہرہ پڑھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ جو مابین شام کو تھی وہ اب یکسر الٹ نظر آ رہی تھی۔ اجنبی۔ بالکل انجان وغیرہ۔

”کیا ہوا؟ طبیعت ٹھیک ہے نا۔“

”نہیں بہت خراب ہے۔ یقیناً اب آپ علاج کا مشورہ دیں گے۔ مگر یہ وہ خرابی نہیں جو میڈیسن کی محتاج ہو۔“

کل آپ کتنے ہی مصروف ہوں۔ خواہ پر ائم فطر سے اپنا ٹکٹٹ ہو آپ کو ہر صورت میرے ساتھ دریاہستی جانا ہے۔ مجھے کچھ نہیں پتا۔ صرف آپ کی ”ہاں“ میں وہ تاثیر ہے کہ میں سو جاؤں گی اور آپ کو مزید ڈسٹرب نہیں کروں گی۔“

وہ بے بسی سے اٹک پیتے ہوئے ہم کلام تھی۔

یاد علی خان نے کچھ سوچتے ہوئے ایک گہرا کش لیا اور مابین کا ہاتھ تمام کر زبردستی بٹھا دیا۔ ”ہوا کیا ہے۔ کچھ پتا تو

چلے؟“

”کچھ نہیں ہوا۔ بس آپ کو میرے ساتھ کل ہر صورت چلنا ہے ورنہ میری شریان پھٹ جائے گی۔“ اس کی آواز بھرا گئی۔

”آپ تو بہت خوش واپس آئی تھیں۔ اور اتنا بہت کچھ جان کر بھی بہت ایزی تھیں۔ پھر اچانک کیا ہوا ہے؟“ ان کی تشویش بجا تھی۔

”آپ میرے ساتھ کل چل رہے ہیں یا نہیں؟“ وہ اسی انداز میں مصرقتی۔

”ٹھیک ہے چلتے ہیں۔ کس وقت؟“ انہوں نے جیسے کچھ سوچ لیا۔

”جب آپ کی مرضی۔ مگر کل۔“

”ٹھیک ہے پھر صبح ہی چلتے ہیں ارلی مارننگ۔ شام ساڑھے چھ بجے یہاں بہت اہم میٹنگ ہے۔ پانچ ساڑھے پانچ بجے تک واپس آ جائیں گے۔ زیادہ دیر رکنے والی تو کوئی بات نہیں؟“ وہ پوچھ بھی رہے تھے اور الجھ بھی رہے تھے۔

”نہیں وہاں پہنچنے کے بعد تو صرف دس منٹ آپ مجھے دے دیجئے گا۔“ مابین کو قدرے قرار سا آیا۔

”او۔ کے۔“ یاد علی خان صوفہ کم بیڈ سے نیچے اتر آئے۔“ چلیں آئیں آرام کریں۔“

انہوں نے مابین کو بازو سے پکڑ کر اٹھایا اور اپنے بازو کے گھیرے میں تمام لیا۔

وہ بغیر کسی مزاحمت کے ان کے ہمراہ بیڈ تک آئی اور سر ہانے سے پانی اٹھا کر ایک سانس میں پی گئی۔

.....
راستے بھر تو کوئی بات نہیں ہوئی۔ عام سی بات چیت کے سوا کہ ڈرائیور ہمراہ تھا۔ مگر ایک دوسرے کی الجھن انہوں نے سارے راستے محسوس کی تھی۔

حویلی میں بغیر اطلاع کی آمد نے عجیب چہل پہل کر دی تھی۔ یاد علی خان کے تو معمولات میں شامل تھا کہ حویلی میں کسی بھی وقت ان کی آمد متوقع کی جاسکتی تھی۔ مگر مابین کو ابھی چند روز ہی ہوئے تھے خیال تھا کہ شفٹنگ کی وجہ سے۔ اس مرتبہ دیر ہو سکتی ہے۔ کچھ حویلی میں یوں بھی کھلبلی تھی کہ روشی اور باری کا معاملہ بٹے ہوئے یا نہ ہونے کی طرف بھی ہر وقت کا دھیان تھا۔ سب نے یہی خیال کیا کہ کوئی بات ہوئی ہے اور وہ دونوں بابا صاحب کے پاس آئے ہیں۔ دیر تک خواتین کچھ جاننے کے شوق میں اس سے ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہیں مگر جب اس نے روشی سے متعلق کوئی بات کی نہ ذکر کیا تو الجھ کر اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہو گئیں۔

دوپہر کے بارہ بج رہے تھے۔ لنگ میں پورا ایک گھنٹہ باقی تھا۔ وہ ہال سے اٹھ کر اپنے بیڈروم میں چلی آئی۔

”کہاں ہیں آپ؟“ بابا صاحب سے بھی ملنے نہیں گیا کہ پہلے یہ تو پتا چلے کہ آپ مجھے یہاں کیوں لائی ہیں؟“

”بھابی بیگم بی بی جان وغیرہ باتیں کر رہی تھیں۔ مجھے تو ورنہ آپ سے زیادہ بے چینی اور جلدی ہے چلیے۔ آئیے میرے ساتھ۔“

”کہاں۔ بابا صاحب کے پاس؟“ یاد علی خان نے اخبارات اٹھا کر ٹیبل پر جماتے ہوئے اس کی صورت دیکھی۔

”آپ آئیے تو سہی۔“ وہ کچھ جھنجلا گئی۔ یاد علی خان اس کے ہمراہ کمرے سے باہر آ گئے۔ وہ انہیں لے کر طویل

راہداری میں چل پڑی۔

احاطے میں قدم رکھتے ہی یاد علی خان نے اس کا بازو تھام کر ٹھہرا لیا۔

”کیوں لے جا رہی ہیں مجھے اس کے پاس۔ مجھے اس کی صورت سے نفرت ہے۔ نہ کرتی وہ مجھے باخبر۔ بے خبری کے

ساتھ زندگی کا احساس تو تھا۔ میری سب سے بڑی دشمن صرف یہ ہے۔“

”یہ تو آپ نے بالکل ٹھیک کہا۔ حقیقتاً ہی آپ کی سب سے بڑی دشمن ہے اور اس کے بعد اپنے دشمن آپ خود ہیں۔

اس کے علاوہ آپ کا تیسرا دشمن اس روئے زمین پر شاید ہی ہو۔

میں کسی وجہ سے آپ کو وہاں لے جا رہی ہوں۔ آپ کو چلنا ہوگا۔“ اس کے انداز میں ضد کی انتہا تھی۔

یاد علی خان نے سوچتے ہوئے اس کی جانب دیکھا پھر گہری سانس لے کر ساتھ چل پڑے۔ پُر اسرار سے کمروں کی

تظار شروع ہوئی تو ایک کمرے سے جھومر نکل آئی۔

یاد علی خان کو دیکھ کر وہ دم بخود سی کھڑی رہ گئی پھر جلدی سے سر پر آچل ڈال کر سلام کیا۔ اور مابین کی سمت سوالیہ نظروں

سے دیکھنے لگی۔

”جھومر! اس کے کمرے کی چابی کس کے پاس ہے؟“

”کمراتو کھلا ہوا ہے چھوٹی دِلہن! وہ بہت بیمار ہے ٹانگیں ماری گئی ہیں بے چاری کی۔ چل نہیں سکتی۔“

جھومر نے یاد علی خان کی موجودگی کے سبب بہت محتاط لہجے میں جواب دیا۔ مابین نے یاد علی خان کا بازو یوں تھام رکھا

تھا جیسے خدشہ ہو کہ وہ موقع پاتے ہی کہیں نکل جائیں گے۔

دو کمرے کر اس کے وہ اس کی کوٹھڑی کے سامنے آئے۔ جھومر اپنے کمرے کے دروازے میں کھڑی دونوں کو دیکھ رہی

تھی۔

یاد علی خان کے چہرے سے ظاہر تھا کہ بہت مجبوری میں وہ یہاں تک آئے ہیں۔ اگر مابین کے رویے نے ان کے

ذہن میں سوالات پیدا نہ کیے ہوتے تو شاید وہ کسی قیمت پر یہاں نہ آتے۔

مابین نے اندر قدم رکھا۔ اب اس نے یاد علی خان کا بازو چھوڑ کر ان کا ہاتھ تھام لیا تھا۔ یہ ایک نفسیاتی کیفیت تھی جس

سے ظاہر ہوتا تھا کہ اس وقت اس کی سب سے بڑی خواہش یاد علی خان کی موجودگی ہے۔

مابین سے زیادہ یاد علی خان اسے دیکھ کر شاکد ہوئے تھے۔ بان کی چار پائی پر ہڈیوں کا بھر پڑا ہوا تھا۔ رنگ بھی اڑ

چکے تھے اور خوشبو کیں بھی۔

مطر بہ کی اعصابی قوت اس حد تک جواب دے گئی تھی کہ وہ حیرت و جوش جیسے جذباتوں کا اظہار کرنے کے قابل بھی نہیں

رہی تھی۔ اس نے پیشانی تک ہاتھ لے جا کر سلام کیا۔

”کیا تم بات کر سکتی ہو مطربہ؟“ سلام کے جواب میں ماہین نے غلٹ بھرے انداز میں سوال کیا۔

بات کریں گی آپ؟“ وہ سوال ماہین سے کر رہی تھی اور نظریں یاور علی خان پر تھیں۔ آواز بے حد کمزور و نحیف تھی۔ لڑکھڑاتی ہوئی۔

”بس اتنا کہو کہ تم نے میری معصوم بہن کو برباد کیا ہے۔ تیمور علی خان کا غصہ میری بہن پر اتارا ہے۔ تم شیطانہ ہو۔ جس کے قلب میں تھوڑی سی سختی پاتی ہو۔ اُسی کو بہکاتی ہو۔“

ماہین کی آواز رندھ گئی۔ اس نے یاور علی خان کو بھی ساتھ لپیٹ دیا تھا۔

”ان کا خیال ہے کہ بابا صاحب کے کہنے پر یا تشدد کروانے پر تم ایسا کہہ بیٹھی ہو۔ ان کا خیال ہے میری بہن اصل میں مجرم ہے۔ ان کے ہاں ایسا ہی ہوتا ہے۔ یہ سی آئی اے سینٹر میں ”ہاتھی“ سے بھی کہلوا لیتے ہیں کہ میں ”شیر“ ہوں۔“ زمانے بھر کی تخی ماہین کے لہجے میں اتر آئی تھی۔

مطربہ نے دونوں ہاتھ جوڑ کر یاور علی خان کی طرف دیکھا۔

”یاور خاناں!“ اس کی نحیف آواز پر آنسو غالب آ گئے۔ ”م۔ میں گنہگار ہوں۔ دل خالی تھا مگر عزت تھی حویلی میں۔ مگر۔ میں نے ناشکری کی۔ ناقدری کی۔“ وہ تھک کر یکنخت خاموش ہو گئی۔ ہاتھ ہنوز جڑے ہوئے تھے۔ آنکھیں بند تھیں۔ گوشوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

”تیمور خاناں سے کہیے گا۔ ہماری طرح انہیں کوئی نہیں چاہے گا۔ کتنی آگ تھی میرے عشق میں کہ ہر طرف آگ لگ گئی۔ جو سامنے آیا جل گیا۔“

وہ پھر خاموش ہو گئی۔ اور گہرے گہرے سانس لینے لگی۔

”چھوٹی بی بی جان کو ایک غزل سنائی تھی۔

ع شعلہ سا جل بجھا ہوں ہوائیں مجھے نہ دو۔

انہوں نے اپنا بہت خوبصورت سوٹ انعام میں دیا تھا۔ اور اب تو واقعی جل بجھی۔ خواب کی طرح کبھی کبھی شعر بھی بہت سچے ہوتے ہیں۔ تیمور خاناں سے کہیے گا۔“

یاور علی خان اس کی بات سننے بغیر یکنخت کوٹھری سے باہر نکل گئے۔ لامحالہ ماہین بھی ان کے پیچھے لگی۔

راہ میں پھر جھومر کھڑی تھی۔

”اگر میں اسے تین تائم دو آنہ کھلاتی تو یہ آج آپ کو زمین کے اوپر نہ ملتی۔“ جھومر نے اپنی کارکردگی کا ذکر کرنا ضروری سمجھا۔

”میں تمہاری شکر گزار ہوں جھومر! میں تمہیں حویلی کے پچھواڑے سے نکال کر اپنے گھر لے جاؤں گی۔ آئندہ یہاں کسی انسان کو نہیں رکھا جائے گا۔“

”اب مجھے کہیں نہیں جانا۔ پھر پائی حویلیوں، محلول ہے۔ دل تو آباد نہیں ہو سکا۔ بوڑھی نانی کی خدمت کر کے ہی کچھ

سکون ملے گا۔

ہم عورتیں واقعی بہت جذباتی ہوتی ہیں۔ جاگتے میں خواب دیکھتی ہیں اور جب قدرت کی طرف سے چار چوٹ کی پڑتی ہے تو سب دل دل دھرے رہ جاتے ہیں۔ دنیا کی حسین ترین عورت تو وہ ہے جسے مرد کا اعتبار و پیار ملتا ہے۔ بچے ملتے ہیں۔ چار دیواری ملتی ہے۔ سارے ملنے والے اس کے آگے پیچھے پھرتے ہیں۔ محلے میں سوگ ہو یا خوشی جائے تو لوگ اس کے لیے جگہ بنانے کو بھاگے پھریں۔ بس عورت تو وہی حسین و پری چہرا ہوتی ہے۔ ماں کہتی تھی کہ بیٹی سے ڈر نہیں لگتا اس کے نصیب سے ڈر لگتا ہے۔ ٹھیک ہی تو کہتی تھی۔“

جھومر پھیکے سے انداز میں مسکرائی۔

یاور علی خان جا چکے تھے۔ ماہین نے قدم بڑھانے سے قبل جھومر کی طرف دیکھا۔

”تم بہت سمجھدار ہو جھومر۔ تم نے بروقت سوچا اور اچھا سوچا۔ بہت اچھے امکان کا دروازہ تمہارے لیے ہمیشہ کھلا رہے گا۔ اچھا خدا حافظ پھر بات ہوگی تم سے۔“

وہ یاور علی خان کی طرف سے فکر مند تھی اس لیے تیزی سے سیدھی اپنے بیڈروم میں آئی تھی۔

یاور علی خان وہاں نہیں تھے۔ وہ گھبرا کر باہر آئی، کٹو سے پوچھا۔

اس نے بتایا، لُج کے لیے مردانے میں جا چکے ہیں اور بڑی بیگم آپ کو بھی بلارہی ہیں۔

ماہین نے ایک گہرا سکون کا سانس لیا تھا۔

یاور علی خان بالکل خاموش تھے۔ مطربہ سمیت کسی موضوع پر کوئی بات نہیں کی تھی۔ یوں لگتا تھا وہ کچھ بولنا نہیں چاہتے۔ ڈھائی بجے انہوں نے ماہین سے صرف اتنا کہا تھا کہ اب چلنا چاہیے۔ روشی کے سلسلے میں وہ بابا صاحب سے سب باتیں کہہ سن چکے ہیں۔ بابا صاحب کو ان کی کسی شرط پر اعتراض نہیں ہے۔ مگر لگتا ہے وہ بہت افسردہ ہیں۔

ماہین کے پاس ان کی کسی بات کا جواب نہیں تھا۔ اس لیے کہ وہ فیصلہ کن حالت میں تھے۔ پونے چھ بجے وہ اسلام آباد پہنچ گئے تھے اور آتے ہی یاور علی خان تیار ہو کر میٹنگ میں چلے گئے تھے۔ باری بھی نظر نہیں آیا۔ روشی کو کچن میں مصروف دیکھ کر وہ آرام کرنے اپنے کمرے میں آ گئی تھی۔ اسے یاور علی خان کی واپسی کا انتظار تھا۔

احساسات یوں ہو رہے تھے گویا کوئی بہت بڑا مسئلہ منطقی حل کی طرف بڑھ رہا ہے۔

اس نے کپڑے نکال کر شاور لینے کا ارادہ کیا کہ پھر دیر تک سونے کا ارادہ تھا۔ رات بھر بھی سو نہیں پائی تھی۔ اور سارا دن سفر میں کٹ گیا تھا۔

شاور لینے کے بعد باہر آئی تو مغرب کی اذانیں ہو چکی تھیں۔ اس نے پہلے عصر کی قضا اور پھر مغرب کی نماز پڑھی۔ پھر پڑ کر سو رہی۔ جانے کیا وقت تھا جب تیز روشنی کے سبب آنکھ کھل گئی تھی۔ گہری نیند سے اچانک بیداری پھر تیز روشنی چند لمحوں تک تو کچھ سمجھ ہی نہ پائی۔

کچھ دیر بعد منظر واضح ہوا تو سامنے یاور علی خان کو پایا وہ کوٹ اُتار رہے تھے۔

”کھانا کھالیا؟“ وہ ماہین سے پوچھ رہے تھے۔

”نہیں۔ آپ نے کھالیا؟“

”ہوں۔“ بہت مختصر جواب آیا۔

”تو پھر کھالیں۔ شاید روٹی بھی آپ کا انتظار کر رہی ہو۔“

”ہوں کھالوں گی۔“ اس نے دلال کلاک کی سمت دیکھا۔ رات کے گیارہ بج رہے تھے۔

”میرا خیال ہے بہت تھک گئی ہیں۔ ویسے آپ نے بہت زحمت کی۔ جب انسان کبھی کسی واقعے پر بہت سوچتا ہے تو

حقائق روشن ہو ہی جاتے ہیں۔ یہ اور بات ہے۔ بہت دیر ہو چکی ہوتی ہے۔ نہ تاوان ادا ہو سکتے ہیں نہ کفارے۔“

وہ کوٹ اُتارنا صوفے پر ڈالتے ہوئے کہہ رہے تھے۔

”یعنی آپ کا مطلب ہے کہ آپ آل ریڈی سب کچھ جان چکے تھے۔ جب ہی تو میں حیران ہو رہی تھی کہ آپ نہ

چوکنے نہ پزل ہوئے۔ لیکن جب حقائق روشن ہو چکے تھے۔ تو مجھے انتقام کی بھینٹ چڑھانے اور استعمال کرنے کی کیا لوجک

تھی؟“ وہ ایک دم تلخ ہو گئی۔

یاور علی خان نرمی طرح چوکنے گئے۔ ”انتقام؟ کیا مطلب ہے آپ کا؟“

”یہی کہ آپ نے میری بہن کو ذہنی ٹارچر پہنچانے کے لیے مجھ سے شادی کی۔“

”ہیسو لوٹلی ٹان سنس۔“ وہ شرٹ کے بٹن کھولتے کھولتے ایک دم ٹھنک گئے۔

”تو پھر آپ کو ایک اور قربانی دینا چاہیے تھی۔ سنگ میل کی طرح مجھ سے صرف نظر کر کے گزر جانا چاہیے تھا۔ کیوں

ٹھہرے۔ رُکے پھر کیوں۔ کیا آپ کو احساس نہیں تھا کہ میری آپ سے شادی ادھر کتنی بڑی شاکنگ نیوز ہوگی؟ وہ کتنی بڑی

ذہنی اذیت میں مبتلا ہو جائیں گی؟“ ماہین جیسے پھٹ پڑی۔

”آپ یہ سب سوچنے میں حق بجانب ہیں۔ لیکن آپ سے شادی کی ریزن یہ نہیں ہے۔ تنگی کے جس موڑ پر مجھے تنہا کیا

گیا تھا۔ اس موڑ پر صرف آپ کھڑی ہوئی ملیں۔ شاید خواہش خواہش ہی رہتی مگر آپ کی توجہ سے توجہ ہٹ جانا کوئی آسان

بات نہیں تھی میرے لیے۔

فائلوں، کتابوں میں مستقل پناہ نہیں ملتی۔ چھاؤں کی طلب پر تو ان کا سب سے زیادہ حق ہوتا ہے جو دھوپ میں بہت

چلے ہوں۔

آپ مجھے ڈس اپائنٹ کر سکتی تھیں۔ میں آپ کو تسلیم نہیں کر رہا ہوں۔ چاہے جانے کی خواہش ہر ذی نفس میں موجود ہوتی

ہے۔ ایک خوبصورت، اسمارٹ، ویل ایجوکیٹڈ لڑکی ہر معقول انسان کو انسپائر کر سکتی ہے۔ اور عالم دیوانگی میں تو ایسی لڑکی بہت

اثریٹ کرتی ہے جبکہ وہ ڈس اپائنٹ بھی نہ کر رہی ہو۔ پھر کوئی مصلحت انتہا نہیں رکھتی کہ دیوانگی کے اس مقام پر مزاحمت کر

سکے۔ البتہ نکاح کے بعد بہت سوچا تھا کہ کچھ ٹھیک نہیں ہوا۔

انتہا میں نے نہیں کی تھی۔ انتہا آگے والوں نے کی تھی۔ حویلی کے بے ڈھب اصولوں نے کی تھی۔ تیمور کو اپنی بات

منوانے میں کبھی دشواری نہیں ہوئی۔ اسے یہ سب نہیں کرنا چاہیے تھا۔“

”سب نے جو کیا وہ غلط کیا۔ سب پر اس کلیش کی کچھ نہ کچھ ذمہ داری ضرور پڑتی ہے۔ سوائے آپ کے۔ کیا مذاق ہے

یہ؟“ ماہین جو زیر اثر آ رہی تھی پھر مجھے سے اکھڑ گئی۔

یاور علی خان نے شرٹ اُتار کر صوفے پر ڈال دی۔ ماہین نے نظریں موڑ لیں۔

”جس کے ذہن میں جو آئے وہ کہہ سکتا ہے اس کا رائٹ بنتا ہے۔ مگر اب حاصل کیا ہے؟ اب مجھے آپ کا سوچنا ہے۔

روٹی اور جواد کا سوچنا ہے۔ آپ کے پاس کیا ہونا چاہیے اب زیر غور صرف یہ بات ہے۔ اور بس۔ آپ کے لیے آپ کی

ذاتی ریزن ہونا چاہیے۔ آپ کا اپنا ایک بچہ ہونا چاہیے۔ آپ کے مستقل قسم کے کمپلٹس کا بندوبست ہونا چاہیے۔ روٹی اور

جواد تو جاگیر میں غیر متنازعہ حصے دار ہیں۔ ان کے جینی فٹس تو ڈور تک سکیور ہیں۔“

ماہین نے ان کی طرف حیرت و صدمے سے دیکھا۔

”یاور صاحب! کوئی موت کی دہلیز پر آ پہنچا ہے۔ ایک مرتبہ تو اعتراف مجرم ان تک پہنچا دیجئے۔“

”کتنا بہتر ہوا اگر ایک وقت میں صرف ایک فرد کا دماغ ماؤف ہو۔ کیا آپ کی تسلی کے لئے یہ بات کافی نہیں کہ احساس

جرم آپ تک تو پہنچا۔ دوسری طرف اس کے معنی اپنی اہمیت کھو چکے ہیں۔ اب آپ مجھے کسی فعل کے لیے مجبور نہیں کریں گی۔“

وہ بہت ٹھحال اور شکستہ آواز میں کہتے ہوئے وارڈ روب سے شب خوابی کا ڈریس نکال رہے تھے۔

”فی الحال سمجھوتے کی راہ تو چلیں۔ کیا معلوم کسی موڑ پر محبت دوبارہ آ کھڑی ہو۔“

”جب حقائق روشن ہو گئے تھے۔ تیمور علی خان سے اس قدر نفرت کیا معنی؟ کہ ان کے دوست کا بیٹا بھی آپ کی

نا پسندیدگی کی زد پر آ گیا۔“

ڈریسنگ کی سمت بڑھتے قدم رک گئے۔ یاور علی خان نے پلٹ کر اس کی سمت دیکھا۔

”یہ نفرت نہیں ہے اعلیٰ درجے کی ذلت آمیز بے بسی ہے۔ اس ڈس ٹینس میں بہت ریلیف ہے۔ میں نے کمال کیا تھا۔

اس نے حد کر دی۔ اپنے دکھ کی انتہا کبھی کسی کو نہیں بتائی اور نہ بتانے کا ارادہ ہے۔ پلیز اسٹاپ دس ٹاپک فار ایور۔“

”سب سے اہم ذمہ داری تو بابا صاحب پر عائد ہوتی ہے۔“ ماہین کہے بنا رہ نہ سکی۔

یاور علی خان نے اپنی بات کے کپے ہونے کا ثبوت دیا اور خاموشی سے ڈریسنگ میں چلے گئے۔

واپس آئے تو ماہین بے آواز اشک بہا رہی تھی۔

”آپ کو قریب پاتی ہوں تو وحشت ہونے لگتی ہے۔ وہ مر رہی ہیں۔“

”جب قضائے الہی سے کسی کا پیارا چھڑتا ہے تو لوگ اللہ پر اظہارِ ناراضگی کر بیٹھتے ہیں۔ آپ حق بجانب ہیں۔ تب

ہی تو کہہ رہا ہوں کہ بات اسی بیڈروم میں ختم کر دیں۔ ”احساس مجرم“ کا ان تک نہ پہنچنا بہتر ہے۔ ممکن ہے زندگی کی ضمانت

بن جائے۔ ورنہ دوسری صورت میں واقعی کچھ ہو جائے گا۔ جائے آپ کھانا کھائیے۔“

”اتنی برداشت اتنی میچورٹی۔ کاش بہت پہلے ہوتی۔ مگر عظیم دکھ ہی تو عظیم دانائی عطا کرتے ہیں۔ اگر یوں نہ ہو تو کہیں بھی کوئی بگاڑ نہ ہوا انتشار نہ ہو۔“

اس نے دوپٹے سے آنکھیں صاف کیں اور سلیپر پاؤں میں ڈال کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

یاور علی خان آئینے کے سامنے کھڑے بالوں میں برش چلا رہے تھے۔

”کیسا مذاق بن گئی ہے۔ میری زندگی۔“ وہ یہ کہہ کر باہر نکل آئی۔

غلام محمد کا انتظار کرتے کرتے عورت کی آنکھیں پتھر اگنی تھیں۔ سب بچے ادھر ادھر پڑے سو رہے تھے۔ دور برآمدے میں بالودو پٹا چہرے پر ڈالے جانے سو رہی تھی کہ جاگ رہی تھی۔

بارہ بجے سے کچھ پہلے غلام محمد گھر میں داخل ہوا۔

بالوکی ماں بڑی سرعت سے اٹھی۔

”اتنی دیر لگا دی۔ کہاں رہ گئے تھے۔ ایک تو حالات ایسے ہیں کہ بول بول کر آدھی ہو گئی۔ مل گیا تھا عارف۔ بات ہوئی اس کی لال خان سے؟“

غلام محمد نے کاندھے سے چار خانے والا رو مال پٹنگ پر ڈال کر ہاتھ اٹھایا جیسے کہہ رہا ہو صبر تو کر دم تو لینے دے۔

”ایک گلاس پانی پلا دے۔“ وہ پٹنگ پر بیٹھ گیا۔

بالوکی ماں بڑی بھرتی سے پانی لائی۔ اس کی ایک ایک حرکت سے اضطراب و بے چینی واضح تھی۔

غلام محمد نے پانی پی کر گلاس اسے واپس تھمایا۔ اور دونوں ہاتھ پٹنگ کی پٹی پر جما کر سر جھکا کر بیٹھ گیا۔ جیسے کسی گہری سوچ میں ہو۔

”اب بتا بھی دو عارف ملایا نہیں؟“ وہ اس کے برابر میں بیٹھ گئی۔

”ملا تھا۔“ غلام محمد اتنا کہہ کر خاموش ہو گیا۔

”یا اللہ۔ پورا کیوں نہیں بول رہے؟ جواب کیا ملا؟“ بالوکی ماں کا ضبط جواب دے گیا۔

”وہ نہ بسانے کا اب اسے۔ کہتا ہے عورت اعتبار کی ہوتی ہے۔ اسے واپس لا کر اپنی عمر بھر کی نیندیں گنوا دوں۔ جیسے ہر

وقت چوری کا دھڑکا لگا رہے جیسے بے دروازوں کا گھر ہو اور لٹنے کا خطرہ کسی پل سونے نہ دے۔ مان لے بالوکی ماں۔

ہمارے نصیب اچھے نہیں۔ ایک ذرا دیر کو بھولی بھٹکی روشنی اس گھر میں آئی تھی بس۔“

غلام محمد ایک دم یوں خاموش ہو گیا جیسے اپنے دکھ پر لوح خوانی کرنے لگا ہو۔

باہر راناں ستائے میں رہ گئی تھی۔ اسے ایک گمان سا تھا کہ کسی نہ کسی طرح عارف لال خان کو آمادہ کر ہی لے گا۔

”عارف کہہ رہا تھا لال خان نے بچے کی ذمہ داری قبول کر لی ہے۔ مہینے کے مہینے اس کا خرچہ بھیج دیا کرے گا۔ وہ یہ

بھی کہہ رہا تھا۔ اگر بالوکی دوسری شادی ہو گئی تو وہ اپنے بچے کو آ کر لے جائے گا۔ اسے بھی اپنے ساتھ باہر لے جائے گا۔“

بالوکی ماں گہم گہم کیفیت سے فوراً باہر آ گئی۔ ”دوسری شادی؟“ تو تم کہو ناں۔ عارف خود کر لے اس سے نکاح۔“

دور بالو کے ساکت وجود میں تھوڑی سی حرکت ہوئی۔

”دماغ خراب ہے تیرا۔ ایسا ہمدرد بھی نہیں کہ عمر بھر کی ذلت کا سودا کر لے تاکہ لال خان کہے کہ ہاں دوست ہی سنی

(صحیح) نہیں ہے۔ پر لے رہے کی بے وقوف عورت۔“ غلام محمد کے کمزور اعصاب چنچ چنچ گئے۔ ”بیٹی کے برابر سونا بھی تول کر

دے گی تو بھی نہیں کرنے کا وہ۔ وہ اور قسم کا مرد ہے۔ کوئی نہیں سمجھ سکتا اسے۔ اگلی چار دن میں پھوٹ لی تھی اس کے گھر سے

(غلام محمد نے عارف کی بیوی کی بابت اشارا دیا۔) اسے نہیں چاہیے گھر والی۔“

بالوکی ماں دکھ سے چور کافی دیر تک ایک ہی زاویے سے بیٹھی رہی۔

”کیسی عزت آئی تھی اس گھر میں۔ کیسی پاس کی بات لگتی ہے۔ جیسے پلک لگی ہو پھر آنکھ کھل گئی ہو۔ گھڑی دو گھڑی کی

بات لگتی ہے۔ آہ۔“

اُس نے سر آدھ بھی کھینچی اور ہاتھ بھی ملے۔ دونوں کے درمیان ایک گہری خاموشی پھا گئی۔

”ہزار دو ہزار تو بھیجا ہی کرے گا مہینے کے مہینے۔“

ہار مان کر بالوکی ماں نے جیسے خود کو دوسری سمت سے بہلانے کی کوشش کی۔

غلام محمد نے کوئی جواب دیا۔ وہ عظیم فلسفی کی طرح اپنی قسمت پر بہت توجہ سے غور کر رہا تھا۔

روشنی مایوں بیٹھ چکی تھی۔ دریا بستہ سے تمام خواتین ولڑکیاں آئی تھیں۔ کراچی سے روشن آ رہی بھی آ گئی تھیں۔ سب اپنی

اپنی حیرت چھپائے خوشی میں حصہ دار تھے۔ بابا صاحب کے بارے میں پتا چلا تھا وہ صرف بارات ڈنر میں شریک ہوں گے۔

حویلی میں صرف شینو تھیں وہ کیوں نہیں آئیں۔ کسی کے پاس جواب نہیں تھا۔

باری تو صبح ہوتے ہی جانے کدھر غائب ہو جاتا تھا۔ لڑکیوں کے ہاتھ میں ہی نہیں لگ رہا تھا۔

رات میں جانے کب آتا تھا۔ سب سے بڑھ کر تو تزئین اس کے کان کھینچنے کے لیے بے تاب تھیں۔ صرف پہلے روز

اس کی جھٹک سی دیکھنے کو ملی تھی۔

سب نے مل کر روشنی کے تو تقریباً جھٹکے مچھڑا رکھے تھے۔

”اس مسٹری جیمپن سے پوچھو وہ کہاں اور کب پایا جاتا ہے۔“ زری نے روشنی کی طرف سب کو لگا دیا۔ اسے فتمیں

کھانا پڑ گئیں کہ اسے نہیں پتا۔

ماہین نے بھی لاعلمی کا مظاہرہ کیا اور ساتھ ہی اندازے سے یہ بھی کہہ دیا کہ ”ممکن ہے خیر آباد چلا جاتا ہو۔ وہاں موسم

کے پھل اتارے جا رہے ہیں۔“

”ہو سکتا ہے اُسے شرم دیر سے آئی ہو۔ شکر ہے ہنستا مسکراتا بروقت ہے۔“

”دیکھو روشنی! یہ کیا کہہ رہی ہے اُسے۔“

روٹی نے تادیب کی شکایت کی۔ روٹی کا بہت فرصت ہی نہیں تھی۔ اس کے سامنے رنگوں کی سرزمین تھی۔ روٹی کے سائے تھے۔ مایوں بظاہر ٹنٹنی تھی مگر ہڈی کو چین نہیں تھا۔ ترنم کے پُر زور اصرار کے باوجود اس نے ابٹن نہیں لگوا یا تھا۔ یہ کہہ کر انکار کر دیا تھا۔

”آ۔ آپ۔ کو کیسے معلوم ہوا؟ کہ.....؟“ وہ اٹکنے لگی۔

”آپ جانیے پھر آپ کے پاس وقت نہیں رہے گا۔“ یہ سنتے ہی مایہن بہت غلٹ میں اندر کی سمت بڑھی۔ مسافر لاؤنج میں پہنچ چکے تھے۔ اس نے ریسپشن سے رجوع کیا۔ اور کارڈ دکھایا۔ اسے تسلی دی گئی کہ ابھی اناؤنسمنٹ کراتے ہیں۔ مسرنا زینیم تیور علی خان ادھر آ کر آپ سے مل لیں گی۔“

مایہن رینگ سے فیک لگا کر بے چینی سے انتظار کرنے لگی۔ تقریباً تین چار منٹ بعد نازنین اور تیور علی خان باہر آتے دیکھائی دیئے۔ شیشے کا دروازہ وا ہونے سے قبل ہی اس نے نازنین کا جائزہ لے لیا تھا۔ کاہی سبز سوٹ میں ملبوس جس پر تیز زرد رنگ کے ریشم سے کام بنا ہوا تھا۔ پہنے ہوئے تھے۔ تیز زرد رنگ کا دوپٹا سینے اور بازوؤں پر پھیلا ہوا تھا۔ جس پر کاسنی سبز رنگ کی ریشمی تیل لگی ہوئی تھی۔ کمال کی جامہ زیب دکھائی دے رہی تھی۔ بال سادہ چوٹی کی شکل میں بنے ہوئے تھے۔ تیز سرخ لب اسٹک نے چہرے کو مزید نمایاں اور روشن کر دیا تھا۔ دائیں ہاتھ میں سبز اور زرد رنگ کی بہت کم چوڑیاں تھیں اور بائیں کلائی پر چمکتے ڈائل گولڈن ریسٹ واچ تھی۔ خطرناک بیماری کا عکس کسی طور کہیں سے نمایاں نہیں تھا۔

وہ چھوٹے چھوٹے قدم رکھتی باہر آئی تھی۔ سامنے مایہن کو دیکھ کر خوشی اس کی آنکھوں میں جھلکائی تھی وہ بڑی وارفتگی سے اس کی سمت بڑھی۔ اور اسے گلے سے لگا لیا۔

”مائی گاڈ۔ یہ تو بالکل غیر متوقع ہے میں تو سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ بالکل۔ بہت اچھا کیا۔ کوئی تو اپنا وقت رخصت سامنے ہو کہ آخری تصویر آنکھوں میں بسی رہے۔“

”خدا نہ کرے بھو! اللہ کرے آپ صحت کی خوشخبری بہت جلد سنیں۔“ مایہن نے تڑپ کر اسے زور سے بھیج لیا۔ ”کتنی رمل رہی ہیں۔ سب آپ کو دیکھ رہے ہیں۔ خدا کرے یہ تابندگی میں تمام عمر دیکھوں۔ آمین۔“

”کیا کروں گی صحت پا کر۔“ وہ افسردہ سے انداز میں مسکرائی۔

”بہت سے لوگ اب بھی آپ کی ضرورت بہت شدت سے محسوس کر رہے ہیں۔ یہ کفران ہے۔“ وہ سمجھانے لگی۔

”ڈرائیور کے ساتھ آئی ہو؟ روٹی اور بھو! کیسے ہیں؟“

”جو ابھی آج آ رہا ہے اسلام آباد۔ روٹی ٹھیک ہے۔“ اس نے جلدی سے جواب دیا۔

”اچھا اپنے کسی کام سے آ رہا ہے یا ویسے ہی تم لوگوں کے ساتھ ویک اینڈ گزارنے؟“ نازنین کے لہجے سے زندگی جھلکنے لگی۔ ”میں نے سنا ہے۔ میرا بیٹا بہت گریس فل اور ذہین ہے۔ ماشاء اللہ۔ تم کیا آگئی ہو ان لوگوں کے پاس۔ میری جان کو سکون مل گیا ہے۔ ان کی زندگی میں بہت سے موڑ آئیں گے۔ اچھے فیصلوں میں ان کی میلپ کرنا۔ آئی دل تھینک فل ٹویو۔“

”بی بی جان! اس میں عجیب سی اسمیل آتی ہے۔ میں ماسک لگا لوں گی۔ بالکل ”اسمیل فری“ ہے۔“

”یتاؤ۔ خالص چینیلی کے تیل میں اسے عجیب سی اسمیل آتی ہے۔ بچوں میں سے جج اسمیل آئے گی تو اٹھا کر پھینک دے گی۔“ وہ بہت بے مزہ ہو گئی تھیں۔

اتنے ہنگامے میں مایہن کے اُلجھے اُلجھے انداز کسی نے نوٹ نہیں کیے۔ ان چار پانچ دنوں میں اس نے دو مرتبہ سرائے فون کر کے نازنین کی خیریت دریافت کی تھی اور گھر میں برپا ہونے والے خوشگوار ہنگامے کی بھٹک بھی نہیں دی تھی۔ کہ زخموں کے ٹانگے نئے سرے سے ادھر نے لگیں گے۔

پرسوں روٹی کی رخصتی تھی اور آج رات گیارہ بجے نازنین نیویارک جا رہی تھی۔ لڑکیاں کھانے کے بعد پھر ڈھولک بجانے بیٹھ گئی تھیں۔ وہ بڑی بے سکون اور بے کل بے کل سی اوپر ٹیرس میں آکھڑی ہوئی۔ اور روڈ پر رواں ٹریفک پر خالی خالی نظریں دوڑانے لگی۔

”واہ بھو! آپ کی بیٹی کے پاس میں ہوں میری خوشبو ہے۔ آپ ہیں تو اس کے قریب۔“ اس کی آنکھیں دھندلانے لگی تھیں۔

جانے کب تک وہ بے خبری کی کیفیت میں کھڑی رہی تھی۔ یونہی خود بخود محسوس ہوا تھا کہ جیسے اس کے علاوہ بھی وہاں دوسرا کوئی موجود ہے۔

اس نے پلٹ کر دیکھا۔ یاور علی خان کھڑے کش لگا رہے تھے۔ اسے متوجہ پا کر انہوں نے سگریٹ منہ سے نکال لیا۔

”آئیے۔ میرے ساتھ۔“ وہ پلٹ گئے۔ اور مایہن کی معمول کی طرح ان کے پیچھے پیچھے چل پڑی۔

وہ نیچے آ کر پورچ کی سمت بڑھ رہے تھے۔ اگلا دروازہ کھول کر مایہن کو اشارے سے بیٹھنے کے لیے کہا۔ خود دوسری طرف سے گھوم کر آئے اور ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔

مایہن نے ان سے یہ نہیں پوچھا کہ وہ کہاں جا رہے ہیں۔

چوکیدار نے گیٹ واکیا اور یاور علی خان تیزی سے گاڑی نکال لے گئے۔

صرف دس منٹ کی ڈرائیو کے بعد وہ اسلام آباد ایئر پورٹ پر موجود تھے۔ دس منٹوں میں بھی ان کے درمیان خاموشی حاکم تھی۔ مگر ایئر پورٹ پر نظر پڑتے ہی اس نے بے تحاشا چوٹ کر یاور علی خان کی سمت دیکھا تھا۔ جواب میں انہوں نے ایک کارڈ اس کی سمت بڑھا دیا تھا۔

”اگر سیکورٹی کی وجہ سے کوئی پرالیم ہو تو یہ کارڈ دکھا دیجئے گا۔ آپ جانیے میں ویٹ کر رہا ہوں۔“

”آ۔ او۔“ ایک ہاؤس کار کچ گئی۔

”بی بی جان! باری کو دیکھیں روشنی کو تنگ کر رہا ہے۔“ لالی نے شرارتاً شکایت لگائی۔

”باری! کچی تم نے روشنی کو نہیں دیکھا؟“ مریم نے یوں کہا جیسے اسے نہ دیکھنے پر بہت افسوس ہو رہا ہو۔

”لو صرف انہی کو تو دیکھا ہے اور تو کوئی نظر نہیں آیا۔“ جانے لگا لگایا۔

ماہین نزدیک ہی کھانے کا انتظام دیکھ رہی تھی۔ شوخ و شنگ جملے اس کے کانوں میں بھی پہنچ رہے تھے۔ وہ ان کے درمیان جانے کا ارادہ کر رہی تھی کہ فون آنے کی اطلاع آئی۔ وہ معے حل کرتی جلدی سے لابی میں آئی۔ شاید نعمان بھائی یا شاید سمندر پار سے۔

”ہیلو۔!“ اس نے ماؤ تھ پیس میں کہا۔ دوسری طرف مترنم آواز اور شستہ انگریزی میں کوئی موصوفہ کہہ رہی تھیں۔ پلیز ویٹ فار جسٹ اے منٹ۔ مسٹر تیمور علی خان آن لائن۔“

ماہین کا دل بڑی تیزی سے دھڑکنے لگا۔ اللہ کرے خیریت کی خبر ہو۔

”ہیلو! السلام علیکم۔ تیمور علی خان فرام یو۔ ایس۔ اے۔“

”وعلیکم السلام کیسے ہیں۔ بچو کی طبیعت کیسی ہے؟“ اس کی آواز میں لرزش آگئی تھی۔

”ٹھیک ہیں۔ پہلا چیک اپ آج یعنی ابھی کچھ دیر پہلے ہوا ہے۔ اچھی خبر یہ ہے کہ ٹائپٹی پر سینٹ امید ہے آپ دعا کریں۔ ہم آپ کو اس لیے بھی فون کر رہے ہیں کہ اب آپ پاکستان میں ہمارا انتظار نہ کیجئے گا۔ ہم یہاں دوماں کے لیے ہیں پھر لندن چلے جائیں گے اور وہیں سیٹل ہوں گے۔“

ہمارا خیال ہے یہ ہم سب کے لیے بہت بہتر ہے۔ ان کا ایٹ موسفیر چینیج کرنا اب بہت ضروری ہو گیا ہے۔ البتہ بچوں کو لینے ہم دو تین ماہ کے اندر پاکستان آئیں گے ہم سے مطلب صرف ہم۔ امید ہے حوصلہ افزا خبر آپ کے لیے بھی بہت بڑی خوشخبری ہے۔“

”جی بہت زیادہ۔ بیان سے باہر ہے۔ آپ کی اس دقت ریکل فیلنگ کیا ہے؟ واقعی آپ خوش ہیں؟“

”ایز اے انسان واقعی یہ بہت اچھی خبر ہے۔ آپ ہماری طرف سے بے فکر ہیں۔“ تیمور علی خان بہت سکون سے بات کر رہے تھے۔

آپ کے لیے ایک شعر ہے۔

پست حوصلے والے تیرا ساتھ کیا دیں گے

زندگی ادھر آ جا ہم تجھے گزاریں گے

”اس میں آپ کا ”ہم“ بھی موجود ہے۔“ ماہین ہنس پڑی تھی۔

”سوٹاکس۔ ٹھیکس۔ اور آپ کیسی ہیں۔ کیا کر رہی ہیں۔“

”کچھ نہیں۔ اچھی مصروفیت تھی۔“ اس کی آنکھیں نم ہونے لگیں۔

تیمور علی خان پر پڑی۔ غالباً وہ نازنین کو بلانے کی غرض سے وہاں تک آئے تھے۔ شیشے کے پیچھے کھڑے ہوئے تیمور علی خان نازنین کے ساتھ بہت ہم آہنگ نظر آ رہے تھے۔

”آپ تو انہی کی ہیں بچو جن کے ساتھ اجنبی بن کر بیس سال گزارے ہیں۔“

تیمور علی خان نے الوادعی انداز میں اٹنے ہاتھ کی انگلیوں کو حرکت دی اور نازنین کے ساتھ اندر غائب ہو گئے۔

ماہین جانے کس خیال میں گم رینگ تھامے کھڑی رہ گئی۔ کسی بچے کے رونے کی آواز سن کر گویا ہوش میں آئی تھی۔ اور بہت جلدت بھرے انداز میں پارکنگ لاٹ کی طرف آئی تھی۔

یاد علی خان اپنی طرف کا دروازہ کھولے۔ اس کا انتظار کر رہے تھے۔ ماہین نے کوئی بات کیے بغیر کارڈان کی سمت بڑھا دیا اور گاڑی میں بیٹھ گئی۔

انہوں نے فوراً ہی گاڑی اشارت کر دی۔

ماہین نے مدہم روشنی میں ایک نگاہ ان کے چہرے پر کی۔ آنکھیں نیم وا۔ ہونٹ سختی سے بھینچے ہوئے۔ جانے کیوں کوئی عام سی بات کرنے کی ہمت بھی نہیں ہوئی۔ اس نے سیٹ کی بیک سے سر نکا کر آنکھیں موند لیں۔

ڈنر کا انتظام بہت محدود پیمانے پر تھا۔ جتنے افراد حویلی کے تھے اتنے ہی باہر کے تھے۔ باری تو صبح ہی سے گرفتار ہو چکا تھا۔ جی بھر کے کان کھینچے گئے تھے۔

مختلف زاویوں سے انٹرویو لیا گیا تھا۔ بال کی کھال نکالی گئی تھی۔ وہ تو عالم تاب کی بروقت مداخلت نے اس کی جان چھڑائی تھی۔

ڈھولک پر ”مسٹر فراڈیے“ باقاعدہ اسے سامنے بٹھا کر گایا گیا۔

واہ بھئی! تو کتنا سیٹ اے۔ مسٹر فراڈیے۔

یہ گردان جاری تھی کہ عالم تاب آگئی تھیں۔ اور یوں اس کی جان چھوٹی تھی۔

”کا کا جان کے بعد یہ دوسری“ محبت زندہ باد ہے۔“ رونی نے اہم نکتے کی طرف ان سب کو متوجہ کیا تھا۔

روشنی دلہن بنی باری کے پہلو میں بیٹھی تھی۔ وہ سب انہیں گھیرے کھڑی تھیں۔ تصاویر کا سلسلہ جاری تھا۔

”اللہ روشنی کتنی پیاری لگ رہی ہے۔“ بیہ نے بہت سرخوشی کی کیفیت میں کہا تھا۔

”باری! دیکھو تو تم تو ماش کے آٹے کی طرح اٹنٹھے بیٹھے ہو۔ آج بیوٹی پارلر کی کارگزاری کی داد تم بھی دو۔“ مونانے

باری کو تنگ کیا۔

مرتا ہوں سادگی پہ کہ فطرت کا خُسن ہے

میرے لیے نہ خود کو سنوارا کرے کوئی

باری نے بڑی شریر مسکراہٹ کے ساتھ ایک لوہار کی کے مصداق جواب دیا تھا۔

”آپ بجو کا خیال رکھیے گا۔ وہ وہاں جا کر آپ سے خفا تو نہیں ہوئیں، لڑیں تو نہیں؟“

ع اُسے میری پُچپ نے رُلا دیا جسے گفتگو میں کمال تھا

ماہین کو خوشگوار سی حیرت ہوئی۔ اسے گمان بھی نہیں تھا کہ تیمور علی خان شاعری بھی استعمال کر سکتے ہیں۔ تیمور علی خان نے خدا حافظ کہہ کر فون بند کر دیا تھا۔ اور وہ ریسورہا تھ میں تھا مے ہنوز ایک ہی زاویے سے کھڑی تھی۔

”بات تو پھر یہ ہوئی بجو کہ ازل سے ہمارے درمیان طویل فاصلے طے ہیں۔“

وہ ریسورہ رکھ کر دوبارہ لان میں آئی تو منظر ہنوز وہی تھا۔ روشنی کے چہرے پر پایابی کے وہ رنگ تھے کہ دل سے مسافت و تھکن کی دھول اُترنے لگی۔

یاور علی خان مین گیٹ پر تنہا ہی کسی جوڑے کا استقبال کر رہے تھے۔ وہ تیزی سے چلتی ہوئی ان کے پہلو میں جا کھڑی ہوئی۔

